اسلام و رُوحانیت

اور فکرِ اقبالؒ

عرش

انوارِ ذات

تجلیات　تجلیات

روح　بسیط

عقل　بسیط

نفس　بسیط

عدم　بسیط

عالمِ امر

عالمِ ھُو — ۱۴ طبقات — دنیا سے قطع تعلق بزرگ

عالمِ ھاھوت — ۱۴ طبقات — کسی روح کا اعلیٰ مقام — عرفان میں باکمال بزرگ

عالمِ لاھوت — ۱۸ طبقات

عالمِ جبروت — ۳۶ طبقات

عالمِ ملکوت — ۳۸ طبقات

عالمِ مثال

برزخ

عالمِ اعراف

عالمِ ناسوت — ۷۲ طبقات — کسی جہنمی کا مقام معاد

عالمِ مادی

ایتھر ← مادہ کی لطیف شکل

کسی انسان کی روح

دُنیا

پیر عبداللطیف خان نقشبندی

ڈائریکٹر (ر) محکمہ موسمیات

خلیفہ مجاز نیریاں شریف

علومِ تصوف اور روحانیت کے مطابق فکرِ اقبالؒ کا پایا جانا
اور روحانی ابواب پر مفصل مدلل اور مکمل راہنما کتاب

اسلام و روحانیت
اور
فکرِ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

علامہ اقبالؒ کے روحانی کلام کے ساتھ ساتھ ۵۱ ابواب میں تمام اسلامی علوم روح، عقل، عشق، سلوک، بیعت، طبقاتِ عرش، روح کا سفر، مقامِ آدم، حکمت، ولایت کے مراتب مولانا رومیؒ کے افکار اور صوفی کی طریقے احوال دیئے گئے ہیں

عبداللطیف خان نقشبندی خلیفہ مجاز نیریاں شریف
ڈائریکٹر (ر) محکمہ موسمیات لاہور

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور۔ کراچی ○ پاکستان

نام کتاب	اسلام وروحانیت اور فکر اقبال رحمۃ اللہ علیہ
مؤلف	عبداللطیف خان نقشبندی
	خلفیہ مجاز نیریاں شریف
	ڈائریکٹر (ر) محکمہ موسمیات، لاہور
اشاعت	نومبر 2008ء
ناشر	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
کمپیوٹر کوڈ	TF64
قیمت	-/385 روپے
معاونت	شاہد ملک ایم۔ڈی ٹرپل ایم، لاہور۔
	محترمہ تسنیم مجید (پرنسپل لاہور میڈیکل اینڈ ڈینٹل کالج، لاہور)
	عاصم مجید خان (ایڈیشنل کلکٹر کسٹم، لاہور)

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔7221953 فیکس:۔042-7238010

9۔الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔7225085-7247350

14۔انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:021-2212011-2630411۔ فیکس:۔021-2210212

e-mail:- Info@zia-ul-quran.com

Visit our website:- www.zia-ul-quran.com

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (النسآء: ۱۱۳)

اور اُتاری ہے اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اور حکمت (تصوف) اور سکھا دیا آپ کو جو کچھ بھی آپ نہیں جانتے تھے

۲۔ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (البقرہ: ۲۶۹)

اور جسے عطا کی گئی دانائی (تصوف) تو یقیناً اُسے دے دی گئی بہت بھلائی

۳۔ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى (الکہف: ۱۳)

بے شک (اصحاب کہف کے) وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے ان پر ہدایت کو کشادہ کیا

۴۔ يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ (النحل: ۲)

اُتارا ہے فرشتوں کو روح (یعنی وحی) کے ساتھ اپنے حکم سے جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے

۵۔ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (بنی اسرائیل: ۸۵)

(انہیں) بتائیے کہ رُوح میرے رب کے حکم سے ہے اور نہیں دیا گیا ہے اس کے علم میں سے مگر بہت کم۔

۶۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً (البقرہ: ۲۰۸)

اے ایمان والو! داخل ہو جاؤ اسلام میں پُورے پُورے

۷۔ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (یوسف: ۱۰۸)

آپ فرما دیجیے یہ میرا راستہ ہے میں تو بلاتا ہوں صرف اللہ کی طرف واضح دلیل پر ہوں میں اور (وہ بھی) جو میری پیروی کرتے ہیں۔

سرِ ورق

اِس کتاب کے سرِ ورق پر جو خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ طبقات السّمٰوت یعنی عوالم ملکوت، جبروت، لاھوت وغیرہ کی عکاسی کرتا ہے۔ ان عوالم کا ظہور عرش کے مختلف طبقات کی بلندیوں پر جلوہ آراء ہے۔ ایک عام انسان جو تصوف سے میلان نہ رکھتا ہو وہ ان حقیقتوں سے نا آشنا اور اِس کی صداقت سے شک و شبہات کے سوا اور کچھ نہیں سمجھتا۔ معلوم ہونا چاہیے کہ اِن حقائق کی تصدیق اولیائے کرام کی قوتِ مشاہدہ سے وابستہ ہے اور وہ ان عوالم کو مکمل تفصیل کے ساتھ معائنہ کر سکتے ہیں۔

اہلِ تصوف کے کمالات اور تصرفات سے ایک بات یہ بھی ہے کہ جب دل کی آنکھ کھل جاتی ہے تو مشاہدہ شروع ہو جاتا ہے، مشاہدہ تک پہنچنے کے لئے مجاہدات کی ضرورت پڑتی ہے۔ اِس بات کی ایک خوبصورت مثال حضرت علی بن عثمان الہجویریؒ نے کشف المحجوب کے باب ''آدابِ سفر'' میں نقل کی ہے کہ ابو مسلم کسی دور دراز علاقے سے ابو سعید ابوالخیر کی زیارت کا شرف حاصل کرنے کے لئے ان کے گھر پہنچے تو اُنہیں لباس فاخرہ میں تخت پر متمکن دیکھ کر دل میں خود کو ان سے بڑا درویش تصور کیا کیونکہ ابو مسلم سخت مجاہدات کی وجہ سے بوسیدہ لباس میں اور مجاہدات کی دیگر کیفیات سے دوچار تھے۔

ابو سعید ابوالخیر نے ابو مسلم کو دیکھا تو دریافت کیا کہ تم نے یہ کس کتاب میں دیکھا ہے کہ جو بندہ تکبر کرے وہ درویش بھی ہو سکتا ہے۔ آپ نے مزید فرمایا اے ابو مسلم ہم نے پوری کائنات میں حق ہی حق کو دیکھا ہے، اِس بات پر حق تعالیٰ نے مجھے مشاہدہ کے لئے تخت نشین فرمایا اور تم نے صرف اپنے آپ کو ہی ملاحظہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں بہت نچلے درجہ پر رکھا ہے۔ فرمایا درویش مقامات سے فانی اور مجاہدات سے بچا ہوا ہوتا ہے اسی لئے اُن کو مشاہدہ عطا کیا جاتا ہے۔ مشاہدے کی بے شمار مثالیں دنیائے تصوف میں عام ملتی ہیں اور مشائخ کا قول ہے کہ درویش جب چاہے اور جہاں چاہے اپنے آپ کو کئی مختلف مقامات پر ظاہر کر سکتا ہے۔

طبقات السّمٰوات کے نچلے چار سو سے چھ سو میل کی بلندی تک موجودہ زمانے کے ماڈرن آلات سے چھان بین ہو چکی ہے۔ اِس سے منسلک اور دیگر تفصیلات کو اِس کتاب کے باب نمبر ۲۰ جو ۷۵ صفحات پر مشتمل ہے مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اِن موضوعات پر لاتعداد احادیث اور قرآن کے اشارات موجود ہیں جو اولیائے کرام کی قوتِ مشاہدہ کا نقشہ پیش کرتی ہیں۔ صحابۂ رسول ﷺ کا جنت کے طبقات کا مشاہدہ کرنا بھی منقول ہے۔ یہ تمام طاقتیں اولیائے کرام کو من جانب اللہ حاصل ہونے کی سند ہیں۔

انتساب

بنام

حضور پُر نور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

جملہ خواجگانِ نقشبند

از حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ تا خواجہ مخدومِ مَن قبلہ پیر حضرت علامہ علاؤ الدین صدیقی غزنوی مدظلہ العالی، سجادہ نشین دربار نیریاں شریف تراڑ خیل آزاد کشمیر اور اِس فقیر کے محبوب قومی شاعر علامہ اقبالؒ اور میرے درویش والدین رحمہم اللہ علیہما جن کی فیض رَس نگاہوں نے مجھے ملت وقوم کی خدمت کے قابل بنایا۔

خادم الفقراء

عبد اللطیف خان نقشبندی

042-6666631

042-6665475

کتاب کے مطالعہ کے لئے اشارات

۱۔ وہ مضامین جو قارئین کی خصوصی توجہ کے طالب ہیں ان سطور کے نیچے لکیر کھینچ دی گئی ہے۔

۲۔ قارئین اپنی معلومات اور یادداشت کے لئے مخصوص عبارات پر نشان لگالیں تو انہیں ثانوی مطالعہ میں مدد ملے گی۔

۳۔ التماس ہے کہ اس کتاب کو خود پڑھنے کے بعد بالائے طاق نہ رکھا جائے بلکہ اپنے بچوں اور دوستوں کو پڑھنے کے لئے دیتے رہیں۔ اس کا اجر بھی آپ کو ہی ملے گا۔

۴۔ کچھ صاحبِ استطاعت لوگ اگر خواہشمند ہوں تو اس کتاب کی مزید اشاعت کروا کے سستے داموں تقسیم کریں۔ مصنف کی اجازت بہرحال ضروری ہوگی۔

۵۔ اہل حکومت اور صاحب ثروت لوگوں سے اپیل ہے کہ مصنف کی کتاب نشان منزل میں مذکور تین اور پانچ روزہ درسوں کا سلسلہ جاری کروائیں کیونکہ اس کتاب میں بیان کردہ طریقہ بہت مؤثر ثابت ہوا ہے۔

۶۔ علامہ اقبالؒ کے اشعار ''کلیات اقبال'' مرتبہ شیخ غلام علی اینڈ سنز کے صفحہ نمبر کے مطابق دیئے گئے ہیں۔

۷۔ مثنوی مولانا رومؒ کے اشعار (ناشران فیصل کے صفحات نمبر اور جلد نمبر کے حساب سے دیئے گئے ہیں۔ مثلاً 6/31 کا مطلب ہے جلد نمبر ۶ صفحہ نمبر ۳۱۔

اس کتاب کے مخصوص سیلز پوائنٹ

(عام دکانوں کے علاوہ)

۱۔ فیروز سنز۔ لاہور۔ راولپنڈی۔ پشاور۔ کراچی۔

۲۔ سنگ میل پبلشرز۔ (پاکستان)

۳۔ ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ لاہور، کراچی

۴۔ مصنف کے گھر سے بارعایت ملے گی۔

۵۔ مکتبۂ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی۔

۶۔ بک سنٹر۔ صدر بازار راولپنڈی۔

اظہارِ تشکر

زیرِ نظر کتاب کی تدوین اور تصنیف کا عمل تقریباً بیس سال کے بعد پایۂ تکمیل تک پہنچ سکا ہے کیونکہ اس کتاب کی ضخامت اور مطالب کی وسعت ایک مصروف مصنف کے لئے آسان کام نہ تھا۔ میں اُن تمام حضرات کا بے حد ممنون ہوں جنہوں نے اپنی استعداد کے مطابق اس کتاب کی تکمیل میں حصہ لیا۔ جناب عاصم مجید صاحب ایڈیشنل کلکٹر کسٹمز لاہور اور اپنے فرزندِ ارجمند لیفٹیننٹ کرنل احمد فضیل، پاکستان انجینئرز کا بے حد مشکور ہوں جنہوں نے اس کتاب کی تخلیق، تحریر، طباعت اور اشاعت کے ہر مرحلے پر اپنی پوری صلاحیتوں سے میری مدد فرمائی۔ اُمید ہے کہ میری باقی کتب جو ابھی زیرِ اشاعت ہیں جلد ہی ان حضرات کی مدد سے منصۂ شہود تک پہنچ جائیں گی۔

میں دُعا گو ہوں کہ اِس وقت تک جو مزید چار کتب پایۂ تکمیل تک پہنچ چکی ہیں "اسلام وروحانیت اور فکر اقبال"، "تہذیبِ نفس"، "شاہین کا جہاں اور" اور "سوز و سازِ رومیؔ" کے علاوہ باقی ماندہ تقریباً آٹھ کتب بھی جلد ہی زیورِ طباعت سے مزین ہو جائیں۔ آمین

میں جناب محمد شاہد ملک پروپرائیٹر ٹریل ایم لاہور کا بے حد ممنون ہوں کہ جنہوں نے میری کتابوں کی پروف ریڈنگ میں استعانت فرمائی۔ میں جناب عاصم مجید کے والد اور والدہ ڈاکٹر پروفیسر تسنیم مجید پرنسپل لاہور میڈیکل کالج کا بھی مشکور ہوں جو ہمارے تبلیغی مشن کو کچھ آگے بڑھانے کے لئے کوشاں رہی ہیں۔

خادم الفقراء

پیر عبداللطیف خان نقشبندی

خلیفہ مجاز نیریاں شریف' آزاد کشمیر

ای ۷/۱- 'اے-۱ ایکسٹنشن ذوالفقار سٹریٹ

کیولری گراؤنڈ' لاہور چھاؤنی

فون: 042-6666631

042-6665475

فہرست

حصہ اوّل

(فقر اور درویشی)

۷۔ درویشی اور فقر پر صوفیاء کے اقوال ۲۸۵

حصہ دوم

(علم الروح اور تصوف)

۸۔ روحانیت اور علم الرّوح ۲۹۱

۱۱۔ تصوف وصول الی اللہ کا طریق ہے ۴۰۲

۱۲۔ تصوف پر ایک سرسری نظر ۴۳۴

حصہ سوم

(سلوک، مشروعیتِ بیعت اور معیتِ صادقین)

۱۷۔ صادقین کی معیت ۵۵۵

حصہ چہارم

(طبقات بالا کے مناظر اور احوال)

حصہ پنجم

(حکمت، معرفت اور بصیرت)

حصہ ششم

(فقراء کے خصائص اور مولاناؒ کی مثنوی)

حصہ ہفتم

(ولایت اور مراتب ولایت)

حصہ ہشتم

(کائنات میں مقامِ آدم)

حصہ نہم

(صوفی کی طریقت کے احوال و کرامات)

۴۵۔ علم ظاہر اور باطن　۱۰۸۵

۴۶۔ خلوت اور جلوت کی کرامات　۱۱۰۱

۴۷۔ صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال　۱۱۱۰

حصہ دہم

(اصطلاحاتِ تصوف اور اشاعتِ اسلام)

حمدِ باریٰ تعالیٰ

(از مصنف)

نہ میں ہی تیرے قابل ہوں، نہ یہ دل تیرے قابل ہے
خدایا کر کرم کہ یہ تری عادت میں شامل ہے

طریقت میں شریعت کا ہے گویا اوّلیں منصب
شریعت جب کہیں ٹکرا گئی، تحریرِ باطل ہے

مٹا دیتا ہے سالک حرفِ "لا" سے پورے عالم کو
دلِ سالک میں اللہ کے سوا ہر چیز فاضل ہے

مجھے کیا کام داغِ لالہ و گل کے بکھیڑوں سے
میرے دل میں تو سوزِ "ھاوھو" کی ایک محفل ہے

رہی ہے آیۂ "لَا تَقْنَطُوْا" پیشِ نظر میرے
سمندر کے تلاطم میں مجھے اُمیدِ ساحل ہے

جدھر دیکھو ادھر جلوۂ "وَجْهُ الله" نظر آئے
فقط یہ بات جس کو عشق والی آنکھ حاصل ہے

جب عرشِ پاک کی ہر شے میں نورِ مصطفائیؐ ہے
تو دیکھو گنبدِ خضرا میں نورِ حق بھی شامل ہے

خدائے کبریا کی شانِ مشتاقی کو دیکھو کہ
محمدؐ کا جو ہو مشتاق وہ انسانِ کامل ہے

نبئ پاکؐ کے در سے ملا ہم کو پتہ تیرا
جو اس راہ سے نہیں آتا وہی مجہول و جاہل ہے

بدونِ عشق، عرفانِ خداوندی نہیں ملتا
جو پیغمبر کا قائل ہے وہی عرفاں کے قابل ہے

قتیلِ عشق ہوں مولا مری دیت بھی تُو خود ہے
بہت اُونچا ہے یہ درجہ، بہت اُونچی یہ منزل ہے

عنایت ہے تری یارب کہ سایہ تیرا مجھ پر ہے
کرم تیرا کہ اب یہ دِل صلائے حق کے قابل ہے

خدا ملتا ہے تو بس مصطفیٰ کے عشق سے واعظ
خدا کا اِس طرح ملنا طریقت میں ہی شامل ہے

ملا ہے جو لطیفؔ ہم کو اُسی کے در پہ جھکنے سے
جھکاتا ہے اسی کو تو جو تیرے در کے قابل ہے

حمدِ باری تعالیٰ

(از مصنف)

تیری قدرت کا الٰہی ہے تعین، نہ حساب
بالاتر ہے ممکنہ اوصاف سے تیری جناب
تو بھی ہے بے مثل اور بے مثل ہے تیرا حبیب
ذرۂ عشقِ محمدؐ ہو ہمیں یا ربّ نصیب

نور سے تیرے ضیاء مصطفیٰؐ کی ہے نمود
اس ضیاء سے گلشنِ عالم میں کارِ ہست و بود
ذکر تیرا باعثِ تسکینِ قلب و جان ہے
اس نشاطِ ذکر میں تیری لگن ایمان ہے

ذکر سے تیرے ہی صوفی کے کدو میں ہے شراب
ہے ترے ہی ذکر میں وجدان و کیف و اضطراب
عاشقوں کا جینا مرنا، ہرنفس تیرے لئے
ہوگئے جو لوگ تیرے، تو ہوا ان کے لئے

مذہبِ حق کیا ہے؟ بندِ طالب و مطلوب بس
چاہتا ہے تو، جسے چاہے تیرا محبوب بس
آج مسلم کو عزیز از جاں ہیں دولت کے صنم
ان کی نظروں میں ہے بے معنی سفر سوئے حرم

خواہش دنیا کے بت ہر ایک کے زیرِ بغل
اور ڈالے پشت میں قرآں، کتابِ بے بدل
مسلم بے باک کو عیش و طرب سے کام ہے
تیرے بندوں کو تری ہی یاد میں آرام ہے

کیا کہیں، کیوں ہر وقت دل صورتِ سیماب ہے
قوم کے غم میں دلِ نالاں سدا بے تاب ہے
خون کے آنسو رلاتی ہے مسلمانوں کی بات
ختم کر دے اے خدا الحاد کی تاریک رات
کن بما لطفِ و چشمِ خوش انجام را
برکشا برما خدایا گردشِ ایام را

حمدِ باری تعالیٰ

(از مصنف)

شکل آدمؑ کی ہے کیا؟ سمجھو خدا کی صورت
ہم شکل ہونے میں ہے قربِ خدا کی صورت

دل میں تو ہو تو تیرا جلوہ نظر آتا ہے
دیکھیں عاشق کو تو یاد آئے خدا کی صورت

قرب سجدوں میں چھپایا ہے خدایا تو نے
ڈھونڈلی ہم نے تری دید و لِقا کی صورت

سر کٹانے میں تامّل نہیں رہتا یکسر
جس نے دیکھی ہو ترے حسن و ادا کی صورت

ہم تری مِلک ہیں ہر چیز کا مالک تو ہے
ہے خوشی اور غمی بھی تو عطا کی صورت

سجدہ کرتا ہوں تو رہتا ہے یہی دل میں خیال
میں تو بندہ ہوں، سراسر ہوں خطا کی صورت

کشفِ غم تجھ سے ہے اور جود و کرم بھی تجھ سے
دور کرتا ہے جو غم آئیں بلا کی صورت

نَحنُ اَقرَبُ سے ہی قائم ہے زمانے کا وجود
ورنہ ذرے کو بھی ملتی نہ بقاء کی صورت

جو کہا آپ نے ہم نے بھی اسے مان لیا
میں تو زندہ ہوں فقط حرفِ وفا کی صورت

بات اللہ سے میں کرتا ہوں بِلا ریب و حجاب
میرے نالوں کے جواب آئے ندا کی صورت

اُسوۂ حسنہ کی توفیق ملی تم کو لطیفؔ
عمر گذری ہے جو نقشِ کفِ پا کی صورت

حمدِ باری تعالیٰ

(از مصنف)

لائقِ حمد و ثناء ہے خالقِ یکتا کی ذات
جس نے کی ہے وقفِ عشقِ مصطفیٰؐ یہ کائنات

حمد پھر بے حد کہ ہم کو اُمتی اسکا کیا
ہیں کرم پہ جس کے قائم یہ زمین و فلکیات

کون ہے جو آپ کے محبوب پر احساں کرے
آپ ہی بھیجیں رسولِ پاک پر یا ربّ صلوٰت

اس قدر محبوبِ حق ہے مصطفیٰؐ کی ہر ادا
اُسوۂ حسنہ میں ہے رازِ بقا، رازِ حیات

باعثِ عشق و محبت تھا جمالِ مصطفیٰؐ
اور یہ عالم ہے لولاکِ لما کی باقیات

دوجہاں پر رحمت عالم ہیں اللہ کے امیں
آپ کے زیرِ تصرف ممکن و ناممکنات

جن کی ایک نظرِ کرم سے سب جہاں بدلا گیا
ان کے عاشق توڑ دیتے ہیں طلسمِ سومنات

عاشقوں کی بزم کے لمحات ہیں کتنے حسیں
ان کی بزم خاص میں ہو جب رسولؐ اللہ کی بات

آج بھی اُن کی رسالت سے ولایت تازہ ہے
دے رہے ہیں آج بھی مُردہ دلوں کو وہ حیات

لازم و ملزوم ہیں عشقِ نبیؐ، عشقِ خدا
مکمل نہیں سکتی بدون مصطفیؐ اللہ کی بات

عظمتِ سرکار میں ہیں دست بستہ اہلِ عشق
اور گستاخ نبیؑ ہیں عقل کے لات و منات

اُلفتِ حق ہے اگرچہ ہر رگِ جاں سے عزیز
ہم پہ ہیں ہر شے سے بڑھ کر مصطفیٰؑ کے واجبات

دیکھتا ہوں بزمِ شیدائے محمدؐ کو لطیفؔ
رقص میں ہے ان کے گرداگرد پوری کائنات

سجدہ ریزی میں گذر جائے اگر عمر لطیفؔ
اس سے ارفع ہیں بہت عشقِ نبیؑ کے اِلتفات

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں آقائے عالم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں سرکارِ من

(از مصنف)

آپؐ ہیں آقائے عالم آپؐ ہیں سرکارِ من
آپؐ ہی سے دل کی رونق اور نشاطِ انجمن

آپؐ ہی کے دم سے ہے رنگینِ بزمِ کائنات
آپؐ سے ہے آدمیت کو شعورِ خویشتن

آپؐ کے مدح سرا، حجر و شجر جن و ملک
آپؐ کی توصیف میں نغمہ سرا مرغِ چمن

آپؐ کی خاطر مزّین آسمانوں پہ چراغ
آپؐ کی تکریم و عزت کو بچھے کوہ و دمن

آپؐ کی آمد سے ہر گلشن میں اُمیدِ بہار
آپؐ کے حسنِ تصور سے ہے گُل کا بانکپن

آپؐ ہی کے حسن کے پیشِ نظر ہر شے جمیل
آپؐ کے اسمِ گرامی سے ہے کلیے کی پھبن

آپؐ کی الفت میں مضطر موجِ دریائے عمیق
آپؐ کی عظمت سے حیرت میں پڑے صحرا و بن

آپؐ کی جویا ہے ہر شے بہرِ شرفِ التفات
لے چلی شبنم کو دیکھو ساتھ سورج کی کرن

آپؐ کے آنے سے پہلے اور چلے جانے کے بعد
منتظر تھے اور اب بھی ہیں بچارے رات دن

کون محبوبِ خدائے لم یزل، مولائے کُل
آپؐ کی جانب ہے انگشتِ نما، سروِ چمن

جستجو میں آپ کی ہی ہے یہ بلبل نالہ سوز
منتظر ہے چشمِ نرگس، چپ ہے لالے کا دہن

ہے تلاشِ مصطفٰے میں کو بکو صحرا میں باد
سِل سکا نہ آج تک مجنوں کا چاکِ پیرہن

گوش و موئے سر ہیں استادہ کسی کی راہ میں
منتظر ہے آپؐ کی آمد کی یہ چشمِ زدن

موت سے مطلوب مومن کو ہے دیدارِ رسولؐ
خوش ہے وقتِ موت مومن، غمزدہ ہے برہمن

اس جہاں کے ذرہ ذرہ کو ہے نسبت آپؐ سے
جس کو دیکھو آپؐ کی الفت کی ہے دل میں لگن

آپؐ کی جانب سے آمد ہے لطیفؔ اشعار کی
اس قدر ہوتا نہ ورنہ میرے شعروں کا وزن

مہمان مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا بنوں میں کبھی کبھی

(از مصنف)

اُٹھتی ہے میرے دل میں تمنا کبھی کبھی
مہمان مصطفےٰ کا بنوں میں کبھی کبھی

رکھتے ہیں اپنے عشق کی دنیا جو تازہ دم
ایسا نہیں کہ ان پہ کرم ہو کبھی کبھی

عاشق ہوا جو آپ کے حسن و جمال کا
ملتا ہے اس کو آپ کا جلوہ کبھی کبھی

سلطانِ دو جہاں کا کرم خوب تر ہوا
وہ خود بھی چل کے آتے ہیں گھر پر کبھی کبھی

گر چاہتا ہے تو کہ ملے لطفِ حسنِ یار
کر خود کو وقفِ دیدِ تمنا کبھی کبھی

دیتے ہیں جب تو دیتے ہیں بے حد و بے حساب
گردش میں دورِ جام ہے آتا کبھی کبھی

جب ہوں حضورؐ اپنے صحابہؓ میں جلوہ گر
نقشہ نظر وہ آتا ہے دل میں کبھی کبھی

ولیوں کی بات ہوتی ہے اب بھی نبیؐ کے ساتھ
یہ آزما کے تم بھی تو دیکھو کبھی کبھی

جو چاہتے ہیں معرفت سرکار کی لطیفؔ
ڈھونڈیں وہ دل میں آپ کا رستہ کبھی کبھی

تقاضا قرب کا ہے فاصلوں کو کم سے کم رکھنا

(از مصنف)

خدائے پاک کا حجرہ ہے دل، اس میں نہ غم رکھنا
عنایت ہے خدا کی یہ، اسے تم محترم رکھنا

وضو کرتے ہیں عاشق دائماً اشکِ پیازی سے
نشاں رومی نے عاشق کا دیا ہے چشمِ نم رکھنا

محبت میں نہیں ہے فرق نزدیکی و دوری کا
تقاضا قرب کا ہے فاصلوں کو کم سے کم رکھنا

طریقت میں توجہ مرشدِ کامل کی جانب رکھ
یہ فرمانِ مجدد ہے، سرِ تسلیم خم رکھنا

مقامِ عشق ہے کعبہ یہاں کعبے کی عظمت ہے
مگر شہرِ مدینہ میں سنبھل کر تم قدم رکھنا

خدا کی دید کو چاہے تو کوتاہ رکھ امیدوں کو
صفائے دل کی خاطر لازماً خالی شکم رکھنا

نہیں مردِ قلندر کو کبھی حالات کا شکوہ
فضا کتنی مکدر ہو مسیحائی کا دم رکھنا

تمہارے دم سے ہی اُگتا رہا ہے سبزۂ رُستہ
ہماری سمت بھی اپنی نظر اہلِ کرم رکھنا

فرشتہ خالی دفتر دیکھ کے مسلم کا روتا ہے
تم اپنا دستِ شفقت ان پر اے شاہِ اُمم رکھنا

تم اپنی خواہشوں کے واسطے کعبے کو جاتے ہو
یہ گھر اللہ کا ہے اس میں نہ خواہش کا صنم رکھنا

سنا تھا فیض ملتا ہے تو نظروں سے ہی ملتا ہے
خدارا میری جانب بھی ذرا چشمِ کرم رکھنا

جہاں میں خواہ کوئی کتنا ہی درد و غم کا مارا ہو
کشادِ غم اسی میں ہے نظر سوئے حرم رکھنا

خدا کے ہاں عرب والوں کی عزت لازمی شے ہے
خیال اس بات کا دائم تم اے اہلِ عجم رکھنا

نہ دیکھو آنکھ اٹھا کر تم فرنگی شیشہ بازوں کو
مسلماں کے لئے واجب ہے ترکِ جامِ جم رکھنا

تماشا بن نہ جائیں یہ نگاہِ اہلِ دنیا میں
تم اپنے ماننے والے مریدوں کا بھرم رکھنا

فقیرانہ عمرؓ داخل ہوئے بیت المقدس میں
نہیں ہے زیب مومن کو لباسِ ذی حشم رکھنا

محمدؐ کی محبت سے ہی بس عرفانِ کامل ہے
لطیف اس نکتہ کو تم دائما دل میں رقم رکھنا

4B

دل میں نہیں جو نقشِ یار حسنِ نماز کچھ نہیں

(از مصنف)

دل میں نہیں جو نقشِ یار، حسنِ نماز کچھ نہیں
دل نہ ہو تار تار اگر، سفرِ حجاز کچھ نہیں

رہتے ہیں دِل میں رات دن، حسنِ مجاز کے نقوش
اہلِ نظر کے واسطے عشقِ مجاز کچھ نہیں

مستیِ ذوق و شوق ہے، اصلِ نماز کا نشان
تیرا قیام بے حضور، بندہ نواز کچھ نہیں

تری اذان میں کہاں، نظرِ رسولؐ کا فروغ
جذب بلالؓ کے بغیر خالی آواز کچھ نہیں

لحۂ عشقِ مصطفیٰؐ بہتر ہے زُہدِ خشک سے
سجدہ گری میں بسر کی، عمرِ دراز کچھ نہیں

عشق کی آگ میں جلا، گیسوئے دل کو برملا
جب تک نہ خم ہو عشق میں، زلفِ ایاز کچھ نہیں

دیتا ہے عشق پر اگر فتویٰ، کفر تُو اے شیخ
فتویٰ یہ تنگ دل کا ہے، اس کا جواز کچھ نہیں

اہلِ نظر کی رفعتِ قلب و نظر کچھ اور ہے
وہ جو اُٹھائیں اک قدم، کوہِ فراز کچھ نہیں

تیرا کلام بے نظیر، قوم کا تو ہے دستگیر
تیرے لئے خراجِ دل، دانائے راز کچھ نہیں

رحمتِ دو جہان دی، اپنے نبیؐ کو شان دی
عشقِ نبیؐ نہ ہو اگر، راز و نیاز کچھ نہیں

میں تو لطیفؔ کہہ چکا اہلِ مراد سے یہ بات
عشق ہے نامراد وہ جس میں گداز کچھ نہیں

کس کا نصیب ہے ملے عشقِ جنابِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

(از مصنف)

عشق ہے مصطفےٰ کا یہ، عام یہ عاشقی نہیں
جس کو ہو جان و دل عزیز عشقِ محمدؐ نہیں

کس کا نصیب ہے ملے، عشقِ جنابِ مصطفےٰ
دل میں حضور گر نہیں سجدوں میں دلکشی نہیں

قاسم[1] عطائے حق کے ہیں جبکہ جنابِ مصطفےٰ
داتا انہیں کہے نہ جو، سچ ہے وہ آدمی نہیں

تیری عبادتوں میں گر عشقِ محمدی نہ ہو
ایسی نماز بے حضور، اس میں تو چاشنی نہیں

تیری عبادتوں میں ہے الجھا فریبِ زندگی
دل میں نہ ہو جو عشق یار اُس کی تو بندگی نہیں

عشق کی دائمی نماز، اس کی غذا ہے سوزوساز
جب نہ ہو سوزوساز تو، لذتِ مے کشی نہیں

ہو جو حضورِ مصطفےٰ، ملتی اسی کو ہے جلا
جس دل میں یہ جلا نہ ہو اسکی تو حاضری نہیں

نورِ خدا وہیں پہ ہے، عشقِ رسولؐ ہو جہاں
دل میں نور ہی نہیں اس میں تو روشنی نہیں

گرچہ فرنگ میں مجھے احساسِ بندگی رہا
ساغر تو ہیں وہاں بہت، پر جامِ معنوی نہیں

اصلِ نماز ہے ہی کیا؟ عشقِ حضور کی شراب
عشقِ حضور کے بغیر، رنگتِ دلبری نہیں

1۔ وَاللّٰهُ يُعْطِيْ وَاَنَا قَاسِمٌ۔ اللہ تعالیٰ دیتا ہے اور میں بانٹتا ہوں (حدیث)

رسم کی عاشقی جدا، مذہب عاشقی خدا
اس میں وہ کیف ہے لطیفؔ، جس میں خوشی غمی نہیں

دیتے ہو بولہب کو کیا، درسِ جنیدؒ و بایزیدؒ
جو دل کہ بے مراد ہو اس میں یہ تشنگی نہیں

رب کی خدائی کے امیں سرورِ کائناتؐ ہیں
ان کی عطا خدا سے ہے جس میں کوئی کمی نہیں

سجدوں کی کثرتوں میں گو غرضِ نجات ہے ضرور
عشقِ نبیؐ اگر نہ ہو قربِ محمدیؐ نہیں

عزمِ صمیمِ عشق ہے، عزمِ لطیفؔ بھی ہے عشق
عشق ہے جرأت و لگن، اس میں لگی بجھی نہیں

ہم عاشق ہیں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمارا کام درویشی

(از مصنف)

نہ حسرت مال و زر کی ہے نہ خطرۂ کم و بیشی
ہم عاشق ہیں محمدؐ کے ہمارا کام درویشی

کوئی نسبت کسی کے کام نہ آئے گی محشر میں
محمدؐ ہی کے عاشق کے لیے ہے نسبتِ خویشی

خزانے اہلِ دنیا کے مبارک اہل دنیا کو
خدا والوں کو ہی ملتی ہے مال و زر سے روپوشی

نہ کارِ عیش و عشرت ہے نہ کارِ منصب و کرسی
ہے درویشوں کی قسمت میں یہ کارِ خود فراموشی

جو محتاجِ زمانہ ہو تو خاک ایسی امارت پر
فقیری میں ہو سلطانی، تو پیدا کر وہ درویشی

خدا کے ہاں کا زینہ ہی تصوف کی علامت ہے
زوالِ مومناں ہے کیوں؟ تصوف سے ہے کم کوشی

بلا و سخت کوشی ہی میں ہوتا ہے کشادِ دل
طریقہ عاشقوں کا ہے وفا کیشی، بلا نوشی

مسلماں کی روش میں مغربی انداز چھائے ہیں
زمانے بھر کو بھاتی ہے یہی مغرب کی مے نوشی

رسول اللہؐ کی صحبت نے جنہیں دیں کا سکوں بخشا
وہ مسلم ڈھونڈتا ہے اب محافل کی گرم جوشی

میں عشقِ مصطفےٰؐ میں غرق رہتا ہوں لطیفؔ اکثر
مرا مذہب ہے مے نوشی، مرا مسلک ہے مدہوشی

ملی منزل بالآخر مصطفیٰ کے در پہ آنے سے

(از مصنف)

یہی ہے عرض پیشِ ذاتِ جلّ شانہٗ میری
ہو پابندِ رضائے مصطفیٰ ہر آرزو میری

حوادث نے کیا ہے چاک دامن یا رسولؐ اللہ
کرم کیجئے کہ ہو یہ چاک دامانی رفو میری

ملی منزل بالآخر مصطفیٰ کے در پہ آنے سے
مسائل میں بہت الجھی خرد اور جستجو میری

مقدر جس کا بھی چمکا تو اس در کی غلامی سے
اسی سے زندگی و بندگی، نام و نمو میری

یہ حسنِ خوبیٔ نامِ محمد ﷺ بزمِ دنیا ہے
مزین ہے بیانِ مصطفیٰ سے گفتگو میری

سمجھ سکتا نہیں زاہد زبانِ آہِ دل میری
تب و تابِ فغاں میری، نہ سوزِ ھا و ھو میری

جو طالب ہو کوئی تو مے پلاتا ہوں حضوری کی
ہوئی مشہورِ عالم لذتِ جام و سبو میری

چھما چھم اشک بہتے ہیں محمد ﷺ کا بیاں ہو تو
جو ہو رقت تو دب جاتی ہے آوازِ گلو میری

قبولِ بارگاہ کن یا رسولؐ اللہ عقیدت را
یہ نذرِ رحمت تو یہ ذرا سی آبجو میری

چراغِ راہ بن جائے شرارِ سوزِ آہِ دل
جگا دے پورے عالم کو صدائے اللہ ھو میری

کرم مانگا ہے دربارِ رسالت سے لطیف اتنا
رہے اُس پاک در کی خاکبانی آبرو میری

کافی ہے یہ کہ عاشقِ خیرالبشر ہوں میں

(از پیر عبداللطیف خان نقشبندی)

کہتے ہیں مجھ کو لوگ کہ اہل نظر ہوں میں
اہلِ نظر، پر آپ سے بھی بے خبر ہوں میں

شاہ و گدا کا نام نہیں معتبر مجھے
کافی ہے یہ کہ عاشقِ خیرالبشر ہوں میں

مجھ کو ڈرا سکیں گے نہ دیر و حرم کے لوگ
فتویٰ ہو کفر کا بھی تو کافر نہیں ہوں میں

اللہ کا رازِ خاص ہے یہ زندگی مری
حق کی ردا کے بیچ ہوں باہر نہیں ہوں میں

ہوتا ہوں میں عوام میں ہر وقت دل عزیز
گر دل کسی کا ہوں تو کسی کا جگر ہوں میں

دنیاوی کاروبار میں شیر و شکر ہوں پر
قومی معاملات میں چیزے دگر ہوں میں

دوزخ کی آگ ڈرتی ہے مومن کے نور سے
شیطان جس سے ڈرتا ہے ایسا شرر ہوں میں

دیتا ہوں میں عوام کو اسباق خیر و رشد
گویا ہزار ظلمتوں کی اک سحر ہوں میں

ہر حال میں ہے قوم کا رہتا ہمیں خیال
قاصد رسولِ پاک کا اور نامہ بر ہوں میں

دنیا کے عیش ہی سے رہا دور میں لطیفؔ
عشق محمدؐ کے سوا بے خبر ہوں میں

اِنتہائے فیض میں دل کی لگن اچھی لگی

(از مصنف)

انتہائے فیض میں دل کی لگن اچھی لگی
دل لگا تو پھر مدینے کی گلی اچھی لگی

حق تعالیٰ کو پسند آئی نہ جنت کی فضا
اس لیے اُس کو مدینے کی گلی اچھی لگی

قسم کھاتا ہے خدا مکے کی گلیوں کی اگر
آپ کے بچپن میں گزری جو گلی اچھی لگی

بارہا جبرائیل آئے لے کے پیغامِ وحی
آتے جاتے تھے مدینے کی گلی اچھی لگی

اتنی کثرت سے مدینے میں ہوا حق کا نزول
خود بھی یزداں کو مدینے کی گلی اچھی لگی

پوری دنیا کا بنا مرکز مدینہ پاک جب
یہ سبب تھا سب جہاں کو یہ گلی اچھی لگی

مصطفیٰؐ کے دفن کے لائق نہ تھے ارض و سماء
روضے کی خاطر مدینے کی گلی اچھی لگی

خاک پاک روضہ رتبے میں ہے افضل عرش سے
اس فضیلت سے مدینے کی گلی اچھی لگی

ساری دنیا میں عزیز حق وہی ہے اے لطیف
جس کو دنیا میں مدینے کی گلی اچھی لگی

ہر بات تصوف کی پُر کیف ہے وجدانی

(از مصنف)

مت پوچھو طریقت کا، قصہ ہے یہ طولانی
ہر بات تصوف کی پُر کیف ہے وجدانی

اک مستی کی حالت میں، رہتا ہے جنوں تازہ
ہو جاتا ہے اللہ سے، اک رابطہ نورانی

امدادِ خدائی ہے مومن کے تصرف میں
غلبہ نہیں مومن کا بے قوتِ یزدانی

اللہ کا مطیع ہے جو طابع ہے جہان اُس کا
ان کے لیے ہر شئے کی خم رہتی ہے پیشانی

اس فقر کی دنیا کا عنوان نہیں ہوتا
پہچانِ طریقت ہے گم گشتی و حیرانی

بس جاتا ہے سانسوں میں جب ذکرِ خداوندی
آجاتی ہے سالک میں اک قوتِ لاثانی

ڈرتا ہے جو اللہ سے غم اُس کو نہیں رہتے
سالک کے سفینے کو چھوتی نہیں طغیانی

ہے الفتِ مال و زر کب مردِ طریقت کو
ہے رغبت سیم و زر، اک فطرتِ نسوانی

اللہ کی چادر نے ولیوں کو چھپایا ہے
ولیوں کی کرامت کی ہوتی نہیں عریانی

کھلتا ہے طریقت میں اک راز یہ پیچیدہ
دشواریٔ پیہم میں تعمیر مسلمانی

ہر اہلِ طریقت کو کچھ خوف نہیں رہتا
نہ فکرِ معیشت ہے نہ حالِ پریشانی

مومن کی ضیا سے ہی ہر شہر میں رونق ہے
اس مردِ طریقت کو آتی نہیں رہبانی

بے سوزِ دروں ہرگز سالک کا نہیں جینا
ہر لمحے میں بیداری، ہر سانس میں جولانی

گو غرق طریقت میں رہتا ہوں لطیفؔ اکثر
آدابِ شریعت میں خم رکھتا ہوں پیشانی

مگر ہے ولایت کا گھر نقشبند

(از مصنف)

طریقت میں ہے بس ولی وہ بلند
جو ڈالے سراسر خدا پر کمند
گھرانے بہت یوں تو دنیا میں ہیں
مگر ہے ولایت کا گھر نقشبند
یہ اعجاز ان ہی کو حاصل ہوا
نہایت [illegible] میں کرتے ہیں بند
یہ [illegible] رہا مالِ دنیا سے دور
مقام اس کا ہے سیم و زر سے بلند
طریقت میں نفسانیت ہی نہیں
یہاں نفس رہتا ہے کوزے میں بند
پہاڑوں، ستاروں سے اس کا گزر
نہیں اس کو کوئی جہاں سود مند
زمان و مکاں سے یہ آزاد ہے
نہیں اس کو بھاتے مقاماتِ چند
ہے جو شخص شیدائے نورِ نبیؐ
وہی شخص عاقل وہی ہوشمند
فقیروں کو دنیا تو بھاتی نہیں
انہیں جلوۂ مصطفٰے ہے پسند

کبھی لوح پر ہے کبھی عرش پر
خدا والے رکھتے نہیں آنکھ بند
وہ تاجر ہے قرآں کی آیات کا
سنائے اجر لے کے جو وعظ و پند
کلامِ ولی حق میں ڈوبا ہوا
کبھی تلخ و مشکل کبھی شیر و قند
ہر اک کے لئے ہمدم و خیر خواہ
نہیں اس سے پہنچی کسی کو گزند
محمدؐ سے اس کا ہے رشتہ لطیف
جسے بوبکرؓ سے ہو نسبت پسند

منقبت (بحضور حضرت علی بن عثمان الہجویری المعروف داتا گنج بخش ؒ)

(از مصنف)

رفعتِ ہجویریؒ می دانی بہ کیست؟
مصطفےٰ را عشق، اُو را زندگیست

یادِ اُو سرمایۂ ہر دو جہاں
عاشقاں را نامِ اُو وردِ زباں

بود ذِکرِ حق بہ ہر ہر موئے اُو
جز محمدؐ اُو نہ دارد رنگ و بُو

نامِ تو موصوف با اسمِ علی
زانکہ تو داری بہ اُو نسبت جلی

تو فروزی اولیاء را مشعلے
نقشِ پائے تو حیاتِ کاملے

بسر کردی در طریقت عمرِ خویش
از تو زندہ شد طریقت بیش بیش

آں مقامِ عشق کہ داری عیاں
یک جہانِ زہد می بینم دراں

قوم را غم خوردہ ای تو روز و شب
جاہِ تو دی روز نہ شد بے سبب

در کمالاتِ تو می بینم خلوص
جہدِ تو لا رَیب، خدمت را فَصوص

زندگی کردی نثارِ خلق تو
غازیِ اسلام، صاحبِ دَلق تو

از تو کفرِ ہندیاں شد پاش پاش
از نگاہت کلمہ گوید بت تراش

ایں ہمہ کارے بہ حُسنِ ذاتِ تو
ما مسلمانیم از برکاتِ تو

عصرِ ما مردہ و آساید نحیف
یک علی ہجویریؒ می باید لطیف

منقبت

بحضور قبلہ محمد قاسم موہڑویؒ

(از پیر عبداللطیف خان نقشبندی)

اے قاسمِ بحرِ علوم اے راکبِ شمس و نجوم
ذات سے تیری ہے قائم عالمِ نسبت میں دھوم

ہے جہانِ معرفت کا تو شہنشاہ بالیقین
کائناتِ ھُو میں ہے بس آپ کے دم سے ہجوم

عشق کا حاصل تھا تجھ کو ہند میں پہلا مقام
ہیں طریقت میں ابھی تازہ تری رسم و رُسوم

ہے ترے دستِ کرم میں بادشاہت کا نظام
تیرے ہر ادنیٰ اشارے کو لیا قسمت نے چوم

جانتا ہوں کیوں عقیدت ہے ترے در کی غلام
آپ نے سکھلائے سب کو ہیں طریقت کے عزوم

تو نے دی ہے زندگی میں خلق کو بس یہ صدا
اُسوۂ حسنہ ہے اول، پھر طریقت کے لزوم

تیرے مرقد سے ملے اسباق اہلِ ذوق کو
تو نے سکھلائے مریدوں کو طریقت میں قدوم

ہے کنارِ عرش پر محفوظ تیری گفتگو
گونجتا ہے تیرے نغموں سے جہانِ مرز بوم

لے گئے سب اولیاء فیضان کا تیرا نصاب
تیرے گردا گرد رہتا تھا مشائخ کا ہجوم

تیرے روضے پر عجب دیکھا گیا دستور یہ
چشمِ عاشق کو ترے روضے کی ضو لیتی ہے چوم

لوگ کہتے ہیں تصوف اب کہیں باقی نہیں
ہے ترے عشاق میں اب بھی تصوف بالعموم

فیض تیرا پوری دنیا میں نظر آتا ہے یوں
ملک ہندوستان کا گویا تھا تو مولائے رومؒ

زیست تیری تھی سراپا منبع نور و حضور
اس لئے تربت پہ تیری عاشقوں کے ہیں ہجوم

جب کبھی جاتا ہے تربت پر تری میرا خیا ل
دور ہٹ جاتی ہے مجھ سے خود بخود بادِ سموم

جو کہا تو نے اشاروں میں وہ باتیں سب ہیں یاد
تیرے عزم و صدق کی موجود ہے سینوں میں دھوم

گوشہ گوشہ رقص میں ہے فیضِ قائمؒ سے لطیفؔ
قائیؒ انوار سے لوگوں کے دل جاتے ہیں جھوم

ابلاغ سے دم لیں گے، نہ آرام کریں گے

(از مصنف)

ابلاغ سے دم لیں گے، نہ آرام کریں گے
جب تک کہ ہیں زندہ، ترا ہم کام کریں گے
ہے آرزو میری، کہ بہ صد جذبۂ پیہم
بے دین ہیں جو، مائلِ اسلام کریں گے
ہے عافیت اسلام میں، اور جائے پناہ بھی
ہر ذرّے کے ہمراہ ترا پیغام کریں گے
اسلام کی امداد میں ہی، ربّ کی مدد ہے
یہ نعرہ بلند آج، سرِ بام کریں گے
افراد کو افکار کی ظلمت سے نکالیں
ملّت کا مداوا یہ، صبح و شام کریں گے
ناواقفِ سرچشمۂ ملت ہے مسلمان
اس علم کو، حکمت کو، سرِ عام کریں گے
محدود ہے چند سینوں میں ولیوں کی محبت
ہر سینے کو اب عشق کا بسطام کریں گے
ہر فرد کے ظاہر میں بھی باطن کی چمک ہو
یہ کام تصوف کا ہے، بے دام کریں گے
خوش ہوں کہ لطیفؔ اپنی طلب ہے تو یہی ہے
ہم خدمتِ اسلام کو ہر گام کریں گے

راز ایسا کہ چھپا پردۂ افلاک میں ہے

(از مصنف)

راز ایسا کہ چھپا پردۂ افلاک میں ہے
اس کا عرفان ترے گوشۂ ادراک میں ہے

کچھ مسائل کہ جو منطق سے کبھی حل نہ ہوئے
ان کی تشریح تو حدیثِ شہِ لولاک میں ہے

کوئی سمجھا ہے نہ سمجھے گا جنوں کا عالم
اس جنوں سے ہی رفو پیرہنِ چاک میں ہے

نہ وہ مسجد میں ہے نہ دیر و کلیسا میں کہیں
وہ سکوں ڈھونڈ کہ جو نالۂ نمناک میں ہے

ناقہ جاتی ہے مدینے کو تو سرمستِ جنوں
ایسی شوخی تو فقط ناقۂ چالاک میں ہے

گر تحمل نہیں اس میں تو وہ صوفی کیسا
یہ تحمل ہی تو صوفی تری پوشاک میں ہے

ایک رفعت ہے جو شبنم کو بھی لے اڑتی ہے
اک گراوٹ ہے کہ انسان کی خاشاک میں ہے

اک جنوں ہے کہ جو زخموں کو بھی سی لیتا ہے
گو یہ کہتے ہیں جنوں پیرہنِ چاک میں ہے

تو جو چاہے تو. جلا ڈالے زمین اور فلک
کس قدر آگ اے مومن تری بیباک میں ہے

ایک لمحے کی بھی غفلت نہیں انساں کو روا
جو یہ سمجھے کہ یہ ابلیس مری تاک میں ہے

ہم تو اس عشق کو ہی رہزِ وفا کہتے تھے لطیف
عشق تو آگ ہے جو شعلۂ بیباک میں ہے

تقدیم

(از مصنف)

مذہب اسلام روحانیت کا مذہب ہے۔ جہاں اسلام ہوگا وہاں روحانیت بھی پائی جائے گی اور جہاں روحانیت ہوگی وہاں اسلام اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ چمکتا ہوا نظر آئے گا۔ جب کہ کائنات ابھی وجود میں نہ آئی تھی تو روحانیت کا وجود اس وقت بھی پایا جاتا تھا۔ تخلیقِ کائنات سے پہلے کُنتُ کَنزًا مَخفِیًّا یعنی خدا کی ذات کا ایک مخفی خزانے کی طرح ہونے والی حدیث، اسلام کی روحانیت کے بابت ایک کھلا اشارہ ہے۔ اس سے پہلے خدا کا عرش پانی پر ہونا اور مختلف ادوار میں کائنات کے پیدا کئے جانے کا عمل قرآنِ کریم میں مذکور ہے اور یہ اسلام کے ایک روحانی مذہب ہونے کی دلیل پیش کرتا ہے۔ قرآن اور حدیث کا یہ انکشاف کہ انبیائے کرامؑ اور اولیائے کرام تخلیق کائنات سے پہلے بھی درجہ انبیاءؑ اور اولیاء پر فائز تھے اس بات کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ روحانیت کی ابتداء کائنات کے وجود میں آنے سے پہلے ہی وجود میں آچکی تھی۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات مثلاً سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۸۱ میں میثاقِ انبیاءؑ، سورۃ الاعراف کی آیت نمبر ۱۷۲ میں وعدۂ الست اور سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر ۳۴ میں آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دینا وغیرہ اس روحانی دنیا کا تخلیق کائنات سے پہلے ہی وجود میں آنے کا ثبوت مہیا کر رہی ہیں جن کے مطالعہ کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بذات خود روحانیت کے نور کا منبع ہے اور ازل سے ہی روحانیت کا دور دورہ شروع ہو چکا تھا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ازل سے ابد تک (اور اس کے بعد بھی) جب تک اللہ کی حکومت قائم ہے حق سبحانہ تعالیٰ کی طرف سے روحانیت کا سلسلہ جاری رہے گا۔ مولانا رومؒ نے فرمایا ہے کہ جب کسی دیوار پر کوئی روشنی نظر آتی ہے تو تم سمجھ لو کہ یہ روشنی سورج کی تابانی کے سوا کچھ نہیں گویا جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم سے ہو رہا ہے۔

گر شود پُر نور روزن یا سرا　　تو مداں روشن مگر خورشید را (۱/۳۳۸)

(اگر کوئی روشن دان یا گھر روشن نظر آئے تو تم سورج کو ہی روشن سمجھو)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (النور: ۳۵) (یعنی اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا) اللہ تعالیٰ کے نور سے ہی دنیا کی روحانیت قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو چھ مراحل میں پیدا

فرمایا اور اس تخلیق سے پہلے اس کی ذات اسماء وصفات سے موسوم نہ تھی (گرچہ رزّاق اور غفار کی صفات بالقوۃ اس کی ذات میں مخفی تھیں مگر وہ ان صفات سے پہچانا نہ جاتا تھا کیونکہ اگر مخلوق ہوتی تو اس کو کوئی رزّاق اور غفّار کے ناموں سے پکارتا) اللہ تعالیٰ کی اس ذات کو مرتبۂ اوّل یا ذاتِ لاتعین یا ذاتِ بحت یا ذات ساذج کہا جاتا ہے۔ اس ذاتِ لاتعین نے سب سے پہلے حقیقتِ محمدیہ ﷺ کو پیدا کیا جسے مرتبہ دوئم یا تعینِ اول، برزخِ اول، عقلِ کُل، روحِ اعظم، برزخ البرازخ اور مقامِ وحدت کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ وَمِنْ نُوْرِیْ خَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ) سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے میرا نور پیدا کیا اور میرے نور سے ہی ہر چیز پیدا فرمائی۔

(مطالع المسرات شرح دلائل الخیرات اور مقالات کاظمی حصہ اول)

تیسرا مرتبہ حقیقتِ انسانیہ کا ہے جو کائنات کا خلاصہ یا اجمال کائنات ہے۔ اس وجود کو مرتبہ تجلی ثانی بھی کہا جاتا ہے۔

چوتھا مرتبہ عالمِ ارواح کا ہے جو عالمِ ملائک بھی کہلاتا ہے، جو کچھ کائنات میں موجود ہے وہ عالمِ ارواح میں باطنی طور پر موجود ہے۔

پانچواں مرتبہ عالمِ مثال کا ہے۔ جو کچھ عالمِ ارواح اور عالمِ شہادت میں موجود ہے وہ یہاں باطناً موجود ہے۔

چھٹا مرتبہ وجود یہ یعنی ظاہری دنیا ہے جسے عالمِ شہادت اور عالمِ ناسوت کا بھی نام دیا جاتا ہے۔

تخلیق کے ان چھ مراحل کو تنزلات ستہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اس کا ذکر قرآنِ کریم میں بھی ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو چھ ایام میں تخلیق کیا۔ یہ تمام سلسلۂ روحانیت کی طرف اعلیٰ اشارات ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ''کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیًا'' کی حدیث کے مطابق خدا تعالیٰ کائنات میں ایک مخفی راز تھا، اور انسان کے علاوہ کوئی مخلوق اس قابل نہ تھی جو اللہ تعالیٰ کے اس مخفی راز کو سمجھ سکتی۔ اگرچہ انسان سب سے بعد میں پیدا کیا گیا مگر قدرت کے تمام رازوں کا شناسا انسان ہی تھا کیونکہ وہ عِلم الاسماء کے ذریعے ان کو سمجھنے کی قوت رکھتا تھا۔ گویا انسان کو جب وجودِ عنصری میں لایا گیا تو اللہ تعالیٰ نے کائنات کے تمام سربستہ رازوں کو ظاہر کرنے کا سامان خود ہی مہیا کر دیا۔ علامہ اقبالؒ انسان کی اس تخلیق پر خود ہی حیرانگی کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ کیا غضب کی بات ہے کہ انسان نے تمام خدائی رازوں کو افشا کر دیا ہے۔ خدائی رازوں کو اس طرح افشا کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کام کے کرنے کی طاقت اور روحانیت کی قوت عطا فرمائی تھی۔ رازِ الٰہی کو فاش کر دینے کے اس حیرت انگیز اتفاق کا اظہار علامہ اقبالؒ نے درج ذیل شعر میں کیا ہے۔

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا　　میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

(ب۔ج:۲۹۷)

ہم کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نائب (انسان) کو روحانی قوتوں کا اتنا بڑا ذخیرہ عطا کر دیا ہے کہ جس کے ذریعے یہ بہت زیادہ روحانی تصرفات کو حاصل کر لیتا ہے اگر چہ اس کے حاصل کرنے کا ایک خاص طریقہ مجاہدات اور مکاشفات کا مقرر کر دیا گیا ہے اور اس کو حیرت انگیز تصرفات کا مالک بنا دیا گیا ہے تا کہ یہ کائنات میں ہر چیز پر تصرف کر سکے۔ یہ قوت اس کو اس لئے دی گئی ہے کیونکہ اسے تمام کائنات کا حاکم اور نگران بنایا جانا تھا۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

اولیاء را ہست قدرت از الٰہ　　تیرِ جستہ باز آرندش زراہ (۱۸۹/۱)

(اولیاء اللہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتنی قدرت دی گئی ہے کہ وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کو راستہ میں سے واپس کر سکتے ہیں۔)

انسان کو لطائفِ ستہ کی عطا ایک ایسی بات ہے جس سے وہ عطا کردہ قوتوں کے بل بوتے پر کائنات کی ہر شے کا مشاہدہ کر سکتا ہے بلکہ اس کو اتنی طاقت عطا کر دی گئی ہے کہ زمین اور آسمان کی ہر چیز کو اس کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا: وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (الجاثیہ: ۱۳) (اور اس نے مسخر کر دیا ہے تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے) روحانی قوتیں بہت سے بزرگانِ اسلام نے حاصل کیں۔ ان قوتوں کے حصول کے لئے خصوصی روحانی دنیا میں قدم رکھنا ہوتا ہے اور مسلمان کسی کامل مرشد کی وساطت سے روحانی مشقوں اور محتاط اسلامی قدروں کا خیال رکھتے ہوئے روحانیت کا رنگ آسانی سے اپنے اُوپر چڑھا لیتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے فلسفۂ خودی کا اظہار مسلمانوں کے سامنے اسی غرض سے پیش کیا ہے تا کہ بندہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ ہر قوت کا اندازہ کر سکے اور یہ سمجھ سکے کہ میری ہستی کی پرواز کہاں تک ہو سکتی ہے۔ ''اپنی خودی پہچان'' سے مراد یہی ہے کہ بندہ اپنی خداداد صلاحیتوں کا اندازہ کر سکے۔ روحانی دنیا کا مطالبہ یہ ہے کہ جو شخص اپنے اندر (ایمان کی حالت میں) دینی علوم کا ذخیرہ جمع کرے اور پھر اس پر حتیٰ الامکان عمل بھی کرے تو اس کی ذات میں اللہ تعالیٰ ایک تیسری چیز یعنی کرامت بھی پیدا کر دیتا ہے۔ ایسی کرامات غیر مسلموں اور نااہل مسلمانوں کے ہاتھوں سے صادر نہیں ہو سکتیں۔ (اس کی تفصیل زیرِ نظر کتاب میں دی گئی ہے) کرامات کا ہونا اس بات کا ثبوت مہیا کرتا ہے کہ عقائد کی درستگی کے ساتھ نیک اعمال کرنے کا یہ اثر ہوتا ہے کہ ایسے شخص میں فوراً خرقِ عادت یعنی کرامات پیدا ہو جاتی ہیں اور ایسے افعال سے روحانیت کی ابتداء ہوتی ہے۔ ایسا شخص اگر کسی شیخ کامل سے کچھ تربیت حاصل کر لے تو وہ بھی ولی کامل بن سکتا ہے اور اس کی ولایت پر کتاب اور سنت

گواہی دیتے ہیں۔

کشف المحجوب میں ولایت پر ایک مکمل باب لکھا گیا ہے۔ اس باب میں روحانی معاملات اور طریقت کے اصولوں کا بہت دلچسپ انداز میں ذکر کیا گیا ہے جس سے روحانی دنیا اور درستگی عقائد کا بخوبی علم ہو جاتا ہے۔ حضرت معین الدین چشتیؒ نے لکھا ہے کہ جس کو کوئی پیر نہ ملتا ہو تو وہ کشف المحجوب کا مطالعہ کرے تو ایسا کرنے سے اس کو پیر کی تلاش میں کوئی مشکل نہ رہے گی۔ راقم الحروف کی روحانی زندگی کی ابتداء اسی کتاب سے ہوئی اور آج بھی (پچاس سال کے بعد) اس کتاب کے مطالعہ کی بہت عجیب کیفیات وارد ہو جاتی ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آجکل جو اختلافی مسائل گھڑ لئے گئے ہیں ان تمام مسائل کا حل آپؒ نے اپنی تحریر میں آسانی سے واضح فرما دیا ہے۔ مثلاً قبروں پر حاضری دینا، بزرگوں سے مرادوں کا ملنا، اولیائے کرام کے مخفی نظام کا رائج ہونا اور ارادت کے بہت سے پیچیدہ مسائل کا حل کشف المحجوب میں کھلے الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے۔

صاحب کشف المحجوب کی ہستی اس قدر بلند مرتبہ ہے کہ آپؒ کا شمار وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ (الواقعہ: ۱۴) (یعنی مقربین حق میں ہوتا اور آپ زمانہ آخر کے قلیل لوگوں میں شمار ہوتے ہیں) ایسے لوگوں کا رتبہ اللہ تعالیٰ نے مقربین حق میں ہونا ظاہر کیا ہے۔ صاحب کتاب بالا نے بہت سے پیچیدہ مسائل پر اپنے روحانی بیانات کے ذریعے فیصلہ دیا ہے جو عین شریعت کے مطابق ہیں اور جس سے شرعی اختلافات ختم ہو جاتے ہیں۔ ایک مثال تو یہ ہے کہ آپؒ نے فرمایا کہ ولیوں کی قبروں سے منہ مانگی مرادیں ملتی ہیں۔ آپؒ نے اس بات کا رد کیا ہے کہ ولی کو اپنی ولایت کا علم نہیں ہوتا۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ میں یہ کہتا ہوں کہ جب ایک شخص اپنی کرامات کو دیکھے گا تو کیا اس کو یہ معلوم نہیں ہو سکے گا کہ وہ ولی اللہ ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ولی کو اگر علم ہو جائے کہ وہ ولی ہے تو تکبر کی بلا میں مبتلا ہو جائے گا۔ آپؒ نے فرمایا کہ وہ شخص ولی نہیں ہو سکتا جو تکبر کرے یعنی ولی ہو گا تو تکبر ہرگز نہ کرے گا۔ اسی طرح آپؒ کی کتاب میں اس بات پر بھی بہت دلچسپ بحث کی گئی ہے کہ مشاہدے مجاہدوں کی میراث ہوتے ہیں یعنی مَنْ طَلَبَ وَجَدَ کی مصداق جس نے طلب کیا اس نے پا لیا۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ جن کو مشاہدہ ہو گیا وہی اس کو طلب بھی کرے گا (یعنی مَنْ وَجَدَ طَلَبَ)۔ آپؒ نے قرآنی آیات اور واقعات سے ثابت کیا ہے کہ مشاہدے مجاہدوں کی وجہ سے ہوتے ہیں اور جو طلب کرتا ہے وہی مراد کو پاتا ہے۔ حضرت علی بن عثمان الہجویریؒ نے تصوف کے علم اور اس کی ضروریات پر تشنگانِ تصوف کی پوری پوری تشفی کی ہے اور واقعی آپؒ کی کتاب راہِ تصوف کی بہترین کتابوں میں سے ایک ہے۔

اگر ہم قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی زندگیوں کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ ان کی زندگی کا ہر ہر عمل روحانی برکات سے لبریز تھا۔ اسی وجہ سے تو اسلام اتنی قلیل مدت میں دور دراز علاقوں تک پھیل گیا۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی انفرادی زندگی کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ دنیاوی زندگی کے کاروبار کے علاوہ ہر

صحابیؓ اپنے اندر ایک بھرپور روحانی دنیا آباد کیے رہتا تھا۔ ان کا ہر عمل روحانی اور وجدانی کیفیات سے معمور تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں اپنا نائب مقرر کیا ہے اور دنیا کے نظام کو چلانے کے لئے اسے مکمل آگہی عطا فرمائی ہے۔ انسان کے جسم اور روح میں ودیعت کیے گئے مخفی اسرار کی نمود کے لئے اس کو روحانی تصرف اور قوت عطا کی ہے اور ان علوم کی انشراح کے لئے علم روح، قرب الہٰی اور علم تصوف سے مکمل آگہی کے لئے مجاہدات اور مخصوص ریاضتوں کو کرتے رہنے کا حکم دیا ہے تاکہ وہ بشریت اور ملکیت کے مقامات اور منازل کو طے کرتے ہوئے اس کائنات میں اپنا مقام جو اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا کیا ہے پہچان سکے۔ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علوم اور صلاحیتوں سے انسان اپنے اندر مخفی اسرار کو ضرب کلیمی کی مدد سے چاک کر سکتا ہے اور اس میں سے انمول موتیوں سے مالا مال ہو سکتا ہے۔

تصوف کی مستند کتابوں سے صحابہ کرامؓ کی زبردست روحانی قوتوں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے جو اس بات کی شہادت پیش کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کرامؓ کو روحانیت کی نہایت اعلیٰ تعلیم عطا فرمائی ہے۔ "مشاہدۂ حق" میں اس بات کو بیان کیا گیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی تربیت خود فرمائی اور پھر حکم دیا کہ فلاں شخص کی بیعت کر لو تاکہ سلسلۂ بیعت آگے جاری رہے۔ اور یہی بیعت اور اس سلسلہ کی روحانی تربیت آج تک جاری ہے۔ صحابہ کرامؓ اور بعد کے بزرگوں کا جنگوں میں جان نثاری کے جذبے کے ساتھ ہلاکت خیز بلاؤں اور آزمائشوں کا مقابلہ کرنا ان کی روحانی اور صوفیانہ تربیت کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ یہ ایک روحانی تربیت کا ہی اثر تھا کہ حضرت جنیدؒ و بایزیدؒ جیسی ہستیاں نمودار ہوئیں جن کا ذکر روحانی دنیا میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ روحانیت کی آخری حد جہاں تک اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو رسائی عطا فرمائی ہے وہ معراج کا معجزہ ہے بلکہ بہت سے بزرگوں کو بھی انکی استطاعت کے مطابق معراج کی کرامات سے نوازا گیا ہے اور اس سلسلہ میں ہمارے نبی آخر الزمان ﷺ کو معراج کی انتہا تک پہنچایا گیا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو بلا حجاب گفتگو کا شرف بھی عطا فرمایا۔

کچھ لوگ رؤیت حق کے متعلق اختلافی گفتگو کرتے ہیں مگر حق یہی ہے کہ آپ ﷺ کو وہ قرب ملا جو کسی رسول کو حاصل نہیں ہو سکا اور پھر حضور اکرم ﷺ کی امتیازی خصوصیت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جہاں جبرائیلؑ کے پر جلتے ہیں اس سے بھی آگے آپ ﷺ کو معراج ہوئی۔ دین محمدی ﷺ کی خصوصیت بھی یہی ہے کہ جس طرح بارگاہ الٰہی میں آپ ﷺ کی رسائی ہوئی ویسی رسائی کسی رسول کی نہیں ہوئی اور آپ ﷺ وہ عظیم الشان رسول اللہ ﷺ ہیں جنہوں نے اللہ کو دیکھنے کے بعد یہ گواہی دی کہ ہاں ایک خدا موجود ہے۔ آپ ﷺ کا لا الٰہ الا اللہ کہنا باقی رسولوں سے الگ نوعیت رکھتا تھا کیوں کہ آپ ﷺ نے رؤیت حق کے بعد یہ کلمہ پڑھا۔ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی نعمتوں سے نوازا اور ان کو حکم دیا کہ ان نعمتوں کا ذکر کریں

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَٰلَمِينَ (البقرہ: ۴۷) یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور (یہ کہ) میں نے فضیلت دی تھی تمہیں سارے جہان والوں پر" مذکورہ بالا حکم کے برعکس اللہ تعالیٰ نے امت محمدی ﷺ کو اپنی ذات کا ذکر کرنے کا حکم فرمایا۔ ارشاد ربانی ہے فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (البقرہ: ۱۵۲) "سو تم مجھے یاد کیا کرو میں تمہیں یاد کروں گا" نعمتوں کا ذکر کرنے اور اللہ کے ذاتی نام کا ذکر کرنے میں بہت فرق ہے۔ اس کتاب میں اس فرق کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے امت محمدی ﷺ کو وہ بزرگی عطا فرمائی ہے جو کسی اور امت کو نہیں عطا فرمائی، چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو روحانیت امت مسلمہ کو عطا کی گئی دوسری امتوں کو عطا نہیں کی گئی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مردوں کو زندہ کرنے کے لئے فرمایا" قُمْ بِإِذْنِ اللهِ" جبکہ ایک روایت میں ہے کہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے" قُمْ بِإِذْنِي" کہہ کر مردہ زندہ کیا (یعنی میرے حکم سے اٹھو) کیونکہ ان کی روحانی طاقت بجائے صفاتی قوتوں کے اللہ تعالیٰ کی ذاتی قوتوں کی حامل تھی۔ اس لئے آپؒ نے اپنی ذات کو حکم میں شامل کیا۔ اولیائے امت محمدی ﷺ کو جو خدا کی ذات سے روحانیت عطا کی گئی وہ کسی دوسری امت کو نہیں دی گئی۔ (حضرت سلطان باہوؒ نے بھی ایسا ہی لکھا ہے۔)

قرآن مجید کی سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۱۵۱ میں اس بات کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو بھیجا اور فرمایا کہ یہ رسول ﷺ جو میری آیتیں لوگوں کو پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے وہ ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور انہیں ان باتوں کی تعلیم دیتا ہے جنہیں وہ لوگ جانتے ہی نہیں تھے۔ اس آیت میں "يُعَلِّمُكُمْ" کا لفظ دو مرتبہ آیا ہے۔ ایک بار تو کتاب اور حکمت کی تعلیم کے لئے يُعَلِّمُكُمُ الْكِتَٰبَ وَالْحِكْمَةَ (البقرہ: ۱۵۱) (سکھاتے ہیں تمہیں کتاب اور حکمت) اور دوسری بار وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ (البقرہ: ۱۵۱) (اور تمہیں وہ باتیں بھی سکھاتے ہیں جنہیں تم جانتے ہی نہ تھے) دوسری مرتبہ "يُعَلِّمُكُمْ" کا لفظ اسی روحانی تعلیم کی طرف اشارہ کرتا ہے ورنہ ایک ہی آیت میں اس لفظ کو دوبارہ دہرانے کی ضرورت نہ تھی۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی" تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں کہ اس لفظ کا دوبارہ ذکر آنے کا مطلب اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ تعلیم پہلی تعلیم یعنی کتاب و حکمت کی تعلیم سے الگ نوعیت کی ہے اور شاید اس سے مراد علم لدنی ہے جو قرآن کریم کے باطن اور نبی مکرم ﷺ کے منور اور روشن سینے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس علم کے حصول کا ذریعہ مروجہ تعلیم و تعلم نہیں بلکہ انعکاس ہے یعنی آفتاب قرآن کریم کی کرنیں اور ماہتاب نبوت کی شعائیں دل کے آئینے پر منعکس ہوتی ہیں اور اولیائے کاملین جو انوار نبوت کے صحیح وارث ہوتے ہیں وہ بھی اپنے مریدان باصفا پر اس قسم کے علوم اور معارف کا القا اور فیضان فرماتے ہیں۔ آپؒ کی مراد یہ ہے کہ مشائخ عظام اس انعکاس کو رسول اللہ ﷺ کے سینہ مبارک سے اخذ کرتے ہیں اور اخذ کرنے کے بعد اپنے مریدین کو حسب

استطاعت عطا کرتے ہیں۔ یہ انعکاس یُعَلِّمُکُمْ کے دوسری مرتبہ استعمال ہونے والے لفظ سے اخذ کیا گیا ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ قرآن کریم اس روحانی تعلیم کی طرف واضح اشارہ کر رہا ہے اور اسلامی روحانیت کا ثبوت قرآن کریم کی اس آیت اور ایسی دوسری آیات سے ملتا ہے۔ حقیقتاً ''یُزَکِّیْکُمْ'' بھی اسی روحانی تزکیہ کو ظاہر کرتا ہے۔

اسلام ایک روحانیت کا مذہب ہے اور اس کا ثبوت قرآن کریم میں دیگر چند واقعات سے بھی ملتا ہے مثلاً بلقیس کے تخت کا آنکھ جھپکنے میں حاضر کیا جانا، حضرت سلیمانؑ کا چونٹی کی دور سے بات سننا، اصحاب کہف کا تین سو سال سے زیادہ عرصے کے لئے غار میں سونے کے بعد اُٹھنا، حضرت عیسیٰؑ کا مردوں کو زندہ کرنا اور بیماروں کو شفا دینا، حضور اکرم ﷺ کا عظیم معجزہ ''شق القمر'' (چاند کا دو ٹکڑے ہونا) کا ظاہر ہونا، یہ تمام باتیں کسی دلیل کی محتاج نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیائے کرامؑ (اور ایسے ہی اولیائے کرامؒ) کو روحانی خصوصیات سے نوازا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دریا کے پانی کو بہنے کا حکم دینا اور حضرت ساریہؓ کو جمعۃ المبارک کے خطبے کے دوران ''یَا سَارِیَۃُ الْجَبَلْ'' کہہ کر فوج کے جرنیل کو بغیر کسی آلۂ صوت کے متنبہ کرنا اور دیگر اولیائے کرامؒ کے بیشمار واقعات کا مستند کتب میں پایا جانا اس روحانی تصرف کے بین دلائل ہیں۔

مذکورہ بالا تصرفات صرف مسلمانوں کی بابت ان کے اسلام کے باعث لوگوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور پھر غیر مسلم لوگوں کی رسائی بے انتہا محنت اور مشقت کے بعد مقام ''ہمہ اوست'' تک ہو سکتی ہے جو بہت نچلے درجے کی بات ہے۔ کرامات کفار کے خرقِ عادت امور سے بہت بلند درجہ رکھتی ہیں۔ انبیائے کرامؑ کے خرقِ عادت معجزہ کہلاتے ہیں اور اولیائے کرامؒ کے خرقِ عادت کے واقعات کرامت اور کفار کے خرقِ عادت کو استدراج کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور طاقتوں کا اندازہ کرنا انسانی طاقت سے باہر کی بات ہے۔ ہاں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسی اپنی قدرت کو کام میں لانے کا اظہار سورۂ یٰسٓ میں یوں کیا ہے کہ جب وہ کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو لفظ ''کُنْ'' سے حکم فرماتا ہے جیسا کہ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (یٰسٓ:۸۲) (اس کا حکم (یوں ہے) کہ جب وہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو صرف اتنا ہی فرماتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے)۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی شان کبریائی ہے کہ اس نے یہ ''کُنْ'' کی طاقت اپنے اولیائے کرامؒ کو بھی بخش دی ہے۔ وہ جس بات کا حکم دیں وہ بھی ہو سکتا ہے (بشرطیکہ وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں میں سے ہوں۔) کشف المحجوب میں ہے کہ ولی اطاعت الٰہی میں کامل ہو تو اس کی ہر بات پوری کی جاتی ہے۔ ایک حدیث قدسی کے مفہوم کے مطابق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ جب بندۂ مومن فرض اعمال کے بعد نفلی عبادات میں

کثرت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی زبان بن جاتا ہے (حدیث طویل ہے) جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا ہر کام خدا کا کیا ہوا کام ہی ہوتا ہے۔ اسی حوالۂ حدیث سے مولانا رومؒ نے فرمایا کہ "گفتۂ او گفتۂ اللہ بود" یعنی اس کا کہنا اللہ کا کہنا بن جاتا ہے اور آپؒ نے یہاں تک فرمایا ہے کہ "ایں کلام حق است باللہ می شود" یعنی یہ کلام سچ ہے خدا کی قسم ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے بھی فلسفۂ خودی میں دلائل سے ثابت کیا ہے کہ "مومن کی طبیعت کا تقاضا ہے تخلیق" یعنی روحانی عروج میں مومن اس قابل ہو جاتا ہے کہ جو چاہے تخلیق کر سکتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کو احسن الخالقین کہا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خالق تو اور (بندے) بھی ہو سکتے ہیں مگر سب سے بہتر خالق اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

مومن بھی ایک قسم کا خالق ہے وہ اس بات سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ مومن کی روح کے متعلق کفار نے سوال کیا تو قرآن کریم نے فرمایا کہ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ (بنی اسرائیل:۸۵) (انہیں بتایئے کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے۔ سورۂ یٰسؔ میں بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا جب امر ہوتا ہے تو وہ چیز پیدا ہو جاتی ہے جیسا وہ چاہتا ہے۔ ان دو آیات میں لفظ "اَمر" باہم شامل ہے جس کے یہ معنی ہوں گے کہ انسان کی روح اَمْرِ رَبِّيْ ہونے کی حیثیت سے جب حرکت میں آجائے تو اس حرکت سے بھی تخلیق ہو جاتی ہے چنانچہ جب مسلمان کی روح اس مقام تک آجائے تو تخلیق ہو جاتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ؎

در عمل پوشیدہ مضمون حیات لذت تخلیق قانون حیات (ا۔خ:۴۹)

(عمل میں زندگی کا مضمون پوشیدہ ہے، لذت تخلیق پالینے میں ہی کامیاب زندگی کا طریقہ ہے۔)

پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق

(ض۔ک:۵۹۱)

علامہ اقبالؒ کا خیال ہے کہ خودی کا عمل تخلیق سے تعلق رکھتا ہے۔ تخلیق اللہ تعالیٰ کی بھی ایک صفت ہے۔ علامہ اقبالؒ کے مطابق خودی کے باعث کائنات میں عمل تخلیق جاری رہتا ہے۔ مسلمان خدا کی تخلیقی صفت اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے۔ جب خودی کی نفی (کچھ نہ کر سکنے کی حالت کی بجائے) خودی کا اثبات ہو یعنی انسان خودی کی تخلیقی صفت پیدا کر لے تو وہ عدیم المثال بن سکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے نزدیک ہر شخص کی انفرادی خودی ہے جس کا انسان خود مرکز ہے۔ خودی ایک لازوال حقیقت ہے جو کائنات کے ہر ذرہ میں ہے مگر اس کا انتہائی کمال انسان میں ظاہر ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کا یہی جذبہ ہے جو حرکت کے ذریعے تخلیق اور نئی صورت عطا کرتا ہے۔ خودی سے مومن میں انا کی تخلیقی قوتیں جاگ اٹھتی ہیں ایسا انسان ہر وقت عمل پیرا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قرب کی وجہ سے انسان "تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ" (التعرف لمذہب التصوف ج:۱، ص:۵) کے مطابق باعمل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کے تمام اخلاق اپنا لیتا ہے اور دنیا میں اللہ تعالیٰ کی نیابت

خاص ادا کرتا ہے۔ اس کے حصول کے لیے اس کو سخت محنت، سخت کوشش اور عمل پیہم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی انا کو انائے کبیر کہتے ہیں۔ جو اس انائے کبیر کا قرب حاصل کر لے تو وہ منبع فیض بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہترین انا کو قرآن مجید نے "رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ" کا لقب دیا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں کے زوال کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ افلاطونی اور ویدانتی افکار کے قائل ہو کر خود کو ناکارہ سمجھ کر بیٹھ گئے اور سکون کی تلاش کرنے لگے۔ اسلام نے انہیں یہ سبق دیا کہ خودی کی نفی کے بجائے خودی کا اثبات کریں تا کہ وہ تخلیق کی خوبی حاصل کرنے کے بعد عدیم المثال بن سکیں۔ علامہ اقبالؒ کے نزدیک ہر شخص کی انفرادی خودی ہے جس کا انسان خود مرکز ہے۔ اس خودی کا انتہائی کمال انسان میں ہے جو انسان کی زندگی کو حرکت میں لاتا ہے اور تخلیق کی صورت میں زندگی کو بقا عطا کرتا ہے اور اس کے سبب وہ خدا کے انوار اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ حیات ایک انجذابی حرکت ہے جس میں خدائی صفات کو جذب کیا جاتا ہے اور اس سے انسان کی راہ کی تمام رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں۔ اس پر خودی کے اسرار جب منکشف ہو جائیں تو قطرہ گوہر تابدار بن جاتا ہے اور سبزہ زمین کے سینے کو چاک کر کے باہر نکل آتا ہے۔ خودی وہ نور ہے جو مٹھی بھر خاک کو کیمیا بنا دیتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ تسخیر کائنات کا مالک بن جاتا ہے اور اس کی زد میں پوری کائنات آ جاتی ہے۔

قرآن مجید میں سورۃ البقرہ کی آیت ۳۰ میں اس بات کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور ان کو کائنات میں اپنا خلیفہ مقرر کیا۔ ایک اور مقام پر اللہ پاک نے فرشتوں اور جنوں سے فرمایا کہ جب میں آدم علیہ السلام کے اندر اپنی روح پھونک دوں تو تم سب کے سب اس کو سجدہ کر دینا۔ فرشتوں نے خود کو آدمؑ سے بہتر مخلوق تصور کیا اور ان کے اس وہم کو ختم کرنے کے لئے کچھ چیزیں امتحان کے طور پر اُن کے سامنے پیش کی گئیں جن کا علم فرشتوں کو نہیں تھا، چنانچہ وہ ان کا نام بتانے سے عاجز رہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام اشیاء کے نام سکھا دیئے اور آدم علیہ السلام نے ان سب کے نام بتا دیئے۔ ان کے اس علم پر فرشتوں پر وجد طاری ہو گیا اور انہوں نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کر دیا۔

امام راغب اصفہانیؒ نے لکھا ہے کہ آدم علیہ السلام کو صرف ناموں ہی کا علم نہیں دیا گیا تھا بلکہ ان چیزوں کی صفات، خواص اور افعال کی معرفت بھی عطا کر دی گئی تھی جس کو عام فہم الفاظ میں ہر چیز کا بنیادی علم کہا جاتا ہے۔ تفسیر روح البیان میں ہے کہ آدم علیہ السلام کو سات لاکھ زبانوں اور بہت سے پیشوں کے علم کے علاوہ جانوروں، شہروں اور مخلوقات کا علم بھی دیا گیا تھا۔ اس علم کا دیا جانا روحانیت کا ایک بہت بڑا حصہ ہے جو کہ انسان کو پیدا کرنے کے فوراً بعد عطا کیا گیا تھا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جب سے انسان کو پیدا کیا گیا ہے اس وقت سے ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسولوںؑ، نبیوںؑ اور ہادیوں کا دنیا والوں کی طرف بھیجنا اور لوگوں کی اصلاح کا کام کیا جانے لگا ہے۔ ہادیوں کو بھیجنا اللہ

تعالیٰ کی سنت رہی ہے۔قرآن کریم میں ہے کہ سنت الٰہی میں کسی قسم کا تعطل، بندش یا رکاوٹ ممکن نہیں چنانچہ آج تک اصلاح کا کام جاری ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ غنیۃ الطالبین میں فرماتے ہیں کہ سنت الٰہی اس بات پر جاری ہے کہ اس دنیا میں ایک پیر اور ایک مرید ہو۔ایک مقتداء اور دوسرا مصاحب ہو یا ایک پیشوا ہو اور دوسرا پیروکار ہو۔اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو استاد بنایا اور فرشتوں کو ان کے تابع کیا۔دنیا میں انبیائے کرام کو ارسال فرمایا اور کچھ لوگوں کو ان کا جانشین یا حواری بنایا حتیٰ کہ حضور اکرم ﷺ کا جانشین حضرت ابو بکر صدیقؓ کو بنایا اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔شیخ طریقت اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان ایک واسطہ یا ایک برزخ ہے (غنیۃ الطالبین) یہ تمام باتیں اسلام میں روحانیت کو قائم رکھنے پر دلالت کرتی ہیں۔ جو کہ کائنات کے لئے رب کائنات کی طرف سے جاری کی گئی ہیں۔

حضرت علی بن عثمان الہجویریؒ کی کتاب کشف المحجوب میں تصوف کے باب میں روحانیت اسلام کی مکمل وضاحت کی گئی ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے امام مالکؒ کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسلام میں فقہ کا علم حاصل کئے بغیر تصوف حاصل کرنے والا زندیق ہے اور علم تصوف حاصل کئے بغیر فقہ کا علم حاصل کرنے والا فاسق ہے۔آپؒ نے فرمایا ہے کہ جس نے فقہ اور تصوف دونوں کو جمع کیا وہ محقق ہے۔آپ کے اس قول سے ظاہر ہوتا ہے اسلام کا تصور بغیر روحانیت کے قطعاً نامکمل ہے۔

روحوں کا وعدۂ الست کی طرف اگر نگاہ کی جائے تو اس میں سوائے اسلام کی روحانیت کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔یہ قصہ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کا اپنے مطالب کے ساتھ سورۃ الاعراف آیت نمبر ۱۷۲ میں مذکور ہے۔مفسرین کرام اس کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ وعدۂ الست (جس کا ذکر اس کتاب میں بھی تفصیل کے ساتھ شامل کیا گیا ہے) کے وقوع سے پہلے روحیں اپنے اپنے مقامات میں رہتی تھیں اور اُس وقت تک انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کا کیا ارادہ ہے۔جب اللہ تعالیٰ نے اپنی قبائے ازلی کو ظاہر کرنا چاہا تو حضرت اسرافیل علیہ السلام کو صور پھونکنے کا حکم دیا تو تمام روحیں جمع ہو گئیں۔ان میں وہ کیفیت پیدا ہوگئی جو قیامت کے دن مُردوں کو زندہ کرنے کے وقت پیدا ہوگی۔روحوں کے جمع ہونے پر اللہ تعالیٰ نے ان روحوں پر اپنا بلا کیف خطاب فرمایا اور کہا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔(الاعراف:۱۷۲) سعادت مند روحوں نے خوشی خوشی اپنے رب کے حکم کا جواب دیا اور بلیٰ کہا۔جس طریقے سے انہوں نے جواب دیا ان کی کیفیت اسی کے مطابق ہوگئی۔نیک اور بد میں امتیاز ہوگیا۔جب بدبخت روحوں نے اللہ تعالیٰ کا خطاب سنا تو کبیدہ خاطر ہوگئیں اور بادل نخواستہ جواب دیا۔وہ اس طرح بھاگیں جس طرح شہد کی مکھیوں کو آگ دکھائی جائے تو برہم ہو کر بھاگتی ہیں۔ایسی روحوں کو ذلت اور خواری حاصل ہوئی اور ان کے نور تاریک ہوگئے۔اس وقت سے مومن اور کافر میں امتیاز ہوگیا اور برزخ میں روحوں کے مقامات کا تعین کر دیا گیا۔اس سے پہلے روحیں جہاں

چاہتی تھیں رہتی تھیں۔ اہل مشاہدہ ان روحوں کو اب بھی الگ الگ دیکھ سکتے ہیں۔ جن روحوں نے خطاب الٰہی کا جواب نہ دیا ان کو محروم کر دیا گیا۔ یہ شہادت اس لئے طلب کی گئی کہ کل قیامت کو کافروں کی روحیں یہ نہ کہیں کہ ہم نے اپنے والدین کی پیروی کی وجہ سے شرک کیا اور یہ نہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان باطل پرستوں کے سبب ہمیں ہلاک کیا ہے۔ (الابریز)

وعدۂ الست جس کا ذکر اوپر ہوا ہے، اس کے مطالعہ کے بعد کچھ لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مختلف روحوں نے مختلف انداز میں جوابات کیوں دیئے؟ اگرچہ یہ اختلاف ان کی فطرت میں اختلاف کی وجہ سے ہے تو وہ یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ ان کی فطرت میں اچھائی یا برائی کس نے پیدا کی۔ وہ کسی خاص جواب کی کیفیت پر کیوں مجبور ہوئیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب روحوں کو جمع کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے سب کے ساتھ ایک جیسا ہی سلوک کیا۔ کسی روح سے کوئی تفریقی رویہ نہیں رکھا، چنانچہ اپنے غلط یا صحیح جواب کے وہ خود ہی ذمہ دار تھے۔ اس روز تو کسی نے ان کو گمراہ نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی گمراہ ہوئے۔ اب معترضین یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ خود کیوں گمراہ ہوئے۔ اس کا جواب یہ ہے "فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست" یعنی ہر شخص کی موج اس کی اپنی ہمت کے مطابق ہوتی ہے۔ راقم الحروف لوگوں کو تبلیغ کی دعوت دیتا ہے تو بعض لوگ فوراً نصیحت قبول کر لیتے ہیں اور اپنی اصلاح کر لیتے ہیں جبکہ کئی اشخاص ایسے بھی دیکھنے میں آتے ہیں کہ ہماری بات کو کاٹ کر دنیا کی غیر ضروری بات کرنا شروع کر دیتے ہیں یعنی گفتگو کے موضوع کو کلیۃً بدل دیتے ہیں۔ وہ اس طرف قطعاً توجہ نہیں دیتے کیونکہ ان کا اس طرف توجہ یا دھیان دینے میں کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ پھر ان لوگوں کا یہ بھی سوال ہو سکتا ہے کہ وہ کیوں دھیان نہیں دیتے اور کیوں توجہ بدل لیتے ہیں۔ اسی طرح آپ اگر ہر سوال کے جواب پر سوالوں کا سلسلہ بند نہ کریں تو کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے راقم الحروف نے اسی کتاب میں یہ اصول بیان کیا ہے کہ اپنی قسمت کو بدلنے کے لئے ہر شخص کو کوشش کرنا ضروری ہے۔ اس معاملے کو سمجھانے کے لئے ہم نے نام رکھا ہے قسمت کو بدلنے کے لئے ٹانگ اٹھانے کی کوشش کرنا۔ جب کوئی شخص کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو اس کو کرنے کے لئے کم سے کم کوشش تو لازمی کرتا ہے جتنی کوئی کوشش کرتا ہے اتنی ہی کامیابی اس کو حاصل ہو جاتی ہے اور اگر کوئی قطعاً کوشش ہی نہ کرے تو اس سے قسمت بدلنے کی کیا امید رکھی جاسکتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی ٹانگ اٹھانے کی کوششوں کی طرف دھیان رکھتا ہے یعنی یہ دیکھتا ہے کہ اس کے دل میں کام کرنے کی نیت ہے یا نہیں۔ اگر تسلی بخش کوشش ہو تو اللہ تعالیٰ کامیابی کی توفیق دے دیتا ہے۔ جو لوگ ذرہ برابر بھی کوشش نہیں کرتے وہ نامراد رہتے ہیں۔ کام کرنے کا اگر ارادہ ہو تو خدائی مدد ملتی ہے اس سے ثابت ہوا کہ ہر شخص اپنے ارادے کے ذریعے ردعمل کا ذمہ دار ہے لہٰذا قسمت بدلنے کا بھی۔

روحانیت کا علم ہمیں اللہ تعالیٰ کے قوانین کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ ایسے لوگوں کی کامیابی یقیناً ہوتی

ہے جو خدائی اصولوں کو نگاہ و ذہن میں رکھتے ہیں۔ روحانیت یہ ہے کہ بندہ خود کو اللہ کے سامنے صدق دل سے پیش کر دے۔ جو پیش ہونا چاہتا ہے اس کو روحانیت کی طرف یعنی مقصود کی طرف ضرور ہدایت ملتی ہے۔ اس بات کا خلاصہ یوں بھی پیش کیا جا سکتا ہے کہ انسان کی روح روحِ بسیط (روح کا دائرہ) سے نکل کر نفس بسیط اور عقلِ بسیط میں سے گذرتی ہے جہاں سے ہر شخص اپنی خواہش یا پسند کے مطابق قوت حاصل کرتا ہے۔ روح، عقل یا نفس کی قوتوں کو (ان دائروں سے) حاصل کیا جاتا ہے اور عدم سے وجود میں آتی ہے، وجود ملنے کے بعد اس کی خصلت وہی ہو جاتی ہے جو اس کی روح نے روح بسیط، عقلِ بسیط اور نفسِ بسیط سے حاصل کیا۔ بزرگوں کی روحوں نے اچھی خصلتوں کو حاصل کیا اور نیک ہو گئیں اور دوسری روحوں نے اپنی پسند کے مطابق بد خصلتوں کو اخذ کیا اور بری روحیں بن گئیں۔ ان کی یہ کوشش اپنی پسند یا فطرت کے مطابق اخذ کرنا تھا۔ روحانیت کی کیفیت اس وقت طاری ہوتی ہے جب انسان کائنات کی پیچیدگیوں میں اللہ سے معاملات کی کوشش کرے۔ روحانی تفکر سے کائنات کے راز اس پر واضح ہونے لگتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ ایک گھڑی کا تفکر ستر سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ تفکر اہل طریقت کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس حدیث شریف کی تصدیق سورۃ فاطر کی آیت ۲۸ سے ہوتی ہے جہاں ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر:۲۸) (اللہ کے بندوں میں سے صرف علماء ہی پوری طرح اس سے ڈرتے ہیں) علامہ اقبال ضربِ کلیم کے صفحہ ۱۰۱ پر لکھتے ہیں کہ اگرچہ مغرب میں خدائی راز دانوں کو جاننے والے (سائنسدان) بہت سے موجود ہیں مگر مشرق میں ایسے راز دانوں کا ملنا شاذ و نادر ہی ہے کیونکہ ان لوگوں میں علم حاصل کرنے اور تفکر کا فقدان ہے۔

خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمت نے اس آبجو سے کیے بحرِ بیکراں پیدا
وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا
خودی کی موت سے مشرق کی سرزمینوں میں ہوا نہ کوئی خدائی کا راز داں پیدا
(ض۔ک:۵۶۳)

۱۹۷۳ میں امریکہ کے شہرۂ آفاق سائنسدان "تھامس ایڈیشن" نے کہا کہ وہ لوگ غلطی پر ہیں جو مجھے ایک بہت بڑا موجد کہتے ہیں حالانکہ میں ایک بیوقوف سا انسان بنانے پر بھی قادر نہیں ہوں۔ اس سائنسدان نے آسمان کی طرف انگلی اُٹھائی اور کہا کہ حقیقی موجد تو اس (اللہ) کی ذات ہے۔

مذکورہ بالا گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تخلیق کائنات میں تفکر کرنا اسلامی روحانیت میں ایک اہم بات ہے اور اسلام اپنے ماننے والوں کو یہ سبق دیتا ہے کہ ایک گھڑی کا تفکر ستر سالہ عبادت سے بہتر ہے۔ یہ حقیقت اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ اسلام روحانی کارناموں کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مذہب سراسر روحانیت کا دین ہے۔ اسلام تحقیقی تفکر کے علاوہ فلسفۂ زماں و مکاں، ریاضی، الجبرا، علم

کیمیا، ہندسہ، نجوم اور ماڈرن سائنس کے مختلف شعبوں کی طرف مسلمانوں کو غور وفکر کرنے کی بھی دعوت دیتا ہے اور بلاشک وشبہ ہمارے اسلاف نے پوری دنیا کی اس میدان میں رہنمائی کی ہے۔ یہ تمام حقائق اسلام کو روحانیت کا مذہب ہونا قرار دیتے ہیں۔

آج اہل یورپ کا ہاتھ اونچا ہے اور وہ جدید علم اور سائنس کے علوم میں دسترس رکھنے کے باعث خود کو دنیا کے مختلف علوم میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مشرق نے نہیں بلکہ مغرب نے پوری دنیا کے لئے متفقہ علوم ایجاد کئے اور وہ خود ہی پوری دنیا کے راہبر ہیں۔ ان کا یہ کہنا اس لئے ہے کہ آج مسلمانوں نے اپنے اسلاف کا طریقہ ترک کر دیا ہے۔ کہنے کو تو کوئی بھی دعویٰ کر سکتا ہے مگر حقیقت کو چھپانا ہرگز ممکن نہیں چنانچہ وہ اسلام کی اس خدمت کو تسلیم بھی کرتے ہیں۔ ان مروجہ علوم میں سے اکثر کے نام ہی عربی زبان سے ماخوذ ہیں۔ الجبرا، کیمیا اور علم نجوم وغیرہ کے ناموں کا عربی نسل سے تعلق ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ جس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام مکمل روحانیت کا داعی ہے۔

یہ خوشی کی بات ہے یورپ کے سائنسدان خود بھی کبھی کبھی سچ بات ظاہر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور کھلم کھلا اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ یہ علوم اسلام نے ہی تمام دنیا پر ظاہر کئے تھے۔ ایک مشہور فرانسیسی سائنسدان، سرجن وسکالر جس کو فرعون کی ممی کو (جو خراب ہوگئی تھی) درست کرنے کا کام سونپا گیا تھا تو اس کو لوگوں نے بتایا کہ فرعونِ مصر کا ایک ایسا بادشاہ تھا جو خود کو خدا کہلواتا تھا اور اس اعتبار سے منکر خدا اور دشمن موسیٰ تھا۔ جب قہرِ الٰہی کے سبب اسے سمندر میں غرق کیا گیا تو آنے والی نسلوں کو سبق دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی لاش کو عبرت کا نشان بنانے کی خاطر سمندر سے باہر پھینک دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً (یونس: ۹۲) (سو آج ہم بچالیں گے تیرے جسم کو (سمندر کی تند موجوں سے) تاکہ تو ہو جائے اپنے پچھلوں کے لئے عبرت کی نشانی۔

مذکور بالا ڈاکٹر بوکیل نامی سائنسدان نے قرآن کریم کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہے اور ایک کتاب لکھی جس کا نام تھا "قرآن، بائبل اور سائنس"۔ اس نے قرآن کریم کا جو کچھ بھی مطالعہ کیا اپنی اس کتاب میں کافی تفصیل سے لکھا ہے اور چند باتیں جس کو اس نے تسلیم کیا ہے وہ یہ ہیں کہ قرآن مجید ایک واحد کتاب ہے جس میں سائنسی حقائق کا تذکرہ ملتا ہے جو اس وقت ہماری سائنس نے ابھی تک بیان نہیں کی تھیں۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ ان باتوں کی بہت عرصہ کے بعد سائنس نے تحقیق کی ہے اور جو قرآن کریم نے کہا ہے سب کو درست پایا۔ ہماری کتاب "نشانِ منزل" کے صفحہ نمبر ۶۲ پر اس کے متعلق مختصر سی رپورٹ لکھ دی گئی ہے۔ فزیالوجی، تولیدِ انسان کی ابتدا، تخلیق کائنات، طوفان نوح، ٹائم اور سپیس، کائنات میں قوتِ تسخیر کا ممکن ہونا مثلاً (چاند وغیرہ پر پہنچ سکنا) Water Cycle، SolarSystem کا ہونا، زمین کی سطح کا ہموار ہونا اور پہاڑوں

کا میخوں کی طرح گاڑھے جانا، حیوانات اور نباتات میں افزائشِ نسل کا ہونا، نباتات کے جوڑے ہونا یہ سب چیدہ چیدہ باتیں ہیں جو قرآن کریم میں بیان کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ہر چیز کو پانی سے پیدا کیا جانا (یعنی ہر چیز میں Water of Cystallization پایا جاتا ہے)، کائنات سے پہلے صرف دھویں کا ہونا اور کائنات کا چھ ادوار میں بنائے جانے کا ثبوت آج ماڈرن سائنس خود ہی پیش کر رہی ہے۔ سورج، ستاروں، اجرامِ فلکی کا مداروں میں گھومنا، کواکب کا خود روشن نہ ہونا بلکہ سورج کی روشنی سے مستفید ہونا، پودوں میں جنسی امتیازات کا ہونا اور مادہ تولید کے معمولی مقدار کا تخم ریزی کے لئے کافی ہونا، تخم ریزی کے بعد عورت کے بیضے کا رحم میں قرار پکڑنے کے علاوہ ماں کے پیٹ میں بچے کے مختلف مراحل مثلاً علقۃ (لوتھڑا) مضغۃ (گوشت کی بوٹی) عظماً (ہڈیاں) لحماً (ہڈیوں پر گوشت چڑھانا) خلقاً اٰخر (یعنی روح پھونک کر دوسری مخلوق بنانا) کا بیان قرآن مجید میں موجود ہے۔ ماں کے رحم میں بچے کے کان، آنکھ، سننے، دیکھنے اور سونگھنے والے اعضاء کا پیدا ہونے کا ذکر بھی قرآن کریم میں ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ماں کے پیٹ میں بھی سننے والا اور دیکھنے والا بنایا ورنہ اولیاء کی کرامات کا ظہور ماں کے پیٹ میں ہرگز ممکن نہ ہوتا۔ موسیٰ علیہ السلام کا فرعون سے ٹکراؤ، طوفانِ نوح کے تاریخی آثار کا ہونا، بنی اسرائیل کا صحرائے سینا کی طرف ہجرت کرنا اور فرعون کی موت کا آثار قدیمہ سے ثابت ہونا، روحانی دنیا کے ثبوت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

یہ بات پہلے بیان ہو چکی ہے کہ اسلام میں روحانیت روزِ ازل ہی سے عمل میں آ چکی تھی اور اسلام کا ہر عمل روحانیت کی طرف لے جاتا ہے حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں روحانیت اپنے عروج پر جا پہنچی۔ صحابۂ کرامؓ کے زمانے میں مسلمانوں نے پوری دنیا کی علم اور تحقیق کے میدان میں رہنمائی کی۔ یہی وجہ ہے قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے سائنس، ریاضی، کیمیا، فلکیات، طب، طبعیات اور دیگر علمی میدانوں میں ایسی یادداشتیں چھوڑی ہیں جن کی مثال زمانے کے کسی حصے میں ابھی تک پیش نہیں کی جا سکیں۔ آج بھی اس ماڈرن زمانے میں لوگ اسلام کی روحانی طاقتوں سے متاثر ہوتے ہیں اور وہ جوق در جوق اسلام قبول کر رہے ہیں۔ یہ بات مشہور ہے کہ امریکہ میں اسلام اس تیزی سے پھیل رہا ہے کہ اب یہ گمان ہوتا ہے کہ اگلے سو سالوں میں پورے امریکہ میں دینِ اسلام غالب نظر آئے گا۔ روس جیسے لادین ملک میں بھی اسلامی کتب کا مطالعہ کیا جا رہا ہے اور صرف امریکہ میں اس وقت ایک کروڑ سے زیادہ مسلمانوں کی تعداد موجود ہے۔

ایک امریکی نومسلم نے ایک پاکستانی کو بتایا کہ وہ شراب کی وجہ سے مسلمان ہوا ہے کیونکہ شراب کی کثرت کے باعث اس پر شراب کا نشہ ہونا بند ہو گیا تھا اور وہ سپرٹ پینے لگا۔ سپرٹ پینے سے اس کی حالت بہت خراب ہو گئی۔ ایک دن اس نے کسی مسلمان کے ہاتھ میں قرآن دیکھا اور پھر اس کو پڑھا تو اس سے اس کو بہت سکون ملا اور طبیعت بھی سنبھل گئی، یہ دیکھ کر وہ مسلمان ہو گیا۔ (روحانیتِ اسلام) راقم الحروف نے

امریکہ میں نیویارک کے نواحی شہروں کی مساجد میں انگریزی زبان میں وعظ کیا تو مواعظ کے سلسلوں کے اختتام پر ایک الوداعی دعوت میں ایک امریکی نے مجھ سے پوچھا کہ تم لوگ میوزک کو حرام کیوں کہتے ہو حالانکہ قرآن کریم کی آواز نے مجھ پر ایسا اثر طاری کیا کہ میں نے قرآنِ کریم کو سنا تو فوراً اسلام قبول کرلیا۔ اس کے ساتھ کام کرنے والے ہمارے ایک مرید نے بتایا کہ یہ پروفیسر قرآن کریم سن کر زاروقطار رو رہا تھا اور پھر فوراً اسلام قبول کرلیا۔ اس کو بتایا گیا کہ ہمارے ہاں میوزک کی فقط ایسی مجلسوں کو حرام قرار دیا گیا ہے جس میں بے حیائی کا اظہار ہو۔ قرأت سے محظوظ ہونا قطعاً ناجائز نہیں۔ ظاہر ہوا کہ روحانیت کے لطف سے حاصل ہونے والے سکون کی خاطر ہزاروں غیر مسلم مسلمان ہو رہے ہیں اور لوگ ابھی بھی ''رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْکَ'' کے جذبات دل میں لئے بیٹھے ہیں بقول علامہ اقبال۔

نمی گردد کہن افسانۂ طور — کہ در ہر دل تمنائے کلیم است (پ-م-۲۰۸)

(طور کا افسانہ کبھی پرانا نہیں ہوتا (کیونکہ آج بھی) ہر دل میں کلیم اللہ علیہ السلام جیسی تمنا موجود ہے۔)

یہ تمام حقائق اور دیگر ایسے حقائق جو تنگیٔ قرطاس کے باعث یہاں بیان نہیں کئے جا سکے، اس بات کا ثبوت مہیا کرتے ہیں کہ اسلام اور صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے کہ اس کی ہر ادا اور ہر عمل میں روحانیت کی لہریں موجزن ہیں جس سے متاثر ہو کر لوگ ایک نیا جہاں اپنے اندر بسا لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو روحانیت کا جذبہ اپنے سینوں میں بسانے کا ذوق وشوق عطا فرمائے اور جو اسلامی روحانیت کے منکر ہیں ان کے دلوں کو بھی روحانیت کا فہم عطا فرمائے۔ (آمین) بحرمت نبینا وامام الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام

خاکِ راہِ صاحب دلاں

پیر عبد اللطیف خان نقشبندی

ڈائریکٹر (ر) محکمہ موسمیات لاہور

فون نمبر: ۰۴۲_۶۶۶۶۶۳۱

۰۴۲_۶۶۶۵۴۷۵

مورخہ یکم اگست ۲۰۰۸ء

غرضِ تصنیف

(از لیفٹیننٹ کرنل احمد فضیل خان)

اسلام وروحانیت اور فکرِ اقبالؒ کے مضامین کو بیان کرنے سے پہلے تاریخِ اسلام کے اوراق کو پلٹنا ہوگا اور ماضی کے مخفی واقعات اور حادثات کا قارئین کے سامنے رکھنا ایک ضروری امر ہوگا۔ عصرِ حاضر کے عام مسلمان ایسے حقائق پر توجہ کرنے سے گھبراتے ہیں جن سے عام قومیں سبق حاصل کیا کرتی ہیں۔ مسلمانوں کی گزشتہ تاریخ ایک طویل داستان ہے اور مصلحین امت کے لئے ایسی داستانوں کا بیان کرنا ہرگز بارگراں نہیں ہوتا مگر جن لوگوں کے لئے اس داستان کو بیان کرنا مقصود ہے وہ ایسی داستانوں کو سننے سے گریز کرتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے اپنی زندگی کو مسلمانوں کی اصلاح کے لئے طویل وعریض پیغام پہنچانے کے لئے وقف کر رکھا تھا مگر ان کو بھی یہ کہنا پڑا کہ ہماری قوم کے افراد ایسے مصلحین کی ضرورت محسوس نہیں کرتے ۔

عصرِ من دانندۂ اسرار نیست　یوسفِ من بہر ایں بازار نیست　(ا۔خ:۶)

(میں آنے والے دور کا شاعر ہوں میرا دور اسرار کو نہیں سمجھتا، میرا یوسف اس بازار کے لائق نہیں۔)

علامہ اقبالؒ کے کلام کا اکثر حصہ قوم کی گتھیاں سلجھانے کے لئے وقف تھا لیکن آپؒ فرماتے ہیں کہ میرے اس قومی درد کے اسرار کو لوگ نہیں سمجھتے۔ آپؒ کے کلام میں موجود قیمتی موتیوں کو دوسری قوموں نے چرالیا اور ترقی کے زینے پر گامزن ہو گئے مگر مسلمان اپنی کورنگاہی کے مرض میں گرفتار رہے اور ان کی قسمت میں ستم ظریفی زمانہ کے آثار ختم نہ ہوئے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنی قومی خدمات کا ذکر اپنے کلام میں کیا ہے اور قوم کا ردعمل بھی نہایت تکلیف دہ انداز میں پیش کیا ہے۔ آپؒ کے ایسے کلام کا کچھ حصہ مصنف کی تصنیف ''سرمایۂ ملت'' میں شامل کر دیا گیا ہے جو عنقریب زیورِ طباعت سے آراستہ ہونے والی ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کی سنت اس بات پر رہی ہے کہ اگرچہ لوگ انبیاء علیہم السلام اور مصلحین کا اثر قبول نہ کریں تو وہ بار بار اپنے مقبول بندوں کی ایک بھاری تعداد کو بے راہ رواں قوم کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے بھیجنے کا اہتمام کرتا رہا ہے تاکہ کچھ لوگ اصلاح کی آواز پر لبیک کہیں۔ اس سلسلے میں کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر اور لاتعداد مصلحین اس عالم رنگ وبو میں تشریف لائے۔ یہ مصلحین امت ہر زمانے میں اپنی کوشش

پیہم کے ذریعے لوگوں کو دینی ہدایت کی طرف بلاتے رہے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب ''اسلام وروحانیت اور فکرِ اقبال'' کی غرضِ تالیف بھی یہی ہے کہ عصر حاضر کے لوگوں تک دعوت فکر وعمل پہنچ جائے اور سونے، چاندی کے بتوں کی پوجا میں گرفتار لوگ خدا کی یاد میں اپنے ایمان کی عافیت تلاش کریں۔ یقیناً جو لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے ساتھ ساتھ کسب حلال میں وقت صرف کریں تو وہی لوگ فلاح پانے والوں میں شمار کیے جائیں گے۔ مسلمانوں کی موجودہ حیثیت کو دیکھ کر اور ان کی جملہ امراض کو پیش نظر رکھتے ہوئے اہلِ نظر کے نزدیک انکی موجودہ حالت کو سنوارنے کا صرف ایک ہی حل باقی رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ روحانی دنیا کے لوگ عوام کے لئے ایسی خوبصورت اور دلکش روحانی قوتوں کو معرض وجود میں لاتے ہوئے ایسی تقریریں اور تحریریں پیش کریں کہ عوام اسلامی طرز زندگی اپنانے پر خود بخود آمادہ ہو جائیں۔ گزشتہ دور میں اولیائے کرامؒ نے اسی انداز سے اپنی روحانی توجہ کو استعمال کرتے ہوئے سوئے ہوئے لوگوں کو بیدار کیا۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام سے قوم میں ایسی روح پھونک دی کہ سوئی ہوئی قوم میں کچھ بیداری کے اثرات ضرور نمودار ہوئے۔ آپؒ فرماتے ہیں ۔

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند (ض۔ک ۴۸۵)

عوام کے دلوں میں ایسا ولولہ پیدا کرنے کے لئے اس قسم کی تحریروں کی ضرورت ہے کہ جس کے مطالعہ سے ان کے دلوں میں تازہ روح پھونکنے کا سامان پیدا ہو سکے۔ یقیناً ایسی تحریروں کو وجود میں لانے کے لئے لکھنے والوں کو مسلمانوں کے دلوں تک رسائی حاصل کرنا اور پھر ان کے دلوں میں محبتِ اسلام کی روح پھونکنا ہوگا۔ جب تک لکھنے والوں کا اپنا دل روحانی طاقتوں سے بھرپور نہ ہو تو وہ لوگوں کے دلوں میں عشق کی آگ پھونکنے کے قابل نہیں ہو سکتے۔ ایسی تحریروں میں اُس مقناطیسی قوت کا ہونا ضروری ہے جو دلوں میں گولی کی طرح اثر انداز ہو سکتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اسی انداز سے شاعری کی ہے اور اس بات کو یوں ظاہر کیا ہے کہ ''ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی''۔ یہاں علامہ اقبالؒ کی نم سے مراد اسی قسم کی روحانی، وجدانی، پرکشش اور ولولہ انگیز گفتگو مراد ہے۔

اس کتاب کا نام ''اسلام وروحانیت اور فکرِ اقبال'' اس بناء پر رکھا گیا ہے کہ اگر مسلمان روحانی زندگی کو سمجھ کر دین اسلام کی طرف بڑھنے کی کوشش کریں تو روحانیت کی برکات سے یہ کتاب ان کو اوجِ ثریا تک پہنچنے کی ضمانت دیتی ہے۔ وہ لوگ جو روحانیت کو ساتھ لے کر کاروبار میں انہماک رکھتے ہیں وہ ایک برائے نام مسلمان کی نسبت بہت زیادہ کامیابیاں حاصل کر لیتے ہیں۔ ایک عام مسلمان بزرگانِ اسلام کی طرح زندگی کی ارتقائی منزلوں تک کیسے پہنچ سکتا ہے، جب تک وہ بھی ان کے نقشِ قدم پر نہ چلے۔ ایک عام مسلمان حضرت داتا گنج بخشؒ، جنید بغدادیؒ اور بایزید بسطامیؒ کا ہم پلہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جن لوگوں نے اولیائے کرامؒ کی زندگیوں کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ شہنشاہوں اور حکمرانوں کی شان وشوکت اولیائے اسلام کے مقابلے

میں لاشئی اور ہیچ میدان ہیں۔

مصنف کتاب نے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ انہوں نے اپنے ابتدائے شباب میں بزرگانِ دین کے احوال اور کوائف کا مطالعہ کیا اور اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ بزرگوں کی زندگی کے سامنے کسی حاکم یا شہنشاہ کی زندگی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ آپ نے عنفوانِ شباب میں اس طائفہ کی زندگیوں کی طرف رغبت کی ابتداء کرنے کے بعد بہت کچھ پایا۔ شاید ہمارے اکثر مسلمانوں کو خدا کی طرف سے ایک نہایت بلند رتبہ عطا کر دیئے جانے کے طریقۂ کار کا علم نہیں۔ اس علم کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے علامہ اقبالؒ نے فلسفۂ خودی کو قوم کے سامنے پیش کیا جس میں مسلمانوں کو یہ ترغیب دی گئی کہ وہ خدا کے عطا کردہ کمالات کا جائزہ لیں اور پہچانیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا نائب (خلیفہ) مقرر فرمایا ہے۔ خلافت کے عطا کرنے کا ذکر سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۳۰ تا ۳۳ میں اور قرآن کریم کے دیگر مقامات میں ملتا ہے۔ خلافت سے متعلق قرآنی آیات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تمام مخلوق پر فضیلت دی ہے۔ یہ فضیلت جو انسان کو دی گئی ہے وہ محض ایک بیان نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ انسان کو وہ صفات عطا فرمائی گئیں ہیں جو باقی مخلوقات کے لئے مفقود ہیں۔ ان تمام قوتوں اور تصرفات کا ذکر اس محدود تحریر میں ممکن نہیں لیکن اگر ان کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین اور آسمان کو انسان کے لئے مسخر فرمایا ہے اور اس کو اپنی اطاعت کے عوض ایسے کمالات اور تصرفات عطا فرمائے ہیں جن کا اندازہ کرنا آسان نہیں۔ اس بات کو ہی لیجئے کہ انسان کا ذہن جو کچھ سوچ سکتا ہے وہ اس کے کرنے پر بھی قادر سمجھا جاتا ہے۔ انسان کو درجۂ اطاعت کے مطابق لفظ ''کُن'' پر اختیار بھی دیا گیا ہے یہاں تک کہ بندۂ مومن جو کچھ بھی کہہ دے تو وہ ''گفتۂ خدا'' تصور کیا جائے گا۔ اس حقیقت کی تصدیق مولانا رومؒ نے درج ذیل الفاظ میں بیان فرمائی ہے۔

گفتہ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(اس کا کہا ہوا اللہ کا کہا ہوا بن جاتا ہے اگرچہ یہ کلام اللہ کے بندے کے حلق سے نکلتا ہے۔)

مذکورہ بالا شعر کی تصدیق ایک حدیثِ قدسی سے بھی ہوتی ہے جس کو علامہ اقبالؒ نے مردِ مومن کی تعریف میں لکھا ہے یعنی ''ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ''۔ مولانا رومؒ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اولیائے کرامؒ کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر طاقت عطا فرمائی ہے کہ وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کو بھی واپس کر سکتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ انسان کے سینے میں اللہ تعالیٰ نے یہ کیا نور رکھ دیا ہے کہ جس کے باعث اس کے مغیبات اس کے حضور کی طرح ہیں۔ کبھی اس کے دل میں براہین الٰہی کے دلائل کی آگ ہوتی ہے اور کبھی اس کے نور میں جبرائیلؑ جیسی روح ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ مردِ خدا تو آسمان سے بجلی کی طرح جھپٹتا ہے، شہر و صحرا اور مشرق و مغرب سب اس کے اینڈھن بن جاتے ہیں۔ بندۂ مومن کائنات کا اہتمام کرنے والا ہوتا ہے، کبھی وہ کلیم اللہ،

مسیح اللہ اور خلیل اللہ علیہم السلام جیسا انسان بنتا ہے، کبھی وہ محمد ﷺ کی صورت اختیار کر کے آتا ہے اور کبھی انسان قرآن اور جبرائیلؑ کے روپ میں بھی آتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن قرآن کا قاری بھی ہے اور بذات خود چلتا پھرتا قرآن بھی ہے (آپؒ نے یہ اس لئے کہا کہ قرآن جس طرح لوگوں کو ہدایت دیتا ہے اسی طرح مومن بھی لوگوں میں ہدایت پھیلاتا ہے، لہٰذا وہ بھی چلتا پھرتا قرآن ہے۔ آپؒ نے فرمایا کہ مومن ہی جبرائیلؑ اور قرآن ہے، وہی فطرت الٰہی کا نگہبان بھی بنتا ہے۔ مومن کے مقام کی سر بلندی کا ذکر مصنف کی تحریر "مقام آدم" (جو اس کتاب میں بھی شامل کر دی گئی ہے) کا مطالعہ فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات کو تخلیق کرنے سے پہلے ہی اس کے لئے قوانین کو وضع کر لیا تھا چنانچہ جب دنیا کو پیدا کیا تو اس کو کہا کہ "اے دنیا تو ان لوگوں کی خدمت کر جو میری تابعداری کریں اور ان کو تھکا دے جو تیری تابعداری کریں" (طبقات الکبریٰ: ۵) اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو لوگ اتباع الٰہی کا اہتمام کرتے ہیں تو پوری کائنات انکی خدمت پر مامور رہتی ہے۔ ایک اور حدیث شریف میں ہے کہ اتباع سنت، ذکر و اذکار اور فرائض کے بعد نفلی عبادتوں کو ادا کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے بہت سے اختیارات سونپ دیئے ہیں۔ کشف المحجوب میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اولیائے کرامؒ کے دم قدم سے یعنی ان کے صدقے سے باران رحمت نازل فرماتا ہے اور زمین سے جو سبزہ اُگ رہا ہے وہ ان کی صفائے حال کی برکت سے اُگ رہا ہے۔ اس کے علاوہ کافروں پر مومنوں کو غلبہ انہیں اولیائے کرامؒ کی ہمت سے حاصل ہوتا ہے۔

یہ مسلمانوں کے والدین کا قصور ہے یا علمائے اسلام کی طرف سے ابلاغ کی کمزوری ہے کہ لوگوں کو ایسی باتوں کا علم نہیں ہو پاتا جن کے سننے کے بعد ہر شخص کا دل اطاعتِ الٰہی کے لئے تیار ہو جائے۔ عمل پر اُکسانے کے لئے کچھ واقعات فوراً اثر انداز ہوتے ہیں مثلاً حضرت علی الہجویریؒ نے حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کا یہ قصہ کشف المحجوب میں لکھا ہے کہ وہ ایک روز ایک جنگل میں چرواہے کے پاس سے گزرے اور آپ نے اس سے پینے کے لئے پانی مانگا تو چرواہے نے کہا کہ یہاں تو دودھ ہے، پانی کہاں سے ملے گا۔ آپ نے فرمایا مجھے تو پانی چاہیئے، وہ چرواہا اٹھا اور اپنی لکڑی کو ایک پتھر پر مارا تو پانی کا چشمہ بہہ نکلا آپ یہ دیکھ کر متحیر ہو گئے۔ وہ چرواہا کہنے لگا کہ اس بات پر تعجب نہ کرو کیونکہ جب بندہ خدا کا مطیع فرمان ہو جاتا ہے تو پورا عالم اسکا مطیع ہو جاتا ہے۔ یہ بات اس حدیث سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ جس میں فرمایا گیا ہے۔ مَنْ کَانَ لَہُ الْمَوْلٰی فَلَہُ الْکُلُّ (جو اللہ کا ہو جائے اس کا سب کچھ ہو جاتا ہے) حضرت علی بن عثمان الہجویریؒ نے بھی کشف المحجوب میں بیان فرمایا ہے کہ اگر ولی اطاعت میں کامل ہے تو اس کی ہر بات پوری کی جاتی ہے۔ ایک اور حدیث شریف میں بھی ہے کہ مَنْ کَانَ لِلّٰہِ کَانَ اللّٰہُ لَہُ (یعنی جو شخص اللہ کا ہو گیا تو اللہ بھی اس کا ہو جاتا ہے۔ (کشف الاسرار) اگر ان روایات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ

بندوں پر اس قدر مہربانی فرمانے پر مائل ہو تو پھر بندوں کو دنیا کے ہاتھوں تکالیف اٹھانے یا زمانے کی ستم ظریفیاں اٹھانے کی کیا ضرورت ہے اور کیوں وہ دنیا اور آخرت کا خسارہ بخوشی اٹھانے کو تیار ہیں؟ کیوں نہ انسان اللہ کے وعدوں پر لبیک کہے اور اسے چاہیے کہ وہ باعزت اور باوقار زندگی بسر کرنے کے مواقع ضائع نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ ایسی ہی ایک بات پر تعجب کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلّٰهِ وَقَارًا (نوح: ۱۳) (تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم پرواہ نہیں کرتے اللہ کی عظمت وجلال کی) اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کیوں دنیا میں دھکے کھاتا ہے اور اللہ کی عظمت اور جلال کی پرواہ نہیں کرتا۔ اس آیت میں اور اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو کہا ہے کہ تم استغفار کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں مال و دولت، اموال اور فرزندوں سے تمہاری مدد کرے گا اور اس کے علاوہ تمہیں باغات اور نہریں عطا کرے گا۔ حضرت حسن بصریؒ، مجاہدؒ اور ضحاکؒ نے کہا کہ کیا تمہیں اللہ کی گرفت کا کوئی ڈر نہیں اور خدائی انعامات حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں؟ اس سے زیادہ اور کیا بدقسمتی ہوگی کہ انسان ان ترغیبات کی پرواہ نہ کرے۔

مستند کتب میں یہ واقعہ ملتا ہے کہ ایک شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آتا اور دستِ سوال دراز کرتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہمیشہ اس کی کچھ نہ کچھ مدد فرما دیتے۔ ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا اے شخص تو میرے دروازے کے چکر لگاتا ہے، مجھے یہ بتا کہ میرا دروازہ بہتر ہے یا اللہ کا دروازہ بہتر ہے؟ اس شخص نے جواب دیا کہ دروازہ تو اللہ تعالیٰ کا ہی بہتر ہے۔ آپؓ نے فرمایا تو پھر جاؤ اور قرآن پڑھو تاکہ تمہیں اس کے دروازے کا علم ہو جائے۔ روایت میں ہے کہ وہ شخص گیا اور پھر کبھی آپؓ کی طرف لوٹ کر نہیں آیا۔ ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ فلاں شخص کو کیا ہوا ہے کہ وہ لوٹ کر ہمارے پاس نہیں آیا۔ ایک دن آپؓ اس کی مزاج پرسی کے لئے گئے تو معلوم ہوا کہ اب وہ کہیں بھی نہیں جاتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا کہ تم اب کیوں نہیں آتے؟ اس نے عرض کیا کہ آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ جاؤ قرآن پڑھو تو جب سے میں نے قرآن پڑھا ہے اسی وقت سے مجھے ہر چیز دستیاب ہونے لگی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم نے قرآن میں کیا پڑھا؟ اس نے کہا کہ جب میں گھر آیا اور آکر قرآن کریم کھولا تو یہ آیت نظر سے گزری: وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ (الذاریٰت: ۲۲) (اور آسمان میں ہے تمہارا رزق اور ہر وہ چیز ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے) اس شخص نے کہا کہ اس آیت کو جب میں نے پڑھا تو میں سمجھ گیا کہ جب میرا رزق آسمان سے آتا ہے تو میں اس کے لئے زمین پر کیوں ذلیل وخوار ہوتا ہوں چنانچہ اس دن سے میں نے آسمان والے سے دوستی لگالی اور اب مجھے گھر بیٹھے ہر چیز مل جاتی ہے۔ اس شخص کی یہ گفتگو سن کر عمر رضی اللہ عنہ رونے لگے۔ غور کا مقام ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہمارے تمام مصائب ومشکلات کا حل پیش کر دیا ہے تو پھر ہم اس کی طرف دھیان کیوں نہیں دیتے اور دنیا کی خواری کو خواہ مخواہ قبول کر لیتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو ہم اللہ

تعالیٰ کی بخششوں پر یقین نہیں رکھتے یا پھر ہم ایک گھٹیا اور ذلیل قوم کے افراد کی طرح ذلیل وخوار ہونے پر رضا مند ہوئے ہیں اور اللہ کی رحمتوں سے محروم رہنا چاہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے لئے ان دونوں امراض کا علاج کرنا قوم کی ضروریات میں سے ہے۔ یقین سے محرومی کا علاج مصنف موصوف کی کتب ''حُسن نماز صفحہ ۱۳۰'' اور اقامۃ الصلوٰۃ کے صفحہ نمبر ۹۵ کا مطالعہ کریں تو بآسانی یقین کی دولت سے حصہ مل سکتا ہے۔ محرومی قسمت کے احساس کا علاج یہ ہے کہ اولیائے کرام کی صحبت میں متواتر بیٹھنے سے اس مرض کا ازالہ ہوسکتا ہے کیونکہ ان کے کلام میں شفا ہے اور ان کی نگاہوں میں اللہ تعالیٰ نے قسمتوں کو بدل دینے کی تاثیر رکھی ہے۔

ہمارے طویل تجربے کا حاصل یہ ہے کہ جب قسمتوں کو بدلنے کی بات کی جاتی ہے تو اس سے مراد دولت دنیا اکٹھا کرنا نہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ انسان دنیا میں باعزت طریقے سے رہے اور جب آخرت کے سفر کی طرف روانہ ہو تو اس کو فرشتے اللہ کی بخششوں اور رحمتوں کے گھر میں داخل کردیں۔ ایک مسلمان کا یہ شعار ہے کہ دنیوی زندگی میں معصیت کی جھاڑیوں سے اپنے کپڑوں کو بچاتا ہوا نکل جائے اور پھر ہر وقت اسی تاک میں رہے کہ وہ کن ذرائع سے اپنی اصلاح کرسکتا ہے تاکہ وہ دنیا میں ایک معزز ملک کا باشندہ بن کر رہے۔ دنیا کے مال حاصل کرنے کے لئے کچھ لوگ ڈاکے ڈالتے ہیں کچھ لوگ اپنے بھائیوں کی جان و مال اور عزت وآبرو کو لوٹتے ہیں۔ دنیا میں جہاں مسلمان رہتے ہیں ان میں سے اکثر لوگ چور، ڈاکو، لٹیرے اور اچکے سمجھے جاتے ہیں۔ حیرت ہے کہ قومی تعمیر اور معیاری کردار کی طرف صرف ایک یا دو فیصد لوگ توجہ دیتے ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ ہمارے گھروں میں اور شہروں میں غلط روش اور بے دینی کی طرف رجحانات بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ہر کوئی پیسے کی دوڑ میں مصروف ہے اور اپنے ملک وقوم اور آخرت کی زندگی کی طرف بہت کم لوگ غور کرتے ہیں حالانکہ اگر وہ نیک نیتی کی زندگی بسر کریں تو قرآن وحدیث اس بات پر گواہ ہیں کہ انسان کامیاب ترین زندگی کو حاصل کرسکتا ہے اور اس کی برکات سے وہ مال ودولت، عزت اور وقار کے مثالی مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔ انسان کا غلط ذرائع سے پیسہ کمانا ہی کامیابی کی ضمانت نہیں بلکہ بسا اوقات ناجائز ذرائع سے حاصل کردہ آمدنی انسان کو دنیا میں مصائب وآلام میں گرفتار کردیتی ہے اور آخرت کے رسوا کن عذاب میں مبتلا کردیتی ہے۔ اگرچہ روپیہ پیسہ روزمرہ زندگی کے لئے ضروری ہے مگر اس کے لئے دین کو داؤ پر نہیں لگا دینا چاہیئے۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے ۔

اگرچہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات
جو فقر سے ہے میسر تو نگری سے نہیں

اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور
قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں

سبب کچھ اور ہے جس کو تو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

اگر جہاں میں مرا جو ہر آشکار ہوا قلندری سے ہوا ہے تونگری سے نہیں

(ض،ک:۴۸۲)

علامہ اقبالؒ کے کلام میں یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ وہ بہت پیچیدہ اور اہم معاملات کو آسان، دلچسپ اور مؤثر الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں۔ آپ کا طرز بیان ایسا ہے کہ (اگر کوئی شخص انسانی قدروں سے محروم نہیں ہے) تو وہ ان کی بات کو اپنے دل اور دماغ میں بیٹھا لیتا ہے اور اس پر عمل کرنے کے لئے بے چین ہو جاتا ہے۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ علامہ اقبال کا کلام انسان کو فرش سے اٹھا کر عرش تک لے جانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کی ہستی کے متعلق صوفیاء کا یہ خیال ہے کہ جو شخص آپؒ کے کلام پڑھنے کی طرف رغبت نہیں کرتا اس میں ارتقائی اور تعمیری جذبہ حاصل کرنے کی سرے سے ہی اہلیت موجود نہیں۔ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس سے یہ اخذ کیا جاتا ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کی طرف توجہ دینا کامیاب زندگی کے لئے اشد ضروری ہے اور اس مقصود کے حصول کے بعد اپنے جذبۂ شوق کو ابھارنے والے امور کی طرف خود کو لے کر جانا چاہیے۔ اگر آپ ہر روز اپنے عزم کو پختہ تر کرتے جائیں تو ایک دن ایسا ضرور آئے گا کہ آپ مقبول بارگاہ الٰہی ہو جائیں گے اور آپ کو ولایت کے درجے پر فائز کر دیا جائے گا۔ اگر جذبۂ شوق تازہ رہے تو ہر آدمی جنید و بایزیدؒ بن سکتا ہے، اگر اس طرف جانے کی کوشش کو جاری رکھا جائے اور متعلقہ معاملات کی طرف رابطہ تیز تر کیا جائے تو کچھ عرصے کے بعد ہی تھوڑی کوشش سے آپ کو بہت اعلیٰ مقام حاصل ہو جائے گا اور آپ وہ کچھ اپنے اندر محسوس کریں گے جو اولیائے کرام کو ملتا رہا۔ ایسی کوششوں میں اگر علامہ اقبالؒ کی دوستی کا دم بھریں تو یہ شوق آپ کو بہت جلد ایک بہت بڑے مقام پر لا کھڑا کرے گا بشرطیکہ کسی جید عالمِ دین سے علامہ اقبالؒ کے کلام کے متعلق گفتگو سنیں۔ کچھ لوگ علامہ اقبالؒ سے محبت کی وجہ سے ان کے قرب میں جگہ حاصل کر چکے ہیں۔ اس زمانے میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو علامہ اقبالؒ کی وفات کے بعد ان سے گفتگو کرنے کا شرف حاصل کر لیتے ہیں۔

زیر نظر کتاب میں مصنف نے تصوف اور درویشی کے مختلف معاملات پر کافی وسیع تحریریں پیش کی ہیں اور یہ کتاب کا (تقریباً بارہ سو صفحات پر مشتمل) انشاء اللہ العزیز عنقریب زیور طباعت سے آراستہ ہو کر راہروانِ طریقت کی تشنگی کو دور کرنے کا ذریعہ بنے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی کاوشوں کو شرف قبولیت عطا فرمائے (آمین)

بحرمت نبینا و امام الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام

خاکپائے اولیائے کرام

لیفٹیننٹ کرنل احمد فضیل خان

پاکستان آرمی

(لاہور)

یکم جولائی ۲۰۰۸ء

تأثرات

(حضرت پیر علاؤالدین صدیقی غزنوی مدظلہٗ)

سلسلۂ نقشبندیہ کا یہ خاصہ ہے کہ اس کے اکابرین نے احیائے اسلام کی غرض سے لاتعداد کتب کو منصۂ شہود میں لانے کی کوشش کی ہے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ کی شان میں حضرت جنید بغدادیؒ نے صراحتاً لکھا ہے کہ میں نے بہت بڑے بڑے اولیائے کرام کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے لیکن جب میں حضرت بایزید بسطامیؒ کے کلام کا مطالعہ کرتا ہوں تو دل کا یہ حال ہوتا ہے کہ ان کے بیان کردہ حقائق میرے دل کی گہرائیوں میں اُمڈ کر غلبۂ حال کی صورت میں آنے لگتے ہیں اور ان کی باتوں سے مجھے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بایزید بسطامیؒ سے اونچی باتیں کسی بزرگ میں نظر نہیں آتیں۔ آپؒ نے حضرت بایزید بسطامیؒ کے بیان کردہ نکات کو کسی کے سامنے بیان کرنا گوارا نہیں فرمایا کیونکہ یہ باتیں ہر کس و ناکس کے سامنے بیان کرنا غیرت اور حمیت کے خلاف ہیں۔ ایسی ہی وجوہات کی بنا پر حضرت جنیدؒ نے یہ بھی فرمایا کہ آپ کا رتبہ تمام مشائخ میں ایسا معظم ہے جیسے تمام فرشتوں میں حضرت جبریل علیہ السلام معظم ہیں۔

الحمدللہ یہ تصانیف کا سلسلہ وراثتاً سلسلۂ نقشبندیہ میں ابھی تک جاری وساری ہے اور ان روایات کے احیاء کے بغیر اُمتِ مسلمہ کی نشاۃِ ثانیہ کا مقصد کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ ایسے مبلغینِ اسلام کی کاوشوں کو قبولیت سے ہمکنار فرمائے۔ آمین

پیر عبداللطیف خان نے اشاعت وتبلیغ کے سلسلہ میں تقریباً پندرہ عدد کتب کو تصنیف کیا ہے جس کی وجہ سے عوام کو بے حد استفادہ ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی کاوشوں کو کامرانی وکامیابی عطا فرمائے۔ آمین

خاکِ راہِ پاک بازاں
پیر علاؤالدین صدیقی غزنوی
سجادہ نشین دربار عالیہ نیریاں شریف
آزاد کشمیر

مقدمہ

(ماخوذ از رابطہ شیخ)

از حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ سابق جسٹس وفاقی شرعی عدالت۔ پاکستان

اللہ رب العزت نے اپنے محبوب کریم عَلَيْهِ التَّحِيَّةُ وَالثَّنَاءُ وَالتَّسْلِيمُ کو بے شمار شانوں اور ان گنت کمالات سے بہرہ ور فرما کر مبعوث کیا۔ یہ کمالات عالیہ حد احصاء سے باہر ہیں۔ انہیں میں سے ایک خصلت حمیدہ یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ دلوں کا تزکیہ فرماتے ہیں، وہ دل جو دنیوی خواہشات سے آلودہ ہو چکے ہوں ان کی دھڑکنوں کا مرکز و محور بدل گیا ہو جو اپنے خالق و مالک کے ذکر کی حلاوت سے محروم ہو چکے ہوں، شیطانی وسوسہ اندازیوں اور نفس کی دسیسہ کاریوں کی آماجگاہ بن چکے ہوں۔ جب ایسے پراگندہ دل بھی آپ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوں گے اور آپ کی نگاہ لطف ان کی جانب اٹھ جائے گی تو ان دلوں کو وہ طہارت نصیب ہو جائے گی کہ قدسیان سمٰوات بھی ان پر رشک کریں گے۔ اب شیطانی حربے ان کے دلوں پر اثر انداز نہیں ہو سکیں گے بلکہ وہ تو انوار ربانی کے مہبط و مرکز بن چکے ہوں گے۔

ہمارے پاک و پاکیزہ سرشت پیغمبر ﷺ کے فیض ہمایوں نے دلوں کی اجڑی ہوئی دنیا کو بہار آشنا کر دیا۔ ایسی سرمدی و دائمی بہار کہ وہ اس کے بعد کبھی بھی خزاں کی ستم رانیوں کا شکار نہیں ہو سکتی۔

نبی اکرم واطہر ﷺ کی فیض بخشیوں کا یہ سلسلہ اولیائے کرام کی صورت میں آج بھی جاری و ساری ہے۔ ان نفوسِ قدسیہ کے روحانی تصرفات اور باطنی فیوضات نے ہمیشہ دنیا میں خیر کی روایت کو زندہ رکھا۔ عصیان ولغزشوں سے آلودہ دلوں کو حق و راستی کے انوار سے روشن و منور کرنے کا سلسلہ ہمیشہ ان پاکان امت نے اپنی شبانہ روز کاوشوں سے بحال رکھا۔ اولیائے کرام کی اس مساعی کے صدقے اس امت میں ایسے ارفع و اعلیٰ کردار اور ایسی برگزیدہ ہستیاں پیدا ہوتی رہیں کہ دنیا کی کوئی قوم ان جیسے نادر روزگار وجود پیش نہیں کر سکتی۔

آج جبکہ عالم اسلام گوناگوں ابلیسی سازشوں کا شکار ہے ان میں سے ایک بہت بڑی سازش اسلام کے اس روحانی نظام کو مشکوک اور بے اصل ثابت کرنے کی ہے۔ اغیار اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ یہ امت اپنے ایمان، محبت اور حق کی خاطر مر مٹنے کے لازوال جذبے کہاں سے حاصل کرتی ہے۔ ایسے میں وہ افراد بڑے

خوش بخت اور فرخندہ اقبال ہیں جو اپنے اسلاف کی درخشندہ اور حیات آفریں روایات کی پاسداری کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔

محترمی عزت مآب حضرت پیر عبداللطیف خان صاحب نقشبندی کی تصنیفات عالیہ دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ فی زمانہ صوفیائے کرام کی تعلیمات کو سہل انداز میں اور عصری مذاق کے مطابق نوجوان نسل اور تشکیک زدہ افراد کے سامنے پیش کرنا بہت ہی ضروری ہے۔ ان روایات کے احیاء کے بغیر امتِ مسلمہ کی نشاۃ ثانیہ کا مقصد کبھی بھی پورا نہیں ہو سکتا۔ ایسی مفید اور معیاری کتابوں کے مصنف یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اپنے حبیب کریم ﷺ کے صدقے اللہ رب العزت اُن کی کاوشوں کو قبولیت سے ہمکنار فرمائے اور اُن کی فیض رسانیوں کے سلسلہ کو مزید وسعت عطا فرمائے۔ آمین

خاکِ راہِ صاحب دلاں
پیر محمد کرم شاہ الازہری
سجادہ نشین، بھیرہ شریف

اپریل ۱۹۹۸ء

تبصرہ

(صاحبزادہ امین الحسنات شاہ سجادہ نشین آستانہ عالیہ بھیرہ شریف سرگودھا)

زیرِ نظر کتاب ''اسلام وروحانیت اور فکرِ اقبال'' ایک عظیم صوفی اور ملک پاکستان کے نامور مصنف اور تصوف کے موضوع پر لکھنے والے عظیم قلمکار کی بیس سالہ کاوشوں کا ثمر ہے۔ فاضل مصنف پیر عبداللطیف خان نقشبندی بنیادی طور پر (محکمہ موسمیات) کے ڈائریکٹر رہ چکے ہیں۔ زندگی کا بیشتر حصہ اسی شعبہ میں صرف کیا اس لئے انہیں ایک طرف تو جدید علوم کا گہرا شعور ہے، جس کا ثبوت باب نمبر ۱۶ طبقات السمٰوات میں واضح نظر آتا ہے اور دوسری طرف وہ اپنے مافی الضمیر کے اظہار میں کامل دسترس رکھتے ہیں جس کا عملی نمونہ آپ کے ہفتہ وار درس میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ فاضل مصنف کے جوہر اسلام وروحانیت اور فکرِ اقبالؒ میں خوب کھلتے نظر آتے ہیں۔ لہٰذا آپ کا طریق استدلال واضح مگر مؤثر اور طرزِ تحریر سادہ، عام فہم اور نئی نسل کی ذہنی سطح کے عین مطابق ہے۔ زیرِ نظر کتاب اسلام وروحانیت اور فکرِ اقبالؒ علمی، عصری، دینی، روحانی اور مذہبی معلومات کا عمدہ ذخیرہ ہے اور تصوف کے موضوع پر ایک لائق تحسین اضافہ ہے۔ یہ کتاب فاضل موصوف کی محنتِ شاقہ، تحقیقی مہارت، دینی حمیت اور اولیائے کرام سے دلی وابستگی کی نادر مثال ہے۔ اس کتاب کے ذریعے تصوف کی حقانیت وصداقت کو اجاگر کرنے کی جس خلوص سے کوشش کی گئی ہے وہ کم اہل قلم کو نصیب ہوتی ہے۔ اسلام وروحانیت اور فکرِ اقبالؒ میں راہِ سلوک کے متلاشیان کے لئے وہ سب کچھ ہے جس کی انہیں تلاش ہے۔ اس کتاب میں قدم قدم پر محبت کی زبان کے جلوے اور محبت کے نظارے پائے جاتے ہیں۔ آپ نے اپنے مخصوص طرزِ فکر اور اندازِ تحریر سے تصوف پر روشنی ڈالی ہے۔ قارئین کو کتاب ھذا کے مطالعہ سے فکر انگیز موضوعات مثلاً اسلام میں فقر اور درویشی، تصوف کی پاکیزگی اور قلوب کی روشنی پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں سلوک و ارادت، معرفتِ الٰہی، فقراء کی دلوں پر حکومت، ولایت ومعرفت، ولایت، مقامِ آدم، مقامِ بشریت اور ملکوتیت پر اعلیٰ مضامین پائے جاتے ہیں، مصنف نے صوفی کی طریقت میں ہے فقط مستی احوال، صوفی شریعت کی پیروی سے مختص ہے، بیعت کی مشروعیت اور صادقین کی معیت اور ضرورتِ شیخ پر استدلال، وغیرہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

موصوف کی کتاب ''اسلام وروحانیت اور فکرِ اقبال'' ایسے لوگوں کے لئے بڑی مدد معاون اور مفید ثابت ہوگی جو سلسلۂ روحانیت سے منسلک ہیں یا جو روحانی شعور رکھتے ہیں، اس کے علاوہ وہ احباب جو روحانی دنیا سے شناسا نہیں ہیں لیکن اس کی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں اُن سب کے لئے یہ کتاب راہنمائے کامل کی حیثیت رکھتی ہے اور قارئین کے ذوق کے مطابق روحانی فیض نوازنے کا بھی وسیلہ ہوگی۔ زیرِ نظر کتاب ۵۱ ابواب پر مشتمل ہے۔ دیگر شعبوں کی طرح تصوف پر بھی اعتراضات ہوئے اور شدید مخالفت بھی کی جاتی ہے لیکن مصنف موصوف نے منکرینِ طریقت وتصوف اور جدید ذہنوں میں اُٹھنے والے شکوک وشبہات کا احسن انداز سے قرآن وحدیث اور بزرگانِ دین کے اقوال کی روشنی میں ازالہ پیش کیا ہے جنہیں پڑھ کر تشکیک زدہ افراد کے قلوب واذہان کی تسلی وتشفی ہو جاتی ہے۔ فاضل موصوف نے مختلف کتب میں بکھرے ہوئے موتیوں کو یکجا کر کے قارئین کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس کتاب میں پیرانِ عظام اور مریدین کے لئے وہ سب کچھ موجود ہے جس کی ان حضرات کو ضرورت ہوتی ہے۔ آپ نے سالکان ومبتدیانِ طریقت کی روحانی تربیت کیلئے کافی مواد پیش کیا ہے۔ اس کتاب سے عام قاری اور بلند پایہ محققین یکساں طور پر استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس علمی کاوش اور عمدہ پیش کش پر فاضل مصنف اور ناشر بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ زیرِ نظر کتاب انتہائی طور پر مفید ہے اور مفید کیوں نہ ہو اس میں موجود ہدایات ونصائح موجودہ اکابرِ اہلِ حق اور گزشتہ سلف صالحین کی برکات وتعلیمات کا خلاصہ اور نچوڑ ہیں اور اس کتاب میں سجادہ نشین حضرات کے لئے قیمتی آراء اور مشکل مراحل کو آسان بنانے کی تدابیر موجود ہیں۔ گدی نشیں حضرات اور مشائخ حضرات کو چاہیئے کہ اس کتاب سے بھرپور فائدہ اُٹھائیں۔ پیر عبداللطیف خان نقشبندی مبارکباد کے مستحق ہیں جنہوں نے ذاتی توجہ، محنت اور دردمندی سے یہ کتاب تحریر کی جسے عوام وخواص کو عظیم تحفہ سرمایہ کے طور پر عطا فرمائی۔

والسلام

صاحبزادہ امین الحسنات شاہ

سجادہ نشین آستانہ عالیہ بھیرہ شریف، سرگودھا

۲۰ راگست ۲۰۰۸ء

تبصرہ

(از پیر سید میر طیب علی شاہ بخاری سجادہ نشین حضرت کرماں والا شریف)

مصنفِ کتاب ہذا کی متعدد کتب اس فقیر کی نظروں سے گزر چکی ہیں جس میں آپ نے اُمتِ مسلمہ کے خوابیدہ مسلمانوں کو بیدار کرنے کی مہم کا بیڑا اُٹھانے کا اظہار کیا ہے اور آپ اب تک اس کے لئے انتھک اور پُرعزم طریقے سے کوشاں ہیں۔ دورِ حاضر کے اس گمراہی کے حال میں اُمت مسلمہ کی نشاۃ ثانیہ کا احاطہ کرنے کے لئے تمام مشائخ اور علمائے اسلام کو مل کر تبلیغ و ترویج اسلام کی ذمہ داری کو قبول کرنا اور اس مقصد کے حصول کے لئے شب و روز محنت کرنا ایک لازمی امر ہے۔ ان کوششوں کے بغیر تعمیرِ ملّت کا فریضہ ادا نہیں ہوسکتا۔ یہ وہ وقت ہے کہ پوری ملتِ اسلامیہ کے نوجوانوں کو گمراہی اور فحش مغربی طرز حیات کی طرف دھکیلنے کے لئے مخالفینِ اسلام کافی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں اور مسلمانانِ عالم کو مادیت کی دوڑ میں اس قدر مغلوب کر دیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو اب ان مسلسل زہریلے اثرات سے نجات دلانا بظاہر ناممکنات کی حدود تک پہنچ چکا ہے۔ مسلمانوں کی اس مرض کا علاج صرف اسی صورت میں ممکن ہوسکتا ہے کہ حکومتِ پاکستان اپنی اس بھولی بسری مذہبی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دے اور وطن عزیز کے چند علماء کے علاوہ کچھ مقتدر ہستیاں اس مرض کے تدارک کے لئے حکومتی کوششوں میں برابر کی شرکت کریں۔ یقین کامل ہے کہ اگر حکومت اور مقتدر حضرات اسلام کی اس نشاۃ ثانیہ کی طرف معمولی سی توجہ دیں تو چند سالوں کے قلیل عرصہ میں ہی مسلمانوں کی دین سے دوری کے مرض کا ازالہ ہوسکتا ہے۔

قومی اصلاح کے لئے اگر مذکورہ بالا تینوں گروہ ساتھ مل کر اُٹھیں تو مسلمانوں کی بے دینی اور سہل کاری کی عادات با آسانی بدل سکتی ہیں۔ اس سلسلہ میں اگر ٹیلی ویژن پر پندرہ منٹ روزانہ مخصوص اصلاحی دروس کے لئے وقف کر دیے جائیں تو نشاۃ ثانیہ کا عمل ایک دو سال کے عرصہ میں پورا ہوسکتا ہے اور عوام الناس کے بجھے ہوئے سینوں میں جذبۂ عمل پیدا ہوسکتا ہے ٹیلیویژن کا موجودہ طریقہ رسمی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اس آسان طریقے کو اپنایا جائے تو ملت اسلامیہ کے افراد وہ قوت حاصل کر سکیں گے جس سے غیر اسلامی قوتوں کا آج کل کے مسلمانوں پر طاری کردہ خوف و ہراس ختم ہوسکتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب کا تحریر کرنا جناب عبداللطیف خان نقشبندی کے ادارہ تبلیغ و ترویج کے ایسے ہی امور سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ کی کتب کے مطالعہ سے مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد حیرت انگیز طور پر اصلاح قبول کر چکی ہے لیکن اس محدود تبلیغی ادارے کی کوششوں سے اصلاح پانے والوں کی تعداد بہت قلیل اور ناکافی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے بہت سے ادارے پورے ملک کے بڑے شہروں میں تعمیر کئے جائیں تو اِس سے اصلاح شدہ مسلمانوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہو سکتی ہے۔ مطلوبہ معیار حاصل کرنے کے لئے حکومت کے علاوہ چند علماء اور کچھ مقتدر ہستیوں کی شرکت ایک لازمی امر ہے۔

مسلمان قوم کے ارتقائی تقاضے پورے کرنے کے لئے مسلمانوں میں علمی کیفیت کو اُجاگر کرنا نہایت ضروری امر ہے کیونکہ اعمال اِس کیفیت سے ہی صادر ہوتے ہیں۔ اِس کتاب میں مؤلف نے اسلام کی روحانی منزلوں کو طے کرنے کے لئے تصوف، درویشی، سلوک، طریقت، علم تصوف، ولایت، کراماتِ اولیاء، فقراء کے آداب اور مقاماتِ فقر کا سیر حاصل ذکر کیا ہے۔ اِس کے علاوہ علامہ اقبالؒ کا نظریہ فقر اور آپؒ کے دیگر فرمودات، مثلاً ضروریاتِ فقر، حقیقتِ فقر، اسلامی روحانی تقاضوں کے علاوہ علامہؒ کے مُلائیت، طریق خانقاہی اور رموزِ قلندری کو نہایت دلچسپ انداز سے بیان کیا ہے۔ طریقت اور فقر پر مشائخ کبار کے اقوال، مولانا رومیؒ کا طریقہ فقر اور اُن کے پیش کردہ علم الروح، ضرورت شیخ اور تصوف کے مختلف پہلوؤں کو آسان طریقوں سے پیش کیا ہے۔

مؤلف نے روح اور نفس کا ایک دلچسپ مقالہ بھی اِس کتاب میں شامل کیا ہے۔ اِس کے علاوہ اِس کتاب میں مقامِ آدم، بشریت، ملکیت اور وِجدان کے علاوہ علمِ ظاہر، علمِ باطن، فراست، معرفت، حکمت اور مختلف اصطلاحاتِ تصوف کو نہایت شد و مد سے پیش کیا ہے۔ مذکورہ مضامین کے علاوہ راہِ طریقت کے جزویات مثلاً طبقات السموات میں عالمِ بالا کے تمام طبقات (برزخ، اعراف، عوالم ملکوت، جبروت، لاھوت، ھاھوت اور ھُو) کی دلچسپ تشریح تحریر فرمائی ہے۔ مسلمانوں کو اگر مذکورہ مضامین کا علم حاصل ہو جائے تو بقول علامہ اقبالؒ اُن کی منزل ہی بدل جاتی ہے ؎

جب اس انگارۂ خاکی میں ہو جائے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

(ب۔د:۱۷۶)

زیرِ نظر کتاب کی خصوصیات میں سے ایک نہایت خوبصورت خصوصیت یہ ہے کہ مؤلفِ کتاب نے تصوف اور روحانیت کے علوم کے علاوہ طریقت کے موضوعاتِ ضروریہ پر علامہ اقبالؒ کا جی کھول کر کلام پیش کیا ہے، جس نے اِس کتاب کے مضامین کو مزید تقویت سے ہمکنار کر دیا ہے اور قارئین کے لئے انتہائی بلند درجوں کی رفعت پر لے اُڑنے کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ تصوف کے پیچیدہ علوم کو جس دلکش انداز میں علامہ

اقبالؒ کے افکار اور فلسفۂ اسلام کا رنگ دیا ہے، وہ اس کتاب کا ایک عظیم خاصہ ہے۔ علامہ اقبالؒ کے اشعار اُن موضوعات کا احاطہ کئے ہوئے ہیں جس سے گئے گزرے مسلمانوں میں بھی تازہ روح پھونکنے کا سامان پیدا ہو گیا ہے۔ اُمید ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے خواہشمند حضرات روحانی، وجدانی اور ایقانی تازگی محسوس کریں گے اور پوری قوم میں اسلامی زندگی کی لہر دوڑ جائے گی۔ (بشرطیکہ آپ کا یہ کلام مسلمانوں کی نظروں تک پہنچ جائے)

میری دُعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ مصنف کو اس نادر البیان کتاب کی تحریر پر اپنا خاص قرب اور درجات کی بلندیاں نصیب فرمائے۔ (آمین بحرمت جاہ حبیبنا وسیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

۱۸ فروری ۲۰۰۷ء

والسلام الی یوم القیام

پیر سید میر طیب علی شاہ بخاری

سجادہ نشین حضرت کرماں والا شریف، اوکاڑہ

تلقینِ روحانی

(مریدوں کے نام)

از پیر عبداللطیف خان نقشبندی

قلبِ مرجوع اور عقلِ سلیم کی متوازی راہوں میں اگرچہ حوادثِ زمانہ کے قطرات ٹپکتے رہتے ہیں تو بھی ان خدائی راہوں پر چلنے والوں کو کوئی طاقت مسدود نہیں کر سکتی۔ ایسی تنگ و تاریک نظر آنے والی راہوں سے بھی وہ شواہد نظر آتے رہتے ہیں جن کی گردِ راہ کو کسی معمولی روحانی شہنشاہ کے اِنتہائی قرب رکھنے والے رفیق ہرگز نہیں پہنچ سکتے۔

روحانیت ایک لامتناہی گہرائیوں کا سمندر ہے جس میں موتی، ہیرے اور جواہرات کو اللہ تعالیٰ نے سمندر کی تہوں میں ہی محفوظ، مقدور اور مامون کر رکھا ہے۔ ایسے بحرِ بیکراں سے جو موجیں اُٹھتی ہیں وہ سمندر کے قریب سے گزرنے والے لوگوں کو بھی کچھ دیر کے لئے مسرور کرتی ہیں لیکن سمندر میں موجود موتیوں اور عام ریگزاروں کی رفعتوں میں کوئی نسبت نہیں ہوتی۔ اس حقیقت کی شان اس دن واضح ہوگی جب سمندر کو قیامت خیز زلزلوں سے افشا کیا جائے گا مگر اس دن کسی کو اپنے کئے ہوئے پر شرم کرنا بھی اُس کے کام نہیں آئے گا۔ میں جس طرح مسدود حالات کے باوجود اور ضعیف العمری کی حالت میں تبلیغی مقاصد سے دور نہیں رہا اور چار عدد کتب کو بنام اسلام وروحانیت اور فکر اقبالؒ، سوز و ساز رومیؒ، تہذیبِ نفس اور " شاہین کا جہاں اور " کو تصنیف کیا ہے ان چار عدد تصانیف کے علاوہ یہ فقیر گیارہ عدد کتب پہلے بھی شائع کر چکا ہے جو اُمتِ مسلمہ کے لئے بہت بڑا سرمایہ ہے۔ اسی طرح آپ بھی حالات کے تھپیڑوں میں خدمتِ خلق کے جذبے سے اپنے سینوں کو گرم رکھیں۔

اُمید ہے کہ یہ کتب اشاعت کے بعد شہرہ آفاق ہونے کا شرف حاصل کریں گی۔ اللہ تعالیٰ ان تصانیف کی برکات سے عالمِ اسلام کے مسلمانوں کو نیا ولولہ اور جذبۂ عمل عطا فرمائے۔

مورخہ یکم جنوری ۲۰۰۸ء

خاکِ پائے درویشاں
عبداللطیف خان نقشبندی
ڈائریکٹر (ر) محکمہ موسمیات لاہور
فون-042-6666631

باب ۱

حصہ اوّل

(فقر اور درویشی)

اسلام میں فقر اور درویشی

علمِ فقر

علم اور فقر کی بات ہو تو فقر کا مفہوم بیان کرنے سے پہلے علامہ اقبالؒ اور کلامِ اقبال کے حسبِ ذیل اشعار خود بخود زبان پر آ جاتے ہیں۔ ان اشعار سے فقر کے علم کا مفہوم سمجھ آ جاتا ہے۔

علم کا مقصود ہے پاکیٔ عقل و خرد — فقر کا مقصود ہے عفتِ قلب و نگاہ
فقر مقامِ نظر، علم مقامِ خبر — فقر میں مستی ثواب، علم میں مستی گناہ (ب۔ج:۳۶۹)

فقر کا مفہوم

عشقِ خداوندی میں دنیا اور عقبیٰ کی ہر خواہش سے بالاتر ہو جانے کی منزل کو فقر کہتے ہیں۔ اس میں تنگدستی، غریبی اور مفلسی کے معنی پائے جاتے ہیں، لیکن فقر میں اسلامی طرزِ زندگی اور اس کے لئے جدوجہد کرنا حتی المقدور لازم رہتے ہیں، جس کے نتیجے میں فقیر کو روحانی اقتدار کے علاوہ زمین و آسمان کے مسخر کرنے کی قوت دے دی جاتی ہے۔ ان کی یہ قوت بڑے بڑے بادشاہوں کو بھی میسر نہیں ہوتی۔ ایسے فقر کے لئے علامہ اقبالؒ نے فرمایا۔

بگذر از فقرے کہ عریانی دھد! — اَے خنک فقرے کہ سلطانی دھد! (ج۔ن:۷۳۲)

(ایسے فقر کو چھوڑ دو جو بھوک ننگ دے، خوش آئین ہے وہ فقیری جس سے شہنشاہی ملے۔)

تجھے گُر فقر و شاہی کا بتا دوں — غریبی میں نگہبانی خودی کی (ب۔ج:۳۸۱)

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور — چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے (ب۔ج:۳۷۶)

فقر ذہن کی ایسی کیفیت کا نام ہے جس کے تحت انسان کسی اعلیٰ مقصد کے لئے جدو جہد تو کرتا ہے لیکن اس کے معاوضے کا آرزومند نہیں ہوتا۔ یہ صورتِ حال اسے ہر لالچ سے محفوظ رکھتی ہے اور اسرارِ جہانگیری کو فاش کرتی ہے اور اس کے ذہن کو خاصیتِ اکسیر عطا کرتی ہے چنانچہ فقر مادی وسائل سے بے نیازی اور دنیا و آخرت کے ملنے والے انعامات کے ساتھ لاتعلقی اور نفرت کا تصور پیدا کرتا ہے۔

درویش متوجہ الی اللہ ہوتا ہے اور اہلِ خوف میں شمار ہوتا ہے۔ اسلام میں خوفِ طبعی کا علاج اتباعِ سنّت ہے اور خوفِ حقانی کا علاج ذات باری تعالیٰ کی سپردگی میں چلے جانا ہے۔ اول الذکر خوف رکھنے والے اولیاء اہلِ ریاضت، اہلِ حضور، شریعت محمدی ﷺ سے وابستہ رہتے ہیں اور اہلِ کسب کہلاتے ہیں۔ موخر الذکر قسم کا خوف رکھنے والے مسلسل ریاضت کرنے والے ہیں اور ان کا تعلق شریعت کے علاوہ حقیقت سے ہوتا ہے اور یہ اہلِ مشاہدہ اور اہلِ قلب میں سے ہوتے ہیں اور قلبی تصرف کی وجہ سے صاحبِ تصرف کہلاتے ہیں۔ اہلِ قلب توجہ دیتے ہیں جبکہ اہلِ شرع کو رب العزت بیان سے نوازتا ہے اور ان کا معاملہ درس و تدریس کے ذریعے بلند کیا جاتا ہے۔ کسی نے ایک بزرگ سے تصوف کی حقیقت پوچھی تو انہوں نے فرمایا کہ ظاہر اور باطن میں مطمئن لوگوں کا گروہ صوفیاء کہلاتا ہے۔

فقر ایک بہت بڑے اصول کا نام ہے، طائفۂ اولیاء کے مذہب کی اصل ہی فقر ہے۔ فقر کی حقیقت نیاز مندی ہے، یہ ولیوں کا شعار اور خواص کا زیور ہے۔ اسے اللہ نے اپنے خاص بندوں یعنی انبیاء اور اتقیاء کے لئے پسند فرمایا۔ فقراء وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے اپنے بندوں میں سے منتخب کر رکھا ہے۔ فقراء اللہ کے راز کے متحمل ہوتے ہیں۔ کشف المحجوب میں ان احادیث کو بیان کیا گیا ہے کہ انہی کی بدولت اللہ تعالیٰ مخلوق کی حفاظت کرتا ہے۔ انہی کی برکت سے اللہ تعالیٰ اہلِ دنیا کے رزق میں برکت دیتا ہے۔ زمین سے جو سبزہ اگ رہا ہے وہ انہی کی صفائے حال کی برکت سے اُگ رہا ہے۔ آسمانوں سے بارانِ رحمت کا نزول ان ہی کے دم قدم سے ہے اور کافروں پر مومنوں کا غلبہ بھی انہی کی ہمت سے حاصل ہوتا ہے۔

انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی اور مٹی کی فطرت میں اشارہ ہے پستی، اخلاق رذیلہ اور گراوٹ کی طرف۔ یہی وجہ ہے کہ انسان ہونے کی نسبت سے یہ خاکی (یعنی اخلاق رذیلہ) کی طرف میلان رکھتا ہے اور فقر میں اس کی خاکی فطرت کو نوری صفات کی طرف لے جانے کا عمل پایا جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

جہاں میں لذتِ پروازِ حق نہیں اس کا
وجود جس کا نہیں جذبِ خاک سے آزاد (ب۔ج:۴۵۵)

وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا

خودی کی موت سے مشرق کی سرزمینوں میں
ہوا نہ کوئی خدائی کا راز داں پیدا (ض۔ک:۵۶۳)

بے دین لوگوں کی بے دینی کی زندگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ لوگ دنیا جمع کرنے

میں ہی ساری عمر گزار دیتے ہیں اور ان کی ناکامی کا علاج ورد "لا الله" میں ہے۔

مردن بے برگ و بے گور و کفن؟ گم شدن در نقرہ و فرزند و زن

(چاندی اور فرزند و زن میں گم ہو جانا، بے گور و کفن مر جانے کے مترادف ہے)

ہر کہ حرفِ لا الٰہ از بر کند عالمے را گم بخویش اندر کند (ج۔ن:۲۶۱)

(جو کوئی لا الٰہ کے حرف کو یاد رکھتا ہے، وہ پوری کائنات اپنے اندر گم کر لیتا ہے)

درویشی کا مطلب

فارسی میں فقر کا متبادل یا مترادف لفظ درویشی ہے اور فقیر کو درویش کہتے ہیں۔ صوفیاء کا قول ہے کہ درویشی عشق و معرفت کا استعارلہ ہے یعنی کسی میں عشق و معرفت ہونے کو درویشی کہتے ہیں۔ صوفیائے کرام کے نزدیک دونوں جہانوں میں سے کسی چیز پر اعتماد نہ ہونا اور طمع سے دستبردار ہو کر خدائے تعالیٰ پر اس کا بدل نہ لانا درویشی ہے (یعنی اس کی جزا کا بھی طالب نہ ہو۔)

علامہ اقبالؒ نے فقر اور درویشی پر کافی کلام کیا ہے۔ درویشی پر لکھی ہوئی مختلف نظموں میں سے آپ کے چند اشعار پیش خدمت ہیں جس سے ایک نظر میں قارئین کو درویشی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

اے حلقۂ درویشاں! وہ مردِ خدا کیسا؟ ہو جس کے گریباں میں ہنگامۂ رستاخیز (ب۔ج:۳۱۸)

مردِ درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ ہے کسی اور کی خاطر یہ نصابِ زر و سیم (ب۔ج:۳۵۳)

ہوا ہے گو تند و تیز، لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ (ب۔ج:۳۲۲)

قوموں کی تقدیر وہ مردِ درویش جس نے نہ ڈھونڈی سلطاں کی درگاہ (ض۔ب:۶۲۹)

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا (ا۔ح:۶۵۷)

بیدار ہوں دل جس کی فغانِ سحری سے اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب (ا۔ح:۶۷۷)

نصیب خطہ ہو یا رب وہ بندۂ درویش کہ جس کے فقر میں انداز ہوں کلیمانہ (ا۔ح:۶۸۳)

امینِ راز ہے مردانِ حُر کی درویشی کہ جبریل سے ہے اسکو نسبتِ خویشی (ب۔ج:۳۲۱)

علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ درویش کا سرمایہ یقین ہے اور اس کے سامنے بادشاہ بھی جھک جاتے ہیں۔

یقیں پیدا کر اے ناداں، یقیں سے ہاتھ آتی ہے وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری (ب۔ج:۳۵۱)

طریقِ اہل دنیا ہے گلہ شکوہ زمانے کا　نہیں ہے زخم کھا کر آہ کرنا شانِ درویشی
(ض۔ک:۵۹۵)

علامہ نے آج کل کے حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے فرمایا ہے کہ آج کے صوفیوں نے فقیری کا مطلب خود کو ذلیل اور بے نوا ظاہر کرنا جانا ہے اور سادہ دل بندوں کو صحیح اور غلط درویش میں فرق معلوم کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

حذر اس فقر و درویشی سے جس نے　مسلماں کو سکھا دی سر بزیری (ا۔ح:۶۷۲)
خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں　کہ درویشی بھی عیاری ہے، سلطانی بھی عیاری
(ب ج:۳۲۹)
کہاں سے تو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی　کہ چرچا پادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا
(ب ج:۳۲۴)

فقر کے لغوی معنیٰ

لغت میں ''الفقیر'' اس شخص کو کہتے ہیں جس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو چنانچہ کہا جاتا ہے ''فَقَرَتْهُ فَاقِرَةٌ'' (یعنی مصیبت نے اس کی کمر توڑ دی۔) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ''اَلْفَقْرُ'' سے ''اَفْقَرَ'' بنا ہے، جس کے معنی گڑھے کے ہیں چنانچہ فقر کا لفظ حسب ذیل چار معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

ا۔ زندگی کی بنیادی ضروریات کے نہ پائے جانے کے اعتبار سے انسان تو کیا، کائنات کی ہر چیز فقیر و محتاج ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ (یعنی اے لوگو! تم سب اللہ کے سامنے محتاج ہو۔ فاطر:۱۵)

۲۔ زندگی کی ضروریات کا کما حقہ پورا نہ ہونے کے　معنوں میں جیسے فرمایا گیا ہے: لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (یعنی اُن حاجتمندوں کے لئے جو خدا کی راہ میں روکے گئے ہیں۔ (البقرۃ:۲۷۳)

۳۔ مال کی ہوس نہ ہونے کے لئے یعنی فقر ''النفس'' کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے کیونکہ غنا تو نفس کی بے نیازی کا نام ہے جیسے کہا جاتا ہے ''اِنَّمَا الْفَقِیْرُ مَنْ خَلَامِنْ مُّرَادٍ'' (فقیر وہ ہے جس کی اپنی کوئی مراد نہ ہو۔) فقر میں نفس کی نامرادی ہے۔ جو فقر کو اپنائے تو یہ انسان کو عاجز اور بے بس کر دیتا ہے۔ جو لطفِ عبادت حالتِ فقر میں ہوتا ہے وہ جاہ و جلال اور مال و منال کے ہوتے ہوئے کہاں ہوتا ہے۔

۴۔ اللہ کی طرف احتیاج کے معنوں میں بھی فقر کا لفظ استعمال ہوتا ہے جیسے حضور اکرم ﷺ دعا فرمایا کرتے تھے کہ اے اللہ مجھے اپنا محتاج بنا کر غنی کر دے اور اپنی ذات سے بے نیاز کر کے فقیر نہ بنا۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: رَبِّ اِنِّیْ لِمَاۤ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ (اے پروردگار! واقعی میں اس خیر و برکت کا جو تو نے

میری طرف اتاری ہے محتاج ہوں) (القصص: ۲۴)

فقر میں بے سروسامانی کا خوف نہیں ہوتا۔ ایسا فقر جس میں حرص اور طمع ہو انسان کو ہر وقت محتاج بنائے رکھتا ہے، جیسا کہ ایک روایت میں ہے "اِيَّاكُمْ وَالطَّمَعَ فَاِنَّهُ الْفَقْرُ الْحَاضِرُ" (یعنی طمع سے بچو کہ وہ ہر وقت محتاج بنائے رکھتی ہے۔) علامہ اقبالؒ نے بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

می شناسی؟ حرص فقر حاضر است من غلامِ آنکہ بر خود قاہر است (ج۔ن:۷۹۶)

(تم جانتے ہو کہ حرص فقر حاضر ہے، میں تو اس کا خادم ہوں جو اپنے اوپر قاہری کرتا ہے۔)

فقیر کون ہے؟

فقیر وہ شخص ہے جو فقر و فاقہ کر کے شریعت کی قیود میں رہتے ہوئے سادہ زندگی گزارے۔ ائمہ اسلام کی زندگیاں اسی فقر کی آئینہ دار تھیں۔ ہندوستان کے شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے حالات کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اس قدر بڑی سلطنت کے سربراہ نے فقیرانہ زندگی گزاری۔ وہ اپنی معاش بیت المال سے نہیں بلکہ ذاتی محنت سے کماتے اور آپ نے وصیت فرمائی کہ میری قبر پر مقبرہ تعمیر نہ کیا جائے اور میری قبر کو تمام مسلمانوں کی قبروں کی مانند بنایا جائے۔ شہنشاہ عالمگیر کے مزار کی زیارت کرنے والے آپ کی فقیرانہ زندگی کو مزار سے عیاں ہوتے دیکھتے ہیں۔

حق گزید از ہند عالمگیر را آں فقیرِ صاحب شمشیر را

(ہند کے بادشاہ عالمگیر نے حق تعالیٰ کو اختیار کیا، وہ فقیر (ہی نہیں تھے بلکہ) صاحب شمشیر تھے۔)

در صفِ شاہنشاہاں یکتاستے فقر او از تربتش پیداستے (ا۔خ:۹۸)

(بادشاہوں کی صف میں وہ یکتائے زمانہ تھے، ان کا فقر ان کی تربت سے ظاہر ہوتا ہے۔)

فقیری

فقیری کا لفظ اسلامی فقر کی شان رکھنے کے معنی رکھتا ہے، جس کے اجزا عشقِ خدا اور عشق رسول اللہ ﷺ کی خاطر زہد، تقویٰ، ترک ماسوی اللہ، توکل، قناعت اور تلوار (بمعنی جہاد و دفاع) وغیرہ ہیں۔ جس فقیری میں یہ چیزیں نہ ہوں وہ فقیری نہیں کہلائے گی بلکہ وہ تو سر بزیری (سر کو جھکانا) ہے۔ حقیقی فقیری یہ ہے کہ کوئی شہنشاہی میں بھی فقیری کرے۔

آں مسلماناں کہ میری کردہ اند در شہنشاہی فقیری کردہ اند (پ۔م:۱۹۰)

(وہ مسلمان جنہوں نے امیری کو اختیار کیا ہے، وہ شہنشاہی میں بھی فقیری کرتے ہیں۔)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی فقیری شان ہی کی مثالیں تھیں، جو دنیا کی سب سے بڑی سلطنت پر حکمرانی کرنے کے باوجود نانِ شعیر پر گزارہ کرتے تھے۔ ان کا دبدبہ اور رعب اس قدر تھا کہ ان کا نام سن کر قیصرِ روم کی سلطنت لرزہ براندام ہو جاتی تھی۔ درحقیقت فقیری اور سپہ سالاری ایک چیز ہے۔ سپہ سالاری میں تلوار استعمال ہوتی ہے اور فقر میں نگاہ تلوار کا کام کرتی ہے، لیکن جس فقیری میں فقط دعویٰ ہو وہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شاہین کرگسوں میں پلا ہو۔ علامہؒ فرماتے ہیں۔

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں　　اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی
نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا　　یہ سپہ کی تیغ بازی وہ نگہ کی تیغ بازی　(ب۔ج:۳۰۹)

وہ فقیری جس کا پیشہ گداگری کی طرح لوگوں کا مال جمع کرنا، شریعت سے دوری اور احکام خداوندی سے غفلت ہو وہ فقیری نہیں بلکہ سربزیری کہلائے گی۔ کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرنا بھیک مانگنے اور احتیاج کے برابر ہے۔

مومن و پیشِ کساں بستن نطاق　　مومن و غداری و فقر و نفاق (ج۔ن:۷۸۸)
(مومن کا اپنی کمر پر جامہ سوال باندھنا ایسے ہے، جیسے مومن کا دین سے غداری کرنا اور فقر سے نفاق کرنا)

علامہؒ نے مثال دی ہے کہ شرف النساء خانم جو نواب خاں بہادر کی بیٹی اور نواب عبدالصمد (گورنر پنجاب درعہد بہادر شاہ) کی پوتی تھی، اس نے اصل فقر کی زندگی گزاری۔ وہ ہر وقت قرآن اور تلوار اپنے پاس رکھتی اور اپنے اوقات نماز، روزہ اور تلاوت میں صرف کرتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ قرآن اور تلوار ہر وقت اپنے پاس رکھنا چاہیے کیونکہ مسلمان کی زندگی کے یہ محافظ ہیں یعنی اگر قرآن پر عمل ہے تو تلوار فتح مند رہے گی اور اگر تلوار ساتھ ہو تو قرآن کا قانون دنیا بھر میں رائج ہو جائے گا۔ علامہؒ نے فرمایا۔

ایں دو قوت حافظِ یکدیگراند　　کائناتِ زندگی را محور اند (ج۔ن:۷۴۵)
(یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے کی محافظ ہیں، اور زندگی کی کائنات کے محور ہیں۔)

شرف النساء بیگم نے وصیت کی تھی کہ قرآن اور تلوار مجھ سے مرنے کے بعد بھی الگ نہ کی جائیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہ دونوں چیزیں اس کی قبر پر رکھ دی گئیں۔

علامہؒ نے فرمایا ''فقرِ اُو نقشے کہ ماند تا ابد'' (یعنی اس کا فقر ایک ایسا نقش تھا جو ابد تک باقی رہے گا۔)

قرآن میں فقر کا ذکر

قرآن میں ۱۳ بار فقر، فقیر اور فقراء کا ذکر آیا ہے۔ احادیث میں متعدد بار ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ قرآن میں رہبانیت کا ذکر بھی آیا ہے جس کی وضاحت تصوف کے بیان میں ''تصوف اور رہبانیت''

کے عنوان سے کر دی گئی ہے۔ اس جگہ چند ان آیات کا ذکر کیا جا رہا ہے جو فقر کے سلسلے میں عام طور پر بطور حوالہ پیش کی جاتی ہیں۔

قرآن میں کچھ آیات ایسی ہیں جن میں یہود اور کفار کا یہ باطل خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ نعوذ باللہ خدا کا ہاتھ تنگ ہو گیا ہے، خدا نے محمد مصطفیٰ ﷺ کو چھوڑ دیا ہے یا یہ کہ خدا ہم سے قرض مانگتا ہے چنانچہ ان کے کہنے کے مطابق ہم غنی ہوئے اور خدا فقیر ٹھہرا۔ یہ بات انہوں نے اس وقت کہی جب یہ آیت نازل ہوئی: مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (یعنی کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دیتا ہے۔ البقرہ: ۲۴۵) ان سب مواقع پر اللہ تعالیٰ نے کفار کی بدگوئی کا شایانِ شان جواب دیا ہے۔ یہود نے جب اللہ پر قرض حسنہ کا بہتان لگایا تو اس کے جواب میں باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِیَآءُ (آل عمران: ۱۸۱)

یعنی بیشک اللہ نے ان کی بات کو سنا جنہوں نے کہا کہ اللہ محتاج ہے اور ہم غنی۔

یہود کے اس الزام کے جواب میں ارشاد باری تعالیٰ ہوا۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ۝ (فاطر: ۱۵)

اے لوگو! تم خدا کے محتاج ہو اور اللہ ہی بے نیاز اور خوبیوں والا ہے۔

صوفیاء اس آیت کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ بندہ اگر تمام دنیا کا مالک ہو جائے تب بھی فقیر ہے اور حق تعالیٰ اگر تمام کائنات کو فنا کر دے تو بھی غنی ہے کیونکہ غنا اس کی ذاتی صفت ہے اور بندہ کی ذاتی صفت فقر ہے۔ ان دونوں کا صفات سے نکلنا ممکن نہیں۔ جو بندہ غیر حق سے جدا ہوا وہ حق تک پہنچا اور جو حق تعالیٰ کو رکھتا ہے وہ فقیر کب ہوا اور جب وہ غیر حق کے ساتھ آرام پکڑتا ہے تو اس نے اگر حق تعالیٰ کو چھوڑا تو اس حالت میں وہ غنی کب ہو سکتا ہے۔

حضرات صوفیاء فرماتے ہیں "فقر ایک بڑا اصول ہے اور اس طائفہ کے مذہب کا اصل ہی فقر ہے فقر کی حقیقت نیاز مندی ہے، بندہ تو نیاز مند ہی ہوتا ہے کیونکہ وہ مالک نہیں اور اس کی بندگی بے ملک ہونے کی وجہ سے ہے۔ مملوک اپنے مالک کا محتاج ہوتا ہے پس غنی تو حقیقتاً حق تعالیٰ ہے اور خلقت فقیر ہے۔ اسی لئے درج بالا آیت میں فرمایا کہ اے لوگو! تم سب فقیر ہو۔"

سورۃ البقرۃ میں فقراء کی علامت بیان کی گئی ہے اور فرمایا ہے کہ اپنے صدقات ان فقراء کو دو جو بظاہر غنی معلوم ہوتے ہیں اور لوگوں سے بعند ہو کر سوال نہیں کرتے۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ ۫ (البقرہ: ۲۷۳)

(تمہارے صدقات) ان فقراء کے لئے ہیں جو اللہ کی راہ میں روکے ہوئے ہیں اور زمین میں

تجارت وغیرہ کی آمد ورفت نہیں کر سکتے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسکین وہ شخص نہیں جو چکر لگا تا رہتا ہے اور اسے ایک یا دو لقمے یا ایک دو کھجوریں مل جاتی ہیں فرمایا مسکین وہ ہے جس کے پاس اتنا پیسہ نہ ہو کہ مالدار کہلائے مگر لوگوں کے پاس سوال کرنے سے (اللہ کے حضور) شرماتا ہے اور نہ ہی لوگوں کو اس کا پتہ ہوتا ہے کہ اسے کچھ بطور صدقہ دیں۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے (بروایت حضرت عمر بن الخطابؓ) کہ ہر چیز کی کنجی ہوتی ہے اور جنت کی کنجی مسکینوں کی محبت ہے اور صاحبِ فقر قیامت کے دن اللہ کے ہم نشین ہوں گے۔ حضرت یحییٰ بن معاذؒ فرماتے ہیں کہ فقیر کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کے ساتھ استغنا نہ کرے اور فقر کی تعریف یہ ہے کہ دنیا کے اسباب اور ذرائع پر اعتماد نہ کیا جائے۔

درج بالا آیات کے علاوہ سورۃ الحج آیت ۲۸ میں مصیبت زدہ فقیر کو کھلانے اور سورۃ الدھر آیت ۸ میں مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلانے، سورۃ البقرہ آیت ۲۷۱ میں خفیہ اور علانیہ صدقات دینے، سورۃ الحشر آیت ۸ میں ہجرت کرنے والے فقیروں کا (جو اپنے گھروں سے نکالے گئے) ذکر ہے۔ کچھ آیات کا ذکر آئندہ صفحات میں بھی آئے گا۔

امی صالح وہ شخص ہے جو مکمل طور پر شریعت کی پیروی کرے۔ اس کی صحبت گناہوں سے پاک کرے۔ صالح کے مقام کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پیغمبروں کے ساتھ دعا کی مقبولیت کے لئے صالحین کا واسطہ اور وسیلہ جائز ہے۔

طالح صالح کی ضد ہے۔ طالح کا دارومدار بدی پر ہے اس کی صحبت زہر ہے جو بتدریج سرایت کرتا ہے۔ طالح کی صحبت برا اور صالح کی صحبت اچھا بنا دیتی ہے بقول مولانا رومیؒ

صحبتِ صالح ترا صالح کند صحبتِ طالح ترا طالح کند (۱۰۲۔۱)

(نیک لوگوں کی صحبت انسان کو نیک بنا دیتی ہے، بُروں کی صحبت انسان کو بُرا بنا دیتی ہے۔)

فاسق وہ ہے جس کے گناہ واضح طور پر زیادہ اور نیکیاں واضح طور پر کم ہوں۔ فقیر جسم کے اعتبار سے تو لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے مگر اس کا دنیا سے واسطہ نہیں ہوتا ہے۔

رسول خدا ﷺ نے فرمایا ''فقر مومن کی آرائش ہے جیسے گھوڑے کے رخسارے پر ایک عمدہ لگام ہو'' آپؐ نے فرمایا کہ میرے دو پیشے ہیں ایک فقر اور دوسرا جہاد۔ نیز آپ کی (فقر) سے ایک مراد یہ ہے کہ جو مجھے چاہتا ہے فقر اس کی طرف اس سے زیادہ تیزی سے آتا ہے، جس طرح پانی نیچی جگہ کی طرف آتا ہے۔ آپ نے اپنے اہلِ بیت کے لئے فرمایا ''اے اللہ تو میرے اہلِ بیت کا رزق روزمرہ دن بدن کی خوراک کر دے۔'' یعنی ضرورت کے مطابق الٰہی عطا فرما اس کے معنی یہ ہیں کہ فقیر ترکِ مراد پر یقین رکھتا ہے۔

حضرت ابو محمد جزیرؒ فرماتے ہیں کہ فقر کی درستی اس میں ہے کہ جب تک تو موجود کو گم نہ کر لے معدوم کو طلب نہ کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک تیرے پاس جو کچھ ہے وہ ختم نہ ہو جائے تو مزید طلب نہ کرے۔ تعرف لمذہب التصوف کی شرح میں ابراہیم القصار فرماتے ہیں کہ بندہ جب حقیقت فقر میں داخل ہوتا ہے تو یہ اس کے لئے ایسا لباس بن جاتا ہے جس سے رضا پیدا ہوتی ہے۔

حضرت رُویمؒ نے فرمایا کہ فقر کی تعریف یہ ہے کہ نفس کو احکام الٰہی میں چھوڑ دینا۔ کہتے ہیں فقر کی تین صفتیں ہیں (۱) راز خداوندی کو محفوظ رکھنا (۲) اپنے فقر کی حفاظت کرنا (۳) فرائض کی ادائیگی۔

فقر کی مزید وضاحت

بہت سی مستند کتابوں میں اس بات کا ذکر ہے کہ فقیر دل کا بھی فقیر ہوتا ہے اور اُس کے مزاج میں انکسار نمایاں ہوتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے ۔

میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر (ب۔ج:۴۳۹)

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝ (فاطر:۱۵)

اے لوگو! تم خدا کے محتاج ہو اور اللہ ہی بے نیاز اور خوبیوں والا ہے۔

حضرت علی بن عثمان ہجویریؒ فرماتے ہیں کہ وہ انسانی وجود جس کا نام خدائے قدوس کی بارگاہ میں فقیر ہے اگرچہ بظاہر امیر بھی ہو تو درحقیقت وہ فقیر ہی کہلائے گا۔ وہ شخص ہلاک ہوا جس نے اپنے آپ کو خدا کی زنجیر میں مقید نہیں سمجھا۔ درج بالا آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ''اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ'' کے خطاب سے انسانوں کو فقیر کہا گیا ہے چنانچہ انسان کو چاہیے خود کو فقیر تصور کرے۔ حضرت علی الہجویریؒ لکھتے ہیں کہ

ظَلَمَ مَنْ سَمّٰى ابْنَ اٰدَمَ اَمِيْرًا وَّقَدْ سَمَّاهُ رَبُّهٗ فَقِيْرًا

اس نے اپنے اوپر ظلم کیا جس نے ابنِ آدم کا نام امیر رکھا حالانکہ اس کے رب نے اس کا نام فقیر رکھا ہے۔

علامہ قشیریؒ فرماتے ہیں لوگ اپنا اختیار استعمال کرتے ہیں۔ میرے نزدیک تو غناء بھی نعمت ہے۔ مگر اس غنا کی وجہ سے جو غفلت پیدا ہو وہ آفت ہے اور فقر بھی نعمت ہے مگر اس میں حرص پیدا ہو جائے تو وہ سخت آفت اور بلا ہے، چنانچہ فقر نام ہے ماسوی اللہ سے دل کا فارغ ہونا اور غنا نام ہے ماسوا اللہ کی طرف دل کا مشغول ہونا۔

حضرت علی الہجویریؒ نے فرمایا۔

لَيْسَ الْفَقِيْرُ مَنْ خَلَا مِنَ الزَّادِ اِنَّمَا الْفَقِيْرُ

فقیر وہ نہیں جو مال سے خالی ہو بلکہ فقیر وہ ہے جو

مَنْ خَلَا مِنَ الْمُرَادِ　　خواہشات باطلہ (طمع اور آرزو) سے خالی ہو۔

بشر حافیؒ فرماتے ہیں "اَفْضَلُ الْمَقَامَاتِ اِعْتِقَادُ الصَّبْرِ عَلَى الْفَقْرِ اِلَى الْفَقْرِ" (فقر کا افضل ترین درجہ یہ ہے کہ فقیر پر جب تک فقر ہو (قیامت تک) صبر سے گزارے۔)

آپؒ فرماتے ہیں کہ فقیر کا صبر مرتبہ عبدیت کا خاص مقام ہے۔ مقام عبدیت مقام فنا ہے، مقام فقر وہ مقام ہے جہاں مقامات بھی فنا ہو جاتے ہیں غرضیکہ مقامِ فقر پر ہی کیفیت اعمال اور آفات مال اور مصائب زوال کا مشاہدہ ہوتا ہے چنانچہ غنا کو فقر پر فضیلت حاصل ہے۔

طلب کرنہ کہ دنیاوی لذات کے حصول کے لئے یعنی ستر ڈھانپنے، بھوک کو روکنے اور کمزوری کو دور کرنے کیلئے جو چیز درکار ہو طلب کرے۔ ایسی چیز جو نماز اور روزہ سے قائم ہو اس کا طلب کرنا نماز روزہ سے بہتر ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا "حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ" (تحفۃ الاحوذی، ۶:۸۱) (یعنی دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے۔) ابو محمدؒ کے درج بالا کلام کا مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ موجود اللہ ہے اور خلقت معدوم ہے۔ جب فقر درست ہو بندہ حق تعالیٰ کو پالیتا ہے اور جب موجود (یعنی اللہ) کو پایا تو پھر معدوم کی کیا ضرورت ہے اور حق کا وجود کبھی معدوم نہ ہوگا تو اس کے محب کو اس کی خیر کی طلب کیسے ہوگی۔ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ نے جب تاج و تخت کو چھوڑ کر درویشی اختیار کی تو سب سے پہلے امام ابو حنیفہؒ کے پاس گئے اور پوچھا کہ انہیں کیا کرنا چاہیئے۔ آپ نے فرمایا کہ آپ علم حاصل کریں۔ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ نے فرمایا کہ ہم نے تو ایک حدیث پڑھی ہے کہ دنیا کی محبت تمام خطاؤں کی جڑ ہے، تو ہم نے اس پر عمل کیا اور دنیا کو چھوڑ دیا۔ فرمایا کہ اے حضرت امام ابو حنیفہؒ، آپ نے اتنی زیادہ حدیثیں پڑھیں ہیں مگر کتنی احادیث پر عمل کیا ہے؟ یہ سن کر امام صاحب بے ہوش ہو گئے اور جب ہوش آیا تو فرمایا "آپ فقراء کی مجلس اختیار فرمائیں۔"

حضرت ابن الجلاؒ فرماتے ہیں کہ فقر یہ ہے کہ تیرا کچھ نہ ہو اور اگر ہو تو بھی تیرا نہ ہو۔ ابن الجلاؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک درویش دیکھا جو نہ کھاتا تھا اور نہ پیتا تھا۔ میں نے اس سے اس کا سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ میں ایک دفعہ جنگل میں راہ گم کر بیٹھا اور کئی دنوں بعد مدینہ شریف رات گئے پہنچا تو حضور اکرم ﷺ کے روضے پر جا کر عرض کیا کہ میں آج رات آپ کا مہمان ہوں۔ رات کو خواب میں آپ ﷺ نے مجھے ایک روٹی عطا فرمائی تو جب میں اُٹھا تو آدھی روٹی میں نے کھالی تھی اور آدھی ہاتھ میں تھی بلکہ میرے منہ میں بھی ایک لقمہ تھا۔ میں نے وہ آدھی روٹی بھی کھالی چنانچہ اس روز سے لے کر آج تک کم و بیش چالیس سال ہو گئے ہیں کہ مجھے کھانے اور پینے کی ضرورت نہیں پڑی۔ فرماتے ہیں کہ جس کو اللہ تعالیٰ مشاہدہ کا طعام اور محبت کا پانی پلا دے تو اس کا کیا حال ہوگا۔ حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ "اِنِّيْ اَبِيْتُ عِنْدَ رَبِّيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَ يَسْقِيْنِيْ" (میں اپنے رب کے پاس رہتا ہوں سو مجھے وہ ہی کھلاتا اور پلاتا ہے۔)

فقراء کی صفت یہ ہے کہ ان کے پاس اگر کچھ ہو تو بھی اور کچھ نہ ہو تو بھی وہ ایثار کرتے ہیں جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (الحشر:9) اور (دوسروں کو) اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگرچہ خود انہیں اس چیز کی شدید حاجت ہو۔

تو اس کا یہ معنی ہوا کہ فقیر کی ملک نہیں ہوتی اور کچھ رکھے تو غیر کو خود پر ترجیح دے۔ فقر اپنے لئے نہیں ہوتا اور ہوتا ہے تو دوسروں کے لئے۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے۔

وَاللّٰهُ فِيْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَادَامَ الْعَبْدُ فِيْ عَوْنِ اَخِيْهِ الْمُسْلِمِ (الصحیح المسلم، ابوداؤد) اللہ بندہ کی امداد میں ہوتا ہے، جب تک بندہ اپنے مومن بھائی کی مدد میں ہوتا ہے۔

درویشی

زمانہ کار او را می برد پیش کہ مرد خود نگہدار است درویش!

(زمانہ اس کے کام کو آگے لے جاتا ہے جو اپنی حفاظت کرنے والا درویش مرد ہو۔)

ہمیں فقر است و سلطانی کہ دل را نگہ داری چو دریا گوہر خویش! (ا۔ح:1000)

(فقر اور سلطانی یہی ہے کہ تو اپنی نگہداشت یوں کرے جیسے سمندر گوہر کی کرتا ہے۔)

درویش کے لفظی معنی فقیر یا صوفی کے ہیں اور درویشی عشق و معرفت کا مستعارلہ ہے۔ علامہ اقبالؒ نے درج بالا اشعار میں فرمایا ہے کہ درویش چونکہ مرد خود نگہ دار (اپنے ہر کام پر نگاہ رکھنے والا) ہوتا ہے اس لئے دنیا والے خود اس کے سب کاموں کے چلانے کا ذمہ اپنے سر لے لیتے ہیں۔ فرماتے ہیں فقر اور سلطانی دراصل ایک ہی چیز ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنی ذاتی یا قومی صلاحیتوں کے گوہر یگانہ کی اس طرح پاسبانی کی جائے جس طرح دریا اپنے موتیوں کی نگہداری کرتا ہے۔

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا یہ سپہ کی تیغ بازی وہ نگہ کی تیغ بازی (ب۔ج:309)

صوفیاء کا قول ہے کہ درویش یا فقیر حقیقی وہ ہے جو ہر دو جہاں میں کسی چیز پر اعتماد نہ رکھے۔ اس کو کسی شخص سے طمع نہ ہو اور نہ وہ خدا تعالیٰ پر بدل لائے۔ فقر اور سلطنت میں کوئی فرق اس لئے نہیں کہ فوج میں تیغ بازی ہوتی ہے اور فقر میں نگاہ تیغ کا کام دیتی ہے۔

درویش خلقت کے نزدیک مطعون ہیں، ہر درویش اپنے وقت کا برگزیدہ، اسباب سے منزہ، کسی کی شکایت سے مبرا، جھگڑے فساد سے بچا ہوا، کسی پر ظلم اور قضانہ کرنے والا، کسی چیز کو اپنے لئے وقف نہ کرنے والا، کسی قسم کی وصیت نہ کرنے والا، طلب دنیا اور خواہش (شراب، زنا وغیرہ) سے بچنے والا ہوتا ہے اور جو کچھ اس کے پاس ہو اس کو ایثار کرنے والا ہوتا ہے۔ صوفیائے کرام نے ان تمام صفات کو سچے درویشوں کی شان

اور ان کی علامت فرمایا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے درویش صفت لوگوں کی شان میں بہت کلام فرمایا ہے۔ آپ کے کافی اشعار اس کتاب میں شامل کئے گئے ہیں۔ بالِ جبریل میں آپ نے فرمایا ہے۔

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہرِ ملکوتی　خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند
درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی　گھر میرا نہ دلّی، نہ صفاہاں، نہ سمرقند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق　نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش　میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند
پُر سوز و نظر باز و نکوبیں و کم آزار　آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند
ہر حال میں میرا دل بے قید ہے خرم　کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکر خند

(ب۔ج: ۳۱۴)

مختلف صوفیائے کرام کے خیال کے مطابق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ درویش وہ مردِ مومن ہے جو حال کے لحاظ سے اپنی خودی میں فنا ہو اور مختلف انوار الٰہیہ سے سیراب ہونے کے بعد بقا بالحق کے مقام تک پہنچا ہوا ہو۔ اس وقت اس کی تمام تر توجہ اللہ کی طرف ہوتی ہے اور وہ کلیۃً مستغنی عن الغیر ہوتا ہے۔

درویش دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو جنت و دوزخ سے بے خبر متوجہ اِلی اللہ ہوتا ہے۔ دوسرا مشاہدات و مجاہدات میں مشغول اور جنت و دوزخ دونوں پر نظر رکھتا ہے۔ یہ اہلِ خوف سے ہوتا ہے۔ یہی لوگ اہل اللہ اور اولیاء کہلاتے ہیں۔ پہلی قسم کا درویش عند اللہ شریعت سے تعلق رکھتا ہے، جو اہلِ کسب کہلاتے ہیں۔ دوسری قسم کے درویش اہلِ مشاہدہ اور اہلِ حضور ہوتے ہیں، اہلِ قلب بھی انہی کو کہا جاتا ہے۔ اہلِ قلب کو تصرف حاصل ہوتا ہے۔ دونوں قسم کے درویش برحق ہیں ان کی اہمیت و خاصیت کے لحاظ سے انہیں بلند مراتب سے نوازا جاتا ہے۔

لفظ درویش کے حروف کے اعتبار سے معنی

لفظ درویش کا پہلا حرف ''د'' ہے جو دلالت کرتا ہے دلائلِ خداوندی پر اور اشارہ کرتا ہے دل کی طرف۔ دوسرا حرف ''ر'' ہے اور اس کے معنی ریاضت بمطابق شرع محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہے۔ حرف ''و'' اشارہ کرتا ہے ورع یعنی مشتبہ چیزوں سے کنارہ کشی اختیار کرنے پر ''ی'' اشارہ کرتا ہے یقین کی طرف اور حرف ''ش'' اشارہ کرتا ہے شرافت کی طرف یعنی شریعت کی شرافت، طریقت کی شرافت اور حقیقت کی شرافت۔ (رموزِ تصوف ص ۵۰۔۵۱)

درندوں سے بچو، کامل کی پناہ میں آجاؤ

مثنوی کے دفتر دوئم حصہ سوئم کی شرح مفتاح العلوم ص ۶۲ پر ایک بیوقوف آدمی کا قصہ لکھا ہے جو ریچھ کی

خوشامد سے دھوکہ کھا گیا۔ قصہ یوں ہے کہ ایک اژدھا کسی ریچھ کو کھینچے لے جا رہا تھا۔ ایک بہادر مرد اس کی فریادرسی کو آیا اور اسے چھڑا دیا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ جب ایک بیوقوف شخص ریچھ کی فریاد پر آ گیا تو اللہ والے کیوں کسی کی مدد کو نہ آئیں گے۔ آج کل بھی کئی شیر مرد ایسے ہیں جو فریادیوں کی مدد کو رحمت کی طرح پہنچتے ہیں۔ ایسے لوگ خلل ہائے دنیا اور باطنی امراض کے طبیب ہیں۔ وہ سراپا محبت ہیں اور کسی ذاتی غرض کے بغیر مدد کرتے ہیں۔ اگر ان سے کوئی پوچھے کہ آپ لوگوں کی کیوں مدد کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ان غریبوں کی بیچارگی اور غم کے سبب۔ فرمایا۔

ہر کجا دردے دوا آں جا رود ہر کجا فقرے نوا آں جا رود

(جہاں کوئی درد ہو تو دوا ادھر ہی جاتی ہے، جہاں محتاجی ہو نوا کا سامان وہیں جاتا ہے۔)

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

(جہاں ڈھلوان ہو پانی ادھر آ جاتا ہے، جہاں کوئی مشکل ہے تو جواب وہاں جاتا ہے۔)

آب کم جو تشنگی آور بدست تابجوشد آبت از بالا و پست (۱۸۹۔۲)

(پانی کی تلاش کم کرو اور پیاس پیدا کرو، تاکہ اوپر اور نیچے سے پانی ابل کر آئے۔)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ پیاس پیدا کرو گے تو اللہ کی طرف سے ''وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا'' کا خطاب ہوگا (یعنی پلائے گا ان کا رب ان کو پاکیزہ شراب۔ الدھر: ۲۱)۔

آب رحمت بایدت رو پست شو وآنگہاں خور خمر رحمت مست شو (۱۸۹۔۲)

(اگر رحمت کا پانی درکار ہے تو نیچے ہو جاؤ، پھر رحمت کی شراب پیئو اور مست ہو جاؤ۔)

رحمت اندر رحمت آمد تا بسر بر یکے رحمت فرو ما اے پسر (۱۹۰۔۲)

(صاحبزادے (تواضع کرو) تم سر تک رحمت میں ڈوب جاؤ گے، ہاں! صرف ایک رحمت پر نہ ٹھہرنا۔)

فرماتے ہیں کہ اس طرح تم آسمان اپنے پاؤں کے نیچے لا سکتے ہو اور آسمان سے اوپر کی آوازیں سن سکتے ہو۔ اپنی آنکھوں کو عیب کے بالوں سے پاک کرو تاکہ غیب کو دیکھ سکو۔ اسی طرح ناک کے زکام کا علاج کرو اور صفرا کا بھی تاکہ غیب کی شکر کا مزہ چکھو اور اپنی روح اور بدن کا علاج بھی کرو اور ایسا نہیں کر سکتے تو کسی چارہ گر کو پکڑ لو۔

ور نمی تانی بکعبہ لطف پر عرضہ کن بیچارگی بر چارہ گر

(اگر تم یہ نہیں کر سکتے تو کعبہ لطف کی طرف پرواز کرو، اپنی بیچارگی کو چارہ گر کے سامنے پیش کرو۔)

زاری و گریہ قوی سرمایہ ایست رحمت کلی قوی تر دایہ ایست

(گریہ وزاری بڑا سرمایہ ہے، اور اللہ کی وسیع رحمت نہایت قوی دایہ ہے۔)

دایۂ و مادر بہانہ جو بود تا کہ کے آں طفلِ او گریاں شود

(دایہ اور مائیں بہانہ ڈھونڈتی ہیں کہ بچہ کب روئے (تا کہ دودھ پلائیں۔)

طفلِ حاجاتِ شمارا آفرید تا بنالید و شود شیرش پدید(۱۹۰۔۲)

(اللہ نے تمہاری حاجتوں کا بچہ پیدا کیا ہے، تا کہ تم رونے لگو اور اس سے دودھ زیادہ ہو جائے۔)

"فِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ" نہ شنیدۂ اندریں پستی چہ بر چسفیدۂ(۱۹۱۔۲)

(" آسمان میں تمہارا رزق ہے" تم نے نہیں سنا، تو پھر اس پستی کے ساتھ کیوں چمٹ رہے ہو۔)

آخری شعر میں یہ اشارہ ہے کہ یہ نہ سوچو کہ اگر عبادت اور اپنی اصلاح کی طرف لگ گئے تو دنیا کے کام رہ جائیں گے۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ اگر دنیا کے مالک سے دوستانہ پیدا کر لو گے تو ہر طرف سے خیر آئے گی۔ اس کا وعدہ قرآن پاک میں موجود ہے۔ تم صرف اس بات کو اختیار کرو اور اللہ سے امید رکھو۔ یہ تمام بہانہ سازی شیطان انسان کے دل میں پیدا کرتا ہے۔ فرماتے ہیں جو چیز تمہیں بالا کی طرف لے جائے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو حرص اور پلیدی کی طرف لے جائے وہ شیطان کی طرف سے ہے۔

مولانا رومؒ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ شیر مرد نے اپنی عقل سے اژدھا کو باندھ کر مار دیا اور ریچھ کو بچا لیا۔ شیر مرد کا حیلہ تو بڑی بات ہے مگر اس پر گھمنڈ میں نہیں آنا چاہئے کیونکہ اس سے بڑے حیلے اور کمالات الٰہیہ اور بھی ہو سکتے ہیں۔ جو کچھ زمین پر ہوتا ہے عالمِ بالا سے آیا ہے لہٰذا عالم بالا کی طرف اپنی آنکھ لگائے رکھو۔ ایسے نہ ہو جاؤ کہ سامری کی طرح ایک بچھڑا بنا کر موسیٰ علیہ السلام سے سرکشی کرنے لگو حالانکہ اس نے وہ ہنر موسیٰ علیہ السلام سے ہی سیکھا تھا۔ لہٰذا موسیٰ علیہ السلام کے ردِ عمل نے اس کی جان لے لی۔ انسان کئی بار اس طرح عقل دوڑاتا ہے کہ وہ سرداری حاصل کر لے مگر اکثر اوقات اس کی وجہ سے اس کا سر بھی کٹ جاتا ہے۔ اس لئے تم سر (یعنی سردار) بننے کی کوشش نہ کرو بلکہ کسی راست باز آدمی کے پاؤں بن جاؤ۔

سر نخواہی کہ رود تو پائے باش در پناہِ قطبِ صاحب رائے باش

(اگر چاہو کہ سر نہ جائے تو پاؤں بن جاؤ، اور کسی قطب کامل رائے کی پناہ میں آ جاؤ۔)

گرچہ شاہی خویش فوقِ اُو مبیں گرچہ شہدی جز نباتِ اُو مچیں

(اگر تم بادشاہ بھی ہو جاؤ تو خود کو استاد سے فوق نہ جانو، اگرچہ شہد بھی ہو پھر بھی اس کی شکر چنتے رہو۔)

فکر تو نقش است فکر اُو ست جان نقد تو قلب ست و نقد اُوست کان

(تمہارا فکر تصویر ہے اور اس کا فکر روح ہے، تمہارا نقد قالب (کھوٹا) ہے اور اس کا نقد معدنی (اصلی) ہے۔)

اُو توئی خود را بجو در اوئے اُو کو و کو گو فاختہ شو سوئے اُو(۱۹۳۔۲)

(شیخ کی ذات تمہاری ہو خود کو اس کی ہستی میں تلاش کرو، فاختہ کی طرح اس کے لئے کہو" کہاں ہے کہاں ہے" اور ہر سو تلاش کرو۔)

جو مرید رُوگردان ہو جائے وہ شیطان کے نرغے میں آ جاتا ہے

مولانا رومؒ اژدھا کی کہانی بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنے شیخ سے بغاوت کر کے بھاگ جائے وہ کسی موذی جانور یعنی شیطان کا شکار ہو جاتا ہے۔

ورنہ خواہی خدمتِ ابنائے جنس   دردہانِ اژدھائی ہمچو خرس (۱۹۳۔۲)

(اگر تم ہم جنسوں کی خدمت نہ چاہو گے تو (یادرکھو) تم اس ریچھ کی طرح اژدھا کے منہ میں آ جاؤ گے۔)

ایک حدیث شریف میں ہے کہ اگر کوئی بھیڑ الگ چرنے لگے، تو بھیڑیا کنارہ کرنے والی بھیڑ کو پکڑ کر لے جاتا ہے "اِنَّ الشَّیْطَانَ ذِئْبُ الْاِنْسَانِ" (نہایۃ ابن الاثیر ج ۳ ص ۲۶) (بے شک شیطان، انسان کا بھیڑیا ہے۔) مولانا رومؒ نے کہا ہے ایسے بھاگنے والوں کے لئے جگر کا خون پینے والے بھیڑیئے کا پنجہ ہی بہتر ہے۔

مرد کہ گردن کشید از حکمِ پیر   سیلیش از دیوے ستمگار بہ

(وہ بندہ جو اپنے پیر کے حکم سے روگردان ہوتا ہے، اس کے لئے ظالم شیطان کا تھپڑ بہتر ہے۔)

در حق میش کہ رہید از شباں   پنجۂ گرگانِ جگر خوار بہ

(جو بھیڑ چرواہے کی نظر سے نکل گئی، اس کے لئے خونخوار بھیڑیئے کا پنجہ بہتر ہے۔)

اے خدا ایں سنگدل را موم کن   نالہ اش را خوش و مرحوم کن (۱۹۴۔۲)

(الٰہی اس سنگدل (طالب) کے دل کو موم کر دے، اسکے گریہ یعنی رونے کو مبارک اور باعثِ رحمت کر دے)

ملت کا دَرویش مرد

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے   وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ (ب۔ج:۴۲۲)

ہر ملت اپنے افراد کے باعث قائم پذیر ہوتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے مذکورہ بالا شعر میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ کسی ملت کے قوم کا مردِ درویش چراغِ ملت کو ہر حال میں روشن رکھتا ہے خواہ ملکی حالات کتنے ہی ناساز گار کیوں نہ ہوں اور جب ملت کے ایسے نوجوان موجود ہوں تو ملت کبھی مردہ نہیں ہوتی۔

بر نخیزد ملتے اندر نبرد   تا درو باقیست یک درویش مرد (پ۔ج:۸۱۷)

(کوئی ملت میدان جنگ میں شکست نہیں کھا سکتی، جب تک اس ملت میں ایک بھی درویش موجود ہے۔)

قوم کے درویش مرد کی ایک بڑی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ صاحب یقین ہوتا ہے اور ایسے لوگ اگرچہ

بہت کم ہیں، لیکن ان میں ایسی صلاحیت موجود ہوتی ہے کہ سیپ کو بھی موتی بنا سکتے ہیں۔ علامہؒ نے اپنی قوم کے لوگوں کو یہ سبق دیا ہے کہ وہ اپنی قسمت کے خود معمار ہیں اس لئے ان کو خود ہی تقدیر کو ساز گار بنانے کی کوشش پیہم کرتے رہنا لازم ہے۔

آگ اس کی پھونک دیتی ہے برنا و پیر کو
لاکھوں میں ایک بھی ہو اگر صاحبِ یقیں
ہوتا ہے کوہ و دشت میں پیدا کبھی کبھی
وہ مرد جس کا فقر خزف کو کرے نگیں
تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں
بالائے سر رہا تو ہے نام اس کا آسماں
زیرِ پر آ گیا، تو یہی آسماں زمیں

(ض۔ک:۶۳۸)

علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے ضمیر میں اس قدر استعداد رکھی ہے کہ وہ ہر مشکل سے مشکل کام کو آسانی سے کر سکتا ہے۔ اگر مسلمان کا ضمیر ان صلاحیتوں کو بروئے کار لے آئے تو کسی سالک کے لئے علم فقیری (یعنی راہ فقر پر چلنا) کوئی مشکل کام نہیں۔ اس کیفیت کو ہاتھ میں لانے کے لئے غفلت، بزدلی اور نرمی کو دور کرنا ہوتا ہے۔ اگر مسلمان میں یہ صفات نہ ہوں تو وہ قہرِ الٰہی کا نشانہ بنتا ہے ورنہ دوسری صورت میں جب خوددار اور غیرت مند ہو تو دنیا اس کے قدموں میں آ جاتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ اہلِ یورپ اسقدر ترقی یافتہ ہونے کے باوجود اپنی اس حیثیت سے آگاہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بشری اور نورانی صفات عطا کر رکھی ہیں جس سے وہ ہر مشکل کو حل کر سکتا ہے۔

آدم کا ضمیر اس کی حقیقت پہ ہے شاہد
مشکل نہیں اے سالکِ رہ علمِ فقیری
فولاد کہاں رہتا ہے شمشیر کے لائق
پیدا ہو اگر اس کی طبیعت میں حریری

(ض۔ک:۶۳۶)

خوددار نہ ہو فقر، تو ہے قہرِ الٰہی
ہو صاحبِ غیرت تو ہے تمہید امیری
افرنگ زخود بے خبرت کرد وگرنہ
اے بندۂ مومن تو بشیری تو نذیری

(ض۔ک:۶۳۷)

اگر انسان کی خودی زندہ ہو تو مردِ مسلمان فقیر ہونے کی حالت میں بھی امیر ہے اور اس کی یہ فقیری سنجر و طغرل جیسے بادشاہوں کی سی شان رکھتی ہے۔ آزاد مرد کو اپنی حدود میں مکمل آزادی اور بادشاہی حاصل ہوتی ہے۔ جب کہ مردہ دل انسان حوادث کا شکار رہتا ہے۔

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی
نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہِ فقیر
نہنگ زندہ ہے اپنے محیط میں آزاد
نہنگ مردہ کو موجِ سراب بھی زنجیر

(ض۔ک:۵۳۸)

باب ۲

اثباتِ فقر

(فقراء کے احوال واوصاف)

مسلمانوں کی ایک جماعت اولیائے کرام کی مخالفت پر کمربستہ ہے اور وہ روحانی طرز حیات کی مخالفت میں رات دن سرگرم عمل رہتے ہیں ان کی اس کوشش کے پیچھے دشمنانِ اسلام کا مخفی ہاتھ کارگر ہے۔ دشمنانِ اسلام کو اس بات کا یقین ہے کہ جب تک صوفیائے کرام کی جماعت مسلمانوں کو راہِ راست پر لانے کے لئے سرگرداں رہے گی اس وقت تک مسلمانوں کے جذبۂ ایمان اور قوت وجدان میں کمی واقع نہ ہو سکے گی۔ اسلام کو ایسے ایمان پرور لوگوں سے دور رکھنے کے لئے مسلمانوں میں ایک جماعت پیدا کر دی گئی ہے اور ان کو دشمنانِ اسلام کی اشیرباد حاصل ہے۔ دشمنانِ اسلام، اہلِ اسلام کے ساتھ ہمیشہ سے ہی برسرپیکار رہے ہیں۔ ہر زمانے میں مسلمانوں کو ایسی مخالف طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑا ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغ مصطفویؐ سے شرار بولہبی
اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام یہی ہے رازِ تب و تابِ ملتِ عربیؐ (ب۔د:۲۲۳)

آج بھی ایسی جماعتیں نظر آتی ہیں جو اعلانیہ طور پر اولیائے کرام کے وجود کی منکر ہیں ایسی جماعتوں کا کہنا ہے کہ جب قرآن اور سنت موجود ہیں تو پھر ان مشائخ کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر قرآن اور سنت پر عمل کر لیا جائے تو پھر کسی شیخ یا پیر کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے ایک بہت دلچسپ واقعہ یاد آیا کہ ۱۹۷۵ء میں راقم الحروف گورنمنٹ کی طرف سے حکومت لیبیا کے ساتھ بن غازی میں تعینات ہوا تو اس فقیر نے وہاں پہنچتے ہی ایک تبلیغی مرکز قائم کیا۔ جب اپنے اس ارادے کا اظہار ڈاکٹروں اور انجینئروں کی ایک مجلس میں کیا گیا تو تقریباً ہر شخص نے ان تبلیغی سرگرمیوں کی مخالفت کی اور کہا کہ ایسی سرگرمیاں یہاں کے ملکی قوانین کے خلاف ہیں اور دوسری بات یہ کہ اس تبلیغ میں آپ یہی کہیں گے کہ نماز پڑھا کرو۔ جب ہر ایک شخص جانتا ہے کہ نماز پڑھنی چاہیئے تو کیا پھر آپ کے کہنے سے لوگ نماز پڑھنے لگ جائیں گے؟ تو میں نے ہسپتال کے اُس ملازم کو جب کہا کہ ہاں۔ تو اس نے اپنے کندھوں کو امریکی طرز میں جنبش دی اور کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص آپ کے کہنے پر نماز پڑھنا شروع

کر دے؟ اثناء گفتگو ایک پاکستانی (جو ملتان کا رہنے والا تھا)، نے تصدیق کی کہ راقم الحروف کی کوششوں سے اس کے دس بھائی ملتان میں نمازی بن چکے ہیں تو اس حقیقت کے واشگاف ہونے کے بعد بھی اس منکرِ اولیاء کی روش میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے زمانے کی طرح ہر زمانے میں منکرینِ طریقت اور منکرینِ مشائخ پیدا ہوتے رہے ہیں، کیونکہ اس قسم کی شکایات کا ہر زمانے کے اولیائے کرام نے اپنی تحریروں میں اظہار کیا ہے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ (جن کو پاک و ہند کے اولیائے کرامؒ میں درجہ کے اعتبار سے اولیت حاصل ہے) نے بھی کشف المحجوب میں ایسے منکرینِ طریقت کے رد میں ایک باب اثباتِ فقر کے نام سے لکھا ہے۔ کشف المحجوب طریقت کی کامل ترین کتابوں میں شامل کی جاتی ہے۔ مثنوی مولانا رومؒ بھی طریقت پر ایک مایۂ ناز تحریر ہے جو کشف المحجوب کی طرح بطور سند پیش کی جاسکتی ہے۔ حضرت مجددّ الف ثانیؒ جن کی اعلیٰ شخصیت سے کوئی شخص کسی پہلو سے بھی انکار کی جرأت نہیں کرسکتا، آپ طریقت کے عظیم پیشواؤں میں شمار ہوتے ہیں۔ طریقت ایک ایسا موضوع ہے جس پر عرب کے مشائخ، شام، عراق اور افغانستان کے مشائخ کے علاوہ ہندوستان کے بڑے بڑے مشائخ نے اپنی اپنی تحریریں قلمبندکی ہیں اور طریقت کے اثبات میں ہمارے سامنے بہت نفیس دلائل لائے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جب ان مشائخِ کبار کی تحریروں کو پڑھا جاتا ہے تو ان بزرگوں کی رفعتِ شان، بلند مقام و اعجازِ بیان اور عظمتِ روحانیت کو دیکھ کر پڑھنے والے ششدر رہ جاتے ہیں اور ان کی بزرگی کی بلندی کو دیکھ کر حیرت میں آجاتے ہیں اور یہ اندازہ نہیں کرسکتے کہ ان کی روحانی رفعتیں کس قدر بلند ہیں۔ کتنے دکھ کی بات ہے کہ حضرت بایزید بسطامیؒ، سید الطائفہ جنید بغدادیؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، شیخ بہاء الدین نقشبندؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ جیسی بلند ہستیوں کے خلاف چند ناچیز اور ہیچ مداں اور دشمنانِ اسلام کے اجارہ دار لوگ نعرہ بلند کر کے اپنی حماقتوں کا اعلان کرتے ہیں ع

چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک

ذیل کے بیانات میں صرف حضرت داتا گنج بخشؒ کے چند نکات پیش کئے جا رہے ہیں جس میں انہوں نے "اثباتِ فقر" پر نہایت حسین، دلکش اور جاذبِ قلب و نظر تحریریں پیش کی ہیں، جن کو پڑھنے کے بعد اثباتِ فقر کے متعلق کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ نے فرمایا ہے کہ "عظیم مشائخ کے سامنے چند نادان لوگوں کی مخالفت ایسے ہی ہے جیسے شیر کی دم کے ساتھ کوئی چوہا کھیل رہا ہو۔"

فقیروں کے احوال

فقیر کے لئے چار چیزیں ضروری ہیں، (۱) علم جو اس کی تدبیر کرے (۲) پرہیزگاری جو اسے برے کاموں سے روکے (۳) یقین جو اسے عمل کرنے پر اکسائے (۴) ذکر جس سے اسے انس محسوس ہو۔

یوسف بن اسباطؒ فرماتے ہیں چالیس برس سے میرے پاس ایک سے زائد قمیص نہیں رہی۔ اس طرح ایک صوفی نے سنا کہ کسی نے کہا ہے خواب میں مالک بن دینارؒ اور محمد بن واسعؒ کو جنت میں داخل ہوتے ہوئے دیکھنے لگا کہ کون پہلے جنت میں داخل ہوتا ہے؟ اس نے دیکھا محمد بن واسعؒ پہلے داخل ہوئے۔ وجہ دریافت کی گئی تو بتایا گیا کہ ان کے پاس ایک قمیص تھی اور مالک بن دینارؒ کے پاس دو قمیصیں تھیں۔ محمد بن علی الکتانی فرماتے ہیں کہ مکہ میں ایک شخص تھا جس نے چیتھڑے پہن رکھے تھے اور وہ ہم سے میل جول نہ رکھتا تھا۔ میرے دل میں اس کے لئے محبت پیدا ہوگئی۔ ایک دن اللہ نے مجھے حلال طریقے سے دوسو درہم عطا کئے۔ میں نے اس کی جائے نماز کے کنارے پر ادب سے رکھ دیئے اور انھیں اپنے کام میں لانے کی درخواست کی۔ اس نے ترچھی نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور کہا کہ میں نے اللہ کے ساتھ مجلس کو علاوہ جاگیر کے ۴۰ ہزار دینار سے خریدا ہے اور تو ان چند درہموں کے ساتھ مجھے دھوکا دینا چاہتا ہے۔ اس نے اٹھ کر ان درہموں کو بکھیر دیا اور چلا گیا۔ جب میں ان درہموں کو چن رہا تھا اور وہ جا رہا تھا تو میں نے ایسی عزت نہیں دیکھی اور اپنے جیسی ذلت نہیں دیکھی۔

اگر منظور ہو تجھ کو خزاں نا آشنا رہنا	جہانِ رنگ و بو سے پہلے قطعِ آرزو کر لے
تنک بخشی کو استغناء سے پیغام خجالت دے	نہ رہ منت کشِ شبنم، نگوں جام و سبو کر لے

(ب۔ د: ۲۵۰)

ابو جعفر حداؒ نے ۲۰ سال ایسے گزارے کہ ہر روز ایک دینار کماتے اور فقراء پر خرچ کر دیتے اور خود روزہ رکھتے شام اور عشاء کے درمیان نکلتے اور لوگ ان کو خیرات دیتے۔

ابراہیم بن شعبانؒ (شاگرد ابو عبداللہ مغربی) فرماتے تھے کہ میں نے ۴۰ سال تک کبھی چھت کے نیچے رات نہیں گزاری اور نہ ہی ایسی جگہ رات گزاری ہے جہاں تالا لگا ہوا ہو۔ ابو عبداللہ بن حفیفؒ فرماتے تھے کہ چالیس سال تک مجھ پر فطر و صدقہ واجب نہیں ہوا، حالانکہ خاص و عام میں میری بہت مقبولیت تھی۔

یوسف بلخیؒ نے کوئی چیز حاتم اصمؒ کے پاس بھیجی انھوں نے اسے قبول کر لیا کسی نے پوچھا آپ نے اسے کیوں قبول کر لیا۔ فرمایا کہ لینے میں ان کی عزت پائی جاتی تھی اور میری ذلت اور اس کے رد کرنے میں میری عزت تھی اور ان کی ذلت۔ حضرت خواصؒ فرماتے تھے کہ کسی شخص نے اگر کوئی خواہش ترک کی اور اس سے اُس کی روح کو تقویت نہ ملی تو سمجھ لو کہ اس کے ترک میں وہ جھوٹا ہے کیونکہ نفس کی آرزوؤں سے نجات کا نام

راحت ہے۔

حضرت ابوالحسنینؒ فرماتے تھے ہمیں اپنے شیخ کا حکم تھا کہ

(۱) ہم دوسروں کو اپنی ضرورت کی چیزیں دینے کو اپنے آپ پر ترجیح دیں۔

(۲) یہ کہ ہم کسی چیز پر رات نہ گزاریں۔

(۳) جو شخص ہم سے برا پیش آئے ہم اس سے بدلہ نہ لیں بلکہ اس سے معذرت کریں۔

(۴) جب ہمارے دل میں کسی کے متعلق حقارت پیدا ہو تو اس کی خدمت کریں اور اس کے ساتھ نیک برتاؤ کریں۔ یہاں تک کہ وہ حقارت دل سے زائل ہو جائے۔

ایثار نہیں تو فقر بھی نہیں

قرآن مجید میں اہلِ ایمان کی واضح صفات میں سے ایک صفت ایثار کا پایا جانا لکھا ہے۔

وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (الحشر:۹)

اور وہ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے ہیں خواہ ان کی اپنی ضرورت کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو۔

ایثار کے موضوع پر حضرات صوفیاء کی کتب میں بہت طویل بیانات (مواقع، مثالیں) وضاحت سے ملتے ہیں۔ ہجرت کی رات حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بسترِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لیٹنا ایک ایسی مثال ہے جس کی تعریف سورۃ البقرہ آیت ۲۰۷ میں یوں فرمائی گئی ہے "وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ" (یعنی لوگوں میں وہ بھی ہے جو بیچ ڈالتا ہے اپنی جان (عزیز) کو اللہ کی خوشنودیاں حاصل کرنے کے لئے۔)

حضرت ابوالحسین نوریؒ کا قول التعرف میں ہے "نَعْتُ الْفَقِيْرِ السُّكُوْنُ عِنْدَ الْعَدَمِ وَالْبَذْلُ وَالْاِيْثَارُ عِنْدَ الْوُجُوْدِ" (یعنی فقیر کی صفت یہ ہے کہ اس کے پاس کچھ نہ ہو تو قانع رہے اور کچھ ہو تو خرچ اور ایثار کرے۔) بذل کے معنی یہ ہیں کہ کسی سابقہ بھلائی کو مدِ نظر رکھ کر مال خرچ کیا جائے اسے مکافاتِ خیر کہا جاتا ہے اور اگر مال کسی آئندہ بھلائی کی خاطر خرچ کیا جائے تو یہ متاخرہ کہلاتا ہے (یہ دونوں صفات عام آدمیوں کا شیوہ ہیں) اور تیسری صورتِ ایثار ہے کہ قربانی میں پہل کی جائے اور اس کے بدلے میں کوئی توقع وابستہ نہ کی جائے اور یہ خواص کا طریقہ ہے۔

فقراء کا خیال ہے کہ جب تک عشقِ الٰہی نہ ہو ایثار پیدا نہیں ہوتا۔ رسالہ قُشیریہ میں ہے کہ اگر کسی کے قبضے میں پوری کائنات آجائے اور وہ اس میں سے اپنے لئے ایک دن کی خوراک رکھ لے تو فقیر نہ کہلائے گا۔ فقراء کی عادت ہے کہ کچھ نہ ملے تو شکر کرتے ہیں اور اگر مل جائے تو اسے ایثار کر دیتے ہیں۔ قرآن میں بھی کہا گیا ہے کہ تمہاری کمائی میں سائل اور محروم کا حق ہے۔ ارشادِ ربانی ہے۔

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ ''اور ان کے اموال میں حق تھا سائل کے لئے اور محروم کے لئے۔ (سورۃ الذّٰرِیٰت :۱۹)

ایثار سے متعلق کلام بہت طویل ہے۔ اس کتاب میں بھی کچھ مزید اقوال مختلف مقامات پر دیئے گئے ہیں۔

فقیروں کے اوصاف پر مشائخ کے فرمودات

ابن نوری فرماتے ہیں کہ فقیر کی یہ صفت ہے کہ جب نہ پائے تو سکون پائے اور جب پائے تو خرچ کر دے۔ بعض صوفیاء نے فرمایا ہے کہ فقیر وہ ہے جو رزق اور سوال سے محروم ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (ایسا درویش) اگر اللہ تعالیٰ کی قسم کھائے تو اللہ تعالیٰ پوری کر دیتا ہے اور یہ اس کی دلیل ہے کہ وہ قسم نہیں کھائے گا۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ درویش وہ نہیں ہے جو وہ رکھتا ہے بلکہ وہ ہوتا ہے جو وہ نہیں رکھتا۔ نہ رکھنے کے باعث اس سے کوئی بھی لطف کا سلوک نہیں کرتا یعنی مخلوق رفق (نرمی) نہیں کرتی اور وہ مخلوق کی منت سے آزاد ہو جاتا ہے تو پھر ساری دنیا اس کی نظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتی اور جاہل لوگ ان کے نہ مانگنے کو دیکھ کر خیال کرتے ہیں کہ وہ غنی ہیں ''يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ'' (خیال کرتا ہے انہیں ناواقف (کہ یہ) مالدار (ہیں) بوجہ ان کے سوال نہ کرنے کے) (البقرہ: ۲۷۳) چنانچہ ان کی علامت یہ ہے کہ وہ سوال نہیں کرتے یہ اس لئے کہ اپنی ذلت کو ذلیلوں کے سامنے پیش کرنا محال ہے۔ رابعہ عدویہ نے فرمایا'' میں دنیا کو دنیا کے مالک سے بھی نہیں طلب کرتی تو پھر جو اس کا مالک ہی نہیں ہے اس سے کیسے مانگوں۔''

حضرت رابعہ عدویہ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ اگر دنیا کی طرف توجہ کی تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی دنیا والوں کے ساتھ رکھ دیں گے اور اس طرح حق تعالیٰ سے اعراض کا موجب ہوگا۔ دوست کے نزدیک یہ خیانت ہے کہ اس کے غیر کے ساتھ میل جول رکھے۔ فقیر حقیقی وہ ہوتا ہے کہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح اپنی ضرورت کے متعلق بات ہی نہ کہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر حال سے واقف ہے۔ چند واقعات اس نوعیت کے پیش کیے جا رہے ہیں۔

(۱) حضرت ابوالخیر اقطع سے دریافت کیا گیا کہ آپ کا ہاتھ کیسے کٹ گیا ہے فرمایا کہ میں اور میرے بال بچے سخت فاقہ کشی میں گرفتار تھے تو میں نے کسی امیر کے آگے ہاتھ پھیلایا جب اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو دیکھا کہ جیب کٹ گئی ہے اس نے مجھے پکڑ کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ جب مجھ سے پوچھا گیا کہ تو چور ہے تو مجھ سے جھوٹ نہ بولا گیا کیونکہ میں خدا تعالیٰ کی خدمت کا چور تھا۔ اس پر انہوں نے میرا ہاتھ کاٹ دیا۔ میں نے اپنا کٹا ہوا ہاتھ ان سے لے لیا تاکہ میں ساری عمر یہ بات یاد رکھوں کہ میں نے پہلی بار ہاتھ پھیلایا تھا جس کا بدلہ میں نے پالیا۔

(۲) حضرت دراج فرماتے ہیں کہ میں اپنے استاد کے تھیلے سے سرمہ دانی نکالنا چاہتا تھا کہ میرے ہاتھ

میں ایک چاندی کی ڈلی آگئی۔ استاد نے فرمایا مجھے دنیا کے مال سے صرف یہ ڈلی ملی تھی اور میں نے سوچا ہے کہ یہ وصیت کروں کہ یہ ڈلی میرے کفن کے ساتھ باندھ دی جائے تا کہ میں اِسے اللہ تعالیٰ کے پاس لے جاؤں اور واپس کر دوں۔ حضرت درّاجؒ فرماتے ہیں کہ میں اپنے استاد کا توشہ دان مثل چاندی دیکھ کر حیران ہوا کیونکہ استاد دنیا سے محبت نہ رکھتا تھا۔ فرماتے ہیں کہ اگر پیر خود کو سیدھا رکھے گا تو مرید بھی سیدھے رہیں گے اور اگر پیر ٹیڑھا ہوا تو مرید بھی ٹیڑھے ہو جائیں گے اور اس کا وبال پیر پر ہوگا۔ فرماتے ہیں کہ اگر پیر کے متعلق کوئی ایسی بات دیکھے تو اس کو اچھے معنوں پر محمول کرے۔ یہ نظریہ مرید کو سیدھے راہ پر رکھے گا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ''بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندۂ مومن کو دنیا سے بچائے رکھتا ہے جس طرح تم اپنے اونٹوں کو ہلاک کرنے والی چراگاہوں سے بچالیتے ہو۔''

(۳) حضرت حسین منصورؒ نے فرمایا کہ ہم نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ اس کا مرقع جوؤں سے بھرا ہوا تھا اور ایک جُو کا وزن تین رتی تھا۔ فرمایا یہ لوگ ضرورت کی چیزوں کو دکھاوے اور آرام کے لئے نہیں بلکہ ضرورت کے لئے رکھتے ہیں اور یہ اپنی ہر ایک چیز کو کئی کاموں میں استعمال کرتے ہیں، مثلاً ان کی جائے نماز، بستر اور تہبند کفن کا کام دیتی ہے۔

(۴) حضرت ابوالقاسمؒ فرماتے ہیں کہ لوگوں نے حضرت ابوالحسن نوریؒ سے پوچھا کہ کل عید ہے تو آپ کیا پہنیں گے۔ فرمایا وہ خلعت پہنوں گا جو بندے کو جرعہ (کڑوا گھونٹ) چکھاتا ہے۔ آپ کی مراد یہ تھی کہ لوگ تو عید پر ظاہر کو آراستہ کرتے ہیں، میں باطن کو آراستہ کرتا ہوں اور وہ خلعت پہنوں گا جو جرعت کی صفت رکھتی ہو کیونکہ حق تعالیٰ کی خلعت اپنے دوستوں کے لئے غم، اندوہ اور محنت ہے اور آپ نے بلاؤں کو خلعت فرمایا۔ دوست کے مشاہدے کی لذّت بلا کے وقت اس سے بلا کو بھلا دیتی ہے جیسے زلیخا کی سہیلیوں نے انگلیاں کاٹ دیں اور محسوس بھی نہ کیا چنانچہ فقراء کی خِلعت فقر اور صبر ہوتی ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

کارِ درویشی ورائے فہم تُست سوئے درویشاں تو منگر سست ست (۱۔۲۵۳)

(درویشی کے کام تیری عقل سے بعید ہیں، درویشوں کی طرف سستی کی نظر سے نہ دیکھ۔)

فقرِ فخری نہ زگزافست و مجاز صد ہزاراں عزّ پنہاں ست و ناز (۱۔۲۵۴)

(الفقر فخری کا رتبہ نہ ڈینگ مارنے کی بات ہے اور نہ مجازی طبع کی، بلکہ اس میں تو ہزاروں عجز و نیاز پنہاں ہیں)

صبر کن در فقر و بگذار ایں مَلال زانکہ در فقر است عزّ ذوالجلال

(فقر میں صبر سے کام لو اور رنجیدہ خاطر نہ رہو، کیونکہ فقر میں رب ذوالجلال نے عزت رکھی ہے۔)

فقرِ فخری، بہر آں آمد سَنی تا زطمّاعاں گریزم در غنی (۵۔۸۰)

(میرا قابلِ فخر فقر اس لئے بہتر ہے کہ میں طمع کرنے والوں سے بچ کر غنی حقیقی (اللہ) کی طرف چلا جاؤں)

جہد کن تا نور تو رخشاں شود　تا سلوک و خدمت آساں شود　(۴۴۴-۳)

(مجاہدہ کرتا رہ تا کہ تیرا نور چمک اٹھے، اور تا کہ تیری راہِ سلوک اور راہِ خدمت آسان ہو جائے۔)

حضرت باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فرمودات

حضرت باقی باللہؒ اپنے ایک مکتوب میں ایک طالب کو لکھتے ہیں (مکتوبات ص ۱۰۵) کہ دونوں جہان کی سعادت شرعی احکام کے بجالانے میں ہے اور فرمانبرداری اور متابعت کے حاصل ہونے کا بڑا سبب خدائے تعالیٰ اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے۔ خدائے تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت تب حاصل ہوتی ہے جب اللہ تعالیٰ کے دوستوں کی محبت اور خدمت حاصل ہو۔

بے عنایات حق و خاصان حق　گر ملک باشد سیاہ ہستش ورق

(اللہ اور اللہ والوں کی عنایت کے بغیر خواہ کوئی فرشتہ بھی ہو تو اس کا صفحۂ عمل خالی ہوتا ہے۔)

حضرت باقی باللہؒ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایت کا دروازہ کھل جاتا ہے تو تیر یعنی باطن اللہ تعالیٰ کی عظمت کو دیکھ لیتا ہے۔ روح اس کی محبت سے چمک اٹھتی ہے۔ دل کتاب وسنت کے احکام کو مان لیتا ہے اور سالک استقامت کے مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔ انسان کی روحانی پیدائش کا مطلب یہی ہے کہ اگر معارف وکمالات اس کو حاصل ہوں اور ان اصولوں میں خلل نہ ڈالے تو وہ "نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ" ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کامل قدرت والا، بندوں کا وکیل، فرمانبرداروں اور مطیعوں کے حق میں لطیف اور رؤف (یعنی لطف اور نرمی کرنے والا) ہے اور سرکشوں اور نافرمانوں کے حق میں قہار اور جبار ہے۔ وہ عاجزوں اور نادموں اور عذر خواہوں کے حق میں غفور رحیم ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے اصولوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جو خدا کی طرف اچھائی کے ساتھ بڑھتا ہے تو خدا بھی اس سے اچھا سلوک کرتا ہے۔ سالک کا باطن اگر حق تعالیٰ کی ذات کا گرفتار ہو تو اس کا نشان یہ ہے کہ دوری کے باوجود تمام مقامات اور مشاہدات اور ظہور کے مراتب اس کی نظرِ ہمت میں حقیر دکھائی دیتے ہیں۔ کہتے ہیں فقر جب تمام ہو تو پھر اللہ ہی اللہ ہے "اَلْفَقْرُ اِذَا تَمَّ هُوَ اللّٰهُ"۔

حضرت باقی باللہؒ (رقعہ ۶۰ میں) لکھتے ہیں کہ ان کے مرشد فرمایا کرتے تھے کہ جب تک اللہ تعالیٰ بندے کی ارادت کی صفت پر تجلی نہ کرے تب تک وہ بندہ اہل اللہ کا سلوک طے نہیں کر سکتا اور نہ ہی کسی کا مرید ہو سکتا ہے۔ اہل اللہ کے رسالوں میں ایسا ہی لکھا ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارادت عطا ہو جائے تو یہ بہت ہی اعلیٰ نعمت ہے۔ ان بزرگوں کی روحوں سے نعمت طلب کرتا رہے۔ آپ نے یہ بھی لکھا ہے (رقعہ ۴۰) کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہمارے ظاہر کو شریعت کے موافق اور باطن کو حقیقت کے غلبے میں فانی کرے۔ تمام سعادتوں سے بڑھ کر یہی سعادت ہے۔ دعا کا قبول ہونا اور تصرف کا ظاہر ہونا کمال کے لئے ضروری نہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں (رقعہ ۳۹) کہ غیبت استغراق کا سالک اندیشہ نہ کرے اور اسی حضور پر قائم رہے تو انشاء

اللہ سکر و محو میں اور فنا و شعور میں مندرج ہو جائے گا۔ کشف القبور پر اعتبار نہ کرے، صورتوں کے کشف میں خطا اور لغزش بہت ہو جاتی ہے۔ کوشش کرے کہ حضور مع اللہ ظاہر ہو اور دوائی طور پر حاصل ہو۔

ایک جگہ فرماتے ہیں (رقعہ ۳۱) کہ اللہ تعالیٰ ہم کو ہستی کی قید اور خود پرستی کے حجاب سے خلاصی بخشے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچنے کا بڑا سبب یہی ہے کہ ہم اہل دل یعنی اہل اللہ لوگوں کے دلوں کی آزاری اور ناراضگی سے بچتے رہیں۔ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص عرش سے گر جائے تو اس کا اس قدر ڈر نہیں جتنا کسی اہل دل کی نظر سے گر جانے سے نقصان ہوتا ہے۔ اس راہ میں خون جگر پینا پڑتا ہے اور ہمہ تن ادب بننا پڑتا ہے۔ جب تک عجز و نیاز کا بچہ پیدا نہ ہو تب تک مکرمت اور عزت کے پستان سے تربیت کا دودھ جوش میں نہیں آتا۔ خودسری اور خود پرستی سے کچھ نہیں بنتا۔

حقیقت کا ظاہر ہونا جذب اور کشش پر موقوف ہے اور یہ دونوں اس وقت حاصل ہوتے ہیں جب کسی کو محبوبی کی صفت عطا ہو جائے۔ یہ بخشش اور عطیہ سید الاولین والآخرین ﷺ کی ظاہری اور باطنی متابعت پر موقوف ہے۔ حضرت باقی باللہؒ ایک جگہ (رقعہ نمبر ۴) پر لکھتے ہیں کہ سالک کی توجہ اپنے شیخ کی طرف ہونا ضروری ہے۔ لکھتے ہیں کہ روٹی کسی اور کی کھائی اور دعا کسی اور کے حق میں کرنا اچھا نہیں۔ یعنی اگر ایک شخص سلسلۂ نقشبندیہ کا نور تو آپ سے حاصل کرے اور سلسلۂ قادریہ کی طرف متوجہ ہو تو اس میں کیا مزہ آئے گا، نیز مرید کو پیر کے سامنے ایسا ہونا چاہئے جیسا مردہ نہلانے والے کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ مرید کو لائق نہیں کہ یوں کہے کہ مجھے فلاں شغل یا طریقے کی تعلیم دو۔ یہ بات بہت ہی بری ہے اور ایسی خود روئی اچھی نہیں ہوتی۔ فرماتے ہیں کہ (رقعہ نمبر ۵) سالک کو ہمیشہ باوضو رہنا چاہئے اور تحیۃ الوضوء کا ادا کرنا، کھانے میں احتیاط کرنا، گناہوں سے بالکل بچنا، غیبت اور نکتہ چینی نہ کرنا، کسی مومن کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھنا، کسی اپنے سے عاجز اور زیر دست مومن پر غضب اور سختی نہ کرنا طریقت کی ضروریات میں سے ہے۔ یہی طریقت کی بنیادیں ہیں۔ ان کے بغیر کام نہیں ہوتا۔

حضرت باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شیخ خواہ کتنا دور ہی کیوں نہ ہو اسے چاہئے (رقعہ نمبر ۷۴) کہ اپنے معتقد مریدوں کی طرف توجہ کرے۔ فرماتے ہیں ہم ایسے مریدوں سے غافل نہیں ہیں کیونکہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے ان کا خادم بنا دیا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی "یا داؤد اذا رأیت لی طالباً فکن لہ خادماً" (اے داؤد! جب تو میرے کسی طالب کو دیکھے تو اس کا خادم بن جا۔)

باب ۳

اسلام اور روحانیت کے ساتھ اقبالؒ کا تعلق!

علامہؒ کا فارسی اور اُردو کلام سے اندازہ

علامہ اقبالؒ کے فارسی اور اُردو کلام کے مطالعہ کے بعد ہی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ علامہؒ کا روحانیتِ اسلام کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ آپؒ کے چند ایک اشعار پڑھ لینے سے ان کے کلام کی نوعیت کا کچھ علم تو ہوسکتا ہے لیکن جب تک آپؒ کا پورا کلام نہ پڑھا جائے اس وقت تک اس میں موجود عمیق رموز ونکات کے متعلق کچھ اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ علامہؒ کا کلام ہمارے شعور واحساس قلب ووجدان اور اعصاب میں حرارت، سوز وگداز، درد وتپش پیدا کرتا ہے۔ اس کے اثر سے مادیت کی زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں۔ باطل کی قدروں کے ڈھیر جل کر فنا ہو جاتے ہیں۔ ان کیفیات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ علامہؒ کس قدر طاقت ور ایمان، پُر درد، پُر سوز اور بے چین روح کے مالک ہیں۔ آپؒ کی شاعری نے غفلت میں پڑی ہوئی قوم کو بیدار کر دیا اور ان کے دلوں میں ایمان اور یقین کی چنگاری پیدا کردی۔ آپؒ کے کلام سے سارے عالم میں خالص اور اسلامی فکر ونظر کو لئے ہوئے ایک نئی نسل اُبھری ہے۔ آپؒ کے کلام کو پڑھنے والوں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور لوگ ان کے کلام کی بلندی سے مسحور ہو جاتے ہیں۔ آپؒ کے کلام کو پڑھنے والوں کے اذہان اور قلوب وہ اثر قبول کرتے ہیں جو کسی ظاہری علمی شخصیت سے نہیں ہوتا۔ کوئی شاعر ان کی منزل پر نہیں پہنچ سکتا اور ان کی سرحدوں کو نہیں چھوسکتا۔ آپؒ کا کلام پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق ذہانتِ علم اور وسعت مطالعہ سے نہیں بلکہ فیضان سے ہے۔

مسلم ممالک میں علامہؒ کا کلام

سلیمان ندوی نے ایک کتاب ''روائع اقبالؒ'' عربی زبان میں لکھی ہے تاکہ عرب ممالک تک آپؒ کا پیغام پہنچ سکے۔ آپؒ کا کلام اپنے افکار کی ضرب سے دنیا میں ایک شورش وطوفاں پیدا کردیتا ہے جس کی لہریں بحرِ ہند سے گزر کر عالم اسلام تک ٹکراتی ہیں۔

مصر اور عرب کے لوگ علامہؒ کے تازہ ترین کلام سننے کے لئے بیتاب رہتے تھے۔ جب آپؒ کا کلام وہاں پہنچ جاتا تو اُمِ کلثوم مصر کی مشہور گلوکارہ اس کو گا کر لوگوں کو رلاتی تھی۔ وہاں کے علماء نے لکھا کہ علامہ کا دل

وحیِ الٰہی کا آئینہ دار ہے۔ مولانا سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ علامہؒ کا شعری کلام اب شاعری کی حد سے نکل کر حکمت کے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ چکا ہے۔ آپؒ کے کلام میں بصیرت اور موعظت، غارِ حرا سے ناموسِ اکبر کی آواز اور جبرائیلِ امین کا پیام ہے۔ آپ نے نقوشِ اقبال میں لکھا کہ علامہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر ہیں۔ ایسا معارف شاعر، فلسفی، عاشقِ رسول اللہ ﷺ، فلسفۂ اسلام کا ترجمان اور کاروانِ ملت کا ہدیٰ خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

علامہؒ کی خدمات اور نہ مٹنے والی شہرت

علامہ اقبالؒ کا کلام جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا ہے دنیا میں یکتا اور نادر الوجود تھا۔ اپنے کلام کی طرح آپؒ خود بھی نادر الوجود شخصیت بن چکے تھے، یہاں تک کہ پوری دنیا میں وہ شاعرِ مشرق کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ آپؒ کے کلام کی اعلیٰ نوعیت ہونے کے ساتھ ساتھ جو چیز قدرت نے آپ کو عطا کی ہے وہ دین اسلام سے آپ کی وابستگی اور اسلامی افکار کو اپنے اشعار میں خوب صورتی کے ساتھ سمونا ہے۔ اس اسلوب نے آپ کو ایسا مقام عطا کیا ہے جو آپ کو رہتی دنیا تک ممتاز اور نہ مٹنے والی دائمی شہرت عطا کرتا ہے۔ آپ کی خدمت کے پیش نظر آپ کا نام رہتی دنیا تک باقی رہے گا اور آخرت میں آپ کے مقام کا اندازہ بھی آپ کی خدمات سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔

علامہ اقبالؒ کے کلام پر اب تک سینکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور لکھی جاتی رہیں گی چنانچہ اس کتاب میں آپ کے کلام پر کچھ مزید لکھنے کی حاجت محسوس نہیں کی جا رہی۔ اس کتاب میں ہماری طرف سے علامہ اقبالؒ کے متعلق کچھ لکھنا صرف اس مقصد کے لئے ہوگا کہ آپؒ نے اپنی شاعری کا بہترین حصہ قرآن اور حدیث کی اشاعت کے مطابق لکھا ہے۔ اس بات سے اس حقیقت کا اخذ کرنا کوئی مشکل بات نہیں ہوگی کہ آپ کا اسلامی شعار کے متعلق کچھ لکھنا اور لوگوں کی راہنمائی کرنا آپ کی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد تھا۔ اس بات کو ہم اس طریقے سے ثابت کرتے ہیں کہ علامہؒ کی تحریروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خیالات اور کلام کا زیادہ تر رجحان قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ روحانیتِ اسلام کی طرف تھا۔ اسلام ایک روحانی مذہب ہے کہ اس راہ پر چلنے کے لئے قرآن وسنت کے علاوہ کسی چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔ آپ کے کلام کا مطالعہ کے بعد ہر عاقل شخص آپ کے کلام کو تسلیم کرتا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ اسلام ایک مکمل اور کامیاب زندگی گزارنے کا واحد ذریعہ ہے۔

علامہ اقبالؒ نے فلسفہ، حکمت اور قوموں کے عروج و زوال پر جی بھر کر کلام کیا ہے۔ اسلاف کے سوز دروں کے علاوہ عقل و عشق پر آپ نے کلام کے دریا بہا دیئے ہیں۔ آپ کا خصوصی شعبہ، اسرار و رموز، خودی اور بے خودی کا ترجمہ اربری نے آپ کے علاوہ، استاد نکلسن نامی نے آپ سے اجازت حاصل کرنے کے

بعد انگلینڈ سے شائع کیا۔ آپ کے نام پر دنیا بھر میں ۲۱ سے زیادہ یونیورسٹیوں کا قیام ہو چکا ہے۔ سب سے زیادہ عجیب بات تو یہ ہے کہ آپ کے کلام پر مبنی اقبالیات نامی مضمون بھی پورے انہماک کے ساتھ شروع ہو چکا ہے جو کہ دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں پڑھایا جاتا ہے۔ مشائخ اسلام نے پاکستان اور پاکستان سے باہر آپ کے کلام کو روحانی کلام کا درجہ دیا ہے۔

علامہ دسمبر ۱۹۳۱ء کو مصر پہنچے تو مختلف شعبہ حیات کے لوگوں نے آپ کا استقبال کیا اور مصر کے معروف روحانی پیشوا ابوالعزائم اپنے صاحبزادوں کے ہمراہ اقبال کی قیام گاہ پر حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس نے دین سے تمسک کیا ہو، اس کی زیارت کے لئے جاؤ تو مجھے خوشی ہوگی۔ میں آپ سے ملنے کے لئے اس لئے چلا آیا کہ میرے آقا مجھ سے خوش ہو جائیں۔

مذکورہ پیشوا نے مزید فرمایا کہ علامہ کے دل میں اسلام سے محبت اور رسول کریم ﷺ سے شیفتگی نظر آتی ہے۔ مصر کے ڈاکٹر عبدالوہاب جوں ہی علامہ کا کوئی کلام آتا تو اس کا عربی ترجمہ کرتے۔ ڈاکٹر صاحب نے علامہ اقبال کے فکر اور فلسفہ پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں علامہ کو شاعر اسلام، شاعرِ مشرق، شاعرِ حیات، شاعرِ انسانیت، شاعرِ جہاد، شاعرِ حریت، شاعرِ جلال اور جمال کے القابات کے ساتھ ان کا تعارف کرایا ہے۔ اس کے علاوہ الصادی شعلون، عبدالحمید ابراہیم، عباس محمود اور مراکشی خطیب وغیرہ بہت سے علماء نے علامہ کے نام پر بہت کچھ تحریر کیا ہے۔ ان کے علاوہ ترکی اور دیگر اسلامی ممالک کے لوگ مسجدوں میں تقاریر کرتے تو علامہ کے کلام کو پڑھ کر خود بھی روتے اور لوگوں کو بھی رلاتے۔ آپ کا کلام سن کر بہت سخت دل انسان بھی رونے لگتے اور علامہ کی کتابیں ہاتھوں ہاتھ بک جاتیں۔ علامہ اقبال کے شکوہ اور جواب شکوہ کا عربی ترجمہ ''حدیث الروح'' (یعنی دل کی بات) جب مصر کی عظیم مغنیہ ام کلثوم نے گایا تو سارے عرب میں تہلکہ مچ گیا۔ ایران نے بھی علامہ اقبال کو اسلامی انقلاب کے مفکروں میں شامل کیا ہے۔ ایران کے صدر علی خامنہ ای نے شالامار باغ لاہور میں کہا کہ میں علامہ اقبال کا مرید ہوں (من اے میرِ امم داد از تو خواہم)

علامہ کے وسعتِ افکار اور اسلام سے تمسک

اگر علامہ اقبال کے اسلام پر دیئے گئے سات لیکچرز اور ان کی دیگر تحریروں کا ان کے کلام کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آئے گی کہ روحانیتِ اسلام کے ساتھ ان کو خاص شغف تھا۔ زیر نظر کتاب میں بھی روحانیتِ اسلام پر روشنی ڈالی گئی ہے اور حتیٰ الامکان روحانیت سے متعلق تمام چیدہ چیدہ افکار اور شعبوں پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ یہاں یہ بات محسوس کی جاتی ہے کہ اسلام کے تمام افکار اور شعبوں کے لئے علامہ اقبال کا کلام کثرت سے ملتا ہے۔

راقم الحروف نے اپنی دیگر تصانیف کی طرح اس تصنیف پر بھی علامہ اقبالؒ کا کلام پیش کرنے کی حتیٰ الامکاں کوشش کی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ایک بہت حسین حقیقت نظر آئے گی کہ تقریباً اس کتاب کے تمام ابواب میں، مضامین کی نوعیت کے مطابق علامہ اقبالؒ کے چند اشعار شامل کر دیئے گئے ہیں۔

علامہ اقبالؒ کے کلام کی وسعت اس حد تک بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے کہ آپ کے کلام کو ہر باب میں مختصر طوالت کے ساتھ شامل کرنے سے تقریباً ۲۰/۲۵ صفحات کا اضافہ ہو جاتا۔ اختصار کی خاطر بعض ابواب میں چند اشعار شامل کئے گئے ہیں لیکن جہاں جہاں آپ کا کلام شامل کرنا ضروری سمجھا گیا ہے، وہاں اشعار کے بہاؤ میں دریغ سے کام نہیں لیا گیا حتیٰ کہ بعض ابواب میں تو تحریر کا اکثر حصہ علامہ اقبالؒ کے کلام سے مالا مال ہے۔ کسی باب کے متعلق جو کچھ کہنے کی ضرورت ہوتی ہے، وہ علامہ اقبالؒ کے کلام میں پہلے سے ہی موجود ہوتی ہے۔ بہر حال یہ دیکھا گیا ہے کہ علامہ اقبالؒ کے اشعار نے اس کتاب میں انفرادیت قائم کر دی ہے کیونکہ عام روحانی کتابوں میں کلام اقبال کا مواد اس طرح شامل نہیں ہے۔

اس تحریر میں ضرورت اس بات کی ہے کہ علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں کن خاص باتوں کا ذکر کیا ہے اور یہ کہ علامہ اقبالؒ کے کلام کو روحانیت کے سلسلے میں عالم اسلام نے کیوں قبول کیا ہے بلکہ اقبالؒ کی معنی خیز روحانی گفتگو صوفیوں کی مجلسوں میں کیوں زیادہ تر رائج ہوگئی ہے؟ یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ صوفیاء کی مجالس میں اقبالؒ کے کلام کو مرکز یا محور بنانے کی ضرورت بھی اسی لئے سمجھی جاتی ہے کہ ان عنوانات میں علامہؒ نے ایسے مضامین بند کئے ہیں جن کو صوفی لوگ اپنے تجربات کو اقبالؒ کے تجربات سے ہم آہنگ پاتے ہوئے آگے بڑھاتے ہیں۔ اس سے ندرتِ فکر کے دروازے کھلتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے تصوف کو کن خوبیوں سے آراستہ کیا؟

علامہ اقبالؒ کی روحانی کمالات کا خاکہ

حضرت جنیدؒ بغدادی کی طرح علامہ اقبالؒ بھی تصوف میں محتاط رویے کے قائل تھے اور افراط و تفریط سے اجتناب فرمایا کرتے تھے۔ وہ بلحاظِ مراقبات یا وجد و سرور کی کیفیتوں، ذکر و اذکار اور حضورِ قلب کے منازل میں اپنا ایک خاص نظریے کے حامل ہیں جس سے مسلمانوں میں شعورِ اسلام پیدا ہو۔ ان کے تصوف میں قلندری احوال کا درس ملتا ہے۔ علامہؒ تصوف میں باعمل زندگی کے شیدا، سخت محنت اور جفاکشی کے قائل تھے۔ ہر وقت اپنے احوال و مقامات میں کھوئے رہنے اور اپنے معاملاتِ دنیا سے بے خبر اور لاتعلق رہنا ان کے نزدیک تصوف کی حقیقت سے خارج ہے بلکہ ان کا تصوف ایک مسلمان کو جہاں شناس اور دیدہ ور بناتا ہے اور کاروبارِ حیات سے آگہی عطا کرتا ہے۔ آپؒ نے اُمتِ مسلمہ کے حالات کا معائنہ کیا اور مسلمانوں کو زمانے کی نزاکت

کے مطابق مسلسل جہاد اور انقلاب کا درس دیا۔ اسلامی شعار کے مطابق وہ ہر شئے کو اس نظر سے دیکھتے تھے کہ وہ انسانی خودی کی ارتقا کے لئے کس قدر فائدہ مند ہے اور اجتماعی طور پر مسلمانوں کے لئے کس طرح مفید ہے۔ وہ اپنی دورانِ حیات اس کوشش اور تدبیر میں رہے کہ مسلمانوں کی بیداری اور ان کی نشاۃ ثانیہ کی تدبیر کی جائے۔ آپ نے حیاتِ اسلام کی روح کو لوگوں کے سامنے پیش کیا، آپ نے ان راہوں کو اجاگر کیا کہ جس سے مسلمانوں کو فکری افلاس سے نکال کر ان میں ایسے اوصاف اور کردار پیدا کئے جائیں کہ وہ دنیا کی تمام قوموں کا نہ صرف مردانہ وار مقابلہ کر سکیں بلکہ اسلام کے مقاصد کو تمام دنیا میں رائج بھی کر سکیں۔

جب علامہ اقبالؒ نے مسلم ممالک کے احوال کا معائنہ کرنے کے بعد ان کی اصلاح پر غور وفکر کیا تو آپ نے ان کے امراض اور وجوہات کی مکمل نشاندہی کی اور پھر ان امراض کے تدارک کے لئے فارسی اور اُردو زبان میں اپنا طویل و عریض کلام قوم کے سامنے پیش کیا۔ علامہؒ پر جو قوم کی اصلاح کے حقوق واجب تھے وہ آپ نے ایک ایک کر کے سب ادا کر دیئے اور مسلمانوں کو قرآن اور حدیث کے مطابق اپنا منفرد لائحہ عمل پیش کیا۔ آپ کی اس خدمت کو دیکھتے ہوئے دنیائے اسلام کے تمام مسلمانوں نے متفقہ طور پر آپ کو حکیم الامت کا خطاب دیا۔

آپؒ نے قومی فکر و تدبر کرتے ہوئے ان کے ماضی کو دیکھا اور مسلمانوں کے عروج و زوال کی وجوہات کا جائزہ لیا اور پھر اُن کی موجودہ شرمناک حالت کو دیکھا جس میں مسلمانوں کی محکومی، مجبوری اور بے بسی کے بادل ہر طرف سے چھائے ہوئے نظر آتے تھے تو کہا کہ جس قوم کو اللہ تعالیٰ نے تمام اَدیان پر غالب ہونے کا فریضہ سونپا تھا وہ قوم خود مغلوب اور دوسرے ملکوں کی ذلت کے ایک کوہِ گراں کے نیچے پس رہی ہے۔ آپؒ نے یہ حقیقت واضح کی کہ ہر میدان میں مسلمانوں کو کچلا جا رہا ہے اور ہر میدانِ جنگ میں مسلمانوں کی شمشیریں کند ہو چکی ہیں۔ دنیا کے تمام ممالک ہر شعبے میں مسلمانوں سے بہت آگے بڑھ چکے ہیں اور دنیا میں ان کا پرسانِ حال کوئی نہیں۔ علم و تحقیق ہو یا سیاست و معاشیات کا میدان ہو مسلمان ہر طرف سے پس رہے ہیں۔ ایجادات وفنون کی دنیا میں یا عسکری لائحہ عمل میں ہر طرف سے مسلمان بُری طرح مات کھا چکے ہیں اور دنیا کے تمام ممالک ہر شعبہ میں اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ آپؒ نے دیکھا کہ دنیا کے طاقتور ممالک مسلمانوں پر اپنے غلط اور صحیح فیصلوں کو ٹھونس رہے ہیں اور خود کو اپنی فوقیت پر حق بجانب سمجھتے ہیں۔ بڑے ممالک جہاں چاہیں اپنے جنگی بیڑے بھیج دیتے ہیں اور مسلمانوں کی عزت و آبرو، اُن کی جان، ان کا مال اور اُن کا لہو ارزاں ہو کر رہ گیا ہے۔ اِس دور میں مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ اور شان وشوکت ایک پرانے قصے کی حیثیت سے زیادہ وزن نہیں رکھتی۔ ایسی حالت میں علامہ اقبالؒ نے قوموں کی ترقی کے اسرار و رموز سے مسلمانوں کو آگاہ کیا اور ایسے اعمال کو طریقت کی روحِ رواں ہونا بیان کیا۔ علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں میں بے موقع مراقبوں اور ملکوتی یا

لاھوتی اعمال سے توجہ ہٹائی۔ اس وقت مسلمان قوم کی مناسب راہنمائی کرنے والی کوئی جماعت بھی موجود نہ تھی۔ علامہؒ نے مسلمانوں کی اس ذلت ورسوائی اور محکومی ومظلومی کی حالت کو دیکھ کر کہا کہ ہماری قوتِ عمل، قومی کردار اور نشترِ تحقیق کُند ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سے ستاروں کے جگر چاک نہیں ہوتے۔ ہمارے ذکرو فکر میں گرمی نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں میں روحانی وقار بھی ختم ہو چکا ہے۔ قلندرانہ ادائیں اور سکندرانہ جلال جو مسلمانوں کی ضروریات میں سے ہے اب باقی نہیں رہا۔ صوفیوں کی طریقت میں صرف مستی احوال ہے تو مُلّا کی شریعت میں فقط شوخی گفتار باقی رہ گئی ہے مگر پوری قوم میں کردار کا فقدان ہو چکا ہے۔ ایسی حالت میں کفار کی یلغار کا خاطر خواہ سدِ باب کیسے ہو سکتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں مسلمانوں کے لئے صورِ اسرافیل کی طاقت حاصل کی اور مردہ قوم میں دوبارہ جان ڈال دی۔ علامہ اقبالؒ نے یہ سبق دیا کہ ہم اندھیری رات میں اپنی منزل کا سُراغ لگا سکتے ہیں اور آپ نے ہر اُن نظریات کو ٹھکرا دیا جس میں ملتِ اسلامیہ کی زندگی کا پیغام نہ ہو اور مسلمانوں کے درد کا درماں موجود نہ ہو۔ اس زمانے میں مسلمانوں میں رائج صوفیوں کا تصوف اور مُلّا کا تصورِ دین جمود کا شکار ہو چکا تھا۔ علامہؒ نے مسلمانوں کی کجرو تقلید، اِنتہا پسندی اور مذموم عقائد کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور فرزندانِ اسلام کو شریعت کے مطابق ہموار راستہ اختیار کرنے کی تلقین کی۔ آپؒ نے مسلمانوں پر خودی کا فلسفہ پیش کیا اور رموزِ خودی اور اسرارِ بے خودی پر عمل کرنے سے ہی مسلمانوں کی نجات کا ہونا قرار دیا۔ حقیقت میں ایسا معیارِ زندگی تصوف کی جان ہے۔

علامہ اقبالؒ نے مردِ مومن کا تصور دیا

مردِ مومن کون ہے اور تصوف کس چیز کا نام ہے؟ اس کا اندازہ لگانا ایک بہت مشکل امر ہے البتہ بہت آسان الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ صحابہ کرامؓ ہی بہترین مسلمان یعنی مرد مسلمان ہونے کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ یہ درجہ انہیں رسول اللہ ﷺ کی اتباع سے حاصل ہوا۔ مسلمان رسول اللہ ﷺ کے ہر حکم پر عمل پیرا ہوتے اور جنگ وجدل میں پیچھے قدم نہ اُٹھاتے۔ مال ودولت کے لئے بھاگ دوڑ اور برے کاموں میں سبقت لئے جانا اُن کا شِعار نہ تھا۔

اطاعتِ رسول اللہ ﷺ نے اُن کو اس قابل بنا دیا تھا کہ اُنہوں نے سائنس اور دیگر علوم وفنون میں بلند وبالا مقام حاصل کیا اور پوری دنیا کی راہنمائی کی جس کا اِعتراف آج بھی اہلِ دنیا اپنی تحریروں میں واضح طور پر کر رہے ہیں۔ آج کے مسلمان صحابہ کرامؓ کی زندگیوں سے اس قدر مختلف رویہ رکھتے ہیں کہ اگر قرونِ اُولیٰ کے مسلمان ان کو دیکھ لیں تو اُنہیں ہرگز مسلمان تسلیم نہ کریں۔ یہ فرق دور کرنا اسی وقت ممکن ہے جب مسلمان

اپنی توجہ کو دینِ اسلام کی طرف مبذول کریں۔ یہی علامہ اقبالؒ کا مردِ مومن تھا اور ایسے مسلمان پیدا کرنا اس کا منشاء ہے۔

مسلمان بننے کا مختصر طریقہ

مندرجہ ذیل چند نکات پر توجہ دینے سے آج کے مسلمان بھی مردِ مومن کہلانے کے حق دار ہو سکتے ہیں۔

i- صرف عبادت سے مومن بننا ممکن نہیں اگرچہ عبادت کا دین میں بہت بڑا مقام ہے۔ جب کوئی اسلام میں داخل ہو گیا تو اِس دین پر پورا پورا اترنا ہی عبادت ہے۔ علامہؒ نے فرمایا ہے کہ جب میں اپنے آپ کو مسلمان کہہ دیتا ہوں تو لرز جاتا ہوں کیونکہ مجھے لا الہ کی مشکلات کا علم ہے۔ ہر غلط بات سے ہاتھ کو روک لینا لا الہ کا تقاضا ہے ورنہ عبادت ادھوری رہ جائے گی۔ حضرت سلطانؒ باہو نے لکھا ہے کہ اگر نماز سے ہی مسلمان بنا جا سکتا ہو تو مسجدوں کے مولوی ہی سب سے زیادہ مُقربِ الٰہی ہوتے۔ آپؒ نے فرمایا کہ

رب انہاں توں راضی باھُو عیاں جہاں دیاں نیتاں ھُو

مولانا رومؒ نے لکھا ہے کہ عقل کا ایک ذرہ تمہاری نمازوں اور روزوں سے بہتر ہے یعنی ایسے راسخ اعمال کرنے سے ہی عبادت کا حق ادا ہوتا ہے ورنہ تصوف تک پہنچنا مشکل امر ہے۔

ii- مومن کے لئے عقل سے کام لینا بھی منشاء الٰہی ہے۔ عقل سے مراد دین کو عملی جامہ پہنانا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے بھی یہی بیان فرمایا ہے کہ جب تک مسلمان کے قومی، معاشی، سیاسی اور نشاۃِ ثانیہ کی طرف سے کئے جانے والے اعمال اُن سے سرزد نہ ہوں تو اس وقت تک لفظ مومن کا اطلاق اُن پر نہیں ہوتا۔ اُوپر جو کچھ علامہؒ نے مسلمانوں پر اسلام کے اسرار و رموز بیان کئے اُن کو اپنانے کے بغیر وہ مومن نہیں کہلا سکتے۔ علامہؒ نے فرمایا کہ جب تک ہم کسی غیر ملک کے عتاب سے باہر نہیں آ جاتے اس وقت تک ہم مسلمان کہلانے کے حقدار نہیں۔

iii- اسلام کے ہر فرد پر یہ واجب ہے کہ قومی اور بین الاقوامی تقاضوں کی طرف ہاتھ پاؤں مارتا رہے، یہی مسلمان کے واجبات میں سے شامل ہے۔ مسلمان کے لئے صرف نماز، روزے یا چند صوفیانہ عملیات کا لحاظ کرنا ہی مسلمانی یا تصوف کا حق ادا کرنے کی دلیل نہیں اور نہ ہی تصوف کے اصولوں کی محض رٹ لگانا تصوف سے منسلک ہونے کا نام ہے۔ تصوف میں تو بہت بڑے بڑے کام کرنا اس کے لوازمات میں شامل ہیں۔ (جیسا کہ علامہؒ کے کلام سے اُوپر بیان کیا گیا اور جیسے علامہؒ کے باقی کلام سے واضح ہوتا ہے۔) آسان لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبالؒ نے اسلام کے مشکل احوال اور تکلیف کے ایام میں قرآن اور حدیث کی رو سے جس طرح اپنی زندگی کو ڈھالا اور جتنی کوششوں کے بعد مسلمانوں کے احوال کو بدلا، ہر مسلمان کے لئے عین ایسا عمل کرنا ایک قومی اور خدائی فریضہ ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ علامہؒ نے کس طرح علوم حاصل کئے، اور اتنا

مطالعہ کیا کہ آپ کو اسلامی روایات اور کمالات کا ضروری علم حاصل تھا۔ آپؒ رات کو مطالعہ کرنے بیٹھتے تو فجر کی اذان ہو جاتی۔ اس کے بعد آپؒ نے اپنے علم کو لوگوں تک پھیلایا اور دُعا کی الٰہی "میرا نور بصیرت عام کردے"، علامہ اقبالؒ نے یہی بات اپنے ضربِ کلیم کے ایک شعر میں بیان فرمائی ہے کہ کوئی شخص مردِ مومن اِس وقت ہی کہلا سکتا ہے جب قدرت (یعنی خدائی) افکار کی عیاری کرے تا کہ وہ دنیا اور آخرت میں سرخروئی حاصل کر سکے۔

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

(ض۔ک:۵۲۲)

علامہؒ نے فرمایا ہے کہ بہت گہرا ہے میرے بحر کا پانی

(علامہؒ کا قرآن پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ)

علامہ اقبالؒ کے ذہن میں ایسے بہت سے مضامین تھے جن میں سے بہت سے رموز و نکات کو جامۂ کلام نہیں پہنا سکے۔ اس بات کی پوری تفصیل درج کرنا ممکن نہیں لیکن یہ بات بہت سی کتابوں (اور علامہؒ کی تحریروں) میں بھی ملتی ہے کہ علامہ اقبالؒ نے قرشی صاحب کو خط لکھا کہ وہ قرآن پر ایک کتاب لکھنا چاہتے ہیں۔ فرماتے ہیں میں شیخی نہیں مارتا کہ ایسی کتاب سوائے میرے اور کوئی نہیں لکھ سکتا لیکن میرے پاس اتنا پیسہ نہیں کہ پریکٹس چھوڑ کر یہ کتاب لکھوں۔ آپؒ نے یہ بھی فرمایا کہ میری صحت بھی ایسی کتاب لکھنے کی مجھے اجازت نہیں دیتی ورنہ میں یہ کتاب لکھ سکتا تھا۔ آپ کے اس ارادے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ اگر آپ یہ کتاب لکھ دیتے تو یقیناً کوئی شخص ایسی کتاب نہ لکھ سکتا۔ اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ آپ رموز و کنایہ میں بہت سی ایسی باتیں لکھ گئے ہیں جس کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ واقعی اگر آپ مذکورہ کتاب لکھتے تو اس زمانے میں اس کتاب کا کوئی لکھنے والا اس کی ہمسری نہ کر سکتا تھا۔ چند وہ نکات جو آپ کے جذبات کو واضح کرتے ہیں نیچے دیئے جا رہے ہیں۔

علامہؒ کی قرآن پر ایک الگ کتاب کے بارے میں آپ کے مذکورہ دعوے کو صحیح سمجھنے کے لئے بہت سی مثالیں آپ کے کلام میں بھی موجود ہیں۔ یہاں چند ایک نکات بیان کئے جا رہے ہیں۔ آپ کے کلام میں سے بہت سے ایسے نمونے ملیں گے جس سے آپ کے خیالات کی انفرادیت ثابت ہوتی ہے لیکن ان تمام اشعار کو بیان کرنا اس کتاب کے احاطہ تحریر سے باہر ہوگا۔ یہاں چند ایک مثالوں پر ہی کفایت کی جائے گی، ان مثالی اشعار سے پہلے یہ بیان کیا جائے گا کہ اس وقت کے صوفی اور ملاؤں نے صوفیانہ اشعار کے پڑھنے کو ہی دین کی بنیاد سمجھ رکھا تھا اور دینِ اسلام کی اصل ضرورت یعنی قرآن کے متعلق سبق دینے کو خیر آباد کہہ دیا تھا۔

مسلمانوں کی عمومی محافل میں محض صوفیانہ رنگ

اسرار و رموز میں علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی ہستی صرف آئین قرآن پر موقوف ہے۔ مسلمانوں کی ترقی کا راز قرآن ہے جو ایک زندہ کتاب اور اس کی حکمت قدیم ہے۔ انسانیت کے تمام دکھوں کا علاج اسی آئین کی اتباع میں ہے۔ جس نے اس پر عمل کیا وہ دنیا میں آقائی لے کر نکلا۔ صوفی لوگ گیتوں کے اشعار سے دل لگاتے ہیں مگر قرآن سے اپنی محفلوں کو نہیں سجاتے، مسجدوں میں ہاتھ دراز کر کے رنگین مزاجی میں واعظ کرتے ہیں اور حدیثوں کا چکر اپنی مرضی کے مطابق مسلمانوں پر بیان کرتے ہیں مگر قرآن میں کیا ہے، یہ بیان نہیں کرتے حالانکہ قرآن پاک سے ہی ہر کوئی اپنے مخصوص مقاصد کو پا سکتا ہے۔

صوفی پشینہ پوشِ حال مست از شراب نغمۂ قوّال مست

(آج کل کے گودڑی پوش اور حال مست صوفی، قوال کے نغموں کی شراب میں مست ہیں۔)

آتش از شعرِ عراقی در دلش در نمی سازد بقرآں محفلش

(عراقی کے اشعار ان کے دلوں میں گرمی پیدا کرتے ہیں، مگر قرآن پاک ان کی محفل کو راس نہیں آتا۔)

از کلاہ و بوریا تاج و سریر فقرِ او از خانقاہاں باجگیر

(انہوں نے کلاہ و بوریا کو تاج تخت بنا رکھا ہے اور ان کا فقر خانقاہوں سے خراج وصول کرتا ہے۔)

واعظِ دستاں زنِ افسانہ بند معنیِ او پست و حرفِ او بلند (ا۔ر:۱۲۳)

(ہاتھ مار کر واعظ کرنے والے صوفی افسانوں کا سا بیان کرتے ہیں ان کی تقاریر میں کہانی بہت مگر معانی بہت کم ہوتے ہیں۔)

علامہؒ کی عرضِ حال بحضورِ نبی اکرم ﷺ

عرض حال مصنف بحضور رحمۃ اللعالمین (ا۔ر:ص ۱۶۸) میں آپ رسول اللہ ﷺ کے کمالات اور احسانات کا انسانیت پر ذکر کرتے ہیں اور اس کے بعد مسلمانوں کا دین اسلام سے لاتعلق ہو جانے کا ذکر فرماتے ہیں اور مسلمانوں کی حالت کے ناسور کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

مسلم از سرّ نبیؐ بیگانہ شد باز ایں بیت الحرم بتخانہ شد

(مسلمان نبی ﷺ کے اسرار سے ناواقف ہیں (اُن کے دلوں کا) بیت الحرم پھر سے بت خانہ بن گیا۔)

از منات و لات و عزیٰ و ہبل ہر یکے دارد بُتے اندر بغل

(منات و لات و عزیٰ اور ہبل جیسے بت ہر شخص کی بغل میں ہیں۔)

شیخ ما از برہمن کافر تر است زانکہ او را سومنات اندر سر است (ا۔ر:۱۶۷)

ہمارا شیخ برہمن سے بھی کافر تر ہے کیونکہ اس کے سر میں سومنات سمایا ہوا ہے۔)

اگر میں نے قرآن کے موتی نہ پروئے ہوں تو حشر کے دن مجھے رُسوا کر دیں

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ میں مردہ مسلمان کی نعش کو طبیبوں کے پاس لے گیا اور میں نے کہا کہ میں نے اس کا بہت علاج کیا ہے اور اس کی محفل کو قرآن اور اپنی آواز کی شمع سے روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس شخص پر فرنگ کا جادو چل چکا ہے۔ علامہ اقبالؒ ایک نظم میں رسول اللہ ﷺ سے عرض کرتے ہیں کہ انہیں سچائی کے ساتھ مدافعت کا ذوق عطا فرمائیں۔ علامہؒ نے رسول اللہ ﷺ کے دربار میں عرض کیا ہے کہ میں نے ملت اسلامیہ کے لئے سوائے قرآن اور حدیث کے کچھ نہیں کہا اور اگر یہ بات غلط ہے تو مجھے اپنے قدموں پر پڑنے سے محروم کر دیں اور مجھے جو چاہے سزا دیں۔

گر دلم آئینہ بے جوہر است　　در بحرفم غیر قرآں مضمر است

(اگر میرے دل کا آئینہ جوہر کے بغیر ہے اور اگر میرے کلام میں قرآن پاک کے بغیر کچھ اور شے پوشیدہ ہے)

اے فروغت صبحِ اعصار و دہور　　چشم تو بینندۂ مَا فِی الصُّدُوْر

(آپ کا نور زمانے کی صبح ہے۔ آپ کی آنکھ پر دلوں کی بات روشن ہے۔)

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن　　ایں خیاباں را زخارم پاک کن

(اگر قرآن کے علاوہ میں کچھ کہہ رہا ہوں تو آپ میرے فکر کے شرف کا پردہ چاک کر دیجئے اور دنیا کو میرے کانٹے سے پاک کر دیں۔)

تنگ کن رختِ حیات اندر برم　　اہلِ ملت را نگہدار از شرم

(زندگی کے لباس کو مجھ پر تنگ کر دیجئے اور مسلمانوں کو میری شاعری کی شرم سے محفوظ کر دیجئے۔)

سبز کشتِ نابسامانم مکن　　بہرہ گیر از ابر نیسانم مکن

(میری کشت ویراں کو سرسبز نہ کیجئے، اسے ابر بہار سے بہرہ مند نہ فرمایئے۔)

خشک گرداں بادہ در انگورِ من　　زہر ریز اندر مے کافورِ من

(میرے انگور کے اندر جو شراب ہے خشک کر دیجئے، میری کافوری شراب کے اندر زہر ڈال دیجئے۔)

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا　　بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

(مجھے قیامت کے دن خوار و رسوا کیجئے، یعنی اپنے بوسۂ پائے سے محروم کر دیجئے۔)

گر دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ ام　　با مسلماناں اگر حق گفتہ ام

(لیکن اگر میں نے شاعری میں قرآن پاک کے موتی پروئے ہیں اور اگر میں نے مسلمانوں سے حق بات کہی ہے)

اے کہ از احسانِ تو ناکس کس است　یک دعایت مزد گفتارم بس است (ا۔ر:۱۶۸)

(آپ وہ ذات ہیں کہ جس کے احسان سے ناکس، کس بن جاتا ہے اور آپ کی دعا ہی میری ساری گفتار کا اجر ہے)

مذکورہ بالا اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؒ نے اپنے کلام میں صرف قرآن اور حدیث کو بیان کیا ہے۔ ہماری تصنیف ''سنت مبارکہ'' کے باب نمبر ۱۲ کا مطالعہ فرمائیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبالؒ نے قرآن اور حدیث کے متعلق کیا کچھ لکھا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آپ کے نزدیک قرآن وحدیث پر عمل کو ہی دینِ اسلام کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ اگر میں نے اپنے کلام میں قرآن اور حدیث کے سوا کچھ اور بیان کیا ہو تو مجھے قیامت کے دن حضور اکرم ﷺ کے پاؤں کا بوسہ نصیب نہ ہو اور بے شک روزِ محشر مجھے رسوا کیا جائے۔ آپ نے درخواست کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی مہربانی سے میرا عشق عمل سے ہمکنار ہو جائے۔

ایک شخص کا خواب میں کلامِ اقبالؒ کا مزین لکھا ہوا نسخہ دیکھنا

یہ ایک عجیب اور دلچسپ واقعہ ہے کہ میرا ایک آشنا شخص جو چغتائی آرٹ سے کچھ شغف رکھتا ہے، نے فون پر مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور اطلاع دی کہ میں آپ کے پاس اپنے چند ضروری خوابوں کی تعبیر کے لئے آنا چاہتا ہوں۔ جب وہ آئے تو میں اوپر تحریر کردہ فارسی اشعار کا ترجمہ لکھ رہا تھا۔ آپ نے بتایا کہ رات کو کسی نے خواب میں مجھے ایک نہایت خوب صورت کتاب دی۔ (جو کہ شکل سے قرآن مجید کی سی تشبیہ رکھتی تھی۔) جب میں نے اسے کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس رنگین اور عکسی کتاب میں علامہ اقبالؒ کا کلام لکھا ہوا ہے اور نیچے قرآن کے ترجمے کی طرح علامہؒ کے اشعار کا ترجمہ درج تھا۔ وہ جب آئے تو میرے لکھے ہوئے اشعار کو پڑھا تو کہنے لگے کہ انہیں محسوس ہو رہا ہے کہ یہ اشعار ہی میرے اس خواب کی تفسیر ہیں، جس میں علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام کی حقیقت کا اظہار کیا اور فرمایا ہے کہ میرا تمام کلام قرآن کریم ہی سے ماخوذ ہے اور انہوں نے اپنے کلام میں قرآن کریم کے ہی موتی پروئے ہیں۔ (دُرِ اسرارِ قرآن سفتہ ام)۔ اُوپر لکھے ہوئے اشعار دیکھ کر ان کو اپنے خواب کی تعبیر مل گئی اور علامہ اقبالؒ کے کلام کو قرآن کے تابع ہونا بھی ان کے خواب سے ثابت ہو گیا۔

قرآن وحدیث پر علامہؒ کے نادر نکات

اُوپر اس بات کا ذکر ہو چکا ہے کہ علامہ اقبالؒ نے جناب قریشی صاحب کو لکھا تھا کہ وہ قرآن پر ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے مگر مالی حالت کمزور ہونے اور صحت کی خرابی کی وجہ سے آپ اس ارادے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس خط میں آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ میں شیخی نہیں مارتا کہ اس کتاب کو میرے سوا کوئی نہیں لکھ سکتا۔

ہمارے دل میں یہ خیال بار بار آرہا ہے کہ اس زمانے میں علامہ ؒ نے اپنے اس ارادے کا ذکر اور کئی ارباب سے بھی کیا ہوگا لیکن افسوس ہے کہ اس زمانے میں کوئی شخص ایسا موجود نہ تھا جو علامہ ؒ کو یہ کہتا کہ آپ کتاب لکھیں، آپ کے گھر کے خرچ کا بوجھ ہم باخوشی اٹھائیں گے۔ اس زمانہ میں دو تین ہزار روپے میں ایک اچھے گھرانے کا خرچ چل سکتا تھا مگر کسی کو اس ذمہ داری کے لینے کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ آج کل تو معمولی عالموں کے لئے لوگ ساٹھ ہزار روپے فی ہفتہ بھی ٹی وی کی تقریروں پر خرچ کر دیتے ہیں لیکن اتنے بڑے کام کے لئے اس وقت کوئی صاحب حیثیت شخص آگے نہ آیا۔ اگر علامہ ؒ یہ کتاب لکھ دیتے تو معلوم نہیں کیا کیا کچھ قرآن کی وضاحت میں لکھتے۔

وہ نمونے جو علامہ ؒ قرآن کے متعلق لکھی جانے والی کتاب میں لکھ سکتے تھے

علامہ اقبال ؒ کے کلام کی نوعیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ضرور قرآن پر ایک ایسی نادر کتاب لکھتے۔ آپ نے جو قرآن اور حدیث پر لکھا ہے اس پر ایک رسالہ ٹائپ کا نوٹ ہماری کتاب ''سنتِ مبارکہ'' سے اگر مطالعہ کیا جائے تو بہت سے رموز کا اس میں اظہار ہوتا ہے۔ اگر آپ کا دوسرا کلام بھی اس نظریے سے دیکھا جائے کہ آپ نے قرآن پر کون سے نوادرات یا ندرت کا اظہار کیا ہے تو بہت سی نئی باتیں مل جاتی ہیں۔ ایسے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس کتاب میں کس نوعیت کا کلام بیان میں لاتے۔ اس جگہ موقع کی مناسبت سے علامہ ؒ کے افکار کے چند نمونے پیش کئے جا رہے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ؒ کے انوکھے خیالات موجودہ کلام میں بھی جھلکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نیچے اختصار کے ساتھ چند نمونوں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ ان اشعار کی طرح اگر دیگر اشعار کو بھی لکھا جائے تو مکمل ایک کتاب کی ضخامت تک نوبت پہنچ جائے گی۔ اس جگہ تشریح میں چند اشعار پر ہی اکتفا کیا جائے گا شاید آنے والے کچھ لوگ ہماری اس کوشش کو آگے بڑھائیں اور قرآن کے موضوعات کو علامہ ؒ کے کلام میں سے چن کر تفصیل کے ساتھ لکھ دیں۔

مثال نمبر ۱

علامہ اقبال ؒ اپنے کلام میں کبھی کبھی ایسے اشعار لکھ دیتے ہیں جن سے قرآن کی وضاحت اور معانی کی وسعت نظر آتی ہے۔ مثلاً درج ذیل شعر ہی کو لیجئے

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن (ض۔ک: ۵۲۲)

اس ساری غزل کے تمام اشعار میں انوکھی باتوں کا اظہار ہو رہا ہے۔ اس شعر میں مومن کو قرآن کہا گیا ہے، کیونکہ قرآن کی تو کئی قسمیں ہیں۔ جہاں بھی قرآن کی طرح کا عمل نظر آئے تو وہ بھی قرآن ہے۔ فطرت کی ہر چیز فطرۃُ اللہ کا اظہار کر رہی ہے اور اس شعر میں مومن کو اس لئے قرآن کہا گیا ہے کہ چونکہ قرآن کی طرح

مومن بھی ہدایت دیتا ہے اور ہدایت پھیلاتا ہے اس لئے یہ بھی قرآن کی طرح ایک چلتا پھرتا قرآن ہے۔ یہ شعر قرآن کے معانی کی وضاحت کرتا ہے۔ اس نظم میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ مومن کی ہر لحظہ ایک نئی شان ہے، کردار میں اللہ کی برحان ہے، مومن کن عناصر سے مومن بنتا ہے، وہ ہمسایہ جبریل امیں ہے، اس کا گھر کہیں نہیں؛ مومن دنیا میں بھی میزان اور قیامت میں بھی میزان ہے، مومن جگرِ لالہ کی ٹھنڈک ہے اور دریاؤں کے دل بھی اس کی نظر سے دہل جاتے ہیں۔ آپ نے مزید فرمایا کہ یہ مومن دنیا میں سورۂ رحمٰن کی طرح ہم آہنگ ہے، مہ وانجم مومن کی فکر کے عمل وسوچ سے بنتے ہیں۔ یہ تمام راز کی باتیں ہیں جن کو کم ہی شعراء بیان کرتے ہیں۔

مثال نمبر ۲

اسی نوعیت کا ایک اور شعر جو قرآن کے معانی کو کھولتا ہے درج ذیل ہے۔

خودی سے اس طلسمِ رنگ و بُو کو توڑ سکتے ہیں یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

(ب۔ج: ۳۱۴)

علامہؒ نے اس شعر میں توحید کی وضاحت کی ہے اور بتایا ہے کہ اصل توحید تو وہی ہے جو اس شعر میں بیان کی گئی ہے۔ اس توحید کو نہ تو سمجھا ہے اور نہ میں سمجھا ہوں۔ وہ توحید کیا ہے؟ غور کرنے سے پتہ چلے گا کہ طلسم رنگ وبو کو توڑنا ہی توحید ہے اور یہ خودی سے ٹوٹتی ہے۔ طلسم رنگ وبو کو اشارے کے طور پر قرآن نے فرمایا کہ

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (الحجرات: ۱۳) تم میں سے بہتر وہی ہے جو زیادہ متقی ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوگا کہ بہتر شخص وہی ہوگا جو تقوے کے علاوہ ہر چیز کی نفی کرے۔ اس شعر کا مقصود یہ ہے کہ کسی گورے شخص کو کالے شخص پر کوئی فضیلت نہیں، کسی امیر کو غریب پر کوئی فضیلت نہیں، کسی ایک پیشہ ور کو دوسرے پیشہ ور پر کوئی فضیلت نہیں، کسی حاکم کو کسی قوم یا محکوم پر کوئی فضیلت نہیں۔ کسی قبیلہ کو (ماسوئی قبیلہ نبی اکرم ﷺ) کسی دوسری ذات یا قبیلے پر کوئی فوقیت نہیں۔ اگر فوقیت ہے تو صرف پرہیزگاری اور تقویٰ کو ہے۔ علامہؒ نے اس شعر میں اس بات کو باور کرایا ہے کہ دنیاوی فضیلتوں کو اہمیت حاصل نہیں ہے اور اگر اہمیت ہے تو فقط اہلِ تقویٰ کو ہی حاصل ہے۔ فرماتے ہیں اصل توحید یہی تو ہے کہ دنیاوی تفاخر کو وزن نہ دیا جائے۔ فرماتے ہیں کہ توحید یہی ہے جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا۔ کیا خوب توحید کو واضح کیا ہے۔ اس نوعیت کے علامہ اقبالؒ کے اشعار جو قرآن کی آیات کو واضح کرتے ہیں ان میں سے تین شعر حسب ذیل ہیں۔

مثال نمبر ۳

دل ہے مسلماں میرا نہ تیرا تو بھی نمازی میں بھی نمازی!
میں جانتا ہوں انجام اس کا جس معرکے میں مُلّا ہوں غازی!

ترکی بھی شیریں، تازی بھی شیریں　حرف محبت ترکی نہ تازی! (ب۔ج: ۳۶۳)

قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا (النساء: ۱۳۶)　اے ایمان والو! ایمان لے بھی آؤ۔

اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ بعض اوقات انسان مسلمان ہوتے ہوئے بھی مسلمان نہیں ہوتا۔ یہی بات پہلے شعر میں بیان کی گئی ہے۔ سورہ الماعون کی آیت نمبر ۴ اور ۵ میں بھی فرمایا گیا ہے کہ

فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ ۙ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۙ (الماعون: ۴۔۵)　پس خرابی ہے ایسے نمازیوں کے لئے جو اپنی نماز (کی ادائیگی) سے غافل ہیں۔

اس آیت میں بھی ان نمازیوں کا ذکر ہے جو اپنی نماز سے بھی غافل ہیں۔ سورہ ھود کی آیت نمبر ۱۴ میں ہے۔

فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ (ھود: ۱۴)　پس کیا (اب) تم اسلام لے آؤ گے؟

علامہؒ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ

شہید محبت نہ کافر نہ غازی　محبت کی رسمیں نہ ترکی نہ تازی (ب۔ج: ۴۳۸)

اس شعر میں بھی یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمان ہونے کے لئے کچھ خاص ضروریات ہیں اور دنیاوی محبت میں شہید ہونے والوں کا اسلام کے فعل سے کوئی تعلق نہیں۔ ایسا شخص نہ کافر ہے اور نہ غازی (یعنی مسلمان وہ ہے جو اسلام پر پابندی کا اظہار کرے دنیاوی محبت میں خودکشی جائز نہیں۔ ایسا مرنے والا نہ کافر ہے اور نہ غازی۔

مثال نمبر ۴

علامہؒ نے فرمایا ہے کہ اسلام پر قائم رہنے سے ہی انسان مسلمان بنتا ہے اور قرآن کو پڑھنا صرف اسی وقت فائدہ دیتا ہے جب قاری یہ محسوس کرے کہ وہ قرآن اس طرح پڑھ رہا ہے گویا کہ قرآن اس پر نازل ہو رہا ہے۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب　گرہ کشا ہے نہ رازیؔ نہ صاحبِ کشاف

کمالِ جوشِ جنوں میں رہا میں گرمِ طواف　خدا کا شکر سلامت رہا حرم کا غلاف

(ب۔ج: ۳۷۰)

گر تو می خواہی مسلماں زیستن　نیست ممکن جز بقرآں زیستن (ا۔ر: ۱۲۳)

(اگر تجھے مسلمان بن کر زندہ رہنا ہے، تو یہ قرآن کے بغیر ممکن نہیں۔)

از یک آئینی مسلماں زندہ است　پیکرِ ملت زقرآں زندہ است (ا۔ر: ۱۲۵)

(مسلمان ایک آئین کی وجہ سے زندہ ہیں، ملت کا لبادہ قرآن سے ہی زندہ ہے۔)

مثال نمبر ۵

خوف نگری کے اثرات میں مسلمان اگر چاہے تو ایک تازہ شریعت ایجاد کر دے۔ اس بارے میں علامہؒ نے فرمایا۔

ہے کس کو یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے　　حریتِ افکار کی نعمت ہے خداداد!
چاہے تو کرے کعبہ کو آتش کدۂ فارس　　چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد
قرآن کو بازیچۂ تاویل بناکر　　چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد
ہے مملکتِ ہند میں اک طرفہ تماشا　　اسلام ہے محبوس، مسلمان ہے آزاد
(ض۔ک:۲۳۔۵۲۴)

علامہؒ فرماتے ہیں کہ قرآن کو مسلمانوں نے بچوں کے تاویلات کا کھیل بنا رکھا ہے اور چند ٹکوں پر قرآن اٹھا کر گواہی دے دیتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے کہ قیامت کے روز نبی کہیں گے کہ الٰہی ان کی امت نے قرآن کو پسِ پشت ڈال دیا تھا۔

إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَٰذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا ۝　　بلاشبہ میری قوم نے اس قرآن کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔
(الفرقان:۳۰)

مثال نمبر ۶

تفکر فی القرآن پر علامہؒ نے بہت زور دیا ہے اور قرآن کریم میں بھی بار بار تفکر فی القرآن کا ذکر ہے۔ ایک حدیث کے مطابق ایک ساعت کا تفکر ستر سالہ بے ریا عبادت سے بہتر ہے، تفکر پر کچھ کلام اس کتاب اور اس باب میں بھی دیا جا چکا ہے، یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

مثال نمبر ۷

علامہؒ فرماتے ہیں کہ۔

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا　　یا اپنا گریباں چاک، یا دامنِ یزداں چاک!
(ب۔ج:۳۴۴)

علامہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے جس طرح مسلمانوں کی اصلاح کے لئے دنیا میں کام کیا ہے اس طرح آخرت میں بھی فارغ نہ بیٹھوں گا اور خدا کے سامنے اپنا گریباں چاک کروں گا کہ امتِ محمد یہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بخش دیا جائے اور اگر خدا اس بات پر راضی نہ ہوا تو میں اس کا دامن پکڑ لوں گا اور کبھی نہ چھوڑوں گا خواہ وہ چاک

ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ اگر اِس اُمت کی بخشش پر رضامند نہ ہوا تو بخشش کے لئے علامہؒ کی اس حرکت میں ایک نئی ترکیب پائی جاتی ہے۔

قرآن کی آیات میں موجود چند قابل غور رموز

علامہ اقبالؒ نے قرآن میں موجود چند رموز کو اپنے کلام کے ذریعے عوام الناس کی راہنمائی کی ہے۔ تقریباً ہر شعر میں قرآنِ کریم کی پوشیدہ حکمتوں کا آپ نے جو ذکر کیا ہے وہ نیچے دیا جا رہا ہے۔ ان اشعار کے مطالب اشعار کے نیچے دیئے گئے ترجمے سے ظاہر ہیں۔

قرآن قلب کے راستے سے شعور میں داخل ہوتا ہے

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ ہر مسلمان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ آیاتِ الٰہیہ پر غور کرے اور اس طرح ان ذرائع کی طرف قرآن کی روشنی میں قدم اُٹھائے جن کی بدولت انسان فی الحقیقت فطرت پر غلبہ حاصل کرتا ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ میں اس گھر کو صد ہزار تحسین کے برابر سمجھتا ہوں جس گھر میں علی الصبح تلاوتِ قرآن مجید کی آواز آئے۔

علامہؒ فرماتے ہیں کہ دراصل قرآن مجید قلب کے راستے سے ہی شعور میں داخل ہوتا ہے اور دماغ کی راہ سے بھی سمجھ میں آتا ہے۔ دماغ کی راہ سے سمجھ آنے کا مطلب یہ ہے کہ حقائق کا ادراک، علم اور فکر، تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں سمجھ میں آتا رہے گا۔ قرآن مجید تمام حقائق کی جامع ہے جو ہمارے ادراک میں آ چکے ہیں اور ان کا بھی جن کا ادراک ابھی باقی ہے۔ خواہ یہ حقائق سنوسی کی زبان سے ادا ہوں خواہ لینن کی حقائق میں۔ بہر حال حقائق تو حقائق ہی ہیں۔ (اقبالؒ کے حضور ص: ۵۷۔۵۸)

علامہؒ نے خطبات میں فرمایا ہے کہ قرآن مجید میں جب کوئی قصہ بیان کیا جاتا ہے تو اس کا مقصد بالعموم یہ نہیں ہوتا کہ کسی تاریخی واقعہ کا ذکر کیا جا رہا ہو۔ اس سے عام طور پر عالمگیر سبق دیا جاتا ہے یا کوئی عالمگیر فلسفیانہ حقیقت اُجاگر کی جاتی ہے۔

علامہ اقبالؒ خطبات میں فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کا حقیقی مقصد تو یہی ہے کہ انسان اپنے اندر ان گوناگوں روابط کا ایک اعلیٰ اور برتر شعور پیدا کرے جو اس کے اور کائنات کے درمیان ہیں۔

چوں مسلماناں اگر داری جگر در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر

(اگر مسلمانوں کی طرح جگر رکھتے ہو تو اپنے ضمیر میں اور قرآن میں نگاہ کرو۔)

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست عصر ہا پیچیدہ در آناتِ اُوست

قرآن کی آیات میں سینکڑوں جہاں تازہ ہیں، اس کی آیاتِ تحقیق میں کئی زمانے پیچیدہ ہیں۔)

چوں کہن گردد جہانے در برش می دہد قرآں جہانے دیگرش (ج۔ن: ۶۵۴)

(اگر اس کا ایک جہاں پرانا ہو جائے، تو قرآن اس کو ایک نیا زمانہ دیتا ہے۔)

جدّتِ کردار

تفکر فی القرآن سے مسلمان کو قرآن کے سمندر سے ہزاروں موتی حاصل ہوتے ہیں مسلمان اگر روح قرآنی کو حاصل کر لیں تو انہیں ہر نعمت اور قوت مل سکتی ہے لیکن پہلے انہیں خود کو بدلنا ہوگا۔

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار
(ض۔ک:۵۹۸)

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی
(ض۔ک:۴۹۳)

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!
(ض۔ک:۴۸۴)

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق!
(ض۔ک:۴۸۴)

غضب ہے سطرِ قرآں کو چلیپا کر دیا تو نے

توحید کو اسلام میں بہت بڑا مقام حاصل ہے لیکن لوگوں نے قرآن کی غلط تاویل سے اسلام میں تفرقہ بازی کو عام کر دیا ہے حالانکہ اللہ بھی، قرآن بھی اور حرم پاک بھی ایک ہے لوگوں نے UNITY OF ACTION & THOUGHT کو اسلام سے غائب کر دیا ہے۔

حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
(ب۔د:۲۰۲)

زمیں کیا آسماں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے غضب ہے سطرِ قرآں کو چلیپا کر دیا تو نے!
(ب۔د:۷۳)

احکام تیرے حق ہیں، مگر اپنے مفسر تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند!
(ب۔ج:۳۱۲)

ز قرآں پیش خود آئینہ آویز

مسلمانوں کی موجودہ زندگی ایسے ہی ہے جیسے جاہلی کی شام آ چکی ہو۔ علامہؒ نے عورتوں کے لئے فرمایا ہے کہ تم پھر قرآن کی تلاوت سے اہل نظر کو متاثر کرو۔ تم جانتی ہو کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بہن کو قرآن پڑھتے

ہوئے سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمان ہو گئے تھے۔ علامہ ؒ فرماتے ہیں کہ قرآن کو میں نے حاصل کیا اور مسلمانوں کی ۱۳۰۰ سالہ غلامی کی رات کو صبح میں تبدیل کر دیا۔

زشامِ ما بروں آور سحر را   بہ قرآں باز خواں اہلِ نظر را

(ہماری شام نے سحر کو پیدا کر، پھر قرآن کی تلاوت سے اہلِ نظر کو متاثر کر۔)

تو میدانی کہ سوزِ قرأت تو   دگرگوں کرد تقدیرِ عمرؓ را (ا۔ح:۹۷۶)

(تو جانتی ہے کہ تری سوزِ قرأت نے، حضرت عمرؓ کی تقدیر بدل دی تھی۔)

ازاں نورے کہ از قرآں گرفتم   سحر کردم صدوسی سالہ شب را (ا۔ح:۹۶۳)

(اس نور سے کہ جو میں نے حاصل کیا، میں نے ۱۳۰۰ سالہ (غلامی کی) شب کو سحر میں بدل دیا ہے۔)

زقرآں پیش خود آئینہ آویز   دگرگوں گشتۂ! از خویش بگریز (ا۔ح:۹۵۵)

(تو اپنے سامنے قرآن کا آئینہ رکھ، تمہاری حالت غیر ہو چکی ہے۔ اس سے بچو۔)

تو قرآں را سرِ طاقِ نہادی

مسلمان اپنی کم عقلی اور کم عملی کے باعث مصائب کو خود ہی مول لیتے ہیں کیونکہ وہ اول تو اسلام کی راہ پر چلتے نہیں اور چلیں تو دو قدم چل کر گر جاتے ہیں۔ ہندوں نے اپنے بتوں سے گھروں کے طاقوں کو سجایا ہے مگر تم نے تو اپنے قرآن کو بالائے طاق رکھ دیا ہے اور اس کی تلاوت نہیں کرتے جبکہ ہندو بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔

درِ صد فتنہ را برخود کشادی   دو گامے رفتی و از پا فتادی

(سینکڑوں فتنوں کے دروازے تو نے خود اپنے لئے کھولے ہیں، دو قدم چلا اور گر پڑا۔)

برہمن از بتاں طاقِ خود آراست   تو قرآں را سرِ طاقے نہادی! (ا۔ح:۹۷۸)

(برہمن نے بتوں سے اپنے طاق کو سجایا، مگر تو نے اپنے قرآن کو طاق کے اُوپر رکھ دیا۔)

برگ وساز ما کتاب وحکمت است

علامہؒ فرماتے ہیں کہ قرآن مسلمانوں کے لئے آب حیات ہے۔ ہمارا سرمایہ قرآن اور حکمت ہے۔ ان ہی قوتوں سے قومیں بنتی ہیں۔

بر خور از قرآں اگر خواہی ثبات   در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات

(اگر قرآن سے ثبوت چاہتے ہو، تو قرآن کی ضمیر میں مَیں نے آب حیات دیکھی ہے۔)

می دہد مارا پیامِ لاتخف   می رساند بر مقامِ لاتخف (پ۔چ:۸۸۱)

(ہم کو لاتخف کا پیام دیتا ہے، ہمیں لاتخف کے مقام تک پہنچاتا ہے۔)

برگ و سازِ ما کتاب و حکمت است ایں دو قوت اعتبارِ ملت است (پ۔چ:۸۷۹)

(ہمارا ساز و ساماں کتاب اور حکمت ہے، یہ دو قوتیں کسی ملت کا اعتبار بنتی ہیں۔)

ہر دو را از حکمتِ قرآں سبق اوز حق گوید، من از مردانِ حق (پ۔چ:۸۶۲)

(میں نے اور سنائی نے حکمتِ قرآن کا سبق دیا، اس نے اللہ کی باتیں بتائیں اور میں نے اللہ والوں کی باتیں بیان کیں۔)

غیرِ قرآں غمگسارِ من نہ بود

علامہؒ فرماتے ہیں کہ قرآن کے علاوہ ہی کوئی غم گسار نہیں ہے اور یہی تحفہ میں نے قوم کے سامنے پیش کیا ہے۔

در حضورِ آں مسلمانِ کریم ہدیہ آوردم ز قرآنِ عظیم (پ۔چ:۸۵۸)

(شریف نفس مسلمانوں کے لئے تو، میں قرآنِ عظیم کا ہدیہ لایا ہوں۔)

غیرِ قرآں غمگسارِ من نہ بود قوتش ہر باب را بر من کشود (پ۔چ:۸۵۹)

(قرآن کے علاوہ میرا کوئی غم گسار نہ تھا، اس کے ہر باب نے مجھ پر قوت کو کھولا)

گم شو بقرآن و خبر

مسلمانوں کے غموں کا علاج یہ ہے کہ وہ قرآن و خبر یعنی قرآن و حدیث میں گم ہو کر اپنے اندر نظر کریں۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں میں صبح کے وقت قرآن خوانی کا لطف باقی نہیں رہا۔ علامہؒ فرماتے ہیں کہ اپنی نوا کو سینے میں پالینا اب کہاں نظر آتا ہے جس کے دم سے ہزاروں غنچوں کو کھولا جاسکتا ہے۔

اندکے گم شو بقرآن و خبر بازاے ناداں بخویش اندر نگر (پ۔چ:۸۵۵)

(کبھی قرآن اور حدیث میں گم ہو جا، اے ناداں پھر اپنے اندر دیکھ)

نغمۂ من در گلوے من شکست شعلۂ از سینہ ام بیروں نجست (پ۔چ:۸۴۶)

(میرا نغمہ میرے حلق میں ہی ٹوٹ گیا ہے، میرا شعلہ میرے سینے سے باہر نہیں جاسکتا۔)

در نفس سوزِ جگر باقی نماند لطفِ قرآنِ سحر باقی نہ ماند (پ۔چ:۸۴۶)

(ہمارے اندر سوزِ جگر باقی نہیں رہا، صبح کی قرآن خوانی کا لطف بھی باقی نہیں رہا۔)

از غلامے لذتِ ایماں مجو

غلامی تو مسلمان کے لئے موت ہے۔ غلام کا تو درود اور عبادت بھی قبول نہیں۔ غلامی میں تو لذتِ ایمان بھی میسر نہیں رہتی۔ علامہؒ نے مردِ آزاد کی بہت اونچی شان بیان کی ہے۔ سیاستِ حاضرہ میں علامہؒ نے بہت

سے اسرار و رموز کو آشکار کیا ہے اور لوگوں کے لئے دینی کیفیات کو بیان کیا ہے ۔

از قیامِ بے حضورِ من مپرس از سجودِ بے سرورِ من مپرس

(ہمارے بے حضوری کے قیام کی بات نہ کرو، ہمارے بے سرور سجود کی بات نہ کرو۔)

مردے آزادے چو آید در سجود در طوافش گرم رو چرخِ کبود

(آزاد مرد جب سجدے میں آتا ہے، اس کے طواف میں آسمان بھی سرگرم ہو جاتا ہے۔)

ما غلاماں از جلالش بے خبر از جمالِ لازوالش بے خبر

(ہم غلام آزاد مردوں کے جلال کو نہیں جانتے اور اس کے لازوال جمال کو بھی نہیں جانتے۔)

از غلامے لذّتِ ایماں مجو گرچہ باشد حافظِ قرآں مجو (پ۔چ: ۸۴۳)

(غلاموں سے ایمان کی لذت تلاش نہ کرو، اگرچہ وہ حافظ قرآن ہی کیوں نہ ہو۔)

فقرِ قرآں ہست و بود کا حساب کرتا ہے۔

مسلمان میں مستی رقص و سرود نہیں ہے۔ بندہ فقر سے مولا صفات بن جاتا ہے۔ پس چہ باید میں ایک نظم فقر پر لکھی گئی ہے جس میں فقر کی صفات کا ذکر کیا گیا ہے اس کی تفصیل فقر کے باب میں دے دی گئی ہے ۔

فقر قرآں احتسابِ ہست و بود نے رباب و مستی و رقص و سرود

(قرآن کا فقر یہ ہے کہ مسلمان جو ہے اور جو تھا کا حساب کرتا ہے، فقر رباب اور مستی و رقص و سرود سے متعلق نہیں)

فقر مومن چیست تسخیر جہات بندہ از تاثیرِ اُو مولا صفات (پ۔چ: ۸۱۸)

(مومن کا فقر یہ ہے کہ جہات کو مسخر کرے، بندہ فقر کی تاثیر سے خدا کی صفات پالیتا ہے۔)

معنیٔ جبریلؑ و قرآں است اُو

حکمتِ کلیمی میں علامہؒ نے مومن کی صفات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ مومن کے دل میں قرآن کا نور ہے۔ وہ معنوی جبریل اور خود ایک قرآن ہے۔ وہ اللہ کی فطرت کا نگہبان ہے ۔

معنیٔ جبریل و قرآں است اُو فِطرۃُ اللہ را نگہبان است اُو (پ۔چ: ۸۰۸)

(مومن معنوی جبریلؑ ہے اور خود ہی قرآن ہے، وہ فطرتِ الٰہی کے قوانین کا نگہبان ہے۔)

نورِ قرآں درمیانِ سینہ اش

تمہید ''پس چہ باید کرد'' میں پیر رومیؒ کے متعلق لکھتے ہیں کہ ان کی منزل چاند و آفتاب سے بلند تھی اور ان کے خیمے کی طنابیں کہکشاں سے بندھی ہوئی ہیں۔ اُن کے سینے میں قرآن کا نور تھا ۔

نورِ قرآں درمیانِ سینہ اش جامِ جم شرمندہ از آئینہ اش (پ۔چ: ۸۰۳)

(اس کے سینے میں قرآن کا نور تھا، ان کے آئینہ سے جام جمشید بھی شرمندہ ہے۔)

مومناں راتیغ با قرآں بس است

علامہؒ نے کئی مقامات پر لکھا ہے کہ مومن کا سامان قرآن، شمشیر اور گھوڑا ہے جس سے وہ جہاد کر کے اپنے جوہر دنیا کو دکھا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ شہزادی شرف النساء کی مثال پیش کرتے ہیں کہ اس نے اپنا یہی اصول بنا رکھا تھا۔ شرف النساء کے متعلق علامہؒ فرماتے ہیں کہ وہ سراپا ذوق وشوق اسلام سے سرمست تھی اور ہمیشہ اپنے ساتھ قرآن اور شمشیر کو رکھتی تھی، اس نے یہ وصیت کی تھی کہ یہ دونوں چیزیں اس کے ساتھ قبر میں دفن کر دی جائیں۔ آپ نے فرمایا کہ مومن کا وجود قرآن پاک سے حرارت پاتا ہے۔

تا ز قرآں پاک می سوزد وجود از تلاوت یک نفس فارغ نبود

(تا کہ قرآن سے اس کا وجود حرارت پاتا رہے، اس کی تلاوت سے وہ ایک لمحہ بھی فارغ نہ تھی۔)

در کمر تیغ دو رو قرآں بدست تن بدن ہوش و حواس اللہ مست!

(وہ کمر میں دو دھاری تیغ اور ہاتھ میں قرآن رکھتی تھی، اس کا تن باہوش وحواس تھا اور وہ اللہ مست تھی۔)

خلوت و شمشیر و قرآن و نماز اے خوش آں عمرے کہ رفت اندر نیاز!

(اس کی خلوت میں بھی شمشیر وقرآن اور نماز ہوتی تھی، وہ جوانی میں ہی اس نیاز مند زندگی میں چلی گئی۔)

گفت اگر از راز من داری خبر سوے ایں شمشیر و ایں قرآں نگر

(ج۔ن:۷۴۴)

(کہتی تھی کہ اگر تم میرے راز سے خبردار ہونا چاہتے ہو تو اس قرآن اور شمشیر کی طرف دیکھو)

مومناں را تیغ با قرآں بس است تربتِ ما را ہمیں ساماں بس است

(مومنوں کو قرآن اور تلوار بہت کافی ہے، ہماری قبر کے لئے بھی یہی ساماں کافی ہے۔)(ج۔ن:۷۴۵)

سینہ ہا از گرمئ قرآں تہی

''بخنے نژادنو'' سے مخاطب ہو کر علامہؒ فرماتے ہیں کہ ایسی بے دین قوم کیا کر سکتی ہے جس کا سینہ قرآن سے خالی ہو ان سے کیا اُمید رکھ سکتے ہو۔

روح چوں رفت از صلوٰت و از صیام فرد ناہموار و ملت بے نظام!

(جب مسلمان کی روح نماز اور روزے سے نکل گئی تو مرد غلط رو اور ملت بے نظام ہو جاتی ہے۔)

سینہ ہا از گرمئ قرآں تہی از چنیں مرداں چہ امید بہی (ج۔ن:۷۸۸)

(ان کے سینے گرمئ قرآن سے خالی ہو گئے، ایسے مردوں سے نیکی کی کیا اُمید رکھی جاسکتی ہے۔)

صاحبِ قرآں و بے ذوقِ عمل

علامہؒ فرماتے ہیں کہ یہ حیرانی کی بات ہے کہ مسلمان صاحبِ قرآن ہوتے ہوئے بھی بے عمل ہیں۔ ان کی سمجھ کو کیا ہو گیا ہے۔

ہر کسے بر جادۂ خود تندرو ناقۂ ما بے زمام و ہرزہ دو!

(ہر کوئی اپنی خیال آرائیوں پر ڈٹا ہوا ہے، ہماری اونٹنی بے مہار ہے اور آوارہ ہو چکی ہے۔)

صاحبِ قرآں و بے ذوقِ طلب العجب ثم العجب ثم العجب!(ج۔ن:۷۸۹)

(صاحبِ قرآن ہو کر بھی قرآن کی طلب نہیں رکھتے، یہ بات کتنی عجیب ہے، کتنی ہی عجیب ہے۔)

چیست جز قرآن و شمشیر و فرس

(مردِ مومن کو قرآن، شمشیر اور گھوڑا اعزیز ہے۔ مسلمان کو اور کیا دولت چاہیئے۔)

"سخنے بہ نژادِ نو" میں ہے کہ شہنشاہ ظفر جو سلاطین گجرات میں سے تھے اور سلطان محمود کے بیٹے تھے اُن سے ہندو کینہ اور بغض رکھتے تھے، ان کو اسلامی شعار پسند تھا اور صحیح معنوں میں مسلمان تھے۔

مردِ مومن را عزیز اے نکتہ رس چیست جز قرآن و شمشیر و فرس؟ (ج۔ن:۷۹۲)

(مظفر مردِ مومن کو یہ بات عزیز تھی اے نکتہ سمجھنے والے کہ اس کے لئے قرآن، شمشیر اور گھوڑے کے سوا کوئی چیز اہم نہ تھی۔)

عالماں از علمِ قرآں بے نیاز

علامہؒ فرماتے ہیں کہ آج کل کے مسلمانوں میں وہ پہلے سا ذوق و شوق کہاں۔ ان کے علماء بھی قرآن سے بے نیاز ہو چکے ہیں اور یہی حال صوفیوں کا ہے۔

در مسلماناں مجو آں ذوق و شوق آں یقیں' آں رنگ و بو آں ذوق و شوق

(مسلمانوں میں اب وہ ذوق و شوق نہ تلاش کرو، وہ یقین اور وہ قرآن کا رنگ و بو کہاں ہے۔)

عالماں از علمِ قرآں بے نیاز صوفیاں درندہ گرگ و مُو دراز

(عالم لوگ قرآن کے علم سے بے نیاز ہیں، صوفی لوگ درندہ بھیڑیے اور لمبے بالوں والے ہیں۔)

گرچہ اندر خانقاہاں ہائے و ہوست کو جوانمردے کہ صہبا در کدوست (ج۔ن:۷۹۴)

(اگرچہ خانقاہوں میں ہاؤ ھو ہوتا ہے، ایسا جواں مرد کہاں ہے کہ اُن کے پیالے میں شراب ہو۔)

می دھد قرآں جہانِ دیگرش (قرآن انسان کو ایک نیا جہاں دیتا ہے۔)

بندۂ مومن خدا کی نشانیوں میں سے ہے۔ اِس کی قامت میں دنیا کی ہر چیز سما جاتی ہے۔ اگر اس کی ایک

قبا خراب ہو جائے تو قرآن اس کو نئی زندگی عطا کر دیتا ہے۔

بندہ مومن ز آیات خداست　هر جهاں اندر بر او چوں قباست

(بندۂ مومن اللہ کی نشانیوں میں سے ہے، اس کی قامت پر جہاں کی ہر چیز قبا کی طرح سج جاتی ہے۔)

چوں کہن گردد جہانے در برش　می دهد قرآں جہانے دیگرش (ج۔ن: ۶۵۴)

(جب اس کے ایک جہان کی قبا پرانی ہو جاتی ہے، تو قرآن پاک اس کو ایک نیا جہاں دے دیتا ہے۔)

کشتنِ ابلیس از شمشیرِ قرآں

علامہ فرماتے ہیں کہ ابلیس سے چھٹکارا پانا بہت مشکل ہے لیکن "حکمت خیرِ کثیر است" میں فرماتے ہیں کہ قرآن اور حکمت کی تلوار سے اس کو مار دیا جائے اور اس کو قرآن کے ذریعے مسلمان کر لیا جائے۔

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است　زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است

(ابلیس کو مار دینا مشکل کام ہے، کیونکہ وہ دل کی گہرائیوں میں گم ہے۔)

خوشتر آں باشد مسلمانش کنی　کشتۂ شمشیر قرآنش کنی (ج۔ن: ۶۶۳)

(بہتر یہ ہے اس کو مسلمان کیا جائے، اس کو قرآن کی شمشیر سے مارا جائے۔)

دامنِ قرآں بگیر آزاد شو

علامہ فرماتے ہیں کہ اگر تم دنیا میں آزاد رہنا چاہتے ہو تو قرآن کے دامن کو پکڑ لو۔

گر چہ دارد شیوہ ہائے رنگ رنگ　من بجز عبرت نگیرم از فرنگ

(اگر چہ افرنگ کے اندر رنگ برنگ کی عریانی ہے، لیکن میں فرنگیوں سے سوائے عبرت کے اور کچھ حاصل نہیں کرتا۔)

اے بہ تقلیدش اسیر آزاد شو　دامنِ قرآں بگیر آزاد شو (ج۔ن: ۶۶۰)

(اے مسلمان تو فرنگ کی تقلید کا قیدی ہے اس سے آزاد ہو جا، قرآن کا دامن پکڑ اور آزاد ہو جا۔)

حفظِ قرآنِ عظیم آئین تست

سعید حلیم پاشا کی نظم میں علامہ فرماتے ہیں کہ کافر تو جہاد کے لئے تیار رہتے ہیں اور مسلمان فی سبیل اللہ فساد میں لگے رہتے ہیں، حالانکہ مومن کی زندگی تو اس کے افکار کی درستی میں ہے اور تمہاری اپنی اصلاح میں ملت کی بقا ہے۔ مسلمان کے دین کی حفاظت تو اس کے آئین یعنی قرآن کی حفاظت میں ہے اور دنیا میں حق بات کہنا مسلمانوں کا دین ہے۔

دینِ کافر فکر و تدبیر جہاد　دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد

(کافر کا دین تدبیر جہاد کی فکر کرنا ہے اور ملا کا دین تو خدا واسطے (بلاوجہ) فساد پیدا کرنا ہے۔)

اے ز افکار تو مومن را حیات از نفسہائے تو ملت را ثبات

(اے مسلمان تیرے افکار میں مومنوں کی زندگی ہے اور تیری اپنی اصلاح میں تو ملت کی بقا ہے۔)

حفظِ قرآنِ عظیم آئینِ تست حرفِ حق را فاش گفتن دینِ تست (ج۔ن:۶۶۴)

(اپنے قرآن کی حفاظت کرنا تمہارا آئین ہے، سچی بات کو کھلا کہہ دینا تمہارا دین ہے۔)

فقرِ قرآں اِختلاطِ ذکر و فکر

مسلمان کی منزلِ مقصود تو قرآن ہے مگر مسلمانوں کے دل میں سوز نہیں اور رسول اللہ ﷺ کی محبت کا نوران کے دل میں نہیں۔ مسلمان قرآن کا پھل نہیں کھاتے۔ اصل شہنشاہی تو قرآن سے ہے۔ باقی سب روباہی ہے۔ ''پیغامِ افغانی باملت روسیہ'' میں علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کی موجودہ حالت کا ذکر کیا ہے اور قرآن کو مسلمانوں کا آئین قرار دیا ہے کیونکہ قرآن کی بغیر مسلمان لاشے ہیں۔

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است رسم و آئینِ مسلماں دیگر است

(قرآن کی منزل و مقصو کچھ اور رہی ہے، مسلمانوں کی رسم اور آئین کچھ اور چیز ہے۔)

در دل اُو آتشِ سوزندہ نیست مصطفیٰؐ درسینۂ اُو زندہ نیست

(مسلمان کے دل میں آگ نہیں سلگ رہی، اس کے دل میں یہ خیال ہے کہ مصطفیٰ زندہ نہیں ہیں یعنی ان کی یادتازہ نہیں ہے۔)

بندۂ مومن زقرآں برنخورد در ایاغِ اُو نہ مے دیدم نہ دُرد

(آج کا مسلمان قرآن کا پھل نہیں کھاتا، اس کے پیالے میں نہ شراب ہے اور نہ تلچھٹ)

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست خود سرِ تختِ ملوکیت نشست (ج۔ن:۶۶۶)

(قیصر و کسریٰ کا جادو خود ٹوٹ گیا اور مسلمان اس کے بعد تخت نشین ہو گیا۔)

جز بقرآں ضیغمی روباہی است فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است

(ج۔ن:۶۶۸)

(قرآن کے بغیر کوئی شیر بھی ہو تو وہ گیدڑ ہے، قرآن کا بیان کردہ فقر ہی بادشاہی ہے۔)

علامہؒ فرماتے ہیں کہ قرآن کا فقر تو ذکر و فکر کو ملانے سے آتا ہے۔ یہ بے سروسامان بندوں کی دستگیری کرتا ہے اور حاکموں کے لئے موت ہے۔

فقرِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر فکر را کامل ندیدم جز بذکر

(قرآن کا فقر تو ذکر و فکر کا مجموعہ ہے، ہم نے ذکر کے بغیر فکر کو مکمل نہیں پایا۔)

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغام مرگ دستگیر بندۂ بے ساز و برگ (ج۔ن:۶۶۸)

(قرآن کیا ہے؟ وہ حاکمیت کے لئے پیغامِ موت ہے، اس کا کام بے سروسامان لوگوں کی دستگیری کرنا ہے۔)

اند کے با نورِ قرآنش نگر

علامہؒ فرماتے ہیں کہ جب سے قرآن نازل ہوا ہے اس وقت سے تمام جوگیوں رشی منیوں کے طلسم ٹوٹ گئے ہیں۔ یہ قرآن تو ہر مشکل کا حل پیش کرتا ہے۔ یہ مسلمانوں کو کہتا ہے اپنی جان ہتھیلی پر رکھو اور جنگ کے لئے تیار رہو اور زائد از ضرورت مال کو اسلام اور غرباء میں تقسیم کردو۔ مسلمانوں نے اپنا دین اور ہی کچھ بنالیا ہے۔ ذرا قرآن کے نور سے دیکھو تو پتہ چلے گا۔

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست نقشہائے کاہن و پاپا شکست

(جب سے اس جہاں میں قرآن کا نقش ثبت ہوا، تو کاہنوں اور پاپاؤں کے نقش ٹوٹ گئے۔)

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ایں کتابے نیست' چیزے دیگر است

(جو میرے دل میں بات ہے وہ میں صاف کہتا ہوں، کہ یہ قرآن ایک کتاب نہیں کچھ اور ہی چیز ہے۔)

با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ

(قرآن مسلمانوں سے کہتا ہے کہ جان ہتھیلی پر رکھ دو، تیری ضرورت سے جو زائد ہے اسے خرچ کردو۔)

آفریدی شرع و آئینے دگر اند کے با نورِ قرآنش نگر (ج۔ن:۶۶۹)

(تو نے تو اور طرح کا شرع اور آئین وضع کرلیا ہے، ذرا قرآن کے نور سے اس بات پر غور کر۔)

چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت

قرآن میں ملوکیت کی گنجائش نہیں اور جب سے مسلمانوں نے خلافت سے رشتہ توڑا تو ان کی آزادی کے حلق میں ملوکیت نے زہر انڈیل دیا۔ اسلام میں تلوار کا استعمال فقط دین اور اُس کی عزت برقرار کرنے کے لئے ہے۔ یہ تو حق کی خاطر جنگ کرتا ہے، جس طرح حضرت امام حسینؓ نے آزادی کے شعلے اکٹھے کئے۔

چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت حریت را زہر اندر کام ریخت

(جب خلافت نے اپنا رشتہ قرآں سے توڑلیا، تو اس نے حریت کے حلق میں زہر انڈیل دیا۔)

خاست آں سر جلوۂ خیر الامم چوں سحاب قبلہ باراں در قدم

(اس کے بعد دلوں میں خیر الامم (رسالتمابؐ) کا جلوہ اٹھا، جیسے قبلہ کی جانب سے بارش سے بھرپور بادل آتے ہیں)

تیغ بہرِ عزتِ دیں است و بس مقصدِ اُو حفظِ آئین است و بس

(شمشیر تو دین کی عزت برقرار رکھنے کے لئے ہے تلوار کا مقصد آئین (قرآن) کی حفاظت کرنا ہے۔)

رمزِ قرآن از حسینؓ آموختیم زآتش اُو شعلہ ہا اندوختیم (ا۔ر:۱۱۱۔۱۱۰)

(ہم نے قرآن پاک کے رموز حضرت حسینؓ سے سیکھے، ان کی روشن کی گئی آگ سے ہم نے آزادی کے شعلے اکٹھے کئے۔)

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم

رسول اللہ ﷺ کی قرآن میں تعریف کی گئی ہے۔ قرآن تا قیامت زندہ رہے گا۔ اس کے مٹانے پر کوئی قادر نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کی حفاظت خدا کے ذمے ہے۔ اس کے ساتھ تمسک کرنے سے بے ثبات لوگوں کو زندگی کا ثبات ملتا ہے۔

آں کہ در قراں خدا اورا ستود آں کہ حفظِ جانِ اُو موعود بود (ا۔ر:۱۱۴)

(رسالتمآب کی ذات وہ ہے کہ قرآن ہی میں ان کی تعریف کی گئی اور قرآن کی جان کی حفاظت کا ذمہ لیا۔)

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم حکمتِ اُو لایزال است و قدیم

(اس کتابِ زندہ یعنی قرآن حکیم کی حکمت لازوال ہے اور قدیم سے تعلق رکھتی ہے۔)

نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

(یہ اسرار حق میں سے ہے جو حیات کو وجود میں لاتی ہے، اس سے پژمردہ چیزوں کو ثبات ملتا ہے۔)

حرفِ اورا ریب نے تبدیل نے آیہ اش شرمندۂ تاویل نے (ا۔ر:۱۲۱)

(اس کے حروف میں شک وشبہ یا تاویل نہیں، اس کی آیات شرمندہ تاویل نہیں۔)

تا دلش از گرمئ قرآں تپید

جب تک مسلمانوں کے دل قرآن کی گرمی سے تپش حاصل کرتے رہے وہ زندہ و جاوید رہے۔ جب بندہ اللہ کے دربار میں اس طرح آیا کہ وہ قرآن سے سبق حاصل کرتا رہا تو ایسا شخص جو غلام بن کر آیا آقائی لے کر نکلا۔

تا دلش از گرمئ قرآں تپید موجِ بے تابش چو گوہر آرمید

(جب تک (عرب کے) لوگوں کے دل قرآن کی گرمی سے تپش حاصل کرتے رہے اس کی موج بیتاب گوہر کی طرح اسودہ رہی۔)

خواند زآیاتِ مبینِ اُو سبق بندہ آمد خواجہ رفت از پیشِ حق (ا۔ر:۱۲۲)

(جب وہ قرآن پاک کی تلاوت سے سبق حاصل کرتا رہا، وہ اللہ کی جناب میں بندہ بن کر آیا اور آقائی لے کر نکلا)

از یک آیئنی مسلماں زندہ است پیکر ملت ز قرآن زندہ است (ا۔ر:۱۲۵)

(مسلمان ایک آئین کی وجہ سے زندہ ہیں، ملت اسلامیہ کی شکل قرآن سے ہی زندہ ہے۔)

قوتِ قرآں وملت مادراں

علامہ اقبالؒ نے عورتوں کی راہنمائی کے لئے طویل کلام کیا ہے۔ اسرار ورموز میں اس کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے ہماری آنے والی تصنیف "متعلقاتِ زوجین" میں بھی اس کی تفصیل دے دی گئی ہے۔

حافظِ رمز اخوت مادراں قوتِ قرآن و ملت مادراں (ا۔ر:۱۵۱)

(رمز اخوت (بھائی چارہ) کی محافظ مائیں ہیں، گویا عورتیں تو ملت اور قرآن کے لئے ایک طاقت ہیں۔)

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی

علامہ فرماتے ہیں کہ مسلمان بلند پروازی کے لئے اپنے پر نہیں کھولتے اور قرآن کو چھوڑ کر خوار ہو گئے ہیں وہ زمانے کی مشکلات کا شکوہ کرتے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ ان کے پاس قرآن موجود ہے جس سے وہ آسمان کی طرف پرواز کر سکتے ہیں۔

تو بہ پروازے پرے نکشودۂ کرمک استی زیرِ خاک آسودۂ

(تو پرواز کے لئے پر نہیں کھینچتا، تم مٹی کے کیڑے کی طرح مٹی کے نیچے آرام کر رہے ہو۔)

خوار از مہجوری قراں شدی شکوہ سنج گردشِ دوراں شدی

(تم قرآن کو چھوڑ کر ذلیل وخوار ہو چکے ہو، (مزید یہ کہ) زمانے کے حالات کا شکوہ کرتے ہو۔)

اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ در بغل داری کتاب زندۂ

(اے کہ تو زمین پر گرا پڑا ہے، اور تیری بغل میں کتاب زندہ (قرآن) ہے۔)

تا کجا بر خاک می گیری وطن رخت بردار و سر گردوں فگن (ا۔ر:۱۶۵)

(کب تک خود کو خاک وطن بنائے رکھو گے، (اس ذلت سے) نکلو اور اپنے سر کو آسمان کی طرف کرو۔)

ز رازیؔ معنیٔ قرآں چہ پرسی

علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ رازی سے قرآن کے معنی کیا پوچھتے ہو۔ انسان کا ضمیر ہی قرآن کی آیات کی حقانیت کی دلیل دے رہا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے بالِ جبریل میں یہ فرمایا ہے کہ جب تک تمہارے دل پر نزولِ کتاب نہ ہو تو قرآن کے

معنی نہ رازی کی تفسیر سے سمجھ میں آتے ہیں اور نہ صاحب کشاف کی تحریروں سے سمجھ میں آتے ہیں۔

ترے ضمیر پہ جب نہ ہو نزولِ کتاب گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف (ب۔ج:۳۷۰)

زرازی معنیٔ قراں چہ پرسی ضمیر ما بآیاتش دلیل است (پ۔م:۲۱۲)

(رازی سے قرآن کے معنی کیا پوچھتے ہو، ہمارا ضمیر ہی آیاتِ قرآن پر گواہی دے رہا ہے۔)

خرد آتش فروزد دل بسوزد ہمیں تفسیرِ نمرود و خلیل است (پ۔م:۲۱۲)

(خرد (عقل) نے آگ جلائی تو دل اس میں کود پڑا، واقعہ نمرود و خلیل کی یہی تفسیر ہے۔)

''لالۂ طور'' پیامِ مشرق میں اس بات کا بیان کرتا ہے کہ تجلیاتِ طور جو ایک شعلے کے روپ میں تھی۔ اس کی شکل کے اعتبار سے ان تجلیات کو لالۂ طور سے تشبیہ دی ہے۔ اس میں تجلیاتِ الٰہی کے مضامین ہیں لالۂ ایک سرخ پھول ہے جو تجلی کی مانند ہے۔

تو قرآنی و من سیپارۂ تو

علامہ اقبالؒ اللہ تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں کہ میں ہمہ وقت خدا اور رسول اللہ ﷺ کے گرد طواف کرتا ہوں اور آپ کے نور سے میں بھی نور ہو گیا ہوں۔ جب بندہ خدا اور رسول اللہ ﷺ سے دور ہو گیا تو وہ نامکمل رہ جاتا ہے۔

تو خورشیدی و من سیّارۂ تو سراپا نورم از نظارۂ تو

(تو سورج ہے اور تیرے گرد (چکر لگانے والا سیارہ، تیرے نظارے سے میں بھی سراپا نور بن گیا ہوں۔)

ز آغوشِ تو دورم ناتمام ۔تو قرآنی و من سیپارۂ تو (پ۔م:۲۱۸)

(میں تجھ سے دور ہوں تو نامکمل ہوں، تو قرآن ہے اور میں تیرا سیپارہ ہوں۔)

علامہ اقبالؒ کا قرآن پر نثری کلام

علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں قرآن پر کافی کلام کیا ہے۔ جو احباب اقبالؒ کے لیکچرز کا قرآن کے حوالے سے مطالعہ کرنا چاہیں تو وہ احباب نذیر نیازی کا ترجمہ لے کر خطباتِ اقبالؒ کا مطالعہ کریں۔ اس کتاب کے آخر میں ایک فہرست ہے جس میں قرآن کا تعلق مختلف عنوانات کے ساتھ ہونے کا ذکر ہے۔ چند عنوانات ہیں تقدیر، زمان، خودی، اجتہاد، بقائے دوام، وحی، مقصدِ قرآن، تصوف، فطرت، دعا، ایجاب، بعثت بعد الموت، نجات، شیطانی واردات، ادراک بالحواس، روح اور جسم، زمان و مکاں، حقیقتِ مطلقہ، وحدتِ انسانی (حیات) کائنات اور عورت دیئے گئے ہیں لیکن اس جگہ ان کا خلاصہ بھی اگر بیان کیا جائے تو بہت طوالت پر مبنی ہوگا۔ علامہؒ کے شعری کلام کے نمونے تو اُوپر دیے گئے ہیں۔ اس کلام میں بہت سی رموز کی

طرف اشارے کئے گئے ہیں۔ چند نثری نمونے پیش کئے جا رہے ہیں۔

قرآن مجید میں جب کوئی قصہ بیان کیا جاتا ہے تو اس سے مقصد بالعموم یہ نہیں ہوتا کہ کسی تاریخی واقعے کا ذکر کیا جائے، بلکہ اس سے عام طور پر کوئی عالمگیر اخلاقی سبق دیا جاتا ہے یا کوئی عالمگیر فلسفیانہ حقیقت اجاگر کی جاتی ہے۔ (خطبات: ۱۲۴)

قرآن مجید کا حقیقی مقصد تو یہ ہے کہ انسان اپنے اندر گوناگوں روابط کا ایک اعلیٰ اور برتر شعور پیدا کرے جو اس کے اور کائنات کے درمیان ہیں۔ (خطبات: ۱۳)

جس قوم میں طاقت و توانائی مفقود ہو جائے تو پھر اس قوم کا نقطۂ نگاہ بدل جایا کرتا ہے۔ ان کے نزدیک توانائی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترکِ دنیا موجب تسکین۔ (اقبال نامہ اول: ۴۵)

قوت میں صداقت سے زیادہ الوہیت ہے۔ خدا قوی ہے تو بھی اپنے آسمانی باپ کی طرح قوی ہو جا۔ قوی انسان ماحول کی تخلیق کرتا ہے۔ کمزوروں کو ماحول کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا پڑتا ہے۔ قوت باطل کو چھو لیتی ہے تو باطل حق میں بدل جاتا ہے۔ تہذیب مردِ قوی کا ایک خیال ہے۔ (شذرات: ۱۳۲، ۱۴۳)

علامہؒ کے اپنے متعلق چند اقوال

علامہ اقبالؒ کے متعلق بہت سے اقوال مطالعہ میں آتے ہیں جن کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علامہؒ خود ہی ہمارے ساتھ کلام کر رہے ہیں۔ "جہانِ اقبال" اور دیگر کتب میں علامہ اقبالؒ کے ارشادات قلب اور روح کے لئے عجیب اثرات پیدا کرتے ہیں۔ علامہؒ کے اپنے متعلق لکھے ہوئے چند اقتباسات نیچے دیئے جا رہے ہیں تاکہ قارئین بھی اس سے لطف اندوز ہو سکیں۔ آپؒ نے فرمایا "اگرچہ لوگ بدقسمتی سے مجھے بحیثیت ایک شاعر کے جانتے ہی لیکن میں شاعر کی حیثیت سے شہرت کا آرزومند نہیں ہوں"۔ (اقبال نامہ، دوم: ۱۴۱)

میرا ادبی نصب العین نغاذ کے ادبی نصب العین سے مختلف ہے، میرے کلام میں شعریت ایک ثانوی حیثیت رکھتی ہے اور میری ہرگز یہ خواہش نہیں کہ اس زمانہ کے شعراء میں میرا شمار ہو۔ میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں، فن شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی، ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لئے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ (اقبال نامہ، اول: ۱۹۵)

شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کبھی میرا مطمع نظر نہیں رہا کیونکہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لئے میرے پاس وقت نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں، کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے

شاعر تصور نہ کریں۔ (اقبال نامہ، اوّل: ۱۰۸)

میرے کلام کی مقبولیت محض فضل ایزدی ہے ورنہ میں اپنے آپ میں کوئی ہنر نہیں دیکھتا اور اعمالِ صالح کی شرط بھی مفقود ہے۔ (اقبال نامہ اوّل: ۲۳۵)

اقبال عزلت نشین ہے اور اس طوفانِ بدتمیزی کے زمانے میں گھر کی چار دیواری کو کشتی نوح سمجھتا ہے' دنیا اور اہلِ دنیا کے ساتھ تھوڑا بہت تعلق ضرور ہے مگر محض اس وجہ سے کہ روٹی کمانے کی مجبوری ہے۔ (اقبال نامہ اوّل: ۲۵۵)

پبلک کے احترام وعقیدت کا خراج ان لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو عوام کے غلط نظریات اور مذہب کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ مجھے عوام کے احترام کی خاطر ان کے نظریات کو قبول کر کے اپنے آپ کو گرانا اور روحِ انسانی کی فطری آزادی کو دبانا نہیں آتا۔ بائرن، گوئٹے اور شیلے کو اپنے معاصرین کا احترام حاصل نہ ہو سکا۔ میں اگرچہ فنِ شعر میں ان کی ہمسری کا دعویدار نہیں ہو سکتا تاہم مجھے فخر ہے کہ کم از کم اس اعتبار سے ان کی ہم نشینی کا حقدار ضرور ہوں۔ (اقبال نامہ دوم: ۱۲۴، ۱۲۵)

علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ قسم ہے خدائے ذوالجلال کی جس کے قبضہ میں میری جان اور آبرو ہے اور قسم ہے اس بزرگ و برتر وجود کی جس کی وجہ سے مجھے خدا پر ایمان نصیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں' دنیا کی کوئی طاقت مجھے حق بات کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ انشاء اللہ

اگر میری روح کے عمیق ترین خیالات کبھی پبلک پر ظاہر ہو جائیں، اگر وہ باتیں جو میرے دل میں پوشیدہ ہیں کبھی سامنے آ جائیں تو مجھے یقین ہے کہ دنیا میرے انتقال کے بعد ایک نہ ایک دن بالضرور میری پرستش کرے گی۔ وہ میری کوتاہیوں کو بھلا دے گی اور آنسوؤں کی شکل میں خراج تحسین ادا کرے گی۔ (اقبال از عطیہ: ۸۲)

اگرچہ خدا کے فضل سے ایسا بے نیاز دل رکھتا ہوں کہ خود اللہ میاں بھی اس پر رشک کریں گے مگر کبھی کبھی یہ دل بھی افکار دنیا سے عاجز آ ہی جاتا ہے اور علائق کی زنجیروں کی جھنکار بیرونی اشیاء کی طرف سے اُسے عارضی طور پر غافل کر دیتی ہے۔ (صحیفہ اقبال نمبر 1 بنام شاد)

متاع گراں مایہ میں اپنے دامن میں چھپائے رکھتا ہوں، حالات مساعد پاؤں تو دنیا کو دکھاؤں اور اگر حالات مساعد نہ ملے تو اقبال کو خیالات ناگفتہ کا ایک متحرک مزار سمجھ لیجئے گا۔ میں لاہور کے ہجوم میں رہتا ہوں، مگر زندگی تنہائی کی بسر کرتا ہوں، مشاغل ضروری سے فارغ ہوا تو قرآن یا عالمِ تخیل میں قرونِ اولیٰ کی سیر ہوتی ہے۔ (مکاتیب بنام نیاز: ۷)

میں بڑے بڑے مجمعوں میں محض اس لئے نہیں جایا کرتا کہ لوگ دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں' وہ اقبال آیا۔

مجھے اس قسم کی شہرت سے بہت الجھن ہوتی ہے۔ (مکاتیب اقبال: ۴۴ بنام نیاز)

میری طرح امتِ مرحومہ میں سینکڑوں آدمی آگے گزر گئے ہیں جنھوں نے رکاوٹوں کے ہوتے ہوئے کام کیا ہے، مجھ سے بھی جہاں تک ہو سکے گا انہیں کی تقلید کروں گا۔ (مکاتیب اقبال: ۴۶ بنام نیاز)

میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے ہیگل، گوئٹے، مرزا غالب، عبدالقادر بیدل اور ورڈز ورتھ سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے، ہیگل اور گوئٹے نے اشیاء کی باطنی حقیقت تک پہنچنے میں میری رہنمائی کی، بیدل اور غالب نے یہ سکھایا کہ مغربی شاعری کی اقدار اپنے اندر سمو لینے کے باوجود اپنے جذبے اور اظہار میں مشرقیت کی روح کیسے زندہ رکھوں اور ورڈز ورتھ نے طالب علمی کے زمانے میں مجھے دہریت سے بچالیا۔ (شذرات: ۱۰۵)

بے شک میرے اشعار میں مختلف فلسفیانہ مسائل کے متعلق فلسفیانہ خیالات موجود ہیں لیکن میرا کوئی منظم و مرتب فلسفہ نہیں ہے۔ البتہ فلسفے کے ایک مسئلے یعنی حیات بعد الممات کے ساتھ مجھے خاص دلچسپی رہی ہے۔ میں ایک انسان کے شاندار اور درخشاں مستقبل پر پختہ یقین رکھتا ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ انسان نظامِ کائنات میں ایک مستقل عنصر کی حیثیت حاصل کرنے کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہے۔ (گفتار: ۲۳۹)

میں سیدھی سادی دیانتدارانہ زندگی بسر کرتا ہوں' میرا دل اور میری زبان ایک دوسرے کے ساتھ کلیتاً ہموا ہیں۔ لوگ ریاکاری کا احترام کرتے ہیں اور اس کی تعریف بھی۔ اگر ریاکاری سے مجھے شہرت، احترام اور تعریف حاصل ہوتی ہے تو میں اسے پسند کروں گا کہ میں ایسی حالت میں مر جاؤں جبکہ مجھے جاننے والا اور میرا ماتم کرنے والا کوئی نہ ہو۔ (اقبال از عطیہ: ۸۲) میں تو اپنا سامان یعنی قاش ہائے دل صد پارہ ایسے وقت بازار میں لے کر آیا جب سوداگروں کا قافلہ رخصت ہو چکا تھا۔ (صحیفہ اقبال نمبر 1) (۱۱۰ بنام شاد ۱۹۱۳ء)

میں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جو مجھ سے پہلے کسی نے نہ کہی ہو۔ کوئی نئی بات کہی ہے تو صرف یہ کہ وہ حقیقت جسے ہم خودی سے تعبیر کرتے ہیں جو بڑھتی، پھیلتی، نمو پاتی طاقت او قدرت حاصل کرتی ہے وہ ایک ایسا عمل ہے جس کے مادی، حیاتی اور نفسیاتی قوانین کی نوعیت قرآن پاک نے واضح الفاظ میں بیان کر دی ہے۔ (اقبال کے حضور: ۱۷۳) میرا مقصد شاعری سے شاعری نہیں بلکہ یہ کہ اوروں کے دلوں میں وہی خیالات موجزن ہو جائیں جو میرے دل میں ہیں۔ (انوار اقبال: ۲۸۷)

قرآن کی وضاحت سُنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ہوتی ہے

قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اسوۂ حسنہ کی سعادت عطا فرمائی ہے۔ قرآن کریم میں یہ بھی فرمادیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو بھی اپنی زبان سے کہتے ہیں وہ بھی وحی الٰہی ہے۔ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم وحی الٰہی ہے اور قرآن کی تفسیر اسی سے مکمل ہوتی ہے۔

مسلمان کا ساز و برگ کتاب و سنت ہے

یہ دونوں ملت کی شہ رگ کی مانند ہیں

علامہؒ فرماتے ہیں کہ کسی قوم کا استحکام اس کے قوانین اور آئین کی حق پرست بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔ اسلام میں سُنّتِ رسول ﷺ کو آئین حق ہونے کا مقام حاصل ہے۔ سُنّتِ رسول ﷺ مسلمانوں کے لئے ید بیضا اور عصا کی حیثیت رکھتی ہے۔ شریعت کے علم سے ہی مسلمانوں کو عمل پر قدرت حاصل ہوتی ہے۔ افراد ملت کے لئے شرع اسلامی ایمان کا زینہ ہے جس سے ایمان کے مختلف مقامات پر مسلمانوں کو پختگی حاصل ہوتی ہے۔ علامہؒ فرماتے ہیں کہ اسلام میں مسلمانوں کا ساز و سامان کتاب و سنت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ قرآن اور سنت دو ایسے انعامات ہیں جو خود اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو زندگی کی کٹھن راہوں پر سے گزرنے کے لئے تجویز فرمائے ہیں۔

۔ ساز ما کتاب و حکمت است   ایں دو قوت اعتبارِ ملت است (پ۔چ:۸۷۹)

(کتاب و حکمت ہی ہمارا سرمایہ ہے۔ انہی دو قوتوں پر ملت کا دارومدار ہے۔)

آں فتوحاتِ جہانِ ذوق و شوق   ایں فتوحاتِ جہانِ تحت و فوق (پ۔چ:۸۸۰)

(ایک یعنی قرآن کی وجہ سے جہان ذوق و شوق (یعنی روحانیت) کے انعامات ہیں اور دوسری سنت سے مادی دنیا کی تسخیر ہے۔)

ہر دو انعام خدائے لا یزال   مومناں را آں جمال است' ایں جلال (پ۔چ:۸۸۰)

(یہ دونوں ہی خدائے لایزال کے انعامات ہیں' مومنوں کے لئے ایک جمال ہے دوسرا جلال)

ملت از آئینِ حق گیرد نظام   از نظامِ محکمے خیزد دوام (ا۔ر:۱۲۶)

(ملت کو بھی شریعت ہی سے نظام حاصل ہوتا ہے اور نظام محکم اسے دوام عطا کرتا ہے۔)

قدرت اندر علمِ اُو پیداستے   ہم عصا و ہم ید بیضا ستے (ا۔ر:۱۲۶)

(شریعت کے علم ہی سے عمل کی قدرت حاصل ہوتی ہے۔ یہ عصا بھی ہے (قوت کا نشان) اور ید بیضا (نور ہدایت) بھی)

فرد را شرع است مرقاتِ یقیں   پختہ تر از وے مقاماتِ یقیں (ا۔ر:۱۲۶)

(فرد کے لئے شرع ایمان کا زینہ ہے، اسی سے ایمان کے لئے مقامات میں پختگی آتی ہے۔)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ کتاب و سنت آئین حیات کی تفسیر ہے رسول اللہ ﷺ کی اِتباع کے بغیر آپ کی محبت کا دعویٰ باطل ہے۔ مسلمانوں کے اباء واجداد کی عقل ہوس کا شکار نہ تھی۔ اس لئے ان کی تقلید کا

ثواب ہے ۔

عقل آبایت ہوس فرسودہ نیست　کار پاکاں از غرض آلودہ نیست(ا۔ر:۱۲۵)

(تمہارے آباء واجداد کی عقل ہوس کی شکار نہیں تھی، پاک بازوں کا کام خود غرضی سے آلودہ نہیں ہوتا۔)

فکرِ شاں ریسد ہے باریک تر　ورع شاں با مصطفیٰؐ نزدیک تر(اُ۔ر:۱۲۵)

(ان کے فکر نے بڑی باریکیاں پیدا کیں ہیں ان کا تقویٰ حضور ﷺ کے قریب تر تھا۔)

ذوقِ جعفرؒ کاوشِ رازیؒ نماند　آبروئے ملتِ تازی نماند(ا۔ر:۱۲۵)

(اب امام جعفر صادقؒ کا ذوق وشوق اور امام رازیؒ کی کاوش باقی نہیں رہی اور نہ ملت حجازی کی وہ شان وشوکت)

از یک آئینی مسلماں زندہ است　پیکرِ ملتؐ ز قرآں زندہ است(اُ۔ر:۱۲۵)

(مسلمان وحدت آئین سے ہی زندہ ہے اور ملت کا پیکر (صورت) قرآں سے زندہ ہے۔)

غور وفکر کے بعد علامہؒ مذکورہ نظم میں ہی نصیحت فرماتے ہیں کہ جمعیت اسی میں ہے کہ اپنے آباء کی راہ پر چلو اور اپنے کام کی تدبیر میں تقلید سے مدد کرلو ۔

راہ آبا رو کہ ایں جمعیت است　معنیٔ تقلید ضبطِ ملت است(ا۔ر:۱۲۴)

(بزرگوں کی راہ پر چل کیونکہ یہی جمعیت ہے تقلید کے معنی ملت کی تنظیم ہے۔)

نقش بر دل معنیٔ توحید کن　چارۂ کار خود از تقلید کن(ا۔ر:۱۲۵)

(دل پر توحید کے معنی کو نقش کرلے اور اپنے کام کی تدبیر تقلید سے کر) ۔

اے امانت دار تہذیب کہن　پشت پا بر مسلکِ آباء مزن(ا۔ر:۵۹)

(اے قدیم تہذیب کے وارث، اپنے باپ دادا کے مسلک کو نہ ٹھکرا)

اقبالؒ کے ہاں قرآن وسنت کی بالادستی

علامہ اقبالؒ کو اتباع رسول اللہ ﷺ پر عشق کی حد تک تعلق تھا اور آپ فرماتے ہیں کہ ہم مکہ مکرمہ (حج کے لئے) اس لئے جاتے ہیں کہ آپ نے اس بات کا ہمیں حکم فرمایا ہے ورنہ ہماری منزل تو آپ ہی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ دنیا کی شہنشاہی حضور اکرم ﷺ کی اتباع میں ہی ہے، ان کی اطاعت سے تم زمین سے آسمان تک کی بلندی حاصل کرلو گے۔ کتاب وحکمت ہی پر مسلمانوں کا دارومدار ہے اور اس پر عمل سے ہی ان کو دنیا میں بالادستی عطا ہوتی ہے۔

تو فرمودی رہ بطحا گرفتیم　وگرنہ جز تو مارا منزلے نیست(ا۔ح:۹۲۸)

(آپؐ نے فرمایا تو ہم نے مکہ مکرمہ کی راہ پکڑی ورنہ آپؐ کے سوا تو ہماری کوئی اور منزل ہی نہیں)

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر بہ اُو نرسیدی تمام بولہبی است!
(ا۔ح:۶۹۱ اُردو)

(اپنے آپ کو حضور ﷺ تک پہنچا دو کیونکہ آپ ہی اصل دین ہیں، اگر ان تک نہ پہنچے تو یہ کفر اور الحاد ہے۔)

ھست دینِ مصطفیٰ دینِ حیات شرعِ اُو تفسیرِ آئینِ حیات (ا۔ر:۱۲۸)

(حضور اکرم ﷺ کا دین ہی دینِ زندگی ہے اور شرعِ محمد ﷺ آئینِ حیات کی تفسیر ہے۔)

عاشقی، محکم شود از تقلیدِ یار تا کمندِ تو شود یزداں شکار (ا۔ر:۲۲)

(اگر تو عاشق ہے تو معشوق کی تقلید کر کے قوی ہو جا، تاکہ تیری کمند سے یزداں (خدا) بھی شکار ہو جائے)

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر بحق دل بند و راہِ مصطفیٰ رَو (ا۔ح:۹۴۷)

(اگر اس دنیا کے بت خانے میں اپنا مقام چاہتے ہو تو اللہ تعالیٰ سے دل لگاؤ اور حضور ﷺ کی اتباع کرو۔)

جنگِ شاہانِ جہاں غارت گری است جنگِ مومن سُنّتِ پیغمبریؐ است
(ج۔ن:۷۷۳)

(دنیا کے بادشاہ لوٹ مار کے لئے جنگیں لڑتے ہیں، لیکن مومن کا جہاد آنحضور ﷺ کی سُنّت کی پیروی کرنا ہے)

شارعِ آئیں شناسِ خوب و زشت بہرِ تو ایں نسخۂ قدرت نوشت (ا۔ر:۱۲۷)

(جناب رسول پاک ﷺ نے جو خوب و زشت کے آئین شناس ہیں، تیرے لئے شریعت کا یہ نسخہ جو تجھے عمل پر قدرت عطا کرتا ہے، تحریر فرمایا)

گر زمینی آسماں سازد ترا آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا (ا۔ر:۱۲۸)

(اگر تو پست ہے تو یہ (نسخۂ شریعت) تجھے آسمان جیسی بلندی عطا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ جو کچھ تم سے چاہتا ہے تمہیں وہی بنا دیتا ہے۔)

علمِ حق غیر از شریعت ہیچ نیست اصلِ سُنّت جز محبت ہیچ نیست (ا۔ر:۱۲۶)

(خدا کا سچا علم شریعت کے علاوہ اور کچھ نہیں، اور سُنّتِ رسول پاکؐ کی بنیاد محبت کے علاوہ اور کچھ نہیں)

برگ و سازِ ما کتاب و حکمت است ایں دو قوت اعتبارِ ملّت است (پ۔چ:۸۷۹)

(کتاب و حکمت ہی ہمارا سرمایہ ہے، انہی دو قوتوں پر ملت کا دارومدار ہے۔)

ہر دو انعامِ خدائے لایزال مومناں را آں جمال است، ایں جلال (پ۔چ:۸۸۰)

(یہ دونوں ہی خدائے لایزال کے انعامات ہیں، مومنوں کے لئے ایک جمال ہے دوسرا جلال)

علم حق سوائے شریعت کے اور کچھ نہیں

یہ وہ گوہر ہے جسے خدا نے خود بنایا ہے

شریعت کو اللہ تعالیٰ نے خود بنایا ہے اور منزل من اللہ ہے' سنت رسول ﷺ وحی غیر متلو ہے۔ اس لئے اس کے الہامی نوعیت سے ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ درج ذیل اشعار میں علامہؒ نے شریعت کی فوقیت کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ بعض علمائے دین خود کو قرآن اور علوم شریعت کے راز دار ہونا ظاہر کرتے ہیں لیکن شریعت کے معاملے میں بے توفیق اور بے نظر ہیں ۔

علمِ حق غیر از شریعت ہیچ نیست اصلِ سنت جز محبت ہیچ نیست(ا۔ر:۱۲۶)

(سچا علم شریعت کے علاوہ اور کچھ نہیں اور سنت رسول پاکؐ کی بنیاد محبت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔)

در شریعت معنی دیگر مجو غیرِ ضوء در باطن گوہر مجو(ا۔ر:۱۲۶)

(شریعت میں کوئی اور معنی نہ ڈھونڈ، گوہر کے باطن میں بھی چمک کے سوا اور کچھ تلاش نہ کرو۔)

ایں گہر را خود خدا گوہر گر است ظاہرش گوہر بطونش گوہر است(ا۔ر:۱۲۶)

(شریعت کا گوہر ایسا موتی ہے جسے خود اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے، اس کا ظاہر بھی موتی ہے اور باطن بھی موتی)

طینتِ پاکِ مسلمان گوہر است آب و تابش از یمِ پیغمبر است(ا۔ر:۱۳۳)

(مسلمان کی پاک فطرت مانند گوہر ہے اور اس کی آب و تاب نبوت کے دریا سے ہے۔)

آبِ نیسانی بآغوشش درآ وز میانِ قلزمش گوہر برآ(ا۔ر:۱۳۳)

(تو بارش کا قطرہ ہے لہٰذا اس دریا کی آغوش میں آ اور حضور ﷺ کے سمندر سے موتی بن کر نکل)

علامہؒ فرماتے ہیں کہ عشق کی تیغ جو ہر دار کی حیثیت آبِ حیات سے کم نہیں ہے اور نقطۂ نور، جس کا نام خودی ہے اللہ تعالیٰ کی محبت کے باعث پائندہ تر اور زیادہ چمک دار ہوتا ہے۔ محبت سے ہی خودی کی صلاحیتوں کی نشو و نما ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا عشق بندے کو مولا صفات بنا دیتا ہے اور کسی کامل کے آستانہ پر بوسہ زن ہو کر بندہ اپنی مشت خاک کو کیمیا بنا سکتا ہے۔

از نگاہِ عشق خارا شق بود عشقِ حق آخر سراپا حق بود(ا۔ر:۱۸)

(عشق کی نگاہ سے پتھر کو توڑ دیا جاتا ہے' اللہ تعالیٰ کا عشق بندے کو سراپا مولا صفات بنا دیتا ہے۔)

عاشقی آموز و محبوبے طلب چشمِ نوحےؑ قلبِ ایوبےؑ طلب(ا۔ر:۱۸)

(عاشقی سیکھ اور اپنے لئے محبوب ڈھونڈ' اس کے لئے چشمِ نوحؑ اور قلب ایوبؑ تلاش کر۔)

کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے بوسہ زن بر آستانِ کاملے(ا۔ر:۱۸)

(اپنی مشتِ خاک کو کیمیا بنالے (ایسا کرنا ہے تو) کسی کامل کے آستانہ پر بوسہ زن ہوجا۔)

علامہؒ نے فرمایا ہے کہ مسلمان آج حجروں میں بیٹھ کر پیری مریدی کرتے ہیں حالانکہ ان کے لئے ضروری ہے کہ دین کے اسرار پوری دنیا پر واضح کریں اور شریعت کے نکتوں کو فاش کریں۔ شریعت مطہرہ کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں کوئی کسی کا محتاج نہ رہے۔

اے کہ می نازی بہ قرآنِ عظیم تا کجا در حجرہ می باشی مقیم

(اے مسلمان تو قرآن پر ناز تو کرتا ہے' کب تک حجروں میں بیٹھا رہے گا۔)

در جہاں اسرارِ دیں را فاش کن نکتۂ شرعِ مبیں را فاش کن (پ۔چ:۸۲۸)

(دنیا میں دین کے رازوں کو فاش کر، شریعت مطہرہ کے اس نکتے کو فاش کر)

کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس (پ۔چ:۸۲۸)

(دنیا میں کوئی کسی کا محتاج نہ رہے، شریعت مطہرہ کا نکتہ یہی ہے۔)

ایک مکتوب شریف میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے خلفاء کو لکھا ہے کہ وہ عوام کو قرآن اور حدیث کا علم سکھائیں۔ روحانیت کے درس ایسے بے علم اور بے عمل لوگوں کے لئے ضروری نہیں۔ ان کے لئے دین کے بنیادی علوم کا حاصل کرنا از حد ضروری ہے۔ طریقت کا علم بے نمازیوں کے لئے نہیں ہے۔ پس چہ باید کرد میں ''در اسرار شریعت'' کے عنوان سے علامہ اقبالؒ نے شریعت کی مخفی رازوں کو کھولا ہے، اس تمام نظم کے پڑھنے کے بعد علامہؒ کے رازہائے شریعت سے آگہی ہوتی ہے چند اشعار اس میں سے پیش کئے جاتے ہیں۔

پس طریقت چیست اے والا صفات شرع را دیدن بہ اعماقِ حیات

(پس طریقت کیا ہے؟ اے صاحب صفات، شرع کو زندگی کی گہرائیوں میں دیکھنا ہے۔)

فاش می خواہی اگر اسرارِ دیں جز بہ اعماقِ ضمیر خود مبیں

(اگر تو دیں کے اسرار کو کھول کر دیکھنا چاہتا ہے، تو یہ اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں ڈوبنے کے بغیر ممکن نہیں۔)

گر نہ بینی دین تو مجبوری است ایں چنیں دیں از خدا مہجوری است

(اگر یہ گہرائیاں تو نہ دیکھے تو تیرا دیں محض مجبوری ہے، ایسا دیں خدا سے دور کرتا ہے۔)

بندہ تا حق را نہ بیند آشکار برنمی آید ز جبر و اختیار

(بندہ جب تک خدا کو کھلم کھلا نہ دیکھ سکے، اس وقت تک وہ جبر و اختیار کے چکر سے باہر نہیں نکل سکتا)

تو یکے در فطرتِ خود غوطہ زن مردِ حق شو بر ظن و تخمیں متن (پ۔چ:۸۲۷)

(بس تو یہ کام کر کہ اپنے فطرت میں غوطہ لگا، اور بندہ خدا بن اور ظن و تخمیں (اندازے) پر نہ چلو)

علامہؒ نے اپنی نظم "در اسرار شریعت" میں اپنی قوم کی حالت کو قلمبند کیا ہے۔ صوفیوں اور شیوخ کتب کے متعلق لکھا ہے کہ بہت سے لوگ خود کو دانائے قرآن و حدیث سمجھتے ہیں لیکن شریعت پر نظر نہیں رکھتے۔ ان کی عقلیں ہوس میں مبتلا ہیں اور ان کا ممبر روٹی کمانے کا ممبر بن چکا ہے۔ ایسے کلیموں سے کشودگی کی اُمید کب ہو سکتی ہے، ایسے کلیموں کی آستین سے جو ید بیضا کے بغیر ہیں قوم کو کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔

ہر یکے دانائے قرآن و خبر در شریعت کم سواد و کم نظر (پ۔ج:۸۲۸)

(یہ علماء اور صوفی ہر ایک قرآن اور حدیث کا خود کو راز دار سمجھتا ہے، لیکن یہ سب شریعت کے معاملے میں بے توفیق اور کم نظر ہیں۔)

قلب مومن را کتابش حکمت است

علامہؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جو نسخہ مسلمانوں کو دیا ہے وہ تجھے قوت عطا کرتا ہے لیکن افسوس کہ مسلمانوں نے قرآن اور سنت کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے۔ رسالتماب ﷺ کی محبت اور اطاعت کے بغیر انسان میں تخم کردار نہیں پھوٹتا۔

از عمل آہن عصب می سازدت جائے خوبے در جہاں اندازدت (ا۔ر:۱۲۸)

(یہ عمل کے ذریعے تیرے اعصاب کو آہنی بناتا ہے اور تجھے دنیا میں بلند مقام عطا کرتا ہے۔)

خستہ باشی استوارت می کند پختہ مثل کوہسارت می کند (ا۔ر:۱۲۸)

(اگر تو کمزور ہے تو یہ تجھے استوار کر دیتا ہے اور پہاڑ کی مانند پختہ بنا دیتا ہے۔)

مصطفیٰ اندر حرا خلوت گزید مدتے جز خویشتن کس را ندید (ج۔ن:۶۵۷)

(جناب رسول پاک ﷺ نے غار حرا میں خلوت اختیار فرمائی اور مدت تک اپنے سوا کسی اور کو نہ دیکھا۔)

اسرار و رموز میں علامہؒ نے لکھا ہے کہ اے مسلمان تجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کتاب اور حکمت یعنی سنت عطا ہوئی ہے ان دونوں پر عمل کرنے کی رفتار تیز کر اور جس نے ان کا دامن چھوڑ دیا تو سمجھ لے کہ اس کے میدان عمل میں موت واقع ہو گئی۔

اے کہ می ،،ی کتابش دربغل تیز تر نہ پا بہ میدانِ عمل (ا۔ر:۱۴۰)

(اے مسلمان! تو جو حضور ﷺ کی سنت کی کتاب بغل میں لئے ہوئے ہے اس کتاب کے میدان عمل میں اپنے قدموں کو تیز تر کر۔)

قلب مومن را کتابش قوت است حکمتش حَبْلُ الْوَرِیْدِ ملت است (ا۔ر:۱۰۱)

مومن کے دل کے لئے یہ کتاب (قرآن) منبع قوت ہے اور اس کی حکمت (حدیث) قوم کی شہ رگ ہے۔)

دامنش از دست دادن مردن است　چوں گل از بادِ خزاں افسردن است (ا۔ر:۱۰۱)

(اس کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا گویا مرنا ہے اور پھول کی طرح بادِ خزاں میں مرجھا جانے کے مصداق ہے۔)

دین فطرت از نبیؐ آموختیم　در رہِ حق مشعلے افروختیم (ا۔ر:۱۰۲)

(ہم نے اسلام کا دستور رسول اکرم ﷺ سے سیکھا اور خدا کی راہ میں مشعلِ توحید روشن کی۔)

علامہؒ فرماتے ہیں کہ ہر چیز کا باطن کسی قانون سے متاثر ہوتا ہے، لہٰذا مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس آئینِ قدرت (یعنی کتاب و سنّت) کی اِتباع سے غافل نہ رہیں۔

از مقامِ مصطفیؐ آگاہ شو　فارغ از اربابِ دون اللہ شو

(حضور اکرم ﷺ کے پیغام کو سمجھ لے اور اللہ تعالیٰ کے سوا اور جتنے آقا ہیں، ان سے فارغ ہو جا۔)

باطنِ ہر شئے ز آئینے قوی　تو چرا غافل زایں ساماں روی (ا۔ر:۴۱)

(ہر شے کی حقیقی پختگی ایک آئین سے ہے، تو کیوں اس سامان سے بے خبر جا رہا ہے۔)

عاشقی؟ محکم شود از تقلیدِ یار　تا کمندِ تو شود یزداں شکار (ا۔ر:۲۲)

(تو عاشق ہے تو اپنے محبوب ﷺ کی تقلید سے اپنے عشق کو محکم کر تا کہ تو اللہ تعالیٰ کو اپنی محبت کی کمند میں لا سکے۔)

علامہؒ کا اشارہ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ کی طرف ہے یعنی اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرو تو پھر اللہ تعالیٰ تمہیں اپنا محبوب بنا لے گا۔

باز اے آزاد دستورِ قدیم　زینتِ پا کن ھماں زنجیرِ سیم (ا۔ر:۴۱)

(اے پرانے آئین (شریعت) سے آزاد شخص اپنے آپ کو اسی نقرئی زنجیر کا پابند بنا۔)

اسرارِ شریعت کو پا لینے کے بعد انسان احسن التقویم کا حامل اور ایمانِ ابراہیمؑ کا وارث بن جاتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے "اسرارِ شریعت" کے متعلق "پس چہ باید کرد" میں نہایت واضح گفتگو کی ہے اور مسلمانوں کو اس بات سے آگاہ کیا ہے کہ اگر ان کی نظر دین کی حکمت پر نہیں تو گویا وہ مال و دولت کے غلام ہیں اور سب اہلِ دولت ان کے آقا ہیں۔ ایسے لوگ ملک میں فساد کا باعث بنتے ہیں اور ایسی قوم جدت کی راہ پر نہیں چل سکتی۔ حقیقتاً ایسے لوگ قوم اور ملک کے دشمن ہیں کیونکہ وہ مزدور سے اس کی روٹی چھین لیتے ہیں اور ان کی بیٹیوں کی عزت و ناموس کو بھی لٹا دینے کا سبب بنتے ہیں۔ علامہؒ فرماتے ہیں کہ ایک ایسا دولت مند قابلِ تحسین

ہے جو تونگری میں بھی فقر کی زندگی کو اپناتا ہے۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ اہل یورپ حلال وحرام میں تمیز نہیں کرتے۔ اس لئے ان کی آنکھ دنیا کو اللہ کے نور سے جدا نہیں دیکھ سکتی۔ نئی تہذیب کا شیوہ انسانوں کو چیر پھاڑ کرنا ہے اور ان کے سودی نظام کی حمایت کرنے کا عمل ایسا افسوس ناک ہے کہ اس سے غریب ملکوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ جب تک خیر وشر میں تمیز نہیں اس وقت تک کوئی ملک یا قوم صراط مستقیم پر قائم نہیں ہو سکتی۔ فرماتے ہیں کہ اسلامی شرع زندگی کی گہرائیوں سے اٹھتی ہے اور نئی زمانہ تمام مروج برائیوں کا قلع قمع کر سکتی ہے۔ شرع اسلام سے ہی کائنات کی تاریکیاں دور ہو سکتی ہیں۔ فرماتے ہیں ۔

مال را گر بہر دیں باشی حمول نِعْمَ مَالٌ صَالِحٌ گوید رسولؐ (پ۔چ:۸۲۵)

(اگر تم مال کو دین کے لئے رکھتے ہو تو حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ اچھی طرح کمایا ہوا مال کیا اچھی چیز ہے)

گر نہ داری اندر ایں حکمت نظر تو غلام و خواجہ تو سیم و زر (پ۔چ:۸۲۵)

(اگر تیری نظر اس حکمت پر نہیں پھر تو غلام ہے اور دولت تیری آقا ہے۔)

خواجہ نانِ بندۂ مزدور خورد آبروئے دخترِ مزدور برد (پ۔چ:۸۲۵)

(ایسا آقا اپنے مزدور غلام کی روٹی کھا لیتا ہے اور اس کی بیٹی کی آبرو چھین لیتا ہے۔)

تا نہ دانی نکتۂ اکلِ حلال بر جماعت زیستن گردد وبال (پ۔چ:۸۲۶)

(جب تک تو حلال کی کمائی کا نکتہ نہ سمجھے گا تو تیری زندگی معاشرے کے لئے وبال ہو جاتی ہے۔)

آہ یورپ زیں مقام آگاہ نیست چشمِ او یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللہ نیست (پ۔چ:۸۲۶)

(افسوس ہے کہ یورپ اس مقام سے آگاہی نہیں رکھتا اس کی آنکھ اللہ کے نور سے نہیں دیکھتی)

شرع برخیزد زاعماقِ حیات روشن از نورش ظلامِ کائنات (پ۔چ:۸۲۶)

(شرع زندگی کی گہرائیوں سے اٹھتی ہے اور اس کے نور سے کائنات کی تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں۔)

گر جہاں داند حرامش را حرام تا قیامت پختہ ماند ایں نظام (پ۔چ:۸۲۶)

(اگر لوگ شرع کی حرام کردہ چیزوں کو حرام سمجھیں تو ملک کا نظام قیامت تک پختگی سے باقی رہے گا۔)

حکمش از عدل است و تسلیم و رضاست بیخ او اندر ضمیرِ مصطفیٰ است

(شرع کا حکم عدل، تسلیم (احکام الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا) اور راضی برضا رہنا ہے شرع کا بیخ حضور اکرم ﷺ (کے قلب) میں ہے۔) (پ۔چ:۸۲۷)

مصطفیٰ داد از رضائے او خبر نیست در احکامِ دیں چیزے دگر (پ۔چ:۸۲۷)

(حضور اکرم ﷺ نے اللہ کی رضا کی ہی خبر دی ہے احکام دین میں اس کے سوا اور کچھ چیز نہیں ہے۔)

از شریعت اَحسَنُ التقویم شَو وارثِ ایمان ابراہیمؑ شو(پ۔ج:۸۲۷)
(احکام شریعت کی پابندی کر کے احسن تقویم کا مصداق بن جا اور ایمان ابراہیمؑ کا وارث بن جا۔)

قرآن اور شریعت کا عامل جبریلؑ امین کے قریب ہو جاتا ہے

علامہؒ فرماتے ہیں کہ شرع کیا چیز ہے؟ پھر خود ہی فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے ہمیں خدا کی رضا حاصل کرنے کے لئے جن اصولوں کو اپنانے کی خبر دی ہے وہ شریعت کی غایت ہے۔ احکامِ دین اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انسان اس بات کو محسوس کرے کہ فقر و شاہی رضائے الٰہی کے ہی مختلف مقامات ہیں۔ انسان شریعت کی پابندی سے احسن التقویم کا مصداق بن جاتا ہے اور ابراہیم علیہ السلام کے دین کا وارث بھی بن جاتا ہے۔ طریقت بھی یہی ہے کہ اس میں زندگی کو شرع کی گہرائیوں کے ساتھ بسر کرنے کا حکم ہے۔ اگر دین کو اس نظریے سے نہ دیکھا جائے تو تیرا دین مجبوریِ محض کا نام ہے اور ایسا دین انسان کو اللہ سے دور کر دیتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کی شرع انسان کو جبریلؑ کے بھی قریب کر دیتی ہے۔ شرع اسلام کا مقصد امن ہے یعنی کوئی انسان کسی انسان کا محتاج نہ رہے۔ جو قومیں آئین خداوندی (احکام کتاب وسنت) کی تاویلیں گھڑ کر اس کی اصل کو بدل دیں تو ایسی قومیں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ صوفی اور علماء کو میں خوب جانتا ہوں۔ انہوں نے اس حکمت اسلام کا مطلب سمجھا ہی نہیں۔ یہاں تک کہ اپنی ناسمجھی کے باعث ہمارے بڑوں نے ایک پیغمبر (قادیانی) کو جنم دے دیا جس نے قرآن سے زندگی بھر اپنی پیغمبری کے ثبوت مہیا کرنے کے سوا کچھ اور نہیں دیکھا۔ یہ تمام لوگ قرآن اور حدیث کے دعویدار ہیں، لیکن شریعت اسلامیہ کے رازوں سے نابلد ہیں۔ قوموں کا معیار تو قوانین الٰہی کو سمجھ کر اس پر عمل کرنے سے بنتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جو شخص نبی کریم ﷺ کے راز (یعنی شریعت) سے حصہ پاتا ہے وہ خدا کے قریب ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

ہر کہ از سرِّ نبی گیرد نصیب ہم بہ جبریلِ امیں گردد قریب (پ۔ج:۸۲۸)
(جو شخص نبی پاک ﷺ کی شریعت سے حصہ پاتا ہے وہ جبریل امین (علامت حکمت) سے بھی قریب ہو جاتا ہے۔)

کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس نکتۂ شرع مبیں ایں است و بس
(شرع مبیں کا نکتہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی انسان کسی کا محتاج نہ ہو۔)(پ۔ج:۸۲۸)

زندہ قومے بود از تاویلِ مُرد آتشِ او در ضمیرِ او فسرد(پ۔ج:۸۲۸)
(مسلمان قوم زندہ تھی مگر قرآن کی غلط تاویلوں نے اسے مار دیا ان کے ضمیر کی آگ بجھ چکی ہے۔)

صوفیانِ با صفا را دیدہ ام شیخِ مکتب را نکو سنجیدہ ام (پ۔ج:۸۲۸)

(میں نے صوفیان باصفا کو دیکھا ہے اور علمائے مدارس کو بھی خوب پرکھا ہے۔)

عصرِ من پیغمبرے ہم آفرید آنکہ در قرآں بغیر از خود نہ

(میرے دور نے بھی ایک نبی (قادیانی) کھڑا کیا' وہ جسے قرآن پاک میں اپنے سوا کچھ اور نظر نہ آیا یعنی اپنی پیغمبری کے حق میں دلائل ڈھونڈتا رہا۔)(پ۔چ:۸۲۸)

ہر یکے دانائے قرآن و خبر در شریعت کم سواد و کم نظر(پ۔چ:۸۲۸)

(یہ سب قرآن اور حدیث کے عالم ہونے کے دعویدار ہیں' مگر شریعت سے بے بہرہ اور اس کے رازوں سے بے بصر ہیں)

کار اقوام و ملل ناید درست از عمل بنما کہ حق در دستِ تست (پ۔چ:۸۲۸)

(قوموں اور ملتوں کے کام اس طرح نہیں سنورتے' اپنے عمل سے ثابت کر کہ حق تیرے پاس ہے۔)

یافت مورے بر سلیمانے ظفر سطوتِ آئینِ پیغمبرؐ نگر(ا۔ر:۱۰۸)

(جناب رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے آئین کی شان دیکھ اس کی بدولت چیونٹی نے سلیمانؑ پر فتح پائی)

(چیونٹی کے متعلق لکھا گیا ہے کہ وہ درود شریف پڑھ رہی تھی اس کی برکت سے سلیمان علیہ السلام نے اسے اُٹھا کر اپنے ہاتھ پر رکھا)

اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑا تو مسلمان باقی نہ رہے

علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں مسلمانوں کی پسماندگی' بے عملی اور کم ہمتی کا جابجا ذکر کیا ہے اور قومی پریشانیوں اور واماندگیوں سے نکلنے کی راہیں تجویز کی ہیں۔ اسلامی تعلیمات کا فلسفہ بھی آپؒ کے کلام سے بارہا جھلکتا ہوا نظر آتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ کی یہ تمام کوششیں رائیگاں نہیں گئیں اور مسلمانوں کی بدلتی ہوئی کیفیت نے غلامی کی زنجیروں کو بالآخر توڑ دیا۔ آپؒ نے قوم پر یہ راز افشاء کیا کہ ان کا علاج کتاب وسنت پر عمل کرنے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے محبت کرنے میں پنہاں ہے۔

آں چناں قطعِ اخوت کردہ اند بر وطن تعمیرِ ملت کردہ اند(ا۔ر:۱۱۵)

(انہوں نے اخوت کے رشتے کو اس طرح توڑا ہے کہ وطن پر قوم کی تعمیر کی ہے۔)

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر بحق دل بند و راہِ مصطفیٰ رو(ا۔ح:۹۴۷)

(اگر تو اس دنیا میں اپنا کوئی مقام چاہتا ہے تو اپنا دل اللہ تعالیٰ کے ساتھ لگا اور مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ چل)

تا شعارِ مصطفیٰ از دست رفت قوم را رمزِ بقا از دست رفت(ا۔ر:۱۲۸)

(جب قوم کے ہاتھوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ (سنت) چلا گیا تو گویا قوم نے اپنی بقا کا راز کھو دیا۔)

دینِ فطرت از نبیؐ آموختیم در رہِ حق مشعلے افروختیم (ا۔ر:۱۰۲)

(دین فطرت ہم نے نبی ﷺ سے سیکھا' ہم نے حق کے راستے میں مشعل روشن کی ہے۔)

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد بر رسولؐ ما رسالت ختم کرد (ا۔ر:۱۰۲)

(اللہ تعالیٰ نے ہم پر شریعت ختم کردی' ہمارے رسول ﷺ پر اللہ تعالیٰ نے رسالت ختم کردی۔)

خدمتِ ساقی گری با ما گزاشت داد مارا آخریں جامے کہ داشت (ا۔ر:۱۰۲)

(ساقی گری کی خدمت اللہ نے ہم پر چھوڑ دی ہے اور اس کے پاس جو آخری جام تھا' وہ ہمیں دے دیا۔)

لَانَبِیَّ بَعْدِیْ زِاحسانِ خداست پردۂ ناموسِ دینِ مصطفیٰؐ است (ا۔ر:۱۰۲)

(آپ کا فرمان کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں' یہ ہم پر خدا کا احسان ہے اور یہ دینِ مصطفیٰؐ کی عزت کا پردہ ہے۔)

قوم را سرمایۂ قوت ازو حفظِ سرِّ وحدتِ ملّت ازو (ا۔ر:۱۰۲)

(قوم کی طاقت کا سرمایہ اسی سے ہے' ملت اسلامیہ کی وحدت کی حفاظت کا راز اس سے ہے۔)

حق تعالیٰ نقش ہر دعویٰ شکست تا ابد اسلام را شیرازہ بست (ا۔ر:۱۰۲)

(نبوت کے ہر دعوے کے نقش کو اللہ تعالیٰ نے مٹا دیا اور اس طرح تا قیامت اسلام کی شیرازہ بندی کردی۔)

جاوید نامہ میں ''زندہ رود' ایک بزرگ کے سامنے اپنی مشکلات پیش کرتا ہے'' کے عنوان سے ''ابلیس حاضر ہونے'' والا حصہ انسان اور شیطان کے معاملات پر بہت دلچسپ انداز سے روشنی ڈالتا ہے۔ شائقین حضرات اس کا بھی مطالعہ کریں۔ اس نظم کا ایک شعر پیش کیا جا رہا ہے ۔

من بَلٰی در پردہَ ''لا'' گفتہ ام گفتۂ من خوشتر از ناگفتہ ام (ج۔ن:۲۴۷)

(میں نے ''نہیں'' کے پردے میں ''ہاں'' کہا ہے میرا کہنا نہ کہنے سے بہتر ہے۔)

اس شعر سے مراد یہ ہے کہ ابلیس کہتا ہے کہ میں نے خدا کے سامنے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا لیکن میرا یہ نہ کہنا انسان کے ہاں کہنے سے بہتر ہے کہ وہ ہاں کہہ کر بھی عملاً انکار کر رہا ہے۔

کتاب وسنت میں ہی مسلمانوں کی بقا ہے

مصائب اور مشکلات کے حل کا نسخہ جو قرآن نے تجویز کیا ہے اس میں صبر اور استقامت کی تلقین کی گئی ہے جیسا کہ سورۂ بقرۃ میں فرمایا گیا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ (البقرہ:۱۵۳)

اے ایمان والو! مدد طلب کیا کرو صبر اور نماز (کے ذریعہ) سے

یہاں صبر سے مراد ناموافق حالات میں سینہ سپر رہنا اور حصول مقصد کے لئے مکمل جدو جہد کرنا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے قرآن کی اس آیت کو" اسرار ورموز" میں" اسرار اسمائے علی المرتضیٰ" کے عنوان سے ایک نظم میں بیان کیا ہے کہ ناموافق حالات میں ہمت ہار دینا اور مردانہ وار مقابلہ نہ کرنا میدان جنگ میں ہتھیار پھینکنے کے مترادف ہے۔ اگر انسان پختہ کاری اور سخت کوشی سے کام لے تو زمانہ اس کے مزاج کے مطابق ڈھل جاتا ہے۔ مسلمان اپنے حالات کو اپنے دست و بازو سے سازگار بنا سکتا ہے ورنہ اسے بزدلوں کی موت مرنا ہوگا۔

ہماری تصنیف'' حضور قلب'' میں بری عادات کو ترک کرنے اور اچھی عادات کے اختیار کرنے کو بھی ہجرت ہی ظاہر کیا گیا ہے۔ تفصیل کے لئے اس کتاب سے رجوع کریں۔

قرآن کے علاوہ حدیث شریف میں بھی محنت و مشقت سے کام لینے والے کو اللہ کا حبیب کہا گیا ہے۔ (اَلْکَاسِبُ حَبِیْبُ اللّٰہِ) علامہؒ نے فرمایا ہے ۔

با جہانِ نامساعد ساختن ہست درمیداں سپر انداختن (ا۔ر:۴۹)

(ناموافق جہان کے ساتھ موافقت کرنا میدان میں ہتھیار پھینکنے کے برابر ہے۔)

مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار با مزاجِ اُو بسازد روزگار (ا۔ر:۴۹)

(جو آدمی خوددار اور پختہ کار ہوتا ہے زمانہ اس کے مزاج کے ساتھ موافقت کرتا ہے۔)

گر نہ سازد با مزاجِ اُو جہاں می شود جنگ آزما با آسماں (ا۔ر:۴۹)

(اگر زمانہ اس کے مزاج کے مطابق نہ رہے تو وہ زمانے سے جنگ شروع کر دیتا۔)

بر کند بنیاد موجودات را می دہد ترکیب نو ذرات را (ا۔ر:۴۹)

(وہ اس دنیا کی بنیاد کو اکھاڑ پھینکتا ہے اور ذرات کو ایک نئی ترکیب دیتا ہے۔)

گردشِ ایام را برہم زند چرخِ نیلی فام را برہم زند (ا۔ر:۴۹)

(وہ زمانے کی گردش اور نیلے رنگ کے آسمان کو درہم برہم کر دیتا ہے۔)

می کند از قوتِ خود آشکار روزگارِ نو کہ باشد سازگار (ا۔ر:۴۹)

(وہ اپنی طاقت سے نیا زمانہ وجود میں لاتا ہے جو اس کے موافق ہوتا ہے۔)

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست (ا۔ر:۴۹)

(اگر تو دنیا میں مردوں کی طرح زندگی بسر نہیں کر سکتا تو مردوں کی طرح جان دینا ہی زندگی ہے۔)

علامہ اقبالؒ رموز بے خودی میں لکھتے ہیں کہ اگر خدا کی توحید پر یقین ہو اور پوری کوشش سے کام کیا جائے تو انسان کی قسمت کی تاریکی اُجالے میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ مچھلی کی مانند سمندر میں آزادی حاصل کرنا ایسا عمل ہے جو مسلمان کو مچھلی کے کردار سے سیکھنا چاہیے۔ ایسی ہی حالت میں جب مسلمان آزادیٔ افکار اور جانفشانی سے کام کرتا ہے تو سنتِ خیر الانام ﷺ اس کو کائنات کی تسخیر کی خوشخبری دیتی ہے۔

اسود از توحید احمر می شود خویشِ فاروقؓ و ابوذرؓ می شود(ا۔ر:۹۲)
(توحید کے ذریعے کالا گورا بن جاتا ہے یعنی ہمسر ہو جاتا ہے اور عمر فاروقؓ اور حضرت ابوذرؓ کا قرابت دار بن جاتا ہے۔)

جوہرِ ما بامقامے بستہ نیست بادۂ تندش بہ جامے بستہ نیست(ا۔ر:۱۱۲)
(ہمارا جوہر کسی ایک مقام سے وابستہ نہیں اس کی سخت شراب کسی ایک جام تک محدود نہیں)

صورتِ ماہی بہ بحر آزاد شو یعنی از قیدِ مقام آزاد شو(ا۔ر:۱۱۴)
(مچھلی کی مانند سمندر میں آزاد رہ یعنی کسی مقام کی قید سے آزاد ہو جا)

ہر کہ تسخیر مہ و پرویں کند خویش را زنجیریٔ آئیں کند(ا۔ر:۴۱)
(ہر وہ شخص جو چاند اور ستاروں کے جھرمٹ کو مسخر کرتا ہے تو گویا وہ اپنے آپ کو قرآن کے قانون کا پابند ہونے کی وجہ سے ہے۔)

حضور اکرم ﷺ نے قومیت کا عقدہ حل فرمایا اور وطن سے ہجرت کی اور اس بات کو واضح کیا کہ ہجرت مسلمان کی زندگی کا دستور ہے۔ اس سے مسلمانوں کو ثبات واستحکام حاصل ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے اس قانون ہجرت سے واضح ہوتا ہے کہ انسان کو اگر دریا کا وسیع پانی ملتا ہو تو شبنم کو چھوڑ دینا قرین مصلحت ہے۔ پھول کو چھوڑ کر باغ یا گلشن کو حاصل کرنا ہجرت کے اصول سے سمجھ میں آ جاتا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے وطن کو ملت کی بنیاد قرار دیا انہوں نے نوع انسانی کے لئے فساد کی راہیں کھول دیں۔ مسلمان کو کسی مقام سے دل بستہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ مسلمان کا کوئی ایک وطن نہیں ہے بلکہ مسلمان کا یہ قانون ہے کہ ''جہاں جا کے جھنڈے کو گاڑا وطن ہے''۔

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است ایں زاسبابِ ثباتِ مسلم است
(ہجرت مسلمان کی زندگی کا دستور ہے یہ مسلمانوں کے ثبات واستحکام کا ایک سبب ہے۔)

معنیٔ اُو از تنک آبی رم است ترکِ شبنم بہرِ تسخیرِ یم است
(اس کے معنی تھوڑے پانی سے گریز کرنا ہے اور دریا کو سر کرنے کی خاطر شبنم کو ترک کرنا ہوتا ہے۔)

بگزر از گل ہم گلستاں مقصود تست ایں زیاں پیرایہ بندِ سودِ تست(ا۔ر:۱۱۴)
(اے مسلمان پھول کو چھوڑ دے ترا مقصود تو باغ ہے یہ نقصان (پھول چھوڑنے کا) ترے فائدے کی خاطر ہے)

قرآن وحدیث میں گم ہو کر ذرا اپنے اندر نظر ڈال کر دیکھ

''پس چہ باید کرد'' کی نظم ''خطاب بہ اقوامِ سرحد'' میں علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ اے مسلمان تیرے

اندر قدرت نے تمام نادر خزانوں کو جمع کر دیا ہے۔ لہٰذا تمہیں چاہیے کہ اس کے اندر جھانک کے دیکھو کہ تم کو کن قیمتی چیزوں سے نوازا ہے۔ جو ایسا نہ کرے تو وہ حجاب میں ہے اور اپنے آپ سے اس طرح کا حجاب اسلام میں حرام ہے۔ دین مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت بھی یہی ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو برملا دیکھے اور اپنے اسرار کو دریافت کرے کیونکہ اپنے دیدار کے بغیر زندگی موت کے مترادف ہے۔ ایسا مسلمان ہی ضمیرِ کائنات سے آگاہ ہونے کے سبب تمام کائنات سے افضل ہے۔ مکاں ولامکاں مردِ مسلمان کا ہی غوغا ہے اور وہ "لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰه" کی تیغ بنتا ہے چونکہ مسلمان پیغمبری کا وارث ہے اس لئے اپنا جہان خود ہی پیدا کرتا ہے۔ مسلمان کی بعض صلاحیتوں کا بیان کرنے کے بعد علامہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے چونکہ انسان کی فطرت کو تمام جہات سے بالاتر بنایا ہے اس لئے ساری کائنات اس کا طواف کرتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ مسلمان کی صلاحیتیں ملت اسلامیہ کے اصولوں کے ذریعے بڑھتی رہتی ہیں اور اس سے آنکھ کی روشنی میں بصیرت پیدا ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ اے مسلمان ذرا قرآن وحدیث کے اندر گم ہو جا اور پھر دیکھ کہ تو کس حد تک اللہ تعالیٰ کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ کچھ نصیحتوں کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ تو اللہ تعالیٰ سے رزق مانگ اُس کے غیر سے نہ مانگ۔ مستی عشق اللہ تعالیٰ سے مانگ اور شراب سے مستی نہ مانگ۔ علامہ اقبالؒ مسلمانوں کو مادیت کا طلب گار ہونے سے منع فرماتے ہیں کیونکہ اس کا طلب گار ہمیشہ ذلیل وخوار رہتا ہے لہٰذا آپ ہمیں یہی سبق دیتے ہیں کہ اپنی آرزوؤں سے اپنی صلاحیتوں کو تیز کرو۔ یہ آرزو ہی کا کمال ہے کہ جو سلطان ومیر کا سرمایہ بن جاتی ہے اور ہماری خاک کو گردوں کی وسعت عطا کر دیتی ہے۔ فرماتے ہیں ۔

اندکے گم شو بقرآن و خبر　باز اے ناداں بخویش اندر نگر (پ۔چ:۸۵۵)

(ذرا قرآن وسنت کے اندر گم ہو جا' پھر اے نادان اپنی طرف نگاہ ڈال کہ تو کس حد تک اس معیار پر پورا اترتا ہے)

علامہؒ فرماتے ہیں کہ خود کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے منسلک رکھو تاکہ اس سمندر میں غوطہ لگانے کے بعد تمہاری گئی ہوئی جان دوبارہ بدن میں واپس آجائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات تو ایک بحر بیکراں کی طرح ہیں جس میں غوطہ زن ہونے سے گوہر نایاب دستیاب ہوتے ہیں ۔

مصطفیٰ بحر است و موج او بلند　خیز و ایں دریا بجوئے خویش بند (پ۔چ:۸۶۵)

(حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وہ بحر ہیں جس کی موجیں بلند ہیں' اٹھ اور اس بحر (کے فیضان) کو اپنی ندی میں سمیٹ لے)

مدتے بر ساحلش وچیدۂ　لطمہ ہائے موج او نادیدۂ

(تو ایک مدت تک اس سمندر کے ساحل سے وابستہ رہا مگر تو نے اس کی موجوں کے تھپیڑے نہیں کھائے)

یک زماں خود را بدریا در فگن　تا روانِ رفتہ باز آید بہ تن (پ۔چ:۸۶۵)

(کچھ مدت کیلئے اپنے آپ کو اس سمندر میں ڈال دے تاکہ تیری گئی ہوئی جان دوبارہ تیرے بدن میں واپس آجائے)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص کتاب وسنت میں غوطہ لگانے کے بعد ایک نئی جان حاصل کر لیتا ہے تو نبی کریم ﷺ کی شریعت سے حصہ پالینے کے سبب آپ کی ذات مبارکہ اور جبرئیل امین کا بھی قرب حاصل کر لیتا ہے۔ فرماتے ہیں غفلت کے حجرے سے نکل اور اسلام کے ان زریں اصولوں پر عمل کر کے تمام زمانے میں رسول اللہ ﷺ کی شرع کے نکات کو پھیلا دے کیونکہ اسلام پوری کائنات کو ہدایت دینے کے لئے آیا ہے۔

ہر کہ از سرّ نبیؐ گیرد نصیب ہم بہ جبریلِ امیں گردد قریب (پ۔چ: ۸۲۸)

(جو شخص نبی کریم ﷺ کے راز (شریعت) سے حصہ پاتا ہے وہ جبریل امین (حکمت کی علامت ہیں) کے بھی قریب ہو جاتا ہے۔)

اے کہ می۔نازی بہ قرآنِ عظیم تا کجا در حجرہ می باشی مقیم (پ۔چ: ۸۲۸)

(اے مسلمان! تو جو قرآنِ پاک پر فخر کرتا ہے کب تک حجرہ نشین رہے گا۔)

در جہاں اسرارِ دیں را فاش کن نکتۂ شرعِ مبیں را فاش کن (پ۔چ: ۸۲۸)

(باہر نکل) دین کا راز فاش کر اور شرع مبین کا نکتہ فاش کر۔)

مسلمانوں کے دین سے دوری کا موثر علاج

جب امتِ مسلمہ زوال وانحطاط کا شکار ہوگئی تو اس کو قعر مذلت سے نکالنے کے لئے مختلف مفکرین نے اپنے اپنے نسخے تجویز کئے۔ کسی نے کہا کہ اسے جدید تعلیم حاصل کرنی چاہیے تو کسی نے کہا کہ اسے یورپی قوموں کی تقلید کرنی چاہئے اور اپنی روایات کو چھوڑ دینا چاہیے مگر حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ اس امت کا علاج کرنے سے پہلے اس کے مرض کی تشخیص کرنا ضروری ہے۔ جب علامہؒ نے قوم کے مرض کی تشخیص کی اور اس کے بعد جو نتیجہ نکالا تو اس کو آپ نے درج ذیل اشعار میں اس طرح پیش فرمایا۔

کون ہے تارکِ آئینِ رسولِ مختارؐ؟ مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار؟
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار؟ ہو گئی کس کی نگہ طرزِ سلف سے بیزار؟
قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں

(ب۔د: ۲۰۲)

علامہ اقبالؒ کے نزدیک امتِ مسلمہ کی مرض کی وجہ امت کا رسول اللہ ﷺ کی سنت کی پیروی کو ترک کرنا ہے۔ زیرِ نظر کتاب کے علاوہ ہماری دیگر کتب میں بھی اس امت کے مرض کا علاج بھی دے دیا گیا ہے جس میں سے ایک ضروری بات اولیائے امت سے وابستگی ہے۔ علامہ اقبالؒ خود بھی پیر رومیؒ کے مرید تھے اور آپ نے لوگوں کے لئے ان کے کلام کا مطالعہ کرنا ضروری خیال کیا ہے۔ ہم نے ایک کتاب ''سوز وسازِ

رومی" کے نام سے فیروز سنز کو شائع کرنے کے لئے دی ہے۔اس کا مطالعہ بھی مسلمانوں کی اصلاح کا ایک نسخہ ہے۔علامہؒ نے خود بھی فرمایا ہے ۔

پیر رومیؒ را رفیقِ راہ ساز　تا خدا بخشد ترا سوز و گداز (ج۔ن:۷۹۶)

(پیر رومیؒ کو اپنی زندگی کے راستے کا ساتھی بناؤ تا کہ خدا تجھے سوز وگداز سے نواز دے۔)

ز رومیؒ گیر اسرار فقیری　کہ آں فقر است محسود امیری (ا۔ح:۹۵۹)

(رومیؒ سے اسرار فقیری حاصل کرو کیونکہ ان کے فقر پر امارت بھی رشک کرتی ہے۔)

شمع خود را ہمچو رومیؒ بر فروز　رومؒ را در آتش تبریزؒ سوز (ا۔ر:۱۹)

(اپنی شمع کو رومیؒ کی طرح روشن کرو مولائے رومؒ کی طرح اپنے آپ کو شمس تبریزؒ کی آگ میں جلا دو)

مذکورہ بالا تحریروں سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علامہؒ نے قرآن اور سنت کو مسلمانوں کی اصلاح کے لئے کیوں تجویز کیا ہے۔

قرآن اور حدیث کے بعد اقبالؒ کو بیدار دل مطلوب ہے

دل آدمی کا ہے فقط اِک جذبۂ بلند

علامہ اقبالؒ کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کو واجبات اسلام کے علم اور عمل کے بعد دل میں موجود خدائی کمالات کا علم ہونا ضروری ہے اور انسان کو دل کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اپنے دل کی طرف توجہ دینا ایسا ہی ہے جیسے کہ خدا والے دل کے ذریعے خدا تک پہنچتے ہیں۔قرآن میں دل کا متعدد بار ذکر آیا ہے۔

اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿٨٩﴾　مگر وہ شخص جو لے آیا اللہ تعالیٰ کے حضور قلب سلیم۔(سلامتی والا دل جس میں کثرت ذکر ہو)　(سورہ الشعراء:۸۹)

قرآن کریم میں سورۂ ق آیت نمبر ۳۳ میں قلب مُنیب کا ذکر بھی ہے یعنی وہ دل جو اخلاص کے ساتھ یاد الٰہی کی طرف متوجہ ہو۔ایسے دل سے خطرات روحی اور نیک کام ظاہر ہوتے ہیں۔مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ ایک حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا (مسند احمد) بلکہ اس کی نگاہ تمہارے دلوں اور اعمال پر رہتی ہے۔مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ انسان کے دل میں جو مسجد ہے اس میں خدا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو صاف رکھنے کا حکم دیا ہے۔

مسجدے کو اندرون اولیاء　سجدہ گاہ خلق است آنجا خداست (رومیؒ)

(وہ مسجد جو اولیاء کے دل میں ہے وہ مخلوق کا سجدہ گاہ ہے اور وہاں خدا ہے۔)

دل کو دنیا اور آخرت کی خواہشوں سے پاک رکھنے کا حکم اس لئے دیا ہے کیونکہ دل کو خدا کا گھر کہا گیا ہے۔
اسی نسبت سے مولانا رومؒ فرماتے ہیں ۔

ما بروں را ننگریم و قال را　ما دروں را بنگریم و حال را (رومیؒ)

(ہم تو تمہاری ظاہری اور زبانی باتوں کو نہیں دیکھتے، ہم تو باطن کی کیفیت اور اصل حالت کو دیکھتے ہیں۔)

سبع سنابل میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا ہے کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے پاک رکھو، یاد رہے کہ خانہ کعبہ کے علاوہ انسان کا دل بھی اللہ کا گھر ہے۔

طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِينَ (الحج:۲۶)

یعنی میرے گھر کی صفائی کرو حج کرنے والوں کے لئے (اس سے مراد خانۂ دل کو دنیا اور آخرت کی کثافتوں سے پاک رکھنا ہے، اس لئے دل کو خدا کا گھر کہا جاتا ہے۔)

ایک حدیث شریف میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَلَاوَاِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَاصَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ وَاِذَافَسَدَتْ فَسَدَالْجَسَدُ کُلُّهٗ اَلَاوَهِیَ الْقَلْبُ

(بخاری کتاب الایمان حدیث:۵۲)

آگاہ رہو کہ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ جب تک یہ ٹھیک رہتا ہے تو بدن ٹھیک رہتا ہے اور جب وہ خراب ہو جاتا ہے تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے اور یاد رہے کہ وہ دل ہے۔

ایک اور حدیث شریف میں ہے کہ آدم کے جسم میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے اور اس گوشت کے ٹکڑے میں دل ہے اور دل میں روح ہے اور روح میں نور ہے اور نور میں سرّ ہے اور سرّ میں میں ہوں (یعنی رب) (سرّ دلبراں ص:۷۸)

کشف المحجوب میں ہے کہ عمرو بن عثمان نے محبت کے باب میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دل کو جسم سے سات ہزار سال پہلے پیدا فرمایا اور مقام قرب میں رکھا اور جانوں کو دلوں سے سات ہزار سال پہلے پیدا فرما کر درجہ وصل میں رکھ کر روز تین سو ساٹھ باران پر ظہور جمال فرمایا (آپ کا بیان طویل) ایک اور حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دل پر تجلی فرماتا ہے جن کا دل دنیا سے خالی ہو اور ان لوگوں پر بھی تجلی فرماتا ہے جو ان کے دل میں ہوں اور پھر ان پر جو ان کے دل میں ہوں۔

حضرت ابو بکر شبلی کو وقت نزع جب کلمہ پڑھنے کی تلقین کی گئی تو آپ نے فرمایا کہ جس دل میں ہر وقت اللہ تعالیٰ کی یاد ہو اس کو کلمہ پڑھنے کے لئے کیا کہتے ہو، پھر آپ نے یہ شعر پڑھا۔ جس میں یہ کہا گیا ہے کہ مومن کے دل میں تو ہر وقت اللہ تعالیٰ موجود رہتا ہے وہاں ہر وقت نور ہی نور ہے۔

اِنَّ بَیْتً اَنْتَ سَاکِنُہٗ غَیْرُ مُحْتَاجٍ اِلَی السُّرُجِ	بیشک وہ گھر جس میں تو (اللہ) ساکن ہے وہ کسی سورج کی روشنی کا محتاج نہیں۔

حضرت بایزید بسطامیؒ کا قول ہے کہ

اِنَّ لِلّٰہِ عِبَادًا لَوْ حَجَبُوْا عَنِ اللّٰہِ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ لَارْتَدُّوْا	اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے بھی ہیں کہ اگر ایک پل دنیا و عقبیٰ میں اس کے جمال سے محجوب ہو جائیں تو وہ اپنے آپ کو مرتد سمجھتے ہیں۔

طریقت کا منشا بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمیشہ وابستگی رہے۔ جب ذکر کیا جائے تو اس وقت تین چیزیں سامنے آتی ہیں ایک ذکر دوسرا ذاکر اور تیسرا مذکور (جس کا ذکر کیا جائے) ان تینوں میں سے ذکر اور ذاکر کو فنا کر دیا جاتا ہے تا کہ ذکر میں سوائے اللہ کے اور کسی چیز پر نظر نہ رہے۔

مذکورہ بالا دل کی کیفیات کے پیش نظر علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ انسان کا دل اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا مرجع ہے۔ ہم نے اپنی تصنیف ''حضور قلب'' میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندۂ مومن کے دل کو لامکاں کا رتبہ عطا فرمایا اور بندۂ مومن کے دل میں اللہ تعالیٰ سما جاتا ہے۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ میں اپنی زمین اور آسمان میں نہیں سما سکتا (کیونکہ یہ دائرہ مکان میں شامل ہے۔ لامکان کا مکان میں سمانا ممکن نہیں)۔ علامہ اقبالؒ نے دل کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ جس سے معلوم ہوتا ہے انسان کا دارومدار دل پر ہی ہے۔ آپؒ کا کچھ کلام یہاں پیش کیا جائے گا۔ آپ نے فرمایا۔

کافرِ بیدار دل پیشِ صنم بہ ز دیندارے کہ خفت اندر حرم (ج۔ن:۶۲۷)

(وہ کافر جس کا دل بیدار ہے اور بت کے سامنے بیٹھا ہے وہ اس دین دار سے بہتر ہے کہ جو حرم میں سویا ہوا ہے)

وہ کافر جس کا دل بیدار ہے کسی وقت بھی اسلام قبول کر سکتا ہے لیکن خوابیدہ دل والا مسلماں ایک مٹی کا ڈھیر ہے۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا۔

نگاہ پاک ہے تیری تو پاک ہے دل بھی کہ دل کو حق نے کیا ہے نگاہ کا پیرو (ب۔ج:۳۶۶)

ہر اک ذرہ میں ہے شاید مکیں دل اسی جلوت میں ہے خلوت نشیں دل

اسیرِ دوش و فردا ہے و لیکن غلام گردشِ دوراں نہیں دل (ب۔ج:۴۷۴)

دل آدمی کا ہے فقط اک جذبۂ بلند

دل ایک گوشت کا لوتھڑا ہے جب تک یہ ٹھیک رہتا ہے بدن بھی ٹھیک رہتا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ گوشت کا دل اصلی نورانی دل کا حجرہ ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ دل پانی کی ایک بوند نہیں بلکہ اسی دل کی کیفیت پر انسان کے شام و سحر کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار ہے۔ فرمایا۔

سمجھا لہو کی بوند اگر تو اسے تو خیر　دل آدمی کا ہے فقط اک جذبۂ بلند
گردش مہ ستارہ کی ہے ناگوار اسے　دل آپ اپنی شام و سحر کا ہے نقشبند
جس خاک کے ضمیر میں ہے آتشِ چنار　ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاک ارجمند　(ا۔ح:۶۸۱)

علامہؒ نے فرمایا ہے کہ نے نواز وہی راگ کہے گا جس سے اس کا دل متاثر ہو۔ جب انسان کا دل خدائی جلوؤں سے متاثر ہوتا ہے تو اس میں اس قدر طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کی نظروں میں سلطنتِ روم و شام و ملک رے کی سطوت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ دل کی طاقت فقط یادِ الٰہی اور ذکرِ الٰہی سے حاصل ہوتی ہے۔ جب کوئی شخص اپنے دل کے رموز کو پہچان گیا تو سمجھو کہ وہ ہر ہنر میں کمال حاصل کر لے گا۔

آیا کہاں سے نالۂ نے میں سرورِ مے　اصل اس کی نے نواز کا دل ہے یا چوبِ نَے؟
(ض۔ک:۵۷۶)

دل کیا ہے اس کی مستی و قوت کہاں سے ہے؟　کیوں اس کی اک نگاہ اُلٹتی ہے تختِ کَے؟
کیوں اس کی زندگی سے ہے اقوام میں حیات؟　کیوں اس کے واردات بدلتے ہیں پے بہ پے؟
کیا بات ہے کہ صاحبِ دل کی نگاہ میں　جچتی نہیں ہے سلطنتِ روم و شام و رے؟
جس روز دل کی رمز مغنی سمجھ گیا　سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے!
(ض۔ک:۵۷۷)

امام غزالیؒ نے فرمایا ہے کہ دل کی بزرگی دو وجہ سے ہے۔ ایک علم اور ایک قدرت کی وجہ سے۔ دل اپنی پرواز مشرق سے مغرب تک ایک لحظہ میں کر لیتا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

جملہ عالم جرعۂ خوش جامِ دل　از مکاں تا لامکاں یک گامِ دل(x)
(تمام عالم دل کے خوب صورت پیالے کا ایک گھونٹ ہے۔ مکاں سے لامکاں تک دل کے لئے ایک قدم ہے)

خواجہ معین الدین چشتیؒ فرماتے ہیں کہ دل خود آگاہ پر فیضِ خداوندی نازل ہوتا ہے جس سے کائنات کا ذرّہ ذرّہ روشن ہو جاتا ہے۔

فیضِ خدا کہ بر دلِ آگاہ می رسد　اے دل باہوش باش کہ ناگاہ می رسد (معین الدینؒ)
(اللہ کا فیض جو ایک دلِ آگاہ پر نازل ہوتا ہے، اے دل ہوشیار رہ کہ یہ اچانک ہی ہو جاتا ہے۔)

چناں از روزنِ دل نورِ آں دلدار می تابد　کہ خورشیدِ جمالِ اُو در و دیوار می تابد (معین الدینؒ)
(دل کے روشندان سے اس دلدار کا نور چمکتا ہے، جس طرح کہ اس کے جمال کا سورج در و دیوار پر چمکتا ہے)

حضرت شرف الدینؒ بو علی قلندر فرماتے ہیں کہ میرا دل جلوۂ جاناں کا مظہر ہے۔

ہست در سینۂ ما جلوۂ جانانۂ ما بت پرستیم دل ما است صنم خانۂ ما (شرف الدینؒ)

(میرے سینے میں میرے محبوب کا جلوہ ہے، ہم بت پرست ہیں اور ہمارے دل میں بت خانہ ہے۔)

بہ دل شمع حرم داری چرا سوئے حرم پوئی چوں یار اندر بغل داری چہ سود از قطع منزلہا (حافظؒ)

(آپ کے دل میں شمع کعبہ ہے حرم کی طرف کیا دوڑتا ہے، تیرا یار بغل میں ہے منزلیں طے کرنے کا کیا فائدہ)

کشف حجاب برائے حج سے عنوان سے کشف المحجوب میں لکھا ہے کہ محمد بن فضل فرماتے ہیں کہ مجھے اس شخص پر تعجب ہے کہ جو دنیا میں اس (خدا) کا گھر ڈھونڈتا ہے وہ دل میں اس کا مشاہدہ کیوں نہیں چاہتا کیونکہ بسا اوقات گھر نہیں ملتا اور کبھی مل جاتا ہے لیکن مشاہدہ ہر وقت رہتا ہے۔ جب وہ پتھر (حجر اسود) جس کی زیارت فریضہ میں شامل ہے اس پر (اللہ کی طرف سے) ایک نظر فرمائی گئی تو وہ دل جس پر رات دن میں تین سو ساٹھ بار نظر فرمائی جائے وہ کیوں اس سے اولیٰ و افضل نہ ہو۔ مشاہدہ کے لئے بوعلی قلندرؒ نے حسب ذیل طریقہ لکھا ہے۔

صاف کن آئینۂ دل از غبار آتشے زن در دل ایں بے قرار (بوعلی قلندرؒ)

(دل کے آئینے کو غبار سے صاف کر دو، اس بے قرار دل میں ایک آگ جلالو۔)

زنگِ دل از صیقلِ ''لا'' پاک کن سینہ با تیغِ محبت چاک کن (بوعلی قلندرؒ)

(دل کا زنگ ''لا'' چمکانے سے پاک کرو اپنے سینے کو محبت کی تلوار سے چاک کرو۔)

حضرت مجدد الف ثانیؒ مکتوبات میں لکھتے ہیں کہ اولیائے کرام جو کچھ دیکھتے ہیں اپنے دل میں ہی دیکھتے ہیں۔ قلب کی طرف گردن جھکائی اور کشف کا شعبہ اختیار کرنے کے بعد ہر چیز کا نقش دل میں نظر آنے لگتا ہے۔

حضرت بہاؤالدین نقشبندؒ فرماتے ہیں کہ ہم چالیس سال سے دل کی آئینہ داری کرتے آئے ہیں اور ہمارے آئینہ نے کبھی غلطی نہیں کی۔

دل ونگاہ کا سفینہ سنبھال کر لے جا

لوگ جو اپنے دل میں موجود حکمتوں کو برباد کرنے والے ہیں ان کی پہچان یہ ہے کہ وہ زمانے کی غلط کاریوں اور مغرب کی نسوانی آفات سے محفوظ نہیں رہتے اور یہی وجہ ہے کہ ہزاروں بار کئی ملکوں کی تباہی رونما ہوئی۔ تمام اسلامی اور غیر اسلامی ممالک میں نفس پرستی کا طوفاں اُٹھ رہا ہے۔ علامہؒ مسلمانوں کو یہ نصیحت فرماتے ہیں کہ وہ اس طوفاں کی زد سے خود کو بچا کر لے جائیں۔

یہ حوریان فرنگی دل و نظر کا حجاب بہشتِ مغربیاں جلوہائے پا بہ رکاب

دل و نظر کا سفینہ سنبھال کر لے جا مہ و ستارہ ہیں بحرِ وجود میں گرداب

وہ سجدہ روئے زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب
(ب۔ج:۳۲۸)

جولوگ اپنے اندر روحانی قوت (ذکر اذکار سے) حاصل کر لیتے ہیں اور دلوں کی اصلاح کر لیتے ہیں وہ اپنے وقت کے حاکم بن جاتے ہیں بلکہ کائنات کی تسخیر ان کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔

دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اٹھتے
نگاہوں میں اگر پیدا نہ ہو اندازِ آفاقی
(ب۔ج:۳۵۰)

اغیار کے دوستی پر چلنا اور مغربی تمدن کے زیر اثر رہنے والے مسلمان ایسے ہی ہیں جیسے انہوں نے کاروبارِ لات ومنات پھر سے شروع کر دیا ہے۔ علامہؒ فرماتے ہیں کہ مسلمان کے پہلو میں دل ہے جو اس کو ہر چیز سے آگاہ کر سکتا ہے لیکن میں نے مردِ مسلمان سے زیادہ غافل کسی کو نہیں دیکھا۔

حریم تیرا خودی غیر کی معاذ اللہ!
دوبارہ زندہ نہ کر کاروبار لات ومنات (ض۔ک:۵۶۸)

غافل ترے زمردِ مسلماں نہ دیدہ ام
دل درمیانِ سینہ و بیگانۂ دل است (پ۔م:۳۴۲)

(میں نے مسلمان سے زیادہ کسی کو غافل نہیں دیکھا، اس کے پہلو میں دل ہے اور وہ دل سے بیگانہ ہے۔)

علامہ اقبالؒ کی شاعری

شاعر کو قوم کی آنکھ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ قوم کی بیماریوں، کوتاہیوں اور کمزوریوں پر نظر رکھتا ہے۔ وہ اصلاح کے لئے قوم کو جھنجھوڑتا ہے اور بیماریوں کا حل تجویز کرتا ہے۔ انگریز نے مسلمانوں میں تفرقہ بازی کی بنیاد رکھی اور اقوامِ ملت کو پارہ پارہ کر دیا۔

تفریق ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم (ض۔ک:۵۲۰)

علامہ اقبالؒ کی شاعری کے متعلق زیادہ تفصیلات کا اجمالی نقشہ پیش کرنا اس کتاب کی وسعت سے باہر ہے اس لئے چند مفید نکات کو ہی نیچے پیش کیا جارہا ہے ملاحظہ فرمائیں۔

نغمہ کجا و من کجا

علامہؒ نے فرمایا ہے کہ شاعری سے ملتیں بنتی ہیں۔ شعر کا مقصد آدم گری ہے۔ میں نے شاعری کا شعبہ اختیار کیا ہے۔ وہ محض اس لئے ہے کہ قوم کے افراد جو بے راہ اونٹنیوں کی طرح آوارہ پھر رہے ہیں ان کو منظم کر کے ایک قطار میں لا کھڑا کروں۔

شعر را مقصود اگر آدم گری است
شاعری ہم وارثِ پیغمبری است (ج۔ن:۶۳۲)

(شعر کا مقصود اگر آدم سازی ہو، تو شاعری بھی پیغمبری کی وارث بن جاتی ہے۔)

بکامِ خود دگر آں کہنہ مے ریز ۔۔۔ کہ با جامش نیرزد ملکِ پرویز (ا۔ح:۹۵۷)

(اپنے منہ میں پھر وہ پرانی شراب ڈال، جس کا ایک جام سلطنت پرویز سے بڑھ کر ہے۔)

ز اشعارِ جلال الدین رومیؒ ۔۔۔ بہ دیوارِ حریمِ دل بیاویز (ا۔ح:۹۵۷)

(جلال الدین رومیؒ کے اشعار سے، اپنے دل کے حرم کی آرائش کرو۔)

علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ لوگ مجھے شاعر کہیں لیکن میں تو محض قوم کی منتشر اونٹنیوں کو قطار میں لانا چاہتا ہوں۔

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست ۔۔۔ سوئے قطاری کشم ناقۂ بے زمام را (ز۔ع:۴۴۷)

(نغمہ کہاں اور میں کہاں ہوں میرا اسارا سخن تو اک بہانہ ہے، میں تو بے مہار اونٹوں کو قطار کی طرف کھینچتا ہوں)

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرو دست ۔۔۔ کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست (ز۔ع:۵۳۸)

(تم اس پست حال مرد میں کوئی خوبی نہیں دیکھو گے جو مجھ پر شعر و شاعری کی تہمت لگاتا ہے)

علامہؒ نے فرمایا کہ جو شاعر ملت کے کام کو درست نہ کرے وہ ملت کے لئے مٹی کا انبار ہے۔ آپ نے اچھے شاعر کی علامات کو درج ذیل اشعار میں بیان کیا ہے۔

شاعر اندر سینۂ ملت چو دل ۔۔۔ ملتِ بے شاعرے انبارِ گل (ج۔ن:۶۳۲)

(شاعر کسی ملت کے سینے میں دل کی حیثیت رکھتا ہے، ملت بغیر شاعر کے ایک مٹی کا ڈھیر ہے)

صد نالۂ شبگیرے، صد صبحِ بلا خیزے ۔۔۔ صد آہِ شرر ریزے، یک شعرِ دلآویزے (پ۔م:۳۳۱)

(شب خیزی کے سینکڑوں نغمات اور سینکڑوں بلاخیز صبحیں اور سینکڑوں شرر ریز آہیں ایک دل آویز شعر کے برابر نہیں)

نوائے شاعرِ جادو نگارے ۔۔۔ زعیشِ زندگی نوشینہ سازد (پ۔م:۲۴۳)

(ایک جادو اثر شاعری کی نوا زندگی کے زہر کو شیریں شربت میں تبدیل کر دیتا ہے۔)

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ! ۔۔۔ عشق کارے است کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

(اے قوم میں آہ و نالہ اس لئے کرتا ہوں کہ تو جاگ اٹھے، ورنہ عشق تو ایسا کام ہے کہ آہ و فغاں کے بغیر بھی کرتے ہیں۔) (ز۔ع:۴۶۳)

میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

ایک اچھے شاعر کو نظر حکیمانہ اور عشق کی حدیث رندانہ اور رازِ درون میخانہ عطا کیا جاتا ہے۔ جس شاعر میں

یہ صفات نہ ہوں تو وہ شاعر نہیں کہلا سکتا۔ جب تک شاعر اپنے آپ کو اپنی آگ میں نہ پگھلا دے اور کسی دردمند کی شام کو روشن نہ کر دے تو وہ محض رنگین بیاں شاعر ہے۔

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ! (ب۔ج:۳۴۳)

میرے نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ کہ میں ہوں محرم رازِ درونِ میخانہ (ب۔ج:۳۴۳)

مجھے خبر نہیں یہ شاعری ہے یا کچھ اور عطا ہوا ہے مجھے ذکر و فکر و جذب و سرود! (ض۔ک:۵۷۲)

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا! (ض۔ک:۵۶۲)

زمن با شاعرِ رنگیں بیاں گوے چہ سُود از سوز اگر چوں لالہ سوزی (پ۔م:۲۱۳)

(میری طرف سے شاعر رنگیں بیاں کو کہو کہ اس سے کیا فائدہ کہ اگر تو صرف لالہ کی طرح سوز رکھتا ہے۔)

نہ خود را می گدازی زآتشِ خویش نہ شامِ دردمندے برفروزی (پ۔م:۲۱۳)

(نہ تو اپنے آپ کو اپنی آگ میں پگھلاتا ہے، اور نہ کسی دردمند کی شام کو روشن کرتا ہے۔)

مرا یاراں غزلخانے شمردند

مسلمانوں کی قوم سو سالہ غلامی کے باعث اپنی تمام صلاحیتیں مکمل طور پر ضائع کر چکی تھی اور اپنی بے حسی کی وجہ سے علامہ کے پیغامات پر عمل کرنے کی استطاعت ضائع کر چکی تھی۔ آپ نے بہت سے اشعار اپنے تنہائی پر لکھے ہیں اور بتایا کہ کوئی ان کا راز دان نہ تھا اور نہ ہی کوئی ان کے کلام کو اہمیت دیتا تھا۔ عام طور پر لوگ آپ کو شاعر سمجھتے تھے۔ ان کے اشعار میں جو حقائق بیان کئے جاتے تھے، اکثر لوگ اس سے بے بہرہ رہتے تھے۔ ایک خاص جماعت نے علامہ کا مکمل انکار کیا اور آپ کی مخالفت پر کمر بستہ رہے۔ ایسے لوگ تو پاکستان کے بننے کی بھی مخالفت کرتے رہے ہیں اور اب بھی اپنی ضد پر قائم ہیں۔ ان لوگوں نے آپ کی آخری عمر میں اس قدر مخالفت کی جو علامہ کی وفات کا باعث بنی۔ یہ لوگ علامہ کو ایک شاعر سے زیادہ رتبہ نہیں دیتے۔ آپ نے اسی لئے یہ اشعار کہے ہیں جس سے ان کے دل کی بات ظاہر ہوتی ہے۔

بآں رازے کہ گفتم پئے نبردند زشاخِ نخلِ من خُرما نخوردند

(جو راز میں نے کہے اُن پر قدم نہیں رکھتے، یہ لوگ میری کھجور کے درخت سے پھل نہیں کھاتے)

من اے میرِ اُمم داد از تو خواہم مرا یاراں غزلخوانے شمردند (ا۔ح:۹۲۵)

(اے تمام امتوں کے امیر میں آپ سے انصاف چاہتا ہوں، یار لوگوں نے مجھے محض ایک شاعر ہی تصور کیا ہے)

یوسفِ من بہرِ ایں بازار نیست

علامہ اقبال کو یہ شکایت رہی کہ ان کی قوم نے اُن جواہرات کو قبول نہیں کیا جو انہوں نے قوم کے

سامنے پیش کیے۔ اس ناقدری کی وجہ لوگوں پر شیطانیت کا غلبہ تھا کہ ان کو چند عاشق اور معشوق کی روایتوں اور کہانیوں کے سوا کچھ نہیں بھاتا تھا۔ پورا معاشرہ اس بے دینی روش میں غرق تھا اور اب بھی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے خودی پر جو کلام اپنی قوم کے لئے لکھا اس سے انگریز قوم نے ولایت میں شائع کرنے کے بعد اس سے فائدہ اُٹھایا۔ علامہ اقبالؒ اس حقیقت کو بیان کر کے رویا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اس قوم کے لئے لکھے گئے مضامین سے انگریز استفادہ کر رہے ہیں۔ آپؒ کی فریاد بالکل برحق تھی۔ اس مضمون پر کلام بہت طویل ہے مگر چند اشعار پر قناعت کی جارہی ہے یہ اشعار پڑھ کر علامہؒ کی کیفیت کا علم ہو سکتا ہے۔

عصر من دانندۂ اسرار نیست یوسف من بہر ایں بازار نیست (ا۔خ:۶)

(میرا زمانہ اسرار کو سمجھنے والا نہیں ہے، میرا یوسف اس بازار کے لئے نہیں ہے۔)

ترسم ایں عصرے کہ تو زادی دراں در بدن غرق است و کم داند زجان!

(جس زمانے میں تو پیدا ہوا ہے میں اس سے ڈرتا ہوں، وہ بدن (کی خواہشات) میں غرق ہیں اور روح کی بات سے لاعلم ہیں۔) (ج۔ن:۷۹۵)

مکتب از مقصود خویش آگاہ نیست تا بجذبِ اندرونش راہ نیست! (ج۔ن:۷۹۰)

(ہمارا مدرسہ اپنے مقصود سے آگاہ نہیں، جب تک یہ جذب کلیسی کا راہ نہیں دکھا سکے۔)

ظالم آں قومے کہ چشماں دوختند وز سخنہا عالمے را سوختند (×)

(وہ لوگ کتنے ظالم ہیں جو اپنی آنکھوں کو سی لیتے ہیں اور اپنی گفتگو سے پوری دنیا کو جلا دیتے ہیں۔)

بہ افرنگی بتاں خود را سپردی چہ نامردانہ در بتخانہ مُردی (ا۔ح:۱۰۲۶)

(تم نے اپنے آپ کو فرنگی بتوں کے سپرد کر دیا ہے، اس بت خانے میں تم کس بُری طرح مر گئے ہو۔)

خرد بیگانۂ دل، سینہ بے نور کہ از تاکِ نیاگاں مے نخوردی (ا۔ح:۱۰۲۶)

(تمہاری عقل دل سے بیگانہ ہے اور دل بے نور ہے، کیونکہ تم بزرگوں کی انگور کی بیل سے شراب نہیں پیتے)

بانگ درا میں اپنی نظم "مسلم" میں اسی حقیقت کو دہرایا ہے اور فرماتے ہیں۔

ہر نفس اقبال تیرا آہ میں مستور ہے ۔ سینۂ سوزاں تیرا فریاد سے معمور ہے

گوش آوازِ سرودِ رفتہ کا جویا ترا اور دل ہنگامۂ حاضر سے بے پروا تیرا

قصۂ گل ہم نوایانِ چمن سنتے نہیں اہلِ محفل تیرا پیغامِ کہن سنتے نہیں (ب۔د:۱۹۵)

اے درائے کاروانِ خفتہ پا! خاموش رہ ہے بہت یاس آفریں تیری صدا خاموش رہ (ب۔د:۱۹۶)

گو فکرِ خداداد سے روشن ہے زمانہ آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

اس قوم میں ہے شوخیٔ اندیشہ خطرناک جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد (ب۔ج ۴۶۰)

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو

درج ذیل اشعار میں علامہ اقبالؒ اپنی ان کوششوں کا ذکر کر رہے ہیں جس کی وجہ سے انہوں نے لوگوں کے حالات کو بدلا۔ ان اشعار میں آپ نے بہت سی عادات اور اوصاف کا ذکر کیا ہے جو از خود ظاہر ہیں ۔

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے
(ب۔ج:۳۵۶)

مری نوا سے ہوئے زندہ عارف و عامی دیا ہے میں نے انہیں ذوقِ آتش آشامی
(ب۔ج:۳۶۵)

صفتِ برق چمکتا ہے مرا فکر بلند کہ بھٹکتے نہ پھریں ظلمت شب میں راہی
(ب۔ج:۳۶۸)

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند
تاثیر ہے یہ میرے نفس کی کہ خزاں میں مرغانِ سحر خواں مری صحبت میں ہیں خورسند!
(ض۔ک:۴۸۵)

محفل رامش گری برہم زدم زخمہ برتارِ رگِ عالم زدم (ا۔ر:۶)
(میں عیش وطرب برہم کرنے والا ہوں میں رگ عالم کو اپنے مضراب سے چھیڑتا ہوں۔)

نغمہ ام از زخمہ بے پرواستم مَن نوائے شاعرِ فرداستم (ا۔ر:۶)
(میرا نغمہ مضراب سے بے پرواہ ہے یعنی آنے والے ایام کا شاعر ہوں۔)

نغمۂ من از جہانِ دیگر است ایں جرس را کاروانِ دیگر است (ا۔ر:۷)
(میرے نغمہ کا تعلق ایک اور دنیا سے ہے، اس گھنٹی کا کارواں کچھ اور ہی ہے۔)

برقہا خوابیدہ در جانِ من است کوہ وصحرا باب جولانِ من است (ا۔ر:۷)
(میری جان میں بجلیاں خوابیدہ ہیں کوہ وصحرا ہی میری تگ وتاز کے لائق ہیں۔)

ہیچکس رازے کہ من گویم نگفت ہمچو فکرِ من دُرِ معنی نہ سفت (ا۔ر:۷)
(کسی نے وہ راز نہیں بیاں کیے جو میں نے کیے میرے فکر کی طرح کسی نے موتیوں کی لڑی کو نہیں پرویا۔)

ہندیم از پارسی بیگانہ ام ماہِ نو باشم تہی پیمانہ ام (ا۔ر:۱۱)
(ہم ہندی ہیں فارسی میری زبان نہیں، میں نئے چاند کی مانند اندر سے خالی ہوں۔)

من مثال لالۂ صحراستم درمیانِ محفلے تنہاستم (ا۔ر:۷۸)
(میں صحرا کے لالہ کی طرح ہوں، اپنی محفل میں تنہا ہوں)

محفل از شمع نوا افروختم قوم را رمزِ حیات آموختم (ا۔ر:۱۶۷)
(میں نے محفل کو اپنی آواز سے روشن کیا اور قوم کو رمز حیات سکھائی)

من بہ آغوشِ صدف تابم ہنوز در ضمیرِ بحرِ نایابم ہنوز (پ۔م:۱۸۷)
(میں ابھی تک صدف کے اندر پیچ و تاب کھا رہا ہوں میں ابھی تک ضمیر کے ناپیدا کنار سمندر میں ہوں۔)

برگِ گل رنگیں زمضمونِ من است مصرعِ من قطرۂ خونِ من است (ا۔ر:۱۸۷)
(پھول کی پتی میرے مضمون سے رنگین ہے، میرے ہر شعر کا مصرع میرے خون کا قطرہ ہے۔)

عجم از نغمہ ہائے من جواں شد

علامہؒ نے فرمایا ہے کہ عجم کو ان کے کلام نے بیدار اور جواں کیا ہے۔ اس راہ میں ان کے رفیقِ کارواں بہت کم لوگ تھے۔ عام لوگ تو آپؒ کی شاعری کے مقاصد کو سمجھ ہی نہیں پاتے۔ فرماتے ہیں۔

لالہ و گل از نوایم بے نصیب طائرم در گلستانِ خود غریب (پ۔م:۱۸۷)
(یہاں کے لالہ و گل میری نوا سے بے نصیب ہیں، میں ایسا پرندہ ہوں جو اپنے ہی گلستاں کے اندر اجنبی ہے)

دریں گلشن پریشاں مثلِ بویم نمی دانم چہ می خواہم' چہ جویم (پ۔م:۱۹۷)
(میں اس باغ (دنیا) میں خوشبو کی مانند پریشاں ہوں، مجھے معلوم نہیں میں کیا چاہتا ہوں کسے تلاش کرتا ہوں)

ببازارم مجو دیگر متاعے چوگل جز سینۂ چاکے ندارم (پ۔م:۲۰۴)
(میرے بازار میں کوئی اور سامان نہ ڈھونڈ، میں بھی پھول کی مانند سینۂ چاک کے علاوہ کچھ نہیں رکھتا)

دریں محفل زمن تنہا ترے نیست بچشمِ دیگرے بینم جہاں را (پ۔م:۲۱۳)
(اس محفل (جہاں) میں مجھ سے زیادہ تنہا کوئی نہیں (کیونکہ) میں اس جہاں کو اور نظر سے دیکھتا ہوں۔)

عجم از نغمہ ہائے من جواں شد زسودایم متاعِ او گراں شد
(عجم میرے نغموں سے جواں ہو گیا ہے، میرے جذب سے اس کی متاع قیمتی بن گئی ہے۔)

ہجومے بود رہ گم کردہ در دشت زآوازِ درایم کارواں شد (پ۔م:۲۴۱)
(مسلماں ایک ہجوم کی مانند تھے جو جنگل میں راہ گم کیے بھٹک رہا ہو، میری آواز نے کارواں کی گھنٹی کا کام کیا ہے اور وہ منزل کی جانب روانہ ہوا۔)

میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ میں تو اپنے ملک کے اندرونی حالات سے واقف ہوں اور مسلمانوں کے حالات نے مجھے پریشان کردیا ہے۔ اسی پریشانی کی حالت میں میں جو کچھ کہہ جاتا ہوں وہ شاعری نہیں بلکہ یہ تو ہماری قوم کا رونا ہے۔ اس سلسلے میں علامہ اقبالؒ نے بہت سے انقلابات پیدا کیے۔ آپ کا فلسفہ بھی کچھ ایسا ہے کہ وہ روحانی کیفیات اتنی جلدی بدلنا چاہتے ہیں جس سے مسلمان کی کائنات بھی تیزی سے بدل جائے۔ ویسے بھی آپ کے روحانی افکار بہت دوررس اور بہت اعلیٰ روحانی اقدار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ تمام باتیں دیکھ کر اسرافیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے شکایت کی کہ یہ بندہ کہیں وقت سے پہلے ہی قیامت برپا نہ کردے۔

میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ — کہ میں ہوں محرم راز درونِ میخانہ
(ب۔ج:۳۴۳)

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق — نے ابلہ مسجد ہوں، نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں، بیگانے بھی ناخوش — میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
(ب۔ج:۳۱۳)

حضورِ حق میں اسرافیلؑ نے میری شکایت کی — یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا
(ب۔ج:۳۱۵)

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ — سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف
(ب۔ج:۳۳۲)

میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا — گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں — کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی
اقبالؔ بھی اقبالؔ سے آگاہ نہیں ہے — کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے
(ب۔د:۶۰)

زیارت گاہِ اہلِ عزم و ہمت ہے لحد میری — کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی
(ب۔ج:۳۰۶)

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں — کبھی سوز و سازِ رومی، کبھی پیچ و تابِ رازی
(ب۔ج:۳۰۹)

کشودم از رخِ معنی نقابے

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ اگر چہ میری پرورش ہندوستان کے بت خانہ میں ہوئی مگر میں نے حرمِ دل کے راز کھولے۔ میں نے غلاموں کو شہنشاہی آداب سکھائے۔ علامہ اقبالؒ نے غزل کے رنگ میں خودی کے راز پیش کیے لیکن وہ جس بت خانے میں رہے ہیں اس کے آداب نہیں جانتے اور میں نے قوم پر تمام راز افشاء کیے۔ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ میں بغیر شراب کے مست ہوں اور عام شاعروں کی طرح افسانے بیان کرتا ہوں ۔

دو عالم را تواں دیدن بمینائے کہ من دارم کجا چشمے کہ بیند آں تماشائے کہ من دارم

(میرے پاس جو جام ہے اُس میں دونوں جہاں دیکھے جاسکتے ہیں کہاں ہے وہ آنکھ جو، یہ دیکھے جسے میں دیکھ رہا ہوں۔)(ز۔ع: ۴۵۴)

در غزل اقبالؔ احوالِ خودی را فاش گفت زانکہ ایں نو کافر از آئینِ دیر آگاہ نیست

(اقبال نے اپنی غزل میں خودی کے راز فاش کر دیئے تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ یہ نیا کافر بت خانے کے آداب سے واقف نہیں ہے۔)(ز۔ع: ۴۷۹)

مرا اگر چہ بہ بت خانہ پرورش دادند چکید از لب من آنچہ در دلِ حرم است (ز۔ع: ۴۸۰)

(گرچہ میری پرورش بت خانے میں ہوئی ہے مگر میں نے اپنے لب سے وہی بات کہی ہے جو حرم کے دل میں ہے)

من کہ رمزِ شہر یاری با غلاماں گفتہ ام بندۂ تقصیر وارم پیشِ سلطانم برید (ز۔ع: ۴۸۱)

(میں نے جو غلاموں کو بادشاہی رموز سے آگاہ کیا ہے، میں تقصیروار ہوں مجھے سلطان کے سامنے لے چلو)

اقبال قبا پوشد در کارِ جہاں کوشد دریاب کہ درویشی بادلق و کلاہے نیست

(اقبال نے معمول کے مطابق اچھا لباس پہنا اور دنیا کے کاموں میں مشغول رہا پس سمجھ لے کہ درویشی کا تعلق فقیروں کی کلاہ و گدڑی سے نہیں)(ز۔ع: ۴۹۷)

یوسفِ گم گشتہ را باز کشودم نقاب تا بہ تنک مایگاں ذوقِ خریدن دہم (ز۔ع: ۵۱۵)

(میں یوسف گم گشتہ کو پھر سامنے لاتا ہوں تا کہ عالمِ متاع کے لوگوں کو اس کی خریداری کا شوق پیدا ہو۔)

غوطہ ہا زد در ضمیرِ زندگی اندیشہ ام تا بدست آوردہ ام افکارِ پنہانِ شما

(میرے فکر نے دریائے زندگی میں غوطہ زن ہو کر تمہاری پنہاں سوچ کو پالیا۔)(ز۔ع: ۵۱۷)

کشودم از رخِ معنی نقابے بدستِ ذرّہ دادم آفتابے (ز۔ع: ۵۳۸)

(میں نے رخِ معنیٰ سے پردہ ہٹا کر ذرہ کے ہاتھ میں آفتاب دے دیا ہے۔)

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم مثالِ شاعراں افسانہ بستم (ز۔ع: ۵۳۸)

(یہ نہ سمجھ کہ میں بغیر شراب کے مست ہوں اور شاعروں کی طرح محض افسانہ گوئی کر رہا ہوں۔)

بکوے دلبراں کارے ندارم دلِ زارے غمِ یارے ندارم (ز۔ع:۵۳۸)

(دلبروں کے کوچہ سے مجھے کوئی کام نہیں نہ میرے پاس دل زار ہے نہ غمِ یار)

تنم گلے زخیابانِ جنتِ کشمیر دل از حریم حجاز و نوا زشیراز است

(میرا بدن جنت کشمیر کی کیاری کا ایک پھول ہے، دل حریم حجاز سے ہے اور نوا شیراز سے)(پ۔م:۴۴۸)

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمے بینی برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

(مجھے دیکھو کہ ہندوستان میں میرے سوا تجھے کوئی اور ایسا برہمن زادہ نہیں ملے گا جو روم اور تبریز کے رموز (تصوف) سے باخبر ہو۔)(ز۔ع:۴۰۵)

اقبالؔ غزلخواں را کافر نتواں گفتن سودا بدماغش زد از مدرسہ بیروں بہ

(اقبال غزل خواں کو کافر تو نہیں کہا جا سکتا البتہ اُس کے دماغ میں سودا ضرور ہے اس لئے اسے مدرسہ سے دور رکھا جائے۔)(ز۔ع:۴۱۵)

دلِ بیدار فاروقی دلِ بیدار کرّاری

ایک حدیث شریف کی رو سے دل بیدار وہ ہے جس میں ذکر الٰہی جاری و ساری ہو۔ اس حدیث کے مطابق جب انسان لایعنی یا دنیاوی کاموں میں مبتلا ہو تو شیطان اپنی چونچ اس کے دل میں رکھ دیتا ہے اور اس میں طرح طرح کے وسوسے پیدا کرتا ہے۔ جب وہ ذکر الٰہی میں مشغول ہو جائے تو شیطان اپنی چونچ اس کے دل سے نکال لیتا ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دل بیدار تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دل بھی بیدار تھا، یہی وجہ ہے کہ ان صحابۂ کرام سے بہت اعلیٰ معیار کے کارنامے صادر ہوئے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ ایک مسجد میں جمعۃ المبارک کا واعظ فرما رہے تھے تو آپ نے فوج کے جرنیل کو آگاہ کیا کہ دشمن کی فوج تمہارے عقب سے تعاقب کر رہی ہے۔ آپ نے حضرت ساریہؓ کو اس تعاقب کے بارے جمعہ کے خطبے کے دوران آواز دی اور حضرت ساریہؓ نے دشمن کا قلع قمع کر دیا۔ آپ کے اور بھی ایسے واقعات ہیں جو یہ ثبوت مہیا کر رہے ہیں کہ آپ زندہ دل مسلمان ہیں۔ علامہؒ فرماتے ہیں کہ جب تک دل بیدار پیدا نہ ہو اس وقت تک کوئی ضرب کاری نہیں ہو سکتی۔ اولیائے کرام کے زندہ دل ہونے کے بہت سے واقعات مشہور ہیں لیکن یہاں ان کا ذکر طوالت کا باعث ہوگا۔

دل بیدار فاروقیؓ دل بیدار کرّاریؓ مِسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جبتک　نہ تیری ضرب ہے کاری، نہ میری ضرب ہے کاری
(ب۔ج:۳۲۹)

دل بینا بھی کر خدا سے طلب　آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں (ب۔ج:۳۳۵)
اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل　لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے
(ب۔د:۱۰۸)

دل اگر اس خاک میں زندہ و بیدار ہو　تیری نگہ توڑ دے آئینۂ مہر و ماہ (ب۔ج:۳۶۹)
دل مردہ دل نہیں، اسے زندہ کر دوبارہ　کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ
ترا بحر پرسکوں ہے! یہ سکوں ہے یا فسوں ہے؟　نہ نہنگ ہے، نہ طوفاں نہ خرابیٔ کنارہ!
(ض۔ک:۴۹۸)

حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

علامہؒ فرماتے ہیں کہ خوددار انساں کے لئے زمانہ خود ہی سازگار ہو جاتا ہے۔ اگر دنیا اس کے لئے نہ مل سکتی ہو تو وہ آسمانی قوتوں سے جنگ آزما ہو جاتا ہے۔ علامہؒ نے دنیا میں کامیاب زندگی گزارنے کے اصول درج ذیل اشعار میں سمو دیئے ہیں۔ یہ وقت بڑا نازک ہے اور سوائے اس کے کہ تمام قوم متفقہ طور پر اپنے دل و دماغ کو اصلاح کی طرف متوجہ نہ کرے کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ دنیا میں کوئی بڑا کام سعی بلیغ کے بغیر نہیں ہوا، یہاں تک کہ خدا تعالیٰ بھی کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم اپنی حالت خود نہ بدلے۔ فرماتے ہیں۔

مرد خود دارے کہ باشد پختہ کار　با مزاجِ او بسازد روزگار
(وہ خوددار جواں مرد جو عمل میں پختہ ہو زمانہ اس کے مزاج کے ساتھ خود موافقت پیدا کر لیتا ہے۔)

گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں　می شود جنگ آزما با آسماں
(اگر دنیا اس کے مزاج کے ساتھ موافقت نہ کرے تو وہ آسمان کے ساتھ جنگ آزما ہو جاتا ہے۔)

درجہاں نتواں اگر مردانہ زیست　ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست
(اگر دنیا میں مردانہ وار زندگی بسر نہیں کر سکتے ہو تو مردوں کی طرح جان دے دینا ہی زندگی ہے۔)

آزماید صاحبِ قلبِ سلیم　زورِ خود را از مہماتِ عظیم
(قلب سلیم رکھنے والا شخص عظیم کارناموں سے اپنی قوت کی آزمائش کرتا ہے۔)

عشق با دشوار ورزیدن خوش است　چوں خلیل از شعلہ گل چیدن خوش است

(مشکلات سے ہی عشق کرنا اچھا ہے، خلیل اللہ کی طرح شعلے سے پھول چننا ہی اچھا لگتا ہے۔)(ا۔ر:۴۹)

میارا بزم برساحل کہ آنجا نوائے زندگانی نرم خیز است

(ساحل پر بزم آراستہ نہ کر یہاں زندگی کی نوا مدہم ہے۔)

بدریا غلط و باموجش در آویز حیاتِ جاوداں اندر ستیز است (پ۔م:۲۱۵)

(کود جا دریا میں اور اس کی موجوں سے زور آزمائی کر، حیاتِ جاوداں کشمکش میں ہے۔)

ولیکن من نہ رانم کشتیِ خویش بدریائے کہ موجش بے نہنگ است

(لیکن میں ایسے سمندر میں اپنی کشتی نہیں ڈالتا جس کی موجوں میں نہنگ (مگرمچھ) نہ ہوں۔)(پ۔م:۲۴۴)

قبائے زندگانی چاک تاکے؟ چو موراں آشیاں درِ خاک تاکے؟

(کب تک زندگی کا لباس تار تار رکھے گا کب تک چیونٹیوں کی طرح خاک میں گھر بنائے گا۔)

بہ پرواز آ وشاہینی بیاموز تلاشِ دانہ در خاشاک تاکے؟(پ۔م:۲۴۵)

(پرواز میں آ اور شاہینی سیکھ، چیونٹی کی طرح کب تک مٹی میں رزق تلاش کرے گا۔)

دل آں بحرِاست کو ساحل نہ ورزد

علامہؒ فرماتے ہیں کہ دل جیسے گہرے سمندر کا کوئی ساحل نہیں ہوتا۔ وہاں مگرمچھوں کا بھی داؤ نہیں چلتا۔ جو لوگ اہل دل ہیں اور جن کے دل ذکر و فکر سے قوت اختیار کر گئے ہیں ان کے لئے دنیا کا کوئی مقام مشکل نہیں۔ دل کی دنیا کے اندر کے قوانین باقی دنیا کے قوانین سے مختلف ہیں۔

دل آں بحرِاست کو ساحل نہ ورزد نہنگ از ہیبتِ موجش بلرزد

(دل وہ سمندر ہے جو ساحل نہیں رکھتا اس کی موجوں کی ہیبت سے مگرمچھ بھی ڈرتے ہیں)

ازاں سیلے کہ صد ہاموں بگیرد فلک بایک حبابِ او نیرزد

(اس کے اندر وہ سیلاب اُٹھتے ہیں جو سینکڑوں بیابانوں کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں آسمان تو اس کے (سیلاب کے) ایک بُلبلہ کے برابر بھی نہیں۔)

دلِ ما آتش و تن موجِ دُودش تپیدِ دمبدم سازِ وجودش

(ہمارا دل آگ ہے اور بدن اُس کے دھوئیں کی موج ہے، مسلسل تڑپ اس (دل) کے وجود کا ساز ہے۔)

بذکرِ نیم شب جمعیتِ او چو سیمابے کہ بندد چوبِ عودش (ا۔ح:۹۹۹)

(ذکرِ نیم شب سے دل کی تشبیت ہے جیسے پارہ کو عود کی لکڑی ساکن کر دیتی ہے۔)

زمانہ کارِ اورا می برد پیش کہ مرد خود نگہدار است درویش

(زمانہ خود اس کے کام کو آگے بڑھاتا ہے کیونکہ خوددار شخص مرد درویش ہے۔)

ہمیں فقر است و سلطانی کہ دل را نگہ داری، چو دریا گوہر خویش

(یہی فقر ہے اور یہی سلطانی ہے کہ تو اپنے دل کی حفاظت اس طرح کرے جیسے دریا اپنے گوہر کی حفاظت کرتا ہے)

تو می گوئی کہ دل از خاک و خون است گرفتارِ طلسم کاف و نون است

(تو کہتا ہے کہ دل خاک و خون سے پیدا ہوا ہے اور یہ بھی طلسم کن میں گرفتار ہے۔)

دلِ ما گرچہ اندر سینۂ ماست ولیکن از جہانِ مابرون است (ا۔ح:۱۰۰۰)

((یہ بات نہیں ہے) اگرچہ ہمارا دل ہمارے سینہ میں ہے، لیکن وہ ہماری دنیا سے ماوراء ہے۔)

جہانِ دل، جہانِ رنگ و بو نیست در و پست و بلند و کاخ و کو نیست

(یہ رنگ و بو کی دنیا دل کی دنیا نہیں ہے دل کی دنیا میں نہ پستی ہے نہ بلندی اور نہ محل نہ کوچہ)

زمین و آسمان و چار سو نیست دریں عالم بجز اللہ ھو نیست (ا۔ح:۱۰۰۲)

(نہ وہاں زمین و آسمان ہیں نہ چہار اطراف ہیں اس جہاں میں سوائے اللہ ھو کے اور کچھ نہیں)

بیا بمجلسِ اقبالؒ و یک دو ساغر کش

علامہؒ فرماتے ہیں کہ میں نہ تو شاعر و خرقہ پوش ہوں لیکن میں تو ایک فقیر راہ نشیں ہوں اور دل بے نیاز رکھتا ہوں۔ مجھے جہاں کے رازوں سے باخبر کیا گیا ہے مگر میں زبان نہیں کھولتا کیونکہ آسماں کج رو ہے۔ فرماتے ہیں کہ اقبالؒ کی مجلس میں آ اور ایک دو کش ساغر کے لگاؤ۔ اگرچہ وہ سر نہیں منڈواتا مگر قلندری جانتا ہے۔

نوائے من بہ عجم آتشِ کہن افروخت عرب ز نغمۂ شوقم ہنوز بے خبر است

(میری نوا نے عجم میں پھر پرانی آگ (اسلام کی) روشن کر دی لیکن عرب ابھی تک میرے نغمۂ شوق سے بے خبر ہے۔) (پ۔م:۳۱۷)

ز شعرِ دلکشِ اقبالؔ می تواں دریافت کہ درسِ فلسفہ میداد و عاشقی ورزید (پ۔م:۳۲۶)

(اقبال کے دلکش اشعار سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ یہ درس تو فلسفہ کا دیتا رہا مگر خود اُس نے عاشقی اختیار کیے رکھی)

نہ شیخ شہر نہ شاعر نہ خرقہ پوش اقبالؔ فقیرِ راہ نشین است و دل غنی دارد

(اقبال نہ شیخ ہے نہ شاعر نہ خرقہ پوش وہ صرف ایک فقیر راہ نشیں ہے البتہ دل بے نیاز رکھتا ہے۔) (پ۔م:۳۳۳)

مسنج معنی من در عیار ہند و عجم کہ اصلِ ایں گہر از گریہ ہائے نیم شبی است (پ۔م:۳۳۵)

(میرے اشعار کے معنی کو ہند و عجم کے معیار پر نہ پرکھ کیونکہ اِس گوہر کی اصل نیم شب کے آنسوؤں سے ہے)

اگر چہ زادۂ ہندم فروغِ چشمِ من است ز خاکِ پاک بخارا و کابل و تبریز

(پ۔م:۳۳۹)

(اگرچہ میں ہند میں پیدا ہوا ہوں مگر میری آنکھ بخارا، کابل اور تبریز کی خاکِ پاک سے روشن ہے۔)

بیا بمجلسِ اقبالؔ و یک دو ساغر کش اگرچہ سر نتراشد قلندری داند (پ۔م:۳۴۶)

(اقبال کی مجلس میں آ کر ایک دو جام نوش کر اگرچہ سر نہیں منڈواتا مگر قلندری جانتا ہے۔)

مرا ز پردگیانِ جہاں خبر دادند ولے زباں نکشایم کہ چرخ کج باز است

(مجھے جہاں کے رازوں سے باخبر کیا گیا ہے لیکن میں زبان نہیں کھولتا کیونکہ آسمان کج رو ہے۔) (پ۔م:۳۴۷)

بجبریلِ آمیں ہم داستانم

علامہؒ فرماتے ہیں کہ میں تو جبریلؑ کا ہم داستان ہوں اور میں اس کو رقیب و قاصد اور دربان نہیں سمجھتا۔ میرا فقر تو سامانِ کلیم رکھتا ہے۔ میری خاک میں دل کو دانے کی طرح کاشت کیا گیا ہے۔ میری ذہن کی تختی میں نئی باتیں نقش کی گئی ہیں۔ خودی کی عطا مجھے شہد کی طرح دی گئی ہے۔ کیا کہوں......

بجبریلِ آمیں ہم داستانم رقیب و قاصد و درباں ندانم

(میں تو جبریل امیں کا ہم داستاں ہوں میرا کوئی رقیب، قاصد یا درباں نہیں ہے۔)

مرا با فقر سامانِ کلیم است فرِ شاہنشہی زیرِ گلیم است

(میرا فقر سامانِ کلیم رکھتا ہے میری گدڑی کے نیچے شوکتِ شہنشاہی ہے۔)

دلِ سنگ از زجاجِ من بلرزد یمِ افکارِ من ساحل نہ ورزد

(میرے شیشے سے پتھر کا دل لرزتا ہے میرے افکار کا سمندر بے کنار ہے۔)

بخاکِ من دلے چوں دانہ کشتند بلوحِ مَن خطِ دیگر نوشتند

(میری خاک میں دل کو دانے کی مانند کاشت کیا گیا ہے میرے ذہن کی تختی پر نئی بات رقم کی گئی ہے۔)

مرا ذوقِ خودی چوں انگبین است چہ گویم وارداتِ من ہمین است

(خودی کا ذوق میرے لئے شہد ہے کیا کروں یہی میری کیفیت ہے۔) (ز۔ع:۵۳۸،۵۳۹)

شرارے جستہٴ گیر از درونم کہ من مانند رومیؔ گرم خونم (ز۔ع:۵۶۷)

(میرے اندر سے شرارے کو لے لے میں رومیؒ کی مانند گرم خون ہے۔)

گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام شرح رمزِ صِبْغَۃَ اللہ گفتہ ام

(میں نے قرآن کے دریا سے موتی نکال کر پروئے ہیں میں نے اللہ تعالیٰ کے رنگ کے راز کی شرح کی ہے۔)

با مسلماناں غمے بخشیدہ ام کہنہ شاخے را نمے بخشیدہ ام

(میں نے مسلمانوں کو نیا احساس دیا ہے میں نے اس پرانی شاخ کو نمی دی ہے۔)

حرف شوق آموختم و اسوختم آتشِ افسردہ باز افروختم

(میں نے مسلمانوں کو شوق (محبت) کی بات سکھائی اور سوزِ عشق سے گرمایا میں نے عشق کی بجھی آگ کو دوبارہ روشن کر دیا۔)

دارم اندر سینہ نورِ لا الٰہ در شراب من سرور لا الٰہ (مثنوی مسافر: ۸۸۲)

(میں اپنے سینے میں لا الٰہ کا نور رکھتا ہوں میری شاعری کی شراب میں لا الٰہ کا سرور ہے۔)

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید؟ نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟

(اب گذشتہ سُرود واپس آئے یا نہ آئے حجاز کی طرف سے ٹھنڈی ہوا چلے یا نہ چلے)

سر آمد روزگارِ ایں فقیرے دگر دانائے راز آید کہ ناید؟ (ا۔ح: ۸۹۴)

(اس فقیر اقبال کی زندگی تو ختم ہوئی اب کوئی اور راز آشنا آئے یا نہ آئے۔)

من اندر مشرق و مغرب غریبم کہ از یارانِ محرم بے نصیبم

(میں مشرق و مغرب میں اجنبی ہوں کیونکہ یارانِ راز دان سے محروم ہوں۔)

غمِ خود را بگویم بادلِ خویش چہ معصومانہ غربت را فریبم! (ا۔ح: ۹۴۳)

(اپنا غم میں اپنے ہی دل سے کہتا ہوں کس معصومانہ انداز میں اپنی تنہائی کو زیب دیتا ہوں۔)

چو رومی در حرم دادم اذاں من ازو آموختم اسرار جاں من

(میں نے رومی کی طرح حرم میں اذاں دی ہے اسی سے میں نے روحانیت کے اسرار سیکھے ہیں۔)

بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن او بہ دورِ فتنۂ عصرِ رواں من (ا۔ح: ۹۴۸)

(پچھلے دور کے فتنہ کا مقابلہ اس نے کیا دورِ حاضر کے فتنے کا مقابلہ میں کر رہا ہوں۔)

میری واردات کچھ اس قسم کی ہیں کہ میں نے لوگوں کو شوق اور محبت کی باتیں سکھائی ہیں اور ان کو سوزِ عشق سے گرمایا ہے اور ان کے عشق کی بجھی ہوئی آگ کو دوبارہ زندہ کر دیا ہے۔

در جہاں اسرار دیں را فاش کن

علامہ" مسلمان عوام اور صوفیوں کے لئے فرما رہے ہیں کہ اپنے حجروں سے نکل کر دنیا میں اللہ تعالیٰ کے اسرار کو فاش کریں تا کہ پوری دنیا اس شریعت کے اسرار سے فائدہ اُٹھائے۔

اے کہ می نازی بہ قرآنِ عظیم تا کجا در حجرہ می باشی مقیم

(اے صوفی تو قرآن عظیم پر ناز تو کرتا ہے، کب تک اپنے حجرے میں بیٹھے رہو گے۔)

درجہاں اسرارِ دیں را فاش کن نکتۂ شرعِ مبیں را فاش کن

(دنیا میں دین کے اسرار کو فاش کرو، شرع مبیں کے نکتہ کو فاش کرو۔)

کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

(دنیا میں کوئی کسی کا محتاج نہ ہو شرع مبیں کا مقصد صرف یہی ہے۔)(پ۔چ:۸۲۸)

اقبال نامہ (اوّل ۲۰۲) میں ہے کہ علامہؒ نے فرمایا کہ دین اسلام جو ہر عقیدے کی رو سے ہر شئے پر مقدم ہے نفس انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کے لئے حدود متعین کرتا ہے۔ ان حدود کے متعین کرنے کا نام اصطلاح اسلام میں شریعت یا قانون الٰہی ہے۔

درونِ سینۂ آدم چہ نور است

علامہ اقبالؒ نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل میں کیا نور رکھا ہے کہ غیب بھی اس کی نظروں کے سامنے ہوتا ہے۔ انسان مکانی ہونے کے باوجود لامکانی ہے۔ یہ دنیا کے بندھن میں جکڑے ہوئے ہونے کے باوجود ماورائے مکان ہے۔ انسان محض سانسوں کا شمار نہیں رکھتا لیکن یہ وہ مخلوق ہے کہ اس کے علاوہ اور کوئی خدا کو ڈھونڈنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ حیات ذکر و فکر کی کمند سے ہر پست و بالا کا شکار کرتی ہے۔ ہر انسان دل کے نور سے دیکھے تو ہر چیز کی بصارت حاصل ہو جاتی ہے۔ انسان کا دل سورج کی روشنی کے بغیر بھی سب کچھ دیکھ سکتا ہے۔ اگر دل آزاد ہے تو بدن بھی آزاد ہے ورنہ ہوا سے اڑ جانے والا تنکا ہے۔ علامہؒ فرماتے ہیں۔

درونِ سینۂ آدم چہ نور است چہ نور است ایں کہ غیبِ او حضور است

(سینۂ آدم میں یہ کیا نور ہے کہ اس کا غیاب بھی حضور ہے۔)

بخاک آلودہ و پاک از مکان است بہ بندِ روز و شب پاک از زمان است

(یہ فکر مکانی ہونے کے باوجود لامکان ہے یہ روز و شب کے بندھن میں گرفتار ہونے کے باوجود ماورائے زماں ہے۔)(ز۔ع:۵۴۰)

شمار روزگارش از نفس نیست چنیں جویندہ یابندہ کس نیست (ز۔ع:۵۴۰)

(فکر کی زندگی کا دارومدار سانس کے آنے جانے پر نہیں اس کی مانند کوئی اور جویندہ و یابندہ نہیں)

زمین و آسماں او را مقامے میانِ کارواں تنہا خرامے

(زمین و آسماں کے مقامات ہیں (منزل نہیں) یہ کاروانِ حیات کے درمیان تنہا چلتا ہے۔)

ازو ابلیس و آدم را نمودے ازو ابلیس و آدم را کشودے
(اسی سے ابلیس و آدم کی نمود ہے (اور) اسی سے ابلیس و آدم کے مسائل کا حل ہے۔)

اگر یک چشم بربند گناہے است اگر باہر دو بیند شرطِ راہے است
(اگر فکر میں اپنی آنکھ بند کر لے تو یہ گناہ ہے اور اگر اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھے تو یہ شرط راہ (ہدایت) ہے۔)

درو ہنگامہ ہائے بے خروش است در و رنگ و صدا بے چشم و گوش است
(اس کے اندر بے آواز ہنگامے ہیں اس کے رنگ بغیر چشم کے دیکھے جاسکتے ہیں اور اس کی صدا بغیر کان کے سُنی جاسکتی ہے۔)

حیات از وے براندازد کمندے شود صیادِ ہر پست و بلندے (ز۔ع:۵۴۱)
(زندگی اس کے انداز اور کمند پر ہے، اس سے ہر پست و بالا کا شکار ہوتا ہے۔)

اند کے اندر جہانِ دل نگر تاز نورِ خود شوی روشن بصر
(ذرا اپنے دل کے جہاں پر نگاہ ڈال تا کہ شہری بصارت اپنے نور سے روشن ہو)

چیست دل؟ یک عالمِ بے رنگ و بوست عالمِ بے رنگ و بُو، بے چار سوست
(دل کیا ہے ایک بے رنگ و بو اور بے چار سو جہاں ہے۔)

ساکن و ہر لحظہ سیار است دل عالمِ احوال و افکار است دل
(دل ساکن بھی ہے اور ہر لحظہ سیار بھی ہے یہ کیفیات اور افکار کا جہاں ہے۔)

چشمِ تو بیدار باشد یا بخواب دل بہ بیندے بے شعاعِ آفتاب
(تیری آنکھ بیدار یا خواب میں ہو تیرا قلب آفتاب کی روشنی کے بغیر دیکھتا ہے۔) (ج۔ن:۷۴۲)

تا دل آزاد است آزاد است تن ورنہ کاہے در رہِ باد است تن!
(جب تک دل آزاد ہے بدن بھی آزاد ہے دل آزاد نہ ہو تو بدن اُس تنکے کی مانند ہے جو ہوا کے راستے میں ہے)

ہمچو تن پابندِ آئین است دل مردہ از کیں زندہ از دین است دل
(ج۔ن:۷۶۶)

(بدن کی طرح دل بھی آئین کا پابند ہے عداوت و کینہ سے دل مرجاتا ہے اور دین سے دل زندہ ہوتا ہے۔)

کفر و دیں راگیر در پہنائے دل دل اگر بگریزد از دلؔ وائے دل!
(کفر و دیں کو دل کی گہرائی میں رکھ ایسے دل پر افسوس ہے جو دوسرے دل سے گریز کرے۔)

گرچہ دل زندانی آب و گل است ایں ہمہ آفاق، آفاقِ دل است
(اگر چہ دل آب و گل (بدن) کے قید خانے میں ہے مگر یہ سارا آفاق دل ہی کا آفاق ہے۔)

درجہاں جز دردِ دل ساماں مخواہ! نعمت از حق خواہ و از سلطاں مخواہ!
(دنیا میں دردِ دل کے علاوہ کسی اور سامان کی خواہش نہ رکھ جو بھی نعمت چاہتا ہے اللہ تعالیٰ سے مانگ کسی بادشاہ سے نہیں)(ج۔ن: ۷۹۴)

نرسد فسوں گریٔ خرد بہ تپیدنِ دلِ زندۂ زکنشتِ فلسفیاں در آ بحریم سوز و گداز
(خرد کی جادوگری دل زندہ کی تڑپ کو نہیں پہنچتی فلسفیوں کے کُنشت (یہود کا معبد) سے میرے سوز وساز کے حرم میں آجا)(پ۔م: ۳۴۴)

جہاں کوراست واز آئینۂ دل غافل افتاد است ولے چشمے کہ بینا شد نگاہش بر دل افتاد است
(یہ جہاں اندھا ہے کیونکہ آئینۂ قلب کی صلاحیتوں سے بے خبر ہے البتہ جو آنکھ بینا ہو جائے اس کی نگاہ دل پر رہتی ہے۔)(ز۔ع: ۴۹۴)

خرد چوں سوز پیدا کرد دل شد

علامہؒ فرماتے ہیں کہ یہ جہاں خاک کی مٹھی ہے لیکن اس دل میں قطرۂ دل کو سنبھالنا مشکل امر ہے۔ ہر شخص کا جہاں اس کے اندر ہے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ سینے کے اندر دل کیا ہے؟ جب خرد نے سوز پیدا کیا تو دل بن گیا یعنی دل اسی وقت قابلِ قدر ہے کہ جب اس میں سوز اور گرمی دل ہو۔ انسان کے دل میں ایک پورا سمندر ہے۔ انسان کے اندر (دل میں) ایک لامحدود جہاں ہے۔ دل حلقہ ہست وبود سے باہر ہے۔ اگر انسان مر بھی جائے تو کیا ہو کیونکہ مرنے کے بعد بھی دل باقی ہے۔ انسان کے اللہ تعالیٰ نے بہت سے گراں قدر رازوں کو افشا کیا ہے اور انسان کو اس کا ادراک ضروری قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

جہاں مشتِ گل و دل حاصل او ست ہمیں یک قطرۂ خوں مشکل او ست
(یہ جہاں خاک کی مٹھی ہے اور دل اُس کا حاصل ہے اِسی ایک قطرۂ خوں کو سنبھالنا اس کی مشکل ہے۔)

نگاہِ ما دوبیں افتاد ورنہ جہانِ ہر کسے اندر دلِ اوست (پ۔م: ۱۹۷)
(ہماری نظر (جہاں اور دل) دونوں کو الگ الگ دیکھتی ہے ورنہ ہر شخص کا جہاں اس کے اپنے اندر ہے۔)

چہ می پرسی میانِ سینۂ دل چیست؟ خرد چوں سوز پیدا کرد دل شد
(کیا پوچھتا ہے کہ سینے کے اندر دل کیا ہے؟، جب خرد نے سوز پیدا کیا تو دل بن گیا۔)

دل از ذوقِ تپش دل بود لیکن چو یک دم از تپش افتاد گِل شد (پ۔م: ۲۰۷)
(دل سوزِ عشق کی بدولت دل تھا لیکن جب ذرا اس گرمی سے خالی ہوا تو مٹی ہو گیا۔)

من اے دنشوراں درپیچ و تابم خرد را فہم ایں معنی محال است

(اے دانشورو! میں ایک الجھن میں ہوں خرد کے لئے اس نکتہ کو سنبھالنا محال ہے۔)

چساں در مشتِ خاکے تن زند دل — کہ دل دشتِ غزالانِ خیال است!
(پ۔م: ۲۱۴)

(مُشتِ خاک (بدن) کے اندر دل کس طرح رکھ دیا گیا کیونکہ دل تو غزالانِ افکار کا مرغزار خیال ہے۔)

یکے بر دل نظر وا کن کہ بینی — یمِ ایّام در یک جام غرق است (پ۔م: ۲۱۷)

(لیکن اپنے دل پر ذرا نظر ڈال، زمانے کا سمندر اِس ایک جام میں سمایا ہوا ہے۔)

ز انجم تا بہ انجم صد جہاں بود — خرد ہر جا کہ پرزد آسماں بود

(ایک ستارے سے دوسرے ستارے تک کئی جہاں ہیں جہاں بھی خرد پہنچی وہاں ایک آسمان تھا۔)

ولیکن چوں بخود نگریستم من — کرانِ بیکراں در من نہاں بود (پ۔م: ۲۲۰)

(لیکن جب میں نے اپنے اندر دیکھا تو میرے اندر ایک لامحدود جہان مخفی تھا۔)

چہ غم داری، حیاتِ دل زدم نیست — کہ دل در حلقۂ بود و عدم نیست

(غم کیا دل کی زندگی محض سانس سے نہیں، دل حلقہ ہست ونیست سے باہر ہے۔)

مخور اے کم نظر اندیشۂ مرگ — اگر دم رفت دل باقی ست غم نیست

(اے کم نظر موت کی فکر نہ کر اگر دم نکل بھی گیا تو دل باقی ہے، غم کیا!) (پ۔م: ۲۳۷)

در جہان است دلِ ما کہ جہاں در دل ماست — لب فرو بند کہ ایں عقدہ کشودن نتواں

(ہمارا دل دنیا میں ہے کیونکہ جہاں ہمارے دل میں ہے، منہ بند رکھ کیونکہ یہ عقدہ حل نہیں کیا جا سکتا) (پ۔م: ۳۳۶)

در جہانِ دلِ ما دورِ قمر پیدا نیست — انقلابیست ولے شام و سحر پیدا نیست

(ہمارے دل کے جہاں میں کوئی ایسا قمر نہیں جو گھٹتا بڑھتا ہو یہاں انقلاب آتے ہیں مگر ان کا تعلق صبح و شام (گردشِ آفتاب) سے نہیں۔) (پ۔م: ۳۴۰)

ایں تیرہ خاکداں کہ جہاں نام کردۂ — فرسودہ پیکرے زصنم خانۂ دل است

(یہ تاریک خاکداں جس کا نام تو نے جہاں رکھا ہے صنم خانۂ دل کا ایک بوسیدہ بت ہے۔) (پ۔م: ۳۴۱)

علامہ اقبالؒ کا طلباء سے خطاب

علامہ اقبالؒ کا تعلیمی فلسفہ جو آپؒ نے بیان فرمایا وہ یہ ہے کہ قوم کا ایک ایک فرد حبِ قوم و وطن سے سرشار ہو کر میدانِ عمل میں کود پڑے۔ آپؒ نے علی گڑھ کے ایک سپاس نامے کے جواب میں کہا ''میں گزشتہ چند سال سے صرف جسدِ خاکی کا مالک ہوں میری روح ہمیشہ آپ کی خدمت کے لئے حاضر رہتی ہے اور جب تک

میں زندہ ہوں وہ آپ کی خدمت کرتی رہے گی۔" علامہ اقبالؒ کی بہت سی نظمیں اقبالؒ کی آرزوؤں، اُمیدوں اور ولولوں کا خوبصورت اظہار ہیں۔

خطاب بہ جوانانِ اسلام

مسلمانوں کی بیداری کے متعلق علامہ اقبالؒ نے جوانانِ اسلام سے یوں خطاب فرمایا جو قابلِ غور ہے۔

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبر بھی کیا تو نے؟
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا؟

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوش محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا

تمدن آفریں، خلاقِ آئینِ جہاں داری
وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارا

سماں الفقر فخری، کا رہا شانِ امارت میں
"بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا"

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشین کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا

اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارا

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار، تو ثابت وہ سیارا

گنوادی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مسلم سے کوئی چارا

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا
''غنی! روز سیاہِ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را''

نمازی بننے کے خواہشمندں کے لئے

شریعتِ اسلامیہ میں طریقت اور روحانیت کے علم کو سیکھنے سے زیادہ اہم کام نمازوں کی پابندی حاصل کرنا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے پہلے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ پہلے مسلمان پانچ وقت کی نمازوں کا پابند بنے۔ اس کتاب کی ابتداء میں قارئین کو اس بات کی اہمیت کو بیان کرنا واجب ہے تاکہ ان کو اس حقیقت کا علم ہو جائے کہ ہر فرد اور ہر ملک کے مسلمانوں کے لئے سب سے اہم بات نمازوں پر پابند ہونا ہے۔ کوئی قوم یا ملک اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک اس کے افراد اسلام کے سب سے اہم فریضے کو قائم نہ کر سکیں۔ پاکستان حکومت کو اس نکتے کی طرف توجہ دینا خدا کی طرف سے مقرر فریضہ ہے کہ ملک میں نماز قائم کرنے کا نظام وجود میں لائیں کیونکہ یہ ملکی ترقی کے لئے پہلا قدم ہے۔ جن مغربی ممالک نے نماز کو قائم کرنے کے بغیر ترقی کی ہے وہ غلط راستوں کے ذریعے ترقی کے زینے پر چڑھے ہیں اور وہ فرعون ونمرود اور ہامان وشداد کی تقلید کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دین و دنیا کی ترقی کے لئے نماز کو ہی ایک کامیاب ذریعہ مقرر کیا ہے۔ یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ اگر کوئی شخص دین دار ہوتے ہوئے ترقی کے موقعوں کو نگاہ میں رکھتا ہے تو یقیناً اسے خدا کی طرف سے بھرپور مدد ملتی ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو کامیابیوں سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

راقم الحروف نے لوگوں کو نمازی بنانے کے لئے ''نشانِ منزل''، ''حسن نماز''، ''اِقَامَۃُ الصَّلٰوۃ'' کے علاوہ زیرِ نظر کتاب کو بھی تصنیف کیا ہے۔ دین دار زندگی کی ابتداء کرنے والوں کے لئے لازم ہے کہ وہ ہماری تصانیف ''نشانِ منزل'' اور ''اِقَامَۃُ الصَّلٰوۃ'' کا مطالعہ کریں۔ یہ کتابیں اس قدر آسان ہیں کہ جسے معمولی تعلیم والا بھی پڑھ سکتا ہے اور اس میں بیان کردہ طریقوں کو اپنا کر آسانی سے نمازی بن جاتا ہے۔ یہاں پر چند مختصر نکات کی نشان دہی کی جارہی ہے اور اگر ہماری مذکورہ (نہایت سستی) کتابوں کا مطالعہ فرمائیں تو ہر شخص پکا نمازی بن سکتا ہے۔ یہ نسخہ بار بار آزمایا جاچکا ہے۔

ا۔ پہلا نقطہ یہ ہے کہ مسلمان کو یقین حاصل ہو سکے کہ ایک خدا ضرور موجود ہے۔ اس یقین کے متعلق مذکورہ کتب میں بہت سے ثبوت دیئے گئے ہیں لیکن سب سے زیادہ اہم ثبوت یہ ہے کہ۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ بیشک ہم ہی نے اُتارا ہے اس ذکر (قرآن

مجید) کو اور یقیناً ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ (سورۃ الحجر: ۹)

دنیا کی کوئی (الہامی کتاب) (تورات، زبور اور انجیل) یا کوئی غیر الہامی کتاب انسان کو حفظ (یعنی زبانی یاد) نہیں ہو سکتی مگر قرآن کے لاکھوں حفاظ موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی حفاظت کے لئے قرآن کو دلوں پر لکھ دیا ہے اور جو شخص اسلام قبول کرتا ہے تو تھوڑی سی محنت کے بعد قرآن کو حفظ کر سکتا ہے۔ یہ ایک کھلم کھلا چیلنج ہے کہ سوائے قرآن مجید کے اور کوئی کتاب حفظ نہیں ہو سکتی اور یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ مذہب اسلام بالکل صحیح مذہب ہے اور ایک خدا بھی اس کی حفاظت کرنے والا موجود ہے۔

ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ماں کے پیٹ میں بچہ کم وبیش نو ماہ کے لئے قیام کرتا ہے مگر اس کو اللہ تعالیٰ نے قطعاً کوئی تکلیف نہیں دی کیونکہ بچے نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ جب یہ بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اس بات پر مکلف ہوتا ہے کہ نیک عمل کرے، اگر یہ بچہ پیدا ہونے کے بعد نیک عمل نہیں کرے گا تو قبر (جو کہ ماں کے پیٹ کی طرح ہے) میں اس کو سزا ملے گی۔ اگر بچہ بڑا ہونے کے بعد نیک اعمال کرے گا تو اس کو قبر میں ماں کے پیٹ کی طرح کوئی تکلیف نہ ہوگی بلکہ اسے ایسا آرام ملے گا جیسا کہ اس کی قبر جنت کا ایک حصہ بن گئی ہے۔

۲۔ نماز کا پڑھنا انسان کے لئے بہت فائدہ مند ہے۔ اس کا ذکر قرآن میں ۷۰۰ بار سے زائد آچکا ہے۔ نماز ایک ایسی عبادت ہے کہ اس کو فرض کرنے کا حکم دینے کے لئے رسول اللہ ﷺ کو معراج پر بلایا گیا جبکہ باقی فرائض (مثلاً رمضان، زکوۃ اور حج) کے لئے بذریعہ وحی احکام صادر کئے گئے۔ اس سے یہ اخذ کیا جائے گا نماز خاص الخاص اور اہم عبادت ہے۔

۳۔ بے نمازیوں کی غفلت دور کرنے کے لئے راقم الحروف نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ انسان اپنے شیطان پر یہ بات واضح کر دے کہ آج سے میں نے نماز کو تسلسل کے ساتھ ادا کرنے کا ارادہ کر لیا ہے اس لئے وہ مجھے گمراہ کرنے کی کوشش نہ کرے کیونکہ شیطان ہی انسانوں کو نماز سے دور رکھنے کی تدابیر وجود میں لاتا ہے۔

۴۔ بے نمازیوں کے لئے راقم الحروف کی یہ تجویز ہے کہ وہ نمازوں میں اختصار کو ملحوظ رکھیں۔ مثلاً عشاء کی نماز میں صرف چار فرض، دو سنت اور تین وتر ادا کریں۔ باقی نمازیں ویسے ہی چھوٹی ہیں۔ جب تک آدمی پکا نمازی نہ ہو جائے اس وقت تک نوافل اور سنتِ غیر مؤکدہ ترک کر سکتا ہے۔

۵۔ اگر کوئی نماز رہ جائے تو اس کی قضا اسی دن یا بعد میں ادا کرے۔ اگر صبح کے وقت آنکھ نہ کھلے تو جب بھی اُٹھے قضا نماز پڑھ کر دنیا کے کام شروع کرے یا اپنے مقامِ کاروبار پر جا کر قضا نماز ادا کرے۔

۶۔ نمازی بننے کے لئے جو تجاویز ہماری تصانیف ''نشانِ منزل'' اور ''اقامۃ الصلوٰۃ'' میں دی گئی ہیں ان کا غور سے مطالعہ کریں۔ ہماری تصنیف ''حسن نماز'' میں نماز کی برکات کا بہت اچھا ذکر کیا گیا ہے۔ وباللہ التوفیق۔ الصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم

(مصنف)

علامہ اقبالؒ کا دیگر کلام

علامہ اقبالؒ کے دوسرے کلام کا خاکہ پیش کرنا تو کوئی آسان کام نہیں کیونکہ یہ دس کتابوں پر پھیلا ہوا ہے۔ آپ کے کلام کی لامتناہی گہرائیوں کو پیش کرنے کی کوشش میں سینکڑوں کتب لکھی جا چکی ہیں اور ابھی لکھی جاتی رہیں گی۔

راقم الحروف کو علامہ اقبالؒ سے عشق کی حد تک لگاؤ ہے اور اکثر اوقات ان کے مزار کی حاضری دیتا ہے۔ کشف القبور کے ذریعہ سے آپ سے بہت سے مسائل پر گفتگو ہوتی ہے جو شاید کسی دوسری کتاب میں لکھی جائے گی۔ آپؒ نے راقم الحروف کی خدمات کو سراہا ہے اور فرمایا ہے کہ اس زمانے میں خصوصی طور پر میرے مشن کو آپ کے سوا اور کوئی شخص نہیں چلا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں ہماری طرف سے تقریباً پندرہ کتب تصنیف کی جا چکی ہیں اور ان سب میں علامہ اقبالؒ کے کلام کو لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس کو علامہ اقبالؒ نے پسند فرمایا ہے۔ ایک اور کتاب جو علامہ اقبالؒ کی تعلیمات پر لکھی جا رہی ہے اِنشاء اللہ (زندگی نے وفا کی تو) دو ایک سال میں شائع ہو سکتی ہے۔

نیچے تبرکاً علامہ اقبالؒ کے کچھ مزید اشعار دیئے جا رہے ہیں جس سے قارئین کی خوشنودی کا امکان ہے ملاحظہ فرمائیں۔

اے مسلماں اپنے دل سے پوچھ مُلّا سے نہ پوچھ ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے پھر اس میں عجب کیا کہ تو بے باک نہیں ہے

کیا صوفی و مُلّا کو خبر میرے جنوں کی اُن کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

مریدِ سادہ تو رو رو کے ہو گیا تائب خدا کرے کہ ملے شیخ کو بھی یہ توفیق

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

ہے مملکتِ ہند میں اک طرفہ تماشا اِسلام ہے محبوس مسلمان ہے آزاد

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی

میں نے تو کیا پردۂ اسرار کو بھی چاک دیرینہ ہے تیرا مرضِ کورِ نگاہی

سکھا دیئے ہیں شیوہ ہائے خانقہی
فقیہِ شہر کو صوفی نے کر دیا ہے خراب

وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اُسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

سُنی نہ مصر و فلسطیں میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب

ہوئی نہ عام جہاں میں کبھی حکومتِ عشق
سبب یہ ہے کہ محبت زمانہ ساز نہیں

اپنے رزّاق کو نہ پہچانے تو مُحتاجِ ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحرخیزی

اب حجرۂ صُوفی میں وہ فقر نہیں باقی
خونِ دلِ شیراں ہو جس فقر کی دستاویز

کرتی ہے ملوکیت آثارِ جنوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

جس کا عمل ہو بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے
حور و خیام سے گزر بادۂ و جام سے گزر

تیرا امام بے حضور تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گزر ایسے امام سے گزر

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے!
فقیہہ و صوفی و شاعر کی نا خوش اندیشی

کافر ہے مسلماں تو نہ شاہی نہ فقیری
مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی

بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات

چہروں پہ سرخی نظر آتی ہے سرِ شام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

کوئی دیکھے تو ہے باریک فطرت کا حجاب اِتنا
نمایاں ہیں فرشتوں کے تبسم ہائے پنہانی

یہ دنیا دعوتِ دیدار ہے فرزندِ آدم کو
کہ ہر مستور کو بخشا گیا ہے ذوقِ عریانی

خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی
یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی

یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کا عیار
اسی مقام سے آدم ہے ظلِ سُبحانی

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقامِ صفاتِ عشق تماشائے ذات

عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال عشق ہے پنہاں جواب

عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں
عشق کے ادنیٰ غلام صاحبِ تاج و نگیں

عشق پہ بجلی حلال عشق پہ حاصل حرام
علم ہے ابن الکتاب عشق ہے اُم الکتاب

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش

دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا
زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش

جرأت ہے تو افکار کی دنیا سے گزر جا
ہیں بحر خودی میں ابھی پوشیدہ جزیرے

کھلتے نہیں اس قلزمِ خاموش کے اسرار
جب تک تو اسے ضربِ کلیمی سے نہ چیرے

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّہ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب

شوکت سنجر و سلیم، تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنیدؒ و بایزیدؒ، تیرا جمالِ بے نقاب

شوق ترا اگر نہ ہو مری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب

تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل، غیاب و جستجو، عشق حضور و اضطراب

تازہ میرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰؐ عقل تمام بولہب

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہر فردا

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغِ وادی سینا

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ!

سنائی کے ادب سے میں نے غواصی نہ کی ورنہ
ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوئے لالا

میرا سبوچہ غنیمت ہے اس زمانے میں
کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو

متاع بے بہا ہے درد و سوزِ آرزومندی
مقام بندگی دیکر نہ لوں شانِ خداوندی

تیرے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے مُلّا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی

احکام تیرے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قراں کو بنا سکتے ہیں پاژند

فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا
افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی
خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبالؒ
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

نہ کر تقلید اے جبریلؑ میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اُولیٰ

حضورِ حق میں اسرافیلؑ نے میری شکایت کی
یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا

ندا آئی کہ آشوبِ قیامت سے یہ کیا کم ہے
گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا!

عشق بھی ہو حجاب میں حُسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

روزے حساب جب میرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

مقامِ شوق تیرے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

میری بساط کیا ہے تب و تاب یک نفس
شعلہ سے بے محل ہے اُلجھنا شرار کا

کر پہلے مجھ کو زندگی جاوداں عطا
پھر ذوق و شوق دیکھ دلِ بے قرار کا

بنایا عشق نے دریائے نا پیدا کراں مجھ کو
یہ میری خودنگہداری مرا ساحل نہ بن جائے

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

متاعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

ضمیرِ لالہ مئے لعل سے ہوا لبریز
اشارہ پاتے ہی صوفی نے توڑ دی پرہیز

نہ اُٹھا پھر کوئی رومیؔ عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی

نہیں ہے نااُمید اقبالؒ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

عشق کی تیغِ جگردار اُڑالی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عین حیات
ہو نہ روشن، تو سخن مرگِ دوام اے ساقی

نہ جبریلے نہ فردوسے نہ حورے نے خداوندے
کفِ خاکے کہ می سوزد زجانِ آرزو مندے

انجام خرد ہے بے حضوری
ہے فلسفۂ زندگی سے دوری

افکار کے نغمہ ہائے صوت
ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت

مرا از منطق آید بوئے خامی
دلیلِ اُو دلیلِ ناتمامی

توڑا نہیں جادو میری تکبیر نے تیرا
ہے تجھ میں مکر جانے کی جرأت تو مکر جا

بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں
لرز جاتا ہے آوازِ اذاں سے

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس اُن کی
الٰہی کیا چھُپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر سمجھا
اور کافر یہ سمجھتا ہے کہ مسلمان ہوں میں

علاج آتشِ رومیؔ کے سوز میں ہے ترا
تیری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

عطارؔ ہو رومیؔ ہو رازیؔ ہو غزالیؔ ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پر ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سربکف!

حاکمی بے نورِ جانِ خام است خام
بے یدِ بیضا ملوکیت حرام

انجامِ خرد ہے بے حضوری
ہے فلسفۂ زندگی سے دوری

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں

حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں
میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی، زیاں تیرا ہے یا میرا

صحبت از علم کتابی خوشتر است
صحبتِ مردانِ حُر آدم گر است

(نیک لوگوں کی صحبت علم کتابی سے بہتر ہے، مردانِ کامل کی صحبت انسان کو انسان بنا دیتی ہے۔)

ما کلیسا دوست ما مسجد فروش
اُو ز دستِ مصطفےٰؐ پیمانہ نوش

(ہم تو کلیسا کے دوست ہیں اور کبھی مسجد فروش ہیں، لیکن اللہ والے محمد مصطفےٰ ﷺ سے (توحید کا) جام پیتے ہیں)

اے سرت گردم گریز از ما چو تیر
دامنِ اُو گیر و بے تابانہ گیر

(تیرے سر کی قسم تو ہم جیسوں سے تیر کی طرح بھاگ، لیکن اللہ والوں کا دامن پکڑ اور بیتابی سے پکڑو)

اندر ایں عالم نیرزی باخسے
تا نیاویزی بداماں کسے

(وہ شخص اس دنیا میں تنکے کی قیمت نہیں رکھتا، جب تک کسی مردِ حر کے دامن کو نہ پکڑ لے۔)

باب ۴

علامہ اقبالؒ کا نظریہ فقر

علامہ اقبالؒ کو فقر کے ساتھ بہت گہری دلچسپی تھی۔ وہ فقر کے دلدادہ اور قدر دان تھے۔ یہاں تک کہ آپ نے اپنے کلام میں بیشتر مقامات پر خود کو قلندر یا فقیر کہنا زیادہ پسند کیا ہے۔ دیگر موضوعات کی نسبت فقر پر آپؒ نے جی کھول کر کلام فرمایا ہے۔ آپ کا نثری کلام اس کتاب میں تصوف کے باب میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اس جگہ آپؒ کے منظوم کلام کا کچھ حصہ پیش کیا جا رہا ہے جس میں آپؒ نے نہایت دلچسپ انداز سے فقر کے تمام زریں اصول، اغراض، غایات اور لوازمات کو بہت خوبصورتی کے ساتھ اپنے مخصوص اور حسین انداز میں بیان فرمایا ہے۔ آپؒ کے اس کلام کے مطالعہ سے مسلمانوں پر مقامِ فقر کی رفعتیں اپنے پورے حسن و کمال کے ساتھ آشکار ہو جاتی ہیں۔ مسلمانوں کے ایک گروہ نے فقر سے بیزاری کا اظہار کیا۔ آپؒ نے اس کی سختی سے تردید کی ہے۔ آپؒ نے اپنے کلام میں خود ساختہ فقر کے باعث مرتب ہونے والے قبیح اور مذموم اثرات سے بھی مسلمانوں کو آگاہ کیا ہے۔ باقی کلام کی طرح جب آپؒ کا قلم فقر پر اٹھا تو آپؒ نے قوم پر اس بات کو واضح کر دیا کہ فقر اسلامی ضابطۂ حیات پر سختی سے عمل پیرا ہونے کا نام ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ان نام نہاد فقراء نے کیا ہے وہ بے دینی اور فسق و فجور کے علاوہ کچھ نہیں۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں اس بات کو واضح فرمایا ہے کہ پورا اسلام فقر کی بنیادوں پر استوار ہے یا یوں کہیے کہ اسلام کا بنیادی منشا فقراء کی سی زندگی گزارنا ہے اور وہ مسلمانوں سے سادہ زندگی بسر کرنے کی توقع رکھتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کبارؓ کی زندگیاں درویشانہ زندگی کی مثالیں تھیں۔ مسلمانوں کو یہ حکم تھا کہ اگر کسی گھڑ سوار کا چابک زمین پر گر پڑے تو وہ یہ خواہش نہ کرے کہ کوئی دوسرا شخص وہ چابک اٹھا کر دے، بلکہ خود گھوڑے سے نیچے اترے اور چابک اٹھائے۔ اس معمولی سی مثال میں یہ سبق دیا جا رہا ہے کہ جو شخص معمولی باتوں میں دوسروں پر انحصار کرتا ہے تو وہ ایک دن بڑے بڑے معاملات میں دوسروں کے رحم و کرم کا محتاج ہو سکتا ہے اسی طرح ایسی قوم تن آسانی کا شکار ہو جائے گی' جو رفتہ رفتہ اسے عیش پرستی کی لعنت میں گرفتار کر دے گی۔ آپ نے اپنے فارسی کلام میں یہ لکھا ہے۔ کہ حضرت عمرؓ کی طرح اپنا چابک اُٹھانے کے لئے خود اُونٹ سے اترو۔

علامہ اقبالؒ نے غلط فقر کو "فقرِ مجازی" قرار دیا ہے مگر وہ صحت فقر کے لئے کچھ شرائط عائد کرتے ہیں اور مسلمان سے فقر کو اپنانے کے لئے ہمت کا مطالبہ کرتے ہیں کیونکہ فقر کوئی ایسی بات نہیں جسے آسانی سے حاصل کیا جاسکے۔ فقر کے لئے ضروری ہے کہ فقیر اپنے دل و دماغ اور ذہن وضمیر کو بے لگام جبلتوں کے دباؤ سے آزاد کرلے اور نفس کو بغاوت سے باز رکھے۔ اس کے ساتھ ساتھ نفس کی جبلتوں پر قادر ہو کر اپنی ذات کو خدا اور اس کے احکام کے اس طرح تابع بنالے کہ اپنی ذاتی پسند یا ناپسند کو احکام الٰہی پر قربان کرسکے۔ یہ تمام ایسے امور ہیں جن کو اپنانے کے لئے مصمّم عزم، ہمت اور استقامت کی ضرورت ہے۔

علامہ اقبالؒ کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپؒ نے اپنی شاعری کے اوائل میں فقر سے متعلق سرسری کلام کیا ہے مگر "ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز" جو ان کی زندگی کے آخری حصے کی تصانیف ہیں ان میں فقر اصطلاحی کا استعمال نسبتاً زیادہ کیا ہے۔ اس مجموعۂ کلام میں آپؒ نے فقر کے متعلقات اور ضروریات پر مفصل گفتگو کی ہے اور اسے کھول کر بیان کیا ہے۔ علامہؒ کے نزدیک فقر ترکِ دُنیا یا ترکِ علائق کا نام نہیں اور نہ ہی رہبانیت کو فقر کہتے ہیں، البتہ اس میں مطالعۂ کائنات اور مطالعۂ ذات کے لئے بالعموم کچھ عرصے کے لیے اپنا وقت خلوت نشینی میں گزارا جاتا ہے۔ یہی غور، تدبّر اور تفکّر فی الاشیاء اسلام میں قابلِ قدر امور سمجھے جاتے ہیں جس کی مثال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں غارِ حرا کے ایامِ خلوت میں ملتی ہے اور آپ ﷺ نے امت کے لئے بھی فرمایا "تَفَقَّهْ ثُمَّ اعْتَزِلْ" (یعنی خوب علم حاصل کرو اور پھر خلوت میں چلے جاؤ) چنانچہ اکثر صوفیائے کرام نے تزکیۂ نفس کے لئے کچھ دیر خلوت ضرور اختیار کی ہے۔ علامہؒ کے ہاں بھی خلوت نشینی اور شب بیداریوں کا ذکر ملتا ہے۔ وہ اپنی ان قلبی بے قراریوں اور عشق کی کیفیتوں کو اپنے کلام میں سوز وسازِ رومی اور پیچ وتابِ رازی کے افکار میں ڈوبی ہوئی راتوں کا حوالہ دیتے ہیں اور اپنی اس رنگ میں رنگی ہوئی زندگی کے آخری لمحات کو بھی روزگارِ فقیر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

سر آمد روز گارِ ایں فقیرے — دِگر دانائے راز آید کہ ناید؟ (ا۔ح: ۸۹۴)

(اس فقیر کا زمانہ اختتام کو آ گیا ہے، اب کوئی اور دانائے راز آئے یا نہ آئے)

صوفیائے کرام جو بڑے بڑے علماء اور فقہاء میں سے تھے اپنے وقتوں میں خلوت اور عزلت کو اختیار کرتے رہے۔ یاد رہے کہ خلوت غیروں سے ہوتی ہے اور عزلت نفس سے ہوتی ہے اور اس چیز سے بھی جو غیر کی طرف بلائے اور خدا سے غافل کر دے۔ خلوت اور عزلت تصوف کی تعلیم اور اتباعِ شریعت کے ضروری خیال کی جاتی ہیں۔

تصوف کی اصل منشا مسلمان میں حق الیقین پیدا کرنا ہے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں [illegible] کی سخت ریاضتوں کے بعد مجھے [illegible] (۲۰) (ہم اس سے [illegible]

زیادہ نزدیک ہیں) پر یقین قائم ہوا اور اگر یہ یقین پہلے قائم ہو جاتا تو اس قدر ریاضتوں کی ضرورت نہ ہوتی۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے "الفتح الربانی" میں فرمایا ہے کہ تم اسلام کو سچ مچ کا اسلام بناؤ تا کہ ایمان تک رسائی حاصل کر سکو۔ پھر اس حالت میں تم وہ کچھ دیکھو گے جو یقین کی حالت سے پہلے نہ دیکھا تھا۔ یقین تمہیں صورت اشیاء کو اس طرح دکھائے گا جیسی وہ ہیں۔ اس طرح سماعی (سنی سنائی) بات آنکھوں دیکھی بن جائے گی۔

حضرت داتا گنج بخشؒ کشف المحجوب میں فرماتے ہیں کہ طریقت تصوف کی مضبوط جڑ ہے اور شاخیں پھل دار ہیں۔ طریقت وتصوف کے جملہ مشائخ اہلِ علم میں سے تھے اور وہ اپنے ارادت مندوں کو علم عطا کرتے تھے۔ یقیناً وہ عوام کے لئے مرشد اور مصلح کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ خانقاہوں میں مقید رہبر نہ تھے، ان کی خانقاہیں مدرسوں کی حیثیت رکھتی تھیں اور ان کی خانقاہیں اسلام کی عملی تربیت گاہیں تھیں۔ کچھ لوگ جو تارک الدنیا تھے وہ نہ تو واجب الاتباع تھے اور نہ ہی مشاہیر شیوخ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ حضرت بایزید بسطامیؒ کا ارشاد جو "التعرف" میں ملتا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر تم کسی کو صاحب کرامت دیکھو تو اس سے دھوکہ مت کھاؤ، پہلے یہ دیکھو کہ وہ شریعت کا احترام کرتا ہے یا نہیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے مکتوبات شریف میں اپنے مرید شیخ عبدالہادیؒ کو گوشہ نشینی کی اجازت فرمائی اور لکھا کہ بے شک گوشہ نشینی صدیقین کی آرزو ہے لیکن مسلمانوں کے حقوق (تربیت اور نگہبانی) کو ہاتھ سے نہ جانے دیں یعنی خلوت میں بھی درس وتدریس اور اہل خانہ کے حقوق پامال نہ ہوں۔ (مکتوبات ربانی)

علامہ اقبالؒ نے اپنے خیالات کا مکمل اظہار اپنے کلام میں اس طرح کر دیا ہے جو کسی وضاحت کا محتاج نہیں لہٰذا زیادہ مناسب یہ ہے کہ تصوف اور رہبانیت میں فرق بیان کرنے کے بعد علامہؒ کا منظوم کلام پیش کیا جائے جو فقر کے طالب علموں کی مکمل راہنمائی کی ضمانت دیتا ہے۔

اسلامی تصوف اور رہبانیت

سورۃ الحدید آیت نمبر ۲۷ میں ہے

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَآتَيْنَاهُ الْإِنْجِيلَ ۙ وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً ۚ وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۖ فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ ۖ وَكَثِيرٌ

ہم نے شفقت اور رحمت رکھ دی ان لوگوں کے دلوں میں جو عیسیٰ علیہ السلام کے تابعدار تھے اور رہبانیت کو انہوں نے خود اختیار کیا، ہم نے ان پر اسے (یعنی رہبانیت کو) فرض نہیں کیا تھا، البتہ انہوں نے رضائے الٰہی کے حصول کے لئے اسے اختیار کیا، پھر اسے وہ نباہ نہ سکے جیسے اس کے

وَمِنْهُمْ فٰسِقُوْنَ۝۲۷

نباہنے کا حق تھا۔ پس ہم نے عطا فرمایا جو ان میں سے ایمان لے آئے (ان کے حُسنِ عمل اور حُسنِ نیت) کا اُجر ہے اور اِن میں سے اکثر فاسق (و فجر) تھے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ

(۱) رہبانیت کو اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں پر فرض نہیں کیا تھا بلکہ انہوں نے اس کام کو اللہ کی رضا کے لئے خود اختیار کیا۔

(۲) ان میں سے جنہوں نے اس کا حق ادا نہ کیا وہ موردِ عتابِ الٰہی ہوئے۔

(۳) جن قلیل لوگوں نے اس کا حق ادا کیا اور خلوصِ نیت سے اسے اختیار کِیا اور اس کے تقاضوں کو پورا کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے حسن عمل کا اجر عطا فرمایا۔

(۴) اگر رہبانیت کا حق ادا کیا جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث ہوگا۔

رہبانیت میں خرابیاں کس طرح پیدا کی گئی ہیں؟

رہبانیت کے معنی خوف اور ڈر کے ہیں اور اس سے مراد وہ مسلک ہے جس کی بنیاد خوف اور ڈر پر ہو۔ رہبانیت "رُھْبَانٌ" سے مشتق ہے، جو راہب کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور اس کا معنی اُن لوگوں کا مسلک اور طرزِ زندگی ہے جو ہر وقت ڈرنے اور خوف زدہ رہنے والے ہیں۔ علامہ راغب اصفہانیؒ نے فرمایا کہ اس کا مطلب فرطِ خوف سے عبادت میں حد درجہ غلو کرنا ہے۔ علامہ پانی پتیؒ لکھتے ہیں کہ اس کا مطلب عبادت اور ریاضت میں مبالغہ ہے، لوگوں سے قطع تعلق کو جائز قرار دینا اور مباح خواہشات کو بھی ترک کر دینا ہے۔

تفسیر ضیاء القرآن میں لکھا ہے کہ "رہبانیت کی ابتداء کیسے ہوئی۔ اس کی وضاحت حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے ہوتی ہے۔ وہ یوں کہ حضور اکرم ﷺ نے ان کو فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل پر جابر لوگ غالب آ گئے اور انہوں نے فسق و فجور کا بازار گرم کر دیا۔ اہلِ ایمان نے غیرتِ ایمانی سے ان کے خلاف جہاد کیا یعنی اِن کے ساتھ جنگ کی لیکن تین مرتبہ شکست ہوئی اور صرف چند لوگ زندہ بچے۔ اُنہوں نے آپس میں کہا کہ اگر اب ہم نے اِن سے لڑائی کی تو وہ ہم سب کو نیست و نابود کر دیں گے اور ایک شخص بھی ایسا نہ بچے گا جو دینِ حق کی طرف لوگوں کو بلائے۔ اُنہوں نے مشورہ کیا کہ ہم زمین میں منتشر ہو جائیں لہٰذا انہوں نے رہبانیت کا آغاز کیا۔ اِن میں سے کچھ لوگ تو اپنے دین کو مضبوطی سے پکڑے رہے اور بعض نے کفر اختیار کیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ الحدید کی یہ آیت [illegible] تلاوت فرمائی۔"

معلوم ہوا کہ دینِ عیسوی کی روح اہلِ دنیا سے کنارہ کشی کرنا نہ تھی بلکہ لوگوں نے جابر بادشاہ کے ظلم سے بچنے کے لئے یہ قدم اٹھایا تھا لیکن بعد میں آنے والوں نے اِس کو دین کا حصہ بنالیا اور اِس میں غلو کیا مثلاً یہ لوگ اپنی جائز خواہشات کا گلا گھونٹنا، ازدواجی زندگی کو خیر باد کہنا، پادریوں کا شادی نہ کرنا اور اپنے جسموں پر بوجھ لادے رکھنا، خود کو زنجیروں میں جکڑے رکھنا، خود کو خصّی کر دینا، اصل رہبانیت قرار دیتے تھے حالانکہ عیسائی مذہب میں ایسی کوئی گنجائش نہیں۔ اِس کے علاوہ ماں باپ، بہن بھائی اور اولاد سے قطع تعلقی رہبانی مدارج طے کرنے کے لئے شرطِ اول تھی۔ تاریخ میں درج اس وقت کے راہبوں کی سفاکی، ظلم اور تشدد کے واقعات پڑھ کر دل کانپ اٹھتا ہے۔ بعد میں یہ تحریک اور بھی زور پکڑ گئی اور ایسی خانقاہوں کی بھرمار ہوگئی جہاں راہب مرد اور راہبہ خواتین آ کر جمع ہوگئیں۔

مصلحت در دینِ ما جنگ و شکوہ　مصلحت در دینِ عیسیٰؑ غار و کوہ (ب۔ج:۴۳۱)

(ہمارے دین کی مصلحت جنگ و دبدبہ ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کے دین کی مصلحت پہاڑ و غار میں ہے۔)

جیسا کہ قرآن مجید میں ذکر ہے کہ بڑے بڑے پوپ اور سینٹ مال و دولت جمع کرنے میں اپنے وقت کے قارونوں کو بھی مات دینے لگے اور جن خانقاہوں میں کنواری راہبات قیام کرتیں وہاں حرام کاری کے اڈے جاری ہو جاتے۔ کلیساؤں کی تاریخ کا یہ بڑا اندوہناک اور شرمناک باب ہے جو ان کے اپنے مؤرخین نے لکھا ہے اور ان تمام بدعنوانیوں کو قرآن نے فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا کے ایک جملے میں بیان کر دیا (پھر وہ اس رہبانیت کو نبھا نہ سکے جیسا کہ اس کے نبھانے کا حق تھا۔ سورہ الحدید آیت نمبر ۲۷) قرطبیؒ نے لکھا کہ ان راہبوں نے رہبانیت کو طلب ریاست کے لئے بطور زینہ استعمال کیا اور وہ لوگوں کا مال ہڑپ کرتے تھے۔

اسلام میں ریاضت اور عبادت کا سلسلہ اس طرح جاری کیا گیا کہ اس نے مسلمانوں کو خواہشات کی پیروی، دولت کی محبت اور آسائشوں میں غرق ہونے سے تو منع کیا لیکن اس نے ترکِ دنیا اور نفس کشی کا طریقہ نہیں سکھایا۔ اسلام نے شادی کی ترغیب دی اجازت دی اور کاروبارِ دنیا کو بھی عبادت قرار دیا اور اپنے عزیز و اقارب کے حقوق کی ادائیگی کا حکم دیا۔ اسلام نے نفس کا حق ادا کرنے کا حکم دیا اور مضرِ صحت مشقتوں سے منع فرمایا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اپنے نفسوں پر سختی نہ کیا کرو ورنہ اللہ تعالیٰ تم پر بھی سختی فرمائے گا۔ ایک قوم نے اپنے اوپر ناروا سختی کی تو اللہ نے بھی ان پر سختی کی۔

احادیث میں ہے کہ کچھ صحابہ کرامؓ نے ساری رات عبادت کرنے کا، ہمیشہ روزہ رکھنے، شادی نہ کرنے اور گوشت نہ کھانے کا ارادہ فرمایا تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ”خدا کی قسم میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں اور سب سے زیادہ پرہیز گار ہوں، مگر میرا معمول یہ ہے کہ میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا

ہوں، راتوں کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ جس نے میری سنت سے دانستہ روگردانی کی اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ حضرت ابو امامہ باہلیؓ کی روایت میں ہے کہ ہمارے ایک ساتھی نے اپنی بقیہ عمر نماز میں گزارنے کے لئے حضور اکرم ﷺ سے اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا" میں یہودیت اور نصرانیت کے ساتھ مبعوث نہیں کیا گیا بلکہ ملّتِ حنفیہ دے کر بھیجا گیا ہوں جس میں آسانی اور فراخی ہے۔ اس ذات پاک کی قسم جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے، ایک صبح اور ایک شام راہ خدا میں جہاد کرنا دنیا ومافیہا سے افضل ہے اور تمہارا مجاہدین کی صفِ اول میں کھڑا ہونا ساٹھ سال کی (نفلی) نماز سے بہتر ہے۔" ایک جگہ فرمایا ہے کہ ہر اُمت کے لئے رہبانیت ہے اور میری اُمت کے لئے رہبانیت راہ خدا میں جہاد ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اسلام میں مجاہدات اور عبادات میں کثرت صرف شریعتِ مُسلمہ کے مطابق ہے اور اس رہبانیت سے سراسر مختلف ہے، جس کو یہود اور نصاریٰ نے اپنی مرضی اور من گھڑت اصولوں پر رائج کیا تھا۔ اسلامی روحانیت کیا ہے؟ اس کو آئندہ تحریر میں بیان کیا جارہا ہے۔ علامہؒ نے فرمایا۔

فقرِ کافر خلوتِ دشت و در است فقرِ مومن لرزۂ بحر و بر است (پ۔چ:۸۱۸)

(کافرانہ فقر ترکِ دنیا اور گوشہ نشینی ہے، مومن کا فقر وہ ہے جس سے بحر و بر لرزہ براندام ہو جائیں۔)

علامہ اقبالؒ نے جب ان تمام راہبانہ حرکات کے خلاف آواز بلند کی تو وہ لوگ جو غیر اسلامی روحانیت کے پیروکار تھے بہ یک آواز اس کی مخاصمت پر اتر آئے اس پر علامہ نے فرمایا۔

ضمیرِ مغرب ہے تاجرانہ، ضمیرِ مشرق ہے راہبانہ وہاں دگرگوں ہے لحظہ لحظہ، یہاں بدلتا نہیں زمانہ
حریف اپنا سمجھ رہے ہیں، مجھے خدایانِ خانقاہی انہیں یہ ڈر ہے کہ میرے نالوں سے شق نہ ہو سنگِ آستانہ
(ا۔ح:۶۸۸)

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا، خدا فریبی کہ خود فریبی؟ عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ
(ا۔ح:۶۸۷)

علامہ اقبالؒ نے ضربِ کلیم میں فرمایا ہے کہ نام نہاد صوفیوں نے خود کو شرابِ الست کے نشے میں مخمور ظاہر کیا ہے اور اس طرح راہِ شریعت سے فرار اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا یہ اسلوب اس لئے ہے کہ ایسی مستی کا اظہار کرنے سے وہ شریعت کے مواخذہ سے بچ جائیں۔ فرماتے ہیں شریعت پر عمل کرنا تو جنگ بدست (یعنی ایک بہت بڑے جہاد) کی طرح ہے اور فقیہ شہر نے بھی خود کو اس جہاد سے دور رکھنے کا بہانہ بنایا ہے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ نے فرمایا کہ جہنم میں [illegible] سے آسان ہے کہ کوئی ایک مسئلہ [illegible]

معلوم کر کے اس پر عمل کرے۔

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ الست
فقیہِ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست
(ض۔ک:۵۰۰)

فقر اور رہبانیت میں فرق

فقر پر سیر حاصل تحریر آئندہ صفحات پر آ رہی ہے۔ رہبانیت ترکِ دنیا اور ترکِ موالات ہے جبکہ فقر میں فقیر شریعتِ مصطفوی ﷺ کی روشنی میں زندگی گزارتا ہے چنانچہ یہ کلیساؤں کی رہبانیت کے بالکل برعکس ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ دین و دنیا میں جدائی ہو جائے تو زندگی کا ہر کام ہوس کی آرزو پوری کرنے کے لئے ہوگا۔ یہ حضور اکرم ﷺ کا اعجاز ہے کہ انہوں نے خوف و اُمید کے درمیان سیدھی سادی زندگی بسر کرنے کا طریقہ سکھایا ہے۔

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں کہ وہ سر بلندی ہے یہ سر بزیری (عاجزی)
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا چلی کچھ نہ پیرِ کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی ہوس کی امیری ہوس کی وزیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشین کا بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری (ب۔ج:۴۱۰)

علامہ اقبالؒ نے واضح الفاظ میں فقیری اور رہبانی کا فرق بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اسلام اُس دنیائے فقر سے بیزار ہے جس میں رہبانیت کی آمیزش ہو اور جب سے کفار کے اُکسانے پر مسلمانوں نے اپنے اصلی فقر کو خیر باد کہا ہے اس وقت سے ان سے دولتِ سلیمانی چھن گئی ہے اور وہ دنیا میں ذلیل و رسوا ہو گئے ہیں۔

کچھ اور چیز ہے شاید تیری مسلمانی تری نگاہ میں ہے ایک فقر و رہبانی
سکوں پرستی راہب سے فقر ہے بیزار فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی (ض۔ک:۵۱۲)
یہ فقرِ مردِ مسلمان نے کھو دیا جب سے رہی نہ دولتِ سلمانی و سلیمانی (ض۔ک:۵۱۳)

علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کو اس بات کی تلقین فرمائی کہ جب تک اُمتِ مسلمہ اِس رہبانیت آمیز فقر کو خیر باد نہ کہے گی اور اسلامی فقر کو اختیار نہ کرے گی وہ ہمیشہ زوال کی طرف نزول کرتی رہے گی۔

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری
ترے دین و ادب سے آ رہی ہے بوئے رہبانی یہی ہے مرنے والی اُمتوں کا عالمِ پیری
(ا۔ح:۶۸۰)

فقر کی وضاحت

قرآن و حدیث نے جس چیز کو فقر قرار دیا ہے اس کی تفسیر پہلے بیان کر دی گئی ہے۔ علامہ اقبالؒ "پس چہ باید کرد" میں اپنے الفاظ میں اس کو یوں بیان کرتے ہیں کہ فقر "نگاہ راہ بین" اور "زندہ دل" ہونے کا نام ہے۔ نگاہ راہ بین سے مراد راہ شریعت کو نگاہ میں رکھنا اور اس کی رعایت کرنا ہے جبکہ زندہ دلی سے مراد ہر وقت ذکر الٰہی سے اپنے دل کو بیدار رکھنا ہے۔ یہ دونوں باتیں جہاں مجتمع ہو جاتی ہیں وہاں شریعت اور طریقت دونوں عملی طور پر پائے جاتے ہیں اور منزل یعنی وصل الٰہی کو پا لینے کی حقیقت میسر ہو جاتی ہے۔ حصول قرب وصل کے بعد سالک کو جن انعامات سے نوازا جاتا ہے اس کی مختصر تشریح درج ذیل اشعار میں نظر آتی ہے یعنی مقام فقر کے حاصل ہونے کے بعد جو صفات فقیر میں پائی جاتی ہیں ان کا تذکرہ علامہ اقبالؒ کچھ اس طرح فرماتے ہیں۔

چیست فقر اے بندگانِ آب و گل　　یک نگاہِ راہ بیں، یک زندہ دل

(اے آب و خاک کے بندو (معلوم ہے) فقر کیا ہے؟ فقر تو ایک نگاہِ راہ بین اور زندہ دلی کا نام ہے۔)

فقر کارِ خویش را سنجیدن است　　بر دو حرف لا الٰہ پیچیدن است

(فقر اپنے کام کو پرکھنا یا جانچنا ہے اور لا الٰہ کے دو حرفوں کو مرکز بنانا ہے۔) (پ۔چ: ۸۱۶)

فقر خیبر گیر بانانِ شعیر　　بستۂ فتراکِ او سلطان و میر

(جو کی روٹی کھا کر درِ خیبر اکھاڑ دینا فقر ہے، اس کا شکار تو بڑے بڑے سلاطین اور امراء ہیں۔)

فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضاست　　ما امینیم ایں متاعِ مصطفیٰؐ ست

(فقر تو (عمل کے لئے) ذوق و شوق اور تسلیم و رضا کی خو ہے، ہم اس فقر کے امین ہیں اور یہ حضور اکرم ﷺ کی متاع ہے۔)

فقر بر کروبیاں شبخوں زند　　بر نوامیسِ جہاں شبخوں زند

(فقر فرشتوں پر غلبہ حاصل کرتا ہے، قدرت کی پوشیدہ قوتوں کو مسخر کرتا ہے۔)

برگ و سازِ او ز قرآنِ عظیم　　مردِ درویشے نہ گنجد در گلیم [illegible]

(اس کی متاع حیات تعلیم قرآن سے ہے مرد درویش گودڑی میں نہیں سماتا [illegible])

فقرِ قرآں احتسابِ هست و بود　　نے رباب و مستی و رقص و سرود

(اس کے تصرف کا دائرہ [illegible] کرتا ہے، رقص و سرود [illegible])

علامہ اقبالؒ [illegible]

اور صفاتِ الٰہی سے متصف ہونے کا نام ہے۔

فقرِ مومن چیست؟ تسخیرِ جہات بندہ از تاثیرِ اُو مولا صفات (پ۔چ:۸۱۸)

(مومن کا فقر کیا ہے؟ تمام جہات کا تسخیر کرنا، ایسے فقر کی تاثیر سے بندہ صفاتِ الٰہیہ پیدا کرتا ہے۔)

فقر خواہی از تہی دستی منال عافیت در حال و نے در جاہ و مال

(اگر فقر چاہتے ہو تو خالی دست ہونے کے خوف سے بے دل نہ ہو جاؤ، عافیت حال کی درستگی میں ہے عزت و مال میں نہیں) (پ۔چ:۸۰۹)

فقر چوں عریاں شود زیرِ سپہر از نہیبِ اُو بلرزد ماہ و مہر

(فقر جب خود کو آسمان کے نیچے سے ظاہر کرتا ہے، تو اس کی دہشت سے سورج و چاند کانپنے لگتے ہیں۔)

فقرِ عریاں گرمیٔ بدر و حنین فقرِ عریاں بانگِ تکبیرِ حسین

(فقر جب ظاہر ہو تو بدر و حنین کی گرمی ظاہر کرتا ہے، حضرت حسینؓ کا نعرہ تکبیر بلند کرنا فقرِ عریاں تھا۔)

فقر را تا ذوقِ عریانی نہ ماند آں جلال اندر مسلمانی نہ ماند

(فقر میں جب یہ اعجاز نہ رہا، تو مسلمانی میں وہ رعب و دبدبہ بھی نہ رہا) (پ۔چ:۸۱۸)

حضور رسالت مآب ﷺ کے نام ارمغانِ حجاز میں جو شعر علامہؒ نے لکھے ہیں ان میں فقر کا مقصد اپنی باز گیری کرنا (خود کو پہچاننا) اور یقینِ کامل حاصل کرنے کے بعد حیاتِ جاوداں حاصل کرنا لکھا ہے۔ صوفی کے مجاہدات اسے یقین کی دولت سے مالا مال کرتے ہیں، جبکہ بے یقینی میں انسانی اقدار کی موت ہے۔

خوشا روزے کہ خود را باز گیری ہمیں فقر است کو بخشد امیری

(وہ دن خوش نصیب ہیں جب تو خود اپنی گرفت کرے، یہی وہ فقر ہے جو حکومت عطا کرتا ہے۔)

حیاتِ جاوداں اندر یقین است رہِ تخمین و ظن گیری بمیری (ا۔ح:۹۹۲)

(ہمیشہ رہنے والی زندگی یقین میں ہوتی ہے، تخمین و ظن کی راہ پکڑو گے تو مر جاؤ گے۔)

قرآن کا فقر دستگیری کرتا ہے

اپنے کلام میں علامہؒ نے قرآن کے مطالعہ اور اس کے احکام پر عمل کرنے کو بہت اہمیت دی ہے۔ فقر، قرآن کی اصطلاح بھی ہے اور اسی کا ایک حصہ ہے۔ یہ اصطلاح علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء میں جاوید نامہ کی تصنیف کے موقع پر ایجاد کی۔ اس سے پہلے کی کتابوں مثلاً اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، پیامِ مشرق اور زبورِ عجم میں فقر کا لفظ ان معانی میں استعمال نہیں فرمایا۔ علامہؒ اس فقر کی تشریح جاوید نامہ میں حسب ذیل الفاظ میں کرتے ہیں۔

جز بقرآں ضیغمی روباہی است فقرِ قرآں اصلِ شہنشاہی است

(قرآن کے علاوہ شیر کی بہادری بھی گیدڑ پن ہے، قرآن کا فقر شہنشاہی کی اصل ہے۔)

فقرِ قرآن اختلاطِ ذکر و فکر فکر را کامل ندیدم جز بذکر

(قرآن کا فقر ذکر اور فکر کے جمع کرنے سے بنتا ہے، فکر کو میں نے ذکر کے بغیر کبھی کامل نہیں دیکھا)

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ دستگیر بندۂ بے ساز و برگ

(ج۔ن:۶۶۸)

(قرآن کیا ہے؟ آقاؤں کے لئے موت کا پیغام ہے، بے سروسامان کی دستگیری کرتا ہے۔)

قرآن کا فہم حاصل کرنا اور اس کو عوام میں پھیلانا علماء اور فقراء کا منصب ہے لیکن علامہؒ کے نزدیک علماء قرآن سے خود کو بے نیاز تصور کئے ہوئے ہیں اور اپنی ولر یا تقریروں سے لوگوں کو مسحور کیا کرتے ہیں جبکہ صوفی لوگ بھی عراقی کے عارفانہ کلام کی قوالیاں سنتے اور اپنے سروں کو دھنتے ہیں۔ صوفی اپنے وجد اور تواجد کو دیگر فرائض سے اعلیٰ اور ارفع تصور کرتے ہیں۔ افسوس ہے کہ وہ اپنی محفلوں کو قرآن کے درسوں سے نہیں سجاتے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے خلفاء کو اس بات کی تلقین فرمایا کرتے تھے کہ بجائے تصوف کی باتیں بیان کرنے کے وہ عوام کو نماز و روزے یعنی شریعت کے احکام کی بجا آوری کا درس دیا کریں کیونکہ یہ زیادہ ضروری ہے۔ مراد یہ کہ تصوف تو اس کے بعد کی بات ہے۔

عالماں از علمِ قرآں بے نیاز صوفیاں درندہ گرگ و مُو دراز (ج۔ن:۷۹۴)

(عالم قرآن کے علم سے لاتعلق ہیں، اور صوفی لوگ خونخوار بھیڑیے کی طرح ہیں اور لمبے بال رکھتے ہیں)

صوفیِ پشمینہ پوشِ حال مست از شرابِ نغمۂ قوال مست (ا۔خ:۱۲۳)

(صوفی پشمینہ پوش اپنے حال میں مست ہے، قوال کے نغموں کی شراب میں غرق ہے۔)

آتش از شعرِ عراقی در دلش در نمی سازد بقرآں محفلش (ا۔خ:۱۲۳)

(عراقی کے شعروں کی آگ اس کے دل میں بھڑک رہی ہے، لیکن اپنی محفل کو درسِ قرآن سے آراستہ نہیں کرتا۔)

علامہ اقبالؒ ارمغانِ حجاز میں صوفیاء اور علماء سے فرماتے ہیں کہ قرآن کی مدد سے قوم کو جہالت کی شام سے علم و دین کی سحر کی طرف لے کر آئیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ اپنی بہن کی قرأت کو سن کر حضرت عمرؓ جو اس وقت اسلام کے دشمن تھے، مائل بہ اسلام ہو گئے اور ایک دم اسلام قبول کر لیا۔

ز شامِ ما برون آور سحر را بہ قرآں باز خواں اہلِ [illegible]

(قوم کی شام جہالت سے علم کی [illegible] قرآن کی طرف [illegible])

[illegible]

(تمہیں یاد ہے کہ تمہاری قرأت کے سوز نے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تقدیر کو بدل کر رکھ دیا)

فقر قرآن کے بغیر ممکن نہیں

تاریخ شاہد ہے کہ قرآن پر عمل پیرا ہونے کے سبب بدو قوموں کو قرآن نے پوری دنیا کا حکمران بنا دیا اور جب سے مسلمانوں نے قرآن کو بالائے طاق رکھ دیا ان کو دنیا میں رسوائی کے سوا اور کچھ نہ ملا۔ مسلمانوں پر ایک وقت یہ بھی آیا کہ انہوں نے کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا پڑھنا بھی بھلا دیا اور جانور ذبح کرنے کے لئے انہیں امام مسجد کا سہارا لینے کی ضرورت ہوتی تھی کیونکہ وہ خود کلمہ تکبیر نہیں پڑھ سکتے تھے۔

بندِ صوفی و مُلّا اسیری حیات از حکمتِ قرآں نگیری

(تم ملا اور صوفی کی بندش میں رہتے ہو قرآن کی حکمت سے زندگی بسر کرنا نہیں سیکھتے)

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست کہ از یٰسٓ اُو آساں بمیری (ا۔ح:۹۵۵)

(قرآن کی آیات سے تیرا سروکار اس سے زیادہ نہیں کہ تو وقت موت یٰسین کے پڑھنے سے جلدی مر جائے گا۔)

جو فقیر قرآن پر عمل پیرا ہے اس کے فقر پر قرآن گواہی دیتا ہے اور اس کی عزت و وقار اور ناموس کا ذمہ دار ہے لیکن فرنگی راج کے وقتوں میں عام مسجدوں کے مُلّا جو مناسب تعلیم کے زیور سے آراستہ نہ تھے، ان کا علم بھی اس قدر ناقص تھا کہ وہ لوگوں کی راہنمائی نہیں کر سکتے تھے، یہی وجہ تھی کہ مسلمان پوری دنیا میں رسوا ہو گئے۔ مسلمان یہ نہیں جانتے تھے کہ قرآن ہی ایک ایسی چیز ہے جو ان کی ترقی اور وقار کا سبب بن سکتی ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ ہر کوئی اپنی مرضی کے مطابق قرآن کی تاویل کرنے لگا جو مسلمانوں میں تفرقہ پروری کا سبب بنا۔ اصلی فقر قرآن سے اپنی زندگی کو آراستہ کرنے کا سبق دیتا ہے۔

دینِ حق از کافری رُسوا تر است زانکہ مُلّا مومنِ کافر گر است

(ان کی وجہ سے خدا کا دین حق کافری سے بھی زیادہ رسوا ہے، کیونکہ ہمارا مُلّا ایسا مومن ہے جو کافر گری کرتا ہے)

از شگرفیہائے آں قرآں فروش دیدہ اَم روح الامین را در خروش

(اس قرآن فروش ملا کی عجیب وغریب باتوں سے میں نے جبرائیل علیہ السلام کو خشمگین (غصہ کرتے) دیکھا ہے۔)

زاں سوئے گردوں دلش بیگانۂ نزدِ اُو اُمّ الکتاب افسانۂ

(آسمان حق سے اس کا دل بالکل بیگانہ ہے، اس کے نزدیک قرآن محض ایک افسانہ ہے۔)

بے نصیب از حکمتِ دینِ نبیؐ آسمانش تیرہ از بے کوکبی (ج۔ن:۶۶۴)

(حکمتِ نبی ﷺ سے اس کو کچھ حصہ نہیں ملا، روشن ستاروں کے نہ ہونے کی وجہ سے ان کا آسمان تاریک ہے)

افسوس کا مقام ہے کہ ان دنوں میں اگرچہ مسلمانوں نے قرآن کی طرف کچھ قدم بڑھایا ہے لیکن اب بھی مسلمانوں کی ایک بھاری اکثریت اسی لاعلمی اور قرآن سے لاتعلقی کا اظہار کر رہی ہے۔ جہاں قرآن خوانی ہوتی ہے وہاں اکثر لوگ چنوں پر کلمہ پڑھتے نظر آتے ہیں۔ مسلمانوں کو اس بات کا یقین کر لینا چاہیے کہ جب تک وہ قرآن سے مدد نہ لیں گے اس وقت تک وہ قعرِ مذلت سے باہر نہیں نکل سکتے۔ ہر مسلمان کے لئے قرآن کا پڑھنا، سننا، سمجھنا اور حتی المقدور عمل کرنا واجب ہے۔ (فرائض اور واجبات کا علم حاصل کرنا بھی واجب ہے۔)

صحبت، فقر کی ضروریات میں سے ہے

ضرورتِ شیخ پر استدلال کے بیان میں مشائخِ کرام کی صحبت سے حاصل ہونے والے کمالات کا ذکر گزر چکا ہے۔ بزرگوں کے ساتھ عقیدت کا بڑا دخل ہے ان کی ہمراہی رنگ لاتی ہے جیسا کہ صحابہؓ پر عقیدت کا رنگ چڑھا اگر عقیدت نہ ہو تو یہ ہمراہی بیکار ہوتی ہے۔

صحبت اگر عداوت کے ساتھ ہو تو باعثِ عذاب اور قہرِ الٰہی کا موجب بنتی ہے جیسے منافقین کو سوائے دین و دنیا کی خجالت کے اور کچھ نہ ملا۔ شیطان بھی ساری عمر مقبولانِ الٰہی کے ساتھ رہتا ہے مگر عقیدت کے بغیر اسے ان کے ساتھ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ صوفیہ فرماتے ہیں کہ عبادت کا فائدہ خوش صحبت عابدوں کو ہوتا ہے، یہاں تک کہ نیکوں کی صحبت کا فائدہ جانوروں بلکہ درختوں اور پتھروں کو بھی ہونا ثابت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا لکڑی کا منبر "استنِ حنانہ" جب آپ ﷺ کے ہجر کے باعث رویا تو تمام صحابہؓ نے اس کے رونے کی آواز سنی۔ تل پھولوں کی صحبت میں پھولوں کی طرح مہک جاتے ہیں حتیٰ کہ اس کا تیل بھی خوشبودار ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ اور منہ سے لگا ہوا رومال آگ میں نہیں جلتا۔ آپ کے پاؤں کا غسالہ بیماریوں کے لئے شفا بن گیا۔ صفا و مروہ کی پہاڑیاں حضرت ہاجرہؓ کے قدموں سے مس ہوئیں تو تا قیامت افضل ہو گئیں۔ ہم بزرگوں سے بیعت کرتے ہیں تو ہمارے اندر ان کے کمالات کی خوشبو پیدا ہو جاتی ہے۔ سعدیؒ نے اس خوشبودار خاک کے احساسات کی ترجمانی یوں کی ہے جو چند روز پھولوں کی صحبت میں خوشبودار ہو گئی تھی۔

گل خوشبوئے در حمام روزے رسید از دست محبوبے [illegible]

(ایک روز حمام میں خوشبودار مٹی ایک محبوب کے ہاتھ سے ملی)

بدو گفتم کہ مشکی یا [illegible] کہ از بوئے [illegible] [illegible]

(میں نے اس سے پوچھا کہ تو مشک ہے یا عنبر، کہ میں تیری دل آویز خوشبو سے مست ہو گیا ہوں۔)

بہ گفتا، من گلِ نا چیز بودم   ولیکن مدتے با گل نشستم

(اس نے کہا کہ میں تو ناچیز مٹی ہی ہوں، لیکن ایک عرصہ پھولوں کی صحبت میں رہی ہوں۔)

جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد   وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

(گلستانِ شیخ سعدی)

(خوشبودار (پھولوں) کے جمال نے مجھ پر اثر کیا ہے، وگرنہ میں تو وہی خاک ہوں، جو ہوں۔)

فقراء کی صحبت

شیخ ابو العباس قصاب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے جو مرید اپنے مرشد کے پاس ایک مجلس بیٹھے گا وہ سو رکعت نوافل سے زیادہ ثواب پائے گا۔ اگر کھانے کا ایک لقمہ رات کو کم کھایا جائے تو یہ ساری رات کی عبادت سے بہتر ہے۔

کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے   بوسہ زن بر آستانِ کاملے (ا۔خ:۱۸)

(مٹھی بھر خاک سے کیمیا پیدا کر، کسی کامل مرد کے آستان پر بوسہ زن ہو جا)

عیارِ فقر زسلطانی و جہاں گیری است   سریرِ جم بطلب، بوریا چہ می جوئی؟

(فقیری کی پہچان یہ ہے کہ جس میں سلطانی اور جہانگیری ہو، (فقیر بن کر) تخت طلب کر، بوریا کیوں تلاش کرتا ہے۔)

نظر زصحبتِ روشن دلاں بیفزاید   زدردِ کم بصری توتیا چہ می جوئی؟

(نظر تو روشن دلوں کی صحبت سے تیز ہوتی ہے، اگر تو کم بصر ہے تو سرمہ کیوں تلاش کرتا ہے۔)

قلندریم و کراماتِ ما جہاں بینی است   زما نگاہِ طلب کیمیا چہ می جوئی؟

(ہم قلندر ہیں ہماری کرامت جہاں پر نظر رکھنا ہے، ہم سے طلب کرتے ہو تو نگاہ طلب کر و سونا بنانے والا کیمیا کیوں طلب کرتے ہو۔) (ج۔ن:۷۷۶)

فقر کا حاصل کرنا بہت محنت طلب امر ہے لیکن جب کوئی فقیر کی منزل کو حاصل کر لے تو پھر اس کی حفاظت کرنا ایک اہم بات ہوتی ہے کیونکہ بسا اوقات ذرا سی غلطی انسان کو منزل سے کوسوں دور لے جاتی ہے۔ جو قومیں اپنی خودی کی حفاظت نہیں کر سکتیں وہ بالآخر غلامی میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے   وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی (ض۔ک:۴۹۳)
خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی   یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی (ض۔ک:۴۹۴)

کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو | کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی
مثالِ ماہ چمکتا تھا جس کا داغِ سجود | خرید لی ہے فرنگی نے وہ مسلمانی
ہوا حریف مہ و آفتاب تو جس سے | رہی نہ تیرے ستاروں میں وہ درخشانی (ض۔ک:۴۹۴)

اولیاء جسے چاہیں شہنشاہ بنا سکتے ہیں

جس طرح سمندر سے موتی حاصل کرنے کے لئے غوطہ لگانے کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح روح کو توانائی کے کمالات حاصل کرنے کے لئے اور نیابت الٰہی کے مقام کو حاصل کرنے کے لئے بڑے بڑے مجاہدات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کو ذکر و تسبیح اور فکر و خلوت کے طویل دور سے گزرنا ہوتا ہے۔ یکسوئی کے لئے بعض اولیاء کرام کچھ عرصے کے لئے غاروں میں جا بیٹھتے ہیں اور جب وہ آتے ہیں تو روحانی طاقت کا بہت بڑا خزانہ اپنے ساتھ لاتے ہیں اور وہ جدھر نگاہ اٹھاتے ہیں دلوں میں خدا کی محبت کی آگ بھڑکا دیتے ہیں، جبینیں اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہونے کے لئے بے تاب ہو جاتی ہیں، وہ اگر چاہیں تو آگ سے اس کی حرارت کو چھین لیں، دریاؤں کی روانی کو بند کر دیں، اشارہ کریں تو پیکر دل میں جان پڑ جائے، لکڑی کا عصا اژدھا بن جائے، چاند کے دو ٹکڑے ہو جائیں۔ یہ زبردست طاقت دلوں کی گہرائیوں میں پنہاں ہے اور صرف اسی دل میں ظاہر و عیاں ہوتی ہے جو ذکر و فکر کی شدت سے اسے ابھارنا چاہے۔ یہ طاقت انبیائے کرامؑ کو دی جاتی ہے اور ان کے بعد اولیائے کرامؒ کو بھی بقدر مراتب ملتی ہے۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اسرارِ خودی میں بوعلی قلندرؒ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ بوعلی قلندرؒ نے اپنے ایک مرید کو کسی ضرورت کے تحت بازار بھیجا۔ وہ اس حالت میں تھا کہ بوعلی قلندرؒ کی پلائی ہوئی شراب کے نشے میں مست جا رہا تھا۔ اتفاق سے حاکمِ وقت کی سواری اس بازار میں پہنچی تو چوبداروں نے حاکم کے لئے راستہ خالی کرنے کی غرض سے لوگوں کو زدوکوب کرنا شروع کیا اور اسی اثناء میں بوعلی قلندرؒ کے مرید کے جسم پر کچھ چوٹیں لگیں۔ اس مرید نے بوعلی قلندرؒ کے پاس آ کر شکایت کی۔ اس کی یہ شکایت سن کر بوعلی قلندرؒ جوش میں آ گئے اور شہنشاہ التمش کو خط لکھا کہ اپنے اس بدطینت حاکم کی بازپرس کرے ورنہ اس کا ملک کسی اور کے حوالے کر دیا جائے گا۔ علامہ اقبالؒ نے جس روایت کو بیان کیا ہے اس کے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

از محبت چوں خودی محکم شود | قوتش فرماں دہِ عالم شود

(جب خودی محبت سے محکم ہو جائے تو اس کی قوت پورے عالم میں فرمانروا بن جاتی ہے۔)

پنجۂ او پنجۂ حق می شود | ماہ از انگشتِ او شق می شود

(اس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے، اس کی انگلی سے چاند ٹکڑے ہو جاتا ہے۔)

در خصوماتِ جہاں گردد حکم تابعِ فرمانِ او دارا و جم

(دنیا کے تنازعات میں وہ منصف بن جاتا ہے، دارا و جمشید جیسے بادشاہ اس کے تابع ہو جاتے ہیں۔)

با تو می گویم حدیثِ بوعلیؒ در سوادِ ہند نامِ او جلی (ا۔خ:۲۵)

(میں تم سے بوعلی قلندرؒ کی روایت بیان کرتا ہوں، ہندوستان کے علاقوں میں ان کا نام مشہور ہے۔)

کوچک ابدالش سوئے بازار رفت از شرابِ بوعلیؒ سرشار رفت

(ان کا ایک تازہ تر مرید بازار کی طرف روانہ ہوا، وہ بوعلی کی پلائی ہوئی شراب میں مست جارہا تھا۔)

عاملِ آں شہر می آمد سوار ہم رکابِ او غلام و چوبدار

(اس شہر کا حاکم اعلیٰ سواری پر نمودار ہوا، اس کے ہمراہ ملازم اور چوبدار تھے۔)

پیش رو زد بانگ اے ناہوش مند بر جلودارانِ عامل رہ مبند

(آگے چلنے والے نے آواز دی کہ اے بے خبر، عامل کے لاؤ لشکر پر راہ بند نہ کرو۔)

رفت آں درویش سر افگندہ پیش غوطہ زن اندر یم افکارِ خویش

(وہ درویش سر لٹکائے جارہا تھا، اپنے روحانی افکار میں غوطہ زن تھا۔)

چوبدار از جامِ استکبار مست بر سرِ درویش چوبِ خود شکست

(چوبدار تکبر کے نشے میں مست تھا، اس نے درویش کے سر پر اپنی لاٹھی کو مار کر توڑ دیا۔)

از رہِ عامل فقیر آزردہ رفت دل گران و ناخوش و افسردہ رفت

(عامل کی طرف سے فقیر افسوس کی حالت میں چلا، اس کا دل گریاں و ناخوش و افسردہ تھا۔)

در حضورِ بوعلیؒ فریاد کرد اشک از زندانِ چشم آزاد کرد

(آ کر حضرت بوعلیؒ کے پاس شکایت کی، اس کی آنکھ کے جھروکوں سے آنسو ٹپک پڑے۔)

صورتِ برقے کہ بر کہسار ریخت شیخ سیلِ آتش از گفتار ریخت

(جس طرح بجلی پہاڑوں پر گرتی ہے، بوعلیؒ کی گفتار سے آگ بکھرنے لگی۔)

از رگِ جاں آتشِ دیگر کشود با دبیرِ خویش ارشادے نمود

(اس کی رگ رگ سے طرح طرح کی آگ برسنے لگی اور منشی سے ارشاد فرمایا)

خامہ را برگیر و فرمانے نویس از فقیرے سوئے سلطانے نویس

(قلم اٹھاؤ اور ہمارا فرمان لکھو، ایک فقیر سے بادشاہ کے نام لکھو)

باز گیر ایں عاملے بد گوہرے ورنہ بخشم ملکِ تو با دیگرے (ا۔خ:۲۶)

(اس حاکم بدسرشت سے باز پرس کرو، ورنہ میں تمہارا ملک کسی دوسرے کو بخش دوں گا۔)

یہ خط بادشاہ کو ملا تو ''لرزہا انداخت در اندام شاہ'' (یعنی بادشاہ کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔)
ہندوستان کے مشہور شاعر امیر خسرو دہلویؒ شاہ کی طرف سے سفارت کے لئے منتخب ہوئے۔ بو علی قلندرؒ کی خدمت میں پہنچے، خلوصِ قلب سے معافی مانگی اور اس طرح ایک درویش خدا مست کے قہر سے نجات ملی۔
علامہ اقبالؒ درست فرماتے ہیں ۔

نیشتر بر قلبِ درویشاں مزن خویش را در آتشِ سوزاں مزن (ا۔خ:۲۷)

(درویشوں کے قلب پر نشتر نہ چبھاؤ، خود کو بھڑکتی آگ میں نہ ڈالو)

اس نوعیت کی یہ ایک تنہا روایت نہیں۔ ایسے سینکڑوں واقعات مستند کتابوں میں موجود ہیں۔

مقامِ فقر

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے ''مثنوی پس چہ باید کرد'' میں ایک طویل نظم فقر کے عنوان سے لکھی ہے جس کے کچھ اشعار الگ بیان کر دیئے گئے ہیں اور چند مزید اشعار کو اس تحریر میں شامل کیا جا رہا ہے۔ آپ نے ان اشعار میں مسلمانوں کو فقر کے مقام سے آگاہ فرمایا ہے اور اس کلام کو مسلمانوں کے زوال کے لئے تریاق ہونا ظاہر کیا ہے۔ یہ اشعار اپنے مطالب کی خود ہی عکاسی کر رہے ہیں ۔

باسلاطیں درفتد مردِ فقیر از شکوہ بوریا لرزد سریر

(مردِ فقیر بادشاہوں سے مقابلہ کرتا ہے، فقیر کے بوریا سے بادشاہوں کا تخت لرز جاتا ہے۔)

از جنوں می افگند ہُوئے بہ شہر وارہاند خلق را از جبر و قہر (پ۔چ:۸۱۶)

(وہ اپنے جنونِ عشق کی ایک ہُو جب شہر پر پھینکتا ہے، تو خلق کو جبر و قہر سے چھٹکارا دلاتا ہے۔)

می نگیرد جز بآں صحرا مقام کاندرو شاہیں گریزد از حمام

(وہ ایسے صحرا کے علاوہ مقام نہیں کرتا، جہاں کا شاہین کبوتر سے ڈرتا ہو۔)

قلبِ اُو را قوت از جذب و سلوک پیشِ سلطان نعرۂ اُو ''لا ملوک''

(اس کے دل کی قوت جذب و سلوک سے ہوتی ہے، بادشاہوں کے سامنے اس کا نعرہ ''کوئی بادشاہ نہیں'' ہوتا ہے۔) (پ۔چ:۸۱۷)

حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ کی دعا سے محمود کو ہندوستان میں فتح حاصل ہوئی چنانچہ جب کسی ملت میں کوئی درویش مرد ہو تو اس ملک کے بادشاہوں کو شکست نہیں ہو سکتی۔ [illegible] سے ملکوں کو قوت حاصل [illegible]

بر نیفتد ملتے اندر نبرد تا درو باقیست یک درویش مرد

(وہ ملت جنگ میں شکست [illegible] جس میں ایک [illegible] درویش مرد باقی [illegible])

حکمتِ دیں دلنوازی ہائے فقر قوتِ دیں بے نیازی ہائے فقر

(دین کی حکمت فقر کی دلنوازیوں میں ہے، اور دین کی قوت فقر کی بے نیازیوں میں ہے۔)

صیدِ مومن ایں جہانِ آب و گل باز را گوئی کہ صیدِ خود بہل (پ۔چ:۸۱۷)

(یہ جہان آب وگل مومن کا شکار ہے، کیا تم باز کو کہتے ہو کہ اپنا شکار چھوڑ دے؟)

وائے آں شاہیں کہ شاہینی نہ کرد مرغکے از چنگِ او نامد بدرد

(افسوس اس شاہین پر جو شاہینی نہیں کرتا، جس کے پنجے سے کوئی پرندہ درد میں مبتلا نہ ہوا)

در کنامے ماند زار و سرنگوں پر نہ زد اندر فضائے نیلگوں (پ۔چ:۸۱۸)

(باز اپنے گھونسلے میں زار و زبوں پڑا ہوا ہے، اس نے وسیع آسمان میں پرکشائی نہیں کی)

مسلمانوں کے بڑے بڑے عالمی معرکے فقر کی ہی خوبصورت مثالیں ہیں اور جب سے مسلمانوں میں یہ فقر ختم ہو گیا تو ان کا جلال اور دبدبہ بھی رخصت ہو گیا۔ فرماتے ہیں کہ اگر یہ قوم رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ پر عمل کرے تو آج بھی اپنا مقام پیدا کر سکتی ہے۔

فقر چوں عریاں شود زیرِ سپہر از نہیبِ اُو بلرزد ماہ و مہر

(فقر جب خود کو آسمان کے نیچے سے ظاہر کرتا ہے، تو اس کے خوف سے مہر و ماہ لرز جاتے ہیں۔)

فقر عریاں گرمیٔ بدر و حنین فقرِ عریاں بانگِ تکبیرِ حسین

(فقر کی نمود بدر و حنین کی حرارت کی طرح ہوتی ہے، فقر کی نمود حضرت امام حسینؓ کی تکبیر کی شکل اختیار کرتی ہے)

فقر را تا ذوقِ عریانی نہ ماند آں جلال اندر مسلمانی نہ ماند (پ۔چ:۸۱۸)

(جب فقر کی یہ نمود نہ رہی، تو مسلمانوں میں وہ جلال باقی نہ رہا)

بر عیارِ مصطفیٰؐ خود را زند تا جہانے دیگرے پیدا کند (پ۔چ:۸۱۹)

(خود کو محمد مصطفیٰ ﷺ کی کسوٹی پر پرکھو تا کہ تم ایک نیا جہاں پیدا کر سکو۔)

آہ اے قومے کہ درویشے نژاد

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں میں امیر، وزیر اور کبیر بننے کا شوق تو عام پایا جاتا ہے مگر افسوس اس بات پر ہے کہ لوگوں کے دلوں میں فقیر بننے کی تمنا نہیں پائی جاتی۔ اس لئے ان میں عرصے سے کوئی باخدا مرد پیدا نہیں ہوا۔ ہر کوئی چاہتا ہے کہ میرا بیٹا مقابلے کا امتحان دے اور بڑا افسر بن جائے۔ اونچے طبقوں میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو اپنے بیٹے کو بڑا عالم یا بہت اعلیٰ پایہ کا فقیر بنانا چاہتا ہو۔

آہ زاں قومے کہ از پا برفتاد میر و سلطاں زاد و درویشے نژاد

(آہ اس قوم پر جس نے جدو جہد ختم کر دی، جس میں سلاطین تو پیدا ہوں لیکن کوئی درویش پیدا نہ ہو۔)

داستانِ اُو مپرس از من کہ من　　چوں بگویم آنچہ ناید در سخن

(اس کی داستان مجھ سے نہ پوچھو کہ میں اس بات کو کیسے کہوں جو سخن میں نہ آ سکے۔)

مسلمِ ایں کشور از خود نااُمید　　عمر ہا شد با خدا مردے نہ دید

(اس برصغیر کے مسلمان خود سے نااُمید ہیں، کئی عمریں گزر گئیں کہ ان میں کوئی با خدا مرد نہیں دیکھا)

لا جرم از قوتِ دیں بدظن است　　کاروانِ خویش را خود رہزن است

(یقیناً یہ قوم دین کی قوت سے بدظن ہے، اپنے قافلے کی خود ہی راہزن ہے۔)

پست فکر و دوں نہاد و کور ذوق　　مکتب و ملائے اُو محرومِ شوق

(یہ قوم پست فکر، خالی ہاتھ اور کور ذوق ہے، ان کا ملا اور مکتب شوقِ اسلام سے محروم ہے۔)

طبعِ اُو بے صحبتِ مردِ خبیر　　خستہ و افسردہ و حق نا پذیر (پ۔چ:۸۱۹)

(اس کی طبیعت میں مردِ کامل کی صحبت کی رغبت نہیں ہے، وہ خستہ و افسردہ اور حق بات سے گریز کرنے والا ہے)

بندۂ رد کردۂ مولاست اُو　　مفلس و قلاش و بے پرواست اُو

(مسلمان اللہ کا رد کیا ہوا بندہ ہے، وہ مفلس و قلاش اور بے پرواہ ہے۔)

نے بکف مالے کہ سلطانے برد　　نے بدل نورے کہ شیطانے برد

(نہ اس کے ہاتھ میں مال ہے کہ سلطان وقت سے لے سکے، اور نہ ہی دل کا نور شیطان لے سکے۔)

شیخِ اُو لردِ فرنگی را مرید　　گرچہ گوید از مقامِ بایزیدؒ

(مسلمانوں کا پیر تو خود انگریز کا مرید ہے، اگرچہ وہ بایزیدؒ (جیسے بزرگوں کے فقر) کی باتیں کرتا ہے۔)

دولتِ اغیار را رحمت شمرد　　رقص ہا گردِ کلیسا کرد و مُرد (پ۔چ:۸۲۰)

(دوسروں سے لئے ہوئے نذرانوں کی دولت کو رحمت خیال کرتا ہے، گرجوں کے طواف میں عمر ضائع کی اور مر گیا۔)

میرے تب و تاب سے کچھ حصہ لے لو

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ آخر میں فرماتے ہیں کہ گو میں علم و دین یا فقر میں کوئی خاص مقام تو نہیں رکھتا مگر دل میں قوم کی بہتری اور ترقی کا بے حد خواہشمند ہوں اس لئے مجھ سے ان نایاب باتوں کے ذخیرہ میں سے کچھ اپنا حصہ لے لو کیونکہ میرے بعد شاید ہی کوئی ایسا مردِ فقیر قریبی زمانے میں آ سکے۔

من نہ ملا، نے فقیہ نکتہ ور　　نے مرا از فقر و درویشی خبر

(میں نہ تو ملا، نہ فقیہ اور نکتہ دان فلاسفر ہوں، اور نہ ہی مجھے فقر و درویشی کا زیادہ علم ہے۔)

در رہ دیں تیز بیں و ست گام　پختۂ من خام و کارم ناتمام

(دین کی راہ کو میں خوب دیکھنے والا مگر سست گام ہوں، میری پختگی خام اور میرا کام نامکمل ہے۔)

تا دِل پُر اضطرابم دادہ اند　یک گرہ از صد گرہ بکشادہ اند (پ۔چ:۸۲۱)

(اللہ تعالیٰ نے مجھے دل پُر اضطرار دیا ہے، (قوم کی) سینکڑوں گرہوں سے میں نے ایک گرہ کو ہی کھولا ہے)

از تب و تابم نصیب خود بگیر　بعد ازیں ناید چُو من مردِ فقیر (پ۔چ:۸۲۱)

(میرے اس تب وتاب (کی گرمی) سے اپنا حصہ لے لو، کیونکہ میرے بعد شاید مجھ جیسا کوئی مردِ فقیر نہ آئے)

فقر نایاب دولت ہے

ارمغانِ حجاز میں علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ خلافتِ اسلامیہ کی بابت فرماتے ہیں کہ خلافت ایسی فقیری ہے جو بے تاج وتخت ہے اور مسلمانوں کے لئے دولت بے پایاں اور نایاب چیز ہے چنانچہ اسے ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔ یہ فقر ایسی دولت ہے کہ جس پر امیری بھی رشک کرتی ہے اور انسان کو سرنگوں ہونے سے محفوظ رکھتی ہے۔

خلافت، فقرِ باتاج و سریر است　زہے دولت کہ پایاں ناپذیر است

(خلافت کیا ہے؟ تاج وتخت کے ساتھ فقر (اختیار کرنا) یہ ایسی دولت ہے کہ جو بے پایاں اور نایاب ہے)

جواں بختا! مدہ از دست ایں فقر　کہ بے اُو پادشاہی زود میر است (اح:۹۶۱)

(اے جواں بخت اس فقر کو ہاتھ سے نہ جانے دے، اس کے بغیر بادشاہی جلد ہی ختم ہو جاتی ہے۔)

ز رومیؒ گیر اسرارِ فقیری　کہ آں فقر است محسودِ امیری

(فقیری کے راز رومیؒ سے سیکھو، کیونکہ ان کا فقر ایسا ہے، جس پر امیری بھی رشک کرتی ہے۔)

حذر زاں فقر و درویشی کہ ازوے　رسیدی بر مقامِ سربزیری (ا۔ح:۹۵۹)

(اس فقر سے بچو جس کی وجہ سے تم سرنگوں ہونے کے مقام پر پہنچے ہو۔)

ارمغانِ حجاز کی رباعیات میں علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے۔

غریبی میں ہوں محسودِ امیری　کہ غیرتمند ہے میری فقیری

حذر اس فقر و درویشی سے جس نے　مسلماں کو سکھا دی سربزیری (ا۔ح:۶۷۲)

درویشانہ زندگی کو ہاتھ سے جانے نہ دو

مسلمان کو علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نصیحت فرماتے ہیں کہ شاہی زندگی میں بھی درویشانہ زندگی بسر کریں۔ اگر ہر عمل اللہ کے لئے ہو تو اس کا جلال تمہاری شخصیتوں سے آشکار ہوگا۔ اگر تمہارا فقر غیور ہو تو تم تمام دنیا کو

تہہ و بالا کر سکتے ہو۔ فرماتے ہیں کہ اہلِ ہنود کا عقیدہ ہے کہ سادھو جتنا برہنہ ہوگا اتنا ہی زیادہ افضل سمجھا جائے گا۔ مقصد یہ کہ جب سادھو ترک دنیا کرے تو معیشت میں دوسروں کا محتاج نہ ہوگا لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ محتاجی کا لازمی نتیجہ محکومی اور غلامی ہوتا ہے۔

در قبائے خسروی درویش زی　　دیدہ بیدار و خدا اندیش زی

(شاہی لباس میں درویشانہ زندگی بسر کر، آنکھوں کو بیدار رکھ اور خدائی سوچ کے مطابق زندگی گزار۔)

قربِ حق از ہر عمل مقصود دار　　تا زتو گردد جلالش آشکار (ا۔ر:۹۳)

(ہر عمل کا مقصود حق تعالیٰ کے قرب کو قرار دو، تا کہ جلال شاہی تم سے آشکار ہو۔)

بگذر از فقرے کہ عریانی دہد　　اے خنک فقرے کہ سلطانی دہد
(ج۔ن:۷۳۲)

(ایسے فقر سے گزر جاؤ جو عریانی (کے بعد غلامی) لائے، خوش رہے وہ فقر جس کا نتیجہ روحانی اقتدار ہو۔)

اگر فقرِ تہی دستاں غیور است　　جہانے را تہ و بالا تواں کرد (ا۔ح:۹۶۷)

(اگر نہتے فقیروں کا فقر غیرت مند ہو، تو وہ پورے جہان کو تہہ و بالا کر سکتے ہیں۔)

جب تک کسی قوم کے عقائد درست اور پختہ نہ ہوں تو قومی تعمیر ممکن نہیں۔ مسلمان کا سرمایہ آزادی کا حاصل ہونا اور موت سے نڈر رہنا ہے۔ اس دنیا کے مال و دولت کو تو کفار کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔

دین ہو فلسفہ ہو فقر ہو سلطانی ہو　　ہوتے ہیں پختہ عقاید کی بنا پر تعمیر
حرف اس قوم کا بے سوز، عمل زار و زبوں　　ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر
(ض۔ک:۶۰۶)

مردِ درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ　　ہے کسی اور کی خاطر یہ نصابِ زر و سیم
(ب۔ج:۳۵۴)

آہ! کہ کھویا گیا تجھ سے فقیری کا راز　　ورنہ ہے مال فقیر سلطنتِ روم و شام
(ب۔ج:۳۵۴)

امارت میں فقر کی مثالیں

اسلام میں پہلے چاروں خلفائے راشدینؓ اور ان کے بعد عمر بن عبدالعزیزؒ کی امارت میں فقر کی [illegible] مثالیں ہیں۔ محمود غزنویؒ، اورنگزیبؒ اور سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے علاوہ شاہی فقر کی سینکڑوں [illegible] بھی موجود ہیں۔

حضرت سلمان فارسیؓ صحابی رسول ﷺ کو عراق میں مدائن کا گورنر مقرر کیا گیا تو آپؓ کی جائے قیام نہایت سادہ تھی جس میں دو ہی چیزیں تھیں ایک قرآنِ پاک اور دوسری تلوار۔ اسی طرح بے سروسامان حضرت سعد بن ابی وقاصؓ مصر کے گورنر تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب آپؓ کے پاس گئے تو دیکھا کہ سوائے چند مٹی کے برتنوں کے گھر میں کچھ نہ تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کچھ سامان زندگی تو رکھنا چاہیے۔ انہوں نے عرض کیا اے امیر المومنین یہ ساز و سامان جو میرے پاس ہے کافی ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

آں مسلمانان کہ میری کردہ اند — در شہنشاہی فقیری کردہ اند
(وہ مسلمان جنہوں نے قوم کی امارت کی ہے، اُنہوں نے شہنشاہی میں فقیری کی ہے۔)

در امارت فقر را افزودہ اند — مثلِ سلمانؓ در مدائن بودہ اند
(اُنہوں نے امارت میں فقر کی افزائش کی، انہوں نے سلمانؓ کی طرح مدائن میں اس طرح وقت گزارا)

حکمرانے بود و سامانے نہ داشت — دستِ اُو جز تیغ و قرآنے نداشت
(کہ وہ حکمران تھے لیکن کوئی سامان نہ رکھتے تھے، ان کے ہاتھ میں سوائے قرآن اور تلوار کے کچھ نہ تھا۔)

ہر کہ عشقِ مصطفیٰؐ سامان اوست — بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست
(ہر وہ شخص جس کا سروسامان عشقِ مصطفیٰ ﷺ ہے، سمندر اور خشکیاں ان کے دامن کے گوشے میں ہوتی ہیں)

سوزِ صدیقؓ و علیؓ از حق طلب — ذرّۂ عشقِ نبیؐ از حق طلب (پ۔م:۱۹۰)
(حضرت صدیق اکبر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کا سوز طلب کرو، حضورِ اکرم ﷺ کے عشق کا ایک ذرہ خدا سے مانگو)

ضربِ کلیم میں علامہ اقبالؒ اپنے بیٹے جاوید سے خطاب کرتے ہیں۔

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر — جس فقر کی اصل ہے حجازی!
اس فقر سے آدمی میں پیدا — اللہ کی شانِ بے نیازی!
روشن اس سے خرد کی آنکھیں — بے سرمۂ بوعلیؒ و رازیؒ!
یہ فقرِ غیور جس نے پایا — بے تیغ و سناں ہے مردِ غازی!
مومن کی اسی میں ہے امیری — اللہ سے مانگ یہ فقیری (ض۔ک:۵۵۰)

مردِ مومن کا فقر

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے مردِ مومن کی شان میں بہت سے اشعار قلمبند کیے ہیں جن میں سے بیشتر اشعار اس کتاب میں مناسب مقامات پر شامل کر دیے گئے ہیں۔ چند مزید اشعار جو مسافر کی نظم میں موجود ہیں۔

ملاحظہ فرمائیں۔

فقر و شاہی وارداتِ مصطفیٰؐ است ایں تجلی ہائے ذاتِ مصطفیٰؐ است

(فقر و شاہی نبی پاک ﷺ کی واردات میں سے ہیں، یہ دونوں آپ ﷺ کی ذات کی تجلیات میں سے ہیں۔)

ایں دو قوت از وجودِ مومن است ایں قیام و آں سجودِ مومن است

(یہ دونوں قوتیں مومن کے وجود کی طاقتیں ہیں، یہ (فقر) مومن کا قیام ہے اور وہ (شاہی) اس کے سجود کی مانند ہے۔)

فقر سوز و درد و داغ و آرزوست فقر را در خوں تپیدن آبروست

(فقر مومن کی آرزوؤں کا سوز، درد اور مفارقت کا داغ ہے، فقر کے لئے اپنے ہی خون میں جلنا باعثِ آبرو ہے۔) (پ۔چ:۸۵۱)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ ''رموز بے خودی'' اور ''جاوید نامہ'' میں فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کی نگاہوں کی برکت سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ اس دولتِ فقر و شاہی کے وارث بنے اور یہ وراثت ابھی تک جاری ہے۔

از کلاہ و بوریا تاج و سریر فقرِ اُو از خانقاہاں باجگیر (ا۔خ:۱۲۳)

(فقیر کا کلاہ اور بوریا اس کا تاج و تخت ہے، اس کا فقر خانقاہوں سے خراج وصول کرتا ہے۔)

از نگاہِ خواجۂ بدر و حنین فقر و سلطان وارثِ جذبِ حسینؓ (ج۔ن:۲۶۰)

(خواجہ بدر و حنین ﷺ کی نگاہ کے فیض سے سلطان (نادر شاہ ابدالی) کا فقر جذبِ حسینؓ کا وارث تھا۔)

مردِ حر کی شان بیان کرتے ہوئے علامہ ''مثنوی پس چہ باید کرد'' میں لکھتے ہیں کہ مردِ حر سراپا کردار، کم سخن، لاالٰہ کی ضرب کا حامل ہے۔ اس کی ضرب سے بڑے بڑے پہاڑ ہل جاتے ہیں۔ اس کی صحبت زندگی عطا کرتی ہے۔

کارِ ما وابستۂ تخمین و ظن او ہمہ کردار و کم گوید سخن

(ہمارے کام تو تخمین و ظن سے وابستہ ہیں، مگر وہ سراپا کردار اور کم سخن یا کم گو ہیں۔)

ما گدایاں کوچہ گرد و فاقہ مست فقرِ اُو از لاالٰہ تیغ بدست

(ہم تو گداؤں کی طرح کوچہ گرد اور فاقہ مست ہیں مگر اس کے فقر کے ہاتھ میں لاالٰہ کی تلوار ہے)

ما [illegible] ضربِ او از کوہ [illegible]

[illegible]

(ہم گھاس کے تنکے کی طرح ہوا کے تابع ہیں، مگر ان کی ضرب کوہِ گراں سے نہر نکال لیتی ہے۔)

محرمِ اُو شو، زما بیگانہ شو　خانہ ویراں باش و صاحب خانہ شو

(اس کے رازدان بن جاؤ اور بے شک ہم سے دور ہو جاؤ، ان کی طلب میں گھر بار لٹا دو اور پھر حقیقی گھر کے مالک بن جاؤ)

شکوہ کم کن از سپہرِ گرد گرد　زندہ شو از صحبتِ آں زندہ مرد

(بدلتے ہوئے آسمان (قسمت) کا شکوہ نہ کرو، ان آزاد مردوں کی صحبت سے زندہ ہو جاؤ) (پ۔چ: ۸۲۳)

قلندری اگر ہو تو سکندری کیا چیز ہے؟

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک قلندر صوفی اگرچہ نادار اور قلاش بھی ہو تو پھر بھی تمام دنیا کی سلطنتیں اس کے زیرِ نگیں ہوتی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں میری وجہِ شہرت میرا علم، فلسفہ، یا جذبۂ شعر و شاعری نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا بھر میں میرے قلندرانہ انداز مشہور و معروف ہو گئے ہیں اور میرے یہی اوصاف میری مقبولیت کا سبب بنے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ایک فقیر کے سینے میں نہ جانے کیا کچھ چھپا ہوتا ہے کہ اس کی ایک سانس بجھی ہوئی شمع میں حرارت پیدا کر دیتی ہے اور اسے شمع فروزاں کی تجلیات عطا کر دیتی ہے۔ ان کے پاس وہ کچھ ہے جو شہنشاہوں کے خزانوں میں بھی نہیں ہوتا۔ اگر تم ایسی طاقت حاصل کرنا چاہو تو ان کی خدمت میں رہا کرو۔

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے!　خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے!

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی　مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری　وگرنہ شعر مرا کیا ہے! شاعری کیا ہے

(ب۔ج: ۳۴۰)

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس ان کی　الٰہی! کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں

تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی　نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو　یدِ بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

ترستی ہے نگاہِ نارسا جس کے نظارے کو　وہ رونق انجمن کی ہے انہیں خلوت گزینوں میں

(ب۔د: ۱۰۴)

فقیر کا اُٹھنا بیٹھنا اور ہر عمل روحِ قرآن کی مطابقت میں ہوتا ہے اس لئے ایسے فقیروں کی شان ادا اور سکندر جیسے شہنشاہوں سے بھی بلند تر ہے۔

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ　　ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی
(ب۔ج:۳۴۹)

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی　　جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی!
(ب۔ج:۳۴۸)

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے　　وہ فقر جس میں ہے بے پردہ رُوحِ قرآنی
(ض۔ک:۴۹۳)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مردِ فقیر اپنے لئے کسی چیز کو حتیٰ کہ خرقہ کو بھی ایک بوجھ اور بار محسوس کرتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس ایک پیالہ اور کنگھی کے سوا کچھ نہ تھا اور جب آپ نے دیکھا کہ ہاتھوں کی انگلیوں سے کنگھی کا کام لیا جاسکتا ہے تو آپ نے اسے بھی پھینک دیا۔ فرماتے ہیں مومن حالات سے مقابلہ کرتا ہے اور جہاں نرمی کی ضرورت ہو وہاں موم کی طرح نرم ہو جاتا ہے۔

خرقہء خود بار است بر دوشِ فقیر　　چوں صبا جز بوئے گل ساماں مگیر
(خرقہ تو خود فقیر پر ایک بوجھ ہے، ہوا کی طرح سوائے گل کی مہک کے اور کوئی سامان نہ اُٹھاؤ)

قلزمی؟ بادشت و در پیہم ستیز　　شبنمی؟ خود را بہ گلبرگے بریز (پ۔چ:۸۰۵)
(تو سمندر ہے! جنگل و دریا (کے حالات) سے جنگ کر، تو شبنم ہے! خود کو پھول کی پتیوں پر بہادے)

جو قوم اپنا امتحان آپ کرتی ہے وہ کامیابی سے ہمکنار ہوتی ہے۔ مومن کا شعار ہے کہ وہ اپنے کردار کو جانچتا رہے اور اصلاح کرتا رہے (نشانِ منزل کے حصہ نماز میں اس امتحان یعنی آزمائش کی تفصیل بھی بیان کر دی گئی ہے۔)۔

عرب را حق دلیلِ کارواں کرد　　کہ اُو با فقر خود را امتحاں کرد
(خدا نے عربوں کو کاروانِ اسلام کے لئے دلیل بنایا، کیونکہ انہوں نے خود اپنے فقر کا امتحان کیا ہے۔)

اگر فقرِ تہی دستاں غیور است　　جہانے را تہ و بالا تواں کرد (ا۔ح:۹۶۷)
(اگر غریبوں کا فقر غیور ہو، تو وہ دنیا کو تہ و بالا کر سکتے ہیں۔)

فقیری کا راز، سلطنتِ روم و شام ہے

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فقیری یہ نہیں کہ دنیا کے اُمور سے دستبردار ہو کر عبادت میں مصروف رہے بلکہ فقیری تو یہ ہے کہ عین دنیا کے کام کاج میں مصروف رہتے ہوئے عبادت اور ملکی فرائض سے روگردانی نہ کرے اور وہ اگر شہنشاہِ وقت بھی ہو تو بھی درویشی کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ اسی طرح اگر وہ فقیری میں [illegible]

اوقات بسر کر رہا ہو تو اس کی فقیری میں بھی بادشاہی جلال پایا جانا اصل فقر کی علامت ہے۔

کافر ہے مسلماں، تو نہ شاہی، نہ فقیری   مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی
کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ   مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
(ب۔ج:۳۲۷)

میں نے تو کیا پردۂ اسرار کو بھی چاک   دیرینہ ہے تیرا مرضِ کورنگاہی (ب۔ج:۳۲۸)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے کلام میں اس بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ وہ مسلمان جس کو شریعت اسلامی سے کوئی شغف نہ ہو وہ نہ تو فقیری کے لائق ہے اور نہ ہی حکومت سنبھالنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ قوم جس میں متاعِ تیموری نہ ہو وہ دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتی۔

یہاں مناسب ہوگا کہ تیمور کا تعارف پیش کر دیا جائے۔ تیمور صاحب قرآن (فاتح دوراں) ۱۳۳۵ء میں پیدا ہوا اور وہ چنگیز خان کی اولاد سے تھا۔ تیمور کا باپ ترغئ تھا اور قبیلۂ برلاس میں اسلام قبول کرنے والا پہلا شخص تھا۔ تیمور کی حکومت ستائیس (۲۷) ممالک پر پھیلی ہوئی تھی جس کی حدود دیوارِ چین سے لے کر قلبِ روم تک اور جنوب میں گنگا سے لے کر دریائے نیل سے ہوتی ہوئی بحیرۂ روم تک تھی۔ ۱۳۶۹ء میں اسے جہانگیر اور گورگان (گرگِ اعظم) کا خطاب ملا۔ ہندوستان میں مغلیہ خاندان کے اقتدار کا وہی بانی ہے اور آخری مغل بادشاہ ظفر اسی کی اولاد میں سے تھا۔ کہتے ہیں کہ جب مشہور شاعر حافظ شیرازیؒ نے درج ذیل شعر لکھا تو تیمور حافظ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

اگر آں ترکِ شیرازی بہ دست آرد دلِ مارا   بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را (حافظ)

(اگر وہ شیرازی معشوق میرے دل کو تھام لے، تو اس کے کالے تل کے عوض میں مَیں سمرقند و بخارا بخش دوں)

تیمور نے حافظ شیرازی سے کہا کہ میں نے سمرقند اور بخارا کو بڑی مشکلوں اور قربانیوں کے بعد فتح کیا ہے اور تم نے اس کو تل پر نثار کر دیا۔ حافظ نے کہا اسی لئے تو ہم مفلس ہو گئے کہ تن پر کپڑا بھی نہیں رہا۔ اس کے بعد حافظ نے امیر تیمور کی بڑی تعظیم کی۔ امیر تیمور نے معذرت کی کہ اس کی تعظیم نہ کی جائے کیونکہ حافظ بزرگ اور تارکِ دنیا ہیں۔ حافظ نے کہا نہیں صاحب ہم سے بڑھ کر آپ تارک ہیں۔ امیر نے کہا کہ آپ نے تو سب کچھ ترک کر دیا ہے۔ حافظ نے فرمایا کہ ہم نے تو کمینی دنیا کو ترک کیا ہے اور آپ نے دنیا کی خاطر آخرت جیسی عظیم چیز کو ترک کر دیا ہے، لہٰذا اصلی تارک تو آپ ہیں۔ یہ سن کر امیر پر بہت اثر ہوا اور وہ تخت کو چھوڑ کر پہاڑ کی کھوہ میں جا بیٹھا۔ تیسرے دن امیر تیمور نے خواب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ فرماتے ہیں "تیمور اُٹھ اور تلوار باندھ کر ملکوں کو فتح کر۔ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو اس کام پر مقرر کیا ہے۔ اس دیوانے (حافظ) کی بات کا کچھ خیال نہ کر" چنانچہ آپ نے گوشہ نشینی کو ترک کیا (فرہنگِ اقبال)

ہر کسے را بہرِ کارے ساختند　　میلِ آں اندر دلش انداختند (مثنوی)

(ہر ایک کو کسی نہ کسی کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور اس کام کی رغبت اس کے دل میں ڈال دی گئی ہے۔)

امیر تیمور کی نیکی، بہادری اور سپہ گری کے پیشِ نظر علامہؒ نے سلطنتوں کے نظام کے ساتھ ساتھ فقر کے اہتمام کرنے کے لئے بھی بہت زور دیا ہے کہ متاعِ تیموری کو کسی حال میں ترک نہ کیا جائے۔ فرماتے ہیں۔

کمال ترک نہیں آب و گِل سے مہجوری　　کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری
میں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا　　تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری
نہ فقر کے لئے موزوں نہ سلطنت کے لئے　　وہ قوم جس نے گنوایا متاعِ تیموری
(ب۔ج: ۳۳۴)

فقر وشاہی میں زیادہ امتیاز نہیں ہے

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے کلام میں اس بات کو ثابت کیا ہے کہ فقر اور اسلامی شہنشاہی (یعنی خلافت) کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کوئی شہنشاہ ہے تو اس سے فقیرانہ زندگی بسر کرنے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر خلفاءِ اسلامی سلطنت کے مثالی سربراہ تھے اور اہلِ فقر کے لئے بھی ان کی زندگی مثالی شان کی حامل تھی۔ دوسری طرف، ایسی ہزاروں مثالیں ملتی ہیں کہ فقرائے اسلام اپنی فقیری میں بھی ایسی شان رکھتے تھے کہ ان کے وقتوں کے شہنشاہوں کے جسم پر ان کا نام سنتے ہی لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔

علامہ اقبالؒ نے مذکورہ بالا مسئلے کی درستگی کو یوں بھی ثابت کیا ہے کہ ہمارے اَسلاف میں فقر کا ایسا نمونہ موجود تھا کہ جس نے بغیر تلوار کے انڈونیشیا اور کچھ روسی علاقے فتح کیے، لہٰذا ایسا فقر بادشاہوں کی بادشاہی سے بھی بہتر تھا لیکن اس کے بعد خانقاہوں میں فقط قصے کہانیوں کو سنایا جانے لگا اور وہ حقیقت فقر مفقود ہوتی گئی۔ علماء بھی اب ایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگانے سے دریغ نہیں کرتے۔

آں فقر کہ بے تیغے صد کشورِ دل گیرد　　از شوکتِ دارا بہ از فرِّ فریدوں بہ (ز۔ع: ۴۱۵)

(وہ فقر جو بغیر تلوار کے دلوں کی سینکڑوں ولائتیں مسخر کر لیتا ہے، وہ دارا اور فریدون کی جاہ و حشمت سے بہتر ہے)

در دیرِ مُغاں آئی مضمونِ بلند آور　　در خانقہِ صوفی افسانہ و افسوں بہ (ز۔ع: ۴۱۵)

(مجلسِ مُغاں میں بلند نظری کے مضامین بحث میں آتے ہیں، اور صوفیوں کی خانقاہوں میں افسانہ افسوں کو بہتر سمجھا جاتا ہے۔)

دیکھا گیا ہے کہ شہنشاہ ظلم و تشدد یا سپاہ و لشکر کے ذریعے عوام کو اپنے زیرِ نگیں کر لیتے ہیں اور [illegible]
زیر کر دیتے ہیں جبکہ فقر تسخیرِ خلق [illegible]

بدل جاتے ہیں اور وہ لوگ اپنے دل سے اس کی ایسی عزت و توقیر کرتے ہیں جو بڑے بڑے بادشاہوں کو کبھی حاصل نہ ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کئی ممالک سلطنتِ اسلامیہ میں محض اسی لئے شامل ہوئے کہ ان فقراء نے وہاں جا کر کچھ عرصہ قیام کیا اور اپنے کردار سے لوگوں کے دلوں کو موہ لیا، علامہ فرماتے ہیں۔

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
یہ سپہ کی تیغ بازی، وہ نگہ کی تیغ بازی! (ب۔ج:۳۰۹)

تختِ جم پوشیدہ زیرِ بوریا است
فقر و شاہی از مقاماتِ رضاست (پ۔چ:۸۲۷)

(جمشید کا تخت پوشیدہ طور پر بوریا والوں کا ممنون تھا، فقر و شاہی مقاماتِ رضائے الٰہی کے ممنون ہوتے ہیں۔)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں نے جہاں بھی حکومت کی وہاں فقر کو شہنشاہی (خلافت) سے الگ نہیں کیا مگر افسوس کی بات ہے کہ اب سلطانی کو شیطانی کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے۔

مسلماں فقر و سلطانی بہم کرد
ضمیرش، باقی و فانی بہم کرد

(مسلمان ہمیشہ فقر اور سلطانی کو ایک دوسرے کے ساتھ رکھتے تھے، ان کے ضمیروں نے باقی آخرت اور فانی دنیا کو ایک ساتھ نبھایا)

ولیکن الاماں از عصرِ حاضر
کہ سلطانی بہ شیطانی بہم کرد (ا۔ح:۹۷۸)

(لیکن اس زمانے سے خدا کی پناہ کہ انہوں نے سلطانی کو شیطانی کے ساتھ جمع کر دیا ہے۔)

علامہؒ نے فرمایا کہ فقر کی تکمیل اسی وقت ہو سکتی ہے جب وہ دلیلِ خسروی (شہنشاہی) کا مقام حاصل کر لے یعنی شہنشاہی اس کے قدموں میں چلی آئے۔ عرب کے مسلمانوں نے اس بات کا اہتمام کیا تھا کہ انہوں نے صدق و یقین اور خُلقِ عظیم سے دنیا کو فتح کیا۔ فرماتے ہیں کہ اہلِ دل کی سلطنت فقر سے قائم ہوتی ہے، شاہی سے نہیں۔

چوں بہ کمال می رسد، فقر دلیلِ خسروی است
مسندِ کیقباد را در تہِ بوریا طلب (ز۔ع:۵۰۷)

(فقر جب کمال کو پہنچے تو وہ بادشاہی کو زیرِ نگیں کر لیتا ہے، کیقباد کا تخت بوریا کے نیچے تلاش کرو)

آہ وہ مردانِ حق! وہ عربی شہسوار
حاملِ "خُلقِ عظیم" صاحبِ صِدق و یقیں

جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب
سلطنتِ اہلِ دل، فقر ہے شاہی نہیں

(ب۔ج:۳۹۰)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے فقر و شاہی کی اصل ایک ہونے کی ایک اور دلیل پیش کی ہے کہ جس طرح بادشاہی میں ایک مملکت کی ضرورت ہے، اسی طرح فقر کو بھی ایک سلطنت درکار ہوتی ہے کیونکہ سلطنت کے بغیر فقر ناپختہ رہتا ہے۔ فقیر کا اثر و رسوخ جہاں تک ہو وہاں تک اس کی حکمرانی چلتی ہے۔ دوسری مماثلت یہ

ہے کہ بادشاہوں کو ملک میں بغاوت کا خطرہ رہتا ہے تو فقیر کو اپنے نفس کی سرکشی کا خیال رہتا ہے کیونکہ اگر وہ آرزوؤں کے سمندر میں بہہ جائے تو اس پر شیطان مسلط کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی ملک کے بادشاہ احکامِ خداوندی سے باغی ہو جائیں تو ان پر چنگیز اور ہلاکو خان جیسے سخت گیر بادشاہ مسلط کر دیئے جاتے ہیں۔

گو فقر بھی رکھتا ہے اندازِ ملوکانہ — نا پختہ ہے پرویزی بے سلطنتِ پرویز
اب حجرۂ صوفی میں وہ فقر نہیں باقی — خونِ دلِ شیراں ہو جس فقر کی دستاویز
اے حلقۂ درویشاں وہ مردِ خدا کیسا — ہو جس کے گریباں میں ہنگامۂ رستاخیز
کرتی ہے ملوکیت آثارِ جنوں پیدا — اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز

(ب۔ج:۳۱۸)

فقر اور شاہی کے تقابل میں علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ مزید فرماتے ہیں کہ فقیری اور شاہی دونوں اپنی سلطنتوں کو کشادہ کرنا چاہتے ہیں اور اپنی حکومت کی بقا کے خواہشمند ہیں۔ سکندری شہنشاہی سحرِ سامری کی طرح ہے اور اس میں فتوحات جنگ اور خونریزی سے حاصل کی جاتی ہیں جب کہ فقر کی وسعت امن اور آشتی کے ساتھ ہوتی ہے۔ سکندری میں قہر اور جبر کے ذریعے اپنی بقا کا سامان مہیا کیا جاتا ہے لیکن قلندری اپنے جوہر کے اعتبار سے صلح اور آشتی کا پیغام دے کر بقا کو حاصل کرتی ہے اور یہ اپنا پیام محبت کے ذریعے پھیلاتی ہے جو خودی کے دوام کو جنم دیتا ہے۔ صوفیا کا قول ہے کہ قلندری جذبۂ کلیم کی شان کی حامل ہے جس کی ایک نگاہ پوری کائنات میں زلزلہ پیدا کر سکتی ہے اور جس کی ایک ضرب سدِ سکندری کو توڑ سکتی ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

دبدبۂ قلندری، طنطنۂ سکندری — آں ہمہ جذبۂ کلیم، ایں ہمہ سحرِ سامری

(قلندری کا دبدبہ اور سکندری کی شان و شوکت یوں ہیں کہ قلندری دبدبہ جذبۂ کلیم ہے اور شاہانہ شوکت سامری کا جادو ہے۔)

آں بہ نگاہ می کشد، ایں بہ سپاہ می کشد — آں ہمہ صلح و آشتی، ایں ہمہ جنگ و داوری

(قلندری نگاہ سے مار ڈالتی ہے اور شہنشاہی لشکر سے مار ڈالتی ہے، قلندری سراسر صلح و آشتی ہے، سکندری تمام بادشاہی اور ساز باز ہے۔) (ج۔ن:۲۱۶)

ہر دو جہاں کشاستند ہر دو دوام خواستند — ایں بہ دلیلِ قاہری، آں بہ دلیلِ دلبری

(دونوں اپنی سلطنتوں کو کشادہ کرتے ہیں اور دونوں دوام چاہتے ہیں، سکندری تو شدت قہر کے ساتھ قلندری دلبری کے ساتھ)

ضربِ قلندری بیار سدِ سکندری شکن　رسمِ کلیم تازہ کن، رونقِ ساحری شکن

(ج۔ن:٦١٦)

(قلندری ضرب لگاؤ اور سکندری دیوار کو توڑ دو، اس طرح کلیم اللہ کی رسم تازہ کرو اور سامری کا جادو توڑ دو)

قیصر و کسریٰ کا تشدّد اور فقرِ حیدرؓ و بوذرؓ

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آج کے مسلمانوں کو تلوار (یعنی جہاد کی افادیت) کا علم نہیں۔ جہادِ بالسیف کے علاوہ مسلمان بزرگوں نے فقر کی تلوار بھی چلائی ہے اور اس سے لوگوں کے دلوں کو فتح کیا ہے۔ ایسے فقراء نے قیصر و کسریٰ کے ظلم و تشدّد اور امارت کو بھی مٹا دیا۔

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تو نے　کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگر دار
ہے فکر مجھے مصرعِ ثانی کی زیادہ　اللہ کرے تجھ کو عطا فقر کی تلوار
قبضے میں یہ تلوار بھی آ جائے تو مومن　یا خالدؓ جانباز ہے یا حیدرِ کرارؓ (ض۔ک:٤٨٩)
مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے　وہ کیا تھا؟ زورِ حیدرؓ، فقرِ بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ

(ب۔د:٢٧٠)

سروری در دینِ ما خدمت گری است　عدلِ فاروقیؓ و فقرِ حیدریؓ است (پ۔م:١٩٠)

(ہمارے دین میں قیادت و سرداری خدمتِ ملّت کا دوسرا نام ہے، فاروقیؓ دور کا عدل و انصاف ہو یا حیدریؓ فقر و استغنا سب جذبۂ خدمت کے نمونے ہیں۔)

نہ کر تقلید اے جبریلؑ میرے جذب و مستی کی　تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

(ب۔ج:٣١٥)

علامہ اقبالؒ بالِ جبریل میں فقر کی شان میں اسی حقیقت کو پیش کرتے ہیں جس کا نقشہ اکابرینِ اسلام نے پیش کیا۔

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ　فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ
علم فقیہہ و حکیم، فقر مسیحؑ و کلیمؑ　علم ہے جویائے راہ، فقر ہے دانائے راہ
چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغِ خودی　ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ

(ب۔ج:٣٦٩)

نہ تخت و تاج میں، نے لشکر و سپاہ میں ہے　جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

(ب۔ج:٣٦٠)

مسلمانوں کے مذکورہ بالا حکمرانوں نے یہ قابل فخر فقر حضور اکرم ﷺ کی معیت سے سیکھا ہے جو یہ ارشاد فرمایا کرتے تھے "اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ" (فقر میرا فخر ہے۔) آپ ﷺ نے پورے عالم کو پناہ دی۔ آپ ﷺ کے دین میں یہ رسمی بادشاہت حرام ہے۔

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است نظامش خام و کارش ناتمام است

(ابھی دنیا میں انسان غلام ہے، دنیا والوں کا نظام خام اور ان کا انتظام نامکمل ہے۔)

غلامِ فقرِ آں گیتی پناہم کہ در دینش ملوکیت حرام است

(ا۔ح:۹۷۲)

(میں تو اس ہستی کے فقر کا غلام ہوں جس نے پورے عالم کو پناہ دی ہے، جس کے دین میں بادشاہت حرام ہے)

فقر کی روحِ رواں عشق ہے

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اوّلین ہے عشق عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدہء تصوّرات

طریقت، عشق خدا اور عشق رسول اللہ ﷺ کے سوا اور کچھ نہیں، اس میں ان دونوں سے شدید محبت پیدا ہو جاتی ہے "اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہ" اور محبتِ مرشد کو اس محبت کا وسیلہ بنایا جاتا ہے۔ اسی لیے مذہب عشق کے قوانین تمام مذاہب سے الگ ہیں۔ طریقت میں مقصود کو حاصل کرنے کے لئے مسلسل لگن اور جگر سوز تڑپ پیدا کی جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اہلِ طریقت تھوڑی سی مدت میں وہ مقام حاصل کر لیتے ہیں جو زاہد خشک سالہا سال میں اس کے قریب بھی پھٹک نہیں پاتا۔ یہی عشق فقر کی روحِ رواں ہے۔ ہماری تصنیف "عقل و عشق" اور علامہ کا فلسفۂ خودی اسی موضوع پر ہے۔ (اس کتاب کا مسودہ چوری ہو گیا ہے اب شاید ہی اس کو دوبارہ ترتیب دیا جائے)۔

عشق کا امتیازی نشان یہ ہے کہ وہ غلاموں پر شہنشاہی کے راز کھول دیتا ہے اور قربِ الٰہی کی شاہراہ پر لا کھڑا کرتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مذہب اسلام کی بنیاد ہی عشق پر ہے۔ صحابہ کرامؓ کو دیکھیں کہ ان کے پاس عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کیا تھا؟ کیا ان کے ہر عمل میں عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا جنون موجزن نہ تھا؟ وہ اسی راہ کے سبب زمانے بھر میں ممتاز ہو گئے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

ہر دو بمنزلے رواں، ہر دو امیرِ کارواں عقل بہ حیلہ می برد، عشق برد کشاں کشاں

(عقل اور عشق ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ فرق یہ ہے کہ عقل حیلوں بہانوں سے لے جاتی ہے مگر عشق کھینچ کر) (ز۔ع:۴۱۲)

تو اے شیخ حرم شاید نہ دانی جہانِ عشق را ہم محشرے ہست

(اے شیخ حرم تو شاید یہ نہیں جانتا کہ جہانِ عشق کا بھی ایک محشر (کالدن) ہے۔)

گناہ و نامہ و میزاں نہ دارد نہ اُورا مسلمے نے کافرے ہست (پ۔م: ۲۱۴)

((اس حشر میں) گناہ، نامہ اعمال، میزان نہیں ہے اور نہ ہی اس کے لئے (یہ دیکھا جائے گا کہ کوئی مسلم ہے یا کافر))

عشق ایک دائمی کیفیت ہے اور عاشقانِ الٰہی کو دوام بخشتا ہے، اس کے دوام کے باعث اس کو ہست و بود میں تمیز نہیں۔ یہ جان کی بازی لگانے سے دریغ نہیں کرتا کیونکہ اس کا مقصود اس کا محبوب ہے اور جان اس کی مقصود و مطلوب نہیں۔ وہ اپنے محبوب کے نام پر سب کچھ لٹانے کو تیار رہتا ہے اور یہی صفات ایک کامیاب فقر کے لئے مطلوبہ معیار ہیں۔

عشق را نازم کہ بودش را غم نابود نے کفرِ اُو زنّار دار حاضر و موجود نے

(مجھے عشق پر ناز ہے کہ اس کے ہونے کو نابود ہونے کا غم نہیں، اس کے کفر میں حاضر و موجود کا زنار نہیں ہے)

عشق اگر فرماں دہد از جانِ شیریں ہم گزر عشق محبوب است و مقصود است و جاں مقصود نے

(ز۔ع: ۵۰۲)

(اگر عشق حکم دے تو اپنی جانِ عزیز کی بھی پرواہ نہ کرو، کیونکہ محبوب و مقصود عشق ہے جان نہیں)

وہ مقام جہاں پر عشق ہی سب کچھ ہے وہاں مذاہب اور رسوم کی قید ختم ہو جاتی ہے۔ جہاں پر کوئی مذہب نہیں رہتا وہاں صرف حقیقی اور ابدی مذہب یعنی مذہبِ خدا (اسلام) ہی رہ جاتا ہے۔ مذاہب بدلتے رہتے ہیں لیکن مذہبِ عشق تمام مذاہب سے بلند و بالا ہے اور یہ وہ مذہب ہے جس کو اہلِ فقر اور اولیاء اللہ اپناتے ہیں۔ اسی لئے مجذوب جو عشقِ الٰہی میں ہمیشہ سرمست رہتے ہیں شریعت کی پابندی سے مستثنیٰ ہیں۔

زماں زماں شکند آنچہ می تراشد عقل بیا کہ عشق مسلمان و عقل زناری است

(عقل کے نظریات وقتاً فوقتاً بدلتے رہتے ہیں اور عقل کے تراشے ہوئے بتوں کو عشق توڑ دیتا ہے آؤ دیکھو کہ عشق مسلمان ہے اور عقل کافر) (ز۔ع: ۴۶۸)

جو لوگ صرف ظاہری اسلام کا نام استعمال کرتے ہیں وہ کفر اور شرک کے فتوے لگانے میں جلد بازی کرتے ہیں۔ یہ لوگ ظاہری اعمال کو اہمیت دیتے ہیں اور باطنی احوال کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ علامہؒ درج ذیل اشعار میں جنونِ عشق کا اظہار کرتے ہیں۔

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

(ب۔ج: ۳۲۷)

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

(ب۔ج: ۳۵۹)

وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفسِ جبرئیلؑ دے تو کہوں
(ب۔ج:۳۱۹)

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک
(ب۔ج:۳۳۴)

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اُس پر حرام
عشق دمِ جبرئیلؑ، عشق دلِ مصطفیٰؐ
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
(ب۔ج:۳۸۶)

عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود
عشق ہے ابن السّبیل، اس کے ہزاروں مقام
(ب۔ج:۳۸۷)

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام
شورشِ طوفاں حلال، لذّتِ ساحل حرام
(ض۔ک:۴۸۳)

عقل بھی عشق سے ہی جہاں تابی کے قوانین سیکھتی ہے اور انسان کے دل میں تمام کیفیات اور روحانی مقامات عشق سے ہی طے ہوتے ہیں۔ ذرا غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ رومیؒ، رازیؒ، فارابیؒ اور جنیدؒ و بسطامیؒ وغیرہ یہ تمام سرتاپا عشق میں ڈوبے رہتے تھے۔ عشق ہی نے ان لوگوں کو ذکر وفکر و اطاعتِ الٰہی سے سر مست کر دیا تھا اور آج بھی کوئی ان جیسے مقامات عشق کی تلاش میں ہو تو ان اہلِ عشق کے قدموں کے نشان پر ٹھیک چل سکتا ہے۔

عقلے کہ جہاں سوزد یک جلوۂ بے باکش
از عشق بیاموزد آئینِ جہاں تابی
(عقل کہ جس کا ایک بیباک جلوہ جہان کو جلا دیتا ہے، عشق سے ہی جہاں تابی سیکھتی ہے۔)

عشق است کہ در جانت ہر کیفیت انگیزد
از تاب و تبِ رومیؒ تا حیرتِ فارابیؒ
(عشق تری جان میں گوناگوں کیفیات پیدا کرتا ہے، رومیؒ کے سوز و ساز سے فارابیؒ کی حیرت تک)

ایں حرفِ نشاط آور می گویم و می رقصم
از عشق دل آساید با ایں ہمہ بے تابی
(یہ خوش کن لفظ میں کہتا ہوں اور رقص کرتا ہوں کہ میرے دل کے سکون کا باعث اس عشق کی بیتابی ہے۔)

ہر معنیٔ پیچیدہ در حرف نمی گنجد
یک لحظہ بہ دل در شو، شاید کہ تو دریابی
(پیچیدہ باتیں حروف میں نہیں آتیں چنانچہ ایک لحظہ کے لیے دل کی طرف متوجہ ہو کہ شاید تو ان باتوں کا حل پالے)(پ۔م:۳۰۳)

کچھ لوگ عشق والوں پر طنز کرتے ہیں۔ وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اسلام تو سیدھا سادہ مذہب ہے اور

انسان کو صرف نماز و روزے کا مکلف بناتا ہے مگر یہ عشق کہاں سے آ ٹپکا۔ ایسے لوگ محض تعصب کا شکار ہیں ان لوگوں کو عشق کے مفہوم سے آگہی نہیں۔ علم تصوف مذہب سے والہانہ عشق ہی تو سکھاتا ہے۔ حضرت داتا گنج بخش ؒ نے امام مالکؒ کا قول نقل کیا ہے آپ نے فرمایا ہے کہ جس نے تصوف کے بغیر فقہ کا علم سیکھا تو وہ فاسق ہوا اور جس نے علم فقہ کے بغیر طریقت کو حاصل کیا تو وہ زندیق ہوا۔ فرماتے ہیں کہ جس نے ان دونوں کو اکٹھا کیا وہ محقق ہے۔ علامہ اقبالؒ نے ان کے اس قول کو شعر میں یوں بیان فرمایا ہے۔

ز رسم و راہ شریعت نہ کردہ ام تحقیق جز ایں کہ منکرِ عشق است کافر و زندیق

(میں نے رسم وراہِ شریعت کی تحقیق اس کے سوا نہیں کی کہ عشق کا منکر کافر و زندیق ہوتا ہے۔)(ز۔ع:۵۰۵)

فقر کی بلند ہمتی عشق کے باعث ہے

عشق ایک ایسا جذبہ ہے جو ہر کام کو آسان کر دیتا ہے۔ اہل فقر میں بھی اگر عشق نہ ہو تو وہ طریقت کی کٹھن منزلوں کو طے نہ کر سکیں گے۔ راقم الحروف نے عقل و عشق اور علامہ اقبالؒ کا فلسفۂ خودی کے نام سے ایک ضخیم کتاب مرتب کی ہے جو انشاء اللہ جلد ہی زیورِ طباعت سے آراستہ ہو جائے گی بشرطیکہ اس کا گم شدہ نسخہ مل جائے یا دوبارہ لکھی جائے۔

درج ذیل اشعار سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ عشق تمام اہلِ فقر کی زندگی کا لازمی جزو تھا۔

عقل در کوہے شگافے می کند یا بگردِ اُو طوافے می کند

(عقل تو پہاڑ میں شگاف ڈال سکتی ہے، یا اس کے گرد طواف کر سکتی ہے۔)

کوہ پیشِ عشق چوں کاہے بود دل سریع السّیر چوں ماہے بود

(عشق کے آگے پہاڑ گھاس کے تنکے کی طرح ہے، اس کی وجہ سے دل چاند کی طرح تیزی سے گھومتا ہے)

زورِ عشق از باد و خاک و آب نیست قوتش از سختیء اعصاب نیست

(عشق کی طاقت ہوا، خاک اور آب سے نہیں، اس کی طاقت مضبوط اعصاب سے بھی نہیں۔)

عشق بانانِ جویں خیبر کشاد عشق در اندامِ مہ چاکے نہاد

(عشق تو نانِ جویں کھا کر خیبر شکنی کرتا ہے، عشق چاند کے بدن کو چاک کر دیتا ہے۔)

کلۂ نمرود بے ضربے شکست لشکرِ فرعون بے حربے شکست

(نمرود کا غرور بغیر حرب وضرب کے توڑ دیا، اور بغیر ساز و سامان کے فرعون کے لشکر کو غرق کر دیا۔)

عشق در جاں چوں بچشم اندر نظر ہم درونِ خانہ ہم بیرونِ در

(عشق روح میں اس طرح ہے جس طرح آنکھ میں نظر، جو اس سے متصل بھی ہے اور منفصل بھی)

عشق سلطان است و برہانِ مبین ہر دو عالم عشق را زیرِ نگیں (ج۔ن:۶۱۰)

(عشق غالب ہے اور کھلی دلیل بھی ہے، اور دونوں جہاں اس کے زیرِ نگیں ہیں۔)

عاشقی؟ از سُو بہ بے سوئی خرام مرگ را بر خویشتن گرداں حرام (ج۔ن:۶۱۱)

(اگر عشق کا دعویٰ کرتا ہے تو جہات یعنی مکان سے نکل کر بے جہت لامکان کی طرف جا، تاکہ تو موت کو اپنے آپ پر حرام کر سکے۔)

فقر کی وابستگی عورت کی جھولی سے ہے

اللہ تعالیٰ نے عورت کو بھی ایک بہت بلند مقام بخشا ہے۔ کسی قوم کی ترقی اس کی عورت کی تربیت، عادات اور کردار پر منحصر ہے۔ حضرت رابعہ بصریؒ سے کسی نے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ عورتوں کو نبوت اور رسالت کے مقام نہیں دیئے گئے۔ آپؒ نے فرمایا کہ یہ مقام کیا کم ہے کہ ہم عورتیں نبی نہیں بنا کرتیں بلکہ نبیوں کو جنا کرتی ہیں۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مسلمانوں کے مستقبل کو سنوارنے میں عورت کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ آپ نے اپنے طویل کلام میں عورت کے مقام کو واضح کیا ہے اور اس کی اصلاح کی ضرورت کو محسوس کیا ہے ان کے کلام کا کچھ حصہ یہاں شامل کیا جا رہا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جس قوم کی عورتیں مہذب، دیندار، عفت شعار اور فرض شناس ہوں اس قوم سے بے شمار ہونہار بچے جب تربیت پا کر ملک کی باگ دوڑ سنبھالیں گے تو اس قوم کو بہتر سے بہتر کی طرف لے جائیں گے اور اس کی عزت کو چار چاند لگا دیں گے۔

بہل اے دخترک ایں دلبری ہا مسلماں را نہ زیبد کافری ہا

(اے بیٹی ان دلبری کی باتوں کو چھوڑ، مسلمان کو یہ کافری کی باتیں زیب نہیں دیتیں)

منہ دل بر جمالِ غازہ پرورد بیاموز از نگاہ غارت گری ہا (ا۔ح:۹۷۴)

(گلگونہ سے آراستہ کئے ہوئے حسن پر دل نہ دے، بلکہ اپنی نگاہ سے تُرشی اور سختی کا ڈھنگ سیکھ)

اگر پندِ ز درویشے پذیری ہزار امت بمیرد تو نہ میری

(اگر تو اس درویش کی نصیحت کو قبول کرے، تو ہزاروں امتیں مٹ جائیں گی مگر تم نہ مٹو گی)

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر کہ در آغوش شبیرؓ بگیری (ا۔ح:۹۷۶)

(پاکدامن بن اور اس زمانے سے بچ کر رہ، تاکہ تیری آغوش میں کوئی شبیر جنم لے سکے۔)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اس دور میں عورتیں اور مرد بھی اپنی آرائش اور زیبائش [illegible] بیکار کاموں میں الجھے رہتے ہیں جس قوم کی عورتیں [illegible] میں الجھ جائیں اس قوم کا انجام [illegible]

مسلمانوں نے اس برائی کو فرنگیوں سے سیکھا جواب خود زوال کا شکار ہیں۔

رسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے روشن ہے نگہ آئینۂ دل ہے مکدر
(ض۔ک:۵۵۵)

آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر
(ض۔ک:۵۵۶)

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ اُمومت ہے حضرت انسان کے لئے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت
(ض۔ک:۵۵۸)

علامہ اقبالؒ عورت کو خطاب کر کے فرماتے ہیں کہ قوم کی عزت اور ناموس تجھ سے ہی وابستہ ہے اور ہمارے شمع دان کی روشنی تیرے ہی دم سے ہے۔ عصر حاضر کی برائیوں سے خود کو محفوظ رکھ اور اپنی قوم کے فرزندوں کو آرام کے ساتھ کنارے لگا دے۔ تیری فطرتِ بلند میں خدا نے بہت سی صلاحیتیں رکھی ہیں۔ تجھے چاہیے کہ خاتونِ جنت حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے طریقے سے منہ نہ موڑے تا کہ تیری شاخ سے ایک بار پھر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ جیسے پھل نمودار ہوں۔

اے ردایت پردۂ ناموسِ ما تابِ تو سرمایۂ فانوسِ ما (ا۔خ:۱۵۴)
(اے اسلام کے ناموس کا روایتی طور پر پردہ رکھنے والی عورت، تیری قوت ہمارے شمع دان کا سرمایہ ہے)

ہوشیار از دست بردِ روزگار گیر فرزندانِ خود را در کنار
(اس زمانے کی تباہ کاریوں سے ہوشیار رہ، اور اپنے فرزندوں کو خود پکڑ کر کنارے پر لے جا۔)

فطرتِ تو جذبہ ہا دارد بلند چشمِ ہوش از اُسوۂ زہراؓ مبند
(تیری فطرت بلند جذبات کی حامل ہے، مناسب ہے کہ تو فاطمۃ الزہراؓ کے اسلوب زندگی کو سیکھنا نہ بند کرے)

تا حُسینے شاخِ تو بار آورد موسمِ پیشیں بہ گلزار آورد (ا۔خ:۱۵۵)
(تا کہ حسینؓ جیسے بلند مرتبہ انسان تیری شاخ کا ثمر بنیں، سابقہ موسم کی طرح تو پھر گلزار بنا دے۔)

صوفی و مُلا

علامہ نے صوفی اور ملا پر جو کچھ فرمایا وہ ملاحظہ فرمائیں۔

مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریقِ خانقاہی

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے وقت میں مُلا اور صوفی کے احوال کو دیکھا اور ان کے ساتھ بے اطمینانی کا

اظہار کیا۔ آپ نے ملاحظہ کیا کہ الا ماشاء اللہ عام ملا اسلام کی روح سے نا آشنا اور فقط دو رکعت کے امام کی حیثیت اختیار کر چکے تھے، آپ نے یہ بھی دیکھا کہ اس وقت کے زیادہ تر صوفی رہبانیت کی طرف زیادہ مائل ہو رہے ہیں اور ان پر باریک سا اسلام کا خول چڑھا ہوا ہے۔ آپ کے خیال میں اسلام کا منشاء محض مسجد نشینی یا خانقاہ نشینی نہیں ہے بلکہ ان پر اسلام کی تمام پابندیاں عائد ہوتی ہیں، جب تک مسلمانوں نے اپنے فرائض کو پہچانا وہ اپنے وقتوں کے حکمرانوں سے دست وگریباں رہے اور جب یہ اسلامی گرم جوشی ختم ہو گئی تو وہ فقط خانقاہ نشینی کی طرف راغب ہو گئے۔

فقیراں تا بہ مسجد صف کشیدند گریبانِ شہنشاہاں دریدند

(فقیر لوگ جب تک مسجدوں میں صف آرائی کرتے رہے۔ تو انہوں نے بڑے بڑے بادشاہوں کے گریبانوں کو چاک کر دیا۔)

چو آں آتش درونِ سینہ افسرد مسلماناں بدرگاہاں خزیدند! (ا۔ح:۹۲۰)

((لیکن) جب یہ آتش دیں (عشق) ان کے سینوں میں بجھ گئی تو مسلمان خانقاہوں میں گھس گئے۔)

جب علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کو ایسے لاتعداد اور خود ساختہ فقراء نظر آئے تو آپ نے فرمایا کہ ان میں جرأت کردار نہیں ہے، وہ یا تو پورے دنیادار ہیں یا محض خانقاہ نشین ہیں۔ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ ایسے لوگ فقر کے معنی ہی نہیں جانتے اور بذات خود اخلاص سے محروم ہیں چنانچہ امت کی رہبری کیونکر کر سکتے ہیں۔ ایسی حالت میں اُمت مسلمہ لاعلمی، کوتاہ نظری اور غلامی وزوال کا شکار ہو گئی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ بہت سے علماء بھی فقر کے قرآنی معنوں سے بے بہرہ ہیں لہٰذا ان کی صراحیوں سے شراب معرفت کیسے مل سکتی ہے؟۔

عالماں از علمِ قرآں بے نیاز صوفیاں درندہ گرگ و مُو دراز

(یہ علماء علم قرآن سے بے نیاز ہیں یہ صوفی بھیڑیا صفت ہیں اور (صرف) لمبے بال رکھے ہوئے ہیں۔)

گرچہ اندر خانقاہاں ہائے و ہوست کو جوانمردے کہ صہبا در کدوست (ج۔ن:۷۹۴)

(اگرچہ خانقاہوں میں ہاؤ ہو تو بہت کچھ ہے مگر وہ نوجوان مرد کہاں جس کے پیالے میں شراب معرفت ہو)

آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں میں تحقیق اور جدت کا معاملہ تو سرے سے ہی ختم ہو گیا ہے اور اب مسجدوں میں وعظوں کی کیفیت یہ ہے کہ وعظ بطور فن باقی رہ گیا ہے جس سے سخن سازی کی جاتی ہے اور کردار سازی بہت کم ہے۔

[illegible] تحقیق [illegible] صوفی و ملا کے غلام اے ساقی

([illegible])

ہوس بالائے منبر ہے تجھے رنگین بیانی کی نصیحت بھی تری صورت ہے اک افسانہ خوانی کی
(ب۔د:۷۳)

تھا جہاں مدرسۂ شیری و شہنشاہی آج ان خانقاہوں میں ہے فقط روباہی
(ب۔ج:۳۶۷)

رمز و ایما اس زمانے کیلئے موزوں نہیں اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن
"قُمْ بِاِذْنِ اللّٰہ" کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن
(ب۔ج:۴۵۳)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے قومی معاملات کا بغور مطالعہ کیا اور دیکھا کہ صوفیوں میں "فقط ھاؤھو" کی محفلیں باقی رہ گئیں ہیں اور ان میں کیفیت و کردار کی بجائے مستی احوال دیکھنے کو آتا ہے۔ مُلا نے جس شریعت کا درس دیا وہ عمل سے سراسر خالی اور محض گفتار یعنی قیل وقال تک محدود تھا۔ آپ کو ملک کے شعراء اور دیگر ادیبوں کی تحریروں میں یہی حال نظر آیا تو انہوں نے فرمایا کہ جب تک یہ نقائص دور نہ ہوں گے مسلمانوں کی فلاح غیر متصور ہے۔

صوفی کی طریقت میں فقط مستیِ احوال مُلا کی شریعت میں فقط مستیِ گفتار
(ض۔ک:۵۰۱)

شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق افکار میں سرمست! نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیِ کردار
(ض۔ک:۵۰۲)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے دیکھا کہ اس وقت کے خانقاہی نظام کا اثر بعض علماء پر بھی ہوتا جا رہا ہے تو آپ نے ان کو بھی خبردار کیا اور بتایا کہ مسلمانوں کی بے ذوق نمازوں کا سبب ان کے غلط انداز اور نظریات کی پیروی میں ہے۔

سکھا دیئے ہیں اسے شیوہ ہائے خانقاہی فقیہِ شہر کو صوفی نے کر دیا ہے خراب
وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب
(ب۔ج:۳۲۸)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات کا غور سے مشاہدہ کیا کہ خانقاہوں میں جس نوعیت کا ذکر ہوتا تھا وہ حقیقی معیار سے گرا ہوا اور ذکر کی افادیت سے محروم تھا ورنہ جس دور میں ذکر کی تعلیم دینے والے صوفیاء موجود تھے اس وقت مسلمانوں نے دنیا پر اپنی گرفت کو مضبوط بنا رکھا تھا۔

حلقۂ صوفی میں ذکرِ بے نم و بے سوز و ساز　میں بھی رہا تشنہ کام، تو بھی رہا تشنہ کام
آہ! کہ کھویا گیا تجھ سے فقیری کا راز　ورنہ ہے مالِ فقیر، سلطنتِ روم و شام
(ب۔ج:۳۵۴)

قوم کے ان معروف صوفیوں اور مُلّاؤں کی یہ حالت دیکھ کر علامہ اقبالؒ نے کہا کہ کسی قوم کے لئے ایسے معاملات انتہائی نزاکت کے حامل ہوتے ہیں جس کے باعث کوئی قوم اجتماعی غلط روش میں مبتلا ہو کر قومی کردار کو مسخ کر رہی ہو۔ آپ نے فرمایا کہ قومی اصلاح اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ یہ مروّج خانقاہی نظام مکمل طور پر ختم نہ کر دیا جائے اور اس کی جگہ حقیقت فقر کو نہ اپنایا جائے۔

یہ معاملے ہیں نازک، جو تری رضا ہو، تُو کر　کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریقِ خانقاہی
(ب۔ج:۳۳۷)

کتابِ صوفی و مُلا کی سادہ اوراقی

تصوّف کی راہ کے فقیروں کو ریاضت، مشقت اور مخصوص عبادتوں سے اپنا مقام پیدا کرنا ہوتا ہے لیکن اگر کوئی شخص ان ریاضتوں اور عبادتوں کے بغیر ہی صوفی کہلوائے اور بڑا صوفی ہونے کا دعویٰ کرے تو یہ وہ صوفی ہے جسے علامہؒ نے طنزاً صوفی کہا ہے اور اسی طرح عالم بے عمل یا کم علم عالم کو آپ نے مُلا کے نام سے پکارا ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ انہوں نے علماء اور صوفیاء کی شان میں نازیبا الفاظ استعمال کیے ہیں، آپ کے کلام میں ایسے بھی بہت سے اشعار ملتے ہیں جن میں آپ نے اس گروہ کی توصیف اور علوِ مرتبت کو بیان کیا ہے۔ (ایسے اشعار کو اسی مجموعہ کلام میں شامل کیا جا چکا ہے۔)

ایسے صوفیوں کے متعلق آپ کا یہ خیال تھا کہ یہ لوگ سوزِ عشق اور ذوقِ طلب سے یکسر محروم ہیں اور بزرگوں کی کرامات بیان کر کے اپنی مجلسوں کو چمکاتے ہیں۔ بادشاہوں کے محلات اور فقیروں کی خانقاہوں میں سوائے خرابی کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ افسوس ہے کہ محلات اور عبادت گاہوں میں ریاکاری عروج پر نظر آتی ہے۔ ان لوگوں کے عمل کا دفتر نیکیوں سے بالکل خالی ہے اور جب یہ قیامت کے دن خدا کے حضور حاضر ہوں گے تو ان کا اعمالنامہ بالکل خالی ہوگا۔

رہا نہ حلقۂ صوفی میں سوزِ مشتاقی　فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی
خراب کوشکِ سلطان و خانقاہِ فقیر　فغاں! کہ تخت و مصلّیٰ کمالِ زرّاقی
کرے گی داورِ محشر کو شرمسار اک روز　کتابِ صوفی و مُلا کی سادہ اوراقی
(ب۔ج:۳۵۷)

ان حالات کو دیکھنے کے بعد آپ نے بے راہ صوفیوں اور مُلاؤں کو اس تباہی کے غار سے نکلنے کے قوانین اور اَسرار سے بھی آگاہ فرمایا ہے۔ آپ کا پورا کلام لوگوں کو دین کی راہ پر لانے، اخلاق و کردار کو سلجھانے اور زندہ قوموں کی طرح اُبھرنے کی تاکید کرتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ فقراء کے لئے ممتاز اصول جو انہیں اپنی خودی کی حفاظت کرنے کے بعد حاصل ہوتے ہیں اور جن کی وجہ سے قوموں کو بلند مقام حاصل ہوتے ہیں وہ یک رنگی، آزادیٔ طبع اور ہمت مردانہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ آزادی کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اللہ نے آزاد پیدا کیا ہے لہٰذا کسی کی غلامی میں نہ آئے کیونکہ ایسا کرنے سے فقر کی شان ختم ہو جاتی ہے۔ سلجوقی خاندان کے بادشاہ سنجر و طغرل کی فتوحات کے اصول اگر کسی مردِ قلندر میں پائے جائیں تو وہ فقر کی صلاحیت رکھنے کا اہل تصور کیا جاتا ہے یعنی خواہ فقیری ہو یا امیری دونوں حالتوں میں کامیابی اسی وقت ممکن ہے جب جرأت مندانہ اقدام کرے۔

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہر یک دانہ　　یک رنگی و آزادی اے ہمتِ مردانہ
یا سنجر و طغرل کا آئینِ جہانگیری　　یا مردِ قلندر کے اندازِ مُلوکانہ (ب۔ج:۳۵۹)
میری میں، فقیری میں، شاہی میں، غلامی میں　　کچھ کام نہیں بنتا بے جرأتِ رندانہ
(ب۔ج:۳۶۰)

زمن بر صوفی و مُلا سلامے

اللہ تعالیٰ نے فقراء اور اولیاء کو فراست کا نور عطا فرمایا ہے، جس کے باعث اُنہیں معاملہ فہمی کی دولت عطاء فرمائی گئی مگر جو لوگ فقر سے محروم ہیں اُن میں یہ نور نہیں پایا جاتا۔ ملکی حالات اور دشمنوں کی چالوں کو پہچاننا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ معاملہ فہمی کی صفت ہر صوفی درویش کے لئے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہے۔ انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی سیاست کے جال پھیلائے لیکن مسلمانوں کے ایک گروہ نے انگریزوں کی ظاہر داری کو دیکھ کر یہ فتویٰ دے دیا کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کسی حالت میں جائز نہیں کیونکہ وہ اہلِ کتاب ہیں اور ان کی حکومت میں ہمیں اذان، جماعت اور عبادت کی کھلی اجازت ہے۔ اس لئے انگریز ہمارے لئے غیر نہیں ہیں۔ ایسے لوگوں نے انگریزوں کے لئے ''لا غیرَ'' یعنی یہ لوگ ہم سے غیر نہیں، کا نعرہ لگایا ایک مولانا نے کلکتہ میں یہی وعظ فرمایا اور انگریزوں کے نام سے جنگ کی۔

مُلا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت　　ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد
(ض۔ک:۴۹۸)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب میں ان مُلاؤں کو انگریز کی پالیسی اور سیاست سے آگاہ کرتا

ہوں تو کہتے ہیں "خدا عاقبت بخیر کرے۔" کچھ لوگوں نے قرآن کی تشریح اس غلط انداز سے کی جس کو سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ علامہ فرماتے ہیں کہ ان کی تاویلوں کو دیکھ کر خدا، جبرئیل علیہ السلام اور خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حیران ہو جاتے ہیں۔ ایسے مُلا اور صوفی کا فقر میں کوئی حصہ نہیں۔

فرنگی صید بست از کعبہ و دیر　صدا از خانقاہاں رفت "لاغیر"

(انگریزوں نے کعبے اور بت خانے میں اپنے غلام بنانے کا جال پھینکا مگر خانقاہوں سے یہ صدا اٹھی کہ انگریز اہل کتاب ہیں کوئی غیر نہیں ہیں۔)

حکایت پیش مُلا باز گفتم　دُعا فرمود "یاربّ عاقبت خیر" (ا۔ح:۹۵۵)

(جب میں اس حقیقت کو مُلا پر واضح کرتا ہوں، تو وہ کہتا ہے کہ خدایا ہماری عاقبت بہتر کر)

زمن بر صوفی و مُلا سلامے　کہ پیغامِ خدا گفتند مارا

(میری طرف سے صوفی اور مُلا پر سلام ہو، کہ وہ ہم کو خدا کا پیغام پڑھ کر سناتے ہیں۔)

ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت　خدا و جبرئیلؑ و مصطفیٰؐ را (ا۔ح:۹۵۶)

(لیکن ان کی پیش کردہ تاویل خدا، جبرئیلؑ اور مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک جماعت لوگوں پر کفر کے فتوے لگانے میں بہت بے دریغ ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کفار ان کے فتووں کو دیکھ کر یہ کہتے ہیں کہ ایسے فتوے لگانے والے خود کافر ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بڑے حاکموں کے ساتھ اپنے تعلقات اس لئے استوار رکھتے ہیں کہ ان کے ساتھ تعلق رکھنے سے وہ تبلیغی کاموں کو بہتر انداز سے ادا کر سکیں گے حالانکہ درویش کو حاکموں سے دور رہنا چاہیے۔

زدوزخ واعظِ کافر گرے گفت　حدیثے خوشتر از وے کافرے گفت

(دوزخ کے متعلق لوگوں پر کفر کے فتوے دینے والے واعظ کی نسبت ایک کافر نے زیادہ بہتر بات کی)

نداند آں غلام احوالِ خود را　کہ دوزخ را مقامِ دیگرے گفت (ا۔ح:۹۵۶)

(کہ یہ غلام (مُلا) اپنے احوال کو نہیں جانتا، جو دوزخ کو (اپنے بجائے) دوسروں کا مقام کہتا ہے۔)

پسر را گفت پیرے خرقہ بازے　ترا ایں نکتہ باید حرزِ جاں کرد

(ایک خرقہ پوش پیر نے اپنے بیٹے سے کہا کہ تمہیں چاہیئے کہ اس نکتے کو اچھی طرح سے سمجھ لو۔)

بہ نمرودانِ ایں دور آشنا باش　زفیضِ شاں براہیمی تواں کرد (ا۔ح:۹۵۷)

(پس اس دور کے نمرودوں (حکمرانوں) سے آشنائی پیدا کرلو، کیونکہ ان کی دوستی کی وجہ سے تم ابراہیمی کردار کر سکو گے۔)

کیا صوفی و مُلا کو خبر میرے جنوں کی؟

ذوق جنوں کسی کام کی تکمیل کے لیے ایک نہایت کارآمد عنصر ہے۔ اس پر علامہ کا ایک نہایت دلکش، وسیع و عریض کلام موجود ہے جس کو راقم الحروف نے اپنی بیماری کے دنوں میں شہر پشاور میں سپرد قلم کیا تھا اور یہ تحریر اس کتاب میں شامل نہ ہو سکے گی کیونکہ یہ کتاب کافی ضخامت اختیار کر چکی ہے۔ اب اسے "علامہ اقبال کا ذوق جنوں" کے نام سے ایک الگ تحریر کی صورت میں لکھا جائے گا یا میری ایک اور تصنیف "تربیت نفس" میں اس کو شامل کیا جائے گا نیچے کچھ ایسا ہی کلام اس تحریر سے پہلے لکھا جا چکا تھا ملاحظہ فرمائیں۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہمارے صوفی و مُلا اپنی کم علمی کے باعث اُس جنون سے محروم ہیں جو عموماً ان لوگوں کو ملتا ہے جنہیں کائنات کے پوشیدہ اَسرار پر آگاہی عطا کر دی جاتی ہے اور وہ ہر چیز کی حقیقت کی کچھ معرفت حاصل کر لیتے ہیں۔ جنون اس لئے کہا کہ ایسا انسان خدا کی قدرتوں کو دیکھ کر متحیر اور بے خود ہو جاتا ہے۔ اسلام کے بنیادی اصولوں میں جو بے پناہ حکمتیں پوشیدہ ہیں ان کو ہر وہ شخص نہیں سمجھ سکتا جس کو اسلام سے سرسری تعلق ہو۔ ان حکمتوں کی روح کو وہی سمجھ سکتا ہے جو قرآن اور حدیث کے وافر علم کے ساتھ ساتھ فطری علوم پر دسترس رکھتا ہو اور اس کائنات میں پھیلی ہوئی خدا کی قدرتوں کو پہچان سکتا ہو تا کہ وہ کائنات کے ذریعے خدا کو کسی حد تک پہچان سکے۔ جیسے قرآن میں فرمایا گیا ہے: اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر: ۲۸) اللہ کے بندوں میں صرف علماء ہی (پوری طرح) اللہ سے ڈرتے ہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "اَلْعِلْمُ نُوْرٌ یَّجْعَلُہٗ فِی الْقَلْبِ" (یعنی علم ایک نور ہے جسے اللہ تعالیٰ دل میں ڈال دیتا ہے۔) علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اکثر لوگوں کی عبادت میں دنیا کے حصول کا جذبہ اور روپے پیسے یا آخرت کی لالچ اور غرض و غایت ہوتی ہے۔ ایسی عبادت تو سوداگری کی ایک شکل سے کم نہیں۔ اس طرح کی عبادت کرنے والوں کو اس بات کا یقین نہیں ہوتا کہ دنیا کا مال تو ان کی تلاش میں رہتا ہے جس طرح موت انسان کو جہاں بھی ہو تلاش کر لیتی ہے۔ یہ تمام کائنات تو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے اس وقت پیدا کر دی تھی جب انسان کا عبادت گزاری کے مقام میں آنا تو کجا اس کا وجود اور نام ونشان بھی موجود نہ تھا۔ یہ زمین و آسمان انسان کے لئے بنائے گئے ہیں اور انسان اپنے خالق کی فرمانبرداری کے لئے بنایا گیا ہے۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسی عبادت جس میں خلوص نہ ہو رائیگاں جاتی ہے اور ایسے عابدوں کا ذکر و فکر بھی تشنہ ناکامی کا باعث ہوتا ہے۔ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو خود آگہی سکھاتا ہے۔ مسلمانوں کی تکبیروں کی آواز تو عرش تک جاتی ہے مگر اس عامی مُلا کا مذہب تو جمادات اور نباتات کی طرح خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات کا قائل ہے اور اس میں بلند و بالا ذکر و افکار کی صلاحیت نہیں۔ ایک ایسا شخص جو دنیاوی علوم پر

دسترس رکھتا ہو اور خدا کی کائنات کا علم زیادہ رکھتا ہو تو اس کا دینی علم عام مسلمان کے علم سے بدرجہا بہتر ہوگا۔
یہی وجہ ہے کہ اب ان میں وہ روشن ضمیری نظر نہیں آتی۔

کیا صوفی و مُلّا کو خبر میرے جنوں کی ان کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے
(ب۔ج:۳۲۵)

دل ہے مسلماں میرا نہ تیرا تو بھی نمازی میں بھی نمازی
میں جانتا ہوں انجام اس کا جس معرکے میں مُلّا ہوں غازی
(ب۔ج:۳۶۳)

میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہوگا مسائلِ نظری میں الجھ گیا ہے خطیب
(ب۔ج:۳۷۱)

نہ مومن ہے نہ مومن کی امیری رہا صوفی گئی روشن ضمیری
خدا سے پھر وہی قلب و نظر مانگ نہیں ممکن امیری بے فقیری (ب۔ج:۳۷۵)
یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست یہ مذہب مُلّا و جمادات و نباتات
(ب۔ج:۳۷۱)

آہ! اس راز سے واقف ہے نہ مُلّا نہ فقیہہ

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آج کے اکابرین دین اس راز کو نہیں سمجھ سکتے کہ مسلمانوں میں وحدتِ افکار (UNIFORMITY OF THOUGHTS) کے ساتھ وحدتِ کردار (UNIFORMITY OF ACTION) کا ہونا کسی قوم کی ترقی کے لئے اہم مقام رکھتا ہے یعنی پوری قوم مذہب ہی کے بنیادی اصولوں کو دل ودماغ میں بسائے ہوئے ہو اور قوم کا ہر فرد ان اصولوں کو عملی جامہ پہنائے اور غیر مسلم کے غلط اصولوں اور باتوں کو تسلیم کرنے سے انکار کردے۔ صحابہ کرام کی زندگیوں کو دیکھیں کہ ان میں سے ایک شخص بھی اسلام کی مرکزی ہدایات سے ذرہ بھر منحرف نہیں ہوا تھا۔ جب ان کی فوج کسی بازار سے فاتحانہ انداز سے گزری تو بام و در پر موجود عورتوں کو دیکھ کر ہر ایک نے اپنے اپنے سر کو نیچے جھکا لیا۔ اگر فوج کا سالار ایک معیوب بات سے اجتناب کرتا ہے تو پوری قوم اس سے منہ موڑ لیتی ہے۔ شراب کی ممانعت کا حکم آیا تو ہونٹوں کے ساتھ لگے ہوئے پیالے نالیوں میں انڈیل دیے گئے اور شراب سے بھرے ہوئے مٹکے توڑ دیے گئے۔ دنیا کی تاریخ نے کبھی ایسا منظر پیش نہیں کیا تھا کہ شراب کی ممانعت کا حکم لانے والا

صرف ایک آیت کے نازل ہونے پر مدینے کی ہر گلی میں شراب کی ندیاں بہہ گئی ہوں۔ سود کو حرام کیا گیا تو اسے یک مشت ختم کر دیا۔ مدینے میں کسی کو زکوٰۃ دی جاتی تو ہر کوئی یہ کہتا "اَنَا غَنِیٌّ" (میں غنی ہوں۔) سورۃ اخلاص میں قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کا مطلب صرف یہی نہیں کہ اللہ ایک ہے بلکہ اس سے یہ بھی مراد ہے کہ پوری قوم ذکر و فکر، سوچ و بچار کا عمل و کیفیت، نفع و نقصان، کمی بیشی، غرض یہ کہ زندگی کے ہر محاذ پر ایک ہو جائے۔ مؤذن نماز کے لئے بلائے تو سب لوگ مسجدوں کو بھاگ نکلیں جیسے چیونٹیاں بلوں سے نکل آتی ہیں۔ جہاد کا اعلان ہو تو ہر شخص جنگ کے لئے میدان میں کود پڑے۔ رمضان میں روزے کے دوران کوئی کھاتا پیتا نظر نہ آئے۔ وعدہ کیا جائے تو اس کے ایفاء پر ہر کوئی جان دے دے۔ لین دین اور تجارت میں کوئی حد سے تجاوز نہ کرے۔ صحابہ کرامؓ نے یہ نمونہ پیش کیا اور صوفیاء اور فقراء نے کبھی ان اصولوں سے انحراف نہ کیا۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

میں نے اے میرِ سپہ تیری سپہ دیکھی ہے　قُلْ هُوَ اللّٰه کی شمشیر سے خالی ہیں نیام
آہ! اس راز سے واقف ہے نہ مُلا نہ فقیہہ　وحدتِ افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام
قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے؟　اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

(ض۔ک:۴۸۷)

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو　تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال　تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

(ض۔ک:۴۸۶)

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں　ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق

(ض۔ک:۴۸۴)

درج بالا حقائق سے پردہ اٹھاتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے قومی حالات کو درست کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کچھ مشورے دیئے ہیں اور آخر میں فرمایا ہے کہ شاید میری بات مسلمانوں کے دل میں اُتر جائے۔

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے　شاید کہ اُتر جائے ترے دِل میں مری بات

(ب۔ج:۳۷۱)

ملت کو نقصان پہنچانے والے پیر اور مرید

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات کو ظاہر کیا ہے کہ ہر نئی چیز جو باہر سے آئی، اہلِ پنجاب نے اس کو خوش آمدید کہا چنانچہ بہت سے غیر اسلامی فرقوں نے پنجاب سے ہی سر اٹھایا اور جعلی پیری مریدی کو قبول کرنے میں

بھی انہی کا حصہ ہے۔ ضربِ کلیم میں "پنجابی مسلمان" کے عنوان سے فرماتے ہیں۔

مذہب میں بہت تازہ پسند اس کی طبیعت — کر لے کہیں منزل تو گزرتا ہے بہت جلد
تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا — ہو کھیل مریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد
تاویل کا پھندہ کوئی صیاد لگا دے — یہ شاخِ نشیمن سے اُترتا ہے بہت جلد
(ض۔ک:۵۲۳)

بعض مریدوں میں عقیدت کی انتہاء یہاں تک ہے کہ اگر ان کو معلوم بھی ہو جائے کہ ان کا پیر نا اہل اور فقط دھوکے باز ہے تو پھر بھی ان کی عقیدت میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ جو دنیا کے کسی کام کو کرنے کے لائق نہیں وہ لوگوں میں صوفی کی شکل میں نمودار ہو کر دھوکہ دیتے ہیں۔ بہت سے لوگ اُٹھے اور پیر بن گئے۔ ایسے لوگ ملک، قوم اور ملت سے بھی فریب کاری کرتے ہیں۔ انہی بے علم اور غلط پیروں نے لوگوں کو غلط راستے پر ڈالا اور ملت بیضاء کو نقصان پہنچانے کے علاوہ حقیقی پیروں اور علماء کی بدنامی کا باعث بنے۔

پیر ہا پیر از بیاضِ مُو شدند — سخرہ بہرِ کو دکانِ کو شدند
(بہت سے پیر سفید بالوں سے پیر بن گئے، جن کی دوکانیں ہر کسی کے لئے مذاق کا سامان بن گئیں۔)

می شود ہر مُو درازے خرقہ پوش — آہ ازیں سوداگرانِ دیں فروش
(ہر لمبے بالوں والا ایک خرقہ پوش بن بیٹھا ہے، افسوس ہے ان سوداگروں پر جو دین فروشی کرتے ہیں۔)

با مُریداں روز و شب اندر سفر — از ضرورت ہائے ملّت بے خبر
(مریدوں کے ساتھ رات دن سفر میں رہتے ہیں، اور ملت کی ضروریات سے بالکل بے خبر ہیں۔)

واعظاں ہم صوفیاں منصب پرست — اعتبارِ ملّتِ بیضاء شکست (ا۔خ:۷۰)
(واعظ اور صوفی سب مرتبہ وجاہ کو پوجتے ہیں (ان کی وجہ سے) ملّتِ بیضاء کا اعتبار جاتا رہا۔)

بگڑے ہوئے فقراء

کشف المحجوب میں حضرت داتا گنج بخش حضرت عمر الورّاق رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل فرماتے ہیں کہ آدمی تین قسم کے ہوتے ہیں، ایک علماء، دوسرے امراء اور تیسرے فقراء۔ جب علماء میں فساد پیدا ہو تو لوگوں میں شریعت کی پیروی اور اطاعت میں فساد پیدا ہو جاتا ہے یعنی شریعت کی اطاعت ختم ہو جاتی ہے۔ جب امراء خراب ہوتے ہیں تو عوام کی معاش ختم ہو جاتی ہے اور جب فقراء خراب ہو جائیں تو لوگوں کے اخلاق و عادات خراب ہو جاتے ہیں۔ علماء کی تباہی مال و دولت کی طمع و حرص کی وجہ سے ہوتی ہے امراء اور بادشاہوں کی تباہی ظلم کی وجہ سے ہوتی ہے جب کہ فقراء کی تباہی مرتبہ اور سرداری کے لالچ

وجہ سے ہوتی ہے۔ جب تک علماء بادشاہوں یعنی امراء کے دست نگر نہیں ہوتے بربادی سے بچے رہتے ہیں اور جب تک فقراء ریاست کے خواہاں نہیں ہوتے ہر خرابی سے بچے رہتے ہیں۔ امراء اور بادشاہوں کا ظلم بے علمی اور علماء کی طمع بددیانتی کے سبب ہوتی ہے اور فقراء میں ریا خدا پر توکل نہ کرنے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ پس بادشاہ بغیر علم کے، عالم بغیر پرہیز گاری کے اور فقراء بغیر توکل کے شیطان کے ساتھی ہیں اور عام مخلوق کی تباہی ان تینوں گروہوں کے واسطے سے ہوتی ہے۔

بگڑا ہوا تصوف

جب فتوحاتِ اسلام پورے آن بان میں آئیں تو دولت کی ریل پیل ہوگئی۔ امراء اپنے فرائض کی ادائیگی میں خیانت کرنے لگے اور ہر شخص کے دل میں دولت کی اُمنگ پیدا ہونے لگی۔ اس حال میں مغربی تہذیب نے لوگوں کو اپنا دلدادہ بنالیا اور صوفی لوگوں پر بھی اس کا اثر ہونے لگا اور ان میں وہ پہلے جیسی روشن ضمیری نہ رہی۔

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد　　محبت میں یکتا حمیّت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا　　یہ سالک مقامات میں کھو گیا (ب۔ج:۴۱۶)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ امارت اور شاہی انعامات کی طرف راغب ہو جاتے ہیں انہیں یہ معلوم نہیں کہ مقامِ فقر کے سامنے شاہی اعزازات لاشئی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس غلط فہمی نے کہ مال و زر سے عزت مل سکتی ہے، بہت سی قوموں کو زوال پذیر کر دیا ہے۔

مقامِ فقر ہے کتنا بلند شاہی سے　　روش کسی کی گدایانہ ہو تو کیا کہیے (ض۔ک:۵۱۵)
تری نگاہ میں ہے معجزات کی دنیا　　میری نگاہ میں ہے حادثات کی دنیا (ض۔ک:۴۹۵)
کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے　　فقیہہ وصوفی وشاعر کی ناخوش اندیشی (ض۔ک:۳۲۲)

بالآخر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اپنی قوم کے احوال کو رسول مقبول ﷺ کی بارگاہ میں پیش کرتے ہیں اور دعا کی درخواست کرتے ہیں۔

مسلماں آں فقیرِ کج کُلاہے　　رمید از سینۂ اُو سوزِ آہے
(مسلمان وہ بانکے فقیر ہیں، ان کے دل میں جو سوز تھا باقی نہیں رہا۔)
دلش نالد! چرا نالد؟ نداند　　نگاہے یارسولَ اللہ نگاہے! (ا۔ح:۹۱۲)
(اس کا دل روتا ہے، کیوں روتا ہے؟ وہ یہ نہیں جانتا یارسول اللہ ﷺ اس پر نگاہِ کرم فرمائیے۔)

اک مفلس خود دار یہ کہتا تھا خدا سے　　میں کر نہیں سکتا گلۂ دردِ فقیری

لیکن یہ بتا تیری اجازت سے فرشتے کرتے ہیں عطا مردِ فرو مایہ کو میری؟
(ب۔ج:۴۴۳)

جو فقر ہوا تلخی دوراں کا گلہ مند اُس فقر میں باقی ہے ابھی بوئے گدائی!
اس دور میں بھی مردِ خدا کو ہے میسر جو معجزہ پربت کو بنا سکتا ہے رائی!
(ض۔ک:۶۳۷)

جھوٹے مدعیانِ فقر

علامہؒ نے فقر کی مختلف اقسام کا ذکر کیا ہے اور فرماتے ہیں کہ ایک فقر تو ایسا ہے کہ شکاری کو خود شکار بنا کر مغلوب کر دیتا ہے۔ ایسا فقر تو بندے کو مسکین اور نادار بنا دیتا ہے جب کہ اصل فقر بندوں پر اسرارِ شہنشاہی کھول دیتا ہے اور وہ مٹی کو بھی اکسیر بنا دیتا ہے۔ درج ذیل اشعار میں وہ اپنے دور کے صوفیوں کے فقر کے احوال اور علامات بیان کرتے ہیں۔

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری! اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری! اک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری
اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری! میراثِ مسلمانی، سرمایۂ شبیری
(ب۔ج:۴۵۲)

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
شہری ہو دیہاتی ہو مسلمان ہے سادہ مانندِ بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن
میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن
(ب۔ج:۴۵۸)

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری
(ب۔ج:۳۲۹)

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی رہ گئے صوفی و مُلا کے غلام اے ساقی
سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی
(ب۔ج:۳۰۴)

میں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری
(ب۔ج:۳۳۴)

دنیادار ہوس کے پجاری ہیں

درج ذیل اشعار میں بھی صحیح فقر کی مزید علامات بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ دنیادار لوگ کافر ہوں خواہ مومن سب زناری ہیں (زُنار جینو کو کہتے ہیں جو بت پرست ہندو کا شعار ہے) زناری سے یہاں مراد یہ ہے کہ یہ مسلمان دیکھنے کو مومن ہیں لیکن ان کے دلوں میں خواہشات کے زنار موجود ہیں۔

وہی ہے بندۂ حُر جس کی ضرب ہے کاری　　نہ وہ کہ حرب ہے جس کی تمام عیاری!
ازل سے فطرتِ احرار میں ہیں دوش بدوش　　قلندری و قباپوشی و کلہ داری!
زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے　　انہیں کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری!
وجود انہیں کا طوافِ بتاں سے ہے آزاد　　یہ تیرے مومن و کافر تمام زناری!
(ض۔ک:۵۰۵)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جو زمانے کے ساتھ ساز باز کر کے اس سے نباہ کر رہے ہیں وہ سراسر غلطی پر ہیں۔ وہ زمانے کے ساتھ نبھانے کی کوشش تو کرتے ہیں مگر اپنے آپ کو درست نہیں کرتے چونکہ پوری قوم ہی اس سیلاب میں بہہ نکلی ہے اس لئے اب ہمارے مدرسوں اور پوری قوم میں مزید جنیدؒ، غزالیؒ اور رازیؒ جیسی بلند پایہ ہستیاں پیدا نہیں ہوتیں۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ (ارمغان حجاز میں) فرماتے ہیں۔

چہ کافرانہ قمارِ حیات می بازی　　کہ با زمانہ بسازی بخود نمی سازی
(تم زندگی کو کس کافرانہ جوئے پہ لگا رہے ہو، کہ دنیا کے ساتھ تو نباہ رہے ہو مگر خود اپنے ساتھ نہیں)
دگر بمدرسہ ہائے حرم نمی بینم　　دلِ جنیدؒ و نگاہِ غزالیؒ و رازیؒ (ا۔ح:۶۸۵)
(اس کے بعد حرم کے ان مدرسوں میں اب جنیدؒ جیسا دل، غزالیؒ اور رازیؒ جیسی نگاہ دیکھنے کو نہیں آتی)

زندہ و صاحب نظر گشتم زِ فقر

(میں فقر کی بدولت زندہ اور صاحب نظر ہو گیا ہوں)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا تعارف بحیثیت فقیر کروانے میں فخر محسوس کیا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مشہور حدیث ہے "اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ" (یعنی مجھے اپنے فقر پر فخر ہے۔) چنانچہ علامہؒ بھی خود کے لئے'' سرآمد روزگارے ایں فقیرے'' میں خود کو فقیر کہتے ہیں اور کبھی'' خوش آگئی ہے جہان کو قلندری میری'' سے اپنے قلندر ہونے کا اعتراف کرتے ہیں۔ آپ نے اپنے کلام میں کئی مقامات پر اپنے اندازِ قلندرانہ کا ذکر کیا ہے۔ اگر آپ کے ایسے اشعار جمع کئے جائیں تو یہ ایک طویل بیان ہو جائے گا۔ زیر نظر کتاب میں بھی رموز قلندری پر ایک باب لکھ دیا گیا ہے۔ اختصار کی خاطر یہاں کچھ اشعار جو انہوں نے اپنے فقر اور بعض لوگوں کی غلط انداز

فقیری کے متعلق تحریر فرمائے ہیں نقل کیے جا رہے ہیں۔

رسمِ خانقاہی جو اس زمانے میں رائج تھی (اور اب تواتر سے کم ہوتی جا رہی ہے) اس کی مذمت کے لئے جو کچھ آپ نے لکھا ہے اوپر بیان ہو چکا ہے۔ صاحب نظر ہونے کی حیثیت سے آپ نے غلط اندازِ فقر کے لئے اپنی رائے یوں تحریر فرمائی ہے۔

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک　　نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

(ب۔ج:۳۳۸)

کہاں سے تو نے اے اقبالؔ سیکھی ہے یہ درویشی　　کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

(ب۔ج:۳۲۴)

مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب　　نہ مدرسے میں ہے باقی، نہ خانقاہ میں ہے

(ب۔ج:۳۶۱)

مرا سبوچہ غنیمت ہے اس زمانے میں　　کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو

(ب۔ج:۳۰۵)

فقیہِ شہر کی تحقیر، کیا مجال مری　　مگر یہ بات کہ میں ڈھونڈتا ہوں دل کی کشاد

کیے ہیں فاش، رموزِ قلندری میں نے　　کہ فکرِ مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طِلسم　　عصا نہ ہو تو کلیمؑ ہے کارِ بے بنیاد

(ب۔ج:۳۶۲)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھوں میں اشکِ خونیں کی حفاظت کی ہے اور یہ خداداد دولت مجھے بہت محنت کے بعد حاصل ہوئی ہے۔ اس فقر کا اعجاز یہ ہے کہ میں خیر وشر کا راز دان بن گیا ہوں اور مجھے حیات جاوداں مل گئی ہے۔ فرماتے ہیں کہ مجھے وہ فقر ملا جس سے میں صاحبِ نظر بن گیا اور راہ حیات کی تمام منزلوں کو پہچانتا ہوں۔ ایسا فقیر نورِ خودی سے اللہ کو دیکھتا ہے اور اپنے اندر توحید کے اَسرار ملاحظہ کرتا ہے۔

درون دیدہ نگہ دارم اشک خونیں را　　کہ من فقیرم و ایں دولتِ خداداد است

(میں نے اپنی آنکھوں میں اشک خونیں محفوظ کیے ہوئے ہیں، کیونکہ میں فقیر ہوں اور یہ میری خداداد دولت ہے۔) (پ۔ج:۸۶۱)

راز دانِ خیر و شر گشتم زفقر　　زندہ و صاحب نظر گشتم ز فقر

(میں فقر کے ذریعے ہی رازدانِ خیر وشر بن گیا ہوں، اور فقر کی وجہ سے ہی زندہ وجاوید اور صاحب نظر بنا ہوں)

یعنی آں فقرے کہ داند راہ را　　بیند از نورِ خودی اللہ را (پ۔ج:۸۶۴)

(مطلب یہ کہ فقر راہ زیست سے واقف ہے، اور فقیر نور خودی سے اللہ کو دیکھتا ہے۔)

مری نوا سے ہوئے زندہ عارف و عامی ۔ دیا ہے میں نے انہیں ذوقِ آتش آشامی
عجب نہیں کہ مسلماں کو پھر عطا کر دیں ۔ شکوۂ سنجرؒ و فقرِ جنیدؒ و بسطامیؒ (ب۔ج:۳۶۵)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جو فقر مجھے ملا ہے وہ محمد ﷺ کے عشق سے ملا ہے۔ اگر ان کا عشق نہ ہوتا تو میری تمام عبادات اور کوششیں کبھی بار آور نہ ہو سکتیں۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فرمایا ہے کہ ''اگر عشق نہ بودے بخدا کس نہ رسیدے'' (اگر عشق نہ ہوتا تو کوئی بھی خدا تک نہ پہنچ سکتا۔)

شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود ۔ فقرِ جنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمالِ بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام ۔ میرا قیام بھی حجاب! میرا سجود بھی حجاب
(ب۔ج:۴۰۵)

مرا دِل مری رزم گاہِ حیات ۔ گمانوں کے لشکر، یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر ۔ اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
(ب۔ج:۴۱۷)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے کارکنانِ قضاوقدر نے اتنی صلاحیت بخشی ہے کہ میں شعروں کے ذریعے آدم گری کا کام کرتا ہوں جس کی وجہ سے مسلمانوں کی تعمیر نو ہوئی چنانچہ میرا ایسا فقر سکندر کی توسیع پسند سلطنت کی آئینہ سازیوں سے بہتر ہے۔

وہ کچھ اور شے ہے محبت نہیں ہے ۔ سکھاتی ہے جو غزنوی کو ایازی
یہ جوہر اگر کار فرما نہیں ہے ۔ تو ہیں علم و حکمت فقط شیشہ بازی
مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے ۔ یہ آدم گری ہے وہ آئینہ سازی (ب۔ج:۴۳۸)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کا زوال مال و دولت کی کمی یا مفلسی کی وجہ سے نہیں ہے۔ کوتاہ نظر لوگ، مال و دولت کی کمی کو تنزل کا سبب گردانتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں دیکھتے کہ کبھی دنیا کی بڑی بڑی قومیں بھی مفلسی کے حال میں تھیں اور سخت جانفشانی کے بعد زینۂ عروج پر قدم رنجہ ہوئیں۔ عام لوگوں کی زندگیوں کو ہی لے لیں تو معلوم ہوگا کہ آج کے امیر اور بڑے افسر کل غریب اور نادار تھے۔ جو لوگ محنت اور جانفشانی سے جی چراتے ہیں وہ کبھی اپنی حالت کو بدل نہیں سکتے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے قلندرانہ مرتبہ بھی محنت اور سادگی کی وجہ سے ملا۔

اگرچہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات ۔ جو فقر سے ہے میسر تونگری سے نہیں!
اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور ۔ قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں!

سب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں!
اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہے، تونگری سے نہیں!
(ض۔ک:۴۸۲)

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر
(ب۔ج:۴۳۹)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قوم کے زوال کے طلسم کو ان کے کلام کی تکبیر بلند بانگ نے توڑا ہے۔ اے قوم اگر تجھ میں انکار کی ہمت ہے تو مکر جا۔

کہتا ہے زمانے سے یہ درویش جوانمرد
جاتا ہے جدھر بندۂ حق تو بھی ادھر جا!
میں کشتی و ملاح کا محتاج نہ ہوں گا
چڑھتا ہوا دریا ہے اگر تُو تو اُتر جا!
توڑا نہیں جادو مری تکبیر نے تیرا
ہے تجھ میں مکر جانے کی جرأت تو مکر جا!
مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر
(ض۔ک:۵۰۳)

علامہ نے خدمت ملت کا وعدہ پورا کیا

مولانا سیّد سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ کے والد نے ان کی طالب علمی کے زمانے میں وعدہ لیا تھا کہ تم ملّتِ اسلامیہ کی خدمت کرنا، جب علامہؒ کے والد بسترِ مرگ پر تھے تو علامہؒ نے پوچھا والد بزرگوار! آپ سے جو میں نے اسلام کی خدمت کا وعدہ کیا تھا وہ پورا کیا یا نہیں؟ باپ نے بسترِ مرگ پر شہادت دی کہ جانِ من! تم نے میری محنت کا معاوضہ ادا کر دیا ہے" (اقبال سلیمان ندوی کی نظر میں ص ۸۶)

علامہ اقبالؒ نے اُوپر لکھے ہوئے اشعار میں ملّتِ اسلامیہ سے بھی پوچھا ہے کہ اُنہوں نے اس کی صدیوں کی غفلت اور غلامی کا افسوں توڑا یا نہیں؟

ملت علامہؒ کی ممنون ہے

علامہ اقبالؒ کے مجموعہ کلام اور امت کی اصلاح کی کوششوں کا کارنامہ وہ میراث ہے جس پر برِ صغیر کے مسلمانوں کے علاوہ دنیا بھر کے مسلمان فخر کر سکتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ آج کے عالمِ اسلام کا اگر کسی ایک مسلمان پر دینِ حق کا بہترین ترجمان ہونے پر سب مسلمانوں کا اتفاق اور اجماع ہے تو وہ علامہ اقبالؒ ہیں۔ آپ خود رسول اللہ ﷺ کے حضور عرض کرتے ہیں کہ دین کی خدمت میں ملاؤں نے کام کیا ہے یا میں نے ملا لوگ خود کو سرِ فہرست تصور کرتے ہیں علامہ نے فرمایا کہ اُن سے زیادہ تو میں نے ہی دین کی خدمت کا فریضہ ادا کیا ہے۔

دل صاحبدلاں اُو برد یا من؟　پیام شوق اُو [illegible] یا من؟

(اہل دل کے دلوں کو اُس نے تراش کیا یا میں نے، ذوق و شوق اسلام وہ لیکر آیا یا میں؟)

من و مُلّا زکیشِ دین دو تیریم　بفرما بر ہدف اُو خورد یا من (ا۔ح:۹۳۱)

(میں اور مُلّا ایک ترکش کے دو تیر ہیں، آپ فرمائیں کہ نشانے پر وہ پہنچا یا میں؟)

علامہ اقبالؒ نے راس مسعود کے نام (اور قرشی کے نام بھی) ایک خط میں لکھا تھا کہ ان کی یہ ایک بہت بڑی خواہش تھی کہ قرآن مجید پر ایک کتاب لکھوں جو جدید اسلام کے لئے ایک بہت بڑی خدمت ہوگی فرمایا کہ میں یہ شیخی نہیں بگھارتا کہ میرے سوا کوئی اس کام کو نہیں کر سکتا مگر محدود آمدنی اور بیماری کی وجہ سے میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ اس کا ذکر پہلے بھی اسی حصہ اول میں کیا جا چکا ہے۔ وہاں بھی ملاحظہ فرمائیں ان کا یہ لکھنا بھی ان کے جذبۂ ایمان کا اظہار کرتا ہے کہ انہوں نے زندگی میں اسلام کے لیے کیا کچھ کرنے کا عزم صمیم نہ کیا تھا۔

باب ۵

''پس چہ باید کرد'' میں بیانِ فقر

فقیر جَو کی روٹی کھا کر درّہ خیبر اکھاڑ دیتا ہے

علامہ اقبالؒ نے ''مثنوی پس چہ باید کرد'' میں ایک طویل نظم ''فقر'' کے عنوان سے لکھی ہے جس میں آپ نے فقر کے موضوع پر کافی کلام کیا ہے اور مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ اے مادی سامان دنیا کے غلامو! جانتے ہو کہ فقر کیا ہے؟ فقر اس ایک نگاہ کا نام ہے جو صحیح راستہ دکھلے اور ایک ایسے دل کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کی محبت سے زندہ ہو۔ فقراء کے اوصاف بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا ہے کہ فقیر اپنے کام کا محاسبہ کرتا ہے اور ''لا الٰہ'' کو اپنے اعمال کا مرکز بناتا ہے۔ حضرت علیؓ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ فقر جَو کی روٹی کھا کر خیبر فتح کرنے کا نام ہے۔ بادشاہ وامیر سب فقر کے فتراک میں بندھے ہوئے (شکار) کی مانند ہیں۔ فقیر ذوق وشوق اور تسلیم ورضا کا حامل ہوتا ہے۔ یہ حضور اکرم ﷺ کی جانب سے ملی ہوئی ایک متاع ہے اور ہم اس کے امین بنائے گئے ہیں۔ (فقر تجھے ایک ایسے مقام تک پہنچا دیتا ہے کہ جس طرح شیشہ الماس بن جاتا ہے۔) فرماتے ہیں کہ حقیقی فقیر وہ ہے جس کا سامان قرآن حکیم ہو۔ ایسا مردِ درویش گدڑی میں نہیں سماتا اور وہ پوری کائنات میں محدود نہیں رہتا۔ اس باب میں علامہؒ نے فقر پر جو کچھ بیان کیا ہے درج ذیل سطور میں اس کا خلاصہ ہی دیا گیا ہے۔

آپؒ نے فرمایا ہے کہ اگرچہ فقیر بزم میں کم گو ہوتا ہے مگر اس کی ایک بات سینکڑوں انجمنوں کو گرما دیتی ہے۔ فقر جس کسی کے دل میں سما جائے بے پر لوگوں کو ذوقِ پرواز اور مچھر کو تمکین شہباز عطا کرتا ہے۔ علامہؒ فرماتے ہیں کہ شکوہِ بوریا نشین سے شہنشاہوں کے دربار لرز جاتے ہیں۔ مردِ فقیر بادشاہوں کے مقابلے میں کھڑا ہو جائے تو اس کے بوریا سے شاہی تخت بھی لرز جاتے ہیں۔ وہ اپنے جنون سے شہر میں ہنگامہ برپا کر دیتا ہے اور خلق خدا کو بادشاہوں کے جبر وقہر سے نجات دلاتا ہے۔ مردِ فقیر صرف اس صحرا میں مقام کرتا ہے جہاں شاہین کبوتر کا مقابلہ کرنے سے گھبراتا ہے۔

فقیر کا قلب جذب وسلوک سے قوت پاتا ہے وہ بادشاہ کے سامنے یہ نعرہ لگاتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی بادشاہ نہیں۔ فقیر کے قلب میں اس قدر گرمیٔ ایمان پائی جاتی ہے کہ اس کی خاک سے ہماری آگ میں تپش پیدا

ہوتی ہے اور فقیر کے وجود کے خس و خاشاک سے اہلِ جفا کا شعلہ بھی ڈرتا ہے۔

فقر، مستی و رقص اور چنگ و رُباب کا نام نہیں

جب تک کسی قوم کے اندر ایک بھی درویش باقی ہے وہ جنگ میں کسی سے شکست نہیں کھاتی۔ فرماتے ہیں کہ مردِ فقیر کے استغناء کے باعث ہماری آبرو ہے اور ہمارا سوزِ جان اس کے شوقِ بے پرواہ کا مرہونِ منت ہے۔ آپ مسلمان کو نصیحت فرماتے ہیں کہ اپنے آپ کو مردِ فقیر کے آئینہ میں دیکھ! تاکہ تجھے ناقابلِ تسخیر قوت حاصل ہو۔ فقیر کی مقبولیت اور اس کی دلنوازی، حکمتِ دین سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی بے نیازی دین کے لئے قوت کا سبب بنتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کا فقر تو یہ ہے کہ اس دنیا کا احتساب کیا جائے، یہ فقر چنگ و رُباب اور مستی، رقص و سرور سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ یہ تو زہد و مجاہدات اختیار کرنے سے آتا ہے۔

فقر، تسخیرِ کائنات کرنا اور مولا کی صفات کا حامل ہونا ہے

علامہؒ اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ مومن کا فقر کیا ہے؟ پھر فرماتے ہیں کہ فقر کائنات کو مسخر کرتا ہے اور فقر کی تاثیر سے بندے کے اندر اپنے مولا کی صفات منعکس ہو جاتی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ کافر کا فقر صحرا اور بیابان میں خلوت گزیں ہو جاتا ہے جبکہ مومن کا فقر اپنی جدّت کردار سے بحر و بر پر لرزہ طاری کر دیتا ہے۔ فقیر کی زندگی غیر مسلموں کی طرح غار و کوہ میں چھپ کر رہنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس کی زندگی مرگ باشکوہ یعنی شہادت کی موت مرنا ہے۔ بندۂ مومن ترک بدن کرنے کے بعد خدا کو ڈھونڈتا ہے، یہ اپنی خودی کو اللہ تعالیٰ کی سان پر چڑھا دیتا ہے۔ فقر تو خودی کو مارنا اور جلا دینا ہے یعنی اپنی خودی کو چراغ کی مانند روشن کرتا ہے۔

فقر مومن کے ہاتھ میں ایک تلوار ہے

جب آسمان تلے فقر عریاں ہو جاتا ہے تو اس کی ہیبت سے سورج اور چاند لرزتے ہیں۔ فقرِ عریاں غزواتِ بدر و حنین کی گرمی ہے، فقرِ عریاں حضرت حسینؓ کی تکبیر کی آواز ہے۔ جب فقر کے اندر مذکورہ غزوات اور آوازِ حسین جیسی عریانی کا ذوق باقی نہ رہا تو مسلمان کے اندر وہ جلال بھی باقی نہ رہا۔ علامہؒ فرماتے ہیں کہ افسوس صد افسوس کہ اس کہن بت خانے (دنیا) کے اندر 'لا' کی تلوار نہ تیرے ہاتھ میں ہے نہ میرے ہاتھ میں۔ افسوس اس قوم پر جس پر زوال طاری ہو گیا، اس نے میر و سلطان تو پیدا کیے مگر کوئی درویش پیدا نہ کیا۔ اس ملک کا مسلمان اپنے آپ سے ناامید ہے اور ایک طویل عمر گزر گئی کہ اس نے کوئی باخدا مرد نہیں دیکھا۔

آج مسلمان محرومِ فقر ہے

علامہؒ کے فرمان کے مطابق گزشتہ تین سو سال (اور اب ۴۰۰ سو سال) سے یہ اُمت زبوں حالی کا شکار ہے اور بغیر اندرونی سوز و سرور کے دن بسر کر رہی ہے۔ آج وہ وقت ہے کہ مسلمان پست فکر، کم ہمت اور کور

ذوق ہو چکا ہے، اس کے مکتب اور علماء سب محرومِ شوق ہیں۔ اس کے فقر کی خرابی نے اسے ذلیل کر دیا ہے اور باہمی اختلاف نے اسے بیزار کر دیا ہے۔ آج مسلمان کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے مقام و منزل کو نہیں پہچانتا اس لئے اس کے اندر ذوقِ انقلاب بھی ختم ہو چکا ہے۔ کوئی مرد خبیر نہ ہونے کی وجہ سے اس کی طبع بیمار، افسردہ اور حق قبول کرنے کی صلاحیت ہی کھو چکی ہے۔ وہ ایسا غلام ہے جس کا آقا اسے رد کر چکا ہے وہ مفلس بھی ہے، قلاش بھی اور لاپرواہ بھی۔ مسلمان اس حال میں ایسے ہے کہ نہ اس کے ہاتھ میں مال ہے کہ کوئی شخص وہ مال اس سے چھین سکے اور نہ اس کے دل میں نور ہے کہ شیطان لے جائے۔ اس کے مصنوعی صوفیہ، فرنگی لارڈ (فرنگی آقا) کے مرید ہیں اگرچہ باتیں حضرت بایزیدؒ کے مقام سے کرتے ہیں۔ ایسے لوگ کہتے ہیں کہ دین کی رونق محکومی سے ہے۔ خودی سے محرومی کا نام زندگی ہے۔ اس نے غیروں کی دولت پہ تکیہ کیا۔ اُن کے فریب کاری سے دیئے ہوئے مال کو رحمت شمار کیا۔ وہ کلیسا کے گرد رقص کرتا رہا اور ان کی تہذیب کو اپناتے اپناتے طبعی موت مر گیا۔ جو ذوق و شوق اور سوز و درد سے خالی ہے تو کیا کر سکتا ہے۔ کیا تو جانتا ہے کہ ہمارے دور نے علم سے ساتھ کیا کیا۔ جب حضور اکرم ﷺ کے عشق کا سوز سینے سے نکل گیا تو گویا آئینے کے اندر سے اس کا جوہر جاتا رہا۔ تو نے اس دَور کے اندرون کو نہ پہچانا، پہلے ہی داؤ میں اپنے آپ کو ہار دیا۔ جب تیرا دماغ اس کی الجھنوں میں پڑ گیا، تو تیرا دل کوئی زندہ آرزو پیدا کرنے کے قابل نہ رہا۔ اپنے آپ سے نہ بھاگ بلکہ اپنا احتساب کر، تھوڑی دیر کے لئے غیروں سے بیگانہ ہو جا۔ خدا کی طرف رجوع کر۔

اس چمن میں کئی بلند شاخیں ہیں انہیں چھوڑ کر نیچی شاخ پر آشیانہ نہ بنا۔ اسلام کے قوانین جہانگیر ہیں۔ اے بے خبر تو اپنے اندر نغمہ (توحید) رکھتا ہے، اپنی جنس کو پہچان اور زاغوں کے ساتھ پرواز نہ کر۔ پہلے اپنی خودی کو تلوار کی طرح تیز بنا پھر اپنے آپ کو تقدیر کے ہاتھ میں دے۔ بے عملی کے حال میں تقدیر کا رونا بے سود ہے۔ دین کے معاملے میں میری نگاہ دور رس ہے اور اس قوم کے قدم سست، ان کی پختگی خام ہے اور کام نامکمل ہے۔ میں نے دل پر اضطراب دے کر سینکڑوں گرہوں میں سے ایک گرہ کھول دی ہے۔ فرماتے ہیں کہ تو بھی میری تب و تاب سے اپنا حصہ لے لے ورنہ، میرے بعد پھر کوئی مجھ جیسا فقیر نہیں آئے گا۔

مرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر (ب۔ج: ۴۳۹)

حضرت علی الہجویریؒ کا اثباتِ فقر پر کلام

حضرت مخدوم علی الہجویریؒ کی ''کشف المحجوب'' تصوف پر ایک نہایت بلند پایہ کتاب ہے۔ آپؒ نے صوفیاء کے نظریات کے مطابق اثبات علم، اثباتِ فقر، تصوف، خرقہ پوشی، فقر و صفوت، ملامت، آدابِ تصوف اور دیگر موضوعاتِ تصوف پر نہایت عالمانہ انداز میں گوہر افشانی کی ہے، جسے دیکھ کر آج کے علماء بھی آپ کے

تبحرِ علمی پر حیرانی کا اظہار کرتے ہیں۔ آپؒ خود بھی طریق روحانیت کے ایک نہایت اہم مسافر تھے اور تصوف کے علمبردار تھے۔ اگر اس تعظیم وتوقیر کا ملاحظہ کیا جائے کہ جو آپ کو موجودہ وقتوں میں بھی حاصل ہے تو تصوف میں آپؒ کے بلند مقام ہونے کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ تصوف پر آپؒ کی طرزِ تحریر اس قدر دلکش اور دل آویز ہے کہ اس کے پڑھنے والوں کے دل اس قدر متاثر ہوتے ہیں اور وہ آپؒ کے فیضان کی شدت کو محسوس کرنے لگتے ہیں۔ قارئین آپؒ کے علمی اور روحانی قابلیت کی رنگینیوں میں یوں ڈوب جاتے ہیں جیسے وہ مصنف سے بالمشافہ ان کا ساحرانہ کلام سن رہے ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ نعوذ باللہ کوئی فقر اور تصوف کو غیر اسلامی اور غیر ضروری علم تصور کرنے پر مصر رہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ مخدوم علی الہجویریؒ ایسی بلند پایہ ہستی کی تصنیف کردہ صرف ایک کتاب یعنی کشف المحجوب ہی اثباتِ فقر اور تصوف پر کافی اور وافی شہادت فراہم کرتی ہے اور اس کے مطالعہ کے بعد کسی دوسری دلیل کی حاجت نہیں رہتی۔ یہ ایک ایسی صداقت ہے جس کا اندازہ ان اہل ایمان کو بخوبی ہو جاتا ہے جو آج بھی آپ کے مزار پر رحمتوں کے نزول کا مشاہدہ کرتے ہیں اور آپ کے مزار سے پھیلنے والی اسلامی نشریات، درسی تعمیرات اور اطراف عالم میں آپ کے مزار کی آمدنی سے اسلام کی خدمات کو ان کی عظمت کی گواہی تسلیم کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی مادر زاد اندھا آپ کی ان نشانیوں پر چشم بصیرت سے محروم ہو جیسے مولانا رومؒ نے فرمایا۔

کور هرگز کے تواند رفت راست (مثنوی)

(اندھے کے لئے سیدھا چلنا ہر گز ممکن نہیں)

کشف المحجوب اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ ایک ایسی کتاب ہے کہ جو اس کا مطالعہ کرے تو اسے تصوف کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ حضرت معین الدین چشتیؒ نے فرمایا ہے کہ جس کسی کو پیر نہ ملتا ہو وہ اس کتاب کا مطالعہ کرے تا کہ اسے صحیح پیر مل جائے۔ اس کتاب کے معارف اس کا مطالعہ کرنے سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں لہٰذا اس جگہ پر آپؒ کے پیش کردہ چند فرمودات پر اکتفا کیا جائے گا۔

حضرت مخدوم علی الہجویریؒ نے فقر کے متعلق بہت سی قرآنی آیات پیش کی ہیں اور فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے خود دعا فرمائی ہے "الٰہی مجھے مسکین کی زندگی عطا فرما، مسکین کی موت دے اور حشر کے دن مسکینوں کی جماعت سے اٹھا۔" حشر کے دن باری تعالیٰ فرمائیں گے کہ مجھ سے میرے محبت کرنے والوں کو قریب کرو اور جب فرشتے پوچھیں گے کہ تجھ سے محبت کرنے والے کون ہیں تو اللہ کا ارشاد ہوگا فقراء اور مساکین۔ آپؒ نے اصحاب صفہؓ کے متعلق تفصیلی بیان تحریر کیا ہے اور ان کے اوصاف بھی لکھے ہیں اور اس آیت کا ذکر کیا ہے جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان اصحاب کو اپنے سے دور نہ کرنے اور اپنی ہم نشینی کا حکم صادر فرمایا گیا ہے۔ سورۃ الانعام آیت ۵۲ میں فرمایا: وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ ... الخ

(اور نہ (اپنے سے) دُور ہٹاؤ انہیں جو پکارتے رہتے ہیں اپنے رب کو صبح وشام) اور باری تعالیٰ نے فرمایا کہ: وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ (الکہف: ۲۸) (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی آنکھیں ان سے نہ پھیریں۔) چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَ فِیْ اُمَّتِیْ مَنْ اَمَرَنِیْ رَبِّیْ اَنْ اَصْبِرَ مَعَهُمْ" (یعنی اللہ کا شکر ہے کہ جس نے میری اُمت میں ایسے آدمی بنائے جن کے پاس بیٹھنے اور محبت اختیار کرنے کا مجھے میرے رب نے حکم فرمایا۔) (لیکن ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو اس جماعت کی نفی ہی نہیں بلکہ مخالفت کرتے ہیں۔)

آپ فرماتے ہیں کہ ظاہری فقر کی اساس مفلسی اور بیچارگی پر ہے اور جس نے اس پر اکتفا کیا اسے کچھ نفع نہ ملا جب کہ حقیقی فقر اقبال اور اختیار پر مبنی ہے اور وہ موجودات سے روگرداں ہوجانا ہے یعنی ماسوائے اللہ کی نفی کرنا ہے اور دیدارِ کلی سے سرفراز ہونا ہے۔ فرماتے ہیں کہ فقر دراصل وہی ہے جس کی ملک میں کوئی شئے نہ ہو اور اسے کسی شئے کے حاصل ہونے سے کوئی فرق نہ پڑے۔ نہ مال کے ہوتے ہوئے خود کو غنی محسوس کرے اور نہ ہی مال کے نہ ہونے سے خود کو محتاج سمجھے کیونکہ مال کا اس کے لئے ہونا یا نہ ہونا برابر ہوتا ہے۔ درویش کی ملکیت میں کچھ نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ کسی چیز سے محبت رکھتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اَلْفَقْرُ عِزٌّ لِاَهْلِهٖ" (یعنی فقر صاحبِ فقر کے لئے عزت ہے) چنانچہ جو چیز اہل کے لئے عزت ہے وہ نا اہل کے لئے بلاوجہ ذلت ہوتی ہے۔ اس کا جسم معصیت سے محفوظ ہوتا ہے اور قلبی کیفیت خلل اور آفت سے مامون ہوتی ہے۔ وہ خلقت سے بے نیاز ہوتا ہے کیونکہ خلقت اُس کی نظروں میں خود محتاج ہے۔ دونوں جہاں اس کی ترازو میں مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہوتے۔

حضرت داتا گنج بخش نے فرمایا بعض مشائخ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ غنا کو فقر پر فوقیت حاصل ہے یہ اس لئے کہ غنا اللہ کی صفت ہے اور فقر اللہ کے لئے روا نہیں چنانچہ جس دوست میں دوست کی صفت موجود ہو وہ زیادہ کامل ہے مگر یہ اشتراک محض رسمی ہے معنوی نہیں۔ حضرت مخدوم فرماتے ہیں کہ غنی کا لفظ محض اللہ کو زیب دیتا ہے اور خلقت اس کے قابل نہیں کیونکہ حقیقی غنی خدا ہے اور وہ جو چاہے کرسکتا ہے اس کو سبب کی ضرورت نہیں اور اس صفت میں انسانی شرکت باطل ہے۔ مخلوق کا غنا اسباب معیشت کے مہیا ہونے کے باعث ہے اور اسبابِ دنیا چونکہ حدث (فنا) کے تحت آتے ہیں لہٰذا انسان کے لئے غنا کا لفظ مجازی ہے اور اللہ تعالیٰ کے لئے حقیقی ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو فقیر کہا ہے اور خود کو غنی کہا ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝ (فاطر: ۱۵) (اے لوگو! تم فقیر ہو اللہ کے روبرو اور اللہ غنی اور قابلِ توصیف ہے۔) چنانچہ جس کو اللہ فقیر کا نام دے اسے امیر کہنا ظلم ہے۔ اس لئے فقر کے افضل ہونے پر مشائخ کا اجماع ہے۔

حضرت علی الہجویریؒ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ غنا کو فقر سے بہتر سمجھتے ہیں کہ اللہ نے غنا پر شکر کا حکم دیا ہے اور فقر پر صبر کا حکم دیا ہے اور وہ شکر کو صبر سے بہتر خیال کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شکر کا حکم نعمتوں میں اضافے کے لئے دیا اور صبر کا حکم قرب میں اضافے کے لئے دیا ہے۔ اللہ کی نعمتوں کا ہونا قربِ الٰہی سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ وہ صبر جس کی بنیاد آزمائش اور فقر پر ہے اس نعمت کے شکر سے بہتر ہے جس کی بنیاد غفلت پر ہو۔ ایسی نعمت پر تو غفلت کو اور بھی زیادہ کر دیا جاتا ہے۔

کشف المحجوب میں فقر اور غنا پر بہت طویل بحث کی گئی ہے جس کو اس جگہ شامل کرنا ممکن نہیں۔

حضرت ایوبؑ کو فقر کی حالت میں اللہ تعالیٰ نے "نِعْمَ الْعَبْدُ" (اچھا بندہ) فرمایا اور سلیمانؑ کو استحکامِ سلطنت میں بھی نِعْمَ الْعَبْدُ فرمایا۔ جب اللہ کی رضا حاصل ہو گئی تو فقرِ حضرت ایوبؑ غناءِ سلیمانؑ ہی کی طرح ہو گیا۔ حضرت داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوالقاسم قشیریؒ سے سنا ہے کہ لوگ فقر اور غنا کے متعلق خواہ مخواہ بحث کرتے ہیں۔ میں تو وہ چیز اختیار کرتا ہوں جو باری تعالیٰ کو پسند ہو۔ حضرت مخدوم علی الہجویریؒ فیصلہ فرماتے ہیں کہ فقر اور تونگری دونوں خدا کی نعمتیں ہیں۔ تونگری غفلت کے باعث آفت بن جاتی ہے اور فقر میں اگر طمع ہو جائے تو آفت بن جاتا ہے لہٰذا اگر فراغتِ دل میسر ہو جائے تو نہ فقر غنا سے بہتر ہے اور نہ غنا فقر سے۔ جب طالب ملکیت کو ترک کر دے (کیونکہ ہر چیز اللہ کی ملک ہے) تو وہ شرک سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور وہ دونوں ناموں (فقیر و غنی) سے بھی بے نیاز ہو جاتا ہے۔

حضرت مخدوم علی الہجویریؒ فرماتے ہیں کہ متاخرین میں سے ایک کا قول ہے "فقیر تہی دست کو نہیں کہتے کہ اس کے پاس متاع یا زاد نہ ہو بلکہ فقیر وہ ہے جس کا دل خواہشات سے خالی ہو حتیٰ کہ مال کو ترک کرنے کا ارادہ کرنے والا بھی غنی ہے کیونکہ مال کو رکھنے والا اور ترک کرنے والا دونوں ہی مال میں تصرف کرتے ہیں اور فقر تو ترکِ تصرف کا نام ہے"۔

وضاحتِ فقر جو حضرت مخدوم علی الہجویریؒ نے پیش کی

کشف المحجوب میں حضرت داتا گنج بخشؒ نے حضرت حسن عسکریؒ کا قول نقل کیا ہے "اَلْفَقِیْرُ قُوْتُهٗ مَاوَجَدَ وَلِبَاسُهٗ مَاسَتَرَوَمَسْكَنُهٗ حَیْثُ نَزَلَ" (فقیر کی غذا وہی ہے جو مل جائے یعنی اسی کو اختیار کرے، لباس وہ ہے جس سے بدن ڈھانپ لے یعنی اس میں اپنا تصرف نہ کرے اور اس کے قیام کرنے کی وہی جگہ ہے جہاں چلتا چلتا ٹھہر جائے یعنی کوئی خاص جگہ نہ بنائے۔)

درج بالا تین چیزوں میں تصرف ایسے ہے جیسے کسی نے غیر اللہ کی چیزوں کو طلب کیا اور حقیقتاً تمام عالم ان تین چیزوں میں تجاوز کرنے کے بعد ہلاکتوں میں مبتلا ہوتا ہے، یعنی تمام دنیا کی برائیاں انہی چیزوں میں

احتیاط نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ فقیر کی غذا وہی ہے جو اسے مل جائے اس کا لباس تقویٰ ہے اور اس کا مسکن مقامِ غیب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

وَّ اَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا (الجن:١٦)

اگر یہ لوگ صراط مستقیم پر قائم رہتے تو ہم انہیں کافی کثیر پانی پلاتے (یعنی وسیع رزق دیتے۔)

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ (الاعراف:٢٦)

اے اولادِ آدم! بیشک اتارا ہم نے تم پر لباس جو ڈھانپتا ہے تمہاری شرمگاہوں کو اور باعث زینت ہے اور تقویٰ کا لباس دیا یہ سب سے زیادہ بہتر ہے۔

حضرت داتا گنج بخشؒ حدیث نبویؐ پیش کرتے ہیں "اَلْفَقْرُ وَطَنُ الْغَيْبِ" (یعنی فقر وطنِ غیب ہے۔) فرماتے ہیں "جب فقیر کا اکل و شرب (کھانا پینا) شرابِ دیدارِ یار یعنی قربت ہے اور فقیر کا لباس تقویٰ اور مجاہدہ ہے اور فقیر کا وطن مقامِ غیب ہے (یعنی کسی ٹھکانے کا نہ ہونا) اور اللہ تعالیٰ سے وصل اور ملاقات کے انتظار میں رہنا فقر کے طریقہ کا واضح اور کھلا راستہ ہے اور اس کے اعمال شریعت سے روشن ہوتے ہیں تو یہی فقیر کا درجہ کمال ہے۔"

کشف المحجوب میں ہی یحییٰ بن معاذ رازیؒ کا قول موجود ہے "یہ دنیا جائے اشغال اور اعمال ہے اور آخرت مقامِ خوف و ہول ہے اور بندہ ہمیشہ اعمال اور خوف میں رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے ٹھہرنے کا مقام یا تو جنت بن جاتی ہے یا جہنم جس میں وہ پڑا روتا رہتا ہے۔ اسی کتاب میں حضرت رویمؒ کا قول ہے کہ تمام لوگوں میں سے ذلیل ترین وہ درویش ہے جو طمع کرتا ہے جس طرح کہ شریف ترین درویش وہ ہے جو سچا ہو۔ طمع درویش کو دونوں جہانوں میں ذلت میں ڈالتا ہے لہٰذا مالدار لوگ اس فقیر سے زیادہ عزت والے ہیں جو فقر کی وجہ سے ذلت میں ہے۔ یہ طمع انسان کو جھوٹ تک لے جاتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ محبت کرنے والا محبوب کی نظروں میں ذلیل و خوار ہوتا ہے اور اس کے لئے تواضع اور عاجزی کرتا ہے کیونکہ اس کی یہ تواضع طمع کے ساتھ تعلق رکھتی ہے ہاں جب طمع ختم ہو جائے تو تمام ذلت عزت میں تبدیل ہو جاتی ہے جیسے کہ زلیخا ہر وقت یوسف علیہ السلام کی طمع میں رہتی تھی تو وہ ذلیل سے ذلیل تر ہو رہی تھی اور جب یوسف علیہ السلام کی طمع اس کے دل سے نکل گئی تو اللہ تعالیٰ نے اسے جوانی اور خوبصورتی سب کچھ عطا فرمایا۔ جب چاہنے والا (محب) بے نیاز ہو جائے تو محبوب اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے گویا وصل کی طمع ہی سب ذلتوں سے بڑھ کر ذلت ہے اور محب وہی ہے جو محبوب کے وصال اور فراق میں مشغول نہ ہو۔

حضرت علی الہجویریؒ کی نظر میں بہترین فقر کون سا ہے

کشف المحجوب میں حضرت عاصم انطاکیؒ کا قول لکھا گیا ہے "اَنْفَعُ الْفَقْرِ مَا کُنْتَ بِهٖ مُتَجَمِّلًا وَبِهٖ رَاضِیًا" (سب سے زیادہ نفع دینے والا فقر وہ ہے جس سے تو جمال پائے اور جس کے ساتھ تو راضی رہے۔) مخلوق کا جمال تو ہر قسم کے اسباب مہیا کرنے میں ہے اور فقیر کا جمال ایسے تمام اسباب کی نفی (ختم) کرنے میں اور اثبات مسبب (اسباب پہنچانے والے یعنی اللہ کو موجود جاننے) میں ہے اور فقیر کا جمال اسی مسببُ کی طرف رجوع کرنے کے بعد اس کے اسباب پر راضی رہنے میں ہے۔ یہ اس لئے کہ فقر تمام اسباب کے ختم کرنے کا نام ہے اور اس کے برعکس غنا اسباب بہم پہنچانے کو کہتے ہیں۔

علی الہجویریؒ فرماتے ہیں کہ فقیر بلا سبب حق تعالیٰ کے ساتھ ہے اور جہاں سبب ہے وہاں انسان کا اپنے آپ پایا جانا موجود ہے یعنی اس کا وجود خود ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں سبب ہوگا تو وہاں حجاب ہوگا اور جہاں ترک سبب ہے وہاں کشف اور دونوں جہانوں کا جمال ہوگا اور کشف میں رضا پائی جاتی ہے لیکن جہاں غیظ وغضب ہوگا وہاں پورا عالم حجاب میں ہوگا۔ یہ بات فقیر کی فضیلت پر روشن اور عیاں دلیل ہے۔

حضرت داتا گنج بخشؒ نے کشف المحجوب میں ابوعبداللہ احمد عاصم الانطاکیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا بہترین فقر وہ ہے جو تیرے لئے باعث عزت ہو اور تو اس سے راضی ہو، یعنی عام لوگوں کی عزت اسباب ظاہر کی موجودگی ہے مگر درویش کی عزت مسبب الاسباب سے ہے۔ وہ ہر حالت میں اس کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس کے احکام کے سامنے سرنگوں ہوتا ہے۔ فقر عدمِ اسباب کا نام ہے اور غنا وجود اسباب کا۔ اسباب کے بغیر فقر خدا شناسی اور اسباب کے ساتھ فقر کا دعویٰ خودنمائی ہے اس لئے کہ اسباب حجاب کا باعث ہیں اور ترک اسباب ذریعۂ کشف و جمال ہے اور دونوں جہان کی دولت کشف و رضا میں ہے اور غضب حجاب ہے یہ بیان فقر کی افضلیت کو واضح کرتا ہے۔ (کشف المحجوب ص ۲۰۵)

کشف المحجوب ہی میں حضرت ابوبکر محمد بن عمر الوارقؒ کا قول ہے کہ "لوگوں کے تین گروہ ہیں، علماء، امراء اور فقراء۔ علماء تباہ ہو جائیں تو علم شریعت ختم ہو جائے۔ امراء تباہ ہو جائیں تو معیشتِ خلق برباد ہو جائے اور اگر فقراء مٹ جائیں تو لوگوں کے اخلاق نیست و نابود ہو جائیں۔"

امراء اور سلاطین کی تباہی جور و ستم سے ہوتی ہے۔ علماء کی تباہی طمع سے اور فقراء کی ریا سے ہوتی ہے۔ امراء برباد نہ ہوں اگر وہ علماء سے منہ نہ موڑیں۔ علماء برباد نہ ہوں اگر وہ دولت کی تلاش نہ کریں۔ شاہوں کا جور و ستم بے علمی پر مبنی ہوتا ہے طمع علماء کی بددیانتی سے جنم لیتا ہے اور فقراء کی ریا کے پیچھے بے توکلی کارفرما ہوتی ہے۔ بادشاہ بے علم، عالم بے پرہیز اور فقیر بے توکل شیطان کے قریب تر ہوتے ہیں۔ تمام دنیا کا فساد ان تین

گروہوں سے وابستہ ہے۔ (کشف المحجوب ص ۲۲۲)

طریقت پر حضرت علی الہجویریؒ کے مزید اقوال

کشف المحجوب میں حضرت داتا گنج بخشؒ نے ابو حامد احمد بن خضرویہ البلخیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا طریقت کا راستہ کھلا ہے اور حق روشن ہے اور نگہبان یعنی اللہ تعالیٰ ہر بات سنا چکا ہے تو اس وضاحت کے بعد تحیر وہی کر سکتا ہے جو اندھا ہو یعنی اب اور راستہ ڈھونڈنا محض غلطی ہے۔ اس لئے کہ راہِ حق مثلِ آفتاب کے تاباں ہے بلکہ انسان اپنے آپ کو ڈھونڈے کہ وہ کہاں ہے اور جب اپنے آپ کو پالے تو راستہ پر آ جائے گا کیونکہ حق اس سے بھی زیادہ اظہر ہے کہ طالب اس کی طلب کرے۔

آپ ہی سے مروی ہے کہ فرمایا "اُستُرعِزَّ فَقرِکَ" فقیری کے منصبِ جلیل کو پوشیدہ رکھ یعنی مخلوق کے آگے نہ کہتا پھر کہ میں درویش ہوں تاکہ تیرا راز نہ کھل جائے۔ اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑی زبردست بخشش ہے۔ آپ سے ہی مروی ہے کہ ایک درویش نے رمضان المبارک میں ایک متمول کی دعوت کر دی اور ان کے گھر میں ایک روٹی کے سوا کچھ نہ تھا۔ جب وہ دولت مند واپس ہوا تو اس نے ایک سنہری تھیلی سکہ کی ان کی خدمت میں بھیج دی۔ آپ نے اس تھیلی کو واپس کر دیا اور کہلا بھیجا کہ یہ تھیلی اسے دے جو اپنا راز تیرے جیسے کے آگے ظاہر کر دے یا تیرے جیسے دولت مند کو اپنی عزتِ فقر سے بلند جانے۔

داتا صاحبؒ "حضرت حسن عسکریؒ کے متعلق لکھتے ہیں کہ آپ سیاحِ متصوفین (صوفی مسافروں) میں سے تھے اور ہمیشہ جنگل میں خلوت نشین رہا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپؒ کی وفات بھی بصرہ کے ایک ایسے جنگل میں ہوئی کہ وفات کے کئی سال بعد ایک قافلہ پہنچا تو آپ کی لاش کو ایک پیر پر قبلہ رو کھڑے دیکھا۔ لاش مبارک بے جان تھی اور خشک ہو چکی تھی اور آپ کے پاس سامنے چمڑے کا کوزہ یعنی کشکول چرمی رکھا ہوا تھا اور عصا ہاتھ میں تھا لیکن جنگل کے درندے آپ کی لاش مبارک کے پاس نہ بھٹکے اور اتنی مدت تک پائے مبارک سے لاش نہ گری۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ "فقر وطنِ غیب ہے" تو جب اکل و شربِ فقیر شرابِ دیدارِ یار ہے اور لباسِ فقیر تقویٰ اور مجاہدہ اور وطنِ فقیر مقامِ غیب اور وصل کے مقام کا اظہار چاہنا فقر کے طریقے کا کھلا راستہ ہے اور اس کے عمل روشن ہیں اور یہ فقیر کا درجۂ کمال ہے۔

حضرت علی الہجویریؒ نے عبد الکریم ہوازن القشیریؒ کا قول نقل فرمایا ہے کہ تصوف برسام کی بیماری کی طرح ہے اِبتداء میں پریشان قسم کی باتیں کہنا ہوتی ہیں اور اس کی انتہا میں خاموشی ہے۔ فرماتے ہیں کہ دل کی صفائی کی دو حالتیں ہوتی ہیں۔ ایک وجد دوسری نمود۔ تصوف کی ابتداء میں جو کچھ ظاہر ہوتا ہے اسے نمود کہتے

ہیں اور تصوف میں جو مقام کی انتہا تک پہنچ جاتے ہیں ان کے اندر وجد یعنی اللہ تعالیٰ کو پانے، دیکھنے، محسوس کرنے کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وجد کی کیفیت کو عبارت میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ بلند ہمت والے طالب بلند ہمتی کی بناء پر گفتگو کرتے ہیں مگر آرزو رکھنے والے نامکمل طالب کی گفتگو اکھڑی ہوئی ہوتی ہے۔ پس جو پہنچ جاتے ہیں وہ پہنچ ہی جاتے ہیں اور ان سے کوئی عبارت یا اشارہ وغیرہ دکھائی نہیں دیتا۔ اس کی مثال ایسے ہے کہ ابتدائی حال میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار ہو جائے اور چونکہ ہمت بلند تھی اس لئے عرض کیا: رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ (اے رب مجھے اپنا دیدار عطا فرما۔ الاعراف: ۱۴۳) اس کے برعکس ہمارے نبی کریم ﷺ کی حالت پختہ اور ٹھوس تھی آپ کی ہمت فانی ہوگئی جب آپ نے فرمایا "لَا اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ" یعنی میں تیری حمد و ثناء بیان نہیں کر سکتا۔ (ابن ماجہ ص ۲۸۱) آپ ﷺ کا یہ مرتبہ بہت بلند اور اعلیٰ مقام کو ظاہر کرتا ہے۔

"اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ" کی شان

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے فقر کو پسند فرمایا ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ" (یعنی مجھے فقیری پر فخر ہے۔) آپ نے امیری پر مسکینی کو ترجیح دی ہے اور دعا فرمائی کہ اے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن میرا حشر مسکینوں کے ساتھ فرما۔ آپ ﷺ کے ارشاد میں ایک بہت بڑا راز پنہاں ہے اور وہ یہ کہ بندۂ مومن جب فقیری کے راز سے واقف ہو جاتا ہے تو دنیا کے مال و دولت، جاہ و حشمت اور زمامِ اختیار وغیرہ اس کی نظروں میں ہیچ ہو جاتے ہیں۔ اس راز سے اور اللہ تعالیٰ کے اس قانون سے بہت کم لوگ آگاہ ہیں کہ جب انسان دنیاوی جاہ و جلال سے بلند و بالا ہو جائے تو دنیا کی دولتیں اس کے قدموں میں لوٹتی نظر آتی ہیں۔ اگر کوئی شخص افلاس و ناداری میں مبتلا ہو جائے تو اس سے اس کی فقیری میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ اس ناداری کا گلہ و شکوہ درست نہیں کیونکہ انسان کی عظمت و عافیت اس کے حال اور احوال میں پوشیدہ ہے نہ کہ درجات و مال میں۔ آپ کے خیال کے مطابق کامیاب زندگی کا راز سخت کوشی اور مجاہدانہ انداز میں مخفی ہے۔ اگر انسان میں یہ جوہر موجود ہو اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی اتباع میں لگا رہے تو اسے کوئی چیز مغلوب نہیں کر سکتی۔ انسان صرف اس وقت مجبور و محکوم ہوتا ہے جب وہ مال و دولت کا غلام بن جاتا ہے۔

علامہ اقبالؒ کا کلام اوپر بیان ہو چکا ہے کہ وہ فقیر جس میں توحید، اتباعِ سنتِ رسولؐ، اتباعِ قرآن، کے علاوہ صدق و اخلاص، نیاز، سوز، درد و اضطراب، ذوق و شوق، تسلیم و رضا، زندہ دلی اور نگاہ راہ بین موجود ہو تو ایسا شخص فقرِ اسلام کا اہل کہلاتا ہے۔ ایسے لوگ چشمِ زدن میں تمام عالم کی سلطنتوں کو تہ و بالا کر سکتے ہیں اور سینۂ افلاک اور ارض و سما کے پوشیدہ اسرار و رموز کو حل کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں یہی حقیقت حدیث "اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ" سے مراد ہے۔ جب سے مسلمانوں نے یہ فقر کھو دیا نہ تو ان کے ہاتھوں میں دین رہا نہ ہی سلطنت بلکہ

ہر شئے نے ان سے منہ موڑلیا ہے۔اس سلسلے میں فقراور راہبی کے عنوان سے لکھا ہوا ''ضرب کلیم'' میں علامہ اقبالؒ کا کلام قابل مطالعہ ہے۔جس کے دواشعار نیچے دیئے جارہے ہیں۔

کچھ اور چیز ہے شاید تیری مسلمانی تری نگاہ میں ہے ایک فقر و رہبانی

یہ فقر مردِ مسلماں نے کھو دیا جب سے رہی نہ دولتِ سلمانی وسلیمانی (ض۔ک:۵۱۳)

علامہ اقبالؒ مسلمان کے لئے دعا کیا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ تجھ کوفقر کی تلوار عطا کردے اس سلسلے میں آپ نے مزید فرمایا ہے کہ

قبضے میں یہ تلوار بھی آ جائے تو مومن یا خالدؓ جانباز ہے یا حیدرِؓکرار (ض۔ک:۴۸۹)

ایک حدیث شریف کے مطابق اسلام کی ابتداء غربت سے ہوئی اور ترقی کے بعد یہ لوٹ کر غربت کی طرف آئے گا اور یہ غربت غرباء کے لئے خوش آئند ہے۔

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍرَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِءنَّ الْاِسْلَامَ بَدَءَ غَرِیْبًاوَسَیَعُوْدُغَرِیْبًا کَمَابَدَءَ فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ (الترمذی)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسلام غربت کے ساتھ شروع ہوااور عنقریب غریبوں ہی کی طرف لوٹ کررہ جائے گا جیسے اس کا آغاز ہو پس غرباء کے لئے جنت کی خوش خبری ہے۔

اس اسلامی فقر پر جس کا ظاہر غربت ہواور باطن اسلامی روح ہواس پر مسلمان کو ہمیشہ فخر رہا ہے۔ مسلمان کے لئے غربت اور جہالت کی آڑ لینا اس کی روحانی کمزوری کی دلیل ہے۔علامہؒ نے فرمایا کہ فقر سے میری مراد افلاس اور تنگدستی نہیں بلکہ استغناء ہے اور دولت سے لاپرواہی ہے۔

عارف رومیؒ فرماتے ہیں کہ جب طبیعت کا میلان حق کے انوارِ معرفت سے منور ہو جاتا ہے تووہ شمع کے شعلے کی طرح بے سایہ ہو جاتا ہے۔ایسا ہونا درجہ فنا کے بعد ہی ممکن ہوسکتا ہے یہی فقیر کا زیور ہے اور یہی فقر فخر کا سبب بنتا ہے۔فرماتے ہیں۔

فقر فخری را فنا پیرایہ شُد چوں زبانہ شمع اُو بے سایہ شُد (۷۷۔۵)

(فقر قابلِ فخر کے لئے فنا زینت ہوگئی،جب اس کی شمع کے وجود کا شعلہ بے سایہ ہوگیا)

فقر فخری بہرِ آں آمد سَنی تا زطمّاعاں گریزم در غنی (۸۰۔۵)

(میرا فقر قابل فخر اس لئے آیا ہے تا کہ میں اہلِ طمع سے اپنے آپ کو لٹوانے کی بجائے خود محتاج بن کر خالقِ حقیقی کی پناہ میں چلا جاؤں)

مذکورہ بالا شعر میں فقر پر فخر اس لئے کرنا ظاہر کیا گیا کہ مسلمان دنیا کی طمع سے بے نیاز ہونے کے بعد خود

مالک حقیقی کی بارگاہ کی پناہ حاصل کر لیتا ہے۔ایک اور شعر میں مولانا فرماتے ہیں کہ الفقر فخری کا قول ایسے برائے نام ہی نہیں بلکہ اس میں لاکھوں عزتیں اور ناز پوشیدہ ہیں۔

فقر فخری نہ زگزاف ست و مجاز صد ہزاراں عز پنہان ست و ناز (۲۵۴۔۱)

(یہ قول کہ فقر میرا فخر ہے کوئی گپ نہیں ہے، بلکہ اس میں لاکھوں عزتیں اور ناز پوشیدہ ہیں۔)

باب ٦

رموزِ قلندری

قلندر وہ ہے جو حالات و مقامات اور کرامات سے تجاوز کر جائے۔ مانعات (روکنے والی چیزوں) سے مجرد ہو کر اپنے آپ کو گم کر دینے کا نام قلندری ہے۔ قلندر وہ شخص ہے جس کی خودی اس قدر بلند ہوگئی ہو کہ اپنے وجود اور تعلقاتِ دنیاوی سے بے تعلق ہو کر فنافی اللہ ہو جائے۔ قلندر مثبت شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔ وہ دینِ حق کا امین اور نفسِ مطمئنہ کا عظیم نشان ہوتا ہے۔ وہ تارک الدنیا نہیں ہوتا بلکہ دنیا کے اندر رہ کر دنیا کا رہنما اور دنیاوی پستیوں سے بالاتر ہستی بن جاتا ہے۔ وہ دولت سے مستغنی ہے اور اگر تونگر ہو تو اسکی تونگری قلندری کے منافی نہیں ہوتی، اس کا ظاہر اور باطن ایک ہوتا ہے۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ محض نظریاتی طور پر قلندری کے قائل نہ تھے بلکہ خود بھی قلندری کی ایک محسوس اور مجسم صورت تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات اثر رکھتی تھی۔ شاہ نعمت اللہ ولی رسالہ قلندریہ میں فرماتے ہیں کہ صوفی منتہی جب اپنے مقصد پر جا پہنچتا ہے تو قلندر ہو جاتا ہے۔

یہ تحریر ایسے لوگوں کی تسلی اور تشفی کے لئے لکھی جا رہی ہے جو قلندری سے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنے کا شغف رکھتے ہیں بلکہ ایسی تحریروں سے عوام الناس کو قلندری شان سے واقفیت حاصل کرنے کی بھی سعادت مل سکتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے قلندری کو بہت پسند کیا ہے اور ان کے کلام میں اس موضوع پر اتنا کلام ملتا ہے کہ اگر اس کا ہی مطالعہ کر لیا جائے تو قارئین کی تشنگی دور ہو سکتی ہے اور قاری کو قلندرانہ اداؤں سے کافی حظ مل سکتا ہے۔

علامہ اقبالؒ کے کلام سے اس بات کی خوب وضاحت ہوتی ہے کہ کچھ لوگوں کے خیال کے خلاف قلندری ترکِ دنیا کا نام نہیں بلکہ اس کے برعکس یہ دنیاوی فرائض کو مخلوق الٰہی میں صحیح طریقے سے رائج کرنے کا نام ہے۔ قلندری تو مصافِ زندگی میں صورتِ فولاد پیدا کرتی ہے اور مشکلات کو مردانہ وار حل کرنے کی صورت حال کا نام ہے۔ مولانا رومؒ کے قول کے مطابق دنیا میں مال و دولت کمانا اور بچوں کی پرورش کرنا امورِ دنیا میں شامل نہیں بلکہ اِن دنیاوی امور میں الجھ کر خدا کو فراموش کر دینے کا نام دنیا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ نے اپنی زندگی اور کاروبارِ دنیا کو ایک ہاتھ میں رکھتے ہوئے مسلمانانِ ہند کو دینی شعار کے مطابق رہنمائی کرنے میں اپنی پوری عمر گزار دی اور پھر لوگوں کو کہا ہے ۔

بیا بمجلس اقبال و یک دو ساغر کش　　اگرچہ سر نتراشد قلندری داند (پ۔م:۳۴۶)

(مجلس اقبال میں آؤ اور ایک دو ساغر پیو، اگرچہ وہ سر نہیں منڈواتا لیکن قلندری جانتا ہے۔)

علامہ اقبالؒ کا قلندر

اسلامی افکار میں فطری طور پر علامہ اقبالؒ کا رجحان قلندری کی طرف زیادہ جھکا ہوا تھا اور یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ کا قلندرانہ اداؤں والا شاہین ان کے کلام میں کافی امتیاز حاصل کر چکا ہے۔ اس حقیقت میں بھی کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ علامہ اقبالؒ کا مردِ مومن کم وبیش قلندرانہ صفات کا حامل ہے چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ مسلمانوں کو مردِ مومن کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے گویا کہ اپنی قوم کی بنیاد قلندرانہ سطح پر ہی رکھنا چاہتے تھے۔ جب آپ نے قومی اصلاح کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے قلم سنبھالا تو ان کی نظر ہمیشہ کی طرح بلندی کی طرف اٹھی اور دنیا میں ایک نہایت پس ماندہ قوم کو مردِ مومن کا روپ دینا چاہا۔ آپ کی طبیعت میں جوش وخروش اور جذبات کی فراوانی کا یہ عالم تھا کہ وہ مومن کو میدانِ عمل میں اترانے اور خدا کی طرف کمند لگانے کا مشورہ دیتے تھے اور اسی لئے آپ نے گری پڑی قوم کو قلندرانہ راہیں دکھانے کا ارادہ کیا۔

علامہ اقبالؒ نے جب مسلمانوں کے حالات کا معائنہ کیا تو قلندرانہ صفات تو کجا وہ ایک عام مسلمان کہلانے کا حق بھی نہ رکھتے تھے۔ قوم کے افراد میں تنزلی اور پستی کے سائے اس قدر ڈھل چکے تھے کہ ان کو دیکھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایسی قوم پر عتاب الٰہی نازل ہونے سے کوئی چیز مانع نہ تھی اور ایسے کردار کی حامل قوم پر موجودہ خدائی عذاب برحق ہے اور ان پر یہ عذاب نازل ہونا بھی چاہیئے تھا کیونکہ وہ اس کے اہل تھے۔ علامہ اقبالؒ نے خود قلندرانہ صفات کی طرف توجہ دی اور اپنی قوم کو فرمایا کہ اگر کچھ بھی نہیں کر سکتے تو میری قلندرانہ عادات اور صفات کی طرف نظر دوڑاؤ فرمایا یہ موقع ہے کہ اپنے اطوار کو بدلو کیونکہ میرے بعد تمہیں کوئی مردِ قلندر نہ ملے گا۔ قلندری کیا ہے اور قلندری صفات کیا ہیں، اس تمام تفصیل کو اِس تحریر میں شامل کر دیا گیا ہے۔ قلندر میں استغراقِ قلبی کا جذبہ شدت سے موجود ہوتا ہے اور کردار میں جوش وخروش کا اظہار اور سادگی کا ہونا ضروری ہے۔ ایسے قلندرانہ آداب کو سیکھنے کے لئے کسی قلندر کی صحبت میں رہنا ضروری ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میری مجلس میں آؤ اور چند گھونٹ میرے جام کے پیؤ اگرچہ میں سر نہیں تراشتا مگر قلندری جانتا ہوں۔

مرا سبوچہ غنیمت ہے اس زمانے میں　　کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو

(ب۔ج:۳۰۵)

صنم کدہ ہے جہاں مردِ حق ہے خلیل　　یہ نکتہ وہ ہے جو پوشیدہ لاالٰہ میں ہے

(ب۔ج:۳۶۰)

افکار جوانوں کے خفی ہوں کہ جلی ہوں　پوشیدہ نہیں مردِ قلندر کی نظر سے
(ض۔ک:۵۰۴)

یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار　جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے
(ض۔ک:۵۰۴)

مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب　نہ مدرسے میں ہے باقی، نہ خانقاہ میں ہے!
(ب۔ج:۳۶۱)

قلندر بیباک اور صاحبِ ادراک ہوتا ہے۔

ایک قلندر میں مردِ مومن جیسی صفات کا ہونا ضروری ہے۔ وہ ظالم اور جابر حاکم کے سامنے نعرۂ حق لگانے سے نہیں گھبراتا، اسی لئے اس کا بیباک ہونا ثابت ہے۔ وہ دنیا کے مصائب اور مشکلات سے نہیں گھبراتا۔ مال و دولت کی ہوس اس کے لئے سامانِ موت ہے۔ خدا خوفی کے لئے قرآن مجید میں ہے کہ "اللہ کے بندوں میں سے صرف علماء (پوری طرح) اس سے ڈرتے ہیں۔" (فاطر:۲۸)

نگاہوں کا پاک ہونا اور دل کو اپنے مقاصد کے لئے سرگرم رکھنا، نگاہوں کی پاکیزگی اور دل میں دائمی سوز و لگن، شوق و ذوق کا پایا جانا قلندروں کی پہچان ہے۔ قلندر کبھی حالات کے قدموں پر نہیں گرتا کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

حالات کے قدموں پہ قلندر نہیں گرتا
ٹوٹے جو ستارہ تو زمیں پر نہیں گرتا
گرتے ہیں سمندر میں بڑے شوق سے دریا
لیکن کسی دریا میں سمندر نہیں گرتا

قلندروں کے دلوں میں بجز خوفِ الٰہی اور کوئی خوف نہیں ہوتا۔ قرآن مجید میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾ (یونس:۶۳)　یعنی بیشک اولیاء اللہ کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

ذوقِ عمل کے دوران ایک کامل مسلمان کے دل پر جنون کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جس سے جذب اندروں پیدا ہوتا ہے اور وہ مشکل سے مشکل کام کو بھی کر گزرتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس طرح ذکر کیا ہے کہ ان کا جنوں بھی سلامت رہتا ہے اور ان کے ہاتھوں سے حرم کے غلاف کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اس جنون

میں ان کی مطلب براری بھی ہو جاتی ہے۔

اِک جنوں ہے کہ باشعور بھی ہے اِک جنوں ہے کہ باشعور نہیں
(ب۔ج:۳۳۵)

ترے سینے میں دم ہے دل نہیں ہے ترا دم گرمیِ محفل نہیں ہے (ب۔ج:۳۷۶)

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے (ب۔ج:۳۷۶)

کمالِ جوشِ جنوں میں رہا میں گرمِ طواف خدا کا شکر سلامت رہا حرم کا غلاف
(ب۔ج:۳۷۰)

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب گرہ کشا ہے نہ رازیؔ نہ صاحب کشّاف
(ب۔ج:۳۷۰)

ویرانوں میں آثار جنوں ٹپکتے ہیں اور کچھ لوگ حالتِ جنوں میں بھی عقل کو قائم رکھتے ہیں جبکہ کچھ لوگ قوتِ برداشت میں کمی ہونے کی وجہ سے اپنے لباس پھاڑ دیتے ہیں لیکن علامہ اقبالؒ اپنی کیفیت جنوں میں بھی باہوش رہتے تھے۔

ہر زماں یک تازہ جولاں گاہ می خواہم ازو تا جنوں فرمائے من گوید دگر ویرانہ نیست

(میں اس سے ہر لحہ ایک تازہ جولانگاہ کا خواہاں رہتا ہوں یہاں تک کہ مجھے جنوں عطا کرنے والا کہہ دے کہ اب کوئی ویرانہ نہیں رہا۔)

باچنیں زور جنوں پاسِ گریباں داشتم درجنوں از خود نہ رفتن کارِ ہر دیوانہ نیست

(اس قدر زور جنوں میں گریبان کا پاس رکھنا ہر دیوانے کا کام نہیں کہ وہ جنوں میں از خود رفتہ نہ ہو)(ز۔ع:۴۱۸)

علامہ اقبالؒ پر ایسا جنوں طاری ہوتا کہ مقصد براری کے لئے اللہ تعالیٰ سے چمٹ جاتے اور جب تک مقصد براری نہ ہو اس وقت تک اللہ کے گریبان کو ہرگز نہیں چھوڑتے۔ ایسی حرکت بھی قلندری کا وطیرہ ہے اور کبھی خلوت کی خاموشیوں میں بیٹھ کر آپ ایسے مقاصد حاصل کر لیتے جہاں امت کی نجات کا سوال ہوتا ہے۔

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا یا اپنا گریباں چاک، یا دامنِ یزداں چاک (ب۔ج:۳۳۴)

خودی کی خلوتوں میں کھو گیا میں خدا کے سامنے گویا نہ تھا میں (ب۔ج:۳۷۳)

نہ دیکھا آنکھ اُٹھا کر جلوۂ دوست قیامت میں تماشا بن گیا میں (ب۔ج:۳۷۳)

خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں مسلمان قوم دولتِ دنیا سے محرومی کے باعث یہی سمجھتے تھے کہ وہ دنیا میں ترقی کی راہوں پر نہیں چل سکتے اور ان کی کمزوری کی وجہ بھی یہی مال کی کمی ہے۔ نااہل قوم کے لئے بہانے بہت

ہوتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ تمہاری مفلسی اور ناداری کا سبب مالِ دنیا کی کمی نہیں بلکہ محنت، علم، ذوق اور شوق کا فقدان ہے اور یہی اُن کے زوال کا سبب ہے۔

علامہ اقبالؒ نے قوم کو اس بات سے آشنا کیا کہ مذکورہ صفات کے ہوتے ہوئے مالِ دنیا مسلمانوں کی ترقی میں حائل نہیں ہوسکتا۔ آپؒ نے اپنی مثال پیش کی ہے کہ میں نے اپنی شاعری کو زمانے کے مطابق داؤ پر نہیں لگایا بلکہ اس کے ذریعے قوم کی فلاح کا سامان تلاش کرتا رہا ہوں۔ آپؒ کو حکومت ہند نے گورنر کے طور پر کام کرنے کو کہا مگر آپؒ نے اس لئے قبول کرنے سے انکار کردیا کہ وہ اپنا مشن قائم نہ رکھ سکیں گے۔

آپ کا ہمیشہ یہ قول تھا کہ میں جانتا ہوں مآلِ سکندری کیا ہے۔ (ب ج: ۳۴۰)

آپ کو نواب حیدر آباد نے قیمتی توشہ عطا کیا اور کہا کہ یہ توشہ ان کو (اقبالؒ) دو کہ ان میں قلندرانہ صفات کے علاوہ ملوکانہ صفات بھی ہیں لیکن آپؒ کی عزت نے اس کو گوارا نہ کیا۔

تھا یہ اللہ کا فرماں کہ شکوہِ پرویز دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات (ا۔ح: ۶۹۰)

علامہ اقبالؒ کے درج ذیل اشعار میں اس قدر اسباق موجود ہیں کہ ایک معمولی انسان بھی اِن اشعار کا فہم حاصل کر کے اپنی زندگی بدل سکتا ہے مگر صرف مسلمانوں نے ہی اس سے فائدہ نہ اُٹھایا۔ آپؒ کا فرمان یہ ہے کہ ''غریبی میں نگہبانی خودی کی!'' (ب۔ج: ۳۸۱)

آپؒ کے مذکورہ بالا اشعار نیچے دیئے جا رہے ہیں ۔

اگر چہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات جو فقر سے ہے میسّر تونگری سے نہیں!
سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں!
اگر جہاں میں میرا جوہر آشکار ہوا قلندری سے ہوا ہے تونگری سے نہیں!
(ض۔ک: ۴۸۲)

علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں قومی اصلاحات پر نہایت دلسوزی سے کام کیا جس کی وجہ سے آپ کو پوری دنیا میں شاعرِ مشرق کا خطاب دیا گیا۔ آپؒ نے فرمایا ہے کہ اُن کو تمنائے سروری سے قطعاً لگاؤ نہیں بلکہ ان کے کلام میں جو اثرات پائے جاتے ہیں وہ محض اِس لئے ہیں کہ ان کی طبیعت میں قلندری معارف زیادہ چھائے رہتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

کسے نہیں ہے تمنائے سروری، لیکن خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے!
خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری وگرنہ شعر مرا کیا ہے، شاعری کیا ہے!
(ب۔ج: ۳۴۰)

کیے ہیں فاش رموزِ قلندری میں نے

قلندری کا فیضان حاصل کرنے کے بعد آپ نے لوگوں کو بھی قلندری آداب سے آگاہ فرمایا کیونکہ مسلمانوں کو موجودہ پستی سے نکالنے کے لئے علامہ اقبالؒ نے قوم کے مرض کا علاج اِسی قلندری کو اپنانے میں محسوس کیا۔ رموز کو فاش کر دینا دو انواع سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک تو اُن رموز کا فاش کر دینا جو عام انسانوں سے مخفی رکھے گئے ہیں جسے علامہؒ نے فرمایا کہ اُنہوں نے اِن رموز کو فاش کر دیا مثلاً اس شعر کو ہی لیجئے۔

میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں! تو نے یہ کیا غضب کیا! مجھ کو بھی فاش کر دیا

(ب ج:۲۹۷)

راز کو فاش کرنے کی دوسری قسم یہ ہے کہ وہ بات مخفی تو نہ ہو مگر لوگوں کا دھیان اس طرف نہ جائے اور کوئی شخص ان چیزوں کو لوگوں کے علم میں لا کر انہیں استفادہ کرنے کا طریقہ سکھا دے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیماری، غریبی اور مفلسی سے چھٹکارا حاصل کرنے کا طریقہ یہ رکھا ہے کہ لوگ اس کی تابعداری کریں۔ طبقات الکبریٰ صفحہ نمبر ۵۰ پر امام شعرانیؒ نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے دنیا کو پیدا کیا تو اس کو کہا کہ اے دنیا جس کو تو دیکھے کہ کوئی انسان میری تابعداری کرتا ہے تو تم اس کی تابعدار ہو جانا اور جو تیری خدمت کرے تو تم اسے تھکا دینا وہ لوگ جو اللہ کی تابعداری نہیں کرتے اُن کو دنیا تھکا دیتی ہے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ سب لوگ مشکلات میں پھنسے ہوئے اور تھکے ماندے اور پریشان ہیں۔ کیونکہ خدا کی تابعداری سے منحرف ہیں۔ مذکورہ احادیث کے علاوہ علماء اس حقیقت سے واقف ہیں کہ جو لوگ اسلام کے احکام پر عمل کرتے ہیں تو ان کو بیماریوں، پریشانیوں اور مشکلات سے حفاظت ملتی ہے۔ جو شخص ان حقائق کو کسی پر طاری اور جاری کر دے تو گویا اس نے خدائی رازوں کو فاش کر دیا۔ ایسے لوگ عوام کی دستگیری کرتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ ضربِ کلیم میں فرماتے ہیں کہ اگرچہ مال سے دنیا کے تمام کاروبار چلتے ہیں اور انسان مال و متاع کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتا مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ جہاں مال و دولت نہ ہو تو دنیا کے تمام کام بند ہو جائیں گے۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو دنیا میں زوال اس لئے نہیں آیا کہ وہ مال و منال سے محروم ہیں بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ۔

میری زندگی کا انداز قلندرانہ ہے نہ کہ رئیسانہ

علامہ اقبالؒ نے بالِ جبریل میں فرمایا ہے کہ انہوں نے رموزِ قلندری لوگوں پر ظاہر کئے ہیں تاکہ فکرِ مدرسہ اور خانقاہ (غلط رسوم سے) آزاد ہو جائیں۔ ہندوؤں میں برہمن اپنے آپ کو اونچی ذات کے مالک سمجھتے تھے اور دوسری ذاتوں کو کمینہ اور نیچ سمجھتے تھے جس پر رشیوں نے بھوک ہڑتالیں کیں۔ ان ہڑتالوں سے برہمنوں پر

ذرہ برابر بھی اثر نہیں ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ دنیا تو طاقت کی زبان کو مانتی ہے، جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ اگر رشیوں کے پاس طاقت ہوتی تو برہمن اپنا ہتھیار پھینک دیتے۔ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے پیغمبری دی اور اس کے ساتھ عصا کی قوت بھی دی۔ اسی وجہ سے انہوں نے فرعون پر غلبہ پایا۔ یہ تمام باتیں رموزِ قلندری کو واضح کرتی ہیں۔ علامہ اقبالؒ کا رتبہ بلاشبہ قلندر سے کم نہ تھا اور آپؒ نے رموزِ قلندری مسلمانوں کو سکھائے۔

نہ فلسفی سے نہ ملّا سے ہے غرض مجھ کو　یہ دل کی موت! وہ اندیشہ و نظر کا فساد!
فقیہِ شہر کی تحقیر! کیا مجال مری　مگر یہ بات کہ میں ڈھونڈتا ہوں دل کی کشاد!
کیے ہیں فاش رموزِ قلندری میں نے　کہ فکرِ مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد!
رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم　عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد!
(ب۔ج:۳۶۲)

علامہ اقبالؒ نے مکان اور لا مکاں کا فلسفہ لوگوں کو سمجھایا اور بتایا ہے کہ خاکی انسانؑ سے لامکاں دور نہیں۔ علم قلندری کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کی حیات اگرچہ کمان سے باہر نکل چکی ہے لیکن پھر بھی اس کا تعلق کمان سے رہتا ہے بلکہ مسلمان تو کمان سے نکلے ہوئے تیر کو واپس بھی لا سکتا ہے (بشرطیکہ روحانی تصرف جو مسلمان کو عطا ہوتا ہے اس میں موجود ہو) انسان کا مقام تو مہ و پروین سے بھی آگے ہے اور اگر مومن قدم بڑھائے تو یہ مقام آسمان سے دور نہیں۔

تو اے اسیرِ مکاں! لامکاں سے دور نہیں　وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دور نہیں
یہ ہے خلاصۂ علمِ قلندری، کہ حیات　خدنگِ جستہ ہے لیکن کماں سے دور نہیں
فضا تری مہ و پرویں سے ہے ذرا آگے　قدم اٹھا یہ مقام آسماں سے دور نہیں　(ب۔ج:۳۴۲)

انسان کی زندگی میں دم اس کی زندگی کے ڈر کی وجہ سے ہے اور زندگی کا غم انسان کے لئے زہر قاتل ہے۔ انسان کو زندگی کے خوف کا غم نہیں ہونا چاہیے لہٰذا غم کا خوف بھی نہ کرو۔ آپ نے فرمایا کہ غم کا زہر بھی نہ پیو۔ یہی شانِ قلندری ہے۔ اگر انسان میں جذبہ اور ہمت ہے تو بھوک اور ننگ کا فکر نہ کرے کیونکہ حضرت علیؓ جیسے شخص کی غذا جَو کی روٹی تھی اور آپ کی طاقت یہ تھی کہ آپؓ نے درّہ خیبر اکھاڑ پھینکا۔ یہ تمام اصول کی باتیں رموزِ قلندری کے طور پر مسلمانوں کے لئے بیان کی جا رہی ہیں۔

دمِ زندگی، رمِ زندگی، غمِ زندگی، سمِ زندگی　غمِ رم نہ کر، سمِ غم نہ کھا کہ یہی ہے شانِ قلندری!
تیری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر　کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری!
(ب۔د:۲۵۲)

علامہ اقبالؒ کے سینے میں نہ جانے کتنے ہی اسرار پوشیدہ تھے جو انہوں نے قوم کے فائدے کے لئے

ایک ایک کر کے بیان کر دیئے اور کچھ رموز ایسے بھی ہوں گے جو آپ بیان نہ کر سکے۔ ان اسرار کو جو آپ نے قرآن وحدیث اور بزرگوں کی وساطت سے سنے تھے فاش کرنے کی کوشش کی اور اس بات کا آپ درج ذیل اشعار میں اعتراف کرتے ہیں۔

تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر (ب۔ج:۳۴۴)

مرقد کا شبستان بھی اسے راس نہ آیا آرام قلندر کو تہِ خاک نہیں ہے (ض۔ک:۵۰۲)

قلندر کون ہوتا ہے؟

رسالۂ غوثیہ میں مذکور ہے کہ سریانی زبان میں اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام قلندر بھی ہے۔ بعض کا مقولہ ہے کہ قلندر اور صوفی ہم معنیٰ الفاظ ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ قلندر وہ ہے جو حالات ومقامات اور کرامات سے تجاوز کر جائے یعنی اس سے آگے گزر جائے۔ خواجہ عبیداللہؒ احرار فرماتے ہیں کہ مانعات (روکنے والی چیزوں) سے مجرد ہو کر اپنے آپ کو گم کر دینے کا نام قلندری ہے۔ (سرِّ دلبراں)

بندہ نواز گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

زمین و آسمان ہر دو شریف اند قلندر را دریں ہر دو مکان نیست

(زمین وآسمان دونوں ہی شریف ہیں، مگر قلندر ان دونوں جگہوں میں سے نہیں ہے)

نظر در دیدہا ناقص فتادہ وگرنہ یارِ من ازکس نہاں نیست

(نظر آنکھوں میں ناقص جگہ پر جاتی ہے، ورنہ ہمارا یار کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔)

شیخ الاسلام احمد النامقی الجامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

قلندر پرتوِ نورِ الٰہی ست قلندر مطلعِ انوارِ شاہی ست

(قلندر اللہ تعالیٰ کے نور کا عکس ہے، قلندر انوارِ شاہی کا مطلع ہے۔)

قلندر را مقامِ کبریائی ست قلندر دُرِ بحرِ آشنائی ست

(قلندر کا مقام کبریائی ہے، قلندر آشنائی کے سمندر کا موتی ہے۔)

قلندر موجِ بحرِ لایزال ست قلندر نورِ شمعِ ذوالجلال ست

(قلندر خدائے لم یزل کے دریا کی موج ہے، قلندر ذوالجلال کی شمع کا نور ہے۔)

قلندر ذرۂ صحرائے عشق ست قلندر قطرۂ دریائے عشق ست

(قلندر صحرائے عشق کا ایک ذرہ ہے، قلندر دریائے عشق کا ایک قطرہ ہے۔)

محمد قلندر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

ما زدریائم و دریا هم زماست　　ایں سخن داند کسے کو آشنا ست

(ہم دریائے (وحدت) سے ہیں اور دریا ہم سے ہے، یہ بات وہی سمجھ سکتا ہے جو کہ آشنا ہو۔)

حضرت شرف الدین بوعلی قلندر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

گر بو علی نوائے قلندر نواختے　　صوفی بُدے ہر آنکہ بعالم قلندر است

(اگر بوعلی قلندرؒ اپنی آواز سے نواز دیتے، تو دنیا میں جو بھی قلندر ہوتا صوفی بن جاتا۔)

میر سید محمد مکی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت نصیر الدین چراغ رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ اعظم تھے، فرماتے ہیں۔

اندر رہِ عشقِ سرسری نتواں رفت　　بے دیدہ رہِ قلندری نتواں رفت

(عشق کی راہ میں سرسری طور سے گزر نہیں ہوسکتا، بغیر آنکھ کے قلندری کی راہ طے نہیں ہوسکتی۔)

خواہی کہ پس از کفر بیابی ایماں　　تا جاں ندہی بکافری نتواں رفت

(اگر کفر کے بعد ایمان لانا چاہو، تو جب تک جان نہ دے دو کافری سے نکل نہیں سکتے۔)

خواجہ مسعود بک رحمۃ اللہ علیہ مرید خلیفہ شیخ رکن الدین ابن شہاب الدین امام حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

مجرّد شد از دین و دنیا قلندر　　کہ راہِ حقیقت ازیں ہر دو برتر

(قلندر کو دین و دنیا سے مجرّد ہونا چاہیے، کیونکہ حقیقی راہ ان دونوں سے برتر ہے۔)

سلطان جلال الدین قریشی رحمۃ اللہ علیہ جن کا مشرب قلندر یہ تھا فرماتے ہیں۔

من مستِ مئے عشقم ہشیار نہ خواہم شد　　از رندی و قلاشی بیزار نخواہم شد

(میں شراب عشق میں مست ہوں ہشیار نہیں ہونا چاہتا، میں رندی اور قلاشی سے بیزار نہیں ہونا چاہتا۔)

شاہ گلشن نقشبندی مجددی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

وقت آں شیریں قلندر خوش کہ در اطوارِ سیر　　ذکر و تسبیح و ملک درحلقۂ زنار داشت

(جب قلندر اپنے سیر کے دوران خوش ہوتا ہے، اس وقت وہ ذکر و تسبیح اور فرشتوں کو حلقہ زنار میں رکھ دیتا ہے)

شاہ حسین بلخی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

قلندر کے بیابد در عبارت　　قلندر کے بگنجد در اشارت

(قلندر بیان میں کیسے آسکتا ہے، قلندر اشاروں کنایوں میں کیسے آسکتا ہے۔)

ایک اور صاحب کا قول ہے　ع　قلندر آنکہ فوق الوصل جوید

(قلندر وہ ہے جو وصل سے اوپر کچھ اور چاہتا ہے۔)

قلندری کی غایت کیا ہے؟

سرِّ دلبراں میں ہے کہ صوفی کا مرتبہ فقیر سے بالاتر ہے۔ فقیر اپنے آپ کو دنیا میں کسی چیز کا مالک قرار نہیں دیتا اور اسکے فقر اختیار کرنے کی تین وجوہات ہیں۔(ا) حلال مال کا حساب دینا ہوگا اور حرام پر گرفت ہوگی۔ (ب) فقراء، امراء سے پانچ سو سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ (ج) اور یہ کہ وہ جمیعت خاطر کے طالب ہوتے ہیں اور عبادت میں ان کو حضورِ دل حاصل ہوتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو یہ سب باتیں فقیر کی ذاتی اغراض سے متعلق ہیں مگر صوفی کا معاملہ اللہ کی رضا اور مخلوق خدا کی خدمت ہوتا ہے۔

قلندر وہ ہستی ہے جس کی اپنی کوئی غرض وغایت نہیں اور جب وہ تصوف کے انتہائی درجے پر پہنچ جائے تو قلندر کہلاتا ہے۔ قلندر کے اوصاف اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شعر قلندر کے مفہوم کو واضح کر دیتا ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قلندر وہ ہے جس کی ملکیت میں صرف لا الٰہ کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اس بات کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ قلندر کی ذاتی غرض وغایت کچھ بھی نہیں ہوتی وہ الا اللہ کے سوا کچھ نہیں جانتا یعنی اس کا جینا مرنا اُٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا غرضیکہ ہر فعل اللہ کے لئے ہوتا ہے۔ اس سے بلند مقام ایک امتی کے لئے اور کیا ہوسکتا ہے جبکہ وہ نبوت کی وراثت بھی رکھتا ہو یعنی اصلاحِ خلق اور نجاتِ خلق کی وراثت۔

آپ نے فرمایا ہے۔

قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا!

(ب۔ج: ۳۲۴)

(قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا یہ تو فقیہہِ شہر ہے اور لغتِ حجازی کا قارون (یعنی خزانہ) ہے۔)

رموزِ قلندرانہ کی وضاحت

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے کلام میں بار بار یہ کہا ہے کہ انہوں نے رموز قلندرانہ کھول کر بیان کر دیئے ہیں اور وہ مسلمانوں سے یہ اُمید رکھتے ہیں کہ وہ انکے بیان کردہ رموز کو سمجھیں اور اُس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں۔ حق بات تو یہ ہے کہ آپؒ کا پورا کلام ہی رموزِ قلندرانہ پر روشنی ڈالتا ہے۔ رموز قلندری میں صرف ایک دو باتوں یا کاموں کا ذکر نہیں کیا جاسکتا۔ آپ کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو زمانے کے حالات اور ماحول کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا چاہیے کیونکہ یہ وقت کی ضرورت ہے۔ ہر شعبۂ حیات میں محنت وجانفشانی اور پوری تندہی سے کام کرنا اور دوسری قوموں کی للکار کا جواب دینا اس کا منصب ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان کسی علمی، فنی یا تکنیکی میدان میں دوسرے ملکوں سے کسی صورت پیچھے نہ رہیں۔ ان کو کفار اور دیگر مذاہب کے عزائم بد کے جواب دینے کے لئے ہر وقت مستعد رہنا چاہیے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انہیں سستی

غفلت نا اہلی اور نالائقی کے رویے کو خیرباد کہہ کر چست و چالاک اور ہوشیار ہونے کی ضرورت ہے۔

ضروریاتِ قلندر اقبالؒ کی نگاہ میں

قلندری کی راہ میں یوں تو علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا پورا کلام ہی چراغ راہ کا کام دیتا ہے لیکن خاص طور پر قلندری رموز کی وضاحت آپ کے درج ذیل اشعار میں ملتی ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ حکومتوں میں اونچ نیچ آتی رہتی ہے اور حالات کی ہما ہمی اکثر دیکھنے کو آتی ہے۔ قلندر کا یہ کام ہے کہ وہ دیکھے کہ اس ملک کے حکمران منافقت سے کام تو نہیں لیتے بلکہ وہ دل کی آواز پر ملک کے عمل کی بنیاد رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہر مسلمان مردِ حق کی طرح قائم رہ کر صبر و استقامت کا ثبوت دے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح سب لوگ نمرود کی خدائی سے ٹکرا جائیں تو کامیابی ان کے قدم چومے گی۔

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق — یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق (ب۔ج:۳۲۶)

نہ تخت و تاج میں، نے لشکر و سپاہ میں ہے — جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے!

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل — یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لاالہ میں ہے (ب۔ج:۳۶۰)

قلندر کی پہچان کے متعلق علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ ضربِ کلیم میں فرماتے ہیں۔

کہتا ہے زمانے سے یہ درویش جوانمرد — جاتا ہے جدھر بندۂ حق تو بھی اُدھر جا!

ہنگامے ہیں میرے تری طاقت سے زیادہ — بچتا ہوا بنگاہِ قلندر سے گزر جا!

میں کشتی و ملاح کا محتاج نہ ہوں گا — چڑھتا ہُوا دریا ہے اگر تُو تو اُتر جا!

توڑا نہیں جادو مری تکبیر نے تیرا؟ — ہے تجھ میں مکر جانے کی جرأت تو مکر جا!

مہر و مہ انجم کا محاسب ہے قلندر! — ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر!

(ض۔ک:۵۰۳)

مشکلات کا حل اور قلندر

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ۔ "فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں" (ب۔د:۱۹۰)

اس لحاظ سے قلندر یہ دیکھتا ہے کہ حالات زمانہ کو اپنی گرفت میں لانے کے لئے مسلمانوں میں باہمی اتفاق، محبت، یگانگت اور آزادیٔ سلطنت کے ساتھ ہمکنار ہونا لازمی ہے۔ اس کے لئے ہمتِ مردانہ کی ضرورت ہے جس کے لئے سنجر و طغرل کا جہانگیری آئین کام دے سکتا ہے یا کسی مرد قلندر کا شہنشاہوں کو ٹھکرانے کا انداز۔

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہرِ یکدانہ — یک رنگی و آزادی اے ہمتِ مردانہ

یا سنجر و طغرل کا آئینِ جہانگیری — یا مرد قلندر کا اندازِ ملوکانہ (ب۔ج:۳۵۹)

مسلمان کی مشکلات میں سے سب سے اہم مشکل یہ ہے کہ جب اس نے لا الٰہ کا کلمہ پڑھ لیا تو اس پر تمام اسلامی تقاضوں کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے جیسا کہ علامہ اقبالؒ نے فرمایا۔

چوں می گویم مسلمانم بلرزم کہ دانم مشکلات لا الٰہ را (ا۔ح:۹۴۱)

(میں جب کہتا ہوں کہ مسلمان ہوں تو میں کانپ جاتا ہوں کیونکہ میں لا الٰہ کی مشکلات کو جانتا ہوں۔)

جو شخص خود کو مسلمان سمجھتا ہے تو لا اِلٰہ کہنے کے بعد تمام اسلامی قوانین پر عمل پیرا ہونا اس کے لئے لازم ہو جاتا ہے۔ جھوٹ، چوری، چور بازاری، دھوکا، فریب، شراب، جوا اور تمام محرمات اسلام سے اس کا باز رہنا ایسے ہی لازم ہو جاتا ہے جیسا کہ ایک شخص نکاح کے دوران ایجاب وقبول کے وعدے کے بعد عورت کی ہر جائز ضرورت کو پورا کرنے کا پابند ہو جاتا ہے۔

قلندر اپنے ملک کے لوگوں کے لئے آزادی کی قدر و قیمت بیان کرتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے آزادی اور غلامی پر بہت کلام کیا ہے جس کو ہم مضمون کی مناسبت سے زیرِ نظر تصنیف میں اپنی جگہ پر بیان کر چکے ہیں۔ قلندر اپنی ناکارہ قوم کو تربیت دیتا ہے اور جانتا ہے کہ اس خاک میں ایسی چنگاریاں ہیں جس سے طلب اور جستجو کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کسی قیمت پر بھی بک نہیں سکتے۔ ان کا وجود، مال و دولت کے بتوں کے طواف سے آزاد ہے۔

وہی ہے بندۂ حُر جس کی ضرب ہے کاری
نہ وہ کہ حرب ہے جس کی تمام عیّاری
ازل سے فطرتِ احرار میں ہیں دوش بدوش
قلندری و قبا پوشی و کلہ داری
زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے
انہیں کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری
وجود انہیں کا طوافِ بتاں سے ہے آزاد
یہ تیرے مومن و کافر تمام زنّاری
(ض۔ک:۵۰۵)

لا وَ اِلَّا سے کیا مراد ہے؟

عربی میں لا حرف نفی ہے اور اِلَّا حرف استثنیٰ ہے یعنی لا اِلٰہ سے مراد نفی غیر اللہ اور اِلَّا اللہ سے مراد اللہ کی وحدانیت اور ذات وصفات کا اثبات کرنا ہے چنانچہ اسلام میں کلمہ توحید کی مکمل صورت ہے لا اِلٰہ اِلَّا اللہ جس کا سادہ اور واضح ترجمہ یہ ہے کہ (کائنات میں) کوئی بھی معبود برحق نہیں، مگر اللہ تعالیٰ!

اس تمہید کے بعد یہ حقیقت نہایت واضح اور غیر مبہم طور پر منشرح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں لا و اِلا لازم وملزوم ہیں۔ اس لئے ایک مسلمان کے ایمان کی تکمیل اسی نفی واثبات پر منحصر ہے اور انہیں کے اتحاد و اجتماع سے اس کا عشق باللہ اور عقیدہ توحید بدرجۂ کمال پختہ ہوتا ہے۔ اسی کو قلندر لاہوریؒ نے یوں فرمایا۔

در مقامِ لا نیاساید حیات سوئے اِلّا می خرامد کائنات!

(زندگی کا مزاج تو یہ ہے کہ وہ نفی تک ہرگز محدود نہیں رہتی بلکہ کائنات فطرتاً اثبات کی جانب مائل پرواز ہے)

در محبت پختہ کے گرد خلیل تانگردد لا سوئے اِلّا دلیل!(پ۔ چ:۸۱۵)

(خلیل اللہ عشق الٰہی میں پختہ کیونکر ہو سکتے تھے جب تک لا سے بالآخر اِلّا کی جانب دلیل راہ نہ بنتا۔)

لہٰذا نفی بے اثبات یعنی ایسی نفی جس کے بعد اثبات نہ ہو محض کفر و الحاد ہے اور ایمان و یقین کا اس میں کوئی شائبہ تک نہیں چنانچہ علم و مطالعہ، تحقیق و تدقیق اور اپنے ترقی یافتہ تہذیب و تمدن کے باوجود اقوام یورپ کی تہذیب حاضر میں لادینی، زندقہ اور دہریت کا دور دورہ ہے۔ سائنس کی شبانہ روز ریسرچ گوناگوں جدید ایجادات اور علوم و فنون کی نئی روشنی نے انسان کو ایک ایسی روحانی و اخلاقی بلندی تک پہنچا دیا ہے کہ وہ نفی (انکارِ وجود باری تعالیٰ) کے لئے تو نہایت دلیر و بے باک ہے لیکن اثبات کی جانب اسکا ایک قدم بھی نہیں اٹھتا۔ جدھر دیکھیئے تہذیب حاضر کے ہر معاشرے اور ہر حلقے میں لا (نفی) ہی کا دور دورہ ہے۔ لیکن اثباتِ وجود باری تعالیٰ یا شعورِ توحید کے لئے کسی میں بھی ذوق و شوق یا جذبہ طلب نہیں۔ بقول علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ۔

لبالب شیشۂ تہذیب حاضر ہے مے لا سے مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ اِلّا!

(ب۔ ج:۳۱۶)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے حرف لا کو انکارِ وجود باری تعالیٰ کے مفہوم میں بھی استعمال کیا ہے۔ جب وہ کسی مادہ پرست اور دہریہ فرد یا قوم پر تنقید کرتے ہیں، تو وہاں لا سے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا انکار مراد ہوتا ہے، مثلاً روس یا کسی بھی دوسرے کیمونسٹ ملک کے لادین نظام پر بالفاظ ذیل اظہارِ خیال فرماتے ہیں ۔

ہم چناں بینی کہ در دورِ فرنگ بندگی با خواجگی آمد بجنگ(پ۔ چ:۸۱۴)

(اسی طرح تو دیکھتا ہے کہ انگریز کے دورِ حکومت میں مزدور اور سرمایہ دار کے درمیان ایک جنگ چھڑ گئی ہے۔)

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ لا سلاطیں لا کلیسا، لا الٰہ!

(میں نے اس کے نظامِ حکومت کا خوب مطالعہ کیا ہے وہ شاہی کا بھی منکر ہے، مذہب کا بھی اور خدا کا بھی)

فکرِ او در تندِ بادِ لا بماند مرکبِ خودرا سوئے اِلّا نراند!

(اسکی سوچ و بچار نفی کی آندھی میں گم ہو کر رہ گئی اور وہ اپنے گھوڑے کو اثبات کی جانب مہمیز نہ کر سکا۔)

لا و اِلّا ساز و برگِ اُمتاں نفی بے اثبات مرگِ اُمتاں

(لا اور الا دونوں ہی امتوں کا سامانِ حیات ہے اور نفی (لا) بے اثبات یا بغیر الا یقیناً امتوں کی موت ہے۔)

ہر کہ اندر دستِ اُو شمشیرِ لا ست جملہ موجودات را فرمانروا ست (پ۔ چ:۸۱۵)

(جو شخص بھی اپنے ہاتھ میں لا کی تلوار رکھتا ہے [illegible])

اسی طرح تصنیفاتِ اقبال میں بعض ایسے افراد کا بھی ذکر ہے جو محض لا (نفی) تک محدود رہ گئے اور اِلاّ (اثبات) تک ان کی رسائی نہ ہو سکی مثلاً جرمنی کا مشہور و معروف فلسفی فریڈ نطشے فوق الانسان کے جنون میں خدا کی ہستی کا قطعی منکر ہو گیا تھا۔ وہ فوق الانسان (Beyond Man) ہی کو خدائی صفات و اختیارات کا حامل سمجھتا تھا۔ بعض اخلاقی نتائج میں اس کے افکار مسیحی مذہب کے خلاف اور اسلام کے بہت قریب تھے۔ علامہ اقبالؒ کے نزدیک اس کا دماغ کافر تھا کیونکہ وہ خدا کا منکر تھا لیکن اس کا قلب مومن تھا کیونکہ اس کے خیالات اسلام کے بہت قریب تھے۔

زندگی شرحِ اشاراتِ خودی است لا و اِلاّ از مقاماتِ خودی است!

(زندگی دراصل اشاراتِ خودی کی شرح ہے اور اس شرح میں لا اور اِلاّ مقاماتِ خودی ہیں۔)

او بہ لا در ماند و تا اِلاّ نرفت از مقامِ عبدہٗ بیگانہ رفت!

(وہ نطشے محض لا کی پستی میں رہا اور اِلاّ تک اسکی رسائی نہ ہوئی لہٰذا وہ عبدہ کے اسرار و رموز سے نا آشنا رہا)

چشمِ او جز رویتِ آدم نخواست نعرہ بے باکانہ زد، آدم کجاست!

(اسکی آنکھ صرف فوق الانسان کی متلاشی ہے لہٰذا بے باکی سے یہ نعرہ لگایا کہ میرا مطلوب انسان کہاں ہے۔)

کاش بودے در زمانِ احمدے تا رسیدے بر سرورِ سرمدے (ج۔ن: ۷۴۱)

(کاش وہ حضرت شیخ احمدؒ سرہندی کے زمانے میں ہوتا تا کہ ازل کے عشق و سرور و سرمدی سے بہرہ ور ہوتا۔)

تمام گزارشات و واقعات کا مقصدِ اولیں یہ ہے کہ خیر الامم کی تمام دنیوی اور اخروی سعادتوں کا انحصار نکتۂ لا و اِلاّ کو صحیح طور پر خلوص کے ساتھ عمل پیرا ہونے پر ہے۔ یہی وہ بے پناہ اور نا قابلِ شکست قوت ہے جس کے متعلق فرمایا۔

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے!

(ب۔د: ۱۹۴)

جاننا چاہیے کہ لا اور اِلاّ کائنات کا بہترین محاسبہ ہے لا اور اِلاّ کے اعجاز سے کائنات کا دروازہ کھلتا ہے اور جب تک رمز لا الٰہ ہمارے ہاتھ نہ آجائے تو اس وقت تک غیر اللہ کے بند کو ہرگز نہیں توڑا جا سکتا۔ بقول اقبالؒ۔

لا و اِلاّ احتسابِ کائنات لا و اِلاّ فتحِ بابِ کائنات

(لا اور اِلاّ کائنات کا بہترین محاسبہ ہے لا و اِلاّ کے اعجاز سے کائنات کا دروازہ کھلتا ہے۔)

تا نہ رمزِ لا الٰہ آید بدست بند غیر اللہ را نتواں شکست (پ۔چ: ۸۱۳)

(جب تک رمز لا الٰہ ہمارے ہاتھ نہ آجائے غیر تو اللہ کے بند کو ہرگز نہیں توڑا جا سکتا۔)

اس کے علاوہ لا اور اِلاّ کے بارے میں مفکرِ اسلام اور مصورِ پاکستان فرماتے ہیں۔

نہادِ زندگی میں ابتدا ''لا'' انتہا ''اِلاَّ''　پیامِ موت ہے جب ''لا'' ہوا ''اِلاَّ'' سے بیگانہ

وہ ملت روح جس کی ''لا'' سے آگے بڑھ نہیں سکتی　یقیں جانو ہوا لب ریز اس ملت کا پیمانہ

(ض۔ک:۵۲۵)

یہی وہ اسلامی عقیدہ ہے جس سے مومن صادق کی تخلیق وتشکیل ہوتی ہے!

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقوام عالم میں بالعموم اور مسلمانوں کی نئی نسل میں بالخصوص دہریت اور انکار وجود باری تعالیٰ کا دور دورہ کیونکر ہے؟

اس سوال کا مبنی بر حقیقت اور واقعاتی جواب تو یہ ہے کہ دنیوی علوم وفنون اور سائنس میں عقل وخرد کو ذریعہ تحقیق وتنقید قرار دینے کے علاوہ مذہبیات اور ایمانیات میں بھی اسی کو معیارِ صحیح وغلط قرار دے دیا گیا ہے۔ خالصتاً مادی ودنیوی علوم وفنون اور سائنس میں عقل وخرد کا عمل دخل بالکل درست وبجا ہے لیکن فہم وشعور کے تمام گمراہ کن اور ذہن کو پراگندہ ومضطرب کر دینے والے محرکات اس وقت جنم لیتے ہیں جب ایمانیات کو بھی عقل وخرد کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ جس کا لازمی نتیجہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات، حیات بعد الموت، حساب ومیزان، جنت ودوزخ اور جزا وسزا سے انکار ہے۔ اسی بناء پر علامہ اقبالؒ نے فرمایا۔

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں　عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ (ب۔د:۲۸۲)

لہٰذا بالخصوص مسلمان دہریت اور انکارِ ذات وصفات کا شکار نہ ہوں بلکہ لا سے محترز رہتے ہوئے الا (اثبات وایمانیات) کا مسلک اختیار کریں کیونکہ جب بدقسمتی سے مسلمانوں ہی کے عقائد ایمانیات کے بارے میں متزلزل ہوئے یا وہ مائل بالحاد ودہریت ہوئے تو پھر کافر ومشرک اقوام کی رہنمائی کون کرے گا؟

قلندر ضربِ قلندری سے سدِ سکندری کو توڑ دیتا ہے۔

دبدبۂ قلندری ایسے ہی ہے جیسے فرعون کے سامنے جذبۂ کلیم کا اظہار ہوتا رہا۔ اس زمانے میں شہنشاہوں کی شان وشوکت سامری کے جادو کی طرح ہے جو قلندر کے سامنے جلد فنا ہو جانے والی چیز ہے۔ قلندر کی ایک ضربِ قلندری سے سکندری دیواروں میں شگاف پڑ جاتے ہیں۔ بادشاہوں کا طریقہ فوج کشی اور کشت وخون بہانا ہے لیکن قلندر کی سپاہ اگرچہ تہ بھی ہو تو اس کی نگاہ قلوب کو فتح کر لیتی ہے۔ شہنشاہوں کا انقلاب کشت وخون سے ہوتا ہے مگر قلندر صلح وآشتی سے اپنا کام کرتا ہے۔ شہنشاہیت اور قلندریت دونوں اپنا وار کرتے ہیں اور دائمی انقلاب لانا چاہتے ہیں۔ ملوکیت قاہری کے ذریعے قبضہ جما لیتی ہے مگر قلندری دلوں کے راستے دلبری سے کام لیتی ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو رسم کلیم کو تازہ کرنا چاہیے اور سکندری دیواروں کو توڑ دینا چاہیے چنانچہ سامری رسوم جہاں بھی نظر آئیں انہیں نیست ونابود کر دینا چاہیے۔ درج ذیل اشعار سے معلوم ہوتا ہے

کہ علامہ اقبالؒ لوگوں کو ضربِ قلندری سے سدِ سکندری توڑنے کا سبق دیتے ہیں۔

دبدبۂ قلندری طنطنۂ سکندری آں ہمہ جذبۂ کلیم، ایں ہمہ سحرِ سامری!

(دبدبۂ قلندری سارے کا سارا جذبۂ کلیم ہے طنطنۂ بادشاہی محض سحر سامری ہے۔)

آں بہ نگاہ می کشد ایں بہ سپاہ می کشد آں ہمہ صلح و آشتی ایں ہمہ جنگ و داوری!

(قلندر نگاہ سے قلب فتح کرتا ہے بادشاہ فوج سے کشت وخون کرتا ہے۔ قلندری صلح و آشتی سے عبارت ہے بادشاہت کشت وخون پر مبنی ہے۔)

ہر دو جہاں کشا ستند ہر دو دوام خواستند ایں بہ دلیل قاہری آں بہ دلیلِ دلبری!

(دونوں فتوحات کرتے ہیں دونوں دوام چاہتے ہیں یہ قاہری کے ذریعہ وہ دلبری کے ذریعہ)

ضربِ قلندری بیا سدِ سکندری شکن رسمِ کلیم تازہ کن رونقِ ساحری شکن

(ضربِ قلندری پیدا کر (اور اس سے) سدِ سکندری توڑ ڈال، حضرت موسیٰؑ کی روایت تازہ کر سامری کی رونق ختم کردے۔) (ج۔ن:٦١٦)

قلندر کے عمل کا طریقہ

ملوکیت کے متعلق جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے اس کے علاوہ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو اور جو کچھ اس میں ہے مومنوں کے لئے مسخر کردیا ہے لیکن تسخیر کائنات کے لیے اللہ تعالیٰ نے قوانین واضح کیے ہیں۔ قلندر دنیا کی تسخیر کے لئے کوشاں رہتے ہیں اگرچہ بظاہر وہ خرقہ پہنتے ہیں مگر بادشاہوں سے خراج وصول کرتے ہیں۔ قلندر جب جلوت میں ہوں تو مہر و مہ پر کمند ڈالتے ہیں اور جس وقت وہ خلوت میں ہوتے ہیں تو زمان ومکان ان کی آغوش میں ہوتے ہیں۔ اپنے احباب میں وہ ریشم کی طرح نرم ہوتے ہیں اور جہاد کے وقت جوشِ جہاد میں سرمست رہتے ہیں۔ وہ پرانے نظام کو بدل کر نیا اور بہتر نظام لاتے ہیں کیونکہ زمانہ ہر لحہ ترقی پذیر ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ وہ ایسے رموز فاش کردیتے ہیں جو کہنے سننے میں نہیں آتے مگر اس عنوان پر فقیہانِ شہر اس انداز میں لوگوں کی تربیت نہیں کرتے۔

قلندراں کہ بہ تسخیرِ آب و گل کوشند زشاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند

(قلندر جو دنیا کی تسخیر میں کوشاں رہتے ہیں بظاہر وہ خرقہ پہنتے ہیں لیکن بادشاہوں سے خراج وصول کرتے ہیں)

بجلوت اند و کمندے بہ مہرو ماہ پیچند بخلوت اندو زمان و مکاں در آغوشند

(جب جلوت میں ہوتے ہیں تو مہر و ماہ پر کمند پھینکتے ہیں اور جب خلوت میں ہوتے ہیں تو زمان ومکاں ان کی آغوش میں ہوتے ہیں۔)

بروزِ بزم سراپا چو پرنیاں و حریر بروز رزم خود آگاہ و تن فراموشند

(دوستوں میں ریشم وکخواب کی طرح نرم ہوتے ہیں مگر جنگ کے دوران بدن سے بے پروااور جوشِ جہاد میں مست ہوتے ہیں۔)

نظامِ تازہ بچرخِ دورنگ می بخشند ستارہ ہائے کہن را جنازہ بر دوشند!

(وہ بوڑھے آسمان کو نیا نظام عطا کرتے ہیں اور اس کے پرانے ستاروں کا جنازہ نکال دیتے ہیں۔)

زمانہ از رخِ فردا کشود بندِ نقاب معاشراں ہمہ سر مست بادۂ دوشند!

(زمانہ مستقبل کے چہرے سے نقاب الٹ چکا ہے مگر لوگ ابھی تک ماضی کی شراب سے مست ہیں۔)

بلب رسید مرا آں سخن کہ نتواں گفت بحیرتم کہ فقیہانِ شہر خاموشند!(ز۔ع:۵۱۳)

(میرے لب پر وہ بات آئی ہے جو کہی نہیں جاسکتی تھی میں حیران ہوں کہ فقیہانِ شہر اس معاملے میں کیوں خاموش ہیں۔)

معلوم ہوا کہ قلندران مخفی رازوں کو افشا کرتا ہے جن کی بابت تمام دنیادار لیڈر یا شہر کے علماء خاموشی اختیار کرتے ہیں۔لوگوں کی اصلاح کا ایک یہی طریقہ ہے کہ ان باتوں کو بیان کیا جائے جو دل پر اثر انداز ہوں اور تدبیر میں کامل حیثیت رکھتی ہوں۔علامہ اقبالؒ خود بھی اپنے رموز کے افشا کرنے کے بارے میں یوں لکھتے ہیں۔

زبرونِ درگزشتم زدرونِ خانہ گفتم! سخنے نگفتہ را چہ قلندرانہ گفتم!(ز۔ع:۳۹۵)

(میں نے بیرونی دروازہ چھوڑ کر گھر کے اندر کی بات کی ہے جو کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا اسے قلندرانہ انداز سے کہہ دیا ہے۔)

اگر مُلا کے دل کو گداز کریں تو امت کے کام کو درست کرسکیں گے

علامہ اقبالؒ نے "ارمغانِ حجاز" میں یارانِ طریق" کی رباعی میں اہل عمل کو دعوت دی ہے کہ ہم ملت کے کاموں کو اس طرح درست کریں کہ شہر کے ملا کا دل بھی گداز ہو جائے۔خواہ اس کے لئے مردانہ وار بازی کیوں نہ لگانا پڑے۔اس طرح جانفشانی سے ہی امت کے کاموں کی آبیاری ہوتی ہے۔

بیا تا کار ایں امت بسازیم قمار زندگی مردانہ بازیم

(آؤ ہم اس امت کے معاملات کو درست کریں اور زندگی کا کھیل مردانہ وار کھیلیں)

چناں نالیم اندر مسجد شہر کہ دل در سینۂ مُلا گدازیم(ا۔ح:[illegible])

(شہر کی مسجد میں اس طرح نالہ وفریاد کریں کہ ملا کے سینے میں جو (پتھر جیسا سخت) دل ہے وہ بھی ہم [illegible]

قلندر کی کرامت جہان بینی ہے

کشف المحجوب میں لکھا ہے کہ اوتاد ہر شب کو دنیا کے ارد گرد سیر کرتے ہیں اور اگر کوئی جگہ ایسی ہو جہاں کوئی خلل واقع ہو جائے تو قطبِ مدار اس خلل یا نقصان کو زائل فرماتے ہیں۔ اسی طرح قلندر بھی جہاں بینی کرتا ہے اور اپنی نگاہ سے لوگوں کے روحانی اور دنیاوی مشکلات دور کر دیتا ہے۔ قلندر آسمانوں کا نر باز ہے۔ اس کی پرواز کے سامنے مشکل مراحل آسان ہو جاتے ہیں۔ اس کی شکارگاہ نیلگوں آسمان ہے وہ چڑیوں کا شکار نہیں کرتا۔

قلندر کسی مشکل کا حل اپنے اصولوں کے مطابق کرتا ہے۔ وہ لمبی چوڑی تقریر نہیں کرتا بلکہ وہ یہ جانتا ہے کہ جس کھیت کو شبیری خون سے پانی نہیں ملا اس کھیت سے فصل حاصل نہیں ہو سکتی۔

قلندریم و کراماتِ ماجہاں بینی است　　زما نگاہ طلب کیمیا چہ می جوئی (ج۔ن:۶۷۷)

(ہم قلندر ہیں ہماری کرامت جہاں کو دیکھنا ہے، ہم سے نگاہ طلب کرو کیمیا کی جستجو کیا کرتے ہو!)

قلندر جرہ بازِ آسمانہا　　بہ بالِ او سبک گردد گرانہا

(قلندر آسمانوں کا نر باز ہے اس کی پرواز کے سامنے مشکل مراحل آسان ہو جاتے ہیں۔)

فضائے نیلگوں نخچیر گاہش　　نمیگردد بگردِ آشیانہا! (ا۔ح:۱۰۱۳)

(اس کی شکارگاہ یہ نیلگوں فضا ہے وہ چڑیوں کے آشیانوں کے گرد نہیں گھومتا۔)

قلندر میل تقریرے ندارد　　بجز ایں نکتہ اکسیرے ندارد

(قلندر تقریروں کا میلان نہیں رکھتا اس نکتہ کے سوا وہ اور کوئی اکسیر نہیں جانتا۔)

ازاں کشتِ خرابے حاصلے نیست　　کہ آب از خونِ شبیرؓ ے ندارد (ا۔ح:۱۰۲۸)

(اس ویران کھیت سے کچھ حاصل نہیں ہوتا جس کو خونِ شبیرؓ سے پانی نہ ملا ہو۔)

قلندر کا یہ نکتہ اکسیر ہے۔ اگر قوم میں جذبۂ شبیریؓ نہ ہو تو لمبی چوڑی تقریروں سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ وہ بہت سی مشکلات اپنی توجہ سے دور کر دیتا ہے۔

قلندر رازِ خودی کو فاش کر دیتا ہے

یہ مقام اس بات کے بیان کرنے کا متحمل نہیں ہیں کہ انسان کی زندگی پر خودی کس طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ علامہ اقبالؒ کی ایک اچھی خاصی تشریح ان کے فلسفۂ خودی اور بے خودی پر موجود ہے۔ کسی قوم میں جو اخلاقی گراوٹ یا کمزوریاں قلندر کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہتیں۔ وہ اپنے مخصوص طرزِ عمل سے ان کو دور کرنے کی تدابیر اختیار کرتا ہے۔ وہ اپنی قوم کے نوجوانوں کو یہ باور کراتا ہے کہ جو غیر خدا کے آگے جھک جاتا ہے تو وہ اپنا

ضمیر بھی ساتھ ہی بیچ دیتا ہے، لہٰذا اس سے کوئی کارآمد خدمت انجام نہیں پا سکتی۔ خودی کو مستحکم کرنے کے لئے وہ تمام راز اپنی قوم کے جوانوں پر کھول دیتا ہے اور وہ اس سے انکی خامیوں کا قرآن وحدیث کے ذریعے ازالہ کرتا ہے۔ وہ مرنے کے بعد قبر میں بھی قوم کی رہنمائی کرتا ہے اور دعائیں بھی کرتا ہے۔

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات — تو جھکا جب غیر کے آگے تو من تیرا نہ تن

(ب۔ج:۳۲۳)

تھا ضبط بہت مشکل اس سیل معانی کا — کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر

(ب۔ج:۳۴۴)

مرقد کا شبستاں بھی اسے راس نہ آیا — آرام قلندر کو تہِ خاک نہیں ہے

(ض۔ک:۵۰۲)

قلندر خون جگر دے کر جوانوں کی کمزوریوں کا علاج کرتا ہے وہ فلسفی نکتہ نظر کی بجائے نظروں سے توجہ دیتا ہے۔

افکار جوانوں کے خفی ہوں کہ جلی ہوں — پوشیدہ نہیں مردِ قلندر کی نظر سے

مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار — جو فلسفہ لکھا نہ گیا خون جگر سے

(ض۔ک:۵۰۴)

فردوس میں رومیؒ سے یہ کہتا تھا سنائی — مشرق میں ابھی تک ہے وہی کاسہ وہی آش!

حلاج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر — اک مرد قلندر نے کیا راز خودی فاش

(ض۔ک:۵۸۰)

قلندر اپنی قوم کے نوجوانوں کو یہ سبق دیتا ہے کہ بندگی اور گدائی میں جو فرق نظر آتا ہے اس کا علاج صرف یہ ہے کہ انسان بندۂ خدا بن کر زندگی گزارے اور اپنی گفتار کو دلبرانہ اور کردار کو قاہرانہ رکھے۔ مسلمان کو یہ حقیقت سمجھ لینی چاہیے کہ جب تک وہ دنیا میں ''لا الٰہ'' کی وراثت کا مالک ہے اور ان اصولوں پر قائم ہے تو تمام دنیا کی قومیں اس کے دبدبہ اور شانِ جلالی سے لرزہ براندام رہے مگر جب سے مسلمانوں کا جلال قلندرانہ ختم ہوا اس وقت سے آج تک وہ پوری دنیا میں ذلت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے۔

یہ بندگی خدائی، وہ بندگی گدائی — یا بندۂ خدا بن، یا بندۂ زمانہ!

اے لا الٰہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں — گفتار دلبرانہ کردار قاہرانہ

تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے! — کھویا گیا ہے تیرا جذب قلندرانہ

(ب۔ج:۳۴۶،۳۴۷)

قلندرانہ ادائیں سکندرانہ جلال

مسلمان جب تک احکاماتِ الٰہی پر پابند رہے تو وہ تمام دنیا پر چھائے رہے۔ زندہ قوموں کی تقدیر ہمیشہ عروج کی طرف سفر کرتی ہے۔ ان کی زندگی کمال صدق اور مروت کا نمونہ تھی۔ ایسی قوم کی خطاؤں سے اللہ تعالیٰ بھی صرف نظر فرماتا ہے۔ یہ وہ قوم تھی کہ ان کی ادائیں قلندرانہ تھیں اور جلال سکندرانہ تھا بلکہ ان کمالات کے باعث وہ دنیا بھر کے لئے ننگی تلواروں کی طرح اُن کے سروں پر لٹکتی تھی۔

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
کمالِ صدق و مروّت ہے زندگی ان کی
معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں
قلندرانہ ادائیں، سکندرانہ جلال
یہ امّتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں

(ا۔ح:۸۵/ ۶۸۴)

افسوس کی بات ہے کہ مسلمان مذکورہ بالا تدبیروں پر غور کرنے کے لئے اہل مغرب کی عیاشی کے اسیر ہو چکے ہیں اور اس زمانے کے قلندروں کی آنکھ مسلمانوں کی یہ حالت دیکھ کر خون کے آنسو روتی ہے۔ اہل مغرب کا یہ اصول ہے کہ مسلمانوں کو حکومتی اعتبار سے اپنے ساتھ شامل نہیں کرتے بلکہ ان کی دماغی صلاحیتوں اور قومی کردار کو چند ٹکوں کے عوض خرید لیتے ہیں اور بیچارہ مسلمان مار کھاتا رہتا ہے۔

اسی سبب سے قلندر کی آنکھ ہے نمناک
ہوا ہے بندہ مومن فسونی افرنگ
خریدتے ہیں فقط ان کا جوہرِ ادراک
شریکِ حکم غلاموں کو کر نہیں سکتے

(ض۔ک:۶۰۱)

مذکورہ بالا قلندری حقائق پر تو ان کا یہ عمل مسلمانوں کو پسماندہ حالت سے نکال کر ترقی کے زینے پر لے جاسکتا ہے۔ اگر نظر رکھی جائے اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے تو ان کا یہ عمل مسلمانوں کو پسماندہ حالت سے نکال کر ترقی کے زینے پر لے جاسکتا ہے۔ اگر نظر رکھی جائے اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے تو ان کا یہ عمل مسلمانوں کو پسماندہ حالت سے نکال کر ترقی کے زینے پر لے جاسکتا ہے۔

رموزِ دین اور رموزِ قلندری کے لئے تحصیل علم اشد ضروری ہے

انسان کو پوری کائنات میں فضیلت کا حاصل ہونا علم الاسماء کی وجہ سے ہی ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آدمؑ کو علم کی اس فضیلت کے عطا کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (البقرہ:۳۱) یعنی اللہ نے آدم کو تمام اشیاء کے نام سکھا دیئے۔ اس آیت کی کچھ تفسیر اس کتاب کی غرضِ تصنیف میں بیان ہو چکی ہے۔ احتیاط کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان کو اشرف المخلوقات کا تاج اسی علم

کے باعث عطا کیا گیا اور جو اس کو قدرت دی وہ کسی کو بھی نہیں دی۔ جو لوگ رموز دین کو فاش کرتے ہیں وہ غیر معمولی علمی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ علم اور عمل کے تقابلی جائزہ کے لئے انشاء اللہ ایک وسیع گفتگو کسی دیگر تصنیف میں تحریر میں لائی جائے گی تاکہ علم اور عمل میں فرق واضح ہو سکے۔

علامہ اور خدمتِ ملّت

مولانا سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ کے والد نے ان کی طالب علمی کے زمانے میں وعدہ لیا تھا کہ تم ملّتِ اسلامیہ کی خدمت کرنا، جب علامہ مرحومؒ کے والد بسترِ مرگ پر تھے تو علامہ اقبالؒ نے پوچھا والد بزرگوار! آپ سے جو میں نے اسلام کی خدمت کا وعدہ کیا تھا وہ پورا کیا یا نہیں؟ باپ نے بسترِ مرگ پر شہادت دی کہ جانِ من! تم نے میری محنت کا معاوضہ ادا کر دیا ہے۔ (اقبالؒ سلیمان ندوی کی نظر میں۔ ص: ۸۶)

علامہ اقبالؒ نے نیچے دیئے گئے اشعار میں ملّتِ اسلامیہ سے پوچھا کہ انہوں نے اس کی صدیوں کی غفلت اور غلامی کا افسوں توڑا یا نہیں۔ ملّت علامہؒ کی ممنون ہے۔ علامہ اقبالؒ کے مجموعہ کلام امت کی اصلاح کی کوششوں کا کارنامہ وہ میراث ہے جس پر برصغیر کے مسلمانوں کے علاوہ دنیا بھر کے مسلمان فخر کر سکتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ آج کے عالمِ اسلام کا اگر کسی مسلمان پر دینِ حق کا بہترین ترجمان ہونے کے لحاظ سے سب مسلمانوں کا اتفاق اور اجماع ہے تو وہ علامہ اقبالؒ ہیں۔ آپ خود رسول اللہ ﷺ کے حضور عرض کرتے ہیں۔

دل صاحب دلاں اُو برد یا من پیامِ شوق اُو آورد یا من
(اہل دل کے دلوں کو اُس نے تراش کیا یا میں نے، ذوق وشوق اسلام وہ لیکر آیا یا میں)

من و ملا زکیشِ دیں دو تیریم بفرما بَر ہدف اُو خورد یا من (ا ح: ۹۳۱)
(میں اور مُلّا دین کے ترکش کے دو تیر ہیں، آپ فرمائیں کہ نشانے پر وہ پہنچا یا میں)

ایک جگہ فرمایا کہ ۔

کیے ہیں فاش، رموزِ قلندری میں نے کہ فکرِ مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد (ب۔ج: ۳۶۲)
کسے نہیں ہے تمنائے سروری، لیکن خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے؟
(ب۔ج: ۳۴۰)

علم اور عمل میں فضیلت کس کو حاصل ہے؟

حضرت جنید بغدادیؒ نے اپنے استاد حضرت عبداللہ بن حارث محاسبیؒ سے دریافت کیا کہ علم اور عمل میں فضیلت کس کو حاصل ہے؟ آپؒ نے بہت پُر مغز جواب دیا جو درج ذیل ہے۔
آپؒ نے جواب دیا کہ "علم کو یعنی علم عمل سے فائق ہے۔" حضرت جنید بغدادیؒ نے [illegible]

کی وضاحت چاہی تو آپؒ نے کہا "ہم علم سے خُدا کو پہچان سکتے ہیں، مگر عمل سے اسے پا نہیں سکتے۔ عمل بندے کی صفت ہے، اور علم خُدا کی۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "گھڑی بھر کا تفکر ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔" گویا دل کے اعمال اعضاء کے اعمال سے بہتر ہیں۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ عالم کی نیند عبادت ہے اور جاہل کی بیداری گناہ ہوتی ہے۔" حضرت جنید بغدادیؒ نے سوال کیا، "وہ کیسے؟"

حضرت عبداللہ بن حارث محاسبیؒ نے جواب دیا خواب ہو یا بیداری، عالم کا دل تو مغلوب ہوتا ہے اور جب دل مغلوب، ہو تو جسم بھی مغلوب ہو جاتا ہے، لہٰذا غلبۂ حق سے مغلوب دل مجاہدے کے باعث حرکات ظاہر پر غلبۂ نفس کی نسبت بہتر ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ کو آپؒ کی باتوں سے لذت محسوس ہونے لگی۔ اب وہ چاہتے تھے کہ محاسبیؒ بولتے رہیں، اور وہ سُنتے رہیں، اس لئے اب ذہن میں سوالات بھی پیدا ہو رہے تھے۔ آپ نے درج ذیل سوالات کے متعلق دریافت کیا۔

تصوّف کے مراتب عالیہ کے لئے، کن خصلتوں کی ضرورت ہوتی ہے؟

حضرت جنید بغدادیؒ نے حضرت عبداللہ بن حارث محاسبیؒ سے دریافت کیا کہ تصوّف کے مراتب عالیہ کے لئے، کن خصلتوں کی ضرورت ہوتی ہے؟

آپؒ نے درج ذیل جواب دیا۔ "چند خصلتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وجہ مَیں بتاتا ہوں، ذہن نشین کر لیں۔" جنید بغدادیؒ ہمہ تن گوش تھے۔ محاسبیؒ کچھ دیر بعد گویا ہوئے، "انسان کو کبھی قسم نہ کھانا چاہیے، کبھی جھوٹ نہ بولے، وعدہ کرے تو ہر حال میں پورا کرے، ظالم پر بھی کبھی لعنت نہ بھیجے، کسی سے بدلہ نہ لے اور کسی کے حق میں بدؑعا نہ کرے، کسی کے کفر و نفاق پر شاہد نہ بنے، گناہ سے کنارہ کشی اختیار کرے تو ظاہری و باطنی طور پر کبھی بھی قصداً گناہ نہ کرے۔ کسی کے لئے بارِ خاطر نہ بنے۔ دوسروں کا بار ختم کرنے میں مدد کرے۔ لالچ ختم کر دے اور دوسروں سے نا اُمید رہے۔ دوسروں کو اپنے سے بہتر تصوّر کرے۔ کسی بھی منصب و مرتبے کی خواہش نہ کرے۔ کیا میری یہ باتیں ذہن نشین ہو گئیں؟" (یہی رموز قلندرانہ ہیں) جنیدؒ کے دل و دماغ پر سحر طاری تھا۔ گویا عالمِ خواب میں جواب دیا، "ہاں! میں نے انہیں ذہن نشین کر لیا ہے۔" آپ نے فرمایا، "تب پھر یقین کر لیں کہ جس نے میری ان باتوں پر عمل کیا تو وہ بامراد و کامران رہے گا۔" اب جنیدؒ سے کوئی سوال نہیں کیا جا رہا تھا اور محاسبیؒ پر وجد کی کیفیت طاری تھی۔ وہ کہہ رہے تھے، "جنید! انسان پر ایک ایسا وقت بھی آ جاتا ہے، جب دل اور علم میں رقابت شروع ہو جاتی ہے، یہ بڑا نازک وقت ہوتا ہے۔" جنیدؒ کی لطف اندوزی اور جستجو میں اور اضافہ ہو گیا۔ پوچھا، "کب؟ یہ کونسا وقت ہوتا ہے جو اتنا نازک ہوتا ہے۔" محاسبیؒ نے جواب

دیا" قربِ الٰہی کی منزل میں، اس منزل میں قلب علم کا رقیب بن جاتا ہے۔" جنیدؒ نے عرض کیا،" آپ بولتے رہیے آپؒ کی باتیں بہت پُر لطف ہیں۔" محاسبیؒ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا،" جنید احکامِ الٰہی کی بجا آوری کا نام صبر ہے اور مصائب پر شاکر رہنے کا اور انہیں منجانب اللہ تصور کرنے کا نام تسلیم ہے۔ اللہ کے دشمنوں سے انقطاعِ تعلق کا نام حیا ہے۔ ترکِ دُنیا کا نام حُبِّ الٰہی ہے۔ محاسبے سے ڈر کر گناہ نہ کرنا خوف ہے۔ مخلوق سے فرار کا نام انسِ خالق ہے اور وہ جو مخلوق کے بُرا سمجھنے کے باوجود خوشی کا اظہار کرے وہ صادق ہے۔ جنید! خودی کو ترک کر دو، اور خُدا کے بن جاؤ، اگر چاہتے ہو کہ تمہیں صحیح راہ مل جائے تو اسے پاکیزہ ریاضت کے ذریعے حاصل کرو۔ (یہی وہ رموز ہیں جن کو علامہؒ نے اپنے کلام میں سمو دیا ہے۔) معلوم ہوا کہ علم کو عمل پر فضیلت کیوں ہے۔

باب ۷

درویشی اور فقر پر صوفیاء کے اقوال

اسلام روحانیت کا مذہب ہے اور اس کو اختیار کرنے سے روحانی قوتیں بیدار ہوتی ہیں۔ جو لوگ روحانی زندگی کا اہتمام کرتے ہیں اور اس کی ضروریات کو پورا کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتے وہ لوگ غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل بن جاتے ہیں۔ ان کی زندگیاں عام لوگوں کی زندگیوں سے بہت مختلف اور ان کا معمول عارفانہ انداز میں پایا جاتا ہے۔ ایسے لوگ صوفی یا عارف باللہ کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں اور وہ دنیا کی ہر چیز کو عام لوگوں سے مختلف انداز میں دیکھتے ہیں۔ ان کی نظر میں زندگی کا مفہوم اس قدر دلچسپ اور رنگین ہوتا ہے کہ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی محبت سے معمور و مخمور رہتے ہیں ان کی پوری زندگی تحقیق اور تخلیقی اُمور کی گتھیاں سلجھانے میں بسر ہو جاتی ہے۔ یہ اولیائے کرامؒ انسانی زندگی کے ہر شعبے کے متعلق عجیب وغریب رموز واَسرار کا انکشاف کرتے ہیں جن کو سن کر لوگوں پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے کلام کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے شعبۂ حیات کے کسی پہلو کو اپنے نظریات کی گوہر افشانیوں سے محروم نہیں رکھا۔

اولیائے کرامؒ جب ولایتِ کبریٰ یا ولایتِ عُلیا پر فائز ہو جاتے ہیں تو عقیدت مندان کی طرف جوق در جوق آتے ہیں اور ان کے فیوض و برکات سے اپنی جھولیاں بھر کر لے جاتے ہیں۔ روحانیت کے دلدادہ لوگ مختلف موضوعات پر اولیائے کرامؒ سے پیچیدہ مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں اور اُن کے جوابات کو قلمبند کر لیتے ہیں جو آنے والے وقتوں میں لوگوں کے لئے ایک قیمتی سرمایہ بن جاتے ہیں۔ فقر اور درویشی سے متعلق جب اولیاء کرامؒ سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے اپنی اپنی بساط کے مطابق جو کچھ فرمایا اس کی ایک مختصر روئیداد اس باب میں پیش کی جا رہی ہے۔ درج ذیل بیانات جو اولیائے کرامؒ کی زبانوں سے صادر ہوئے وہ نہایت دلچسپ اور قابلِ مطالعہ ہیں۔

درویشی اور فقر سے متعلق چند بزرگوں کے اقوال

درویشی اور فقر سے متعلق بہت سی احادیث اور مشائخ کے اقوال اس کتاب میں بیان ہو چکے ہیں اب یہاں مزید مختلف مشائخ کے اقوال جمع کئے جا رہے ہیں تاکہ قارئین کرام مشائخ عظام کے اقوال سے محظوظ ہو سکیں۔ رسول ﷺ نے خود اپنی زندگی کو فقر سے زینت بخشی اور فرمایا "اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ" (یعنی فقر پر مجھے

فخر ہے۔) اور آپ ﷺ نے مسکینی اور فقر کی حالت میں واصل حق ہونے کی دُعا فرمائی۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اگر تم یہ چاہتی ہو کہ قیامت کے دن میرے ساتھ رہو تو درویشانہ گزر بسر کرو۔ امیری سے دور رہو اور کپڑے اس وقت تک نہ بدلو جب تک اس میں پیوند نہ لگ جائیں۔ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ باقی تمام انبیائے کرام نے بھی بخوشی فقر کو قبول فرمایا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تمام عمر سامان دنیا میں سے اپنے پاس کچھ نہ رکھا۔

حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو نصیحت فرمائی کہ کسی پھٹے ہوئے کپڑے والے کو ذلیل اور حقیر نہ جان بلکہ یہ جان کہ اس کا اور تمہارا خدا ایک ہے۔ نیچے مشائخ عظام کے کچھ اقوال ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ لعنتی ہے وہ شخص جو کسی کو درویشی کی وجہ سے ذلیل وخوار سمجھے اور تونگری کی وجہ سے عزیز اور محترم تصور کرے۔

روایت میں ہے کہ امیروں کی گت جو سفیان ثوری کی مجلس میں بنتی تھی وہ کہیں اور نہ بنتی تھی۔ وہ امراء کو آخری صف میں جگہ دیتے تھے اور درویشوں کو اپنے پہلو میں بٹھاتے تھے۔

حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ اے گروہ درویشاں! لوگ تمہیں باخدا سمجھتے ہیں، خدا کے نام پر تمہاری عزت کرتے ہیں۔ دیکھو خلوت کی حالت میں تم (حق درویشی میں) کس کیفیت سے دوچار ہوتے ہو۔

یحییٰ بن معاذؒ فرماتے تھے کہ آدمی اگر دوزخ سے ایسا ہی ڈرتا جتنا کہ غربت سے ڈرتا ہے تو دونوں (غربت، دوزخ) سے محفوظ رہتا اور اگر بہشت کو بھی اتنا ہی چاہتا جتنا کہ امیری کو چاہتا ہے تو وہ دونوں کو حاصل کر لیتا۔ اگر باطن میں بھی اللہ سے اتنا ہی ڈرتا جتنا ظاہر میں ڈرتا ہے تو دونوں جہانوں کی سعادتیں حاصل کرتا۔

حضرت یحییٰ بن معاذؒ سے جب کسی نے پوچھا کہ فقر کیا ہے؟ تو فرمایا کہ فقر کے زائل ہونے کا ڈر فقر ہے۔ پھر پوچھا مالداری کیا ہے؟ فرمایا اللہ کے پاس امن حاصل کرنا۔

ابن الکرنبیؒ نے فرمایا کہ سچا فقر مالداری سے پرہیز کرنا ہے اس ڈر سے کہ کہیں مالداری داخل ہو کر اس کے فقر کو خراب نہ کر دے۔ موسیٰ علیہ السلام کو وحی کی گئی کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری نیکیاں تمام لوگوں کی نیکیوں جتنی ہو جائیں تو مریض کی عیادت کیا کرو۔ فقراء کے کپڑوں سے جوئیں نکالا کرو۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام ہر ماہ میں سات دن فقراء کے ہاں چکر لگاتے۔

سہیل بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ فقر یہ ہے کہ وہ اپنے موجودہ حال کے سوا کسی اور چیز کو نہ دیکھے۔ فرمایا کہ فقیر نہ سوال کرتے ہیں نہ رد کرتے ہیں اور نہ روکتے ہیں۔ فرمایا کہ پانچ چیزیں نفس کا جوہر ہیں۔

(۱) محتاج جو اظہار مالداری کرتا ہو (۲) بھوکا جو شکم سیری ظاہر کرتا ہو (۳) غم زدہ جو خوشی کا اظہار کرتا ہو (۴) وہ شخص جس کی کسی سے عداوت ہو مگر اس سے محبت کا اظہار کرتا ہو (۵) وہ شخص جو دن کو روزہ رکھے اور رات [illegible]

قیام کرے مگر کمزوری کو ظاہر نہ ہونے دے۔

حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں بندہ پر اللہ کی ناراضگی کی علامت یہ ہے کہ بندہ فقر سے ڈرتا ہو۔

حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے پاس ساری دنیا ہو اور وہ اسے ایک دن میں خرچ کر ڈالے اور بعد میں اس کے دل میں یہ خیال ہو کہ ایک دن کی خوراک رکھ لیتا تو یہ فقر نہیں ہے۔

حضرت ابوعلی دقاقؒ فرماتے ہیں کہ لوگ یہ بحث کرتے ہیں کہ فقر اور غنا میں کون سا افضل ہے میرے نزدیک افضل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قدر عطا کر دے کہ جس سے گزر بسر ہو سکے۔

ابومحمد یٰسین ابن جلاءؒ سے فقر کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ خاموش رہے کچھ دیر کے بعد آپ اٹھ کر چلے گئے اور پھر واپس آ کر فرمایا کہ میرے پاس چار دانگ (تین درہم) تھے اس لئے مجھے اللہ سے شرم آئی کہ میں فقر کی بات کروں آپ نے جا کر کسی کو وہ درہم دے دیئے پھر بیٹھ گئے اور فقر پر گفتگو کی۔ انہی سے پوچھا گیا کہ فقیر کب فقیر کہلانے کا حقدار ہوتا ہے۔ تو فرمایا جب خود پر فقر کا وہم وگمان بھی نہ ہو کیونکہ جسے فقر پر گمان ہو گا وہ فقیر نہیں۔ جو یہ سمجھے کہ فقر اسے حاصل نہیں تو درحقیقت فقر اُسے حاصل ہوتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ فقر کے ہوتے ہوئے مالداری کا اظہار فقر سے بہتر ہے۔

حضرت مزینؒ فرماتے ہیں کہ اللہ کی طرف جانے کے طریقے ستاروں سے بھی زیادہ تھے مگر طریقِ فقر کے سوا اور کوئی طریقہ باقی نہ رہا اور یہی صحیح ترین طریقہ ہے۔

حضرت نوریؒ فرماتے تھے کہ فقیر کی تعریف یہ ہے کہ محتاجی کے وقت اسے سکون ہو اور جو کچھ اس کے پاس ہو وہ دوسروں کو دے دے اور دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دے۔

استاد ابوعبداللہ رندیؒ نے مظفر القرمینی سے سنا ہے کہ فقیر وہ ہے جس کی اللہ کے پاس کوئی حاجت نہ ہو۔

ابن خفیفؒ فرماتے ہیں کہ اپنے آپ کو کسی چیز کا مالک قرار نہ دینا اور کسی صفت کو اپنی طرف منسوب نہ کرنا فقر ہے۔

محمد مسوحیؒ فرماتے ہیں کہ فقیر وہ ہے جسے اپنی ذات کے لئے کسی سبب کی ضرورت نہ ہو۔

سہیل بن عبداللہؒ نے فرمایا کہ فقر یہ ہے کہ فقیر اپنے موجودہ حال کے سوا کسی اور چیز کو نہ دیکھے فرمایا کہ فقیر نہ سوال کرتے ہیں نہ رد کرتے ہیں اور نہ رد کتے ہیں۔

یحیٰ بن معاذؒ نے فرمایا کہ کسی نبی کی طرف وحی نازل ہوئی کہ اگر تم یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ تم سے میں کہاں تک راضی ہوں تو تمہیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ تم سے فقراء کہاں تک راضی ہیں۔

حضرت دقاقؒ فرماتے ہیں جو فقر میں صاحبِ تقویٰ نہیں وہ حرام خور ہے۔

عبدالرحمان سلمیؒ فرماتے ہیں کہ فقیر کو یہ حکم ہے کہ کسی چیز سے رغبت نہ کرے اور اگر کرے تو کفایت سے زیادہ نہ ہو۔

ابوبکر مصریؒ فرماتے ہیں کہ فقیر وہ ہے جو نہ کسی چیز کا مالک ہو اور نہ مالک ہونے کی خواہش کرتا ہو۔

ابوحدادؒ نے بیس سال اس طرح گزارے کہ ہر روز ایک دینار کماتے اور فقراء پر خرچ کر دیتے اور دن بھر روزہ رکھتے شام کو عشاء کے بعد لوگوں سے خیرات لے کر کھاتے۔

ابوبکر عراقیؒ فرماتے تھے کہ فقیر کے لئے دنیا اور آخرت میں خوش خبری ہے اس لئے دنیا میں بادشاہ اس سے خراج نہیں لیتا اور آخرت میں اللہ اس سے حساب نہیں مانگے گا۔

بعض مشائخ کا قول ہے کہ درویشوں میں تین چیزیں نہیں پائی جاتیں، طمع، منع، جمع۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فتح الربانی میں فرماتے ہیں کہ جو شخص عالمانِ باعمل کی صحبت میں نہ رہے وہ مردود ہے۔ اس کے لئے نہ دلیل ہے نہ اصل۔ ایسے کی صحبت میں رہو جس کو حق تعالیٰ کے ساتھ محبت ہو۔

حضرت ذوالنونؒ مصریؒ کا قول حضرت داتا گنج بخشؒ نے نقل کیا ہے کہ صوفی جب بات کرے تو اس کا کلام حقائق و معارف کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس کی بات میں الفاظ اس کی اپنی حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں یعنی وہ ایسی بات کہے گا ہی نہیں جو اس کے حسبِ حال نہ ہو۔ اس کی گفتار اصلیت پر مبنی ہوتی ہے اور اس کا کردار تجرد اور قطع علائق کا مظہر ہوتا ہے جب بولے تو اس کا ہر قول حق اور ہر فعل درویشی کی شان لئے ہوتا ہے۔ صوفی جب خاموشی اختیار کرے تو اس کے اعضاء اس کی حقیقت کے غماز ہوتے ہیں۔ وہ خلق سے قطع کر کے خدا کی ذاتِ واحد کا ہو جاتا ہے۔ اس کی خاموشی میں اس کے اعمال ظاہر ہوتے ہیں۔

شیخ ابوبکر بن طاہرؒ نے فرمایا کہ فقیر کو کوئی خواہش اور رغبت نہیں ہوتی اور اگر کوئی رغبت ہوتی بھی ہے تو وہ حدِ ضرورت سے تجاوز نہیں کرتا۔

شیخ فارسؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایسے فقیر سے جس سے بھوک اور فاقہ کے آثار نمایاں تھے کہا کہ تم سوال کیوں نہیں کرتے؟ اُس نے کہا مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے سوال کیا اور لوگوں نے مجھے منع کر دیا تو وہ فلاح سے محروم ہو جائیں گے۔

حضرت ابراہیم خواصؒ کا قول ہے کہ فقر شرف اور بزرگی کی چادر ہے، مرسلین کا لباس اور صالحین کی اوڑھنی ہے۔

حضرت شبلیؒ نے فرمایا کہ فقیر وہ ہے جو اللہ کے سوا کسی چیز سے غنا طلب نہیں کرتا یعنی وہ خدا کے سوا کسی سے راحت نہیں پاتا اور اس کا پالینا ہی غنا ہے۔ آپ نے ہی فرمایا کہ فقر دریائے بلا ہے اور اس کی جملہ بلائیں اور آزمائشیں عزت ہیں۔

جنید بن محمد ابن الجنیدؒ فرماتے ہیں فقر دل کو ہر اشکال سے خالی کرنے کا نام ہے۔

حضرت رویمؒ کا قول ہے کہ درویشی موجودات کی نیستی ہے اور مفقودات کا چھوڑنا ہے یعنی جو موجود ہے اس کو چھوڑ دے اور جو معدوم ہے اس کی طلب نہ کرے۔ آپ نے فرمایا کہ فقیر کی خصوصیات باطن کی نگہداشت،

نفس کی حفاظت اور فرائض کی ادائیگی ہے۔

فقہاء کا قول ہے کہ "اَلْاِشْتِغَالُ بِمَا لَا یَعْنِیْہِ لَغْوٌ" یعنی بے فائدہ چیز میں مشغولیت بے ہودہ ہے۔

حضرت ابن الکتانیؒ نے فرمایا کہ جب بندے کا نیاز حق تعالیٰ سے درست ہو جاتا ہے تو خدا تعالیٰ کے ہوتے ہوئے سب سے غنی ہو جاتا ہے یعنی اللہ کے ساتھ نیاز اسی قدر ہوتا ہے جتنا غیر اللہ سے استغنیٰ ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جبرائیل علیہ السلام سے مدد نہ چاہی کیونکہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز کو فقر اور عجز کی صفت میں دیکھا اور یہ جانا کہ عاجزوں سے حاجت روائی محال ہے۔ فقیر عجز کو وہاں لے جاتا ہے جہاں عجز نہیں ہے حتیٰ کہ حق تعالیٰ کی قدرت سے قادر ہو جاتا ہے اور حق تعالیٰ کے غنا سے غنی ہو جاتا ہے کیونکہ خدا یہ تمام قدرتیں دے سکتا ہے۔

ابراہیم بن المولدؒ فرماتے تھے کہ میں نے ابن الجلاء سے پوچھا کہ فقیر کب تک فقیر کہلانے کا حقدار ہے۔ فرمایا کہ جب فقر میں سے کچھ بھی اس کے پاس باقی نہ رہے (یعنی فقر کا وہم وگمان بھی اسے نہ رہے۔) فرمایا کہ جب وہ یہ خیال کرے کہ مقامِ فقر اسے حاصل ہے تو درحقیقت اسے یہ حاصل نہیں ہے اور جب وہ یہ خیال کرے کہ مقام فقر اسے حاصل نہیں ہے تو دراصل اسے یہ حاصل ہوتا ہے۔

شیخ ابن الجلاءؒ فقر کی تعریف فرماتے ہیں کہ فقر یہ ہے کہ تیرے لئے کچھ نہ ہو اور جو کچھ تیرے پاس ہو تو اس کو ایثار کردے اور تیرے پاس کچھ باقی نہ رہے۔ آپ کا قول ہے کہ اگر تواضع فخر والی چیز نہ ہوتی تو فقیر کو یہ حکم دیا جاتا کہ چلتے ہوئے اکڑ کر چلو۔

شیخ کتانیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کا صحیح طور پر محتاج بن جائے تو اللہ تعالیٰ کی بدولت وہ غنی اور بے نیاز بن جاتا ہے۔ یہ دونوں ایسے روحانی حال ہیں کہ ایک کا تکملہ دوسرے کے بغیر نہیں۔

ابوسلیمان درانیؒ نے فرمایا کہ خواہشات کی اشتہا کے بغیر فقیر کا سانس لینا ایسا دشوار کام ہے جس پر ایک غنی کی ساری عمر کی عبادت اتنی قدرت نہیں رکھتی۔

بشر حافیؒ فرماتے ہیں کہ عبادت اغنیاء کو نہیں بجتی اور تقویٰ فقط فقیر میں ہی بجتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ زندگی بھر صبر پر قائم رہنا افضل مقامات میں سے ہے۔

حضرت فریدالدین گنج شکرؒ فرماتے ہیں اگر کسی خرقہ پوش کے اعمال درست ہیں تو خیر ورنہ قیامت کے روز وہ خرقہ اپنے حق کی ادائیگی نہ کرنے کا سوال کرے گا۔ فرماتے ہیں خرقہ پوشی قابل اعتبار نہیں بلکہ خرقہ، خرقہ پوش کی وجہ سے قابلِ اعتبار ہے۔ حضرت سلطان باہوؒ فرماتے ہیں۔

لباسِ فقر می پوشی، شراب ھُو نمی نوشی　　چرا در مکر می کوشی، کنی چوں قصہ افسانہ

(لباس فقر پہنتے ہو، شراب بھی نہیں پیتے، اس دھوکے میں کیوں پڑے ہو اور قصے کو افسانہ کیوں بناتے ہو۔)

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ کی معرفت اس شخص پر حرام ہے جس کے باطن میں دنیا کی محبت رائی کے دانے جتنی بھی ہو۔ (اس سے مراد یہ ہے کہ دنیا ہاتھوں میں ہو تو حرج نہیں لیکن اس کی محبت دل میں محسوس نہ کرے۔)

فقر اور درویشی پر علامہ اقبالؒ کا کلام

زیرِ نظر کتاب میں فقر اور درویشی پر علامہ اقبالؒ کا کلام کافی بہتات سے دے دیا گیا ہے۔ علامہ اقبالؒ کا نظریہ فقر کے عنوان سے جو اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے وہ قارئین کے لئے قابلِ توجہ ہے۔ علامہؒ کے کلام میں کچھ صوفیاء کی آرا پر بھی لکھا جا چکا ہے۔ اس باب میں علامہ قبالؒ کے فقر پر اشعار کا شامل کیا جانا مناسب نہیں۔ کیونکہ یہ پہلے ہی کافی مقدار میں شامل کیے گئے ہیں۔

باب ۸

حصہ دوم

(علمُ الروح اور تصوف)

روحانیت اور علم الرُّوح

لفظ روحانیت سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ علمِ روحانیت کا روح سے گہرا تعلق ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ انسان جو کہ جسم اور روح کا مجموعہ ہے ان دونوں میں انسان کی روح مغز کی حیثیت رکھتی ہے اور بدن کا تعلق قشر (چھلکا) سے زیادہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے روح کو اس قدر لطافت عطا فرمائی ہے کہ اس کی شعاع کو سیمنٹ کی ہزاروں چھتیں بھی non-conductor بن کر منقطع نہیں کر سکتیں اور یہ ہر رکاوٹ سے گزر جاتی ہے۔ اس لطافت کے سبب روح میں بہت سی خصوصیات موجود ہیں جو اس کو دنیا میں ایک عظیم تر مخلوقِ خداوندی کا مقام عطا کرتی ہیں۔ روحانی کمالات جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو مختص کیا ہے اسی روح کے باعث انسان کو حاصل ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان نے جواب تک روحانی دنیا میں کمالات حاصل کیے ہیں وہ روح کی اصلیت نوعیت، محنت اور متقیت کی بنا پر ہی ہیں جس میں فضلِ خداوندی کا ایک بہت بڑا عنصر بھی شامل ہے۔

روح کی حقیقت اور اصلیت یا فلسفہ کو جاننا تو انسان کی بساط سے باہر ہے کیونکہ اتنی بڑی عظیم چیز کی کُنہ یا حقیقت کو سمجھنا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور شخص کے لئے ناممکن ہے۔ اس باب میں روح کے معلوم شدہ علوم اور حقائق پر قرآن اور حدیث کی مدد سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی، اگرچہ سورہ بنی اسرائیل میں اس بات کا ذکر ہے کہ انسانوں کو روح کا علم نہیں دیا گیا سوائے قلیل علم کے۔

روح کے لغوی معنی

امام راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ روح کے لغوی معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''روح'' اور ''سانس'' دراصل ایک ہی ہیں۔ روح کا اطلاق سانس پر بھی ہوتا ہے کیونکہ سانس روح کا ایک جزو ہے اور روح کا

اطلاق اس پر بھی ہوتا ہے جس کے ذریعے زندگی، حرکت، منافع کا حصول اور مضرات (ضرررساں چیزیں) سے بچاؤ حاصل ہوتا ہے۔ قرآنِ پاک میں روح کی حقیقت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا۔

وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (بنی اسرائیل:۸۵)
یہ دریافت کرتے ہیں آپ سے روح کی حقیقت کے متعلق۔ (انہیں) بتایئے روح میرے رب کے حکم سے ہے۔

سورۃ الحجر میں بھی فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں اپنی روح کا نفحہ فرمایا ہے۔

فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ (الحجر:۲۹)
تو جب میں اسے درست فرمادوں اور پھونک دوں اس میں خاص روح اپنی طرف سے

اِن دونوں آیتوں میں روح اسی معنی میں ہے اور اللہ تعالیٰ کا اسے اپنی ذات کی طرف منسوب کرنا اضافت ملکیہ کے طور پر ہے۔ جس سے روح کی شرافت کا اظہار مقصود ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ کہ خوب صاف ستھرا رکھنا میرا گھر (البقرہ:۱۲۵) میں بیت کی اضافت اپنی ذات کی طرف اعزازی طور پر فرمائی ہے۔ (مفردات القرآن اردو، بترمیم یسر، ج ۱ ص ۴۱۸)

روح کیا ہے؟

روحِ انسانی کیا چیز ہے، اس کی حقیقت و ماہیت کیا ہے۔ اِس کے متعلق دو روایتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ یہود کی انگیخت پر مشرکین مکہ نے روح کی حقیقت کے بارے میں حضور رحمتِ عالم ﷺ سے سوال کیا۔ دوسری یہ کہ ہجرت کے بعد جب حضور اکرم ﷺ مدینہ طیبہ تشریف فرما ہوئے تو وہاں کے احبارِ یہود نے اس معمہ کا حل امتحاناً دریافت کرنا چاہا۔ بہرحال یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس کی خلش پر غور و فکر کرنے والا اپنے دل و دماغ میں محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ ہر زمانہ کے فلسفیوں نے اس معمہ کو حل کرنے کی انتہائی کوشش کی لیکن ہر کوشش نے اسے پیچیدہ سے پیچیدہ تر بنا دیا۔ یہی سوال بارگاہِ رسالت ﷺ میں پیش کیا گیا تو زبانِ قدرت نے اس کا مختصر لیکن جامع جواب دے کر تمام اوہام و شکوک کا دروازہ بند کر دیا۔ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (بنی اسرائیل: ۸۵) (یعنی روح میرے رب کا امر ہے۔)

اب سب سے پہلے یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ روح ہے کیا چیز؟

روح لطیفۂ بدن کا رب، حیاتِ حِسّی کا مصدر اور قوائے نفسانی پر فیضان کا منبع ہے۔ روح جسم میں آنے سے جسم زندہ ہو جاتا ہے اور نکل جانے سے جسم کو موت آ جاتی ہے۔ انسانی جسم میں حرکت کا یہی سبب ہے۔ ہر چیز میں روح ہوتی ہے۔ نباتات سے حیوانات کی روح ارفع ہے اور انسانی روح کو قائم رکھنے والی

روح اس سے بھی افضل ہے۔ بعض صوفیاء نے کہا کہ روح ایک سوار ہے اور بدن اس کی سواری ہے۔ یا روح ایک مستقل جسم ہے جس کا ظاہری مظہر بدن ہے۔ روح عالم برزخ میں سیر کرتی اور دنیا کے احوال کا مشاہدہ کرتی ہے۔ ملائکہ کے احوال کی نگران ہے۔ روح ان تمام باتوں کو سنتی ہے جو ملائکہ آسمانوں میں انسانوں کے بارے میں کرتے ہیں۔ کچھ روحیں پروازِ بہشت میں مصروف ہیں اور عروج میں جہاں تک پہنچ گئیں وہی ان کا مقام بن جاتا ہے۔ مرنے کے بعد جب روحیں پہلوں کے پاس پہنچ گئیں وہیں ان کا مقام بن جاتا ہے۔ مرنے کے بعد جب روحیں پہلوں کے پاس پہنچتی ہیں تو ان سے زندہ لوگوں کے متعلق سوال کرتی ہیں اور وہ جواب دیتی ہیں۔ احادیث میں ہے کہ زندہ لوگوں کے اعمال انتقال شدہ روحوں پر پیش کیے جاتے ہیں اور وہ اچھے اعمال سے خوش اور برے اعمال سے افسردہ ہوتی ہیں۔ جو روح عالمِ ارواح میں سب سے زیادہ اللہ کے قرب میں رہی وہ سب سے زیادہ عظیم ہے۔

روح کے تصرفات

احادیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روح سے افضل کسی چیز کو نہیں بنایا۔ روح کو اس قدر طاقت حاصل ہے کہ تمام کائنات کو ایک لقمہ میں ہڑپ کر سکتی ہے۔ اِنسان کو جس قدر کمالات اور تصرفات اللہ تعالیٰ نے عطا کئے ہیں وہ سب اس کو روح کی وجہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ روح کی طاقت قربِ الٰہی سے ہے، جو روح جتنی اللہ کے قریب ہے وہ اتنی ہی طاقت ور اور قوی تر ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا قربِ خاص حاصل ہونا انسان کے اعمال پر موقوف ہے یا جس روح پر اللہ تعالیٰ کی خاص نظر ہو جائے وہ اتنی ہی زیادہ قوی اور مقرب ہو جاتی ہے۔ جن لوگوں کا شمار چوٹی کے بزرگوں میں ہوتا ہے وہ سب طریقتِ اعمال کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کرتے ہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص واصل باللہ یعنی مقربِ الٰہی ہو گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ قرب اعمالِ صالح اور اتباعِ رسول اللہ ﷺ کے باعث میسر ہوتا ہے، ذکر و اذکار اور تسبیحات سے روح کو قوت ملتی ہے۔ ایسی قوی روح کو وہ طاقت حاصل ہے کہ جب چاہے، جہاں چاہے پہنچ سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بعض ارواح کو اس قدر طاقت بخشی ہے کہ وہ جو بات منہ سے نکال دیں تو وہ خدا کے منہ سے نکلی ہوئی بات تصور کی جاتی ہے، یہی کیفیت انسان کی روحانی کیفیت کہلاتی ہے جو ہر ایک شخص کے درجے مطابق ہوتی ہے۔ اس کے حصول کے لئے کسی شیخ سے اسباق حاصل کئے جاتے ہیں۔ یہ باتیں لکھنے پڑھنے سے بہت بالا ہیں لہٰذا اس سے زیادہ لکھنا لا حاصل ہے۔

زیادہ تفصیلات کے لئے اِس کتاب کے کرامات کے باب کا مطالعہ فرمائیں۔ نیچے روح کی قسمیں بیان کی جارہی ہیں۔

(۱) روحِ حیوانی

یہ عناصر کے بخاراتِ لطیف سے پیدا ہوتی ہے۔ جسم میں حیات کی صلاحیت پیدا کر کے اس میں حس و حرکت پیدا کرتی ہے۔ ہڈیوں اور گوشت میں ایسے سرایت کرتی ہے۔ جیسے کوئلوں میں آگ ہو۔ اس روح کے بدن سے نکل جانے سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ (جیسے درخت کی جڑیں کاٹنے سے درخت ختم ہو جاتا ہے) اس کے اصل معدن (جگہ) میں طبیب کی حکمت نہیں چلتی اور نہ ہی سائنس اس کو جانتی ہے۔ اس کو روحِ طبعی یا ہوائی بدن بھی کہتے ہیں۔

(۲) روحِ انسانی

اس کا تعلق علوی اور آسمانی روح سے ہے اس لئے روحِ آسمانی یا روح علوی بھی کہتے ہیں۔ یہ روحِ حیوانی پر ایک اضافی چیز ہے۔ اللہ کا ایک نور ہے۔ جس کا پرتو روحِ حیوانی پر ڈالا جاتا ہے۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ حضرت علیم (اللہ تعالیٰ) کی شعاعِ علم ہے جو نطفۂ انسانی پر چمکتی ہے اور رحم مادر میں تخلیق انسانی کا باعث بنتی ہے۔ اس کو روحِ ملکوتی بھی کہتے ہیں اور یہ عالم امر سے متعلق ہے جو روح حیوانی کے بغیر زندہ رہ سکتی ہے لیکن اس کی غذا روحانی اور بدنی عبادات ہے۔ علم کو روح کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔ چنانچہ روحِ آدم عقل کے ساتھ اس طرح نشو و نما پاتی ہے جس طرح بدن غذا سے۔ علامہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عشق کا مقام علم و عقل سے بھی بلند ہے جس کو یہ عطا ہو جائے تو مردوں کو زندگی عطا کرتا ہے۔

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل! (ب۔ج: ۳۵۵)

روح را جز عشقِ اُو آرام نیست عشقِ اُو روزیست کو را شام نیست (پ۔م: ۱۹۱)

(اس کے عشق کے بغیر روح کو آرام نہیں آتا، عشق ایک ایسا دن ہے جس کی شام نہیں ہے۔)

گرچہ آنجا جرأت گفتار نیست روح را کارے بجز دیدار نیست (ج۔ن: ۷۷۰)

(اگرچہ اس جگہ بات کرنے کی جرأت نہیں، لیکن روح کو دیدار (الٰہی) کے بغیر کام نہیں۔)

(۳) روح القدس

یہ وجود حق تعالیٰ سے ایک خاص وجہ (ذاتِ حق تعالیٰ یا ذاتِ حقیقی) ہے اور یہ "کن" کے احاطے سے پیدا نہیں کی گئی۔ اس لیے مخلوقات میں شامل نہیں۔ اس سے ہی حضرت آدم علیہ السلام میں روح کا نفخہ پیدا کیا گیا۔ نقائص کونیہ (عیوب) سے پاک ہے۔ قرآن میں ہے۔ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا (البقرہ: ۱۴۸) (اور ہر قوم کے لئے ایک سمت (مقرر) ہے، وہ اسی کی طرف منہ کرتی ہے) وَ نَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي (الحجر: ۲۹) (اور پھونک دوں اِس میں خاص روح) اور فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (البقرہ: ۱۱۵) (سو جدھر بھی رخ کرو

وہیں ذاتِ خداوندی ہے۔) سے اسی روح کی طرف اشارہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شے میں اللہ کی روح ہے اس کو روح الارواح، سرِّ الٰہی اور وجودِ ساری بھی کہتے ہیں۔ ہر شے میں روحِ مخلوق کے ساتھ روح القدس کا ہونا ضروری ہے مگر انسان کے ساتھ ایک تیسری چیز ہے جو ان دونوں کے درمیان بطور برزخ کے ہے اور جس کی وجہ سے ان دونوں میں قوی رابطہ رہتا ہے اسے روحِ انسانی، روحِ ملکوتی یا روح الروح بھی کہتے ہیں۔ اسی کے واسطے سے اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان سلسلۂ راز و نیاز جاری رہتا ہے۔ روحِ انسانی اپنی اصل اور حقیقت کے اعتبار سے روحِ اعظم ہے اور یہی روح مظہرِ ذاتِ الٰہی ہے، اس لئے یہ ممکن نہیں کہ سوائے اللہ کے کوئی اس کی کُنہ (اصل) تک پہنچ جائے۔ جب سالک روحِ حیوانی (کی حیوانی صفات) سے بالکل خلاصی پالیتا ہے تو روحِ ملکوت اسے اپنی جانب کھینچتی ہے یا روح القدس میں اسے محویت حاصل ہو جاتی ہے تو پھر وہ بقا پا جاتا ہے۔ یہ نبوت کا ورثہ ہے یا پھر نفس ناطقہ (قلب جو روح اور نفسِ انسانی کے درمیان ایک چیز ہے) اسے کھینچتا ہے اور وہ انانیتِ کبریٰ میں فنا ہو جاتا ہے اور نئے سرے سے بقا حاصل کرتا ہے اور یہ ولایتِ کبریٰ ہے یا پھر ورثۂ نبوت اور ورثۂ ولایت دونوں کا جامع ہو جاتا ہے۔ اس مقام کو جمع الجمع کہتے ہیں۔

روح کا نفس کے ساتھ تعلق

سورۃ الشمس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب روح کا بدن سے تسویہ کیا گیا تو ایک اور چیز جسے نفس کہتے ہیں، پیدا ہوا۔

وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ (الشمس: ۷ تا ۱۰)

قسم ہے نفس کی اور اس کو درست کرنے والے کی۔ پھر اس کے دل میں ڈال دیا۔ اس کی نافرمانی اور اس کی پارسائی کو۔ یقیناً فلاح پا گیا جس نے (اپنے) نفس کو پاک کر لیا اور یقیناً نامراد ہوا جس نے اسے خاک میں دبا دیا۔

اَلْهَمَهَا کا مطلب یہ ہے کہ دل میں کسی چیز کو ڈال دینا۔ "لسان العرب" میں ہے کہ دل میں ایسا خیال پیدا کر دینا جس کے باعث وہ کسی کام کو کرے یا ترک کر دے۔ الہام اس خیال کے لئے مخصوص ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو یا ملاء اعلیٰ کی طرف سے ہو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص کو اللہ تعالیٰ نے نیک و بد اور حق و باطل میں تمیز کرنے کا شعور دل میں ڈال دیا ہے یعنی انسان میں نیکی اور بدی کے اختیار کرنے کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ اب اس کی مرضی ہے کہ نیکی کو اختیار کرے یا بدی کو۔ قرآن میں یہ تصریح کئی بار آئی ہے۔ کہ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ۝ (الدھر: ۳) (بے شک ہم نے اسے دکھایا (اپنا) راستہ، اب

چاہے شکر گزار بنے، چاہے احسان فراموش)۔ اب ان آیات کی تشریح روحانی انداز میں ملاحظہ فرمائیں جس کو صاحب ''عوارف المعارف'' اور دیگر مفسرین نے لکھا ہے۔

روح کا تعلق عقل سے ہے۔ اس لئے اس کے متعلق کچھ جان لینا ضروری ہے۔ عقل روحِ علوی کا جوہر ہے۔ ''عوارف المعارف'' میں ہے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ عقل کا محل وقوع دماغ ہے مگر حقیقتاً اسے عقل کی ایک جگہ قرار نہیں دی جاسکتی۔ جب عقل نافرمانی کی تدبیر کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو اس کا مقام دماغ ہوتا ہے اور جب عقل فرمانبرداری اور نیکوکاری کی طرف رخ کرے تو اس کا مقام قلب ہوتا ہے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔

حسِ اسیر عقل باشد اے فلاں عقل اسیرِ روح باشد ہم بداں

(اے فلاں! حواس عقل کے پابند ہیں سمجھ لے! عقل روح کی پابند ہے۔)

دست بستہ عقل را جاں باز کرد کارہائے بستہ را ہمساز کرد (۳۔۱۸۲)

(روح نے جکڑی ہوئی عقل کو آزاد کردیا، الجھے ہوئے کاموں کو سلجھادیا۔)

علوی روح اپنی بلندیٔ مرتبہ کے باعث کائنات سے بے تعلق ہو کر اللہ کی طرف توجہ کرتی ہے۔ اس کے برعکس قلب اور نفس چونکہ عالم خلق میں ہیں، کائنات میں شامل ہیں۔ جب روح اپنے مولیٰ کی طرف توجہ کرتی ہے تو قلب روح سے محبت کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ اس وقت نفس کی خواہشات دب جاتی ہیں اور حرص وھویٰ کا مادہ ختم ہو جاتا ہے۔ ایک حدیث شریف کے مطابق ''جو شخص ذکر الٰہی کرتا ہے اور جو شخص ذکر الٰہی نہیں کرتا وہ زندہ اور مردے کے مانند ہیں'' (مشکوٰۃ رقم الحدیث: ۲۱۵۶) قلب پر وارد ہونے والے القا کی چھ قسمیں ہیں۔ القائے نفس، القائے شیطان، القائے روح، القائے ملک، القائے عقل، القائے یقین۔

نفس کا تسویہ کیسے ہوا؟

علوی روح کا محل یہی روحِ حیوانی ہے۔ جب علوی روح اس روحِ حیوانی پر وارد ہوتی ہے تو حیوانی روح علوی روح کی ہم جنس بن جاتی ہے اور حیوانی روح نطق (بولنے کا) اور الہام کا محل بن جاتی ہے جیسا کہ سورۂ الشمس کی مذکورہ آیات ۷ تا ۱۰ میں ذکر ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے نفس کا تسویہ (درست کرنا) اس طرح کیا کہ نفس میں انسانی روح (علوی) اتاری اور نفس کو تمام حیوانی ارواح سے الگ کردیا، یعنی نفس کی پیدائش روح علوی کے باعث ہوئی اور اسی نفس کا روحِ حیوانی سے تسویہ کیا۔ دراصل یہ روحِ حیوانی تھی اور یہ روحِ علوی کے وجود سے وجود میں آئی۔ (لب لباب اس کا یہ ہوا کہ روحِ حیوانی کے ساتھ جب روحِ انسانی یا علوی مل گئی تو ان کے ملنے سے ایک تیسری چیز یعنی نفس پیدا ہوا)

روح علوی اور حیوانی کے تعلق باہمی سے عشق اور محبت میں اس قدر بڑھ گئے ہیں جس طرح حضرت آدم علیہ السلام اور بی بی حوا علیہا السلام میں بڑھ گئے تھے اور پھر آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کی تخلیق ہوئی۔ اس زوجیت کے سکون کے بابت قرآن مجید میں یوں ذکر آیا ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۲۱ (الروم:۲۱)

اور اس کی (قدرت کی) ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے پیدا فرمائیں تمہارے لئے تمہاری جنس سے بیویاں تاکہ تم سکون حاصل کرو ان سے اور پیدا فرما دیئے تمہارے درمیان محبت اور رحمت کے (جذبات) بے شک اس میں بہت نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

جسم اور روح کی جدائی محبت کے باعث اس طرح ناگوار ہے جیسے کہ موت۔ ان دونوں کی جدائی موت ہے۔ روحِ علویہ سے روحِ حیوانی کو تسکین حاصل ہوتی ہے اور دونوں ایک دوسرے سے مانوس ہو کر نفسِ انسانیہ بن گئے۔ اس پیار کے نتیجے میں قلب پیدا ہوا (قلب وہ لطیفہ ہے جس کا محل گوشت والا قلب ہے) گوشت والا قلب عالمِ خلق سے ہے اور لطیف قلب (نورانی) عالمِ امر سے ہے۔ یہ قلب امری روح سے بہت پیار رکھتا ہے۔ (''عوارف المعارف'')

حضرت علی الہجویری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نفس اور روح دونوں لطیف ہیں جو انسان کے قالب (بدن) میں موجود ہیں جیسے دنیا میں شیاطین، ملائکہ، بہشت اور دوزخ ہیں۔ ان میں سے ایک محل خیر اور ایک محل شر ہے۔ جس طرح آنکھ محل نظر ہے، کان محل سمع اور زبان محل ذائقہ ہے۔ اس طرح بہت سے اعیان اور وصف ہیں جو انسان کے بدن میں ودیعت کیے گئے ہیں۔ سِرّ مشاہدہ کا محل ہے۔ سِرّ روح سے زیادہ لطیف ہے اور روح قلب سے زیادہ اشرف ہے۔ سِرّ کے علاوہ خفی اور اخفیٰ بھی زیادہ لطیف چیزیں ہیں۔

فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ۝ (طٰہٰ:۷)

وہ تو بلاشبہ جانتا ہے رازوں کو بھی اور دِل کے بھیدوں کو بھی

ابو القاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نفس انسان کے اوصاف و اعمال کا معلوم ہے۔ (یعنی نفس کی وجہ سے انسان کے اوصاف اور اعمال بنتے ہیں) اور ان کی وجہ سے وہ محمود یا مذموم بنتا ہے۔ علمائے تحقیق کہتے ہیں کہ ارواح اجسام سے ۲۰۰۰ سال پہلے تخلیق کی گئی ہیں۔ شیطان متاع ایمان کو لوٹنے کے لئے انسان کے سامنے کس طرح امید کے محلات تعمیر کرتا ہے۔ (دیکھیں سورہ النساء آیت نمبر ۱۱۸)

لفظ انسان کا اطلاق جسم، روح اور نفس وغیرہ کی تمام چیزوں کے مجموعے پر ہے۔ جیسے قرآن کریم میں فرمایا

گیا ہے۔

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ۞ (الدھر:۱)

بے شک گزرا ہے انسان پر زمانہ میں ایک ایسا وقت جبکہ یہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا۔

مطلب یہ ہوا کہ انسان ذکر کے قابل اس وقت ہوا جب روح اور وجود کے اختلاط سے نفس پیدا ہوا۔ علم اور حال سے واقف ہونا سوائے انسانی وجود کے نہیں ہے ہاں انبیاء علیہم السلام کے لئے یہ قید نہیں۔

بعض بزرگوں نے کہا ہے کہ روح ایک لطیفۂ غیبی ہے جو اللہ کی طرف مشہور مقامات کی سیر کرتی ہے۔ اس کو روحِ سیرانی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ روح ''کن'' کے کہنے سے پیدا ہوئی اور کوئی کہتا ہے کہ اللہ کے جلال و جمال سے اشارۂ تخلیق پا کر پیدا ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے سلام سے مخصوص فرما کر اپنے کلام کے ذریعے زندہ کیا اور وہ لفظ ''کن'' کی ذات سے آزاد ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ روح ایک جوہر ہے اور مخلوق ہے مگر تمام مخلوقات سے لطیف، صاف، منور اور نورانی ہے۔ اس کے ذریعے غیب کی چیزیں نظر آتی ہیں اور اربابِ حقائق کو کشف اس کے ذریعے سے ہوتا ہے اور یہ روحانی سیر سے پوشیدہ ہو جاتی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ انسان پر اللہ تعالیٰ کی قیومیت روح کی قیومیت کے ذریعے سے ہے۔

ابو عبداللہ النباحی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ روح ایک ایسا لطیفہ جسم ہے کہ جو حس اور لمس سے بالاتر ہے۔ اس کے متعلق صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ موجود ہے۔ شیخ ابن عطار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ روحوں کو پیدا کیا گیا پھر اجسام کی صورتیں بنائی گئیں۔ وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ (الاعراف:۱۱) ''اور بے شک ہم نے پیدا کیا تمہیں پھر (خاص) شکل و صورت بنائی تمہاری) حضرت ابو صالح رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ روح انسان کی شکل میں ہوتی ہے مگر وہ انسان نہیں ہوتی۔ بصیرت باطنی والے پہچان سکتے ہیں کہ یہ روح کس کی ہے اور اس کا نام کیا ہے۔

حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عرش کے سوا اللہ تعالیٰ نے روح سے برتر کوئی مخلوق پیدا نہیں فرمائی۔ وہ اتنی عظیم ہے کہ اگر چاہے تو ساتوں زمینوں اور آسمانوں کو ایک لقمے میں نگل جائے۔ اس کو ملائکہ کی صورت پر پیدا کیا اور اس کا چہرہ آدمیوں کے چہرے کی طرح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے روح کو اس قدر تصرف عطا فرمایا کہ جب بحیثیت مجموعی کسی ایک تقاضے پر انسان کا ذہن مرکوز ہو جائے (مراقبہ) تو روح حرکت میں آ جاتی ہے اور جب روح حرکت میں آ جائے تو جس وجود کا وہ خیال کرتی ہے اس کا مظہر سامنے وجود میں آ جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ (بنی اسرائیل:۸۵) ''(انہیں) بتایئے روح میرے رب کے حکم سے ہے)'' یعنی روح اللہ کا امر ہے اور قرآن میں یہ بھی ہے کہ جب اللہ کسی چیز کا ''امر'' (حکم) کرے تو

وہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب روح بھی اللہ کا حکم ہے تو اس کے حرکت میں آ جانے سے بھی تخلیق ہو جاتی ہے اور اس کا وجود لازم ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ مومن وہ ہے جو صاحب تخلیق ہو۔

ذوق تخلیق آتشے اندر بدن ... از فروغ او فروغ انجمن (ج۔ن: ۶۵۷)

(ذوق تخلیق تیرے بدن میں آگ کی طرح موجود ہے اس کی روشنی سے تمام انجمن روشن ہے۔)

پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں ... ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق! (ض۔ک: ۵۱۱)

کیا نفس اور روح سے ایک چیز مراد ہے یا دو؟

قرآن کریم میں جہاں لفظ روح استعمال ہوا ہے وہاں لفظ نفس استعمال نہیں ہوتا۔ مثلاً فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي (الحجر: ۲۹) (تو جب میں اسے درست فرما دوں اور پھونک دوں اس میں خاص روح اپنی طرف سے)" یہاں 'روحی' کی جگہ 'نفسی' نہیں کہا۔ اسی طرح تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي (المائدہ: ۱۱۶) "(یعنی تو جانتا ہے جو میرے نفس میں ہے۔)" یہاں تَعْلَمُ فِي رُوحِي نہیں کہا۔ یقیناً ان دونوں کے مابین تعبیری فرق ہے۔ (کہ لفظ نفس بول کر روح مراد لے یا روح بول کر نفس مراد لے۔ اس بات کا امام ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور تصنیف "التمہید" میں ذکر فرمایا ہے جس کا ترجمہ نیچے دیا ہے۔

إِنَّ اللهَ تَعَالَى خَلَقَ آدَمَ وَجَعَلَ فِيهِ نَفْسًا وَرُوحًا فَمِنَ الرُّوحِ عِفَّتُهُ وَفَهْمُهُ وَحِلْمُهُ وَسَخَاوَتُهُ وَوَفَاؤُهُ وَمِنَ النَّفْسِ شَهْوَتُهُ وَطَيْشُهُ وَسَفَهُهُ وَغَضَبُهُ

بے شک اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا فرمایا اور اس میں نفس اور روح رکھی۔ پس روح کی بدولت آدمی کی عفت، فہم، حلم، سخاوت اور وفا ہے اور نفس کی وجہ سے اس کی شہوت، طیش، جہالت اور غضب ہے۔

انسان کی روح

انسان کی روح کے متعلق کفار مکہ نے حضور اکرم ﷺ سے دریافت کیا کہ روح کیا چیز ہے، تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ بنی اسرائیل میں اس کا جواب یہ فرمایا کہ آپ فرما دیجئے کہ یہ "روح میرے رب کی طرف سے ایک امر ہے اور تم کو اس کا علم نہیں دیا گیا مگر قلیل"۔ (بنی اسرائیل: ۸۵) سورہ یٰسٓ آیت نمبر ۸۲ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا امر تو یہی ہے کہ جب وہ کسی چیز کو چاہتا ہے تو اس سے فرماتا ہے کہ ہو جا اور وہ فوراً ہو جاتی ہے۔ دونوں قسم کی صورتوں میں "امر اللہ" کا لفظ آیا ہے یعنی روح کو فرمایا کہ یہ "امر اللہ" ہے اور جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کے کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے لئے بھی یہی فرمایا "إِنَّمَا أَمْرُهُ" یعنی اللہ کا امر جب (حکم) ہو جائے تو وہ چیز فوراً ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ جب اللہ کا حکم (امر اللہ) ہو جائے تو تخلیق ہو جاتی ہے اور انسان کی روح بھی (جو کہ امر اللہ ہے) جب حرکت میں آ جائے تو بھی تخلیق ہو سکتی ہے۔ چنانچہ جب اللہ کے بندوں

کی روح مراقبے کے ذریعے حرکت میں آ جائے تو اس سے بھی تخلیق ہو جاتی ہے یعنی اگر کسی نیک بندے کی روح کچھ کرنا چاہے تو اس کی روحانی قوت سے وہ اس کے سامنے حاضر ہو سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ روح بھی ''کن'' کی کنجی ہے۔ بنابریں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو وہ قوت دی ہے کہ انسان کی روح جو چاہتی ہے وہ ہو سکتا ہے۔ مشائخ کا کہنا ہے کہ روح میں وہ طاقت ہے کہ وہ جو کچھ چاہے ہو جاتا ہے اور روح اگر چاہے تو زمین اور آسمان کو ایک لقمہ میں ہڑپ کر جائے بھی کہا گیا ہے کہ روح سے زیادہ طاقتور کوئی چیز اللہ تعالیٰ نے نہیں بنائی۔ اس پر اقوال اور احادیث وارد ہیں۔

روح کی بہت سی قسمیں ہیں۔ روح حیوانی جو ہر جاندار میں ہوتی ہے اور روح سیرانی یا روح انسانی صرف انسان ہی میں ہوتی ہے اور سونے کے وقت یہ انسان سے جدا ہو کر مقامات کی سیر کرتی ہے۔ اسی لئے اسے روح سیرانی کہا جاتا ہے۔ روح کے متعلق یہ بات قرآن مجید میں بھی بیان کی گئی ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کی روح کو اللہ تعالیٰ اپنے قبضے میں لے لیتا ہے تو اس پر نیند طاری ہو جاتی ہے اور جب روح کو واپس نہ کیا جائے تو انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ (الزمر: ۴۲) اس حقیقت کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے نیچے دیئے گئے اشعار میں بھی بیان کیا ہے۔

روح کا کچھ مختصر سا بیان ہماری تصنیف ''نشانِ منزل'' میں (صفحہ نمبر ۱۱۰، ۱۱۱) پر بھی دیا گیا ہے۔ عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ عشق میں دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ اگرچہ دو شخصوں کے جسم الگ الگ ہیں۔ دونوں میں مکانی بعد نہیں ہوتا۔ وہ اس کی مثال یوں دیتے ہیں کہ اگر ایک کمرے میں دو شمعیں روشن ہوں تو ان کی روشنیاں ایک دوسرے سے ملی ہوتی ہیں اور وہ ناقابل تقسیم ہوتی ہیں۔ اگر عشق نفسانی نہ ہو تو جس طرح عاشق معشوق کا طالب ہوتا ہے اسی طرح معشوق بھی عاشق کا جویا ہوتا ہے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

کہ ز دل تا دل یقیں روزن بُوَد　نے خُدا و دُور چوں دو تن بُود (۴۱۷/۳)

(اس لئے کہ یقیناً ایک دل دوسرے کے لئے جھروکہ بنتا ہے، وہ دو جسموں کی طرح الگ اور دور نہیں ہوتے۔)

متصل نہ بُود سِفالِ دو چراغ　نورِ شاں ممزوج باشد در مَساغ (۴۱۷/۳)

(دو چراغوں کی بتیاں ملی جلی نہیں ہوتیں، ان کی روشنی پھیلاؤ میں ملی جلی ہوتی ہے۔)

ہیچ عاشق خود نباشد وصلِ جو　کہ نہ معشوقش بود جویائے اُو (۴۱۷/۳)

(کوئی عاشق کسی کے وصل کا خود بخود (طالب) نہیں ہوتا جب تک کہ اس کا معشوق اس کا طالب نہ ہو۔)

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر تمہارے دل میں خدا کی محبت پیدا ہو جائے تو سمجھ لو کہ یقیناً خدا کے ہاں بھی تمہاری محبت موجود ہے۔

در دل تو مہر حق چوں شد دو تو　ہست حق را بے گماں مہرے بتو (۴۱۸/۳)

(اگر تیرے دل میں خدا کی محبت دوگنی ہوگئی تو بے شک خدا کو بھی تم سے محبت ہو جائے گی۔)

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق روح کے خصائص

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بھیڑیوں اور کتوں کی روحیں اور ہیں مگر شیرانِ خدا یعنی اولیائے کرام رحمۃ اللہ علیہم کی روحیں دیگر انسانوں سے بھی اولیٰ تر ہیں۔ روح کے لئے لازم ہے کہ وہ خیر اور شر کو پہچانے اور اللہ کی ناراضگی سے ڈرے اور گریہ وزاری کرے۔ انسان سوتا ہے مگر اس کی روح آفتاب کی طرح آسمان اور زمین کے گرد چکر لگاتی ہے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عام انسان تو کھانے پینے اور سونے میں مشغول رہتا ہے مگر جب وہ ایمان، اسلام اور اخلاص سے مشرف ہو جائے تو وہ ایک چیز دگر بن جاتا ہے اور ملائک سے بھی بہتر ہو جاتا ہے۔ روح کے کمالات کو اللہ تعالیٰ نے مخفی رکھا ہے، اس لئے اس کے لئے جو بھی مثال بیان کی جائے، وہ بے معنی ہوگی۔ آپ نے فرمایا۔

جانِ گرگاں و سگاں ہر یک جداست　متحد جانہائے شیرانِ خداست (۴/۵۲)

(کتے اور بھیڑیوں کی روحوں میں اختلاف ہے مگر شیران خدا کی ارواح سب متحد ہیں)

جاں چہ باشد باخبر از خیر و شر　شاد باحسان و گریاں از ضرر (۶/۲۸)

(روح کی تعریف یہ ہے کہ وہ خیر وشر سے باخبر ہو، نیکی سے خوش اور برائی سے غمگین اور خدا کے حضور رونے والی ہو)

مرد خفتہ روحِ اُو چوں آفتاب　در فلک تاباں و تن در جامۂ خواب (۶/۳۱۸)

(مرد سویا ہوتا ہے مگر اس کی روح مثلِ آفتاب آسمان پر تاباں ہوتی ہے اور جسم لباسِ خواب میں ہوتا ہے۔)

مرد اول بستۂ خواب و خورست　آخرالامر از ملائک بہترست (۴/۳۱۸)

(انسان پہلے صرف کھانا اور سونا چاہتا ہے لیکن ایمان اسلام اور اخلاص سے مشرف ہو کر ملائک سے بازی لے جاتا ہے)

روح چوں مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ مختفی ست　ہر مثالے کہ بگویم منتفی ست (۶/۳۱۸)

(ہماری روح ''اَمْرِ رَبِّیْ'' کے لفظ سے مخفی ہے، اس کے لئے جو بھی مثال ہوگی وہ بے معنی اور غیر حقیقی ہوگی۔)

روح بے قالب نتاند کار کرد

(بغیر جسم کے روح کام نہیں کر سکتی)

اللہ تعالیٰ نے روح اور جسم کو اس طرح پیوست کر دیا ہے کہ دونوں میں تمیز کرنا مشکل ہے۔ مولانا سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شریعت میں روح ایک خاص ہستی انسان کے ظاہری وجود کے اندر ہے، گویا انسان کے اندر ایک اور جسم ہے جو اس کے جسم کے برابر (ہر حال اور کیفیت میں) ہو بہو وہی ہے۔ اگر کوئی

انسان روح کو دیکھ سکتا ہے تو اس کے لئے روح اور جسم کو الگ الگ امتیاز کرنا مشکل ہو جائے گا۔

صوفیہ کے خیال میں یہ جسم ایک مثالی جسم ہے اور روح اس سے برتر ایک اور ہستی ہے۔ قصائی لوگ گردن، پٹھ، شانہ، سینہ اور ران کی شناخت کرتے ہیں۔ چنانچہ گاہک جو چیز مانگتا ہے اسے وہی چیز دیتے ہیں مگر روح اور جسم کے درمیان ایک ایسا ارتباط ہے کہ ان میں اب یہ تقسیم ناممکن ہے۔

روح بے قالب نتاند کار کرد قالبِ بے جان فسردہ بود و سرد (۵/۳۴۴)

(روح قالب کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتی، قالب بے جان بے کار اور ٹھنڈا ہوتا ہے۔)

روح کے متعلق چار سوال

روح کے متعلق عام طور پر چار سوال کئے جاتے ہیں

(۱) روحِ حیوانی کا خاکی جسمانی سے اجتماع کیونکر ہوا۔

(۲) اس اجتماع کے بعد وہ ایک مدت معین تک کیسے رہتے ہیں

(۳) جسم کو کمتر ہونے کے باوجود ظہور میں نظر آنے کی فضیلت کیوں بخشی گئی اور روح کو افضل ہونے کے باوجود مخفی حالت میں کیوں رکھا گیا۔

(۴) انسان صرف روح کا نام ہے یا جسم اور روح کا مجموعہ

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ ان چاروں کا جواب دیتے ہیں۔

ہر دو اُو باشد و لیک از ریع و زرع دانہ باشد اصل و آں کہ ہست فرع (۵/۳۴۴)

(انسان روح اور جسم دونوں کا مجموعہ ہے۔ لیکن پیداوار کھیتی میں سے دانہ اصل ہوتا ہے اور بھوسہ اس کی فرع ہے)

حکماء کہتے ہیں انسان کا مصداق صرف روح ہے، جسم اس کا ایک آلۂ کار ہے۔ جس طرح سوار صرف گھوڑے پر بیٹھنے والے کو کہتے ہیں، گھوڑا اس کا مرکب ہے۔ سوار کے مفہوم میں گھوڑا داخل نہیں۔ چنانچہ انسان روح ہے۔ یہ چوتھے سوال کا جواب ہے یعنی انسان جسم اور روح کا نام ہے۔

حکمت ایں اضداد را باھم بہ بست اے قصاب ایں گرد راں با گردن ست (۵/۳۴۴)

(حکمت نے ان دونوں چیزوں کو باہم کر دیا ہے، اے قصائی یہ ران کا حصہ گردن کے ساتھ پیوستہ ہے۔)

قالبِ بے جان کم از خاک ست دوست روح چوں مغز است و قالب ہچو پوست

(اے دوست! جسم بے روح سے بھی کم رتبہ ہے، روح گویا مغز ہے اور جسم مثل پوست اور پوست مغز کے بغیر نکما ہے)۔(۵/۳۴۴)

تیسرے سوال کا جواب اس شعر میں ہے، یعنی روح اپنی نفاست کی وجہ سے مغز کی مانند ہے اور جسم اپنی

کثافت کی وجہ سے مثل پوست ہے اور مغز ہمیشہ پوست میں مخفی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جسم ظاہر ہے (پوست) اور روح مغز ہونے کی وجہ سے مخفی ہے۔ جسم کا تعلق عالم ناسوت یا عالم شہادت سے ہے۔ (جو اس دنیا کی چیز ہے) اور روح کا تعلق ارواح سے ہے۔ اس دنیا کے آلات اس دنیا کی چیزیں یعنی جسم کو جسمانی حواس ہی محسوس کر سکتے ہیں اور روح چونکہ عالم ارواح سے تعلق رکھتی ہے اس لئے جسمانی آلات حواس اس کو محسوس نہیں کر سکتے۔ انسان کے کسب اعمال کا مقام دنیا ہے اس لئے انسان کو اس دنیا میں مباشر و معالج ہونا ضروری ہے۔ اس اعتبار سے جسم کا ظاہر ہونا لازمی تھا کیونکہ اس کے بغیر کسب اعمال کا ہونا ممکن نہیں ہے۔ روح چونکہ مباشر بالذات نہیں اس لئے اس کا ظہور یا بروز لازمی نہیں۔ اس کے بعد مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ان سوالوں کی تصدیق میں بہت سے ثبوت دیتے ہیں۔

جسم اور روح کے متعلق دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں (یعنی روح اور جسم کو) اس لئے اکٹھا رکھا کہ یہ ایک مدت معین تک مل کر کام کریں ورنہ نہ تو روح کوئی کام کر سکتی ہے اور نہ ہی جسم بلا روح کے کسی حس و حرکت کے قابل ہے۔

مذکورہ بالا شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جسم اگرچہ ظاہر ہے اور روح مخفی لیکن دونوں کے اجتماع سے دنیا کے کاروبار چلتے ہیں۔ یہ پہلے سوال کا جواب ہے کہ روح اور جسم کا اجتماع کیوں ہوا۔ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے روح اور جسم کے اجتماع میں یہ حکمت رکھی ہے کہ انسان کو مرغوب اشیاء کی طلب ہو اور غیر مرغوب اشیاء کو دفع کرنے میں مدد حاصل ہو۔

حکمتے کہ بود حق را ازدواج　　گشت حاصل از نیاز و از لجاج (۵/۴۴۵)

(حق تعالیٰ نے اس اجتماع (روح اور جسم) سے جو حکمت ظاہر فرمائی وہ انسان کے طلب (مرغوبات) اور دفع غیر مرغوبات سے حاصل ہوگئی۔)

موت اور نیند کی حالت میں روح کا قبض ہونا

قرآن کریم کی ''سورۃ زمر'' کی آیت نمبر ۴۲ میں درج ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی روحوں کو جسم سے نکال لیتا ہے اور پھر داخل کر دیتا ہے اور جن کو موت آئے تو ان کی روح کو دوبارہ داخل نہیں کیا جاتا۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے مثنوی شریف میں ایک عنوان قائم کیا ہے۔

تمثیل مرد عارف و تفسیر آیت اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا (الزمر: ۴۲)

مرد عارف کی مثال اور آیت کی تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جانوں کو ان کو موت کے وقت قبض کر لیتا ہے۔

شمۂ زیں حالِ عارف وانمود　　خلق را ہم خوابِ حسّی در رُبود (۱/۷۰)

(عارف کے حال کا کچھ نمونہ (خدا نے حسیات کے ذریعہ سے) ظاہر کر دیا ہے۔ چنانچہ مخلوق کو بھی یہ نیند عارض ہوئی جو ظاہری ہے۔ (سکرو بے خودی مراد نہیں)

عنوان بالا میں ''سورۂ: الزمر'' کی آیت نمبر ۴۲ کی تفصیل مع ترجمہ نیچے دیا جا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ قبض کرتا ہے جانوں کو موت کے وقت اور جن کی موت کا وقت ابھی نہیں آیا (ان کی روحیں) حالت نیند میں پھر روک لیتا ہے ان روحوں کو جن کی موت کا فیصلہ کرتا ہے اور واپس بھیج دیتا ہے دوسری روحوں کو مقررہ معیاد تک۔ بے شک، اس میں (اس کی قدرت کی) نشانیاں ہیں ان کے لئے جو غور وفکر کرتے ہیں۔

اسی طرح حدیث شریف میں آیا ہے کہ نیند بھی موت کی بہن ہے یعنی موت اور نیند کی دونوں صورتوں میں ذی روح کے جسم سے اس کی جان نکل جاتی ہے پھر جس پر موت کا حکم صادر ہوتا ہے اس کی روح تو واپس جسم میں نہیں آتی اور جس پر نیند طاری کی جاتی ہے اُس کی جان واپس بدن میں ڈال دی جاتی ہے۔ تفسیر مدارک میں لکھا ہے کہ ہر شخص کے دو نفس ہیں۔ ایک نفس حیات جو موت کے وقت جسم سے نکل جاتا ہے اور دوسرا نفس تمیز جو خواب کے وقت جسم سے نکلتا ہے۔

جس طرح اَرواح کو ایک وقت خاص میں قیدِ جسم سے آزادی بخش کر بار تکالیف سے سبکدوش کر دیا جاتا ہے اسی طرح ہم کو بھی اگر باطنی خطرات کے پھندے سے آزادی دلائی جائے تو کیا بات ہے۔ خواب میں ارواح جسم سے نکلتی نہیں صرف اتنا ہوتا ہے کہ روح حواس وقویٰ کے واسطہ سے جو تصرف جسم میں کرتی ہے وہ تصرف موقوف ہو جاتا ہے اس کو روح کی آزادی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ روحیں ہر شب اس (عنصری) پنجرے سے چھوٹ جاتی ہیں اور فارغ البال بغیر کسی افسری وماتحتی کے پھرتی ہیں۔

ہر شبے از دامِ تن ارواح را می رہانی می کنی الواح را (۱/۰۷)

(الٰہی) تو ہر شب روحوں کو بدن (کے مضبوط) جال سے آزاد کر دیتا ہے (اور نفس بدن کی) تختیاں (اور کواڑ) کھول دیتا ہے۔ (تاکہ روحیں آزاد ہو جائیں۔)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ابن آدم میں ایک نفس ہوتا ہے اور ایک روح۔ ان دونوں کے درمیان شعاع شمس کی طرح ایک شعاع ہوتی ہے۔ نفس میں عقل وتمیز ہوتی ہے اور روح میں تنفس اور تحرک ہوتا ہے۔ جب بندہ سوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے نفس کو قبض کر لیتا ہے، روح کو قبض نہیں کرتا۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ خواب میں زندوں اور مردوں کی اَرواح باہم ملتی ہیں۔ پس جب تک اللہ کو منظور ہوتا ہے باہم ملاقات وتعارف کرتی ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ اس روح کو روک رکھتا ہے جس پر موت صادر ہو چکی ہے اور دوسری کو اس کے جسم میں واپس بھیج دیتا ہے۔

کلید مثنوی میں لکھا ہے کہ اہل کشف کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو جسم عطا

فرمائے ہیں۔ ایک جسم عنصری کہ دنیا میں رہتا ہے اور آخرت میں محشور ہوگا اور اس پر ثواب وعذاب ہوگا۔ دوسرا جسم مثالی کہ عالم مثال میں موجود ہے اور خواب میں نظر آتا ہے اور روح حقیقی جو ایک امر ربی ہے دونوں جسموں سے تعلق رکھتی ہے اور اس سے روح طبعی مراد نہیں۔ اس کا تعلق صرف جسم عنصری سے ہے۔ پس روح کے بدن سے نکلنے اور عالمِ مثال میں جانے سے مراد یہ ہے کہ جسمِ عنصری سے اس کا تعلق ضعیف ہو کر جسمِ مثالی سے تعلق بڑھ جاتا ہے اور عالمِ مثالی سے بدن میں آنے سے مراد یہ ہے کہ جسمِ مثالی سے تعلق کم ہو کر جسمِ عنصری کے ساتھ زیادہ ہو جاتا ہے۔ الغرض خواب کے اندر جسم سے روح نکلتی ہو یا نفس اور اس کی سیر و حرکت مجرداً ہو یا بہ تعلق جسمِ مثالی، بہرکیف یہ حالت موت کے ساتھ ملتی جلتی ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا ہے: اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ (الروم: ۲۱) یعنی کیفیتِ خواب میں غور کرنے والوں کے لئے بہت کچھ عبرت و استبصار کا سامان ہے تاکہ وہ اس پر قیاس کر کے موت کو یاد رکھیں اور فکرِ عاقبت کریں۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ یہاں خواب کی کیفیت بیان فرماتے ہیں اور چونکہ یہ بیان آیت کے مضمون کے مطابق ہے اس لئے اس بیان کو آیت کی تفسیر کہہ دیا گیا ہے اور یہ بیان عارف کے حال کی تمثیل ہے یعنی جو حالت خواب والوں کی ہوتی ہے وہی عارف کی ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ میں نہیں ہوتا۔

کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ نقش اولیا ست   کو دلیلِ نورِ خورشیدِ خداست (۱/۲۴)

(کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ (میں جو سایہ کا اشارہ ہے اس سے مراد) اولیائے کرام کا وجودِ مبارک ہے، جو خورشیدِ حق کی طرف راہنما ہے۔)

مطلب: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَ لَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَیْهِ دَلِیْلًا (الفرقان: ۴۵) ترجمہ: "کیا آپ نے نہیں دیکھا اپنے رب کی طرف کیسے پھیلا دیتا ہے سایہ کو اور اگر چاہتا تو بنا دیتا اسے ٹھہرا ہوا پھر ہم نے بنایا آفتاب کو اس پر دلیل"۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں جو سایۂ ظاہری کا حکم آیا ہے یہی مثال اولیاء اللہ کی ہے کہ جس طرح سایہ ظاہری سے سورج اور اس کی رفتار کا پتہ چلتا ہے اسی طرح اولیاء اللہ کی ذات بابرکات سے ظِل اللہ میں آفتاب حق یعنی اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ کچھ لوگوں نے اس آیت سے مراد یہ لی ہے کہ اللہ تعالیٰ اَرواح کو دنیا میں کیسے بھیجتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جیسے سایہ دراز ہوتا ہے اسی طرح ایک روح عالمِ اَرواح سے آتی ہے اور وہ کسی مرد کی صلب میں کسی پھل یا سبزی کے ذریعے آتی ہے اور پھر رحمِ مادر میں جاتی ہے۔

روح انسان کو آسمان کی طرف کھینچتی ہے اور نفس زمین کی طرف

روح اگرچہ جسم میں مقید اور علائق جسمانیہ میں محصور نظر آتی ہے مگر اس کا اصلی مقام اعلیٰ و ارفع ہے۔ اس

لئے وہ ان علائق سے آزاد ہونے اور اپنی اصل کی طرف واصل ہونے کی متقاضی ہے۔ انسان روح کو بار علائق کے نیچے دبائے رکھتا ہے جو اس کے لئے مانعِ ترقی ہیں اور پرواز سے روکتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے انسان میں دو قوتیں ودیعت کی ہیں۔ ایک قوت ملکیہ یعنی فرشتوں کے ساتھ مناسبت رکھنے والی طاقت اور اس کے پیدا ہونے کی صورت یہ ہے کہ روحِ حیوانی جو بدن انسان میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ روحِ انسانی سے فیض یاب ہو اور وہ اس کے فیض کو قبول کر لے اور اس سے مغلوب ہو جائے۔ دوسری قوت بہیمیہ یعنی چوپایوں سے مناسبت رکھنے والی قوت اور یہ نفس حیوانی سے پیدا ہوتی ہے جو تمام حیوانات میں مشترک ہے اور یہ قوت روحِ طبیعی کے قویٰ کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ ان دونوں قوتوں میں کھینچا تانی اور مزاحمت ہوتی رہتی ہے۔ قوت ملکی عروج چاہتی ہے اور بلندی کی طرف لے جاتی ہے۔ اگر قوت بہیمی غالب آ جائے تو قوت ملکی دب جاتی ہے اور اگر قوت ملکی کا غلبہ ہو جائے تو قوت بہیمی ہار کر رہ جاتی ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

روح می بردت سوئے عرش بریں سوئے آب و گل شدی در اسفلیں (۱/۸۴)

(روح تو تجھے عرشِ بریں کی طرف لے جاتی (لیکن) تو پانی اور مٹی کی طرف نچلے درجوں میں آ گیا۔)

انسان کی روح حیوانوں اور دیگر مخلوق سے برتر ہے

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے علم کی مثال دے کر یہ بات ثابت کی ہے کہ انسان کا علم چونکہ زیادہ ہے اس لئے وہ حیوانات کی روح سے افضل ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حیوانات کو صرف جزئیات کا علم ہے اور انسان کو کلیات کا بھی علم ہے۔ جس طرح ایک انسان اپنے قوی دشمن سے کوئی چوٹ کھا کر فرار ہوتا ہے اسی طرح ایک جانور بھی لاٹھی کی ضرب کھا کر بھاگ جاتا ہے کیونکہ یہاں ایک امر محسوس مؤثر ہے جس سے متاثر ہونے میں انسان اور جانور دونوں برابر ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس جس طرح دور سے لاٹھی اٹھانا انسان کے لئے موجب خوف و حذر ہے اسی طرح حیوان کے لئے بھی باعث فرار ہے کیونکہ یہاں ایک امرِ متوہم یعنی توقع اذیت مؤثر ہے اور اس میں بھی دونوں مساوی ہیں، لیکن اگر فرض کریں کہ کسی مکان میں ایک انسان اور ایک چوپایہ موجود ہوں اور چھت کے شہتیر سے ٹوٹنے کی آواز آئے تو انسان فوراً بھاگ جائے گا مگر چوپایہ کی طبیعت میں کوئی امر بھاگ جانے کا محرک نہ ہوگا کیونکہ اس مقام پر خوف و حذر کا باعث ایک امر کلی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب چھت کا شہتیر ٹوٹتا ہے تو ضرور ساری چھت زمین پر آ گرتی ہے اور اس کے نیچے دب کر ہلاک ہونے کا قوی اندیشہ ہوتا ہے۔ انسان مدرک کلیات ہے۔ اس نے اس امر کلی کو ادراک کر لیا بھاگ کھڑا ہوا، چوپایہ مدرک کلیات نہیں صرف محسوسات کا ادراک کر سکتا ہے اس لئے اسے کوئی

محسوس نہیں ہوا اور کھڑا رہا۔ اس سے انسان کے علم کا حیوان کے علم سے بدارج زیادہ ہونا ثابت ہوا۔ جب ہمارا علم ان کے علم سے بڑھ کر ہے تو ہماری زندگی بھی ان کی زندگی سے افضل و برتر ہو گی۔

بعض خاص اعتبارات سے انسان ملائکہ سے افضل ہے۔ مگر علم اور احاطۂ معلومات کے لحاظ سے عامہ بشر سے ملائکہ بڑھ کر ہیں کیونکہ انسان میں حس حیوانی ہے حس ملکی نہیں جب کہ فرشتوں میں حسِ ملکی ہے حیوانی نہیں اور حس ملکی ادراک مغیبات میں حس حیوانی سے بڑھ کر ہے۔ واضح رہے کہ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ ملائکہ انسان سے افضل ہیں یا انسان ملائکہ سے افضل ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد کو پیدا فرمایا تو ملائکہ نے عرض کیا ''اے پروردگار تو نے ایک ایسی مخلوق پیدا کی ہے جو کھاتے ہیں، پیتے ہیں، نکاح کرتے ہیں اور سوار ہوتے ہیں۔ پس ان کے لئے دنیا مخصوص کر دے اور ہمارے لئے آخرت۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں نے جس کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی ہے اسے میں اس مخلوق کے برابر نہیں بناؤں گا جو صرف لفظ کن کے کہنے سے موجود ہو گئی۔ (مشکوٰۃ) ابن العربی کہتے ہیں اس سے ثابت ہوا کہ انسان اور ملائکہ کرامات اور قربت میں برابر نہیں ہیں بلکہ انسان کی بندگی بڑھ کر ہے۔ (حاشیہ مشکوٰۃ شریف)

جانِ ما از جانِ حیواں بیشتر　　از چہ! زاں رو کہ فزوں دارد خبر (۲/ ۳۱۳)

(دیکھو ہماری جان چوپایہ (جانوروں) کی جان سے بڑھ کر ہے (یہ) کیوں؟ اس لئے کہ ہماری جان زیادہ علم رکھتی ہے)۔

جان نباشد جز خبر در آزموں　　ہر کہ را افزوں خبر جانش فزوں (۲/ ۳۱۳)

(آزمائش میں علم حاصل نہ کرنے کے سوا اور کسی چیز سے جان ثابت نہیں ہوتی، جس کا علم بڑھا ہوا ہے، اس کی جان بڑھی ہوئی ہے)۔

انسانوں اور حیوانوں کی ارواح میں فرق

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حیوانات اور انسان کی روح میں بہت فرق ہے اور اسی طرح انبیاءؑ اور اولیاءؒ کی روحوں میں بھی فرق ہے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ روحِ انسانی کی تعریف میں فرماتے ہیں کہ تمام حیوانات جن میں انسان، درندے، پرندے، طیور اور وحوش وغیرہ شامل ہیں، شعور اور روحِ حیوانی میں مشترک ہیں۔ شعور کے معنی ہیں اپنے فائدے اور نقصان اور راحت و زحمت کا احساس کرنا اور روحِ حیوانی وہ ہے جس سے جسم زندہ ہے اور اس کے تصرف سے وظائف جسم پورے ہوتے ہیں۔ پس یہ دونوں چیزیں انسان اور غیر انسان میں پائی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ عقل اور روح انسانی خاص انسان میں پائی جاتی ہیں۔ باقی حیوان اس

سے بہرہ مند نہیں۔ عقل کے خواص میں سے ایک ادراکِ کلیات اور حصول معارف بھی ہے جس سے باقی حیوانات کو مطلق تعلق نہیں۔ پھر انبیاء اور اولیاءؒ کی روح و عقل اور بھی پایہ کی ہوتی ہے، جو انوارِ الٰہیہ ہونے کے لحاظ سے باقی تمام انسانوں کی روح و عقل سے ممتاز ہوتی ہے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شعور اور روح حیوانی اگرچہ انسان یا غیر انسان یعنی باقی تمام حیوانات میں موجود ہو تو وہ ذریعہ اتحاد نہیں بلکہ روح انسانی اور عقل ذریعہ اتحاد ہے اور انبیاءؑ اولیاءؒ کی روح و عقل واثق ترین ذریعۂ اتحاد ہے۔ اِس سے باہر عام انسان کی ارواح بھی متحد نہیں۔ روح حیوانی ایک جسم لطیف بخاری ہے جو غذاؤں سے متولد ہوتا ہے اسی کو مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں باد کہا ہے۔ اِس لحاظ سے کہ اس کی بقا سانس اور ہوا پر موقوف ہے۔ روحِ انسانی اس سے الگ اور برتر چیز ہے جو خاص انسان میں پائی جاتی ہے۔ اس لئے روحِ حیوانی اتحاد نہیں رکھتی، اتحاد اگر ہے تو روح انسانی میں ہے۔ اتحاد کا مطلب ایک جان کا ہونا جیسے انبیاء کو ایک جان کہا جاتا ہے اور مومنوں کو بھائی بھائی کہا جاتا ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

جانِ حیوانی ندارد اتحاد تو مجو ایں اتحاد از روحِ باد (۵۲/۴)

(حیوانی جان اتحاد نہیں رکھتی ہے، تُو یہ اتحاد ہوائی روح میں تلاش نہ کر)

باز غیرِ عقل و جانِ آدمی ہست جانے در ولی و در نبی (۵۲/۴)

(پھر انسان کی عقل اور جان کے علاوہ، ولی اور نبی میں اور جان ہے۔)

روحِ انسانی کے متعلق مغربی فلسفہ اور سائنسی نقطۂ نظر

اس جگہ روح کے متعلق صرف مغربی ممالک کا نقطہ نظر پیش کیا جارہا ہے۔ اسلام میں جو کچھ روح کے متعلق کہا جاچکا ہے ان کا تذکرہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں۔ مصر چونکہ تہذیب کا سب سے پہلا مرکز ہے وہاں کے لوگوں نے ہزاروں سال پہلے اس بات پر غور کیا کہ انسان کیا ہے؟ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جارہا ہے؟ ہر سال پھولوں کے کھلنے اور ختم ہو جانے پر ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ حیات ایک جاودانی اور غیر فانی حقیقت ہے۔

۱۵۴۳ میں یورپ کے پرنیکی نے انسان کو ایک روحانی حقیقت ثابت کیا ہے، اس کے بعد گلیلیو، کیپلر، نیوٹن اور بہت سے سائنس دانوں اور فلسفیوں نے یہ انکشاف کیا کہ مردہ کبھی مرتا نہیں اور اب تک مختلف روحانی موضوعات مثلاً روح، جسم لطیف، دعا، کاسمک ورلڈ، (The cosmic world) حیات بعد الممات اور تعلق باللہ وغیرہ پر ہزاروں کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ یورپ میں اس روحانی علم کی مقبولیت کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ اس موضوع پر کئی ایک کتب ایسی بھی لکھی گئیں ہیں کہ جن کے ستائیس طبائع (ایڈیشن) صرف چند ماہ

میں ہی چھپ گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ علم جو مسلمانوں کی بدولت تھا، اب رفتہ رفتہ یورپ میں جارہا ہے اور ہوسکتا ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد روحانی معاملات میں بھی وہ مسلمانوں سے پیش رفت حاصل کرلیں۔

مسلمانوں کا روحانی علم تو حضرت آدم علیہ السلام سے ہی جاری وساری ہے اور بعثت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم (چھٹی صدی عیسوی) کے بعد اس علم میں بہت کچھ دیکھا، لکھا اور پڑھا گیا ہے۔ بہت سا علم سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا مسلمانوں کے علوم روحانی کے متعلق کچھ لکھنا اس کتاب کی بساط سے باہر ہے البتہ یورپ نے اب یہ تسلیم کرلیا ہے کہ ہمارے جسمِ خاکی کے اندر ایک اور جسم ہے جو پانی کے بخارات سے بھی زیادہ لطیف ہے اور حقیقی انسان وہی ہے۔ یہ جسم خاکی فانی ہے اور وہ لطیف جسم غیر فانی ہے۔ (یہ تمام نظریات چھٹی صدی میں ہی مسلمانوں میں موجود تھے) نیند میں یہ روح جسم سے نکل کر گھومتی پھرتی ہے اور کسی بیماری یا حادثہ کا شکار ہوتو یہ بندھن ختم ہوجاتا ہے اور موت واقع ہوجاتی ہے۔ (دیکھیں سورۂ زمر آیت ۴۲) گویا کہ جسمِ خاکی اس کی عارضی قیام گاہ ہے۔

مغربی سائنس دانوں نے معلوم کیا ہے کہ انسان کے جسم سے مختلف رنگ کی شعاعیں نکلتی ہیں۔ جو جسم کے اردگرد ایک ہالہ بنالیتی ہیں۔ (aura) ان کا رنگ انسان کے اعمال کے مطابق مختلف ہوتا ہے، یہ وہ حجاب ہے جسے قرآن کریم میں غلف (غلاف) غشاوہ (پردہ) یا سدًا (دیوار) کہا گیا ہے جس شخص کا ہالہ سخت غلاف کی طرح ہوجائے تو اس پر نہ نصیحت اثر کرتی ہے، نہ دعا اور نہ ہی کاسمک ورلڈ (cosmic world) کے عمدہ اثرات اندر آسکتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے بیان کیا ہے کہ ایسے شخص پر شیطان مسلط ہوجاتا ہے۔ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ﴿الزخرف:۳۶﴾ (تو ہم مقرر کردیتے ہیں اس کے لئے ایک شیطان، پس وہ ہر وقت اس کا رفیق رہتا ہے۔) یہ شعاعیں جسم لطیف اور جسم خاکی دونوں سے خارج ہوتی ہیں۔ کاسمک ورلڈ سے مراد ایتھر ہے اور جس کو ہم عوالم، ناسوت، ملکوت، جبروت وغیرہ کہتے ہیں)

ہر بات اور ہر عمل کا ریکارڈ کاسمک ورلڈ میں موجود ہے

فضا میں کئی شفاف دیواریں (layers) موجود ہیں۔ ایک ایسی دیوار بھی ہے جس کی کاسمک شعاعوں میں دس ارب وولٹ کی بجلی موجود ہوتی ہے۔ اگر یہ دیوار نہ ہوتی تو زمین پر زندگی ختم ہوجاتی اور لوگ جھلس کر مرجاتے۔ ایک دیوار ایسی ہے جو ایتھر کی لہروں کو روک کر زمین کی طرف لوٹا دیتی ہے (Ionosphere) اور اسی کی بدولت ہم ریڈیو سے آواز سن سکتے ہیں۔

مثبت بجلی (+ve) کشش زمین، روح اور ایتھر وہ راز ہیں جن کا علم انسان کے پاس بہت قلیل ہے۔

انیسویں صدی میں معلوم ہوا کہ ایتھر ہر جگہ موجود ہے۔ یہ ایک لطیف سا بادل ہے جو عرش سے تحت الثریٰ تک

پھیلا ہوا ہے۔اس میں کوئی خلا یا وزن نہیں غالباً ذیل کی آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَ زَيَّنّٰهَا وَ مَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝ (ق:6)

کیا اُنہوں نے نہیں دیکھا آسمان کی طرف جو اُن کے اُوپر ہے ہم نے اسے کس طرح بنایا ہے اور اسے کیسے آراستہ کیا ہے اور اس میں کوئی شگاف نہیں۔

اگر پانی کے تالاب میں ایک پتھر پھینکا جائے تو اس میں لہریں پیدا ہو کر کناروں کی جانب روانہ ہوں گی مگر پانی وہیں رہے گا۔دوسرے لفظوں میں پانی انتقالِ امواج کا وسیلہ بنتا ہے۔اسی طرح ایثر بھی ہماری متعدد خدمات سرانجام دے رہا ہے۔یہ ہمارا قاصد ہے جو ہمارے پیغامات آناً فاناً ہزارہا میل کی مسافت پر پہنچ رہا ہے۔نیز عملِ بصارت ایثر ہی کی بدولت وقوع پذیر ہو رہا ہے۔اس درمیانی واسطے یا وسیلے کا نام ایثر ہے۔ آفتاب ایثر میں ہیجان پیدا کرتا ہے اور یہ ہیجان ہمارے دماغ تک پہنچ کر روشنی اور حرارت کا احساس پیدا کرتا ہے۔مقناطیس ایک سوئی کو اپنی طرف کھینچتا ہے چنانچہ سوئی اور مقناطیس کے درمیان واسطے کا نام ایثر ہے۔ ایک روسی سائنس دان کا خیال ہے کہ ایثر گیس سے بھی زیادہ لطیف کوئی چیز ہے، جس کے ذرات ہر جسم میں داخل ہو سکتے ہیں۔ایثر کی لہریں روشنی کی رفتار یعنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ چلتی ہے سورج کی روشنی ۸ منٹ میں زمین پر پہنچتی ہے۔جس سے علماء کا خیال ہے کہ روشنی نہیں چلتی بلکہ ایثر کی لہریں چلتی ہیں۔یہ ایثری لہریں منفیوں کی گردش سے پیدا ہوتی ہیں۔ان منفیوں کی مختلف گردش فی سیکنڈ کے حساب سے ہمارے ذہن میں مختلف رنگوں کا احساس پیدا ہوتا ہے۔(مثلاً ایک انچ کے فاصلے میں اگر ۳۷۰۰۰ لہریں ہوں او رمنفیوں کی گردش ۴۴۰ ملین فی سیکنڈ ہو تو نارنجی رنگ کا احساس ہوگا۔)

سائنس دانوں نے جو روحانیت پر کام کر رہے ہیں۔ایثر کو کئی حصوں میں تقسیم کیا ہے اور کاسمک ورلڈ اور آسٹرل ورلڈ اس کے مختلف علاقہ جات ہیں۔خواب میں انسان کا جسمِ لطیف (روح) جسمِ خاکی سے نکل کر آسٹرل ورلڈ (ایثر) میں چلا جاتا ہے، جہاں وہ عجیب وغریب مناظر دیکھتا ہے اور کبھی اپنے عزیزوں سے ملاقات کرتا ہے۔اس دنیا میں جو کچھ ہے اس کی لطیف شکل آسٹرل ورلڈ میں بھی موجود ہے۔کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ دنیاوی اشیاء پر جب روشنی پڑتی ہے تو وہ روشنی دنیائے ایثر میں جاتی ہے تو وہاں اس چیز کی مثل شکل اختیار کر لیتی ہے تو گویا زمین پر جو چیز موجود ہے وہ آسٹرل ورلڈ میں بھی موجود ہے۔کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہر چیز کی اصل، عالمِ بالا میں جسمِ لطیف کی شکل میں موجود ہے اور اس کا جسمِ کثیف دنیا میں ہے۔حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں عالمِ مثال کے وجود کا تذکرہ کیا ہے اور اس کا مشاہدہ بھی کیا ہے۔

اگر ہم فضا کی بلندی میں جا کر دیکھیں تو زمین کی چیزوں سے ٹکرانے والی روشنی نظر آئے گی اور چونکہ

ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چلتی ہے اس لئے سورج کے طلوع ہونے کا پہلا کنارہ ہمیں زمین پر آٹھ منٹ بعد نظر آئے گا کیونکہ وہ روشنی ۹ لاکھ ۵۰ ہزار میل کا فاصلہ ۸ منٹ میں طے کرے گی۔ اسی طرح اگر آپ فضا میں بہت زیادہ بلندی پر چلے جائیں گے تو سینکڑوں سال پہلے کے مناظر نظر آ سکتے ہیں۔ اگر ہم فضا میں ایسی جگہ پر پہنچ جائیں جہاں زمین کی لہریں جو ۶۲۲ء یا ۶۸۱ء، ۱۵۶۰ء یا ۱۹۴۷ء میں روانہ ہوئی تھیں اور آج وہاں پہنچی ہیں تو بصورت اول ہمیں حضور اکرم ﷺ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ جاتے ہوئے نظر آئیں گے۔ بصورتِ ثانی واقعہ کربلا کا منظر نظر آئے گا، بصورتِ ثالث جلال الدین اکبر دہلی کے تخت پر متمکن نظر آئے گا اور بصورتِ رابع قائداعظم گورنر جنرل ہاؤس میں نظر آئیں گے۔ یہ اس لئے کہ یہ ایثر یا عالم مثال میں ہر چیز کی لاتعداد تصاویر محفوظ رہتی ہیں اور وقت کے ساتھ مسافت طے کرتی ہیں۔ نہ صرف تصاویر بلکہ تمام آوازیں بھی ایثر میں موجود رہتی ہیں۔ امریکہ کے ریڈرز ڈائجسٹ برائے مئی ۱۹۵۹ء میں ایک مضمون تھا کہ امریکہ کی ایک ٹیلیوژن کمپنی جو ۱۹۴۱ء میں ختم ہو گئی تھی لیکن اس کے ختم ہونے کے سترہ سال بعد (اپریل ۱۹۵۸ء) میں ٹیلیوژن کے sets میں اس کمپنی کا پروگرام دوبارہ آنے لگا، جس سے لوگوں کو یقین ہو گیا کہ آواز کبھی فنا نہیں ہوتی۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ۝ (ق:۱۸) ''وہ نہیں نکالتا اپنی زبان سے کوئی بات مگر اس کے پاس ایک نگہبان (لکھنے کے لئے) تیار ہوتا ہے''۔

جب ہمارا ہر عمل ہر قول اور ہر ارادہ فضا میں موجود رہتا ہے تو پھر کوئی شخص اپنے کیے ہوئے اعمال سے کیسے انکار کر سکتا ہے۔ سورہ یٰسٓ کی آیت ۶۵ میں اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ (آج ہم مہر لگا دیں گے کفار کے مونہوں پر اور بات کریں گے ہم سے اُن کے ہاتھ) اور اُن کے کیے کی شہادت دیں گے۔ آج یہ طاقت تو سائنس نے حاصل کر لی ہے کہ سیٹلائٹ دنیا کی ہر چیز کی فوٹو لے لیتا ہے۔ اگر روس کسی کے طیارے کو مار گراتا ہے تو امریکہ روس کے انکار کرنے کی صورت میں اس طیارے کے گرانے کی تصویریں (بمعہ اس جہاز کی تصویر کے جس نے اس کو گولی مار کر گرایا تھا، ثبوت کے طور پر دکھا دیتا ہے، راجیو گاندھی پر سری لنکا میں قاتلانہ حملہ ہوا تو اس پر حملہ کرنے کی تصویر اخباروں میں سیٹلائٹ کے ذریعے دکھا دی گئی۔ اس مثال سے خدا کے نظام قدرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سیٹلائٹ زمین کے ہر حصے کی ہر لمحہ کی تصویر کو اپنے دماغ میں محفوظ رکھ لیتا ہے اور آپ جب چاہیں تو ان گزرے ہوئے لمحات کی تصاویر سکرین پر دیکھ سکتے ہیں۔ یہ وہی نظام ہے جو انسانی دماغ میں بھی موجود ہے کہ آپ لاکھوں حادثات، واقعات اور تحریرات کو ذہن میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ جب آپ کبھی کوئی بات بھول جاتے ہیں تو آپ اس کو یاد کرنے کے لئے بے چین ہو جاتے ہیں اور یہ بے چینی کی لہریں ہوا میں جا کر اس چیز کو تلاش کر کے اپنا پیغام لہروں میں بھیج دیتی ہیں، تو وہ بھولی ہوئی بات آپ کے دماغ میں آ جاتی ہے۔ اسی

طرح اگر ایک آدمی پہلی بار سائیکل چلاتا ہے تو ڈرتا ہے، مگر اس کا شوق جو بذات خود ایک انرجی ہے لہروں کی شکل میں ایتھری طاقتوں کو متاثر کرتا ہے اور وہاں سے کوئی طاقت جواب میں ایسی لہریں بھیجتی ہے کہ اس کا خوف دور ہو جاتا ہے اور وہ شخص سائیکل چلانا سیکھ لیتا ہے۔ عالم مثال (آسٹرل ورلڈ) کے بہت سے طبقات ہیں، جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں لیکن اس کتاب کے طبقات السموات میں اس کی زیادہ تفصیل دی گئی ہے۔

عالمِ ناسوت

آسٹرل باڈی روح انسانی سے سب سے پہلے اس طبقہ میں جاتی ہے۔ بدکار لوگوں کی روحیں ہزاروں سال نچلے طبق میں پھرتی رہتی ہیں اور نیک روحیں طبقات بالا میں چلی جاتی ہیں۔

عالمِ جبروت

اس کو اعراف بھی کہتے ہیں۔ اس میں درمیانے قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ عالم ناسوت والے سزا کے بعد اس میں آتے ہیں۔ عالم اعراف تو جبروت کا نچلا علاقہ ہے جو نہ جنت میں شامل ہے اور نہ ہی دوزخ میں۔

عالمِ ملکوت

صالحین کا مقام اس میں ہوتا ہے۔

عالمِ لاہوت

زیادہ نیک اَرواح کا مقام ہے اس کے علاوہ ہاہوت، عالم ہو، وغیرہ بھی ہیں۔ آج کل اس بات پر تجربات جاری ہیں کہ فضا کی محفوظ آوازیں اور تصویریں دوبارہ ٹی وی سکرین پر دیکھی جا سکیں اور اس میں کچھ کامیابیاں بھی ہوئی ہیں۔ کچھ وفات شدہ روحوں کے دھندلے سے نقوش انگلینڈ میں خاص ٹی وی پر دیکھے گئے ہیں۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

روح پر عبادت کا اثر ہوتا ہے۔ نماز اور دیگر عبادات اللہ تعالیٰ کے سامنے نیازمندی اور دعا کا اظہار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کو شفا کہا ہے۔ اب یورپ والوں نے بھی ثابت کیا ہے کہ ہر بولے جانے والے حرف کا ایک خاص رنگ اور خاص طاقت ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں نے دیکھا کہ "الف" کا رنگ سرخ "ب" کا نیلا "د" کا سبز اور "سین" کا رنگ زرد ہے ان کے اثرات کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ کچھ الفاظ ایسے ہیں جن سے بیماریاں جاتی رہتی ہیں۔ وحی الٰہی کا ہر لفظ قوت کا ایک خزانہ ہے یہی وجہ ہے کہ آج یورپین پادری (لیڈ بیٹر) اور کچھ دیگر سائنس دان تعویذ یا ٹوٹکے میں زبردست مقناطیسی اثر ملاحظہ کرتے ہیں۔

لیڈ بیٹر نے لکھا ہے کہ ہر لفظ ایتھر میں ایک خاص شکل اختیار کر لیتا (جس سے نفرت یا محبت وغیرہ کے جذبات پیدا ہوتے ہیں) اس پادری نے زبور کے مختلف الفاظ پڑھنے سے بیماریوں کی شفا کا معائنہ کیا۔ الہامی کتاب کے الفاظ کا ورد کرنے سے دکھ درد اور پریشانیوں سے نجات مل جاتی ہے۔ ہمارے مذہب کے مطابق قرآن کریم کی تلاوت اور اسمائے الٰہی کے ورد سے یہ توقع بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ غیر الہامی الفاظ میں وہ اثر کہاں جو اصل آخری اور صحیح اسلامی کتاب قرآن مجید میں موجود ہے۔ ہر لفظ ایک ایٹم کی طرح ہے اور اس کے اندر جذبات کی بجلیاں پنہاں ہیں اور ان کا اثر عالم خاکی اور عالم لطیف (بدن اور روح) دونوں پر ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی گالی دے دے تو سننے والے کے بدن میں یہ الفاظ ارتعاش یا آگ لگا دیتے ہیں۔ یہ گالی الفاظ ہی کا مجموعہ ہے جو اثر پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح بعض واعظ اپنی تقریر سے انسان کے رونگٹے کھڑے کر دیتے ہیں اور کسی قابل جرنیل کی تقریر مردہ سپاہیوں کے تن میں نئی روح پھونک دیتی ہے اور وہ موت سے بھی ٹکرا جاتے ہیں۔ یہ الفاظ اور ان کی ادائیگی کے کمال کی ہی مثالیں ہیں۔

روح کی اقسام

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ روح اور بدن کے احکام اور حالات مختلف ہیں۔ روح جنت میں ہونے کے باوجود اپنی قبر سے اور اس میں مدفون اپنے بدن سے اتصال رکھتی ہے اور اوپر جانے اور نیچے اترنے میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے میں اس کی سرعت رفتار کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ روح کی مندرجہ ذیل اقسام ہیں۔ (۱) آزاد روحیں (۲) مقید روحیں (۳) علوی روحیں (۴) سفلی روحیں

صاحبِ مزار زائرین کو پہچانتا اور سلام کا جواب دیتا ہے

(احادیث صحیحہ کثیرہ سے یہ ثابت ہے کہ صاحب مزار اپنے زائر کو پہچانتا ہے اور اس کی آواز کو سنتا ہے ان میں سے چند حدیثیں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ، امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر محدثین نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے کہا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب بندے کو اس کی قبر میں رکھا جاتا ہے اور اس کے دوست دفن کرنے کے بعد واپس لوٹتے ہیں تو وہ ان کے جوتوں کی آواز سنتا ہے۔

(۲) ابن ابی شیبہ طبرانی، ابوحبان، حاکم اور بیہقی (جیسے جلیل القدر محدثین) نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت کی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ جب میت کو اس کی قبر میں رکھا جاتا ہے تو وہ اسے دفن کر کے واپس لوٹنے والوں کی جوتیوں کی آہٹ سنتی ہے۔

(۳) حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا کہ جب کوئی شخص اپنے بھائی کی قبر کی زیارت کے لئے جاتا ہے اور اس کے پاس بیٹھتا ہے تو صاحب مزار کو اس سے بڑی راحت ہوتی ہے اور وہ اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔

(۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب کوئی شخص اپنے جاننے والے کی قبر پر آتا ہے اور اسے سلام کہتا ہے تو صاحب مزار اس کے سلام کا جواب بھی دیتا ہے اور اسے پہچانتا بھی ہے اور اگر کسی ایسے شخص کے مزار پر آتا ہے جس سے جان پہچان نہیں تھی اور اسے سلام کہتا ہے تو قبر والا اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔ (البیہقی)

(۵) بعینہ یہی الفاظ علامہ ابن عبدالبرؒ نے بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہا حضور نبی کریم ﷺ سے نقل کیے ہیں۔

سماعِ موتیٰ

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے سماع موتیٰ کے متعلق اپنی تحقیق کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں یعنی صالحین کا سماع موتی پر اجماع اور اتفاق ہے۔ ان سے درجۂ تواتر تک ایسی روایات مروی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ میت کی زیارت کے لئے جب کوئی شخص آتا ہے تو میت کو اس کی آمد کا علم بھی ہوتا ہے اور اس سے اسے بڑا سرور حاصل ہوتا ہے۔

علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الملہم شرح صحیح مسلم میں اس مسئلہ کی خوب تحقیق کی ہے۔ متعدد احادیث اور اقوال علماء تحریر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: متعدد روایات سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ صحیح اور کثیر التعداد احادیث سے سماع موتی کا مسئلہ ثابت ہے۔ واللہ اعلم۔

یہ ثابت کرنے کے بعد کہ میت سنتی ہے علامہ مذکورہ نے ان آیات کا مفہوم واضح کیا ہے جن سے بظاہر سماع موتی کی نفی سمجھی جاتی ہے۔ وہ مولانا محمد قاسم صاحب کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ افعال کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) افعال عادیہ یعنی جن کا وقوع عادت کے مطابق اسباب وعلل کے پائے جانے سے ہوتا ہے۔ مثلاً کسی نے کسی پر بندوق سے فائر کیا اور مر گیا، ایسے افعال کی نسبت اس بندوق چلانے والے کی طرف کی جاتی ہے۔

(۲) افعال غیر عادتیہ: جو ظاہری اسباب وعلل کے پائے جانے کے بغیر وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ جیسے کسی نے کنکریوں کی مٹھی پھینکی اور ایک لشکر جرار کو شکست دے دی۔ ایسے افعال کی نسبت اس ظاہری فاعل کی طرف نہیں کی جاتی بلکہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف کی جاتی ہے۔ جیسے وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (الانفال: ۱۷) اور (اے میرے محبوب) نہیں پھینکی آپ نے (وہ مٹھی خاک) جب آپ نے پھینکی بلکہ اللہ

تعالیٰ نے پھینکی۔

یہاں بھی میت زیر زمین دفن ہے۔اس کے اوپر منوں مٹی کا انبار لگا ہے۔نہ وہاں ہوا کا گزر ہے اور نہ روشنی کا۔آواز کو کسی تک پہنچانے کے لئے ظاہری سبب ہوا ہے۔جو یہاں قطعاً مفقود ہے،اس لئے میت اگر سنتی ہے تو اس کو سنانے والا وہ زائر نہیں کیونکہ ہوا کے فقدان کے باوجود آواز کو سنا دینا کسی انسان کے بس کا روگ نہیں چنانچہ اس آیت میں اس بات کی نفی نہیں کی گئی کہ میت نہیں سنتی بلکہ اس کی نفی کی گئی ہے کہ تم نہیں سنا سکتے۔ وَ مَاۤ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ﴿۲۲﴾ (فاطر:۲۲)"(اور آپ نہیں سنانے والے جو قبروں میں ہیں)"لیکن اس سے یہ تو ہرگز ثابت نہیں کہ جسے تم نہیں سنا سکتے اسے خداوند عالم بھی نہیں سنا سکتا۔اس کی قدرت اسباب اور علل کی محتاج نہیں۔وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

سید انور شاہ صاحب فیض الباری شرح بخاری میں رقم طراز ہیں۔میں (سید انور شاہ) کہتا ہوں کہ سماع موتی کے ثبوت کے لئے اتنی احادیث ہیں جو درجۂ تواتر کو پہنچ چکی ہیں اور حدیث صحیح میں ہے کہ جب کوئی شخص میت کو سلام کرتا ہے تو وہ اس کا جواب دیتا ہے اور اگر صاحب مزار اس کو دنیا میں پہچانتا تھا تو اب بھی وہ اس کو پہچان لیتا ہے۔

اکابر علماء دیوبند کی تصریحات کا مطالعہ آپ نے فرمالیا۔معلوم نہیں اب ان کے شاگرد اور پیروکار اپنے ان بزرگوں کے عقیدہ کے برعکس سماع موتی کا انکار کیوں کرتے ہیں اور اولیائے کرام رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے مزارات پُرانوار پر حاضر ہونے والوں پر کفر و شرک کا فتویٰ کیوں لگاتے ہیں۔

بعض علمائے کرامؒ نے فرمایا ہے کہ آیات میں مطلق سماع کی نفی نہیں بلکہ ایسے سماع کی نفی ہے جو مفید اور نفع رساں ہو۔امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

سِمَاعُ مَوْتٰی کَلَامُ الْخَلْقِ قَاطِبَۃً قَدْ صَحَّ فِیْھَا لَنَا الْاٰثَارُ بِالْکُتُبِ
وَاٰیَۃُ النَّفْیِ مَعْنَا ھَا سِمَاعُ ھُدًی لَا یَسْمَعُوْنَ وَ لَا یَصْغُوْنَ لِلْاَدَبِ

میت کا لوگوں کے کلام کے سننا صحیح دلائل سے ثابت ہے اور جن آیات میں سنانے کی نفی کی گئی ہے اس سے مراد ایسا سننا ہے جو ہدایت کا باعث ہو اور نفع رساں ہو۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا جنگ بدر میں کفار کے مردوں سے خطاب

جنگ بدر میں جب بڑے بڑے مشرکین مکہ ہلاک ہوئے تو ابوجہل،عتبہ وغیرہ مشرکین کی لاشیں ایک گڑھے میں پھینک دی گئیں۔حضور علیہ الصلوۃ والسلام وہاں تشریف لائے اور ایک ایک کا نام لے کر فرمایا۔

یَا فُلَانَ بْنَ فُلَان ، یَا فُلَانَ بْنَ فُلَان ھَلْ وَ اے فلاں فرزند فلاں،اے فلاں پسر فلاں!

جَدْتُّمْ مَا وَعَدَ كُمْ رَبُّكُمْ حَقًّا فَاِنِّيْ وَجَدْتُّ مَا وَعَدَنِيْ رَبِّيْ حَقًّا؟

ذلت اور عذاب کا جو وعدہ تمہارے رب نے تم سے کیا تھا کیا اس کو تم نے سچا پالیا؟ بے شک میرے رب نے نصرت و کامرانی کا جو وعدہ میرے ساتھ فرمایا تھا، میں نے اسے سچا پالیا۔

(بخاری شریف: رقم الحدیث ۱۱۵۸)

قَالَ لَهٗ عُمَرُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَا تَخَاطَبُ مِنْ اَقْوَامٍ قَدْ جِيْفُوْا فَقَالَ وَالَّذِيْ بَعَثَنِيْ بِالْحَقِّ مَا اَنْتُمْ بِاَسْمَعَ لِمَا اَقُوْلُ وَ لٰكِنَّهُمْ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ جَوَابًا

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! آپ ایسے لوگوں کو خطاب فرما رہے ہیں جو بے جان لاشے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا مجھے اُس کی قسم جس نے مجھے حق کے ساتھ مبعوث فرمایا میری بات تم ان سے زیادہ نہیں سن رہے۔ لیکن وہ جواب دینے کی طاقت نہیں رکھتے۔

اس حدیث سے صراحۃً ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان تو مسلمان کفار و مشرکین کے مردے بھی سنتے ہیں۔

سماع موتی کے منکرین نے اس حدیث کے جواب میں کہا ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس حدیث کی تاویل کی ہے، اس لئے یہ حدیث اس مسئلہ کی دلیل نہیں بن سکتی۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ جمہور محدثین نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی اس تاویل کو قبول نہیں کیا بلکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کو قبول کیا ہے کیونکہ اسے بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تائید حاصل ہے جو خود اس موقع پر بارگاہِ رسالت میں حاضر تھے اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا وہاں خود موجود نہ تھیں۔ نیز ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے سماع موتی کی نفی پر اس آیت سے فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَ لَا تُسْمِعُ (الروم: ۵۲) جو استدلال کیا ہے اس کا جواب جمہور محدثین نے بایں الفاظ دیا ہے۔

تم ان کو کوئی ایسی بات نہیں سنا سکتے جو انہیں نفع پہنچائے یا تم خود اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر انہیں کچھ نہیں سنا سکتے۔ کتب حدیث میں ایسی روایات بھی ملتی ہیں جن سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا اس مسئلہ سے رجوع ثابت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ علامہ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یہ حدیث روایت کی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنے بھائی کی قبر کی زیارت کے لئے جاتا ہے اور اس کے پاس بیٹھتا ہے تو صاحب مزار کو اس سے بڑی تسکین اور راحت ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ وہاں سے اٹھ جائے۔ اس روایت سے بھی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا رجوع ثابت ہوتا ہے۔

علامہ عثمانی نے سماع موتی کی تحقیق کرتے ہوئے علامہ محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ صاحب روح المعانی کی یہ عبارت بھی نقل کی ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے۔

حق یہ ہے کہ مردے یقیناً سنتے ہیں اور اس کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ (فتح الملهم جلد دوم ۹۔ ۴۷۸)

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت کو صحیح فرمایا ہے کیونکہ اس کی تائید دیگر شواہد کثیرہ سے ہوتی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر: ۴۳۸)

حجرہ مقدسہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دفن ہونے سے پہلے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا یہ معمول تھا کہ جب زیارت کے لئے حاضر ہوتیں تو اوڑھنی کا زیادہ اہتمام نہ کرتیں۔ فرماتیں یہاں ایک میرے سرتاج ہیں اور دوسرے میرے والد محترم، مجھے پردہ کی ضرورت نہیں۔ لیکن حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے وہاں دفن ہونے کے بعد جب سلام عرض کرنے کے لئے حاضر ہوتیں تو بڑے اہتمام سے سر کو اوڑھنی سے ڈھانپ کر حاضر ہوتیں۔

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اپنی شہرۂ آفاق تفسیر میں اس آیت کی توضیح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

یعنی سلف صالح کا اس بات پر اجماع ہے اور متواتر روایات سے یہ مسئلہ ثابت ہے کہ میت اپنے زیارت کرنے والے کو پہچانتی ہے اور اس سے خوش ہوتی ہے۔

موت کے بعد روح کا مقام

موت کے بعد حشر تک روح کا مقر اور مقام کہاں ہے؟ اس کے متعلق علامہ ابن قیمؒ نے تقریباً سولہ قول لکھے ہیں۔ جن میں سے ایک قول یہ ہے کہ موت کے بعد روح بھی عدم محض ہو جاتی ہے۔ جسم کی دوسری صفات علم، قوت وغیرہ کی طرح (حیاۃ) بھی اس کی ایک صفت ہے۔ جسم کے فنا ہو جانے سے جس طرح دوسری صفات فنا ہو جاتی ہیں اسی طرح روح بھی فنا ہو جاتی ہے لیکن یہ قول سراسر باطل ہے۔ کتاب وسنت اور اجماع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علاوہ دلائل عقلیہ بھی اس کی تردید کرتے ہیں۔

يَآ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِيٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿۲۸﴾ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿۲۹﴾ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴿۳۰﴾

(الفجر: ۳۰،۲۹،۲۸،۲۷)

اے نفس مطمئن واپس چلو اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تُو اُس سے راضی (اور) وُہ تجھ سے راضی پس شامل ہو جاؤ میرے (خاص) بندوں میں اور داخل ہو جاؤ میری جنت میں۔

یہاں خطاب روح مطمئنہ کو ہو رہا ہے اور اس وقت ہو رہا ہے جب وہ جسم سے الگ ہوتی ہے اگر روح کا اپنا مستقل وجود نہ ہوتا، تو پھر اس سے خطاب کیسے کیا جاتا۔ احادیث کثیرہ سے یہ بھی ثابت ہے کہ روح کا اپنا

مستقل وجود ہے۔

وَهُوَقَوْلٌ لَمْ يَقُلْ بِهِ اَحَدٌ مِّنْ سَلَفِ الْاُمَّةِ وَلَامِنَ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِيْنَ وَلَااَئِمَّةِ الْاِسْلَامِ (ابن قیم)

یعنی یہ ایسا قول ہے جسے نہ سلف صالحین میں سے کسی نے تسلیم کیا ہے نہ صحابہ، تابعین اور ائمہ اسلام کا یہ خیال ہے۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اس بارے میں یہ قول ہے کہ مومنین کی ارواح برزخ میں ہیں اور جدھر چاہتی ہیں جاتی ہیں۔

برزخ کے لفظ کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں اَصْلُهُ الْحَاجِزُ بَيْنَ الشَّيْئَيْنِ دو چیزوں کے درمیان جو چیز حائل ہو اس کو برزخ کہا جاتا ہے۔ یہاں برزخ سے مراد دنیا اور آخرت کا درمیانی جہان ہے۔

تیسرا قول: مومنین کی روحیں حضرت آدم علیہ السلام کے دائیں جانب ہیں اور کفار کی روحیں آپ علیہ السلام کی بائیں جانب۔

چوتھا قول: ابو محمد بن ابی حزم کا قول یہ ہے کہ اجسام کے پیدا کرنے سے پہلے روح جہاں تھی موت کے بعد لوٹ کر پھر وہاں ہی چلی جاتی ہے۔

پانچواں قول: بعض نے یہ کہا کہ مومنین کی روحیں اللہ تعالیٰ کے پاس ہوتی ہیں۔ اس سے زیادہ ان لوگوں نے مزید کہنے کی جرأت نہیں کی اور جتنا کچھ قرآن میں ہے ادب واحترام کے تقاضے کے پیش نظر اتنا کہنے پر ہی توقف کرتے ہیں۔

چھٹا قول: بعض کی رائے یہ ہے کہ ارواح اپنی مزارات کے اوپر ہوتی ہے۔

ساتواں قول: اہل ایمان کی روحیں اگر کوئی گناہ کبیرہ یا قرض رکاوٹ نہ بنے تو وہ جنت میں ہوتی ہیں [illegible] اپنے جسد خاکی پر ان کی توجہ اس طرح ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے مزارات پر حاضر ہو تو وہ [illegible] ہیں اور اگر کوئی سلام کہے تو اس کا جواب دیتے ہیں۔ اس شبہ کا ازالہ کرنے کے لئے روح اگر جنت [illegible] علیین میں ہو تو اپنی قبر پر آنے والے کو اتنی دور سے کس طرح پہچانتی ہے اور کس طرح اس کا سلام [illegible] کیونکر اس کا جواب دیتی ہے۔ علامہ ابن قیمؒ لکھتے ہیں: تو اس چیز کو تسلیم کرنے سے تنگ دل [illegible] جب ملاء اعلیٰ میں ہے اور جنت میں سیر وسیاحت میں مصروف ہے تو وہ کس طرح اپنی قبر پر آ[illegible] سلام سنتی ہے پھر کس طرح نزدیک ہو کر سلام کرنے والے کو جواب دیتی ہے کیونکہ روح کی [illegible] جسم کی شان اور۔ علامہؒ نے بڑی شرح وبسط سے اس چیز کو ثابت کیا ہے کہ روح کے لئے [illegible] مسافت کی دوریاں کوئی [illegible] نہیں رکھتیں۔ وہ ایک [illegible] میں ملاء اعلیٰ سے زمین پر اور زمین سے [illegible] سکتی ہیں۔ وہ لوگ [illegible]

ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ کیا تم نہیں جانتے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب شب معراج حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مزار کے پاس سے گزرے تو انہیں اپنی قبر میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے دیکھا اور جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مرکب ہمایوں افلاک کی بے پایاں رفعتوں کو سمندِ ہمت سے روندتا ہوا چھٹے آسمان تک پہنچا تو وہاں پھر موسیٰ علیہ السلام کو اپنا منتظر پایا۔ جبریل امین علیہ السلام ایک لحہ پہلے آسمان کی بلندیوں پر پر کشا نظر آتے تو دوسرے لمحے بارگاہِ رسالت میں دست بستہ بیٹھے ہوئے حاضر دکھائی دیتے لیکن ان امور کو ہر آدمی تسلیم نہیں کرتا۔ صرف انہی سعید روحوں کو یہ استعداد بخشی جاتی ہے جو ان حقائق کو سمجھتے بھی ہیں، تسلیم بھی کرتے ہیں اور ان پر یقین بھی رکھتے ہیں۔

مرتبہ کے لحاظ سے روحوں کی حالت

اس کے بعد علامہ نے ایک فصل تحریر کی ہے جس میں انہوں نے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ ساری روحوں کی حالت یکساں نہیں ہوتی بلکہ قوت اور ضعف، کبر اور صغر کے اعتبار سے ہر ایک کا رتبہ الگ الگ ہوتا ہے۔ عظیم اور کبیر روحوں کا مقام اتنا بلند ہوتا ہے کہ ان سے کم درجہ والی روحیں نہیں پا سکتیں۔ روحوں کے درمیان یہ تفاوت ہم اس مادی جہان میں بھی مشاہدہ کرتے رہتے ہیں اور جب روح جسمانی علائق اور مادی پابندیوں سے رستگاری حاصل کر لیتی ہیں، تو اسے تصرف، قوت، ہمت اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق میں جو مقام نصیب ہوتا ہے، وہ ان روحوں کو نصیب نہیں ہوتا جو جسم کے اس قفس میں قید ہیں اور جنہیں مادی دنیا کی زنجیروں نے جکڑ رکھا ہے۔ عظیم روحیں جب قفس عنصری کو توڑ کر آزاد ہوتی ہیں تو ان کی شان اور علو ہمتی کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا اور اس سے ایسے ایسے کارہائے نمایاں ظہور پذیر ہوتے ہیں جن کا تصور کرنا بھی ہمارے بس کی بات نہیں۔ پھر علامہ موصوف لکھتے ہیں کہ بارہا لوگوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواب میں زیارت کی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ بھی ہیں اور انہوں نے کفار و مشرکین کے جرار لشکروں کو شکست فاش دی اور ان کو مغلوب و مقہور کر دیا حالانکہ مسلمانوں کی فوج ہر لحاظ سے کمزور تھی۔ علامہ کی عبارت غور سے پڑھیے۔ آپ کا ایمان تازہ ہو جائے گا۔

ان کے علاوہ علامہ نے متعدد دوسرے قول ذکر کیے ہیں جن میں سے بعض سراسر باطل ہیں اور بعض کی کچھ تاویل کی جا سکتی ہے۔ آخر میں علامہ نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ ان متعدد اقوال میں تمہارے نزدیک راجح قول کون سا ہے جس کے مطابق اعتقاد رکھا جائے تو جواب میں کہا جائے گا کہ ساری روحیں یکساں نہیں ان میں بڑا تفاوت ہے اور اسی تفاوت کی وجہ سے ان کی منزلیں جدا جدا ہیں اور مختلف احادیث میں روحوں کے مختلف ٹھکانوں کا جو ذکر ہے اس میں تضاد نہیں بلکہ مختلف ارواح کے مختلف مقامات

ذکر کیے گئے ہیں۔

روح ہر جگہ پہنچ سکتی ہے۔

بخاری شریف کی ایک حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جب کوئی شخص کسی بزرگ کی قبر پر جا کر سلام عرض کرتا ہے تو اس کی روح خواہ کسی جگہ ہو آنِ واحد میں (بجلی کی رفتار سے تیز) اپنی قبر پر حاضر ہو جاتی ہے اور اس کے سلام کا جواب دیتی ہے۔ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ مکتوبات میں لکھتے ہیں۔ کہ جب ان بزرگوں سے مدد طلب کی جاتی ہے تو ان کی روحیں حاضر ہو کر مدد فرماتی ہیں۔ آپ نے خود مکتوب شریف میں بہت سی روحوں کے حاضر ہونے کا ذکر فرمایا ہے۔ حضرت عبید اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ ان کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے آپ کے ساتھ مل کر حج کیا اور کچھ کہتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ بغداد میں دو ماہ تک رہے ہیں، حالانکہ حضرت عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ اس دوران کبھی اپنے گھر سے باہر بھی نہیں نکلے۔

خواجگانِ نقشبند فرماتے ہیں کہ اگر تمہیں اپنے شیخ سے محبت ہو تو وہ شیخ تمہیں اپنے دیدار سے مشرف کرتا رہے گا اور اگر تمہارے دل میں مرشد کے متعلق تھوڑی سی بھی کراہت پیدا ہو جائے تو فیض کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ جس طرح آئینہ سورج کے سامنے ہوتا ہے تو اس کی حرارت کو حاصل کر لیتا ہے اور دوسری تمام صورتوں کے حجاب نظر سے اٹھ جاتے ہیں۔ یہ طریق حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ماخوذ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بے انتہا محبت تھی اور اسی رابطۂ محبت سے وہ فیض حاصل کرتے رہتے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو بھی اپنی تمام عنایات اور نوازشات سے مزین فرمائے، آمین بجاہ، سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

روحانی معراج، رابطہ اور قربِ الٰہی وغیرہ مکانی نہیں

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ روحانی حقائق نہ زمانی ہیں اور نہ مکانی ہیں۔ روح کا سفر اور اس کا عروج و زوال بھی کوئی مکانی حیثیت نہیں رکھتا۔ ذات و صفات الٰہیہ اور روحانی حقائق کے لئے اگرچہ مادی دنیا کے اعتبار سے سمجھانے کی زمانی اور مکانی تشبیہوں میں بیان کیا جاتا ہے مگر حقیقت میں ان پر زمان و مکاں کا اطلاق نہیں ہوتا۔ خدا کے پاس جانے یا اس کا قرب حاصل کرنے کے معنی یہ نہیں کہ مادی افلاک کو عبور کر کے اس کے پاس پہنچنے کی ضرورت ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ ایک جگہ فرما چکے ہیں۔

عشق نے بالا نہ پستی رفتن است عشق حق از جنسِ ہستی رستن است

(عشق یہ نہیں کہ کوئی اوپر جائے یا نیچے۔ خدا کا عشق اپنی ہستی کی جنس سے الگ ہونا ہے۔)

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سفر ارتقائی ہوتا ہے۔ ایک ادنیٰ حالت سے دوسری بہتر حالت تک ترقی کرنے کو رجعت الی اللہ کہتے ہیں۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ اس سفر کو سمجھانے کے لئے ایک مثال پیش کرتے ہیں

کہ انسان کی نطفہ سے لے کر پیدائش اور بلوغت تک جو ترقی ہے وہ سیر و سفر مکانی نہیں۔ دنیا کے زمان و مکان تو مادی دنیا کی حقائق کو سمجھانے کے لئے آلات ہیں۔ عالم ملکوت اور عالم لاہوت کی باتوں کو دنیاوی مثالوں سے واضح نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ۔

ایں دراز و کوتہ اوصاف تن است رفتنِ ارواح دیگر رفتن است

(یہ دراز اور کوتاہ ہونا جسم کے اوصاف ہیں روحوں کا جانا اور ہوتا ہے (جسم کا جانا اور ہوتا ہے۔)

سیر جاں بے چوں بود در دور و دیر جسمِ ما از جاں بیاموزید سیر

(روح کی سیر بے مثال ہوتی ہے اور اس میں دور اور دیر کی اصلاحیں نہیں۔ ہمارا جسم روح سے سیر کرنا سیکھتا ہے)

روح کا علم

روح کے علم کے متعلق کافی تفصیلات طبقات السموات میں بھی دیئے جا چکی ہیں۔ خلاصے کے طور پر نیچے بھی دیئے جارہی ہیں۔

صوفیاء کرام کا قول ہے کہ قرآن کی درج ذیل آیت میں روح کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا "کوئی جاندار بھی ایسا نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ نے پکڑا ہوا ہے اسے پیشانی کے بالوں سے"۔ (ھود:۵۶)

اس میں چوٹیوں سے مراد روح ہے اور اس آیت کا یہ مطلب ہوا کہ تمام جانداروں کی روحیں اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں۔ روح کے متعلق مختصر معلومات درج ذیل میں (۱) روح ایک شعاع ہے جو انسان کے قلب سے ہوتی ہوئی ام الدماغ سے نکل کر عالمِ ارواح تک پہنچتی ہے اور اس کی wave length (لہر کا طول) اس قدر چھوٹی ہے کہ کسی آنکھ کو نظر نہیں آسکتی۔ البتہ اہلِ بصیرت اس کو دیکھ سکتے ہیں۔ انسان کے ساتھ منسلک روح کے حصہ سے لے کر عالم ارواح تک موجود روح کی شعاع میں چھوٹے چھوٹے ذرات الیکٹران کی طرح موجود ہیں اور ہر ذرہ میں انسان کا پیکر مثال بھی موجود ہے۔ جس کو قرین یعنی ہمزاد بھی کہتے ہیں اور وہ ذرہ مثالی جسم ہوتا ہے جو انسان کا بالکل ہم شکل ہوتا ہے۔ گویا انسان کا ہمزاد اس کی روح کے ہر ذرہ میں موجود ہے اور اگر وہ انسان جو روحانی تصرف رکھتا ہے وہ اپنی روح کو جب چاہے، جہاں چاہے آنِ واحد میں حاضر کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کئی اولیائے کرام رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کو بیک وقت کئی جگہوں پر دیکھا گیا ہے۔ نیک روح کا جسم سے تعلق ٹوٹ جائے تو موت واقع ہو جاتی ہے اور نیک آدمی کی روح ایک لحظہ میں اپنے مقام موعود پر پہنچ جاتی ہے جہاں اس نے مرنے کے بعد جانا ہوتا ہے۔ اگر وہ روح نیک نہیں تو اپنے اس مقام سے دور رہے گی حتیٰ کہ عذاب کے بعد اپنے مقام پر پہنچے گی۔ کفار اور گناہ گاروں کی روحیں

مقام معاد تک پہنچتی ہیں اور ان کا یہ مقام جہنم میں ہوتا ہے۔

(۱) روح ہر وقت انسان کے ساتھ رہتی ہے اور سریع السیر ہے۔

(۲) کوئی چیز نان کنڈکٹر یعنی غیر موصل بن کر روح کو کاٹ نہیں سکتی اور یہ ہر چیز میں سے گزر جاتی ہے۔

(۳) انسان جو علم حاصل کرتا ہے وہ روح کو منتقل ہوتا رہتا ہے۔ جس میں بصیرتِ باطنی بھی شامل ہے۔

(۴) انسان کا قلب جن چیزوں سے متاثر ہوتا ہے روح بھی متاثر ہوتی ہے مگر جسم اور روح میں ایسا تضاد ہے کہ جو چیز روح کے لئے آرام دہ ہے وہ جسم کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے اور جس بات میں جسم کو مسرت حاصل ہو روح کو اس سے تکلیف ہوگی۔ جن چیزوں سے جسم موٹا ہوتا ہے روح کمزور ہو جاتی ہے۔

(۵) نیک یا بد اعمال کے کردار میں جو طاقت یا کمزوری ہوتی ہے۔ وہ بھی روح کو ملتی ہے اور روح حسب اعمال یا تو کوئی طاقت حاصل کرتی ہے یا کمزور ہو جاتی ہے۔

(۶) اپنی قوت کی وجہ سے روح جہاں چاہے چشم زدن میں کبھی بغیر جسد کے کبھی بمع جسم کے جا سکتی ہے۔

(۷) مقام موعود سے نیچے والا روح کا حصہ اوپر والے حصہ سے قضا وقدر کے احکامات سے متاثر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فیوض بھی روح کی وساطت سے انسان تک پہنچتے ہیں گویا اللہ کی قیومیت بندہ پر روح کی قیومیت سے واقع ہوتی ہے۔ کفار یا گناہگار لوگوں کی اَرواح موت کے بعد جب جسم سے الگ ہوتی ہیں تو عالمِ برزخ کی طرف سفر شروع کرتی ہیں اور ان کی رفتار گناہوں کے بوجھ کی وجہ سے اس قدر کم ہوتی ہے کہ وہ سینکڑوں سال تک اسی دنیا میں ہی بھٹکتی رہتی ہیں اور اس طرح اپنے اعمال کے مطابق دوزخ میں زیادہ دیر تک رہتی ہیں۔ گنہگار مسلمانوں کی روحیں بالآخر جہنم سے نکل کر جنت میں جاتی ہیں۔

(۸) روح ان تمام طبقات سے گزر کر جائے گی جن کا ذکر اس باب میں الگ کر دیا گیا ہے۔

(۹) روح دوسرے طبقات میں عالم مثال کی سیر کر سکتی ہے جو کبھی تو خواب کی صورت میں دیکھتی ہے یا سکر کی حالت میں۔

(۱۰) روح پر کیفیت فنا و بقا روحانی مجاہدات کے باعث حاصل ہوتی ہے۔

روح مخلوق ہے اور محدث ہے

چونکہ روح کے متعلق یہ فرمایا گیا کہ "مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ" یعنی اللہ کے حکم سے ہے تو یہ لفظ "کُن" سے پیدا کی

گئی لہٰذا محدث ہے۔ قدیم تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ مخلوق اس کی معرفت سے عاجز ہے۔ ابو عبد اللہ بناجی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "روح ایک لطیف جسم ہے جسے حس نہیں پا سکتی اور لمس (چھونے) سے بزرگ تر ہے اور کوئی چیز اس کو مس نہیں کر سکتی اور اس سے زیادہ اس کی تعبیر کی جا سکتی ہے کہ وہ موجود ہے" شرح تعرف میں ہے کہ حضرت عبد اللہ کا روح کو لطیف جسم کہنا بھی روا نہیں اس سلسلے میں طویل بحث کی گئی ہے جو عوام کی فہم میں آسانی سے نہیں آ سکتی۔

احادیث میں ہے کہ موت کے وقت نیک لوگوں کی روح آرام سے نکالی جاتی ہے اور فرشتہ اس کو ساتھ لے جاتا ہے۔ اس کے نکلنے سے خوشبو پھیل جاتی ہے اور بدوں کی روح کو عزرائیل علیہ السلام بہت سختی اور تکلیف سے نکال کر بدی کے فرشتے کے حوالے کر دیتے ہیں جس سے نکلنے کے بدبو پھیل جاتی ہے۔

ابن عطار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ روحوں کو جسموں سے پہلے بنایا گیا (جیسا کہ فرمایا: وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ (الاعراف:11) "اور بے شک ہم نے پیدا کیا تمہیں پھر (خاص) شکل وصورت بنائی"۔ آئمہ دین اور اہل معرفت کا اس پر اتفاق ہے کہ ارواح جسموں سے پہلے پیدا کی گئیں اور بندے کا جسم جب رحم میں پیدا کیا جاتا ہے تو روح کو اس میں داخل کر دیا جاتا ہے اور جب بندہ مر جائے تو نیک بندے کی روح کو علیین میں پہنچاتے ہیں اس پر سند سورۃ المطففین کی آیت نمبر ۱۸ ہے: كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ﴿۱۸﴾ (یہ حق ہے نیکوکاروں کا صحیفۂ عمل علیین میں ہوگا۔) سورہ الفجر آیت ۲۹ میں روح مطمئنہ کا رب کی طرف جانا مذکور ہے۔ ایک حدیث شریف میں روحوں کو لشکر مجندہ (جمع کئے ہوئے جھنڈ کے جھنڈ) کہا ہے اور کئی روحوں کا سونگھنا اور دوسری روحوں سے دوستی کرنا یا کئی روحوں کا دوسری روحوں سے ناآشنا رہنے کا ذکر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے روحوں کو پیدا فرما کر ان کو صف بہ صف کھڑا کیا۔ تمام ارواح سے مقدم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی روح تھی اور باقی انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین اور عام مسلمانوں کی ارواح اپنے اپنے مقام پر کھڑی کی گئیں۔ جو روحیں ایک صف میں تھیں ان کا تعارف ہوا اور یہ روحیں دنیا میں آ کر آپس میں ملیں اور جو اس صف میں ناآشنا تھیں۔ وہ دنیا میں بھی ناآشنا ہیں اللہ تعالیٰ نے روحوں کو آدم علیہ السلام کی پشت سے نکال کر ان کو خطاب فرمایا۔ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ "کیا میں نہیں ہوں تمہارا رب؟" (الاعراف: ۱۷۲) یہ خطاب مختلف صفات کے ساتھ ہوا (مثلاً صفتِ کرم، ہیبت، عدل، فضل وغیرہ) ہر روح نے اس خطاب سے اپنا اپنا مشرب پا لیا۔ (ہم مشرب دنیا میں مل بیٹھتے ہیں) حدیث شریف میں بھی ہے کہ لوگ جانوروں کی جنس کی طرح ہیں اور اپنی جیسی شکل کی طرف اڑتے ہیں۔ سمجھ لیں کہ روح نورانی ہے، یہ سماوی عرشی اور علوی ہے جبکہ نفس ارضی، سفلی اور شیطانی ہے لیکن قلب ان دونوں کے درمیان منقلب ہے (پھرنے والا) اس کو قلب اسی لئے کہتے ہیں کہ یہ گھوم جاتا ہے۔ کبھی روح کی طرف اور کبھی نفس کی طرف۔ جب نفس کی طرف آتا ہے تو اس کے ساتھ ایک ہو

جاتا ہے (اس کے رنگ میں رنگا جاتا ہے) اور جب روح کی طرف آتا ہے تو اس کے ساتھ ایک ہو جاتا ہے اور نیکی کی طرف رجوع کرتا ہے بلکہ نفس پر غالب آجاتا ہے اور اس سے نیکی کے کام سرزد ہوتے ہیں لیکن جب نفس کے ساتھ ایک ہو جائے تو برائی کی طرف رجوع کرتا ہے اور روح پر غالب آجاتا ہے اور اس سے مخالفت شرع اور معصیت کے کام سرزد ہوتے ہیں۔ اس طرح کبھی نفس روح سے محجوب ہو جاتا ہے اور کبھی روح نفس سے محجوب ہو جاتا ہے۔

ایک حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قلب مومن پر دن رات میں تین سو ساٹھ بار نظر فرماتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جب شیطان اور نفس انسان کے قلب و روح پر غلبہ پالینے کے لئے تاریکی ڈالتے ہیں تو حق تعالیٰ فرشتے کے ذریعے روح کی مدد فرماتا ہے اور انسان اس مدد کو قبول کر لے تو شیطان اور نفس پر غلبہ پالیتا ہے۔ صوفیاء کا قول ہے کہ حق تعالیٰ کی نظر مشاہدہ کی تاثیر ہے جب انسان غیر حق کی طرف نظر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اور قلب کے درمیان حجاب آجاتا ہے اور پھر جب اللہ تعالیٰ کی نظر پڑتی ہے تو وہ حجاب جل جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ نظر حجاب کے جلانے میں مدد کرتی ہے اور مدد حاصل کرنا اس صورت میں ہے کہ انسان اپنا قلبی رجوع نیکی کی طرف کرے۔

باب ۹

تصوف اور طریقت

تصوف کا مختصر تعارف

علم تصوف وہ علم ہے جس سے تزکیۂ نفس، تصفیۂ اخلاق اور تعمیر ظاہر و باطن کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ اس علم کی غایت وصول الی اللہ اور سعادت ابدی کا حاصل کرنا ہے۔ تصوف میں صفات باری تعالیٰ سے متصف ہونا اور اسلام کے درجۂ احسان کے مطابق اپنے اعمال کو ڈھالنا ہے۔ یہ اسلام کی روح، دین کی جان اور عشق الٰہی کا قبلہ ہے اور اس میں اعلیٰ مقام اس وقت ہی حاصل ہو سکتا ہے جب سالک سختی سے شریعتِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع کرے۔ شریعت پر عمل پیرا ہونے سے ہی ولیوں کے دل منور ہوتے ہیں اور شریعت کی اتباع سے ہی وہ نفس کی لذات سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ آئندہ صفحات میں مختلف مشائخ کی بیان کردہ تصوف کی تشریح پیش کی جائے گی۔

تصوف دین اسلام پر چلنے کا اعلیٰ ترین راستہ ہے اور اس کا علم حاصل کرنے کے لئے اگر پوری زندگی بھی صرف کر دی جائے تو وہ بھی کم ہوگی۔ اس موضوع پر صوفیائے کرام نے بہت کچھ لکھا ہے اور اگر علمِ تصوف پر تسلی بخش اور سیر حاصل بحث کی جائے تو کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ حال ہی میں مولانا محمد یعقوب مصطفائی نے ''شرح تصوف لمذہب التصوف'' پر پانچ جلدیں لکھی ہیں۔ چند لوگوں نے تصوف کی مخالفت میں لکھنا اور کہنا شروع کیا ہے اور یہ لوگ تصوف کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ان کی یہ کیفیت اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ تصوف کی دنیا میں انہوں نے ایک قدم بھی نہیں رکھا اور محض کسی شخص سے متاثر ہو کر اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے سے اب تک اس قدر جلیل القدر ہستیاں تصوف کے ساتھ وابستہ رہیں جن کا نام تصوف کی ہی وجہ سے زندہ ہے اور اگر تصوف اسلام میں ناپسندیدہ ہوتا تو یہ لوگ کبھی تصوف کی راہ پر نہ چلتے۔ ان ہستیوں کے نام احاطہ تحریر میں لانا مشکل امر ہے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ اس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اکابرینِ اہلِ بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد پاک و ہند کے علاوہ دیگر ممالک میں حضرت اویس قرنی، حضرت ابراہیم بن ادھم، حضرت ابوالحسن خرقانی، حضرت ابوالحسن نوری، حضرت بایزید بسطامی، حضرت بشر

حافی، حضرت داؤد طائی، حضرت حسن بصری، حضرت ذوالنون مصری، حضرت سری سقطی، حضرت سہل بن عبداللہ، حضرت سفیان ثوری، حضرت شقیق بلخی، حضرت عبداللہ بن مبارک، حضرت معروف کرخی، مولانا جلال الدین رومی، حضرت رابعہ بصری، حضرت شہاب الدین سہروردی، حضرت امام غزالی، شیخ عبدالقادر جیلانی، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت بابا فرید الدین گنج شکر، حضرت محی الدین ابن عربی، حضرت نظام الدین اولیاء، حضرت ابوالحسن ہجویری، حضرت بوعلی قلندر، حضرت بہاؤ الدین بن عثمان زکریا، حضرت بہاؤ الدین نقشبندی، حضرت باقی باللہ، حضرت شمس الدین سیالوی، حضرت فخر الدین عراقی، حضرت مجدد الف ثانی، حضرت خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین اور دیگر سینکڑوں مشائخ کبار منسلک رہے ہیں تو سلسلۂ تصوف سے سوائے راندۂ بارگاہ الٰہی اور کون روک سکتا ہے۔ اس طریقہ تصوف کو ناپسند کرنے کی گستاخی کرنے والا عقل سلیم کا حامل نہیں کہا جا سکتا بلکہ اتنی بلند و بالا شخصیتوں کے مقابلہ میں معترضین تصوف کی مخالفت ایسے ہی ہے جیسے شیر کی دم سے چند چوہے کھیل رہے ہوں۔

تصوف اپنے عملی اعتبار سے وہ طریقِ کار ہے جس کی ابتدا آغازِ اسلام میں ہی ہو چکی تھی (اگرچہ اس کو تصوف کے نام سے موسوم نہ کیا جاتا تھا) اس سلسلے میں ایک مضمون کہ تصوف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے ہی شروع ہو چکا تھا زیر نظر کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں اور اس کے مقدمے میں یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ تصوف کا آغاز تو اس وقت ہو چکا تھا جب آدم علیہ السلام کو خلیفۃ اللہ فی الارض مقرر کیا گیا تھا اور آپ کو علم الاشیاء کا وارث بنایا۔ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کی کاروائی میں بھی انسان پر علم تصوف کی مہر لگا دی گئی تھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے باطن اور صدری کوائف، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رب العزت کے حضور وہ پسندیدہ ادائیں، وجدانی اور روحانی معاملات جو (اعلان نبوت سے پہلے ہی) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ میں پائے گئے ہیں، یقیناً تصوف کے زمرے میں شامل ہیں۔ راتوں کو کثرتِ عبادت، غارِ حرا میں طویل خلوت نشینیاں، معجزات کا اظہار، سینہ مبارک کا شق کیا جانا، نماز کے دوران سینہ مبارک سے جَوْفُ الْمِرْجَلِ (دیگ کے پکنے) کی آواز کا آنا، خدمتِ خلق کرنا، معاملاتِ سلوک کی راہوں کو طے کرنا اور سیرت پاک میں صفا کا پایا جانا، لوگوں کو حق کی دعوت دینا اور اس کے لئے بے چین رہنا وغیرہ یہ سب امورِ تصوف ہی تو ہیں۔ کیفیاتِ کشف اور جذب جو صحابہ کرام کو عطا ہوئے، معرفتِ الٰہی کے علوم کی خصوصی مجالس کا منعقد ہونا، اور ذکرِ الٰہی میں رجوع الی اللہ کی تعلیم دینا اور اس قسم کے دیگر تمام امور تصوف سے متعلق ہیں۔

امداد السلوک میں شداد بن اوس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت نقل کی گئی ہے، (جس کی تصدیق حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی کی ہے) کہ ایک دن ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور حاضر تھے کہ آپ نے دریافت فرمایا کہ تم میں کوئی اجنبی یعنی اہل کتاب بھی ہے؟ ہم نے عرض کیا نہیں۔ آپ نے فرمایا اچھا دروازہ بند کر دو۔

جب ہم نے دروازہ بند کر دیا تو آپ نے فرمایا کہ اپنے ہاتھ اٹھاؤ اور کہو لا الٰہ الا اللہ۔ ہم سب نے ایسا ہی کیا۔ پھر ایک ساعت کے بعد آپ نے اپنے دست ہائے مبارک کو اپنی جگہ رکھ لیا اور فرمایا کہ یا اللہ تیرا شکر ہے تو نے اس کلمہ کے ساتھ مجھے مبعوث کیا اور اس کلمہ کا حکم فرمایا اور اس کلمہ کے کہنے پر جنت کا وعدہ فرمایا اور تو اپنے وعدے کا ہرگز خلاف نہ کرے گا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ خوشخبری ہو کہ حق تعالیٰ نے تم کو بخش دیا اور اس طرح صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے تابعین نے، انہوں نے تبع تابعین کو اور ان کے بعد کلمے کے ذکر کی تعلیم مشائخ کے ذریعے جاری رہی۔ (امداد السلوک)

احیاء العلوم، کشف المحجوب اور اسد الغابہ جلد اول اور دیگر بہت سی کتب میں ایک حدیث منقول ہے جس میں حضرت حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہ واقعہ بیان ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ انہوں نے خود کو دنیا سے ہٹا لیا، رات بھر جاگے اور دن بھر پیاسے رہے اور اس کے بعد اپنی روحانی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہا کہ میں نے یوں محسوس کیا کہ اللہ کا عرش مجھے سامنے نظر آتا تھا اور میں اہلِ جنت کو دیکھتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے تھے اور اہلِ دوزخ ایک دوسرے پر آوازیں کس رہے تھے اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تو نے حق کو پہچان لیا اور اس پر قائم رہ۔ آپ نے حضرت حارثہؓ کو اس کیفیت کی حفاظت کرنے کے لئے فرمایا۔ یہ تمام واقعہ صحابہ کرامؓ کی روحانی کیفیت اور مشاہدات کا حاصل ہونا واضح کر رہا ہے جس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم کو روحانی تربیت دی جاتی تھی اور وہ اعلیٰ روحانی مقامات پر قائم تھے اور یہ تمام باتیں طریقت کے زمرے میں شامل ہیں۔ شاہ محمد عبد الحق دہلوی محدثؒ نے مدارج نبوت میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ''مَا کَانَ وَمَا یَکُوْنُ'' کا علم دیا گیا ہے اور آپ کا اس بات پر خطبہ دینا کہ روز اول سے قیامت تک جس بات کا بھی ذکر کرو تو میں اس کا جواب دونگا یہ آپ ﷺ کے علم تصوف دیئے جانے کا ثبوت ہے۔ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ستر (۷۰) علوم کے ابواب کا عطا کیا جانا جو آپ نے کسی اور کو عطا نہیں کیے علوم تصوف کی مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جمعہ کے خطبے میں ''یَاسَارِیَۃَ الْجَبَل'' فرمانا اور حضرت ساریہؓ کا اس سے مطلع ہونا تصوف کا علم ہونے کی کوئی معمولی دلیل نہیں۔ ان سب باتوں کی نفی کر کے مخالفین طریقت نہایت بزدلانہ اور حماقت آمیز جرأت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ مستدرک حاکم کی ایک حدیث میں ذکر ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا۔

اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا فَمَنْ اَرَادَ الْعِلْمَ فَلْیَاْتِ الْبَابَ (مستدرک حاکم)	میں علم کا ایک شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہیں اور جو علم تک پہنچنا چاہتا ہے تو اسے اس دروازے سے آنا ہوگا۔

یہ دروازہ راہ طریقت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اللہ تعالیٰ کے ہاں کھانے پینے کا معاملہ اور معراج کے تمام احوال راہ طریقت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ معراج میں حضرت جبرئیل امین علیہ السلام کا سدرۃ المنتہیٰ پر جا کر رک جانا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اوپر تک جانا تصوف کے خاص دلائل ہیں۔

''لطائف معنوی'' میں حدیث نقل کی گئی ہے کہ ایک آدمی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ گناہ کرتا رہتا ہے لیکن پھر بھی جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کی کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ فرمایا وہ مشاہدہ کرتا ہے اور توبہ کر لیتا ہے۔ بیعت کرنا بھی توبہ ہے اور اہل طریقت کو مشاہدہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ علم بذریعہ القا حاصل تھا کہ ابن ملجم ان کا قاتل ہوگا اور اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر غیب کے علوم بھی منکشف ہوتے تھے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ کا ابوالحسن خرقانیؒ کی پیدائش کی خبر (۳۰۰) تین سو سال پہلے دینا بھی اسی زمرے میں شامل ہے۔

شیخ الاسلام زکریا انصاری رحمۃ اللہ علیہ نے علم تصوف کی تعریف میں یہ کہا ہے کہ یہ وہ علم ہے جس سے تزکیہ نفس، تصفیہ اخلاق اور تعمیرِ ظاہر و باطن کے احوال کا علم ہو جائے اور اس کی یہ عنایت سعادتِ ابدی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ (ابنِ ماجہ، السنن، ۱: ۸۳ رقم ۲۲۹)	''مجھے اخلاقِ کریمانہ کی تکمیل کے لئے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے''۔

قرآن نے بھی آپ کی صفت میں فرمایا۔

وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (آل عمران ۱۶۴)	''اور (یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پاک کرتا ہے انہیں اور سکھاتا ہے قرآن اور سنت''۔

تصوف اس تزکیہ نفس، تصفیہ اخلاق اور تکمیلِ مکارم اخلاق کا دوسرا نام ہے۔

تصوف کی وجہ تسمیہ

علماء نے لفظ تصوف اور صوفی پر بہت اختلافی بحث کی ہے۔ مختلف اقوال اور آراء کو حسب ذیل الفاظ میں اختصار کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔

(۱) صوف پہننے والے: ابن خلدونؒ نے صوف (یعنی پشمینہ) پہننے والوں کو صوفی کہا ہے۔ جیسے قمص کے معنی ہیں کہ اس نے قمیص پہنی اسی طرح تصوف کا مطلب ہوا کہ اس نے صوف پہنا۔ یہ بات کسی حد تک ٹھیک ہے کیونکہ صوفیاء صوف پہنتے تھے لیکن صرف صوف پوشی ہی صوفیا کی پہچان نہیں کہلا سکتی۔

(۲) صفائے قلب والے: حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

اَلصَّفَاءُ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰی اِنْعَامٌ وَّاِکْرَامٌ وَّالصُّوْفُ لِبَاسُ الْاِنْعَامِ صفا یعنی باطن کی صفائی اللہ تعالیٰ کا بندے پر انعام ہے اور اکرام ہے اور صوف انعام کا لباس ہے۔

لہٰذا کچھ لوگ اہلِ صفا (باطن یعنی قلب کی صفائی والے) کو صوفی خیال کرتے ہیں' کیونکہ بخاری شریف کی ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ بنی آدم کے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے کہ جس کی اگر اصلاح ہو جائے تو پورے جسد کی اصلاح ہو جاتی ہے اور جب وہ فاسد ہو جائے تو سارا جسد ہی فاسد ہو جاتا ہے۔ یاد رکھو کہ وہ انسان کا دل ہے۔ صوفی کا مفہوم تو صفا سے ظاہر ہوتا ہے مگر اس پر اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ لغوی اعتبار سے اہل صفا کو ''صفوی'' کہا جائے گا صوفی نہیں لیکن چونکہ صوفی کا لفظ مشہور ہو چکا ہے اس لئے یہ لوگ صوفی ہی کہلائے گئے۔

(۳) پہلی صف والے: کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ جو لوگ حضورِ حق میں پہلی صف میں کھڑے ہوتے تھے ان کو صوفی کہا جاتا ہے مگر لغت کے اعتبار سے ان کو ''صفی'' کہا جانا چاہیئے۔ زبان پر ثقیل ہونے کی وجہ سے صوفی ہی کہا گیا ہے۔

(۴) اہلِ صُفّہ: چونکہ صوفیہ دنیا سے منقطع ہو کر مسجد نبوی میں اللہ کی یاد میں منہمک رہتے تھے اس لئے دنیاوی تعلقات ترک کرنے والوں کو صوفی کہا جانے لگا۔ لیکن اشتقاقِ لفظی کے لحاظ سے ان کو ''صُفی'' کہا جانا چاہیئے نہ کہ صوفی۔ یہاں بھی زبان پر ثقیل ہونے کی وجہ سے صوفی ہی کہا گیا ہے۔

(۵) یونانی لفظ شیوصوفیاء: فلاسفہ اسلام میں علامہ لطفی نے لکھا ہے کہ صوفی کا لفظ ''شیوصوفیاء'' سے مشتق ہے جس کے معنی حکمتِ الٰہی کے ہیں' چونکہ صوفی حکمتِ الٰہی کا طالب ہوتا ہے اس لئے صوفی کی غایت حقیقتُ الحقائق کا جاننا ہے۔ یہ لفظ اس وقت رائج ہوا جب یونانی کتابوں کا ترجمہ عربی میں ہوا اور فلسفہ کا لفظ اس زبان میں داخل ہو چکا تھا۔

(۶) اوصافِ حمیدہ سے متصف لوگ: یعنی یہ لوگ درج بالا تمام صفات اور دیگر تمام اوصاف حمیدہ سے متصف لوگ ہیں۔ امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ لفظ صوفی ۲۰۰ ہجری سے کچھ پہلے شروع ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھیوں کو صحابہ رضی اللہ عنہم کہا جاتا تھا اور اس زمانے میں اس سے بہتر کوئی جماعت تصور نہیں کی جاتی تھی۔ اس کے بعد تابعین اور تبع تابعین کی اصطلاحیں اختیار کی گئیں اور اس کے بعد نیک لوگوں کو زہاد اور عباد (زاہد و عابد) کے ناموں سے یاد کیا جاتا تھا مگر کچھ عرصے کے بعد بدعات کا ظہور ہونے لگا تو خواص اہل سنت نے جو ہر وقت یادِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے خود کو لوگوں سے الگ کر لیا اور انہی لوگوں کو صوفی کہا جانے لگا۔ ان لوگوں کی علامت صفائے قلب' صوف پوشی' نفس کے ساتھ سختی' شرع محمدی کو لازم پکڑنا اور دنیا کو پسِ پشت ڈالنا تھی۔ (جیسا کہ علی رودباریؒ نے کہا)۔

تصوف کی وجہ تسمیہ کی مزید وضاحت: امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ تصوف کا لفظ ۲۰۰ھ سے کچھ پہلے مشہور ہوا، پہلے صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے الفاظ استعمال ہوتے تھے۔ اس کے بعد صوفی لوگوں کو زہاد اور عباد کے نام دیئے جانے لگے اور بالآخر جب بدعات اور دھوکہ بازی نے اپنا رنگ دکھایا تو زہاد اور اہل سنت نے علیحدگی اختیار کر لی اور ان کو صوفیاء کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔ تصوف کے دو دور ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک دور ماقبل تنقید اور دوسرا دور تنقید۔ دور ماقبلِ تنقید میں تصوف چار مراحل سے گزرا ہے۔ پہلا مرحلہ زہد وورع اور تقویٰ کا دور ہے۔ دوسرا مرحلہ مجاہدۂ نفس اور باطنی کیفیات کا دور ہے۔ تیسرا مرحلہ جذب اور نسبت کا دور ہے۔ چوتھا مرحلہ حقائق کی نظری تشکیل کا دور ہے۔

تصوف کی تعریف مولائے رومؒ کی نظر میں

مولانا رومیؒ نے تصوف کی جو اصطلاحی تعریف پیش کی ہے، وہ ہر پہلو سے مکمل، زُود فہم اور ہر خاص و عام کی تشنگی کو پورا کرتی ہے، لہٰذا اس باب میں صرف مولانا کی بیان کردہ اصطلاح کو ہی بیان کیا جارہا ہے۔ مولانا رومیؒ کے علاوہ دیگر صوفیاء کرام نے جو تصوف کی تعریف پیش کی ہے اسے بھی اس کتاب کے ایک باب ''تصوف پر مشائخ عظام کی آراء'' کے تحت بیان کر دیا گیا ہے۔

مثنوی مولانائے رومؒ تصوف پر بہترین کتاب تصور کی جاتی ہے حضرت جلال الدین رومیؒ کا مقام تصوف کی دنیا میں بہت بلند ہے، چنانچہ مولانائے رومؒ نے دفتر پنجم میں تصوف کی جو تعریف کی ہے، اسے سب سے پہلے بیان کرنا زیادہ مناسب ہے، آپؒ فرماتے ہیں۔

تعریف تصوف

''شریعت ہمچو ں شمعے است که راه می نماید، چوں در راه آمدی ایں رفتن تو طریقت است و چوں به مقصود رسیدی آں حقیقت است، حاصل آنکه شریعت ہمچوں علم کیمیا آمو ختن بست از استاد یا از کتاب، طریقت استعمال کردن دارو، مِس را در کیمیا مالیدن و حقیقت زر شدن مس'' یا ''مثالِ شریعت ہمچوں طلب آموختن است و طریقت پرہیز کردن بموجب علم طب و دارو خوردن و حقیقت صحت یافتن۔'' (انوار اولیاء)

ترجمہ:۔ شریعت شمع کی مانند ہے کہ جو راہ دکھاتی ہے، جب تو اس راہ میں آجائے تو تیرا اس راستے پر چلنا طریقت ہے اور جب تو مقصود (یعنی باری تعالیٰ) کو پالے (جس کو وصل کہتے ہیں) تو یہ حقیقت ہے۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ شریعت علم کیمیا کی طرح کسی استاد سے یا کتاب سے سیکھنے کا نام ہے، طریقت دوا کا استعمال کرنا

اور تانبے کا کیمیا سے ملنے کا نام ہے اور حقیقت اس تانبے کا سونا بن جانے کا نام ہے۔ اس کی مثال یہ بھی ہے کہ ایک شخص نے علمِ طب پڑھا، یہ شریعت ہے، دوا استعمال کی یہ طریقت ہے، مرض سے اُسے افاقہ ہو گیا، یہ حقیقت ہے۔ حاصل یہ کہ شریعت علم ہے، طریقت عمل ہے، حقیقت عمل کا اثر ہے۔

انوارِ اولیاء میں ہے کہ شریعت چار چیزوں کا نام ہے (۱) اقرارِ زبانی (۲) اعتقادِ قلبی (۳) تزکیۂ اخلاق (۴) اعمال یعنی اوامر و نواہی۔ اعتقاد تین طریقوں سے پیدا ہوتا ہے۔ تقلید سے، استدلال سے، کشف و حال سے۔ پہلی دونوں قسموں کو شریعت کہتے ہیں یعنی ان طریقوں سے کسی کو اگر اعتقاد حاصل ہو تو کہا جائے گا کہ اس کو شرعی اعتقاد حاصل ہے جبکہ تیسری قسم کا اعتقاد طریقت ہے، یہ قسم بھی شریعت سے باہر نہیں، لیکن امتیازاً ایک خاص نام رکھ لیا گیا ہے، کیونکہ یہ اعتقاد سلوک و تصوف اور مجاہدات و ریاضت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ درجِ ذیل تفصیل قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی" کے مکتوب ششم سے ماخوذ ہے۔

اسی طرح تزکیۂ اخلاق کے جو احکام شریعت میں مذکور ہیں، ان کا نام شریعت ہے، لیکن محض احکام جاننے سے تزکیۂ اخلاق نہیں ہوتا۔ علمائے ظاہر اخلاق کی حقیقت و ماہیت سے بخوبی واقف ہوتے ہیں، لیکن خود ان کے اخلاق پاک نہیں ہوتے، یہ مرتبہ مجاہدات اور فنائے نفس سے حاصل ہوتا ہے اور اسی کا نام طریقت ہے، تعمیلِ فرائض اور اجتنابِ منہیات کا بھی یہی حاصل ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ شریعت اور طریقت دو متناقض چیزیں نہیں بلکہ دونوں میں جسم و جان، جسد و روح، ظاہر و باطن اور پوست و مغز کی نسبت ہے۔ تصوف بھی دو اجزا سے مرکب ہے۔ علم، عمل اور عقائد کے باب میں جن مسائل سے بحث کی جاتی ہے، ان میں ذات و صفاتِ باری کے متعلق جو مسائل ہیں، تصوف میں بھی انہی مسائل سے بحث ہوتی ہے، لیکن تصوف میں ان عقائد کی حقیقت بیان کی جاتی ہے، چنانچہ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ یہی حصہ تصوف کا علمی حصہ ہے۔

تصوف کے اس حصہ میں جو چیز اصلاً مابہ الامتیاز ہے، وہ یہ ہے کہ اس میں علم اور ادراک کا طریقہ عام طریقوں سے مختلف ہے۔ تمام حکماء اور علماء کے نزدیک ادراک کا ذریعہ حواس ظاہری اور باطنی، یعنی حافظہ، تخیل، حسِ مشترک وغیرہ ہیں، لیکن اربابِ تصوف کے نزدیک اِن وسائل کے سوا ادراک کا ایک اور بھی ذریعہ ہے۔ حضرات صوفیہ کا دعویٰ ہے کہ مجاہدہ و ریاضت، مراقبہ اور تصفیۂ قلب سے ایک اور حاسہ پیدا ہوتا ہے جس سے ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جو حواس ظاہری و باطنی سے معلوم نہیں ہوتیں۔ امام غزالیؒ نے اس کی مثال یوں دی کہ جیسے ایک حوض ہے جس میں نلوں اور جدولوں کے ذریعہ سے پانی باہر آتا ہے۔ یہ گویا علوم ظاہری ہیں، خود حوض کی تہہ میں ایک سوت بھی ہے جس سے فوارہ کی طرح پانی اچھلتا ہے اور حوض میں آتا ہے، یہ علمِ باطن ہے۔ یہی علم ہے جس کو علمِ لدنی، کشف اور علمِ غیبی بھی کہتے ہیں اور یہی وہ علم ہے جو انبیاءؑ اور اولیاءؒ

کے ساتھ مخصوص ہے۔ انبیاء اور اولیاء میں فرق یہ ہے کہ انبیاء میں یہ علم نہایت تام اور فطری ہوتا ہے، یعنی مجاہدہ اور ریاضت کا محتاج نہیں ہوتا، بخلاف اس کے اولیاء کو مجاہدات اور ریاضت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

اہلِ ظاہر مذکورہ بالا اقوال پر اعتراض کرتے ہیں کہ تحقیقاتِ علمیہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ انسان کو جو علم ہوتا ہے، صرف اسی طرح ہوتا ہے کہ وہ اشیائے خارجی کو کسی حاسہ سے محسوس کرتا ہے، پھر اس قسم کی بہت سی چیزوں کو محسوس کر کے ان میں قدرِ مشترک پیدا کرتا ہے، جس کو کلی کہتے ہیں، پھر انہی جزیات وکلیات کے باہمی نسبت اور مقابلہ سے ہزاروں نئی نئی باتیں پیدا کرتا ہے، لیکن ان تمام معلومات کی بنیاد حواس ہی ہوتے ہیں۔ ان کو الگ کر دیا جائے تو تمام سلسلہ بے کار ہو جاتا ہے۔ جبکہ حضرات صوفیاء کا یہ دعویٰ ہے کہ حواس کے سوا کوئی اور ذریعہ ادراک بھی ہے جو تحقیقاتِ علمی سے ماوراء ہے۔ حضراتِ صوفیہ کا جواب یہ ہے کہ۔

ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

(خُدا کی قسم تم اس شراب کا ذوق نہیں جان سکتے، جب تک اس کو چکھو گے نہیں)

حضراتِ صوفیہ کہتے ہیں کہ جس طرح علم ظاہری کے سیکھنے کا ایک خاص طریقہ مقرر ہے، جس کے بغیر وہ علوم حاصل نہیں ہو سکتے اسی طرح اس علمِ باطن کا بھی ایک خاص طریقہ ہے۔ جب تک اس طریقہ کا تجربہ نہ کیا جائے، اس سے انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ امر مسلم ہے کہ بہت سے مسائل علمی ایسے ہیں جن کو کسی خاص حکیم یا عالم نے دریافت کیا اور لوگ صرف ان کی شہادت کی بنا پر ان مسائل کو تسلیم کرتے ہیں۔ اسی قیاس پر جب سینکڑوں بزرگ جن کے فضل وکمال، صدق و دیانت، دقتِ نظر اور جدتِ ذہن سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، مثلاً حضرت بایزید بسطامیؒ، سلطان ابوسعیدؒ، امام غزالیؒ، شیخ محی الدین اکبرؒ، شیخ سعدیؒ، نظام الدین اولیاءؒ اور شاہ ولی اللہؒ وغیرہ نہایت وثوق اور اطمینان سے اس کی شہادت دے رہے ہیں کہ علم باطن حواس سے بالکل جداگانہ چیز ہے تو ان کی اس شہادت پر کیوں نہ اعتبار کیا جائے؟ سینکڑوں ایسے علماء گزرے ہیں جن کو علم باطن سے قطعاً انکار تھا، لیکن جب وہ اس کوچہ میں آئے اور خود ان پر وہ حالت طاری ہوئی، تو وہ سب سے زیادہ اس کے معترف بن گئے۔ چونکہ یہ مسئلہ تصوف کے تمام علمی مسائل کی بنیاد ہے اس لئے مولانا نے اس کو بار بار بیان کیا ہے۔ اور مختلف مثالوں سے سمجھایا ہے اور کہا ہے کہ اربابِ ظاہر کا اس سے منکر ہونا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک بچہ مسائل فلسفہ سے انکار کرتا ہے، یا ان کے سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم مختلف مقامات سے اس کے متعلق مثنوی کے اشعار نقل کرتے ہیں: فرماتے ہیں۔

پنج حسے ہست جز ایں پنج حس آں چو زر سُرخ و ایں حس ہا چو مس

(ان پانچ حواس کے علاوہ روحانی پانچ حواس اور ہیں، وہ حواسِ روحانی سرخ سونے کی طرح ہیں اور یہ حواس تانبے کی طرح۔)

اے بردہ رختِ جس با سوے غیب دست چوں موسیٰ بروں آور زجیب (۱۹_۲)
(اے انسان تُو اپنے جس کی متاع کو غیب کی طرف لے گیا ہے، (ہمت سے کام لے) موسیٰ کی طرح ہاتھ کو گریبان سے باہر نکال کر دیکھ۔)

تو زصد ینبوع، شربت مے کشی ہر چہ زاں صد کم شود کاہد خوشی (۳۴۴_۶)
(تُو سینکڑوں چشموں سے شربت کھینچ رہا ہے، ان سینکڑوں میں سے جو کم ہو جائے تو خوشی گھٹ جائے۔)

چوں بجوشد از دروں چشمہ سنی زاستراقِ چشمہا گردی غنی
(جب کوشش سے اندر کا چشمہ جاری ہو گیا، بہت سارے چشموں کے چرانے سے بے نیاز ہو جائے گا۔)

قلعہ را چوں آب آید ازبروں در زمانِ امن باشد برفزوں (۳۴۵_۶)
(شاہی قلعہ کو جب باہر سے پانی حاصل ہوتا ہے، تو امن کے زمانے میں وہ پانی قلعے میں بہت جمع رہتا ہے۔)

چونکہ دشمن گردِ آں حلقہ کند تا کہ اندر خونِ شاں غرقہ کند
(جب دشمن قلعے کا محاصرہ کرتا ہے، تا کہ اندر ہی اندر قلعے میں محصور سپاہ کو خون میں نہلا دے۔)

آب بیروں را بُرند آں سپاہ تا نباشد قلعہ را زانہا پناہ (۳۴۵_۶)
(قلعہ میں باہر سے آنے والے پانی کو بند کر کے دشمن کی سپاہ کوشش کرتی ہے کہ قلعے میں پناہ لینے والوں کو پناہ حاصل نہ ہو۔)

آں زماں یک چاہِ شورے ازدروں بہ زصد جیحونِ شیریں از بروں
(ایسے موقع پر اگر قلعہ کے اندر کڑوے پانی کا کنواں ہو، وہ باہر کے سینکڑوں میٹھے پانی کے چشموں سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔) (۳۴۵_۶)

علم کاں نبود زہُو بے واسطہ آں نپاید ہمچو رنگِ ماشطہ (۳۵۵_۱)
(وہ علم جو ذاتِ باری تعالیٰ سے تعلق نہ رکھتا ہو، وہ علم کبھی مشاطہ کے سنگھار کی مثل چمک نہیں دکھاتا یعنی سرخی پاؤڈر سے حسن نہیں آتا۔)

ہمچو موسیٰ نور کے یابد زجَیب سُخرۂ استاد و شاگرد و کتیب (۳۱۶_۴)
(موسیٰ کی مثل گریبان سے نور کب حاصل کرے گا اگر کوئی استاد کا تابع اور کتاب کا ہی شاگرد ہو۔)

خویش را صافی کُن از اوصافِ خود تا بہ بینی ذاتِ پاکِ صافِ خود
(اے انسان! اپنے اوصاف یعنی اپنے آپ کو نفس کی آلائشوں (یعنی حرص، خواہشات) سے پاک کرتا کہ تو اپنی خودی کے جوہر اپنے اندر دیکھ سکے۔)

بینی اندر دل علومِ انبیاء بے کتاب و بے معید و اوستاد

(پھر تو اپنے دل میں انبیاءؑ کے علوم کے چشمے جاری دیکھے گا، بغیر کسی کتاب کے اور بغیر کسی سہارے اور ظاہری استاد کے۔)

بے صحیحین و احادیث و روات بلکہ اندر مشربِ آبِ حیات (۱۔۳۵۶)

(بغیر بخاری و مسلم اور احادیث کے یاد کرنے اور اسماء الرجال کے اپنے دل کے اندر چشمہ آبِ حیات کا جاری دیکھے گا۔)

رومیاں آں صوفیانند اے پدر بے ز تکرار و کتاب و بے ہنر

(رومیؒ ایسے صوفی ہیں، اے بابا! جنہوں نے بغیر تکرار و کتاب اور ہنر سے یہ نعمت حاصل کی ہے۔)

لیک صیقل کردہ اند آں سینہ ہا پاک ز آز و حرص و بخل و کینہ ہا

(لیکن ان صوفیوں نے) سینے قلعی کئے ہیں ایسے کہ پاک کر دیئے ہیں، برائیوں یعنی حرص و بخل اور حسد سے۔)

آں صفائے آئینہ وصفِ دل ست صورت بے منتہا را قابل ست

(وہ صفائی آئینے کی مثل دل کی صفائی کے ہے، دور کی صورتوں کو وہ اپنے اندر عکس کی شکل میں قبول کرتی ہے۔)

صورتِ بے صورتے بے حد و عیب زآئینۂ دِل تافت بر موسیٰ زجیب (۱۔۳۵۸)

(بغیر صورت کی صورت، جو بے حد و بے عیب تھی گریباں میں سے موسیٰؑ کے آئینہ دل پر چمکی تھیں۔)

تاابد، ہر نقشِ نو کاید برو مے نماید بے حجابے اندرو

(قیامت تک کا ہر نیا نقش جو اس دل پر پڑتا ہے کسی جواب کے بغیر اس دل میں دکھائی دیتا ہے۔)

پس بدانی چونکہ رَستی ازبدن گوش و بینی چشم می تاند شدن (۴۔۲۳۱)

(یہ سب کچھ جان لینے کے بعد یہ سمجھے کہ جب آپ مادی جسم سے نجات حاصل کریں تو کان سے سننا اور آنکھوں سے دیکھنا تمھاری اپنی بات ہو جائے گی۔)

راست گفتست آں شہِ شیریں زبان چشم گردد موبموئ عارفاں

(سچ فرمایا اس بادشاہ میٹھی زبان والے نے کہ عارفوں کے لئے جسم کا ہر بال آنکھ بن جاتا ہے۔)

نور را باپیہ خود نسبت نبود نسبتش بخشید خلّاقِ وَدُود

(آنکھ کی روشنی کو اس کی چربی سے کوئی نسبت نہیں تھی۔ لیکن خُدائے مہرباں نے اس کو نور کی صلاحیت عطا کر دی۔)

علّت دیدن مداں پیہ اے پسر ورنہ خواب اندر نہ دیدے کس صُور (۴۔۲۳۲)

(اس چربی کو سبب بینائی نہ جان اے لڑکے اور نہ خواب کے عالم میں کوئی کسی صورت کو نہ دیکھتا۔)

پس چو آہن گرچہ تیرہ ہیکلی صیقلی کن صیقلی کن صیقلی

(دیکھو لوہا جبکہ کالی سیاہ شکل میں نظر آتا ہے تاہم اس کو قلعی کرو یعنی صیقل کروا تا کہ روشن اور چمکدار ہو جائے۔)

تا دلت آئینۂ گردد پُر صُور　اندرو ہر سو ملیحے سیمبر

(جب تیرا سخت دل صورتوں کے لئے آئینے کی طرح بن جائے تو اس میں ہر طرف سے چاندی کے جسم والی سیم اندام محبوبائیں نظر آئیں گی۔)

آہن ارچہ تیرہ و بے نور بود　صیقلی آں تیرگی از وے زدُود(۷_۲۳۴)

(فولاد کیسا ہی سیاہ اور بے نور کیوں نہ ہو، اُس کو جب صیقل کیا جائے تو سیاہی دور ہو جاتی ہے۔)

گر تنِ خاکی غلیظ و تیرہ است　صیقلش کن زانکہ صیقل گیرہ است

(اے انسان! اگرچہ تیرا خاکی جسم اندر سے سخت غلیظ اور سیاہ ہے تاہم اس کو صیقل کر، اس لیے کہ یہ صیقل کو قبول کرتا ہے۔)

تا درو اشکالِ غیبی رُو دہد　عکسِ حورے و ملک در وے جہد

(تا کہ اس میں غیبی انوار سامنے آئیں اور اس میں حوروں اور فرشتوں کے عکس صاف صاف نظر آئیں۔)

صیقلِ عقلت بداں دادست حق　کہ بدو روشن شود دل را ورق(۴_۲۳۸)

(عقل کی روشنی اس لئے اللہ تعالیٰ نے تجھے دی ہے، کہ اسی سے دل کے پردے روشن اور منور ہوتے ہیں۔)

تصوف کے مراحل

تصوف کے چار مراحل کا ترتیب وار ذکر کیا جاتا ہے۔

تصوف کا پہلا مرحلہ: عہدِ رسالت مآب ﷺ اور عہدِ صحابہؓ و تابعینؒ میں تصوف اپنے ارتقائی عمل کے اعتبار سے پہلے مرحلے میں تھا۔ اس دور میں زہد و ورع اور تقویٰ کا رنگ غالب تھا۔ مردانِ حق اپنی باطنی زندگی کے جملہ مراتب و کمالات اسی طریق سے حاصل کرتے تھے اور خدا تعالیٰ سے قرب و حضوری کی نسبت بھی اسی طرح متحقق ہوتی تھی۔ ان لوگوں سے بھی مستی و بےخودی اور خوارق و کرامات کا ظہور ہوتا تھا جس کا تعلق نفسی احوال سے تھا مگر بہت کم۔ اس دور میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اصحاب صفہ اور تابعینؒ میں سے امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اویس قرنی، امام زین العابدین، سعید بن میتب، طاؤس کیمانی، داؤد بن دینار، سلیمان تیمی، عامر بن عبداللہ تیمی اور محمد بن منکدر رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے اسماء قابلِ ذکر ہیں۔

دوسرا مرحلہ: تبع تابعین کے زمانے میں تصوف اپنی دوسری ارتقائی منزل میں داخل ہوا۔ دوسری اور تیسری صدی ہجری میں جب اخلاص فی العمل کا زوال شروع ہوا اور محض فقہیت کی جانب میلان کی بنا پر شریعت کی جگہ تشرع نے لے لی تو اہلِ حق نے اخلاص فی العمل کی خاطر مجاہدہ نفس کی طرف رجوع کیا اور

ریاضت ومجاہدہ کے ذریعے تعلق باللہ کی نسبت پختہ کی۔ مجاہدۂ نفس کی وجہ سے انہیں انس و وحشت' مستی و بے خودی' کشف واشراف اور خوارق وکرامات کی صورت میں باطنی کیفیات حاصل ہوئیں اور اُنہوں نے یہ احوال' نکات واشارات میں بیان بھی کئے' اس مرحلہ تصوف میں رابعہ بصری' حبیب عجمی' مالک بن دینار' فضیل بن عیاض' عبداللہ بن مبارک' ابراہیم بن ادہم' بشر الحافی' شیبان راعی' ذوالنون مصری' حارث المحاسبی' بایزید بسطامی' سری سقطی' جنید بغدادی اور سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہم کے اسماء قابل ذکر ہیں۔

تصوف کے تیسرے مرحلے کا دور چوتھی اور پانچویں صدی ہجری پر مشتمل ہے اس مرحلہ میں اہلِ کمال میں سے عوام تو حسبِ سابق شرعی اوامر ونواہی پر مکتفی رہے مگر خواص نے باطنی احوال وکیفیات کو اپنا مطمح نظر بنایا اخص الخواص صوفیاء اعمال واحوال سے گزر کر ''مقامِ جذب'' تک پہنچے۔ اسی جذب کی وجہ سے ان پر ''نسبتِ توجہ'' کا راستہ منکشف ہوا۔ تعیّنات کے پردے چاک ہوئے اور انہوں نے مشاہدۂ حق تک رسائی حاصل کر لی۔ پھر انہیں ذات حق میں محویت واستغراق نصیب ہوا اور توحید وجودی وشہودی میں فرق وامتیاز باقی نہ رہا۔ اس عہد میں شیخ ابوسعید حراز' ابوالحسن خرقانی' ابوعلی رودباری' ابوالفرح طرطوسی' ابوبکر شبلی' ابو القاسم قشیری اور ابوعثمان المغربی رحمۃ اللہ علیہم کے اسماء قابل ذکر ہیں۔ حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی دور کے آواخر میں ہوئے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی حیثیت کاروانِ صوفیاء کے راہبر وراہنما کی تھی۔

چوتھا مرحلہ: تصوف کا یہ عہد چھٹی اور ساتویں صدی ہجری پر مشتمل ہے' اس دور میں صوفیائے کرام نے باطنی واردات کے ذریعے حاصل شدہ تصورِ حقیقت کی نظری تشکیل کی اور حقائق تصوف پر بحث وتدقیق کا آغاز ہوا۔ انہوں نے ظہورِ وجود کے مدارج وتنزلات (یعنی تنزلاتِ خمسہ' ۱۔ذات احد' ۲۔تنزلاتِ واحدانیت' ۳۔تنزلِ ارواح' ۴۔عالمِ امثال اور ۵۔عالمِ اجسام) پر گفتگو کی۔ اس طرح تصوف مابعد الطبیعاتی مسائل اور فلسفیانہ مباحث سے دو چار ہوا۔ نظریہ وحدت الوجود اس دور میں دلائل نظری کی بنیاد پر مرتب صورت میں سامنے آیا۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ ابن الفارض حموی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصانیف میں علم وحکمت کی ادق زبان میں اس تصور کو دلائل وبراہین کے ساتھ بیان کیا اور شیخ عطار' عارف رومی اور مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہم نے شعر کے دلکش وجد آور اور ذو دار پیرائے میں ان حقائق کو بیان فرمایا۔ اس طرح معارف تصوف خواص سے عوام تک پہنچے اور ہر شخص تصوف کا کلمہ پڑھنے لگا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ان مراحل اربعہ پر شرح وبسط کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں۔

بالجملہ این چہارم قدم الصدق است در ملاء اعلی وواجب آب است کہ کلام ہر طبقہ را بر مناسب اذواق وے حمل کنند و یکے را بر مذاق دیگر نیارند۔" (ہمعات' ج ۲ ص ۲۰)

(یعنی یہ چاروں رستے ملاء اعلیٰ میں قدر و منزلت اور حق وصداقت کے حامل ہیں اور ضروری ہے کہ ارباب تصوف پر بحث کرتے ہوئے ان کے اقوال واحوال کو ان کے ہی عہد کے ذوق کی مناسبت سے جانچا جائے۔ ایک عہد کے صوفیہ کے احوال دوسرے دور کے معیاروں پر محمول نہ کئے جائیں۔)

تصوف سے کیا مراد ہے؟

تصوف وہ علم ہے جس سے اسلام کی حقیقت معلوم ہو کہ روحِ انسان اور عقل ونفس کیا ہیں؟ مرنے کے بعد کیا معاملات ہوں گے۔ جنت اور دوزخ کیا ہیں؟ اللہ تعالیٰ کی معرفت کیا ہے وغیرہ کی تحقیق کرے اور جان لے کہ تصوف اللہ تعالیٰ سے ایسی بے لوث اور بے غرض دوستی اور محبت کا نام ہے جو صرف دنیوی لالچ سے ہی نہیں بلکہ اخروی طمع سے بھی یکسر پاک ہو اور اس راہ کے سالک کا قلب تعلق باللہ میں ہمہ نوع دنیوی واخروی منفعتوں، مصلحتوں اور ہر قسم کے اندیشہ نظر وخطر سے کلیۃً بیگانہ ہو جائے، جس کے نتیجے میں اِخْلَاصْ فِي النِّيَّةِ وَالْعَمَلِ (نیت وعمل کے اخلاص) کا جذبہ ظاہر و باطن میں اس قدر راسخ ہو جائے کہ انسان کی بندگی خالصتاً لوجہ اللہ ہو جائے، نہ دنیا وآخرت میں انعام وجزا کی آرزو بندے کی عبادت کا محرک رہے اور نہ سزا وعتاب کا خوف باقی رہے بقول علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ ؎

سوداگری نہیں، یہ عبادت خدا کی ہے ۔۔۔ اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے (ب۔د:۱۰۸)

الغرض تعلق باللہ کی لذت وحلاوت اور محبتِ الٰہی کی چاشنی وشیرینی کو اس طرح حرزِ جان بنا لیا جائے کہ بارگاہِ صمدیت میں حاضری کے وقت اس کے غیر کا موہوم سا خیال بھی بندے کے دل کے کسی گوشے میں راہ نہ پا سکے اور پھر اسے ہمہ وقت بندگی نصیب ہو جائے۔ بس یہی حقیقتِ تصوف ہے۔ جب سے ہماری زندگی پر استعماریت (نوآبادیاتی نظام) کی گرفت مضبوط ہوئی ہم کتاب وسنت اور تاریخِ اسلام سے اپنی حیات ملی کے تصور سے محروم ہو گئے۔ ہمارا رشتہ اپنے پُرعظمت ماضی سے منقطع ہو گیا اور اپنے حال ومستقبل کو بہتر بنا سکنے کا اعتماد مضمحل ہو گیا۔ اس اعتماد کو از سرِ نو بحال کرنے کے لئے ہمیں گہرا غور وخوض کرنا ہوگا۔ تہذیبی وثقافتی زندگی کے معرضِ ارتقاء میں ہونے کا باعث ہر دور میں تصوف کی طرف متوجہ کرنے والے محرکات الگ الگ رہے اور اسی بنا پر صوفیانہ تفکر بھی ارتقاء پذیر رہا۔ لیکن تصوف جن مدارجِ ارتقاء سے بھی گزرا اس کی ارتقائی حرکت کی سمت یہی رہی کہ صوفیانہ مذہبی واردات کا انجام کار پیغمبرانہ وحی کے مطابق ہو جائے، چنانچہ جہاں کہیں ان کے مابین عدمِ مطابقت کا شائبہ ہوا اسے رفع کر کے سازگاری وہم آہنگی پیدا کی گئی۔

مرتبۂ احسان ہی تصوف کی اصل ہے

کچھ صوفیہ کا یہ خیال ہے کہ حدیثِ جبرئیل علیہ السلام ہی اصل تصوف ہے، کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے

جبرئیل علیہ السلام کی گفتگو کے متعلق ارشاد فرمایا تھا کہ مجھ سے ملاقات کے لئے آنے والے حضرت جبرائیل تھے اور وہ صحابہ کرامؓ کو ان کا دین سکھانے کے لئے آئے تھے۔ اس حدیث میں آپ نے اسلام ایمان اور احسان کے مطالب جو بیان فرمائے وہی اصلِ تصوف ہیں احسان کو ہی لیں تو یہ جملہ کمالاتِ ظاہری اور باطنی کی اصل ہے کیونکہ ان کا طریقہ ماسوا اللہ کے ہر تصور سے پاک رہنا اور یہ کوشش کرنا ہے کہ محبوبِ حقیقی کے علاوہ کسی اور کا دل میں گزر نہ ہو۔ حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ شریعت، میرے اقوال کا نام ہے طریقت، میرے اعمال حقیقت، میری باطنی کیفیت ہے اور معرفت، میرا راز ہے۔ ان تمام چیزوں (شریعت' طریقت' حقیقت اور معرفت) کا علم حاصل کرنا ہی طریقت یا تصوف کہلاتا ہے۔

کچھ علماء ان احادیث کو خبر واحد کا نام دے کر اسے معتبر نہیں سمجھتے۔ ان احادیث کو تواتر اس لئے حاصل نہ ہوا کیونکہ جن احادیث کے ہمیں زیادہ راوی ملتے ہیں وہ تمام احادیث نماز' وضو اور روزہ اور حج وغیرہ سے متعلق ہیں۔ اگرچہ قرونِ اولیٰ میں لفظ تصوف تو موجود نہ تھا مگر اصلِ تصوف ان ہی چیزوں کا نام ہے۔ اس نوعیت کی ایک اور حدیث کو لیا جائے جس میں اس بات کا ذکر ہے کہ جو شخص فرائض کو ادا کرنے کے بعد نوافل کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے کان' آنکھ' ہاتھ' پاؤں' زبان بن جاتا ہے۔ اس کیفیت کا حاصل ہونا ہی اصلِ تصوف ہے۔ عین اسی طرح مومن کو فراست کا عطا ہونا یعنی اللہ کے نور سے دیکھنا بھی تصوف ہے۔ ایسی تمام باتیں ہی تصوف کا خاصہ ہیں اور تصوف کی اصل ہیں۔

جو صوفیہ حدیثِ جبرئیل علیہ السلام کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ یہی تصوف کی اصل ہے تو راقم الحروف کو یہ کہنے سے کوئی روک ٹوک نہیں سکتا کہ حضور پاک ﷺ کا مبعوث ہونا ہی اصلِ تصوف ہے اگرچہ اس وقت تصوف کا نام نہ لیا جاتا تھا لیکن حضور اکرم ﷺ کی موجودگی سے جو کچھ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو حاصل ہوا' جو کچھ پوری مخلوق اور کائنات کو ملا یہ سب کا سب ہی اصل طریقت تھا۔ چاند کو دو ٹکڑے کرنا' کنکریوں کا کلمہ پڑھنا' ایک آفتابے سے پورے لشکر کا سیراب ہونا اور اس قسم کے سینکڑوں دیگر واقعات اصلِ طریقت نہیں تو اور کیا ہیں؟ ''حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں روحانی کیفیات'' کے عنوان سے ایک الگ بیان اس کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔

حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ کو جب کشف کا وہ مرتبہ نصیب ہوا جو عام لوگوں میں نہ پایا جاتا تھا تو آپ نے یہ سمجھا کہ اب میں حقیقی معنوں میں مومن بن گیا ہوں۔ ایسے علوم کو ان صوفیاء نے جو گوشہ نشین یا زاویہ نشین تھے آگے بڑھایا اور اس علم کی باقاعدہ اصطلاحات وضع کیں اور اس علم کو رفتہ رفتہ علمِ تصوف کہا جانے لگا۔

طریقت ایک طریقِ عبادت ہے

حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ شریعت ایک شمع ہے جو راہ دکھاتی ہے اور اس راہ پر چلنا طریقت ہے جبکہ منزل پر پہنچ جانا حقیقت کہلاتی ہے۔ چنانچہ عبادات کی ادائیگی کسی آشنائے طریقت سے سیکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ وہ رسیدہ (یعنی منزل پر پہنچ چکا ہو) اس راہ کی نشیب و فراز سے آگہی رکھتا ہے اور اگر کتابوں سے طریقت اخذ کی جائے تو وہ کافی نہ ہوگی۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے مکتوبات میں فرمایا ہے کہ وہ ذکر جو کسی شیخ کامل اور مکمل سے اخذ کیا جائے وہ اپنے اندر خاص کمالات پیدا کر دیتا ہے اور جو ذکر مشائخ کی روحانیت کے بغیر اخذ کیا جائے وہ یہ درجہ نہیں رکھتا اور اس سے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ (کمالاتِ ذکر کی تفسیر ذکر کے بیان میں دی گئی ہے) ان دونوں نوعیت کے ذکر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ تمام وظائف کے لئے اپنے مرشد سے ہدایات لینا اور اس کی صحبت سے فیض حاصل کرنا نہایت ضروری ہے تاکہ وظائف کی ادائیگی صحیح طریقے سے ہو سکے۔ مرشد اپنے مریدوں کو وظائف کے طریقوں کے علاوہ مقام اور اوقات کی پابندی اور وظائف سے متوقع فوائد پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ شیخ نماز کی اقامت اور دیگر عبادات' روزہ' حج' قربانی' اعتکاف' طہارت اور وضو کے مسائل' زکوٰۃ کی ادائیگی' مال کے اکتساب اور انفاق وغیرہ کے متعلق مسنون طریقوں سے آگاہ کرتا ہے۔ اسلام میں ہر عبادت کسی خاص مقصد کی حامل ہے اور جب تک عبادات کے مطالب اور مقاصد کا علم اور مشاہدہ نہ ہو یہ عبادت اپنا مقصود حاصل کرنے کی افادیت کھو دیتی ہیں اور حضرت بلھے شاہؒ کے قول کے مطابق "لیناں اک نہ دینا دو"۔ والا معاملہ رہ جاتا ہے۔

وظائف کے دوران نفی کا حاصل کرنا وظائف شروع کرنے سے پہلے اپنی توجہ کو دنیاوی امور، ذہنی و قلبی تاثرات اور تفکرات سے مکمل طور پر ہٹانا' اپنے اکابرینِ سلسلہ کی طرف توجہ کرنا' اکابرین سلسلہ سے رابطہ قائم کر کے ان سے توجہ کو طلب کرنا' انہماک و محویت حاصل کرنا اور اس قسم کے دوسرے لوازمات وظائف کا اہتمام کرنا' ضروریات وظائف میں سے ہے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو خواہ کسی نام سے پکارا جائے مگر پکارنے کا انداز درست ہونا چاہیے۔ دورانِ وظائف بے چینی اور اضطراب کی حالت طاری کرنی چاہیے اور اولیائے کرام کی محبت کو بھی دل میں جاگزیں کرے۔ اگر گریہ کی کیفیت طاری ہو جائے تو اجابت فوراً ہوتی ہے۔ اگر سالک کے دل میں عجز و نیاز ہو تو سمجھ لو کہ اس نے اپنا پیغام اللہ تعالیٰ کو پہنچا دیا۔ اپنی ظاہری حالت کو درست کرے تو رقت قلب خدا کی طرف سے مل جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فقط میلانِ قلب کو دیکھتا ہے اور اگر یہ حالت حاصل ہو جائے تو وظیفہ

اپنے اثر سے ہمکنار ہو جاتا ہے اور اس میں زمانی تقدم اور تاخر نہیں ہوتا یعنی جونہی وظیفہ کیا فوراً اثر پیدا ہو گیا۔

حضرت اسمٰعیل شاہؒ صاحب کرمانوالے فرمایا کرتے تھے کہ معلوم نہیں تم درود شریف کس طرح پڑھتے ہو کہ اس کا اثر نہیں ہوتا۔ میں تو جس کام کے لئے ایک بار درود شریف پڑھتا ہوں وہ کام فوراً ہو جاتا ہے۔ فرماتے تھے کہ درود شریف اس طرح پڑھو کہ اللہ اور فرشتے ایک طرف درود پڑھ رہے ہیں اور دوسری طرف مومنین درود پڑھ رہے ہیں۔ گویا اس طرح پڑھو کہ رسول اللہ ﷺ دونوں کے درمیان ہیں۔ اگر روضہ مبارک کی زیارت کی ہو تو اس کا نقشہ سامنے رکھو ورنہ روضے کا تصور کر لینا ہی کافی ہوگا۔ آپ نے ۱۹۶۴ء میں راقم الحروف کو تہجد کے وقت پانچ سو بار (صَلَّى اللّٰهُ عَلٰى حَبِيْبِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَسَلَّمَ) پڑھنے کی تلقین فرمائی اور فرمایا "مولوی جی! اگر یہ دونوں کام کر لو تو ہوا میں اڑو گے"۔ (اسی وقت سے یہ عمل شروع ہے)

صوفیائے کرام کا فرمان ہے کہ بارگاہ الٰہی میں واصل ہونے کے لئے تین باتوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک رزق حلال' دوسرے اولیائے کرام کی صحبت اور تیسرے ذکر' فکر اور مراقبہ میں کثرت کرنا اس طرح کہ اتباع شریعت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ اہل طریقت ان عبادات کی صحیح ادائیگی کا طریقہ اپنے شیخ سے حاصل کرتے ہیں۔

اصولِ طریقت

طریقت میں بہت سے مقامات اور منازل ہیں۔ تمام مقامات اور منازل کا بیان اس کتاب کے احاطے سے باہر ہے، البتہ چند ایک مقامات کا ذکر کیا جائے گا۔ یاد رہے کہ ہر مقام کے لئے ایک بدایہ (ابتدا) اور ایک نہایت ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص نہایت کو نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ بدایت کو درست نہ کرے۔ صوفیاء کا قول ہے کہ وصول الی اللہ (حقیقت و معرفت) طریقت کے ان اصولوں کو خراب کر دینے سے ضائع ہو جاتا ہے۔ ابو سلیمان درانی رحمۃ اللہ علیہ نے اصولِ طریقت اور ہدایت کو سنوارنے کی تاکید فرمائی ہے۔ اصولِ طریقت جو صوفیائے کرامؒ نے بیان فرمائے ہیں حسب ذیل ہیں۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اصول طریقت پانچ چیزیں ہیں۔

(۱) دن کا روزہ جب تک پیٹ کو بھوکا اور جگر کو پیاسا نہ رکھو گے مشاہدہ اور معرفت کا ملنا ممکن نہیں۔ (بقدرے استطاعت)

(۲) شب کا قیام اولیاء کے لئے شب بیداری طریقت کے لوازمات میں سے ہے۔ "کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی" کا مقولہ بالکل درست ہے۔ ہماری تصنیف "حُسن نماز" میں شب بیداری کی بہت تفصیل دی گئی ہے اور مطالعہ کے لائق ہے۔

(۳) عمل میں اخلاص "حسن نماز" کتاب میں خلوصِ نیت کا بیان مطالعہ فرمائیں۔

(۴) جملہ اعمال میں رعایت و ترتیب: ہر عمل میں طریقت کے اصولوں کی رعایت اور تربیت کا ملحوظ خاطر رکھنا۔

(۵) توکل، اعتماد، یقین اور طریقت کے دو اہم جزو ہیں۔ یقین کی تفصیل بھی ہماری درج بالا کتاب "حسن نماز" میں آچکی ہے۔

(i) حضرت سہل تستری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہمارے اصول سات ہیں۔ (۱) کتاب الٰہی کو مضبوطی سے پکڑنا (۲) سنتِ نبویہ کا اتباع کرنا (۳) اکلِ حلال (۴) مخلوق کو ایذا نہ دینا (۵) گناہوں سے بچنا (۶) توبہ کرنا اور (۷) جملہ حقوق کا ادا کرنا۔

(ii) حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بدایت کی طرف لوٹ کر آنا ہی طریقت ہے۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ ہدایت سے مراد حق تعالیٰ کی ذات کی طرف رجوع کرنا ہے کیونکہ وہی ہر شے کا مبداء اور منتہا ہے۔ جیسے فرمایا۔

اِلَیۡهِ یُرۡجَعُ الۡاَمۡرُ کُلُّهٗ (ھود: ۱۲۳) اس کی طرف لوٹائے جاتے ہیں سارے کام۔

ایک اور مقام پر ارشادِ ربانی ہے۔

اِلٰی رَبِّكَ مُنۡتَهٰهَا (النٰزعٰت: ۴۴) آپ کے رب تک اس کی انتہا ہے۔

ابتدائے طریقت یہ ہے کہ شرعی رخصت اور سہولتوں کو چھوڑ کر مستحب اور مستحسن اعمال کو اپنے اوپر لازم کرنا ہے (امداد السلوک) یعنی ہر عمل کی اولیٰ اور افضل صورت کو اختیار کرنا بدایت ہے۔ اور جب ذات حق کی طرف رجوع کر لیا تو نہایت کو پہنچ گیا۔ یعنی وہ ایسا ہو گیا جیسے ماں کے پیٹ میں معصوم تھا۔ (یہ مقام توبہ سے حاصل ہوتا ہے) تو سالک نہایت کو پہنچ جاتا ہے۔

وصول الی اللہ کا یہی مطلب ہے کہ غیرِ خدا سے انقطاع حاصل ہو جائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جو فرمایا اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب کوئی بندہ کسی مسلمان بھائی کی زیارت کے لئے نکلتا ہے تو فرشتے دعا کرتے ہیں کہ الٰہی جس طرح اس بندہ نے خاص تیرے لئے تیری راہ میں مواظبت اختیار کی ہے اور محض اسلام کی وجہ سے ایک مسلمان سے ملنے کو نکل کھڑا ہوا تو بھی اس بندے کو اپنا واصل بنا لے چنانچہ جس قدر غیر خدا سے دوری ہوگی اتنا ہی واصل باللہ ہوگا۔ حضرات صوفیاء نے وصول الی اللہ کے چار رکن بیان کئے ہیں۔

(۱) دینِ حق میں عبرت یعنی نیکوں کو دیکھ کر حرص کرے اور بے دینوں کو دیکھ کر اپنے حال پر شکر گزار ہو۔

(۲) مکاشفات و تجلیات کو دیکھے تو عالی حوصلگی کا ثبوت دے اور ان کو مقصود نہ سمجھ بیٹھے۔

(۳) ہمت کی حفاظت یعنی طلبِ مقصود کی کوشش میں ہمت نہ ہارے بلکہ ہمت سے لگا رہے۔

(۴) شیخ کا احترام' بڑوں کا احترام' چھوٹوں پر شفقت کامل ایمان والوں کو نصیب ہوتی ہے۔

طریقت میں حصول مقصود کے طریقے

امداد السلوک میں ہے کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ بدایت کو درست کرنے کے لئے اور حصولِ مقصود کیلئے سب طریقوں سے اقرب آٹھ طریقے ہیں جن کو انہوں نے حسب ذیل نکات میں ظاہر کیا ہے۔

(۱) دوام عبادت یعنی عبادت میں کسل اور سستی کو چھوڑ کر مشقت و مجاہدہ اختیار کرنا ہے اور عباداتِ شرعیہ میں بمطابق سنتِ رسول ﷺ پوری کوشش کرنا ہے۔ سالک کے لئے ضروری ہے کہ ہر وقت باوضو رہے (فضیلتِ وضو ہماری تصنیف ''حُسن نماز'' اوائل صفحات میں ملاحظہ فرمائیں)

(۲) روزہ رکھنا اور بھوکا رہنا روزہ رکھنے اور بھوکا رہنے کی فضیلت ہماری کتاب ''تہذیب نفس'' میں بیان ہو چکی ہے۔ حصولِ مقصود کے لئے یہ دونوں چیزیں نہایت ضروری ہیں کیونکہ مشاہدۂ حق ان کے بغیر ممکن نہیں۔

(۳) دوامِ سکوت اس سے مراد کم گوئی اور صرف حق بات کے لئے زبان کھولنا ہے۔ (اس کی تفصیل بھی ہماری تصنیف ''جنید و بایزید'' میں دے دی گئی ہے)

(۴) دوامِ خلوت اگر بیداری میں بھی حواس ظاہری بند کر لئے جائیں تو دل کے حواس کھل جاتے ہیں اور جو چیزیں خواب میں نظر آتی ہیں' بیداری میں بھی نظر آنے لگتی ہیں۔ حضور اکرم ﷺ اور اولیاء کرامؒ نے اپنی زندگیوں میں کچھ عرصے کے لئے خلوت نشینی اختیار کی ہے کیونکہ خلوت نشینی میں قلب کو فراغت ملتی ہے اور فکر پر اعانت حاصل ہوتی ہے۔ نبوت سے قبل حضور اکرم ﷺ کو خلوت نشینی زیادہ عزیز کر دی گئی تھی اس لئے آپ ﷺ نے کافی عرصہ غارِ حرا میں گزارا اور اس میں کئی کئی دنوں تک خلوت اختیار فرمائی۔ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اولیائے کرام نے بھی طویل عرصہ کے لئے خلوت کو اپنا شعار بنایا۔ یہ لوگ خلوت اور عزلت کے وسیلے سے ہی سلوک طے کرواتے رہے ہیں۔ خلوت اور جلوت کے تاثرات آگے آنے والے باب ''خلوت اور جلوت کی کرامات'' میں ملاحظہ فرمائیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے میرے سینے میں ڈالا ہے وہ میں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سینے میں ڈال دیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرح دوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے قلوب بھی روشن ہو گئے اور ان کی بشری صفات بالکل مضمحل ہو گئیں اور وہ اعلیٰ درجے کے عابد' زاہد' اہل معرفت' موحد کامل اور علوم میں راسخ اور مستحکم ہو گئے اور ان کی روشنی سینے بہ سینہ آگے پہنچتی رہی۔ یہ سب کچھ آپ کو حضور اکرم ﷺ کی صحبت سے ہی نصیب ہو گیا اور آپ کے قلب

مبارک پر آفتاب نبوت کا عکس ڈالنے اور نظر ہدایت کی ایک نگاہ ڈالنے سے حاصل ہوگیا۔ اس طرح صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین حضور اکرم ﷺ کی نبوت اور انوار اور معدنِ رسالت کے جواہر سے مشرف اور مالا مال ہوئے، اس کتاب کے اسی حصے میں طریق رابطہ کو ملاحظہ فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو طریق رابطہ سے کس طرح اکتساب فیض ہوا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے روایت کی ہے کہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص چالیس صبح (دن) حق تعالیٰ کے لئے اخلاص (کا برتاؤ) کرے گا تو حکمت کے چشمے اس کے دل اور زبان سے ظاہر ہونے لگیں گے۔ خلوت کے فوائد کا بیان طوالت کے باعث اس کتاب میں شائع نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ خلوت اور جلوت کا مختصر بیان آنے والے ایک الگ باب میں کر دیا گیا ہے۔

حصول طریقت کے اہم ترین اصول یہ ہیں کہ آدمی پسندیدہ اخلاق کا حامل رہے اور اپنے رب کی رضا پر راضی رہے۔ حضرت ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

"تصوف درحقیقت آزادی کا نام ہے، مگر آزادی سے مراد حرص وہوس سے آزادی ہے۔ تصوف میں ایک ہی جوانمردی ہے کہ بندہ خواہشاتِ نفسانی سے مجرد ہو جاتا ہے اور تکلفات ترک کر کے اپنے مقسوم پر راضی اور مطمئن رہتا ہے۔ تصوف ایسی سخاوت کا نام ہے کہ صوفی دنیا کو اہل دنیا کے حوالے کر دیتا ہے اور خود بے تعلق ہو جاتا ہے"۔

حضرت ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح فرمایا ہے کہ

"آج تصوف کا بس نام ہی نام رہ گیا ہے۔ حقیقتاً کچھ نہیں۔ ایک دن وہ تھا کہ حقیقتاً خالص تصوف موجود تھا اور اس کا نام موجود نہیں تھا"۔ "وہ دور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا دور تھا کہ اس وقت حقیقت تصوف ہر کس وناکس میں موجود تھی لیکن وہ خود کو صوفی نہیں کہتے تھے۔ مگر آج رسمی صوفی تمہیں ہر جگہ، ہر کوچہ و بازار میں ملیں گے جو بہت مشہور ہیں لیکن دعویٰ کے اعتبار سے دیکھو تو مجہول ہیں۔ دعوے بہت ہیں مگر اعمال وافعال کا وجود نہیں"۔

ان حالات میں اگر کوئی شخص اسم تصوف سے انکار کرتا ہے تو کرے کیونکہ معانی حقائق میں مسمیات سے بے گانہ ہو چکے ہیں مگر اسے چاہیے کہ عین تصوف کا انکار نہ کرے کیونکہ یہ انکار احکام شرعیہ اور انبیائے کرام کے انکار کے مترادف ہے اور ان کے خصائلِ حمیدہ کا انکار ہے۔

طریقت میں یقین کی دولت کے بغیر قدم نہیں اٹھائے جاتے

حضرت نعمان رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ علم کی استطاعت یقین ہی کے ساتھ ہوتی ہے انسان اسی قدر عمل کرتا

ہے جس قدر اس کا یقین ہوتا ہے۔ عمل میں کوتائی (کمی) اسی وقت ہوتی ہے جب یقین میں کمی ہو، چونکہ یقین عمل کے لئے دعوت دیتا ہے اس لئے یقین عمل سے افضل ہے۔ اگر یقین اس کو عمل کی دعوت نہ دیتا تو وہ عبودیت کا ارادہ نہ کرتا اور اگر یقین عبودیت کی دعوت نہ دیتا تو وہ حق ربوبیت ادا نہ کرتا۔

حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک شخص آیا اور پوچھا کہ ان دو شخصوں میں سے کون افضل ہے۔ ایک شخص کثیر العبادات، کثیر العمل ہے اور کم گنہگار ہے لیکن ضعیف الیقین ہے اس کو متواتر شک لاحق رہتا ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اس کے علم کو اس کا شک باطل کرتا ہے۔ سوال کرنے والے نے کہا کہ دوسرا شخص کم عمل لیکن قوی الیقین ہے اور بہت گنہگار ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ سن کر کچھ دیر خاموش رہے تو اس شخص نے کہا کہ اگر پہلے شخص کا ضعفِ یقین اس کے عمل کو باطل کرتا ہے تو اس قوی یقین رکھنے والے کا یقین ضرور اس کے کُل گناہوں کو محو کر دے گا۔ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس شخص کا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا کہ میں نے اس شخص سے بڑھ کر کسی کو فقیہ نہیں پایا۔ (عوارف المعارف)

علامہ اقبال کا قول ہے

کافر بیدار دل پیش صنم به ز دیندار سے کہ خفت اندر حرم

(وہ کافر جس کا دل بیدار ہے، اس دین دار سے بہتر کہ جو حرم میں سو گیا ہو۔)

حضرت شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مقامِ محبت نور یقین کے غلبہ سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ نفس کی اصلاح ہو جائے تو قلب پر ذکر کے اثر سے مقامِ حق الیقین حاصل ہو جاتا ہے اور جب محبت صحبت کے درجے پر پہنچ جائے تو اس وقت قلب پر احوال مرتب ہونے لگتے ہیں۔ محبت ایک ایسا جام ہے کہ اگر حواس اس سے متاثر ہوں تو ان میں سوز برپا ہو جاتا ہے اور اگر نفوس میں جاگزیں ہو جائے تو وہ نیست ہو جاتے ہیں۔ یہ سب یقین کی بدولت ہے۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پروانوں کا شعار تصوف ہے

عرب کے لوگوں کے دلوں کی دنیا بدلی تو وہی لوگ جو قاتل تھے انسانی جانوں کے محافظ بن گئے۔ چور آتے تو امین ہو جاتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت میں دیوانے آتے تو عقل کی باتیں کرنے لگتے۔ زانی آتے تو حیاء اور عفت کے پیکر بن جاتے۔ ڈاکو امن وامان کے معلم بن جاتے۔ متکبر اور کج رو آتے تو حلم اور تواضع کی مثالیں قائم کر جاتے۔ مال کے پجاری آتے تو خدا کی راہ میں اپنا سب کچھ لٹا جاتے، بے کار اور بے ہنر آتے تو ماہر زمانہ بن کر جاتے، جانوں کے دشمن آتے تو اپنے خون معاف کر دیتے۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے بھی نعمت کا اظہار فرمایا۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا (آل عمران: ۱۰۳)

اور یاد رکھو اللہ تعالیٰ کی وہ نعمت (جو اس نے) تم پر فرمائی جب کہ تم تھے (آپس میں) دشمن پس اس نے الفت پیدا کر دی تمہارے دلوں میں تو بن گئے تم اس کے احسان سے بھائی بھائی۔

ایک اور جگہ فرمایا۔

وَ اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ (الانفال: ٦٣)

اور اسی نے (اللہ نے) الفت پیدا کر دی ان کے دلوں میں اگر آپ خرچ کرتے جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب تو نہ الفت پیدا کر سکتے ان کے دلوں میں

صرف چند سالوں کی تعلیم سے یہ لوگ ایسے ہو گئے جیسے یہ لوگ اس دنیا کے رہنے والے نہ تھے بلکہ فرشتوں سے بھی افضل مخلوق تھے۔ ان کا وجود اطاعت' محبت' شرافت اور شجاعت کا سراپا تھا۔ وہ لوگ جو پانی پینے پلانے پر لڑتے، گھوڑا آگے بڑھانے پر کٹ مرتے' خود سے کسی کو بلند دیکھنا پسند نہ کرتے۔ اور جو افراد خود سری' بغاوت' عداوت اور سرکشی کے خوگر تھے، وہی لوگ خدا کے پرستار' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق اور شمع صداقت کے دیوانے بن گئے۔ یہی لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جان نچھاور کرتے اور اُن کے وضو مبارک کے پانی کو لینے کے لئے ایک دوسرے پر جھپٹتے اور آپ کی اتنی عزت واکرام کرتے جو کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کو بھی حاصل نہ تھی۔ (آج اپنے شیوخ کے احترام کرنے والوں پر شرک کا فتویٰ لگ جاتا ہے)۔

یہ شمع رسالت کے پروانے اس طرح فیض یاب ہوئے کہ انہوں نے شمع صداقت کو فروزاں کیا۔ نیکی کے نقیب اعلیٰ بنے' بھلائی کے کاموں کی طرف دوڑے اور موت پر اس طرح لپکتے جیسے ہرن پر شیر لپکتا ہے۔ یہ لوگ بدی سے نفرت کرتے' ظلم کو نیست ونابود کرتے' لوگوں میں فقر اور غربت کو کلی طور پر ختم کرتے جیسے ان میں کوئی بھی غریب اور مسکین نہ ہو راتوں کو عبادت کرتے اور پھر سجدوں میں گر کر گریہ وزاری کرتے۔ یہ لوگ قرآن پڑھتے، یاد کرتے اور اس میں تفکر کرتے، دن کے وقت یہ اپنا رزق تلاش کرتے، غریبوں اور مسکینوں کو کھانا کھلاتے، کمزوروں اور ضعیفوں کی دستگیری کرتے، مسافروں کی خبر گیری کرتے، بیواؤں اور یتیموں کے سروں پر دست شفقت رکھتے، کھیل کود سے دور رہتے، عیش وعشرت کی محفلوں سے اجتناب کرتے۔ اعلیٰ کاروبار ہونے کے باوجود نہایت عاجزی اور سادگی کا رویہ اختیار کرتے۔ گھروں اور بستیوں میں رہتے ہوئے بھی ایسے رہتے جیسے غریب الوطن اور مسافر رہتے ہیں۔ عالیشان مکانوں اور محلوں کی بجائے سادہ مکانوں

سے مانوس رہتے۔ (حالانکہ اس وقت بھی لوگوں کے پاس ہر قسم کے عیش وعشرت کے سامان موجود تھے) اپنا کام خود کرتے یہاں تک کہ خادموں اور غلاموں سے برابر کا سلوک روا رکھتے۔ یہ تمام صفات جس قوم میں موجود ہوں تو کیا ان کو یکتائے زمانہ کا شرف حاصل نہ ہوگا؟ کائنات کی سروری ان کے قدم نہ چومے گی؟ کیا قیصر و کسریٰ کے محلوں میں زلزلوں کے جھٹکے محسوس نہ ہوں گے؟۔

موجودہ حالت میں مسلمانوں کا زمانے بھر میں رُسوا ہونا درست ہے کہ نہیں؟

جو کچھ اوپر بیان ہوا حقیقت اس سے بھی زیادہ تھی اور اگر خاص لوگوں کے اوصاف بیان کئے جائیں تو کئی کتابوں کا حجم مطلوب ہوگا۔ غور کا مقام ہے کہ ہم اپنی طرف نگاہ کریں اور دیکھیں کہ ہم میں یہ اوصاف پائے جاتے ہیں یا نہیں اور موجودہ ایمان کی حالت میں ہمارا زمانے بھر میں رسوا ہونا درست ہے کہ نہیں۔ ہم کیوں ان باتوں سے دور رہتے ہیں جن کا اسلام ہم سے مطالبہ کرتا ہے اور اس کے صلہ میں اتنا بڑا مقام دینا چاہتا ہے۔ اگر ہماری قوم میں ایمان کی ادنیٰ سی رمق بھی آجائے تو مسلمانوں کی کایا پلٹ جائے گی۔

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا (ض۔ک:۵۸۱)

جب قوتِ ایمانی دلوں میں آ گئی تو ان مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ یہ جھونپڑیوں میں رہنے والے بدو بھی ایلچی بن کر جاتے اور قیصر و کسریٰ کے عالیشان محلوں کے قالینوں کو پاؤں تلے روندتے ہوئے بغیر شاہی آداب بجالاتے ہوئے کھلے بندوں پیغامِ اسلام سناتے اور ان محلوں کے باسی ان کی نظروں کے سامنے مٹی کے بتوں سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے اور جب بھی کسی نے ان کے کردار کو محض ایک بات سمجھ کر میدانِ جنگ میں للکارا تو ان مجاہدین نے باوجود قلت سامان اور تعداد کے اپنی شجاعت اور استقامت کی ایسی زندہ تصویر دکھائی کہ پھر ان کو مجاہدین کے کردار کا یقین ہو گیا اور کبھی ان کی طرف انگلی بھی کھڑی نہ کر سکے اور تمام عمر ان کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات کرنے کے قابل نہ رہے۔

بچشمِ عشق نگر تا سراغِ او گیری جہاں بہ چشمِ خرد سیمیاؤ نیرنگ است (پ،م:۳۲۱)

(عشق کی آنکھ سے دیکھ تا کہ اس کا سراغ ملے، عقل کی آنکھ میں تو یہ جہاں سفید جادو اور دھوکا ہے۔)

حضرت علی ہجویریؒ اور علمِ تصوف

حضرت علی بن عثمان ہجویریؒ کشف المحجوب میں درج ذیل حدیث سے تصوف کے بیان کا آغاز فرماتے ہیں اور اس سے پہلے سورہ الفرقان کی آیت نمبر ۲۵ کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ اللہ کے خاص بندوں کی پہچان یہ ہے کہ وہ زمین پر جھک کر چلتے ہیں اور جب جاہل انہیں چھیڑیں تو بجائے جواب دینے کے ان سے کہہ دیتے ہیں اچھا خوش رہو۔ اس کے بعد صاحب کشف المحجوب مشائخ کا درج ذیل قول تحریر فرماتے ہیں۔

مَنْ سَمِعَ صَوتَ اَهْلِ التَّصَوُّفِ فَلَا يُؤْمِنُ عَلٰى دُعَائِهِمْ كُتِبَ عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الْغَافِلِيْنَ

جس نے اہل تصوف کی آواز سنی اور ان کی دعوت کو قبول نہ کیا وہ اللہ کے نزدیک غافلوں میں لکھا گیا۔

اس کے بعد آپ نے صوفی کے لفظ کی وجہ تسمیہ کا ذکر فرمایا ہے۔ (جسے الگ بیان کر دیا گیا ہے) آپ نے فرمایا کہ صوف پہننے والے کو بھی لوگ صوفی کہتے ہیں اور قیامت کے روز صفِ اول میں کھڑے ہونے والوں کو یا اصحابِ صفہ کو بھی صوفی کہتے ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک اہلِ صفاء یعنی جن کے اندر اور باہر صفائی ہو وہ صوفی کہلانے کا حق دار ہے۔ فرماتے ہیں کہ صفائی ہر پہلو سے اچھی ہے اور اس کی ضد کدورت ہے۔ حدیث شریف میں ہے۔

ذَهَبَ صَفْوُ الدُّنْيَا وَبَقِيَ كَدْرُهَا

دنیا کی صفائی جاتی رہی اور اس کی کدورت باقی رہ گئی۔ (بخاری)

اہل تصوف نے اپنا دل کدورتِ دنیا کی آفات سے صاف فرما لیا ہے۔ اس زمانے میں اللہ تعالیٰ نے اہل تصوف کو عوام سے حجاب میں رکھا ہے اور ان کے بلند مرتبے کو عوام سے مخفی رکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ تو تصوف کو بے حقیقت چیز سمجھ بیٹھے ہیں اور ان کی پیروی جاہل عوام کَالْاَنْعَامِ نے کی ہے اور صفاء باطن کی خواہش کی ضرورت محسوس نہیں کی اور وہ سلف صالحین اور صحابہ کرامؓ کے طریقے کو چھوڑ بیٹھے۔ فرماتے ہیں۔

اِنَّ الصَّفَا صِفَةُ الصِّدِّيْقِ اِنْ اَرَدْتَ صُوْفِيًا عَلَى التَّحْقِيْقِ

یعنی اگر تو واقعی صوفی کی تلاش میں ہے تو یاد رکھ کہ صوفی کی شان صفا تو صرف صدیق اکبر رضی اللہ عنہ میں تھی۔

آپ فرماتے ہیں کہ حقیقی صفا کی ایک اصل ہوتی ہے اور ایک فرع۔ اصل تو یہ ہے کہ دل کو ماسوا اللہ سے منقطع کر دے اور فرع یہ ہے کہ دل کو غدار دنیا کی محبت سے خالی کر دے اور یہ دونوں صفات صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اس لئے صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہی وہ ہستی ہے جسے امامِ اہل طریقت اور مقتداء اہل تصوف کہا جاتا ہے اور یہی وہ پاکباز تھے جن کا دل اغیار سے اس قدر صاف تھا کہ صحابہ کرامؓ میں بھی آپ کی ہستی کا کوئی مقابل نہ تھا۔ دل کا ماسوا اللہ اور دنیا و مافیہا سے خالی ہونا یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ مال و متاع اور غلام قبضہ میں ہو راہ مولیٰ میں لٹا دے اور ایک ٹاٹ میں لپٹ کر دربارِ رسالت پناہ میں حاضر ہو جیسا کہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ہے کہ سب مال و متاع غلام لونڈی اللہ کے لئے صدقہ کر کے اس شان سے آقا کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ ایک ٹاٹ جسم اطہر پر تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا مَا خَلَّفْتَ لِعِيَالِكَ ابوبکر اپنے بیوی بچوں کے لئے کیا چھوڑ کر آئے ہو؟ عرض کی کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو یعنی بیوی بچوں کے

لئے دو گنج بیکراں چھوڑ کر آیا ہوں۔ ایک محبت خدائے حقیقی دوسرا اتباعت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، یہ اس لئے کہ میرا دل اس کمینی دنیا کے تعلق سے آزاد ہو چکا ہے اور صوفی کی اور عارف صادق کی مکمل صفت یہی ہے۔ حضرت علی الہجویری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دنیا میں ملوث و مشغول ہونا صفات بشری میں داخل ہے اور فی الحقیقت صوفی وہ ہے جو تکدر (میل کچیل) سے گزر کر صفات بشری سے بالاتر ہو جائے۔ اس کی تائید میں مشائخ طریقت کا یہ قول ہے۔

لَیْسَ الصَّفَا مِنْ صِفَاتِ الْبَشَرِ لِاَنَّ الْبَشَرَ مَدَرٌ وَالْمَدَرُ لَا یَخْلُوْ مِنَ الْکَدَرِ

یعنی صفائی صفات بشریہ سے نہیں کیونکہ انسان کی پیدائش مٹی سے ہے اور مٹی کے ذاتی خواص میں میل کچیل ہے۔

اس لئے انسان کے لئے میل کچیل کے سوا چارہ نہیں۔ تو ظاہر ہو گیا کہ صفا کا حاصل کرنا افعال و اعمال سے نہیں ہو سکتا بلکہ فرمایا۔

اَلصَّفَا صِفَۃُ الْاَحْبَابِ وَھُمْ شُمُوْسٌ بِلَا سَحَابٍ

یعنی صفا محبوبانِ خدا کی صفت ہے اور وہ آفتاب روشن ہیں جس پر ابر کا حجاب نہیں۔

ایک مرتبہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق دریافت کیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

عَبْدًا نَوَّرَ اللّٰہُ قَلْبَہٗ بِالْاِیْمَانِ۔

یعنی ایسا بندہ ہے جس کا دل اللہ تعالیٰ نے نور ایمان سے بھر دیا ہے۔ (یعنی جس طرح چاند سورج کو دیکھ کر روشن ہو جاتا ہے۔)

مشائخ سلسلہ میں سے کسی کا یہ شعر

ضِیَاءُ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ اِذَا اشْتَرَکَا
اَنْمُوْذَجٌ مِنْ صَفَاءِ الْحُبِّ وَالتَّوْحِیْدِ اِذَا اشْتَبَکَا

(یعنی جب سورج اور چاند کی دونوں روشنیاں آپس میں اکٹھی جمع ہو جائیں تو ان کی مثال توحید و محبت کی صفائی ہے۔)

یاد رکھو کہ سورج اور چاند کے نور کی وہاں کچھ حقیقت نہیں جہاں نور محبت و توحید کی جلوہ ریزی ہو' نور محبت و توحید کی مثال سورج اور چاند سے اس لئے دی گئی ہے کہ اس دنیا میں کوئی نور ان سے زیادہ منور و روشن نہیں اور ہماری ظاہری آنکھ سورج و چاند کے نور سے آسمان دیکھ رہی ہے اور بس۔ مگر نور توحید و محبت سے قیامت تک آنے والے تمام حالات دنیا میں منکشف ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لطائف کے مشاہدہ سے مغرور نہیں ہوتا' بلکہ اس کا ظاہر و باطن شک و شبہ اور وہم و گمان کی دستبرد سے محفوظ ہوتا ہے۔ جب اس درجہ پر صوفی پہنچ

جاتا ہے تو دنیاوعقبیٰ میں فنا ہو جاتا ہے اور بظاہر انسانی جسم رکھ کر ربانی بن جاتا ہے اور اس کی نگاہ میں زر و جواہر اور کنکر و پتھر یکساں ہوتے ہیں اور جو کچھ دنیاداروں پر مشکل ہوتا ہے وہ سب اس پر آسان ہو جاتا ہے۔ کسی بزرگ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جو محبت کے ذریعہ صاف ہوا وہ صافی ہوا اور جو محبتِ حبیب میں محو و مستغرق ہو کر غیرِ محبوب سے بری ہو گیا وہ صوفی ہو گیا۔

تصوف پر حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے نظریات

آج تک کوئی بزرگ ایسا نہیں ہوا جس نے بیعت نہ کی ہو۔ یوں تو ہر بزرگ نے اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے لیکن ہمارے اس زمانے سے قریب ترین اکابرین مشائخ میں سے حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ (جن کے بزرگ ہونے پر کسی کو کوئی شک وشبہ نہیں) کی ایک مختصر مگر جامع تحریر پیش کی جارہی ہے تاکہ پیروں سے نفرت کرنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ (جس نوعیت کا بزرگ ایک ہزار سال میں صرف ایک ہی ہوتا ہے) اس معاملے میں کیا عقیدہ رکھتے ہیں۔ ہماری تصنیف ''بیعت کی تشکیل اور تربیت'' میں حضرت علی ہجویری' شیخ عبدالقادر جیلانی' شہاب الدین سہروردی' امام غزالی' مجدد الف ثانی' شمس الدین سیالوی' امام قشیری' شیخ ابونصر سراج' عبدالعزیز دباغ' سلطان باہو' حاجی امداد اللہ مہاجر مکی' شاہ ولی اللہ' شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہم اور دیگر مشائخ کبار کے تصوف اور بیعت کے متعلق دلائل بھی شامل کئے گئے ہیں۔ (ان سب بزرگوں کے دلائل کو جھٹلانا چٹان سے ٹکرا کر اپنا سر پھوڑنے کے برابر ہے)

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان ملاحظہ فرمائیں۔

مکتوب ۴۲ دفتر دوئم میں مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں'' جاننا چاہئے کہ میرے پیر اور وصول الی اللہ میں راہنما وہ لوگ ہیں جن کے توسل سے میں نے اس راہ سلوک میں آنکھ کھولی ہے اور انہی کی وساطت سے میں نے معاملہ میں لب کشائی کی ہے اور طریقت میں الف اور با کا سبق انہی سے لیا ہے۔ میں نے مولویت کا ملکہ انہی حضرات کی توجہ شریف سے حاصل کیا ہے اگر مجھ میں علم ہے تو انہی کے طفیل، اگر معرفت ہے تو وہ بھی انہی کی توجہات کا اثر ہے۔ انتہا کو ابتدا میں داخل کرنے کا طریقہ انہی سے میں نے سیکھا ہے اور میں نے قیومیت کی جہت سے جذب کی نسبت انہی سے اخذ کی ہے اور میں نے ان کی ایک نظر سے وہ فیض پایا ہے جو دوسروں کو چالیس روز کی چلہ کشی میں بھی میسر نہیں آسکتا۔ میں نے ان کی گفتگو سے وہ کچھ پایا ہے جو دوسرے برسوں میں بھی حاصل نہیں کرتے۔

موقع محل کے مطابق گزارش

یہ مناسب تھا کہ یہاں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے چار پانچ اقتباسات پیش کئے جاتے مگر مذکور بالا ایک

واخلاق جو خواص وعوام میں مشترک ہے دوسرا علم اسرار جو باریکی و پوشیدگی کے سبب سے اخیار سے محفوظ اور خواص علماء یعنی اہل عرفان سے مخصوص ہے۔ دوسری قسم کے علم کے اظہار وافشاء سے ممانعت اس واسطے نہیں کہ وہ علم شریعت کے خلاف ہے بلکہ وجہ یہ ہے کہ علم باطن کی دقت و پوشیدگی کے سبب سے عوام اُسے سمجھ نہ سکیں گے اور قائل کو منکرات سے منسوب کریں گے۔

اسی کے مطابق راقم الحروف کا شعر ہے ۔

میرا ہے دین عاشقی میرے خمار میں دوام
میری زبان اور ہے میرا کلام اور ہے

میں نہ لطیف کہہ سکا دل میں چھپی ہے ایک بات
شرع کی قید تو نہیں منہ میں لگام اور ہے

(از مصنف)

حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ فَعِلْمٌ فِی الْقَلْبِ فَذَالِکَ الْعِلْمُ النَّافِعُ وَعِلْمٌ عَلَی اللِّسَانِ فَذَالِکَ حُجَّةُ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ عَلَی اِبْنِ اٰدَمَ۔

یعنی علم دو ہیں ایک علم دل میں یہ علم نفع دینے والا ہے، دوسرا علم زبان پر یہ علم خدا کی حجت ہے آدمیوں پر۔ (رواہ الدارمی)

جس کو قرآن وسنت رد کر دیں وہ زندقہ ہے

اسلام ہمیں خدا کو ماننے اور اس سے مدد طلب کرنے اور اس کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ہم اللہ کی طرف سے رشتہ جوڑنے کی بات سنتے ہیں مگر اللہ کیا ہے؟ کہاں ہے؟ کیسا ہے؟ اس کا جواب تصوف بذریعہ عرفان عطا کرتا ہے۔ جب یہ عرفان حاصل ہو جائے تو اس شخص کو مقرب بارگاہ الٰہی کہتے ہیں۔ قرآن میں انسانوں کے تین گروہوں کے نام آئے ہیں یعنی مقربین، اصحاب یمین اور اصحاب شمال۔ اصحاب یمین کا علم ہدایتی علم ہے۔ اصحاب شمال کا علم اضلالی ہے جسے علم نفس یا ہویٰ کہا جاتا ہے اور ذات کا علم جو مقربین کو ہے وہ کسی کو نہیں مگر وہ جو اللہ کا قرب پاتے ہیں اور اس کی صفات سے وابستہ ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ بولنے، دیکھنے، سننے میں صفات الٰہیہ اس کی معاون بن جاتی ہیں۔ طریقت کا علم قرآن وسنت سے حاصل کیا جاتا ہے۔ جس طریقہ کو کتاب وسنت رد کر دے وہ زندقہ ہے۔

زندقہ کے دو اسباب ہیں، مشائیت اور اشراقیت: اشراقیت میں یہ عقیدہ مانا جاتا ہے کہ خدا کے سوا کسی کا وجود نہیں۔ وجود کا پہلا اشراق عقل ہے، دوسرا روح اور تیسرا مادہ ہے، وہ کہتے ہیں کہ وجودِ حقیقی خدا کا ہے اور اس کے علاوہ کوئی موجود نہیں۔ کچھ لوگوں نے ہر چیز کے متعلق کہا کہ سب کچھ حق ہی حق ہے اور غیر حق ذاتاً اور وجوداً معدوم ہے۔

مشائیت ارسطو کا فلسفہ ہے جسے اسکندر کے حکم سے مدون کیا گیا اور فارابی، ابن رشد اور ابن سینا نے اس کو مہذب بنایا تھا۔ درسِ نظامی میں یہ فلسفہ پڑھایا جاتا ہے۔ علم الکلام میں ارسطو کے فلسفے کے بعد متاخرین نے فلسفہ اور منطق کو بھر دیا۔ معتزلہ اور اشاعرہ وغیرہ جیسے بہت سے فرقوں نے اپنی تعلیمات سے اسلام کے عجیب الانواع فرقے پیدا کر دیئے جس کی وجہ سے ہمہ اوست، طریقت و معرفت، علم سینہ جیسے صحیح علوم کو غلط رنگ دے کر عام کر دیا حالانکہ اسلاف میں سے بہت سے بزرگ ان کی صحیح صورت کے قائل تھے۔ افسوس اس بات پر ہے کہ ایسے لوگوں نے شریعت، طریقت اور حقیقت میں غلو کر کے غیر مقصود کو مقصود قرار دے دیا اور نتیجتاً تصوف کو بدنام کر دیا۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اسرار و رموز میں فرماتے ہیں۔

اے گرفتار رسومِ ایمانِ تو　شیوہ ہائے کافری زندانِ تو

(تو دین کی رسوم میں گرفتار رہے، کافرانہ طور طریقے تیرے لئے زندان بنے ہوئے ہیں۔)

صوفیِ پشمینہ پوشِ حال مست　از شرابِ نغمۂ قوال مست

(آج کل کے گودڑی پوش اور حال مست صوفی اقوال کے نغموں کی شراب سے مست ہیں۔)

آتش از شعرِ عراقی در دلش　درنمی سازد بقرآں محفلش

(عراقی کے اشعار ان کے دلوں میں گرمی پیدا کرتے ہیں، مگر قرآن پاک ان کی محفلوں کو راس نہیں آتا۔)

از کلاہ و بوریا تاج و سریر　فقرِ او از خانقاہان باجگیر

(انہوں نے کلاہ و بوریا کو تاج و تخت بنا رکھا ہے اور ان کا فقر خانقاہوں سے اپنا خراج وصول کرتا ہے۔)

واعِظ دستاں زنِ افسانہ بند　معنیٔ اُو پست و حرفِ اُو بلند (ا۔ر: ۱۲۳)

(واعظوں کا یہ حال ہے کہ وہ ہاتھ ہلا ہلا کر کہانیاں بیان کرتے ہیں، ان کی تقریروں میں لفاظی بہت زیادہ ہوتی ہے مگر معانی کم۔)

طریقت کے جھوٹے مدعیان کا نقشہ (بالخصوص تقسیم ہند سے پہلے)

تصوف والوں کے احوال بدل جانے کے بعد وہ وقت آیا کہ لذات و احوال، کشف کونی، تصرفات و کرامات، وجد و حال، رویائے صادقہ وغیرہ سالک کی علامت اور پہچان پائے جانے لگے اور ایسی باتوں کو ہی بزرگی کی علامت خیال کیا جانے لگا۔ حقیقت کی بجائے کلاہ اور جبہ نے لے لی۔ اس کے حصول کے لئے غیر مسنون مشقوں کی ابتدا ہوئی۔ عجیب نوعیت کے لباس پہنے جانے لگے۔ کچھ لوگ تو بھنگ، چرس اور افیون میں مست رہ کر احوال طریقت کے دعویدار بننے لگے۔ ان میں سے بعض تو شراب خوری سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ ان لوگوں نے جوگیوں اور سنیاسیوں سے اشغال سیکھنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ کچھ لوگوں نے

اتباع شریعت کو غیر ضروری کہنا شروع کیا اور مشہور کیا کہ وہ اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں اب ان کے لئے شریعت کا ارتفاع ہو گیا ہے (یعنی شریعت اٹھ گئی ہے) بلکہ شریعت کو ناقص لوگوں کا شعار قرار دیا جانے لگا اور کہا کہ کاملین کو اس کے اتباع کی ضرورت نہیں۔ ایسے لوگوں نے یہ کہا کہ جب ہم سے غیریت اٹھ گئی اور حق ہی حق رہ گیا تو اب شریعت کی پابندی کیسی۔ جمال کا اتباع عورتوں کا کام اور جلال کا اتباع مردوں کا کام کہا جانے لگا۔ یہ لوگ کہتے کہ شریعت کا علم علمِ سفینہ ہے لیکن طریقت کا علم تو علمِ سینہ ہے جو سینہ بہ سینہ چلا آ رہا ہے۔ راز پوشیدہ ہے اور سر مکنون ہے۔ ایسے مدعیانِ طریقت کی خانقاہوں میں تاش، شطرنج، جواء جیسے بُرے کاموں کا عام رواج تھا اور یہ خانقاہیں اچھے خاصے مسلمانوں کو اعمال اور کردار کے اعتبار سے مفلوج اور اپاہج بنانے کے مراکز بنے ہوئے تھے۔ یہ تصوف تھا جو پاک و ہند میں بہت سے لوگوں میں رائج ہوا، اگرچہ صحیح تصوف پر چلنے والے بھی موجود تھے مگر عوام کا زیادہ تر رجوع ایسے غیر شرعی لوگوں کی طرف تھا جن کو قلندر کہا جاتا تھا۔ عوام کی اکثریت ان جھوٹے صوفیوں کی تاویلوں میں بآسانی آ جاتی اور حقیقی تصوف کو بھلا بیٹھی۔ یہ لوگ ایسے دلائل پیش کرتے جن کو عوام بلا تامل تسلیم کر لیتے ہیں۔ اس کی وجہ تو یہی تھی کہ اس قسم کے صوفیوں کی پیداوار دشمنانِ اسلام کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ تھا تا کہ تصوف کو بدنام کیا جائے اور لوگ صوفیائے کرام سے اخذِ فیض کے لئے روک دیئے جائیں کیونکہ صوفیائے کرام سے ان کو خطرات محسوس ہوتے تھے۔

علامہ اقبالؒ نے لوگوں کے اس روش کو ضرب کلیم میں (پنجابی مسلمان) کے نام سے یوں لکھا ہے ؎

مذہب میں بہت تازہ پسند اس کی طبیعت — کر لے کہیں منزل تو گزرتا ہے بہت جلد

تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا — ہو کھیل مریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد

تاویل کا پھندہ کوئی صیاد لگا دے — یہ شاخِ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد

(ض۔ک: ۵۲۳)

آج بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو خود کو پیر نہیں بلکہ فقیر کہتے ہیں اور نماز و روزہ سے بے پرواہ ہیں اور ... ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے یہ نماز ہرگز نہیں پڑھی جس میں قیام و رکوع ہے کیونکہ اصل نماز تو یہ ہے کہ ... دل اللہ کے حضور میں جھکا رہے اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ پانچ وقت تو کیا ہمارا سر تو ہر وقت نماز میں ... ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے قرآن اور شریعت کو جھٹلایا اور طریقت کو بدنام کیا ؎

چراغِ مردہ و شمعِ آفتاب کجا — بہ بیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا (...)

(بجھا ہوا چراغ اور آفتاب کہاں اس فرق کو دیکھو کہ کہاں سے کہاں تک ہے۔)

ایسا تصوف تو قوم کے لئے ناسور ہے

ایسے خودساختہ پیر تقسیمِ ہند سے پہلے تو بے شمار تھے اور آج پاکستان میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن کو شریعت کی مخالفت میں روحانی کمال نظر آتا ہے۔ اگر کوئی نمازی یا باشریعت انسان ان کی محفل میں آجائے تو یہ صوفی نما لوگ سب سے پہلے اس کو ترکِ نماز کا حکم دیتے ہیں۔ راقم الحروف کو ایسے کئی لوگوں سے ملاقات کا اتفاق ہوا ہے جو صرف دل کی نماز (بغیر قیام، رکوع، سجود) کی بات کرتے ہیں اور اس قیام و رکوع وغیرہ کو اللہ سے حضور قلبی کے قیام اور رکوع مراد لیتے ہیں نہ کہ بدنی قیام و رکوع وغیرہ۔ یہ لوگ جو کہ مسنون نماز سے انکار کرتے ہیں قطعاً اسلام سے خارج اور مرتد ہیں۔ ہندوستان میں اس قسم کا تصوف پہلے عروج پر تھا۔ جب علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی آواز کو بلند کیا اور اپنے کلام کے ذریعے لوگوں کو ایسے فقر اور روحانیت سے باز رہنے کا سبق دیا تو لوگوں کو قدرے شعور آیا۔ اس قسم کے تصوف کو دیکھ کر بعض خشک علماء نے تو سرے سے ہی طریقت کو اسلام کے خلاف اور حرام قرار دے دیا اور یہ لوگ آج بھی طریقت کو مذموم اور غیر ضروری تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ یہی وہ علماء تھے جنہوں نے دشمنانِ اسلام کے عزائم کو کامیاب بنا دیا وہ اسلام کے اس قسم کے دشمن تھے کہ مشائخ کو اور طریقت کو مکمل طور پر نیست و نابود کرنا چاہتے تھے۔ لیکن الحمد للہ ان کی کوششوں کے باوجود آج بھی مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد حقیقی طریقت اور اہلِ طریقت کی قدردان ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے دیکھا کہ ایسے لوگ تو پوری قوم کو مفلوج، اپاہج اور کسب و کردار سے عاری طرزِ عمل کی طرف کھینچ کر لئے جا رہے ہیں تو آپ نے بروقت اس تصوف اور رسمِ خانقاہی (جو ان دنوں میں عروج پر تھی) کے خلاف آواز اٹھائی۔ ہماری تصنیف ''شاہیں کا جہاں اور'' میں غلط قسم کے ملاؤں اور صوفیوں پر علامہ کا کلام یکجا کر دیا ہے۔ آپ نے قوم کو قرآن و سنت پر عمل پیرا ہونے اور مستعد باعمل ہونے کی تلقین فرمائی۔ آپ نے وہ کام کیا جو سینکڑوں علماء انجام دینے سے قاصر رہے اور بجا طور پر آپ اس تحسین کے حقدار ہیں کہ آج انہیں بالاتفاق حکیم الامت کہا جاتا ہے۔ ان کے کلام کے چند اشعار جو اس قسم کے بدنام زمانہ صوفیوں اور ملاؤں کے رد میں لکھے گئے ہیں قارئین کی خدمت میں پیش کئے جا رہے ہیں لیکن اس سے ان کی ہرگز یہ مراد نہ تھی کہ طریقت کو ہی ترک کر دیا جائے۔ آپ نے صحیح طریقت کا اعتراف کیا ہے اور آپ مشائخ اور اہل اللہ کے دل سے قدردان تھے بلکہ انہوں نے خود بھی اپنے والد سے بیعت کا شرف حاصل کیا تھا۔ سیرتِ اقبالؒ میں آپ نے فرمایا ؎

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری　　اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری　　اک فقر سے مٹی سے خاصیتِ اکسیری

(ب،ج: ۴۵۲)

ارمغان حجاز میں " آوازِ غیب " میں آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں کا اب قرون اولی کے مسلمانوں کا سا حال کہیں نہیں رہا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ غلط قسم کی پیری مریدی میں پھنس گئے تھے۔ ارمغانِ حجاز میں " آواز غیب " میں آپ نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں کا قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا سا حال کیوں نہیں رہا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ غلط قسم کی پیری مریدی میں پھنس گئے۔

کس طرح ہوا کند ترا نشترِ تحقیق؟ ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک؟
مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں؟ کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک؟
باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری (ا۔ح:٦٦٩)

علامہ اقبالؒ نے فرمایا۔

یہ معاملے ہیں نازک جو تیری رضا ہو، تُو کر کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریق خانقاہی
(ب۔ج:٣٣٧)

تصوف کے ارکان

حضرت ابوالحسن محمد بن احمد فارسی رحمۃ اللہ علیہ کا قول تعرّف میں نقل کیا جا چکا ہے کہ تصوف کے حسب ذیل دس ارکان ہیں اور تصوف ان کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ ان ارکان کو سیرِ تصوف جلد سوم ص ۳۰۱ پر نہایت طوالت سے لکھا گیا ہے یہاں صرف ان کے نام درج کئے جا رہے ہیں۔

(۱) تجرید توحید یعنی توحید کا پیراستہ کرنا۔ (۲) سماع کا سمجھنا۔ (۳) حسنِ معاشرت یعنی باہمی خوش دلی یا خوش زندگانی۔ (۴) ایثار الایثار یعنی غیر کی منفعت کو خود پر مقدم کرنا۔ (۵) اختیار کا چھوڑنا۔ (۶) مشروعیۃ الوجد یعنی وجد سے محظوظ ہونا اور اس سے فارغ نہ ہونا۔ (۷) کشف عنِ الخواطر جو دل میں گزرے اس کا کشف۔ (۸) سفر کی کثرت۔ (۹) ترکِ اکتساب یعنی نفس کا کسی کام کے سبب کو پا کر اس پر اعتماد نہ کرنا کیونکہ اس سے توکل پر زد پڑتی ہے اور (۱۰) ذخیرہ کرنے کو حرام جاننا۔

فلسفہ اور تصوف کی پہنچ

فلسفے میں حقائق کا عرفان، منطقی استدلال اور استنباط سے کیا جاتا ہے۔ جب کہ تصوف میں یہ عرفان چند ایسی کوششوں اور مشقوں اور اعمال سے کیا جاتا ہے جن سے باطنی حواس اور روحانی قوتیں جاگ [illegible] فلاسفہ کا ایک گروہ ہے جو کہ خداوند تعالیٰ کو نہیں مانتا اور فقط حواسِ خمسہ سے ہی مندرجہ بالا عرفان کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جبکہ فلسفیوں کا دوسرا گروہ آخر میں خدا کو مان لیتا ہے۔ خدا کو نہ ماننے والے [illegible] ازلی اور ابدی مانتے ہیں۔ تصوف ایک مسلسل عمل ہے [illegible]

مایوسیوں کے ظلمت کدوں میں ایمان ویقین کے چراغ جلانے' امت کی عروقِ مردہ میں زندگی کی لہریں دوڑانے اور خزاں رسیدہ چمن کو بہار آشنا کرنے کا نام ہے۔ اسلامی فلسفہ میں جوہر صفات اور حقیقت کے مسئلہ کی تحقیق کچھ اس انداز میں کی گئی ہے' مثلاً اس میں یہ اعتقاد رکھا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ ہی واحد حقیقت ہے، ہم (یعنی مخلوق) محض مظاہر ہیں۔ نیز یہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ انسانی صفات محض ایک نقشِ بے ثبات ہیں جن میں ان خدائی صفات کا ایک دھندلا سا عکس نظر آتا ہے جو ابدی اور دائمی ہیں۔

تصوف کا لفظ قرآن میں استعمال نہیں کیا گیا بلکہ اس کی جگہ حکمت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس میں تصوف کے معانی شامل ہیں۔

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ

''(اللہ پاک) عطا فرماتا ہے دانائی جسے چاہتا ہے اور جسے عطا کی گئی دانائی تو یقیناً اسے دے دی گئی بہت بھلائی''۔ (البقرۃ:۲۶۹)

اللہ تعالیٰ نے طلب اور دریافت کا جو راستہ اپنے خاص بندوں پر کھولا ہے اور سچ کہنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی جو راہ اس نے اپنے بندوں کو سمجھائی ہے' یہی راست بازی ان کو حکمت سے آشنا کر دیتی ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر تم حکمت سے آشنا ہونا چاہتے ہو اور اس کی وہ صفات اپنانا چاہتے ہو جو تمہیں محبوب ہیں' تو پھر اس کے لئے لازم ہے کہ تم اپنے باطن کو ان امراض سے محفوظ رکھو جو حکمت کی راہ میں حائل ہونے والی ہیں اور اس حذر و احتیاط کو اپنے مقصد کا وسیلہ بناؤ۔ نیز اپنے ضمیر کی اصلاح کرو اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ جو چیز اس کے لئے ضروری ہے اسے کچھ عرصہ تک کے لئے وقف کر دو۔ اس لئے کہ حکمت ایک ایسے شخص کے لئے جس کے اندر اس کی خواہش بے پایاں ہو اور اس کے باطن پر اس کی محبت چھائی ہوئی ہو ایک پُر شفقت ماں اور ہمدرد باپ سے زیادہ مہربان اور عنایت گستر ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ مجھے یوں لگتا ہے گویا معرفت کے بادل تمہارے سر پر چھائے ہوئے اور تم پر سایہ کئے ہوئے ہیں اور ان کے برسنے کی بابت تمہاری امیدیں بہت قوی ہو گئی ہیں۔ پس حکمت کے ان بادلوں میں جو بارش موجود ہے اس کو طلب کرو اور وہ یوں کہ ہمیشہ حکمت و عمل کے دائرے میں اپنے آپ کو محصور رکھو اور ساتھ ہی اس ہستی سے بارانِ رحمت کی طلب جاری رکھو جو بارش کو اتارنے والی اور بادلوں کو پھیلانے والی ہے' جو نقصان کو دور کرتی ہے اور گردنوں کو آزاد کرتی ہے اور جان لو کہ اللہ عزوجل اپنی رحمت کی بارش کے ایک قطرے سے اپنی مخلوقات کی سوکھی سڑی زمین کو دوبارہ زندگی بخش دیتا ہے۔ پس تم بھی زندگی کی طلب جاری رکھو' وہ ذات ضرور آبیاری کرے گی۔ امید یہ ہے کہ اس باران کے آغاز میں ہی تم شفا پاؤ گے اور اگر وہ کھل کر برسا تو تمہارے باطن میں

جتنا کچھ بھی میلِ دنیا ہے، وہ سب دھل جائے گا اور تمہارے جسم پر اس کا اثر یہ ہوگا کہ تمہاری باقی سب بیماریاں بھی زائل ہو جائیں گی۔ جب اس طرح تم نے حکمت و معرفت کا مزہ چکھ لیا تو تمہارے نفس سے خواہشات کا جنازہ نکل جائے گا۔

تصوف کی تعلیم اور صحبت کا اثر

تصوف کی تعلیم خفیہ طور پر دی جاتی ہے اور صرف ان خاص لوگوں کو دی جاتی ہے جو اس کے اہل ہوں۔ عوام کو نہ تو اتنا شوق ہوتا ہے اور نہ ہی وہ اس کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب میں بھی تصوف کی نقل کی گئی ہے اور یہ لوگ بھوک، ننگ، حبسِ دم، نفس کو ہلاک کرنے، گوشہ نشینی اختیار کرنے کو اپنے حواسِ خمسہ کو بیدار کرنے کا ذریعہ بناتے ہیں مگر اسلام کا طریقہ بہت سہل ہے اور ان مندرجہ بالا طریقوں سے مختلف ہے۔ اہل تصوف زیادہ تر فکر اور مراقبہ میں مشغول رہتے ہیں اور استغراق کامل حاصل کرنے کے بعد ان کے دل کی آنکھ منور ہو جاتی ہے اور انسان کا تعلق عالم بالا سے ہو جاتا ہے۔ تصوف میں داخل ہونے کیلئے کسی مکمل اور کامل شیخ سے بیعت کرنا ضروری ہے کیونکہ مشائخ کا قول ہے کہ

مَنْ کَانَ لَا شَیْخَ لَہٗ فَاِنَّ الشَّیْطَانَ شَیْخٌ لَہٗ　　جس کا کوئی شیخ نہیں تو شیطان اس کا شیخ ہوتا ہے

غیر اسلامی طریقے والا شخص بے شمار عبادات کے بعد بھی کسی وقت مردود ہو سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں مختلف لوگوں کو مختلف تعلیم کے بعد روحانی عنایات عطا کی جاتی تھیں۔ درجہ ایمان اور احسان صحبتِ رسول ﷺ سے ہی حاصل ہو جاتا تھا۔ جو لوگ ایمان کی حالت میں رسول اللہ ﷺ کی ایک جھلک دیکھ لیتے تھے وہ صحابی کا درجہ حاصل کر لیتے تھے۔ زمانے کا بڑے سے بڑا قطب اور غوث بھی ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کے درجہ سے بہت ہی کم تر ہوتا ہے۔ غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے "جہاد پر جانے والے عام صحابیؓ کے گھوڑے کے پاؤں کی خاک اڑ کر میرے جسم پر گر جائے تو میں یہ سمجھوں گا کہ میری بخشش ہو گئی"۔ اگر کوئی رات دن عبادت میں لگا رہے تب بھی وہ صحابیؓ کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ درجات کا یہ تفاوت ظاہر کرتا ہے کہ جس کو صحبتِ رسول اللہ ﷺ حاصل ہو گئی اس کا مقابلہ آج کا بڑے سے بڑا عابد اور زاہد بھی نہیں کر سکتا۔

تصوف کی ضرورت

انسان کی تین قسمیں ہیں: اولاً عوام جو تقلید پر قناعت کرتے ہیں اور دوسروں سے سیکھتے ہیں ان کا مرتبہ بلند نہیں ہوتا، تاہم یہ لوگ اہلِ نجات میں سے ہیں۔ ثانیاً وہ گروہ جو دانشور اور عقلمند ہے یہ زیادہ تعداد میں نہیں ہوتے۔ ثالثاً وہ طبقہ جو عقل و دانش کے ذریعہ تصرف کرتا ہے یہ لوگ اجتماعی عبادت میں [illegible]

ہیں۔ ہوشیاری میں ابلیس کے مترادف ہوتے ہیں جس نے خود فریبی میں یہاں تک کہنا شروع کر دیا کہ "میں آدم سے بہتر ہوں، مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے۔" حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ شیطان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اگر وہ عقلمند و زیرک نہ ہوتا تو دانشمندوں اور دانا اشخاص کو گمراہ نہ کر سکتا۔ تاہم اہلِ بینش وار بابِ بصیرت پر شیطان کی دسترس نہیں ہوتی جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ "جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا غلبہ نہیں ہو سکتا ہے"۔ (بنی اسرائیل: ۶۵)

اسی طرح قرآن نے لوگوں کو تین درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان تینوں درجات میں دولت اور دولت کی محبت کی بنیاد رہتی ہے۔ دولت کی جدائی میں جو سوزش کارفرما ہے اس کے تین درجے ہیں، پہلا سعادت مندی کا ہے، یعنی لوگ اپنی مرضی سے صدقہ و خیرات کرتے ہیں۔ دولت کی اس جدائی کا سوز عموماً سازگار ہوتا ہے سورہ فاطر کی آیت ۳۲ میں لکھا ہے کہ ایسے لوگ "مِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَیْرٰتِ" کے زمرے میں آتے ہیں۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ لوگ ضرورت و حاجت کو پورا کرنے کے لئے مال و دولت حاصل کرتے ہیں۔ یہ "وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ" کے طبقہ میں آتے ہیں۔ تیسرا درجہ بدبختوں کا ہے جو نہ تو اپنی مرضی سے اور نہ ہی زبردستی مال سے جدا ہوتے ہیں۔ یہ لوگ "فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ" کے گروہ میں داخل ہونے کے مستحق ہیں۔

تصوف روحوں کی توجہ کو اللہ کی طرف کرنے کا نام ہے

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ مکتوب نمبر ۲۸۷ (دفتر اول حصہ پنجم) میں فرماتے ہیں کہ روح کے لئے بدن کے ساتھ متعلق ہونے سے پہلے اپنے مقصود کی طرف توجہ حاصل تھی۔ (یعنی پیدا ہونے سے پہلے روحیں ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہتی تھیں) لیکن جب بدن سے متعلق ہوئیں تو وہ توجہ زائل ہو گئی۔ اس بلند سلسلہ (نقشبندیہ) کے اکابر نے اس پہلے والی توجہ کے ظہور کے لئے طریقہ وضع فرمایا ہے۔ جب روح بدن سے متعلق ہو تو توجہ قلبی موجود رہتی ہے اور توجہ قلبی موجود ہو تو توجہ نفس اور توجہ روح دونوں رہتی ہیں) اور اس میں شک نہیں کہ توجہ روحی توجہ قلبی میں درج رہتی ہے لیکن وہ توجہ روحی جو منتہی حضرات کو حاصل ہوتی ہے وہ اس وقت ملتی ہے جب ان کی روح فنا حاصل کر کے حقانی وجود حاصل کر کے بقا حاصل کر لیتی ہے۔ اس بقا کو بقا باللہ کہتے ہیں۔ وہ توجہ جو روح کو بدن میں آنے سے پہلے حاصل تھی اس کو ابھی فنا اور بقا حاصل نہ ہوئی تھی۔ فنا والی توجہ اور بدن سے تعلق رکھنے سے پہلی توجہ میں بہت فرق ہے۔ اس انکشاف کے بعد حضرت مجدد علیہ الرحمۃ نے انجذاب قلبی پر عمیق گفتگو کی ہے جو عام لوگوں کے فہم سے بہت بلند ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس نکتہ کو بیان فرمایا کہ دنیا میں آنے کے بعد لوگوں کے بہت سے

گروہ بن گئے اور ان کا فرق صرف اس توجہ سابقہ کو برقرار رکھنے یا نہ رکھنے سے متعلق ہے۔ ظاہر ہے کہ جب روحوں کا تعلق جسم سے ہوا تو ان کی توجہ کھانا' پینا' لباس اور مکان وغیرہ کی طرف مرتکز ہوگئی اور بعض روحوں کی یہ کیفیت ہوگئی کہ اس دنیا میں ان کی توجہ الی اللہ بالکل منقطع ہوگئی، البتہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کی توجہ آج بھی ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی طرف مرتکز رہتی ہے عین اسی طرح جس طرح کہ عالم ارواح میں تھی۔ (ایسے لوگوں کو محبوبین کا درجہ حاصل ہوتا ہے)

خانقاہی نظام کی ابتداء

اللہ تعالیٰ کو قطعاً بھلا دینے والوں کو راہ راست پر لانے کے لئے مشائخ نے خانقاہوں کا رواج ڈالا اور خاص طریقوں سے ان کے دلوں میں ذکر الٰہی جذبہ، کیفیت اور لذت کے ساتھ اللہ کی طرف ان کا رجوع کرایا۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے پہلی مرتبہ ۱۱۰ھ میں تصوف کا درس دیا۔ جب کہ اس سے پہلے روحانی علم زبان پر آنے کی بجائے سینوں میں مخفی تھا اس طرح یہ علم دل سے نکل کر دماغ میں آنے لگا۔ ۲۴۰ھ میں ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے علم تصوف کو کتابی شکل دی اور تصوف کی اصلاحات' قواعد باطنی اور مشاہدات وغیرہ کا رواج ہونے لگا۔ اب یہ علم کتابی بن گیا۔ آج اہل یورپ نے اس علم پر سینکڑوں کتابیں لکھی ہیں اور خود بھی حبس دم وغیرہ کی مشقوں سے روحانیت میں قدم رکھنا شروع کر دیا ہے۔ عجمی لوگوں نے حلقے بنانے شروع کیے۔ حال وارد ہونے لگے اور معرفت کے اشعار پڑھے جانے لگے۔ خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے قوالی شروع کی کیونکہ اس وقت کے ہندو لوگوں میں گانا عام تھا اس لئے ان کو اصلاح کے راستہ پر لانے کے لئے آپ نے قوالی کو مناسب سمجھا۔ آج عرب وعجم میں تصوف کے بہت سے خاندان بن چکے ہیں۔ جن میں چار خاندان قادریہ' چشتیہ' سہروردیہ' نقشبندیہ برصغیر میں بہت مشہور ہیں۔ (البتہ عرب ممالک میں اور بہت سے خاندان بھی مشہور ہیں) مملکت پاک و ہند میں کچھ لوگوں نے خانقاہی نظام کو بھی رواج دیا جس کا بیان اوپر گزر چکا ہے اور جس کی مخالفت میں علامہ اقبال کو بہت کچھ لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

طریقت جذبہ عمل کے محرکات پیدا کرتی ہے

تزکیہ نفس کا مدار عمل پر ہے۔ نفس کی اصلاح میں ہی انسان اپنے اندر روحانی کیفیات پیدا کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے اور جو ڈرتا رہا ہوگا اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے سے اور (اپنے) نفس کو روکتا رہا (بری) خواہش سے یقیناً جنت ہی اس کا ٹھکانہ ہوگا۔ (النّٰزعٰت: ۳۹ تا ۴۱) قرآن میں جہاں بھی کسی رسول یا ہادی کے بھیجنے کا ذکر ہوا ہے وہاں بالعموم اس بات کو ظاہر کیا گیا ہے کہ تمام مرسلین کتاب' حکمت اور تزکیہ

کے لئے بھیجے گئے۔ اس تحریر میں انسانی خصائل کا ذکر کیا جارہا ہے اور ساتھ ہی ان محرکاتِ عمل کا بھی ذکر کیا جا رہا ہے جو اصلاحِ نفس کے لئے اثر انداز ہوتے ہیں۔

انسان میں بدی اور نیکی کے جذبات کو جمع کیا گیا ہے اور وہ بدیوں سے مقابلہ کرنے کے باعث بلند درجات پر فائز ہوتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ گناہ بدی کی صورتوں میں رونما ہوتا ہے اور نیکی صالحات کی شکل میں رونما ہوتی ہے۔ گناہ کے نتائج مرض، غم، بے چینی، حوادث، افلاس، ناکامی، ذلت ورسوائی، بے رونق چہرہ، نفرت آمیز شخصیت، اقرباء واحباب سے بگاڑ، غلط تجاویز واقدامات، ملائکہ کی امداد سے محرومی وغیرہ ہیں۔ ایک عام آدمی کے سینے میں یہ تمام چیزیں موجود ہوتی ہیں۔ جب نیکی کی جائے تو اس کی صورتیں اطمینانِ قلب، صحت وتندرستی، فراخیٔ رزق، ہر اقدام پر کامیابی، سچی عزت، اقارب سے پیار، عالم بالا سے صحیح تجاویز کا القا ہونا، ملائکہ کی امداد، دلکش اور دلنواز شخصیت کا ابھار، ہر جائز دعا قبول ہونا اور موت کے بعد انبیاء اور اولیاء کا رفیق ہونا ہے۔

• تجاویز آسمان سے ذہن میں آتی ہیں۔ اچھی تجاویز اللہ کی طرف سے اور بری شیاطین کی طرف سے۔ جب کوئی شخص نیکی کرتا ہے تو اس کی نیکی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے فرشتے برائی کے کاموں میں مدافعت کرتے ہیں۔ جب انسان بدی کرتا ہے تو اس کا تعلق شیاطین سے ہو جاتا ہے اور نیکی کی صورت میں ملائکہ سے اس کا سوچنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا اللہ کے لئے اور اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے اس کی سوچ میں القاء بھی ملائکہ کرتے ہیں اور فیصلہ صحیح ہوتا ہے۔ جبکہ شیطانی القاء سے فیصلہ غلط ہوتا ہے۔ ایک بزرگ کا بیان ہے کہ میں نے ایک شخص کے جسم لطیف کو دیکھا تو وہ ناسوروں سے بھرا ہوا تھا۔ جب اس کا جسم دیکھا تو اس میں واقعی تین ناسور تھے۔ جب اس کو عبادت پر دو ماہ کے لئے لگایا تو روحانی ناسور ختم ہو گئے اور دیکھنے پر معلوم ہوا کہ جسمانی ناسور بھی ختم ہو گئے۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (الشوریٰ: ۳۰)

''اور جو مصیبت تمہیں پہنچتی ہے تمہارے ہاتھوں کی کمائی کے سبب پہنچی ہے''۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی گستاخ طریقت کے لئے لکھا ہے کہ بے ادب خود ہی بد نہیں رہتا بلکہ اس کی آگ تمام جہان کو لگ جاتی ہے اور جو بھی غم اور ظلمات تم پر آتے ہیں وہ بے باکی اور گستاخی کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

(بے ادب خود ہی آپ کو برا نہیں بناتا بلکہ پوری زمین وآسمان میں آگ لگا دیتا ہے۔)

ہر چہ آمد برتو از ظلمات و غم آں زبیباکی و گستاخیست ہم

(جو مصیبت تجھ پر آتی ہے ظلمات اور غم کی قسم سے وہ بھی تمہاری بے باکی اور گستاخی کے باعث ہے۔)

جو کوئی کسی کا مرید ہو تو اس کا شیخ علاج بھی کرتا ہے اور راہ بھی دکھاتا ہے۔ اس کے جذبہ نیکی کو زیادہ کرتا ہے اور بدی سے نفرت پیدا کرتا ہے۔ محنت اور ریاضت اس طریق میں ضروری ہے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ جو لوگ داتا گنج بخش یا معین الدین چشتی اور فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہم نے انہوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ کسی میں احساس بکتری ہو تو اس کا حل بھی جذبہ وکیف کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ عبادات واذکار اور اشغال کا مقصد ہی یہی ہے کہ کمی کو پوری محنت سے دور کیا جائے۔ شیخ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ۔

صد ہزاراں قطرۂ خوں از دل چکد تانشانِ قطرہ از آں یافتم

(دل سے لاکھوں قطرہ ہائے خون نکلنے کے بعد پھر کہیں قطرہ بھر آگاہی ہوتی ہے۔) (شیخ فرید)

آپ کے فرمودات میں ہے کہ ایک سانس میں نو دفعہ سے اٹھارہ تک لفظ اللہ کہے۔ یہ مراقبہ خلوت میں ہو اور اگر اس سے بھی استفادہ نہ ہو تو مشائخ سے رجوع کرے اور فائدہ اس قدر ہوگا جس قدر شیخ سے نسبت قوی ہوگی۔ یہ بیان بہت طویل ہے، ہم تو اللہ سے مدد مانگتے ہیں کہ اللہ ہر حال میں مدد فرمائے۔ (آمین)

توئی معبود گر نزدیک دیرم توئی مقصود گر مشغولِ غیرم

(اگر میں بت خانے کے قریب ہوں تو پھر بھی تو ہی میرا معبود ہے اور اگر میں غیر میں مشغول ہوں تو پھر بھی تو ہی میرا مقصود ہے۔)

اگرچہ کافرم یا بت پرستم قبولم من خدایا ہر چہ کہ ہستم

(اگرچہ میں کافر ہوں یا بت پرست ہوں، خدایا میں جو کچھ ہوں مجھے قبول فرما۔) (غیر معروف)

یاد رکھیں کہ اپنی اصلاح میں لگے رہنے میں ہی فلاحِ دارین ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب جنتِ عدن کو پیدا فرمایا تو اس میں ایسی نعمتیں پیدا کیں جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل پر اس کا خیال گزرا تو اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا کہ تو کچھ کہنا چاہتی ہے تو مجھ سے کہہ اس پر جنت نے تین مرتبہ کہا۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ (المومنون:1) بیشک دونوں جہاں میں بامراد ہو گئے ایمان والے

پھر جنت نے کہا بے شک میں بخیل اور ریاکار پر حرام ہوں۔

فلاح کے لئے تزکیہ نفس کا ہونا ضروری ہے۔

تزکیہ کا مدار عمل پر ہے اور محرکات عمل تقریباً پانچ ہیں: (1) (روٹی، کپڑا، مکان [illegible] (2) وافر خواہشات: تن ڈھانپنے کے لئے کپڑا، مکان اور خوراک اگر چہ مل جائے تو پھر بھی خواہشات سے خوب تر کی طرف رہتی ہے۔ [illegible]

شہرت بقائے دوام کی خواہش اور برتری کا جذبہ بھی ہے۔ (۳) شہوات' جنسی خواہشات جس سے دوسری خواہشیں ابھرتی ہیں (۴) جذبات انسانی یعنی محبت' غصہ' ہمدردی' نفرت' عداوت' رشک' حسد' بغض' غیرت' حمیت' انتقام وغیرہ۔ اس کی جڑیں انسان میں ہیں اور جب ظاہر ہوں تو بڑی قوت سے ظاہر ہوتی ہیں۔ ان پر کنٹرول ہو تو نتیجہ حیرت ناک ہوتا ہے ورنہ خطرناک نتائج ثابت ہوتے ہیں۔ جیسے بھاپ کنٹرول میں کام کرتا ہے نہ ہو تو تباہی کا باعث بنتا ہے (۵) نفسِ ناطقہ یا روح ملکوتی' یہ نورِ یزدانی ہے۔ اللہ نے اپنی روح انسان میں پھونکی وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (الحجر:۲۹) اور پھونک دوں اس میں اپنی (طرف سے خاص) روح اور انسان کو مسجودِ ملائکہ بنایا۔ اس سے خیر وشر کی معرفت ہوئی۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا (الشمس:۸)، (پھر اس کے دل میں ڈال دیا اس کی نافرمانی اور اس کی پارسائی کو) نور چونکہ آسمانی ہے زمینی نہیں اس لئے فوراً آسمان کی طرف لپکتا ہے (بشرطیکہ انسان میں سفلی تقاضے نہ ہوں) اور انسان کو اوپر کی طرف اٹھاتا ہے۔ یہی چیز اس کو تمام حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔ یہ ایک ملکوتی محرک ہے جو انسان کو اعلیٰ کردار پر ابھارتا ہے اور نیک کاموں میں راحت محسوس کرتا ہے' برے کاموں پر ملامت کرتا ہے۔ (نفسِ لوامہ)

اوّل چاروں محرکات اپنے مطالبہ پورا کروانا چاہتے ہیں خواہ جائز طریقہ سے ہو یا ناجائز۔ ان ضروریات کے مذہب میں حلال وحرام کی تمیز نہیں۔ ان صفات سے انسان حیوانی صفات کا مظاہرہ کرتا ہے اور جہاں ان کی ضرورت پوری ہوتی نظر آئے تو اس مقام پر ڈیرے ڈال دیتا ہے۔ پانچواں محرک روح قابل اعتماد ہے یہ خدا کی طرف پرواز کرتا ہے بشرطیکہ اس کو شتر بے مہار کی طرح نہ چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ اس محرک کو صحیح رکھنے کے لئے وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى (النزعت:۴۰) "اور جو ڈرتا رہا ہوگا اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے سے اور (اپنے) نفس کو روکتا رہا ہوگا (ہر بری) خواہش سے" یعنی اس آیت کے مطابق اپنی زندگی کو شریعت کے مطابق ڈھالیں اور روح کو طاقتور کرنے کے لئے ذکر اذکار اور وظائف جاری رکھیں۔ جو بھی کام کریں خدا کے لئے کریں' بیوی بچے وغیرہ نفسانی خواہشات کے لئے نہ ہوں، بلکہ اللہ کے لئے ہوں غصہ بھی اللہ کے لئے ہو۔ حدیث میں ہے کہ جو بھی اللہ کے لئے کام کرو گے اللہ کے ہاں جزا پاؤ گے' یہاں تک کہ اس لقمہ پر بھی اجر پاؤ گے جو تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالو گے۔ افسوس ہے کہ تقریباً ہر شخص ان رموز کو نہیں پہچانتا۔ زندگی تمام گزر گئی تو پھر کچھ پتا چلا جیسے اقبالؒ نے کہا ۔

کب زباں کھولی ہماری لذتِ گفتار نے
پھونک ڈالا جب چمن کو آتشِ پیکار نے (ب، د:۴۳)

طریقت روحانیت سے مختص ہے۔

تصوف یا روحانیت کا مضمون اسی قدر وسیع ہے جس طرح اس کا دائرہ کمالات اور تصرفات لامحدود ہیں۔

روحانیت کسی ایک چیز یا ایک صفت کے پائے جانے پر ہی موقوف نہیں بلکہ یہ جملہ خصائل، کمالات اور ایک مجموعۂ جمالیات اور اجلال کے پائے جانے کا نام ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے انہی خصائل کی طرف ایک ہی شعر میں بامعنی کلام کیا ہے ۔

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت　یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان (ض۔ک:۵۲۲)

ضربِ کلیم میں شامل کی گئی علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی یہ نظم "مردِ مسلمان" کے عنوان سے موجود ہے اور اس نظم میں ایک مردِ مسلمان کے چند اوصاف اور کمالات نہایت دلکش الفاظ میں بیان کیے گئے ہیں' مگر ایک ولی اللہ کے اوصاف کا معیار اس سے بھی کہیں زیادہ بلند' اعلیٰ اور ارفع ہونا تصور کیا جاتا ہے۔ مردِ مومن کے اوصاف علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں جا بجا ملتے ہیں' مگر ان سب کا اس جگہ بیان کرنا طوالت کا باعث ہوگا' البتہ راقم الحروف نے اس بات کو مدنظر رکھا ہے کہ جہاں جہاں ممکن ہو سکے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کو موقع محل کے مطابق عوام کے سامنے پیش کیا جائے' چنانچہ کوشش یہ کی گئی ہے کہ اپنی ہر کتاب میں آپ کا کلام پیش کرنے سے دریغ نہ کیا جائے۔

دیکھا گیا ہے کہ روحانیت کا نام سنتے ہی عوام کے ذہنوں میں فوراً محیر العقول اور نادر العجائب اعمال سرزد ہونے کا تصور قائم ہو جاتا ہے، حالانکہ روحانیت اسلامی ضابطہ حیات کو مضبوطی سے تھامنے اور اس پر عمل پیرا ہو کر جادۂ عزم واستقلال پر چل کر منزلِ وصل کی حقیقتوں کو پالینے کا نام ہے۔ یہ ایک عملی زندگی گزارنے کا ہی خاکہ نہیں بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ سے ایک مضبوط رسی کے ذریعے وابستگی اختیار کرنے کے بعد ایک بہت بڑے کارنامے کو انجام دینا ہوتا ہے۔ اس راہ پر چلنے والے اولیائے کبار کی وساطت سے طریقت کی سنگلاخ وادیوں میں ہمت وعزم اور استقلال کے ساتھ ریاضتوں اور مشقتوں کے ذریعے اپنے نفوس کی اصلاح کرتے ہیں اور شہنشاہِ حقیقی کی ہمہ وقت معیت میں اپنے اوقات کو ڈھالتے ہیں۔ اس راہ میں سالکان راہ طریقت پر امید پر کشش اور جانفزا جذب ومستی' ذوق وشوق اور والہانہ محبت اور عشق وکیف کو اپنا راہنما بنا کر نفس کی مزاحمتوں کو راہ سے ہٹا کر محبوبِ حقیقی کی طرف رات دن قدم بڑھایا کرتے ہیں جب سالکانِ راہِ طریقت ایسے پر امید پر کشش اور جانفزا جذبات سے سرشار ہو کر اپنے معبودِ حقیقی کی طرف والہانہ اور مخلصانہ انداز میں رواں دواں ہوتے ہیں تو رحمتِ ایزدی بھی اپنے دستِ شفقت سے لامتناہی لطف وکرم اور فیضانِ لاینقطع سے استقبال کرتی ہے اور ان پر اپنے انوار وانعامات کی اس طرح خصوصی بارش کرتی ہے کہ وہ حقیقتاً [illegible] راہروانِ طریقت کے نام قائم اور دائم نقوش کی شکلیں اختیار کر لیتے ہیں۔

تصوف یا روحانیت کا مکمل خاکہ پیش کرنا تو ایک امر [illegible] ہے، البتہ ذیل کے مضامین میں [illegible]

کی مدد سے ان تمام اوصاف اور خوبیوں کا ذکر کرنے کی کوشش کی جائے گی جس میں روحانیت کے دائرہ کار کے نقوش پائے جاسکیں۔ یہاں اس امر کا انتباہ کر دینا ضروری ہے کہ اس مضمون میں پیش کیے جانے والا خاکہ روحانیت کے خدوخال کو ظاہر کرنے کی محض ایک کوشش ہے اور اس کا حقیقی یا امرواقعی اندازہ کسی مرشدِ کامل کی رہنمائی کو حاصل کرنے کے بعد اس راہ پر چل نکلنے سے ہی محسوس کیا جاسکتا ہے یعنی یہ وہ پھل ہے جس کا ذائقہ اس کو چکھنے کے بغیر حاصل نہیں کر سکتے۔

روحانیت کے مشمولات کا مختصر جائزہ

لفظِ روحانیت سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ طریقت کے اس علم کی یہ شاخ روح کے احوال سے وابستہ ہے، لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ علم روح کے احوال ومواجید' قوت وتصرفات اور روح کو ایک مضبوط ضابطۂ حیات میں ڈھالنے کا نام ہے۔ اس علم کی مہارت حاصل کرنے کے لیے درجِ ذیل عنوانات پر مشتمل مضامین میں مکمل دسترس حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

علمِ روح

روح کا علم اس قدر طوالت طلب ہے کہ اس پر کئی کتابیں تصنیف کی جاچکی ہیں' البتہ اس کتاب میں بھی ایک مکمل باب روح کے عنوان سے شامل کر دیا گیا ہے۔ روح کا علم حاصل کرنا مقصود ہو تو اس کے لئے روح کے احوال' کوائف' تصرفات' دائرہ کمالات کی وسعت کا علم ہونا ضروری ہے۔ باضابطہ مطالعہ سے یہ حقیقت منکشف ہوگی کہ روح کا اختیار کس قدر وسیع اور اس کی حرکات کس قدر سریع السیر ہیں۔ روح بہت سے اعمال کو نہایت سرعت سے انجام دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ روح کی پرورش اور صحت کو برقرار رکھنے کے لیے کن اعمال اور روحانی مشقتوں کی ضرورت ہوتی ہے ان تمام سوالات کا جواب روحانیت کے موضوع پر لکھی گئی تحریروں سے واضح ہوسکتا ہے۔ روح سے متعلق علم کا مطالعہ مقصود ہو تو اس عنوان پر بہت طویل تحریریں لکھی جا چکی ہیں۔ ایسی چند تحریروں کا احاطہ اس کتاب میں شامل کردہ ''روح'' کے باب میں بھی کرنا ممکن نہیں البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ شائقین کے لئے اس باب میں کافی مواد مہیا کر دیا گیا ہے۔

قربِ الٰہی اور عشقِ الٰہی کا حصول

اگر کسی چیز کو آنکھوں کے قریب لایا جائے تو بہت زیادہ قریب آنے کے بعد نظر آنا بند ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ بھی اظہر اور اقرب ہے۔ اظہر کا مطلب ہے جس کا بہت زیادہ ظہور ہو چکا ہو اور اقرب اسے کہتے ہیں جو نہایت ہی قریب ہو۔ ایسی چیز نظر نہیں آسکتی۔ سورج کو دیکھنے سے آنکھیں چندھیا جاتی ہیں حتیٰ کہ اگر کچھ دیر

ایسے کئی سورجوں کو دیکھا جائے تو آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ ایسے ہی اللہ تعالیٰ کے انوار کے سامنے لاکھوں بلکہ اربوں سورج بھی لاشَیءٌ ہیں۔ ہر شخص اور ہر چیز فطری طور پر اللہ تعالیٰ کے عشق میں سرشار ہے کیونکہ اس کی تخلیق ہی ایسی ہوئی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے انوار اس میں موجود ہیں۔ ہر چیز اپنی اصل کی طرف دوڑ رہی ہے مگر عقل ایک ایسی چیز ہے جو غافل ہے اور جہاں عقل نہیں وہاں عشق اور کشف بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچے، کم عقل لوگ، مجذوب اور جانور کو کشف زیادہ ہوتا ہے، وہ تو قبر کے عذاب کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو عقل سے نہیں، دل کی آنکھوں سے بھی نہیں دیکھا جا سکتا بلکہ دل کے نور سے دیکھا جا سکتا ہے، چنانچہ عشق کے لئے نبوت کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ عشق جب بھی ہوتا ہے تو وہاں معشوق بھی ہوتا ہے ورنہ عشق کیسا، اس عشق کی حد نہیں کیوں کہ معشوق لافانی اور غیر محدود ہے، چنانچہ عشق کبھی ٹھنڈا نہیں ہوتا اور اس کا کوئی کنارہ نہیں۔ ہماری تصانیف ''سوز و ساز رومی'' میں عشق پر مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان کردہ کلام کافی وسیع پیمانے پر شامل کیا گیا ہے۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو جس لگن میں لگا ہے، نیک ہو یا بد خواہ کھیتی باڑی ہو یا مال و زر اکٹھا کرنا، ہر ایک کا کام طلبِ حق ہے اور اسی وجہ سے وہ کام کرتا ہے اور اسے کشاں کشاں لئے پھرتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ یہ دولت کی طلب ہے جو ہر جگہ سر، مار رہی ہے۔ جب ایسے لوگ (دنیادار) کسی اللہ والے کے ہاتھ چڑھتے ہیں تو وہ انہیں بتاتا ہے کہ تمہارا عشق اسی دولت کا عشق ہے، پھر اس کا یقین حق الیقین کی حقیقت تک پہنچ جاتا ہے اور وصال نصیب ہو جاتا ہے۔ بری راہوں پر چلنے والے تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ صحیح راہ پر چلنے لگتے ہیں۔

علومِ تصوف سے مکمل آگہی

روحانیت کی دنیا باقاعدہ ایک روحانی ضابطۂ حیات ہے، جسے اپنائے بغیر اس کی منازل کو طے کرنا مشکل ہی نہیں، بلکہ ناممکن ہے۔ اس میں چند ایسے قوانین اور ضوابط ہیں جن کا لحاظ رکھنا ایک ضروری امر ہے۔ اس راہ پر چل نکلنے سے شیخ کامل اپنے مریدین کو ان تمام علوم کو حاصل کرنے کی ہدایت اور راہنمائی کرتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ جو لوگ ان علوم کے حصول کو ضروری نہیں خیال کرتے وہ نام نہاد پیر تو بن سکتے ہیں لیکن پیر زاہداں اور راہنما بننا ان کے بس کی بات نہیں۔ اس جگہ ان تمام علوم کا مکمل بیان کرنا نہایت مشکل امر ہے۔ البتہ اس کتاب ''اسلام وروحانیت اور فکر اقبال'' میں ایسے تمام علوم کو کسی حد تک شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب میں ہی چند دیگر کتب کے مطالعہ کا مشورہ بھی دے دیا گیا ہے تاکہ قارئین کی اس سمت میں بھی راہنمائی ہو سکے۔

روحانی مجاہدات اور مخصوص مشقوں کا اپنانا

اس راہ پر کامیابی کے ساتھ چلنے کے لیے چند مجاہدات اور مشقوں کا اپنانا ضروری ہے۔ ان مجاہدات [illegible]

مجاہدۃ النفس کے علاوہ خورد ونوش کی پابندی' وظائف کے ضابطوں کا برقرار رکھنا' ذکر پر مداومت کرنا' اخلاق اور آداب کی حدود کا لحاظ رکھنا' اپنا احتساب کرتے رہنا، مراقبہ' معاتبہ' محاسبہ' وغیرہ) اور باقاعدگی کے ساتھ منازل سلوک کو طے کرنے پر نظر رکھنے کے علاوہ بہت سے دیگر معمولات پر کڑی نگرانی رکھنا بھی شامل ہے۔ یاد رہے کہ جو لوگ راہِ سلوک میں قدم تو رکھ دیتے ہیں' مگر سلوک کے مذکورہ تمام امور میں محنت' مشقت اور جانفشانی سے کام نہیں لیتے' تو روحانیت کی کسی منزل پر پہنچنے سے محروم رہتے ہیں۔ یہ وہ میدان ہے جس میں باہمت لوگ ہی کمال حاصل کر سکتے ہیں ورنہ خار دار جھاڑیوں پر ہاتھ پھیرنے والی بات ہے۔ علامہ اقبالؒ ضربِ کلیم میں فرماتے ہیں ۔

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال ملا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق افکار میں سرمست! نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار
(ض۔ک:۵۰۱)

بشریت اور ملکوتیت کے مقامات سے آگہی

اس حقیقت کا علم حاصل کرنا کہ انسان بشری مقامات سے تعلق رکھنے کے باوجود نوریوں (ملائکہ) کے اوصاف سے بھی متصف ہو سکتا ہے اور ان تمام کمالات کا حامل ہو سکتا ہے جو ملائکہ کو نوری مخلوق ہونے کی وجہ سے حاصل ہیں۔ اس کتاب میں بیان کر دیا گیا ہے دیکھیں'' مقامِ آدم '' کے علاوہ '' انسان کا مقامِ بشریّت اور ملکوتیت'' اگر انسان میں اس قدر لطافت پیدا ہو جائے تو وہ خاک سے پیوند رکھتے ہوئے اپنے اندر جبریل امین کی طرح جوہرِ ملکوتی پیدا کر لیتا ہے۔ اس کیفیت کی طرف علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے درج ذیل اشعار میں لطیف اشارہ فرمایا ہے ۔

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہرِ ملکوتی خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند (ب،ج:۳۱۲)
ہمسایہ جبریلِ امیں بندۂ خاکی ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشاں
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن قاری نظر آتا ہے' حقیقت میں ہے قرآن (ض،ک:۵۲۲)

جب کوئی انسان کسی ولی کامل سے نسبت حاصل کر لیتا ہے تو اس انسان میں بھی اس ولی اللہ کے عالم ملکوت سے حاصل کردہ انوار اور تجلیات کے اثرات نمودار ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور اس کی روح شیخ کے ساتھ ہی عالم ملکوت سے وابستگی حاصل کر لیتی ہے۔ اس سلسلے میں راقم الحروف کی ایک نظم '' براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے'' میں ایسے ہی تغیرات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس نظم کے چند اشعار نیچے نقل کئے جا

رہے ہیں جن میں ایک انسان کے نورانی اور روحانی منازل طے کرنے کی بات کی گئی ہے۔

نہ سجدہ ریزی سے پیدا نہ عقد حل سے ہوتی ہے
"براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے"
ٹھکانہ اہلِ دردِ دل بہت کاوش سے ملتا ہے
جو مل جائے تو نسبت پھر کہیں منزل سے ہوتی ہے
عبث کرتا ہے تو ہنگامۂ زہد و ورع پیدا
بساطِ دل کی رونق مرشد کامل سے ہوتی ہے
کٹے گو عمر ساری بے ریا سجدوں کی تابش میں
عقیدت وہ عطا ہے جو کہ دل کو دل سے ہوتی ہے
محمدؐ اپنی محفل میں سدا تشریف لاتے ہیں
کسی محفل کی جاں تو صاحبِ محفل سے ہوتی ہے
وسیلہ ذکر حق کا ذکرِ محبوبِ خدا ہی ہے
ہماری گفتگو یوں لیلیٰ محمل سے ہوتی ہے
نہیں تنہا لطیف افکار کی اس وادیٔ دل میں
حضوری اپنے دل کی احمدِ مرسلؐ سے ہوتی ہے
(از مصنف)

زیرِ نظر کتاب میں ہی ایک انسان کی بشری اور نورانی جہتوں پر قادر ہونے کی گفتگو مقام بشریت اور ملکیت کے عنوان سے کی گئی ہے۔ وہاں مزید ملاحظہ فرمائیں۔

انسان میں ودیعت کیئے گئے مخفی اسرار کی نمود

جو کچھ تمام کائنات میں تفصیلی طور پر موجود ہے، وہ انسان کے دل میں بھی اجمالی طور پر موجود ہے۔ انسان کے دل کی مثال ایسے ہے جیسے کہ درخت کے بیج میں پورے کا پورا درخت موجود ہوتا ہے اور یہی بیج جب مناسب ماحول میں نشو ونما پاتا ہے تو اس میں سے ایک کونپل پھوٹتی ہے جو رفتہ رفتہ درخت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ عین اسی طرح انسان کے دل میں پوری کائنات کے تمام اسرار پوشیدہ کر دیئے گئے ہیں جو مناسب احوال کے اثرات سے انسان پر منکشف کر دیئے جاتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ دل ایک سمندر ہے اور اس کے اسرار موسیٰ علیہ السلام کی ضربِ کلیمی کے بغیر منکشف نہیں ہوتے۔ ضربِ کلیمی سے مراد ذکر کے دوران لگائی گئی لا الٰہ الا اللہ کی ضرب لی جاسکتی ہے۔

کھلتے نہیں اس قلزمِ خاموش کے اسرار
جب تک تو اسے ضربِ کلیمی سے نہ چیرے
(ب۔ج:۴۵۹)

تصوف کی دنیا ایسے تمام اسرار کے کھل جانے سے اپنی شناخت کرواتی ہے۔ ایسے اسرار ذکرِ الٰہی سے صرف اسی وقت کھلتے ہیں جب سالک اتباعِ شریعت کے ساتھ ساتھ، کسی شیخ کامل کی نگرانی میں منازلِ سلوک طے کرنے کی پوری پوری کوشش کرتا ہے۔

برزخ کا مختصر حال

برزخ کا حال معلوم کرنا خصوصیاتِ روحانیت میں سے ہے۔ مصنف کی ایک الگ کتاب میں لطائفِ ستہ کے بیان کا مطالعہ سودمند ثابت ہوگا۔ حضرت عبدالعزیز دباغ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ برزخ (روحیں دنیا میں آنے سے پہلے جہاں تھیں اور مرنے کے بعد بھی اسی جگہ جائیں گی) کی جڑ پہلے آسمان میں ہے جو نیچے سے تنگ اور اوپر سے وسیع ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ ساتویں آسمان پر ایسا ہے جیسے کوئی گنبد رکھ دیا گیا ہو۔ ساتویں آسمان سے اوپر تک جانے والا حصہ برزخ کا اشرف ترین حصہ ہے کیونکہ اس میں رسول کریم ﷺ اور اہلِ بیتؓ، خلفاء اربعہؓ، شہداء جو آپ ﷺ کے سامنے شہید ہوئے اور آپ ﷺ کے کامل وارث اغواث' اقطاب اور اولیائے کرامؒ ہوں گے۔ بیت المعمور بھی ساتویں آسمان کے اس حصے میں ہے۔ تمام برزخ میں سوراخ ہیں جس میں روحیں مقیم ہیں۔

اس گنبد کے سات حصے ہیں اور ہر حصہ سات جنتوں میں سے ایک جنت کے مشابہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی روح کے اسرار کی حامل سوائے انکی ذات کے اور کوئی جگہ متحمل نہیں اس لیے وہ کسی اور جگہ پر نہیں رہتی۔ عام روح جس مقام سے دنیا میں آتی ہے تو مرنے کے بعد وہ اپنے عمل کے مطابق کسی مقام پر آتی ہے (پہلے سے بلند یا کم مقام پر) کافروں کی روحیں ایک حصہ میں ہیں جو باہر کو نکلتے ہوئے (ٹہنی یا تنا) کی شکل میں ہیں اور جہنم کی جہت میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کو اس طرح حجاب میں رکھ دیا گیا ہے جیسے ان کی ہر چیز سی دی گئی ہو گویا ان کے لئے آسمان کے دروازے کھولے نہیں گئے۔ برزخ کا اسفل السافلین حصہ ساتویں زمین کے نیچے تک چلا گیا ہے۔

برزخ میں کفار کی روحوں کو مومنین کی روحوں کے نور سے مستفید ہونے سے روک دیا گیا ہے لیکن اس کے برعکس مومنین کو ایک دوسرے سے فائدہ ہوگا اور گنہگار روحوں کے کچھ گناہ نیکیوں کی بدولت دھل جائیں گے۔ (ابریز) مومنین کے فوت ہونے کے بعد ان کی روح سے نوری ڈورے جنت کی طرف جائیں گے جہاں سے ان روحوں کو فائدہ حاصل ہوتا رہے گا اور کفار کی روحوں کو جہنم کا عذاب پہنچتا رہے گا۔ جب انسان زندہ ہوتا ہے تو اس کے سر سے ایک ڈورا سفید اور صاف ستھرا نظر آتا ہے اور یہ ڈورے کی طرح موٹا ہوتا ہے۔ کسی کا ڈورا "نے" کی طرح موٹا اور بعض اکابرین اولیاء کا کھجوا کی طرح موٹا دکھائی دیتا ہے۔ یہ ڈورا سر سے ایک بالشت اوپر جا کر نظر آتا ہے، کفار کا ڈورا نیلا سیاہی مائل ہوتا ہے جس طرح گندھک کی آگ ہوتی ہے اور یہ بھی نظر آتا ہے اور یہ بھی باریک ڈورے سے لے کر کھجور کے خوشے جتنے موٹے ہوتے ہیں اور برزخی مقر تک جاتے ہیں۔ ازلی کافر بچوں کے ڈورے بھی نیلے ہوتے ہیں اور مسلمان ہو جانے والے بچوں کے ڈورے سفید نظر آتے ہیں۔ جو

بچے بڑے ہو کر ولی بنتے ہیں'ان کے ڈورے بچپن سے ہی ولیوں کی طرح ہوتے ہیں۔ نیک آدمیوں کی محبت سے نیلا ڈورا بتدریج سفید ہو جاتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بدلتا نہیں۔ اسی لیے اجتماعی حالت کو اسلام نے پسند فرمایا ہے۔ حدیث میں ہے کہ جو جماعت سے بالشت برابر بھی باہر نکلا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

جب کوئی انسان مرجاتا ہے تو روح برزخ میں چلی جاتی ہے لیکن بعض بزرگوں کی روح کا تعلق قبر سے قائم رہتا ہے اور عموماً اُوپر کو چڑھتی ہے اور برزخ میں اپنے مقام پر چلی جاتی ہے۔

اولیائے کرام مدبران مُلک اور احوالِ عالم کے خبردار اور تمام عالم کے والی ہوتے ہیں اور نظامِ عالم ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ہر قسم کے حل اور عقد (مسائل کا حل) ان سے وابستہ ہوتے ہیں اور احکامِ عالم میں ان کا تصرف (دخل دینے کا اختیار) ہوتا ہے۔

نظامِ اولیاء کے متعلق علم

اہلِ طریقت (پیروں اور مشائخ) میں مشہور ہے کہ اوتاد ہر شب میں تمام جہان کی سیر کرتے ہیں اور اس سیر میں جو جگہ ان کی سیر سے رہ جاتی ہے وہاں لازمی طور پر خلل واقع ہوتا ہے تو وہ اسی وقت قطب مدار کو حکم کرتے ہیں تا کہ وہ اپنی توجہ اور ہمت اس طرف مبذول کرے اور وہ خلل ونقصان ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ زائل فرما دیتے ہیں۔ (کشف المحجوب صفحہ ۴۰۹ ترجمہ ابوالبرکات) ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

''ان اولیائے کرام میں چار ہزار وہ ہیں جو بالکل اوجھل ہوتے ہیں جو اپنے حال اور زیب وزینت کے علاوہ ایک دوسرے کو بھی نہیں پہچانتے۔ معتزلہ کے فرقے والے، اولیاء کی تخصیص (ایک دوسرے پر فوقیت رکھنے) کا انکار کرتے ہیں حالانکہ اولیائے کرام کو ایک دوسرے پر فضیلت وفوقیت ہوتی ہے)۔ اللہ تعالیٰ نے برہانِ نبوت کو آج تک باقی رکھا ہے اور اولیائے کرام کو اس برہان کے اظہار کا سبب بنایا ہے تا کہ مسلسل آیات وحجت (اللہ کی نشانیاں، دلائل) کی صداقتِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پیوستہ طریق پر ظاہر و باہر رہے۔ ان ہستیوں کو خصوصیت سے والیانِ عالم بنایا ہے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ مجھے (حضرت ہجویری کو) اس معاملے کی خبر عیاں آئی ہے۔ ان چار ہزار اولیائے کرام میں ارباب حل وعقد ہیں (صاحبِ اختیار) جنہیں سرہنگان درگاہِ حق تعالیٰ کہا جاتا ہے، وہ تین سو نفوس قدسی ہیں جنہیں اخیار کہتے ہیں' چالیس ہستیاں ہیں' جنہیں ابدال کہتے ہیں اور سات وہ ہیں جنہیں ابرار کہتے ہیں' چار وہ ہیں جنہیں اوتاد کہتے ہیں' تین وہ ہیں جنہیں نقیب کہتے ہیں اور ایک وہ ہے جو قطب کہلاتا ہے اور اسے غوث بھی کہتے ہیں اور یہ تمام ایک دوسرے کو جاننے اور پہچانتے ہیں اور نظامِ معاملات (Administration) اور امورِ تصرف میں ایک دوسرے کے اذن واجازت کے محتاج ہیں۔ اس پر احادیث ناطق ہیں اور اربابِ حقیقت اس کی صحت پر متفق ہیں۔ (ترجمہ

برکات صفحہ ۳۹۱)

اہل اللہ پر اعتراض سے اجتناب کرنا

وہ لوگ جو پیرانِ عظام اور مشائخ کی مخالفت پر کمر بستہ ہیں وہ طرح طرح کے اعتراض کرتے ہیں۔ جب ایک پیش کردہ حقیقت کا جواب بن نہ پائے تو وہ دوسرا اعتراض کر دیتے ہیں۔ یہ سب کچھ سننے کے بعد وہ کہتے ہیں کہ ہم اولیائے کرام کے منکر نہیں البتہ اس سلسلہ بیعت اور پیری مریدی کے خلاف ہیں۔ اولیاء اللہ کا ذکر تو قرآن میں بھی مانتے ہیں تو پھر شیخ کوئی بدعت تو نہیں کیونکہ انہی اولیائے کرام کو پیر یا شیخ کہتے ہیں۔ وہ شیخ یا پیر (اگر وہ صحیح پیر ہے تو) لازمی ولی ہوتا ہے اور ان کو اس منصب پر بٹھانے والا ایک نظام ہے۔ یہ صاحب اذن (اجازت) ہوتے ہیں اور انہیں بیعت اور تبلیغ کی اجازت اور حکم ہوتا ہے۔ باقی رہا یہ اعتراض کہ بیعت کیوں لی جاتی ہے تو اس کے متعلق عرض ہے کہ یہ سوال (اگلے جہاں میں جا کر) حضرت رسول اکرم ﷺ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اہلِ بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین حضرت بایزید بسطامیؒ ابوالحسن خرقانیؒ ابویوسف ہمدانیؒ عبدالخالق غجدوانیؒ عارف ریوکریؒ بابا سماسیؒ امیر کلالؒ بہاؤالدین نقشبندؒ مولانا عطارؒ عبیداللہ احرارؒ خواجہ درویشؒ خواجہ امکنگی حضرت باقی باللہ مجدد الف ثانیؒ سے لے کر آج تک جو سلسلہ نقشبندیہ میں جو مشائخ نے بیعت کا سلسلہ قائم رکھا ہے ان سے دریافت کریں یا اگر ایسا نہ ہو سکے تو سلسلہ قادریہ جنیدیہ رفاعیہ نوریہ حکیمیہ سہیلیہ وغیرہ جن سب میں بیعت کا سلسلہ حضور اکرم ﷺ سے لے کر اب تک جاری ہے ان سب سے دریافت کریں یعنی ان کی کتب کا مطالعہ کریں۔ کیا یہ سب لوگ غلط راستے پر تھے اور یہ معترض دین کی چند کتابیں پڑھنے سے عالم بننے کا دعویٰ کرتا ہے جسے روحانیت اور تصوف کی الف با کا بھی علم نہیں) کیا ان سب کو بیکار اور کم علم سمجھ کر خود کو ان سے بالاتر جان کر دین کا خیر خواہ سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو جہاد کے لئے بیعت لی تھی اب اس کی کیا ضرورت ہے۔ کیا وہ اس حقیقت کو مذکورہ بالا بزرگوں سے زیادہ جانتے ہیں۔ چہ نسبت خاک را بار عالم پاک۔

انکارِ بیعت کا فتنہ آجکل ان چند علماء کے انکار سے کافی شدت اختیار کرتا جا رہا ہے اور اس سے نفرت دلانے کے لئے یہ لوگ غلط پیروں کی مثالیں دیتے اور لوگوں کو گمراہ اور دین سے دور کرتے جا رہے ہیں۔ دراصل یہ لوگ خود کار علماء ہیں یہ نہ تو کسی شیخ کی صحبت میں بیٹھے اور نہ ہی ان لوگوں نے کبھی اولیاء کرام کی کتابوں کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا ہے۔ راقم الحروف کو خود اس بات کا تجربہ ہے کہ ایسے عقائد والے کشف المحجوب طبقات الکبریٰ مکتوبات امام ربانی مدارج النبوۃ حضرات القدس حسب ونسب خزینہ معارف مبدء ومعاد مفتاح العلوم لمعات خصائص الکبریٰ کتاب اللمع رسالہ قشیریہ تذکرہ غوثیہ مثنوی مولانا روم کلام

حضرت سلطان باہو، جامی، بابا فرید، عطار، حافظ، میاں محمد بخش رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ اور دیگر تصانیف اولیاء کبار کو بالکل ہاتھ نہیں لگاتے اور صرف ان نام نہاد علماء کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں جن میں کفر اور شرک کے من گھڑت فتوے لگائے گئے ہیں اور ایک دوسروں پر گند اچھالا گیا ہے اور ان کی اساس محض فرقہ بازی ہے۔ ان سے گزارش ہے کہ وہ اولیاء کے کردار کا مطالعہ کریں تاکہ انہیں دونوں میں فرق محسوس ہو سکے۔ اس حقیقت کو اس کتاب میں دلائل کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے۔ یاد رہے کہ یہ مخالفین جن لوگوں کی کتب کا مطالعہ کرتے ہیں وہ محض عالم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا درجہ مشائخ کرام سے بہت دور ہے۔ ایسے عالم تو انگریزوں، ہندوؤں اور سکھوں میں بھی ہوتے ہیں مگر وہ اولیاء کی فہرست میں نہیں آتے۔

زمانۂ رسالت کا تصوف اور تاریخ تصوف

(زمانۂ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں روحانی کیفیات)

تربیتِ عشاق میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں روحانی قوت اس درجہ تھی کہ جس شخص کو آپ کلمہ پڑھا کر مسلمان بنالیتے، اسی وقت اس کو مرتبہ احسان (یعنی رگ رگ میں ایمان کا جانا اور دل کی آنکھ سے اللہ تعالیٰ کے جمال کا مشاہدہ کرنا) حاصل ہو جاتا۔ چنانچہ ایسے مسلمانوں کو مجاہدات کی چنداں ضرورت نہ رہتی کیونکہ صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ میں وہ طاقت (بقدر استطاعت) موجود تھی لیکن رفتہ رفتہ یہ بات بعد کے لوگوں میں کم ہوتی گئی۔ اس کمی کی تلافی کیلئے بزرگوں نے مجاہدات اور ریاضتوں کا اجرا کیا جو حصولِ مقصد کے لئے ذریعہ بنیں اور یہ کمی کسی حد تک پوری ہوئی۔ رفتہ رفتہ یہی اذکار اور مشاغل مقصود بالذات (یعنی رسمی طور پر جاری) ہو گئے اور درجہ احسان کی بجائے لوگ استغراق کے دلدادہ ہو گئے اور علماء نے بھی احسان کے مقصد کو چھوڑ کر صرف تحصیلِ علم کو اپنا مقصد بنالیا ہے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ تیس سالہ مجاہدات کے بعد مجھے وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ﴿۱۶﴾ (ق:۱۶) پر یقین ہوا (اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں)۔ آپ فرماتے ہیں کہ اگر شروع سے ہی میں اس بات کا یقین کر لیتا تو ۳۰ سال مجھے اس قدر سخت مجاہدات کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ صاحب تربیتِ العشاق لکھتے ہیں کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ یہ مشاغل مقصود بالذات ہو گئے اور احسان کی جگہ استغراق نے لے لی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حالتِ ایمان میں ایک لمحہ بھی صحبت اختیار کرنے والا شخص صحابی کہلاتا ہے اور آپ کی اس زیارت کے سبب ہی اس کو وہ شرف حاصل ہو جاتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد خواہ کوئی کتنی ہی عبادت کیوں نہ کرے اور کتنے ہی بڑے روحانی منصب (غوث یا قطب وغیرہ) پر کیوں نہ فائز ہو جائے، وہ ایک صحابی کی

شان کا حامل نہیں ہو سکتا۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جہاد پر نکلنے والے ایک ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کے گھوڑے کے پاؤں سے اڑنے والی خاک اگر میرے بدن پر پڑ جائے تو مجھے اپنے جنتی ہونے کا یقین ہو جائے۔ اس بات سے یہ ظاہر ہوا کہ جن مسلمانوں نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک لحہ بھر کی صحبت اختیار کر لی اس کو درجہ احسان نصیب ہو جاتا ہے۔ حضرت عطار رحمۃ اللہ علیہ نے تذکرہ اولیاء میں لکھا ہے کہ حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار اپنی مجلس میں یہ ارشاد فرمایا کہ جس نے ہمیں دیکھ لیا ہے اس کی بخشش ہو جائے گی۔ محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو اس مجلس میں موجود تھے فرمایا کہ ابوجہل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا لیکن بالاتفاق وہ جہنمی ہے آپ کو دیکھنے والا کیسے جنت میں جا سکتا ہے۔ فرمایا خدا کی قسم! ابوجہل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا ہی نہیں اور اس بات پر قرآن کی آیت شاہد ہے جیسا سورہ اعراف آیت نمبر ۱۹۸ میں فرمایا۔

وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾ "اور تو دیکھے گا انہیں کہ دیکھ رہے ہیں تیری طرف حالانکہ انہیں کچھ نظر نہیں آتا"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توجہ شریف کا یہ حال تھا کہ جس کو آپ کبھی جنگ یا تبلیغ یا کسی بھی کام کے لئے بھیجتے تو تھوڑی سی توجہ کے بعد وہ اس کا اہل ہو جاتا جس پر وہ مامور کیا جاتا تھا چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو جب درہ خیبر کے لئے یہ حکم فرمایا تو آپؓ نے اس کو اپنے ہاتھوں سے اکھاڑ پھینکا۔ آپ کا اپنا قول ہے کہ جس دروازے کو ساٹھ آدمی نہ اٹھا سکتے تھے، میں اس کو اٹھا کر ڈھال کا کام لیتا تھا اور اب یہ وقت ہے کہ سوکھی روٹی کا چبانا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک ایسا وقت تھا کہ میں نو دس اونٹوں کو جب چراگاہ میں لے جاتا تو ان کو سنبھال نہ سکتا تھا اور اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہوں کا یہ اثر ہے کہ اتنی بڑی سلطنت میں کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں۔ احادیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت میں اگر کوئی دیوانہ آتا تو عقل کی باتیں کرنے لگتا۔ یہ آپ ہی کی نگاہوں کا اثر تھا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور علی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ و دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسی ہستیوں کو اسلام کے درخشندہ ستارے بنا دیا گیا ہے جن کی مثال قیامت تک دیکھنے میں نہیں آسکتی۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو خفیہ روحانی تعلیمات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خفیہ روحانی تعلیمات کا باب بہت طویل ہے۔ اختصار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے، صرف چند واقعات کے اشارات کو ہی پیش کیا جا رہا ہے اگر کسی کو تفصیل کی ضرورت ہو تو متعلقہ روایات کی طرف رجوع کیا جائے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضور اکرم ﷺ نے ہمیں دو قسم کے علوم تعلیم فرمائے۔ایک تو وہ علم ہیں جن کو ہم نے لوگوں کے سامنے بیان کیا اور دوسرا وہ علم ہے کہ اگر ہم اس کو بیان کریں تو لوگ ہمارا گلا کاٹنے کو آئیں۔ایک حدیث شریف میں فرمان نبوی ہے کہ لوگوں کی عقل کے مطابق گفتگو کیا کرو۔ کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِھِمْ (احادیث مثنوی ص ۵۶۔احیاء العلوم ج ۱،ص ۴۷۔شرح نہج البلاغہ ج ۴،ص ۲۶۷)

دیگر بہت سی احادیث اس بات پر گواہ ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے لوگوں کو علم سکھانے کے بہت سے درجات قائم رکھے تھے۔ کچھ علوم تو عام مسلمانوں کے لئے تھے اور کچھ علوم خواص کے لئے مخصوص تھے اور کچھ علوم ایسے بھی تھے جو خاص الخاص صحابہ کرامؓ کو تعلیم کیے جاتے تھے۔حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے ان کو علم وحکمت کے ستر باب ایسے تعلیم فرمائے کہ جو کسی کو تعلیم نہیں کیے گئے اور اگر تم ان میں سے ایک بات بھی سن لو تو تمہارا اپنے گھروں میں سکون سے رہنا ناممکن ہو جائے۔(یہ حدیث الگ بیان کردی گئی ہے۔)

مشاہدۂ حق میں (جناب واحد بخش سیال نے) یہ بات نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت خود فرمائی اور پھر آپ کو حکم دیا کہ فلاں شخص سے بیعت کرلو تاکہ یہ سلسلہ بیعت آگے چلتا رہے۔ ہماری تصنیف ''رابطہ شیخ'' میں اویسی فیض کا ملنا بہت سے بزرگوں سے نقل کیا گیا ہے۔حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تعلیم بھی حضور اکرم ﷺ نے جس طریقہ سے فرمائی' اس طریقے کو آج تک اویسی طریقہ کہا جاتا ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی زندگیوں میں ایسے نادر واقعات دیکھنے میں آئے ہیں جو حضور اکرم ﷺ کی خصوصی تعلیم کے بغیر ممکن نہیں' مثلاً حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یَا سَارِیَۃَ الْجَبَل کے الفاظ کا کہنا اور حضرت ساریہ رضی اللہ عنہ کا اس کلمہ کو سننا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کنیز کی لکڑیوں کا گٹھا بذریعہ پتھر بحکم رضوان جنت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچنا' اور حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ کا اپنی آنکھوں سے احوال جنت ودوزخ کا دیکھنا وغیرہ بہت سے واقعات مستند کتابوں میں ملتے ہیں۔ایسے لاتعداد واقعات کا رونما ہونا اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کو حضور اکرم ﷺ نے تصوف اور روحانیت کی نہایت اعلیٰ تعلیم عطا فرمائی تھی۔

صحابہ کرام کا جنگوں میں بخوشی اپنی جانوں کو نثار کرنا' بڑی بڑی ہلاکت خیز بلاؤں کا بلاخوف مقابلہ کرنا اور مشکل حالات میں ڈٹ جانا یہ تمام باتیں ان کے ایسے کمالات ہیں جو ان کی بہت بڑی روحانی اور صوفیانہ تعلیم وتربیت کے بغیر ممکن نہیں۔ایسی تعلیمات آپ کے پردہ فرما جانے کے بعد اور آج بھی مشائخ عظام اپنے

مریدوں کو خفیہ طریقوں سے دیتے ہیں اور یہ انہی تعلیمات کا اثر ہے کہ آپ کی امت میں سے جنید و بایزید رحمۃ اللہ علیہما اجمعین جیسی لاکھوں ہستیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔

اسلام میں تصوف کا ارتقاء

اسلام میں تصوف کا ارتقاء حالتِ خوف سے چل کر پہلے حالتِ عشق اور پھر حالتِ فنا اور اتصال تک کا سفر ہے۔ رسول خدا ﷺ اور آپ کے صحابہؓ کے زمانے میں مذہب ایک سیدھا سادہ طریق زندگی تھا' جس میں انسانی رویئے کی تہہ میں خوف خدا کا جذبہ ہی سب سے قوی تر تھا اور قرآن حکیم میں خدا کا تصور زیادہ تر ایک ایسی غالب اور مقتدر اور باجبروت ہستی کی صورت میں پیش کیا گیا تھا' جس کے سامنے انسان بالکل عاجز اور درماندہ ہے اور اس کی نجات کی صورت صرف یہی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں خدا کے خوف کو سب چیزوں پر مقدم رکھے۔ بعض اجلہ صحابہ کے حالات اور اقوال یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے اندر خوف خدا روح کی طرف جاری وساری تھا۔ ایک صحابی تمیم الداری رضی اللہ عنہ کے متعلق روایت ہے کہ ایک مرتبہ وہ تمام رات قرآن پاک کی صرف درج ذیل آیت بار بار پڑھتے رہے یہاں تک کہ دن ہو گیا۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (الجاثیہ:۲۱)

"کیا خیال کر رکھا ہے ان لوگوں نے جو ارتکاب کرتے ہیں برائیوں کا کہ ہم بنا دیں گے انہیں ان لوگوں کی مانند جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے کہ یکساں ہو جائے ان (دونوں) کا جینا اور مرنا بڑا غلط فیصلہ ہے جو وہ کرتے ہیں"۔

ایک دوسرے صحابی ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "اگر تم لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ موت کے بعد تمہارا کس چیز سے سامنا ہوگا تو تم اس زندگی میں کچھ نہ کھاؤ' نہ پیو! (اور کہو) اے کاش کہ میں ایک درخت ہوتا جسے کاٹ ڈالا جاتا ہے اور وہ مویشیوں کا چارہ بن جاتا ہے"۔

رسول خدا ﷺ کی فقیرانہ زندگی اور کثرتِ قیام و سجود اور صحابہ کرام کا یہ رویہ خدا خوفی و پارسائی' نیز وہ حدیثِ قدسی کہ تم نماز اس طرح پڑھو' کہ تم خدا کو اپنے سامنے دیکھ رہے ہو اور اگر یہ نہ ہو سکے تو جیسے وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ یہ ایسے امور تھے جنہوں نے آگے چل کر اسلامی تصوف کے لئے بنیاد فراہم کی۔ پہلی صدی ہجری کے ختم ہوتے ہوتے لوگوں کی زندگیوں میں کافی تغیر واقع ہوا تھا۔ عبادات اور شعائر تو باقی تھے لیکن زندگیوں پر ان کا اثر برائے نام تھا۔ ان حالات میں زاہد اور متقی لوگوں کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آیا جس نے دنیوی زندگی کے اس فتنہ اور شور و شر سے اپنا دامن چھڑا کر خدا کی عبادت میں اپنے لئے پناہ ڈھونڈی اور خوف

خدا کو اپنا شعار بنایا۔ اس زمانہ کی ایک مشہور شخصیت حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ تھے' جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان پر خوف خدا اس قدر طاری تھا کہ ان کا چہرہ ہر وقت زعفران کی طرح زرد رہتا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے دوزخ کی آگ ساری مخلوق میں سے صرف انہیں کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ یہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ ہی تھے جنہوں نے اعضاء و جوارح کی نیکی اور روح و نفس کی نیکی میں ایک امتیاز قائم کیا اور ایک ایسی انقلاب انگیز بات کہی جس نے آگے جا کر صوفی عقیدے اور فکر کے لئے سند کا کام دیا۔ انہوں نے فرمایا: ''اصل نیکی روح کی نیکی ہے اور سچی نیکی کا ایک دانہ نمازوں اور روزوں کے ہزار گنا وزن سے بڑھ کر ہے''۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اصطلاحی معنوں میں صوفی نہیں تھے' اس لئے کہ اس وقت تک تصوف کا نام کوئی نہیں جانتا تھا اور نہ ''صوفی'' کی اصطلاح مروج ہوئی تھی لیکن ان کے فقر و زہد اور ان کے ان رجحانات کے پیش نظر بعد میں صوفیہ نے انہیں نہ صرف اپنے زمرے میں شامل کیا بلکہ اپنے لئے مشعل راہ اور امام تسلیم کیا اور انہیں سلسلہ تصوف کی ابتدائی کڑیوں میں شمار کیا۔

صوفی کی اصطلاح کیسے رائج ہوئی؟

صوفی کی اصطلاح کس طرح اور کن حالات میں رائج ہوئی؟ اس کا جواب اہل علم نے مختلف طریقوں سے دیا ہے۔ اس کتاب میں گزشتہ صفحات میں لفظ صوفی پر تحقیق پیش کی گئی ہے تاہم بعضوں کے نزدیک صوفی' عابد و زاہد لوگوں کے اس گروہ کا نام ہے جو اس زمانے کا مقبول لباس ریشم و حریر کو چھوڑ کر صرف اُون (صوف) پہننے پر اکتفا کرتے تھے۔ دوسروں نے کہا کہ ''صوفی'' صفا سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں دل کی صفائی۔ جب کوئی اپنے دل کا آئینہ صاف کرنے کے لیے ریاضت کرتا ہے تو وہ صوفی کہلاتا ہے۔ کچھ اور لوگوں نے ''صوفی'' کا تعلق اصحاب صفہ سے جوڑا۔ اصحاب صفہ عہد نبوت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا وہ گروہ تھا جو دنیا کے مشاغل سے الگ ہو کر دن اور رات کا زیادہ حصہ عبادت اور ذکر میں بسر کرتے تھے لیکن ان میں کوئی توجیہہ بھی ایسی نہیں ہے جس پر کسی نہ کسی پہلو سے اعتراض وارد نہ ہو سکتا ہو۔ علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''الغزالی'' میں ''تصوف'' کے عنوان سے جو بحث کی ہے' اس میں وہ اس مسئلے پر پہلے تو اپنی رائے محفوظ رکھتے ہیں' پھر آخر میں جا کر ایک انوکھے انداز سے اس راز پر سے پردہ اٹھاتے ہیں' کہتے ہیں ''تصوف کا لفظ اصل میں سین سے تھا اور اس کا مادہ ''سوف'' تھا جس کے معنی یونانی زبان میں حکمت کے ہیں۔ دوسری صدی ہجری میں جب یونانی کتابوں کا ترجمہ ہوا تو یہ لفظ عربی زبان میں آیا اور چونکہ حضرات صوفیہ میں اشراقی حکماء کا انداز پایا جاتا تھا اس لئے لوگوں نے اس کو سوفی یعنی حکیم کہنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ یہ لفظ سوفی سے صوفی ہو گیا۔'' کوئی شک نہیں کہ لفظ ''صوفی'' کی یہی توجیہہ سب سے زیادہ معقول اور قابل تسلیم ہو۔

تصوف کی ابتدا جس طرح سے بھی ہوئی اس نے پہلے عمیق اور پر جوش عقیدت اور پھر عشق و محبت کا روپ اختیار کیا۔ ایک صوفی کے نزدیک برائی سے اجتناب اور نیکی کا اختیار کرنا اس لئے ضروری نہیں تھا کہ اس کے بدلے انسان سے جنت کا وعدہ کیا گیا تھا بلکہ اس لئے کہ یہ اس عمیق اور ازلی محبت کا ایک ادنیٰ تقاضا تھا جو ایک بندے کو اپنے رب کے ساتھ ہونی چاہیے۔ بندے اور اپنے رب کی محبت کے تقاضے ابتداء میں کچھ دور تک تو شریعت اور تعلیماتِ دینی کے ساتھ ساتھ چلے' لیکن آگے جا کر یہ ان سے بچھڑ گئے' پھر علمِ ظاہر اور علمِ باطن کے دوئی کے تصور کو جنم لیا۔ صوفیہ کے نزدیک علم کا ذریعہ نقل و روایت نہیں بلکہ وہ وجدان ٹھہرا جس کے ذریعے ایک بندے کو براہِ راست "حقیقتِ مطلقہ" کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ دنیائے تصوف کے ممتاز صوفی حضرت خواجہ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ عوارف المعارف میں فرماتے ہیں کہ "تصوف نہ محض فقر ہے' نہ محض زہد' بلکہ اس میں فقر و زہد دونوں شامل ہیں اور ان کے سوا کچھ مزید بھی" ہے۔ اس "کچھ مزید" سے آپ جو بھی چاہیں مراد لے سکتے ہیں۔ اس میں وہ سب منزلیں شامل ہیں جو ایک صوفی کو سفر کرنے کی راہ میں پیش آتی ہیں۔

تاریخ تصوف

آنحضرت ﷺ کے وصالِ با کمال کے بعد جب فتوحات کی وجہ سے مسلمانوں میں عیش و عشرت کی زندگی عام ہوگئی اور لوگ دنیاداری میں زیادہ الجھ گئے تو مصلحین اسلام نے چھپ کر تعلیم دینی شروع کر دی۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس سلسلہ تعلیم کے شروع کرنے والے زیادہ تر عجمی تھے اور جہاں پر یہ تعلیم دی جاتی' ان جگہوں کو خانقاہیں یا زاویئے کہا جانے لگا۔ مشائخِ کرام کا قول ہے کہ عالمِ ارواح میں تمام روحوں کی توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہر وقت رہتی ہے اور جب روحوں کا دنیا میں آنا ہوا تو وہ توجہ الی اللہ دنیا میں آتے ہی جسم خورد و نوش اور دنیاوی حاجات کی طرف پھر گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ صحبت سے جو چیز ملتی ہے' وہ محض عبادت سے حاصل نہیں ہو سکتی ہے اس لئے تصوف میں صحبت کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے حضور اکرم ﷺ کے چہرہ مبارک سے نکلی ہوئی ان کرنوں کو حاصل کیا جو اگر کسی صاحبِ ایمان کے قریب سے بھی گزر جائیں تو اس کی زندگی حیات طیبہ کا درجہ حاصل کر لیتی ہے اور ان کو روحانی مشقوں کی چنداں ضرورت نہیں رہتی، اگرچہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو یہ حکم تھا کہ وہ چلتے پھرتے کلمہ شریف کا ذکر کرتے رہیں۔ آنحضرت ﷺ کے بعد مشائخ کرام اور اکابرین اسلام نے تزکیہ نفس کے لیے ذکر اور مراقبہ جیسے اعمال کو رواج دیا اور حلقہ ذکر کی مجالس آباد ہونے لگیں۔

احادیثِ نبوی ﷺ جو حصن حصین میں درج ہیں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذکر کے حلقے آنحضرت ﷺ کے زمانے میں بھی منعقد ہوتے تھے' امداد السلوک میں اس حدیث کا ذکر کیا گیا ہے جس میں آنحضرت ﷺ

نے کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بند کمرے میں بٹھایا اور اپنے ہاتھوں کو اوپر اٹھا کر کلمہ توحید پڑھا اور اللہ کے حضور میں یہ عرض کیا اے اللہ تو گواہ رہ کہ میں نے یہ کلمہ ان بندوں تک پہنچا دیا ہے۔ایک حدیث میں ہے۔

جَدِّدُوْا اِیْمَانَکُمْ قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَ کَیْفَ نُجَدِّدُ اِیْمَانَنَا قَالَ اَکْثِرُوْا مِنْ قَوْلِ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ (مجمع الزوائد)

اپنے ایمان کی تجدید کرو پوچھا گیا یا رسول اللہ ﷺ کہ کیسے ہم اپنے ایمان کی تجدید کریں آپ ﷺ نے فرمایا لا الہٰ الا اللہ کا ذکر کثرت سے کیا کرو۔

تاریخ تصوف پر علامہ اقبالؒ کا اظہار خیال

علامہ محمد اقبالؒ نے "تاریخِ تصوف" کے بارے میں لکھا ہے کہ اسلامی تصوف کے ماضی پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صدی کے آخر میں اس کی ابتداء ہوئی ہے۔ جب بنی امیہ کے مظالم اپنی انتہا پر پہنچے ہیں تو اس وقت صوفیائے کرام کا پہلا طبقہ وجود میں آیا۔ طبقاتِ اول کے صوفیاء میں حضرت حسن بصری، حبیب عجمی، حضرت فضیل بن عیاض اور حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہم جیسے بزرگ مشہور ہوئے۔ پھر زمانے نے ایک کروٹ بدلی، بنوامیہ کا دور ختم ہوا اور بنوعباس کا دور شروع ہوا اور صوفیاء کرام کا دوسرا طبقہ وجود میں آیا جس میں حضرت بایزید بسطامی، حضرت معروف کرخی، حضرت فریدالدین عطار اور حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین جیسے بلند پایہ بزرگ شامل تھے۔

اسی طرح یہ صدیاں گزرتی رہیں اور مختلف صوفیائے کرام پیدا ہوتے رہے۔ تیرہویں صدی عیسوی تک اسلام میں تصوف کی عالمگیر تحریک بن چکی تھی۔ اس صدی میں صوفیائے کرام نے اپنی خانقاہیں قائم کر کے رشد وہدایت کے چراغ روشن کئے۔ یہ ہے اسلامی تصوف کا ایک اجمالی سا خاکہ، جن احباب کو تصوف کی تفصیلات درکار ہوں وہ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب تاریخِ تصوف (مرتبہ پروفیسر صابر کلوروی) کا مطالعہ فرمائیں۔ حضرت امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالہ قشیریہ میں لکھتے ہیں۔

"جان لو خدا تم پر رحم کرے کہ بعد رسول اللہ ﷺ کے مسلمانوں کے لئے ان کے زمانے میں کوئی نام بڑی فضیلت والا سوائے صحبت رسول اللہ ﷺ کے نہیں رکھا گیا کیونکہ اس سے بڑھ کر اور کوئی فضیلت نہیں تب ان کو صحابہ رضی اللہ عنہم کہا گیا اور جب دوسرے زمانے والوں نے ان کو پایا تو جن لوگوں نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی صحبت حاصل کی ان کا نام تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم رکھا گیا۔ پھر مختلف قسم کے لوگ پیدا ہو گئے اور ان کے مراتب میں فرق پڑ گیا۔ تب ان خواص لوگوں کو جنہیں دین کے کام میں زیادہ توجہ تھی، زاہد، عابد، کہا گیا۔ پھر بدعت ظاہر ہوگئی اور فرقوں کے مدعی پیدا ہو گئے۔ ہر ایک فریق نے یہ دعویٰ کیا کہ ہم زاہد

ہیں۔ تب اہل سنت کے خاص لوگوں نے جو خدا کے ساتھ اپنے نفسوں کی رعایت رکھنے والے اور اپنے دلوں کی غفلت سے حفاظت کرنے والے تھے اس نام کو چھوڑ کر اپنا نام اہل تصوف رکھا اور ان اکابر کا دوسری صدی ہجری سے پہلے یہ نام مشہور ہو گیا"۔

مطالعۂ تصوف کے فارسی ماخذ قبل از مغلیہ عہد

روحانی تجربہ جسے انگریزی میں Mystic Experience بھی کہا جاتا ہے دنیا کے تمام مذاہب میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے لیکن جب ہم مسلمانوں کے روحانی تجربات وواردات کے لیے لفظ "تصوف" استعمال کریں تو اس لفظ کے امتیازات کو بھی ذہن میں رکھنا ہوگا۔ تصوف Mysticism نہیں ہے کیونکہ یہ کسی مخفی (روحانی) تجربے سے زیادہ ایک اخلاقی رویہ ہے یا آپ اسے تعمیرِ سیرت کا ایک نظام کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے تصوف کی بہت سی تعریفوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "اَلتَّصَوُّفُ کُلُّهٗ اَدَبٌ" تہذیبِ اخلاق کا تعلق یا کسب ومجاہدہ سے ہے یا تاثیر صحبت سے اور تصوف کا نظامِ تربیت انہی دو بنیادوں پر قائم ہے۔ صوفیاء اسے "طریقت" سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کا مرتبہ شریعت سے بلند تر بتاتے ہیں۔ انہوں نے یہ درجہ بندی اس طرح کی ہے کہ پہلا مقام شریعت ہے دوسرا طریقت اور تیسرا حقیقت۔ شریعت سے حقیقت تک جو سفر ہے وہ سلوک کہلاتا ہے۔ اس میں شریعت کی بالادستی کہیں ختم نہیں ہوتی' چنانچہ ہمیں تاریخ میں ایسی متعدد مثالیں مل جاتی ہیں کہ جہاں علمائے ظاہر نے یہ محسوس کیا کہ شریعت کی بالادستی کو نظر انداز کیا گیا ہے تو وہاں انہوں نے صوفیاء کو حد وتعزیر سے بھی معاف نہیں رکھا۔ حسین بن منصور حلاج (ف ۳۰۹) عین القضاۃ ہمدان۔ (ف ۵۳۳)

مسعود بکؒ یا سرمدؒ کے معاملے میں اس کی واضح مثالیں موجود ہیں۔ صوفیاء نے بھی یہ جرأت نہیں کی کہ وہ قانونِ شریعت کی بالادستی کو چیلنج کریں یا ان سے اپنی بے نیازی کا اظہار کریں۔ ابتدائی دور سے لے کر تقریباً آٹھویں صدی ہجری تک جو کتابیں عربی یا فارسی میں تصوف کے فنی اور نظری مباحث پر لکھی گئی ہیں' ان میں زیادہ تر اعتزار کا رنگ ملتا ہے یہ ثابت کرنے کی کوشش نظر آتی ہے کہ نہ صرف تصوف میں قانونِ شریعت اور روحِ اسلام کے خلاف کوئی بات نہیں ہے بلکہ خود تصوف میں "روحِ اسلام" ہے۔ رہا یہ سوال کہ طریقت اور حقیقت کا مرتبہ شریعت سے بلند کیوں رکھا گیا ہے؟ اس کی تشریح صوفیاء یوں کرتے ہیں کہ جب کوئی مقام حقیقت سے گرے گا تو مقامِ طریقت میں آپڑے گا اور مقامِ طریقت سے ساقط ہوگا تو مقامِ شریعت میں رہے گا لیکن شریعت سے گر گیا تو اس کا تصوف بلکہ اسلام سے ہی کوئی تعلق باقی نہیں رہ جاتا۔ اس لئے ہمیں تصوف پر گفتگو کرتے ہوئے اسلامی تصوف کے صرف وہ علمی اور عملی معیار سامنے رکھنے چاہئیں جو محققینِ صوفیاء نے

قائم کر دیئے ہیں۔ اس دنیا میں جو کچھ کیا ہو رہا ہے اور ہماری نظروں کے سامنے جو نمونے آتے رہتے ہیں' اسے مطالعۂ تصوف کا علمی معیار نہیں بنایا جا سکتا۔ دنیا کا کوئی بھی مذہب ہو یا نظریہ' وہ کتابوں میں کچھ ہوتا ہے اور عمل میں کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ قول و عمل کے اس تضاد سے انسان آج تک چھٹکارا نہیں پا سکا اور تصوف دراصل ظاہر و باطن کے اس تضاد کو ختم کرنے کا نام تھا جسے ہم صرف Mysticism یا باطنیت کہہ کر گزر جاتے ہیں۔ عوام پر قیاس کر کے اگر حکم لگایا جائے تو تصوف کیا خود معنی اسلام ہی کی جو شکل سامنے آئے گی وہ کچھ دل پذیر اور پر تاثیر نہیں ہو سکتی۔

مشائخ اور صوفیاء کا نظریہ ہے کہ تصوف ''اسلام کی روح'' ہے۔ یہی وہ منتہی ہے جہاں قوانین شریعت ہمیں لے جانا چاہتے ہیں۔ یہی عبادت کا مغز ہے' یہی معاملات کا مقصود اور مجاہدات کا ثمرہ ہے۔ یہی وہ ''نور'' ہے جس کی طرف قرآن و حدیث کے ذریعے ہماری رہنمائی کی گئی ہے۔ تصوف نہ ہم سے کچھ لیتا ہے' نہ ہمیں کچھ دیتا ہے' یہ صرف ایک طرز زندگی اور زاویہ نگاہ ہے اور بے حاصلی کے سوا کچھ اس کا حاصل نہیں ہے' جسے فارسی شاعر یوں کہتا ہے۔

اول ما آخرِ ہر منتہی　آخر ما حبیب تمنا تہی (فارسی شاعر)

(ہماری ابتداء ہر منتہیٰ کی انتہا ہے جب کہ ہماری انتہا فقط محبوب کی تمنا ہے۔)

اور داغ دہلوی نے یوں کہا ہے۔

لاکھ دینے کا ایک دینا ہے　دل بے مدعا دیا تو نے (داغ)

اس بنیادی نکتے کو ذہن میں رکھیں تو معلوم ہوگا کہ تصوف اسلامی کا سب سے بڑا ماخذ خود قرآن کریم ہے۔ قرآن میں صوفیاء کی مخصوص اصطلاحیں کہیں استعمال نہیں ہوئی ہیں' لیکن سلوک و طریقت کے جتنے اہم اور بنیادی اصول صوفیاء نے بتائے ہیں' ان سب کی سند وہ قرآن سے دیتے ہیں۔ اگر علمائے ظاہر یا وہ لوگ جو تصوف کے مخالف ہیں' صوفیاء کی تفسیرِ قرآن کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور اسے ''تفسیر بالرائے'' کہتے ہیں، جسے متعصب طبقہ ہمیشہ شکوک و شبہات کی نظر سے دیکھتا رہا ہے' لیکن صوفیاء نے آیات قرآنی سے اصول تصوف کا جس طرح استخراج کیا ہے اسے آنکھ بند کر کے رد بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً شیخ شہاب الدین سہروردی (ف ۶۳۲) نے لکھا ہے کہ ارادت کا مقصد ''طلب وجہ ربّ'' ہے کیوں کہ ''وجہِ ربّ'' ہی باقی رہ جانے والا ہے اور سب کچھ فانی ہے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿٢٦﴾ وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ ﴿٢٧﴾ (الرحمٰن: ۲۶ تا ۲۷)

''جو کچھ زمین میں ہے فنا ہونے والا ہے اور باقی رہے گی آپ کے رب کی ذات جو بڑی عظمت اور احسان والی ہے''۔

اور وجہ رب کی طلب رکھنے والوں کی تربیت کرنا قرآن سے ثابت ہے: ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ (الکہف: ۲۸)
"اور روکے رکھیے اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے رب کو"

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (التوبہ: ۱۱۹)
"اے ایمان والوں ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور ہو جاؤ سچے لوگوں کے ساتھ"

سلوک میں مجاہدات تجویز کئے جاتے ہیں۔ ان مجاہدوں میں کچھ غلو بھی کیا گیا ہے اور سنٹرل ایشیاء میں اس پر بدھ مت کا اثر بھی ہوا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ترکِ دنیا اور رہبانیت اسلام میں نہیں ہے مگر ترکِ دنیا کا مفہوم بھی ناسمجھ لوگوں نے بدل کر رکھ دیا ہے۔

صوفیاء نے جس ترکِ دنیا کی تعلیم دی ہے وہ ایک مثبت رویہ ہے کوئی منفی طریقہ نہیں ہے۔ حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (ف ۷۵۷ھ) نے فرمایا کہ طلبِ حق کے لیے مجاہدہ اس آیت کی رو سے شرط ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت: ۶۹)
"اور جو (بلند ہمت) مصروف جہاد رہتے ہیں ہمیں راضی کرنے کے لئے ہم ضرور انہیں دکھا دینگے انہیں اپنے راستے"۔

یہ منطق کی مسلمات میں سے ہے کہ شرط اور جزا لازم و ملزوم ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ ہدایت بے مجاہدہ نہیں مل سکتی۔ حضرت چراغ دہلی رحمۃ اللہ علیہ نے (خیر المجالس ص ۱۲۸) میں اس نکتے کی طرف بھی توجہ دلائی کہ یہاں "سبلنا" بصیغہ جمع آیا ہے "یعنی ہمارے راستے" کہا گیا سبیلنا (ہمارا راستہ) نہیں کہا گیا ہے۔ اس سے صوفیاء کے مشرب کی وسعت کا جواز پیدا کیا جا سکتا ہے یعنی ہر ایک کا اپنا رستہ ہے۔ اسی طرح صوفیاء کا نظریۂ عشق آیت "يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗۤ" (سورہ مائدہ: ۵۴) سے ثابت کیا جا رہا ہے۔

قرآن میں تصوف کے موضوع پر کیا کچھ ملتا ہے اس بارے میں اصولِ تصوف کی کتابوں میں بہت سا مواد بکھرا ہوا ہے۔ ہمارے دور میں ڈاکٹر میر ولی الدین کی کتاب "قرآن اور تصوف" میں بھی کچھ احاطہ کیا گیا ہے۔ یہی کتاب انگریزی میں مطبوعہ Quranic Sufism کے نام سے موجود ہے۔

تصوف کا دوسرا بنیادی ماخذ احادیثِ رسول ﷺ ہیں۔ احادیث کے مجموعے اپنے پایۂ اِستناد کے اعتبار سے مختلف مدارج رکھتے ہیں لیکن جن چھ کتابوں کو "صحاحِ ستہ" کہا جاتا ہے ان میں بھی اخلاق ومعاملات کے مختلف عنوانوں کے تحت ایسی بہت سی احادیث موجود ہیں جن سے سلوک وطریقت کے اصول وقوانین کی سندیں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ اسلام کی ابتدائی تین چار صدیوں میں تصوف کے موضوع پر جو کتابیں

لکھی گئیں ان کی بنیاد انہی دو ماخذوں پر ہے یعنی کتاب اور سنت۔

یہاں اس تمہید کی ضرورت اس لیے تھی کہ جب ہم اسلامی تصوف کا علمی اور تحقیقی مطالعہ کریں تو اس کے اولین مصادر یہی ہیں' ان کے سوا جن ماخذ سے استفادہ کیا جائے گا' ان کی حیثیت ثانوی ہوگی اور اگر ان ماخذوں میں کچھ ایسا مواد موجود ہو جو قرآن اور حدیث سے معارض ہو تو اس کا قطعاً اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح تصوف کے منابع کے بارے میں مستشرقین کے پرانے نظریات جو کہ شامی رہبانیت سے ماخوذ ہے' یا یونان کے فلسفۂ اشراق سے متاثر ہے یا اس پر زرتشتی فکر کے گہرے اثرات ہیں' یا وہ ہندوستان ویدانت کی توسیع ہے' ان سب پر خاصی بحث ہو چکی ہے۔ علاقائی اثرات سے انکار کرنا ممکن نہیں لیکن اس حد تک خود مستشرقین بھی قائل ہو چکے ہیں کہ تصوف کا ابتدائی ڈھانچہ عربی تھا۔

ان دو بنیادی ماخذوں کے بعد ہم اس سلسلے میں قدیم علماء کی ان تصانیف کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے جو چوتھی سے چھٹی صدی ہجری تک عربی اور فارسی میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں ابو نصر سراج طوسی رحمۃ اللہ علیہ (ف ۳۷۸ھ) کی کتاب اللمع ابو بکر کلا بازی رحمۃ اللہ علیہ (ف ۳۳۸) کی '' التعرف لمعرفۃ اصل التصوف '' ابو طالب مکی رحمۃ اللہ علیہ (ف ۳۸۶ھ) کی قوت القلوب 'عبد الرحمٰن السلمی رحمۃ اللہ علیہ (ف ۵۱۲ھ) کی طبقات الصوفیہ ' ابو نعیم الاصبہانی (ف ۴۳۰ھ) کی حلیۃ الاولیاء ' ابو القاسم القشیری رحمۃ اللہ علیہ (ف ۴۶۳ھ) کی آداب المریدین اور ان کے بھتیجے شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ (ف ۶۳۲ھ) کی عوارف المعارف ' پھر دنیائے تصوف میں عظیم فکری انقلاب برپا کرنے والی شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ (ف ۶۳۸ھ) کی تصانیف فتوحاتِ مکیہ اور فصوص الحکم ' جن میں عقیدہ وحدت الوجود کی فلسفیانہ علمی اور کشفی تشریح کی گئی ہے۔ یہ سب وہ بنیادی ماخذ ہیں جن کے بغیر تصوف کا علمی مطالعہ ہو ہی نہیں سکتا۔

تصوف کے متعدد پہلو

مطالعۂ تصوف کے متعدد پہلو ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔

(ا) تصوف کا نظری مطالعہ

جس میں مثلاً یہ بحث ہے کہ تصوف کیا ہے؟ اس میں اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب اور تہذیبوں کے اثرات کہاں تک ہیں؟ فلسفہ، سماجیات اور نفسیات سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ اس ذیل میں خود تصوف کی اصطلاحات بھی زیر بحث آجاتی ہیں۔ یہودی' عیسائی' رومی' بدھ مت، زرتشت اور ہندومت کے اثرات کا سراغ انہی اصطلاحوں اور ان کی تعبیروں سے لگایا جا سکتا ہے۔

(۲) تصوف کا عملی پہلو

تصوف کے عملی پہلو میں اعمال' عبادات' اشغال' مجاہدات' ریاضات وغیرہ زیر بحث آئیں گی۔ اس کا بھی ایک حصہ وہ ہے جو صرف ذاتی تجربے سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں خبر و اطلاع وغیرہ ہماری کوئی مدد نہیں کریں گی مثلاً کسی صوفی کو اگر کسی مقام کا ''کشف'' ہوتا ہے تو وہ ہمیں اس کی خبر دے سکتا ہے' تجربہ نہیں کرا سکتا۔ اس کشف کی جو کیفیت اس نے بیان کی ہے' اس کی بازیافت ہمارے لئے صرف اپنے عمل اور مجاہدے سے ہی ممکن ہے' یقینی پھر بھی نہیں ہے۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ کشف جو کسی ولی سے صادر ہوتا ہے تو اس کے کشف کی صحت کا علم کشف کے مطابق اگر وقت پر ظاہر ہو جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ کشف صحیح ہے اس لئے بعض اولیائے کرام یہ الفاظ لکھتے ہیں کہ فلاں بات کشفِ صحیح سے معلوم ہوتی ہے۔ کشف صحیح ہو تو صبح کی سپیدی کی طرح ظاہر ہو جاتا ہے۔

(۳) تاریخِ تصوف کا نظری مطالعہ

یہ اس مطالعے کا تیسرا پہلو ہے۔ اس کی بھی کئی شاخیں ہیں۔ ایک ''تذکرہ'' جس میں صوفیاء کے احوال اور اقوال جمع کر دیئے جاتے ہیں۔ دوسرا ''سیر الاولیاء'' جس میں ان کی سیرت اور طریق تعلیم و تربیت نیز سوانح وغیرہ کا بیان ہوتا ہے۔ تیسرا ''طبقات الصوفیہ'' جس میں طبقات فقہاء و محدثین کے انداز پر صوفیاء کے تراجم لکھے گئے ہیں' اسے بھی تذکرہ و سیرت ہی کا ایک حصہ سمجھا جا سکتا ہے۔ چوتھے شعبے میں ''ملفوظات'' آتے ہیں۔ یہ مشائخ صوفیا کے وہ اقوال و ارشادات ہیں جنہیں ان کا کوئی مرید اور مسترشد قلم بند کر لیتا ہے۔

بنیادی مآخذ کی اِس درجہ بندی کے بعد ہم مطالعہ تصوف کے ان ہندوستانی مصادر کا کسی قدر تفصیل سے جائزہ لیں گے جو مغلیہ دور سے پہلے لکھے گئے ہیں' لیکن یہاں ایک بنیادی نکتہ اور سمجھ لینا ضروری ہے کہ تاریخ ادبِ تصوف' تاریخ تصوف نہیں ہے۔ چنانچہ فارسی' ہندی' پنجابی یا اردو شعراء کا کلام دوہے' مثنویاں یا تصوف کے رنگ میں رنگے ہوئے اقوال' تمثیلیں وغیرہ مطالعہ تصوف کے بنیادی مصادر کے ذیل میں نہیں آ سکتے۔ مثلاً امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کا کلام جائس کی تصانیف یا کبیر کے دوہے تصوف کے بنیادی مصادر نہیں کہے جا سکتے۔ البتہ فنی و اصطلاحی مطالعے کے لیے جو ہمیں دستیاب ہے' اس کی روشنی میں ان کتابوں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے اور اسے تصوف کا اطلاقی ادب کہا جائے گا۔ ہندوستان میں مطالعہ تصوف کا جو کچھ مواد ملتا ہے اس کا جائزہ لینے سے پہلے ایک مسئلہ اور واضح ہو جانا چاہیے' یہاں ابتدا سے مذہبی زبان عربی' تصنیف و تالیف کی زبان فارسی' عوامی رابطے کی زبان ہندی اور مقامی تہذیب کی زبان علاقائی رہی ہے۔ اس لئے تصوف سے جو کچھ مواد ہمیں دستیاب ہوگا اگر مذہبی اور علمی سطح پر ہے تو عربی و فارسی میں ہوگا۔ ہندوستان میں پنجابی' ہندی اور اس کی بعض

بولیاں مثلاً اودھی' بیسواڑی وغیرہ میں تصوف کا اطلاقی ادب موجود ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم سب سے پہلے ہندوستانی' فارسی ماخذ کی ان چند کتابوں کا ذکر کریں گے جو تصوف کے نظری مطالعے سے متعلق ہیں لیکن اس سے پہلے ایک اور ذیلی تمہید ہندوستان میں تصوف اور صوفیاء کی آمد کے متعلق باقی رہتی ہے۔ ابھی تک یہ سمجھا جاتا ہے کہ حضرت علی الہجویری رحمۃ اللہ علیہ پہلے صوفی ہیں جو ہندوستان میں تشریف لائے لیکن اس میں بحث کی گنجائش ہے۔ ''فوائد الفواد'' کی ایک روایت سے ظاہر ہے کہ ان کے لاہور تشریف لانے سے قبل وہاں ایک بزرگ شیخ حسین زنجانی رحمۃ اللہ علیہ موجود تھے لیکن ہمیں سردست صرف دو باتیں ملحوظ رکھنا ہوں گی: ایک تو یہ کہ مسلمان فاتحوں کے شمالی ہند میں نفوذ کرنے سے پہلے یہاں بدایوں' قنوج' ملتان جیسے قدیم شہروں میں مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی نوآبادیاں ظاہر ہو چکی تھیں اور مقامی آبادی سے ان کے فکری وثقافتی رابطوں کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ دوسرے سندھ اور پنجاب کے علاقے غزنی کی حکومت میں شامل ہونے کے ساتھ ہی یہاں صوفیاء کی آمد کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اس زمانے کے حکمران اور فاتحین حصولِ دعا وبرکت کے لئے مشائخ کی خانقاہوں میں حاضر ہوتے تھے۔ مفتوحہ علاقوں میں زمین اور معافیاں دے کر انہیں بساتے تھے اور اکثر حالات میں فوج کے ساتھ انہیں بھی لے کر جاتے تھے' چنانچہ ایک چشتی بزرگ کا محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ہندوستان میں آنا معلوم ہوتا ہے لیکن ابتدا میں صوفی سلسلوں کی تنظیم نہیں تھی' اس لئے کسی درویش کی خانقاہ اس کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی تھی۔ سلسلے کی باقاعدہ تنظیم اور خلفاء وجانشین نامزد کرنے کا طریقہ تقریباً چھٹی صدی ہجری سے ملتا ہے۔ سلسلوں کی تنظیم کے بعد پہلے چشتی اور سہروردی سلسلے ہندوستان میں آئے' پھر نقشبندی یہی تین بڑے سلسلے ہیں۔ دوسرے سلسلے یہاں دیر میں پہنچے اور زیادہ فروغ بھی نہ پا سکے۔ اس لئے ہم انہیں نہیں گن رہے ہیں۔

چشتی اور سہروردی سلسلوں کے بارے میں تاریخی قطعیت کے ساتھ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ کون یہاں پہلے پہنچا۔ سہروردی سلسلے کی پہلی خانقاہ ملتان میں حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ (۵۶۶۔۶۲۱ھ) نے قائم کی۔ چشتی خانقاہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ (ف ۶۳۴ھ) نے اجمیر میں قائم کی اور اس کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ چشتی صوفیاء خواجہ معین الدین اجمیریؒ' قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ (ف ۶۳۴ھ) حضرت خواجہ فریدالدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ (ف ۶۶۴ھ) حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ (ف ۷۲۵) خواجہ علاؤالدین علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ بزرگوں نے ''فنِ تصوف'' پر کتابیں نہیں لکھی بلکہ انہوں نے نظری مباحث سے زیادہ اس کے عملی پہلو پر زور دیا اور خانقاہی تربیت کو حاصلِ اصول سمجھا۔ اس کے برعکس سہروردی بزرگوں نے ابتداء ہی سے تصنیف وتالیف سے شغل رکھا۔

شیخ ضیاء الدین سہروردی (۴۹۰۔۵۶۳ھ) کی کتاب ''آداب المریدین'' اور ان کے بھتیجے اور خلیفہ شیخ

شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ (۵۳۹-۶۳۲ھ) کی تالیف ''عوارف المعارف'' خود چشتی خانقاہوں میں بھی ایک نصابی کتاب کی طرح پڑھائی جاتی تھی۔ حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے پیرومرشد سے ''عوارف المعارف'' کے چند ابواب کا باقاعدہ درس لیا تھا۔

تصوف کے نظری پہلو پر ہمیں ہندوستان میں لکھی ہوئی سب سے پہلی کتاب حضرت شیخ علی بن عثمان الہجویری کی ''کشف المحجوب'' ملتی ہے۔ یہ کتاب ہندوستان' ایران' روس' پاکستان اور یورپ میں کم سے کم گیارہ بار چھپی ہے' اس کا انگریزی ترجمہ پروفسر نکلسن نے کیا تھا اردو میں اس کے بیس سے زیادہ ترجمے ہوئے ہیں۔ ایک بہت عمدہ ترجمہ مولانا ابوالحسنات قادری رحمۃ اللہ کا کیا ہوا ۱۹۷۸ میں لاہور سے چھپا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ''کشف المحجوب'' اسلامی تصوف کی امہاتِ کتب میں سے ہے' اس سے ہر زمانے میں علمائے تصوف نے استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ ہمیں شیخ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کی ''تذکرۃ الاولیاء'' مولانا عبدالرحمٰن جامی رحمۃ اللہ علیہ کی ''نفحات الانس'' شیخ یحیٰی منیری رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات صدی و دوصدی سید اشرف جہانگیر سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات ''لطائف اشرفی'' اور حضرت گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف میں ''کشف المحجوب'' کے حوالے ملتے ہیں۔ اس کتاب کی تالیف میں شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے جن کتابوں سے استفادہ کیا تھا' ان میں ابوعبدالرحمٰن سلمی رحمۃ اللہ علیہ کی ''طبقات الصوفیہ'' اور ''تاریخ اہل صفہ'' کے علاوہ ''رسائل قشیری'' اور ''کتاب اللمع'' وغیرہ شامل ہیں۔

شیخ ہجویری رحمۃ اللہ علیہ صاحبِ سلسلہ بزرگ نہیں ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو پہلے صاحب سلسلہ بزرگ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ ہیں اور سہروردی بزرگ حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں مگر ان دونوں بزرگوں کی کوئی تصنیف ہمیں دستیاب نہیں ہے۔ شیخ زکریا ملتانیؒ کے اعمال و اوراد ایک مجموعہ ''کتاب الاوراد'' حال ہی میں اسلام آباد سے چھپ گیا ہے مگر یہ نظری تصوف کی نہیں' اعمال واشغال کی کتاب ہے۔ سہروردی مشائخ میں قاضی حمید الدین سہروردی ناگوری رحمۃ اللہ علیہ (ف ۵ رمضان ۶۴۳ھ) پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے تصوف کے موضوع پر متعدد رسائل لکھے' ان میں ''عشیقہ'' یا ''عشقیہ'' چھپا بھی ہے۔ اس کے علاوہ ''لوامع'' اور ''طوالع الشموس'' ان کی دو کتابیں ہیں۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔ حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ علومِ معقول و منقول کے جامع تھے' ان کا فارسی اور عربی' ہندی اور پنجابی میں شعر کہنا ثابت ہے۔ بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کا جو پنجابی کلام ''گرنتھ صاحب'' میں شامل ہے وہ مسلمانوں کے قدیم ماخذ میں نہیں ملتا۔ لیکن یہ سینہ بہ سینہ بابا گرونانک کو پہنچا تھا اور اسی کو گرو ارجن دیو نے ''گرنتھ صاحب'' میں شامل کیا ہے۔ اس پنجابی کلام کے بارے میں اس وقت زیادہ تفصیل سے گفتگو نہیں ہوسکتی لیکن مختصراً میرا خیال ہے کہ حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ

علیہ کی تصنیف ہو سکتا ہے۔ اس میں ایک شہادت تو یہ ہے کہ اس کا انتساب کسی دوسری شخصیت سے نہیں ملتا' دوسری داخلی شہادت یہ ہے کہ اس میں مسلمات صوفیاء اور اصول تصوف کے خلاف کچھ نہیں ہے' نہ کوئی ایسا خیال ہے جسے حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب کرنے میں تامل ہو۔ رہا یہ کہ مسلمانوں کے مصادر میں یہ کلام کیوں نہیں ملتا' تو ضروری نہیں کہ مصادرِ تصوف میں ہر چیز ہی مل جائے۔ دوسرے یہ سب مصادر بھی کہاں ملتے ہیں' تیسرے بعض قدیم کتابوں مثلاً ''شمائل الاتقیاء' سیر الاولیاء'' اور جواہر فریدی'' وغیرہ میں جزوی طور پر ہندی اور پنجابی کلام آیا بھی ہے۔ یہ پنجابی کلام پنجاب کے عوام کی اخلاقی اور روحانی تربیت کے لیے تھا اور حقائقِ تصوف کو ان کی سطح ادراک کے مطابق سمجھانا مقصود تھا۔ اس لئے یہ عوام تک ہی محدود رہا۔ بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ ہندی اور پنجابی دونوں زبانوں میں گفتگو فرماتے تھے اور ان میں شعر بھی کہتے تھے۔ اس کا سب سے قدیم حوالہ ''شمائل الاتقیاء'' میں ہے۔ ''سیر الاولیاء'' میں ان کے ہندی فقرے بھی نقل ہوئے ہیں' وہ جملہ: ''پونوں کا چاند بھی بالا ہوتا ہے۔'' اکثر نقل کیا جاتا ہے۔ اسی طرح انہوں نے شیخ علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ کو رخصت کرتے ہوئے فرمایا تھا ''صابر بھوگ کرو گے''۔ ان کی پنجابی کا ایک فقرہ ''عیسی منجی نہ سبھے'' سیر الاولیاء میں موجود ہے۔ ہندی میں ان کے دوہے کی ایک پنکتی ''شمائل الاتقیاء'' میں آئی ہے۔ یہ کتاب ایک ایسے بزرگ شیخ برہان الدین غریب رحمۃ اللہ علیہ کی فرمائش پر اور ان کی نگرانی میں لکھی گئی ہے۔ جنہوں نے حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کا زمانہ پایا تھا اور ان کے بہت سے مریدوں کو دیکھا تھا وہ پنکتی یہ ہے۔

''جس کا سائیں جاگتا سو کیوں سووے داس''

سیر الاولیاء میں ایک ہندی دوہا یوں لکھا ہے۔

کنت نہو ہتین کارری ناکاں ہت منائے بس کندلے مدہن گرہوریں لہد لہاہ

تیسری اور بہت ہی اہم شہادت یہ ہے کہ حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ پنجابی زبان میں بھی ذکر کرتے تھے۔ کسی دوسرے صوفی کے بارے میں ایسی روایت نہیں ملتی جس سے مقامی زبان میں اس کا ذکر کرنا ثابت ہوتا ہو۔ اس لئے حضرت گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ (ف ۸۲۵ھ) نے اپنے ''یازدہ رسائل'' میں اسے ''ذکر خاصہ حضرت شیخ فرید گنج شکرؒ'' لکھا ہے۔ یہ پنج ضربی ہے۔

(۱) ایہہ دل توں

(۲) اوہ دل توں

(۳) ایتھے توں

(۴) اوتھے توں

(۵) توں ہی توں

یہی ذکر چہار ضربی اور سہ ضربی ارکان کے ساتھ بعد کے زمانے کے چشتی ملفوظات میں آتا ہے۔ مثلاً شیخ محمد چشتی اور حضرت شاہ کلیم اللہ جہان آبادی کی تصانیف میں آیا ہے۔

"جواہرِ فریدی" جو علی اصغر فریدی بن شیخ مودود بن شیخ محمد چشتی بہدالوی رحمۃ اللہ علیہ نے عہدِ جہانگیری میں تالیف کی تھی اس میں حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کا یہ پنجابی دوہا موجود ہے۔

فریدا ادھر سولی سر پنجرے تلیا تو کنڈ کاگ   رب اجیوں بنا ناھڑے سودھن ساڈے بھاگ

"گرنتھ صاحب" میں اس دوہے کی یہ شکل ملتی ہے۔

فریدا تن سکا پنجر تھیا تلیاں کھونڈے کاگ   اجے سواب نہ باہوڑیہو دیکھ بندے کے بھاگ

حضرت چراغ دہلی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خلیفہ قاضی عبدالمتقد رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات ان کے پوتے شیخ ابوالفتح جونپوری نے جمع کئے تھے۔ قاضی عبدالمتقد ؒ نے ۷۸۸ھ یا ۷۹۱ھ میں انتقال کیا اور حوض شمسی کے قریب خانقاہ عبدالصمدؒ میں مدفون ہوئے۔ اس زمانے میں گجرات کے شیخ احمد رحمۃ اللہ علیہ کٹھو کے ملفوظات "تحفۃ المجالس" محمود بن سعید ایرجی نے جمع کئے۔ سہروردی سلسلے کے بزرگوں میں حضرت شیخ یحییٰ منیری (ف ۶ شوال ۷۸۲ھ) کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ انہوں نے اپنے مکتوبات میں تصوف کے دقیق مسائل کو خوب حل کیا ہے۔ ان کے ایک مرید نے کتاب "مناقب الاصفیاء" میں سہروردیہ بزرگوں کے حالات لکھے تھے۔ خود شیخ منیری رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات زین بدر عربی نے "معدن المعانی" کے نام سے مرتب کئے۔ (آصفیہ تصوف فارسی) ان ملفوظات میں بھی تصوف اور تاریخ تصوف کا بہت قیمتی مواد ہے۔

تھوڑا سا عہد مغلیہ میں گھس کر ہم اپنا جائزہ حامد بن فضل اللہ جمالی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (ف ۹۴۲ھ) کی "سیر العارفین" پر ختم کرتے ہیں جو ہمایوں کے عہد میں مرتب ہوئی ہے۔ جمالی رحمۃ اللہ علیہ سہروردی سلسلے سے متعلق تھے اور تصوف کا گہرا چاہو امذاق رکھتے تھے۔ افغانستان وسط ایشیا ایران ترکی عراق حجاز اور شام تک سیاحت کر چکے تھے۔ "سیر العارفین" میں انہوں نے جابجا اپنے مشاہدات بھی قلمبند کیے ہیں۔ برصغیر پاک وہند میں تصوف کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے کوئی بھی تاریخ کا طالب علم "سیر العارفین" کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

اسلام کا روحانی نظام

یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ اسلام کا روحانی نظام یعنی تصوف ہی موجودہ سائنس کی طرح انسان کو روحانی مشاہدات تک پہنچا کر اسے عین الیقین اور حق الیقین کے درجے پر فائز کر سکتا ہے اور مادیت زدہ ناپاک باطن اسی سے پاکیزگی کی نعمت سے ہمکنار ہو سکتے ہیں مگر انتہائی قابلِ افسوس امر یہ ہے کہ اس پاکیزہ اور مؤثر روحانی تعلیمات پر مبنی نظام (تصوف) کے ساتھ خود مسلمانوں نے دو انتہاؤں میں بٹ کر ظلم

کیا۔ ان انتہاؤں میں بٹتے ہوئے مسلمانوں کو اگر دو طبقے کہا جائے تو ان میں پہلا طبقہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو سرے سے اسلام کے روحانی نظام کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ وہ بیک جنبشِ قلم ''تصوف'' کو عجمی تصور کہہ کر دائرہ اسلام سے خارج کر دینے کو ہی اسلام کی حقیقی خدمت سمجھتے ہیں اور حتی المقدور صوفیائے اسلام کی ناقابلِ فراموش خدمات کی مختلف تاویلیں کر کے انہیں شرک کے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ لوگ فقہی مذاہب اربعہ، حنفی، شافعی، حنبلی، مالکی کی طرح سلاسلِ طریقت کے مختلف مکتبہ ہائے فکر (نقشبندی، چشتی، قادری، سہروردی اور رفاعی وغیرہ) کی تقسیم کو بھی اسلام کے خلاف ''گھناؤنی سازش'' قرار دیتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسرا طبقہ ان جاہل، بے عمل اور نام نہاد صوفیاء کا ہے جنہوں نے خانقاہی نظام کو بدنام کرنے میں بنیادی اور مرکزی کردار ادا کیا۔ علم و عمل سے فارغ ایسے ''کاروباری پیر'' آج ہر روپ میں ہر جگہ بکثرت پائے جاتے ہیں جو تصوف و طریقت کے پاکیزہ مشن کو باقاعدہ تجارتی دھندا سمجھتے ہوئے حصولِ شہرت و زر کی اعلیٰ منازل طے کر چکے ہیں۔ اس وقت بے شمار گدی نشین إلا ماشاء اللہ ایسے ہیں جو اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے مصرعے

''خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن'' کے حقیقی مصداق ہیں اور اکثر صاحبزادگان پر۔ ''زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن'' کی حقیقت فٹ آتی ہے۔

برصغیر میں ان دو طبقات کے علاوہ ایک تیسرا طبقہ بھی موجود ہے جو تصوف کے تاریخی کارناموں سے انکار تو نہیں کر سکتا اور اس نظام کو کسی قدر برحق بھی سمجھتا ہے، مگر عملاً صوفیائے اسلام کی تعلیمات سے نہ جانے کیوں الرجک ہے۔ ان میں سے بعض ''منکرین'' کے نزدیک ''آج تصوف افیون یا ذیابیطس کی بیماری ہے'' جس سے قوم کو نجات دلانا ضروری ہے۔ حقیقت تو خیر حقیقت ہی ہوتی ہے، اس کے لئے کسی کا انکار یا اقرار و تصدیق کوئی معنی نہیں رکھتے، مگر آج جامد خانقاہیت، ظواہر پرستی اور نفس پرستی پر مبنی ''پیری مریدی'' نے اسلام کی روح کو جتنا نقصان پہنچایا ہے اس کا ازالہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ عملِ تصوف کو روحانی تربیت کے ذریعے جدید تقاضوں کے مطابق متعارف کرایا جائے تاکہ اس دورِ زوال میں امتِ مسلمہ کو پھر سے رازی، غزالی، رومی، جیلانی، ہجویری، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ علیہم اجمعین جیسے مردانِ حق میسر آ سکیں۔ تاریخ کے اس اہم موڑ پر اس وقت تجدید و احیائے دین اور اسلام کی ترویج و تبلیغ اور اشاعت کی غیر معمولی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے والے افراد اور اداروں کو وقت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اسلام کی پیاس اور روحانی سکون کے لیے ترستی ہوئی انسانیت کو اسلام کے چشمہ صافی تک پہنچانے کا فریضہ پوری دیانت اور خلوص کے ساتھ سرانجام دینا چاہیے۔ ہمارا ایمان ہے کہ صوفیائے اسلام کا طریقہ ہی وہ صحیح طریقہ ہے جو تمام ابلیسی و مادی خطرات سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک تصوف شریعتِ محمدی ﷺ سے ہٹ کر کوئی الگ چیز نہیں،

بلکہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے بقول!'' جس طرح دین کے تمام اعمال کی ایک ظاہری شکل ہے اور اس کی باطنی حقیقت' ہے اور ظاہری شکل کے بغیر باطنی حقیقت کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور باطنی حقیقت کے بغیر ظاہری شکل ایک بے جان جسم کی طرح ہے۔ بس یوں ہی دین کی ظاہری شکل کا تعلق شریعت سے ہے اور باطنی حقیقت کا تعلق طریقت یا تصوف سے''۔

باب ۱۰

تصوف پاکیزگی قلب ہے

صفائے قلب و باطن، تصوف کا مقصود ہے

تاریخ اسلام کے اوائل دور میں صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین رضی اللہ عنہم اجمعین اور دیگر محدثین کے علاوہ قرون اولیٰ اور وسطیٰ کے بزرگانِ دین وصوفیائے عظام کی زندگیوں اور ان کے احوال وآثار کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان کی تمام تر عبادتوں، ریاضتوں کی غایت اور محنتوں کا ماحاصل قلب و باطن کی صفائی کا حصول ہوتا تھا یعنی شب وروز کی تمام عبادتوں کا مقصد یہی ہوتا تھا کہ انہیں صفائے قلب اور تزکیہ نفس حاصل ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ صفائے قلب و باطن ہی اصل تصوف وطریقت ہے، یہی مدعائے تقویٰ اور یہی حاصلِ زندگانی اور کمالِ بندگی ہے۔ اگر دل صاف نہ ہو تو نہ اس پر عبادت کے نقش جم سکتے ہیں، نہ ہی تقویٰ کے ثمرات مل سکتے ہیں، صفائے قلب و باطن کے حوالے سے یہاں ان لوگوں کی بات ہو رہی ہے جو تقویٰ کے حصول کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ ہماری مراد وہ لوگ نہیں جو اس راہ کے مسافر ہی نہیں اور جنہوں نے اللہ کی رضا جوئی کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ ان کے لئے تو صفائے قلب اور تطہیرِ باطن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں ان لوگوں کی بات کر رہا ہوں جو اس راہِ سلوک پر چل رہے ہیں، یعنی ہم لوگ جو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور اس کی بندگی کے دعویدار ہیں ہمارے دلوں کا حال یہ ہے کہ ہم اگرچہ بندگی میں اللہ اللہ بھی کرتے ہیں، نماز بھی ادا کرتے ہیں، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی ادائیگی بھی کر لیتے ہیں، راتوں کو اٹھ اٹھ کر بھی اللہ کی رضا کے حصول کی کوشش کرتے ہیں، مگر ہمارے دل زندہ نہیں ہوتے۔ حاجی، نمازی ہو کر بھی دلوں کو قرار نہیں ملتا۔ اس میں شک نہیں کہ اس عبادت وریاضت کا اجر شاید مل بھی جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کے اجر کو ضائع نہیں کرتا، مگر وہ نورِ بندگی، نورِ عبادت، نورِ روحانیت وصالحیت اور اللہ کا قرب ووصال جو کہ بندگی کا مطلوب ہے، اس کی طرف صفائے قلب کے بغیر ایک قدم بھی چلا نہیں جا سکتا۔ ہم نوافل بھی پڑھ لیتے ہیں، تسبیح بھی کرتے رہتے ہیں۔ وقت ملے تو اللہ کے دین کی تبلیغ بھی کر لیتے ہیں، اللہ کے راستے میں محنت ومشقت بھی کرتے ہیں مگر صفائے قلب و باطن کی حالت نصیب نہیں ہوتی۔

صفائے قلب و باطن کیا ہے؟

قلب و باطن کی اس صفائی سے کیا مراد ہے جو اکثر لوگوں کو حاصل نہیں ہوتی؟ مثال کے طور پر ہمارے شعور یا لاشعور میں اللہ کے بندوں کے لئے کسی درجے میں عناد ہوتا ہے۔ کسی نہ کسی شکل میں کوئی عداوت ہوتی ہے۔ ذاتی پسند اور ناپسند کی بنا پر ہم کسی شخص سے حسد کر رہے ہوتے ہیں' بغض کو دل میں جگہ دیئے ہوتے ہیں لیکن چونکہ وہ لاشعوری طور پر ہوتا ہے' اس لئے بالعموم اس کا خیال نہیں ہوتا۔ اسے ہم گناہ تصور نہیں کرتے اور یوں وہ ہمارے دلوں کے نور اور باطن کی طہارت کو آہستہ آہستہ ختم کر دیتا ہے۔

روزمرہ کی زندگی میں جہاں بھی ہم پیشہ لوگ ہوں' حسد کا جذبہ کسی نہ کسی درجہ میں کارفرما ہوتا ہے۔ مثلاً کاروبار کو لے لیں۔ مارکیٹ میں آمنے سامنے یا پہلوؤں میں بیٹھے کاروبار کرنے والے ایک دوسرے سے حسد کرتے ہیں۔ ایک کا کاروبار اگر تھوڑا اچھا ہے' اس کے پاس گاہک زیادہ آتے ہیں' سیل زیادہ ہوتی ہے' لیکن دوسرے کا کام نسبتاً ٹھنڈا ہے تو وہ اپنے سے اچھے کاروبار والے کے ساتھ میل ملاپ بھی رکھتا ہے' اُٹھتا بیٹھتا بھی ہے' مگر اس کے دل میں ایک بغض اور عناد ہوتا ہے' جس کی بنا پر اس سے بغض اور کینہ رکھتا ہے اور اگر اسے اچھے کاروبار والے سے کسی اور کا کاروبار بہتر ہے تو وہ اس پر حسد کر رہا ہوگا' الغرض یہ سلسلہ نیچے سے اوپر تک چلتا جاتا ہے' لیکن اگر ہم ان سے پوچھیں تو ہر ایک قسم اٹھا کر کہے گا کہ میں فلاں سے کوئی حسد نہیں کرتا' مجھے اس سے کوئی عداوت یا بغض نہیں' لیکن اگر لاشعور کا کھوج لگایا جائے تو ہر ایک دوسرے کے اخلاق و کردار' رہن سہن' انداز گفتار و رفتار' میل ملاپ غرض کسی نہ کسی گوشۂ حیات کا گلہ کرے گا کہ جی! وہ ویسے تو اچھا آدمی ہے لیکن بڑے تکبر سے ملتا ہے' اس کا اخلاق اچھا نہیں' بڑی ترش روئی سے بولتا ہے' اس کا رہن سہن نوابوں جیسا ہے وغیرہ وغیرہ۔ کسی کے متعلق یہ تھوڑے بہت گلے شکوے جو ہمارے ذہنوں میں موجود ہیں' دراصل لاشعوری حسد اور بغض کے آئینہ دار ہیں۔

اسی طرح دین سے متعلقین اور وابستگان کو لے لیں' جن میں علماء' آئمہ' مدرسین اور طلبہ وغیرہ شامل ہیں یا تبلیغ اور خدمت دین کے وابستگان ہیں' کسی دینی تحریک کے رفقاء و اراکین ہیں' یہ لوگ (الا ماشاء اللہ) دو سطحوں پر حسد' بغض اور عداوت کا شکار ہوتے ہیں۔ ایک ان کی انفرادی زندگی کی سطح ہے جہاں ان کے ساتھ کام کرنے والے دوسرے ہم پیشہ اور ہم مکتب و ہم مسلک لوگ ہوتے ہیں' ان کے متعلق چغلی کھانا' ان کی شکایات کرنا' ان کی ذاتی زندگیوں کو کرید کر ان کے عیوب کو لوگوں کے سامنے بیان کرنا' یہ سب لاشعوری حسد اور بغض ہوتا ہے۔ دوسری سطح مجموعی مسلکی سطح ہے جہاں وہ دوسرے مکتبہ فکر کے ہر فرد سے عداوت رکھتے ہیں۔ ہر وقت ایک دوسرے کی کمزوریوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں اور اگر کوئی موقع مل جائے تو الزامات اور

اتہامات کے انبار لگا دیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان کی زندگی اسی کام کیلئے وقف ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ دین سے متعلقہ ایسے حضرات یہ سب کچھ بزعم خویش خدمت دین سمجھ کر کرتے ہیں۔ وہ یوں کہ ان میں سے ہر ایک چونکہ مصلح ہوتا ہے دینی خدمت کے لئے اس کی زندگی وقف ہوتی ہے اس لئے تنقید کرنا' کسی کے کام میں کیڑے نکالنا' ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنا' الزام تراشی اور عوام الناس میں اس کی بدنامی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دینا وغیرہ سب کچھ اپنے طور پر اصلاح کی خاطر ہوتا ہے۔ وہ اپنے ذہن' اپنے ہاتھ اور اپنی زبان کو تحریر و تقریر کے ذریعے بے دھڑک دوسرے کے خلاف استعمال کرتے ہیں' اگر ان سے اس کا سبب پوچھا جائے تو وہ بھی قسم اٹھا کر کہہ دیں گے کہ جناب! مجھے ذاتی طور پر اس سے کوئی دشمنی نہیں' میرا اس سے کیا تعلق؟ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ اس کی اصلاح ہو جائے اور وہ راہ راست پر آ جائے۔ میرا مقصود تو فقط اصلاح ہے اور یہ ہر ذمہ دار شخص کا فرض ہے۔

اللہ تعالیٰ انہیں حسنِ جستجو عطا فرمائے اور وہ خلوت میں بیٹھ کر ان ساری چیزوں کے پس منظر پر غور کریں تو بڑی آسانی سے انہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ جو ساری چیزیں اُچھال رہے تھے' ان کی کوئی حقیقت نہیں تھی اور اگر انہیں راستِ مومنانہ کا تھوڑا سا حصہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہو جائے تو ان کے سامنے حقیقت کھل کر آ جائے گی۔ وہ اپنے شعور میں کارفرما حسد اور بغض کو بھانپ لیں گے' لیکن اگر یہ جذبہ ان کے لاشعور میں رہے تو اس کی حقیقت کا واضح ہونا قدرے مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے کہ لاشعوری کی سطح پر جو روحانی امراض دبے رہتے ہیں' وہ زیادہ مہلک ہوتے ہیں۔ اور غیر شعوری طور پر انسان میں مفاسد کا زہر گھولتے رہتے ہیں۔ اس لیے صوفیاء و عارفین اور کاملین سب سے پہلے اس لاشعور کو صاف کرتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ایسے ہی امراض کے علاج کے لئے تصوف وطریقت کی ضرورت ہے۔ خود صوفیاء کی زندگیوں کے مطالعے سے معلوم ہوا ہے کہ انہیں کبھی بھی ایسے روحانی امراض کا شکار نہیں پایا گیا۔ وہ کسی کو برا بھلا نہیں کہتے اور اپنے کام سے کام رکھتے ہیں لیکن عام پیر بھینسوں کی طرح ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتے ہیں۔

صالحین کا طریقہ کار

سلف صالحین' عارفین و اولیائے کرام اور بزرگانِ دین رحمۃ اللہ علیہم اجمعین ہمیشہ قلب و باطن کی ان آلودگیوں کو رگڑ رگڑ کر دھوتے تھے۔ وہ عبادتوں' ریاضتوں اور تسبیح ونوافل کی کثرت کی طرف اتنی توجہ نہیں دیتے تھے بلکہ پہلے اپنے من کو پاک کرتے اور اسے اتنا پرنور اور چمک دار کرتے کہ اس پر کبھی شیطانی وسوسہ دخل اندازی نہیں کرتا تھا۔ ان کے باطن کے شیشے اتنے صاف ستھرے ہوتے تھے کہ کوئی ادنیٰ سا شیطانی خیال بھی انہیں فوراً محسوس ہو جاتا تھا۔ ان کی باطنی صفائی اس قدر ہوتی تھی کہ ان کا کوئی متعلقہ شخص دنیوی اعتبار سے جتنا بھی بلند

مرتبہ حاصل کر لیتا' ان کے دلوں میں اس کے متعلق ایک رائی کے کروڑویں حصے جتنا حسد یا بغض نہیں آتا تھا۔ انہیں خود پسندی' تکبر ونخوت جیسی باطنی' روحانی امراض کا شائبہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ ایک حقیقت یہ ہے کہ ان کا تعلق اس ذات کے ساتھ استوار ہو جاتا تھا' جہاں پہنچ کر یہ نفسیاتی آلودگیاں کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ انہیں اپنے حقیقی محبوب کا ایسا عشق لگ جاتا تھا کہ اس عشق کی آگ میں یہ برائیوں اور آلودگیوں کے سارے ڈھیر جل کر راکھ ہو جاتے تھے۔ کاروان عشق ومستی کے امیر اور حکیم الحکماء مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ ان بیماریوں کا علاج یوں بیان فرماتے ہیں۔

ہر کرا جامہ زعشقے چاک شد   او زحرص و عیب کلّی پاک شد
شاد باش اے عشق خوش سودائے ما   اے طبیب جملہ علت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما   اے تو افلاطون و جالینوس ما(۳۴۔۱)

(مراد یہ ہے کہ جس کے قلب وباطن کا جھوٹا بھرم آتش عشق سے ٹوٹ گیا' جھوٹے پندار کا جامہ عشق سے چاک ہو گیا' وہ پھر حرص وعیب گوئی وعیب بینی جیسی روحانی بیماریوں سے پاک ہو گیا۔ اے عشق تو آباد رہے اور خوش رہے جو اتنا اچھا معالج ہے کہ اس نے ہماری جملہ لا علاج اور مہلک بیماریوں کی دوا کی ہے۔ بلاشبہ ہمارے نزدیک تو تو افلاطون اور جالینوس جیسے مشہور حکیموں سے بھی زیادہ حکیم ہے جس نے ہمارے نفس کی غلاظتوں اور باطنی رذائل کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔)

اس طرح جب عشق کی گرمی سے ان کے قلوب اور باطن کی تختیاں صاف ہو جائیں تو پھر جو عبادت بھی کرتے ہیں' وہ جوہر کی طرح چمکتی ہے۔ ان کا ایک سجدہ بھی ہزار سجدوں پر بھاری تھا۔ ان کے دولحوں کی یاد عمر بھر کی شب بیداریوں پر بھاری ہوتی۔ ان کے اندر عبادت وریاضت سے اتنا نور پیدا ہوتا کہ جو بھی ان کی مجلسوں میں آتا' اس کے دل کی تاریکیاں بھی ڈھل جاتیں۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ ایسے پاکیزہ دلوں کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

آئینہ کز زنگ وآلائش جدا ست   پُر شعاعِ نورِ خورشید خدا ست(۳۵۔۱)

(یعنی وہ آئینہ دل جو زنگ اور میل کچیل سے پاک ہو جاتا ہے' پھر اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ خدا کے پاکیزہ نور کے آفتاب کی شعاعوں سے معمور ہو جاتا ہے)

اس کے بعد آپ نصیحت فرماتے ہیں کہ اے غافل ونادان انسان۔

رُو تو زنگار از رخِ اُو پاک کن   بعد ازاں آں نور را ادراک کن
ایں حقیقت راشنو از گوشِ دل   تابروں آئی بکلّی زآب و گل
فہم گر دارید جاں را رہ دہید   بعد ازاں از شوق پا در رہ نہید(۳۵۔۱)

(یعنی جا اور اس کے نورانی آفتاب کے رخ کی کرنوں سے اپنے قلب و باطن کے زنگ کو صاف کر اور جب تیرا آئینہ دل ایسی صحبت کی برکت سے صاف ستھرا ہو جائے تو' تو بھی ایسا نور حاصل کر لے گا جس سے زنگ آلودہ دلوں کی صفائی ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو دل کے کان سے سن اور قلب و باطن کی صفائی کے لئے اہل دل کے ہاں جایا کرتا کہ ان کی صحبت میں رہ کر تجھے بھی ان کے باطنی روحانی اثرات زندہ کر دیں اور تو بھی دنیائے آب و گل کے مادیت پرست ماحول سے باہر نکل کر حیات جاوید پا سکے۔)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اے انسان! قلب و باطن کی صفائی حاصل کرنے کا نسخہ اور اس کا ثمر میں نے تجھے بتا دیا' اب تیرا کام ہے کہ تو اس پر کس قدر عمل کرتا ہے' لیکن اگر تجھے تھوڑی بہت بھی سمجھ بوجھ ہے تو روح کی صفائی کر کے اسے پہنچنے کا راستہ دے اور جب تیری روح صاف اور منور ہو جائے تو رہ نور و شوق بن جا کیونکہ عشق کے راستے پر چلنے والے منزل مقصود پر بہت جلد پہنچ جاتے ہیں۔

صاف دل چراغ سے زیادہ منور ہوتے ہیں

مندرجہ بالا اشعار میں مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حقیقت بھی بیان کی ہے کہ انسان کا نفس' اس کی روح اور قلب و باطن جب پاک و صاف اور منزہ ہو جاتا ہے تو وہ نورانی چراغ کی طرح چمکنے لگتا ہے۔ اس چراغ کی روشنی اس کے شیشہ دل سے چھن چھن کر عالم کی تاریکی دور کرتی ہے اور ایسے روشن دل لوگوں کے پاس آنے والے لوگ بھی اسی طرح صفائے قلب و باطن حاصل کرتے ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ پرانے بزرگ ہر قسم کے میل کچیل اور بغض و حسد کی آلودگیوں سے لوح دل کو صاف کر لیتے تو ہر ایک عبادت ان کے دلوں میں نور بن کر چمکتی تھی۔ ان کا تھوڑا سا عمل بھی ہماری عمر بھر کی عبادتوں سے زیادہ مؤثر ہوتا تھا ان کے سینوں سے ہر وقت نور کے چشمے رواں رہتے تھے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ اندر غلاظت تو ہوتی نہیں تھی' اس لئے جو لقمہ کھاتے تھے' وہ بھی حلال ہوتا تھا اور اس سے بھی باطنی نور میں اضافہ ہوتا تھا۔ چلتے پھرتے' خدا کی یاد کرتے وہ بھی اس نور میں اضافہ کرتی اگر وہ وعظ و نصیحت کرتے' عبادت و ریاضت کرتے' تسبیح پڑھتے' تبلیغ کرتے' الغرض وہ جو کچھ کرتے' چونکہ وہ خالصتاً لِوَجْهِ اللّٰهِ ہوتا اس لئے اُن کے ہر عمل سے نور پھوٹتا۔ اُن کا اندر چونکہ بالکل صاف ستھرا ہوتا' اس لئے ان سے جو کچھ قول و فعل کی صورت میں صادر ہوتا' وہ ایسی نورانی شعاعوں کا سا اثر رکھتا تھا۔

صفائے قلب کی ایک دلچسپ حکایت

صفائے قلب کی اس پاکیزگی اور نورانیت کو سمجھنے کے لئے صوفیاء نے ایک حکایت بیان کی ہے۔ اسے مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے مثنوی شریف میں بھی بیان کیا ہے۔ وہ واقعہ یوں ہے کہ روم اور چین کی پرانی تہذیبیں چونکہ مشہور ہیں تو ایک دفعہ کسی ملک میں ان دونوں ملکوں کے ماہرین کے درمیان نقش و نگار کا مقابلہ ہوا۔ بادشاہ

نے دونوں ملکوں کے ماہرین کو حکم دیا کہ آمنے سامنے دیوار بنا کر اس پر اپنے فن کا مظاہرہ کریں اور درمیان میں ایک پردہ لٹکا دیں تا کہ دوران عمل ایک دوسرے کا پتہ نہ چلے کہ کون کیا کر رہا ہے! اور یہ فیصلہ ہوا کہ عین جس دن مقابلہ ہوگا' پردہ اٹھایا جائے گا اور بادشاہ اور اس کے وزراء آ کر موازنہ کریں گے' چنانچہ پروگرام کے مطابق دونوں طرف مقابلے کی تیاریاں شروع ہو گئیں ان میں سے ایک طرف کے کاریگروں نے نقش ونگار بنانے شروع کر دیئے اور دنیا کے ہر نادر نمونے سے دیوار کو مزین کر دیا۔ انہوں نے اپنے فن کی انتہا کر دی اور دل ہی دل میں خوش ہو گئے کہ کسی اور کے ہاں اتنے نادر نقش ونگار کے نمونے کہاں ہوں گے؟

دوسری سمت والوں نے یہ کمال کیا کہ پس پردہ دیوار بنا کر اس کو چمکانا شروع کر دیا اور اتنا صیقل کر دیا کہ شیشے سے کہیں زیادہ چمک دار ہو گئی' اس میں اتنی صفائی اور چمک پیدا کر دی کہ اس کے سامنے چھوٹی سی سوئی بھی رکھی جائے تو اپنے اصل وجود سے کہیں زیادہ واضح شکل میں نظر آئے۔ انہوں نے اس پر کوئی نقش ونگار نہ بنائے' جب مقابلے کا دن آیا اور بادشاہ معائنہ کے لئے آیا تو اس نے درمیان سے پردہ ہٹانے کا حکم دیا اور دونوں طرف باری باری جائزہ لیا۔ جب وہ ایک طرف دیکھتا تو کھردری سی دیوار پر نقش ونگار اپنی اصلی شکل میں نظر آتے اور دوسری طرف دیکھتا تو وہی نقش ونگار یہاں بھی نظر آتے لیکن یہاں ان کے ساتھ روشنیاں بھی نکلتیں اس سے زیادہ چمک دمک ہوتی' نتیجہ یہ ہوا کہ جنہوں نے صرف دیوار بنا کر اس کو چمکا دیا تھا' وہ جیت گئے اور جو نقش ونگار بناتے رہے' مگر دیوار کی طرف دھیان نہ دیا وہ مقابلہ ہار گئے۔ دوسروں نے چونکہ دیوار خوب چمکائی تھی لہٰذا ان کے نقش ونگار منعکس ہو کر اس دیوار میں اپنی اصل سے بھی حسین تر دکھائی دینے لگے۔

حاصلِ حکایت

یہ واقعہ بیان کرنے کا مقصد یہاں صرف یہ ہے کہ من کی صفائی کی اہمیت کا احساس اجاگر ہو سکے اور یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ اگر دل صاف ہو جائیں تو وہ آئینے کی طرح اپنے سامنے آنے والی ہر چیز کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں۔ خواہ ظاہری علوم ہوں یا باطنی' سب ان کے اندر جمع ہو جاتے ہیں اور پھر جب ان کی انعکاسی شعاعیں نکلتی ہیں تو اس سے پورا عالم جگ مگ کرنے لگتا ہے۔ مندرجہ بالا حکایت سے یہ امر بھی واضح ہو گیا کہ مرید اگر اپنا قلب وباطن صاف کر لے تو شیخ کی تمام روحانی تجلیات اس کے شیشۂ دل میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ اس طرح محنت تو شیخ کی ہوتی ہے' مگر اس سے مرید کا باطن بھی منور ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی طالب علم ایسا ہو تو محنت استاد کرتا ہے' لیکن اس کا فائدہ بھی وہ روشن دل طالب علم لے لیتا ہے۔ الغرض دل اگر صاف بھی ہو تو جو کچھ اس کے سامنے آتا چلا جائے' اس کے اثرات دل میں جمع ہوتے رہیں گے' اس طرح کتنوں کے فیض اس ایک قلب میں جمع ہو جاتے ہیں اور نہ صرف اپنی ریاضتیں اس کے مقامات و درجات میں ترقی کا

باعث ہوتی ہیں بلکہ کئی دوسرے عابدوں کی محنتیں اس کے درجات میں بلندی کا سبب بن جاتی ہیں۔

قلبِ مومن اور ایٹم بم

ایسا دل جو کئی روحانی چشموں سے سیراب ہوتا رہے' جہاں جائے اور جس کے سامنے جائے' اس کے فیوضات اپنے اندر سمیٹ لے تو وہ فیوضاتِ الٰہیہ کا مرقع بن جاتا ہے۔ اس کی حیثیت ایٹم بم کی سی ہو جاتی ہے جو ظاہری وجود کے اعتبار سے اگرچہ بالکل چھوٹا اور معمولی سا جسم رکھتا ہے' مگر طاقت اور قوت کے لحاظ سے ایک دنیا پر حاوی ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اگر پہاڑ کو رکھا جائے جو لاکھوں ٹن وزنی ہوتا ہے اور حجم میں اس سے لاکھوں گنا بڑا ہوتا ہے۔ حجم میں ایٹم بم اور پہاڑ کی کوئی نسبت ہی نہیں ہوتی۔ وہ کمیت کے اعتبار سے پہاڑ کا مقابلہ نہیں کر سکتا' مگر طاقت میں ایٹم بم کے سامنے پہاڑ کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ ایک ایٹم بم پھٹنے سے لاکھوں من کے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ ایک چھوٹے سے جسم میں اتنا جوہر کیسے پیدا ہو گیا کہ اس سے دنیا کی ہر چیز لرزاں و ترساں ہے؟ صحرا اور پہاڑ تمام تر وسعتوں اور رفعتوں کے باوجود ایٹم بم کے چھوٹے سے وجود کے سامنے اتنے بے حیثیت کیوں ہیں؟

اگر تھوڑا غور کیا جائے تو ساری حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ مخصوص دھاتوں کو صیقل کر کے ان کے ثقل کو اتنا کم کیا گیا کہ ان کی تمام کثافتیں اور فاضل ذرات ختم ہو گئے۔ ان کے وجود سے سائنس دان تمام فالتو اشیاء ایک خاص طریقے سے خارج کرتے رہے اور اسے نکھارتے رہے' اور چھوٹا کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جوہر حجم میں قلیل تر رہ گیا اور خالصیت کی بنا پر طاقت میں کثیر تر ہو گیا۔ ایک مومن کی روحانی' چمک دار' اور نورانی دل کی کیفیت بھی یہی ہوتی ہے۔ وہ انوارِ الٰہیہ میں اتنا صاف' پاک اور منور ہو جاتا ہے کہ اس کی لطافت ایک آئینے سے زیادہ چمک دار اور اس کی طاقت ایٹم بم سے کہیں زیادہ ہو جاتی ہے۔ بے شک ہوتا وہ ایک دل ہی ہے مگر اس میں کائنات کی ہر چیز سما جاتی ہے۔ مردِ مومن کا دل تو اس قدر پاک و صاف ہو جاتا ہے کہ اس کے سامنے اس دنیا کی حقیقتیں تو کیا' ماضی اور حال کے تمام واقعات اور عالم پست و بالا کی ہر ایک چیز واضح اور روشن ہو جاتی ہے اس جگہ وہ بات نہیں کی گئی کہ مومن کے دل میں آفاق و انفس کی ہر چیز نظر آ جاتی ہے اور یہ دل کی طاقت پر منحصر ہے۔ لہٰذا حضور غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمہ جیسا مردِ مومن اگر یہ کہہ دے کہ۔

نَظَرْتُ اِلٰی بِلَادِ اللّٰهِ جَمْعًا كَخَرْدَلَةٍ عَلٰی حُكْمِ التِّصَالِ

(یعنی جب میں پوری کائنات کی طرف دیکھوں تو وہ مجھے اپنی ہتھیلی پر رائی کے دانے کی طرح نظر آتی ہے)

تو یہ کون سی تعجب کی بات ہے؟ غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ تو کجا' علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے دل کی اس صفائی

کی اہمیت کو سمجھا تو کہنے لگے ۔

مجھے رازِ دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

(ب۔د:۷۰)

تزکیہ

قرآن کریم میں جن جن مقامات پر نبوت کے فرائض چہارگانہ کا تذکرہ کیا گیا ہے' تزکیہ کو ان میں ضرور ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر ارشاد ہے۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ (البقرۃ:۱۵۱)

"جیسا کہ ہم نے بھیجا تمہارے درمیان ایک رسول (ﷺ) تم میں سے جو تمہارے سامنے ہماری آیتوں کی تلاوت کرتا اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے"۔

دعائے ابراہیمی میں ذکر ہوا۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (البقرۃ:۱۲۹)

"اے ہمارے رب بھیج ان میں ایک رسول انہیں میں سے جو ان کے سامنے تیری آیتوں کی تلاوت کرے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے' بے شک تو بہت بڑی قوت وحکمت والا ہے"۔

سورۂ آل عمران میں ایک مقام پر مومنوں پر احسان جتلاتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

(آل عمران:۱۶۴)

"بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا جبکہ ان میں ایک رسول (ﷺ) انہیں میں سے مبعوث فرمایا جو ان کے سامنے اللہ کی آیات کی تلاوت کرتا' ان کا تزکیہ کرتا اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے' حالانکہ وہ اس سے قبل کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا تھے"۔

ان تمام آیات سے ثابت ہوا کہ حضور اکرم ﷺ کی بعثت کے چار مقاصد اور آپ کے فرائض نبوت میں چار فرائض ہیں (۱) تلاوتِ آیات (۲) تعلیمِ کتاب (۳) تعلیمِ حکمت (۴) تزکیۂ نفوس۔

اس وقت زیر بحث چوتھا فریضہ یعنی تزکیۂ نفوس ہے۔ تفصیلات میں جانے کی گنجائش نہیں۔ صرف تزکیہ

کے مفہوم کو واضح کرنا ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے مجموعۂ اضداد بنایا ہے۔

وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا ۝ (الشمس: ۷،۸)

اور قسم ہے نفس کی اور اس کو درست کرنے والی کی، پھر اس کے دل میں ڈال دیا اس کی نافرمانی اور اس کی پارسائی کو۔

معلوم ہوا کہ انسان میں فجور و تقویٰ دونوں کی صلاحیت رکھی گئی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ ہیں: (۱) ملکیت (۲) اور بہیمیت یعنی ایک تو نیکی اور پرہیز گاری والی ملکوتی صلاحیتیں جو انسان کو خیر کی طرف متوجہ کرتی اور خالق کی معرفت کا سبق دیتی ہیں اور دوسری بہیمی یعنی حیوانی صلاحیتیں جو انسان کو کھانے پینے، جنسی خواہشات کی تکمیل فسق و فجور اور برائی کی طرف لے جانے والی ہیں۔ اول الذکر قوت خدا پرستی، شرافت نفس، تقویٰ، احسان، عدل صبر و رضا، رحم وعفو، شکر، توکل، نرم دلی، رواداری، اخوت، شجاعت، سخاوت اور اس قسم کے فضائل کا منبع ہے اور ثانی الذکر قوت وحشت و بربریت، ہوس پرستی، کفر و طغیان، غرور سرکشی، عیش پرستی و عیش کوشی، غصب، ظلم، جلد بازی، بے صبری، لالچ، انتقام، شہوت زنی، سنگدلی، بزدلی، حسد، کینہ اور بغض و عناد جیسے رذائلِ اخلاق کا منبع ہے۔ انسانی وجود میں ہر وقت ان دونوں متخالف طاقتوں کے درمیان جنگ جاری رہتی ہے۔ نفس و شیطان انسان کو رذائل میں ملوث کرنا چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے رسول اپنی مقدس تعلیمات سے اسے رذائل اخلاق سے بچا کر اللہ تعالیٰ کا مطیع و منقاد بنانے کے لئے دنیا میں تشریف لائے۔ (حجۃ اللہ البالغہ ا، ۲۰ مطبع المکتبہ السلفیہ لاہور)

قرآن کریم نے نتیجہ بتلا دیا کہ

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ (الشمس: ۹،۱۰)

"وہ شخص فلاح پا گیا جس نے اپنے نفس کو پاک کیا اور وہ خائب و خاسر ہو گیا جس نے اسے گناہوں میں دبا دیا"۔

انبیاء علیہم السلام تزکیہ نفس ہی کے لئے تلاوت آیات یا تعلیم کتاب و حکمت کرتے ہیں۔ ان کا مقصود صرف یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی حقیقت کی معرفت حاصل کرے۔ اس وسیع و عریض اور حسین و جمیل کائنات پر غور کرے اور پھر آفاق و انفس میں پھیلی ہوئی بے شمار نشانیوں کے ذریعہ اپنے خالق و مالک کو پہچانے۔ اس کے اور صرف اسی کے آگے سر نیاز جھکائے۔ کسی سے ڈرے نہ کسی سے لالچ رکھے۔ یہ یقین پیدا کرے کہ اس زندگی کے بعد بھی ایک عالم میں جانا ہے جہاں ایک ایک عمل اور ایک ایک حرکت و سکون کا حساب دینا ہوگا۔ انسان انسان کے ساتھ نیک سلوک کرے۔ حقوق ادا کرے اور سب مل جل کر ایک صاف اور شائستہ معاشرے کی تشکیل کریں جو جبر و استبداد اور ظلم و استحصال سے خالی ہو۔ انسان صحیح معنوں میں اللہ کا نائب بنے اور

کے نظام کو اس کائنات میں برپا کرے۔

طریقِ تزکیہ

نظام تزکیہ کو کامیاب بنانے کے لیے انبیاء علیہم السلام آیات الٰہی کی تلاوت فرماتے اور تعلیم کتاب وحکمت دیتے رہے ہیں۔ ان چہارگانہ فرائض نبوت میں بنیادی اور مرکزی حیثیت ''تزکیہ'' ہی کو حاصل ہے۔ اس مسئلہ کو ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کریں، مثلاً ایک شخص نہایت خوش الحانی اور تجوید کے قوانین کی پابندی کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہے لیکن اس کا مقصود یہ ہے کہ لوگ اس کی قرأت وتلاوت سن کر محظوظ ہوں۔ اس کی عزت وتوقیر بڑھے اور اس کا نام روشن ہو تو یہ ممکن ہے کہ اس کو اس کا مقصود حاصل ہو جائے' لیکن چونکہ اس کی نیت میں کھوٹ ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کے لئے کوئی اجر نہیں ہے۔ اسی طرح کوئی شخص قرآن کریم کا درس دیتا ہے اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ معلمِ کتاب کا نبوی فریضہ نیابتاً انجام دے رہا ہے' لیکن اس کا مقصود یہ ہے کہ اس تعلیم سے وہ لوگوں پر اپنے علم وفضل کا رعب قائم کرے' دولت کمائے' شہرت حاصل کرے جیسا کہ ایک حدیث میں حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ لِيُجَارِيَ بِهِ الْعُلَمَآءَ اَوْلِيُمَارِيَ بِهِ السُّفَهَآءَ اَوْ يَصْرِفَ بِهٖ وُجُوْهَ النَّاسِ اِلَيْهِ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ النَّارَ (رواہ الترمذی ورواہ ابن ماجہ، بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح: ص ۳۴ طبع مجتبائی دہلی)

حضرت کعب بن مالکؓ سے روایت ہے' حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص علم اس لئے طلب کرے کہ اس کے ذریعہ علماء سے مقابلہ کرے یا جاہلوں سے مجادلہ یا لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے، ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ جہنم میں داخل کرے گا۔

اب دیکھ لیجئے طلب علم کتنی بڑی فضیلت کی شے ہے کہ فرشتے طالب علم کے قدموں تلے اپنے پر بچھاتے ہیں لیکن اگر مقصود درست نہ ہو تو وہی علم جہنم میں لے جانے والا ہے۔

الغرض تلاوت آیات ہو یا تعلیم کتاب وحکمت' ان تمام مقدس امور کے لئے ضروری ہے کہ انسان کی نیت درست ہو، اس کا نفس مزکی ہو اور وہ اخلاق اور صداقت شعاری کا پیکر ہو۔ معلوم ہوا کہ فرائض چہارگانہ (تلاوت آیات، تعلیم کتاب، تعلیم حکمت' تزکیہ) کی نیابتاً بجا آوری بھی تزکیہ نفس پر مبنی ہے۔ جسے ''اخلاص'' کا نام دیا جاتا ہے۔ آیت وَيُزَكِّيْهِمْ کی تفسیر کرتے ہوئے امام رازی نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ ''انسان دو ہی صورتوں میں کمال حاصل کر سکتا ہے یا تو وہ بذات خود حق کو پہچان لے اور پھر اس کے مطابق اپنے اعمال کی اصلاح کرے یا پھر خیر کی معرفت حاصل کرے تاکہ اس پر عمل پیرا ہو کر درجات کمال حاصل کرے۔ اگر کوئی

انسان ان دونوں چیزوں سے محروم ہے تو وہ رذائل اخلاق سے کبھی بھی رہائی نہیں حاصل کر سکتا۔ نہ اپنے عیوب ونقائص کو دور کر سکتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ اپنے طریق تزکیہ میں دو طرح کے اقدام فرماتے کبھی تو آپ بغیر تلاوتِ آیات و تعلیمِ کتاب وحکمت محض آخرت کی نعمتوں کے وعدوں اور عذاب کا خوف دلا کر وعظ وتذکیر فرماتے اور بار بار اس کا اعادہ کرتے ہیں تا کہ لوگ خود بخود مومن خالص اور مومن صالح بن جائیں۔ اس کیلئے آپ کا ذاتی اخلاق جسے قرآن نے "خلق عظیم" کے نام سے یاد کیا ہے بڑی حد تک مدد معاون بنتا اور دوسرے یہ کہ آپ اپنے فیضان صحبت سے تزکیہ فرماتے۔ اس وقت آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ حضور اکرم ﷺ کل قیامت کے دن ان کی مزکی ہونے کی شہادت دیں گے۔ (ملخصا الفخر الرازی، تفسیر کبیر ج ۴، ص ۷۴، ۷۵، طبع قاہرہ)

"وَ یُزَکِّیْھِم" کی تفسیر کرتے ہوئے علامہ آلوسی روح المعانی میں لکھتے ہیں۔

یُزَکِّیْھِمْ یُطَھِّرُھُمْ مِنْ اَرْجَاسِ الشِّرْکِ وَ اَنْجَاسِ الشَّکِّ وَقَاذُوْرَاتِ الْمَعَاصِی وَ ھُوَ اِشَارَۃٌ اِلَی التَّخْلِیَۃِ کَمَا اَنَّ التَّعْلِیْمَ اِشَارَۃٌ اِلَی التَّحْلِیَۃِ (علامہ آلوسی، روح المعانی ج ۱ ص ۳۸۷، طبع بیروت)

یُزَکِّیْھِم کا مطلب یہ ہے کہ آپ انہیں شرک کی بالیدگیوں اور شک کی آلودگیوں اور معاصی کی گندگیوں سے پاک کرتے ہیں اور یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ پہلے آپ دلوں کو خالی اور پاک کرتے ہیں، جس طرح تعلیم کتاب وحکمت سے اشارہ تحلیہ یعنی سجانے کی طرف ہے۔

علامہ آلوسی اسی مضمون کو ذرا وضاحت سے روح المعانی کی چوتھی جلد میں یوں بیان فرماتے ہیں۔

اَلتَّزْکِیَۃُ ھِیَ اَوَّلُ اَمْرٍ یَّحْصُلُ مِنْہُ صِفَۃٌ یَتَلَبَّسُ بِھَا الْمُؤْمِنُوْنَ وَ ھِیَ مِنْ قَبِیْلِ التَّخْلِیَۃِ الْمُقَدَّمَۃِ عَلَی التَّحْلِیَۃِ لِاَنَّ دَفْعَ الْمَفَاسِدِ اَوْلٰی مِنْ جَلْبِ الْمَصَالِحِ

(علامہ آلوسی، روح المعانی ج ۴ ص ۱۱۴ طبع بیروت)

تزکیہ، یہ پہلا مرحلہ ہے جس سے ایسی صفت حاصل ہوتی ہے جس سے کامل مومن متصف ہوتے ہیں، اور یہ تخلیہ پر مقدم ہوتی ہے اس لئے کہ برائیوں کا ازالہ کرنا بھلائیوں کے حصول سے بہتر ہے۔

ضروری یہ ہے کہ اس حقیقت کو ایک مثال سے واضح کر دیا جائے تا کہ عام لوگوں کی سمجھ میں تخلیہ اور تحلیہ کی حیثیت سمجھ میں آجائے۔ مثال کے طور پر یہ اطلاع ملے کہ فلاں دن فلاں دفتر میں بادشاہ تشریف لائیں گے۔ ضروری ہے کہ بادشاہ کی آمد سے پہلے دفتر کی صفائی، جس کمرے میں بادشاہ کو جلوہ افروز ہونا ہے اسے صاف ستھرا کیا جائے۔ خوشبو سے بسایا جائے۔ بیش بہا قیمت قالین بچھائے جائیں اور صفائی اور ستھرائی کے بعد جھنڈیاں؟ زنجیر اور دیگر سامان د آرائش لگایا جائے، تب بادشاہ آکر دفتر کے اس مخصوص کمرے میں جلوہ افروز ہوگا۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا کہ دفتر میں کوڑا کرکٹ بھرا ہوا ہو دیواروں پر جالے تنے ہوئے ہوں ہر کونے سے بدبو

کے بھبکے اٹھ رہے ہوں، دیواروں کی قلعی ماند پڑ چکی ہو اور صرف چند جھنڈیاں لگا دی جائیں۔ ایک بیش قیمت قالین بچھا دیا جائے اور اس کمرے میں بادشاہ کو لا کر بٹھا دیا جائے۔ احیاء العلوم میں ہے کہ مومن کا دل اللہ کا عرش ہے۔ (غزالی' احیاء العلوم '۳' ۶' قاہرہ ۱۹۶۷ء) مومن کا کمال یہ ہے کہ وہ اسے حقیقی معنوں میں رب جلیل کا عرش بنائے تاکہ اس میں رب جلیل جلوہ افروز ہو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے تخلیہ کیا جائے۔ یعنی دل سے کفر و شرک' معاصی اور رذائلِ اخلاق کو دور کیا جائے۔ جب دل ہر قسم کی آلائش سے پاک اور صاف ہو جاتا ہے تو اسے ''قلب مزکی'' (پاک دل) کہتے ہیں۔ اب اس کے تحلیہ یعنی سجانے کی ضرورت پیش آتی ہے تحلیہ کا یہ عمل اللہ کے ذکر اور ذکر کے انوار سے انجام پاتا ہے اسے علم و حکمت کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ فرائض چہارگانہ (تلاوتِ آیات' تعلیم کتاب' تعلیم حکمت اور تزکیہ نفوس) میں اولیت ''تزکیہ'' کو حاصل ہے۔

پاکیزگی قلب کے بغیر حج بھی درست نہیں

ہماری تصنیف ''سوز و سازِ رومیؒ '' میں حضرت بایزید بسطامیؒ کے پہلے حج کا واقعہ لکھا ہے کہ ان کو راستے میں ایک شیخ ملے اور انہوں نے کہا کہ اے بایزید تم نے کہاں کا ارادہ کیا ہے؟ آپؒ نے حج کے سفر کا بتلایا تو انہوں نے کہا کہ میرے گرد سات چکر کاٹ لو اور حج کا خرچہ مجھے دے دو ابھی تم حج کے قابل نہیں ہوئے کیونکہ دل کا گھر صاف نہ تھا۔ آپؒ نے وہ حج کی رقم اس شیخ کو دے دی جس سے ان کو بہت فائدہ ہوا۔ باقی اشعار میں بھی ایسے ہی اشارے موجود ہیں ۔

گفت عزمِ تو کجا اے بایزید ۔ رختِ غربت را کجا خواہی کشید (۲۱۶۔۲)

(اس نے کہا اے بایزید کہاں کا ارادہ کر کے آئے ہو۔ یہ سامان سفر کدھر کے لئے باندھا ہے۔)

خاکسارانِ جہاں را بہ حقارت منگر　توچہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

(اس دنیا کے خاکساروں کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھو' تمہیں کیا معلوم کہ اس گرد میں کوئی شاہ سوار ہو۔)

شبانِ وادیٔ ایمن گہے رسد بہ مراد　کہ چند سال بجاں خدمتِ شعیبؑ کند

(وادی ایمن کے گڈریے تبھی اپنی مراد کو پہنچتے ہیں۔ جب وہ دل و جاں سے کسی شعیبؑ کی خدمت کریں۔)

گرچہ از نیکاں نیم خود را بہ نیکاں بستہ ام　در ریاضِ آفرینش رشتۂ گلدستہ ام

(اگرچہ میں نیک نہیں لیکن خود کو نیکوں سے وابستہ کر لیا ہے۔ اس تخلیق کے باغ میں ہم ایک گلدستہ میں پیوست ہیں۔)

باب ۱۱

تصوف وصول الی اللہ کا طریق ہے

(تعلق باللہ کی وضاحت)

وصول الی اللہ

سالک کا غیرِ خدا سے انقطاع ہو جانا اور واصلِ حق ہو جانا وصول اِلی اللہ کہلاتا ہے، اور اس سے مراد سالک کا اعلیٰ مقام و مرتبہ تک پہنچنا ہے یعنی سالک کا قلب آئینہ ذات بن جائے اور سالک کی ذات سے ذاتِ حق کا ظہور ہو جائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث میں اسی طرف اشارہ دیا گیا کہ ولی اللہ کی پہچان یہ ہے کہ جب ان کو دیکھا جاتا ہے تو اللہ یاد آجاتا ہے "اِذَا رُؤُوْا ذُکِرَ اللّٰہُ"۔ (دیکھئے مکتوبِ ربانی دفتر دوم، مکتوب نمبر ۵۲)

سر دلبراں میں ہے کہ وصالِ حق سے مراد تعین جدائی کا واقع ہونا اور اپنی خودی کے وہم سے بیگانہ ہو جانا ہے۔ اس کو آشنائی حق بھی کہتے ہیں۔ مخلوقات میں سے ہر شے کو تعین کہتے ہیں اور جب تک تعین رفع نہیں ہوتا، وصول میسر نہیں ہوتا چنانچہ واصلِ حق عام مخلوق کی طرح نہیں رہتا اور مخلوق کے اثرات اس سے زائل ہو جاتے ہیں۔

دل کا غیر اللہ سے فارغ ہونا ذاتِ احدیت کی تجلی ہونے پر موقوف ہے

نفحات الانس از مولانا جامیؒ میں ہے کہ حضرت عبید اللہ احرارؒ نے فرمایا کہ غیرِ حق کی امیدوں اور آرزوؤں کے دل سے جدا ہونے اور غیر اللہ کی محبت سے خالی ہونے کی یہ دلیل ہے کہ سالک کا دل وصفِ احدیت کے ساتھ حق تعالیٰ کی تجلی کا مظہر بن گیا ہو یعنی اس کے دل پر اللہ تعالیٰ نے اپنی صفتِ احدیت کو ظاہر کر دیا ہو۔ حقائق کے علم کو پانا اللہ تعالیٰ کی اس تجلی کے بغیر مشکل ہے کیونکہ تجلّیات کے انوار کے عکس کو قبول کرنا اسی وقت ممکن ہے جب دل کی توجہ مخلوق کی رغبت سے ہٹا لے۔ آپ کی مراد یہ ہے کہ انوارِ الٰہیہ (جو صورتِ مثالیہ میں ظاہر ہوتے ہیں) کے عکس کی تصویر اس قلب پہ ظاہر ہوتی ہے جس میں غیر نہ رہتا ہو۔ مثال کے طور پر جس وقت پانی صاف ہوگا تو باہر کی تصویریں اس میں ظاہر ہوں گی لیکن گندے اور خاک آلود پانی میں عکس نمودار نہیں ہو سکتا۔ احدیت یکتائی کو کہتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ اپنی یکتائی کی صفت کا کوئی حصہ ظاہر فرماتا ہے تو اس وقت بندے کے دل میں اس عکس کے سوا کچھ نہیں رہتا۔

مذکورہ بالا قول میں غیر سے التفات نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ بطریق مزاحمت دل میں غیر کا شعور نہ رہے۔ یہ نہیں کہ مطلقاً شعور نہ رہے اور شعور بالکل ختم ہو جائے کیونکہ ایسا ہونا کبھی کبھی ہوتا ہے۔

عشق آں شعلہ است کو چوں بر فروخت　　ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت (۵۔۶۹)

(عشق وہ ہے کہ جب چمکنے لگتا ہے تو معشوق کو چھوڑ کر دوسری سب چیزوں کو جلا دیتا ہے۔)

حضرت عبید اللہ احرارؒ فرماتے ہیں کہ دل کا خالی ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفتِ احدیت کی تجلی دل پر فرمائے اور اللہ تعالیٰ ہی صفتِ احدیت کو اس پر ظاہر فرماتا ہے اور یہ اس وقت ہی ممکن ہے جب بندہ اللہ اور اس کے رسول اکرم ﷺ پر ایمان کو پختہ کر لے اور اتباع سنت کے بعد ذکر و اذکار کی مشقتوں کو خود پر لازم کر لے۔ ان چیزوں کے علاوہ جماعتِ اولیائے کرام کی صحبت کو اپنے اوپر لازم کر لے جن کے قلوب اس تجلی کے مظہر بن گئے ہوں۔ حضرت عبید اللہ احرارؒ فرماتے ہیں کہ اگر تو چاہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ کے ساتھ حضور کے مقام میں رہے اور شیطان کے مکر اور وسوسے سے آزاد رہے بلکہ تیرے حضور پر فرشتوں کو اطلاع نہ ہو حتیٰ کہ خود کو بھی اس کی خبر نہ ہو تو تُو اپنے لئے ایسے مرشد کی صحبت لازم کر لے جس کا دل اور ذات ذکر الٰہی میں مستغرق ہو گئی ہو اور وہ اپنے آپ سے رہائی پا چکا ہو۔ اگر یہ بات میسر نہ ہو، تو حضراتِ نقشبندیہ کا طریقۂ ذکر، توجہ اور جذبہ کو قبول کر کے خود کو پوری طرح ریاضت اور محنت تک پہنچا دے۔

تعلق باللہ میں خدا کی رضا مقدم رہتی ہے۔

جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ اہل اللہ کی بندگی خالصتاً اللہ کے لئے ہوتی ہے۔

لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ (البیّنۃ: ۵)

یہ کہ اللہ کی عبادت کریں اللہ تعالیٰ کے دین کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے۔

احادیث میں تعلق باللہ کے رکھنے والوں کی شان یوں بیان کی گئی ہے۔

خَشْيَةُ اللّٰهِ فِي السِّرِّ وَالْعَلَانِيَةِ (الحدیث)

کھلے اور چھپے کام میں اللہ کا خوف محسوس کرنا۔

اَنْ تَكُوْنَ بِمَا فِي يَدَيِ اللّٰهِ اَوْثَقَ بِمَا فِيْ يَدَيْكَ (احیاء العلوم)

اپنے ذرائع و وسائل کی بہ نسبت تیرا بھروسہ اللہ کی قدرت پر زیادہ ہو۔

مَنِ الْتَمَسَ رِضَا اللّٰهِ بِسَخَطِ النَّاسِ

جو آدمی اللہ کو راضی کرنے کے لئے لوگوں کو ناراض کر لے۔

اور اس کے بالکل برعکس حالت یہ ہے کہ آدمی لوگوں کو راضی کرنے کے لئے اللہ کی ناراضگی مول لے

"مَنِ الْتَمَسَ رَضِیَ النَّاسِ بِسَخَطِ اللّٰہِ"۔

احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر دنیا کو خدا کی رضا اور احکام کو بجا لانے کی خاطر ہاتھوں میں رکھا جائے تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ "الٰہی میرے دل کو دنیا کی محبت سے خالی کردے لیکن میرے ہاتھ دنیا سے خالی نہ رکھ" ایک حدیث شریف میں ہے کہ دنیا اور آخرت دو سوکنوں کی طرح ہیں اگر تو ایک کو راضی کرے گا تو دوسری ناراض ہو جائے گی۔ دنیا اور آخرت کی محبت ایک جگہ مجتمع نہیں ہو سکتی۔ علامہ اقبالؒ نے اس سلسلے میں بہت کلام کیا ہے۔ اگر آپ کے کلام کا مختصر حصہ بیان کیا جائے تو دوسو (۲۰۰) صفحات سے زائد کی ضخامت درکار ہوگی۔

یہ بندگی خدائی، وہ بندگی گدائی　یا بندۂ خدا بن، یا بندۂ زمانہ (ب۔ج:۳۴۶)

دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامانِ موت　فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم؟ (ب۔ج:۳۲۵)

بتوں سے تجھ کو امیدیں، خدا سے نومیدی　مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے!

کسے نہیں ہے تمنائے سروری، لیکن　خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے! (ب۔ج:۳۴۰)

وصول الی اللہ اور تعلق باللہ سے کیا مراد ہے؟

تعلق باللہ سے مراد یہ ہے کہ بندے کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا تعلق استوار ہو جائے جس میں عبد و معبود کے حقوق کی ادائیگی میں کسی قسم کی کجی، کمی اور منافقت کا شائبہ نہ رہے اور عبد اور معبود کے مابین مکمل محبت کا اظہار ہوتا رہے۔ یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ انسان کا تعلق یا تو ذاتِ الٰہی سے ہو سکتا ہے یا طاغوتی طاقتوں کے ساتھ استوار ہو سکتا ہے یعنی انسان صرف خیر کے ساتھ تعلق رکھے یا شر کے ساتھ۔ نیکی و بدی، ایمان و منافقت، محبت اور نفرت باہم ایک جگہ مجتمع نہیں کئے جا سکتے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے، وہ باطل کی تاریکی کو خیر باد کہہ دیتے ہیں اور صرف اللہ تعالیٰ کے ہی ہو کر رہتے ہیں۔ ایسے مطالب کی ترجمانی قرآن مجید کی درج ذیل آیت میں کی گئی ہے۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ۚ ... (الانعام: ۱۶۲، ۱۶۳)

"آپ فرما دیں بے شک میری نماز، میری قربانیاں، میری زندگی اور میری موت سب اللہ کے لئے ہے جو سارے جہاں کا رب ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے یہی حکم ہوا ہے"۔

تعلق باللہ میں جیسا کہ تعلق کے لفظ سے ظاہر ہوتا ہے، یہ مفہوم موجود ہے کہ انسان اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے سفر میں ہو یا حضر میں، بیماری ہو یا تندرستی، امارت ہو یا غربت غرضیکہ ہر حال میں اللہ کے ساتھ رابطہ قائم رکھے۔ لفظ رابطہ کی مفصل وضاحت ہماری تصنیف ''رابطہ شیخ'' میں جامع الفاظ میں بیان کر دی گئی۔ رابطے سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ انسان کسی امر پر ہمیشگی اختیار کرے اور کسی چیز کا دوسری چیز سے بندھ جانا ربط یا رابطہ کہلاتا ہے۔ چنانچہ دل کا کسی مطلوب (یعنی اللہ یا کسی ولی اللہ) کے ساتھ بندھے رہنے کو رابطہ کہتے ہیں۔ رابطہ قائم کرتے ہوئے انسان کو غیر اللہ کے تمام لشکروں سے اور نفس کو سرکشی سے حفاظت میں رکھنا مطلوب ہوتا ہے۔ اگر کسی انسان کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس طرح ربط یا تعلق قائم ہو جائے تو اس کا دل تمام گناہوں سے محفوظ رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ یا کسی کامل بزرگ کی طرف توجہ ہونے کے باعث روحانی قوت حاصل کر لیتا ہے۔

طریقت کی دنیا میں تعلق باللہ قائم کرنے کے لیے بہت سے طریقے وضع کیے گئے ہیں، اتباع شریعت اور سنتِ رسول ﷺ کو ملحوظ رکھنے سے بھی یہی مراد ہے کہ بندے کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ استوار ہو جائے۔ اگر ہم صرف نماز کی طرف ہی غور کریں تو معلوم ہوگا کہ نماز ایک واحد عبادت ہے جس میں ایک معمولی مسلمان بھی اللہ تعالیٰ سے ہمکلامی کا شرف حاصل کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ہمکلامی کوئی معمولی بات نہیں۔ اگر شخص حرمین شریفین کے امام سے مختصر ہمکلامی کا موقع پالیتا ہے تو وہ جہاں بھی جائے ہر جگہ پر بہت فخر کے ساتھ اس ملاقات کا لوگوں کے ساتھ اظہار کرتا ہے۔ جس شخص کی ہمکلامی خدا سے ہو جائے تو اس سے بڑی اور کوئی سعادت تصور نہیں کی جا سکتی۔ بات صرف یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ عبد اور معبود کے قرب کی حقیقت یہ ہے کہ نماز میں دو سجدوں کو وہ مقام حاصل ہے کہ انسان کی ہستی اللہ تعالیٰ کے انتہائی قرب میں جا پہنچتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ العلق آیت ۱۹ میں اس حقیقت کا کھلم کھلا اعلان کیا ہے کہ اگر تم میرا قرب چاہتے ہو تو سجدوں کے ذریعے حاصل کرو۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے خادم حضرت ربیعہؓ سے یہ ارشاد فرمایا کہ اگر تم جنت میں میرا ساتھ چاہتے ہو تو نماز اور سجدوں سے میری مدد کرو۔ (الحدیث) نماز کو مومن کی معراج قرار دیا گیا ہے۔ (الحدیث) کیونکہ وہ نمازی کو اللہ کے سامنے کر دیتی ہے۔

قرآن اور حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تمام عبادات کا مقصود اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کے ساتھ تعلق حاصل کرنا ہے۔ اتباع شریعت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے تعلق باللہ قائم ہوتا ہے مگر طریقت میں صرف اتباع شریعت پر ہی اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ کچھ ایسے مراسم اور طریقے اپنائے جاتے ہیں جن کے ذریعے ایک سالک تعلق باللہ کے عمل کے ذریعے اپنے آپ کو باکمال مقام پر پہنچا دیتا ہے۔ اس کتاب کا یہ حصہ اس عروج کو بیان کرنے کا متحمل نہیں البتہ اختصار کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ طریقت کے نظام میں ذکر، مراقبہ، مشاہدہ، محاسبہ، معائنہ اور تصورِ شیخ وغیرہ ایسے طریقے ہیں جن کی مدد سے ایک سالک کی راہنمائی اس کو

تصوف کی سر بہ فلک چوٹیوں پر پہنچادیتی ہے۔ ان حقائق پر غور کرنے کے بعد یہ معلوم ہوگا کہ تعلق باللہ کا شرف حاصل کرنے کے لئے طریقت کی مدد حاصل کرنے کی اشد ضرورت ہوتی ہے اور اس کے بغیر ایک انسان عبادات میں خواہ کس قدر انہماک حاصل کرلے اس مقصد میں کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔

طریقت میں تعلق باللہ کا مفہوم ادا کرنے کے لئے ایک متبادل لفظ جو عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے، وہ وصل الی اللہ یا واصل بالحق ہوجانا ہے۔ ہماری تصنیف ''رابطۂ شیخ'' میں وصول الی اللہ پر ایک مکمل باب تحریر کیا گیا ہے جس کے مضامین بہت محنت سے تیار کئے گئے ہیں اور قارئین کے ذوق اور طلب کی تشنگی کو کافی حد تک پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، لہٰذا وہ مضامین معمولی اضافے کے ساتھ اس کتاب میں بھی شامل کئے جارہے ہیں تا کہ یہ کتاب روحانیت کے ہر ممکن موضوع کی نمائندگی کرسکے۔

درج ذیل مضامین میں وصول ''وصل وفصل، واجب الوجود، اور ممکن الوجود کا وصال، آئین وصل اور وصول الی اللہ حاصل کرنے کے طریقوں پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے نظریہ وصل کے علاوہ ہجر اور وصل کی متضاد کیفیتوں کو کافی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جن کے مطالعہ کے بعد واصل باللہ ہونے کی راہیں کھلتی جائیں گی۔

وصل کے لفظی معنی ''ملانے'' کے ہیں اور یہ اسمِ عین (ذات) اور معنی دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اَلِاتِّصَالُ کے معنی اشیاء کے باہم اس طرح متحد ہوجانے کے ہیں جس طرح قطر دائرے کے دونوں طرفوں سے ملا ہوا ہوتا ہے۔ (المفردات)۔

وصال تعین کا اُٹھ جانا، ہستیٔ مجازی سے جدائی کا واقع ہوجانا اور اپنی خودی کے وہم سے بیگانہ ہوجانا وصالِ حق ہے (یعنی جو اپنی مجازی ہستی سے یا اپنے آپ سے الگ ہوجائے وہ اللہ کا وصال حاصل کرلیتا ہے) اور وہ شخص آشنائے حق ہوجاتا ہے۔

تو مباش اصلاً کمال این است و بس　　تو زتو گم شو وصال این است و بس

(تو اپنے آپ میں قطعاً نہ رہ، بس یہی کمال ہے تو اپنے آپ سے گم ہوجائے، بس وصال یہی ہے۔)

واصلِ حق بھی حق ہی کہلاتا ہے کیونکہ اگر کسی سے تعینات اٹھ جائیں تو وہ مخلوق نہیں رہتا بلکہ مخلوق کے اثرات اس سے زائل ہوجاتے ہیں۔ وصول، بندے کا آئینہ حق بن جانا اور اس سے ذات کا ظہور واقع ہونا وصول کہلاتا ہے۔ (سرِّ دلبراں)

اتصال، انسان کے اسرار باطنی کو نسیان (بھلا دینا) تک پہنچادے تو اسے اتصال کہتے ہیں۔ یعنی بندہ حق تعالیٰ کے سوا کسی کو موجود نہ پائے اور اس کا خیال صانع حقیقی کے سوا کسی اور کی طرف نہ ہو۔ یحییٰ بن معاذؒ فرماتے ہیں کہ تائب پر توبہ کا اور زاہد پر زہد کا اور مشتاق پر حال کا پردہ ہوتا ہے مگر واصل کو کوئی شے حق سے چھپا

نہیں سکتی۔

شیخ ابو سعید القرشیؒ کا ارشاد ہے کہ واصل وہ ہے جس کے پاس خدا خود پہنچے۔ وہ اس بات سے نہیں ڈرتا کہ وصل قطع ہو جائے گا۔ شیخ سباریؒ فرماتے ہیں کہ واصل وہ ہے جس کو خدا کا قرب حاصل ہو۔ حضرت رویمؒ نے فرمایا کہ واصلین وہ ہیں جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے جوڑ دیا ہو۔

اِنَّهٗ لَيُغَانُ عَلٰى قَلْبِيْ وَاِنِّيْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِي الْيَوْمِ مِائَةَ مَرَّةً (المشکوٰۃ) میرے دل پر البتہ بادل چھا جاتے ہیں یہاں تک کہ میں دن میں سو بار استغفار کرتا ہوں۔

آپ حق تعالیٰ سے درخواست کرتے تھے کہ حقیقت کے غلبے کے وقت وہ آپ کے دل پر پردہ ڈال دے کیونکہ وجودِ حق کے ساتھ باقی رہنا ناممکن ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے چہرے کو منکشف کر دے تو اس کے انوار ہر چیز کو جلا دیں گے۔ استغفار کے معنی ''پردے'' کے ہیں۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ کو جب وصالِ باری کے جلوؤں کی تابانی زیادہ دیر کے لئے میسر ہوتی تو اس کا برداشت کرنا بہت مشکل امر ہو جاتا۔

رسالہ قشیریہ میں ایک شخص کا واقعہ حضرت منصور مغربیؒ نے روایت کیا ہے کہ ایک شخص کسی درویش کی خدمت میں مصروف تھا، اس کے پاس سے اس کی چچا زاد بہن گزری وہ اس کے دامن کے جلوے کو دیکھ کر بیہوش ہو گیا۔ اس درویش کو جب اس قصے کا علم ہوا تو لڑکی کے خیمے میں گیا اور اس نوجوان کی سفارش کی کہ وہ لڑکی اس پر رحم کرے۔ اس لڑکی نے جواب دیا کہ یہ شخص تو میرے دامن کی غبار کی تاب نہیں لا سکا تو میری محبت کی تاب کیسے لائے گا۔ جلوؤں کو برداشت کرنا ہر شخص کی ہمت کے مطابق ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی انوار کی تاب نہ لا سکے جبکہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو معراج کے موقع پر دیکھا اور آنکھ نہ جھپکی۔

وصول کسے کہتے ہیں؟

امداد السلوک میں ہے کہ وصول اس بات کا نام ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندہ کے قلب پر اپنے نور سے نظر فرمائے اور یہ نور جب بندہ پر غلبہ پالیتا ہے تو بندہ حق تعالیٰ سے جدا نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ بھی حق تعالیٰ کی صفتوں میں سے ایک ہے بندہ اس کو نورِ الٰہی کی طاقت سے دیکھتا ہے۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ کی صفات سے بعینہٖ متصف ہونا بشر کی طاقت سے بالکل باہر ہے۔ پس وصال کے معنی بجز اس کے کچھ نہیں کہ دنیا میں سِرّ اور قلب سے مشاہدہ ہو اور آخرت میں آنکھ سے اور یہ جو وصال کے معنی بعض نے سمجھ لیے کہ بندے کی ذات حق تعالیٰ سے متصل ہو جائے تو یہ زندقہ والحاد ہے۔ حق تعالیٰ اس اتصال سے بہت بالاتر ہے۔ آخرت کی رؤیت بھی بلا کیف ہو گی جیسا کہ دنیا کی توحید و معرفت اور علم و ایمان بلا کیف ہیں۔ جب تک دنیا میں کسی کا ایمان کتاب و

سنت اور اجماعِ امت کے موافق نہ ہوگا۔ اس وقت تک اسے آخرت میں خسارے کے سوا کچھ نہ ملے گا۔

کتاب اللمع میں ایک بزرگ کا قول نقل کیا گیا ہے کہ وصل کی حقیقت "عقل کا رخصت ہونا" ہے۔ اسی کتاب میں ہے کہ وصل کا مفہوم غائب سے لاحق یا مل جانا ہوتا ہے۔ یحییٰ بن معاذؒ فرماتے ہیں کہ جس کسی نے جب تک عرش کے نیچے کی اشیاء سے آنکھیں بند نہ کی ہوں وہ عرش کے اوپر جو کچھ موجود ہے، وہاں تک نہیں پہنچ سکتا، یعنی اس نے خالقِ عرش کے وصل تک رسائی حاصل نہ کی۔ وصل کے اصولوں کو ضائع کرنے کے باعث کسی کو وصل نصیب نہیں ہوا۔ طریق رابطہ میں بھی ذاتی غرض یا ذاتی مفاد کی صورتوں کا دخل نہ ہو تو اسی وقت مقصود سے رابطہ قائم ہوگا اور ایسے شخص کو ہی طریقت کی راہ پر استقامت حاصل ہوگی۔

علامہ اقبالؒ نے "وصال" کے لفظ کو "اپنے محبوب سے ملاقات یا وصل" کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ آئندہ صفحات میں علامہ اقبالؒ کے درجِ ذیل مصرع کی وضاحت آئینِ وصل میں کردی جائے گی ہے۔

ع ذرّہ ہا صحراست از آئینِ وصل (ا۔خ:۴۱)

(وصل سے بہت سے ذرے صحرا بن جاتے ہیں۔)

وصل و فصل

وصل و فصل سے مراد دو آدمیوں یا دو گروہوں کی مصالحت اور نزاع (یعنی انہیں ملانے اور جدا کرنے) کے ہیں۔ علامہ اقبالؒ حکومت الٰہی کو واضح کرنے کے لئے فرماتے ہیں کہ بندۂ حق مردِ آزاد ہے۔ اس کی رسم و راہ، دین و آئین، خوب و ناخوب اور تلخ و شیریں وغیرہ سب اللہ کے احکام کے مطابق ہیں۔ انسان معمول کے مطابق اس دنیا میں اپنا فائدہ ہی دیکھتا ہے لیکن حق تعالیٰ کی وحی سب کا فائدہ پیش نظر رکھتی ہے۔ وحی کے احکام صلح و جنگ میں عدل پر مبنی ہیں۔ وہ دوست اور دشمن میں امتیاز نہیں کرتی اور مردِ حق کو کسی سے خوف نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کی حکومت کے علاوہ اور کسی کی حکومت ہو تو اس میں طاقتور کمزور پر مسلط ہو جاتا ہے اور وہ جبری قانون نافذ کرتا ہے۔ خدائی حکومت نیک و بد اور اچھے و برے میں فرق پیدا کرتی ہے جبکہ کفر کی حکومت میں زود گیر شاہین، ممولوں کو اپنے امورِ حکومت میں مشیر بناتا ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

عادل اندر صلح و ہم اندر مصاف وصل و فصلش لا یُراعی لا یَخاف (ج۔ن:۶۵۹)

(احکامِ وحی صلح و جنگ دونوں میں عدل پر مبنی ہیں، وہ دوستی اور دشمنی دونوں میں نہ کسی کی رعایت کرتے ہیں اور نہ کسی سے ڈرتے ہیں۔)

واجب الوجود اور ممکن الوجود کا وصال (خدا اور بندے کا وصال)

زبورِ عجم کے حصہ گلشنِ رازِ جدید میں سوال و جواب کی صورت میں اس مضمون پر تفصیلی کلام کیا گیا ہے۔

درج ذیل شعر میں یہ سوال موجود ہے کہ ممکن الوجود (یعنی انسان) اور واجب الوجود (یعنی ذات باری تعالیٰ) کا باہم وصال کیسے ہوسکتا ہے اور قرب وبعد اور بیش وکم کی حقیقت کیا ہے؟ اس سے خدا اور بندے کے درمیان رابطہ، ارتباط، تلازم باہمی، ایک دوسرے کی معیت یا اتصال کا لزوم مراد ہے نہ کہ ملاقات اور وصل۔ وہ شعر حسبِ ذیل ہے۔

وصالِ ممکن و واجب بہم چیست؟ حدیثِ قُرب وبعدوبیش وکم چیست؟ (ز۔ع:۶: ۵۴۶)

(ممکن (کائنات) اور واجب (ذاتِ باری تعالیٰ) کا باہم وصال کیسے ہے؟ قُرب و بُعد اور بیش وکم کی حقیقت کیا ہے؟)

اس سوال کے جواب میں علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ اس کائنات کے تین ابعاد (Diamensions) ہیں اور چوتھا بعد وقت یعنی زمان ہے۔ خرد (عقل) سے اس دنیا کے بیش وکم کو معلوم کیا جاسکتا ہے۔ اس دنیا کے معیار کے مطابق عقل ان ابعاد سے کام لیتی ہے۔ اس کے زمان اور مکان دونوں اضافی ہیں۔ اس دنیا کے زمین وآسمان بھی اعتباری ہیں۔ مثلاً جہاں ہماری نظر رک گئی، وہ ہمارے لئے آسمان ہے۔ اس کائنات میں مطلق ذات کو ڈھونڈنا نہیں چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی چیز مطلق نہیں یعنی اللہ تعالیٰ خود قائم ہے اور باقی سب چیزیں اس کی وجہ سے قائم ہیں۔ کائنات کا کنارا اس کے اندر ہی ہے کیونکہ یہ محدود ہے۔ اللہ تعالیٰ کائنات کو ہردم وسعت دے رہے ہیں۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ ہماری عقل صرف اس دنیا کی باتوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ خرد یعنی عقل ابد کو نہیں سمجھ سکتی۔ عقل صرف چھلکے کو دیکھتی ہے، مغز کو نہیں جانتی۔ ہم نے ماہ وسال کا تعیّن اس دنیا کے مطابق کیا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وقت ایک بسیط آنِ واحد ہے۔ وہ ماضی، حال اور مستقبل میں منقسم نہیں ہوتا۔ سورۃ الاحقاف آیت ۳۵ میں ہے'' کہ اس دنیا میں گزاری جانے والی طویل عمر اللہ کے ہاں جانے کے بعد محض ایک آن یا لحہ کی طرح محسوس کی جائے گی۔'' علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ اگر وصالِ الٰہی مطلوب ہے تو اپنے آپ تک پہنچ جاؤ۔ باہر کے ہنگامے چھوڑ دو اور اپنے ضمیر کے اندر اتر جاؤ۔ تن اور جان اگرچہ دو چیزیں ہیں، مگر ان کو الگ سمجھنا حرام ہے۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ فرنگ نے جب بدن کو روح سے الگ سمجھا تو انہوں نے مذہب اور حکومت کو بھی الگ کردیا حالانکہ اسلام میں ایسا کرنا درست نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت مکروفن میں لگ گئی اور تن بے جان ہوگیا۔ علامہ اقبالؒ مسلمانوں کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ عقل کو دل کے ساتھ لے کر سفر حیات طے کریں۔ اگر مسلمان ترک قوم کی طرح فرنگ کی تقلید کرنے لگے تو وہ اپنے دین سے دور ہو جائیں گے۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ انسان جس کائنات کو دیکھتا ہے، وہ تو محض ایک مشت خاک ہے۔ فلاسفر مردہ

بدن کی آرائش میں مصروف ہیں۔ ان کے پاس دمِ عیسیٰؑ اور یدِ بیضا جیسی کوئی چیز موجود نہیں۔ دانشِ فرنگ حکمت سے خالی ہے۔ پیچ و تاب کھانے والی اس (متغیر) کائنات پر انحصار کرنا درست نہیں، بلکہ انسان کو اپنے من میں ڈوب کر سراغِ زندگی پانے کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ انسان عالم جزوی ہوتے ہوئے پوری کائنات سے اکبر ہے۔ عقل نے جو ایجاد کیا ہے، اس کو بھی سمجھنا ضروری ہے مگر اس میں ہی گم نہیں ہو جانا چاہیئے بلکہ اپنے اندر سفر جاری رکھنا چاہیئے۔ عقل کی مدد سے اس جہان چون و چرا کو اپنے تصرف میں لاؤ اور اس دنیا کی گرفتاری سے نکل کر اپنے مقام کو جو اس کائنات سے باہر ہے، تلاش کرو اور ایسے جہان کی طرف توجہ کرو جو سمت اور جہت یا زمان و مکان سے آزاد ہے۔

اس تمام گفتگو سے علامہؒ کی مراد یہ ہے کہ مادی دنیا کی طرف صرف اتنی توجہ دینا ضروری ہے جس سے نظام حکومت اور کاروبارِ حیات چلتا رہے۔ حقیقی توجہ اللہ کی طرف مرکوز ہونا ایک مسلمان کے لئے زیادہ اہم ہے۔ اگر کوئی اس طرح زندگی ڈھال سکے تو بندہ واصل باللہ ہو جاتا ہے۔ اختصار کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ کا متعلقہ کلام یہاں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

آئینِ وصل

آئین کا لفظ اسم ہے۔ اس کے معنی طرز، اصول یا ہر قسم کی تنظیم ظاہر کرنے کے ہیں اور اس سے مراد ادائیں، آئینِ قدرت یا تقدیر بھی لئے جاتے ہیں جیسے علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے ؎

ع کارہا پابند آئیں بود شد

(بہت سے کام ایک آئین کے پابند تھے، اس لئے ایسا ہوا)

وصل کے معنی پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ آئینِ وصل، مرکب ناقص ہے جس کے معنی میں اس اصول کا ہونا لیا جاتا ہے، جو قدرت نے سمندر کے قطرے کا بھاپ بن کر اڑنے، بادل کی شکل میں برسنے اور اپنی اصل (یعنی سمندر) سے مل جانے کے ہیں۔ ایسا ہی اصول ذرّوں کے لئے بنایا ہے جنہیں ہوائیں اور آندھیاں اڑا کر لے جاتی ہیں اور وہ مل کر ریت کا میدان بن جاتے ہیں۔ اسی طرح حالات انسانوں کو ایک دوسرے سے ملنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور مختلف طبیعتوں کے انسان مل بیٹھتے ہیں۔ روحوں کے ملنے کا بھی آئین ہے۔ کچھ روحیں پہلے عالم ارواح میں مل کر بیٹھتی ہیں تو اس دنیا میں بھی ان کا ملاپ ہو جاتا ہے۔ اسی لئے کبھی کسی سے پہلی ملاقات پر ہی محسوس ہوتا ہے کہ ہم پہلے بھی مل چکے ہیں۔ یہ روحوں کے اتصال کے باعث ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ روحوں کا ایک دوسرے سے فیض لینا مقدر میں لکھا جا چکا ہے، لہٰذا کسی نہ کسی بہانے وہ ایک دوسرے سے فیض لینے کے لئے باہم مل جاتی ہیں۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ جو کائنات کو مسخر کرتا ہے،

وہ پہلے خود کسی آئین کا پابند بنتا ہے۔ (مراد اس آئین سے آئینِ اسلام ہے) ہوا پھول کے قید خانے میں رہ کر خوشبو بن جاتی ہے اور خوشبو قید ہو کر آہو کا نافہ بن جاتی ہے۔ ستارے اسی قانون میں رہ کر اپنی منزلیں طے کرتے ہیں۔ گلِ لالہ ہمیشہ جلتا رہتا ہے۔ سبزہ قانونِ قدرت کی پابندی سے اُگتا ہے۔ جب قطرے اور ذرّے اس وصل کے قانون کی پابندی کرتے ہیں تو قطرے سے سمندر اور ذرّے سے صحرا بن جاتے ہیں۔

باطنِ ہر شے ز آئینے قوی تو چرا غافل زایں ساماں روی (ا۔خ:۴۱)

(ہر شے کی حقیقی پختگی آئین سے ہے تو کیوں اس سامان سے بے خبر جا رہا ہے۔)

آئینِ وصل کے اصولوں کے مطابق سالک کے لئے لازم ہے کہ وہ آئین اسلام پر عمل پیرا ہونے کی نیت سے کسی مردِ حق پرست کے ساتھ رابطہ قائم کرے تا کہ اس آئین کے تحت وہ واصل باللہ ہو سکے۔

خدا کے جلوے ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں

سورۃ البقرہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ تم جدھر بھی رخ کرو گے، وہیں ذاتِ خداوندی موجود ہے۔ اگر اس بات پر یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے تو اس کے پا لینے میں کچھ مشکل محسوس نہیں ہوتی۔ اگر اللہ تعالیٰ کے جلوے ہر سمت موجود ہوں تو وصلِ الٰہی میں کون سی چیز مانع ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ کے جلووں کا ہر جگہ موجود ہونا درج ذیل آیت کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات سے ثابت ہوتا ہے۔

فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ (البقرہ:۱۱۵) سو جدھر بھی تم رُخ کرو، وہیں ذاتِ خداوندی ہے۔

اللہ تعالیٰ نور ہے، زمین اور آسمانوں کا (النور:۳۵) زمین اور آسمانوں کے درمیان ہر طرف اللہ کا نور پھیلا ہوا ہے اور عقل بھی ایک نور ہے، لہٰذا کوئی جتنا اللہ تعالیٰ کے قریب ہوگا، اتنا ہی اس کے نور میں اور نورِ عقل میں اضافہ ہوگا۔ انسان اگرچہ خاکی ہے اور اس کے بدن کی تکمیل انہی اربعہ عناصر سے ہوئی ہے، مگر کسی شخص میں موجود کمالات کا مدار اس کے بدن کے جوہر یعنی روح کی کیفیت پر ہوتا ہے۔ اگر انسان کی روح پر سوز نہیں تو اس کی شاخِ افکار میں اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے نم حاصل کرنے کی استطاعت دوسرے باکمال لوگوں کی استطاعت سے مختلف ہوگی یعنی ہر شخص انجذابِ قلبی کے مطابق اللہ تعالیٰ کے نور سے استفادہ کرتا ہے۔

سالکِ راہِ خدا کے لئے ضروری ہے کہ دنیوی غموں اور مادی محاصل سے دور ہٹ کر ذکرِ الٰہی میں مشغول رہے تا کہ واصل باللہ ہونے کی سعادت حاصل کر لے۔ اس راہ میں مردِ کامل سے اعانت حاصل کرنا مقصود کے حصول کے لئے کیمیاء ہے۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا حضورِ قلب دِلوں کا شعار ہے۔

اگر خاکِ تو از جاں محرمے نیست بشاخِ تو ہم از نیساں نمے نیست

(اگر تیرا خاکی بدن جان کا محرم نہیں تو تیری شاخِ افکار ابرِ رحمت سے نم دار نہیں ہوگی۔)

زغم آزاد شو، دم را نگہ دار	کہ اندر سینۂ پُر دَم غمے نیست (ا۔ح:۹۹۶)

(غموں سے نجات پاؤ اور اپنی سانسوں پر نگاہ رکھو کیونکہ حوصلہ مند سینے میں غم نہیں رہ سکتا۔)

دَم سے مراد یہاں روح ہے یا ذکر سے لبریز سانسیں ہیں۔ ان سانسوں کو ذکر سے آباد کرنے کے لئے کسی مردِ کامل کی صحبت درکار ہے۔ علامہ فرماتے ہیں۔

ندانی تا نہ باشی محرمِ مرد	کہ دلہا زندہ گردد از دَمِ مرد (ا۔ح:1018)

(کسی کامل کی صحبت کے بغیر تو یہ نہیں جان سکتا کہ دل ان کے دم سے زندہ ہوتے ہیں۔)

علامہ اقبالؒ اسرارِ خودی میں فرماتے ہیں کہ شمس تبریزؒ کی برقِ نگاہ جونہی مولانا رومؒ کے دل پر پڑی، اسی لمحے مولانا کے دل کو اپنی لپیٹ میں لے کر ایک عجیب انقلاب پیدا کر دیا۔

بر زمیں برقِ نگاہِ اُوفتاد	خاک از سوزِ دمِ اُو شعلہ زاد (ا۔خ:٦٧)

(شمس تبریزیؒ کی برق نگاہ ان کے دل کی زمین پر پڑی تو ان کی خاک آپ کے سوز سے شعلہ بن گئی۔)

وصلِ الٰہی کا حاصل کرنا صرف زندہ دلوں کا شعار ہے۔ انسان کا دل جب نفس کی صحبت اختیار کرے تو وہ غفلت میں گرفتار ہو جاتا ہے لیکن اگر اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے اور بزرگوں کی صحبت سے اپنے من کی دنیا کو تخلیق کر لیتا ہے تو وہ دل بیدار ہو جاتا ہے۔ اگر سالک اپنے لئے تن کی محکومی (نفس کی اتباع کرنے سے) اختیار کر لے تو دل مردہ ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے وصل کی استطاعت کھو بیٹھتا ہے۔

دلے چوں صحبتِ گلِ می پذیرد!	ہماں دم لذتِ خوابش بگیرد!

(جب دل مٹی (بدن) کی صحبت اختیار کر لیتا ہے، تو اُسی وقت اسے نیند کی لذت آ لیتی ہے۔)

شود بیدار چوں "من" آفریند	چو "من" محکوم تن گردد بمیرد (ا۔ح:۱۰۰۴)

(جب دل من کو پیدا کرے تو بیدار ہوتا ہے، جب من بدن کا غلام ہو تو مر جاتا ہے۔)

ایک حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ جب تک انسان کا دل خدا کے ذکر سے آباد رہتا ہے تو وہ دل زندہ ہوتا ہے اور جس دل میں ذکرِ خدا سے غفلت ہو تو وہ دل مردہ ہو جاتا ہے اور شیطان ایسے دل میں اپنی چونچ مسلط کر دیتا ہے اور طرح طرح کے وسوسے پیدا کرتا ہے۔ علامہؒ نے فرمایا۔

دلِ بیدار فاروقی دلِ بیدار کرّاری	مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری
دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک	نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری!
مشامِ تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشان اس کا	ظن و تخمیں سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری!

(ب۔ج:۳۲۹)

یہاں آہوئے تاتاری کے ہاتھ میں آنے سے مراد دل کو خدا کے جلووں کے لئے قابو کرنا ہے۔ ایک اور

مقام پر فرماتے ہیں کہ خرد جب ذوق وشوق سے ذکر اور فکر کی مشقت اختیار کرلے تو اس کے سوز سے وہ دل کا مقام حاصل کر لیتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ دل اسی ذوقِ تپش سے دل بنتا ہے اور جونہی وہ اس تپش سے محروم ہو جائے تو مٹی بن جاتا ہے۔

چہ می پرسی میانِ سینہء دل چیست؟ خرد چوں سوز پیدا کرد دل شد
(کیا پوچھتے ہو کہ سینے میں دل کیا ہے؟ خرد نے جب سوز پیدا کیا تو وہ دل بن گیا)
دل از ذوقِ تپش دل بود لیکن چو یک دم از تپش افتاد گلِ شد (پ۔م:۲۰۷)
(دل سوزِ عشق کی بدولت دل تھا ورنہ جب ذرا اس سے خالی ہوا تو مٹی ہو گیا۔)

اپنے سینوں کو خدا کی یاد سے معمور کرنے والے ہی واصل باللہ ہوتے ہیں

انسان اللہ کو تلاش کرنے کے لئے نکلتا ہے تو بالآخر اس کو اپنی منزل اپنے سینے کے اندر ہی ملتی ہے جہاں وہ خدا کو پالیتا ہے۔ صوفیائے کرام کا قول ہے کہ تو دور دراز کا سفر کیوں طے کرنے پر تلا ہوا ہے، خدا تو تیرے اندر ہی موجود ہے۔ حضرت بلھے شاہؒ نے بھی بہت مزے کی بات کی ہے، چند اشعار پیش نظر ہیں۔

ایہہ تلکن بازی ویہڑا اے تھم تھم کے ٹرو اندھیرا اے
وڑ اندر ویکھو کیہڑا اے اینویں خلقت باہر ڈھونڈیندی اے
منہ آئی بات نہ رہندی اے

جس پایا بھیت قلندر دا اس کھوجیا راہ اپنے اندر دا
او واسی اے سکھ مندر دا جتھے کوئی نہ چڑھدی لہندی اے
منہ آئی بات نہ رہندی اے

بلھیا رب اساں توں وکھ نئیں بن رب توں دوجا ککھ نئیں
پر ویکھن والی اکھ نئیں تائیوں جان جدائی سہندی اے
منہ آئی بات نہ رہندی اے

ایک اور مقام پر حضرت بلھے شاہؒ، جمالِ الٰہی کا دیدار کرنے کے بارے میں فرماتے ہیں۔

ہادی مینوں سبق پڑھایا اُوتھے غیر نہ آیا جایا
مطلق ذات جمال دکھایا وحدت پایا شور نی
میں ہو گئی ھن کجھ ہور نی

اوّل ہو کے لا مکانی ظاہر باطن وسدا جانی

رہیا نہ .. میرا نام نشانی مٹ گیا جھگڑا شور نی
میں ہو گئی ھن کجھ ہور نی

حاجی لوک مکے نوں جاندے اساں جاناں تخت ہزارے جت ول یار اُت ول کعبہ، بھادیں دیکھ کتاباں چارے
حاجی لوک مکے ول جاندے، میرے گھر وچ نوسو مکہ وچے حاجی، وچے گا جی، وچے چور اُچکا

مندرجہ بالا اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جلوے انسان کے دل میں ہی موجود ہیں اور اس کے انوار ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں، مگر انسان خود ہی ان جلوؤں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ متوجہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ اگر انسان اللہ تعالیٰ کے احکامات پر عمل پیرا ہوتے ہوئے ذکر اور فکر سے اپنی استطاعتِ دیدارِ الٰہی کو بیدار کر لے تو پھر اللہ تعالیٰ کے اسرار اور انوار کو دیکھنا اور وصلِ الٰہی حاصل کر لینا کوئی بڑی بات نہیں۔

کسی پنجابی شاعر نے بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان پوری عمر تلاشِ الٰہی میں سرگرداں رہتا ہے، حالانکہ دوستِ حقیقی تو اپنے ہی دل میں رہتا ہے۔

جند مکدیاں مکدیاں مک گئی اے پینڈا یار دے در دا نئیں مکدا
یار دل دے اندر وسدا اے سفر اپنے ہی گھر دا نئیں مکدا(x)

وصلِ الٰہی پر علامہ اقبالؒ کے نظریات

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی طرف مشغول رہنے کے لئے ہی تخلیق فرمایا ہے اور اس غایتِ تخلیق کو ہماری تصنیف ''حضورِ قلب'' اور ''رابطۂ شیخ'' میں بہت تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ ان دونوں کتابوں کا مطالعہ زیرِ بحث موضوع کے فہم کے لئے کافی مددگار ہوگا۔ ان دونوں کتابوں کی چند ایک تحریروں کو اس کتاب میں بھی سرسری تعارف کی غایت سے پیش کیا گیا ہے۔ مذکورہ کتابوں میں علامہ اقبالؒ کے نظریات خاصی تفصیل کے ساتھ شامل کئے گئے ہیں جن میں سے چند نکات کی طرف نیچے اشارہ کیا گیا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے:

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا، اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔
(اصفہانی، حلیۃ الاولیاء، ۱۰:۲۰۸)

حدیث پر بہت کلام کیا ہے اور فرمایا ہے کہ انسان کا اصل جوہر اس کی روح ہے اور روح کا دارومدار اس کی اپنی پہچان پر ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں راقم الحروف نے ایک باب مَنْ اَنَا (اپنی پہچان) کے عنوان سے شامل کیا ہے۔ جس میں علامہ کا بہت سا کلام شامل کر دیا گیا ہے۔ یہ حقیقت نہایت واضح ہے کہ اپنی پہچان کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو خدا اسی حالت میں تسلیم کر سکتا ہے جب وہ خود کو بندہ سمجھ لے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہر انسان خود کو نہ صرف خدا ہی سمجھتا ہے بلکہ لاشعوری طور پر خود کو خدا سے بہتر سمجھتا ہے ''حسنِ نماز'' میں

اس بات پر گفتگو ہو چکی ہے کہ اکثر لوگ خدا کے لئے جب کوئی چیز دیتے ہیں تو گھٹیا چیز دیا کرتے ہیں اور اچھی چیز کو اپنے استعمال میں لاتے ہیں (جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم خود کو خدا سے بہتر تصور کرتے ہیں) عرفانِ خویش کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ نے ایک نیا فلسفہ ''فلسفۂ خودی'' کے نام سے جاری کیا ہے جس پر بہت سی کتابیں بھی تحریر ہو چکی ہیں (راقم الحروف نے بھی ایک کتاب ''عقل و عشق اور فلسفۂ خودی'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو انشاء اللہ عنقریب ہی شائع ہونے والی ہے۔)

خدا کی پہچان اور خدا تک رسائی کے لئے علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ اگر انسان خدا کو تلاش کرے تو وہ اپنے سوا کسی اور کو نہ پائے گا اور اگر ہم اپنے آپ کو تلاش کرنے کے لئے نکلیں تو خدا کے سوا کسی اور کو نہیں پاتے۔ آپ فرماتے ہیں۔

کرا جوئی، چرا در پیچ و تابی ۔ کہ اُو پیدا ست تو زیرِ نقابی
(کس کو ڈھونڈتے ہو، کس چکر میں پڑے ہوئے ہو، سمجھو کہ خدا تو ظاہر ہے مگر تو خود پردے میں ہے۔)

تلاشِ اُو کنی جز خود نہ بینی تلاشِ خود کنی جز اُو نیابی (پ۔م:۲۲۲)
(اس کی تلاش کرو گے تو اپنے سوا کچھ نہ پاؤ گے اور اگر اپنی تلاش کرو گے تو سوائے اللہ کے کچھ نہ پاؤ گے)

علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ اگر خدا کو پانا چاہتے ہو تو پہلے اپنا دیدار کر لو کیونکہ اس کے بغیر زندگی بھی موت کے مترادف ہے۔ فرماتے ہیں کہ جب تک کوئی اپنا نظارہ نہیں کرتا، وہ خدا سے قرب بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ تجلیاتِ کلیم، مشاہداتِ حکیم، اور تجلیاتِ الٰہیہ اور نظر در ذاتِ الٰہی پر بھی علامہ نے کافی کلام کیا ہے۔ آپ نے اس حقیقت سے بھی پردہ اُٹھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کرنے کے لئے اور مشاہدۂ حق کے لئے قلبی بصیرت کی ضرورت ہے اور ہر شخص کو حقیقتِ محمدیہ ﷺ کے ذریعے وصلِ الٰہی ملتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے کلام سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں، زمینوں میں وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں
حقیقت اپنی آنکھوں پر نمایاں جب ہوئی اپنی مکاں نکلا ہمارے خانۂ دل کے مکینوں میں
(ب۔د:۱۰۳)

تو اے اسیرِ مکاں، لامکاں سے دور نہیں وہ جلوہ گاہ ترے خاکدان سے دور نہیں
(ب۔ج:۳۴۲)

مرے دیدار کی ہے اک یہی شرط کہ تو پنہاں نہ ہو اپنی نظر سے (ا۔ح:۶۶۰)
ہستیِ مسلم تجلی گاہ او طورہا بالد زگردِ راہِ اُو (ا۔خ:۲۱)
(مسلمان کا وجود حضور اکرم ﷺ کے نزول کی جگہ ہے، آپؐ کی گردِ راہ سے کئی طور پیدا ہوتے ہیں۔)

چناں در جلوہ گاہِ یار می سوز عیاں خود را نہاں اورا بر افروز

(یار کی جلوہ گاہ میں اس طرح جل جا کہ ظاہر میں تو چمک اُٹھے اور باطن میں اس کی چمک نظر آئے)

چناں با ذاتِ حق خلوت گزینی ترا اُو بیند و اُو را تو بینی (ز۔ع:۵۵۹)

(ذاتِ حق سے اس طرح خلوت حاصل کر کہ وہ تجھے دیکھے اور تو اُسے دیکھے)

راقم الحروف کی مذکورہ بالا دونوں کتابوں میں اس قدر مضامین بیان ہو چکے ہیں کہ یہاں مزید لکھنے کی ضرورت نہیں، البتہ اس کے مضامین تکمیلِ بیان کے لئے اس باب میں بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔

مشاہدۂ حق سے مراد

حضرت عبید اللہ احرارؒ فرماتے ہیں کہ مشاہدۂ حق کا مطلب یہ نہیں کہ حق تعالیٰ کو حسِ بصر سے دیکھا جائے یا کسی حس سے معلوم کر لیا جائے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب دل کا حضور حقیقتِ ذکر کے ساتھ یعنی مذکور میں گم ہو جائے (جو کہ حرف اور آواز سے پاک ہے) اور اس میں مداومت اور مواظبت (ہمیشگی) کے ساتھ اس درجہ میں ترقی کر لے کہ دل میں دوسرے کے لئے گنجائش اور سمائی نہ رہے تو اس حالِ دل کو مشاہدہ کہتے ہیں۔

انسان کی روح جسم کے ڈھانچے میں مقید ہے اور اس قید سے اس کی رہائی اس صورت میں ہی ممکن ہے جب کشش اور جذبہ کا عمل اس روح کو اس پنجرے سے نکال لے۔ جذبہ اور کشش مقامِ محبوبی کے حصول کے لئے لازم ہے یعنی ایسا چمٹا ہوا ہے جو اس سے جدا نہیں ہوتا۔ پس یہ نہ ہوگا کہ کوئی شخص اللہ کا محبوب بن جائے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے جذبہ اور کشش نہ ہو۔ مقام محبوبی تو رسول اللہ ﷺ کی مکمل پیروی میں ہے۔ اگر غیر اللہ سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے تو اتباعِ رسول اللہ ﷺ لازمی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قرب وہی شخص سمجھے گا جو اپنی اصلیت اور حقیقت کو سمجھتا ہوگا۔

وصل کی راہ میں رکاوٹیں

نشانِ منزل (ص ۲۲۲ پر) راقم الحروف نے اللہ تعالیٰ کے وصال کی راہ میں چار رکاوٹوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس جگہ تنگیٔ قرطاس کے باعث فقط ان کا خلاصہ بیان کیا جا رہا ہے۔ یہ وہ رکاوٹیں ہیں جو ابلیس نے خدا کے وصل کی راہ میں انسانوں کے لئے پیدا کی ہیں۔ کچھ صوفیاء کا خیال ہے کہ رکاوٹیں اللہ تعالیٰ نے خود اپنی راہ کے لئے حائل کی ہیں تا کہ مجھ تک صرف وہی انسان آسکیں جو ان بندشوں کو توڑنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اس کی مثال یوں پیش کی جا سکتی ہے کہ گورنمنٹ ہاؤس کے دروازے سے لے کر گورنر کی رہائش گاہ تک پہنچنے کے لئے چند پہرے دار یا حکومت کا عملہ کئی جگہوں پر متعین کیا جاتا ہے اور گورنر سے صرف وہی مل سکتا ہے جس کے پاس ملنے کی سند موجود ہو اور کئی جگہوں پر تفتیش کا ہونا اس غرض سے ہوتا ہے کہ کوئی غلط آدمی

گورنر تک نہ پہنچ سکے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں چار رکاوٹوں کا حائل کرنا ابلیس کے ذمہ عائد کیا گیا ہے۔ ابلیس کی مذکورہ چار رکاوٹیں یا حربے حسب ذیل ہیں۔

(۱) علم نافع سے محروم کر دینا

حضرت امام غزالیؒ کا قول ہے کہ علم ایک کیفیت پیدا کرتا ہے اور اعمال اس کیفیت سے ہی صادر ہوتے ہیں۔ اپنی اور خدا کی پہچان (معرفت) کے لئے علم ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ بے علم لوگوں کے لئے خدا تک پہنچنا بعید ہے۔ اس علم سے مراد صرف مدرسوں کا علم ہونا مقصود نہیں۔ اَن پڑھ اشخاص بھی بہت فاضل ہو سکتے ہیں۔ ابلیس نے شیاطین کو اس بات پر تعینات کیا ہے کہ لوگوں کو دین کا علم حاصل نہ کرنے دو۔ چنانچہ ہمارے تقریباً ۹۵ فیصد سے زائد مسلمان علمِ دین سے نابلد ہیں۔ یعنی تقریباً ۹۵ فیصد لوگ تو صرف اسی بات پر واصل باللہ ہونے سے روک دیئے جاتے ہیں کہ ان کو دین کا قطعاً کوئی علم نہیں ہوتا۔ اس قسم کے لوگوں کی اکثریت بے نمازیوں کی جماعت میں ہوتی ہے۔ ابلیس کی خواہش یہ ہے کہ مسلمانوں کو نہ دین کا علم ہو اور نہ وہ دین کی طرف مائل ہوں اور اس طرح واصل باللہ ہونے کے بجائے واصل جہنم ہو جائیں۔ معاذ اللہ اکثر مسلمانوں کو نماز، وضو اور غسل کے فرائض کے مسائل کا بھی علم نہیں۔ فرض اور واجب میں کیا فرق ہے؟ یہ تو اکثر نمازیوں کو بھی معلوم نہیں۔ اس رکاوٹ کا علاج یہ ہے کہ پورے ذوق کے ساتھ علم حاصل کیا جائے یعنی ایسا علم جو ضروری اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

(۲) ذوقِ عمل کو التوا میں ڈالنا

اگر مسلمانوں کی ایک قلیل جماعت علم کو حاصل کر لے یا کوئی عالم مسلمانوں کے ایک گروہ کو یکجا کر کے ان کے علم کی کمی کو پورا کر دے تو ابلیس کے پہلے حربے کا تدارک تو ہو جائے گا مگر ابلیس فوراً اپنے دوسرے حربے یعنی انسان کو عمل سے غافل کرنے کے حربے کو حرکت میں لے آتا ہے۔ دوسرا حربہ (رکاوٹ) یہ ہے کہ لوگ عمل کی سعادت حاصل نہ کر سکیں، لہٰذا ابلیس لوگوں میں بہت سے خیالات پیدا کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ عمل کا معاملہ کل پر ٹل جائے کیونکہ ایک دو دن تک تو یہ جذبہء عمل بالکل سرد ہو جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ وقت زخموں کو بھی مندمل کر دیتا ہے چنانچہ علم کی کیفیت سے متاثر شدہ لوگوں کے دلوں میں شیطان یہ خیال پیدا کرتا ہے کہ آج تو نہیں، کل سے یہ عمل شروع کریں گے۔ کبھی وہ کہتا ہے کہ ابھی تو بہت عمر باقی ہے، کچھ دنوں بعد دیکھا جائے گا، غرضیکہ ہزاروں بہانے تراش کر مسلمانوں کے دلوں میں عمل نہ کرنے کا خیال القا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر عمل کا جذبہ التوا میں چلا گیا تو یہ بات یقینی ہو گی کہ انسان ہرگز عمل نہ کر سکے گا۔ اس شیطانی حربے کا علاج یہ ہے کہ انسان دل میں یہ عہد کرے کہ کل سے نہیں، بلکہ آج سے ہی عمل شروع کرنا ہے۔

(۳) تکبر کے باعث وصل کی راہ سے روکنا

اگر کوئی شخص علم کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور عمل طے کرنے کی رکاوٹ پھلانگ گیا تو ایسے شخص کے لئے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کی اپنے فضل وکرم سے امداد کرے گا۔ ایسے شخص کی زندگی کو صالح کر دیا جاتا ہے اور اس سے کرامات کا صدور ہونے لگتا ہے۔ لوگ اس کی تعریف کرنے لگتے ہیں اس کی دُعا میں قبولیت کا اثر پیدا ہونے لگتا ہے۔ جب ایسا شخص ان تمام خوبیوں کو ملاحظہ کرتا ہے تو شیطان اس بات کا خیال پیدا کرنے لگتا ہے کہ اب تو آپ بہت بڑے بزرگ اور صاحب کرامت ہو گئے ہیں۔ حالانکہ اگر کسی مسلمان کے دل میں ایسے خیالات پیدا ہونے لگیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ تکبر کا شکار ہو گیا ہے اور وہ واصل باللہ تو کیا، شیطان کی طرح راندہء درگاہ ہو جاتا ہے۔ شیطان کی اس رکاوٹ کا علاج یہ ہے کہ انسان تکبر نہ کرے اور سمجھے کہ یہ میرا نیک ہونا اللہ تعالیٰ کی ایک عطا ہے یا اس شخص کی مہربانی ہے، جس نے مجھے نیکی پر مائل کیا۔ ایسا سمجھنے سے تکبر پیدا نہ ہو گا۔

(۴) شرک خفی میں الجھا دینا

اگر کوئی مسلمان درج بالا تینوں حربوں (رکاوٹوں) سے کامیابی کے ساتھ نکل گیا تو شیطان اسے شرکِ خفی میں الجھا دیتا ہے۔ شرکِ خفی یہ ہے کہ کسی کام کی تکمیل میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور ذات کو فاعلِ حقیقی یا مددگار سمجھنا۔ اس سلسلہ میں اولیاء اللہ کی دعاؤں کو اللہ کی ہی مدد تصور کیا جانا چاہیے اور یہ کہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں بزرگ کی دعا سے میرا فلاں کام درست کر دیا۔ اس حالت میں بھی فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہی کہا جائے گا۔ شرکِ خفی بہت معمولی نوعیت کا شرک ہے، جس سے انسان مشرک یا خارج از اسلام تو نہیں سمجھا جاتا البتہ اولیاء اللہ کی شخصیت سے اس قسم کے شرک کی بھی توقع نہیں کی جاتی۔ اس قسم کے شرک میں مبتلا ہونے والا مرتبہ ولائیت پر فائز نہیں ہو سکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی درج ذیل دُعا قرآن کریم میں ملتی ہے۔

وَّاجۡنُبۡنِیۡ وَبَنِیَّ اَنۡ نَّعۡبُدَ الۡاَصۡنَامَ "یعنی اے اللہ! مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پوجا سے محفوظ فرما"۔ (ابراہیم: ۳۵)

یہاں بتوں کی پوجا سے مراد سونے اور چاندی کے بت ہیں اور اس دُعا میں ایسے ہی بتوں کی محبت سے پناہ مانگی جا رہی ہے، نہ کہ پتھر کے بتوں سے کیونکہ انبیاء سے اور ان کی اولاد سے یہ بات ہرگز متصور نہیں ہو سکتی کہ وہ بتوں کی پوجا کریں چنانچہ ہر کام میں اللہ تعالیٰ کو ہی فاعلِ حقیقی سمجھنا چاہیے۔ شریعت کے مطابق یہ کہنا شرکِ خفی ہو گا کہ اگر فلاں شخص نہ ہوتا تو میرا فلاں کام کبھی نہ ہوتا، البتہ یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں شخص کو میرے فلاں کام میں مددگار بنا دیا۔

جب کوئی مسلمان شیطان کی مذکورہ بالا تمام رکاوٹوں کو عبور کر لیتا ہے تو اس کے لئے وصلِ الٰہی کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور اگر ایک رکاوٹ پر بھی رک گیا تو وصلِ الٰہی متصور نہیں ہو سکتا۔

وصول الی اللہ کا مطلب

درجِ بالا کلام سے ظاہر ہوا کہ سالک کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے علم حاصل کرے اور اپنے عقائد اور اعمال کو درست کرے اور اس کے بعد مذکورہ بالا دونوں حربوں سے بچنے کی تدبیر کرے۔ وصال واتصال ماسوا اللہ سے منقطع ہو جانے کا نام ہے۔ اس وصال کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ قلب کا حجاب اُٹھ جانے کے بعد سالک محبوبِ حقیقی کا جمال دل کی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے لگے اور اس طرح کرنے سے رفتہ رفتہ دوامِ مشاہدہ کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ سالک اس بات کی کوشش کرے کہ وصال کے بعد بلند مقامات یعنی انس اور بسط وغیرہ تک جا پہنچے۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت ابوذر غفاریؓ سے فرمایا کہ جو مسلمان بندہ اپنے مسلمان بھائی کی زیارت کے لئے نکلے تو حق تعالیٰ کے لطف وکرم سے ستر ہزار فرشتے اس کے پیچھے چلتے ہیں اور اس کے لئے مغفرت کی دُعا مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ الٰہی! اس بندے نے خاص تیرے لئے تیری راہ میں مواصلت اختیار کی اور محض اسلام کی وجہ سے ایک مسلمان سے ملنے کے لئے نکل کھڑا ہوا، تو بھی اس بندہ کو اپنا واصل بنا لے۔

وصال کے یہی معنی ہیں کہ غیرِ خدا سے چھٹکارا حاصل کرلے اور حق تعالیٰ جل شانہ میں محویت ہو جائے، نہ یہ کہ دو چیزوں کے باہم مل جانے کو خدا اور بندے کے اتصال پر قیاس کرے۔ چنانچہ جتنی غیر اللہ سے دوری ہوگی، اسی قدر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا اور مرتبہءِ وصل عروج پکڑے گا۔

مراقبہ غیر اللہ کی نفی کے بغیر ممکن نہیں

حضرت توکل شاہ صاحبؒ کے ایک خلیفہ سے منقول ہے کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے ایک اشرفی بطور نذرانہ پیش کی۔ آپ نے اس کو اپنی چادر میں باندھ لیا کیونکہ اس وقت کوئی درویش موجود نہ تھا ورنہ عموماً آپ نذرانوں کو فقراء میں تقسیم فرما دیتے تھے۔ اسی اثناء میں شاہ صاحبؒ مراقبہ میں مشغول ہوئے مگر مراقبہ میں دل لگانے کے باوجود دل نہ لگا۔ توبہ واستغفار کے بعد بھی وہی پریشانی لاحق رہی۔ آپ نے سوچا کہ خدایا مجھ سے کیا قصور ہوا، مگر کچھ سمجھ نہ آیا۔ آخر قدرت نے مدد کی اور دل میں خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ اشرفی اس آفت اور بلا کا سبب ہے۔ جب اس اشرفی کو سڑک پر پھینک دیا تو مراقبہ میں دل لگ گیا۔

روایات میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک مرتبہ جنگل میں عبادت کرنے کے بعد زمین پر آرام فرما ہوئے تو آپ نے شیطان کو دیکھا کہ ان کے پاس کھڑا ہے۔ آپ نے پوچھا تو یہاں ایک رسول کے پاس

کیوں کھڑا ہے؟ کہنے لگا آپ کے پاس میرا سامان موجود ہے، اس لئے یہاں پہنچ گیا ہوں۔ پوچھا کہ تیرا کیا سامان ہے جس کے لئے تو یہاں آیا ہے؟ کہنے لگا کہ آپ کے سر کے نیچے جو اینٹ آرام کی غرض سے موجود ہے، وہ میرا سامان ہے، چنانچہ آپ نے وہ اینٹ اپنے سر کے نیچے سے نکال کر پھینک دی اور شیطان وہاں سے رخصت ہو گیا۔ ان حکایات سے معلوم ہوا کہ جب تک کوئی غیر اللہ سے فارغ نہ ہو جائے، اس وقت تک مراقبہ یا حضورِ قلب میں دل نہیں لگایا جا سکتا۔

وصول الی اللہ کے چار رکن

شیخ قطب الدین دمشقیؒ نے (رسالہ مکیہ) امداد السلوک میں تحریر فرمایا ہے وصل الی اللہ کے چار رکن ہیں۔ اول دینِ حق میں عبرت (یعنی دینداروں کو دیکھ کر حرص کرے اور بے دینوں پر متاسف ہو) دوم مکاشفات وتجلیات کے مشاہدوں کے وقت اعلیٰ حوصلگی رکھے۔ (مشاہدات میں جو کچھ نظر آئے اسے مقصود نہ سمجھ لے اور اپنی طلب کو ختم نہ کر دے بلکہ رضائے حق اور وصول وقرب ذات کو اپنا مطلوب سمجھے اور آگے بڑھتا رہے) سوم ہمّت کی حفاظت (طلبِ مقصد میں دیر ہو جائے تو ہمت نہ ہارے بلکہ اگر مشاہدات نہ ہوں تو گھبرا کر طریقت کو چھوڑ نہ دے) اور چہارم شیخ کا احترام اور برادرانِ طریقت پر شفقت کیونکہ یہ باتیں ناقصوں کو نصیب نہیں ہوتیں۔

درج بالا باتوں کے علاوہ مرید کے لئے ضروری ہے کہ ظاہر و باطن اور خلوت وجلوت میں خدا تعالیٰ کے ساتھ اپنا معاملہ درست رکھے اور ہر حال میں اخلاص کو برقرار رکھے۔ صدق واخلاص کے بعد قوی امید ہے کہ وصول الی اللہ سے بہرہ ور ہو جائے گا۔ حضرت ابو درداؓ سے ایک حدیثِ قدسی منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

مَنْ طَلَبَنِیْ فَقَدْ وَ جَدَنِیْ وَ مَنْ طَلَبَ غَیْرِیْ فَلَمْ یَجِدْنِی (الحدیث: مسند دارمی)	جس نے مجھ کو طلب کیا، اس نے مجھے پا لیا اور جس نے میرے سوا غیر کو طلب کیا اس نے مجھے نہیں پایا۔

سالک کے لئے ضروری ہے کہ اس کی عبادات اور مکاشفات ذات خداوندی کے لئے ہوں، نہ کہ جنت کے طمع اور دوزخ کے خوف سے۔ اگر عبادت کا نظریہ ایسا ہو تو خدا تعالیٰ ایسے لوگوں کو اپنا دوست رکھتا ہے۔ کچھ لوگ وصلِ الٰہی کے تین راستے بیان کرتے ہیں۔ پہلا راستہ اختیار کا راستہ ہے۔ جس میں کثرتِ صوم و صلوٰۃ، وظائف، ذکر، تسبیح تلاوت، حج، جہاد اور دیگر اعمالِ اسلام شامل ہیں۔ دوسرا راستہ ریاضتوں اور مجاہدوں کا ہے جس میں ریاضتِ شاقہ سے اللہ تعالیٰ کا قرب اور وصل حاصل ہو جاتا ہے اور تیسرا راستہ عشق و محبت سے مقاماتِ طریقت کو طے کرنے سے متعلق ہے اور یہ سب سے زیادہ مؤثر اور درمیانی طریقہ ہے۔ اس

کے ذریعے تو سالک چند لمحات میں ہی واصل باللہ بن سکتا ہے۔

جائے کہ زاہدے بہ صد ماہ می رسد مستِ شراب عشق بہ یک آہ می رسد

(وہ جگہ جہاں ایک زاہد سینکڑوں مہینوں میں پہنچتا ہے، مستِ شرابِ عشق ایک آہ میں پہنچ جاتا ہے۔)

خود سے غائب رہنے والا ہی خدا کا وصل حاصل کرتا ہے

حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ مجھے اس بندے پر حیرت ہوتی ہے جو خدا کو پہچاننے کے بعد عبادت کرتا ہے یعنی حیرت اس بات پر ہے کہ وہ بندہ خدا کو پہچاننے کے بعد ہوش میں کیسے رہ سکتا ہے! کیونکہ جس نے اللہ کو پہچان لیا وہ اس قدر متحیر ہو جاتا ہے کہ اس کو دنیا کا ہوش ہی نہیں رہتا۔ روایات میں ہے کہ ایک شخص حضرت بایزید بسطامیؒ کی خدمت میں تیس سال تک مصروف رہا لیکن وہ جب بھی سامنے آتا تو آپ پوچھتے کہ تیرا نام کیا ہے؟ آخر ایک دن اس شخص نے عرض کیا کہ کیا آپ مجھ سے مذاق کرتے ہیں کہ بار بار مجھ سے میرا نام پوچھتے ہیں۔ فرمایا کہ مذاق نہیں کرتا بلکہ میرے قلب اور روح میں اللہ کا نام اس طرح جاری و ساری ہو جاتا ہے کہ اس کے نام کے سوا مجھے کسی کا نام یاد ہی نہیں رہتا۔

حضرت داتا گنج بخشؒ کشف المحجوب میں لکھتے ہیں کہ ایک دن حضرت ذوالنون مصریؒ کا ایک مرید حضرت بایزید بسطامیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دروازے پر دستک دی تو حضرت بایزیدؒ نے پوچھا کہ تو کون ہے اور کسے چاہتا ہے؟ مرید نے عرض کیا کہ بایزید کو! فرمایا وہ کون ہے اور کہاں ہے؟ مجھے تو مدت ہوگئی بایزید کو ڈھونڈ رہا ہوں، میں نے اسے اب تک نہیں پایا۔ حضرت ذوالنون مصریؒ کو جب حضرت بایزیدؒ کا یہ حال معلوم ہوا تو فرمایا۔

ذَهَبَ اَخِیُ فِیُ الذَّاهِبِیۡنَ فِیُ اللّٰهِ یعنی میرا بھائی بایزیدؒ جانے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حضوری میں چلا گیا۔

حضرت داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں کہ خود سے غائب رہنے سے اللہ تعالیٰ کا حضور حاصل ہوتا ہے اور جو خود سے غائب نہیں، وہ حاضر بحق نہیں ہو سکتا اور جو حق میں حاضر ہے، وہ خود سے غائب اور یقیناً غائب ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ ایک وقت مجھ پر ایسا تھا کہ زمین اور آسمان والے میری حیرت پر روتے تھے اور اب کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ میں ان کی غیبت پر روتا ہوں اور کبھی میں نہ ان سے باخبر ہوتا ہوں نہ خود اپنے آپ سے۔ آپ کا یہ حال کمال درجے کی حضوری پر دلالت کرتا ہے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا ہے کہ میں ۳۰ سال تک عبادت کرتا رہا مگر مجھ پر حق تعالیٰ کا دروازہ مصائب کے برداشت کرنے کے بعد ہی کھلا اور جب قلبی لگاؤ کے ذریعے چلا تو منزل تک پہنچ گیا۔ آپؒ نے

فرمایا کہ پھر مجھے اللہ تعالیٰ نے وہ مقام عطا کیا کہ کُل کائنات کو اپنی انگلیوں کے درمیان دیکھتا ہوں۔آپ نے فرمایا کہ خدا کی معرفت کے ایک حبّہ (دانہ) میں جو لذت ہے وہ جنت کی نعمتوں میں کہاں؟ خدا کی یاد میں فنا ہو جانا زندہ و جاوید ہو جانا ہے۔

خداشناسی کے لئے خدا کی محبت ضروری ہے

حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ محشر میں اہل جنت کے سامنے کچھ صورتیں پیش کی جائیں گی اور جو کسی صورت کو اپنا لے گا (یعنی اس سے راضی ہو گیا تو) وہ دیدار الٰہی سے محروم ہو جائے گا۔فرمایا: جو خدا شناس ہو، وہ خدا کو ضرور دوست رکھتا ہے کیونکہ محبت کے بغیر معرفت بے معنی ہے۔اللہ تعالیٰ نے جن قلوب کو بار محبت اُٹھانے کے قابل تصور کیا، ان کو عبادت کی طرف لگا دیا کیونکہ محبت کا بار سوائے عارف کے اور کوئی نہیں برداشت کرسکتا۔اگر مخلوق خود اپنی ہستی کو پہچان لے تو خدا کی معرفت خود بخود آ جاتی ہے۔فرماتے ہیں کہ بندے کو ایسا وقت ضرور نکالنا چاہیے جس میں اپنے مالک کے سوا کسی پر نظر نہ اُٹھائے۔حضرت حبیب عجمیؒ نے ایک روز اپنی کنیز سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ہماری کنیز کو ذرا بلانا۔اس کنیز نے جواب دیا کہ میں تیس سال سے آپ کے گھر میں کام کر رہی ہوں کیا ابھی تک آپ میری صورت سے آشنا نہیں ہوئے؟ فرمایا کہ گزشتہ تیس سال سے مجھے یہ مجال نہ ہوئی کہ میں اپنی نظروں کو اللہ کی طرف سے ہٹا کر کسی اور کی طرف ایک لمحہ کے لئے بھی کروں، تو پھر تجھے کیسے پہچان سکتا ہوں۔اگر خدا سے محبت ہو تو بندہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا۔

وصل میں مرگِ آرزو، ہجر میں لذتِ طلب

وصل اور ہجر میں الگ الگ کیفیات پائی جاتی ہیں۔اگرچہ وصال میں رؤیت و دید ملاپ و سنگم اور حضوری کی لذتیں پائی جاتی ہیں لیکن فراق اور ہجر میں اضطراب، لگن، جستجو اور طلب کی لذتیں اس قدر حیات آمیز ہوتی ہیں کہ عاشق کی دلسوزیاں اسے وہ دولت عطا کر دیتی ہیں جو وصال کے نصیب سے بہت دور ہوتی ہیں۔افسانوی رنگ میں ان دونوں پر قلم اُٹھانے والے مقالہ نویس بہت طویل اور خوبصورت تحریریں پیش کر سکتے ہیں، مگر اس کتاب میں ایسے کلام کی گنجائش نہیں، البتہ چند خوبصورت نکات موضوع گفتگو کے طور پر پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

علامہ اقبالؒ بال جبریل میں لکھتے ہیں کہ جن لوگوں کے ہاں سوز و ساز کی قدر و منزلت ہے، ان کے نزدیک وصل سے بڑھ کر ہجر میں لذت اور شیرینی پائی جاتی ہے۔سوز و گداز میں جو کیفیات پائی جاتی ہیں وہ وصل کے نصیب سے بعید ہیں۔وصل میں آرزوؤں کی موت ہے کیونکہ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ "زندگی

موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش" اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی گریہ وزاری کو بہت بلند مقام حاصل ہے۔ سالکین راہ طریقت شب خیزیوں کی آہ وزاری میں جو کچھ حاصل کر لیتے ہیں وہ سالہا سال کی عبادت و ریاضت میں حاصل نہیں ہوتا (اس سلسلے میں کثرتِ عبادت اور ذوقِ شب خیزی کا مضمون ہماری کتاب ''حسنِ نماز'' میں مطالعہ فرمائیں) مولانا رومؒ نے مثنوی میں ایک نمازی کا واقعہ لکھا کہ جب وہ مسجد میں نماز کے لئے پہنچا اور اسے معلوم ہوا کہ نماز با جماعت ادا ہو چکی ہے تو اس نے ایک سرد آہ بھری جس کا نور ساتویں آسمان تک گیا۔ ایک عارف نے جب اس نور کو آسمان پر سے گزرتے ہوئے ملاحظہ کیا تو اس نمازی سے کہا کہ اگر تم میری باجماعت نماز کا ثواب لے لو اور اس آہ کا اجر مجھے دے دو تو پھر بھی مجھے خسارہ نہیں۔

علامہ اقبالؒ نے بالِ جبریل میں ''ذوق وشوق'' کی نظم میں لکھا ہے کہ اہلِ عشق کو کسی کام کی تکمیل میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی کیونکہ یہی جذبہ، ذوق وشوق اور سوز واضطراب اسے کشاں کشاں اپنی منزل تک کسی حیلے بہانے کے ساتھ یا کششِ ذوق کے باعث کھینچ کر لے جاتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہمیشہ فراق میں ہی گرمی آرزو پائی جاتی ہے اور ''ہائے وہُو'' میں موجود گرانمایہ سوزش بھی فراق ہی کی بدولت ہوتی ہے۔ آپ کا نظریہ ہے کہ موج بھی ہمہ وقت فراق کے باعث محوِ جستجو رہتی ہے اور قطرے کی آبرو بھی فراق میں ہی پائی جاتی ہے کیونکہ جب قطرہ سمندر میں مل جاتا ہے تو اپنی انفرادی حیثیت کو ختم کر دیتا ہے اور پھر اسے کوئی شخص قطرے کے نام سے یاد نہیں کرتا، گویا سمندر کے ساتھ اس کا وصال اس کی موت کا باعث بنتا ہے، آپ فرماتے ہیں۔

گاہ بحیلہ می برد، گاہ بزور می کشد　عشق کی ابتدا عجب، عشق کی انتہا عجب!
عالم سوز وساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق　وصل میں مرگِ آرزو، ہجر میں لذتِ طلب!
عینِ وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا　گرچہ بہانہ جُو رہی میری نگاہ بے ادب!
گرمیِ آرزو فراق! شورشِ ہائے و ہُو فراق　موج کی جستجو فراق! قطرہ کی آبرو فراق!

(ب۔ج:۴۰۶)

علامہ اقبال'' بانگ درا میں'' ''دو ستارے'' کی نظم میں لکھتے ہیں کہ دو ستارے جب بہت مدت کے بعد قریب آ کر ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہمارا یہ وصل اگر ہمیشہ کے لئے ہوتا تو کیا اچھی بات ہوتی اور اللہ تعالیٰ ہم پر کرم کرے تو ہماری ایک جیسی ہی چمک ہو جائے لیکن ستاروں کا ملاپ (اور دنیا میں بندوں کا ملاپ) جب ہی نصیب ہوتا ہے تو یہ وصل اصل میں فراق کا پیغام بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں وصل کو دوام نہیں بخشا۔ ہر چیز گردش میں ہے۔ ہر چیز کی راہ مُعین ہے اور اس جہان کو جدائی کے قانون پر بنایا گیا ہے۔ صوفیہ کا خیال ہے کہ وصال اس دنیا کی دولت نہیں، یہ تو اگلے جہان کی سوغات ہے۔ یہاں ہم ملتے ہیں تو بچھڑنے کے لئے مگر طریق رابطہ کے ذریعے ہم اگلے جہان سے وابستگی حاصل کر لیتے ہیں اور اس رابطے میں وہ سرور ملتا ہے جو

انسان کے لئے معراج کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا:

اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ یعنی نماز مومن کے لئے معراج ہے۔

والی حدیث سے وہی لذت مراد ہے جو مومن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معراج کے توسل سے حاصل ہوتی ہے اور انسان اس دنیا میں ہوتے ہوئے دوسرے جہان سے منسلک ہو جاتا ہے۔ وصال میں کچھ پابندیاں بھی عائد ہوتی ہیں اور جویانِ وصل کو وصل کے حاصل کرنے کے لئے کچھ قربانیاں دینا ایک لازمی امر ہے۔ وصل کا گھر وہ گھر ہے جو لٹ جانے کے بعد آباد ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے ایک نظم وصال کے عنوان سے اور دوسری نظم میں پھول کا تحفہ عطا ہونے کے عنوان سے درج ذیل اشعار لکھے ہیں۔

اٹھا کے صدمۂ فرقت وصال تک پہنچا تری حیات کا جوہر کمال تک پہنچا

(ب۔د:۱۵۸)

قید میں آیا تو حاصل مجھ کو آزادی ہوئی دل کے لٹ جانے سے میرے گھر کی آبادی ہوئی

(ب۔د:۱۲۰)

جمالِ الٰہی کے دیکھنے والا کسی اور طرف نگاہ نہیں کرتا

منقول ہے کہ حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ ایک عورت میرے پاس آئی اور اس نے اپنے شوہر کے خلاف شکایت کی کہ وہ مجھ پر سوکن لانا چاہتا ہے۔ میں نے کہا "بی بی! شریعت نے چار شادیوں کی اجازت دی ہے تو اسے اپنے ارادے سے کوئی منع نہیں کر سکتا" وہ عورت بولی! " آپ کی بات درست ہے کہ شریعت نے چار عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دی ہے لیکن اگر اسلام اس بات کی اجازت دیتا کہ میں اپنے حسن و جمال کو آپ کے سامنے بے نقاب کر سکتی تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ جس کی بیوی اس قدر حسین و جمیل ہو، اس کے لئے دوسری عورت کی طرف توجہ کرنا ہرگز روا نہیں۔" عورت کا یہ قول سن کر حضرت جنیدؒ بے ہوش ہو گئے اور جب ہوش میں آئے تو آپ نے فرمایا کہ اس عورت کے اس قول سے میرے ذہن میں باری تعالیٰ کا وہ فرمان گھوم گیا جس میں اس نے فرمایا ہے کہ " اگر میرے لئے اہل جہان کو اپنا جمال بے نقاب دکھانا روا ہوتا تو اہل جہاں کو معلوم ہو جاتا کہ ان کے لئے میرے سوا کسی اور کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا ہرگز مناسب نہیں" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس کا لگاؤ اللہ تعالیٰ کی طرف ہو جائے، اس کے لئے یہ ہرگز روا نہیں کہ وہ غیر اللہ کی طرف نگاہ کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی جب معراج کی رات اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا تو کسی اور طرف قطعاً متوجہ نہ ہوئے۔

نفسانی خواہشات کا ترک وصل میں مدد کرتا ہے

حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا کہ نفسانی خواہشات چھوڑ دینا دراصل واصل الی اللہ ہو جانا ہے اور جو واصل الی اللہ ہو جاتا ہے، مخلوق اس کی فرمانبردار ہو جاتی ہے۔ جو شخص بھوک اور مخلوق کی طرف سے اذیت رسانی کو برداشت کرتا ہے اور مخلوق سے خندہ پیشانی سے پیش آتا ہے، وہ خدا کے بہت نزدیک ہوتا ہے۔ آپ کا قول ہے کہ خدا کی یاد کا مفہوم اپنے نفس کو فراموش کر دینا ہے۔ جو شخص خدا کو خدا کے ذریعے شناخت کرتا ہے، وہ زندہ و جاوید رہتا ہے۔ برخلاف اس کے کہ جو اپنے نفس کے ذریعے خدا کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔ جب مخلوق سے کنارہ کش ہو کر انسان کی اپنے عیوب پر نظر پڑنے لگے تو اسی وقت اسے قربِ الٰہی حاصل ہو جاتا ہے۔ فرمایا کہ اگر فرعون فاقہ کشی کرتا تو خدائی کا دعویٰ نہ کرتا۔

حضرت بایزید بسطامیؒ کا قول ہے کہ خواہ عرش، کرسی یا قلم ہو یا کوئی پیغمبر یا فرشتہ ہو انسان ان تمام کو اپنے اندر پاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ انسان حق میں فنائیت کے بعد تمام چیزوں کو اپنے اندر ہی ضم پاتا ہے کیونکہ حق میں سب چیزیں موجود ہوتی ہیں۔

ایک ہی شخص میں ہجر اور وصل کی متضاد کیفیات

انسان خیر اور شر سے مرکب ہے، کبھی اس پر خیر غالب آجاتی ہے اور کبھی وہ شر سے اس قدر متاثر ہو جاتا ہے کہ وہ کفر کی حدود کے بہت قریب آجاتا ہے اور ذرا سی مزید لغزش ہو جائے تو کفر کی حدود بھی پھلانگ جاتا ہے۔ انسان کی ان کیفیات پر بہت سی احادیث بھی ناطق ہیں، مگر اس کتاب میں اس موضوع پر زیادہ تفصیل میں جانا زیرِ نظر تحریر کا مقصود نہیں، البتہ یہ حقیقت سمجھ لینا ضروری ہے کہ انسان کی کیفیات اس کے دل پر انحصار کرتی ہیں اور قلب بذاتِ خود تغیراتِ احوال کا نام ہے کیونکہ یہ بہت جلد ایک کیفیت سے دوسری کیفیت میں منقلب ہو جاتا ہے۔ اسی انقلاب کے باعث اسے قلب کہا جاتا ہے۔ جب ہم کسی شیخِ کامل کی تلاش کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد یہی ہوتی ہے کہ ہمارا دل اچھی کیفیات میں بدل جائے اور مراقبہ اور ربط میں ایسا ہی انقلاب رونما ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا کیفیات میں تغیّر کے ساتھ ساتھ وصل اور ہجر کی کیفیات بھی بدلتی رہتی ہیں۔ علامہ اقبال بانگ درا کی ایک رباعی میں فرماتے ہیں کہ یہ کاروبارِ آشنائی بہت پریشان کن شے ہے اور میرے کلام کی رنگین نوائی اس سے بھی زیادہ پریشان کن ہے کیونکہ کبھی تو میں وصل کی گھڑیوں میں خود کو لطف کی کیفیت میں پاتا ہوں اور کبھی میں جدائی اور تنہائی کی گھڑیوں کی تلاش میں رہتا ہوں کہ میرا کلام ان دونوں کیفیات سے متاثر ہوتا ہے۔

پریشاں　کاروبارِ　آشنائی
پریشاں　تر　مری　رنگین　نوائی

کبھی میں ڈھونڈتا ہوں لذّتِ وصل خوش آتا ہے کبھی سوزِ جدائی (ب۔ج:۳۷۳)

اللہ والوں کے احوال ان کی قلبی کیفیت کی تبدیلی سے تو بدل ہی جاتے ہیں لیکن قلب کی کیفیتوں کا دنیاوی اغراض و مقاصد کے لیے بدلنا یا وصالِ الٰہی کا دعویٰ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دور رہنا سوائے نفاقِ قلب کے اور کچھ نہیں ہوسکتا کبھی ایک شخص خانہ کعبہ میں بیٹھ کر بھی اللہ سے دور ہوتا ہے اور کبھی صنم خانے میں بتوں کے سامنے بیٹھنے والا مقربِ بارگاہِ الٰہی بن جاتا ہے۔علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

کافرِ بیدار دل پیشِ صنم بہ ز دیندارے کہ خفت اندر حرم (ج۔ن:۶۲۷)

(بیدار دل والا کافر خواہ بت کے سامنے ہو، اس دیندار دل سے بہتر ہے جو حرم میں بھی سو گیا۔)

اسلام میں وحدت کے تصور سے صرف یہ بات ہی متصور نہیں کہ مسلمان ایک خدا کو مانیں بلکہ اس میں وحدتِ خیالات، وحدتِ فکر وافکار، وحدتِ کردار و عمل اور وحدتِ نظریات کا بھی بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ مسلمان کے عمل اور سوچ میں اگر اختلافات وافتراق ہو تو وہ یگانگت و مماثلت سے خارج اور تفرقہ اور نفاق کا شکار ہو جائیں گے۔قُرُونِ اُولیٰ کے مسلمان سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں ایک رات حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خواب میں دیکھا کہ ایک عورت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کھجوروں کا ٹوکرا مسجدِ نبوی میں لائی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب کو دو دو کھجوریں تقسیم فرمائیں۔حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ کھجوریں اس قدر لذیذ تھیں کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مزید کھجوروں کا سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سب کے حصے میں دو کھجوریں ہی آسکتی ہیں۔صبح کی نماز کے بعد بعینہٖ وہی واقعہ پیش آیا۔نمازِ فجر کے بعد مسجد میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سب کو دو دو کھجوریں تقسیم فرمائیں جب حضرت عمرؓ نے مزید کھجوروں کا سوال کیا تو آپ نے فرمایا'' کیا رات کو خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمہیں دو سے زیادہ عطا فرمائیں تھیں، جواب تم مجھ سے مزید کھجوروں کا سوال کر رہے ہو؟''افسوس ہے کہ آج مسلمانوں میں یہ ہم آہنگی مفقود ہوگئی ہے۔علامہؒ فرماتے ہیں۔

سر زمین اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو اک قربِ فراق انگیز ہے

بدلے یک رنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب

لذتِ قربِ حقیقی پہ مٹا جاتا ہوں میں
اختلاطِ موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں

(ب۔د:۴۲)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ جب دنیا کے لوگ آدابِ بود و باش اور تہذیبِ انسانیت سے نابلد تھے،اس وقت اسلام نے تمام اہلِ دنیا کو اخوت محبت اور خلوص کا سبق سکھایا اور پابندِ ملتِ اسلامیہ کو یہ بات ذہن نشین کرائی کہ اگر کوئی قوم ایمان، کمالِ انسانیت اور اخوت کا ارادہ رکھتی ہے تو اسے اخلاق و کردارِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو

اپنانا ہوگا اور بولہبی کے اصولوں سے دور رہنا ہوگا کیونکہ جو لوگ اس کے بین بین رہنا پسند کرتے ہیں، ان کو سوائے منافقت کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ آپؒ نے ضربِ کلیم میں امرائے عرب کے عنوان سے لکھا ہے کہ۔

یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس اُمت کو　　وصالِ مصطفویؐ، افتراقِ بولہبی! (ض۔ک:۵۲۵)

وصل میں ہجر کی کیفیات

وہ اولیائے کرامؒ جن کو وصالِ الٰہی میسر ہے، انہیں کبھی وصل میں بھی ہجر کی کیفیات محسوس ہوتی ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وصال کے اندر جو کیفیات میسر ہوتی ہیں، ان کے برداشت کرنے میں صاحبِ وصال کو مشکل لاحق ہوتی ہے جیسا کہ حیرت شاہ وارثی (راقم الحروف کے جالندھر والے گھر کے ہمسایوں کے ہاں جن کا آنا جانا رہتا تھا) نے فرمایا ہے۔

جلوہَ خال نے مارا　　مجھ کو ان کے جمال نے مارا
لوگ مرتے ہیں ہجر کے مارے　　مجھ کو ان کے وصال نے مارا

خواجہ غلام فریدؒ نے بھی فرمایا ہے۔

بھانویں ہجر تے بھانویں وصال ہووئے　　دوناں دیاں دکھ لذتاں نیں
جتھاں خود قرب قرب ہے دوری　　اوتھاں کیا ہجر کیا مہجوری

خواجہ غلام فریدؒ فرماتے ہیں کہ جہاں قرب بھی ہجر بن چکا ہو، وہاں ہجر اور وصل بے معنی ہو جاتے ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ عاشق کی طرف سے اور معشوق کی طرف سے بھی انانیت کا زور ہوتا ہے۔ انا سے مراد یہ ہے کہ انسانی جسم میں ایک مضغہ ہے اور اس میں فواد (دل) ہے اور فواد میں روح ہے اور روح میں سر ہے اور سر میں خفی اور خفی میں اخفی اور اخفی میں اَنا ہے۔ اس انانیت سے اشارہ ہے ذات مطلق (اللہ) کی جانب۔ بندے میں جو اَنا ہے وہ انائے حقیقی کی آواز (بازگشت) ہے۔

ایک اور جگہ حضرت خواجہ غلام فریدؒ فرماتے ہیں کہ اگرچہ عاشقانِ الٰہی پیمانوں اور صراحی سے شراب نوش نہیں کرتے بلکہ دریا کے دریا نوش کر لیتے ہیں اور کبھی کسی حلاج کی طرح اناالحق کے نعرے نہیں لگاتے۔ کسی شاعر نے ایک فارسی کی رباعی میں اس بات کو واضح کیا ہے کہ جب ذات حق ہر جگہ موجود ہے تو سیر الی اللہ (اللہ کی طرف سیر) اور سیر من اللہ (اللہ کی طرف سے سیر) کا کیا مطلب ہوا۔ اسی طرح مولانا رومؒ نے مثنوی میں لکھا ہے کہ جب ہم یہ بات کہتے ہیں کہ فلاں شخص خدا تک پہنچ گیا تو اس قول سے کیا مراد ہے؟ خود ہی دوسرے مصرعے میں فرماتے ہیں کہ یہ سفر مکانی نہیں بلکہ علمی اور غیر فانی ہے۔ جیسے علامہ اقبالؒ نے بھی فرمایا ہے۔

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں　　وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

(ب۔د:۱۰۳)

اس شعر میں آپ کا مطلب یہ ہے کہ جب سالک علم الیقین سے عین الیقین میں پہنچ کر تقلیدی نہیں بلکہ تحقیقی اور تصدیقی ہو جاتا ہے تو پھر اپنے سر کی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں فرماتے ہیں کہ عملاً سفر سے کچھ حاصل نہیں ہوگا بلکہ خضرؑ کی طرح گوہر مقصود کو مجمع البحرین سے حاصل کرنا چاہیے۔ یعنی ایک بحر سالک کے اندر ہوتا ہے اور دوسرا سمندر اللہ کا ہوتا ہے گویا جب سالک کی روح ذات حق میں فنائیت حاصل کرے گی تو گوہر مقصود (اللہ) خود بخود مل جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سالک فنافی اللہ بھی ہو اور باقی باللہ بھی۔ حضرت شیخ صدر الدین قونویؒ نے اس رباعی کے متعلق فرمایا ہے کہ اس سے مراد ایک نسبت جامع کا قائم کرنا مقصود ہے، جس میں دو حکم شامل ہوں یعنی حکمِ حقیقت اور حکمِ مجاز۔ حکمِ حقیقت سے بندہ فنافی اللہ ہو جائے اور حکمِ مجاز سے مقام دوئی یعنی شہادت پر واپس آ کر باقی باللہ ہو جائے۔ اس طرح سالک عین وصل میں ہجر کے مزے اُڑاتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے حضرت باقی باللہ کو خط میں لکھا کہ اب میری یہ حالت ہے، قرب بھی بعد بن گیا ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں سالک واصل بھی ہوتا ہے اور مہجور بھی۔ اسی کو مقام جامعیت کہتے ہیں۔

وصل میں فراق ہونا

قرآن مجید میں سورہ قٓ کی آیت ۱۶ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝ "یعنی ہم انسان سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں"۔

تو پھر انسانوں کی بہت بڑی تعداد خدا سے دوری اور فراق کی کیفیت کیوں محسوس کرتی ہے؟ اس سوال کا جواب بہت مشکل ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جیسے اوپر بیان ہوا ہے کچھ لوگوں کو وصل الٰہی کا شرف بھی حاصل ہوتا ہے مگر وہ وصل میں ہوتے ہوئے بھی خود کو فراق میں ہی تصور کرتے ہیں۔ واصلین کی جماعت میں کچھ ایسے باکمال لوگ ہوتے ہیں جن کو ہر وقت اللہ کا وصل حاصل رہتا ہے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا ہے۔

اِنَّ لِلّٰهِ عِبَادًا لَوْحَجَبُوْا عَنِ اللّٰهِ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَا ارْتَدُّوْا — اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں کہ جب وہ ایک لمحہ کے لئے بھی خدا سے حجاب میں آ کر غافل ہو جائیں تو وہ خود کو مرتد تصور کرتے ہیں۔

وصال کی حالت میں ہجر یا فراق کی کیفیات میں امتیاز کرنا صرف اس صورت میں ہی ممکن ہے کہ جب کوئی شخص قرب و بعد کی حقیقتوں کو دیکھنے والی آنکھ بھی رکھتا ہو۔ علامہ اقبالؒ نے اسی بات کو ارمغانِ حجاز میں ایک رباعی کی صورت میں بیان کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ہمارا وصال بھی ایسا وصال ہے جس میں نفس کی

آلودگی کے باعث فراق موجود رہتا ہے اور اس بات کو سمجھنے کے لئے کسی اہلِ نظر کی نگاہ کی ضرورت ہوتی ہے جو ہماری اس آلودگی کو دور کرسکتی ہو۔ آپ نے ایک مثال کے ذریعے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ موتی اگرچہ دریا کی آغوش میں رہتا ہے مگر دریا میں رہتے ہوئے بھی دریا سے الگ ہوتا ہے اور گوہر کا پانی نیساں سے تعلق رکھتے ہوئے بھی دریا سے الگ ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قرب میں رہتے ہوئے اس کی رؤیت حاصل کرنا اہلِ طریقت اور اہلِ نظر کا ہی کام ہے۔

وصال ما وصال اندر فراق است　　کشودِ ایں گرہ غیر از نظر نیست

(اللہ تعالیٰ سے ہمارا وصال، وصال کے اندر بھی فراق ہے۔ یہ عقدہ اہل نظر کے بغیر کھل نہیں سکتا)

گہر گم گشتۂ آغوشِ دریا است　　ولیکن آبِ بحر آبِ گہر نیست (ا۔ ح: ۱۰۰۴)

(بے شک گوہر (خودی) آغوشِ دریا (باری تعالیٰ) میں گم ہے، لیکن دریا کے پانی اور گوہر کے پانی میں بہت فرق ہے۔)

عین وصل کی حالت میں بندوں کا خدا سے دوری کی حالت میں رہنے پر ہمیں شعراء کا بہت سا کلام ملتا ہے مگر یہاں فقط چند ایک اشعار پیش کیے جا رہے ہیں۔

اے وائے بدنصیبی کہ ملنا نہیں نصیب　　سایہ کی طرح گرچہ جہاں ہو تم وہیں ہوں میں

اتصال بے کیف بے قیاس　　ہست ربُّ النّاسِ باجانانِ ناس (x)

(بے کیف اتصال (ملاپ) غیر متصور ہے اگرچہ لوگوں کا رب لوگوں کی جان سے بہت قریب ہے۔)

دوست نزدیک تر از من بمن است　　ویں عجب تر کہ مَن از وے دورم (x)

(میرا دوست (اللہ تعالیٰ) مجھ سے بھی میرے نزدیک تر ہے لیکن یہ زیادہ حیران کن بات ہے کہ میں پھر بھی اس سے دور رہوں۔)

اللہ تعالیٰ کا قرب جو "نَحنُ اَقرَبُ" سے متصور ہے اس سے قربِ مکانی نہیں بلکہ قربِ صفاتی و حالی مقصود ہے (یعنی ہم بولتے ہیں، وہ سنتا ہے، یا ہم جو کرتے ہیں، وہ دیکھتا ہے وغیرہ وغیرہ)۔ قرب سے مراد صفات الٰہی سے متصف ہونا، سیرِ قطرہ بجانبِ دریا اور حجابِ خودی کا اُٹھنا ہے اور بعد سے مراد صفاتِ بشری میں مقید رہنا، لذتِ نفسانی میں گرفتار رہ کر مبداء حقیقی (اللہ تعالیٰ) سے دور اور حقیقت حال سے بے خبری میں رہنا ہے۔ انسان اپنے سے جتنا قریب ہے، حق تعالیٰ سے اتنا ہی دور ہے۔ قرب و بُعد کے ان معانی کو سمجھنے کے بعد، علامہ اقبالؒ کے درج بالا اشعار کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ اسی حقیقت کو حافظ شیرازیؒ نے یوں بیان کیا ہے۔

میانِ عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست　　تو خود حجابِ خودی حافظ از میاں برخیز

(عاشق اور معشوق کے درمیان کوئی آڑ نہیں ہے، اے حافظ تو خود اپنے لئے ایک پردہ ہے، درمیان سے اُٹھ جا)

ہجر بھی وصال کے مقامات میں سے ہے

خودی کی کامیابی اس بات میں مضمر ہے کہ عاشق کو محبوب کی ذات کا ادراک حاصل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی خو ہمہ وقت اور ہمہ حال جدوجہد میں مصروف رہتی ہے اور جدوجہد کرتے رہنے میں انسان کی اصل کامیابی ہے۔ وصل ہمیشہ دیر طلب ہوا کرتا ہے کیونکہ انسان کی جدائی اور ہجر اس کے وصل کی قدر و منزلت کو اور بھی بڑھا دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو بہترین انداز میں ساخت کیا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو ہر کوئی واصل باللہ بن سکتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس بات کو پسند فرمایا ہے کہ اس کا وصال اس کے حقداروں اور اہلیت رکھنے والوں کو ہی مل سکے ورنہ دوسری صورت میں ہر کوئی جنیدؒ اور بایزیدؒ بننے کا دعویٰ کر بیٹھتا۔ حضرت داتا گنج بخشؒ نے کشف المحجوب میں مشاہدے اور مجاہدے کے بارے میں خوبصورت انداز میں بحث کی ہے اور یہ کہا ہے کہ کچھ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ مجاہدوں کے بعد مشاہدات حاصل ہوتے ہیں یعنی مَنْ طَلَبَ وَجَدَ (جس نے طلب کیا اس نے پالیا) یا مَنْ جَدَّ وَجَدَ (جس نے کوشش کی اسی نے پالیا) اس حقیقت کو قرآن نے بھی درج ذیل لفظوں میں بیان فرمایا ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا　"وہ لوگ جنہوں نے ہمارے معاملے میں مجاہدہ کیا تو انہیں ہم اپنی راہیں ضرور دکھا دیں گے"۔ (العنکبوت: ۶۹)

اس حقیقت کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ باوجود حصولِ قرب اور وصلِ مطلوب کے اور عاقبت کی طرف سے بے فکر کیے جانے کے عبادتیں اور راتوں کو شب بیداریاں فرمایا کرتے تھے اور آپ کی عبادات اس قدر زیادہ تھیں کہ مجاہدات سے بھی آگے بڑھ چکی تھیں، حتیٰ کہ سورۃ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

طٰهٰ ۝ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝　"یعنی ہم نے آپ پر یہ قرآن اس لئے نہیں نازل فرمایا کہ آپ اس قدر مشقت میں پڑ جائیں"۔ (طٰہٰ: ۱-۲)

حضرت داتا گنج بخشؒ نے دوسرے گروہ کا قول بھی نقل کیا ہے۔ ان کا نظریہ اس کے بالکل برعکس ہے اور وہ کہتے ہیں کہ "مَنْ وَجَدَ طَلَبَ" یعنی جس نے پالیا اس نے طلب کیا۔ ایسے لوگ درجِ بالا آیت کا ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ

وَالَّذِيْنَ هَدَيْنَا هُمْ سُبُلَنَا جَاهَدُوْا فِيْنَا　"جنہیں ہم نے راہ دکھائی انہوں نے ہی ہماری راہ میں مجاہدہ کیا"۔

اس قول کا مطلب یہ ہے کہ جن کو مشاہدہ یا قرب نصیب ہو وہی لوگ ہیں جو مجاہدات میں لگے رہے

ہیں۔اس موضوع پر نشانِ منزل کے صفحات ۱۴۴ تا ۱۶۱ مطالعہ فرمائیں۔حضرت داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں کہ لوگ کہتے ہیں کہ رسیدہ (یعنی پہنچا ہوا) آسودہ ہوتا ہے مگر طالب پر آرام اور آسودگی درست نہیں۔اس کو مجاہدہ کرتے رہنا چاہیے تاکہ مشاہدوں (وصول) کی راہ کھل جائے۔فرماتے ہیں کہ جو لوگ اطاعت کی طرف قدم اُٹھاتے ہیں، توفیقِ الٰہی بھی انہیں کا مقدر بنتی ہے۔علامہ اقبالؒ نے رسائی کا اصول یوں بیان فرمایا ہے۔

خودی روشن ز نورِ کبریائی است رسائی ہائے او از نارسائی است

(خودی اللہ تعالیٰ کے نور سے روشن ہے، انسان کی کوشش ناتمام میں ہی اس کی کامیابی ہے۔)

جدائی از مقامات وصالش وصالش از مقامات جدائی است (ا۔ح:۱۰۰۳)

(اس (اللہ) کا ہجر، اس کے مقاماتِ وصال میں سے ہے اور اس کا وصال مقاماتِ جدائی میں سے ہے۔)

جو کوئی واصل باللہ ہو گیا وہ بھی ایک بایزیدؒ ہے

حضرت شمس الدین سیالویؒ نے ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے۔

كُلُّ تَقِيٍّ وَنَقِيٍّ فَهُوَ الِيُ (نزہۃ المجالس) یعنی ہر متقی اور پاکیزہ میری (روحانی) اولاد میں ہے

آپؒ نے فرمایا کہ مرید بھی شیخ کی روحانی اولاد میں شامل ہوتا ہے۔جب مرید شیخ سے رابطہ قائم کرے تو وہ اپنے شیخ کی ذات میں اس طرح ڈوب جائے کہ اپنی کسی حرکت وسکون کو اپنی نہیں بلکہ پیر کا سمجھے حتیٰ کہ پیرو مرید کی صورت ایک جیسی ہو جائے۔فرماتے ہیں کہ شیخ بہاؤ الحق سہروردیؒ اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ جب ایک جگہ بیٹھ جاتے تو لوگ دونوں میں تمیز نہ کر سکتے تھے۔ان کا درجہ اتحاد اس قدر بڑھ گیا تھا کہ دونوں کی شکل و صورت بھی ایک ہو گئی تھی۔حضرت سیالویؒ فرماتے ہیں کہ مریدِ صادق کو اپنی حاجت پیر کے آگے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔پیر کی امداد ہر وقت مرید کو پہنچتی رہتی ہے۔فرماتے ہیں کہ مرید پیر کی محبت اور اطاعت میں اس طرح غرق ہو جائے کہ وہ خدا اور رسول ﷺ کے مظہر کو دیکھ سکے۔بقول مولانا رومیؒ۔

گر تو ذاتِ پیر را کردی قبول ہم خدا در ذاتش آمد ہم رسولؐ

گر جدا بینی زحق تو خواجہ را گُم کنی ہم متن ہم دیباچہ را

(اگر تو نے پیر کی ذات کو قبول کیا ہے تو پیر کی ذات میں خدا اور رسول دونوں شامل ہیں اور اگر تم نے خواجہ یعنی پیر کی ذات کو خدا سے جدا دیکھا تو گویا تم نے کتاب کا دیباچہ اور متن دونوں کو الگ کر دیا۔)

حضرت سیالویؒ نے فرمایا کہ ہر وقت تصورِ شیخ رکھنے سے نفسانی خیالات اور شیطانی وسوسوں سے رہائی ملتی ہے۔یہ رابطہ گناہوں کے مقابلے میں ڈھال ہے۔ذکر اور تصورِ شیخ سے مرید اپنی منزل مقصود تک جلد پہنچ جاتا ہے۔اولیائے کرام کے ہاتھ اور پاؤں چومنا جائز ہیں۔کیونکہ حدیث میں صحابہؓ نے حضور اکرم ﷺ کے

ہاتھوں اور پاؤں کو بوسہ دیا ہے بلکہ جبریلؑ نے بھی حضور اکرم ﷺ کو معراج پر لے جانے سے پہلے آپ ﷺ کے تلوؤں کو بوسہ دیا، مگر اولیائے کرام کے علاوہ امراء اور سلاطین کے ہاتھوں کو بوسہ دینا جائز نہیں۔ ہر سلسلہ میں ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق مقامِ محبوبیت حاصل کرتا ہے اور حضرت بایزید بسطامیؒ کی طرح اپنی ایک انفرادیت قائم کرسکتا ہے۔

تو مگو کاندر جہاں یک بایزیدےؒ بود و بس ہر کہ واصل شد زجاناں بایزیدےؒ دیگر است

(تم یہ نہ کہو کہ دنیا میں صرف ایک ہی بایزیدؒ ہوگزرا، بلکہ جو خدا سے واصل ہوگیا، وہ بھی ایک طرح کا بایزیدؒ ہے)

ہر شخص یہی سوچتا ہے کہ میں کسی صورت میں بزرگی میں قدم نہیں رکھ سکتا، لیکن لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سب کی روحوں کو راہ خدا میں عمل پیرا ہونے کی استطاعت بخشی ہے۔ اگر کوئی شخص کوشش کرے اور اسی طرز پر اپنی زندگی کو ڈھال لے جس پر حضرت داتا گنج بخشؒ نے اپنے شب و روز کو ڈھالا، اگرچہ داتا گنج بخشؒ کے مقام و مرتبہ پر تو نہ پہنچ سکے گا۔ (کیونکہ اس کے لئے ویسا عمل کرنا ممکن نہیں) لیکن اس مقام کے آس پاس کہیں پہنچ ہی جائے گا۔ قانونِ مکافاتِ عمل اللہ کی طرف سے سب کے لئے یکساں ہے۔ اَن پڑھ، بے وقوف اور نالائق شخص بھی اپنی کوششوں کو زیادہ کردے تو اس کی کوششوں کے مطابق اسے ضرور مقام عطا کیا جاتا ہے۔

واصل باللہ ہونے کے لئے سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ عبادات اور ریاضات کی ادائیگی میں اخلاصِ نیت کو مدنظر رکھے۔ حضرت سلطان باہوؒ فرماتے ہیں کہ اگر عبادت سے رب کا ملنا ممکن ہوتا تو مسجد کے مولویوں سے زیادہ واصل باللہ کوئی نہ ہوتا، اور نہانے دھونے سے ملتا تو مچھلیوں اور مینڈکوں کو ملتا اور آخر میں فرماتے ہیں۔

رب انہاں نوں ملدا باہُو نیتاں جنہاں دیاں سچیاں ہُو

واصل باللہ ہونے کی نسبت جنت میں داخل ہونے کی راہ قریب ہے

حضرت ابوالحسن خرقانیؒ فرماتے ہیں کہ جنت میں داخلہ کی راہ قریب ہے لیکن واصل باللہ ہونے کی راہ دور ہے۔ فرماتے ہیں کہ انسان کو دن میں تین ہزار بار مر کر زندہ ہونا چاہیے۔ پھر کہیں جا کر شاید ایسی حیات جاوداں حاصل ہوسکے جس کے بعد موت نہیں۔ (نفی اثبات میں اپنے وجود کو ختم کرنا اور پھر وجود میں آنے کا عمل پایا جاتا ہے۔ اس سے مر مر کر زندہ ہونا مراد ہے۔ ایسے ہی اچھی خواہشات کو اس طرح ترک کرنا کہ ہر خواہش پر دم نکلے، بار بار مرنے کے مترادف ہے) آپ فرماتے ہیں کہ جب تم راہِ خدا میں اپنی ہستی کو فنا کرلو گے تو تمہیں ایسی ہستی مل جائے گی جو فنا ہونے والی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے بندے پر ایک ایسا راستہ کھل جاتا ہے جس سے معرفت و شہادت نصیب ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس راستے سے بندے پر خود کو ظاہر کردیتا ہے۔

حضرت ابوالحسن خرقانیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر بندے کو کسی نہ کسی مشکل سے دوچار کر کے اپنے سے جدا کر دیتا ہے لیکن شجاعت یہ ہے کہ بندہ تمام چیزوں کو چھوڑ کر خدا سے رابطہ قائم کر لے اور اسے اپنے سے کبھی جدا ہی نہ کرے۔ فرمایا زمین پر بہت سے چلنے پھرنے والے لوگ مردہ ہیں اور زمین میں بہت سے مدفون لوگ زندہ ہیں۔ فرمایا کہ عبادت و معصیت (گناہوں) کو چھوڑ کر خدا کے بحرِ کرم اور دریائے بے نیازی میں اس طرح غوطہ لگاؤ کہ خود کو نیست کر کے اس کی ہستی میں ابھر آؤ۔ جس کی زندگی خدا کے ساتھ وابستہ نہیں ہوتی، وہ اپنے نفس و قلب اور روح پر قدرت نہیں رکھ سکتا۔ خدا کے ہمراہ مشاہدہ کرنے کا نام ہی بقا ہے۔ خدا اپنے کرم سے اپنی مخلوق میں جس کو چاہے، اپنی ذات سے (بذریعہ صفات) آگاہ فرما دیتا ہے۔

باب ۱۲

تصوف پر ایک سرسری نظر

تصوف کی تاریخ اور اس کی طرف غلط نسبتیں جو قائم کی گئیں

ایک بڑی قوت کو سلب کرنے کے لئے دوسری بڑی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ حضرت امیر معاویہؓ کا قول ہے کہ بڑے کاموں کو انجام دینے کے لئے بڑی صلاحیتوں اور قربانیوں سے کام لینا ہوتا ہے۔ ان اقوال سے اس بات کا ثبوت مہیا ہوتا ہے کہ تصوف یا طریقت جیسے نیک کام کو میدانِ عمل سے خارج کرنے کے لئے دشمنانِ اسلام کو بے حد دشوار کاوشوں اور مشکلات کا سامنا کرنے کی نوبت آئی۔ بے تحاشا سرمایہ کاری اور بے حد دشواریوں کے بعد اس حزبِ مخالف نے مسلمانوں کے دلوں سے دینی اور پھر روحانی علوم کی چاہتوں کا نہ صرف قلع قمع کر دینے کی کوشش کی بلکہ انہوں نے ان علوم سے نفرت آمیز تاثر پیدا کر کے مسلمانوں کو تصوف سے منحرف بھی کرنا چاہا۔ افسوس کی بات ہے کہ اس مخاصمتِ طریقت میں مسلمانوں کے کچھ طبقوں نے پورا تعاون کیا اور اس کے خلاف اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی۔ اپنوں اور غیروں کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ جو تصوف حضرت جنیدؒ و بایزیدؒ کو جان سے بھی زیادہ عزیز تھا، اب اسے معیوب سمجھا جانے لگا۔

اسلام دشمنی اور بنا بریں تصوف دشمنی کا پس منظر راقم الحروف کی کتاب "بیعت اور اس کی تشکیل" میں بیان کیا جا چکا ہے اور اس سے متعلق کچھ تفصیل اس کتاب بھی میں بیان کر دی گئی ہے۔ یہاں اس تحریر کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس بات سے خبردار کیا جائے کہ تصوف سے یہ دشمنی کا رویہ دشمنانِ اسلام نے اس غرض سے اختیار کیا ہے کہ مسلمان عوام، اولیائے کرام کے ساتھ اختلاط اور اخذِ فیض سے محروم ہو جائیں۔ اس غلط انواع کی نشر و اشاعت کا اثر یہ ہوا ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت کے دلوں میں تصوف کے نام سے ایک قسم کی چڑ پیدا ہو گئی ہے اور اب وہ اس کا نام سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ بیچارہ مسلمان اس بات پر کبھی غور نہیں کرتا کہ انگریزوں نے عربوں میں "السلام علیکم" کی بجائے "صَبَاحَ الْخَیْر" جو (Good Morning) کا ترجمہ ہے کو کیوں رواج دیا؟ فرسٹ اپریل فول (First April fool) مسلمانوں میں کیوں منوایا جاتا ہے؟ کتوں کے نام سلطان ٹیپو کے نام پر کیوں رکھے گئے؟ معمولی حجاموں کو خلیفہ صاحب کا نام کیوں دیا؟ مولوی کو مُلا کے نام سے موسوم کیوں کیا گیا؟ مغلیہ خاندان کے بادشاہوں کا لباس چپڑاسیوں کو پہنا کر انگریزوں نے اپنے دفاتر

کے دروازں پر کھڑا کیوں کیا؟ روحِ اسلام کو مسلمانوں کے بدن سے کیوں نکال دیا گیا؟ اور تصوف کو بھیانک روپ چڑھا کر غلط رنگ میں پیش کر کے اس کو ترک کرنے پر علماء کے فتوے کیوں دلوائے گئے؟ ان سب سوالوں کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے دین سے دور کیا جائے اور مسلمانوں کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ وہ مذکورہ تمام علامات کا بڑی خوشی سے نشانہ بن رہے ہیں (اور خود بھی اپریل فول مناتے ہیں)۔

علامہ اقبالؒ نے دشمنانِ اسلام کے ان ڈھکوسلوں کا متعدد بار ذکر کیا ہے۔ آپ کے کچھ اشعار بیان کی مناسبت سے مختلف مقامات پر بیان کر دیئے گئے ہیں۔ اس جگہ بھی چند اشعار مضمون کی تشریح کے لئے پیش کیے جا رہے ہیں۔ علامہؒ کے زمانے میں یہ غلط رنگ کا تصوف جسے اہلِ مغرب نے مسلمانوں کو دھوکا دینے اور بھکانے کے لئے رائج کیا تھا، کافی زوروں پر تھا اور علامہؒ نے اپنے کلام میں جہاں کہیں خانقاہی نظام اور تصوف کا نام لیا ہے، وہاں آپ کی مراد اس قسم کے جعلی تصوف کی طرف اشارہ کرنا ہے۔

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
(ا۔ح:۶۵۴)

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں
ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے
(ا۔ح:۶۵۵)

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مُہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے
(ا۔ح:۶۵۶)

مذکورہ بالا اشعار میں ابلیس کی طرف سے بولے گئے الفاظ "وہی شعر و تصوف" مسلمان کے لئے ایک خاص تصوف تجویز کرنے کا مشورہ ظاہر کرتے ہیں جو مومن کی نظروں سے حقیقی تصوف کو چھپا دے۔ ان اشعار میں مومنوں کو ذکر و فکر میں مست رکھتے ہوئے مزاجِ خانقاہی میں پختہ کر دینے کا بھی مشورہ دیا جا رہا ہے۔ ان اشعار میں ایسے فرسودہ تصوف کا ذکر کیا جا رہا ہے جو انگریزوں نے مسلمانوں میں بہت مشکلوں اور مصیبتوں کے بعد جذبۂ تصوف کو ناکام کرنے کے لئے پھیلایا تھا۔ اس بات پر غور کرنا ضروری ہے کہ ذکر و فکر تو اسلام میں بہت بڑا مقام رکھتے ہیں اور علامہ اقبالؒ نے ذکر و فکر کی تعریف میں بہت کلام تحریر فرمایا ہے۔ اسی طرح جنیدؒ اور بایزیدؒ کے تصوف کو علامہ اقبالؒ نے ہمیشہ عزت کی نظر سے دیکھا اور ان بزرگوں کا بہت احترام کیا ہے۔ مثنوی

اور مسافر میں بہت سے بزرگوں کی آپ نے جی کھول کر تعریف کی ہے کیونکہ یہ تمام بزرگ، تصوف کی دُنیا میں بہت بڑے اسلامی راہنما تھے۔ ان اشعار کے مطالعہ کے بعد یہ معلوم ہوا کہ انگریزوں کا پھیلایا ہوا تصوف اور اولیائے عظام کا تصوف جو حقیقی تصوف کا درجہ رکھتا ہے، ان دونوں انواع کے تصوف کو ایک دوسرے کے ساتھ ملانا سراسر ظلم ہے۔ ہم لوگ تقسیم ہند سے پہلے کفارِ ہند کو یہ کہا کرتے تھے کہ آپ لوگ کسی مسلمان کو بُرا کام کرتے ہوئے دیکھتے ہو تو یہ نہ کہو کہ اسلام بُرا ہے بلکہ یہ کہو کہ فلاں شخص زید یا بکر بُرا ہے۔ تصوف کے غلط معنی لینے والے واقعی بُرے لوگ ہیں مگر اس کا معنی یہ نہیں کہ اپنے چند علماء کی طرح کوئی تصوف کو ہی بُرا بھلا کہنے لگے۔ یہ تو کفار کے طرزِ عمل پر چلنے کی مانند ہے۔

تصوف کا ابتدائی جائزہ

دوسری صدی کے اواخر میں زہد کی جگہ تصوف نے لے لی اور پہلا صوفی حلقہ قائم ہوا۔ تصوف جس زندگی اور فکر کی ترجمانی کرتا ہے، اسے روحانی اور الہامی کہتے ہیں۔ یہ نظامِ حیات دین کے علمی پہلوؤں کے بالمقابل قلب کے معاملات، عبادات کے داخلی اثرات اور ان احوال یا روحانی فوائد کو ملحوظ رکھنے پر زور دیتا ہے جو قلب پر مرتب ہوتے ہیں اور اس میں تزکیۂ نفس اور تطہیرِ قلب کے لئے کچھ نئے طریقے دریافت کئے گئے ہیں اور روحانی عروج اور احوال و مقامات کو معینہ طریقوں سے ممکن بنایا گیا جس کے نتیجے میں غیب کے معانی کا کشف دائرہ امکان میں آ گیا۔ اسی کشفِ معانی غیب کو جس کے بارے میں منجانب اللہ ہونے کا عقیدہ قائم کیا گیا ہے، علمِ لدنی یا علمِ باطن کہتے ہیں۔

تصوف پر مزید گفتگو مختلف ابواب میں ہو چکی ہے۔

باب ۱۳

تصوف پر مشائخ عظام کی آراء

حضرت داتا گنج بخشؒ نے ولی کی ولایت اور کرامات پر کشف المحجوب میں بہت طویل بحث فرمائی ہے اور فرماتے ہیں کہ ”اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کچھ بندوں کو اپنا دوست بناتا ہے۔“ اہل ذوق حضرات اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ”اللہ کے دوستوں کو دنیوی مال و دولت سے بے نیازی اور صرف ذات خداوندی سے محبت ہوتی ہے، ان کے چہرے نورانی ہوتے ہیں، جب لوگ ڈرتے ہیں تو وہ نہیں ڈرتے اور جب دوسرے لوگ غمزدہ ہوں تو یہ غمزدہ نہیں ہوتے، ایسے لوگ جب دنیا میں نہ رہیں گے تو قیامت آجائے گی۔“

تصوف پر صوفیائے کرامؒ کے اقوال

چند مستند علماء وصوفیاء کے اقوال تصوف کی وضاحت میں ملاحظہ فرمائیں:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ دنیا کی صفائی کی گئی اور کدورت باقی رہ گئی ہے۔ بس آج کل ہر مسلمان کے لئے موت ایک تحفہ ہے۔ (رسالہ قشیریہ، ص، ۵۰۹)

صوفیائے کرامؒ کے اقوال حسب ذیل ہیں

۱۔ حجۃ الاسلام حضرت امام غزالیؒ: امام صاحب ”المنقذ من الضلال“ میں فرماتے ہیں ”جب میں ان علوم سے فارغ ہو کر صوفیہ کے طریقے کی طرف متوجہ ہوا تو معلوم ہوا کہ ان کا طریقہ علم و عمل سے تکمیل کو پہنچا ہے، ان کا علم نفس کی گھاٹیوں کو طے کرنا ہے، اخلاقِ ذمیمہ اور صفاتِ خبیثہ سے پاک و منزّہ ہونا ہے تاکہ اس کے ذریعے قلب کو غیر اللہ سے خالی کیا جائے اور اس کو ذکر الٰہی سے آراستہ کیا جائے۔ آپؒ نے اپنے درس و تدریس کے زمانہ کو باطل زمانہ اور بربادی کا وقت قرار دیا۔

آپؒ فرماتے ہیں کہ میں نے دس سال مجاہدہ کے لئے خلوت گزینی اختیار کی۔ اسی خلوت کے دوران مجھ پر ایسے امور کا انکشاف ہوا جن کا احاطہ و اندازہ بھی ممکن نہیں۔ لیکن امورِ نافعہ کا تذکرہ یہاں ضروری ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ صوفیائے کرام ہی معرفت الٰہی کی راہ پر گامزن ہیں، ان کی سیرت سب کی سیرتوں سے بہتر ہے بلکہ ان کا طریقہ سب کے طریقوں سے درست، ان کا خُلق سب کے

اخلاق سے پاکیزہ ہے بلکہ اگر تمام عقلاء کی عقل، حکماء کی حکمت، علماء کا علم اور اس کے اسرار و معارف کو جمع کر لیا جائے، تب بھی ان کی سیرت و اخلاق سے بہتر نہیں ہو سکتے کیونکہ ان کے تمام ظاہری و باطنی حرکات و سکنات براہ راست سینۂ نبوت کے نور سے فیض یاب و مستنیر ہوئے ہیں اور اس کائنات میں نورِ نبوت سے بڑھ کر اور کوئی نور نہیں جس سے روشنی حاصل کی جائے۔

۲۔ ابوالقاسم قشیریؒ: فرماتے ہیں۔

اَلصَّفَا مَحْمُوْدَةٌ بِكُلِّ لِسَانٍ وَ ضِدُّهُ اَلْكُدُوْرَةُ وَهِيَ مَذْمُوْمَةٌ

"صفا ہر زبان میں محمود کا معنی رکھتا ہے اور اس کی ضد کدورت ہے اور وہ مذموم ہے"۔

۳۔ حضرت معروف کرخیؒ: آپؒ فرماتے ہیں کہ "خدا کے اولیاء یعنی خدا کے دوستوں کی تین نشانیاں ہوتی ہیں۔ ان کا خیال خدا کے حضور میں رہتا ہے، ان کا رہن سہن خدا کے ساتھ ہوتا ہے، ان کا سارا کاروبار بھی خدا کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔

۴۔ حضرت بایزید بسطامیؒ: آپؒ نے فرمایا کہ دنیا کے لالچ سے باز رہو تا کہ اس کے پھندے سے نجات ملے۔

نیکو مثلے شنو ز پیر بسطامی از دانۂ طمع ببیر کہ رُستی از دام

(ایک اچھی مثال پیر بسطامؒ سے سنو۔ دانے کی طمع نکال دو تا کہ پھندے سے نجات پا سکو)

۵۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ: آپؒ فرماتے ہیں کہ بلا حرکتِ اعضاء قلب کا مطمئن ہونا، فراخ و کشادہ سینہ، روشن چہرہ، باطن آباد اور تعلق الٰہی کی وجہ سے تمام چیزوں سے بے پرواہ ہونا تصوف ہے۔

۶۔ حضرت شبلیؒ: آپؒ نے فرمایا صوفی خلق سے منقطع اور حق سے منسلک ہوتا ہے، وہ غیر حق کے لئے نہ سود و زیاں ثابت کرتا ہے اور نہ منع و عطا۔ وہ بلا و عطا میں خدا کو ہی فاعل سمجھتا ہے۔

۷۔ حضرت ابوسلیمان درانیؒ: آپؒ فرماتے ہیں کہ جب عارف کی روحانی آنکھ کھل جاتی ہے تو اس کی جسمانی آنکھ بند ہو جاتی ہے، وہ ذاتِ حق کے سوا کسی چیز کو نہیں دیکھ سکتا۔

۸۔ ذوالنون مصریؒ: (الف) آپؒ فرماتے ہیں کہ صوفی وہ ہیں جنہوں نے تمام کائنات میں صرف اللہ کو پسند کیا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی ان کو ہی پوری کائنات میں پسند کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر خدا کو اختیار کر لینا ہی تصوف ہے۔

(ب): آپ فرماتے ہیں خدا کی معرفت وجد سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ جو خدا کی سب سے زیادہ معرفت رکھتا ہے، وہی اُس میں سب سے زیادہ گم ہے۔

۹۔ حضرت ابو علی رودباریؒ: آپؒ نے فرمایا کہ صوفی وہ ہے جو صفائے قلب کے ساتھ صوف پوشی اختیار کرتا ہے۔ نفس کو سختی کا مزہ چکھاتا ہے۔ شرع مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کو لازم کر لیتا ہے اور دنیا کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔

۱۰۔ حضرت خواجہ جنید بغدادیؒ: آپؒ فرماتے ہیں کہ "ایک صوفی صحیح معنوں میں صوفی نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس زمین کی مانند نہ ہو جس پر نیک و بد بھی چلتے ہیں۔ (کتاب المیثاق)۔ آپ کا قول یہ بھی ہے کہ محض خدا کے لئے جینا مرنا تصوف ہے۔

۱۱۔ حضرت رویمؒ: آپؒ فرماتے ہیں کہ نفس کو حق تعالیٰ کے ساتھ حق تعالیٰ کے ارادے پر چھوڑ دینا ہی تصوف کی بنیاد ہے۔ مزید فرمایا اپنے آپ کو بالکل خدا کے ہاتھ میں دے دینا تصوف ہے۔

۱۲۔ حضرت ابو سعید ابوالخیرؒ: آپؒ فرماتے ہیں۔

اَلتَّصَوُّفُ تَرْکُ التَّکَلُّفِ　　یعنی تصوف تکلف کو ترک کر دینا ہے۔

تکلف میں خودی اور تکبر ہوتا ہے۔ تکلف چھوڑ دیا جائے تو تمام چیزیں ختم ہو جاتی ہیں۔

۱۳۔ حسین بن منصورؒ: آپؒ نے فرمایا: صوفی وحدانی الذات ہوتا ہے، نہ اس کو کوئی قبول کرتا ہے اور نہ وہ کسی کو قبول کرتا ہے۔ آپ کی مراد یہ ہے کہ ایسا شخص صوفی ہے کہ نہ اس کو کوئی پسند کرے اور نہ وہ کسی کو پسند کرے یہی تصوف ہے اس کے ظاہر اور باطن میں اللہ بس جاتا ہے اور وہ غیر اللہ سے منقطع ہو جاتا ہے۔

۱۴۔ حضرت الکتانیؒ: آپؒ نے فرمایا تصوف خُلق کا نام ہے جو شخص اخلاق حسنہ میں تجھ سے بڑھ گیا وہ تجھ سے صفائے قلب میں بھی بڑھ گیا۔

۱۵۔ ابو سہیل الصعلوکیؒ: آپؒ نے فرمایا۔

اَلْاِعْرَاضُ عَنِ الْاِعْتِرَاضِ　　یعنی اعتراضات سے منہ موڑ لینا تصوف ہے۔

۱۶۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ: آپؒ فرماتے ہیں کہ وہ ہمارے گروہ میں سے نہیں جس نے کتاب اللہ پر غور نہ کیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ میں فہم و بصیرت حاصل نہ کی، وہ ہم میں سے نہیں جس نے ایسے علماء کی صحبت ترک کر دی ہو جو صوفیاء ہیں اور انہیں کتاب و سنت میں درک ہے۔ وہ ہم میں سے نہیں جو ایسے اصحابِ علم سے کنارہ کش ہو گیا ہو جو تصوف میں بہرہ ور یعنی حصہ رکھتے ہوں اور ایسے محدثین کی صحبت میں نہ بیٹھے جو محدثین کے ساتھ فقہاء بھی ہوں۔ وہ ہم میں سے نہیں جس نے ایسے فقہاء کی صحبت ترک کر دی ہو جو علمِ حدیث بھی جانتے ہیں۔ باقی رہے جاہل صوفیاء اور جاہل علماء جو تصوف کا انکار کرتے ہیں تو وہ دونوں چور اور راہزن ہیں، ان سے بچنا چاہیے۔ (شاہ ولی اللہ کا فلسفہ نفسیات اور تصوف، ص ۴۹)

۱۷۔ حضرت ابو بکر حریریؒ: آپؒ فرماتے ہیں کہ برے اخلاق سے بری اور اخلاق حسنہ کا جامع ہونا تصوف ہے۔ شریعت میں پہلے علم حاصل ہوتا ہے اور پھر اس پر عمل کیا جاتا ہے۔ مگر تصوف میں پہلے عمل ہوتا ہے اور پھر علم

ہوتا ہے جیسا کہ علامہ اقبالؒ نے فرمایا "کھلتے نہیں اس قلزم خاموش کے اسرار، جب تک تو اسے ضرب کلیمی سے نہ چیرے" ذکر کے اسرار ذکر کے بعد ہی کھلتے ہیں۔

۱۸۔ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ: آپؒ فرماتے ہیں کہ ہم صوفیہ کے معنی مقربین ہی کے سمجھتے ہیں۔

۱۹۔ محمد بن القصابؒ: آپؒ نے فرمایا تصوف اخلاقِ کریمہ ہیں جو بہترین زمانہ میں بہتر شخص سے بہتر قوم کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔

۲۰۔ عمرو بن عثمان مکیؒ: آپؒ نے فرمایا کہ صوفی نقد وقت کی قیمت جانتا ہے اور ہر وقت جس کا ہوتا ہے، اس کا ہو کر رہتا ہے۔

۲۱۔ ابو محمد الجریریؒ: تصوف ہر نیک خصلت سے مزین ہونا اور تمام بری عادتوں سے قلب کا تخلیہ کرنا ہے "اَلدُّخُوْلُ فِیْ کُلِّ خُلُقٍ حَسَنٍ وَ الْخُرُوْجُ مِنْ کُلِّ خُلُقٍ دَنِیٍّ"۔

۲۲۔ ابو علی قزوینیؒ: آپؒ نے فرمایا۔

اَلتَّصَوُّفُ ھُوَ الْاَخْلَاقُ الْمَرْضِیَّةُ یعنی تصوف پسندیدہ اخلاق کا نام ہے۔

۲۳۔ ابو الحسن نوریؒ (م ۲۷۵ھ): آپؒ فرماتے ہیں کہ صوفی وہ ہے جس کی روح بشریت کی کدورت سے آزاد ہو گئی ہو اور یہ لوگ غیر اللہ سے بھاگتے ہیں۔ یہ لوگ نہ کسی چیز کے مالک ہوتے ہیں اور نہ کسی کے مملوک یعنی "تصوف مولیٰ سے دوستی اور دنیا سے دشمنی کا نام ہے۔"

اَلتَّصَوُّفُ تَرْکُ کُلِّ حَظٍّ لِّلنَّفْسِ یعنی تصوف حظِ نفس کا ترک ہے۔

اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ اپنے نفس کو اللہ کے تابع کردے یہ کہ نفس کی اتباع کو ترک کر دیا جائے کیونکہ یہ نفس راہِ خدا سے گمراہ کر دیتا ہے۔

تصوف کی عالمانہ اور صوفیانہ تعریف

تصوف کیا ہے؟ اس کا اندازہ صوفیائے کرام کے بیان کردہ الفاظ سے بخوبی ہو سکتا ہے کیونکہ اولیائے کرام کا یہ گروہ تصوف کی تعریف بیان کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں چند اولیائے عظام کی وضاحت قارئین کی نذر کی جارہی ہے جس سے یہ اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ تصوف کی راہ دینِ محمدی ﷺ کی راہوں پر سختی سے چلنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حقیقتاً تصوف اللہ تعالیٰ کے ساتھ بلا واسطہ دل کے قائم کرنے کا نام ہے۔ تمام اولیائے کرام اسی راہ سے واصل باللہ ہوئے ہیں۔ مختلف صوفیائے کرام نے تصوف کی وضاحت کے لئے جو خیال آرائی کی ہے، ان میں سے چند ایک کی تحریریں مختصراً پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ حضرت جنید بغدادیؒ: آپؒ فرماتے ہیں کہ اہل تصوف کا علم کتاب و سنت ہی سے استوار اور مستحکم ہوتا

ہے۔ یاد رہے کہ حضرت شبلیؒ اور حضرت نوریؒ کو اس وقت کی حکومت نے گرفتار کر لیا تھا کیونکہ ان کے خلاف یہ شکایت تھی کہ یہ دونوں صوفی بے دینی پھیلا رہے ہیں ان دونوں صوفیوں سے ایسے سوالات کیے گئے جو نہایت دقیق اور فقہ سے متعلق تھے لیکن انہوں نے ایسے واضح جوابات دیئے کہ سب لوگ دنگ رہ گئے اور آخر ان لوگوں کو رہا کرنا پڑا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہل تصوف کے لئے شریعت کا علم اور عمل نہایت ضروری ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں" تصوف کی راہ صرف وہی پا سکتا ہے جس کے دائیں ہاتھ میں قرآن اور بائیں ہاتھ میں حدیث وسنتِ رسول اللہ ﷺ ہو۔ ان دونوں چراغوں کی روشنی میں راستہ طے کرے تا کہ نہ تو شرک کے گڑھے میں گرے اور نہ بدعت کے اندھیروں میں بھٹکے۔" حضرت جنید بغدادیؒ کا یہ بھی قول ہے کہ صوفی فانی زخویش اور باقی بحق ہوتا ہے یعنی وہ اپنی قیومیت ذاتیہ سے فانی ہو کر حق تعالیٰ کی قیومیت (ہویت اور انا) سے باقی ہوتا ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا کہ عارف وہ ہے کہ جب حق تعالیٰ اسرارِ پنہاں سے گفتگو کرتا ہے تو وہ خاموش رہتا ہے۔ صوفی وہ ہے کہ جس میں اسماعیلؑ کی طرح تسلیم ورضا، حضرت داؤدؑ کی طرح اندوہ وغم، عیسیٰؑ جیسا فقر اور حضرت ایوبؑ جیسا صبر اور موسیٰؑ جیسا شوق اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ جیسے اخلاق عالیہ ہو۔

۲۔ حضرت معروف کرخیؒ: آپؒ فرماتے ہیں کہ" حقائق کو گرفت میں لانا، دقائق پر گفتگو کرنا، خلائق کے پاس جو کچھ ہے اس سے ناامید رہنا تصوف ہے۔" حضرت معروف کرخیؒ مزید فرماتے ہیں کہ تصوف حقائق کی گرفت اور خلق سے مایوسی ہے۔

۳۔ حضرت ابوبکر: آپؓ کے اس رازدارانہ علم کے متعلق اہلِ تصوف کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ ان سے اس پر گفتگو کرتے تھے تو حضرت عمرؓ کی حالت نہ سمجھنے والے حبشی کی طرح ہوتی ہے جیسا کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے۔

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا تَكَلَّمَ مَعَ اَبِىْ بَكْرٍ كُنْتُ كَالزَّنْجِي الَّذِىْ لَا يَفْهَمُ

"رسول اللہ ﷺ جب حضرت ابو بکرؓ سے بات کرتے تھے تو میری حالت اس حبشی جیسی ہوتی تھی جو سمجھتا نہ ہو"۔

حضرت علیؓ کو بھی اس علم کا وافر حصہ ملا تھا۔ شیخ ابونصر سراج طوسیؒ فرماتے ہیں۔

ذَاكَ اِمْرَءٌ اُعْطِىَ عِلْمُ اللَّدُنِّىْ وَالْعِلْمُ اللَّدُنِّىْ هُوَ الْعِلْمُ الَّذِىْ خُصَّ بِهِ الْخِضَرُ عَلَيْهِ السَّلَامُ (کتاب اللمع ص ۱۲۹)

"یہ وہی ذاتِ گرامی ہے جنہیں علمِ لدنی عطا فرمایا گیا۔ اور علم لدنی وہ علم ہے جو خاص طور پر حضرت خضر علیہ السلام کو دیا گیا"۔

اس سلسلہ میں حضرت علیؓ کی طرف یہ قول منسوب کیا جاتا ہے۔

عَلَّمَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سَبْعِیْنَ بَابًا مِّنَ الْعِلْمِ لَمْ یَعْلَمْ ذٰلِکَ اَحَدٌ غَیْرِیْ

"رسول اللہ ﷺ نے مجھے ستر قسم کے علوم سکھائے جنہیں میرے علاوہ کوئی نہیں جانتا"۔

یہ قول حضرت علی کے اس قول کے مخالف ہے جو بخاری شریف میں مذکور ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے بھی حضرت علیؓ کو علم و معاملہ طریقت میں اہل تصوف کا امام بتایا ہے۔ شیخ ہجویریؒ فرماتے ہیں۔

پس اهل ایں طریقت اقتدا بد و کنند به حقائقِ عبادات و د قائق اشارات و تجرید از معلوم دنیا و آخرت و نظاره اندر تقدیرِ حق (کشف المحجوب ص ۶۱)

"اس راہ میں لوگ عبادات کی حقیقتوں، اشارات کی باریکیوں دنیا و آخرت سے بیگانگی اور تقدیر الٰہی کے مشاہدہ کیلئے انہیں کی پیروی کرتے ہیں"۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں: تمام صوفیہ کا نسلاً بعد نسلٍ اس بات پر اتفاق چلا آرہا ہے کہ طریقت کے سارے سلسلے حضرت علیؓ کی طرف راجع ہیں۔" ان سلسلوں کے حضرت علی تک پہنچنے کی وجہ شاہ صاحب نے یہ بتائی ہے کہ انہوں نے ہی سب سے پہلے جذب کا دروازہ کھولا اور وہی اس امت کے پہلے مجذوب اور پہلے صوفی و عارف ہیں۔ (فیوض الحرمین ص ا، اللمعات ص ۲۵)

مذکورہ بالا بیانات سے علمائے متقدمین اور مشائخ عظام کا چند پیچیدہ علوم کی طرف اشارہ ملتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اولیائے کرام کو اللہ تعالیٰ نے ظاہری علوم کے علاوہ باطنی علوم سے بھی نوازا ہے۔ یہ باطنی علوم تو اولیائے کرام یعنی اہل طریقت کے حصے میں ہی آئے ہیں اور دوسروں کو اس علم کی طرف رغبت ہونا بہت دور کی بات ہے۔

تصوف کی تعریف صوفی کے احوال و مقام کی کیفیت پر منحصر ہے

تصوف کا تعلق احوال و مقامات سے ہے اور احوال و مقامات کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ہر وقت متغیر و متبدل ہوتے رہتے ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ ہر آن ارتقاء پذیر رہتے ہیں لہٰذا اساطین فن جن احوال و مقامات میں رہے یا جس طرح کی کیفیات کا ان پر غلبہ رہا، انہوں نے اسی کے مطابق تصوف کی تعریف کردی۔ ان تعریفات میں جو اختلاف نظر آئے وہ حقیقی یا اساسی نہ سمجھا جائے بلکہ اس اختلاف کو احوال و مواجید کے اختلاف پر مبنی تصور کیا جائے کیونکہ حقیقت واحد ہے، اظہار کے پیرائے مختلف ہیں۔

عِبَارَتُنَا شَتّٰی وَ حُسْنُکَ وَاحِدٌ وَ کُلٌّ اِلٰی ذَاکَ الْجَمَالِ یُشِیْرُ

(ہماری عبارتیں مختلف ہیں لیکن تیرا حسن ایک ہی ہے اور ساری عبارتیں اس ایک حسن کی طرف اشارہ کرتی

ہیں) لہٰذا تصوف کی جامع اصطلاحی تعریف کرنے کے لئے زیادہ مناسب ہے کہ اسے تین مختلف ادوار یا کیفیات پر تقسیم کردیا جائے۔

(۱) متقدمین صوفیہ کی تعریف (۲) مجاہدات سے گزرنے والے صوفیہ کی تعریف (۳) وہ تعریفات جن کا تعلق ذوق یا ایک خاص کیفیت سے ہے۔

(۱) متقدمین صوفیاء کی تعریف

اس میں چند مشائخ کی تعریف بیان کی جارہی ہیں۔

(الف) حضرت معروف کرخیؒ نے فرمایا۔

اَلتَّصَوُّفُ اَلْاَخْذُ بِالْحَقَائِقِ وَالْیَأْسِ مِمَّا فِیْ اَیْدِی الْخَلَائِقِ (السہروردی عبدالقاہرین عبداللہ، عوارف، ۵۳، بیروت)

"تصوف حقیقت کی معرفت حاصل کرنے کا نام ہے اور، اُن چیزوں سے بیزاری جو مخلوقات کے ہاتھ میں ہیں"۔

(ب) حضرت رویمؒ نے فرمایا۔

اَلتَّصَوُّفُ مَبْنِیٌّ عَلٰی ثَلَاثِ خِصَالٍ اَلتَّمَسُّکُ بِالْفَقْرِ وَ الْاِخْتِصَارِ وَ التَّحْقِیْقُ بِالْبَذْلِ وَ الْاِیْثَارِ وَ تَرْکُ التَّعَرُّضِ وَ الْاِخْتِیَار

"تصوف کی بنیاد تین عادتوں پر ہے فقر و اختصار کی راہ پر قائم رہنا۔ سخاوت و ایثار اختیار کرنا اور تعرض اور اختیار کو ترک کرنا (یعنی رضا بالقضاء)"

(۲) مجاہدات سے گزرنے والے صوفیاء کی تعریف

اس میں الجریری اور نوری کا بیان پیش کیا جارہا ہے۔

(الف) حضرت ابو محمد الجریریؒ آپؒ نے تصوف کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا۔

هُوَ الدُّخُوْلُ فِیْ کُلِّ خُلُقٍ سَنِیٍّ وَالْخُرُوْجُ مِنْ کُلِّ خُلُقٍ دَنِیٍّ (الرسالہ القشیریہ)

"تصوف جملہ اخلاق فاضلہ کو حاصل کرنے اور جملہ عادات دنیّہ سے چھٹکارا حاصل کرنے کو کہتے ہیں"۔

(ب) نوریؒ نے فرمایا۔

لَیْسَ التَّصَوُّفُ رَسْمًا وَّلَا عِلْمًا وَّ لٰکِنَّهٗ خُلُقٌ لِاَنَّهٗ لَوْ کَانَ رَسْمًا لَحَصَلَ

"تصوف کسی رسم و مرتبے کا نام ہے نہ کسی علم کا۔ یہ تو صرف مکارم اخلاق کا نام ہے کیونکہ اگر یہ

بِالْمُجَاهَدَةِ وَلَوْ كَانَ عِلْمًا لَحَصَلَ بِالتَّعْلِيمِ لٰكِنَّهُ تَخَلُّقٌ بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ (نشاۃ التصوف)

کوئی مرتبہ ہوتا تو مجاہدے سے حاصل ہو جاتا یا کوئی علم ہوتا تو تعلیم کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا تھا۔ یہ تو دراصل تَخَلُّقٌ بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ (اللہ کے اخلاق کی طرح اپنا اخلاق بنانا) ہے"۔

علامہ اقبالؒ کا فقر پر کلام

علامہ اقبالؒ کے فقر اور تصوف پر ارشادات اس کتاب کے ایک باب میں اور دیگر بہت سے مقامات پر دے دیئے گئے ہیں۔ تفصیل کے لئے فقر پر "علامہ اقبالؒ کا نظریہ فقر" والے باب کا مطالعہ فرمائیں۔ اس جگہ پر ان اشعار کا لکھنا ان کا عادہ کرنے کے برابر ہوگا۔ زیر نظر کتاب کے متعلقہ ابواب سے رجوع فرمائیں۔

باب ۱۴

حصہ سوم

(سلوک، مشروعیتِ بیعت اور معیتِ صادقین)

بیعت کی مشروعیت

طریقت میں پیر ضروری ہے

مولانا رومیؒ درج ذیل اشعار میں اس نکتے کی وضاحت کرتے ہیں کہ پیر کامل کی پیروی کے بغیر صحرائے حیات میں سفر روحانیت بہت دشوار اور جاں گسل ہے اور اس راستے میں اتنی پریشانیوں اور خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جن سے صرف مرشد ہی اپنے مرید کو نجات دلا سکتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

پیر را بگزیں کہ بے پیر ایں سفر ہست بس پُر آفت و خوف و خطر (۳۰۸/۱)

(پیر (کا توسل) اختیار کر، یہ سفر بغیر پیر کے آفت اور خوف وخطر سے بہت پُر ہے۔)

گر نباشد سایۂ پیر اے فضول بس ترا سرگشتہ دارد بانگِ غول (۳۰۹/۱)

(اے مہمل! اگر پیر کا سایہ نہ ہو، شیطان کی آواز تجھے بہت پریشان کرے گی۔)

غُولت از رہ افگند اندر گزند از تو داہی تر دریں رہ بس بدند (۳۰۹/۱)

(شیطان تجھے گمراہ کر کے نقصان پہنچا دے گا، تجھ سے زیادہ چالاک اس راستے میں بہت سے گمراہ ہوئے ہیں)

از نُبے بشنو ضلالِ رہرواں کہ چہ شاں کرد آں ابلیس بدرواں (۳۰۹/۱)

(راستہ چلنے والوں کی گمراہی قرآں سے سن کہ ان کے ساتھ بدذات شیطان نے کیا کیا ہے۔)

طلب سچی ہو تو گوہرِ مقصود حاصل ہو جاتا ہے

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ طالبِ صادق اپنی مراد کو ہر حال میں پا لیتا ہے اس کی مثال وہ ایک تشنہ لب مسافر سے دیتے ہیں جو پیاس کی شدت سے بے قرار ہو کر چشمۂ آب کی تلاش میں نکلتا ہے۔ اس کے خشک ہونٹ اسے کشاں کشاں چشمے کی طرف لے جاتے ہیں اور اس کی تشنہ لبی اور اضطراب اس بات کی دلیل ہے

کہ تلاش آپ کی راہ میں حائل تمام رکاوٹیں بالآخر دور ہو جائیں گی۔ ذیل میں دیئے گئے اشعار اسی حقیقت کو بے نقاب کرتے ہیں۔

کاں لبِ خشکت گواہی می دہد کو بآخر بر سرِ منبع رسد (۱۴۵/۳)

(کیونکہ تیرے خشک ہونٹ گواہی دیتے ہیں کہ وہ بالآخر چشمے پر پہنچ جائیں گے۔)

خشکی لب ہست پیغامے زآب کہ بمات آرد یقیں ایں اضطراب (۱۴۵/۳)

(ہونٹوں کی خشکی پانی کا ایک پیام ہے کہ یقیناً یہ اضطراب تجھے ہم تک لے آئے گا۔)

ایں طلب مفتاحِ مطلوباتِ تُست ایں سپاہِ نصرت و رایاتِ تُست (۱۴۵/۳)

(یہ طلب تیرے مطلوبوں کی کنجی ہے، یہ طلب تیری کامیابی کے سپاہی اور جھنڈے ہیں۔)

گرچہ آلت نیستت تو می طلب نیست آلت حاجت اندر راہِ رب (۱۴۵/۳)

(خواہ وسائل نہ ہوں تو طلب کر کیونکہ اللہ کے راستے میں وسائل کی ضرورت نہیں)

تو بہر حالے کہ باشی می طلب آب می جُو دائما اے خشک لب (۱۴۵/۳)

(تو جس حال میں ہو طلب جاری رکھ، اے خشک ہونٹوں والے ہمیشہ پانی تلاش کر۔)

ہر کرا بینی طلبگار اے پسر یار اُو شو پیش اُو انداز سر (۱۴۵/۳)

(اے بیٹے! تو جس کو طلبگار دیکھے، اس کا دوست بن جا اور اس کے سامنے سر رکھ دے۔)

کز جوارِ طالباں طالب شوی وز ظلالِ غالباں غالب شوی (۱۴۵/۳)

(طلبگاروں کے قرب سے تو بھی طلبگار بن جائے گا اور نفس پر غالب لوگوں کے سائے سے تو غالب بن جائے گا)

چوں نہادی در طلب پا اے پسر یافتی و شد میسّر بے خطر (۱۴۶/۳)

(اے بیٹے! اب جبکہ تو نے جستجو کی راہ میں قدم رکھ دیا، تو نے مطلوب کو پالیا اور وہ بلا خطر تجھے مل گیا۔)

عاقبت جوئندہ یابندہ بود چونکہ در خدمت شتابندہ بود (۱۴۶/۳)

(جستجو کرنے والا بالآخر پانے والا ہوتا ہے چونکہ وہ مطلوب کی خدمت میں پہنچنے کیلئے دوڑنے والا ہوتا ہے)

ولایت میں احوال و واردات خدا کی دین ہے

جبکہ مقامات مجاہدہ ریاضت کی پیداوار ہیں

مولانا رومیؒ کے مطابق اولیاء اللہ کا مقام وہ باطنی کیفیت ہے جو کسب یعنی مجاہدہ و ریاضت سے حاصل ہوتی ہے جبکہ حال وہ قلبی کیفیت ہے جو بلا کسب پیدا ہوتی ہے۔ اس پر یہ مشہور مقولہ دلالت کرتا ہے۔

اَلْمَقَامَاتُ مَکَاسِبُ وَالْاَحْوَالُ مَوَاھِبُ "مقامات کسب سے حاصل کیے جاتے ہیں اور احوال

خدا کی عطا ہیں"۔

پیرِ رومؒ اس بارے میں ارشاد فرماتے ہیں۔

وز نوازشہائے حق ابدال را تا بداند اُو مقام و حال را

(اور اولیاء کے واسطے حق تعالیٰ کی نوازشیں ہیں تا کہ وہ اس کے مقام اور حال کو جانیں۔)

حال چوں جلوہ است زاں زیبا عروس ویں مقام آں خلوت آمد با عروس

(حال گویا اس حسین دلہن کا جلوہ ہے اور یہ مقام دلہن کے ساتھ خلوت ہے۔)

جلوہ بیند شاہ و غیر شاہ نیز وقتِ خلوت نیست جز شاہِ عزیز(۱۶۸۔۱)

(جلوہ تو شاہ اور شاہ کے غلام بھی دیکھتے ہیں لیکن خلوت کے وقت عزیز و مقتدر بادشاہ کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا)

جلوہ کرد عام و خاصاں را عروس خلوت اندر شاہ باشد با عروس

(دلہن عوام اور خواص کو جلوہ دکھاتی ہے، دلہن کے ساتھ خلوت میں صرف بادشاہ ہوتا ہے۔)

ہست بسیار اہلِ حال از صوفیاں نادر ست اہلِ مقام اندر میاں

(صوفیوں میں اہلِ حال بہت ہیں لیکن ان میں صاحبِ مقام کم ہیں۔)

شیخ کامل بود و طالب مشتہی مرد چابک بود و مرکب درگہی

(شیخ کامل تھا اور طالب پُر شوق، سوار ہوشیار تھا اور سواری تیار۔)

دید آں مرشد کہ اُو ارشاد داشت تخمِ پاک اندر زمینِ پاک کاشت(۱۶۹۔۱)

(مرشد نے دیکھا کہ وہ استعداد رکھتا ہے، پاک بیج پاک زمین میں بو دیا)

اولیاء کاملین وخاصانِ حق سے اعمال بتقاضائے طبیعت صادر ہوتے ہیں

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے عارفانِ الٰہی اور خاصانِ حق کے باب میں ارشاد فرمایا ہے کہ وہ حالاتِ دنیا کے بارے میں لاتعلقی و بے نیازی کا رویہ اپنائے رہتے ہیں اور ان کا وجود بمنزلہ اس قلم کے ہے جس کے پیچھے خدا کا دستِ قدرت کارفرما ہے۔ فرماتے ہیں۔

خفتہ از احوالِ دنیا روز و شب چوں قلم در پنجۂ تقلیبِ رب(×)

(یہ (عارف) دن اور رات دنیا کے حالات سے خفتہ رہتا ہے اور کاتب کے قلم کی طرح خدا کے دستِ تصرف میں (الٹ پلٹ ہوتا رہتا) ہے۔)

لیکن یہاں یہ شبہ وارد ہو سکتا ہے کہ پھر ان عارفانِ الٰہی کی فضیلت کیا ہوئی جب اُن کے کسی کام میں

اپنے ارادے کا عمل دخل نہ ہوا، اور وہ جو کچھ کرتے ہیں مجبوراً کرتے ہیں۔ یہ خیال جمہور اہل سنت کے عقیدے کے خلاف ہے۔ جن کے نزدیک بندہ کسی نیک یا برے کام کو اضطراراً نہیں بلکہ قصداً اور اپنے اختیار سے کرتا ہے۔ مولانا رومیؒ کے شعر کے مفہوم سے مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ اولیاء اللہ کے تمام اعمال وافعال گو اُن سے قصداً اور اختیار وارادہ سے صادر ہوتے ہیں لیکن انہوں نے اپنی رضا اور ارادے کو یوں رضا ومشیتِ الٰہی میں گم کر دیا ہے کہ وہ جو نیک اعمال اور اوامر واحکام الٰہی بجالاتے ہیں وہ گویا اُن سے طبعاً صادر ہوتے ہیں اور وہ اعمالِ حسنہ سے کسی صورت باز نہیں رہ سکتے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے کوئی مخلوق اپنے طبعی افعال سے باز نہیں رہ سکتی۔ نیکی اور خیر کا جوہر ان کے خمیر اور سرشت میں اس طرح شامل کر دیا گیا ہے کہ وہ ان کی فطرتِ ثانیہ بن گیا ہے۔ پس ایسے مقبولانِ الٰہی کا ہر فعل ہر چند کہ اختیاری ہے مگر ان کے لازمۂ طبیعت بن جانے کے سبب سے کاتب کے قلم کی طرح اضطراری فعل کے مترادف ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں مولانا رومیؒ فرماتے ہیں۔

آنکہ اُو پنجہ نہ بیند در رقم فعل پندارد بہ جنبش از قلم (۷۰-ا)

(جو (ظاہر بین) بوقتِ تحریر ہاتھ کو نہیں دیکھتا وہ اس فعل کو قلم کی حرکت سے (ظہور میں آتا) سمجھتا ہے۔)

بیعت کرنے کے مقاصد اور مطالب

اختصار کی وجہ سے صرف چند نکات پیش کیے جا رہے ہیں۔ بیعت کرنے والے کو حسب ذیل فیوض حاصل ہوتے ہیں۔

(۱) سلسلۂ بیعت کے تصور سے مرید تمام مشائخ سلسلہ سے منسلک ہو کر ان کا فیض حاصل کرتا ہے۔

(۲) مرشد کے بتائے ہوئے اعمال اور اسباق کے کرنے پر خوشی، اطمینان اور سکون حاصل ہوتا ہے۔

(۳) ذکرِ الٰہی سے روح کو قوت حاصل ہوتی ہے اور وہ آفاقی رفعت کے قابل ہو جاتی ہے۔

(۴) اخلاق کی اصلاح ہو جاتی ہے۔

(۵) طلب حق کا بڑھنا اور برائیوں سے بچنا نصیب ہوتا ہے۔

(۶) نفس کی کیفیت بدلتی ہے۔ امارہ سے لوامہ، پھر مطمئنہ، راضیہ اور مرضیہ تک پہنچتا ہے۔

(۷) عبادت میں دل لگتا ہے۔ ذکر میں لذت حاصل ہوتی ہے۔ کیفیت اور جذبہ بڑھتا ہے۔

(۸) ایمانِ کامل نصیب ہوتا ہے۔

(۹) کبھی دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے اور بلا ارادہ ذکر جاری ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ قلب جاری ہو جائے تو ہمہ وقت ذکر جاری رہتا ہے۔

(۱۰) مرید کو حالت جذب، حرارتِ قلبی، کیف و سرور، نشہ اور سکر، بے خودی اور سرمستی جیسی کیفیات میسر ہوتی ہیں۔ جذب مرشد کی طرف سے عطا ہوتا ہے اور وہبی ہوتا ہے۔

(۱۱) جذب سے منازل طے ہوتی ہیں اور کچھ لوگ جذب میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔

(۱۲) جذب ایک ایسی طاقت ہے جو لوگوں کو کشش کرتی ہے اور ان کی ہدایت کا ذریعہ بنتی ہے۔ بعض لوگ جذب کی وجہ سے مجذوب ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جذب اس کی طاقت سے زیادہ یا قبل از وقت مل جاتا ہے۔ جذب اگر اعتدال پر ہو تو بسط کہلاتا ہے ورنہ قبض کہلاتا ہے۔

(۱۳) معرفتِ الٰہی حاصل ہوتی ہے اور بالآخر رویتِ قلبی کا شرف حاصل ہوتا ہے۔

(۱۴) عالم روحانی کا علم حاصل ہوتا ہے جسے علم لدنی کہتے ہیں اور وہ ایسی چیز ہے جو اللہ کی طرف سے قلب پر القاء ہوتی ہے اس کو کشف بھی کہہ سکتے ہیں۔

(۱۵) قلب کی آنکھ کھل جانے سے عالمِ امر کے ساتھ تعلق قائم ہو جاتا ہے اور مشاہدات میسر آتے ہیں۔

(۱۶) لطائف کھل جاتے ہیں۔ قلب، روح، سر، خفی اور اخفیٰ کے لطائف سے بہرہ مند ہوتا ہے۔

(۱۷) سچے خواب واقعات، روحیں اور عالم بالا کی چیزیں نظر آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ کبھی ان وجوہات پر اگر کسی کو تکبر ہو جائے تو شیخ اس کی اصلاح کرتا ہے۔

(۱۸) کشف اور کرامات کی طاقت آ جاتی ہے۔ لوگوں کے دلوں کے احوال ان پر کھلنے لگتے ہیں اسی لیے اولیاء کو جَوَاسِیْسُ الْقُلُوْبِ کہتے ہیں۔ (دلوں کے جاسوس)

(۱۹) نورِ فراست تیز ہو جاتا ہے اور وہ ایسی باتوں کا معائنہ کرتے ہیں جو ظاہر کی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔

(۲۰) تزکیۂ اخلاق حاصل ہو جاتا ہے۔

حصولِ حکمت کے تین طریقے ہیں ذکر، مجاہدہ اور تزکیۂ اخلاق۔

۱۔ ذکر

ذکر عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں یاد کرنا، بھولی ہوئی چیز کی یاد تازہ کرنا، اُسے بار بار ذہن میں لانا وغیرہ۔ دینی اصطلاح میں ذکر سے مراد اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا ہے۔ ذکر غفلت کی ضد ہے۔ انسان ہمیشہ اس چیز کو یاد کرتا ہے جس کے ساتھ گہرا لگاؤ ہو اور کسی صورت میں اسے بھلانے کے لیے تیار نہ ہو۔ یہ دلی لگاؤ مختلف وجوہ و اسباب کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ یہ وجوہ اچھے بھی ہو سکتے ہیں اور برے بھی۔ ایک مومن کامل کی دلی محبت اور مخلصانہ الفت صرف ذات باری تعالیٰ سے ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ذکر کی اہمیت و فضیلت بیان فرمائی ہے۔ ارشاد فرمایا۔

فَاذْكُرُوْنِیْٓ اَذْكُرْكُمْ (البقرہ: ۱۵۲) "تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا"۔

حضرت ثابت بنانیؒ فرماتے ہیں کہ مجھے معلوم ہے کہ میرا پروردگار مجھے کس وقت یاد کرتا ہے۔ لوگ ان سے ڈر گئے اور پوچھا کہ آپ کو کیسے پتا چلا؟ فرمایا کہ جب میں اس کو یاد کرتا ہوں، وہ مجھے یاد کرتا ہے۔

۲۔ مجاہدہ

اللہ کے لئے اپنے نفس سے جہاد کرنا مجاہدہ ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کے قول کی اللہ تعالیٰ نے ہمیں خبر دی اور فرمایا۔

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ (یوسف: ۵۳) "اور میں اپنے نفس کی برأت (کا دعویٰ) نہیں کرتا بے شک نفس تو حکم دیتا ہے برائی کا"۔

حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں غور وفکر عبادت کی کنجی ہے اور درست کام کرنے کی نشانی یہ ہے کہ نفس اور خواہشات کی مخالفت کرے اور ان دونوں کی مخالفت ان کی خواہشات کو ترک کر دینے سے ہوتی ہے۔ مجاہدہ کا مضمون الگ دے دیا گیا ہے اور ہماری تصنیف "جنیدؒ و بایزیدؒ" میں بھی موجود ہے۔

۳۔ تزکیۂ اخلاق

اخلاق، خُلق سے ہے جس کے معنی پختہ عادت کے ہیں۔ اصطلاحاً خُلق سے مراد وہ اوصاف ہیں جو کسی فطرت وطبیعت کا اس طرح لازمی جزو بن جائیں کہ زیادہ غور وفکر کے بغیر روزمرہ کی زندگی میں ان کا ظہور ہوتا ہو۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے نزدیک خلق انسان کی اس کیفیت کا نام ہے جو اس کی طبیعت کے مختلف اوصاف وکمالات کو حدوجہد کر کے اپنی طرف راجع کرے۔ امام غزالیؒ کے نزدیک خُلق انسان کی ایسی کیفیت اور ہیئت راسخہ کا نام ہے جس کی وجہ سے بغیر کسی فکر وتوجہ کے نفس سے اعمال سرزد ہوں۔ مُلا جلال الدین دوانیؒ فرماتے ہیں جب افعال کسی فکر وتردد کے بغیر نفس سے سرزد ہونے لگیں تو اس کیفیت کو خُلق سے تعبیر کرتے ہیں۔ تزکیۂ اخلاق پر حضور پاک ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مکمل ہدایات ارشاد فرمائیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اے معاذ! اللہ سے ڈرو، عہد وپیماں کو پورا کرو، امانت ادا کرو، خیانت چھوڑ دو، پڑوسیوں کی حفاظت کرو، یتیم پر رحم کرو، نرم گفتگو کرو، سلام کو پھیلاؤ، اچھے کام کرو، امیدیں کم رکھو، حساب سے ڈرو، تواضع اختیار کرو، کسی شریف یا بردبار آدمی کو گالی دینے یا سچے انسان کو جھٹلانے سے پرہیز کرو، کسی گنہگار سے کوئی توقع نہ رکھو، انصاف پسند حاکم کی نافرمانی نہ کرو، زمین میں فتنہ وفساد نہ پھیلاؤ، میں تمہیں ہدایت اور وصیت کرتا ہوں کہ ہر پتھر ودرخت یا مٹی پر سے گزرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے ڈرو، ہر گناہ پر توبہ کرو اگر گناہ پوشیدہ ہو تو پوشیدہ اور اگر اعلانیہ ہو تو اعلانیہ توبہ کرو۔ (صحیح بخاری ومسلم)

حقیقتِ بیعت

اپنی جان اور مال کو خدا کے ہاتھ فروخت کر دینا اصل بیعت ہے۔ وہ لوگ جو خدا کی مملکت میں بے جا تصرف کرتے ہیں اور اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہوئے علمِ بغاوت بلند کرتے ہیں تو ایک وقت آتا ہے کہ کسی ولی اللہ کے روبرو اپنی غلطیوں، سرکشی اور بغاوت پر نادم ہو کر اپنی روش کی اصلاح کرتے ہیں۔ اس رجوع الی اللہ کو بیعت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بیعت میں بیع کا معنی لین دین ہے اور بیعت میں اخلاق رذیلہ کو ترک کرنے کے بعد اخلاق جمیلہ کو بخوشی اختیار کرنا اس تجارت میں شامل ہے۔ جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر کمربستہ ہو جاتا ہے تو اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی حاصل کرتا ہے۔ اس لین دین کو اللہ تعالیٰ نے خرید و فروخت سے موسوم کیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ (التوبہ:۱۱۱)

"بیشک اللہ تعالیٰ نے مول لی ہیں مومنوں سے ان کی جانیں اور مال اس بدلے میں کہ ان کیلئے جنت ہے"۔

صورتِ بیعت

خرید و فروخت کے لئے صرف نیت یا ارادہ کافی نہیں ہوتا بلکہ اس ارادہ کو عمل میں لانے کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ بیعت کا عمل بھی مخصوص ہے حق تعالیٰ کے ساتھ یہ بیع ہمیشہ اس برگزیدہ شخص کی وساطت سے عمل میں آتی ہے جو اس سنجیدہ مہتم بالشان معاملہ میں وسیلہ بننے کا مجاز ہو۔ اس کی تشریح سورہ مائدہ کی آیت ۳۵: وَابْتَغُوْٓا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ میں کر دی گئی ہے۔

مقصد بیعت

"ضرورتِ شیخ پر استدلال" کے عنوان سے بیعت کے مقصود کا اظہار بھی کافی حد تک ہو گیا ہے۔ یہاں مقصدِ بیعت کی مزید وضاحت کی جارہی ہے۔ ولی اللہ سے بیعت کا مقصد اللہ تعالیٰ کی طرف راہنمائی حاصل کرنا اور ماسویٰ اللہ سے رغبت ہٹانا ہے۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ لوگ صرف دنیاوی امور کے حل کے لئے مشائخ کے پاس آتے ہیں اور کچھ لوگ تو مشائخ کے پاس آ کر دنیا کی باتیں ہی کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے اولیاء ناراض ہوتے ہیں اور ایسی بیعت میں مرید اگر مصیبت سے بچ جائے تو غنیمت ہے۔ شیخ کی ناراضگی کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں نمبر ۱: مرید کی ولی سے محبت اللہ کے لئے نہیں رہتی اور مرید جو محبت ظاہر کرتا ہے وہ فقط ظاہری ہوتی ہے چنانچہ اس پر نورِ حق نازل نہیں ہوتا۔ نمبر ۲: مرید ماسویٰ اللہ میں الجھا رہتا ہے اور ولی اس کا تعلق اللہ سے کروانا چاہتا ہے۔ عموماً مرید اپنے دنیاوی مقصود پر ڈٹے رہتے ہیں۔ نمبر ۳: جب کسی کو دنیاوی حاجت کو پورا کرنے میں ولی کی مدد پہنچتی ہے تو مرید سمجھتا ہے کہ اس کے کام ہو رہے ہیں۔ ایسی حالت میں

مرید سمجھتا ہے کہ اس کا پیر ٹھیک ہے اور اسے پیر سے معرفت بھی حاصل ہوتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ انہی کاموں کے لئے لوگ پیروں کے پاس آتے ہیں۔ اگر اس کے دنیاوی کام نہ بنیں تو وہ چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ مرید کے ایسے رویے کو دیکھ کر پیر اس کو خود بھگا دیتا ہے۔

بیعت کا اصل مقصد یہ ہے کہ مرید شیخ سے طریقت کی ان تمام اصطلاحات اور ضروریات کو سیکھے جو اس راہ کی اہم حاجات ہیں۔ (جن میں سے اکثر چیزوں کو اس کتاب میں بیان کیا جارہا ہے۔) مرشد اپنے مرید کو اس راہ پر اس طرح چلاتا ہے جس طرح باپ اپنے بچے کو انگلی پکڑ کر چلاتا ہے۔ پیر اپنے مرید کے مقاماتِ طریقت کو طے کرنے میں پوری مدد کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ مرید اب کون سی منزل پر پہنچ گیا ہے اور اگلی منزلوں کی طرف راہ ہموار کرتا ہے۔ کچھ مقامات ایسے ہوتے ہیں جو علمی نوعیت سے بالکل الگ اور عملی طریقہ تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں۔ بہت سے کام ایسے ہیں جو کہ شیخ کی توجہ کے محتاج ہوتے ہیں، کچھ معاملات ایسے بھی ہیں جن میں شیخ سے انعکاس وصول کرنے کی حاجت ہوتی ہے۔ کچھ فیوض مرشد کی نگاہ سے عطا کیے جاتے ہیں، کچھ اشغالِ روحانیت ایسے بھی ہیں جن میں شیخ مرید کو ریاضتوں میں ڈال دیتا ہے اور اس کے کامیاب نتائج برآمد ہونے تک اس کو نگاہ میں رکھتا ہے۔

صاحبِ جامع الاصول فرماتے ہیں کہ زمانہ قدیم سے یہ رسم چلی آئی ہے اور تجربہ بھی اس پر گواہ ہے کہ اندرونی نجاستوں اور غلاظتوں مثلاً غرور، نخوت، عُجب، ریا، کبر، حرص طمع، شہوت اور طلب جاہ وغیرہ جیسی امراض مہلکہ سے پاک وصاف ہونا اور نماز کو حضور اور خشوع وخضوع سے ادا کرنا (جس کو حدیث نبوی ﷺ "اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ کَاَنَّکَ تَرَاهُ" میں لفظ احسان سے تعبیر کیا گیا ہے) شیخ کامل کی تربیت کے سوا ممکن نہیں۔

چشتیہ سلسلے میں بالخصوص سماع سے اور کبھی عام سلاسل میں شیخ کے کلام سے کسی مرید کو مشاہدہ حق نصیب ہو جاتا ہے تو وہ سماع گویا کلامِ شیخ کو بمنزلہ کشتی استعمال کرتا ہے۔ جس کے ذریعے وہ مشاہدہ کے سمندر کو عبور کرتا ہے۔ جب مرید خود اولیائے کبار میں سے ہو جائے تو مشاہدہ وسیع ہو جاتا ہے اور اس کا عشق ایسے ہو جاتا ہے جیسے عشقِ مجازی اور وہ ہر وقت سرور وطرب میں رہتا ہے۔ وہ اللہ کے افعال سے خوش رہتا ہے اور کبھی وجد میں آجاتا ہے۔

مشروعیت بیعت

تمام صوفیائے کرام اور مشائخ عظام نے بیعت کو سنت قرار دیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے بھی بیعت کو سنت قرار دیا ہے اور کچھ مشائخ نے بوقتِ ضرورت بیعتِ ہجرت کو فرض قرار دیا ہے۔ بیعتِ اسلام کو سنت، بیعتِ جہاد کو واجب اور بیعتِ طلب الاسرار اور بیعتِ توجہ کو مستحب قرار دیا ہے۔

برزِ دلبراں میں ہے، خلافت راشدہ کے زمانے میں بیعتِ اسلام متروک رہی کیونکہ سلطنت اس قدر وسیع ہوگئی کہ اسلام میں داخل ہونے والے بے شمار لوگوں کو بیعت کرنا مشکل ہوگیا تھا۔ بنوامیہ اور عباسیہ کے زمانے میں بھی تقریباً نہ تھی کیونکہ حکمران عموماً قیامِ سنت کی طرف سے لاپرواہ ہوگئے تھے۔ بیعت اس لئے بھی نہ تھی کہ اسے بیعتِ خلافت سمجھ کر جھگڑے نہ کھڑے ہوجائیں۔ صوفیائے کرام کی بیعت جاری رہی اور خرقہ کی رسم بھی جاری رہی۔ جب سلوک اور سلاطین سے بیعت معدوم ہوگئی تو صوفیہ نے اس مردہ سنت کو زندہ کیا۔

۱۔ بیعتِ خلافت یہ بیعت خلافت کو تسلیم کروانے کے لیے لی جاتی تھی۔

۲۔ بیعتِ طلب اسرار طالب مولیٰ سے اسرارِ الٰہی کے سلسلے میں لی جاتی ہے۔

۳۔ بیعتِ ہجرت جب ہجرت کی ضرورت محسوس ہوتی تو یہ بیعت لی جاتی۔

۴۔ بیعتِ جہاد جہاد پر جاتے وقت رسول اکرم ﷺ نے بیعتِ جہاد لی۔

۵۔ بیعتِ تقویٰ زمانہ قربِ رسالت میں یہ بیعت متروک تھی۔ علاوہ ازیں امورِ سلطنت کی وجہ سے خلفائے راشدین کا بیشتر وقت حکومت کے امور میں لگ جاتا اور خلافت کی ذمہ داریوں میں صرف ہوجاتا تھا۔ اس دور کے کچھ دیر بعد جب سلاطین اور ملوک سے رسمِ بیعت معدوم ہوگئی تو حضراتِ صوفیاء نے اس مردہ سنت کو زندہ کیا اور بیعتِ تقویٰ کو جاری کیا۔

۶۔ بیعتِ شوقِ عبادت شوقِ عبادت پیدا کرنے کے لئے لوگوں کو تیار کیا جاتا ہے اور ان سے بیعت لی جاتی ہے۔

۷۔ بیعتِ توبہ بیعتِ توبہ تو آج بھی لی جاتی ہے اور ہر زمانے میں رہی۔ آج بھی فاسق، فاجر، بے دین لوگوں کو دین کی طرف لانے کے لئے توبہ کرائی جاتی ہے اور نیک راستے کی تلقین کی جاتی ہے۔

۸۔ بیعتِ تصوف بیعتِ تقویٰ انقطاع عن ماسوا اللہ کے دیگر لوازمات کو اپنے ساتھ شامل کر کے بیعتِ تصوف میں شامل ہے۔ یہ بیعت پہلے زمانہ میں بھی تھی اور آج بھی ہے۔

احادیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال نہ کرنے پر، نوحہ نہ کرنے پر، مسلمانوں کی خیر خواہی کے لئے، خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرنے اور حق بات کہنے پر بیعت لی۔

شیخ کی تعریف

راہ طریقت دکھانے والا یعنی ہادیٔ طریقت، اس راہ کا راہ نما، استاد طالبان حق کو اپنی تعلیم و تربیت اور اپنے توسل و فیضانِ باطنی سے اور اپنے تصرف کے ساتھ وصول الی اللہ تک پہنچانے والے کو شیخ کہتے ہیں۔ ایک حدیث کے مطابق جس نے کتاب اللہ کی ایک آیت بھی سکھائی ہو تو وہ انسان کا مولیٰ (استاد) ہوتا ہے۔

اس کو چاہیے کہ اپنے استاد کو رسوا نہ کرے۔ بوجہ صاحب ارشاد ہونے کے شیخ نائب رسول بھی ہوتا ہے۔ ہر نبی یا رسول کی بعثت کا مقصد مخلوقِ الٰہی کا خالق کائنات کے ساتھ تعلقات کو استوار کرنا ہے۔ جو کام کسی پیغمبر نے اپنی حیاتِ ظاہری میں کیے۔ شیخ اسے بعد میں آنے والے زمانوں مین جاری رکھتا ہے۔ اسی لیے حدیث میں وارد ہوا ہے "اَلشَّیْخُ فِی قَوْمِہٖ کَالنَّبِیِّ فِیْ اُمَّتِہٖ" (الاسرار المرفوعۃ: حدیث ۲۲۹) قرآن مجید میں بھی اس بات کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ فرمایا "لِکُلِّ قَوْمٍ ھَادٍ" ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہوتا ہے (الرعد: ۸) چنانچہ نبوت کے ختم ہونے کے بعد قوم کی ہدایت کا ذمہ اس قوم کے شیخ کے سپرد ہوتا ہے۔ جس طرح انبیاء کرام کو معجزات سے نوازا گیا اسی طرح شیوخ عالم کو ملک اور ملکوت پر حق تعالیٰ کی طرف سے تصرف عطا ہوتا ہے۔ مقامِ مشیخیت مقامِ ولایت سے بالاتر ہے۔

اقسامِ شیخ

شیخ کے مقام اور فرائض کی انجام دہی کے مطابق مشائخ کی مندرجہ ذیل اقسام ہیں۔

ا۔ شیخ کامل جو خود کامل ہو اور دوسروں کو کامل نہیں بنا سکتا اگرچہ ابتدائی تعلیم دے سکتا ہو۔

۲۔ شیخ مکمل جو خود بھی کامل ہو اور دوسروں کو بھی کامل بنا سکتا ہو۔ یہ ذوالحال ہوتا ہے۔

۳۔ شیخِ اکمل شیخ مکمل کی اہلیت والا ہے اور اپنے آپ میں مصروف رہتا ہے، مغلوب الحال ہوتا ہے۔ دوسروں کو کامل بنانے کی فرصت نہیں پاتا۔

بیعت کی مختلف صورتیں

علماء اور صوفیاء نے بیعت کی مختلف صورتیں نقل کی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

ا۔ بیعتِ اسلام

جو لوگ اسلام میں داخل ہوتے وہ رسول اکرم ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کرتے۔ خلفائے راشدین کے زمانہ میں یہ بیعت ختم ہوگئی جب کہ لاکھوں انسان اسلام میں داخل ہونا شروع ہو گئے اور اس کا امتیاز اٹھ گیا کہ خالصتاً اللہ کے لئے کون اسلام قبول کر رہا ہے اور غلبۂ اسلام کی وجہ سے کون اسلام میں داخل ہو رہا ہے۔ بنو امیہ اور بنو عباس میں کچھ حکمران فاسق اور ظالم تھے اس لئے وہ بیعت سے لاپرواہ ہو گئے۔

۲۔ تجدیدِ بیعت کی مختلف انواع

(ا) برِّ دلبراں میں ہے کہ اگر شیخ کا وصال ہو گیا ہو اور سلوک ناتمام رہ گیا ہو اور مرید اپنے شیخ کی قبر سے اکتسابِ فیض برائے تکمیلِ سلوک نہ کر سکتا ہو تو تجدیدِ بیعت جائز بلکہ فرض ہے۔

(۲) اگر شیخ لاپتہ ہو گیا ہو اور باوجود تلاش کے نہ ملے تو بھی دوسرے کے ہاتھ پر بیعت کرنا جائز ہے۔

(۳) بیعت کرنے کے بعد یہ پتہ چلے کہ جس سے بیعت کی گئی تھی وہ صاحب نسبت نہ تھا یا اس نے ابھی سلوک پورا طے نہ کیا ہو تو مرید کو فسخ بیعت کا حق حاصل ہے۔ اگر شیخ صاحب نسبت نہیں تو اس حالت میں بیعت ہی نہیں ہوئی۔

(۴) جب کوئی شیخ کسی مرید کی تربیت معنوی نہ کر سکا ہو تو دوسرا شیخ اس کو بیعت کر کے اس کی تربیتِ معنوی کرے۔

(۵) اگر نابالغی کے زمانے میں بیعت ہوئی جس کو بیعتِ تبرک کہتے ہیں تو بڑے ہو کر وہ کسی اور سے فیض حاصل کرتا ہو تو اس سے بھی بیعت کر سکتا ہے۔

اگر مرید میں کوئی کمی نہیں اور شیخ اس کی بیعت کو توڑنا چاہے تو شیخ اس بیعت کو توڑنے کا مجاز نہیں۔ خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ نے لکھا ہے کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کا ایک مرید حضرت مجددؒ سے بدظن ہو کر تجدیدِ بیعت کے لئے کسی اور شیخ کے پاس گیا۔ جس وقت یہ دونوں بیعت کی نیت سے بیٹھے تو حضرت مجدد علیہ الرحمۃ نے بہت زور سے اس مرید کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کیا اور اس کیفیت کو دیکھ کر شیخ بھی گھبرا گیا اور اس نے اس شخص کو یہ کہہ کر بیعت کرنے سے انکار کر دیا کہ تمہارا شیخ کامل ہے، لہٰذا تمہیں تجدیدِ بیعت کی ضرورت نہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شیخِ کامل سے مرید بدظن ہو جائے اور اپنے شیخ کو چھوڑ کر دوسرے مشائخ کی طرف رخ کر لے تو ایسے مرید کو عمر بھر کسی شیخ سے بھی فیض حاصل نہیں ہو سکتا، کیونکہ ایک مخلص شیخ کو ترک کرنے کی طریقت میں یہی سزا ہوتی ہے۔ مشائخ کو بھی چاہیے کہ دوسروں کے مریدوں کو بلاوجہ بیعت نہ کریں اور اپنے سے بڑے مشائخ کے مرید کو بلا ضرورت بیعت نہ کرے، کیونکہ طریقت میں اس کام کو گستاخی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ایسے مرید کو یہ کہہ دینا چاہیے کہ میری مجال نہیں کہ اتنے بڑے پیر کے مرید کو بیعت کروں۔ اگر کوئی مرید اپنے شیخ سے بدظن نہ ہو اور اس میں کوئی کمی محسوس نہ کرتا ہو تو ایک سے زیادہ مشائخ سے بیعتِ رشد کرنا جائز ہے لیکن اس صورت میں تمام مشائخ کے بتائے ہوئے وظائف پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔

شیخ برزخ کی مانند ہوتا ہے

لغت میں برزخ اس کو کہتے ہیں جو دو چیزوں کے درمیان حائل ہو، اس طرح کہ دونوں میں واصل اور فاصل ہو یعنی وہ ایک طرف سے ایک چیز سے اور دوسری طرف سے دوسری چیز سے متصل ہو۔ خواہ ان چیزوں کو ان سے مناسبت ہو یا نہ ہو۔ اصطلاحِ صوفیاء میں برزخ کے کئی معنی ہیں۔

۱۔تعین اوّل

یعنی حقیقتِ محمدیہ ﷺ کو برزخ کہتے ہیں کیونکہ یہ ذات اور صفات کے درمیان واسطہ ہے۔ یہ اخفا اور ظہور کے درمیان یا ظہور اور بطون کے درمیان واسطہ ہے اس کو برزخِ کبریٰ یا برزخِ جامع یا برزخِ اوّل بھی کہتے ہیں۔

۲۔عالمِ مثال

عالمِ ارواح (ارواحِ مجردہ) اور عالمِ اجسام (اجسامِ کثیفہ) کے درمیان عالمِ وسطیٰ یا عالمِ مثال برزخ ہے۔

۳۔تجلی روح

• عالمِ ارواح اور اعیانِ ثابتہ کے درمیان تجلی روح بھی برزخ ہے۔ (وہ صورتیں جن میں اسماء الٰہی ظاہر ہوں۔)

۴۔دِل

روح اور مضغہ کے درمیان دل برزخ ہے۔

۵۔صدر (سینہ)

دل اور دماغ کے درمیان برزخ ہے۔

۶۔علم

عالم اور معلوم کے درمیان علم برزخ ہے۔

۷۔اسماء

اعیانِ ثابتہ اور وجود کے درمیان اسماء برزخ ہیں۔

۸۔تصورِ شیخ

صوفیاء تصورِ شیخ کو بھی برزخ کہتے ہیں کیونکہ فیضانِ قدس اور طالب کے درمیان واسطہ ہے۔

۹۔عرصۂ محشر

موت اور حشر کے درمیان کے عرصہ کو بھی برزخ کہتے ہیں۔

منکرینِ طریقت کے اعتراضات

کچھ لوگ طریقت کے متعلق بیان کردہ دلائل، شواہد اور استنباط کو سننے کے بعد ضرورت شیخ اور اخذِ بیعت کے قائل تو ہو جاتے ہیں مگر چونکہ مخالفتِ شیخ ان کے رگ رگ میں بس چکی ہوتی ہے اس لیے موجودہ طرز بیعت

اور مشائخ کے رویے پر اعتراض کرتے ہیں۔ ایک اعتراض عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ طریقِ بیعت کو اگر تسلیم کر بھی لیا جائے تو وہ مشائخ جو باطور پر بیعت لینے کے مجاز ہیں آج کل کہیں نظر نہیں آتے۔ مولانا روم کے اشعار میں (جو اس باب میں بیان کر دیے گئے ہیں) اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے کہ اگر تمہیں وہ نظر نہیں آتا تو اس کو لاکھوں میں تلاش کرو کیونکہ اگر کسی زمانہ میں یہ مشائخ نہ ہوں تو زمان و مکان کا وجود ہی ختم ہو جائے گا یعنی قیامت آ جائے گی۔

معترضین کا دوسرا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اکثر پیر جھوٹے ہوتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ معترض کا ذہن مشکوک ہونے کی وجہ سے وہ نیک لوگوں پر بھی حسنِ ظن نہیں رکھ سکتا ہے اور اسے ہر پیر ناقص اور جھوٹا نظر آتا ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مشائخ کے علمی مرتبت اور روحانی اعتبار سے بھی مختلف درجات ہوتے ہیں۔ اعلیٰ درجات کے مشائخ اعلیٰ قسم کے عوام کی رہنمائی کرتے ہیں اور معمولی درجے کے مشائخ دیہاتیوں اور بے علم لوگوں کی رہنمائی کے لئے بھی کفایت کر جاتے ہیں۔ ایسے پیروں میں اگر کچھ کمی یا کمی نظر آئے تو معترضین تعصب کی بنا پر ان کی مخالفت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں حالانکہ چھوٹے درجے کے مشائخ کم علم لوگوں کی راہنمائی کا کام انجام دے سکتے ہیں۔ اسی طرح کم علم امام مسجد عموماً چھوٹی مسجدوں میں بھی کام چلا سکتے ہیں مگر شاہی مسجد لاہور میں ۱۹ یا ۲۰ گریڈ کا خطیب لگایا جاتا ہے۔ اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اس زمانے میں جہاں ہر چیز میں ملاوٹ اور فریب ہے تو وہاں پیروں کے طبقات میں بھی جعلی پیر شامل ہو گئے ہیں۔ ایسے پیروں کا تذکرہ اسی باب میں خود ساختہ پیروں کے عنوان سے کر دیا گیا ہے لیکن جس طرح ہم اجناس خوردنی کے سلسلے میں اعلیٰ قسم کی اجناس کا انتخاب کرتے ہیں اسی طرح شیخ کامل کی تلاش کرنا بھی ضروری ہے۔

معترضین کا ایک اعتراض یہ بھی ہوتا ہے کہ مشائخ نے پیری مریدی کا دھندہ ذریعہ معاش کے طور پر اپنا لیا ہے۔ پیرانِ کرام مریدوں سے نذرانے وصول کرتے ہیں اور اسے اپنے مصارف میں استعمال کرتے ہیں۔ اس اعتراض کے متعلق یہ کہہ دینا کافی ہے کہ مریدین کے نذرانوں کی حیثیت اسلام میں ہدیہ قرار دی جاتی ہے اور ہدیات کا وصول کرنا حرام یا مکروہ نہیں بلکہ مباح اور جائز ہے۔ مشائخ کبار اور فقہاء نے ہدیات وصول کیے ہیں بلکہ رسول اکرم ﷺ کے بھی ہدیات وصول کرنے کی احادیث کثرت سے ملتی ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ ان نذرانوں کا استعمال کیسے کیا جاتا ہے۔ اس کا جواب بھی بالکل سیدھا سادہ ہے کہ اگر کچھ مال کسی کو ہدیے کے طور پر دیا جائے تو لینے والے کو مکمل اختیار ہے کہ وہ جہاں چاہے استعمال کرے (اسراف ہے یا صرف کے) دوسروں کو اس پر اعتراض کرنے کا حق ہے۔ اس پر ایک اور اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ رسول ﷺ یا مشائخ کبار نذرانے وصول کرتے تھے اسے لوگوں میں ہی تقسیم کر دیا جاتا تھا اور آج کل کے مشائخ کی طرح اپنی ذات پر نہیں خرچ کرتے تھے۔ اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم اور مشائخ کبار جیسی بلند مرتبت ہستیوں کے مطابق عام مشائخ کو پرکھنا اسی طرح بعید از فہم ہے جس طرح ان کی عبادات کے معیار کو کم درجہ کے لوگوں سے مقابلہ کرنا بے معنی ہے۔ اس اعتراض میں بھی معترضین کا تعصب زیادہ نظر آتا ہے کیونکہ وہ مشائخ کے مقامات مصارف کو نہیں جانتے۔ وہ نہیں جانتے کہ ان نذرانوں کی رقوم سے مشائخ چوبیس گھنٹے کے لئے لنگر خانہ جاری رکھتے ہیں۔ تبلیغی کاموں کے لئے خط و کتابت، درس و تدریس کا سلسلہ، مہمان خانوں کی تعمیر اور دیگر رفاہی کاموں پر خرچ کرنا مشائخ کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اپنے بیوی بچوں اور گھر بار کا خرچ بھی انہی نذرانوں سے پورا کیا جاتا ہے۔ اگر مشائخ نذرانے وصول نہ کریں اور اپنی کسب معاش کے لئے سرگرداں رہیں تو وہ لوگوں کی اصلاح اور تبلیغ کے لئے ہرگز وقت نہیں نکال سکتے۔ وہ نذرانے اس لئے وصول کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو لوگوں کی خدمت پر مامور کر رکھا ہے اور ان کی روزی کو لوگوں کی آمدنی میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح لوگوں کی آمدنی سے وہ اللہ کا دیا ہوا حصہ ہی وصول کرتے ہیں۔ (قوت القلوب میں روزی کے انداز کا مطالعہ فرمائیں جہاں شیخ ابو طالب مکیؒ نے دینی خدمت کرنے والوں کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے۔)

منکرینِ بیعت کے اعتراضات

بیعتِ تصوف پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان میں سے ایک اعتراض تو یہ ہے کہ "وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ" سے وسیلۂ شیخ یا وسیلۂ مقربانِ بارگاہِ رحمانی مراد نہیں ہے۔ اس کا جواب آیتِ وسیلہ کی تشریح میں دیا جا چکا ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ جو بیعت صوفیوں میں مروّج ہے وہ شرعاً کوئی اصلیت نہیں رکھتی۔ بزمِ دلبراں میں لکھا ہے کہ یہ اعتراض انتہائی درجہ کی لاعلمی پر دلالت کرتا ہے۔ احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی ہجرت، کبھی جہاد اور کبھی ارکانِ اسلام پر ثابت قدمی، کبھی تمسک بالسنۃ اور بدعات سے بچنے اور کبھی عبادت پر حریص اور شائق ہونے پر اور کبھی سوال نہ کرنے پر، کبھی نوحہ نہ کرنے پر بیعت لی ہے۔ مختلف قسم کی بیعت کا ذکر ہو چکا ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے "اَلْقَوْلُ الْجَمِیل" میں لکھا ہے کہ "رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خلیفۃ اللہ تھے اس کی زمین میں اور عالم تھے اس کے لیے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن اور حکمت اتارا، اور معلم تھے قرآن اور حدیث کے اور امت کے پاک کرنے والے تھے۔ سو جو عمل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنا پر خلافت کیا وہ خلفاء کے واسطے سنت کیا اور جو فعل بجہتِ تعلیم کیا وہ علمائے راسخین کے واسطے سنت ہوا۔" علمائے راسخین سے وہ علماء مراد ہیں جو کہ علوم ظاہر و باطن کے علم کے جامع ہیں۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ کتاب اللہ کے ہوتے ہوئے شیخ کی کیا ضرورت ہے؟ اس اعتراض کا جواب گزشتہ صفحات میں دیا جا چکا ہے۔ اس اعتراض کے متعلق یہ بھی جان لینا چاہیے کہ جب اُمت کے بیشتر صوفیاء

اور علماء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ قرآن کی آیتِ وسیلہ میں وسیلہ سے مراد پیر کامل ہے تو پھر یہ بات قرآن کی نص سے ثابت ہو رہی ہے کہ بیعت کرنا قرآن کے احکامات کے عین مطابق ہے۔

حق تعالیٰ نے بلاشبہ قرآن کو نازل کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک ہادی بھی مبعوث فرمایا جو ہمارے ساتھ مل جل کر رہا جس نے ہمیں قرآن پاک کے دقیق رموز سمجھائے، عقل و دانش کی باتیں سکھائیں اور اپنے انوارِ ہدایت کا پرتو ہم پر ڈال کر ہماری زندگیوں کو پاکیزہ بنا دیا لیکن اگر قرآن ہی نازل کیا جاتا تو نہ کوئی صدیق ہوتا اور نہ کوئی صحابی ہوتا۔ آپ کی موجودگی میں صحابہ کرام کو جو فیوض ملے وہ بھی نہ ملتے۔ قرآن پاک میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ہر زمانے اور ہر قوم میں ہادیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کے لئے کوئی نہ کوئی ہادی مقرر کیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے۔

لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (الرعد: ۷)

"ہر قوم کے لئے ایک راہنما ضروری ہوتا ہے"۔

قرآن پاک ایک نسخہ کی طرح ہے اور پیغمبر ایک طبیب کی مثل ہے۔ دونوں کا باہم ہونا ضروری ہے۔ یہ کہنا حماقت ہے کہ جب نسخے موجود ہیں تو ڈاکٹر کی کیا ضرورت ہے۔ بعینہٖ یہ کہنا بھی سراسر غلط ہے کہ جب قرآن اور سنت موجود ہے تو کسی شیخ کی کیا ضرورت ہے۔ اس لئے فرمایا گیا ہے۔

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا (الانعام: ۹)

"اور اگر ہم بناتے نبی کسی فرشتہ کو تو بناتے اس کو انسان (کی شکل میں)"۔

ہادیٔ برحق کی ضرورت اس بات سے بھی واضح ہوتی ہے کہ قرآن تو اب بھی موجود ہے لیکن اگر قرآن ہی کافی ہوتا تو آج یہ بے دینی کا عالم نہ ہوتا۔ ظاہر ہے کہ یہ فرق صرف اس ہادی اعظم کی غیر موجودگی کی وجہ سے ہے۔ ویسے تو اہل یورپ نے قرآن اور حدیث کا بہت شدت کے ساتھ مطالعہ کیا ہے لیکن یہ مطالعہ ان کے کسی کام نہ آسکا کیونکہ عرب کے لوگوں میں جو معلم (کتاب وحکمت) موجود تھا، وہ اہل یورپ کو نصیب نہ ہوا۔ آج بھی اگر کوئی بزرگ ہستی ان غیر مسلموں کے سامنے دین کو بیان کرتی ہے تو وہ لوگ خاصی تعداد میں مسلمان ہو جاتے ہیں اور ہوئے ہیں۔ آج قرآن کے مفسرین اور قرآن کو سمجھنے والوں کی کمی نہیں ہے لیکن درجہ صحابیت پر ایک بھی شخص فائز نہیں ہو سکتا یہ صحبت کا ہی اثر ہے کہ صحابہؓ کے بعد تابعینؒ کا گروہ نمودار ہوا اور ان کی صحبت سے تبع تابعین۔ آج اس صحبت کی نفی کرنے میں کوئی مصلحت نظر نہیں آتی۔

مقربین کی صحبت سے روگردانی کرنے کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ صحیح بصیرت پیدا نہیں ہوتی ہے چنانچہ قرآن کو خود ہی پڑھنے والے بزعمِ خود مجتہدین بن بیٹھتے ہیں اور اسلام میں انتشار کا باعث بنتے ہیں۔ ایسے مجتہدین کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی طب کی کتابیں پڑھ کر خود ہی اپنا معالج بن جائے۔ اسلام کے ۷۳ فرقوں میں سے ہر ایک قرآن اور حدیث کی سند پیش کرتا ہے۔ ایسے ہی کئی لوگ صحیح راستہ سے ہٹ کر گمراہ ہو گئے اور

دوسروں کی گمراہی کا باعث بنے اس لیے کہ انہوں نے اپنے فہم کو، صرف ونحو اور لغت دانی کو کافی سمجھا اور تاویلات کے لیے اپنی ذہانت پر اعتماد کر لیا۔ فہم سلیم، صحیح ذوق اور بصیرت کے لیے جن امور کی ضرورت تھی ان سے استغنا برتا گیا۔ اسی لیے قرآن فرماتا ہے کہ یہ لوگ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں اور یہ بھی فرمایا۔

وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ (البقرہ:۲۶) ''اور نہیں گمراہ کرتا اس سے مگر نافرمانوں کو''

مولانا رومؒ نے اسی لئے ایسے لوگوں کے لئے کہا ہے۔

کیست کافر! غافل از ایمانِ شیخ کیست مردہ! بے خبر از جانِ شیخ (۳۱۳۔۲)

(کافر کون ہے جو شیخ پر ایمان کی لذت سے بے خبر ہو، مردہ کون ہے جو شیخ کی روحانی قوت سے بے خبر ہو)

پھر مولانا فرماتے ہیں۔

پس تو اے ناشستہ رُو در چیستی در نزاع و در حسد با کیستی

(پس اے ناپاک منہ والے تو کس خیال میں ہے، (ذرا دیکھ) تو کس کے ساتھ جھگڑتا اور حسد کرتا ہے۔)

باذُمِ شیرے تو بازی می کنی بر ملائک ترک تازی می کنی

(تو شیر کی دم سے کھیل رہا ہے، اور تو فرشتوں پر حملہ کر رہا ہے۔)

بد چہ می گوئی تو خیرِ محض را ہیں ترفع کم شمر ایں خفض را

(تو اس مجسم نیکی کو برا کیوں کہہ رہا ہے، خبردار اپنی پستی کو بلندی نہ خیال کر۔)

مس اگر از کیمیا قابل نہ بُد کیمیا از مس ہرگز مس نہ شد (۳۱۴۔۲)

(تانبا اگر کیمیا سے سونا نہ بن سکا، تو سمجھ کیمیا تانبے سے ہرگز تانبا نہیں بن جائے گا۔)

در رخِ مہ عیب بینی می کنی در بہشتے خار چینی می کنی

(تو چاند کے چہرے میں عیب نکالتا ہے اور بہشت میں کانٹا تلاش کرتا ہے۔)

گر بہشت اندر روی اے خار جُو ہیچ خار آں جا نیابی غیرِ تو

(اگر بہشت میں تو کانٹا تلاش کرنے نکلے تو اس بہشت میں تیرے سوا کوئی کانٹا نہ ہوگا۔)

عیبہا از ردِ پیراں عیب شد غیب ہا از رشکِ پیراں غیب شد (۳۱۵۔۲)

(بہت معیوب چیزیں پیروں کے رد کرنے سے معیوب قرار پائی ہیں، اور بہت سے مخفی راز پیروں کی غیرت کی وجہ سے مخفی ہیں۔)

مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کچھ گناہ گار کہتے ہیں کہ ہم نیک کام نہیں کرتے تو خداوند تعالیٰ نے ہمارا کیا بگاڑ لیا ہے۔ فرماتے ہیں ان کو رونے اور گریے کی توفیق نہیں اور اگر نماز و روزہ بھی کریں تو بھی وہ روحانی لذت

سے محروم کر دیے جاتے ہیں۔

وز نماز و از زکوٰۃ و غیرِ آں　لیک یک ذرہ ندارد ذوق جاں

(وہ اپنی نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کی عبادتیں کرتا ہے، لیکن ان میں ایک ذرہ بھر بھی روحانی لطف نہیں پاتا)

می کند طاعات و افعالِ سنی　لیک یک ذرہ ندارد چاشنی (۳۱۹۔۲)

(وہ طاعات اور اعلیٰ اعمال تو بجالاتا ہے، لیکن ان میں وہ ایک ذرہ چاشنی نہیں پاتا)

ذوق باید تا دہد طاعات بر　مغز باید تا دہد دانہ شجر (۳۱۹۔۲)

(ذوق ہونا چاہیے تاکہ طاعات پھل لائیں، دانہ میں مغز ہونا چاہیے تاکہ درخت کا بیج اُگ سکے۔)

صوفیاء کے خلاف اعتراضات کے جوابات

ماضی بعید میں علماء سوء نے چند ایسے مسائل کھڑے کر دیے جن سے آج تک مسلمانوں میں مسلسل اختلاف بڑھتا ہی جا رہا ہے جس کو بعد میں محمد بن عبدالوہاب نے ہوا دی۔ ان علماً کے خلاف بہت سے جید علماً نے قلم اٹھایا ہے اور ثابت کیا ہے کہ ان کا نقطۂ اختلاف فروعی تھا۔ درج ذیل چند اختلافی مسائل ہیں جن کی مختصر سی وضاحت کی جا رہی ہے۔ تفصیل درکار ہو تو اسلامی روحانیت اور مشاہدۂ حق از کپتان واحد بخش سیال اور دیگر کتب کا مطالعہ کریں۔

ا۔ قبروں کی زیارت

علامہ ابن تیمیہ نے "لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلَاثَۃِ مَسَاجِدَ" (اونٹوں پر کجاوے نہ کسے جائیں سوائے تین مساجد کے یعنی مسجد حرام، مسجد نبوی اور بیت المقدس) والی حدیث کا منشا یہ لیا ہے کہ سوائے ان تین مساجد کے کسی اور طرف سفر اختیار نہ کرو، جس کو اکثر ائمہ نے غلط قرار دیا ہے۔ (تفصیل دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ مسئلہ مشہور ہے۔) حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو دمشق میں حضور پاک ﷺ کی زیارت خواب میں ہوئی اور فرمایا کہ اے بلال! یہ کیا ظلم ہے کہ تم ہماری زیارت کو نہیں آئے چنانچہ صبح اٹھتے ہی بلال رضی اللہ عنہ نے حضور پاک ﷺ کی قبر کی زیارت کے لئے سفر اختیار کیا۔ (دیکھئے جذب القلوب الی دیار المحبوب از عبدالحق محدث دہلوی) اس کے علاوہ حضور پاک ﷺ نے ہمیشہ جنگ بدر اور اُحد کے شہداء کی قبروں کی زیارت کی اور صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو بھی قبروں کی زیارت کے لئے ارشاد فرمایا۔ دراصل حدیث پاک میں جس بات کی ممانعت کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ان تین مساجد کے علاوہ زیادہ ثواب کے حصول کی نیت کرتے ہوئے کسی اور مسجد کی طرف سفر نہیں کرنا چاہیے۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ امام ابن رجب حنبلیؒ اور امام عراقیؒ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقام

"الخلیل" کی طرف جا رہے تھے اچانک ابن رجبؒ کہنے لگے میں نے مسجد خلیل کی نیت کر لی۔ امام عراقیؒ نے فرمایا میں نے مزار خلیل کی زیارت کی نیت کر رکھی ہے اور تم نے حدیث کے خلاف نیت کر رکھی ہے حدیث میں صرف تین مسجدوں کی طرف کوچ کرنے کی اجازت ہے اور تم نے ایک چوتھی مسجد کا ارادہ کر رکھا ہے۔ جب کہ میں نے مزار خلیل کا ارادہ کر رکھا ہے اور حدیث میں ہے کہ قبروں کی زیارت کیا کرو اس گفتگو پر ابن رجبؒ حیران رہ گئے)۔ (فضائلِ حج از زکریا)

۲۔ مجلس ذکر

کچھ کج فہم لوگ تو اس بات پر بھی معترض ہیں کہ صوفیہ کرام حلقہ اور مجلس کی شکل میں ذکر کیوں کرتے ہیں، حالانکہ صحابہ کرام تو ایسا نہیں کرتے تھے؟ یہ معترضین کی کم علمی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ متعدد احادیث مبارکہ میں ہے کہ فرشتے ذکر کے حلقے تلاش کرتے رہتے ہیں اور جب کوئی حلقہ ذکر انہیں مل جائے تو وہ اپنے ساتھیوں سے کہتے ہیں آؤ تمہارا مطلوب یہ ہے۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ کچھ فرشتے دنیا میں گھوم پھر کر ذکر کے حلقوں کی زیارت کرتے ہیں اور پھر اپنی اس سیر کی گفتگو اللہ تعالیٰ سے کرتے ہیں۔ اس حدیث کا بیان ذکر کے باب میں آئے گا۔ اِنشاء اللہ

نبی کریم ﷺ نے خود ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ کو ایک مقام پر جمع فرمایا، دروازہ بند کرایا اور پوچھا تمہارے درمیان کوئی اجنبی تو موجود نہیں؟ صحابہؓ نے عرض کیا نہیں فرمایا سب کہو "لا الٰہ الا اللہ" پھر فرمایا جس نے یہ کہا جنت میں داخل ہوا (الانوار القدسیہ ص ۱۷) اس حدیث میں حلقہ کی صورت میں ذکر کرنے پر بہترین اسوہ ہے اس واقعہ کو حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے بھی رسالہ مکیہ میں کیا ہے جو "امداد" کے نام سے محمد عاشق میرٹھی نے شائع کیا ہے۔

۳۔ عرس منانا اور قبروں پر غلاف چڑھانا

قبروں پر غلاف چڑھانا، فاتحہ دینا، عرس منانا اور قوالی سننا وغیرہ ایسے مسائل ہیں جن میں علماً کا اختلاف ہے۔ یہ مسائل فروعی ہیں نہ کہ اصولی۔ علماً کا فتویٰ ہے کہ ہر ایک کو یہ اختیار ہے کہ اپنے مسلک پر قرآن اور حدیث کی رو سے عمل کرے۔ فروعی مسائل میں اگر غلطی بھی ہو جائے تو اجتہادی غلطی پر گناہ نہیں ہوتا۔ صوفیائے کرام چونکہ علم شریعت میں ماہرین کی حیثیت رکھتے ہیں اور درج بالا تمام باتوں کو جائز قرار دیتے ہیں اس لیے عوام کے لیے ان کے فتویٰ پر عمل جائز ہے۔ حضرت باقی باللہؒ نے عرس پر جانے کا ذکر کیا ہے جس کا بیان مکتوبات میں ہے۔ ان کی پیروی میں سلامتی ایمان کی ضمانت ہے خود کو با کمال گردانتے ہوئے سامری کی طرح گمراہی کی راہ پر نہ چلو۔

سامری وار آں ہنر در خود چوں دید اُو ز موسیٰ از تکبر سر کشید

(سامری کی طرح جب اس نے خود میں وہ ہنر دیکھا، تو از راہِ تکبر اس نے موسیٰ علیہ السلام سے سرکشی کی۔)

اُو ز موسیٰ آں ہنر آموختہ وز مُعلم چشم را بر دوختہ (۱۹۳۔۲)

(اس نے وہ ہنر موسیٰ علیہ السلام سے سیکھا تھا، اور بالآخر اپنے استاد سے قطع نظر کر بیٹھا۔)

قُربِ حق و رزق بر جملہ ست عام قربِ وحیِ عشق دارند ایں کرام (۷۶۔۲)

(اللہ کا قرب اور رزق تو سب پر عام ہے، لیکن وحیِ عشق کا قرب تو صرف اولیاء کرام کا حصہ ہے۔)

در جام جہاں نمائے می بیں سِرِّ دو جہاں ولے مکن فاش (عراقی)

(اس جام میں تمام جہاں نظر آتا ہے یعنی (دِل) میں دونوں جہانوں کے رازوں کو دیکھو مگر انہیں فاش نہ کرو)

از جانِ خویشتن ہمرازے نہفتہ دارم زیرا کہ می نشاید بیگانہ محرمی را (امیر خسرو)

(میں نے اپنی جان سے بھی ایک ہمراز (محبوب) کو چھپا رکھا ہے تا کہ میرا غیر میرے محرم کو پہچان نہ لے)

پیشِ ارباب خود شرح مکن مشکلِ عشق نکتۂ خاص مگو، محفلِ عام است اینجا (جامی)

(اپنے دوستوں کے سامنے عشق کی مشکلیں بیان نہ کرو، خاص نکتے کو ظاہر نہ کرو یہ عام لوگوں کی مجلس ہے)

حضرت داتا گنج بخشؒ نے اپنے ایک مشاہدہ کا بیان کشف المحجوب میں لکھا ہے کہ وہ ایک بزرگ کی قبر پر جاتے تھے اور دیکھتے تھے کہ روزانہ ایک کبوتر ان کی قبر کے غلاف میں گھس جاتا ہے اور بعد میں کہیں نظر نہیں آتا صاحبِ مزار نے بتایا کہ یہ کبوتر ان کے دل کی صفائی ہے جو روزانہ ان کو ملنے آتی ہے۔ اس سے قبروں پر غلاف کا جواز ملتا ہے اور ہر ولیِ کامل کے مزار پر غلاف ہوتے ہیں۔

۴۔ وسیلہ کی ایک اور واضح دلیل

عہدِ فاروقی میں حضرات حسنینؓ نے اپنے بچپنے کی عمر میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے ساتھ کھیلنے سے منع کر دیا اور کہا کہ جاؤ تم تو ہمارے غلام زادے ہو۔ بچے نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس شکایت کی تو آپ نے فرمایا کہ یہ بات ان سے لکھوا لو۔ جب لکھ لی گئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا جنت کے لئے یہ سند کافی ہے (کہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا غلام تھا) اور فرمایا کہ اس کاغذ کو قبر میں رکھ کر مجھے سپرد خاک کرنا آپ کا یہ فرمان وسیلہ کی واضح دلیل ہے۔

۵۔ استمداد از غیر اللہ

غیر اللہ سے مدد حاصل کرنا، اس پر بہت کلام کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ ہر ذی عقل جانتا ہے کہ کوئی مخلوق اپنے ذاتی اور مستقل اختیار سے کسی مخلوق کی مدد نہیں کر سکتا اور نہ ہی کوئی مسلم اللہ

تعالیٰ کی طرف جسے دار جان کر کسی سے مدد مانگتا ہے۔ ہاں جو کچھ رب تعالیٰ سے طلب کرنا ہے وہ اہل اللہ سے کہہ کر لیا جاتا ہے۔ بارش اللہ تعالیٰ نازل فرماتا ہے لیکن صحابہ کرامؓ درخواست حضور اکرم ﷺ سے کرتے تھے۔ قحط سالی اللہ نے ختم کرنا ہوتی ہے لیکن صحابہؓ نے حضور اکرم ﷺ کے روضہ انور پر آ کر شکایت کی جس پر بارش ہوئی اور قحط سالی ختم ہوئی۔ اہل اللہ خواہ حیات ہوں یا وصال فرما چکے ہوں ان سے دعا کی درخواست کرنا ہی ان سے استمداد ہے۔ راقم الحروف کی تصنیف ''رابطۂ شیخ'' میں ایک باب اولیاء اللہ کی امداد کا اللہ کی مدد ہونے کا مستند حوالہ جات کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے شکوک رفع ہو جاتے ہیں۔

۶۔ شیخ کے وسیلہ ہونے پر گفتگو

قرآن مجید میں آیت وسیلہ کا ذکر کیا گیا ہے جس کو قارئین کے لئے نیچے بیان کیا جا رہا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ابْتَغُوْۤا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ (المائدۃ:۳۵) ''اے ایمان والو! ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور تلاش کرو اس تک پہنچنے کا وسیلہ''۔

اس آیت میں لفظ وسیلہ کے متعلق کچھ لوگوں نے غلط رائے قائم کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ وسیلہ سے مراد صرف اعمالِ صالحہ ہیں۔ اس سلسلے'' میں قبولیتِ دعا کے لئے اہم عنصر'' کے عنوان کے تحت وسیلے کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ اس تفصیل کا مطالعہ ہماری تصانیف ''بیعت کی تشکیل اور تربیت'' کے علاوہ ''حسن نماز'' سے کیا جا سکتا ہے۔ یہاں اس قدر لکھ دینا کافی ہوگا کہ لفظ وسیلہ کی تحقیق کرتے ہوئے مندرجہ ذیل مشائخ اور علماء کبار نے وسیلے سے مراد مرشد کامل کا ہونا لیا ہے جو اپنی روحانی توجہ سے اپنے مرید کی آنکھوں سے غفلت کی پٹی اتار دے اور دل میں یادِ الٰہی کی تڑپ پیدا کر دے۔ ان مشائخ اور اولیاء کے نام حسب ذیل ہیں۔

ابن منظورؒ (لسان العرب)، صاحب کشاف، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (القول الجمیل)، مولانا اسماعیل (صراط مستقیم)، شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلوی (تفسیر عزیزی)، مولانا جامیؒ، شاہ عبدالرحیم سید محمد ذوقیؒ (سِرّ دلبراں)، حضرت بایزید بسطامیؒ، جنید بغدادیؒ، معین الدین چشتیؒ، نظام الدین اولیاءؒ تمام اولیائے قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ خصوصاً حضرت مجدد الف ثانیؒ، مولانا رومؒ، مولانا عطارؒ، علامہ اقبالؒ اور تمام صوفی شعراء کے علاوہ اسلامی مفکرین وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے فرمایا ہے کہ کچھ لوگ اعمالِ صالحہ کو وسیلہ خیال کرتے ہیں لیکن یہ اعمال بھی پیر کی وجہ سے صادر ہوتے ہیں اس لئے شیخ کا وسیلہ اعمال کے وسیلے سے بھی بڑا وسیلہ ہے۔

درج بالا تمام بزرگوں نے مرشد کو وسیلہ تسلیم کیا ہے اور خود بھی کسی نہ کسی سلسلۂ طریقت سے منسلک تھے۔ لاکھوں اولیائے کرام سلسلۂ بیعت سے مستفیض ہوتے رہے۔ (بیعت کی مخالفت موجودہ زمانے کے مخالفین

اسلام کی پیداوار ہے جس سے ان کا مقصد مسلمانوں میں روحِ اسلام کو مفقود کرنا ہے ورنہ آج تک کوئی بزرگ ایسا نہیں دیکھا گیا جس نے بالواسطہ یا بلاواسطہ بیعت کا شرف حاصل نہ کیا ہو۔ حضرت معین الدین چشتیؒ اور دیگر اکابرین نے تو یہاں تک فرمایا کہ جس کا کوئی پیر نہیں اس کا شیطان پیر ہے۔

مولانا رومؒ، شاہ شمس تبریزؒ، مولانا عطارؒ اور دیگر تمام صوفی شاعروں نے دل کھول کر بیعت کی افادیت اور مخالفینِ بیعت کی مذمت کی ہے۔ ایسے شعراء کا کچھ کلام اسی باب میں بیان کر دیا گیا ہے۔ ابن منظورؒ، صاحب کشاف اور لسان العرب کے مطابق وسیلہ ہر وہ چیز ہے جس کے ذریعے کسی تک پہنچا جائے اور اس کا قرب حاصل ہو، وسل رغبت و محبت کے ساتھ ملنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ صحاح جوہری اور مفردات القرآن میں اس کی تشریح کی گئی ہے۔ وسیلہ ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو دو چیزوں کو جوڑ دے۔

حضرت داتا گنج بخشؒ امام ابو حنیفہؒ کے حالات زندگی میں لکھتے ہیں کہ حضرت یحییٰ بن معاز رازی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا میں نے کہا: یارسول اللہ! اَیْنَ اَطْلُبُکَ؟ قَالَ عِنْدَ عِلْمِ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ میں آپ کو کہاں تلاش کروں؟ فرمایا ابو حنیفہ کے علم کے پاس۔ (کشف المحجوب نیروی ص ۱۸۹)

حضور اکرم ﷺ نے براہ راست قرآن کی طرف نہیں فرمایا۔ اس لئے کہ قرآنی ہدایات اہل اللہ کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتیں۔

وسیلہ سے متعلقہ دیگر آیات

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ''اور ذکر کیا کرو اپنے رب کے نام کا اور سب سے کٹ کر اس کے ہو رہو''۔ (المزمل: ۸)

اس آیت میں ذکر میں ہمیشگی اور سب سے کٹ کر الگ تھلگ ہونا ہے جس کو طریقت کی اصطلاح میں دوامِ ذکر (پاسِ انفاس) اور فناء الفناء کہتے ہیں۔ ان دو قدموں کے اٹھنے سے ہی منزل آ جاتی ہے۔ پہلے قدم میں مخلوق سے قطع تعلق اور دوسرے قدم پر وصول الی الحق ہے۔ دونوں لازم اور ملزوم ہیں۔ اس آیت میں محض ذکر نہیں کہا گیا بلکہ اللہ کے نام کا ذکر کرنا فرمایا گیا ہے کیونکہ ہماری رسائی اس کے اسماء کے ذکر تک ہی ممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کا ذکر تو بہت دور کی بات ہے اللہ تعالیٰ کے اسماء کا ذکر اس کی ذات تک راہنمائی کرتا ہے۔ گویا اس کا ذکر اس کی ذات کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ یاد رہے کہ اللہ کا لفظ اللہ نہیں بلکہ اللہ کی طرف اشارہ کرتا ہے اور قرآن کے حروف قرآن نہیں ہیں بلکہ نورِ قرآن کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ تفسیر مظہری میں ہے کہ ''تبتل'' کے مقام تک پہنچانے کا وسیلہ صرف ایسا ذکر ہی بنتا ہے جس میں جذب الٰہی دستگیری فرمائے یا شیخ کامل

کی کشش نصیب ہو۔ حضرت یعقوب چرخیؒ فرماتے ہیں کہ "تبتل" سے مراد ماسوا اللہ کی نفی ہے اور یہ معنی عنایت ازلی اور شیخ کامل کی خدمت کے علاوہ ذکر کی کثرت سے حاصل ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا تمام باتیں کتابی سطح پر حاصل نہیں ہوسکتی ہیں بلکہ اس کے لیے خاص الخاص تربیت یافتہ شیخ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کے بغیر اس آیت کے مقاصد کو حاصل کرنا صرف دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ قرآن کی ایسی آیات کے ہوتے ہوئے ان کا بیعت سے انکار کرنا قرآن کی آیات کے مقصود کا انکار ہوگا۔

بے عنایاتِ حق و خاصانِ حق　　گر ملک باشد سیاہ ہستیش ورق (۲۰۷-۱)

(اللہ اور خاصانِ حق کی عنایات کے بغیر، کوئی فرشتہ بھی ہو تو اس کا نامہ اعمال سیاہ ہوتا ہے۔)

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ (المعارج: ۴)

"عروج کرتے ہیں فرشتے اور جبرائیل علیہ السلام اللہ کی بارگاہ میں (یہ عذاب) اس دن (ہوگا) جس دن کی مقدار پچاس ہزار برس ہے"۔

معارج عروج سے بنا ہے جس کے معنی اونچا ہونا ہے اور اس کے معنی سیڑھیاں بھی ہیں۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ معارج آسمان ہیں کیونکہ وہ بھی سیڑھیوں کی طرح درجہ بدرجہ ہیں۔ روح سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ علامہ پانی پتیؒ لکھتے ہیں کہ روح سے مراد انسانی روح ہے جس کا تعلق عالم امر سے ہے اور انبیاء اور اولیاء کی روحیں غفلت کی پستیوں سے پرواز کر کے رب ذوالجلال کے حریم قرب میں جگہ بنالیتی ہیں۔ (مظہری)

تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ "تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ" سے مراد قیامت کا دن نہیں بلکہ اب بھی فرشتے بارگاہ الٰہی میں حاضر ہوتے ہیں اور وہاں سے احکام اور ہدایات حاصل کرتے ہیں۔ یہ فرشتے نہایت قلیل وقت میں ہدایات پر عمل پیرا ہونے کے لئے اپنے اپنے مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔ یہ مسافت وہ پل بھر میں طے کر لیتے ہیں جو انسان کے لئے اپنی طبعی رفتار کے مطابق پچاس ہزار سال کا راستہ ہے۔ فرماتے ہیں کہ اتنی تو کسی کی عمر بھی نہیں ہوسکتی لیکن ولی اللہ انسان کی روح یہ راستہ ایک لمحے میں طے کر سکتی ہے۔ بخاری شریف کی حدیث میں ہے کہ جب کوئی شخص کسی ولی کامل کی قبر پر حاضر ہو کر سلام پیش کرتا ہے تو وہ روح اعلیٰ علیین سے لحہ بھر میں اپنی قبر پر پہنچ جاتی ہے۔ اس قدر مسافت کا اتنی سرعت سے طے ہونا اللہ تعالیٰ سے کشش اور جذب کے بغیر (معرفت کے ذریعے حاصل ہوتی ہے) ممکن نہیں۔

حضرت ثناء اللہ پانی پتیؒ تفسیر مظہری میں فرماتے ہیں کہ انسانی طاقت کے مطابق کثرت سے اللہ کا ذکر کرنا، جیسا کہ "وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ" سے مراد ہے" بندے کو "تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا" کی منزل تک پہنچانے کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ بشرطیکہ جذب الٰہی دستگیری فرمائے شیخ کامل کی کشش نصیب ہو۔ حضرت یعقوب چرخیؒ

فرماتے ہیں کہ اسی کو اہلِ تصوف ماسویٰ کی نفی کہتے ہیں اور یہ معنی کثرتِ ذکر سے حاصل ہوتا ہے اور عنایتِ ازلی اور شیخ کامل و مکمل کی خدمت اس کا سبب بنتی ہے۔ مولانا رومؒ نے درج ذیل آیت کے مطابق اپنے کلام میں استدلال قائم کیا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ (التوبہ:۱۱۹) "اے ایمان والو! ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور ہو جاؤ سچے لوگوں کے ساتھ"۔

پچھلی آیاتِ میں منافقین پر عتاب اور سچے صحابہ کی قبولیتِ توبہ کا ذکر کرنے کے بعد اس میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اے ایمان والو! تم سچے صحابہ کا ساتھ اختیار کرلو اور قیامت تک کے آنے والوں کو اس راستے پر چلنے کی تلقین کی جارہی ہے جو اپنے قول اور فعل میں سچے اور عشقِ الٰہی میں ثابت قدم ہیں۔ اگر کوئی جرم ہو جائے تو یہ لوگ اظہار ندامت اور استغفار کرتے ہیں۔ نبی پاک ﷺ نے فرمایا کہ ہمیشہ سچ بولا کرو، سچ بولنا نیکی کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور نیکی جنت کا راستہ دکھاتی ہے اور انسان جب سچ بولتا رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی جناب میں اس کو صدیق کا لقب عطا کیا جاتا ہے "حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ صِدِّيْقًا" یہاں مناسب ہوگا کہ صدیق کی کچھ تشریح کردی جائے۔

باب ۱۵

ضرورتِ شیخ پر استدلال

(مشائخ کبار کے فرمودات اور انکشافات)

خدا کے نزدیک مشائخ کا درجہ

مشائخِ کبار اور اولیائے عظام کا ضرورتِ شیخ پر استدلال پیش کرنے سے پہلے یہ اَمر ضروری ہے کہ ان کی رفعت اور روحانی دنیا میں ان کے مقام اور شان کے متعلق قارئین کو مختصراً تعارف کروا دیا جائے۔ اولیائے کرام کو روحانی دنیا میں جو مقام حاصل ہے اس کو ظاہر کرنے کی سعی نامکمل اس کتاب میں "معرفتِ ولایت" کے عنوان سے بیان کی گئی ہے۔ خدائے قدوس نے ان بے مثل اور بلند ہستیوں کے گروہ کو اتباعِ نبی ﷺ اور آپ ﷺ سے شدید محبت کے باعث محبوبینِ الٰہی ہونے کا شرف عطا فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غلبۂ عشق میں اپنے اوقات کو صرف کرنے والے یہ محبوبین، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس قدر انعام یافتہ ہیں کہ اس نے اس دنیا میں انہیں امرِ "کُنْ" کا شرف بخش دیا ہے۔ اس مخلوق پر خدا کے دیگر عظیم انعامات پر اگر طائرانہ نظر کی جائے تو عقلیں متحیر اور رأسِ قلم بے بس ومجبور ہو جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا کھانا، پینا، اٹھنا، بیٹھنا، اوڑھنا اور بچھونا معیتِ خداوندی کے بغیر متصور نہیں۔ یہ لوگ اللہ کے ہم نشین، انبیائے کرام علیہم السلام کے وارث اور ان میں سے بعض صدیقین اور بعض شہدائے عظام کے درجات کے متحمل ہیں اور مخلوقات میں سب سے اشرف مخلوق کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو دیکھنا، اس کی معیت میں رہنا اور اس سے شرفِ ہمکلامی حاصل کرنا، ان پاک لوگوں کی خصوصیات میں شامل ہے۔ ان میں سے ایسے لوگ بھی ہیں جن کو رسول اللہ ﷺ سے آج بھی بالمشافہ گفتگو اور آپ ﷺ کا دیدار کرنے کا شرف حاصل ہے۔

یہ اولیائے کرامؒ اس قوم سے ہیں جو مختلف فیہ امور میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ سے براہ راست استفادہ کرنے کے بعد نہایت دقیق مسائل کا حل تلاش کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں مگر کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ کچھ کم ہمت اور ناسمجھ طبقے سے تعلق رکھنے والے خود ساختہ علماء ایسے بلند مقام صوفیہ کے متعلق لب کشائی کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ ایسے علماء کی مثال چوہوں کی سی ہے جو شیر کی دم سے کھیلنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ شیر ان کی پرواہ نہیں کرتا۔ اس طرح یہ اولیاء کبار بھی بصیرت ومشاہدہ سے بے بہرہ

لوگوں کو معذور اور محرومِ سعادت تصور کرتے ہوئے درگزر سے کام لیتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ عادتاً اولیائے کرام تو درکنار صحابہ کرامؓ اور خود رسول اللہ ﷺ کی شان میں توہین آمیز جملے کہہ جانے سے گریز نہیں کرتے۔ کم عقل اور ناعاقبت اندیش لوگوں سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ دین کے متعلق ان اولیاء کبار کا ہر قول اور فعل گفتۂ خدا اور رسول اللہ ﷺ کے عین مطابق ہوتا ہے۔ یہ اس لئے کہ خدائے تبارک و تعالیٰ ان لوگوں سے راضی ہو چکا ہے اور اس نے اُن کو الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ (الفاتحہ: ۶) کے زمرے میں شامل کیا ہے۔ احادیث میں بھی وارد ہے کہ خدائے پاک نے ان کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ اور ان کی بات کو اپنی بات کہا ہے۔ جو لوگ صرف صحابہ کرامؓ تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کو ہی قابل تقلید تصور کرتے ہیں اور بعد میں آنے والی ہستیوں کو ہدایت یافتہ لوگوں میں شامل نہیں کرتے وہ سخت غلطی پر ہیں۔ وہ درحقیقت یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تبع تابعینؒ کے بعد ہدایت یافتہ لوگوں کا گروہ نابود کر دیا گیا ہے۔ اسی لئے اب کوئی اور قابلِ اتباع نہیں ہے حالانکہ سورۂ واقعہ میں ان کی تعداد کے متعلق ثُلَّۃٌ مِّنَ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۱۳﴾ وَ قَلِیۡلٌ مِّنَ الۡاٰخِرِیۡنَ ﴿۱۴﴾ (الواقعہ) (ایک بڑی جماعت پہلوں سے اور قلیل تعداد پچھلوں سے) کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور اس زمانے میں بھی ان کے موجود ہونے کی دلیل پیش کی گئی ہے۔ مزید برآں اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۙ﴿۶﴾ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ (الفاتحہ) میں ہدایت یافتہ لوگوں کی اتباع کا حکم موجود ہے اور ان کی اتباع کو ناجائز قرار دینے کی کوئی دلیل قرآن اور حدیث سے ثابت نہیں۔ حضرت مخدوم علی الہجویریؒ کا ارشاد ہے کہ یُّحِبُّہُمۡ وَ یُحِبُّوۡنَہٗۤ (المائدہ: ۵۴) سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں محبوب رکھتا ہے اور وہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کا ناصر و مددگار ہے اور اس نے ان پاک ہستیوں کو اپنی دوستی اور ولایت کے لئے مخصوص کر لیا ہے۔ مختلف انواع و اقسام کی کرامتیں ان کی ذات کے ساتھ مخصوص کر دی ہیں۔ آفاتِ طبع اور ھویٰ سے ان کو پاک کر دیا ہے اور نفس کی پیروی سے ان کو آزاد گردانا ہے۔ ان کی ہمت اور ارادے سوائے مشیتِ الٰہی کے، ظہور میں نہیں آتے (گویا یہ وہی کرتے ہیں جو اللہ چاہتا ہے اور جس کا رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے۔) یہ لوگ ہم سے قبل موجود تھے، اب بھی موجود ہیں اور اس بزمِ ہستی میں قیامت قائم ہونے تک رہیں گے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں کہ بارانِ رحمت جو آسمان سے نازل ہو رہی ہے وہ ان کے دم قدم اور ان کے صدقہ سے ہے، زمین سے جو سبزہ اُگ رہا ہے وہ ان کے تصفیۂ باطن اور ولایت کی برکت سے اُگ رہا ہے اور کافروں پر مومنوں کو غلبہ انہیں کی ہمت سے حاصل ہوتا ہے۔

غور کا مقام ہے کہ ان اوصافِ حمیدہ کے حامل برگزیدہ بندگانِ خدا کی بزرگی و عظمت خود اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے، ایسی ہستیوں کے متعلق نازیبا الفاظ استعمال کرنا ہرگز درست نہیں اور اگر کوئی ان کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کرتا ہے تو وہ ان ہستیوں کی بلندیوں سے قطعاً نابلد ہے۔ ان نفوسِ قدسیہ کے کوائفِ روحانی اور مجاہداتِ

نفس کے علاوہ ان سے منسلک روایات، مکاشفات، روحانی پرواز، عروج ونزول اور روحانی احوال کو سمجھنا تو ایک طرف، یہ لوگ ان اصطلاحوں سے ہی سرسری واقفیت کے سوا کچھ بھی نہیں جانتے۔ دیکھا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کا مطالعہ فقط ایک مخصوص طبقہ فکر کے علماء کی تحریر کردہ کتابوں تک ہی محدود رہتا ہے اور وہ جید علمائے اسلام کی کتابوں سے رجوع نہیں کرتے اور جب ان کو ان کتب کا حوالہ دیا جائے تو حیرت کا اظہار کرتے ہیں، لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ معترضین محدود اور متعصب عملیت کی وجہ سے اس مینڈک سے زیادہ اہلیت نہیں رکھتے جس کی ساری کائنات ایک کنوئیں کی چار دیواری سے ہی متعلق ہے کہ وہ جان بوجھ کر اس تنگ کنوئیں سے باہر نکلنا نہیں چاہتے۔ ان کی اکثریت اسی ضد اور عناد کی وجہ سے ہی انکارِ بیعت کرتی ہے۔ وہ قرآن اور حدیث سے بیعت کی مشروعیت کے ختم ہونے کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتے، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے آج تک بیعت کا سلسلہ جاری ہے۔ بغیر کسی دلیل کے یہ کہہ دینا کہ اس وقت بیعت کی ضرورت تھی اور اب نہیں رہی یا یہ کہ بیعت تو جنگوں میں سر کٹانے کے لئے تھی، اس قسم کے عذر تو کوئی قابلِ قبول بات نہیں۔

راقم الحروف نے ایک مسجد میں ماہِ رمضان کے درمیان چند روز کے لئے روحانی اُمور پر درس دینے کا اہتمام کیا جس میں حضرت جنید بغدادیؒ اور بایزید بسطامیؒ وغیرہ کے کلام کے نمونوں سے قیمتی نکات پیش کئے جس کو سن کر اہلِ عقیدت لوگوں پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی۔ چند روز کے بعد ایک شخص بول اٹھا کہ جناب آپ نے اب تک اپنے درسوں میں جو باتیں بیان کی ہیں ان سے ایک بات بھی ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ اعتراض کرنے والے صاحب چونکہ کسی خاص گروہ سے متعلق تھے اور اس دن سے پہلے یہ باتیں ان کے گوش گزار نہ ہوسکی تھیں اس لئے ایسے شخص کو سوائے اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ۔

نظر نہیں تو میرے حلقۂ سخن میں نہ بیٹھ کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثالِ تیغ اصیل

(ب۔ج:۳۵۵)

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جس طرح صحابہ کرام میں حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے کسی ایک کی مثال نہیں ملتی اسی طرح بعد کے زمانے میں شیخ عبدالقادر جیلانی، ابن عربی حضرت بایزید بسطامی، حضرت جنید بغدادی اور حضرت عطار رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کی مثال بھی ممکن نہیں، ان اولیائے کرام کے علاوہ اور بھی بے شمار ایسی ہستیوں کا وجود ملتا ہے کہ جن کا مقام اول الذکر اولیاء کی طرح تو نہیں لیکن ان کی حیثیت اس نوعیت کی بھی نہ تھی کہ جن کے متعلق ہرزہ سرائی کی جاسکے۔ چنانچہ امام غزالیؒ، شہاب الدین سہروردیؒ، علی ہجویریؒ، معین الدین چشتیؒ، نظام الدین اولیاءؒ، بہاؤالدین نقشبندؒ، باقی باللہ اور مجدد الف ثانیؒ ایسی بلند ہستیاں ہیں جن کے ناموں کو مقربین الٰہی میں شامل کیا جاتا ہے اور ان کے قول وفعل پر کسی شخص کو انگلی اٹھانے کی جرأت کرنے سے پہلے لاکھ بار سوچنا چاہیے۔

بیعت کے جواز اور اس کی موزونیت کے بارے میں ایسے لوگوں کے قول اور فعل کو اس جگہ نقل کیا جارہا ہے تاکہ طریقت سے ناآشنا لوگ طریقت کی حقیقت سے آشنا ہو سکیں لیکن وہ لوگ جو علماء سؤ کی گرفت میں آچکے ہیں قیامت تک اپنے آپ کو اس نعمت سے بہرہ ور نہیں کر سکیں گے۔ ایسے لوگوں کا نام طریقت سے محروم اور دین سے غافلین کے زمرے میں درج ہو چکا ہے تاوقتیکہ نصرت ایزدی کی بدولت وہ اپنی ہٹ دھرمی سے تائب ہوں۔

اکابر اولیاء میں سے تقریباً سب اولیائے کرام سلسلۂ بیعت سے منسلک تھے اور آج تک یہ سلسلۂ نسبت پوری آب و تاب سے جاری و ساری ہے۔ اس مختصر تحریر میں تمام اولیاء کرام کے ملفوظات کو طوالت کے سبب شامل نہیں کیا جاسکتا البتہ چند معروف اور بلند پایہ اولیائے کرام کے ارشاداتِ گرامی شامل کئے جارہے ہیں جو تکمیلِ مقصد کے لئے انشاء اللہ کافی ہوں گے۔ ان کے ملفوظات کے مطالعہ کے بعد حقیقتِ حال سے آگاہی حاصل ہوگی۔ ان اولیائے کرام نے قرآن اور حدیث سے بیعت پر استدلال قائم کئے ہیں اور امرِ واقعہ تو یہ ہے کہ اگر یہ اولیاء کبار برصغیر پاک و ہند میں تشریف نہ لاتے تو ہم سب ایمان کی دولت سے بے بہرہ اور نورِ توحید و رسالت سے محروم، کفر و شرک کی ظلمتوں میں بھٹک رہے ہوتے، لہٰذا ان کی باتوں کو غلط یا بے دینی سے تعبیر کرنا دینِ مبین سے عدمِ واقفیت اور محض بہتانِ عظیم ہے۔

ا۔ حضرت امام غزالیؒ

حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ (محمد بن محمد الغزالی الطوسیؒ) طاہران (خراسان) کے ایک ضلع طوس میں ۴۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد احمد بن محمد اذکانیؒ سے فقہ کی تعلیم پائی اور ابونصر اسماعیل جرجانیؒ سے تحصیل علم کیا۔ اس کے بعد نیشاپور گئے اور امام الحرمین عبدالملک ضیاء الدین سے علم حاصل کیا۔ امام الحرمین نے خود فرمایا "غزالی علم و معرفت کا بحرِ زخار ہے" نیشاپور سے جب نکلے تو علم و فضل میں آپ کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ اس وقت آپ کی عمر ۲۸ برس تھی۔ نظام الملک بغداد نے آپ کا تبحرِ علمی اور علمائے کبیر کے ساتھ متعدد بحثوں میں خداداد قابلیت دیکھ کر نظامیہ بغداد (بغداد یونیورسٹی) کا صدر مدرس (وائس چانسلر) بنا دیا۔ آپ پچاس برس تک درس و تدریس کے علاوہ باطنی، ظاہری، فلسفی، متکلم، صوفی اور زندیقی وغیرہ کے طبقات کے سربراہوں سے ملے اور سب کے عقائد کا سراغ لگایا۔

آپ نے اپنی کتاب "المنقذ من الضلال" (گمراہی سے نکالنے والی) میں تحریر فرمایا ہے کہ جب میں نے تصوف کی طرف توجہ دی تو سیّد الطائفہ جنید بغدادیؒ، مع ابوبکر شبلیؒ اور سلطان العارفین بایزید بسطامیؒ کے ملفوظات کا مطالعہ کیا تو دنیا کی دل فریبیوں کا صحیح نقشہ میری نظروں میں گھوم گیا۔ آپ نے حضرت ابوعلی فارمدیؒ

سے بیعت کا شرف حاصل کیا اور تھوڑی دیر بعد ہی آپ نے فیصلہ کیا کہ درس و تدریس تو شہرت کا ایک ذریعہ ہے چنانچہ نجاتِ اُخروی اس سے حاصل نہ ہو گی۔ ابن خلکان کی روایت ہے کہ ۴۸۸ھ میں امام غزالیؒ نے مدرسہ نظامیہ کو چھوڑا اور بغداد سے نکل پڑے۔ اس بغداد میں دولت و ثروت، عزت اور احترام میں ان سے آگے کوئی نہ تھا اور پھر یہ ہوا کہ قیمتی لباس کی بجائے فقیرانہ لباس میں آ گئے۔

بغداد کے بعد آپ دمشق پہنچے اور مجاہدہ و ریاضت میں مشغول ہو گئے۔ دو برس کے بعد بیت المقدس گئے اور وہاں صخرہ کے حجرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیتے اور مجاہدہ کرتے۔ رسالہ ''قواعد العقائد'' بیت المقدس والوں کی فرمائش پر لکھا۔ مجاہدات کے دوران آپ نے شام، دمشق، مقامِ خلیل، مصر، اسکندریہ، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں کچھ وقت گزارا، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ''احیاء العلوم'' آپ نے اسی دور میں تصنیف فرمائی اور اسی سفر میں لکھی گئی۔

گیارہ سال کی ریاضت اور مجاہدہ کے بعد جب آپ نے دیکھا کہ دینِ اسلام مظلوم ہوتا جا رہا ہے اور عقائدِ اسلامیہ سے ایک بہت بڑا گروہ روگردانی کر رہا ہے، تو خلوت نشینی کو خیر باد کہہ کر ۴۹۹ھ میں دوبارہ مسندِ درس پر رونق افروز ہوئے اور نیشا پور کے مدرسہ نظامیہ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس دور میں سلطانِ سنجر اور اسکے وزیرِ اعظم فخر الملک (پسر نظام الملک) حکمران تھے مگر امام صاحب اور ان کے رفقاء طریقت کی رائے غالب رہتی تھی۔ اس کے بعد پھر مدرسہ نظامیہ کو چھوڑ کر خانہ نشین ہو گئے اور تادمِ آخر (جمادی الثانی ۵۰۵ھ تک) ظاہری و باطنی علوم کی تربیت دیتے رہے۔

آپ کی مذکورہ بالا کتاب کا اردو ترجمہ ''روشنی کی طرف'' اس وقت بازار میں موجود ہے۔ اختصار کے پیشِ نظر آپ کے چند ارشادات پیش کئے جاتے ہیں۔ لوگوں کی فرمائش پر آپ نے اسی کتاب میں علم کے مقاصد اور اسرار و رموز پر روشنی ڈالنے کے علاوہ مختلف مذاہب کے نشیب و فراز، علم الکلام، مختلف فلسفیوں کے فلسفے، فلاسفہ کی مختلف اقسام اور حق کی تلاش میں اپنی پیہم جستجو سے متعلق گفتگو کی ہے۔ آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ میں نے طلباء کی کثرت کے باوجود درس و تدریس کا سلسلہ کیوں ختم کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اسلام کے مختلف فرقوں کے گہرے سمندروں میں بہت سے فرقے ڈوب چکے ہیں اور ہر فرقہ اپنے خیال سے متاثر ہے۔ آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ناجی (نجات پانے والا) اہلِ سنت والجماعت ہی ہے جس پر آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحابؓ تھے چنانچہ آپ نے تمام فرقوں سے حقائق طلب کئے اور اسی طرح ہر صوفی اور ہر زندیق کے متعلق بھی معلومات حاصل کیں۔ آپ نے اِن تمام حقائق پر بحث کی۔

مذکورہ بالا کتاب میں آپ لکھتے ہیں کہ آخر میں آپ کو یہ معلوم ہوا کہ علمِ یقین وہ نور ہے کہ جس سے کوئی شبہ نہیں رہتا اگر چہ اس کے برعکس کو صحیح ثابت کرنے کے لئے خواہ کوئی لاٹھی کو سانپ ثابت کرنے کی طاقت رکھتا

ہو۔ آپ نے دہریہ، طبعیہ (مادّہ پرست) الٰہیہ (ارسطو کی منطق) فلاسفہ باطنیہ، علم اخلاق اور سیاست کو پرکھا اور ان کے نقائص اور کمزوریوں پر روشنی ڈالی۔ پھر آپ نے صوفیہ کے مسلک کی طرف توجہ دی اور اپنی تحقیق کے بعد درج ذیل حقائق کو واضح کیا۔

۱۔ تصوف میں علم بھی ہے اور عمل بھی اور یہ دونوں انسان کو کامل بناتے ہیں۔

۲۔ صوفیہ کے علم کا نتیجہ یہ ہے کہ نفس کے تمام مکائد (مکروفریب) روشن ہو جاتے ہیں۔

۳۔ تصوف کے عمل سے نفس، اخلاقِ مذمومہ اور صفاتِ خبیثہ سے پاک ہو جاتا ہے۔

۴۔ انسان کا قلب ماسوا اللہ سے خالی ہو کر ذکرِ الٰہی سے منوّر رہتا ہے۔

۵۔ فضائلِ محمودہ اور خصائلِ حمیدہ، اہلِ تصوف کے قلوب کو آراستہ وپیراستہ کر دیتے ہیں۔

۶۔ جب میں نے اس علم کا مطالعہ کیا تو یہ مشکل محسوس ہوئی کہ علم تصوّف کے اسرار ونکات کتابوں سے حاصل نہیں ہو سکتے، اس کے حصول کے لئے ذوقِ وجدان، صدقِ حال اور تبدیلی صفات کی ضرورت ہے۔

۷۔ سعادتِ آخرت اس وقت تک حاصل نہ ہو سکے گی جب تک تقویٰ کو اپنایا نہ جائے اور خواہشاتِ نفسانی کو ترک نہ کیا جائے اور یہ سب دنیاوی تعلقات سے ہاتھ اُٹھا کر فقط اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے اور حُبِّ جاہ ومال سے اعراض کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

آپ نے اس کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ میں خود بھی دنیاوی معاملات میں گھرا پھنسا ہوا تھا، میں نے دیکھا کہ جو درس میں دیتا ہوں اس میں سے کچھ تو دین میں شامل ہے اور کچھ دینی دروس میں بھی جاہ وشہرت اور ناموری کا شائبہ تھا چنانچہ کبھی میں درس وتدریس کو چھوڑنا چاہتا اور کبھی اس کو جاری رکھنے کا فیصلہ کرتا۔ کبھی ایمان کی منادی کرنے والا مجھ سے کہتا کہ سفرِ آخرت کا وقت آ گیا ہے، تھوڑی عمر باقی ہے اور سفر دور دراز کا ہے۔ آپ یہ سمجھتے تھے کہ میرا یہ علوم وفنون کا بکھیڑا خالی اور وہمی ہے اور ان سب کو چھوڑنے کا وقت آج ہی ہے۔ چھ ماہ تک آپ اسی تردّد اور کشمکش میں رہے آپ فرماتے ہیں کہ آخر کار ذوالحج ۴۸۸ھ کو میں بے اختیار ہو گیا اور میری زبان بند ہو گئی۔ درس وتدریس ختم ہو گیا اور میں ایک آدھ گھنٹہ بھی نہ پڑھا سکتا تھا۔ آخر اس زبان بندی سے قوت ہاضمہ خراب ہوئی اور کھانا پینا ترک ہو گیا حتیٰ کہ معالجوں نے علاج سے ہاتھ اُٹھا لیا اور کہا کہ اسے کوئی قلبی صدمہ ہے چنانچہ اس صدمے کے علاج کرنے کو کہا۔ فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی اور وہ قبول ہوئی۔ میرے دِل سے بوجھ ہٹا۔ دِل چاہتا تھا کہ شام میں مقیم ہو جاؤں۔ مگر سلاطین سے ڈرتا تھا کہ کہیں وہ طلب نہ کر لیں، میرے اس فیصلے سے مخالف علماء اور بھی زیادہ بدظن ہو گئے اور کہنے لگے کہ دینی خدمت کی منزل سب سے بڑی ہے اور دینی خدمت سے میرا اعراض نامناسب اور اسلامی خدمت سے پہلوتہی کرنا ہے، حالانکہ انھیں معلوم نہ تھا کہ میرا یہ اِقدام اور اس منصب کو لات مارنے کا کام خدمتِ دین کی خاطر ہی تھا۔ کچھ

مخالفین ہمارے خلاف یہ افواہ پھیلا رہے تھے کہ امراء اور سلاطین نے مجھے تعلیم سے برطرف کر دیا ہے، حالانکہ وہ تو میرے اس کام کو ترک نہ کرنے کے لئے منتیں کرتے تھے چنانچہ میں نے عراق میں کمایا ہوا کچھ مال اہل و عیال کے لئے چھوڑا اور کچھ اپنے ساتھ لیا اور بقیہ مال اہلِ عراق کے لئے چھوڑا کیونکہ یہ ان کا ہی حق تھا۔

عراق کو چھوڑنے کے بعد دو سال شام میں گوشہ نشینی کی۔ میرا کام تزکیۂ نفس، تہذیب اخلاق، یادِ الٰہی اور تصفیۂ قلب تھا اور اس میں تصوف نے میری رہنمائی کی۔ اس کے بعد مجھے حج بیت اللہ اور زیارتِ روضہ مبارکہ کا شوق ہوا۔ وہاں سے پھر اپنے گھر آ گیا اور یہاں بھی خلوت نشین رہا، کچھ دین اور دنیا کے کام بھی کئے مگر زیادہ خلوت میں رہا یہاں تک کہ دس سال گزر گئے۔ اس دوران جو اسرار اور نکات منکشف ہوئے وہ بیان سے باہر ہیں ان میں سے کچھ افادۂ خلق کے لئے لکھتا ہوں۔

۱۔ صوفیائے کرام رحمۃ اللہ علیہم راہِ مولیٰ پر گامزن ہیں، ان کا طریق سلوک بارگاہِ الٰہی تک پہنچتا ہے۔

۲۔ صوفیائے کرام کی سیرت اور عادت سب سے افضل ہے۔

۳۔ صوفیاء کا راستہ دیگر تمام راستوں سے صاف اور سیدھا ہے بلکہ اگر تمام عقلاء اور حکماء کی عقلیں، حکمتیں اور آشنائے اسرارِ شریعت کی تمام صلاحیتیں جمع کی جائیں تو بھی صوفیائے کرام کے اخلاق واطوار کا مقابلہ نہیں کر سکتیں چہ جائیکہ ان سے افضل اور برتر ہوں۔ یہ اس لئے کہ ان کی تمام حرکات وسکنات انوارِ نبوت سے فیض یاب رہتی ہیں اور انوارِ نبوت کے علاوہ کسی اور نور سے یہ روشنی حاصل نہیں ہو سکتی۔

۴۔ نکتہ چین لوگ اہلِ طریقت پر کیسے اعتراض کر سکتے ہیں کیونکہ تصوف کی پہلی شرط ترک ماسوا اللہ ہے اور آخری شرط فنا فی اللہ ہے، اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہاں مکاشفات اور مشاہدات کی ابتداء ہوتی ہے اور یہاں انسان عالمِ بیداری میں فرشتوں اور نبیوں کو دیکھتا اور سنتا ہے اور ان سے فیض حاصل کرتا ہے، جس کی وجہ سے وہ رفتہ رفتہ قربِ الٰہی کا مقام حاصل کرتا ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ اولیاء کی کرامتیں دراصل انبیاء کے معجزات کی طرف ہدایت کرتی ہیں جو لوگ ان اولیاء کے پاس بیٹھتے ہیں وہ ان علامات سے واقف ہیں کیونکہ ایک حدیث کے مطابق "هُمْ قَوْمٌ لَا يَشْقٰى بِهِمْ جَلِيْسُهُمْ" (یہ وہ لوگ ہیں جن کے ہم نشین محروم نہیں ہوتے) اور قرآن فرماتا ہے۔

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ (المجادلہ:11) "اللہ تعالیٰ ان کے جو تم میں سے ایمان لے آئے اور جن کو علم دیا گیا درجات بلند فرما دے گا"۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ ان کے علاوہ جاہلوں کا ایک گروہ اور ہے جو کہ اس حقیقت کا منکر ہے بلکہ اس حالت کا مذاق اڑاتا ہے اور اس کا ذکر سُن کر حیرت اور تعجب سے کانوں پر ہاتھ رکھتا ہے کہ یہ کس طرح ممکن

ہے۔ایسے منکرین کے لئے قرآن نے فرمایا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے مہر ثبت کر دی ہے اور یہ اپنی خواہش کے تابع ہیں: وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ إِلَيْكَ ۚ حَتّٰى إِذَا خَرَجُوْا ..الخ (محمد:١٦)(اور ان میں کچھ ایسے ہیں جو کان لگائے رکھتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف حتیٰ کہ جب نکلتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس سے تو کہتے ہیں اہل علم سے (کہ ذرا غور فرمائیے) یہ صاحب ابھی کیا کہہ رہے تھے) امام غزالیؒ نے فرمایا کہ انبیائے کرام علیہم السلام کی مثال ایسی ہے کہ اگر کوئی آٹا گوندھ کر روٹی پکائے تو توے پر روٹی پک سکتی ہے اور اگر آٹا گوندھے بغیر آگ پر رکھ دو تو قیامت تک روٹی نہ پک سکے گی۔ تَوا اس لئے ہوتا ہے کہ وہ آگ کی گرمی جذب کرتا ہے اور روٹی کو پکا دے کیونکہ روٹی اس آگ کو براہ راست برداشت نہیں کر سکتی۔ جس طرح بغیر توے کے روٹی نہیں پک سکتی اسی طرح انبیاء کرام کے بغیر دین نہیں آتا اور دین کو براہ راست اللہ تعالیٰ سے اَخذ نہیں کیا جا سکتا توے کی طرح نبی برزخ ہے اور شیخ بھی برزخ کی مانند ہے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اگر سونا خریدنا ہو تو کھوٹے اور کھرے کی پہچان لازمی ہے۔ خریدار یا تو خود پہچان رکھتا ہو یا کسی پہچاننے والے کی مدد حاصل کرے جو سونے کو کسوٹی پر پرکھ سکتا ہو۔ فرماتے ہیں کہ دین کے لئے یا تو خود پیرو مرشد ہونا چاہیے ورنہ کسی پیرو مرشد کی صحبت حاصل کرے۔ تصوف کی کسوٹی سالک کا نفس ہے۔ سالک کو چاہیے کہ اس کسوٹی سے یہ کام لے کہ اس کا نفس جس طرف رغبت دلائے وہ یہ سمجھ لے کہ یہ کام غلط ہے (شیخ مرید میں اس پہچان کی استطاعت پیدا کر دیتا ہے۔)

۲۔حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے فرمودات

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو روحانی دنیا میں ایک بہت بڑا مقام حاصل ہے۔ اس کا ذکر حضرت مجدد الف ثانیؒ نے مکتوب نمبر ۱۲۳ دفتر سوم حصہ دوم میں کافی تفصیل سے فرمایا ہے جس میں آپ نے واصل باللہ ہونے کے دو طریقوں کا ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وصل حاصل کرنے کا بالواسطہ طریقہ بیعت ہے اور بیعت میں واصلین حق کے پیشوا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو ظاہر فرمایا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدم مبارک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مبارک سر پر ہیں۔ اس طریقہ میں اہل بیت کے بعد یہ منصب أئمہ اثنا عشرہ میں سے ہر ایک کو ملا اور ان کے بعد نوبت حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ قدس سرہ تک پہنچی اور مذکورہ منصب آپ کے سپرد ہوا۔ آپ کے وصال کے بعد بھی مجدد زمانہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا مقام اس قدر بلند تھا کہ آپ کے قول کے مطابق آپ کا قدم تمام ولیوں کی گردنوں پر تھا۔ ''غُنیۃ الطالبین'' (ترجمہ شمس بریلوی صفحہ ۶۱۳) میں ارادت، آداب مریدین، تصوف اور سالک کے بیان کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ مرید کو اس بات کا یقین رکھنا چاہیے کہ عادت الٰہی اس طرح جاری ہے کہ اس زمین پر ایک پیر

ہو اور ایک مرید، ایک مقتداء ہو اور دوسرا مصاحب، ایک پیشوا ہو اور دوسرا پیروکار اور یہ عادت حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے جاری ہے اور قیامت تک رہے گی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو معلم، استاد اور شیخ بنایا اور فرشتوں کو شاگرد، تابع اور پیروکار بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام موجودات کا نمونہ اور عالم روحانی اور جسمانی کا مجموعہ بنایا اور ملائکہ کے لئے حصول کمالات کا وسیلہ کیا تو انہیں حکم فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں کیونکہ اس میں شکرگزاری اور حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت کے احترام اور ملائکہ کے مقولہ کی معذرت پائی جاتی تھی۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام اور بڑے مقربین فرشتوں نے سب سے پہلے سجدہ کیا کیونکہ انہیں یہ معلوم تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام سے فیوض وبرکات کا حصول سب سے پہلے اور سب سے زیادہ ان کو ہی ملے گا۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں کہ یہ قانون حضرت آدم علیہ السلام کے زمین پر آنے کے بعد جاری رہا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے دنیا کے کام حضرت آدم علیہ السلام کو سکھائے اور عبادت کے طریقے بھی، حالانکہ جنت میں آدم علیہ السلام ان کے مقتداء اور شیخ تھے۔ اس تبدیلی مقام کا باعث تغیرِ حال تھا۔ اسی طرح آدم علیہ السلام سے یہ سلسلہ باقی سب لوگوں میں جاری رہا حتیٰ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، تابعین، تبع تابعین اور ہر نبی کا جانشین مقرر ہوا جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کے جانشین یوشع بن نون اُن کے خادم تھے، حواری حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جانشین تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور ان کے جانشین حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضوان اللہ علیہم اجمعین ہوئے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں کہ تمام اولیائے کرام کا سلسلہ ہی اس طرح چلا آرہا ہے کہ کوئی استاد ہو اور کوئی شاگرد۔ حضرت حسن بصریؒ کے شاگرد عتبہ غلام تھے، حضرت سری سقطیؒ کے شاگرد ان کے بھانجے اور خادم ابوالقاسم جنیدؒ تھے۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ مشائخ ہی اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ اور واسطہ ہیں۔ یہی خداوند تعالیٰ کا راستہ دکھانے والے ہیں اسی دروازہ سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں راستہ ملتا ہے۔ کوئی مستثنیٰ ہو تو ہو ورنہ ہر مرید کے لئے شیخ کی ضرورت ہے۔ طریقت کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کا خود انتخاب فرمائے اور اس کی تربیت فرمائے اور شیطان سے اس کی حفاظت فرمائے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا۔ فرماتے ہیں کہ ہم اس کے منکر نہیں لیکن اکثر اور عام طریقہ یہی ہے جس کو ہم نے (شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے) بیان کیا ہے، یہی طریقہ زیادہ سلامتی اور بہتری کا ہے۔ فرماتے ہیں کہ شیخ سے مرید کا منقطع ہونا اس وقت تک جائز نہیں جب تک کہ وہ خدا رسیدہ ہو کر مستثنیٰ نہ ہو جائے اور اللہ تعالیٰ خود اس کی تربیت کا ذمہ دار نہ ہو جائے۔

حیرت کی بات ہے کہ اس زمانے کے چند لوگوں نے ان بزرگوں کے خلاف نہایت دلیری کے ساتھ

بیانات دیئے ہیں کہ اب بیعت کی چنداں ضرورت نہیں ہے اور انہوں نے ان تمام اکابرینِ اسلام کا بے باکانہ رد کیا ہے۔ "اَلْعَجَبُ ثُمَّ الْعَجَبُ"۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں کہ مرید اگر شیخ سے کچھ سیکھنا چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ اس کو شیخ پر یقین راسخ اور پختہ اعتقاد ہو کہ اس ملک میں میرے شیخ سے بزرگ کوئی شیخ نہیں ہے، اس سے اس کو اپنے مقصد میں فائدہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں اس کو قبولیت ہوگی اور وہ اسے آفات سے محفوظ رکھے گا۔ مرید کو چاہیئے کہ شیخ کی کسی چیز میں مخالفت نہ کرے۔ مشائخ کی مخالفت مریدوں کے لئے زہر قاتل ہے۔ آپ نے تصوف اور شیوخیت پر بہت کلام کیا ہے، آپ کی تمام تحریروں میں اور خاص طور پر قصیدۂ غوثیہ میں پیری مریدی کے متعلق بہت اعلیٰ اور پُر زور ارشادات موجود ہیں جو آپ کے کمالات اور تصوف کی حقانیت کی بین دلیل ہیں اور یہ قصیدۂ پیری مریدی کی افادیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

رَفِيعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ ۚ يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (المومن:۱۵)

"بلند درجات پر فائز کرنے والا عرش کا مالک نازل فرماتا ہے وحی اپنے فضل سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے"۔

"سِرُّ الاَسرار" میں فرماتے ہیں کہ اس روح کو حاصل کرنے کے لئے (جو معرفت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے) مرشد کی تلاش از بس ضروری ہے۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ تربیت کے لئے مناسبت کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ مبتدی جو ابتدائی مرحلہ میں ہوتا ہے اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کسی قسم کی مناسبت نہیں اور نہ ہی اسے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی قسم کا لگاؤ ہے، اس لئے نہایت ضروری ہے کہ سب سے پہلے ولی (مرشد) اس کی تربیت کرے کیونکہ مرشد ان دونوں کے درمیان بمنزلہ واسطہ کے ہے۔ خیال رہے کہ بایزید بسطامیؒ جیسے اعلیٰ پایہ کے بزرگ تجلی الٰہی کو ظاہر دیکھ کر فرماتے تھے "سُبْحَانِیْ مَا اَعْظَمَ شَانِیْ" (ہم پاک ہیں ہماری شان بلند ہے) اور جنید بغدادیؒ جیسے بلند پایہ بزرگ فرماتے ہیں "لَیْسَ فِیْ جُبَّتِیْ سِوَی اللّٰہِ تَبَارَکَ وَ تَعَالٰی" (میرے جُبّہ میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں) عام اور مبتدی سالک کے لئے کسی رہبر کی اشد ضرورت ہے ورنہ نہ جانے وہ بے خودی میں کیا کچھ کہہ سکتا ہے۔

غلامِ ہمتِ آں خود پرستم — کہ بانورِ خودی بیند خدارا (پ۔م:۲۳۷)

(میں اس خودی پر قائم رہنے والے کی ہمت کا غلام ہوں، کہ جو اپنی خودی کے نور سے خدا کو دیکھتا ہے۔)

۳۔ حضرت داتا گنج بخشؒ اور علومِ شریعت

"کشف المحجوب" میں حضرت داتا گنج بخشؒ نے علمِ تصوف، علم و عرفان، فقہ، خرقہ پوشی، محبت اور

متعلقات محبت کے متعلق الگ الگ ابواب قائم کیے ہیں اور یہ تمام ابواب علم تصوف کی تائید کرتے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا موضوع ہی علم تصوف پر قائم کیا گیا ہے اور اس کتاب کا وجود ہی جوازِ تصوّف پر بہت بڑا استدلال ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے ذاتی تجربات، مکاشفات، واردات اور مجاہدات وغیرہ قلم بند کیے ہیں اور ارباب سلوک کے لئے مضامین نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں، ان کے اس بلند و بالا کلام کو پڑھ کر عقل ششدر رہ جاتی ہے۔ حضرت شیخ معین الدین چشتیؒ نے اس کتاب کی کرامت یہ بیان کی ہے کہ اگر کسی کو شیخ کامل نہ ملتا ہو تو وہ اس کتاب کو پڑھ لے تو اُسے ضرور کوئی پیر کامل مل جائے گا۔ آپ کے فرمان کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اس کتاب کو پڑھے گا لازمی طور پر وہ ان تمام اَسرار و رُموزِ معرفت سے باخبر ہو جائے گا جو طریقت کے صحت مندانہ جزو کی حیثیت رکھتے ہیں، ایسے شخص کا جب علمی معیار صحیح ہو گیا تو پھر پیر کی پہچان مشکل بات نہیں رہتی۔ حضرت داتا گنج بخشؒ نے فرمایا۔

اَلْعِلْمُ ثَلٰثَۃٌ عِلْمٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ عِلْمٌ مَّعَ اللّٰہِ وَ عِلْمٌ بِاللّٰہِ "یعنی تین قسم کے علم ہیں، جنکی تفصیل نیچے دی جا رہی ہے"۔

(i) عِلْمٌ مِّنَ اللّٰہ وہ علم یا عرفان ہے جو انبیاء اور اولیاء کو ملتا ہے۔ جس سے وہ عارف الٰہی بنتے ہیں، یہ اِکتساب سے نہیں بلکہ معرفتِ الٰہی یا معیتِ الٰہی سے ملتا ہے (یاد رہے کہ معیتِ الٰہی بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ کے ذکر، مراقبہ اور حضوری کے ذریعہ ملتی ہے۔ فنا فی اللہ اور بقاء باللہ بھی ان تینوں کے ذریعہ ہی حاصل ہوتے ہیں۔) علم من اللہ کے بغیر درجہ عرفان محال ہے (چنانچہ جو لوگ تصوف یعنی مرتبۂ احسان کے منکر ہیں وہ سرے سے عرفان سے محروم رہتے ہیں۔)

(ii) عِلْمٌ بِاللّٰہ یہ علمِ شریعتِ حقہ ہے اس کے ذریعہ ہم مُکلّف بالاَحکام بنائے گئے ہیں اور وہ فرمانِ حق ہے جو زبانِ انبیائے کرامؑ سے ہم تک پہنچا ہے۔

(iii) عِلْمٌ مَّعَ اللّٰہ یہ علم فضلِ الٰہی کی معیت میں حاصل ہوتا ہے، جس سے مقاماتِ ولایت اور طریق حق و ہدایت اور مدارج ولایت و عنایت الٰہی حاصل ہوتی ہیں۔

فرماتے ہیں یہ تینوں علم ایک دوسرے کے بغیر نامکمل اور غیر صحیح ہیں، یعنی جو عرفان کی دولت سے محروم ہے وہ مردہ دل ہے، جو علمِ شریعت نہیں رکھتا اس کا دل نادانی کا مریض ہے، جسے معیتِ الٰہی حاصل نہ ہو وہ مدارج ولایت سے محروم رہتا ہے۔ آپ نے ابنِ معاذ رازیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ تین قسم کے لوگوں کی صحبت سے بچنا چاہیے۔

۱۔ عالم بے عمل

۲۔ فقیر مداہن (غیر شرعی عامل جو زبانِ حق کو بند کرنے والا ہو)

۳۔ متصوف (جاہل، بناہوا صوفی)

فرماتے ہیں کچھ لوگ متصوف جاہل ہوتے ہیں جو کبھی کسی پیرِ کامل کی صحبت سے مستفیض نہیں ہوتے یا وہ لوگ جنہوں نے کبھی کسی مرشد سے تعلیم نہ لی ہو اور عوام میں اپنے آپ کو باکمال کہلانے کی آرزو رکھتے ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے مصائب زمانہ اور نشیب وفرازِ علم کا ذائقہ تک کبھی نہ چکھا ہو، مگر جاہلوں میں اپنی بہکی بہکی باتیں کہہ کر پیرِ کامل کہلوائیں اور ذلت کی راہیں اختیار کریں اور بیوقوفوں میں بیٹھ کر سب کو اپنے جیسا کہتے پھریں۔ ایسی حالت میں ان پر من جانب اللہ راہِ حق پوشیدہ ہو جاتی ہے اور وہ اسی ظلمت میں پڑے رہتے ہیں۔ یہ تینوں گروہ اہلِ باطل ہیں۔

خرقہ پوشی کے باب میں حضرت داتا گنج بخشؒ لکھتے ہیں کہ پیر اس درجہ کامل ہو کہ مرید کے احوال وکوائف سے پورا پورا واقف ہو کہ مرید درجہ کمال میں کس حد تک پہنچ سکے گا۔ اس قسم کے مشائخ درحقیقت طبیب ہوتے ہیں۔ حضور سیدِ یومِ النشور ﷺ نے فرمایا "اَلشَّیْخُ فِیْ قَوْمِہٖ کَالنَّبِیِّ فِیْ اُمَّتِہٖ" (یعنی شیخ (پیرِ کامل) اپنی قوم (اور مریدوں) میں ایسے ہے جیسے نبی اپنی اُمت میں (کنوز الحقائق) فرمایا جب مرشدِ کامل، صاحبِ ولایت مرید کو ریاضت کی تعلیم دے کر اسے خرقہ پہنا دے تو جائز ہے، ورنہ اسے یہ کہہ کر رخصت کر دے کہ طریقت اسے قبول نہیں کرتی۔ (عموماً تین سال کے عرصے میں ایک سال خدمت، ایک سال اطاعت اور تیسرے سال میں نگہداشت کی جاتی ہے۔)

فرماتے ہیں کہ مشائخ کا طریقہ ہے کہ جب کوئی مرید ترکِ مَاسِوَی اللہ کر کے ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ ان کو تین سال میں اگر ثابت قدم دیکھے تو فبہا ورنہ اسے رخصت کر دے۔ آپ کی کتاب ''کشف المحجوب'' روحانی اسباق سے بھری پڑی ہے جو اس کا مطالعہ نہیں کرتا حقیقتاً وہ تصوف سے نابلد ہے۔ (ہمارے ہاں ایسے پیروں کی کمی نہیں کہ جو ایسی کتابوں سے دانستہ طور پر دور رہتے ہیں۔)

۴۔ امام قشیریؒ کے ارشادات

امام صاحب کے بہت سے ارشادات اس کتاب میں جا بجا نقل کئے گئے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ ارادت راہِ طریقت کی ابتداء ہے۔ اس میں اللہ کی طرف جانے کا ارادہ پایا جاتا ہے، جیسے کہ ارادہ ہر کام کا پیش خیمہ ہوتا ہے تو اللہ کی راہ پر چلنے کا نام ارادت رکھ دیا گیا، چنانچہ مرید وہ ہے جس میں ارادہ پایا جائے، جیسے علم والے کو عالم کہتے ہیں۔ تصوف میں مرید اسے کہتے ہیں جس کا اپنا کوئی ارادہ نہ ہو۔ ابو علی دقاقؒ نے فرمایا کہ ارادت میں مجاہدے کے وصف سے موصوف ہونا، باطن میں تکالیف برداشت کرنا، بستر سے الگ رہنا، دشوار کام کرنا، ہر وقت مستعد رہنا اور تھکانے والے کام کرنا، اپنے اخلاق سے کشتی کرنا، مشقتیں جھیلنا، خطروں سے

بغل گیر ہونا اور ہم جنسوں سے الگ رہنا ضروری ہے۔

امام قشیریؒ نے اپنے رسالے میں فرمایا کہ مرید اگر اپنے شہر میں ایسے شخص کو نہ پائے جس سے تربیت حاصل کر سکے تو وہ ہجرت کر کے ایسے شخص کے پاس چلا جائے جو مریدوں کی رہنمائی کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ اس کے پاس عقیدت سے رہے اور اس کے دَر کو اِس وقت تک نہ چھوڑے جب تک کہ وہ خود اجازت نہ دے۔ اگر شیخ کا دل مرید کو قبول کرلے تو یہ اِس کے لئے سعادت کا باعث ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مرید کے لئے حج کرنے سے پہلے معرفتِ الٰہی کا حاصل کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ اگر گھر کے مالک کی معرفت نہ ہوئی تو اس کے گھر کی زیارت کرنا بھی فرض نہ ہوئی اس کا استدلال قرآن کی اس آیت سے ملتا ہے، جس میں ارشاد ہے کہ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ (یعنی میرے گھر (دل) کو طواف کرنے والوں کے لئے صاف رکھ۔ (البقرۃ:۱۲۵) کسی نے کہا ہے۔

تہی دستانِ قسمت راچہ سود از رہبرِ کامل که خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را (×)

(قسمت کے محروم لوگوں کو رہبرِ کامل سے کیا فائدہ ہے، کیونکہ خضر بھی سکندر کو آبِ حیات سے تشنہ کام لے آیا)

حضرت بایزید بسطامیؒ کے پہلے حج کا واقعہ ہماری کتاب ''جنیدؒ و بایزیدؒ'' میں بیان ہو چکا ہے آپ جب حج کو جا رہے تھے تو راستے میں ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ جب حضرت بایزید بسطامیؒ نے اپنا ارادہ حج ظاہر کیا تو اس بزرگ نے فرمایا کہ حج کے سفر کا خرچ میرے حوالے کر دو اور میرا طواف کر لو تمہارا حج ہو جائے گا کیونکہ تم اپنی موجودہ روحانی حالت میں حج کرنے کے قابل نہیں ہو۔ حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ واقعی میں اس وقت حج کے قابل نہ تھا اور اس شیخ کی صحبت سے مجھے بہت کچھ حاصل ہوا۔

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی

(ض۔ک: ۴۹۳)

۵۔ حضرت خواجہ شہاب الدین سہروردیؒ کے فرمودات

حضرت خواجہ شہاب الدین سہروردیؒ ''عوارف المعارف'' میں فرماتے ہیں کہ مستند مشائخ کی اسناد سے ان تک یہ روایت پہنچی ہے کہ ایک صحابی حضرت عبداللہ بن بشرؓ نے فرمایا کہ اگر ایک جگہ بیس یا اس سے زیادہ افراد جمع ہوں اور ان میں ایک شخص بھی ایسا نہ ہو جو اللہ تعالیٰ سے ڈرانے والا ہو تو سب کا معاملہ خطرناک ہو جاتا ہے وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ (یعنی تم میں سے ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہیے جو نیکی کی طرف بلایا کرے۔ (آل عمران:۱۰۴) پس مشائخ اللہ تعالیٰ کے وقار سے آگاہی کا ذریعہ ہیں کیونکہ مرید ان سے ظاہری اور باطنی ادب حاصل کرتے ہیں جیسا کہ فرمایا۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ (الانعام:۹۰)
یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ہدایت دی تھی اللہ نے تو انہیں کے طریقہ کی پیروی کرو۔

قرآن کی رو سے مشائخ چونکہ ہدایت یافتہ ہوتے ہیں لہٰذا ان کی پیروی درج بالا آیت سے ظاہر ہے۔

حدیثِ قدسی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِذَا کَانَ الْغَالِبُ عَلٰی عَبْدِی الْاِشْتِغَالَ بِیْ جَعَلْتُ هِمَّتَهٗ وَ لَذَّتَهٗ فِیْ ذِکْرِیْ (عوارف المعارف)
جب میرے بندے پر میرے ساتھ مشغولیت غالب ہو جاتی ہے تو میں اس کی تمام تر توجہ اور لذت اپنے ذکر پر مرکوز کر دیتا ہوں۔

گویا اللہ تعالیٰ ان کا اور وہ اللہ تعالیٰ کے پیارے ہو جاتے ہیں اور درمیانی حجاب اٹھ جاتے ہیں۔

احادیث میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ ان اولیاء کی وجہ سے دنیا والوں سے اپنا عذاب ٹال دیتا ہے۔

حضرت شہاب الدین سہروردیؒ فرماتے ہیں کہ شیخ لوگوں کے دلوں میں اللہ کی محبت پیدا کرتا ہے اور ان کا تزکیۂ نفس کرتا ہے اور اس سے دل کے آئینے کو جلا ملتی ہے۔ پھر اس میں تجلیات الٰہی ضوفگن ہوتی ہیں اور ایسی راہ پر چلنے کے بعد سالکین مشاہدۂ حق میں مصروف ہو جاتے ہیں جب ان کا نفس مطمئن ہو جاتا ہے تو مریدوں کی فطری برودت (پوسنگی) یعنی طبیعت کی سردی اور خشکی دور ہو جاتی ہے کیونکہ ان دونوں کی وجہ سے ہی انسان میں سرکشی اور اطاعت سے روگردانی پیدا ہوتی ہے جو اگر ختم ہو جائے تو نرمی پیدا ہو جاتی ہے، جیسا کہ فرمایا۔

ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ (الزمر:۲۳)
پھر ان کے بدن اور ان کے دل اللہ کے ذکر کی طرف نرم پڑ جاتے ہیں۔

"عوارف المعارف" میں ہے کہ عبادہ بن صامتؓ نے فرمایا کہ ہم لوگوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس بات پر بیعت کی کہ ہم تنگی وفراخی، مسرت وغم اور ہر حال میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام بجالائیں گے اور اولی الامر (وقت کے حاکموں) کے احکام کی تعمیل میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہ کھائیں گے۔ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ فرماتے ہیں یہی مقصودِ بیعت ہے اور ان کا حاصل ہونا صحبتِ شیخ سے ہی ممکن ہے۔

حضرت شہاب الدین سہروردیؒ "عوارف المعارف" میں فرماتے ہیں کہ جب مریدوں کے نفوس (حیثیت کے اعتبار سے) شیخ کے نفس کے عین مطابق ہو جاتے ہیں تو اس وقت شیخ مریدوں کے نفوس کی ادب کے ذریعے اسی طرح تادیب کرتا ہے جیسے اس نے اپنے نفس کی تادیب کی تھی۔ اس وقت شیخ وہی جذبہ اپنے مریدوں کے لئے رکھتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں اپنے جیسے اخلاق پیدا کرنا چاہتا ہے، جیسا کہ "تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ" (التعرف لمذہب التصوف: ج ۱، ص ۵) کی حدیث میں وارد ہے۔ ایک حدیثِ قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "جب میرے اَبرار کا شوق میرے دیدار کے لئے طول پکڑ گیا

ہے تو بے شک میں ان کے دیدار کا ان سے زیادہ شائق ہوں۔"

حضرت شہاب الدین سہروردیؒ میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مرید اور شیخ میں ایک روحانی رشتہ قائم کیا ہے اس لئے مرید جزوِ شیخ بن جاتا ہے جس طرح کوئی بچہ پیدا ہو تو وہ باپ کا جزو بن جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے جس شخص کی ولادت دو مرتبہ نہ ہوئی ہو آسمان کے مقامِ ملکوت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ ولادتِ اوّل سے تو اس کا اس دنیائے عالم سے رشتہ قائم ہو جاتا ہے اور ولادتِ روحانی کی بدولت روحانی دنیا اور ملکوت سے اس کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ اس تعلق کا ذکر قرآن میں اللہ تعالیٰ کا وہ قول ہے کہ ایسے ہی ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو آسمانوں اور زمینوں کی سلطنتیں دکھلائیں تاکہ وہ اہلِ یقین سے ہو جائیں وَ كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝ (الانعام: ۷۵) (اور اسی طرح ہم نے دکھادی ابراہیمؑ کو ساری بادشاہی آسمانوں اور زمین کی تاکہ وہ ہو جائیں کامل یقین والوں میں۔) فرماتے ہیں کہ جب یہ یقین پیدا ہو جائے تو مرید کو روحانی کمال حاصل ہوتا ہے اور شیخ بھی کمالِ روحانی کی وجہ سے میراثِ انبیاءؑ کا مستحق بنتا ہے پس جس کو میراثِ انبیاءؑ سے حصہ نہ ملا وہ پیدا ہی نہیں ہوا خواہ وہ کتنی ہی فطانت (دانائی یا ہوشمندی) اور ذکاوت (عقل) کیوں نہ رکھتا ہو کیونکہ فطانت اور ذکاوت عقل کا نتیجہ ہے اور جب عقل نورِ شرع سے مُستَنیر اور منوّر نہیں تو وہ ملکوت میں داخل نہیں ہو سکتی لہٰذا وہ عالمِ تذبذب میں رہے گی اور علومِ عقلیہ تک ہی اس کا تصرف رہے گا، چونکہ عقل روح کی زبان ہے اور بصیرت قلبِ روح ہے چنانچہ اس کی زبان رازدار اور حقیقت شناسِ قلب نہ ہو گی ایسے لوگ نورِ ہدایت جیسے عطیۂ خداوندی سے محروم رہتے ہیں اور یہ عطیہ صرف ان کو عطا کیا گیا ہے جو ہدایت کی صحیح پیروی کرنے والے ہیں مگر جن کی عقلیں نورِ ہدایت سے محروم اور صراطِ مستقیم سے بھٹکی ہوئی ہیں ایسے لوگ محض ترجمان کی حیثیت رکھتے ہیں اور جو کچھ وہ بیان کرتے ہیں اس کی حقیقت سے محروم رہتے ہیں۔ خود نبی کریم ﷺ انہی حقائق کے لئے دعا فرمایا کرتے تھے "رَبِّ اَرِنِی حَقَائِقَ الْاَشْیَاءِ" (اے میرے رب مجھے حقائق اشیاء کا علم دے۔)

۶۔ علامہ ثناء اللہ پانی پتیؒ کے دلائل

علامہ موصوف اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (سنو! بے شک اللہ کے دوستوں کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یونس: ۶۲) کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ قاموس میں ولی کا معنی قرب اور نزدیکی کے ہیں اور ولی اللہ کو ولی اللہ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ متقرب الی اللہ ہوتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ قرب دو قسم کا ہوتا ہے، ایک قرب وہ جو ہر چیز اور ہر انسان بلکہ ہر ذرہ کو حاصل ہے اگر یہ قربِ الٰہی حاصل نہ ہو تو کوئی چیز موجود نہ ہو سکے، دوسرا قرب وہ ہے جو خاص بندوں کو میسر ہے اور وہ قربِ محبت کہلاتا

ہے، اس قرب کے بے شمار درجے ہیں۔ بخاری شریف کی حدیث کے مطابق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب کوئی بندہ فرائض کی ادائیگی کے بعد نوافل کی کثرت سے میرا قرب حاصل کرتا ہے تو میں بھی اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے......الخ۔

ولی کی تعریف کرتے ہوئے علامہ موصوف فرماتے ہیں کہ ولایت پر فائز ہونے کے بعد بالواسطہ یا بلاواسطہ آئینۂ دل پر آفتابِ رسالت کے انوار کا انعکاس ہونے لگتا ہے اور پرتوِ جمالِ محمدی ﷺ روح کو منور کر دیتا ہے۔ یہ نعمت انہی کو بخشی جاتی ہے جو بارگاہِ رسالت میں نائبینِ رسالت یعنی اولیائے اُمت کی صحبت میں بکثرت حاضر رہیں اور کسی دن ناغہ نہ کریں۔

علامہ قرطبیؒ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ اللہ کے بندوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو نہ نبی ہیں نہ شہید لیکن قیامت کے دن قربِ الٰہی کی وجہ سے انبیاء اور شہداء ان پر رشک کریں گے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہمیں بتائیں کہ وہ کون لوگ ہیں اور ان کے اعمال کیا ہیں تا کہ ہم ان لوگوں سے محبت کریں۔ فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے واسطے آپس میں محبت کرتے ہیں نہ ان میں کوئی رشتہ ہے نہ مالی منفعت، بخدا ان کے چہرے سراپا نور ہوں گے اور نور کے منبروں پر انہیں بٹھایا جائے گا، جب دوسرے خوف زدہ ہوں گے تو انہیں کوئی خوف نہ ہوگا، لوگ حزن اور ملال میں مبتلا ہوں گے اور انہیں کوئی حزن و ملال نہ ہوگا۔ پھر حضور اکرم ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (یونس: ٦٢) عارف رومیؒ نے ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا۔

گرچہ شیری چوں روی رہ بے دلیل ہمچو روبہ در ضلالی و ذلیل (×)

(تو شیر ہی کیوں نہ ہو اگر تو اس راہ پر راہ نما کے بغیر چلے گا تو لومڑی کی طرح گمراہ اور ذلیل ہو جائے گا۔)

میں مپر اِلّا کہ با پر ہائے شیخ تا بہ بینی عونِ لشکر ہائے شیخ (۶۳-۴)

(خبردار اپنے مرشد کے پروں کے بغیر اڑنے کی کوشش نہ کرو، تب تجھے اپنے مرشد کی مدد اور لشکر کا پتہ چلے گا۔)

علامہ پانی پتیؒ تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں کہ صوفیائے کرامؒ نے فرمایا ہے کہ فنائے قلب کا مقام صوفی کو صرف اللہ تعالیٰ کی کشش اور جذب سے حاصل ہوتا ہے اور یہ جذب حضور نبی اکرم ﷺ اور مشائخ کے توسط سے حاصل ہوتا ہے اگر کوئی شخص شیخ کامل کی توجہ کے بغیر صرف عبادتوں اور ریاضتوں سے اس مقام تک پہنچنا چاہے تو اس کے لئے پچاس ہزار سال کا عرصہ درکار ہے اتنی تو کسی کی عمر نہیں ہو سکتی۔ اس سے یہ بات آشکار ہو گئی کہ پیرِ کامل کی توجہ کے بغیر کسی کا اس مقام پر فائز ہونا محال ہے۔ سورۃ المعارج میں ہے کہ آسمان کا راستہ

جو فرشتے طے کرتے ہیں ۵۰ ہزار برس کا ہے۔اس آیت کی تفسیر الگ دے دی گئی ہے۔

۷۔شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ جب عارف ایسے مرتبہ پر فائز ہوتا ہے جہاں وہ دوسروں کو باکمال بنا سکتا ہے تو اس کے مریدوں میں ہر قسم کے لوگ شامل ہوجاتے ہیں جن کی استعداد میں بہت تفاوت ہوتا ہے کوئی بالکل ناقص اور کوئی کامل۔اس وقت عارف کے لئے ضروری ہے کہ وہ مغفرت طلب کرے تا کہ اس کے ناقص مرید بھی مرتبہ کمال پر فائز ہوجائیں اور عارف کی اس دعائے مغفرت کے باعث جبلی استعداد میں جو خامی ہو وہ پوری ہوجائے۔(حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرامؓ کے لئے سورۃ نصر میں استغفار کا حکم ہوا تھا۔)

تفسیر عزیزی میں وَّادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا وَّقُوۡلُوۡا حِطَّۃٌ نَّغۡفِرۡ لَکُمۡ خَطٰیٰکُمۡ (اور داخل ہونا دروازے میں سر جھکائے ہوئے اور کہو ہمارے گناہ معاف کردو، ہم بخش دیں گے تمہاری خطائیں۔البقرہ:۵۸) کے تحت لکھا ہے کہ بعض بزرگ لوگ اور بعض خاندان ایسے ہوتے ہیں جن کے پاس بیٹھ کر توبہ کرنے سے توبہ جلد قبول ہوتی ہے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے (بروایت ابن ابی شیبہؒ) فرمایا کہ اس اُمت میں ہم اہل بیت کشتی نوحؑ اور بنی اسرائیل کے دروازے کی طرح ہیں۔مولانا رومؒ اسی روایت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

گر نداری تو دمِ خوش در دُعا رو دعا می خواہ ز اخوانِ صفا(۳۱۔۳)

(اگر تم میں قبولیتِ دُعا کا اثر نہیں تو جاؤ اہلِ صفا سے دُعا کرواؤ۔)

ہر کہ اوّل پاک شد از اعتدال آں دُعائش می رود تا ذوالجلال

(جو اعتدال سے (تجاوز نہ کرنے کی وجہ سے) پہلے پاک ہوگیا،اس کی دُعا ربِ ذوالجلال تک پہنچتی ہے)

ہیں بجو ایں قوم را اے مبتلا ہیں غنیمت دار شاں پیش از بلا(۲۱۷۔۳)

(اے درد و رنج میں مبتلا شخص اولیاء کی جماعت کو تلاش کر،اور بلا آنے سے پہلے ان کو تُو غنیمت سمجھ۔)

ما و اصحابمؓ چوں کشتیِ نوحؑ ہر کہ دست اندر زند یابد فتوح(۶۳۔۴)

(ہم اور ہمارے صحابہ کشتی نوحؑ کی طرح ہیں، جو ہمارا سہارا پکڑے گا فلاح پائے گا۔)

شیخ عبدالعزیز محدث دہلویؒ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اہل اللہ کے طریقے میں داخل ہونا اور ان کو بارگاہِ رب العزت میں وسیلہ بنانا اہلِ اسلام کے نزدیک مستحب اور مستحسن ہے۔اس سبب سے کہ حق تعالیٰ ان کو دوست رکھتا ہے اور ان کے کلام و انفاس اور افعال و سکنات اور ان کے ہم نشینوں، اولاد و نسل حتیٰ کہ ان کی زیارت کرنے والوں پر لگاتار برکتیں نازل فرماتا رہتا ہے۔اللہ تعالیٰ اپنے نزدیک ان کو وہ مرتبہ اور اکرام بخشتا ہے کہ ان کی دعا قبول کی جاتی ہے بلکہ جو کوئی ان کا وسیلہ پکڑتا ہے اس کی

حاجت بھی پوری ہو جاتی ہے۔ آپ کے ان بیانات سے واضح ہوا کہ اخذ بیعت کو ان بزرگوں نے مستحسن قرار دیا ہے اور یہ بزرگ خود اخذ بیعت کئے ہوئے تھے اور لوگوں سے بھی بیعت لیتے رہے۔

۸۔ حضرت قطب الدین دمشقیؒ کے ارشادات

۔ "امداد السلوک" صفحہ ۶۹ پر آپ لکھتے ہیں کہ طریقت میں سلوک سے مراد یہ ہے کہ اخلاق مہذب ہو جائے اور سالک بخل، حسد، ریا، کینہ اور دیگر افعال رذیلہ سے باز آ جائے اور اس کے برعکس اخلاق حمیدہ (اخلاص، سخاوت، تواضع، تقویٰ وغیرہ) سے متصف ہو کر اللہ تبارک وتعالیٰ سے واصل ہو جائے جس کا پہلا دروازہ شریعت کی اتباع ہے۔ فرماتے ہیں طریقت میں بہت سے مقامات، منازل، مراحل، اصطلاحیں، حقائق اور معارف ہیں، اس کے کچھ اصول، قوانین، قواعد، ثمرات و نتائج کے علاوہ وظائف، واردات، حالات، کمالات، مناقشات، مجاہدات، مشاہدات، مکاشفات ہوتے ہیں جن کا جاننا بہت ضروری ہے اور یہ تمام چیزیں طریقت کے دائرہ میں آتی ہیں چنانچہ طریقت کے واجبات، ممنوعات اور تعلیمات کے سیکھنے کے لئے حصول بیعت لازمی ہے۔

"امداد السلوک" میں آپ لکھتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کا طریقہ اخذ کیا اور ان سے حسن بصریؒ پھر ان سے عبد الواحدؒ نے اور ان سے حبیب عجمیؒ نے اخذ کیا یہاں تک برہان الدین برہندیؒ اور پھر ہم تک سلسلہ وار ذکر پہنچا۔ فرماتے ہیں کہ مرید کو غفلت سے بیدار ہونے کے بعد لازم ہے کہ اپنے آپ کو ایسے شیخ کے سپرد کرے جو صاحب معرفت اور ایمان دار ہو اور طریقت کی باریکیوں سے آگاہ ہو۔ شیخ وہی ہوتا ہے جو شریعت کو لوگوں کے دلوں میں راسخ اور مستحکم کر دے۔ فرماتے ہیں کہ مرید جب تک شیخ کامل سے تلقین نہیں پائے گا اس وقت تک اس کے وجود کا درخت معرفت کے پھل نہیں دے گا۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے۔

کھلتے نہیں اس قلزمِ خاموش کے اسرار جب تک تو اسے ضربِ کلیمی سے نہ چیرے

(ب۔ ج: ۴۵۹)

قطب الدین دمشقیؒ لکھتے ہیں کہ سالک کو ایسا شیخ ڈھونڈنا چاہیے جو اسے توحید درست کرنے والے عقائد اور فقہی مسائل کی تعلیم فرمائے اور اس کے بعد مجاہدہ اور زہد و تقویٰ کا راستہ دکھائے۔ آپؒ نے فرمایا کہ مثل مشہور ہے "مَنْ لَا شَیْخَ لَهٗ فَاِنَّ الشَّیْطَانَ لَهٗ شَیْخٌ" (جس کا کوئی پیر نہیں، اس کا شیطان پیر ہوتا ہے۔)

آپؒ نے فرمایا ہے کہ جو شخص نہ خود (روحانی) علم رکھتا ہو اور نہ اس کا کوئی پیر ہو تو شیطان اس کو آسانی سے گمراہ کر دیتا ہے بلکہ شیطان تو بڑے بڑے عالموں اور زاہدوں پر بھی کسی نہ کسی وقت حملہ کر کے گمراہ کر دیتا ہے۔ آپ ایک اور مقام پر لکھتے ہیں کہ جاننا چاہیے کہ سالک کے لئے شیخ کامل کا ہونا نہایت ضروری ہے آپؒ

نے اس آیت وَابْتَغُوْا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ (خدا تک پہنچنے کا وسیلہ تلاش کرو۔(المائدہ:۳۵) میں وسیلہ ڈھونڈنے سے کسی شیخ کو ڈھونڈنا مراد لیا ہے آپ نے امام غزالیؒ کی مشہور کتاب "احیاء العلوم" سے ایک اور حدیث کا حوالہ دیا ہے "اَلشَّيْخُ فِيْ جَمَاعَتِهٖ كَالنَّبِيِّ فِيْ اُمَّتِهٖ" (کسی جماعت میں شیخ ایسا ہوتا ہے جیسے کسی اُمت میں کوئی نبی ہوتا ہے۔)

"اِمداد السلوک" میں آپ لکھتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا اے موسیٰ! جانتے ہو کہ کس شے کے سبب ہم نے تم کو ساری مخلوق سے اعلیٰ بنایا؟ عرض کیا، الٰہی میں نہیں جانتا۔ فرمایا کہ ہم نے تم کو دیکھا کہ ایک دن ہماری بارگاہ عالیہ میں تواضع کے ساتھ خاک پر پڑے ہوئے تھے اس سبب سے ہم نے تم کو سارے آدمیوں سے بالا کر دیا۔ منقول ہے کہ اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام دن میں ہزار بار خاک پر لیٹا کرتے تھے۔ حضرت قطب الدین دمشقیؒ فرماتے ہیں کہ لیٹنا خاک میں نہ تھا بلکہ اس سے عالم ارواح میں نفس اور روح کی روحانی خاک پر لیٹنا مراد ہے اور یہ لیٹنا بندے کا کسب ہے، اس لیٹنے کو وہی جانتا ہے جو عالم ارواح میں ہو اور جو اس کا طریقہ جاننا چاہے وہ اس کے جاننے والوں سے حاصل کرے۔

درج بالا احادیث اور حقائق کو پیش نظر رکھا جائے تو بیعت کی مشروعیت اور افادیت ظاہر ہوتی ہے اور انہی وجوہات کی بنا پر مشائخ کبار نے بیعت کو اہل اللہ کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔

"تربیت العشاق" میں ہے کہ حضرت قطب الدین دمشقیؒ مدینہ منورہ میں روضۂ اقدس پر مراقب تھے کہ خواجہ نور محمد جھنجھاویؒ جو حضرت کے پیر تھے، روضہ کے اندر سے نمودار ہوئے اور آپ کے سر پر دستار باندھی اور فرمایا کہ تم قطب مکہ ہو، اس کے بعد ایک بزرگ جو چالیس سال سے وہاں مقیم تھے آئے اور فرمایا مکہ مبارک ہو اور فرمایا جس نے آپ کے سر پر دستار باندھی وہ آپ کے پیر کی شکل میں خود رسول خدا ﷺ تھے۔

۹۔ حضرت شمس الدین سیالویؒ کے دلائل

مراۃ العاشقین میں ہے کہ حضرت سیالویؒ فرماتے ہیں کہ بیعت دو قسم کی ہے، بیعت جہاد جیسے کہ بیعت رضوان تھی جس کا ذکر قرآن میں اس طرح آیا ہے۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ (الفتح:۱۸)

"یقیناً اللہ تعالیٰ ان مومنوں سے راضی ہو گیا جب وہ بیعت کر رہے تھے آپ ﷺ سے اس درخت کے نیچے"۔

دوسری بیعت تو یہ ہے، جیسے رسول خدا ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے اوامر و نواہی کی رعایت کرنے کا وعدہ لیا۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے فرمایا۔

يُبَايِعُوْنِيْ اَنْ لَّا تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ شَيْئًا "مجھ سے اس بات پر بیعت کرو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ گے"۔

حضرت شمس الدین سیالویؒ نے مرأۃ العاشقین میں درج ذیل حدیث کا ذکر کیا ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اہل اللہ اور روحانی زندگی سے وابستہ مومنوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل میں شامل کر لیا جاتا ہے، اسی اعتبار سے آپؐ نے حضرت سلمان فارسیؓ وغیرہ کو اپنی اہل بیت میں فرمایا ہے۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

كُلُّ تَقِيٍّ وَّ نَقِيٍّ آلِىْ (حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح) متقی اور ستھرا میری آل ہے۔

حضرت شمس الدین سیالویؒ نے فرمایا فنافی الشیخ یہ ہے کہ مرید اپنے شیخ کی ذات میں اس طرح ڈوب جائے کہ اپنی کسی حرکت وسکون کو اپنا نہیں پیر کا سمجھے بلکہ پیر و مرید کی صورت ایک جیسی ہو جائے۔ فرماتے ہیں کہ شہاب الدین سہروردیؒ اور ان کے مرید بہاؤ الدین سہروردیؒ دونوں جب ایک جگہ بیٹھتے تو لوگ دونوں میں تمیز نہ کر سکتے تھے۔ ان کا درجۂ اتحاد اس قدر بلند ہو گیا تھا کہ دونوں کی شکل اور صورت بھی ایک ہو گئی تھی۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ مرید صادق کو اپنی حاجت پیر کے آگے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی پیر کی امداد ہر وقت مرید کو پہنچتی رہتی ہے۔

دستِ پیر از غائباں کوتاہ نیست دستِ او جز قبضۂ اللہ نیست (۳۱۲۔۱)

(دور والوں سے پیر کا ہاتھ کوتاہ نہیں، اس کا ہاتھ اللہ کے قبضے کے علاوہ نہیں ہے۔)

راقم الحروف نے خزینۂ کرم کا مطالعہ کیا ہے، اس میں حضرت اسمٰعیلؒ شاہ صاحب کے متعلق یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ تقسیم ہند کے وقت کسی شخص نے حضرت اسمٰعیلؒ شاہ صاحب کو یہ خبر دی کہ ان کا فلاں مرید ہندوستان میں کافروں کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا ہے۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ یہ خبر غلط ہے اور وہ شخص ابھی زندہ ہے لوگوں نے خبر کی درستگی پر اصرار کیا تو فرمایا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرا مرید ہو اور مجھے اس کی موت کا علم نہ ہو سکے، چنانچہ کچھ عرصے کے بعد معلوم ہوا کہ واقعی وہ شخص زندہ تھا۔ فرماتے ہیں کہ مرید کو چاہیے کہ پیر کی محبت اور اطاعت میں اس طرح محو ہو جائے کہ مرید خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مظہر کو دیکھ سکے۔ جیسے مولانا رومؒ نے فرمایا ہے۔

گر تو ذات پیر را کردی قبول ہم خدا در ذاتش آمد ہم رسول

(اگر تو پیر کو قبول کرلے، تو اس کی ذات میں خدا اور رسول بھی شامل ہوتے ہیں۔)

گر جدا بینی ز حق تو خواجہ را گم کنی ہم متن وہم دیباچہ را

(اگر تو اپنے خواجہ کو ذات حق سے جدا دیکھے گا، تو تو دیباچہ کے ساتھ متن بھی گم کر دے گا۔)

حضرت شمس الدین سیالویؒ نے فرمایا ہے کہ ہر وقت تصور شیخ میں رہنے سے نفسانی خطرات اور شیطانی وسواس سے رہائی ملتی ہے گویا پیر کی ذات گناہوں کے مقابلے میں ایک ڈھال ہے جس کے ہوتے ہوئے مرید کو گناہوں پر ہمت نہیں پڑتی۔ ذکر اور تصور شیخ سے مرید اپنی منزل مقصود کو جلد پہنچ جاتا ہے۔

جائے کہ زاہداں بہ ہزار اربعین رسد مستِ شرابِ عشق بہ یک آہ می رسد(×)

(جس مقام پر زاہد لوگ ۴۰ ہزار سالوں میں پہنچتے ہیں، شرابِ عشق کا متوالہ ایک آہ میں پہنچ جاتا ہے۔)

حضرت شمس الدین سیالویؒ نے لکھا ہے کہ احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اور پاؤں چومنا ثابت ہیں اس میں سجدے کی مماثلت نہیں امراء اور سلاطین کی تعظیم روا نہیں، اولیائے کرام کی تعظیم روا ہے اور کار ثواب ہے۔ منقول ہے کہ جب سلطان محمود غزنویؒ، حضرت ابوالحسن خرقانیؒ کے گھر ان کی آزمائش کے لئے حاضر ہوا تو حضرت ابوالحسن خرقانیؒ اندرون خانہ چلے گئے تاکہ شہنشاہ کی تعظیم میں کھڑے ہونے کا موقع ہی نہ رہے لیکن جب محمود غزنوی، حضرت ابوالحسن خرقانیؒ کی ارادت میں داخل ہو گیا تو محمود غزنوی کی روانگی کے وقت حضرت خواجہ اٹھ کر تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ محمود غزنوی نے جب اس تعظیم کا سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ تمہاری آمد پر تعظیم اس لئے نہیں کی کہ تم ایک شہنشاہ کی حیثیت میں آئے تھے اور روانگی کے وقت تمہاری تعظیم تمہاری ارادت کے باعث کر رہا ہوں۔

۱۰۔ عبدالوہاب شعرانیؒ کا استدلال

(کتابوں سے راہ طریقت ممکن نہیں)

موصوف کی طرف سے انوار قدسیہ میں شیخ کامل کے وجوب پر استدلال قائم کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اندرونی نجاستوں کا دور کرنا واجب ہے۔ پس ظاہر ہے کہ ان نجاستوں کے دور کرنے کا طریقہ واجب ہو گا اور ان نجاستوں کے دور کرنے کے لئے سوائے اتباع شیخ کے کوئی طریق نہیں ہے۔ پھر لکھتے ہیں۔

وَلَوْ تَكَلَّفَ لَا يَنْفَعُ بِغَيْرِ شَيْخٍ وَلَوْ حَفِظَ أَلْفَ كِتَابٍ

"آدمی اگر خود بخود اپنی اصلاح کرنے لگے تو اسے بغیر شیخ کچھ فائدہ نہ ہو گا اگرچہ ہزاروں کتابیں حفظ کر لے"۔

(ابوالفیض سہروردی، الفقر فخری:۱۶۶)

کلیات باقی باللہ میں یوں ہے۔

در کنز و ہدایہ نتواں دید خدا را در صفحہ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست

(کنز اور ہدایہ کی کتابوں سے دیدِ الٰہی حاصل نہیں ہو سکتا، دل کے صفحے کو دیکھو کہ اس سے بہتر کتاب اور کوئی نہیں۔)

مقامِ شوق بے صدق و یقیں نیست یقیں بے صحبت روح الامیں نیست
(ا۔ح:۱۰۲۵)

(شوق کا مقام بغیر صدق اور یقین کے نہیں آتا، اور یقین صحبتِ جبرئیل (یعنی شیخ) کے بغیر ممکن نہیں۔)

صد کتاب و صد ورق در نار کن روئے دل را جانبِ دلدار کن

(سو کتابیں اور سینکڑوں اوراق کو نذرِ آتش کر دو، اور اپنے دل کے چہرے کو دلدار (محبوب) کی طرف کر لو)

دیں مجو اندر کتب اے [illegible] علم و حکمت از کتب، دیں از نظر
(پ۔چ:۸۶۵)

(اے بے خبر! دین کو کتابوں میں تلاش نہ کر، علم و حکمت تو کتابوں سے مل سکتا ہے مگر دین نظر سے ملتا ہے)

نہ کتابوں سے نہ وعظوں سے نہ زر سے پیدا دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا
(اکبر الہ آبادی)

صد کتاب آموزی از اہلِ ہنر خوشتر آں درسے کہ گیری از نظر

(اہلِ ہنر سے (بیشک) سینکڑوں کتابیں پڑھو، لیکن اس سے بہتر درس وہ ہے جو کسی بزرگ کی نظر سے ملے)

ہر کسے زاں مے کہ ریزد از نظر مست می گردد باندازِ دگر (ج۔ن:۷۹۱)

(جس کی نظر سے شراب ظاہر ہو، وہ ایک اور ہی انداز سے انسان کو مست کر دیتی ہے۔)

ورکنی خدمت نخوانی یک کتیب علمہائے نادرہ یابی زجیب (۱۹۵۔۶)

(اگر تم بزرگوں کی خدمت اختیار کر دو اور ایک بھی کتاب نہ پڑھو، تو تمہیں نادر علوم ان کے گریبان سے ملیں گے)

۱۱۔ حضرت توکل شاہ صاحبؒ کے ارشادات

"ذکرِ خیر" میں ہے کہ کسی نے حضرت توکل شاہ صاحبؒ سے پیر اور مرید کے ایک دوسرے پر حقوق کے متعلق دریافت کیا تو حضرت نے فرمایا کہ مرید ہونے کا سب سے پہلا فائدہ یہ ہے کہ مرید کے دینی اور دنیاوی کاموں میں اللہ کی حفاظت شاملِ حال ہو جاتی ہے اور جب مرید پیر کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیتا ہے تو اس کی ہر چیز کا مالک اس کا پیر ہو جاتا ہے حتیٰ کہ گھر بار، دھن دولت جو مرید کی مِلک میں ہو سب پیشوا کی مِلک ہو جاتی ہے۔ گویا مرید کی حالت یہ ہوتی ہے "مردہ بدستِ زندہ" (حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ اگر کسی کو کسی سے محبت ہے تو محبت کرنے والا اپنی محبت میں جب ہی سچا ہوتا ہے کہ محبوب چاہے تو اس کا سارا مال لے جائے اور اسے اس پر کوئی اعتراض نہ ہو۔)

جب حضرت توکل شاہ صاحبؒ سے مرید کے حقوق کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ یہ سن کر پہلے تو

خاموش ہو گئے اور بہت دیر تک گردن جھکائے بیٹھے رہے پھر فرمایا پیر پر مرید کا جو حق ہے وہ بھی معلوم ہو گیا ہے۔ وہ یہ کہ پیر مرید کے واسطے جان کنی کے وقت اللہ سے دعا کرے اور مدد کرے کہ مرید کے دل میں ذکرِ الٰہی جاری ہو جائے اور اگر مرید پر بے ہوشی طاری ہو تو نور کی تجلی وارد کرے تا کہ علمِ توحید حاصل ہو جائے اور شیطان کے دھوکے سے بچائے کہ وہ ایمان نہ سلب کر لے۔ دوسرے یہ کہ منکر نکیر کے سوال و جواب کے وقت اللہ تعالیٰ سے جواب میں آسانی یا معافی کرا دے بلکہ اس وقت پیر کی روح پاس موجود ہوتی ہے کہ وہ گھبرا نہ جائے۔ تیسرے یہ کہ پل صراط پر مرید کی مدد کرے اور [illegible] صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت میں داخل کرے اور جنت میں پہنچا دے۔ یہ سب کچھ ان مریدوں کا حق ہے جو پیشوا سے محبت رکھتے ہوں اور ان کے وظائف پر پابندی کرتے ہوں اور ان کے ارشادات پر عمل کرتے ہوں، لیکن جو مرید پیشوا کی ذات میں فنا ہو چکے ہوں ان کے حقوق تو کہنے سننے سے باہر ہیں، یہ سب اس لئے ہے کہ مرید کی ہر چیز کی ملکیت حاصل کر لینا کوئی آسان بات تو نہیں ہے۔

حضرت توکل شاہ صاحب ؒ فرماتے ہیں مرید کو چاہیے کہ پیشوا کی خدمت اور اس کی خوشنودی و رضا کو اپنا اصل مدعا سمجھے اور اگر پیشوا اپنے مقام سے گر جائے تو بھی اس کی خدمت میں کوتاہی نہ کرے۔ آپ نے ایک روایت بیان کی کہ ایک پیشوا سے کوئی غلطی ہو گئی اور وہ ولایت سے گر گیا مگر اس کا ایک مرید اس کی خدمت میں لگا رہا جب پیشوا نے پوچھا کہ اب جب کہ میں اپنے مقام سے گر گیا ہوں تو پھر تو میری خدمت کیوں کر رہا ہے، اس نے عرض کی کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ توبہ کا دروازہ ابھی کھلا ہے، شاید آپ کی توبہ قبول ہو جائے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ نے مجھ پر یہ احسان کیا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ تک پہنچا دیا ہے ابھی اس احسان کا بدلہ مجھ سے ادا نہیں ہو سکا۔ میں اس احسان کے شکریہ کے لئے آپ کی خدمت کر رہا ہوں۔ میں خدا کے دربار میں گریہ کناں ہوں کہ خدایا میرے پیر کو پہلے سے زیادہ درجہ عطا فرما۔

جو لوگ بیعت کے قائل نہیں وہ مذکورہ بالا تمام نعمتوں سے محروم رہتے ہیں چہ جائیکہ ان کو کسی بزرگ سے اس قدر برکات حاصل ہوں۔ اہل اللہ نے ان ہی وجوہات کی بنا پر بیعت کرنا ضروری خیال کیا ہے۔

۱۲۔ ایک عقلی دلیل

جب کوئی چیز کسی ایک برتن سے دوسرے برتن میں منتقل کرنا مقصود ہو تو جس برتن سے اس چیز کو ڈالا جائے گا وہ اوپر کیا جائے گا اور جو خالی ہے اس کو نیچے کیا جائے گا۔ ایسا کیے بغیر خالی برتن کا بھرنا ممکن نہیں۔ فیضانِ الٰہی کے حاصل کرنے کے لئے ایک برتن کو اوپر اور دوسرے کو نیچے کرنا ضروری ہو گا۔ یہی اصول پیر اور مرید کی حیثیتوں کا تعین کر دیتا ہے۔ پیر اپنی پوجا نہیں کرواتا بلکہ اس کے مقام کا احترام لازمی ہے اور روحانی فیضان

لینے کے لئے اپنے دل کے برتن کو شیخ کے دل کے نیچے کرنا ہوتا ہے۔

۱۳۔ ہر کام کی طرح طریقت میں استاد کا ہونا

اللہ تعالیٰ تک رسائی حاصل کرنا تو بڑی چیز ہے، دنیا کے چھوٹے چھوٹے کام سیکھنے کے لئے اور دنیاوی تعلیم کے لئے سینکڑوں استادوں کی شاگردی کرنا ضروری ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دینی اور روحانی کاموں کے لئے ماہرین کی صحبت دنیاوی کاموں سے بھی زیادہ ضروری ہوگی۔ کیا یہ کام اتنا ہی آسان ہے کہ چند کتابوں اور چند ایک معمولی استادوں سے سیکھ کر اس پر کفایت کی جاسکے؟ روحانیت جیسے اہم کام کی تربیت سے مسلمانوں کو محروم کرنے کے لئے دشمنانِ اسلام نے یہ بات مشہور کردی ہے کہ جب قرآن اور حدیث موجود ہے تو کسی استاد کی ضرورت نہیں۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ روحانی تعلیم کو مفقود کردیا جائے تاکہ مسلمانوں کی آنے والی نسلیں رفتہ رفتہ اسلام سے نا آشنا ہو جائیں، لیکن ان کی اس بات کو تسلیم کرنے والے مسلمان یہ نہیں جانتے کہ روحانی تعلیم میں تو انسان کو ان چیزوں سے واسطہ پڑتا ہے جو نظر نہیں آتیں مثلاً روح، جنت، دوزخ، فرشتے، آخرت، مرنے کے بعد جینا، ذات باری تعالیٰ کے متعلق تفکر، صفات باری تعالیٰ پر غور، رسولوں اور بزرگوں سے فیوض و برکات کا حصول، مراقبہ، کشف اور الہام وغیرہ چنانچہ ایسی باتوں کے لئے تو بغایت اولیٰ راہنما اور راہبر کی ضرورت ہوتی ہے، سنتِ الٰہی بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابوں اور صحیفوں کے ساتھ ساتھ معلمانِ کتب کو بھی مبعوث فرمایا ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آج جب کہ ہمارے پاس مکمل ہدایت قرآن اور سنت کی شکل میں موجود ہے تو کسی شخص کی رہنمائی کی کیا ضرورت ہے تو ان لوگوں کے جواب میں کپتان واحد بخش سیال نے اپنی کتاب ''مشاہدہ حق'' میں لکھا ہے کہ ان لوگوں کا یہ استدلال غلط ہے کیونکہ اگر یہ صحیح ہوتا تو قرآن میں صادقین کی صحبت اختیار کرنے کا حکم نہ دیا جاتا۔ احادیث میں شیخ کے فضائل اور ان کی ضرورت پر زور نہ دیا جاتا اور نہ ہی صحابہ کرامؓ اور ائمہ اہل بیتؓ کی اقتداء کی تاکید کی جاتی بلکہ قرآن و حدیث کو کافی سمجھا جاتا لیکن یہ نہیں کیا گیا بلکہ جابجا ہادی، راہبر کامل اور شیخ کامل کی صحبت حاصل کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

یاد رہے کہ جس طرح صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحبت کے ذریعہ فیض اخذ کیا اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء اور جانشینوں نے تابعین کو ایسی ہی تعلیم دینے کی ضرورت محسوس کی اور بنابریں تابعین نے تبع تابعین کو وہی تعلیم دینے کی کوشش کی۔

۱۴۔ روح کے علوی اور سفلی حصہ میں توازن کرنا

اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے کہ انسان کی روح عالمِ بالا کے دو حصوں سے گزرتی ہے، اوپر والا حصہ عالمِ

امر میں ہوتا ہے اور نچلا حصہ عالمِ خلق میں ہی رہتا ہے۔ انسانی بدن بھی چونکہ پورے عالم کا نمونہ ہے چنانچہ بدن میں ناف سے اوپر والا حصہ عالم امر کی طرح ہے اور نچلا عالمِ خلق کی مثل ہے۔ نچلا حصہ سفلی کہلاتا ہے۔ روح کے سفلی حصے کا مرکز لطیفۂ نفس ہے اور روح کا وہ حصہ جو عالمِ امر میں ہوتا ہے علوی حصہ کہلاتا ہے، اس کا مرکز لطیفۂ سِر میں ہے۔ جس طرح سوار کو اپنی سواری کے اوپر ہونا ضروری ہے اسی طرح طریقت میں سفلی حصے کو مغلوب رکھنا پڑتا ہے اور علوی کو غالب رکھنا ضروری ہے۔ عالمِ امر والے حصے کی کمزوری طریقت کی راہ میں رکاوٹ کا باعث بنتی ہے اور یہ کام سالک خود نہیں کر سکتا یہ شیخ کا کام ہے کہ اپنی توجہ سے دونوں میں توازن قائم کرے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ قلب عالمِ خلق اور عالمِ ارواح کے درمیان برزخ ہے۔ گویا قلب کا نصف حصہ عالمِ خلق سے ہے اور نصف حصہ عالمِ ارواح سے ہے اور عالمِ خلق والے نصف حصے کو پھر نصف کریں تو معاملہ عنصر ہوا و ہوس پر جا پڑے گا جو عالم عناصر اربعہ سے نسبت رکھتا ہے۔ جو شخص اس کی گرفتاری میں ہوا سے ہوا و ہوس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ پہلے قلب کا یہ چوتھا حصہ طے کیا جائے تو مقامِ فنا حاصل ہوتا ہے، یعنی مجاہدات و ذکر سے ہوا و ہوس کو ختم کیا جائے اور باقی تین حصے بعد میں طے ہوں تو واصل باللہ اور باقی باللہ سے ملقب ہوتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ جب سیر کی ابتداء عالمِ امر سے ہو تو سالک اپنے اندر ایک لذت اور حلاوت پاتا ہے جو جذبہ اور کشش کا ہراول دستہ ہے اور اگر یہ اثر پیدا نہ ہو تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ سالک میں عالمِ امر عالمِ خلق کی نسبت کمزور ہے اور یہ کمزوری راہ کی رکاوٹ بنتی ہے اور یہ اس وقت تک رہتی ہے جب تک عالمِ امر عالمِ خلق پر غلبہ اور قوت حاصل نہ کر لے اور معاملہ برعکس نہ ہو جائے۔ اس کمزوری کا علاج یہ ہے کہ مکمل تصرف والا مرشد پورے تصرف سے کام لے، نقشبندی سلسلے کے علاوہ اس کا علاج یہ ہے کہ تزکیۂ نفس کیا جائے اور ریاضت اور مجاہداتِ شاقہ موافقِ شریعت کئے جائیں۔ فرماتے ہیں کہ یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ دیر سے اثر اور حلاوت کا پیدا ہونا استعداد کے ناقص ہونے کی علامت نہیں بلکہ کئی دفعہ مکمل استعداد والے بھی اس بلا میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس کا علاج کوشش اور توجہ مرشد سے ہو جاتا ہے۔ حوصلہ ہار کر راہِ سلوک چھوڑ نہیں دینا چاہئے۔ بعض اوقات تو تصورِ شیخ سے بہت سے معاملات درست ہو جاتے ہیں۔

حضرت مجددؒ الف ثانیؒ کو طریقت میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ آپ کے فرمان کے مطابق روحانی زندگی کی رکاوٹوں کا علاج مرشد کی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتا، لہٰذا بیعت کرنے کا جواز درج بالا حقائق سے ثابت ہو جاتا ہے۔

۱۵۔ وہ کمالات جو طریقت کے ساتھ مخصوص ہیں

ضرورتِ شیخ کی اہمیت تو مشائخِ کبار کے پیش کردہ استدلال کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ ہی واضح ہو جاتی ہے مگر ذوق کی تسکین اور مزید معلوماتی اضافے کے لئے اس جگہ چند ضروری نکات پیش کئے جا رہے ہیں جن پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوگا کہ اگر کوئی شخص بیعت جیسی عظیم چیز سے محروم رہتا ہے تو وہ خدا کی کن کن عظیم نعمتوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ ان میں سے بعض نکات تو ایسے ہیں جن کا عام علماء کی نظروں سے بھی گزرنا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ روزمرّہ زندگی میں ایسے لوگ بہت کم پائے جاتے ہیں جو ان روحانی علوم سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہاں پر امام غزالیؒ کا قول یاد آتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں ''جو اللہ تک نہ پہنچ سکا تو اس لئے کہ وہ اس راہ پر چلا ہی نہیں اور چل اس لئے نہ سکا کہ اس نے اس راہ کی تلاش ہی نہیں کی، تلاش اس لئے نہ کی کہ اس کو اس راہ کی پہچان نہ ہو سکی اور پہچان اس لئے نہ ہو سکی کہ ایمان مکمل نہ تھا اور ایمان اس لئے مکمل نہ ہوا کہ مردِ راہ دان کی راہبری سے محروم رہا۔''

اس جگہ ان مخصوص کمالات کا ذکر کیا جا رہا ہے جن کا طریقت کی راہوں کے علاوہ دستیاب ہونا ممکن نہیں۔ اس ضمن میں صرف ان چیزوں کا ذکر کیا جائے گا جو ضرورتِ شیخ پر استدلال، طریقت پر مشائخِ کبار کا اظہارِ خیال اور تصوف کے تعارف کے مضامین میں بیان نہیں کی گئیں۔ طریقت میں جن باتوں کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے وہ حسبِ ذیل ہیں۔

(ا) صحبت کا راستہ اختیار کرنا

صحبت کو طریقت میں اولیت کا مقام حاصل ہے۔ درج ذیل تشریحات کے مطالعے کے بعد اس حقیقت کو سمجھنا کوئی مشکل بات نہیں رہتی کہ اہلِ طریقت نے صحبت کے اختیار کرنے پر اس قدر اصرار کیوں فرمایا؟

i۔ صحبت کو جملہ خصائص پر فوقیت حاصل ہے

صحبت کی بلندی اس بات سے واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے رفقاء، ساتھیوں اور ہمرازوں کے لئے صحابہ رضی اللہ عنہم کا نام تجویز فرمایا۔ صحابی وہ ہوتا ہے جو رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں رہا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے صحبت کو صحابی کی وجہ تسمیہ بنایا حالانکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم صرف صحبتِ رسول ﷺ سے ہی سرفراز نہ تھے بلکہ وہ حفاظِ قرآن، مفکرین و مفسرین قرآن کے علاوہ علمائے دین، فقہائے اسلام، تاجران، عابدان اور زاہدِ زمانہ تھے ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ وہ اہلِ تقویٰ صاحبانِ زہد و ورع، ماہرینِ حرب و قتال، علومِ دنیا مثلاً سائنس، ریاضی، کیمیا، ہندسہ، طبیعات و فلکیات وغیرہ پر دسترس رکھنے والے بھی تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ کے ان تمام خصائص پر صحبت کی خصوصیت کو پسند فرمایا اور ان کو صحابہ کا نام دیا جس سے ظاہر

ہوتا ہے کہ صحبت کو اُمّ الخصائص مقرر فرمایا۔ آخر صحبت میں ضرور کوئی ایسی خوبیاں مخفی کر دی گئیں ہیں جس نے اس کو جملہ خصائص سے ممتاز بنا دیا۔

ii۔ کوئی عبادت صحبت کی ہم پلہ نہیں

صحابی صرف وہی ہو سکتا ہے جس نے حضور اکرم ﷺ کی صحبت حاصل کی ہو خواہ وہ ایک لمحہ کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے سامنے آیا اور آپ پر ایمان لاتے ہوئے ایک بار کہہ دیا السلام علیک یا رسول اللہ ﷺ تو وہ صحابی ہو گیا اور صحابی کی وہ شان ہے جس کی بلندی کو کوئی بڑے سے بڑا عابد، زاہد قطب اور غوث نہیں پہنچ سکتا، کوئی خواہ لاکھوں سال رات دن عبادت میں لگا رہے، صحابی کے درجے کو نہیں پہنچ سکتا۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ بعض لوگ حضرت امیر معاویہؓ کے متعلق زبان طعن دراز کرتے ہیں لیکن انہیں یہ معلوم نہیں کہ امیر معاویہؓ کا درجہ عام صحابہ کرامؓ سے بلند ہے، آپ نے یہاں تک فرمایا کہ اگر امیر معاویہؓ (کے جہاد پر جانے والے) گھوڑے کے سموں سے اڑنے والی خاک میرے دامن پر پڑ جائے تو مجھے اپنے جنّتی ہونے کا یقین ہو جائے گا۔

iii۔ اولیاء کی صحبت ریاضت سے بہتر ہے

اپنے طور پر حاصل کردہ علم کی حیثیت اس علم کے مقابلے میں کوئی وقعت نہیں رکھتی جو عارفانِ حق کی وساطت سے حاصل کیا گیا ہو۔ عارف باللہ راہ طریقت کی اونچ نیچ سے مکمل واقفیت رکھتے ہیں اور سالکین کی بآسانی تربیت کر سکتے ہیں۔ عارفانِ راہ طریقت کئی سالوں کی راہ کو مہینوں اور کبھی مہینوں کے سفر کو چند لمحات میں طے کروا دیتے ہیں۔ یہ بات مشہور ہے کہ حضرت بلھے شاہؒ کو ان کے پیر حضرت عنایت شاہؒ نے جب دھان کی پنیری کو ایک جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ پر لگایا تو فرمایا "بلھیا دل دا کی سمجھاوناں ایتھوں پٹیا تے اُتھے لاوناں"، یعنی اہلِ طریقت اتنی دیر میں مرید کے قلب کی حالت کو بدل دیتے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں: آج اس دولت کا حاصل ہونا اس طریقہ عالیہ کے ساتھ توجہ اور اخلاص پر وابستہ ہے جو بڑی بڑی سخت ریاضتوں اور مجاہدوں سے اس قدر حاصل نہیں ہوتی جو یہ بزرگ ایک ہی صحبت میں بخش دیتے ہیں اور جو دوسرے طریقے کے لوگوں کو نہایت میں جا کر حاصل ہوتا ہے۔ ان بزرگوں کا طریقہ صحابہ کرامؓ کا طریقہ ہے ان کو خیر البشر ﷺ کی پہلی ہی صحبت میں وہ کمالات حاصل ہو جاتے تھے جو اولیائے امت کو نہایت میں شاید ہی میسر ہوں اور یہی ابتداء میں انتہا کے درج کرنے کا طریق ہے۔ (مکتوبات دفتر اول حصہ دوئم مکتوب ۹۰)

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ (مکتوب ۱۴۲ دفتر اول حصہ سوئم میں) فرماتے ہیں: فقراء کی محبت اور اس گروہ

سے نسبت رکھنا خدا تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔ حق سبحانہ تعالیٰ اس پر استقامت فرمائے۔ خلیفہ خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ زبدۃ المقامات میں فرماتے ہیں کہ ایک عالمِ دین حضرت مجددؒ الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کے لئے آئے اور کچھ دیر تک حضرت کی مجلس میں بیٹھے رہے لیکن حضرت مجددؒ الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے بہت دیر تک سکوت فرمایا اور کلام سے اجتناب کیا، [illegible] وہ اس مجلس سے اٹھ کر باہر آیا اور لوگوں سے کہا کہ میں آپ سے کچھ فیض حاصل کرنے کی نیت سے [illegible] تھا مگر آپ نے کلام ہی نہیں فرمایا، لہٰذا جیسے آیا تھا ویسے ہی واپس جا رہا ہوں۔ جب حضرت کو یہ [illegible]لوم ہوئی تو آپ نے فرمایا جس شخص کو ہماری خاموشی سے فیض حاصل نہ ہو سکا اس کو ہمارے کلام سے بھی کچھ حاصل نہیں ہو سکے گا۔ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ اور دیگر مشائخ عظام کا قول ہے "سایۂ رہبر بہ است از ذکرِ حق" (یعنی صحبتِ شیخ ذکرِ حق سے بہتر ہے) فرماتے ہیں کہ یہاں یہ کہنا نفع کے اعتبار سے ہے کیونکہ مرید کو مذکور (یعنی اللہ) کے ساتھ ابھی کامل مناسبت حاصل نہیں۔ (مکتوبات) اس لئے کہا جاتا ہے کہ جب کوئی مرید اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر ہو تو اس وقت شیخ کے چہرے کو دیکھنا ہی عبادت ہے اور ایسے وقت میں کوئی وظیفہ، کتاب، اخبار حتیٰ کہ نوافل وغیرہ نہ پڑھے۔

اس سلسلے میں مشائخ کے اقوال بے حد و بے شمار ہیں جن کا یہاں بیان کرنا ممکن نہیں اس بیان سے معلوم ہوا کہ بذریعہ شیخ اپنے دل کی حالت کو بدلنا سوائے راہِ طریقت پر چلنے کے ممکن نہیں۔ اس کے بعد وہ باتیں دی جا رہی ہیں جو بیعت کے بغیر ممکن نہیں۔

iv۔ صحبت سے اخذِ فیض کی تقسیم

مثل مشہور ہے کہ انسان کی پہچان اس بات سے ہوتی ہے کہ وہ کس قسم کے لوگوں کے ساتھ صحبت اختیار کرتا ہے۔ صوفیائے کرام کا قول ہے کہ انسان خواہ کس قدر عالم فاضل متقی پرہیزگار ہی کیوں نہ ہو وہ صحبت سے مستثنیٰ نہیں۔ پیغمبرانِ حق بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ صحبت کے محتاج تھے۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ جو ائمہ اربعہ میں اعلیٰ درجہ رکھتے تھے اور بجا طور پر امام اعظمؒ کہلانے کے حقدار ہیں وہ بھی حضرت بہلول داناؒ اور دیگر اولیاء کی صحبت میں بیٹھا کرتے اور اپنی زندگی کے آخری دو سال انہی کی صحبت میں اس مقصد کی تکمیل کے لئے صرف کئے۔ آپ کہا کرتے تھے "لَوْلَا السَّنَتَانِ لَهَلَكَ النُّعْمَانُ" (یعنی اگر یہ دو سال نہ ہوتے تو نعمان ہلاک ہو جاتا۔) حضرت امام احمد بن حنبلؒ، بشر حافیؒ کی صحبت میں رہتے اور اتنے بڑے امام ہونے کے باوجود بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ کی سواری کی رکاب کے ساتھ غلامانہ چلتے۔ جب لوگ ان سے اس احترام کا سبب پوچھتے تو کہتے کہ بشر رحمۃ اللہ علیہ کو خدا کی معرفت مجھ سے زیادہ حاصل ہے۔ اسی طرح ابو عمرانؒ بہت بڑے فقیہ تھے اور جامعہ منصور میں درس دیتے لیکن جب حضرت شبلیؒ (۳۳۴ھ) درس دیتے تو لوگ ان کے درس کو چھوڑ کر

حضرت شبلیؒ کے درس میں چلے جاتے اس پر حضرت ابوعمرانؒ سخت برافروختہ ہوتے۔ ایک دن آپ اپنے شاگردوں کے ساتھ حضرت شبلیؒ کا درس سننے گئے۔ آپ کے ایک شاگرد نے حضرت شبلی سے حیض سے متعلق سوال کیا تاکہ لوگوں کو یہ علم ہو جائے کہ یہ عالم نہیں ہیں مگر جب حضرت شبلیؒ نے کلام شروع کیا اور علماء کے اقوال اور اختلاف کا ذکر کیا تو ابوعمرانؒ سن کر ششدر رہ گئے اور اُٹھ کر ان کے سر کو بوسہ دیا اور کہا کہ اے شبلیؒ مجھے آپ کے ذریعے دس ایسے اقوال معلوم ہوئے ہیں جن کا مجھے پہلے علم نہیں تھا اور جتنے قول آپ نے بیان فرمائے ہیں مجھے ان میں سے صرف تین قول آتے تھے۔ (رسالہ قشیریہ اور لوائح الانوار)

صحبتِ شیخ چونکہ صحبتِ صالح کے مترادف ہے اس لئے ایسے لوگوں کی صحبت میں رہنے کا کم سے کم فائدہ یہ تو ہوتا ہے کہ مرید بری صحبت سے بچ جاتا ہے اور اس سے بڑا فائدہ یہ کہ وہ نیک صحبت میں نیک تربیت حاصل کرتا ہے۔ ان کی صحبت سے جو معارف حاصل ہوتے ہیں وہ ایک طویل گفتگو کے محتاج ہیں۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ مرید جب شیخ کے پاس بیٹھتا ہے تو اس کا شیخ اپنے الفاظ کے ہمراہ نور بھی ارسال کر دیتا ہے چنانچہ ان کے منہ سے نکلا ہوا کلام سامعین پر مختلف اثر رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے بندوں کے منہ سے نکلی ہوئی بات اثر رکھتی ہے اور ان کی بات عام آدمی کی بات کی طرح نہیں ہوتی۔

شیخ نورانی زرہ آگہ کند ۔ باسخن ہم نُور را ہمرہ کند (۲۵۳_۵)

(شیخ نورانی راہِ خدا سے آگاہ کرتا ہے اور اپنے ارشادات کے الفاظ کے ہمراہ نور بھی ارسال کرتا ہے۔)

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ جب تم کسی پیر کو اپنی اصلاح کے لئے اختیار کر لو تو پھر اس کی اتباع کرو جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام کے زیرِ فرمان ہو گئے تھے۔

چوں گرفتی پیر ہیں تسلیم شو ۔ ہمچو موسیٰؑ زیرِ حکمِ خضرؑ رو (۳۱۱_۱)

(جب تم پیر کو اختیار کر لو تو سرِ تسلیم خم کر دو، جس طرح حضرت موسیٰؑ حضرت خضرؑ کے حکم کے تابع ہو گئے تھے)

حضرت داؤد طائیؒ اتنے بڑے عالم ہونے کے باوجود حضرت حبیب عجمیؒ کی صحبت میں رہتے تھے کیونکہ باطن کی اصلاح کے لئے یہ ضروری تھا اور حضرت حسن بصریؒ تو حبیب عجمیؒ کے استاد بھی تھے، مگر حضرت حبیب عجمیؒ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کو فرمایا کرتے تھے کہ تم کاغذ سیاہ کرتے ہو اور میں دل کو سفید کرتا ہوں۔

مولانا رومؒ نے صحبت کے اختیار کرنے کے لئے بہت کلام لکھا ہے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

چونکہ دستِ خود بدستِ اُو نہی ۔ پس زدستِ آکلاں بیروں جہی (۵_۸۳)

(جب تم اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دو گے، پھر تم گمراہ لوگوں کے ہاتھ سے باہر نکل جاؤ گے۔)

رہبرِ راہِ طریقت آں بود ۔ کو بہ احکامِ شریعت می رود (x)

(رہبر راہِ طریقت وہی ہوتا ہے، جو احکام شریعت کا خود بھی پابند ہو)

مشکوٰۃ، جامع صغیر اور کنوز الحقائق میں حدیث شریف ہے کہ

اَلْوَحْدَۃُ خَیْرٌ مِّنْ جَلِیْسِ السُّوْٓءِ یعنی برے کی صحبت میں بیٹھنے سے تنہائی بہتر ہے

وَالْجَلِیْسُ الصَّالِحُ خَیْرٌ مِّنْ وُحْدَۃٍ اور صالح ہم مجلس آدمی تنہائی سے بہتر ہے۔

خلوت از اغیار باید نے زِ یار پوستیں بہرِ دے آمد نے بہار (۲۔۱۷)

(تنہائی غیروں سے چاہئے اپنے یار سے نہیں، پوستین موسم سرما کے لئے ہوتی ہے بہار کے لئے نہیں۔)

صحبتِ صالح ترا صالح کند صحبتِ طالح ترا طالح کند (۱۔۱۰۲)

(اچھوں کی صحبت تجھے اچھا بنا دیگی ہے، بروں کی صحبت تجھے برا بنا دیگی ہے۔)

دور شو از اختلاطِ یارِ بد یارِ بد بدتر بود از مارِ بد

(برے دوست کے میل جول سے دور رہ، کیونکہ برا دوست زہریلے سانپ سے بھی بدتر ہوتا ہے۔)

مار بد جانے ستاند اے سلیم یار بد آرد سوئے نارِ جَحِیم (۵۔۲۶۹)

(زہریلا سانپ کاٹنے سے جان لے لیتا ہے، اور برا ساتھی جہنم کی آگ کی طرف لے آتا ہے۔)

دشمنِ دینِ نبی در خار دار بر سرِ منبر منہ بر دار دار

(نبی ﷺ کے دین کے دشمن کو کانٹا سمجھو، اسے منبر پر جگہ نہ دو پھانسی کے تختے پر چڑھا دو۔)

اے خنک آں مردہ کز خود رستہ شد در وجودِ زندۂ پیوستہ شد (۱۔۱۷۸)

(ٹھنڈا رہے وہ مردہ (دل) جو کسی مردہ (دل) کے پاس بیٹھے، ایسا شخص مردہ ہو گیا اور حقیقی زندگی سے محروم ہو گیا۔)

یک زمانے صحبتے با اولیاء بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا (۱۔۱۰۱)

(کچھ عرصہ اولیاء کی صحبت میں بیٹھنا سو سالہ بے ریا اطاعت سے بہتر ہے۔)

ب۔ کتاب اور حکمت کی تعلیم شیخِ کامل کے بغیر ممکن نہیں

قرآن کی آیات سے نبوت کے یہ چار منصب معلوم ہوتے ہیں کہ نبی اُمت پر آیات کی تلاوت کر کے لوگوں کو سنائے، ان کا تزکیۂ نفس کرے، کتاب اللہ کی تعلیم دے اور حکمت یعنی اَسرار و رُموزِ حق تعالیٰ سے آگاہ کرے۔ ان چار کاموں میں کتاب اللہ کی ابتدائی تعلیم کسی حد تک معلم کے بغیر ہو سکتی ہے اور باقی تین کاموں یعنی تزکیۂ نفس، احکامِ خداوندی کی روشنی میں لوگوں کی تربیت اور اَسرار و رموز سے آگاہ کرنے کے لئے کسی نہ کسی روشن ضمیر کی ضرورت لازمی ہے۔ ان کاموں میں شخصی عنصر کی ازحد ضرورت ہوتی ہے۔

احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے رخِ انور کی زیارت، آپ ﷺ کے مبارک تکلم اور

آپ ﷺ کے چھونے سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے روحانی مراتب طے ہو جاتے تھے۔ یاد کریں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا کہ تم میں سے اس وقت تک کوئی سچا ایماندار نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ مجھے اپنے بال بچوں، مال و دولت اور جان سے زیادہ عزیز نہ جانے، تو اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ میں اپنے اندر یہ کیفیت محسوس نہیں کرتا لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سینے پر ہاتھ رکھا تو عرض کرنے لگے کہ یا رسول اللہ ﷺ اب میں یہی کیفیت محسوس کرتا ہوں۔ اسی طرح ایک صحابیؓ کو جب کسی علاقے کا عامل مقرر کیا گیا تو انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ میں اپنے اندر یہ اہلیت محسوس نہیں کرتا۔ آپ ﷺ نے جب اس کے کندھوں کو ہاتھ لگایا تو عرض کرنے لگے کہ یا رسول اللہ ﷺ اب محسوس کرتا ہوں۔ حضرت سلمان فارسیؓ جب پہلی بار آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو رُخِ انور پر نظر پڑتے ہی ان کے روحانی مراتب بلند ہو گئے۔ صاحب مشاہدۂ حق لکھتے ہیں کہ کیا یہ بعد میں آنے والے لوگوں کے لئے زیادتی نہ ہو گی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو آنحضرت ﷺ کی صحبت اور باطنی توجہ سے اس قدر فائدہ اٹھائیں اور بعد میں آنے والوں کے سامنے قرآن اور حدیث کی کتابیں اُٹھا کر رکھ دی جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ روحانی منازل طے کرانے کے لئے ایسے رہبر کامل کی ضرورت ہوتی ہے جو باطنی آنکھوں سے قلب کی بیماریوں پر نظر ڈال کر ان کا علاج کر دے۔ اولیائے کرام روحانی ضروریات پر روشنی ڈالتے ہیں اور لوگوں کی ان ضروریات کو ان کے لئے مہیا کرنے کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔

اولیائے کرام "اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ" (مومن کی باطنی بصیرت سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے (سنن ترمذی) کے مطابق لوگوں کے قلب پر نظر ڈال کر ان کی بیماریوں کا علاج کرتے ہیں، بلکہ ایک حدیث میں تو "بِیْ يُبْصِرُ وَ بِیْ يَسْمَعُ" کے قول سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ لوگ اللہ کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور اللہ کے کانوں سے سنتے ہیں، تو پھر ایسے اولیائے کرام سے لوگوں کو محروم رکھنے کا مدعا اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ کچھ اسلام دشمن لوگ مسلمانوں کو اخلاقی اور روحانی بیماریوں کی دلدل میں ہی رکھنا چاہتے ہیں۔

اس کے علاوہ روحانی مقامات سے آگاہ کرنا، سیر الی اللہ، سیر فی اللہ کی منازل سے آگاہ کرنا، مرید کو دشوار گھاٹیوں سے گزارنا، شیطان کے ہتھکنڈوں سے بچانا اور باطنی قلوب سے مریدوں کے دلوں کو سرشار کرنا، لطائف ستہ سے ذکر کو جاری کرنا، فنا اور بقاء کی کیفیات سے آگاہ کرنا، ایک راہ دان، راہنما اور پیر کامل کے علاوہ ممکن نہیں۔ جو لوگ سلسلۂ بیعت کے مخالف ہیں وہ ان تمام روحانی مراتب سے نہ صرف محروم ہیں بلکہ ان کی قدر و قیمت اور معارف سے بھی بے بہرہ ہیں۔

ابن تیمیہؒ کے شاگرد حافظ ابن قیمؒ کی مشہور کتاب "کتاب الروح" میں انہوں نے ایسے بہت سے

واقعات نقل کئے ہیں جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے مزار مبارک میں بیٹھے ہوئے اُمت کے حالات سے واقف ہونا اور ان کی اصلاح فرمانا ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح آپ کی اُمت کے اولیائے کرام آج بھی لوگوں کی ایسے طریقے سے راہنمائی کرتے ہیں اور اس نسبت کو اویسی نسبت کہا جاتا ہے۔ یہ بات معروف ہے کہ اولیائے کرام کے مزاروں سے آج بھی لوگوں کو فیض ملتا ہے۔ حضرت معین الدین چشتیؒ، بابا فرید گنج شکرؒ اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ وغیرہ کے چلّے اب بھی تاریخ میں محفوظ ہیں ان مقامات میں سے حضرت معین الدین چشتیؒ کا حجرۂ چلہ کشی آج بھی علی الہجویریؒ کے مزار سے تقریباً ۱۲ فٹ کے فاصلے پر موجود ہے۔ صاحب مشاہدۂ حق نے لکھا ہے کہ تاریخ شاہد ہے کہ حضرت بہاؤ الدین نقشبندؒ نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مزار سے فیض حاصل کیا اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی روحانی تربیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کر دی تھی لیکن آگے سلسلہ چلانے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ظاہری شیخ کی بھی ضرورت ہے اور جا کر فلاں شیخ سے بیعت کرلو۔ ابن تیمیہ خود سلوک کی تمام منازل مثلاً فنافی اللہ اور بقاء باللہ، سکر و صحو وغیرہ کے قائل تھے۔ مگر ان کے ہی پیروکار آج ان تمام باتوں کو غیر اسلامی کہتے ہیں۔ حضرت سلطان باہوؒ فرماتے ہیں کہ اہلِ ظاہر کی عبادت حقیقی عبادت کی طرح کس طرح ہو سکتی ہے۔ جس کے ظاہر کے ساتھ باطنی اصلاح نہ ہو تو وہ شخص اپنی اصلاح کس طرح کر سکتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

علم باطن ہمچوں مسکہ، علم ظاہر ہمچوں شیر　　کے بود بے شیر مسکہ، کے بود بے پیر پیر

(باطنی علم گھی کی طرح ہے اور ظاہری علم دودھ کی طرح، دودھ کے بغیر گھی کیسے بن سکتا ہے اور پیر کے بغیر پیر کیسے بنے گا۔)

ج۔ ملکوتی اور بشری صفات کا پیدا کرنا

اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور فرشتوں کو دو جہتیں عطا فرمائی ہیں، ایک نورانی اور ایک بشری۔ فرشتوں پر نورانی جہت کو غالب فرمایا اور وہ ہر وقت نورانی صفت میں رہتے ہیں مگر جب چاہیں بشری صورت بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ حدیث جبرئیلؑ میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کا انسان کی شکل میں حاضر ہونا اور کئی بار نزولِ وحی کے وقت حضرت دحیہ کلبیؓ کی شکل میں حاضر ہونا اس امر کی اہم مثالیں ہیں۔ انسان کو چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنا نائب بنایا اور خلافت کے منصب سے سرفراز فرمایا ہے اسلئے اسے ایسے کمالات بھی عطا فرمائے جو نورانی مخلوق سے بہت اعلیٰ و ارفع ہیں۔ انسان پر اگرچہ بالعموم بشری جہت غالب رہتی ہے مگر جب چاہے اپنی استطاعت کے مطابق نورانی جہت کو غالب کر کے فیوض ربانی حاصل کر سکتا ہے۔

انبیاءِ کرامؑ زیادہ تر فیض خداوندی نورانی جہت سے حاصل کرتے ہیں اور بشری صفت میں آ کر بندوں کو

فیض دیتے ہیں۔ شیخ سعدیؒ کی رباعی میں "بَلَغَ الْعُلٰی بِکَمَالِهٖ" سے مراد یہ ہے کہ آپؐ اپنے کمال کے مرتبوں پر پہنچے "کَشَفَ الدُّجٰی بِجَمَالِهٖ" کا مطلب یہ ہے کہ وہ بشری صفات سے نکلے "حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِهٖ" سے مراد یہ ہے کہ وہ اخلاصِ الٰہی کی صفات سے موصوف ہوئے۔

ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ نماز کی دو رکعتیں انسان کے لئے اسی طرح ہیں جس طرح فرشتوں کے لئے دو پر۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کثرتِ مجاہدات اور عبادات سے انسان میں ایسے روحانی کمالات پیدا ہو جاتے ہیں جس سے اس کی روح کو تقویت حاصل ہوتی ہے، اسی لیے صوفی اپنی قوت اور تصرف کی وجہ سے جہاں چاہے چشمِ زدن میں مع جسم جا سکتا ہے اور کئی اولیائے کرام کو اس قدر تصرف حاصل ہوتا ہے کہ وہ جب چاہیں جہاں چاہیں کئی مقامات پر خود کو ظاہر یا حاضر کر سکتے ہیں۔ اس کی تفصیل اس کتاب میں گزر چکی ہے۔

معراج النبی ﷺ میں ملکوتی صفات کے حاصل ہونے کی دلیل ہے۔ سدرۃ المنتہٰی پر جبرئیل علیہ السلام کی پرواز کی حد ختم ہوئی مگر حضور اکرم ﷺ نے اس سے بھی آگے پرواز فرمائی۔ دیگر انبیائے کرامؑ کو بھی کسی نہ کسی نوعیت کی معراج نصیب ہوئی اور حضور اکرم ﷺ کو ہر نماز میں معراج کی سی کیفیت کا حاصل ہونا بھی احادیث میں وارد ہے۔ اولیائے کرام کو بھی آپ ﷺ کے طفیل نماز میں معراج حاصل ہوتی ہے۔ اولیائے کرام کا عرش پر مصلیٰ گزارنا اور عرش پر عروج کا حاصل ہونا، فرشتوں کو دیکھنا، ان کی آوازوں کا سننا بھی ملکوتی صفات حاصل ہونے کی مثالیں ہیں۔ مکتوبات میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے انبیائے کرامؑ اور اہل بیت عظامؓ اور خود حضور اکرم ﷺ کے مقامات کی سیر حاصل کرنے کا ذکر کیا ہے۔ اولیائے اُمت کو مراقبہ کے دوران بڑے بڑے مقامات کی سیر کا حاصل ہونا، روحانی کتابوں میں منقول ہے۔ اگرچہ اس سلسلے میں کلام بہت طویل ہے مگر یہاں اسی پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ کچھ لوگ ان تمام معارف اور کمالات سے قطعاً بے بہرہ ہیں لیکن اپنی لاعلمی کے باعث اولیائے کرامؒ کے ان کمالات کی نفی کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس طرف رغبت کرنے کی توفیق سے بھی محروم کر دیئے گئے ہیں۔

د۔ قربِ الٰہی اور اس کا ادراک

قرب کے متعلق تفصیلی بیان کچھ کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے اور کچھ دوسری کتب میں بھی لکھ دیا گیا ہے۔ یہاں صرف یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ وہ کون سے طریقے ہیں جن کو اپنایا جائے تو ایک عام مسلمان بھی خدا کا قرب حاصل کر سکے۔ گزشتہ اَوراق میں بیان ہو چکا ہے کہ ولی کے لفظی معنی قرب اور نزدیکی کے ہیں چنانچہ ولی اللہ وہی ہے جو خدا کے قریب اور نزدیک ہو۔ اس بات سے معلوم ہوا کہ قربِ الٰہی اولیاء کی وساطت سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ حضرت پانی پتیؒ فرماتے ہیں کہ قربِ الٰہی دو قسم کا ہوتا ہے، ایک وہ قربِ الٰہی جو

ہر شے کو حاصل ہے اور اگر یہ قرب نہ ہو تو کوئی شے زندہ نہیں رہ سکتی۔ یہ قرب معنوی ہے وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (ق:۱۶)(اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہیں) سے یہی قرب مراد ہے۔ دوسرا وہ ہے جو اللہ کے خاص بندوں کو حاصل ہوتا ہے اور یہ قرب محبت ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس قرب میں ولایت پر فائز ہونے کے بعد دل پر بالواسطہ یا بلاواسطہ آفتاب رسالت کا انعکاس ہوتا ہے۔ یہ انعکاس ایک قسم کی نورانی کرنوں کا حاصل کرنا ہے۔ نبی پاک ﷺ کے جسم مبارک سے جو شعاعیں صحابہ کرامؓ کو ملیں، ان کے ذریعے وہ صحابی بن گئے۔ یاد رہے کہ دنیا کی ہر شئے سے کچھ نہ کچھ شعاعیں نکلتی ہیں اور انسانوں میں یہ شعاعیں ان کی روحانی قوت کے مطابق ہوتی ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کے جسم مبارک سے جو شعاعیں خارج ہو کر اہلِ ایمان کے سینوں میں داخل ہوئیں تو ان میں وہ تمام خوبیاں پیدا کر گئیں جو ان کا خاصہ تھیں اور شریعت کے احکام بجالانے کی استطاعت ان پر نافذ ہو گئی۔ (کفار اپنے انکار کی وجہ سے ایسی استطاعت سے محروم رہے کیونکہ ان کے سینے ان کے بغض کی وجہ سے ان شعاعوں کے لئے بند ہو گئے تھے۔)

حضرت عطارؒ نے تذکرۃ الاولیاء میں یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوالحسن خرقانیؒ نے ایک مجلس میں فرمایا کہ جس نے ہمیں دیکھ لیا وہ بخشا جائے گا۔ شہنشاہ محمود غزنویؒ نے (جو اس مجلس میں موجود تھے) عرض کیا ابو جہل نے حضور اکرم ﷺ کو دیکھا لیکن بالاتفاق وہ جہنمی ہے۔ حضرت نے بہت طیش میں فرمایا کہ خدا کی قسم ابو جہل نے حضور اکرم ﷺ کو دیکھا ہی نہیں اور اس بات کی تصدیق قرآن میں موجود ہے کہ وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾ (الاعراف:۱۹۸)(اے نبی ﷺ) آپ دیکھیں گے ان کو کہ وہ دیکھ رہے ہیں آپ ﷺ کی طرف حالانکہ انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ جواب سن کر محمود غزنوی خاموش ہو گئے۔

اولیائے کرامؒ فرماتے ہیں کہ ان شعاعوں کا فیضان اولیائے کرام کی مجلسوں میں اکثر بیٹھنے والوں کو اولیائے کرام کے سینوں سے آج بھی تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس قسم کا قرب اور اس کے معارف القاء یا انعکاس سے ہی دل میں آتے ہیں۔ علامہ بانی پتیؒ فرماتے ہیں کہ ذکر اور مراقبہ کرنے والوں کے دل اسی انعکاس کو حاصل کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں اور اس طرح دل کو صاف کرنے کے بعد ہی کوئی حضور اکرم ﷺ سے فیضان یا القاء وصول کر سکتا ہے اور اگر ایسا ہو جائے تو خدا سے دوری کے حجابات اٹھ جاتے ہیں۔ علامہ موصوف فرماتے ہیں کہ اگرچہ قرب الٰہی ہر ایک کو حاصل ہے لیکن اگر دل وصول فیضان کے قابل نہ ہو تو ایسا شخص قریب ہو کر بھی دور ہوتا ہے۔

درج بالا بیان سے معلوم ہوا کہ ذکرِ الٰہی کو سیکھنا اور دل کے تزکیہ کے بعد حضور اکرم ﷺ کی رسالت کے فیضان کی شعاعوں کو دل میں اخذ کرنا بغیر شیخ مکمل و کامل کی صحبت کے ممکن نہیں کیونکہ عام ذکر وہ درجہ نہیں رکھتا۔ جو ذکر کسی صاحب حال شیخ سے سیکھا جائے۔ ایسا ذکر ہی قرب کی استعداد پیدا کرتا ہے۔ مولانا رومؒ

فرماتے ہیں کہ ایک شمع سے ہزاروں شمعیں جلائی جاتی ہیں اور جس نے اس آخری شمع کو دیکھا تو گویا اس نے پہلی شمع (شمع رسالت) کو ہی دیکھا۔

چوں چراغ نورِ شمع را کشید ہر کہ دید آں را یقین آں شمع دید

(جب چراغ کسی شمع سے روشنی حاصل کرتا ہے، جس نے اس چراغ کو دیکھا اس نے یقینا پہلی شمع کو ہی دیکھا)

ہم چنیں تا صد چراغ از نقل شد دیدنِ آخر لقائے اصل بد(۲۱۴۔۱)

(اس طرح (اگر) سینکڑوں شمعیں اس سے جلائی جائیں، تو آخری شمع کو دیکھنا (گویا) اصل شمع کو دیکھنا ہے)

دستِ اُو را حق چوں دستِ خویش خواند تایَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ براند(۳۱۱۔۱)

(ان کے ہاتھ کو چونکہ خدا نے اپنا ہاتھ کہا ہے، اس لئے اللہ نے "یداللہ" والی آیت نازل کی)

یار باید راہ را تنہا مرو از سر خود اندریں صحرا مشو(۳۱۲۔۱)

(راستے کے لئے یار ضروری ہے تنہا مت چلو، خودسری کے باعث اس صحرا میں قدم نہ رکھنا)

شیخ سعدیؒ اپنے لئے نہیں بلکہ ان محروم لوگوں کی طرف سے فرماتے ہیں کہ ان لوگوں پر افسوس ہے جو اللہ سے قریب ہوتے ہوئے بھی دور ہیں۔

دوست نزدیک تر از من بہ من است ویں عجب تر کہ من از وے دورم(شیخ سعدیؒ)

(دوست مجھ سے بھی زیادہ میرے نزدیک ہے، تعجب ہے اس پر کہ میں اس سے دور ہوں)

چہ کنم با کہ تواں گفت کہ اُو در کنارِ من و من مہجورم(شیخ سعدیؒ)

(میں کیا کروں اور کس سے یہ بات کہوں، کہ وہ محبوب میری آغوش میں ہے اور میں ہجر میں ہوں)

علامہ پانی پتیؒ فرماتے ہیں کہ نورِ فراست سے ہی اس قرب کا ادراک کیا جا سکتا ہے۔ حواس ظاہری اور قوت عقل اس کے ادراک سے عاجز ہیں یہ صرف اہل تصوف ہیں جو اس قرب کو محسوس کرتے ہیں۔

ھ۔ طالب کو اس کی استطاعت سے آگے لے جانا

ہر طالب کی روحانی پرواز اپنی استطاعت کے مطابق ہوتی ہے، روحانی کمالات کا از خود حاصل کرنا کمال استعداد رکھنے والے سالکین کے لئے بھی ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، بایزید بسطامیؒ اور جنید بغدادیؒ جیسے اعلیٰ ظرف، بلند ہمت اور باکمال رفعتوں اور بے مثال ریاضتوں کی استطاعت رکھنے والے راہ روانِ طریقت کو بھی بیعت حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور ان تمام بلند مقام اولیاء کرام نے اخذ بیعت کو ضروری امر تصور کیا۔ یاد رہے کہ یہ بزرگوار بیعت حاصل کرنے سے پہلے بھی بہت بلند روحانی کمالات رکھتے تھے لیکن انہیں بھی بیعت کی ضرورت محسوس ہوئی ایسے بلند ہمت لوگوں کو جب مرشد کامل کی رہنمائی حاصل ہو

جاتی ہے تو ان کے پیران کامل ان طالبوں کی استعداد سے کہیں زیادہ مدارج روحانیت طے کروا دیتے ہیں ورنہ بہت سے بلند ہمت لوگ مناسب راہنمائی کے نہ ملنے کی وجہ سے اپنی استطاعت کو بروئے کار نہیں لا سکے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ (دفتر اول حصہ سوم مکتوب نمبر ۱۸۸ میں) لکھتے ہیں کہ جس کی استعداد مرتبہ روح یا قلب تک ہے (عروج اور نزول کی مناسبت سے) پھر صاحب تصرف پیر اس کو مرتبہ فوق تک پہنچا سکتا ہے۔

یہاں ایک ایسا دقیقہ ہے جو حضور سے تعلق رکھتا ہے جس کو بذریعہ تحریر بیان کرنا مشکل ہے، دوسرے یہ کہ جب ظاہر، باطن کے رنگ میں اور باطن ظاہر کے رنگ میں رنگا جائے تو پھر کیا مشکل ہے ظاہر کے احکام باطن میں اور باطن کے احکام ظاہر میں پیدا ہو جائیں۔ یہ موضوع بھی کافی دقیق اور طوالت طلب ہے اور اس میں زیادہ تفصیل یہاں مناسب نہیں۔ بس اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ ہر شخص کچھ نہ کچھ روحانی استطاعت ضرور رکھتا ہے (بشرطیکہ وہ خود کو اس کا خواہاں ثابت کرے) اور ہر شخص راہنمائی حاصل کرنے سے اپنی استطاعت سے زیادہ بلند مقام پر پہنچ سکتا ہے۔

د۔ قوتِ مشاہدہ پیدا کرنا

جب مرشد اپنے مرید کو آداب طریقت سے آگاہی عطا کرتا ہے تو فنا اور بقا کی استعداد اس میں پیدا ہو جاتی ہے، اس کا قلب منور اور متزکی ہو جاتا ہے چنانچہ فرائض کی کمال پابندی کے بعد مرشد اپنے مرید کو نوافل کی ادائیگی کا حکم دیتا ہے۔ مرشد اپنے کسی مرید کے لئے ذکر، تلاوتِ کلام پاک اور نوافل کی ادائیگی کی تعداد کا تعین مرید کے درجے کے مطابق کرتا ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ مرید مبتدی، متوسط اور منتہی میں سے کس درجے پر فائز ہے۔ (اس کا ذکر اس کتاب کے ایک باب میں کر دیا گیا ہے۔) جب مرید کی غفلت دور ہو جائے اور وہ نوافل کے ذریعے قرب الٰہی حاصل کر لے تو اس کو یہ شرف حاصل ہو جاتا ہے کہ اس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ اور اس کا کہنا اللہ کا کہنا بن جاتا ہے ایسے مریدین کو مقام مشاہدہ حاصل ہو جاتا ہے۔ (مشاہدہ کی تفصیل الگ عنوان سے دے دی گئی ہے۔) اس حالت میں مرید روحوں، فرشتوں اور بعض مغیبات کا ملاحظہ کرتا ہے کبھی وہ خانہ کعبہ کے انوار کا ملاحظہ کرتا ہے اور بعض اولیائے کرام فرشتوں کو دیکھتے اور ان کی آپس میں گفتگو کو بھی سن سکتے ہیں، ان کو درجہ احسان حاصل ہوتا ہے اور "اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ" کے مصداق حق تعالیٰ کے انوار کا مشاہدہ کرتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ میں خدا کی عبادت نہیں کرتا جب تک کہ میں اس کو دیکھ نہ لوں ان کا یہ دیکھنا بصیرتِ قلبی سے دیکھنا مراد ہے۔

ذ۔ طریقت میں مخصوص تربیت کا انداز

منقول ہے کہ جب حضرت جنید بغدادیؒ صغر سنی میں تھے تو ان کے ماموں حضرت سری سقطیؒ نے ان کو

ایک روز اپنے پاس بلا کر بٹھالیا اور انہیں کہا کہ آؤ تمہیں اللہ اللہ کرنا سکھائیں۔ انہوں نے حضرت جنیدؒ کو مراقبہ کرنے کا طریقہ تعلیم کیا اور کہا یوں مراقبہ کرو "اَللّٰهُ حَاضِرِیْ، اَللّٰهُ نَاظِرِیْ، اَللّٰهُ مَعِیْ" (یعنی اللہ حاضر ہے، اللہ ناظر ہے اور اللہ میرے ساتھ ہے) یہ کہہ کر حضرت سری سقطیؒ نے آنکھیں بند کر لیں اور حضرت جنیدؒ بھی مراقبہ میں مشغول ہو گئے۔ جب رات کا کافی حصہ گزر گیا تو حضرت سری سقطیؒ نے دیکھا کہ حضرت جنیدؒ بدستور مراقبے میں منہمک ہیں تو آپ نے فرمایا کہ جاؤ اب جا کے سو جاؤ۔ جب دوسرے دن صبح حضرت جنیدؒ کی والدہ انہیں رفع حاجت کے لئے لے گئیں تو حضرت جنیدؒ نے یہ کہہ کر رفع حاجت کرنے سے انکار کر دیا کہ اللہ دیکھ رہا ہے تو ان کو ان کی والدہ ان کے ماموں سری سقطیؒ کے پاس لے گئیں اور ان سے کہا "خود تو تم کسی کام کے رہے نہیں اور اب میرے بیٹے کو بھی خراب کر رہے ہو۔" انہوں نے حضرت جنیدؒ کو بلا کر توجہ دی تو ان کی حالت اعتدال پر آ گئی۔

اولیائے کرام کی تربیت کا اثر اسی طرح رونما ہوتا ہے جیسے صغر سنی کے عالم میں حضرت جنیدؒ کو اللہ تعالیٰ کی موجودگی کا احساس پیدا ہو گیا۔ یہ سب مشائخ کی تعلیم کے بغیر ممکن نہیں۔ روایات میں منقول ہے کہ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ نے ایک مرید کو بیعت کرنے کے سترہ دن بعد ہی خرقۂ خلافت عطا کر دیا جب کہ وہ لوگ جو کئی سالوں سے آپ کے مرید تھے تاہنوز شرف خلافت سے محروم تھے۔ جب ان پرانے مریدین نے اس قدر جلدی خلافت دینے پر تعجب کیا تو آپ نے فرمایا کہ اس مرید کی حالت اس سوکھی لکڑی کی طرح تھی جو بہت جلد آگ پکڑ لیتی ہے۔ اس بات کو ذہن نشین کرانے کے لئے ایک روز آپ نے سب مریدین کو ایک ایک کبوتر اور ایک ایک چھری دے کر کہا کہ ایسی جگہ جا کر اپنے اپنے کبوتر کو ذبح کرو جہاں کوئی نہ دیکھتا ہو چنانچہ سب مریدین کسی نہ کسی جگہ چھپ کر اپنے اپنے کبوتروں کو ذبح کر کے حاضر خدمت ہو گئے لیکن وہ خلافت یافتہ مرید اپنے کبوتر کو ذبح کئے بغیر ہی لے آیا اور کہا کہ حضور میں نے کئی جگہوں پر چھپ چھپ کر کبوتر کو ذبح کرنے کی کوشش کی لیکن ذبح اس لئے نہیں کر سکا کہ میں نے ہر جگہ اللہ تعالیٰ کو حاضر و موجود پایا ہے۔ اس کے جواب پر حضرت شہاب الدینؒ نے دوسرے مریدین کو واضح کیا کہ چونکہ اس مرید میں قوتِ مشاہدہ اور حق الیقین تم سب سے زیادہ ہے اس لئے یہ تم سب سے پہلے خلافت کا حقدار ٹھہرا۔

ک۔ شیطان کی چال بازیوں سے بچنا

ابلیس نے جنت میں حضرت آدم علیہ السلام جیسے پیغمبر کو شجرِ ممنوعہ کی طرف راغب کیا اور جنت سے دنیا میں منتقل کروایا۔ بڑے بڑے ولیوں کو دھوکا دیا۔ بلعم بن باعورا اور برصیصا جیسے لوگوں کو گمراہ کیا، کئی لوگوں سے نبوت کے دعوے کروائے، بہت سے لوگوں کو شریعت سے منحرف کر کے ولایت کے دعوے کروائے۔ کسی کو

گمراہ کرنا اس کے لئے بڑی بات نہیں تاوقتیکہ اللہ تعالیٰ کسی کو بچا نہ لے اور یہ دیکھا گیا ہے کہ جن کا کوئی پیر نہ ہو ان کو شیطان بڑی آسانی سے گمراہ کر لیتا ہے۔ لہٰذا اس سے بچنے کا طریقہ یہی ہے کہ کسی کامل پیر کے سایۂ عاطفت میں آجائے۔

حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے فرمایا ہے کہ سلوک طے کرنا کوئی معمولی کام نہیں۔ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے اور بغیر شیخ کے ممکن نہیں۔ مرید خواہ کتنا ہی عابد ہو شیطان کے پھندوں سے بچ نہیں سکتا۔ وہ کہیں نہ کہیں اور کبھی نہ کبھی اس کو گمراہ ضرور کر دے گا بلکہ جو لوگ زیادہ عابد اور متقی ہوتے ہیں انہیں تو یہ اور بھی زیادہ گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اولیائے کرام اگر چاہیں تو اپنے مریدوں کو طویل فاصلوں کی مسافت پر ہوتے ہوئے بھی بہت سی آفات سے بچا لیتے ہیں۔ روایات میں ہے کہ ایک مرید کی جان کنی کے وقت ابلیس اس کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ یہ پانی کا پیالہ میں تمہیں اس حالت میں دوں گا اگر تم یہ اقرار کر لو کہ خدا کی کوئی ہستی موجود نہیں۔ مرید نے خدا کی موجودگی کے بے شمار دلائل پیش کئے مگر اس نے ہر دلیل کا رد پیش کر دیا اور مرید بالکل بے بس ہو گیا۔ اس کے مرشد نے سینکڑوں میلوں کے فاصلے سے اسے پکارا ''اسے اس کو کہہ دے کہ میں خدا کو بغیر دلیل کے مانتا ہوں'' اس جواب پر ابلیس پانی کا پیالہ پھینک کر بھاگ نکلا۔ میاں محمدؒ کے ایک پنجابی کے شعر کا یہ مطلب ہے کہ پیر اپنے مریدوں کے پیچھے رہتے ہیں خواہ مرید اچھے ہوں یا برے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سینکڑوں میلوں سے دشمنوں کے متعلق ''یَا سَارِیَۃُ الْجَبَلَ'' کہہ کر آگاہ کرنا اسی قبیل سے ہے اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا یوسف علیہ السلام کو سینکڑوں میل سے اشارہ کرنا (جس کا ذکر قرآن میں یوں کیا گیا ہے وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ (اور بے شک عورت نے اس کا ارادہ کیا اور وہ بھی عورت کا ارادہ کرتا اگر اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتا۔ یوسف: ۲۴) مفسرین نے لکھا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے والد ماجد کو دیکھا کہ انگشت مبارک دندان اقدس کے نیچے دبا کر اجتناب کا اشارہ فرماتے ہیں۔ یہ واقعہ بھی اس بات کی ایک مثال ہے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا ایک بہت مشہور قول ہے کہ آپؒ نے ایک بار فرمایا کہ ''قَدَمِیْ هٰذِهٖ عَلٰی رَقَبَۃِ کُلِّ وَلِیِّ اللّٰہِ'' (میرا یہ قدم تمام اولیاء کی گردنوں پر ہے۔) تو سب ولیوں نے آپ کی بات سنتے ہی سر تسلیم خم کر لیا مگر ایک شخص نے کہا کہ میں اپنی گردن پر آپ کا قدم تسلیم نہیں کرتا۔ اس پر حضرت نے فرمایا ''جاؤ تمہاری گردن پر خنزیر کا قدم ہو گا'' چنانچہ وہ شخص ولایت سے معزول ہو گیا اور ایک یہودی عورت پر عاشق ہو گیا۔ عورت کو حاصل کرنے کی خاطر وہ اس کے گھر والوں کے خنزیروں کے ریوڑ کو کئی سال تک جنگلوں میں چرانے کے لئے جاتا رہا اور اگر کوئی خنزیر کا بچہ پیدا ہوتا تو وہ اسے کندھوں پر اٹھا کر گھر لے آتا۔ اس طرح

خنزیروں کے قدم اس کی گردن پر آ گئے اور جس دن وہ رسم شادی پر یہودی مذہب اختیار کرنے کو تیار ہوا تو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا کہ پہلے تو ولایت سے گیا تھا آج وہ بدبخت دین اسلام سے بھی جا رہا ہے۔ لوگوں نے التماس کی کہ حضور نظر کرم فرمائیں۔ اس پر آپ نے وضو کے دوران ہی پانی کا ایک چلو اس کی سمت پھینکا تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ فوراً وہاں سے اٹھ کر بھاگا اور آپؒ کے پاس آ کر تائب ہوا۔

مولاناؒ فرماتے ہیں۔

دستِ پیر از غائباں کوتاہ نیست دستِ او جز قبضۂ اللہ نیست(۳۱۲۔۱)

(پیر کا ہاتھ دور والوں کے لئے چھوٹا نہیں، اس کا ہاتھ اللہ کے قبضہ قدرت رکھنے کے بغیر نہیں۔)

گر نہ باشد سایۂ پیر اے فضول بس ترا سرگشتہ دارد بانگِ غول(۳۰۹۔۱)

(اے فضول شخص اگر تجھ پر پیر کا سایہ نہ ہو، تجھے شیطانوں کا لشکر پاگل بنا دے گا۔)

اندر آ در سایۂ آں عاقلے کش نتاند برد رہ از ناقلے (x)

(اس عاقل کے سایہ عاطفت میں آ جاؤ، کوئی اپنے ناصح سے منہ نہیں موڑ سکتا۔)

ظل او اندر زمیں چوں کوہ قاف روحِ او سیمرغ، بس عالی طواف(۳۱۱۔۱)

(اس کا سایہ زمین پر ایسا ہے جیسے کوہ قاف، اس کی روح عظیم پرندے کی طرح بلند پرواز ہے۔)

از پسِ صد سال آنچہ آید برو پیر می بیند معین مو بمو(۲۰۳۔۲)

(جو چیز سینکڑوں سال بعد ہونے والی ہے، اس کو پیر ایسے صاف دیکھتا ہے جیسے اس کے سامنے ہے۔)

ہر کہ او بے مرشدے در راہ شد او زغولاں گمرہ و در چاہ شد(۳۰۸۔۱)

(جو بغیر کسی مرشد کے راہ پر چلا، وہ شیطانوں کی وجہ سے گمراہ ہو کر کنوئیں میں آ گرا۔)

چوں گرفتی پیر ہیں تسلیم شو ہمچو موسیٰؑ زیرِ حکمِ خضرؑ رو(۳۱۱۔۱)

(جب تو پیر کو پکڑ لے تو اس کو ہر طرح تسلیم کر لے، جس طرح موسیٰؑ خضرؑ کے حکم کے پابند ہو گئے۔)

عیبہا از ردِ پیراں عیب شد غیبہا از رشکِ پیراں غیب شد(۳۱۵۔۲)

(بہت سے عیب پیروں کے رد کی وجہ سے عیب بن گئے، بہت سے مخفی راز پیروں کی غیرت کی وجہ سے مخفی ہیں)

ل۔ پیر کی اطاعت میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کا ہونا

حضرت شمس الدین سالویؒ کا قول آداب المریدین میں لکھا ہے کہ جس نے اپنے پیر کی اطاعت کی تو گویا اس نے اللہ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ مرید کو چاہیے کہ وہ خود کو پیر میں محو کر دے تاکہ وہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مظہر کو دیکھ سکے۔ منقول ہے کہ حضرت معین الدین چشتیؒ نے دیکھا

کہ ایک مرید کو قبر کا عذاب ہو رہا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ حضرت عثمان ہارونی ؒ کی روح وہاں حاضر ہوئی اور فرشتوں سے کہا کہ یہ ہمارا مرید ہے، اس کو کچھ نہ کہو۔ فرشتوں نے کہا کہ یہ شخص خراب ہے اور اس نے برے کاموں کا ارتکاب کیا ہے۔ آپ نے فرمایا ٹھیک ہے مگر اس نے اپنا ہاتھ فقیر کے دامن میں ڈالا ہے۔ اس کے بعد اس کا عذاب ختم کر دیا گیا۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ اگر خدا کو کائنات کی کتاب کا متن کہا جائے تو حضور اکرم ﷺ اس کتاب کا دیباچہ ہیں۔

گر تو ذات پیر را کردی قبول ہم خدا در ذاتش آمد ہم رسولؐ (x)

(اگر تو نے پیر کی ذات کو قبول کر لیا، تو اس قبول کرنے میں خدا اور حضور ﷺ کی ذات بھی آجاتی ہے۔)

گر جدا بینی زحق تو خواجہ را گم کنی ہم متن و ہم دیباچہ را (x)

(اگر تو نے پیر کو ذات حق سے الگ جانا، تو گویا کتابِ خدا کے متن اور دیباچہ (یعنی رسول) کا انکار کیا۔)

چونکہ فنا فی الشیخ کے بعد فنا فی الرسول اور فنا فی اللہ کا رتبہ پیر کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے، اس لئے مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ پیر کا دیکھنا خدا کا دیکھنا ہے۔

پیرِ کامل صورتِ ظلِّ الٰہ یعنی دید پیر دیدِ کبریا (x)

(پیر کامل خدا کی صورت کا سایہ ہے، یعنی پیر کا دیکھنا خدا ہی کا دیکھنا ہے۔)

ہر کہ پیر و ذات را یک نہ دید نے مرید و نے مرید و نے مرید (x)

(جس نے پیر اور ذاتِ حق کو یک جا نہ دیکھا، وہ مرید نہیں مرید نہیں ہرگز مرید نہیں۔)

اولیائے کرام کا قول ہے کہ جس کائنات میں حضور اکرم ﷺ دیباچہ کی حیثیت رکھتے ہیں قرآن نے أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ۚ (النساء: ۵۹) (حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور ان کا جو تم میں حکومت والے ہیں) میں اللہ و رسول ﷺ اور حکام وقت کو ایک ساتھ اطاعت کے لئے شامل کیا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ (النساء: ۸۰) (جس نے رسول ﷺ کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی) اس سے بھی بڑھ کر فرمایا گیا ہے قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ (آل عمران: ۳۱) (آپ ﷺ فرما دیجئے کہ اگر تم (واقعی) اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، تب اللہ تم سے محبت فرمانے لگے گا۔ اور اولیائے کرام چونکہ حضور اکرم ﷺ کے جانشین ہیں اس لئے ان کی اطاعت بھی حضور اکرم ﷺ کی ہی اطاعت ہے۔ اس لئے مولانا رومؒ نے فرمایا کہ مرشد کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے کیونکہ وہ اس وقت تک مرشد کہلانے کا حق دار نہیں جب تک وہ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت نہیں کرتا اور ان کی اطاعت کا حکم نہیں دیتا۔ جو لوگ مرشد (اور معاً نبی پاک ﷺ) کی اطاعت کرتے ہیں ایسے لوگوں کو آل عمران کی درج بالا آیت میں محبوبانِ الٰہی ہونے کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اس

اطاعت کے آداب طریقت میں ہی ٹھیک ٹھیک سمجھائے جاتے ہیں، لہٰذا اہلِ طریقت کے علاوہ دوسرے لوگوں کو یہ درجہ خال خال ہی دیا جاتا ہے۔

متفرق کمالاتِ طریقت

یوں تو طریقت کے بہت سے کمالات ایسے ہیں جو صرف اہلِ طریقت کے ساتھ ہی مربوط ہیں لیکن ان سب کا بیان یہاں ممکن نہیں۔ ان میں سے بہت سے کمالات کا ذکر ''تصوف اور طریقت پر مشائخ کے اقوال'' کے عنوانات سے بیان کر دیا گیا ہے۔ اس جگہ چند مزید نکات اشارۃً بیان کئے جا رہے ہیں کیونکہ اس کی تفصیل کا بیان کرنا ایک طوالت طلب مسئلہ ہے۔

۱۔ تصوف کی راہ ہر کسی کے لئے کھلی ہے

تصوف کے بلند مقامات کی راہ ہر اس شخص کے لئے کھلی ہے جو اس کی طرف رغبت رکھنے اور ان مقامات تک پہنچنے کی طلبِ صادق رکھتا ہو، اگر کوئی معمولی استطاعت والا شخص اس راہ پر چلنے کا ارادہ کر لے تو مرشد کامل کی راہنمائی سے چند دنوں میں روحانیت میں اپنا مقام پیدا کر سکتا ہے۔ کسی کو صاحبِ کمال بننا فقط اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اس طرف کتنی رغبت ظاہر کرتا ہے۔

ع = با کریماں کارہا دشوار نیست

۲۔ تصوفِ اولیاء

تصوف میں نہ صرف مقاماتِ ولایت طے ہوتے ہیں بلکہ سالک کو بہت کم عرصے میں اس قدر استطاعت مل سکتی ہے کہ اس کا شمار صاحبِ تصرف اولیاء میں ہو سکتا ہے۔ تصرفِ اولیاء کا بیان انشاءاللہ دوسرے مقام پر کیا جائے گا۔ جس کو ولایت مل جائے اسے تصرف بھی دیا جاتا ہے اور ولایت کے ایک معنی تصرف کے بھی ہیں جیسا کہ فرمایا هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ (الکہف: ۴۴) (یہاں سے ثابت ہو گیا کہ سارا اختیار اللہ سچے کے لئے ہے)

۳۔ عالمِ بالا سے تعلق

روحانی اور نورانی قلب میں ایک ایسی آنکھ ہوتی ہے جس کو قلب کی آنکھ کہا جاتا ہے۔ کچھ مخصوص مجاہدات اور اذکار سے یہ آنکھ کھل جاتی ہے اور جب یہ آنکھ کھل جائے تو سالک کا تعلق عالمِ بالا سے ہو جاتا ہے۔ (اس کی تفصیل ذکر کے بیان میں کر دی گئی ہے۔) اس کے بعد ... روحوں کی آوازوں، فرشتوں کی آوازوں اور دیگر مغیبات کو سنتا ہے اور ان کی صورتوں کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔ اس کے علاوہ سالک کا آسرِل

ورلڈ (عالم بالا میں ایک روحانی دنیا) سے تعلق ہو جاتا ہے اور بہت سی روحانی چیزوں کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔ یہ مشاہدہ اور روحوں سے گفتگو عام آدمی کے بس کی بات نہیں، اس کا صرف ان لوگوں کو ہی شرف حاصل ہوتا ہے جو طریقت کی راہ کے مسافر ہوتے ہیں۔ (اس کتاب کے حصہ دوم میں عبادت کے باب میں آسٹرل ورلڈ کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کا ذکر ملاحظہ فرمائیں۔)

دل بینا بھی کر خدا سے طلب آنکھ کا نور، دِل کا نور نہیں (ب۔ج:۳۳۵)
خدا سے پھر وہی قلب ونظر مانگ نہیں ممکن امیری بے فقیری
(ب۔ج:۳۷۵)

۴۔ذاتِ باری تعالیٰ اور ارواح سے ہم کلامی

ایسے لوگ جو مشقتوں اور ریاضتوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، ان میں مکاشفۃ القبور، روحوں سے گفتگو اور اللہ تعالیٰ سے بھی گفتگو کرنے کی استطاعت پیدا ہو جاتی ہے۔ جنید بغدادیؒ، ابوالحسن خرقانیؒ، ابراہیم بن ادھمؒ اور سینکڑوں دوسرے بزرگوں کی اللہ تعالیٰ سے گفتگو کے متعلق بہت سی کتابوں میں ذکر ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنے اس نوعیت کے سوال وجواب کو باقاعدہ نقل کیا ہے، اس قسم کی ہم کلامی محض روحانی استعداد رکھنے والے سالکین کا خاصہ ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر کرتے ہیں خطاب آخر، اٹھتے ہیں حجاب آخر
احوالِ محبت میں کچھ فرق نہیں ایسا سوز وتب وتاب اول، سوز وتب وتاب آخر
(ب۔ج:۳۴۴)

۵۔نظامِ کائنات میں اربابِ حل وعقد

عام اولیائے کرام کے علاوہ کچھ ایسے اولیاء بھی ہوتے ہیں جو اربابِ حل وعقد بھی ہیں، جن کا ذکر حضرت مخدوم علی الہجویریؒ نے سرہنگان درگاہِ حق تعالیٰ کے نام سے ''کشف المحجوب'' میں کیا ہے۔ ان میں ۳۰۰ اخیار، ۴۰ ابدال، ۷ ابرار، ۴ اوتاد، تین نقیب اور ایک قطب یا غوث ہر وقت موجود رہتے ہیں اور امورِ دنیا کا چلانا ان کے سپرد کیا گیا ہے۔ چناؤ ان لوگوں میں سے ہوتا ہے جو طریقت کی راہ سے گزر چکے ہوں۔ اس کی تفصیل کے لئے ''کشف المحجوب'' یا دیگر روحانی کتب کا مطالعہ فرمائیں۔

باب ۱۶

طریقت مشائخِ کبار کی نظر میں

(مشائخِ کبار کی خوبصورت استدلالی تحریریں)

مشائخِ عظام کے مقامات کی شان اور علوِ مرتبت کے متعلق پہلے کچھ بیان گزر چکا ہے۔ اس جگہ طریقت کے متعلق چند معروف اور ممتاز مشائخِ کرام کے تاثرات، محسوس کردہ کیفیات اور ذاتی تجربات کے متعلق ان کی تحریروں کے اقتباسات پیش کیے جارہے ہیں۔ ان بزرگ ہستیوں کی شان اس قدر بلند ہے کہ کوئی ذی عقل انسان ان کی تحریروں کے خلاف آج تک خامہ فرسائی کی جرأت نہیں کر سکا، چنانچہ یہ بات نہایت اطمینان کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہ تحریریں ان بزرگوں کی بلند علمیت، تقویٰ اور روحانی کمال کے باعث مستند ہونے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جن مشائخ کی تحریروں کو پیش کیا جارہا ہے یہ لوگ صوفیاء، اولیاء اور عابدین وزاہدین ہونے کے علاوہ جید علماء وفقہاء بھی تھے اور علمِ فقہ، اجتہاد اور دیگر علوم شرعیہ میں ان کا کوئی ہمسر نہیں تھا۔ زیرِ نظر تحریروں میں حضرت مجدد الف ثانیؒ اور مولانا رومؒ کے فرمودات کو زیادہ تفصیل سے پیش کیا گیا ہے کیونکہ ان کی بلندیٔ مرتبت کے سبب کوئی شخص انگشت نمائی کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اگر کسی کو زیادہ تفصیلات مطلوب ہوں تو وہ ''کشف المحجوب''، ''غنیۃ الطالبین''، ''کتاب اللمع''، ''المنقذ من الضلال''، ''عوارف المعارف''، ''بحر العلوم''، ''مفتاح العلوم''، ''مکتوباتِ ربانی''، ''مبداء ومعاد'' اور دیگر متعلقہ کتب کا مطالعہ کرے۔

آیئے اب ان تحریروں کا حضرت مجدد الف ثانیؒ کے فرمودات سے آغاز کریں۔ اہلِ دل ان تحریروں کے مطالعہ سے یقیناً لطف اندوز ہوں گے اور وجدانی کیفیت حاصل کرتے ہوئے سرمستی و بےخودی اور رقت کے احساسات سے ہم کنار ہوں گے۔

۱۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تحریریں

آپ کی بےنظیر تحریروں میں سے کچھ حصے نیچے دیئے جارہے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

i۔ واصل باللہ ہونے کے دو ہی طریقے ہیں

حضرت مجدد الف ثانیؒ مکتوب نمبر ۱۲۳ (دفتر سوئم صفحہ ۱۲۲۵) میں رقمطراز ہیں، وہ راستے جو اللہ تعالیٰ

تک پہنچانے والے ہیں دو ہیں، ایک وہ راہ ہے جو قرب نبوت سے تعلق رکھتی ہے اور اللہ تک پہنچانے والی راہ ہے۔ اس راہ سے انبیاء علیہم السلام واصل ہوتے ہیں اور ان کے چند صحابہ کرامؓ ان کے طفیل واصل باللہ ہوتے ہیں ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ سے براہِ راست وصل حاصل کرتے ہیں۔ اس راہ میں توسط اور حیلولت نہیں ہے جو بھی ان واصلین میں سے فیض حاصل کرتا ہے وہ بغیر کسی وسیلہ کے اصل سے حاصل کرتا ہے اور کوئی بھی دوسرا اس راہ میں حائل نہیں ہوتا۔

دوسری وہ راہ ہے جو قرب ولایت سے تعلق رکھتی ہے۔ اقطاب و اوتاد، ابدال و نجباء اور عام اولیاء اللہ اسی راہ سے واصل ہیں۔ راہِ سلوک اسی راہ سے متعلق ہے بلکہ متعارف جذبہ بھی اسی میں داخل ہے۔ اس راہ میں توسط اور حیلولت ثابت ہے۔ اس راہ کے واصلین کے پیشوا اور ان کے سردار اور بزرگوں کے منبع فیض حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ ہیں اور یہ عظیم الشان منصب ان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس راہ میں گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دونوں قدم مبارک حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سر پر ہیں اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس مقام میں ان کے ساتھ شریک ہیں۔ فرماتے ہیں کہ حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جسدی پیدائش سے پہلے بھی اس مقام کے ملجا و ماویٰ تھے، جیسا کہ آپ جسدی پیدائش کے بعد ہیں۔ جن کو بھی ہدایت اس راہ سے پہنچی ان کے ذریعے سے ہی پہنچی ہے کیونکہ وہ اس راہ کے آخری نقطہ کے نزدیک ہیں۔ جب حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دور ختم ہوا، تو یہ عظیم القدر مقام و مرتبہ ترتیب وار حضراتِ حسنین کریمینؓ کے سپرد ہوا اور اس کے بعد وہی منصب بارہ اماموں کو ترتیب وار اور تفصیل سے مقرر رہا۔ ان بزرگواروں کے زمانہ میں اور ان کے انتقال کے بعد جس کو بھی فیض اور ہدایت پہنچی ہے ان بزرگوں کے ذریعے اور حیلولت سے پہنچی ہے، اگرچہ اقطاب و نجبائے وقت ہی کیوں نہ ہوں، سب کے ملجا و ماویٰ یہی بزرگ ہیں کیونکہ اطراف کو اپنے مرکز کے بغیر چارہ نہیں۔ یہاں تک کہ نوبت حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ تک پہنچی تو منصب مذکور آپ کے سپرد ہوا۔ ائمہ مذکور اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے درمیان کوئی بھی اس مرکز پر فائز نہیں ہوا (کسی اور کو یہ منصب نہیں ملا یعنی کوئی اور اس راہ میں نہیں ہوا۔) اس راہ کا فیض جس کو بھی ملتا ہے آپ کے واسطے سے ہی ملتا ہے ان کا یہ مرکز ان کے علاوہ اور کسی کو میسر نہیں ہوا۔ اسی لئے آپؒ نے فرمایا۔

اَفَلَتْ شُمُوْسُ الْاَوَّلِیْنَ وَ شَمْسُنَا　اَبَدًا عَلٰی اُفُقِ الْعُلٰی لَا تَغْرُبُ

(پہلوں کے سورج غروب ہوگئے اور ہمارا سورج ہمیشہ بلندی پر رہے گا کبھی غروب نہ ہوگا)

حضرت مجدد الف ثانیؒ اس مقام پر شیخ کے نائب ہیں اور شیخ کی نیابت اس طرح کرتے ہیں جس طرح "نُوْرُ الْقَمَرِ مُسْتَفَادٌ مِنْ نُوْرِ الشَّمْسِ" (چاند کا نور سورج کے نور سے فائدہ حاصل کرتا ہے۔)

حضرات شیخین (حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما)، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مہدی علیہ السلام پہلے راستہ سے واصل ہیں، جس میں وسیلہ نہیں ہے۔ کچھ لوگ دونوں راستوں سے منسلک ہوتے ہیں۔
درج بالا بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی ولی اللہ ایسا نہیں گزرا جو ان دونوں راستوں میں سے کسی ایک سے واصل باللہ نہ ہوا ہو، لہٰذا راہِ طریقت دونوں کے لئے لازم ہے۔

ii۔ مرید کا کام کامل پیر کے بغیر دشوار ہے

حضرت مجدد الف ثانیؒ مکتوب ۲۹۲ دفتر اوّل حصہ چہارم میں فرماتے ہیں کہ راہِ فقر دو حال سے خالی نہیں یا تو مرید ہے یا مراد۔ مراد کی راہنمائی اللہ تعالیٰ انجذاب اور محبت کے راستے میں کشاں کشاں کرتے ہیں اور ہر ادب بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کو سکھا دیتے ہیں اور اعلیٰ مقام عطا کرتے ہیں۔ اگر مرید ہوں گے تو ان کی تکمیل کا کام کامل پیر کے بغیر دشوار ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایسا پیر چاہئے جو فنا، بقا اور دیگر سیروں کو طے کر چکا ہو۔ اگر ایسا پیر مل جائے تو مکمل طور پر خود کو اس کے حوالے کر دیں اور اپنی نیک بختی اسی کی رضامندی میں اور اپنی بد بختی ان کی ناراضگی میں خیال کریں۔

iii۔ آپ کے تربیتی فرمودات

حضرت مجدد الف ثانیؒ مکتوبات دفتر اوّل حصہ پنجم صفحہ ۱۷۷ میں لکھتے ہیں کہ سالک کے ذہن میں یہ بات موجود رہنی چاہئے کہ منازل اور مدارج عروج کا طے کرنا کامل، مکمل، شیخ راہ دان، راہ بین اور راہنما و مقتدا کی توجہ اور تصرف سے وابستہ ہے جس کی نظر امراض قلبی سے شفا بخشتی ہے اور توجہ اخلاق رذیلہ و ناپسندیدہ کو دفع کرتی ہے، لہٰذا سالک کو چاہیے کہ پہلے شیخ کامل تلاش کرے۔ اگر محض فضلِ ایزدی سے اسے شیخِ کامل دستیاب ہو جائے تو ایسے شیخ کی معرفت و پہچان کو نعمتِ عظمیٰ تصور کرتے ہوئے خود کو اس کے آستانے کا خادم بنا دے اور مکمل طور پر خود کو اس کے تصرفات کا مطیع کر دے۔ شیخ عبد السلام ہرویؒ فرماتے ہیں کہ جب تک کوئی اللہ کے دوستوں کی شناخت نہیں کرتا خدا کو بھی نہیں پا سکتا اور جب تک خدا کو نہ پائے ان بزرگوں کی شناخت بھی نہیں کر سکتا۔

فرماتے ہیں کہ اپنے اختیار کو کلیتہً شیخ کے اختیار میں گم کر دے اور اپنے آپ کو تمام مرادوں سے خالی کر کے اپنی کمرِ ہمت اس کی خدمت کے لئے باندھ لے اور جس کام کے متعلق شیخ اسے حکم دے وہ کام اپنے لئے سعادت جانتے ہوئے اس کی بجا آوری میں پوری کوشش کرے۔ شیخ مقتدا اگر ذکر کو اس کی استعداد کے مناسب پائے گا تو اسے ذکر کی تلقین کرے گا اور اگر توجہ اور مراقبہ مناسب ہوگا، تو اشارہ کرے گا اور اگر صرف صحبت ہی کافی جانے گا تو صرف صحبت کا حکم دے گا۔ مختصر یہ کہ صحبتِ شیخ کی موجودگی میں راہ سلوک کی شرائط

میں سے کسی شرط کے تحت ذکر کی حاجت نہیں (شیخ کی موجودگی میں ذکر کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔) اگر راہِ سلوک کی شرط میں سے کسی امر میں اس کی کوتاہی ہوگئی تو شیخ کی صحبت اس کی تلافی کرے گی اور اس کی توجہ اس کے نقصان کو پورا کردے گی۔

آپ فرماتے ہیں کہ سالک مرادوں میں سے ہو تو شیخ اُسے اپنی طرف کھینچ لے گا اور بجائے صحبت کے محض عنایتِ بے غایت اس کا کام پورا کردے گا اور شرائط یا آداب مطلوبہ اسے بتادے گا اور منازل سلوک طے کرنے میں بعض اکابر کی روحانیت کو اس کی راہ کے وسائل و ذرائع بنادے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عادت کے مطابق راہِ سلوک طے کرنے میں مشائخ کی روحانیت کا واسطہ درکار ہوتا ہے۔

اگر سالک مریدوں میں سے ہے (مرادوں میں سے نہیں) تو شیخِ مقتدا کے وسیلہ کے بغیر اس کا چلنا خطرے سے خالی نہیں جب تک اُسے شیخ کامل نہ ملے اللہ تعالیٰ سے التجا وزاری کرتا رہے کہ اسے شیخِ مقتدا سے ملادے۔ شرائطِ طریقت کتابوں میں بالتفصیل مذکور ہیں وہاں سے ملاحظہ کرکے ان کی رعایت کرے۔

فرماتے ہیں "راہ طریقت میں بڑی شرط نفس کی مخالفت ہے اور یہ مخالفت تقویٰ اختیار کرنے اور حرام کاموں سے بچنے سے حاصل ہوتی ہے۔ حرام کاموں سے بچنے اور فواحش کو ترک کرنے کی کوئی صورت نہیں جب تک سالک فضول مباحات سے اجتناب نہ کرے، کیونکہ مباحات کے اِرتکاب میں نفس کی لگام ڈھیلی رکھنا مُشتبہ امور تک پہنچا دیتا ہے اور مشتبہ حرام کے نزدیک ہوتا ہے اور اس طرح حرام میں مبتلا ہو جانے کا قوی احتمال رہتا ہے، اس لیے نفس کی اصلاح شیخِ مقتدا کی راہنمائی کے بغیر محال ہے"۔

ہیچ نکشد نفس را جز ظلِّ پیر   دامنِ آں نفس کُش را سخت گیر (۲۴۲-۲)

(نفس پیر کے سائے کے بغیر نہیں مارا جاتا، اس نفس کو ختم کرنے والے پیر کا دامن مضبوطی سے پکڑلو۔)

مکتوبات کے دفتر سوم حصہ ہشتم کے صفحہ ۱۴۱۸ پر حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ بزرگوں کو قبول کرنا ازلی سعادت ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ انبیائے کرامؑ کو اللہ نے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ وہ دعوت الی اللہ اس لئے دیتے ہیں کہ دشمنِ انسان (شیطان) کو تباہ کریں اور انسان کو جہالت اور خباثت سے باہر نکالیں۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص ازلی سعادت رکھتا ہے اس نے ان بزرگواروں کی سعادت کو قبول کیا اور اپنی جہالت اور خباثت سے باز آگیا اور احکامِ منزلہ کے تابع ہوا۔

حضرت مجددؒ تزکیۂ نفس کے دو طریقے بیان فرماتے ہیں ایک طریقہ ریاضت اور مجاہدات کا ہے جو مریدوں کے لئے خاص ہے اور اس میں مطلوب (اللہ) کی طرف چل کر جانا ہے اور دوسرا طریقہ جذب اور محبت کا ہے (یعنی اس میں مرشد کی کشش کھینچ لیتی ہے۔) یہ مرادوں کے لئے ہے اور یہ مقصود تک لے جانا ہے "جانے" اور "لے جانے" میں بڑا فرق ہے۔

حضرت مجدد علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے کہ اللہ کا دیدار بہت بڑی نعمت ہے۔ اللہ تو ایک طرف، اگر جنت کی حور کا ایک بال بھی دنیا میں گر جائے تو اس بال کی روشنی اور چمک سے دنیا میں رات نہ پڑے اور اندھیرا نہ ہو (اس بات کی تصدیق حضرت عائشہؓ سے مروی حدیث سے ہوتی ہے کہ جب اندھیرے میں ان کی سوئی گر گئی تو حضور اکرم ﷺ کے دندانِ مبارک سے نکلنے والی روشنی سے انہوں نے سوئی کو تلاش کر لیا) فرماتے ہیں کہ اولیاء اللہ نورِ خدا کا مشاہدہ دِل کی آنکھوں سے کرتے ہیں۔ اس دنیا میں اللہ کا جمال سر کی آنکھوں سے دیکھنا ناممکن ہے۔ (صفحہ ۱۴۳۵)

دفتر دوم کے مکتوب ۵۲ میں حضرت مجدد علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ (اولیاء اللہ) اللہ کے ہم نشین ہیں جس نے ان کو پہچان لیا خدا کو پالیا۔ ان کی نظر دوا اور ان کا کلام شفاء ہے اور ان کی صحبت ضیاء اور رونق بخشتی ہے۔ جس نے ان کے ظاہر کو دیکھا وہ خائب اور خاسر ہو گیا۔ جس نے ان کے باطن کو دیکھا وہ نجات اور فلاح پا گیا۔ مولانا عبدالسلام ہرویؒ فرمایا کرتے تھے کہ اے اللہ تو نے اپنے دوستوں کو کیا کر دیا ہے کہ جس نے انہیں پہچانا اس نے تجھے پہچانا اور جو تجھے نہ پہچان سکا ان کو بھی نہ پہچان سکا یعنی ان کی شناخت اور تیری شناخت ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتی۔ آپ کے ان بیانات کے بعد کوئی ازلی بدبخت ہی ان اولیاء کا انکار کرے گا۔

iv۔ عرصہ اڑھائی ماہ میں نسبت کی تکمیل ہوگئی

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے مکتوبات کے دفتر اول حصہ چہارم مکتوب نمبر ۲۶۶ میں تفصیل کے ساتھ اپنے روحانی مدارج کو کم عرصہ میں طے کرنے کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان بزرگوں کی توجہ شریف نے اس ناقابل کو دو اڑھائی ماہ کے عرصہ میں نسبت نقشبندیہ تک پہنچا دیا اور ان بزرگواروں کا حضور خاص عطا فرمایا۔ جو کچھ انوار و تجلیات ظہورات اور رنگ و بے رنگیاں وغیرہ اس عرصہ میں حاصل ہوئیں بیان سے باہر ہیں۔ ان بزرگوں کی توجہ کی برکت سے معارف توحید، اتحاد، قرب و معیت، احاطہ اور سیر میں شاید ہی کوئی دقیقہ رہ گیا ہو گا جو اس فقیر پر نہ کھلا ہو اور اس کی حقیقت سے اطلاع نہ پائی ہو۔ وحدت کا کثرت میں اور کثرت کا وحدت میں مشاہدہ کرنا ان معارف کے مقامات اور مبادی میں سے ہے۔

v۔ صحبتِ فقراء کے فیوض و برکات

حضرت مجدد الف ثانیؒ مکتوبات میں (مکتوب نمبر ۲۰۳ دفتر اول حصہ سوئم صفحہ ۱۳۲) ملا حسینی کو لکھتے ہیں کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے "أَنَا جَلِيسُ عِندَ مَنْ ذَكَرَنِي" (یعنی میں اس کا ہم نشین ہوں جس نے میرا ذکر کیا۔) اور حق تعالیٰ کا ارشاد یہ بھی ہے "لَا يَشْقَى بِهِمْ جَلِيسُهُمْ" (ان کا ہم نشین بدبخت نہیں ہوتا۔) آپ نے ایک حدیث نقل کی ہے "اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ" (انسان کا حشر اس کے ساتھ ہوتا ہے، جس سے وہ محبت

کرتا ہے۔) چنانچہ جو کوئی ان کے ساتھ ہو یعنی جو لوگ اولیاء کرام سے محبت کرتے ہیں وہ لازمی طور پر قیامت کے دن اولیاء کے ساتھ ہوں گے۔ فرماتے ہیں کہ اہلِ اللہ کی محبت نہایت ضروری ہے۔ حق تعالیٰ ہمیں ان کی محبت نصیب فرمائے۔ اسی خط میں مزید لکھتے ہیں مکتوب شریف مُلا حسینیؒ کا جو فقراء کی محبت پر مبنی تھا پہنچا اور بڑی خوشی حاصل ہوئی۔ حق تعالیٰ اس بلند گروہ کی محبت کو دن بدن زیادہ کرے اور ان کی نسبت نیاز مندی کو ہمارے لیے سرمایۂ روزگار بنائے اور "اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ اِلَیْہِ عَزَّ سُلْطَانُہٗ" کے بموجب ان کا ہمیشہ ساتھ عطا فرمائے۔

فرماتے ہیں کیونکہ افادے اور استفادے کا راستہ طرفین (اللہ اور بندے) کی مناسبت پر مبنی ہے اس لئے ابتداء میں طالب کو اس کی کمال پستی اور کمینگی کے باعث جناب اقدس عزّ سلطانہ کے ساتھ مناسبت نہیں ہوتی لہٰذا اس وقت (مرید کو) دو جہتوں والا واسطہ اور برزخ درکار ہوتی ہے اور وہ شیخ کامل کی ذات ہے (اس سے ظاہر ہوا کہ شیخ بندے اور اللہ کے درمیان برزخ کا کام کرتا ہے۔) حضرت یعقوب چرخیؒ فرماتے ہیں کہ پیروں کے بغیر فرشتہ سیرت انسانوں کا اعمال نامہ بھی سیاہ ہوتا ہے۔

بے عنایاتِ حق و خاصانِ حق گر ملک باشد سیاہ ہستش ورق (x)

vi۔ مرشد کی نظر سے فیض ملتا ہے

حضرت مجدد الف ثانیؒ مکتوبات (دفتر اول میں ہی) فرماتے ہیں کہ عنایت ازلی اور شیخ کامل کی خدمت سے ماسوی اللہ کی نفی ہوتی ہے۔ شیخ جو محبوب حق اور مجذوب مطلق ہوتا ہے اس کی ایک نظر مبارک سے ظاہر اور باطن کی وہ صفائی حاصل ہوتی ہے، جو طرح طرح کی ظاہری عبادتوں سے حاصل نہیں ہوتی۔ الٰہی ہمیں تو اپنی کششوں سے وہ عطا فرما جو تیری شانِ کرم کے شایانِ شان ہو۔ سلطان العارفین حضرت سلطان باہوؒ فرماتے ہیں۔

سے روزے سے نفل نمازاں، سے سجدے کر تھکے ہو
کے حج گئے سے واری دل دی دوڑ نہ کے ہو
چلے چلئے جنگل بھونا اس گل تھیں نہ پکے ہو
سب مطلب ہو جاندے حاصل، جے پیر نظر اک تکے ہو

مکتوب نمبر ۴۲ دفتر دوئم حصہ اول صفحہ ۱۰۵۸ میں حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں جاننا چاہیے کہ میرے پیر وصول الی اللہ میں وہ راہنما ہیں جن کے توسّل سے میں نے اس راہ سلوک میں آنکھیں کھولی ہیں اور انہی کی وساطت سے میں نے راہ سلوک جیسے معاملہ میں لب کشائی کی ہے اور طریقت میں الف اور با کا

سبق انہی سے لیا ہے۔ میں نے مولویت کا ملکہ انہی حضرات کی توجہ شریف سے حاصل کیا ہے۔ اگر مجھ میں علم ہے تو انہی کے طفیل اور اگر معرفت ہے تو وہ بھی انہی کی توجہ کا اثر ہے، انتہا کو ابتدا میں داخل کرنے کا طریقہ ان ہی سے سیکھا ہے۔ قیومیت کی جہت سے جذب کی نسبت اُن ہی سے اخذ کی ہے۔ میں نے ان کی گفتگو سے وہ کچھ پایا ہے جو دوسرے سالکین برسوں میں بھی حاصل نہیں کر سکتے۔

vii۔ مرید کو پیر کا برزخ درکار ہے

مکتوب نمبر ۱۸۷ دفتر اول حصہ سوئم میں فرماتے ہیں کہ حضرت خواجہ احرار قدس سرہ کا فرمان ہے "سایۂ رہبر بہ است از ذکر حق" (پیر کا سایہ ذکر حق سے بہتر ہے۔) یہاں بہتر کہنا نفع کے اعتبار سے ہے یعنی رہبر کا سایہ مرید کے لئے اس کے ذکر کرنے سے زیادہ فائدہ مند ہے کیونکہ مرید کو ابھی مذکور (اللہ) کے ساتھ کامل مناسبت نہیں ہے۔ مکتوب نمبر ۲۰۷ دفتر اوّل حصہ دوم میں لکھتے ہیں "گر کعبہ از برکات ایں بزرگواراں دریوزہ نماید چہ عجب" (یعنی اگر کعبہ بھی ان بزرگوں سے بھیک مانگے تو کیا عجب ہے۔)

مکتوب نمبر ۶۱ دفتر اوّل کے حصہ دوئم میں حضرت مجدد فرماتے ہیں کہ مرید کو چاہئے کہ شوق اور درد کی حفاظت اس وقت تک کرتا رہے جب تک شیخ کامل و مکمل کی خدمت میں نہ پہنچے۔ اس کی خدمتِ اقدس میں پہنچ جانے کے بعد اپنی تمام مرادیں اس کے حوالے کر دے جس طرح میت غسال کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

زاں روی کہ چشم تست احول معبود تو پیر تست اول!(x)

(چونکہ تیری نظر اوّل احول (ایک کو دو) دیکھنے والی ہے۔ اس لئے اولاً تیرا قبلہ گاہ تیرا مرشد ہے۔)

viii۔ شیخ کو برزخ کیوں کہتے ہیں

حضرت مجدد فرماتے ہیں کہ شیخ ایک نظر میں وہ فیض دیتا ہے جو دوسروں کو چالیس روز کی چلہ کشی میں بھی میسر نہیں آ سکتا۔ شیخ مقتدا کو برزخ اس لحاظ سے کہتے ہیں کہ وہ مقام برزخیت میں نیچے آ چکا ہوتا ہے اور اس نے روح و نفس دونوں اطراف سے کافی حصہ لیا ہوتا ہے، روح کی سمت سے (جو قلب سے فوق کا مقام ہے) استفادہ کرتا ہے اور نفس کی جہت سے اپنے ماتحت کو فائدہ پہنچاتا ہے چونکہ اس کے لئے حق سبحانہ اور خلق دونوں کی طرف توجہ جمع ہو چکی ہوتی ہے، اس لئے ان دونوں اطراف میں سے کوئی توجہ اس کے لئے حجاب اور پردہ نہیں ہوتی لہٰذا بیک وقت استفادہ اور افادہ اس کو حاصل ہوتا ہے۔ بعض مشائخ اس برزخیت کو "بَرْزَخٌ بَيْنَ الْخَلْقِ وَالْحَقِّ" کہتے ہیں۔ (نبی بھی اسی طرح اللہ تعالیٰ سے احکام وصول کر کے اُمت کے لئے مہیا کرتا ہے۔)

ix۔ اولیاء اللہ امراضِ قلبی کا علاج کرتے ہیں

حضرت مجدد الف ثانی" مکتوب نمبر ۲۳ دفتر دوم میں فرماتے ہیں کہ اولیاء کرام وہ بزرگ ہیں جن کی بلند

پایۂ صحبت سے ہی طالبانِ حق وابستہ ہیں اور ناقصوں کی تکمیل ان کی توجہ شریف پر موقوف ہے۔ ان بزرگوں کی نظر تمام امراضِ قلبی سے شفاء بخشتی ہے اور ان کی التفات باطنی اور روحانی علتوں اور خرابیوں کو دفع کرتی ہے۔ ان کی ایک توجہ سو چلوں کا کام کرتی ہے اور ان کی ایک دفعہ کی التفات برسوں کی ریاضت اور مجاہدات کے برابر ہے۔ اسی دفتر میں مکتوب نمبر ۷۳ میں فرماتے ہیں اولیاء کی نشانی یہ ہے (جیسا کہ ایک حدیث میں بھی وارد ہے) کہ ان کو دیکھنے سے خدا یاد آجاتا ہے۔

x۔ پیر کا تصرف بلند مراتب پر پہنچا سکتا ہے

حضرت مجدد الف ثانی" مکتوب نمبر ۲۱۲ (دفتر اوّل حصہ سوئم) میں پیر کے تصرف کے متعلق فرماتے ہیں کہ پیر اپنے مرید پر تصرف کر سکتا ہے اور بلند مراتب تک پہنچا سکتا ہے مثلاً ایک صاحب استعداد مرید جو ولایتِ موسوی کی استعداد رکھتا ہے (وہ بھی نصف راہ تک جانے کی) تو اس کا صاحب تصرف پیر اپنے تصرّف سے اس کو ولایتِ موسوی کے بالکل آخری اور انتہائی مراتب تک پہنچا سکتا ہے۔

xi۔ شریعت کی متابعت اور شیخ کی محبت ہو تو غم نہیں

حضرت مجدد علیہ الرحمۃ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں کہ اگر دو چیزوں میں فتور نہ ہو تو غم کی ضرورت نہیں۔ ایک شریعت کی متابعت دوسرے اپنے شیخ کی محبت اور اخلاص۔ ان دونوں چیزوں کی موجودگی میں اگر ہزاروں ظلمتیں اور کدورتیں طاری ہو جائیں تب بھی ڈر کی بات نہیں، آخر اس مرید کو ضائع نہیں کریں گے۔ اگر خدانخواستہ ان دو میں سے کسی ایک میں نقصان پیدا ہو گیا تو خرابی ہی خرابی ہے۔ اللہ کے آگے گریہ وزاری کر کے دونوں پر استقامت کی دعا کرتے رہیں۔

ایک اور جگہ (مکتوب نمبر ۱۰۶ دفتر اول میں) فرماتے ہیں کہ اس طائفے (یعنی اولیائے کرامؒ) کی محبت جو معرفت پر مبنی ہے، خدا تعالیٰ کی بڑی نعمتوں میں سے ہے اور اس گروہ سے بغض رکھنا زہر قاتل ہے اور ان کی عیب جوئی ابدی محرومی کا باعث ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں اس ابتلا سے بچائے۔ شیخ عبدالسلام ہرویؒ فرمایا کرتے تھے" اے مولائے کریم تو جسے برباد کرنا چاہتا ہے اسے ہم سے ٹکرا دیتا ہے۔" ایک اور مقام پر (مکتوب نمبر ۱۳۲ دفتر اول) حضرت مجدد علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ فقراء کے آستانے کی جاروب کشی (جھاڑو دینا) دولت مندوں کے ہاں صدر نشینی سے بھی بہتر ہے۔ (ایک شخص نے فقراء کی صحبت چھوڑ دی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں) آج یہ بات اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے، آخر ایک دن سمجھ میں آجائے گی لیکن پھر کچھ فائدہ نہ دے گی۔ چرب کھانوں کی خواہش اور قیمتی لباس کی تمنا نے اس کو بلا میں ڈال دیا ہے۔ ایک مکتوب (نمبر ۲۲۵ دفتر اول) میں فرماتے ہیں اولیاء کی محبت کو دنیاوی اور اخروی سعادتوں کا سرمایہ تصور کرتے ہوئے

خدا تعالیٰ سے اس پر مضبوطی اور استقامت کی دعا کرتے رہیں۔ احکام شرعیہ کی بجا آوری کی توفیق اولیاء سے محبت کا نتیجہ ہے اور باطن کی پاکیزگی وطہارت کا حصول ان کی دوستی کا ثمرہ ہے، اگر سارے جہاں کی ظلمتوں اور کدورتوں کو باطن میں ڈال دیں مگر اولیاء کرام کی محبت کا رشتہ قائم رہے تو کچھ غم نہیں۔

xii۔ اولیاء نسبت کی عطا پر پوری قدرت رکھتے ہیں

حضرت مجدد الف ثانیؒ (مکتوب نمبر ۲۲۱ دفتر۔ حصہ چہارم صفحہ ۵۱۹ پر) فرماتے ہیں کہ یہ بزرگوار جس طرح نسبت کے عطا کرنے پر پوری طاقت رکھتے ہیں اور تھوڑے وقت میں طالب کو حضوری اور آگاہی بخشتے ہیں، اسی طرح نسبت کے سلب کرنے پر بھی پوری قدرت رکھتے ہیں اور ایک ہی بے التفاتی سے صاحب نسبت کو مفلس کر دیتے ہیں۔ ہاں سچ ہے جو دیتے ہیں وہ لے بھی لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے غضب اور اولیاء کرام کے غضب سے بچائے۔

مکتوب نمبر ۲۱۸ دفتر اوّل میں فرماتے ہیں کہ اپنے مربی (مرشد) کی طرف پوری توجہ رکھنی چاہئے کیونکہ یہ اس دولت (معرفت) کے حصول کا ذریعہ ہے اور وسیلہ بھی یہی ہے۔ پیرومرشد کی خدمت میں حاضری کے وقت ہر حال میں اس سے تعلق رکھنے والی چیزوں کے آداب کی اچھی طرح رعایت کرنی چاہئے۔ ان بزرگوں کی رضا کو حق تعالیٰ کی رضا کا ذریعہ اور وسیلہ تصور کریں۔ فلاح اور نجات کا راستہ یہی ہے۔ ایک جگہ فرمایا "یہ کس قدر سعادت ہے کہ خدا تعالیٰ کے دوست کسی کو قبول فرمالیں چہ جائیکہ ان سے محبت کریں اور اپنے قرب سے سرفراز کریں۔"

۲۔ خواجہ معصوم سرہندیؒ کے فرمودات

i۔ سلسلۂ تصوف مشائخ نے اپنے پاس سے نہیں گھڑ لیا

خواجہ معصومؒ اپنے والد حضرت مجدد الف ثانیؒ کا قول نقل کرتے ہیں کہ اولیائے کرام ہی عوام کی نیک راہ کی طرف راہنمائی فرماتے ہیں اور ان کو نیک اعمال کی رغبت دلاتے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ ایک عمل کے بدلے اگر کوئی دنیا و آخرت بھی دے دے تو یہ اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ حضرت مجددؒ نے فرمایا کہ مستحب کی رعایت اس حد تک پیش نظر رکھتا ہوں کہ چہرہ دھوتے وقت قصد کرتا ہوں کہ پانی پہلے دائیں رخسار پر پڑے کیونکہ دائیں طرف سے شروع کرنا مستحبات میں سے ہے۔ اولیائے کرام کی صحبت میں بیٹھنے والے اگر اس اتباع کی دولت سے مالا مال ہو جائیں تو اس مجلس کو غنیمت جانیں۔ صوفیاء کا قول ہے کہ بزرگوں کے حالات محض کتابوں سے دیکھ کسی سالک کی راہنمائی اور مرشد کامل کی دستگیری کے بغیر راہ سلوک طے کرنا بہت مشکل امر ہے۔ خواجہ معصومؒ فرماتے ہیں کہ جب سلاطین مجازی کی

بارگاہ میں بے وسیلہ باریابی نہیں تو سلطانِ حقیقی اور شہنشاہ حقیقی کی بارگاہ میں شرعی وسیلہ بہت ضروری ہے۔

طریقہ نقشبندیہ کا دارومدار شیخ مقتدیٰ کی صحبت اور رابطۂ محبت پر ہے۔ کشود کار اور ترقی اسی سے متعلق ہے۔ یہ سلسلہ پیغمبر علیہ السلام سے لے کر اب تک جاری ہے یہ کوئی نئی بات نہیں جس کو مشائخ نے اپنی طرف سے گھڑ لیا ہو۔

تمام سلسلے سید عالم حضرت محمد ﷺ تک منتہی ہوتے ہیں۔ جو لوگ بیعت کو بدعت کہتے ہیں تو یہ ایسا ہی ہے جیسا کوئی کہہ دے کہ صحیح بخاری کا پڑھنا اور ہدایہ کا درس دینا بدعت ہے ہم کو تو جو کچھ ملا اپنے خواجہ بزرگ اور برتر سے ملا۔

بہ چہ مشغول کنم دیدہ و دل را کہ مدام ۔۔۔ دل ترا می دیدہ ترا می خواہد(x)

(دیدہ و دل کو کس بات میں مشغول کروں، کہ دل ہمیشہ تجھے ہی طلب کرتا ہے اور آنکھ بھی تجھے ہی چاہتی ہے)

دوسری ضروری بات جس کو صوفیاء کرام زیادہ اہمیت دیتے ہیں وہ عشقِ خدا اور عشقِ رسول ﷺ ہے۔ جہاں عشقِ اولیاء ہو تو اس کی وجہ سے عشقِ خدا تعالیٰ بھی ہوگا۔ عشقِ رسول ﷺ غایتِ عشقِ الٰہی کے سوا نہیں۔ حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ فرماتے ہیں کہ عشق از راہ دیدن نیست (دیکھنے سے) ہی نہیں ہوتا کیونکہ خدا کو دیکھنے کا وعدہ تو آخرت میں ہے (اس جہان میں خدا کو دیکھنا بصیرتِ قلبی کے سوا نہیں) اور اس کا تعلق شنیدن (سننے) دانستن (جاننے) سے ہے۔ عشق مجازی کے لئے کہا جاتا ہے۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد ۔۔۔ بسا ایں دولت از گفتار خیزد(x)

(یہ عشق تنہا دیدار سے پیدا نہیں ہوتا بسا اوقات یہ دولت گفتار سے پیدا ہوتی ہے۔)

اگر عشق جاننے (دانستن) سے پیدا ہو جاتا تو عشقِ الٰہی عشقِ مجازی کی طرح ہمارے دلوں کے اندر آتش عشق پیدا کیوں نہ کرتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عشق محض جاننے سے ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو تمام مسلمان عاشق اور شیدا ہوتے اور ہر مسلمان خدا کے عشق میں خود فراموش ہوتا۔ درحقیقت یہ عشق ہر کسی کو نہیں ملتا یہ تو عطیۂ ربانی ہے، اگرچہ جاننا (دانستن) اس کا سبب بنتا ہے مگر یہ عشق تو راہ سلوک اختیار کرنے اور ریاضت کرنے سے وابستہ ہے اور ساتھ ہی صحبتِ کامل کی بھی ضرورت ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ جو خود نہ دیکھ سکتا ہو اس کو کسی کی راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔

کور ہرگز کے تواند رفت راست ۔۔۔ بے عصائش کو را رفتن خطاست(x)

(اندھا شخص سیدھا چلنے کی طاقت نہیں رکھتا، ایسے اندھے کے لئے بغیر لاٹھی کے چلنا خطا ہے۔)

ii۔ بیعت کا مقصد معاصی سے بچنا اور عشق سے منسلک ہونا ہے

اس راہ میں بغیر شیخ کے منزل پر پہنچنا محال ہے۔ ابوبکر سعدانؒ فرماتے ہیں کہ صوفیاء کی ہم نشینی اس طرح

اختیار کرے کہ "بے نفس و بے دل اور بے مِلک ہو کر ان کی محبت میں رہے" اور اگر چیزوں میں سے کسی چیز پر نگاہ رکھے تو یہ امر اس کو مطلوب تک پہنچنے سے روکے گا۔ ایک درویش کا قول ہے کہ اچھے اعمال تو نیک اور فاجر دونوں کر لیتے ہیں لیکن معاصی سے بچنے کا اہتمام صدیق کا کام ہے۔ شیخ طریقت سے بیعت کرنے کا مقصد گناہوں سے توبہ کرنا اور خدا اور رسول ﷺ سے محبت ہے۔ شیخ محمد معصوم سرہندیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی گناہ وقوع میں آ جائے تو بہت جلد اس کا تدارک توبہ و استغفار سے کر لینا ضروری ہے۔ گناہ پوشیدہ کی توبہ پوشیدہ اور گناہ آشکار کی توبہ اعلانیہ طور پر ہو۔ توبہ میں دیر نہ کی جائے۔ منقول ہے کہ کراماً کاتبین تین ساعت تک گناہ لکھنے میں توقف کرتے ہیں۔ اگر کسی نے اس دوران توبہ کر لی تو اس گناہ کو نہیں لکھتے، ورنہ اپنے رجسٹر میں اس کے گناہ کا اندراج کر لیتے ہیں۔ صوفیائے کرام کا قول ہے کہ توبہ سے غفلت کرنا، ارتکابِ گناہ سے بھی زیادہ بری بات ہے۔ بیعت سے بھی حقیقتاً مراد کسی شیخ کے ہاتھ پر توبہ کرنا ہے اور بغیر عذر اس میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ شیخ سے معرفت ملتی ہے اور وہ معرفت جس سے صوفیاء کرام ممتاز ہیں اسی عشق اور ولولہ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ حقیقی عشق پیدا ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عشق کا تعلق بے کیف اور بے مثل مراتب سے ہے جو کہ باطن کا ہی حصہ ہوتا ہے اور وہ ظاہر تک کم سرایت کرتا ہے جب کہ عشق مجازی ظاہر اور چون و چگون (یعنی شکل و صورت) سے متعلق ہے اور اس کے آثار ظاہر میں زیادہ نظر آتے ہیں، مثلاً بے قراری، آہ و زاری اور بے آرامی وغیرہ۔ عشقِ حقیقی کا اثر فنافی المحبوب ہونا اور اس کے ماسوا سے آزاد ہونا ہے۔ عشقِ حقیقی حقیقتِ عشق ہے اور مجازی صورتِ عشق ہے۔ عشقِ مجازی میں چونکہ محبّ اور محبوب میں مناسبتِ صوری موجود ہے، اس لئے اس کے آثار صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ جیسے مولانا رومؒ نے فرمایا ہے "عشق عاشق با دو صد طبل نفیر" (یعنی عاشق کا عشق شور و غل سے عیاں ہوتا ہے) اس کے برعکس عشق حقیقی میں مناسبت صوری مفقود ہے چنانچہ عشق حقیقی کے آثار بھی ظاہر میں کم پائے جاتے ہیں۔ یہ عشق حقیقی فنا اور پھر بقا تک پہنچاتا ہے اور یہ مقاماتِ باطن سے ہے، البتہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مقاماتِ ظِلّ میں (جہاں صورت کی پرچھائیں نظر آتی ہیں) محبّ اور محبوب کے درمیان حقیقی مناسبت پائی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں اس عشق کے آثار بھی کچھ نہ کچھ ظاہر ہوتے ہیں چنانچہ کبھی عشقِ حقیقی میں چیخ و پکار اور نعرہ بازی پائی جاتی ہے۔ ایسے عاشقوں کے کچھ نہ کچھ اثرات کسی نہ کسی شکل میں نمودار ہو جاتے ہیں جیسے جانِ جاناں کی صاحب زادی جاناں بیگم نے کہا ہے۔

عاشق زخلق عشق تو پنہاں چساں کند   پیداست از دو چشمِ ترش خوں گریستن

(عاشق مخلوق سے تیرا عشق کس طرح چھپائیں، ان کی چشمان تر سے خون کا بہنا ظاہر ہوتا ہے۔)

جب معاملہ ظِلّ سے اوپر چلا جاتا ہے اور غیب الغیوب (یعنی اصل الاصول اللہ) پر بات پہنچتی ہے تو اس

منزل میں بے چینی اور بے آرامی کم ہو جاتی ہے، لہٰذا کمالاتِ نبوت کے مقام میں محبت بمعنی ارادہ واطاعت رہ جاتی ہے اور انتہائی عبادت میں بھی تکلیف محسوس نہیں ہوتی بلکہ سکون میسر ہوتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (اے محبوب!) آپ فرمایئے (انہیں کہ) اگر تم واقعی محبت کرتے ہو اللہ تعالیٰ سے تو میری پیروی کرو (تب) محبت فرمانے لگے گا تم سے اللہ۔ (آل عمران: ۳۱)

iii۔ حصولِ کمال کے لئے شیخ کا ہونا ضروری ہے

حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ فرمایا کرتے تھے کہ کسبِ منازل وحصولِ کمال بدون شیخ ممکن نہیں۔ آپ نے مکتوبات (تلخیص صفحہ ۵۷) میں مرزا خان کو لکھا کہ ''ادعیہٗ واذکار'' جو فقیر نے آپ کو تعلیم کئے تھے وہ اس عنوان سے نہ تھے کہ جو راہِ طریقت میں شرائط کا درجہ رکھتے ہوں یا سلوک کے طریق کا ان پر دار و مدار ہو بلکہ اس طور پر تھے کہ تم خالی نہ رہو اور حصول صحبتِ شیخ تک اپنے اوقات کو معمور رکھ سکو، غفلت میں اوقات ضائع نہ ہوں۔''

مرزا خان نے آپ کو خط لکھا کہ اگر چہ صحبت شیخِ کامل سلوک میں ضروری ہے لیکن سلسلۂ نقشبندیہ میں غائبانہ بھی ''افادہ واستفادہ'' کی محفل گرم ہوتی ہے جیسا کہ حضرت باقی باللہؒ اور حضرت مجددؒ کے درمیان غائبانہ افادہ اور استفادہ ہوتا رہا۔ حضرت خواجہ نے جواب میں فرمایا کہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کو جو کچھ ''مقاماتِ ولایت'' کے سلوک اور ''منازلِ قرب'' کی رسائی میں درکار تھا وہ تمام تر حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی خدمت میں ہی ظہور پذیر ہوا اور ان کی صحبتِ پرنور میں مراتبِ کمال کی تکمیل ہوئی اور یہ امر آپ کے مکتوبات سے بھی ظاہر ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ سلوک طے کرنے کے بعد مراسلات اور مکاتیب کا سلسلہ جاری رہا۔ اس سے بھی فائدہ ہوا جو بحث سے باہر ہے کیونکہ یہ بعد از حصولِ کمال ومراتب کے سلوک تھا۔

کسبِ منازل وحصولِ کمال کے لئے صحبتِ شیخ ضروری چیز ہے۔

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ محبوبیت کا درجہ رکھتے تھے اگر غائبانہ (بے صحبت) پیر سے اخذ فیوض و برکات کر لیتے تو گنجائش تھی کیونکہ محبوبوں کا معاملہ ہی جدا ہوتا ہے ان کو ''اجتباء'' کے راستے سے لے جاتے ہیں اور بغیر واسطہ پیر بھی ان کو منزل پر پہنچا دیتے ہیں۔ اُن محبوبوں کے علاوہ باقی سب ''انابت'' کے راستے سے چلتے ہیں اور ظاہری صحبت کے محتاج ہوتے ہیں۔ ان میں اور ان میں بڑا فرق ہے۔ حضرت باقی باللہؒ اپنے مرید ذی شان کی محبوبیت کو تسلیم کرتے تھے اور ان کے عشق کے متعلق مولانا رومؒ کے یہ اشعار پڑھا کرتے تھے۔

میلِ معشوقاں نہاں است و ستیر　میلِ عاشق با دو صد طبل ونفیر (۴۳۶-۳)

(محبوبوں کا عشق چھپا ہوا اور راز میں ہوتا ہے، اور عاشق کا عشق بہت شور اور ڈھول کے ساتھ ہوتا ہے۔)

لیک عشقِ عاشقاں تن زہ کند　　عشقِ معشوقاں خوش و فربہ کند (۴۱۷-۳)

(لیکن عاشقوں کا عشق بدن کو کمزور کرتا ہے، معشوقوں کا عشق خوشی اور موٹاپے کا باعث ہوتا ہے۔)

۳۔ عبدالعزیز دباغؒ کے فرمودات

ولی کامل ایک نگاہ میں واصل کر دیتا ہے

آنانکہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند　　آیا بود کہ گوشۂ چشمے بہ ماکنند (x)

(جو خاک کو نظر سے کیمیا کر دیتے ہیں، کاش ایک گوشۂ چشم ہماری طرف بھی کر دیں۔)

عبدالعزیز دباغ رحمۃ اللہ علیہ "الابریز" میں فرماتے ہیں کہ ولی کامل انسان کو ایک لحظہ میں واصل باللہ بنا سکتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ولی میں یہ قدرت ہوتی ہے کہ وہ اگر کسی کے کان میں کوئی بات کہہ کر اٹھے تو وہ شخص اور وہ ولی بغیر کسی قسم کے فرق کے معارف میں برابر ہو جاتے ہیں لیکن اس کا دارومدار اس گوند پر ہے جس سے یہ راز چسپاں کیا جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا وہ گوند موتِ نفس ہے۔ موتِ نفس یہ ہے کہ انسان کے تمام افعال خالص اللہ کے لئے ہوں اور اگر اعمال غیر اللہ کے لئے ہوں تو یہ نفس کے زندہ ہونے کی علامت ہے۔ نفس کے زندہ ہونے کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ بندہ کے دل میں وساوس پیدا ہوں۔ جس قدر نفس زندہ ہو اس قدر وساوس ہوں گے۔ کسی نے پوچھا کہ نفس کا کیا علاج ہے فرمایا کہ نفس کا کوئی علاج نہیں سوائے اس کے کہ اس پر کوئی بہت بڑا پہاڑ گرے۔ فرمایا کہ وہ پہاڑ اللہ کی معرفت اور اس کا مشاہدہ ہے جب بندے کا دل معرفت الٰہی سے معمور ہو تو اسے یقین ہوتا ہے کہ اللہ اس کی باتوں کو دیکھ رہا ہے اور سن رہا ہے اور اللہ جو چاہے اس سے سلوک کر سکتا ہے۔ اس حالت میں وہ سمجھ لے گا کہ وہ اس دنیا اور آخرت میں نہ کسی کو اور نہ خود کو کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ ہاں اگر خدا تعالیٰ عطا کرے تو اس وقت وہ غیر اللہ کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا۔

حضرت عبدالعزیز دباغؒ نے فرمایا کہ علماء کے نزدیک صرف ایک صورت میں غسل واجب ہوتا ہے (یعنی جب وہ حالت جنابت میں ہوں) مگر اولیاء کے نزدیک جنابت کی کئی قسمیں ہیں اور سب پر غسل واجب ہوتا ہے۔ فرمایا کہ جب اولیاء کی نگاہ اللہ سے اس طرح منقطع ہو جائے کہ اس کی تمام تر نگاہیں اللہ کی طرف سے بند ہو جائیں اور اس کا رگ و ریشہ غیر اللہ کے ساتھ سرور سے لبریز ہو جائے اور اللہ کی طرف سے کلی طور پر توجہ منقطع ہو جائے تو ملائکہ اور محافظ فرشتے اس سے بھاگ جاتے ہیں۔ پوچھا گیا کہ اگر جماع کے وقت اللہ کی طرف دھیان رہے تو غسل واجب نہ ہوگا۔ فرمایا کہ یہ نادر ہے اور نادر پر کوئی حکم نہیں لگایا جاتا (یعنی شرع کے حکم کے مطابق غسل واجب ہوگا۔)

پہلے یہ بیان گزر چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ایک نگاہ [illegible] کرام کی زندگیوں کی صفائی، رعونت

سے پاکی، سرّ خداوندی کا تحمل، انسانی ظلمتوں سے پاکیزگی اور باطل سے انقطاع ہو جاتا تھا۔ وہ لوگ سوتے جاگتے اور ہر حالت میں تلاشِ حق میں رہتے۔ ہر شخص رسول اللہ ﷺ کی رضا جوئی میں سرگرداں رہتا۔ یہ سب رسول اللہ ﷺ کی ایک نظر کا فیضان تھا۔ احادیث میں ہے کہ بیوقوف آپ ﷺ کے پاس آتے اور صاحب عقل بن جاتے۔ مجنوں آپ ﷺ کی صحبت سے عقل کی باتیں کرنے لگ جاتے۔ اب بھی یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ چور اچکے، ڈاکو اور رذائلِ اخلاق کے مارے ہوئے انسان جب اولیاء کرام کی صحبت اختیار کرتے ہیں تو ان کی کایا پلٹ جاتی ہے۔

۴۔ ابنِ حجر عسقلانیؒ کی دلیل

آپ کی وفات ۸۵۲ھ میں ہوئی۔ آپ فتح الباری شرح صحیح بخاری میں لکھتے ہیں کہ ہر طالبِ خدا کو چاہیے کہ وہ اپنی راہنمائی کے لئے کسی شیخِ کامل کو منتخب کرے اور منکرین کی تعصب آمیز باتوں میں ہرگز نہ آئے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ منکرین تصوف اس وقت بھی موجود تھے۔ جب کوئی شیخِ کامل مل جائے تو پھر مرید کے لئے حرام ہے کہ اس کا دامن چھوڑے۔ آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں کتاب اللہ، سنتِ نبویؐ، اجماعِ اُمت اور قیاس کی پوری پوری شہادت سے کہہ رہا ہوں، یہی نہیں بلکہ چاروں آسمانی کتابیں اس دعوے پر شاہد ہیں۔ کتاب وسنت کی اتباع کامل میں جب تک نفس پر جبر وتشدد کا تعلق رہتا ہے شریعت کہلاتی ہے اور جب یہ اتباع ذوق وشوق سے ہونے لگے اور عبادات میں لذت محسوس ہونے لگے اور نوبت قال سے حال تک پہنچے تو طریقت کہلاتی ہے۔ تصوف اور طریقت کو فرض قرار نہیں دیا گیا بلکہ مستحب بتایا گیا ہے صاحبِ طریقت جو کچھ بھی کرے گا پورے شوق اور رغبت کے ساتھ کرے گا۔ اسے نہ جنت کی پرواہ ہوگی نہ دوزخ کا اندیشہ ہوگا۔ فرماتے ہیں کہ حقیقتاً اہلِ طریقت کی جماعت عشاق کی جماعت ہے۔

۵۔ حضرت ابوسعید ابوالخیرؒ کے فرمودات

حضرت مخدوم علی الہجویریؒ نے ''کشف المحجوب'' میں آپ کا ذکر فرمایا ہے اور ساتھ ہی حضرت ابوسعیدؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ تصوف خدا سے دل کے بلاواسطہ تعلق کا نام ہے اور اس قول کے متعلق آپ نے لکھا ہے کہ یہ قول مشاہدہ کی طرف اشارہ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مشاہدہ غلبہ دوستی سے ہوتا ہے۔ مشاہدہ اور شوق رؤیت استغراق میں ہوتا ہے بالفاظ دیگر بقا بحق فنا کے بعد ہی ہوتا ہے۔ ایک جگہ حضرت ابوسعیدؒ نے فرمایا کہ تصوف یہ ہے کہ دل کو غیر کی جزئیات سے بھی محفوظ رکھا جائے کیونکہ جو غیر ہو وہ وصل کا جذبہ نہیں ہوا کرتا۔

i۔ طریقت کا دارومدار پیر پر ہے

آپؒ کا قول ہے کہ جس نے کسی شیخ سے ادب وسلیقہ نہ سیکھا وہ نکما اور بیکار ہے، چاہے کوئی شخص اعلیٰ مرتبہ و

مقام پر پہنچ جائے، یہاں تک کہ غیب سے اس پر انکشافات ہونے لگیں، مگر اس کا استاد اور پیشوا نہ ہو تو اس سے ہرگز کچھ صادر نہیں ہوتا۔ طریقت کا دارومدار پیر پر ہے (یعنی پیر نہیں تو طریقت بھی نہیں)

ii۔ سب خرقے ایک ہی ہیں

آپ فرماتے ہیں کہ یہ سستی اور کاہلی کے بہانے ہیں کہ اگر کوئی یہ کہے کہ آج پہلے جیسے مشائخ نہیں رہے۔ ابوالحسن خرقانیؒ کی طرح ابتدا سے ہی شیخ کی تلاش کرے اور سفر میں رہے۔ آپ نے ۸۳ سال عبادات میں گزارے اور پھر آخر یہ مقام میسر ہوا جیسا کہ آپ نے فرمایا تھا کہ عرش سے تحت الثریٰ تک میرے لئے ایک قدم کر دیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ دنیا کے صوفیا میں کوئی اختلاف یا تضاد نہیں بشرطیکہ وہ واقعتاً صوفی ہوں۔ حقیقت پر نظر کرے تو یہ سب ہاتھ اور سب خرقے ایک ہی ہیں۔ جو ایک کو قبول ہے وہ سب کو قبول ہے۔ جو ایک کے ہاں مسترد ہے وہ سب کے ہاں مسترد ہے۔

iii۔ صوفیا کی منزل نہ خوشی ہے نہ غم

آپ (ابوسعید ابوالخیرؒ) نے فرمایا کہ میں حضرت ابوالعباس قصابؒ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ابوالحسن خرقانیؒ اور ابوعبداللہ داستانیؒ ان کے پاس آئے اور کہا کہ آپ ہمارے درمیان فیصلہ کریں کہ خوشی ابدی ہے یا غم۔ آپ نے اپنے منہ پر ہاتھ پھیر کر فرمایا کہ الحمدللہ قصاب کے بیٹے کی منزل نہ خوشی ہے نہ غم۔ فرمایا "لَيْسَ عِنْدَ رَبِّكُمْ صَبَاحٌ وَّلَا مَسَاءٌ" (تمہارے رب کے ہاں نہ صبح ہے نہ شام) خوشی اور غمی تو حادثات ہیں، حادث کو قدیم سے کیا راہ؟ اوامر و نواہی میں محمد مصطفیٰ ﷺ کی سنت کا اتباع ہی قصاب کے بیٹے کی راہ ہے۔ یہ بوڑھی عورتوں کا ہتھیار نہیں بلکہ جوانمردوں کا میدانِ جنگ ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ایک روز حضرت قصابؒ کے پاس درویش آئے اور آپ ان کی خواہشات پوری کرتے گئے اور خدا سے کہنے لگے کہ الٰہی ہر ایک کی خواہش پوری کر دے اور ہماری خواہش پوری نہ کرنا۔ مجھے کوئی خواہش اور تمنا نہیں۔ پس ہمیں یہ دے کہ ہم نہ ہوں۔

iv۔ اہلِ باطن کے ساتھ عقیدت ضروری ہے

حضرت ابوسعیدؒ فرماتے ہیں کہ شیوخ طالبوں کو سکر، صحو، کشف، مراقبہ، تزکیۂ قلب، تزکیۂ نفس، فنا اور بقا مجاہدات اور ریاضات کے علاوہ اصطلاحات سے آگاہ کرتے ہیں۔ سالکین کو جب تک ایسے علوم حاصل نہ ہوں ان کو اس وقت تک یہ کیفیت حاصل نہیں ہوتی۔ ظاہری علوم سے ظاہری عبادات کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے مگر باطن کی اصلاح اہلِ باطن کے ساتھ مجالست اختیار کرنے اور ان کے ساتھ عقیدت رکھنے سے ہی ممکن ہے۔

v۔ طریقت میں کٹھن معاملات کا مقابلہ

شیخ ابوسعیدؒ (۹۶۷ء تا ۱۰۴۹ء) فرماتے ہیں کہ ایک وقت تھا کہ ہمسائے میرے احترام سے شراب نہ

پیتے، بہت سے لوگ میرے ہاتھ پر تائب ہوئے۔ میرے خچر کے پاؤں کو لگی ہوئی نجاست کو لوگ اپنے منہ اور سر پر ملتے۔ میرے ہاتھ سے اگر خربوزے کا چھلکا گر جاتا تو اسے یہ دینار میں خرید لیتے ایک روز مسجد سے آواز آئی "اَوَ لَمْ یَکْفِ بِرَبِّکَ" (کیا تجھے تیرا رب کافی نہیں ہے۔) ایک نور میرے سینے میں روشن ہوا اور کئی حجابات اُٹھ گئے۔ پھر ایک وقت آیا کہ جنہوں نے میری عقیدت مندی کے پیمان باندھے تھے اُنہوں نے ہی مجھے ردّ کر دیا اور قاضی شہر سے مل کر میرے کافر ہونے کی گواہیاں دیں۔ جہاں سے میرا گزر ہوتا لوگ کہتے کہ اس شخص کی نحوست سے زمین پر سبزہ نہیں اُگے گا۔ عورتیں مجھ پر گندگی پھینکتیں۔ میرے کانوں میں آواز آئی "اَوَلَمْ یَکْفِ بِرَبِّکَ" (کیا تجھے تیرا رب کافی نہیں ہے۔) جب مسجد میں نماز کے لئے جاتا تو لوگ کہتے جس مسجد میں دیوانہ ہے، ہم اس میں نماز نہیں پڑھیں گے۔ آپ ذکر بالجہر کرتے اور ساتھ ہی رقص بھی فرماتے۔ سلطان طغرل نے آپ کے لئے سخت احکامات جاری کئے لیکن آپ نے پرواہ نہ کی۔ فرماتے ہیں جب میں نے قرآن کریم کھولا تو یہ آیت نکلی وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَیْرِ فِتْنَةً ؕ وَ اِلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۵﴾ (الانبیاء: ۳۵) (اور ہم خوب آزماتے ہیں تمہیں بُرے اور اچھے حالات سے دوچار کر کے اور (آخرکار) تم سب کو ہماری طرف ہی لوٹ آنا ہے۔) اس کے بعد آپ نے باورد اور سرخس کے مابین سات سال بغیر غذا کے ریاضت اور مجاہدات کئے اور پھر ایسا وقت آیا کہ لوگ آپ کی پہلے سے بھی زیادہ تعظیم کرنے لگے۔

حضرت! یہ رقص کیا ہے؟

ایک بار حضرت ابو سعیدؒ سے علماء نے دریافت کیا کہ یہ رقص کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ رقص وہ کرے کہ اگر وہ زمین پر پاؤں مارے تو اسے تحت الثریٰ تک ہر چیز نظر آ جائے اور اگر آستین اٹھائے تو اس کی نگاہ عرش پر پڑے۔ اگر یہ کیفیت حاصل نہیں تو اسے چاہیے کہ بایزید بسطامیؒ، جنید بغدادیؒ اور شبلیؒ کے چشمے سے پانی پیئے اور رقص نہ کرے۔ اپنے مریدوں سے کہتے تھے کہ اگر تمہیں کوئی پوچھے کہ رقص کیوں کرتے ہو تو انہیں کہو کہ ہم اپنے پیر کی اتباع میں کرتے ہیں۔ سلطان طغرل کے وزیر ابو منصور ورقانی کی قبر میں آپ کی وجہ سے منکر نکیر کے سوال نہ کرنے کی حقیقت حال الگ بیان کی جا چکی ہے۔

مولانا رومؒ نے اسے اشعار میں خوبی سے سمویا ہے۔

خواجگاں ایں بندگی ہا کردہ اند   تا گماں آید کہ ایشاں بندہ اند

(آقاؤں نے یہ عبادات اس لئے کی ہیں تا کہ دیکھنے والوں کو یہ گمان ہو کہ یہ تو غلام ہیں۔)

ویں غلامانِ ہوا برعکسِ آں   خویشتن بنمودہ میرِ عقل و جاں

(اور یہ نفس کے غلام اس کے برعکس ہیں، خود کو عقل و جان کا آقا ظاہر کرتے ہیں۔)

آید از خواجہ رہِ افگندگی ناید از بندہ بغیر از بندگی (۱۴۹-۲)
(آقاؤں کو خاکساری کا طریقہ ہی آتا ہے، اور بندے سے سوائے بندگی کے اور کچھ وقوع میں نہیں آتا)

حضرت ابوسعیدؒ نے فرمایا کہ شان وشوکت کی نمود انسان کے دل سے نکل جائے تو تب ہی وہ غلام کہلا سکتا ہے۔فرمایا "اِنَّ اٰخِرَمَا یَخْرُجُ عَنْ رُؤُسِ الصِّدِّیْقِیْنَ حُبُّ الرِّیَاسَۃِ" (صدیقین کے دماغوں سے جو چیز سب سے آخر میں نکلتی ہے، وہ حکمرانی کی محبت اور خودسری کی بو ہے۔) آپؒ نے فرمایا کہ اسلام سارے کا سارا اخلاق ہے اور جس کا خُلق اچھا ہو ہر چیز اس سے اچھے خُلق کا مظاہرہ کرتی ہے۔حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام خلیق تھے تو آگ بھی ویسے ہی خُلق کے ساتھ پیش آئی۔

vi۔طریقت رفق (نرمی) اور صدق ہے

حضرت ابوسعید ابوالخیرؒ نے فرمایا کہ کشش کوشش سے بہتر ہے۔جب تک کشش نہ ہو کوشش نہیں ہوسکتی۔جب تک کوشش نہ ہو نگاہ نہیں ہوسکتی۔اس سے مراد یہ ہے کہ جب کسی ولی اللہ کی کشش کسی کو کھینچ لے تو پھر ہی کوئی دین کی طرف التفات کرتا ہے اور جب وہ کوشش کرے تو اللہ تعالیٰ اپنی نگاہِ رحمت فرمادیتا ہے۔آپ ہی سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دلوں کو ایک دن میں تین سوستر بار دیکھتا ہے۔آپ نے فرمایا طریقت صدق اور رفق ہے۔صدق اللہ کے ساتھ اور رفق (نرمی) مخلوق کے ساتھ۔

حضرت ابوسعید ابوالخیرؒ سے پوچھا گیا کہ کیا کوئی طریقت کی راہ مرشد کے بغیر خود بخود طے کرسکتا ہے۔فرمایا ہرگز نہیں کیونکہ جو اس راہ کی اونچ نیچ سے آگاہ ہوتا ہے مرید کی راہنمائی کرتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ یہ فلاں منزل ہے، یہاں زیادہ دیر تک قیام کرنا ہے اور اس منزل سے جلدی سے گزر جانا ہے۔اس راہ میں مرید کی حوصلہ افزائی بھی کی جاتی ہے اور اگر تنہا ہی سفر کی منزل طے کرے تو وہ اس شخص کی طرح ہوتا ہے جو صحرا میں ہو اور راستہ نہ جانتا ہو۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيَاطِينُ فِي الْأَرْضِ حَيْرَانَ (الانعام:۷۱)
"مثل اس شخص کے کہ بھٹکا دیا ہو اسے جنوں نے زمین میں اور وہ حیران و پریشان ہو"۔

آپ نے فرمایا کہ ہم مشرق سے مغرب تک ایسے دیکھتے ہیں جس طرح تم لوگ ایک تھالی میں دیکھتے ہو۔

فرمایا کہ سات بزرگانِ دین نے تصوف پر گفتگو کی ہے۔سب سے عمدہ بات یہ ہے۔

اِسْتِعْمَالُ الْوَقْتِ بِمَا هُوَ اَوْلٰی بِهٖ
"عمدہ ترین بات میں وقت خرچ کرنا تصوف ہے"۔

آپ نے فرمایا ہے کہ مردِ حق کو ہر ایک چیز کرنی چاہیے لوگوں نے تفصیل پوچھی تو فرمایا کہ مردِ حق کو تمام کوچوں اور مقامات پر جانا چاہیے اور اسے آزمانا چاہیے کہ اس کا دل کہیں غیر اللہ کی طرف مائل تو نہیں ہوتا

(مگر ایسا کرنا اس وقت درست ہے جب پختگی آجائے ورنہ ایسا نہ ہو کہ آزمائش میں پھنس کر کسی بلا میں گرفتار ہو جائے۔)

حضرت ابوسعید ابوالخیرؒ سے دریافت کیا گیا کہ بندگی کیا ہے فرمایا "خَلَقَکَ اللّٰهُ حُرًّا فَكُنْ كَمَا خَلَقَکَ" (اللہ نے تمہیں آزاد پیدا کیا ہے تم اسی طرح رہو جس طرح اس نے پیدا کیا ہے) درویش نے پوچھا حضرت! میں نے بندگی کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ فرمایا تمہیں معلوم نہیں کہ جب تک تم دو جہاں کی خواہشات سے آزاد نہ ہو جاؤ بندہ نہیں بن سکتے۔

۶۔ حضرت سلطان باہوؒ کے ارشادات

حضرت سلطان باہوؒ ۱۴۰ کتابوں کے مصنف اور بہت بلند پایہ مشائخ میں سے ہو گزرے ہیں۔ آپ کی تمام تر تصانیف تصوف کے موضوع پر لکھی گئی ہیں، لہٰذا صرف ایک حدیث اور آپ کے چند اشعار تبرکاً پیش خدمت ہیں۔ آپ نے سرّ الاسرار میں درج ذیل حدیث نقل فرمائی ہے۔

لَادِیْنَ لِمَنْ لَا شَیْخَ لَهٗ فَمَنْ لَا شَیْخَ لَهٗ فَلَهُ الشَّیْطَانُ

''جس کا راہبر نہیں اس کا دین کامل نہیں اور جس کا راہبر نہیں ہوتا اس کا ابلیس راہبر بن جاتا ہے''۔

مولانا رومؒ نے فرمایا کہ جس کا کوئی پیر نہیں اسے شیطان کبھی نہ کبھی بے کسی کی حالت میں قتل کر دے گا۔

ہر کہ را دیو از کریماں وا برد بے کسش یابد سرش را وا خورد (۲۰۹۔۲)

(جس کو شیطان اللہ والوں سے الگ کر دے، تو اس کا بحالتِ بے کسی سر کاٹ دے گا۔)

حضرت سلطان باہوؒ فرماتے ہیں کہ پیری مریدی، مرشدی وطالبی عظیم سرّ الاسرار میں سے ہیں۔

باجھوں مرشد کجھ نہ حاصل پئے راتیں جاگ پڑھیوے ہو

حضرت سلطان العارفین نے عین الفقر میں فرمایا کہ پارسائی اور زیادہ علم حاصل کرنا فرض نہیں، البتہ گناہوں سے بچنا فرض ہے۔ اگر انسان گناہوں سے نہ بچے تو تمام عبادات اور علوم بے فائدہ ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ریاضت، صوم، صلوٰۃ، حج، زکوٰۃ، ذکر وفکر، مشاہدہ ومجاہدہ، مراقبہ ومحاسبہ، وصال وحضور، درود و وظائف، تسبیح وتلاوت، علم فقہ، خرقہ پوشی، دلق پوشی وگدڑی، خلق سے الگ رہنا، خاموشی اختیار کرنا، نیک عادات پیدا کرنا، چلہ کشی، گوشہ نشینی، اپنے حال کو پریشان رکھنا اور تمام اشیاء کی لذت سے باز رہنا یہ سب چیزیں نفس کے خلاف ہیں۔ کیا ان سے نفس مر جاتا ہے؟ پھر خود ہی فرماتے ہیں ''نہیں''۔ فرماتے ہیں بھوک، درس وتدریس، خدا شناسی سے نفس نہیں مرتا، بھوک کی حالت میں نفس کتے کی طرح ہوتا ہے اور شکم سیری میں گدھے کی طرح۔ فرماتے ہیں کہ گناہ کرنے کے وقت اگر انسان کے سامنے قرآن وحدیث، حشر ونشر، حساب

اور عذابِ قبر، میزان و پل صراط اور مسائلِ ترہیب و ترغیب پیش کیے جائیں تو بھی موذی نفس باز نہیں آئے گا اور گناہ کو چھوڑنے پر تیار نہ ہوگا، سوائے توفیقِ الٰہی کے اور وسیلہ مرشد کامل کے۔ اسی لئے آپ فرماتے ہیں ۔

سے" روزے سے" نفل نمازاں، سے" سجدے کر تھکے ہُو
کے حج گئے سے واری، دل دوڑ نہ مکے ہُو
چلے چلئے جنگل بھونا، اس گل تھیں نہ پکے ہُو
سب مطلب ہو جاندے حاصل پیر نظر اک تکے ہُو

حضرت سلطان باہوؒ اپنی تصنیف "تیغ برہنہ" میں فرماتے ہیں کہ مرشد جب طالب کو بیعت کرتا ہے تو ایک توجہ اور نظر سے اس کو فقر کی معرفت عطا کر دیتا ہے اور ایک جگہ فرماتے ہیں کہ مرشد کامل اسم ذات (لفظ اللہ) کی تلوار سے مرید کے نفس کو قتل کر دیتا ہے، جو شخص اسم ذات کے تصرف سے نفس کو مار ڈالتا ہے اور تکبیر تحریمہ سے ذبح کرتا ہے وہ دونوں جہانوں کو اپنے قبضے میں لے لیتا ہے۔ فرماتے ہیں ۔

طالب بیا! طالب بیا! طالب بیا! تا رسانم روز اوّل باخدا(x)

(اے طالب میرے پاس آ میں پہلے دن ہی تجھے خدا تک پہنچادوں۔)

اتباعِ شیخ کے باعث شیخ کا ارادہ مرید کا اپنا ارادہ ہو جاتا ہے یعنی مرید اپنی مرضی سے کچھ نہ چاہے گا بلکہ اس کا شیخ جو چاہے وہی کرے گا۔ کہا جاتا ہے "اَلْمُرِیْدُ لَا یُرِیْدُ بِنَفْسِہٖ" (یعنی مرید اپنی مرضی سے کچھ نہیں چاہتا)

صوفیائے عظام کا قول ہے کہ "اَلْمُرِیْدُ لَایُرِیْدُ اِلاَّ اللّٰہَ الْمُرَادُ لَایُرِیْدُ شَیْئاً فِی الْکَوْنَیْنِ"
(مرید سوائے اللہ کے کچھ نہیں چاہتا اور مراد وہ ہے جو دونوں جہانوں میں کسی شے کو نہیں چاہتا)

حضرت میاں محمد بخشؒ فرماتے ہیں کہ

پیر دے ہتھ وچ ہتھ نوں دے کے بھید نہ دل دا کھولیں
جیہڑا کلمہ مرشد بولے اوہی کلمہ بولیں

قبولیتِ دعا

اولیائے کرام نے چونکہ اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق قائم کر رکھا ہے اور فرائض کی ادائیگی کے بعد دوسری نفلی عبادتوں میں بھی کثرت کرتے ہیں اس لئے ان کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ اور ان کی بات کو اپنی بات کہا ہے۔ بحوالہ حدیث "بِیْ یُبْصِرُ وَ بِیْ یَسْمَعُ" (وہ مجھ سے ہی دیکھتے اور سنتے ہیں) چنانچہ مولانا فرماتے ہیں کہ اولیاء کی ہر بات گفتۂ الٰہی بن جاتی ہے اور ان میں سے بعض مشائخ کبار کو تو اللہ تعالیٰ نے "کن" کی کنجی عطا کر رکھی

ہے اور اللہ کے حکم سے جس چیز کو جیسے کہتے ہیں ویسے ہی ہو جاتی ہے۔

کاں دعائے شیخ نے چوں ہر دعا ست　فانی ست وگفتِ اُو گفتِ خُدا ست (۲۲۹۔۵)

(شیخ کی دُعا عوام کی طرح نہیں ہے، شیخ چونکہ فنافی اللہ ہے اس کا کہنا خدا کا کہنا ہوتا ہے۔)

گفتۂ اُو گفتۂ اللہ بود۔　گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود (x)

(اس کا کہا ہوا خدا کا کہا ہوا بن جاتا ہے، اگرچہ وہ خدا کے بندے کے حلق سے نکلی ہوئی بات ہو۔)

اللہ اللہ گفت اللہ می شود　ایں سخن حق است باللہ می شود (x)

(اس نے اللہ اللہ کہا اور فنافی اللہ ہو گیا، یہ بات حق ہے خدا کی قسم ایسا ہی ہوتا ہے۔)

۷۔ مولانا جلال الدین رومیؒ کے فرمودات

مقبولینِ بارگاہ کے سائے کے بغیر منزل نہیں ملتی

مولانا رومیؒ پر لکھی گئی ہماری تصنیف ''سوز و سازِ رومی'' ملاحظہ فرمائیں۔ مولانا رومؒ نے مثنوی کے دفتر اول کے چند اشعار میں روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک روز حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا کہ اے علی! تم بہادر پہلوان ہو لیکن اپنی پہلوانی پر اعتماد نہ کرنا بلکہ کسی اللہ والے کے سائے میں آنے کی کوشش کرنا۔ پھر فرمایا کہ لوگ جو عبادت کرتے ہیں ان کا مقصد قربِ الٰہی کا حصول ہوتا ہے۔ فرمایا اے علی! اگر تم اپنی عبادت میں قرب حاصل کرنا چاہتے ہو تو کسی خاص بندۂ خدا کا سایہ اختیار کر لو۔ جو شخص اطاعت اختیار کرتا ہے اس نے اپنے لئے کسی مخلص بندہ کی صحبت ضرور اختیار کی ہے۔

یا علیؓ از جملۂ طاعاتِ راہ　بر گزیں تو سایۂ خاصِ اِلٰہ (x)

(اے علیؓ! جملہ اطاعات جو قربِ الٰہی کے لیے کرتے ہو اس کی کامیابی کے لیے کسی خاص بندۂ خدا کا سایہ اختیار کر لو۔)

ہر کسے در طاعتے بگریختند　خویشتن را مخلصے انگیختند (x)

(جس نے بھی اطاعت اختیار کی اس نے اپنے لئے کسی مخلص کو ضرور اپنایا ہے۔)

تو برو در سایۂ عاقل گریز　تا رہی زاں دشمنے پنہاں ستیز

(تم بھی جا کر کسی عاقل مرد کے سایہ میں پناہ پکڑو، تب چھپے ہوئے دشمن یعنی نفس سے رہائی پاؤ گے۔)

چُوں گرفتی پیر ہیں تسلیم شو　ہمچو موسیٰؑ زیرِ حکم خضرؑ رو (۱۔۳۱۱)

(جب تمہیں پیر مل جائے تو اس کے آگے سرِ تسلیم خم کرو، جس طرح موسیٰؑ، خضرؑ کے حکم پر چلتے تھے۔)

پس تقرب جو بُدو سوئے اِلٰہ　سر مپیچ از طاعتِ اُو ہیچ گاہ

(پس اس وسیلہ سے اللہ کا قرب حاصل کرو، اور کسی وقت اس کے حکم کی سرتابی نہ کرو۔)

زانکہ اُو ہر خار را گلشن کند　دیدۂ ہر کور را روشن کند(۳۱۰۔۱)

(یہ اس لئے کہ وہ ہر خار کو گلشن بنا دیتا ہے، اور اندھوں کو آنکھ والا کر دیتا ہے۔)

دست گیرد بندۂ خاص اِلٰہ　طالباں را می برد تا پیش گاہ

(اللہ کا بندہ دست گیری کرتا ہے، اور طالبان حق کو قرب الٰہی تک پہنچاتا ہے۔)

گر بگویم تا قیامت نعتِ او　ہیچ آں را غایت و مقطع مجو(۳۱۱۔۱)

(اگر قیامت تک اس کی تعریف کروں، تو بھی اس کی تعریف ختم نہ ہو گی۔)

یار باید راہ را تنہا مَرو　از سَرِ خود اندریں صحرا مَشو

(خبردار! اس راہ کے لئے ساتھی چاہیئے تنہا نہ چلو، اپنی خودسری کے باعث اس صحرا میں تنہا نہ نکلنا۔)

ہر کہ تنہا نادرایں رہ را بُرید　ہم بعونِ ہمت مرداں رسید(۳۱۲۔۱)

(اگر کوئی تنہا اس راستے پر چلا، تو وہ بھی پیروں کی توجہ یا مدد سے ہی منزل پر پہنچا۔)

کور ہرگز کے تواند رفت راست　بے عصائش کور را رفتن خطاست

(اندھا ہرگز سیدھا نہیں چل سکتا، اندھے کا عصا کے بغیر چلنا خطا ہے۔)

ہر نبی و ہر ولی را مسلکیست　لیک تا حق می برد جملہ یکیست(۳۲۲۔۱)

(ہر نبیؑ اور ہر ولی کا خاص مسلک ہوتا ہے، لیکن سب حق تعالیٰ تک پہچانے میں ایک ہی ہوتے ہیں۔)

اولیاء، اللہ کے اہل و عیال کی مانند ہیں

(ان سے ڈرو ان کی نصیحت دل و جان سے قبول کرو)

مولانا رومؒ نے مثنوی کے تیسرے دفتر کے پہلے حصے میں ایک حکایت نقل کی ہے کہ ایک دفعہ ہندوستان میں ایک قافلہ لمبے سفر کے بعد ایک مقام پر پہنچا جہاں پر ایک بزرگ موجود تھا۔ قافلہ میں شامل لوگ سخت بھوک میں مبتلا تھے۔ اس بزرگ نے ان کی بھوک کا اندازہ لگا کر کہا کہ اس جنگل میں ہاتھی کے بچے بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ہاتھیوں کے بچوں کا شکار کر کے ان کو کھانا شروع کر دو۔ اس بزرگ نے کہا کہ ہاتھیوں کی مائیں جنگل میں چھپی رہتی ہیں۔ اگر تم نے ان پر بری نظر کی تو وہ ایک دم موقع پر پہنچ کر تمہارا خاتمہ کر دیں گی۔ اس قافلہ والوں نے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا اور جونہی ایک ہاتھی کے بچے کو مارا تو ہاتھیوں کے غول نے ان سب کو مار ڈالا اور قافلے کا خاتمہ کر دیا۔

مولاناؒ اس مثال کے بعد سمجھاتے ہیں کہ اولیاء اللہ بھی اسی طرح اللہ تعالیٰ کے عیال ہیں اور جو بھی ان کی

طرف بری نظر سے دیکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے معاف نہیں کرتا۔ اس بات کے ثبوت میں وہ ایک حدیث لاتے ہیں۔

اَلْمَخْلُوْقُ كُلُّهُمْ عَيَالُ اللّٰهِ "تمام مخلوق اللہ کے لئے اہل وعیال کی مانند ہیں"۔ (لطائف معنوی ص ۱۱۱)

یعنی مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اللہ کے نزدیک وہ شخص زیادہ محبوب ہے جو اس کے کنبے کو زیادہ نفع پہنچائے اور زیادہ برا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو اس کے کنبے کو زیادہ اذیت دے۔ رسالہ قشیریہ میں ہے۔ "اَلصُّوْفِيَّةُ اَطْفَالٌ فِي حِجْرِ الْحَقِّ" (یعنی صوفیہ اللہ کی گود میں بچوں کی مانند ہیں۔) کیونکہ بچے دنیا سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ:

اولیاء اطفالِ حق اند اے پسر در حضور و غیبت آگاہ باخبر

(اے عزیز من! اولیاء اللہ کے بچے ہیں، وہ غیبت اور حضور کی حالتوں سے خوب آگاہ ہیں۔)

غایبی مندیش از نقصانِ شاں کوکشد کیں از برائے جانِ شاں (۲۲۔۳)

(غائب ہونا ان کے لئے مضر نہیں، کیونکہ ان کی جان کے لئے (خدا) انتقام لیتا ہے۔)

گفت، اطفالِ من اند ایں اولیاء در غریبی فرد از کار و کیا

(اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ یہ اولیاء میرے بچے ہیں، اگرچہ کاروبارِ دنیا میں یہ بالکل الگ مشغول ہیں۔)

از برائے امتحان خوار و یتیم لیک اندر سرِّ منم یار و ندیم

(آزمائش کی وجہ سے یہ بے کس نظر آتے ہیں، لیکن در پردہ میں اِن کا مددگار اور ہم نشین ہوں۔)

پُشت دارِ جُملہ عصمتہائے من گوئیا ہستند خود اجزائے من

(وہ میری تمام حفاظتوں کی پناہ میں ہیں اور ایسے ہیں گویا وہ میرے اپنے ہی ٹکڑے ہیں۔)

ہاں و ہاں ایں دلق پوشانِ من اند صد ہزار اندر ہزار و یک تن اَند (۲۳۔۳)

(خبردار یہ گودڑی پوش میرے (بچے) ہیں، یہ ایک ارب کی تعداد میں ہیں اور ایک ہیں۔)

پندِ مرداں را پذیرا شو بجاں تا رہی از خوف و مانی در اماں (۲۱۔۳)

(مردان (حق آگاہ) کی نصیحت کو جان ودل سے قبول کرتا کہ تو خوف سے چھوٹ جائے اور امن میں آجائے)

اولیاء کی حیاتِ بے بہا سے سب کچھ ملتا ہے

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اولیاء اللہ کو وہ روحانی کیفیت عطا فرمائی ہے جس میں وہ ہمہ وقت اللہ کے ساتھ مشغول رہتے ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کو حیاتِ بے بہا عطا فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق

استوار کرنے کے بعد یہ باز سلطانی کی طرح بلند و بالا ہو کر اخلاق رذیلہ سے پاک ہو گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا نور ان پر سایہ کناں ہے اور یہ ہر وقت محبت الٰہی کی شراب میں مخمور نظر آتے ہیں کائنات کا نظام بھی انہیں کے دم قدم سے چل رہا ہے۔ یہ لوگ اللہ کی محبت کے نشہ میں مخمور رہتے ہیں اور وہ اس کیفیت سے باہر نکلنا نہیں چاہتے۔

اولیاء را در دروں ہم نغمہاست طالبان را زاں حیاتِ بے بہاست (۲۱۱۔۱)

(اولیاء کے دلوں میں ہزاروں نغمے ہوتے ہیں، جن سے طالبان حق کی حیات بے بہا وابستہ ہے۔)

اے تواضع بُردہ پیشِ ابلہاں وی تکبر کردہ تو پیشِ شہاں (x)

(اے مخاطب تو دنیاداروں کے سامنے تو تواضع کرتا ہے، اور اللہ والوں کے سامنے تکبر کرتا ہے۔)

بازِ سلطان گشتم و نیکو پیم فارغ از مردارم و کرگس نیم (x)

(میں شاہی باز بن گیا ہوں اور نیک خصلت ہو گیا ہوں، میں حرام خوری سے فارغ ہو گیا ہوں اور چیل کی طرح نہیں ہوں۔)

چوں بمردم از حواسات بشر حق مرا شُد سمع و ادراک و بصر (۳۲۶۔۱)

(چونکہ میں نے بشری حواس کو ختم کر ڈالا ہے، تو اب میرے سننے اور دیکھنے کا ادراک حق تعالیٰ کے نور سے ہے)

نورِ اُو در یمن و یُسر و تحت و فوق برسر و بر گردنم چوں تاج و طوق (x)

(حق تعالیٰ کا نور (میرے) دائیں بائیں اوپر نیچے ہر جگہ ہے، یہ نور میرے سر اور گردن میں تاج اور طوق کی مانند ہے۔)

بادہ در جوشش گدائے جوشِ ماست چرخ در گردش فدائے ہوشِ ماست

(شراب کا نشہ جوش کے لئے ہمارے جوش کا محتاج ہے، اور آسمان اپنی گردش میں ہماری ہوش مندی کے تابع ہے۔)

بادہ از ما مست شد نے ما ازو قالب از ما ہست شد نے ما ازو (۲۰۱۔۱)

(شراب کی مستی ہم سے ہے نہ کہ ہم شراب سے مست ہیں، ہمارا بدن ہماری وجہ سے ہے نہ کہ ہم بدن کی وجہ سے ہیں۔)

نعرۂ مستانہ خوش می آیدم تا ابد جاناں چنیں می بایدم (۱۰۵۔۶)

(مجھے نعرہ مستانہ بہت اچھا معلوم ہوتا ہے، میں قیامت تک اے محبوب اسی طرح دیوانہ رہنا چاہتا ہوں۔)

غیرِ آں زنجیرِ زُلفِ دلبرم گر دو صد زنجیر آری بَردرم (۱۹۶۔۵)

(زنجیر زلف محبوب کے علاوہ اگر تم دو صد زنجیریں بھی ڈالو گے تو میں توڑ دوں گا۔)

اولیاء اللہ باطن میں اللہ کا راستہ بنادیتے ہیں

جو لوگ اولیاء اللہ کے راستے کے علاوہ کوئی راستہ اختیار کرتے ہیں تو وہ استدلال، فلسفہ اور منطق کا ہی ہو سکتا ہے لیکن یہ راستہ نہایت بودا اور کمزور ہے۔ اس راستے سے وصال الٰہی بہت دور کی بات ہے، البتہ اولیائے کرام کی وساطت کے ساتھ دلوں میں قربِ الٰہی کا راستہ فوراً پیدا ہو جاتا ہے اور اس کے لئے اولیائے کرام اپنی نظرِ فیض سے غیر اللہ کی راہوں کو بند کر دیتے ہیں۔ نفس جو انسان کا دشمن ہے اس کے لئے بھی اولیاء کی صحبت ہی کیمیا گری کا کام کرتی ہے۔ تم اپنے گوشت پوست کے بدن کو اسی کیمیا سے درست کر سکتے ہو۔ اس مضمون پر بھی مولانا رومؒ نے بہت اشعار لکھے ہیں۔

پائے استدلالیاں چوبیں بُود پائے چوبیں سخت بے تمکیں بُود (۲۳۲۔۱)

(استدلال والوں کے پیر لکڑ کے پیروں کی طرح ہوتے ہیں، لکڑی کے پاؤں نہایت کمزور اور بودے ہوتے ہیں۔)

گر بہ بینی یک نَفَس حسنِ وَدُود اندر آتش افگنی جان و وجود

(اگر تو ایک لمحہ کے لئے اللہ کا حسن دیکھ لے، تو اپنی جان عظیم کو اس کی آگ کے نذر کر دے۔)

جیفہ بینی بعد ازاں ایں شُرب را چوں بہ بینی کرّ و فرِّ قُرب را (۳۰۷۔۴)

(اگر تم خدا کے قرب رکھنے والوں کی شان و شوکت دیکھ لو تو یہ دنیا تمہاری نظروں میں مردار نظر آنے لگے)

راہ کن در اندرونہا خویش را دور کن ادراک غیر اندیش را

(اپنے باطن میں اللہ کا راستہ بنالو اور غیر حق کا احساس اپنے سے دور کردو۔)

کیمیا داری دوائے پوست کن دشمنان را زیں صناعت دوست کن

(اے انسان تیرے پاس ایک کیمیا ہے، اس سے بدن کا علاج کر اور دشمنوں (نفس) کو اس کاریگری سے دوست بنا۔)

چوں شدی زیبا بداں زیبا رسی کہ رہاند روح را از بے کسی (۲۹۹۔۲)

(جب تیرے اخلاق اچھے ہو جائیں تو سمجھ لے کہ اچھوں کے پاس آ گیا، جو تیری روح کو بے کسی کی حالت سے نجات دلاتا ہے۔)

دنیا اور دین میں مناسبت قائم رکھنا

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اہل اللہ کسی دنیاوی مصلحت کے تحت اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنی دلی محبت کو منسلک نہیں ہونے دیتے۔ یہ لوگ جو بھی کام کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے لئے کرتے ہیں کسی ذاتی منفعت (خواہ وہ دنیاوی ہو

یا اخروی) کو پیش نظر نہیں رکھتے۔ خدا کی خوشنودی ان کا سب سے بڑا مدعا ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ دنیا اور آخرت دونوں کو خوش کرنا عاشقوں کا دستور نہیں ۔

عاشقاں را با مصالح کار نیست قصدِ ایناں جز رضائے یار نیست (×)

(عاشق لوگ دنیاوی مصلحتوں کو نہیں دیکھتے، ان کا مقصود رضائے یار کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔)

ہم خدا خواہی وہم دنیائے دوں ایں خیال است و محال است و جنوں (×)

(تم خداوند تعالیٰ کو چاہتے ہو اور کمینی دنیا کے بھی خواہاں ہو، یہ تو ایک خام خیال ہے محال ہے بلکہ جنون ہے)

با دو قبلہ در رہِ توحید نتواں رفت راہ یا رضائے یار باید یا رضائے خویشتن (×)

(دو قبلوں کے ساتھ توحید کے راستے پر چلا نہیں جاسکتا، یا تو اپنے یار کی راہ چاہیے یا اپنی خواہشات پر چلو)

نوٹ: یہاں دو قبلوں سے مراد ایک خانہ کعبہ اور دوسرا دنیا کو قبلہ کہا ہے۔

ایک عاشق لاکھوں سے بہتر ہے

مولانا رومؒ ایک حدیث نقل فرماتے ہیں جو امام مناوی کی کنوز الحقائق میں موجود ہے جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عام مومن اور خاص مقبول بارگاہِ الٰہی میں ایک اور ہزار سے زیادہ کی نسبت ہوسکتی ہے یعنی ایک مومن (خاص) ہزاروں عام مومنوں سے بہتر ہوتا ہے "لَيْسَ شَيْءٌ خَيْرًا مِّنَ اَلْفٍ مِثْلِهٖ اِلَّا الْاِنْسَانُ الْمُؤْمِنُ" (یعنی کوئی چیز اپنے جیسی ہزار چیزوں سے بہتر نہیں ہوسکتی سوائے مومن انسان کے (یعنی ایک مومن ہزاروں انسانوں سے بہتر ہوسکتا ہے)۔ کنوز الحقائق)۔

واحد کالالف کہ بود آں ولی بلکہ صد قرنست آں عبدالعلی (۱۷-۶)

(اکیلا ہزاروں کے برابر کون ہوسکتا ہے، بلکہ وہ اللہ کا بندہ جو ۱۰۰ قرن (سو سال) کے لوگوں سے بھی بہتر ہے وہ خدا کا ولی ہوتا ہے۔)

علامہ اقبالؒ نے غالباً اسی شعر سے متاثر ہو کر بال جبریل میں یہ شعر شامل کیا ہے۔

صحبتِ پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف
(ب،ج:۳۳۱)

اس شعر میں لاکھ حکیم سر بجیب سے مراد یہ ہے کہ لاکھوں فلسفی یا عاقل انسان اگر اپنے سروں کو گردنوں پہ لے کر حاضر ہو جائیں تب بھی ایک سر بکف کلیم پاک نسبت رکھنے والا عاشق الٰہی ان سے بہتر ہے۔ یہ فرق اسے طریقت کی راہوں پر چلنے کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ کسی نے اہل حال کے متعلق فرمایا ہے کہ ان لوگوں کو ان باتوں کا علم ہوتا ہے جو عابدوں اور زاہدوں کو نہیں۔

راز درونِ پردہ ز رندانِ مست پرس　　کایں حال نیست زاہدِ عالی مقام(×)
(یعنی پردۂ راز کے حالات مست رندوں سے پوچھ، کیونکہ یہ حال زاہد عالی مقام کا نہیں ہے۔)

نیاز مندوں کو ہی مرشد کی عطا ہوتی ہے

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ جو لوگ نیاز مندی کی وجہ سے خود کو کتوں سے بہتر نہیں سمجھتے، وہی لوگ پیروں کے فیض کی وجہ سے فرشتوں سے زیادہ شرف حاصل کر لیتے ہیں۔ کسی طالب کی ارادت درست ہو تو وہ فیض سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ اگر سامعین باذوق ہوں تو مقرر اگرچہ مردہ بھی ہو تو زندہ دل ہو جاتا ہے۔ اس کا اندازِ تقریر بہت بہتر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی اولیاء سے عقیدت رکھے تو ان عنایات سے مالا مال ہو جاتا ہے۔

چوں گزیدی پیر نازک دل مباش　　ست و ریزندہ چو آب وگل مباش (۳۱۲۔۱)
(جب پیر پکڑ لیا تو نازک دل نہ بنو، کیچڑ کی طرح گرے پڑے ست نہ بن جاؤ۔)

گر بامر پیر رفتی ایں طریق　　مست گردی عاقبت ہم زیں رحیق
(اگر اس راہ کو پیر کے حکم کے مطابق طے کر لیا، تو ایک دن خالص شراب معرفت سے ضرور مست ہو جاؤ گے)

گر ہزاراں طالب اند و یک ملول　　از رسالت باز می ماند رسول
(اگر مجلس میں ہزاروں طالب ہوں اور ایک معترض ہو، تو اس کی نحوست سے آمد مضامین بند ہو جائے گی)

ازیں بر ملائک شرف داشتند　　کہ خود را بہ از سگ نہ پنداشتند
(اسی سبب سے ملائکہ پر شرف رکھتے ہیں، کہ وہ خود کو کتے سے زیادہ نہیں سمجھتے۔)

کے رسانند آں امانت را بہ تو　　تا نہ باشی پیشِ شاں راکع دوتو (۳۴۵۔۳)
(یہ امانت (عاجزی کی) تمہیں کس طرح پہنچائیں، جب تک تو ان کے سامنے نیاز مندی نہ دکھائے۔)

مستمع چوں تشنہ و جُویندہ شد　　واعِظ ار مُردہ بُوَد گویندہ شد
(سامعین میں اگر نیاز مندی اور تشنگی ہو، تو واعظ اگر مردہ بھی ہو تو وہ زندہ ہو جاتا ہے۔)

ہر چہ را خوب و خوش و زیبا کنند　　از برائے دیدۂ بینا کنند (۲۵۶۔۱)
(جو شخص آرائش اور زیبائش کرتا ہے، وہ آنکھ والوں کے لئے کرتا ہے (اندھوں کے لئے نہیں۔)

دید آں مرشد کہ اُو ارشاد داشت　　تخمِ پاک اندر زمینِ پاک کاشت (۱۶۹۔۱)
(مرشد نے جب دیکھا کہ وہ استعداد رکھتا ہے، تو اس نے اس کے پاک دل کی زمین میں معرفت کا بیج بو دیا)

مرشد خدا کا سایہ ہوتا ہے

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اس آفت زدہ زمانے میں کسی مرشد کو بلا تاخیر تلاش کرنے کی کوشش کرو۔ مرشد خدا

کا سایہ ہے۔ اس کے ذریعے خدا سے جا ملو۔ یاد رکھو اس راہ پر چلنے کے لئے جو فاسد خیالات دل میں آئیں گے وہ ابلیس لعین کی طرف سے ہوں گے۔ فرماتے ہیں کہ ہم نے حسد کے سر پر خاک ڈال دی ہے اور تم بھی ایسے ہی کرو اور اس سعادتِ ازلی کو حاصل کرو۔

سایۂ یزداں بُود بندہ خدا مردۂ ایں عالم و زندہ خدا

(خدا کا خاص بندہ (مرشد) خدا کا سایہ ہوتا ہے، اس عالم کا مردہ خدا کے ساتھ زندہ ہوتا ہے۔)

دامنِ اُو گیر زوتر بے گماں تارہی از آفت آخر زماں (۱۔۴۳)

(جلد اور بلا تامّل اس مرشد کا دامن پکڑ لے تا کہ اس آخری زمانے کی آفت سے نجات پالے۔)

اندریں وادی مرو بے ایں دلیل "لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ" گو چوں خلیلؑ

(وادی (سلوک) میں بغیر دلیل (مرشد) کے نہ چل، خلیلؑ اللہ کی طرح کہو کہ میں فنا ہونے والوں کو پسند نہیں کرتا۔)

رو زِ سایہ آفتابے را بیاب دامن شہ شمس تبریزی بتاب

(جاؤ سایۂ آفتاب (مرشد کے ذریعے) راستہ پالو اور شمس تبریز کے دامن کو پکڑ لو۔)

رہ نہ دانی جانبِ ایں سُور و عُرس از ضیاء الحق حُسام الدّین پرس

(اگر اس بافیض اور پر رونق مجلس کی راہ نہیں جانتے، تو جاؤ ضیاء الحق حسام الدّین سے پوچھو۔)

در حَسَد گیرد ترا در رہ گلو در حَسَد ابلیس را باشد غلو

(اگر اس راہ میں حسد تیرا گلہ دبا دے، تو یاد رکھو حسد میں ابلیس تجھ سے زیادہ غلو میں ہے۔)

کو زِ آدم ننگ دارد از حَسَد با سعادت جنگ دارد از حسد

(حسد کی وجہ سے ہی تو ابلیس بے ادب ہو گیا، اور وہ حسد کے سبب ہی نیکی سے جنگ کرتا ہے۔)

خانماں از حسد گردد خراب باز شاہی از حسد گردد غُراب (۱۔۴۴)

(حسد کے سبب کئی گھر اجڑ گئے اور شاہی باز حسد کے باعث کوا بن گیا ہے۔)

خاک شو مردانِ حق را زیرِ پا خاک بر سَر کُن حسد را ہمچو ما (۱۔۴۵)

(مردان حق کے پیروں کی خاک بن جاؤ، اور ہماری طرح حسد کے سر پر خاک ڈال دو۔)

تلاشِ مرشد میں در بدر پھرو

جو شخص خود کو راہِ طریقت پر گامزن کرنا چاہے تو اسے لازم ہے کہ وہ ایک بزرگ کے پاس نہیں بہت سے بزرگوں کی صحبت میں رہے (اور پھر ایک کو اپنے لئے متعین کرلے) تا کہ منزلِ مقصود تک پہنچ کر آفتاب سے

بھی زیادہ رخشندہ بن جائے۔

فاختہ ساں روز و شب گو گو و گو   گنج پنہانی زدرویشے مجو

(فاختہ کی طرح رات دن کوکو کی طرح ذکر کرو اور پوشیدہ خزانہ کسی ایک درویش سے حاصل نہ کرو۔)

در بدر میگرد و می رو کو بکو   جستجو کن، جستجو کن، جستجو(۲۔۲۱۳)

(تو ہر دروازہ اور ہر گلی میں پھر، اور خوب جستجو کرتا ہی رہے۔)

رو بخسپ اندر پناہے مقبلے   بو کہ آزادت کند صاحب دلے

(پھر جا اور کسی مقبول کی پناہ میں سو جا، ہوسکتا ہے وہ صاحب دل تجھے (غموں سے) آزاد کردے۔)

تاتوانی زاولیاء بر متاب   جہد کُنْ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ

(جس قدر ہو سکے اولیاء سے اپنا منہ نہ پھیر، کوشش جاری رکھ اللہ خوب جاننے والا ہے۔)

گر سفر داری بدیں نیت برو   در حضر باشد ازیں غافل مشو

(اگر سفر میں جاؤ تو اسی نیت سے جاؤ، اور اگر حضر میں رہو تو اس مقصد سے غافل نہ ہو۔)

سایۂ شاہاں طلب ہر دم شتاب   تا شوی زاں سایہ بہتر زآفتاب(۲۔۲۱۴)

(ان بادشاہوں کا سایہ ہر وقت طلب کر، کہ اس سائے کی بدولت تم آفتاب سے بہتر بن جاؤ گے۔)

ور نہ خواہی خدمتِ ابنائے جنس   دردہانِ اژدہائی ہمچو خرس(۲۔۱۹۳)

(اگر تم ہم جنسوں کی خدمت کو پسند نہیں کرو گے، تو تم اس طرح ہو جاؤ گے جیسے اژدھے کے منہ میں ریچھ ہو)

پیر کو مضبوطی سے پکڑلو

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ جب تم کسی کامل مرشد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ تو پھر ڈھیلے ڈھالے آدمی کی طرح سست نہ رہو بلکہ طریقت کو اخذ کرنے کے لئے مستعد ہو جاؤ۔

چوں گزیدی پیر نازک دل مباش   سست و ریزندہ چوں آب و گِل مباش

(جب تو پیر پکڑ لے تو نازک دل نہ بن جا، اور مٹی و پانی کی طرح گرا پڑا سست و نازک نہ بن جا۔)(۲۔۳۱۲)

مرید ار عاشقے پیرے نباشد   مراد را ہیچ تدبیرے نہ باشد(x)

(مرید اگر پیر کا عاشق نہ ہو تو اس کی مراد حاصل ہونے کی کوئی صورت نہیں بنتی۔)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی تیز پا مرشد کے ہمراہ ہو جاؤ گے تو وہ تمہیں منزل مقصود پر آسانی سے لے جائے گا۔ آپ نے چیونٹی کی مثال پیش کی کہ جب اس نے کبوتر کے پاؤں تھام لئے تو کچھ عرصے میں خانہ کعبہ پہنچ گئی۔

مور مسکین ہوسے داشت کہ در کعبہ رسید پنجہ در پائے کبوتر زد و ناگاہ رسید(x)
(ایک بے بس چیونٹی کو کعبے پہنچنے کی خواہش ہوئی، تو اس نے کبوتر کے پنجے کو پکڑ لیا اور اچانک پہنچ گئی۔)

خودساختہ و جعلی پیر سے بچو

علماء کرام اور مشائخ عظام جہاں ضرورتِ شیخ کی تاکید کرتے ہیں وہاں نااہل اور جعلی پیروں سے اجتناب کرنے کا حکم بھی دیتے ہیں۔ صوفیائے کرام کا قول ہے کہ پہلے شیخ کی تلاش میں لگے رہو اور جب تمہیں کوئی مناسب (شریعت پر پابندی کرنے والا) شیخ نظر آ جائے تو اسے مضبوطی سے پکڑ لو۔ مولاناؒ فرماتے ہیں۔

چوں بسے ابلیس آدم روئے ہست پس بہ ہر دستِ نشاید داد دست(۶۲۔۱)
(چونکہ بہت سے ابلیس انسان کی شکلوں میں ہوتے ہیں، اس لئے ہر کسی کے ہاتھ میں ہاتھ نہیں دینا چاہئے)

زاں کہ صیاد آورد بانگِ صفیر تا فریبد مرغ را آں مرغ گیر
(یہ اس لئے کہ صیاد چڑیوں جیسی آواز بناتا ہے، حتیٰ کہ جانور پکڑنے والا جانوروں کو دھوکے میں ڈال دیتا ہے)

بشنود آں مرغ بانگِ جنسِ خویش از ھوا آید بیابد دام و نیش(۶۳۔۱)
(وہ جانور جب اپنے ہم جنس کی آواز سنتا ہے تو ہوا سے اتر آتا ہے اور جال میں پھنس جاتا ہے۔)

حضرت داتا گنج بخشؒ کے استدلال شیخ کے ... میں جعلی پیروں کا تذکرہ گزر چکا ہے۔ راقم الحروف نے سروس کے دوران اپنے ہی دفتر میں ایسے ہی پیروں کا مشاہدہ کیا ہے جن کو علومِ دینیہ سے تقریباً نا آشنائی تھی اور وہ پابندِ شریعت بھی نہ تھے البتہ انہیں باتوں کا اسقدر کمال تھا کہ بھولے بھالے آدمی ان کی چرب لسانی میں گرفتار ہو جاتے تھے۔ ان کو دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ ایسے نالائق لوگ ایسے ہی نالائق پیروں کے پاس پھنس جاتے ہیں اور بلند معیار کے لوگ بلند معیار کے پیر مل جاتے ہیں۔ اگر ایسے کم علم پیروں کی نیت میں خلل نہ ہو تو یہ دیہاتیوں اور سادہ لوح لوگوں کی راہنمائی اور دیگر ضروریاتِ دینیہ کو پورا کر سکتے ہیں۔

جس قدر جعلی پیر دیکھنے میں آتے ہیں، بظاہر تو کوئی بھی یہ بات نہیں کہتا کہ میں جعلی پیر ہوں لیکن مریدوں کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ وہ بیعت سے پہلے اس شیخ کی اچھی طرح شناخت کر لیں اور یونہی ہاتھ میں ہاتھ نہ دیں۔ پیر کی سب سے اکمل پہچان یہ ہے کہ وہ شریعت کا پابند ہو، اس کے پاس بیٹھنے سے طبیعت نیکیوں کی طرف راغب ہو جائے اور اس کی صحبت میں آنے والے لوگ بھی پابندِ صوم وصلوٰۃ ہونے لگیں۔ پیر کی پہچان پر ایک الگ مضمون لکھ دیا گیا ہے۔ البتہ یہ بات بھی درست نہیں کہ کسی کو اچھے بھلے پیر میں عیوب نظر آئیں اور اس کا یقین کسی کامل شیخ پر بھی قائم نہ ہوتا ہو۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں ایسے بے نور دلوں پہ مشائخ کرام کی باتوں کا اثر نہیں ہوتا۔

بس کلام پاک در دلہائے کور می نہ پاید می رود تا اصلِ نُور (۴۴۔۲)

(کچھ پاک کلمات بے نور دلوں پر اثر نہیں کرتے، بلکہ وہ کلمات حق تعالیٰ کی طرف چلے جاتے ہیں۔)

پیشوا بڈھا چاہیے بڈھا!

طریقت میں لفظ پیر کے معنی بڈھے کے ہیں، اس لئے پیرِ طریقت کو بڈھا ہی کہتے ہیں خواہ وہ جوان ہو یا بڈھا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ عام بڈھوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اسے بے شمار بیماریاں (جوانی کی غلط کاریوں کے سبب) لاحق ہو جاتی ہیں مگر پیرِ طریقت کی یہ حالت نہیں ہوتی کیونکہ یادِ حق میں مست رہنے اور ذکرِ الٰہی میں مشغولیت کے سبب دنیا و اہلِ دنیا کی طرح حسد و بغض میں ہرگز ملوث نہیں ہوتا اور پاکیزہ زندگی بسر کرتا ہے۔ ایسی حالت میں اگرچہ دیکھنے کو وہ بڈھا بھی ہو لیکن باطن میں وہ بچے کی طرح معصوم ہوگا۔ یہ بات اولیاءؒ اور انبیاءؑ پر صادق آتی ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ بڈھے کا احترام کرو۔ اس کے علاوہ پیر اگر بڈھا ہوگا تو اس میں سنجیدگی، زہد، تقویٰ اور طیب زندگی کے آثار موجود ہونے کے امکانات زیادہ ہوں گے۔ ایسا بڈھا تمام روحانی اور جسمانی بیماریوں سے پاک ہوگا، چنانچہ مثنوی میں مولاناؒ نے بخاری شریف کی اس حدیث کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ پیشوا بڈھا چاہیے "کَبِّرُوا الْکِبَرَ اَلْکِبَرُ اَلْکِبَرُ" (بہت بوڑھے کا احترام کرو۔)۔

ہم تو گفتستی و گفتِ تو گوا پیر باید پیر باید پیشوا (۱۹۹۔۴)

(آپ ﷺ ہی نے فرمایا ہے اور آپ کا فرمان گواہ ہے، کہ پیشوا بڈھا چاہیئے بڈھا۔)

از بروں پیر است و در باطن صبی خود کیانند آں ولی و آں نبی (۲۹۲۔۲)

(بظاہر وہ بڈھا ہے اور باطن میں بچہ ہے، جانتے ہو وہ کیا ہیں؟ وہ ولی ہیں اور نبی ہیں۔)

مرشد کا نور گناہوں کی آگ کو ٹھنڈا کر دیتا ہے

مولانا رومؒ دفتر دوم کے حصہ دوم میں فرماتے ہیں کہ جب مومن پلِ صراط سے گزرے گا تو جہنم کی آگ اس سے خوشامدانہ لہجے میں کہے گی کہ اے مومن ذرا جلدی سے گزر جا تا کہ تمہارا نور میری آگ کو ٹھنڈا نہ کر دے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اگر بدیوں کی آگ کو بجھانا چاہتے ہو تو کسی مومن کامل کا نور ہی اس کو بجھا سکتا ہے، جس طرح مومن کا نور جہنم کی آگ کو ٹھنڈا کر دیتا ہے، اس لئے اس کی صحبت میں چلے جاؤ۔ نور اور نار کا باہم ضد ہونا اس وقت سمجھ نہیں آئے گا کیونکہ قیامت کے روز ہی یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ آگ قہرِ الٰہی کا مظہر ہے اور نور فیضِ خداوندی ہے۔ اسی طرح دنیا میں بدی کا دور ہونا بھی مرشد کے نورِ ہدایت کے باعث ہو سکتا ہے۔ یہ کلام کسی مرشد کی راہبری اختیار کرنے کی دلیل پیش کرتا ہے۔

گویدش بگذر زمن اے شاہ زود ہیں کہ نورت سوزِ نارم را ربود

(دوزخ اس کو کہے گی اے شاہ مجھ سے جلدی گزر جا، دیکھو تمھارے نور نے میری آگ کی سوزش کو اڑا دیا ہے)

پس ہلاکِ نار نورِ مومن ست زانکہ بے ضد دفع ضد لا یمکن ست

(پس (برائیوں کی) آگ کو بجھانا مومن کے نور سے ہے، کیونکہ ضد کے بغیر ضد کا ازالہ کرنا ناممکن ہے۔)

گر ہمی خواہی تو دفعِ شرِّ نار آبِ رحمت بر دل آتش گمار

(اگر تم آتش کے شر کو دفع کرنا چاہتے ہو تو (شیخ کے) آبِ رحمت کو اس آگ کے اندر ڈال دو۔)

چشمۂ آں آبِ رحمت مومن ست آبِ حیواں روح پاک محسن ست

(یہ مومن (مرشد) آبِ رحمت کا چشمہ ہے، اور اس محسن کی روح پاک آبِ حیواں ہے۔)

حس و فکرِ تو ہمہ از آتش ست حسِ شیخ و فکرِ او نورِ خوش ست

(تیری حس اور فکر دوزخ کی آگ کی طرح ہے، اور شیخ کی حس اور فکر ایک عمدہ نور ہے۔)

آبِ نورِ او چو بر آتش چکد چک چک از آتش برآید بر جہد (۱۲۸-۲)

(جب اس نور کا پانی تمہاری (برائیوں) کی آگ پر گرے گا تو اس آگ سے چڑ چڑ کی آواز آئے گی اور وہ بجھ جائے گی۔)

اولیاء اللہ اپنے نفس کی سرزنش کرتے ہیں

نفس ہی وہ چیز ہے جو انسان کو گمراہی کے گڑھے میں لے ڈوبتا ہے اور نفس کی مخالفت پر ہی انسان فرشتوں پر فضیلت حاصل کرتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہی ایک ایسی چیز ہے کہ جس پر غالب آنے سے انسان بلند درجات تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ تمام اولیائے کرام کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ اولیائے کرام جو زمانے بھر میں ممتاز ہوئے انہوں نے نفس کی تادیب کی اور اس کے بعد وہ ان مقامات پر پہنچے جو دوسروں کو حاصل نہیں ہو سکے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں ایسے شخص کا دامن پکڑ لو جو تمہارے نفس کو ختم کر ڈالے۔ (دامن آں نفس کش محکم بگیر) فرماتے ہیں کہ نفس ایک کتا ہے اور کتے کے گلے میں زنجیر نہ ہو تو تنگ کرتا ہے۔ آپ نے نفس کا معاملہ نمرود اور ایوب علیہ السلام کی حسب ذیل مثالوں سے واضح فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نمرود کو سمندر میں غرق ہونے سے بچایا اور اس کی پرورش کروائی لیکن وہ نفس کے ہاتھ سے ہی اللہ تعالیٰ سے نبرد آزما ہوا۔ روایت ہے کہ حق تعالیٰ نے عزرائیل علیہ السلام سے پوچھا کہ تم نے اتنے لوگوں کی جانیں نکالیں تم کو سب سے زیادہ رحم کس پر آیا؟ عرض کی الٰہی سب ہی کی جان نکالنے پر میرا دل سوختہ ہوتا ہے مگر آپ کے حکم کی تعمیل کرتا ہوں۔ فرمایا سب سے زیادہ کس پر دل غمگین ہوا؟ عرض کیا کہ ایک واقعہ نے

میرے دل میں گہرے اثرات چھوڑے ہیں وہ یہ کہ جب ایک کشتی والوں کے لئے آپ نے حکم دیا کہ سب کی جان نکال لو سوائے ایک عورت اور اس کے بچے کے، تو ہم نے کشتی توڑ دی اور حکم کی تعمیل کی۔ ماں اور بچہ ایک تختہ پر رہ گئے اور کنارے لگے۔ اس پر میرا دل خوش ہوا۔ پھر آپ نے حکم دیا کہ اس عورت کی جاں نکال لو اور بچہ کو تنہا چھوڑ دو۔ آپ کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ مگر اس پر مجھے سخت غم ہوا اور اس کی بے کسی اب تک میرے تصور اور خیال سے نہیں گئی۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

نیست کسبے از توکل خوب تر چیست از تسلیم خود محبوب تر (۱۱۹_۱)

(کوئی کوشش، توکل سے بہتر نہیں ہے، رضا و تسلیم سے زیادہ محبوب کیا چیز ہے؟)

حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اب تم اس بچے کا ماجرا سنو۔ میں نے ہواؤں کو حکم دیا کہ اس کو ایسے جنگل میں لے جاؤ جہاں بہترین پھل پھول آب شیریں کے چشمے، میوے دار درخت، خوبصورت پرندوں کی آوازیں، برگِ نسرین کا بسیرا ہو اور جہاں کوئی آفت نہ ہو۔ ہواؤں کو، سورج کو، پانی کو، بجلیوں کو اور ہر ایک چیز کو حکم دیا کہ اس بچے کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے یہاں تک کہ خزاں کو حکم دیا کہ اعتدال کو سلب مت کرے۔ ایک مادہ چیتے کو حکم دیا کہ اس کو دودھ پلائے غرضیکہ میں نے اس (نمرود) پر اتنے انعامات برسائے کہ اس کو کسی سبب سے مصیبت میں نہ ڈالا اور اس سے میری منشاء یہی تھی کہ وہ کسی سبب کی طرف نظر نہ کرے اور یہ عذر نہ پیش کرے کہ میں اسباب کی مشکلات میں پھنس کر اللہ کی طرف توجہ نہ کر سکا اور اس کو اس طرح ہر شر سے محفوظ رکھا تاکہ اس کو شکوہ نہ ہو کہ فلاں نے مجھے گمراہ کر دیا مگر اے عزرائیل اس بچے نے میرا کیا شکر ادا کیا۔ یہی بچہ نمرود ہو گیا اور اس نے میرے خلیل کو آگ میں جلانے کے لئے سامان تیار کیا لیکن میں نے اس آگ کو گلزار کر دیا (جنات نے اس کا دودھ چھڑایا اور اس کو بولنا سکھایا اور اس کی اس طرح پرورش کی کہ تمہاری عقل دنگ رہ جائے۔) اللہ تعالیٰ نے کہا میں نے ایوب علیہ السلام کے بدن سے کیڑوں کی پرورش کروائی اور ان کیڑوں پر باپ جیسی شفقت عطا کی یہاں تک کہ اگر کوئی کیڑا جسم سے دور ہو جاتا تو انہیں (ایوب علیہ السلام کو) ایسے محسوس ہوتا کہ میری اولاد میں سے کوئی مجھ سے دور ہو گیا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں۔

دادہ من ایوبؑ را مہر پدر بہر مہمانی کرماں بے ضرر

(میں نے ایوب علیہ السلام کو باپ کی سی محبت دی تھی، وہ کیڑوں کی مہمانی کے لئے بے ضرر تھے۔)

مادراں را مہر من آموختم چوں بُوَد شمعے کہ من افروختم (۴۶۴_۶)

(ماؤں کو محبت بھی میں نے سکھائی ہے، وہ کیسی شمع ہو گی جس کو میں نے روشن کیا ہو۔)

نفس کتا ہے اس کے گلے سے زنجیر نہ کھولو

مولانا روم فرماتے ہیں کہ یہ نفس نہایت خطرناک دشمن ہے اس سے پناہ مانگتے رہو۔ دوسروں کے لئے گمراہی کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے مگر نمرود اتنی نعمتوں کے باوجود نفس کا شکار ہو گیا۔ جہاں گمراہ کرنے والا کوئی نہیں ہوتا وہاں نفس گمراہ کن ہوتا ہے اس لئے اچھے ساتھی کی تلاش کرنا ضروری ہے تا کہ نفس کی برائیوں سے بچ سکو۔

گرگ درّندہ است نفسِ بد یقیں چہ بہانہ می نہی بَر ہر قریں

(نفس بدیقین ہے اور درندہ ہے، تم اپنے ساتھیوں پر اپنی گمراہی کا کیا الزام دیتے ہو۔)

زیں سبب می گویم اے بندۂ فقیر سلسلہ از گردن سگ بَر مگیر (۴۶۵۔۲)

(اس لئے کہتا ہوں کہ اے بندۂ فقیر، اس کتے کی گردن سے زنجیر مت کھولو۔)

اگر کسی بری صحبت سے مغلوب ہو جاؤ تو اس کا علاج یہ ہے کہ کسی اللہ والے کے ساتھ تعلق قائم کرو تا کہ اس کی آہِ سحر گاہی اور دعاؤں اور صحبت کی برکت سے تم بھی غالب ہو جاؤ۔

یار غالب شو کہ تا غالب شوی یارِ مغلوباں مَشو ہیں اے غوی (۲۷۵۔۴)

(غالب الاحوال یار کی تلاش کرو تا کہ غالب رہو، خبردار اے غافل مغلوب الاحوال کے یار نہ بنو۔)

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بھی یہی حکم فرمایا ہے۔

وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ (لقمان:۱۵) ”اور پیروی کرو ان کے راستے کی جو میری طرف مائل ہو“۔

جو کشتی بان نہ ہو وہ کشتی نہ چلائے

مولانا روم نے ایک مثال پیش کی ہے کہ جنگل میں ایک اونٹ چر رہا تھا وہاں ایک چوہے نے مذاق ہی مذاق میں اونٹ کی مہار پکڑی اور بھاگنے لگا۔ اونٹ نے بھی کہا چلو مذاق ہی سہی، دیکھیں یہ کیا کرتا ہے چوہا جدھر لے جاتا اونٹ بھی ادھر ہی چلا جاتا۔ چوہا اونٹ کو اپنی اِتباع میں دیکھ کر بڑے فخر سے جا رہا تھا اور دل میں کہہ رہا تھا کہ اتنے بڑے عظیم جانور کو میں نے اپنے قبضہ میں کر لیا ہے۔ چلتے چلتے دریا آ گیا اور چوہا ڈر کے مارے کھڑا ہو گیا۔ اونٹ نے کہا۔

ایں توقف چیست حیرانی چرا پا بنہ مردانہ اندر جُو در آ (۳۲۳۔۲)

(یہ توقف کیسا؟ حیرانی کیوں؟ دریا میں مردانہ وار قدم رکھ دے۔)

چوہے نے کہا میں ڈوب جانے کا خوف کرتا ہوں۔ اونٹ نے کہا میں دیکھتا ہوں کہ پانی کتنا ہے پھر کہا

گھٹنے تک پانی ہے آجاؤ خیر ہے۔ اس نے کہا تمہارا گھٹنا تو میرے قد سے کئی گنا زیادہ ہے۔ اونٹ نے کہا تم تو بڑے فخر سے میری راہنمائی کر رہے تھے میں نے تیری اقتداء اس لئے کی تھی کہ تیری حماقت اور زیادہ ہو جائے۔ چوہے نے کہا میری توبہ میں تو ڈوب جاؤں گا، میں اب تمہارا پیشوا نہیں بنوں گا۔

گفت توبہ کردم از بہر خدا　بگذراں زیں آبِ مہلک مر مرا (۲۔۳۲۴)

(چوہے نے کہا میں نے توبہ کی اللہ کے لئے، اب میری جان اس خطرناک پانی سے چھڑالو۔)

اونٹ کو اس کی توبہ پر رحم آگیا اور کہا اچھا آجاؤ اور میری کوہان پر بیٹھ جاؤ اور تیرے جیسے سو چوہے اور بھی بیٹھ جائیں تو بھی میں اس پانی سے سب کو بحفاظت گزار سکتا ہوں۔ اس کے بعد مولانا قارئین کو نصیحت فرماتے ہیں کہ اگر تم بادشاہ نہیں تو رعایا بن کر رہو اور اگر کشتی بان نہیں ہو تو کشتی مت چلاؤ۔

تو رعیت باش چوں سلطاں نہٗ　تنگ مراں چوں مردِ کشتی باں نہٗ (۲۔۳۲۴)

(تو رعایا بن کر رہ اگر خدا نے تجھے حاکم نہیں بنایا، اور کشتی نہ چلا جب تجھے کشتی بانی نہیں آتی۔)

خدمت اکسیر کن مس وار تو　جور می کش اے دل از دلدار تو (۲۔۳۲۶)

(تانبے کی طرح اہلِ کیمیا کی خدمت کر، اور اے دل! کسی اللہ والے کی ناز برداری برداشت کر۔)

اللہ والوں کی شان بہت بلند ہے کیوں کہ ہفت اقلیم سے ان کے دل کا رابطہ قائم ہو چکا ہے اس چوہے کی طرح انہیں حقیر نہ سمجھو اگر تم ان پر برتری کا احساس رکھو گے تو محروم اور ذلیل ہو جاؤ گے اور ان کی پیٹھ پر بیٹھنے کے علاوہ راستہ پار نہیں ہو سکتا۔ اس چوہے کی طرح توبہ کرنی ہوگی۔

اولیاء کو اپنے جیسا قیاس نہ کرو

مولانا رومؒ نے مثنوی کے دفتر اوّل میں لکھا ہے کہ بہت سے لوگ بزرگوں کو اپنی طرح قیاس کرتے ہیں اور ان کی صلاحیتوں اور خوبیوں کا انکار کرتے ہیں۔ آپ نے اس زندہ حقیقت کو ایک مثال دے کر واضح کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک بقال (سبزی فروش) نے ایک خوش رنگ اور خوشنما طوطی پال رکھا تھا، جو اس کی دکان پر بیٹھ کر دکان کی نگہبانی کرتا اور سودا خریدنے والوں کے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں کرتا، اس طوطی کی وجہ سے ہر کوئی اس دکان سے سودا خریدنے کی کوشش کرتا۔ ایک دن دکاندار گھر گیا ہوا تھا اور طوطی دکان کی نگہبانی کر رہا تھا کہ اچانک ایک بلی دکان میں موجود ایک چوہے پر کودی تو طوطی اڑ کر دکان کے ایک کونے میں چلا گیا اسکی اڑان سے روغن بادام کی شیشیاں گر کر ٹوٹ گئیں۔ دکاندار آیا تو اس نے دکان کے کچھ حصوں کو تیل سے تر پایا اور ٹوٹی ہوئی بوتلوں کو دیکھ کر اسے بہت طیش آیا۔ اس نے طوطی کی ایسی مرمت کی کہ اس کے سر کے بال گر گئے اور بے چارہ گنجا ہو گیا۔ مار کھانے کے بعد طوطی دکاندار سے ناراض ہوا اور اس نے مالک اور گاہکوں سے بات چیت

ترک کردی۔ اس کا ردیہ دیکھ کر مالک بہت شرمندہ اور پشیمان ہوا۔

تین دن کے بعد طوطی کی حالت کو دیکھ کر مالک اور زیادہ پریشان اور نا اُمید ہو گیا اور طوطی کو رضامند کرنے کے لئے بار بار اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا کہ شاید کسی طرح طوطی بولنے لگے۔ کبھی وہ طوطی کو پکڑ کر لوگوں کے سامنے کرتا کہ شاید یہ ان ہی سے بات کرلے لیکن طوطی سخت ناراض تھا اور دکاندار کی کوئی تدبیر کام نہ آئی۔ اتفاق سے ایک دن دکان کے سامنے سے ایک قلندر کا گزر ہوا، جس کا سر گول اور طشت کی طرح تھا اور اس پر ایک بھی بال نہ تھا۔ جب وہ دکان کے سامنے آیا تو طوطی اسی وقت بول پڑا اور اس قلندر سے بآواز بلند کہنے لگا کہ اے گنجے! تو کیسے گنجا ہو گیا۔ شاید تو نے بھی روغن کی شیشی گرائی ہوگی اور تیری اس غلطی پر تیرے آقا نے تجھے مار مار کر گنجا کر دیا ہوگا، طوطی کی یہ بات سن کر لوگ بے تحاشا ہنسنے لگے کہ طوطی نے اس کمبل پوش فقیر کو اپنے جیسا تصور کیا ہے۔ اس مثال کے بعد مولانا سمجھاتے ہیں کہ اسی طرح ظاہر پرست لوگوں نے اولیائے کرام رحمۃ اللہ علیہم کو بھی اپنے جیسا خیال کیا ہے اور ان کے متعلق طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں، لہٰذا مولاناؒ درج ذیل اشعار میں نصیحت فرماتے ہیں۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر گرچہ باشد در نوشتن شیر شِیر (۱۔۵۸)

(پاک لوگوں کے معاملہ کو اپنے اوپر قیاس نہ کرو، اگرچہ لکھنے میں شیر (درندہ) اور شیر (یعنی دودھ) ایک جیسے ہیں۔)

جملۂ عالم زیں سبب گمراہ شد کم کسے زِ اَبدالِ حق آگاہ شد (۱۔۵۸)

(دنیا کے بہت سے لوگ اسی سبب گمراہ ہوئے، بہت کم لوگ خدا کے ابدالوں سے آگاہ ہیں۔)

اشقیاء را دیدۂ بینا نہ بود نیک و بد در دیدہ شاں یکساں نمود

(بدبختوں کو دیکھنے والی آنکھ میسر نہیں، اچھا اور بُرا ان کی نظروں میں ایک جیسا دکھائی دیتا ہے۔)

ہمسری با انبیاءؑ برداشتند اولیاء را ہم چوں خود پنداشتند

(انہوں نے انبیائے کرامؑ سے ہمسری کا دعویٰ کیا، اور اولیاء کو اپنے جیسا ہی گمان کیا۔)

گفتہ اینک ما بشر ایشاں بشر ما و ایشاں بستۂ خوابیم و خور

(وہ کہتے ہیں ہم بھی بشر ہیں وہ بھی بشر ہیں، ہم دونوں خورد و نوش اور سونے کے پابند ہیں۔)

ایں نہ دانستند ایشاں از عمیٰ ہست فرقے درمیاں بے منتہیٰ (۱۔۵۸)

(انہوں نے اپنے اندھے پن کی وجہ سے نہ جانا، کہ ہم میں اور ان (بزرگوں) میں کتنا فرق ہے۔)

ہر دو گوں زنبور خورد۔ از یک محل لیک زیں شد نیش و زاں دیگر عسل

(بھڑ اور شہد کی مکھی ایک ہی پھول کو چوستی ہیں لیکن ایک (بھڑ) میں زہر بن جاتا ہے اور دوسری (مکھی) میں شہد۔)

ہر دو گوں آہو گیا خوردند و آب زیں یکے سرگیں شد و زاں مشکِ ناب
(۱۔۵۸)

(دونوں ہرن گھاس کھاتے اور پانی پیتے ہیں، لیکن ایک سے گوبر اور دوسرے سے عمدہ مشک بن جاتا ہے)

ایں خورد گردد پلیدی زو جدا واں خورد گردد ہمہ نورِ خدا

(ایک کھاتا ہے تو پلیدی بن جاتی ہے، اور دوسرے (اللہ والے) کھائیں تو نورِ خدا بن جاتا ہے۔)

ہر دو صورت گر بہم ماند روا ست آبِ تلخ و آبِ شیریں را صفا است

(دونوں صورتیں اگر ایک جیسی ہوں تو بعید نہیں، کیونکہ میٹھا اور کھارا پانی صاف نظر آتے ہیں۔)

جز کہ صاحب ذوق نشناسد بیاب او شناسد آبِ خوش از شورہ آب (۱۔۵۹)

(ذائقہ والے کے سوا کوئی کیسے جان سکتا ہے، کہ وہی کھارے اور میٹھے پانی کی پہچان کر سکتا ہے۔)

عقل نہ ہو تو اہلِ عقل کو غنیمت جانو

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ دنیا میں لوگوں کی عقلیں مختلف انواع سے تعلق رکھتی ہیں۔ کچھ لوگ تو پورے عاقل ہیں اور خود اپنی بصیرت کی مشعل کی مدد سے راستہ تلاش کر لیتے ہیں بلکہ دوسروں کی راہنمائی کے بھی قابل ہیں۔ کچھ لوگ عقل رکھتے ہیں اور وہ کسی ولی کی تقلید کرتے ہوئے منزلِ مقصود پر پہنچ جاتے ہیں، جیسے نابینا اپنے راہبر کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی منزل کو پا لیتا ہے۔ تیسرے درجے پر وہ لوگ ہیں جو گدھوں کی طرح عقل سے محروم ہیں اور ذرہ برابر بھی عقل نہیں رکھتے اور کسی عقل والے (ولی) کی اتباع کرنا بھی نہیں چاہتے۔ ایسے لوگ حکمت و فلسفہ کی بحثوں میں پڑے رہتے ہیں اور اس کے ذریعے راہِ حق کو تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ نہ تو خود ہی کچھ جانتے ہیں نہ ہی کسی سمجھانے والے کی پرواہ کرتے ہیں۔ ایسے لوگ غفلت اور کج روی میں ڈوبے رہتے ہیں اور کسی راہبر کے پیچھے چلنے میں اپنی ہتک محسوس کرتے ہیں، چنانچہ ابدی نقصان سے داغدار ہو جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اگر تم خود اس راستے کو نہیں سمجھ سکتے تو کسی عاقل مرد کے سامنے خود کو مردہ ہی بنا لو تاکہ مراد کو پہنچو۔

پیروِ نورِ خود ست آں پیش رو تابعِ خویش ست آں بیخویش رو

(وہ پیشوا اپنے نور کا خود تابع ہے، یہ اپنے (نور کے) تابع ہے (گو بظاہر) وہ خود چلنے والا نہیں۔)

دیگرے کہ نیم عاقل آمد او عاقلے را دیدۂ خود داند او

(دوسرا شخص آدھی عقل رکھتا ہے، اس طالب نے اہلِ عقل کو دیکھا اور عقل مند کو اپنی آنکھ سمجھتا ہے۔)

واں خرے کز عقل جوئے نداشت   خود نبودش عقل و عاقل را گزاشت
(تیسرا وہ گدھا جو کہ جَو برابر بھی عقل نہیں رکھتا، نہ وہ خود عاقل ہے نہ عاقلوں کی اتباع کرتا ہے۔)

نیست عقلش تا دمِ زندہ زند   نیم عقلے نے کہ خود مردہ کند
(اس میں اتنی عقل نہیں کہ زندہ ہونے کا دعویٰ کر سکے، اور اتنی عقل بھی نہیں کہ عاقل کے سامنے مردہ بن جائے)

عقل کامل نیست خود را مردہ کن   در پناہِ عاقلے زندہ سخن(۲۱۲۔۴)
(اگر عقل کامل نہیں تو اپنے آپ کو مردہ بنالو، اور کسی عاقل زندہ سخن کی پناہ میں آجاؤ۔)

محرومِ طریقت سے مولانا کا خطاب

جو لوگ اہلِ طریقت کی مخالفت میں زبان درازی کرتے ہیں' مولانا ان کو بے حاصلوں کے نام سے پکارتے ہیں کیونکہ ان لوگوں سے منہ موڑ کر وہ صرف مقام بے حاصلی تک پہنچ سکتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ جو لوگ ان اہل اللہ سے دور بھاگتے ہیں انہیں معلوم نہیں کہ وہ ان سے دور چلے جائیں گے تو لامحالہ فاسقوں اور فاجروں کے ساتھ ہی دوستی رکھیں گے جس نے تکبر کیا اور خود کو ان اولیائے کرام سے بہتر سمجھا تو وہ لازمی طور پر محروم رہ جائے گا۔ یہ خدا کا قانون ہے کہ جو لوگ ان کی خدمت پر خود کو مامور کر دیتے ہیں زمانہ انہی کی عزت کرتا ہے۔

دل نگہ دارید اے بے حاصلاں   در حضورِ حضرتِ صاحب دلاں(۳۰۳۔۲)
(اے محروم لوگو! اپنے دل کی حفاظت کرو، یعنی تم اللہ والوں کے حضور آؤ۔)

جز خضوع و بندگی و اضطرار   اندر ایں حضرت ندارد اعتبار(۱۳۴۔۳)
(بجز خضوع، بندگی اور اضطرار کے حق تعالیٰ کی راہ میں اور کوئی چیز معتبر نہیں۔)

ہر کہ خدمت کرد اُو مخدوم شد   آں کہ خود را دید او محروم شد
(جو بھی خدمت کرتا ہے وہ مخدوم بن جاتا ہے اور جس نے اپنے آپ کو دیکھا وہ محروم رہ جاتا ہے۔)

آں یکے چوں نیست با اخیار یار   لاجرم شد پہلوئے فجار جار(۱۶۲۔۴)
(جو نیک بندوں کی صحبت اختیار نہیں کرتا نتیجتاً وہ بروں کی صحبت میں ضرور چلا جائے گا۔)

سالہا باید کہ تا از آفتاب   لعل یابد رنگ و رخشانی و تاب
(کئی سال درکار ہوتے ہیں کہ آفتاب سے بے قیمت پتھر لعل بن کر رنگ، چمک اور تابانی حاصل کرے)

ان بادشاہوں پر چوری کا الزام نہ لگاؤ

مولانا روم فرماتے ہیں کہ ان اولیائے کرام پر اپنی لاعلمی کے باعث الزام نہ لگاؤ کیونکہ اتنی بڑی ہستیوں پر اس طرح زبان دراز کرنا ایسے ہی ہے جیسے کسی بادشاہ پر دو پیسے کی چیز چوری کرنے کا الزام لگایا جائے۔ فرماتے

ہیں کہ فقر چاہتے ہو تو ان کی صحبت سے نصیب ہوتا ہے، یہاں عقیدت کے علاوہ اور کوئی چیز کام نہیں آتی۔ جب تک تم ان کی شان کے معترف نہیں ہوتے اس وقت تک ان کے فیض سے محروم رہو گے۔ خوبصورت چیزوں سے تو آنکھ والے ہی محظوظ ہو سکتے ہیں۔

عیب کم گو بندۂ اللہ را۔ متہم کم کن بہ وزدی شاہ را(۳۲۶۔۲)

(اللہ والوں پر الزام لگانے سے باز آجاؤ، اور بادشاہوں پر چوری کا الزام مت لگاؤ۔)

فقر خواہی آں بہ صحبت قائم ست نے زبانت کاری آید نہ دست(۱۱۳۔۵)

(فقر چاہتے ہو تو یہ صحبت سے قائم ہوتا ہے، یہاں نہ زبان کام دیتی ہے نہ ہاتھ۔)

ور بہ ہر زخمے تو پُر کینہ شوی پس کجا بے صیقل آئینہ شوی

(اگر تو چھوٹے چھوٹے زخموں کا دل میں کینہ رکھے گا، (تو کامیاب نہ ہوگا) لہٰذا تو صیقل ہونے کے بغیر آئینہ نہیں بن سکتا۔)

اولیاء تمہارے تانے بانے کو جانتے ہیں

مثنوی کے دفتر چہارم کے درمیان میں مولاناؒ فرماتے ہیں کہ تم نے بایزید بسطامیؒ کا وہ قصہ سنا ہے کہ آپ جب خرقان کے شہر ''رے'' میں پہنچے تو آپ نے حضرت ابوالحسن خرقانیؒ کی ولادت سے کئی سال پہلے ان کے پیدا ہونے کی خبر دی۔ آپ نے ان کا نام ونسب، جائے ولادت اور سر سے پاؤں تک کا حلیہ اپنے مریدوں کے سامنے بیان فرمایا۔ جب حضرت ابوالحسنؒ کئی سالوں کے بعد بایزید بسطامیؒ کی قبر کی زیارت کے لئے سفر دراز طے کر کے آئے تو اس وقت تمام قبریں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ حضرت بایزید بسطامیؒ نے جو حقیقتاً قبر میں زندہ تھے، حضرت ابوالحسنؒ کو ندا فرمائی کہ میں تم کو پکار رہا ہوں ادھر آؤ، چنانچہ یہ ندا سن کر آپ نے قبر کو پہچان لیا۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ اولیائے کرام اسی طرح لوگوں کے احوال سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔

کاملاں از دور نامت بشنوند تا بہ قعرِ تار و پودت در رَوَند

(اولیاء اللہ دور سے تیرا نام سنتے ہیں یہاں تک کہ تیرے تانے بانے کی گہرائی تک پہنچ جاتے ہیں۔)

بلکہ پیش از زادن تو سالہا دیدہ باشندت تُرا با حالہا

(بلکہ تیرے پیدا ہونے سے سالوں پہلے ہی تیرے تمام حالات ملاحظہ فرماتے ہیں۔)

حال تو دانند یک مُو بہ مُو زانکہ پُر بودند از اسرارِ ہُو(۱۷۷۔۴)

(تمہارے ہر حال اور ہر بال کے احوال سے آگاہ ہیں، اس لئے کہ وہ اسرار ربانی سے بھرپور ہیں۔)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ مرید اگرچہ سینکڑوں میل دور ہوں پھر بھی مرشد اپنے مریدوں کے احوال سے واقف ہوتے ہیں۔ اگر کوئی اعتراض کرے تو اسے جان لینا چاہیئے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ساریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مدینے میں بیٹھے ہوئے نہاوند کے میدانِ جنگ میں ان کی فوج کی کمان کے متعلق احکامات کو ایک لمحے میں روحانی طور پر پہنچایا اور حضرت ساریہؓ نے یہ احکامات سن بھی لئے۔ حضرت سید اسماعیل شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کرمانوالے کو پاکستان میں اطلاع دی گئی کہ ان کا ایک مرید ہندوستان میں قتل کر دیا گیا ہے آپؒ نے فرمایا کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ میرا مرید ہو اور مجھے پتہ نہ چلے کہ وہ مر گیا ہے؟ کچھ روز بعد اطلاع آئی کہ وہ زندہ ہے مگر افسوس ہے کہ ہمارے کچھ مسلمان ایسی معمولی باتوں میں الجھے رہتے ہیں اور ایسی باتوں پر شرک کے فتوے لگاتے ہیں، حالانکہ تبت کے لاما ایسے پیغام رسانی کے کاموں کو بالکل معمولی نوعیت کے کام سمجھتے ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں۔

دستِ پیر از غائباں کوتاہ نیست   دستِ اُو جز قبضۂ اللہ نیست

(پیر کا ہاتھ دور دراز کے لوگوں سے کوتاہ نہیں، اس کا قبضہ قدرتِ الٰہی کے سوا کچھ نہیں۔)

غائباں را چوں چنیں خلعت دھند   حاضراں از غائباں لا شک بہند

(یہ لوگ دور والوں کو جب اس طرح خلعتوں سے نواز دیتے ہیں، تو جو حاضر ہیں ان کو دور والوں سے بہتر نواز سکتے ہیں۔)

غائباں را چوں نوالہ می دہند   پیش مہماں تا چہ نعمت ہا نہند (۳۱۲-۱)

(جب وہ غائبوں کو تر نوالے سے نوازتے ہیں، تو ان کے آستانے پر حاضر مہمانوں کو کیسی نعمتوں سے نوازیں گے؟)

اگر قابلیت نہ ہو تو کسی کا تختہ مشق بن جاؤ

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ تم اپنے اندر روحانی اہلیت نہیں رکھتے تو ایسے شخص کی اتباع میں آ جاؤ جو روحانیت کے معاملات سے آگاہ ہے۔ اس اصول کو سمجھانے کے لئے آپؒ مثالیں پیش فرماتے ہیں۔

چوں پیمبر نیستی پس رو براہ   تا رسی از چاہ روزے سوئے جاہ

(جب تو خود راہبر نہیں تو راہرو بن کر چل، تاکہ تو ایک دن کنوئیں سے نکل کر مشیخیت تک پہنچے۔)

تو رعیت باش چوں سلطاں نہ   تمک مراں چوں مرد کشتیباں نہ

(جب تو بادشاہ نہیں تو رعیت بن جا، جب تو کشتی بان نہیں تو کشتی کو گہرائی میں نہ چلا۔)

چوں نہ کامل دکاں تنہا مگیر   دستِ خوش می باش تا گردی خمیر (۳۴۴-۲)

(جب تو کامل نہیں تو اکیلا دکان نہ کھول، بلکہ کسی کا تختۂ مشق بن جا تا کہ تو خمیر بن جائے۔)

چونکہ آزادیت ناید بندہ باش ہیں مپوش اطلس برو در ژندہ باش

(جب تو آزاد نہیں تو کسی کا غلام بن کر رہ، ارے! اطلس نہ پہن جا گدڑی میں رہ۔)

در بگوئی مشکل استفسار گو با شہنشاہاں تو مسکیں وار گو(۲۴۴۔۲)

(اگر تم اپنی مشکل بیان کرنے لگو تو بطور استفسار بیان کرو، ان شہنشاہوں (اولیاء) سے تم مسکین کی طرح بولو)

مردہ دلوں کی صحبت سے بچو

مولانا رومؒ نے ایک حدیث "لَا تَسکُنِ الْکُفُوْرَ فَاِنَّ سَاکِنَ الْکُفُوْرِ کَسَاکِنِ الْقُبُوْرِ" (یعنی احمق لوگوں کی صحبت سے پرہیز کرو کیونکہ جو آدمی ایسے لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے وہ دراصل قبر والوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے۔ دیکھئے نہایہ ابن اثیر ج ۴ ص ۲۷) اسی طرح کنوز الحقائق صفحہ ۱۵۶ پر ہے "لَا تَنْزِلُوْا الْکُفُوْرَ فَاِنَّهَا بِمَنْزِلَةِ الْقُبُوْرِ" (یعنی بے وقوف آدمیوں یا شیخ کو اپنے ہاں مت آنے دو کیونکہ وہ قبروں کی مانند ہیں۔) مولاناؒ فرماتے ہیں۔

قولِ پیغمبرؐ شنو اے مجتبیٰ گور عقل آمد وطن در روستا(۶۰۔۲)

(اے خواجہ پیغمبر ﷺ کا پیغام سنو، کیونکہ اس کی بود و باش گاؤں کی طرح ہو جائے گی جیسے قبر میں مردہ)

دنیا سے محبت رکھنے والے، خدا کی یاد سے غافل اور احمق لوگ مُردوں میں شمار کئے جاتے ہیں اور ان کی محفل مُردوں کی محفل ہوتی ہے خواہ کوئی دُنیا دار شیخ ہی کیوں نہ ہو۔

پیر کا امتحان لینے والے غلطی پر ہیں

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص کسی شیخ سے بیعت کرنے سے پہلے اپنے شیخ کی اچھی طرح چھان بین اس طرح کر لے کہ وہ مطمئن ہو جائے کہ وہ بزرگ مشیخت کے قابل ہے تو پھر بیعت کرے، مگر بیعت کے بعد مرید اگر اپنے پیر کا امتحان کرتا ہے تو وہ نرا گدھا ہے۔ فرماتے ہیں پیر اور مرید میں اتنا فرق تصور کرنا چاہیے جتنا ایک ذرے اور پہاڑ میں فرق ہوتا ہے۔ ذرہ اگر پہاڑ کا وزن کرنے لگے تو اس کا ترازو پہاڑ کے وزن سے پاش پاش ہو جائے گا، لہٰذا مرید کے لئے اپنے پیر کا امتحان کرنا عقلی اصولوں کے بھی منافی ہے۔

شیخ را کہ پیشوا و رہبر ست گر مریدے امتحان کرد اُو خرست

(شیخ جو پیشوا اور رہبر ہے اگر کوئی مرید اس کا امتحان کرے تو (نرا) گدھا ہے۔)

امتحانش گر کنی در راہِ دیں ہم تو گردی ممتحن اے بے یقیں

(اگر تو مرتبۂ کمال طریقت کے متعلق امتحان کرے گا تو اے بے اعتقاد تو بھی آزمائشِ دین میں پڑ جائے گا)

جرأت جہلت شود عریاں و فاش او برہنہ کے شود زیں افتاش

(خود تیری جہالت اس جرأت کی وجہ سے بے پردہ ہو جائے گی، وہ اس تفتیش سے کب رسوا ہوتا ہے۔)

گر بیاید ذرہ سنجد کوہ را بردرد زاں کہ ترازوش اے فتی (۷-۴۷-۴)

(اگر ایک ذرہ پہاڑ کا وزن کرنے آئے، تو اے جواں اس کا ترازو اس پہاڑ سے پاش پاش ہو جائے گا۔)

کچھ مرید ظالم بھیڑیئے سے بھی بدتر ہوتے ہیں

عربی کا مقولہ ہے "لَا تُجَرِّبِ الْمُجَرَّبَ" (یعنی آزمائے ہوئے کو نہ آزماؤ۔) آزمائش کے بغیر ولایت بھی عطا نہیں کی جاتی۔ آزمانا بھی دو طرح کا ہے ایک تو یہ دیکھنا کہ یہ شخص کتنا بڑا بزرگ ہے۔ دوسرا آزمانا یہ ہے کہ مرید اس بات کا امتحان کرے کہ پیر کی دعا سے اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو پیر ٹھیک ہے ورنہ پیر بنانے کے قابل نہیں۔ مولانا" فرماتے ہیں کہ جو پیر کو اس طرح آزماتے ہیں وہ گدھے کی طرح کم عقل رکھتے ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ ایسا مرید مکار ہے اور پیر کے لئے یہ بات اس سے بہتر ہے کہ ایسے مرید کی جگہ اسے کوئی ظالم بھیڑیا مل جائے۔

گرگ دریابد ولی را بہ بود زانکہ دریابد ولی را نفسِ بد

(اگر کسی ولی کو بھیڑیا مل جائے تو یہ اس سے بہتر ہے، کہ اس کو ایسا مرید مل جائے جس کا نفس بد ہو۔)

زانکہ گرگ ارچہ کہ بس اشگریست لیکش آں فرہنگ و کید و مکر نیست

(کیونکہ بھیڑیا اگرچہ بہت ظالم ہے، لیکن اس میں وہ چالاکی اور مکر وفریب نہیں جو ایسے مرید میں ہے۔)

ورنہ کے اندر فتادے او بدام مکر اندر آدمی باشد تمام

(ورنہ وہ جال میں کب گرفتار ہوتا، پورا مکر تو آدمی میں ہی ہوتا ہے۔)

مکر زانِ اوست کو وارد درم بشنود آواز و گوید نشنوم (۶-۲۴۲)

(مکر تو اس کا حصہ ہے جو درہم و دینار رکھتا ہے اور مال نہ دینے کا بہانہ یوں کرتا ہے، کہ وہ سوالی کی آواز سن کر کہتا ہے میں نہیں دیکھتا ہوں)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ ایسا مرید حقیقتاً کسی شیخ کے لئے بھیڑیئے سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے کیونکہ ایک تو وہ اپنے کام کے لئے شیخ کا وقت ضائع کرتا ہے اور ظاہر یہ کرتا ہے کہ وہ شیخ کی خدمت میں اللہ کے لئے آتا ہے (یعنی منافقت کا طریق اختیار کرتا ہے) اور دوسرے یہ کہ خدانخواستہ اس شخص کا کام اگر نہ ہو تو پورے علاقے میں شیخ کے خلاف آواز بلند کرتا ہے اور لوگوں سے کہتا ہے کہ یہ شیخ تو قطعاً بزرگ نہیں [illegible] میں بزرگی کی علامات سرے سے نہیں ملتیں۔ اس طرح وہ شیخ کی تبلیغی سرگرمیوں میں سخت رکاوٹ [illegible]

ہے کیونکہ اس کی ایسی باتوں سے لوگ اس پیر سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ یہ بات مشاہدہ میں آئی ہے کہ ایسے بھیڑ یا صفت مریدوں کے اگر بیشتر اور اکثر مشکل کام حل ہو بھی جائیں اور ایک کام میں کچھ رکاوٹ ہو جائے تو فوراً منہ پھیر لیتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پیروں کے پاس ۹۵ فیصد سے زیادہ لوگ اپنے کاموں میں کامیابی کے لئے ہی آتے ہیں اور شاید و باید ہی کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اہل اللہ کے پاس خدا کی رضا حاصل کرنے کے لئے آتے ہوں۔

کچھ مرید تو یوں کہنے سے بھی گریز نہیں کرتے کہ حضرت اگر آپ ہمارا فلاں کام کروا دیں تو ہم آپ کی بزرگی کو تسلیم کر لیں گے۔ ایک شخص کسی پیر کے پاس لوہے کی تاروں کا الجھا ہوا گچھا لے کر آیا اور کہنے لگا کہ پیر صاحب اگر آپ ان تاروں کو سلجھا دیں تو ہم آپ کو پیر مانتے ہیں۔ پیروں سے لوگ کس قدر عجیب توقعات رکھتے ہیں۔

ایک بادشاہ بخارے کے کسی پیر کے گھر گیا تو اس بزرگ نے بادشاہ کے سامنے ایک طشت میں کچھ عمدہ سیب پیش کئے۔ بادشاہ نے دل میں سوچا کہ اگر یہ بزرگ خود بخود مجھے فلاں سیب اٹھا کر پیش کرے تو واقعی صحیح بزرگ ہوگا ورنہ بزرگ نہیں۔ اس بزرگ نے کہا کہ بادشاہ سلامت چند روز قبل میں نیشا پور گیا تھا اور وہاں ایک مجمع میں کوئی مداری یہ تماشا دکھا رہا تھا کہ اس نے اپنے بیل کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنا رومال مجمع میں سے کسی شخص کے ہاتھ میں تھما دیا اور پھر بیل سے کہا کہ بتا دے یہ رومال کس کے پاس ہے۔ اس بیل نے پورے مجمع کا چکر لگایا اور جس کے پاس رومال تھا اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ بزرگ کہنے لگے کہ بادشاہ سلامت ایسا کام تو ایک بیل بھی کر لیتا ہے اور اگر میں فلاں سیب آپ کو دے دوں تو میرا یہ کمال اس بیل سے زیادہ عجیب نہ ہوگا۔ کہنے لگے بادشاہ سلامت بزرگی یہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔

بھیس بدلنے پر شیخ پہچان لیتا ہے

منقول ہے کہ جب محمود غزنوی نے حضرت ابوالحسن خرقانی کو اپنے دربار میں طلب کیا تو آپ نے حاضر ہونے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ جو ہمیں ملنا چاہتا ہے تو ہمارے آستانے کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ محمود غزنوی نے حکم بھیجا کہ قرآن کی آیت أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ (النساء:۵۹) (اطاعت کرو اللہ کی، اللہ کے رسول ﷺ کی اور ان کی جو تمہارے حاکم ہیں۔) کے مطابق حاکم وقت کی حیثیت سے میرا حکم ماننا آپ کے لئے واجب ہے۔ حضرت ابوالحسن خرقانی نے جواباً فرمایا کہ میں ابھی تک "أَطِيعُوا اللَّهَ" کے چکر میں ہوں اور "أَطِيعُوا الرَّسُولَ" سے شرمندہ ہوں اور "أُولِي الْأَمْرِ" تو ان دونوں کے بعد کی بات ہے۔ لہٰذا کچھ دنوں کے بعد محمود غزنوی بھیس بدل کر کچھ وزیروں کے ساتھ خود آپ کے آستانہ

پر اس طرح حاضر ہوا کہ غلام کو شاہانہ لباس پہنایا اور خود غلام کا لباس پہنا اور کچھ عورتوں کو بھی مردانہ لباس پہنا کر ساتھ لایا۔ حضرت کو جب معلوم ہوا تو اٹھ کر اندر چلے گئے تا کہ تعظیماً کھڑا نہ ہونا پڑے۔ جب یہ سب لوگ کمرے میں داخل ہو گئے تو آپ تشریف لائے اور سب کو اپنے مقام کے مطابق بٹھایا۔ مردوں کے لباس میں عورتوں کو زنان خانے میں جانے کا حکم فرمایا محمود غزنوی" آپ کی فراست کو دیکھ کر آپ کا معتقد ہوا اور سومنات کو فتح کرنے کے لئے عرض کرنے لگا۔ اس وقت محمود غزنوی" اپنے سترھویں حملے کی تیاری میں تھا۔ آپ نے اپنا خرقہ عطا فرمایا اور مشکل وقت میں اسے سامنے رکھ کر دعا کرنے کے لئے فرمایا۔

جب سومنات پر حملہ کیا گیا تو ہندوستان کے تمام راجے مہاراجوں نے مل کر مقابلہ کیا اور قریب تھا کہ غزنوی" کو شکست ہو جاتی۔ اس رات کو محمود غزنوی" نے آپ کا خرقہ سامنے رکھ کر فتح کی دعا کی تو دوسرے دن سومنات فتح ہو گیا۔ اسی رات محمود غزنوی" کو حضرت ابوالحسن خرقانی" نے خواب میں فرمایا کہ تم نے ہمارے چوغے کی آبرو خاک میں ملا دی۔ اگر تم یہ دعا کرتے کہ تمام ہندو مسلمان ہو جائیں تو ایسا ہی ہو جاتا۔

حضرت بلھے شاہ" کئی سالوں کے بعد جب اپنے ناراض مرشد کو ناچ کر اور اپنا کلام سنا کر راضی کرنے کی غرض سے آئے تو سائیں عنایت" نے کلام سننے کے بعد کہا "تم بلھے شاہ تو نہیں ہو؟" اس پر بلھے شاہ نے عرض کی جناب "بلھا" "نہیں" "بھلا" (بھولا ہوا) ہوں تو آپ نے ان کو معاف کر دیا۔

مولانا روم" کے افکار علامہ کے الفاظ میں

قرآن اور حدیث میں مختلف مقامات پر مردِ کامل کی صحبت اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ مولانا روم" نے بھی ان اولیاء اللہ کی صحبت اختیار کرنے کو اہمیت دی ہے۔ علامہ مرحوم چونکہ مولانا روم" کے عاشق تھے اس لئے آپ نے بھی صحبت کو علمِ کتابی پر مقدم کیا ہے اور فرمایا ہے۔

اگر کوئی شعیب آئے میسر شبانی سے کلیمی دو قدم ہے (ب۔ج:۳۸۰)

تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں (ب۔د:۱۰۴)

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر علم و حکمت از کتب، دیں از نظر (پ۔ج:۸۶۵)

(اے بے خبر! دین کتابوں میں نہ ڈھونڈ کتابوں سے علم و حکمت ملتی ہے، مگر دین اہلِ نظر کی نظر سے ملتا ہے۔)

علامہ نے اپنے اردو کلام میں سینکڑوں اشعار کے ذریعے اولیاء اللہ سے صحبت کا نظریہ شدت سے قائم کیا ہے۔ اس موضوع پر آپ کے بہت سے اشعار مختلف مقامات پر اور بالخصوص "فقر" کے عنوان سے بیان کر

دیئے گئے ہیں۔ چند فارسی کے اشعار مزید ملاحظہ فرمائیں۔

صحبت از علمِ کتابی خوشتر است صحبتِ مردانِ حُر آدم گر است

(علم کتابی سے صحبت بہت زیادہ مفید ہے، آزاد مردوں کی صحبت آدم گری کا کام کرتی ہے۔)

پادشاہاں در قباہائے حریر زرد رو از سہم آن عریاں فقیر

(بادشاہ کہ جو ریشمی لباس میں ملبوس ہیں، ان کا چہرہ برہنہ تن فقیر کے خوف سے زرد رہتا ہے۔)

ما کلیسا دوست ما مسجد فروش اُو زِ دستِ مصطفیٰ پیمانہ نوش (پ۔چ:۸۲۲)

(ہم کلیسا پرست اور مسجد فروش ہیں، مگر وہ دستِ رسول ﷺ سے شراب پینے والے ہیں۔)

در جہان بے ثبات او را ثبات مرگ او را از مقاماتِ حیات

(دونوں جہانوں میں صرف ان کو ہی ثبات (دوام) حاصل ہے، ان کی موت بھی زندگی کے مراتب سے ایک مرتبہ ہے۔)

اہل دل از صحبت ما مضمحل گل ز فیض صحبتش دارائے دل (پ۔چ:۸۲۳)

(اہلِ دل ہماری مجلس سے افسردہ خاطر ہوتے ہیں، لیکن ان کی مجلس سے مٹی بھی دلدار بن جاتی ہے۔)

اے سرت گردم، گریز از ما چو تیر دامن او گیرو بے تابانہ گیر

(اے تیری قسم! ہم سے بری طرح بھاگ، مگر ان کا دامن پکڑ لے اور والہانہ طور پر پکڑ لے۔)

می نہ روید تخمِ دل از آب و گل بے نگاہے از خداوندان دل

(اس مٹی اور پانی سے دل کا تخم پیدا نہیں ہوتا، تاوقتیکہ اس پر صاحبِ دل کی نظر نہ پڑے۔)

اندر ایں عالم نیرزی باخسے تا نیاویزی بدامانِ کسے (پ۔چ:۸۲۴)

(اس دنیا میں تیری قیمت ایک تنکے سے بھی کم ہے، جب تک تو کسی مردِ حر کا دامن نہ پکڑ لے۔)

از تب و تابم نصیبِ خود بگیر بعد ازیں نہ آید چو من مردِ فقیر (پ۔چ:۸۲۱)

(میرے تب وتاب سے حصہ لے لے، کیونکہ میرے بعد کوئی فقیر مرد نہیں آئے گا۔)

علامہ فرماتے ہیں کہ اگر تم ان اولیائے کرام کے آستانوں پر عقیدت سے جاؤ گے تو تمہارے بدن کی خاک کیمیا کے اوصاف حاصل کر لے گی اور یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب تمہیں کوئی شمس تبریزؒ جیسے مردِ کامل کی صحبت حاصل ہو جائے۔

کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے بوسہ زن بر آستانِ کاملے (ا۔ح:۱۸)

(اپنی مٹھی بھر خاک سے سونا پیدا کر، کسی کامل مرد کے آستانے پر بوسہ زن ہو جا۔)

شمع خود را ہمچو رومی بر فروز روم را در آتشِ تبریز سوز (ا۔ح:۱۹)

(اپنی شمع کو رومی کی طرح خوب بھڑکاؤ، اپنے روم کو کسی شمس تبریزؒ کی آگ میں جلاؤ۔)

علامہ اقبالؒ اور عرفی، مولاناؒ کی تصدیق میں

پہلے یہ بیان ہو چکا ہے کہ علامہ اقبالؒ کا تمام کلام مولانا رومؒ کے افکار کی تصدیق میں لکھا گیا ہے۔ علامہ نے کئی مقامات پر یہ بات واضح کی ہے کہ جو لوگ سونے چاندی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں وہ حقیقتاً سونے چاندی کو ہی خدا مانتے ہیں۔ ان کی یہ محبت بھی شرکِ حقیقی سے کم نہیں۔

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟ (ب۔ج:۳۴۰)

عرفی کا کلام بھی مولانا رومؒ کے خیالات کے عین مطابق ہے۔ ان کا کلام طریقت کی تائید میں پایا جاتا ہے۔ یہاں ان کے دو اشعار پیش کئے جا رہے ہیں جن میں انہوں نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ بہت سے علماء اور فقہاء جاہ و منصب اور دنیا کی تلاش میں رہتے ہیں۔ گویا اہل اللہ ہی صحیح معنوں میں اپنے اللہ کی طلب میں ہر وقت سرگرداں رہتے ہیں۔

حرم جویاں درے را می پرستند فقیہاں دفترے را می پرستند

(حرم کو تلاش کرنے والے صرف دروازے کی پوجا کرتے ہیں علما کتابوں کی پوجا کرتے ہیں۔)

بر افگن پردہ تا معلوم گردد کہ یاراں دیگرے را می پرستند (عراقی)

(اے خدا تو اپنا پردہ اٹھا تا کہ معلوم ہو جائے کہ یار لوگ کسی اور کی ہی پوجا کرتے ہیں۔)

مختار صدیقی نے ان ہی خیالات کا یوں اظہار کیا ہے۔

سحرِ ازل کو دی گئی وہی آج تک ہے مسافری

اسے طے کریں تو پتہ چلے کہاں کون کس کی طلب میں ہے (مختار صدیقی)

دیگر مشائخِ کرام کے فرمودات

زیرِ نظر کتاب کی ضروریات میں اب تک جو اوپر بیان ہوا ہے وہ بہت کافی تصور کیا جا رہا ہے لہٰذا جن اصحاب کو دیگر مشائخ کرام کے اقوال مطلوب ہوں تو ان کے متعلق لکھی گئی تصنیفات کا مطالعہ فرمائیں۔

باب ۱۷

صادقین کی معیت

صحبت کی افادیت

طالبان راہ سلوک کے لئے صحبت صالحین ایک بنیادی جزو ہے۔ عارفین کا قول ہے کہ جب سالک پر انوار رسالت کا انعکاس (عکس کا پڑنا) شروع ہو جاتا ہے تو پرتو روح محمدی ﷺ اس کی روح کو روشن کر دیتی ہے اور یہ دولت ان کو ملتی ہے جو بکثرت اولیائے کرام کی صحبت میں حاضر رہتے ہیں۔ سلوک کا طے کرنا ایک شیخ کے بغیر ممکن نہیں۔ حضرت شمس الدین سیالویؒ فرماتے ہیں کہ پیر کے بغیر روحانیت میں ترقی ممکن نہیں کیونکہ پیر کی صحبت سے خدا اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت نصیب ہوتی ہے اور مرید خدا اور رسول اللہ ﷺ کے مظہر کو دیکھ سکتا ہے۔ حضرت عبدالعزیز دباغؒ نے فرمایا کہ کوئی ولیٔ کامل انسان کو ایک لحظہ میں واصل باللہ بنا سکتا ہے۔

روحانیت کی کوئی بات ہو تو اس کو صحابہ رسول ﷺ کی طرف رجوع کرنے سے پیچیدہ معاملات بھی حل ہو جاتے ہیں۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ اُمت رسول ﷺ میں صحابہ کرام کی جماعت کو تمام لوگوں سے بہتر شمار کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ نمازی، حاجی، مجاہد، عالم، باعمل، حافظین قرآن اور بہترین مفسرین قرآن تھے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کی تمام خوبیاں صحابہ کرام میں چمکتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ ان لوگوں کو اسلام میں صحابہ کرام کا لقب عطا فرمایا گیا اور ان کی دیگر خوبیوں کو ان کے نام کی طرف موسوم نہیں کیا گیا بلکہ ان کے ناموں کو صحبتِ رسول ﷺ کے وصف کے ساتھ منسوب کیا گیا ہے۔ صحابی کے لغوی معنی صحبت کرنے والے مراد لئے جاتے ہیں، اس دلیل سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کے تمام اوصاف میں سے وصفِ صحبت ہی سب سے زیادہ اولیٰ وصف تھا اور اسی وصف کے اعتبار سے ان کا نام صحابیٔ رسول ﷺ رکھا گیا۔

مردانِ کامل کی صحبت سے استفادہ کرنے کے لئے بہت سے قیمتی نکات اس کتاب میں اور بیعت کی تشکیل میں مختلف مقامات پر دیئے جا چکے ہیں۔ حضرت داتا گنج بخشؒ نے صحبت کے نام پر ایک پورا باب لکھا ہے جس میں آدابِ صحبت بھی شامل کیے گئے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے متعلق ایک بیان دیا ہے جو ہماری بیعت کی کتاب کے صفحہ نمبر ۷۷ اور ۷۸ پر موجود ہے آپ فرماتے ہیں کہ انہوں نے قابل ذکر طریقت کا الف اور با کا سبق اپنے شیخ کامل سے حاصل کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے ان کی ایک نظر

سے وہ فیض پایا ہے جو دوسروں کو چالیس دنوں کی چلہ کشی میں بھی میسر نہیں آتا۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے سینے سے لگا کر بھینچا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ تمام کچھ پڑھ لیا جس کی وحی آپ پر کی گئی تھی۔ اسی نسبت میں مسلمانوں میں معانقہ کی رسم قائم کی گئی۔ اصحاب کہف کا کتا صحبت کی وجہ سے ہی ان کے ساتھ جنت میں جائے گا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تمام عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیّت میں رہے۔ آپ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بچپن، جوانی، غارِ ثور اور قبر کے ساتھی تھے اور جنت میں بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی جنت میں داخل ہوں گے۔ ایک حدیث شریف میں ہے اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ (مسند احمد: ج ۱ ص ۳۹۹) کہ انسان اس کے ساتھ ہوتا ہے جس سے اس کو محبت ہو۔ یہ محبت ان کی معیّت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اولیائے کرام کی تحریروں میں ہر طرف صحبت کے کمالات بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مولانا رومؒ نے اپنی شعری مجموعہ میں تحریر فرمایا ہے کہ اگر طریقت چاہتے ہو تو وہ صحبت سے قائم ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ علم کا تعلق اقوال اور حقائق سے ہے مگر فقر کا تعلق صحبت سے ہے۔ دانش ایک روحانی چیز ہے جو مرشد کی روح سے مرید کو ملتی ہے۔ صنعت و حرفت کا سیکھنا فعلی کام ہے یعنی دانش عملی کام سے ہاتھ میں آتی ہے ۔

علمِ آموزی طریقش قولی ست حرف آموزی طریقش فعلی ست (۵/۱۱۲)

(تو علم سیکھتا ہے' تو اُس کا طریقہ زبانی ہے، دستکاری سیکھتا ہے' تو اُس کا طریقہ عملی ہے۔)

فقر خواہی آں بصحبت قائم ست نے زبانت کار می آید نہ دست

(فقر چاہتا ہے تو وہ صحبت سے متعلق ہے، اس میں نہ تیری زبان کام آتی ہے نہ ہاتھ)

دانشِ آنرا ستاند جاں ز جاں نے زراہِ دفتر و نے از زباں

(دانش کے علم و مرید کی روح مرشد کی روح سے (سینہ بہ سینہ) حاصل کرتی ہے وہ کتاب اور زبان سے حاصل نہیں ہوتا)

دانشِ انوارست درجانِ رجال نے زراہِ دفتر و نے قیل و قال (۵/۱۱۳)

(فقر اور سلوک کی دانش ایک قسم کے انوار ہیں جو مردان حُر کی صحبت سے حاصل ہوتے ہیں۔)

ہماری بہت سی تصانیف میں صحبت مردان حُر پر کافی کلام دیا جا چکا ہے۔ چند اشعار علامہ اقبالؒ کے بھی ملاحظہ فرمائیں۔

صحبت از علمِ کتابی خوشتر است صحبتِ مردانِ حُر آدم گر است (پ۔چ: ۸۲۴)

(صحبت علم کتابی سے بہتر ہے، آزاد بندوں کی صحبت آدم گری کرتی ہے۔)

پادشاہاں درقباہائے حریر زرد رو از سہم آں عُریاں فقیر

(وہ بادشاہ جو ریشمی لباس میں ہوتے ہیں، ان کا چہرہ اس برہنہ تن فقیر سے خوف زدہ ہے۔)

ماکلیسا دوست! ما مسجد فروش! اُو زدستِ مصطفیٰؐ پیمانہ نوش (پ۔چ:۸۲۲)

(ہم کلیساؤں کے دوست ہیں اور مسجدوں کو بیچ دیتے ہیں، وہ دستِ مصطفیٰؐ سے پیمانہ نوش کرتے ہیں۔)

در جہانِ بے ثبات اورا ثبات مرگ اُورا از مقاماتِ حیات! (پ۔چ:۸۲۳)

(اس جہانِ بے ثبات میں ان کو ثبات ملتا ہے، ان کی موت ان کے مقامات حیات میں سے ہے۔)

اے سرت گردم گریز از ما چو تیر دامنِ او گیر و بے تابانہ گیر (پ۔چ:۸۲۴)

(میں تیرے قربان تو ہم سے تیر کی طرح بھاگ، مگر اس کا دامن پکڑ لے اور بے تابانہ پکڑ)

می نہ روید تخمِ دل از آب و گل بے نگاہے از خداوندانِ دل (پ۔چ:۸۲۴)

(اس جسم خاک وآب سے تخم دل ہرگز پیدا نہیں ہوتا مگر خداوندانِ دل کی نگاہ کے بغیر نہیں ہے۔)

اندر ایں عالم نیرزی باخسے تانیاویزی بدامانِ کسے! (پ۔چ:۸۲۴)

(تو اس دنیا میں تنکے کے برابر بھی نہیں ہے، جب تک کسی صاحب دل سے نہ جا ملے۔)

طریقت سب کی سب آداب صحبت کو ملحوظ رکھنے سے ہاتھ آتی ہے اس لئے تصوف کی تمام کتابوں میں آداب صحبت کی خوشبو آتی ہے۔ علامہ اقبالؒ کا بہت سا کلام آدابِ صحبت بجالانے پر ہے جس کا اس جگہ نقل کرنا ایک مشکل امر ہے۔ ذیل میں حافظ شیرازیؒ کا ایک شعر ہی ضرورتِ مضمون کے لئے کافی ہے۔

شبانِ وادیٔ ایمن گہے رسد بمراد کہ چند سال بہ جاں خدمتِ شعیب کند (حافظؒ)

(وادیٔ ایمن کے گڈریے اس وقت مراد کو پہنچتے ہیں جب چند سال دل وجان سے شعیب علیہ السلام کی خدمت کریں۔)

صدیق کس کو کہتے ہیں

لغت کے اعتبار سے بہت سچ بولنے والے کو صدیق کہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ صدیق اسے کہتے ہیں جس نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو۔ بعض نے کہا کہ صدیق وہ ہے جو سچ کا اس قدر خوگر ہو کہ اس سے جھوٹ بن ہی نہ آتا ہو۔ بعض کے نزدیک وہ ہے جو قول اور اعتقاد میں سچا ہو اور پھر اپنی سچائی کی تصدیق اپنے عمل سے بھی کر دکھائے۔ (مفردات امام راغب) امام راغبؒ لکھتے ہیں کہ صدیقین سے وہ لوگ مراد ہیں جن کا ذکر سورۃ النساء کی آیت نمبر ۶۹ میں مِّنَ النَّبِيِّنَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِينَ کے الفاظ میں کیا گیا ہے۔ اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ صدیقین سے وہ لوگ مراد ہیں جو فضیلت میں انبیاء سے کچھ کم درجہ رکھتے ہوں۔ کچھ علماء نے صدق کا معنی ظاہر و باطن اور دل و زبان سے خفیہ اور اعلانیہ طریق پر حق تعالیٰ اور خلق کے

سامنے صداقت اور راست بازی سے پیش آتا ہے۔ بعض صوفیاء نے فرمایا ہے کہ صدیق وہ ہے جس کا ظاہر اور باطن ایک جیسا ہو وہ عبادت اس طرح کرے کہ اس کا کھانا، پینا، سونا (امورِ دنیا) اس کے مقرر کردہ اذکارِ الٰہی سے اس کو نہ روک سکیں۔ صدیق اپنا نفس اللہ تعالیٰ کے لئے وقف کر دیتا ہے۔

صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے معنی ہیں نبی کی نبوت کی تصدیق کرنے والا۔ صدیق نبی کو دلائل یا معجزات سے نہیں تسلیم کرتا بلکہ اپنے نورِ قلب سے نبی کو پہچانتا ہے۔ جیسے انسان اپنی طبیعت سے اچھی چیزوں کو قبول کر لیتا ہے اور بری چیزوں کو رد کر دیتا ہے ایسے ہی صدیق کا نفس ایمان کو بخوشی قبول کر لیتا ہے اور کفر و ضلالت سے خود بخود نفرت کرتا ہے۔ یہ تمام باتیں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ میں موجود تھیں۔ آپ اسلام سے قبل بھی کبھی شراب اور زنا جیسی قبیح باتوں میں نہ الجھے تھے۔ آنحضرت ﷺ کی نبوت، معراج اور ہر بات کی بغیر دلیل کے تصدیق کی۔ قرآن میں ان ہی کی راہ پر چلنے کی بارہا تاکید کی گئی ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ ہی نہیں کہا بلکہ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ کہا۔ جس میں ایسی پاک ہستیوں کی تقلید کرنے کا حکم ہے۔ درج بالا آیت فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ (النساء: ۶۹) میں بھی بتایا گیا ہے کہ جو بھی اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرے گا اس کو ایسے انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی صحبت دنیا اور آخرت میں نصیب ہوگی۔

مراتبِ صدق اور صادق

مراتبِ صدق اور صادق چھ ہیں۔ صدقِ قول، صدقِ نیت و ارادہ، صدقِ عزم، صدقِ وفائے عزم، صدقِ عمل اور صدقِ تحققاتِ مقاماتِ دین۔ جو شخص ان تمام مراتبِ صدق کا حامل ہو وہ صدیق ہے اور جو ان میں سے کسی ایک کا یا چند کا حامل ہو تو وہ صادق کہلانے کا مستحق ہے۔ حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ اگر ایک صادق اللہ تعالیٰ کی طرف ایک ہزار سال تک متوجہ رہے پھر ایک لحظہ اس سے غافل ہو جائے تو اس کا نقصان ایک ہزار سال کے فائدے سے زیادہ ہوگا چنانچہ مشائخ کرام طالب راہِ خدا کے مبتدی کو اپنے اوصاف کے ساتھ صادق کہتے ہیں اور منتہی کو صدیق کہتے ہیں۔ ابو سعید قرشیؒ نے فرمایا ہے کہ صادق وہ ہے جس کا ظاہر درست ہو اور باطن کبھی کبھار خواہشاتِ نفسانی کی طرف مائل ہو جاتا ہو۔ اس کی علامت یہ ہے کہ اس کو کبھی بندگی میں حلاوت محسوس ہوتی ہے اور کبھی حلاوت محسوس نہیں ہوتی۔ قوت القلوب میں مشائخ کا قول نقل کیا گیا ہے کہ صدیقین اور شہداء کے قلوب پر اللہ تعالیٰ کی براہ راست نظرِ رحمت ہوتی ہے اور پھر اس قوم کی طرف ہوتی ہے جو ان کے قلوب میں ہوتے ہیں اور اس طرح قلوب در قلوب نظر پڑتی رہتی ہے۔

صادق کون ہوتا ہے؟

صادق کا لفظ الصدق سے بنا ہے اور یہ الکذب کی ضد ہے۔ یہ لفظ قول کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ الصدق کے معنی دل و زبان کی ہم آہنگی اور بات کا نفس واقعہ کے مطابق ہونا ہے۔ صادق وہ شخص ہے جس کی صفت صدق ہو۔

صوفیاء کا قول تعرف کی شرح میں لکھا گیا ہے۔

اَلصَّادِقُ یَقُوْلُ مَا یَقُوْلُهُ النَّبِیُّ عَلَیْهِ السَّلَامُ وَیَدْعُوْ اِلٰی مَایَدْعُوْ اِلَیْهِ ۔ "صادق یعنی ولی وہی کہتا ہے جو نبی کہتا ہے اور اس چیز کی دعوت دیتا ہے جس کی نبی دعوت دیتا ہے"۔

بعض لوگ دل، زبان اور اعمال وغیرہ سب کے سچے ہوتے ہیں، وہ صادقین کہلاتے ہیں اور بعض دل، زبان، اعمال اور ارادے وغیرہ سب کے سچے ہوتے ہیں، وہ صدیق کہلاتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جو واقعہ ہو ویسا بیان کر دیں، وہ صادق ہیں اور بعض وہ کہ جیسا ان کی زبان سے نکل جائے ویسا ہی واقعہ ہو جائے وہ صدیق ہوتے ہیں۔

صدیق اگر کوئی غلط بات بھی کہہ دے تو اللہ اسے سچ کر دیتا ہے مستند روایات میں ہے کہ ایک عورت ایک جنگ کے بعد اسلامی لشکر کی واپسی پر شہر سے باہر آ کر اپنے بیٹے کو دیکھنا چاہتی تھی سب کو علم تھا کہ وہ شہید ہو گیا ہے مگر ہر گروہ اس عورت کو کہتا رہا کہ پیچھے جو لوگ آ رہے ہیں ان سے پوچھو اور سب سے آخر میں حضرت ابو بکر صدیقؓ آ رہے تھے آپؓ نے فرمایا کہ وہ پیچھے آ رہا ہے آپؓ کے ان الفاظ کو سچا کر دیا گیا اور واقعی اس کا بیٹا زندہ ہو کر آ رہا تھا اس میں شک نہیں ہونا چاہیے ایسی ہزاروں روایتیں ہیں کہ مردے زندہ کر دیئے گئے۔ بنی اسرائیل کو زندہ کرنے کی بات قرآن کریم میں ہے۔ اُمتِ محمدیہ ﷺ کے ولیوں کی بھی یہ طاقت ہے۔

فقط اشارے سے سب کی نجات ہو کے رہی ‏ ‏ تمہارے منہ سے جو نکلی وہ بات ہو کے رہی
جو شب کو کہہ دیا دن ہے، تو دن نکل آیا ‏ ‏ جو دن کو کہہ دیا شب ہے تو رات ہو کے رہی

صادقین کی ہمراہی صادق بنا دیتی ہے۔ صدیقین کی ہمراہی صادق گر بنا دیتی ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ سب سے زیادہ سچے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، لہٰذا محمدی بنو اور حنفی شافعی وغیرہ نہ بنو۔ اس لئے بیعت کی بھی ضرورت نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تمام لوگ آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں لیکن ان کو ملکوں قوموں میں تقسیم کرنا ضروری تھا تا کہ عنوان قائم کیے جا سکیں۔ جیسے قرآن میں ہے۔

وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ (الحجرات: ۱۳) "ہم نے تم کو گروہوں اور قبیلوں میں اس لئے تقسیم کر دیا تا کہ تمہاری پہچان ہو"۔

اب چونکہ غلط لوگ بھی فرقے قائم کر چکے ہیں اس لئے فرقوں کا نام ہونا چاہیے تاکہ روحانی امتیاز جو شریعت اور طریقت کے سلسلوں سے ہوتا ہے، معلوم ہو جائے کہ کون کس فرقے سے تعلق رکھتا ہے بلکہ ان روحانی طریقوں میں بھی امتیاز ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی اہلِ حدیث تو کیا وہ روپڑی ہے یا ثنائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوگئی تو نئے نئے فرقے پیدا ہونے لگے پہلے تو مسلمانوں کے ساتھ صرف منافق چھپے ہوئے تھے اور اب تو مسلمانوں نے فرقے خود ہی بنانے شروع کر دیئے۔

اِرشادِ خداوندی ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (التوبہ:119) اس آیت میں مومنوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ تقویٰ اختیار کرو اور صادقین کی صحبت میں رہا کرو۔ یہ حکم تمام مسلمانوں کے لئے ہے۔ صادقین سے مراد صحابہ کرامؓ اور تا قیامت آنے والے علمائے دین اور اولیائے کرامؒ ہیں جو دل، زبان، نیت، اعمال اور ارادے کے سچے ہیں۔ معیت سے مراد عقائد اور اعمال میں ساتھ رہنے کے ہیں کیونکہ معیت قلبی اور مضبوط ہوتی ہے جو کبھی نہیں ٹوٹتی اور دنیا، برزخ اور آخرت میں کام آتی ہے۔ یہ حضرات حقانیت کی دلیل ہیں، راستہ دراز ہے، سفر لمبا ہے، راہ میں ڈکیتی ہوتی ہے اچھوں کے ساتھ ہو تو بخیریت منزل پر پہنچ جاؤ گے۔

جب خلافت کا سوال اٹھا تو انصار نے کہا کہ ایک خلیفہ انصار سے ہو اور دوسرا مہاجرین سے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کو صادقین فرمایا۔ جیسے ارشاد ہے لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِیْنَ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا وَّ یَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ (الحشر:8) اور تمام مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (التوبہ:119) کہہ کر ان مہاجرین کے ساتھ رہنے کا حکم دیا ہے۔ لہٰذا مہاجرین میں امیر ہوں گے اور تم وزیر ہو گے چنانچہ اس پر مسئلہ خلافت طے ہوا اور مہاجرین میں سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بالاتفاق خلیفہ مقرر ہوئے۔

صادقین کے ساتھ رہنے کے فوائد

تفسیر نعیمی میں صادقین کے ساتھ رہنے کے چند فوائد بیان کیے گئے ہیں۔

(۱) تقویٰ اور سچوں کا ساتھ صرف مومنوں کو فائدہ دے گا کیونکہ خطاب ایمان والوں کو ہے۔ کافر اور منافق اس سے بے نصیب رہیں گے۔

(۲) صرف ایمان سے وہ فائدہ نہ ہوگا جو نیک اعمال اور صادقین کے ساتھ رہنے سے ہوگا۔

(۳) متقی اکیلا نہ رہے بلکہ صادقین کے ساتھ کیونکہ لکڑی کے ساتھ لوہا بھی پانی میں تیرنے لگتا ہے۔ یہ لکڑی (صادقین) کے ساتھ رہنے کا فائدہ ہے۔

(۴) سچوں کے ساتھ رہنے کا حکم تا قیامت ہے چنانچہ صادقین بھی تا قیامت دنیا میں رہیں گے۔

(۵) "کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ" میں اجماع ہے اور اجماع اُمت دلیل شرعی ہے اور جس پر اجماع ہو جائے وہ بات حق ہے۔

(۶) دین موسوی اور عیسوی جب سے منسوخ ہوا ہے ان میں کوئی ولی نہیں رہا۔ ہمارے نبی کا دین کبھی منسوخ نہ ہوگا اس لئے ولایت ہمیشہ اور ہر زمانے میں رہے گی چنانچہ وہ جماعت جس کو نبوت سے فیض رسانی ہوتی رہے گی اس میں ولایت دائم و قائم رہے گی لہٰذا مسلمانوں کو اپنا تعلق اس فرقے اور جماعت سے رکھنا چاہیے۔ جب کہ جو فرقہ اولیاء اللہ سے خالی ہو وہ حق پر نہیں اور نبی کا فیض صرف اسی فرقے پر ہوتا ہے جس میں اولیائے کرام ہوں۔

(۷) چاروں اماموں کو ماننے والے برحق اور جو ان اماموں کی تقلید پر نہ چلے وہ حق پر نہیں اور اولیاء بھی ان میں نہ ہوں گے۔ اگر چہ وہ اپنے علماً کو ولی کہتا ہے لیکن ولی وہ ہے جو ولایت کے سانچے میں پورا اترے، لہٰذا ولی کی شناخت کے لئے اس کتاب میں ایک بیان شامل کر دیا گیا ہے۔ وہاں ولی کی علامات بھی بیان کر دی گئی ہیں۔

حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا کہ صدیقین کا مرتبہ کمال پیغمبر کا اولین درجہ ہے، ان کی ارواح نفس کی تاریکیوں سے آزاد ہو کر بساط قرب تک پہنچ چکی ہوتی ہیں۔ خواہشات کی آگ بجھ جاتی ہے۔ آخرت ان پر منکشف ہو جاتی ہے۔ جس پر لوگ یقین رکھتے ہیں۔ یہ اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ جیسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا۔

مَنْ یُّرِیْدُ اَنْ یَّنْظُرَ اِلٰی مَیِّتٍ یَّمْشِیْ عَلٰی وَجْهِ الْاَرْضِ فَلْیَنْظُرْ اِلٰی اَبِیْ بَکْرٍ

"جو روئے زمین پر میت کو چلتا پھرتا دیکھنا چاہتا ہے تو وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دیکھ لے"۔

حضور پاک ﷺ کے اس قول میں اشارہ اس طرف تھا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو وہ روحانی علم حاصل ہو چکا تھا جو عام مومنین کو مرنے کے بعد ہوتا ہے۔ (یاد رہے کہ مومن کا خدا سے قرب سب سے کم اس دنیا میں ہوتا ہے، اس سے زیادہ موت کے وقت ہوتا ہے، اس سے زیادہ قبر میں ہوتا ہے، اس سے زیادہ حشر میں ہوگا اور سب سے زیادہ جنت میں ہوگا۔) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنی زندگی میں فرمایا کرتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ آخرت کے تمام پردے بھی اٹھا دے تو ہمارے ایمان میں ذرہ برابر بھی فرق نہ ہوگا۔ اس کا تذکرہ سورۃ قٓ آیت نمبر ۲۲ میں حسب ذیل الفاظ میں کیا گیا ہے۔

فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴿۲۲﴾ (قٓ: ۲۲)

"پس ہم نے اٹھا دیا ہے تیری آنکھوں سے تیرا پردہ سو تیری بینائی آج بڑی تیز ہے"۔

بعض علماً کا قول ہے کہ صدیق، فعیل کے وزن پر مبالغے کا صیغہ ہے یعنی نہایت راست باز یا راست

گفتار اور مقامات قرب الٰہی میں ایک خاص مقام کا نام ہے۔ شیخ محمد عبدہٗ لکھتے ہیں کہ صدیقین وہ لوگ ہیں جن کی فطرت اور جن کا باطن ہر گرد و غبار سے یوں صاف اور پاک ہوتا ہے کہ جب ان پر حق پیش کیا جاتا ہے تو بے ساختہ اس کو قبول کر لیتے ہیں۔ خیر اور شر کے درمیان انہیں التباس نہیں ہوتا جیسے نگاہ سیاہ اور سفید میں بلا امتیاز فرق کر لیتی ہے اسی طرح وہ حق و باطل، خیر و شر اور بہتر و کہتر میں امتیاز کر لیتے ہیں۔

صدیقیت کا مرتبہ حضور پاک ﷺ کے کئی صحابہ کرامؓ کو حاصل تھا اور اب بھی ہے۔ ان تمام صدیقین میں سے حتیٰ کہ قیامت تک آنے والے تمام صدیقین سے بڑے صدیق اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یارِ غار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ جن کی زندگی کا ہر لمحہ اسی صدیقیت کبریٰ کا مظہر اتم ہے۔ آپ نے ایمان بلا جھجک قبول کیا، معراج کو تسلیم کیا، صلح حدیبیہ پر رضامندی کا اظہار کیا اور یہ واحد صحابی تھے جن کو صلح حدیبیہ کی شرائط پر کوئی تردّد نہ تھا۔ خلافت میں جو قدم اٹھایا اکابر صحابہؓ بھی پریشان ہو گئے لیکن آپؓ کا قدم درست نکلا کیونکہ آپؓ صدق پر تھے۔ اس آیت میں شہداء اور صالحین کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ امام رازیؒ لکھتے ہیں کہ شہید وہ شخص ہے جو کبھی نور برہان اور قوتِ بیان اور کبھی شمشیر و سنان سے دینِ الٰہی کی حقانیت کی شہادت دے راہِ خدا میں قتل ہونے والا اپنی جان قربان کر کے دین کی حقانیت کی گواہی دیتا ہے اسی لئے شہید کہلاتا ہے اور مردِ صالح وہ ہے جو عقائد اور اعمال دونوں کے اعتبار سے صالح ہو۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے بھی صحابی فرمایا ''اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ'' (توبہ: ۴۰) جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مصاحب سے فرمایا کہ غم نہ کرو اور ایک جگہ متقی فرمایا۔

وَ سَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۝ الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰى ۝ (الیل: ۱۷۔۱۸) ''اور دور رکھا جائے گا اس سے وہ نہایت پرہیزگار جو دیتا ہے اپنا مال اپنے دل کو پاک کرنے کیلئے''۔

ان آیات کے علاوہ اور بہت سی آیات آپ کے حق میں نازل ہوئیں۔ جامع کرامات اولیاء میں ہے کہ صدیق کا مقام اتنا بلند ہے کہ نبوت تشریعی اور صدیقیت میں کوئی مرتبہ حائل نہیں۔ ادھر صدیقین کی بلند و بالا شخصیت سے آدمی آگے بڑھا اور ادھر نبوت کے قصر رفیع میں داخل ہو گیا۔ مقامِ صدیقیت سے اوپر اور مقام نبوت تشریعی سے نیچے ایک مقام قربت ضرور ہے۔ شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ یہ مقامِ قربت جن افراد کو عطا ہوتا ہے یہ نبوت سے تو نیچے ہیں لیکن مقامِ صدیقیت سے اوپر ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جسے مقامِ سرّ (بھید) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہی سرّ قلبِ صدیق اکبر میں جاگزیں ہوا تو وہ سب صدیقوں سے افضل قرار پائے اور اب حضور نبی کریم ﷺ اور سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے درمیان اور کوئی صاحب مقام آدمی حائل نہیں کیونکہ آپ صدیقیت اور مقامِ سرّ دونوں کے جامع ہیں یعنی ادھر منبع رسالت سے انوار نکلے اور ادھر مخزنِ صدیقیت میں ضیاء پوش ہونے لگے۔ اسی لیے حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ جو علم مجھے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ملا اس کو میں

نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دل میں نچوڑ دیا۔اسی لیے علامہ اقبالؒ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں عرض کیا کہ ہمارے معاملے اور کام کی بنیاد اور اساس آپ کے ہاتھ میں ہے۔لہٰذا آپ ہمارے ناصر اور چارہ گر بنیں۔(یہ شرک نہیں ہے۔)۔

پختہ از دستت اساسِ کارِ ما چارۂ فرما پئے آزارِ ما(ا۔ر:۱۵۶)

(ہمارے معاملے اور کام کی بنیاد آپ کے ہاتھ میں ہے۔آپ ہی قوم کے امیرِ اول ہیں لہذا ہماری مشکلات ومصائب کے لئے کوئی چارہ تجویز فرمائیں)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ روضہ نبوی ﷺ میں بھی ثانی ہونے کا شرف رکھتے ہیں،لہٰذا اُمت انہیں ثانیٔ لاثانی مانتی ہے۔صدیق کون ہوتا ہے اور صدیقِ اکبرؓ کیا ہیں؟یہ ایک بہت طویل گفتگو ہے وقت اور جگہ کی تنگی کے باعث پوری بیان نہیں ہوسکتی۔شاید کسی اور مقام پر بیان ہوسکے۔

قرآن میں کتنے صدیقوں کا ذکر ہے

قرآن میں کل پانچ صدیقوں کا ذکر آتا ہے۔باقی (بغیر ناموں کے) کچھ صدیقینِ اُمت مصطفوی ﷺ کا بھی ذکر ہے۔پہلی صدیقہ حضرت مریم علیہا السلام (المائدہ:۷۵) دوسرا نام حضرت یوسف علیہ السلام (یوسف:۴۶) تیسرا نام حضرت ابراہیم علیہ السلام (مریم:۴۱) چوتھا نام ادریس علیہ السلام (مریم:۵۶) پانچواں نام حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ (الزمر:۳۳) چھٹا نام رسول اکرم ﷺ کی اُمت کے صدیقوں کا ہے۔(الحدید:۱۹)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سب سے بڑے صدیق ہیں

حدیث میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ ایک علم اللہ نے مجھے ایسا عطا فرمایا ہے جو آپ نہیں جانتے اور ایک علم آپ کو عطا فرمایا ہے جو میں نہیں جانتا۔مفسرین ومحدثین نے لکھا ہے حضرت خضر علیہ السلام کا خاص علم،علم بالحق اور مکاشفہ تھا۔وارد ہوا ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو نماز وغیرہ اعمال کی بنا پر صحابہ پر فضیلت نہیں بلکہ ان کو فضیلت اس چیز سے ہے جو ان کے سینے میں ہے یعنی علم باطن وعلم اسرار کیونکہ ان علوم کی بدولت جو افعال صادر ہوں گے وہ حکمت سے ہوں گے اگرچہ بظاہر خلاف معلوم ہوں۔

بشریت

فرمانِ خداوندی ہے:قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (الکہف:۱۱۰)(اے پیکر رعنائی وزیبائی) آپ ﷺ فرمائیے کہ میں بشر ہی ہوں تمہاری طرح آپ حسن وصورت میں بھی سب سے اعلیٰ وبالا تھے اور حقیقت روح

اور باطن کے اعتبار سے تو تمام انبیائے کرامؑ میں اوصاف بشر سے اعلیٰ تھے۔ قاضی عیاضؒ اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے فرمایا ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام اجسام وظواہر میں حد بشریت پر اور ان کے ارواح و بواطن بشریت سے بالا اور ملاء اعلیٰ سے متعلق ہیں۔ آپ کی ذات وکمالات میں آپ کا کوئی مثل نہ تھا۔ اس آیت میں تواضع کے لئے صورت بشریت کا بیان کرنے کے لئے فرمایا ہے۔ مگر اس کو سند نہیں بنانا چاہیے اصحاب عزت بطور تواضع اگر کچھ فرمائیں تو ان باتوں کا کہنا دوسروں کے لئے روا نہیں۔ دوسرے یہ کہ آپ ﷺ کو اللہ نے فضائل جلیلہ اور مراتب رفیعہ عطا فرمائے ہیں اور اب ان مراتب کا ذکر چھوڑ کر وصف عام کا ذکر کرنا جو ہر کہ ومہ میں ہو ان کمالات کو نہ ماننے کے برابر ہے۔ سوئم یہ کہ کفار کا قرآن میں بار بار ذکر آیا ہے کہ وہ آپ کو اپنے جیسا بشر کہتے ہیں اور اس سے وہ گمراہی میں مبتلا ہوئے۔ (قوت القلوب ص ۲۵۴)

ابو طالب مکیؒ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبین کو دنیا میں سب سے پہلے جو عطا فرماتا ہے وہ ''کن'' کی عطا ہے، مگر وہ اسے اللہ کی محبت کے باعث استعمال نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہاں تک حکم دیا ہے کہ قیامت کے بارے میں کن کہہ لیں لیکن اللہ کے مخفی رازوں کو لوگوں کے سامنے ظاہر نہ کریں ورنہ احکام ساقط ہو جائیں گے اور عوام ہلاکت میں پڑ جائیں گے۔ جب زنگی فوج بصرے میں داخل ہوئی تو قتل عام ہو گیا۔ حضرت سہلؒ کے اصحاب ان کے پاس جمع ہوئے اور عرض کی کہ کاش آپ اللہ سے دعا کریں۔ آپ نے کچھ دیر خاموشی اختیار کی اور پھر فرمایا ''اس شہر میں اللہ کے ایسے بندے بھی ہیں کہ جو اللہ سے ظالموں کے خلاف بد دعا کریں تو ساری زمین پر کوئی ظالم آدمی زندہ نہ رہے مگر وہ ایسی بد دعا نہیں کرتے۔'' فرمایا کہ اگر وہ اللہ سے دعا کریں، کہ قیامت قائم نہ ہو تو اللہ قیامت قائم نہیں کرے گا اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب اسے کن کی عطا ہو جائے۔ امام محمدؒ نے بھی فرمایا کہ کن دراصل کان کے نیچے بند اور لپٹا ہوا ہے چنانچہ ان کے نزدیک کن سے کان زیادہ محبوب ہے۔ اللہ تعالیٰ کن پر اس وقت غلبہ دیتا ہے جب ان کے دلوں پر ''کون'' منکشف ہو جائے۔ فتوح الغیب میں ہے کہ بعض الہامی کتب میں ہے کہ اے آدم کے بیٹے میں جو چاہتا ہوں ہو جاتا ہے تو میری تابعداری کر میں تجھ میں بھی یہ وصف ڈال دوں گا پھر تو جس چیز کو کہے گا ہو جا تو وہ ہو جائے گی۔

مقام حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

آپ کے مراتب کا بیان بہت طوالت طلب ہے۔ اس پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ یہاں صرف چند نکات بیان کئے جا رہے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے تین خصوصی انعامات دیئے ہیں جو ان کے سوا اور کسی کو نہیں ملے۔

(۱) حضور پاک ﷺ کا فرمان ہے میری اُمت میں سے جو مجھ پر ایمان لایا اللہ تعالیٰ نے ان سب کے

مجموعے کے برابر ایمان تجھے عطا فرمایا۔ اسی لیے منقول ہے کہ ایک ہزار عوام اہل اسلام مومنوں کے برابر ہر صالح مومن کا ایمان ہے اور ایک شہید کا ایمان تمام صالحین کی طرح ہے اور تمام شہداء کا ایمان ایک صدیق کی طرح ہے۔

(۲) دوسری حدیث میں ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے تین سو خلق ہیں جن کو توحید کے ساتھ ان میں سے ایک بھی حاصل ہو جائے وہ جنت میں داخل ہو گیا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کیا میرے اندر ان میں سے کوئی خلق ہے؟ آپؐ نے فرمایا اے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تیرے اندر سب خلق ہیں اور اللہ تعالیٰ کو سخاوت سب سے زیادہ محبوب ہے۔

(۳) تیسرا انعام یہ ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا "میں نے دیکھا کہ آسمان سے ایک ترازو لٹکایا گیا اس کے ایک پلڑے میں مجھے رکھا گیا اور میں سب سے بھاری ہو گیا اور ابو بکرؓ ایک پلڑے میں رکھے گئے اور میری اُمت لائی گئی اور وہ دوسرے پلڑے میں رکھی گئی تو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سب سے بھاری نکلے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا کہ جیسے موسیٰ علیہ السلام کے لئے ہارون تھے، ایسے ہی میرے لئے علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ (یہ مقام اخوت ہے) حضور پاک ﷺ کا ارشاد ہے کہ اگر میں لوگوں میں سے کسی کو خلیل بناتا تو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلیل بناتا لیکن تمہارا صاحب اللہ تعالیٰ کا خلیل ہے۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اے ابو بکر رضی اللہ عنہ تم میری امت میں سب سے پہلے جنت میں داخل ہو گے۔

محبین اور صدیقین اللہ کے پاس ہوتے ہیں

قوت القلوب ۲۴۹ جلد دوم میں ہے کہ محبین اللہ کے پاس ہوتے ہیں اور جو اللہ کے پاس ہو اسے نہ کوئی بشر دیکھتا ہے اور نہ کوئی فرشتہ۔ منقول ہے کہ حضرت حسن بصریؒ ایک دن حبیب عجمیؒ کے گھر میں چھپ گئے۔ جب پولیس ان کے تعاقب میں اندر داخل ہونے لگی تو آپ دیوار پھلانگ کر بھاگنے لگے مگر حبیب عجمیؒ نے کہا کہ اے ابو محمد! بیٹھ جاؤ، دیکھتے رہو کیا ہوتا ہے۔ سپاہی دیکھتے رہے اور تلاش کے بعد رخصت ہو گئے۔ حسن بصریؒ نے پوچھا کہ سپاہیوں نے مجھے کیوں نہیں دیکھا۔ فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کے پاس تھے۔ اس لیے انہوں نے تمہیں نہیں دیکھا اور اگر تم میرے پاس ہوتے تو دیکھ لیتے۔ حضرت حسن بصریؒ نے پوچھا کہ جس وقت پولیس داخل ہوئی تو آپ کیا پڑھ رہے تھے؟ کیا تم نے اللہ کا اسم اعظم پڑھا۔ فرمایا نہیں بلکہ میں نے یہ کہا تھا کہ "اے اللہ اسے اپنے پاس کر لو حتیٰ کہ وہ اسے نہ دیکھ سکیں۔"

حضرت حبیبؒ، حسن بصریؒ کے مرید تھے اور حسن بصریؒ کے درجات ان سے کئی گنا زیادہ تھے۔ یہ محبین کی شان ہے تو صدیقین کی شان کیا ہو گی؟ حضرت بایزید بسطامیؒ سے کوہ قاف اور کشتی نوحؑ وغیرہ کے متعلق

پوچھا کہ حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ نے کوہ قاف پر نوح علیہ السلام کی کشتی کو دیکھا اور اس کے حالات بتائے ہیں یہ کیسے ممکن تھا۔ فرمایا کہ بصرہ میں اللہ کا ایک بندہ ہے وہ بیٹھے بیٹھے اپنا ایک پیر اٹھاتا ہے اور اسے کوہ قاف پر رکھ دیتا ہے۔ مشائخ فرماتے ہیں کہ ساری دنیا ایک ولی کے لئے ایک قدم اٹھانے کے برابر ہے اور اللہ کا ایک ولی ایک قدم اٹھائے تو پانچ سو برس کا فاصلہ طے کر لیتا ہے۔

حضرت یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ نے عشاء کے بعد فجر تک ایک ہی حالت میں بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔ آپ نے ایک سجدہ کیا اور دعا فرمائی ایک شخص نے جو پاس بیٹھا ہوا تھا پوچھا حضرت آپ نے کیا دیکھا، فرمایا جو کچھ تمہارے مراتب ہیں میں بتادوں گا پھر فرمایا فلک اسفل، ملکوت سفلی اور تحت الثریٰ تک دکھایا پھر آسمانوں میں لے گئے اور خوب سیر کرائی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے سامنے کھڑا کیا اور کہا مانگو جو تم نے دیکھا میں تمہیں دوں گا۔ میں نے کہا کہ مولا کریم میں تو کسی چیز کو مانگنے کے قابل نہیں سمجھتا، میں تو تجھے ہی مانگتا ہوں۔ فرمایا تو میرا حقیقی بندہ ہے، تو میری عبادت میں سچا ہے، میں تم سے ایسا سلوک کروں گا، اس شخص نے کہا کہ آپ نے اللہ سے اس کی معرفت کیوں نہیں مانگی۔ اس پر وہ زور سے چلائے۔ "تیرا ناس ہو تم مجھے ان پر جرأت دلا رہے ہو۔"

صادقین سے معیت کے حصول کا طریقہ

کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ کے تحت مشائخ کرام فرماتے ہیں کہ جب سالک صادقین کے ساتھ رفاقت شروع کرتا ہے اور ان کے آستانوں کے خادموں میں داخل ہو جاتا ہے تو ان کی محبت، تربیت اور ولایت کی قوت سے سیر الی اللہ اور ترک ماسوا اللہ کے مراتب تک پہنچ جاتا ہے۔ حضرت شیخ اکبر ابن عربیؒ قدس سرہ (متوفی م ۶۳۸ھ) مواقع النجوم ومطالع اہل الاسرار والعلوم میں فرماتے ہیں کہ اگر تو اپنے افعال کو کسی دوسرے کی مراد کے موافق نہ کرے گا تو ہوا و ہوس اور خواہش نفسانی سے رہائی نہ پائے گا اگر چہ اپنی تمام عمر نفس سے مجاہدہ کرتا رہے۔ جب تجھے ایسا بزرگ مل جائے جس کی تعظیم اور حرمت تو اپنے نفس میں پائے تو اس کا خادم بن جا اور ایسا ہو جا جیسے مردہ غسال کے ہاتھ میں ہوتا ہے وہ جس طرح چاہے تجھ میں تصرف کرے۔ تجھے اپنی ذات میں اس کے ساتھ کوئی تدبیر واختیار نہ ہو۔ اس کے اوامر و نواہی کی تعمیل کے لئے تیار رہ۔ اگر وہ تجھے کسی کسب کا حکم دے تو اس کے حکم سے کسب کر نہ کہ اپنی نفسانی خواہش سے کیونکہ وہ تیری مصلحتوں کو تجھ سے بہتر جانتا ہے۔ پس اے فرزند پیر کی تلاش میں کوشش کر، تاکہ وہ تیرا رہنما بنے اور تیرے فوائد کی نگہبانی کرے اور تیری ذات وجود الٰہی سے کامل ہو جائے اور اس وقت تو وجود کشفی، اعتصامی سے اپنے نفس کی تدبیر کرے۔ استاد ابو علی دقاق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو درخت اللہ کا ذکر بند کر دے اس پر آرا چلا دیا جاتا ہے۔ علم لدنی اور وہبی علم کا ذکر قرآن مجید کی درج ذیل آیت سے بھی ملتا ہے۔

كَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِیْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ یَتْلُوْا عَلَیْكُمْ اٰیٰتِنَا وَ یُزَكِّیْكُمْ وَ یُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ یُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ۠ (البقرۃ:۱۵۱)

"جیسا کہ بھیجا ہم نے تمہارے پاس رسول تم میں سے پڑھ کر سناتا ہے تمہیں ہماری آیتیں اور پاک کرتا ہے تمہیں اور سکھاتا ہے تمہیں کتاب وحکمت اور تعلیم دیتا ہے تمہیں ایسے باتوں کی جنہیں تم جانتے ہی نہیں تھے"۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ درج بالا آیت میں "یُعَلِّمُکُمْ" کا لفظ دو مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ پہلی مرتبہ یہ لفظ کتاب اور حکمت کی تعلیم کے لیے استعمال ہوا ہے اور دوسری بار جو استعمال کیا گیا ہے یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ علم کتاب اور حکمت کے علاوہ ہے اور الگ نوعیت رکھتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ غالباً اس علم سے مراد علم لدنی ہے جو قرآن کے باطن اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے روشن سینے سے حاصل ہوتا ہے اور اس کا حصول بذریعہ تعلیم نہیں بلکہ بذریعہ انعکاس ہے یعنی قرآن اور نبوت کی کرنیں مومن کے دل کے آئینے پر منعکس ہوں۔

علامہ اقبالؒ نے فرمایا۔

می نہ دانی عشق و مستی از کجا ست؟ ایں شعاعِ آفتابِ مصطفیٰؐ ست (پ۔چ: ۸۶۴)

(کیا تم نہیں جانتے کہ یہ عشق اور مستی کہاں سے آتی ہے، یہ تو آفتاب مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی ایک شعاع ہے)

علامہؒ موصوف فرماتے ہیں اولیائے کاملین جو انوارِ نبوت کے صحیح وارث ہوتے ہیں وہ اپنے مریدانِ باصفا کو اس قسم کے علوم اور فیضان عطا فرماتے ہیں اس کے بعد ان معارف کے حاصل کرنے کے طریقے اور ذریعے کے متعلق فرمایا کہ یہ ذکر سے حاصل ہوتا ہے۔

حلقۂ انعکاس، طریقۂ انعکاس

صوفیائے کرام بیان کرتے ہیں کہ حدیث شریف کے مطابق پہلی وحی کے نازل ہونے کے وقت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جبرائیل علیہ السلام نے کہا "اِقْرَاْ" (پڑھیے) تو آپ نے فرمایا "مَا اَنَا بِقَارِئٍ" (کہ میں پڑھنے والا نہیں۔) اسی طرح جبرائیل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تین دفعہ اپنے سینے کے ساتھ بھینچا جس سے آپ کو تکلیف بھی محسوس ہوئی لیکن تیسری دفعہ معانقہ کرنے کے بعد آپ نے وہ سب کچھ پڑھا جو اللہ کی طرف سے نازل ہوا تھا یہی طریقۂ انعکاس ہے۔ صوفیائے کرام جو معانقہ فرماتے ہیں وہ اسی سے ماخوذ ہے۔

ایک حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ میرے سینے میں ڈالا وہ میں نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سینے میں ڈال دیا۔ یہ بھی انعکاس کی ایک مثال ہے۔ ایک اور حدیث میں

ذکر ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے محسوس کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کندھوں کے درمیان اپنا دستِ قدرت رکھا جس سے آپ ﷺ نے زمین اور آسمان کی اشیاء معلوم کر لیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ مقربین فرشتے کس معاملے میں گفتگو کر رہے ہیں تو آپ ﷺ نے فرشتوں کی اس گفتگو کو سنا جو ہاتھ رکھنے سے پہلے آپ سن نہ سکتے تھے۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سینے پر جب رسول پاک ﷺ نے اپنا دستِ مبارک رکھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اب میں اپنے دل میں سب سے زیادہ محبت آپؐ کے لئے محسوس کرتا ہوں۔ (جب کہ یہ کیفیت پہلے موجود نہ تھی۔)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی مجلس شریف میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے کچھ یاد نہیں رہتا تو آپ ﷺ نے فرمایا اپنی چادر بچھاؤ چنانچہ میں نے چادر بچھا دی جو میرے اوپر تھی تو حضور پاک ﷺ نے اپنا کلام (علم) اس پر بہا دیا۔ (دونوں ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے) پھر میں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کے بعد میں کوئی چیز نہیں بھولا۔ علماء کا قول ہے کہ پانچ ہزار سے زائد احادیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہیں۔ (الاصابہ فی تمییز الصحابہ) یہ تعلیم فرمانے کا طریقہ بھی طریقۂ انعکاس میں شامل ہے۔

حدیث شریف میں ہے۔

اَلعِلمُ عِلمَانِ فَعِلمٌ فِی قَلبٍ فَذَالِکَ عِلمٌ نَافِعٌ وَ عِلمٌ عَلَی اللِّسَانِ فَذَالِکَ حُجَّۃُ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ عَلٰی اِبنِ اٰدَمَ (سنن دارمی)

علم دو قسم کا ہوتا ہے ایک علم جو دل میں ہوتا ہے، یہی علم نافع ہے اور زبان کا علم اور یہ علم اللہ تعالیٰ کی ابن آدم پر ایک حجت (دلیل) ہے۔

شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں علم نافع وہ ہے جس کی روشنی دل میں پھیلتی ہے اور اس سے دل کے پردے اٹھتے ہیں۔ علم اللسان وہ ہے جو تاثیر نہ کرے اور دل کو نورانی نہ کرے۔ روایات میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی دعا سے ابن عباس رضی اللہ عنہما کو قرآن کے باطن کا علم دیا گیا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ خود بھی فرمایا کرتے تھے کہ میں راسخین علم میں سے ہوں اور مجاہدؒ نے یہ بھی کہا کہ آپ تشابہات کی تاویل بھی جانتے تھے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا علم ظاہر کچھ اور ہے اور تصوف میں اس کا علم چونکہ مشاہدے اور کشف سے ہوتا ہے اس کی نوعیت کچھ اور ہے، لہٰذا صوفی کو چاروں طرف خدا ہی خدا نظر آتا ہے۔

در و دیوار شد آئینہ از کثرت شوق ہر کجا می نگرم روئے ترا می بینم (x)

(کثرتِ شوق سے در و دیوار آئینے کا کام دیتے ہیں، میں جدھر بھی دیکھتا ہوں تیرا چہرہ ہی نظر آتا ہے۔)

حضرت مجدد علیہ الرحمۃ نے حدیث "اَلعُلَمَاءُ وَرَثَۃُ الاَنبِیَاءِ" (ترمذی: ص ۳۸۴) (علماء انبیاء کے

وارث ہوتے ہیں۔) کی تشریح میں فرمایا ہے کہ انبیاءؑ کے علم کا وارث وہ ہوتا ہے جس کو دونوں علم یعنی علم احکام اور علم اسرار میں سے حصہ حاصل ہو۔

قرآن کے باطن کی ایک خوبصورت مثال

سورۂ آل عمران کی ساتویں آیت میں اس بات کا ذکر ہے کہ قرآن کی کچھ آیتیں محکم ہیں جو کہ کتاب کی اصل ہیں اور دوسری قسم کی آیتیں متشابہات ہیں۔ مفردات میں ہے کہ محکم آیت وہ ہے جس کا مفہوم واضح اور بین ہو اور اس کے لفظ اور معنی کے اعتبار سے اس پر کسی قسم کا شبہ نہ وارد ہو سکتا ہو اور متشابہات وہ آیات ہیں جن کا معنی اور تفسیر کسی لفظی یا معنوی پیچیدگی کی وجہ سے مشکل ہو چنانچہ اس میں مختلف تاویلات کی گنجائش ہوتی ہے۔

کچھ لوگ ایسی آیتوں کے معنی سادہ لوح لوگوں کے سامنے غلط تاویلیں کرتے ہیں جو محکم آیات کے منافی ہوتی ہیں اور لوگوں کے دلوں میں شکوک اور وسوسے پیدا کرتی ہیں۔ یہ ان کی نیت کے فاسد ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔

اولیائے کرام آیت قرآن اور احادیث کے ظاہری معنوں کو پھیر یا بدل نہیں دیتے بلکہ ان کی تشریح کو دو طریقوں سے بیان کرتے ہیں، ایک ظاہری معنوں کے ساتھ اور ایک باطنی معنوں کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ صرف اولیاء کے قلوب پر منکشف فرماتا ہے۔ قرآن کی ایک آیت کا ظاہری اور باطنی ترجمہ قارئین کے ذوق کے لئے پیش کیا جارہا ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا ٘ (الفتح: ۲۹)

”محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور وہ جو آپ کے ساتھی ہیں کفار کے مقابلے میں بہت بہادر اور طاقتور ہیں۔ آپس میں بڑے رحمدل ہیں تو دیکھتا ہے انہیں کبھی رکوع کرتے ہوئے کبھی سجدہ کرتے ہوئے طلبگار اللہ کے فضل اور اس کی رضا کے“۔

اس آیت کی باطنی تفسیر اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے انبیاء کو پیدا فرمایا ان میں سے ہر ایک کا مزاج روحانی (کرنٹ) الگ تھا۔ کسی کا مزاج سخت، کسی کا نرم، کسی کا معتدل، کوئی تنہائی پسند، کوئی محفلیں سجانے والا اور کوئی سجود و رکوع میں مبالغہ کرنے والا، کوئی مناجات کرنے والا، کوئی آہ و زاری کرنے والا، کوئی خوش مزاج، کوئی کم گفتار، کوئی بھوکا رہنے والا، کوئی اپنے جگر کو پیاسا رکھنے والا، کوئی حلیم، کوئی علیم غرضیکہ ایسی ہزاروں صفات پر کسی نہ کسی نبی کو پیدا کیا گیا۔ اولیائے کرام کا قول ہے کہ ہر ایک مزاج کا مالک جب اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو اسی مزاج پر کوئی دوسرا شخص پیدا ہو جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ ابراہیمی صفات پر ہر زمانے میں لوگ موجود رہتے ہیں اور ان کی تعداد کو ان کے مرنے کے بعد بھی برقرار رکھا جاتا ہے۔ صوفیائے کرام کا خیال

ہے کہ حجۃ الوداع میں ایک لاکھ چوبیس ہزار کے مزاجوں کو اتنے ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں منتقل کیا گیا۔ (حجۃ الوداع میں کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کرام موجود تھے۔) صحابہ کرام کے بعد چار عدد رسولوں کے مزاجوں کو چار صحابہ کبار میں منتقل کیا گیا۔ جس کی تفصیل نیچے دی جارہی ہے۔

غور کا مقام ہے کہ جو مزاج ان چار رسولوں میں اللہ کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے اسی نوعیت کا مزاج چار صحابہ کرام میں علی الترتیب پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر حضرت داؤد علیہ السلام کو لیجئے، ان کے مزاج میں عشق کی انتہا، مناجات کا کمال درجے میں پایا جانا، رقیق القلب ہونا، آہ و بکا میں حد درجہ کی شدت اختیار کرنا وغیرہ بہت سی صفات کا مجموعہ موجود تھا اور اگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شخصیت کا مطالعہ کیا جائے تو یہ تمام صفات کافی حد تک ان میں بھی موجود تھیں۔ آپ محبت اور عشق کے مقتداء ہوئے، آپ کی مناجات آہ و زاری، شمع رسالت پر فدا ہونے اور عشق رسول میں جلتے رہنے کی مثالیں مشہور اور معروف ہیں، چنانچہ داؤد علیہ السلام کا مزاج حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ میں منتقل کیا گیا۔ اسی طرح دوسرے رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صفات اور عادات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ آپ نہایت سخت مزاج، صاحب جلال اور ہر ناروا حرکت پر غیظ و غضب کا رویہ اختیار کر لیتے تھے۔ بعینہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مزاج میں سختی موجود تھی۔ کفر کی ذرا سی بات پر آپ کے مزاج میں طیش پیدا ہو جاتا اور ناروا حرکات پر کفار کے سامنے تلوار نکال کر کھڑے ہو جاتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کرتے کہ وہ ان کی گردن اڑانے کی اجازت مرحمت فرمادیں۔ آپ نے ایک مسلمان کی گردن صرف اس وجہ سے اڑادی کہ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کو ماننے میں تردد تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی گردن زنی کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا اے عمر! تم نے ایک مسلمان کو قتل کر دیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا کہ خدا کی قسم میں نے مسلمان کو قتل نہیں کیا، چنانچہ ذات باری تعالیٰ نے آپ کے اس فیصلے کو درست ثابت کرنے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی کہ واقعی ایسا شخص مسلمان کہلانے کا حق دار نہیں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کو آخری فیصلہ تسلیم نہ کرے۔

فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ (النساء:٦٥)

"تمہارے رب کی قسم یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ حاکم بنائیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر اس جھگڑے میں جو پھوٹ پڑا ان کے درمیان"۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مزاج پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو متعین کیا گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک قبطی پر گرفت کرنے کے لئے ایک گھونسہ مارا کہ وہ مرہی گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مزاج میں موافقت پائی جاتی ہے لہٰذا اوّل الذکر کا مزاج مؤخر الذکر میں منتقل کیا گیا۔

تیسرے رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے، جو نہایت منکسر المزاج، رحمدل، نرمی پہ مائل اور عاجزی کے اظہار میں مشہور تھے۔ تیسرے صحابی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی ایسے ہی مزاج کے حامل تھے یہی وجہ تھی کہ آپ نے اپنے دور خلافت میں کسی کا خون بہانے پر اپنی رضامندی کا اظہار نہیں کیا حتیٰ کہ منافقین کے ہاتھوں خود قتل ہو گئے۔ جس کی یہ وجہ تھی کہ وہ مدینۃ الرسول میں اپنی زندگی کی بقا کے لئے خون بہانا پسند نہیں کرتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رحمدلی اور حیاء ان کی خاص پہچان تھی چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا مزاج ان میں منتقل کیا گیا۔ چوتھے رسول خود رسول پاک ﷺ کی اپنی ذات مبارکہ ہے، آپ تمام رسولوں کے کمالات کے جامع تھے۔ عبادات میں بے حد مبالغہ کرنے والے تھے، تمام رات قیام کرنے والے تھے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس مشقت میں پڑنے سے منع فرمایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ چوتھے صحابی تھے۔ آپ کا زہد و تقویٰ اور ریاضت مشہور و معروف ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے اہل بیت میں آپ کو خاص مقام حاصل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے خاص علوم سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نوازا تھا اور اسی لئے فرمایا کہ

اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَ عَلِيٌّ بَابُهَا "میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہیں"۔

(جامع الصغیر: ج ا ص ۱۰۷)

دوسری حدیث میں ہے کہ جس کا میں مولا ہوں علیؓ اس کے مولا ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم اہل بیت نوح علیہ السلام کی کشتی کی طرح ہیں جو اس میں سوار ہو گئے وہ نجات پا گئے۔ اس تمام بیان کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مزاج میں رسول اللہ ﷺ کے مزاج کے ساتھ مماثلت رکھی گئی ہے۔

مندرجہ بالا تفصیل کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ اس آیت میں ان صحابہ کرام کی طرف اشارہ کرنے والے الفاظ کی ترتیب بھی عین اسی طرح ہے جس طرح اس دنیا میں رسولوں کے آنے کی ترتیب تھی اور صحابہ کرام کے مزاج کی ترتیب بھی اس کے موافق ہے اور پھر خلافت راشدہ بھی اس ترتیب کے مطابق رونما ہوئی۔ مثلاً اس کی وضاحت یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ "وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ" سے مراد بالخصوص حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں اور بالعموم باقی وہ تمام امتی جن کی معیت ان لوگوں کے ساتھ ہے۔ اس آیت کا دوسرا اشارہ "اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ" بالخصوص حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور باقی اس مزاج پر رونما ہونے والے امتیوں کی طرف ہے۔ تیسرا اشارہ "رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ" سے بالخصوص حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی طرف ہے اور بالعموم اس مزاج پر رونما ہونے والے باقی امتیوں کی طرف ہے چوتھا اشارہ "تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا" رسول اللہ ﷺ کی طرف اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف بالخصوص ہے اور اس قسم کے دیگر عابدین اُمت کی طرف بالعموم ہے۔ خلافت راشدہ کی ترتیب بھی

اس ترتیب کے مطابق واقع ہوئی ہے۔ یہاں پر ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت چوتھے نمبر پر اس لیے رکھی گئی ہے کہ آپ کے بعد اس روحانی سلسلہ کی ابتدا ہوتی ہے جس کو حضرت مجدد الف ثانی نے اپنے مکتوب نمبر ۱۲۳ دفتر سوم حصہ دوم میں قرب ولایت کے سلسلہ میں بیان کیا ہے جسے اسی باب میں واصل باللہ ہونے کے دو طریقوں کے عنوان سے شامل کر دیا گیا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مبارک سر پر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں قدم مبارک بیان کئے گئے ہیں اور اکثر روحانی سلسلوں کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ آخری نقطے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے نزدیک ہیں اور تمام سلاسل حضرت علیؓ کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسلک ہوتے ہیں۔ صرف نقشبندی سلسلہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وساطت سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسلک ہے۔ اس بیان سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ خلافت راشدہ کی ترتیب اس آیت میں مقرر کردہ ترتیب کے مطابق ہوئی اور اس میں جھگڑا کرنا بے سود ہے۔

فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ "پس اہل ذکر سے پوچھو اگر تم نہیں جانتے"۔

(النحل: ۴۳)

قوت القلوب میں (حصہ دوم کے صفحہ ۱۷۳ پر) ہے کہ ایک سالک نے ایک عارف سے پوچھا کہ میں خدا سے بہت غافل ہوں، نیکیوں کی طرف سست اور کاہل ہوں، کوئی نصیحت فرمائیں کہ اس کی تلافی کروں۔ فرمایا بھائی اگر تو اولیاء سے محبت کر سکے اور ان کا تقرب والفت حاصل کر سکے تو یہ کر، شاید وہ تم سے محبت کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر روز ستر بار اولیاء کے قلوب پر نظر رحمت فرماتا ہے۔ شاید کسی روز ان کے ساتھ محبت کے باعث تیری جانب بھی اللہ تعالیٰ نظر رحمت فرمائے اور تجھے دنیا اور آخرت کی پریشانیوں اور تحیر سے پناہ دے دے جب کہ تیری طرف اس کی براہ راست نظر نہیں۔

مشائخ فرماتے ہیں کہ صدیقین اور شہداء کے قلوب کی طرف اللہ کی براہ راست نظر رحمت ہوتی ہے۔ پھر اس قوم کے قلوب کی طرف نظر رحمت ہوتی ہے جو ان کے قلوب میں ہوں۔ اس طرح قلوب در قلوب نظر رحمت پڑتی رہتی ہے۔ اولیاء کرام کا فرمان ہے کہ جس طرح اولیاء سے محبت رکھنا نیکی ہے اسی طرح اہل بدعت اور ظالموں سے نفرت کی جائے تا کہ وہ بھی تجھ سے ناراض اور غضب ناک رہیں کیونکہ ان کی ناراضگی سالکین کے لیے نیکی میں داخل ہے اور یہ ناراضگی دوستی اور ولایت حاصل کرنے کا باعث ہے۔ کسی نے کہا ہے ۔

گرد مستان گرد گر مئے کم رسد بوئے رسد بُوئے او گر کم رسد رُوئے ایشاں بس است (x)

(مستوں کے گرد رہو کیونکہ اگر ان کی شراب نہ ملے تو اس کی بُو تو ملتی ہے، ان کی شراب کی بُو بھی اگر نہ ملے تو ان کے چہرے کو دیکھنا ہی کافی ہے۔)

مولانا رومؒ فرماتے ہیں ۔

ہر کہ باشد ہمنشینِ دوستاں ہست در گلخن میانِ بوستان

(جو اولیاء کی صحبت میں رہتا ہے، وہ آتش کدہ میں ہو تو بھی گلستان میں ہوتا ہے۔)

دِل ترا در کوئے اہلِ دِل کشد تن ترا در حبسِ آب و گلِ کشد (۱۰۱۔۱)

(فطرتاً تیرا دل تجھے اہلِ دل کے کوچے کی طرف کھینچتا ہے، مگر تیرا بدن مٹی اور پانی کے (کیچڑ یعنی دنیا) کی طرف کھینچتا ہے۔)

فقر خواہی آں بہ صحبت قائم ست نے زبانت کار می آید نہ دست (۱۱۳۔۵)

(اگر فقر چاہتے ہو تو یہ صحبت سے ہی قائم ہوتا ہے، اس میں نہ تو زبان کام آئے گی اور نہ ہاتھ)

ناریاں مر ناریاں را جاذب اند نوریاں مر نوریاں را طالب اند (۲۲۔۲)

(دوزخیوں کو دوزخی اپنی طرف کھینچتے ہیں، اور نورانی لوگ نورانیوں کے طالب ہوتے ہیں)

طیبات آمد برائے طیبین للخبیثات الخبیثین ست ہیں (۴۰۔۲)

(قرآن میں ہے کہ) پاک عورتیں پاک مردوں کے لئے ہوتی ہیں اور یاد رکھو کہ خبیث مردوں کے لئے خبیث عورتیں ہوتی ہیں۔)

چونکہ در یاراں رسی خامش نشیں اندراں حلقہ مکن خود را نگیں

(جب اللہ والوں کے پاس جاؤ تو خاموش بیٹھ جاؤ، ان کی مجلس میں امتیازی حیثیت سے نہ بیٹھو)

گفت پیغمبرؐ کہ در بحرِ ہموم در دلالت داں تو یاراں را نجوم (۱۶۴۔۶)

(پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم بحرِ مصائب میں ہو، تو حدیث کی دلیل کے مطابق اولیاء کو راہ دکھانے والے ستارے سمجھو۔)

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ (بنی اسرائیل: ۵۷)

"وہ لوگ جنہیں یہ کافر پوجتے ہیں وہ آپ ہی اپنے رب کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں کہ کونسا بندہ (اللہ سے) زیادہ قریب ہے"۔

مولوی اسمٰعیل منصب امامت صفحہ ۵۵ مطبع فاروق دہلی میں لکھتے ہیں کہ وسیلہ سے مراد وہ شخص ہے جو کہ منزلت میں اللہ کا مقرب ہو اور اقرب الی اللہ بہ اعتبار منزلت پہلے رسول ہیں پھر اس کے بعد امام جو کہ ان کا نائب ہے۔ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے لئے جو اقرب الی اللہ ہے، وسیلہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کے بعد بحث کی کوئی گنجائش نہیں کہ مقربین بارگاہ الٰہی ہی بارگاہ رب العزت کا وسیلہ ہیں جس کی تلاش کے لئے حکم دیا جا رہا ہے۔ یہ بیعت جب پورے آداب و شرائط کے ساتھ کی جائے تو سلسلہ بہ سلسلہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے اور خداوند تعالیٰ پر جا کر منتہی ہوتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ　"وہ جو تمہاری بیعت کرتے ہیں وہ اللہ ہی کی بیعت کرتے ہیں"۔　(الفتح:۱۰)

اسمٰعیل دہلوی کے اس بیان کے بعد اور تمام اکابرینِ اسلام کی وضاحت کے بعد بیعت کی مشروعیت میں شک وشبہ کرنا کسی طرح بھی روا نہ سمجھا جائے گا۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ　"وہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت کی ہے تو ان کی ہدایت کی پیروی کرو"۔　(الانعام:۹۰)

مشائخ کرام کے علاوہ اور کون سی جماعت ہوسکتی ہے، جن کو ہدایت یافتہ قوم کی طرف منسوب کیا جائے۔ اس آیت نے اولیاء کرام کی اتباع کو بھی جائز قرار دیا ہے کیونکہ ان لوگوں سے غیر شرعی امور متوقع نہیں ہیں اور ائمہ کرام کے تمام فیصلے درست اور برحق ہوتے ہیں۔ یہ کہہ دینا مناسب نہیں کہ فقط صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ قابل اتباع تھے ان کے بعد کوئی شخص اقتداء کے قابل نہیں۔ (سورۃ الواقعہ کی آیت نمبر:۱۰۔۱۱) کے مطابق صحابہ کرام مقربین الٰہی کے زمرہ میں شامل ہیں اور اس آیت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے مقربین الٰہی ابتدائی زمانے میں بہت زیادہ ہونگے اور آخری دور میں کم پائے جائیں گے اس سے معلوم ہوا کہ مقربین رسول اللہ ﷺ کے بعد بھی آتے رہیں گے اور آپ ﷺ کے بعد بھی کچھ لوگ قابل اقتداء ہوسکتے ہیں اگرچہ ان کی تعداد قلیل ہی کیوں نہ ہو۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت داتا گنج بخشؒ، حضرت علی ہجویریؒ، حضرت معین الدین چشتیؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ ایسی ہستیاں ہیں کہ جن کی اقتداء غلط نہیں ہوسکتی تبع تابعین کے بعد ایسی لکیر نہیں لگائی جاسکتی جس سے یہ مراد لی جائے کہ ان کے بعد کسی کی اقتداء ناجائز ہے اگر یہ مراد لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تبع تابعین کے بعد اسلام میں کوئی شخص مثالی کردار کا حامل نہیں ہوسکتا اور یہ مشاہدہ اور حقیقت کے خلاف ہے۔

حضرت شہاب الدین سہروردی عوارف المعارف میں لکھتے ہیں کہ باغبان جب پودوں کی ایک جگہ پر پودا لگاتا ہے اور پھر ایک جگہ سے نکال کر دوسری جگہ منتقل کرتا ہے تو اس میں خوب پھل آتے ہیں کیونکہ ان پودوں پر تصرف کیا جاتا ہے اور دیکھ بھال بھی کی جاتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ شریعت میں سدھائے ہوئے کتے کا شکار بھی حلال قرار دیا جاتا ہے یہ سب تربیت اور پرورش کی افادیت کی مثالیں ہیں۔ شیخ کی تربیت سے اس کی باطنی قوت مرید کے باطن میں اس طرح سرایت کرجاتی ہے جیسے ایک چراغ دوسرے چراغ سے روشن ہوتا ہے بشرطیکہ مرید اپنا اختیار نفس ختم کرکے شیخ میں فنا ہوجائے۔

جو لوگ علم کے ذریعے بزرگ وعزیز بنتے ہیں۔ دنیا میں ایسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں جو تحصیل علم کا قصد کرتے ہیں پھر مزید ان میں سے بہت کم تعداد ایسے اشخاص کی ہوتی ہے جو فہم رکھتے ہیں۔ پھر ان ارباب ذکاء

اور اہلِ فہم میں سے بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو اخلاق و کردار کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ علم و عمل کو ہم آہنگ و متوازن کرتے اور ہمیشہ تقویٰ کو اپنا آلہ کار بناتے اور مخلوق کی رہبری کے سزاوار ہوتے ہیں۔ جن کے بارے میں ارشادِ خداوندی ہے کہ

وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ؕ۟ وَ كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یُوْقِنُوْنَ ۝ (السجدہ: ۲۴)

"اور ہم نے ان میں جب کہ انہوں نے صبر کیا، بہت سے پیشوا بنا دیئے تھے جو ہمارے حکم سے ہدایت کیا کرتے تھے اور وہ لوگ ہماری آیتوں کا یقین رکھتے تھے"۔

ایسے لوگوں کی راہ میں شیطان روڑے اٹکاتے ہیں۔ رشتہ داری، مال، جائیداد، دشمنی اور نزاع وغیرہ تمام شیاطین ہیں جو ایسے لوگوں کے راستہ کو قطع کرتے ہیں۔ (امام غزالی ص ۸۵۔۸۶)

دِلوں پر پردے

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا "خدا کو پہچاننے کے لیے حق کو پہچانو اور اس طرح تم اہل حق سے بھی روشناس ہو جاؤ گے۔" بنا بریں روح آدم اِس عالم میں غیر مانوس ہے اس کا آشیانہ تو بہشت ہے۔ اس کی دل بستگی ملاء اعلیٰ سے ہے۔ اس کا نشیمن اور جلوہ گاہ تو اسی عالم سے ہے جس کو بہشت کہتے ہیں اور عالم علوی سے نامزد کرتے ہیں۔ یہ حقیقت قرآن وسنت سے بھی عیاں ہے چنانچہ نگاہِ بصیرت سے کوئی شخص روح انسانی کی حقیقت کا ادراک کرے تو وہ جان لے گا کہ روح کی خاصیت وفطرت پروردگار عالم کی پہچان ہے اور بارگاہِ قدس کے جلوے ہی اس کی توانائی کا سامان ہیں۔ اس عالم رنگ و بو کے جس قدر خصائص و کیفیات ہیں اور اس روح کی ذات سے مانوس ہیں وہ اس کے لئے عارضی حیثیت رکھتے ہیں، لہٰذا ایسے شخص کے لیے ضروری ہے کہ اس کا اصل اور واحد مطمح نظر خدا کی معرفت کا حصول ہو۔ اسے چاہیے کہ وہ حقیقت کی تلاش و جستجو علم کے ذریعے کرے جو کتابوں سے حاصل ہوتا ہے۔ البتہ اگر اس کی سمجھ مسائل کی گرفت کرنے سے قاصر ہے تو اسے چاہیے کہ علماء کی مدد لے کیونکہ حقیقی اور پختہ علم وہی ہے جو علماء کی زبانی حاصل کیا جائے۔ علماء سے حصولِ علم کے لئے ضروری ہے کہ دل حسد و عناد سے پاک ہو، کیونکہ ایسے افراد کو کسی دلیل و حجت سے بھی نہیں سمجھایا جاسکتا۔ جن کے بارے میں اس طرح ارشاد ہوا ہے۔

اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ یَّفْقَهُوْهُ وَ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَ اِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ یَّهْتَدُوْۤا اِذًا اَبَدًا ۝ (الکہف: ۵۷)

"ہم نے ڈال دیئے ان کے دلوں پر پردے تاکہ وہ قرآن کو نہ سمجھ سکیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی اور اگر تم بلاؤ انہیں ہدایت کی طرف تو

جب بھی وہ ہدایت قبول نہیں کریں گے"۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر کبیر میں اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے صرف الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی ہدایت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ فرمایا۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مرید ہدایت اور مکاشفہ حاصل کرنے کے لئے شیخ راہنما کی اقتدا کرے جو اسے سیدھے راستے پر چلائے اور گمراہی اور غلطی کے راستوں سے بچائے، کیونکہ اکثر مخلوق پر نفس اور کوتاہی غالب ہے اور صواب اور غلط میں تمیز کرنے میں پورے نہیں اترتے۔ لہٰذا ایسے مردِ کامل کی ضرورت ہے جو ناقص کی راہنمائی کرے۔ آپ نے یہ لکھا ہے کہ "اور میں کہتا ہوں کہ یہ خیال درست ہے۔"

حضرت داتا گنج بخش" نے لکھا ہے کہ مشائخ کرام حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو پیشوائے اہلِ مشاہدہ مانتے ہیں۔ صاحبِ مشاہدہ کا حال دوسروں پر بہت کم منکشف ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بلند آواز سے قرآن پڑھنے کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے تلاوتِ کلام پاک اس لیے بلند آواز سے کی تاکہ سوتے ہوئے لوگوں کو جگایا جائے اور شیطان کو بھگایا جائے۔ حضرت داتا گنج بخش" فرماتے ہیں کہ یہ بات مجاہدہ پر دلالت کرتی ہے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ مشاہدہ کے اندر مجاہدہ اس طرح ہے جس طرح قطرہ دریا میں۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

هَلْ اَنْتَ اِلَّا حَسَنَةٌ مِنْ حَسَنَاتِ اَبِیْ بَکْرٍ "عمر! تم ابوبکر صدیق کی بھلائیوں میں سے ایک بھلائی ہو"۔

قرآنی آیات

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (الرعد: ۷) "آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو انجام بد سے ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہے"۔

ابن کثیر"، عکرمہ" اور ابن زہاد نے کہا کہ ھاد سے مراد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ آپ منذر بھی ہیں اور راہنما بھی ہیں۔ اس کا مفہوم یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا میں جتنی قومیں گزری ہیں یا اب موجود ہیں سب کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور ان کے نائبین کو مقرر فرمایا ہے تاکہ انہیں پیغامِ حق دیں۔ اس آیت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جب انبیاء نہیں ہوتے تو علماء ان کے رشد و ہدایت کے فرائض ادا کرتے ہیں۔ علماء کے علاوہ کوئی اور جماعت اس منصب کے اہل نہیں ہے۔

فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (النحل: ۴۳) "اگر تم نہیں جانتے ہو تو اہلِ ذکر (یعنی جاننے والوں) سے پوچھو"۔

اس آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شرعی مسئلہ کی تصدیق مطلوب ہو تو علمائے مجتہدین کی جانب رخ کرو اور اگر علوم مکاشفہ و مسائلِ طریقت کا حل چاہتے ہو تو اصحابِ کشف، اہل اللہ، پیرانِ عظام اور اولیائے کرام کی خدمت میں جاؤ۔ (الفقر فخری، ابوالفیض قلندر سہروردی ص ۱۶۹)

یہ کہنا کہ حضور علیہ السلام کے بعد کوئی شخص قابل اتباع نہیں، یہ سراسر غلط ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر ہدایت یافتہ شخص کی اتباع کرنے کی اجازت دی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم کشتیِ نوحؑ کی طرح ہیں اور حِطّۃ کے دروازے کی طرح ہیں۔ (مفتاح العلوم ص ۱۰۸ حصہ اوّل جلد چہارم)

مولانا روم ”فرماتے ہیں۔

یارِ غالب شو کہ تا غالب شوی یارِ مغلوباں مشو ہیں اے غوی (۲۷۵۔۴)

(غالب الاحوال یار تلاش کرو تاکہ تم بھی غالب ہو جاؤ، اے غافل خبردار مغلوب الحال کے یار مت بنو)

وَّاتَّبِعۡ سَبِيۡلَ مَنۡ اَنَابَ اِلَىَّ (لقمان: ۱۵) ''اور پیروی کرو اس کے راستہ کی جو میری طرف مائل ہوا''

گرچہ شیری چوں روی رہ بے دلیل ہمچوں روبہ در ضلالی و ذلیل

(تم خواہ شیر ہی کیوں نہ ہو اگر اس راہ پر بغیر مرشد کے چلوگے تو لومڑی کی طرح گمراہ اور ذلیل ہو جاؤ گے۔)

ہیں مپر الا کہ با پرہائے شیخ تا بہ بینی عونِ لشکر ہائے شیخ (۶۳۔۴)

(اپنے مرشد کے پروں کے بغیر اڑنے کی کوشش نہ کرو، تاکہ تمہیں اپنے شیخ کی مدد اور لشکر کا علم ہو جائے۔)

وَاذۡكُرُوۡهُ كَمَا هَدٰٮكُمۡ‌ۚ (البقرۃ: ۱۹۸) ''اور ذکر کرو اس کا جس طرح اس نے تمہیں سکھایا''۔

اس آیت میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ تم اس طرح ذکر کرو جس طرح تمہیں سکھایا گیا ہے۔ یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ ذکر کس طرح سکھایا گیا۔ احادیث میں ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا کہ چلتے پھرتے (ہر وقت) اللہ کا ذکر کرتے رہا کرو۔ امداد السلوک میں ایک حدیث نقل کی گئی ہے جس میں فرمایا۔

جَدِّدُوْا اِيْمَانَكُمْ بِقَوْلِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ''اپنے ایمان کی تجدید کلمہ لا الٰہ الا اللہ سے کرتے رہو''۔ (مجمع الزوائد)

امداد السلوک میں یہ روایت بھی بیان کی گئی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مجھ کو وہ راستہ دکھائیں جو بندگانِ خدا پر سب سے زیادہ قریب اور سہل تر ہو اور حق تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ افضل ہو۔ آپ نے فرمایا کہ خلوت میں ذکر بر مداومت کو لازم پکڑ لو۔ علی کرم اللہ وجہہ نے عرض کیا کہ ذکر کس طرح کروں؟ آپ نے فرمایا کہ اپنی آنکھیں بند کر لو (اور جس طرح میں ذکر کروں ایسے ہی کرو) اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسی طرح ذکر کیا اور اپنا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو سنایا۔ بعد ازاں حضرت علی رضی

اللہ عنہ نے یہ طریقہ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کو سکھایا اور انہوں نے عبدالواحد اور حبیب عجمی کو تلقین کیا۔ اسی طرح یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

مذکورہ بالا آیت کو اس حدیث اور روایت سے ملا کر پڑھا جائے تو ان تینوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ذکر الٰہی ایک ضروری امر ہے اور اس ذکر کو سکھانے والے ہادی یا راہنما کی ضرورت کو اسلام نے نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ اہم قرار دیا ہے اور یہ ذکر کوئی ایسی معمولی بات نہیں جو از خود کتابوں سے سیکھی جا سکے۔ ذکر کی بہت سی قسمیں ہیں مثلاً ذکرِ لسانی، ذکرِ نفس، ذکرِ قلب، ذکرِ سرّ، ذکرِ روح، ذکرِ خفی اور ذکرِ اخفی وغیرہ جن کو کسی ہادی کے بغیر سیکھا نہیں جا سکتا۔ ذکر کی اس اہمیت کے پیش نظر اس کے متعلق ایک الگ تفصیلی بیان اسی باب میں شامل کیا جا رہا ہے۔ ذکر کا سیکھنا روحانی علم سے تعلق رکھتا ہے اور یہ روحانی علم قلب کا نور ہے چنانچہ اس علم کے سیکھنے کے بغیر قلب گویا اندھا ہے۔

بوعلی رودباریؒ نے فرمایا ہے کہ تصوف میں میرے استاد حضرت جنیدؒ ہیں اور علم فقہ میں حضرت ابوالعباس بن شریحؒ اور نحو میں ثعلبؒ اور حدیث شریف میں ابراہیمؒ ہیں۔ فرماتے ہیں کہ نفس کی اصلاح کے لئے بس یہی علوم ضروری ہوتے ہیں۔ علم کے بغیر انسان عمل میں لغزش کھاتا ہے اور اس کی اطاعت برباد ہو جاتی ہے اور بے علمی کے سبب اسے اپنے اعمال کی بربادی کا علم ہی نہیں ہوتا۔ اسی لیے صوفیائے کرام نے طلب علم کو تمام اعمال میں سے افضل قرار دیا ہے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس روحانی تصوف کو کسی ہادی سے سیکھنا قرآن، حدیث اور ائمہ کبار کے عمل سے ثابت ہوتا ہے چونکہ یہ کام ایک روحانی پیشوا سے متعلق ہے اس لیے بیعت کا عمل عین اسلامی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ　(النساء: ۱۰۳)

"تو ذکر کرو اللہ تعالیٰ کا کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے اور اپنے پہلوؤں پر (لیٹے ہوئے)"۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ یادِ الٰہی محبین پر ہر حالت میں فرض ہے (کیونکہ یہاں امر کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ ذکر الٰہی کرو رات ہو یا دن، خشکی ہو یا دریا، سفر ہو یا حضر، تونگری ہو یا فقر، تندرستی ہو یا مرض، خفیہ ہو یا اعلانیہ۔ اس اہم، عظیم اور خصوصی عبادت کا کرنا کسی سے سیکھنے کے بغیر ممکن نہیں کیونکہ جب تک ذکر کسی بزرگ سے سیکھا نہ جائے تو اس وقت تک ذکر صحیح تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے بھی کسی شیخ سے بیعت اخذ کرنے کی ضرورت کا اظہار ہوتا ہے۔

فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ　(النحل: ۴۳)

"اگر تمہیں علم نہ ہو تو اہل ذکر سے پوچھ لیا کرو"۔

اہل ذکر سے مراد علماء ومشائخ ہیں اور یہاں ان کو مقتدا بنانے کی ضرورت ظاہر کی گئی ہے۔

متعدد آیات قرآنیہ

درج بالا آیت کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات میں اس بات کا ذکر ہے کہ جولوگ رسول اکرم ﷺ سے محبت رکھتے ہیں اور آپ کی اتباع کرتے ہیں وہ ان کی متابعت کی وجہ سے اس دنیا میں آپ کا روحانی اور اُخروی زندگی میں آپ کا حقیقی قرب حاصل کریں گے۔ اولیائے کرام چونکہ حضور پاک ﷺ کے جانشین ہیں اس لئے ان کے ساتھ صحبت رکھنے سے حضور پاک ﷺ کی محبت سے وافر حصہ ملتا ہے اور انسان بیعت کے ذریعے سلسلۂ نبوت سے منسلک ہو جاتا ہے۔ یہ نسبت اگرچہ اتباع رسول اللہ ﷺ کے باعث ہوتی ہے لیکن کسی کو محض اتباع سے ہی وہ مقام حاصل نہیں ہوسکتا۔ البتہ یہ مقام اس عشق کی برکت سے عطا کیا جاتا ہے۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ (یوسف:۱۰۸)

"آپ فرما دیجئے یہ میرا راستہ ہے میں تو بلاتا ہوں صرف اللہ کی طرف واضح دلیل پر ہوں میں اور (وہ بھی) جو میری پیروی کرتے ہیں"۔

اس آیت میں بالکل واضح طور پر فرمادیا گیا ہے کہ میرے تابعین (جس میں تمام اولیائے کرام اور مشائخ عظام شامل ہیں) وہی دعوت اسلامیہ کا فریضہ ادا کرتے ہیں جو میں خود بھی کرتا ہوں۔ یہاں پر اولیائے کرام کی جانشینی قطعی دلیل سے ثابت ہوگئی ہے اور اس آیت کے بعد اولیا کی تبعیت سے اور متابعت سے اگر انکار کرے تو اس کی قسمت میں ابدی محرومی کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فرمایا ہے۔

اسرافیلِ وقت اند ایں اولیاء (اولیائے کرامؒ اپنے وقت کے اسرافیل ہیں۔)

قرآنِ مجید میں فرمانِ خداوندی ہے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰۗىِٕكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰۗىِٕكَ رَفِيْقًا ۝ (النساء:۶۹)

"اور جو اطاعت کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین اور کیا ہی اچھے ہیں یہ ساتھی"۔

یہ آیت عاشق رسول ﷺ حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں اس وقت نازل ہوئی جب آپ کے دل میں یہ غم تھا کہ وہ اس دُنیا کی زندگی میں تو حضور پاک ﷺ سے مل کر دل کی پیاس بجھا لیتے ہیں لیکن مرنے کے بعد چونکہ ہم دونوں کے درجات میں بہت فرق ہوگا اس لئے وہاں ملاقات کیسے ہو سکے گی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کر کے اہلِ حق کو تسلی دی کہ جو لوگ آپ سے محبت رکھتے ہیں ان کو مرنے کے بعد اگلے جہاں

میں بھی ان لوگوں کی معیت حاصل ہوگی۔ ایک حدیث شریف میں بھی اس بات کو بیان فرمایا گیا ہے کہ:

اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ

"انسان اس کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہو گی"۔ (مسند احمد: ج ۱ ص ۳۹۹)

علماء کا اتفاق ہے کہ اہل تصوف کو اپنے عشق کی وجہ سے یہ سعادت عطا کی جائے گی نہ کہ اجر و ثواب کی وجہ سے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (الفتح: ۲۹)

"محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور وہ (سعادت مند) جو آپ کے ساتھی ہیں، کفار کے مقابلے میں بہادر اور طاقتور ہیں آپس میں بڑے رحمدل ہیں"۔

اس آیت کی تشریح پہلے کر دی گئی ہے۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ جو لوگ خود کو معیت رسول اللہ ﷺ (بنا بر اس معیت اولیاء کرام) میں رکھتے ہیں وہ آج بھی صحابہ کرام کی طرح معیت رسول سے استفادہ کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے ایسا کیا وہ اس کی حقیقت سے واقف ہیں کہ اولیائے کرام یا اہل تصوف کی مجلسوں میں اللہ تعالیٰ کی خالص محبت کے چشمے انسان کے اندر جاری کیے جاتے ہیں (حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایسا ہی فرمایا ہے۔)

وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (اعراف: ۱۵۷)

"اور (جنہوں نے) پیروی کی اس نور کی جو اتارا گیا آپ کے ساتھ وہی (خوش نصیب) کامیاب و کامران ہیں"۔

یہاں بتایا جا رہا ہے کہ اتباع قرآن و سنت کے بعد حضور اکرم ﷺ کی تکریم سب سے اہم ہے اور اس وقت تک قرآن کا حق ادا نہیں ہو سکتا جب تک حضور پاک ﷺ کی محبت نہ ہو۔ یہاں پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قرآن اور سنت کے ساتھ صاحب قرآن سے محبت اور ان کی تعظیم لازمی ہے اور آپ ﷺ کی محبت جب ہی کامل ہو سکتی ہے جب آپ ﷺ کی اُمت کے اولیاء جن سے دینِ خدا اخذ کیا جاتا ہے، کی بھی محبت دل میں ہو۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ (المائدہ: ۱۵)

"بے شک تشریف لایا ہے تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور اور ایک کتاب (ہر چیز کو) ظاہر کرنے والی اللہ تعالیٰ اس کو سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے اس کے ذریعے سے۔ جو اس کی خوشنودی کی پیروی کرے"۔

امام المفسرین ابن جریرؒ لکھتے ہیں کہ یہاں نور سے مراد ذات پاک محمد مصطفیٰ ﷺ ہے جن کی وجہ سے اللہ نے حق کو روشن کیا، اسلام کو ظاہر فرمایا اور شرک کو نیست و نابود کیا۔ فرماتے ہیں کہ حضور پاک ﷺ نور ہیں مگر اس کے لئے جو اس نور سے دل کی آنکھوں کو روشن کرنا چاہے یہاں پر واؤ عاطفہ تغایر پر دلالت کرتی ہے اس لئے نور اور کتابٌ مُبِیْنٌ دونوں سے قرآن مراد نہیں ہو سکتا۔

حضور پاک ﷺ صرف نور ہی نہیں بلکہ آپ کے نور سے کائنات کو نور ملا ہے اور اب تک ہر اس شخص کو نور ملتا ہے جس کے دل میں آپ کی محبت ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ کا نور آپ کے سینے سے اولیائے کرام کو ملتا ہے اور ان کے سینوں سے مریدین نور حاصل کرتے ہیں۔ جو اس نور کو نہیں مانتے وہ اس نور سے محروم رہ جاتے ہیں بلکہ اولیائے کرام جب بولتے ہیں تو بھی اپنے الفاظ کے ہمراہ نور ارسال کرتے ہیں۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

شیخ نورانی، زِرہ آگاہ کند با سخن ہم نور را ہمراہ کند (۲۵۳-۵)

(شیخ نورانی ہوتا ہے اور راہ سے مطلع کرتا ہے اور اپنے نور کو الفاظ کے ہمراہ ارسال کر دیتا ہے۔)

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ (بنی اسرائیل:۵۷)

"وہ لوگ جنہیں یہ مشرک پکارا کرتے ہیں وہ خود ڈھونڈتے ہیں اپنے رب کی طرف وسیلہ کہ کونسا بندہ (اللہ سے) زیادہ قریب ہے اور امید رکھتے ہیں اللہ کی رحمت کی"۔

اس آیت میں مشرکین کے اس عمل کی طرف اشارہ ہے کہ وہ جن کو خدا ابنائے ہوئے ہیں (مشرک وہی ہوتا ہے جو خدا کے سوا کسی اور کو خدا ابنائے) اور اپنی مصائب کا حل ان سے طلب کرتے ہیں تو ان کے وہ خدا خود اللہ تعالیٰ کی عبادت اور رضا جوئی کو طلب کرتے ہیں اور اگر وہ خدا ہیں تو ان کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی کیا ضرورت تھی۔ یہ آیت مشرکین کے لئے ہے کہ وہ بندوں کو خدا مانتے ہیں۔ (یدعون میں پکارنا اور عبادت کرنا بھی شامل ہے) خدا کے علاوہ کسی سے استقلالاً مانگنا شرک ہے لیکن کسی کو وسیلہ بنانا یا مقبولانِ بارگاہ الٰہی سے دعا کروانا جائز ہے۔ لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس آتے اور دعائیں کرواتے۔ یہ حقیقت بہت سی احادیث سے واضح ہے۔ اس آیت کو صحابہؓ یا مسلمانوں پر چسپاں کرنا صحابہ کرامؓ پر بھی جرأت کرنے کے مترادف ہوگا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (الفتح:۱۰)

"(اے جانِ عالم) بے شک جو لوگ آپ کی بیعت کرتے ہیں درحقیقت وہ اللہ تعالیٰ سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے"۔

جب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق افواہ گرم ہوئی کہ آپ کو کفار نے شہید کر دیا ہے تو رسول

اللہ ﷺ ان چودہ سو صحابہ کرام سے جو آپ ﷺ کے ساتھ عمرہ کی نیت سے آئے تھے، اللہ کے حکم سے از سر نو بیعت لینے کے بعد ان سے فرمایا کہ آج روئے زمین پر تم سب سے بہترین لوگ ہو اور تم میں سے کوئی بھی دوزخ میں داخل نہیں ہوگا۔ (ابنِ کثیر)

علامہ اسمٰعیل حقیؒ لکھتے ہیں کہ آج کل جو ہم کسی ولی اللہ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں وہ اسی سنت کی اتباع ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ فقیر یہ کہتا ہے کہ اس آیت سے بیعت کی سنت اور مشائخ کبار سے اکتساب فیض ثابت ہوتا ہے وہ مشائخ جنہیں اللہ تعالیٰ نے قطب ارشاد کے مقام پر فائز کیا ہے۔ وہ اس طرح ہے کہ ان کو علمی تجلی سے ترقی دے کر انہیں مشاہدہ کی تجلی تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ عورتوں سے بیعت لینا بھی قرآن میں مذکور ہے۔

درج بالا حقائق سے واضح ہوا کہ بیعت لینا حضور اکرم ﷺ کی سنت ہے آپ نے جنگ کے علاوہ بھی بہت سے مقاصد کے لئے بیعت لی ہے۔ (جس کا ذکر اقسامِ بیعت میں ہو چکا ہے) تو پھر منکرین بیعت کن کن آیتوں اور احادیث کو جھٹلائیں گے۔ اس کے علاوہ تمام مشائخ کبار نے اب تک بیعتِ توبہ کا یہ سلسلہ جاری رکھا ہے۔ یہ لوگ ان تمام اولیائے کرام کو بھی بدعتی تصور کرتے ہیں جن میں جنید رحمۃ اللہ علیہ اور بایزید رحمۃ اللہ علیہ جیسے نام بھی شامل ہیں۔ اللہ ایسے لوگوں کو عقل عطا فرمائے۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (یونس:٦٢)

"سنو! بلاشبہ جو اللہ کے دوست ہیں، نہ ان پر کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے"۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک شخص آیا کہ میں آپ کا دوست بننا چاہتا ہوں۔ فرمایا "کیا تم اس بات پر راضی ہو کہ میں تمہارے گھر سے جو چاہوں لے جاؤں؟ اس نے کہا نہیں۔ فرمایا پھر تو مرید اپنے دعوے میں جھوٹا ہے۔ دوست تو وہ ہوتا ہے کہ جو اس کا دل چاہے لے جائے، دوسرے دوست کو اعتراض نہ ہو ورنہ پھر دوستی کیسی؟

ضرورت شیخ پر احادیث سے استدلال

یہاں علم حدیث پر بحث یا اس علم کے متعلق فہم اور استنباط پر گفتگو کرنا مطلوب نہیں۔ البتہ اس بات کی وضاحت کرنا ہے کہ علمِ حدیث کو سمجھنا محض رسمی محدثین اور فقہاء کے بس کی بات نہیں۔ علمِ حدیث کا پڑھنا پڑھانا اور بات ہے اور اس کا فہم حاصل کرنا کچھ اور بات ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے صاف الفاظ میں فرمایا ہے کہ جس نے فقہ کے بغیر تصوف کو حاصل کیا وہ زندیق ہوا اور جس نے تصوف سیکھے بغیر فقہ کا علم حاصل کیا وہ فاسق ہوا اور جس نے ان دونوں (فقہ اور تصوف) کو ملایا وہ محقق ہوا۔

درج بالا قول کے مطابق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ حدیث کی کتاب ہر کوئی کھول کر پڑھ لیتا ہے اور محدث

ہونے کا دعویٰ کرتا ہے مگر اولیاء کرام وہ پاک نفوس ہیں جو احادیث کا صحیح فہم رکھتے ہیں۔ کچھ علماء ان اولیائے کرام کی پیش کردہ احادیث کو محض اس وجہ سے غیر مستند قرار دے دیتے ہیں کہ وہ ان کے اپنے مسلک سے ٹکراتی ہیں۔ حالانکہ اولیائے کرام جہاں سربستہ رازوں کو پہچانتے ہیں وہاں غلط اور صحیح حدیث میں فرق بھی معلوم کر لیتے ہیں۔ قارئین نے ایسے کئی واقعات کا مطالعہ کیا ہو گا جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اولیائے کرام حدیثوں کی تصدیق براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کر لیتے ہیں۔

تربیت عشاق میں حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایسا ہی ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے۔ حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ خود تو پڑھے لکھے نہ تھے مگر جو شخص فارغ التحصیل نہ ہوتا اسے بیعت نہ فرماتے تھے اور اگر کوئی اہل عقیدت فارغ التحصیل نہ ہوتا تو اسے خود درس دیا کرتے تھے۔ منقول ہے کہ جب آپ نے درس دینا شروع کیا تو علماء حیران ہونے لگے کہ ایسا بے علم شخص درس کیسے دے سکتا ہے چنانچہ ایک روز کچھ علماء آپ کے درس میں شامل ہوئے تو آپ نے دوران درس ایسے معارف وحقائق بیان فرمائے کہ تمام علماء دنگ رہ گئے اور روزانہ ان کے درس میں شامل ہونے لگے۔ علماء نے ایک روز عرض کیا کہ آپ جو حقائق نادرہ بیان کرتے ہیں ہمارے علم کے مطابق ان میں پیش کردہ بعض احادیث ضعیف ہوتی ہیں مگر آپ انہیں صحیح قرار دیتے ہیں اور بعض احادیث جو ہمارے نزدیک صحیح ہیں آپ انہیں قبول نہیں فرماتے۔ یہ کیا وجہ ہے؟ آپ نے فرمایا "جب مجھے شبہ ہوتا ہے تو میں براہ راست رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کر لیتا ہوں۔"

منقول ہے کہ ایک روز حضرت سائیں توکل شاہ صاحب مسجد کے قریب سے گزرے تو مولوی صاحب کو ایک حدیث پڑھاتے سنا تو کہا "اے مولوی یہ حدیث ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نہیں ہے۔" ایک بزرگ ایسے بھی تھے کہ جن کو اگر کوئی غلط حدیث سنائی جاتی تو ان کے بازو پر بال کھڑے ہو جاتے تھے چنانچہ اس بات کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ بلند پایہ بزرگوں کی تصانیف میں جو احادیث بیان کی گئی ہیں ان کو درست تسلیم کر لینا چاہیے۔ حضرت داتا گنج بخش، شیخ عبدالقادر جیلانی، معین الدین چشتی، نظام الدین اولیاء، بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہم جیسی ہستیاں ایسی بلندیوں سے ہمکنار تھیں کہ ان کا پیش کردہ کلام حجت کا درجہ رکھتا ہے۔ دین کو سمجھنے والے ان لوگوں کے علاوہ اور کون ہو سکتے ہیں؟

حدیث اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ سے استدلال

اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ فَبِاَیِّھِمْ اقْتَدَیْتُمْ اِھْتَدَیْتُمْ۔ "میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں سو تم جس کی بھی اقتدا کرو گے ہدایت پاؤ گے"۔ (کنوز الحقائق)

مشاہدہ حق میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان موجود ہے کہ سب سے بہتر زمانہ میرا ہے اس کے بعد وہ زمانہ جنہوں

نے ان لوگوں کو پایا اور پھر اس کے بعد جنہوں نے ان کو پایا یعنی تابعین، پھر تبع تابعین کا زمانہ اور آپ نے ان کی اقتدا کرنے کا حکم دیا۔ اس سلسلہ ہدایت میں تبع تابعین کے بعد کسی اور کی اقتدا کسی حدیث میں منع نہیں کی گئی۔ اس کے علاوہ ائمہ اہل بیت کی اقتدا کا ذکر بھی آتا ہے وَّلِکُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (الرعد: ۷) (یعنی ہر قوم کے لئے آپ ہدایت دینے والے ہیں) میں ہادی رہبر اور شیخ کامل سے تقویت حاصل کرنے کی تلقین ہے۔ سورۂ فاتحہ میں صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ میں ہر اس شخص کے راستے پر چلنے کی اجازت ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا۔ آخر اولیائے کرام جن کو اللہ تعالیٰ نے ولایت اور بزرگی سے نوازا ہے، ان کے راستے پر چلنے سے کون منع کر سکتا ہے۔ یہ سراسر زیادتی ہوگی کہ اگر ہم صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم، تابعین اور تبع تابعین کے بعد ایک ایسی لکیر لگا دیں جس سے ان کی اتباع کو بلا جواز ناجائز قرار دیا جائے ایسے لوگوں پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا ہدایت کے راستے تبع تابعین کے بعد مسدود کر دیئے گئے جبکہ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے۔

وَّلِکُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (الرعد: ۷) "ہر قوم کے لئے آپ ہدایت دینے والے ہیں"

اور صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ کا اطلاق ہر ہدایت یافتہ بزرگ یا ولی اللہ پر ہوتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ فتنہ دشمنان اسلام نے مسلمانوں میں نفاق ڈالنے کے لئے پیدا کیا اور ہمارے بہت سے سادہ لوح انسان داتا گنج بخش، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، بایزید بسطامیؒ، جنید بغدادیؒ اور دیگر عظیم اولیائے کرام کی اتباع کو غیر اسلامی قرار دیتے ہیں جبکہ یہ وہ ہستیاں ہیں جن سے حقیقت حال مخفی نہیں، جن کی نظر لوح محفوظ پر ہوتی ہے، جو احکام شرعیہ کا قرآن کی نص کے مطابق استنباط کرتے ہیں اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو رسول اللہ ﷺ سے بالمشافہ حالت بیداری میں ملاقات کرتے ہیں اور احادیث کی صحت دریافت کر لیتے ہیں۔ ایسے اولیائے کرام بھی ہو گزرے ہیں جن کے سامنے غلط حدیث پڑھی جاتی تو ان کے جسم کے بال کھڑے ہو جاتے تھے۔

کچھ ایسے بھی تھے جن کا ہاتھ حرام ذرائع سے حاصل کئے گئے طعام کی طرف بڑھنے سے رک جاتا تھا۔ ایسے لوگوں کی بات کو نہ ماننا سراسر ہٹ دھرمی اور ان اولیاء کرام کی سخت توہین ہے اور ایسے لوگ دشمنان اسلام کے نرغے میں بری طرح پھنسے ہوئے ہیں۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

گفت پیغمبرؐ کہ اصحابی نجوم رہرواں را شمع و شیطان را رجوم (۷۲-۳-۱)

(جناب پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا ہے کہ میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں۔ یعنی وہ رہروں لوگوں کے لئے ہدایت اور شیطان کے لئے چوٹ ہیں۔)

بحر العلوم میں درج ذیل حدیث کو مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کے اشعار کی تشریح میں پیش کیا گیا ہے۔

اِحْذَرُوْهُمْ فَاِنَّهُمْ جَوَاسِيْسُ الْقُلُوْبِ "ان (اولیائے کرام) سے ڈرو کیونکہ یہ دلوں کے جاسوس ہیں"۔

(شرح تعرف ج ا ص ۸، بحرالعلوم)

حدیث شریف میں ہے کہ

لِكُلِّ شَيْءٍ صَقَالَةٌ" وَصَقَالَةُ الْقُلُوْبِ ذِكْرُ اللّٰهِ۔ (الوابل العیب من کلم الطیب ص: ۱۷۷) "یعنی ہر چیز کو صیقل کرنے والی کوئی چیز ہوتی ہے اور دل کو صیقل کرنے والا ذکرِ الٰہی ہوتا ہے"۔

جب دل صیقل ہو جائے تو دوسرے بندوں کے دل کی باتیں اس کے دل میں منعکس ہو کر کاشفِ احوال بن جاتی ہیں۔ اسی لئے ان کو دلوں کے جاسوس کہا جاتا ہے اور اولیاء کا قول ہے کہ اللہ والوں کے پاس جاؤ تو دل کو ان کی منافرت سے خالی کر کے جاؤ کیونکہ کوئی ایسی بات جو دل میں ہو ان پر منکشف ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ مولانا فرماتے ہیں ۔

بندگانِ خاص علّامُ الغیوب در جہاں جانِ جَواسیس القلوبِ

(علام الغیوب (اللہ) کے خاص بندے ایسے ہیں، جو روحانی دنیا میں دلوں کے جاسوس ہیں۔)

در تنِ گنجشک چہ بود برگ و ساز کہ شود پوشیدہ آں بر عقلِ باز

(چڑیا کے بدن پر اتنا ساز وسامان کیا ہوتا ہے؟ جو باز کی عقل سے پوشیدہ رہے۔)

در درونِ دل درآید چوں خیال پیشِ شاں مکشوف باشد سرِ حال

(کسی کے دل میں جونہی کوئی خیال آتا ہے، تو ان (اولیاء) کے سامنے یہ بھید منکشف ہو جاتا ہے۔)

آنکہ واقف گشت بر اسرار ہُو سرِ مخلوقات چہ بود پیشِ اُو

(جو شخص اللہ کے اسرار سے واقف ہو جاتا ہے، اس کے سامنے مخلوقات کا بھید کیا (مشکل؟) ہے۔)

آنکہ بر افلاک رفتارش بود بر زمیں رفتن چہ دشوارش بود (۲-۱۴۸)

(جس باکمال کی رفتار آسمانوں پر ہو، اس کو زمین پر چلنا کیا مشکل ہے۔)

ایک حدیث میں ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ حق پر غالب اور قائم رہے گی اور خدا کی طرف سے ان کی مدد کی جائے گی اور کسی کا مدد نہ کرنا ان کو نقصان نہ پہنچا سکے گا اور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ جماعت دین اور علم کے حاملین کا گروہ ہے اور ان سے تعلقات استوار رکھنا نہایت ضروری ہے۔

اَلْجَارُ قَبْلَ الدَّارِ وَ الرَّفِيْقُ قَبْلَ الطَّرِيْقِ، وَالزَّادُ قَبْلَ الرَّحِيْلِ۔ "مکان بنانے سے پہلے پڑوسی کی تحقیق کر لو، سفر سے پہلے ساتھی کی اور کوچ سے پہلے زادِ راہ کی تسلی کر لو"۔

(جامع صغیر، کنوز الحقائق)

یہ محاورہ بھی مشہور ہے اَلْجَار ثُمَّ الدَّارُ (مجمع الامثال) مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ۔

پس تو ہم اَلْجَارُ ثُمَّ الدَّارُ گو گر دِلے داری برو دلدار جو (۲۹۰۔۶)

(پس تم بھی نیک ہمسائے کی تلاش کرو، اور پھر مکان تلاش کرو، اگر دل رکھتے ہو تو جاؤ دلدار کی تلاش کرو۔)

سرِّ دلبراں میں ایک حدیث نقل کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں ہر صدی (کے راس پر) اللہ تعالیٰ ایسا مجدد بھیجے گا جو اس دین کی تجدید کرتا رہے گا۔ قرآن سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہادی ہیں مگر نیابتاً آپ کے خلفاء ورثاء ہوں گے۔ یہ سلسلہ امام آخر الزماں کے ظہور تک جاری رہے گا۔ مجدد صدی انہی مشائخ سے ہوتے ہیں۔

اَلْعُلَمآ ءُ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَآءِ (ترمذی: ص ۳۸۴) "علماء انبیاء کے وارث ہوتے ہیں"۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مرشد نبی کی تعلیمات کا اشاعت کرنے والا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ نورِ نبی ٹھہرا۔ اس سے وہی روشنی پھوٹتی ہے جو نبی کی بعثت سے۔

بیعت سے متعلق احادیث اور مشائخ کے اقوال

بیعت سے متعلق بہت سی احادیث دیکھنے میں آتی ہیں۔ ان میں سے چند بطور تبرک پیش کی جا رہی ہیں۔

مَنْ لَّمْ یَکُنْ لَّہٗ شَیْخٌ فَشَیْخُہٗ الشَّیْطَانُ۔ "جس کا کوئی مرشد نہ ہو اس کا مرشد شیطان ہوتا ہے"۔ (لطائف معنوی از عبداللطیف طبع ہند)

مَنْ لَّا شَیْخَ لَہٗ فَشَیْخُہٗ شَیْطَانٌ ۔ "جس کا کوئی شیخ نہیں اس کا شیخ شیطان ہوتا ہے"۔

(۱) حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ نے کتاب معرفۃ المریدین میں لکھا ہے کہ مذکورہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے۔ (متوفی ۲۸۳ھ)

(۲) شیخ العالم حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردی نے عوارف میں اس کو نقل کیا ہے۔

(۳) ابوالفیض قلندر سہروردی نے الفقر فخری کے صفحہ ۹ پر اس حدیث کو درج کیا ہے۔

(۴) حضرت سلطان باہوؒ نے عین الفقر شرح نظام الدین حصہ دوم صفحہ ۱۵ پر اس کو نقل کیا ہے۔

(۵) شیخ سید عبدالقادر جیلانیؒ نے فتوح الغیب (مع غنیۃ الطالبین مقالہ ۳۶ صفحہ ۱۴۷) پر اس کو نقل کیا ہے۔

(۶) حضرت قطب الدین دمشقی نے رسالہ مکیہ المعروف امداد السلوک میں صفحہ ۱۸۸ پر اس کا ذکر کیا ہے۔

(۷) حضرت معین الدین چشتیؒ اور نظام الدین اولیاءؒ نے بھی لکھا ہے کہ جس کا کوئی پیر نہیں اس کا پیر شیطان ہوتا ہے۔

مولانا رومؒ ان احادیث کی روشنی میں جن کا شیخ نہ ہو ان کو فضول انسان قرار دیتے ہیں۔

ہر کہ اُو بے مرشدے در راہ شد　　اُو ز غولاں گمرہ و در چاہ شد(۳۰۸_۱)

(جو کسی مرشد کے بغیر طریقت کی راہ پر چل نکلا، وہ شیطانوں کے ہاتھوں گمراہ ہو کر گڑھے میں جا گرتا ہے۔)

گر نہ باشد سایۂ پیر اے فضول　　بس ترا سرگشتہ دارد بانگِ غول(۳۰۹_۱)

(اے مہمل انسان اگر مرشد کا سایہ ترے سر پر نہ ہو، تو تجھے شیطان کی آواز پریشان رکھے گی۔)

اَلشَّیْخُ فِیْ قَوْمِهٖ کَالنَّبِیِّ فِیْ اُمَّتِهٖ　　''شیخ اپنی قوم میں ایسے ہوتا ہے جیسے نبی اپنی امت میں''۔　(منبع القوی، لطائف القوی)

جامع صغیر اور کنوز الحقائق میں یہ حدیث اس طرح لکھی گئی ہے۔

اَلشَّیْخُ فِیْ بَیْتِهٖ کَالنَّبِیِّ فِیْ قَوْمِهٖ.　　''شیخ اپنے گھر میں ایسے ہوتا ہے جیسے قوم میں کوئی نبی''

جیسا کہ مولانا جامیؒ نے فرمایا ہے کہ مولانا رومؒ کی مثنوی فارسی زبان میں قرآن کا ترجمہ ہے۔ اسی طرح آپ نے احادیث کا ترجمہ بھی کئی مقامات پر اپنے اشعار میں کیا ہے۔ اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں ۔

دست را مسپار جز در دستِ پیر　　حق شد ست آں دست اُو را دستگیر

(اپنا ہاتھ پیر کے ہاتھ کے سوا کسی کو نہ دو کیونکہ اس کا ہاتھ حق بن گیا ہے اس کا ہاتھ پکڑو۔)

کو نبی وقتِ خویش ست اے مرید　　زانکہ زو نورِ نبی آید پدید(۸۳_۵)

(کیونکہ اے مرید! وہ مرشد اپنے وقت کا نبی ہے اس لئے کہ وہ صاف طور پر نبی کا نور ہے۔)

گفت پیغمبرؐ کہ شیخ رفتہ پیش　　چوں نبی باشد میانِ قومِ خویش(۱۷۸_۳)

(نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ شیخ پیش رو ہے، اپنی قوم میں مثل نبی کے ہوتا ہے۔)

چوں بہ دادی دست خود در دستِ پیر　　پیرِ حکمت کو علیم ست و خبیر(۸۳_۵)

(جب تم اپنا ہاتھ پیر کے ہاتھ میں دے دو گے، وہ پیر حکمت ہے کیونکہ وہ دانا اور باخبر ہے۔)

مِثْلُ عِتْرَتِیْ کَسَفِیْنَةِ نُوْحٍ مَنْ رَکِبَهَا نَجَا　　''میرے اہلِ بیت کی مثال سفینۂ نوحؑ کی ہے جو اس میں سوار ہو گیا، نجات پا گیا''۔　(مستدرک)

مولانا رومؒ نے اس حدیث کا ترجمہ اپنی مثنوی میں کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ۔

ما و اصحابیم چوں کشتیِ نوحؑ　　ہر کہ دست اندر زند یابد فتوح(۶۳_۴)

(ہم اور صحابہ کشتیِ نوح کی مانند ہیں، جو ہمارا سہارا پکڑے گا نجات پائے گا۔)

یا کسے کو در بصیرتہائے من　　شد خلیفہ راستیں بر جائے من(۳۲۰_۴)

(یا وہ لوگ جو میری بصیرت سے بہرہ مند ہوئے، وہ بھی میرے خلیفہ میری جگہ پر قائم مقام ہیں۔)

ہر ولی را نوح و کشتی بان شناس　　صحبتِ ایں خلق را طوفاں شناس(۲۲۱_۶)

(ہر ولی کو نوح اور کشتی بان کی طرح سمجھ، اس مخلوق کی صحبت کو طوفان سمجھو۔)

مشائخ کا قول ہے کہ جب ایک آدمی کشتی میں سوار ہوتا ہے تو کشتی چلتی رہتی ہے اور بیٹھے بیٹھے اس کی منزلیں طے ہو جاتی ہیں۔ لیکن کشتی رانی کے دوران کشتی کے آداب معلوم ہونا ضروری ہیں۔ شیخ بھی کشتی کی مانند ہے جیسے جیسے کشتی بڑھتی جاتی ہے مرید کی منزلیں بھی طے ہوتی جاتی ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَاَمْوَالِکُمْ وَلٰکِنْ یَّنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَاَعْمَالِکُمْ۔ (مسلم شریف، مسند احمد)

"خدا تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ اس کی نگاہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال پر رہتی ہے"۔

درجِ بالا حدیث کے حوالے سے مولاناؒ فرماتے ہیں کہ دلوں کی اصلاح کے حصولِ فیض اور صیقلِ قلب کے لئے مردِ حق آگاہ اور حق بین اور خدامست بزرگ کی صحبت ضروری ہے۔

گفت لَا یَنْظُرُ اِلیٰ تَصْوِیْرِکُمْ "فَابْتَغُوْا ذَاالْقَلْبِ فِیْ تَدْبِیْرِکُمْ (۹۵-۵)"

(حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ وہ تمہاری صورت کو نہیں دیکھتا، پس اپنے حال کی اصلاح کے لئے کسی صاحبِ دل کی تلاش کرو۔)

ننگرم در تو دراں دل بنگرم تحفہ اُو را آر اے جاں بردرم (۹۶-۵)

(میں تجھ کو نہیں دیکھتا میں تیرا دل دیکھوں گا، اے عزیز اس کو بطور تحفہ میرے پاس لاؤ۔)

حضرت ابو ہریرہ کی قطع حلقوم والی حدیث

بخاری شریف کی حدیث ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے دو برتن حاصل کئے۔ ایک تو ان میں سے تم کو تقسیم کر دیا اور دوسرے کی اگر تم میں اشاعت کروں تو میرا حلقوم کاٹ دیا جائے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ گلہ کاٹنے والے علم سے مراد بادشاہوں کے خلاف باتوں کا علم تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی باتیں علم میں شامل نہیں کی جاسکتیں لہٰذا یہ علم سوائے علم لدنی کے اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ معارف اور علم کی تعلیم زبانِ قال سے نہیں ہوسکتی بلکہ زبانِ حال ہی اس کی ترجمانی کرسکتی ہے یعنی اس کا ادراک کسی علم سے نہیں بلکہ حضوری سے ہوتا ہے۔ یہ اس لئے کہ ان معارف کے الفاظ موضوع، اور نہ ہی سامعین کو اس وضع کا علم ہوتا ہے۔ لہٰذا استعارات مجاز کو گفتگو میں لایا جاتا ہے جس کو عام لوگ سمجھ نہیں پاتے اور کفر کا فتویٰ لگا دیتے ہیں جس سے گردن کے کٹنے کا خطرہ رہتا ہے۔ چنانچہ یہ علم طریقت ہی ہے جس کے حقائق اور معارف یا تو انعکاسِ قلوب سے حاصل ہوتے ہیں یا القا سے دستیاب ہوتے ہیں اور کثرتِ ذکر و مراقبہ اس انعکاس کی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے۔ یہ انعکاس کبھی رسول اللہ ﷺ سے بلا

واسطہ اور کبھی اولیائے کرام کی وساطت سے حاصل ہوتا ہے۔

یاد رہے کہ کچھ اولیائے کرام نے اس قسم کی گفتگو کی (جس کو شطحیات کہا جاتا ہے) تو ان کو لوگوں نے پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا۔ حضرت منصور حسین کا اَنَا الحق کہنا اس نوعیت سے تعلق رکھتا ہے۔ حضرت سلطان باہوؒ نے اسی طرف اشارہ فرماتے ہوئے کہا ہے کہ ؎

شریعت دے دروازے اُچے راہ فقر دی موری ھُو
عالم فاضل ڈروے لنگھدے جو لنگھے سو چوری ھُو

(حضرت سلطان باہوؒ)

لَا یَشْقٰی بِھِمْ جَلِیْسُھُمْ۔ (الصحیح المسلم) ''ان کے پاس بیٹھنے والا شقی نہیں ہو سکتا''۔

یہی وجہ ہے کہ عارفین کے پاس بیٹھنے والا اگر بغیر وضو جائے تو خلاف ادب ہوگا۔ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کا قول ہے کہ جو شخص ہماری خاموشی سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتا وہ کلام سے کیا حاصل کرے گا۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ آپ کا فرمان ہے کہ :-

میں تمہارے لئے دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ایک کتاب اللہ اور دوسری میری سنت اور ایک جگہ اپنے اہل بیت کا بھی ذکر ہے کہ اہل بیت وہ کشتی ہے جس پر بیٹھ کر تم گمراہ نہیں ہو گے۔ (بِھِمْ یُمْطَرُوْنَ وَبِھِمْ یُرْزَقُوْنَ) ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ انہی کی وجہ سے بارش نازل کی جاتی ہے اور انہی کے وسیلے سے مخلوقات کو رزق ملتا ہے۔)

مرشد سے فیض لینے کے طریقے

طریقت کا یہ قاعدہ ہے کہ مریدین کو سلسلے کا فیضان اپنے سلسلے کے بزرگوں سے (یا دوسرے سلسلے کے بزرگوں کے ذریعے اپنے ہی مرشد کا فیضان) ملتا ہے۔ اس فیضان کے لئے ضروری ہے کہ کسی بزرگ کے ساتھ روحانی رابطہ قائم ہو اور یہ فیضان اسی کی وساطت سے ملتا ہے۔ غنیۃ الطالبین میں ہے کہ کبھی یہ فیضان ان کی مجلس میں بھی تقسیم کیا جاتا ہے۔

فیضان کا حصول دو باتوں پر انحصار کرتا ہے ایک یہ کہ فیض دینے والے کی کیا حیثیت ہے اور فیضان لینے والے کا ظرف کتنا ہے۔ بالعموم جب تک لینے والا مستعد نہ ہو، اس وقت تک فیض دینے والا رجوع نہیں کرتا۔ فیض صرف وہ لوگ ہی حاصل کرتے ہیں جو فیض رسانی کے آداب سے آگاہ ہوں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ جسے اپنے مرشد سے بے پناہ محبت ہو۔ وہی فیض لینے میں کامیاب ہوتا ہے۔

فیض رسانی کی ابتدا اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات سے ہوتی ہے جو فخر موجودات اور سرور کائنات کی

وساطت سے سلاسل کے بزرگوں سے ہوتی ہوئی اپنے شیخ کے سینے سے مرید کو حاصل ہوتی ہے۔ حضرت عبدالعزیز دباغ" فرماتے ہیں کہ طریقت میں یہ اصول کارفرما ہے کہ پیر خواہ اپنے مرید کو کتنا ہی چاہے لیکن جب تک مرید اپنے شیخ سے محبت نہ کرے اور اس کی طرف رجوع نہ کرے، اس کی روحانیت سے اخذ فیض ممکن نہیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں اگر مرید اپنے شیخ سے مکمل رابطہ قائم رکھے تو یہ عین ممکن ہے کہ مرشد کے تمام کمالات کو اپنے اندر جذب کرلے کہ وہ اپنے مرشد کے ہر کمال اور ہر ادا کی حرکات وسکنات کا نمونہ بن جائے بلکہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ دونوں کی شکل وصورت میں ایسی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور لوگ دونوں میں آسانی سے تمیز نہیں کر پاتے۔ (اس کی خوبصورت مثال حضرت بہاؤالدین سہروردیؒ اور حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کے معاملے میں مشہور ہے) اپنے مرشد سے ہم آہنگی اس طرح ہو جاتی ہے کہ آئینہ دیکھے تو اسے مرشد کی شکل نظر آئے۔ منقول ہے کہ اسمٰعیل شاہ صاحب کرمانوالےؒ کے چند مرید تسبیح کے محراب میں مدینہ شریف کی تصویر دیکھ رہے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے بھی دکھاؤ میں بھی اس نگینے کو دیکھوں۔ جب دیکھا تو فرمایا کہ مجھے تو اس میں شرقپور شریف میں اپنے شیخ کا روضہ نظر آرہا ہے۔ حضور پاک ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ جب پانی پینے لگتے تو آپ اُس میں تاجدار مدینہ ﷺ کا چہرہ مبارک ملاحظہ فرماتے تو رو دیتے۔ محبت شیخ کی طرف راہنمائی کے لئے نیچے کچھ الگ مضمون دے دیا گیا ہے۔ صوفیائے کرام کا قول ہے کہ اگر شیخ مرید سے محبت نہ کرتا ہو لیکن مرید شیخ سے محبت رکھتا ہو تو جذب فیض کر سکتا ہے۔

مرید اور مراد کی بحث (جب تک اللہ نہ چاہے کوئی مرید نہیں ہوسکتا)

صوفیاء کا قول ہے کہ حقیقت میں مرید مراد ہے اور مراد مرید ہے۔ مرید خواہندہ (چاہنے والا) اور مراد خواستہ (چاہا گیا) ہوتا ہے۔ بندہ کی صفت نہ تو مرید ہوتی ہے اور نہ مراد تاوقتیکہ حق تعالیٰ خود اسے نہ چاہے۔ جب بندہ مرید حق ہوتا ہے تو لامحالہ حق بھی ہوتا ہے کیونکہ اللہ کا فرمان ہے کہ:

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ (التکویر:۲۹) "تم نہیں چاہ سکتے بجز اس کے کہ اللہ چاہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ تم اس کی خواہش بھی نہیں کر سکتے جب تک توفیق الٰہی تمہاری دستگیری نہ کرے۔ فہم و خرد کے چراغ یہاں کام نہیں دیتے ورنہ ہر سمجھدار اللہ کو چاہنے والا ہوتا۔ جب اللہ کی نظر لطف ہو تو سب حجاب اٹھ جاتے ہیں اور رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں اور انسان خدا کی جانب رواں دواں ہو جاتا ہے۔ اس میں بندوں کی مشیت (چاہنے) کو ثابت کیا مگر ان کی مشیت کی علت اپنی طرف منسوب کی (کہ اگر میں چاہوں تو تم چاہ سکتے ہو۔)

صوفیاء کا یہ بھی قول ہے کہ مرید اس وقت تک نہیں چاہ سکتا جب تک خدا کی ارادت نہ ہو جو اس کے لئے

مقدم ہو چکی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے ازل سے ہی چاہا کہ فلاں اللہ کا مرید ہوگا یا یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ یہ بندہ تو روز ازل ہی اللہ کا مرید تھا لیکن چونکہ ارادت حق تعالیٰ کی ازلی صفت ہے اس لئے جس کو اللہ نے چاہا وہ مرید ہو گیا۔ اس بات کا اشارہ سورہ المائدہ آیت ۵۴ میں ہے۔ ارشاد فرمایا۔

یُحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗٓ (المائدہ:۵۴) ''محبت کرتا ہے اللہ ان سے اور وہ محبت کرتے ہیں اس سے''۔

یعنی حق تعالیٰ بندے کو دوست رکھے تب بندہ خدا کو دوست رکھتا ہے چنانچہ جتنا اللہ تعالیٰ ہمیں دوست رکھے گا ہم بھی اس کو اتنا ہی دوست رکھیں گے۔ ایک شخص نے حضور پاک ﷺ سے عرض کیا۔ یا رسول اللہ ﷺ کیا بندہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی منزلت کتنی ہے؟ فرمایا۔ ہاں (بندہ) ضرور دیکھ لے کہ اللہ تعالیٰ کی منزلت اس کے نزدیک کتنی ہے۔ سو اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی منزلت اتنی ہی کرتا ہے جتنی منزلت حق تعالیٰ کی اس کا بندہ کرتا ہے۔ یعنی اگر بندہ کے دل میں اللہ کی قدر و منزلت ہے تو اللہ بھی اس بندے کی اتنی ہی قدر و منزلت کرتے ہیں۔

جس قدر بندہ اللہ کی قضا پر راضی ہو اسی قدر خدا بھی بندے سے راضی ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بندوں کی رضا پر اپنی رضا کو مقدم کیا تا کہ بندوں کی رضا اس کی اپنی رضا کے مطابق ہو۔ جب تک اللہ اپنی رضائے ازلی سے بندہ پر راضی نہ ہو تو بندہ اللہ تعالیٰ سے راضی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا جس قدر بندے کو خدا کی لکھی ہوئی تقدیر (قضا) پر رضامندی کا احساس ہوتا ہے اسی قدر خدا کو بھی بندے کے افعال پر رضا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو بندہ تھوڑے رزق پر راضی ہو میں اس کے تھوڑے اعمال پر راضی ہو جاتا ہوں اور یہ بھی فرمایا:

رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (المجادلہ:۲۲) ''اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی''

ثُمَّ تَابَ عَلَیْهِمْ لِیَتُوْبُوْا (التوبہ:۱۱۸) ''تب اللہ تعالیٰ ان پر مائل بہ کرم ہوا تا کہ وہ بھی رجوع کریں''۔

اس سے معلوم ہوا کہ توبہ کرنا بندوں کا کمال نہیں بلکہ توبہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہوتی ہے۔ یہ بات واضح ہو گئی کہ بندوں کی حق تعالیٰ کے ساتھ ارادت کا باعث بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ارادت کا ہونا ہے۔ کیونکہ تمام اشیاء کے ہونے کا سبب (علت) حق تعالیٰ کی صفت ہے اور حق تعالیٰ کی صفت کا کوئی سبب (علت) نہیں۔ گویا بندے کی بندگی علت ہے نہ کہ بندگی خدا کی علت (سبب) ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بندوں کی ارادت بندوں کی صفت ہے ارادت محدث ہے حق تعالیٰ قدیم ہے اس لئے حق تعالیٰ کی صفت

ارادت بھی قدیم ہے اور بندہ چونکہ محدث ہے اس لئے اس کی بندے کی ارادت بھی محدث ہے۔ قدیم میں تغیر روا نہیں جبکہ محدث میں تغیر روا ہے چنانچہ یہ ممکن ہوا کہ قدیم محدث کا سبب ہو کیونکہ حدوث تغیر ہے اور عدم سے وجود میں آیا ہے اور یہ قدیم کو متغیر نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیاء نے کہا حق تعالیٰ کی ارادت سابق (پہلے) ہونی چاہیے تا کہ بندوں کا حق تعالیٰ مرید ہو۔ چونکہ حق تعالیٰ کی ارادت بندے کے لئے ہے اس لئے درست ہوا کہ بندہ (جو مرید ہے) مراد ہو۔ لہٰذا حق تعالیٰ کی ارادت بندے پر مقدم ہے۔

ایک صوفی کا قول ہے کہ بندے کو جب خدا تعالیٰ چاہے تو یہ محال ہے کہ بندہ خدا تعالیٰ کو نہ چاہے۔ (یعنی جب بندے کو خدا کی خواہش ہو تو خدا کو بھی بندے کی خواہش ہوتی ہے) کیونکہ خدا کی ہر ارادت کے خلاف کوئی بات ظاہر ہو ہی نہیں سکتی اور اگر ہو جائے تو خدا کا مجبور ہونا ظاہر ہوگا اور یہ محال ہے کہ خدا مجبور ہو۔ راقم الحروف کے دیوان میں ایک نظم کا پہلا شعر اسی حقیقت کی غمازی کرتا ہے۔

منظورِ حق جو ہے وہی منظور ہے ہمیں کس سادگی سے ہم نے خدا کو منا لیا (از مصنف)

مراد کی وضاحت

مراد اُس شخص کو کہتے ہیں جسے حق تعالیٰ اپنی قدرت سے اپنی طرف جذب کر لیتا ہے اور خلقت سے علیحدہ کر دیتا ہے۔ وہ کوئی بلا نہیں دیکھتا اس کے (سر کے) سامنے جو حالات غیبی لاتا ہے وہ اسے کشف ہو جاتے ہیں۔ مرید وہ ہے کہ اس کی بلا پیش از وجود ہوتی ہے یعنی بلا آنے سے پہلے اسے خبر ہو جاتی ہے یہ بلا کھینچتا ہے کیونکہ اس نے ابھی مراد نہیں پائی اس لئے بلا کھینچتا ہے۔ مراد وہ ہوتا ہے جسے پہلے کشف ہوتا ہے اور بعد کو اجتہاد اور ریاضت اور بلا وجود میں آتی ہے اور جب بلا آتی ہے تو وہ بلا کی لذت میں ایسا غائب ہو جاتا ہے جیسے کہ وہ بلا سے بالکل بے خبر ہوتا ہے۔ مرید کو بلا پہلے اور کشف بعد میں ہوتا ہے جبکہ مراد کو کشف پہلے ہوتا ہے اور بلا بعد از کشف ہوتی ہے اس اعتبار سے بھی مرید مراد ہوا اور مراد مرید ہوا۔ بلا کے بغیر حق تعالیٰ کو پانا ممکن نہیں۔ مراد کا منہ اللہ تعالیٰ خلقت سے ہٹا کر اپنی جانب کر لیتا ہے اور ترک کے ارادے میں خلقت کی طرف اس کی پیٹھ ہوتی ہے اور طلب کی نیت پر اس کا منہ حق تعالیٰ کی طرف ہوتا ہے۔ مراد کا خلقت کی طرف سے منہ پھیرنا اور حق تعالیٰ کی طرف منہ کرنے سے حق تعالیٰ اس کے دل میں لطف پیدا کر دیتا ہے جو اسے اجتہاد کی طرف ابھارتا ہے۔ مریدوں کو اجتہاد کشف کے قابل بناتا ہے جبکہ مراد کو پہلے کشف ہوتا ہے اور بعد میں وہ اجتہاد کرتا ہے۔

حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ کی مشہور حدیث میں اس بات کا ذکر ہے کہ انہوں نے اپنے نفس کو دنیا سے دور رکھا دنوں میں خود کو پیاسا رکھا اور راتوں کو بیداری کی تو انہوں نے اپنے رب کے عرش کو ظاہر دیکھا۔ اللہ تعالیٰ نے حارثہ

کو مریدوں کے محل میں رکھا کیونکہ ان کی بیداری، تشنگی اور بلا پہلے تھی، تب قیامت کا غیب انہیں روشن ہوا۔

مراد کو مشاہدہ کی قوت اجتہاد اور نشاط پر ابھارتی ہے اور اس کا منہ خدا کی طرف ہو جاتا ہے۔ لہٰذا بلا کا تحمل آسان ہو جاتا ہے اور وہ کوئی ڈر نہیں رکھتا ہے۔ اس لئے کہ وہ بلا کو آسان بنا دیتا ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ جب بادشاہ سے خلعت کی امید ہو تو بندہ جہاد کی سنت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے میدان میں آجاتا ہے اور تلوار سے ہلاک ہونے کے خطرے کی پرواہ نہیں کرتا۔ فرعون کے جادوگروں کو مراد کے مقام پر رکھا کیونکہ انہوں نے جب حضرت موسیٰ کے عصا کو دیکھا تو اللہ کی قدرت اور طاقت کا مشاہدہ کیا۔ لہٰذا انہوں نے اللہ تعالیٰ کو تسلیم کر لیا اور اس کے عوض ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے۔ ایسی مثال میں کشف پہلے تھا اور بلا (ہاتھ پاؤں کاٹنا) بعد کو تھی۔ چنانچہ انہوں نے کشف کے مقابلے میں بلا کو آسانی سے قبول کر لیا۔

شرح تعرف میں حضرت عمرؓ کے مراد ہونے کی مثال بھی پیش کی گئی ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کے لئے نکلے تو راستے میں معلوم ہوا کہ ان کی ایک بہن بھی اسلام قبول کر چکی ہے مگر جس وقت انہوں نے قرآن پاک کی سورۂ طٰہٰ کی ان آیات کو سنا۔

طٰهٰ ۞ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۞ ''نہیں اتارا ہم نے آپ پر یہ قرآن کہ آپ مشقت میں پڑیں''۔ (طٰہٰ: ۱، ۲)

تو اپنے دل میں کہا کہ ہم اپنے بتوں کی جتنی ہی عبادت کریں لیکن وہ ہمیں مشقت سے نہیں بچاتے اور نہ ہی انہیں اس مشقت کا علم ہوتا ہے۔ خدا تو ایسا ہی ہونا چاہیے جسے بندوں کی ہر بات کا علم ہو۔ لہٰذا آپ ایمان لے آئے۔ علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں: دگرگوں کرد تقدیر عمرؓ را (خدا نے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تقدیر کو بدل دیا)

حضرت ابراہیمؒ بن ادھم کھیل کود کی نیت سے شکار کو گئے اور شروع میں کوئی ریاضت نہ رکھتے تھے مگر انہوں نے پہلے ہرن سے اور دوسری بار اپنے گریبان سے یہ آواز سنی کہ خدا نے تمہیں کھیل کود کے لئے پیدا نہیں کیا اور نہ ہی تجھے اس کا حکم دیا ہے۔ آپ نے اس آواز کو اپنے گھوڑے کی زین سے تیسری بار سنا تو فرمایا۔ ''خدا کی قسم آج کے بعد میں خدا کا عاصی نہ بنوں گا۔'' اس آواز سے آپ کا کشف زیادہ ہوا اور سوچا کہ میں نیاز مند ہوتے ہوئے کھیل کود کی طرف دوڑتا ہوں اور اللہ بے نیاز ہوتے ہوئے اپنی طرف بلاتا ہے۔ مولانا رومؒ نے یہ پورا واقعہ نظم کیا ہے۔ اس مثال میں کشف پہلے اور ریاضت بعد میں آئی چنانچہ آپ بھی مرادوں میں سے تھے۔

مشتری ماست اللہ اشتری از غم ہر مشتری ہیں بر تر آ

(ہمارا خریدار اللہ ہے جس نے خرید لیا ہے ہر خریدار کے غم سے آگے بڑھ۔)

مشتری جُو کہ جُویانِ تو است عالم آغاز و پایان تو است (۱۵۴۔۵)

(اس خریدار کو تلاش کرو جو تیرا متلاشی ہے تیرے آغاز اور انجام کو جاننے والا ہے۔)

مشتری خواہی کہ از وے زر بری　　　بہ ز حق کے باشد اے دل مشتری (۱۰۰-۶)

(تو خریدار چاہتا ہے جس سے تو مال کمائے اے دل! اللہ تعالیٰ سے بہتر کب کوئی خریدار ہو گا۔)

خلاصہ یہ ہے کہ مرید اور مراد کی اپنی کوئی ارادت نہیں ہوتی فرق صرف اتنا ہے کہ مرید جب تک اپنی تمام اراد توں کو ختم نہیں کرتا حق تعالیٰ کے ساتھ اس کی ارادت درست نہیں ہوتی اور مراد جب حق تعالیٰ تک پہنچتا ہے تو اس کی اپنی تمام ارادتیں ساقط ہو جاتی ہیں۔ جسے اللہ چاہے اسے کچھ اور درکار نہیں اور جو اس تک پہنچ گیا تو اللہ تعالیٰ اس کو کسی کے تصرف میں نہیں چھوڑتا۔

مرید اور مراد میں فرق

ابو القاسمؒ فرماتے ہیں کہ ہر مرید، مراد (جسے اللہ چاہتا ہے) ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ مراد نہ ہو تو مرید بھی نہیں ہو سکتا اور اللہ تعالیٰ اسے ارادت کی توفیق ہی نہ دیتا۔ صوفیا مرید اور مراد میں اس طرح فرق کرتے ہیں کہ مبتدی (ابتدا کرنے والے) کو مرید کہتے ہیں اور منتہی (انتہائی درجات پر پہنچنے والے) کو مراد کہتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مرید وہ ہے جو تکان اور مشقتیں برداشت کرنے میں پڑے اور مراد وہ ہے جس کو مشقتوں سے بچا دیا گیا ہو۔ کچھ لوگوں پر تو ابتدا میں ہی بڑے بڑے معانی مکاشفہ سے حل ہو جاتے ہیں اور بعض مشقتوں کے باوجود اس مقام پر نہیں پہنچ سکتے۔ ابو علی دقاقؒ فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام مرید تھے کہ انہوں نے عرض کیا۔

رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي۔ (طٰہٰ: ۲۵)　　　"اے اللہ! میرا سینہ کھول دے"۔

اور حضور ﷺ مراد تھے کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا۔

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (الانشراح: ۱)　　　"کیا ہم نے آپ کے لئے آپ ﷺ کے سینے کو کھول نہیں دیا"۔

موسیٰ نے عرض کیا۔

رَبِّ أَرِنِي۔ (الاعراف: ۱۴۳)　　　"اے اللہ! مجھے اپنی ذات دکھا"۔

اور حضور پاک ﷺ سے فرمایا۔

أَلَمْ تَرَ إِلَىٰ رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ (الفرقان: ۴۵)　　　"کیا آپ نے اپنے رب کی طرف نہیں دیکھا کہ اس نے کیسے سایہ کو لمبا کیا ہے"۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ عمل سے آج کل مرید اور مراد میں فرق کرنے والے صوفی نہیں رہے۔ اور تصوف سے عاری صوفی کہتے ہیں کہ ہمارے تصوف میں شریعت یوں پوشیدہ ہے جیسے الفاظ میں معانی مخفی ہوتے ہیں۔ آج کے صوفی رندی سے بھی آگاہ اور شریعت سے بھی اپنے آپ کو باخبر کہتے ہیں اگر ان سے

تصوف کے بارے میں کچھ معلوم کرو تو خود کو منصور کا ہم پلہ کہتے ہیں جس نے رب کے جلوے اپنے دل کے نہاں خانے میں عیاں دیکھے اور شاعر نے قدرت کے بانکپن میں جس جلوہ کو افروز پایا ایسے باکمال اور باہمت شیر مردوں سے تحقیق کا میدان خالی ہو گیا ہے۔ اگر کچھ باقی سامنے ہے تو اے دوست، صوفیوں اور مُلاؤں کے نام باقی ہیں اور یہ محض بیوپاری ہیں۔

علامہ اقبالؒ اور مولانا رومؒ کے نظریات

پہلے بیان کئے گئے اشعار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبالؒ پیرانِ عظام کو نہایت عزت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اُن کا موقف یہ تھا کہ وہ بیکار لوگ جو نہ تو تجارت کے ہی قابل تھے اور نہ انکا کوئی ذریعہ معاش تھا ایسے لوگ پیر بن بیٹھے ہیں لوگوں کو چاہیئے کہ وہ اپنا وقت ان پیر نما لوگوں کی خانقاہوں میں ضائع نہ کریں، لیکن یہ دوسری نوعیت کے علماء تو سرے سے ہی پیرانِ عظام کی مخالفت کے درپے ہیں۔ علامہ اقبالؒ تو خود بھی اپنے والد سے بیعت تھے اور قادری سلسلہ رکھتے تھے۔ جو لوگ چند نام نہاد پیروں کی وجہ سے سب پیروں کو برا کہتے ہیں، وہ سراسر زیادتی کرتے ہیں۔ غور کا مقام ہے کہ اگر زید یا بکر مسلمان ہوتے ہوئے بھی کبائر میں الجھا ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں لینا چاہیئے کہ اسلام کو ہی چھوڑ دیا جائے اور کہا جائے کہ اسلام نعوذ باللہ اچھا مذہب نہیں۔ اسی طرح اگر کچھ لوگ پیروں کو بدنام کرتے ہیں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ سب کے سب پیر ہی غلط ہیں۔ اُن کو یہ معلوم نہیں کہ اسلام میں مقدس ترین گروہ انہی صحابہؓ اور اولیائے کرامؒ کا ہے جو انبیاءؑ کے بعد شمار کیا جاتا ہے۔ اس گروہ سے تعلق رکھنے والے جنیدؒ، بایزیدؒ، ابوالحسن خرقانیؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، علی ہجویریؒ، معین الدین چشتیؒ، بہاء الدین نقشبندؒ، فرید الدین گنج شکرؒ، نظام الدین اولیاءؒ، وغیرہ جیسی شان رکھنے والی لاکھوں ہستیاں منسلک ہیں۔ اس گروہ کی نفی ان تمام اولیائے کرام کی نفی اور انکار ہے اور اُن کے اس انکار کی نوبت منبع اسلام تک جا پہنچے گی۔ یہ لوگ خود نہیں بلکہ اس منصب پر بٹھائے گئے ہیں۔ ان کو برا کہنا، اکابرین کو برا کہنے کے برابر ہے۔ یہ لوگ قوم کی شہ رگ اور دین پھیلانے کا منبع ہیں۔ حضرت ہجویریؒ فرماتے ہیں انہی کے قدموں کے صدقے باران رحمت نازل ہوتی ہے اور زمین میں جو سبزہ اُگ رہا ہے وہ ان کے صفاء حال کی برکت سے اُگ رہا ہے اور کافر کو مومن پر غلبہ انہی کی ہمت سے حاصل ہے۔

دشمنانِ اسلام نے قوم کو ان لوگوں کے فیوض سے محروم کرنے کے لیے پیری مریدی کے خلاف ایک زبردست مہم چلا رکھی ہے تا کہ مسلمان نہایت سکون سے گمراہی میں مبتلا ہو جائیں اور افسوس کہ ہمارے ''پیر دشمن علماء'' اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ایسے علماء میں سے کچھ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم اس گروہ کا انکار تو نہیں کرتے مگر آج کل تو سب پیر ہی ایسے ہیں۔ ایسے لوگوں کو مولانا رومؒ نے یہ جواب دیا کہ۔

گر تو گوئی نیست پیرے آشکار ، تو طلب کن در ہزار اندر ہزار(x)

(اگر تم کہتے ہو کہ کوئی پیر نظر نہیں آتا، تو تم ہزاروں میں تلاش کرو۔ تمہاری تلاش درست نہیں)

زآنکہ گر پیرے نہ باشد درجہاں نے زمیں بر جائے ماند نے مکاں(x)

(یہ اس لئے کہ اگر جہاں میں کوئی پیر باقی نہ رہے تو یہ زمیں اور کون ومکاں اپنی جگہ پر نہیں رہ سکتے۔)

ہیچ کس از نزدِ خود چیزے نہ شد ہیچ آہن خنجرے تیزے نہ شد(x)

(کوئی شخص خود بخود کوئی چیز نہیں بن سکا۔ کوئی لوہا کبھی خود تیز خنجر نہیں بن سکتا۔)

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم تا غلام شمس تبریز نہ شد(مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ)

(مولانا روم اس وقت تک مولوی سے مولانا روم نہ بنے جب تک وہ شمس تبریزیؒ کے غلام نہ بنے۔)

ہیچ نکشد نفس را جز ظلِ پیر دامنِ آں نفس کش محکم بگیر(۲۴۲۔۲)

(نفس کو شیخ کے سایہ کے علاوہ کوئی چیز نہیں مارتی۔ اس نفس کو مارنے والے کا دامن مضبوطی سے پکڑلو)

ہر کہ خواہد ہم نشینی باخدا گو نشیند در حضورِ اولیاء(۲۰۹۔۲)

(جو شخص خدا تعالیٰ کی ہم نشینی چاہتا ہے، اُسے کہو کہ وہ اولیائے کرامؒ کے حضور بیٹھے۔)

دست گیرد بندۂ خاص اِلٰہ طالباں را می برد تا بارگاہ(x)

(اللہ تعالیٰ کے خاص بندے دست گیری فرماتے ہیں اور طالبان کو بارگاہِ الٰہی میں پیش کرتے ہیں۔)

معلوم ہوتا ہے کہ یہ دین دشمن عناصر مولانا رومؒ کے زمانے میں بھی موجود تھے اور اس قسم کے فتنے اُس وقت بھی اسلام کو کمزور کرنے کے لیے اُٹھائے گئے، چنانچہ مولانا ان لوگوں سے سخت برہم ہوئے اور طویل کلام کے بعد فرماتے ہیں کہ جو لوگ اولیائے کرام کے منکر اور دشمن ہیں، وہ مردہ ہیں اور اسلام سے خارج ہیں۔

کیست کافر؟ غافل از ایمانِ شیخ کیست مردہ! بے خبر از جانِ شیخ(۳۱۳۔۲)

(کافر کون ہے؟ جو شیخ کی ایمانی قوت سے غافل ہے۔ مردہ کون ہے؟ جو شیخ کی روحانی قوت سے بے خبر ہے)

پس تو اے ناشُستہ رُو در چیستی؟ در نزاع و در حسد با کیستی

(پس اے ناپاک منہ والے! تو کس خیال میں ہے۔ (ذرا دیکھ) تو کس کے ساتھ جھگڑتا اور حسد کرتا ہے۔)

با دُمِ شیرے تو بازی می کنی بر ملائک ترکتازی می کنی

(تو شیر کی دم کے ساتھ کھیل رہا ہے اور تو فرشتوں پر حملہ کر رہا ہے۔)

بد چہ می گوئی تو خیرِ محض را ہیں ترفع کم شمر ایں خفض را(۳۱۴۔۲)

(تو اس مجسم نیکی کو برا کہہ رہا ہے اور خبردار اس پستی کو بڑائی نہ سمجھ۔)

می کند طاعات و افعالِ سنی لیک یک ذرہ نہ دارد چاشنی

(تو طاعت اور نیک عمل تو بجالاتا ہے لیکن ان میں تو ایک ذرہ بھی چاشنی نہ پائے گا۔)

ذوق باید تا دہد طاعات بَر مغز باید تا دہد دانہ شجر (۳۱۹-۲)

(ذوق عبادت ہونا چاہیے تا کہ عبادات پھل دیں، دانہ میں مغز کا ہونا ضروری ہے تا کہ وہ درخت اُگ سکے)

حضرت ہجویریؒ کے نظریات

اگر مولاناؒ کا یہ کلام بھی کافی نہیں سمجھا جاتا تو حضرت علی ہجویریؒ کی کشف المحجوب میں سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔

۱۔ تصوف کو اسلام میں ایک مرکزی مقام حاصل ہے۔

۲۔ تصوف چمنِ اسلامی میں شجرِ حیات ہے، اسی لیے اسلامی تمدن کے جو مظاہر بھی تاریخ کے خاکے میں ہوتے ہیں، ان کا رشتہ کسی نہ کسی طور تصوف سے استوار ہوتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو تاریخ کے ہر مرحلے پر ایک ایسی معرفت نظر آتی ہے جو اربابِ حال پر ظاہر ہوتی ہے اور پھر اس کے انعکاس سے مظاہرِ تہذیب کی ہیئت اور ان کی معنویت میں ایک نیا زاویہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ تاریخ کی عمومی جہت ہے جہاں معارفِ تہذیب تسلسل میں ظاہر نہیں ہوتے۔

بقولِ مرزا غالب ''آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں''۔

تہذیب کے وہ سارے مطالعے جو معرفت کے مذکورہ بالا پہلو کو نظر انداز کر کے کئے جاتے ہیں، وہ تہذیب کی کلیت کو سمجھنے میں عموماً ناکام دکھائی دیتے ہیں۔ دنیا کی ہر روایتی تہذیب میں عموماً اور اپنی تہذیب میں جامعیت کے اعتبار سے اسلام میں بالخصوص تصوف کو ایک مرکزی مقام حاصل ہے اسلام کے مطالعے میں اس مرکزی مقام کا لحاظ رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ اسلام نے اپنی دنیا مختلف انداز میں تعمیر کی ہے کہیں تبلیغ کے ذریعے، کہیں اہل تجارت کے روابط سے پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے ذریعے اور کہیں عسکری فتوحات کے اعتبار سے برصغیر پاک و ہند میں اسلام نے اپنی جو دنیا تخلیق کی اس میں کم و بیش یہ سارے عوامل استعمال ہوئے۔ اسی لئے اس تہذیبی منطقہ میں ایک ایسی جامعیت پیدا ہوئی ہے جس میں ہر اسلوب اور ہر انداز کی تصویر وجود میں آئی ہے۔ اسی لئے اس تہذیب منطقہ کا مطالعہ ان مرکزی حوالوں سے کیا جا سکتا ہے جن کی جڑیں تصوف اسلامی کی سرزمین میں پیوست ہیں۔ آج کی دنیا میں روایتی تمدن کے سانچے ٹوٹ پھوٹ رہے ہیں جس سے ایک دوہری مشکل پیدا ہو رہی ہے۔ ایک طرف تو روایتی تمدن کی وضعوں کو سمجھنا مشکل ہوتا جا رہا ہے دوسری طرف وہ اسرار جو ان تمدنی اوضاع کے پیچھے حجاب اندر حجاب پوشیدہ تھے، ان کے ظاہر ہونے کی ضرورت شدید تر ہوتی جا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گذشتہ چند صدیوں میں تصوف پر تحریری مواد کثرت سے

دستیاب ہونے لگا ہے۔ یہ ایک ایسی تبدیلی ہے جو کونیاتی اسباب سے وقوع پذیر ہوئی ہے۔

حقیقت تصوف کی وضاحت حضرت امام غزالیؒ کے کلام سے

حجۃ الاسلام حضرت امام غزالیؒ جو اپنے دور کے عظیم عالم، فلسفی، محقق اور عبقری انسان تھے، اور آپ کا مقابلہ ان کے دور میں کوئی بھی نہ کر سکا یہاں تک کہ جن کو "الراسخون فی العلم" کا درجہ حاصل تھا۔ علم کے سمندر پی جانے کے باوجود وہ فرماتے ہیں کہ مجھے بھی تلاش حق رہی۔ علوم وفنون سمندروں کی طرح میرے ذہن میں متلاطم تھے، لیکن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود دل غیر مطمئن تھا کیونکہ میں ابھی تک دین کی حقیقت عظمیٰ سے بے خبر تھا۔ میرے دل میں ایک طوفان برپا تھا کہ کس طرح حقیقت تک پہنچوں، چنانچہ آپ فرماتے ہیں۔

"میں علم الکلام والوں کے پاس گیا اور اُن سے پوچھا کہ آیا تمہارے پاس حق ہے؟ اُنہوں نے دلائل دیئے لیکن میں ان دلائل کے ذریعے حق تک نہیں پہنچ سکا۔ میں فلسفیوں اور منطقیوں کے پاس گیا جن کے علوم و فنون پر مجھے خود بھی عبور حاصل تھا لیکن وہ بھی میرے واصل حق ہونے کا باعث نہ بن سکے، پھر میں اُس زمانہ کے فرقہ باطنیہ کے پاس گیا اور اُن سے راہ حق کے متعلق پوچھا لیکن بے سود۔ غرض ساری راہیں دیکھ لیں لیکن کہیں بھی مجھے حق نہ مل سکا۔ آخر کار میں صوفیاء کی بارگاہ میں گیا اور اُن سے پوچھا کہ حق کیا ہے؟ تو اُنہوں نے کہا کہ حق ہماری راہ میں ہے، چنانچہ میں نے اُن کی راہ کو اپنایا تو حق کو پالیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ صوفیاء کا گروہ ہی وہ گروہ ہے جو کہ خاص اللہ تعالیٰ کے راستے پر گامزن ہے۔ ان کی سیرت تمام لوگوں کی سیرتوں سے بہتر ہے۔ اُن کا طریقہ سب طریقوں سے صحیح اور ان کا اخلاق سب کے اخلاق سے پاکیزہ ہے، بلکہ اگر عقلاء کی عقل، حکماء کی حکمت، علماء کا علم اور ان کے اسرار کو جمع کر لیا جائے تب بھی ان کی سیرت اور اخلاق سے بہتر نہیں ہو سکتے کیونکہ ان کی تمام ظاہری اور باطنی حرکات وسکنات براہ راست سینہ نبوت کے نور سے فیض یاب اور مستنیر ہوتے ہیں اور اس کائنات میں نور نبوت سے بڑھ کر اور کوئی نور نہیں جس سے روشنی حاصل کی جا سکے۔"

مزید فرماتے ہیں "معترضین اس مسلک صوفیاء پر کیا نکتہ چینی کر سکتے ہیں، جس مسلک کی پہلی شرط ہی طہارت ہے اور ان کے ہاں طہارت کا مفہوم بھی یہ ہے کہ دل کو غیر اللہ کے تصور سے ہی پاک کر دیا جائے۔ طریقت میں ابتدا ہی سے مکاشفات ومشاہدات شروع ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ صوفیاء حالت بیداری میں ملائکہ اور انبیاء علیہم السلام کی ارواح طیبہ کی زیارت کرتے ہیں ان کی آوازیں سنتے ہیں اور ان سے اکتساب فیض کرتے ہیں۔

صوفیاء کی صحبت سے ان چیزوں پر ایمان ویقین کی دولت ملتی ہے کیونکہ یہ وہ مقدس گروہ ہے جن کی صحبت میں بیٹھنے والا بدبخت نہیں ہو سکتا جسے اس ذوق کی دولت عطا نہ ہوئی ہو، حقیقت نبوت کو صرف نام کے طور پر ہی سمجھ سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں سمجھ سکتا اور اولیائے کرام کی کرامات، انبیائے کرام کی

مبادیات میں سے ہیں، یہی حالت ابتدا میں حضور اکرم ﷺ کی تھی۔ جب آپ ﷺ نے دنیا سے کنارہ کش ہو کر غار حرا کو اپنا ٹھکانہ بنا لیا تھا جہاں آپ ﷺ خلوت میں رب قدوس کی عبادت میں مصروف و مشغول رہتے۔ عربوں نے حضور اکرم ﷺ کی یہ حالت دیکھ کر کہنا شروع کر دیا کہ محمد ﷺ اپنے رب پر عاشق ہو گئے ہیں۔"

یہ باتیں امام غزالیؒ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "المنقذ من الضلال" میں تحریر کی ہیں۔ دین اسلام کے دو رُخ اور دو پہلو ہیں۔ ایک ظاہری اور دوسرا باطنی و روحانی ہے۔ ظاہری رخ اور پہلو شریعت ظاہرہ کے نام سے موسوم ہے جسے علماء اور فقہاء نے اپنایا اور باطنی رُخ کو فقر و تصوف اور طریقت کا نام دیا گیا ہے۔ علم تصوف اور فقر کا مقصد اسلام کے اس روحانی اور باطنی رُخ کو ثابت کرنا اور اس کو عملی جامہ پہنانا ہے۔ کائنات کی ہر شے ظاہری اور باطنی پہلوؤں میں بٹی ہوئی ہے۔ ہر چیز کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ خود ہمارا وجود روح اور جسم میں منقسم ہے۔ جسم ظاہر ہے اور روح باطن۔ اصل شے روح ہے اور اسی پر جسم کی زندگی کا دارومدار ہے۔ تمام کائناتی حقائق باطن میں پوشیدہ اور مخفی ہیں۔ اسی طرح اسلام میں شریعت گویا جسم ہے اور تصوف و فقر اس کی روح ہے اور یہی اصل حقیقت اور صداقت کا سرچشمہ ہے۔

رسول مقبول ﷺ کی حیات کے یہی پہلو قرآن اور احادیث سے ثابت ہیں اور کوئی باشعور، ذی عقل اور صحیح العقیدہ مسلمان اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ آپ ﷺ کی ذات گرامی ظاہر و باطن کی جامع تھی اور آپ ﷺ ہی سے یہ دونوں طریقے مسلمانوں میں رائج ہوئے۔ ظاہری بصارت کے ساتھ باطنی بصیرت بھی ضروری ہے اور شریعت کے ساتھ ساتھ طریقت کو اپنانا بھی لازمی ہے۔ آفاق کے ساتھ انفس بھی ہے اور عالم شہادت کے پہلو بہ پہلو عالم غیب بھی موجود ہے اور اس کے لئے دل کی بینائی ضروری ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ۔

دل بینا بھی کر خدا سے طلب　　آنکھ کا نور دل کا نور نہیں (ب۔ج:۳۳۵)

فقر اور تصوف در حقیقت رسول اکرم ﷺ کی روحانی اور باطنی زندگی کی پیروی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل حسب استعداد باطنی کمالات تک رسائی حاصل کرنے کا نام ہے اور یہ وہ لائحہ عمل ہے جس کے ذریعے اسلام کے مذکورہ باطنی اور روحانی پہلو کو عملی طور پر ثابت کیا جاتا ہے۔ جب تک اسلام کا باطنی اور روحانی پہلو ثابت نہ ہو جائے، اسلام مکمل طور پر سامنے نہیں آتا اور اس کی حقیقت پورے طور پر منکشف نہیں ہوتی اور جب تک رسول مقبول ﷺ کی باطنی اور روحانی زندگی کو نہ اپنایا جائے مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان اور حقیقی معنوں میں مومن نہیں بن سکتا۔ "مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے۔"

ہر ذرہ باطنی جوہری توانائی کا حامل ہے

ہم جو کچھ ظاہری و مادی حواس کے ذریعے محسوس اور مشاہدہ کرتے ہیں، کائنات کا ماحصل یہی کچھ نہیں بلکہ کائنات اس کے علاوہ اور بے شمار نادیدہ اشیاء اور غیر مرئی مخلوقات اور غیر محسوس دنیاؤں سے بھری پڑی ہے۔ان کا مشاہدہ کرنے کے لئے باطنی حواس اور روحانی اِدراک کی ضرورت ہے ہر ظاہر کا ایک باطن ضرور ہے اور ہر وجود کے اندر ایک روح موجود ہے۔ یہاں تک کہ ہر ذرہ باطنی جوہری توانائی کا حامل ہے اور اس توانائی پر اس کے وجود و عدم، زندگی و موت ہستی اور نیستی کا انحصار ہے۔ تصوف اور فقر کائنات کی ان نادیدہ اشیاء، غیر مرئی مخلوقات اور غیر محسوس دنیاؤں سے ہمیں روشناس کراتا ہے اور عالمِ غیب اور عالمِ روحانیت سے ہمارا رشتہ استوار کرتا ہے۔ مادی حواس اور عقل کی حدود جہاں ختم ہوتی ہیں، وہیں سے رہنمائی کا فرض تصوف ادا کرتا ہے اور جہاں ظاہری شرعی علوم کے حاملین کی عقل دینی مسائل حل کرنے سے عاجز آ جاتی ہے وہیں سے علمِ فقر اور تصوف کے حاملین قیادت اور پیشوائی کی ذمہ داری سنبھالتے ہیں۔ آئمہ تصوف نے شرعی نصوص ہی سے تصوف کے مسائل اور اصول کا استنباط اور استخراج بالکل اسی طرح کیا ہے جس طرح آئمہ مجتہدین اور فقہاء نے شرعی مسائل کا قرآن وسنت اور اجماع وقیاس کی روشنی میں استنباط اور استخراج کیا ہے تصوف کا ماخذ معلوم کرنے کے لئے ہمیں قرآن وحدیث، حضرت محمد ﷺ کی حیات طیبہ اور صحابہ کرامؓ کی زندگی کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔اس بات میں اب ذرا بھی اشتباہ نہیں رہا کہ تصوف کا حقیقی ماخذ قرآن وسنت ہیں اور فقہ اور تصوف باہم مترادف ہیں اور اسی کو شارع اسلام ﷺ نے ''اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ'' کہہ کر اپنے لیے باعث فخر قرار دیا۔ لفظِ تصوف چاہے عربی ہو یا عجمی، س سے ہو یا ص سے، سوف سے ہو یا صوف سے اور اس کے لغوی معنی چاہے اصحابِ صُفہ کے تاریخی پس منظر میں نظر آئیں یا صفائے قلب اور جامہ ہائے صوف سے متعین ہوتے ہوں، مگر صدیوں سے اس کے اصطلاحی معنی یہی متعین ہو کر رہ گئے ہیں کہ تصوف قرآن وسنت کی روشنی میں ایسی زندگی بسر کرنا ہے، ایسے مشاغل اختیار کرنا اور تصورات، تفکرات، ذکر وفکر، مجاہدات، اور عبادات کا ایک ایسا متوازن لائحہ عمل اپنانا جس کے ذریعے تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب اور تجلیۂ روح حاصل ہو۔ یاد رہے کہ نفس کے تزکیئے اور قلب کے تصفیے کے لئے صرف مبہم اشارات ہی سے نہیں بلکہ واضح احکام سے قرآن مجید بھرا پڑا ہے۔ لہٰذا تصوف عین اسلام اور عین شریعت ہے، بلکہ اصلِ اسلام اور اصلِ شریعت ہے۔

مسائل تصوف نا اہل نہیں سمجھ سکتے

سائنسی علوم کی چکا چوند نے اگرچہ آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے، لیکن یہ کربناک حقیقت اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ اس چکا چوند نے روح میں تاریکیاں انڈیل دی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خلا کو مسخر کرنے، گہرائیوں کو کھنگالنے اور

مظاہر فطرت کو اپنے تابع کرنے کے باوجود انسان قلبی اور روحانی طور پر کرب واضطراب کے دوزخ میں جل رہا ہے۔ اس آگ کو گلزار بنانے کا واحد راستہ تصوف کا مطالعہ ہے تصوف آپ کی مضطرب روح کو ایسے قرار اور سکون سے آشنا کرے گا جس کی آپ تمنا کرتے ہیں۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے اپنے ہم عصر اور دوست شیخ ابو بکر کتانی کو ایک ہزار مسائل تصوف لکھوائے تھے۔ جب ابوبکر کتانیؒ نے وفات پائی تو آپ کو بہت تشویش ہوئی کہ کہیں وہ مسائل کسی نااہل کے ہاتھ نہ لگ جائیں مگر جب معلوم ہوا کہ ابوبکر کتانی نے خود انہیں وفات سے قبل دھلوا دیا تھا تو بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ مسائل تصوف کو سمجھنے کے لیے استعداد کی ضرورت ہے، ہر کس وناکس ان کو نہیں سمجھ سکتا۔

تصوف اخلاصِ عمل کا نام ہے

حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا کہ اخلاص میں نے ایک حجام سے سیکھا، وہ یوں کہ ایک مرتبہ مکہ معظمہ گیا ہوا تھا میرے بال بہت بڑھ گئے تھے، لیکن حجامت کے لیے پیسے نہیں تھے۔ ایک دن میں نے ایک حجام کو دیکھا جو ایک شخص کے بال درست کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ بھائی اس وقت میں بالکل تہی دست ہوں، تم خدا کے نام پر میرے بال درست کر دو۔ حجام نے اس آدمی سے جس کی وہ حجامت بنا رہا تھا، کہا کہ تم ذرا علیحدہ ہو جاؤ۔ جب خدا کا نام آ گیا تو پھر سب سے پہلے خدا کا کام کرنا چاہیے۔ پھر مجھے بٹھا کر پہلے میرے سر کو بوسہ دیا اور اس کے بعد نہایت محبت اور توجہ سے میرے بال درست کر دیئے۔ حجامت سے فارغ ہونے کے بعد اس نے مجھے کاغذ کی ایک پڑیا دی جس میں چاندی کے کچھ سکے تھے اور کہا کہ ان کو اپنی ضروریات پر صرف کرو۔ میں اس کے حسن اخلاص سے بڑا متاثر ہوا اور عہد کیا کہ جو پہلی فتح ہوگی وہ اسی حجام کو دوں گا۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد بصرہ سے اشرفیوں کی ایک تھیلی میرے لئے آئی۔ وہ تھیلی لے کر میں حجام کے پاس گیا۔ اُس نے پوچھا یہ کیا ہے؟ میں نے اپنی نیت اور عہد کا ذکر کیا۔ یہ سن کر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے کہا: مرد خدا شرم نہیں آتی خدا کے نام پر کام کرنے کے عوض مجھ کو معاوضہ دیتے ہو۔

تصوف سرچشمہ ادب ہے

تصوف سب کا سب ادب ہی تو ہے ہر وقت، ہر مقام اور ہر حال کے لئے ادب ہے جو مرید آداب بجا لانے کو اپنے اوپر لازم کر لے وہ مردانِ حق کے درجہ کو پہنچ جاتا ہے اور جو آداب کو ضائع کر دے وہ اس لحاظ سے کہ اپنے آپ کو قریب سمجھتا ہے، بعید ہو جاتا ہے اور اس حیثیت سے مردود ہوتا ہے اور خود کو قبول خیال کرتا ہے۔ تصوف کی تعریف ایک جملہ میں یوں ہے کہ خود کسی کا ہو جائے اور اپنے مطلوب کو روح اور قلب دونوں میں جگہ دے تو عین تصوف ہے۔

تصوف کی حقیقی روح

خانوادۂ چشت کے عارف کامل حضرت خواجہ شاہ محمد سلیمان تونسوی (متوفی ۱۲۶۷ھ) فرماتے ہیں:

"متابعت عبارت از دو چیز است، آں چہ خدا و رسول خدا اورا امر کردہ اند بباید کرد و آں چہ منع فرمودہ اند بکاید کرد۔" ہر کہ خواہد مقبول و محبوب حق سبحانہ تعالیٰ گردد باید کہ متابعتِ شریعت ظاہرا و باطنا کوشش نماید ایں حقیقی روحِ تصوف است۔ "یعنی اتباع دو باتوں سے عبارت ہے جس بات کا اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا ہے اُس کی بجا آوری کی جائے اور جن باتوں سے منع فرمایا ہے، اُنہیں نہ کیا جائے۔" جو شخص یہ چاہتا ہو کہ وہ حق سبحانہ وتعالیٰ کا مقبول اور محبوب بندہ بن جائے تو، اُسے چاہیے کہ وہ ظاہراً اور باطناً شریعت کی پیروی میں لگا رہے یہی تصوف کی حقیقی روح ہے۔ (نافع السالکین ص ۱۹۷، ملفوظات خواجہ محمد سلیمان تونسوی)

حضرت شاہ کلیم اللہ رحمۃ اللہ علیہ جہاں آبادی (متوفی ۱۱۴۲ھ) نے اپنے مکتوبات میں واضح طور پر اتباع شریعت کی تلقین کی ہے اور اتباع شریعت ہی کو صوفیاء کا معیار قرار دیا ہے۔ "اے برادر! در تفاوت فقراء اگر امروز خواہی کہ دریابی بجانب شریعت او نگاہ کن کہ شریعت معیار است، مینار فقر بر شریعت روشن می گردد۔" مینارِ حقیقت طریقت است و مینار طریقت شریعت آں کہ در چشمِ اُو جمال شریعت بیش بود، طریقت وحقیقت اتم واکمل بود علامت وصول بدرجہ حقیقت ایں است کہ روز بروز آناً فاناً سالک در شریعت قدم راسخ بود۔ (مرقع کلیمی ص ۱۹۹)

یعنی اے برادر! اگر آج کے دور میں تم یہ جاننا چاہو کہ فقراء کے درجات میں کیا فرق ہے تو یہ دیکھو کہ شریعت پر کس قدر عمل پیرا ہے، کیونکہ اصل معیار شریعت ہے جس شخص کی نظر میں شریعت کا جمال زیادہ ہوگا، اس قدر وہ شخص طریقت وحقیقت میں کامل اور اتم ہوگا۔ درجہ حقیقت کے وصول کی علامت یہ ہے کہ لحہ بہ لحہ سالک کا قدم شریعت میں راسخ تر ہو جاتا ہے۔"

مختلف سلاسلِ تصوف کے بزرگوں کے اقوال و ملفوظات، جن کا عہد دوسری صدی ہجری سے تیرہویں صدی تک پھیلا ہوا ہے، اپنے مفہوم اور معنی میں قطعی طور پر واضح ہیں۔ یہ امر قابل غور ہے کہ تمام اکابر اس اصول پر متفق ہیں کہ تصوف تزکیۂ اخلاق کا دوسرا نام ہے اور یہ تزکیہ اخلاق رسول اکرم ﷺ کی سنت مبارکہ کی پیروی اور متابعت سے حاصل ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں طریقت، شریعت سے علیحدہ اور جدا نہیں دونوں کا اصل اصول اطاعت اور اتمام عبدیت ہے۔ ان اقوال و ملفوظات سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی اس تشریح کا مفہوم بھی واضح ہوتا ہے کہ "دینِ اسلام کی دو حیثیتیں ہیں، ایک ظاہری اور دوسری باطنی یعنی ظاہری اعمال کی ادائیگی سے دل پر جو اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں، اُن کا حصول اور اُن کی بقا صوفیہ کا نصب العین ہے۔"

اس سلسلے میں تاریخی شواہد و حقائق، آئندہ صفحات میں پیش کیے جائیں گے۔ یہاں یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ تصوف کی حقیقی روح اور اِس مسلک کی اساس وہ مفروضات نہیں ہیں جو اسلام کے بنیادی عقائد اور اس سے پیدا ہونے والے انفرادی اور اجتماعی طرز احساس کا مطالعہ کیے بغیر قائم کر لیے گئے ہیں، بلکہ اس مسلک کی بنیادیں ان اسلامی اصولوں اور عقائد پر مبنی ہیں جنہیں توحید، رسالت، کتاب، ملائکہ، اور آخرت پر ایمان لانا کہا گیا ہے۔ اس بحث کا ماحصل یہ ہے کہ اسلامی تصوف کی خصوصیات میں جو امور داخل ہیں وہ توحید، ایمان بالغیب، صفات باری تعالیٰ، خلوص عمل، اتباع سنت اور اطاعت رسول ﷺ ہیں۔ یہ خصوصیات اسلامی تصوف کو دیگر ادیان کی سیرت اور روحانی مسلک سے متفرق کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں صاحب کشف المحجوب حضرت داتا گنج بخشؒ کے یہ کلمات قولِ فیصل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ''یعنی آج تصوف ایک بے حقیقت نام ہے اس سے قبل نام نہ تھا، بلکہ اس کی حقیقت ہر ایک میں ضرور تھی۔ اب نام ہے، حقیقت نہیں ہے۔ یعنی معاملات معلوم تھے اور دعویٰ مجہول تھا۔ اب دعویٰ عام ہے لیکن معاملات مجہول ہیں۔''

ڈاکٹر خلیق احمد نظامی نے صوفیاء کے پہلے طبقے کے رجحان کو تاریخی اصول اور ماحول کے تقاضوں کی روشنی میں دیکھا ہے۔ ''تاریخ مشائخ چشت'' میں اُن کے تجزیے کا ماحصل یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد مسلمانوں کے مادی، اخلاقی اور روحانی رویے میں تبدیلی کے آثار رونما ہونے لگے۔ طلب دنیا اور جاہ و حشم کی خواہش نے مسلم معاشرے کی روح کو مجروح کرنا شروع کر دیا۔ صوفیہ نے معاشرے کی اس بے اعتدالی کے خلاف دین اور اخلاق کو اختیار کرنے کی ترغیب دی۔'' وہ کہتے ہیں۔

''بصرہ اور کوفہ جہاں اُموی گورنروں نے ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھائے تھے، تصوف کے سب سے پہلے مرکز بنے اور یہیں سے یہ تحریک اسلامی دُنیا کے اور حصوں میں پھیلی۔ اس دور کے صوفیہ کی خصوصیات یہ تھیں۔

(۱) ان بزرگوں پر خشیت الٰہی کا بڑا غلبہ تھا اور اس بنا پر وہ توبہ پر بہت زور دیتے تھے۔ ان کی پوری زندگی توبہ و استغفار کی کیفیت ظاہر کرتی تھی۔

(۲) ان بزرگوں نے اپنے طرز فکر کو اجتماعی شکل دینے کی کوشش نہیں کی۔ وہ انفرادی طور پر عبادت و ریاضت میں مصروف رہتے تھے۔ کوئی نئی اصطلاح یا کوئی نیا طریقہ کار ایجاد نہیں کیا۔ حُب جاہ و حشم کے وہ مناظر جو مسلمانوں کی سیاسی زندگی کا طرہ امتیاز ہو کر رہ گئے تھے، رسول عربی ﷺ کی تعلیم کے منافی تھے۔ اس دور کے صوفیہ کو ان سے ایک بنیادی اختلاف تھا۔

(۳) اس دور کے صوفیہ نے اپنے خیالات کا اظہار تصانیف میں بہت کم کیا ہے۔

تصوف وسلوک اول تا آخر ادب ہی ادب ہے

شیخ اور سالک کا تعلق بظاہر اُستاد اور شاگرد کا سا نظر آتا ہے لیکن کیفیت کے اعتبار سے ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ حصولِ تعلیم کے سلسلہ میں ایک شاگرد کے دل میں اگر استاد کا احترام موجود نہ ہو، جب بھی حصولِ علم میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی، مگر ایک سالک کو اپنے شیخ سے جس قسم کا قلبی تعلق ہوتا ہے، اس میں اگر معمولی سا فرق بھی آجائے تو حصولِ فیض میں بہت بڑی رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ شیخ جب سالک کو توجہ دینے لگتا ہے تو جہاں رحمت باری شیخ کی طرف متوجہ ہوتی ہے، وہاں رضائے باری تعالیٰ بھی شیخ سے وابستہ ہوتی ہے اور یہ دونوں چیزیں شیخ کے واسطہ سے سالک کی طرف متوجہ ہوتی ہیں۔ سالک خواہ کتنے بلند منازل طے کر جائے، اس کی باگ ڈور شیخ کے ہاتھ میں ہوتی ہے جیسے کاغذ کی پتنگ ہوا میں خواہ کتنی بلند ہو جائے اس کی ڈور اُڑانے والے کے ہاتھ میں ہوتی ہے جب چاہے اُسے اُتار لے۔ اس تعلق کو عوارف المعارف جلد دوم صفحہ ۱۶ پر اس طرح بیان کیا ہے۔

اَلتَّصَوُّفُ كُلُّهٗ اَدَبٌ لِكُلِّ وَقْتٍ اَدَبٌ وَّلِكُلِّ حَالٍ اَدَبٌ وَّلِكُلِّ مَقَامٍ اَدَبٌ مَّنْ يَّلْزَمُ الْاَدَبَ يَبْلُغُ الرِّجَالَ وَمَنْ حَرَمَ الْاَدَبَ فَهُوَ بَعِيْدٌ مِّنَ اللّٰهِ وَمَرْدُوْدٌ

"تصوف سارے کا سارا ادب ہے، ہر وقت کے لئے ادب ہے ہر حال اور ہر مقام کے لئے ادب ہے جس نے ادب کو لازم پکڑا، وہ مردانِ خدا کے درجے پر پہنچا اور جو ادب سے محروم ہوا، وہ خدا سے دور اور مردود ہوا"۔

ظاہری علوم اور تصوف میں ایک اور فرق بھی ہے کہ استاد کے بغیر بھی کسی نہ کسی درجے کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے مگر تصوف وسلوک کی راہ میں شیخ کامل کی رہبری کے بغیر چلنا محال اور قربِ الٰہی کی منزل تک پہنچنا ناممکن۔ امام رازیؒ نے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ۔ "اس بدل میں اشارہ ہے کہ انسان صراط مستقیم پر نہیں چل سکتا جب تک اس راہ پر چلنے والے اعلیٰ لوگوں کی اتباع نہ کرے، اس راہ پر چلنے کے لئے صرف کتابوں کی ورق گردانی کام نہیں دے سکتی۔" یہ اس امر کی دلیل ہے کہ مرید اور طالب کے لیے ہدایت کے مقامات اور مکاشفات تک پہنچنے کا اس کے بغیر کوئی ذریعہ نہیں کہ کسی شیخِ کامل کی اقتداء کرے جو اس کی رہنمائی کرے گا اور اُسے غلطیوں اور گمراہیوں سے بچائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نقص اکثر مخلوق پر غالب ہے اور صرف عقول انسانی ادراک حقیقت کے لئے کافی نہیں اور حق اور باطل میں کماحقہ تمیز کر لینا عقلِ انسانی کے بس کی بات نہیں لہٰذا یہ ضروری ٹھہرا کہ شیخ کامل کی تلاش کرے اور اس کی اقتداء کرے تاکہ اس ناقص کی عقل کامل کے نورِ عقل سے کامل بن جائے اور ناقص سعادت

کے مدارج اور کمال کے اوج تک پہنچ سکے۔ اس آیت کی تفسیر سے ظاہر ہے کہ شیخ کامل کی رہنمائی کے بغیر منازل سلوک طے نہیں ہوسکتیں اور سالک کا مقصد وصول الی المحبوب ہوتا ہے اور ارشاد ربانی ''وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ کے تحت رب العالمین ہی مومن کا محبوب ہے اور شیخ چونکہ محبوب تک پہنچانے والا ہے، اس لیے شیخ بھی محبوب ہے جس شیخ نے خدا کو سالک کا محبوب بنایا اور وہ خدا کا محبوب بنا جیسے فرمایا: يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ایسا شیخ کیوں نہ محبوب ٹھہرے، لیکن شیخ کی محبت اور اظہار محبت میں حدود شرعی کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ فرط محبت میں شیخ کو خدا سمجھنے لگے یا شیخ کو سجدہ کرنے لگے۔ اول شرک اور ثانی قطعی حرام۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ شیخ سے جو علوم حاصل کرلے، ان میں شیخ لازماً کامل، مکمل ہو، دیکھئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت خضر علیہ السلام کے مقابلے میں علم، ورع اور تقویٰ میں کہیں بڑھ کر تھے پھر بھی وہ خاص علم حاصل کرنے کی غرض سے حضرت خضرؑ کے پاس تشریف لے گئے۔ شیخ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ مرید سے ہر حال میں شریعت کی پوری پابندی کرائے، کیونکہ شریعت سے ہٹ کر طریقت کا تصور زندیقیت اور الحاد ہے۔ جامع کرامات اولیاء جلد اول ص ۵۱۱ پر ارشاد ہے کہ ''شیخ ابوالعباسؒ نے فرمایا کہ کوئی قطب، قطب نہیں ہوسکتا نہ اوتاد، اوتاد ہوسکتا ہے اور نہ کوئی ولی، ولی ہوسکتا ہے جب تک کہ اس کے دل میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم نہ ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے احکام بجا نہ لائے۔''

شیخ باپ کی طرح مشفق ہوتا ہے۔

کسی اسے شیخ سے تعلق رکھنے اور مدتیں گذر جانے کے باوجود اگر سالک کے دل میں نہ شریعت سے لگاؤ پیدا ہو، نہ اسلامی شعائر کی تعظیم کا اور نہ شریعت کے احکام کی پابندی کا شوق پیدا ہو تو نہ ایسا شخص شیخ کامل ہے، نہ ایسا مُرید سالک مخلص۔ سالک کو احکام شریعت کی پابندی کرنے اور فرائض و واجبات کی پابندی کا خوگر بنانے اور اتباع سنت کا شوق پیدا کرنے کے بنیادی کام کے ساتھ ساتھ شیخ کو اپنی بصیرت سے سالک کے قلب کی زمین کا جائزہ لینا چاہیے اس کی فطری صلاحیتوں کے مطابق اس کی تربیت کرنی چاہیے۔ ذکرِ الٰہی بالخصوص ذکر اسم ذات سے اس کی روحانی تربیت شروع کرے، جیسا کہ ایک زمیندار زمین کی نوعیت کے مطابق اس میں تخم ریزی کرتا ہے اور اُس بیج سے فصل اُگتی، نشو و نما پاتی اور پھل دیتی ہیں، اسی طرح جب سالک کے قلب میں ذکرِ اسمِ ذات راسخ ہو جائے گا تو اُسے اعلیٰ منازلِ سلوک کی طرف رہنمائی کرے گا، پھر شیخ سالک کی استعداد اور صلاحیت کے مطابق کسی کو ذکر لسانی کرائے، کسی کو لطائف، کسی کو فنا و بقا اور سلوک کی اعلیٰ منازل کی طرف لے جائے گا اگر شیخ کامل تمام سالکین کو شروع ہی سے لطائف کرانا شروع کردے تو یہ محض دعوت عام کے فرض کی ادائیگی کی ایک صورت ہے، جس میں کسی کی تخصیص نہیں۔ ہاں! لطائف کے بعد سلوک کی اونچی منازل

سالک کی استعداد کے مطابق ہی طے کرائی جاتی ہیں اور یہ صورت حضور اکرم ﷺ کی اس سنت کے عین مطابق ہے کہ "كَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ" (لوگوں سے کلام کرو اُن کی عقلوں کی حیثیت سے) شیخ شہاب الدین سہروردیؒ عوارف المعارف جلد اول ص ۴۴ پر فرماتے ہیں کہ "شیخیت کا مرتبہ تصوف کے اعلیٰ مراتب سے ہے اور دعوت الی اللہ کے سلسلے میں نیابت نبوت کی حیثیت ہے اس لیے شیخ کا فرض ہے کہ ہر ایک کو دعوت عام دے۔"

روحانی تربیت کا عمل اس طرح کیا جائے جس طرح ایک شفیق باپ اپنی اولاد کی تربیت کرتا ہے، بلکہ شیخ کی شفقت ماں باپ کی شفقت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے جیسا کہ امام رازیؒ نے تفسیر کبیر جلد اول ص ۲۶۱ پر فرمایا ہے۔

شیخ کا مرتبہ ماں باپ سے اونچا ہے، کیونکہ ماں باپ دنیا کی آگ اور اُس کی آفتوں سے بچاتے ہیں اور شیخ اُسے دوزخ کی آگ اور اُس کی سختی سے بچاتا ہے۔"

علامہ ابراہیم عبیدی مالکیؒ نے اپنی کتاب "عمدۃ التحقیق فی بشائر آل الصدیق" کے صفحہ ۳۳۰ پر فرمایا کہ "اولاد دو قسم کی ہوتی ہے، نسبی اور قلبی۔ صوفیاء عارفین کے نزدیک قلبی اولاد نسبی سے مقدم ہے۔" قلبی اولاد کی اس برتری کی وجہ یہ ہے کہ والد اپنی نسبی اولاد کے بدن کی پرورش مادی غذا سے کرتا ہے اور یہ دونوں فانی ہیں اور شیخ سالک کی روحانی تربیت ذکرِ الٰہی کی غذا سے کرتا ہے اور یہ دونوں غیر فانی ہیں اور ہمیشہ رہنے والی ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ باقی رہنے والی چیز فنا ہونے والی چیز سے مقدم ہے۔ مولانا جامیؒ نے شیخ کامل کے اسی پہلو کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے بیٹے کو وصیت فرمائی۔

بکارِ نیک گردد یاورِ تو بکوئے نیک نامی رہبرِ تو

(شیخ نیک مقصد میں تیرا مددگار صراط مستقیم میں تیرا راہنما ہوگا۔)

چنیں بارے کہ یابی خاکِ اُو شو اسیرِ حلقۂ فتراکِ اُو شو

(جب تو ان کا قرب پالے تو اس کے قدموں کی خاک ہو جا اس کے تھیلے کی زنجیری کا قیدی ہو جا۔)

مکن باصوفیانِ خام یاری کہ باشد کارِ خاماں خام کاری

(خالی صوفیوں کے ساتھ دوستی نہ کر کیونکہ خام لوگوں کا کام بھی خام ہوتا ہے۔)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ شیخ ایک تو روحانی باپ ہے، دوسرا استاد اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شیخ سے سالک کو وہ چیز حاصل ہوتی ہے جو انبیاء علیہم السلام کی میراث ہے۔

نام نہاد صوفیوں اور مُلاؤں کے متعلق علامہؒ کا اظہار خیال

علامہ اقبالؒ علماء اور صوفیائے کرام کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ ان کی شان میں آپؒ نے اپنے کلام میں نہایت عزت افزاء گفتگو تحریر کی ہے۔ "سفر نامہ" میں اور اپنی دیگر کتب میں جید علماء اور اصحابِ تصرف اولیاء کی بلندیوں کو ظاہر کرتے ہوئے آپ نے منقبت میں بڑی بڑی تحریریں پیش کی ہیں، مگر اُن کے زمانے میں (اور آج بھی) کچھ ایسے علماء اور صوفیاء ملتے ہیں کہ جن کو دیکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ع "یہ وہ مسلمان ہیں جنہیں دیکھ کر شرمائیں یہود۔" ایسے علماء کے متعلق ساقی نامہ میں آپ لکھتے ہیں۔

حقیقت خرافات میں کھو گئی ۔۔۔ یہ اُمت روایات میں کھو گئی
لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب ۔۔۔ مگر لذتِ شوق سے بے نصیب
بیان اس کا منطق سے سلجھا ہوا ۔۔۔ لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا
وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد ۔۔۔ محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا ۔۔۔ یہ سالک مقامات میں کھو گیا
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے ۔۔۔ مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے (ب۔ج: ۴۱۶)
واعظِ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی ۔۔۔ برقِ طبعی نہ رہی شعلہ مقالی نہ رہی (ب۔د: ۲۰۲)
رہ گئی رسمِ اذاں، روحِ بلالی نہ رہی ۔۔۔ فلسفہ رہ گیا، تلقینِ غزالیؒ نہ رہی (ب۔د: ۲۰۳)

تصویر درد میں بھی علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ آج کا خطیب جب مسجد میں وعظ کے لیے جاتا ہے تو اس کا مطمحِ نظر صرف یہ ہوتا ہے کہ اس کے وعظ کو سننے والے اس کو داد دیں اور اس کا رتبہ صفِ اول کے مقررین میں شمار کیا جائے۔

ہوس بالائے منبر ہے تجھے رنگین بیانی کی ۔۔۔ نصیحت بھی تری صورت ہے اک افسانہ خوانی کی
(ب۔د: ۷۳)

راقم الحروف کو یہ نہایت افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ اسے جب دینی جلسوں میں بطور صدارت یا مہمان خصوصی بلایا جاتا ہے تو مقررین کی تقاریر کو سن کر دل کو رونے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا اور یہ خیال آتا ہے کہ ہمارے مقررین عوام کو کیا سبق دے رہے ہیں۔ لاہور میں ایک پروفیسر صاحب (نام لکھنا مناسب نہیں) کا وعظ سن کر سر پیٹنے کو دل چاہتا ہے۔ کبھی وہ اپنے وعظ میں عجیب و غریب آوازیں نکالتے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ بلیاں رو رہی ہیں اور کبھی فلمی گانوں کی دھن لگاتے ہیں۔ معراج کے واقعہ کو بیان کرتے ہوئے درج ذیل شعر کو فلمی طرز میں عوام کی تالیوں کے ساتھ گاتے ہوئے اکثر سنے گئے ہیں۔

''آجاوے سونیا اکھیاں اڈیکدیاں''

لوگوں کو خوش کرنے کے لئے کچھ لوگ تو معراج کے واقعہ میں یہ شعر پڑھنے سے بھی گریز نہیں کرتے ''چپ چپ کھڑے ہو، ضرور کوئی بات ہے''۔ اگر ہمارے خطیبوں میں چند ایک خطیب بھی ایسے ہوں تو وہ سب کی بدنامی کا باعث بنتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے جن خیالات کا اظہار درج ذیل اپنے کلام اور اشعار میں کیا ہے تو وہ بالکل حق بات کہتے ہیں اور اپنے چشم دید حقائق کو بیان کرنے میں قطعاً حق بجانب ہیں۔ نیچے آپ کے چند اشعار پیش کرنے پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں اس سے زیادہ لکھنا چنداں ضروری نہیں۔

علامہ اقبالؒ نے کچھ ایسے صوفیوں کو بھی دیکھا ہے جو خود کو ہمیشہ شراب الست میں سرمست ظاہر کرتے تھے اور شریعت پر عملداری کو غیر ضروری خیال کرتے تھے۔ علامہ اقبالؒ نے ارمغانِ حجاز میں ابلیس کی مجلس شوریٰ کے نام سے جو کلام لکھا ہے اس میں آپ نے ابلیس کی ان تمام کوششوں کا ذکر کیا ہے جس سے مسلمانوں کے دین میں فتور پیدا ہوا۔ تفصیل کے لئے ارمغان حجاز کے مذکورہ کلام کا مطالعہ فرمائیں۔

اسلام کے احکام کی محبت اور عشقِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ اتباع کرنے والے کو صوفی کا نام دیا ہے۔ آج کے نام نہاد صوفی اپنے آپ کو صوفی تو کہہ دیتے ہیں مگر صوفیوں کے جو اوصاف ان میں ہونا ضروری ہیں، شاید ہی کوئی وصف ان میں ہو، لہٰذا ان کو صوفی کہنا حق تصوف پر ظلم کرنے والی بات ہے۔ ایسے صوفیوں کی اللہ کے ہاں کوئی قدر و منزلت نہیں اور نہ ہی ان میں کسی قسم کے تصرفات اور کمالات والی بات نظر آتی ہے کچھ صوفیوں کی خوش شکل اور خوش کلام ہونے اور آبائی گدی کے زور پر لوگوں پر ڈاکے ڈالتے اور رقوم بٹورتے ہیں۔ ان وجوہات کی بنا پر علامہؒ نے ایسے صوفیوں کی مخالفت میں بہت کلام لکھا ہے جس میں سے کچھ اشعار نیچے دیئے جاتے ہیں۔

یہ ہماری سعیٔ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و مُلا ملوکیت کے بندے ہیں تمام!
(ا۔ح:۶۴۸)

ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
(ا۔ح:۶۵۶)

مُلا کی نظر نورِ فراست سے ہے خالی
بے سوز ہے میخانۂ صوفی کی مئے ناب
(ا۔ح:۶۷۶)

رندوں کو بھی معلوم ہیں صوفی کے کمالات
ہر چند کہ مشہور نہیں ان کے کرامات
(ا۔ح:۶۷۹)

کہتے تھے کہ پنہاں ہے تصوف میں شریعت
جس طرح کہ الفاظ میں مضمر ہوں معانی
(ب۔و:۵۹)

رندی سے بھی آگاہ، شریعت سے بھی واقف پوچھو جو تصوف کی، تو منصور کا ثانی
(ب۔د:۶۰)

صوفی نے جس کو دل کے ظلمت کدہ میں پایا شاعر نے جس کو دیکھا قدرت کے بانکپن میں
(ب۔د:۱۲۱)

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی رہ گئے صوفی و مُلا کے غلام اے ساقی!
(ب۔ج:۳۰۴)

مرا سبوچہ غنیمت ہے اس زمانے میں کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو!
(ب۔ج:۳۰۵)

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے؟ فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی!
(ب۔ج:۳۲۲)

کیا صوفی و مُلا کو خبر میرے جنوں کی اُن کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے
(ب۔ج:۳۲۵)

سکھا دیئے ہیں اسے شیوہ ہائے خانقہی فقیہہ شہر کو صوفی نے کر دیا ہے خراب!
(ب۔ج:۳۲۸)

حکیم و عارف و صوفی تمام مستِ ظہور کسے خبر کہ تجلی ہے عین مستوری!
(ب۔ج:۳۳۴)

رہا نہ حلقۂ صوفی میں سوزِ مشتاقی فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی!
کرے گی داورِ محشر کو شرمسار اِک روز کتابِ صوفی و مُلا کی سادہ اوراقی!
(ب۔ج:۳۵۷)

نہ مومن ہے نہ مومن کی امیری رہا صوفی گئی روشن ضمیری
(ب۔ج:۳۷۵)

تمدن، تصوف، شریعت، کلام بتانِ عجم کے پجاری تمام!
(ب۔ج:۴۱۶)

تری نگاہ میں ہے معجزات کی دُنیا مری نگاہ میں ہے حادثات کی دُنیا
(ض۔ک:۴۹۴)

درج ذیل کلام میں علامہ اقبالؒ نے فلسفیانہ انداز میں اسلامی تصوف کی ضروریات کو ظاہر فرمایا ہے اور

اس بات کو واضح طور پر روشن کیا ہے کہ حقیقی مسلمان وہی ہے جو اسلام کی روح کو سمجھتے ہوئے اپنے اعمال کو درست کرے۔

تخیلات کی دُنیا غریب ہے لیکن غریب تر ہے حیات و ممات کی دُنیا!
عجب نہیں کہ بدل دے اسے نگاہ تیری بُلا رہی ہے تجھے ممکنات کی دُنیا! (ض۔ک:۴۹۵)

یہ حکمتِ ملکوتی، یہ علم لاہوتی حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکر نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سرور تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ عقل، جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار شریکِ شورش پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں (ض۔ک:۴۹۶)

خرد نے کہہ بھی دیا لاالٰہ تو کیا حاصل دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں (ض۔ک:۴۹۷)

عجب نہیں کہ پریشاں ہے گفتگو میری فروغ صبح پریشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں! (ض۔ک:۴۹۷)

مسکینی و محکومی و نومیدی جاوید جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد (ض۔ک:۴۹۷)

بہ بندِ صوفی و مُلا اسیری حیات از حکمتِ قرآں نگیری (ا۔ح:۹۵۵)

(تو صوفی اور مُلا کی قید میں اسیر ہے۔قرآن پاک سے زندگی حاصل نہیں کرتا۔)

زمن بر صوفی و مُلا سلامے کہ پیغامِ خدا گفتند مارا (ا۔ح:۹۵۶)

(میری طرف سے صوفی اور ملا کو سلام کہہ دو کیونکہ وہ ہمیں خدا کا پیغام سناتے ہیں۔)

فارسی میں بھی علامہ اقبالؒ کا بہت کلام ملتا ہے۔آپ کے ایسے تمام کلام کو پیش کرنا تو ممکن نہیں، البتہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔آپ کا بہت کلام اس کتاب کے دوسرے اوراق میں پیش کیا جاچکا ہے۔

واعظاں ہم صوفیاں منصب پرست اعتبارِ ملت بیضا شکست (ا۔خ:۷۰)

(کیا واعظ اور کیا صوفی سب جاہ پرست ہیں، ملتِ بیضا کا وقار ختم ہو چکا ہے۔)

واعظِ ما چشم بر بُتخانہ دوخت مفتیِ دینِ مبیں فتویٰ فروخت (ا۔خ:۷۰)

(ہمارے واعظ کی آنکھ بت خانہ پر لگی ہوئی ہے اور ہمارے دین جس کے مفتی فتوے فروخت کرتے ہیں۔)

لاہوتیاں اسیرِ کمندِ نگاہِ او صوفی ہلاکِ شیوۂ ترکانۂ دل است (پ۔م:۳۴۲)

(فرشتے اس (دل) کی کمند نگاہ کے اسیر ہیں، صوفی بھی دل کے دلیرانہ انداز کے مارے ہوئے ہیں۔)

در دیرِ مغاں آئی مضمونِ بلند آور در خانقاہ صوفی افسانہ وافسوں بہ (ز۔ع:۴۱۵)

(پیر مغاں کے دیر میں آئے تو بلند مضمون والی بات کہہ، قصے کہانیوں کی باتیں تو صوفی کی خانقاہ میں اچھی لگتی ہیں۔)

نہ ایں جا چشمکِ ساقی، نہ آنجا حرفِ مشتاقی ز بزمِ صوفی و مُلا بسے غمناک می آیم
(ز۔ع:۴۲۳)

نہ یہاں کوئی رمز محبت کی بات ہے اور نہ وہاں کوئی شوق کی بات ہے۔ میں صوفی و مُلا دونوں کی بزم سے غمناک نکلا۔)

تو آں نہٖ کہ مصلیٰ ز کہکشاں میکرد شرابِ صوفی و شاعر ترا زخویش ربود (ز۔ع:۵۱۰)

(اے مسلمان) کیا تو وہ نہیں کہ جس نے کہکشاں کو مصلیٰ بنایا تھا، صوفی و شاعر کی شراب نے تجھے اپنا آپ بھلا دیا ہے۔)

صوفی! بروں زنگہٖ تاریک پا بنہ فطرت متاعِ خویش بسوداگری کشید! (ز۔ع:۵۲۶)

(اے صوفی! تاریک خانقاہ سے باہر نکل دیکھ فطرت نے اپنا سارا سامان بازار میں لا کر سجایا ہے۔)

نہ با مُلاّ نہ با صوفی نشینم تو میدانی کہ من آنمٗ نہ اینم (ا۔ح:۹۳۰)

(نہ میں مُلا کے پاس بیٹھا نہ صوفی کے پاس۔ آپ جانتے ہیں کہ نہ میں ان سے ہوں اور نہ ان میں سے)

شیخ سے فیض حاصل کرنے کے آداب

(۱) شیخ کامل سے اخذِ فیض اور کامل تربیت حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ طالب کے دل میں شیخ سے پوری عقیدت ہو اور وہ پوری استقامت سے اس پر جما رہے۔ تصوف کی اصطلاح میں اسے توحید مطلب کہتے ہیں۔ جامع کرامات اولیاء جلد اول ص ۲۴۸ پر ارشاد ہے کہ "مرید کے لیے ضروری ہے کہ راسخ القدم ہو، اُسے کوئی چیز اس راہ سے ہٹا نہ سکے اور اپنے شیخ کے متعلق اس کی عقیدت میں تبدیلی نہ آئے۔ حتیٰ کہ اگر حضرت خضرؑ بھی سامنے آجائیں تو اُن کی طرف بھی توجہ نہ کرے۔"

یہ صورت اس وقت ضروری ہے، جب ایک طرف شیخ کامل ہو اور دوسری طرف طالب صادق ہو اور اگر کسی وجہ سے ناقص آدمی سے کوئی طالب صادق تعلق قائم کرلے اور اُسے کوئی روحانی فائدہ نہ پہنچے اور ظاہر ہے کہ جو خود ناقص ہے، وہ دوسرے کو کیا سلوک سکھائے گا تو ایسی صورت میں طالب صادق کو کسی شیخ کامل کی تلاش کر لینی چاہیے ورنہ یہ ثابت ہوگا کہ وہ طالب مولیٰ نہیں، شخصیت پرستی کے مرض میں مبتلا ہے اور اگر یہ صورت ہو کہ نہ شیخ کامل اور نہ طلب صادق ہو تو یہ تعلق محض ایک "سیپ" ہوگی، جس کا تصوف وسلوک سے کوئی تعلق نہیں۔

پہلی صورت میں طالبِ صادق کو یہ دیکھ لینا چاہیے کہ جس شیخ سے اس کا تعلق ہے، اس کے ہزاروں مریدوں میں سے اگر چند ایک بھی ایسے نہیں ملتے جن کو سلوک کی راہ میں ترقی حاصل ہوئی تو بس سمجھ لیجئے کہ شیخ کے ناقص ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اس لیے ایسے شیخ کو ترک کرنا فرض ہے۔ شیخ کامل تو ان لوگوں کو اللہ کے

فضل سے عارف باللہ بنا دیتا ہے، جن کی زندگیاں فسق و فجور میں گذری ہوں۔ اس زمانے میں زیادہ مرید ایسے ہیں کہ جو کچھ حاصل کرنا نہیں چاہتے۔

(۲) شیخ سے غلط بیانی نہ کرے، بات صاف صاف کرے۔

جامع کرامات الاولیاء جلد اول صفحہ ۳۴۸ پر ارشاد ہے کہ "سچ بات بہت اچھی اور عمدہ چیز ہے اور طالب کو چاہیئے کہ جھوٹ نہ بولے۔ شیخ کے سامنے اور شیخ کے متعلق جھوٹ بولنے سے بچتے رہو۔"

(۳) پہلے دور کے صوفیہ نے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، حکومت سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ وہ سرکاری ملازمت اور خلفاء کی صحبت کو بُری نظر سے دیکھتے اور ہمت واستقامت کے ساتھ اُن پر تنقید کرتے تھے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ حلمی نے "الحیاۃ الروحیۃ فی الاسلام" میں تقریباً وہی نقطہ نظر پیش کیا ہے جو ڈاکٹر نظامی نے تاریخی تجزیئے کی بنیاد پر قائم کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں "غیر اقوام کی تہذیب اور ثقافت سے مقابلہ آراء ہونے کے بعد جب عام طور پر مسلمان دنیا کی طرف لپکے تو ایک موثر جماعت ایسی وجود میں آئی جس نے غنا پر فقر کو ترجیح دے کر ایک نیا معیار زندگی پیش کیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو بہت کم کھاتے تھے، بہت سادہ لباس پہنتے تھے اور جو دنیا کی طرف بہت زیادہ راغب نہیں تھے، جو دنیا کے پیدا کرنے والے کی یاد میں مستغرق اور منہمک رہتے تھے، چنانچہ ان لوگوں کا مستقل نام زہاد، عباد اور، فقراء یہیں سے پڑا اور فقراء کی مستقل اصطلاح کا زور بھی یہیں سے شروع ہوا۔ کچھ عرصہ بعد یہ سارے نام ہلکے اور ماند پڑ گئے اور صوفی کا ایک جامع و مانع نام رکھ لیا گیا۔

صوفیہ

ادبِ صوفیہ کے مطالعہ سے مستنبط ہوتا ہے کہ کبارِ صوفیہ میں کثرت ان بزرگوں کی ہے جنہوں نے اتباع سنت میں متاہل زندگی اختیار کی اور اس باب میں وہ تمام حقوق ادا کئے جو قرآن وسنت سے ہر مسلمان پر واجب ہوتے ہیں۔ خواجہ حسن بصریؒ (متوفی ۱۱۰ھ) جو تصوف کے سب سلاسل کے سرخیل ہیں، باوجود اپنے زہد و اتقاء کے متاہل زندگی بسر کرتے تھے۔ جن دنوں حجاج بن یوسف کے ظلم وتشدد سے تنگ آ کر روپوش تھے تو اُن کی صاحبزادی کا انتقال ہو گیا۔ خواجہ حسن بصریؒ کے ایماء کے مطابق محمد بن سیرینؒ کو کہا گیا کہ مرحومہ کی نماز جنازہ وہی پڑھائیں۔

تذکرۃ الاولیاء کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مالک بن دینارؒ (متوفی ۱۳۴ھ) حبیب عجمیؒ جو حسن بصریؒ کے معاصر تھے، فضیل بن عیاضؒ (متوفی ۱۸۷ھ)، عبداللہ بن مبارکؒ (متوفی ۱۸۱ھ)، سفیان ثوریؒ (متوفی ۱۶۱ھ) صاحب اہل وعیال صوفیہ تھے۔ عزیز عرفی کی تحقیق کے مطابق سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے انچاس (۴۹) صاحبزادے اور صاحبزادیاں تھیں۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ جو برصغیر میں چشتیہ سلسلے کے بانی

ہیں، متاہل زندگی گزارتے تھے۔ حضرت خواجہ کے خلیفہ اول شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ بھی صاحب اہل و عیال تھے۔ خواجہ اجمیر کے ایک اور خلیفہ خواجہ حمید الدین ناگوریؒ (متوفی ۶۷۳ھ) جو سلطان العارفین کے لقب سے مشہور ہیں، زن و فرزند رکھتے تھے۔ اُن کے ترکِ دنیا کا یہ حال تھا کہ ایک بیگھہ زمین ان کے پاس تھی۔ آدھا بیگھہ زمین خود کدال سے درست کرتے اور کوئی چیز اُس میں بوتے۔ انہیں سلطان العارفین سے متعلق ایک واقعہ تاریخ کی کتابوں میں بیان کیا گیا ہے، جسے مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے نقل کیا ہے۔ ناگور کے مقطع (صُوبے دار) نے شیخ حمید الدینؒ سے چاہا کہ کچھ امداد قبول کریں لیکن پذیرائی نہ ہوئی۔ اس نے بادشاہ غالباً ناصر محمود التمش کو اُن کے حالات لکھ بھیجے۔ دلی سے "پانچ صد تنکہ نقرہ و خرمان ایک دیہہ" صوبے دار کے پاس آیا کہ فوراً شیخ کی خدمت میں حاضر کرو۔ صوبے دار لے کر حاضر ہوا۔ آپ دیوان خانہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ صوبے دار نے حضرت کو حال سنایا اور کچھ نہ بولے اور زنان خانہ میں تشریف لے گئے بیوی سے جا کر واقعہ کا ذکر کیا۔ اُس وقت بیوی صاحبہ کی اوڑھنی پھٹی ہوئی تھی اور شیخ کی لنگی میں بھی پیوند تھے۔ مگر سنتے ہو، اس حال میں بھی اسلام کی خاتون کا حال سنتے ہو۔ شیخ سُن رہے تھے! اے خواجہ می خواہی کہ فقر چندیں سالہ خود را باطل کنی۔ تو خاطر جمع دار، من دو سیر سیماں بدست خود درشتہ ام۔ ازاں مقصد ترا جامہ خواہد شد کہ ترا غوطہ (لنگی) و مرا دامنے (اوڑھنی) خواہد شد۔) اے خواجہ! کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ بالکل مطمئن رہیں۔ میرے پاس دو سیر سوت موجود ہے جو میں نے اپنے ہاتھوں سے کاتا ہے، اُس سے کپڑے بن جائیں گے، آپ کے لئے لنگی اور میرے لئے اوڑھنی۔

"دائرۃ المعارف الاسلامیہ" کے مندرجات کے مطابق خود اصحابِ صُفہ رضوان اللہ علیہم کی جماعتی زندگی کا یہ حال تھا۔ "اصحاب صُفہؓ نے بھیک کبھی نہیں مانگی کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا، جو کچھ ملا کھا لیا۔ ایک ٹولی کبھی جنگل جاتی اور لکڑیاں چین کر لاتی اور بیچ کر اپنے بھائیوں کے لئے کھانا مہیا کرتی۔"

المختصر یہ کہ اپنے مخصوص مسلکی اور طرزِ احساس کے باوصف صوفیہ اس اصولِ صداقت سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ اُنہوں نے تمام عرصہ حیات جیسا کہ فرض کر لیا گیا ہے، زاویوں، خانقاہوں اور صحراؤں میں طے نہیں کیا ہے بلکہ عام انسانوں کی طرح اُنہوں نے بھی جبلی مشکلوں کے مطابق عملی زندگی بسر کی ہے۔ اُن میں وہ بزرگ بھی تھے جو ترک و تجرید پر عمل پیرا تھے، وہ بھی تھے جنہوں نے اہل و عیال کے ساتھ اپنے کام کو جاری رکھا۔ اُن میں متوکل بھی تھے، وہ بھی تھے جو ضرورمات زندگی کیلئے کسب کرتے تھے۔ محمد بن سیرینؒ (متوفی ۱۱۰ھ) کا پیشہ تجارت تھا۔ ابو عبیدہ محمد حسام البریؒ کی گزران کا ذریعہ کاشت کاری تھا۔ احمد نوریؒ (متوفی ۲۹۵ھ) اپنے معاش کے لیے دکان کرتے تھے۔ سری سقطیؒ (متوفی ۲۵۷ھ) جو جنید بغدادیؒ کے شیخ تھے، تجارت کے پیشے سے منسلک تھے۔ عہد غزالی کے ایک بزرگ خواجہ محمد منکدر بھی تجارت کے پیشے سے منسلک تھے۔ شیخ احمد

نیروائی کپڑا بنتے تھے۔ عثمان حرب آبادی روٹی سالن فروخت کرتے تھے، یہی نہیں بلکہ صوفیہ نے تقاضائے وقت کے مطابق جہاد بالسیف سے دریغ نہیں کیا۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ، حاتم اصمؒ اور شقیق بلخیؒ نے باقاعدہ جہاد میں حصہ لیا۔ انہوں نے زاویے اور خانقاہیں بھی قائم کیں جہاں غرباء و مساکین کو کھانے کھلائے جاتے تھے اور اُن کی دوسری ضرورتوں کو پورا کیا جاتا تھا۔ انہوں نے دینی تعلیم کے لئے مدارس و مکاتیب جاری کئے اور مسند علم پر بیٹھ کر تشنگان علم کو سیراب کیا۔

ڈاکٹر خلیق احمد نظامی نے ''اسلام کی حیات روحیہ'' میں صوفیہ کے کردار کی صحیح نشان دہی کی ہے، وہ لکھتے ہیں۔ ''جب تاریخ کا کوئی طالب علم اسلام کا بہ حیثیت ایک مذہبی تحریک کے مطالعہ کرنا چاہتا ہے تو اُس کو حضور اقدس سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ کے بعد انہی بزرگوں کی حیات طیبہ کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح یہ بزرگ اسلام کی دینی تاریخ کا جزو لاینفک بن گئے ہیں۔ اُن کی زندگیوں کو غیر اسلامی قرار دے کر اگر نظر انداز کیا جائے تو نہ صرف اسلام کی مذہبی تاریخ میں ایک خلا پیدا ہو جائے گا بلکہ اسلام کے دینی نشو ونما کا صحیح مطالعہ ہی ناممکن ہو جائے گا۔ ''تکمیل اخلاق'' جو بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اہم مقصد تھا۔ ہمیشہ ان بزرگوں کا مطمح نظر رہا۔'' اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ تصوف کی اصل جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کے عہد میں موجود تھی اور اسی اصل و اساس پر دور مابعد کے صوفیہ نے اس مسلک کو برقرار رکھا اور اس کی حفاظت کی۔

(۴) شیخ کے ساتھ خیانت کا برتاؤ نہ کرے حتیٰ کہ شیخ کے کلام، راز اور اسرار کے معاملے میں بھی امانت کا ثبوت دے۔ جو شخص معمولی چیزوں میں خیانت کا مرتکب ہو وہ اسرار الٰہی اور مناصب باطنی کے معاملے میں کب امین بنایا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں بے احتیاطی سے مناصب بھی سلب ہو جاتے ہیں۔

(۵) جو کچھ اپنی ذات کے لیے محبوب جانتا ہے شیخ کی ذات کے لئے بھی محبوب جانے۔

(۶) شیخ کی بات غور سے سنے اور اس پر دل سے کاربند ہو۔ شیخ کی مجلس میں شیخ کی بات سننے کی نیت سے جائے، اپنی بات سنانے کا شوق لے کر نہ جائے۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا کہ میں نے ایک آدمی کو ابو حفص نیشاپوریؒ کی خدمت میں دیکھا جو نہایت خاموشی سے شیخ اور رفقاء کی خدمت میں مصروف ہے، میں نے اس کے متعلق پوچھ گچھ کی۔ مجھے ایک فقیر نے بتایا، یہ آدمی ابو حفصؒ کی خدمت میں رہتا ہے اور ہم سب کی خدمت کرتا ہے۔ اس نے اپنے شیخ کے لئے دو لاکھ درہم خرچ کر دیئے ہیں مگر اب تک شیخ کے سامنے ایک کلمہ بھی زبان سے نہیں نکالا۔

(۷) شیخ سے اس بات کا مطالبہ یا تقاضا نہ کیا جائے کہ مجھے اگلی منازل سلوک میں ترقی دی جائے بلکہ جو کچھ شیخ از خود دیں اس پر شاکر رہے جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا۔

قَالَ يٰمُوْسٰۤى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَ بِكَلَامِىْ ۖؗ فَخُذْ مَاۤ اٰتَيْتُكَ وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ (الاعراف: ۱۴۴)

"اے موسیٰ علیہ السلام! میں نے سرفراز کیا ہے تجھے تمام لوگوں پر اپنی پیغامبری سے اور اپنے کلام سے اور لے لو جو میں نے دیا ہے تمہیں اور ہو جاؤ شکر گزار بندوں سے"۔

اس لئے طالبِ صادق کو چاہیئے کہ جو منازل سلوک طے ہوتے ہیں، ان کی حفاظت کرے اور اللہ کا شکر ادا کرے، اللہ اپنے وعدے کے مطابق اور عطا کرے گا۔

(۸) شیخ کی مجلس میں بیٹھا ہو تو شیخ کے چہرے کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نہ دیکھے، بلکہ اپنے قلب کی طرف متوجہ ہو کر ذکر قلبی میں مشغول رہے، یا اپنے منازل کی نگہداشت کرے۔

(۹) شیخ سے کوئی بات پوچھے تو سیکھنے کی غرض سے اور طالب علمانہ انداز میں پوچھے، اعتراض کے طور پر کوئی سوال نہ کر، کیونکہ شیخ پر اعتراض مانع فیض ہے، جیسا کہ شیخ شہاب الدین سہروردی نے عوارف المعارف میں فرمایا۔

"جس شخص نے شیخ کی بات کے جواب کا احترام ملحوظ نہ رکھا، وہ شیخ کے فیض سے محروم ہو گیا اور جس نے شیخ کی بات کے جواب میں "نہیں" کہہ دیا وہ بھی کامیاب نہیں ہوگا۔" اگر شیخ کی رائے سے بہتر کوئی صورت سالک کی معلومات میں موجود ہو تو یوں کہے کہ اس مسئلے کی ایک اور صورت بھی ہے ممکن ہے، وہ بہتر ہو۔

(۱۰) چلتے وقت شیخ کے آگے نہ چلے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (الحجرات: ۱)

"(آگے نہ بڑھا کرو اللہ اور اسکے رسول ﷺ سے) کیونکہ اپنے مربی کی عزت اور اس کا احترام کرنا اللہ اور رسول ﷺ کا احترام ہے۔)"

(۱۱) شیخ کی خدمت میں جب حاضر ہو، خالی ہاتھ نہ جائے جیسا کہ تَهَادُوْا تَحَابُّوْا۔ (حدیث) میں یہ ادب سکھایا گیا ہے۔ ہاں شیخ کے لیے ضروری ہے کہ وہ مرید کے مال پر نظر نہ رکھے، اس کو "اشراف نفس" یا اِشْرَافُ اِلٰى حَالِ الْمُرِيْدِ کہتے ہیں، یہ جائز نہیں۔

(۱۲) شیخ کی عدم موجودگی میں شیخ کے مقرر کردہ خلیفہ کا احترام اسی طرح کرے جس طرح شیخ کا احترام کرتا ہے، اس میں کوتاہی نہ کرے۔ بالخصوص اصحابِ مناصب کی عزت اور احترام نہایت ضروری اور یہ ادب اور احترام حدود شرعی کے اندر ہو۔

(۱۳) جس شیخ سے فیض لینا مقصود ہو، اس کے پاس مدعی بن کر نہ جائے اور اپنے کمالات کا اظہار نہ کرتا رہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ میں کیا عمدہ تعلیم دی گئی ہے۔ حضرت

موسیٰ علیہ السلام کے الفاظ قابل غور ہیں۔

هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰۤى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا (الکہف:٦٦) "کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں بشرطیکہ آپ سکھائیں مجھے وہ ہدایت کا خصوصی علم جو آپ کو سکھایا گیا ہے"

اتباع اور اطاعت نہ کرنے سے انسان مرتبہء انسانیت سے گر جاتا ہے۔ (فیض الباری جلد سوم ص ۲۷۷ پر ملاحظہ ہو) کتا اپنے مالک کی اطاعت کی وجہ سے انسان کے حکم میں آ گیا اور انسان اپنے رب کی نافرمانی کر کے کتے سے بھی بُرا بن گیا۔" دیکھئے شکاری کتا سدھانے سے مالک کا پوری طرح مطیع ہو جاتا ہے۔ اس لئے جب اُسے شکار پر چھوڑا جاتا ہے تو اُس کا مارا ہوا شکار حلال ہوتا ہے۔ گویا کتا ذابح انسان کے حکم میں آ گیا اور بلعم باعور جیسا انسان اپنے رب کی نافرمانی کر کے جانوروں سے بدتر ہو گیا۔

(۱۴) شیخ کی وفات کے بعد شیخ کا ادب اسی طرح کرنا چاہیئے جیسے شیخ کی زندگی میں کیا جاتا تھا اور شیخ کے رشتہ داروں کا بھی احترام کرنا چاہیئے۔

(۱۵) شیخ کے سامنے شیخ کے آنے پر کھڑا ہو جانا اظہارِ ادب کی ایک مروج صورت ہے لیکن اس میں اختلاف بھی ہے، اس سلسلے میں احتیاط کی ضرورت ہے جیسا کہ فیض الباری میں ذکر کیا گیا ہے۔

وَاعْلَمْ اَنَّ الْقِيَامَ لِلتَّوْ قِيرِ رُخْصَةٌ اَوْ مُسْتَحَبٌّ (فیض الباری جلد ۴ ص ۶۵) "یہ بات خوب اچھی طرح جان لو کہ بزرگ کے احترام و اکرام کے لئے کھڑا ہونا مستحسن ہے یا مستحب ہے"۔

"قیام تعظیمی کے بارے میں شریعت نے یہ ضابطہ مقرر کیا ہے کہ اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ آنے والا شخص یہ آرزو رکھتا ہے کہ اس کی تعظیم میں کھڑا ہو جائے تو کھڑا ہونا ممنوع ہے۔ ورنہ مباح یا مستحب ہے۔ قیام کی آرزو رکھنے والے شخص کے سامنے کھڑا ہونا اس لئے ممنوع ہے کہ اس سے اس کی انا اور نفسانیت میں ہوگا۔ اور یہ بات اس کے حق میں زہر قاتل ہے۔

معجزہ اور کرامت میں فرق

ولی کی کرامت دراصل اس نبی کا معجزہ ہوتا ہے، جس کا وہ متبع ہوتا ہے اور جب کرامت کے صدور کے لئے نبی کی کامل اتباع شرط ہے تو کرامتِ ولی، معجزۂ نبی کی فرع ٹھہری۔ اس لئے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ہر عجیب بات جو کسی سے ظاہر ہو، کرامت نہیں ہوا کرتی، بلکہ کرامت کا اطلاق صرف اس خرقِ عادت امر پر ہوتا ہے جو کسی کامل متبع شریعت سے ظاہر ہو۔ معجزہ کا اظہار نبی کے اختیار میں ہوتا ہے اور کرامت کا صادر ہونا ولی کے اختیار کی چیز نہیں، دونوں من جانب اللہ ہوتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے اظہار کے

لئے انبیاء علیہم السلام اور اولیاء عظام کی برگزیدہ ہستیوں کو منتخب کر لیتا ہے۔ کرامات کی دو قسمیں ہیں۔ اول معنوی، جسے اہل دانش و بینش سمجھتے اور اس سے متاثر ہوتے ہیں اور یہی حقیقی کرامت ہے۔

اِعْلَمْ اَنَّ اَعْظَمَ الْكَرَامَاتِ وَاَجَلَّهَا الَّتِيْ لِلْاَوْلِيَاءِ دَوَامُ التَّوْفِيْقِ لِلطَّاعَاتِ وَالْعِبَادَاتِ وَالْحِفْظُ مِنَ الْمَعَاصِيْ وَالْمُخَالَفَاتِ.

خوب سمجھ لو کہ اولیاء کی سب سے بڑی اور عظیم کرامت شریعت کی کامل اتباع اور اس پر استقامت اور خلاف شرع اُمور سے بچ کر رہنا ہے۔

ان کی یہ کرامت ماحول پر اثر انداز ہوتی ہے اللہ کی مخلوق جو خدا سے دور ہو چکی ہوتی ہے، اس کی کشش سے اللہ کی یاد اور اللہ کی عبادت کی طرف کھنچی چلی آتی ہے اور ان کے دل میں یقین اور ایمان کی شمعیں روشن ہونے لگتی ہیں اور انہیں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کا خیال آنے لگتا ہے۔ رزائل دور ہوتے ہیں اور فضائل کے حصول کا جذبہ اور شوق پیدا ہونے لگتا ہے۔ اولیاء اللہ کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک ہستی نے بالکل نامساعد اور ناگفتہ بہ حالات میں دعوت الی اللہ کے نام سے ہزاروں بلکہ لاکھوں بگڑے ہوئے لوگوں کو اللہ کا بندہ بنا دیا۔ عوام تک ہی محدود نہیں، ان بے نوا فقیروں نے بیسیوں شاہانِ وقت کو راہ ہدایت پر لگا دیا۔

دوسری قسم کرامت حسی ہے۔ یہ عوام کے ذہنوں کو متاثر کرتی ہے چونکہ ان کی ذہنی سطح پست ہوتی ہے، اس لئے معنوی کرامت کو وہ لوگ سمجھ ہی نہیں پاتے اور ان کی نگاہیں حسیات اور مادیات میں ہی اٹک کر رہ جاتی ہیں۔ چنانچہ حضرت جنید بغدادیؒ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک شخص ان کی خدمت میں دس برس حاضر رہا، آخر مایوسی کی کیفیت کے ساتھ واپس ہونے لگا۔ آپ نے وجہ پوچھی۔ کہنے لگا، بڑی شہرت سنی تھی کہ جنید بڑا ولی اللہ ہے، مگر دس برس میں، میں نے ایک بھی کرامت نہیں دیکھی۔ حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ اس عرصے میں جنید کا کوئی کام ایسا بھی دیکھا جو سنت کے خلاف ہو؟ کہنے لگا ایسا تو نہیں۔ فرمایا: یہی سب سے بڑی اور حقیقی کرامت ہے۔

باب ۱۸

سلوک اور ارادت

سلوک

سلوک خدا تک پہنچنے کا راستہ ہے جو کہ بطریق سیر کشفی عیانی نہ کہ بطور استدلال طے کیا جاتا ہے۔ اس راہ پر چلنے والے کو سالک کہتے ہیں۔ سلوک کو طے کرنے والے پر ایک ایسا وقت آتا ہے کہ جب اس پر یاد باری تعالیٰ کا غلبہ ہوتا ہے تو دوسرے خیالات بالکل محو ہو جاتے ہیں۔ یہ منجانب اللہ ایک کشش ہے جو باعث ترقی ہوئی ہے۔ سالک کی اس حالت کو صفائے مبتدی کہتے ہیں اور اس مرتبہ کے صوفی کو سالک مجذوب کا نام دیتے ہیں۔ (سرِ دلبراں)

سلوک سے کیا مراد ہے؟

سلوک سے مراد طریقت کی راہ پر چلنا ہے اور اپنے اخلاق کو تہذیب سے آراستہ کرنا اور تمام اخلاقِ ذمیمہ کو دور کر کے اخلاقِ محمودہ کو اختیار کرنا ہے۔ اس میں بخل، حسد، ریا، کبر، خودنمائی وغیرہ سے اخلاص اور سخاوت، تواضع، تذلل و عاجزی وغیرہ جیسے پسندیدہ اخلاق کا اختیار کرنا ہے تاکہ وصول الی اللہ کی استعداد حاصل ہو سکے۔ سلوک میں طریقت صوفیاء کی اصطلاح کے مطابق مقامات اور منازل الی اللہ طے کرنا اصل مدعا ہے۔ سلوک کا خلاصہ یہ ہے کہ سالک شرعی رخصت اور سہولتوں کو چھوڑ کر مستحب اور مستحسن افعال کو اپنے اوپر لازم کر لے۔ یہی ابتداء طریقت ہے۔ جب سالک بتمام اپنی بدایت یعنی حق سبحانہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے تو وہ نہایت کو پہنچ جاتا ہے۔ یعنی اس حالت میں خشوع و خضوع اور تذلل کے ساتھ متصف ہونا اور صفاتِ مذمومہ سے بالکل منزہ ہونا ہے۔ سلوک کا انجام کار یہ ہے کہ سالک ایسی حالت بنائے جیسی کہ شکمِ مادر میں تھی تو وہ نہایت کو پہنچ جائے گا، یہی ایک صوفی کا کمال ہے اور اس مرتبہ میں کمال آدمیت اور مصائب نفس سے آزادی حاصل ہوتی ہے۔

جب صوفی پر ایسے اوقات آتے ہیں کہ جس میں اس پر تجلیات وارد ہوتی ہیں تو اس حالت کو صفائے متوسط کہتے ہیں اور اس مرتبہ کے صوفی کو مجذوب کہتے ہیں اور جب ایسا صوفی واصل ذات ہو کر مقام تمکین (صاحبِ مقام سالک جب وہ مغلوب الحال نہیں ہوتا) پر پہنچتا ہے تو اس کو صفائے منتہی یا مجذوب سالک کہتے

ہیں۔ ایسے صوفیوں کی اقسام بے انتہا ہیں لیکن عام طور پر تین اقسام زیادہ مشہور ہیں۔

(۱) طریق اخیار

اس میں کثرتِ صوم وصلوٰۃ' تلاوت وحج وجہاد وغیرہ کے ذریعے منزل مقصود تک پہنچتے ہیں۔

(۲) طریقِ مجاہدات وریاضات

اس میں صوفی کے اخلاق ذمیمہ سخت ریاضتوں اور مجاہدوں سے دور کر کے اخلاقِ حمیدہ میں تبدیل کئے جاتے ہیں۔ اس میں سالک کی عالم علوی سے مناسبت پیدا کی جاتی ہے اور اسے راہ طے کرائی جاتی ہے۔

(۳) طریق اصحابِ شطاریہ

اس طریقے میں ریاضت سے گریز' صحبت سے پرہیز اور ماسویٰ اللہ سے بیزاری کا سبق دیا جاتا ہے۔ اس میں دردو اشتیاق' ذوق وشوق اور ذکر وفکر بتایا جاتا ہے اور ان کے علاوہ ہر چیز سے پرہیز کی جاتی ہے۔ پہلے دو راستوں سے یہ راستہ زیادہ اقرب اور قوی ہے۔ اس میں کامیابی کے لئے کششِ ربانی زیادہ ضروری ہے۔ اس راہ سے وہی نوازے جاتے ہیں جو اس میں زیادہ جدوجہد کرتے ہیں۔ جب بلا کشف وکرامت یہ سلوک طے ہوتا ہے تو اسے طیر کہتے ہیں۔ سیر اور طیر کی اصطلاحات سلوک کے ایک مقام سے دوسرے مقام یا ایک تجلی سے دوسری تجلی میں منتقل ہونے کو کہتے ہیں۔ جب کشف وکرامات سے یہ سلوک طے کیا جاتا ہے تو اسے سیر کہتے ہیں۔ اس طور پر راستہ دیر سے طے ہوتا ہے۔ جب بلا کشف وکرامات یہ سلوک طے ہوتا ہے تو اسے طیر کہتے ہیں۔ اس میں راستہ جلد طے ہوتا ہے اور اسی کو صوفیاء سلوکِ اتم کہتے ہیں۔ سلوک کی راہ میں عروج اور ھبوط (نزول) کے ذریعے مبتدی منتہی کے مقام پر پہنچ جاتا ہے اور نہایت کو بدایت میں درج کرنا اسی کو کہتے ہیں۔ عروج پر پہنچنے سے سالک پر سکر کی حالت طاری ہو جاتی ہے اور بے خودی' فنا اور فناء الفنا سے آشنا ہو جاتا ہے۔ اس راہ میں کمال یہ ہے کہ بقا بعد الفنا حاصل ہو جائے جسے باقی باللہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ نزول میں سالک پھر مقامِ آغاز پر آ جاتا ہے جو کہ عبودیت اور متابعت کا مقام ہے۔ سلوک کی تکمیل اس مقام پر ہوتی ہے (کہ وہ اپنے مقامِ ابتدا پر آ کر صاحب ارشاد کی طرح زندگی گزارے یعنی رشد وہدایت پر متعین ہو جائے۔ اس مقام پر اس کے سر پر خلافت کا تاج رکھ دیا جاتا ہے اور ناقصوں کی تکمیل کی خدمت اس کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ سکر سے نکل کر پھر سالک صحو میں آتا ہے اور مقامِ تمکین وتعین میں متمکن ہو کر خلیفہ حق اور ہادی ورہنما بنتا ہے۔ (سر دلبراں)

حضرات نقشبندیہ میں سلوک طے کرانے کے الگ طریقے' سلوکِ مجددیہ ہیں' اور کچھ اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں ان کا نقشہ حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے' یہ اصطلاحات گیارہ ہیں۔ ہوش در دم جو سانس نکلے یاد الٰہی میں نکلے۔ غفلت کسی وقت راہ نہ پائے۔ ہمیشہ ہوشیار اور اپنے معمولات میں مشغول

رہے۔ یہ گیارہ اصطلاحات کا بیان اگلے صفحات پر آرہا ہے۔

اِرادت

رسالہ قشیریہ میں ہے کہ ارادت سلوک یا راہِ طریقت کی ابتدا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف جانے والوں کی پہلی منزل کا نام ارادت ہے چونکہ ارادہ ہر بات کا پیش خیمہ ہے۔ لہٰذا جو اللہ تعالیٰ کی راہ پر چلنے کا ارادہ کرے تو اسی ابتدا کا نام ارادت ہے۔ مرید کو اس لئے مرید کہا جاتا ہے کہ اس کا اپنا کوئی ارادہ نہیں ہوتا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ بھلائی کرنے کا ارادہ کرنا چاہتا ہے تو اسے موت سے پہلے نیک عمل کی توفیق دے دیتا ہے۔ مشائخِ عظام کا خیال ہے کہ عام غفلت کے کام اور خواہشاتِ نفس کی تابعداری کی عادت کو ترک کر دینے کا نام ہی ارادہ ہے۔ اگر کسی سالک میں احساسات پائے جائیں تو اس عزم پر ڈٹے رہنے کا نام ہی ارادت ہے۔ ارادت کی حقیقت یہ ہے کہ دل طلب حق کے لئے اٹھ کھڑا ہو اور اگر ارادت کی جلن دل میں ہو تو یہ ہر قسم کی گھبراہٹ کو آسان کر دیتی ہے۔ اب اس سلسلہ میں چند ایک بزرگوں کے اقوال نیچے درج کئے جا رہے ہیں۔

حضرت ابوعلی دقاقؒ

آپؒ کا قول ہے کہ ارادت ایک قسم کی جلن اور دغدغہ ہے۔ یہ ضمیر میں اور اس کے باطن میں بے چینی اور دل میں بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔

حضرت حاتم اصمؒ

آپؒ نے فرمایا کہ جب تو کسی مرید کو دیکھے کہ وہ اپنی مراد (یعنی اللہ) کے سوا کسی اور کو چاہ رہا ہے تو جان لے کہ اس نے اپنا کمینہ پن ظاہر کر دیا ہے۔

حضرت ابوبکر الکتانیؒ

آپ فرماتے ہیں کہ مرید کے لئے یہی حکم ہے کہ اس وقت سوئے جب نیند کا غلبہ ہو اس وقت کھائے جب فاقہ کی حالت ہو اور ضرورت کے بغیر کلام نہ کرے۔

حضرت جنید بغدادیؒ

آپ کا قول ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی مرید سے بھلائی چاہتا ہے تو اسے پاک باطن صوفیاء کے حوالے کر دیتا ہے اور باغیوں کی صحبت سے اسے روک دیتا ہے۔

حضرت ابو عثمانؒ

فرماتے ہیں کہ جب مرید صوفیاء کے علوم میں سے کچھ سن لے اور پھر ان پر عمل کرے تو وہ علوم اس کے دل میں آخر عمر تک حکمت بن جائیں گے۔ ورنہ ان کی تمام باتیں قصے اور کہانیوں کی مانند ختم ہو جائیں گی اور وہ ان علوم کو بھول جائے گا۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ مرید اگر صالحین کے قصے سنے تو اس کی وجہ سے اس کا دل مضبوط ہو جاتا ہے جس طرح قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَ كُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ (ھود: ۱۲۰)

''اور یہ سب جو ہم بیان کرتے ہیں آپ سے پیغمبروں کی سرگزشتیں یہ اس لئے ہیں کہ پختہ کر دیں ان سے آپ کے قلب (مبارک) کو''

مقامِ سلوک کا اجمالی بیان

سالک راہِ طریقت کے لئے لازم ہے کہ وہ کسی نہ کسی عبادت میں لگا رہے اور اس کو اس بات کا احساس ہونا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ہر عمل کا مواخذہ کرنے والا ہے۔ اور اگر (کسی کا کوئی عمل) رائی کے دانے کے برابر بھی ہو گا تو ہم اسے بھی لا حاضر کریں گے۔ (الانبیاء: ۴۷) اگر کوئی شخص اللہ کی گرفت سے محفوظ رہنا چاہے تو اول اپنی پچھلی زندگی سے توبہ کرے اور توبہ کی کثرت کو اختیار کرے۔ دوم انابت کے ذریعے اپنی غفلت سے ذکر کی جانب لوٹ آئے۔ صحیح انابت اس رجوع سے حاصل ہوتی ہے جو باطن سے کی جائے۔ سوم عفت کا مقام ہے جو شہوات کے چھوڑنے کا نام ہے اس کے بعد چہارم ورع (یعنی زہد اور پرہیز گاری) ہے جس میں ان تمام امور کا ترک ہے جن کا ترک سالک کو حق تعالیٰ کی طرف مشغول کر دے۔ یاد رہے کہ حرام سے بچنا فرض ہے اور حلال سے بھی ایک حد تک بچنا افضل کہلاتا ہے اور اس میں مباح چیزوں سے بھی بچنا ہوتا ہے۔ پنجم ارادہ یعنی ایسی ارادت اختیار کرنا جس میں مشقت اٹھانے کا عزم اور راحت کو چھوڑ دینا ہے اور ششم فقر اختیار کرنا جس میں مشقت اٹھانے کا عزم اور راحت کو چھوڑ دینا ہے۔ یعنی کسی شے کا بھی مالک نہ رہنا اور جو چیز پاس نہ ہو اس سے دل کو فارغ کر لینے کا نام ہے۔ ہفتم صدق اختیار کرنا ہے اور یہ ظاہر اور باطن کے برابر ہو جانے کا نام ہے۔ ہشتم تصبر اور یہ نام ہے نفس کو تلخ عیش' ناگوار طبع امور کے خوگر بنانے کا' نواں صبر ہے یعنی ماسوائے اللہ کے شکوہ چھوڑ دینا۔ دسواں رضا کا مقام حاصل کرنا ہے یعنی مصیبت میں لذت پانا۔ گیارھواں اخلاص کو اختیار کرنا ہے جس میں خالق کے ساتھ معاملہ رکھنے کا اور مخلوق کا دخل بھی دور کرنا ہے۔ یعنی کوئی برا مانے یا بھلا مگر طاعت میں فرق نہ آئے اور آخری بارھواں کام توکل اختیار کرنا اور توکل کرنے کا مطلب ہے حق تعالیٰ کے وعدہ وعید پر اعتماد رکھنا اور ماسوائے اللہ کے طمع کا

قطع کر دینا۔

منازلِ سلوک یا مقاماتِ عشرہ کا طے کرنا

منازلِ سلوک طے کرنے سے مراد مقاماتِ عشرہ کا طے کرنا ہے۔ ولایت بلاحصول مقاماتِ عشرہ طے نہیں ہوتی جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) توبہ (۲) انابت (۳) زہد (۴) قناعت (۵) ورع (۶) صبر (۷) شکر (۸) توکل (۹) تسلیم (۱۰) رضا۔

مذکور بالا مقاماتِ عشر کا طے کرنا تجلیاتِ ثلاثہ سے وابستہ ہے۔ ان مقامات میں سے سوائے مقام رضا کے سب تجلی افعال و تجلی صفات سے وابستہ ہیں اور مقامِ رضا وابستہ ہے تجلی ذات تقدس و تعالیٰ سے اور محبت ذاتیہ سے' تینوں تجلیات کی تعریف نیچے دی جارہی ہے۔

تجلی فعلی

اس تجلی میں سالک صفاتِ فعلیہ ربوبیہ میں سے کسی صفت کے ساتھ حق تعالیٰ کو متجلی پاتا ہے۔ جب یہ تجلی سالک پر آئے تو اس کا قول و فعل و ارادہ سلب ہو جاتا ہے اور وہ ہر چیز میں ہی قدرت کے جاری ہونے کو دیکھتا ہے۔

تجلی صفاتی

اس تجلی میں سالک حق تعالیٰ کی امہاتِ صفات سے تجلی پاتا ہے۔ امہاتِ صفات سات ہیں جنہیں صفاتِ سبعہ ذاتیہ بھی کہتے ہیں اور وہ ہیں:

(۱) حیات (۲) علم (۳) قدرت (۴) ارادہ (۵) سمع (۶) بصر (۷) کلام۔

تجلی ذات

جب ذاتِ اقدس کی تجلی سالک پر پڑتی ہے تو سالک فانی مطلق ہو کر اپنے علم و شعور و ادراک سے بے تعلق ہو جاتا ہے۔ عبد گم ہو جاتا ہے اور حق باقی رہ جاتا ہے۔ اس تجلی میں فنا ہونے کے بعد بقائے حق سے باقی رہنے کو بقا باللہ کہتے ہیں۔ اس میں خالق بلا تعین جسمانی اور روحانی خود کو اطلاق کے رنگ میں پاتا ہے۔ اس وقت اس کا علم (جو اس کا اپنا نہیں بلکہ تجلی کی وجہ سے ہے۔) پوری کائنات کے ذرات کا مشاہدہ کرتا ہے اور خود جمیع صفاتِ الٰہیہ سے متصف ہو جاتا ہے اور کسی چیز کو اپنا غیر یا اپنے سے خارج نہیں پاتا۔ کمال توحید عیانی بھی اسی کو کہتے ہیں۔

جب سالک تجلی ذات کو اپنے اوپر تمام اشیاء پر رونما ہوتی ہوئی پاتا ہے تو رفتہ رفتہ صفاتِ سبعہ ذاتیہ

(حیات، علم، قدرت، ارادہ، سمع، بصر اور کلام) کی طرف خود بخود رجوع کرنے لگتا ہے اور ان صفات سے متصف ہو جاتا ہے۔

سلسلہ نقشبندیہ کی مشہور گیارہ اصطلاحات

حضراتِ نقشبندیہ رحمۃ اللہ علیہم کی مشہور گیارہ اصطلاحات عموماً سننے میں آتی ہیں۔ جن پر عمل کرنا روحانی ترقی حاصل کرنے کیلئے ضروری ہے۔ چنانچہ اس جگہ ان کی مختصر تعریف ''سرّ دلبراں'' کے الفاظ میں کی جارہی ہے۔ اگر چہ ان اصطلاحات پر کچھ مشائخ نے بہت طویل کلام کیا ہے لیکن یہاں اختصار پر کفایت کی جائے گی۔

(۱) ہوش در دم

جو سانس نکلے یاد الٰہی میں نکلے۔ غفلت کسی وقت راہ نہ پائے۔ ہمیشہ ہوشیار اور اپنے نفس پر آگاہ رہے۔ اس شغل سے تفرقہ انفسی دفع ہوتا ہے۔

(۲) نظر بر قدم

چلتے پھرتے وقت نگاہ اپنی پشت پر رکھنا تا کہ پراگندہ نہ ہو اور جمعیت خاطر رہے کیونکہ ابتدا میں دل تابعِ نظر ہوتا ہے اور پراگندگی پریشانی دل کا باعث ہوتی ہے۔ نظر بر قدم سے سرعتِ سیر کی جانب بھی اشارہ ہوسکتا ہے۔ یعنی یہ کہ قطعِ مسافت ہستی اور عبور بر عقباتِ خود پرستی میں سالک کی نظر جہاں تک پہنچے فوراً قدم بڑھا کر وہیں پر رکھ دے۔

(۳) سفر در وطن

سالک کا طبیعت بشری میں ایک مقام سے دوسرے مقام یعنی صفاتِ ذمیمہ سے صفات حمیدہ پر جانا ''تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ'' پر عمل کرنا سفر در وطن ہے۔

(۴) خلوت در انجمن

بظاہر مخلوق کے ساتھ اور باطناً حق تعالیٰ کے حضور میں رہنا۔ ہر حال میں متوجہ الی اللہ رہنا۔

(۵) ذکر لسانی و قلبی

ذکر لسانی و قلبی جس سے غفلت دور ہو اور حق تعالیٰ کی یاد تازہ رہے۔

(۶) باز گشت

جب ذاکر دل یا زبان سے کلمہ طیبہ کا ذکر کرے تو ہر بار اپنے دل میں یہ مناجات کرے کہ الٰہی میرا مقصود تو

اور تیری رضا ہے۔ تیرے ہی لئے میں نے دنیا و آخرت کو ترک کیا ہے اور تو اپنی ہی نعمتیں عطا فرما اور اپنی ہی بارگاہ میں اصولِ تمام عنایت فرما۔"

ذکر میں شرط نہایت عظیم ہے جسے ہرگز نظر انداز نہ کیا جائے۔

(۷) نگاہداشت

نگرانی خاطر از خطرات ماسوی اللہ۔ مثلاً اس بات کی نگہداشت رکھے کہ اگر سالک ایک دم میں سو بار کلمہ طیبہ کہے تو اس دوران ایک بار بھی خیال ادھر ادھر نہ بھٹکنے پائے بلکہ اسماء وصفات سے غافل ہو کر احدیتِ مجردہ اور وراء الوراء ہی پر نظر رکھے۔

(۸) یادداشت

حق تعالیٰ کی جانب ہر دم اور ہر حال میں بسبیلِ ذوق متوجہ رہے۔ بعض کے نزدیک یادداشت سے مراد حضورِ بے غیب ہے۔ اہلِ تحقیق کے نزدیک یادداشت یہ ہے کہ سالک کے دل پر استیلائے شہودِ حق بتوسط حب ذاتی ہو جائے اور اسی کو مشاہدہ کہتے ہیں۔ یہ دولت بدون فناء تام اور بقائے کامل حاصل نہیں ہوتی۔

(۹) وقوفِ زمانی

بندہ ہر حال میں اپنے احوال پر واقف رہے۔ اگر طاعت میں ہے تو شکر کرے اور معصیت میں ہے تو استغفار کرے یا پاس انفاس میں حضور وغفلت کا خیال رکھے۔ یا قبض وبسط پر نظر رکھے اور شکر کے موقع پر شکر اور استغفار کے موقع پر توبہ واستغفار کرے۔ اسے محاسبہ بھی کہتے ہیں۔

(۱۰) وقوف عددی

نفی اثبات کے ذکر میں عدد طاق کی رعایت رکھنا بلحاظ اس کے کہ اللہ طاق ہے اور طاق کو پسند فرماتا ہے۔

ذکر قلبی میں اس نوعیت کی رعایت عددی تفرقہ کے دور کرنے اور جمعیتِ خاطر کے پیدا کرنے میں خاص طور پر مؤثر ہے۔ ایک سانس میں ایک بار، دوسرے میں تین بار حتیٰ کہ ۱۳۱ بار پورے نفی اثبات کا ذکر کرنے کا طریقہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے جاری ہوا ہے۔ جس کا ذکر "حسن نماز" میں دیا گیا ہے۔

(۱۱) وقوف قلبی

ذاکر کا حق تعالیٰ سے واقف وآگاہ رہنا' دل میں اللہ تعالیٰ سے آگاہی ہے اور اس کا حضور اس طور ہو کہ غیر حق سے مطلق علاقہ نہ رہے۔ دورانِ ذکر اس نوعیت کا ارتباط اور اس قسم کی حضوری وآگاہی ایک ضروری شرط ہے جس کے بغیر ذکر مؤثر نہیں ہوتا۔

سالک کا فرض ہے کہ ہر دم بڑھتا چلا جائے جو قدم بڑھے آگے ہی کی جانب بڑھے' نہ کہیں ٹھہرے نہ پیچھے ہٹے۔ ٹھہرنا مضر ہے اور پیچھے ہٹنا سلوک کے لئے مہلک ہے۔ سالک اسی کو کہتے ہیں جو ساعت بساعت ترقی کرتا رہے۔ واقف اسے کہتے ہیں جو کسی مقام پر رک جائے یا ٹھہر جائے اور ترقی اس کی بند ہو جائے۔ ایسی حالت کو جمود یا حالتِ جمودی کہتے ہیں۔ ایسا شخص کسی مقام پر اڑا رہے تو پھر لازمی طور پر وہ پیچھے کی جانب ہٹنے لگتا ہے۔ راجع اسے کہتے ہیں جو پیچھے کی جانب ہٹے۔ اس رجعت کا فوراً ہی معقول علاج نہ کیا جائے تو حالتِ مایوسی طاری ہو جاتی ہے۔

کامل کی سیر عروجی اور نزولی کے دور پرکار کی طرح ہمیشہ جاری رہتے ہیں۔ بس جو حال اس کے ساتھ دائمی ہوتا ہے' یہ ہوتا ہے کہ حجاباتِ کثرت ہمیشہ مرتفع رہتے ہیں وہ وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ سالکِ حالک وہ ہے جو ابتدائے حال میں مقید بہ مجاز رہا ہو۔ سالک واصل المسالک وہ ہے جو ابتدائے سلوک ہی سے محکوم بہ حقیقت رہا ہو اور جس نے اپنا سینہ جملہ بتانِ مجازی سے ہمیشہ پاک وصاف رکھا ہو۔ وہ سالک جو مقامات کو از روئے حال طے کرتا ہو، نہ کہ صرف علم وتصور سے۔

جذبہ اور سلوک میں فرق

خواجگان نقشبند قدس سرہم کے طریقے میں اسمِ ذات "اللہ" کا ذکر سیکھنے سکھانے اور نفی واثبات کی تعلیم پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا قول (حضرات القدس ص ۱۶۸ جلد دوم پر) نقل کیا گیا ہے کہ جو کچھ ہم کو کشف سے معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اسم ذات کو جذبے سے زیادہ مناسبت ہے جبکہ ذکرِ نفی اور اثبات کو سلوک سے منسوب کرتے ہیں چونکہ جذبے کا مقام مبتدی کے حال کے زیادہ مناسب ہے اس لئے طریقہ نقشبندیہ کے مبتدیوں کے لئے اسم ذات یعنی لفظِ "اللہ" کی تکرار کرنے کی تاکید کی جاتی ہے اور یہی ان کے لئے بہتر ہے۔ جب کوئی سالک راہ سلوک میں قدم رکھے تو اس وقت نفی اثبات "لا الٰہ الا اللہ" کا ذکر اس کے حال کے مطابق ہوتا ہے اور اس وقت اس ذکر کو بڑھا دیا جاتا ہے۔ یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اسم ذات سے جذبہ پیدا ہوتا ہے اور نفی واثبات سے منازل سلوک طے کرنے میں مدد ملتی ہے اور چونکہ طریقت کی ابتدا میں جذبے کا پیدا ہونا مبتدی کے حال کے مناسب ہے اس لئے اس طریقے (نقشبندی) کی ابتدا کرنے والوں کے لئے اسم ذات کی تکرار ضروری ہے۔ غالباً اس لئے کہ ذکر اسم ذات چونکہ اللہ تعالیٰ کے ذاتی نام کا ذکر ہے اس لئے اس میں جلال پایا جاتا ہے لہٰذا اس سے جذبہ پیدا ہوتا ہے اور نفی اثبات (لا الٰہ الا اللہ) کے ذکر میں بہ نسبت جلال کے کچھ کم گرمی ہے اس لئے رفعت پرواز پیدا کرتا ہے جو جذبہ سے پیدا ہونے والی پرواز سے کچھ کم ہے۔ اس میں قدرے اعتدال کا شمول ہونا بھی قرینِ قیاس ہے۔

سلسلۂ نقشبندیہ میں جذبہ کو سلوک پر مقدم رکھتے ہیں

سلسلۂ نقشبندیہ سب طریقوں سے اس لئے اقرب ہے کہ اس میں حضور اکرم ﷺ کی جناب میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وسیلہ ہے اور وسیلہ جس قدر اقرب ہوگا وصول الی اللہ بھی اتنا ہی اقرب ہوگا اور منزلوں کا طے کرنا بھی اتنا ہی جلد ہوگا۔ چونکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ اس سلسلہ کی نسبت ہے اور آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تمام انبیاء علیہم السلام کے بعد سب سے افضل ہیں۔ اس لئے حضرت مجدد علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ کی ان کے ساتھ نسبت (یعنی دوامِ آگہی یا دوامِ حضور) یقیناً سب آگاہیوں اور نسبتوں سے افضل ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ درج بالا طریق نقشبند موصل (یعنی وصل عطا کرنے والا ہے) اور یہاں عدم وصول کا احتمال نہیں کیونکہ نقشبندی سالکوں کا پہلا قدم جذبہ ہے (جذبے کا بیان الگ کر دیا گیا ہے) جو وصول الی اللہ کی دہلیز ہے اور سالک فوراً (پہلے قدم پر ہی) وصول الی اللہ کی دہلیز پر پہنچ جاتا ہے۔ اس میں سلسلہ کے طریق میں سلوک اور جذبہ دونوں ملے جلے رہتے ہیں کیونکہ اس میں نہ سلوک خالص ہے اور نہ جذبہ محض ہے۔ شیخ کی صحبت میں رہ کر سالک اگر وہ شرائط پوری کرے جو مشائخ نے ضروری قرار دی ہیں تو سالک واصل ہو جاتا ہے۔ (جذبہ اور سلوک کا فرق نیچے بیان کر دیا گیا ہے۔)

جذبہ

منقول ہے کہ حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہ نے بارگاہ رب العزت میں دعا کی تھی کہ مجھے ایسا طریقہ عطا کیا جائے جو اقرب اور موصل ہو۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو قبول فرمایا اور آپ کو راہ سلوک پر جذبہ کی تقدیم کا الہام ہوا۔ (یعنی کہ مریدوں کو سلوک سے پہلے جذبہ کی تعلیم دی جائے۔

سلوک

جبکہ دوسرے طریقوں میں سلوک کو جذبے پر مقدم کرتے ہیں اور پہلے محنت شاقہ اور ریاضتوں میں ڈالتے ہیں۔ یعنی اربعین بیداری (چالیس دن رات جاگے) اور گرسنگی (بھوکا رہنے) کا حکم دیتے ہیں۔ دوسرے طریقوں میں پہلے مرید کے خصائل اور نفس مصفّٰی کیے جاتے ہیں اور جب مرید نفس کی طہارت کے بعد اپنے سے باہر عالم مثال میں دیکھتا ہے۔ مثلاً ستارہ یا ہلال یا ماہِ ناقص یا ماہ کامل یا آفتاب تو اس کے بعد شیخ کو اس فنا اور تصفیہ نفس کی بشارت دیتا ہے اس طریقے کو سلوک کہتے ہیں اور اس سیر کو سیر آفاقی کہتے ہیں۔ (کیونکہ مرید احوال اور انوار میں جو کچھ دیکھتا ہے آفاق میں دیکھتا ہے) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ شیخ اپنے مرید کو اسم ذات کا ذکر تلقین کرتا ہے اور محض اپنی توجہ سے ہی مرید کے عالم امر کے لطائف کے تزکیہ میں مشغول ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ مرید فنا اور بقا کی صفت سے متصف ہو جاتا ہے۔ اسے جذبہ کہتے ہیں اور اس سیر کو سیر انفسی

کہتے ہیں کیونکہ اس سیر میں طالب جو کچھ استنارت (نور طلب کرنا) ترقی اور وصولی وفنا دیکھتا ہے اپنے ہی اندر دیکھتا ہے۔ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ اس سیر کو انفسی اس لئے فرماتے ہیں کہ انفس اسماء وصفات باری تعالیٰ کے ظلال اور عکوس کے آئینے ہو جاتے ہیں۔ نہ یہ کہ سالک کی سیر نفس میں ہوتی ہے۔ (یہاں ظلال کی سیر انفس کے آئینوں میں ہوتی ہے) طریقہ نقشبندیہ میں جذبے کو سلوک پر مقدم رکھتے ہیں۔ ابتداء لطائف عالم امر سے کرتے ہیں۔ سلوک جذبہ کے ضمن میں اور سیر آفاقی سیر انفسی کے ضمن میں طے ہو جاتی ہے۔

عام آدمی جس کو کشف نہیں ہوتا اس کی دعا کی قبولیت کی نشانی یہ ہے کہ اس کو دعا میں لذت آتی ہے اور دل لگتا ہے۔ جن لوگوں پر انکشاف ہوتا ہے وہ یا تو اللہ کی طرف سے کوئی ندا سن لیتے ہیں کہ تمہاری دعا قبول کی گئی ہے۔ یا ان پر قبولیت کی تجلی جو لذت اور سرور والی ہو وارد ہونے لگتی ہے اور اس کو دیکھ کر سمجھ جاتے ہیں کہ دعا قبول ہو گئی ہے۔

یہ اہم نکتہ ہے کہ طریق سلوک میں واسطہ ہوتا ہے مگر طریق جذب میں براہ راست فیض ملتا ہے۔

زیر نظر کتاب میں جذبہ اور سلوک پر کافی تفصیل دے دی گئی ہے اور زیرِ غور موضوع پر جو عبارت ہماری تصنیف "رابطۂ شیخ" میں دی گئی ہے اسے یہاں بیان کیا جا رہا ہے۔

خواجہ محمد پارسا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہمارے خواجہ رحمۃ اللہ علیہ اویسی تھے۔ خواجہ عطار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اویسی وہ اولیاء اللہ ہیں جنہیں ظاہر میں پیر کی حاجت نہیں ہوتی کیونکہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم یا دوسرے بزرگ خود اپنے حجرہ عنایت میں انکی پرورش فرماتے ہیں۔ اس میں کسی دوسرے کا واسطہ نہیں ہوتا اور حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تربیت اسی طرح فرمائی گئی۔ یہ بہت اعلیٰ مقام ہے جسے اللہ تعالیٰ نوازے اور کچھ لوگ تو ابتدا سے ہی اس مقام کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔ طریقِ سلوک میں فیض حاصل کرنے کے لئے ارواحِ مقدسہ کا درمیان میں واسطہ ہوتا ہے۔ لیکن طریقِ جذب میں کوئی واسطہ درمیان میں نہیں ہوتا۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ہمیں یہ بات صحیح یقین سے معلوم ہے کہ آپ کو حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روحانیت سے نسبت ہے جب کہ آپ کی پیدائش حضرت امام جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات کے بعد ہوئی۔ اسی طرح شیخ ابو الحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ کو تصوف میں حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی روحانیت سے نسبت حاصل ہوئی ہے۔ اسی طرح حضرت بہاؤ الدین نقشبندؒ کی تربیت حضرت اتا قدس سرہ کے حکم سے ایک ترکی درویش حضرت خلیل رحمۃ اللہ علیہ نے کی۔ اس کے علاوہ حضرت بہاؤ الدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کی تربیت حضرت خواجہ سید امیر کلال رحمۃ اللہ علیہ سے لی جو آپ کے مرشد تھے مگر آپ کے استادِ حقیقی پیرِ معنوی شیخ عبد الخالق غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ تھے جو آپ سے پہلے ہو چکے ہیں۔ حضرت خواجہ عبد الخالق غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ خواجہ بہاؤ الدین رحمۃ اللہ علیہ کے باطن پر متجلی ہونے اور ذکرِ خفی، بعض ریاضاتِ سریع الاثر اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے

اقوال وافعال کی تربیت اپنے سامنے گویا بالمشافہ فرمائی۔ لہٰذا حضرت باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

بہ ظاہر پیرش از میر کلالؒ است   بہ پیر غجدوانیؒ اتصال است

(اگرچہ ظاہر میں ان کے پیر حضرت کلال رحمۃ اللہ علیہ تھے مگر حضرت غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ سے اتصال تھا۔)

مراد اور مرید کی تربیت بطریق جذب وسلوک

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے مرید اور مراد کی تربیت میں ایسے مشائخ کی ضرورت محسوس کی ہے جو جذبہ وسلوک کے ذریعے ان کو سلوک کے مطلوبہ مقامات طے کرواسکے۔ آپ فرماتے ہیں۔ ''جان لے کہ اس راستے کے سالک دو حال سے خالی نہیں یعنی وہ مرید ہو یا مراد ہو۔ اگر مراد ہیں تو خوبی ہے ان کے لئے کشش ومحبت کے طریق سے ان کو کھینچ کھینچ کرلے جائیں گے اور اعلیٰ مطلب تک پہنچادیں گے اور جو ادب درکار ہوگا بوساطت یا بلا وساطت ان کو سکھادیا جائے گا۔ اگر کوئی لغزش واقع ہوگی تو ان کو آگاہ کردیں گے اور اس پر گرفت نہ کریں گے اور اگر پیر ظاہر کی حاجت ہوگی تو ان کی کوشش کے بغیر اس دولت کی طرف رہنمائی کریں گے۔ حاصلِ کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ کی عنایت ازلی ان بزرگواروں کے حال کی کفیل ہے۔ بذریعہ سبب یا بے سبب ان کا کام پورا کردیں گے۔ اللہ چن لیتا ہے اپنی طرف جسے چاہتا ہے اور اگر مرید ہیں تو ان کا کام بغیر واسطہ پیر کامل ومکمل کے دشوار ہے۔ ان کے لئے ایسا پیر چاہیے جو جذب وسلوک کی دولت سے مشرف ہوا ہو اور فنا وبقا کی سعادت سے بہرہ ور ہو اور سیر الی اللہ، سیر فی اللہ، سیر عن اللہ باللہ اور سیر فی الاشیا باللہ کو تمام کیا ہو اور اگر اس کا جذب اس کے سلوک پر مقدم ہو اور مرادوں کی تربیت سے پرورش پائی ہو تو کبریتِ احمر یعنی اکسیر ہے۔ اس کا کلام دوا اور اس کی نظر شفا ہے۔ مردہ دل اس کی توجہ شریف سے اور پژمردہ جانوں کی تازگی اس کی التفاتِ لطیف سے وابستہ ہے۔ اگر اس طرح کا صاحبِ دولت پیر نہ ملے تو سالکِ مجذوب بھی غنیمت ہے۔ ناقصوں کی تربیت اس سے بھی ہوتی ہے اور اس کی وساطت سے فنا وبقا کی دولت کو پہنچ جاتے ہیں۔

آسماں نسبت بہ عرش آمد فرود   ورنہ بس عالی است پیشِ خاک تود

(عرش سے نسبت ہو تو آسمان بھی نیچے آجاتا ہے، ورنہ زمین کے تودے کے سامنے آسمان بہت بلند ہے۔)

اور اگر خدا جل شانہ کی عنایت سے کسی طالب کو اس طرح کے پیر کامل کی طرف رہنمائی حاصل ہوجائے تو چاہیے کہ اس کے وجود شریف کو غنیمت سمجھے اور اپنے تئیں بالکلیہ اس کے حوالہ کردے اور اپنی سعادت کو اس کی مرضیات میں جانے اور اپنی بدبختی کو اس کی مرضیات کے خلاف سمجھے۔ حاصلِ کلام یہ کہ اپنی نفسانی خواہش کو اس کی رضا کے تابع کردے۔ حدیث نبوی ﷺ ہے کہ تم میں سے کوئی ایمان دار نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ اس کی نفسانی خواہش میرے دین وشریعت کے تابع ہو۔ (بخاری شریف) جان لے کہ آدابِ صحبت کی رعایت

اس راہ کی ضروریات سے ہے تاکہ فائدہ اٹھانے اور فائدہ پہنچانے کا راستہ کھل جائے اور بغیر ان کے محبت کا کوئی نتیجہ نہیں اور نہ مجلس کا کوئی ثمرہ ہے۔ آداب و شرائط میں سے بعض بیان کئے جاتے ہیں۔

جذب کو سلوک پر مقدم کرنے کی مزید توضیح

اُوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے جذب کو سلوک پر مقدم کرنے کی بات واضح ہو جاتی ہے مگر اپنے مخصوص انداز میں حضرت مجدد علیہ الرحمۃ جذب کو سلوک پر مقدم کرنے کی توضیح و تشریح یوں فرماتے ہیں کہ سیر و سلوک اور جذبہ و تصفیہ سے مقصود نفس کو اخلاق ردیہ اور اوصاف رذیلہ سے پاک کرنا ہے۔ انفس کی گرفتاری خواہشات کے سبب سے ہے۔ کیونکہ جس چیز کو کوئی شخص دوست رکھتا ہے اپنے مفاد کے سبب دوست رکھتا ہے مثلاً اگر فرزند و مال کو دوست رکھتا ہے تو اپنے فائدے کے لئے دوست رکھتا ہے۔ چونکہ سیر انفسی میں محبتِ خدا تعالیٰ کے غلبہ کے سبب اپنی دوستی زائل ہو جاتی ہے۔ اس لئے ثابت ہوا کہ اپنی ذات کی گرفت کے دور ہو جانے سے دوسروں کی گرفتاری بھی دور ہو جاتی ہے۔ اس طرح سیر انفسی کے ضمن میں سیر آفاقی بھی قطع ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں سیر انفسی و سیر آفاقی کے معنی بھی بلا تکلف درست رہتے ہیں۔ کیونکہ حقیقت میں سیر انفس میں بھی ہے اور آفاق میں بھی۔ انفس کے تعلقات کا قطع بتدریج انفس میں سیر ہے۔ اور آفاق کے تعلقات کا قطع جو سیر انفسی کے ضمن میں ہوتا ہے آفاق میں سیر ہے۔ دیگر مشائخ نے جو ان دونوں کے معنی بیان کئے ہیں، ان میں تکلف ہے۔ پس طریقۂ نقشبندیہ میں راہ اقرب ہوا۔ اسی واسطے کہا گیا ہے کہ دوسروں کی نہایت ان بزرگوں کی بدایت میں مندرج ہے۔

واضح رہے کہ سیر انفسی و سیر آفاقی دونوں ولایت کے رکن ہیں۔ شہود انفسی کو کمال بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اپنے سے باہر شہود دریاضت نہیں۔ مگر حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مطلوب جو بیچون و بیچگون ہے، آفاق و انفس سے باہر ہے۔ آفاق و نفس کے آئینوں میں اس کی ذات اور اسماء وصفات کی گنجائش نہیں۔ ان میں جو ظاہر ہوتا ہے وہ ظلال اسماء وصفات ہیں بلکہ اسماء وصفات کی ظلیت بھی ان دونوں سے باہر ہے۔ چونکہ آفاق و انفس اور سلوک و جذب سے باہر کی خبر نہیں دی ہے اور کمالاتِ ولایت کے مطابق فرما دیا ہے کہ اہل اللہ فنا و بقا کے بعد جو کچھ دیکھتے ہیں، اپنے میں دیکھتے ہیں اور ان کی حیرت اپنے وجود میں ہے اور تمہارے وجود میں بھی (نشانیاں ہیں) جو تمہیں نظر نہیں آتی۔ وَفِيٓ أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ﴿٢١﴾ (الذاریات: 21) مگر الحمد للہ کہ ان بزرگوں نے اگرچہ انفس سے باہر کی خبر نہیں دی۔ مگر وہ گرفتار انفس بھی نہیں۔ وہ انفس کو بھی آفاق کی طرح تحت میں لا کر اس کی نفی کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت خواجہ بزرگ قدس سرہ کا ارشاد ہے کہ جو کچھ دیکھا گیا اور سنا گیا اور جانا گیا وہ سب غیر ہے۔ حقیقت کلمہ لا سے اس کی نفی کرنی چاہیے۔

نقش بندند ولے بند بہر نقش نیند ہر دم از بو العجبی نقش دگر پیش آرند

(نقشبند کہلاتے ہیں مگر کسی نقش میں بند نہیں ہیں' اپنے کمال اور بوالعجبی سے ہر ساعت نہایت عمدہ نقش پیش کرتے ہیں۔)

نقشبندانیم و لیک از نقش پاک نقشِ ما ہم گرچہ پاک از لوحِ خاک

(نقشبند کہلاتے ہیں لیکن ہر نقش سے پاک ہیں اگرچہ ہمارا نفس بھی لوح خاک سے پاک ہے۔)

یہ طریق البتہ موصل ہے۔ عدم وصول کا احتمال یہاں نہیں پایا جاتا کیونکہ اس راہ کا پہلا قدم جذب ہے جو وصول کی دہلیز ہے۔ سالک کے وصول کا مانع یا جذب محض ہے جس میں سلوک نہ ہو یا سلوک محض بغیر جذب کے یہ دونوں مانع نہیں پائے جاتے کیونکہ اس طریق میں نہ سلوک خالص ہے نہ جذب محض بلکہ جذبہ ہے متضمن سلوک۔ لہٰذا اس طریقہ عالیہ میں وصول کا سدراہ سوائے طالب کی ہستی کے اور کوئی چیز نہیں۔ طالب صادق اگر پیر کامل کی صحبت میں رہے اور شرائط طلب جو اکابر سلسلہ نے قرار دی ہیں بجالائے تو امید ہے کہ یقیناً واصل ہوگا۔ اگر پیر ناقص سے کسی کا پالا پڑ جائے تو چونکہ وہ خود واصل نہیں دوسرے کو کیسے واصل بنا سکتا ہے۔ اس صورت میں طریقت کا کیا قصور ہے۔

حضرت قیوم ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ عالیہ کی تاریخ میں ایک نیا دور پیدا کر دیا ہے۔ ولایت کبریٰ کے اوپر کے تمام مقامات آپ ہی پر منکشف ہوئے ہیں اور آپ کے علوم و معارف جدیدہ پر شریعت کی مہرِ تصدیق ہے۔ چنانچہ آپ مکتوب ۲۶۰ جلد اول میں اپنا طریق بیان کر کے یوں لکھتے ہیں۔

"یہ ہے بیان اس طریق کا بدایت سے نہایت تک جس کے ساتھ حق سبحانہ تعالیٰ نے اس حقیر کو ممتاز فرمایا ہے۔ اس طریق کی بنیاد نسبت نقشبندیہ ہے جو متضمن اندراج نہایت در بدایت ہے۔ اس بنیاد پر عمارتیں اور محل بنائے گئے اگر یہ بنیاد نہ ہوتی تو معاملہ یہاں تک نہ بڑھتا۔ بخارا اور سمرقند سے بیج زمین ہند میں جس کا مایہ خاکِ یثرب و بطحاء سے بویا گیا اور اس کو سالوں آبِ فضل سے سیراب رکھا گیا اور تربیتِ احسان سے پرورش کیا گیا جب وہ کھیتی کمال کو پہنچی تو یہ علوم و معارف کے پھل لائی۔"

ایک اور مکتوب (مکتوب ۲۸۱ دفتر اول) میں آپ یوں ارشاد فرماتے ہیں۔

"اس طریق میں ایک قدم رکھنا دوسرے طریقوں کے سات قدم سے بہتر ہے۔ اور راستہ جو بطریق تبعیت و وراثت کمالات نبوت کی طرف کھلتا ہے اس طریق عالی سے مخصوص ہے۔ دوسرے طریقوں کی نہایت کمالات ولایت کی نہایت تک ہے۔ وہاں سے کمالات نبوت کی طرف کوئی راستہ کھلا نہیں"۔

مولانا عبدالرحمٰن جامی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا ہے۔

نقشبندیہ عجب قافلہ سالار اند کہ برند از رہِ پنہاں بحرم قافلہ را

(نقشبندی بزرگ عجب قافلہ سالار ہیں کہ پوشیدہ راستے سے قافلے کو حرم تک پہنچا دیتے ہیں۔)

از دلِ سالک رہِ جاذبہ صحبتِ شاں ے برد وسوسہ خلوت وفکر چلہ را

(اس صحبت کے ذریعے سالک کو جذبے کی راہ وسوسہ خلوت اور فکرِ چلہ کو لے جاتے ہیں۔)

قاصرے گر کند ایں طائفہ راطعنِ قصور حاش للہ کہ برآرم بزبان ایں گلہ را

(کوتاہ نظر اگر ان لوگوں پر زبان طعن کھولتے ہیں خدا کی پناہ کہ میں ایسی بات زباں پر بھی لاؤں۔)

ہمہ شیرانِ جہاں بستہ ایں سلسلہ اند روبہ از حیلہ چساں بگسلد ارینْ سلسلہ را

(دنیا کے تمام شیر اس سلسلے میں بندھے ہوئے ہیں، لومڑی اپنے حیلہ سے اس سلسلے کو کیسے توڑ سکتی ہے؟)

حصولِ سلوک کے لئے آٹھ اہم طریقے

مختلف اولیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم نے اپنے تجربے کے مطابق راہِ سلوک کو طے کرنے کے لئے کچھ طریقے تجویز کئے ہیں۔ ان تمام طرق میں سے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کردہ آٹھ طریقوں کا مختصر جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ وہ آٹھ طریقے یہ ہیں: (۱) دوامِ عبادت (۲) دوامِ صوم (۳) دوامِ سکوت (۴) دوامِ خلوت (۵) دوامِ ذکر (۶) دوامِ نفی خواطر (۷) دوامِ ربط قلب باشیخ (۸) دوامِ ترکِ اعتراضات بر خدا تعالیٰ ان طریقوں کے اختیار کرنے سے سالک کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت راسخ ہو جاتی ہے اور وہ مخلوق سے منہ پھیر لیتا ہے جس کے بعد وہ قربِ وصال کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ ان طریقوں کے ذریعے انسان ایک حالت سے دوسری حالت میں ہجرت کرتا ہے یعنی مخلوق سے اللہ کی طرف رجوع کر لیتا ہے۔ حضرت سہل تستری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ہجرت قیامت تک فرض رہے گی۔ ان کی مراد جہل سے علم کی طرف، غفلت سے ذکر کی طرف، گناہ سے اطاعت کی طرف اور معصیت سے توبہ کی طرف ہجرت ہے۔ ان مذکورہ آٹھ طریقوں کو حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے رسالہ مکیہ میں بیان کیا ہے۔ جن کو اختصار کے ساتھ قارئین کی نظر کیا جا رہا ہے۔

ا۔ دوامِ عبادت

عبادات میں مشغول رہنا سالک کے لئے اولین شرط ہے۔ عبادت میں پاکیزگی نظر اور پاکیزگی اعمال بہت ضروری ہے۔ اس سلسلے میں مشائخ اپنے مریدوں کو ہمیشہ باوضو رہنے کی تاکید فرماتے ہیں۔ ایک حدیث شریف میں ہے دین کی بنا پاکی پر ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ نماز کی کنجی طہارت ہے اور طہارت نصفِ ایمان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ اے موسیٰ علیہ السلام اگر تو گھر سے بے وضو نکلے اور تجھے کوئی مصیبت پہنچے تو اس صورت میں تم اپنے سوا کسی اور کو ملامت نہیں کر سکتے۔ (وضو کا بیان اور فضیلت ہماری تصنیف ''حسن نماز'' میں کافی وضاحت سے شامل کر دیا گیا ہے۔) جو شخص شریعت کے موافق اپنے ظاہر

کو پاک نہ رکھے گا اس کا باطن ہرگز طریقت کے قابل نہیں ہو سکتا۔ طہارت پر نگاہ رکھنے والے پر انوار ربانی وارد ہوتے ہیں اور اس کا دل مشاہدۂ انوار سے سرفراز کیا جاتا ہے۔

۲۔ دوامِ صوم اور بھوکے رہنا

سالک راہ طریقت کے لئے دوسری شرط دوامِ صوم یعنی اپنے آپ کو بھوکا رکھنے کا عادی بنانا ہے۔ سالک کے لئے ضروری ہے کہ روزہ رکھنے کے وقت اور افطار کے وقت غذا کم کھائے تاکہ پیٹ میں گرانی نہ رہے اور اس کی روح چاک و چوبند رہے۔ حد سے زیادہ بھوکا رہنا بھی مناسب نہیں کیونکہ دونوں حالتوں میں حد سے بڑھنا ہلاکت کا باعث بن سکتا ہے۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ ہر نیکی کا ثواب دس سے ستر گنا تک ہے، بجز روزہ کے کہ وہ خاص اللہ تعالیٰ کیلئے ہے، ایک اور حدیث میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزا ہوں۔ حضور اکرم ﷺ نے روزے کو ڈھال فرمایا ہے کیونکہ یہ شیطان سے جہاد کرنے کے لئے ڈھال کا کام دیتا ہے۔ بنی آدم کے لئے پیٹ بھرنے سے زیادہ بدتر کوئی چیز نہیں۔ شہوات، حرص، بغض و کینہ اور تمام خصائل رذیلہ پیٹ بھر کر کھانے کی وجہ سے ظاہر ہوتے ہیں۔ پس انسان کے لئے ضروری ہے کہ اتنا کھائے کہ جس سے وہ اپنی کمر کو سیدھا رکھ سکے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ اپنے پیٹوں کو بھوکا، جگروں کو پیاسا اور بدنوں کو (ستر ڈھانپنے کے علاوہ) ننگا رکھو تا کہ تم اپنے رب کو دیکھ سکو۔ (حلیۃ الاولیاء)

بھوک کی افادیت

بھوک سے مراد پیٹ کو زیادہ بھوکا رکھنا نہیں بلکہ اصل مقصود اعتدال برقرار رکھنا ہے، نہ اس قدر کھایا جائے کہ سالک پر غفلت کے آثار طاری ہونے لگیں اور نہ ہی اس قدر بھوک رکھی جائے کہ کمزوری اور لاغری تک نوبت پہنچے۔ حقیقت یہ ہے کہ بھوک اور نیند دو ایسی چیزیں ہیں جن کو سالک جتنا چاہے بڑھا لے اور اگر چاہے تو بہت کمی کی حد تک لا سکتا ہے۔ زندہ رہنے کیلئے جتنا کھانا اور نیند کی ضرورت ہے اس سے زیادہ کمی یا بیشی مضر ثابت ہوتی ہے۔ شریعت نے پیٹ اور بدن کا حق دیا ہے اور جانوروں کی طرح پیٹ بھر لینے سے بھی منع فرمایا ہے۔

راقم الحروف کی عنقریب شائع ہونے والی کتاب ''تہذیب نفس'' میں بھوک کے عنوان سے اس قدر تفصیل سے معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں، جس کی ضخامت ایک اچھی خاصی کتاب کی ضخامت سے کم نہیں۔ قارئین اس کتاب کا ضرور مطالعہ فرمائیں۔

۳۔ دوامِ سکوت یا تقلیلِ کلام

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور روز قیامت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہئے کہ کلامِ خیر کہے یا چپ رہے اور اس طرف بھی اشارہ دیا ہے کہ لوگ اپنے منہ سے بولے ہوئے الفاظ کے سبب دوزخ

میں اوندھے منہ ڈالے جائیں گے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ساری نیکی چار چیزوں میں ہے یعنی کلام، سکوت، نظر اور حرکت میں۔ فرمایا جو کلام ذکرِ الٰہی سے خالی ہو بیہودہ ہے، سکوت جس میں فکر نہ ہو فراموشی ہے، نظر جو عبرت کا سبب نہ ہو غفلت ہے اور جو حرکت عبادت کے لئے نہ ہو مستی ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ نشہ فقر میں اگر کوئی مستی کرے تو وہ ثواب ہے لیکن علم کی مستی گناہ ہے اور نشہ دولت اور شراب کی مستی سب خرمستیوں میں شامل ہیں۔

علم کا مقصود ہے پاکی عقل و خرد فقر کا مقصود ہے عفتِ قلب و نگاہ
فقر مقامِ نظر، علم مقامِ خبر فقر میں مستی ثواب، علم میں مستی گناہ (ب۔ج:۷۷)

ہماری تصنیف ''جنیدؒ و بایزیدؒ'' میں ایک باب خاموشی کے عنوان سے بھی لکھا گیا ہے جس میں سکوت اور خاموشی پر اچھی خاصی تفصیل شامل کردی ہے۔ خاموشی کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا قول قابل ذکر ہے۔ منقول ہے کہ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کے آستانے پر ایک عالمِ دین حاضر ہوئے اور آپ کی خدمت میں کچھ عرصہ بیٹھ جانے کے بعد اپنے گھر کو لوٹ گئے۔ دربار عالیہ سے جب باہر نکلے تو انہوں نے لوگوں سے کہا کہ میں تو حضرت کے کلام سے مستفیض ہونے کی نیت سے حاضر ہوا تھا لیکن حضرت نے سکوت فرمایا اور قطعاً ایک جملہ بھی ارشاد نہیں فرمایا لہٰذا میں مستفیض ہونے کے بغیر ہی واپس جا رہا ہوں۔ جب حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ کو اس عالمِ دین کے اس قول کا علم ہوا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص ہماری خاموشی سے فیض نہیں اٹھا سکا اس کو ہمارے کلام سے بھی کچھ فیض نہیں پہنچ سکتا۔ آپ کے جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ اولیائے کرام کے سکوت میں بھی رازِ تکلم مخفی ہوتا ہے۔ اس رازِ تکلم کو راقم الحروف نے اپنی تصنیف ''رابطۂ شیخ'' میں قربِ الٰہی کے باب میں ''اولیائے کرام وہ ناگفتہ سبق دیتے ہیں جو ان کے باطنی احوال سے تعلق رکھتا ہے'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے مولانا رومؒ کا شعر ہے ۔

شیخ فعال است بے آلت چو حق با مریداں دادہ بے گفتہ سبق (۱۳۴۔۲)
(پیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بغیر کسی آلہ کے تصرف کرتا ہے بغیر بولے مریدوں کو سبق دیتا ہے۔)

۴۔ دوامِ خلوت

سرِ دلبراں میں ہے کہ خلوت اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے انقطاع کر لینا ہے۔ سورہ مزمل آیت ۸ میں ہے وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا (اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو)۔ اس آیت سے مراد یہ ہے کہ خلوت کی اصل بس یہی چیز ہے کہ بندے کو حق تعالیٰ کے ساتھ جو نسبتِ راز و نیاز حاصل ہے اس میں کسی دوسرے کو شریک نہ کیا جائے۔ یہ مقصد جن جن صورتوں سے حاصل ہو وہ سب خلوت کے تحت شامل ہو جاتا ہے۔ سلسلۂ نقشبندیہ میں

خلوت در انجمن ایک بہت مشہور اصطلاح رائج ہے جس سے مراد یہ ہے کہ سالک بظاہر تو مخلوق کے ساتھ نظر آتا ہے مگر باطن میں حق تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے۔

از دروں شو آشنا و از بروں بیگانہ وش　　ایں چنیں زیبا روش کم می بود اندر جہاں

(باطن میں خدا سے آشنائی رکھو اور ظاہر دنیا سے بیگانہ ہو جاؤ۔ اس قسم کی خوبصورت چال دنیا میں دیکھنے میں کم آتی ہے۔)

سورۂ نور میں ان پاک مردوں کا ذکر کیا گیا ہے کہ جن کو تجارت اور کاروبار دنیا اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتا۔ رِجَالٌ لَّا تُلۡهِيهِمۡ تِجَٰرَةٌ وَلَا بَيۡعٌ عَن ذِكۡرِ ٱللَّهِ (النور: ۳۷)

حضور اکرم ﷺ کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ آپ نبوت سے پندرہ سال قبل ہی خلوت کو پسند فرمایا کرتے تھے اور غار حرا میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کے مطابق ایک ایک مہینہ تشریف رکھتے۔ اولیائے کرام رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ جب انسان سو جائے تو ظاہری حواس بند ہونے کے باعث دل کے حواس کھل جاتے ہیں اور اسے خواب میں بہت سے واقعات نظر آنے لگتے ہیں۔ اسی طرح اگر بیداری میں ظاہری حواس کو بذریعہ نفی معطل کر دیا جائے تو بیداری میں بھی ظاہری حواس کھل جاتے ہیں اور جو خواب میں نظر آتا ہے وہ بیداری میں بھی نظر آنے لگتا ہے۔ اولیاء کرامؒ کی زندگیوں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے مشائخ نے ہمیشہ خلوت کو اختیار کیا اور جب ان کی روحانی قوتیں بیدار ہوئیں تو وہ خلق خدا میں نمودار ہوئے اور رشد و ہدایت کی ذمہ داریوں کو سنبھالا۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ جب تک روحانی انداز میں (کسی مرشد کی زیر نگرانی) روحانی طاقتوں کو مطلوبہ معیار تک نہ پہنچایا جائے اس وقت تک رشد و ہدایت سے متعلق کلام میں کسی شے کو بھی تاثر کی دولت حاصل نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ ان اصولوں کو نظر انداز کر کے تبلیغی ذمہ داریوں کو سنبھالنا چاہتے ہیں ان کی تبلیغ میں چنداں اثرات نہیں ہوتے۔

صوفیائے کرام رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے کہ بیداری کی حالت میں اندھیرے کمرے میں بیٹھ کر آنکھیں بند کر لی جائیں اور خیالات کو ہر طرف سے ہٹا کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کر لیا جائے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ مراقبہ اور ذکر کرنے سے پہلے اپنی توجہ کا مرکز سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کے مشائخ کی طرف کر لینا چاہیے اور ان سے مدد طلب کرنی چاہیے تا کہ ان کی طرف سے فیض کا سلسلہ ذاکر اور مراقب کی طرف جاری ہو جائے۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے مرقات شریف میں لکھا ہے کہ وہ حجرہ جس میں سالک خلوت اختیار کرے تنگ اور تاریک ہونا ضروری ہے تا کہ خیالات کا سلسلہ منتشر ہونے نہ پائے۔ تاریکی کا ہونا ذکر اور مراقبہ کے درمیان دلوں کو جلاء بخشنے والی چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ذکر کے حلقوں میں روشنیوں کو بند کر دیا جاتا ہے۔ حجرہ اس قدر تنگ ہونا چاہیے کہ ذکر کے وقت چار زانوں بیٹھ سکے اور کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکے اور تاریک اتنا ہو کہ سورج کی

شعاع اور اس کی روشنی کا گزر نہ ہو۔ سالک کے لئے یہ ضروری ہے کہ ضروریات طہارت، جماعت اور جمعہ کے علاوہ کسی نفسانی خواہش کے حصول کے لئے باہر نہ نکلے۔ سالک دن کے آرام اور نفس کے اطمینان کی طرف توجہ نہ کرے۔ تقویٰ اور پرہیز گاری، صدق واخلاص اور ثابت قدمی پر نگاہ رکھے۔ ایامِ خلوت میں اخلاقِ رذیلہ سے پرہیز کرے اور اخلاقِ محمودہ اختیار کرے۔ دنیا کی محبت اور مال وجاہ سے اعراض، کم کھانا، کم سونا، اپنا شعار بنالے۔ خلوت میں جانے سے پہلے بھی اپنے آپ کو مذکورہ خوبیوں کی طرف رفتہ رفتہ راغب کرے۔ ان ایام میں سالک گوشت زیادہ نہ کھائے تاکہ جماع کی رغبت پیدا نہ ہو۔ معمولی مقدار میں کھانے کا کچھ مضائقہ نہیں۔ خورد ونوش کے اصول کو صوفیانہ طرز پر ڈھالے اور جی بھر کر کھانے اور پانی پینے سے پرہیز کرے۔

خلوت کے دوران اگر خورد ونوش میں احتیاط کی جائے تو اللہ تعالیٰ اس کی پیاس اور بھوک کو دور کر دے گا، یہاں تک کہ بعض صوفیائے کرام کئی کئی دنوں اور کئی کئی مہینوں تک کھانا نہ کھاتے تھے اور پانی نہ پیتے اور ان کے بدن میں مطلق کوئی نقصان بھی رونما نہ ہوتا۔ کشف المحجوب میں اس بات کا ذکر آیا ہے کہ بعض اولیائے کرام کافی عرصہ کے لئے بھوکے رہتے مگر آپ نے ایک بزرگ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ ایسے بزرگ کو صحیح تسلیم کرتے ہیں جو کھانا بھی خوب کھائے اور عبادت میں بھی کمال حاصل کرے۔ اہلِ تصوف کی زیادہ تعداد پرہیز گاری کے عمل کو ہی اپنائے ہوئے ہے۔ کیونکہ اس میں سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کی سعادت بھی میسر ہو جاتی ہے۔ دوسری طرز کے قلندروں کا یہ خیال نیچے لکھے ہوئے مشہور شعر سے ظاہر ہوتا ہے ۔

شکمِ درویشاں تنور است ہر چہ اینجا رسید فنا شد

(درویشوں کا پیٹ تنور ہے جو کچھ اس میں پہنچتا ہے فنا ہو جاتا ہے)

خلوت میں قلب کو فراغت ملتی ہے، فکر پر اعانت ہوتی ہے اور مالوفات نفسانی سے علیحدگی نصیب ہوتی ہے بلکہ اس سے خشوع وخضوع بخوبی میسر آتا ہے۔ لوگوں سے منہ موڑنے اور خلوت کو انتخاب کرنے سے سالک روحانی درجات کی انتہا تک پہنچ جاتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی خلوت کو پسند فرمایا۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ عنقریب ایسا وقت آنے والا ہے کہ آدمی کی ہلاکت اس کی ماں، باپ یا بیوی بچوں کے ہاتھوں سے ہوگی جو اسے تنگی معاش پر غیرت دلائیں گے اور وہ آدمی خوشحال بننے کے لئے حرام ومعصیت پر دلیر بن جائے گا اور اپنے آپ کو دین سے دور کر لے گا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مُفْرَدُوْنَ" بازی لے گئے، یعنی جو شخص بیوی، بچوں اور مال کی ذمہ داریوں سے مبرا ہو وہ اپنے آپ کو حساب کے لئے ہلکا محسوس کرے گا۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فرمایا کہ جو شخص دین کی سلامتی اور بدن وروح کے آرام کا خواہاں ہو اسے چاہیئے کہ لوگوں سے یکسو رہے۔ احادیث سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ جو لوگ برے اخلاق کی طرف مائل ہوں وہ اگر خلوت اختیار کریں تو ان کی بدکاریوں اور بداخلاقیوں سے لوگ محفوظ رہیں گے۔ ایسے بدکار سے وہ لوگ

بہتر ہیں جن پر نفسانی خواہشات کا غلبہ نہیں اور وہ خلوت اختیار نہیں کرتے۔ یاد رہے کہ نیک لوگ اپنے روحانی درجات کو بڑھانے کے لئے اور نفس کی اصلاح کی خاطر کچھ عرصہ خود کو خلوت سے ضرور گزارتے ہیں۔ (خواہ وہ خلوت مخلوق سے دور رہ کر ہو یا مخلوق میں رہ کر ہو) حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کامل شخص وہ ہے جس کو عوام سے ملنے جلنے سے کوئی ضرر نہ پہنچے۔

خلوت بصورتِ صحبت

صحابہ کرامؓ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے جو فیوض نصیب ہو جاتے تھے وہ دوسروں کو سالہا سال کی خلوت سے بھی حاصل نہیں ہوتے۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قلیل صحبت میں بھی ایسا اثر حاصل ہو جاتا تھا کہ وہ یقین کی دولت سے مالا مال ہو جاتے اور بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہ کرتے یہاں تک کہ کامل اخلاق کے نمونہ بن جاتے۔ ایسے لوگوں کو خلوت کی کیا حاجت ہوگی جن کے سینوں میں خلوت کے باعث پیدا ہونے والی صفات آپ کے قلب مبارک سے ایک عکس ڈالنے سے ہی پیدا ہو جائیں۔ عوارف المعارف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے میرے سینے میں ڈالا تھا وہ میں نے ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سینے میں ڈال دیا۔ پس صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے قلوب اس نور سے روشن ہو گئے اور ان کے وجود کے چراغدان منور ہو گئے۔ اس نور کے باعث صحابہ کرامؓ کے بشری صفات بالکل مضمحل ہو گئے اور وہ اعلیٰ درجے کے زاہد، عابد صاحبانِ علم و معرفت، حاملِ فہم و دانش اور موحد کامل ہو گئے۔ ان حضرات کی روشنی تابعین، تبع تابعین تک پہنچی۔ زمانہ بعد میں جس کو یہ روشنی نہ پہنچ سکی ان کو خلوت اختیار کرنے کی نوبت آئی۔ حضرت بایزید بسطامیؒ اس خلوت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بندے کو ایسا وقت ضرور نکالنا چاہیے جس میں اپنے مالک کے سوا کسی اور پر نظر نہ اٹھے۔ آپ فرماتے ہیں کہ جب میں قلبی لگاؤ سے چلا تو منزل تک پہنچ گیا۔ فرمایا کہ نفسانی خواہشات کو چھوڑ دینا بھی واصل الی اللہ بنا دیتا ہے اور جو واصل الی اللہ ہو گیا مخلوق اس کی فرمانبردار ہو جاتی ہے۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا فلسفۂ خلوت و جلوت

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا خیال ہے کہ جلوت میں بندہ زمانے کے تقاضوں کے ساتھ نبرد آزما ہوتا ہے۔ لہذا اسے غیب سے تعبیر کرتے ہیں اور خلوت میں اپنی ہستی کا اثبات پاتا ہے تو یہ حالت اس کی حضور کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یعنی جلوت میں وہ غیب سے متصف ہوتا ہے اور خلوت میں حضور کی حالت کو پاتا ہے۔ بندے کی جلوت اللہ کی صفات کے نور سے روشن ہے اور اس کی خلوت نورِ ذات سے منور ہوتی ہے، گویا کہ وہ جلوت میں صفائے انوار کا مظہر ہوتا ہے اور خلوت میں اللہ تعالیٰ کے ذاتی جلوؤں سے منور ہوتا ہے۔ انسان کی عقل اسے

جلوے کی طرف لاتی ہے اور جذبۂ عشق اسے خدا کی طرف کھینچتا ہے۔ عقل بھی اس کائنات میں اپنا کام دکھاتی ہے اور مادیت کے طلسم کو توڑنے کی کوشش کرتی ہے۔ ایسی عقل کو عقلِ سلیم کہا جائے گا۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اس نظریے کے قائل ہیں کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں کہ وہ تمام کائنات کو مسخر کر سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر چیز کو انسان کی خدمت پر مامور کیا ہے اور انسان کو اپنی شناخت، دوستی اور اپنی طرف ہمہ تن متوجہ رہنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ جب کائنات کی ہر چیز انسان کی غلام اور خادم کی حیثیت رکھتی ہے تو پھر یہ عجیب بات ہے کہ آج دنیا میں مسلمان اس کی غلامی میں کیوں مبتلا ہیں۔ اس دنیا میں رہ کر اس پر حکمرانی نہ کرنا مسلمان کے لئے باعث شرم ہے۔ انسان اپنی قدر و قیمت نہیں جانتا ورنہ یہ لعل و زمرد پتھر کے ٹکڑوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔

بچشمِ عشق نگر تا سراغِ او گیری — جہاں بچشمِ خرد سیمیا و نیرنگ است

(بچشمِ عشق دیکھ تا کہ تجھے اس کا سراغ ملے، عقل کی نظر میں تو یہ جہاں سحر و ساحری ہے۔)

بلند تر ز سپہر است منزلِ من و تو — براہِ قافلہ خورشید میلِ فرسنگ است

(میری تیری منزل آسمان سے بھی بلند تر ہے ورنہ ہمارے قافلے کی راہ میں سورج تو سنگِ میل ہے۔)

ز خود گزشتہ اے قطرۂ محال اندیش — شدن بہ بحر و گہر برنخاستن ننگ است

(ذرہ بھر مشکل سے خائف تو خود کو بھول چکا ہے ورنہ بحر میں رہ کر گوہر نہ بننا تو شرمندگی ہے۔)

تو قدرِ خویش ندانی بہاز تو گیرد! — وگرنہ لعلِ درخشندہ پارہ سنگ است (پ۔م:۳۲۱)

(تو اپنی قدر نہیں جانتا ورنہ لعلِ درخشاں جو پتھر کا ایک ٹکڑا ہے تجھ سے ہی قیمت پاتا ہے۔)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر خلوت میں انسان اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے اور زندہ دل لوگوں کی صحبت میں آ کر خدا کا سراغ حاصل کرلے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ واصل باللہ نہ ہوسکے۔ افسوس تو یہ ہے کہ خدا کی عطا کردہ تمام طاقتوں کا حامل انسان خدا کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا اور خلوت کے بیش قیمت جواہر کو چھوڑ کر دنیا کی حقیر چیزوں کی طرف متوجہ رہتا ہے جبکہ انکی قیمت چند کوڑیوں سے زیادہ نہیں۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

نظر بخویش چناں بستہ ام کہ جلوۂ دوست — جہاں گرفت و مرا فرصتِ تماشا نیست

(میں خود پر اس طرح نظر باندھے ہوئے ہوں کہ جلوہ دوست تو ہر طرف ہے اور مجھے دیکھنے کی فرصت ہی نہیں۔) (ج۔ن:۷۰۵)

بیا کہ غلغلہ در شہرِ دلبراں فگنیم — جنونِ زندہ دلاں ہرزہ گردِ صحرا نیست (پ۔م:۳۲۹)

(اٹھو کہ شہرِ دلبراں میں ہنگامہ بپا کردیں، زندہ دلوں کا جنون صحرا میں آوارہ نہیں ہوتا۔)

شریکِ حلقہ رندان بادہ پیما باش　　حذر ز بیعت پیرے کہ مرد غوغا نیست (ج۔ن:۷۰۵)

(رندانِ بادہ کشوں کے حلقے میں شریک ہو جا۔ ایسے پیر کی بیعت نہ کر جو ہنگامہ سرا نہ ہو۔)

تخلیقی کارناموں کے لئے خلوت لازمی جزو ہے

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے جاوید نامہ میں "محکماتِ عالمِ قرآنی" کو بیان کرتے ہوئے یہ راز افشا کیا ہے کہ خلوت اور کم آویزی کسی چیز کی تخلیق اس کی ضروریات میں شامل نہیں۔ علم کے لئے تخلیق کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ تحقیق بغیر تخلیق ممکن نہیں اور اس کے لئے خلوت درکار ہوتی ہے۔ جب انسان خلوت اختیار کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف دھیان کرتا ہے تو انسان کے سینے میں موجود تمام اسرار اس پر کھلنے لگتے ہیں۔ اس حقیقت کو علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے درجِ ذیل چند اشعار کے علاوہ دیگر بہت سے اشعار میں وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں ہماری تصنیف "رابطۂ شیخ" میں تخلیق پر لکھے گئے باب "صفحہ ۱۹۶" کا مطالعہ فرمائیں۔ چند اشعار خلوت کی مناسبت سے ملاحظہ فرمائیں۔

کھلتے نہیں اس قلزمِ خاموش کے اسرار　　جب تک تو اسے ضربِ کلیمی سے نہ چیرے (ب۔ج:۴۵۹)

پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں　　ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق
انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اس کو　　شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق (ض۔ک:۵۹۱)

علم و ہم شوق از مقاماتِ حیات　　ہر دو می گیرد نصیب از واردات

(علم اور شوق دونوں زندگی کے مقامات میں سے ہیں، ہر دو کا تعلق مشاہدات اور تجربات سے ہے۔)

علم از تحقیق، لذت می برد　　عشق از تخلیق لذت می برد

(علم تحقیق سے لذت پاتا ہے اور عشق تخلیق سے لذت پاتا ہے۔)

صاحبِ تحقیق را جلوت عزیز　　صاحبِ تخلیق را خلوت عزیز
در نگر ہنگامۂ آفاق را　　زحمتِ جلوت مدہ خلاق را (ج۔ن:۶۵۸)

(پس تو ہنگامہ آفاق کو دیکھ کر اس کے خلاق کو جلوت کی زحمت نہ دے۔)

خلوت کے فوائد

خلوت میں عبادت کی کثرت، زبان اور حواس کا فضول حرکت سے بچنا، دنیا کے اختلاط سے محفوظ رہنا جمعہ اور جماعت کے لئے مستعد ہونا میسر ہوتے ہیں۔ عام دنیادار آدمی ان تمام خوبیوں میں کمال حاصل نہیں کر سکتا۔ حدیث شریف میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا۔ "میں اُس وقت بھی نبی تھا جب آدم علیہ السلام ابھی پانی اور مٹی کے درمیان تھے (المدخل، ج ۲)" گویا اس عالم میں ظہور اس حالت میں ہوا تو خلوت اختیار

فرمانے کے بعد نبوت کا ظہور ہوا۔ اسی طرح ولایت ولی میں پوشیدہ رہتی ہے مگر اس کے ظاہر ہونے کے لئے گوشہ نشینی کی حاجت رہتی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ سونا اور چاندی کو پہاڑوں کی کان سے نکالنے کے لئے سخت محنت اور مشقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح انسان میں مخفی اسرار مشقت اور مجاہدہ کے بعد ہی چمکتے ہیں۔

خلوت میں ہمہ وقت باوضو رہنا، نماز روزہ کی پابندی کرنا اور شہوات ولذات کو چھوڑ کر مراقبہ وحضور اور مناجات میں مصروف رہنا، یہ سب باتیں خلوت کے بغیر ادھوری رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خلوت کے ذریعے جمعیتِ قلبی یعنی خلوت درجلوت حاصل کرنیکی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان ہے کہ جب قلب متمکن الحال بن جاتا ہے تو اس کے لئے خلوت اور جلوت دونوں برابر ہو جاتے ہیں اور ایسی حالت میں انسان کو آدمیوں میں رہنا اور ان کے ساتھ اختلاط کرنا نقصان نہیں پہنچاتا۔ انہیں معنوں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگوں سے ملنے جلنے والا مسلمان یکسو رہنے والے مسلمان سے بہتر ہے۔ (کیونکہ وہ خلوت کی دولت سے پورا حصہ حاصل کر چکا ہے۔)

سورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۲۴ میں ہے ''جس نے منہ پھیرا میری یاد سے تو اس کے لئے زندگی (کا جامہ) کو تنگ کر دیا جائے گا اور ہم اسے اٹھالیں گے قیامت کے دن اندھا کر کے۔''

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''جو شخص بنا رہا اس دنیا میں اندھا وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔'' (بنی اسرائیل ۸۲)

دنیا میں صرف وہی شخص دانا و بینا ہے جو اپنی خلوتوں کو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے روشن کرے اور اپنے باطنی حواس کو گناہوں سے محفوظ رکھے۔ قرآن میں حضرت ابراہیمؑ کا قول خلوت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ''میں جا رہا ہوں اپنے رب کی طرف وہ میری راہنمائی فرمائے گا'' (الصّٰفّٰت:۹۹)

حضرت مریم علیہا السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے خلوت نشینی کے متعلق بھی قرآن کریم میں واضح اشارات موجود ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ انبیائے کرام یعنی داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام اور دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کے متعلق بھی خلوت نشینی کے حوالہ جات ملتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے وفات کے بعد اپنے عصا کی ٹیک پر ایک سال قیام فرمایا جس کو دیکھ کر جنات بیت المقدس کی تعمیر میں مشغول رہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنات کو اس بات کا علم تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام پہلے بھی طویل عرصے کے لئے خلوت میں وقت صرف کرتے تھے۔

خلوت کی مقدار

احادیث میں آیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ارشاد فرمایا کہ تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے اور فرمایا کہ شب بیداری بھی کرو اور نیند کا آرام بھی حاصل کرو اور اگر

نفس پر سخت گرفت کروگے تو وہ اسکی برداشت سے باہر ہو جائے گا اور صبر نہ کر سکے گا۔ اگر نفس نے بغاوت کی تو یہ خلوت سے بالکل ہی متنفر بنا دے گا۔ چنانچہ صوفیائے کرام نے بقدر ہمت ہی خلوت کو پسند فرمایا ہے۔

بعض مشائخ نے خلوت کی مقدار چالیس روز مقرر فرمائی ہے اور اس کی بنیاد حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی وہ روایت ہے جس میں حضور اکرم ﷺ کا فرمان منقول ہے "کہ جو شخص چالیس دن حق تعالیٰ کے ساتھ اخلاص کا برتاؤ کرے گا تو حکمت کے چشمے اس کے دل اور زبان سے ظاہر ہونے لگیں گے"۔ بعض حضرات نے خلوت کی مقدار حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کے مطابق ایک ماہ رکھی ہے۔ قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کوہ طور پر چالیس دن کا عرصہ کاٹنا بھی ثابت ہے اور صوفیائے کرام کے چلے بھی چالیس دن کی مقدار پر دلالت کرتے ہیں کیونکہ چلے کا لفظ چالیس دن کے عرصے گزارنے کے عمل کو ظاہر کرتا ہے۔

بعض صوفیائے کرام نے خلوت کے لئے زیادہ لمبے عرصے کو اختیار کیا ہے حتیٰ کہ بارہ سال اور چالیس سال تک کا عرصہ خلوت میں گزارنے کی روایات بھی ملتی ہیں اور حقیقت یہی ہے کہ جس صوفی کا جیسا عزم ہو وہ اتنا عرصہ ہی خلوت میں گزارتا ہے۔ اعتکاف میں بھی (جس کی حیثیت سنت کفایہ بتائی جاتی ہے۔) خلوت کی مدت نو سے دس دن تک پائی جاتی ہے۔ بالآخر یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ خلوت کی مدت کا طول اس قدر مقرر کرنا چاہیے کہ جس سے اخلاقِ رذیلہ کا خاتمہ ہو جائے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے عرصہ چالیس سال تک خلوت اختیار کی۔ جب آپؒ نے ایک مدت خلوت کو اختیار کیا تو معلوم ہوا کہ کچھ اخلاقِ رذیلہ کی بو ابھی تک ان میں پائی جاتی تھی چنانچہ آپؒ نے دو دو سال کا مزید عرصہ ان رذائل میں سے ہر ایک کو دور کرنے کے لئے صرف کیا۔

(۵) دوامِ ذکر

پانچویں شرط دوام ذکر ہے اور دوامِ ذکر سے مراد ہے کہ مرید کو ذکر خفی یا بالجہر جیسا بھی تلقین کیا گیا ہے ہمیشہ کرتا رہے۔ جب ذکر کرنے والا ایک مدت تک پورے حضور اور کامل تعظیم کے ساتھ ذکرِ ربانی پر مداومت رکھتا ہے تو ذکرِ قلبی کے ساتھ دل کو اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ ذکر کے بہت سے درجات اس کتاب کے ایک الگ باب میں بیان کر دیئے گئے ہیں لہٰذا اس جگہ زیادہ تفصیل میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں۔

منقول ہے کہ بایزید رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا کہ معرفت کی حقیقت کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ حیرت و پریشانی بذکر الٰہی یعنی اللہ تعالیٰ کے کمال حضور کے سبب ذکر کو بھی حیرانی جاننے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے غفلت کا نام جہل ہے۔ حضرت نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ سالک پر ایک ایسا وقت آتا ہے کہ ذکرِ لسانی سے وہ پریشان ہونے لگتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا حضور نصیب ہونے سے اس کا ذکر اس کی زبان پر سوائے عبادت کے جاری نہیں ہوتا۔ صوفیا کا قول ہے کہ اپنے دل سے فتویٰ لے اگرچہ لوگ تجھے فتویٰ

دے چکے ہوں۔ یہاں پر آ کر ذکرِ حقیقی شروع ہو جاتا ہے۔ ذکر سے باز آنے سے مراد یہ ہے کہ وہ ذکر صوری سے باز آ جاتا ہے۔ اسی لئے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ زبان کا ذکر لقلقہ (بکواس) ہے اور قلب کا ذکر وسوسہ ہے یہ اس لئے کہا کہ جو ذکر ذاکر اور مذکور کی خبر دے (خواہ وہ کوئی ذکر ہو) وہ ذکر نہیں۔ اصل ذکر ذاکر کا مذکور (یعنی اللہ تعالیٰ) میں فنا ہو جانے کا نام ہے۔

ذکر کی مزید تفصیل کے لئے اس کتاب کی دوسری جلد میں بابِ ذکر ملاحظہ فرمائیں۔

۶۔ خواطر کی نفی

خواطر کی نفی پر بات کرنے سے پہلے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ واردات اور خواطر کے کیا معنی ہیں۔

وارد کی تعریف

خواطر پر بات کرنے سے پہلے وارد کی تعریف جاننا ضروری ہے۔ یہ سمجھ لینا چاہئے کہ خاطر اس وارد کا نام ہے جو دل میں خطاب کی صورت میں آتا ہے۔ وارد وہ چیز ہے جو بندے کے کسب کے بغیر قلب پر نازل ہو۔ مثلاً حزن (غم)، قبض اور بسط وغیرہ کہ بعض دفعہ سالک پر طاری ہوتا ہے اور سالک کو اس کی وجہ بھی معلوم نہیں ہوتی۔

خواطر کی اقسام

خطرہ ایک قسم کے خطاب کو کہتے ہیں جو انسان کے ضمیر پر وارد ہوتا ہے۔ (یعنی دل میں کسی خطاب کا القا ہونا) اگر یہ خطاب نفس کی جانب سے ہو تو یہ خطرۂ نفسانی کہلاتا ہے اور اسے "ہواجس" بھی کہتے ہیں۔ اگر خطاب شیطان کی جانب سے ہو تو یہ خطرۂ شیطانی ہے جسے "وسواس" بھی کہتے ہیں۔ خطاب اگر فرشتے کی جانب سے ہو تو خطرۂ ملکی ہے اور اسے الہام بھی کہتے ہیں۔ اگر خطاب حق تعالیٰ کی جانب سے ہو تو یہ خطرہ ربانی ہے جو اس شان سے وارد ہوتا ہے کہ بندے کو مغلوب کر لیتا ہے اور اس کا دفعیہ کرنا محال ہوتا ہے۔ خطرہ کو خاطر بھی کہتے ہیں۔ (سرِّ دلبراں)

سالک خواطر کا لحاظ رکھتا ہے۔

سالک کے دل پر جو خواطر وارد ہوں ان کو تولنا چاہیئے پس وہ فرض واجب، سنت اور مستحب کو جاری رکھے اور اگر حرام اور مکروہ ہو تو دور کرے۔ مباح میں وہ جانب اختیار کرنا بہتر ہے جس میں نفس کی مخالفت ہو۔ انسان کے ضروری حقوق کی رعایت کرنے میں بہتری ہے۔ مثلاً نکاح یا غذا کا حق ادا کرے اور حظوظ جو حقوق سے زیادہ ہوتے ہیں ان کو دفع کرتا رہے۔ صوفیہ نے خطرۂ واجب کو خطرۂ حقانی، حرام کو خطرۂ شیطانی، مستحب کو

خطرۂ ملکی اور مکروہ کو خطرۂ نفسانی کہا ہے۔ صوفیہ نے خطرۂ مباح کو خطرہ ہی نہیں کہا۔ بعض صوفیہ نے خاطر روح اور قلب (کا اضافہ کیا ہے اور ان) کو خاطر ملکی میں داخل کیا ہے۔ خاطر شیخ بھی ایک خطرہ مانا گیا ہے۔ خاطر عقل اگر خاطر روح اور قلب کی امداد کرتا ہے تو تب تو یہ ملکی ہے اور اگر نفس وشیطان کی مدد کرتا ہے تو خطرۂ شیطانی ہے۔ خاطر شیخ ایک قسم کی اعانت ہے کہ شیخ اپنی ہمت کے واسطے سے اپنے مرید کے قلب تک پہنچتا ہے۔ جب مرید کو کوئی مشکل درپیش ہو تو مرید شیخ کی طرف توجہ کرتا ہے تو فوراً وہ مشکل بعونہ تعالیٰ حل ہو جاتی ہے۔ خاطرِ یقین بھی ایک وارد ہے جو دل میں آتا ہے اور شک یا وہم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہ بھی خطرۂ ربانی میں داخل ہے۔ سالک کو چاہیئے کہ جملہ خواطر کی نفی کرے کیونکہ خواطر پیدا کرنا ذکر میں انہماک کی لذت کو سلب کر لیتے ہیں۔ مال' گھر' بیوی' بچے وغیرہ ذکر کو خراب کر دیتے ہیں۔

خطرۂ نفسانی

نفس کی فطرت یہ ہے کہ اس میں ممنوعہ لذات کا شوق ابھرتا ہے اور شہوات پر آمادگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ خطرات اگر دل میں آ جائیں تو کافی دیر پا ہوتے ہیں کیونکہ نفس ضدی ہے اور لذاتِ نفسانی پر اڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ بعض انسان گدھے سے بھی بدتر ہوتے ہیں کیونکہ گدھا جب کسی دلدل میں پھنس جائے تو اس میں سے باہر نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے لیکن انسان جب کسی اخلاقی دلدل میں پھنس جائے تو نہایت مطمئن ہو کر وہیں ڈیرے ڈال دیتا ہے اور باہر نکلنے کی کوشش نہیں کرتا۔

خطرۂ شیطانی میں معصیت کی خواہش دل میں پیدا ہوتی ہے' یہ خطرہ آتا ہے اور جلد چلا جاتا ہے۔ کیونکہ شیطان کا مقصد بندہ کو صرف معصیت میں مبتلا کرنا ہوتا ہے۔ اس کو اس سے بحث نہیں کہ بالتخصیص کوئی معصیت ہو۔ کوئی سی بھی معصیت ہو اس میں بندہ کو مبتلا کر دینے سے اس کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ شیطانی خطرہ کے متعلق قرآن کریم میں ارشاد ہے اور جو شخص (دانستہ) اندھا ہے رحمٰن کے ذکر سے تو ہم مقرر کر دیتے اس کے لئے ایک شیطان۔ اور حدیث شریف میں ہے کہ شیطان انسان کے دل میں اپنی چونچ بٹھائے رکھتا ہے اور جب انسان ذکر کرے بھاگ جاتا ہے۔ اس لئے وہ یکے بعد دیگرے متعدد مزید مختلف خطرات پیش کرتا ہے تاکہ ایک میں نہیں تو دوسرے میں اور دوسرے میں نہیں تو تیسرے میں بندہ مبتلا ہو۔ برعکس خطرات نفسانی کے خطرات شیطانی میں قیام نہیں ہوتا۔

خطرۂ ملکی یہ خطرہ عبادت وطاعات کی طرف آمادگی کا اظہار کرتا ہے اور نیکیوں سے رغبت اور معاصی ومکروہات سے بچاؤ کرتا ہے۔ یہ خطرہ گناہوں کے ارتکاب اور عبادات میں کاہلی پر ملامت کرتا ہے۔ شیطان کا اثر انسان کو گناہوں سے لذت دلاتا ہے۔ اور فرشتے کا اثر حق کی تصدیق کرتا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ دیرپا

نہیں ہوتا' آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ اس لئے جب کوئی خطرۂ ملکی وارد ہو تو ہر طرف سے توجہ کو ہٹا کر اس کی جانب فوراً رجوع ہو جانا چاہیے ورنہ وہ جاتا رہے گا۔

خطرۂ رحمانی کو خاطرِ حق بھی کہتے ہیں جو حق تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتا ہے۔ یہ ایک علم ہے جو حق تعالیٰ اہلِ حضور کے دلوں کو غیب سے بلاواسطہ عطا کرتا ہے۔ محبت الٰہی کو بھڑکانے اور عرفان کا شوق ابھارنے اور ہمیشہ مشاہدہ حق میں رہنے کا شوق پیدا کرنے آتا ہے۔ یہ خطرۂ مبارک جب آجاتا ہے تو جانے کا نام نہیں لیتا اور دل میں مستقل قیام اختیار کر لیتا ہے۔ کوئی وجہ اس کے متغیر کرنے کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ یہ خطرہ دل کو غیر کی جانب متوجہ نہیں ہونے دیتا۔

خاطرِ اول وہ ہے جو دل میں سب سے پہلے کسی امر کے متعلق گزرتا ہے۔ اسی کو خاطر ربانی یا ہاجس یا سبب اول یا نقر خاطر بھی کہتے ہیں اور اس میں خطا کا کبھی احتمال نہیں ہوتا، جب وہ خطرہ قوی ہو کر نفس میں متحقق ہو جاتا ہے تو اسے ارادہ کہتے ہیں۔ جب تردد اور غور و خوض اور مزید چھان بین سے اس میں پختگی پیدا کر لی جاتی ہے تو اسے ہمت کہتے ہیں۔ اس میں جب اور بھی مضبوطی آجاتی ہے تو اس کا نام عزم ہو جاتا ہے جب دل میں اس عزم کے عمل میں لانے کا خیال پیدا ہوتا ہے تو قصد کے نام سے اسے موسوم کرتے ہیں۔ جب اس کام کو شروع کرنے لگتے ہیں تو قصد نیت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

خواطر شیطانی اور خواطر ملک میں فرق

خواطرِ حق کا مقابلہ تو کوئی شے نہیں کر سکتی اور جب اس کا غلبہ ظاہر ہوتا ہے تو بدن کے سارے اجزاء اس کے تابع ہو جاتے ہیں اور دوسرے سارے خطرات نابود ہو جاتے ہیں۔ خطرہ ملکی کو خطرۂ نفسانی اور خطرۂ شیطانی دور کر دیتا ہے۔ خطرۂ نفسانی اور خطرۂ شیطانی میں فرق یہ ہے کہ خطرۂ نفسانی ذکر کے نور سے قطع نہیں ہوتا اور نفس ذکر کے باوجود بھی اپنے مطلوب کا تقاضا کرتا رہتا ہے۔ البتہ اگر توفیق ازلی دستگیری کرے تو اس کے تقاضے کی رگ کاٹ دیتا ہے۔ خطرۂ شیطانی ذکر کے نور سے ختم ہو جاتا ہے۔ البتہ دوبارہ پھر آسکتا ہے اور بعض دفعہ ذکر کو بھی بھلا دیتا ہے۔ اسی حقیقت کا ذکر اس حدیث میں ملتا ہے جس میں یہ فرمایا گیا'' کہ ذکر کے وقت شیطان بھاگ جاتا ہے اور غفلت کے وقت انسان کے دل میں چونچ رکھ دیتا ہے اور طرح طرح کے وسوسے پیدا کرتا ہے'' خطرۂ ملکی کی بندہ کبھی موافقت کرتا ہے اور کبھی نہیں کرتا۔ (کبھی فرشتہ دل میں یہ القاء کرتا ہے کہ فلاں نیک کام کر تو کبھی وہ بندہ نیک کام کر لیتا ہے اور کبھی نہیں بھی کرتا) مگر بندہ خطرہ حق کی مخالفت کسی طرح نہیں کر سکتا۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ خطرہ حقانی تو ایک تنبیہ ہے اور خطرۂ ملکی عبادت کا مطالبہ ہے جبکہ خطرۂ نفسانی لذتوں کی خواہش ہے اور خطرۂ شیطانی گناہ کے کاموں کو خوشنما بنا دیتا ہے۔

مذکورہ بیان کے بعد یہ جاننا چاہیے کہ سالک توحید کے نور سے واردات حقانی کو قبول کرتا ہے اور جب معرفت کا نور آئے تو خطرۂ ملکی کو قبول کرتا ہے اور نفس کو ڈانٹتا اور جھڑکتا ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ خطرۂ رحمانی وہ ہدایت ہے جو اسرار کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ خطرۂ ملکی طاعات کا راستہ دکھاتا ہے۔ خطرۂ نفسی دنیا اور جاہ دنیا کی طرف کھینچتا ہے اور خطرۂ شیطانی گناہوں اور شہوات کی طرف لے جاتا ہے۔ خطرۂ ربانی بلا واسطہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے اور دوسرے خطرات بواسطہ فرشتہ، نفس اور شیطان کے آتے ہیں۔ باعتبار ادب دوسرے خطرات کی بھی حق تعالیٰ کی طرف نسبت نہیں کرنی چاہئے۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی مدد کرنا چاہے تو اس کو اپنی بارگاہ کا قرب بخشتے ہیں اور اس سلسلے میں کبھی فرشتے اس کے قلب پر نازل کرتے ہیں تاکہ اس کی روح اور قلب قوی ہو جائے اور خاطر رحمانی کے قابل ہو جائے مگر جب کسی کو دور فرمانا چاہے تو اس پر گروہ شیاطین کو بھیج دیتا ہے جو اس کے نفس کی مدد کرتے ہیں اور انسان سفلی مرکز کی طرف چلا جاتا ہے۔ اس طرح اس میں خطرات نفسانی ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ جان لینا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ مدد بندے کے نیکی یا بدی کی طرف میلان رکھنے کی وجہ سے آتی ہے جو حق کا متلاشی ہے اس کو حق کی طرف رہنمائی کرتے ہیں ورنہ دوسری صورت میں وہ بہک جاتا ہے۔

نور و ظلمات کے ستر ہزار پردوں کو منکشف کرنا

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس راستے کو ہم طے کرنے کے درپے ہیں وہ سارا سات قدم ہے۔ جس طرح انسان کے سات لطیفے ہیں۔ دو قدم تو عالمِ خلق میں ہیں جو قالب (بدن) اور نفس سے تعلق رکھتے ہیں اور پانچ عالم امر میں ہیں۔ جو قلب، روح، سر، خفی اور اخفیٰ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان سات قدموں میں سے ہر قدم میں دس ہزار حجابات اٹھاتے ہیں۔ یہ حجابات نورانی ہوں یا ظلمانی۔

اِنَّ لِلّٰهِ سَبْعِيْنَ اَلْفَ حِجَابٍ مِّنْ نُّوْرٍ وَّظُلْمَةٍ "بے شک اللہ اور بندے کے درمیان ستر ہزار پردے ہیں نور اور ظلمت کے۔"
(مسلم کتاب الایمان، مقدمہ ابن ماجہ، مسند احمد، طبرانی)

اول قدم میں جو عالم امر میں رکھتے ہیں تجلی افعال ظاہر ہوتی ہے۔ دوسرے قدم میں تجلی صفات تیسرے قدم میں تجلیات ذاتیہ کا آغاز ہوتا ہے پھر تجلیات کے فرق کے مطابق آگے ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔ ان سات قدموں میں اپنے سے دور اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ان قدموں کے مکمل ہونے سے قرب الٰہی بھی مکمل ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ فنا اور بقا سے مشرف کر دیئے جاتے ہیں اور ولایت خاصہ کے درجے تک پہنچا دیئے جاتے ہیں۔ سلسلہ نقشبندیہ میں اس سیر کی ابتدا عالم امر سے کی جاتی ہے اور عالم خلق کو اس ضمن میں طے کر لیا جاتا ہے۔ کچھ صوفیاء نے سات لطائف میں سے ہر لطیفہ کو عالم مثال

میں ان کے مناسب انوار میں سے کسی ایک نور کی صورت میں قرار دیا ہے اور ہر لطیفہ کی صفائی کی علامت ان انوار مثالی میں سے کسی نور کے ظہور کو مقرر کیا ہے۔ مثلاً صفائی قلب کی علامت نور سرخ، صفائی روح نور زرد رنگ، صفائی سر سفید رنگ، خفی سیاہ رنگ اور صفائی اخفیٰ کو نور سبز رنگ کی صورت قرار دی ہے۔

جب سیر کی ابتدا عالم امر سے ہوتی ہے تو سالک اپنے اندر لذت اور حلاوت پاتا ہے جو جذبہ اور کشش کا ہراول دستہ ہے اور مجدد صاحب "فرماتے ہیں کہ اگر یہ اثر پیدا نہ ہو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سالک میں عالم امر عالم خلق کی نسبت کمزور ہے اور یہ کمزوری راہ کی رکاوٹ ہے۔ یہ اس وقت تک رہتی ہے جب تک عالم امر عالم خلق پر غلبہ اور قوت حاصل نہ کر لے اور معاملہ برعکس نہ ہو جائے۔ اس ضعف یا کمزوری کا علاج یہ ہے کہ کمل تصرف والا مرشد پورے تصرف سے کام لے۔ نقشبندی سلسلہ کے علاوہ اس کا علاج یہ ہے کہ پہلے تزکیہ نفس کیا جائے اور ریاضت اور مجاہدات شاقہ موافق شریعت کیے جائیں۔ لکھتے ہیں کہ یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ دیر سے حلاوت اور اثر کا پیدا ہونا استعداد کے ناقص ہونے کی علامت نہیں بلکہ کئی دفعہ کمل استعداد والے بھی اس آفت میں مبتلا اور گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اس کا علاج کوشش اور توجہ مرشد سے ہوتا ہے۔ حوصلہ ہار کر راہ سلوک چھوڑ نہیں دینا چاہیے۔ بعض اوقات تو تصور شیخ سے بہت سے معاملات درست ہو جاتے ہیں۔ مندرجہ بالا ستر ہزار پردوں کو عظمت کی وجہ سے پردہ کعبہ اسرار بھی کہہ دیتے ہیں اگر ان پردوں کو اٹھا دیا جائے تو سارا عالم خاکستر ہو جائے جیسا کہ سائنس نے انکشاف کیا ہے کہ اگر O3(OZONE) کی (LAYER) نہ ہو تو اس میں سے رک جانے والی U.V. RAYS سے دنیا والوں کو SUN STROKE ہو جائے۔ یہ گیس نقصان دینے والی گرمی کو روک لیتی ہے۔ باقی پردوں کا تصور اس O3 کے پردے سے کیا جا سکتا ہے۔

یہ پردے انوار رحمانیہ اور ظلمات نفسانیہ ہیں۔ (یعنی حواس خمسہ اخلاق ذمیمہ، نفس ہوا و ہوس، شہوت اور شیطانی وغیرہ) پاک نفس چونکہ ظلمت اور کدورت سے طبعی طور پر متنفر ہوتا ہے اور انوار سے مانوس ہوتا ہے اس لئے ظلماتی پردوں کا اٹھا دینا ذاکر پر آسان ہوتا ہے اور نورانی پردوں کا اٹھانا دشوار ہوتا ہے۔

دس ہزار پردہائے ظلمت لطیفہ قالب (جو سالک کا وجود ہے۔) خاکی رنگ کے ہوتے ہیں اور یہ پردے ہیشگی ذکر کی وجہ سے نظر آ جاتے ہیں اور جب ذکر کی وجہ سے جسم صالح ہو جاتا ہے تو یہ پردے اٹھ جاتے ہیں۔ دس ہزار پردے آسمانی رنگ کے ہوتے ہیں جو نفس کے تزکیہ سے اٹھ جاتے ہیں۔ لطیفہ قلب کے پردے غذا کے پرہیز سے اٹھ جاتے ہیں ورنہ دھوئیں کی آمیزش ہو جاتی ہے اور جلد اوپر نہیں چڑھتے۔

حضرت نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص ان رنگوں سے متصف ہوگا خواہ سالک قصد کرے یا نہ کرے مقام فنا پر ضرور پہنچ جائے گا۔ مولانا امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ رنگ بے حد دشواری اور بے حد مجاہدہ کے بعد ظاہر ہو جاتے ہیں اور یہ پردے اٹھ جانے کے بعد ساتوں لطیفوں کے انوار مشاہدہ میں آنے لگتے

ہیں اور سالک لطیفۂ قالب میں جنات کو، لطیفۂ نفس میں دوزخ کو، لطیفۂ قلب میں جنت کو لطیفۂ سر میں فرشتوں کو لطیفۂ روح میں اولیائے کرامؒ کو، لطیفۂ خفی میں انبیائے کرامؑ کو لطیفۂ اخفیٰ میں فخر رُسل ﷺ کا مشاہدہ کرتا ہے۔اس کے بعد نور علی نور تجلی فرماتے ہیں اور سلوک مکمل ہو جاتا ہے اور طالب کی سیر جذبہ جلیلہ (کھلا جلوہ) کے ساتھ بدل جاتی ہے۔جب سالک حق تعالیٰ کی محبت میں سلوک اختیار کرتا ہے اور عبادت میں مشغول ہو جاتا ہے۔(نماز روزہ طہارت لطافت وغیرہ) تو اس کو جذبہ خفی اور سیر الی اللہ کہتے ہیں جو محض اتباع سنت سے ہی حاصل ہو جاتا ہے۔اگر طالب صادق چالیس روز متواتر شرائط کا پابند رہے تو مکاشفات کا دروازہ اس پر کھل جاتا ہے اول انوار کا پھر فرشتوں کا پھر صفات کا مشاہدہ ہوگا۔یہ حال ابتداء کا ہے اور جب سالک بلند ہو جاتا ہے تو حق ہی حق ملاحظہ کرتا ہے اور اس کو نہایت سلوک کہتے ہیں۔بشرطیکہ کسی بزرگ سے پوچھے اور پھر عمل کرے۔

(۷) شیخ کے ساتھ پوری ارادت

ساتویں شرط پوری ارادت سے اپنے شیخ کے ساتھ ربط قائم رکھنا ہے کیونکہ شیخ کے ذریعے تمام منازل کا طے کرنا وابستہ ہے۔شیخ وہ ہے جو حق کا راستہ دکھاتا ہے اور مرید کو تمام روحانی مقامات سے آگاہ کرتا ہے۔شیخ کی صحبت سے عطر اگر نہ بھی ملے تو کم از کم خوشبو تو ضرور آئے گی۔اس سلسلے میں ضرورت شیخ کے باب میں بہت بیان گزر چکا ہے وہاں ملاحظہ فرمائیں۔سالک کو معلوم ہونا چاہیے کہ بیعت کرنا کیوں ضروری ہے اور اس سے کیا سیکھا جاتا ہے۔شیخ طریقت کی صفات کیا ہیں اور اس کی تلاش کس طرح کی جاتی ہے۔طریق سلوک شیخ کے ذریعے کیسے حاصل کیا جاتا ہے اور اس راہ سلوک کی ضروریات کیا ہیں۔یہ پوری کتاب ہی طریقت اور سلوک کے حصول کی راہوں کو آشکار کر رہی ہے۔

(۸) ترکِ اعتراض الی اللہ

دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر نہیں۔ہماری تصنیف ''نشانِ منزل'' میں دو عنوان اس سلسلے میں قابل مطالعہ ہیں۔ایک عنون ''ہمارے اعمال میں ارادہ الٰہی کا دخل'' اور دوسرے عنوان ''انسان کن باتوں پر قادر ہے'' ان دونوں عنوانات کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کام کے لئے حکم دیتا ہے تو اس کام کا ہو جانا اللہ تعالیٰ کے ارادے پر موقوف ہوتا ہے، کام وہی انجام کو پہنچتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا حکم تکمیل بھی ہو اور اس کام کے ہونے کا وہ ارادہ بھی کرے۔مثلاً آدم علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ دانہ نہ کھائیں لیکن اللہ تعالیٰ نے دانہ نہ کھانے کا ارادہ نہیں کیا لہٰذا آدم علیہ السلام نے دانہ کھا لیا۔حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا تجزیہ یوں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے حکم کے جاری ہونے پر عذاب نہیں دیتا بلکہ حکم کی مخالفت

پر عذاب دیتا ہے اگر کوئی بھول چوک کر خطا کرے تو اللہ تعالیٰ معاف بھی فرما دیتا ہے۔ آدم علیہ السلام نے قصداً حکم عدولی نہیں کی۔ بلکہ ان کے اجتہاد میں خطا ہوئی اور اجتہادی خطا بھی گناہ نہیں ہوتی۔ آپ علیہ السلام نے صرف یہی سمجھا کہ دانہ نہ کھانے کی معمولی سی ممانعت یعنی ممانعت تنزیہی (معمولی) نوعیت کی ہے۔ اگر آپؑ اس خطا کو تحریمی سمجھتے تو کبھی خطائے تحریمی کے مرتکب نہ ہوتے کیونکہ انبیائے کرامؑ خطائے تحریمی کا ارتکاب نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا۔ (طٰہٰ: ۱۱۵) ''سو وہ بھول گیا اور نہ پایا ہم نے (اس لغزش میں) اس کا کوئی قصد''

چنانچہ

ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ (طٰہٰ: ۱۲۲) ''پھر (اپنے قرب) کیلئے چن لیا انہیں ان کے ربّ نے''

مذکورہ بالا واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام امور منجانب اللہ ہوتے ہیں اور اگر کوئی معیوب بات نظر آئے تو اس کو کسی غلطی کی طرف منسوب کرنا چاہیے اور اس کا الزام خدا پر رکھنا مناسب نہیں۔ مثال کے طور پر اگر کسی ملک پر کوئی ظالم، جابر بادشاہ مسلط کیا جاتا ہے تو اس کو مکافاتِ عمل پر محمول کیا جائے گا کہ اس ملک کے باشندے اللہ کی نافرمانی پر قائم تھے۔ اسی وجہ سے ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظالم اور جابر بادشاہ مسلط کیا گیا۔ کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ظالم اور جابر بادشاہ کیوں مقرر کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہاں کے لوگ ہی اسی طرح کے بادشاہ کے لائق تھے اور یہ ان کا اپنا ہی قصور ہے کہ ایسا بادشاہ ان پر مسلط کیا گیا۔ اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کو غلط نہ تصور کیا جائے بلکہ اپنی غلطی کو معلوم کرنا ضروری ہے کہ جس کے باعث اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا حکم نازل ہوا۔

اللہ والے تو اپنے کسی کام میں اپنی مرضی کو مقدم نہیں رکھتے بلکہ جو خدا کی رضا ہو وہی مقدم ہوتی ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ سخت بیمار ہوئے تو ایک بزرگ جوان کی عیادت کو آیا حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کرنے لگا کہ آپؒ اللہ تعالیٰ سے عرض کریں کہ وہ آپ کو ٹھیک کر دے۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی تھی کہ وہ مجھے تندرست کرے تو اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم ہماری مخلوق ہو اور ہم اپنی مخلوق سے جو چاہیں سلوک کریں۔ تم اس میں دخل دینے والے کون ہوتے ہو؟ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ تعالیٰ کے اس جواب سے مکمل اتفاق کیا اور چپ ہو گیا۔ اس راویت سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق سے جو وہ چاہے رویہ اختیار کرنے کا حق رکھتا ہے۔ کسی کے اعتراض کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ حضرت رابعہ بصریؒ کا قول ہے کہ اگر کوئی یہ معلوم کرنا چاہے کہ خدا اس سے راضی ہے تو پہلے اسے یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ خدا سے راضی ہے یا نہیں۔ آپ رحمۃ اللہ علیہا نے فرمایا کہ اگر تم خدا سے راضی

ہو تو سمجھ لو کہ خدا بھی تم سے راضی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ والے خدا کے کسی حکم پر اعتراض نہیں کرتے۔ راقم الحروف کی ایک نعت کے پہلے دو اشعار اس حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں۔

منظورِ حق جو ہے، وہی منظور ہے ہمیں کس سادگی سے ہم نے خدا کو منا لیا
تم مان۔جاؤ گے تو خدا مان جائے گا گویا کہ ایسے تم نے خدا کو منا لیا (از مصنف)

کسی حال میں بھی حق تعالیٰ پر اعتراض کرنا درست نہیں۔ تنگی ہو یا فراخی انشراحِ قلب ہو یا بسط، تندرستی ہو یا بیماری، امارت ہو یا غربت، ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو مہربان ہی تصور کرنا چاہیے۔ اپنی تمام حالتوں کو اس کے حوالے کر دینا اولیائے کرام کا معمول ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان اور شفیق ہے اور آسمان اور زمین کے تمام ذرات کے نقصان کو اچھی طرح جانتا ہے تو پھر اس سے کسی قسم کی خطا کا تصور کرنا حماقت سے زیادہ کچھ نہیں۔ اپنے ہر کام کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جائد کی گئی قضا و قدر پر گردن رکھ دینا ہی اللہ تعالیٰ کو تسلیم کر لینے کے مترادف ہے۔ جیسے کہ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۳۱﴾ (البقرہ:۱۳۱)

"اور یاد کرو جب فرمایا اس کے رب نے (اے ابراہیم علیہ السلام) گردن جھکا دو عرض کی میں نے اپنی گردن جھکا دی سارے جہانوں کے پروردگار کے سامنے"

سلوک میں سَیر سے کیا مراد ہے؟

سالک کا ایک حال، مقام، فعلی یا تجلی سے دوسرے حال مقام، فعلی یا تجلی تک منتقل ہونے کو سیر یا طیر کہتے ہیں۔ جس کا بیان "سلوک سے کیا مراد ہے؟" کے ضمن میں اسی باب کے اوائل میں گزر چکا ہے۔ سلوک میں کئی انواع کی سیروں کا ذکر آتا ہے جن کی مختصر تعریف نیچے دی جا رہی ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

سَیر الی اللہ

سرِّ دلبراں میں ہے کہ انسان کا (جو کہ خلاصہ تعینات مکسرات ہے) سیر شعوری و رجوعی کے ساتھ بجانب کلی جو کہ واحدِ مطلق ہے یعنی بمقام احادیث وصول یاب ہونا سیر الی اللہ ہے۔ (اس سے مراد یہ ہے کہ اپنے شعور کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی جانب رجوع کرنا سیر الی اللہ ہے۔)

امداد السلوک میں ہے جب اللہ کی محبت میں کوئی سالک سلوک کی راہ میں عبادتوں (نماز، روزہ، طہارت و لطائف) میں مشغول ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا قرب تلاش کرتا ہے تو سلوک کی راہ پر چلنا ممکن نہیں۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي　"اے محبوب: آپ فرمایئے (انہیں کہ) اگر تم (واقعی) محبت کرتے ہو اللہ سے تو میری پیروی کرو"۔　(آل عمران: ۳۱)

چنانچہ اس جذبہ محبت اور اتباع کے بغیر واصل باللہ ہونا ممکن نہیں۔ حضرت امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر طالب صادق چالیس روز متواتر شرائط سلوک پر کاربند رہے تو مکاشفات کا دروازہ اس پر کھل جائے گا۔ عموماً اس راہ پر انوار روحانی نظر آتے ہیں پھر فرشتوں کا مشاہدہ ہونے لگتا ہے اور صفات کا کھلنا بھی اسی سے ممکن ہے۔ اس حال کو بدایت (ابتداء) کہتے ہیں۔ لیکن جب عالمِ امثال سے ہر چیز میں حق ہی حق ملاحظہ کرتا ہے اور اس کے بعد اس عالمِ مجاز میں جو ظل (سایہ) کی مثل ہے تو مخلوق کو جمالِ حقیقی سے محروم دیکھ کر ان پر تعجب کرتا ہے۔ اس حال میں سالک خود سے بھی بیگانہ ہوتا ہے اور اس کا ذکر ذکر لسانی (زبانی) سے ذکرِ قلبی کی نوعیت اختیار کرتا ہے۔ اس کا یہ حال ذکر اور اتباع سنت کے باعث ہوتا ہے اور یہی سلوک کی نہایت کا مقام کہلاتا ہے جو بدایۃ (ابتداء) کی صحت اور درستی کے بعد پیدا ہوتی ہے۔

اگر انسان اپنی خداداد صلاحیتوں کو بیدار کرلے اور ان سے کام لینا چاہے تو یہ انفس (نفسِ انسانی کا ظاہر اور باطن) اور آفاق (کائنات میں جو کچھ ظاہر اور باطن ہے) کی سیر کرسکتا ہے اور ان سے بطریقِ کشف اور شہود آگاہ ہوسکتا ہے۔ انسان کے دل میں پوری کائنات کا عکس موجود ہے اور یہ عالمِ دنیا حقیقت انسانی کا ہی تفصیلی ظہور ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ جو کچھ آفاق (کائنات) میں تفصیلی طور پر موجود ہے وہ تمام کا تمام انفس (نفس انسانی کے ظاہر اور باطن) میں بھی اجمالی (خلاصے کے) طور پر موجود ہے۔ اگر بصیرت قلبی ہو تو اپنے اندر وہ سب کچھ ملاحظہ کیا جاسکتا ہے جو آفاق میں موجود ہے۔ آفاق و انفس اللہ کی نشانیوں کے محل و منظر ہیں جن سے حق تعالیٰ کا پتا چلتا ہے۔ جس انسان نے ان نشانیوں کو دیکھنے کی صلاحیت پیدا کرلی اور اللہ تعالیٰ کی ظاہری اور باطنی قوتوں کو پہچاننے لگا تو اس نے انسان ہونے کا حق ادا کردیا اور جو اس مرتبہ تک نہ پہنچ سکا وہ انسانیت سے گر گیا۔ ایسا شخص خدا کے نزدیک جانوروں سے بھی بدتر ہوگیا اور اسے سورہ الانفال میں بہرہ اور گونگا بلکہ جانوروں سے بھی بدتر کہا گیا ہے۔ مسلمان کے گھر میں پیدا ہوجانے سے ہی انسانیت کا حق ادا نہیں ہوتا بلکہ خدا کی پہچان سے ہی انسان انسان کہلاتا ہے۔ (علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا

زندگی جہد است استحقاق نیست　جز بعلم انفس و آفاق نیست (پ۔م: ۱۸۸)

(زندگی سراسر جہد ہے استحقاق نہیں یہ سوائے علم انفس و آفاق کے اور کچھ نہیں۔)

سیر اطوار

اطوار جمع ہے طور کی۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے۔

وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا۔ (نوح: ۱۴) "حالانکہ اس نے تمہیں کئی مرحلوں سے گزار کر پیدا کیا ہے"۔

انسان کو اس کی تخلیق کے دوران اللہ تعالیٰ نے کئی مرحلوں سے گزارا ہے۔ مثلاً وہ مرحلے جو پیدا ہونے سے پہلے آفاق میں رونما ہوتے ہیں اور وہ مرحلے جو اس کی ماں کے پیٹ میں اور پیدا ہو کر مرنے سے جنت یا دوزخ تک پہنچنے کے درمیان واقع ہوئے۔

سیرِ اطواری وجودی انفسی

یہ وہ مراتب ہیں جو باطوار مراتب تنزلات انسان اپنے باپ کی پشت سے جنت یا جہنم تک پہنچنے کے درمیان آتے ہیں۔

سیرِ اطواری وجودی آفاقی

آفاق میں حقائق الہیہ اور تنزلات کونیہ کی سیرِ اطواری کو وجودی آفاقی کہتے ہیں۔

سیرِ عروجی

سیر مقید بجانب اطلاق اور سیر جزو بجانب کل سیر عروجی کہلاتی ہے۔ اس سیر کی انتہا یا رسائی احدیت تک ہے جو کہ انسان کا نقطہ اول ہے۔ مستلزم معرفتِ کشفی شہودی یہی ہے۔ (مقام تقید وہ مقام ہے جہاں سے سالک سیر شروع کردے اور مقامِ اطلاق وہ مقام ہے جہاں سالک لاتعین یا احدیت کے مقام پر پہنچے۔ یعنی عروج کا بالاتر مقام دیکھئے جو شکل سرِّ دلبراں کے صفحہ ۲۰۰ پر دی گئی ہے۔

سیرِ نزولی

سیرِ اطلاق سے تقید یا کل سے جز کی جانب آنے کو سیرِ نزولی کہتے ہیں۔ یعنی تنزل احدیت اور مراتب کثرت امکانیہ از جہت اظہار اسماء وصفات اس سیر کو ظہوری الباطن بھی کہتے ہیں۔

سیر باللہ

اطلاق میں فنا و اتصال کے بعد بغرضِ تکمیل ناقصاں بمقتضائے حکمتِ الٰہی عالم پر جو مرتبہ تقید ہے واپس گزرنا بقا بعد الفنا جو کہ مقامِ تمکین ہے۔ سلوک کی کتابوں میں ابتدائی صورت کو مقام ب کی جانب اشارہ کرتے ہیں اور مندرجہ ذیل اصطلاحات کے ذریعے اشارہ کیا جاتا ہے۔ مبدا' بدایت' تقید' تعین' فرق' کثرت' بعد۔ مقام کا اشارہ مندرجہ ذیل اصطلاحات سے کیا جاتا ہے۔ اطلاق' احدیت' تکوین' سکر' استغراق' بے خودی' فنا' فناء الفنا' سیر فی اللہ' جمع قوس عروجی یعنی ب ع اکی جانب ذیل کی اصطلاحات سے

اشارہ کیا جاتا ہے۔ سیر عروجی' سیر الی اللہ' عروج۔ قوس ان ب کی جانب اشارہ مندرجہ ذیل اصطلاحات سے کیا جاتا ہے۔ سیرِ نزول' سیر من اللہ' سیر مع اللہ' سیر باللہ' سیرِ رجوعی۔

طریقہ

(جمع: طُرُق) اسی عربی لفظ کے' جو سڑک' راستے' پگ ڈنڈی کے معنوں میں ہے' اسلامی تصوف میں یکے بعد دیگرے دو اصطلاحی مفہوم ہو گئے۔

(۱) نویں اور دسویں صدی عیسوی میں یہ ان افراد کی عملی رہنمائی کے لئے اخلاقی نفسیات کا ایک طریقہ تھا جن پر وجدانی کیفیت طاری ہوتی تھی۔

(۲) گیارہویں صدی کے بعد یہ روحانی تعلیم کے اس دستور العمل کا نام ہو گیا جو مختلف سلسلوں میں' اس وقت مسلمانوں کے ہاں قائم ہو رہے تھے' عام زندگی کے لئے معین کیا گیا۔

اسلامی تصوف بطور خود اپنی ابتدا' تصورات اور رجحانات کے لحاظ سے ایک الگ مضمون ہے' جس کا ذکر کسی دوسری جگہ آئے گا (رجوع کیجئے تصوف) یہاں ہم صرف انسانی معاشرے پر اس کے اثرات سے بحث کریں گے اور ان جماعتوں اور سلسلوں (حلقوں) کا ذکر کریں گے جو عقیدت مند مسلمانوں کے ہاں اس طریقے پر عمل پیرا ہونے سے پیدا ہوئے۔ پہلے معنوں میں (دیکھئے تصانیفِ جنیدؒ' الحلاج' السراج' القشیری' ہجویریؒ) لفظ طریقہ ابھی تک مبہم ہے اور اس کے معنی صرف اس نظری طریق کے ہیں۔ (رعایہ اور سلوک زیادہ پرزور لفظ ہیں) جو ہر مریدِ صادق کی اس روحانی مسلک کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو اسے خدا تک پہنچاتا ہے اور احکام شریعت کی لفظی پابندی کے مختلف نفسیاتی مدارج (احوال ومقامات) سے گزرنے کے بعد حقیقت خداوندی سے روشناس کراتا ہے۔ چونکہ اس دعویٰ کی بنا پر فقہا کی جانب سے نکتہ چینی کا طوفان امنڈ آیا تھا' لہٰذا معلمینِ تصوف اپنے مسلک کی وضاحت اور اپنے اعمال کو دائرہ شریعت کے اندر محدود کرنے کی طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے آداب وقواعد (آداب الصوفیہ) مرتب کئے تاکہ شکوک وشبہات دور ہو سکیں۔ یہ سلسلہ السلمی اور المکی سے لے کر ابن طاہر المقدسیؒ (صفوۃ) اور الغزالی تک جاری رہا۔ اگرچہ ان کا منتہائے مقصد یہی رہا کہ براہ راست منزل حقیقت (فتح) پر پہنچ جائیں' تاہم عملاً انہوں نے آہستہ آہستہ مجالسِ سماع کی شرکت ترک کر دی' جن میں وہ اپنی وجدانی کیفیات کے جوش وخروش میں اکثر مجذوبیت کے عالم میں نعرے لگانے لگتے تھے۔ جس پر اکثر نکتہ چینی ہوتی تھی۔ اس کی جگہ ایسے وظائف واذکار شروع ہوئے جو قرآن مجید پر مبنی تھے۔ اس طرح مبتدی مرید کو اس ذہنی غور وفکر (تفکر) کے لئے تیار کیا جاتا تھا جس کا تجربہ اسے خود بھی خاموش رہ کر ہو سکتا ہے' یعنی ایک ایسی حالت کا طاری ہو جانا جس میں مختلف رنگوں کی روشنیوں (انوار) کا پے در پے

ادارک ''صفا'' کو الفاظ کے پردے سے نکال کر قلب میں مجسم کر دیتا ہے' پھر قلب اپنے ذکر یا وظیفے کے جوہر خداوندی میں شریک ہو جاتا ہے۔

(ذکر الذات' تجر نور الذکر فی القلب' بقول السہروردی' عوارف' باب ۲'۷: ۱۹۱)

الغرض طریقہ کا مفہوم آخر کار وہ عام زندگی یا معاشرہ ہو گیا جو احکام اسلام کی عام پابندیوں کے علاوہ مخصوص قواعد کے ایک سلسلے پر مبنی ہو۔ سالک کامل (فقیر یا درویش) بننے کے لئے نو آموز صوفی (مرید) سے گواہوں کے مقدس زمرے (شیخ السجادۃ' خلیفہ' ترجمان' فارسی: رندز رہبر' وغیرہ) کے سامنے بیعت لی جاتی ہے۔ اگر وہ کسی ایسے سلسلے سے بھی تعلق رکھتا ہے جس میں سیاحت کی اجازت ہو تو بھی اسے گاہے بگاہے ان کے ساتھ سلسلے میں کسی رباط (زاویہ' فارسی: خانقاہ' ترکی: تکیہ) میں گوشہ نشینی (عزلہ' خلوہ' اربعینیہ' فارسی: چہل (چلہ) اختیار کرنی پڑتی ہے۔ ان کی معاش لوگوں کی نذر و نیاز پر منحصر تھی گوشہ نشینی عام طور پر کسی قابل احترام ولی اللہ کے مقبرے کے قریب ہی ہوتی ہے جس کا سالانہ عرس بڑی عقیدت سے منایا جاتا ہے اور اس کی روح سے حصول فیضان (زیادۃ' برکتہ) کی استدعا کی جاتی ہے۔ خانقاہ کے اندر برادران طریقت (اخوان' ترکی اخیار' یہ تیرھویں صدی کی آنا طولی اصطلاح ہے۔ تیرھویں اور چودھویں صدی میں مصر اور شام میں خواہران سلسلہ کے زاویوں کے قیام کی محض کوشش ہی کی گئی) کا معاشرہ بعض نافلہ مجاہدات کی وجہ سے ممیز ہے' مثلاً شب بیداری' روزے (صیام)' ورد (مثلاً ''یا لطیف'' کو سو بار یا ہزار بار پڑھنا) وظائف (ذکر' حزب) بالخصوص بعض تہواروں پر (شب بیداری' شب برات' شب قدر) اور اسی طرح بعض اجازتیں (رخص مثلاً خیرات جمع کرنا اور مجالس خلوت جن میں مخصوص ادعیہ کے علاوہ بے شمار لوگ نظر بازی' مزاح' رقص اور جامہ دری کی بھی اجازت ہوتی ہے۔

راسخ العقیدہ فقہاء' نے ان بدعتوں کے خلاف' جن کی تبلیغ بعض صوفی طریقے کرتے رہے' ہمیشہ جنگ جاری رکھی' یعنی ان کی نفلی عبادتوں اور ان کی مستثنیات' ان کے مخصوص لباسوں (مثلاً خاص لباس جس میں کئی رنگوں کے کپڑوں کے پیوند ہوتے ہیں اور کلاہ' تاج وغیرہ) نشی اشیاء (مثلاً قہوہ' حشیش' افیون) کے استعمال' ان کی شعبدہ بازی اور ان کے اس عقیدے کے خلاف کہ تلقین اور برکت میں مافوق الفطرت تاثیر ہوتی ہے۔ انہوں نے اسناد بیعت پر تنقید کرنے پر خاص توجہ کی ہے اور ان کے سلسلوں کے رخنوں اور نقائص کو ظاہر کر کے ان کی صحت کو غیر الغلب قرار دیا ہے۔ (رجوع کیجئے تصوف) انہوں نے اسناد الہامی (روحانی) کے خلاف بھی آواز بلند کی ہے' جس کی بنا پر سلسلہ تصوف کو ایک ایسی مقدس ہستی کے مظاہرے سے فیضان حاصل ہوتا ہے جو پراسرار اور غیر فانی ہے' یعنی حضرت خضر علیہ السلام (رک باں) جن کی ہادی طریقہ کی حیثیت سے سب سلسلے توقیر و تعظیم کرتے ہیں کیونکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام (الکہف: ۶۰ تا ۸۲) کے راہنما اور صوفی کی روح کو حقیقت علیا سے آشنا کرانے کے اہل ہیں۔ یہ عقیدہ غالباً تصوف کی کسی مستند کتاب میں نہیں پایا جاتا۔ حضرت

خضر علیہ السلام کی ہدایت کا معاملہ تو وہ ایک علیحدہ بات ہے۔ صوفیہ کے سلسلوں کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ ترکی میں حکومت کو کئی دفعہ ان سلسلوں کے خلاف دارو گیر کرنا پڑی اور ایک مختصر سی عارضی صلح کے بعد جس کے دوران سلطان عبدالحمید نے اپنی تحریک پان اسلامزم کے سلسلے میں ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ انہیں ۱۹۲۵ء میں رجعت پسندانہ بغاوت کے جرم میں ختم کر دیا گیا۔ دوسرے اسلامی ممالک میں باوجود اصلاح کی اس کوشش کے جو ہند میں اخلاقی اور الجزائر میں ذہنی لحاظ سے دلچسپ ہے' یہ طریقے ہر جگہ زوال پذیر ہو چکے ہیں۔ چھوٹے درجے کے فقیروں کی شعبدہ بازیوں اور کرتبوں سے اور ان کے متعدد معتقدین کے اخلاق سوز کارناموں کی وجہ سے موجودہ اسلامی دنیا کے خواص میں تقریباً ان سب کے خلاف بیگانگی اور حقارت پیدا ہو گئی ہے۔

اسلامی طریقوں کی فہرست

ذیل کی فہرست کے تاریخی پس منظر کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے اس امر کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ اسلام میں ایک مشترک معاشرہ قائم کرنے کے لئے لوگوں نے جو مختلف کوششیں کیں انہیں ۸۱۴ء میں (اسکندریہ اور کوفے میں) صوفیہ کے اصطلاحی نام سے یاد کیا گیا۔ ۸۵۷ء کے بعد (المحاسبی) یہ اصطلاح کسی قدر غیر معین طور پر ان لوگوں کے لئے بھی استعمال ہونے لگی جنہیں عراق میں تصوف کا ذوق وشوق پیدا ہوا۔ (جہاں مرکزی یا بنیادی اداروں سے زیادہ تعلق رکھنے والوں کو سالیہ یا حلاجیہ بھی کہتے تھے۔) اس کے بعد تقریباً دو صدیوں تک اس کے نام کے مقابلے میں ملامتیہ کی اصطلاح بھی مستعمل رہی' جس کا اطلاق خراسان کے زیادہ سرگرم عمل اور انتہا پسند صوفیوں پر ہوتا تھا کیونکہ انہیں لوگوں کی ملامت سے بے نیاز ہونے کا دعویٰ تھا۔

جہاں تک اس ابتدائی زمانے کا تعلق ہے' مندرجہ ذیل فہرست کو مرتب کرتے وقت تسلسلِ زمانی کو مدنظر نہیں رکھا گیا۔ بارہویں صدی کے بعد اس فہرست سے مختلف سلسلوں کی تاسیس کے حالات خاصی صحت کے ساتھ معلوم ہو سکتے ہیں اور ان کی تاریخ مختصراً یہ ہے:۔ سلسلہ صوفیہ خفیفیہ میں ایک ضمنی سلسلہ کازرونیہ کا (۱۳۰۴ء) اور سلسلہ صوفیہ جنیدیہ میں ایک بڑے سلسلے کا ظہور ہوا' جس کے رہنما صوفیہ کبار تھے۔ (جرجانیؒ' نساجؒ' احمد غزالیؒ) یہ سلسلہ آخر کار تیرہویں صدی میں تین شاخوں میں تقسیم ہو گیا۔ خواجگان (یوسف ہمدانی' م ۱۱۴۰ھ) کبراویہ (کبرٰ م ۱۲۲۱ھ) اور قادریہ (اگرچہ بانی سلسلہ ۱۱۶۶ء میں وفات پا گئے تھے تاہم اس کی تنظیم نصف صدی کے بعد جا کر ہو سکی' آخری دو سلسلوں میں احمد ابن القاضی (قواعد وفیہ' قب لالہ لی' مخطوطہ عدد ۱۴۷۸ء) نے رفاعیہ' مدنیہ (جو بعد میں شاذلیہ کے نام سے مشہور ہوا) اور چشتیہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ دوسرے سلسلے بھی ان میں جلد شامل ہو گئے' مثلاً تیرہویں صدی میں قلندریہ محمدیہ' مولویہ اور چودہویں صدی میں بکتاشیہ' نقشبندیہ' صفویہ خلوتیہ کا مع اپنے بے شمار متاخر شاخوں کے اضافہ ہوا۔ پندرہویں صدی میں

المغرب میں الجزولی کی صالحی تحریک شروع ہوئی اور سماٹرا اور ہند میں سلسلہ شطاریہ کی ابتدا ہوئی' آخر میں' یعنی انیسویں صدی میں' قادریہ اور شاذلیہ سلسلوں کی تجدید سے تجانیہ' درقاوہ اور سنوسیہ سلسلے پیدا ہوئے۔

بڑے بڑے سلسلوں میں آج کل سنوسیہ اور مولویہ کے سوا کسی سلسلے کا بھی کوئی مخصوص مرکز نہیں۔ رشتہ بیعت' جس میں مرید منسلک ہوتا ہے' دائمی نہیں ہوتا۔ عام طور پر کسی بھی اسلامی ملک میں کل آبادی کے تین فیصد سے زیادہ لوگ ان سلسلوں سے وابستہ نہیں۔ جن سلسلوں کی موجودہ زمانے میں وسیع تبلیغ واشاعت ہے' وہ حسب ذیل ہیں۔

قادریہ (عراق' ترکی' پاکستان وہند' ترکستان' چین' نوبہ' سوڈان' المغرب) نقشبندیہ (ترکستان' چین' ترکی' پاکستان وہند ملایا) شاذلیہ (المغرب' شام' پاکستان وہند) بکتاشیہ (ترکیہ' البانیا) تجانیہ (المغرب چاڈ) سنوسیہ (صحرائے اعظم' حجاز) شطاریہ (پاکستان وہند ملایا)

باب ۱۹

امتحانِ شیخ

شیخ اور مرید کے درمیان نہایت لطیف اور خوبصورت روحانی نسبتوں کا رشتہ ہوتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان جو سب سے زیادہ لطیف اور نورانی نسبت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مرید شیخ کی وساطت سے حضور اکرم ﷺ کی روحانیت کے ساتھ منسلک ہو جاتا ہے اور ایک عظیم نسبت قائم کر لیتا ہے۔ جس کو رسول اللہ ﷺ سے نسبت حاصل ہو جائے تو اس سے بڑی اور کون سی سعادت ہو سکتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے روز تمام نسبتیں ختم ہو جائیں گی سوائے اس نسبت کے جو میرے ساتھ ہو گئی ہو۔ اس نسبت کی بدولت مرید رسول اللہ ﷺ کی روحانی آل میں بھی شامل ہو جاتا ہے بشرطیکہ اسے حضور اکرم ﷺ سے دلی محبت حاصل ہو چکی ہو۔

مذکورہ بالا نسبت کے علاوہ شیخ اور مرید کے درمیان استاد اور شاگرد کا رشتہ بھی منضبط ہوتا ہے کیونکہ مرید اپنے شیخ سے نہ صرف علمِ دین حاصل کرتا ہے بلکہ طریقت کی الف با بھی اپنے شیخ سے ہی حاصل کرتا ہے۔ حضرت شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ اپنی معروف کتاب ''عوارف المعارف'' میں لکھتے ہیں کہ شاگرد کا اپنے استاد کے سامنے لفظ ''کیوں'' کا استعمال بھی بے ادبی میں شامل ہے اور آپ فرماتے ہیں کہ استاد وہ ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی شخص سے علم کا خواہ ایک حرف ہی کیوں نہ سیکھے۔ طریقت میں شیخ کو ایک خاص مقام حاصل ہوتا ہے اور مرید کا دار و مدار اس کے شیخ کی خوشنودی پر ہوتا ہے۔ راقم الحروف نے ادب کے عنوان سے ایک مکتوب اس کتاب میں شامل کیا ہے جو ''مکتوباتِ لطیف'' کے باب میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اس مکتوب کے مطالعے سے اس بات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شیخ کے آداب ملحوظ خاطر رکھنے سے مریدین کو کیسے کیسے مقامات حاصل ہوتے ہیں۔ مرید اپنے دل میں جس قدر اپنے شیخ کا احترام کرتا ہے، اسی کے مطابق اس کو ایک روحانی مقام حاصل ہو جاتا ہے۔

شیخ اور مرید میں اس بات کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے کہ مرید کو شیخ کا روحانی بیٹا ہونے کا بھی شرف حاصل ہوتا ہے۔ اگرچہ صلبی والد کے علاوہ اس کے سسر کو بھی باپ (عربی کے لفظ ''اَبْ'' کا ترجمہ جو کہ سسر کیلئے قرآن و حدیث میں بھی مستعمل ہوا) درجہ دیا جاتا ہے لیکن روحانی باپ کا معاملہ تو ایسے ہی ہے جیسے کسی امت

میں کوئی نبی ہو۔ اس اعتبار سے بھی شیخ کا ادب اور احترام لازم ہو جاتا ہے۔ طریقت میں ایک بہت مشہور قول ہے جسے ہر خاص و عام جانتا ہے کہ مرید جب بیعت کر لیتا ہے تو وہ اپنی مرضی کو اپنے شیخ کے سپرد کر دیتا ہے اور خود ایسے ہو جاتا ہے جیسے "مردہ بدست زندہ"۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ "اَلْمُرِیْدُ لَایُرِیْدُ" (یعنی مرید کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی) چنانچہ اس کو اپنے شیخ سے اختلاف، بدظنی اور بدگمانی کا کوئی حق نہیں ہوتا، یہاں تک کہ اگر مرید کو اپنے پیر میں کوئی برائی نظر آئے تو وہ اسے اپنی کجی یا نااہلی پر محمول کرے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے لکھا ہے کہ اس راہ میں اپنے شیخ کے ساتھ ذرا برابر بھی بدگمانی زہر قاتل ثابت ہوتی ہے جو مرید کو ایک لمحے میں ہلاک کر سکتی ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ اگر پیر کو ایک پہاڑ تصور کیا جائے تو مرید کی حیثیت اس کے سامنے ایک ذرّے کی طرح ہوتی ہے اور اگر مرید اپنے شیخ کا امتحان کرنے لگے تو یہ ذرّہ پہاڑ کو کس ترازو میں تول سکتا ہے۔

مرید جب کسی شیخ سے بیعت کرتا ہے تو اس کے لئے یہ بات ضروری ہوتی ہے کہ وہ پہلے اپنی طبیعت اور پسند کے مطابق پیر کو تلاش کرے اور جب پیر کا چناؤ ہو جائے تو پھر اس کو ناپسند کرنے کا خیال خود اس مرید کی اپنی نااہلی پر دلالت کرتا ہے۔ اس بات کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے کہ ایسی نازیبا حرکتوں سے پیر کی ناراضگی مول لینے والی بات ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ پیر ایک ہی بے التفاتی سے مرید کی صلاحیتوں کو ختم کر سکتا ہے اور اس کے خفا ہو جانے میں سراسر نقصان ہے۔ اگر کوئی مسلمان حضور اکرم ﷺ کی شان کے خلاف دل میں ذرا سی بھی کجی لے آتا ہے تو گویا اس نے اسلام لانے کے بعد کفر کیا۔ (دیکھیں سورہ توبہ آیت: ۷۴) مرید بھی جب بیعت کرنے کے بعد روحانی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے تو اپنی بدظنی کے بعد موردِ عتاب ہو جاتا ہے اور شیخ اسے اپنے سلسلۂ بیعت سے خارج کرے یا نہ کرے، وہ بیعت کی تمام برکات سے محروم ہو جاتا ہے بلکہ اس کی اہلِ سلسلہ کے بزرگوں سے مدد اور اعانت بند ہو جاتی ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ شیخ کی ناراضگی سے بچائے کیونکہ ایسا شخص کہیں کا نہیں رہتا۔ راقم الحروف نے اس بات کا بارہا مشاہدہ کیا ہے کہ طریقت میں گستاخی کرنے والوں کا حشر اس قدر بھیانک ہوتا ہے کہ وہ کسی دوسرے شیخ سے بھی فیض حاصل نہیں کر سکتے بلکہ ایسے سرکش لوگوں سے اگر مال اور دولت چھین لی جائے تو بھی ان کی روحانیت میں یکسر زوال آ جاتا ہے۔ کبھی ایسے باغیوں سے نماز روزہ بھی چھوٹ جاتا ہے یا وہ کسی غلط عقیدے کے پیروکار ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی نظر آتے ہیں کہ جو اسلام سے نکال دیئے جاتے ہیں۔ اہل اللہ کا یہ ایمان ہے کہ کوئی شخص اگر کسی بے لوث، نیک اور ولی صالح کو ٹھکرا کر چلا جائے (جیسا کہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے) تو ایسے بھگوڑے کو کہیں سے فیض نہیں مل سکتا خواہ وہ جبرائیل علیہ السلام کی صحبت میں ہی کیوں نہ چلا جائے۔ راندۂ طریقت کو کہیں امان نہیں ملتی مگر افسوس ہے کہ ایسے محروم لوگ اپنے

آپ کو پاکباز اور ولی کامل سمجھتے ہیں اور اپنی غلطی کو غلطی قرار نہیں دیتے۔

راقم الحروف نے اس کتاب کی تصنیف تک تقریباً پچاس سال روحانی زندگی سنوارنے میں گزار دیئے ہیں اور اس بات پر صحیح ایمان ہے کہ روحانی زندگی کے مدعی اکثر و بیشتر اپنے مشائخ کے فیوض سے محروم رہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے پیروں کا نہ تو احترام کرتے ہیں اور نہ ہی وہ یہ جانتے ہیں کہ پیروں کا کہاں تک ادب کرنا ضروری ہے۔ تجربے میں یہ بات بھی آتی ہے کہ ۹۰٪ سے زائد مرید تو پیروں کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں اور اگر ذرا سی بات مرضی کے خلاف ہوگئی تو پیر صاحب سے ناراض ہو جاتے ہیں یا بیعت توڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لاکھوں مریدوں میں کوئی ایک ہی مرید ایسا ہوتا ہے جو دائرہ ادب سے خارج نہ ہوتا ہو۔ اگر یہ حال ہو تو کیسی طریقت اور کیسی روحانی درجات کی بلندی۔ اکثر لوگ مقاماتِ روحانی پر فائز ہونے سے بالکل محروم رہتے ہیں۔ ایسے مریدوں کی حکایات لکھنے کو دل نہیں چاہتا جو بیعت کو محض دنیاوی حاجات کو پورا کرنے کے لئے مشائخ کے پاس آتے ہیں۔ ان لوگوں کے رویئے نے راقم الحروف کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ بیعت کا سلسلہ ہی بند کر دیا جائے مگر کچھ دیر بعد اللہ کی طرف سے اشارے پر یہ سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا گیا۔ روحانی مقامات سے خالی یا محروم رہنے کے اور بھی بہت سے اسباب ہیں ان میں سے ایک تو روحانی اسباق کا حاصل نہ ہونا ہے اور دوسرا سخت مجاہدات کو اپنا شعار نہ بنانا ہے۔ بہت سی مخلصانہ اور مشقتوں سے لبریز زندگی گزارنے کے بعد ہی سالک کو کوئی مقام نصیب ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں (ز۔ع:۴۶۵).

(کئی عمروں تک زندگی کعبہ اور بتخانہ میں روتی ہے، تب جا کر کہیں کسی بزمِ عشق سے ایک دانائے راز باہر آتا ہے۔)

اس تمام تحریر کا خلاصہ یہ ہوا کہ اگر کوئی شخص سلوک میں قدم رکھتا ہے تو اس کے لئے اپنے شیخ سے مکمل عقیدت کا ہونا اور خلوص کے ساتھ ریاضتوں کی تکمیل کرتے رہنا ایک ضروری امر ہے اس اثنا میں اگر شیخ سے بد دلی پیدا ہو جائے تو مرید کو سوائے تباہی کے اور کچھ نہیں ملتا کیونکہ سلوک کا مدار شیخ کے ساتھ عقیدت کا ہوتا ہے۔

اپنے شیخ کا امتحان مت کرو

مولانا رومؒ نے مثنوی میں فرمایا ہے۔

شیخ را کہ پیشوا و رہبر است گر مریدے امتحان کرد اُو خرست

(وہ شیخ جو پیشوا اور رہبر ہے، اگر مرید اس کو آزمائے تو وہ (مرید) گدھا ہے۔)

امتحانش گر کنی در راہِ دیں ہم تو گردی ممتحن اے بے یقیں

(اگر تو دین کے راستہ میں اس کا امتحان کرے گا، اے شکی! تو خود امتحان میں پڑ جائے گا۔)

جرأت و جہلت شود عریان و فاش   اُو برہنہ کے شود زیں افتتاش

(تیری بے باکی اور جہالت ننگی اور ظاہر ہو جائے گی وہ اس تفتیش سے ننگا کب ہوگا؟)

گر بیاید ذرّہ سنجد کوہ را   بردرد زاں کہ ترازوش اے فتی

(اگر ذرہ پہاڑ کو تولے اے نوجوان! اس پہاڑ سے اس کی ترازو ٹوٹ جائے گی۔)

کز قیاسے خود ترازو می تند   مردِ حق را در ترازو می کند(۷۔۴۷۔۴)

(کیونکہ وہ اپنے اندازے سے ترازو بناتا ہے، اللہ (تعالیٰ) کے ولی کو ترازو میں رکھتا ہے۔)

علامہ اقبالؒ کس تصوف کے خلاف تھے

علامہؒ فرماتے ہیں کہ اسلام کے اولین دور کے صوفی زہاد تھے۔ زہد اور تقویٰ ان کا شعار تھا بعد کے تصوف میں مابعد الطبیعات اور نظریات شامل ہو گئے۔ اب تصوف میں فلسفہ کی آمیزش ہو رہی ہے۔ ہمہ اوست مذہبی مسئلہ نہیں، فلسفہ کا مسئلہ ہے، وحدت اور کثرت کی بحث سے اسلام کو کوئی سروکار نہیں اسلام کی روح توحید ہے۔ اس کی ضد کثرت نہیں شرک ہے۔ وہ فلسفہ جو مذہبی تعلیم اور انسانی شخصیت کی نشو ونما کے منافی ہو بے کار ہے۔ نام نہاد تصوف نے روح دین کو بہت نقصان پہنچایا ہے نام نہاد تصوف یہ ہے کہ لوگ ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتے تعویذ طلب کرتے ہیں۔ گوش و چشم بند کرنا اور صرف چشمِ باطن پر زور دینا جمود اور انحطاط ہے۔ قدرت کی تسخیر اور جدوجہد کی جگہ انسانی طریقوں کو اپنانے کی تلاش ہے۔ اسلامی تصوف یہ ہے کہ احکامِ الٰہی کے ذریعے اپنی ذات کے استحکام میں لگ جائیں۔

یہ انداز خالص صوفیانہ ہے کہ قاری پر قرآن کی کیفیت طاری ہو جائے اور اپنی فکر اپنے عمل اور اپنی ذات میں یہاں تک کھو جائے کہ وہ خود قرآن بن جائے۔ مومن کو قرآن اس لئے کہا کہ قرآن چونکہ ہدایت دیتا ہے تو ایسا مسلمان بھی لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بنے گا لہٰذا اس کی حقیقت بھی قرآن ہے۔

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن   قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن (ض۔ک:۵۲۲)

بادشاہوں پر چوری کا الزام مت لگاؤ

مولانا رومؒ نے مثنوی میں اس موضوع پر بہت طویل کلام فرمایا ہے کہ مرید کو اپنے شیخ پر کوئی الزام نہیں لگانا چاہیے کیونکہ شیخ کو یہ مقام حاصل ہوتا ہے کہ وہ دوری کے باوجود مریدوں کے دلوں کی جاسوسی کر لیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اپنے شیخ کے پاس جاؤ تو دل میں کوئی ایسی بات نہ لے کر جاؤ جس میں شیخ کی مخالفت کی بو آتی ہو۔ مرید کے ایسے جذبات اور خیالات کا پیر کو بخوبی علم ہو جاتا ہے اس سلسلے میں آپ کے چند اشعار پیش کیے

جارہے ہیں۔

دستِ پیر از غائباں کوتاہ نیست دستِ اُو جز قبضۂ اللہ نیست (۳۱۲-۱)

(پیر کا ہاتھ دور والوں کے لیے کوتاہ نہیں کیونکہ اس کا ہاتھ تو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہی ہے۔)

ہر کہ پیر و ذات را یکجا نہ دید نے مرید و نے مرید و نے مرید

(جس نے پیر اور ذاتِ الٰہی کو یکجا نہ دیکھا وہ مرید نہیں، مرید نہیں، ہرگز مرید نہیں)

مرید ار عاشقِ پیرے نہ باشد مراد را ہیچ تدبیرے نہ باشد

(مرید اگر پیر کا عاشق نہیں ہے تو اس کی تدبیر مفید نہیں ہوتی۔)

عیب کم گو بندۂ اللہ را متہم کم کن بدزدی شاہ را

(اللہ والوں پر الزام لگانے سے باز آجاؤ اور بادشاہوں پر چوری کا الزام مت لگاؤ)(۳۲۶-۲)

فقر خواہی آں بہ صحبت قائم ست نے زبانت کار می آید نہ دست (۱۱۳-۵)

(فقر چاہتے ہو تو یہ صحبت سے قائم ہوتا ہے، یہاں نہ زبان کام دیتی ہے نہ ہاتھ)

گر بامرِ پیر رفتی ایں طریق مست گردی عاقبت ہم زیں رحیق (مثنوی)

(اگر پیر کے حکم سے اس راستے پر چلو گے تو ایک دن خالص شرابِ معرفت سے ضرور مست ہو جاؤ گے)

گر ہزاراں طالب اند و یک ملول از رسالت باز می ماند رسولؐ

(اگر ہزاروں طالب فیض یاب ہوتے ہوں اور ایک رنجیدہ ہو تو (پیغام پہنچانے سے) فیضِ رسول بند ہو جائے گا۔)

کے رسانند آں امانت را بہ تُو تا نہ باشی پیش شاں راکع دوتُو (۳۴۵-۳)

(تمہیں یہ امانت کس طرح فیض پہنچا سکتی ہے، جب تک تجھ میں تواضع نیازمندی اخلاص وادب نہ ہو۔)

ہر چہ را خوب و خوش و زیبا کند از برائے دیدۂ بینا کند

(جو شخص آرائش اور بناؤ سنگھار کرتا ہے، یہ بناؤ سنگھار تو ان کے لئے ہے جن کی دیکھنے والی آنکھ ہو۔)

دید آں مرشد کہ او ارشاد داشت تخم پاک اندر زمینِ پاک کاشت (۱-۱۶۹)

(جب مرشد دیکھتا ہے کہ مرید استعداد رکھتا ہے، تو اس کے پاک دل کی زمین میں معرفت کا بیج بو دیتا ہے۔)

شمع خود را ہمچو رُومیؒ بر فروز روم را در آتشِ تبریزؒ سوز (ا۔ر:۱۹)

(اپنی شمع کو رومی کی طرح خوب بھڑکاؤ، مولانا رومؒ کی طرح اپنے دل کو شمس تبریز کی آگ میں جلاؤ)

مرید کو چاہیے کہ وہ دیکھے کہ وہ کس سے بدظنی کر رہا ہے

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ مرید کو چاہیے کہ وہ اس بات کا اندازہ کرے کہ وہ کس باوقار اور بلند و بالا ہستی کا مقابلہ کر رہا ہے۔ اگر کوئی مرید اپنے شیخ کے اندر کوئی نقص تلاش کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ فرشتہ خصلت لوگوں پر اپنی کمینگی کے باعث حملہ کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

پس تو اے ناشستہ رو در چیستی؟ در نزاع و در حسد با کیستی (۲۔۳۱۴)

(پس اے ناپاک منہ والے تو کس خیال میں ہے، (ذرا دیکھ) کس کے ساتھ جھگڑتا اور حسد کرتا ہے۔)

با دمِ شیرے تو بازی می کنی بر ملائک ترکتازی می کنی

(تو شیر کی دم سے کھیل رہا ہے فرشتوں پر حملہ کر رہا ہے۔)

بد چہ می گوئی تو خیرِ محض را ہیں ترفع کم شمر ایں خفض را

(تو اس مجسم نیکی کو برا کیوں کہہ رہا ہے؟ خبردار! اپنی پستی کو بلندی نہ خیال کر)

مس اگر از کیمیا قابل نہ بد کیمیا از مس ہرگز مس نہ شد (۲۔۳۱۴)

(تانبا اگر کیمیا سے سونا نہ بن سکا تو تانبے سے کیمیا (تو کیمیا ہی رہے گا) تانبا نہیں بن جائے گا۔)

در رخِ مہ عیب بینی می کنی در بہشتے خار چینی می کنی

((ظالم) تو چاند کے چہرے میں عیب نکالتا ہے اور بہشت میں کانٹا تلاش کرتا ہے۔)

گر بہشت اندر روی اے خار جو ہیچ خار آنجا نیابی غیر تو (۲۔۳۱۵)

(اے کانٹے تلاش کرنے والے! اگر تو بہشت میں جائے گا تو اپنے علاوہ اور کوئی کانٹا نہ پائے گا۔)

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ کچھ گنہگار کہتے ہیں ہم نیک کام نہیں کرتے تو خدا نے ہمارا کیا بگاڑ لیا ہے۔ فرماتے ہیں ایسے لوگوں کے لئے اس سے بڑی اور کیا سزا ہوگی کہ ان کو رونے اور گریہ کی توفیق نہیں دی جاتی اور اگر نماز روزہ بھی کرلیں تو بھی وہ روحانی لطف سے محروم کر دیئے جاتے ہیں۔

وز نماز و از زکوٰۃ و غیر آں لیک یک ذرہ ندارد ذوقِ جاں

(وہ اپنی نماز و زکوٰۃ وغیرہ کی عبادتیں کرتا ہے، لیکن ان میں ایک ذرہ بھر بھی روحانی لطف نہیں پاتا)

می کند طاعات و افعالِ سنی لیک یک ذرہ ندارد چاشنی

(وہ طاعات اور اعلیٰ اعمال تو بجالاتا ہے، لیکن ان میں وہ ایک ذرہ چاشنی نہیں پاتا)

ذوق باید تا دہد طاعات بر مغز باید تا دہد دانہ شجر (۲۔۳۱۹)

(ذوق ہونا چاہیے تا کہ طاعات پھل لائیں، دانہ میں مغز ہونا چاہیے تا کہ درخت اُگ سکے۔)

فقراء پر تہمت نہ لگاؤ

کشف المحجوب میں منقول ہے کہ حضرت ذوالنون مصریؒ ایک کشتی میں سوار ہو کر مصر سے جدہ روانہ ہوئے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے ساتھ ایک جوان خرقہ پوش بھی سوار ہوا۔ میرے دل میں اس کے پاس بیٹھنے کی خواہش ہوئی مگر اس کی ہیبت سے ہمت نہ پڑتی تھی اور میں اس سے کلام بھی نہ کر سکا اس لئے کہ وہ بڑا بزرگ تھا۔ اس کی ایک ساعت بھی یادِ الٰہی سے غفلت میں نہ تھی۔ ایک روز کشتی میں سے کسی کی تھیلی سے ایک جوہر گم ہو گیا۔ سب کی تلاشی لی گئی مگر وہ موتی نہ ملا تھیلی والے نے اس بزرگ پر الزام لگایا اور لوگ اس سے بد سلوکی پر آمادہ ہوئے۔ میں نے ان لوگوں کو روکا اور اس بہانے سے میں اس بزرگ کے قریب ہو گیا اور اس کو بتایا کہ لوگوں کو آپ پر بدگمانی ہے۔ مولانا رومؒ نے بھی اس قصے کو بہت وضاحت سے مثنوی میں بیان کیا ہے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

دلق بیروں کن برہنہ شو ز دلق　　تا ز تو فارغ شود اوہامِ خلق

(گدڑی اتار دو ننگے ہو جایئے تا کہ لوگوں کے شکوک تم سے رفع ہو جائیں۔)

یہ سن کر اس جوانِ باخدا نے آسمان کی طرف منہ کر کے کچھ فرمایا تو میں نے دیکھا کہ سمندر کی تمام مچھلیاں سطح سمندر پر آ گئیں اور ہر ایک کے منہ میں ایک ایک موتی تھا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں۔

گفت یا رب مر غلامت را خساں　　متہم کردند فرماں در رساں

(بزرگ نے دعا کی اے پروردگار یہ کمینے لوگ تیرے غلام پر تہمت لگا رہے ہیں تو کوئی مناسب حکم دے۔)

يَا غِيَاثِيْ عِنْدَ كُلِّ كُرْبَةٍ　　يَا مَعَاذِيْ عِنْدَ كُلِّ شِدَّةٍ

(اے ہر مصیبت کے وقت فریادرس، اے ہر سختی کے وقت میری پناہ)

يَا مُجِيْبِيْ عِنْدَ كُلِّ دَعْوَةٍ　　يَا مَلَاذِيْ عِنْدَ كُلِّ مِحْنَةٍ

(اے میری ہر دعا کے قبول کرنے والے، اے ہر مشقت کے کام میں میری جائے پناہ)

چوں بدرد آمد دلِ درویش ز آں　　سر بروں کردند ہر سو در زماں

(جب (تہمت پر) درویش کے دل کو دکھ پہنچا تو فوراً ہر طرف سے (مچھلیوں نے) سر نکالے)

صد ہزاراں ماہی از دریائے پُر　　در دہانِ ہر یکے دُرِّ چہ دُر (۲۔۳۲۷)

(بھرے دریا میں سے لاکھوں مچھلیوں نے اس حال میں کہ ہر مچھلی کے منہ میں ایک نفیس موتی (کیسا اچھا موتی) تھا سر نکالا)

اس بزرگ نے ایک مچھلی کے منہ سے ایک موتی لے کر اس کو دے دیا جس کی تھیلی سے ایک موتی گم ہوا

تھا کشتی کے سب لوگوں نے یہ کمال دیکھ کر اس جوان کی طرف عقیدت مندی کا مظاہرہ کرنا چاہا لیکن اس بزرگ نے کشتی میں سے دریا میں پاؤں رکھا اور سطح آب پر چلنے لگا۔ یہ موتی ملاحوں میں سے ایک نے چرایا تھا اس نے گھبرا کر وہ موتی دے دیا اور کشتی والے شرمندہ ہوئے۔

گفت از تہمت نہادن بر فقیر وزحق آزاری پئے چیزے حقیر

(اُس نے کہا کہ فقیر پر تہمت لگانا، حقیر چیز کے لئے حق تعالیٰ کو ناراض کرنا ہے۔)

آں فقیری بہرِ پیچا پیچ نیست بل پئے آنکہ بجز حق ہیچ نیست (۴۲۸_۲)

(وہ فقیری مکر وفریب کے لئے نہیں ہے، بلکہ اس لئے ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا ان کے فقر میں اور کچھ نہیں)

باب ۲۰

حصہ چہارم

(طبقات بالا کے مناظر اور احوال)

طبقات السمٰوٰت

(مختصر تعارف)

المفردات القرآن میں ہے کہ اَلْمُطَابَقَةُ کے معنی ایک چیز کے اوپر اس کے برابر دوسری چیز کو رکھنا ہے۔ اسی سے مُطَابَقَةُ النَّعْلِ کہا جاتا ہے یعنی کسی کے نقش قدم پر چلنا۔ عام طور پر یہ لفظ اس چیز کے لئے استعمال ہوتا ہے جو دوسری کے اوپر ہو۔ قرآن مجید میں ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ ''جس (اللہ تعالیٰ) نے سات آسمان اوپر تلے بنائے''۔ (الملک:۳)

پیٹھ کے مہروں میں سے ہر مہرہ کو طبق اسی لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ باہم مطابق ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (الانشقاق:۱۹) ''تمہیں (بتدریج) زینہ بہ زینہ چڑھنا ہے''۔

مذکورہ آیت میں ارتقائی منزلوں کی طرف اشارہ ہے۔ (یعنی مٹی سے نطفہ تک اور دیگر حالات کی طرف ترقی پاؤ گے۔) اس سے حشر و نشر، حساب و کتاب اور پل صراط سے جہنم اور جنت میں پہنچنے کی طرف اشارہ ہے۔

کائنات کا نظام

کائنات کو عموماً تین طبقوں یا حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ سب سے اوپر عالمِ امر اور اس کے بعد عالمِ مثال اور سب سے نیچے ہماری دنیا سے ملحق عالمِ مادی۔ عرف عام میں عالمِ مثال اور عالمِ مادی کو عالمِ خلق کہا جاتا ہے۔

عالمِ مادی میں زمین، سورج، چاند اور تمام ستارے شامل ہیں جس کو ہم نظامِ شمسی کہتے ہیں۔ عالمِ مثال اور عالمِ امر تمام کائنات کی فضا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ عالمِ مثال میں مختلف انواع کی جنتیں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ

وہ وسیع و عریض جنتیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے آراستہ کر رکھا ہے۔ اس کے لئے کوشش کرنا انسان کا کام ہے اور ان مقامات تک پہنچنا اللہ تعالیٰ کے فضل اور انصاف پر موقوف ہے۔ اس کا اشارہ سورۃ الحدید کی آیت ۲۱ میں ایسے فرمایا گیا ہے کہ "تیزی سے آگے بڑھو اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمان اور زمین کی چوڑائی کے برابر ہے۔

عالمِ مثال میں عالمِ ملکوت، جبروت، لاھوت، ھاھوت اور عالمِ ھُو موجود ہیں۔ اس سے اوپر عالمِ امر ہے جو روحِ بسیط، عقلِ بسیط، نفسِ بسیط اور عدم بسیط کو اپنے اندر شامل کیے ہوئے ہے جن میں روحِ بسیط سب سے اوپر اور اس کے بعد عقلِ بسیط، نفسِ بسیط اور عدم بسیط آتے ہیں۔

اس کائنات کا مرکز عرشِ اعظم ہے اور یہ کائنات گرّوی شکل کی ہے۔ عرش کا مرکز ذاتِ بحت کا جائے قرار ہے اس طرح کہ وہ اس جگہ بھی ہے اور ہر جگہ پر بھی ہے، جس طرح پاور ہاؤس ایک جگہ ہو اور اس کی بجلی یا انوار ہر جگہ موجود ہوں۔ یہ ذاتِ پاک تمام صفات، جہات اور مقامات سے منسوب کرنے سے بری ہے۔ عرش کے سرے سے صفاتی تجلیات شروع ہو جاتی ہیں اور جوں جوں ہماری دنیا کی طرف فاصلہ بڑھتا جائے مقابلتاً کم لطیف ہوتا جاتا ہے۔ ذاتی اور صفاتی تجلیات کا پھیلنا عرش سے ہے اور اس کے انوار کائنات کی ہر جگہ اور ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ عالمِ امر میں عوالم ھُو، ھاھوت، لاھوت، جبروت اور ملکوت واقع ہیں۔ ان کے بعد جنت کے طبقات ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد (دنیا کی طرف) ناسوت یعنی دوزخ کے طبقات شروع ہو جاتے ہیں۔ عرش کے بعد ہر طبقہ اس کے نیچے والے طبقے سے لطیف تر ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ ہمارا عالمِ مادی کثیف تر ہے۔ ناسوت سے اوپر عالمِ اعراف ہے جس کا ذکر باقی عوالم کی طرح الگ سے کر دیا گیا ہے۔

عالمِ ناسوت سے اوپر کی طرف جائیں تو ہر اوپر والا مقام نیچے والے مقام سے زیادہ لطیف تر ہے۔

عالمِ مادی، خلق اور عالمِ امر کی وسعتیں

ان عالموں کی وسعتوں کو تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے مگر ان کے مقامات کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ ہماری دنیا سے ملحق عالمِ مادی شروع ہو جاتا ہے اور اس سے اوپر عالمِ مثال ہے۔ اور اس سے اوپر عالمِ امر کہلاتا ہے۔ قارئین کی سہولت کے لئے یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ عالمِ مادی اور عالمِ مثال مل کر عالمِ خلق کہلاتا ہے اور عالمِ امر اس عالمِ خلق سے بھی اوپر ہے۔ گویا کہ یہ تینوں عالمِ امر، مثال اور خلق کائنات کہلاتے ہیں۔ انسانی روح کا وہ حصہ جو عالمِ خلق میں ہے عبادات فرائض سے تقویت پکڑتا ہے اور روح کا وہ حصہ جو عالمِ امر میں ہے نفلی عبادات سے تقویت پکڑتا ہے۔ اس کا ذکر انشاء اللہ بعد میں کیا جائے گا۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ مکتوبات شریف میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے عالمِ امر لفظ کُن

سے پیدا فرمایا اور عالمِ خلق کو اس کے بعد پیدا فرمایا جس کی تخلیق میں زمانہ صرف ہوا، آسمان اور زمین کی تخلیق چھ دن میں ہوئی۔ سورۃ السجدۃ میں ایک دن ایک ہزار سال کا کہا گیا ہے۔ سورۃ المعارج میں فرشتوں کا آسمان پر پہنچنے کا سفر دنیا کے پچاس ہزار سال کا ذکر آیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

عالمِ مادی میں نظامِ شمسی شامل ہے۔ عالمِ مثال اور عالمِ امر تمام کائنات کی فضا میں پھیلا ہوا ہے۔ ہماری زمین اور ستارے کرّوں میں بھی موجود ہیں۔ عالمِ مثال میں رہنے والی مخلوق کو یہ کرّے محسوس نہیں ہوتے۔ سورۃ آلِ عمران کی آیت ۱۳۳ اور سورۃ الحدید کی آیت ۲۱ میں (مفہوماً) ہے کہ جنت زمین اور آسمان کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان آیات میں اسی طرف اشارہ ہے۔

اس کائنات کا مرکز عرشِ اعظم ہے اور اس عرش کا مرکز عین ذات یا ذاتِ بحت کا جائے قرار ہے۔ جس کا اشارہ قرآن کریم میں اس طرح ہے: ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ (پھر وہ متمکن ہوا عرش پر جیسے اس کی شان ہے) (الفرقان: ۵۹) اللہ تعالیٰ کو کسی ایک جگہ پر ہونا ظاہر نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ ان تمام صفات سے پاک ہے جس سے ہم اس کو منسوب کرتے ہیں۔ اس ذات بحت کے ارد گرد ذاتی تجلیات کا عالم ہے۔ عرش کے سروں سے صفاتی تجلیات شروع ہوتی ہیں اور جوں جوں اس سے دور ہوتے جائیں لطافت کم ہو جاتی ہے۔ ذاتی وصفاتی تجلیات کا مبداء اگرچہ عرش ہے مگر وہ (اللہ) وہاں بھی ہے اور تمام کائنات میں ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے۔ جیسے بادلوں میں بجلی مستور ہے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ذات بحت ایک جگہ پر بھی ہے اور ہر جگہ پر بھی ہے جیسے کہ پاور ہاؤس ایک جگہ پر ہو اور تمام شہر میں اس کی بجلی موجود ہوتی ہے۔ (سر دلبراں)

عرش کے بعد بے شمار بسائط (بسیط کی جمع) موجود ہیں جن کی تعداد اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم ہے، لیکن ان میں سے خاص خاص چار ہیں۔ عرش دنیا کی طرف آئیں تو سب سے پہلے روح بسیط یا روح الاعظم ہے۔ دوسرے عقل بسیط، تیسرے نفس بسیط اور اس کے بعد عدم بسیط۔ عدم بسیط کے بعد عالمِ امر ختم ہو جاتا ہے۔ گویا اس طرح صورت نزول میں ہم عرش سے عالمِ مثال اور عالمِ مادی کی طرف آرہے ہیں۔ بسائط کے بعد دوسرے عوالم عرش کے چاروں طرف طبقات کی طرح موجود ہیں۔

عالمِ امر کے ختم ہونے کے بعد عالمِ مثال شروع ہو جاتا ہے۔ جس کے پہلے طبقے کا نام عالمِ ''ھو'' ہے۔ اس کے بعد بالترتیب عالمِ ھاھوت، لاھوت، جبروت اور ملکوت ہیں۔ یہ تمام جنت کے طبقات ہیں اور ملکوت کے بعد جنت کے طبقے ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد عالمِ اعراف اور عالمِ ناسوت ہوتے ہیں۔ عالمِ ناسوت کے بعد ہمارا عالمِ مادی آجاتا ہے۔ جوں جوں ہم عرش سے عالمِ مادی کی طرف آتے ہیں تو لطافت کثافت میں تبدیل ہو جاتی ہے حتیٰ کہ ہماری دنیا میں ہر چیز اپنے اوپر والے طبقوں سے سب سے زیادہ کثیف ہے۔

عوالم کائنات کا مختصر جائزہ

"سرِّ دلبراں" میں ہے کہ عالم مشتق ہے علامت سے۔ لغوی اعتبار سے عالم وہ ہے کہ جس کی وجہ سے کوئی دوسری چیز پہچانی جا سکے۔ اصطلاحِ صوفیہ میں ماسویٰ اللہ کو عالم کہتے ہیں کیونکہ اس کے ذریعے باعتبار اپنے اسماء اور صفات کے پہچانا جاتا ہے۔ عالم کا ہر جزو خواہ کتنا ہی چھوٹا اور عوام کی نگاہ میں بے قدر کیوں نہ ہو حق تعالیٰ کے کسی نہ کسی اسم کا مظہر ہے۔ عالم صورت حق ہے کیونکہ وجود صُوَرِ حقائق نے ممکنات کے لباس میں ظہور فرمایا۔ اس لئے حق تعالیٰ روحِ عالم اور آدم علیہ السلام خلیفۂ حق ہونے کے اعتبار سے انسان کامل ہے اور اس کو روحِ عالم بھی کہا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کل عالم اٹھارہ ہزار ہیں جن میں آٹھ ہزار آسمانوں میں، آٹھ ہزار دریا اور زمین کے اندر اور دو ہزار اس دنیا میں ہیں۔ ان دو ہزار میں سے ایک ہزار شکمی ہیں۔ (جن کے پیٹ سے بچے پیدا ہوتے ہیں، اور ایک ہزار عالم بیضہ ہیں جو انڈے دیتے ہیں اور پھر ان انڈوں میں سے بچے نکلتے ہیں۔ کچھ عوالم نیچے دیئے جا رہے ہیں۔

عالمِ الامر

وہ عالَم جو بلا مدت و مادہ حق تعالیٰ کے حکم سے وجود میں آیا۔

عالمِ الخلق

یہ عالمِ شہادت ہے اور وہ عالَم ہے جو مادہ سے پیدا کیا گیا ہے۔ (اس کی کچھ تفصیل الگ دی جا رہی ہے)

عالَمِ کُلی

عقلِ کلی، نفسِ کلی کا مظہر انسان کامل ہے۔

عالمِ مثال

سر دلبراں میں ہے کہ یہ عالمِ برزخ ہے جو عالمِ ملکوت اور عالمِ ناسوت کے درمیان، محسوس و مقدار ہونے میں وہ جوہر جسمانی کے مشابہ اور نورانی ہونے میں جوہر مجرد عقلی کے مشابہ ہے۔ نہ وہ جسم ہے جو مادہ سے مرکب ہو نہ مجرّد جوہر عقلی ہے بلکہ دونوں کا غیر ہے اور دونوں کے درمیان برزخ و حد فاصل ہے۔ ایک جہت سے عالمِ غیب سے مناسبت رکھتا ہے اور دوسری جہت سے عالمِ شہادت سے۔ اس کا نام عالمِ مثالی اس لئے رکھا گیا ہے کہ وہ عالمِ جسمانی کی صورتوں پر مشتمل ہے۔ اعیانِ حقائق کی جو علم الٰہی میں صورتیں ہیں ان کا پہلا ظہور عالمِ مثال میں ہی ہوتا ہے۔ خیال منفصل بھی اسی کا نام ہے کیونکہ یہ مادی نہیں اس لیے خیال متصل سے بہت مشابہ ہے۔ کوئی چیز اور کوئی روح ایسی نہیں جو اپنے کمال کی مناسبت سے کوئی صورت مثالی نہ رکھتی ہو کیونکہ ہر

شے کو اسم ظاہر سے کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ملا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرائیل علیہ السلام کو سدرۃ المنتہیٰ میں چھ سو بازوؤں کے ساتھ دیکھا۔ یہ عالمِ مثال عرش و کرسی اور ساتوں آسمان و زمین اور ان میں پائی جانے والی تمام چیزوں پر محیط ہے یعنی ان کی صورتیں اس عالم میں نمایاں ہیں تمام محسوس صورتیں جو عالمِ شہادت میں نمایاں ہیں صورِ مثالی کی ہی ظل ہیں۔ مومن صاحبِ فراست کی نظر ان صورِ مثالیہ پر ہوتی ہے چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ

اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُوْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ "مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے"۔
(جامع صغیر ج ۱ ص ۸)

ایک اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ دجال کی پیشانی پر یہ لکھا ہوا ہے کہ یہ کافر ہے اور اس لکھے ہوئے کو مومن ہی پڑھ سکے گا۔ نیز سورۃ الرحمٰن میں ہے کہ

يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ (الرحمٰن: ۴۱) "پہچان لیے جائیں گے مجرم اپنے چہروں سے تو انہیں پکڑ لیا جائے گا پیشانی کے بالوں اور ٹانگوں سے"۔

"سرِّ دلبراں" میں لکھا ہے کہ عالمِ مثال عالمِ شہادت سے نہیں ہے۔ یہ عالم اس عالم سے روشن ہے۔ وہ عالم گویا ایک روزن (جھروکا) ہے جس میں سے روشنی اس عالم میں آتی ہے اور پھیلتی ہے۔ انسان بوجہ اَسْفَلُ السّٰفِلِيْن ہونے کے اس وقت تک عالمِ مثال کی سیر نہیں کر سکتا جب تک کہ اپنے لطیفۂ سر خیالاتِ مقیدہ سے تجاوز کر کے عالمِ مثالی کے مطلق تک نہ پہنچ جائے۔ پھر اس صورت میں اس کو تمام مشاہدات ہونے لگیں گے اور ہر امر کو وہ اصلی طور پر ادراک کرنے لگے گا اور ان صورِ عقلیہ کی بینائی اسے حاصل ہو جائے گی جو لوحِ محفوظ میں ثبت ہیں۔ (لطائف ستہ کا بیان ایک الگ کتاب کی شکل میں کر دیا گیا ہے) لوحِ محفوظ علم الٰہی کی مظہر ہے۔ اسی مقام سے انسان کو اپنی عین ثابتہ اور اس کے حالات کا بالمشاہدہ علم حاصل ہوتا ہے کیونکہ وہ ظلال سے انوارِ حقیقی کی جانب منتقل ہوتا ہے۔

عالمِ حسّی

"سرِّ دلبراں" میں لکھا ہے کہ عالمِ حسّی میں جو چیز ہے اس کا عالمِ مثالی میں ہونا ضروری ہے لیکن عالمِ مثال کی ہر چیز کا عالمِ حسی میں ہونا ضروری نہیں۔ چنانچہ عالمِ مثال عالمِ حسّی کے مقابلے میں بہت زیادہ وسیع ہے۔ جب حق تعالیٰ ان صورتوں کو جن کی کوئی کامل تصویر یہاں موجود نہیں ہے، عالمِ حسّی میں ظاہر فرمانا چاہتا ہے تو انہیں محسوسات کی ان صورتوں میں متشکل کر دیتا ہے جن کو ان سے کوئی مناسبت ہو، جیسے عقولِ مجردہ وغیرہ۔ مثلاً جبرئیل علیہ السلام کبھی کبھی ظاہر ہوا کرتے تو وہ دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی صورت میں ظاہر ہوتے۔ آسمانی اور

عنصری فرشتے بھی مختلف صورتیں بدلتے رہتے ہیں۔ جنات بھی بوجہ ناری وجود رکھنے کے اپنی صفات سے مناسبت رکھنے والی مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ نفوس انسانی میں بھی جو لوگ مرتبۂ کمال پر پہنچ چکے ہیں وہ اپنے آپ کو مختلف شکلوں اور صورتوں میں بدل لیا کرتے ہیں اور یہ شکلیں اور صورتیں محسوسات میں سے ہوتی ہیں (یعنی محسوس کی جاسکتی ہیں)۔ انہیں یہ بات بفضلہٖ تعالیٰ اس دنیا سے حاصل ہو جاتی ہے اور عالمِ آخرت میں منتقل ہونے کے بعد بوجہ مانعات بدنی اٹھ جانے کے بدلیت کی یہ قوت اور بھی بڑھ جاتی ہے (یعنی صورتوں کی حالت زیادہ بدل جاتی ہے۔) یہ حضرات عالمِ ملکوت میں ملکوتی صورتوں سے داخل ہوتے ہیں۔ اہل مکاشفہ کے خیالات تک ان حضرات کا گزر ہوتا ہے اور ملائکہ اور دیگر برگزیدہ ہستیوں کی شان سے ان میں ظہور فرماتے ہیں اور صاحب وجدان ان میں اور فرشتوں میں امتیاز کر لیتے ہیں۔

عالمِ معانی

ذات وصفات واسمائے الٰہی کو کہتے ہیں

عالمِ کون یا حادث کی قسمیں

عالمِ کون یا حادث کی دو اقسام ہیں ایک عالمِ لطیف اور دوسرا عالمِ کثیف۔

(۱) عالمِ لطیف: عالمِ لطیف باطن ہے اور مجردات کا عالم ہے جو مادہ نہیں رکھتا۔ مثلاً عالمِ ارواح یعنی نفوس ناطقہ بشریہ خواہ بدن سے متعلق ہوں یا نہ ہوں اور عقول یعنی ملائکہ کرّوبین اور نفوس یعنی ملائکہ سماویہ وغیرہ۔

(۲) عالمِ کثیف: عالمِ کثیف عالمِ اجساد اور عالمِ مادی کا مرکب ہے اور ظاہر عرش سے مرکز خاک تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ دونوں عالم (لطیف اور کثیف) باعتبار حقیقت و ماہیت کے (نہ کہ باعتبار وجود خارجی اور اسمائے کونی کے) ۳۵۴ کلیات عالمِ ارواح واجساد ہیں اور دائرہ تعین ثانی میں ظاہر کیے گئے ہیں۔ یہی تجلی نفس رحمانی ہے اور مفردات عالمِ ارواح واجسام کی تفصیل ہے جس کا انتہائی نقطہ انسان ہے جو کہ جامع ہے کل حقائقِ الٰہی اور کونی کا حتیٰ کہ برزخ وحدت تک کو اپنے میں لئے ہوئے ہے۔ زیادہ تفصیل کے لیے سرِ دلبراں کا مطالعہ کریں۔

عالمِ کلی: عقلِ کلی نفسِ کلی کا مظہر انسانِ کامل ہے۔

عالمِ ارواح

عالمِ ارواح سے مراد عالمِ ملکوت ہے۔ (عالمِ ملکوت کے بیان کی طرف رجوع فرمائیں) عالمِ ملکوت کی فرع عالمِ محسوس ہے۔ ملکوت میں نسخہ ہے عالم کے ہر موجود کا اس لیے جو چیز ملکوت میں ہوتی ہے اس کا اظہار عالمِ محسوس میں وقت اور ترتیب وحال کی مناسبت سے ضروری ہے۔ عالمِ ارواح بمقابلہ عالمِ محسوس کے ذوق شہود میں ظاہر اور قوی تر ہے۔ عالمِ ارواح میں معانی محسوس صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔

عالم ناسوت میں کسی چیز کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے آواز دیتے ہیں اور پکارتے ہیں اس کے قائم مقام عالم ارواح یعنی ملکوت میں کسی کو اپنی جانب متوجہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کا تصور کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ روح بھی متوجہ ہو جاتی ہے۔ ارواح کی عادت ہے کہ جس چیز کی جانب متوجہ ہوتی ہیں اس میں حلول کرتی ہیں مگر اس طور پر کہ اپنے مرکز اصلی سے جدا نہیں ہوتیں مثلاً آفتاب جو کہ عالم کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس میں حلول کرتا ہے مگر اپنے مرکز اصلی سے جدا نہیں ہوتا۔

ارواح جب کسی صورت میں متشکل ہوتی ہیں تو وہ اس صورت سے بالذات جدا نہیں ہو سکتیں اور اپنی بساطِ اصلی کی طرف نہیں لوٹ سکتیں لیکن اس کی طاقت رکھتی ہیں کہ اپنی اصلی صورت کو چھوڑے بغیر جس صورت کے ساتھ چاہیں متشکل ہو سکیں۔ روح باعتبار اپنے مجرد ہونے اور عالمِ ارواح کی چیز ہونے کے بدن سے مغائر (بغیر) ہے۔ صرف تدبیر اور تصرف کے لئے اس سے متعلق ہے مگر بذاتہٖ اپنی بقا اور اپنے قیام کے لئے اپنے بدن کی محتاج نہیں لیکن اس اعتبار سے کہ بدن اس کی صورت ہے اور عالمِ شہادت میں اس کے کمالات کا اظہار قوۂ ؟ بدنی پر ہی موقوف ہے۔ روح بدن کی محتاج ہے۔ روح کا بدن میں ایسا سریان ہے جیسا کہ وجود مطلق کا موجوداتِ عالم میں ہے۔ جس جہت سے کہ حق تعالیٰ اشیاء کا عین ہے روح بدن کی عین ہے اور جس جہت سے حق تعالیٰ اشیاء کا غیر ہے روح بدن کی غیر ہے۔ روح بدن کی رب ہے اور اس کو بدن کے ساتھ وہ تعلق ہے جو رب کو مربوب سے ہوتا ہے۔

ارواحِ بسیطیہ

اس سے مراد ارواحِ مجردہ یعنی ارواحِ محض ہوا کرتی ہیں۔

روحِ عالم

اس سے اکثر آدم علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے کیونکہ ان کو اس عالم کے ساتھ وہی نسبت ہے جو روح کو جسم کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔ علاوہ ازیں آدم علیہ السلام حق تعالیٰ کے خلیفہ ہیں جن باتوں کا اطلاق حق تعالیٰ پر کیا جا سکتا ہے ان کا اطلاق حق تعالیٰ کے خلیفے پر بھی بلحاظ خلافت جائز ہے اور اس لحاظ سے سرورِ کائنات حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر بھی روحِ عالم اور جانِ عالم کا اطلاق ہوتا ہے۔

عالم الامر

وہ عالم جو بلا مدت و مادہ حق تعالیٰ کے حکم سے وجود میں آیا۔ اس کی تفصیل الگ دی جا رہی ہے۔

عالمِ شہادت

اسماءِ الٰہی جن صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں انہیں مظاہرِ اسماء کہتے ہیں۔ وہ صورتیں یا وہ مظاہر جن میں اسمائے الٰہی علمِ الٰہی میں ظاہر ہوتے ہیں اعیانِ ثابتہ اور صورِ علمی کے نام سے موسوم ہیں اور وہ مظاہر جو خارج میں ظاہر ہوتے ہیں ان کو اعیانِ ممکنات، وجود اور عالمِ شہادت کہتے ہیں۔ اصطلاحاتِ صوفیہ میں ہے کہ عالمِ شہادت عالمِ امر کے بعد ہوا ہے اور اس کی تخلیق میں قرب و بعد زمانہ اور مادہ کو دخل ہے۔

عالمِ کبیر عالمِ صغیر

جس طرح اسم اللہ جملہ اسماءِ الٰہی کا جامع ہے اسی طرح انسان جملہ صفاتِ الٰہی کا جامع ہے۔ پس حقیقتِ انسانی مظہر ہے اسم اللہ کی جب کائنات میں ان اسماء کا ظہور ہے جن کا جامع اسم اللہ ہے تو حقائقِ عالمِ علمی اور عینی اعتبارات سے حقیقت انسانی ہی کے مظاہر ہیں یعنی عالم میں انسان ہی کی حقیقت ظاہر ہے۔ اس بنا پر عالم کو عالمِ کبیر اور انسان کو عالمِ صغیر کہتے ہیں۔ حقیقت انسانی کا تفصیلی ظہور عالم میں ہے اور عالم کا اجمالی ظہور انسان میں ہے یا انسان کی تفصیلی صورت عالَم ہے اور عالَم کی اجمالی صورت انسان ہے۔ جو کچھ عالَم میں ہے سب کچھ اجمالی طور پر انسان میں بھی ہے اور جو کچھ انسان میں ہے سب کچھ تفصیلی طور پر عالَم میں ہے۔

(سرِ دلبراں: ص، ۳۶۔۳۵)

عرش، عرش المجید، عرش العظیم اور عالمِ قدس

چند اصطلاحات جو عالمِ بالا کے لئے استعمال ہوتی ہیں ان کا ذکر عام معلومات کے لیے دیا جا رہا ہے۔

عرش: سب سے اونچا آسمان جو تمام افلاک معنویہ و صوریہ کا احاطہ کیے ہوئے ہے عرش کہلاتا ہے۔ اس آسمان کی سطح مکانتِ رحمانیہ ہے۔ اس کی ھویت مطلق وجود ہے خواہ عینی ہو خواہ حکمی۔ اس آسمان کا ایک ظاہر ہے ایک باطن ہے۔ اس کا باطن عالمِ قدس ہے جو اسماء و صفات کا عالم ہے اس کا ظاہر عالمِ اِنس ہے جو تشبیہ و تجسیم و تصویر کا محل ہے اور جو جنت کی چھت ہے۔ یہ مکان جہتِ ستہ سے منزہ ہے۔ منظرِ اعلیٰ ہے۔ تمام اقسامِ موجودات کو گھیرے ہوئے ہیں جس طرح جسمِ ہیکلِ انسانی جمیع متفرقاتِ انفس کا جامع ہے اسی طرح عرش جسم کلی ہے جو جمیع متفرقاتِ آفاق کا جامع ہے۔ اس میں اسماء و صفات کے مجلا کو کثیب کہتے ہیں جس کے معنی ریت کے بلند تودے کے ہیں۔ اہل جنت مشاہدۂ حق کے لئے اس کی جانب جائیں گے اور اس پر کھڑے ہوں گے۔ (''سرِّ دلبراں'')

جب مطلق عرش کہا جاتا ہے تو یہی آسمان مراد ہوتا ہے۔ جب صفات کے ساتھ اسے مقید کیا جاتا ہے تو کثیب کہتے ہیں۔

عرش المجید: اس سے عالمِ قدس مراد ہوتا ہے جو مرتبہ رحمانیت ہے۔
عرش العظیم: اس سے حقائقِ ذاتیہ اور مقتضیات نفسانیہ مراد ہیں جن کی مکانت اور عظمت بھی عالمِ قدس ہی ہے۔
عالمِ قدس: اس سے معانی الٰہیہ مراد ہیں جو احکام خلقیہ اور نقائص کونیہ سے مقدس و منزہ ہیں۔

مختلف نظامِ شمسی، مختلف زمانے اور تخلیقِ کائنات

اس جگہ قارئین کی دلچسپی کو بڑھانے کے لئے چند ایسی حقیقتوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جن کا کچھ علم تو حاصل ہو چکا ہے لیکن اکثر حصہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔ چونکہ یہ مضمون بہت دقیق اور عمیق ہے اس لئے اس کا سرسری تذکرہ کیا جائے گا۔ جو لوگ علمِ سیارگان اور طبیعات کے مضامین کا مطالعہ کر چکے ہیں انہیں اس بات کا اندازہ ہے کہ سائنس دانوں نے اس مضمون پر تحقیقات پر مبنی کتب شائع کی ہیں اور چونکہ یہ مضمون مخصوص علمی نوعیت کا ہے، اس لئے اس کے متعلق محض محدود اور عامیانہ باتوں کا ذکر کیا جائے گا جس کو ہر شخص آسانی سے سمجھ سکے کیونکہ اس مضمون کی گہرائیوں میں صرف وہ لوگ جا سکتے ہیں جو ایسے مضامین میں B.Sc اور M.Sc کی سند (Degree) حاصل کر چکے ہوں۔

اسی مشکل کے پیش نظر کہ عام انسان مشکل مضامین کو سمجھ نہیں سکتا لہٰذا ہماری ایک کتاب ''نشانِ منزل'' میں ''تخلیقِ کائنات'' کا ایک مضمون شامل کیا گیا تھا مگر چونکہ وہ بھی عام انسان کی فہم سے بالا تھا اس لئے اس کا آسان خلاصہ کر دیا گیا ہے۔ اس آسان مضمون کو پڑھنے سے اندازہ ہوا کہ عام انسان اس کو سمجھنے سے قاصر ہے لہٰذا جتنا کوئی سمجھ سکا اسی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ کائنات کی ساخت اور شکل و صورت کا اندازہ لگانے کے لئے ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہماری زمین نظامِ شمسی کا ایک حصہ ہے جس میں سورج کے گرد نو عدد سیارے گھوم رہے ہیں۔ (اس کی ڈرائنگ ہماری تصنیف نشانِ منزل کے صفحہ ۶۰ پر دی گئی ہے۔) ایسے ہزاروں نظامِ شمسی سے مل کر ایک گلیکسی بنتی ہے اور ایسی کروڑوں گلیکسیاں مل کر گلیکسیوں کا ایک مجموعہ بنتا ہے جو گردش میں ہے۔ ان کی گردش کی سمت اور رفتار معلوم نہیں ہو سکی۔ جب ہم اپنی زمین سے باہر نکل جاتے ہیں تو وہاں کے وقت کا معیار مختلف ہو جاتا ہے اور بہت اوپر جا کر ہمیں ماضی، حال اور مستقبل ایک طرح کے نکات نظر آتے ہیں۔

ہمارا ایمان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو معراج ہوئی وہ معراج جسمانی تھی کیونکہ معراج تو بہت سے انبیاءؑ اور اولیاءؒ کو بھی حاصل ہو چکی ہے۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کے اقطار (قطروں) سے نکالا گیا تو وہاں زمان اور مکان کچھ اور تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت دیر تک وہاں قیام فرمایا اور سیر بھی کی۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو

واپس بھیجا گیا تو آپ کو ماضی، حال یا مستقبل کے اوقات میں سے کسی جگہ پر اتارا جا سکتا تھا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہوا اور آپ کو نکتہ حال والے وقت پر اتارا تو آپ کا بستر اسی طرح گرم تھا، دروازے کی کنڈی ہل رہی تھی اور وضو کا پانی اسی طرح بہہ رہا تھا۔

روحانی کائنات کی حدود کا تعین کرنا ممکن نہیں، اس کی حقیقتوں کا علم نہیں ہوا کہ یہ کائنات کہاں تک پھیلی ہوئی ہے۔ ابھی تک سائنسدان بھی آئے دن نئے نئے عوالم دریافت کر رہے ہیں۔ کئی ایسے ستارے بھی موجود ہیں جن کی روشنی (روشنی کی سپیڈ کے ساتھ) ابھی تک ہماری زمین تک نہیں پہنچی۔ روشنی کی سپیڈ کا علم تو ہو چکا ہے (کہ وہ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ سے چل رہی ہے اور دنیا کے فاصلوں کو طے کرتی ہے۔) مگر نور جو ایک خاص قسم کی روشنی ہے اس کی رفتار کا ابھی تک علم نہیں ہو سکا البتہ قرآن مجید کی سورۃ المعارج آیت نمبر ۴ میں اس حقیقت کا ذکر ہے کہ اب بھی زمین سے بارگاہِ الٰہی میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور وہاں سے احکام اور ہدایات حاصل کرتے ہیں اور نہایت قلیل وقت میں ان کو نافذ کرنے کے لئے اپنے اپنے مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔ یہ مسافت جو وہ پل بھر میں طے کرتے ہیں اتنی طویل ہے کہ اگر انسان اپنی طبعی رفتار سے چلنا شروع کر دے تو پچاس ہزار سال پہنچنے میں لگ جاتے ہیں۔ (ضیاء القرآن: ص ۳۶۱، ج ۵)

علامہ ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلے میں فرمایا ہے کہ فنائے قلب کا مقام صوفی کو صرف اللہ تعالیٰ کی کشش اور جذب سے حاصل ہوتا ہے اور یہ جذب و کشش حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مشائخ کے توسط سے حاصل ہوتی ہے اور کوئی شخص شیخ کامل کی توجہ کے بغیر صرف عبادتوں اور ریاضتوں سے اس مقام تک پہنچنا چاہے تو اس کے لئے پچاس ہزار سال کا عرصہ درکار ہوگا اور اتنی تو کسی کی عمر بھی نہیں ہو سکی۔ اس سے یہ بات آشکار ہو گئی کہ پیر کامل کی توجہ کے بغیر کسی کا اس مقام پر فائز ہونا محال ہے۔ وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ (مظہری)

آئن سٹائن (ایک جرمن سائنسدان) نے یہ مفروضہ پیش کیا ہے کہ اگر ہم زمین کے قطر کے اردگرد چکر لگائیں جس کی مسافت ۲۵۰۰۰ میل ہے۔ اس چکر میں زیادہ سے زیادہ رفتار لائٹ کی ہو سکتی ہے اور سی جی ایس سسٹم کے مطابق یہ ۲۵۰۰۰ میل کا سفر چند سیکنڈوں میں طے ہوگا لیکن اگر ہم اپنی رفتار کو نور کی رفتار کے مطابق بڑھا دیں تو ان کے فارمولے کے تحت ہم چلنے سے پہلے ہی واپس اپنی جگہ پر پہنچ جائیں گے۔ نور کی رفتار (روشنی کی رفتار) ۱۸۶۰۰۰ میل فی سیکنڈ سے بڑھ کر بے انتہا رفتار تک پہنچ جائے گی اور ان کے فارمولے میں وقت "T" کی کیت "منفی T" آتی ہے۔ اس لئے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ نور کی رفتار سے اگر چلا جائے تو ہم چلنے سے پہلے ہی واپس اپنے مقام پر آ جائیں گے۔

انسان اور خدا کے درمیان پردے

امداد السلوک میں لکھا ہے کہ جو چیزیں نظر آتی ہیں ان سب کی حقیقتیں عالم معنی میں موجود ہیں اور یہ جو عالم مثال میں روشن ہوتا ہے انہی حقیقتوں کا ظل اور پرتو ہے۔ تاہم ان سے مانوس نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ حق تعالیٰ نے اس راہ سلوک میں نور و ظلمت کے ستر ہزار پردے پیدا فرمائے ہیں اور ان کو عزت و عظمت کی وجہ سے پردۂ کعبہ اسرار قرار دیا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی راز کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ کے لئے نور و ظلمت کے ستر ہزار پردے پیدا ہیں کہ اگر ان کو اٹھا دیا جائے تو سارا عالم خاکستر ہو جائے اور وہ پردے یہی انوار روحانیہ اور ظلمت جسمانیہ کے ہیں۔ یعنی حواس خمسہ، طبائع اغراض، اخلاق ذمیمہ، نفس کی ہوا و ہوس، شہوت اور شیطان وغیرہ اور پاک نفس چونکہ ظلمت و کدورت سے بالطبع متنفر اور انوار سے طبعاً مانوس ہوتا ہے اس لئے ظلماتی پردوں کا اٹھا دینا طالب پر سہل ہوتا ہے مگر نورانی پردوں کا اٹھانا بے حد دشوار۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ دس ہزار پردہ ہائے ظلمت تو لطیفہ قالب میں جو سالک کا وجود ہے خاکی رنگ کے ہیں اور ذکر پر دوام اور مواظبت کے سبب ذکر کے نور سے جسم صالح ہو جاتا ہے اور ابر سفید کی طرح صاف بن جاتا ہے۔ دس ہزار نورانی پردے لطیفہ نفس میں آسمانی رنگ کے ہیں۔ خوب جان لینا چاہیے کہ نفس انسان کے وجود کا تربیت کنندہ ہے اور اپنی برائیاں وجود پر ڈالتا رہتا ہے۔ پس جب تربیت کنندہ پاک و صاف ہو جائے گا تو نیکیوں کا فیضان وجود پر ڈالے گا (اور اس طرح نفس کے تزکیہ سے ظلماتی حجاب مرتفع ہو جائیں گے) اور دس ہزار نورانی پردے لطیفہ قلب میں آگ کی مثل سرخ رنگ کے ہیں۔ اگر حسب خواہش غذا کھائی جاتی ہے تو اس میں دھوئیں کی بھی آمیزش ہو جاتی ہے اور جلد اوپر کو نہیں چڑھتے ورنہ سریع الصعود ہوتے ہیں اور دس ہزار نورانی پردے لطیفۂ سر میں برنگ شیشہ سفید و صاف جیسے آفتاب ان پر چمکتا ہو اور دس ہزار نورانی لطیفہ روح میں ہیں زرد رنگ کے کمال درجہ صاف ہیں۔ دس ہزار نورانی لطیفہ خفی میں ہیں، صیقل دار رُومی آئینہ کے رنگ پر جیسے انسان کی آنکھ کی پتلی کا رنگ ہے اور دس ہزار نورانی لطیفہ حقیقت میں جس کے ساتھ تمام لطیفے قائم ہیں سبز رنگ کے ہیں کہ اس سے آنکھوں کو ٹھنڈک اور قلب کو فرحت ملتی ہے اور وہی دل کی حیات کا رنگ ہے اس کے بعد عقیق کا رنگ باقی رہ جاتا ہے۔

حضرت نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص ان رنگوں سے متصف ہوگا خواہ سالک قصد کرے یا نہ کرے مقام فنا پر ضرور پہنچ جائے گا۔ جیسے کہ روح بالذات آگ سے گھبراتی ہے صاحب روح کے اختیار و قصد کو اس میں دخل نہیں ہے (کہ چاہے تو اس نفرت کو نہ ہونے دے) اور یہ رنگ بہت دشواری اور بے شمار مجاہدہ کرنے کے بعد بسہولت ظاہر ہو جاتا ہے اور پردہ ہائے مذکورہ اٹھ جانے کے بعد ساتوں لطیفوں کے انوار

مشاہدہ میں آنے لگتے ہیں اور سالک لطیفۂ قالب میں جنات کو، لطیفۂ نفس میں دوزخ کو، لطیفۂ قلب میں جنت کو، لطیفۂ سِر میں فرشتوں کو، لطیفۂ روح میں اولیائے کرام کو، لطیفۂ خفی میں انبیاء علیہم السلام کو اور لطیفۂ حقیقت میں فخرِ رُسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مشاہدہ کرتا ہے۔ اس کے بعد نور الانوار تجلی فرماتا ہے اور جملہ انوارِ سابقہ کو مدھم اور ماند کر دیتا ہے۔ پس سلوک تام ہو جاتا ہے اور طالب کی سیر جذبہ جلیہ (جلوۂ جلی) کے ساتھ بدل جاتی ہے۔

راہِ سلوک میں حجابات کا اٹھنا

جاننا چاہیے کہ جب حق تعالیٰ کی محبت میں سالک، سلوک اختیار کرتا اور افضل عبادتوں اور نماز، روزہ اور طہارت و لطافت میں مشغول ہوتا ہے اور حق تعالیٰ کا قرب تلاش کرتا ہے تو اس کو جذبہ خفی اور سیر الی اللہ کہتے ہیں اور سلوک کا افتتاح سمجھتے ہیں اور اس جذبہ کے بدون اس راستہ میں چلنا ممکن نہیں اور یہی معنی ہیں ارشادِ خداوندی کے کہ یُحِبُّوْنَهٗ (وہ محبت رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ سے۔ المائدہ: ۵۴) اور اس پر سالک کی مواظبت کے سبب جب حق تعالیٰ اس کو اپنا محبوب بناتا اور اپنی طرف کھینچتا ہے اور اپنی محبت کے راز سے آگاہ فرماتا اور واصل کر لیتا ہے تو اس کو جذبہ جلی کہتے ہیں اور یہی حق تعالیٰ کے ارشاد کا مصداق ہے۔ یُحِبُّهُمْ یعنی اللہ تعالیٰ ان سے محبت رکھتا ہے اور اس جذبہ تک جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت کا اتباع کیے بغیر پہنچنا ہرگز ممکن نہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران: ۳۱)

(اے محبوب!) آپ فرمائیے (انہیں کہ) اگر تم (واقعی) محبت کرتے ہو اللہ سے تو میری پیروی کرو تب محبت فرمانے لگے گا تم سے اللہ

یہ محبت کا راز ایسا راز ہے کہ جس نے چکھا نہیں وہ واقف نہیں اور طالب صادق اگر چالیس روز متواتر شرائط پر کاربند رہے گا تو انشاء اللہ تعالیٰ مکاشفات کا دروازہ اس پر کھل جائے گا اور اول انوارِ روحانی اور کواکب روحانی نظر آئیں گے۔ پھر فرشتوں کا مشاہدہ ہونے لگے گا۔ پھر صفات کا مشاہدہ ہو گا کہ ان صفات کے واسطے سے سالک پر بعض حقائق کا ترشح ہو گا اور یہ حال بدایت میں ہوتا ہے اور جب عالمِ مثال سے بلند ہو جاتا ہے تو جملہ اشیاء میں حق ہی حق ملاحظہ کرتا ہے اور جب پھر اسی عالمِ مجاز میں جو سایہ کی مثل ہے، واپس آتا ہے تو مخلوق پر ترس کھاتا اور بنگاہِ رحم دیکھتا ہے کہ یہ لوگ جمالِ حقیقی سے محروم ہیں اور اس عالمِ غرور و عالمِ ظل پر مغرور اور قناعت کیے بیٹھے ہیں اور یہ شخص اگرچہ اپنے وجود و جسم کے اعتبار سے مخلوق کے ساتھ ہوتا ہے مگر قلب کے اعتبار سے ان سے غائب اور دور ہوتا ہے اور اس شخص کو خلقت کے ظہور پر تعجب ہوتا ہے کہ حق کے ظہور کے سامنے سب محو کیوں نہ ہو گئے اور لوگ اس شخص کے حال پر تعجب کرتے ہیں کہ اس کو کیا ہو گیا کہ جسم اور وجود

ہوتے ہوئے ایسا بے خود ہو گیا ہے اور اپنے آپ سے بھی بیگانہ ہو گیا ہے اور یہ سب ذکر ہی کا ثمرہ ہے کہ اول ذکر زبانی تھا۔ اس کے بعد ذکر قلبی اور اس کے بعد غلبۂ ذکر اور اس کے بعد ذکر میں محویت کہ ذاکر مذکور میں محو ہو جاتا ہے اور یہ نتیجہ ہے نیک عمل اور اتباع سنت کا اور نہایت سلوک بھی یہی ہے جو ہدایت کی صحت و درستی کے بعد پیدا ہوتی ہے۔

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کا حجابات اٹھانے کا طریقہ

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس راستے کو ہم طے کرنے کے درپے ہیں وہ سارا سات قدم ہے۔ جس طرح انسان کے سات لطیفے ہیں۔ دو قدم تو عالمِ خلق میں ہیں جو قالب (بدن) اور نفس سے تعلق رکھتے ہیں اور پانچ عالمِ امر میں ہیں۔ جو قلب، روح، سر، خفی اور اخفیٰ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان سات قدموں میں سے ہر قدم میں دس ہزار حجابات اُٹھاتے ہیں۔ یہ حجابات نورانی ہوں یا ظلماتی۔

اِنَّ اللّٰهَ دُوْنَ سَبْعِيْنَ اَلْفَ حِجَابٍ مِنْ نُوْرٍ وَّ ظُلْمَةٍ (المعجم الكبير للطبراني: ج ٦، ص ١٤٨، رقم الحديث: ٥٨٠٢)

بے شک اللہ اور بندے کے درمیان نور اور ظلمت کے ستر ہزار پردے ہیں۔

اوّل قدم میں جو عالمِ امر میں رکھتے ہیں تجلیٔ افعال ظاہر ہوتی ہے، دوسرے قدم میں تجلیٔ صفات تیسرے قدم میں تجلیاتِ ذاتیہ کا آغاز ہو جاتا ہے۔ پھر تجلیات کے فرق کے مطابق آگے ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔ ان سات قدموں میں اپنے سے دور اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ان قدموں کے مکمل ہونے سے قربِ الٰہی بھی مکمل ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ فنا اور بقا سے مشرف کر دیے جاتے ہیں اور ولایت خاصہ کے درجہ تک پہنچا دیئے جاتے ہیں۔ سلسلۂ نقشبندیہ میں اس سیر کی ابتداء عالمِ امر سے کی جاتی ہے اور عالمِ خلق کو اس ضمن میں طے کر لیا جاتا ہے۔ کچھ صوفیاء نے سات لطائف میں سے ہر لطیفہ کو عالمِ مثال میں ان کے مناسب انوار میں سے کسی ایک نور کی صورت میں قرار دیا ہے اور ہر لطیفہ کی صفائی کی علامت اُن انوارِ مثال میں سے کسی نور کے ظہور کو مقرر کیا ہے۔ مثلاً صفائی قلب کی علامت نور سرخ، صفائے روح نور زرد رنگ، صفائے سر سفید رنگ، خفی سیاہ رنگ اور صفائے اخفیٰ کو نور سبز رنگ کی صورت قرار دی ہے۔

جب سیر کی ابتداء عالمِ امر سے ہوتی ہے تو سالک اپنے اندر لذت اور حلاوت پاتا ہے جو جذبہ اور کشش کا ہراول دستہ ہے اور حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ اثر پیدا نہ ہو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سالک میں عالم امر عالم خلق کی نسبت کمزور ہے اور یہ کمزوری راہ کی رکاوٹ ہے۔ یہ اس وقت تک رہتی ہے جب تک عالم امر اور عالم خلق پہ غلبہ اور قوت حاصل نہ کر لے اور معاملہ برعکس نہ ہو جائے۔ اس ضعف یا کمزوری کا علاج

یہ ہے کہ مکمل تصرف والا مرشد پورے تصرف سے کام لے۔ نقشبندی سلسلہ کے علاوہ اس کا علاج یہ ہے کہ پہلے تزکیۂ نفس کیا جائے اور ریاضت اور مجاہداتِ شاقہ موافقِ شریعت کیے جائیں۔ لکھتے ہیں کہ یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ دیر سے حلاوت اور اثر کا پیدا ہونا استعداد کے ناقص ہونے کی علامت نہیں بلکہ کئی دفعہ مکمل استعداد والے بھی اس بلا میں مبتلا اور گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اس کا علاج کوشش اور توجہ مرشد سے ہو جاتا ہے۔ حوصلہ ہار کر راہ سلوک چھوڑ نہیں دینا چاہیے۔ بعض اوقات تو تصور شیخ سے بہت سے معاملات درست ہو جاتے ہیں۔

امداد السلوک میں ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

ذِکْرُ اللِّسَانِ لَقْلَقَةٌ وَذِکْرُ الْقَلْبِ وَسْوَسَةٌ　زبان کا ذکر بکواس اور قلب کا ذکر وسوسہ ہے۔

وَّذِکْرُ الرُّوْحِ شِرْکٌ وَّ ذِکْرُ السِّرِّ کُفْرٌ　اور روح کا ذکر شرک اور سر کا ذکر کفر ہے۔

یہ اس لئے کہا کہ جو ذکر، ذاکر اور مذکور کی خبر دے (خواہ وہ کوئی ذکر ہو) وہ ذکر نہیں۔ اصل ذکر مذکور میں (یعنی اللہ) میں ذکر اور ذاکر کا فنا ہونا ہے۔ اس لیے ذکر کو لقلقہ، وسوسہ فرمایا۔ (نوٹ: کفر کا مطلب یہاں پر ایمانی کفر نہیں بلکہ ماسوا رب کے ہر چیز کا انکار کر دینا فقط اللہ کی ذات میں کھو جانا ہے۔)

جس چیز کے باعث تم دوست سے دور ہو جاؤ، وہ چاہے کفر ہو چاہے ایمان الَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ صَلَاتِھِمْ سَاھُوْنَ ﴿۵﴾ (پس خرابی ہے ایسے نمازیوں کیلیے جو اپنی نماز (کی ادائیگی) سے غافل ہیں۔) (الماعون: ۴،۵)

شیخ ابو سعید ابو الخیر رحمۃ اللہ علیہ نے بوعلی سینا سے مقصود پر دلیل طلب کی تھی اور اس نے جواب میں لکھا تھا کہ کفر حقیقی میں آ جا اور اسلام مجازی سے نکل جا اور ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ نے عین القضاۃ کی طرف لکھا کہ اگر میں لاکھ برس تک عبادت کرتا تو مجھے وہ فائدہ حاصل نہ ہوتا جو مجھے بوعلی سینا کے اس کلمہ سے حاصل ہوا ہے۔ اس پر عین القضاۃ نے لکھا کہ اگر آپ سمجھتے تو بوعلی سینا کی طرح مطعون کیوں ہوتے۔ (کفر حقیقی کا مطلب ماسوی اللہ سے نکل آنا اور اسلام مجازی سے مراد ہے کہ کوئی رسمی طور پر مسلمان ہو جائے۔ اسی وجہ سے حضرت مولانا رومؒ نے فرمایا ہے کہ ان کے پیر "شمس الدین بوصیری مسلماں بود کافر شد" (حضرت شمس الدین پہلے مسلمان تھے پھر کافر ہو گئے یعنی کفر حقیقی میں آ گئے اور اسلام مجازی کو ترک کر دیا۔)

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ کفرِ حقیقی کیا ہے۔ وہ دوئی کا بالکل دور ہو جانا اور کثرت کا بالکل چھپ جانا یعنی دوسرے لفظوں میں مکمل فنا ہے۔ اس کفر حقیقی کے اوپر اسلام حقیقی کا مقام ہے۔ جس کو بقا کا محل کہتے ہیں۔ بوعلی سینا اسلام حقیقی کی طرف نگاہ نہ کر سکا یہ اس کی کوتاہی تھی۔ اس نے کفر حقیقی سے اور نہ ہی اسلامِ مجازی سے کچھ حاصل کیا اور فلسفیانہ بکھیڑوں میں عمر گزار دی اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس کی تکفیر کرتے ہیں کہ بوعلی سینا کے فلسفیانہ اصول، اصولِ اسلام کے منافی ہیں۔

حضرت علامہ ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کا حجابات اٹھانے کا طریقہ

ہماری تصنیف ''حسنِ نماز'' کے صفحہ ۲۰۷ پر اس بات کی تشریح بیان کی گئی ہے کہ سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر ۷۲ میں جس امانت کے اٹھانے کا ذکر ہے اس کے متعلق حضرت علامہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس امانت کے اٹھانے کا مطلب احکامِ شرعیہ کو اٹھانا مراد نہیں کیونکہ عبادت کرنے پر جب فرشتے اور دیگر مخلوقات بھی مامور ہیں تو انسان کی اس میں فضیلت کیا ہوئی۔ فرمایا کہ صوفیائے کرام نے اس امانت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ امانت جو انسان کے سوا کسی نے قبول نہ کی وہ نور العقل اور نار العشق تھی کیونکہ انسان نور العقل کے ساتھ استدلال قائم کرتا ہے اور پھر اس استدلال سے خدا کی معرفت حاصل کرتا ہے اور پھر ہر چیز پر عقلی دلائل پیش کرتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ نار العشق انسان کے دل میں وہ آگ ہے جو خدا اور بندے کے درمیان ہر قسم کے حجابات کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے اور بندے کو مکمل و اکمل معرفتِ الٰہی تک پہنچا دیتی ہے۔

معلوم ہوا کہ معرفتِ ذاتیہ نار العشق کے نور العقل کے ساتھ جمع ہونے سے ہی وابستہ ہے۔ یہی وہ آگ ہے جو بندے کو خدا کے سامنے بے حجاب کر کے واصل باللہ بنا دیتی ہے۔ باقی مذکورہ کتاب میں مطالعہ فرمائیں۔

اولیاء میں بشری صفات کے حجابات

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ''مبدأ و معاد'' میں لکھتے ہیں کہ اولیائے کرام کے حجاب اور پردے ان کی بشری صفات ہیں۔ جن چیزوں کی باقی تمام لوگوں کو ضرورت ہوتی ہے ان بزرگوں کو بھی ہوتی ہے۔ ان کا ولی ہونا انہیں احتیاج سے بری نہیں کر سکتا۔ ان کی ناراضگی بھی عام آدمیوں کی ناراضگی کی طرح ہوتی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں بھی عام انسانوں کی طرح ناراض ہوتا ہوں۔ (تو اولیائے کرام اس سے کیسے بَری ہو سکتے ہیں۔) کھانے پینے اور اہل و عیال سے زندگی بسر کرنے اور ان سے انس کرنے میں اولیاء اللہ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین اور باقی آدمی شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام علیہم السلام کے حق میں فرمایا ''ہم نے ان کے جسم بھی کھانا کھانے والے بنائے''۔ ظاہر ہے کفار کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے کہ یہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ جس کی نگاہ اولیاء کے صرف ظاہر پر پڑتی ہے، وہ نعمتِ الٰہی سے محروم رہتا ہے اور دنیا و آخرت کا نقصان اٹھاتا ہے۔ اسی بات سے ابولہب کو دولتِ اسلام سے محروم رکھا گیا اور ابدی نقصان میں ڈالا۔ باسعادت وہی شخص ہے جو اہلِ رتبہ کے ظاہر کا چنداں خیال نہیں کرتا بلکہ اس کی نظر کی تیزی ان کے باطنی اوصاف تک پہنچتی ہے۔ اولیاء اللہ دریائے نیل کی طرح ہیں کہ محجوبوں کے لئے بلا اور محبوبوں کے لئے پانی ہیں۔ یہ عجیب معاملہ ہے کہ جس قدر صفات بشریت کا ظہور اہل اللہ میں ہوتا ہے باقی آدمیوں میں نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہموار اور مصفّا مقام پر میل کچیل اور تاریکی خواہ تھوڑی بھی ہو تو زیادہ ظاہر ہوتی ہے اور غیر مصفّا مقام پر

میل کچیل اور تاریکی خواہ زیادہ ہو کم دکھائی دیتی ہے۔ صفات بشریت کی تاریکی عوام کے قلب و قالب اور روح و نفس میں سرایت کر جاتی ہے لیکن خواص میں صرف قلب اور نفس تک محدود رہتی ہے۔ خواص الخواص میں نفس بھی اس تاریکی سے بری ہوتا ہے۔ تاریکی صرف قالب تک محدود رہتی ہے۔ یہ تاریکی خواص میں اتنا عرصہ نہیں رہتی کہ انہیں میلا کر دے بلکہ اس کے بعد جو ندامت اور استغفار ہاتھ آتی ہے وہ کئی کدورتوں کو دور کر دیتی ہے اور ترقی نصیب ہوتی ہے۔ یہی تاریکی فرشتوں میں نہ ہونے کے باعث وہ ترقی نہیں کرتے۔ بظاہر یہ نفس کی تاریکی باعث مذمت اور فی الحقیقت موجب مدح ہے۔

دنیا کے ساتھ ملحق عالمِ مادی کی فضا

عالمِ مادی کا سب سے نچلا حصہ جو ہماری دنیا سے ملا ہوا ہے اور فضائی وسعتوں تک پھیلا ہوا ہے قدرت کی عجیب و غریب کاریگری کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ اس فضا سے آگے دوسرے عالموں کے ادوار اور طبقات شروع ہوتے ہیں۔ مناسب ہوگا کہ طبقات بالا کو بیان کرنے سے پہلے کچھ اس حصے کے متعلق بھی چیدہ چیدہ احوال بیان کر دیے جائیں تاکہ اللہ تعالیٰ کی افرینشِ کائنات سے متعلق ان دلچسپ چیزوں کا علم ہو جائے جن سے انسانی زندگی کا گہرا تعلق ہے۔ آج سائنس کا علم اس قدر وسیع ہو چکا ہے کہ اس کا احاطہ کرنا اس قدر مشکل ہو گیا ہے کہ انسانی دسترس سے باہر نکلا جا رہا ہے۔ قدرتی نظامِ تخلیق کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی صناعی طاقتوں کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے۔ انسان کے لئے یہ لمحہ فکریہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے زمین، آسمان، ستارے، نظامِ شمسی، گلیکسیز، کہکشاں، نبولا، سدیم اور ایسی ہزاروں عجیب و غریب چیزوں پر مشتمل کائنات کو دیکھ کر بھی مسلمانوں کا خدا کی عظمت کی طرف خیال نہیں جاتا۔ انسان کی حقیقت ان تمام چیزوں کے سامنے ایک کیڑے سے زیادہ نہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کے تمام عجائبات کو انسان کی خاطر پیدا کیا اور یہ غافل انسان ان تمام چیزوں سے بے خبر ہے اور اپنی قدر و قیمت سے لاعلم ہے۔ کائنات میں ایسی واضح نشانیاں موجود ہیں جن سے مغرب کا ایک حکیم متاثر ہو کر لکھتا ہے "جوں جوں ہمارا علم فطرت بڑھتا جاتا ہے ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ابھی کچھ اور بھی ہے جسے جاننا چاہیے۔ اس کیفیت انگیز دنیا میں ہم جوں جوں آگے بڑھتے ہیں ہماری مسرتوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ مطالعہ کائنات پر صرف کیا گیا ایک لمحہ ہمیں بلند ترکیف و مستی کا پیغام دیتا ہے۔ ہم سب اس حسین منزل کی طرف بڑھتے ہی جائیں گے اور ٹھہریں گے نہیں اس لئے کہ کائنات کی تجلیات از بس فریب نظر ہیں" اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے کائنات کا علم حاصل کرنے کو عین عبادت قرار دیا ہے۔

ایک حکیمِ مغرب لکھتا ہے "میری مثال اس بچے کی سی ہے جو سمندر کے کنارے کھیل رہا ہو۔ مجھے اپنے ساتھیوں کی نسبت کوئی زیادہ خوب صورت سنگریزہ یا گھونگا مل گیا مگر ابھی حقیقت بحرِ زخار کی طرح میرے

سامنے ہے۔ جس کا ہمیں کوئی علم نہیں۔"

فرانسیسی تھامپسن نے لکھا ہے "تمام قریب اور بعید کی اشیاء کو ایک لازوال طاقت نے مخفی طور پر بہ یک دیگر باندھ رکھا ہے۔ جب تم ایک پھول کو چھیڑو گے تو فضائے گردوں میں ایک ستارہ کانپ اٹھے گا۔"

یورپ کا ایک شاعر کہتا ہے "میری نگاہ جب تیرے مہیب آسمانوں اور مہتاب پر پڑتی ہے جو تیری مشیت سے مقہور اور مجبور ہو کر سرگرم عمل ہیں تو معاً خیال آتا ہے کہ خدا جانے یہ انسان کیا چیز ہے جس کی تجھے اس قدر فکر ہے کہ اس آدم کو تو نے اپنا جلوہ بھی دکھایا، کبھی ہم کلامی کا شرف بخشا اور کبھی انسانوں کی طرف تو نے اپنے پیغمبر بھیجے۔"

لندن یونیورسٹی کے ایک پروفیسر ڈیوڈ مریسر نے لکھا ہے کہ جسم انسانی کا علم حاصل کرنے کے بعد عظیم فطرت کے لامتناہی جلال و جبروت دیکھ کر میرا دل ڈوب رہا ہے۔ سر جینز کہتا ہے "یہ کائنات کوئی مشین نہیں بلکہ کسی شاعر کا زبردست تخیل معلوم ہوتا ہے۔"

آئن سٹائن کا قول ہے "وہ انسان جو کائنات پر اظہار تعجب کیے بغیر نہیں ٹھہرتا اور اس پر خشیت اور تقویٰ کی کیفیت طاری نہیں ہوتی تو وہ مردہ ہے۔ اس کی آنکھیں بصارت سے محروم ہیں۔ ان سائنسدانوں کے اقوال پر قرآن مجید گواہی دیتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مجھ سے میری کائنات کا علم رکھنے والے ہی ڈرتے ہیں۔

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ   اللہ تعالیٰ سے صرف علمائے (فطرت) ہی ڈرتے ہیں۔ (فاطر: ۲۸)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے ایسے افکار سے لبریز اشعار اگر پیش کیے جائیں تو کم از کم ایک سو صفحات کی ضخامت درکار ہوگی۔ آپؒ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

خودی میں ڈوبنے والوں کی عزت و ہمت نے
اس آبجو میں کیے بحرِ بیکراں پیدا
خودی کی موت سے مشرق کی سرزمینوں میں
ہوا نہ کوئی خدائی کا رازداں پیدا
وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا
(ض ک: ۵۶۳)

اہلِ ذوق کے مطالعہ کے لیے عالمِ مادی کے نچلے حصے کی چند کیفیات کا ذکر کیا جا رہا ہے تاکہ ان کے ذوق و شوق میں اضافہ ہو۔ آسمانوں کے مختلف طبقات شکل نمبر ا میں ظاہر کیے گئے ہیں۔ یہ کائنات کیسے پیدا ہوئی اور کتنے ادوار میں پیدا ہوئی۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے اور جغرافیائی میگزین میں اس سلسلے میں قرآن

مجید سے ملتا جلتا بیان آیا ہے وہ ہماری تصنیف "نشانِ منزل" کے صفحہ ۸۶ پر کمپیوٹر کی تحقیقاتی روشنی میں کائنات کی تخلیق کو اختصار سے دے دیا گیا ہے۔

دنیا کے ابتدائی ایام میں فضا کی کیفیت

وہ فضا جو دنیا کو ابتدائی ایام میں گھیرے ہوئے تھی موجودہ کیفیات سے بالکل جداگانہ تھی۔ آج سے ۴۰۶ ملین سال پہلے زیادہ تر ہائیڈروجن اور ہیلیم (Hydrogen and Helium) گیسوں کے علاوہ Methane (میتھین) اور ایمونیا گیسوں کے مرکب تھے۔ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ زمین کی گرمی کی وجہ سے یہ گیسز سپیس (Space) میں چلے گئے۔ اس کے بعد اسّی فیصد آبی ذرات اور 10 فیصد کاربن ڈائی آکسائیڈ اور زلزلوں سے نکلے ہوئے گرم مادے بھی فضا میں شامل ہوئے۔ سمندروں میں کاربن ڈائی آکسائیڈ اور فضا میں O3 (اوزون) زمین میں O2 (آکسیجن) مختلف جگہوں پر براجمان ہو گئے۔ (تفصیل طویل ہے۔)

Layers of the Atmosphere

The atmosphere of the Earth may be divided into several distinct Layers as the following figure indicates.

Layers of the Earth's Atmosphere
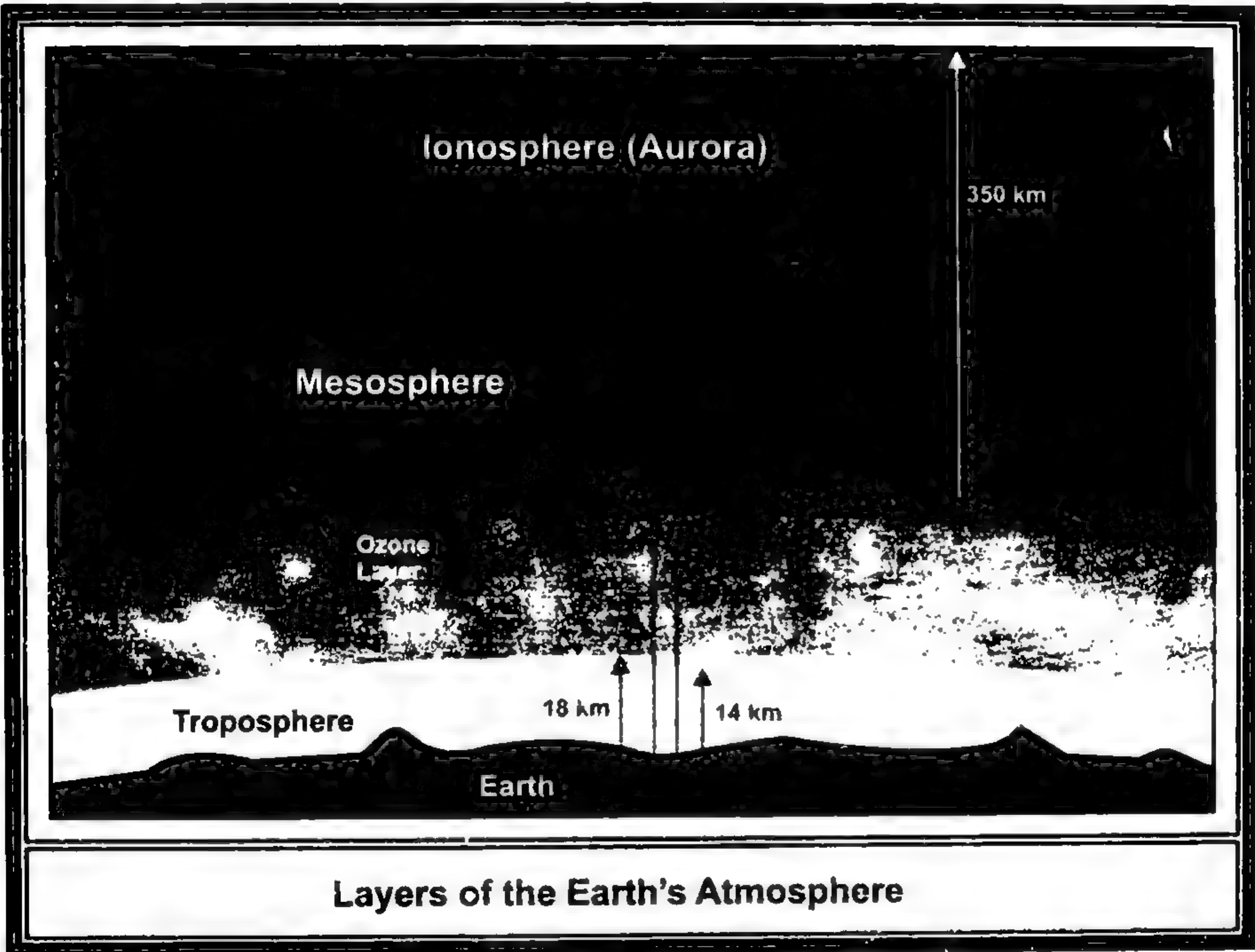
Figure-1

زمین سے اوپر آسمان میں فضا کی مختلف تہیں۔

Vertical Structure of the Atmosphere
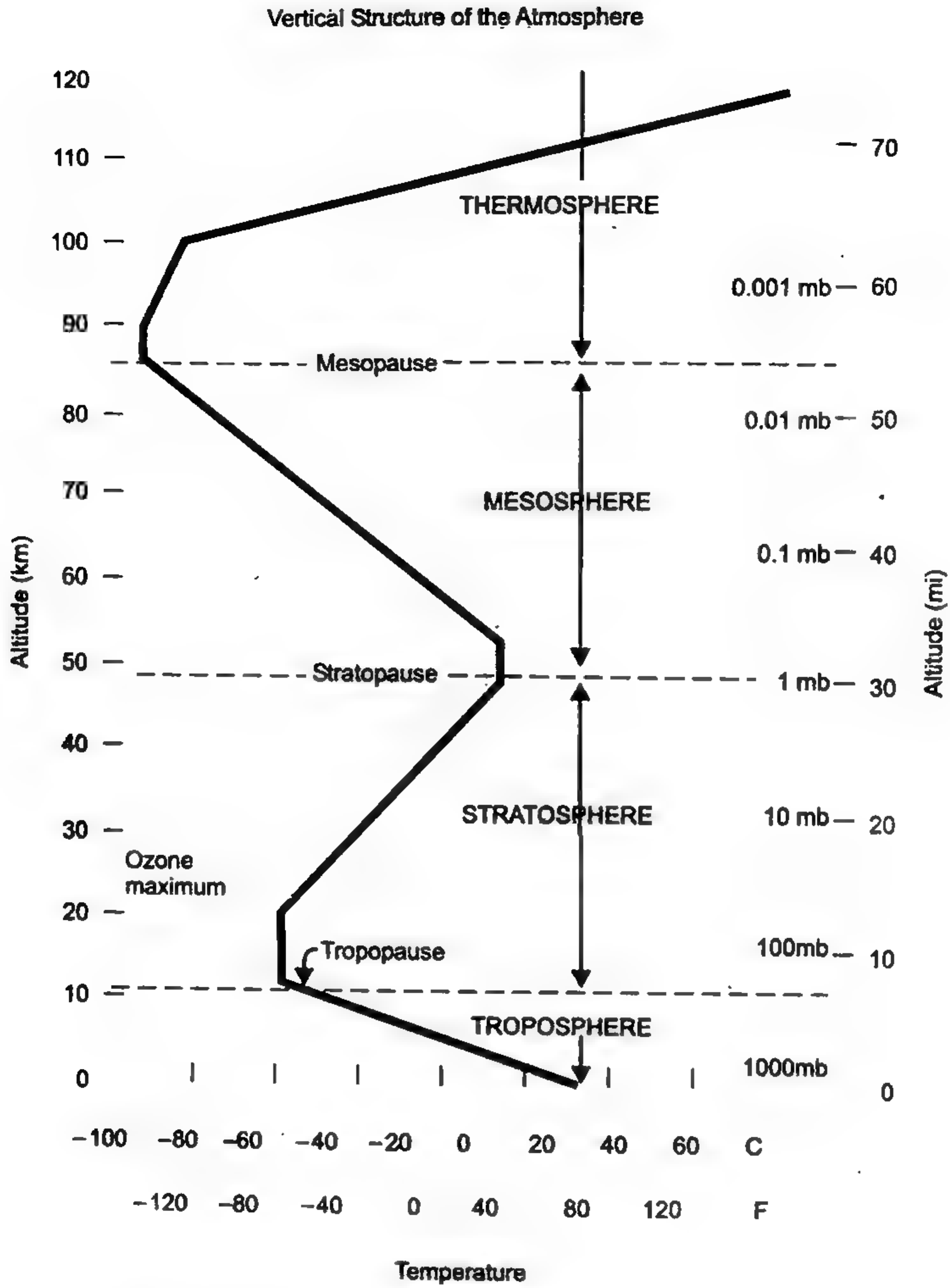
FIGURE: 2
Layer of the atmosphere as related to the average profile of air temperature above the earth's surface, The heavy line illustrates how the average temperature varies in each layer.

زمین کی سطح سے اوپر حرارت کی تبدیلیاں۔ ہر تہہ کی حرارت کا انداز اس میں واضح کیا گیا۔
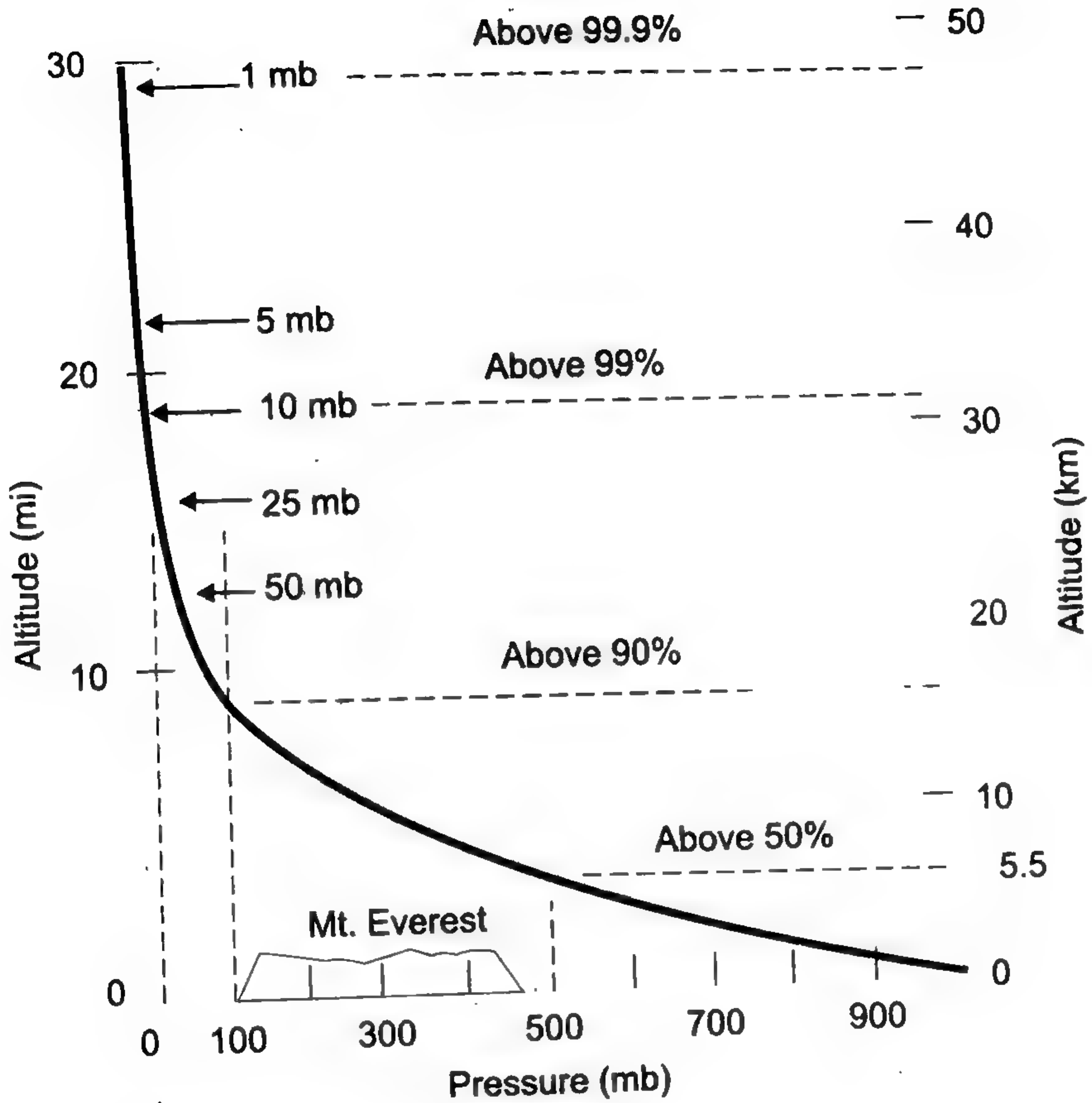
FIGURE: 3
Atmosphere pressure decreases rapidly with height. Climbing to an altitude of only 5.5 km, where the pressure is 500 mb, would put you above one-half of the atmosphere's molecules.

ہوا کا دباؤ بلندی کے ساتھ کم ہوتا ہے۔

500
400
300
200
100
0
Altitude (km)
Air molecules
Air density
Air pressure
Low
High
Increasing
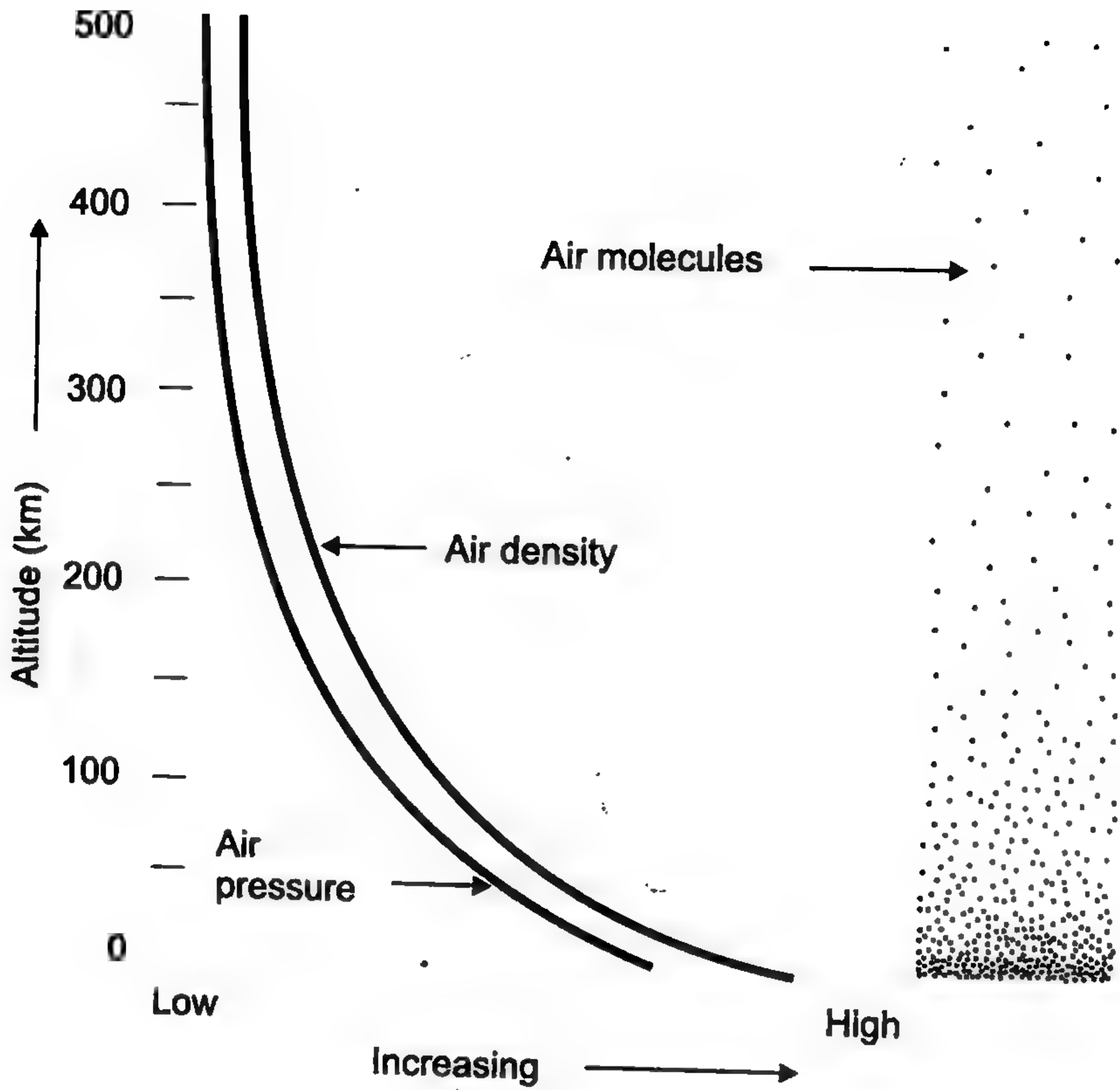
FIGURE: 4
Both air pressure and air density decrease with increasing altitude.

ہوا کا دباؤ اور ہوا میں نمی کا بلندی پر کم ہو جانا۔
دائیں طرف ہوا کے ذرات بلندی کے دور ہوتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔

بلندی کے ساتھ فضا میں تبدیلیاں

زمین سے اوپر عموداً اگر دیکھا جائے تو فضا کے بہت سے حصے نظر آتے ہیں۔ یہ حصے حرارت (Temperature) کے بدلنے، گیسز کے بدلنے اور اس میں بجلیوں کی بدلی ہوئی کیفیات کے علاوہ ہوائی دباؤ (Air Pressure) اور ہوا میں نمی کے بدلنے سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ جب ہم اوپر جائیں گے تو یہ پانچوں چیزوں کے بدلنے سے مختلف طبقات بن جاتے ہیں جس کو نیچے دیئے گئے شکل نمبر ۲ میں بھی ظاہر کیا گیا ہے۔

بلندی کے ساتھ ہوائی دباؤ اور نمی کا تغیر

کشش ثقل سے ہوا میں موجود ہر چیز کے مالیکیول زمین کی سطح پر ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں۔ جوں جوں ہم اوپر جاتے ہیں توں توں مالیکیولز کا فاصلہ کشش ثقل کے کم ہونے سے پہلے تو تیزی سے اور پھر آہستہ آہستہ زیادہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اوپر جانے سے ہوا کی Density (نمی) اور ہوا کا دباؤ کم ہوتا جاتا ہے۔

ہوا کے مالیکیولز کا وزن ہوتا ہے۔ زمین کے گرد ہوا کا وزن ۵۶۰۰ ٹریلین ٹن ہوتا ہے۔ یہ وزن زمین پر ایک دباؤ کی طرح کام کرتا ہے۔ اس وزن کو ہم Pressure (ہوا کا دباؤ) کہتے ہیں۔ ایک مرتبہ 1862ء میں دو سائنس دان گرم غبارے میں فضا میں گئے اور .8.8Km پر یعنی 29,000 فٹ پر جا کر ایک تو بے ہوش ہو گیا اور دوسرے نے اپنے دانتوں سے کنٹرول والا حصہ کھولا۔ ہوا کا دباؤ (P) اور ہوا کی (Density) بلندی پر جا کر پہلے تو آہستہ آہستہ اور پھر ایک دم کم ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ بلندی پر چونکہ ہوا کی (d) زیادہ ہوتی ہے اس لیے ہوا کا دباؤ (P) بھی کم ہو جاتا ہے۔ زمین کی ایک مربع انچ جگہ پر ہوا کا وزن 14.7 پاؤنڈ ہوتا ہے۔ اگر اس مربع انچ جگہ کے اوپر ہوا کی (d) زیادہ ہو جائے تو ہوا کا دباؤ (P) زیادہ ہو جائے گا اور (d) کے کم ہونے سے کم ہو جائے گا۔ ہوا کے دباؤ (P) اور نمی (d) کو شکل نمبر ۳ اور ۴ میں دیکھیں۔ اس طرح کم دباؤ والے علاقوں میں (d) کم ہو جاتی ہے اور معلوم ہو سکتا ہے کہ زمین کے کس حصے پر (d) کم ہے اور اس جگہ (P) بھی کم ہوگا۔ ماپنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سطح سمندر پر (P) 1000 Mbs ہے تو تقریباً 18,000 فٹ پر یہ P آدھا یعنی 500 Mbs رہ جائے گا لہٰذا اس بلندی پر ہوا کے مالیکیولز گنتی میں بھی سطح سمندر کی نسبت آدھے رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک پہاڑی جس کی بلندی 9 کلومیٹر (29,000 فٹ) ہو گی تو ہوا کا دباؤ 1000 Mbs کی بجائے 300Mbs رہ جائے گا اور اس کے اوپر ہوا کے مالیکیولز کا وزن ستر فیصد کم ہو جائے گا۔ چنانچہ اس حساب سے پچاس کلومیٹر کی بلندی پر ہوا کا دباؤ صرف 1Mb رہ جائے گا جس کے معنی یہ ہوئے کہ صرف ایک فیصد ہوا کے مالیکیولز اس جگہ کے اوپر ہوں گے۔ یہ دباؤ اور بھی کم ہو جاتا ہے حتیٰ کہ ہم space میں پہنچ جاتے ہیں۔

درجہ حرارت کی تبدیلی بلندی کے ساتھ

زمین سورج کی گرمی سے گرم ہو جاتی ہے تو اس کا درجہ حرارت زیادہ ہوتا ہے۔ یہ گرم ہوا اوپر کی ہوا کو گرم کر دیتی ہے۔ جب ہم اوپر جاتے ہیں تو پہلے 11 Km تک ٹمپریچر کم ہوتا جاتا ہے (یعنی 36,000 فٹ تک) لیکن 9 Km (30,000 فٹ) پر درجہ حرارت -50C (منفی پچاس ڈگری) ہو جاتا ہے۔ مختلف حالات میں درجۂ حرارت گرنے کا ریٹ بدلتا رہتا ہے۔ دیکھیں شکل نمبر ۲۔

فضا کے مختلف طبقات کا حال

نیچے ایک ایسی شکل دی جا رہی ہے جس میں فضا کی بلندی کے ساتھ ساتھ مختلف تہیں (Layers) دکھائی گئی ہیں۔ یہ خاکہ از خود واضح ہے مگر ان میں سے ہر ایک Layer کی وضاحت نیچے کر دی گئی ہے تاکہ سمجھنے میں آسانی رہے۔

۱۔ ٹروپوسفیئر (Troposphere): یہ Layer زمین سے 11KM تک پھیلی ہوئی ہے جس میں ہوائیں نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے آتی رہتی ہیں اور موسم میں خرابی کا باعث بنتی ہیں۔ اس تہہ میں اوپر کی طرف جانے سے درجہ حرارت کم ہو جاتا ہے۔ یہ علاقہ Troposphere کہلاتا ہے جس کا لاطینی زبان میں نام ہواؤں کا بدلنا ہے۔ اس تہہ میں ۱۱ کلومیٹر کے بعد درجۂ حرارت گرنا بند ہو جاتا ہے اور اسے Tropopause کہتے ہیں۔ دیکھیں شکل نمبر ۱ اور ۲۔

۲۔ سٹریٹوسفیئر (Stratosphere): مذکورہ بالا Tropopause کے بعد کچھ دیر درجہ حرارت نہیں بدلتا اور پھر 20 سے 50 ہزار فٹ تک بڑھتا جاتا ہے۔ اس تہہ کو (20 سے 50 ہزار فٹ تک) Stratophere کہتے ہیں۔ اس علاقے کے درجہ حرارت کو شکل نمبر ۲ میں ظاہر کر دیا گیا ہے۔

۳۔ ٹروپوپاز (Tropopause): ٹروپوسفیئر کو سٹریٹوسفیئر سے الگ کرنے والی باؤنڈری ٹروپوپاز کہلاتی ہے۔ اس کی زمین سے بلندی مختلف مقامات پر کم و بیش ہوتی ہے۔ یہ اوسطاً گیارہ کلومیٹر سے ذرا آگے پیچھے ہوتی ہے اور کہیں اس تہہ میں شگاف ہوتے ہیں جہاں عموماً 100 کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے زائد Jet Streem ہوتی ہے۔

۴۔ میزوسفیئر (Mesosphere): پچاس ہزار فٹ سے تقریباً ۸۸ ہزار فٹ پر درجہ حرارت دوبارہ بلندی کے ساتھ بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ دیکھیں شکل نمبر ۲ (ماسوائے پہلے ۲۵ ہزار فٹ کے)۔ اس علاقے کو میزوسفیئر کہتے ہیں۔ اس میں ہوا کے ذرات بہت دور دور ہوتے ہیں اور اس جگہ آکسیجن (O2) مالیکیولز اور نائٹروجن سانس لینے کے لیے بہت کم ملتے ہیں اس لیے یہاں آ کر O2 ساتھ لے کر جانے کی ضرورت

ہوتی ہے۔ ورنہ یہاں Hypoxia کی وجہ سے سانس گھٹ جاتا ہے۔ یہاں کا اوسط درجہ حرارت منفی 90 رہتا ہے۔ پانی اور ہوا کے ذرات کے ساتھ ساتھ منفی 90 درجہ حرارت کی وجہ سے انسان اس جگہ اپنے سانس میں موجود نمی کے باعث ایسا محسوس کرتا ہے جیسے پانی میں ڈوبا جا رہا ہو۔ یہاں P تقریباً 0.01 ملی بار ہوتا ہے۔

۵۔ تھرموسفیئر (Thermosphere): میزوسفیئر کے اوپر کی تہہ گرم ہونے کی وجہ سے تھرموسفیئر کہلاتی ہے۔ (شکل نمبر ۲) اس تہہ میں مالیکیولز تقریباً ایک ایک میل دور ہوتے ہیں اور ایک میل سفر کر کے دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ جبکہ زمین پر دو مالیکیولز کا درمیانی فاصلہ انچ کا لاکھواں حصہ ہوتا ہے۔ یہاں (P) اور بھی کم ہو کر 0.001 ملی بار رہ جاتا ہے۔ یہاں پر آکسیجن (O2) سورج کی طاقتور Ultra Violet Rays کو جذب کرتی ہے اور اس لیے اس تہہ کا درجہ حرارت 50 سنٹی گریڈ تک بڑھ جاتا ہے۔ اس کی تفصیل نیچے دی جا رہی ہے۔

٦۔ اوزون لیئر (Ozone Layer): ٹروپوسفیئر کے اوپر سٹریٹوسفیئر میں O3 گیس سطحی سمت پر یعنی مشرق سے مغرب یا مغرب سے مشرق کی طرف چلتی ہے اور اس میں 15 سے 35 ہزار فٹ کے درمیان (زیادہ تر 20 سے 30 ہزار فٹ کے درمیان) ایک پتلی سی تہہ آکسیجن (O2) اور O3 (اوزون) کی ہوتی ہے اور وہ سورج کی الٹراوائلٹ شعاعوں کو جذب کر کے O3 کو O2 اور O میں تبدیل کرتی ہے اور اس طرح سورج کی بہت سی توانائی کو استعمال کر لیتی ہے۔ O2 کی یہ تہہ سورج کی کچھ شعاعیں واپس آسمان کی طرف لوٹا دیتی ہے اور اس کے نتیجے میں معمولی حرارت زمین تک پہنچ پاتی ہے۔ اگر یہ اوزون کی تہہ نہ ہوتی اور سورج کی تمام حرارت زمین تک پہنچ جاتی تو لوگوں کو Sun Burn ہو جاتا اور زمین پر زندگی مشکل ہو جاتی۔ کہا جاتا ہے کہ زمین پر انسانوں کے پیدا کردہ فلورو کاربن کمپونڈ سے اس O3 کی تہہ کو ختم کرنے میں مدد ملتی ہے جو کبھی کسی وقت ختم ہو گئی تو دنیا کے لئے مصیبت بن سکتی ہے۔

مذکورہ بالا Ozone (اوزون) کی تہہ جو اللہ تعالیٰ نے ۱۵ سے ۳۵ ہزار فٹ کے درمیان محفوظ کی ہے وہ لوگوں کے آفاتِ سماوی (انتہائی سخت گرمی) سے بچاؤ کے لیے رکھی ہے۔ ایک حدیث شریف میں ستر ہزار پردوں کا ذکر ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ دُوْنَ سَبْعِيْنَ اَلْفَ حِجَابٍ مِّنْ نُّوْرٍ وَّ ظُلْمَةٍ (المعجم الکبیر للطبرانی: ج٦، ص١٤٨، رقم الحدیث:٥٨٠٢)	بے شک اللہ اور بندے کے درمیان نور اور ظلمت کے ستر ہزار پردے ہیں

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس راستے کو ہم طے کرنے کے درپے ہیں وہ سارا سات قدم ہے۔ جس طرح انسان کے سات لطیفے ہیں ان میں سے دو قدم تو عالمِ خلق میں ہیں جو قالب (بدن) اور نفس سے تعلق رکھتے ہیں اور پانچ عالمِ امر میں ہیں جو قلب، روح، سر، خفی اور اخفیٰ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان

سات قدموں میں سے ہر قدم میں مذکورہ ستر ہزار پردوں میں سے دس ہزار پردے اٹھائے جاتے ہیں۔ یہ حجاب نورانی ہوں یا ظلماتی، ان پردوں کا تفصیلی بیان اس کتاب میں پہلے دیا جا چکا ہے۔ اوزون کی تہہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ باقی پردوں میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی حفاظت کے لئے کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔ مذکورہ حدیث شریف میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگر ان ستر ہزار پردوں میں سے ایک پردہ بھی ہٹا دیا جائے تو دنیا جل کر خاکستر ہو جائے۔

۷۔ ایکسوسفیئر (Exosphere): تھرموسفیئر (شکل نمبر ۲) کے اوپر زمین سے 500 کلومیٹر (300 میل) اوپر ایک تہہ ایسی ہے جس میں ایک مالیکیول کو دوسرے مالیکیول سے ٹکرانے کے لیے بہت لمبا سفر کرنا ہوتا ہے۔ یہ مالیکیولز زمین کی کشش ثقل سے بچ نکلتے ہیں اور اس تہہ کو ایکسوسفیئر کہتے ہیں۔ یہ جگہ فضا کا اُوپر والا حصہ کہلاتا ہے۔ چونکہ یہاں اور Space میں کششِ ثقل کا اثر برائے نام ہوتا ہے اس لیے یہاں جس حالت میں آپ بیٹھ جائیں یا لیٹ جائیں تو کرسی اور بستر کی ضرورت نہیں رہتی۔ کرکٹ کا گیند اگر ذرا زور سے پھینکا جائے تو وہ کہیں رکنے کے بغیر چلتا رہے گا۔

۸۔ ہوموسفیئر (Homosphere): ایکسوسفیئر تک تو زمین سے 600 کلومیٹر سے اُوپر تک جو تہوں کی تقسیم کی گئی تھی اس میں محض درجہ حرارت پیش نظر رکھا گیا تھا مگر ایک تقسیم ایسی بھی کی گئی ہے جس میں تہوں کی ساخت یعنی ان میں Gases وغیرہ کو لحاظ میں رکھا گیا ہے۔ تھرموسفیئر کے نیچے Gases کی مقدار تقریباً ایک جیسی یونیفارم رہتی ہے یعنی 78 فیصد نائٹروجن اور 21 فیصد آکسیجن کیونکہ اس علاقے میں اوپر نیچے کی حرکتیں ہوتی رہتی ہیں۔ یہ نچلا حصہ ہوموسفیئر کہلاتا ہے۔

۹۔ ہیٹروسفیئر (Hetrosphere): تھرموسفیئر میں مالیکیولز اور ایٹم میں ٹکراؤ باہمی فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے کم ہوتا ہے لہٰذا اس علاقے میں وزنی Gases نیچے بیٹھ جاتی ہیں اور ہلکی Gases مثلاً ہائیڈروجن اور ہیلیم اوپر چلی جاتی ہیں۔ تھرموسفیئر کے نچلے حصے سے فضا کی چوٹی تک کی تہہ ہیٹروسفیئر کہلاتی ہے۔

۱۰۔ آئینوسفیئر (Ionosphere): آئینوسفیئر ایک ایسی Layer ہے جس میں کافی تعداد میں آئیونز پھیلے ہوئے ہیں۔ Ions ایسے ایٹمز یا مالیکیولز ہی ہوتے ہیں جن میں سے ایک یا اس سے زیادہ Ion خارج ہو چکے ہوں یا جمع ہو چکے ہوں۔ آئینوسفیئر زمین سے ساٹھ کلومیٹر سے فضا کی حد تک پھیلا ہوا ہے اور اس کا زیادہ حصہ تھرموسفیئر میں ہوتا ہے۔ اس سفیئر کا نچلا حصہ A.M ریڈیو کی لہروں کو کمزور حالت میں واپس زمین میں بھیج دیتا ہے۔ مگر رات کو ریڈیو کی لہریں اوپر والے حصے کی طرف چلی جاتی ہیں اور زمین پر دور دور تک پھیل جاتی ہیں۔ اس طرح صبح اور شام کو ریڈیو پروگرام اچھی طرح سنے جاتے ہیں۔

مختلف عوالم کا مختصر تعارف

قرآن مجید میں مختلف طبقاتِ سماوی کا ذکر ملتا ہے۔ ایسی آیات کا اس جگہ حوالہ دینا طوالت کا باعث ہوگا

لہٰذا چند مشہور عوالم کے متعلق کچھ معلومات بہم پہنچائی جا رہی ہیں تا کہ جو لوگ ان سے نا آشنا ہیں وہ ان عوالم کا واجبی سا علم حاصل کر سکیں۔

کارخانۂ قدرت کو سمجھنے کے لئے عوام سے استدعا ہے کہ وہ اوامر ونواہی کے احکامِ خداوندی کی پیروی کرنے کے بعد زمین و آسمان کے رازوں کے بارے میں اللہ کی مدد مانگتے ہوئے غور وفکر فرمائیں تا کہ انہیں تائید ایزدی حاصل ہو سکے اور اللہ کی قدرتِ صناعی کا اندازہ کر سکیں۔ طبقاتِ آسمان کی طرف توجہ سے مراد کائنات میں تفکر کرنا ہے۔ یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے اگر اپنی نماز کو اس حالت کی طرف لے آئے کہ مشاہدۂ حق بھی ہو اور مشاہدۂ کائنات بھی۔

اولیائے کرام رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کا فرمان ہے کہ نماز کی ادائیگی سے مراد یہ ہے کہ اس کی نماز صرف سجدہ سجود تک محدود نہ ہو بلکہ نماز میں ترک وجود کرے تا کہ اسے قیام وقعدہ اور پوری نماز میں خدا میں محویت نصیب ہو اور اللہ تعالیٰ کا قرب نصیب ہو۔

نمازِ زاہداں سجدہ سجود است نمازِ عاشقاں ترکِ وجود است (×)

(زاہدوں کی نماز رکوع اور سجدہ ہے، عاشقوں کی نماز ترکِ وجود ہے۔)

قیام و قعدہ و تکبیر و نیت ہمہ محوست در عینِ معیّت (×)

(قیام، قعدہ اور تکبیر ونیت یہ سب عین معیتِ (خدا) میں محو ہیں۔)

نماز کا مقصد طہارت ہے اور اگر یہ میسر ہو جائے تو تب کہیں جا کر کوئی خدا کا مقرب بندہ اس کا نمازی بنتا ہے۔

اے بہ پندارِ وجود الودہ خود را پاک ساز کہ ایں طہارت، سالکِ رہ را نمازی می کند

(اے شخص تکبر سے لتھڑے ہوئے وجود کو قبولیت (کے پانی) سے پاک کر، کیونکہ یہ پاکی راہرو کو نمازی بنا دیتی ہے۔)

نماز آرد توجہ جانبِ حق حضورِ باطنت گشتس محقق (×)

(نماز توجہ کو حق کی طرف لے آتی ہے، حضوری قلب محقق ہو جاتی ہے۔)

رمیدن از ہمہ اغیار سویش نیاز و راز آوردن بہ کویش (×)

(ہر طرف سے بھاگ کر اس کی طرف آنا ہے، نماز سے راز ونیاز مندی کو اس کے کوچے کی طرف لانا ہے۔)

اولیائے کرام رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کا قول ہے کہ جو لوگ ذرا سے مال کی خاطر نماز کو چھوڑ کر دنیا کی طرف مصروف ہو جاتے ہیں حقیقتاً وہ نماز میں قبلہ کی طرف پیٹھ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔

جز یکے نیست نقدِ ایں عالم باز بیں و بعالمش مفروش (×)

(اس عالم کا سونا چاندی وہی ایک ہے اسی کو دیکھو، اسی پر نظریں لگاؤ اور کسی قیمت پر اسے فروخت نہ کرو۔)

پارسایانِ روئے در مخلوق پشت برقبلہ می کنند نماز (x)

(وہ پارسا جن کی پارسائی کا رخ دنیا کی طرف ہوتا ہے وہ درحقیقت قبلہ کی طرف پیٹھ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔)

چند روز اگر اسی توجہ کے ساتھ ایسی نماز پڑھنے کی کوشش کی جائے تو انشاءاللہ جلد ہی نماز کی سمت درست ہو کر بندے کو کار آمد صورت میں نماز ادا کرنے کے قابل بنادے گی۔

عالمِ ناسوت

''سرِّ دلبراں'' کے مطابق بشریت یا عالمِ بشریت کو ناسوت کہتے ہیں۔

ہمارے عالمِ مادی سے ملا ہوا عالمِ ناسوت یا دوزخوں کا عالم ہے۔ اہلِ مشاہدہ اس کے بہتر طبقات لکھتے ہیں اور سب سے نچلے درجے کا نام قرآن کریم میں غیّ دیا گیا ہے۔ شروع میں (یعنی عالمِ اعراف کے نیچے) بے برگ و گیاہ ریگستان اور بیابان ہیں اور جلے ہوئے خشک پہاڑ ہیں، پھر آگ سے بھری ہوئی وادیاں ہیں۔ پینے کے پانی کا کہیں نام ونشان تک نہیں ملتا اور اگر ملتا بھی ہے تو گرم اور کڑوا۔ درختوں میں سوائے زقوم، ناگ پھنی اور خاردار جھاڑیوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اوپر کے طبقات (جو عالمِ اعراف سے قریب ہیں) عین اسی طرح ہیں جیسے اس دنیا میں کہیں گرمی ہے اور کہیں سرسبز علاقے بھی ہیں۔ چند طبقات ایسے بھی پائے جاتے ہیں کہ جن میں قدرے ٹھنڈا پانی اور کچھ بہتر قسم کے جنگل اور آبادیاں ہیں اور سب سے آخری بہتر واں طبقہ جنت کے عالمِ ملکوت کے نچلے حصہ سے ملتا جلتا ہے۔ اس سے آگے ایک دیوار ہے جس کا نام اعراف ہے۔

تعین جسدی وعالمِ ناسوت

''تعلیمِ غوثیہ'' میں ہے کہ عالمِ اجساد سے مراد ہے صورِ مرکباتِ کثیفہ سے۔ اس کو عالمِ ناسوت یا عالمِ حس یا عالمِ شہادت بھی کہتے ہیں۔ یہ مرتبہ جامعیت ہے اور تعینِ تنزل پنجم جو حرکت یا حس کہ اس عالم میں موجود ہے اور عالمِ مثال کے واسطہ سے ہے۔ یعنی اول فیاضِ مطلق کا فیض عالمِ ارواح میں پہنچتا ہے پھر عالمِ مثال میں پھر عالمِ حس وشہادت میں۔ عالمِ شہادت صورِ حسی اور عالمِ مثال صورِ خیالی اور عالمِ ارواح میں سے۔ حق تعالیٰ سبحانہٗ سب سے لطیف ہے۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ (الانعام:۱۰۳) — نہیں گھیر سکتیں اسے نظریں اور وہ گھیرے ہوئے ہے سب نظروں کو

شنیدہ ام کہ جمالِ تو دیدہ اند بسے — وے چناں کہ توئی آں چناں نہ دید کسے (x)

(سنا ہے کہ کبھی تیرا جمال بھی دیکھا جاتا ہے وہ اس طرح کہ جیسا تو ہے ایسا کسی نے نہیں دیکھا)

واحدیت اور اعیان

بیانِ بالا کا خلاصہ یہ ہے کہ تعین اول مراد ہے علمِ اجمالی سے جس کو وحدت کہتے ہیں، دوسرا تعین مراد ہے علمِ تفصیلی سے جس کو واحدین اور اعیان ثابتہ اور صورِ علمیہ وحقائقِ ممکنات بھی کہتے ہیں۔ چوتھا تعین مثالی اور پانچواں تعین جسدی۔ تمام صوفیاء کے مطابق تعین اول وثانی مرتبہ وجوب میں ہے اور باقی تین تعین (روحی، مثالی اور جسدی) مرتبۂ امکان میں ہیں۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ اعیان ثابتہ کا سایہ ہے اور یہی محل جزا وسزا اور تکالیف شرعیہ ہیں اور اعیانِ ثابتہ ہیں صورِ علمیہ یعنی ذات کا علم تفصیلی اور علم بلحاظ مفہوم کے عین ذات نہیں لیکن بہ لحاظ وجود کے غیر ذات بھی نہیں۔ بعض نے فرمایا کہ علم عین ذات ہے اور ذات عین علم ہے۔ مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ نے لوائح میں فرمایا کہ صفاتِ تعالیٰ من حیث المعقول غیر ذات ہیں ومن حیث التحقیق والحصول عین ذات اور تعین ثانی کے اعتبار سے حضرت علم میں ہر شے کے وجود کی حقیقت تعین ہے۔ یعنی اعیانِ ثابتہ (صورِ علمیہ) اسمائے الٰہی کے مظاہر ہیں اور یہ موجوداتِ خارجی کے لئے ترتیب دیئے گئے ہیں۔

عالمِ اعراف

قرآن مجید میں ایک سورۃ کا نام ہے جسے سورۃ الاعراف کہتے ہیں۔ اس میں فرمایا گیا ہے۔

وَ بَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَ عَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا بِسِيْمٰهُمْ ۚ وَ نَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۗ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَ هُمْ يَطْمَعُوْنَ ﴿۴۶﴾

(الاعراف: ۴۶)

اور دونوں (جنت و دوزخ) کے درمیان ایک حجاب ہے اور اعراف پر کچھ مرد ہوں گے جو پہچانتے ہوں گے سب کو ان کی علامت سے اور وہ جنتیوں کو پکارا کریں گے تم پر سلام ہو (اور ابھی) وہ (حجاب الاعراف میں ہوں گے) جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے اور وہ جنت میں داخل ہونے کے خواہشمند ہوں گے۔

اور اعراف والوں سے مراد بعض نے کہا کہ وہ انبیاء علیہم السلام ہوں گے اور بعض نے کہا کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اولیاء وصلحاء بھی ہوں گے۔ بعض نے کہا کہ وہ تمام جنتی ہوں گے اور جو دیکھ رہے ہوں گے وہ دوزخ سے جنت کی طرف آئیں گے۔

"المفردات القرآن" میں ہے کہ الاعراف سے وہ دیوار مراد ہے جو جنت اور دوزخ کے درمیان حائل ہے۔ علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۶۶۸ھ) نے لکھا ہے کہ الاعراف العرف کی جمع اور اس کا معنی بلند جگہ ہے۔

امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ عامر نے بیان کیا ہے کہ

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اصحاب الاعراف وہ لوگ ہیں جن کی نیکیاں بھی ہوں اور گناہ بھی ہوں۔ ان کے گناہ ان کو جنت سے روک دیں اور ان کی نیکیاں ان کو دوزخ سے روک لیں گی۔ وہ اسی حالت میں رہیں گے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے درمیان فیصلہ فرمادے گا۔ پھر ان کے درمیان اپنا حکم جاری فرمائے گا۔

امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اصحاب الاعراف وہ لوگ ہیں جن کی نیکیاں اور گناہ برابر ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میرے فضل اور میری بخشش سے جنت میں داخل ہو جاؤ۔ تم پر آج نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ تم مغموم ہوگے۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ جس شخص کا ایک گناہ بھی نیکیوں سے زیادہ ہوا وہ دوزخ میں داخل ہو جائے گا اور جس شخص کی ایک نیکی بھی اس کے گناہوں سے زیادہ ہوئی وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ پھر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت کی۔

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَظْلِمُونَ ۝ (الاعراف: 8، 9)

اور (اعمال کا) تولنا اس دن برحق ہے پس جن کے بھاری ہوئے ترازو تو وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں اور جن کے ہلکے ہوئے ترازو تو یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے نقصان پہنچایا اپنے آپ کو بوجہ اس کے کہ ہماری آیتوں کے ساتھ بے انصافی کیا کرتے تھے۔

حضرت ابن مسعودؓ نے پھر فرمایا: ایک رائی کے دانہ کے برابر وزن سے بھی میزان کا پلڑا جھک جاتا ہے اور فرمایا: جس شخص کی نیکیاں اور گناہ برابر ہوں وہ اصحاب الاعراف میں ہوگا، ان کو پل صراط پر ٹھہرایا جائے گا، پھر وہ اہل جنت اور اہل دوزخ کو پہچان لیں گے۔ جب وہ اہل جنت کی طرف دیکھیں گے تو کہیں گے "سَلَامٌ عَلَيْكُمْ" اور جب ان کی نظر بائیں جانب کی طرف پھیری جائے گی تو وہ اہل دوزخ کو دیکھیں گے اور کہیں گے: اے ہمارے رب! ہمیں ظالم لوگوں کے ساتھ نہ کرنا اور دوزخیوں کے ٹھکانوں سے اللہ کی پناہ چاہیں گے اور جو نیکیوں والے ہوں گے ان کو ان کی نیکیوں کا نور دیا جائے گا اور اس نور کی روشنی میں اپنے سامنے اور اپنے آگے چلیں گے، اس دن ہر بندے اور ہر بندی کو نور دیا جائے گا اور جب وہ پل صراط پر پہنچیں گے تو اللہ ہر منافق اور ہر منافقہ کا نور سلب فرمالے گا اور جب اہل جنت منافقوں کا حال دیکھیں گے تو کہیں گے: اے ہمارے رب! ہمارا نور مکمل کردے اور رہے اصحاب الاعراف تو ان کا نور بھی ان کے سامنے ہوگا اور ان سے چھینا نہیں جائے گا اور اس موقع کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ قول نقل فرمایا ہے: وہ (اصحاب الاعراف) جنت میں داخل نہیں ہوئے اور وہ اس کے امیدوار ہیں۔ (الاعراف: 46) حضرت ابن سعد رضی اللہ عنہ نے

فرمایا: جب بندہ ایک نیکی کرتا ہے تو اس کی دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور جب وہ ایک برائی کرتا ہے تو اس کی صرف ایک برائی لکھی جاتی ہے پھر فرمایا: جس کی دس نیکیوں پر ایک گناہ غالب آ گیا وہ ہلاک ہو گیا۔ (یعنی جس کی نیکیوں کو دس سے ضرب دینے کے باوجود اس کے گناہ زیادہ ہوئے) عبداللہ بن حارث رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ الاعراف جنت اور دوزخ کے درمیان ایک دیوار ہے اور اصحاب الاعراف اس جگہ ہوں گے حتیٰ کہ جب اللہ ان کو عافیت میں لینا چاہے گا تو ان کو ایک دریا کی طرف لے جائے گا جس کو حیات کہا جاتا ہے، اس کے دونوں کنارے سونے کے سرکنڈے ہیں جن میں موتی جڑے ہوئے ہیں اور ان کی مٹی مشک ہے۔ ان کو اس دریا میں ڈالا جائے گا، حتیٰ کہ ان کا رنگ سفید چمکدار ہو جائے گا، پھر اللہ ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمائے گا تم جو چاہو تمنا کرو، پھر وہ تمنا کریں گے اور جب ان کی تمنائیں ختم ہو جائیں گی تو اللہ ان سے فرمائے گا: تم نے جو تمنائیں کی ہیں، تم کو وہ بھی ملیں گی اور ان کا ستر گناہ اضافہ بھی ملے گا۔ وہ جنت میں داخل ہوں گے در آنحالیکہ ان کے سینوں پر سفید تل ہوں گے جن سے وہ پہچانے جائیں گے اور ان کو کہا جائے گا یہ جنت کے مساکین ہیں۔ (جامع البیان، جز ۸، ص ۲۵۱۔۲۴۹، ملتقطاً مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۵ھ)

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۶۶۸ھ) نے لکھا ہے کہ ثعلبی رضی اللہ عنہ نے ذکر کیا ہے الاعراف پل صراط پر ایک بلند جگہ ہے اس پر حضرت عباس، حضرت حمزہ، حضرت علی ابن ابی طالب اور حضرت جعفر ذو الجناحین رضی اللہ عنہم ہوں گے۔ وہ اپنے محبت کرنے والوں کو پہچان لیں گے جن کے چہرے سفید ہوں گے اور ان سے بغض رکھنے والوں کو بھی پہچان لیں گے ان کے چہرے سیاہ ہوں گے، اور زہراوی نے بیان کیا ہے کہ یہ ہر امت کے نیک لوگ ہوں گے جو لوگوں کے اعمال پر گواہ ہوں گے۔ نحاس نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ یہ لوگ جنت اور دوزخ کے درمیان ایک دیوار پر ہوں گے۔ زجاج رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ انبیاء ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے صغیرہ گناہوں کا دنیا میں تکلیفوں اور مصیبتوں سے کفارہ ادا نہیں ہوا اور ان کے کبیرہ گناہ نہیں ہوں گے ان کو جنت میں جانے سے روک لیا جائے گا تا کہ ان کو غم ہو جو ان کے صغائر کے مقابلہ میں ہو۔ حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کے غلام حضرت سالم رضی اللہ عنہ نے یہ تمنا کی تھی کہ وہ اصحاب الاعراف میں سے ہوں۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ ملائکہ ہیں جو لوگوں کو جنت اور دوزخ میں داخل کرنے سے پہلے مومنوں اور کافروں کو ممتاز کریں گے یہ ابو مجاز کا قول ہے۔ ان پر اعتراض کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب الاعراف کو رجال کہا ہے اور فرشتوں کو رجال نہیں کہا جاتا۔ انہوں نے اس کا جواب دیا کہ فرشتے مذکر ہیں مؤنث نہیں ہیں اس لئے ان پر رجال کا اطلاق بعید نہیں ہے۔ علامہ قرطبی مالکی رضی اللہ عنہ نے اور بھی کئی اقوال لکھے ہیں۔

ضیاء القرآن کی جلد نمبر دوم میں صفحہ نمبر ۲۰۵ پر ہے کہ الاعراف اہل جنت اور اہل دوزخ میں ایک ایسا پردہ حائل ہے جو دوزخ کی آنچ کو جنت تک اور جنت کے روح پرور اثرات کو دوزخ تک نہیں پہنچنے دیتا۔

اعراف جمع ہے عرف کی اور عرف کا لغوی معنی بلند جگہ ہے۔ وَالْاَعْرَافُ فِی اللُّغَةِ الْمَكَانُ الْمُشْرِفُ جَمْعُ عُرْفٍ (قرطبی) اس مناسبت سے گھوڑے کی گردن کے بالوں کو "عُرْفُ الْفَرَسِ" اور مرغے کی کلغی کو "عَرْفُ الدِّیْکِ" کہتے ہیں۔ یہاں اس حجاب کا بالائی حصہ مراد ہے اور وہ لوگ جو وہاں اعراف میں ہوں گے وہ کون ہیں۔ اس کے متعلق مفسرین کرام نے پندرہ اقوال لکھے ہیں۔ (روح البیان)

حضرات عبداللہ بن مسعود، حذیفہ بن الیمان، ابن عباس، ضحاک اور ابن جبیر رضی اللہ عنہم کا قول یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی نیکیاں اور برائیاں مساوی ہوں گی۔ هُمْ قَوْمٌ اِسْتَوَتْ حَسَنَاتُهُمْ وَ سَيِّئَاتُهُمْ (قرطبی وغیرہ) اور دوسرے متعدد اقوال کو علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اس عبارت میں ذکر کر دیا ہے۔ وَ قِيْلَ قَوْمٌ عَلَتْ دَرَجَاتُهُمْ كَالْاَنْبِيَاءِ وَالشُّهَدَاءِ اَوْخِيَارِ الْمُؤْمِنِيْنَ اَوْ عُلَمَائِهِمْ: یعنی بعض علما کے نزدیک اعراف کی بلندیوں پر فائز ہونے والے انبیا، شہدا، صلحا اور علما ہوں گے۔ ان کی عزت افزائی کے لیے ان کو اس بلند مقام پر ٹھہرایا جائے گا تاکہ تمام اہلِ محشر ان کی عظمت و شان اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ واللہ اعلم

اس بلند دیوار پر بیٹھے ہوئے اہل اعراف جنتیوں کو بھی شاداں و فرحاں دیکھ رہے ہوں گے اور دوزخیوں کو بھی گریاں و بریاں ملاحظہ کر رہے ہوں گے۔ جب ان کی نگاہ اہل جنت کی طرف اٹھے گی تو انہیں اس فوزِ مبین پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے سلامتی کی دعائیں دیں گے اور جب اہلِ جہنم کی طرف دیکھیں گے تو سراپا عجز و انکسار بن کر بارگاہِ الٰہی میں اس عذابِ الیم سے بچنے کی دعا کریں گے۔

اعلیٰ حضرت مولانا شاہ محمد احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمۂ قرآن "کنز الایمان" کے حاشیہ سے لیا گیا اقتباس ملاحظہ ہو۔ جن کو اصحاب الاعراف کہتے ہیں یہ کس طبقہ کے ہوں گے۔ اس میں بہت مختلف اقوال ہیں۔ ایک قول تو یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہوں گی۔ وہ اعراف پر ٹھہرے ہوں گے جب اہل جنت کی طرف دیکھیں گے تو انہیں سلام کریں گے اور دوزخیوں کی طرف دیکھیں گے تو کہیں گے یارب! ہمیں ظالم قوم کے ساتھ نہ کر۔ آخرکار جنت میں داخل کیے جائیں گے۔

ایک قول یہ ہے کہ جو لوگ جہاد میں شہید ہوئے مگر ان کے والدین ان سے ناراض تھے وہ اعراف میں ٹھہرائے جائیں گے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ جو لوگ ایسے ہیں کہ ان کے والدین میں سے ایک ان سے راضی ہو، ایک ناراض ہو وہ اعراف میں رکھے جائیں گے۔ ان اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل اعراف کا رتبہ اہل جنت سے کم ہے۔ مجاہد کا قول یہ ہے کہ اعراف میں صلحاء، فقراء اور علماء ہوں گے اور ان کا وہاں قیام اس لئے ہو گا کہ دوسرے ان کے فضل و شرف کو دیکھیں اور ایک قول یہ ہے کہ اعراف میں انبیاء ہوں گے وہ اس مکان عالی میں تمام اہل قیامت پر ممتاز کئے جائیں گے۔ اور ان کی فضیلت اور رتبہ عالیہ کا اظہار کیا جائے گا تاکہ جنتی اور دوزخی ان کو دیکھیں اور وہ ان سب کے احوال اور ثواب و عذاب کے مقدار و احوال کا معائنہ کریں۔ ان اقوال

کے مطابق اصحابِ اعراف جنتیوں میں سے افضل لوگ ہوں گے کیونکہ وہ باقیوں سے مرتبہ میں اعلیٰ ہیں۔ ان تمام اقوال میں کچھ تناقض نہیں ہے اس لئے ہوسکتا ہے کہ ہر طبقہ کے لوگ اعراف میں ٹھہرائے جائیں اور ہر ایک کے ٹھہرانے کی حکمت جداگانہ ہو۔

عالمِ ملکوت

ملکوت کا لفظ فرشتہ، بادشاہی، سلطنت، حکومت، حکمرانی، فرشتوں کا عالم، فرشتوں کے رہنے کا مقام، عالمِ ارواح کی اصطلاحِ صوفیاء کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس اصطلاح کے معنی بلحاظ فقر تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ صوفیاء کرام کی نظر میں یہ عالمِ ارواح کے معنوں میں آتا ہے۔ ان کی نظر میں یہ ایک ماوراء مقام ہے جو حد نظر میں نہیں ہے۔ صوفیاء کی نظر میں یہ جبروت کے نیچے کے عالم ہیں۔ (اسلامی انسائیکلو پیڈیا، ج ۲ ص ۵۰۸)

''تعلیم غوثیہ'' میں ہے کہ عالمِ علوی کو مختلف اعتبار سے عالم الملک و عالمِ ملکوت و جبروت کہا جاتا ہے۔ یہاں کے باشندگان اسے عالمِ ملکوت کہتے ہیں کیونکہ یہاں کے لوگوں کا اتفاق ایک ہی نگاہ ایک ہی توجہ اور ایک معبود یعنی حق سبحانہ پر ہے۔ وہ ان کی معرفت اور مشاہدے پر متفق ہیں اور اس میں ان کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہے۔ برخلاف عالمِ سفلی میں زمین کے باشندوں کے کہ ان میں سورج پرست، چاند پرست، کواکب پرست، اصلیت پرست اور بت پرست بھی قسم کے گمراہ پائے جاتے ہیں لہٰذا عالمِ علوی کے برعکس ان کی نگاہ میں اختلاف ہے۔ چنانچہ عالم الملک وہ عالم ہے جس کا ادراک حواس سے ہوسکے اور عالمِ ملکوت وہ ہے جس کا ادراک عقل سے ہوسکے اور عالمِ جبروت وہ ہے جس کا ادراک مواہبِ الٰہیہ سے ہو (ان کی ارواح اور معارف کو سیراب کرنے اور ان کے مقامات کو برقرار رکھنے کے لئے یہ نوران پر چلتے ہیں۔) (تعلیم غوثیہ)

بعض کا خیال ہے کہ عالمِ ظاہر کو عالمِ ملک کہتے ہیں اور جو عالمِ باطن اور عقل میں ہے وہ ملکوت ہے اور عالمِ جبروت ان دونوں کے درمیان ہے یعنی ہر دو عالم سے کچھ نہ کچھ لئے ہوتا ہے۔ ایک اور قول ہے کہ عالمِ جبروت میں اسماء ہیں اور عالمِ ملکوت میں صفات کیونکہ صفات اسماء اور افعال میں تصرف کرنے کا ذریعہ ہیں۔ ریاض الملکوت کا مطلب یہ ہے کہ ملکوت کے تمام محاسن عالمِ علوی میں ہوتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس عالم میں لوحِ محفوظ مع قلم، برزخ اور عرش کے ہیں کیونکہ لوحِ محفوظ میں آنحضرت ﷺ تمام انبیاء علیہم السلام، اولیاء کرام اور صلحاء رحمۃ اللہ علیہم اجمعین اور تمام مومنین کے نام درج ہیں اور لوحِ محفوظ کے الفاظ سے نور چمکتا ہے۔ یہ نوران کے مرتبوں اور سانسوں کے مطابق ہے۔ برزخ کے رنگوں کے نکلنے کا کوئی شمار ہی نہیں کرسکتا۔ عرش کا نور بھی اس نوعیت کا ہے۔ اسی لئے باغات سے ان کو تشبیہ دی گئی ہے۔ معلوم ہوا چونکہ آپ ﷺ کا اسمِ مبارک لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے اور نور کی چمک اسرار قلم میں بھی پائی جاتی ہے چنانچہ آپ ﷺ کا نور اس

تمام عالم میں پایا جاتا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال کے پھول ہیں۔

''سرِّ دلبراں'' میں ہے کہ عالمِ ملکوت وہ عالم ہے جو مختص ہے ملائکہ اور ارواح کے لئے اور نفوس کے لئے''۔

عالمِ اعراف کی دیوار یعنی اس کی حدود کے بعد یہ پہلا عالم جو جنت میں شامل ہے عالمِ ملکوت ہے۔ عالمِ اعراف اور جنت کے طبقے ملحق ہیں۔ عالمِ اعراف اور جنت کے پہلے طبقے میں یہ فرق ہے کہ جنت کے تمام طبقات میں (اور ملکوت میں بھی) کھانے پینے اور آرام و آسائش کے ساماں عالمِ اعراف سے بہت بہتر ہیں۔ مشائخ کا کہنا ہے کہ دونوں عوالم دیکھنے کو ایک جیسے ہی لگتے ہیں سوائے اس کے کہ ملکوت میں رہنے سہنے اور کھانے پینے کا انتظام جنتیوں کے لئے تیار ملتا ہے لیکن اعراف میں یہ کھانے پینے کی چیزیں مشقت کروانے کے بعد دی جاتی ہیں۔ ہر شخص سے محنت مشقت اور مزدوری کروائی جاتی ہے۔ اعراف میں جانے والی روحیں اوپر والی جنتوں کی ازواح کو بہتر حالت میں دیکھ کر جلتی ہیں اور رنج کرتی ہیں اور یہ تکلیف ہی ان کے لیے عذاب سے کم نہیں۔ عالمِ ملکوت اور اس سے اوپر کے عوالم کی روحوں کو دیکھنے والی دوسری روحیں اپنے سے بہتر حالت میں رہنے والی روحوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہیں اور اس بات کا احساس کرتی ہیں کہ ہم سے بہتر حالت میں رہنے والی روحیں عبادات کی وجہ سے اچھے مقام پر فائز ہوئی ہیں۔ اس طرح اہل جنت کے لئے خوشی ہی خوشی ہے۔ رنج نام کو بھی نہیں۔

عالمِ مادی میں خوشی اور غمی ہوتی ہے جب کہ اہلِ جنت کے لئے خوشی ہی خوشی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ عالم جس میں ہم موجود ہیں مادی ہے اور جسم بھی مادی ہی رکھتے ہیں مگر جنت میں جسم روحانی اور لطیف ہوتا ہے۔ عالم مثال سارے کا سارا روحانی ہے۔ اگرچہ روحانی جسم کو بھی خوشی اور غمی محسوس ہوتی ہے مگر جنت میں غمی کا سامان نہیں ہوتا۔ یہ اس لئے کہ غمی اور عذاب وغیرہ تو عالمِ ناسوت (دوزخیوں) کے لیے ہے۔ ایسے عذاب اور خوشی کا ذکر قرآن کریم میں بھی ہے۔ یہاں پر ایک درویشانہ بات یاد آتی ہے جس کو نیچے بیان کیا جاتا ہے۔

شیخ ابوسعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ کے مجموعہ کلام ''اسرار التوحید'' میں آپ رحمۃ اللہ علیہ کا قول موجود ہے کہ ایک روز وہ قصبہ آمل میں شیخ ابوالعباس قصاب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر تھے اور دو شخص آئے اور کہنے لگے اے شیخ ہمارے درمیان یہ جھگڑا پڑا ہوا ہے کہ خوشی ابدی (ہمیشہ رہنے والی) ہے یا غم؟ آپ اس کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ آپ نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر کہا ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' کہ قصاب کے بیٹے کے لئے نہ غم ہے نہ خوشی۔ لَیْسَ عِنْدَ رَبِّکُمْ صَبَاحٌ وَّلَا مَسَاءٌ (تمہارے رب کے ہاں نہ صبح ہے نہ شام) خوشی اور غمی تو تمہاری صفت ہے جو حادث ہے اور حادث کو قدیم سے کیا راہ؟ پھر فرمایا خدا کے بندوں کے لئے سنتِ مصطفوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہی ایک راستہ ہے اور اگر کوئی جوانمردی کا دعویٰ کرے تو اس کا گواہ یہی راستہ ہے۔ یہ بوڑھی عورتوں کا راستہ نہیں بلکہ جوانمردوں کا میدانِ جنگ ہے۔ شیخ نے بتایا کہ دونوں سائل ابوالحسن خرقانی اور

ابو عبد اللہ داستانی رحمۃ اللہ علیہما تھے۔

اگلے جہان میں اگر یہ حال ہے تو اس جہان میں اللہ والوں کی یہی شان ہے کہ نہ تو انہیں خوشی کے مواقع پر خوشی ہوتی ہے اور نہ رنج و غم کے مواقع پر کسی قسم کا رنج ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآنِ کریم میں فرمایا ہے کہ

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (سورۃ یونس: ۶۲) سنو! بے شک اولیاء اللہ کو نہ تو کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (البتہ بشارتوں کا وعدہ کیا گیا ہے۔)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے دعائیہ طور پر فرمایا۔

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر شریکِ زمرۂ لَا یَحْزَنُوْن کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں میرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر (ب ج: ۳۷۹)

صوفیائے کرام کی اصطلاح میں ولی اس کو کہتے ہیں جس کا دل محبت الٰہی سے لبریز ہو اور کسی غیر کی وہاں گنجائش نہ ہو۔ خاص جنتیوں کا یہ طریقہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی چیز سے خوش نہیں ہوتے۔ ان کے ہاں نہ کوئی خوشی ہے اور نہ غمی۔ حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے خواب میں دیکھا کہ جنت کے آخری طبقے میں کھڑے تھے اور مسلسل اللہ تعالیٰ کے دیدار میں رہتے ہیں۔ ان کو کھانے پینے اور کسی چیز سے بھی کوئی غرض نہیں۔

تعینِ روحی و عالمِ ملکوت

"تعلیمِ غوثیہ" میں ہے کہ عالمِ ارواح جس کو ملکوت بھی کہتے ہیں اس کا ذکر قرآن شریف میں درج ذیل الفاظ میں ہے۔

فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ وَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ (یٰسٓ: ۸۳) (پس وہ (ہر عیب سے) پاک ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی حکومت ہے اور اسی کی طرف تمہیں لوٹایا جائے گا۔)

اس مرتبے کی طرف اشارہ ہے کہ روح کا وجود صرف بسیط ہے جس کی کوئی صورت نہیں مگر جس صورت میں چاہتا ہے نمودار ہوتا ہے اور یہ معنی ہر ایک صورت میں ظاہر ہے اس کو روحِ ربانی کہتے ہیں۔ اس کو تنزل و تعین سوم کہتے ہیں۔ اس مرتبہ میں ذات باسمِ روح موسوم ہے۔

وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ (الحجر: ۲۹) اور پھونک دوں اس میں خاص روح اپنی طرف سے

اسی مقام کا بیان ہے۔

تعینِ مثالی و عالمِ مثال

عالمِ مثال جس کو لوحِ محفوظ بھی کہتے ہیں۔

لوحِ محفوظ ست پیشانیٔ یار رازِ کونینش نماید آشکار (۶۔۲۵۸)

(لوحِ محفوظ پیشانی یار ہے جس میں ہمارے محبوب خدا کا بھید ظاہر ہوتا ہے۔)

یہاں ذات بمنزلہ مثال ہے اس کو تعین چہارم بھی کہتے ہیں۔

عالمِ ملکوت، عالمِ اجساد اور عالمِ مثال

زیر نظر کتاب میں "علم ظاہر اور باطن" کے باب میں چند عوالم کا ذکر کیا گیا ہے اور مختلف اولیائے کرام کے مشاہدات کا اس میں ذکر موجود ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ انسان کی سیر گاہ عالمِ مثال میں ہے اور اس میں عجائبات ملک اور ملکوت بھی ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق عالمِ مثال کو عالمِ ارواح اور عالمِ اجسام کے معنی و حقائق کے لئے آئینہ کی مانند لکھتے ہیں کہ اس عالمِ مثال میں عالمِ اجسام اور ارواح کے معانی و حقائق لطیف صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں کیونکہ اس میں ہر معنی و حقیقت کی ایک خاص مناسب شکل ہے۔ عالمِ مثال میں بذات خود کوئی صورت اور شکل و ہیئت نہیں ہے۔ صور و اشکال دوسرے عالموں سے آ کر اس میں عکس ڈالتی ہیں جس طرح آئینہ میں کوئی صورت نہیں ہوتی بلکہ جو صورتیں اور شکلیں اس میں آتی ہیں وہ باہر سے آتی ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عالمِ موجودات میں ایک ایسا عالم بھی ہے جو غیر مادی ہے اور جس میں معنی ان اجسام کی صورت میں متشکل ہوتے ہیں جو اوصاف کے لحاظ سے اس کے مناسب ہیں۔ پہلے اس عالم میں ایک گونہ وجود ہو سکتا ہے تب دنیا میں اس کا وجود میسر ہوتا ہے اور یہ دنیاوی وجود ایک اعتبار سے بالکل اسی عالمِ مثال کے وجود کے مطابق ہوتا ہے۔ اکثر وہ اشیاء عوام کے نزدیک جسم نہیں رکھتیں۔ اس عالم میں منتقل ہوتی اور اترتی ہیں اور عام لوگ اس کو نہیں دیکھتے (حجۃ اللہ البالغہ)۔ اس عالم کے علاوہ حضرت شاہ ولی اللہ عالمِ برزخ کا ذکر کرتے ہیں جو ان کے خیال میں عالمِ اجسام اور عالمِ مثال کے بیچ میں ہے اور دونوں عالموں کے احکام کا جامع ہے۔

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دل کا آئینہ جب صاف ہو جائے تو وہ لوح محفوظ سے تعلق پیدا کر لیتا ہے اور اس کی ہر چیز ان کو نظر آتی ہے (کیمیائے سعادت) مذکورہ مضمون چونکہ زیر نظر کتاب میں بھی ہے اس لئے اس کا مطالعہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

علامہ اقبالؒ اور حکمتِ ملکوتی ولاھوتی

علامہ اقبالؒ کے کلام میں عالمِ ملکوتی، لاھوتی کے علاوہ عالمِ جبروت، لاہوت، عالمِ بشریت اور اعراف کے متعلق کچھ اشارے ملتے ہیں جس سے انہوں نے انسان کا ان عوالم سے تعلق رکھنے کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً آپ کا ایک بہت مشہور شعر طائرِ لاہوتی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اے طائرِ لاھوتی اُس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

(ب ج:۳۴۸)

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس انسان کا تعلق عالمِ لاھوت کے وطن سے ہے یہ اس کے شایانِ شان نہیں کہ وہ رزق کی خاطر اپنے آپ کو اتنا گرادے کہ جس سے اس کا وقار مجروح ہوتا ہوا نظر آئے۔ اسی سلسلے میں وہ وضاحت فرماتے ہیں کہ انسان جس باغ کا پرندہ ہے اس کی شان یہ ہے کہ اس کا عشق آدابِ خود آگاہی سکھاتا ہے اور کسی بلند مقام کے حصول کیلئے اسے چاہیے کہ عطار، رومی، رازی اور غزالی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کی طرح اپنے مقام کو عبادات سحر گاہی کے ذریعے بلند کرے۔ قوم کے راہبروں کے لیے آپؒ نے یہ اشارہ دیا ہے کہ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ اگرچہ مسلمان کم کوش ہیں لیکن اپنی بلندیٔ شان کی وجہ سے بلند پروازی کا ذوق رکھتے ہیں۔

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی
عطار ہو رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحرگاہی
نو مید نہ ہو ان سے اے راہبر فرزانہ کم کوش تو ہے لیکن بے ذوق نہیں راہی
اے طائرِ لاھوتی اُس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

(ب۔ج:۳۴۸)

حضرت علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ ''بالِ جبریل'' میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ملکوتی جوہر بخشے ہیں۔ اگرچہ انسان کی اصل خاک سے ہے لیکن وہ خاک سے پیوند نہیں رکھتا۔ درج ذیل اشعار میں وہ انسان کو عطا کردہ ملکوتی اور لاھوتی صفات کے باعث اس کی چند خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ اس بات کا سبق دیتے ہیں کہ انسان خواہ کہیں کا رہنے والا ہو لیکن اس کا تعلق مشرق سے ہے نہ مغرب سے ہے بلکہ وہ ملکوت اور لاھوت کا رہنے والا ہے۔ ایک اور مقام پر آپ نے فرمایا ہے ''لَاشَرْقِیٌّ وَلَا غَرْبِیٌّ اَنَا عَرَبِیٌّ'' کہ میں نہ تو مشرق سے تعلق رکھتا ہوں اور نہ مغرب سے بلکہ ہمارا ملک عرب سے ہے کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کی آل ہیں اور اگر یقین نہ ہو تو قرآن کریم کی یہ آیت پڑھیں۔

اَبِیْکُمْ اِبْرٰهِیْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ تمہارا باپ ابراہیم ہے جس نے تمہارا نام مسلمان

رکھا ہے۔ (ارمغ:۷۸)

بالِ جبریل کا کلام جس میں بہت سی باتوں کا ذکر ہے، وہ حسب ذیل ہیں۔

حاضر ہیں کلیسا میں کباب و مے گلگوں
مسجد میں دھرا کیا ہے بجز موعظۂ و پند!
احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند!
فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا
افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند!

(ب۔ج:۳۱۲)

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی
خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند!
درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دِلّی نہ صفاہاں نہ سمرقند!
مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہِ دماوند!
ہوں آتش نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں، نہیں دانۂ اسپند!
ہر حال میں میرا دل بے قید ہے خرم
کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکرخند!
چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند!

(ب۔ج:۳۱۳)

''ضرب کلیم'' میں ایک جگہ علامہ'' اپنا یعنی انسان کا تعلق نہاں خانۂ لاہوت سے ہونا ظاہر کرتے ہیں۔ آپؒ اس تعلق سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اگرچہ انسان بہت سی نادانیوں کا مرتکب ہوتا ہے مگر اس کی اصل تو لاہوت سے تعلق رکھتی ہے اور اسی وجہ سے انسان دنیا بھر میں اللہ تعالیٰ کی تعلیمات کو پھیلا رہا ہے اور انسان کے پھیلائے ہوئے دینی علم سے بہت سے لوگ اللہ کے نام کے ساتھ منسلک ہو چکے ہیں۔

میں بندۂ ناداں ہوں مگر شکر ہے تیرا
رکھتا ہوں نہانخانۂ لاہوت سے پیوند (ض۔ک:۴۸۴)
اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند
تاثیر ہے یہ میرے نفس کی کہ خزاں میں
مرغانِ سحر خواں مری صحبت سے ہیں خورسند (ض۔ک:۴۸۵)

بالِ جبریل میں علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو حکمتِ ملکوتی اور علمِ لاہوتی عطا کیا ہے۔ قرآن کریم میں بھی سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۶۹ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جس کو حکمت دی گئی اس کو بہت بڑی خیر عطا کر دی گئی ہے۔ صوفیاء کرام اس حکمت سے مراد علم تصوف کی حکمت لیتے ہیں کیونکہ پورے قرآن کریم میں تصوف کا نام کہیں نہیں لیا گیا البتہ لفظ حکمت ہی اس تصوف کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ انسان کو ایک اور علم عطا کیا گیا ہے جسے قرآن نے علم الاشیاء کا نام دیا ہے۔ دیکھئے

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (البقرۃ:۳۱) اور سکھا دیئے آدم کو تمام اشیاء کے نام

اسماء کے علم سے یہی علم مراد ہے۔ حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ علوم جو اللہ تعالی نے انسان کو عطا کیے ہیں حرم کے درد کا درماں نہیں بنتے تو ان علوم کے حاصل کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ جو لوگ ایسے تصوف کو اپناتے ہیں جس میں ذکر نیم شبی اور مراقبوں کے سرور سے لطف اندوز ہوتے ہیں تو ایسی عبادات سے اس کا مقصود پورا نہ ہو تو یہ تصوف کیسا ہے؟ یہ وہ تصوف ہے جس کی شکل تو ہو مگر اس میں تصوف کی روح نظر نہ آئے۔ اگر انسانی عقل نے لَا اِلٰہ کہہ بھی دیا تو اس کا یہ ورد بے فائدہ ہے اگر لَا اِلٰہ کہنے والے کی دل و نگاہ مسلماں نہ ہوں۔

حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

یہ حکمتِ ملکوتی، یہ علم لاہوتی حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکرِ نیم شبی یہ مراقبے، یہ سرور تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ عقل جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار شریکِ شورشِ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

(ب۔ج:۴۹۶)

خرد نے کہہ بھی دیا لَا اِلٰہ تو کیا حاصل دلِ و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
عجب نہیں کہ پریشاں ہے گفتگو میری فروغِ صبح پریشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

(ب۔ج:۴۹۷)

ضربِ کلیم میں علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہمارے سیاستدان سے کسی اچھے کام کی توقع کیا کی جاسکتی ہے کیونکہ یہ خاکباز ہیں اور خاک کی صفات (گھٹیا صفات) اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ان کا تعلق عالمِ ملکوت سے نہیں ہے اور نہ ہی ان کے تخیلات بلند ہیں۔ ایسے سیاستدانوں کی نگاہیں تو مچھروں اور چیونٹیوں پر لگی رہتی ہیں۔ ان کی کمندیں تو مکڑی اور اس کے جالے کی طرح نازک ہیں۔ ایسے خوش قسمت قافلہ سالار وہ ہیں جن کی متاع تخیلِ ملکوتی اور جذبہ ہائے بلند پر ہو۔ ایسے لوگ کسی قوم میں شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔

اُمید کیا ہے سیاست کے پیشواؤں سے یہ خاکباز ہیں رکھتے ہیں خاک سے پیوند
ہمیشہ مور و مگس پر نگاہ ہے ان کی جہاں میں صفت عنکبوت ان کی کمند
خوشا وہ قافلہ کہ جس کے امیر کی ہے متاع تخیلِ ملکوتی و جذبہ ہائے بلند! (ض۔ک:۶۱۹)

''ضرب کلیم'' میں ہی علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ آفاق کی شعاعیں جو ہر گوشہ سے اُٹھتی ہیں تو وہ خورشید کو اپنا پیغام دیتی ہیں۔ مسلمانانِ عالم یہ سمجھتے ہیں کہ مغرب میں روحانی اجالا ناممکن ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اہلِ افرنگ مشینوں اور فیکٹریوں کے کارخانوں میں پیسہ سمیٹنے میں مصروف ہیں۔ اہل مشرق میں اگرچہ لوگ خال خال روحانی دنیا میں قدم رکھتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن یہ عالمِ لاہوت کی طرح خاموش

ہیں۔ ان کی روحانیت کے کمالات نظر نہیں آتے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی حالت کو اپنے دامن میں چھپالیں اور مسلمانوں کو فراموش نہ فرمائیں۔

آفاق کے ہر گوشے سے اٹھتی ہیں شعاعیں بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش
(ض۔ک: ۵۶۹)

اک شور ہے مغرب میں اجالا نہیں ممکن افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش
مشرق نہیں گو لذتِ نظارہ سے محروم لیکن صفتِ عالمِ لاہوت ہے خاموش
پھر ہم کو اسی سینۂ روشن میں چھپا لے اے مہرِ جہاں تاب نہ کر ہم کو فراموش
(ض۔ک: ۵۷۰)

"ارمغان حجاز" (اردو) میں اس بات کا ذکر ہے کہ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کو نواب حیدر آباد دکن کی طرف سے ایک ہزار روپے کا چیک (Cheque) بطور تواضع موصول ہوا جس پر حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک نظم تحریر فرمائی کہ اس تحفہ کی عطا اللہ کی طرف سے تھی کیونکہ یہ شخص قلندر ہونے کے باوجود ملوکانہ صفات کا حامل ہے۔ حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ کو فرمایا گیا کہ اس حسنِ تدبیر سے کام کریں کہ اس آنی و فانی دنیا کو ثبات مل سکے۔ حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ تو شاید اس کام کو انجام دیتے مگر جب آپ کو یہ کہا گیا کہ یہ ریاست کی زکوۃ ہے تو آپ کی عزت اسے گوارہ نہ کرسکی۔ جو لوگ ملوکانہ صفات کے حامل ہیں وہ زکوۃ جیسے بوجھ سے بچتے ہیں۔

تھا یہ اللہ کا فرمان کہ شکوہِ پرویز دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے، اور شہنشاہی کر حسن تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
میں تو اس بار امانت کو اٹھاتا سر دوش کام درویش میں ہر تلخ ہے مانند نبات
غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات
(ا۔ح: ۶۹۰)

مقامِ اعراف اور "بالِ جبریل"

اعراف ایک ایسا علاقہ ہے جو جنت میں ہے نہ دوزخ میں بلکہ ان دونوں کے درمیان کے علاقے کو اعراف کہتے ہیں۔ "بالِ جبریل" میں علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ افلاطون غیب و حضور کے درمیان تڑپ رہا ہے۔ وہ خود کو فلسفی کہتا تھا اور نجات یافتہ لوگوں میں خود کو شمار کرتا تھا۔ وہ اپنے وقت کے نبی پر ایمان نہ لایا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اس کو کسی ہدایت کی ضرورت نہیں۔ اس حالت میں علامہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ نہ تو غیب میں تھا اور نہ حضور میں، بلکہ اس کا مقام اعراف میں تھا اور ہمیشہ اہلِ خرد کا مقام اعراف میں ہی ہوتا ہے

کیونکہ وہ ہدایت سے محروم ہوتے ہیں۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ جب کعبہ میں گئے تو اپنے جوشِ جنوں کی وجہ سے اپنے آپ سے باہر ہو گئے اور جنون کی کیفیت طاری ہو گئی۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اس کیفیت میں بھی انہوں نے ہوش وحواس کو خیر باد نہیں کہا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ حرم کا غلاف ان کے جنوں کی وجہ سے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہوا اور اُمیدوں کے برخلاف سلامت رہا ہے۔ جنون میں بھی بہت سی کیفیتیں وارد ہوتی ہیں۔ ایک جنون تو وہ ہے کہ جس میں شعور اور حصولِ مقصد کا خیال باقی رہتا ہے اور دوسرا جنوں وہ ہے جس میں شعور نہیں، جیسا کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب آنکھ کا نور دل کا نور نہیں
اِک جنوں ہے کہ باشعور بھی ہے اک جنوں ہے کہ باشعور نہیں (ب ج: ۳۳۵)

''زبورِ عجم'' میں علامہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس قدر زورِ جنوں میں گریباں کا پاس رکھنا ہر دیوانے کا کام نہیں ہے کہ وہ جنوں میں صبر اور سکون سے گزر جائے۔

باچنیں زورِ جنوں پاسِ گریباں داشتم در جنوں از خود نرفتن کارِ ہر دیوانہ نیست (ز۔ع: ۴۱۸)

(اس قدر زورِ جنوں میں میں پاسِ گریباں رکھتا ہوں، جنوں میں اپنے آپ سے گزر جانا ہر دیوانے کا کام نہیں)

عالمِ ملکوت و جبروت وغیرہ سے انسانوں کو وہ روحانی غذا ملتی ہے جو عام کتابوں سے حاصل نہیں ہوتی۔ جب انسان قرآن پڑھے تو ایسا محسوس کرے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن کا نزول اس کے دل پر ہو رہا ہے اور اگر ایسا نہیں تو امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تشریح اور علامہ زمخشریؒ کی کتاب ''کشاف'' کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

ایک شعر میں فرماتے ہیں روحانی عوالم سے چونکہ اہلِ مغرب کو غذا میسر نہیں ہے اس لئے ان کا سوز وسرور ناپائدار ہے ورنہ شراب فرنگ پر ہی اگر نشہ شراب کا انحصار ہوتا تو ان کی ساغر کی تہہ کی شراب بھی بہت صاف ہوتی مگر یہ روحانیت سے محروم ہے۔

کمال جوشِ جنوں میں رہا میں گرمِ طواف خدا کا شکر سلامت رہا حرم کا غلاف
یہ اتفاق مبارک ہو مومنوں کے لئے کہ یک زباں ہیں فقیہانِ شہر میرے خلاف
تڑپ رہا ہے فلاطوں میانِ غیب و حضور ازل سے اہلِ خرد کا مقام ہے اعراف
ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب گرہ کُشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشّاف
سُرور و سوز میں ناپائدار ہے، ورنہ مئے فرنگ کا تہ جرعہ بھی نہیں ناصاف

(ب ج: ۳۷۰)

جبروت "ضربِ کلیم" میں

جس طرح رسول اللہ ﷺ کی روحِ مطہرہ کمالاتِ باطنیہ میں کامل ہے اسی طرح آپ ﷺ کی ذات بھی کمالاتِ ذاتیہ میں کامل ہے کہ ملکوت کے باغات آپ ہی کے جمال کی بدولت خوشنما معلوم ہوتے ہیں اور عالمِ جبروت کے حوض آپ ہی کے نور کے فیض سے چھلک رہے ہیں۔

تقدیر پر کلام کرتے ہوئے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ ضربِ کلیم میں لکھتے ہیں کہ نااہل لوگ دنیاوی قوتوں کو عمل میں لاتے ہوئے کبھی قوت اور دبدبہ حاصل کر لیتے ہیں لیکن اولیاء اللہ عالمِ جبروت سے عظمت و جلال حاصل کرتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض نیک انسان ایسا دبدبہ حاصل نہ کر سکنے کے باعث زمانے میں خوار ہو جاتے ہیں۔ علامہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شاید اس بات میں بھی کوئی منطق پنہاں ہو اور تقدیر تو کسی منطق کے تابع نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں کلام تو بہت طویل ہے مگر ایک مثال سے یہ معاملہ واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پیغمبر ہونے کے باوجود فرعون کی کٹ حجتیوں کی وجہ سے تکلیف برداشت کرتے رہے (کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ اپنے بندوں کے مخالفین کو کچھ دیر بعد گرفت میں لاتے ہیں، چنانچہ فرعون کی گرفت چالیس سال کے بعد نظر آئی) موسیٰ علیہ السلام اپنی فرض کی ادائیگی میں ثابت قدم تھے اس لئے کامیاب ہوئے۔ اگر کوئی استقامت اختیار نہیں کرتا تو وہ اللہ کی مدد کا حق دار نہیں۔ غلط قسم کے لوگ نجات نہیں پاتے لیکن اللہ والوں کو خدا کی مدد ملتی رہتی ہے۔ جو لوگ احکامِ الٰہی کو مدِنظر رکھتے ہیں ان کی کامیابی پر تاریخ شاہد ہے۔ علامہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

نا اہل کو حاصل ہے کبھی قوت و جبروت　ہے خوار زمانے میں کبھی جوہرِ ذاتی
شاید کوئی منطق ہو نہاں اس کے عمل میں　تقدیر نہیں تابعِ منطق نظر آتی!
ہاں ایک حقیقت ہے کہ معلوم ہے سب کو　تاریخِ امم جس کو نہیں ہم سے چھپاتی
(ض۔ک: ۴۸۶)

ہر لحظہ ہے قوموں کے عمل پر نظر اس کی　بُرّاں صفتِ تیغِ دو پیکر نظر اس کی
(ض۔ک: ۴۸۷)

تقدیر کے بدلنے کے لئے کام کرنے کی لگن اور جنون کی ضرورت ہے۔ بعض لوگ اس تقدیر کے بدلنے کو ستاروں کی روشنی پر تحول کرتے ہیں۔ علامہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ستارہ کیا تقدیر کے بدلنے کی خبر دے گا وہ تو خود افلاک کی فراخی میں زار و زبوں ہے۔ فرماتے ہیں کہ حیات صرف خیال و نظر کی مجذوبی ہے اور ڈر یا خوف سے زندگی بسر کرنا تو خود انسان کو لے ڈوبتی ہے۔ اگر اسلامی منطق یعنی قوانینِ اسلام اور وسعتِ قلب و

نظر پر نظر رکھی جائے تو زندگی انسان کے قدموں کی باندی ہے۔

وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں — خدا مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہوں
ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا — وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں
حیات کیا ہے؟ خیال و نظر کی مجذوبی — خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناں گوں

(ب۔ج:۳۱۹)

عالمِ بشریت

اللہ تعالیٰ نے عالمِ بشریت سے بلند تر کوئی جہان پیدا نہیں کیا اور رسول اللہ ﷺ کو بشریت کا تاج پہنایا۔ عالمِ کن فکاں میں انسان کو نیابت کا شرف بخشا اور اس سے بلند تر کوئی شرف نہیں۔ حضور اکرم ﷺ جسدِ خاکی میں اللہ کے نور تھے اور نوریوں کی انتہا سے بہت بلند۔ آپ ﷺ کا مقام تھا کہ جہاں سے آگے جبرئیل امین (نوریوں کے سردار) بھی نہ جاسکے وہاں سے آگے آپ ﷺ کا مقام شروع ہوتا ہے اور یہ کلام بہت طویل ہے۔ اس سب کلام کا لُبِ لباب یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے وہ مقام عطا فرمایا ہے جو اس کی مخلوق میں سے کسی کو حاصل نہیں اور اس کی وجہ خدا سے اور انوارِ خدائی سے اس کو قرب حاصل ہونا ہے۔ یہ قرب اس کو ان عوالم کے ذریعے حاصل ہوتا ہے جن کا اوپر ذکر ہوا اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی تابعداری سے ہی ملتا ہے۔ علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے انسانی معراج اسی کو فرمایا ہے۔

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفٰے سے مجھے — کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں!
یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید — کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں! (ب ج:۲۰، ۳۱۹)

عالمِ آب وخاک

یہ دنیا مٹی اور پانی سے بنی ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پانی سے زندہ کیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ (الانبیا:۳۰)

اور ہم نے پیدا فرمائی پانی سے ہر زندہ چیز کو

اس عالمِ آب وخاک میں حضور اکرم ﷺ کے ظہور سے رونق ہے اور آپ ﷺ کے نور سے ہی ذرہ ریگ کو طلوعِ آفتاب دیا گیا ہے۔ جدھر بھی دیکھیں (خواہ عالمِ جبروت ہو یا ملکوت) ہر جگہ آپ ﷺ کے انوار کا ظہور چمک دمک رہا ہے۔ اہلِ تصوف ان عوالم سے اخذِ فیض کرتے ہیں۔ علامہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب — گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ — ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود — فقرِ جنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمالِ بے نقاب

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام　میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب
(ب ج:۴۰۵)

عالمِ آزاد

ماحول اور احوال کے اعتبار سے بہت سے عالم دیکھنے کو آتے ہیں ان میں سے مادی اشیاء کو عالمِ مجبور بنایا گیا ہے اور انسان کو جو اشرف المخلوقات ہے عالمِ آزاد میں پیدا کیا گیا ہے۔ اس کی آزادی کی وسعت وہم و خیال سے بھی ماوراء ہے۔ علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات　مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند (ض ک: ۵۲۶)

اِنسان کو قوت اور تصرف کی اِس قدر استطاعت دی گئی ہے کہ اس کے لئے زمین و آسمان میں جو کچھ ہے مسخر کیا گیا ہے۔ مگر یہ اختیار اس کی قوتِ استطاعت اور فرمانبرداری پر منحصر ہے۔ اس دنیا کی ہر چیز ذوقِ طلب میں سرگرداں ہے سوائے چند نافرمان اور غافل جنّوں اور انسانوں کے کہ جو ذوقِ طلب کھو بیٹھے ہیں۔ اگر انسان احکام الٰہی کا پابند ہے تو اسے کسی چیز سے نہ تو خطرہ ہے اور نہ کھٹکا۔ جو خدا سے ڈرتا ہے ہر چیز اس سے ڈرتی ہے۔ علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔

ناچیز جہانِ مہ و پرویں ترے آگے　وہ عالمِ مجبور ہے، تو عالمِ آزاد
موجوں کی تپش کیا ہے؟ فقط ذوقِ طلب ہے　پنہاں جو صدف میں ہے وہ دولت ہے خداداد
شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا　پُر دم ہے اگر تُو تو نہیں خطرۂ اُفتاد
(ض۔ک: ۵۳۴)

مسلمانوں کی عالمِ بالا کے مشاہدے سے بے بضاعتی

مسلمانوں کی دنیا میں جو لوگ خود کو مسلمان کہتے ہیں ان میں سے بیشتر تو وہ لوگ آتے ہیں جو صرف نام کے مسلمان ہیں اور مسلمانوں کی تباہی کا باعث بھی یہی امر ہے کہ وہ کچھ بھی کرنا نہیں چاہتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ایسا دین اِیجاد کیا جائے جس میں عمل کے تقاضے نہ ہوں اور وہ بغیر کشمکش زندگی کے نہایت آسودہ زندگی بسر کر سکیں۔ بے عملی پر وہ اس قدر پختہ ہو چکے ہیں کہ اپنی بوسیدہ حالت سے باہر آنا اب ایک امر لاینحل معلوم ہوتا ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

ہے کس کی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے　حرّیتِ افکار کی نعمت ہے خداداد (ض۔ک: ۵۲۳)
قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر　چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد
ہے مملکتِ ہند میں اک طرفہ تماشا　اسلام ہے محبوس، مسلمان ہے آزاد (ض۔ک: ۵۲۴)

تصوف کا علم ایک خاص نوعیت کا علم ہے جو کہ مخصوص نوعیت کے مسلمانوں کا ہی مقدر بنتا ہے۔ عام لوگوں میں سے چند لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس علم میں دلچسپی لیتے ہیں اور اس سے بھی کم لوگ ایسے ہیں جو اس پر مداومت اور پختگی اختیار کرتے ہیں۔ ایسے منتخب لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ ہستیوں کی اعانت حاصل کرنے کے لئے ان کی صحبت اختیار کرنے کو کہا جاتا ہے۔ بہت کم اشخاص اس کام کو تکمیل تک پہنچاتے ہیں کیونکہ اس میں استقامت، مخصوص مشقتیں اور کچھ ریاضتی اعمال اختیار کرنے ہوتے ہیں جس سے روحانی طاقت سالک میں پیدا ہوتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ سالک کی نیت اور ارادے کو پسندیدہ ملاحظہ کرتا ہے تو اس کو اس راہِ سلوک کے لیے چن لیا جاتا ہے۔ راہِ سلوک اختیار کرنے کے بعد پوری عمر سالک کو مستعد اور باخبر رہنا ہوتا ہے کیونکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ذراسی لغزش کے بعد وہ منزل سے دور بھٹک جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان راہروانِ طریقت کی مدد فرمائے۔

تصوف کی ضروریات کے لئے راقم الحروف نے متعدد کتابیں تالیف کی ہیں جس سے سالکانِ راہِ طریقت کی تشنگی دور کرنے اور ان کی مکمل رہنمائی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس تمام گفتگو کا یہاں اعادہ کرنا ضروری نہیں البتہ سالکانِ طریقت کے لیے اس راہ کے لوازمات کو جاننا اور ان پر عمل کرنا کافی ہے۔ اسلام کیا ہے اور وہ ہم سے کیا چاہتا ہے؟ اِسلام کی تعلیمات اس کی عائد کردہ پابندیاں، اسلامی عقائد، فقہٗ اسلامیہ اور کشف والہامات کی تفاصیل ایک اچھے مسلمان کیلئے حصولِ علم کے ضروری حصے ہیں۔ کچھ لوگ مغربی تہذیب کے اس قدر دلدادہ ہیں کہ ان کی راہ پر چلنے کو اپنی کامیابی کا راز سمجھ بیٹھے ہیں۔ علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ۔

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب   کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

(ض۔ک: ۴۸۴)

ہم مسلمانانِ افرنگی مآب   چشمہ کوثر بجویند از سراب (ج۔ن: ۷۹۴)

(انگریز نما مسلمان بھی اس جھوٹے سراب سے چشمہ کوثر کو تلاش کرتے ہیں۔)

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان

جب مسلمانوں کے جوانوں کی یہ حالت ہو کہ وہ بے دین اغیار کے در پر پڑے رہتے ہوں تو ان کو عالمِ ملکوت، جبروت اور لاھوت وغیرہ کا مشاہدہ حاصل ہونا تو درکنار، ان بے چاروں کو اسلام کی چیدہ چیدہ اصطلاحات کا بھی علم نہیں ہوتا بلکہ اکثریت کو ایمانیات، عبادات اور معاملات کے احکام ومسائل کا علم تک نہیں۔

مسلمان نوجوانوں کی اسلامی طرز پر اگر تربیت ہو تو جو جوان تیار ہوں گے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے مسلمانوں کی شان میں بہت کلام لکھا ہے اور مسلمانوں میں جو اوصاف ہونے ضروری ہیں ان کا اعادہ کیا

ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ چونکہ مسلمان اللہ تعالیٰ کے ارادوں کا تکمیل کرنے والا ہوتا ہے تو وہ خود اللہ تعالیٰ کی صفات کا حامل بھی ہوتا ہے۔ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ یعنی اللہ کے اخلاق پیدا کرو۔ (الحدیث) (التعرف لمذہب التصوف: ج ۱، ص ۵) قرآن مجید میں بھی ہے کہ کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ (ہر روز وہ ایک نئی شان سے تجلی فرماتا ہے (الرحمٰن: ۲۹) اسی طرح مومن کی بھی ہر لحظہ نئی آن اور نئی شان ہوتی ہے۔ اس کی گفتار اور کردار اللہ تبارک و تعالیٰ کی برہان ہوتی ہے۔ اس کے اخلاق میں جب قہاریت، غفاریت، قدوسیت، جبروتیت کے عناصر پائے جاتے ہوں تو پھر کہیں جا کر یہ کما حقہٗ مسلمان کہلانے کا حقدار بنتا ہے۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ انسان خاک سے پیوند رکھتا ہے مگر صفات اور کردار میں یہ جبریل امین کا ہمسایہ ہے اور اپنی صفات کے اعتبار سے بخارا اور بدخشاں کا رہنے والا نہیں بلکہ عرش نشین ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگرچہ مومن قرآن کا قاری ہے لیکن حقیقی معنوں میں یہ بذات خود قرآن ہے۔ یہ راز کسی کو معلوم نہیں کہ وہ بذاتِ خود قرآن کس طرح کہلاتا ہے۔ یہ بات اس طرح سمجھ میں آتی ہے کہ جب ہم قرآن کی حقیقت پر غور کریں کہ قرآن کیا ہے؟ حقیقتاً قرآن ہدایت دینے والی کتاب ہے اور مومن چونکہ خود بھی دنیا بھر کے لئے ہدایت کا ذریعہ بن جاتا ہے تو معنوی طور پر یہ بھی ایک قرآن ہے۔ یہ جہاں بھی جاتا ہے ہدایت پھیلاتا ہے۔ اس لئے یہ بھی ایک چلتا پھرتا قرآن ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مومن قدرت کے مقاصد کو دنیا بھر میں پھیلانے والا ہے اور اس کی شان یہ ہے کہ دنیا میں بھی وہ میزان قائم کرنے والا ہے اور آخرت میں بھی دوسری امتوں پر گواہی دے کر میزان قائم کرے گا۔

مومنوں کی صفات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ (آپس میں بڑے رحمدل ہیں) (الفتح: ۲۹) یعنی ایک دوسرے کے دل کے لئے ٹھنڈک ہیں اور جب مومن قہر میں آجائے تو دریاؤں کے دل بھی اس سے دہل جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادوں کی تکمیل مومن کرتا ہے اور آہنگ دنیا میں سورۂ رحمٰن میں پیش کیے جانے والی تمام خصوصیات کا حامل ہے۔ اگر وہ خدائی ارادوں کا حامل بن جائے تو تمام کائنات اس کے اشاروں پر چلتی ہے مگر آج مسلمان دنیوی ناز برداریوں کے لالچ میں اپنا اصلی منصب جو خدا نے اس کو عطا کیا ہے کھو چکا ہے۔ اگر مسلمان اپنی ان تمام خوبیوں کے ساتھ خود کو ظاہر کرے تو وہ عالمِ ملکوت، جبروت اور لاھوت اس کے سامنے منکشف ہو جائیں اسی طرح شب و روز کی کوشش سے مومن کا مقدر بنتا ہے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریل امیں بندۂ خاکی ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشاں

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
فطرت کا سرودِ ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن
بنتے ہیں مری کارگہِ فکر میں انجم
لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان
(ض ک: ۵۲۲)

عالمِ ملک، ملکوت اور جبروت

عالمِ ملک: عالمِ شہاد، عالمِ محسوسات اور عالمِ اجسام کو کہتے ہیں۔

سبع سنابل میں ہے کہ خدائے تعالیٰ کی ذات محض وحدت ہے اور عالمِ جبروت میں اگرچہ تمام موجودات بیک دم موجود ہیں لیکن نام اور نشان نہیں رکھتے۔ جو چیزیں اس میں موجود ہیں شکل وصورت قبول نہیں کرتیں لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ عالمِ جبروت میں سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں۔ عالمِ ملکوت عالمِ مراتب ہے اور جو چیزیں عالمِ جبروت میں ہیں وہ وجود پاتی ہیں۔ لیکن ملک عالمِ اضداد ہے کہ اس میں شکل اور صورت آشکارا ہوتی ہے۔ عالمِ ملک کی لطافت کو عالمِ ملکوت کی لطافت سے کوئی نسبت نہیں۔ (لطافت میں جبروت زیادہ لطیف اور پھر عالمِ ملک اس سے کم لطیف اور ملکوت اس سے بھی کم لطیف ہے۔ عالمِ جبروت کی لطافت ذاتِ خداوند تعالیٰ کی لطافت سے کوئی نسبت نہیں رکھتی کیونکہ وہ لطافت کی انتہا ہے۔ پھر عالمِ ملک کا کوئی ذرہ ایسا نہیں کہ عالمِ ملکوت کی ذات اس میں جلوہ گر اور اس کو محیط نہ ہو اور جبروت کا کوئی ذرہ ایسا نہیں کہ خداوند تعالیٰ کی ذات کی تجلی اس میں نہ ہو اور وہ اس کا احاطہ نہ کیے ہوئے ہو۔ عالمِ ملک و عالمِ ملکوت اور عالمِ جبروت کا کوئی ذرہ ایسا نہیں کہ خداوند تعالیٰ کی ذات کی تجلی اس میں نہ ہو اور وہ اس کا احاطہ نہ کیے ہوئے ہو اور اس سے واقف نہ ہو۔

سبع سنابل میں ہے کہ دل کے اندر ایک سوراخ ہوتا ہے جو ملکوتِ آسمان کی جانب کھلتا ہے۔ اسی طرح دل کے پانچ دروازے عالمِ محسوسات کی جانب کھلے ہوئے ہیں۔ دل ایک آئینہ ہے اور لوحِ محفوظ بھی ایک آئینہ ہے جس میں تمام موجودات کی صورتیں موجود ہیں۔ دل کا آئینہ اگر صاف ہو تو لوحِ محفوظ کی تمام صورتیں دل میں صاف نظر آتی ہیں بشرطیکہ وہ محسوسات سے فارغ ہو کر صاف ہو۔ ایسی حالت میں دل کی لوحِ محفوظ سے مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب دل محسوسات میں گھرا ہوا ہو تو عالمِ ملکوت کی نسبت پردہ کے اخفیٰ میں رہتی ہے۔ اگر انسان دل کو لوحِ محفوظ سے منسوب کر لے (یعنی بری عادتوں کے چنگل سے چھڑا لے) تو دل کا روزن (جھروکا) بڑھ جاتا ہے تو دوسرے لوگ جو چیز خواب میں دیکھتے ہیں تو وہ شخص بیداری کی حالت میں

دیکھ لیتا ہے۔ ارواح انبیائے کرام علیہم السلام، ملائکہ علیہم السلام اور آسمان وزمین کی مملکتیں اسے نظر آنے لگتی ہیں۔ اگر کوئی پانچوں حواس کو (ان کے کام سے) بے بہرہ کردے تو دل کا راستہ کھل جاتا ہے تو پھر وہ جس صورت پر نظر ڈالے گا تو اسے معنی کا راز حاصل ہو جائے گا۔ بری عادتیں دھوئیں اور تاریکی کی طرح ہیں جو دل کو اندھا کر دیتی ہیں۔ اچھی عادتیں گناہوں کی تاریکیوں کو مٹا دیتی ہیں۔

اِتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا   ہر بدی کے بعد نیکی کرلو کہ وہ اس بدی کو مٹا دے گی۔ (مسند امام احمد بن حنبل: ج ۵، ص ۵۸)

حلقۂ درویشاں میں بعض لوگ نوافل اور وظائف، ذکر و مراقبہ میں بڑے مصروف رہتے ہیں لیکن فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کا مظاہرہ کرکے فرائض کی اہمیت سے ناواقف ہوتے ہیں۔

حضرت مخدوم ملت شیخ بڈھن قدس سرہٗ نے لکھا ہے کہ سالک کے لئے راہِ سلوک میں ایک ایسا مقام بھی آتا ہے کہ اس کی دنیا آخرت ہو جاتی ہے۔ اول آخر سے انجام پذیر ہوتا ہے اور آخر اول سے پیوستہ ہو جاتا ہے اور جب عالم یہ ہے تو کون سا محقق دنیا میں دیدار الٰہی کے انکار کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ جب ازل ابد تک رسیدہ اور ابد ازل سے پیوستہ ہے تو ان محققین کے لئے ایک کلمہ ایک حرف بن جاتا ہے حدیثِ قدسی ہے: اَلْعَظْمَةُ اِزَارِىْ وَالْكِبْرِيَائِىْ رِدَائِىْ (سنن ابی داؤد: ص ۲۵) عظمت میری ازار اور کبریائی میری رداء (چادر) ہے اس کی طرف اشارہ ہے اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (النور: ۳۵)

اے جملہ جہاں حسنت آخر چہ جمال ست ایں   پیدائی و پنہائی آخر چہ کمال ست ایں
در ہر چہ نظر کردم، غیر از تو نمی بینم   غیر از تو کسے باشد حقا چہ مجال ست ایں

(اے وہ کہ تمام عالم تیرے حسن کا پرتو ہے۔ آخر یہ کون سا جمال ہے؟ تو ظاہر بھی باطن بھی ہے۔ یہ کتنا عظیم کمال ہے۔ میں جس چیز میں نظر کرتا ہوں تیرے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور تیرے سوا اور ہو بھی کون سکتا ہے۔ اس کی گنجائش بھی کہاں ہے کہ ہم اس کا احاطہ کر سکیں یہ بہت دور کی بات ہے۔)

وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ مُّحِيْطٌ ﴿۲۰﴾ (البروج: ۲۰)   یعنی اللہ تعالیٰ کے علم کا ہم کو محیط ہونا ہمارے خود کے احاطے سے بھی قریب ہے۔

عالمِ ''ھاھوت'' اور ''ھو''

عالمِ ملکوت اور دیگر عوالم میں کچھ بزرگوں نے دیکھا ہے کہ ہر ایک عالم کو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ عالمِ ملکوت کے ۳۸ طبقات بنائے گئے ہیں اور عالمِ جبروت کے ۳۶ طبقات معلوم ہوتے ہیں، جبکہ لاھوت کے ۱۸ طبقات اور ھاھوت کے ۱۴ طبقات محسوس کیے گئے ہیں۔ یہ طبقات اس قدر لطیف ہیں کہ اس کی جنتیں بڑی

بزرگ روحوں کو محض دھندلے نقوش نظر آتے ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں عرفان میں باکمال لوگوں کی روحیں ہوتی ہیں۔ اس کے بعد عالمِ "ھُو" کے ۱۴ طبقات ہیں اور اس میں دنیا سے قطع تعلق کرنے والے بزرگوں کی روحیں رہتی ہیں۔ اس عالم میں بھی لطافت اس قدر ہے کہ اُوپر والے مقامات ہر نیچے والے مقام سے زیادہ لطیف تر ہیں۔ اس میں وہ لوگ ہوں گے جو اللہ کے سوا کسی اور جگہ دل نہیں لگاتے۔ حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ایک روایت نظروں سے گزری ہے کہ کسی بزرگ نے جنت کی چند روحوں کے احوال بیان کئے اور حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق فرمایا کہ وہ تو ہر وقت اللہ کی طرف نظریں جمائے رہتے ہیں۔ ان کو ماکولات اور کسی شے سے رغبت ہی نہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عالم 'ھُو' میں جنتوں کے نظارے بھی دیکھنے میں نہیں آتے بلکہ ایک حدیث میں ہے کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں اللہ کے عاشقوں کو ہر وقت اللہ تعالیٰ مسکراتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

سورۃ الفرقان میں ہے کہ دوزخ بہت ہی بری جگہ ہے خواہ مستقل رہنے کے لئے ہو یا عارضی قیام کے لئے۔ سورۃ الفرقان کے اسی رکوع کے اخیر میں ہے کہ جنت بہت عمدہ ٹھکانہ اور قیام گاہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ دوزخ کے کچھ قیام کے بعد جنتوں میں آ جائیں گے اور جنتوں کے کچھ لوگ ترقی کے بعد عالمِ ھاھوت یا ھو میں چلے جائیں گے کیونکہ حقیقتاً جنتیں عالمِ لاھوت کے بعد ختم ہو جائیں گی۔ ھاھوت اور ھو جنتوں کے طبقات نہیں ہیں۔

عالمِ ارواح یا روحِ بسیط

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ عرش کے بعد روحِ بسیط کا طبقہ شروع ہو جاتا ہے۔ خالق کائنات نے ان تمام ارواح مجردہ کو جو اس طبقہ میں موجود ہیں روز ازل محض اپنے حکم سے پیدا کر دی تھیں، ان ارواح مجردہ میں کوئی صفت سوائے محبت اور عبودیت کے اور کچھ نہیں ہوتی لیکن اپنی استعداد کے مطابق دوسروں کے خواص کو جذب کر سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عالمِ امر کو لفظ کن سے پیدا فرمایا۔

روح کی تخلیق اور دیگر معلومات کا ذکر حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے مکتوبات شریف اور مبدأ و معاد میں کیا ہے اور یہ مقام ایسی تفاصیل کا متحمل نہیں۔ خزینۃ المعارف (الابریز تبریز) میں بھی روح کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ نظرِ عمیق سے مطالعہ کرنے والے حضرات ان کتب کا مطالعہ فرمائیں۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے مکتوبات شریف میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب روحوں کو پیدا فرمایا تو روح کو بدن کے ساتھ تعلق ہونے سے پہلے اپنے مقصود (یعنی اللہ تعالیٰ) کی طرف توجہ حاصل تھی۔ جب بدن کے ساتھ متعلق ہوئی تو وہ توجہ زائل ہو گئی (اور اس کی توجہ جسم، خورد و نوش، ملبوسات، مکان و مسکن

اور بیوی بچوں کی طرف مائل ہوگئی۔) کچھ لوگ تو ایسے ہیں کہ ان کی توجہ کلی طور پر اپنے مقصود سے ہٹ گئی اور دیگر اشیاء میں منہمک ہوگئی۔ فرماتے ہیں کہ کچھ اللہ کے نیک بندے ایسے بھی ہیں کہ جن کی توجہ اب بھی (اس دنیا میں) اپنے مقصود کی طرف اسی طرح ہے جیسے کہ عالم ارواح میں تھی۔ یہ لوگ محبوبین کے گروہ میں شامل ہیں۔ یہ عین دنیا کے کاموں میں منہمک رہ کر بھی اپنے مقصود سے قطعاً غافل نہیں بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ (النور: ۳۷) وہ (جواں) مرد جنہیں غافل نہیں کرتی تجارت اور نہ خرید و فروخت یادِ الٰہی سے)

اولیائے کرام نے لکھا ہے کہ کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں کہ اگر وہ اللہ کی یاد سے ایک آنکھ جھپکنے کی دیر کے لئے بھی غافل ہو جائیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ مرتد ہو گئے ہیں۔ اس سلسلے میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا مکتوب نمبر ۲۸۷ دفتر اول حصہ پنجم کا ایک حصہ نیچے دیا جا رہا ہے جس میں روح اور قلب کے انجذاب کا کافی مفصل ذکر ہے۔

جب یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ طالبانِ طریقت کی ہمت اور پستیِ فطرت اور شیخ کامل مکمل کی صحبت نصیب نہ ہونے کے باعث راہ طویل اور مطلب بلند کو چھوٹے راستے اور پست مقصد میں بڑ کر نیچے لے آئے ہیں اور راستے میں جو بھی حقیر اور معمولی چیز انہیں میسر آئی اسی پر کفایت کر لی اور اسی کو اپنا مقصد گمان کر لیا اور اپنے آپ کو اتنا کچھ حاصل ہونے پر کامل و منتہی خیال کرتے ہوئے منتہی حضرات اور واصلانِ درگاہ کو ان حالات کے بیان فرمانے پر جو انہیں انجام کار اور نہایت پر جا کر میسر آتے ہیں، اس پست فطرت جماعت نے قوت متخیلہ کے غلبہ کے باعث ان احوال کاملہ کو اپنے احوال ناقصہ سے مطابق کیا ہے۔ یہ تو وہ قصہ ہوا۔ ع

بخواب اندر مگر موشے شتر شد (خواب میں چوہا اونٹ بنا ہوا نظر آیا)

ان کم ہمت لوگوں نے نہایت گہرے سمندر سے ایک قطرہ سے بلکہ صورتِ قطرہ اور دریائے عمان سے ایک چھینٹے بلکہ صورتِ چھینٹے پر قناعت کر لی ہے۔ چوں کو بے چوں تصور کرتے ہوئے بے چوں کو چھوڑ کر چوں کے ساتھ آرام پذیر ہو گئے ہیں۔ مثل کو بے مثل خیال کرتے ہوئے بے مثل ذات کو بھلا کر مثل پر فریفتہ ہو چکے ہیں۔ ان کے برعکس اس جماعت (عوام مسلمین) کے حالات جو تقلید سے بے چون ذات پر ایمان لائے ہیں اور بے مثل ذات کے گرویدہ ہو چکے ہیں، ان ناتمام سلوک والوں اور سراب کے ساتھ آرام پکڑنے والے تشنہ لبوں کے حالات سے کئی مرتبے بہتر ہیں۔ محق اور مبطل اور مصیت کے درمیان بہت فرق ہے۔ ان مطلب نارسیدہ طالبوں پر افسوس جو حادث کو قدیم اور چوں کو بے چوں خیال کرتے ہیں، اگر ان کے کشفِ غیر صحیح پر انہیں معذور قرار نہ دیا گیا اور اس خطا اور غلطی پر ان کا مواخذہ نہ کیا گیا۔ اے اللہ ہمارا مواخذہ نہ کر اگر ہم

بھول جائیں یا خطا کر بیٹھیں۔

نارسیدہ طالب کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کعبہ جانے کا طالب ہوا اور شوق سے اس تک پہنچنے کی طرف متوجہ ہوا۔ اتفاق سے راستہ میں اسے خانہ کعبہ کی مثل ایک مکان نظر آیا اگرچہ وہ مشابہت صرف صورت میں ہے۔ اس شخص نے خیال کیا کہ یہی مکان کعبہ ہے اور وہاں معتکف ہو گیا۔ اس کے برعکس دوسرا شخص جس نے واصلانِ کعبہ سے کعبہ کے خواص معلوم کر کے اس کی تصدیق کی ہو تو اس شخص نے اگرچہ طلب کا کوئی قدم بھی کعبے کی طرف نہیں اٹھایا، لیکن اس نے غیر کعبہ کو کعبہ نہیں سمجھا، اور اپنی تصدیق میں سچا ہے، اس کا حال خطا میں مبتلا ہو جانے والے مذکورہ طالب سے بہتر ہے۔

ہاں اس طالب کا حال جو ابھی مطلب تک نہیں پہنچا، لیکن غیر مطلب کو مطلب بھی نہیں جانا، مقلدِ محق سے جس نے مطلب کے راستے کی طرف قدم نہیں اٹھایا، بہتر ہے کیونکہ اس نے مطلوب کی درست تصدیق کے ساتھ ساتھ راہِ مطلوب کی مسافت کا کچھ حصہ بھی طے کر لیا ہے۔ لہٰذا فضیلت اس کے لیے ثابت ہے۔ اور ان میں سے بھی ایک گروہ نے خیالی کمال اور وہمی وصال کی بنا پر اپنے آپ کو شیخی کے مسند اور خلقت کی پیشوائی کی طرف کھینچ لائے ہیں اور اپنے نقصان کے سبب بہت سے کمالات کی استعداد رکھنے والے ذی استعداد لوگوں کی استعداد کو ضائع کر چکے ہیں اور اپنی صحبت کی ٹھنڈک کی شومی کے باعث طالبوں کی طلب کی حرارت کو زائل کر چکے ہیں۔ ضَلُّوا فَاَضَلُّوا ضَاعُوا فَاَضَاعُوا۔ خود بھی گمراہ تھے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا اور خود بھی ضائع ہوئے اور دوسروں کو بھی ضائع کیا۔

کمال کا تخیل اور وصال کا یہ وہم سلوک نامکمل کردہ مجذوبوں میں بذریعہ جذب نہ پہنچنے والے سالکوں کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے مبتدی اور منتہی صورتِ جذب میں شریک ہیں اور بظاہر عشق و محبت میں مساوی ہیں، اگرچہ فی الحقیقت ایک دوسرے سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے اور ہر ایک کے حالات ایک دوسرے سے جدا ہیں۔

ع چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

ابتداء میں جو کچھ بھی ہے علت اور نقص سے خالی نہیں اور عرض پر محمول ہے اور انتہا میں چونکہ حق کے ساتھ ہوتا ہے اس لیے سب کچھ حق کے لئے ہوتا ہے۔ اس بات کی تفصیل انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب ذکر کی جائے گی۔ یہ صوری مشابہت اور یہ ظاہری مناسبت اس تخیل کا باعث ہے۔

اور جبکہ طریقہ عالیہ نقشبندیہ میں جذبہ سلوک پر مقدم ہے، اس طریق کے مجذوبوں کو جو دولت سلوک سے مشرف نہیں ہوئے ہیں اس قسم کا تخیل اور اس طرح کا وہم بہت زیادہ لاحق ہوتا ہے اور ان میں سے ایک جماعت کو کہ مقام جذبہ میں منقلب احوال حاصل ہوتے ہیں اور ایک حال سے دوسرے حال کی طرف جاتے

ہیں وہ اس انتقالِ احوال کو منازل سلوک کا قطع کرنا اور سیر الی اللہ کے راستے کو طے کرنا گمان کرتے ہیں اور ان گردشوں کی بنا پر اپنے آپ کو مجذوب و سالک تصور کرتے ہیں۔ اس بنا پر دلِ سُست میں یہ بات قرار پذیر ہوئی کہ حقیقتِ جذبہ و سلوک اور ان دونوں مقاموں کے درمیان فرق کے بیان میں چند فقرے لکھے جائیں نیز وہ خاصیتیں بھی لکھی جائیں جو ایک کو دوسرے سے ممتاز کرتی ہیں اور جذب مبتدی اور جذب منتہی کے درمیان فرق اور مقام تکمیل وارشاد کی حقیقت اور دوسرے علوم جو اس مقام کے مناسب ہیں، احاطہ تحریر میں لائے جائیں۔

لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَ يُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٨﴾ (الانفال:٨)　　تاکہ ثابت کر دے حق کو اور مٹا دے باطل کو اگرچہ ناپسند کریں (اس کو) عادی مجرم

تو میں حق تعالیٰ سبحانہ کی حسنِ توفیق سے اس کا بیان شروع کرتا ہوں اور اللہ سبحانہ ہی صحیح راہ کی ہدایت کرتا ہے اور وہی اچھا کارساز اور اچھا وکیل ہے۔ یہ مکتوب دو مقاصد اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ مقصد اول ان معارف کے بیان میں جو مقام جذبہ سے تعلق رکھتے ہیں، اور مقصد ثانی معارف سلوک سے متعلق ہے اور خاتمہ ان متفرق علوم و معارف میں ہے جن کا جاننا طالبوں کے لئے کثیر المنفعت ہے۔

مقصدِ اول

جاننا چاہیے کہ سلوک نا مکمل کردہ مجذوب اگرچہ جذب قوی رکھتے ہیں اور جس راہ سے بھی ان کو کھینچا جائے، اربابِ قلوب کے گروہ میں داخل ہیں۔ سلوک اور تزکیۂ نفس کے بغیر مقام قلب سے آگے نہیں گزر سکتے اور نہ مقلبِ قلبِ ذات (حق تعالیٰ) تک پہنچ سکتے ہیں۔ ان کا انجذاب انجذابِ قلبی ہے۔ ان کی محبت عرضی ہے ذاتی نہیں۔ نیز ان کی محبت غرض پر مبنی ہے، اصلی نہیں کیونکہ اس مقام میں نفس روح سے اور ظلمت نور سے ملی ہوئی ہے۔ مکمل طور پر مقام قلب سے نکلنا اور مقلبِ قلبِ ذات سے ملنا اور مطلوب کے ساتھ انجذابِ روحی پیدا کرنا اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک مطلوب کی طرف توجہ کے لئے روح نفس سے آزاد نہ ہو اور نفس کا روح سے جدا ہونا اور مقامِ بندگی میں نیچے آنا اس علیحدگی کے بغیر متصور نہیں جب تک یہ دونوں حقیقت میں اکٹھے ہیں۔ حقیقتِ جامعہ قلبیہ اپنی جگہ مضبوط اور قائم ہے اور خالص روحی انجذاب ممکن نہیں اور روح کا نفس سے علیحدہ ہونا منازلِ سلوک قطع کرنے، سیر الی اللہ کے راستے طے کرنے اور سیر فی اللہ سے موصوف ہونے کے بعد ہوتا ہے۔ بلکہ مقام "الفرق بعد الجمع" جو سیر عن اللہ یا بعد سے تعلق رکھتا ہے، کے حصول کے بعد ہی اس کی صورت بنتی ہے۔

ہر گدائے مرد میداں کے شود　　پشۂ آخر سلیماں کے شود (x)

(ہر گداگر مرد میدان نہیں بن سکتا، مچھر آخر سلیمان کا ہم پایہ کیسے ہو سکتا ہے۔)

تو اس سے منتہی کے جذب اور مبتدی کے جذب کے درمیان فرق واضح ہو گیا۔ ان ارباب قلوب مجذوبوں کا شہود پردۂ کثرت میں ہے۔ وہ اس معنی کو جانیں یا نہ جانیں اور ان کا شہود اس عالم کثرت میں نہیں۔ مگر صرف عالم ارواح جو لطافت، احاطہ اور سریان میں اپنے موجد سے صورتاً مشابہت رکھتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ   اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا

(مسند امام احمد بن حنبل: ج ۲ ص ۲۴۴)

اور اس مناسبت کے سبب روح کے شہود کو حق تعالیٰ و تقدس کا شہود سمجھ لیتے ہیں اور احاطہ و سریان اور قرب و معیت بھی اسی قیاس پر ہے اس لئے کہ سالک کی نگاہ صرف مقام فوق تک عبور کر سکتی ہے مقام فوق الفوق تک نہیں جا سکتی اور ان کا مقام فوق مقام روح ہے پس ان کی نظر مقام روح سے زیادہ بلند نہیں جا سکتی اور ان کا مشہود روح کے سوا کوئی اور امر نہیں ہوتا۔ روح سے اوپر نظر کا جانا اس پر موقوف ہے کہ سالک مقام روح میں پہنچ جائے۔ محبت اور انجذاب بھی شہود کی طرح ہیں۔ حق سبحانہٗ کا شہود بلکہ جناب قدس خداوندی کی محبت اور اس کی طرف انجذاب فنا کے حاصل ہونے سے وابستہ ہے جسے سیر الی اللہ کی نہایت سے تعبیر کرتے ہیں۔

ہیچ کس را تا نہ گردد او فنا   نیست راہ در بارگاہِ کبریا(×)

(کوئی شخص بھی جب تک فنا کا مقام نہ پائے بارگاہِ کبریا تک راستہ نہیں پا سکتا۔)

اس مقام میں شہود کا اطلاق میدانِ عبارت کی تنگی کے باعث ہے ورنہ ان بزرگوں کا کارخانہ متعارف شہود سے وراء الوراء ہے اور جس طرح ان کا مقصد بے چون و بے چگون ہے ان کا اتصال بھی حق سبحانہٗ کے ساتھ بے چون و بے چگون ہے چون کے لئے بے چون ذات کی طرف کوئی راستہ نہیں۔ لَا یَحْمِلُ عَطَایَا الْمَلِکِ اِلَّا مَطَایَاہُ (بادشاہ کی عطاؤں کو اسی کی سواریاں اٹھا سکتی ہیں)۔

اتصالے بے تکیف و بے قیاس!   ہست رب الناس را باجانِ ناس

(لوگوں کے رب کا لوگوں کے ساتھ اتصال بے کیف ہے اور قیاس میں نہیں آ سکتا۔)

احاطہ، سریان اور اس ذات سبحانہٗ کا قرب و معیت محققینِ ارباب سلوک کے نزدیک جو نہایت کار تک پہنچ چکے ہیں، علمی ہے۔ جیسا کہ علمائے اہل حق شَکَرَ اللّٰهُ تَعَالٰی سَعْیَهُمْ کا مسلک ہے۔ قرب ذاتی اور اس طرح کی دوسری باتیں ان کے نزدیک بے حاصلی اور دوری میں داخل ہیں۔ خدا تعالیٰ کے لئے قرب ذاتی کا قائل نہیں ہیں۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

"جو یہ کہے کہ میں خدا کے نزدیک ہوں وہ دور ہے، اور جو اپنے آپ کو دور سمجھے وہ نزدیک ہے" تصوف یہ ہے۔

وہ علم جو توحید وجودی سے تعلق رکھتا ہے، اس کا منشا انجذاب اور محبت قلبی ہے۔ اربابِ قلوب جنہوں نے جذبہ پیدا نہ کیا ہو اور سلوک کے راستے سے منازل طے کر رہے ہوں، یہ علم ان سے مناسبت نہیں رکھتا۔ اسی

طرح جو مجذوب سلوک کے ذریعے قلب سے کلیۂ مقلبِ قلب (حق تعالیٰ) کی طرف متوجہ ہیں وہ بھی ان علوم سے برأت کا اظہار اور استغفار کرتے ہیں۔

بعض مجذوب ایسے بھی ہوتے ہیں جو اگرچہ سلوک کے راستے سے آتے ہیں اور منازل طے کرتے ہیں لیکن ان کی نظر مقام مالوف سے قطع نہیں ہوتی، اور رخ اوپر کی طرف نہیں کرتے۔ اس قسم کے علوم ان کا دامن نہیں چھوڑتے اور اس گرداب سے باہر نہیں آتے۔ اس لئے مدارجِ قرب میں عروج اور معارج قدس تک چڑھنے سے قاصر اور لنگڑے ہیں۔

رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا (النساء: ۷۵)

اے رب ہمارے نکال ہمیں اس بستی سے ظالم ہیں جس کے رہنے والے اور بنا دے ہمارے لئے اپنے پاس سے دوست اور بنا دے ہمارے لئے اپنے پاس سے کوئی مددگار۔

نہایت مطلب تک پہنچنے کی علامت یہ ہے کہ اس طرح کے علوم سے سالک بیزاری کا اظہار کرے کیونکہ جس قدر تنزیہہ کے ساتھ زیادہ مناسبت پیدا ہوگی عالم کو صانع کے ساتھ زیادہ بے مناسب پائے گا۔ اس وقت عالم کو صانع کا عین جاننا یا صانع کو عالم کا محیط بالذات گمان کرنا کچھ معنی نہیں رکھتا۔

ع چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

نہایت کو بدایت میں درج کرنا

حضرت خواجہ نقشبند قدس اللہ تعالیٰ سرہ الاقدس نے فرمایا ہے کہ ہم نہایت کو بدایت میں درج کرتے ہیں۔ اس عبارت کے معنی یہ ہیں کہ جو انجذاب و محبت منتہی حضرات کو انتہا میں جا کر میسر آتی ہے، اس طریقہ میں وہ انجذاب و محبت ابتداء میں درج ہے۔ اس لئے کہ منتہی کا انجذاب انجذاب روحی ہے اور مبتدی کا جذب جذبِ قلبی اور قلب چونکہ روح اور نفس کے درمیان برزخ ہے اس لئے جذبِ قلبی کے ضمن میں جذب روحی بھی حاصل ہو جاتا ہے اور تمام جذبات میں اس معنی کے حاصل ہونے کے باوجود اندراج کی یہ تخصیص اس طریقہ کے ساتھ اس بنا پر ہے کہ اس خانوادہ کے اکابر نے اس معنی کے حصول کے لئے ایک طریقہ وضع کیا ہے اور اس مطلب تک پہنچنے کے لئے ایک راستہ متعین کیا ہے اور دوسروں کو یہ معنی اتفاق سے نصیب ہو جاتا ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لئے ان کے پاس کوئی ضابطہ اور قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ نیز ان بزرگوں کی جذبہ کے مقام میں خاص شان ہے جو دوسروں کو میسر نہیں اور اگر ہے بھی تو بہت کم۔ اسی بنا پر اس سلسلہ کے بعض کو اس مقام میں منازل سلوک طے کرنے کے بغیر ہی اربابِ سلوک کی فنا و بقا کے مشابہ ایک فنا و بقا

حاصل ہوتی ہے اور مقامِ تکمیل سے جو مقامِ سیر عن اللہ باللہ کے مشابہ ہوتا ہے، کچھ حصہ میسر آتا ہے۔ جس کے ساتھ وہ مستعدوں کی تربیت کرتے ہیں۔

یہاں ایک نکتہ ہے جس کا بیان یوں ہے کہ روح کے لئے بدن کے ساتھ متعلق ہونے سے پہلے اپنے مقصود کی طرف توجہ حاصل تھی۔ جب بدن سے متعلق ہوئی تو وہ توجہ زائل ہوگئی۔ اس بلند سلسلہ کے اکابر نے اس توجہ سابق کے ظہور کے لئے طریقہ وضع فرمایا۔ لیکن جب رُوح بدن سے متعلق ہو تو توجہ قلبی موجود رہتی ہے، جو نفس اور روح دونوں کی تو کی جامع ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ توجہ روحی توجہ قلبی میں مندرج ہے۔ لیکن وہ روحی توجہ جو منتہی حضرات کو نصیب ہوتی ہے، روح کو فنا اور حقانی وجود کے ساتھ بقا حاصل کرنے کے بعد ہوتی ہے اور اس بقا کو بقا باللہ سے تعبیر کرتے ہیں اور جو روحی توجہ توجہ قلبی کے ضمن میں ہوتی ہے۔ بلکہ روح کی جو توجہ بدن کے ساتھ متعلق ہونے سے پہلے تھی، وہ توجہ ہے جو ہستیِ رُوح کے ہوتے ہوئے ہے جس کی طرف ابھی فنا کو راستہ نہیں ملا اور روح کی ہستی کے ہوتے ہوئے اور اس کی اس توجہ میں جو فنا ہونے کے بعد ہے، بہت فرق ہے۔ پس توجہ قلبی میں درج شدہ توجہ روحی کو نہایت کہنا اس اعتبار سے ہے کہ رُوح ہی کی توجہ ہے جو نہایت میں جا کر باقی رہتی ہے تو نہایت کے بدایت میں درج ہونے سے مراد یہ ہے کہ صورت نہایت بدایت میں درج ہے، نہ کہ نہایت کی حقیقت۔ کیونکہ اس کا بدایت میں اندراج محال ہے۔ ممکن ہے صورت کا لفظ اس طریقہ کے طالبین کی ترغیب کے لیے ظاہر نہ کرتے ہوں اور اصل بات وہی ہے جس کی میں نے بعون اللہ تعالیٰ تحقیق کی ہے اور سابقین جن کا انجذاب بلا عمل اور بلا کسب ہے بلکہ وہ توجہ اور حضور سے آئے ہیں، ان کا انجذاب بھی قلبی ہے اور روح کی توجہ سابق کا اثر ہے۔ جو بدن سے متعلق ہونے کے باوجود بالکل زائل نہیں ہوا۔ توجہ سابق کے ظہور کے لیے کسب وعمل کی ضرورت اس جماعت کے لئے ہے جو بدن سے متعلق ہونے کی وجہ سے توجہ سابق کو بالکل فراموش کر چکے ہیں۔ کسب توجہ سابق پر گویا تنبیہ ہے اور اس گمشدہ دولت کی یاددہانی ہے۔ لیکن توجہ سابق کو بھلا دینے والے مذکورہ سابقین سے زیادہ لطیف الاستعداد ہیں۔ اس لئے کہ توجہ سابق کا بالکلیہ نسیانِ بدن کی طرف بالفعل کلی توجہ اور اس میں گم ہونے کی خبر دیتا ہے اور توجہ کا عدم نسیان اس طرح نہیں۔ غایۃ مافی الباب یہ ہے کہ سابقین میں وہ توجہ عموم وسریان کو کلیۃً ان میں پیدا کر دیتی ہے اور ان کا بدن بھی روح کا حکم اختیار کر لیتا ہے۔ جیسا کہ محبوب ومراد لوگوں کی شان ہے۔ لیکن محبوبوں کی سرایت اور سابقین کی سرایت میں ایسا فرق ہے جیسا حقیقت شے اور صورت شے میں ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس کے جاننے والوں پر ظاہر ہے۔ ہاں محبانِ واصل اور مریدانِ کامل کے لیے بھی اس قسم کے شمول (ایک قسم کی کیفیت) کا تحقق ہوتا ہے، لیکن بجلی کی طرح لحہ بھر کے لئے دائمی نہیں، دائمی شمول محبوبوں کا خاصہ ہے۔

معرفت

ارباب قلوب مجذوب جب مقام قلب میں قرار اور پختگی حاصل کرتے ہیں اور معرفت وصحو جو اس مقام کے مناسب ہے انہیں میسر آتی ہے تو ان سے بھی طالبوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے اور طالبوں کی جماعت کو ان کی صحبت سے انجذاب اور محبت قلبی حاصل ہوتی ہے۔ اگر چہ ان سے کمال تک نہیں پہنچ سکتے کیونکہ وہ ابھی خود حدِ کمال کو نہیں پہنچے ہوتے۔ دوسروں کے لئے حصولِ کمال کا ذریعہ کیسے بن سکتے ہیں؟ مشہور ہے کہ ناقص سے کامل چیز ظہور میں نہیں آسکتی۔ ان مجذوبوں سے جو فائدہ بھی پہنچتا ہے، اربابِ سلوک کے افادہ سے زیادہ ہوتا ہے اگر چہ اربابِ سلوک نہایت سلوک کو پہنچ چکے ہوں اور منتہی حضرات کا جذب اپنے اندر پیدا کرلیں لیکن انہیں مقامِ قلب میں براستہ سیر عن اللہ باللہ نیچے نہیں لایا گیا۔ کیونکہ عالم کی طرف غیر مرجوع منتہی تکمیل وافادہ کا مرتبہ نہیں رکھتا۔ اس کی عالم سے کچھ مناسبت اور توجہ باقی نہیں رہی تاکہ اس سے فائدہ پہنچ سکے اور شیخ مقتدا کو جو برزخ کہتے ہیں، اس لحاظ سے کہتے ہیں کہ وہ مقامِ برزخیت کے مقام میں جو مقام قلب ہے نیچے آچکا ہوتا ہے اور روح ونفس دو جہت سے اس نے حصہ وافر لے لیا ہوتا ہے روح کی جہت سے فوق سے استفادہ کرتا ہے اور نفس کی جہت سے اپنے ماتحت کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ کیونکہ اس کے لئے حق سبحانہ اور خلق دونوں کی طرف توجہ جمع ہو چکی ہوتی ہے۔ ان دونوں میں سے کوئی توجہ دوسری کے لئے حجاب اور پردہ نہیں، لہٰذا بیک وقت افادہ اور استفادہ اس کے لئے حاصل ہے۔ بعض مشائخ اس برزخیت کو برزخیت بین الخلق والحق کہتے ہیں اور شیخ صاحب برزخ کو جامع بین التشبیہ والتنزیہہ قرار دیتے ہیں۔

پوشیدہ نہ رہے کہ اس طرح کی برزخیت جس کی بنا سکر پر ہے شیخیت کے مقام کے لائق نہیں، جس کا مبنیٰ صحو پر ہے۔ اس لئے کہ ان کا نفس اس مقام میں انوار روح کے غلبات میں مندرج ہے اور یہی اندراج سکر کا منشا ہے اور قلب کی برزخیت کے مقام میں نفس اور روح ایک دوسرے سے جدا ہیں اس لیے لامحالہ یہاں سکر کی گنجائش نہیں بلکہ یہاں صحو ہی ہے جو مقام دعوت کے لائق ہے، اسے ذہن میں رکھو۔

شیخ کامل کو مقام قلب میں جب نیچے لاتے ہیں تو وہ برزخیت کی وجہ سے عالم کے ساتھ مناسبت پیدا کر لیتا ہے اور کمالات کی استعداد رکھنے والوں کے لیے حصول کمالات کا ذریعہ بن جاتا ہے اور مقام قلب میں قرار پذیر مجذوب بھی عالم سے مناسبت رکھتا ہے اور اپنی توجہ ان سے روک کر نہیں رکھتا اور انجذاب اور محبت سے بھی اگر چہ قلبی ہی ہے حصہ رکھتا ہے اس لئے فائدہ پہنچانے کا راستہ اس پر بھی کھلا ہے۔

بلکہ میں کہتا ہوں کہ مجذوب متمکن (مقامِ قلب میں قرار پذیر) سے فائدہ پہنچنے کی مقدار خلق کی طرف لوٹائے گئے منتہی کے افادہ کی مقدار سے زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن منتہی کی کیفیت افادہ مجذوب کی کیفیت افادہ

سے زیادہ ہے اس لئے کہ خلق کی طرف لوٹائے گئے منتہی کو بھی اگر چہ جہاں سے مناسبت پیدا ہو چکی ہے تاہم یہ مناسبت صرف صورت میں ہے ورنہ یہ منتہی حقیقت میں عالم سے جدا ہے اور اصل کے رنگ سے رنگین اور بقا حاصل کر چکا ہے اور اس مجذوب کو عالم کے ساتھ حقیقتاً مناسبت ہے اور اسی بقا کے ساتھ باقی ہے جس کے ساتھ عالم باقی ہے اس لیے طالبین مناسبت حقیقی کی وجہ سے مجذوب سے زیادہ فائدہ حاصل کرتے ہیں اور دنیا کی طرف برائے دعوت لوٹائے گئے منتہی سے کم۔ (یہ مکتوب اس کے بعد بھی جاری ہے۔)

عالمِ ارواح کی صورت اور روحوں کا سفر

کہا جاتا ہے کہ عالمِ ارواح ایک بہت بڑے پیالے کی طرح ہے جو الٹا رکھا گیا ہو اور اس کے اندر شہد کی مکھیوں کے گھروں کی طرح چھوٹے چھوٹے گھر بنے ہوئے ہیں اور ہر سوراخ میں ایک روح موجود ہے۔ روح کا ایک سرا اس سوراخ سے منسلک رہتا ہے اور دوسرا سرا دنیا کے اس انسان کے سر کے ساتھ جڑا ہوا رہتا ہے جس کی یہ روح ہوتی ہے۔ جو روحیں عالم ارواح میں قریب رہتی ہیں یا جن کا تعلق ایک دوسرے کے ساتھ جان پہچان کا ہوتا ہے تو وہ ایک دوسرے کو پہچانتی ہیں اور جب دنیا میں آ جاتی ہیں تو وہ ایک دوسرے سے مانوس ہونا محسوس کرتی ہیں۔ وہ یہ احساس دیتی ہیں کہ انہوں نے اس شخص کو کہیں دیکھا ہے۔ کئی مرتبہ یہ تعلق بہت گہرا ہو تو آپس میں محبت ہو جاتی ہے۔ دوسری حالت میں ایک دوسرے کو دیکھتے ہی ناراض رہتی اور نفرت کرتی ہیں۔ ان سب روحوں کی توجہ ہر وقت اپنے مقصود کی طرف مائل رہتی ہے۔

جب اللہ تعالیٰ کسی روح کو دنیا میں بھیجنا چاہتا ہے تو اس کو سفرِ دنیا کا حکم دیتا ہے۔ روحِ بسیط روحوں کے سمندر کی طرح ہے کہ جس میں لاتعداد روحیں سمندر کے پانی کے قطروں کی طرح موجود رہتی ہیں۔ سمجھانے کے لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ روحِ بسیط ایک سمندر ہے پانی کے بے شمار ذرّات کا۔ جب سورج اس پر نظر ڈالتا ہے تو اس نظر کی حرارت سے ان ذرات میں زندگی یعنی حرارت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ذرات ایک تار یا شعاع کی شکل میں آسمان کی طرف پرواز کرتے ہیں جس طرح پانی کے ذرّات بھاپ کی شکل میں اڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بادلوں کو جب بلندی کی طرف پرواز ملتی ہے تو وہ ٹھنڈک کی وجہ سے پھر قطرات کی شکل میں بن کر زمین کی طرف برسنے لگتے ہیں۔ اگر پرواز زیادہ مل جائے تو ٹھنڈک کے باعث قطرات برف بن کر اولوں (ژالہ باری) کی صورت میں (کئی بار چائے کے کپ سے بڑے ہو کر) زمین پر گرتے ہیں اور جانداروں اور فصلوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ کچھ اولے رحمت بن کر گرتے ہیں کیونکہ جوں جوں وہ نیچے آتے ہیں تو نچلے حصے میں گرمی کی وجہ سے ان کا سائز چھوٹا ہو جاتا ہے اور محض ضرر رسانی کی نوبت نہیں آتی)

بارش کا پانی جب زمین پر گرتا ہے تو اپنی اصل یعنی سمندر کی تلاش میں نشیبی علاقوں کی طرف بھاگنے لگتا

ہے۔ کچھ پانی جس کو صراط مستقیم مل جاتا ہے وہ دریاؤں کے ذریعے تھوڑی ہی دیر میں سمندر میں پہنچ جاتا ہے اور اس آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ (المائدہ:۳۵) اور تم تلاش کرو اس تک پہنچنے کا وسیلہ۔

اس پانی میں سے کچھ حصہ راستہ نہیں پا سکتا اور تنگ راستوں سے کنوؤں، جھیلوں اور دیگر غلط راہوں سے سمندر کی تلاش میں رہتا ہے اور اکثر اوقات گلے سڑے اور بدبودار پانی کی طرح پڑا رہتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ پانی عرصہ دراز کے بعد اپنی اصل سے جا ملے اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کبھی اپنی منزل تک نہ پہنچ سکے۔ سورۃ النحل کی مندرجہ ذیل آیت میں اسی طرف اشارہ ہے۔

وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ (النحل:۹) اور اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہے راہِ راست کو دلائل سے واضح کرنا اور ان میں غلط راہیں بھی ہیں۔

مذکورہ سمندر کے پانی کے ذرات (ایٹم) کی مثال روحوں کے احوال کے مطابق درست خیال کی جاتی ہیں۔ آفتابِ حقیقی جب کسی روح کو پیدا فرمانا چاہتا ہے تو اپنی نظرِ حیات بخش اس پر ڈالتا ہے جس کے اثر سے یہ روحانی ایٹم لمبا ہو کر بشکل شعاع یا بشکل ظل یا پرچھائیں دنیا کی طرف سفر کرنے لگتا ہے۔ اس شعاع (روح) کا ایک سرا روحِ بسیط میں اپنی جگہ پر ہی قائم رہتا ہے۔ روحِ بسیط سے گزر کر یہ شعاع (روح) عقل بسیط سے گزرتی ہے اور وہاں اپنی استطاعت کے مطابق عقل کو جذب کر لیتی ہے اور اسی طرح نفس بسیط سے گزر کر جو حصہ نفس کا اس کے مقدر میں ہوتا ہے، لے لیتی ہے۔ نفس بسیط میں روح اپنے نفس کا حصہ قبول کرتی ہے اور اس کے بعد روح عدم بسیط سے گزرتی ہے اور تخریب اور فنا کے تاثرات اور خواص کو اپنے ساتھ ملا لیتی ہے۔ اگر عدم میں سے کوئی چیز نہ گزرتی تو وہ کبھی فنا نہ ہو سکتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ کوئی ہستی اس وقت تک وجود میں نہیں آ سکتی جب تک وہ اپنی ضد کے مقابلے میں نہ آ جائے جیسے رات دن، تاریکی نور، بدی کے مقابل میں حسن آتا ہے اسی طرح انسان کی ظلمت عدمی (یعنی نہ ہونے کی ظلمت) کے مقابل میں نور آتا ہے۔ یعنی ظلمت ضد ہے نور کی اور ظلمت (عدمی) کی صفت تاریکی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انسان ماہیۃً معلوم ہے مگر معدوم الوجود ہے اور ظلمت اس کی اسی عدم اضافی کی تعبیر ہے۔ اب اگر وہ اپنے آپ کو خود بخود سمجھنے لگتا ہے اور وجود کی نسبت فقط اپنی طرف (اصلی حیثیت سے) آنے لگتا ہے تو غاصب قرار پاتا ہے اور اس طرح سمجھنے سے اس میں نفس پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ نفس شرک فی الوجود کی وجہ سے ہی پیدا ہوتا ہے اور جب وہ علم اور انا وغیرہ کو اپنا سمجھنے لگتا ہے تو ھویٰ پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسی عدم میں پہنچتے ہی انسان کو عرفان ہو جاتا ہے اور یہ عرفان ابھی کمزور ہوتا ہے کہ نفس اور ھویٰ کی وجہ سے وہ امانتِ الٰہی (جو اس کو سونپی گئی ہے۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ (الاحزاب:۷۲)

(ہم نے پیش کی یہ امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے (کہ وہ اس کی ذمہ داری اٹھائیں) تو انہوں نے انکار کر دیا اس کے اٹھانے سے اور وہ ڈر گئے اس سے اور اٹھالیا اس کو انسان نے۔) کی حیثیت سے نکل کر غاصبانہ صورت اختیار کر لیتا ہے تو توحید کو چھوڑ کر شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ نفس کا دعویٰ ہے کہ میں ہی میں ہوں یا یہ بندہ میری ملک ہے حالانکہ نہ وجود اس کا ہے اور نہ ملک اس کی ہے۔ اسی لیے حدیث شریف میں قتل کی وجہ شرک بیان کی گئی ہے (تَمُوْتُ النَّفْسِ وَ هِيَ مُشْرِكَةٌ) ھویٰ کے ختم ہونے سے انسان نورانی ہو جاتا ہے اور نفس کے فنا ہونے سے نور ہو جاتا ہے اور اس طرح وہ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِيْ نَفْسِيْ نُوْرًا وَ اجْعَلْنِيْ نُوْرًا کا مصداق بن جاتا ہے۔

قرآن کریم میں آیت اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (الاحزاب: ۷۲) (بے شک یہ ظلوم بھی ہے (اور) جہول بھی) سے مراد جہل از غیر اللہ ہے۔ جہل بھی ضد ہے نور کی اور علم چونکہ نور ہے تو اس کی ضد جہل یعنی تاریکی اور ظلمت ہے۔ انسان میں دو صفات جس کا ذکر قرآنِ کریم میں ہے ان میں سے ایک ظلمت عدمی ہے (جس کا ذکر ہوا) اور دوسری صفت جہل از غیر اللہ ہے۔ انسان چونکہ نور اور ظلمت کا مرکب ہے اس لیے نور محض (نورانی صفات والا) ہوتے ہوئے شیشے کی مانند ہے جس کے پیچھے ظلمت محض کی قلعی موجود ہے۔ چنانچہ اس شیشے میں اس نے عکس الٰہی دیکھ لیا جو دنیا کی باقی اشیاء ظلمت محض ہونے کی وجہ سے (یا نور محض یعنی فرشتے ہونے کی وجہ سے) اس عکس کو دیکھ نہ سکے۔ اس آیت کو راقم الحروف نے ''حسنِ نماز'' میں دو مقامات پر تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اگر انسان میں یہ دونوں صفات نہ ہوتیں تو یہ امانت اٹھانے کے قابل نہ ہوتا۔ انسان کی روح کے متعلق قرآن میں ظل یعنی پرچھائیں یا روح کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل آیت کا مطالعہ فرمائیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَ لَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ﴿۴۵﴾ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ﴿۴۶﴾ (الفرقان: ۴۶،۴۵)	کیا آپ نے نہیں دیکھا اپنے رب کی طرف کیسے پھیلا دیتا ہے سایہ کو اور اگر چاہتا تو بنا دیتا اس کو ٹھہرا ہوا۔ پھر ہم نے بنا دیا آفتاب کو اس پر دلیل پھر ہم سمیٹتے جاتے ہیں سایہ کو اپنی طرف آہستہ آہستہ۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ روح کو عدم بسیط کے بعد عالمِ امر کا سفر ختم کر کے عالمِ مثال میں لے آتے ہیں۔ یہ روح جو دنیا کی طرف سفر کرتی ہے تو یہ روح یا تو جنتی ہے یا دوزخی۔ اگر روح جنتی ہے تو جنتوں میں سے کسی جگہ پر یہ کچھ دیر ٹھہرتی ہے اور یہی اس روح کا مقام ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر دوزخی ہے تو عالمِ ناسوت کے کسی طبقے میں اس کے لئے کوئی خاص مقام ہوتا ہے جس کو اس کا مقامِ معاد کہتے ہیں۔ اس مقام پر اس کو اس لیے ٹھہرایا جاتا ہے تا کہ وہ اپنے مقام سے مانوس ہو جائے اور اسی جگہ پر اس کو وہ وجود عطا ہوتا ہے

جس کو روحانی وجود کہا جاتا ہے۔ جنت والی روح اس عالمِ مثال میں سے گزرتی ہوئی عالمِ ناسوت (دوزخ) میں سے گزر کر ایتھر میں داخل ہوتی ہے۔ ایتھر سے یہ حواس پنجگانہ اور دیگر مادی خواص وقویٰ بقدر ہمت اخذ کرتی ہے اور کسی نظام شمسی کے آفتاب میں پہنچتی ہے اور اس سے جان یا روحِ حیوانی کی حرارت حاصل کر کے اس کُرّے میں پہنچتی ہے جہاں اس کو پیدا ہونا ہے۔ اس کے بعد وہ کسی کھانے پینے کی چیز مثلاً پھل، سبزی یا غلہ میں داخل کی جاتی ہے اور اس شخص کے کھانے میں آتی ہے جس نے اس کا باپ بننا ہو۔ صلبِ والد سے یہ رحمِ مادر میں منتقل ہوتی ہے اور ماں کے پیٹ سے نو ماہ کے بعد پیدا ہو جاتی ہے۔ اب جتنی اس کی زندگی ہوتی ہے وہ بسر کرنے کے بعد وہ عالمِ مادی پیکرِ مادی پہننے کے بعد عالمِ مثال میں اپنے مقامِ اعلیٰ یا مقامِ معاد کو واپس چلی جاتی ہے اور یومِ حساب تک وہیں قیام کرتی ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ انسان کی روح عالمِ ارواح سے عالمِ مادی میں لطیف احوال سے کثیف حالات میں آتی ہے۔ جرثومہ کی شکل میں یہ روح مادی دنیا میں ماں کے پیٹ میں غذا حاصل کر کے آہستہ آہستہ کثیف ہوتی جاتی ہے۔

مزید روحانی معلومات

(روح کے کرشمات)

روحِ انسانی ایک شعاع ہے اور نفخۂ الٰہی کے باعث خدا کے نور کی ایک کرن ہے۔ اس کی Wave Length (لہر کی لمبائی) اس قدر چھوٹی ہے کہ یہ ہر رکاوٹ سے گزر جاتی ہے۔ اس قدر چھوٹی Wave Length ہونے کی وجہ سے یہ نظر نہیں آتی۔ انسانی آنکھ کوئی خاص Wave Length والی روشنی کو دیکھ سکتی ہے۔ اس سے بڑی اور چھوٹی لمبائی والی لہریں انسان کو نظر نہیں آتیں۔ کچھ جانور جن میں سے بلی بھی ایک جانور ہے جو ہماری نظر نہ آنے والی روشنی کی لہروں کو بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ایسے کیمرے بھی موجود ہیں جو مختلف روشنی کی لہروں کو ریکارڈ کر لیتے ہیں۔ مثلاً لوہے کا ''توا'' جب گرم ہو جائے تو اس میں سے لمبی لہروں والی لہریں (Long Wave Length) نکلتی ہیں جو آنکھوں کو تو نظر نہیں آتیں مگر کیمرہ میں اس کا ریکارڈ آ جاتا ہے۔ وہ موسمی سیٹلائٹ جو کئی سو میل سے زمین کی فوٹو لیتے ہیں اُن پر دن میں زمین پر گرنے والی روشنی کے سبب گرمائش پیدا ہونے سے سیٹلائٹ میں فوٹو آ جاتی ہے اور وہ سیٹلائٹ اس کی ریکارڈ کی ہوئی تصویروں کو زمین پر بذریعہ Receiver بھیج دیتا ہے مگر رات میں جب اس کے کچھ حصوں پر سورج کی شعاعیں نہ پڑ رہی ہوں تو رات کے وقت Infra Red شعاعوں کے ذریعے زمین پر موجود اشیاء کی تصویر سیٹلائٹ میں بھیج دیتا ہے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ زمین کا وہ حصہ جو دن کو سورج کی شعاعوں سے گرم ہوتا رہے رات کے وقت اس میں سے روشنی کی لمبی لہریں نکلتی رہتی ہیں۔ ان لمبی لہروں والی روشنی کو Infra Red شعاعیں کہا جاتا ہے۔ کسی چیز کو گرم

کیا جائے تو اس میں سے یہ لمبی شعاعیں نکلتی ہیں، لیکن ان شعاعوں کی نوعیت سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تصویر جو کیمرہ وصول کرتا ہے کس چیز کی تصویر ہے۔ زمین کی تصویر، پہاڑ اور سمندر یا زرخیز سبز علاقے کی تصویروں میں تمیز کی جاسکتی ہے۔ اگر ہوائی اڈوں پر جہازوں کو درختوں یا کپڑوں میں چھپالیا جائے تو اس کا بھی علم ہو جاتا ہے یہاں تک کہ صدام کو امریکیوں نے بازاروں میں گھومتے ہوئے شناخت کر لیا تھا۔ یہ کیمرے اتنے حساس ہوتے ہیں کہ زمین پر چلنے والی گاڑی کی نمبر پلیٹ بھی پڑھی جاسکتی ہے۔ امریکہ نے یہ اطلاع دی تھی کہ بنگلہ دیش کے بننے سے پہلے ہندوستان نے چھیانوے ہزار (96000) قیدیوں کو رکھنے کے لئے بیرکس تعمیر کر لی ہیں۔ غرضیکہ سیٹلائٹ کے یہ کیمرے دشمن کے ہر جنگی حربے کے نقشے مہیا کر دیتے ہیں۔ اندرا گاندھی کو قتل کرنے کی تمام فلم سیٹلائٹ پر دستیاب کر دی گئی تھی۔ روس نے ایک مسافر جہاز کو مار گرایا اور ساتھ ہی اس جہاز کو مارنے سے لاعلمی کا اظہار کیا تو امریکہ نے وہ فلم دکھا دی جس میں اس جہاز کو گرایا جا رہا تھا اور اس طرح روس کے دعوے کا رد ثابت ہو گیا۔ یہ سیٹلائٹ زمین کے گرد چکر کاٹتے رہتے ہیں اور جو چیزیں ان کو نظر آئیں کیمرے میں محفوظ کر لیتے ہیں اور کیمرے کی یادداشت میں رکھے ہوئے تمام واقعات بوقت ضرورت دوبارہ مہیا کر کے لوگوں کو دکھا دیتے ہیں۔ بہت سے واقعات خفیہ رکھے جاتے ہیں۔

روحِ انسانی روشنی کی ایک نہایت چھوٹی لہر والی شعاع ہے جس کو کوئی چیز نان کنڈکٹر بن کر کاٹ نہیں سکتی لہٰذا یہ ہزاروں چھتوں میں سے بھی گزر کر اپنے مبدا کی طرف دوڑتی ہے۔ روح کا ایک سرا روحِ بسیط میں رہتا ہے اور دوسرا سرا انسان کے سر سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ یہ شعاع عالمِ خلق یعنی عالمِ مادی اور عالمِ مثال سے گزر کر عالمِ امر میں روحِ بسیط تک جاتا ہے لیکن یہ شعاع جن عوالم میں سے گزر کر جاتی ہے ان طبقات میں اس کے ذرات (الیکٹرون کی طرح) موجود رہتے ہیں تو گویا اس انسان کی روح ان طبقات میں ہر جگہ پر موجود رہتی ہے۔ اس روح کے ذرّات کو اس انسان کا پیکرِ مثالی یا ہمزاد کہتے ہیں۔ اس کی مثال ایسے دی جاسکتی ہے کہ جیسے کسی سینما گھر میں کوئی فلم چل رہی ہو۔ سینما والوں کی تیز روشنی اس فلم میں سے گزر کر پردۂ سکرین پر پہنچتی ہے۔ فلم میں سے گزری ہوئی روشنی تمام ہال میں موجود رہتی ہے اور اس کے ہر ذرّے میں وہ تصویر جو سکرین پر آ کر گرتی ہے بھی موجود ہوتی ہے، گویا کہ ہال میں جہاں بھی سکرین ڈالیں گے وہ تصویر اس جگہ بھی موجود ہوگی۔

اگر ایک پردہ الف، ب، ج یا د پر ڈال دیا جائے تو تصویر وہاں بھی نظر آئے گی گویا یہ تصویر ہال میں موجود روشنی کے ہر ذرے میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ انسان کی روح تمام طبقات میں سے گزر کر جاتی ہے اور اس شعاع کے ہر ذرے میں انسان کا ہمزاد موجود ہوتا ہے۔ سورۂ ھود میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی چوٹی ہمارے ہاتھ میں نہ ہو۔

مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا (ھود: ۵۶) کوئی جان دار بھی ایسا نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ نے

پکڑا ہوا ہے اسے پیشانی کے بالوں سے۔

روح کا وہ سرا جو روحِ بسیط میں ہے اگر اس کو آسانی کی غرض سے الف کہیں اور وہ سرا جو انسان میں موجود ہے ج کہیں تو وہ جگہ جہاں انسان کی روح جسم سے نکلنے کے بعد کچھ دیر قیام کرے گی ''ب'' کہیں گے۔ اس کو اس روح کا مقام اخرت کہیں گے۔ یہ مقام ''ب'' وہ مقام ہے جہاں روح عالم امر سے نیچے عالم مثال میں پہنچتی ہے۔

روح کے خواص و تاثرات

''تعمیرِ ملت'' میں ہے کہ جو علم اللہ تعالیٰ نے بزرگوں کو عطا کیا ہے ان کو اگر مجموعی طور پر یکجا کیا جائے تو درج ذیل نکات سامنے آئیں گے۔

(۱) روح ایک شعاع ہے جو انسان سے نکل کر روحِ بسیط تک پہنچتی ہے اور ہر جگہ انسان کے ساتھ رہتی ہے اور جب تک موت نہ آئے اس وقت تک انسان سے جدا نہیں ہوتی یعنی کوئی چیز اس کو کاٹ نہیں سکتی۔

(۲) یہ شعاع اس قدر لچکدار اور سریع السیر ہے کہ انسان خواہ کہیں بھی اور کسی سواری سے بھی سفر کرے تو یہ انسان کے ساتھ ہی رہتی ہے۔

(۳) روح کے نکتہ الف سے ج تک اس شعاع کے ہر ذرہ میں ایک پیکرِ مثالی یا ہمزاد موجود رہتا ہے جو ہو بہو اس کی شکل کا ہوتا ہے۔ نکتہ ج سے الف تک جوں جوں آپ اوپر کی طرف جائیں ہر جسم (ہمزاد) پچھلے سے لطیف تر ہوتا ہے۔ نکتۂ الف سے ج تک انسان نہ تو ایک ہی ہے اور نہ ہی اس کے بہت سے جسم ہیں۔ اس کی مثال فلم میں دکھائی گئی تصویر سے سمجھ آ جاتی ہے۔ راقم الحروف کا یہ خیال ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلیفہ یا نائب بنایا ہے تو اپنی تمام صفات کا پرتو انسان پر ڈالا اور جس طرح اللہ تعالیٰ تمام مخلوق پر قائم و دائم ہے اور اس صفتِ قیومیت سے وہ ہر چیز پر تصرف کرتا ہے اسی طرح انسان کو بھی یہ طاقت عطا فرمائی گئی ہے کہ وہ اپنی روح کے ذریعے ہر شے پر تصرف کر سکتا ہے لہٰذا انسان کا تصرف اس کی روح کے ذریعے ہوتا ہے۔ احادیث میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی روح کو اس قدر طاقتور بنایا ہے کہ اگر وہ چاہے تو دنیا کی ہر چیز کو ہڑپ کر سکتی ہے۔ احادیث میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ انسان کی روح جو تصرف کرنا چاہے اس کو اللہ کی طرف سے غلبہ دیا گیا ہے اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ نے روح سے بہتر کسی چیز کو نہیں بنایا۔ انسان کا ہر چیز پر تصرف قائم کرنے کے لئے ضروری تھا کہ اس کی روح کو ہمزاد سے طاقت دی جائے یعنی جہاں

انسان کی روح پہنچ سکتی ہے اس کا تصرف بھی پہنچ سکتا ہے لہٰذا روح کے ہمزاد ایسے ہی ہیں کہ گویا انسان ہر جگہ پر موجود ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ انسان کے اندر نفخہ خدائی ہے تو جس طرح اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ زمین اور آسمان کی وسعتوں میں ہر جگہ موجود ہے تو یہ ضروری تھا کہ انسان اس کی نیابت کا حق ادا کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے اس کمال سے بھی مشرف ہو جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق فرمایا کہ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اللہ نور ہے زمینوں اور آسمانوں کا)۔ (النور: ۳۵)

(۴) انسان کا دماغ اس کے حواس خمسہ اور تجربہ سے جو علم حاصل کرتا ہے وہ مثالی اجسام (ہمزاد) کو بھی ان کی متناسب لطافت کے لحاظ سے منتقل ہوتا ہے اور بصیرت باطنی بھی۔

(۵) انسان کا قلب جن جذبات یا عقائد سے متاثر ہوتا ہے وہ مثالی جسم سے بھی تدریجاً اثر انداز ہوتا ہے۔

(۶) انسان کا نفس، عقائد اور اعمال کی وجہ سے جو رنگ پکڑتا ہے وہی رنگ ان مثالی اجسام پر بھی تدریجاً چڑھتا ہے۔

(۷) انسان میں کردار کی جو طاقت یا کمزوری پیدا ہوتی ہے وہ مثالی اجسام پر بھی پیدا ہوتی ہے۔ انسان اپنے پیرومرشد اور نیک لوگوں کے ساتھ صحبت کے اثرات سے فیض یاب ہوتا ہے تو اس کا رنگ اس کی روح پر بھی ہوتا ہے۔

(۸) یہ شعاع انسانی ارادے کی قوت کے مطابق چشم زدن میں کائنات کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک حرکت کر سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اولیاء میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ خود کو جب چاہیں جہاں چاہیں مجسم حاضر کر سکتے ہیں۔ کشمیر کے ایک بزرگ کے متعلق یہ مشہور ہے کہ ایک دن میں انہوں نے چالیس جگہوں پر دعوت میں شرکت کی اور ہر جگہ پر ایک نئی غزل لکھی۔ ایک بزرگ کو جیل میں بھی اور جیل کے باہر بھی دیکھا گیا۔ ایسا اکثر ہوا ہے کہ کچھ لوگ نماز پنجگانہ مدینہ شریف میں ادا کرتے ہیں۔ ایک شخص حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ کے پاس گیا جو دور جنگل میں مقیم تھے۔ حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ نے اس شخص سے پوچھا کہ تم جمعہ کی نماز ادا کرنا چاہتے ہو؟ اس نے کہا جمعہ ادا کرنے کے لئے مسجد کی یہاں سے دو دن کی مسافت ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تمہیں جمعہ کی نماز ادا کرنے سے غرض ہے نہ کہ یہ معلوم کرنے کی کہ مسجد کی مسافت کس قدر ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میرے پیچھے آ جاؤ۔ ابھی کچھ قدم ہی چلے تھے کہ مسجد میں آ گئے اور نماز جمعہ ادا کی۔ قوت القلوب میں ہے کہ ایک بزرگ ایک قدم اٹھاتے تو ۵۰۰ میل کی مسافت طے کر لیتے۔ جو لوگ ان حقائق سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ حضور ﷺ کی معراج جسمانی تھی۔

(۹) خط ج، ب اپنے اوپر والے حصہ ب د کے ذریعے قضا و قدر کی طرف سے نازل ہونے والے احکامات سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ یہ تقدیر ہے۔ عالمِ مادی اور مثال میں اپنے اردگرد کے ماحول کا اثر بھی اپنی کمزوری اور طاقت کے لحاظ سے قبول کرتا ہے (تو یہ حوادثات ہیں۔) جسمِ مادی سے جو افعال و اعمال سرزد ہوتے ہیں ان سے بھی انسان متاثر ہوتا ہے۔ یہ تدبیر ہے۔

(۱۰) جب تک خط ج ب الف کا تعلق نقطہ ج سے قائم رہتا ہے تو یہ زندگی کہلاتی ہے جب یہ شعاع جسم سے منقطع ہو جائے تو یہ اس انسان کی موت ہے

(۱۱) وہ امانت جو کائنات میں کسی نے بھی اٹھانے کی جرأت نہ کی انسان نے اپنی روحانی طاقتوں کی وجہ سے فوراً قبول کر لی۔

روح اور جسم کا آپس میں کیا تعلق ہے؟

مثنوی میں مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ روح نورانی ہے اور جسم خاکی ہے۔ ان کے آپس میں اجتماع میں یہ حکمت رکھی گئی ہے کہ انسان کو مرغوب اشیاء کی طلب ہو اور غیر مرغوب اشیاء کو دفع کرنے میں مدد ملے (یعنی جسم یہ طلب پیدا کرسکتا ہے اور روح اس کو دفع کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔)

دوسرا سوال یہ ہے کہ اللہ نے جسم اور روح کو اکٹھا کیوں رکھا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں کو اکٹھا اس لئے رکھا ہے تاکہ دونوں مل کر کام کریں ورنہ تو نہ ہی کوئی روح بغیر جسم کے کوئی کام کر سکتی اور نہ ہی کوئی جسم بغیر روح کے کام کرسکتا۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ جسم کا درجہ روح سے کم تر ہے مگر اس کے باوجود جسم کو یہ فضیلت دی گئی ہے کہ وہ نظر آسکتا ہے (روح نظر نہیں آتی) اور اللہ تعالیٰ نے روح کو مخفی کیوں رکھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ روح اپنی نفاست کی وجہ سے مغز کا مقام رکھتی ہے اور جسم اپنی کثافت کی وجہ سے پوست ہے۔ مغز (روح) ہمیشہ پوست میں مخفی رکھا جاتا ہے۔ روح کا تعلق عالمِ ارواح سے ہے جبکہ جسم کا تعلق عالمِ شہادت سے ہے جو اس دنیا کی چیز ہے اس لئے اس کو جسمانی حواس محسوس کرسکتے ہیں اور روح دنیاوی چیز کو محسوس نہیں کرسکتی۔ جسم کا تعلق کسبِ اعمال اور مباشرت و معالج سے ہے اس واسطے جسم کا ظاہر ہونا لازم تھا۔ روح کا تعلق چونکہ مباشرات وغیرہ سے نہیں اس لئے روح کا ظاہر ہونا ضروری نہ تھا۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ انسان صرف روح کا نام ہے یا جسم اور روح کے مجموعے کا نام ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حکماء کے مطابق انسان کا مصداق صرف روح ہے۔ جسم اس کا ایک آلۂ کار ہے۔ جس طرح گھڑسوار صرف گھوڑے پر بیٹھنے والے کو کہتے ہیں۔ گھوڑا تو اس کی سواری ہے۔ سوار جب کہا جائے تو اس کے مفہوم میں

گھوڑا داخل نہیں۔ سوار تو صرف سوار ہے (گھوڑا نہیں) چنانچہ انسان روح کا نام ہے۔ اس سلسلے میں ہماری تصنیف ''سوز وسازِ رومی'' کو ملاحظہ فرمائیں جس میں روح کے مزید احوال درج ہیں۔

موت اور سفرِ آخرت

جب انسان کی موت کا حکم ہوتا ہے تو نقطہ الف نقطہ ب کو اور نقطہ ب نقطہ ج کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس کشش کا اثر یہ ہوتا ہے کہ نقطہ ج سے روح کا تعلق انسان سے ٹوٹ جاتا ہے۔ کیونکہ یہ نقطہ سب سے زیادہ کثیف ہوتا ہے۔ اس نقطے کے جسم سے الگ ہونے کا نام موت ہے۔ جسم سے جو نقطہ بالکل قریب تھا وہ چونکہ تمام مثالی اجسام سے کثیف ہوتا ہے لہٰذا الگ کر دیا جاتا ہے۔ جسم کے قریب اس نقطے کو ہم نقطہ ''ذ'' کہیں گے۔ اگر یہ نقطہ ''ذ'' بہت کثیف ہے کہ مثالی اجسام اس کے ساتھ رہتے ہیں لیکن اگر نقطہ ''ذ'' میں کثافت کم ہے تو نقطہ ب کی طرف روح سمٹتی رہتی ہے اور جسم عالمِ ناسوت کو طے کرتا جاتا ہے اور اگر جسم مثالی ''ذ'' سے ''ب'' تک لطیف ہو تو یہ ناسوت کا سفر طے کر کے جنتوں کے طبقات میں پہنچ جاتا ہے۔

اگر مثالی جسم زیادہ لطیف نہیں ہیں تو نقطہ ''ذ'' اور اس کے ساتھ کے اجسام عالمِ ناسوت (دوزخ) میں اپنے مقامِ معاد پر پہنچ جاتے ہیں اگر کوئی روح بہت گنہگار ہے تو اپنے مقام معاد پر ہی قیام کرتی ہے۔ یاد رہے کہ جب یہ روح عالمِ ارواح سے دنیا کی طرف آتی ہے تو مقامِ ''ب'' پر کچھ دیر قیام کرتی ہے تاکہ اس مقام سے روشناس ہو جائے۔ اسی مقام پر وہ روح وجود مثالی اختیار کرتی ہے اور یہاں روحانی وجود بھی ملتا ہے۔ لطافت اگر اور زیادہ ہو تو مثالی اجسام ایک دوسرے میں سما کر ایک جسم ہو جاتے ہیں اور ناسوت کا سفر طے ہونے کے بعد ناسوتی حصے کا تمام جسم سمٹ کر نقطہ ''ذ'' ملکوت میں یعنی جنتوں میں طبقۂ اول میں پہنچ جاتا ہے۔ اسی طرح اگر مثالی اجسام کے وہ حصے جو ملکوت، جبروت اور لاہوت وغیرہ میں سے گزرتے ہیں مناسب طور پر ہلکے ہوں تو شعاع اور سکڑ جاتی ہے اور جبروت، لاہوت یا اور آگے تک سمٹ جاتی ہے۔ چنانچہ ''ذ'' اپنے اصلی مقام ب تک پہنچ جاتا ہے جو اس کا آخری مقام ہے۔ روح جو یہاں پہنچ گئی وہ قیامت تک یہاں رہے گی (اور حساب کتاب کے بعد اپنے اصلی مقام پر آ جائے گی)۔ اس کے برعکس جو روح لطیف نہیں ہوتی تو وہ کثافت کے لحاظ سے عالمِ ناسوت کی طرف سفر کرے گی اور اگر وہ روح گنہگار ہے تو عالمِ ناسوت میں یوم حساب تک رہے گی۔ اگر روح بہت زیادہ گنہگار ہے تو وہ روح کثافت کی وجہ سے اوپر نہیں اٹھے گی بلکہ اس دنیا میں ہی عرصہ دراز تک بھٹکتی رہتی ہے اور اپنی کثافت کی وجہ سے کبھی کبھی کسی کو نظر بھی آ جاتی ہے۔ کئی اشخاص ایسی روحوں کو دیکھنے سے بیمار بھی ہو جاتے ہیں اور مر بھی جاتے ہیں۔ بعض لڑکوں نے بیان کیا ہے کہ اگر ان کے سامنے کوئی ننگا ہو جائے تو یہ بدروحیں یا چڑیلیں بھاگ جاتی ہیں۔ ایک دو واقعات کسی کے دیدہ اور ہمارے

شنیدہ بیان کئے جارہے ہیں۔

ایک واقعہ: جالندھر چھاؤنی کا ایک درزی بذاتِ خود ہم سے بیان کرتا ہے کہ وہ چھاؤنی میں ملٹری کا کام زیادہ ہونے کی وجہ سے کئی مرتبہ بہت رات گئے گھر کو آیا کرتا تھا۔ کبھی کبھار شارٹ کٹ کی غرض سے وہ قبرستان سے بھی آتا تھا۔ ایک رات جب وہ قبرستان میں داخل ہوا تو آواز سنی ''چلے او جی'' میں نے کہا'' جی ہاں'' اور یہ سوچا کہ شاید کوئی جاننے والا ہوگا۔ قبرستان کے وسط میں بھی یہی آواز آئی اور میں نے کوئی خیال نہ کیا لیکن جب قبرستان سے نکلنے لگا تو پھر وہی آواز آئی تو میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ کون ہوسکتا ہے جو بار بار کہتا ہے ''چلے او جی''۔ جب میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک بہت طویل عورت یا چڑیل تھی۔ میں نے سائیکل کو تیز کر لیا تو وہ بھی تیز ہو گئی۔ آخر میں کمپنی باغ پہنچا تو وہاں بیٹھ کر کولڈ ڈرنک پی کر گھر آیا اور مجھے تین دن بخار آتا رہا۔ اس قسم کے سینکڑوں واقعات سننے میں آتے ہیں۔

دوسرا واقعہ: ابھی ۲۰۰۵ء میں ہمارے ایک مرید کے تین دوست مری میں سیر کی غرض سے گئے تو ایک جگہ کیمرہ سے تصویریں بنانے لگے۔ جو لڑکا تصویر بنا رہا تھا اس نے دیکھا کہ اس کے ساتھیوں کے پیچھے ایک ڈائن سی کھڑی ہے (اور اس کی فوٹو بھی کیمرہ میں آگئی)۔ وہ دو لڑکے گر کر مر گئے۔ لوگوں کو بلایا گیا اور جب ان کو گاڑی میں ڈال کر ہسپتال پہنچایا گیا تو ڈاکٹروں نے بتایا کہ ان دونوں کے دل اور گردے جسم سے غائب ہیں۔ ہمارے مرید نے اس ڈائن کی فوٹو بھی دیکھی لیکن دوسرے روز ہی جس نے فوٹو بنائی تھی اس کو ڈائن نے دھمکایا کہ اس کی فوٹو کو ضائع کر دو ورنہ تمہیں بھی مار دیں گے۔ ہمیں یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ آیا یہ کوئی خاص قسم کی مخلوق تھی؟ کیونکہ عام چڑیلوں کے متعلق ایسی باتیں سننے میں نہیں آتیں۔

ایک اور واقعہ: ہمارے گلگت کے آفس کے ایک چپڑاسی نے بیان کیا ہے کہ مجھے کسی نے بتایا کہ قبر سے مردے کا سر نکال کر لاؤ اور اس پر کسی کام کے لئے عمل کیا جائے گا۔ وہ چپڑاسی بتاتا ہے کہ اس نے ایک قبر سے مردے کا سر نکالا اور وہ مردہ روزانہ رات کو میرے سر کی طرف کھڑا رہتا تھا، اس حالت میں کہ اس کا دھڑ تو موجود تھا مگر سر نہیں تھا۔ کسی نے مجھے کہا کہ اس کا سر قبر میں واپس ڈال دو۔ ایسا کیا تو وہ مردہ رات کو میرے گھر آنا بند ہو گیا۔ ہمارا خیال ہے کہ تقریباً ہر گھر میں کچھ بدروحیں رہتی ہیں مگر اللہ والوں کو تکلیف نہیں دیتیں۔ البتہ برے لوگوں کے لئے تکلیف کا باعث بنتی ہیں۔ (یہ قصہ بھی بہت طوالت طلب ہے۔)

قرآن مجید میں سورۂ عنکبوت اور دیگر آیات میں گناہوں کو بوجھ کہا گیا ہے، چنانچہ جو روحیں گنہگار ہیں ان کے مثالی اجسام بوجھل (کثیف ہوتے ہیں) اور ان کی اوپر کے طبقات کی طرف پرواز مشکل ہوتی ہے۔ ان میں سے بعض تو اتنی بوجھل ہوتی ہیں کہ ان کا دنیا میں ہی چلنا پھرنا مشکل ہو جاتا ہے یا مسلسل بیمار رہتی ہیں۔ کچھ لوگ تو اتنے برے کاموں کے مرتکب ہوتے ہیں کہ ان کو دنیا میں سخت مصائب اور ذلت کا سامنا رہتا ہے اور

یہ بات ان کے چہروں سے ہی معلوم ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگ جب ہمارے پاس آتے ہیں تو پہلی نظر میں ہی ان کو پہچان لیا جاتا ہے کہ خدا کے باغی ہیں لیکن جب پوچھا جائے کہ یہ مصیبت کیوں پیش آئی تو کہتے ہیں کہ "پتہ نہیں"! جبکہ ہمیں تو ان پر پہلی نظر ڈالنے سے کیفیت کا علم ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے قواعد اور قوانین سمجھائے جائیں تو اکثر لوگ توبہ کر لیتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بدکاروں کو بظاہر کوئی سزا نہیں ملتی مگر ان کا حشر فرعون کی طرح ہوتا ہے۔

برخلاف اس کے کہ ناسوت (دوزخ) کے پہلے طبقات میں دہکتی ہوئی آگ اور کھولتے ہوئے پانی کا عذاب ہے نیک روحیں بہت تیزی کے ساتھ ناسوت کے علاقوں سے گزر جاتی ہیں اور انہیں اس آگ کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ وہ تھوڑی دیر میں ہی اپنے اعلیٰ مقام "ب" پر پہنچ جاتی ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ جہنم کی آگ مومن سے خوشامد کرے گی کہ اے مومن جلدی سے گزر جا۔ ایسا نہ ہو کہ تیرا نور میری آگ کو ٹھنڈا کر دے۔ اولیائے کرام کی روحیں چشمِ زدن میں اپنے مقام "ب" پر پہنچ جاتی ہیں۔ ایک اور حدیث شریف میں ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوں گے کہ جب صور پھونکا جائے گا تو ان کی قبروں پر براق کی طرح کے جانور موجود ہوں گے۔ جن پر بیٹھ کر وہ جنت میں پہنچ جائیں گے۔ (حدیث لمبی ہے) فرشتوں کے پوچھنے پر وہ بتلائیں گے کہ نہ تو انہوں نے کسی قسم کا حساب کتاب کا معاملہ دیکھا اور نہ ہی جہنم سے گزر کر آئے ہیں (کیونکہ جہنم سے گزرنا چند لمحات تک ہی محدود ہوگا) اور ان کے علاوہ بعض روحوں کو بغیر حساب کتاب جنت میں داخل کیا جائے گا۔ وہ فرشتوں کے پوچھنے پر بتائیں گے کہ وہ امتِ محمدیہ ﷺ سے ہیں اور ان کا عمل یہ تھا کہ وہ ہر حال میں خدا سے راضی تھے۔ اس کے علاوہ وہ بتائیں گے ان کے اعمال جو وہ ظاہر میں کرتے تھے وہی حال ان کے باطنی احوال کا تھا یعنی یہ نہیں کہ باہر سے کچھ اور اندر سے کچھ۔ بعض لوگوں کے لئے کہا جاتا ہے کہ "چوں بخلوت می روند کار دیگر می کنند" یعنی جب خلوت میں جائیں تو اور قسم کے کام کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں اس بات کا ذکر ہے کہ لَتَرۡكَبُنَّ طَبَقًا عَن طَبَقٍ ﴿١٩﴾ (الانشقاق:19) (تمہیں بتدریج زینہ بہ زینہ چڑھنا ہے) ظاہر ہے کہ طبق ایک دوسرے کے اوپر ہوتے ہیں اور یہ وہی طبقات ہیں جن کا ذکر عوالم کے ناموں سے پہلے کیا جا چکا ہے۔ اس سلسلہ میں جو الفاظ اوپر نیچے یا دائیں بائیں، دور اور نزدیک کا استعمال کیا جائے تو وہ محض سمجھانے کے لئے ہے ورنہ عالمِ امر اور مثال میں اس مادی دنیا کے اطراف، وقت اور فاصلے ہرگز نہیں استعمال ہوتے۔ اس بلند مقام سے دیکھا جائے تو ماضی، حال اور مستقبل ایک ہی طرح نظر آتے ہیں۔ ٹائم اینڈ سپیس (Time and Space) کے مضمون کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر جگہ کے وقت کا سٹینڈرڈ الگ ہے۔ مادی دنیا میں کہیں چاند پر ایک سال ۲۹ دن کا ہے اور کہیں (نیپچون پر) ۲۴۸ سال کا ایک دن ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک دن کا ایک ہزار سال تک لمبا ہونا سورۂ السجدہ آیت نمبر ۵ میں بیان کیا گیا ہے۔ اگر ہمارے قد موجودہ

اوسط سے دس گنا ہو جائیں یا ہماری رفتار موجودہ اوسط رفتار سے دس (۱۰) گنا بڑھ جائے تو ہمارے لئے فاصلے بقدر دس حصے کم ہو جائیں گے یعنی دس میل ایک میل کے برابر معلوم ہوگا۔ آئن سٹائن نے یہ کہا ہے کہ اگر ہم روشنی کی رفتار کے ساتھ دنیا کا چکر لگائیں تو کچھ وقت درکار ہوگا لیکن اگر ہم نور کی سپیڈ سے یہی چکر لگائیں تو ہم چلنے سے پہلے ہی واپس اپنی جگہ پر آ جائیں گے کیونکہ اس فارمولا میں وقت یعنی t کی مقدار t+ کی بجائے t- آتی ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم چلنے سے پہلے ہی پہنچ جائیں گے۔

اگر ہم ایٹم کی صورت اور اندرونی ساخت پر غور کریں تو اس کے اندر وہی نظام چل رہا ہے جو ہمارے نظامِ شمسی کا ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے درج ذیل شعر کا مطلب بھی یہی ہے کہ اگر ہم ذرّے پر غور کریں تو وہ بذاتِ خود ایک نظامِ شمسی کی صورت رکھتا ہے۔

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں

(ب د:۱۷۲)

مناسب ہوگا کہ قارئین سائنس کی جدید تحقیقات کا علم حاصل کریں تا کہ ان کے علم میں اضافہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی قدرتوں پر یقین بڑھ جائے۔

اللہ تعالیٰ کو پہچاننے کی کوشش

شیخ ابو سعید خراز رحمۃ اللہ علیہ نے لوگوں سے پوچھا کہ آپ نے خدا کو کیوں کر پہچانا۔ جواب ملا کہ مجمعِ اضداد سے۔ پھر یہ آیت پڑھی۔

هُوَالْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وہی اول وہی آخر، وہی ظاہر وہی باطن

(الحدید:۳)

پھر فرمایا کہ اضداد کا جمع ہونا صرف حیثیتِ واحد ہی سے متصور ہے۔ (بحر الحقائق میں ہے کہ وہ اوّل ہے عینِ اخیریت میں، وہ آخر ہے عینِ اوّلیت میں، وہ ظاہر ہے عینِ باطنیت میں اور باطن ہے عینِ ظاہریت میں جاننا چاہیے کہ بنی آدم کی حقیقت جسے عالمِ ربانی کا لطیفۂ مُدرکہ کہتے ہیں، وہ تمام عالمِ ملکوت کا خلاصہ ہے۔ انسان عالمِ روحانی اور عالمِ جسمانی دونوں کا مرکب ہے اور تمام موجودات سے کامل تر اور اہلِ بصیرت کے نزدیک اس کے اور حق تعالیٰ کے مابین کوئی اور واسطہ نہیں۔ یہیں سے معلوم ہوا کہ انسان کی تمام روحانی اور جسمانی فطرتیں سب اللہ تعالیٰ کے افعال ہیں یعنی

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ حالانکہ اللہ نے تمہیں بھی پیدا کیا اور جو کچھ تم کرتے ہو۔

(الصّٰفّٰت:۹۶)

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی ذات اور ذات کے عوارض کو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور ارادت بنفس نفیس وجود میں لاتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ (الشمس:۸) پھر اس کے دل میں ڈال دیا اس کی نافرمانی اور اس کی پارسائی کو

حضرت ابوبکر واسطی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ہر کام میں عاجز بنایا ہے اور فرمایا۔

وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (التکویر:۲۹) اور تم نہیں چاہ سکتے بجز اس کے کہ اللہ چاہے جو رب العالمین ہے

اس سے مراد یہ ہے کہ تم کچھ نہ کرسکو گے مگر اس کی قوت سے۔ اطاعت یا عبادت نہ کرسکو گے مگر اس کے فضل سے اور گناہ نہ کرسکو گے مگر اس کے ذلیل کرنے سے۔ تو تمہارے پاس ہے کیا؟ اور تم کس چیز پر اتراتے ہو؟ حالانکہ تم کسی چیز کے مالک نہیں۔

ابن بطوطہ نے شیخ الصالح ابوعبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کی کرامت لکھی ہے کہ اسکندریہ میں ایک بزرگ سے ان کی ملاقات ہوئی۔ یہ ایک حجرے میں رہتے تھے اور ان کے ساتھ کوئی خادم نہ تھا۔ کچھ لوگ ان کے حجرے کے باہر تقدیر سے متعلق باتیں کر رہے تھے کہ تقدیر کوئی چیز نہیں۔ ہر شخص اپنے افعال پر خود قادر ہے۔ شیخ نے کہا کہ اگر ایسی بات ہے تو جس جگہ پر تم بیٹھے ہو اٹھ کر دکھاؤ۔ سب نے اٹھنے کی کوشش کی مگر کوئی اٹھ نہ سکا۔ شیخ ان لوگوں کو چھوڑ کر خود حجرے میں چلے گئے اور یہ لوگ بہت دیر تک دھوپ میں جلتے رہے۔ آخر دوپہر کے بعد چند مرید حاضر ہوئے اور ادب و احترام سے ان کا حال بیان کیا اور یہ بھی بتایا کہ وہ لوگ اپنے عقیدے سے توبہ کرتے ہیں۔ شیخ خود حجرے سے باہر آئے اور ان کو اپنے ہاتھ سے پکڑ پکڑ کر کھڑا کیا۔

یاد رکھنا چاہیے کہ روح کی اضافت کسی عضو کی جانب نہیں کی جاسکتی۔ (یعنی روح انسان کے ہاتھ پیر یا سر کو نہیں کہہ سکتے) یہ اس لئے کہ تمام اعضاء تقسیم کو قبول کرتے ہیں مگر روح کسی قسم کی تقسیم قبول کرنے والی چیز نہیں۔ جو چیز تقسیم کو قبول نہیں کرتی وہ تقسیم قبول کرنے والی چیز میں کیسے سما سکتی ہے۔ ورنہ وہ تقسیم کے قابل ہو جائے۔ روح کسی قسم کی تقسیم کو قبول نہیں کرتی اور ہر عضو اس کے تصرف میں ہے جس طرح تمام عالم اللہ تعالیٰ کے تصرف میں ہے اور وہ خود منزہ ہے (ہر چیز سے بری ہے) اور اس کی تصدیق اس حدیث سے ہوتی ہے کہ

اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔

(مسند امام احمد بن حنبلؒ: ج ۲: ۲۴۴)

یعنی جس طرح اللہ کا تمام عالم پر تصرف ہے اور وہ خود منزہ ہے اسی طرح روح پورے جسم پر تصرف کرتی ہے اور خود تقسیم ہونے سے بری ہے۔ جس طرح انسان بسم اللہ کا لفظ لکھنا چاہے تو یہ خیال اس کے دل و دماغ

میں آتا ہے اور مختلف اعضاء میں حرکت ہوتی ہے اور انسان کا ہاتھ بسم اللہ کے حروف لکھتا ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کی صفتِ ارادہ حرکت مین آتی ہے اور اس ارادہ کا اثر عرش سے کرسی پر ہوتا ہے اور پھر یہ لوحِ محفوظ تک جاتا ہے۔ اس کے بعد جواہرِ لطیفہ جو عرش وکرسی پر موکل ہیں ستاروں کو حرکت دیتے ہیں اور اصولِ فطرت جنبش میں آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ عرش پر استویٰ کر کے تمام مملکت کی تدبیر کرتا ہے۔ کائنات کے تمام امور کی تمام اوقات میں بازگشت حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔ وسائل کے حجاب اٹھتے ہیں تو یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے۔ عین اسی طرح اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہو کر تمام دنیا کی تدبیر فرماتا ہے جیسے فرمایا۔

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ — پھر متمکن ہوا عرش پر (جیسے اسے زیبا ہے) ہر کام کی تدبیر فرماتا ہے۔ (یونس: ۳)

یاد رکھیں کہ خدائے تعالیٰ کی ذات محض وحدت ہے اور عالمِ جبروت میں تمام موجودات بیک دم موجود ہیں مگر نام ونشان نہیں رکھتے اور شکل وصورت قبول نہیں کرتے۔ لہٰذا عالمِ جبروت میں سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں۔ عالمِ ملکوت عالمِ مراتب ہے کہ عالمِ جبروت کا نام ونشان یہاں وجود پاتا ہے لیکن عالمِ ملک کی لطافت کو عالمِ ملکوت کی لطافت سے کوئی نسبت نہیں۔ (عالمِ ملک عالمِ ملکوت سے لطیف ہے) اور عالمِ ملکوت کی لطافت کو عالمِ جبروت کی لطافت سے کوئی نسبت نہیں (یعنی عالمِ جبروت عالمِ ملکوت سے زیادہ لطیف ہے) کیونکہ عالمِ جبروت حد درجہ لطیف ہے۔ عالمِ جبروت کی لطافت خداوند تعالیٰ کی لطافت سے کوئی نسبت نہیں رکھتی۔ عالمِ ملک کا کوئی ذرّہ ایسا نہیں کہ عالمِ ملکوت اس میں جلوہ گر نہ ہو اور اس کو محیط نہ ہو۔ عالمِ ملکوت کے ذرّات میں کوئی ذرّہ ایسا نہیں کہ جبروت کی ذات اس میں کارفرما نہ ہو (یعنی جبروت کے ذرّات کا ملکوت میں ہونا ضروری ہے)۔ عالمِ ملک، عالمِ ملکوت اور عالمِ جبروت کا کوئی ذرّہ ایسا نہیں کہ خداوند تعالیٰ کی ذات کی تجلی اس میں نہ ہو اور اس کا احاطہ نہ کئے ہو اور اس سے واقف نہ ہو۔ قرآن مجید میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر محیط ہے اور وہ جانتا ہے تمہارا چھپا ہوا اور ظاہر (يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَ جَهْرَكُمْ) اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ آدمی صورتاً جسمانی ہے اور معناً روحانی ہے۔ وہ صورتاً عالمِ خلق سے ہے اور معناً عالمِ امر سے۔ بحرِ حقائق میں ہے کہ سِرّ سے مطلب سِرِّ خلافت ہے جس کو انسان میں امانتاً رکھا گیا ہے اور جہر کا مطلب حیوانی صفات اور انسانی احوال ہیں۔ وہ ہمارے ان اعمال کو جانتا ہے جو مراتبِ انسانیہ میں ترقی کے موجب ہوں یا حیوانی درجوں میں تنزّل کے باعث ہوں۔ یہ اس لیے کہ وہ لطیف علی الاطلاق ہے لطیفِ مطلق، محیطِ مطلق اور خبیرِ مطلق ہوتا ہے۔ تمام اجسام ارواح کے ظل (سائے) ہیں تمام ارواح اعیان کے پرتو ہیں اور اعیان اسماء الٰہیہ کے عکس ہیں اور اسماء ذات مطلق کے ظل ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی عطاؤں اور عتاب کے انداز

''سبع سنابل'' میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو خلافت بخشی مگر ان میں پہلے (ان کے لائق) دانہ کھانے کی لغزش پیدا فرمائی۔ اس لغزش کا ہونا عطا کا ایک بہانہ تھا۔ اگر یہ لغزش ان میں نہ ہوتی تو اسماء اور صفات کا علم ان پر منکشف نہ ہوتا۔ اگر وہ لغزش کی وادی سے نہ گزرتے تو یُحِبُّهُمْ کی تجلی (اللہ ان سے محبت کرتے ہیں) وَيُحِبُّونَهٗ (اور وہ محبت کرتے ہیں اس (اللہ) سے) (المائدہ: ۵۴) کی صورت میں ان پر نہ ڈالی جاتی۔ اگر ان میں تخم جرم کی اہلیت نہ ہوتی تو امانت کا بوجھ کس طرح اٹھاتے۔ (فرشتے جرم کرنے کے قابل نہ تھے اور شیطان کی طرف اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (بے شک یہ ظلوم بھی ہے اور جہول بھی) (الاحزاب: ۷۲) کا سیاہ دانہ پھینکا تو وہ اندھا ہو گیا۔ (حضرت آدم علیہ السلام میں جرم کی اہلیت رکھی گئی تھی) حضرت آدم علیہ السلام کی لغزش فرشتوں کی معصومیت پر بازی لے گئی۔ فرشتوں کو چونکہ گناہ سے کوئی سروکار نہ تھا اس لئے انہوں نے کہا کہ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا (البقرۃ: ۳۰) (کیا تو مقرر کرتا ہے زمین میں جو فساد برپا کرے گا اس میں) اور یہ جواب پایا کہ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرۃ: ۳۰) (بے شک میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے) (البقرۃ: ۳۰) یعنی جو اسرار ہم انسان کی معصیت کاری میں جانتے ہیں تم نہیں جانتے۔ آسمان نے کہا کہ مجھ میں وصفِ رفعت موجود ہے۔ زمین نے کہا کہ مجھ میں کشادگی کی وسعت ہے۔ پہاڑ نے کہا کہ میرا قدم راسخ ہے۔ ہم اس بوجھ کو اٹھانے کے قابل نہیں۔ سب نے کہا کہ ایسا نہ ہو کہ ہمیں کوئی مصیبت پہنچے اور ہماری خوبیاں بھی چلی جائیں۔ انسان نے سوچا کہ میرے پاس کیا ہے جو واپس لے لیا جائے گا۔ جس امانت کا بوجھ اٹھانے سے سب مخلوق عاجز تھی انسان نے اسے اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ حضرت قاسم انور قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ اس امانت سے مراد خلافت ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا منشا تھا کہ وہ تمہیں اختیار اور تصرف سے متہم کرے تو تم اس کا اعتراف کرو۔ اگر گناہ اور گمراہی سے تمہیں مخاطب کرے تو تم اس کا اقرار کرو اور یہ نہ کہو کہ اختیار اور تصرف تو خدا کا ہے اور یہ معصیت اور گمراہی ترے ارادۂ قضا سے ہے بلکہ اپنے اوپر الزام لو اور کہو رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا ٚ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (الاعراف: ۲۳) (اے ہمارے پروردگار! ہم نے ظلم کیا اپنی جانوں پر اور اگر نہ بخشش فرمائے تو ہمارے لیے اور رحم نہ فرمائے ہم پر تو یقیناً ہم نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔) حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حقیقت کو درج ذیل شعر میں لکھا ہے۔

گناہ گرچہ نبود اختیارِ ما حافظ   تو بر طریقِ ادب گو کہ گناہِ من است (حافظ شیرازی)

(گناہ اگرچہ ہمارے اپنے اختیار میں نہ تھا اے حافظ مگر تم ادب سے کہو کہ ہاں یہ گناہ میرا ہے۔)

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کی نظر تو اس امانت کا بار پیش کرنے پر تھی اور امانت کے ثقل (بوجھ) پر نہ تھی۔ غرضیکہ لذت نے ثقل کے بوجھ کو دل سے نکال دیا۔ لہٰذا لطفِ ربانی نے بھی فرما دیا کہ اچھا امانت تمہارے سپرد کی جاتی ہے اور حفاظت ہمارے ذمہ کرم پر رہے گی۔

اللہ کی بندے سے محبت یہ ہے کہ اس کو اپنا قرب دے دے اور بندے کی محبت اللہ سے یہ ہے کہ اس کا دل خدا کے سوا ہر چیز سے فارغ ہو۔ جو درد و عشق نہیں رکھتا اس کی قدر و منزلت نہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام پر رحم کرنے کا ذکر اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے۔

وَ لَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا۠ (طٰہٰ:۱۱۵)

اور ہم نے حکم دیا تھا آدم کو اس سے پہلے (کہ وہ اس درخت کے قریب نہ جائے) سو وہ بھول گیا اور نہ پایا ہم نے (اس لغزش میں) اس کا کوئی قصد)

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام پر اپنا کرم کرنے کا ذکر قرآن مجید میں یوں بھی فرمایا ہے جس سے تمام مخلوق (ملائک اور جن) پر ان کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْۤ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا۠ (بنی اسرائیل:۷۰)

اور بے شک ہم نے بڑی عزت بخشی اولادِ آدم کو اور ہم نے سوار کیا انہیں (مختلف سواریوں پر) خشکی میں اور سمندر میں اور رزق دیا انہیں پاکیزہ چیزوں سے اور ہم نے فضیلت دی انہیں بہت سی چیزوں پر جن کو ہم نے پیدا فرمایا نمایاں فضیلت۔

ان تمام واقعات کے مطالعہ کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے دلوں کی کیفیت کو دیکھتا ہے۔ اگر چہ بظاہر وہ سختی یا عذاب کا اظہار بھی کرتا ہے لیکن اس کی منشا یہ رہتی ہے کہ بندوں پر کرم کیا جائے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے جب اپنے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام کو شکار پر جانے کی اجازت دی تو آپ علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو اللہ کے سپرد نہیں کیا تو حضرت یوسف علیہ السلام طویل عرصہ تک باپ سے جدا رہے۔ اس جدائی میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو کنوئیں سے نکالا اور عزیز مصر کے عہدے پر فائز فرمایا اور جہاں جہاں ان کی مدد کی تو فرمایا۔

وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ٘ وَ لِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِؕ (یوسف:۲۱)

اور یوں (اپنی حکمتِ کاملہ سے) ہم نے قرار بخشا یوسف کو (مصر کی) سرزمین میں اور تا کہ ہم سکھا دیں اسے خوابوں کی تعبیر۔

اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں اور نیک بندوں پر اپنی مہربانی اور کرم کا اظہار کیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر اس

کے بندے اپنے دلوں میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ عقیدت رکھتے ہیں تو ضرور اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے فضل وکرم کا اظہار کیا۔ ابلیس چونکہ اس صفت سے محروم تھا اس لئے عتاب الٰہی کا نشانہ بنا۔ آپ جس پر بھی بنظر عمیق غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ یہی قانون الٰہی ہر طرف کارگر ہے۔ محمود اور ایاز کی زندگیوں کو دیکھ لیں تو یہ معلوم ہوگا کہ جہاں کوئی شخص کسی محمود کی ایازی کرتا ہے تو وہ اپنی مراد کو پہنچتا ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کا انصاف ہے۔ اگرچہ کسی کو وقتی طور پر یہ سلوک برا محسوس ہو مگر آخر کار اسے اللہ تعالیٰ کی کرم بخشی نظر آئے گی۔ اللہ تعالیٰ کی کرم بخشی ان لوگوں کے لئے ہے جو دل وجان سے اسے اپنا محبوب تسلیم کرتے ہیں۔ اگر ابلیس نے ایسا خیال کیا ہوتا تو اس کے ساتھ یہ سلوک نہ ہوتا۔

مذکورہ بالا واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیارے انسان کے حق میں ہی فیصلہ کرتا ہے تاکہ اس کو اس سے فائدہ پہنچے۔ اگر بظاہر کوئی کام اللہ کے حکم کے خلاف ہو مگر دلی کیفیت درست ہے تو اللہ کا کرم اس کا پیچھا کرے گا۔ جیسے حضرت آدم علیہ السلام کو حکم دیا کہ پھل نہ کھائیں مگر انہوں نے کھا لیا تو اس میں ان کا دلی ارادہ نہیں تھا۔ ''قوۃ القلوب'' (حصہ اوّل، ص ۴۸۴) میں لکھا ہے کہ ایک عالم نے ابو طالب مکی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو سجدے کا حکم دیا تو کیا اللہ تعالیٰ نے اس سے سجدہ ادا ہونے کا ارادہ بھی کیا؟ (جیسا کہ سورۃ النحل آیت نمبر ۴۰ کا مفہوم ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو حکم دیتا ہے کہ ہو جا) اب جب سجدہ نہیں ہوا تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سجدے کے ہونے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کو پھل کے نہ کھانے کا حکم دیا مگر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے پھل کے نہ کھانے کا ارادہ نہیں کیا۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک معتزلہ کا امام عمرو بن عبید آتا تھا اور پھر الگ ہو گیا کیونکہ وہ کہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ خود فیصلہ کرتا ہے کہ ایک کام نہ ہو تو پھر اس کے نہ ہونے پر بندے کو عذاب کیوں کرتا ہے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تیرا ناس ہو اللہ تعالیٰ اپنے حکم پر عذاب نہیں کرتا بلکہ اپنے حکم کے خلاف کرنے (سجدہ نہ کرنے) پر عذاب کرتا ہے۔ اس سجدہ نہ کرنے اور پھل کھا لینے کا جواز اوپر دے دیا گیا ہے۔ اس میں انسان پر رحم کرنے کا منشائے الٰہی پایا جاتا ہے۔

روحانی مراحل کی کشائش

یہ دنیا دار العمل ہے اور ہر کام کی انجام دہی کے لئے مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ روحانی دنیا کی طرف توجہ دینا اور اس راستے میں مشکلات کا مقابلہ کرنا دنیاوی کاموں کی کارکردگی کے مقابلے میں زیادہ مشکل محسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ دنیاوی کاروبار کے ساتھ کچھ دنیاوی مال ومتاع بھی ہاتھ لگتا ہے جبکہ روحانی اور اُخروی کاموں میں معاوضہ فوراً یا اسی وقت نہیں بلکہ کچھ دیر کے بعد نظر آتا ہے۔ یہی اللہ کی راہ کی طرف آنے کی پہلی شکل ہے۔ گو

اہل بصیرت کو نیک کاموں کے اثرات فوراً محسوس ہونے لگتے ہیں۔ مگر دنیادار لوگ جب تک مال ہاتھ نہ لگے حوصلہ اور ہمت کھو بیٹھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دینی مشاغل میں لوگوں کا انہماک پیدا ہونا مشکل سی بات نظر آتی ہے اور خاص طور پر جب دنیاوی خورد و نوش کے لئے ہر شخص مال کا محتاج ہے تو پھر بہت قلیل لوگ ایسے نظر آتے ہیں کہ مالی ضروریات کے ہوتے ہوئے بھی روحانی دنیا کی طرف توجہ دیں۔ چنانچہ روحانی دنیا کی سب سے پہلی اور اہم مشکلات میں سے ایک یہ بات ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ادھر لگ گئے تو دنیا ناراض ہو جائے گی۔ ایک مشہور حدیث شریف میں ہے کہ دنیا و آخرت دو سوکنیں ہیں اگر ایک کو راضی کیا تو دوسری ناراض ہو جائے گی۔

اس دنیا میں آنے سے پہلے روحوں کی توجہ ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی طرف رہتی تھی اور جب کوئی روح دنیا میں آ جاتی ہے تو اس کی توجہ بٹ جاتی ہے اور اپنے خورد و نوش، بدن اور اس کے لوازمات اور دیگر ضروریات زندگی کی طرف مبذول ہو جاتی ہے حتیٰ کہ بعض انسان تو صبح سے شام تک دنیا کی ضروریات کو پورا کرنے میں اس قدر انہماک رکھتے ہیں کہ عالمِ ارواح کی توجہ بالکل ضائع ہو جاتی ہے اور انسان جانوروں سے بھی بدتر زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ اس کے برعکس کچھ سعادت مند لوگ ایسے بھی ہیں جن کی دنیاوی کاروبار اور خرید و فروخت کے اندر بھی توجہ الی اللہ یوں ہی رہتی ہے کہ جیسے عالمِ ارواح میں تھی۔ یہ ان محبوبینِ الٰہی کی روحیں ہیں کہ اگر ایک لحہ کیلئے بھی خدا کی یاد سے غافل ہو جائیں تو خود کو مرتد سمجھتے ہیں۔ اس حقیقت حال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کسی کیلئے دنیا کی مصروفیات یادالٰہی میں رکاوٹ نہیں بنتیں اگر کسی کا ارادہ یہ ہو تو اسے چاہیے کہ وہ ہمہ تن خدا کی یاد میں مصروف رہے۔

حقیقت حال بھی یہی ہے کہ جن پاک روحوں کی توجہ الی اللہ متصور رہتی ہے تو ان کے لئے کوئی بات مشکل نہیں۔ اس کتاب میں ایک حدیث مبارک متعدد بار درج کی جا چکی ہے کہ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق جو "طبقات الکبریٰ" میں نقل کیا گیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے دنیا پر یہ وحی فرمائی کہ تو اس کی خدمت کر جو میری تابعداری کرے اور اس کو تھکا دے جو تیری تابعداری کرے۔" اس حدیث کی رو سے جو لوگ اللہ تعالیٰ کی خدمت کرتے ہیں وہ کبھی محتاج نہ رہیں گے اور دنیا ان کی تابعدار رہے گی۔ پس جو لوگ نماز و روزہ جیسی عبادت کرتے ہیں اور دینِ اسلام کی خدمت میں کچھ وقت صرف کرتے ہیں ان کو دنیا میں (اور آخرت میں بھی) کسی قسم کی محتاجی نہ ہوگی۔ انسان کے ذمہ ہے کہ وہ اپنا فرض ادا کرے اور اگر ایسا ہو جائے تو مال و متاع کی کمی بیشی کا خطرہ ٹل جاتا ہے۔ اور انسان کو چاہیے کہ پختہ ارادے سے روحانی دنیا کی طرف لگ جائے۔ جو شخص یہ کام نہیں کر سکتا تو پھر اسے دنیا میں محتاجی کی زندگی بسر کرنے کے لئے محنت کرنا ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اُس محنت سے یہ محنت آسان ہے۔

روحانیت کی راہ میں دوسری رکاوٹ نفسانی خواہشات ہیں جو اس میں شدت خواہشات کا شکار ہوا تو سمجھ لو کہ بغیر تلوار کے مارا گیا۔ اس میں بھی اعتدال کا راستہ اختیار کرنا ضروری ہے۔ جائز راستوں سے اپنی

خواہشات کی تکمیل کرنے کی شرع نے اجازت دی ہے۔ اس سلسلہ میں ہماری تصنیف "تہذیبِ نفس" جو عنقریب شائع ہونے والی ہے تمام ضروری مسائل کا حل پیش کرتی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ فائدہ مند ثابت ہوگا۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا چاہتے ہیں اور روحانی سفر کو طے کرنے کے درپے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے خواہشاتِ نفس پر قابو پانے کی کس قدر تاکید کی ہے۔ اس مشکل کے حل کے لئے شرعی ہدایات اور اولیائے کرام کے حالات زندگی کا مطالعہ کیا جائے۔

روحانی دنیا کی تیسری مہم صحبتِ شیخ کی کمی ہے۔ اس راستے کو طے کرنے میں صحبتِ شیخ یا کسی کامل شیخ سے بیعت کرنا واجب قرار دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مطلوبہ دلائل ہماری تصنیف "بیعت اور اس کی تشکیل" کے علاوہ زیر نظر کتاب "اسلام اور روحانیت" میں کافی تفصیل سے دیئے گئے ہیں۔ قرآن اور حدیث سے بھی کچھ دلائل ان کتابوں میں درج کر دیئے گئے ہیں۔ حضرت عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب باطنی نجاستوں کا دور کرنا واجب ہے تو ان نجاستوں کے دور کرنے کا طریقہ سیکھنا (یعنی بیعت طریقت) بھی واجب ہے۔ آپ نے فرمایا کہ انسان اپنی اصلاح خود نہیں کر سکتا خواہ کتنی کتابوں کا مطالعہ کر لے، لہٰذا بیعت کرنا واجب ہے۔ شیخ طریقت کا تعلق عالمِ ملکوت سے قائم ہوتا ہے اور مرید کا تعلق بھی اپنے شیخ کی توجہ سے عالمِ ملکوت سے ہو جاتا ہے۔

طریقت کے کچھ حصے ایسے بھی ہیں جن میں مرشد کی راہنمائی از بس ضروری ہے اور اس کے بغیر وہ منزلیں طے نہیں ہو سکتیں مثلاً مراقبہ، کشف، کشف القبور، توجہ، رابطہ، تصرفاتِ باطنی وغیرہ۔ نیز روحانی راہ کی بہت سی اصطلاحات، معاملات اور پیچیدگیاں عملی طور پر پیر کی وساطت سے حل ہوتی ہیں۔ صحبت میں اس قدر معاملات طے ہوتے ہیں جس کا بغیر مرشد کے طے ہونا ہرگز ممکن نہیں، جیسے مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم تا غلامِ شمس تبریزی نہ شد (مولانا عبدالرحمٰن جامی)

روحانی دنیا کی چوتھی مشکل اور بہت ضروری چیز ریاضتوں اور روحانی مشقتوں کا قائم کرنا اور جاری رکھنا ہے۔ یہ مرحلہ وقت طلب اور توجہ طلب ہے۔ اس حصے میں کچھ کمی رہ جائے تو معاملات ادھورے رہ جاتے ہیں۔ روحانی مقام کا انحصار اس حصے کی تکمیل پر موقوف ہے۔ اس حصے میں سالک کے اپنے استقلال اور توجہ شیخ کا دخل ہے۔ روحانی تصرفات کی بنا انہی ریاضتوں پر رکھی گئی ہے۔

روحانی دنیا کا پانچواں شغل تفکر اور مطالعۂ تصوف ہے۔ فکر اگر جامد ہو جائے تو ذکر سے کھل جاتا ہے۔ فکر اگر کھل جائے تو راہ کھل جاتا ہے اور راہ وہ ہوتا ہے جو خدا سے ملا دے۔ کتب طریقت کا مطالعہ اور مشائخ سے ان معاملاتِ طریقت پر گفتگو کرنے سے طریقت کا ماحول قائم ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا پانچ نقاط کی مختصر نشاندہی کر دی گئی ہے لہٰذا اس سے زیادہ تفصیل دینے کی یہاں ضرورت نہیں۔ اس کتاب میں ہی کافی مواد شامل کر دیا گیا ہے۔

باب ۲۱

حصہ پنجم

(حکمت، معرفت اور بصیرت)

حکمت

حق اگر سوزے نہ دارد حکمت است شعر می گردد چوں سوز از دل گرفت (پ۔م:۲۷۶)

(حقیقت میں اگر سوز نہ ہو تو وہ فلسفہ ہے، اگر وہ دل سے سوز حاصل کرلے تو شعر بن جاتی ہے۔)

اَلْحِکْمَۃُ کے معنی علم اور عقل کے ذریعے حق بات دریافت کر لینے کے ہیں۔ لہٰذا حکمت الٰہی کے معنی اشیاء کی معرفت اور پھر نہایت احکام کے ساتھ ان کو موجود کرنے کے ہیں (مفردات) اور انسانی حکمت موجودات کی معرفت اور اچھے کاموں کو سرانجام دینے کا نام ہے۔

کچھ علماء کا کہنا ہے کہ ہر چیز کو اپنے محل اور موقع پر رکھنے کو حکمت کہتے ہیں (وَضْعُ الْاَشْیَاءِ عَلٰی مَوَاضِعِھَا) قرآن میں حکمت کی تعلیم دینے سے مراد احکام قرآن کی ایسی تفصیل اور بیان ہے جس کے جاننے کے بعد انسان ان احکام کی ایسی تعمیل کر سکے جیسے قرآن کو نازل کرنے والے خدا کا منشا ہے۔ نبی کا فرض یہی نہیں کہ قرآن سکھا دے بلکہ اس کا صحیح بیان اور تفصیل بھی سکھائے تاکہ قرآن پر اللہ کی منشا کے مطابق عمل ہو سکے۔

اسی حکمت یعنی بیان قرآن کو سنتِ نبوی ﷺ کہا جاتا ہے اور یہ مُنَزَّلٌ مِنَ اللّٰہ ہوتا ہے جیسے کہ فرمایا۔

وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ اور اللہ تعالیٰ نے آپ (ﷺ) پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی۔ (النساء:۱۱۳)

اس سے ثابت ہوا کہ جس طرح قرآن کی اطاعت فرض ہے اسی طرح حکمت یعنی سنت پر بھی عمل کرنا ضروری ہے۔ کچھ لوگوں نے حکمت کو طریقت کے معنوں میں لیا ہے کیونکہ پورے قرآن میں تصوف کا لفظ نہیں ملتا اس لئے تصوف کے معنوں سے لبریز متبادل لفظ حکمت ہی ہو سکتا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ کے متعلق حُکم کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے وہ معنی مراد نہیں ہوتے جو کسی انسان کے حکم کے ہوتے ہیں اس لیے کہ اس نے خود کو اَحْکَمُ الْحَاکِمِیْنَ کہا۔ قرآن پاک کو حکیم یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ حکمت کی باتوں پر مشتمل ہے، جس طرح فرمایا۔

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝ (یونس:۱)　الف لام را۔ یہ آیتیں ہیں کتاب حکیم کی۔

اسی طرح سورۃ قمر آیت ۵ میں حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ (وہ خبریں سراسر حکمت ہیں) فرمایا گیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ حکم بمعنی محکم کے استعمال ہوا ہے۔ جس طرح قرآن میں الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ (ھود:۱) (الرٰ، یہ وہ کتاب ہے محفوظ و مستحکم بنادی گئی ہے) حکم کا لفظ حکمت سے عام ہے۔ ہر حکمت کو حکم کہہ سکتے ہیں ہر حکم حکمت نہیں ہوسکتا کیونکہ حکم کے معنی کسی چیز کے متعلق فیصلہ کرنے کے ہوتے ہیں۔ قرآن کی آیات کو محکم اس لئے کہتے ہیں کہ ان میں پُر از حکمت احکام بھی ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِكْمَةً (بعض اشعار مبنی بہ حکمت ہوتے ہیں۔ (مفردات)

حکمت کا مفہوم

تفسیر نعیمی میں ہے کہ حکمت چیزوں کو صحیح طور پر جاننا ہے کیونکہ وہمی باتوں کا جاننا حکمت نہیں۔ ایسے ہی غلط تحقیق علم نہیں بلکہ جہالت ہے۔ اس تفسیر میں حکمت کے متعلق ۲۹ اقوال بیان کیے گئے ہیں کہ اس سے مراد نبوت یا قرآن کا علم یا ناسخ منسوخ و محکم متشابہ کی پہچان یا علم فقہ یا تدبر فی القرآن یا اچھے اعمال یا علم نافع یا علم یا عمل یا رب کی معرفت یا قلبی نور جو الہام اور وسوسہ میں فرق کرے یا الہام یا قرآنی اسرار یا خیر کی توفیق یا خوف الٰہی وغیرہ کے معانی ہیں۔

حضرت مقاتل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں حکمت کا لفظ چار معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ پہلے قرآنی وعظ جیسے: وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ (البقرۃ:۲۳۱) (اور (یاد کرو) جو اس نے نازل فرمایا تم پر قرآن اور حکمت وہ نصیحت فرماتا ہے تمہیں اس سے)، دوسرے، فہم و علم کے لئے جیسے وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا (مریم:۱۲) (اور ہم نے عطا فرمادی ان کو دانائی جبکہ وہ بچے تھے) اور تیسرے، نبوت کے معنی جیسے اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (النساء:۵۴) (ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کی اولاد کو کتاب اور حکمت عطا فرمائی ہے) اور چوتھے، قرآن اور اسرار قرآن کے معنی میں۔ جیسے فرمایا: اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ (سورۂ نحل:۱۲۵) (اے محبوب) (بلایئے (لوگوں کو) اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت سے۔) جہاں یہ لفظ تمام معنوں میں استعمال ہوا تو فرمایا وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (البقرۃ:۲۶۹) اور جسے عطا کی گئی دانائی تو یقیناً اُسے دے دی گئی بہت بھلائی۔

حکمت کا لفظ جہاں اسے خیر کثیر کہا گیا ہے وہاں اس کو وسیع معانی میں استعمال کیا گیا ہے۔ بالعموم حکمت کی دو قسمیں سمجھی جاتی ہیں۔ (۱) حکمت نظری، جس میں منطق، فلسفہ، علم کتاب و معاشیات، اخلاقیات اور نفسیات شامل ہیں۔ (۲) حکمت عملی، جس میں طبیعیات، ریاضی، حساب، صنعت و حرفت وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ

علوم جدیدہ پر بھی لفظ حاوی ہے۔ حکمت اشیاء، وہ دانائی کی باتیں ہیں جو چیزوں میں چھپی ہوئی ہیں۔

حکمت کے دیگر معانی

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے حکمت کو نظریہ تصوف، وحدت الوجود کے لئے استعمال کیا ہے۔ علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے حکمت معقول کے الفاظ جرمن کے مشہور فلسفی ہیگل کے فلسفہ کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ اس کا یہ خیال تھا کہ مادہ موجود نہیں، خدا ہی کائنات ہے اور کائنات ہی خدا ہے۔ وہ افکار مجردہ سے بحث کرتا ہے جس کا عالم محسوس سے تعلق نہیں۔ اس کی نظر میں معقول ہی حقیقی ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ اس کے فلسفہ کی حقیقت کو کوئی سمجھ نہ سکا اور نہ واضح کر سکا۔ لکھتے ہیں۔

ع　ہیگل کا صدف گوہر سے خالی　ہے اس کا طلسم سب خیالی (ض، ک: ۴۹۰)

غیر اسلامی حاکموں کی روش اور قاصد ملوکیت کے متعلق علامہ مرحوم نے حکمت فرعونی کے عنوان سے ''پس چہ باید کرد'' میں حکومت فرعونی کے عنوان سے اک نظم لکھی ہے جس میں فرعون کی فاسد حکومت کے اثرات پر مفصل تبصرہ کیا ہے۔

خدا کی نظر مومن کے دل پر کیوں؟

اللہ تعالیٰ مومن کے بدن کی بلاؤں کو ٹالتا ہے اور ایسے کرنے میں بدن کی عزت مقصود نہیں بلکہ اس کے بدن میں ایک خزانہ ہے اور وہ دل ہے اور دل میں ایک خزینہ ہے اور وہ معرفت ہے۔ یہ تمام شرف اس معرفت کی قدر کے سبب ہے۔ اللہ تعالیٰ مومن کے ظاہر کو ہزاروں جفا کاروں کی بلاؤں سے محفوظ رکھتا ہے۔ جب بدن گناہ کرتا ہے تو دل خدا کے آگے روتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو رنج دینا پسند نہیں فرماتا لہٰذا حدیث شریف میں ہے کہ

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَ اَعْمَالِکُمْ وَ لٰکِنْ یَّنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ (مسلم، جلد ۸، ص ۱۱)

اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور اعمال کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے۔

''سیر تصوف'' میں اس کی تاویل میں یہ حدیث بیان کی گئی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یَنْظُرُ فِیْ کُلِّ یَوْمٍ وَّ لَیْلَۃٍ ثَلٰثَ مِائَۃٍ وَّ سِتِّیْنَ نَظْرَۃً فِیْ قَلْبِ کُلِّ مُؤْمِنٍ وَّ مُؤْمِنَۃٍ

اللہ تعالیٰ ہر رات اور دن میں ہر مومن مرد اور عورت کے دل پر تین سو ساٹھ مرتبہ نظر فرماتا ہے

انسان کا نطفہ جب ماں کے رحم میں قرار پاتا ہے تو حق تعالیٰ یہ پسند نہیں فرماتا کہ وہ اس امانت (معرفت) پر کسی کا ہاتھ پہنچے اور اس کو دشمن کے ہاتھوں ضائع کردے۔

یُؤْتِی الْحِکْمَۃَ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ

(اللہ تعالیٰ) عطا فرماتا ہے دانائی جسے چاہتا ہے

فَقَدۡ اُوۡتِیَ خَیۡرًا کَثِیۡرًا ؕ (البقرۃ:۲۶۹) اور جسے عطا کی گئی دانائی تو یقیناً اسے دے دی گئی بہت بھلائی۔

ضیاء القرآن میں اس آیت کی تفصیل میں لکھا گیا ہے کہ حکمت سے مراد وہ علم صحیح ہے جو اتنا پختہ اور طاقت ور ہو کہ وہ انسانی ارادہ کو حکماً علم خیر کی طرف متوجہ کر دے اور یہ اللہ تعالیٰ کا وہ احسان ہے جسے قرآن نے خیر کثیر فرمایا ہے جبکہ دنیا و مافیھا کو مَتَاعٌ قَلِیۡلٌ کہا گیا ہے۔ اب اگر کوئی صاحب علم اپنے آپ کو امراء اور اغنیاء سے کم تر سمجھے تو یہ اس کی اپنی کم نگاہی ہے ورنہ جو نعمت اور دولت اُسے عطا فرمائی گئی ہے اس کے سامنے دولتِ قارون اور جاہِ فریدون کی اوقات ہی کیا ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے حکمت کو اپنے اشعار میں بیان کیا ہے۔ جس سے ان کی مراد حقیقت و ماہیت ہے۔ استدلال کے جملہ علوم دانائی یا دانائی کا کوئی راز فلسفۂ خودی، خرد، ترکیب اور سائنس ہے جیسا کہ درج ذیل اشعار سے واضح ہوتا ہے۔

گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر
(اللہ تعالیٰ نے حکمت کو خیرِ کثیر فرمایا ہے، جہاں کہیں تُو اس خیر کو دیکھے، اپنا لے)

علم حرف و صوت را شہپر دہد پاکی گوہر بہ نا گوہر دہد
(علم مصنف اور خطیب کو شہپر عطا کرتا ہے، اس سے معمولی شخصیت کو بھی اندرونی پاکیزگی حاصل ہو جاتی ہے)

علم را بر اوجِ افلاک است رہ تا زچشمِ مہر بر کندد نگہ
(علم کا راستہ افلاک کی بلندیوں تک پہنچتا ہے، یہاں تک کہ وہ سورج کی آنکھ سے نگاہ چھین لیتا ہے۔)

نسخۂ اُو نسخۂ تفسیرِ کل بستۂ تدبیر او تقدیرِ کل
(علم ساری موجودات کی تفسیر حاصل کرنے کا نسخہ ہے، سب کی تقدیر اسی کی تدبیر کے ساتھ وابستہ ہے۔)

دشت را گوید حبابے دہ دہد بحر را گوید سرابے دہ دہد
(اگر علم صحرا سے کہے کہ حباب دے تو وہ دے دیتا ہے، اگر وہ بحر سے کہے کہ سراب دکھا تو وہ دکھا دیتا ہے۔)

چشمِ اُو بر وارداتِ کائنات تا بہ بیند محکماتِ کائنات (ج،ن: ۶۶۲)
(علم کی نظر کائنات کے بارے میں تجربات پر ہے تا کہ وہ کائنات کے بنیادی اصول دیکھے)

حکمت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف ''جاوید نامہ'' میں ایک عنوان قائم کیا ہے جس میں حکمت کی پُر زور الفاظ میں تعریف کی ہے۔ آپؒ کے کلام کا خلاصہ قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔
اللہ تعالیٰ نے حکمت کو خیرِ کثیر فرمایا ہے جہاں کہیں تو اس خیر کو دیکھے اپنا لے۔ علم مصنف اور خطیب کو شہپر

عطا کرتا ہے اس سے معمولی شخصیت کو بھی اندرونی پاکیزگی حاصل ہو جاتی ہے۔ علم کا راستہ افلاک کی بلندیوں تک پہنچتا ہے، یہاں تک کہ وہ سورج کی آنکھ سے بھی نگاہ چھین لیتا ہے۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اگر تو علم کو سوزِ عشق کے بغیر پڑھے تو یہ شر ہے۔ ایسے علم کا نور بحر و بر کی تاریکی ہے۔ اس علم کے غازے سے دُنیا اندھیر نگری بن جاتی ہے۔ اس کی بہار شجرِ زندگی کے پتے گرا دیتی ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اسی علم نے فرنگیوں کے سینے میں آگ بھڑکائی ہے اور اسی سے انہیں شبخون اور یلغار کی لذت حاصل ہوئی ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے مثنوی "پس چہ باید کرد" میں مندرجہ ذیل اشعار میں بے ہمت لوگوں کی حکمت کے بارے میں فرمایا۔

حکمت ارباب دیں کردم عیاں حکمت اربابِ کیں را ہم بداں

(اصحابِ دین کی حکمت تو میں نے بیان کر دی اور کینہ پرور (بے ہمت) لوگوں کی حکمت کو بھی سمجھ لو۔)

حکمتِ اربابِ کیں مکر است و فن مکر و فن؟ تخریبِ جاں تعمیرِ تن

(بے ہمت لوگوں کی حکمت مکاری اور فنی مہارت ہے، مکر و فن دونوں روح کو بگاڑتے اور جسم کی پرورش کرتے ہیں)

حکمتے از بندِ دیں آزادہ از مقامِ شوق دُور افتادہ

(یہ لوگ حکمتِ دین سے بے خبر اور آزاد ہیں اور مقامِ شوق سے دُور جا پڑے ہیں۔)

بے نصیب آمد زاولادِ غیور جاں بہ تن چو مردہ در خاکِ گور

(یہ لوگ غیرت مند اولاد سے محروم ہیں۔ ان کی جان ایسی ہے جیسے قبر کی خاک میں مردہ)

از حیا بیگانہ پیرانِ کہن نوجواناں چوں زناں مشغولِ تن (پ، چ: ۸۱۱)

(ان کے بڑے بھی حیا سے بیگانہ ہیں۔ نوجوان عورتوں کی طرح آرائشِ تن میں مشغول ہیں۔)

علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے حکمت فرنگ کو بھی اپنی نظموں میں واضح کیا ہے۔ اور ایک طنزیہ نظم میں فارس کے ایک مردہ کی زبان سے علامہؒ نے مغرب کے مہلک ہتھیاروں پر چوٹ کی ہے۔

(دیکھئے "حکمتِ فرنگ" صفحہ ۲۹۵، کلیاتِ اقبالؒ)

جرمن کے مشہور شاعر گوئٹے کی ایک منظوم کتاب جس کا موضوع دانش کی باتیں علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے "پیامِ مشرق" میں اُس کے کلام پر تبصرہ کیا ہے۔ حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے کلام کو "پیرِ مغرب" کے نام سے منسوب کیا ہے۔ اس کے علاوہ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے حکمتِ آخرین، حکمت پسند، حکمتِ دین، حکمتِ محکم، حکمتِ مشرق و مغرب اور حکمتِ ملوکیت کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان میں سے چند اشعار ملاحظہ کریں۔

حکمت مشرق و مغرب نے سکھایا ہے مجھے ایک نقطہ کہ غلاموں کے لئے ہے اکسیر

دین ہو، فلسفہ ہو، فقیر ہو، سلطانی ہو ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر

حرف اُس قوم کا بے سوز، عمل زار و زبوں ۔ ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر
(ض،ک:۶۰۶)

اسلام کی مغربی اقوام کے ہاتھوں تباہی کے متعلق لکھتے ہیں۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز
حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز
ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے تُو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز
(ب،د:۲۶۴)

علامہ رحمۃ اللہ علیہ حکمتِ تصوف کے متعلق لکھتے ہیں۔

یہ حکمتِ ملکوتی، یہ علم لاہوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکرِ نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سرُور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ عقل جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار
شریکِ شورشِ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
(ض،ک:۴۹۶)

ہندوستان کے لوگوں کے اجتہاد میں کمزوری کے متعلق لکھتے ہیں۔

ہند میں حکمتِ دیں کوئی کہاں سے سیکھے
نہ کہیں لذّتِ کردار نہ افکارِ عمیق
حلقۂ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں
آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق
خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق
اِن غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق
(ض،ک:۴۸۴)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ جنیوا اور اقوامِ مغرب کی فریب کاریوں اور عالم اسلام کو تباہ کرنے کی کاوشوں کا ذکر کرتے ہیں۔

تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم!
مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم؟ (ض،ک:۵۲۰)
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغ کارزاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے
(ب،د:۲۷۴)

بھٹکنے دو حسن کی گلیوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کرتے تھا
میں حکمت سے فہم و [illegible] میں الجھا رہا — آج تک فیصلہ صحیح و ضرور کرتے تھا

([illegible])

قرآن اور حکمت

"لغات قرآن" میں ہے: حکمت کے لئے وضع الاشیاء علی مواضعها یعنی ہر چیز کو اپنے محل پر رکھنا [illegible] ہے۔ سورۃ الجمعہ آیت ۲ میں حکمت سے مراد [illegible] قرآن کی تفصیل [illegible] کا بیان ہے [illegible] احکام کی تعمیل کرتے جیسے قرآن نازل کرنے والے خدا کا منشا ہے [illegible] کہ قرآن کے [illegible] بیان اور تفصیل بھی کرے تاکہ قرآن پر [illegible] عمل ہو سکے۔ اسی حکمت یعنی قرآن کی تفصیل بیان کرنے کو منصب نبی کہا جاتا ہے۔ قرآن میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ حکمت قرآن جو نبی ﷺ نے بیان کی وہ ان کا ذاتی اجتہاد نہیں بلکہ وہ بھی اللہ کی طرف سے نازل کی گئی ہے۔ جیسے ارشاد ہے۔

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ — اور اتاری ہے اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اور حکمت (النساء:۱۱۳)

اس سے ثابت ہوا جیسے قرآن کی اطاعت فرض ہے اسی طرح صاحب قرآن کی سنت پر عمل کرنا ضروری ہے۔ جو لوگ سنت نبی کریم ﷺ کو ان کی ذاتی رائے خیال کرتے ہیں اور عمل کرنا ضروری نہیں سمجھتے ان کی غلط فہمی کا ازالہ ہوتا ہے۔

"تفسیر نعیمی" میں ہے کہ حکمت سے صحیح اعمال یا قوی دلائل یا احادیث یا فقہ مراد ہیں کیوں کہ یہ حکم سے بنا ہے جس کے معنی ہیں مضبوط کرنا فیصلہ کرنا اور واپس کرنا۔ اسی لیے جج کو حَکَم بادشاہ کو حاکم مضبوط چیز کو محکم اور عالم باعمل کو حکیم کہتے ہیں۔ "تفسیر عزیزی" کا قول "تفسیر نعیمی" میں نقل ہے کہ سورۃ البقرۃ آیت ۱۲۹ کی تفسیل میں لکھا ہے کہ حکمت سے مراد علم باطن اور قرآن کریم کے اسرار سکھانا ہے کیونکہ علم ظاہر علم باطن کے بغیر بے دینی ہے اور علم باطن کے بغیر علم ظاہر جعل سازی ہے۔ "تفسیر کبیر" میں ہے کہ حکمت حُکم سے بنا ہے جس کے معنی روکنا یا پلٹنا ہے۔ علم کو اس لئے حکمت کہا جاتا ہے کہ اس سے نفس جہالت سے پھر جاتا ہے۔ بُری باتوں سے رُک جاتا ہے اور حق کو پلٹتا ہے۔ بعض نے فرمایا کہ یہاں حکمت سے مراد فقہ ہے، بعض نے فرمایا حدیث سنت اور بعض نے قرآن پاک کے اسرار، بعض نے کہا کہ حق و باطل میں فیصلہ کرنے والی چیز، بعض نے کہا کہ کتاب سے مراد صحیح قول اور عمل ہے۔ اس لئے عالم باعمل کو حکیم کہتے ہیں۔ "تفسیر نعیمی" میں ہے کہ

ممکن ہے کہ حکمت سے مراد یہ تمام باتیں مراد ہوں کیونکہ حضور پاک ﷺ نے ہی سب کو سکھایا۔ یا اس سے مراد طریقت کے مدارج طے کروانا اور صاحب حال وقال بنانا ہے۔ نبی آخرالزماں ﷺ نے بارگاہ میں بیٹھنے والوں کو ہر قسم کا علم حاصل ہوتا تھا چنانچہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اسلام لاتے ہی آن کی آن میں قاضی، عالم، حافظ، قاری، جرنیل اور حاکم بنا کر بھیج دیئے گئے۔ علامہ رحمۃ اللہ علیہ کارل مارکس کی آواز کا نقشہ کھینچتے ہیں۔

یہ علم و حکمت کی مہرہ بازی یہ بحث و تکرار کی نمائش
نہیں ہے دُنیا کو اب گوارا پُرانے افکار کی نمائش

(ب،د:۱۳۹)

تیری کتابوں میں اے حکیمِ معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوطِ خم دار کی نمائش! مریز و کجدار کی نمائش

(ض،ک:۵۹۹)

علامہ رحمۃ اللہ علیہ لینن کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی!
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات

(ب،ج:۳۹۹)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ "پیر و مرید" میں پیر رومی رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ حکمتِ اسلامی میں رزقِ حلال علم و حکمت اور عشق و رقت اضافہ کرتا ہے۔

مریدِ ہندی: علم و حکمت کا ملے کیوں کر سراغ؟
کس طرح ہاتھ آئے سوز و درد و داغ؟

پیر رومی: علم و حکمت زاید از نانِ حلال
عشق و رقت آید از نانِ حلال

(ب،ج:۴۳۴)

وہ کچھ اور شے ہے محبت نہیں ہے
سکھاتی ہے جو غزنوی کو ایازی

یہ جوہر اگر کار فرما نہیں ہے
تو ہیں علم و حکمت فقط شیشہ بازی

(ب،ج:۴۳۸)

رسول اللہ ﷺ نے پوری دُنیا کو اس حکمت کا سبق دیا جس کو خداوند تعالیٰ نے قرآن کی شکل میں نازل کیا ہے۔

پا گئی آسودگی کوئے محبت میں وہ خاک
مدتوں آوارہ جو حکمت کے صحراؤں میں تھی

حسن کی تاثیر پر غالب نہ آ سکتا تھا علم
اتنی نادانی جہاں کے سارے داناؤں میں تھی

میں نے اے اقبال یورپ میں اسے ڈھونڈا عبث
بات جو ہندوستان کے ماہ سیماؤں میں تھی

(ب،د:۱۳۹)

نبی پاک ﷺ کا ارشاد پاک ہے: اَلْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ (جامع الصغیر ج:۲ ص:۹۷) حکمت مومن کا گم شدہ مال ہے۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی توضیح میں بہت لطیف نکات بیان کیے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ دین عین حکمت ہے جو حکمت کا طالب ہے وہ دین ہی کا طالب ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا عقیدہ ہے کہ آفرینش سے پہلے روح انسانی خداوند تعالیٰ سے آشنا ہو چکی تھی۔ اگر دُنیا کی آلائشوں میں پھنس کر اس آشنائی کو یہ دوبارہ طلب کرے تو اسے ضرور پہچان لے گی جس طرح کوئی شخص اپنی گم شدہ اونٹنی کو پہچان لیتا ہے۔

ضالہ، چہ بود ناقۂ گم کردۂ از کفت بگریختہ در پردۂ

(گم شدہ چیز کیا ہے جس طرح گم کردہ اونٹنی جو تیرے ہاتھ سے نکل گئی اور پردہ میں آ گئی ہے۔)

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حکمت اور معرفتِ الٰہی کی گم شدہ اونٹنی کی طلب میں انسان سرگرداں پھرتا ہے۔ روحِ انسانی کو اپنی اصلی حالت کی پہچان بھی ہے لیکن دُنیا میں غرض مند لوگوں، احمقوں اور مسخروں نے انسان کو پریشان کر رکھا ہے۔

ہم چنانکہ کسے در معرفت می کند موصوف غیبے را صفت

(اس طرح ہر شخص معرفت کے میدان میں موصوف گم شدہ معرفت کی نشان دہی کرتا ہے)

مشہور اسلامی شاعر عرفی اپنے کلام میں فرماتے ہیں کہ دُنیا میں ہر قسم کے لوگ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن اگر خدا پردہ اُٹھا دے تو سب کو معلوم ہو جائے کہ وہ خدا کی نہیں بلکہ کسی اور چیز کی تلاش میں ہے۔

برگ وسازِ ما کتاب وحکمت است

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ قرآن وحکمت ہمارا سرمایہ ہے۔ ہماری تصنیف سنتِ مبارکہ میں قرآن اور سنت کی اہمیت کو ظاہر کیا گیا ہے۔ اس سے رجوع کیا جائے اور انہی دو قوتوں پر ملت کا دارومدار ہے۔ اشیا کی حکمت جاننے کا علم (فزکس اور کیمسٹری وغیرہ) اسلام سے ہی ہوا ہے۔ فرنگیوں نے نئی ایجادوں پر ہی کام کیا ہے۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ حکمتِ قرآن سے انسان کی زندگی کی تعمیر ہوتی ہے لیکن افسوس کہ مسلمان اس سے اپنی زندگی کو مزین نہیں کرتے بلکہ قرآن سے ایسے کام لیتے ہیں جو خالقِ قرآن کے منشا کے خلاف ہیں۔ قرآن کے اعلیٰ ترین مفسرین سے مسلمان اپنی زندگی کا چراغ جلائیں تو قوم میں انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔

ملت قرآن

برگ سازِ ما کتاب و حکمت است این دو قوت اعتبار ملت است (پ، ج:۸۷۹)

(کتاب وحکمت ہی ہمارا سرمایہ ہے۔انہی دوقوتوں پرملت کا دارومدار ہے۔)

حکمتِ اشیاء فرنگی زاد نیست اصلِ اُو جز لذتِ ایجاد نیست (پ،چ:۸۸۰)

(اشیاء کی ماہیت جاننے کا آغاز فرنگیوں سے نہیں ہوا۔اس کی بنیاد صرف نئی دریافت کی لذت ہے۔)

ز رازی حکمتِ قرآں بیاموز چراغے از چراغ اُو بر افروز (ا،ح:۹۵۱)

(بے شک) رازی سے قرآن پاک کی حکمت سیکھ،اس کے چراغ سے اپنا چراغ جلا)

بہ بندِ صوفی و مُلّا اسیری حیات از حکمتِ قرآں نگیری (ا،ح:۹۵۵)

(تو صوفی ومُلّا کی قید میں گرفتار ہے،قرآنِ پاک سے زندگی حاصل نہیں کرتا)

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست کہ از یٰسٓ اُو آسان بمیری (ا،ح:۹۵۵)

(اس کی آیات سے مجھے صرف اتنا سروکار ہے کہ مرتے وقت یٰسٓ پڑھ لے تاکہ جان آسانی سے نکل جائے)

ہماری تصنیف "سنتِ مبارکہ" میں علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ جو کچھ قرآن، حکمت اور سنت کے متعلق ارشادات فرمائے ہیں قابلِ توجہ ہیں۔کتاب وسنت آئینِ حیات کی تفسیر ہے۔اتباع حکمت سے مراد سنتِ نبوی کی اتباع ہے۔(دیکھیں سنتِ مبارکہ:صفحہ ۲۶۹)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان ہے کہ علم وحکمت دینی کتابوں اور تفاسیر سے حاصل ہوئے ہیں لیکن روحانیتِ دین (جو حکمت کا متبادل مضمون ہے) اولیائے کرام کی نظروں سے حاصل ہوتی ہے۔اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانیوں کو دیکھنے کا حکم قرآن میں صادر فرمایا ہے اور حکمت کی باتوں کو سیکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کی آیات میں غور کرنے کا حکم دیا۔قرآن کریم میں کائنات کی طرف بار بار اُنظُرُوْا (غور کرو اور دیکھو) کا حکم آیا ہے۔

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر علم و حکمت از کتب، دیں از نظر (پ،چ:۸۶۵)

(اے بے خبر! دین کتابوں میں نہ ڈھونڈ، کتابوں سے علم وحکمت ملتی ہے مگر دین اہلِ حق کی نظر سے حاصل ہوتا ہے)

ہر کہ آیاتِ خدا بیند حُر است اصلِ ایں حکمت ز حکمِ "اُنظر" است (پ،چ:۸۳۹)

(جو بھی حق تعالیٰ کی آیات دیکھتا ہے وہ مردِ حر ہے، اِس حکمت کی اصل "اُنظر" کے حکم پر مبنی ہے۔)

علم وحکمت شرع ودیں، نظمِ امور

شرع اسلامیہ کا حکم عدل وتسلیم ورضائے الٰہی پر مبنی ہے اور شرح کی حکمت ہے۔اس حکمت کا بیج حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں ہے۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دم قدم سے مسلمانوں میں پیار اور الفت کے جذبات پیدا ہوئے حالانکہ آپ سے پہلے وہ ایک دوسرے کی جان کے دُشمن تھے۔اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا اس طرح بھائی بھائی بن جانا اپنی طرف سے ایک بیش بہا نعمت تصور کیا ہے۔دیکھئے سورۃ آلِ عمران

آیت ۱۰۳ جہاں فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا (پس ہوئے تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی) کا ذکر ہے۔
علم وحکمت، شرع ودین، معاملات کا انتظام اور دلوں کی ناصبوری حضور اکرم ﷺ کے باعث ممکن ہوا ہے ۔

حکمتش از عدل است وتسلیم و رضاست بیخ او اندر ضمیرِ مصطفیٰؐ است (پ۔چ:۸۲۷)

(شرع کا حکم عدل، تسلیم (احکام اسی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا) اور راضی بہ رضا رہنا ہے۔ شرع کا بیج حضور اکرم ﷺ کے قلبِ مبارک میں ہے۔)

علم وحکمت ریزۂ از خوانِ کیست؟ آیۂ فَاَصْبَحْتُمْ اندر شانِ کیست؟ (پ، چ:۸۳۵)

(علم وحکمت کس کے دسترخوان کا ریزہ ہے؟ یہ آیت کہ ''تم ان کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے'' کس کی شان میں نازل ہوئی؟)

علم و حکمت، شرع و دیں، نظمِ امور اندرونِ سینہ دل ہا ناصبور (پ، ج:۸۳۶)

(علم وحکمت، شرع ودین، معاملات کا انتظام سینوں کے اندر دلوں کی ناصبوری ہے)

حکمت کشفِ اسرار ہے

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پوشیدہ چیزوں کا انکشاف ہونا ہی علم وحکمت ہے۔ ایسی حکمت جس کے لئے جستجو نہ کی جائے اس کی کوئی قدر ومنزلت نہیں۔ انسان کی عقل بہت سے اہداف کا نشانہ کرنے سے معذور ہے اور اگر محبت کے ساتھ حکمت کی طرف رجوع نہ کیا جائے تب بھی حکمت بے جان اور مردہ ہوگی۔ اس کے لئے عشقِ الٰہی کا ہونا ضروری ہے۔

کارِ حکمت یہ ہے کہ وہ بہت سے نظریات کو باطل قرار دیتی ہے لیکن جب حکمت میں عرفان شامل ہو جائے تو حقیقت کو دیکھنے اور تحقیق کو آگے بڑھانے کا کام دیتی ہے۔

علم وحکمت کشفِ اسرار است وبس حکمتِ بے جستجو خوار است و بس (ج،ن:۶۸۴)

(پوشیدہ چیز کا انکشاف ہی علم وحکمت ہے بغیر جستجو کے علم بے وقعت ہے۔)

بے محبت علم و حکمت مردۂ عقل تیرے بر ہدف ناخوردۂ (ج،ن:۶۶۳)

(عشقِ الٰہی کے بغیر علم وحکمت مردہ ہے اور عقل ایسا تیر ہے جو نشانے سے دور ہے۔)

کارِ حکمت دیدن و فرسودن است کارِ عرفاں دیدن و افزودن است! (ج،ن:۷۰۳)

(فلسفے کا کام دیکھنا اور نظریات کا ابطال کرتے رہنا ہے، معرفت کا کام حقیقت کو دیکھنا اور اس میں آگے بڑھنا ہے۔)

اولیائے کرام اور حکمتِ ابلاغ

قرآن کریم کی سورۃ النحل آیت ۱۲۵ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ...(النحل۔۱۲۵)

(اے محبوب!) بُلایئے (لوگوں کو) اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت سے اور عمدہ نصیحت سے

تبلیغ یا ابلاغ کا کام بغیر حکمت کے کامیاب نہیں ہو سکتا اس لئے مبلغین کو حکمت کے ذریعے لوگوں کو دین کی طرف بلانا چاہیئے۔ اس حکمت کی تاویل بہت طویل ہے۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ بذاتِ خود تبلیغ اسلام پر مامور تھے۔ انہوں نے نادر شاہ اور دیگر لوگوں کے طریقہ ابلاغ کا ذکر کیا ہے۔ نیچے دیئے گئے پہلے شعر میں نادر شاہ کا ذکر ہے اور دوسرے میں اپنے اور سنائیؒ کے طریقہ ابلاغ کا ذکر کیا ہے۔ فرمایا کہ سنائیؒ نے حکمتِ قرآن سے لوگوں کو سبق دیا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے متعلق بیانات یا اسباق دیئے ہیں اور میں نے مردانِ حق یعنی اولیائے کرام کو اپنے کلام کا محور بنایا ہے اور ان کے کارنامہ ہائے حیات کا ذکر کیا ہے۔

در نگاہش روزگارِ شرق و غرب حکمت اُو رازدارِ شرق و غرب
(پ،چ:۸۵۸)

(نادر شاہ کی مشرق و مغرب (دونوں) کے حالات پر نگاہ تھی۔ اس کی دانائی مشرق اور مغرب دونوں کی (سیاست) کے راز جانتی تھی۔)

ہر دو را از حکمتِ قرآن سبق اوز حق گوید من از مردانِ حق (پ،ج:۸۶۲)
(ہم دونوں نے قرآن پاک کی حکمت سے فیض پایا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی بات کرتا ہے اور میں اہل اللہ کی۔)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ ''پس چہ باید کرد'' میں ''در اسرارِ شریعت'' میں ایک حدیث کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں کہ اگر تو مال کو دین کے لئے رکھتا ہے تو اچھے طریقے سے کمایا ہوا مال خوب ہے۔ اگر تیری نظر اس حکمت پر نہیں تو تُو مال کا غلام ہے اور دولت تیری آقا ہے۔ ایسا شخص ہمیشہ غریبوں کو محروم کرتا ہے اس کے برعکس وہ دولت مند شخص جو فقیرانہ زندگی بسر کرتا ہے وہ بہت مبارک ہے اور اس کی یہ بے نیازی دین کے لیے قوت بنتی ہے۔ دین اسلام میں حکمت کا منشا یہی ہے کہ اس کے فقیروں (درویشوں) میں دلنوازی پیدا ہو جائے اور ایسی بے نیازیاں کسی قوم کے لئے قوت کا سامان بنتی ہیں اور قوم مضبوط ہو جاتی ہے۔ دوسری حالت میں کوئی قوم کسی معیاری مقام تک نہیں پہنچ سکتی۔

حکمتِ دیں دل نوازی ہائے فقر قوتِ دیں بے نیازی ہائے فقر (پ،چ:۸۱۷)

(فقر کی دلنوازی حکمتِ دین سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی بے نیازی دین کے لئے قوت بنتی ہے۔)

حکمت پر آپ مزید فرماتے ہیں۔

گر نداری اندر ایں حکمت نظر تو غلام و خواجۂ تو سیم و زر (پ، چ: ۸۲۵)

(اگر تیری نظر اس حکمت پر نہیں پھر تو غلام ہے اور دولت تیری آقا ہے۔)

عالمِ واقع میں مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کے مشورے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے لئے

عالمِ واقع میں علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کو مولانا رومیؒ نے مسلمانوں کی بگڑی ہوئی حالت کا تذکرہ کیا اور آپ کو مشورہ دیا کہ وہ مسلمانوں کو فرنگی اثرات کے زائل کرنے کا حکم دیں اور لوگوں کو دین اور سیاست کے رموز بیان فرمائیں اور حکمتِ اسلام کے اسباق سے ان کو بہرہ مند فرمائیں۔

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دُنیا کے غم کھالینا اس بات سے بہتر ہے کہ غم بڑھانے والے لوگوں کا غم کھایا جائے کیونکہ عقل مند آدمی دُنیا کے غم برداشت کرسکتا ہے تاکہ حکمت اس کے ہاتھ آئے۔

معنیٔ دین و سیاست باز گوے اہلِ حق را زیں دو حکمت باز گوے

"غم خورد نانِ غم افزایاں مخور زانکہ عاقل غم خورد کودک شکر" (پ، چ: ۸۰۵)

(دین وسیاست کے معانی پھر بیان کر، اہل حق کو از سرِ نو ان کی حکمت بتا۔ غم کھالے، مگر غم بڑھانے والوں کی روٹی نہ کھا کیونکہ عقل مند غم کھاتا ہے اور بچہ شکر کھاتا ہے۔)

صحبتِ اُو ہر خزف را دُر کند حکمت اُو ہر تہی را پُر کند (پ، چ: ۸۰۹)

(اس نبی کی صحبت ہر سنگریزے کو موتی بنادیتی ہے اور اس کی حکمت ہر ایک کا دامن بھر دیتی ہے۔)

منافق اور حرام خور حکمت کے اہل نہیں

جن قوموں کی سیاست دھوکہ اور فریب پر مبنی ہے اور ان کی حکمت غریب ملکوں کی تباہی کی طرف لگی رہتی ہے وہ حکمتِ قرآن سے کبھی حصہ نہیں لے سکتے بلکہ اس سے متضاد منفی حکمت کو اپناتے ہیں۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے بالِ جبریل میں مغربی افکار اور لینن کی پالیسیوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ لوگ حکمت کو کیا جانیں جن کے رگ وریشہ میں منافقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ درج ذیل اشعار سے ہی ان لوگوں کی سیاست کا علم ہوجاتا ہے۔

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات (ب۔ ج: ۳۹۹)

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو (ب۔ ج: ۴۰۲)

علامہ اقبال "پس چہ باید کرد" میں "در اسرار شریعت" میں لکھتے ہیں کہ فرنگی اور دیگر اقوام کو حلال اور حرام میں تمیز نہ ہونے کی وجہ سے حکمت کے کام نامکمل ہیں اور ان کی حکمت یہ ہے کہ غریبوں سے روٹی چھین لی جائے اور ان کے جسموں سے جان نکال لی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تلوار صرف غریب ملکوں پر اُٹھتی ہے اور طاقت ور ملکوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتے۔

حکمتش خام است کارش ناتمام اُو نداند از حلال و از حرام

(وہ حلال و حرام میں امتیاز نہیں کرتا، اس کا فلسفہ خام ہے اور اس کا کام نامکمل ہے۔)

از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است از تنِ شاں جاں ربودن حکمت است (پ، ج:۸۲۶)

(کمزور لوگوں سے روٹی چھیننا ان کی حکمت ہے۔ ان کے بدنوں سے جان کو نکال لینا ان کی حکمت ہے۔)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے "حرف چند با اُمتِ عربیہ" میں مسلمانوں کی کیفیت کا ذکر کیا ہے اور اس میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ مسلمان ایک اُمت تھے جس کو اب مختلف قومیت میں تقسیم اور منتشر کر دیا گیا ہے۔ یہ کام مسلمانوں نے خود ہی کیا ہے کیونکہ وہ افرنگ کی چالوں کو نہ سمجھ سکے۔ ان کی ڈپلومیسی نے ہر قوم کو لاچار اور عربوں کی ٹکڑیوں میں منقسم کر دیا ہے۔

حکمتش ہر قوم را بے چارہ کرد وحدت اعرابیاں صد پارہ کرد (پ، ج:۸۳۷)

(اس کی ڈپلومیسی نے ہر قوم کو لاچار اور عربوں کو سینکڑوں ٹکڑوں میں منقسم کر دیا ہے۔)

حکمت نیٹشے کی عقل سے دُور کی بات تھی

جرمنی کا ایک مشہور فلسفی جو ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوا، وہ کہتا ہے کہ زندگی غلبہ اور اقتدار کا نام ہے۔ انسان کو چاہیے کہ طاقت حاصل کرے تا کہ دُنیا پر حکومت کر سکے۔ وہ عیسائیت کا دُشمن تھا اور خدا کا منکر تھا گو بعض اخلاقی اقدار میں اس کے افکار اسلام سے بہت قریب تھے۔ اس لیے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے لیے کہا ہے۔

ع قلب اُو مومن دماغش کافر است (اس کا دل مومن تھا اور دماغ کافر تھا)

ایک اور جگہ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ نیٹشے کے فلسفہ نے ہمیں کچھ نہیں دیا۔

نہ دیا نشانِ منزل مجھے اے حکیم تُو نے مجھے کیا گلہ ہو تجھ سے، نہ تُو رہ نشیں نہ راہی (ب۔ج:۳۳۷)

نیٹشے مقامِ کبریا تک نہیں پہنچ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مقام عقل و حکمت تک نہیں پہنچ سکا۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا۔

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں تو اقبال اس کو سمجھا تا مقامِ کبریا کیا ہے (ب۔ج:۳۴۸)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

آنچہ او جوید مقامِ کبریاست ایں مقام از عقل و حکمت ماوراست (ج۔ن:۷۴۱)

(اسے مقامِ کبریا کی تلاش تھی اور یہ مقام عقل و حکمت سے ماوراء ہے۔)

بے نصیب از حکمتِ دینِ نبی ﷺ

حکمت چونکہ اللہ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ پر نازل کی جاتی ہے اس لئے اہلِ دُنیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے ہی حکمت موصول کرتے ہیں لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں وہ اس حکمت کو حاصل کرنے سے محروم رہتے ہیں۔ ویسے تو بہت سے لوگ اس فہرست میں آتے ہیں مگر درجِ ذیل شعر میں علامہ اقبال نے مُلّا کو اس حکمت سے محروم پایا ہے اور اس کا آسمان اس روشنی سے تاریک ہے۔

بے نصیب از حکمتِ دینِ نبی ﷺ آسمانش تیرہ از بے کوکبی! (ج،ن:۶۶۴)

(وہ جنابِ رسول اللہ ﷺ کے پاک دین کی حکمت سے محروم ہے۔ اس کا آسمان ستاروں کے نہ ہونے کی وجہ سے تاریک ہے۔)

علم و حکمت کا سراغ پانا کیسے ممکن ہے

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی راتیں فکر اور مطالعہ میں بسر کرتا ہے اور اس کا سینہ حکمت کے حصول کے لئے ناصبور ہے تو نچلے درجے کے انسانوں کو بھی یہ دولت نصیب ہو جاتی ہے۔

گر کسے شبہا خورد دودِ چراغ گیرد از علم و فن و حکمت سراغ (ج،ن:۶۶۷)

(اگر کوئی شخص اپنی راتیں فکر اور مطالعہ میں بسر کرتا ہے تو علم و فن اور حکمت کا سراغ پا لیتا ہے۔)

باب ۲۲

معرفتِ الٰہی

مفردات امام راغب اصفہانیؒ میں ہے کہ "اَلْمَعْرِفَۃُ وَالْعِرْفَانُ" کے معنی ہیں کہ کسی چیز کی علامات اور آثار پر غور وفکر کر کے اس کا ادراک کر لینا۔ امام راغب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے اس سے مراد کسی چیز کی بُو کو پالینا ہے۔ صوفیاء کے نزدیک عارف کا لفظ اس کے لئے بولا جاتا ہے جسے عالمِ ملکوت اور ذاتِ الٰہی یا کسی چیز کے ساتھ حسنِ معاملہ کے متعلق خصوصی معرفت حاصل ہو۔ طریقِ رابطہ میں بھی سالک جب کسی ہستی یا اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر مراقب ہوتا ہے تو اپنے ظرف کے مطابق اس کی معرفت حاصل کر لیتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی مکمل معرفت کا حاصل ہونا کسی انسان کے لئے ممکن نہیں اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معرفتِ الٰہی کے متعلق فرمایا وَمَا عَرَفْنٰکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ یعنی اے اللہ ہم تجھے اس طرح نہیں پہچان سکے جس طرح تجھے پہچان لینے کا حق ہے۔ انسان چونکہ اللہ تعالیٰ کا مکمل علم حاصل کرنے کے قابل نہیں اس لئے کہا جاتا ہے کہ "فُلَانٌ یَعْرِفُ اللّٰہَ" (یعنی فلاں اللہ کی معرفت رکھتا ہے) اور یوں نہیں کہا جاتا کہ "فُلَانٌ یَعْلَمُ اللّٰہَ" (یعنی فلاں اللہ کا علم رکھتا ہے۔) انہی معنوں میں صحابہ کرامؓ فرمایا کرتے تھے "اَللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ" (اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بہتر جانتے ہیں) اور ہم یوں نہیں کہہ سکتے "اَللّٰہُ یَعْرِفُہٗ" یعنی اللہ تعالیٰ اس کی معرفت رکھتا ہے۔

طریقِ رابطہ میں سالک ربط قائم کرنے کے دوران مربوط کی بُو پالیتا ہے اور اولیائے کاملین اس بُو کے پالینے کے بعد اللہ تعالیٰ (مربوط) کا سراغ لگا لیتے ہیں۔ جب شکاری صحرا میں ہرن کے قدموں کے نشان پالینے کے بعد چند قدم ان نشانات پر چلتا ہے تو پھر ہرن کے نافے کی خوشبو اس شکاری کی راہنمائی کرنے لگتی ہے۔ وہ شکاری جس کی قوتِ شامہ (سونگھنے کی قوت) تیز ہوتی ہے تھوڑی دیر میں ہی ہرن کا پتا لگا لیتا ہے۔ ایسے ہی اولیائے کاملین تھوڑی دیر میں ہی طریق رابطہ کے ذریعے معرفت الٰہی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، چونکہ اپنے مربوط (جس کے ساتھ رابطہ کیا جائے) کی معرفت حاصل کرنا طریق رابطہ کا ایک ضروری امر ہے اس لئے مناسب ہوگا کہ معرفتِ الٰہی کے متعلق اس جگہ چند بزرگوں کے احوال اور اقوال بیان کر دیئے جائیں تاکہ قارئین کو معرفتِ الٰہی کی اہمیت کا علم ہو سکے۔

معرفت الٰہی کے متعلق ایک بہت مشہور حدیث میں یوں فرمایا گیا ہے: مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ

رَبَّہٗ" (اصفہانی، حلیۃ الاولیاء، ۱۰: ۲۰۸) جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا تحقیق اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے "کشف المحجوب" میں فرمایا ہے۔ جس نے اپنے آپ کو بندہ سمجھا اس نے اللہ تعالیٰ کو رب سمجھا۔ جس نے اپنے نفس کی فنا کو سمجھ لیا اس نے ذاتِ الٰہیہ کو باقی جانا اور جس نے اپنی ذات کو ذلت کے ساتھ جان لیا اس نے اپنے رب کو عزت کے ساتھ پہچانا۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا خیال ہے کہ اگر تم اپنے آپ کو تلاش کرو گے تو تم خدا کو پالو گے اور اگر تم اپنے رب کو تلاش کرو گے تو بالآخر تم خود کے سوا اور کچھ نہ پاسکو گے۔ اس موضوع پر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا کچھ کلام راقم الحروف کی تصنیف "حضورِ قلب" اور "رابطہ شیخ" میں بیان ہو چکا ہے۔

معرفتِ الٰہی کیا ہے؟

قرآن مجید کی سورۃ الذاریٰت، آیت ۵۶ میں جنوں اور انسانوں کی تخلیق کا مقصد لِیَعْبُدُوْنَ یعنی عبادت کرنا فرمایا گیا ہے اور مفسرین کرام نے اس کے معنی لِیَعْرِفُوْنَ کیے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ جنوں اور انسانوں کو اللہ کی معرفت حاصل کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ سورۃ المائدہ کی آیت ۸۳ میں فرمایا گیا ہے کہ قرآن کی آیات جب نازل ہوتی ہیں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین پہچان لیتے کہ یہ کلامِ حق ہے یعنی معرفت وہ چیز ہے کہ جس کے ذریعے حق اور ناحق کا علم ہو جاتا ہے اور عارف کو بھی حق اور ناحق میں تمیز ہو جاتی ہے۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے۔

وَمَاقَدَرُوااللہَ حَقَّ قَدْرِہٖٓ (الانعام: ۹۱)　　اور نہ قدر پہچانی انہوں نے اللہ کی جیسے حق تھا اس کی قدر پہچاننے کا

اس آیت مقدسہ میں معرفت الٰہی کو بیان کرنا ہی مقصود ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ دین کا دارومدار معرفت باللہ، یقین اور ایسی عقل پر ہوتا ہے جو برائیوں سے روکے۔ اس حدیث میں عقل سے مراد یہ ہے کہ اپنے آپ کو اللہ کی نافرمانی سے روکنا اور اللہ کی اطاعت کی خواہش کرنا ہے۔ علمائے کرام "علم" کو بھی معرفت کا ذریعہ کہتے ہیں لہٰذا ہر علم بھی معرفت ہے۔ چنانچہ سائنس دان جب کسی نئی چیز کو دریافت کرتے ہیں تو ان کو خدا کی معرفت ہی حاصل ہوتی ہے اور کئی سائنس دانوں کو بالآخر یہ کہنا پڑا کہ اے اللہ ہم تیری کائنات کے متعلق جتنا زیادہ علم حاصل کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم تیری قدرت کے خزانوں کے بارے میں اتنا ہی کم جانتے ہیں جتنا کہ ایک بچہ سمندر کے کنارے سمندر کے پتھروں سے کھیلتا ہے۔ صوفیاء کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو عارف کر دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کو پہچانے، اپنے معاملات میں سچا ہو اور آفات نفس سے پاک ہو کر اللہ کے دروازے پر طویل عرصہ کے لیے کھڑا رہا ہو، تب جا کر اللہ تعالیٰ تقدیروں کے

ردّوبدل کا راز اسے بتاتا ہے۔ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے جب معرفت کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اس کی ابتدا ذکر سے ہوتی ہے مگر اس کی انتہا کوئی نہیں ہے۔

یحیٰی بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جب بندہ معرفت حاصل کرنے کی راہ میں ہوتا ہے تو اسے کہا جاتا ہے کہ اپنے اختیار سے دور رہ یہاں تک کہ تجھے عرفان مل جائے اور جب عارف ہو جائے تو کہا جاتا ہے کہ اب تو کوئی چلہ اختیار کر یا نہ کر تیری مرضی ہے کیونکہ تیرا اختیار ہمارے (یعنی اللہ کے) اختیار کے ساتھ ہوگا اور تیرا ترک ہمارے اختیار سے ترک ہوگا۔ کہتے ہیں کہ عارف نیکوں کے ساتھ بھی معرفت کا ذکر نہیں کرتا چہ جائیکہ دُنیاداروں سے کرے اور اگر عارف رب کی اجازت کے بغیر مخلوق کی طرف متوجہ ہوا تو سمجھ کہ رُسوا ہوگیا۔

حضرت محمد بن احمد بن حمدون رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کمالِ معرفت کا مقام اس وقت آتا ہے جب بندے کے لئے متفرقات ایک ہو جائیں۔ احوال و مقامات یکساں ہو جائیں اور احساسِ تمیز مٹ جائے یعنی بندے کا وقت ایک جیسا ہو (ہر حالت میں اللہ سے لو لگائے رکھے) اور ماسوائے اللہ سے منقطع رہے۔

ابوالحسن ثوری رحمۃ اللہ علیہ کو پوچھا گیا کہ آپ نے اللہ کو کس ذریعے سے پہچانا ہے تو فرمایا کہ اللہ ہی کے ذریعے سے۔ فرمایا عقل تو عاجز ہے لہٰذا کسی عاجز چیز کو بھی نہیں پہچان سکتی ہے۔ جب اللہ نے عقل کو پیدا فرمایا اور پوچھا کہ میں کون ہوں تو عقل خاموش رہی۔ پھر جب اس کو سرمۂ وحدانیت لگایا گیا تو پکار اُٹھی ''تو اللہ ہے'' یعنی عقل نے بھی اللہ کو اللہ کے ذریعے ہی پہچانا۔

معرفت، آتشِ شوق اور وجد ہے جب کہ ایمان نور اور عطاو بخشش ہے۔ مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے اور عارف اللہ کی آنکھ سے۔ مومن صاحبِ قلب ہوتا ہے اور عارف قلب نہیں رکھتا۔ مومن خدا کے ذکر سے مطمئن ہو جاتا ہے اور عارف کو سوائے محبوب ازلی کے قرار نہیں ملتا۔ گویا ایک ذکر حبیب میں محو ہے تو دوسرا رخ یار کے مشاہدے سے شادکام ہے۔

سیرِ عارف ہر دمے تا تختِ شاہ سیرِ زاہد ہر مہے یکروزہ راہ

(عارف کی سیر ہر لحہ شاہ کے تخت تک ہے، زاہد کی سیر ہر مہینہ ایک دن کے راستہ پر ہے۔)

منقول ہے کہ جب ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ نے بلخ کی بادشاہت مردانہ وار چھوڑی اور معرفتِ الٰہی کے راستے میں قدم رکھا تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جو دُنیا بھر کے مقتدا تھے کی خدمت میں حاضری دی۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آپ رحمۃ اللہ علیہ کا استقبال کیا۔ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، ''اے امام رحمۃ اللہ علیہ میرے حق میں کیا ارشاد ہے کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا، ''تمہیں علم حاصل کرنا چاہیے۔'' حضرت ابراہیم بن ادھمؒ نے جواب دیا کہ ایک حدیث میں ہے کہ

تَرْکُ الدُّنْیَا رَاْسُ کُلِّ عِبَادَۃٍ وَ حُبُّ دُنیا کو ترک کرنا ہر عبادت کی بُنیاد ہے اور دُنیا کی

اَلدُّنْیَا رَاْسُ کُلِّ خَطِیْئَۃٍ (مبارکفوری، تحفۃ الا حوذی، ۱۰، ۵۶، رقم ۳۶۰۹)　محبت ہر گناہ کی اصل ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، "ہم نے اس حدیث پر عمل کیا ہے اور تخت و تاج کو چھوڑ دیا ہے۔ فرمایا تم کو اتنا علم ملا بھلا بتاؤ تم نے بھی کوئی کام کیا ہے۔" امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ بات سن کر مدہوش ہو گئے اور کچھ دیر بعد جب ہوش میں آئے تو فرمایا۔ "تمہیں تحصیلِ علم کی ضرورت نہیں۔ اہلِ معرفت کی صحبت اختیار کرو۔"

معرفت کی قسمیں

معرفت کی درج ذیل دو قسمیں بیان کی جاتی ہیں۔

i　معرفتِ نظری: یہ وہ معرفت ہے جس میں کسی چیز کی علامت اور آثار میں فکر و نظر یا غور و تدبر کرنے سے اللہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ "امداد السلوک" میں ہے کہ معرفت اللہ کی طرف سے ہدایت ہے اور اس (کی پہلی قسم یعنی معرفت نظری) کا دوسرا نام معرفت استدلالی ہے کیونکہ اس معرفت میں دُنیا کی اشیاء کو دیکھ کر اللہ تک رسائی حاصل کر لی جاتی ہے، جیسا کہ فرمایا۔

سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَ فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (حٰمۤ السجدہ: ۵۳)　ہم دکھائیں گے انہیں اپنی نشانیاں آفاق (عالم) میں اور ان کے اپنے نفسوں میں تاکہ ان پر واضح ہو جائے کہ قرآن واقعی حق ہے۔

معرفت کی یہ قسم اہلِ علم اور علمائے راسخین کو حاصل ہے کیونکہ وہ دُنیا کی نشانیوں کے ذریعے اللہ تک راستہ پاتے ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ظاہری عالم (کائنات) کو اپنی معرفت کی دلیل بنایا ہے اسی طرح انسان میں موجود عالمِ باطن کو بھی دلیلِ معرفت بنایا ہے کیونکہ ظاہر میں دلیل ہو اور باطن میں دلیل نہ ہو تو اس سے دلیل میں تعطل کا ہونا ثابت ہوتا ہے، چنانچہ ایسی دلیل کو دلیل نہیں کہا جا سکتا۔ قرآن مجید میں ہے کہ جس کا باطن نورِ مشاہدہ سے منور نہیں وہ اندھا ہے جو اس دُنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہے۔ جو شخص اطاعت نفس میں لگا رہتا ہے اسے اللہ تعالیٰ اپنے مشاہدہ سے دور کر دیتا ہے۔

ii　معرفت شہودی: معرفت شہودی یہ ہے کہ بغیر استدلال یعنی بغیر غور و فکر کے پہلی ہی نظر میں اس چیز کی معرفت حاصل کر لے۔ یہ درجہ صدیقین کا ہے۔ اس معرفت کا نام یقین اور احسان بھی ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ داؤد علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ اے داؤد جانتے ہو کہ میری معرفت کیا ہے؟ تو آپ نے عرض کی نہیں! تو ارشاد ہوا۔

وَهُوَ حَيَاةُ الْقَلْبِ بِمُشَاهَدَتِيْ (کشف المحجوب) اور وہ قلب کی حیات ہے میرے مشاہدے سے۔

قرب اور معرفت

قربِ الٰہی سے مراد قرب عرفانی ہے اور عرفان جتنا ہوگا قرب میں اتنی ہی ترقی ہوگی۔ قرب کا دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ جتنا اللہ کی صفات یا اخلاق کو اپناؤ گے اتنا ہی قرب ہوگا جیسے کہ اللہ نے ارشاد فرمایا۔

تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کے اخلاق سے اپنے آپ کو متصف کر لو۔ (التعرف لمذہب التصوف: ج ۱، ص ۵)

صفاتِ الٰہی کی دو قسمیں ہیں: i: اللہ کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ نیک و بد پر یکساں مہربان ہے جیسے وہ رحمٰن کی صفت سے متصف ہے۔ ii: دوسری صفت یہ ہے کہ وہ نیکوں پر بدوں کی نسبت زیادہ مہربان ہے۔ جیسا کہ رحیم کی صفت سے متصور ہے، لیکن بسم اللہ شریف میں دونوں صفاتِ الٰہیہ، رحمٰن اور رحیم موجود ہیں اور عرفان یہ ہے کہ تمام علم بسم اللہ کی ''ب'' کے نقطے میں موجود ہے۔ عشق بھی عرفان سے پیدا ہوتا ہے اس لیے عشق کی کوئی انتہا نہیں یعنی جوں جوں عشق بڑھتا جاتا ہے عرفان میں بھی ترقی ہوتی جاتی ہے اور جب عرفان کی کوئی انتہا نہیں تو عشق کی بھی کوئی انتہا ممکن نہیں۔

عرفانِ الٰہی پانے والے خوش نصیب

کتبِ تصوف ایسی عظیم شخصیات کی مثالوں سے بھری پڑی ہیں جن کو اپنے اپنے ظرف اور استعداد کے مطابق معرفتِ الٰہی نصیب ہوئی۔ طوالت کے خوف سے صرف چند ایک مثالیں جو کیمیائے سعادت سے ماخوذ ہیں، پر اکتفا کیا جارہا ہے تاکہ ایسے عارفین کی روایات، حالت اور احوال کو سن کر معرفت کی بات سمجھ میں آجائے۔

احادیث میں ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دوسرے صحابہؓ پر نماز روزے کی وجہ سے فضیلت نہیں ملی بلکہ ایک پوشیدہ راز کی وجہ سے ملی ہے۔ آپ ﷺ کے اس فرمان سے مراد یہ تھی کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی معرفت باقی تمام صحابہ رضی اللہ عنہم سے زیادہ تھی۔ ایک حدیث میں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ قیامت کے دن حق تعالیٰ کی ایک تجلی تو عوام کے لئے ہوگی اور ایک جلوہ وہ بھی ہوگا جو خاص ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لئے ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لذت دیدار حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ہوگی وہ دوسروں کو میسر نہیں ہوگی کیونکہ لذت دیدار کا انحصار حاصل کردہ معرفت کی بلندی کے مطابق ہوگا۔

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ دُنیا سے متنفر ہو کر گوشہ نشیں ہوگئے۔ جب لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے یہ گوشہ نشینی دوزخ کے خوف اور جنت کے حصول کی خاطر کی ہے تو آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، ''یہ بھی کوئی چیزیں

ہیں؟ اگر تم بادشاہ حقیقی کی دوستی کی لذت چکھ لو تو ان تمام باتوں کو بھول جاؤ۔ معرفتِ الٰہی کے مقابلے میں کوئی چیز نہیں آسکتی۔''

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ '' عَلِیُّ بْنُ الْمُوَفِّقِ '' فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں بے شمار لوگوں کو جنت میں کھانا کھاتے دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ ایک شخص کھانا نہیں کھا رہا بلکہ اپنی مبہوت آنکھیں کھول کر اللہ کی طرف نظر جمائے ہوئے تھا۔ فرماتے ہیں کہ میں نے رضوان جنت سے پوچھا کہ یہ بزرگ کون ہیں؟ تو فرمایا یہ معروف کرخی (رحمۃ اللہ علیہ) ہیں اور ان کو اپنے شوقِ دیدار اور عشقِ الٰہی کے باعث اللہ کی طرف یوں دیکھتے رہنا مباح کر دیا گیا ہے۔

حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے وصال کے بعد کسی نے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ ابونصر تماد رحمۃ اللہ علیہ اور عبدالوہاب وراق رحمۃ اللہ علیہ کا کیا حال ہے۔ فرمانے لگے ابھی ابھی میں انہیں جنت میں چھوڑ کر آیا ہوں۔ وہ بہشتی کھانے کھا رہے تھے۔ جب پوچھا گیا کہ آپ کا کیا حال ہے تو فرمایا کہ اللہ جانتا ہے کہ مجھے کھانے پینے سے کوئی غرض نہیں مجھے تو اللہ کا دیدار ہی کافی ہے اور وہ مجھے میسر ہے۔

ابوسلیمان درانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو آج اپنے آپ میں اور دُنیا میں مصروف ہے وہ قیامت کے دن بھی اپنے (پچھتاوے) میں مصروف ہوگا اور جو آج حق تعالیٰ میں مصروف ہے قیامت کے دن بھی اللہ کے دیدار میں مصروف ہوگا۔

یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ نقل کرتے ہیں کہ ایک رات انہوں نے دیکھا کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بہت طویل سجدہ کیا اور پھر اٹھے تو اپنے پنجوں کے بل کھڑے ہو گئے اور اپنی مبہوت آنکھیں کھول کر تمام رات اسی طرح کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ سے باتیں کرتے رہے۔ میں ان کی باتیں سنتا رہا۔ جب انہوں نے مڑ کر دیکھا تو میں نے عرض کیا کہ اپنے احوال کے متعلق مجھے بھی کچھ بتائیں۔ فرمایا تیرے حال کے متعلق جو بات ہے صرف وہی تجھے بتاتا ہوں۔ پھر فرمایا آج اللہ تعالیٰ نے مجھے ملکوتِ اسفل سے ملکوتِ اعلیٰ تک سب کچھ دکھایا اور پوچھا مانگو کیا مانگتے ہو! میں نے عرض کیا بار الٰہ مجھے ان چیزوں میں سے جو تو نے مجھے دکھائی ہیں کچھ نہیں چاہیے۔ تب ارشاد ہوا '' بے شک تو میرا اور صرف میرا بندہ ہے۔'' حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ اگر تجھے خُلّتِ ابراہیم علیہ السلام، مناجاتِ موسیٰ علیہ السلام اور روحانیتِ عیسیٰ علیہ السلام بھی عطا ہو جائے تو خدا سے منہ نہ موڑ کیونکہ وہ ان تمام چیزوں سے بڑھ کر شان رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ جب میں کسی بندے کے دل کی طرف دیکھتا ہوں کہ اس میں نہ طلب دُنیا ہے اور نہ طلب آخرت تو اپنی محبت کو اس میں موجود پاتا ہوں۔ پھر اس کی حفاظت بھی خود کرتا ہوں۔ رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا سے پوچھا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کیسی ہے؟ تو کہا کہ بے حد مشکل

لیکن محبتِ الٰہی نے مجھے دوستی خلق سے بے نیاز کر دیا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب ''کیمیائے سعادت'' میں ایک واقعہ لکھا ہے (جس کی روایت قوت القلوب کی عبارت سے ذرا مختلف ہے) وہ یہ کہ ابوتراب نخشبی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مرید انتہائی استغراق کی حالت میں رہتا تھا۔ ایک روز آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ابویزید رحمۃ اللہ علیہ کا دیدار عین روا ہے۔ بولا کہ ہوگا مگر میں تو دیدارِ الٰہی میں مشغول ہوں۔ ایک دن پھر یہی بات ہوئی اور مرید نے کہا کہ میں تو ستر بار اللہ کا دیدار کر چکا ہوں، ابویزید کو کیا کروں؟ ابوتراب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اگر تم ایک بار ابویزید کو دیکھ لو تو وہ خدا کو ستر بار دیکھنے سے بہتر ہے۔ مرید یہ سن کر سناٹے میں آ گیا اور کہا کہ آپ نے یہ کیسے کہہ دیا؟ فرمایا کہ تو خدا کو اپنی بساط کے مطابق دیکھتا ہے اور اگر تم بایزید رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھو تو خدا کو ان کی بساط کے مطابق جلوہ فرما پاؤ گے۔ مرید کو یہ بات سمجھ میں آ گئی اور کہا کہ چلیے ابھی چلیے۔ جب وہ ایک ٹیلے پر پہنچے جہاں ابویزید رحمۃ اللہ علیہ ایک حجرہ سے باہر نکل رہے تھے تو مرید نے ان کو دیکھا اور ایک نعرہ مارا اور اپنی جان دے دی۔ ابوتراب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا کہ بایزید رحمۃ اللہ علیہ کی ایک نگاہ نے اسے مار ڈالا تو حضرت ابویزید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا نہیں! بلکہ یہ مرید اپنے قول میں سچا تھا اور اس کے اندر ایک راز پنہاں تھا جو اس پر اپنی قوت سے آشکار نہیں ہو رہا تھا۔ جب اس نے ہمیں دیکھا تو یہ راز آشکار ہو گیا اور وہ بیچارا چونکہ ضعیف تھا اس کی تاب نہ لا سکا اور ہلاک ہو گیا۔

معرفت پر مشائخ کے اقوال

ایک حدیث پاک میں ہے کہ ہر چیز کی ایک معدن (کان) ہے اور تقویٰ کی معدن صاحب معرفت کا دل ہے، اسی واسطے ان لوگوں کا نام عارف رکھا گیا ہے۔ کتب تصوف سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بعض صوفیاء معرفت اس کو کہتے ہیں کہ جس کے دل پر معبود حقیقی یعنی اللہ جل شانہٗ کے علوم پے در پے وارد ہوتے ہوں اور اس کی عقل بالکل زائل ہو جائے اور ان علوم کے آثار اس پر ظاہر ہو جائیں۔ مشائخ کرامؒ کے اقوال میں سے ہے کہ جس کو معرفت حاصل نہ ہو اسے چاہیے کہ چپ رہے مبادا کہ خلاف ادب کوئی بات کہہ دے اور جس کو معرفت حاصل ہوگی اس پر خود بخود سکوت لازم آ جاتا ہے کیونکہ بے کیف ذات کا حال بیان ہو ہی نہیں سکتا اسی لئے کہا گیا ہے کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ كَلَّ لِسَانُهٗ یعنی جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس کی زبان گنگ ہو گئی۔ مشائخ کا تجربہ ہے کہ مناظرہ سے قلب سخت ہوتا ہے، لہٰذا کسی سے بحث مباحثہ نہ کرو کیونکہ اس سے للہیت ختم ہو جاتی ہے اور انسانیت اور انانیت آ جاتی ہے۔ بحث و مباحثہ میں بسا اوقات انسان اپنے نظریئے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے غلط، ناجائز اور کبھی کفریہ کلمات بھی کہہ جاتا ہے۔ جب دیکھو کہ بحث غلط انداز میں شروع ہو گئی ہے تو فوراً موضوع گفتگو کو بدل دو۔

صوفیائے کرامؒ نے کہا ہے کہ جس نے اللہ کو پہچان لیا اس پر دُنیا باوجود وسعت کے تنگ ہو جاتی ہے۔ اس کی زندگی پاک ہو جاتی ہے۔ زندگی میں مزہ معلوم ہوتا ہے ہر چیز اس سے ڈرتی ہے۔ مخلوق کا خوف اس سے جاتا رہتا ہے اور وہ اللہ کے ساتھ انس محسوس کرتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ معرفت سے حیا اور تعظیم پیدا ہوتی ہے جس طرح توحید سے رضا و تسلیم پیدا ہوتی ہے اسی طرح عارف کو دُنیا کی کوئی خواہش نہیں رہتی اور اس کے لیے جدائی اور وصل کوئی معنی نہیں رکھتی۔

معرفت کے موضوع پر مشائخ کرامؒ نے کچھ حیرت انگیز نکات کو اپنے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے اور ان میں سے ہر ایک کے کلام میں الگ لذت اور شیرینی پائی جاتی ہے۔ مناسب ہوگا کہ قارئین کرام کو بھی ان کے ارشادات سے محظوظ کیا جائے۔ چنانچہ چند مشائخ کرام رحمۃ اللہ علیہم کے اقوال نیچے پیش کیے جا رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''پاک ہے وہ ذات جس نے بندوں کو اپنی معرفت کے متعلق اس سے سوا نہیں بتایا کہ وہ اسے اپنی عقلِ قاصر سے ہی پہچانیں۔ فرمایا جس نے معرفتِ حق کو جان لیا اس کو فاقہ اور وحشت ہرگز نہ پہنچے گی اس لئے کہ وہ ہر دم اللہ کے ساتھ ہے اور اسی میں محو ہے۔

(۲) حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ

آپؒ فرماتے ہیں کہ عارف نیند اور بیداری میں اللہ کے سوا کچھ نہیں دیکھتا۔ وہ غیر اللہ کی نہ تو موافقت کرتا ہے اور نہ ہی مطالعہ۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا گیا کہ معرفت کی حقیقت کیا ہے؟ تو فرمایا، ''ذکرِ الٰہی کے باعث حیرت اور پریشانی۔'' یعنی ذاکر خود کو مذکور یعنی ذاتِ حق تعالیٰ میں کمالِ حضور کے سبب اپنے ذکر کو بھی حیرانی تصور کرتا ہے۔ جہل کے متعلق آپ رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا گیا تو فرمایا، ''اللہ کی یاد سے غفلت کا نام جہل ہے۔''

(۳) حضرت ابوتراب رحمۃ اللہ علیہ

آپ رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ عارف کی علامت کیا ہے؟ فرمایا جسے کوئی چیز مکدر نہ کر سکے لیکن ہر چیز اس سے صفائی حاصل کرے۔

(۴) حضرت ابوعثمان مغربی رحمۃ اللہ علیہ

آپ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عارف کے لیے علم کے انوار روشن ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے وہ غیب کی

عجیب وغریب باتیں دیکھ لیتا ہے۔

(۵) حضرت ابو یحیٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ

آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ عارف مخلوق کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ان سے الگ ہوتے ہیں۔

(۶) حضرت ابو سعید خراز رحمۃ اللہ علیہ

آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ معرفت اپنی طرف سے پوری کوشش کرنے اور سخاوت ایزدی (عطا) سے حاصل ہوتی ہے۔ آپ نے معرفت کے متعلق یوں بھی فرمایا ہے کہ معرفت کے سرچشمے دو ہیں، ایک آنسو بہانا اور دوسرا مقدور بھر مجاہدہ کرنا۔

(۷) حضرت ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ

آپ رحمۃ اللہ علیہ سے جب پوچھا گیا کہ اللہ کو عقل پا بھی نہیں سکتی اور عقل کے بغیر وہ پہچانا بھی نہیں جا سکتا تو اس کے متعلق آپ (رحمۃ اللہ علیہ) کیا فرماتے ہیں۔ فرمایا کہ محدود غیر محدود کو، مکلّف غیر مکلّف کو اور کیف والا بے کیف کو کیسے پا سکتا ہے۔ کیف وکوائف، زمان ومکان اور اوّل واوّلیت کو پیدا کرنے والا ان چیزوں کے احاطے میں کیسے آ سکتا ہے۔ البتہ وہ کبھی وصل سے نوازتا ہے اور کبھی ہجر سے تاکہ تجدید لذت کا کام جاری رہے۔ اسی لیے وہ مشاہدے سے نہیں بلکہ صفتِ تخلیق سے پہچانا جاتا ہے۔

(۸) حضرت احمد بن عطا رحمۃ اللہ علیہ

آپ رحمۃ اللہ علیہ کے فرمان کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا کو خدا کے سوا کسی نے نہیں جانا اور نہ ہی کسی نے اس کے سوا اس کو چاہا ہے کیونکہ اس کی صمدیت (بے نیازی) احاطہ اور ادراک کو روکے ہوئے ہے۔ فرمایا کہ عارف ایک بندہ ہی تھا جو ظاہر ہو گیا۔ (یعنی ممتاز ہو گیا۔) علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

تو نے یہ کیا غضب کیا، مجھ کو بھی فاش کر دیا   میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

(ب ج:۲۹۷)

(۹) حضرت رویم رحمۃ اللہ علیہ

آپ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ معرفت عارف کے لیے آئینہ ہوتی ہے۔ جب عارف اس میں دیکھتا ہے تو اسے اپنا خدا نظر آتا ہے۔ فرمایا عارفین کی ریا مریدین کے اخلاص سے بہتر ہے۔

(۱۰) حضرت ابو علی دقاق رحمۃ اللہ علیہ

آپؒ فرماتے ہیں کہ دل میں ہیبتِ الٰہی کا پایا جانا اور دل میں سکون ہونا معرفت کی علامت ہے۔ جس

قدر زیادہ ہیبت ہوگی معرفت بھی اسی قدر زیادہ ہوگی اور اتنا ہی زیادہ دلی سکون ہوگا۔

(۱۱) حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ

آپؒ فرماتے ہیں کہ عارف کا بجز اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، نہ ہی اس کو اللہ سے کوئی شکایت ہوتی ہے، نہ اسے اللہ کے بغیر قرار آتا ہے اور نہ ہی اللہ سے اسے فرار ہوتا ہے۔ آپ سے دریافت کیا گیا کہ بندہ مشاہدے پر کب فائز ہوتا ہے، فرمایا جب شاہد (اللہ) ظاہر ہو جائے، شواہد فنا ہو جائیں، حواس جاتے رہیں اور احساس مضمحل پڑ جائے۔

ایک اور جگہ آپؒ نے فرمایا ہے کہ اپنے اعمال اور ماسویٰ اللہ پر نظر نہ ڈالنا کامل معرفت ہے۔ آخرت میں اللہ کا دیدار ایسے ہی ہوگا جیسے دُنیا میں معرفت حاصل تھی کیونکہ وہ اطراف و اکناف اور حد اور تناہی (جسمیت) سے پاک ہے۔

(۱۲) حضرت ابوالحفص رحمۃ اللہ علیہ

آپ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب سے میں نے اللہ کو پہچانا میرے دل میں کوئی چیز داخل نہیں ہو سکی۔

(۱۳) حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ

فرماتے ہیں کہ عارف کے ساتھ میل جول رکھنا اسی طرح ہے جس طرح اللہ کے ساتھ میل جول رکھنا ہے، کیونکہ وہ اخلاقِ خداوندی سے موصوف ہونا چاہتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہر چیز کے لیے سزا ہے اور عارف کی سزا یہ ہے کہ وہ ذکر سے منقطع کر دیا جائے۔

(۱۴) حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ

''غنیۃ الطالبین'' میں فرماتے ہیں کہ معرفت خداوندی کی اساس یہی ہے کہ بندہ کے دل میں اللہ تعالیٰ کی صفات اور قدرتوں کا مکمل احساس ہو اور اگر ایسا ہو تو اس کو یقین ہو جائے گا کہ اللہ اس پر شاہد ہے اور اس کے علم میں کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ ایسے یقین کے بعد اس کی عقل کامل اور عزم درست ہو جائے گا اور اسے محاسبہ کا مرتبہ مل جائے گا اور اللہ کی معرفت حاصل ہو جائے گی۔ اس کے ہر عمل میں اللہ کا خوف پیدا ہو جائے گا اور وہ اللہ کے ساتھ رہے گا۔ اس کے دل کی نگرانی کی جائے گی اور وہ لاحاصل مقاصد سے الگ ہو جائے گا۔ جب اسے اللہ کا قرب حاصل ہوگا تو اسے اللہ سے شرم محسوس ہوگی اور وہ پسندیدہ اعمال بجالائے گا اور اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہوگی جس سے اللہ تعالیٰ کی آگہی کا خیال پہلے سے اس کے دل میں موجود نہ ہو۔

(۱۵) حضرت شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ

آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ زاہدین کے زندگی بسر کرنے کے تمام احوال کا علم ہونا علم معرفت ہے۔ اس سے آپ رحمۃ اللہ علیہ کی مراد یہ ہے کہ جب زاہدین کی زندگی کے احوال معلوم ہوں تو ہر شخص کے دل میں ایسی زندگی بسر کرنے کی اُمنگ پیدا ہوگی۔

(۱۶) حضرت حسین بن منصور رحمۃ اللہ علیہ

اللہ تعالیٰ خواطر کے ذریعے عارف پر وحی نازل فرماتا ہے اور بُرے خیال اس کے نزدیک نہیں آتے اور اس کے باطن کی حفاظت کرتا ہے تاکہ اس میں ماسوا کا خیال نہ آئے۔

(۱۷) حضرت ابوطیب رحمۃ اللہ علیہ

آپؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا انسان کے باطن پر مسلسل انوار سے طلوع ہونا معرفت کہلاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عارف جو کچھ کہتا ہے وہ اس سے بلند تر ہوتا ہے اور عالم جو کچھ کہتا ہے اس کا درجہ اس سے کم تر ہوتا ہے۔

(۱۸) حضرت ابوسلیمان درانی رحمۃ اللہ علیہ

آپؒ فرماتے ہیں کہ عارف کے لئے اللہ تعالیٰ بستر پر وہ چیزیں کھول دیتا ہے جو اوروں پر نماز میں بھی نہیں کھلتیں۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی فرمایا کہ خلق کے اعمال اللہ تعالیٰ کو راضی یا ناراض نہیں کرتے۔ وہ جس سے راضی ہو جائے اسے ایسے اعمال میں لگا دیتا ہے جو اس کی رضا کا باعث ہوتے ہیں اور جس سے ناراض ہو اسے ایسے کاموں میں لگا دیتا ہے جو اس کی ناراضگی کا باعث بنتے ہیں۔

(۱۹) حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ

آپ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عارف وہ ہے جو خود تو خاموش رہے اور حق تعالیٰ اس کے اسرار بیان کرے۔ فرماتے ہیں کہ عارف اپنے وقت کے حکم کے ماتحت ہوتا ہے کیونکہ پانی کا رنگ وہی ہوتا ہے جو اس کے برتن کا ہوتا ہے۔ اسی طرح عارف کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک ہی کیفیت رہتی ہے۔ خواہ احوال یا اوقات بدلتے رہیں۔ جب پوچھا گیا کہ عارفین اللہ سے کیا چاہتے ہیں فرمایا اپنے لیے حفاظت اور پناہ طلب کرتے ہیں۔

(۲۰) حضرت واسطی رحمۃ اللہ علیہ

آپؒ فرماتے ہیں کہ خبر سے کسی چیز کو جاننا علم ہے اور جس سے معلوم کرنا معرفت ہے۔ معرفت چونکہ غفلت کے بعد ہوتی ہے اس لئے اللہ کے لئے معرفت کا اطلاق نہیں ہوتا کہ اُسے عارف کہا جائے کیونکہ اس کا

علم قدیم ہے۔ فرمایا کہ جس نے اللہ کو پہچان لیا وہ غیر اللہ سے منقطع ہو گیا۔

(۲۱) حضرت سہل تستری رحمۃ اللہ علیہ

آپؒ فرماتے ہیں کہ نفس کو گندگیوں سے پاک کر کے اوامر و نواہی کی پابندی لازم کرنا، سنت کی اقتداء اور ادب کی رعایت رکھ کر اپنے صاف ستھرے نفس کو بارگاہِ الٰہی کا مقرب بنانا معرفت ہے۔

(۲۲) حضرت ابن عطار رحمۃ اللہ علیہ

آپؒ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ سے ایسا معاملہ رکھو کہ اس کے انعامات اور عنایات مثلاً ہوا میں اُڑنا، پانی پر چلنا وغیرہ کو عجب بات محسوس نہ کرو کیونکہ حق تعالیٰ کا ہر کام اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔

(۲۳) حضرت احمد بن یحییٰ بن الجلال رحمۃ اللہ علیہ

آپؒ فرماتے ہیں کہ عارف کے تمام ارادے اور قوتیں اس کے مولا کی طرف موقوف ہوں تو وہ ہرگز اپنے مولا کے حکم کے بغیر کسی طرف رجوع نہیں کرتا۔

(۲۴) حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ

حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہ‘ کی تشریحات سے مراد معرفتِ انسانیت ہے۔ چنانچہ آپ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آدمی کا نفس ایک آئینۂ معرفتِ الٰہی ہے جو کوئی اس میں دیکھے، وہ حق تعالیٰ کو دیکھتا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں، ''معرفت علم شریعت جانے بغیر صحیح نہیں اور اتباعِ شریعت بغیر مقاماتِ رُشد و ہدایت (یعنی طریقت) جانے نہیں ہو سکتی۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ کُنْتُ کَنْزًا مَّخْفِیًا والی حدیث میں اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ کائنات کا سبب اپنی پہچان کرنا قرار دیا ہے۔ یعنی میں (اللہ تعالیٰ) ایک مخفی خزانہ تھا پھر میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں اپنی صفات رزّاقی، رحیمی، غفاری، ستاری وغیرہ سے اور یہ اس وقت ہی ممکن تھا کہ مخلوق کو پیدا کیا جاتا۔ چنانچہ اس حدیث سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آخر وہ اپنی صفات سے اسی وقت پہچانا گیا جب اس نے مخلوق کو پیدا فرمایا۔ گویا تخلیقِ کائنات کا مقصد اللہ کی معرفت حاصل کرنا ہے اور صفات کے ذریعے ہی معرفت ہو سکتی ہے۔

معرفت پر مذکورہ بالا گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی معرفت کا خواہش مند ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کا رویہ اختیار کرے اور محبت کی علامت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات پر نظر رکھے۔ اتباعِ شریعت کا اہتمام کرے اور اولیائے کرام رحمۃ اللہ علیہم کی صحبت اختیار کرے تاکہ اس کی روحانی معاملات میں راہنمائی ہو سکے۔ ایک حدیث شریف کو حضرت مخدوم علی الہجویری رحمۃ اللہ علیہ

نے ''کشف المحجوب'' میں نقل کیا ہے کہ اپنے پیٹوں کو بھوکا اور جگروں کو پیاسا رکھو تاکہ اللہ تعالیٰ کے نور کا مشاہدہ کر سکو۔ صوفیاء کا خیال ہے کہ بزرگوں سے خالی پیٹ توجہ لی جائے یا مریدین کو اس حالت میں توجہ دی جائے تو اس کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔

تعینات کے فہم کے بغیر عرفانِ الٰہی میں ترقی ممکن نہیں

اس دُنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ عالم مثال (META PHYSICAL WORLD) میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس وقوع کو عالم مثال میں دیکھ لیتے ہیں۔ خواب کی حالت میں جب کوئی چیز دیکھی جائے تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دیکھنے کا تعلق آنکھ سے نہیں ہوتا بلکہ اسے روح کے ذریعے دیکھا جاتا ہے۔ حقیقتاً دیکھنے والی چیز روح بھی نہیں بلکہ دیکھنے والی چیز ''انا'' ہے جو ''حقیقی انا'' کی بازگشت (رجوع کرنا یا لوٹ آنا) ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ میری روح میرا جسم اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب چیزیں آپ کی ہیں مگر آپ کچھ اور ہیں۔ روح سے مراد بھی آپ نہیں کیونکہ اس کو آپ کی روح کہا جاتا ہے اور خالی جسم ہو تو بھی یہ آپ کی میت ہی کہلائے گی۔ جو جسم کا روح سے تعلق ہے وہی روح کا آپ کے ساتھ تعلق ہے۔ جس طرح جسم روح کا لباس ہے اسی طرح روح بھی ''انا'' کا لباس ہے اور ''انا'' جب ''انائے حقیقی'' کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے تو تمام راز کھلنے لگ جاتے ہیں اور ہر چیز کی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے۔ انسان کے جسم میں ایک مُضغہ'' (گوشت کا لوتھڑا) ہے۔ اس مضغہ میں نورانی دل ہے۔ جس کو فواد کہتے ہیں اور فواد میں روح ہے اور روح میں سِرّ ہے اور سِرّ میں خفی ہے اور خفی میں اخفیٰ ہے اور اخفیٰ میں ''انا'' ہے۔ ''انا'' سے اشارہ ہے ذاتِ مطلق (اللہ) کی طرف۔ بندہ میں جو انانیت ہے وہ ''دانائے حقیقی'' کی بازگشت ہے۔

تعینات کی اقسام

''انا'' کو سمجھنے کے لئے تعینات کو سمجھنا ضروری ہے۔ تعینات تعین کی جمع ہے جس کا معنی ہے حق کا اپنی ذات کو پانا۔ تعینات دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک تعیناتِ داخلی اور دوسری تعیناتِ خارجی۔

۱۔ تعیناتِ داخلی: تعیناتِ داخلی بھی دو قسم پر ہیں۔

i: اجمالی: یہ تعین اوّل ہے یعنی یہ وہ وحدت ہے جہاں اللہ نے اپنے وجود کو پایا اور فرمایا ''انا''

ii: تفصیلی: یہ وہ تعین ہے جہاں ذاتِ باری تعالیٰ نے اپنی ذات میں اپنی صفات کو پایا

۲۔ تعیناتِ خارجی: تعیناتِ خارجی وہ تعینات ہوتے ہیں جو بطور اسماء و صفات و افعال کے ظہور میں آئیں۔ مثلاً ارواح، امثال اور اجسام وغیرہ۔ کسی چیز کا تعین کرنا ہو تو عام طور پر باعتبار تعینات ہم ''من و تو'' کہہ دیتے ہیں لیکن اس سے اطلاق (مراد) ھُوَ (وہ اللہ) ہے۔ چنانچہ ''انا'' کہنے سے انانیت حق تعالیٰ کی خبر

ملتی ہے اور حق تعالیٰ کی جانب سے اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ کیونکہ عارف اس مقام پر حق تعالیٰ میں فنا ہوتا ہے۔ وہ "هُوَ الْحَقُّ" کہے یا "اَنَا الْحَقُّ" کہے تعبیر دونوں کی ایک ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ تعین کے دور کرنے سے "اَنَا" اور "هُوَ" ہم معنی ہو جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کہیں اپنے لئے صیغۂ جمع استعمال کرتا ہے اور کہیں صیغۂ واحد استعمال کرتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ تجردِ ذات (یعنی فقط اپنی ذات کے اعتبار) کے ساتھ کلام فرماتا ہے تو واحد کا صیغہ استعمال فرماتا ہے اور جب ذات اور صفات کے ساتھ کلام کرے تو "نَحْنُ" یعنی جمع کا صیغہ استعمال کرتا ہے۔ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (قٓ:۱۶) سے مراد یہ ہے کہ ہم ذات اور صفات کے ساتھ اس کی شہ رگ کے قریب ہیں۔

حصولِ مقصد کے لئے تعینات کا ہونا ضروری ہے۔ فنا بغیر تعینات کے نہیں حاصل ہو سکتی کیونکہ فنا ہونے کے لئے کوئی نہ کوئی وجود ضروری ہے۔ اگر ایک پتھر کو سمندر میں پھینکا جائے تو ہم کہیں گے کہ پتھر سمندر میں فنا ہو گیا لیکن سارے سمندر میں تو فنا نہیں ہوا بلکہ اس سمندر کے ایک حصے میں فنا ہوا ہے۔ اسی طرح فنافی الذات باری تعالیٰ ہونے کے لئے تعینِ شیخ اور تعینِ رسالت کی ضرورت ہے۔ تعینات کے باعث انسان حفظِ مراتب کو ملحوظ رکھتے ہوئے عشق میں ڈوب کر اپنی طاقت بڑھاتا ہے جس سے عرفان میں ترقی ہوتی ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا۔

قُم باذنی کہا جائے یا قُم باذنِ اللہ   ہر دو نغمہ امد از لب یار

(میرے حکم سے اُٹھو (کہا جائے) یا اللہ کے حکم سے اُٹھو (کہا جائے) ہر دو حال میں اُسی یار (یعنی اللہ تعالیٰ کے لبوں سے ایک نغمہ ہے۔)

قُمْ بِاِذْنِیْ اور قُمْ بِاِذْنِ اللّٰہِ میں جو فرق رکھا گیا ہے وہ ہماری تصنیف "رابطۂ شیخ" کی "غرضِ تالیف" میں "مکاشفۂ ذاتی" کے عنوان میں بیان کیا جا چکا ہے۔ مکاشفۂ ذاتی میں اشیاء کی حقیقت ظاہر کر دی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ذاتی جلووں کو برداشت کی حد تک ظاہر کیا جاتا ہے۔ تفصیل کے لئے ہماری تصنیف "رابطۂ شیخ" کا مطالعہ فرمائیں۔

عارف کے قلب کی وسعتیں

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر عرش اور جو کچھ عرش میں ہے اس کو عارف کے گوشۂ دل میں رکھ دیا جائے تو عارف کو قلب کی فراخی کے باعث کچھ محسوس نہ ہوگا۔ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ "مکتوبات شریف" میں فرماتے ہیں کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ اس بات کی تائید کرتے ہیں اور دلیل سے ثابت کرتے ہیں کہ جب حادث قدیم کے ساتھ مل جاتا ہے تو اس کا اثر ختم ہو جاتا ہے یعنی عرش اور ما فیہا حادث ہے [illegible]

عارف کا قلب جو انوار قدم کے ظہور کا محل ہے، جب اس حادث کو قدیم کے ساتھ ملنے کا اتفاق ہوتا ہے تو عرش و مافیہا فانی اور ناچیز ہو جاتے ہیں، تو پھر حادث کس طرح محسوس ہو سکے۔ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں، ''اس فقیر کے نزدیک جو جذبات الٰہی سے تربیت یافتہ ہے یہ کہتا ہے کہ عارف کا قلب جب اپنی خاص استعداد کے موافق غایت ونہایت النہایت تک پہنچ جاتا ہے اور وہ قابلیت پیدا کر لیتا ہے جس سے بڑھ کر کوئی اور کمال متصور نہیں ہو سکتا تو عارف کے دل میں اس بات کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے کہ عرش کے انوار کے بے نہایت لمعات میں سے ایک لمعہ اس پر فائز ہو۔ اس لمعہ کو ان لمعات کے ساتھ وہ نسبت ہوتی ہے جو قطرہ کو دریائے محیط اور بحرِ بیکراں کے ساتھ ہوتی ہے۔ (مکتوبات نمبر ۱۰، دفتر دوم، حصہ اوّل، صفحہ ۹۴۴)

حضرت مجدد علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ یہ بزرگ لوگ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے ہم نشین ہیں اور یہ حق تعالیٰ کا ذکر کرنے والی وہ قوم ہے جس کا ہم نشین بد بخت نہیں ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کفار پر نصرت اور کامیابی کے لئے فقراء اور مہاجرین کے طفیل حق تعالیٰ سے دُعا کیا کرتے تھے۔ ان بزرگوں کی رضا کو حق تعالیٰ کی رضا کا وسیلہ بنائیں۔ نجات اور فلاح کا طریقہ یہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اہل اللہ کا وجود درحقیقت کرامتوں میں سے ایک کرامت ہے اور ان کی دعوت الی الحق رحمتوں میں سے ایک رحمت ہے۔ مردہ دلوں کو زندہ کرنا ان کی عظیم نشانیوں میں سے ہے۔ یہ لوگ اہل زمین کے لئے باعثِ امن ہیں۔

معرفت پر کلام اقبالؒ

بال جبریل میں علامہ اقبالؒ نے مدرسہ وخانقاہ کے متعلق اپنے تاثرات بیاں کئے ہیں کہ ان مدرسوں میں نہ محبت ہے نہ معرفت اور نہ ہی نگاہ پیدا ہوتی ہے۔ یہ چیزیں تو کسی درویش بے گلیم سے ہی پیدا ہوتی ہیں۔

اُٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک ‏ ‏ ‏ نہ زندگی نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

حدیثِ دل کسی درویشِ بے گلیم سے پوچھ ‏ ‏ ‏ خدا کرے تجھے تیرے مقام سے آگاہ (ب۔ج:۳۳۸)

عقل و دل میں ایک بحث میں علامہؒ نے کافی مدلل کلام لکھا ہے اور دل کی طرف سے یہ دلیل دی ہے کہ عقل سے تو علم ہے مگر حاصل کرنا دل کا کام ہے اور یہ دل اللہ تعالیٰ کا عرش بھی ہے۔

علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے ‏ ‏ ‏ تو خدا جُو خدا نما ہوں میں

کس بلندی پہ ہے مقام میرا ‏ ‏ ‏ عرش ربِ جلیل کا ہوں میں (ب۔د:۴۲)

علامہ اقبالؒ کا کلام دیکھا جائے تو اس میں معرفت اور عرفان کے سبق دیئے گئے ہیں جس کو اس جگہ تحریر کرنا مشکل ہے۔

باب ۲۳

ولی کی فراست اور بصیرت

ولی کی فراست، بصیرت اور علمِ معرفت کے متعلق ہماری تصنیفات میں کافی کچھ بیان ہو چکا ہے۔ معرفت کے متعلق ہماری تصنیف ''رابطۂ شیخ'' میں اچھی خاصی تفصیل موجود ہے۔ اس کے علاوہ ہماری تصنیف ''جنیدؒ و بایزیدؒ'' میں بھی اہل اللہ کی بصیرت اور قوتِ مشاہدہ، مجاہدات، قوتِ روحانی، معرفت اور آدابِ صحبت، علمِ لدنی، خاموشی، خلوت اور فراست پر کافی تحریریں شامل کی گئی ہیں۔ اس جگہ فراست، بصیرت اور علمِ معرفت پر کچھ مضامین شامل کیے جا رہے ہیں۔

فراست، کیاست، کرامت اور استقامت

فراست اللہ کا ایک نور ہے جس سے مومن دیکھتا ہے اور پھر فائدہ اُٹھاتا ہے۔ کیاست اس زیرکی و دانائی کو کہتے ہیں جس کا تعلق دماغ سے ہو۔ فکر سے کیاست پیدا ہوتی ہے اور حدس (القاء کی ایک قسم) سے بھی فراست پیدا ہوتی ہے۔ حدس مخفی علوم کے بغیر سوچے سمجھے اور بلا غور و خوض اور بغیر آلہ یا حیلہ کے دفعۃً (کسی بات کا) قلب میں القاء ہو جانے کو کہتے ہیں۔ فراست دلوں کی باتوں یا لوگوں کے حالات پر اللہ کے نور سے آگاہ ہو جانا ہے۔ (سرِ دلبراں)

کرامت خرقِ عادات کے اظہار کو کہتے ہیں یعنی ایسے معاملات کا ہونا جو عام طور پر انسانوں سے سرزد نہیں ہوتے، البتہ خاص لوگوں سے سرزد ہو سکتے ہیں۔ اس کا بیان الگ سے کر دیا گیا ہے۔ استقامت، عہدِ وفا اور اعمالِ دین و دنیا میں حدودِ اوسط کی رعایت سے ثابت قدم رہنے کو کہتے ہیں۔ اس کی تین قسمیں ہیں: (۱) تقویم (تادیبِ نفس کے ذریعے ثابت قدم رہنا) (۲) اقامت (یعنی تہذیبِ قلب سے استقامت اختیار کرنا) (۳) استقامت جو ذریعہ ہے تقربِ اسرار کا۔ استقامت مقبولیت کی دلیل ہے اور توفیقِ استقامت حق تعالیٰ کی جانب سے ہی ملتی ہے اور صوفیاء میں مشہور ہے ''اَلْاِسْتِقَامَةُ فَوْقَ الْكَرَامَةِ'' یعنی استقامت کرامت سے بھی درجہ فوق رکھتی ہے۔ (سرِ دلبراں) تجلیاتِ الٰہی کے لئے استقامت کی ضرورت ہوتی ہے اس کا کچھ بیان کرامت کے ضمن میں ہو چکا ہے۔

فراست کی کچھ تفصیل

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِیْنَ (اس میں صاحب فراست لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ الحجر: ۷۵)

فراست ایک خیال ہے جو دل پر طاری ہوتا ہے اور ہر متضاد خیال کو نکال دیتا ہے اس کے مقابلے میں نفس کو خیال و شبہات تجویز نہیں کرتا۔ فراست ہر شخص کی قوت ایمانیہ کے مطابق ہوتی ہے جس قدر ایمان قوی ہو فراست بھی زیادہ تیز ہوگی۔ جس نے فراست سے دیکھا اس نے نور حق سے دیکھا۔ واسطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صاحب فراست اشیاء کو اس طرح دیکھتا ہے جس طرح حق سبحانہ تعالیٰ اسے دکھاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں۔

اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ — مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ (سنن ترمذی رقم الحدیث: ۳۱۲۷)

منقول ہے کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مرشد کے حکم پر بھی وعظ نہ کہتے تھے کیونکہ ان کو اپنے شیخ کے ہوتے ہوئے وعظ کہنے میں جھجک محسوس ہوتی تھی۔ ایک رات خواب میں حضور اکرم ﷺ نے حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کو وعظ کے لئے فرمایا۔ آپ فرماتے ہیں کہ صبح کے وقت میں سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کے دروازے پر پہنچا تو آپ نے فرمایا کہ تم نے میری بات نہ مانی یہاں تک کہ تمہیں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا۔ اس دن آپ مسجد کے صحن میں بیٹھے تو یہ بات پھیل گئی کہ جنید رحمۃ اللہ علیہ لوگوں کو وعظ فرمانے لگے ہیں۔ ایک عیسائی لڑکا بھیس بدل کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے پوچھا کہ "اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ" کا کیا مطلب ہے؟ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے سر جھکایا اور پھر سر اٹھا کر فرمایا: مسلمان ہو جا کیونکہ تمہارے مسلمان ہونے کا وقت آ گیا۔ اس پر وہ لڑکا مسلمان ہو گیا کیونکہ اس نے کہا تھا کہ اگر آپ میرے حال سے واقف ہو گئے تو میں مسلمان ہو جاؤں گا۔ حضرت ابو القاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مستنبط وہ ہے جس سے کوئی چیز غائب نہ ہو اور نہ مخفی رہے۔ جیسے فرمایا۔

لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ — جو لوگ نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اس کو جان لیں گے۔ (النساء: ۸۳)

اس آیت سے یہی مراد ہے۔ متوسم وہ ہے جو وسم یعنی علامت سے پہچان لے۔ لہٰذا "لِلْمُتَوَسِّمِیْنَ" سے علامات کے ذریعے معلوم کرنے کی طرف اشارہ ہے کہ وسم میں اللہ تعالیٰ ولیوں اور دشمنوں کے لئے ظاہر کر دیتا ہے مگر متفرس (فراست والا) اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ یہ نور اٹھنے والا نور ہے جن کے ذریعے وہ معانی کو سمجھ لیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر ربانیین یعنی عالم، حکیم اور اخلاق خداوندی اختیار کرنا ہے اس میں مخلوق کے ساتھ مشغول ہونے سے مبرا ہوتے ہیں۔

حضرت ابن الحسن بوشجی رحمۃ اللہ علیہ اور حسن حداد رحمۃ اللہ علیہ ایک بار ابو القاسم رحمۃ اللہ علیہ کی عیادت کے لئے آئے اور راستے میں کچھ سیب اُدھار خریدے اور ابو القاسم کی خدمت میں پیش کئے۔ ابو القاسم نے پوچھا یہ تاریکی کیسی ہے؟ اس پر دونوں باہر نکل آئے اور کہا شاید یہ تاریکی سیب کی قیمت نہ ادا کرنے کی وجہ سے ہے، چنانچہ وہ قیمت ادا کر کے آ گئے، تو ابو القاسم نے کہا کہ کیا انسان کے لئے ممکن ہے کہ اتنی سرعت سے ظلمت سے نکل آئے۔ صحیح صحیح بات کہہ دو اس پر انہوں نے سیبوں کے اُدھار کا قصہ سنایا۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے تم میں سے ہر ایک اپنے ساتھی پر اعتماد کرتا تھا کہ وہ قیمت ادا کر دے گا اور دکاندار تقاضا کرنے سے شرماتا تھا اس کی گرفت تم پر باقی رہتی اور میں اس اُدھار کا سبب تھا۔ لہٰذا میں نے یہ بات تم میں دیکھ لی۔

حسین بن منصور رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جب کسی دِل پر غلبۂ حق ہو جاتا ہے تو اللہ اسے اسرار کا مالک بنا دیتا ہے، لہٰذا وہ سب کچھ دیکھ لیتا ہے۔ کسی صوفی نے کہا کہ جو ارواح عالم ملکوت میں گھومتی رہتی ہیں وہ مخلوق کے اسرار کا مشاہدہ کر لیتی ہیں۔

ابو عبد الرحمٰن سُلَمی اپنے نانا سے نقل کرتے ہیں کہ جو شخص حرام سے اپنی نگاہ نیچی رکھے، اتباعِ شہوات سے خود کو رُوکے رکھے، باطن کو مراقبہ کے ساتھ اور ظاہر کو سنت کے ساتھ آباد رکھے اور رزق حلال کا عادی ہو اس کی فراست میں خطا نہیں ہو گی۔

ابو الحسن نوری کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب انسان میں اپنی روح کا نفخہ کیا تو اسی نور سے فراست کا حصہ ملا۔ آپ فرماتے ہیں کہ فراست والا وہی ہے جو پہلی نگاہ سے ہی صحیح مقصد کو پہنچے۔ احمد بن عاصم بن انطاکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جب اہلِ صدق کی محفل میں بیٹھو تو صحیح نیت سے بیٹھو کیونکہ یہ لوگ تمہارے دِلوں میں اس طرح داخل ہوتے اور نکلتے ہیں کہ تم محسوس بھی نہیں کر سکتے۔ آپ نے فرمایا۔

اِنَّهُمْ جَوَاسِیْسُ الْقُلُوْبِ — یعنی یہ لوگ دِلوں کے جاسوس ہوتے ہیں۔

(شرح تعرف اور بحر العلوم)

حضرت ابو بکر کتانی رحمۃ اللہ علیہ تیس سال تک کعبۃ اللہ کے پرنالے کے نیچے بیٹھے رہے، دن رات میں صرف ایک بار وضو کے لئے اُٹھتے اور تمام شب ذکر کرتے۔ ایک بوڑھا شخص آیا اور کہا کہ اے ابو بکر مقامِ ابراہیم پر کیوں نہیں بیٹھتے؟ وہاں ایک بزرگ حدیث بیان کرتے ہیں تم بھی وہ سُن لیا کرو۔ ابو بکر نے پوچھا یہ بزرگ کہاں سے آئے ہیں اور کس کی روایت سے حدیث بیان کرتے ہیں؟ کہا عبد الرزاق عبد الرحمٰن معمر زہری اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: جن سے یہ اسناد کرتے ہیں ہم ان سے براہِ راست بات سُن لیتے ہیں۔ پوچھا کس سے سُنتے ہو؟ فرمایا: "حَدَّثَنِیْ قَلْبِیْ عَنْ رَبِّیْ" "میرے دِل نے میرے رب سے یہ حدیث بیان فرمائی۔ پوچھا اس کی دلیل کیا ہے؟ ابو بکر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کی دلیل یہ ہے کہ تم خضر ہو۔ حضرت خضر

نے کہا کہ میں اب تک خیال کرتا تھا کہ اب تک کائنات ارض پر کوئی ولی ایسا نہیں جسے میں نہ جانتا ہوں لیکن جب میں نے ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا تو انہوں نے مجھے پہچان لیا اور میں نے انہیں نہیں پہچانا۔

ابو موسیٰ دہلوی نے عبد الرحمٰن بن یحییٰ سے توکل کے متعلق دریافت کیا۔ فرمایا کہ توکل یہ ہے کہ اگر تو اپنا ہاتھ اژدھا کے منہ میں ڈال دے تو پھر بھی اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرے۔ وہ کہتے ہیں کہ پھر میں بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس گیا کہ ان سے توکل کے متعلق پوچھوں۔ جب میں نے دستک دی تو حضرت بایزیدؒ نے فرمایا کہ کیا عبد الرحمٰن کا قول تمہارے لئے کافی نہ تھا۔ آپ نے میرے لئے دروازہ نہ کھولا اور فرمایا کہ تم میری زیارت کے لئے نہیں آئے۔ ابو موسیٰ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ایک سال بعد آپ کی زیارت کا قصد کر کے گیا تو آپ نے خوش آمدید کہا۔ میں ایک ماہ تک ان کے پاس ٹھہرا اور جو بھی بات میرے دل میں ہوتی آپ اسے بیان کر دیتے۔

خیر النساج رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے گھر میں تھا کہ دل میں خیال پیدا ہوا کہ جنید دروازے پر ہیں۔ مگر میں نے اس خیال کو دور کر دیا، پھر دوبارہ اور سہ بارہ خیال آیا۔ میں باہر نکلا تو جنید دروازے پر تھے۔ انہوں نے فرمایا: پہلے خیال پر کیوں نہیں نکلے؟

محمد حسین بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ابو عثمان مغربی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس گیا اور دل میں خیال کیا کہ شاید وہ مجھ سے کوئی چیز چاہیں گے اس پر ابو عثمان نے فرمایا: کیا لوگوں کے لئے کافی نہیں کہ میں ان کی چیز قبول کر لیتا ہوں پھر وہ مجھ سے یہ چاہتے ہیں کہ میں ان سے مانگوں۔

بغداد میں ایک فقیر نے دل میں خیال کیا کہ مرتعش مجھے پندرہ درہم لا کے دیں تا کہ میں کچھ سامان لے کے جنگل کی طرف چلا جاؤں۔ کچھ دیر بعد دیکھا کہ دستک ہوئی اور مرتعش دروازے پر کھڑے ہیں۔ ان کے پاس ایک کپڑے کا ٹکڑا تھا مجھے فرمایا کہ یہ لے لو میں نے عرض کی کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ فرمایا: تو پھر ہمیں کیوں ایذا پہنچاتے ہو۔ تم کتنے درہم چاہتے ہو؟ میں نے عرض کیا پندرہ، تو فرمایا: یہ پندرہ درہم ہی تو ہیں۔

کسی نے ابو الحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ کو لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے دیکھا جب حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کو علم ہوا تو آپ نے سو درہم تول کر ایک تھیلے میں ڈال دیئے اور بغیر گنے بھی ایک مٹھی درہم ڈال دیئے۔ خادم حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ کچھ دینار، درہم تو لے اور کچھ بغیر تولے ڈال دیئے۔ فرمایا کہ اسے ابو الحسن نوری کو دے آؤ۔ جب خادم ابو الحسن نوری کو دینے گیا تو انہوں نے تول کر ایک سو درہم نکال کر مجھے واپس کر دیئے اور باقی (مٹھی بھر) خود رکھ لیے اور فرمایا کہ جنید بڑا سیانا ہے کہ اس کی مرضی ہے کہ وہ دونوں طرف سے سلامت رہے اور یہ بھی فرمایا کہ جو ہمارے تھے وہ رکھ لیے اور جو جنید کے لئے تھا وہ واپس کر دیا۔ یہ سن کر وہ شخص اور بھی حیران ہوا۔ جب اس نے یہ ماجرا جنیدؒ کو سنایا تو آپ نے فرمایا: ''اللہ المستعان'' جو کچھ ان کے لئے تھا، انہوں نے

لے لیا اور جو کچھ میرے لیے تھا انہوں نے لوٹا دیا۔ راوی کہتا ہے کہ اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں نے کہا حضرت آخر مجھے بھی بتلایئے یہ راز کیا ہے؟ تو فرمایا: سو درہم میں نے ثواب آخرت کے لئے دیئے تھے اور مٹھی بھر درہم اللہ تعالیٰ کے لئے ڈالے تھے۔ انہوں نے وہی قبول کر لئے جو حق تعالیٰ کے لئے تھے اور جو میرے تھے وہ مجھے واپس کر دیئے۔ اس قسم کی بہت سی روایات پڑھنے میں آتی ہیں کہ اولیاء اللہ کی نگاہیں جب لوگوں پر پڑیں تو انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ کس نے مخفی طور پر کون کون سا گناہ کیا ہے۔

فراست اور گمان میں فرق و امتیاز

فراست اور گمان میں فرق کیا جا سکتا ہے وہ یوں کہ گمان صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔ گمان نیک نیتی اور پاکیٔ دل و نگاہ سے بھی کیا جا سکتا ہے اور دل و نگاہ کی تاریکی اور بد طینتی سے بھی۔ اس لئے اللہ تبارک و تعالیٰ نے اکثر گمانوں سے بچنے کا حکم فرمایا اور آگاہ کیا کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس فراست میں غلطی کھانے کا احتمال نہیں۔ خدا تعالیٰ نے اہلِ فراست کی تعریف و تحسین فرمائی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِیْنَ ۝۷۵　بلاشبہ ان میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

(الحجر: ۷۵)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ''لِلْمُتَوَسِّمِیْنَ'' کی تفسیر کرتے ہوئے اسے ''لِلْمُتَفَرِّسِیْنَ'' قرار دیا ہے۔ جس زمرے میں وہ لوگ آتے ہیں جنہیں حق تعالیٰ نے فراست سے سرفراز فرمایا ہے۔ ایک اور آیت کریمہ میں ان مساکین کا ذکر کرتے ہوئے جو وضعداری اور پاسِ حیا سے کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتے اور نہ ہی دامن سے لپٹتے ہیں اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا۔

یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ　جاہل انہیں سوال نہ کرنے کی وجہ سے مالدار سمجھتے ہیں۔

(البقرۃ: ۲۷۳)

لیکن جو اربابِ بصیرت ہیں وہ انہیں قیافے اور پیشانیوں سے پہچان لیتے ہیں۔ مومن کو اللہ کے قرب سے فراست ملتی ہے کیونکہ جب اس کا دل تقرب الی اللہ کے نور سے معمور ہو جاتا ہے تو اس کے سامنے سے حجابات اُٹھ جاتے ہیں اور وہ اپنے درجے اور اعمال کے موافق روشنی حاصل کرتا ہے جس سے وہ چیزوں کو دیکھ لیتا ہے اور اس سے کچھ محجوب اور بعید نہیں رہتا۔ ایک حدیث قدسی کے مطابق یہ مقام بندے کو قربِ فرائض سے بھی حاصل ہوتا ہے اور قربِ نوافل سے بھی اور اس کا دل ایک صاف آئینے کی مانند ہو جاتا ہے جس میں وہ ہر چیز بلاکم و کاست دیکھنے لگتا ہے۔ اس کی فراست کبھی خطا نہیں کرتی۔ روایات کے مطابق حضور نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم جو بحالت نماز آپ ﷺ کے مقتدی ہوتے تھے وہ دل کی آنکھوں

یا نورِ فراست سے اپنے پیچھے یا دائیں بائیں دیکھ لیا کرتے تھے۔

ایک نوجوان حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آیا جایا کرتا تھا۔ وہ صاحب فراست تھا، اور لوگوں کے دل میں گزرنے والے خیالات بتادیا کرتا تھا۔ ایک دن حضرت کے سامنے اس کا ذکر کیا گیا تو آپ نے پوچھا کہ لوگوں کا آپ کے بارے میں جو خیال ہے کیا وہ درست ہے؟ وہ کہنے لگا کہ آپ اپنے دل میں کوئی بات سوچیں میں بتاتا ہوں۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کہنے لگے میں نے سوچ لی ہے۔ اس نوجوان نے بتا دی۔ آپ نے کہا غلط ہے اس نے کہا کوئی اور بات سوچ لیں۔ آپ نے کہا میں نے سوچ لی ہے اس نے پھر بتایا، تو آپ نے اسے غلط قرار دیا۔ تیسری بار اس نے پھر کہا کہ کوئی اور بات سوچ لیں۔ آپ نے کہا میں نے سوچ لی ہے اس نے پھر بتایا، آپ نے کہا کہ غلط ہے۔ اس پر وہ نوجوان کہنے لگا عجیب بات ہے آپ بھی سچے ہیں اور مجھے بھی اپنے دل پر اعتبار ہے۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے کہ تم نے تینوں بار صحیح بتایا تھا لیکن میں تمہیں آزمارہا تھا اور دیکھنا چاہتا تھا کہ تمہاری قلبی واردات بدلتی ہے یا نہیں۔

ابوسعید خراز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ مسجد حرام میں تھے کہ ایک فقیر کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس نے دو گدڑیاں پہنی ہوئی تھیں۔ میں نے دل میں گمان کیا کہ ایسے ہی لوگ ہیں جو لوگوں پر بوجھ ہیں۔ فقیر میرے قلبی احوال سے باخبر ہو گیا اور میری طرف متوجہ ہو کر اس نے یہ آیت پڑھی۔

وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ مَا فِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ فَاحۡذَرُوۡهُ (البقرۃ: ۲۳۵)	اور جان لو کہ یقیناً اللہ جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے سو اس سے ڈر جاؤ۔

وہ کہنے لگے کہ یہ سن کر میں نے دل ہی دل میں اپنی بدگمانی سے توبہ اور استغفار کی۔ وہ فقیر پھر میری طرف متوجہ ہوا اور آیت پڑھی۔

وَهُوَ الَّذِىۡ يَقۡبَلُ التَّوۡبَةَ عَنۡ عِبَادِهٖ وَيَعۡفُوۡا عَنِ السَّيِّاٰتِ (الشوریٰ: ۲۵)	اور وہی ہے جو توبہ قبول کرتا ہے اپنے بندوں کی اور درگزر کرتا ہے ان کی غلطیوں سے

ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں جامع مسجد میں تھا کہ ایک خوبرو، وجیہ اور خوش لباس نوجوان آیا، جس سے خوشبو کے حلے آرہے تھے۔ میں نے اپنے ہم مجلس لوگوں سے کہا کہ میرے خیال میں وہ یہودی ہے لیکن کسی کو میری بات کا یقین نہ آیا۔ کچھ دیر بعد میں وہاں سے اُٹھ گیا تو اس نوجوان نے میرے رفقاء سے پوچھا کہ شیخ میرے بارے میں کیا فرمارہے تھے۔ لوگوں کو میرے خیال کے بارے میں اسے بتانے سے حجاب اور شرم مانع ہوئی لیکن اس کے پیہم اصرار پر مجبوراً انہیں بتانا پڑا کہ شیخ آپ کو یہودی بتا رہے تھے۔ یہ سن کر وہ نوجوان میرے پاس آیا اور میرے ہاتھ پر جھک کر مسلمان ہو گیا۔ میں نے پوچھا کہ تمہارے اسلام لانے کی کیا وجہ ہے تو وہ بولا کہ ہم نے اپنی کتابوں میں پڑھا ہے کہ جو صادق (سچا) ہو اس کی

فراست خطا نہیں کرتی۔ میں نے سوچا کہ اس سلسلے میں کیوں نہ مسلمانوں کو آزمایا جائے۔ میں آپ کے پاس آیا تو آپ نے مجھے دیکھتے ہی کہہ دیا کہ میں یہودی ہوں چنانچہ مجھے اس امر کا یقین ہو گیا کہ آپ ضرور صدیقین میں شامل ہیں۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پاس ایک صحابی آئے جو راستے میں اثنائے سفر ایک خوبصورت عورت کو دیکھ کر آئے تھے اور اسی کے حسن و جمال کے بارے میں غور کر رہے تھے۔ آپ اس صحابی کے خیال سے مطلع ہو گئے اور فرمانے لگے، میرے پاس بعض لوگ اس حالت میں آتے ہیں کہ زنا کا اثر ان کی آنکھوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ کہنے لگے کہ کیا رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی وحی کا سلسلہ جاری ہے؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا نہیں یہ تو سچی فراست ہے۔ حضرت شاہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ غضب کی فراست کے مالک تھے اور اکثر و بیشتر ان کی بتائی ہوئی باتیں صحیح ہوتی تھیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ جو شخص حرام چیزوں سے اجتناب کرے، خواہشات کا دروازہ اپنے آپ پر بند کرلے اور اپنے دل کو مراقبہ اور ذکر الٰہی سے آباد رکھے، اتباع سنت کو ملحوظ رکھے اور لقمہ حلال کھانے کا عادی ہو اس کی فراست کبھی خطاء نہیں جاتی۔

ولی کی بصارت

بصارت پر کچھ مضمون ہماری تصنیف ''جنیدؒ بایزیدؒ'' میں بھی دے دیا گیا ہے۔ یہاں چند نکات بیان کئے جائیں گے۔ حضرت عبدالعزیز دباغ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نظر بصیرت کے تین لاکھ چھیاسٹھ ہزار اجزاء ہیں۔ ان میں سے ایک جزو آنکھ کی نگاہ میں آیا ہے اور باقی تمام اجزاء وارث کامل عارف کی ذات میں ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی ذات سے اسی طرح دیکھتا ہے جس طرح ہم آنکھ سے دیکھتے ہیں مگر اس کی نظر تمام کے تمام اجزاء پر ہوتی ہے اور یہ مرتبہ صرف ایک شخص کو یعنی غوث کو حاصل ہوتا ہے جس کے ماتحت اقطاب سبعہ ہوتے ہیں۔

اس وقت ہم شہر تطاون میں حضرت کے گھر بیٹھے ہوئے تھے کہ حاضرین میں سے ایک شخص نے جسے آپ کے مرتبہ کا علم تھا کہا کہ امام عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت احمد بن حسین رفائی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت ابراہیم دسوقیؒ کا عالم ملکوت میں اجتماع ہوا اور وہاں ان سے ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جس کا ذکر حضرت ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے چند مریدوں سے کر دیا۔ مریدوں نے کہا اس بات کا کون گواہ ہے؟ حضرت دسوقی اس وقت اپنے مریدوں کے ساتھ مصر میں تھے اور دیگر دونوں بزرگ عراق میں تھے۔ ان دونوں بزرگوں کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے، یہی لوگ گواہی دیں گے چنانچہ وہ دونوں اسی وقت آ موجود ہوئے اور انہوں نے گواہی دی پھر اس شخص نے کہا کہ تینوں شخص ایک جیسے ہیں۔ (حاضر ہونا کوئی ناممکن بات نہیں۔)

حضرت نے فرمایا کہ اس قسم کی بات تو معمولی ولی بھی کر سکتا ہے، میں نے ایک ایسے ولی کو دیکھا جو بہت بڑے مرتبہ تک پہنچا ہوا تھا، چنانچہ اسے تمام مخلوقات جاندار و بے جان، وحوش وحشرات، آسمان، ستارے، زمینیں اور جو کچھ زمینوں میں ہے، سب کا مشاہدہ حاصل تھا اور تمام کرہ عالم اس سے مدد لیتا تھا اور وہ ایک ہی لحظہ میں تمام کرہ عالم کی آواز اور کلام سن لیتا تھا اور ہر ایک کو اس کی ضرورت اور مصلحت کی چیز عطا کرتا۔ بدون اس کے کہ کوئی اسے دوسرے سے روک رکھے بلکہ جہاں کا اوپر کا حصہ اور نچلا اس کے لئے ایک جیسے تھے پھر اللہ تعالیٰ اس ولی پر رحم فرماتے اور وہ جان لیتا کہ یہ تمام مدد اسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آرہی ہے۔ اب ولی اپنے آپ کو مینڈک کی طرح پاتا اور تمام مخلوق کو اپنے سے زیادہ طاقتور گردانتا۔ پھر وہ مزید جانتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مدد حق تعالیٰ کی جانب سے آرہی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی میراث ایک لاکھ چوبیس ہزار میں منقسم ہے لیکن یہ تمام ورثہ غوث کو کیوں نہیں ملا؟ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں جتنی طاقت تھی وہ کسی شخص میں بھی نہیں ہے۔ غوث کے وارث ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے غوث جتنا سیر نہیں ہوتا۔

باب ۲۴

حصہ ششم

(فقراء کے خصائص اور مولانا رومؒ کی مثنوی)

فقر پر مولانا رومؒ کا اظہارِ خیال

فقر میں مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کو جو مقام حاصل ہے اس کی عکاسی کرنے کے لئے اس پر علامہ اقبالؒ کا کلام پوری دلالت کرتا ہے۔ آپ کے متعلق حضرت جامیؒ نے فرمایا ہے کہ مولاناؒ کی مثنوی فارسی زبان میں قرآن کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس جگہ مولانا رومؒ کے چند اشعار جو آپ نے فقر کے بارے میں تحریر فرمائے ہیں پیشِ خدمت ہیں۔ اگر چہ فقر پر درج ذیل اشعار کے علاوہ آپ کے اور بھی بہت سے اشعار ملتے ہیں لیکن ان سب کا یہاں احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ قارئین کی تشنگی کو پورا کرنے کے لئے کچھ اور اشعار زیرِ نظر کتاب میں کئی اور مقامات پر بھی لکھ دیئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ہماری تصنیف ''سوز وسازِ رومیؒ'' مولانا کے کلام کی ایک جامع صورت میں چھپ چکی ہے۔ امید ہے کہ قارئین کے لئے یہ تمام کلام، جو مختلف صفحات پر پھیلا ہوا ہے، مولانا رومؒ کی ایمانی ذہانت اور جذبۂ عشق و محبت کی ترجمانی کرتا ہوا نظر آئے گا۔

فقر اور مولانا رومؒ

صوفیانہ مسلک میں فقر کا مقام بہت اہم ہے، تصوف اور فقر معنوی اعتبار سے تقریباً مترادف الفاظ ہیں۔ صرف دنیوی املاک اور کاروبار سے دستبردار ہونا فقر نہیں اور نہ ہی فقر سے یہ مراد ہے کہ دنیوی اسباب و آلات سے گریز کیا جائے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ فقر جہاں آجائے تو وہاں امدادِ غیبی سے سب کام چلتے جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں تو فقر اس بات کا نام ہے کہ کوئی پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس دربدر کشکول لے کر بھیک مانگتا پھرے، حالانکہ حقیقتِ حال ایسی نہیں۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔

جو یہ کہتے ہیں وفا پیرہنِ چاک میں ہے　ہم سے خوش پوش فقیروں سے وہ ملتے تو سہی

درویشی میں شکستگی ہے اور اللہ تعالیٰ شکستہ دلوں کو پسند فرماتا ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ اگر دنیا میں پناہ چاہتے ہو تو فقر میں آجاؤ۔ اگر چہ اس میں بہت محنت کرنا پڑتی ہے مگر جو مقام اہلِ فقر کو ملتا ہے دوسروں کو اس کا عشر

عشیر بھی نہیں مل سکتا۔ اہلِ فقر پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دن رات عطاؤں کے خزانوں کی بخشش ہوتی رہتی ہے۔

چوں شکستہ می رہد اشکستہ شو امن در فقر ست اندر فقر رو(۲۶۴۔۴)

(جب شکستہ ہونے میں نجات ملتی ہے، تو شکستہ ہوجا امن تو فقر میں ہے فقر اختیار کر)

محنتِ فقر ارچہ کم از نیش نیست از بلائے اغنا خود بیش نیست

(فقر کو برقرار رکھنے کی محنت اگرچہ زہر سے کم نہیں، یہ تو غنا کو قائم رکھنے کی بلا سے کچھ زیادہ نہیں)

کارِ درویشی ورائے فہم تست سوئے درویشاں تو منگر سست(۲۵۳۔۱)

(درویشوں کا کام تمہارے فہم سے بالا ہے، تو درویشوں کی طرف کج نگاہی سے نہ دیکھ)

زانکہ درویشی ورائے کار ہاست دمبدم از حق مر ایشاں را عطاست

(۲۵۳۔۱)

(یہ اس لئے کہ درویشی بڑے کارناموں کے بعد آتی ہے، ہر لحظہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان درویشوں کو عطائیں ملتی ہیں۔)

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ لوگ فقر سے ایسے ڈرتے ہیں جیسے کوئی بری بلا یا مصیبت سے ڈرتا ہے حالانکہ یہ فقر تو باعثِ صد اکرام اور قابلِ فخر چیز ہے۔ فرماتے ہیں کہ شیطان بھی انسان کو فقر سے ڈراتا ہے کہ اگر فقر کی راہ اختیار کرلو گے تو اپنے بال بچوں کا پیٹ کس طرح پالو گے۔ اس طرح شیطان لوگوں کو برائی کی دعوت دیتا ہے۔ (اقبالؒ اور مسلک تصوف:۲۳۹)۔

آنچناں کز فقر می ترسند خلق زیرِ آبِ شور رفتہ تا بہ حلق

(لوگ فقر سے اس قدر ڈرتے ہیں کہ جیسے پانی کے نیچے کھاری پن کا مادہ حلق میں اتر جائے۔)

گر بترسندے ازاں فقر آفریں گنجہا شاں کشف گشتے در زمیں

(اگر وہ فقر کے پیدا کرنے والے سے ڈرتے (تو) زمین میں (گڑھے ہوئے) خزانے ان پر منکشف ہو جاتے)

جملہ شاں از خوفِ غم در عین غم در پے ہستی فتادہ در عدم(۲۱۶۔۳)

(فقر کی شان و شوکت اس خوف و غم کے باعث ہست سے نیست کی طرف چلی جاتی ہے۔)

دیو می ترساندت کین ہیں و ہیں زیں پشیماں گردی و گردی حزیں(۲۸۔۵)

(شیطان تجھے ڈراتا ہے کہ ہائیں ہائیں، اس سے تو شرمندہ ہوگا اور غمگین بنے گا۔)

مولاناؒ نے فرمایا ہے کہ فقر مومن کے لئے باعثِ صد فخر ہے لیکن افسوس کی بات ہے کہ لوگ اس سے ڈرتے ہیں کہ فقر آیا تو بھوکے مرجائیں گے۔ اہلِ فقر قیامت کے دن ہلکے پھلکے ہو کر اٹھیں گے جس طرح کوئی

بے گناہ بچہ بغیر حساب کتاب کے ہی جنت میں چلا جائے گا۔

فقر آں محمودِ تست اے بے سعت طبع ازو دائم ہمی ترساندت

(اے بے سعادت، فقر تیرے لئے محمود ہے، مگر تو ہمیشہ اپنی طبع کو اس سے ڈراتا رہتا ہے۔)

گر بدانی رحمِ ایں محمود راد خوش بگوئی عاقبت محمود باد

(اگر تو اس سخی محمود (فقر) کا رحم سمجھ لے، تو تم خوشی سے کہو گے کہ بہتر انجام ہو)

فقر آں محمودِ تست اے نیم دل کم شنو زیں مادرِ طبعِ مُضِل

(اے چھوٹے دل والے! فقر تیرا محمود ہے اس گمراہ کرنے والی ماں یعنی طبیعت کی بات نہ سن)

چوں شکارِ فقر گردی تو یقیں ہمچو کودک اشک باری یوم دیں (۱۴۷۔۶)

(جب تو فقر کا شکار ہو جائے گا، تو یقیناً قیامت کے دن بچے کی طرح آنسو بہائے گا۔)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ مردہ تو کسی ایک مرض کے باعث مرتا ہے مگر ایک صوفی کو تو زندگی میں لاکھوں بار مرنا ہوتا ہے۔ قانونِ الٰہی کے مطابق ہر مقتول کا خون بہا ملتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی شہرِ وفا کے قتل ہونے والوں کو لاکھوں گنا خون بہا دیتا ہے۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ جو لوگ اللہ کی محبت میں مارے جاتے ہیں وہ قتیل عشق ہیں اور اللہ تعالیٰ خود ان کا خون بہا بن جاتا ہے۔

آں گروہے کز فقیری پے برند صد جہت زاں مردگاں فانی ترند

(وہ گروہ جس نے فقیری کا پتہ لگا لیا ہے، سو حیثیتوں سے عام مردہ سے زیادہ فانی ہیں۔)

مردہ از یک روست فانی در گزند صوفیاں از صد جہت فانی شدند

(مردہ تو ایک حیثیت سے ایک مرض سے فانی ہے، صوفیاء سو حیثیتوں سے فانی ہو گئے ہیں۔)

مرگ یک قتل ست و ایں سی صد ہزار ہر یکے را خوں بہائے بیشمار

(موت تو ایک قتل ہے مگر یہ تیس لاکھ بار قتل ہوتا ہے، اور ہر قتل کا خون بہا بھی بے شمار ہے۔)

گرچہ کشت ایں قوم را حق بارہا ریخت بہرِ خوں بہا انبارہا (۱۵۹۔۶)

(اگر چہ اللہ تعالیٰ نے اس قوم صوفیا کو بارہا قتل کیا ہے، لیکن ان کے خون بہا بھی بیشمار ادا کئے ہیں۔)

علامہؒ فرماتے ہیں کہ فقیری کرنا معمولی بات نہیں بلکہ فقراء کے لئے قرآن میں متعدد بار حضور اکرم ﷺ کو یہ حکم آیا ہے کہ فقراء کو اپنی توجہ، معیت اور سنگت سے محروم نہ رکھیں کیونکہ یہ لوگ محض اللہ کے لئے صبح وشام ذکر و فکر میں مشغول رہتے ہیں اور ان کے دلوں میں سوائے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے اور کوئی بات مقصود نہیں۔ آیتِ عبس اور سورۂ کہف میں ایسے احکامات نازل ہوئے ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا حکم درج ذیل الفاظ میں آیا ہے۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ (الکہف:۲۸)

(اے رسول اللہ ﷺ) روکے رکھیئے اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح و شام (اور جو) طلبگار ہیں اس کی رضا کے۔

آں فقیرانِ لطیفِ خوش نفس　کز پے تعظیم شاں آمد عبس (۳۲۸-۴)

(وہ پاکیزہ اور نیک دم فقیر جن کی تعظیم کے لئے سورہ ''عبس'' نازل ہوئی)

آں فقیری بہر پیچا پیچ نیست　بل پے آنکہ بجز حق ہیچ نیست (۳۲۸-۲)

(وہ فقیری اینچ پینچ کے لئے نہیں، بلکہ اس لئے ہے کہ خدا کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔)

یعنی فقیری میں حقانیت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ فقر پر مولانا'' کا بہت سا کلام دوسرے ابواب میں شامل کر دیا گیا ہے۔

باب ۲۵

مثنوی تصوف کا بحرِ زخّار ہے

مولانا رومیؒ کا کلام

(قرآن اور حدیث کی زبان میں)

مولانا رومیؒ کا کچھ کلام جو قرآنی آیات اور احادیثِ نبویہ ﷺ کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، اس باب میں متفرق موضوعات کے اعتبار سے بطور نمونہ شامل کر دیا گیا ہے۔ اس باب میں محض وہ اشعار بیان کئے جا رہے ہیں جن میں احادیثِ نبویہ ﷺ کی طرف اشارات موجود ہیں۔ ان اشعار کے نیچے وہ احادیث (مع ترجمہ) بھی نقل کر دی گئی ہیں جن کی طرف آپ نے ان اشعار میں اشارہ فرمایا ہے۔ ویسے تو مولاناؒ کے کلام میں تقریباً آٹھ صد (۸۰۰) اشعار ایسے ہیں جو راقم الحروف کی نظروں سے گزرے لیکن ان سب کو یہاں بیان کرنا ممکن نہیں، لہٰذا چند اشعار پر ہی اکتفا کیا جا رہا ہے۔

وہ اشعار جن کو نیچے بیان کیا جا رہا ہے سب کے سب طریقت سے متعلقہ ہیں اور ان احادیث کو ان اشعار کے ساتھ شامل کر لیا گیا ہے جن میں مختلف جگہوں پر فقر، درویشی اور روحانیت کے اسباق موجود ہیں۔ اشعار کا یہ مجموعہ مولاناؒ کے پورے کلام میں سے منتخب ہے اس لئے قارئین کو یہ سہولت میسر کر دی گئی ہے کہ وہ پوری مثنوی کا مطالعہ کرنے کی بجائے ان منتخب اشعار سے ہی محظوظ ہو سکیں اور ان اشعار کو تازگی ایمان کا ذریعہ بنائیں۔ وَبِاللّٰهِ التَّوْفِيْقُ۔

۱۔ مولانا رومؒ کا مقام

تو کہ دانی از مقامِ پیرِ رومؒ   می ندانی از کلامِ پیرِ رومؒ (ج۔ن:۷۰۹)

(تم پیرِ رومؒ کے کلام کو کیا جانو؟ تم پیرِ رومؒ کے مرتبہ سے ناآشنا ہو۔)

مثنوی معنوی اور مولانا رومیؒ دونوں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ہر دور اور ہر زبان میں انہیں انتہائی ادب اور قبولیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ ان کی تشریح و توضیح اگرچہ ہر دور میں اپنے وقتی ذوق اور علمی

رسائی کے مطابق ہوتی رہی ہے مگر جس عقیدت اور ارادت سے اس نیک فریضہ کو ہمارے عظیم محسن اور شاعرِ ملت حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے نبھایا ہے اس کی نظیر ادبیات کے عالم میں کہیں ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ علامہ اقبالؒ کا نام آتے ہی مسلمانوں کے سر ادب سے جھک جاتے ہیں اور علامہ خود مولانا رومؒ کے حضور سراپا ادب نظر آتے ہیں۔

تا خود غلامِ کیست کہ سعدیؒ غلامِ اُوست (آپ جس کے غلام ہیں، سعدیؒ بھی اسی کا غلام ہے)

اندریں حالات مسلمانوں کے لئے بالعموم اور تشنگانِ آبِ معرفت کے لئے بالخصوص مثنوی معنوی کے منبع فیض (کہ فیض اش دائم است) سے پھوٹنے والے اس چشمہ کی اہمیت، افادیت اور نورانیت پر کسی قسم کی روشنی ڈالنا محض تحصیلِ حاصل ہے اور ایسے ہے جیسے سورج کو چراغ دکھانا۔

۲۔ گفت اطفالِ من اند ایں اولیاء

مولانا رومی کے کلام میں ایک خوبی یہ ہے کہ وہ کسی مشکل مسئلے کو ذہن نشین کرانے کے لئے مثالوں اور تشبیہات سے کام لیتے ہیں۔ تشبیہات رومی کے متعلق ہم اپنی کتاب ''سوز و سازِ رومیؒ'' میں ایک باب تحریر کر چکے ہیں۔ درج ذیل اشعار میں مولاناؒ ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ کچھ مسافر بھوک اور ننگ کی حالت میں جب ایک گاؤں میں پہنچے تو لوگوں نے ان سے کہا اس جگہ سے آگے جب تم جاؤ گے تو تم کو بہت سے ہاتھیوں کے بچے ملیں گے مگر تم ان کو پکڑنے کی کوشش نہ کرنا کیونکہ سینکڑوں بڑے بڑے ہاتھی جو درختوں میں چھپے رہتے ہیں تم پر ایک دم حملہ کر دیں گے اور تمہیں مار ڈالیں گے۔ جب وہ مسافر آگے بڑھے تو انہوں نے ہاتھیوں کے بچوں کو پکڑا تو واقعی تمام ہاتھی ان مسافروں پر ٹوٹ پڑے اور ان کو پاؤں تلے روند دیا۔ اس مثال سے مولاناؒ یہ واضح کرتے ہیں کہ اولیاء اللہ بھی اللہ تعالیٰ کے عیال کی طرح ہیں، ان کو اگر کچھ کہو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر فوراً گرفت کرے گا۔ یہ بات ایسے ہے کہ جیسے کوئی کہہ دے کہ فلاں میرے بیٹوں کی طرح ہے حالانکہ وہ بیٹا نہیں ہوتا۔

گفت اطفالِ من اند ایں اولیاء در غریبی فرد از کار و کیا (۲۳۔۳)

(اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ اولیاء میرے عیال کی طرح ہیں، اجنبیت میں کام اور شغل سے الگ (ماسوا اللہ سے قطعاً بیگانہ ہیں)

مطلب یہ کہ اولیاء میری طرف اس طرح متوجہ اور مشغول ہیں کہ ماسوا اللہ سے بالکل اجنبی اور بیگانہ ہو کر رہ گئے ہیں۔

اَلْخَلْقُ كُلُّهُمْ عَيَالُ اللهِ (لطائف معنوی ص ۱۱۱) تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔

حضرت شبلیؒ سے منقول ہے کہ

اَلصُّوْفِیَۃُ اَطْفَالٌ فِی حِجْرِ الْحَقِّ
صوفیاء اللہ کی گود میں بچوں کی مانند ہوتے ہیں۔
(رسالہ قشیریہ مطبوعہ مصر ص ۱۲۷)

مال ایشاں خون ایشاں داں یقیں زانکہ مال از زور آید در یمیں (۲۹۔۳)

(ان کے مال کو ان کے خون کے برابر سمجھو، ویسے ان کا مال چھین لینا ان کی خونریزی سے کم نہیں کیونکہ مال زورِ بازو سے ہاتھ آتا ہے۔)

درج ذیل حدیث پاک میں خون پسینہ ایک کر کے کمائے ہوئے رزقِ حلال کی اہمیت کا بھی بیان ہے۔

حُرْمَتُم مَالِ الْمُسْلِمِ کَحُرْمَۃِ دَمِہٖ
(حیلۃ الاولیاء (ج: ۷، ص ۳۳۴، جامع صغیر ج ۱، ص ۱۰۵)
مسلمان کا مال دوسرے مسلمان کے لئے اس طرح حرام ہے جیسا کہ اس کا خون۔

قِتَالُ الْمُؤْمِنِ کُفْرٌ وَ اَکْلُ لَحْمِہٖ مِنْ مَّعْصِیَۃِ اللّٰہِ وَ حُرْمَۃُ مَالِہٖ کَحُرْمَۃِ دَمِہٖ
(جامع صغیر ج ۱ ص ۶۳)
مومن کے ساتھ جنگ کرنا کفر ہے اور اللہ کی نافرمانی میں سے ہے اس کا گوشت کھانا اور اس کا مال کھانا اس طرح حرام ہے جیسا کہ اس کا خون بہانا حرام ہے۔

۳۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باخبر ہیں

ہماری غیر مطبوعہ تصانیف "مسلکِ اولیاً" اور "سرمایۂ ملت" میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھ دیا گیا ہے۔
مثنوی مولانا رومؒ میں اس موضوع پر اور بھی اشعار ہیں مگر یہاں صرف دو اشعار دیئے جا رہے ہیں۔
مطلب: آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے عاشق زار اویس قرنیؓ کی خوشبو یمن سے محسوس فرمائی تھی۔ اس کی جانب اشارہ ہے کہ آپ باخبر تھے۔

اِنِّیْ لَاَجِدُ نَفَسَ الرَّحْمٰنِ مِنْ جَانِبِ الْیَمَنِ۔ (احیاء العلوم ج ۳ ص ۱۵۳)
بے شک میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے جھونکے یمن کی طرف سے پا رہا ہوں۔

اَلَا اِنَّ الْاِیْمَانَ یَمَانٌ وَالْحِکْمَۃُ یَمَانِیَۃٌ وَ اَجِدُ نَفَسَ رَبِّکُمْ مِنْ قِبَلِ الْیَمَنِ۔
(احیاء العلوم ج ۳ ص ۱۵۳)
خبردار! بے شک صحیح ایمان وہی ہے جو یمنی لوگوں کا ہے اور صحیح دانائی بھی یمنی لوگوں کی ہی ہے اور میں خدا کی رحمت کے جھونکے یمن کی طرف سے محسوس کر رہا ہوں۔

اِنِّیْ اَجِدُ رَوَائِحَ الْجَنَّۃِ مِنْ قِبَلِ قَرْنٍ۔
بے شک میں جنت کی خوشبو کے جھونکے قرن کی

جانب سے پا رہا ہوں۔ (سفینۃ البحار ج ۱ ص ۵۳)

آنکہ یابد بوئے حق را از یمن چوں نیابد بوئے باطل را زمن

(وہ پاک ہستی جو (مدینے میں بیٹھے ہوئے) یمن کے ملک سے رحمٰن کی خوشبو محسوس کرتی ہے، مجھ سے بدبو کیوں نہ محسوس کرے گی۔)

مصطفیٰ چوں بوئے برد از راہ دور چوں نیابد از دہانِ ما بخور (۲۹۔۳)

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یمن کی اس قدر دور دراز سے بو محسوس فرمائی، تو ہمارے منہ کی بو کیونکر نہ محسوس کریں گے۔)

۴۔ اعمال کا مدار عقلوں پر ہے

اختلافِ عقل ہا در اصل بود بر وفاقِ سُنیاں باید شنود (۱۵۴۔۳)

(اہلِ سنت و جماعت کے مسلک کے موافق سننا چاہئے کہ عقلوں کا اختلاف اصل فطرت میں ہے۔)

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَوْمًا رَبَّنَا هَلْ خَلَقْتَ خَلْقًا اَعْظَمَ مِنَ الْعَرْشِ قَالَ نَعَمْ الْعَقْلَ قَالُوْا وَمَا بَلَغَ قَدْرُهٗ قَالَ هَيْهَاتَ لَا يُحَاطُ بِعِلْمِهٖ هَلْ لَكُمْ عِلْمٌ بِعَدَدِ الرِّمَالِ قَالُوْا لَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى فَاِنِّىْ خَلَقْتُ الْعَقْلَ اَصْنَافًا شَتّٰى كَعَدَدِ الرِّمَالِ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ اُعْطِىَ حَبَّةً وَّمِنْهُمْ مَنْ اُعْطِىَ حَبَّتَيْنِ وَمِنْهُمْ مَنْ اُعْطِىَ الثَّلَاثَ وَمِنْهُمْ مَنْ اُعْطِىَ اَرْبَعًا وَّ مِنْهُمْ مَنْ اُعْطِىَ فَرَقًا وَّ مِنْهُمْ مَنْ اُعْطِىَ وَسَقًا وَّ مِنْهُمْ مَنْ اُعْطِىَ اَكْثَرَ مِنْ ذَالِكَ (المنہج القوی ج ۳ ص ۲۲۰)

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے سنا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "فرشتوں نے ایک دن کہا کہ ہمارے رب کیا تو نے اپنے عرش سے بھی زیادہ کوئی چیز عظیم بنائی ہے؟ خدا نے فرمایا ہاں عقل۔ انہوں نے کہا کہ اس کی انتہا کہاں تک ہے؟ خدا نے فرمایا کہ علم کے ذریعے اس کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیا تمہیں ریت کے ذروں کی تعداد کا علم ہے؟ فرشتوں نے نفی میں جواب دیا۔ خدا نے کہا کہ میں نے عقل کو پیدا کیا اتنی ہی قسموں پر جس طرح ریت کے ذروں کی تعداد ہوتی ہے۔ بعض آدمی تو وہ ہیں جن کو عقل کا صرف رتی برابر حصہ دیا گیا ہے، بعض وہ ہیں جن کو دو رتیاں دی گئی ہیں بعض کو تین رتیاں اور بعض کو چار رتیاں اور بعض کو سر کے بوجھ کے برابر اور بعض کو شجرِ خرما

کے بوجھ کے برابر اور بعض کو اس سے بھی زیادہ۔

۵۔ قبولیتِ دُعاء

ہماری تصنیف "حُسنِ نماز" کے آخری حصہ میں دعا کے موضوع پر تقریباً ۱۲۰ صفحات پر مشتمل مضمون دیا جا چکا ہے۔ تفصیل کے لئے اس کا مطالعہ فرمائیں۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

آں بلالؓ صدق در بانگ نماز حَیَّ را ھَیّ خواند از روئے نیاز (۳۰۔۳)

(سچائی کا وہ نمونہ بلالؓ نماز کی اذان میں (حَیَّ عَلَی الصَّلوٰۃِ) کی بجائے خلوص کے ساتھ ھَیَّ (ھائے ہوز کے ساتھ) پڑھتے تھے۔)

مطلب یہ ہے کہ دعا اگر صدقِ دل اور خلوصِ نیت سے کی جائے تو مقبول ہوتی ہے اگرچہ اس کے الفاظ غیر فصیح ہوں۔ مولانا نے اس کی مثال یہ دی کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی غلط اذان ان کے خلوص کی بنا پر دوسرے لوگوں کی صحیح اذان سے بدرجہا بہتر تھی۔

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ اَمَرَ بِلَالًا اَنْ يُّؤَذِّنَ يَوْمَ الْفَتْحِ عَلٰى ظَهْرِ الْكَعْبَةِ فَاَذَّنَ عَلٰى ظَهْرِهَا وَالْحَارِثُ بْنُ هِشَامٍ وَّ صَفْوَانُ بْنُ اُمَيَّةَ قَاعِدَانِ فَقَالَ اَحَدُهُمَا لِلْاٰخَرِ اُنْظُرْ اِلٰى هٰذَا الْحَبَشِيِّ فَقَالَ اَنْ يَّكْرَهَهُ اللّٰهُ يُغَيِّرُهُ (طبقات ابن سعد، ص ۱۶۷)

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ فتح مکہ کے دن کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان کہے چنانچہ انہوں نے بیت اللہ شریف کی چھت پر چڑھ کر اذان کہی اور حارث بن ہشام اور صفوان بن امیہ دونوں بیٹھے ہوئے تھے، ان میں سے ایک نے کہا، ذرا اس حبشی کو دیکھنا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا اس کافر کو حقارت کی نگاہ کے ساتھ دیکھنے کی بنا پر اس کی شکل کو مسخ کر دے گا۔

۶۔ رحم کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے

رحم خواہی رحم کن بر اشک بار رحم خواہی بر ضعیفاں رحم آر (۱۱۱۔۱)

(اگر تم خود چشم نمناک کے متمنی ہو تو آبدیدہ ہو کر معافی مانگنے والے پر رحم کرو اور اگر تم رحم کے خواستگار ہو تو پہلے خود کمزوروں پر رحم کرو۔)

مطلب یہ ہے کہ طالب رحم کو خود بھی رحم کرنا چاہیے۔

اشارہ: احادیث ذیل سے ماخوذ ہے۔

لَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ

اللہ تعالیٰ اس پر رحم نہیں کرتا جو لوگوں پر رحم نہ کرے۔

ذیل کی صورت میں بھی روایت ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ ؓ اَنَّ الْاَقْرَعَ بْنَ حَابِسٍ ؓ اَبْصَرَ النَّبِیَّ ﷺ يُقَبِّلُ الْحَسَنَ فَقَالَ اِنَّ لِیْ عَشَرَةً مِّنَ الْوَلَدِ مَاقَبَّلْتُ وَاحِدًامِّنْهُمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِنَّهٗ مَنْ لَا يَرْحَمُ لَايُرْحَمُ اِنَّمَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مِنْ عِبَادِهِ الرُّحَمَآءَ

(مسلم ج ۳ ص ۳۹، جامع صغیر ج ۱ ص ۳۷، کنوز الحقائق ص ۳۶)

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ اقرع بن حابس نے رسول پاک ﷺ کو دیکھا کہ آپ حضرت حسنؓ کا بوسہ لے رہے ہیں۔ اقرع کہنے لگا میرے دس بچے ہیں لیکن میں نے کسی ایک کا بھی بوسہ نہیں لیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں پر رحم کرتا ہے، جو رحم کرنے والے ہیں۔

اِنَّمَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ يَّرْجُوْهَا وَ اِنَّمَا يَجْتَنِبُ النَّارَ مَنْ يَّخَافُهَا وَ اِنَّمَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مَنْ يَّرْحَمُ اِرْحَمْ مَنْ فِی الْاَرْضِ يَرْحَمْكَ مَنْ فِی السَّمَآءِ

(جامع صغیر ج ۱ ص ۳۸، کنوز الحقائق ص ۱۱)

یقیناً جنت میں وہ داخل ہوگا جو اس کی آرزو رکھے گا اور یقیناً جہنم سے وہ اجتناب کرے گا جو اس سے خوف کھائے گا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ رحم کرتا ہے اس پر جو رحم کیا کرتا ہے دوسروں پر۔ زمین میں بسنے والوں پر رحم کر کہ وہ ذات جس کا جلوہ آسمانوں پر موجود ہے وہ تجھ پر رحم کرے گی۔

اِرْحَمُوْا تُرْحَمُوْا وَ اغْفِرُوْا يُغْفَرْلَكُمْ

(جامع صغیر ج ۱ ص ۳۷)

یعنی رحم کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے، لوگوں کی غلطیاں معاف کر دیا کرو تا کہ تمہاری غلطیاں معاف کی جائیں۔

زور را بگذار زاری را بگیر　　رحم سوئے زاری آید اے فقیر (۵۔۵۸)

(زور کو چھوڑیئے عاجزی کو اختیار کیجئے، اے درویش! رحم ہمیشہ انکساری کی طرف آتا ہے۔)

۷۔ ولی، اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہوتا ہے

نور غالب ایمن از کسف و غسق　　درمیانِ اِصْبَعَیْنِ نورِ حق (۱۔۲۰۴)

(وہ ایک نور ہے سب پر چھا جانے والا، گہن اور تاریکی سے محفوظ، نورِ حق کی دو انگلیوں کے درمیان ہے۔)

مطلب یہ ہے کہ وہ نور یعنی وہ ولی کامل اللہ تعالیٰ کی دو انگشتِ قدرت کے درمیان ہوتا ہے اور اس کا مطیع و

منقاد رہتا ہے۔

اشارہ

اِنَّ قُلُوْبَ بَنِیْٓ اٰدَمَ کُلَّھَا بَیْنَ اِصْبَعَیْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ قَلْبٍ وَّاحِدٍ یُصَرِّفُهٗ حَیْثُ یَشَآءُ (صحیح مسلم ج ۸ ص ۵۱)

تمام بنی آدم کے دل ایک دل کی مانند خدائے رحمٰن کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں وہ جس طرف چاہتا ہے ان کو موڑ دیتا ہے۔

اشارہ

قَلْبُ الْمُؤْمِنِ بَیْنَ اِصْبَعَیْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ اِنْ شَآءَ اَقَامَهٗ وَ اِنْ شَآءَ اَزَاغَهٗ (احیاء العلوم ج ا ص ۷۲)

مومن کا دل خدائے رحمان کی دو انگلیوں کے درمیان ہے، چاہتا ہے تو اس کو سیدھا کر دیتا ہے چاہتا ہے تو ٹیڑھا کر دیتا ہے۔)

۸۔ نورِ ولایت

حق فشاند آں نور را بر جانہا مقبلاں برداشتہ دامانہا(۲۰۵۔۱)

(حق تعالیٰ نے (اولیاءؑ اور انبیاءؑ کے) اس نور کو (طالبوں کی) ارواح پر نازل فرمایا اور جو اہلِ اقبال ہیں (وہ ان سے حق کے انوار لینے کے لئے) دامن اٹھائے ہوئے ہیں۔) اس شعر میں نور استعارہ ہے، نورِ ولایت اور رسالت سے۔

اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی خَلَقَ خَلْقَهٗ فِیْ ظُلْمَةٍ فَاَلْقٰی عَلَیْھِمْ مِّنْ نُّوْرِهٖ فَمَنْ اَصَابَهٗ مِنْ ذَالِکَ النُّوْرِ یَوْمَئِذٍ اِھْتَدٰی وَمَنْ اَخْطَاهُ ضَلَّ (جامع صغیر ج ا ص ۹۶، فتوحات مکیہ ج ۲ ص ۸۱)

اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اندھیرے میں پیدا کیا پھر اُن پر اپنا نور ڈالا جس کو وہ نور پہنچا وہ ہدایت پا گیا اور جس نے خطا کی وہ گمراہ ہو گیا۔)

۹۔ نفسِ اَمّارہ انسان کا بدترین دشمن ہے۔

نفس ہر دم از درونم در کمیں از ہمہ مردم بتر از مکر و کیں

(غیروں سے کیا شکایت) خود میرا نفس میرے اندر تاک لگائے بیٹھا ہے، جو مکر اور کینے میں سب لوگوں سے بدتر ہے۔)

مطلب یہ ہے کہ نفسِ امّارہ کے مکروفریب کا بیان و تذکرہ ہے۔ (احادیث مثنوی ص ۱۷ شعر نمبر ۳) (ڈاکٹر محمد عبداللطیف)

اشارہ

اَعْدٰی عَدُوِّکَ نَفْسُکَ الَّتِیْ بَیْنَ جَنْبَیْکَ (مشکوٰۃ شریف)
(دشمن تیرا نفس ہے جو تیرے دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے۔)

نیز امیر المومنین حضرت علیؓ کا قول اس مضمون کے بہت موافق ہے۔

لَا عَدُوَّ اَعْدٰی عَلَی الْمَرْءِ مِنْ نَفْسِہٖ اللّٰہُ فِی الْجِھَادِ بِالنَّفْسِ فَھِیَ اَعْدَی الْعَدُوِّ لَکُمْ
انسان کا نفس سے بڑھ کر کوئی دشمن نہیں۔ اللہ نفس کے ساتھ جہاد کرنے سے ملتا ہے کیونکہ نفس تمہارے لئے سب دشمنوں سے بڑا دشمن ہے۔

۱۰۔ حق شناسی

گفت درویشے بدرویشے کہ تو
چوں بدیدی حضرتِ حق را بگو (۵۳۔۵)

(ایک درویش نے دوسرے درویش سے کہا، یہ تو بتاؤ کہ تم نے حضرتِ حق کو کیسے دیکھا؟)

مطلب یہ ہے کہ مصیبت کے وقت اعمال حسنہ کا دامن نہ تھامنے والے ظاہر بین، ابتلا کے وقت حق بین حضرات سے پہچانے جاتے ہیں۔

اشارہ

اِنَّ مَعَ الدَّجَّالِ اِذَا خَرَجَ مَآءً وَّنَارًا فَاَمَّا الَّذِیْ یَرَی النَّاسُ اَنَّہٗ نَارٌ فَمَآءٌ بَارِدٌ وَاَمَّا الَّذِیْ یَرَی النَّاسُ اِنَّہٗ مَآءٌ فَنَارٌ تَحْرِقُ فَمَنْ اَدْرَکَ ذَالِکَ مِنْکُمْ فَلْیَقَعْ فِی الَّذِیْ یَرٰی اَنَّہٗ نَارٌ فَاِنَّھَا مَآءٌ عَذْبٌ بَارِدٌ
(مسند احمد ج ۵ ص ۹۹، ۳۹۷، ۳۹۵، ۴۰۵)

یعنی بے شک دجال کا خروج ہوگا تو اس کی معیت میں آگ اور پانی ہوگا۔ جس چیز کو آدمی آگ سمجھیں گے وہ درحقیقت ٹھنڈا پانی ہوگا اور جس کو پانی سمجھیں گے وہ ایک جلا دینے والی آگ ہوگی۔ تم میں سے جو آدمی اس کو پائے اسے چاہیے کہ اس حصے میں گرے جو بظاہر آگ دکھائی دے رہی ہو کیونکہ بے شک وہ آگ نہیں وہ شیریں اور ٹھنڈا پانی ہے۔

۱۱۔ دیہاتی مہمان نواز ہوتے ہیں

اَلْکِیَاسَۃُ وَالْاَدَبُ لِاَھْلِ الْمَدَرِ اَلضِّیَافَۃُ وَالْقِرٰی لِاَھْلِ الْوَبَرِ

(دانائی اور تہذیب شہر والوں کا حصہ ہے اور ضیافت و مہمان نوازی کا وصف دیہاتیوں کے لئے ہے۔)

اَلضِّیَافَۃُ لِلْغَرِیْبِ وَالْقِرٰی اَوْدَعَ الرَّحْمٰنُ فِیْ اَھْلِ الْقُرٰی (۲۳۶۔۶)

(مسافر کے لئے ضیافت اور مہمان داری حق تعالیٰ نے اہل دیہات کو بخشی ہے۔)
مطلب یہ ہے کہ تہذیب وشائستگی اہل شہر کا اور مہمان نوازی اور مسافر پروری اہل دیہات کا حصہ ہے۔

۱۲۔ انسان کی فضیلت

جوہر است انساں و چرخ اُو را عرض جُملہ فرع و سایہ اند و اُو غرض (۳۵۹-۵)

(انسان ایک جوہر ہے اور آسمان اس کی عرض ہے تمام مخلوقات (غیر انسان) متعلقات اور سایہ ہیں اور اصل مقصود انسان ہے۔)

مطلب یہ ہوا کہ انسان کی فضیلت اور منزلت کا تذکرہ ہے۔

یَا ابْنَ اٰدَمَ خَلَقْتُکَ لِاَجْلِیْ وَ خَلَقْتُ الْاَشْیَآءَ لِاَجْلِکَ (فتوحات مکیہ: ج ۴، ص ۱۶۳)
اے ابنِ آدم! میں نے تجھ کو اپنے لئے پیدا کیا اور کائنات کی چیزیں تیرے لئے پیدا کیں۔

۱۳۔ اپنے نفس کو ذلیل کرو

چوں طمع بستی تو در انوارِ ھُو مصطفیٰ گوید کہ ذلّت نفسہٗ (۳۶۵-۵)

(جب تم انوار الٰہیات کے شائق ہو جاؤ تو (تم اس عالی مقام پر پہنچ گئے جس کے متعلق) حضورؐ کا فرمان ہے کہ اس کا نفس ذلیل ہو گیا ہے۔ مطلب یہ کہ خواریٔ نفس ایک اعلیٰ فضیلت ہے۔)

ایں جہادِ اکبر است آں اصغر است ہر دو کارِ رستم است و حیدرؓ است

(یہ بڑا جہاد ہے اور وہ چھوٹا جہاد دونوں جہاد رستم (ابن زال) اور حیدر کرارؓ جیسے بہادروں کے ہیں یعنی جنگ لڑنا جہاد اصغر ہے اور نفس کے خلاف جنگ جہاد اکبر ہے۔)

۱۴۔ اہلِ محبت ہر وقت تمہارے ساتھ رہتے ہیں

کو نبیِ وقتِ خویش ست اے مرید زانکہ زو نورِ نبی آید پدید

۔(کیونکہ اے مرید وہ مرشد کامل اپنے وقت کا نبی ہے، اس لئے کہ وہ صاف طور پر نبی کا نور ہے۔)

تا معیت . راست آید زانکہ مرد باکسے جفت ست کورا دوست کرد (۸۳-۵)

(تاکہ تمہارے لئے حق کا ساتھ ثابت ہو جائے اس لئے کہ آدمی کو اس کا ساتھ حاصل ہوتا ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے۔)

ایں جہان و آں جہان با اُو بود ویں حدیث احمدِ خوشخو بود

(اس دنیا اور آخرت میں) اس کے ساتھ ہو گا اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ جو اچھی عادت والے تھے ان کی

حدیث کا مضمون یوں ہے۔)

گفت اَلْمَرْءُ مَعَ مَحْبُوْبِہٖ لَا یَفُکُّ الْقَلْبُ مِنْ مَطْلُوْبِہٖ (۸۳۔۵)

(کہ آدمی اپنے محبوب کے ساتھ رہتا ہے، قلب اپنے مطلوب سے جدا نہیں ہوتا۔)

اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ (احیاء العلوم ج ۳ ص ۱۲۶، حلیۃ الاولیاء، جامع صغیر ج ۲ ص ۱۸۴)

انسان اس کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا ہے۔

اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ وَلَهٗ مَاكُتِبَ اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ وَ اَنْتَ مَعَ مَنْ اَحْبَبْتَ (کنوز الحقائق ج ا ص ۱۳۴، جامع صغیر ج ۳ ص ۱۸۴)

انسان اپنے محبوب کے ساتھ ہوگا اور اسے وہی ملے گا جو اس کے لئے لکھا گیا ہے۔ انسان اپنے محبوب کے ساتھ ہوگا اور تم ان کے ساتھ ہو گے جس سے تم محبت کرتے ہو۔

اَلْعَبْدُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ اَلْعَبْدُ عَنْ ظَنِّهٖ بِاللّٰهِ وَهُوَ مَعَ مَنْ اَحَبَّ (جامع صغیر ج ۲ ص ۶۷)

آدمی جس سے محبت کرتا ہے اس کے ساتھ ہوگا انسان جیسا اللہ کے ساتھ گمان رکھتا ہے اسی طرح ہوگا اور وہ اپنے محبوب کے ساتھ ہوگا۔

۱۵۔ قلب بدل جاتے ہیں

در حدیث آمد کہ دل ہمچوں پریست در بیابانے اسیرِ صرصریست (۱۶۵۔۳)

(حدیث میں آیا ہے کہ دل گویا ایک پر ہے، جو ایک جنگل کے اندر تیز ہوا کے قبضے میں ہے)

مطلب: انسان کے دل کا اعتبار نہیں۔ اشارہ: یہ ہے کہ

اِنَّ هٰذَا الْقَلْبَ كَرِيْشَةٍ بِفَلَاةٍ مِنَ الْاَرْضِ تُقَلِّبُهَا الرِّيْحُ عَلٰى ظَهْرِ الْبَطْنِ (مسند احمد ج ۴ ص ۴۱۹)

یعنی اس دل کی مثال اس تنکے کی ہے جو زمین پر پڑا ہو اور ہوا کے جھونکے اس کو الٹ پلٹ رہے ہوں۔

مَثَلُ الْقَلْبِ كَمَثَلِ رِيْشَةٍ فِي اَرْضٍ فَلَاةٍ تُقَلِّبُهَا الرِّيْحُ ظَهْرَ الْبَطْنِ (احیاء العلوم ج ۳ ص ۴۴)

اس دل کی مثال اس تنکے کی ہے جو ایک صحرائی زمین میں پڑا ہو اور جس کو جھکڑ الٹ پلٹ رہے ہوں۔

مَثَلُ الْقَلْبِ كَمَثَلِ رِيْشَةٍ بِاَرْضٍ فَلَاةٍ فِي يَوْمِ رِيْحٍ عَاصِفٍ تُقَلِّبُهَا الرِّيْحُ

اس دل کی مثال اس تنکے کی ہے جو ایک صحرائی زمین میں پڑا ہو ایک ایسے دن جس دن سخت آندھی آئی ہو تو

ظَهرَ البطْنِ (شرح تعرف: ج ۲ ص ۱۶۷) وہ آندھی اس تنکے کو الٹ پلٹ دیتی ہے۔

۱۶۔ نفلی عبادت سے اللہ تعالیٰ بندے کے ہاتھ اور پیر بن جاتا ہے۔

رو کہ ''بِیْ یَسْمَعُ وَبِیْ یُبْصِرُ'' توئی سرّ توئی چہ جائے صاحب سرّ توئی (۲۱۳۔۱)

(اے میرے پیارے بندے جا اور امن وچین سے دن گزار اس لئے کہ تو میرے ذریعے سنتا اور میرے ہی ذریعے دیکھتا ہے تو خود میرا سرِّ مخفی بن گیا ہے چہ جائیکہ تو محض صاحب اسرار ہی ہو۔)

مطلب یہ ہے کہ خدا جب کسی کو محبوب بنالیتا ہے تو اس کا گوش، گوشِ حق بن جاتا ہے اور اس کی چشم، چشمِ حق بن جاتی ہے اور وہ کبریا کے سرِّ مخفی کو پالیتا ہے۔

اشارہ

اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَالَ مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُهٗ عَلَيْهِ وَلَا يَزَالُ عَبْدِیْ يَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّهٗ فَاِذَآ اَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ يَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِیْ يُبْصِرُ بِهٖ وَيَدَهُ الَّتِیْ يَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِیْ يَمْشِیْ بِهَا وَ اِنْ سَاَلَنِیْ لَاُعْطِيَنَّهٗ وَ اِنِ اسْتَعَاذَ بِیْ لَاُعِيْذَنَّهٗ وَمَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَیْءٍ اَنَا فَاعِلُهٗ كَتَرَدُّدِیْ عَنْ قَبْضِ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ يَكْرَهُ الْمَوْتَ وَاَنَا اَكْرَهُ مَسَآءَتَهٗ

(الجامع الصحیح للبخاری رقم الحدیث ۶۵۰۲)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جس شخص نے میرے ولی سے عداوت رکھی میں اسے جنگ کا چیلنج کرتا ہوں اور میرا بندہ کسی ایسی چیز کے ذریعے میرے نزدیک نہیں ہو سکتا جو مجھے اس چیز سے زیادہ محبوب ہو جو میں نے اس پر فرض کی۔ میرا بندہ نوافل مسلسل ادا کرتا ہے اور میرے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ میں اسے محبوب رکھنے لگتا ہوں اور جب وہ میرا محبوب بن جاتا ہے تو جن کانوں سے وہ سنتا ہے میں وہ کان بن جاتا ہوں، جن ہاتھوں کے ساتھ پکڑتا ہے اور جن پاؤں کے ساتھ وہ چلتا ہے وہ میں بن جایا کرتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے مانگے تو میں ضرور عطا کرتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے پناہ مانگے تو میں اسے پناہ دیتا ہوں اور میں جو کام کرنا چاہتا ہوں اُس میں تاخیر نہیں کرتا سوائے مومن کی روح قبض کرنے کے۔ وہ موت کو ناپسند کرتا ہے تو میں اسے مہلت دیتا ہوں (یہاں تک کہ وہ خود میرے پاس آنا پسند کرے۔)

۱۷۔ جو اللہ کا ہو گیا اللہ اس کا ہو گیا

چوں شدی مَن کان للہ از ولہ　　　　من ترا باشد کہ کانَ اللہ لہٗ (۱-۲۱۳)

(جب تم عشق کی بدولت "من کان للہ" کے مصداق بن گئے تو تمہارا اللہ حامی و ناصر ہو گا کیونکہ کانَ اللہُ لہٗ حدیث برحق ہے۔)

مطلب یہ ہے کہ "قطرہ دریا سے جو مل جائے تو دریا ہو جائے۔"

ایں سخن دریا بگوشِ قطرہ گفت　　　　ہر کہ از ما می شود ما می شود

(یہ بات دریا نے قطرہ سے کہی کہ جو ہمارا ہو گیا ہم اس کے ہو جاتے ہیں۔)

اشارہ

مَنْ کَانَ لِلّٰہِ کَانَ اللّٰہُ لَہ　　　　(یعنی جو اللہ کا ہو جائے اللہ اس کا ہو جاتا ہے۔)

(کشف الاسرار دانشگاہ تہران ص ۵۶۲)

۱۸۔ حکمت مومن کی گم شدہ چیز ہے

کالۂ حکمت کہ گم کردہ دل ست　　　　پیشِ اہل دل یقیں آں حاصل ست (۲۲۸-۲)

(سرمایہ حکمت جس کو دل گم کر چکا ہے، اہل دل کے پاس یقیناً وہ حاصل ہو سکتا ہے۔)

یعنی سرمایۂ حکمت مومن کا مال ہے جو اسے حضرات کاملین کی صحبت و معیت میں ملے گا۔

۱۹۔ انسانی ساخت پر غور و فکر

از دو پارہ پیہ ایں نورِ رواں　　　　موجِ نورش می زند تا آسماں (۲۳۴-۲)

(چربی کے دو ٹکڑوں یعنی آنکھ کے دو ڈھیلوں سے خدا نے وہ سریع السیر اور تیز رفتار نور پیدا کیا ہے جس کی موج آسمان سے جا ٹکراتی ہے۔)

مطلب یہ ہے کہ قدرت الٰہیہ کی مثالیں دی جا رہی ہیں اور یہ تیسری مثال ہے کہ حکمتِ کاملہ سے جب نور بصارت لمحہ میں میلوں تک دیکھ سکتا ہے تو نور بصیرت کا کیا کہنا وہ ماورائے آسمان بھی پہنچ سکتی ہے۔ گویا جہاں یہ قدرت حق کی مثال ہے، وہیں یہ بات بھی ضمناً آ گئی کہ

درِ معرفت دیدۂ آدمی ست

(معرفت کا دروازہ انسان کی نگاہ ہے۔)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا قول ہے۔

اِعْجَبُوْا لِھٰذَا الْاِنْسَانِ یَنْظُرُ بِشَحْمٍ وَّ　　　　اس انسان کو دیکھ کر تعجب کرنا چاہیے کہ یہ چربی

يَتَكَلَّمُ بِلَحْمٍ وَّ يَسْمَعُ بِعَظْمٍ وَّ يَتَنَفَّسُ مِنْ خَرْمٍ (شرح نہج البلاغہ ج ۴ ص ۶۴۴)

کے ساتھ دیکھتا ہے، گوشت کے ساتھ بولتا ہے، ہڈی کے ساتھ سنتا ہے اور خرم کے ساتھ (یعنی نتھنے سے) سانس لیتا ہے۔

۲۰۔ اللہ تعالیٰ کا مائل بہ کرم ہونا

من نکردم امر تا سودے کنم بلکہ تا بر بندگان جودے کنم (۱۷۳۔۲)

(میں نے مخلوق کو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ خود کوئی فائدہ حاصل کروں، بلکہ اس لئے کہ بندوں پر احسان کروں۔)

مطلب: مقصد تخلیق کائنات کا بندوں پر احسان کرنا ہے۔

يَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِنَّمَا خَلَقْتُ الْخَلْقَ يَرْجُوْا عَنِّيْ وَلَمْ اَخْلُقْهُمْ لِاَرْجُ عَنْهُمْ (مسلم ج ۸ ص ۱۲، مسند احمد ج ۲ ص ۳۸۵)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے مخلوق کو اس واسطے پیدا کیا کہ وہ مجھ سے فائدہ حاصل کریں، اس لئے پیدا نہیں کیا کہ میں ان سے نفع حاصل کروں۔

۲۱۔ اللہ تعالیٰ دل کو دیکھتے ہیں

ما بروں را ننگریم و قال را ما دروں را بنگریم و حال را (۱۷۴۔۲)

(ہم ظاہر اور زبانی باتوں کو نہیں دیکھتے بلکہ ہم تو باطن کی کیفیت اور اصلی حالت کو دیکھتے ہیں۔)

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ظاہری صورت اور زبانی تحمید و تقدیس درکار نہیں۔ عقیدتِ تام و خلوص کامل درکار ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ دلوں اور عملوں کو دیکھتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ اِلٰى صُوَرِكُمْ وَاَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَّنْظُرُ اِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَ اَعْمَالِكُمْ (مسلم ج ۸ مسند احمد ج ۲ ص ۲۸۵، احیاء العلوم ج ۳ ص ۱۹۰)

خداوند تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ اس کی نگاہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال پر رہتی ہے۔

۲۲۔ ولی اللہ دلوں کے جاسوس ہیں

بندگان خاص علام الغیوب در جہانِ جاں جواسیس القلوب (۱۴۸۔۲)

(خدائے غیب دان کے خاص بندے ایسے ہیں جو روحانی دنیا میں دلوں کے جاسوس ہیں، مطلب و مراد یہ ہے کہ اپنے قلوب کی صفائی کی وجہ سے لوگوں کے دلوں کی باتیں ان کے دل پر منعکس ہونے لگتی ہیں۔)

اِحْذَرُوْهُمْ فَاِنَّهُمْ جَوَاسِيْسُ الْقُلُوْبِ (شرح تعرف ج ۱ ص ۸، بحر العلوم)

اولیاء اللہ سے ڈرو کیونکہ وہ دلوں کے جاسوس ہیں۔

۲۳۔ جہل باعثِ مذمت ہے۔

چونکہ ملعون خواند ناقص را رسولؐ بود در تاویل نقصانِ عقول(۱۵۴۔۲)

(حضور سرورِ کائناتؐ نے جو ناقص کو ملعون کا لقب دیا ہے، اس سے بروئے تاویل عقلوں کا نقصان مراد ہے۔)

مطلب یہ ہے کہ مذمت جہل ہے۔ ناقص تن قابلِ رحم ہوتا ہے لیکن ناقصِ عقل جو اصلی و نقلی اور باقی و فانی کے فرق کو نہیں سمجھتی وہ ملعون ہے۔ "اَلنَّاقِصُ مَلْعُوْنٌ" (شرح خواجہ ایوب طبع مصر ج ۳ ص ۳۵۲)

۲۴۔ ولی کا نورِ بصیرت

چشم او یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللہِ شدہ پردہ ہائے جہل را خارق بدہ(۱۵۸۔۲)

(اس کی آنکھ اللہ کے نور کے ساتھ دیکھنے والی ہوتی ہے اور اس نے جہل کے پردے کو چاک کر ڈالا ہے۔)

آنکہ او یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللہِ بود هم ز مرغ و هم ز موی آگاہ بود

(ص۔۶۳۰/۲۸۵)

(اور وہ جو اللہ کے نور کے ساتھ دیکھنے والا ہوتا ہے، وہ مرغ سے بھی اور بال تک سے بھی آگاہ و آشنا ہوتا ہے۔)

مطلب یہ ہے کہ خاصانِ حق کے کمال باطن کی طرف اشارہ ہے۔

۲۵۔ خدمت ایک آزمائش ہے

خدمت استطاعت کے مطابق اللہ کی طرف سے سپرد کی جاتی ہے۔

ہر کسے را خدمتے دادہ قضا در خورِ آں گوہرش در ابتلا(۱۶۔۶)

(ہر کسی کو خدائی تقدیر کے تحت ایک خدمت دی گئی ہے، یہ خدمت اس کی صلاحیت کے مطابق آزمائش کے لئے دی گئی ہے۔)

مطلب یہ ہے کہ ہر کوئی اپنی فطرت کے تقاضے کے مطابق کام کرتا ہے۔

اشارہ

اِعْمَلُوْا فَکُلٌّ مُیَسَّرٌ لِّمَا خُلِقَ لَهٗ

(مسلم ج ۸ ص ۴۷، جامع صغیر ج ۲ ص ۹۳، بخاری ج ۳ ص ۱۳۹)

کام کرتے رہو ہر ایک کے لیے وہ کام آسان کر دیا گیا ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے۔

۲۶۔ ہر شخص مخصوص خدمت کے لئے پیدا کیا گیا ہے

ہر کسے را بہر کارے ساختند میلِ آں را در دلش انداختند (۳۔۱۶۲)

(ہر شخص کو کسی نہ کسی خاص کام (خدمت) کے لئے پیدا کیا گیا ہے، اسی کام کی خواہش اس کے دل میں ڈال دی گئی ہے۔)

مطلب یہ ہے کہ ہر شخص مخصوص کام (یعنی خدمت) کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ مولانا تمثیل سے بات کو واضح کرتے ہیں کہ جس طرح ہمارے شہر میں مل جل کر رہنا آسان ہے اسی طرح دوسروں یعنی اہل اللہ کے لئے بھی سفر کرنا اور پہاڑوں پر تنہا رہنا آسان ہو گیا ہے۔ جس طرح تم سرداری کے دلدادہ ہو، ایک صاحب لوہار کے پیشہ پر فریفتہ ہے اور اپنی اپنی پسند ہے۔

ہمچنانکہ سہل شد مارا حضر سہل شد ہم قوم دیگر را سفر

(جس طرح ہمیں کسی جگہ قیام کرنا آسان ہے اسی طرح ایک دوسری قوم کے لئے سفر کرنا آسان ہے۔)

آنچنانکہ عاشقی بر سروری عاشق است آں خواجہ بر آہنگری (۱۶۲۔۳)

(جس طرح تم سرداری کے دلدادہ ہو اسی طرح وہ خواجہ لوہار کے پیشے پر فریفتہ ہے۔)

مخلصان ہستند دائم در خطر امتحانہا ہست در راہ اے پسر (۱۶۸۔۳)

(خداوند تعالیٰ کے بااخلاص بندے بھی ہمیشہ خطرے میں رہتے ہیں، اس راستے میں انہیں بڑے بڑے امتحانات پیش آتے ہیں۔)

ایک اور جگہ مولاناؒ اس بات کو وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔

زانکہ مخلص در خطر باشد مدام تا زخود خالص نگردد او تمام (۱۳۴۔۲)

(اہلِ اخلاص جب تک شائبہ خودی سے بالکل پاک ہو کر فنا فی اللہ نہ ہو جائیں ہمیشہ خطرے میں ہوتے ہیں۔)

مطلب یہ ہے کہ مخلصین کو بھی اپنی بے خودی سے خائف رہنا چاہیے۔

ع کس نداَنست کہ آخر چہ حالت برود (کوئی شخص نہیں جانتا کہ بالآخر وہ کس حالت سے دوچار ہوگا۔)

وَالْمُخْلِصُوْنَ عَلٰی خَطَرٍ عَظِیْمٍ (شرح خواجہ ایوب) مخلص لوگ ہر وقت ایک عظیم خطرے کے کنارے پر ہوتے ہیں۔

۲۷۔ قرآن کے ظاہری اور باطنی معنی

ہمچو قرآن کہ بمعنی ہفت توست خاص را و عام را مطعم دراست (۱۸۹۔۳)

(جیسا کہ قرآن مجید بلحاظ معانی سات تہیں رکھتا ہے اور اس میں خاص و عام سب کے لئے حسب قابلیت عملی غذا موجود ہے)۔

مطلب: یہ ہے کہ تنزیلِ ربانی کے اندر معانی در معانی موجود ہیں ہر کوئی اپنی استعداد اور کاوش کے مطابق بہرہ اندوز ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ

اِنَّ لِلْقُرْاٰنِ ظَهْرًا وَّبَطْنًا وَ لِبَطْنِهٖ بَطْنًا اِلٰی سَبْعَةِ اَبْطُنٍ (مقدمہ تفسیر صافی)

قرآن پاک کا ایک ظاہری معنی ہوتا ہے اور ایک باطنی اور پھر اس باطنی کے سات تک باطنی معنی ہوتے ہیں۔

كَانَ الْكِتَابُ الْاَوَّلُ نَزَلَ مِنْ بَابٍ وَّاحِدٍ عَلٰی حَرْفٍ وَّاحِدٍ وَّ نَزَلَ الْقُرْاٰنُ مِنْ سَبْعَةِ اَبْوَابٍ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ زَجْرٍ وَّ اَمْرٍ وَّ حَلَالٍ وَّ حَرَامٍ وَّ مُحْكَمٍ وَّ مُتَشَابِهٍ وَّ اَمْثَالٍ فَاَحِلُّوْا حَلَالَهٗ وَحَرِّمُوْا حَرَامَهٗ وَافْعَلُوْا مَا اُمِرْتُمْ بِهٖ وَ انْتَهُوْا عَمَّا نُهِيْتُمْ عَنْهُ وَاعْتَبِرُوْا بِاَمْثَالِهٖ وَاعْمَلُوْا بِمُحْكَمِهٖ وَاٰمِنُوْا بِمُتَشَابِهِهٖ وَ قُوْلُوْا اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا۔

(تفسیر طبری ج ۱ ص ۲۲)

یعنی پہلی کتاب جو کہ آسمان سے نازل ہوئی تھی، وہ ایک ہی باب اور ایک ہی موضوع پر نازل ہوئی تھی اور قرآن پاک سات قرأتوں کے ساتھ سات موضوعات پر نازل ہوا۔ زجر و توبیخ، احکام، حلال و حرام، محکم، متشابہ اور ضرب الامثال۔ پس قرآن کی حلال کردہ چیزوں کو حلال اور حرام کردہ چیزوں کو حرام سمجھو اور وہ کام کرو جن کے کرنے کا تمہیں حکم دیا گیا ہے اور وہ کام نہ کرو جس سے تمہیں منع کیا جائے۔ اس کی مثالوں سے عبرت حاصل کرو، اس کی محکم آیات پر عمل کرو اور متشابہات پر ایمان لے آؤ اور کہو کہ ہم پورے قرآن پر ایمان لائے ہیں اور اس کے تمام حصے ہمارے ربِّ حقیقی کے نازل کئے ہوئے ہیں۔

دوسرے مصرع کی مناسبت ذیل کی روایت سے زیادہ واضح ہے کہ

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَاْدُبَةُ اللّٰهِ فَاقْبَلُوْا مِنْ مَاْدُبَتِهٖ مَا اسْتَطَعْتُمْ

(مستدرک للحاکم ج ۱ ص ۵۵۵)

یہ قرآن خدائی ضیافت کا کھانا ہے جتنی توفیق ہو اس خدائی ضیافت کے کھانے سے مستفیض ہونے کی کوشش کرو۔

۲۸۔ اُمت پر نبی مثلِ والد شفیق ہوتا ہے

گفت پیغمبرؐ شما را اے مہاں چوں پدر ہستم شفیق و مہربان (۱۹۲۔۳)

(پیغمبرؐ خدا نے فرمایا ہے، اے شریف لوگو! میں تم پر باپ کی طرح شفیق اور مہربان ہوں۔)

مطلب یہ ہے کہ شفقت ورافت پیغمبر کا بیان ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ

اِنَّمَا اَنَا لَکُمْ مَثَلُ الْوَالِدِ (یعنی میں تمہارے لئے والد کی مانند ہوں۔

(مسند احمد ج ۲ ص ۲۴۷)

اَنَا اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (میں ایمان والوں کے زیادہ قریب ہوں، ان

(جامع صغیر) کی جانوں سے بھی زیادہ۔

اَنَا مِنْ نُوْرِ اللّٰهِ وَالْمُؤْمِنُوْنَ مِنْ نُوْرِیْ میں اللہ کے نور سے ہوں اور تمام اہل ایمان

(مکاشفات) میرے نور کا پرتو ہیں۔

۲۹۔ وطن کی محبت عینِ ایمان ہے

از دم حب الوطن بگذر مایست کہ وطن آنسو ست جاں ایں سُوی نیست (۲۱۴۔۴)

(حُب الوطن کے دھوکے سے نکل جا، کھڑا نہ ہو کیونکہ وطن اگلا جہان ہے۔)

گر وطن خواہی گذر آن سوی شط ایں حدیث راست را کم خواں غلط (۲۱۴۔۴)

(اے جان یہ جہان تیرا وطن نہیں اگر تم وطن چاہتے ہو تو ساحل کے اس پار (سوئے عقبیٰ) جاؤ (اس صحیح حدیث کو غلط نہ سمجھو)

اس سچی حدیث کو بعض کم علم لوگ غلط سمجھتے ہیں۔ راز یہ ہے کہ

حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْاِیْمَانِ (وطن کی محبت ایمان سے ہے اور یہ کہ اہل حق کا

(اللؤلؤ المرصوع۔ ص ۳۴) وطن مرتبہ احدیت ہے۔

ہمچنیں حب الوطن باشد درست تو وطن بشناس ای خواجہ نخست (۲۱۶۔۴)

(اسی طرح حب الوطن کی حدیث بھی درست ہے، اے صاحب پہلے اصلی وطن کے مفہوم کو تو سمجھو۔)

مطلب: "حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْاِیْمَانِ" کی طرف اشارہ ہے اور وطن سے مراد عقبیٰ ہے۔

۳۰۔ جس نے طلب کیا اس نے پالیا

ہر کہ رنجے برد گنجے شد پدید ہر کہ جدّے کرد در جدّے رسید (۲۰۹۔۵)

(جس شخص نے محنت کی، مشقت برداشت کی اس نے خزانہ پالیا، جس کسی نے سعی وکوشش کی وہ بزرگی پا گیا۔)

مطلب یہ ہے کہ رنج کے بغیر گنج نہیں، جوئیندہ و یابندہ شود۔ اس لئے سالک کو کسی درجہ پر قانع نہیں ہونا چاہیے ورنہ ناقص رہ جائے گا "مَنْ طَلَبَ شَیْئًا وَّجَدَ" جو آدمی کسی چیز کی تلاش کرے گا اسے پالے گا۔ اس قول کو کشف المحجوب میں حضرت داتا گنج بخش سید علی الہجویریؒ نے عارف بغداد جنید بغدادیؒ کی طرف منسوب کیا

ہے۔(کشف المحجوب ص ۵۴۰)

۳۱۔مومن کا دوزخ پر سے گزرنا

گرچہ مومن را سقر ندہد ضرر ۔ لیک ہم بہتر بود زانجا گذر

(اگرچہ مومن کو دوزخ ضرر نہیں پہنچاتی لیکن وہاں سے جلدی گزر جانا ہی بہتر ہے۔)

گرچہ دوزخ دور دارد زونکال لیک جنت بہ ورا در کل حال(۷۔۳۔۶)

(اگرچہ اس مومن سے دوزخ اپنا عذاب دور ہی رکھتی ہے لیکن بہرحال اس کے لئے جنت ہی اچھا مقام ہے۔)

مطلب:ہر چند دنیا کے مال و دولت کا ملنا حق کو ضرر نہیں پہنچاتا تاہم اس سے پرہیز ہی بہتر ہے۔

اشارہ:ان روایات پر مبنی ہے جو مفسرین قرآن نے "وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا" سورۂ مریم آیت ۷ کے باب میں کی ہیں مثلاً

لَا یَبْقٰی بَرٌّ وَّلَا فَاجِرٌ اِلَّا دَخَلَهَا فَتَكُوْنُ عَلَى الْمُؤْمِنِ بَرْدًا وَّ سَلَامًا كَمَا كَانَتْ عَلٰى اِبْرَاهِیْمَ

(مستدرک للحاکم ج ۴ ص ۵۸۷)

نہ باقی رہے گا کوئی نیک اور نہ بد، مگر ضرور داخل ہو گا اس میں (یعنی دوزخ سے ہر کوئی گزرے گا) مگر وہ مومن پر امن و سلامتی والی ہو گی، جس طرح کہ تھی ابراہیمؑ پر۔

مطلب: یہ ہے کہ کوئی فاسق و فاجر مسلمان ایسا نہیں ہو گا جو جہنم میں نہ جائے مگر وہ جہنم مسلمان مومنوں پر اسی طرح باعثِ سلامتی اور ٹھنڈی ہو جائے گی جیسے کہ ابراہیمؑ پر تھی۔مذکورہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہر کوئی جہنم کے اوپر (پل صراط پر) سے گذرے گا۔

مولانا نے ایک اور مقام پر کچھ اشعار میں لکھا ہے جہنم مومن سے منت سماجت کرے گی کہ اے مومن جلدی سے گزر جا کہیں ایسا نہ ہو کہ تیرا نور میری آگ کو ٹھنڈا کر دے۔

۳۲۔بری صحبت سے تنہائی بہتر ہے

ہست تنہائی بہ از یارانِ بد نیک چوں بابد نشیند بد شود

(برے رفیقوں سے تو تنہائی اچھی ہے،نیک آدمی جب بد کے پاس بیٹھتا ہے تو بد ہو جاتا ہے۔)

مطلب: بے شک جماعت رحمت ہے مگر صحبت بد سے تنہائی بھلی۔یہ بات درج ذیل حدیث سے ظاہر ہے۔

اَلْوَحْدَةُ خَیْرٌ مِّنْ جَلِیْسِ السُّوْءِ وَالْجَلِیْسُ الصَّالِحُ خَیْرٌ مِّنَ الْوَحْدَةِ

برے دوست کی صحبت سے تنہائی بہتر ہے اور نیک آدمی کی صحبت تنہائی سے بہتر ہے۔

(مشکوٰۃ شریف، جامع صغیر ج ۲ ص ۱۹۶، کنوز الحقائق ص ۱۴۹)

۳۳۔ جو شخص اللہ کا ہو جائے اللہ اس کا ہو جاتا ہے

کانَ لِلّٰہِ بودہ ای در ماضی　تا کہ کان اللہ لہٗ آمد جزا

(تم عہدِ ماضی میں اللہ کے ہو چکے ہو حتیٰ کہ اس کی یہ جزا ٹھہری کہ اللہ تمہارا ہو گیا یعنی جو اللہ کا ہو جائے اللہ اس کا ہو جاتا ہے)

"مَنْ کَانَ لِلّٰہِ کَانَ اللّٰہُ لَہٗ" (جو شخص اللہ کا ہو جائے اللہ اس کا ہو جاتا ہے۔ کذا فی کشف الاسرار)

۳۴۔ فرشتے اللہ کے ولیوں کے لئے دعا کرتے ہیں

انبیاء با دشمناں بر می تنند　پس ملائک رَبِّ سَلِّم می زنند (م۔ ۵۔ ۱)

(انبیائے کرام ﷺ جو لوگوں کی ہدایت کے لئے معبوث ہوتے ہیں تو گویا وہ اپنے دشمنوں کے مقابلے میں آ رہے ہیں اس لئے فرشتے "الٰہی ان کو سلامت رکھ" کا نقارہ بجاتے ہیں۔)

مطلب: یہ ہے کہ فرشتے بھی دعا کرتے ہیں کہ بارِ خدایا نورِ ہدایت کی یہ مشعل کفر کی پھونکوں سے بجھنے نہ پائے۔

شِعَارُ الْمُسْلِمِیْنَ عَلَی الصِّرَاطِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اَللّٰھُمَّ سَلِّمْ سَلِّمْ

پل صراط پر قیامت کے دن مسلمانوں کے امتیازی الفاظ یہ ہوں گے "اَللّٰھُمَّ سَلِّمْ سَلِّمْ"۔

(مستدرک للحاکم ج ۲ ص ۳۷۵، تفسیر ابو الفتوح ج ۳ ص ۴۸۶)

قرآن میں مومنوں کے لئے فرشتوں کی مختلف دعائیں آئی ہیں۔

۳۵۔ خدا تعالیٰ کو خدا کے نور سے ہی پہچانو

بلک از او عاریت کن چشم و نظر　پس ز چشمِ او بروئے او نگر

(خود اسی محبوب سے آنکھ اور نظر مستعار لے لو اور پھر اُسی کی آنکھ سے اس پر نظر کرو۔)

ما بچشم دوست می بینیم روئے دوست را　ہم اپنے دوست کی نگاہ سے دوست کا چہرہ دیکھتے ہیں۔

"اِعْرَفُوْا اللّٰہَ بِاللّٰہِ" (الحدیث) خداوند تعالیٰ کو اسی کے نور سے پہچانو۔

مولانا فرماتے ہیں کہ عشق کے بیان سے زبان، قلم اور عقل تینوں عاجز ہیں۔ پس جسے عشق کے حالات کی

آرزو ہو وہ مقامِ عشق میں داخل ہو کر یہ آرزو پوری کرے اس کی تمثیل سورج سے دی ہے۔

۳۶۔ جو عشق کی آرزو کرتا ہے وہ عشق کے مقام میں داخل ہو جاتا ہے

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب　گر دلیلت باید از وے رُو متاب (۴۳۔۱)

(آفتاب کی دلیل خود آفتاب ہی ہے، اگر تجھ کو دلیل چاہیے تو اس کی طرف سے رخ نہ پھیر۔)

اشارہ: ظاہراً روایات ذیل سے اقتباس ہے۔

قَالَ اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلِیٌّ کَرَّمَ اللّٰہُ وَجْھَہُ الْکَرِیْمَ اِعْرِفُوْا اللّٰہَ بِاللّٰہِ وَالرَّسُوْلَ بِالرِّسَالَۃِ وَ اُوْلِی الْاَمْرِ بِالْمَعْرُوْفِ وَالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَ سُئِلَ اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلِیٌّ بِمَ عَرَفْتَ رَبَّکَ فَقَالَ بِمَا عَرَفْتُ نَفْسِیْ

(اصول کافی طبع ایران ص ۴۱)

امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو پہچانو، اس کی ذات وصفات سے اور رسول اللہ ﷺ کو رسالت سے پہچانو اور حاکموں کو نیکیوں اور عدل واحسان سے پہچانو۔۔ حضرت علیؓ سے پوچھا گیا کہ آپ نے اللہ کو کیسے پہچانا؟ فرمایا: اس چیز سے جس سے میں نے اپنے نفس کو پہچانا۔

شیخ عطارؒ نے اسی کو ابوالحسین نوری (احمد بن محمد متوفی ۲۹۵) سے یوں نقل کیا ہے۔

ابوالحسین نوریؒ سے لوگوں نے پوچھا کہ خدا کے ہونے کی کیا دلیل ہے انہوں نے جواب دیا ''خود خدا'' لوگوں نے کہا پھر عقل کا کیا حال و مقام ہے۔ فرمایا: عقل عاجز ہے اور عاجز اپنے جیسے عاجز کے علاوہ کسی اور پر دلالت نہیں کرسکتا۔ (تذکرۃ الاولیاء مطبوعہ لندن ج ۲ ص ۵۴)

۳۷۔ شیخ کی تعریف بے خودی کے عالم میں نہیں ہوسکتی

لَا تُکَلِّفْنِیْ فَاِنِّیْ فِی الْفَنَا　کَلَّتْ اَفْھَامِیْ فَلَا اُحْصِیْ ثَنَآءَ (م۔۴۴۔۱)

(مجھے مدح کرنے پر مجبور نہ کر کیونکہ میں بے خودی کی حالت میں ہوں، میرے ہوش وحواس بیکار ہو رہے ہیں پس میں (اس کی) پوری تعریف نہیں کرسکتا۔)

مطلب: روح جو مدح شیخ پر مجبور کر رہی تھی۔ مولاناؒ اس سے عذر کر رہے ہیں کہ میں سوزِ فراق سے بے خود ہوں، لہٰذا معذور و مجبور ہوں۔

اشارہ: حدیث ذیل سے ماخوذ ہے۔

عَنْ عَلِیٍّ اَنَّ النَّبِیَّ کَانَ یَقُوْلُ فِیْ اٰخِرِ وِتْرِہٖ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِرِضَاکَ مِنْ سُخْطِکَ وَ اَعُوْذُ بِمُعَافَاتِکَ مِنْ عُقُوْبَتِکَ وَ اَعُوْذُ

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ اپنے آخری وتر میں یہ فرماتے تھے یا اللہ میں تیری رضا کے ساتھ تیرے غصے سے پناہ مانگتا

بِکَ مِنْکَ لَا اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ (مسند احمد بن حنبل طبع معرج اول ص ۱۵۰، ۶۸، ۹۶، صحیح مسلم طبع معرج ۲ ص ۵۱، احیاء العلوم ج ۴ ص ۶۳، جامع صغیر ج ۱ ص ۵۹)

ہوں اور تیری عافیت کے ساتھ تیری سزا سے پناہ مانگتا ہوں اور میں تیری پناہ تجھ ہی سے پکڑتا ہوں، میں تیری اس طرح تعریف نہیں کر سکتا جیسا کہ تو اپنے آپ میں قابل تعریف ہے۔

۳۸۔ نماز میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک خاص وقت ہوتا ہے

لِیْ مَعَ اللّٰهِ وَقْتٌ بود آں دم را لَا یَسَعُ فِیْهِ نَبِیٌّ مُّجْتَبٰی (۲۸۳۔۴)

(میرا ایک وقت خدا کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ، جہاں کسی نبی مرسل کی بھی گنجائش نہیں ہوتی)

مطلب: حضور اکرم ﷺ کے تقرب کا بیان ہے کہ آپ ﷺ کو نماز میں ایسا وقت ملتا تھا "لِیْ مَعَ اللّٰهِ وَقْتٌ لَّا یَسَعُنِیْ فِیْهِ مَلَکٌ مُّقَرَّبٌ وَّلَا نَبِیٌّ مُّرْسَلٌ" (مجھ کو خدا کے ساتھ محبت و قرب کا ایک خاص وقت حاصل ہوتا ہے، جس میں اور کسی رسول یا مقرب فرشتے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ الحدیث)

۳۹۔ قضا کے سامنے انسان اندھا ہو جاتا ہے

آدما تو نیستی کور از نظر لیک اِذَا جَآءَ الْقَضَا عَمِیَ الْبَصَرُ (۴۳۔۴)

(اے انسان تم بینائی سے اندھے نہیں ہو لیکن جب قضا آتی ہے تو بصارت بیکار ہو جاتی ہے، اسی لئے تجھ دانا سے یہ غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ قضا کے سامنے بصیرت و بصارت ہر چیز ہی ہیچ ہو کر رہ جاتی ہے)

چون قضا آید نہ بینی غیرِ پوست دشمنان را باز نشناسی ز دوست (۱۴۵۔۱)

(جب قضا آئے گی تو تم سوائے ظاہری حالت کے کچھ نہ دیکھو گے، دشمن دوست میں تمیز نہ کر سکو گے)

مطلب: مقدر کے سامنے حزم و احتیاط اور بصیرت و بصارت بھی کام نہیں دیتی۔

اِنَّ اللّٰهَ اِذَا اَرَادَ اِنْفَاذَ اَمْرٍ سَلَبَ کُلَّ ذِیْ لُبٍّ لُبَّهٗ (جامع صغیر ج ۱ ص ۶۶)

جب اللہ اپنے کسی فیصلے کو نافذ کرنا چاہتا ہے تو وہ ہر عقلمند کی عقل سلب کر لیتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اِذَا اَرَادَ اِمْضَآءَ اَمْرٍ نَزَعَ عُقُوْلَ الرِّجَالِ حَتّٰی یُمْضِیَ اَمْرَهٗ فَاِذَا اَمْضَاهُ رَدَّ اِلَیْهِمْ عُقُوْلَهُمْ وَوَقَعَتِ النَّدَامَةُ (جامع صغیر ج ۱ ص ۶۶)

جب اللہ اپنے حکم کو نافذ کرنا چاہتا ہے تو وہ لوگوں کی عقل سلب کر لیتا ہے۔ یہاں اس کا حکم نافذ ہو جاتا ہے پھر ان کی عقلیں واپس لوٹا دی جاتی ہیں اور پھر ان کے پاس ندامت کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔

چوں قضا آید شود دانش بخواب مہ سیہ گردد بگیرد آفتاب (۱۴۹۔۱)

(جب قضا آتی ہے تو عقل سو جاتی ہے، چاند سیاہ پڑ جاتا ہے اور سورج کو گرہن لگ جاتا ہے)

مطلب: عقل وادراک جو مہر وماہ کی طرح روشن بھی ہے قضائے الٰہی کے سامنے تاریک و بے نور ہو جاتی ہے۔

۴۰۔ ایک ولی ہزاروں پر حاوی ہوتا ہے

وَاحِدٌ کَالْاَلْفِ کہ بود آں ولی بلکہ صد قرن است آں عبد العلی (۱۷۔۶)

(ایسا اکیلا ہزار آدمی کے برابر کون ہوتا ہے، وہ خدا کا ولی ہوتا ہے اور ہزار تو درکنار وہ بندۂ حق سو قرن کے لوگوں سے قوی ہوتا ہے) بقول علامہ اقبالؒ۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا؟ نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

(ب۔د:۲۷۱)

"لَیْسَ شَیْءٌ خَیْرًا مِّنْ اَلْفٍ مِّثْلِہٖ اِلَّا الْاِنْسَانُ الْمُؤْمِنُ" (کوئی چیز اپنی جیسی ہزار چیزوں سے بہتر نہیں ہو سکتی سوائے مومن انسان کے۔ (کنوز الحقائق ص، احیاء العلوم ج ۳ ص ۳۷، جامع صغیر ج ۲ ص ۱۳۵)

ابو عبادہ بحتری کا قول ہے۔

وَ لَمْ اَرَ اَمْثَالَ الرِّجَالِ تَفَاوُتًا لِذِی الْمَجْدِ حَتّٰی عَدَّ اَلْفٍ بِوَاحِدٍ

(اور میں نے نہیں دیکھا لوگوں کو تفاوت کے لحاظ سے کوئی فرق مگر صاحب بزرگی اور صاحب عظمت ایک ہونے کے باوجود ہزار کے مقابلے کا ہوتا ہے۔)

باب ۲۶

فقر خدمت کے سوا کچھ نہیں

جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے طریقت میں اگر خدمتِ خلق نہ ہو تو وہ فقر کا درجہ حاصل کرنے سے قاصر ہے کیونکہ طریقت میں خدمتِ خلق کا مقام نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ جن احباب کو طریقت کے ساتھ کچھ شغف رہا ہے وہ جانتے ہیں کہ ساری کی ساری طریقت خدمتِ خلق پر انحصار کرتی ہے۔ مولانا رومؒ نے اپنی مثنوی شریف میں فرمایا ہے کہ کسی اہل اللہ کو مخدومیت کا شرف محض اس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب وہ خدمتِ خلق کو اپنا شعار بنالے۔ مولانا رومؒ نے فرمایا میں بھی اس وقت تک مولائے روم نہ بن سکا جب تک کسی شمس تبریزؒ کی غلامی میں نہ آیا۔

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد　آنکہ خود را دید او محروم شد

(جس نے بھی خدمت کی وہی مخدوم بنا جس نے خود کو دیکھا وہ محروم رہا) (مشائخ)

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم　تا غلام شمس تبریزیؒ نہ شد (مولانا جامیؒ)

(مولوی اس وقت تک مولائے روم نہ بنے، جب تک شمس تبریزیؒ کے غلام نہ بنے)

صوفیائے کرامؒ فرماتے ہیں کہ خدمت نیازمندی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی اور چونکہ اللہ تعالیٰ کو عاجزی اور نیازمندی بہت زیادہ پسند ہے اس لئے خدمت کو بہت اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ انکساری سخت پتھر پر بھی گرے تو وہاں سے چشمۂ آب جاری ہو جاتا ہے۔ تصوف ایک ایسی چیز ہے جس میں عبادت بھی ہے اور خدمت بھی۔ حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں کہ عبادت اللہ کی ہوتی ہے اور خدمت مخلوق کی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ عبادت خواہ کتنی ہی عظیم کیوں نہ ہو تکبر یا ریاء وغیرہ کے باعث رائیگاں جا سکتی ہے مگر خدمت خواہ کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو رائیگاں نہیں جاتی۔ عبادت کے معیار پر کوئی شخص بھی پورا نہیں اُتر سکتا مگر خدمت خواہ کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو مقبول ہوتی ہے۔ گویا تصوف میں عبادت کے علاوہ خدمت بھی ہے اور خدمت کے باعث عبادت قبول ہونے کا زیادہ امکان ہوتا ہے۔ خدمت میں اگر ریا ہے تو وہ خدمت ہی نہیں۔

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا جب

تک وہ عام لوگوں پر اتنی شفقت نہ کرے جتنی وہ اپنے خاص قریبی رشتہ داروں یا عزیز واقارب سے کرتا ہے۔

مولانا رومؒ نے ان تمام نکات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مثنوی شریف میں فرمایا ہے۔

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست — بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست(x)

(طریقت سوائے خدمتِ خلق کے اور کچھ نہیں، طریقت تسبیح، مصلیٰ اور گودڑی کا نام نہیں)

ایک حدیث شریف میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ جو میرے کاموں (خدمت خلق) میں لگا رہتا ہے تو میں بھی اس کے کاموں میں لگا رہتا ہوں۔ یہ حقیقت قرآن مجید میں بھی بیان کی گئی ہے کہ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ (اے ایمان والو! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے گا) (محمد: ۷) ایک حدیث شریف میں ہے کہ جو بندہ اپنے بھائی کے کام آتا ہے اللہ تعالیٰ (کا دین) اس کے کام آتا ہے۔

مَنْ کَانَ فِیْ حَاجَۃِ اَخِیْہِ کَانَ اللّٰہُ فِیْ حَاجَتِہٖ (متفق علیہ) — جو شخص اپنے بھائی کی ضرورت میں لگ جائے اللہ اس کی ضرورت پوری فرما دیتا ہے۔

یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں — کہ دنیا میں کام آئے انساں کے انساں

اللہ تعالیٰ نے دنیا کی طرف وحی فرمائی کہ اے دنیا! جو میری خدمت کرے تو اس کی خدمت کر اور جو تیری خدمت کرے تو اس کو تھکا دے۔ ویسے بھی قانون الٰہی کے مطابق انسان کی روزی اسے تلاش کرتی ہے جیسے کہ موت اس کی تلاش میں رہتی ہے۔

قوم کا سردار قوم کا خادم ہوتا ہے

ایک بہت مشہور حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے "سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُھُمْ" (مفید الطالبین) (قوم کا سردار ان کا خادم ہوتا ہے۔) ایک اور مقام پر آپ ﷺ نے فرمایا "کُلُّکُمْ رَاعٍ وَّکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِیَّتِہٖ" (مفید الطالبین) (تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی رعایا کے بارے میں پوچھا جائے گا۔) اس حدیث سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص سے دوسرے شخص کی مشکل کشائی کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ اس حدیث میں بھی خدمتِ خلق پر دلیل قائم کی جاتی ہے علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

سروری در دینِ ما خدمت گری است — عدلِ فاروقیؓ و فقرِ حیدریؓ است (پ۔م: ۱۹۰)

(ہمارے دین میں سرداری خدمت کرنے کا نام ہے، عدلِ فاروقی اور فقرِ حیدری جذبۂ خدمت پر ہی مامور تھے۔)

خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر — کارہا را کس نمی سنجد بہ زر (ج۔ن: ۶۹۴)

(علم وصنعت (تعلیمی اداروں اور ٹیکنالوجی) کا مقصد بھی خدمت ہے، کوئی شخص دولت کے زور سے تمام کام نہیں انجام دے سکتا)۔

جو خدا کا طالب ہو تم اس کے خادم بن جاؤ

خدمتِ خلق کی عظمت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے سب سے زیادہ برگزیدہ بندوں یعنی انبیائے کرام کو انسانوں کی خدمت کے لئے مامور فرمایا۔ حضور اکرم ﷺ کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے سورۃ الکہف کی آیت نمبر ۲۸ میں یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو ان فقراء کی صحبت کے لئے روکے رکھیں جو اپنے رب کو صبح وشام اس کی رضا کے لئے پکارتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ وہ خود کو طالبانِ حق کی خدمت کے لئے وقف کر دیں۔ جیسا کہ حسب ذیل حدیث قدسی میں وارد ہوا ہے۔

یَا دَاوٗدُ اِذَا رَاَیْتَ لِیْ طَالِبًا فَکُنْ لَهٗ خَادِمًا — اے داؤدؑ! جب تو میرے کسی طالب کو دیکھے تو اس کا خادم بن جا۔

اس حدیث قدسی کا ترجمہ فارسی زبان میں مولانا رومؒ نے یوں کیا ہے ۔

ہر کہ را بینی طلبگار اے پسر — یار او شو پیشِ او انداز سر (۱۴۵۔۳)

(اے بیٹے تو جس کو (خدا کا) طلبگار دیکھے اس کا دوست بن جا، اور اس کے سامنے اپنا سر رکھ دے۔)

مذکورہ حقائق کے باعث اولیائے کرام اور مشائخ نے خود کو مخلوق کی خدمت کے لئے سرگرم عمل رکھا لیکن یہ خدمت کا جذبہ آج کل خال خال ہی نظر آتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا۔

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد — محبت میں یکتا حمیت میں فرد

عجم کے خیالات میں کھو گیا — یہ سالک مقامات میں کھو گیا (ب۔ج:۴۱۶)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ابلیس ترک سجدہ سے کافر نہیں ہوا بلکہ ترک خدمت اور ترک ادب سے کافر ہوا ہے۔ اس نے خود کو بہتر سمجھ کر ترک خدمت اور ترک ادب کا ارتکاب کیا اور اگر وہ خود کو فراموش کر دیتا تو حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد حق تعالیٰ کی طرف سے دیکھتا۔

طریقت صدق اور رِفق (نرمی) کا نام ہے

حضرت ابو سعید ابوالخیرؒ نے فرمایا کہ طریقت صدق اور رفق کا نام ہے یعنی صدق اللہ کے ساتھ ہو اور رفق (نرمی) بندوں کے ساتھ۔

مباش در پے آزار و ہرچہ خواہی کن — کہ در طریقتِ ما جز ایں گناہے نیست

(لوگوں کو تکلیف نہ پہنچا آزادی سے زندگی گزار جیسے چاہے ویسے کر، کیونکہ ہماری طریقت میں اس سے خلق کو

آزار (دکھ دینے سے) بڑا گناہ نہیں ہے۔)

حضرت ابوسعید ابوالخیرؒ نے فرمایا کہ مردِ خدا وہ ہے جو اللہ کی مخلوق کے درمیان رہے ان کے ساتھ نشست و برخاست رکھے، ان ہی میں سوئے اور جاگے اور لوگوں سے لین دین رکھے، مخلوق خدا کے معاملات میں دخل رکھے۔ اندریں حالات ایک لحہ بھی یادِ خداوندی سے غافل نہ رہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ بندوں کا اوّلین مقام یہ ہے کہ وہ اپنے ربّ تعالیٰ کی ذات کو پہچانیں اور نبوت کا آخری مقام یہ ہے کہ مومنین کے حقوق کی رعایت کی جائے۔ فرمایا کہ مخلوقِ خدا کے حقوق کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہوسکتا جب تک وہ عام لوگوں پر اتنی ہی شفقت نہ کرے جتنی وہ اپنے عزیزوں پر کرتا ہے۔ عوام الناس تمہاری سلطنت کے فرزند ہیں۔ انہیں اپنے بیٹوں کی طرح محبت کی نگاہ سے دیکھا کرو۔ لوگ ضروریات کے غلام ہیں اور جب تک تم ان کی ضروریات پوری کرتے رہو گے وہ تم سے خوش رہیں گے اگرچہ تم میں بہت سے عیب ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر تم اُن کی حاجات کا خیال نہ رکھو گے تو خواہ تم کتنے ہی اچھے ہو وہ تم سے مایوس ہو کر دور رہیں گے۔ جو لوگوں کو لوگوں کی نگاہ سے دیکھے گا تو اس کو لوگوں سے نفرت ہوگی اور دشمنی بڑھے گی۔ جو اللہ کی نگاہ سے دیکھے گا تو اس کی لوگوں سے محبت بڑھے گی۔

شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

قرآن پاک میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ کافی تفصیل سے دیا گیا ہے اور اس وقت کا ذکر کیا گیا ہے کہ جب آپ حضرت شعیب علیہ السلام کی خدمت میں پہنچے اور دس سال خدمت کرنے کا عہد کیا چنانچہ آپ نے دس سال تک حضرت شعیب علیہ السلام کی بکریاں چرانے کی خدمت ادا کی اور جب اپنے گھر لوٹنے لگے تو راستے میں وادیٔ طور میں اللہ تعالیٰ کی ہمکلامی سے مشرف ہوئے اور نبوت سے سرفراز کئے گئے۔ خدمت کا صلہ اس قدر جلد مل جانا باعث حیرت ہے۔ حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں ۔

شبانِ وادیٔ ایمن گہے رسد بہ مراد　　کہ چند سال بہ جاں خدمتِ شعیبؑ کند (دیوانِ حافظ)

(وادیٔ ایمن کا گڈریا اس وقت مراد کو پہنچتا ہے، جب کہ چند سال دل و جان سے شعیبؑ کی خدمت کرے۔)

علامہ اقبالؒ نے بھی اس خدمت کی طرف یوں اشارہ کیا ہے ۔

اگر کوئی شعیبؑ آئے میسر　　شبانی سے کلیمی دو قدم ہے (ب۔ج: ۳۸۰)

تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی　　نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

(ب۔د: ۱۰۴)

وہ خدمت جس سے نبی ﷺ کی رفاقت ملے

حضرت ربیعہ بن کعب اسلمیؓ کا یہ واقعہ روایات میں آیا ہے آپؓ فرماتے ہیں کہ میں رات کو تہجد کی نماز کے لئے حضور اکرم ﷺ کو وضو کروانے کا شرف حاصل کرتا (اور غالباً دس سال اس خدمت میں گزار دیئے۔) فرماتے ہیں کہ ایک روز آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا "سَلْ" (یعنی مانگ) میں نے عرض کیا "اَسْئَلُکَ مُرَافَقَتَکَ فِی الْجَنَّۃِ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ" (اے اللہ کے رسولؐ! میں آپ سے بہشت میں آپ کا ساتھ مانگتا ہوں۔) آپ ﷺ نے فرمایا کہ "کچھ اور مانگ" حضرت ربیعہؓ نے عرض کیا کہ میرا مقصود تو یہی ہے جو میں نے عرض کر دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ (اس مقصد کے حصول میں) تو میری مدد کر اس حالت میں کہ تو نماز بہت بڑھا کر اور سجدوں میں دعا کیا کر۔ (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم، کتاب الصلوٰۃ باب السجود وفضلہ) حضرت عبد الحقؒ نے اشعۃ اللمعات میں لکھا کہ حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمان ایسا تھا کہ آپ ﷺ نے حضرت ربیعہؓ کو تخصیص نہ فرمائی کہ فلاں چیز مانگ اور فلاں چیز نہ مانگ بلکہ فرمایا کہ جو چاہتے ہو مانگو وہی ملے گا۔ اس بات سے یہ مسئلہ حل ہوتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جو چاہیں عطا کر سکتے ہیں۔

خدمت پر صوفیاء کے اقوال

صوفیہ کا قول ہے کہ جو انکساری کے باعث دوسروں کی خدمت پر مامور رہے تو اس خدمت کرنے والے کا درجہ بہت جلد بڑھ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ درویش دوسرے درویشوں کے پاؤں کو ہاتھ لگاتے ہیں اور کبھی دوسروں کی جوتیاں سیدھی کرتے ہیں تاکہ عجز پیدا ہو اور خدمت کا درجہ بھی حاصل ہو سکے۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ جو ہم سے توڑے ہم اس سے جوڑیں، جو ہمیں محروم کرے ہم اسے عطا کریں، جو ہم پر ظلم کرے ہم اسے معاف کر دیں۔ یہ تمام باتیں خدمت کی اصل ہیں۔ اولیائے کرامؒ کا دستور ہے کہ جب کسی کے متعلق ان کے دل میں کراہت ہو تو وہ اس کی خدمت پر لگ جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ کراہت دل سے دور ہو جائے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدمت گزاری نہ صرف عجز وانکساری ہے بلکہ اس سے دلی تکبر اور خود سری کا مادہ نکل جاتا ہے۔

خدمتِ خلق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت ابو سعید ابوالخیرؒ نے فرمایا کہ مرد خدا وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے درمیان رہے، ان کے ساتھ نشست و برخاست رکھے، ان ہی میں سوئے اور جاگے اور لوگوں سے لین دین رکھے۔ اندریں حالات ایک لحہ بھی یادِ خداوندی سے غافل نہ رہے۔

خدمت کی چند خوبصورت مثالیں

ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا، خواہ وہ نیکی رائی کے

برابر ہی کیوں نہ ہو۔ جو لوگ چھوٹی نیکیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں بڑی سعادتوں کی توفیق عطا نہیں فرماتے۔ جو لوگ چھوٹے گناہوں کو بڑا سمجھ کر بچنے کی خواہش کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں بڑے گناہوں سے بچنے کی توفیق عطا فرما دیتے ہیں۔ یہ بات بہت مشہور ہے کہ کالے علم والے لوگ کالے علم کی کامیابی کے لئے ہر نیکی کے عمل سے بچنے کا حکم دیتے ہیں کیونکہ اگر کالے علم کے عمل کے دوران کوئی چھوٹی سی نیکی بھی کر دی جائے تو کالے علم کا عمل کارگر نہیں ہوتا۔ آپ نے سنا ہوگا کہ ایک شخص نے خربوزے کا چھلکا رستے سے ہٹا دیا تو اس نیکی کے باعث اس کا کالا علم کامیاب نہ ہو سکا۔

صوفیاء کا معمول ہے کہ وہ مشائخ کی صحبت کے دوران خدمت کا بہت اہتمام کرتے ہیں۔ منقول ہے کہ حضرت ابو منصور مغربیؒ سے کسی نے پوچھا کہ آپ اپنے پیر ابو عثمانؒ کی صحبت میں کتنا عرصہ رہے ہیں؟ فرمایا میں صحبت میں نہیں رہا بلکہ خدمت میں رہا ہوں کیونکہ صحبت تو روحانی بھائیوں اور اقران اور امثال (یعنی ہم جیسوں) سے ہوتی ہے اور شیخ کی تو خدمت کی جاتی ہے۔ یہاں پر چند ایسی مثالیں دی جا رہی ہیں جن کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوگا کہ خدمت کرنے والوں کو کیا کچھ ملتا ہے۔

(۱) جذبۂ خدمت کا تعلق نیت سے ہے اگر نیت میں خلوص ہو اور عمل کرنے کا ارادہ محض خدمت کے جذبے کو مد نظر رکھتے ہوئے کیا جائے تو ایسے عمل کے اجر میں زمین و آسمان کا فرق ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی عورت اپنے خاوند کو اس نیت سے کھانا پکا کر دیتی ہے کہ میرا خاوند نیک کاموں میں لگا رہتا ہے لہٰذا اس کی خدمت کرنا اس کی نیکی میں معاونت کا درجہ رکھے گی تو ایسی عورت کو کھانا پکانے کے عمل کا اجر تو ملے گا ہی مگر اس کے خاوند کے نیک کاموں میں معاونت کا صلہ بھی ملے گا۔ ایک گنہگار شخص کو کسی نے اس کے مرنے کے بعد خواب میں دیکھا کہ اس کی بخشش ہو گئی ہے تو خواب دیکھنے والے نے جب اس کا سبب دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ ایک روز حضرت بایزید بسطامیؒ دُعا فرما رہے تھے تو اس نے بھی ان کی دُعا پر آمین کہا بس اتنی بات پر اس کی بخشش ہو گئی۔

(۲) مشائخ کی خدمت کی روایات میں ہے کہ شیخ عبدالحق دہلویؒ کا بختیار نامی ایک مرید تھا جو بعد میں آپ کے خلفاء میں سے ہوا، ایک بار آپؒ نے اسے بلا کر فرمایا کہ یہاں کنواں کھود دو۔ جب کنواں مکمل ہوا حضرت کو اطلاع دی گئی تو حضرت نے فرمایا کہ اچھا اب یہ کنواں بند کر دو۔ مرید نے یہ بات نہ کہی کہ اگر بند ہی کروانا تھا تو کھدوایا کیوں تھا۔ مرید نے وہ کنواں بند کر دیا تو فرمایا کہ اب آ جاؤ! جس دوران مرید کنواں کھود رہا تھا تو اس کی تمام تر توجہ کنواں کھودنے میں تھی اور شیخ کی توجہ اس پر تھی۔ دونوں اپنا کام کر رہے تھے جب مرید گھر جا رہا تھا تو ہر منزل پر اس کا ایک مقام طے ہوتا گیا جب گھر پہنچا تو تکمیل ہو گئی۔ صوفیاء کرام اس کی تشریح یوں فرماتے ہیں۔

مذکورہ واقعہ میں شیخ نے اپنے مرید پر ایک ایسی نظر ڈالی کہ جب وہ واپس جا رہا تھا تو اپنے سفر کی منزلوں کو طے کرنے کے ساتھ ساتھ روحانی منزل کو بھی طے کرتا چلا گیا۔ اسی طرح نظام الدین بلخیؒ نے اپنے ایک مرید

کو پانی بھرنے کی خدمت سپرد کی اور ایک عرصہ کے بعد فرمایا کہ جاؤ تمہارا کام ہو گیا ہے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ کو حضرت جعفر صادقؒ نے ایک روز کہا کہ فلاں طاق سے فلاں کتاب اٹھا لاؤ۔ آپ نے پوچھا کہ کون سا طاق؟ فرمایا آپ کو یہاں اتنا عرصہ ہو گیا ابھی تک طاق کا علم نہیں ہوا۔ حضرت بایزید بسطامیؒ نے عرض کیا کہ مجھے اس سے کیا غرض کہ آپ کے ہوتے ہوئے ادھر ادھر نظر اٹھا کر دیکھوں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر ایسا معاملہ ہے تو واپس بسطام چلے جاؤ تمہارا کام ختم ہو گیا ہے۔

(۳) حضرت باقی باللہؒ کے متعلق یہ بات مشائخ نقشبندیہ کی سیرتوں میں آتی ہے کہ ایک رات کافی دیر سے کچھ لوگ حضرت کے آستانہ عالیہ پر حاضری کے لئے پہنچے تو آپ نے فرمایا کہ جو شخص ہمارے مہمانوں کو کھانا کھلائے گا ہم اس کو خوش کریں گے۔ لنگر خانے کے باورچی نے تھوڑی دیر میں ہی کھانا پکایا اور مہمانوں کو کھلایا۔ دوسرے روز باورچی نے حضرت سے انعام طلب کیا تو آپ نے فرمایا مانگو کیا مانگتے ہو؟ اس پر باورچی نے عرض کیا کہ حضور مجھے اپنے جیسا کر دیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ تم برداشت نہ کر سکو گے مگر اس نے اپنی بات پر اصرار کیا، حضرت باقی باللہؒ نے اسے اپنے سینے سے لگایا اور جب الگ کیا تو دونوں کی کیفیت ایک جیسی تھی مگر فرق یہ تھا کہ آپ باہوش و حواس تھے اور باورچی بے قرار اور دیوانہ بن چکا تھا۔

(۴) حضرت ابو علی فارمدی طوسیؒ، امام ابو قاسم قشیریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے وہ حالات بیان کئے جو ان پر وارد ہوتے تھے۔ آپ نے فرمایا اے لڑکے! جا علم پڑھنے میں مشغول رہ۔ حضرت ابو علیؒ تین سال تک مزید علم حاصل کرتے رہے یہاں تک کہ ایک روز آپ نے قلم دوات سے نکالا تو وہ سفید نکلا۔ جب امام ابو قاسم قشیریؒ کو بتایا تو آپ نے فرمایا کہ اب علم تجھ سے دست بردار ہو گیا ہے اور تو بھی علم سے دست بردار ہو جا اور طریقت کے کام میں لگ جا، چنانچہ میں اپنا سامان مدرسہ سے خانقاہ میں لے آیا اور روحانی معاملات میں مشغول ہو گیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں امام صاحب کی صحبت میں رہنے لگا۔ ایک روز استاد امام ابو القاسم حمام میں نہا رہے تھے کہ میں نے جا کر چند ڈول پانی کے حمام میں ڈالے جب حضرت امامؒ نکلے تو مسجد میں نماز پڑھ کر پوچھا کہ کون شخص تھا جس نے حمام میں پانی ڈالا؟ فرماتے ہیں کہ میں نے اس خیال سے کہ شاید میرا پانی ڈالنے کا عمل خلاف مرضی ہو خاموش رہا۔ آپ نے پھر پوچھا تو میں نے جواب نہ دیا۔ آپ نے تیسری بار پوچھا تو میں نے جواب دیا کہ پانی خادم نے ڈالا تھا۔ امام ابو قاسم قشیریؒ نے فرمایا کہ اے ابو علیؒ! جو کچھ میں نے ستر سال میں پایا تو نے پانی کے ایک ڈول سے پا لیا۔ اس واقعہ سے معمولی سی خدمت کے عوض میں اتنا بڑا مقام حاصل ہونا خدمت کی عظمت پر دلالت کرتا ہے۔

(۵) حضرت مخدوم صابر پیر کلیر شریفؒ کو جب حضرت فرید الدین شکر گنجؒ کی خدمت میں تربیت تصوف کے لیے پیش کیا گیا تو آپ کو لنگر برتانے کی خدمت پر مامور کیا گیا اور آپ نے برسوں تک کھانا نہیں کھایا اور

جب آپ بہت نحیف ہو گئے تو دریافت کرنے پر آپ نے فرمایا کہ مجھے تو لنگر برتانے کا حکم تھا کھانے کا حکم نہ تھا۔ اکثر مشائخ کا یہی حال تھا کہ وہ خدمت میں لگے رہتے اور کئی کئی سالوں تک خود کچھ نہ کھاتے۔

(۶) راقم الحروف کے ایک مرید محمد جاوید (لاہور کے گورنمنٹ ٹیکنیکل ٹریننگ سنٹر میں سینئر انسٹرکٹر کی حیثیت سے ملازم ہیں) بیان کرتے ہیں کہ ان کے والد صاحب نے اپنے انتقال سے چند روز قبل خواب میں ایک مکان خریدا جس میں بجلی نہ ہونے کے باعث اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ جب یہ خواب جاوید صاحب کو بیان کیا گیا تو جاوید صاحب نے والد صاحب سے کہا چونکہ وہ بجلی کا کام جانتے ہیں اس لئے وہ (اس خواب میں خریدے جانے والے) مکان میں بجلی خود لگا دیں گے۔ جب ان کے والد چند دن کے بعد ہی فوت ہو گئے تو جاوید صاحب نے اس خواب کی یہ تعبیر کی کہ یہ نیا خرید کردہ تاریک مکان ان کی قبر کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ ان کے فوت ہونے کے چودہ سال بعد راقم الحروف نے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی کوٹھی کی تعمیر شروع کی تو جاوید صاحب نے بغیر کسی اجرت کے اس کوٹھی میں بجلی کا نظام مکمل کرنے کی خدمات پیش کیں۔ جاوید صاحب کا بیان ہے کہ جس روز کوٹھی میں بجلی کا کام مکمل ہوا اور یہ گھر بجلی سے چمک اٹھا تو انھوں نے اسی رات اپنے والد صاحب کی قبر کو خواب میں دیکھا کہ ان کی قبر میں بھی بجلی لگ گئی ہے اور ان کی قبر کافی وسیع اور عریض ہے۔ ان کے اس خواب نے ظاہر کر دیا کہ ان کو اس بے لوث خدمت کا یہ صلہ ملا کہ ان کے والد ماجد کی تاریک قبر میں بھی روشنی ہو گئی۔ خدمت کی یہ زندہ مثال آج بھی عقیدت مندوں کی رہنمائی کے لئے ایک زندہ ثبوت کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ راقم الحروف کا گھر صرف ایک گھر ہی نہیں ہے بلکہ ایک تبلیغی مرکز بھی ہے جہاں ہزاروں تشنگانِ طریقت اپنی پیاس بجھاتے ہیں اور بے راہ مسلمان راہ پاتے ہیں ایسی خدمات جو اجتماعی فلاح و بہبود کی حیثیت رکھتی ہیں ان کا اجر کچھ اور ہی ہوتا ہے۔

خدمت کا اصل اصول قرآن بیان کرتا ہے

حضرت شاہ ولی اللہؒ ''الفوز الکبیر'' میں جو اُصولِ تفسیرِ قرآن کے موضوع پر ہے، لکھتے ہیں کہ پورے قرآن کا خلاصہ تین نکات میں کیا جا سکتا ہے۔

(۱) خدا کو راضی کرنے کا ذریعہ عبادت ہے۔

(۲) رسول اللہ ﷺ کو راضی کرنا مقصود ہو تو آپ سے محبت اور اطاعت کی جائے۔

(۳) خلقِ خدا کا حق ادا کرنا ہو تو خدمت سے ہی کیا جا سکتا ہے۔

بے شک اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ملائکہ پر فضیلت دی اور ان کو مسجود ملائک بنایا۔ مسجود ساجد سے لا محالہ بہتر ہوتا ہے اسی لئے فرشتوں کو انسانوں کا خادم بنایا ہے اور انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی خدمت

کے لئے مامور فرمایا۔ انسان کو جب اپنا خادم بنایا تو اسے مخلوقات کی خدمت کا حکم دیا اور باقی مخلوق کو انسان کی خدمت پر لگایا۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (بنی اسرائیل: ۷۰)

اور بے شک ہم نے اولادِ آدمؑ کو بڑی عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور سمندر میں سوار کیا (مختلف سواریوں پر)

فتوحات مکیہ میں ایک حدیث نقل کی گئی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اے ابنِ آدم! میں نے تجھ کو اپنے لئے پیدا کیا اور کائنات کی دوسری چیزیں تیرے لئے پیدا کیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ اگر کائنات کی ہر چیز پر انسان کی خدمت فرض ہے تو انسان پر حق تعالیٰ کی خدمت فرض ہونے کے ناطے سے انسانوں کی خدمت کرنا بدرجہ اتم فرض ہے۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد کی غرض و غایت خدمتِ خلق ہے

اللہ تعالیٰ نے تمام کائنات کو پیدا فرمایا اور کائنات کے لئے ربوبیّت کا فریضہ اپنے ذمہ پر رکھا، چنانچہ مخلوقات کو اپنی عبادت کا حکم دیا۔ اس عبادت کو حقوق اللہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اگرچہ عبادت کا ڈھانچہ حقوق اللہ پر رکھا گیا ہے لیکن حقوق العباد کو اس قدر بلند مقام عطا فرمایا کہ عبادت اور حقوق اللہ میں کسی قسم کی لغزش ہونے کو ناقابلِ معافی قرار دیا۔ اگر کوئی شخص حقوق العباد میں سے کچھ کمی کرتا ہے تو اس کی معافی وہ شخص ہی دے سکتا ہے جس کے حقوق تلف کئے گئے ہوں۔ حقوق اللہ میں اگر کوئی کمی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اسے معاف بھی کر سکتا ہے لیکن حقوق العباد میں اگر کمی ہو جائے تو اسے متعلقہ انسان ہی معاف کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگرچہ عبادت کا مکمل ڈھانچہ حقوق اللہ پر قائم ہے مگر دین کی عمارت سازی میں حقوق العباد کو بہت بڑا دخل ہے۔ اگر کسی کا پڑوسی بھوکا مر رہا ہو تو اس امیر شخص کی عبادت قبول نہ کی جائے گی۔ اسی طرح اگر کوئی شخص دینی علم سے محروم ہو تو کسی اہلِ علم کی عبادت قبول نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ وہ اپنے بے دین ساتھیوں کو دین کے مطلوبہ معیار تک نہ پہنچا دے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان پر خدمت کا فریضہ حقوق اللہ کی طرف سے بھی عائد اور حقوق العباد کے ناطے سے بھی واجب قرار دیا جاتا ہے بلکہ حقوق العباد تو سارے کے سارے ہی خدمتِ خلق ہیں کیونکہ ہر تندرست پر ہر بیمار کی خدمت، ہر اہلِ علم پر بے علم کی خدمت، ہر امیر پر غریب کی خدمت اور ہر خوشحال پر مفلوک الحال کی خدمت کرنا واجب ہے جس طرح ہر نعمت کا شکر ادا کرنا (بذریعہ خدمت) واجب ہے۔ قرآن مجید میں ایثار، غریب پروری، سائل اور محروم کے حقوق کی ادائیگی کے احکامات بھی وجوب کا درجہ رکھتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ کی نظر میں خدمتِ خلق کا مقام

مومن کی نظر میں کائنات کا ذرّہ ذرّہ یکساں اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے وہ سب کو ہمدردی اور دوستی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ کسی کو دکھ میں مبتلا دیکھتا ہے تو کانپ اٹھتا ہے۔ کسی پر آفت آتی ہے تو لرز جاتا ہے اور جب تک اس کی تکلیف کو دور نہ کر لے اس کو سکون اور چین نہیں آتا۔ اس کی زندگی کا مقصود ہی خدمتِ خلق ہوتا ہے۔ وہ سرکارِ دو عالم ﷺ کی تقلید میں سب کے دکھ درد میں شریک ہو کر ان کی مدد کرنا اپنے آپ پر فرض جانتا ہے اور اس خدمت کا کوئی عوض نہیں چاہتا۔ بنی نوعِ انسان کی یہ خدمت ہمیشہ مومن کی نمایاں خصوصیت رہی ہے۔ افسوس کہ اب مکارمِ اخلاق کے ساتھ یہ صفت بھی ہم میں سے ناپید ہوتی جا رہی ہے علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے۔

بندۂ عشق از خدا گیرد طریق می شود بر کافر و مومن شفیق (ج۔ن: ۷۹۳)

(عشق کا بندہ خدا سے اخلاق لیتا ہے، اسی لئے وہ کافر و مومن پر مہربان ہوتا ہے۔)

طبعِ روشن مردِ حق را آبرو ست خدمتِ خلقِ خدا مقصودِ اُوست (ج۔ن: ۶۹۶)

(روشن طبیعت مردِ حق کی عزت ہے، مخلوقِ خدا کی خدمت اس کا مقصود ہے۔)

خدمت از رسم و رہِ پیغمبری است مُزدِ خدمت خواستن سوداگری است

(خدمتِ خلق پیغمبری راہ و رسم ہے، اسی خدمت کی اجرت طلب کرنا سوداگری ہے۔) (ج۔ن: ۶۹۶)

باب ۲۷

فقراء کے اَخلاق و آداب

فقراء اپنے اَخلاق و آداب سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ یہ لوگ ان اخلاق و آداب کے معاملات میں حضور ﷺ کی اتباع کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کے اخلاق اس قدر بلند اور اعلیٰ معیار کے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے خُلق کو خُلقِ عظیم فرمایا اور قرآن میں آپ کو وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِیْمٍ (القلم: ۴) (بے شک آپ ﷺ عظیم الشان خلق کے مالک ہیں۔) کی امتیازی سند عطا فرمائی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کے اخلاق کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا "کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنُ" (صحیح مسلم) (یعنی پورا قرآن ہی آپ ﷺ کا خُلق تھا) اس سے پہلے کہ فقراء کے خُلق و آداب کو بیان کیا جائے حضور اکرم ﷺ کے خُلقِ عظیم کے متعلق کچھ بیان کرنا زیرِ نظر مضمون سے زیادہ اقرب معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا راقم الحروف کی تصنیف "متاعِ اخلاق" میں سے آپؐ کے خلقِ عظیم کے مضمون کا اقتباس اس باب میں شامل کیا جا رہا ہے۔ (اگر زندگی ہوئی تو متاعِ اخلاق شائع ہو سکتی ہے)

جہاں تک فقراء کے ادب کا تعلق ہے اس سلسلے میں حضرت جنید بغدادیؒ کا نام سب سے پہلے لیا جاتا ہے۔ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کی صحبت نہایت خاموش اور ادب کی صحبت تھی۔ جس شخص کو تھوڑی دیر یہ نعمتِ صحبت نصیب ہوئی اس نے ہمیشہ فخر کیا۔ حضرت رویمؒ کو خلیفہ بغداد نے ایک بار بے ادب کہا۔ آپ نے جواب دیا کہ مجھے حضرت جنیدؒ کی صحبت آدھا روز کے لئے نصیب ہوئی ہے پھر میں کیسے بے ادب ہو سکتا ہوں۔ جب حضرت ابو حفصؒ بغداد میں آپؒ سے ملنے آئے تو حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ آپ نے اپنے مریدوں کو شاہی آداب سکھا رکھے ہیں۔ فرمایا ظاہری حسن ادب باطنی حسن ادب کا آئینہ دار ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ عارف باللہ کے لئے ادب اسی طرح ضروری ہے جس طرح مبتدی کے لئے توبہ ضروری ہوتی ہے۔ صوفیہ کا قول ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور صدیقین کے سوا کسی کو کمالِ ادب حاصل نہیں ہوتا (یعنی ادب والے صدیقین کے درجے کو پہنچتے ہیں۔) حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ جب کوئی مرید ادب کا خیال نہیں رکھتا تو وہ لوٹ کر وہیں پہنچ جاتا ہے جہاں سے وہ چلا تھا۔

فکرِ صالح در ادب می بایدت رجعتے سوئے عرب می بایدت (ا۔خ:۳۸)

(ادب میں فکر صالح ہونی چاہئے (جو عمل میں رہنمائی کرے) ہمیں دوبارہ عرب کے ادب کی طرف لوٹنا چاہیے۔)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خُلقِ عظیم کے مالک تھے

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خلق اس قدر عظیم تھا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے: وَ اِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (القلم: ۴) (بے شک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خلقِ عظیم کے مالک ہیں۔) حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ افضل ایمان والا کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "جو اخلاق میں سب سے بہتر ہے۔" صوفیہ فرماتے ہیں کہ کسی ارادے کے عادت بن جانے کو خلق کہتے ہیں۔ اگر ارادہ عطاء و بخشش کا خوگر ہو جائے تو اس کو خُلقِ کریم کہتے ہیں۔ استاد ابو علی دقاقؒ فرماتے ہیں کہ اچھے اخلاق انسان کی بہترین خوبیاں ہیں اس سے انسان کا جوہر ظاہر ہوتا ہے۔ انسان اپنے افعال کی وجہ سے چھپا رہتا ہے مگر اخلاق کی وجہ سے مشہور ہوتا ہے۔ انسان کے طبعی رجحانات کا اپنے استمرار و تسلسل کی وجہ سے غالب آ جانا خلق کہلاتا ہے۔ اگر خلق اچھی عادت یا رجحان میں ہو تو خلقِ حسن کہلاتا ہے۔

خُلقِ عظیم کی وضاحت

واضعیؒ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خُلق کو اس لئے عظیم فرمایا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں جہانوں کی جملہ اشیاء کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ اکتفا کیا۔ واسطیؒ نے فرمایا کہ خُلقِ عظیم کا مطلب یہ تھا کہ اللہ کی شدید معرفت کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ تو خود کسی سے جھگڑے اور نہ کوئی ان سے جھگڑ سکا۔ حسن منصورؒ فرماتے ہیں کہ مخلوق کی جفا کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کوئی اثر نہ تھا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حق کا مطالعہ کر چکے تھے۔ الکتانیؒ فرماتے ہیں کہ تصوف نام ہی اخلاق کا ہے لہٰذا جو شخص تم میں سے اخلاق میں بلند ہو گا وہ تصوف میں بھی تم سے بلند ہو گا۔ ابن عمرؓ نے فرمایا کہ اگر تم مجھے اپنے غلام کو "اَخْزَاکَ اللّٰہُ" (خدا تجھے رسوا کرے۔) کہتے ہوئے سن لو تو تم گواہ رہنا کہ وہ آزاد ہے۔ فضیلؒ فرماتے ہیں کہ اگر ایک شخص کلیتاً نیکی کرتا ہے اور اس کی ایک مرغی ہے جس سے وہ بُرا برتاؤ کرتا ہے تو وہ نیک کام کرنے والا نہیں کہلائے گا۔

ایک حدیث شریف میں ہے کہ ایمان کے بعد سب سے بڑی نیکی خُلق ہے۔ آپؐ نے ایک جگہ فرمایا کہ "تم اپنے مال کے ذریعے لوگوں کو خوش نہیں کر سکتے بلکہ خندہ پیشانی اور حسن خُلق سے انہیں خوش رکھا کرو۔" ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ جو سب سے زیادہ بد خلق ہے وہ سب سے زیادہ غم زدہ رہتا ہے۔ اویس قرنیؓ کو بچے پتھر مارتے تو کہتے کہ اگر تم نے پتھر مارنے ہی ہیں تو اتنے بڑے نہ مارو جن سے میری پنڈلیوں سے خون جاری ہو اور میں نماز نہ پڑھ سکوں۔ ایک شخص نے احنف بن قیسؒ کو گالی دی اور گالیاں دیتا ہوا آپ کے پیچھے گھر تک گیا جب گھر کے قریب ہوئے تو آپ رُک گئے اور اسے کہا کہ اگر اور کوئی بات تمہارے دل میں رہ گئی ہے

تو یہیں کہہ لوتا کہ میرے قبیلے کا کوئی فرد تمہاری بات سن کر تمہیں کچھ جواب نہ دے۔ وھبؒ فرماتے ہیں کہ بندہ جس بات کو چالیس دن تک اپنا خلق بنائے تو وہ خلق اس کی طبیعت بن جاتا ہے۔ جریریؒ فرماتے ہیں کہ میں مکہ شریف گیا تو واپسی پر پہلے جنیدؒ کے گھر حاضری دی اس لئے اگر آپ کے گھر نہ گیا تو آپ میرے گھر پر آنے کی تکلیف فرمائیں گے۔ جب میں نے مسجد میں صبح کی نماز پڑھی تو دیکھا کہ جنیدؒ میرے پیچھے صف میں تھے۔ میں نے کہا میں کل اسی غرض سے آپ کے ہاں حاضر ہوا تھا کہ آپ تکلیف نہ فرمائیں۔ آپ نے فرمایا وہ تمہاری مہربانی تھی اور مکہ معظمہ کی زیارت کرنے کے بعد یہ تمہارا حق ہے۔

ابو نعیمؒ نے بیان کیا کہ خُلق تو وہی ہے جو اللہ نے اپنے حبیب ﷺ کو عطا فرمایا یعنی خلق یہ ہے کہ تو لوگوں کی بد خلقی اور اللہ کی قضا کو بغیر ملال اور اظہارِ بے چینی کے قبول کرے۔ فتوت یہ ہے کہ بندہ اوروں کے کام میں لگا رہے اور حدیث شریف میں ہے کہ اللہ بھی ایسے شخص کے کاموں میں لگا رہتا ہے جو اوروں کے کاموں میں لگا رہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ فتوت یہ ہے کہ تو اپنے آپ کو دوسروں سے افضل نہ سمجھے یا جو اپنی خواہشات کی مخالفت کرے وہ صاحبِ فتوت ہے۔ ایک مجوسی نے حضرت ابراہیمؑ سے دعوت چاہی تو آپ نے فرمایا کہ اس شرط پر دعوت کرتا ہوں کہ اگر تو مسلمان ہو جائے یہ سن کر مجوسی چلا گیا۔ حضرت ابراہیمؑ پر وحی نازل ہوئی کہ اے ابراہیمؑ ہم تو پچاس برس سے اس کو باوجود کافر ہونے کے، کھانا دے رہے ہیں اگر تو ایک لقمہ دین کی تبدیلی کے بغیر اسے دے دیتا تو بہتر تھا۔ آپ گئے اور اس سے معذرت کی اور کھانا کھلایا یہ قصہ سن کر وہ مجوسی مشرف بہ اسلام ہو گیا۔

امام فخر الدین رازیؒ فرماتے ہیں کہ خُلق نفس کے اس ملکہ اور استعداد کو کہتے ہیں جو اُس میں پایا جائے اور اس کے لئے افعالِ جمیلہ اور خصائلِ حمیدہ پر عمل پیرا ہونا اس طرح آسان اور سہل ہو جائے جیسے دیکھنا سننا آسان ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں اچھا فعل کرنا الگ بات ہے مگر اس کو آسانی اور سہولت سے کرنا کہ اس کو کرنے میں تکلف کی نوبت نہ آئے جیسے دیکھنا، سننا، بولنا بے تردد ہو تو ان امور میں تیرا اخلاق تصور کیا جائے گا۔ حضور اکرم ﷺ کی ذات پاک تمام کمالات کی جامع تھی شکرِ نوحؑ، خلت ابراہیمؑ، اخلاص موسیٰؑ، صدقِ اسماعیلؑ، صبر ایوبؑ، سلیمانؑ کی تواضع، زکریاؑ کی عبادت، یحییٰ کی عفت اور عیسیٰؑ کا زُہد سب جمع تھے۔ یہی وہ حقیقی نقش و نگار ہیں جن سے ہماری روحانی اور اخلاقی دنیا کا ایوان آراستہ ہے اور جہاں کہیں ان صفات عالیہ کا وجود ہے وہ ان ہی بزرگوں کی مثالوں اور نمونوں کا عکس ہے۔ بہتر سے بہتر فلسفہ، عمدہ سے عمدہ تعلیم، اچھی سے اچھی ہدایت زندگی نہیں پا سکتی اور کامیاب نہیں ہو سکتی اگر اس کے پیچھے کوئی ایسی شخصیت اس کی حامل اور عامل نہ ہو جو ہماری توجہ محبت اور عظمت کا مرکز ہو۔

صوفیاء ہمارے لئے روحانی بیماریوں کے نسخے تجویز کرتے ہیں

انسانوں کی عمدہ معاشرت، صحیح تمدن اور سامانِ تعیش کی تکمیل اور کائنات میں اس کو اشرف المخلوقات کا مرتبہ حاصل کرنے میں یقیناً ہر طبقے کے کارکنوں کا حصہ ہے۔ ہیئت دانوں نے ستاروں کی چالیں بتائیں، حکماء نے چیزوں کے خواص ظاہر کئے، طبیبوں نے بیماریوں کے نسخے ترتیب دیئے، مہندسوں نے عمارتوں کا فن نکالا اور صناعوں نے ہنر اور فن پیدا کئے، ان سب کی کوششوں سے مل کر یہ دنیا تکمیل کو پہنچی، اس لئے ہم ان سب کے شکر گزار ہیں مگر سب سے زیادہ ممنون ہم ان بزرگوں کے ہیں جنہوں نے ہماری اندر کی دنیا کو آباد کیا جنہوں نے ہماری حرص و ہوا کی اندرونی چالیں درست کیں ہماری روحانی بیماریوں کے نسخے ترتیب دیئے ہمارے جذبات، احساسات اور ارادوں کے نقشے درست کئے ہمارے نفوس و قلوب کے عروج و تنزل کا فن ترتیب دیا جس سے دنیا کے صحیح تمدن اور صحیح معاشرت کی تکمیل ہوئی۔ اخلاق و سیرت انسانیت کا جوہر قرار پایا۔ نیکی اور بھلائی ایوانِ عمل کے نقش و نگار ٹھہرے۔ اللہ اور بندے کا رشتہ باہم مضبوط ہوا اور روزِ الست کا بھولا ہوا وعدہ ہم کو یاد آیا۔ اگر ہم انسانی سرشت کے ان رموز و اسرار اور نیکی و سعادت کی ان پیغمبرانہ تعلیمات سے ناواقف ہوتے تو کیا یہ دنیا کبھی تکمیل کو پہنچ سکتی، اس لئے برگزیدہ اور پاک طبقۂ انسانی کے احسانات ہم انسانوں پر سب سے زیادہ ہیں اور اس لئے ہر فردِ انسانی خواہ وہ کسی صنف سے تعلق رکھتا ہو، ان کی شکر گزاری اس پر واجب ہے۔ اسی کا نام اسلام کی زبان میں ''صلوٰۃ و سلام'' ہے جو ہمیشہ انبیائے کرامؑ کے نام نامی کے ساتھ ہم ادا کرتے ہیں۔ ''اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَ سَلِّمْ عَلٰی نَبِیِّنَا وَعَلَیْھِمْ تَسْلِیْمًا'' حضور اکرم ﷺ نے فرمایا صِلْ مَنْ قَطَعَکَ وَاَعْطِ مَنْ حَرَمَکَ (الحدیث) یعنی جو تم سے قطع تعلقی کرے تو اس سے تعلق جوڑ۔ جو تمہیں محروم رکھے تم اسے عطا کرو۔ جو تم پر ظلم کرے تم اسے معاف کر دو اور فرمایا کہ قیامت کے دن میزان میں جو سب سے زیادہ وزنی چیز رکھی جائے گی وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور حسن اخلاق ہے۔

فقراء حضور اکرم ﷺ کے اخلاق کی اتباع کرتے ہیں

جس طرح تمام اصحابِ رسول ﷺ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے پیروکار تھے اسی طرح تمام فقراء اور اولیائے کرامؒ بھی حضور اکرم ﷺ کی پیروی میں اپنی زندگیاں بسر کرتے ہیں، ان سب کا محور و مرکز حضور اکرم ﷺ کی ذات اقدس ہے۔ آپ کی سیرت و اخلاق اور سنت مطہرہ پر عمل پیرا رہنا اور حضور اکرم ﷺ کی ذات سے محبت و عشق کرنا ان حضرات کے ایمان کا حصہ ہے۔ قرنِ اوّل کے فقراء سے لے کر آج تک تمام فقراء آپ ﷺ کے اخلاق کے پیروکار اور متبع ہیں۔ حضرت حسن بصریؒ کے بارے میں مشہور

روایت ہے کہ وہ تین ماہ کی عمر میں تھے ان کی والدہ بیوہ ہوگئیں۔ حسن یتیم ہو گئے تھے وہ حسن کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لائیں تا کہ آپ اس بچے کی صحت و عافیت، علم و عمل اور درازیٔ عمر کے لئے دعا فرمائیں۔ آپ نے ان کے لئے دعائے برکت فرمائی اور حسنؒ کے منہ میں شہد اور دودھ بھی ڈالا اور ان کو حضرت ام المومنین ام سلمیٰؓ نے اپنے پاس ٹھہرالیا اور حضرت حسنؒ نے ان کی تربیت کا شرف حاصل کیا۔ حسن بصریؒ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شاگردی اختیار کی جہاں سے تقویٰ، علم، زہد اور ادب آپ نے سیکھا اور عمر بھر وہ اُن کی تعلیم دیتے رہے۔ حضرت حسنؒ کے شاگردوں اور خلفاء میں سرِ فہرست حضرت حبیب عجمیؒ تھے وہ بھی علم و ادب کا مرقع تھے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ کی پوری زندگی اخلاق اور ادب سے عبارت تھی یہ لوگ حضور اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ اور اخلاق و ادب کا کامل نمونہ تھے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ کا خُلق و ادب

صوفیاء کرام اپنے نفس کو ادب سکھاتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے آپ کو مشقت اور محنت میں مصروف رکھتے ہیں اور ان کی نظر ہمیشہ اپنے نفسِ امارہ پر ہوتی ہے جس کے متعلق حکم ہے کہ "اَلنَّفْسُ كَالطِّفْلِ لَا تُمْهِلْهُ"، نفس کا معاملہ بچوں کا سا ہے تو نفس کو بچے کی طرح آزاد نہ چھوڑ بلکہ اس کو ادب سکھا۔ اس طرح کا واقعہ حضرت بایزید بسطامیؒ سے متعلق تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے کہ ایک دفعہ حضرت بایزید بسطامیؒ نے اپنے نفس کا معائنہ کیا تو اسے بہت فربہ یعنی موٹا پایا۔ آپ نے فرمایا کہ اے نفس! میں تو تمہیں بہت کم کھلاتا پلاتا ہوں۔ تمہاری کوئی خواہش بھی پوری نہیں کرتا پھر تم اتنے موٹے کیوں ہو گئے ہو اس نے جواب دیا کہ اس قوت کی بدولت جو مجھے مل جاتی ہے پوچھا کون سی؟ نفس نے کہا یہ کہ جب آپ بازار جاتے ہیں تو سب اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور آپ کے ہاتھ چومتے ہیں بس اس سے اپنا کام بن جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا اچھا یہ بات ہے۔ رمضان کے مہینے میں سر بازار روٹی کا ٹکڑا چبانا شروع کر دیا۔ آپ کی اس حرکت پر لوگ آپ سے بدظن ہو گئے اور آپ سے نفرت کرنا شروع کر دی۔ پھر آپ نے دیکھا کہ نفس بہت نحیف (یعنی کمزور) ہو گیا ہے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے تیس سال سخت مجاہدات کئے۔ لوگوں نے کہا کہ اپنے مجاہدات کا حال ہمیں بھی بتائیں۔ فرمایا کہ تم میرے سخت مجاہدات تو کیا معمولی مجاہدات کو سننے کی تاب نہیں رکھتے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ ایک عرصہ سے میرا نفس پلاؤ کھانے کو مانگتا تھا۔ آخر میں نے اس کا مطالبہ اس شرط پر قبول کیا کہ وہ اس کے بعد پھر کوئی خواہش نہیں کرے گا لیکن جب پلاؤ کھایا تو نفس نے کہا "پانی" میں نے کہا کہ تم نے عہد کیا تھا کہ پلاؤ کے بعد کچھ نہیں مانگوں گا چنانچہ میں نے ایک سال تک اپنے نفس کو پانی پینے کے لئے نہ دیا۔

فقراء کے اخلاق و آداب

عوارف المعارف میں ہے کہ بے طلب سوال کرنے والا صوفی نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ فقر عذاب بھی ہے۔ (اگر فقیر کے اخلاق برے ہوں، رب کا نافرمان ہو اور اپنے فقر پر شکوہ کرے) اور فقر ثواب بھی ہے (اگر اخلاق نیک ہوں، رب کا اطاعت گزار ہو اور اپنے حال کی شکایت لب پر نہ لائے۔)

فقیر دوستوں سے شگفتہ روئی سے پیش آئے اور چیں بہ جبیں نہ ہو۔ لوگوں کی مخالفت کو برداشت کرے، ان سے کینہ اور دشمنی نہ رکھے۔ دل میں کسی سے نفرت نہ کرے۔ کسی کو منہ پر برا نہ کہے اور موجود نہ ہو تو غیبت نہ کرے۔ لوگوں کی عیب پوشی کرے۔ عیادت فی سبیل اللہ کرے بدلہ کے طور پر نہ جائے۔ اگر کوئی رشتہ توڑے تو فقیر کو چاہیے کہ وہ اس سے رشتہ جوڑے۔ جو ظلم کرے اس پر عطا کرے۔ جو خطا کرے اس کو معذور تصور کرے۔

فقیر دوسروں کی چیز کو اجازت کے بغیر استعمال نہ کرے اور خود اپنی چیزوں کے دینے کو ممنوع قرار نہ دے۔ مستعار چیز کا واپس مانگنا جوانمردی نہیں کیونکہ ہر چیز کا مالک اللہ ہی ہے۔ اپنی تکلیف اور غم لوگوں پر ظاہر نہ کرے۔ اگر مال کی کمی ہو تو مال کی کمی سے قوت حاصل کرے یعنی مال کی کمی سے دل کی روشنی میں اضافہ ہوگا اور اگر اپنی ناداری پر دل تنگ ہو اور اللہ سے شکایت کا پہلو ہو تو سمجھ لے کہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے، لہٰذا توبہ واستغفار کرے اور اپنی لغزش کا پتہ کرے۔

اگر فقیر کثیر العیال ہو تو خرچ کے متعلق دل تنگ نہ کرے بلکہ اللہ کے وعدے پر کامل اعتماد رکھے۔ فقیر اپنی سعی کو محض وسیلہ سمجھے جبکہ رزق کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھے۔ رزق تنگ ہو تو کشائش کے لئے دعا کرے۔ فقیر کو مستقبل کی فکر نہیں ہونی چاہیے، کسی کے رزق پر حسد نہ کرے۔ فقیر کو چاہیے کہ موت کا انتظار رکھے اور اس کے لئے تیار رہے۔ ناداری میں خلاف شریعت کام نہ کرے۔ عزیمت کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ مشتبہ چیزوں کو قبول نہ کرے۔ کسی کی امداد کو سہارا نہ سمجھے بلکہ اللہ کی طرف سے عطا تصور کرے۔

فقیر کو چاہیے کہ سوال میں احتیاط کرے اور سوال کی شرائط کو مدنظر رکھے۔ فقراء کے وہ آداب معاشرت جو فقراء کی شان کے لائق ہیں نگاہ میں رکھے۔ دوستوں کے ساتھ، کھانے کے آداب، اغنیاء کے ساتھ میل جول، دعوت کے آداب اور اہل وعیال کی تربیت وآداب کی طرف توجہ دے۔ قیام اور سفر کے دوران عوام میں مقبولیت کے متعلق فقراء کے ادب کا خیال رکھے۔

درویشوں کے درجات تونگروں کو نصیب نہیں ہوتے

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں ایک حدیث نقل کی ہے کہ ایک دفعہ درویشوں نے ایک عرضداشت حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں ارسال کی جس میں انہوں نے شکایت کی کہ دنیا و دین کی نیکیاں صدقہ،

زکوٰۃ اور حج وغیرہ تو امیروں کے لئے رہ گئیں ہیں اور ہم ان امور کی انجام دہی سے محروم ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ایلچی کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ تو ایسے لوگوں کی طرف سے آیا ہے جو مجھے بے حد محبوب ہیں اور فرمایا کہ درویش قانع کے لئے تین درجے ایسے ہیں جو تونگروں کو نصیب نہ ہوں گے۔

(۱) ان کے لئے بہشت میں ایسے کوشک (کرسیاں) ہوں گے جنہیں اہل بہشت بھی ایسے دیکھیں گے جیسے اہلِ زمین ستاروں کو دیکھا کرتے ہیں اور یہ مقام صرف پیغمبر درویشوں، مومن درویشوں اور شہید درویشوں کو ملیں گے۔

(۲) فقیروں کو امیروں سے پانچ سو برس پہلے بہشت میں داخل کر دیا جائے گا۔

(۳) جب ایک درویش ایک بار "سُبْحَانَ اللهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاللهُ اَكْبَرُ" کہتا ہے اور امیر بھی یہی کہتا ہے اور ساتھ دس ہزار دینار صدقہ بھی دیتا ہے تو بھی فقیر کا درجہ اور ثواب اس سے زیادہ ہوگا۔ یہ فرمان سن کر فقیروں نے کہا ہم خوش ہوئے ہم خورسند ہوئے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ذکر اسی دل میں عظیم اثر کرتا ہے جو شکستہ ہو اور امیر کے دل سے یہ اس طرح اچھل جاتا ہے جیسے سخت پتھر سے پانی کی بوندیں اچھل جاتی ہیں اور امیروں کا دل دنیا سے فارغ نہیں ہو سکتا۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ دنیا نے جب خود کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "دور رہ مجھ سے دور رہ" مشائخ کا قول ہے، کاش عاجزی کرنے والے غریب کو اپنے مقام کی خبر ہوتی۔ عجز کا جو مقام غریب کو ورثہ میں ملا ہے امیر کو چالیس سال کی عبادت میں بھی حاصل نہیں ہوتا۔ حدیث میں ہے کہ جو تھوڑی روزی پر راضی ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے تھوڑے اعمال سے راضی ہو جاتا ہے۔

قانع فقراء سب کچھ لٹا دیتے ہیں۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ایک روز اپنی مجلس میں تھے تو ان کی بیوی آئی اور کہا کہ تم یہاں بیٹھے ہو اور گھر میں کچھ بھی نہیں ہے۔ فرمایا اے عورت میرے سامنے انتہائی دشوار گزار گھاٹی ہے، وہاں سے وہی گزر سکتا ہے جو خفیف بار ہو (جس کا بوجھ ہلکا ہو) یہ سن کر اہلیہ کو مسرت ہوئی اور وہ چلی گئی۔

ایک حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے لوگو! آگے بڑھو کیونکہ "مُفَرِّدُوْن" (تن تنہا لوگ) بہت آگے نکل گئے ہیں" حضرت ابوذر غفاری کے پاس سلیمی خاندان کا ایک شخص حاضر ہوا اور کہنے لگا مجھے اپنے پاس رہنے کی اجازت دیں میں آپ کے چرواہے کی خدمت کروں گا۔ آپ نے اس شرط پر منظور کیا کہ میری اطاعت کے لئے تیار رہو گے۔ ایک دن کسی نے حضرت ابوذر سے کہا کہ فلاں جگہ چشمے

ضرورت مند لوگ رہتے ہیں آپ نے سلیمی سے کہا کہ جو سب سے اچھا اونٹ ہے اس کو ذبح کر کے ان غرباً میں تقسیم کرو۔ سلیمی نے سوچا یہ اونٹ تو بہت کام کا ہے چنانچہ وہ دوسرے نمبر کا اونٹ لے آیا۔ ذبح کیا اور ضیافت کی۔ سب سے اعلیٰ اونٹ ذبح نہ کیا۔ کچھ دنوں بعد آپ نے سلیمی سے دریافت کیا کہ تم عمدہ اونٹ بھول کر چھوڑ آئے تھے یا عمداً چھوڑ کر آئے۔ اس نے عرض کی حضور یہ اونٹ بہت کار آمد تھا آپ کی ضرورت کے تحت اسے چھوڑ آیا تھا۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے فرمایا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میری ضرورت کا دن کون سا ہے؟ فرمایا میری ضرورت کا دن وہ ہے جب میں قبر کے گڑھے میں اکیلا ڈال دیا جاؤں گا۔ وہ دن میری ضرورت اور احتیاج کا ہے۔ پھر فرمایا مال کے تین حصہ دار ہیں۔ ایک تقدیر جو مال کو لے جانے میں انتظار نہیں کرتی، دوسرے ورثاء، تیسرا حصہ دار تو خود ہے اگر تیری طاقت میں ہو تو ان تینوں میں سے سب سے زیادہ کمزور نہ بن پھر فرمایا: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران: ۹۲) تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک اپنی پسندیدہ ترین چیزیں خرچ نہیں کرو گے۔

حضرت ابو طلحہؓ کا باغ بئر حا نامی مسجدِ نبوی ﷺ کے قریب تھا جس میں پانی وافر اور میٹھا تھا۔ حضور اکرم ﷺ بھی کبھی تشریف لے جاتے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ تو آپؓ نے یہ باغ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا حضور اکرم ﷺ نے اسے حضرت ابو طلحہؓ کے رشتہ داروں میں تقسیم کروا دیا۔

کتب تفاسیر میں منقول ہے کہ جب سورۃ الحدید کی آیت نمبر ۷ نازل ہوئی تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہوگئی اور آپ نے سب کچھ اللہ تعالیٰ کے نام پر تقسیم کر دیا۔ ایک شخص آخر میں آیا تو آپ نے اپنے بدن کے کپڑے اس کو دے دیئے اور خود دروازے کے ٹاٹ میں ملبوس ہو گئے۔ سب کچھ لٹا کر حضور اکرم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو جبرئیل علیہ السلام اس واقعہ کی خبر آنحضرت ﷺ کو پہلے ہی سنا چکے تھے۔ آپ ﷺ نے دیکھا کہ جبرئیل علیہ السلام ٹاٹ کا لباس پہنے ہوئے حاضر خدمت ہیں۔ جب آپ ﷺ نے اس کا سبب دریافت کیا تو جبرئیل علیہ السلام نے پورا واقعہ سنایا کہ چونکہ آج حضرت صدیق اکبرؓ نے سب کچھ لٹا کر ٹاٹ کا لباس پہنا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے تمام فرشتوں کو ٹاٹ کا لباس پہننے کا حکم فرمایا ہے۔ اتنے میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بھی تشریف لے آئے۔ زیادہ تفصیل مقصود ہو تو ضیاء القرآن دیکھیں، اللہ تعالیٰ نے جو پیغام بھیجا وہ بھی ملاحظہ فرمائیں (ملخصاً از ضیاء القرآن)

درویش اور تونگر عبادت گزار میں فرق

مشائخ کا قول ہے کہ جب فقیر مرتا ہے تو وہ آخرت کی طرف دیکھتا ہے۔ جہاں کے لئے اپنی ساری پونجی

ارسال کر چکا ہوتا ہے مگر امیر کا دنیا کی طرف دھیان ہوتا ہے کیونکہ اس کا سارا مال دنیا میں جمع ہوتا ہے۔

درویش کو جو لذت عبادت میں ہے تونگر کو نہیں ہو سکتی۔ تونگر کے صرف ہونٹ ہلتے ہیں۔ باطن کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جب تک دل زخم خوردہ اور خستگی سے چور چور نہ ہو تب تک ذکر الٰہی کی لذّت باطن میں کہاں پیدا ہو سکتی ہے

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

اگر درویش اور عبادت گزار تونگر دونوں قناعت کا درجہ رکھتے ہوں تب بھی افضل تر درویش ہے اور اگر فقیر درویش حریص ہے اور تونگر قانع اور شاکر ہے (یہاں تک کہ تونگر کو مال کے آنے اور جانے کا دل پر اثر نہ ہو) اور اس کی قناعت اس کی طہارت کا سبب بن جائے تو اس کی یہ طہارت فقیر کی طہارت کے قریب ہی پہنچتی ہے کیونکہ فقیر حریص کی طہارت رنج واندوہ کی وجہ سے اکمل ہے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اگر مالدار سب کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کر دے اور اس کے پاس مال کا ہونا نہ ہونا برابر ہو تو وہ اس درویش سے جس کے پاس مال نہ ہو بہتر ہے جیسے حضرت عائشہؓ نے ایک دن ایک لاکھ درہم خیرات کر دیئے اور اپنے لئے ایک بھی درہم نہ رکھا کہ جس سے روزہ افطار کر لیتیں۔ خادمہ کو کہا کہ اگر تم مجھے یاد کروا دیتی تو افطاری کے لیے کچھ رقم رکھ لیتی۔

حقیقی فقراء بہت کم نظر آتے ہیں

حضرت شہاب الدین سہروردیؒ عوارف المعارف میں فرماتے ہیں کہ فقر صوفیہ کی ذاتی صفت بن جاتی ہے ان کے پاس متاع دنیاوی میں سے کچھ ہو یا نہ ہو مگر اس صفت میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوتا۔ ان کے پاس اگرچہ دنیا بھر کے خزائن ہوں تب بھی وہ شعور ملکیت سے آزاد ہوتے ہیں۔ ان کی نگاہوں میں دولت اور غربت دونوں یکساں ہوتے ہیں۔

علامہؒ فرماتے ہیں۔

حکمتِ دیں دلنوازی ہائے فقر قوتِ دیں بے نیازی ہائے فقر (پ۔چ:۸۱۷)

(فقر کی دلنوازی سے حکمتِ دین پیدا ہوتی ہے اور اس کی بے نیازی دین کے لئے قوت بنتی ہے۔)

فقر کی منزل تک پہنچنا آسان بات نہیں اور یہ ہر ایک کی دسترس میں نہیں ہے۔ ان فقراء میں جو کچھ پایا جاتا ہے اس سے قوم کے افراد محروم ہیں لہٰذا مسلمان کو مسلمان بنانے کے لئے امّت کو بے لوث اہلِ عزم و ہمت اور اصحابِ علم وبصیرت کی بہر حال شدید ضرورت ہوتی ہے جو انسان کو مادی ہوس اور طمع کی بندشوں سے کسی قدر آزاد رہنے کے سلسلے میں مدد دیں۔ ایسے اشخاص پچھلے وقتوں میں بھی قوموں میں آئے ہیں اور اب

بھی موجود ہیں لیکن منکرین تصوف نے استفادہ نہ کیا بلکہ کچھ ان کی مخالفت پر کمر بستہ رہے۔ افسوس کی بات ہے کہ ہر زمانے میں اور آج بھی بہت سے ایسے لوگوں نے فقر کا دعویٰ کیا جو فقر کے نام سے آشنا نہیں۔ اخلاق اور کردار و عمل سے فقر کے ایسے جعلی دعویداروں کو دور کا بھی واسطہ نہیں حقیقی فقراء بہت کم نظر آتے ہیں۔ علامہؒ نے فرمایا۔

وہ بندے، فقر تھا جن کا ہلاکِ قیصر و کسریٰ
نہ ایران میں رہے باقی، نہ توران میں رہے باقی

(ب۔ ج: ۳۱۵)

صحابہ کرام کو رسولِ خدا ﷺ نے ایسی تربیت دی کہ وہ مفلسی میں غیرت مند دل رکھتے تھے اور غیر اللہ سے کسی چیز کے طالب نہ تھے۔

قوم را دارد بہ فقر اندر غیور (پ۔ چ: ۸۴۴)

(اسی سے قوم فقر میں غیور ہے۔)

جب مسلمانوں کا بیت المال سونے چاندی سے بھرا ہوا تھا سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس وقت بھی فقر کی شان کو برقرار رکھا، جسے علامہؒ نے آپ کے متعلق فرمایا۔

تو اے بادِ بیاباں از عرب خیز
زنیلِ مصریاں موجے بر انگیز

(اے صحرا کی ہوا تو عرب سے اٹھ اور مصریوں کے دریائے نیل سے ایک موج پیدا کر)

بگو فاروق را پیغامِ فاروقؓ
کہ خود در فقر و سلطانی بیامیز (ا۔ ح: ۹۶۰)

(اور شاہِ فاروق کو حضرت فاروقؓ کا یہ پیغام دے کہ اپنی شاہی میں فقر کی شان پیدا کرو۔)

فقر میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مقام ممتاز ہے

روایات میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ آپ کس وجہ سے ہم سب پر سبقت لے گئے۔ فرمایا پانچ وجہ سے، ایک یہ کہ میں نے کسی کو دنیا کا مرید پایا اور کسی کو آخرت کا مرید مگر میں مریدِ مولا ہوا۔ دوسرے یہ کہ جب سے میں اسلام میں داخل ہوا دنیا کے کھانوں سے سیر نہ ہوا کیونکہ مجھے معرفت کی لذت نے دنیا کی لذت سے بے نیاز کر دیا۔ تیسرے یہ کہ میں اسلام کے بعد دنیا کے پانیوں سے سیراب نہ ہوا بلکہ عشق الٰہی کی شراب نے مجھے ان شربتوں سے بے نیاز کر دیا۔ چوتھے یہ کہ جب میرے سامنے دنیا اور دین کے اعمال آئے تو میں نے دنیا کے کام پر دین کے کام کو مقدم رکھا اور پانچویں یہ کہ مجھے حضور اکرم ﷺ کی صحبت میسر ہوئی تو میں نے آپ ﷺ کو راضی رکھنے کی کوشش کی۔ (معالی الہمم۔ ترجمہ ضیاء الحسن فاروقی)

باب ۲۸

فقراء کی دلوں پر حکومت

بعد از وفات تربتِ ما در زمیں مجو در سینہ ہائے مردمِ عارف مزار ما (x)

(وفات کے بعد میری قبر زمین پر نہ تلاش کرو، بلکہ تم مردانِ عارف کے سینوں میں ہمارا مزار پاؤ گے۔)

کچھ لوگ تو اللہ اور رسول ﷺ کے حکم کو بھی تسلیم نہیں کرتے ۔اس گروہ میں شامل لوگوں کو منافق کہا جاتا ہے اور قرآن میں ان کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (النساء: ۶۵)

تو (اے محبوب ﷺ) تمہارے رب کی قسم وہ لوگ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنے باہمی اختلافات میں تمہیں اپنا حاکم نہ بنائیں اور پھر جو کچھ تم حکم فرما دو تو وہ اپنے دلوں میں قطعاً تنگی نہ پائیں اور جو فیصلے آپ ﷺ کر دیں، اس کو وہ دل وجان سے تسلیم کر لیں۔

ایسے لوگوں کے علاوہ کچھ ایسے مسلمان بھی ہیں جو آپ ﷺ کے اسمِ گرامی پر اپنی جان بھی دینے سے قطعاً گریز نہیں کرتے ۔یہ دوسرا گروہ عالی مقام صوفیاء اور عاشقانِ رسول ﷺ کا ہے۔اس گروہ میں شامل لوگ اپنے مشائخ کرام کے احکامات کو بھی دل وجان سے مانتے ہیں اور یہ بات محض اس لئے ہے کہ وہ اپنے مشائخ کو رسول اللہ ﷺ کے جانشین جانتے ہیں اور ان کی تہہ دل سے عزت اور احترام کرتے ہیں۔

وہ عقیدت مند حضرات جو مشائخ عظام سے اپنا تعلق بیعت کے ذریعے استوار کرتے ہیں وہ مشائخ کی محبت کو اپنے دلوں میں سمو لیتے ہیں اور تصورِ شیخ قائم کرنے کے بعد ان کے تصرفات کو اپنے دلوں پر اثر انداز ہوتا ہوا پاتے ہیں۔اسی محبت کو دلوں پر حکومت ہونے کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔راقم الحروف کی کتاب "رابطۂ شیخ" کے مطالعہ کرنے کے بعد اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ لوگوں کے دلوں پر اولیاء اللہ کی حکومت کس طرح قائم ہو جاتی ہے اور وہ ان کے عشق میں کیونکر اس قدر گم ہو جاتے ہیں کہ مرید کی ہر ادا اپنے شیخ کی اداؤں کے بلا بق ڈھلنا شروع ہو جاتی ہے اور بالآخر نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ بعض اوقات شیخ اور مرید کی شکل و

صورت، عادات اور مزاج میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

وہ محبت جس کا نفاذ دلوں پر ہوتا ہے اور جس کو دلوں پر حکومت سے تعبیر کیا جاتا ہے ارادت مندوں کے دلوں پر مشائخ کرام کی محبتوں کا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ مشائخ کرام اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں اس طرح حکمرانی کرتے ہیں کہ جس کی نظیر کسی اور مذہب میں نہیں مل سکتی۔ پروفیسر آرنلڈ (جو علامہ اقبالؒ کے استاد بھی رہ چکے ہیں) اپنی ایک کتاب ''PREACHING OF ISLAM'' میں لکھتے ہیں کہ میں نے حضرت معین الدین چشتیؒ نامی ایک بزرگ کے مقبرے کو دیکھا جنہوں نے ہندوستان میں آ کر اسلام پھیلایا اور ان کے ہاتھوں پر ننانوے لاکھ آدمی مسلمان ہوئے۔ پروفیسر صاحب لکھتے ہیں کہ بیشک آج یہ بزرگ اپنے مرقد منور میں آرام فرما رہے ہیں لیکن یہ بزرگ پورے ہندوستان میں لوگوں کے دلوں پر حکومت کر رہے ہیں ان کو ماننے والوں کی تعداد اس وقت تک کروڑوں اور اربوں تک پہنچ چکی ہے۔ یہی وہ بزرگ ہیں جو پردہ فرمانے کے بعد بھی اب تک اپنے عقیدت مندوں کے دلوں پر حکومت کر رہے ہیں۔

جب اہلِ دنیا سے کسی کو محبت ہو جائے تو یہ محبت کسی نہ کسی مطلب پر مبنی ہوتی ہے اور چونکہ دنیا بذات خود ایک فانی چیز ہے اس لئے اس کی کسی شے سے محبت ہونے لگے تو انجام بھی فانی ہوگا اور ایسی محبت حصولِ مقصد کے بعد فنا ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس وہ محبت جو اللہ والوں کے ساتھ قائم ہو جائے (بشرطیکہ وہ محبت کسی مال و دولت کے حصول کی خاطر نہ ہو) تو ایسی محبت محض اللہ کے لئے ہوتی ہے۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ اللہ کے نام کو فنا نہیں اور اس کے ساتھ تعلق رکھنے والی محبت کو بھی فنا نہ ہوگی چنانچہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ اور باقی رہے گی۔ ایسی سچی محبتوں کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی جو محبت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دیکھنے سننے میں آئی ہے اس کو کوئی شخص بیان نہیں کر سکتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کو دیکھا تو خلافت سے دل بھر گیا۔ حضرت ہارون رشید نے جب حضرت ابو علی فضیلؒ سے گفتگو کی تو دورانِ گفتگو کئی بار بے ہوش ہوئے اور جب ان کے گھر سے باہر نکلے تو اپنے وزیر سے کہنے لگے کہ درحقیقت ابو علی فضیلؒ بادشاہ ہیں۔ اگر ہم کچھ مزید مثالوں کو اختصار کے ساتھ پیش کریں تو معلوم ہو گا کہ اللہ والے واقعی لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کو بادشاہ جہانگیر اور نور جہان نے بہت اذیتیں پہنچائیں یہاں تک کہ آپ کو ایک طویل مدت کے لئے جیل میں ڈال دیا گیا اور جب جہانگیر نے حضرت کی غلامی اختیار کی تو عرض کرنے لگا کہ ہم نے تمام عمر شہنشاہی کے بل بوتے پر عیاشی کی۔ کیا ہماری بخشش کی بھی کوئی اُمید ہے؟ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جہانگیر سے فرمایا کہ فکر نہ کرو، اگر ہم جنت میں گئے تو اکیلے نہیں جائیں گے۔ شہنشاہ جہانگیر نے اس واقعہ کو تزکِ جہانگیری میں نقل کیا ہے اور اس بات سے اس کی ارادت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک طویل روایت میں اس واقعہ کا ذکر ہے کہ شہنشاہ محمود غزنویؒ نے حضرت

ابوالحسن خرقانیؒ کو طلب کیا مگر آپ نے انکار کر دیا۔ محمود غزنویؒ خرقان میں پہنچ گیا اور حضرت ابوالحسن کو اپنے خیمے میں یہ پیغام بھیج کر طلب کیا کہ ہم غزنی سے یہاں آ گئے ہیں اور آپ چند قدموں پر نصب شدہ میرے خیموں میں تشریف لائیں مگر آپ نے پھر انکار کر دیا۔ محمود غزنویؒ نے کہا میں سلطانِ وقت ہوں اور میرا حکم ماننا قرآن کی آیت سے ثابت ہے۔ آپ نے کہلا بھیجا کہ میں "اَطِیْعُوا اللّٰہَ" کی گرفت میں ہوں اور "اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ" سے سخت شرمسار ہوں اور "اُولُوا الْاَمْرِ" (حاکموں کی اطاعت) تو بہت دور کی بات ہے۔ قصہ بہت طویل ہے لیکن محمودؒ جب بھیس بدل کر حضرت کے دربار میں آیا تو حضرت اُٹھ کر اندرون خانہ چلے گئے تا کہ بادشاہ کی تعظیم کے لئے اُٹھنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ محمودؒ ایاز کے لباس میں تھے اور دیگر وزراء غلاموں کے لباس میں ملبوس تھے، حضرت ابوالحسنؒ نے اُنہیں اپنے مقام کے مطابق بٹھایا جس سے محمودؒ آپ کی بزرگی کا قائل ہو گیا پھر سومنات پر سترھویں حملے کی بات ہوئی اور آپ نے محمودؒ کو اپنا چوغہ عطا فرمایا۔ جب محمودؒ رخصت ہوا تو آپ اُٹھ کر کھڑے ہوئے اور محمودؒ کی تعظیم بجالا کر رخصت کیا۔ محمود نے یہ سوال کیا کہ جب ہم آپ کے گھر میں آئے تو اس طرح تعظیم نہیں کی گئی اور اب آپ نے میری عزت افزائی کیوں فرمائی۔ آپ نے جواب دیا کہ پہلے تم بادشاہت کے رعب میں آئے تھے اب تم عقیدت کے ساتھ واپس جا رہے ہو اس لئے تمہارا احترام ضروری تھا۔ یہ ایک ایسی مثال ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ بادشاہوں کے دلوں پر بھی غلامی کے آثار پائے جاتے ہیں اور یہ بزرگوں کی دلوں پر حکمرانی کو ثابت کرتی ہے۔

مشہور ہے کہ حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے مزار میں ایک بہشتی دروازہ آپ کے عرس کے موقع پر کھلتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ جو اس دروازے سے گزر جائے تو وہ جنتی ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ اعتراض کرتے ہیں، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان تونسویؒ کے سامنے کہا گیا کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ حضرت تونسویؒ کو جلال آ گیا اور فرمایا کہ وہ دروازہ تو بہت بڑی بات ہے، جو شخص میرے طبہ، میری گلی، بلکہ محلہ سے گزر گیا اس کی بھی بخشش ہو جائے گی۔ (فرمودات تونسویؒ) تذکرہ حضرت عطارؒ میں اس بات کا ذکر ہے کہ حضرت ابوالحسن خرقانیؒ نے فرمایا کہ جس نے مجھے دیکھ لیا اس کی بخشش ہو جائے گی۔ حضرت محمود غزنویؒ جو اس مجلس میں موجود تھے کہنے لگے کہ ابو جہل نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا مگر سب اس بات پر متفق ہیں کہ وہ قطعی جہنمی ہے۔ حضرت خواجہ کو جلال آ گیا اور فرمایا خدا کی قسم ابو جہل نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہی نہیں اور قرآن میں اس بات کی تصدیق ہے جہاں فرمایا گیا ہے وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ۝ (الاعراف: ۱۹۸) (یعنی غور سے دیکھو ان کو تم اے محبوب ﷺ وہ نظریں ضرور گھماتے ہیں تمہاری طرف لیکن وہ تمہیں نہیں دیکھ پاتے۔) اس پر محمود غزنویؒ خاموش ہو گئے۔ حقیقت یہی ہے کہ جس نے ان بزرگوں کو عقیدت سے دیکھا تو انہوں نے اپنے دلوں پر ان کی حکمرانی کو بھی تسلیم کیا۔

حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ نے جب ایک بہت بڑی مجلس میں اس بات کا اعلان کیا کہ میرا قدم تمام ولیوں کی گردنوں پر ہے، تو سب نے آپؒ کے اس قول کو تسلیم کیا لیکن ایک شخص جو کسی اور کا مرید تھا کہنے لگا کہ میں اپنی گردن پر ان کا قدم تسلیم نہیں کرتا۔ یہ بات جب حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ تک پہنچی تو آپ نے فرمایا "جاؤ تمہاری گردن پر سور کا قدم ہوگا" چنانچہ وہ شخص ولایت سے معزول ہوا اور ایک یہودیہ عورت پر عاشق ہو گیا اور اس سے شادی کرنے کا خواہش مند ہوا اور لڑکی والوں کے کہنے پر کئی سال ان کے سوروں کو چراگاہ میں لے جاتا رہا اور سوروں کے بچوں کو اپنی گردن پر اٹھا کر لاتا رہا۔ بالآخر وہ شخص یہودی مذہب قبول کرنے لگا تو لوگوں نے اس بلا سے نکالنے کے لئے حضرت کی خدمت میں عرض کیا۔ حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ نے اپنے وضو کے پانی کا ایک چھینٹا سینکڑوں میل سے اس کی طرف مارا تو اس کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ وہاں سے بھاگا۔ جب وہ شخص واپس آیا تو حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے سامنے آ کر توبہ کی اور اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ جو لوگ بزرگوں کی عظمتوں کا انکار کرتے ہیں تو وہ تمام عمر ناکامی اور محرومی میں گزار دیتے ہیں۔ جو لوگ اہلِ عقیدت ہیں وہ بزرگوں کے اقوال کی تردید نہیں کرتے بلکہ ان کی خدمت میں رہتے ہیں۔

حضرت بشر حافیؒ جب بازار سے گزرتے تو حضرت امام احمد بن حنبلؒ ان کی رکاب کو تھام کر چلتے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ تو امام ہیں آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ فرمایا بشر حافیؒ کو خدا کی معرفت مجھ سے زیادہ ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ بزرگ لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔

تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

(ب۔د:۱۰۴)

فقر اللہ تعالیٰ کا راز ہے

استاد ابو علی دقاقؒ فرماتے ہیں کہ ایک فقیر نے ایک مجلس میں کھڑے ہو کر کچھ مانگا اور کہا کہ میں تین دن سے بھوکا ہوں۔ ایک شخص جو وہاں موجود تھا اس نے بلند آواز سے کہا کہ یہ جھوٹ کہتا ہے۔ فقر تو اللہ کا راز ہے اور اللہ تعالیٰ اپنا راز اس شخص کے پاس نہیں رکھتا جو اس راز کو جہاں چاہے لئے پھرے۔

حمدون قصارؒ فرماتے ہیں کہ جب شیطان اور اس کی فوج اکٹھی ہوتی ہے تو انہیں اپنی کسی بات پر اتنی خوشی نہیں ہوتی جتنی تین چیزوں پر ہوتی ہے۔

۱۔ اس مومن پر جو مومن کو قتل کرے۔

۲۔ اس شخص پر جو کفر کی حالت میں مرے۔

۳۔اس دل پر جسے فقر کا ڈر ہو۔

حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ اے فقراء کی قوم تمہیں لوگ اللہ کی اطاعت کی وجہ سے جانتے ہیں اور اللہ ہی کی خاطر تمہاری عزت کی جاتی ہے لہٰذا جب تم اللہ کے ساتھ خلوت میں ہو تو تمہیں سوچ لینا چاہیے کہ تمہیں کیسا ہونا چاہیے۔ حضرت کہتے ہیں کہ فقیر کی تین صفتیں ہیں۔

۱۔رازِ خداوندی کو محفوظ رکھنا۔

۲۔اللہ کے فرائض کو ادا کرنا۔

۳۔اپنے فقر کی حفاظت کرنا۔

دلوں پر فقیروں کی حکومت

علامہؒ نے ایک شعر میں فرمایا ہے کہ ''فقر نگاہ کی تیغ بازی ہے'' یہ ایسی تیغ ہے کہ زبان خاموش بھی ہو تو نگاہ اثر کرتی ہے۔ حضرت عبد القادر بن عبداللہ سہروردیؒ کا قول عوارف المعارف میں ہے ''مَنْ لَا يَنْفَعُكَ لَحْظُهٗ لَا يَنْفَعُكَ لَفْظُهٗ'' (یعنی تجھے جس کی نگاہ کوئی فائدہ نہ دے اس کے لفظ بھی کوئی فائدہ نہ دیں گے۔) یہ نگاہ کی مقناطیسیت دل کی صفائی کے بغیر پیدا نہیں ہوتی۔ اکتسابِ جذب حُسنِ عمل کا محتاج ہے اور حسنِ عمل آنکھوں میں بجلی بن کر چمکتا ہے جو اپنے سامنے بیٹھنے والے ہر اس شخص پر اثر انداز ہوتا ہے جس کے دل کے دریچے بند نہ ہوں۔

تاریخ شاہد ہے کہ گو مختلف وقتوں پر آنے والے شہنشاہوں کا رعب اور دبدبہ جہانگیر تھا وہ اپنے وقتوں کے فقراء کے درباروں میں عجز و انکساری کے ساتھ حاضر ہوتے تھے ان کے دلوں میں ان بزرگوں کا احترام اس درجہ کا ہوا کرتا تھا کہ وہ ان بزرگوں کے مقابلے میں لاشئ نظر آتے تھے۔ بڑے بڑے سلاطین اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ حقیقی بادشاہ تو فقراء ہی ہیں۔

اسلام کے پھیلانے میں فقراء کا ہاتھ

تاریخ اسلام اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ اگرچہ کچھ ملکوں پر مسلمانوں نے (کسی نہ کسی وجہ سے) جنگ آزمائی کی اور اس میں فتح مندانہ داخل ہوئے مگر کئی ایسے ملکوں کے نام بھی آتے ہیں جہاں بغیر یلغار کے مسلمانوں کے فقراء اور مسلمان تاجروں کی خوش اخلاقی اور خوش اسلوبی کے باعث اسلام پھیلا۔ ایسے ممالک جہاں فقراء اور مسلمان تاجروں کی وجہ سے حکومت قائم ہوئی ان کی مثالیں انڈونیشیا، ہند، چین، فلپائن، ملائشیا اور افریقہ کے بہت سے ممالک ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت داتا گنج بخشؒ، ابوالحسن خرقانیؒ اور معین الدین چشتیؒ جیسے بزرگوں کی دعاؤں سے ہندوستان پر مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا۔

بہت سے مغربی مفکر (آرنلڈ، برنگھم اور ہٹی وغیرہ) اور دیگر اہلِ تحقیق نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان غیر مفتوحہ اور غیر محروسہ مسلم علاقوں میں اسلام محض اہلِ فقر کے باعث اور مسلمان تاجروں کی بدولت پھیلا۔ دراصل یہ تاجر بھی فقیرانہ شان کے حامل تھے اور تجارت اس طرح کرتے تھے کہ چور بازاری، حرص، بدمعاملگی سے قطعاً مبرا تھے۔ ان کی خوش اسلوبی نے لوگوں کے دلوں کو جیت لیا اور وہ جوق در جوق اسلام میں داخل ہو گئے۔

آں فقر کہ بے تیغ صد کشورِ دل گیرد از شوکتِ دارا بہ، از فرِّ فریدوں بہ (ز۔ع: ۴۱۵)

(ایسا فقر جو تلوار کے بغیر دلوں کی صد ہا مملکتیں فتح کر لیتا ہے۔ شوکتِ دارا اور فرِّ فریدوں سے بہتر ہے۔)

فقیر بادشاہ بھی ہو تو فقیر ہے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ دم آخر سخت گھبراہٹ میں تھے اور خوف سے تھر تھر کانپتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ نے تسلی دی تو فرمایا خدا کی قسم میرے پاس زمین بھر سونا ہوتا تو عذابِ الٰہی دیکھنے سے پہلے اس کو قربان کر دیتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے آپ کے عہد خلافت کی تعریف کی تو فرمایا کہ کیا خلافت اور امارت کے بارے میں میری تعریف اور تزکیہ کی باتیں کرتے ہو۔ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا تو وہ خوش رہے۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ رہا تو دمِ آخر تک ان کی فرمانبرداری کرتا رہا مجھے تو تمہاری اس امارت اور خلافت کے بارے میں خطرہ ہے۔ جب آپ کو خلافت کی ذمہ داری کا احساس شدت سے ہوتا تو مٹی کو مٹھی میں بھینچ کر فرماتے اے کاش میں مٹی ہوتا، بلکہ کچھ بھی نہ ہوتا اے کاش میری ماں مجھے نہ جنتی۔ یہ خوف ان لوگوں کا ہے جنہوں نے اللہ کو راضی کیا، اتنا کچھ کرنے کے بعد یہ حال تھا اور ہم دنیادار رہ کر مطمئن کیسے ہو سکتے ہیں اور دنیا کے جاہ وجلال جس پر ہم مرتے ہیں اس کا یہ حال تھا کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جانشین مقرر کرنے کی بات ہوئی تو آپ نے فرمایا اگر ابو حذیفہؓ کا غلام سالمؓ زندہ ہوتا تو میں ان کو خلیفہ مقرر کرتا اور اگر پروردگار سالمؓ کے متعلق مجھ سے سوال کرتا تو میں کہتا کہ "میں نے آپ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا کہ سالمؓ اللہ سے محبت کرتا ہے" مغیرہ بن شعبہؓ نے تجویز پیش کی کہ اپنے بیٹے کو خلیفہ نامزد کر دیں تو فرمایا۔

"تجھے خدا سمجھائے واللہ میں نے کبھی یہ خیال نہیں کیا اور نہ ہی میں نے حکومت کو کوئی قابلِ تعریف چیز پایا ہے کہ اسے اپنے گھر والوں کے لئے پسند کروں۔ اگر حکومت خیر تھی تو ہمیں مل گئی اور اگر بری تھی تو آلِ عمر رضی اللہ عنہ کے لئے یہی کافی ہے کہ ان میں سے ایک فرد سے اُمتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھ گچھ کی جائے۔ فرمایا میں نے اپنی ذات کو بڑی تکلیف پہنچائی اور اپنے گھر والوں کو بالکل محروم رکھا اور اگر اس پر بھی بغیر کسی عذاب کے چھوٹ جاؤں تو خود کو بہت سعید اور خوش قسمت تصور کروں گا۔" اب اسی طرح ہم کو بھی یہی رویہ

اپنانا چاہئے۔

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلافت سنبھال لی تو حضرت علیؓ نے ان کو مشورہ دیا کہ اگر تم اپنے رفیق ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچنا چاہتے ہو تو اپنی قمیص میں پیوند لگایا کرو، تہبند اونچا رکھا کرو، اپنی جوتی خود گانٹھ لیا کرو، موزے کو جوڑ لگا لیا کرو، امیدوں کو کم کیا کرو، کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہ کھایا کرو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی پوری خلافت کے عہد میں اس مشورے پر عمل کرتے رہے۔ سخت لباس پہنتے، اپنی ٹانگوں پر کوڑے مارتے، اپنے سر کو خاک پر رکھتے وغیرہ۔

فقراء کے ہمنشین اللہ کے ہمنشین ہیں

ہر کہ خواہد ہمنشینی با خدا گو نشیند در حضورِ اولیاء (۲۰۹۔۲)

(جو خدا کی ہم نشینی چاہتا ہے، اس کو کہو کہ اولیاء کے پاس بیٹھے)

ایک حدیث شریف کا اس کتاب میں حوالہ دیا جا چکا ہے۔ جس میں اولیائے کرام کو "جُلَسَآءُ اللّٰهِ" (یعنی اللہ کے ہمنشین) کہا گیا ہے۔ صوفیائے کرام کا قول ہے کہ "وَمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّجْلِسَ مَعَ اللّٰهِ فَلْيَجْلِسْ مَعَ الْفُقَرَآءِ" (یعنی جو اللہ کی ہم نشینی چاہتا ہے تو اس کو چاہئے کہ فقراء کے پاس بیٹھے۔) اس کے بعد سالک میں وہ استعداد پیدا ہوتی ہے کہ براہ راست اللہ سے فیض حاصل کرتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے۔

مردانِ خدا، خدا نہ باشند لیکن از خدا جدا نہ باشند (×)

(اللہ والے اللہ تو نہیں ہیں، لیکن اللہ سے جدا بھی نہیں ہیں۔)

مومن کو اس دنیا میں اپنے نفس کے خلاف کام کرنے اور اپنی خواہشات کے خلاف اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم ہے۔ دنیا کو قید خانہ اسی لئے کہا گیا ہے کہ اس میں محنت اور مشقت کے بغیر کوئی چارہ نہیں اور قید خانے میں عیش و عشرت کو طلب کرنا عقل سے بعید ہے۔ جب دل میں جذبہ محبتِ شیخ پیدا ہو تو مال دنیا اور عیش و عشرت کو طلب کرنا عقل سے بعید ہے۔ بلکہ مال دنیا اور عیش و عشرت سے دوری ہو جاتی ہے۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ ایک صحابی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ مجھے موت سے ڈر لگتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا تیرے پاس کچھ مال ہے؟ عرض کیا جی ہاں مال تو میرے پاس بہت ہے۔ فرمایا سب خدا کی راہ میں دے دو۔ اس نے سب مال اللہ کی راہ میں دے دیا اگرچہ بیوی نے سخت احتجاج کیا۔ کچھ روز کے بعد جب وہ حضور اکرم ﷺ سے ملا تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا "کیا اب بھی موت سے ڈر لگتا ہے؟" کہا نہیں حضور اب تو مرنے کا شوق ہے۔ مشائخ کی صحبت میں محبتِ الٰہی کا درس ملتا ہے اور خود بخود دنیا سے دوری ہو جاتی ہے۔

فقراء کی مجلس میں بیٹھنے کی برکت یہ ہے کہ مرید کا قلب ذکر کی طرف راغب ہوتا ہے اور اس کے بتائے ہوئے اذکار اور مشاغل سے جب لطائف ستہ مکمل جائیں تو ان میں ذکر جاری ہو جاتا ہے۔ اسے سلطان الاذکار بھی کہتے ہیں اس حالت میں سالک کو لذت حاصل ہوتی ہے اور اس کا احساس تمام لطائف میں ہوتا ہے۔ (ایک الگ کتاب میں لطائف ستہ کا بیان ملاحظہ فرمائیں۔) محبوب حقیقی کی جمال آرائیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ شیخ کامل اپنی گفتگو کے دوران ایک خاص کیفیت میں ہوتے ہیں ان کی مجلس میں بیٹھنے والے سامعین پر بھی وہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ عبید اللہ احرار "فرماتے ہیں کہ ان فقراء کی صحبت نہایت ضروری تصور کی جاتی ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ

نماز راہِ حقیقت قضا بود لیکن نماز صحبتِ مارا قضا نہ خواہد شد(×)

(حقیقتاً ہماری نماز تو قضا ہوگئی، لیکن ہماری صحبت کی نماز قضا نہیں ہوگی۔)

حضرت ابوعلی دقاق "(م ۳۹۵ھ) کے پاس ایک فقیر آیا جس نے ٹاٹ کا کرتہ اور ٹاٹ کی ٹوپی پہن رکھی تھی، ان کے شاگردوں میں سے کسی نے تفریح کے طور پر کہا کہ یہ ٹاٹ کتنے میں خریدا ہے؟ تو اس فقیر نے جواب دیا میں نے یہ ٹاٹ دنیا دے کر خریدا ہے اور بیچنے والے نے مجھ سے کہا کہ اسے میرے پاس بیچ دو اور آخرت لے لو مگر میں نے نہیں بیچا۔

ایک حدیث شریف میں ہے کہ "كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَكُوْنَ كُفْرًا" (کنوز الحقائق ص: ۹۳) (محتاجی قریب ہے کہ کفر بن جائے۔) ابوعلی دقاق "فرماتے ہیں کہ کسی چیز کی ضد اس کی فضیلت اور قدر کے مطابق ہوتی ہے۔ مثلاً ایمان اشرف ترین خصلت ہے اس لئے اس کی ضد کفر ہے، لہٰذا فقر پر کفر کا خطرہ جب منڈلایا تو معلوم ہوا کہ فقر اشرف ترین خصلت ہے۔

باب ۲۹

فقر اور علائقِ مال وزر

نقشبندی سلسلے میں سب سے پہلا قدم فنا کے مقام پر رکھا جاتا ہے اور فنا سے مراد علائق دنیا سے دل کی وابستگی کو ختم کر کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ رشتہ قائم کرنا ہے۔ اس ترک علائق میں مشاغل دنیا کو یکسر ختم نہیں کیا جاتا بلکہ دنیا کے مختلف معاملات کو اپنے محل کے مطابق اہمیت دی جاتی ہے۔ ایسے بھی بندگان الٰہی دیکھے جاتے ہیں جو عین دنیا کے تعلقات کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی دنیا سے لاتعلق ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے کسی چیز کا ہونا یا نہ ہونا بے معنی ہو جاتا ہے۔ حضرت بہاؤالدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے منیٰ کے بازار میں ایک تاجر کو دیکھا جو کم وبیش پچاس ہزار دینار کی خرید وفروخت کر رہا تھا مگر اس کا دل ایک لحظہ کے لئے بھی یاد الٰہی سے غافل نہ تھا۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قول کو مکتوبات شریف کے دفتر اوّل حصہ اوّل مکتوب نمبر ۳۳۰ میں شامل کیا ہے اور فرماتے ہیں کہ اہل اللہ نے دنیا کی برائی اور قباحت کا مشاہدہ کر لیا ہے اور انہوں نے آخرت کو بقا کی نظر سے دیکھا ہے اور دنیا کو فنا کے داغ سے داغدار پایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو باقی رہنے والی (آخرت) کے حوالے کر دیا ہے اور دنیا سے الگ ہو گئے ہیں (اسی کو ترک علائق کہا جاتا ہے) اور اسی میں آخرت کی عظمت کا مشاہدہ خدائے لایزال کی عظمت کے مشاہدے کا ثمرہ اور نتیجہ ہے۔ فرماتے ہیں کہ دنیا و مافیہا کو ذلیل وخوار جاننا آخرت کی عظمت کے مشاہدے کے لوازمات میں سے ہے۔ آپ نے حدیث شریف نقل کی ہے "اَلدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةُ ضَرَّتَانِ اِنْ رَضِیَتْ اِحْدٰاهُمَا سَخِطَتِ الْاُخْرٰی" (دنیا اور آخرت دو سوکنیں ہیں۔ اگر ایک کو راضی کرو گے تو دوسری ناراض ہو جائے گی۔)

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "مَا اَحْسَنَ الدِّیْنُ وَالدُّنْیَا لَوِاجْتَمَعَا" (کیا ہی اچھا ہوتا اگر دین و دنیا دونوں جمع ہو جاتے) یعنی دنیا و دین کو اپنے اپنے مقام پر رکھا جاتا۔ آپ فرماتے ہیں کہ مشائخ کرام میں سے ایک گروہ اپنے آپ اور اپنے ارادے سے پوری طرح باہر آ چکا ہے۔ بعض حقانی وجوں کے باعث اہل دنیا کی صورت اختیار کر رکھی ہے اور بظاہر دنیا کی طرف راغب نظر آتے ہیں لیکن فی الحقیقت انہیں دنیا سے کوئی تعلق نہیں اور سب سے فارغ اور آزاد ہیں جیسا کہ قرآن میں آیا ہے:-

رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (النور: ۳۷)

ایسے مردانِ حق ہیں جنہیں سوداگری اور خرید و فروخت اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔

تجارت اور بیع وشرا وغیرہ ان کے لئے ذکرِ حق سے مانع نہیں ہوتیں، امورِ دنیا کے ساتھ عین تعلق کے اندر بھی دنیا سے بے تعلق ہیں۔ اسی مکتوب شریف میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے علماء سوء کی مذمت بیان فرمائی ہے اور فرمایا ہے کہ علماء سوء وہ علماء ہیں جو محبت دنیا میں گرفتار ہیں اور انہوں نے علم کو حصول دنیا کا ذریعہ بنا رکھا ہے اور آپ نے ان زاہد علماء کی مدح اور ثناء بیان فرمائی ہے جو دنیا سے بے رغبت ہو چکے ہیں۔

انسان کی دنیا میں آلودگی کی مذمت دنیائے دنی کے عنوان سے راقم الحروف کی تصنیف ''تہذیبِ نفس'' میں بیان کردی گئی ہے۔ دنیا کی آلودگی سے بچنے کے لئے اس کتاب میں لکھا گیا ہے کہ دنیا کا جادو ہاروت اور ماروت کے جادو سے بھی سخت ہے دنیا کو خدا نہ سمجھ بیٹھو ورنہ وہ تمہیں اپنا بنا لے گی۔ دنیا آرائش اور ابتلاء (آزمائش) کا مقام ہے اس کے ظاہر کو مختلف ملمع سازیوں اور زینتوں سے آراستہ کیا گیا ہے، اس کی صورت کو موہوم خدو خال اور زلف ورخسار سے خوبصورت کیا گیا ہے، اسے دیکھنے میں شیرینی، طراوت اور تازگی کا خیال آتا ہے لیکن حقیقت میں یہ عطر لگا ہوا مردار، مکھیوں اور کیڑوں سے بھرا ہوا نجاست خانہ اور زہر سے لبریز شکر ہے۔ اس کا باطن سراسر خراب اور ابتر ہے اس کے معاملے کی گندگی جتنا تم خیال کر سکتے ہو اس سے بھی ابتر ہے اس پر فریفتہ، دیوانہ اور مسحور ہے اس کا گرفتار مجنون اور فریب خوردہ ہے جو اس کے ظاہر پر فریفتہ ہو گیا تو وہ نقصان ابدی کے ساتھ داغدار ہو گیا۔ جس نے اس کی حلاوت کے اوپر نظر کی اسے دائمی ندامت اور شرمندگی حصہ میں آئی۔ جس نے دنیا کو راضی کیا تو اس کی آخرت ناراض ہوگئی اور جس نے آخرت کو راضی کر لیا اس سے دنیا روٹھ جاتی ہے۔

اہل اللہ نے جب دنیا کے خصائص اور خبائث کی طرف نگاہ کی تو انہوں نے اپنے دلوں کو دنیا کی طرف سے ہٹا کر اللہ کی طرف پھیر لیا۔ یاد رہے کہ اگرچہ دنیا کے آرام اور آسائشوں کا شمار مباحات میں ہوتا ہے (جن کے کرنے سے نہ تو گناہ ہوتا ہے اور نہ ثواب) لیکن سالکانِ راہِ طریقت کو اس حقیقت کا علم ہے کہ درجات کی بلندی مباحات کے ترک میں ہی رکھی گئی ہے اگرچہ اعلیٰ بستروں اور لباسوں کا استعمال کرنا ناجائز نہیں لیکن روحانی درجات کی بلندی کے لئے ایسی آسائشوں کو خیر باد کہنا ضروری ہے دنیا کے جائز سہولتوں کو ترک کرنا دل گردے کا کام ہے۔ ترک مباحات کا روحانی درجات سے تعلق اس کتاب میں اپنی جگہ پر بیان کر دیا گیا ہے۔

اللہ کا قانون ہے کہ جو جس چیز سے آرام پکڑتا ہے اللہ تعالیٰ اس چیز کو اس کے لئے بلا گردانتا ہے تا کہ انسان اپنی پسندیدہ چیز کو ترک کر کے اللہ کے دروازے کا ہو کر رہ جائے، چنانچہ آدم علیہ السلام نے جنت میں قرار پکڑا تو انہیں دنیا میں بھیج دیا گیا جہاں ان کے لئے سوائے اللہ کی یاد کے اور کوئی شغل نہ رہے اور کہا کہ یہاں

اس دنیا میں آرام سے نہ بیٹھنا اور نہ ہی کسی شئے کے ساتھ قرار حاصل کرنا۔

خیال فرمائیں کہ آدم علیہ السلام نے صرف جنت کے ایک درخت کے پھل کو چکھا جس کے لئے حکم تھا کہ اس درخت کے قریب نہ جانا۔ آپ نے درخت کا پھل اس لئے کھالیا کہ اس کو حرام یا مکروہ نہیں فرمایا گیا تھا اور ان کا یہ عمل قابل مواخذہ یا عذاب بھی نہ تھا لیکن پھر بھی اتنے بڑے پیغمبر کے لئے یہی کہا جاسکتا ہے کہ آپ کا اس درخت سے قرار پکڑنا اللہ کے نزدیک درست نہ تھا کیونکہ مقربین الٰہی ہوتے ہوئے آپ سے یہی توقع تھی جیسا کہ فرمایا "حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّاٰتُ الْمُقَرَّبِیْنَ" (نیک لوگوں کی نیکیاں مقربین بارگاہ الٰہی کے لئے برائیوں میں شمار کی جاتی ہیں۔) چنانچہ خواص کے لئے ترکِ اولیٰ پر بھی مواخذہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ مولانا رومؒ نے فرمایا۔

بود آدم دیدۂ نورِ قدیم　موئے در دیدہ بود کوہِ عظیم (۱۶۔۲)

(آدم علیہ السلام نورِ قدیم (اللہ) کی آنکھ تھے اور آنکھ میں اگر ایک بال بھی پڑ جائے تو پہاڑ لگتا ہے۔)

آدم علیہ السلام کی اس ذراسی بات کے متعلق ابن عربی لکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی کا عیش و آرام (جو جنت میں ان کو میسر تھا) خاک میں ملا دیا، راحت اور آرام کی جگہ مشقت اور محنت مقدر میں لکھ دی گئی۔ آدم علیہ السلام کے اس قصے سے خدا نے بنی آدم کو یہ سبق دیا کہ جب تم میرے بندے ہو تو تمہیں کسی سے سکون حاصل کرنا مناسب نہیں (بلکہ عاشقوں کے لئے تو یہ سکون حرام ہے) کیونکہ ان کو تو اللہ کے ذکر اور محبت سے ہی سکون ملتا ہے۔ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (یاد رکھو کہ صرف اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو سکون ملتا ہے۔) (الرعد:۲۸)

مولانا رومؒ نے اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے مجنوں کی ایک کیفیت کو نظم کیا ہے جن کو ہفت مسئلہ میں نقل کیا ہے۔

دید مجنوں را یکے صحرا نورد　در بیابانِ غمش بنشستہ فرد

(مجنوں کو کسی صحرا نورد نے دیکھا کہ بیاباں میں کسی کے غم میں تن تنہا بیٹھا ہوا ہے۔)

ریگ کاغذ بود و انگشتاں قلم　می نمودے بہر کس نامہ رقم

(ریت کو کاغذ اور انگلیوں کو قلم بنائے ہوئے تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی کو خط لکھ رہا ہے۔)

گفت اے مجنونِ شیدا چیست ایں؟　می نویسی نامہ بہر کیست ایں؟

(پوچھا اے عاشق زار مجنوں یہ کیا ہے؟ یہ خط کس کو لکھ رہا ہے؟)

گفت مشقِ نام لیلیٰ می کنم　خاطرِ خود را تسلی می دہم

(کہا کہ میں لیلیٰ کے نام کی مشق کر رہا ہوں، اس طرح اپنے دل کو تسلی دے رہا ہوں۔)

اس مثال سے مولاناؒ نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ اللہ کے عاشقوں کو خدا کی یاد کے سوا کسی شئے سے سکون نہیں ملتا۔ اللہ تعالیٰ کی اس سنت کی اور بھی سینکڑوں مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام سے قرار پکڑا تو فراق آیا اور یوسف علیہ السلام کو ایک طویل مدت کے لئے ان کی آنکھوں سے اوجھل کر دیا، چنانچہ ان کے فراق میں سوائے گریہ وزاری اور اللہ کی یاد کے اور کچھ نہ کرتے تھے۔ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ نے جب حکومت چھوڑی تو ایک بچہ بھی چھوڑا۔ یہ بچہ جس وقت جوان ہوا تو حضرت کی تلاش میں آیا۔ آپ سے ملاقات ہوئی تو اسے گلے سے لگایا فوراً ارشاد ربانی ہوا کہ دعویٰ محبت ہم سے کرتے ہو اور دوستی غیروں سے کرتے ہو۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ الٰہی میری مدد فرما اس کی جان لے یا میری جان لے لے، چنانچہ بیٹا زمین پر گرا اور روح قفسِ عنصری سے نکل گئی۔ اسی طرح فرشتوں نے خلافت حاصل کرنی چاہی اور کہا کہ

اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا کیا تو مقرر کرتا ہے زمین میں (ایسا خلیفہ) جو فساد برپا کرے گا اس میں۔ (البقرۃ: ۳۰)

تو اللہ تعالیٰ نے ان کو خلافت سے محروم کر دیا۔ شیطان نے خود کو پسند کیا اور آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تو اس کو جنت ہی نہیں بلکہ ایمان سے بھی خارج کر دیا۔

درج بالا واقعات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے غلاموں کے دلوں کو صرف اپنی ہی طرف متوجہ رکھنا چاہتے ہیں اور جہاں کسی نے غیر اللہ کی طرف قرار پکڑا تو اس کو دنیا میں ذلیل وخوار کر دیا۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو بھی یہی حکم دیا ہے کہ جو میری طرف آئے اے دُنیا! تو اس کی منزل بن جا اور جو تیری طلب میں رہے تو اس کو تھکا دے۔ یہ مصائب اور شدائد محض اس لئے دیئے گئے ہیں کہ شاید انسان اللہ کی طرف رجوع کرے اور اپنے دل کو اس کی طرف پھیر دے۔ (طبقات الکبریٰ ص ۵۰ کا یہ مضمون ہماری تصانیف "اقامۃ الصلوٰۃ" اور "شاہین کا جہاں اور" میں بھی شامل کر دیا گیا ہے۔)

آخرت کے لئے دل اسی وقت خالی ہوتا ہے جب دنیا کی محبت سے خالی ہو

طبقات میں سہل بن عبداللہؒ سے منقول ہے کہ سنت کی پیروی اور مردم آزاری کے لحاظ سے زندگی چار قسم پر ہے۔

(۱) فرشتوں کی زندگی جو اطاعت میں ہے۔

(۲) نبیوں کی زندگی علم وحی کے انتظار میں ہے۔

(۳) صدیقوں کی زندگی اقتداء میں ہے۔

(۴) باقی سب لوگوں کی زندگی خواہ عالم ہو یا جاہل، زاہد ہو یا عابد کھانے پینے میں ہے۔

چنانچہ نبی کو صرف ضرورتِ علم و وحی پیشِ نظر رہتی ہے۔ صدیقوں کو قوام اور مومنین کو قوت اور چوپایوں (چوپایہ کی جمع) کے لئے راتب پیشِ نظر ہوتا ہے۔

جنیدؒ جو اس راہ کے شہنشاہ ہیں، فرماتے ہیں کہ دل اسی وقت علم آخرت کے لئے خالی ہوتے ہیں جب دنیا کی محبت سے انہیں خالی کیا جائے اس لئے ابتداء سے ہی دنیا کو دل سے نکالنے پر نگاہ رکھنی چاہیے ورنہ یہ تم کو آگے نہ بڑھنے دے گی اور ترقی کرنے سے روکے گی۔ جب تک تم اس حالت میں رہو گے تو تمہارا پیر تمہیں ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکے گا۔ حضرت جنیدؒ نے یہ بھی فرمایا کہ اخلاص اسی وقت پیدا ہو گا جب چار باتوں کا خوف دل میں نہ ہو (۱) بھوکا رہنے کا (۲) ننگا رہنے کا (۳) درویشی کا (۴) خواری اور رسوائی کا۔

ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ جس نے زندگی میں زہد اختیار کیا اس کی دو رکعت نماز سارے مجتہدوں کی عمر بھر کی عبادت سے بہتر ہے۔ لیکن اب وہ زمانہ ہے کہ۔

مُلا کی نظر نورِ فراست سے ہے خالی بے سوز ہے میخانۂ صوفی کی مئے ناب
اے وادیٔ لولاب

بیدار ہوں دل جس کی فغانِ سحری سے اُس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب
اے وادیٔ لولاب (ا۔ح:۶۷۶)

یہاں پر سوائے اللہ والوں کے اور خواجگان کے تمام افراد اسی رنگ میں ہیں تو پھر کہاں سے نکلے صدائے "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ"۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بادشاہ نے جنگل میں ایک صحت مند غریب الحال نوجوان کو دیکھا جو ہنستا گاتا جا رہا ہے۔ بادشاہ نے پوچھا تم کون ہو؟ کہا میں نہ کسی کا حاسد نہ محسود اور باوجود اپنی ناداری اور مفلسی کے کسی پر حسد نہیں کرتا اور نہ ہی مجھ پر کوئی رشک کرتا ہے۔ بادشاہ نے کہا تو نے غلط کہا ہے۔ تیرا سب سے بڑا حاسد میں ہوں۔ تو مطلب یہ ہوا کہ دنیا سے انسان کسی صورت خوش نہیں البتہ اگر اللہ کا اور اس کے رسول اللہ ﷺ کا حکم مانا جائے تو جب ہی اس کے دل کو سکون مل سکتا ہے۔

نہیں کوئی بلا دنیا سے بدتر نہ چین آئے اسے پا کر نہ کھو کر (x)

فقر بمقابلہ تونگری

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ دنیا کے مال کی طرف نہ دیکھا کرو کہ اس کی جھلک کہیں ایمان کی حلاوت اور لذت تم سے چھین نہ لے۔ دین اور دنیا کی حلاوتیں ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ دنیا کی حلاوت دین کی حلاوت کو ضائع کر دیتی ہے۔ دنیا سے دل لگانا دین سے دور کر دے گا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا۔

اَلدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃُ ضَرَّتَانِ اِنْ رَضِیْتَ یعنی دنیا اور آخرت دو سوکنیں ہیں ایک کو راضی

اِحْدٰھُمَا سَخِطَتِ الْاُخْرٰی کروگے تو دوسری ناراض ہو جائے گی۔

(شرح تعرف ج ۲ ص ۱۱۱)

ابو سلیمان دارانیؒ فرماتے ہیں کہ کسی فقیر کا کسی شے کی آرزو میں آہ سرد بھرنا جس سے وہ عاجز ہے، ایک تونگر کی ہزار سالہ عبادت سے افضل ہے۔ منقول ہے کہ کسی نے بشر حافیؒ سے دُعا کی درخواست کی اور کہا "میرے حق میں دعا فرمائیے کیونکہ میں عیال دار ہوں اور مفلس و نادار ہوں۔" فرمایا "اے شخص! جب تیرے بیوی بچے تجھے کہیں کہ روٹی نہیں ہے اور گھر میں آٹا بھی نہیں ہے اور تو آٹا فراہم کرنے کے لئے خود کو عاجز پائے اور شدت غم سے بیچارگی کے بادل تیرے دل پر چھا جائیں تو اللہ سے اس وقت میرے حق میں دُعا کرنا کہ اس وقت تیری دُعا میری دُعا سے بدرجہا بہتر اور افضل ہوگی۔"

مال کا بقدر کفایت ہونا مبارک ہے

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ خوش بخت ہے وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے راہ اسلام دکھائی اور مال بقدر کفایت عنایت فرمایا اور اس نے اس پر قناعت کی۔ آپ ﷺ صحابہ کرامؓ کو وصیت فرماتے کہ جتنے مال کا حق ادا ہو سکے اتنا ہی مال بہتر ہے تاکہ فقر کا ثواب تم کو مل سکے ورنہ اس سے محروم رہو گے۔ درویش قیامت کے دن حق تعالیٰ کے قریب ترین ہوں گے۔ قیامت کے دن ہر شخص یہ خواہش کرے گا کہ کاش دنیا میں اسے بقدر کفایت سے زائد کچھ ملا ہی نہ ہوتا۔ حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن امیر لوگ اپنا منہ چھپاتے پھریں گے جس طرح دنیا میں بعض غریب چھپاتے ہیں۔ قیامت کے روز دنیا کی ایک دن کی امیری بھی باعثِ ندامت ہوگی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام پر وحی ہوئی کہ مجھے تلاش کرنا چاہتے ہو تو شکستہ دلوں کے پاس تلاش کرو عرض کیا وہ کون ہیں۔ فرمایا وہ درویش جو صابر اور قانع ہیں۔

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہاں ہیں وہ میرے بندے جو ساری خلق سے برگزیدہ ہیں؟ فرشتے پوچھیں گے اے ہمارے رب وہ کون ہیں؟ ارشاد ہوگا وہ مسلمان درویش جو میری عطا پر ہمیشہ راضی رہے۔ جاؤ ان کو اس وقت بہشت میں پہنچا دو جب کہ دوسروں کا حساب ابھی ہو رہا ہوگا۔

پرہیزگاری، امیدوں کو کوتاہ کرنے کا نام ہے نہ کہ مال و زر سے یکسر خالی ہونا

حضرت سفیان ثوریؒ کہا کرتے تھے کہ اگر میں دس ہزار دینار چھوڑ کر مر جاؤں جس کا حساب مجھے دینا پڑے تو میرے نزدیک لوگوں کی محتاجی سے یہ بہتر ہے۔ اگلے زمانوں میں مال مکروہ سمجھا جاتا تھا مگر آج تو یہ مومن کے لئے سپر (ڈھال) ہے جو اس کو بادشاہوں اور مالداروں کی دست نگری سے محفوظ رکھتا ہے۔ محتاج لوگوں کے لئے اپنا مال خرچ کرنے کے بغیر چارہ نہیں ہوتا اس لئے اپنے قبضہ میں مال رکھنا چاہیے۔ سفیان

ثوریؒ کی طرف سے یہ نصیحت تھی کہ جو شخص تم پر فوقیت جتلائے اس کے ساتھ سفر نہ کرو کیونکہ اگر تم نے خرچ میں برابری کی تو تم کو نقصان پہنچا اور اگر تم نے اس کا احسان اٹھایا تو اس نے تم کو غلام بنا لیا۔ فرماتے تھے کہ دنیا میں پرہیزگاری کا مطلب امیدوں کو کم کرنے کا نام ہے نہ کہ چھوٹی موٹی غذا، کھردرا کپڑا پہننے اور کمبل اوڑھنے کا۔ جب عالم کو بادشاہ کے دروازے پر پناہ لیتے دیکھو تو سمجھ لو یہ ریاکار ہے۔

حضرت سفیان ثوریؒ کے متعلق ہی روایت ہے کہ آپ نے ایک عالم شخص کو دیکھا کہ وہ حاکموں کی خدمت میں رہتا ہے۔ آپ نے اس عالم سے فرمایا کہ تم حاکموں کے دروازے پر چکر کیوں لگاتے ہو؟ اس نے کہا کہ جناب کیا کریں بال بچے دار ہیں ایسا کرنا ہی پڑتا ہے۔ حضرت سفیان ثوریؒ نے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا ''دیکھو اس شخص کو یہ کہتا ہے کہ اگر خدا کا حکم مانوں گا تو اس کے بچے بھوکے مر جائیں گے۔'' آپؒ کا فرمان ہے کہ عورتوں کی کثرت دنیا داری نہیں ہے کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ صحابیوں میں بڑے زاہد تھے۔ ان کی چار بیویاں اور ۱۹ لونڈیاں تھیں۔ حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ مجھے کسی شخص کا دنیا دوست ہونے کا علم اس طرح معلوم ہو جاتا تھا کہ ایسا شخص اہل دنیا کی طرف مائل رہتا تھا اور ان کو سلام کہلا بھیجتا تھا۔ آپ سے پوچھا گیا کہ آپ بادشاہوں اور حاکموں کے پاس کیوں نہیں جایا کرتے تاکہ آپ ان کو نصیحت کریں۔ فرمایا کہ تم مجھ سے یہ فرمائش کرتے ہو کہ دریا میں تیروں اور میرے پاؤں بھی نہ بھیگیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ میری آؤ بھگت کریں گے اور میں ان کی طرف جھک جاؤں گا۔ بس میرا عمل ہوا ہو جائے گا۔

امیروں کو اولیاء کے ساتھ خوش اسلوبی سے باز رکھا گیا ہے

ایک بزرگ سے پوچھا گیا کہ کیا وجہ ہے کہ امیروں کو اس طائفہ کے ساتھ نیکی کرنے سے روکا گیا ہے؟

فرمایا کہ اس کی تین وجوہات ہیں۔

(۱) پہلی یہ کہ تونگر جو کچھ رکھتے ہیں ناپاک ہے اور یہ طائفہ اللہ کے خواص ہیں اور خواص کے ساتھ جو نیکی کرے اس کو اللہ تعالیٰ قبول کرتے ہیں لیکن (چونکہ) اللہ تعالیٰ پاک مال کو پسند کرتا ہے اس لیے وہ ان کا ناپاک مال ان پر خرچ کرنے کو پسند نہیں فرماتا جس طرح صدقہ محمد ﷺ پر اور ان کی اولاد پر حلال نہیں ہے تاکہ وہ پلیدی سے محفوظ رہیں (کیونکہ صدقہ عاصیوں کے گناہ کو پاک کرتا ہے۔) اولیائے کرام کو تو اللہ تعالیٰ حلال سے بچانا چاہتا ہے تو پھر حرام سے کیوں نہ بچائے گا۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ اولیاء کے ساتھ جو نیکی کرتا ہے تو اس کا ثواب اور برکت پاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ تونگروں کو ثواب اور برکت کا اہل نہیں سمجھتا۔ جن کے اموال میں حرام کی آمیزش ہو۔

(۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی مراد بلاء ہے اور وہ اولیاء کو بلاؤں میں ہی رکھنا چاہتا ہے تاکہ وہ ہمیشہ [illegible]

میں مبتلا رہ کر عظیم اجر کے مستحق بنیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ چونکہ عطا کرنے والے کا احسان ہوتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ اولیاء سے تونگروں کے احسان کو روکنا چاہتا ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ امیروں کی عطاء پر اولیاء کو اعتماد نہ ہو جائے جو ایک طبعی امر ہے اور حق تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ اولیائے کرام سوائے حق سبحانہ کے اور کسی پر اعتماد نہ کریں اور امیروں سے دوستی کرنا نہ شروع کر دیں کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ''دلوں کو جو اچھا لگتا ہے اس سے محبت کا ہونا اور جو برا لگتا ہے اس سے بغض کا ہونا جبلت ہے'' مگر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اولیاء کا دل خدا کی محبت کے سوا کسی اور میں مشغول نہ ہو۔

ابن فارسؒ کا قول ہے کہ انہوں نے ایک درویش سے پوچھا کہ تم بھوک میں سوال کیوں نہیں کرتے تو اس نے کہا کہ ایک حدیث کی وجہ سے ڈرتا ہوں کہ اگر کوئی میرے سوال کو رد کر دے تو وہ گناہ گار ہو جائے گا۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے ''لَوْ صَدَقَ السَّائِلُ مَا اَفْلَحَ مَنْ رَدَّهٗ'' (اگر سائل سچ کہتا ہے تو جس نے اس کو عطا نہ کیا تو وہ ہلاک ہو گیا۔)

دُرویش مالِ دنیا سے دور رہتا ہے

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو درویش عیال دار اور پارسا ہو، اللہ تعالیٰ اسے دوست رکھتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے بلال! کوشش کر کہ دنیا سے رخصت کے وقت تو درویش ہو، مالدار نہ ہو۔ منقول ہے کہ حضرت بشر حافیؒ کے پاس فوت ہونے سے کچھ دیر پہلے جب کہ آپ غسل خانے میں تھے ایک فقیر آیا۔ آپ نے اسے اپنا کرتہ عطا فرما دیا اور جب آپ چارپائی پر لیٹ گئے تو ایک درویش نے صدا کی تو آپ نے اپنا تہبند بھی اُتار کر دے دیا اور اس کے فوراً بعد ہی آپ کا دم نکل گیا، گویا آپ نے اس حالت میں انتقال فرمایا جس طرح تن تنہا بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد لوگوں نے آپ کے جسم کو ایک کپڑے سے ڈھانپ دیا۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میری اُمت کے افضل ترین لوگ وہی ہیں جو فقیر ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب بندوں کو دوست رکھتا ہے تو آفتوں میں مبتلا کر دیتا ہے اور دوستی کی انتہا امتناع میں مبتلا کر دیتا ہے۔ (نہ مال نہ اہل وعیال چھوڑتا ہے) ایک بار حضور اکرم ﷺ کو جبرائیل علیہ السلام نے آ کر کہا کہ اللہ تعالیٰ سلام فرماتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اگر آپ چاہیں تو زمین کے تمام پہاڑوں کو سونا کر دیا جائے اور پھر جہاں آپ چاہیں حاضر ہو جایا کریں آپ ﷺ نے فرمایا نہیں جبرئیلؑ مجھے یہ درکار نہیں کیونکہ دنیا بے گھروں کا گھر ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جس کی طرف جتنا زیادہ التفات کرتا ہے اسے اتنا ہی زیادہ دنیا سے دور رکھتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے معراج کے دوران دیکھا کہ دوزخیوں میں سے اکثر و بیشتر وہ لوگ ہیں جو دنیا میں مالدار تھے اور جنت میں دیکھا تو زیادہ تر وہی لوگ تھے جو کہ درویش اور محتاج تھے۔ عورتیں جنت

میں بہت کم نظر آئیں۔ میں نے پوچھا عورتیں کہاں ہیں تو مجھے بتایا گیا کہ زیور اور رنگین کپڑوں نے انہیں گرفتار کر رکھا ہے۔

ایک پیغمبر علیہ السلام دریا کے کنارے سے گزرے تو دیکھا کہ ایک ماہی گیر نے خدا کا نام لے کر جال ڈالا تو ایک بھی مچھلی اس میں نہ آئی اور ایک نے شیطان کا نام لے کر جال ڈالا تو مچھلیوں سے بھرا ہوا نکلا۔ پیغمبر علیہ السلام نے عرض کیا اے باری تعالیٰ! میں جانتا ہوں کہ یہ سب کچھ تیری طرف سے ہے لیکن اس کا سبب کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ اس پیغمبر کو ان دونوں ماہی گیروں کے بہشت اور دوزخ میں مقام دکھا دو۔ جب ان کے مقامات دیکھے تو پیغمبر علیہ السلام نے کہا بارِ خدایا میں راضی ہوا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اپنی تونگری کی وجہ سے جو پیغمبر سب سے آخر میں بہشت میں داخل ہوں گے وہ سلیمان بن داؤد علیہ السلام ہوں گے اور میرے صحابہ میں سے عبدالرحمٰن بن عوفؓ۔

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ درویش سے معذرت فرمائے گا

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن درویش کو خدا کے سامنے لایا جائے گا تو خدا ان سے ایسے معذرت کرے گا جیسے بندے ایک دوسرے سے کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کہے گا کہ دنیا میں جو تجھے تنگی دی تھی وہ اس لئے تھی کہ میں آخرت میں تجھے اپنی بارگاہ میں خلعت اور بزرگی سے نوازنا چاہتا تھا۔ اب تمہیں اجازت ہے کہ لوگوں کی صفوں میں گھس جاؤ اور جنہوں نے تیری مدد کی تھی ان کا ہاتھ پکڑ لو کیونکہ میں نے ان کا معاملہ تمہارے سپرد کر دیا ہے۔ قیامت کے روز ستر ہزار لوگ بے حساب جنت میں جائیں گے اور ان میں سے ہر ایک شخص ستر ہزار ایسے لوگوں کو بخشوائے گا جن پر جہنم واجب ہوگی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ لوگ مال جمع کرنے، دنیا سمیٹنے اور تعمیرِ عمارات میں مشغول ہوں گے اور درویشوں سے دشمنی روا رکھیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو چار قسم کی آفات میں مبتلا کر دے گا۔

(۱) زمانے بھر میں قحط ڈال دے گا (۲) ظالم اور جابر سلطان ان پر مقرر کر دے گا (۳) بددیانت حاکموں سے ان پر ظلم کروائے گا (۴) ان کے دشمنوں اور کافروں کو ان کے سامنے شان و شوکت عطا کرے گا۔

جو دنیا کو ہی سب کچھ سمجھتا ہو

حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ جس شخص کا مقصد دنیا بن جائے (یعنی دنیا ہی اس کا اصل مقصود بن جائے اور دین کو ثانوی اہمیت دے) تو اللہ تعالیٰ اس کے دل پر تین چیزیں مسلط کر دیتا ہے۔

(۱) ایک ایسا غم جو کبھی ختم نہ ہو (۲) ایسا مشغلہ جس سے فراغت نصیب نہ ہو (۳) ایسا فکر جس کا کبھی ...

نہ ہو۔

ایک اور حدیث شریف میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری اُمت پر کبھی زوال نہیں آئے گا جب تک دو چیزیں ان میں پیدا نہ ہوں۔(۱) دنیا کی محبت اور (۲) موت کا ڈر۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ جو دنیا کو حقیر سمجھے (دنیا میں اس کا ہاتھ تو ہو لیکن دل نہ ہو) تو میں اس کو عزیز جانتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی طرف وحی نازل فرمائی کہ جو تیری خدمت نہ کرے تو اس کی خدمت کر جو تیری خدمت کرے تو اس کو تھکا دے۔ صوفیائے کرام کا قول ہے کہ بندہ اگر اپنی روزی سے بھاگ کھڑا ہو تو روزی اس کو اس طرح تلاش کرے گی جس طرح مرنے والے کو موت تلاش کر لیتی ہے۔

علماء کا قول ہے کہ مال اس لئے کماؤ کہ عبادت کے لئے فراغت ہو سکے۔ اس نیت سے کمانے کے لئے معیشت کا اجر بھی ملتا ہے۔ اگر کچھ جمع کریں، اس فراغت کو برقرار رکھنے کے لئے ہو، خرچ کریں تو وہ زہد اور تقویٰ کے لئے ہو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مال خواہ کتنا ہی کیوں نہ ہو اگر حق تعالیٰ کے لئے خرچ کرے تو امیر ہونے کے باوجود زاہد ہے اور اگر تمام مال ترک کر دے مگر اس کا یہ ترک اللہ کے لئے نہ ہو تو زاہد نہیں کہلائے گا۔ مال سے دور رہنا اس لئے ضروری ہے کہ تکبر، غرور اور غفلت پیدا نہ ہو اگرچہ تب بھی مال کے جمع ہونے پر آخرت کے درجوں میں کمی ہو کر رہے گی۔ البتہ اس سوال کا جواب ضرور دینا ہو گا کہ مال کہاں سے آیا اور کہاں خرچ ہوا؟

درویشی کے آداب

افضل ترین ادب یہ ہے کہ باطن میں راضی برضائے الٰہی رہے اور ظاہر میں گلہ شکوہ نہ کرے کیونکہ جو شخص اللہ سے راضی ہوتا ہے تو اللہ بھی اس سے راضی رہتا ہے۔ اگر کوئی یہ معلوم کرنا چاہے کہ خدا اس سے راضی ہے یا نہیں تو وہ یہ دیکھ لے کہ وہ خود خدا سے راضی ہے کہ نہیں اگر وہ خدا سے راضی ہے تو خدا بھی اس سے راضی ہو گا۔

دُرویش تین طرح کے ہوتے ہیں۔

(۱) دُرویشی سے شاد و خرم اور شاکر ہو اور اس حقیقت سے آشنا ہو کہ دُرویشی اللہ تعالیٰ کی سچی عنایت ہے جو کہ اس کے دوستوں کے ساتھ مخصوص ہے۔

(۲) سالک کو چاہیے کہ وہ اگر فقر سے خوش نہ ہو تو فکر سے بھی ناخوش نہ ہو۔ فکر سے کراہت نہ کرنا بھی بڑی بات ہے۔

(۳) دُرویشی اور فقر کی وجہ سے اللہ سے ناراض نہ ہو کیونکہ یہ حرام ہے اور وہ فکر کے ساتھ ثواب کو زائل کر دیتا ہے۔ کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ گلہ کرے، اگر کوئی گلہ کرے تو ایسی دُرویشی غضب الٰہی کا سبب بن جاتی ہے۔

اس کی علامت یہ ہے کہ قضائے الٰہی پر چلاتا ہے اور برہمی کا اظہار کرتا ہے۔

ڈرویشوں کی علامت یہ ہے کہ امیروں سے میل جول نہیں رکھتے۔ امیروں کے آگے عاجزی نہیں کرتے اور نہ ہی امیروں کی خوشامد کرتے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر کسی کے پاس مال کم ہو تو ایسے شخص کا دیا ہوا ایک درہم ایک لاکھ کے برابر ہو جاتا ہے اور یہ ایسے مردِ غنی کے ایک لاکھ سے بھی بہتر ہے جس کے پاس لاکھوں کروڑوں درہم ہوں۔

راقم الحروف کا نعتیہ کلام نیچے دیا جارہا ہے جس کا مطالعہ فائدے سے خالی نہیں ہے۔

ہم عاشق ہیں محمد ﷺ کے ہمارا کام ڈرویشی

نہ حسرت مال وزر کی ہے نہ خطرہ کم وبیشی　ہم عاشق ہیں محمد ﷺ کے ہمارا کام ڈرویشی

کوئی نسبت کسی کے کام نہ آئے گی محشر میں　محمد ہی کے عاشق کے لیے ہے نسبتِ خویشی

خزانے اہل دنیا کے مبارک اہل دنیا کو　خدا والوں کو ہی ملتی ہے مال و زر سے روپوشی

نہ کارِ عیش وعشرت ہے نہ کارِ منصب وکرسی　ہے درویشوں کی قسمت میں یہ کارِ خود فراموشی

جومحتاج زمانہ ہو تو خاک ایسی امارت پر　فقیری میں ہو سلطانی، تو پیدا کر وہ ڈرویشی

خدا کے ہاں کا زینہ ہی تصوف کی علامت ہے　زوالِ مومناں ہے کیوں؟ تصوف سے ہے کم کوشی

بلا وسخت کوشی ہی میں ہوتا ہے کشادِ دل　طریقہ عاشقوں کا ہے وفا کیشی، بلا نوشی

مسلمان کی روش میں مغربی انداز چھائے ہیں　زمانے بھر کو بھاتی ہے یہی مغرب کی مے نوشی

رسولؐ اللہ کی صحبت نے جنہیں دیں کا سکون بخشا　وہ مسلم ڈھونڈتا ہے اب محافل کی گرم جوشی

میں عشق مصطفیٰؐ میں غرق رہتا ہوں لطیفؔ اکثر　مرا مذہب ہے مے نوشی، مرا مسلک ہے مدہوشی

باب ۳۰

فقراء کی تعظیم، توقیر اور بے نیازی

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندگانِ خاص کو اپنی محبت اور دوستی کے لئے مخصوص فرما کر لوگوں کے محلِ عداوت سے محفوظ رکھا اور فرمایا وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں اور میں ان سے محبت کرتا ہوں یُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ (المائدہ: ۵۴) (محبت کرتا ہے اللہ تعالیٰ ان سے اور وہ محبت کرتے ہیں اس سے) قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اولیاء کی شان میں فرمایا ہے کہ بے شک اس کے محبوبوں اور ولیوں پر کوئی خوف اور غم نہیں ہوتا اور ایک جگہ فرمایا: نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ (حٰم السجدہ: ۳۱) (ہم تمہارے مددگار ہیں دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں بھی) ایک حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے ایسے بھی ہیں جن پر انبیاء اور شہداء رشک کرتے ہیں اور اسی حدیث میں ہے وہ ایک قوم ہے جو خوش رہتی ہے اپنے رب کی خوشنودی میں بغیر مال ومنال حاصل کرنے کے۔ ان کے چہرے منور ہیں۔ ایک اور حدیث میں فرمایا گیا کہ قیامت کے روز ان کے چہرے اس قدر چمکتے ہوں گے کہ انبیاء کرامؑ بھی ان کو دیکھ کر حیران ہوں گے۔

ایک حدیث قدسی میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ جس نے میرے ولی کو ایذا دی اس نے اپنے لئے میرے ساتھ جنگ کرنے کو جائز کر لیا "مَنْ اٰذٰى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ اِسْتَحَلَّ مُحَارَبَتِيْ" (اتحاف السادۃ المتقین ج ۵ ص ۲۹۵) مذکورہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اولیائے کرام کا اللہ تعالیٰ ناصر ومددگار ہے اور اس نے ان پاک ہستیوں کو اپنی دوستی اور ولایت کے لئے مخصوص کر لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان اولیائے کرام کو اپنی کائنات کا والی بنایا ہے اور ان کو اپنے افعال وقوت کا مظہر بنایا ہے۔ ان سب خصوصیات کو دیکھ کر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں فقراء کو کس قدر توقیر اور عزت حاصل ہے۔

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے زیرِ بحث مضمون پر بہت لمبی تحریریں پیش کی ہیں۔ آپ نے ایک حدیث نقل کی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "بہت سے ایسے لوگ ہیں جو پریشان حال اور غبار آلودہ بالوں والے اور پھٹے ہوئے کپڑوں میں ملبوس رہتے ہیں جن کو لوگ کچھ اہمیت نہیں دیتے مگر ان کا مرتبہ یہ ہے کہ اگر وہ کسی معاملے میں خدا کی قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ اسے پورا فرما دیتا ہے۔" (مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۲۶۴) ایک حدیث شریف میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی شخص سے محبت کرتا ہے تو جبرئیل علیہ السلام کو یہ فرماتا ہے کہ اے جبرئیل!

میں فلاں شخص سے محبت کرتا ہوں تم بھی اس سے محبت کرو۔ اس بات کا اعلان تمام فرشتوں میں کر دیا جاتا ہے اور اس سلسلے میں ایک منادی زمین پر بھی کر دی جاتی ہے، چنانچہ تمام فرشتے اور زمین والے اس شخص سے محبت کرنے لگتے ہیں اور اس کا احترام کرتے ہیں۔ اس نوعیت کی بہت سی احادیث اس کتاب میں مختلف مقامات پر بیان کر دی گئیں ہیں، لہٰذا یہاں پر اس قدر بیان کرنے پر ہی اکتفاء کیا جا رہا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے اولیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم کو اس قدر اعزاز بخشا تو اولیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم پر بھی یہ بات لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کسی اور چیز سے محبت نہ کریں۔ ان اولیائے کرام رحمۃ اللہ علیہم کو اللہ تعالیٰ نے اپنا دوست اور محبوب بنایا اور پیغمبروں میں سے کسی کو روح اللہؑ، کلیم اللہ، ذبیح اللہؑ، خلیل اللہؑ، حبیب اللہ کے القاب بخشے۔ اولیائے کرام رحمۃ اللہ علیہم کو ان انبیاء علیہم السلام کا وارث بنایا تو ان اولیائے کرام رحمۃ اللہ علیہم نے بغیر کسی لالچ اور واسطہ کے ہر قسم کے طمع کو دل سے نکال کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔ اولیائے کرام رحمۃ اللہ علیہم نے تمام دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر اللہ سے تعلقات قائم کئے اور اسی لئے اللہ تعالیٰ بھی ان کی ہر بات کو مانتا اور برداشت کرتا ہے۔ فقراء کی بے نیازیوں کے متعلق اگر کچھ بیان کیا جائے تو اس کے لئے ایک پوری کتاب کی ضخامت درکار ہو گی۔ اس بارے میں مختصر تحریر اگلے صفحات میں دی جا رہی ہے۔

فقراء کی تعظیم و توقیر

حضرت معاذ نسفیؒ فرماتے ہیں کہ لوگ خواہ کسی قسم کے اعمال بھی کرتے ہیں پھر بھی اللہ تعالیٰ انہیں ہلاک نہیں کرتا حتیٰ کہ وہ فقراء کی تذلیل و اہانت کریں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کی طرف سے وحی ہوئی کہ جب تم فقراء کو دیکھو تو ان سے اسی طرح کی باتیں کرو جس طرح لوگ مال داروں سے کرتے ہیں۔ حضرت ابو درداءؓ فرماتے ہیں کہ میں اس بات کو زیادہ پسند کرتا ہوں کہ محل سے گر کر چور چور ہو جاؤں بجائے اس کے کہ میں مال داروں کی مجلس میں بیٹھوں اس لئے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ مُردوں کی ہم نشینی سے بچا کرو فرمایا کہ مال دار لوگ مردہ ہیں۔

احادیث میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ کے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام موجود تھے کہ اتنے میں حضرت ابوذر غفاریؓ آتے ہوئے نظر آئے ابھی وہ کچھ دور ہی تھے کہ جبرئیل علیہ السلام نے دریافت فرمایا یہ ابوذر غفاریؓ آ رہے ہیں؟ حضور اکرم ﷺ نے اثبات میں جواب دیا اور دریافت فرمایا کہ آپ نے ان کو کس وجہ سے پہچان لیا؟ عرض کیا کہ ابوذر غفاریؓ کو اہل عرش اہل زمین سے زیادہ پہچانتے ہیں۔ جب اس کی وجہ دریافت کی گئی تو انہوں نے عرض کیا کہ ابوذر غفاریؓ کو فرشتے اس لئے پہچانتے ہیں کہ وہ کثرت سے سورۂ اخلاص پڑھتے ہیں۔ اور اپنے دل سے خود کو عاجز یقین کرتے ہیں۔ حصن حصین کی ایک حدیث شریف

میں ایسا بھی آیا ہے کہ جن گھروں میں اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، وہ گھر آسمان سے اس طرح چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں جیسے زمین سے آسمان پر ستارے چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

انبیائے کرام علیہم السلام اور اولیائے کرام رحمۃ اللہ علیہ کی توقیر واجب ہے

قرآن مجید میں سورۃ الفتح کی آیت نمبر ۹ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ شٰهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ۝ لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ (الفتح: ۹،۸)

ہم نے آپ (حضور ﷺ) کو شاہد، مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا تا کہ (اے لوگو!) تم اللہ اور اُس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ اس کی مدد کرو اور توقیر کرو۔

اس آیت کے علاوہ قرآن مجید میں اور متعدد مقامات پر آپ ﷺ کی عزت و توقیر کے متعلق اللہ تعالیٰ کے احکامات نظر آتے ہیں۔ عروہ بن مسعودؓ (اس وقت جب وہ ابھی ایمان نہ لائے تھے) ایک بار حدیبیہ میں حضور اکرم ﷺ سے گفتگو کرنے کے لئے گئے تو واپس آ کر قریش سے کہنے لگے کہ میں نے آپ ﷺ کے صحابہ کرام کو آپ ﷺ کی جو عزت کرتے ہوئے دیکھا ہے اس کی کہیں نظیر نہیں ملتی۔ ''سیرت رسول عربی از نور بخش توکلی'' کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں یہ روایت مکمل نقل کی گئی ہے اور حضور اکرم ﷺ کی توقیر اور ادب کے دیگر نہایت خوبصورت واقعات نقل کئے گئے ہیں جن کے مطالعہ سے اہلِ محبت کا دل خوش ہوتا ہے چونکہ اولیائے کرام حضور اکرم ﷺ کے جانشین ہیں اس لئے عوام ان کی بھی اس طرح عزت افزائی کرتے ہیں۔

تاریخ آثار الدول عن تاریخ نیشاپور میں ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ ایک روز امام علی رضا ابن امام موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہما خچر پر سوار نیشاپور بازار پہنچے۔ آپ کے رُخِ مبارک پر نقاب تھا۔ امام ابوزرعہ رازیؒ اور محمد بن اسلم طوسیؒ محدثین کے ہمراہ کئی ہزار سامعین اور طالبین تھے انہوں نے بھاگ کر امام علی رضا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رکاب پکڑ لی اور عرض کی ''اے سید السادات ہمیں اپنا جمالِ مبارک ایک نظر دکھا دیجئے اور ہمیں ایک ایسی حدیث جس کی ساری سند صرف آپ کے پاک خاندان کی ہو بتا دیجئے۔'' تو آپ نے نقاب اٹھایا اور فرمایا ''میں نے یہ حدیث اپنے والد موسیٰ کاظمؒ سے روایت کی ہے اور انہوں نے اپنے والد حضرت امام جعفر صادقؒ سے اور انہوں نے امام محمد باقر رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اور انہوں نے فرمایا کہ حدیث بیان کی مجھ سے میرے حبیب میری آنکھوں کی ٹھنڈک حضور رسول کریم ﷺ نے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ حدیث بیان کی مجھ سے حضرت جبرئیل علیہ السلام نے، سنا میں نے رب العزت حق تبارک و تعالیٰ سے کہ ارشاد فرمایا ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' میرا قلعہ ہے، جس نے ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کہہ لیا وہ میرے قلعے میں داخل ہوا اور وہ

میرے عذاب سے بچا اور محفوظ ہو گیا۔" یہ حدیث حضرت امام علی رضا سے ہزار آدمیوں نے لکھی اور سننے والے شمار سے باہر تھے۔ حضرت امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ فلاں کے حاکم نے جس کا نام مسامانہ تھا، سونے کے پانی سے " لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" لکھ کر اپنے پاس تعظیم سے رکھا تو کسی نے خواب میں دیکھا کہ اس حاکم نے بتایا کہ اللہ نے "لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کی تعظیم کرنے اور ایمان لانے کی وجہ سے مجھے بخش دیا۔

ایسی لاتعداد روایات ملتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی لوگ اس قدر عزت و توقیر کرتے ہیں کہ بڑے بڑے سلاطین کی اس قدر عزت نہیں کی جاتی تھی بلکہ اس وقت کے سلاطین ان محدثین اور اولیائے کرام کی عزت دیکھ کر رشک کرتے تھے۔ سورہ المنافقون میں فرمان باری تعالیٰ ہے: وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ (المنافقون: ۸) (اور عزت تو اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ اور مومنوں کے لئے ہی ہے) اس آیت میں اللہ، رسول اللہ ﷺ اور مومنین کے لئے عزت کا مخصوص ہونا ثابت ہے۔ کچھ نااہل لوگ رسول اللہ ﷺ اور مومنین کی عزت کو ترازو میں تولنے لگتے ہیں اور اللہ کے سوا باقی انبیاء اور اولیاء کی عزت کو شرک قرار دیتے ہیں حالانکہ جو باتیں ناز یبا ہیں اور واقعی شرک ہیں ان کی طرف قطعاً توجہ نہیں دیتے۔ علامہ اقبالؒ کا شعر دیکھیں ۔

یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

فقراء دو جہان میں سے کسی چیز کو خاطر میں نہیں لاتے

صوفیاء فرماتے ہیں کہ وہ فقیر نہیں جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور چیز کی طرف اِلتفات کرے۔ ان کے لئے اللہ کا نام اور اللہ سے تعلق قائم رکھنا ہی سب سے زیادہ عزیز چیز ہے۔ جیسے کہ ایک نعت شریف میں ہے ۔

کچھ نہیں مانگتا شاہوں سے یہ شیدا تیرا

ایک شخص حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کے پاس دس ہزار درہم لایا مگر آپ نے قبول کرنے سے انکار کیا اور فرمایا کہ تو دس ہزار درہم دے کر میرا نام فقراء کے دیوان سے مٹانا چاہتا ہے میں ایسا نہیں کروں گا۔ ابو سعید خرازؒ فرماتے ہیں کہ امیر فقراء کی اس لئے مدد نہیں کرتے کہ

۱۔ اکثر امیروں کا مال حلال نہیں ہوتا۔

۲۔ توفیق ایزدی اُن امیروں کے شاملِ حال نہیں ہوتی۔

۳۔ فقراء کو اللہ تعالیٰ آزمائش میں ڈالتا ہے۔

بنان مصریؒ نے فرمایا کہ میں مکہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک نوجوان فقیر میرے پاس آیا۔ ایک شخص نے درھموں سے بھری ہوئی تھیلی اس کے سامنے رکھ دی۔ نوجوان نے کہا مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اس شخص

نے کہا کہ اسے مسکینوں میں بانٹ دو۔ جب رات ہوئی تو میں نے انہیں وادی میں اپنے کھانے کے لئے کچھ ڈھونڈتے ہوئے دیکھا۔ میں نے کہا جو کچھ تمہارے پاس تھا اس میں سے کچھ اپنے لئے رکھ لیتے تو اچھا تھا۔ کہنے لگا مجھے معلوم نہ تھا کہ میں اس وقت تک زندہ رہوں گا۔

ابوعلی رودباریؒ فرماتے ہیں چار آدمی ہمارے زمانے میں ہوئے۔ ان میں سے ایک نہ بندوں سے کوئی چیز لیتا نہ بادشاہ سے۔ ایک یوسف بن اسباطؒ تھے۔ انہیں اپنے والد کی وراثت سے ستر ہزار درھم ملے تھے مگر انہوں نے کچھ نہ لیا۔ کھجور کی چٹائی بنا کر روزی کماتے تھے۔ دوسرا شخص اپنے بھائیوں اور سلطان دونوں سے لے لیا کرتا تھا۔ وہ ابواسحاق خرندیؒ تھے جو کچھ بھائیوں سے لیتے وہ خفیہ طور پر لوگوں پر خرچ کر دیتے اور جو بادشاہ سے لیتے اسے بھی غرباء کی طرف بھیج دیتے۔ تیسرا شخص اپنے بھائیوں سے تو لیتا مگر بادشاہ سے نہ لیتا وہ عبداللہ بن مبارکؒ تھے وہ اپنے بھائیوں سے لے کر اس کے بدلے میں انہیں کچھ دیتے۔ چوتھا شخص بادشاہ سے لیتا اور بھائیوں سے نہ لیتا۔ کہتے تھے کہ بادشاہ احسان تو نہیں جتلاتا، بھائی احسان جتلاتے ہیں۔

حضرت ابوعلی دقاقؒ نے "مَنْ تَوَاضَعَ لِغَنِيٍّ لِاَجْلِ غِنَاهُ ذَهَبَ ثُلُثُ دِيْنِهٖ" (جس شخص نے کسی مالدار کے ساتھ اس کے مال کی وجہ سے تواضع کی اس کا دوتہائی دین جاتا رہا۔) دوسری حدیث کے متعلق فرمایا کہ انسان دل، زبان اور نفس تین چیزوں کا مجموعہ ہے، لہٰذا جب وہ زبان اور نفس سے امیروں کی تواضع کرتا ہے تو اس کے دین کا دوتہائی حصہ جاتا رہتا ہے اور اگر دل سے اس کی فضیلت کو مانتا ہے تو پھر اس کا سارا دین چلا جاتا ہے۔

اہلِ فقر کی بے نیازیاں

اہلِ فقر کو نہ تو فقر و فاقہ سے دریغ ہوتا ہے اور نہ ہی شاہانِ وقت کا دبدبہ ان پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اہل فقر نہ تو مال و دولت کے خواہاں رہتے ہیں اور نہ ہی جاہ و جلال اور منصب و کرسی کے طالب ہوتے ہیں۔ ان کے دل میں فقط اللہ تعالیٰ کی محبت موجزن رہتی ہے۔ وہ اسی کے ذکر و فکر اور اپنی سوز و مستی اور جنون و شوق میں رات دن ڈوبے رہتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا۔

من کی دنیا؟ من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا؟ تن کی دنیا سُود و سَودا مکر و فن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن، جاتا ہے دھن
من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن
پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

(ب۔ج: ۳۲۳)

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے فقر مانگا تو مالداری نے ہمارا استقبال کیا اور لوگوں نے مالداری مانگی تو فقر نے ان کا استقبال کیا۔ یوسف بن اسباطؒ فرماتے ہیں کہ چالیس سال ہوگئے کہ میرے پاس ایک سے زائد قمیص نہیں رہی ہے۔ ایک صوفی نے دیکھا کہ مالک بن دینارؒ اور محمد بن واسعؒ کو جنت میں داخل ہونے کا حکم ہوا تو انہوں نے دیکھا کہ محمد بن واسعؒ پہلے داخل ہوئے۔ اس صوفی نے اس کا سبب پوچھا تو جواب ملا کہ اس کے پاس صرف ایک قمیص تھی اور مالک بن دینارؒ کے پاس دو قمیصیں تھیں۔

محمد بن علی الکتانیؒ فرماتے ہیں کہ مکہ میں ایک شخص تھا جس نے چیتھڑے پہن رکھے تھے اور وہ ہم سے میل جول نہ رکھتا تھا۔ میرے دل میں اس کے لئے محبت پیدا ہوگئی۔ ایک دن اللہ نے مجھے حلال طریقے سے دو سو درہم عطا کئے۔ میں نے اس کی جائے نماز کے کنارے پر ادب سے رکھ دیئے اور انہیں اپنے کام میں لانے کی درخواست کی۔ اس نے ترچھی نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور کہا کہ میں نے اللہ کے ساتھ مجلس کو علاوہ جاگیر کے ۴۰ ہزار دینار سے خریدا ہے اور تو ان چند درہم کے ساتھ مجھے دھوکا دینا چاہتا ہے۔ اس نے اُٹھ کر ان درہموں کو بکھیر دیا اور چلا گیا۔ جب وہ جا رہا تھا، میں نے ایسی عزت نہیں دیکھی اور اپنے جیسی ذلت نہیں دیکھی جب میں ان درہموں کو چن رہا تھا۔

عبداللہ بن خفیفؒ فرماتے ہیں کہ چالیس سال تک مجھ پر صدقہ فطر واجب نہیں ہوا، حالانکہ خاص و عام میں میری بہت مقبولیت تھی۔ ان سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی فقیر تین دن کے فاقے کے بعد ضرورت کے مطابق خوراک مانگ لے تو اس فقیر کو کیا کہا جائے گا؟ فرمایا یہی کہا جائے گا کہ وہ گداگر ہے۔

جلالِ عشق و مستی بے نیازی

جمالِ عشق و مستی نے نوازی جلالِ عشق و مستی بے نیازی
کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدرؓ زوالِ عشق و مستی حرفِ رازی! (ب۔ج:۴۷۵)

اہلِ مغرب یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی مذہب انسان کی ذہانت اور جمالیات میں اضافہ نہیں کرتا تو ایسا مذہب زندہ نہیں رہتا۔ حضور اکرم ﷺ کی سیرت جمالیات کی حس کو بیدار اور تیز تر اور مکمل کرتی ہے اور اس کی اصل وجہ اس مذہب میں موجود روحانی جذبات اور کیفیات ہیں۔ اس روحانی قوت کے باعث نہ صرف جمالِ الٰہی کا مشاہدہ ہوتا ہے بلکہ سالک راہِ طریقت اپنی شخصیت میں جمالِ الٰہی کو دیکھتا اور پاتا ہے کیونکہ وہ فیوض جو اس کو کسی نبی (یا ولی) کی معرفت سے ملتے ہیں ان کا ورود اللہ تعالیٰ کی ذات ہی سے ہوتا ہے اور نبی اسے معتدل کیفیت میں تبدیل کر کے اپنے اُمتیوں میں تقسیم کرتا ہے۔ جمال میں ٹھنڈک، لطف، رفق (نرمی)، حسن، شوق، خمار، سکون، اطمینان اور طمانیت کا اظہار ہوتا ہے جب کہ جلال میں گرمی، تپش، طیش، بے صبوری اور

آتش ذوق وشوق اور اضطراب کی کیفیات پائی جاتی ہیں۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ فقر جنیدؒ و بایزیدؒ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جمالِ بے نقاب کی عکاسی کرتے ہیں اور اسی طرح شوکتِ سنجر و سلیم (یعنی حضرت معین الدین چشتیؒ اور حضرت سلیم چشتیؒ) میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جلال کی جھلک نظر آتی ہے جیسا کہ بالِ جبریل میں ذوق و شوق کی نظم میں علامہؒ نے فرمایا۔

شوکتِ سنجرؒ و سلیمؒ، تیرے جلال کی نمود فقرِ جنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمالِ بے نقاب (ب۔ج:۴۰۵)

اہلِ تصوف کا خیال ہے کہ جلال و جمال میں اللہ تعالیٰ کے حسنِ مطلق کا ظہور ہے اور تمام چیزیں اسی کے حسن و جمال کی صورتیں ہیں۔ جلال اور جمال، ابرے اور استر کا تعلق ہے ہر جلال کے لئے جمال اور ہر جمال کے لئے جلال لازمی ہے۔ ہر جمال شدت ظہور سے جلال ہوتا ہے اور ہر جلال خفتِ ظہور سے جمال ہو جاتا ہے۔ سورج کی روشنی شدت کی وجہ سے نسبتاً جلال ہے مگر جب یہ چاند سے منعکس ہو کر ہم تک آتی ہے اور چاندنی کی شکل میں نمودار ہوتی ہے تو اسی سورج کی روشنی میں جمال پیدا ہو جاتا ہے۔ کمال معشوقیت، نورِ ایمان کا کشف اور الہام کا سالک کے دل پر وارد ہونا اور دیگر دلنوازیوں کو بھی جمال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح صفاتِ قہاری و جباری وغیرہ سب جلال کے تحت آتے ہیں۔

عاشقاں را شد مدرّس حُسنِ دوست

(عاشقوں کا استاد حسن دوست ہے)

جمال میں حسن خوش نمائی، دل کشی، وہ خوبی جو دلوں کو اپنی جانب کھینچے، وہ کشش جو کسی اثر پذیر دل کو اپنی جانب جذب کر لے حسن میں جزوی خوبی ہوتی ہے۔ حسین چیز ایک یا چند اعتبارات سے دل کش ہوتی ہے اور بقیہ اعتبارات سے دلبری کی شان سے خالی ہوتی ہے، جب کہ جمیل جملہ اعتبارات ظاہری و باطنی سے دل کش اور جاذبِ نظر ہوتا ہے۔ اس میں ایک بھی بات ایسی نہیں ہوتی جو حسن سے خالی ہو ''اَللّٰہُ جَمِیْلٌ وَّ یُحِبُّ الْجَمَالَ'' (یعنی اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔) اس کی ہر بات میں حسن اور ہر ادا دل کش ہے۔ ہر چیز من موہنی ہے۔ اس کا حسن دیکھنے کا ایک آئینہ ہے۔ تمام چیزیں اس کے حسن کے انعکاسات ہیں۔ اصلی فقیر کی شان بھی یہی ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جمال نظر آئے۔

بے نیازی کی شان یہ ہوتی ہے کہ استغنائے معشوقیت کے اظہار سے عاشق کو کچلنا۔ معشوقانہ بزرگی کا اس شان سے اظہار کرنا کہ ہم تک کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی اور ہم تک نظروں کا پہنچنا محال ہے اور یہ کہ ہم کو سوائے ہمارے کوئی نہیں جان سکتا۔ اس میں قہاری اور جباری کے جلوے نظر آتے ہیں۔ یہی شان ایک فقیر کی ہونا مطلوب ہے جیسا کہ علامہ اقبالؒ نے فرمایا۔

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان (ض۔ک:۵۲۲)

اس بیان کی ابتدا میں لکھے گئے اشعار سے یہی بات واضح ہوتی ہے کہ جمالِ عشق و مستی میں عشق کے نغمات اور نَے نوازی ہے اور جب عشقِ سالک میں جلال و مستی پیدا ہو جائے تو اس سے بے نیازی کا اظہار ہونا شروع ہو جاتا ہے اور وہ سب سے الگ تھلگ اور کسی شاہ و گدا میں امتیاز نہیں کرتا۔ اس کے لئے مٹی اور سونا یکساں بے سود اور بے معنی ہو جاتے ہیں۔ یہاں پر پہنچ کر علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

گدائے میکدہ کی شان بے نیازی دیکھ پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سُبو
مرا سُبوچہ غنیمت ہے اس زمانے میں کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو
میں نَو نیاز ہوں مجھ سے حجاب ہی اولیٰ کہ دل سے بڑھ کے ہے میری نگاہ بے قابو!
(ب۔ج:۳۰۵)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ اس بے نیازی سے ہی میری فطرت میں نیاز پیدا ہوا اور میں ہوا کی طرح ہر وقت جستجو کا سوزِ دل میں رکھتا ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی حسین ذات ہر لحظہ میرے پیشِ نظر رہتی ہے اور میں نے اس سے ایفائے محبت کا عہد استوار کر رکھا ہے۔

گو حسینِ تازہ ہے ہر لحظہ مقصودِ نظر حسن سے مضبوط پیمانِ وفا رکھتا ہوں میں
بے نیازی سے ہے پیدا میری فطرت کا نیاز سوز و سازِ جستجو مثلِ صبا رکھتا ہوں میں
(ب۔د:۱۲۳)

علامہ اقبالؒ اور ان کا درسِ بے نیازی

نہ محتاجِ سلطاں، نہ مرعوبِ سلطاں محبت ہے آزادی و بے نیازی (ب۔ج:۴۳۸)

علامہ اقبالؒ نے مسلمان اور بالخصوص درویشوں کی طبیعت میں بے نیازی کا پایا جانا ضروری قرار دیا ہے کیونکہ اس کے بغیر خودی کی تعمیر میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی صفت بے نیازی ہے اور وہ مسلمانوں کو بھی "تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ" اور "تَوَصَّفُوْا بِصِفَاتِ اللّٰهِ" کا حکم دیتا ہے۔ جب تک مسلمان میں ناز پیدا نہ ہو بے نیازی پیدا نہیں ہو سکتی۔ انسان جب خودی یعنی اپنے آپ کو پہچان گیا تو اس کا بدن جس میں اللہ تعالیٰ کے رازہائے خودی پنہاں ہیں انسان کے لئے پردۂ راز میں نہیں رہتے اور اپنی تمام خوابیدہ صلاحیتوں کو پہچان کر اپنی زندگی کو شاہراہ ترقی کے لئے ہموار کر لیتا ہے۔ زندگی کے متعلق جب تک کسی کا زاویۂ نگاہ (Angle of approach) درست نہ ہو تو نہ وہ عبادت کے قابل ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی قابلِ ذکر کارنامہ انجام دے سکتا ہے۔ ایسی زندگی کی راہ پر چلنے کے لئے کسی رومیؒ جیسے آشنائے راز کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ علامہؒ نے ضربِ کلیم میں فرمایا۔

غلط نگر ہے تری چشمِ نیم باز اب تک!
ترا وجود ترے واسطے ہے راز اب تک!
ترا نیاز نہیں آشنائے ناز اب تک!
کہ ہے قیام سے خالی تری نماز اب تک!
گسستہ تار ہے تیری خودی کا ساز اب تک!
کہ تو ہے نغمۂ رومیؒ سے بے نیاز اب تک!
(ض۔ک:۵۸۳)

مسلمانوں کی موجودہ کوتاہ اندیشی کے بہت سے اسباب ہیں۔ سب سے پہلا سبب تو دین سے دوری ہے اور پھر اس کے بعد اپنی ذات میں مطلوبہ صفات پیدا کرنے کے جذبے کا فقدان ہے، لہٰذا علامہؒ مسلمانوں میں موجودہ کمزوریوں کی نشاندہی کرتے ہوئے مختلف الفاظ استعمال کرتے ہیں اور فرماتے ہیں ''ترا اندیشہ افلاکی معیار کے مطابق نہیں ہے'' ''ترا بحر پرسکوں ہے (جو تلاطم سے محروم ہے) ترا تن روح سے ناآشنا ہے، تیری ذات کا جلوہ ترے دلِ ناصبور کی تسلی نہ کرسکا، ترا حجاب ہے قلب ونظر کی ناپاکی، ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں، ترا دین خریدۂ کافری، ترا دم گرمیٔ محفل نہیں، ترا گناہ کہ تخیل بلند کا ہے گناہ، ترا مرض ہے آرزو کی بے نیشی، ترا وجود سراپا تجلیٔ افرنگ، ترا وجود ہے قلب ونظر کی رسوائی، تری آنکھوں میں بھی بہا کی نہیں ہے، تری اذاں میں نہیں میری سحر کا پیام اور تری پرواز لولا کی نہیں ہے وغیرہ، مسلمانوں کی بیداری کے لئے علامہؒ نے خودی کو پہچاننے اور دین کی روش اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے اور اسی میں قوم کی فلاح کا ہونا لکھا ہے۔

بے نیازی دوام کی طرف لے جاتی ہے

بندۂ مومن میں جب بے نیازی پیدا ہو جائے تو اس کی ہر چیز میں ایک انفرادیت آ جاتی ہے اور اس کے عمل اور کارناموں کو ثبات اور دوام حاصل ہو جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی میں رونما ہونے والے تمام واقعات ''شعائر اللہ'' اللہ کی نشانیاں کہلانے لگے اور آج بھی حج میں آپؑ سے متعلق تمام واقعات کی یاد دہرائی جاتی ہے اور ان روایات کو دینی شعائر کا درجہ حاصل ہے۔ یہ سب برکات ان کے دین سے تمسک اور خوئے بے نیازی کے باعث تھا۔

علامہ اقبالؒ نے مسجدِ قرطبہ کی قدیم عمارت کی سطوت اور شان کو دیکھ کر بالِ جبریل میں ایک نظم لکھی ہے اور کہا ہے کہ اس میں اس کے بنانے والوں کے کمالات، جستجو، طلب، لگن اور بے نیازی کی جھلک نظر آتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش، اس کی شبوں کا گداز
اس کا مقام بلند، اس کا خیال عظیم
اس کا سرور اس کا شوق، اس کا نیاز اس کا ناز

ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کار کشا، کار ساز

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دلِ بے نیاز

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب، اس کی نگہ دل نواز

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز

(ب۔ج:۳۸۹)

علامہ اقبالؒ کی طبیعت میں بے نیازی کی جھلک

کچھ لوگ علامہ اقبالؒ جیسے قوم کے عظیم محسن پر اپنے خیالات کی گندگی اچھالنے سے گریز نہیں کرتے اور علامہؒ کو انگریز نواز اور انگریز کا پٹھو بھی کہتے ہیں۔ پھر مزید یہ کہتے ہیں کہ حکومت برطانیہ نے ان کو "سر" کا خطاب بھی اسی ناطے سے دیا تھا۔ ان لوگوں کو شاید معلوم نہیں کہ علامہؒ نے اپنا بیشتر کلام تہذیب فرنگ کی مخالفت میں اور فرنگ دشمنی میں لکھا ہے اور اسی وجہ سے ان کے کلام پر پابندی بھی لگائی گئی تھی۔ علامہ اقبالؒ نے انگریزوں کی طرف سے گورنر پنجاب کے عہدے کی پیش کش کو بھی قبول نہ فرمایا کیونکہ ان کا مقام اس سے کہیں بلند تھا۔ اس سلسلے میں ہماری مختلف تصانیف میں (خصوصاً سرمایۂ ملّت اور حضورِ قلب میں) کافی کچھ لکھ دیا گیا ہے، لہٰذا یہاں اس موضوع پر مزید کچھ لکھنا بے سود ہوگا۔ مصر یونیورسٹی میں ہونے والے ایک سیمینار کی جھلکیاں راقم الحروف کی کتاب "رابطۂ شیخ" میں "رابطہ میں تخلیق ایک لازمی جزو ہے" کے عنوان کے تحت ملاحظہ فرمائیں، جس میں علامہ اقبالؒ کی شخصیت میں مخفی تخلیقی عناصر پر تحقیق پیش کی گئی ہے۔

علامہ اقبالؒ بھی ایک مردِ فقیر اور قلندر کا سا حال رکھتے تھے۔ ان کے متعلق زیادہ لکھنا اس کتاب کی شمولیات سے باہر ہے، البتہ چند اشعار پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

نہ میں اعجمی نہ ہندی نہ عراقی و حجازی
کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی

تو میری نظر میں کافر، میں تیری نظر میں کافر
ترا دیں نفس شماری، مرا دیں نفس گدازی!

(ض۔ک:۵۳۵)

کشادہ دست کرم جب وہ بے نیاز کرے
نیاز مند نہ کیوں عاجزی پہ ناز کرے

بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تو نے اے واعظ
خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے

کوئی یہ پوچھے کہ واعظ کا کیا بگڑتا ہے
جو بے عمل پہ بھی رحمت وہ بے نیاز کرے

(ب۔د:۱۰۶)

اپنی اس ادائے بے نیازی کے حصول کے متعلق علامہ اقبالؒ خود ہی حیران ہو کر بالِ جبریل میں اپنے

آپ سے پوچھتے ہیں کہ اقبال! تو نے یہ بے نیازی کہاں سے سیکھی ہے۔ اس کے بعد خود ہی فرماتے ہیں کہ ایسی کمال بے نیازی کو میں نے اپنے مرشد (مرشد رومیؒ یا اپنے شیخ) سے سیکھا ہے اور ان کا سوز و گداز میرے اندر پیدا ہو گیا۔

کہاں سے تو نے اے اقبالؔ سیکھی ہے یہ درویشی
کہ چرچا پادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا
(ب۔ج:۳۲۴)

تھا یہ بھی کوئی ناز کسی بے نیاز کا
احساس دے دیا مجھے اپنے گداز کا
(ب۔د:۴۵)

علامہ اقبالؒ اللہ تعالیٰ کی بے نیازی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بندہ آخر بندہ ہے خواہ کتنا ہی عروج کر جائے اور خدا ہر حالت میں خدا ہے خواہ وہ کتنا ہی نزول کر جائے۔ اگر کوئی چیز میرے کام آئی ہے تو وہ نیازمندی کا گوہر ہے جو میں نے اپنے مشائخ سے حاصل کیا، میری اپنی شاعری اور نے نوازی اس سمت میں میری کوئی مدد نہ کر سکی جب تک میں نے مرشد رومیؒ کی غلامی اختیار نہ کی۔

وہی میری کم نصیبی، وہی تیری بے نیازی!
میرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی!
(ب۔ج:۳۰۹)

وہ فقر مانگو جس سے اللہ کی شانِ بے نیازی پیدا ہوتی ہے

علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ مسلمان میں دین و دولت جوئے بازی کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس قوم میں عمل کی مستی والے لوگ ناپید ہیں، البتہ نفس پروری کا عمل تیزی سے چل رہا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ فقر ایسا تلاش کرو جس کی اصل حجازی ہو اور جس کی سند قوم کے صُلحاء سے ملی ہو اور جس فقر سے اللہ کی شانِ بے نیازی ٹپک رہی ہو۔ جن لوگوں کو ایسا فقر ملا ان کی مثال ایسے ہے کہ جس نے بغیر تیر و تفنگ جذبۂ ایمان پر انحصار کرتے ہوئے میدانِ جنگ جیت لیا ہو، مومن ایسے فقر کے باعث امیر ہے۔ خدا سے ایسی فقیری طلب کرو۔

مومن پہ گراں ہیں یہ شب و روز
دین و دولت قمار بازی!
ناپید ہے بندۂ عمل مست
باقی ہے فقط نفس درازی!
ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر
جس فقر کی اصل ہے حجازی! (ض۔ک:۵۵۰)
اس فقر سے آدمی میں پیدا
اللہ کی شانِ بے نیازی!
یہ فقرِ غیور جس نے پایا
بے تیغ و سناں ہے مردِ غازی!
مومن کی اسی میں ہے امیری
اللہ سے مانگ یہ فقیری! (ض۔ک:۵۵۱)

باب ۳۱

فقیر دستِ سوال دراز نہیں کرتا

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ سوال فواحش میں سے ہے اور فحش بلا ضرورت حلال نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ خوش بخت ہے وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے راہِ اسلام دکھائی اور مال بقدر کفایت عطا فرمایا اور اس پر اس نے قناعت کی۔ فرمایا کہ مال اس قدر ہی بہتر ہے جس کا حق ادا ہو سکے۔

حضرات اولیائے کرامؒ کا فرمان ہے کہ فقر اللہ کا راز ہے اور جو فقیر لوگوں سے یہ کہے کہ میں کئی دنوں سے بھوکا ہوں تو اس نے جھوٹ بولا کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے راز (فقر) کو اس شخص کے پاس نہیں رکھتا جو اس راز کو لوگوں پر کھول دے۔ بزرگوں سے دعا کی استدعا کا تعلق اللہ سے رہتا ہے یہ سوال میں شامل نہیں۔ علامہؒ نے فرمایا۔

امینِ راز ہے مردانِ حُر کی درویشی　کہ جبرئیل سے ہے اس کو نسبتِ خویشی (ب۔ج:۳۲۱)

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے　فقیہہ وصوفی وشاعر کی ناخوش اندیشی (ب۔ج:۳۲۲)

فقیر کے لئے سوال کرنا درست نہیں تاہم عند الضرورت وہ کسی بھی صورت میں اظہار کر سکتا ہے۔ (آداب الفقراء للسیوطیؒ) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ "اَلسُّوَالُ ذِلٌّ" (سوال کرنا ذلت و رسوائی ہے۔) آپؐ نے ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا "اَلْیَدُ الْعُلْیَا خَیْرٌ مِنَ الْیَدِ السُّفْلٰی" اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے یعنی دینے والا لینے والے سے بہت بہتر ہے۔ (طحاوی باب الصدقات) امامِ علم وعمل عبد اللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ فقر میں مالداری کا اظہار کرنا فقر سے بہتر ہے۔ (العلم والعلماء مبحثِ فقر)

حضرت ابو حفصؒ فرماتے ہیں کہ بہترین چیزیں جن سے انسان اپنے مولا تک پہنچ سکتا ہے تین ہیں۔ ایک یہ کہ ہر حالت میں بندہ اپنی حاجات اللہ کے پاس لے جائے، دوسری یہ کہ ہر حال میں سنت پر کاربند رہے اور تیسری یہ کہ حتی المقدور حلال ذرائع سے روزی کمائے۔ ایک حدیث شریف جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوں گے جن کی قبروں پر براق کی سواریاں کھڑی ہوں گی اور وہ بغیر حساب کے جنت میں پہنچ جائیں گے جب کہ لوگ ابھی حساب کی سختی میں مبتلا ہوں گے۔ (یہ حدیث اس کتاب میں دوسرے ابواب میں سے کسی باب میں مکمل طور پر لکھی گئی ہے۔) جب جنت کے فرشتے ان سے پوچھیں گے کہ تم کون ہو اور کیا عمل

کرتے تھے تو وہ کہیں گے کہ ہم اُمتِ محمدیہ میں سے ہیں اور ہمارے عمل میں یہ بات خاص تھی کہ ہمارا ظاہر ہمارے باطن کے مطابق تھا اور جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا کیا تھا ہم اس پر راضی تھے۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ جو تھوڑی روزی پر راضی ہو جائے اللہ تعالیٰ اس کے تھوڑے اعمال پر راضی ہو جاتا ہے۔ صوفیاء کا کہنا ہے کہ کاش غریب کو اپنے مقام کی خبر ہوتی۔ عجز کا؟ مقام غریب صوفی کو وراثت میں ملا ہے امیر کو چالیس سال کی عبادت میں بھی حاصل نہیں ہوتا۔

اگر کوئی شخص غریب ہے تو اس کو اپنی روزی میں برکت حاصل کرنے کے ذرائع اختیار کرنا ضروری ہیں۔ حضرت شقیق بلخیؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے پانچ چیزیں تلاش کیں اور ان کو پانچ جگہ پایا۔ روزی کو چاشت کی نماز میں، قبر کا نور تہجد میں، منکر نکیر کا سوال قرأت میں، پل صراط کا پار ہونا روزہ اور صدقہ میں اور عرش کا سایہ خلوت میں پایا۔ اس کے علاوہ نیک اعمال کرنے اور نوافل کی ادائیگی سے روزی میں برکت ہو جاتی ہے۔ لوگوں کو اللہ کے واسطے (تھوڑا بہت) کھانا کھلانے میں بھی روزی میں برکت ہو جاتی ہے۔ اگر اس طرح روزی بڑھ جائے تو دستِ سوال دراز کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

اولیاء لذتِ نفس کے لئے کبھی سوال نہیں کرتے

ایک خوددار مسلمان کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ خدا کے علاوہ کسی اور کے آگے دستِ سوال دراز کرے۔ سورۃ البقرہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ...... (خیرات) ان فقیروں کے لئے ہے جو راہِ خدا میں روکے گئے ...... وہ (فقراء) نہیں مانگا کرتے لوگوں سے لپٹ کر۔

لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا (البقرہ: ۲۷۳)

درج بالا آیت میں فرمایا گیا ہے کہ خیرات اور صدقات کے حقدار وہی لوگ ہیں جن کو لوگ مالدار سمجھتے ہیں کیونکہ وہ سوال ہی نہیں کرتے۔ لوگ ان کی صورت کو پہچانتے ہیں کہ وہ مانگا نہیں کرتے لیکن درحقیقت وہ مفلس و نادار ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص ہر صبح لکڑیاں چن کر اپنی پیٹھ پر اُٹھا کر لائے اور اس کی قیمت سے جو ملے اس سے صدقہ بھی کرے اور خود بھی کھائے تو یہ شخص اس سے بہتر ہے جو لوگوں سے مانگتا پھرے۔ اسلام نے بلاوجہ مانگنے کی سخت ممانعت کی ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے روایت کی ہے (جو انوار الفرید میں بھی نقل کی گئی ہے) کہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ نے اپنے فقراء کو کھانے پکانے کا طریقہ تعلیم فرمایا تھا اور ہر شخص کو کھانا پکانے کے مختلف فرائض سونپ دیئے تھے۔ ایک روز آپ کھانا تناول فرمانے لگے اور پہلا لقمہ اٹھایا تو اسے تناول نہ فرمایا اور واپس چھوڑ

دیا اور پوچھا "نظام الدین کیا بات ہے لقمہ گراں ہے؟" حضرت نظام الدینؒ دست بستہ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور عرض کرنے لگے کہ جناب کھانے سے متعلقہ تمام کام آپ کی ہدایت کے مطابق پورا کیا گیا ہے۔ آپ نے پوچھا نمک کہاں سے آیا؟ عرض کیا کہ جناب آج لنگر خانے میں کوئی پیسہ موجود نہ تھا اس لئے فلاں ہندو سے نمک ادھار خریدا گیا ہے۔ آپ نے کھانا تناول نہ فرمایا اور حضرت نظام الدینؒ کو مخاطب ہو کر فرمایا "نظام الدین اولیاء اللہ اگر چہ بہ فاقہ میرند، از برائے لذت نفس قرض نہ گیرند" یعنی اولیاء اللہ اگر چہ فاقے سے ہی مر جائیں تو بھی لذت نفس کے لئے قرض نہیں لیتے۔

سوال کرنے سے خودی میں کمزوری واقع ہوتی ہے

علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام کا ایک حصہ اس موضوع کے لئے مخصوص کیا ہے کہ ایک غیور مسلمان کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ کسی سے کسی قسم کا کوئی سوال کرے جس سے اس کی محتاجی ظاہر ہو۔ آپ کا خیال ہے کہ محتاجی انسان کی خودی کو کمزور کر دیتی ہے، خواہ گداگری کی شکل میں ہو یا شاہی جبر و استحصال کی شکل میں ہو۔ محتاجی کا احساس حوصلوں کو پست اور شخصیت کو تباہ کر دیتا ہے۔ اس صورت میں شہنشاہ اور بھکاری دونوں غیر کے محتاج ہو جاتے ہیں۔ محتاجی گداگر کے دل میں احساسِ کمتری پیدا کر دیتی ہے اور اس کی "انا" کو مجروح کر دیتی ہے اور انا کی تابنا کی چھین لیتی ہے۔ علامہؒ فرماتے ہیں کہ گدائی سے شکست بہتر ہے۔ چیونٹی بھی سلیمان علیہ السلام کے سامنے سوال نہ کرے

مور بے پر! حاجتے پیش سلیمانے مبر ۔۔۔ مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست
(ب۔د:۲۶۵)

عین دریا میں حباب آسانگوں پیمانہ کر ۔۔۔ تو اگر خود دار ہے منت کشِ ساقی نہ ہو
(ب۔د:۱۹۱)

کب تلک طور پہ در یوزہ گری مثلِ کلیم ۔۔۔ اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر
ہو تری خاک کے ہر ذرے سے تعمیرِ حرم ۔۔۔ دل کو بیگانۂ اندازِ کلیسائی کر (ب۔د:۲۷۹)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تازیانہ (چابک) اُونٹ سے گر گیا تو خود اُونٹ سے نیچے اترے اور کسی کو یہ نہ کہا کہ یہ تازیانہ اُٹھا دو کیونکہ یہ بھی سوال کرنے کی ایک صورت تھی۔ غیر کی منت سے پرہیز میں خودی کی عظمت ہے۔

خود فرود آ از شتر مثلِ عمرؓ ۔۔۔ الحذر از منتِ غیر الحذر (ا۔خ:۲۳)

(حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرح خود اونٹ سے نیچے اتر، دوسروں کی منت کشی سے بچو، ضرور بچو!)

مرا از شکستن چناں عار ناید　　که از دیگراں خواستن مومیائی
(مجھے ٹوٹ جانے سے اس طرح شرم نہیں آتی، جتنا کہ دوسروں سے تقویت حاصل کرنے میں آتی ہے۔)
ماہ را روزی رسد از خوانِ مہر　　داغ بر دل دارد از احسانِ مہر (ا۔خ:۲۴)
(چاند کو سورج کے دسترخوان سے روزی ملتی ہے، اور چاند کے دل پر داغ سورج کے احسان کے باعث ہیں۔)

علامہؒ نے مسلمانوں کو اس بات کی تلقین کی ہے کہ دوسروں پر انحصار کرنے کی عادت کو قطعاً ترک کر دیں اور اپنی طاقتوں پر بھروسہ کرتے ہوئے اللہ سے مدد طلب کریں۔

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک　　اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم
(ب۔ج:۳۲۵)

یہ بندگی خدائی، وہ بندگی گدائی　　یا بندۂ خدا بن یا بندۂ زمانہ! (ب۔ج:۳۴۶)

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ　　پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
(ب۔د:۲۵۹)

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار　　اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
(ب۔د:۲۶۰)

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات　　تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن
(ب۔ج:۳۲۳)

مولانا رومؒ کا تعمیرِ انسانیت کے لئے یہ مثال دینا علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کو بہت پسند ہے کہ جب کوئی عمارت بوسیدہ ہو جائے تو اُسے گرا کے نئی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ آپؒ نے اس حقیقت کو فلسفۂ خودی میں ظاہر کیا ہے۔

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ　　پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
(ب۔د:۲۵۹)

اولیائے کرامؒ دوسروں کے دستِ نگر نہیں ہوتے

اولیائے کرام اور دیگر اکابرینِ اسلام کی ہمیشہ سے یہ عادت رہی ہے کہ وہ دوسروں کے دستِ نگر نہیں ہوتے بلکہ بعض انبیائے کرام علیہم السلام اور اولیائے کرامؒ تو اللہ تعالیٰ سے بھی مانگنے میں شرم محسوس کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ہر ایک کے حال سے واقف ہے تو اس سے مانگنے کی کیا حاجت؟ جب ابراہیم

علیہ السلام کو آتش نمرود میں پھینکنے کے انتظامات مکمل ہو گئے تو جبرئیل علیہ السلام نے دریافت کیا کہ آپ کو مجھ سے کوئی حاجت ہے تو فرمائیں۔ میں اس آگ کو اپنا پر مار کر اڑا دوں۔ آپؑ نے فرمایا "اَمَّا اِلَیکَ فَلا" (یعنی مجھے تجھ سے چنداں حاجت نہیں۔) جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا کہ آپ خدا سے دعا کیوں نہیں کرتے۔ فرمایا "عِلْمُہٗ بِحَالِیْ یَکْفِیْنِیْ عَنْ سَوَالِیْ" یعنی خدا کا میرے حال سے واقف ہونا مجھے اس بات سے کفایت کرتا ہے کہ اس سے سوال کروں۔ علامہ اقبالؒ نے غالباً اسی اعتبار سے کہا ہے کہ مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنی خودی کو اس قدر بلند کرے کہ اسے خدا سے مانگنے کی حاجت ہی نہ پیش آئے اور ایسی نوبت آنے سے پہلے ہی خدا بندے سے خود پوچھے بتا تو کیا چاہتا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
(ب۔ج:۳۴۷)

کشف المحجوب میں حضرت داتا گنج بخشؒ لکھتے ہیں کہ ایک بچی اپنی والدہ سے کہہ رہی تھی کہ اماں مجھے فلاں چیز کی ضرورت ہے ماں نے کہا کہ بیٹی خُدا سے مانگو۔ وہ کہنے لگی کہ اماں مجھے خُدا سے مانگتے ہوئے شرم آتی ہے۔ آپؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ فلاں شہر میں ایک شخص اپنے ہاتھ پر چڑیا بٹھا کر لوگوں سے کہتا تھا کہ اس چڑیا کے لئے کچھ دو۔ اس کو یہ بات معیوب لگتی تھی کہ وہ لوگوں کو کہتا کہ "مجھے اللہ کے لئے کچھ دو"

علامہ اقبالؒ اسرار و رموز میں لکھتے ہیں کہ سوال کرنے سے خودی میں کمزوری واقع ہو جاتی ہے۔ وہ مسلمان کو اپنا پرانا وقت یاد دلاتے ہیں کہ وہ شیروں کی طرح دنیا سے خراج وصول کرتا تھا مگر اب اس قدر ضعف ہو گیا ہے کہ کمزور لومڑی کی طرح لوگوں کے خراج پر نظر ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس کی ناداری نے اس کے فکر بلند سے رفعتوں کو چھین لیا ہے اور اعلیٰ افکار کی شمع کو گل کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اے مسلمان! تو کب تک منصب اور اعلیٰ سواریوں کی بھیک مانگتا رہے گا۔

فطرتے کو بر فلک بندد نظر پست می گردد زاحسانِ دگر (ا۔خ:۲۳)
(وہ فطرتِ بلند جو آسمان پر نظر رکھتی ہے، دوسروں کے احسان سے پست ہو جاتی ہے۔)

از سوال آشفتہ اجزائے خودی بے تجلی نخلِ سینائے خودی (ا۔خ:۲۳)
(سوال کرنے سے خودی کے اعضاء بکھر جاتے ہیں اور خودی کا نخلِ سینا کی تجلی سے محروم ہو جاتا ہے۔)

از سوال افلاس گردد خوار تر از گدائی گدیہ گر نادار تر (ا۔خ:۲۳)
(سوال سے مفلسی اور بھی ذلیل ہو جاتی ہے، گدائی سے گداگر اور بھی نادار ہو جاتا ہے۔)

مشتِ خاکِ خویش را از ہم مپاش مثلِ مہ رزقِ خود از پہلو تراش (ا۔خ:۲۳)
(اپنی مشتِ خاک کو اور بھی پراگندہ نہ کر، چاند کی طرح اپنے پہلو سے رزق حاصل کر)

مانگنے سے ملت اسلامیہ کی آبرو زائل ہو جاتی ہے

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ اگرچہ وہ مفلس و نادار بھی ہو اور مصائب کے سیلاب میں گھر چکا ہو تب بھی دوسروں کی نعمت سے رزق کا جو یا نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرے گا تو تیری مفلسی دور ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگ اور حالات کا مقابلہ کر۔ دستِ سوال دراز کر کے ملتِ اسلامیہ کی آبرو زائل نہ کر۔ جس ذات گرامی (رسول اکرم ﷺ) نے کعبہ کو بتوں سے پاک کیا اس کا ارشاد ہے کہ "اَلْکَاسِبُ حَبِیْبُ اللّٰہِ" (یعنی محنت کرنے والا اللہ کا دوست ہے۔) جس کی گردن دوسروں کے احسان سے جھک گئی اس نے ایک کوڑی کے بدلے غیرت کا قیمتی سرمایہ فروخت کر دیا۔ آپ مزید فرماتے ہیں۔

اے فراہم کردہ از شیراں خراج گشتۂ روبہ مزاج از احتیاج

(اے وہ قوم جو شیروں سے خراج حاصل کرتی رہی، اب وہ لومڑی کی خصلت والی محتاج ہو گئی ہے۔)

خستگی ہائے تو از ناداری است اصلِ دردِ تو ہمیں بیماری است

(تمہاری تمام بیماریاں ناداری کے سبب ہیں، اس بیماری کی اصل یہی ناداری کی بیماری ہے۔)

می رباید رفعت از فکرِ بلند می کشد شمعِ خیالِ ارجمند

(یہ (بیماری) فکر بلند سے رفعت چھین لیتی ہے، اور اعلیٰ افکار کی شمع کو گل کر دیتی ہے۔)

از خُمِ ہستی مئے گلفام گیر نقد خود از کیسۂ ایام گیر (ا۔خ: ۲۳)

(تو زندگی کے خمخانے سے مئے رنگین لے، زمانے کی جیب سے اپنی نقدی نکال)

ہمت از حق خواہ و باگردوں ستیز آبروئے ملتِ بیضا مریز (ا۔خ: ۲۴)

(اللہ تعالیٰ سے ہمت طلب کر اور حالات کا مقابلہ کر، کسی سے (سوال کر کے) ملت بیضاء کی آبرو کو زائل نہ کر)

علامہ اقبالؒ تو پروانے کو بھی شمع کی آگ کی بجائے اپنی ہی آگ میں جلنے کو پسند کرتے ہیں۔

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو اپنی فطرت کی تجلی زار میں آباد ہو (ب۔د: ۲۶۳)

پروانے کی منزل سے بہت دور ہے جگنو کیوں آتشِ بے سوز پہ مغرور ہے جگنو

اللہ کا سو شکر کہ پروانہ نہیں میں دریوزہ گرِ آتشِ بیگانہ نہیں میں (ب۔ج: ۴۰۷)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ اگر فقر چاہتے ہو تو یہ خالی ہاتھ ہونے یا بے نام و ننگ ہونے سے نہیں آتا بلکہ یہ فقر کے احوال طاری اور جاری ہونے سے آتا ہے۔ فقر کی دلنوازی سے حکمت آتی ہے اور بے نیازی سے دین قوی ہوتا ہے۔

فقر خواہی از تہی دستی منال عافیت در حال و نے در جاہ و مال

(اگر فقر چاہتے ہو تو یہ خالی ہاتھ ہونے سے نہیں آتا، عافیت کا حصول حال سے ہے مال و مرتبہ سے نہیں)

صدق و اخلاص و نیاز و سوز و درد نے زر و سیم و قماشِ سرخ و زرد (پ۔چ:۸۰۹)

(فقر صدق، اخلاص، نیاز اور سوز و درد سے آتا ہے، نہ کہ سونے چاندی اور سرخ و زرد لباس سے)

حکمتِ دیں دلنوازی ہائے فقر قوتِ دیں بے نیازی ہائے فقر
(پ۔چ:۸۱۷)

(حکمتِ دیں فقر کی دلنوازیوں میں ہے اور دین کی قوت فقر کی بے نیازیوں میں ہے۔)

علامہ اقبالؒ تو اس قدر اپنے آپ پر انحصار کرتے ہیں کہ وہ بجائے طور پر جا کر دید کا تقاضا کرنے کے خود اپنے اندر طور جیسے جلوے پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثلِ کلیم اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر
ہو تری خاک کے ہر ذرے سے تعمیرِ حرم دل کو بیگانۂ اندازِ کلیسائی کر
(ب۔د:۲۷۹)

بتوں سے تجھ کو اُمیدیں خُدا سے نومیدی مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟
(ب۔ج:۳۴۰)

باب ۳۲

فقیر پر مقام حرام ہے اور اس کا کوئی وطن نہیں

ما کہ از قیدِ وطن بے گانہ ایم چوں نگہ نور دو چشمیم و یکیم

(ہم مسلمان وطن کی (جغرافیائی) حد بندیوں سے آزاد ہیں، ہم نگاہ کی مانند ہیں، جو دو آنکھوں کے نور سے مرکب ہونے کے باوجود ایک ہے۔)

از حجاز و چین و ایرانیم ما شبنمِ یک صبحِ خندانیم ما

(ہم حجاز، چین اور ایران کے شہری تو ہیں، مگر ایک ہی صبح خنداں (حضور اکرمؐ) کی شبنم ہیں۔)

مست چشمِ ساقیِ بطحاستیم در جہاں مثلِ مے و میناستیم

(ہم ساقی بطحا کی کیف چشم سے سرشار ہیں، دنیا میں ہماری مثال مے اور مینا کی سی ہے۔)

چوں گُلِ صد برگ مارا بُو یکیست اوست جانِ ایں نظام و اُو یکیست

(ا۔خ:۲۰،۲۱)

(سو پتیوں والے پھول کی طرح ہماری خوشبو ایک ہے وہ اس نظام کی ہے اور وہی ایک ہمارا محبوب ہے۔)

حضور اکرم ﷺ نے نسلی امتیازات و مفادات کو یکسر مٹا دیا، حضور اکرم ﷺ نے ان خس و خاشاک سے باغِ دنیا کو پاک کر دیا۔ اسلام نے نسل و نسب اور ملک و رنگ کے امتیازات مٹا کر ایک وحدت قومی کا نظریہ پیش کیا ہے۔ تمام ملت اسلامیہ باہم یک ذات و یک جہت ہے اور یہ وہ اخوت ہے جس سے بہتر مثال آج تک تاریخِ عالم پیش نہ کر سکی۔ فقیر بھی اسی اخوت کا خوگر ہوتا ہے وہ بھی قومیّت وطنیت، لونیت ولسانیت (رنگ وزباں) سے بالاتر ہوتا ہے فقیر کا کوئی مکان نہیں ہوتا اس کا وطن ذاتِ باری تعالیٰ اور مقصدِ زندگی احیائے اسلام اور اعلائے کلمۃ الحق اور عشقِ رسول اللہ ﷺ فنا فی الشیخ اور خدمتِ خلق ہوتا ہے، جہاں بھی سلوک کے سفر میں دن آیا دعوتِ دین میں گزار دیا خدمتِ خلق میں مصروف رہا اور جس جگہ رات آئی یادِ الٰہی میں گزار دی فقیر کا نظریہ ہی یہ ہوتا ہے ؎

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ افغانی

(ب۔د:۲۷۰)

علامہ اقبالؒ اور قومیت کا اسلامی تصور

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ قومیت کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراکِ زبان ہے، نہ اشتراکِ وطن، نہ اقتصادی اغراض کا اشتراک بلکہ ہم اس برادری میں جو جناب رسالتِ مآب ﷺ نے قائم فرمائی تھی اس لئے شریک ہیں کہ یہ مظاہرِ کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ہے۔

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم چمن زادیم و از یک شاخساریم

(ہم مسلمان نہ افغانی نہ ترکی نہ تاتاری ہیں، ہم سب مسلمان ایک ہی باغ کے پھول اور ایک ہی شاخ کے بلبل ہیں۔)

تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم (پ۔م:۲۲۲)

(رنگ ونسل کی تفریق ہم مسلمانوں پر حرام ہے، اس لئے کہ ہم ایک ہی ملت (یعنی ملت اسلامیہ) کے افراد ہیں۔)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں جو تاریخی روایات ہم سب کو تُرکہ (یعنی ورثے) میں ملی ہیں وہ بھی ہم سب کے لئے یکساں ہیں اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے اور اس کی قومیت کا دارومدار ایک خاص تہذیبی تصور پر ہے جس کی تجسیمی شکل وہ جماعتِ اشخاص ہے جس میں بڑھنے اور پھیلتے رہنے کی قابلیت طبعاً موجود ہے۔(مقالاتِ اقبالؒ)

علامہؒ فرماتے ہیں کہ فقیر مردِ آفاقی ہوتا ہے۔

نہ چینی و عربی وہ نہ رومی و شامی سما سکا نہ دو عالم میں مردِ آفاقی (ب۔ج:۳۵۸)

اہلِ مغرب نے مسلمان کو وطنیت کا زہر دیا

اہلِ مغرب نے مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لئے وطن کی پوجا کرنے کی تعلیم دی ہے۔اس کی تفصیل اگلے مضمون میں دی جارہی ہے اور بتایا جارہا ہے کہ فقیر کا کوئی مکان نہیں ہوتا۔انسان کی فطرت اور پیدائش خاک سے متعلق ہے اور یہ اخلاق رذیلہ کی طرف انسان کو کھینچتی ہے۔اہلِ فقر اس خاکی تاثیر سے خود کو الگ کر کے لامکان کی طرف پرواز کرتے ہیں۔خاکی اثرات سے بچنے، جان کو پاک کرنے اور اپنی آگاہی حاصل کرنے سے دین حاصل ہوتا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ سلطنت عثمانیہ کو ختم کرنے کے لئے مسلمانوں کو وطنیت کا زہر دیا گیا اور خانہ کعبہ کے اندر مسلمان کو مسلمان سے لڑا دیا۔اب یہ ملکی منافرت اس قدر مضبوط ہو چکی ہے کہ کوئی ملک اس سے بچ نہیں

سکتا۔ علامہؒ نے اس موضوع پر بہت کلام کہا ہے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

لردِ مغرب آں سراپا مکر و فن اہلِ دیں را داد تعلیمِ وطن

(یورپ کا لارڈ جو سراپا مکر وفن ہے، اس نے اہلِ اسلام کو وطنیت کی تعلیم دی)

اُو بفکرِ مرکز و تو در نفاق بگذر از شام و فلسطین و عراق

(وہ خود تو ایک مرکز بنانے کی فکر میں ہے اور تو نفاق میں پڑا ہے، تو شام، فلسطین اور عراق کی علیحدگی کی بات چھوڑ دے)

تو اگر داری تمیزِ خوب و زشت دل نہ بندی با کلوخِ سنگ و خشت

(اگر تو اچھے برے کی تمیز رکھتا ہے، تو اپنا دل مٹی، پتھر اور اینٹ سے نہ لگا)

چیست دیں؟ بر خاستن از روئے خاک تا زخود آگاہ گردد جانِ پاک (ج۔ن:۶۵۰)

(دین کیا ہے؟ خاک سے اوپر اٹھنا، تاکہ جان پاک اپنے آپ سے آگاہی حاصل کرے)

می نگنجد آں کہ گفت اللہ ھو در حدودِ ایں نظامِ چار سو (ج۔ن:۶۵۱)

(اللہ ہو کہنے والا چار جہات (مکان) کے اس نظام کی حدود میں نہیں سماسکتا)

فقیر کا کوئی وطن نہیں ہوتا

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ آزاد مرد (مسلمان) جہات اور زمان ومکاں کی قید سے آزاد ہے۔ یہ مٹھی بھر خاک جسے ہم وطن کا نام دیتے ہیں اور یہ علاقے جسے مصر وشام وایران کہا جاتا ہے اگرچہ اہلِ وطن کے لئے یہ وطن ہونے کی نسبت رکھتے ہیں کیونکہ قوم اسی خاک سے طلوع ہوتی ہے لیکن صاحبِ نظر کے لئے اس میں ایک بال سے باریک رمز موجود ہے وہ یہ کہ سورج جو بڑی آب وتاب سے مشرق سے طلوع ہوتا ہے وہ سوزِ درون کے باعث دن بھر کشمکش میں رہتا ہے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف ہجرت کرتا ہے اور اس طرح کرنے سے وہ شرق وغرب کے چکّر سے باہر نکل جاتا ہے۔ وہ پورے آفاق کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور اس کی فطرت مشرق ومغرب سے آزاد ہے اگرچہ نسبت کی رو سے وہ مشرقی ہے۔ علامہؒ کا مقصد اس سے یہ ہے کہ مسلمان جب مشرق سے ابھرتے ہیں تو انہیں کسی مقام پر قناعت نہیں کرنی چاہیے۔ جہاں وہ جا کے جھنڈے کو گاڑ دیتا ہے وہی مقام اس کا وطن بن جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے متعدد جگہوں پر اس نکتہ پر تاکیداً زور دیا کہ مسلمان کا کوئی وطن نہیں اس لئے اسے مشرق ومغرب، مصر وشام وحجاز سے آگے گزرنا چاہیے۔

تو ابھی رہ گزر میں ہے قیدِ مقام سے گزر مصر و حجاز سے گزر، پارس و شام سے گزر

کوہ شگاف تیری ضرب، تجھ سے کشادِ شرق وغرب تیغِ ہلال کی طرح عیش نیام سے گزر

(ب۔ج:۳۲۱)

مردِ فقیر کے لئے بھی یہی کہا جاتا ہے کہ وہ مسافر اور سیلانی ہوتا ہے اس کا کوئی مکان نہیں۔ جہاں اسے رات آجائے وہ اسی جگہ قیام کر لیتا ہے۔

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہرِ ملکوتی خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی گھر میرا نہ دلی، نہ صفاہاں نہ سمرقند (ب۔ج: ۳۱۳)

ہندوستان میں تقسیم ہند سے پہلے کانگرس نے مسلمانوں اور سکھوں کو اپنے ساتھ ملا کر یہ نعرہ لگایا تھا ''ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی آپس میں سب بھائی بھائی'' اس سے ان کا منشاء یہ تھا کہ انگریزوں کی حکومت اکثریتی جماعت (ہندو) کو مل جائے اور اس کے بعد وہ مسلمانوں اور سکھوں سے بھی نپٹ لیں گے چنانچہ مسلمانوں کی ایک کافی بڑی جماعت ان کے ساتھ مل گئی اور ہندوؤں کو مسجدوں میں لا کر اتحاد کے وعظ کروائے گئے۔ ان کے ساتھ جو مسلمان مل گئے تھے انہوں نے منبر رسول اللہ ﷺ پر یہ کہا تھا کہ ہم پہلے ہندی ہیں اور بعد میں ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی ہیں۔ علامہ اقبالؒ اس وقت زندہ تھے آپ نے اس نعرے کی اپنے کلام میں تردید کی اور ''ملت از وطن است'' (یعنی ملت وطن کی وجہ سے ہے) پر سخت تنقید کی جس پر پوری جماعت علامہ اقبالؒ کے خون کی پیاسی ہو گئی۔ ملت وطن سے قائم نہیں بلکہ وطن ملت کے واسطے قائم کیا جاتا ہے۔ ارمغان حجاز اردو میں صفحہ ۶۹۱ پر علامہ اقبالؒ کا کلام حسین احمد کے نام لکھا کہ ''سرور بر سر سبز کہ ملت از وطن است'' ملاحظہ فرمائیں۔ کسی شخص نے ایک کتاب ''علامہ اقبال کا آخری معرکہ'' لکھی ہے جس میں ان اشعار پر پیدا شدہ فساد کا ذکر دیا گیا ہے۔

وطن پرستی کا بُت سامری نے تراشا ہے

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ پہلے کی طرح اس زمانے میں بھی انسانوں نے کئی بت تراش رکھے ہیں اور ہر دور میں وہ ایک نیا بُت تراش لیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ آج کل انسان نے سامری کا پیشہ اختیار کیا اور ایک ایسا خدا بنا ڈالا ہے جس کا نام نسب اور وطن پرستی ہے۔ اس وطنیت کے نظریہ نے لاکھوں انسانوں کو آپس میں لڑا دیا ہے۔ علامہؒ فرماتے ہیں کہ اے مسلمان! تو نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے توحید کی شراب پی ہے، لہٰذا اس نظریہ پر ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کی تلوار چلا دے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ دشمنانِ اسلام نے جب دیکھا کہ مسلمانوں کو حرب کے ذریعے شکست نہیں دی جا سکتی تو انہوں نے مسلمانوں میں ملکی، قومی اور طبقاتی تفرقہ بازی کا بیج بو ڈالا اور خلافتِ عثمانیہ کو ختم کرنے کے لئے عرب کے مسلمانوں میں پھوٹ ڈالی اور سلطنت عثمانیہ کو توڑ ڈالا۔ اب یہ حال ہے کہ کوئی خطہ مسلمانوں کا ایسا نہیں جو ملکی تعصب سے آزاد ہو وہ ایک دوسرے کا نام سننا نہیں چاہتے۔

فکر انسان بت پرستے بت گرے ہر زماں در جستجوئے پیکرے

(انسانی فطرت بت بنانا (باطل) اور اس کی پوجا کرنا ہے، اور وہ ہر دور میں ایک نئے بت کی تلاش میں رہتا ہے۔)

باز طرحِ آزری انداخت است　تازہ تر پروردگارے ساخت است

(اب اس نے آذری کا طریقہ اختیار کیا ہے، اور ایک نیا خدا بنایا ہے۔)

کاید از خوں ریختن اندر طرب　نام اُو رنگ است وہم ملک و نسب (ا۔خ:۱۴۰)

(جو خون ریزی سے بے حد خوش ہوتا ہے، اس خدا کا نام "رنگ، ملک اور نسب" ہے۔)

آں چناں قطع اخوت کردہ اند　بر وطن تعمیرِ ملّت کردہ اند (ا۔خ:۱۱۵)

(لوگوں نے اخوت کے جذبے کو قطع کر دیا ہے، اور ملّت کی بنیاد وطن پر تعمیر کی ہے۔)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ یہ وطنیت کی پوجا کا نظریہ غیر اسلامی ہے اور دینِ مصطفوی ﷺ کو غارت کرنے والا ہے۔ آپ نے مسلمانوں کو کہا ہے کہ وہ اس بت کو خاک میں ملا دیں۔

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے　غارت گر کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے　اسلام ترا دیس ہے تو مصطفویؐ ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے　اے مصطفویؐ خاک میں اِس بُت کو مِلا دے
ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی　رہ بحر میں آزادِ وطن، صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی　دے تو بھی نبوّت کی صداقت پہ گواہی
(ب۔د:۱۶۰)

ملت اسلامیہ کی بنیاد توحید اور رسالت پر ہے نہ کہ حدودِ مکانیہ پر

علامہ اقبالؒ اسرار و رموز کی ایک نظم میں فرماتے ہیں کہ ملت محمدیہ علیٰ صاحبہا ﷺ کی بنیاد توحید و رسالت پر ہے اس لئے یہ مکان کی حدود سے ماوراء ہے۔ حضرت کعبؓ، نبی کریم ﷺ کو بہت ایذا دیا کرتے تھے فتح مکہ کے بعد مکہ سے بھاگ کر طائف چلے گئے۔ وہاں سے قصیدہ "بَانَتْ سُعَاد" لکھ کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے گزشتہ گناہوں کی معافی مانگی۔ حضور اکرم ﷺ نے ان کو معاف کر دیا اور قصیدے کے صلے میں اپنی چادر مبارک عطا فرمائی۔ اس قصیدے میں کعبؓ نے حضور اکرم ﷺ کو "سَیْفٌ مِّنْ سُیُوْفِ الْهِنْدِ" ہندوستان کی تلواروں میں سے ایک تلوار کے الفاظ سے مخاطب کیا کیونکہ اس وقت سیف الہند محاورۃً استعمال ہوتا تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے کعبؓ کے مصرع میں اصلاح کی اور فرمایا کہ "سَیْفٌ مِّنْ سُیُوْفِ اللّٰهِ" کہنا چاہیے۔ (یعنی اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار۔)

علامہ اقبالؒ نے اسی مضمون کو بڑے حسین و دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔

جوہرِ ما با مقامے بستہ نیست بادۂ تندش بجامے بستہ نیست

(ہماری ملت کا جوہر کسی سرزمین سے وابستہ نہیں ہے، اس کی تیز و تند شراب کا دارومدار جام پر نہیں)

ہندی و چینی سفالِ جامِ ماست رومی و شامی گلِ اندامِ ماست

(ہندی اور چینی ہمارے جام کی مٹی ہیں، اور رومی و شامی ہمارے (ملی) بدن کی خاک ہیں۔)

قلبِ ما از ہند و روم و شام نیست مرزبوم اُو بجز اسلام نیست

(ہمارے قلب کا تعلق ہند، روم یا شام سے نہیں ہے، اسلام کے سوا ہمارا کوئی اور وطن نہیں)

پیشِ پیغمبرؐ چو کعبؓ پاک زاد ہدیہ آورد از "بَانَتْ سُعَاد"

(ا۔خ:۱۱۲)

(جب حضرت کعبؓ، حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں قصیدہ "بَانَتْ سُعَاد" کا تحفہ لائے)

چاند اس لئے گردش کرتا ہے کہ اپنا مقام حاصل کر لے

مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مشہور ہے کہ آپ اکثر سفر پر رہا کرتے تھے۔ آپ کے مرشد حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ (جو آپ کے سسر بھی تھے) نے فرمایا کہ جامی تو چاند کی طرح اپنی منازل سفر میں طے کرتا رہتا ہے، تو انھوں نے اپنے شیخ کی اس بات کو شعر میں یوں ادا کیا۔

ماہ گردد تا شود صاحب مقام سیرِ آدم را مقام آمد حرام (ج۔ن:۷۹۲)

(چاند چکر کاٹتا ہے تاکہ وہ اپنا مقام حاصل کر لے، اسی طرح انسان کے لئے بھی ایک مقام پر رکنا حرام ہے۔)

چاند اپنی منزل کے لئے رواں دواں رہتا ہے اور جب وہ چھپ جائے تو لوگ اس کی دید کے متلاشی رہتے ہیں۔ جب چاند نظر آ جائے تو لوگ چاند چاند پکار کر اس کا دیدار کرتے ہیں۔ صوفی یا فقیر بھی اپنی منزل کے لئے رواں دواں اور سرگرداں رہتا ہے۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ سورج بھی مشرق سے نکلتا ہے اور ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ وہ ایک جگہ قیام نہیں کرتا اور مشرق و مغرب میں گھومتا رہتا ہے اگرچہ کہا یہی جاتا ہے کہ سورج مشرقی نسبت رکھتا ہے۔

بر دمد از مشرقِ خود جلوہ مست تا ہمہ آفاق را آرد بدست

(وہ (سورج) اپنے مشرق سے جلوہ مست نکلتا ہے، تاکہ سارے آفاق کو اپنی لپیٹ میں لے لے)

فطرتش از مشرق و مغرب بری است گرچہ اُو از روئے نسبت خاوری است

(ج۔ن:۶۵۱)

(اس کی فطرت مشرق ومغرب سے آزاد ہے، اگرچہ نسبت کی رو سے وہ مشرقی ہے۔)

رنگ ونسل نہ صرف اسلام کے بلکہ انسانیت کے بھی منافی ہے

اسلام ہمیشہ رنگ ونسل کے عقیدے کا، جو انسانیت کی راہ میں سب سے بڑا سنگِ گراں ہے نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ رینان کا یہ خیال غلط ہے کہ سائنس اسلام کی سب سے بڑا دشمن ہے۔ دراصل اسلام بلکہ کائناتِ انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ ونسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوعِ انسان سے محبت رکھتے ہیں ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علَمِ جہاد بلند کریں۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدود پر ہے، دنیائے اسلام میں استیلاء حاصل کر رہا ہے اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدہ کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک ووطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدرد نوع انسان کی حیثیت سے انہیں یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فریضہ سارے بنی آدم کی راہبری وراہنمائی ہے۔

یہ درست ہے کہ مجھے اسلام سے محبت ہے لیکن مسٹر نکلسن کا یہ خیال درست نہیں کہ میں نے اس کی محبت کے پیش نظر مسلمانوں کو اپنا مخاطب ٹھہرایا ہے حقیقت یہ ہے کہ عملی حیثیت سے میرے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ ایک خاص جماعت یعنی مسلمانوں کو اپنا مخاطب بناؤں کیونکہ تنہا یہی جماعت میرے مقاصد کے لئے میرے لئے واقع ہوئی ہے۔ انسانیت کی فوز وفلاح کے پروگرام کو عمل میں لانے کے لئے ضروری ہے کہ اس نظریہ کو پہلے ایک ایسی سوسائٹی تک محدود کیا جائے جو ایک مستقل عقیدہ اور معین راہِ عمل رکھتی ہو لیکن اپنے عملی نمونے اور ترغیب وتبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی جائے میرے نزدیک اس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے۔

نگہ پیدا کر اے غافل تجلی عین فطرت ہے کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا

(ب۔ج:۳۱۴)

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا

وہ چنگاری خس وخاشاک سے کس طرح دب جائے جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

(ب۔ج:۳۱۷)

اسلام کا اصولِ قومیت

اسلام کا اصولِ قومیت یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان خواہ وہ کسی خطۂ زمین پر بستے ہوں، ایمان کے

اشتراک کی بنا پر ایک قوم کے افراد ہیں اور محض ایک قوم کے افراد نہیں بلکہ ایک دوسرے کے بھائی ہیں اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (الحجرات: ۱۰) اس اخوت کو اس نے کتاب اللہ سے وابستگی کا لازمی نتیجہ اور خدا کی خصوصی نعمت قرار دیا ہے جب کہا ہے کہ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا (تو تم اس کے احسان سے بھائی بھائی بن گئے۔ آل عمران: ۱۰۳) اس اخوت کی بنا پر یہ اُمت کسی ایک خطۂ زمین میں محدود و محصور نہیں ہے، مسلمان جہاں بھی ہے یا دنیا کے کسی حصے میں سکونت پذیر ہے دنیا کے باقی مسلمانوں کا بھائی اور اُمتِ مسلمہ کا ایک فرد ہے۔ تمام دنیا کے مسلمان ایک قوم کے اجزاء ہیں بنابریں جس طرح نسلی وابستگی کی بنا پر مسلمانوں کی الگ الگ قومیت کا تصور خلافِ اسلام ہے، اسی طرح جغرافیائی حدود یعنی وطن کی بنا پر ان کی جداگانہ قومیتوں کا نظریہ بھی دین کی نقیض ہے۔

اُمتِ مسلمہ ایک عالمگیر اُمت ہے

علامہ اقبالؒ نے جو اسلام کی اس عالمگیر دعوت کا گہرا احساس رکھتے تھے اپنے اس پیغام کو ہندوستان کی چار دیواری سے آگے لے جا کر پورے عالم اسلام تک پھیلا دیا۔ انہوں نے ۱۹۲۲ء میں جب پہلی جنگ عظیم کے بعد تمام مسلم ممالک کی بالعموم اور ترکی کی بالخصوص سقیم حالت کو دیکھا تو جملہ عالمِ اسلام کو مخاطب کر کے کہا کہ یاد رکھو! ہماری زبوں حالی کا ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے　نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا　ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیٔ والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی　اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہگذر
(ب۔د: ۲۶۵)

اور اس سے اگلے سال ۱۹۲۳ء میں انھوں نے اپنی مشہور نظم "طلوعِ اسلام" میں انہی اقوام کو مخاطب کر کے کہا کہ۔

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو　اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی و تورانی　تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے　تو اے مُرغِ حرم، اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا
(ب۔د: ۲۷۳)

مسلمان قوم کے تین مہالک

آپ نوعِ انسان کی تاریخ پر غور کیجئے جس زمانہ میں جس ملک میں اور جس قوم میں آپ کو فسادِ آدمیت کی

جھلک نظر آئے تحقیق کے بعد معلوم ہوگا کہ اس فساد انگیزی کے عوامل و عناصر تین ہی تھے یعنی (۱) ملوکیت (۲) مذہبی پیشوائیت (۳) اور سرمایہ داری۔

هَلْ اَفْسَدَ الدِّيْنَ اِلَّا الْمُلُوْكُ وَ اَحْبَارُ سُوْءٍ وَالرُّهْبَانُ

(دین کو بادشاہوں، برے عالموں اور جاہل پیروں نے برباد کیا ہے۔)

زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ ابلیسِ دہر (یعنی شیاطینِ وقت) اپنا پیکر بدلتے رہیں گے، لیکن روح ہر زماں اور ہر مکاں میں وہی کارفرما ہوگی۔ اگر آپ قرآن کریم پر گہری نظر سے غور کریں گے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آ جائے گی کہ حضرات انبیائے کرامؑ کی دعوت انہی فساد انگیز عناصر کے خلاف نعرۂ انقلاب تھی۔ وہ انسانوں کو نظامِ خداوندی کے مرکز پر جمع کرتے تاکہ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری کے تختوں کو الٹ دیا جائے۔ انبیائے گزشتہ کے کوائف امم سابقہ کی داستانیں، جو قرآن میں مذکور ہیں وہ اسی کشمکش کی سرگزشت اور اسی انقلابی جدوجہد کی تفاصیل ہیں۔ ان داستانوں میں قصہ بنی اسرائیل کو خاص اہمیت حاصل ہے، اس لئے کہ اس کشمکش میں فسادِ آدمیت کے یہ تینوں گوشے یکجا سامنے آ گئے تھے یعنی فرعون، استبداد ملوکیت کا مجسمہ، ہامان، مذہبی پیشوائیت کی ابلیسانہ روباہ بازیوں کا پیکر اور قارون، سرمایہ داری کی خون آشامیوں کا نمائندہ۔ یہ تینوں یکجا اور ان کے پنجہ فولادی کی گرفت میں تڑپتی پھڑکتی قوم بنی اسرائیل جس کی رستگاری کے لئے دو اولعزم پیغمبر (حضرت موسیٰ کلیم اللہ اور ان کے بھائی حضرت ہارونؑ) مصروفِ جہاد رہے اور اگر تاریخ کا بیان صحیح ہے تو وادیٔ سینا میں ایک اور پیغمبر حضرت شعیب علیہ السلام ان کے مددگار تھے۔ یہ کشمکش حق و باطل، یہ چراغ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی کی ستیزہ کاری اسی طرح مسلسل چلی آ رہی تھی کہ آج سے چودہ سو سال پہلے خدا کی آخری کتاب قرآن کریم اور اس کا آخری رسول ﷺ، نبی اکرم ﷺ نوع انسان کو ان فساد انگیزیوں سے نجات دلانے کے لئے آئے۔ قرآن کریم نے حضور نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا ہے کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (اور اتارتا ہے ان سے ان کا بوجھ اور (کاٹتا ہے) وہ زنجیریں جو جکڑے ہوئے تھیں انہیں۔ الاعراف: ۱۵۷)

نبی اکرم ﷺ نے اپنی عدیم المثال انقلابی جدوجہد سے ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور نظام سرمایہ داری کی ان زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا اور اس طرح خدائی مخلوق دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہوگئی۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

نقشِ قرآن تا دریں عالم نشست نقش ہائے کاہن و پاپا شکست (ج۔ن: ۶۶۹)

(قرآن کا سکہ جب جہاں میں بیٹھ گیا، تو کاہنوں اور پاپائیت کے نقوش ٹوٹ گئے۔)

لیکن یہ دورِ حریت و آزادی تھوڑے عرصہ تک قائم رہا اور اس کے بعد خود مسلمانوں نے ان زنجیروں کے

بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو اپنی "مژگانِ عقیدت" سے ایک ایک کر کے چنا اور اس طرح اپنے گلے میں ڈال لیا کہ پھر کوئی قوت انہیں توڑ نہ سکے۔ میں اس وقت اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ ایسا کس طرح ہوا۔ اس وقت میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ آسمان کی آنکھ نے اس سے زیادہ حیرت انگیز تماشا کہیں نہیں دیکھا ہوگا۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست خود سر تختِ ملوکیت نشست (ج۔ن:۲۶۶)

(اُس نے خود ہی قیصر و کسریٰ کا طلسم توڑا اور اب خود ہی بادشاہت کے تخت پر بیٹھ گیا۔)

جب ہم اپنی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو محوِ حیرت رہ جاتے ہیں کہ مسلمان اس غیر قرآنی زندگی کا اس قدر خوگر ہو چکا ہے کہ اس کے نزدیک قفس حلال اور آشیانہ حرام ہے اس کے اسباب وعِلَل ظاہر ہیں۔ مفاد پرست گروہ نے اقتدار کی کرسیوں اور رزق کے سرچشموں پر قبضہ کر لیا، مذہبی پیشوائیت نے اس خلاف اسلام نظام کو عین اسلام ثابت کرنے میں شرعی سندات مہیا کیں۔ ارباب حکومت نے ان کے وظیفے مقرر کر دیئے تھے اور یہ ممبروں پر کھڑے ہو کر انہیں "ظِلُّ اللّٰهِ عَلَى الْاَرْضِ" قرار دیتے اور ان کی سلامتی کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ یہ وہی فرعون، ہامان اور قارون کی ملی بھگت تھی جسے قرآن نے داستانِ بنی اسرائیل کے سلسلہ میں شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ گمانِ غالب ہے کہ اس دور میں خدا کے ایسے بندے بھی پیدا ہوئے ہوں گے جنہوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی ہو گی لیکن جیسا کہ ہر مستبد نظام کیا کرتا ہے، ان کا گلا گھونٹ دیا گیا اور ان کے آثار تک کو مٹا دیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ آج ہمارے ہاں ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی تاریخ تو پوری تفصیل کے ساتھ موجود ہے لیکن اس کے خلاف آواز اٹھانے والوں کا ذکر تک نہیں ملتا، بجز اس کے کہ اس تاریخ میں کہیں طعن و تشنیع کے ساتھ انہیں ہدفِ ملامت بنا دیا گیا ہو۔ اس سارے طوفانِ بلا میں اگر اُمید کا کوئی سہارا ہے تو وہ یہ کہ خدا کی کتاب کے الفاظ ہمارے ہاں محفوظ چلے آتے ہیں۔

یہی تھی خدا کی وہ کتابِ محفوظ جس پر ہمارے دور کے ایک عظیم مفکر (یعنی علامہ اقبالؒ) نے عمر بھر غور و فکر کیا اور اس کے بعد اس کی حقیقت کو واشگاف الفاظ میں اُمت کے سامنے پیش کیا کہ اس کی یہ حالت اس لئے ہوئی ہے کہ۔

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر سود خوار و والی و مُلّا و پیر (ج۔ن:۷۷۸)

(اس سخت جان (مسلم) کی گھات میں چار اموات ہیں۔ سود خور، حاکم، مُلّا اور پیر)

اور اس لئے مسلمان کو مخاطب کر کے کہا کہ

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری اے کشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری (ا۔ح:۶۷۰)

میں مختصر الفاظ میں اس حقیقت کو واضح کروں گا کہ قرآن کریم نے فسادِ آدمیت کے ان تینوں گوشوں ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری کے متعلق کیا کہا ہے اور علامہ اقبالؒ نے اپنے حسین و بلیغ انداز میں اس کی کس طرح تشریح کی ہے۔

ملوکیت کا تصور اسلام میں نہیں

ہمارے ہاں ملوکیت سے مراد موروثی بادشاہت لی جاتی ہے یعنی باپ کے بعد بیٹے کا تخت نشین ہونا۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں جہاں یہ آیا ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ نے اپنے بیٹے کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا تو کہا جاتا ہے کہ اس سے ملوکیت کا آغاز ہوا۔ دنیا کے عام تصور کے مطابق بھی ایک فرد کی حکومت کو پہلے ملوکیت (Monarchy) یا شخصی اقتدار (Autocracy) کہا جاتا تھا اور اب اسے آمریت (Dictatorship) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی عام تصور کے مطابق اگر کسی ملک پر اس ملک کے رہنے والوں کی حکومت ہے تو اسے آزادی کہا جاتا ہے اور اگر اس پر کسی دوسرے ملک کی قوم حکمران ہے تو اسے محکومی کہا جاتا ہے۔ آزادی اور محکومی کا یہ تصور تو دنیا میں اب تک موجود ہے لیکن انقلابِ فرانس نے ایک جدید سیاسی نظام کو جنم دیا جسے جمہوریت یا ڈیموکریسی کہہ کر پکارا گیا۔ لفظی طور پر تو اس کا مفہوم ہے پوری کی پوری قوم کی حکومت لیکن عملاً اس سے مراد ہے نمائندگانِ قوم میں سے اس پارٹی کی حکومت ہو جسے اکثریت حاصل ہو یعنی اس میں اقتدارِ مملکت، ایک فرد کے بجائے ایک گروہ کو حاصل ہوتا ہے۔ میں اس وقت اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ دو سو سال کے تجربے نے اس جمہوریت کے متعلق خود یورپ کے اربابِ فکر و نظر اور اصحابِ سیاست و عمرانیت کو کس نتیجے پر پہنچایا ہے اور وہ کس طرح اس سے تنگ آچکے ہیں۔ میں اس وقت اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ مغربی جمہوریت کی مشینری ایسی ہے جس کی رو سے وہی لوگ قوم کے نمائندوں کی حیثیت سے منتخب ہو سکتے ہیں جنہوں نے کسی نہ کسی طرح دولت سمیٹ کر معاشرہ میں اثر و رسوخ حاصل کر لیا ہو، لہٰذا اس طرزِ حکومت سے جس گروہ کے ہاتھ میں زمامِ اقتدار آتی ہے، وہ صلاحیت و قابلیت یا سیرت و کردار کی رو سے قوم کا منتخب طبقہ نہیں ہوتا، مفاد پرستوں ہی کا ایک گروہ ہوتا ہے لہٰذا ملوکیت و آمریت اور جمہوریت میں فرق اتنا ہی ہوتا ہے کہ ملوکیت میں بزنس و کاروبار، ایک فرد کی ملکیت ہوتا ہے۔ جمہوریت میں یہ ایک لمیٹڈ کمپنی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ مقصد دونوں کا سلب و نہب (Exploitation) ہوتا ہے۔

قرآن کریم نے انسانی آزادی اور محکومی کا بنیادی تصور ہی بدل دیا۔ اس نے کہا کہ انسانوں پر حکومت کا حق کسی کو حاصل ہی نہیں نہ ایک فرد کو اور نہ کسی جماعت کو۔

(۱) مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ نہیں ہے مناسب کسی انسان کے لیے کہ

وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِن دُونِ اللَّهِ (آل عمران:۷۹)

(جب) عطا فرما دے اللہ تعالیٰ کتاب اور حکومت اور نبوت تو پھر وہ کہنے لگے لوگوں سے کہ بن جاؤ میرے بندے اللہ کو چھوڑ کر۔

(۲) إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ (یوسف:۴۰)

نہیں ہے حکم (کا اختیار کسی کو) سوائے اللہ تعالیٰ کے

اور اس کی عملی شکل یہ ہے کہ کاروبارِ مملکت، خدا کی نازل کردہ کتاب کے مطابق سرانجام پائے۔

(۳) وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (المائدہ:۴۴)

اور جو فیصلہ نہ کرے اس (کتاب) کے مطابق جسے نازل فرمایا اللہ نے تو وہی لوگ کافر ہیں۔

(۴) فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (المائدہ:۴۵)

تو وہی لوگ ظالم ہیں۔

انسانوں کو حاکم اور محکوم کے طبقات میں تقسیم کر دینے سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے؟

لہٰذا قرآن کی رو سے مملکت، قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنے کی ایجنسی ہے اور یہ فریضہ اُمت کے باہمی مشورہ سے سرانجام پاتا ہے کہ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (شوریٰ:۳۸) ان کے تمام کام باہمی مشوروں سے طے ہوتے ہیں۔ اس تصور کی رو سے ایک ملک پر اگر خود اس ملک کے رہنے والے حکمران ہوں اور حکومت کا انداز مغربی جمہوریت بھی ہو لیکن کاروبارِ مملکت' خدا کی کتاب کے مطابق سرانجام نہ پا رہا ہو تو وہ آزادی نہیں غلامی ہے۔ اسے ملوکیت کہا جائے گا لیکن اگر نظامِ مملکت، قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل ہوں اور امورِ مملکت امت کے باہمی مشورے سے طے پائیں تو یہ آزادی ہے، خواہ طرزِ حکومت (Form of Governament) کسی قسم کا ہو، اسے ہماری اصطلاح میں "خلافت" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں تصوراتِ حکومت (ملوکیت اور خلافت) ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک اسلامی اور دوسرا غیر اسلامی۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ صدارتی نظامِ جمہوریت غیر اسلامی ہے اور پارلیمانی سسٹم مطابقِ اسلام ہے تو یہ محض سیاسی نعرہ بازی ہے۔ اسلامی نظامِ جمہوریت اس کے سوا کچھ نہیں کہ قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے قوم کے مشورہ سے کاروبارِ مملکت سرانجام پائے۔ صدیوں کی ملوکیت کے خواب آور اثرات سے مسلمان، خلافت کے تصور کو فراموش کر چکا ہے۔ دوسری طرف یورپ نے نظامِ جمہوریت کے حق میں اس قدر پروپیگنڈہ کیا کہ ساری دنیا اس سے مسحور ہو گئی اور یہ سمجھنے لگی کہ جنت سے نکلے ہوئے آدمی نے پھر سے فردوس گم گشتہ کو پالیا ہے وہ اس نظام کو آئینہ رحمت اور نوعِ انسانی کے لئے سحابِ کرم خیال کرتی ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی خود مسلمان بھی اسے انعامِ خداوندی سمجھنے لگا اور یہ آوازیں چاروں طرف سے اُٹھنا شروع ہو گئیں کہ نظامِ جمہوریت عین مطابق اسلام ہے۔ اس ہنگامہ ہائے ہوس اور تلاطمِ شور و شغب میں جب کہ ساری فضا اس قسم کے نعروں سے گونج رہی

تھی، علامہ اقبالؒ کی فراستِ قرآنی نے اس فتنہ کو بھانپا اور اپنی بھرپور آواز سے مسلمانوں کو للکار کر کہا کہ اس فریب میں مت آؤ۔

ہے وہی سازِ کہن، مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب تو سمجھتا ہے کہ یہ آزادی کی ہے نیلم پری!
(ب۔د:۲۶۱)

علامہؒ نے کہا کہ یاد رکھو! نظامِ حکومت جمہوری ہو یا شخصی اگر اس کی اساس خدا کی کتاب پر نہیں تو وہ ملوکیت ہے۔اس کے برعکس جس نظام کی بنیاد ضابطۂ قوانینِ خداوندی پر ہے وہ عین اسلام ہے۔اسے خلافت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

خلافت بر مقامِ ما گواہی است حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
(خلافت ہمارے مقامِ (بلند) پر گواہی دے رہی ہے، جسے بادشاہت کہتے ہیں۔وہ ہمارے لئے حرام ہے)
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است (ا۔ح:۹۷۲)
(بادشاہت سراسر مکروفریب ہے، جبکہ خلافت ناموسِ الٰہی (اخلاقِ اعلیٰ) کی محافظ ہے۔)

اس لئے ہر وہ نظام جس میں غیر قرآنی قوانین رائج ہوں ملوکیت ہے اور ظلم واستبداد کا مظہر!

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی
(ب۔ج:۳۳۲)

مذہبی پیشوائیت

آپ انسانی نفسیات پر غور کیجئے دنیا میں کوئی انسان بھی کسی کا محکوم اور غلام بننا نہیں چاہتا۔اس کی طبیعت ان زنجیروں کے خلاف اِبا کرتی ہے۔پھر یہ کیا ہے کہ انسانوں کا گروہِ عظیم، ایک انسان یا انسانوں کے گروہ کی محکومی اور غلامی پر اس طرح رضامند ہو جاتا ہے کہ اس کے خلاف بغاوت کرنا تو ایک طرف اس کے دل میں اس کے خلاف نفرت کا جذبہ تک پیدا نہیں ہوتا! یہ کام مذہبی پیشوائیت کرتی ہے۔اس کی سحر آفرینی کا اثر ہے کہ

صید خود صیاد را گوید بگیر! (ج۔ن:۷۲۵)
(شکار خود شکاری کو کہتا ہے کہ مجھے پکڑ لو۔)

برہمن عوام کو یہ کہہ کر افیون پلاتا ہے کہ راجہ ایشور کا اوتار ہے۔کلیسا کا اُسقف، سادہ لوح انسانوں سے کہتا ہے کہ بادشاہ کو حقوقِ خداوندی (Divine Rights) حاصل ہوتے ہیں۔محراب ومنبر سے یہ سحر آفریں الفاظ دھرائے جاتے ہیں "اَلسُّلْطَانُ ظِلُّ اللّٰہِ عَلَی الْاَرْضِ" (بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہے۔) اسی

لئے بادشاہ کے حکم کی تعمیل درحقیقت اطاعتِ خداوندی ہے جو اس سے سرتابی کرتا ہے وہ خدا کی معصیت کرتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ رسمی واعظ اس قسم کے الفاظ کہتا رہتا ہے کہ دنیا قابلِ نفرت شئے ہے، اس سے دور بھاگو۔ اس دنیا کی قوت و دولت، ثروت و حشمت، زیب و زینت، فاسق و فاجر لوگوں کے لئے ہے۔ خدا کے بندوں کی دنیا آخرت ہے۔ انہیں اسی پر نگاہ رکھنی چاہئے اور آخرت کے حصول کے لئے وہ چند بے روح عقائد اور بے جان رسومات کو عینِ دین قرار دے کر لوگوں کو ان میں زیادہ سے زیادہ منہمک رکھتا ہے تا کہ ان کی نگاہ دوسری طرف اٹھنے ہی نہ پائے۔

مذہبی پیشوائیت، عوام کو اس فریب میں مبتلا رکھتی ہے تا کہ ملوکیت کو اپنی سلب و نہب میں کسی قسم کا خطرہ نہ رہے۔ اس طرح ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا ساجھا ہو جاتا ہے۔ راجہ برہمن کی رکھشا یعنی حفاظت کرتا ہے اور برہمن راجہ کو اشیر باد یعنی دعا دیتا ہے۔ کنگ کلیسائی نظام کے لئے جاگیریں مقرر کرتا ہے۔ کلیسا، بادشاہ کے حقوقِ خداوندی کا محافظ بنتا ہے۔ سلطان، مذہبی پیشواؤں کے وظائف مقرر کرتا ہے اور مذہبی پیشوا برسرِ منبر اس کے لئے تائید و نصرت الٰہی کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔ یہ ملوکیت اور برہمیت کی وہ ملی بھگت ہے جس سے استبداد کے فولادی پنجہ کی گرفت کبھی ڈھیلی نہیں ہونے پاتی۔ یاد رکھیے! ہامان کی مدد کے بغیر کسی فرعون کی فرعونیت ایک دن بھی نہیں چل سکتی۔

ابھی فرعون زندہ ہے عبورِ نیل باقی ہے
تمنا ہے کہ پھر کوئی موسیٰ دریا شگاف آئے

اسلام نے ملوکیت کے ساتھ مذہبی پیشوائیت کا بھی خاتمہ کر دیا لیکن جب مسلمانوں میں دوبارہ ملوکیت کی نمود ہوئی تو فطری طور پر اس کے ساتھ مذہبی پیشوائیت بھی جلوہ گاہِ محراب و منبر ہو گئی۔ علامہ اقبالؒ نے قوم کو اس مہیب خطرہ سے بھی آگاہ کیا اور عمر بھر سلطانی کے ساتھ ساتھ مُلائی و پیری کے خلاف مصروفِ جہاد رہا۔

نظامِ سرمایہ داری

اس میں شبہ نہیں کہ ملوکیت کی گرہیں کسنے کے لئے پیشوائیت کی سحر آفرینی بڑی موثر ہوتی ہے لیکن اس میں یہ خطرہ ضرور ہوتا ہے کہ اگر لوگوں نے ذرا بھی علم و عقل سے کام لینا شروع کر دیا تو اس طلسمِ سامری کی نگاہ فریبی کا جال دھواں بن کر اڑ جائے گا۔ اس کے لئے ایک اور حربہ استعمال کیا جاتا ہے۔

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ سرکس کا شیر، اتنی مہیب قوتوں کے باوجود، رنگ ماسٹر کے سامنے بکری کیوں بنا رہتا ہے؟ اس لئے کہ اسے متواتر بھوکا رکھا جاتا ہے، بھوک وہ موثر ترین حربہ ہے جس سے بڑے بڑے قوی ہیکل سرکشوں کو گردن جھکانے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ انسانی دنیا میں اس حربہ کا نام نظام سرمایہ داری ہے جو حکمت ابلیسی کا نادر شاہکار ہے۔ یہ عیار طبقہ رزق کے سرچشموں پر سانپ بن کر بیٹھ جاتا ہے

اور اسی طرح جب لوگ روٹی کے لئے اس کے محتاج ہو جاتے ہیں تو ان سے جو کام چاہتا ہے، لیتا ہے۔ دینِ خداوندی، نظامِ سرمایہ داری کے خلاف کھلا ہوا چیلنج تھا۔ وہ اسے جڑ سے اکھیڑنے کے لئے آیا تھا۔ نظامِ سرمایہ داری کی عمارت، فاضلہ دولت یعنی ضرورت سے زیادہ سرمایہ جمع رکھنے کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔ قرآن نے اس بنیاد ہی کو منہدم کر دیا۔

نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد تو فاضلہ دولت (Surplus Money) پر ہوتی ہے لیکن یہ فاضلہ دولت زمانۂ قدیم میں زمینداری سسٹم سے حاصل ہوتی تھی اور عصر حاضر میں نظامِ کارخانہ داری (انڈسٹری) سے اکٹھی کی جاتی ہے۔ قرآن کریم نے نظامِ زمینداری کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ زمین، تمام نوعِ انسان کے لئے رزق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، اس لئے اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ (الرحمٰن:۱۰) اور زمین کو ہم نے تمام مخلوق کے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے۔

اس لئے اسے "سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ" ہر ضرورت مند کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔ اس سے جس قدر رزق پیدا ہوتا ہے اس میں کاشتکار کی محنت شامل ہوتی ہے اور باقی سب کچھ فطرت کی طرف سے بلا مزدوری معاوضہ ملتا ہے۔ زمیندار فطرت کی ان بخششوں کو بھی اپنی ذاتی ملکیت بنا لیتا ہے اور کاشتکار کی محنت کا بیشتر حصہ بھی ہتھیا لیتا ہے۔ قرآن کریم اس حقیقت کو بڑے دل نشین انداز میں بیان کرتا ہے کہ " کیا تم نے اس پر بھی کبھی غور کیا ہے کہ تم جو کھیتی کرتے ہو تو اس میں تمہارا حصہ کس قدر ہوتا ہے اور ہمارا کس قدر، تم زمین میں ہل چلا کر تخم ریزی کر دیتے ہو۔ اس کے بعد کیا اس دانے کو تم اُگاتے ہو یا ہمارا قانون ایسا کرتا ہے؟ اگر ہمارا قانون مشیت یوں ساتھ نہ دیتا تو کھیتی کا اُگنا تو ایک طرف تمہارا بیج بھی ضائع ہو جاتا اور تم سر پکڑ کر بیٹھ جاتے کہ ہم پر مفت میں چٹی پڑ گئی۔ پھر تم نے اس پانی پر بھی غور کیا ہے جس پر زندگی کا اور کھیتی کا دارومدار ہے۔ کیا اسے تم بادلوں سے برساتے ہو یا ہم ایسا کرتے ہیں؟ اگر ہمارا قانون مشیت ساتھ نہ دیتا اور جس طرح کا تلخ اور نمکین پانی سمندر میں تھا ویسا ہی یہ بادلوں سے برستا تو کھیتی کا اُگنا تو ایک طرف تم خود بھی زندہ نہ رہ سکتے۔ پھر کیا تم اس آگ پر غور نہیں کرتے جسے تم جلاتے ہو اور جس کی حرارت میں زندگی کا راز سر بستہ ہے۔ کیا درختوں کی سبز شاخوں میں اس شعلہ سامانی کو ہم نے محفوظ رکھ چھوڑا ہے یا تم نے ایسا کیا ہے؟ ہم نے اس داستان کو اس لئے دہرایا ہے کہ تمہیں ایک فراموش کردہ حقیقت یاد کرا دی جائے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ زراعت کا یہ سارا کاروبار تمہارا اور ہمارا مشترکہ ہے اس لئے اس کے محاصل یعنی پیداوار میں سے تم اپنا حصہ لے لو اور ہمیں ہمارا حصہ دے دو تم پوچھو گے کہ تمہارا حصہ ہم کسے دیں، تو سُن لو کہ اسے بھوکوں کو دے دو یہ ہم تک پہنچ جائے گا۔ (الواقعہ: ۶۳، ۶۴، ۶۸، ۶۹، ۷۱، ۷۲) علامہ اقبالؒ نے انہی آیات کے مفہوم کو اپنے

حسین انداز میں اس طرح بیان کیا ہے۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ کون دریاؤں کی موجوں سے اُٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ ساز گار؟ خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟ موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟
دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں تیرے آباء کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں

(ب،ج:۴۱۱)

پھر علامہؒ نے صنعتی نظام (انڈسٹری) کی چکی میں پسے ہوئے خاک نشین مزدور کو اُٹھا کر گلے لگایا اور آنسو پونچھتے ہوئے کہا کہ۔

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارحیلہ گر شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مُزد یوں ملتی رہی اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

(ب۔د:۲۶۲)

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

(ب۔د:۲۶۳)

یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

علامہ اقبالؒ کا درج ذیل شعر عجیب طریقے سے توحید کے مقصد کو سمجھاتا ہے۔آپؒ نے فرمایا۔

خودی سے ہم طلسمِ رنگ وبو کو توڑ سکتے ہیں یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

(ب۔ج:۳۱۴)

اس شعر سے آپؒ کی مراد یہ ہے کہ اگر خودی ہو تو اس سے طلسم رنگ وبو کو توڑا جا سکتا یعنی کسی گورے کو کالے پر کسی امیر کو کسی غریب پر اور کسی حاکم کو کسی محکوم پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے کیونکہ "اللہ کے نزدیک زیادہ عزّت والا وہی ہے جو زیادہ متقی ہے۔" (الحجرات۔ ۱۳) اس طرح نفی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ سب لوگ ایک جیسے ہیں۔اگر فرق کرنے والی کوئی چیز ہے تو وہ تقویٰ ہے اس طرح سب کو ایک سطح پر لے آنا ہی توحید ہے جس کو عام آدمی نہیں سمجھ سکتا۔

باب ۴۳

فقراء کا زُہد

فقراء کے فقر کا دارومدار ان کے زہد اور تقویٰ کے درجات پر ہے۔ یہ جان لینا چاہئے کہ زُہد صرف حرام چیزوں سے بچنے کا نام نہیں بلکہ اپنے اختیار سے حلال مال کے بے جا استعمال سے بچنے کو ہی زہد کہا جاتا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حرام چیزوں کا ترک زہد میں واجب ہے نہیں بلکہ ترکِ حرام تو عام مسلمانوں کے لئے بھی فرض ہے۔ حلال صورتوں میں زہد اختیار کرنا افضل ہے اور جس قدر اللہ نے دیا ہو اس پر راضی رہنا بہتر ہے۔

علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو دنیا میں دل کو نہ الجھانے کا حکم دیا ہے اور دنیا کے مال کو متاعِ قلیل قرار دیا ہے جبکہ آخرت کو پرہیز گاروں کے لئے مخصوص فرمایا ہے۔ حضرت سفیان ثوریؒ نے فرمایا کہ دنیا سے اعراض کرنا یہ نہیں کہ تو غیر لطیف غذائیں کھائے اور گھٹیا لباس پہنے بلکہ زہد یہ ہے کہ اپنی امیدوں کو چھوٹا اور کم کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ولیوں سے دنیا کو سلب کر رکھا ہے اور اصفیاء کو اس سے محفوظ کر رکھا ہے اور اپنے دوستوں کے دلوں سے دنیا کو نکال دیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ اپنے دوستوں کو دنیا سے محظوظ کرے جیسا کہ سیّدنا علی المرتضیٰؓ کا شعری ارشاد ہے۔

رَضِینَا قِسۡمَةَ الۡجَبَّارِ فِینَا لَنَا عِلۡمٌ وَّ لِلۡجُهَّالِ مَالٌ

(ہم میں خدائے جبار نے جو بانٹ کی اس پر ہم راضی ہیں، ہمارے لئے علم ہے اور جاہلوں کیلئے مال ہے)

لِاَنَّ الۡمَالَ یَفۡنِیٰ عَنۡ قَرِیۡبٍ وَ اِنَّ الۡعِلۡمَ بَاقٍ لَا یَزَالُ

(بیشک مال تو عنقریب فنا ہونے والا ہے، اور علم باقی رہنے والا ہے کبھی زوال پذیر نہ ہوگا۔)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ دنیا اس کا گھر ہے جس کا کوئی گھر نہیں، یہ اس کا مال ہے، جس کا کوئی مال نہیں ہے۔ اس کو وہ جمع کرتا ہے جس کو عقل نہیں۔ اس کے لئے وہ ظلم کرتا ہے جس کو علم نہیں، اس پر وہ حسد کرتا ہے جس کو کوئی سمجھ نہیں اور اس کے لئے وہ کوشش کرتا ہے جس کو یقین نہیں۔ (کیمیائے سعادت)

ایک عارف کی نظر میں دنیا ذلیل وخوار ہے اور اس کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دینا زہد کہلاتا ہے بشرطیکہ ترکِ مباحات بھی ہو کیونکہ ممنوعاتِ شرعیہ کا ترک کرنا تو شرعاً لازم ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسان جس چیز پر قادر ہو اس کا ترک جائز ہے ورنہ مجبوری کا ترک تو مجبوراً زہد ہوگا۔ زہدِ مطلق کا تقاضا یہ ہے ۔۔۔

حشمت اور دنیا کی ہر لذت سے کنارہ کشی کرے تاکہ اس کا بدل آخرت ہو جائے۔ معرفت والوں کے نزدیک زہد یہ ہے کہ دنیا کی چیزوں کی طرح آخرت کو بھی بیچ سے ہٹا دیں۔ حقیقی زہد یہی ہے کہ آخرت کے طمع کو دل سے نکال دے اور مقصود صرف اللہ تعالیٰ کی محبت اور رضا کا حصول ہو۔

اگر کوئی زہد کی خوبصورت مثال دیکھنا چاہے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زندگی پر غور کرے کہ تمام مالِ دنیا ان کے قدموں میں آ گیا لیکن آپؓ اس سے فارغ اور بے نیاز تھے۔ روایات میں آیا ہے کہ آپؓ کے دورِ خلافت میں بیت المال ہر قسم کی چیزوں سے بھر گیا تھا۔ آپؓ کی بیٹی حضرت حفصہؓ (جو حضور اکرم ﷺ کی زوجہ مطہرہ تھیں) نے کہا "ابا جان! اب آپ نرم اور ملائم لباس زیب تن فرمایا کریں اور عمدہ ولذیذ کھانے خود بھی اور اپنے عزیزوں کو بھی کھلایا کریں۔" اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے حفصہؓ! تم نے اتنے سال حضور اکرم ﷺ کے ساتھ گزارے کیا تمہیں ان امور کا علم نہیں کہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے اہلِ بیت کو دن میں ایک بار کھانا نصیب ہوتا، فتح خیبر تک آپ ﷺ نے کبھی سیر ہو کر خرمے نہیں کھائے، رات کو آپ ﷺ کچھ دیر کے لئے کملی کی دو تہیں کر کے لیٹ جاتے۔ آپؓ نے فرمایا کہ حضور اکرم ﷺ کپڑے دھوتے تو جب تک آپ ﷺ کے کپڑے سوکھ نہ جاتے آپ ﷺ باہر نہ نکل سکتے کیونکہ آپ ﷺ کے پاس صرف ایک ہی جوڑا ہوتا تھا۔ ایک عورت جو آپ ﷺ کے لئے چادر اور تہبند بُن رہی تھی اس نے آپ ﷺ کے لئے ایک جوڑے میں سے صرف ایک کپڑے کو تیار کر کے آپ ﷺ کے پاس بھیج دیا کیونکہ اس وقت آپ ﷺ کے پاس پہننے کے لئے کچھ نہ تھا۔ یہ باتیں سن کر حضرت حفصہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما اتنا روئے کہ آنسوؤں کا تانتا بندھ گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میرے دو محبوب (حضور اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) مجھ سے پہلے جا چکے ہیں اگر میں ان کی راہ پر نہ چلوں تو میں ان تک کیسے پہنچ سکوں گا۔ آج ہم ان تینوں ہستیوں کو ایک جگہ پر مدفون دیکھ کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی ان دونوں کی راہ پر چلے اور بالآخران کے ساتھ مل گئے۔ (اس واقعہ کی مکمل تفصیل ہماری تصنیف "نشانِ منزل" کے آخری صفحات میں دیکھیں۔)

روایات میں آتا ہے امیر المومنین حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اپنے زمانۂ خلافت میں اپنے ایک غلام کو ساتھ لے کر بازار گئے اور اس سے فرمایا کہ تم دکان سے کچھ کپڑے پسند کر لو۔ غلام نے بہت قیمتی کپڑے کا انتخاب کیا جو اس کے خیال میں امیر المومنینؓ کی شان کے شایان تھا لیکن امیر المومنین نے دکاندار کو کہا کہ یہ سستا سا کپڑا میرے لئے دے دیں۔ غلام بولا کہ میں نے یہ قیمتی لباس آپؓ کے لئے پسند کیا ہے کیونکہ آپؓ آقا ہیں اور امیر المومنین ہیں۔ آپؓ نے فرمایا یہ مہنگا کپڑا تمہاری پسند ہے۔ میری پسند تو یہ سستا لباس ہے۔

زہد اور تقویٰ کے متعلق اس روایت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ رابعہ بصریؒ نے ایک بار اپنی قمیص میں

ایک پیوند شاہی مشغل کی روشنی میں لگایا جس کی وجہ سے ان کے دل کا سکون جاتا رہا اور جب انہیں اس بات کا احساس ہوا تو اپنی قمیص کو پھاڑ ڈالا۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے خلفائے راشدینؓ جیسے زہد اور تقویٰ کو اختیار کیا۔ ایک دن آپؒ نے اپنے غلام سے دریافت فرمایا کہ لوگ ہمارے متعلق کیا کہتے ہیں؟ غلام نے کہا لوگ کیا کہیں گے سب مزے میں ہیں، البتہ میں اور آپ سخت مصیبت میں ہیں۔ آپؒ نے پوچھا وہ کیسے؟ کہا میں نے آپ کو خلیفہ بننے سے پہلے بھی دیکھا ہے آپ عطر میں بسا ہوا لباس فاخرہ پہنتے تھے، اچھی سواریوں پر چڑھتے تھے، اچھا کھانا کھاتے تھے، جب آپؒ حاکم بنے تو میں نے خیال کیا کہ اب میں کچھ آرام پاؤں گا لیکن خلافت پانے کے بعد آپؒ خود بھی مصیبت میں گرفتار ہو گئے اور ہمارا حال بھی برا ہے۔ یہ سن کر آپؒ نے غلام کو آزاد کر دیا اور فرمایا کہ مجھے میرے حال پر اس وقت تک چھوڑ دو جب تک اللہ تعالیٰ مجھے چھٹکارا نہ دے۔ روایات میں آتا ہے کہ آپؒ مسندِ خلافت پر متمکن ہونے سے پہلے بہت نرم کپڑا پہنتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر یہ کپڑا اور بھی نرم ہوتا تو زیادہ ہی بہتر ہوتا لیکن خلافت کے بعد سخت اور کھردرا کپڑا پہنتے اور فرماتے کہ اگر یہ اور بھی کھردرا ہوتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔

علامہ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے کسی عزیز نے تحفہ میں انہیں سیب بھیجے تو انہوں نے لوٹا دیئے، کسی نے کہا جناب! ہدیہ تو خود رسول اللہ ﷺ قبول فرما لیا کرتے تھے؟ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے جواب دیا "رسول کریم ﷺ کے لئے وہ ہدیہ ہوتا تھا مگر ہمارے لئے یہ رشوت ہے۔" روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے گھر دو چراغ تھے۔ جب انہیں سرکاری خطوط لکھنا ہوتے تو سرکاری چراغ جلاتے اور ذاتی کام کرتے تو ذاتی چراغ جلاتے اور سرکاری چراغ بجھا دیتے۔

تقویٰ اور زہد کی ایک مشہور روایت یاد آتی ہے کہ حضرت بشر حافیؒ نے جب قرآن پاک کی آیت وَ السَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّ اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَ الْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ﴿۴۸﴾ (الذریٰت: ۴۷) (اور ہم نے ہی آسمان کو ہاتھوں سے بنایا اور ہم نے ہی اس کو وسیع کر دیا اور زمین کو ہم نے بچھایا اور ہم کیسے اچھے بچھانے والے (فرش بنانے والے) ہیں۔ سنی تو فوراً آپؒ نے اپنی جوتیاں اتار دیں اور فرمایا کہ میں اللہ کے دستر خوان پر جوتیوں کے ساتھ کیسے چل سکتا ہوں۔ آپؒ کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ جب بھی آپؒ مشتبہ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتے تو آپؒ کے بازوؤں کے بال کھڑے ہو جاتے اور آپؒ اسی وقت اس کھانے سے اپنا ہاتھ روک لیتے۔ اس کے برعکس ایک اور مثال ہمارے مطالعہ میں آئی ہے کہ حضرت معروف کرخیؒ کو جب بھی کوئی چیز کھانے کے لئے پیش کی جاتی تو آپؒ اسے تناول فرمانے سے گریز نہ فرماتے اور فرمایا کرتے تھے کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں جو چیز ہمیں وہ بھیجتے ہیں ہم کھا لیتے ہیں۔

دنیا سے بے رغبتی اور زہد کی ایک اور مثال ہمیں اس فقیر کی ملتی ہے جو حضرت ابو علی دقاقؒ کے پاس آیا اور جس نے ٹاٹ کا کرتہ اور ٹاٹ کی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ ان کے شاگردوں میں سے کسی نے تفریح کے طور پر کہا کہ یہ ٹاٹ کتنے میں خریدا ہے تو اس فقیر نے جواب دیا میں نے یہ ٹاٹ دنیا دے کر خریدا ہے اور بیچنے والے نے مجھ سے کہا کہ اسے میرے پاس بیچ دو اور آخرت لے لو مگر میں نے نہیں بیچا۔

کہتے ہیں ایک عورت امام احمد بن حنبلؒ کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ ہم اپنے مکان کی چھت پر سوت کاتتے ہیں لیکن جب قبیلہ طاہرہ کی مشعلیں ہمارے سامنے سے گزرتی ہیں تو ان کی شعاعیں ہم پر پڑتی ہیں۔ کیا ان کی شعاع میں ہمارے لئے سوت کاتنا جائز ہے؟ امام احمدؒ نے پوچھا "پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟ اس عورت نے جواب دیا کہ بشر حافیؒ کی بہن ہوں۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ رو پڑے اور کہا کہ ایسی سچی اور پرہیز گاری تو تمہارے گھر سے ہی نکلی ہے۔ تم ان کی شعاعوں میں سوت نہ کاتا کرو۔

فقیرانہ زہد کی حقیقت

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ فقیر وہ ہے کہ جس چیز کی اسے حاجت ہو وہ اس کے پاس نہ ہو اور اس کا پاس ہونا بھی اس کے اختیار میں نہ ہو۔ فرماتے ہیں کہ انسان کو اپنے وجود کے بقا کی بھی حاجت ہے اور اس کی بقا کے لئے غذا، خوراک، مال و دولت، کپڑا، مکان وغیرہ کی حاجت ہے اور یہ سب اس کے اختیار میں نہیں ہیں۔ وہ ان سب کا محتاج ہے "اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ" سے مراد یہی ہے غنی محض اللہ کی ذات ہے اور باقی سب جن، انسان، فرشتے اور شیاطین کی ہستی کی بقا ان کی اپنی ذات سے نہیں اسی لئے فرمایا۔

هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ یَّبْخَلُ ۚ وَ مَنْ یَّبْخَلْ فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ الْغَنِیُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ (محمد: ۳۸)

ہاں تم ہی وہ لوگ ہو جنہیں دعوت دی جاتی ہے کہ (اپنے مال) خرچ کرو اللہ کی راہ میں پس تم میں سے کچھ بخل کرنے لگے اور جو شخص بخل کرتا ہے وہ اپنی ذات سے بخل کر رہا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ تو غنی ہے (کسی کا محتاج نہیں) بلکہ تم اس کے محتاج ہو۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اپنے کردار میں گروی رکھا ہوا ہوں اور اس کردار کی کنجی کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ پس مجھ سے بڑھ کر فقیر کون ہے؟

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ تصوف کے اعتبار سے فقیر وہ ہے جو یہ سمجھے کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں، نہ دنیا کی اور نہ آخرت کی چیزیں اس کے اختیار میں ہیں۔

مشائخ کا قول ہے کہ دین کا مدار چار اصولوں پر ہے۔

۱۔ نفس ۲۔ دنیا

۳۔ آخرت ۴۔ حق تعالیٰ

ان میں سے دو کا ترک کرنا (نفس اور دنیا) اور دو کا طالب ہونا (آخرت اور حق تعالیٰ) لازم ہے۔ خوف اور صبر تو فقر کے مقدمات ہیں (ابتداء) دنیا کی دوستی باعثِ ہلاکت ہے اور اس کا علاج ضروری ہے اور اس کی شرح معلوم ہونا بھی ضروری ہے۔

فقراء کی شان

حضرت ابراہیم دسوقی قرشیؒ کا قول ہے کہ جب فقیر اللہ تعالیٰ کی طرف رُخ کرنے میں سچا ہوگا تو اس کے لئے اضداد پلٹ جائیں گی چنانچہ جو اس سے بغض رکھتا ہے فقیر اس کو دوست رکھے گا جس نے اس کو الگ کر دیا وہ اس کو ملا دے گا۔ جو اس کو پسند نہیں کرتا وہ اس کی ستائش کرے گا اس کو صرف گناہ گار اور منافق ہی برا سمجھے گا۔ آپ کا قول ہے کہ اگر مرید کسی دن اپنا وظیفہ موقوف کر لیتا ہے تو ضرور اللہ تعالیٰ اس دن اس سے اپنی مدد کو روک لیتا ہے۔ آپؒ نے فرمایا کہ جس شخص کے اعمال واقوال اس چیز کی یافت (حاصل کرنے) سے روکیں جس کو تو چاہتا ہے وہ شخص مقامِ توحید اور مقامِ تفرید سے محروم ہے۔ فرماتے ہیں کہ ولی اپنے رب کی طرف جست نہیں کرتا جب تک اللہ کے ماسوا کے ساتھ وقوف کو ترک نہ کرے خواہ وہ کوئی مقام ہو یا کوئی درجہ۔

اگر تم رب کے ساتھ مجتمع ہونا چاہتے ہو تو مخلوق میں سے کسی کی نسبت اپنے دل میں برائی کو جگہ دینے سے پاک وصاف کرو۔ جب تک تمہاری زبان حرام چکھتی رہے گی اس وقت تک اس بات کی طمع نہ رکھو کہ تم حکمتوں اور معرفتوں کا کچھ بھی مزہ چکھو گے۔ آپؒ کا قول ہے کہ اللہ عزّ وجل فقیر کو کسی امر میں اسی لئے مبتلا فرماتا ہے کہ وہ اس کو مردانِ خدا کی منزلوں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ آپؒ نے فرمایا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے اس بات کی بیعت کی ہے کہ میں تمہارے مال کا جویا نہ رہوں گا اور نہ تمہاری میراث لوں گا اور تمہارے قبضہ کی چیز سے میں اپنے خرقہ کو میلا نہ کروں گا۔ حضرت ابوالحسن خرقانیؒ کا طریقہ یہ تھا کہ فقیرانہ لباس اور گودڑی لپیٹنے سے اعراض کرتے کیونکہ یہ لباس بآوازِ بلند کہتا ہے کہ میں فقیر ہوں مجھے کچھ عطا کرو اور فقیر کا راز فاش کرتا ہے۔

حضرت ابراہیم دسوقی قرشیؒ کے پاس کسی فقیر نے آکر خرقہ پہننے کی درخواست کی تو آپؒ نے اسے کہا کہ میاں صورت بنالینا کوئی اچھی بات نہیں۔ خرقہ پہننا صرف اس کو زیب دیتا ہے جس کو زمانے نے رگڑے دیئے ہوں جس نے راستہ کی کڑیاں جھیلی ہوں جس کا معاملہ خلوص کے ساتھ ہو اور جس نے اس خرقہ کے رموز کے معانی پڑھے ہوں اس کی اخبار پر نگاہ ڈالی ہو اور اس کے ساری حرکات وسکنات، سفر وحضر اور خلوت وجلوت میں اُس کے مقصود کو پہچانا ہے۔ آپؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے اس طریقہ کی بنا صرف شور افزا دریا، دہکتی ہوئی

آگ، بھوک اور کمزور جسم پر رکھی ہے۔ اس میں نہ زبان آوری ہے نہ لاف زنی ہے۔

علامہ اقبالؒ کا فقراء کے زُہد پر کلام

علامہ اقبالؒ کے مطابق زُہد و تقویٰ یہ ہے کہ جس کام کو بھی کیا جائے تو وہ صرف اللہ کے لئے کیا جائے۔ ایسے کام کی جزا ہی کچھ اور ہوتی ہے۔

تو ابھی رہ گزر میں ہے قیدِ مقام سے گزر!
مصر و حجاز سے گزر، پارس و شام سے گزر!
جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے
حور و خیام سے گزر، بادہ و جام سے گزر!
(ب۔ج:۳۲۱)

علامہ اقبالؒ کا اکثر کلام دینِ اسلام، اتباعِ شریعت اور کردار سازی سے متعلق ہے۔ آپؒ نے اوصاف حمیدہ اور اسلام کے تقریباً ہر موضوع پر کلام کیا ہے آپؒ کے چند اشعار جو زُھد اور تقویٰ کی بنا پر لکھے گئے نیچے پیش کئے جا رہے ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے زُھد اور رندی پر ایک نظم بھی لکھی ہے۔ جس میں آپؒ نے فرمایا ہے کہ ان کے پڑوس میں ایک زاہد صاحب رہتے تھے اور علامہؒ کے متعلق لوگوں کو شکایت کے لہجہ میں بہت باتیں کرتے تھے۔ ان باتوں کی خبر علامہؒ کو بھی ہوئی تو انہوں نے بانگِ درا میں زُہد اور رندی پر ایک نظم لکھی ہے فرمایا کہ ایک بار موصوف زاہد صاحب کی ملاقات حضرت علامہؒ سے ہوگئی تو انہوں نے ان شکایات کا لمبا سا بیاں ان کو سنایا۔ آپ کی یہی باتیں زھد کی بنیاد ہیں۔ اس پر علامہؒ نے فرمایا۔

میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا
گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں
کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی
اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے!
(ب۔د:۵۹)

بانگ درا میں ہی غزلیات سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

عجب واعظ کی دینداری ہے یارب!
عداوت ہے اسے سارے جہاں سے
بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں
لرز جاتا ہے آوازِ اذاں سے!(ب۔د:۹۹)
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں
(ب۔د:۱۰۴)

فرماتے ہیں کہ دیدار الٰہی زُہد سے بھی بہتر ہے۔

تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو
کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں (ب۔د:۱۰۵)
کشادہ دستِ کرم جب وہ بے نیاز کرے
نیاز مند نہ کیوں عاجزی پہ ناز کرے
بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تونے اے واعظ!
خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے
مری نگاہ میں وہ رند ہی نہیں ساقی
جو ہوشیاری و مستی میں امتیاز کرے
غرورِ زہد نے سکھلادیا ہے واعظ کو
کہ بندگانِ خدا پر زباں دراز کرے
(ب۔د:۱۰۶)

عشق کی منزل علامہ اقبالؒ کی نظر میں اس قدر بلند ہے کہ وہ ملاّ وزاہد اور حکیم سے بھی بالاتر ہے۔ یہی زُہد حقیقی ہے جس میں عشق کی آمیزش ہو۔

عقل عیّار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بے چارہ نہ مُلاّ ہے نہ زاہد نہ حکیم!
(ب۔ج:۳۵۲)

باب ۳۴

فقراء کی مختلف اقسام

یوں تو فقراء کی بہت سی قسمیں ہیں مگر مزاج کے اعتبار سے فقراء کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک جلالی مزاج اور دوسری جمالی مزاج۔ یہ مقام اس بحث میں الجھنے کی اجازت نہیں دیتا کہ طبیعتوں کا امتزاج کن باتوں پر منحصر ہے۔ مختصر جائزہ لینے کے لئے یہ کہا جاتا ہے کہ ارواح جب دنیا میں آتی ہیں تو روح بسیط، عدم بسیط، نفس بسیط اور عقل بسیط کے دائروں سے ہوتی ہوئی اپنی اپنی بساط کے مطابق ہر طبقے کے اثرات قبول کرتی ہیں اور ان اثرات کا ان کی طبیعتوں اور مزاجوں پر رنگ نمودار ہوتا ہے۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ جب روحوں کو پیدا کیا گیا تو ہر روح ایک مخصوص مزاج لے کر آئی اور غالباً یہ روحوں کا ایک دوسرے سے مختلف ہونا اس بات پر انحصار کرتا تھا کہ کون سی روح اللہ تعالیٰ کے قرب میں کس قدر متوجہ رہی اور اس کو اللہ تعالیٰ کا کس قدر قرب حاصل ہوا۔

احادیث میں آیا ہے کہ سب سے پہلے حضور اکرم ﷺ کی روح کو پیدا کیا گیا اور اس کو (حضرت جبرئیل علیہ السلام کے قول کے مطابق ستر ہزار ۷۰۰۰۰ سالوں سے زائد) اللہ تعالیٰ نے اپنے قُرب میں رکھا چنانچہ حضور اکرم ﷺ کو اس قدر طویل قرب حاصل ہوا جو کسی اور روح کو نہ ہو سکا۔ حدیث شریف میں اس طرح آتا ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے دریافت کیا کہ آپ کی عمر کتنی ہے تو انہوں نے عرض کیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے مجھے پیدا فرمایا تو اس وقت صرف ایک ستارے کا نور موجود تھا اور وہ ستارہ ستر ہزار برس کے بعد نظر آتا تھا۔ میں نے اس کو ستر ہزار بار دیکھا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " یَاجِبْرَئِیْلُ اَنَا ذٰلِکَ الْکَوْکَبُ الدُّرِّیُّ " (یعنی اے جبرئیلؑ! وہ چمکنے والا ستارہ میں ہی تھا۔ (انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون، یعنی سیرۃ حلبی) اس اعتبار سے کسی نبی یا ولی کو حضور اکرم ﷺ جتنا قرب حاصل کرنے کا شرف حاصل نہ ہو سکا یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کا کوئی بھی ہمسر نہ تھا اور نہ ہے۔

صوفیاء کا قول ہے کہ جس قدر انبیائے کرام پیدا ہوئے، اسی قدر انسانی مزاج بھی پیدا کئے گئے، لہٰذا اگر کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیائے کرام دنیا میں تشریف لائے تو اس قدر مزاجوں کا امتزاج یا مزاجوں کی تعداد تھی اور ہر زمانے میں ایک مزاج ایک کے بعد دوسرے تیسرے اور مختلف اشخاص میں منتقل کئے جاتے

ہیں، گویا ایک شخص فوت ہوتا ہے تو وہ مزاج کسی دوسرے میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع میں ان تمام مزاجوں کو حج میں موجود ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کرامؓ میں منتقل کیا اور آج تک یہ مزاج منتقل کئے جاتے ہیں۔

درج بالا اقوال اولیائے کرام کے فرمودات میں موجود ہیں اور ان کی تصدیق سورۃ الفتح کے آخری رکوع آیت نمبر ۲۹ سے بھی ہوتی ہے، جہاں فرمایا گیا ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۗ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۖ (الفتح:۲۹)

محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور ان کے ساتھ والے، کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں نرم دل ہیں، تو انہیں دیکھے گا رکوع کرتے، سجدے میں گرتے، اللہ کا فضل و رضا چاہتے ہوئے۔

درج بالا آیت میں چار مزاجوں کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ چار مزاج حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ میں موجود تھے۔ ان چار پیغمبروں کے مزاجوں کو چاروں صحابہ کبار یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ میں منتقل کیا گیا۔ اگر ذرا سا غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان چاروں صحابہ کرامؓ کا مزاج مذکورہ چار رسولوں سے ملتا جلتا تھا۔ کون نہیں جانتا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مزاج حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح عشق و محبت اور مناجات کی طرف راغب تھا اور تمام عمر حضور اکرم ﷺ کی معیت میں رہے (یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر، بچپن، جوانی، غار، قبر، جنت اور آخرت کے ساتھی ہیں۔) لہٰذا مذکورہ آیت میں "مَعَهٗ" کا اشارہ ان کے اس مزاج کی طرف دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح پرجلال، سختی کی طرف مائل اور سخت گیر تھے، لہٰذا قرآن میں "اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ" کا اشارہ ان کے مزاج کی طرف ہے۔ عَلٰی ھٰذَا الْقِیَاسِ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح نرم مزاج، حلیم الطبع اور رقیق القلب تھے، لہٰذا "رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ" کا اشارہ ان کے مزاج کی عکاسی کرتا ہے۔ چوتھے صحابی حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے جن کے متعلق حضور اکرم ﷺ فرمایا کرتے تھے "اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا" (جامع الصغیر: ج ۱ ص ۱۰۷) (یعنی میں علم کا شہر ہوں اور علی کرم اللہ وجہہ اس کا دروازہ ہیں۔) اور فرمایا "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ" (جامع ترمذی: ص ۶۱۶، کنز العمال: ج ۶ ص ۳۹۷) (یعنی جس کا میں مولا ہوں علی کرم اللہ وجہہ بھی اس کے مولا ہیں۔) ان نسبتوں کے ساتھ حضور اکرم ﷺ کا مزاج (علم، روحانیت، سلسلہ فقر، عبادات وغیرہ) حضرت علی رضی اللہ عنہ میں منتقل کیا گیا۔ علی ہذا القیاس تمام صحابہ کرامؓ میں تمام انبیائے کرام علیہم السلام کے مزاجوں کو منتقل کیا گیا اور یہ سلسلہ اس اُمت میں اب تک تمام فقراء میں وراثتاً

جاری ہے۔

مذکورہ بالا مزاجوں کے بیان کرنے کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ آ جائے گی کہ حضرت ابوذر غفاریؓ تنہائی پسند تھے اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بہت پرسوز اور رقت آمیز تلاوت فرماتے، حضرت ابوہریرہؓ اور دیگر اصحاب صفہ ہروقت ذکر وفکر میں مشغول رہتے، حضرت سلمان فارسیؓ نے امارت کو چھوڑ کر فقر اختیار کیا، حضرت صہیب رومیؓ نے اسلام کی خاطر سخت سزاؤں کی بھی پرواہ نہ کی، حضرت بلال حبشیؓ گرم ریت پر بھی احد احد کا نعرہ بلند کرتے رہے اور حضور اکرم ﷺ کے وصال کے بعد اذان دینے کا عمل قطعاً منقطع کر دیا۔ حضرت امام حسینؓ نے یزید کی بیعت سے انکار کر کے اپنے سر کو اصولوں کی خاطر کٹوا دیا۔ مذکورہ ناموں کے علاوہ ہر درویش اور فقیر ایک خاص مزاج کا حامل ہوتا ہے اور اپنے اس مزاج کے مطابق منفرد مقام پیدا کر لیتا ہے۔

فقراء میں اکثر اور بیشتر لوگ تو نرم مزاج ہوتے ہیں اور اگر کوئی کام طبیعت کے خلاف ہو جائے تو فوراً نرم مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سلسلۂ فقر کے مقتدیٰ تھے اور اکثر اولیائے کرامؒ کا سلسلہ آپؓ سے ہی جاری ہوا۔ آپؓ غصہ کی حالت میں بھی عفو و درگزر سے کام لیتے اسی طرح دوسرے اولیائے کرامؒ سے بھی بہت سی روایات دیکھنے میں آتی ہیں جس میں ان کی منفرد سیرت کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ اگر ہم محمود اور ایاز رحمۃ اللہ علیہما کی زندگیوں کو دیکھیں تو ان کی زندگی کے بہت سارے واقعات سامنے آتے ہیں۔ حضرت ایازؒ ایک گڈریا تھے اور اپنی محبت اور ادب کے خصائل کے باعث محمود غزنویؒ کے مقرب ترین وزیر بن گئے اس قدر بڑے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود حضرت ایازؒ (جن کا مقبرہ لاہور کی شاہ عالمی مارکیٹ میں ہے) رات کو جب تہجد کی نماز پڑھتے تو گڈریوں کا لباس پہن کر نماز ادا کرتے اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی صورت کو دیکھ کر کہتے اے ایاز اپنی اصلیت کو بھول نہ جانا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بھی بہت سی نرم مزاجی کی روایات ملتی ہیں۔ منقول ہے کہ ایک بار آپؓ نے اپنے ایک غلام کو تین بار پکارا اور جب وہ ان کے پاس حاضر نہ ہوا تو آپ نے ساتھ والے کمرے میں جا کر دیکھا تو وہ غلام بڑے آرام سے لیٹا ہوا تھا۔ آپؓ نے دریافت فرمایا کہ کیا تم نے میری آواز نہیں سنی، تو اس نے اثبات میں جواب دیا۔ آپ نے پوچھا تم پھر کیوں نہیں آئے۔ غلام نے جواب دیا کہ میں اس لئے نہیں آیا کہ مجھے معلوم تھا کہ آپ کچھ نہیں کہیں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس غلام کو آزاد کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا وہ واقعہ سب کے مطالعے میں آ چکا ہے کہ آپ ایک کافر کو چت کرنے کے بعد جب خنجر سے مارنے لگے تو اس نے آپؓ کے منہ پر تھوک دیا۔ اس پر آپؓ نے کافر کو قتل کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور فرمایا کہ پہلے میں تجھے اسلام کی خاطر قتل کرنا چاہتا تھا لیکن جب تم نے میرے منہ پر تھوک دیا تو اس وقت یہ قتل اپنے غصے کی وجہ سے ہوتا۔ آپؓ کے اس سلوک کو دیکھ کر اس کافر نے اسلام قبول کر لیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک لونڈی نے سامنے سے

ہوا پیالہ آپ کے سامنے زمین پر گرادیا تو آپ کے چہرے پر جلال کے آثار نمودار ہوئے اس لڑکی نے یہ آیت تلاوت کی "وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ" اور مومن کی شان یہ ہے کہ غصہ کو پینے والے ہوتے ہیں۔ آپ نے کہا "كَظَمْتُ غَيْظِىْ" میں نے غصہ پی لیا۔ اس لونڈی نے پھر یہ الفاظ پڑھے "وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ" اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہوتے ہیں۔ آپ نے کہا "عَفَوْتُ عَنْكِ" میں نے تجھے معاف کردیا۔ پھر اس نے یہ الفاظ پڑھے "وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ" اور اللہ دوست رکھتا ہے احسان کرنے والوں کو۔ فرمایا میں نے لوجہ اللہ تجھے آزاد کردیا۔

فقراء کی پوری جماعت میں سے اکثر لوگ سادہ اور بے سروسامانی کے حال میں زندگی گزارتے اور وہ اپنے پاس مال و متاع دنیا میں سے کچھ نہ رکھتے تھے۔ منقول ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کوئی مکان اور کوئی سامان نہ تھا۔ آپ کے چند حواریوں نے یہ عرض کیا کہ آپ ہمیں حکم دیں تو ہم آپ کے لئے ایک عالیشان مکان بنادیتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب ایک بہت بڑی آبشار کے قریب پہنچے تو حواریوں سے فرمایا کہ جہاں یہ آبشار گرتی ہے یہاں میرے لئے مکان بنادو تو انہوں نے عرض کیا کہ حضور یہاں مکان کس طرح بن سکے گا۔ آپ نے فرمایا کہ دنیا مصائب اور حوادثات کی جگہ ہے یہاں پر کہیں کوئی مکان بنانا ممکن نہیں۔ ایک روایت میں ملتا ہے کہ آپ اکثر جنگلوں میں پھرتے رہتے۔ ایک دن آپ کسی کھلے صحرا میں لیٹے ہوئے تھے تو ابلیس وہاں آ پہنچا آپ نے دریافت فرمایا کہ اے ابلیس میں ایک پیغمبر ہوں۔ تم میرے پاس کیوں آئے ہو۔ ابلیس نے جواب دیا کہ ہماری متاع آپ کے پاس موجود ہے اس لئے آیا ہوں۔ پوچھا تمہاری کون سی متاع میرے پاس موجود ہے۔ کہا کہ وہ پتھر جو آپ نے سر کے نیچے رکھا ہے۔ یہ ہماری متاع ہے۔ آپ نے وہ پتھر اٹھا کر پھینک دیا تو ابلیس لعین بھی وہاں سے دفع ہو گیا۔ دورانِ سفر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک پیالہ اور کنگھا اپنے ساتھ رکھتے جب آپ نے یہ دیکھا کہ چلّو سے پانی پیا جاسکتا ہے اور ہاتھ کی انگلیوں سے بال درست کئے جا سکتے ہیں تو آپ نے ان دونوں چیزوں کو بھی پھینک دیا۔

درویشوں کے جلال کی ایک بہت بڑی مثال حضرت بوعلی قلندرؒ سے ملتی ہے کہ ایک روز آپ کا ایک مرید بازار سے مہمانوں کے لئے دال روٹی لینے کے لئے گیا تو عاملِ شہر (گورنر) کی سواری اور بڑا جلوس وہاں سے گزرا۔ گورنر کے اہل کاروں نے راستہ صاف کرنے کے لئے اس خادم کو چند ہنٹر لگادیئے۔ جب وہ مرید واپس آیا تو حضرت بوعلی قلندرؒ نے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ عامل کی سواری کی وجہ سے وہاں رش تھا اور اہل کاروں نے اسے مارا بھی ہے۔ حضرت بوعلی قلندرؒ غضب میں آگئے اور اپنے منشی کو طلب فرمایا اور حکم دیا کہ بادشاہ کو میری طرف سے خط لکھو کہ اس عاملِ شہر کی گرفت کرے ورنہ اس کا ملک کل سورج نکلنے سے پہلے کسی اور شخص کو بخش دیں گے۔ علامہؒ نے یہ واقعہ لکھا ہے جس کا اختتام اس شعر پر ہوتا ہے۔

باز گیر ایں عاملے بد گوہرے ورنہ بخشم ملکِ تو با دیگرے (ا۔خ:۲۶)

(اس بدنہاد عامل کو یہاں سے واپس بلالو، ورنہ میں تیری بادشاہت کسی اور کو دے دوں گا۔)

بوعلی قلندرؒ کے مذکورہ بالا خط موصول ہونے کے بعد بادشاہ کا رنگ زرد ہوگیا اور بدن پر کپکپی طاری ہوگئی اور چہرہ شام کے سورج کی طرح زرد پڑ گیا اس نے گورنر کی گرفتاری کا حکم جاری کیا اور بوعلی قلندرؒ سے معافی کا خواستگار ہوا۔ بادشاہ نے امیر خسروؒ کو بوعلی قلندرؒ کی طرف بھیجا تو ان کی معذرت پیش کرنے کے انداز نے درویش کے غصے کو موم کر دیا۔ علامہ فرماتے ہیں کہ درویشوں کے دلوں کو زخمی کرنا ایسا ہی ہے جیسے اپنے آپ کو جلتی ہوئی آگ میں ڈال دینا۔

مذکورہ بالا اقسام کے علاوہ درویشوں میں کچھ اور اقسام بھی پائی جاتی ہیں جن کا مختصر بیان اگلے صفحات پر دیا جا رہا ہے۔

فقرِ اضطراری اور اختیاری

ان احادیث سے جن میں فقر اختیار کرنے کا ذکر ہے معلوم ہوتا ہے کہ فقر دو قسموں کا ہے، ایک وہ فقر جو نامساعد حالات کی وجہ سے انسان پر بلا کی طرح مسلط ہو جائے اور دوسرا وہ فقر جس کا کوئی شخص اسباب، مال و دولت کے مہیا ہونے کے باوجود خود اپنی خوشی اور رضا کے ساتھ انتخاب کر لے چنانچہ اختیاری فقر انسان کے دل و دماغ اور روح کے لئے باعث اضطراب نہیں ہوتا بلکہ فقراء کو ایک شعورِ تسخیر، مسرت اور فرحت سے لذت یاب کرتا ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ غنیۃ الطالبین میں فرماتے ہیں "فقیر کی شان کے شایان یہ ہے کہ وہ اپنے فقر سے اتنی ہی محبت کرے جتنی کوئی دولت مند اپنی دولت سے کرتا ہے۔ صاحبِ دولت کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کی دولت میں کمی واقع نہ ہو۔ اسی طرح فقیر کے لئے بھی ضروری ہے کہ اپنے فقر کو زوال اور نقصان سے محفوظ رکھے۔"

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے فرمایا کہ امیری مال و دولت کی کثرت کا نام نہیں، امیری تو دل کی امیری ہے "لَیْسَ الغِنٰی عَنْ کَثْرَۃِ الْعِرَضِ... الخ"۔ ایک حدیث میں ہے کہ "اَلْغَنِیُّ مَنْ اَغْنَاہُ اللّٰہُ" یعنی غنی وہ ہے جسے اللہ غنی کر دے۔ فقر کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خدا اپنی مخلوق کے لئے فقر کو انعام بھی دے دیتا ہے اور سزا بھی۔ اس کے انعام ہونے کی صورت میں انسان خوش خُلق اور خدا ترس ہوتا ہے۔ وہ اپنی حالت کی شکایت نہیں کرتا بلکہ وہ اُس خدا کا شکر گزار رہتا ہے جس نے اسے فقر سے نوازا۔ مگر دوسری طرف یعنی اس کی سزا کی صورت میں آدمی بدخُلق ہو جاتا ہے، خدا کی نافرمانی کرتا ہے، اپنے احوال کی اکثر شکایت کرتا ہے اور اپنی تقدیر سے برہم رہتا ہے۔ ظاہر ہوا کہ اصل فقر اختیاری، انعامی، اصلاحی اور انتخابی فقر ہے۔

ایسے فقر میں انسان کے مزاج میں بے نیازی، درویشی، خدا ترسی آ جاتی ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ ایسے فقر کی دولت محض اہلِ عزم و ہمت ہی اختیار کر سکتے ہیں چنانچہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے فرمایا "اَلْفَقْرُ عِزٌّ لِاَهْلِهٖ" (حدیث) فقر اہلِ فقر کے لئے عزت ہے۔

شرعی اور حقیقی فقر

شرعی فقر یہ ہے کہ غنی نہ ہو گویا اس پر صدقہ حلال ہو اور حقیقی فقر یہ ہے کہ دونوں جہانوں میں اسے تعلق نہ ہو نہ تو موجودات کے ساتھ محبت ہو اور نہ معدومات (آخرت) سے کوئی طمع ہو اور نہ ہی اسے حق تعالیٰ سے کوئی نصیب ہو۔ یہ بھی خیال نہ کرے کہ میں حق تعالیٰ تک پہنچ گیا ہوں کیونکہ حق تک پہنچنے سے بندہ غنی ہو جاتا ہے فقیر نہیں رہتا۔ فقیر ہی حقیقتاً غنی ہوتا ہے کیونکہ اس کا فقر فقط اللہ تعالیٰ کے ساتھ درست ہوتا ہے لیکن جو خلقت کا محتاج ہے وہ فقیر نہیں۔ حقیقی فقر میں اس کا فقر غنا ہو جاتا ہے۔ یہ غنی وہ ہے جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔ اگر کسی کے پاس ساری دنیا ہو اور اسے مزید درکار نہ ہو تو وہ فقیر ہے اور اگر وہ دنیا سے کچھ بھی نہیں رکھتا اور نہ ہی اسے کچھ چاہئے تو وہ غنی ہے۔

فقرِ حقیقی میں صحبت مخلوق سے نہیں ہوتی اور اس کا حال فقر ہو تو عبارت اور بیان ختم ہو جاتا ہے۔ (یہی نصیحت حضرت حسینؓ نے حضرت رویم کو فرمائی) جو فقیر اپنے معنی کی بات نہیں کہتا یعنی جو اس کے باطن میں نہ ہو تو وہ گدھے کی مثل ہے اور "یَحْمِلُ اَسْفَارًا" (وہ گدھے کی مثل بوجھ اُٹھانے والے) کے مصداق ہے۔

فقر میں زہد پہلا مقام ہے اور زہد کا معنی ترکِ حلال ہے (ترکِ حرام فرض ہے) اور حرام کو لینے والا عاصی ہے اور اس کے لئے نہ مقام زہد ہے اور نہ مقامِ ولایت۔ جو دنیا سے تعلق رکھے وہ نہ خلقت سے چھوٹتا ہے اور نہ شیطان سے بچ سکتا ہے۔ ایسا شخص خلقت سے خصوصیت اور نفس کے ساتھ شہوت کی راہ پکڑتا ہے اور شیطان کے ساتھ صحبت رکھتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو دنیا اسے کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ ان فقرا کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنے دوستوں کے مال میں صرف اسی وقت تصرف کرتے ہیں جب ان کو علم ہو کہ اسے کوئی اعتراض نہ ہو گا اور اس دوست سے ان کو اجازت ہو۔ کچھ صوفیاء کہتے ہیں کہ اگرچہ کوئی اجازت بھی دے تب بھی کسی کا مال نہ لے کیونکہ صاحب دل کو بھی اپنے دل پر قبضہ نہیں ہوتا (اور دل بدلتا رہتا ہے) جیسے حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے "اِنَّ الْقُلُوْبَ بِيَدِ اللّٰهِ يُقَلِّبُهَا كَيْفَ يَشَآءُ" (بیشک دل اللہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور وہ دلوں کو بدل دیتا ہے جس طرح چاہتا ہے۔)

ابوالمغیث "تو دیوار کے ساتھ کمر نہ لگاتے تھے کیونکہ اس میں نفس کی سہولت ہے اور پہلو پر نہ سوتے اور اکثر ساری رات جاگتے کیونکہ عارفوں کو نفس کے ساتھ دشمنی اور حق کے ساتھ دوستی ہوتی ہے۔ حضرت ابو عبداللہ

شکالؒ کے متعلق فارس نے لکھا ہے کہ وہ کسی سے کلام بھی نہ کرتے تھے اور رات کو کوفے کے نواحی جنگلات میں رہتے۔ آپ گھاس پھوس یا خاک دانوں سے روٹی کے ٹکڑے صاف کر کے کھا لیتے۔ حضرت معاذیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ قشاعؒ کو دجلہ کے کنارے پر دیکھا کہ وہ تمام رات کہتے رہے "اے میرے سید مجھے پیاس لگی ہے اور آخر صبح کے وقت فرمایا افسوس کہ ایک چیز تو مجھ پر حلال کرتا ہے اور پھر مجھ کو اس سے باز رکھتا ہے اور ایک چیز تو حرام گردانتا ہے اور مجھے اس پر چھوڑ دیتا ہے، میں کیا کروں؟" یہ کہہ کر واپس ہو گئے اور پانی نہ پیا۔ اصحاب جریریؒ میں سے ایک کہتے ہیں بیس سال سے زائد ہوئے ہیں کہ میرے قلب پر طعام کا ذکر تک نہیں آیا۔ یہاں تک کہ طعام حاضر ہوتا اور جب طعام حاضر ہوتا تو ردّ بھی نہ فرماتے تا کہ حق پر اعتراض کا موقع نہ ملے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھ پر بیس سال ایسے گزرے کہ میں نے عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی۔ حضرت ابو المغیثؒ کو حضرت محمد بن سعدؒ نے دیکھا کہ بیس سال تک آپ نے کبھی کسی فوت ہونے والی چیز پر غم نہیں کیا۔ یہ کبھی نہ ہوا کہ جس چیز کی آپ کو طلب ہو اور پائی نہ ہو۔

ملکیت کے اعتبار سے فقراء کی اقسام

کتاب اللمع میں فقراء کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں ایک یہ کہ جن کے پاس اسباب دنیاوی سے کچھ بھی نہیں ہوتا وہ کسی سے نہ ظاہراً کچھ طلب کرتے ہیں اور نہ باطناً کسی سے کچھ ملنے کی توقع رکھتے ہیں اور نہ ہی کسی سے لینے کی لالچ رکھتے ہیں، یہ مقربین کا مقام ہے۔ حضرت سہل بن عبد اللہؒ نے فرمایا کہ یہ کہنا جائز نہیں کہ صوفیاء فقیر ہیں بلکہ وہ تو اللہ کی مخلوق میں سب سے بڑھ کر غنی ہوتے ہیں۔

ابو علی رودباریؒ فرماتے ہیں کہ فقراء ضرورت کے وقت بھی کسی سے لینے سے انکار کرتے ہیں کیونکہ عطا کی بجائے عطا کرنے والے پر ہی اکتفاء کرتے ہیں۔ حضرت ابو بکر زقاقؒ فرماتے ہیں کہ فقراء کو کسی کی عطا سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا کیونکہ وہ فقط وصل یار کے بھوکے ہوتے ہیں اور فاقہ انہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچاتا۔ ابو نصر بن الحماییؒ فرماتے ہیں کہ فقراء اس لئے ہر شئے کو چھوڑ کر فقر اختیار کرتے ہیں کہ فقر منازل توحید میں سے پہلی منزل ہے (یعنی اگر کوئی مال وزر کے بتوں کی پوجا کرے تو توحید کہاں رہتی ہے لیکن آج کل چند علماء فقط مزاروں پر جانے کو ہی شرک سمجھتے ہیں۔)

فقراء کا دوسرا گروہ وہ صوفیاء ہیں جو کچھ نہ رکھتے ہوئے بھی کسی سے سوال نہیں کرتے اور نہ بالواسطہ مانگتے ہیں لیکن اگر کوئی دے تو رد نہیں کرتے۔ سہیل بن عبد اللہ فرماتے ہیں کہ سچا فقیر نہ کسی سے کچھ مانگتا ہے اور نہ ہی اپنے پاس کوئی چیز جمع کرتا ہے۔ ابن الجلاءؒ فرماتے ہیں کہ حقیقی فقر وہ ہے جو نفس کے لئے نہ ہو اور اگر ہے تو محتاج ہی نہ ہوگا بلکہ در حقیقت غنی ہوگا۔ ابراہیم الخواصؒ فرماتے ہیں کہ صادق فقیر وہ ہے جو زبان کے

شکایت نہیں لاتا اور مصائب کے اثرات کو ظاہر نہیں کرتا۔ ایسے مقام پر صدیقین فائز ہوتے ہیں۔

تیسرا گروہ فقراء کا وہ ہے جن کی ملکیت میں کچھ نہ ہو مگر بوقتِ ضرورت اپنے فقیر بھائیوں سے طلب کر لیتا ہے کیونکہ وہ دینے پر خوش ہوتے ہیں۔ فقیر وہ ہے جو اشیاء کو اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے حاصل کرتا ہے۔ سب سے بہتر شخص وہ ہے جو لوگوں سے اعلانیہ لے لیتا ہے اور خفیہ طور پر حاجت مندوں کو دے دیتا ہے۔

امام غزالیؒ کے نزدیک فقراء کی چار قسمیں

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ فقراء چار قسم کے ہوتے ہیں۔

(۱) مال ہاتھ میں نہ آئے (میسر ہی نہ ہو) وہ فقیر ہے۔

(۲) مال نہ ہو مگر تلاش کی ہر ممکن کوشش کرے۔ یہ فقیر حریص ہے۔

(۳) مال نہ ہو اور تلاش بھی نہیں کرتا اور طلب بھی نہیں، آئے تو رد بھی نہیں کرتا، کوئی دے تو بھی خوش، نہ دے تو بھی خوش یہ فقیر قانع ہے۔

(۴) مال نہیں ہوتا، طلب بھی نہیں کرتا، کوئی دے تب بھی نہیں لیتا اور کراہت محسوس کرتا ہے۔ قصداً علیحدگی اختیار کرے۔ (یہ زاہد کہلائے گا۔)

مشائخ کا قول ہے کہ درویشوں میں تین چیزیں نہیں پائی جاتی ہیں، طمع، منع، جمع۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک امیر شخص کسی مزار پر تبرک حاصل کرنے کے لئے قطار میں کھڑا ہو گیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ تو غنی ہیں قطار میں کیوں کھڑے ہو گئے؟ فرمانے لگے کہ مجھے خطرہ تھا کہ میں اگر قطار میں نہ کھڑا ہوا تو میرا نام کہیں فقراء کی فہرست سے کاٹ نہ دیا جائے۔

نصاب کے اعتبار سے فقراء کے تین درجے

فقراء کو ان کے اصول وکوائف کے اعتبار سے کئی درجات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، مگر شریعت کے اعتبار سے فقراء کو ان کے نصاب کے اعتبار سے بھی تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

پہلا درجہ ہے نصاب سے کم مال کا مالک ہونا۔ اس میں زکوٰۃ لینا جائز ہے مگر سوال کرنا حرام ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ اگر کوئی فقیر چند فاقے گزار چکا ہو اور مقروض بھی ہو تو اس کیلئے سوال بھی جائز ہے۔

حدیث شریف (مسلم) میں ہے کہ جب ادائے قرض کی کوئی صورت نہ ہو تو سوال جائز ہے۔ علاوہ ازیں ہلاکتِ مال کی صورت یا فاقہ کی صورت میں بھی سوال کرنا جائز ہے۔ بلا ضرورت سوال کرنے والے پر عذاب ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو بھیک نہ مانگنے کا عہد کرے میں اس کے لئے جنت کا ضامن ہوں، لہٰذا ذلت کا سوال منع ہے عام چیزوں مثلاً پانی، آگ، سوئی دھاگہ وغیرہ کا سوال جائز ہے۔ مسجد میں

اپنے لئے سوال کرنا سخت منع ہے مگر دوسروں کے لئے جائز ہے۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ کوئی بھوک سے قریب المرگ ہو اور کوئی حلال غذا میسر نہ ہو تو اس صورت میں مردار کھانا بھی جائز ہے۔ کچھ صوفیاء عام طور پر تین دن کے بعد کھانا کھاتے تھے۔ کیونکہ تین دن کے فاقہ کے بعد حرام چیزیں حلال ہے۔

سچے فقراء کون ہیں؟

قوت القلوب (ص ۶۶۹ حصہ دوم) میں ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے عرض کیا "اے پروردگار! میں تجھے کہاں تلاش کروں۔" اللہ عزوجل نے فرمایا "جن کے دل میری وجہ سے شکستہ ہیں ان کے پاس۔" عرض کیا وہ کون ہیں؟ فرمایا "سچے فقراء۔" حدیث شریف میں ہے اَنَا عِنْدَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مِنْ اَجْلِيْ" (یعنی میری خاطر جو شکستہ دل ہیں میں ان کے قریب ہوں۔ المقاصد الحسنہ رقم ۱۸۸)۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے، نگاہِ آئینہ ساز میں

(ب۔د: ۲۸۱)

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جب فقیر راضی ہو تو اس سے افضل تر کوئی نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے کچھ لوگوں سے اس بات پر بیعت لی کہ کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہ کرو گے۔ آپؐ نے فرمایا لوگوں سے مستغنی ہو جاؤ، سوال جس قدر کم ہو بہتر ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ جب لینے والا محتاج ہو تو دینے والے کو لینے والے سے زیادہ اَجر نہ ہوگا (یعنی لینے والا اگر محتاج ہو تو اس کو لینے کا بھی اَجر ملتا ہے، کیونکہ تقویٰ اور نیکی میں دونوں تعاون کر رہے ہیں اور ایسا عطیہ لینے میں کوئی حرج نہیں۔)

ایک حدیث شریف میں ہے کہ جس پر احسان کیا جائے اسے چاہیئے کہ اس کا معاوضہ دے اور (معاوضے کی) اگر ہمت نہ ہو تو اس کی تعریف ہی کر دے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ ہدیہ لینے والا اگر شکر ادا کرے تو اس شکر کے باعث اس کو بھی اَجر ملے گا کیونکہ جس نے لوگوں کا شکر نہیں کیا اس نے خدا کا شکر نہیں کیا۔ قوت القلوب میں (ص ۷۰۴ حصہ دوم) درج ہے کہ جس طرح زکوٰۃ دینا واجب ہے، لینا بھی واجب ہے کیونکہ اگر مستحقین زکوٰۃ نہ لیں تو لوگ کسے دیں گے۔

راحت القلوب (ص ۴۴) میں بابا فرید الدین گنج شکرؒ کا قول ہے کہ اگر درویش دنیا میں مصروف رہتا ہو اور جاہ و رفعت کا طالب ہو تو سمجھو کہ وہ درویش نہیں بلکہ طریقت کا مرتد ہے کیونکہ فقر تو دنیا سے اعراض کرنے کا نام ہے۔ عمدہ میں خواجہ جنیدؒ لکھتے ہیں کہ مذہب فقر میں درویش کے لئے حرام ہے کہ وہ اہل دنیا سے میل جول رکھے یا بادشاہوں یا سلطانوں کے ہاں آئے جائے۔ مشائخ کا قول ہے کہ "صُحْبَةُ الْاَغْنِيَاءِ

لِلۡفُقَرَآءِ سَمٌّ قَاتِلٌ" (امیروں کی ہم نشینی فقیروں کے لئے زہر قاتل ہے۔) بابا صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جس قدر تونگروں سے بچو گے اسی قدر خدا سے نزدیک ہو جاؤ گے۔ فرمایا طریقت یہ ہے کہ درویش کے دل میں دنیا اور اہلِ دنیا کی دوستی میں ذرہ بھر اثر نہ ہو۔ فقیر کے نزدیک تمام خلق برابر اور یکساں ہے۔ ایک دن حضرت نظام الدینؒ سے فرمایا ''اصل چیز اس راہ میں حضوری قلب ہے اور یہ اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک لقمہ حرام سے پرہیز اور اہلِ دنیا سے اجتناب نہ کیا جائے۔''

کچھ فقراء کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کے بدلے فقراء کو علمِ معرفت عطا فرمایا ہے۔ انہوں نے اللہ کی خاطر آج کو چھوڑ دیا ہے اور اس کے عوض کل کو پسند کیا ہے تو اللہ ان پر ایسے انعامات کرے گا جن کو کوئی نہیں جانتا۔

وَالۡمَلٰٓئِكَةُ يَدۡخُلُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ مِّنۡ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ بِمَا صَبَرۡتُمۡ (الرعد: ۲۴)

اور ان پر ہر دروازے سے فرشتے آئیں گے اور کہیں گے ''سلامتی ہو تم پر اس کے عوض کہ تم نے صبر کیا''۔

باب ۳۵

حصہ ہفتم

(ولایت اور مراتبِ ولایت)

ولایت اور معرفتِ ولایت

(ولی اور اس کی ولایت کی پہچان)

ولی کے لغوی معانی

"اَلْوَلْیُ" کے معنی قرب اور نزدیکی کے ہیں۔ وَلِیٌّ اس سے اسم ہے اس کے معنی ہیں قریب، مُحب، صدیق اور مددگار۔ (قاموس) اس لفظ کی مزید تحقیق اسی باب میں آ رہی ہے۔

مفرداتِ امام راغبؒ میں ہے کہ "اَلْوِلَاءُ وَ التَّوَالِیْ" وِلَاءٌ کے اصل معنی ہیں دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا اس طرح یکے بعد دیگرے آنا کہ ان کے درمیان کوئی ایسی چیز نہ آئے جو ان میں سے نہ ہو۔ بعد میں استعارہ کے طور پر یہ لفظ قرب کے معنوں میں استعمال ہونے لگا، یہ قرب خواہ بلحاظ مکان یا نسب دین اور دوستی یا نصرت کے ہو یا بلحاظ اعتقاد۔ "اَلْوِلَایَۃُ" (بکسر واؤ) کے معنی نصرت اور (وَلَایَۃُ) (بفتح واؤ) کے معنی کسی کام کے متولی ہونے کے ہیں۔

سرِّ دلبراں میں ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے رسول اکرم ﷺ کی پوری اتباع کی وہ دو طریقوں سے ہوتی ہے۔ پہلی اتباع ظاہر جو مرتبۂ نبوت سے متعلق ہوتی ہے اور اتباع باطنی مرتبۂ ولایت سے ہوتی ہے۔ مرتبۂ نبوت میں وہ تمام احکام شریعت ہیں جو آپ نے بواسطہ جبریلؑ حاصل کیے اور خلق کو پہنچائے۔ ولایت میں وہ فیضانِ اسرارِ توحید ہے جو حضور اکرم ﷺ نے مقامِ "لِیْ مَعَ اللّٰہِ" میں براہ راست حق تعالیٰ سے اخذ فرمائے۔ اولیائے کرام کا قول ہے کہ ولایت نبوت سے افضل ہے۔ وہ اس لئے کہ جب تک نبی کی ولایت کمال درجے پر نہ پہنچے، نبوت ظاہر نہیں ہوتی یعنی قوتِ نبوت بحسب قوتِ ولایت ہوتی ہے۔ آدمؑ جنت میں ولی تھے اور جب دنیا میں آئے تو نبی بنائے گئے۔ پھر نبی نورِ نبوت کو اپنے ہی کمالات ولایت کے آفتاب سے اخذ کرتا ہے، وہ کسی غیر کا تابع نہیں اور ولی آفتابِ نبوت سے نور اخذ کرتا ہے۔

جو لوگ حضور اکرم ﷺ کی متابعت ظاہری سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں وہ ارباب ظاہر کہلاتے ہیں اور جو قلیل جماعت "یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ" (النور:۳۵) (پہنچا دیتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے نور کی طرف جس کو چاہتا ہے) کی دستگیری سے اسرار ولایت تک رسوخ پاتی ہے، ان کو ارباب باطن کہتے ہیں۔ نبوت کا باطن ولایت ہے اور ظاہر کو باطن سے مدد ملتی ہے۔ باطنی پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے قوی تعلق قائم ہو اور اس سے استغراق اور فنائیت حاصل ہو، اس میں تصرفات عطا کئے جاتے ہیں جو خلق میں مقبولیت کا باعث ہوں مثلاً کرامات اور کمالات وغیرہ، اسی کا نام ولایت ہے اور ظاہری پہلو وہ ہے جو باطنی طریقے سے حاصل ہو کہ خدا کی طرف سے تصرفات عطا کئے جائیں اور اسے خلق تک مناسب طریقے سے پہنچا دیا جائے۔ اس طریقے سے مخلوق الٰہی کو مقام قرب تک پہنچایا جاتا ہے۔ اسی کو وَلایت کہتے ہیں۔

بعض حضرات کو درج بالا ولایتوں میں سے ایک، اور بعض کو دونوں ولایتیں عطا کی جاتی ہیں اور کبھی ایک کو دوسرے پر غلبہ حاصل رہتا ہے۔ مشائخ نقشبندیہ میں ولایت (بالفتح واؤ) کا غلبہ ولایت (بالکسر) پر رہتا ہے اور ان حضرات میں جب کوئی اس عالم سے رحلت فرما جاتا ہے تو ولایت (بالکسر) کو اپنے کسی مخلص کے حوالے کر جاتا ہے اور وَلایت (بالفتح) کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔

"اَلْوَلِیُّ وَالْمَوْلٰی" یہ دونوں کبھی اسم فاعل اور کبھی اسم مفعول کے معنی میں آتے ہیں۔ <u>مومن کو ولی تو کہہ سکتے ہیں لیکن مولیٰ (اللہ) کہنا ثابت نہیں</u>۔ ایک حدیث میں حضرت علیؓ کے لئے مولیٰ کا لفظ استعمال ہوا اور رسول اللہ ﷺ نے خود بھی اپنے آپ کو مولیٰ فرمایا چنانچہ ولی اللہ کہنا درست ہے، مولیٰ اللہ نہیں کہا جاتا۔

قرآن پاک میں ولی کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے مثلاً

(۱) بمعنی دوست جیسے فرمایا۔

اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (البقرہ:۲۵۷) — اللہ ان لوگوں کا دوست ہے جو ایمان لائے۔

(۲) کارساز کے معنوں میں جیسے فرمایا:

وَاللّٰهُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ (آل عمران:۶۸) — خدا مومنوں کا کارساز ہے۔

(۳) حمایتی اور مددگار کے معنوں میں جیسے فرمایا:

نِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ (الانفال:۴۰) — اللہ خوب حمایتی اور مددگار ہے۔

(۴) مالکِ برحق کے معنوں میں جیسے فرمایا:

ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ (الانعام:۶۲) — پھر لوٹائے جائیں گئے اللہ تعالیٰ کی طرف جو ان کا حقیقی مالک ہے۔

(۵) وارث، ہم جنس یا ساتھی کے معنوں میں جیسے فرمایا:

وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ (الانفال:۷۳) — اور وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا وہ ایک دوسرے کے حمایتی ہیں۔

(۶) بمعنی رفیق کے:

اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِیْنَ یَتَوَلَّوْنَهٗ (النحل:۱۰۰) — اس کا زور تو صرف ان پر چلتا ہے جو یارانہ گانٹھتے ہیں اس سے۔

(۷) کسی چیز پر لگانے کے معنوں میں جیسے:

وَلَّیْتُ عَیْنِیْ كَذَا (محاورہ) — میں نے اپنی آنکھوں کو فلاں چیز پر لگایا۔

(۸) بمعنی پھیر لینے کے جیسے فرمایا:

فَوَلِّ وَجْهَكَ (البقرہ:۱۵۰) — اپنا چہرہ پھیر لو۔

(۹) بہ معنی وارث جیسے کہ فرمایا:

فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا (مریم:۵) — پس بخش دے مجھے اپنے پاس سے ایک وارث۔

(۱۰) "اَلْمَوَالِیْ" بھائی یا چچازاد بھائی کے لئے بولا جاتا ہے۔ مثلاً

خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ (مریم:۵) — میں ڈرتا ہوں (اپنے بے دین رشتہ داروں سے کہ وہ) میرے بعد (دین ضائع نہ کردیں)

(۱۱) "اَلْمَوَالِیْ" کا کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے، مثلاً:

(۱) غلام کو آزاد کرنے والا (۲) آزاد شدہ غلام (۳) حلیف (۴) عم زاد یعنی چچازاد بھائی (۵) پڑوسی

(۱۲) اولیٰ کے معنوں میں یعنی زیادہ حقدار یا سزاوار ہونے کے لئے جیسے محاورتاً کہا جاتا ہے۔

فُلَانٌ اَوْلٰی بِكَذَا — فلاں اس کا زیادہ حقدار ہے۔

(۱۳) افسوس کے معنوں میں آیا ہے:

(۱۴) ثُمَّ اَوْلٰی لَكَ فَاَوْلٰی (القیامۃ:۳۵) — پھر تیری خرابی آگئی اب آگئی۔

ولایت

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا قول زبدۃ المقامات (ص ۹۷) میں نقل کیا گیا ہے کہ ولایت (زیر کے ساتھ) اس قرب بندہ کو کہتے ہیں جو وہ اپنے رب کے ساتھ رکھتا ہے اور لوگوں کو جو فیوض اور برکات حاصل ہوتے ہیں وہ وَلایت (زبر کے ساتھ) کا اثر ہوتا ہے۔ فرمایا کہ جب طالب کا آئینہ اس کے مرشد کے آگے

کے سامنے ہوتا ہے تو جو کچھ مرشد کے آئینے میں ہوتا ہے بقدر مناسبت (طالب کی استعداد کے مطابق) اپنا پرتو طالب پر ڈالتا ہے اور ولایت (زبر کے ساتھ) اس وقت کہا جاتا ہے جب ولی بموجب قبول خلق ہو اور اہل عالم اس کی طرف رجوع کریں اور یہ چیز تکوینات (عالم وجود میں لائے جانے کی صورت حال) سے تعلق رکھتی ہے اور خوارق (کرامات وغیرہ) اور تصرفات اس دوسری قسم سے تعلق رکھتے ہیں جب مرشد دنیا سے رخصت ہو تو ولایت (زبر کے ساتھ) کسی ایک مخلص کو دی جاتی ہے۔ ولایت (زیر کے ساتھ) ولی اپنے ساتھ لے جاتا ہے (اور مرنے کے بعد بھی فیض عطا کرتا ہے) فرمایا اگر کوئی لغزش ہو جائے تو ولایت (زبر کے ساتھ) ولی سے واپس لے لی جاتی ہے۔

حصولِ ولایت

سرِّ دلبراں (ص ۳۲۰) میں ہے کہ ولایت بلا حصول مقامات عشرہ حاصل نہیں ہو سکتی وہ مقامات حسب ذیل ہیں: (۱) توبہ (۲) انابت (۳) زہد (۴) قناعت (۵) ورع (۶) صبر (۷) شکر (۸) توکل (۹) تسلیم (۱۰) رضا۔

اولیائے کرام رحمۃ اللہ علیہم اجمعین انبیائے کرام علیہم السلام کے وارث ہوتے ہیں اور انبیائے کرام علیہم السلام سے بھی اکتساب بیعت کرنے میں ہر ولی کسی نہ کسی نبی کے زیر قدم ہوتا ہے۔ زمانہ کبھی اولیائے کرام رحمۃ اللہ علیہم اجمعین سے خالی نہیں ہوتا۔ کم وبیش سوا لاکھ پیغمبر گزر چکے ہیں اور کم از کم سوا لاکھ اولیائے کرام رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کا ہر زمانے میں رہنا لازمی ہوتا ہے۔ بعض انبیائے کرام علیہم السلام کے زیر قدم کئی کئی سو کی تعداد میں اولیائے کرام رحمۃ اللہ علیہم اجمعین ہوتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام کی تعداد کے مطابق اتنے ہی ولی ان انبیائے کرام علیہم السلام کے مزاج کے مطابق ہوتے ہیں۔ جب ایک رحلت کر جاتا ہے تو دوسرا اس مزاج پر پیدا ہو جاتا ہے۔

ہر نبی ولی ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر ولی نبی ہو۔ نبی مثل آفتاب کے ہے جو خود بھی روشن ہے اور دوسروں کو بھی روشنی بخشتا ہے۔ ولی مثل مہتاب کے ہے جو کہ آفتاب نبوت سے نور اخذ کرتا ہے اور متابعت آفتاب اس پر لازم ہوتی ہے۔ آدم جنت میں ولی تھے، جب دنیا میں آئے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو نبوت عطا فرمائی کیونکہ نبوت تشریع و تکلیف کا نام ہے اور دنیا تکلیف کا گھر ہے جبکہ جنت کرامت اور مشاہدہ کی جگہ ہے۔

ولایت انبیاء علیہم السلام کا ورثہ ہے

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خاتم الانبیاء ہیں اور آپ کے بعد قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا، اس لئے بنی نوع انسان کی ہدایت اور راہنمائی کا فریضہ حضرات اولیائے کرام رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے سپرد کر دیا گیا ہے اور یہ سلسلہ تا قیام قیامت جاری و ساری رہے گا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیضانِ رسالت پاکانِ امت یعنی اولیائے

کرام رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کی ولایت کے ذریعے نوع انسانی تک منتقل ہوتا رہے گا یہاں تک کہ حشر ونشر اور حساب و کتاب کے مرحلوں کا آغاز ہو جائے گا۔

یہ اولیاء اللہ ہی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متابعت اور محبت سے کُلی طور پر انسان کامل کے مرتبے پر فائز ہو کر خلافت نبی اور نیابتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منصب پر متمکن ہوتے ہیں اور امام آخر الزماں کے ظہور تک ہر زمانے میں ہوتے رہیں گے۔ یہ لوگ اس زمیں پر اللہ کے نائب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وارث ہوتے ہیں اور زمین پر تصرف کی قوتیں اللہ تعالیٰ سے اخذ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے (اسماء وصفات) کے متولی ہوتے ہیں۔ وہ معرفتِ الٰہی کے بھی محتاج ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کے فضل وکرم کی بقدر قوتِ بشری اپنے اندر طاقت رکھتے ہیں۔ کمالِ خلافت یا کمالِ انسانی کا دارومدار اِسی معرفت پر ہے۔ سالک لمبے سفروں کو طے کرتا، کثرتِ تعینات کی منازل کو عبور کرتا صفات بشری سے دور ہو کر اصلِ حقیقت سے واصل ہوتا ہے۔ تجلیٔ ذاتِ الٰہی کو حاصل کر کے اس کی جمیع اسماء وصفات کا مظہر بنتا ہے۔ دوسروں کی تکمیل کا ذریعہ بنتا ہے گویا کہ وہ خواجہ دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غلامی کے کام انجام دیتا ہے۔ متابعت اور عبودیت میں تمکین اختیار کرتا ہے قیود سے تجاوز نہیں کرتا، تمام حقوق ادا کرتا ہے۔ طریقت اس کی رَوش ہوتی ہے شریعت اس کا شعار ہوتا ہے اور حقیقت اس کا مقام ہوتا ہے۔ ایسا شخص اس زمین پر اخلاقِ الٰہی کی چلتی پھرتی تصویر اور اس دنیا کے رہنے بسنے والوں کے لئے رحمت اور برکت کا باعث ہوتا ہے۔ ایک حدیث شریف میں ہے۔

اَلْعُلَمَآءُ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَآءِ — علماء، انبیاء کے وارث ہوتے ہیں۔

(سرِّ دلبراں ص ۴۰ بحوالہ بخاری شریف)

ان کی شان میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِیْ بِهٖ فِی النَّاسِ (الانعام: ۱۲۲) — اور ہم نے بنا دیا اس کیلئے نور چلتا ہے وہ جسکے اجالے میں لوگوں کے درمیان۔

حضرت داتا گنج بخش ؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فیضانِ نبوت کو دوام بخشا اور اولیائے کرام رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کو ان کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ وہ ہمیشہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آیات دلائل اور صدق کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی برکت سے آسمان سے بارش ہوتی ہے۔ ان کے صفائے باطن کے طفیل زمین سے نباتات پھوٹتی ہیں؛ ان کی توجہ سے مسلمان کفار پر فتح یاب ہوتے ہیں۔ ان اولیائے کرامؒ میں چار ہزار اولیائے کرامؒ چھپے ہوئے ہیں۔ یہ اہل بست وکشاد اور درگاہ حق کے پہرے دار ہیں۔ جنہیں "سرہنگان درگاہ حق" کہا جاتا ہے وہ تین سو نفوس قدسیہ ہیں جنہیں اصطلاح تصوف میں اخیار کہتے ہیں اور چالیس وہ ہستیاں ہیں، جنہیں ابدال کہتے ہیں اور سات وہ ہیں جنہیں ابرار کہتے ہیں اور چار وہ ہیں جنہیں اوتاد کہتے ہیں، تین وہ ہیں جنہیں نقیب کہتے ہیں

ایک وہ ہے جو قطب کہلاتا ہے اور اسے غوث بھی کہتے ہیں۔ یہ تمام ایک دوسرے کو جانتے اور پہچانتے ہیں اور نظامِ معاملات وامور تصرف میں ایک دوسرے کے اذن واجازت کے محتاج ہیں۔ ان تمام باتوں پر احادیث ناطق ہیں اور اربابِ حقیقت اس کی صحت پر متفق ہیں۔ (حضرت داتا گنج بخشؒ کے اس فرمان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو اس دنیا میں اولیائے کرامؒ نافذ کرتے ہیں اور ان کی حیثیت حکومت کی انتظامیہ کی طرح ہوتی ہے۔ دنیا کا نظام اللہ کے حکم سے ان کے ہاتھوں سے چلتا ہے۔ یہ لوگ ایسے ہی کام کرتے ہیں جس طرح سورۃ کہف میں حضرت خضرؑ کے کشتی توڑنے، قتلِ معصوم اور دیوارِ یتیم مرمت کرنے کے کارناموں کا ذکر آیا ہے۔)

اس بیان کے بعد حضرت داتا گنج بخشؒ نے اس متنازع فیہ امر پر بحث کی کہ کیا ولی کو اپنی ولایت کی خبر ہوتی ہے یا نہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اگر ولی کو معلوم ہو جائے کہ میں ولی ہوں تو وہ اپنی عاقبت کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے اور اپنی ولایت کو دیکھ کر مغرور ہو جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ولی سے یہ دونوں باتیں ممکن نہیں کیونکہ وہ اس وقت تک ولی نہیں بن سکتا جب تک وہ آخرت کی غفلت اور تکبر کی لعنت سے مبرّا نہ ہو۔ ولی اسی وقت بنتا ہے جب وہ تمام رزائل سے پاک ہو جائے۔ آپ فرماتے ہیں کہ مندرجہ بالا اخیار ابدال ابرار وغیرہ اپنی ولایت کو جانتے ہیں اور دوسرے چار ہزار اولیاء میں سے بعض کو اپنی ولایت کی معرفت ہوتی ہے اور بعض کو نہیں۔ آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب ایک ولی اپنی کرامات کو دیکھتا ہے تو وہ جان لیتا ہے کہ وہ ولی ہے۔ لیکن شرطِ ولایت یہ ہے کہ وہ ولایت کی نگہداشت کرے۔ ایسی صورت میں اسے متکبر ہونا جائز نہیں۔

تحقیق لفظِ ولی

اگر یہ لفظ "عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ" کی طرح مبالغہ کا صیغہ مانا جائے تو اس سے مراد ایسا شخص ہوگا، جو ہمیشہ اطاعت وبندگی میں مشغول رہے اور گناہ ومعصیت اس کی عبادت میں خلل نہ ڈالیں اور اگر اس کو "قَتِیْل" اور "جَرِیْح" کی طرح بروزن فعیل مانا جائے جو مفعول کا معنی دیتے ہیں، جیسے قتیل بمعنی مقتول، اور جریح بہ معنی مجروح، تو پھر اس سے مراد وہ ذات ہوگی جس کی اللہ تعالیٰ ہر قسم کے گناہوں سے مسلسل حفاظت فرما کر اسے ہمہ وقت اپنی عبادت وبندگی کی توفیق عطا فرمائے۔ حضرت امام رازیؒ قرآن پاک سے لفظ ولی کی تحقیق نقل فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے۔

اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (البقرہ:۲۵۷)	اللہ تعالیٰ مددگار ہے ایمان والوں کا۔
وَهُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِیْنَ (الاعراف:۱۹۶)	اور وہ حمایت کیا کرتا ہے نیک بندوں کی۔

اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ (المائدہ:۵۵)　تمہارا مددگار تو صرف اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول (پاک) ہے۔

ان مذکورہ بالا آیات کریمہ کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ولی کے معنی قریب اور نزدیک کے ہوتے ہیں یعنی جو آدمی کثرت سے عبادتِ الٰہی کرے اور زیادہ سے زیادہ اخلاص بھی شامل حال ہو تو اس کو قربِ خداوندی نصیب ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور فضل واحسان کے ذریعہ اس کے قریب آجاتے ہیں تو پھر جب عابد ومعبود دونوں کا قرب مل جائے تو ولایت کا خمیر اٹھتا ہے۔

جو شخص ولایت کا دعویٰ کرتا ہے اس کی کرامتوں کو ماننے میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ ولی کو کرامتوں کا دعویٰ نہیں کرنا چاہیے اور کچھ کہتے ہیں کہ ولی کو کرامتوں کا دعویٰ کرنا جائز ہے پھر اس بات میں بھی اختلاف کرتے ہیں کہ کرامتیں اس ولی کے مطابق ظاہر ہوتی ہیں یا نہیں اور جس انسان سے خرقِ عادت باتیں ظاہر ہوتی ہیں، مگر وہ ولایت کا دعویٰ نہیں کرتا تو اگر یہ شخص اللہ کا نیک و پاک بندہ ہے گنہگار و نافرمان نہیں تو اس کی یہ خرق عادت باتیں کرامت کہلائیں گی۔ علماء اہل سنت ان کے جواز کے قائل ہیں اور معتزلہ میں سے صرف ابوالحسن بصری اور اس کا دوست محمود خوارزمی دونوں اولیاء اللہ کی کرامتوں کے قائل ہیں، باقی سب معتزلہ اولیاء اللہ کی کرامتوں کے منکر ہیں۔ اگر یہ خرق عادت باتیں کسی گنہگار مجرم آدمی سے سرزد ہوں تو وہ استدراج ہوگا۔ ان کو کرامت نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس لئے کہ شعبدہ بازی بہروپے (مداری) قسم کے لوگوں کا کام ہوتا ہے۔ یہ لوگ شیطان کے چیلے ہوتے ہیں یعنی ان پر شیطان ہر وقت مسلط ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کو ولی اللہ ماننا سخت غلطی ہے۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد واضح موجود ہے۔ فرمایا۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (الحجرات:۱۳)　بے شک تم میں اللہ تعالیٰ کے ہاں معزز وہ ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ متقی ہے۔

اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد گرامی بھی ہے۔

کُلُّ تَقِیٍّ وَ نَقِیٍّ اٰلِیْ (نزہت المجالس)　ہر متقی اور ستھرا شخص میری اہل بیت میں شامل ہے۔

اس مذکورہ بالا آیت کریمہ اور حدیث شریف کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے ہاں قرب اور درجہ، عزت ومرتبہ اور مقام بلند حاصل کرنے کا ذریعہ صرف اور صرف تقویٰ (خدا ترسی) پرہیزگاری (گناہوں سے بچنا) ہی ہے۔ اور بس، اس کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعہ اور راستہ نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کا متقی بندوں کیلئے ہدایت ہونے کا یوں ذکر فرمایا۔

ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ (البقرہ:۲)　یہ ہدایت ہے پرہیزگاروں کے لئے۔

دوسرے لوگ جو متقی و پرہیزگار نہیں ہیں، وہ بجائے ہدایت ورہنمائی حاصل کرنے کے بجائے ضلالت و

گمراہی میں مبتلا ہو کر اپنی تباہی اور بربادی کرتے ہیں، اور عذابِ الٰہی کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ ایسے ظالموں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۚ اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

(البقرہ: ۲۵۸)

یعنی جو لوگ نافرمانی کے باعث قبولِ ہدایت کی توفیق سے محروم کر دیئے گئے ہیں وہی ظالم اور گمراہ ہیں۔ ان کو دین کی سمجھ بوجھ حاصل نہیں ہو سکتی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی اسی بارے میں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے، تو اسے دین کی سمجھ عطا فرما دیتا ہے۔

(صحیح بخاری: ج ۱ ص ۱۶)

دوسری حدیث میں ارشاد گرامی ہے۔

مَا اسْتَذَلَّ اللّٰهُ رَجُلًا اِلَّا حَرَّمَهُ الْعِلْمَ جب اللہ تعالیٰ کسی آدمی کو ذلیل کرنا چاہتا ہے تو اس پر علم (دین) کو حرام کر دیتا ہے۔

(الحدیث)

حاصل کلام علم دین کا حاصل کرنا اور تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرنا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔

مقامِ ولایت

لفظ ولی کی جمع اولیاء ہے۔ ولی اس پاک ہستی کو کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفتوں سے کامل شناسا ہو، وہ ممکن حد تک اطاعت پر ہمیشگی کرے اور گناہ سے بچے، لذتوں اور شہوتوں میں مشغول ہونے سے اپنے آپ کو قطعی طور پر پاک و صاف رکھے، یہ تعریف علامہ تفتازانی" نے شرح العقائد میں لکھی ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ لذتوں اور شہوتوں میں محو و مستغرق نہ ہو یعنی اگر وہ تکلیف کے بغیر حاصل ہوئی ہیں اور ان کے حصول میں انتہائی درجہ کی مشغولیت نہ ہو تو جائز حد تک حلال اور قابل انتفاع ہیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اولیاء اللہ کی کرامات کا کئی مقامات پر ذکر فرما کر ان کی حقانیت پر مہر تصدیق ثبت فرما دی ہے۔ مثال درج ذیل ہے۔

جب حضرت سیدہ مریم علیہا السلام اپنے خالو حضرت زکریا علیہ السلام کے زیر کفالت تھیں تو ان کے حجرہ میں حضرت زکریا علیہ السلام کے بغیر کوئی نہیں جا سکتا تھا۔ جب حضرت زکریا علیہ السلام بسلسلہ تبلیغ کہیں باہر تشریف لے جاتے تو دروازے بند کر کے جاتے۔ واپسی پر انہیں حضرت مریم علیہا السلام کے پاس قسم قسم کے بے موسم پھل دیکھ کر حیرانی ہوئی اور بے ساختہ بول اٹھے: اے مریم علیہا السلام یہ تیرے پاس کہاں سے آ جاتے ہیں؟ تو وہ جواب میں فرماتیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سے عطا ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے، بے حساب رزق

دیتا ہے۔ یہ تھی حضرت مریم علیہا السلام کی کرامت، جس کو دیکھ کر حضرت زکریا علیہ السلام جن کو باوجود بڑھاپے کے ابھی اولاد عطا نہیں ہوئی تھی، فوراً پکار اُٹھے: اے میرے پروردگار: مجھے اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد عطا فرما دے، اس لئے کہ تو سب کی دعاؤں کو سننے والا ہے یعنی حضرت زکریا علیہ السلام نے جب حضرت مریم علیہا السلام کے پاس بے موسم پھل دیکھے تو ان کے یقینِ کامل میں زبردست اضافہ ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ جب یہ کچھ کرسکتا ہے تو اگرچہ میری جوانی نہیں رہی اور موسم شباب رخصت ہوگیا اور بڑھاپا آگیا، اب میرے لئے اولاد کا ہونا بالکل بے موسم پھل کی طرح ہے، مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی مشکل اور بعید نہیں، وہ اس بڑھاپے کے عالم میں بھی مجھے اولاد عطا کرسکتا ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا فوراً قبول فرمائی اور ان کو بیٹے کی خوشخبری فرشتوں کی زبانی دلوائی جب کہ وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت مریم علیہا السلام کی کرامت دیکھ کر حضرت زکریا علیہ السلام دعا فرماتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو حضرت یحییٰ علیہ السلام جیسا پاکباز اور صالح نبی، بیٹا عطا فرماتے ہیں۔ حاصلِ کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کی پکار کو سنتا اور قبول کرتا ہے بشرطیکہ خلوص دل اور یقین کامل سے اس کو پکارا جائے۔

جیسے کامل یقین اور سوز وگداز سے حضرت زکریا علیہ السلام نے پکارا تو فوراً دعا قبول ہوئی۔ ظاہر ہے کہ ایسا یقین اور سوزِ دروں آج بھی ہم میں پیدا ہوجائے تو مراد مل سکتی ہے۔ اس سوزِ دروں کے لئے ہمیں اولیاء اللہ کی مجالس ومحافل میں حاضر ہوکر ان سے تزکیۂ نفس کرانا چاہیے تاکہ دنیا کی محبت جو ہمارے دِلوں میں رچ بس چکی ہے، وہ نکل کر اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی محبت ہمارے قلوب میں موجزن ہوجائے۔

اصل اور حقیقی دولت یہی ہے۔ جس انسان کو یہ دولت نصیب ہوجائے تو وہ دونوں جہانوں میں کامیاب و کامران ہے اور جو شخص اس دولتِ ایمان ویقین کو حاصل نہ کرسکے تو وہ دونوں جہاں میں ناکام ونامراد ہے۔ غرض کہ سارے عالم کی کامیابیاں اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے اور جناب نبی پاک ﷺ کے مبارک طریقوں پر چلنے سے حاصل ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور حضور اکرم ﷺ کی تابعداری نہ کرنا بڑی بدنصیبی کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے بچائے۔ آمین۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اولیاء اللہؒ کی ولایت کے صدقے سے اللہ تعالیٰ ایسے خرقِ عادت کام ظاہر فرماتا ہے، جو دوسرے لوگ کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ گویا یہ کرامت ولی کے سچا ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔ تاہم یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ جس ولی سے کسی قسم کی کرامت کا صدور نہ ہو وہ ولی ہی نہیں۔ اولیاء اللہؒ کی پہچان اللہ تعالیٰ نے خود اپنی کتاب میں بایں الفاظ کروائی ہے۔

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ (یونس: ۶۳) یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور (عمر بھر) پرہیز گاری کرتے رہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗۤ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (الانفال: ۳۴)
اس کے متولی تو صرف متقی لوگ ہی ہیں، لیکن ان کی اکثریت اس حقیقت کو نہیں جانتی۔

اللہ والوں کی پہچان کے لیے چشم بصیرت چاہیے، ہر کہہ ومہہ کو یہ مقام حاصل نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ بزرگ فرماتے ہیں۔

ع ولی را ولی می شناسد

(یعنی ولی کی پہچان ولی ہی کرسکتا ہے۔)

غرض کہ جو مسلمان متقی و پرہیز گار ہے، اس سے کوئی مستحب بھی نہیں چھوٹتا، اور مکروہ تنزیہی سے بھی اجتناب کرتا ہے خواہ اس سے کوئی کرامت ظاہر ہو یا نہ ہو، یقیناً وہ ولی اللہ ہے۔ اس لیے کہ بزرگ فرماتے ہیں۔

اَلْاِسْتِقَامَةُ فَوْقَ الْكَرَامَةِ
اِستقامت (تعلیماتِ اسلامیہ پر مستقل طور پر عمل پیرا رہنا) کرامت سے بلند ہے۔

اس کی دلیل قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (حٰم السجدہ: ۳۰)
بے شک وہ (سعادت) مند جنہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر اس پر ڈٹ گئے۔

معلوم ہوا کہ ولی کے لئے اللہ تعالیٰ کی عبادت و بندگی اور حضور اکرم ﷺ کی غلامی شرط اولیں ہے۔ اس سے ذرہ بھر بھی انحراف کرنا شیطان کا دوست بننے کے مترادف ہے، اور دونوں جہانوں میں ہلاکت اور تباہی و بربادی کا ذریعہ ہے۔

ولی کس کو کہتے ہیں؟

یوں تو ہر نیک مسلمان، صوم وصلوٰۃ کا پابند، کبائر سے اجتناب کرنے والا، حقوق العباد میں انصاف کرنے والا ولی اللہ ہوتا ہے، لیکن ولایت کے درجات کے اعتبار سے یہ ولی کے کسب عبادت پر منحصر ہے۔ ولی وہ شخص ہے جو عبادت اور اطاعت کرنا اپنا معمول بنا لیتا ہے اور اطاعت میں اسے استقامت حاصل ہوتی ہے۔

ابو القاسم قشیریؒ فرماتے ہیں کہ ولی وہ شخص ہے جس کے کاموں کا اللہ والی ہو، جیسے فرمایا۔

وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ (الاعراف: ۱۹۶)
اللہ تعالیٰ صالحین کا والی ہے

لہٰذا اللہ تعالیٰ ایک لحظہ کے لئے اس بندے کو اس کی ذات پر نہیں چھوڑتا بلکہ خود اس کی نگہبانی کرتا ہے۔

ولی کے دوسرے معنی

ولی بروزن فعیل اس کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت اپنے ذمہ لے لیتا ہے اور اس میں

استقامت کرتا ہے اور درمیان میں نافرمانی نہیں کرتا۔ ولی کی شان یہ ہے کہ اسے کوئی خوف نہ ہو۔ جیسے قرآن حکیم میں فرمایا گیا۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (یونس:۶۲)

سنو! اللہ کے ولیوں کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہونگے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے، جس نے میرے ولی کو اذیت پہنچائی اس نے مجھ سے جنگ کرنا جائز سمجھا.... الخ (بخاری، رقم الحدیث ۲۔۶۵)

اولیاء اللہؒ کے خوف پر علامہ اقبالؒ نے بہت کلام کیا ہے اور اولیاء اللہ کو خوف نہ ہونے پر بھی بہت معنیٰ خیز گفتگو کی ہے مگر اس جگہ اختصار کو ملحوظِ خاطر رکھا جارہا ہے۔

ولی کی تعریف

یوں تو ولی اس کو کہتے ہیں جو عبادات میں مشغول ہو محرمات سے اجتناب کرے اور حقوق العباد کی رعایت کرے۔ اولیاء کے کمالات کے مطابق اس کے درجات ہیں۔ تفسیر مظہری میں ہے: ولی کامل وہ ہوتا ہے جس کا دل ذکر الٰہی میں مستغرق رہے شب و روز تسبیح و تہلیل میں مشغول رہے، اس کا دل محبت الٰہی سے لبریز ہو اور غیر اللہ کی وہاں گنجائش تک نہ ہو۔ وہ اگر کسی سے محبت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے لئے اور اگر کسی سے نفرت کرتا ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے لئے یعنی یہ ولی کا وہ مقام ہے جسے فنافی اللہ کا مقام کہتے ہیں۔ (تفسیر مظہری)

علامہ ثناء اللہ پانی پتیؒ فرماتے ہیں کہ مرتبۂ ولایت کے اصول کی یہی صحت ہے کہ بالواسطہ یا بلاواسطہ آئینہ دل پر آفتابِ رسالت کے انوار کا انعکاس ہونے لگے اور پرتو جمالِ مصطفیٰ ﷺ سے قلب و روح منور ہو جائیں۔ یہ نعمت ان لوگوں کو ملتی ہے جو اولیائے امت کی صحبت میں بہ کثرت حاضر ہوتے ہیں۔ (حضرت معاذ بن جبلؓ) سے ایک روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ان لوگوں سے میں ضرور محبت کرتا ہوں جو آپس میں میری وجہ سے محبت کرتے ہیں، میری رضا جوئی کے لئے ایک دوسرے کی زیارت کرتے ہیں اور میری خوشنودی کے لیے خرچ کرتے ہیں۔

علامہ ثناء اللہ پانی پتیؒ فرماتے ہیں کہ اولیاء اللہ کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جو طالب اور مرید ہیں اور دوسرے وہ جو مطلوب اور مراد ہیں۔ ایک وہ جو محبت ہیں، ایک وہ جنہیں محبوبیت کی خلعتِ فاخرہ سے سرفراز کیا گیا ہے۔ جو محبوب ہیں، ان کا ذکر امام مسلم کی صحیح حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔ (بروایت ابو ہریرہؓ) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبریلؑ کو بلاتا ہے اور فرماتا ہے: اے جبریل! میں اپنے فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت کر۔ پس جبریلؑ بھی

اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ وہ پھر آسمان والوں میں منادی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے محبت کرتا ہے، تم بھی اس سے محبت کرو، پھر سب اہل آسمان اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر زمین میں اس کے لئے مقبولیت رکھ دی جاتی ہے۔۔۔ الخ (بخاری رقم الحدیث ۷۴۸۵، مسلم رقم الحدیث ۲۶۳۷)

علامہ سعد الدین تفتازانی نے شرح العقائد میں تحریر فرمایا ہے کہ ولی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفات کا عارف ہو، وہ تا حد امکان طاعات پر مواظبت کرتا ہو اور معاصی سے بچتا ہو۔ وہ لذات اور شہوات میں انہماک سے بھی روگردانی کرتا ہو لیکن اگر شہوات و لذات بغیر انہماک کے ہوں تو اس تعریف سے خارج ہوں گے۔

ولی بمعنی قرب

ضرورت شیخ کے استدلال میں بیان کیا جا چکا ہے کہ قرب دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ قرب جو کائنات کے ہر ذرے کو اپنے خالق کے ساتھ حاصل ہے اور دوسرا قرب صحبت ہے۔ وہاں تفصیل ملاحظہ کی جائے۔

یہاں اس حدیث کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ جس میں "لَا یَزَالُ الْعَبْدُ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ" اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ بندہ نوافل کی ادائیگی سے میرا قرب حاصل کرتا ہے حتیٰ کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور میں اس کا کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اور میں اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ الخ (البخاری) اس قرب کا سب سے بلند مقام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی کو یہ مقام نہیں مل سکتا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے اوروں کو بھی یہ قرب حسب مقام ملتا ہے۔

ایک حدیث قدسی کے مطابق حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ رب العزت کا یہ ارشاد ان الفاظ میں بیان فرمایا۔

مَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُہٗ عَلَیْہِ (جامع صغیر ج ۱ ص ۷۰)

کوئی بندہ میرے فرائض کی ادائیگی سے بڑھ کر کسی اور چیز سے میرا تقرب حاصل نہیں کر سکتا۔ پھر (فرائض کے بعد وہ نوافل سے مزید میرا قرب حاصل کرتا جاتا ہے حتیٰ کہ میں اسے اپنا محبوب بنا لیتا ہوں جب وہ (بندہ) میرے مقام محبت تک پہنچ جاتا ہے تو میں اس کے کان، آنکھ، زبان، دل، ہاتھ اور پاؤں بن جاتا ہوں۔ وہ میرے ذریعہ سے سنتا، دیکھتا، بولتا اور چلتا ہے)

اس حدیث قدسی کی رو سے بندہ مرتبہ ولایت پر فائز ہو کر قرب الٰہی کے اس عظیم مقام سے سرفراز کر

دیا جاتا ہے کہ اس کے تمام اعضاء اور جوارح اللہ تعالیٰ کے ارادے اور منشاء و مرضی کے تابع ہو جاتے ہیں اور اس کی تمام زندگی بقول مولانا رومؒ اس کی زبان اللہ کا فرمان بن جاتا ہے۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود (مثنوی)

(اس کا کہا اللہ کا کہا ہو جاتا ہے، اگرچہ وہ اللہ کے بندے کی زبان سے نکلتا ہے۔)

کی جیتی جاگتی تصویر بن جاتی ہے۔

بہت سی کتب میں اولیائے کرام رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے فضائل و خصائص پر بہت طویل اور عریض بیانات آئے ہیں جن کا اس تحریر میں سمانا مشکل امر ہے۔ ایسی گفتگو عموماً بعض مجلسوں کی تقاریر میں ہی مناسب رہتی ہے جہاں سننے والے اہلِ ذوق ہوں اور وقت کی پابندی کا بھی اندیشہ نہیں ہوتا۔

باب ۳۶

عظمت و مراتبِ ولایت

نبوت و ولایت میں بایں وجہ واضح فرق ہے کہ نبوت وہبی ہے، اور ولایت کسبی چیز ہے۔ اگر کوئی مسلمان ساری عمر ریاضت و مجاہدہ کرتا رہے کہ وہ نبی بن جائے تو یہ صرف ناممکن نہیں بلکہ محال ہے، وہ کبھی بھی نبی نہیں بن سکتا۔ اللہ تعالیٰ نبوت کا براہِ راست انتخاب فرماتا ہے اور جسے چاہتا ہے نبی بنا لیتا ہے۔ جیسے کسی شاعر نے کتنے خوبصورت انداز میں یہ بات سمجھائی ہے۔

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیئے احوال	کہ آگ لینے کو جائیں پیغمبری مل جائے (×)

یعنی حضرت موسیٰ کوہ طور پر آگ لینے کو جاتے ہیں تو وہاں اللہ تعالیٰ نبوت عطا فرما دیتے ہیں اور ولایت کسبی چیز ہے۔ اگر کوئی مسلمان تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کرے، نفس کے خلاف ریاضتیں اور مجاہدے کرے تو وہ ولایت کے اونچے درجے تک فائز ہو سکتا ہے۔ اِس راہ میں جتنی محنت و مشقت اٹھائے گا، اتنا ہی اونچا درجہ حاصل کرلے گا۔ یہ قانونِ قدرت ہے کہ وہ کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا بلکہ اپنی طرف آنے والے ہر مسلمان کی چھوٹی سے چھوٹی محنت کی بھی قدر کرتا ہے اور اسے درجاتِ رفیعہ عطا فرماتا ہے حتیٰ کہ وہ بندہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ "گفتۂ او گفتۂ اللہ بود۔۔۔ گرچہ از حلقومِ عبد اللہ بود" (رومی) یعنی اس کا بول حقیقت میں اللہ کا بولنا ہوتا ہے اگرچہ ظاہر میں یہ الفاظ بندہ کی زبان سے ادا ہو رہے ہوتے ہیں۔ اس کی وضاحت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے: اللہ ربُّ العزت نے اپنے حبیبِ پاک ﷺ کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا۔

وَ مَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰی ؕ اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی ۙ (النجم: ۳)	اور وہ تو بولتا ہی نہیں اپنی خواہش سے۔ نہیں ہے یہ مگر وحی جو اُن کی طرف کی جاتی ہے۔

یعنی اللہ کا محبوب بندہ بننے کے لئے اپنی من چاہی زندگی چھوڑ کر رب چاہی زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ زندگی کا ایک سانس ایک لحہ بھی اللہ کی یاد کے بغیر نہیں گزارا جا سکتا۔ جو شخص اللہ کی یاد سے غافل ہو کر، حضور اکرم ﷺ کے نورانی طریقوں کو چھوڑ کر آپ ﷺ کی سنتوں کو اپنے ہاتھوں ذبح کر کے پھر ولایت کا دعویٰ کرتا ہے، تو وہ جھوٹا اور کذاب ہے۔ ایسا شخص ولی تو کجا، مسلمان کہلانے کا بھی حقدار نہیں۔ صلحائے امت کا تو یہ فرمان ہے کہ "جو دم غافل، سو دم کافر" یعنی مسلمان کا جو سانس بھی اللہ تعالیٰ کی یاد کے بغیر گزرے گا، وہ کفر و

نافرمانی میں شمار ہوگا۔اس لئے مزید فرماتے ہیں کہ "دست بکار دل بیار" یعنی ہتھ کار ول دل یار ول والا معاملہ ہروقت مسلمان کا ہونا چاہیے۔تو پھر مسلمان کا دنیوی کاروبار کرنا، رزق حلال کمانا عبادت میں شمار ہوگا۔ پھر ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَاَنِیْبُوْٓا اِلٰی رَبِّکُمْ (الزمر:۵۴) اور (سچے دل سے) لوٹ آؤ اپنے رب کی طرف۔

اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اس کے ماسوا کے ترک کے بعد ہوتا ہے۔ایک اور مقام پر ارشاد گرامی ہے۔

فَفِرُّوْٓا اِلَی اللّٰہِ (الذٰریٰت:۵۰) پس دوڑ واللہ کی طرف (اور اس کی پناہ لے لو)

حضرت ابن عطاءؒ فرماتے ہیں کہ تصوف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ " مُسْتَرْسَلْ " ہو جائے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جس جگہ وہ کھینچے اس جگہ کو جائے اور یہ ایسی صفت ہے کہ جس میں بندہ کی دونوں جہان کی بھلائی ہے، چنانچہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ

اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (البقرہ:۱۳۱) میں نے اپنی گردن جھکا دی سارے جہانوں کے پروردگار کے سامنے

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰہِ (المومن:۴۴) اور میں اپنا کام اللہ کو سونپتا ہوں۔

یہ حکم اس وقت نبھایا جا سکتا ہے جب ازل کی طرف نگاہ کرے اور جان لے کہ جو کچھ میرے لئے ازل میں مقرر ہو چکا ہے، میرے اضطراب سے اس میں نہ زیادتی ہوگی، اور نہ کمی ہوگی۔ جو شخص تسلیم و رضا پر شاکر نہیں ہوتا، اس کا حکم عبدِ ابق (نافرمان بندہ) یا باغی گھوڑے کا ہوتا ہے۔ ایسا شخص اپنے مالک کا مطیع و فرمانبردار نہیں ہوتا۔اس کے بعد فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کو پانے کی ایک صورت یہ ہے کہ نفس کو اسباب سے فنا کیا جائے۔

نفس کو فانی بنانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ یہ سمجھے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے ماسوا ہے سب اسباب ہیں اور مُسبّب اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور مُسبّب بغیر اسباب جو کچھ چاہے کر سکتا ہے اور سبب مسبب کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا، مثلاً ماں باپ اولاد کے سبب ہیں اور تقدیرِ الٰہی میں جب اولاد مقدر نہ ہو، ماں باپ کچھ نہیں کر سکتے۔لیکن مسبب (اللہ تعالیٰ) ماں باپ کے بغیر بھی پیدا کر سکتا ہے جس طرح کہ حضرت آدم و حوا علیہما السلام اور موسیٰؑ کا اژدہا اور صالحؑ کی اونٹنی کو پیدا فرمایا اور ساری مخلوق کو حق تعالیٰ بلا اسباب وجود میں لایا، ابتدا میں کوئی سبب نہ تھا۔فرماتے ہیں کہ بندہ جب اللہ تعالیٰ کی قدرت، مشیت اور سلطنت کو ملاحظہ کرے گا تو نفس اسباب سے فانی ہو جائے گا اور یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ روح کو نفس پر غالب رکھے کیونکہ روح نورانی ہے اور نفس ظلمانی ہے۔ جب نفس کو روح پر غالب کرے گا تو روح کی روشنی بجھ جائے گی اور مردہ چراغ فائدہ نہیں دیتا اور جب روح کو نفس پر غالب کرے گا تو ظلمت نور کی موجودگی میں کالعدم ہو جائے گی۔ یہ روح اور نفس کی مثال ہے۔اس

لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ (یونس: ۳۲) پس حق کے بعد کیا ہے، بجز گمراہی کے ؟

ضلالت میں نجات محال ہے اور حق کے ساتھ ہوتے ہوئے ہلاکت محال ہے کیونکہ حق ہمیشہ غالب اور باقی ہے اور ضلال ہمیشہ فانی اور ہلاک کرنے والا ہے۔

• آفرینش عالم بلکہ تمام کائنات کی پیدائش یعنی ان کا عالم وجود میں آنا حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے وجود مسعود سے ہے۔ حدیث قدسی میں ہے۔

لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ وَلَوْلَاکَ لَمَا اَظْهَرْتُ الرُّبُوْبِيَّةَ (الحدیث)

اے محبوب پاک صلی اللہ علیہ وسلم! اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوتے تو میں افلاک کو پیدا نہ کرتا اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوتے تو میں اپنی ربوبیت کا اظہار ہی نہ کرتا۔

تو معلوم ہوا کہ وجہ کائنات، شانِ دو عالم، جانِ دو عالم حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی ذات بابرکات ہے۔ کسی شاعر نے کیا ہی اچھا کہا ہے۔

وہ جو نہ تھے تو کچھ بھی نہ تھا وہ جو نہ ہوں تو کچھ بھی نہ ہو
جان ہیں وہ جہان کی، جان ہے تو جہان ہے

اللہ رب العزت نے حضرتِ انسان کو ارذل الاشیاء، مٹی سے پیدا فرما کر، اشرف المخلوقات بنا دیا اور اول البشر، ابو الانبیاء حضرت آدم علیہ السلام کو اپنے دست قدرت سے بنا کر مسجود ملائکہ بنایا اور "خَلِيْفَةُ اللّٰهِ فِي الْاَرْضِ" یعنی خلافتِ ارضی کا وارث بنایا اور آپ کی اولاد سے قریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار یا کم وبیش انبیاء و رسل پیدا فرمائے حتیٰ کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کو سب سے آخر میں تاج وتخت ختم نبوت عطا فرما کر مبعوث فرمایا اور ہم جیسے گنہگاروں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمتی بننے کا شرف عطا فرمایا کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

جب موسیٰ نے دیکھی شانِ نبی اُمتی ہونے کی تمنا کی (×)

حضرت موسیٰ جیسے اولو العزم رسولؑ نے جب حضور علیہ السلام کی شان ملاحظہ فرمائی تو اللہ تعالیٰ سے التجا کی کہ یا اللہ تو مجھ سے نبوت و رسالت لے کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمتی بنا دے۔ مگر ذات باری تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول نہیں فرمائی اور ان کو حضور علیہ السلام کا اُمتی نہیں بنایا اور ہم گنہگاروں پر اللہ تعالیٰ کی کتنی کرم نوازی ہے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ سے کوئی درخواست و التجا بھی نہیں کی اور بن مانگے محض اپنے فضل و کرم سے اس نے ہمیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمتی ہونے کا شرف عطا کیا۔ یہ ہم پر اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا احسان ہے جس کا شکر یہ ہم تا قیامت ادا نہیں کر سکتے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تاجِ ختمِ نبوت پہنا کر ہم گنہگار اُمتیوں کو وہ نبیوں والا اونچا مقام سونپ دیا، جس اونچے کام کے لئے ہر زمانے میں انبیاء و رسل مبعوث ہوتے رہے تا آنکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر

نبوت کا دروازہ بند کر دیا گیا اور فریضہ تبلیغ رسالت آپ ﷺ کی امت کے سپرد کر دیا گیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (آل عمران: ۱۰۴)	اور ضرور ہونی چاہیے تم میں ایک جماعت جو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کاموں کا حکم کرے اور برے کاموں سے روکے۔ اور یہی لوگ کامیاب وکامران ہیں۔

یقیناً یہی لوگ کامیاب ہوں گے۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے کامیابی کا دارومدار امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے کو قرار دیا ہے۔

ولایت، قرآن اور حدیث کی روشنی میں

ولایت اور اقسامِ ولایت

ولایت　بندہ کا قرب جو اللہ تعالیٰ سے ہے، مرنے کے بعد ساتھ لے جاتا ہے۔

ولایت　خلق میں مقبول ہونے کا سبب۔ اہل عالم کا گرویدہ ہونا، خوارق تصرفات، مرنے کے بعد کسی مخلص کے حوالے کر جانا۔

اقسام　ولایتِ صغریٰ (قلب کے مقام پر منحصر ہے) ولایت کبریٰ، ولایت ولاء اعلیٰ، ولایت موسوی، ولایت عیسوی، ولایت انبیاء، ولایت محمدی وغیرہ۔

آیاتِ قرآنیہ

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ (الفتح: ۲۹)	(جانِ عالم) محمد مصطفیٰ (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور وہ (سعادتمند) جو آپ (ﷺ) کے ساتھی ہیں کفار کے مقابلہ میں بہادر اور طاقتور ہیں۔

هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ (الکہف: ۴۴) یعنی تمام قبضہ و تصرف اللہ تبارک و تعالیٰ کے لیے ہی ہے۔

"يُحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗ" انہیں اللہ محبوب رکھتا ہے، وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔

اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (یونس: ۶۲)	خبردار رہو بے شک اللہ کے ولیوں پر کوئی خوف اور غم نہیں۔

اور فرمایا۔

نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ (حٰمٓ السجدۃ:۳۱)
ہم تمہارے مددگار ہیں، حیاتِ دنیا اور آخرت میں۔

اور فرمایا۔

اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (البقرۃ:۲۵۷)
اللہ ان کا مددگار ہے جو ایمان لائے۔

احادیث میں اولیاء کا ذکر

جیسا کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

رُبَّ اَشْعَثَ اَغْبَرَ ذِی طِمْرَیْنِ لَا یُعْدَآءُ بِہٖ لَوْاَقْسَمَ عَلَی اللّٰہِ لَاَبَرَّہٗ
اکثر ایسے لوگ ہیں کہ ژولیدہ اور غبار آلودہ بالوں والے پھٹے ہوئے کپڑوں میں کہ لوگ اس کو تین میں سمجھیں نہ تیرہ میں مگر ان کا مرتبہ یہ ہے کہ اگر وہ خدا کی قسم کسی معاملہ میں کھائیں تو اللہ اسے پوری فرما دیتا ہے۔

اور فرمایا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے۔

اِنَّ مِنْ عِبَادِ اللّٰہِ لَاُنَاساً یَغْبِطُھُمُ الْاَنْبِیَآءُ وَالشُّھَدَآءُ قِیْلَ مَنْ ھُمْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ لَعَلَّنَا نُحِبُّھُمْ ... الخ
اللہ کے بندوں میں ایسے بندے بھی ہیں کہ جن پر انبیاء وشہداء غبطہ کرتے ہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ کون ہیں؟ شاید ہم ان سے محبت کریں۔

مَنْ اٰذٰی وَلِیًّا فَقَدِ اسْتَحَلَّ مُحَارَبَتِیْ (مسلم شریف)
جس نے کسی ولی کو ایذا دی، اس نے اپنے لئے میری جنگ جائز کر لی۔

"ھُمْ قَوْمٌ لَا یَشْقٰی جَلِیْسُھُمْ"
(ان کا ہم نشین بدنصیب نہیں ہوتا)

ھُمْ جُلَسَآءُ اللّٰہِ بِھِمْ یُمْطَرُوْنَ وَبِھِمْ یُرْزَقُوْنَ (الصحیح المسلم باب فضل مجالس الذکر)
وہ اللہ کے ہم نشین ہیں انہی کے ذریعے بارش ہوتی ہے اور رزق دیا جاتا ہے۔

اَلْعُلَمَآءُ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَآءِ (ترمذی:ص ۳۸۴)
علمائے کرامؒ انبیائے کرامؑ کے وارث ہوتے ہیں۔

صحابہؓ نے صحبت میں اپنی جہالت کے زمانے کی عادات کو چھوڑ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت اختیار کی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو اپنی ارادت میں سچا دیکھا تو اپنے قلب مبارک کا عکس ڈالا اور نظر ہدایت سے ایک نگاہ ڈال کر نبوت کے انوار سے مالا مال کر دیا۔ حدیث شریف ہے کہ جس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک

بارزیارت کرلی تو غبی اور مجنوں بھی عاقل بن گیا۔

"اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ" (سنن ترمذی: رقم الحدیث ۳۱۲۷)

مومن کی فراست سے ڈرو، بیشک وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ میں (اللہ تعالیٰ) ولی کی زبان بن جاتا ہوں۔

ولی لوگوں میں مخفی ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے اور خود اپنے حال سے بھی مخفی ہوتے ہیں اور قیامت تک رہیں گے۔ اور کافروں پر فتح انہی کے ارادے سے ہوتی ہے اور بارانِ رحمت اور زمین میں جو کچھ اُگتا ہے، ان کے قدموں کی برکت سے ہے۔

مشائخ کے اقوال

ابوعلی جرجانیؒ فرماتے ہیں۔

اَلْوَلِیُّ هُوَ فِیْ حَالِهٖ وَبَاقٍ فِیْ مُشَاهَدَةِ حَقٍّ لَمْ يَكُنْ لَهٗ عَنْ نَفْسِهٖ اَخْبَارٌ وَّ لَا مَعَ غَيْرِ اللّٰهِ قَرَارٌ

ولی اپنے حال میں مستغرق ہوتا ہے، مشاہدہ حق میں باقی ہوتا ہے، اسے اپنے آپ کی خبر نہیں ہوتی اور نہ ہی اسے غیر اللہ کے ساتھ قرار آتا ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ ولی وہ ہے کہ جسے کوئی خوف نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ خوف اسے ہوتا ہے جس کے آنے سے دل کراہت کرتا ہے۔ ولی ابن الوقت یعنی صاحب الوقت ہوتا ہے اس کیلئے آئندہ کوئی ایسا وقت نہیں جس سے وہ ڈرے۔ اللہ فرماتا ہے کہ اس کو نہ خوف ہے نہ غم۔ جس طرح اسے خوف نہیں ہوتا امید بھی نہیں ہوتی۔ جو رضا میں ہو اسے کب غم اور امید ہوتی ہے۔

ابوعثمان مغربیؒ فرماتے ہیں۔

اَلْوَلِیُّ لَا يَكُوْنُ مَشْهُوْرًا وَلَا يَكُوْنُ مَفْقُوْدًا

ولی نہ مشہور ہوتا ہے نہ معدوم۔

ایک اور جگہ پر فرماتے ہیں۔

اَلْوَلِیُّ قَدْ يَكُوْنُ مَسْتُوْرًا لَا يَكُوْنُ مَشْهُوْرًا

ولی مخفی ہوتا ہے مشہور نہیں ہوتا

ابوعثمان فرماتے ہیں کہ ولی کی شہرت ممکن ہے، مگر اس کی شہرت میں فتنہ اور ابتلا نہیں یعنی فراڈ نہیں ہوتا۔

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ نے ایک شخص کو فرمایا کہ کیا تو چاہتا ہے کہ اللہ کے ولیوں میں سے ولی ہو۔ عرض کی ہاں آپؒ نے فرمایا۔

لَا تَرْغَبْ فِیْ شَیْءٍ مِّنَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَافْرِغْ نَفْسَكَ لِلّٰهِ بِوَجْهِكَ

دنیا و آخرت کی کسی چیز میں رغبت نہ کر اور اپنے من کو اللہ کے لئے خالی کردے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں۔

اَلْوَلِیُّ هُوَ الصَّابِرُ تَحْتَ الْاَمْرِ وَالنَّهْیِ یعنی ولی وہ ہے جو امر و نہی کے تابع رہے۔

اولیاء کی شان

شیخ الاسلام ہرویؒ فرماتے ہیں کہ الٰہی تو نے اپنے دوستوں کو کیا کر دیا کہ جس نے انہیں شناخت کر لیا، تجھے پالیا اور جو تجھے شناخت نہ کر سکا، انہیں بھی نہ پا سکا۔ حضرت مجدد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اس گروہ کے ساتھ بغض و عناد زہر قاتل ہے اور ان پر اعتراض اور نکتہ چینی ابدی محرومی کا موجب ہے۔ مجدد صاحب فرماتے ہیں کہ شیخ الاسلام کا یہ بھی قول ہے کہ الٰہی تو جسے مردود بارگاہ کرنا چاہتا ہے، اسے ہم سے الجھا دیتا ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں ۔

گفتۂ اُو گفتۂ اللہ بود ان کا کہنا اللہ کا کہنا بن جاتا ہے۔

اولیاء را ہست قدرت از الٰہ (۱۸۹۔۱) اولیاء کو اللہ کی طرف سے طاقت عطا کی جاتی ہے۔

اے اخی گر اولیاء را یافتی پس یقیں می داں خدا را یافتی

(اے بھائی اگر تو اولیاء کو پالے، تو یقین کر کہ خدا کو پالیا۔)

یک زمانہ صحبتے با اولیاء بہتر از صد سالہ طاعتِ بے ریا (۱۰۱۔۱)

(اولیاء کے ساتھ گزاری گئی ایک گھڑی سو سالہ بے ریا عبادت سے بہتر ہے۔)

حدیث دل کسی درویش بے گلیم سے پوچھ خدا کرے تجھے تیرے مقام سے آگاہ

(ب۔ج:۳۳۸)

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو یدِ بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

(ب۔د:۱۰۴)

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

(ب۔د:۲۷۱)

حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اہل اللہ میں بعض ایسے پراگندہ مُو غبار آلودہ، دریدہ لباس اور خستہ حال ہوتے ہیں کہ ان کی ظاہری حالت اور آشفتگی دیکھ کر کوئی انسان ان کی پرواہ نہیں کرتا، کسی بات پر وہ اگر خُدا کی قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم پوری کر دیتا ہے۔ اس حدیث سے پتا چلتا ہے کہ ان کا مقام اللہ کی نظر میں اتنا بلند ہوتا ہے کہ ان کی کہی ہوئی بات کو پورا کرنا وہ اپنی ربوبیت کا تقاضا بنالیتا ہے۔ (یہ حدیث پیچھے گزر چکی ہے۔)

وہ خوش قسمت افراد ہیں جن کو مقام ولایت عطا کر دیا جاتا ہے۔ اگر وہ اپنی ولایت میں کامل ہو تو اسے ان امور پر جن کا وہ فیصلہ کرتا ہے، متصرف بنا دیا جاتا ہے اور اس کے بارے میں باری تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ جو فیصلہ میرے بندے کا ہے وہی فیصلہ میرا ہے گویا اس کا معاملہ اللہ کے ساتھ بقول علامہ اقبالؒ۔

خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے؟ (ج۔ب:۳۴۷)

جیسا ہو جاتا ہے۔ یہ مقام ولایت معمولی نہیں۔ صحیح بخاری میں حدیث قدسی ہے۔

مَنْ عَادٰی لِیْ وَ لِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ (بخاری شریف)

جس نے میرے ولی سے عداوت رکھی، میرا اس کے ساتھ اعلان جنگ ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے میرے ولی سے محبت کی اس نے گویا مجھ سے محبت کی اور اگر اس نے دشمنی کی تو وہ مجھ سے دشمنی ہوگی۔ یہ اس لئے کہ جو بندہ اللہ کا ولی ہو جاتا ہے، وہ اپنے سارے کام اس کے سپرد کر دیتا ہے۔

عبادت کرنے والوں کی مخلوق میں عزت

اخلاص کی علامت جسم کا آلودہ خستہ یا پریشان ہونا، آواز کا پست رکھنا ہے تاکہ خشوع ظاہر ہو۔ یہ باتیں اگر از خود نہیں تو ریا کاری ہے۔ اعمال کی غرض خالص اللہ کی رضا مندی ہونا چاہیئے۔

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ نے فرمایا کہ میں نے معرفت ایک راہب سے سیکھی، جس کو سمعان کہتے تھے۔ فرماتے ہیں کہ میں اس کے صومعہ میں گیا جس میں اس نے رہبانیت اختیار کی تھی۔ میں نے پوچھا: تم کب سے یہاں ہو؟ اس نے کہا: ستر برس سے۔ میں نے کہا کہ تم کیا کھاتے ہو؟ اس نے کہا ایک چنا دن رات میں۔ میں نے کہا کہ تمہارے دل میں کیا چیز جوش کرتی ہے کہ یہ چنا تم کو کافی ہوتا ہے؟ اس نے کہا: تم کیوں یہ سوال کرتے ہو؟ میں نے کہا مجھے فقط دریافت کرنے کی خواہش ہے۔ اس نے کہا کہ اس کے سامنے والے عبادت خانے میں جو لوگ جمع ہوتے ہیں، وہ سال میں ایک بار میرے صومعہ پر آتے ہیں۔ اس دن صومعہ کو سجایا جاتا ہے۔ یہ لوگ اس کے گرد گھومتے ہیں، میری تعظیم کرتے ہیں۔ میرا دل عبادت سے گھبراتا ہے تو میں دل میں اس گھڑی کو یاد کرتا ہوں اور اس گھڑی کی خاطر میں تمام سال کی سختی برداشت کر لیتا ہوں۔ اس نے کہا اے حنیفی تجھے لازم ہے کہ تو دائمی عزت کے لئے جدوجہد کرے۔ اس کی گفتگو سے میرے دل میں معرفت نے گھر کر لیا۔ اس کے بعد ایک آب خورے سے چنے کے بیس دانے نچلی منزل میں رسی سے لٹکا دیئے اور میں نے جا کر نکال لئے۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ میں نے اپنی غذا میں سے یہ چنے تجھے دیئے ہیں۔ لوگوں نے مجھے کہا کہ تمہیں بابا نے کیا دیا ہے؟ میں نے کہا اس نے اپنی غذا میں سے یہ چنے مجھے دیئے ہیں۔ لوگوں نے کہا یہ

تمہارے کس کام کے ہیں؟ آپ اس کی قیمت ہم سے لے لیجئے۔ میں نے کہا بیس دینار دو۔ انہوں نے دے دیئے۔ جب پھر اس راہب کے پاس گیا تو اس نے کہا کہ اگر تم بیس ہزار دینار مانگتے تو وہ تمہیں بیس ہزار دینار بھی دے دیتے۔ اس نے کہا اے حنفی یہ عزت اس کے لئے ہے جو اللہ کو نہیں پوجتا۔ اب تو قیاس کر لے کہ جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے، اس کی کیا عزت ہوگی؟

تفسیر نعیمی میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۶۱ میں "سَبْعَ سَنَابِلَ" کی تشریح میں یہ لکھا ہے کہ نفلی صدقہ کا اتنا ثواب ہے جیسے زمین میں ایک دانہ بویا جائے تو اس ایک دانے سے (۷۰۰) سات سو دانے بن جاتے ہیں۔

روح المعانی میں ہے کہ اصحاب کشف اور اولیاء کو متشابہات کا علم ہوتا ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ دیگر آیات کو محکم اس لئے کہتے ہیں کہ متشابہات کو ان کی طرف لوٹایا جائے اور ان کے معانی محکمات کے مطابق کئے جائیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے لئے حضور اکرم ﷺ نے دعا فرمائی تھی "اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاْوِيْلَ" (اے اللہ انہیں دین کا فقیہ بنا اور متشابہات کی تعلیم سکھا) اگر متشابہات کا علم انسانوں کو نہ دیا جاتا تو اس دعا کے کیا معنی؟ بلکہ ابن عباسؓ کا قول ہے کہ میں متشابہات کی تاویل جانتا ہوں اور عقلمند لوگ ان متشابہات سے نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ نیز اگر بندوں کی اس علم تک رسائی نہیں تو پھر ان کو قرآن میں رکھنے کا کیا فائدہ تھا؟

ولی کی وضاحت مشائخِ عظام کی زبان میں

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا: ولی وہ ہے جسے کوئی خوف لاحق نہ ہو کیونکہ خوف اس چیز کا ہوتا ہے جس کے احتمال سے دل میں کراہت ہو یا اس خیال سے ہوتا ہے کہ محبوب جو اب اس کے سامنے ہے، غم فراق میں مبتلا کر کے چھوڑ نہ جائے۔ ولی صاحب وقت ہوتا ہے۔ اس کے لیے کوئی مستقبل کا خدشہ باعثِ ہراس نہیں ہو سکتا۔ باری تعالیٰ نے فرمایا۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (یونس: ۶۲)	خبردار رہو بے شک اللہ کے محبوبوں، ولیوں پر کوئی خوف اور غم نہیں۔

ابوعثمان مغربیؒ نے فرمایا: ولی دنیا میں مشہور ہوتا ہے لیکن دنیا سے محبت نہیں رکھتا۔ ایک اور بزرگ نے کہا "ولی مستور ہوتا ہے، مشہور نہیں ہوتا"۔ اس قول سے مراد یہ ہے کہ شہرت سے پرہیز کرتا ہے اور شہرت فتنہ پرور ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ شہرت روا ہے اگر باعث فتنہ نہ ہو۔ فتنہ کی بنا کذب پر ہے اور کذب سے ولی اللہ پاک ہوتا ہے اور اپنی ولایت میں صادق ہوتا ہے۔ لفظ ولی کاذب پر چسپاں نہیں کیا جا سکتا اور کاذب سے کرامت ظہور پذیر نہیں ہو سکتی۔

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ سے کسی نے پوچھا کہ " کیا تو ولی ہونا چاہتا ہے تو آپ نے جواب دیا " ہاں " تو اس بزرگ نے فرمایا کہ دنیا اور عاقبت کی کسی چیز سے وابستگی پیدا نہ کر، اپنے نفس کو فارغ کر اور اپنے پیش نظر صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات پاک کو رکھ۔ صوفیا کا قول ہے کہ حق تعالیٰ سے منہ پھیر کر دنیا کی طرف رغبت کرنا فانی چیز میں الجھنے کے برابر ہے۔ اپنی ذات کو خدا کی دوستی کے لئے فارغ کرنا دنیا اور عاقبت کی ہوس سے پاک کرنا ہے۔ اگر یہ اوصاف موجود ہوں تو ولایت کا مقام کچھ دور نہیں۔

بایزید بسطامیؒ سے پوچھا گیا کہ ولی کون ہے؟ فرمایا: ولی اسے کہتے ہیں جو باری تعالیٰ کے اوامر و نواہی پر قائم رہے۔ اگر حق تعالیٰ کی دوستی نصیب ہو تو اس کے احکام کی تعظیم دل میں زیادہ ہوتی ہے اور نواہی سے جسم زیادہ دور رہتا ہے۔ یاد رہے کہ حضرت بایزید بسطامیؒ ایک مشہور بزرگ کی زیارت کے لئے سینکڑوں میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جب ان کے پاس پہنچے تو اس بزرگ نے مسجد میں قبلہ کی طرف منہ کر کے کلی کر دی۔ یہ معاملہ دیکھ کر آپ اس کو سلام کئے بغیر واپس پلٹ آئے اور کہا کہ ولی شریعت کا پاسدار ہوتا ہے تاکہ باری تعالیٰ اس کا مقام برقرار رکھیں۔ اگر یہ شخص فی الواقع ولی ہوتا تو مسجد میں تھوکنے کا مرتکب نہ ہوتا اپنی عزت کا لحاظ رکھتا اور اپنے مقام کا حق ادا کرتا تاکہ صحیح کرامات کے لائق ہوتا۔ اسی رات پیغمبر ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ آپ ﷺ فرماتے ہیں " اے بایزید! جو تو نے کیا، خدا تجھے اس کی برکات سے نوازے، تمہارے اس فعل سے میں بہت خوش ہوا ہوں۔"

بایزیدؒ کہتے ہیں کہ دوسرے ہی روز مجھے وہ مقام نصیب ہوا جس پر لوگ مجھے فائز دیکھتے ہیں۔

اولیاء کے وجود کی برکات

حضرت مجدد الف ثانیؒ (مکتوب نمبر ۲۰، جلد ثانی) میں فرماتے ہیں: اہل اللہ کا وجود حقیقت میں کرامات میں سے ایک بڑی کرامت ہے اور لوگوں کے لیے حق تعالیٰ کی طرف سے دعوت حق تعالیٰ کی رحمتوں میں سے ایک رحمت ہے۔ مردہ دلوں کو اس دعوت سے زندہ کرنا بڑی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ اہل اللہ زمین والوں کے لیے امان اور زمانے کے لئے غنیمت ہیں۔ ان کے طفیل آسمان سے بارش ہوتی ہے اور لوگوں کو رزق ملتا ہے۔ ان کا کلام دوا ہے اور ان کی نظر شفا ہے۔ وہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کا ہم نشین بدبخت نہیں رہتا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ ان کے ہم نشینوں، اولاد اور نسل کو حتیٰ کہ ان کی زیارت کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ مسلسل برکتیں عطا فرماتا رہتا ہے۔ ان کی دعا قبول کی جاتی ہے بلکہ جو کسی حاجت میں ان کا وسیلہ پکڑتا ہے، ان کی حاجت پوری ہو جاتی ہے۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ حق سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا کہ میں زمین و آسمان میں نہیں سما سکتا۔ عجب ہے کہ میں مومن کامل کے دل میں سما جاتا ہوں۔

پس اے انسان اگر تو مجھ کو چاہتا ہے تو دلوں میں تلاش کر اور طلب کر۔

ملّتِ اسلامیہ کے خاص الخاص اراکین تو اولیائے کرام ہیں۔ یہ لوگ نور لذت استنباط کرتے ہیں اور حجابِ حقیقت کو اُٹھاتے ہیں۔ سلوک طریقت پر عملاً اور حالاً چلتے ہیں۔ حقائق کی تحقیق ان کے ہاں پائی جاتی ہے۔ وہ اہل یقین ہوتے ہیں۔ نفس کے مکر کی صراحت ان کے ہاں پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ اِبقا اور تہذیب اخلاق کی واقفیت میں یکتا ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں تزکیۂ ظاہر، تصفیۂ باطن، تخلیۂ قلب اور تزکیۂ روح میں کوئی دوسرا طبقہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور انہیں جس طرح اموال و احوال، اخلاق و مقامات وجد و ذوق، نکات و اشارات غرضیکہ انتہائی اخلاق کے کمالات حاصل ہیں، وہ کسی دوسرے طبقے میں نہیں پائے جاتے۔ یہ کتاب و سنت کے عامل ہوتے ہیں۔ شریعت اور طریقت کی تمام ظاہری و باطنی حدود کا احترام کرتے ہیں۔ انہوں نے کبھی ظاہری شریعت اور باطنی طریقت میں تغافل یا تساہل سے کام نہیں لیا۔ ان حضرات قدس اللہ اسرارھم نے لکھا ہے۔ ''ہماری طریقت کی بنیاد کتاب وسنت ہیں، جو ان کی مخالفت کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے اور ہم اسے منکر احکام رسول اللہ ﷺ جانتے ہیں۔''

اگر ذکر الٰہی، نماز و تلاوت قرآن پاک میں ذوق، حضور قلب اور خشوع و خضوع حاصل ہو تو فتح الباب کی اُمید رکھنی چاہیے۔ اگر یہ چیزیں حاصل نہیں تو کچھ بھی حاصل نہیں۔ جو شخص قرآن و حدیث پر غور و فکر نہیں کرتا وہ علماء و فقہاء کی صحبت سے دور رہتا ہے، وہ بے ادب ہے اور خائب و خاسر ہوگا۔ اولیائے کرام کی ارواح انبیاء کرام کی ارواح سے فیضیاب ہوتی ہیں اور انبیائے کرام کی روحیں حضرت خاتم النبیین محمد مصطفیٰ ﷺ سے مستفیض ہوتی ہیں اور روح خاتم الانبیاء ذات باری تعالیٰ سے مستفید ہوتی ہے۔

ولی اللہ کے لئے خدائی بشارتیں

سورۂ یونس کی آیت ۶۲ میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ کے ولیوں کو نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ صوفیاء کا خیال ہے کہ یہ حضرات عمداً کوئی برا کام نہیں کرتے جس کا انہیں غم ہو، اور ان حضراتؒ کے خوف و غم سے آزاد ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ انہیں رب کی طرف سے بشارتیں پہنچتی رہتی ہیں۔ قرآن حکیم میں بہت سی ایسی آیات موجود ہیں جو اللہ کے خاص بندوں کو مصائب میں ڈھارس بندھاتی ہیں اور اللہ کی طرف سے مدد کے وعدے کرتی ہیں۔ (انکا ذکر ہماری تصنیف ''نشانِ منزل'' کے باب ابتلا یعنی آزمائش کے بیان میں گزر چکا ہے) ایسی آیات میں سے ایک یہ ہے۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا　(الطور: ۴۸)

اور آپ صبر فرمائیے اپنے رب کے حکم سے پس آپ بلاشبہ ہماری نظروں میں ہیں۔

جب کسی کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے حال سے واقف ہے اور ہمیں دیکھ رہا ہے تو پھر غم کس طرح باقی رہ سکتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت جبریل علیہ السلام کو فرمایا کہ مجھے تیری مدد کی ضرورت نہیں اور جب جبریل علیہ السلام نے عرض کیا: آپ اللہ سے آگ سے نجات کے لئے دعا فرمائیں تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ میرے کہنے کے بغیر میرے حال سے واقف ہے۔"

مذکورہ بالا بشارت کے علاوہ ولیوں کے لئے بشارت یہ ہے کہ مخلوق خدا میں بہت سے لوگوں کی زبان سے نکلتا ہے کہ فلاں ولی ہے جیسے فرمایا۔

لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (البقرۃ: ۱۴۳)　تا کہ تم لوگوں کے لئے گواہ ہو جاؤ۔

امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مسلمان تمام امتوں پر گواہی دیں گے۔ تیسری بشارت یہ ہے کہ لوگوں کے دل ولی کی طرف کھنچ جاتے ہیں اور ان کو دیکھ کر لوگ ان سے خواہ مخواہ محبت کرنے لگتے ہیں (خواہ دنیا انہیں مقام دے یا نہ دے) یہ ولایت کی خاص علامت ہے۔ (جبریلؑ کے ذریعے اللہ کی محبت کرنے کا اعلان کرنے والی حدیث کو دیکھیں جو پہلے گزر چکی ہے، جب دنیا میں کسی کی ولایت کا اعلان ہو جائے تو مخلوق کے دلوں میں ان کی قبولیت ڈال دی جاتی ہے۔

چوتھی بشارت یہ ہے کہ ان کے دلوں میں اچھے کاموں اور اچھے بندوں کی محبت پیدا کر دی جاتی ہے اور ایسے کاموں میں غم اور خوف نہیں رہتا۔

پانچویں بشارت یہ ہے کہ مرتے وقت فرشتے ان کو جنت میں داخل ہونے اور رب کی رضا کی خوش خبری سناتے ہیں: وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ۔ (الفجر: ۳۰) (اور داخل ہو جاؤ میری جنت میں)

چھٹی بشارت یہ ہے کہ ان کو خوابوں اور الہام کے ذریعے اپنی رحمتوں اور دنیا وعقبیٰ کی باتوں کی اطلاع دی جاتی ہے جس کے معلوم ہونے سے ان کے غم دور ہو جاتے ہیں۔ ساتویں بشارت یہ ہے کہ

وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا ﴿۴۷﴾ (الاحزاب: ۴۷)　اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم مژدہ سنا دیں مومنوں کو کہ ان کے لئے اللہ کی جناب سے بڑا ہی فضل ہے

آٹھویں بشارت یہ ہے کہ جنت کے داخلے کے وقت فرشتے ان کو خوشخبری دیں گے۔

طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ (الزمر: ۷۳)　تم خوب رہے پس اندر تشریف لے چلو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

نویں بشارت یہ ہے کہ موت کے وقت اللہ تعالیٰ بشارت دیتا ہے کہ جا تجھے بخش دیا اور جس نے تیری میت کو کندھا دیا، وہ بھی بخش دیا جائے گا۔

دسویں بشارت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو وعدے اولیائے کرام کے لئے قرآن میں فرمائے ہیں، ان

وعدوں میں تبدیلی نہ ہونے کا اقرار "لَا تَبۡدِیۡلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰهِ" (یونس: ۶۴) کہہ کر فرمایا ہے۔

گیارہویں بشارت یہ ہے کہ مرنے کے بعد یہ بزرگ باقی رہتے ہیں اور تصرف کرتے ہیں، ان کی قبروں پر ہزاروں سال کے بعد بھی چراغ جلتے ہیں۔

اللہ کے دیوانوں کے قدموں میں سب کچھ آ جاتا ہے

ہر کہ دیوانہ بود در ذکرِ حق زیرِ پایش عرش و کرسی نہ طبق(x)

(اللہ کا ذکر کرتے ہوئے جو دیوانہ اور بے خود ہو جاتا ہے، اس کے قدموں کے نیچے عرش کرسی اور تمام عالم زیریں و بالا آ جاتے ہیں۔)

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اپنی تصنیف "عوارف المعارف" میں اس حقیقت کا انکشاف کرتے ہیں کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ کے وہ بندے جو دریائے معرفت میں مستغرق ہوتے ہیں، باوجود اس امر کے کہ انہیں کشف کی قدرت حاصل نہیں ہوتی، مرتبے میں ان سے بڑھ جاتے ہیں جنہیں کشف حاصل ہوتا ہے۔ وہ بندگانِ خدامست قادر مطلق کے قرب میں اتنے سرشار ہوتے ہیں کہ انہیں کسی چیز کی حاجت نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ خود عالمِ حکمت میں ان پر اپنے کرم اور لطف و عطا کی بارش کرتا رہتا ہے اور ان پر اتنی تجلی ریزیاں ہوتی رہتی ہیں کہ وہ مظاہرِ قدرت کے کسی عنوان کو عجیب و غریب نہیں سمجھتے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں حضرت شبلیؒ کے سامنے کسی نے اس واقعہ کا ذکر کیا کہ ایک دفعہ انہیں بھوک لگی تو سارا صحرا ان کے لئے کھانے میں بدل دیا گیا۔ وہ (حضرت شبلیؒ) کہنے لگے کہ یہ تو ان کے ساتھ محض رفاقت کا نرم سلوک روا رکھا گیا۔ اگر وہ ولایت کے مقامِ تحقیق تک پہنچ جاتے تو ان کے ساتھ وہی معاملہ ہوتا جس کا ذکر اس حدیث میں ہے جس میں حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "میں اپنے رب کے پاس رات گزارتا ہوں، وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے"۔

اولیاء اللہ کی کیا ضرورت ہے؟

اہل دنیا روحانی طور پر اولیائے کرام کے قدموں کی برکتوں کے ایسے ہی محتاج ہیں جیسے وہ روٹی، پانی اور دیگر مادی ضرورتوں کے محتاج ہیں۔ درج ذیل نکات سے اس بات کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

(۱) اولیاء صراط مستقیم کی دلیل ہیں۔ جس دین پر ولی ہو، وہی دینِ حق ہے، جو ملت ولایت سے خالی ہے، وہ باطل ہے۔ گزشتہ امتوں میں بھی ولی تھے، جن کی درخشاں مثالیں آصف بن برخیاؑ، اصحابِ کہف، حضرت مریم علیہا السلام، حضرت جریج رحمۃ اللہ علیہ وغیرھم ہیں۔

(۲) رسول مقبول ﷺ کے معجزات آج بھی زندہ جاوید ہیں اور اولیائے کرام ایک ایسا معتبر ذریعہ ہیں جن سے کمالاتِ مصطفوی کے بارے میں دنیا کو آگاہی ملتی ہے۔

(۳) رسول اللہ ﷺ کے فیوض ظاہری، علمائے دین اور فیوض باطنی اولیائے کرام کے ذریعے ہم تک پہنچتے ہیں۔ جیسے دل کا فیض، بصورتِ خون، رگوں کے ذریعے تمام بدن کو ملتا ہے، اگر رگیں کٹ جائیں تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر ولایت کا فیضان درمیان میں نہ ہو تو امت کی روحانی موت واقع ہو جاتی ہے۔ تمام روحانی سلاسل حضور اکرم ﷺ کے منبع فیض سے چلنے والے قمقمے ہیں۔

(۴) قیامت کے روز لوگوں کو اپنے پیشواؤں یا اماموں کے ذریعے بلایا جائے گا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ (بنی اسرائیل:۷۱) — وہ دن جب ہم بلائیں گے تمام انسانوں کو ان کے پیشوا کے ساتھ

جو کسی امام یا رہبر طریقت کے ساتھ نہ ہوگا، اس کا کوئی مقام نہ ہوگا۔

اولیاء اللہ کے مناقب

زیر نظر کتاب میں ولایت کے باب میں لفظ ولی کی تحقیق میں کافی مضمون دیا جا چکا ہے اور ولی کی شناخت اور تعریف میں کافی کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ اصطلاحاتِ تصوف کے بارے میں لفظ صوفی کی کافی وضاحت کی جا چکی ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمائیں۔ زیرِ نظر بحث میں ولی کے مناقب، فضیلت، قدرت، اہمیت وغیرہ کے عنوانات شامل کئے جا رہے ہیں تاکہ قارئین کو ولی سے متعلق خاطر خواہ معلومات حاصل ہو سکیں۔ صوفیاء کی اصطلاحات احادیث سے ماخوذ ہیں۔

اولیاء اللہ کے مختلف مناصب کے بارے میں عام ذہنوں میں کچھ غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں اور جن اصطلاحات کے خلاف ''بدعت'' کا شور مچا کر نفرت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ان کے متعلق غلط تاثر دور کرنے کے لئے ذخیرہ احادیث میں سے چند شواہد پیش کئے جاتے ہیں: ابو نعیم نے ''حلیہ'' میں ذکر کیا کہ ''حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں ہر زمانہ میں یعنی ہر صدی میں پانچ سو اخیار ہوں گے اور چالیس ابدال، ان دونوں میں کمی نہ ہوگی، ان میں سے جو فوت ہوگا، ان پانچوں میں اللہ تعالیٰ اُس کی جگہ دوسرے شخص کو چالیس (ابدالوں) میں داخل کر دے گا۔

امام احمدؒ کی حدیث میں یوں ہے کہ ''اس امت میں ابدال تیس ہوں گے جن کے قلوب حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے قلوب پر ہوں گے، ان میں جو فوت ہوگا، اللہ اس کی جگہ دوسرا ابدل دے گا۔'' حدیث طبرانی میں اس طرح ارشاد ہے کہ ''میری امت میں تیس ابدال ہوں گے، انؑ کے سبب سے زمین قائم رہے گی، ان کی وجہ سے بارش برسائی جائے گی اور انکی وجہ سے مدد دی جائے گی۔'' حدیث ابن عساکر میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ ''ابدال شام میں ہوتے ہیں اور وہ چالیس مرد ہیں، ان کے سبب سے تمہیں بارش دی جاتی ہے اور ان کی

وجہ سے دشمنوں پر فتح دی جاتی ہے اور ان کے سبب اہل زمین کی تکالیف اور مصائب دور کئے جاتے ہیں۔"
طبرانی کی حدیث میں اضافہ بھی ہے کہ ان کی وجہ سے تمہیں مدد دی جائے گی اور تمہیں رزق دیا جائے گا۔"
ابن ابی الدنیا کی حدیث میں ہے "میری امت کے ابدالوں کی نشانی یہ ہے کہ وہ کسی چیز پر لعن طعن نہیں کرتے۔" اور بیہقی کی حدیث میں ہے کہ "میری امت کے ابدال اپنے اعمال کے سبب جنت میں داخل نہ ہوں گے بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے نفسوں کی سخاوت سے اور سینوں کی سلامتی سے داخل ہوں گے۔" اور قطب کے متعلق جو بیان ہوا جیسا بعض محدثین نے لکھا ہے ابو نعیم نے حلیہ میں بیان کیا کہ بہت سی حدیثیں اس کی تائید میں وارد ہو چکی ہیں جن کا ذکر ہو چکا اور وہ بھی جو مذکور نہیں مثلاً حدیث حکیم ترمذی اور ابو نعیم کہ ہر زمانہ میں میری امت میں سابقون ہوں گے اور ہر زمانہ کے لیے سابقون ہوں گے۔ علامہ سیوطیؒ نے تقریباً بیس رواۃ سے ابدال کی احادیث نقل کی ہیں اور تمام کو صحیح اور حسن فرمایا ہے۔ تمام طرق احادیث کو جمع کرنے پر قطب مشترک یعنی ابدال کا وجود یقیناً تسلیم کرنا پڑے گا۔ جس مستقل کتاب کا حوالہ علامہ موصوف نے دیا ہے، اس کا نام "الخبر الدال من وجود القطب والنجباء والابدال" ہے۔

ابدال، قطب، غوث اور قیوم وغیرہ اولیاء اللہ کی خاص اصطلاحات ہیں۔ بعض نادان لوگوں نے ان سے غلط مفہوم لیا ہے۔ وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ ادھر بعض غالی مولویوں نے لفظ غوث پر خواہ مخواہ اعتراض کئے ہیں، یہ دونوں گروہ افراط و تفریط کا شکار ہوئے۔ "دلائل السلوک" میں مولانا اللہ یار خان مرحوم نے اعتراف کیا کہ "غوث اور قیم کی اصطلاحات تمام کتب نظامیہ میں موجود ہیں اور بڑے بڑے موحدوں نے اپنی ذاتی تحریروں میں بھی یہ اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ مولانا حسین علی صاحب نے فوائد عثمانیہ میں کئی مقامات پر لفظ غوث استعمال کیا ہے۔ اسی طرح شاہ ولی اللہؒ، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ، امام ربانی مجدد الف ثانیؒ اور قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے اپنی کتاب "تفسیر مظہری" میں یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ (دلائل السلوک ص ۱۴۲)

غوث اور قطب

صوفیاء کی بعض اصطلاحات کی اصل تو خود قرآن و حدیث میں موجود ہے، جیسے ابرار، اخیار اور نقباء وغیرہ۔ علامہ سیوطیؒ نے ان اصطلاحات پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ "ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ خدا کے تین سو بندے مخلوق میں ہیں جن کے قلوب حضرت آدمؑ کے قلب کی مانند ہیں۔ چالیس ایسے ہیں جن کے قلوب حضرت موسیٰؑ کے قلب کی مانند ہیں۔ سات ایسے ہیں جن کے قلوب حضرت ابراہیمؑ کے قلب سے ہیں۔ پانچ ایسے ہیں جن کے قلوب حضرت جبرئیلؑ کے قلب پر ہیں۔ تین ایسے ہیں جن کے قلوب حضرت میکائیلؑ کے قلب پر ہیں اور ایک ایسا بندہ جس کا قلب حضرت اسرافیلؑ کے قلب پر ہے۔ ان روایات سے چار قطب اور ایک غوث کے مناصب ثابت

ہوئے۔ اقطاب کے فرائض کے متعلق امام ربانی مجدد الف ثانیؒ نے تصریح فرمادی ہے۔

اقطاب کے فرائض حضرت مجددؒ کی نظر میں

قطب ابدال واسطه وصول فیض است که وجود عالم به بقائے آں تعلق دارد قطب ارشاد واسطه فیوض است که بارشاه و ہدایت تعلق دارد، پس تخلیق و ترزیق وازاله بلیات و وضع امراض و حصول عافیت و صحت منوط به فیوض مخصوصه قطب ابدال است و ایمان و ہدایت و توفیق حسنات و انابت ازئیات نتیجه فیوضات قطب ارشاداست (مکتوب ۴۴)

حضرت مجددؒ فرماتے ہیں کہ "قطب ابدال عالم کے وجود اور اس کی بقا سے تعلق رکھنے والے امور میں وصول فیض کا واسطہ ہے اور قطب ارشاد ہدایت وارشاد کے متعلق امور میں اصول فیض کا ایک واسطہ ہے اس لئے پیدائش، رزق، مصائب کے دور ہونے اور صحت و آرام کے حاصل ہونے کا تعلق قطب ابدال کے فیض کیساتھ مخصوص ہے اور ایمان ہدایت، نیک کاموں کی توفیق اور توبہ وغیرہ کا تعلق قطب ارشاد کے فیض کا نتیجہ ہے۔

قُطبِ مدار

قُطبِ مدار کے متعلق قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کے واقعہ کے تحت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ سے حضرت خضرؑ کا قول نقل فرمایا ہے۔

وَجَعَلَنَا اللّٰهُ تَعَالٰی مُعِیناً لِلْقُطْبِ الْمُدَارِ مِنْ اَوْلِیَآءِ اللّٰهِ تَعَالٰی الَّذِیْ جَعَلَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی مُدَارَالْعَالَمِ بِبَرَکَةِ وُجُوْدِهٖ وَ اِفَاضَتِهٖ فَقَالَ الْخِضْرُاِنَّ الْقُطْبَ فِیْ هٰذِهِ الزَّمَانِ فِیْ دِیَارِ الْیَمَنِ مُتبع" لِلشَّافِعِیْ فِی الْفِقْهِ فَنَحْنُ نُصَلِّیْ مَعَ الْقُطْبِ (مکتوب:۴۵)

حضرت خضرؑ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے ہم کو قطب مدار کا مددگار بنایا ہے۔ جو اولیاء اللہ سے ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے دنیا کی بقاء کا سبب بنایا ہے۔ یہ اس کے وجود کی برکت اور فیضان ہے اور فرمایا کہ اس وقت قطب مدار ملک یمن میں ہے اور فقہ شافعی کا پیروکار ہے اور ہم اس کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔

اور وہ حدیث جس کو علامہ سیوطیؒ نے کنانیؒ سے روایت کیا ہے، اس کے آخر میں "والغوث واحد" کے آگے روایت یوں ہے۔

فَمَسْكَنُ النُّقَبَآءِ الْمَغْرِبُ وَ مَسْكَنُ النُّجَبَآءِ مِصْرُ وَ مَسْكَنُ الْاَبْدَالِ الشَّامُ وَالْاَخْيَارُ سَيَّاحُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَالْقُطْبُ فِيْ زَوَايَا الْاَرْضِ وَ مَسْكَنُ الْغَوْثِ مَكَّةُ فَاِذَا عَرَضَتِ الْحَاجَةُ فِيْ اَمْرِ الصَّمَامَةِ اِسْتَهَلَ فِيْهَا النُّقَبَآءُ ثُمَّ النُّجَبَآءُ ثُمَّ الْاَبْدَالُ ثُمَّ الْاَخْيَارُ ثُمَّ الْقُطْبُ فَاِنْ اُجِيْبُوْا وَاِلَّا ابْتَهَلَ الْغَوْثُ فَلَا تَمَّ مَسْئَلَةُ حَتّٰى تُجَابَ دَعْوَتُهُ (مکتوب:۴۶)	نقباء کا مسکن، مغرب، نجباء کا مصر، ابدال کا شام ہے۔ اخیار سیاح ہوتے ہیں۔ قطب زمین کے گوشوں میں ہوتے ہیں۔ جب مخلوق کو عوامی مصیبت آ جائے تو دعا کے لئے نقباء ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ اگر قبول نہ ہو تو نجباء پھر اخیار پھر قطب اور اگر پھر بھی قبول نہ ہو تو غوث دعا کے لئے ہاتھ پھیلاتا ہے حتیٰ کہ اس کی دعا قبول ہو جاتی ہے۔

قیوم کون ہوتا ہے؟

قیوم کے متعلق حضرت مجدد علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے کہ

آں عارفے کہ بہ مرتبہ اشیاء مشرف گشتہ حکم وزیردارد کہ مہمات مخلوق راباُو مرجوع داشت اند ہر چند انعامان از سلطان است اما وصول آنہا مربوط بتوسط وزیر است (مکتوب:۴۷)	وہ عارف جو قیوم کے منصب پر فائز ہو، وزیر کا حکم رکھتا ہے کہ مخلوق کے اہم امور کا تعلق اس سے ہے، گو انعام تو بادشاہ کی طرف سے ہوتے ہیں مگر وہ وزیر کی وساطت سے ملتے ہیں۔

فرد اور قطب وحدت کا مفہوم بعینہ وہ حدیث ہے جو رسول کریم ﷺ سے بطور دعا غزوۂ بدر کے موقع پر زبان مبارک سے ادا ہوئی۔

اَللّٰهُمَّ اِنْ تُهْلِكْ هٰذِهِ الْعِصَابَةَ لَا تُعْبَدْ فِي الْاَرْضِ اَبَدًا	الٰہی! اگر آپ نے اس جماعت کو ہلاک کر دیا تو آپ کی عبادت زمین میں کبھی نہ کی جائے گی۔

معرفت توحید، فیضان کا عام اور جلد ہونا قطب وحدت اور افراد کی خصوصیات میں سے ہے اور معرفت ذات باری تعالیٰ اس سے وابستہ ہوتی ہے۔

درجۂ قیوم کا انسانِ کامل ہوتا ہے

حضرت مجددؒ فرماتے ہیں کہ قیوم انسان کامل ہوتا ہے اور کل احکام ظاہری و باطنی قیوم کی ذات سے

وابستہ ہیں کیونکہ یہ بمنزلہ وزیر کے ہے۔ یہ مفہوم حدیث سے بھی متبادر ہوتا ہے۔

قَالَ اِنَّمَآ اَنَا قَاسِمٌ وَّاللّٰهُ يُعْطِىْ۔ میں تقسیم کنندہ ہوں، دیتا اللہ تعالیٰ ہے۔

قیوم اولوالعزم رسول کا نائب ہوتا ہے۔ اس کا مخالف فیض سے محروم رہتا ہے، کیونکہ وہ حکومت کے وزیر کا باغی ہوتا ہے اور باغی کو حکومت کی طرف سے انعام نہیں ملا کرتا۔ ہر چیز اچھی یا بُری سلطان الملک یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وزیر کے ذریعے مخلوق کی طرف آتی ہے، جب مخلوق مصیبت میں مبتلا ہو جاتی ہے تو غوث بارگاہ رب العزت میں درخواست پیش کرتا ہے، اللہ تعالیٰ چاہے تو اس کی دعا قبول فرما کر مصیبت دور کر دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ غوث مستجاب الدعوات ہوتا ہے۔ اس طرح قیوم کُل انعامات کا سبب ہوتا ہے۔ نیز قطب، ابدال اور قطب ارشاد جزوی انعامات کا ذریعہ ہیں اور خاص خاص ایک ایک انعام پر مقرر ہیں اور قطب وحدت اور فرد کا تعلق براہ راست ذات باری تعالیٰ سے ہوتا ہے۔ اس لئے ان کا مرتبہ غوث اور قیوم سے بہت بلند ہے۔

لفظِ غوث کی تشریح

لسان العرب میں لفظ غوث کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

یعنی غوث اسم مصدر مبنی للفاعل ہے اور اس کے معنی پکارنے والا'' دعا کرنے والا اور فریاد کرنے والا ہوں گے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ محاورہ عرب میں غوث بمعنی دعا اور پکار کے ہیں جیسے ''لسان العرب'' میں ہے:''اَجَابَ اللّٰهُ غُوْثَاهُ وَغُوَاثَهٗ'' (اللہ نے اس کی دُعا اور پکار کو قبول کر لیا۔)

وَلَمْ يَأْتِ فِى الْاَصْوَاتِ شَىْءٌ بِالْفَتْحِ غَيْرَهٗ وَاِنَّمَا يَاْتِىْ بِالضَّمِّ مِثْلَ الْبُكَآءِ بِالْكَسْرِ مِثْلَ النِّدَآءِ وَالصِّيَاحِ

آواز کو ادا کرنے والا کوئی لفظ زبر کے ساتھ نہیں آتا سوائے غوث کے بلکہ پیش کے ساتھ آتا ہے جیسے بُکَاءٌ ہے اور زیر کے ساتھ آتا ہے جیسے نِدَاءٌ اور صِیَاحٌ ہے۔

اصطلاحِ صوفیہ میں غوث اس مستجاب الدعوات ہستی کے لئے بولا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے فریاد کرتا ہے اور دعا کرتا ہے اور لغت عرب بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ اس لفظ کا معنی بعض اہل لغت نے ''فریادرس'' بھی کیا ہے۔ (قاموس اللغات باب الغین)

تصوف میں طریقۂ نقشبندیہ کی فضیلت واہمیت

یہ طریقہ سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے۔ مختلف زبانوں میں اس کے مختلف القاب رہے ہیں، چنانچہ صدیق اکبرؓ سے شیخ بایزید بسطامیؒ تک اسے صدیقیہ کہتے تھے اور بایزید بسطامیؒ سے خواجہ عبدالخالق غجدوانیؒ تک طیفوریہ اور خواجہ عبدالخالقؒ سے خواجہ بہاؤالدین نقشبندؒ تک خواجگانیہ کہلاتا تھا اور

حضرت خواجہ نقشبندؒ سے حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ تک نقشبندیہ کے نام سے موسوم تھا اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے زمانہ سے نقشبندیہ مجددیہ کہلاتا ہے۔

ہر انسان پر لازم ہے کہ اپنے مولا کریم جلّ و اعلیٰ مجدہ کے اوامر بجالائے اور نواہی سے باز رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اخلاص کا حکم دیا ہے جسے حدیث جبریلؑ میں احسان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ دوامِ عبودیت یا دوام آگاہی فناء و محبت ذاتیہ کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس لیے صوفیہ کرام نے فناء و محبت ذاتیہ کی تحصیل کے لئے مختلف طریقے بیان کئے ہیں جن میں طریقۂ نقشبندیہ امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس طریقہ عالیہ کا مدار متابعت سنت کے التزام اور بدعت کے اجتناب پر ہے اور اوراد و اذکار بھی اگر ہیں تو وہی جو ماثورہ ہیں۔ حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نوع بشر بلکہ ملائکہ سے بھی اکمل الاکملین ہیں۔ ظاہر و باطن اور صفات جبلی و کسبی میں اور علم و اعتقاد و عمل اور عبادات و عادات و معاملات میں جو شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جس قدر زیادہ مشابہت پیدا کرے گا، اسے اسی قدر کامل جاننا چاہیے اور جو شخص مشابہت میں ان اشیاء میں سے کسی چیز میں قاصر ہے اس کو اسی قدر ناقص سمجھنا چاہیے۔ کمال اتباع سنت جو حضرات نقشبندیہ نے اختیار کی ہے، اس کے سبب سے وہ دوسروں سے سبقت لے گئے ہیں اور کمال متابعت کی وجہ سے یہی کمال مشابہت ان کی افضلیت کی دلیل ہے۔ وہ عمل بر عزیمت وحتی المقدور ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور رخصت پر عمل تجویز نہیں کرتے۔ وہ احوال و مواجید کو احکام شرعیہ کے تابع رکھتے ہیں اور اذواق و معارف کو علوم دینیہ کے خادم سمجھ کر جواہر نفیسہ شرعیہ کے عوض میں وجد و حال کے رموز کو نہیں لیتے اور صوفیہ کے تبرکات پر مغرور نہیں ہوتے۔ اسی واسطے ان کا وقت و حال دوام واستمرار پر ہے۔ نقشِ ماسوا ان کے دل سے اس طرح محو ہو جاتا ہے کہ اگر ہزار سال ماسوا کے حاضر کرنے میں تکلف کریں تو حاضر نہ ہو سکے۔ وہ تجلی ذاتی جو دوسروں کے لئے مثل برق کے ہے، ان بزرگوں کے لئے دائمی ہے۔ وہ حضور جس کے پیچھے غیبت ہو، ان کے نزدیک اس اعتبار سے ساقط ہے۔ وہ اس آیت مبارکہ کی عملی تفسیر ہیں۔

رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (نور: ۳۷)　یعنی وہ مرد کہ غافل نہیں کرتی ان کو سوداگری اور نہ خرید و فروخت خدا کی یاد سے۔

حضرت خواجہ نقشبند علیہ الرحمۃ نے بارگاہ رب العزت میں دعا کی تھی کہ مجھے ایسا طریقہ عطا فرمایا جائے جو اقرب طرق اور موصل ہو۔ اللہ جل شانہ نے حضرت خواجہ کی دعا قبول فرمائی اور ان کو سلوک پر جذبہ کی تقدیم کا الہام ہوا۔ دوسرے طریقوں میں سلوک کو جذبہ پر مقدم کرتے ہیں۔ یعنی پیر کامل اپنے مرید کو پہلے ریاضات (اربعین و بیداری و گرسنگی وغیرہ) یعنی چلّہ کشی، جگ رتہ اور فاقہ وغیرہ کا حکم دیتا ہے اور ان ریاضتوں سے مرید کے عناصر و نفس کو مصفّا کرتا ہے۔ جب مرید اپنے نفس و عناصر کی طہارت اپنے سے باہر عالم مثال میں دیکھتا

ہے مثلاً ستارہ یا ہلال یا ماہ ناقص یا بدر کامل یا آفتاب تو اس وقت شیخ اس مرید کو فنا تصفیہ نفس و عناصر کی بشارت دیتا ہے اسے سلوک کہتے ہیں اور اس سیر کو "سیر آفاقی" کہتے ہیں کیونکہ طالب اپنے سے خارج عالم مثال میں جو منجملہ آفاق ہے، اپنے احوال وانوار دیکھتا ہے۔ اس کے بعد شیخ محض اپنی توجہ سے مُرید کے لطائف عالم امر کے تزکیہ میں مشغول ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ فنا و بقاء حاصل کرتے ہیں، اسے جذبہ کہتے ہیں اور اس سیر کو "سیر انفسی" کہتے ہیں کیونکہ اس سیر میں طالب جو کچھ استنارت و ترقی و وصول باصل وفناء دیکھتا ہے، اپنے اندر دیکھتا ہے۔ حضرت مجدد اس سیر کو سیر انفسی اس واسطے کہتے ہیں کہ نفس اسماء وصفات باری تعالیٰ کے ظلال وعکوس کے آئینے ہو جاتے ہیں نہ یہ کہ سالک کی سیر نفس میں ہوتی ہے۔ یہاں حقیقت میں ظلال اسماء کی سیر ہے نفس کے آئینوں میں۔ طریقہ نقشبندیہ میں جذبہ کو سلوک پر مقدم کرتے ہیں اور ابتداء لطائف عالم امر سے کرتے ہیں۔ سلوک جذبہ کے ضمن میں اور جذبہ و تصفیہ کے مقصود نفس کا اخلاق ردیہ اور اوصاف رزیلہ سے پاک کرنا ہے۔ انفس کی گرفتاری اور مرادات نفس کا حصول سب سے بڑی برائی ہے۔ آفاق کی گرفتاری نفس کی گرفتاری کے سبب ہے کیونکہ جس چیز کو کوئی دوست رکھتا ہے تو اپنی دوستی کے سبب سے دوست رکھتا ہے۔ مثلاً اگر فرزند و مال کو دوست رکھتا ہے تو اپنے فائدے کے لئے دوست رکھتا ہے کیونکہ سیر انفسی میں محبت خدا تعالیٰ کے غلبہ کے سبب سے اپنی دوستی زائل ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس کے ضمن میں فرزند و مال کی دوستی بھی زائل ہو جاتی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ اپنی ذات کی گرفتاری کے دور ہو جانے سے دوسروں کی گرفتاری بھی دور ہو جاتی ہے۔ اس طرح سیر انفسی کے ضمن میں سیر آفاقی بھی قطع ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں سیر انفسی و سیر آفاقی کے معنی بھی بلا تکلف درست رہتے ہیں کیونکہ حقیقت میں سیر انفس میں بھی ہے اور آفاق میں بھی میسر ہوتی ہے۔ انفس کے تعلقات کا قطع بتدریج انفس میں سیر ہے اور آفاق کے تعلقات کا قطع جو سیر انفسی کے ضمن میں ہوتا ہے، آفاق میں سیر ہے۔ دیگر مشائخ نے جو ان دونوں کے معنی بیان کئے ہیں، ان میں تکلف ہے۔ پس طریقہ نقشبندیہ میں راہ اقرب ہوا اس واسطے کہا گیا ہے کہ دوسروں کی نہایت ان بزرگوں کی بدایت میں مندرج ہے۔

واضح رہے کہ سیر انفسی و سیر آفاق دونوں ولایت کے رکن ہیں۔ شہود انفسی کو کمال بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اپنے سے باہر شہود و یافت نہیں، مگر حضرت مجدد فرماتے ہیں کہ مغلوب جو بے چون و بے چگون ہے، آفاق وانفس سے باہر ہے۔ آفاق وانفس کے آئینوں میں اس کی ذات اور اسماء وصفات کی گنجائش نہیں۔ ان میں جو ظاہر ہوتا ہے، وہ ظلال اسماء وصفات ہیں بلکہ اسماء وصفات کی ظلیت بھی ان دونوں سے باہر ہے۔ چونکہ آفاق وانفس اور سلوک و جذب سے باہر ولایت اولیاء کا گزر نہیں اس لئے اکابر نقشبندیہ نے بھی آفاق وانفس اور سلوک و جذب سے باہر کی خبر نہیں دی ہے اور کمالات ولایت کے مطابق فرمایا ہے کہ اہل اللہ فنا و بقاء کے بعد جو کچھ دیکھتے ہیں، اپنے میں دیکھتے ہیں اور ان کی حیرت اپنے وجود میں ہے۔

" وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ " مگر الحمدللہ کہ ان بزرگوں نے اگرچہ انفس سے باہر کی خبر نہیں دی، مگر وہ گرفتار انفس بھی نہیں وہ انفس کو بھی آفاق کی طرح لا کے تحت میں لا کر اس کی نفی کرتے ہیں، چنانچہ حضرت خواجہ بزرگ" کا ارشاد ہے کہ جو کچھ دیکھا گیا اور سنا گیا اور جانا گیا، وہ سب غیر ہے۔ حقیقت کلمہ لا سے اس کی نفی کرنی چاہیے۔

(مکتوبات دفتر دوم، حصہ اوّل ،ص ۱۰۵۹)۔

نقش بندند ولے بند بہر نقش نیند ہر دم از بوالعجبی نقشِ دگر پیش آرند
(ہم نقشبند کہلاتے ہیں مگر کسی نقش میں بند نہیں ہیں اپنے کمال اور بوالعجبی سے ہر ساعت ایک نیا نقش پیش کرتے ہیں)

نقشبندانے و لیک از نقش پاک نقشِ ما ہم گرچہ پاک از لوحِ خاک
(ہم نقشبند کہلاتے ہیں لیکن ہر نقش سے پاک ہیں اگرچہ ہمارا نقش بھی لوحِ خاک سے پاک ہے۔)

طریقہ نقشبندیہ کے اقرب طرق ہونے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ حضرات نقشبندیہ کا وسیلہ حضور سرورِ انبیاء علیہ وعلیٰ آلہ الصلوات والتسلیمات کی جناب میں حضرت ابوبکر صدیق" ہیں۔ ظاہر ہے کہ وسیلہ جس قدر زیادہ قوی ہوگا، راہ وصول اقرب ہوگا اور قطع منازل بہت جلدی ہو جائے گا۔ وہ جو اس سلسلہ کا اکابر کی عبارت میں واقع ہے کہ ہماری نسبت سب نسبتوں سے بلند و بالا ہے، بالکل درست ہے کیونکہ ان کی نسبت (یعنی دوام حضور یا دوام آگاہی) حضرت صدیق اکبر" کی نسبت ہے جو پیغمبروں کے بعد افضل البشر ہیں اور حضرت صدیق اکبر" کی آگاہی سب آگاہیوں سے ارفع و اعلیٰ ہے۔

یہ طریق البتہ موصل ہے۔ عدم وصول کا احتمال یہاں نہیں پایا جاتا کیونکہ اس راہ کا پہلا قدم جذبہ ہے جو وصل ﷺ کی دہلیز ہے۔ سالک کے وصول مانع یا جذب محض ہے جس میں سلوک نہ ہو یا سلوک محض بغیر جذبہ کے، یہ دونوں مانع نہیں پائے جاتے کیونکہ اس طریق میں نہ سلوک خالص ہے، نہ جذب محض، بلکہ جذبہ ہے متضمنِ سلوک۔ لہٰذا اس طریقہ عالیہ میں وصول کا سد راہ سوائے طالب کی سُستی کے اور کوئی چیز نہیں۔ طالب صادق اگر پیر کامل کی صحبت میں رہے اور شرائطِ طلب جو اکابر سلسلہ نے قرار دی ہیں، بجا لائے تو اُمید ہے کہ واصل ہوگا۔ اگر پیر ناقص سے کسی کا پالا پڑ جائے تو چونکہ وہ خود واصل نہیں، دوسرے کو کیسے واصل بنا سکتا ہے؟ اس صورت میں طریق کا کیا قصور ہے، حضرت قیوم ربانی مجدد الف ثانیؒ نے اس سلسلہ عالیہ کی تاریخ میں ایک نیا دور پیدا کر دیا ہے۔ ولایت کے تمام مقامات آپ ہی پر منکشف ہیں اور آپ نے علوم و معارف جدیدہ پر شریعت کی مہر تصدیق کی ہے، چنانچہ آپ مکتوب ۲۶۰ جلد اول میں اپنا طریق بیان کر کے یوں لکھتے ہیں۔

"یہ ہے بیان اس طریق کا بدایت سے نہایت تک جس کے ساتھ حق سبحانہ وتعالیٰ نے اس حقیر کو ممتاز فرمایا ہے۔ اس طریق کی بنیاد نسبت نقشبندیہ ہے جو متضمن اندراج نہایت اور بدایت ہے۔ اس بنا پر عمارتیں اور محل بنائے گئے، اگر یہ بنیاد نہ ہوتی تو معاملہ یہاں تک نہ بڑھتا۔ بخارا و سمرقند سے بیج زمینِ ہند میں لایا گیا جس کا مایہ خاک یثرب و بطحاء سے بویا گیا اور اس کو سالوں آبِ فضل سے سیراب رکھا گیا اور تربیتِ احسان سے پرورش کیا گیا جب وہ کھیتی کمال کو پہنچی تو یہ علوم و معارف کے پھل لائی"۔

ایک اور مکتوب (مکتوب ص ۲۸۱ دفتر اول) میں آپؒ یوں ارشاد فرماتے ہیں۔ (تذکرہ، ص: ۴۹۲)

"اس طریق میں ایک قدم رکھنا دوسرے طریقوں کے سات قدم سے بہتر ہے۔ وہ راستہ ہے جو بطریق تبعیت و وراثت کمالات نبوت کی طرف کھلتا ہے اس طریق عالی سے مخصوص ہے جو دوسرے طریقوں کی نہایت کمالات ولایت کی نہایت تک ہے۔ وہاں سے کمالاتِ نبوت کی طرف کوئی راستہ کھلا نہیں۔"

مولانا عبدالرحمٰن جامی قدس سرہ السامیؒ نے کیا خوب فرمایا ہے۔

نقشبندیہ عجب قافلہ سالار اند　برند از رہِ پنہاں بحرم قافلہ را

(نقشبندی عجیب قافلہ سالار ہیں، جو مخفی راستے سے قافلے کو حرم میں پہنچا دیتے ہیں۔)

از دلِ سالکِ رہ جاذبہ صحبتِ شاں　می برد وسوسہ خلوت فکر چلہ را

(سالک کے دل سے براستہ جذب ان کی صحبت چلے کی خلوت فکر کے وسوسہ کو لے جاتی ہے۔)

قاصرے گر کند ایں طائفہ را طعنِ قصور　حاش لِلّٰہ کہ بر آرم بزبان .ایں گلہ را

(اگر کوئی قصور وار لوگ ان لوگوں کو قصور کا طعنہ دیں، اللہ معاف کرے کہ میں زبان پر ایسا گلہ لاؤں۔)

ہمہ شیرانِ جہاں بستۂ ایں سلسلہ اند　روبہ از حیلہ چساں بگسلد ایں سلسلہ را

(تمام دنیا کے شیر اسی سلسلے سے بندھے ہوئے ہیں، لومڑی کسی حیلے سے اس سلسلے کو کیسے توڑ سکتی ہے؟)

ولی کا مقام احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں

حضور اکرم ﷺ نے ولی اللہ کے مقام کی پہچان کے لئے جو کچھ فرمایا وہ ایک طویل بیان ہے جسے مختلف مقامات پر بیان کیا جا چکا ہے۔ ان میں چند فرمودات یہاں پیش کیے جا رہے ہیں۔

(۱) حضور اکرم ﷺ سے جب پوچھا گیا "مَنْ اَوْلِیَاءُ اللّٰہِ" (اولیاء اللہ کون ہیں؟ تو فرمایا "اَلَّذِیْنَ اِذَارُءُ وْا ذُکِرَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ" (وہ لوگ ہیں جن کے دیدار سے خدا یاد آ جائے۔)

(۲) آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تمہیں ان لوگوں کے بارے میں آگاہ نہ کروں جو تم سب سے بہتر ہیں۔ سب نے عرض کی کہ اے اللہ کے رسول اللہ ﷺ بتائیے۔ آپ نے فرمایا جب ان کی زیارت کی جائے اللہ

یاد آجائے کیونکہ ان کا دل وہ آئینہ ہے جس میں تجلیات الٰہیہ کا عکس پڑ رہا ہے اور جب کوئی چیز ایسے آئینہ کے مقابل رکھی جاتی ہے جس پر سورج کی کرنیں پڑتی ہوں، تو وہ چیز بھی روشن ہو جاتی ہے بلکہ اگر آئینہ کا عکس روئی پر ڈالا جائے تو وہ جلنے لگتی ہے۔ حالانکہ سورج کی کرنیں اگر بلاواسطہ پڑیں تو وہ نہیں جلتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سورج سے دور ہے، وہ (لیکن جلنے والی روئی) آئینہ سے قریب ہے۔

حدیث میں بھی آتا ہے کہ جب کوئی مسلمان شرک جلی شرک خفی، اخفا، حسد، کینہ، غرور و تکبر اور ہوا و ہوس وغیرہ سے پاک ہو جائے اور تقویٰ کے بلند مقام پر پہنچ جائے تو اسے خلعت ولایت عطا کی جاتی ہے۔ حضرت سیدنا عمر فاروق ؓ سے مروی ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے بندوں میں سے ایسے لوگ بھی ہیں جو نہ نبی ہیں نہ شہید لیکن قیامت کے دن قرب الٰہی کی وجہ سے انبیاء اور شہداء ان پر رشک کریں گے۔ صحابہ کرام ؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! ہمیں بتائیے وہ کون ہیں، ان کے اعمال کیا ہیں تاکہ ہم ان لوگوں سے محبت کریں۔ فرمایا وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے لئے آپس میں محبت کرتے ہیں، نہ ان میں کوئی رشتہ ہے اور نہ مالی منفعت۔ بخدا ان کے چہرے سراپا نور ہوں گے اور نور کے منبروں پر انہیں بٹھایا جائے گا۔ جبکہ دوسرے لوگ خوفزدہ ہوں گے اور انہیں کوئی خوف نہ ہوگا۔ لوگ حزن و ملال میں مبتلا ہوں گے لیکن انہیں کوئی حزن و ملال نہ ہوگا، پھر حضور اکرم ﷺ نے یہ آیت پڑھی: اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (یونس: ۶۲) سنو! بے شک اولیاء اللہ کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اثباتِ ولایت

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ولایت واؤ کے زیر کے ساتھ "تصرف و ملکیت کے معنی میں آتا ہے۔ اور واؤ کے زبر کے ساتھ امارت کے معنی میں۔ ولی کی دو قسمیں ہیں یا تو وہ مرید ہوگا یا مراد یعنی یا تو وہ خود اللہ کا طالب ہوگا (اس وقت اسے مرید کہیں گے) یا پھر اللہ تعالیٰ اس کا طالب ہوگا۔ (اس وقت اسے مراد کہیں گے اور اس کی مثال حسام الدین ہیں جن کی عزت مولانا رومیؒ اس طرح کرتے تھے جیسے کوئی پیر مرید کی عزت کرتا ہے) اللہ تعالیٰ اپنے محبوبین کا ناصر و مددگار ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس نے صحابہ کرام ؓ کے بارے میں فرمایا۔

اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ (البقرۃ: ۲۱۴) اچھی طرح سن لو اللہ تعالیٰ کی مدد بہت قریب ہے

اور کافروں کے بارے میں ارشاد فرمایا۔

وَاَنَّ الْکٰفِرِیْنَ لَا مَوْلٰی لَهُمْ (محمد: ۱۱) اور کفار کا کوئی مددگار نہیں۔

اللہ تعالیٰ اگر کافروں کا معین و مددگار نہیں تو لازماً مومنوں کا مددگار ہوگا اور بدرجہ اولیٰ اپنے دوستوں کا مددگار۔ اللہ تعالیٰ کے یہی دوست عوام کے درمیان "ولی" کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں اور کتاب و سنت سے

ان کا وجود ثابت ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (یونس: ۶۲)

سنو! بے شک اولیاء اللہ کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

ایک مقام پر ارشاد ہے۔

نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ (حٰم السجدۃ: ۳۱)

ہم ہیں تمہارے دوست دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں۔

ایک حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

مَنْ اٰذٰی وَلِيًّا فَقَدِ اسْتَحَلَّ مُحَارَبَتِیْ

جس نے میرے کسی ولی کو ایذا دی اس نے میرے لیے جنگ جائز کرلی۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کا ناصر و مددگار ہے۔ اللہ تعالیٰ جنہیں اپنا ولی بناتا ہے، ان کے ساتھ مخصوص قسم کی کرامتیں وابستہ کردیتا ہے اور پھر انہیں طبعی آفتوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ ان کی محبت وانس کا راستہ سوائے اس ذات واحد کے کسی کے ساتھ نہیں ہوتا۔ اس طرح کے لوگ ہم سے قبل بھی موجود تھے، ہمارے زمانے میں (حضرت ہجویریؒ کے زمانے میں) بھی موجود ہیں۔

اس طرح کے اولیاء اللہ کی تعداد چار ہزار ہے۔ یہ لوگوں سے مخفی ہیں اور ایسے مخفی ہیں کہ ایک دوسرے کو بھی نہیں پہچانتے۔ حتیٰ کہ بعض خود اپنے جمال سے بھی بے خبر ہوتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ قیامت تک رہیں گے۔ یہ اولیاء اللہ زمین میں اللہ جل شانہ کی برہان ہیں۔ ان چار ہزار اولیاء میں تین سو ارباب حل وعقد ہیں جنہیں تصوف کی اصطلاح میں ''اخیار'' کہا جاتا ہے۔ چالیس وہ ہستیاں ہیں جنہیں ''ابدال'' کہا جاتا ہے۔ سات وہ ہیں جنہیں ''ابرار'' کہا جاتا ہے۔

چار وہ ہیں جنہیں ''اوتاد'' کہا جاتا ہے۔ تین وہ ہیں جنہیں ''نقباء'' کہا جاتا ہے۔ ایک وہ ہے جسے ''قطب'' کہتے ہیں۔ اسے ''غوث'' بھی کہتے ہیں۔ مذکورہ بالا تمام ایک دوسرے کو جانتے اور پہچانتے ہیں اور نظام معاملات وتصرف میں ایک دوسرے کی اجازت کے محتاج ہیں۔ ان باتوں پر احادیث ناطق ہیں اور ارباب صحبت ان پر متفق ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے اولیاء اس کی حفاظت اور نگرانی میں ہوتے ہیں اور نفس ومعصیت کی بہت سی آفات سے محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ معتزلہ البتہ تخصیص ولایت کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں تمام مسلمان اللہ کے ولی ہیں۔ اس میں اولیاء اللہ کی کیا تخصیص ہے۔ صرف شرط اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی ہے۔ ان کا تو یہ بھی عقیدہ ہے کہ مسلمان ہمیشہ کے لئے فی النار ہوسکتا ہے۔ انبیاء ورسل اگر نہ بھی آتے اور آسمانی کتابیں اگر نازل نہ بھی ہوتیں

تو بھی عقلاً مکلف بہ اطاعت ہوتے۔ حضرت ہجویریؒ فرماتے ہیں کہ میں تو ایسے عقیدے والے کو شیطان سمجھتا ہوں کیونکہ معتزلہ تو یہاں تک مانتے ہیں کہ "کرامت" مومن اور کافر دونوں کو حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ تمام عقائد باطل اور گمراہ کن ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ ایمان کا حکم عوام کے لئے عام ہے اور حکم کرامت خواص کے لئے خاص ہے اور تخصیص کی نفی کرنا مکابرہ ہے۔

بادشاہ کے دربار میں وزیر، امیر، سپہ سالار، منشی، دربان، چوکیدار سب ہوتے ہیں۔ نوکر ہونے میں سب ہی برابر ہیں۔ مگر ہر ایک کا منصب اور مرتبہ جداگانہ ہے۔ اسی طرح اگرچہ بارگاہ الٰہی میں ایمان لانے کے اعتبار سے ہر مومن برابر ہے لیکن ان میں ایک مومن عاصی ہے، ایک اطاعت شعار، ایک عالم، ایک جاہل، ایک زاہد ہے ایک فاسق لہٰذا منصب اور مراتب کا انکار کرنا کل معانی کے انکار کے برابر ہے۔

ولی کی حقیقت سے متعلق مشائخ کے اقوال

ولی کی حقیقت کے بیان میں مشائخ کے بہت سے اقوال ہیں اِن میں سے کچھ نیچے دیئے گئے ہیں۔

حضرت ابوعلی جرجانیؒ فرماتے ہیں کہ

"ولی وہ ہے جو اپنے حال سے فانی ہو اور حق کے مشاہدے کے ساتھ باقی ہو۔ وہ اپنے حال سے غافل ہوتا ہے اور حق کے ساتھ قرار پکڑتا ہے۔"

حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔

"ولی خوف و حزن سے خالی ہوتا ہے، ولی صاحب وقت ہوتا ہے، اس کے لیے ایسا کوئی وقت نہیں ہوتا جس سے کہ وہ ڈرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خوف و حزن نفس کے نقیب ہیں اور ولی نفس کی گرفت سے پہلے ہی آزاد ہو چکا ہوتا ہے، کیونکہ اس کا نفس فانی ہو گیا ہے اور اس کی صفت رضا بن جاتی ہے۔ اس کے بعد خوف و حزن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رضا حال کو مستقیم بناتی ہے۔ حضرت ابوعثمان مغربیؒ نے فرمایا کہ

"ولی مخلوق میں مشہور تو ہوتا ہے لیکن مخلوق کے ساتھ مشغول نہیں ہوتا۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ شہرت ولی کے لیے فتنہ نہیں بنتی کیونکہ فتنہ تو کذب میں ہوتا ہے اور ولی صادق ہوتا ہے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ ولی کون ہوتا ہے، فرمایا۔

اَلْوَلِیُّ ھُوَ الصَّابِرُ تَحْتَ الْاَمْرِ وَالنَّھْیِ ولی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے امر و نہی پر صبر کرے۔

ولی کی پہچان

ولی کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ اس کا کوئی عمل شریعت اور ادب شریعت کے خلاف نہ ہو۔

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ایک آدمی کی ولایت کا شہرہ سن کر حضرت بایزید بسطامیؒ بغرض ملاقات

گئے اور اسے دیکھا کہ اس نے قبلہ کی طرف کلی کر دی۔ آپ واپس چلے گئے اور کہا کہ ولی کو چاہیے کہ احکام شریعت کا پابند ہو۔ رات میں حضور اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بایزید آج تم نے وہ کام کیا جس کی برکت سے تم اس درجے پر پہنچے ہو یعنی اتباع واحترام شریعت۔ اسی طرح ایک شخص حضرت ابو سعیدؒ سے ملنے آیا اور مسجد میں پہلے بایاں پاؤں رکھ دیا۔ آپؒ نے فرمایا: واپس جاؤ اور پہلے دایاں قدم مسجد میں رکھ کر واپس آؤ۔ اس لئے کہ جو دوست کے گھر میں آنے کا قاعدہ نہیں جانتا، وہ ہمارے کام کا نہیں ہے۔

ملاحدہ

ملحدوں ملعونوں کی ایک جماعت کہتی ہے کہ جب آدمی ولی ہو جاتا ہے تو اس پر سے شریعت کا بار اتر جاتا ہے۔ یہ صریح گمراہی ہے۔ صوفیہ کے درمیان ایسا کوئی بھی طبقہ اور مقام نہیں ہے جس پر سے بارِ شریعت یا بارِ خدمت اٹھ جائے۔

اثباتِ کرامت

حضرت ہجویریؒ نے فرمایا کہ صحتِ حال اور صحتِ مجاہدہ کی صورت میں ولی سے کرامت ظاہر ہو سکتی ہے۔ اس بات پر جملہ علمائے اہل سنت کا اتفاق ہے۔ عقل بھی اسے ممکن مانتی ہے کیونکہ درحقیقت ولی سے کرامت اس وقت صادر ہوتی ہے جب وہ قوت الٰہیہ کا (وقتی طور پر) مظہر بنتا ہے۔

کرامت دراصل صداقتِ ولایت کی دلیل ہوتی ہے۔ کاذب سے اس کا صدور محال ہے۔ کرامت ایسے فعل کا نام ہے جو عادت وعقل کے خلاف اللہ تعالیٰ کے کسی بندے سے صادر ہو۔ کرامت صادر ہونے کے باوجود صوفی پر شریعت کے تمام احکام باقی رہتے ہیں۔

معجزہ اور کرامت میں فرق

معجزہ بھی خلاف عادت ہوا کرتا ہے اور کرامت دراصل معجزہ کا ظل ہوتی ہے اور اسی سے مستفاد ہوتی ہے جس طرح کہ ولایت نبوت سے مستفاد ہوتی ہے۔ مگر معجزہ میں شرط یہ ہے کہ اس کے ساتھ دعوائے نبوت بھی ہو اور معجزہ نبی کے ساتھ خاص ہوتا ہے۔ ولی ہمیشہ نبی کی تصدیق کرنیوالا ہوتا ہے۔ معجزہ نبی کی نبوت کو ثابت کرتا ہے اور کرامت انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کرتی ہے۔ ولی کی کرامت انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کی اہم ترین اساس ہے۔

معجزہ میں اظہار شرط ہے جبکہ کرامت میں کتمان (چھپانا) شرط ہے کیونکہ معجزہ کا مقصود لوگوں کی اصلاح ہے جبکہ کرامت خاص صاحب کرامت کے لئے ہے۔ معجزہ کو صاحب معجزہ قطع بھی کر سکتا ہے اور یہ اس کا عین اعجاز ہے جبکہ کرامت کا اظہار ہو جانے کے بعد صاحب کرامت اسے قطع نہیں کر سکتا۔ مثلاً اگر وہ اپنی بددعا کے

ذریعہ کسی پر عذاب نازل کرا دے تو پھر وہ اسے دفع نہیں کر سکتا۔ مشائخ کا نظریہ یہ ہے کہ نبی اگر اپنی بددعا والے کو معاف کر دے تو اس کو اللہ کی طرف سے عموماً معافی مل جاتی ہے لیکن اگر ولی اپنی بددعا کو ختم کرنا چاہے تو یہ خدا کی مرضی پر ہے کہ اسے معاف کرے یا نہ کرے۔

صاحب معجزہ شرع میں تصرف کر سکتا ہے یا اس کے اوامر و نواہی کی ترتیب بدل سکتا ہے جبکہ صاحب کرامت شرع شریف کے سامنے بے بس ہے اور وہ کوئی بھی اقدام شریعت کے خلاف کرنے کا مجاز نہیں۔ کرامت بغیر تصدیق نبوت کے صادر نہیں ہو سکتی نیز ایسے مومن مطیع سے صادر ہوتی ہے جو خلاف شریعت کوئی بھی عمل نہ کرتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کرامت ولی سے صادر ہوتی ہے وہ نبی کی نبوت پر سچی شہادت ہے یعنی آدمی ولی کی کرامت دیکھ کر یہ محسوس کر سکتا ہے کہ جب امتی میں بوجہ اتباع نبی یہ طاقت پیدا ہو چکی ہے تو نبی میں کتنی طاقت ہو گی۔

معجزہ کا صادر کرنا نبی کے اختیار میں ہوتا ہے جبکہ کرامت کا صادر کرنا ولی کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ بعض اوقات وہ کرامت صادر کرنا چاہے تو صادر نہیں ہوتی اور بعض اوقات غیر اختیاری طور پر اس سے کرامت صادر ہو جاتی ہے۔

کرامت و استدراج

اگر کسی کافر اور فاسق و فاجر سے کوئی امر خرق عادت صادر ہو تو اسے استدراج کہتے ہیں۔

کرامت کی حقانیت کو جاننے کے لئے عمل بالشریعہ اور تصدیق رسالت واحد ذریعہ ہے۔ مثلاً جب آخر زمانے میں دجال ظاہر ہو گا تو وہ بہت سے خرقِ عادت امر انجام دے گا جس سے کمزور ایمان والوں کو شبہ ہو گا کہ وہ اپنے دعوائے الوہیت میں سچا ہے۔ اس وقت یہی دعوائے الوہیت اس کے کاذب ہونے کا ثبوت ہو گا، تاہم یہ ہرگز ممکن نہیں کہ کسی جھوٹے مدعی نبوت سے کوئی ایسا فعل صادر ہو کہ اس پر نبوتِ صادقہ کا شبہ ہونے لگے کیونکہ اگر ایسا ہو تو پھر سچے کو جھوٹے سے پہچاننا اور متمیز کرنا ممکن نہ رہے گا البتہ یہ ممکن ہے کہ کسی مدعی ولایت سے کرامت کے مثل کوئی خارق عادت امر صادر ہو جائے۔ اس وقت بھی اس کرامت کو کرامت حقیقی سے ممتاز کرنے والی اور اسے استدراج بتانے والی شریعت ہی ہو گی کیونکہ شریعت کا باغی ہرگز ہرگز ولی نہیں ہو سکتا۔

عصمتِ ولایت

اگرچہ ولایت خالص محبتِ الٰہی ہے تاہم اولیائے کرامؒ انبیائے علیہم السلام کی طرح معصوم نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ عصمت شرط نبوت ہے شرط ولایت نہیں۔ تاہم اولیاء اللہ پر اللہ کا خاص کرم ہے کہ وہ اپنے اولیاء کی آفات معصیت سے حفاظت فرماتا ہے۔

اکابر صوفیہ مثلاً حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ، حضرت ابوسلیمان دارانیؒ اور حضرت ابوحمد بن قصار رحمہم اللہ کا مسلک یہ ہے کہ شرطِ ولایت اطاعت پر مداومت ہے حتیٰ کہ اگر کسی ولی کے دل پر گناہ کبیرہ کا خطرہ بھی گزرتا ہے تو اس کی ولایت سلب ہو جاتی ہے، مگر حضرت ہجویریؒ اس مسلک سے متفق نہیں ہیں، ان کا خیال ہے کہ اس امر پر امت کا اجماع ہے کہ بندہ ارتکاب کبیرہ سے خارج از ایمان نہیں ہوتا اور ولایت ایمان سے افضل نہیں ہے تو جب ایمان (جو معرفت کی اصل ہے) معصیت سے زائل نہیں ہوتا تو محض ولایت کیسے زائل ہو سکتی ہے؟

ظہورِ کرامت اور صحو وسکر

اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ ولی سے کرامت کا صدور حالت سکر میں ہوتا ہے یا حالت صحو میں؟ حضرت بایزید بسطامیؒ، محمد بن خفیفؒ، حسین بن منصورؒ اور یحییٰ بن معاذ رحمہم اللہ کا مسلک ہے کہ "ولی سے صدور کرامت مقلوب الحال ہونے کی صورت میں ہوتا ہے اور جو بحالت صحو ظاہر ہو وہ کرامت نہیں بلکہ ولی کے پردے میں نبی کا معجزہ ظاہر ہوتا ہے (اس وقت ولی کی حیثیت صرف ایک آلے یا ایک مظہر کی سی ہوتی ہے) البتہ نبی کا معجزہ بحالت صحو ظاہر ہوتا ہے تاکہ وہ لوگوں پر اپنی نبوت کی صداقت کو ظاہر کر کے دعوتِ اتباع دے اور ولی کے لئے دعوت نہیں ہوتی نہ وہ قوم کو معاوضہ کے لئے طلب کرتا ہے۔ نبی صاحبِ شرع ہوتا ہے اور ولی صاحبِ سرّ۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ کرامت حالت غیبت و دہشت میں صادر ہو کیونکہ اس وقت اس کے تمام تصرفات حق کے ماتحت ہوتے ہیں۔ اولیاء اللہ حالت صحو میں احوال بشریت کے تابع ہوتے ہیں لیکن جب ان پر تجلیات منکشف ہونے لگتی ہیں تو وہ ان کے مشاہدے کے وقت متحیر ہو کر عالم بے خودی میں چلے جاتے ہیں اور الطاف حق کی لامتناہیت کا احساس انہیں دریائے تحیر میں غرق کر دیتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے، جس میں اظہار کرامات ہوتا ہے۔ چونکہ ان تمام کیفیات و احساسات کا بلاواسطہ تعلق حالت سکر سے ہوتا ہے اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ولی سے کرامت کا صدور حالت سکر میں ہوتا ہے جیسے ایک مرتبہ حضرت ابوعبداللہ حارثہ بن نعمان انصاری دنیا سے علیٰحدہ ہو گئے اور دنیا و عاقبت کے حقائق ان پر منکشف ہو گئے تو انہوں نے کہا کہ

عَرَضْتُ نَفْسِیْ عَنِ الدُّنْیَا فَاسْتَوٰی عِنْدِیْ حَجَرُهَا وَ ذَهَبُهَا وَفِضَّتُهَا وَمَدَرُهَا

میں نے اپنے نفس کو دنیا سے الگ کر لیا تو میری نگاہ میں دنیا کا پتھر، سونا، چاندی اور کنکر سب یکساں ہو گئے۔

مقام صحو میں اولیاء درجہ عوام پر ہوتے ہیں اور مقام سکر میں وہ انبیاء علیہم السلام سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ جب وہ ہوش میں آتے ہیں تو خود کو عوام سے جانتے ہیں اور جب عالم بے خودی ان پر طاری ہوتا ہے تو وہ اپنی ذات سے مخفی راجع بحق ہوتے ہیں پھر صدورِ کرامت شروع ہو جاتا ہے۔ تاہم یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اولیاء کا سکر

مہذب ہوتا ہے اور ہر حال میں ذات حق سے وابستہ رہتا ہے۔ حضرت جنید بغدادیؒ، ابوالعباس سیاریؒ، ابوبکر واسطی اور حضرت محمد بن علی ترمذی رحہم اللہ کا مسلک ہے کہ "کرامت بحالت صحو وتمکین صادر ہوتی ہے اس لئے کہ اولیاء اللہ مدبران نظام عالم ہوتے ہیں اور ان کی رائے دنیا کے تمام اہل الرائے کی آراء پر فائق ہوتی ہے۔ وہ تمام مخلوق کے ساتھ شفقت رکھتے ہیں۔ ابتداء حال میں ان میں سکر وتلوین ہوتی ہے لیکن جوں جوں مجاہدہ اور ریاضت بڑھتی جاتی ہے سکر صحو میں اور تلوین تمکین میں تبدیل ہوتی جاتی ہے۔ اس وقت ولی صحیح معنوں میں ولی بن کر منصب ولایت پر فائز ہو جاتا ہے اور اس سے کرامتوں کا صدور ہونے لگتا ہے اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ اصحاب سکر عارفین کے نزدیک سونا اور پتھر یکساں ہوتے ہیں تو یہ کوئی کمال کی بات نہیں ہے بلکہ کمال یہ ہے کہ نگاہ میں سونا سونا رہے اور پتھر پتھر اور پھر آدمی ان کی آفات سے بچا رہے۔ حضرت حارثہ بن نعمانؓ چونکہ صاحب سکر تھے۔ اس لئے سونا اور پتھر ان کے نزدیک برابر تھے۔ لیکن صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ چونکہ صاحب صحو تھے اور ترک دنیا کے ثواب سے واقف تھے۔ انہوں نے اللہ کے لئے سب کچھ چھوڑ دیا اور جب حضور اکرم ﷺ نے دریافت فرمایا کہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تم نے اہل وعیال کے لئے کیا چھوڑا تو عرض کیا اللہ اور اس کے رسول کو۔" حالت صحو وسکر میں کرامت کے سلسلے میں حضرت جنید بغدادیؒ کا مسلک زیادہ اقرب الی الشرع معلوم ہوتا ہے لیکن سکر میں کرامت کا اظہار احوال تصوف کے زیادہ قریب ہے۔ راقم الحروف نے اپنی تصنیف "جنیدؒ و بایزیدؒ" میں ایک باب سکر اور صحو پر لکھا ہے اور آخری فیصلہ حضرت داتا علی ہجویریؒ کے قول کے مطابق یہ ہوا کہ ہر دو فریق میں کوئی فرق نہیں ہے یعنی سکر ہو یا صحو اختلاف نظر کے سوا اور کچھ نہیں۔

"وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ"

باب ۳۷

کامل عقل والے کون ہیں؟

حضرت ذوالنون مصریؒ سے کسی نے پوچھا کہ خلق میں سفلہ یعنی ادنی درجہ کون ہیں؟ فرمایا وہ لوگ جو اللہ کا راستہ نہ جانتے ہوں اور نہ ہی جاننے کی کوشش کرتے ہوں اور اللہ کے دربار سے عارف کے نکالے جانے کی علامت یہ ہے کہ وہ اللہ عزوجل کے ذکر سے الگ ہو جاتا ہے۔ راقم الحروف کے خواجہ صاحب فرمایا کرتے ہیں کہ درخت جب اللہ عزوجل کا ذکر بند کر دے تو اس پر آرا چلا دیا جاتا ہے۔ بزرگوں کا خیال ہے کہ جس جگہ اللہ کا ذکر نہ ہو اس جگہ پر یا تو عذاب الٰہی آ جاتا ہے یا وہ جگہ زمین میں دھنس جاتی ہے۔

ذوالنون مصریؒ سے کسی نے پوچھا کہ عقل کب کمال پر پہنچتی ہے اور معرفت کب؟ فرمایا اللہ کے حکم کے پابند رہو اور جس کی ممانعت کی گئی ہے اس سے دور رہو تو تم کامل عقل والے ہو اور جب تمہارا سروکار اللہ عزوجل سے ہو اور تم اپنے احوال اور اعمال پر تکبر نہ کرو تو تم کامل معرفت والے ہو۔ بات بس اتنی ہے اور یہی بزرگی ہے جس کو لوگ سمجھ نہیں پاتے۔

اویس خولانیؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص بغیر عمل کے حدیث بیان کرتا ہے وہ فقیہہ نہیں اور جس کے دل میں ذرہ برابر نیکی ہو اللہ اس کی پردہ دری نہیں کرتا۔ جس کی زبان درست ہو اس کی لوگوں میں وقعت قائم ہو جاتی ہے اور جس کے دل کی درستگی ہو جائے اسے اللہ کے نزدیک عزت مل جاتی ہے۔

حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ علم کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ اسے اس کی قیمت کے بغیر کسی کو نہ دیا کرو۔ جب پوچھا گیا کہ علم کی کیا قیمت ہے؟ تو فرمایا کہ علم کا ایسے شخص کے پاس رکھنا جو خوبی کے ساتھ اس کا بار اٹھا سکے اور اس کو ضائع نہ کرے۔

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ فرماتے ہیں کہ میزان میں وہی عمل سب سے بھاری ہو گا جو جسم پر سب سے زیادہ دشوار ہے۔ جس نے عمل میں پوری جان لڑا دی اس کو پورا اجر ملے گا جس نے عمل نہیں کیا وہ دنیا سے آخرت کی طرف خالی ہاتھ گیا۔ فرمایا علم کی جستجو اس لئے کرو کہ اس پر عمل کرو۔ بہت سے آدمی غلطی میں پڑ گئے کہ ان کا علم تو پہاڑ کے برابر ہے اور عمل چیونٹی کے برابر۔

اللہ والوں کی دنیا سے لاتعلقی

حضرت سہلؒ فرماتے ہیں کہ مجھے حرم شریف میں ایک درویش ملا جس کے جسم پر سات سو سال پرانا جبہ تھا

جو حضرت مسیحؑ کے زمانے سے قبل انہوں نے پہن رکھا تھا مگر تازگی کے اثرات اس میں پائے جاتے تھے۔ اس بزرگ نے مجھے کہا ''سہلؒ بدن کپڑوں کو بوسیدہ نہیں کرتے ان کو تو گناہ کی بو اور حرام کھانے بوسیدہ کرتے ہیں۔ سہلؒ فرماتے ہیں جس طرح حرام نہ کھانے والوں کے کپڑے بوسیدہ نہیں ہوتے اسی طرح مرنے کے بعد ان کے جسم بھی بوسیدہ نہیں ہوتے۔ (ہوسکتا ہے کہ یہ بات روحانی زندگی کے بارے میں ہو۔)

حضرت جنیدؒ جو اس راہ کے شہنشاہ ہیں فرماتے ہیں کہ علم آخرت کے لئے دل اسی وقت خالی ہوتا ہے جب دنیا کی محبت سے اسے خالی کیا جائے اس لئے ابتداء سے ہی دنیا کو اپنے دل سے نکالنے پر نگاہ رکھنی چاہیے ورنہ یہ تم کو آگے نہ بڑھنے دے گی اور ترقی سے روکے گی۔ جب تک تم اس حالت میں رہو گے تمہارا پیر تمہیں ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکے گا۔ سہلؒ نے یہ بھی فرمایا کہ اخلاص اسی وقت پیدا ہوگا جب چار باتوں کا خوف دل میں نہ ہو، (۱) بھوکا رہنے کا (۲) ننگا رہنے کا (۳) درویشی کا (۴) خواری اور رسوائی کا۔

ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ جس نے زندگی میں زہد اختیار کیا اس کی دو رکعت نماز سارے مجتہدوں کی عمر بھر کی عبادت سے بہتر ہے لیکن اب وہ زمانہ ہے کہ

مُلا کی نظر نورِ فراست سے ہے خالی بے سوز ہے میخانہ صوفی کی مئے ناب

اے وادیٔ لولاب

بیدار ہوں دل جس کی فغانِ سحری سے اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب

اے وادیٔ لولاب (ا۔ح:۶۷۷)

ایک روایت میں ہے کہ ایک بادشاہ نے جنگل میں ایک صحت مند غریب الحال نوجوان کو دیکھا کہ ہنستا گاتا جا رہا ہے بادشاہ نے پوچھا تم کون ہو؟ کہا، میں نہ کسی کا حاسد نہ محسود اور اپنی ناداری اور مفلسی کے باوجود کسی پر حسد نہیں کرتا اور نہ ہی مجھ پر کوئی رشک کرتا ہے۔ بادشاہ نے کہا تو غلط کہتا ہے، تیرا سب سے بڑا حاسد میں ہوں۔ مطلب یہ ہوا کہ دنیا سے انسان کسی صورت خوش نہیں البتہ اگر اللہ کا اور اس کے رسول کا حکم مانا جائے تو جب ہی اس کے دل کو سکون مل سکتا ہے۔

نہیں کوئی بلا دنیا سے بد تر نہ چین آئے اسے پا کر نہ کھو کر (×)

اسبابِ دنیا

حضرت فریدالدین گنج شکرؒ فرماتے ہیں کہ درویش اگر چاہتا ہے کہ خدا تک پہنچے اور اس کا قرب حاصل کرے تو اسے لازم ہے کہ دنیا سے بیزار ہو جائے اور اہلِ دنیا سے دور ہو جائے (حتیٰ کہ اہلِ دنیا اس کے نزدیک بکری کی مینگنیوں کی طرح ہو جائیں) جس درویش کو مال، مرتبہ اور ترقی کی تمنا ہو وہ طریقت کا مرتد

ہے۔ حضرت خضرؑ فرماتے ہیں کہ اگر تمام دنیا مجھے ملے اور مجھ سے وعدہ کیا جائے کہ تجھ سے اس کا حساب نہیں لیں گے تب بھی اسے قبول نہ کروں گا اور اگر یہ کہا جائے کہ دنیا قبول کرلو ورنہ دوزخ میں ڈال دیں گے تو دوسری بات قبول کرلوں گا۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے۔

متاعِ بے بہا ہے دردو سوزِ آرزومندی　　مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خُداوندی (ب۔ج: ۳۰۶)

مومن کا فقر

یہ حقیقت ہے کہ جو صفات فقر میں پائی جاتی ہیں وہ ایک مومن کی ذات کا ہی حصہ ہیں یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ فقر کے بغیر مومن ہونا ممکن نہیں۔ صاحبِ فقر صاحب دل، مردِ کامل، مردِ مومن، قلندر، درویش یہ سب نام دراصل ایک ہی اصل کو ظاہر کرتے ہیں۔ صاحبِ فقر مومن سوائے اللہ کے اور کسی کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتا "اَلْحُکْمُ لِلّٰہِ وَالْمُلْکُ لِلّٰہِ" اور وہ کسی حاکم کے سامنے سرنگوں نہیں ہوتا حتیٰ کہ تمام کائنات اس کے سامنے مسخر ہو جاتی ہے۔ جس قوم کے افراد ان فقیرانہ صفات سے محرومی کا شکار ہوں وہ نہ صرف دوسری قوموں کے سامنے سرنگوں ہوتے ہیں بلکہ اپنے ملک وقوم کے لئے بھی باعثِ ننگ وعار اور بار گراں ہوتے ہیں۔

قلب اُو را قوت از جذب و سلوک　　پیشِ سلطان نعرۂ اُو لا ملوک (پ۔چ: ۸۱۷)

(اس کا دل جذب وسلوک سے قوی ہے، بادشاہ کے سامنے اس کا نعرہ ہے کہ کوئی بادشاہ نہیں)

آہ ازاں قومے کہ از پا بر فتاد　　میر وسلطان زاد و درویشے نزاد (پ۔چ: ۸۱۹)

(افسوس اس قوم پر جس پر زوال طاری ہوگیا۔ اس نے میر وسلطان پیدا کئے مگر کوئی درویش پیدا نہ کیا)

مردِ حُر از لا الٰہ روشن ضمیر　　می نہ گردد بندۂ سلطان و میر

(آزاد مرد کا ضمیر لا الٰہ سے روشن ہے وہ کسی بادشاہ یا امیر کا غلام نہیں ہوتا)

مردِ حُر چوں اشتراں بارے برد　　مردحر بارے برد خارے خورد (پ۔چ: ۸۲۲)

(آزاد مرد اونٹ کی طرح بوجھ اٹھاتا ہے اور آزاد مرد بوجھ اٹھا کر کانٹے کھا کر گزارہ کرتا ہے۔)

مومن کا فقر اسے دو جہان کی سرداری سکھاتا ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہونے کے باوجود روکھی سوکھی کھا کر گزارا کرتا ہے۔ عیش وعشرت کی بجائے سادہ زندگی کو پسند کرتا ہے۔ حضرت شرف الدین بوعلی قلندرؒ فرماتے ہیں۔

معلم درس توحید نہ گوید　　کہ ایں اسرار بیرونِ کتاب است

(استاد تجھے توحید کا درس نہیں دیتا کیونکہ یہ ایسے رازوں میں سے ہے کہ جو کتابوں سے باہر ہیں۔)

زہد و تقویٰ چیست اے مرد فقیر　　لاطمع بودن زسلطان و امیر

(اے مردِ فقیر! زہد اور تقویٰ کی حقیقت کیا ہے وہ یہ ہے کہ کسی بادشاہ اور امیر سے کوئی طمع نہ ہو)

باب ۳۸

نبوت اور ولایت کی معرفت

جملہ علمائے دین اور مشائخِ طریقت اس بات پر متفق ہیں کہ تمام اولیاء امت متابعتِ انبیاء میں ہیں اور ان کی تصدیق کرنیوالے ہیں۔ انبیاء کا رتبہ اولیاء سے فاضل بلکہ افضل ہے اس لئے کہ نہایتِ ولایت بدایت نبوت ہے یعنی اِبتدائے نبوت ہے۔ اس بنا پر ہر نبی کا ولی ہونا ضروری ہے لیکن کوئی ولی ہرگز ہرگز نبی نہیں ہو سکتا۔ انبیاء کرام علیہم السلام نفی صفات بشریہ کے اندر متمکن ہوئے ہیں جبکہ اولیاء کا ہر حال عارضی ہوتا ہے۔ اولیاء کا جو اعلیٰ ترین مقام ہے وہ انبیاء علیہم السلام کے لئے حجاب ہے۔ اس بات پر تمام محققین طریقت متفق ہیں۔ سوائے گروہ حشویہ کے اور وہ گمراہ لوگ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اولیاء، انبیاء سے افضل ہوتے ہیں (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ) یہ لوگ خود کو ولی کہتے ہیں اور یہ ولی ہیں بھی تو ولیٔ شیطان۔ ایک دوسرا گروہ ''مشتبہ'' کا ہے یہ حلول اور انسانی وجود میں (ہندوؤں کی طرح) نزول حق مانتا ہے۔ یہ ذات حق کی تجزی کا قائل ہے۔ یہ دونوں گروہ گمراہ اور قابل مذمت ہیں یہ دونوں گروہ خود کو مسلمان بھی کہتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام سے نفی تخصیص بھی کرتے ہیں حالانکہ جو نفیٔ تخصیص انبیاء کا عقیدہ رکھے وہ کافر ہے۔ صحیح عقیدہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام داعی الی الحق ہیں اور اولیاء ان کے متبع ہیں کیونکہ یہ محال ہے کہ ماموم امام سے افضل ہو جائے۔ اگر جملہ اولیاء کے احوال انفاس کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو انبیاء کے ایک قدم کے برابر نہیں ہو سکتے اور اِس حقیقت میں کسی کو مجال انکار نہیں کہ نبی کا ایک سانس تمام عالم سے افضل ہے۔ اولیاء کو جو انتہائے حال میں مشاہدہ ہوتا ہے وہ انبیاء علیہم السلام کو اِبتداء میں ہو جاتا ہے۔ مثلاً تمام اولیاء اللہ اس امر پر متفق ہیں کہ مقام جمع و تفریق کمالاتِ ولایت میں سے ہے کیونکہ بندہ جب کسی ایک حال پر پہنچتا ہے تو غلبۂ مشاہدہ کے باعث اس کی عقل مغلوب ہو جاتی ہے اور فاعل حقیقی کے شوق میں آ کر کہہ دیتا ہے کہ سارا عالم وہی ہے۔ یہ عالم حیرت ہوتا ہے اور ولی نظر باطن سے ایسا ہی دیکھتا ہے۔ یہی کیفیت بدایت حال میں انبیاء علیہم السلام کی ہوتی ہے، جیسے حضرت ابراہیمؑ نے ابتداء میں کواکب، چاند اور سورج کے بارے میں رب ہونے کا خیال کیا اور فوراً '' لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ '' کے مقام پر پہنچ گئے۔ یہ حالت حیرت کی نہ تھی غرضیکہ ان کی اِبتداء بھی جمع کے ساتھ تھی اور انتہا بھی جمع کیساتھ۔ کسی نے حضرت بایزید بسطامیؒ سے دریافت کیا کہ انبیاءؑ کس حال میں ہیں؟ فرمایا معاذ اللہ ہمیں ان کے حال میں کسی قسم

کا تصرف حاصل نہیں کہ ہم تمہیں دکھا سکیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے نفی و اثبات کو ایسی منزل میں رکھا ہے کہ چشم مخلوق وہاں پہنچ ہی نہیں سکتی۔ ایک مرتبہ حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ کے قرب کی سعادت حاصل ہوئی۔ (جسے اہلِ طریقت معراجِ بایزید کہتے ہیں) تو حضرت بایزیدؒ نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ "مجھے تجھ تک پہنچنے کی کوئی راہ نہیں ملتی میں کیا کروں؟ جواب ملا۔" بایزید! تو میرے دوست (حضرت نبی اکرم ﷺ) کی متابعت کر، ان کی خاکِ قدم کا سرمہ آنکھوں میں ڈال اور ان کی اطاعت و متابعت پر مداومت اختیار کر یہی مجھ تک پہنچنے کی بے خطر راہ ہے"۔

انبیاءؑ و اولیاء کی ملائکہ پر فضیلت

اہلِ سنت والجماعت اور جملہ مشائخِ طریقت کا اس امر پر اجماع ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور وہ اولیاء جو محفوظ ہیں ملائکہ سے افضل ہیں۔ بخلاف معتزلہ کے کہ وہ فرشتوں کو انبیاء پر فضیلت دیتے ہیں اور کہتے ہیں چونکہ ملائکہ باعتبار تخلیق لطیف تر ہیں، اور اطاعت الٰہی میں ہمہ وقت مشغول ہیں، نیز ان سے معاصی کا صدور نہیں ہوتا اس لئے وہ انبیاء علیہم السلام سے افضل ہیں۔

حضرت ہجویریؒ کے نزدیک یہ دعویٰ غلط ہے کیونکہ وجود لطیف اور اطاعت بے معصیت حق تعالیٰ کے نزدیک علت فضیلت نہیں ہوسکتی کیونکہ اگر ان اسباب و علل کو معیارِ فضیلت تسلیم کر لیا جائے تو شیطان لعین کو بھی افضل ماننا پڑے گا۔ فضیلت اسے حاصل ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ افضل قرار دے، انبیاء علیہم السلام کی ملائکہ پر فضیلت کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں اور یہ ایک ناقابل انکار صداقت ہے کہ مسجودلہ ساجد سے افضل ہوتا ہے۔ اگر اس موقع پر کوئی اعتراض کرے کہ خانہ کعبہ تو پتھروں اور بے جان مسالوں کا ایک مجموعہ ہے تو مومن اس کو سجدہ کیوں کرتے ہیں لہٰذا وہ مومن سے کیسے افضل ہوسکتا ہے یا دیوار محرابِ مومن سے کیسے افضل ہوسکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کعبہ یا دیوارِ مسجد کو سجدہ کر رہا ہے۔ سجدہ تو دراصل اللہ تعالیٰ کو کیا جاتا ہے، البتہ سجدہ کی سمت سمتِ کعبہ ہوتی ہے اور یہ بھی ہے کہ بعض اوقات عذر کی بنا پر سمت کعبہ کی تخصیص بھی ساقط ہو جاتی ہے مثلاً گھوڑے پر سوار شخص نفل بغیر تعین سمتِ کعبہ کے ادا کر سکتا ہے۔ یا ایسی جگہ پر جہاں سمت معلوم نہ ہو، جدھر منہ کر کے نماز پڑھنا چاہے پڑھ سکتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ مسجودلہ کعبہ نہیں ہے بلکہ مسجودلہ ربّ کعبہ ہے۔ عقلی طور پر بھی ملائکہ انبیاء سے افضل نہیں ہو سکتے اس لئے کہ ان میں شہوت نہیں، ان کے دل میں حرص و آفت نہیں، ان کی غذا اطاعت الٰہی اور فطرت امتثال امر الٰہی ہے اطاعت ان کی جبلت میں داخل ہے ان کے مقابلے میں انسان کا خمیر ہی خطا و نسیان سے اُٹھایا گیا ہے۔ شہوت، حرص اور غضب اس کی طینت میں داخل ہیں۔ دن رات شیطانی وس وساان کے دل و

دماغ کو پراگندہ کرتے رہتے ہیں۔ زن و فرزند کی محبت اور تعلق اسے اپنی طرف مائل کرتا رہتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر کوئی شخص ان تمام بندھنوں کو توڑ دے، نفس و شیطان کی غلامی سے انکار کر دے، اپنے طبعی تقاضوں کو محض امتثال امرِ الٰہی کے لیے پامال کر دے اور مراقبہ و مجاہدہ کے ذریعہ اپنی خواہشات کو کچل دے تو اول الذکر مخلوق یعنی ملائکہ کے مقابلے میں وہ لازماً افضل ہوگا۔ حضرت ہجویریؒ فرماتے ہیں ''مجھے اپنی جان کی قسم مجھے ان لوگوں پر تعجب آتا ہے جو فضیلت اعمال میں دیکھتے ہیں یا بزرگی جمال و مال و عزت میں سمجھتے ہیں۔''

ایسے لوگوں کو چاہیے کہ وہ اپنے معیار فضیلت پر نظر ثانی کریں اور جان لیں کہ فضیلت اللہ جسے دے وہ افضل ہے اور وہ فضیلت ایمان و عرفان میں ہے۔ وہ حضرت جبریلؑ جو عرصہ دراز سے یہ تمنا رکھتے تھے کہ شب معراج حضرت نبی اکرم ﷺ کی سواری کی باگ تھامنے کا موقع آیا تو اس سعادت پر نازاں و فرحاں ہوں گا بھلا وہ محمد رسول اللہ ﷺ سے افضل کیسے ہو سکتے ہیں۔؟

راقم الحروف نے مقامِ آدم کے متعلق جو ایک کتابچہ لکھا تھا اب اسے ایک باب کی صورت میں اس کتاب میں بھی شامل کیا ہے اس سلسلے میں قابلِ مطالعہ ہے۔ علامہ اقبالؒ کے اشعار جو اس باب میں شامل کئے گئے ہیں ان سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ مقامِ آدم فرشتوں سے بہت اعلیٰ ہے۔ عُلمائے اسلام کا فتویٰ ہے کہ عام انسان عام فرشتوں سے افضل ہیں اور خواص اہلِ اسلام خاص فرشتوں سے افضل ہیں۔

ملائکہ لطیف الخلقت اور پاک طینت ضرور ہیں لیکن بھلا وہ ان انسانوں کے برابر کیسے ہو سکتے ہیں جو عبادت و ریاضت کر کے اپنے نفس کو مغلوب کرتے ہیں اور شب و روز مجاہدے کی بدولت دیدارِ الٰہی سے مشرف ہوتے ہیں۔ الغرض صحیح نظریہ یہ ہے کہ

(۱) خاص مومن خاص ملائکہ سے افضل ہیں اور عام مومنین عام ملائکہ سے۔

(۲) جو لوگ منہیات سے اجتناب کریں اور اطاعت الٰہی میں مشغول رہیں اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے انہیں محفوظ و معصوم عن الخطا قرار دیا گیا ہو تو وہ حضرت جبریلؑ و میکائیلؑ سے افضل ہیں۔

(۳) اور جو معصوم نہیں لیکن متورع ہیں وہ (کراماً کاتبین) سے افضل ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ''ولایت اسرار الٰہیہ میں سے ایک سرّ ہے۔ اس پر چلے بغیر کچھ ظاہر نہیں ہوتا اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ''ولی را ولی می شناسد۔'' (ولی کو ولی ہی پہچانتا ہے۔)

مقاماتِ اولیاء

مولانا رومیؒ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اولیاء اللہ کے دل میں ایک مسجد ایسی ہے جس کی طرف ہر کوئی سجدہ کرتا ہے۔ دل کے اندر مسجد ہونے سے مراد یہ ہے کہ ہر شے دل کے تابع ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مومن کے دل کو

اپنے عرش ہونے کا شرف بخشا اور اس میں ہی خدا کا سماجانا بھی ممکن ہے اس لئے مومن مخلوق کے لئے سجدہ گاہ کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ معارفِ کعبہ جو ہماری تصنیف ''حسنِ نماز'' میں بیان ہوئے ہیں اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ دلِ مسلم بیت اللہ سے عظیم تر ہے کیونکہ یہ معرفتِ حق کا مقام ہے اس کے علاوہ انسان خدا کے جمیع اسماء وصفات کا مظہر ہے جبکہ کعبہ اللہ تعالیٰ کی صرف ایک صفت کا مظہر ہے۔ لوگ ظاہری بیت اللہ کی تو تعظیم کرتے ہیں مگر حقیقی بیت اللہ کو سمجھ نہیں پاتے اسی لئے مولانا فرماتے ہیں۔

کالۂ حکمت کہ گم کردہ دلست پیشِ اہلِ دل یقین آں حاصل ست (۲۲۸-۲)

(حکمت کا آلہ جس کو تو گم کر چکا ہے وہ دل ہے، یقیناً اہل دل سے (وہ آلہ) حاصل ہو سکتا ہے۔)

ابلہاں تعظیم مسجد می کنند در جفائے اہل دل جدّ می کنند

(بے وقوف لوگ مسجدوں کی تعظیم تو کرتے ہیں مگر اہل دل کو ستانے پر کمر بستہ رہتے ہیں۔)

آں مجاز ست ایں حقیقت اے خراں نیست مسجد جز درونِ سروراں

(اے کم عقلو! مسجد تو مجازی ہے اور اہل دل حقیقی کیونکہ مسجد تو ان بلند شان بزرگوں کے دل ہی ہیں۔)

مسجدے کاں اندرونِ اولیاء ست سجدہ گاہِ جملہ است آنجا خداست (۲۹۳-۲)

(وہ مسجد جو اولیاء اللہ کے دلوں میں ہے، تمام مخلوق کے لئے سجدہ گاہ ہے کیونکہ اس میں خدا ہے۔)

مولانا فرماتے ہیں کہ اگر رسول اللہ ﷺ کا نور حضرت آدم علیہ السلام کی پیشانی میں نہ رکھا ہوتا تو فرشتے سجدہ کیوں کرتے۔ اولیاء اللہ سے بھی اللہ تعالیٰ کا نور ظاہر ہوتا ہے اگر کوئی بصیرت کی آنکھ رکھتا ہے تو اولیاء اللہ کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھے۔

گر نہ بودے سرِ حق اندر وجود آب و گل را کے ملک کر دے سجود (×)

(اگر سرِ حق حضرت آدمؑ کے وجود میں نہ ہوتا تو فرشتے آپ کو سجدہ کیوں کرتے)

نورِ حق ظاہر بود اندر ولی نیک بیں باشی اگر اہل دلی (۳۹-۱)

(یقیناً ولی میں خدا کا نور ظاہر ہوتا ہے (اگر تو بصیرت رکھتا ہے) تو اسے اچھی طرح پہچان لے)

ہر چہ گیرد علتی علت شود کفر گیرد کاملے ملت شود (۱۸۵-۱)

(بیمار جو پکڑتا ہے وہ بیماری ہو جاتی ہے لیکن کاملین اگر کفر کو ہاتھ میں لیں تو اسے ملت میں تبدیل کر دیتے ہیں)

آں ولی حق چو پیدا شد ز دور از سراپائش ہمی می ریخت نور (۳۹-۱)

(جب ولی خدا دور سے ظاہر ہوا، اس کے سر سے پاؤں تک نور برستا تھا۔)

ہر کہ ترسید از حق و تقویٰ گزید ترسد از وے جن وانس و ہر کہ دید (۱-۱۶۸)

(جو خدا سے ڈرتا ہے اور تقویٰ اختیار کرتا ہے تو جن وانس جو بھی اسے دیکھتا ہے اس سے ڈرتا ہے۔)

اولیاء اللہ کی صفات

یہ مبارک گروہ تمام مخلوق خدا پر بہت شفیق و مہربان ہوتا ہے۔ خواہ کوئی عالم ہو یا جاہل، فرمانبردار ہو یا نافرمان سب پر شفقت فرماتے ہیں یعنی فرمانبردار پر اس کی تابعداری کی عظمت کا لحاظ رکھتے ہوئے شفقت ہوتی ہے اور نافرمان پر اس لئے کہ ان کی برکت سے شاید وہ اپنی اصلاح کر لے۔ شفقت خصومت سے افضل ہوتی ہے جب تو خصومت کرے گا کہ وہ ہلاک ہو جائے یہ تو ایسے ہی ہے گویا کہ تیرے دل میں یہ خیال ہے کہ خدا تعالیٰ کی رحمت تنگ ہے جس میں اس گنہگار کی سمائی ہی نہیں، بلکہ خدا تعالیٰ کی رحمت تو بہت وسیع ہے جس میں سب کی گنجائش ہے۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ (الاعراف:۱۵۶)

اور میری رحمت کشادہ ہے ہر چیز پر سو میں لکھوں گا اس کو ان لوگوں کیلئے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔

اسی طرح حدیث قدسی ہے کہ "سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ عَلٰی غَضَبِیْ" یعنی میری رحمت میرے غضب سے سبقت لے گئی ہے۔ اس میں ایک راز ہے کہ جب تک آدمی خود کو نہیں دیکھتا یعنی عجب و خود پسندی کا شکار نہیں ہوتا تو اس سے خصومت نہیں آتی اور خود بینوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف راستہ نہیں ملتا بلکہ یہ ایک عجیب چیز ہے کہ مشفق جب تک اپنے آپ میں مشغول ہوتا ہے اُس کو اُسی کے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے تا کہ وہاں پڑا رہے، جہاں وہ شخص ہوتا ہے جس کے ساتھ یہ خصومت کرتا تھا لیکن جب تک مشفق غیر میں مشغول ہے تو وہ خود سے فارغ ہے اور جو خود سے فارغ ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہوتا ہے اور جس کی اللہ حفاظت کرے وہ ہرگز تباہ نہیں ہوسکتا۔ اس گفتگو کی دلیل دو نبیوں کے واقعہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ ایک تو حضرت نوحؑ ہیں کہ جب آپؑ نے فرمایا۔

رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ دَیَّارًا (نوح:۲۶)

اے میرے رب! روئے زمین پر کافروں میں سے کسی کو بستا ہوا نہ چھوڑ۔

اور دوسرے نبی سید دو عالم احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔

اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (بخاری شریف، مسلم شریف)

اے میرے اللہ! میری قوم کو ہدایت عطا فرما کیونکہ وہ جانتے نہیں ہیں۔

یہاں پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضور رحمۃ للعالمین ﷺ اپنی امت پر دوسرے انبیاء کی نسبت اتنے زیادہ شفیق ہیں کہ اپنی قوم کے لئے بددعا نہیں فرمائی بلکہ ہدایت کی دعا فرمائی۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دن الحمدللہ کہا اور اب تک اس حمد سے توبہ کر رہا ہوں تاکہ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ بات کیا ہے؟ فرمانے لگے کہ ایک دن میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ مصیبت میں مبتلا ہے تو میں نے کہا الحمدللہ یہ میں نہیں ہوں۔ جواب ملا کہ یہ نہ تیرا کمال ہے اور نہ میرا عیب ہے، میں اپنی خود بینی پر اس دن سے آج تک استغفار کر رہا ہوں۔

اللہ کے ولی تمام مخلوق سے زیادہ سخی ہوتے ہیں یعنی جو کچھ رکھتے ہیں دے دیتے ہیں اور پھر لینے کا خیال تک نہیں کرتے اور جو کچھ مخلوق کے ہاتھوں میں ہے۔ اس سے سب سے زیادہ زاہد (بے پرواہ) ہوتے ہیں، یعنی جب لوگوں کو خدا تعالیٰ کے ماسوا میں مشغول دیکھتے ہیں تو ان پر رحم کھاتے ہیں۔ یہ محال ہے کہ جس صفت سے لوگوں پر رحم کھائیں پھر اسی میں اپنے آپ کو مشغول کریں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مخلوق کی چیزوں میں تب رغبت کریں کہ اللہ تعالیٰ کے خزانہ میں نہ پائیں، جب خدا تعالیٰ کے خزانہ میں سب کچھ موجود ہے تو انسان کو غیر اللہ سے طمع رکھنا محال ہے۔ پس جو شخص لوگوں کی چیزوں میں رغبت کرتا ہے وہ ان کو خدا تعالیٰ سے زیادہ غنی یا زیادہ کریم سمجھتا ہے۔ منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت رابعہ بصریؒ نے حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ کو فرمایا: کہ "خدا کی قسم! جو دنیا کا مالک ہے میں اس سے دنیا نہیں مانگتی اور پھر جو اس کا مالک نہیں میں اس سے کیسے مانگوں۔" اس لئے بزرگوں نے فرمایا۔

مَنْ رَّأٰی شَیْئًا سِوَی الْحَقِّ فَلَیْسَ بِعَارِفٍ جس نے ماسوا اللہ کو دیکھا وہ عارف نہیں۔

اور جو شخص اللہ تعالیٰ کو دیکھتا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے ماسویٰ اللہ اور کچھ نہیں مانگتا اور اللہ کے ولی دنیا سے تمام مخلوقات سے زیادہ اعراض (روگردانی) کرنے والے ہوتے ہیں کیونکہ دنیا اللہ تعالیٰ کی سخت مبغوض چیز ہے۔

حدیث پاک میں ارشادِ گرامی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ مُنْذُ خَلَقَ الدُّنْیَا لَمْ یَنْظُرْ اِلَیْھَا بُغْضًا لَّھَا (الحدیث) جب سے اللہ تعالیٰ نے دنیا کو پیدا فرمایا اس کو ایک دفعہ بھی اپنے غضب کی وجہ سے نہیں دیکھا۔

ولی کی یہ شان ہے کہ جس چیز کو اس کا اللہ نہیں دیکھتا اس کے لئے اس چیز کا دیکھنا بھی محال ہے اور جس چیز کو دوست دشمن رکھتا ہے اس کو اس چیز کا دوست رکھنا بھی مشکل ہے اور اللہ کا ولی سنت کی زیادہ طلب کرتا ہے یعنی سنت و آثار کی تابعداری پر زیادہ حریص ہوتا ہے۔ اس لئے اللہ کے ولی سے کوئی فعل خلاف سنت کبھی سرزد نہیں ہوتا۔ وہ ہر وقت اتباع سنت میں ہی شریعت کی پاسداری کرتا ہے۔ اس بات سے بدعتی گروہ[1] کی تردید ہو جاتی ہے جو اس جماعت پر طرح طرح کے بہتان باندھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ولی اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں ہر واسطہ درمیان سے اُٹھ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے معاملہ صاف فرما دیا" کہ جو ہمارا دوست ہے اس کا واسطہ میرے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں"۔ علامہ ابن تیمیہ نے کہا ہے کہ "جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ وہ واسطہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بغیر بارگاہ

الٰہی تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا وہ کافر ہے" (التصدیق بکرامات الاولیاء ص ۵۳)

ولی کو احکامِ شریعت کسی وقت اور کسی حال میں معاف نہیں ہوتے

صوفیہ کی مبارک جماعت کا اس پر اجماع ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بندوں پر فرض کیا ہے اور حضور اکرم ﷺ نے واجب کیا ہے۔ ان فرائض و واجبات پر ہر عاقل و بالغ کو عمل کرنا حتمی طور پر لازم ہے یعنی ان احکام شریعت سے تخلف جائز نہیں۔ کسی انسان کو بھی کسی وجہ سے سستی کرنا درست نہیں اگرچہ بلند ترین مرتبہ پر پہنچا ہو یا بزرگ ترین منزلوں اور اعلیٰ ترین مقاموں میں قدم رکھتا ہو خواہ کوئی صدیق یا ولی و عارف ہو۔ یہ اس لئے کہ بدعتوں کے ایک گروہ نے جو اپنے آپ کو اس جماعت میں شمار کرتا ہے ایک مذہب نکالا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے قرب کے اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ ہم سے خدمت اٹھالی گئی اور کہتا ہے کہ جب دوستی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو عبادت معاف ہو جاتی ہے کیونکہ عبادت حصول قرب کے لئے ہے، جب مقام قرب مل گیا تو خدمت محال ہے۔ یہ سب گمراہی اور بدعت ہے اس مذہب کا مجوز کافر ہے۔ اہل معرفت اس مذہب سے بیزار ہیں ان کا مذہب یہ ہے کہ بندہ جتنا اللہ تعالیٰ سے قریب تر ہوتا ہے اتنا اس کا آداب پر زیادہ مواخذہ ہوتا ہے کیونکہ بے ادبی قرب کے زوال کا سبب ہے اور اللہ تعالیٰ بے ادبوں کو اپنے قرب کی طرف راستہ نہیں دیتے۔ اللہ تعالیٰ کے سب سے مقرب ترین بندے انبیاء علیہم السلام ہیں جب پیغمبروں سے اوامر و نواہی نہیں اٹھتے تو اولیاء اللہ سے کیسے اٹھ سکتے ہیں۔

جب ابوالبشر حضرت آدمؑ پر ایک لغزش سے عتاب الٰہی ہوا کہ وہ تین سو سال تک روتے رہے تب معافی ہوئی اور حضرت نوحؑ نے اپنے بیٹے کنعان کے لئے درخواست کی تو دربار الٰہی سے عتاب آیا اور اس پر آپ اتنا روئے کہ آپ کا نام نوحؑ ہو گیا اور جب داؤدؑ نے اس وعدہ پر جو آپ کو سنایا گیا تھا، جلدی کی تو اللہ تعالیٰ کا عتاب آیا۔ آپ چالیس دن اور رات سجدے میں پڑے رہے اور اسی طرح سلطان الانبیاء ﷺ کو عتاب کی بجائے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ (توبہ: ۴۳) — آپ (ﷺ) نے ان (منافقین) کو کیوں اجازت دی۔

اور دوسرے واقعہ میں نرمی سے فرمایا۔

لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ (تحریم: ۱) — آپ (ﷺ) کیوں حرام کرتے ہیں اس چیز کو جس کو اللہ تعالیٰ نے آپ (ﷺ) کے لئے حلال کیا ہے۔

پس یہ امر محال ہے کہ اولیاء سے عبادت اٹھ جائے کیونکہ اگر اولیاء ایک ہزار بھی ہوں تو بھی کسی ایک نبی کے برابر نہیں ہو سکتے۔ تو پھر وہ قرب میں اس مقام تک کیسے پہنچ سکتے ہیں کہ جو چاہیں کریں، شریعت ان سے اٹھ جائے تو ثابت ہوا کہ یہ قول باطل اور عقیدہ فاسد ہے۔ مذکورہ بالا دونوں واقعات کی تفصیل کتب تفاسیر میں ملاحظہ فرمائیں۔

حقیقتِ معرفت

اللہ تعالیٰ کی قدر کے مقابلے میں تمام قدروں کو حقیر سمجھنا معرفت ہے، یہاں پر دو باتیں سمجھانا مقصود ہیں ایک حالِ بقا اور دوسری حالِ فنا۔ حالِ بقا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدر کے مقابل تمام قدروں کو حقیر سمجھے اور حالِ فنا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی قدر کے ساتھ کسی قدر کو نہ دیکھے۔ پہلا حال اس شخص کا ہے جس کی معرفت ابھی کمال کو نہیں پہنچی۔ اپنے سِرّ میں خدا تعالیٰ کو دیکھتا ہے جو چیز اس سے فوت ہو جاتی ہے خدا تعالیٰ کے مقابلے میں اس کا کوئی خوف نہیں کھاتا۔ مثلاً ایک شخص کسی کو دوست رکھتا ہے تو اس دوست کے دیدار کے مقابلے میں تمام مصیبتوں کو بخوشی قبول کرتا ہے، اگر لوگ اس سے پوچھتے ہیں تو کہتا ہے کہ جب تک میرا فلاں دوست زندہ ہے مجھے کسی تکلیف کی پرواہ نہیں ہے۔ یہ اُس محبت کی صفت ہے جس کا بدل دوست ہے۔ پس جس کا دوست ہی ایسا ہو جس کا کوئی بدل نہیں تو اس کے حال کی کیا کیفیت ہوگی۔

یہاں مثال کے طور پر حضرت یعقوبؑ کا ذکر کیا جاتا ہے آپ کی حضرت یوسفؑ پر دوسرے فرزندوں سے زیادہ نظر تھی۔ آپ کی محبت کا یہ حال تھا کہ جب حضرت یوسفؑ (ایک) گم ہو گئے تو دوسرے دس اس (ایک) کی جگہ نہ ہو سکے اور تعجب کی بات نہیں کہ اگر لاکھ بھی ہوتے تو اس ایک کے قائم مقام نہ ہو سکتے۔ فرماتے ہیں کہ "وَمَنْ قَامَ لَهٗ شَیْءٌ مُّقَامَ حَبِیْبِهٖ فَلَیْسَ بِمُحِبٍّ" یعنی جس کو اس کے حبیب کے قائم مقام کوئی چیز محبوب ہو تو وہ محب نہیں ہے۔

عوام و خواص اور انبیاء علیہم السلام تینوں کی معرفت میں فرق ہے

ابن عطاءؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے عوام کو اپنی یوں پہچان کرائی ہے۔ جیسے ارشاد ربانی ہے۔

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَیْفَ خُلِقَتْ (الغاشیہ:۱۷)

کیا یہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ اسے کیسے (عجیب طرح) پیدا کیا گیا ہے۔

اور خواص کو اپنے کلام اور اپنی صفات سے اپنی یوں پہچان کرائی، جیسے ارشاد فرمایا۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ (محمد:۲۴، النساء:۸۲)

تو کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے

دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔

وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (بنی اسرائیل: ۸۲)

اور ہم اتارتے ہیں قرآن میں وہ چیزیں جو باعث شفاء ہیں اور سراپا رحمت ہیں اہل ایمان کے لئے۔

اور انبیاء علیہم السلام کو اپنی ذات سے شناسا کیا۔ جیسے ارشاد فرمایا۔

وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (الشوریٰ: ۵۲)

اور اسی طرح ہم نے بذریعہ وحی بھیجا آپ کی طرف ایک جانفزا کلام اپنے حکم سے۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے عوام کو اپنی خلقت سے اپنا شناسا کیا اور خواص کو اپنے کلام، صفات سے اور انبیاء علیہم السلام کو اپنی ذات سے اپنا شناسا کیا۔ مذکورہ بالا بیان سے ثابت ہوا کہ معرفت کے اسباب مختلف ہیں، عوام تو مخلوق سے خالق کی راہ پاتے ہیں اور فعل سے فاعل کو اور صنعت سے صانع کو پہچانتے ہیں۔ آیات بالا میں مخلوق میں سے چار کا ذکر فرمایا۔ بایں معنی کہ اونٹ کا بغیر کچھ کھائے پیئے کئی دن تک چلنا، چلانے والے پر دلیل ہے اور آسمان کا ایک جگہ کھڑا رہنا، کھڑا رکھنے والے پر دلیل ہے اور پہاڑوں کا زمین پر قائم ہونا، قائم رکھنے والے پر دلیل ہے اور زمین کا پانی کی سطح پر قرار پکڑنا، بچھانے والے پر دلیل ہے۔ ان چاروں کو مخصوص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ زمین پاؤں کے نیچے ہے اور آسمان سر کے اُوپر ہے اور پہاڑ آنکھوں کے سامنے ہیں خواہ نیچے دیکھو، خواہ اُوپر، خواہ آگے دیکھو ہر طرف دلیل اور حجت کو دیکھو گے۔

ہر مخلوق میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی خوبی رکھی ہے جو دوسری میں نہیں ہے۔ دیکھنے والا اس مخلوق میں اللہ تعالیٰ کی کاریگری کا لطف اٹھاتا ہے اور صنعت کے اس لطف سے صانع کی لطافت پر دلیل پکڑتا ہے اور حق تعالیٰ کو اس وجہ سے پہچانتا ہے مگر خواص اس کو اس کے کلام اور صفات سے پہچانتے ہیں یعنی صفت سے موصوف کی راہ پاتے ہیں اور اسم سے مسمّی کو حاصل کرتے ہیں۔ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام اور صفت ہے وہ فرماتا ہے کہ قرآن پاک جو میرا کلام اور صفت ہے اس میں کیوں غور نہیں کرتے۔ اس کلام کی عبارت اور بیان مخلوق کو میں نے دیا اور مخلوق اس جیسی عبارت اور بیان لانے سے عاجز ہے اور یہ بھی فرمایا کہ قرآن مومنوں کے لئے شفاء اور رحمت ہے اور عین یہی قرآن دشمنوں کے لئے ہلاکت ہے۔ پھر فرمایا کہ مجھے میرے ناموں سے پکارو کہ میرے نام اچھے ہیں۔ یعنی مجھے جو مسمّی ہوں، میرے نام سے جانو۔ جب خواص نے ان اسماء وصفات کو معلوم کیا تو ان کے معانی سے تعلق پیدا کیا اور اس کے غیر سے مستغنی ہو گئے، جملہ احوال میں اسی کو دیکھا اور اسی کے ساتھ رہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو اپنی ذات سے آشنا کیا کہ انہوں نے اس کو اسی سے دیکھا نہ غیر سے اور نہ اس کی صفات سے۔ پھر فرمایا کہ "اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ" کیا آپ نے نہیں دیکھا اپنے رب کی طرف کیسے پھیلا دیتا ہے سایہ کو (الفرقان: ۴۵)۔" یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو غیر حق سے حق کو دیکھنا نہیں

فرمایا، لیکن حق کو حق سے دیکھنا فرمایا یعنی انبیاء علیہم السلام ذات سے ذات کی طرف راہ پاتے ہیں۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔

وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا — اور اسی طرح ہم نے آپ کے پاس اپنے حکم سے وحی بھیجی روح کی۔ (الشوریٰ: ۵۲)

"مِّنْ اَمْرِنَا" یعنی اپنے حکم سے جبریلؑ کو پیغام دے کر آپ کی طرف بھیجا۔ اس کے آنے کو نہ دیکھ بلکہ ہمارے بھیجنے کو دیکھ، یہ نہ دیکھ کہ تیرے پاس کون آتا ہے، یہ دیکھ کہ اس کو بھیجتا کون ہے۔ پھر جب جبریلؑ کو چند دن تک آنے سے بند کر دیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زمین پر جبریلؑ کے نہ آنے پر حیران ہوئے اور ادھر جبریلؑ بھی آپ کے پاس نہ بھیجے جانے پر آسمان پر حیران ہوا۔ جبریلؑ کو اللہ تعالیٰ کے بھیجنے کے شرف پر جلدی تھی۔ حضور علیہ السلام کو بھیجے جانے والے کے نظارہ کرنے کی جلدی تھی۔ دونوں کو ایک دوسرے سے روک دیا تاکہ آنکھوں کو ایک دوسرے کے نظارہ سے ہٹا دیں اور ہم کو دیکھیں۔ جبریل علیہ السلام کو جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کا اذن ہوا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریلؑ کو فرمایا: " اَبْطَاْتَ " تو نے اتنی دیر لگا دی، جواب ملا کہ "ہم نازل نہیں ہوتے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رب کے حکم سے"۔ (مریم: ۶۴) یعنی میرا نظارہ کرنے والے ہی نہ ہو جائیے کہ میں آنے والا ہوں بلکہ بھیجنے والے کے حکم کا نظارہ کرنے کے مشتاق ہو جائیے یوں جب اللہ تعالیٰ مجھے روک دیتا ہے تو میں رک جاتا ہوں اور جب بھیجتا ہے تو میں آ جاتا ہوں۔ خود کو درمیان سے نکال دیا اور دکھا دیا کہ میرے قبضہ میں کچھ بھی نہیں ہے۔ میری طرف نہ دیکھیں بلکہ اللہ کی طرف دیکھیں۔ مشاہدہ حق (دوست) کے حال میں یہاں پر ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیت اللہ شریف کا طواف فرما رہے تھے، ایک شخص نے آپ کو سلام کیا۔ آپ نے سلام کا جواب نہ دیا۔ اس شخص نے حضرت عمرؓ کی خدمت میں جا کر شکایت کی تو حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ کو بلوا کر جواب طلب کیا۔ حضرت عبداللہؓ نے عرض کیا کہ اس مکان میں ہم اللہ کو دیکھ رہے تھے۔ بیٹے کے اس جواب پر حضرت عمرؓ نے انکار نہیں فرمایا۔ اس بات سے ثابت ہوا کہ عارف کو سِرّ میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا مشاہدہ ہو سکتا ہے۔ اس سے زیادہ قوی دلیل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لِیْ مَعَ اللّٰهِ وَقْتٌ لَا يَسَعُنِیْ فِيْهِ مَلَكٌ مُقَرَّبٌ وَّلَا نَبِیٌّ مُّرْسَلٌ (الحدیث) — اللہ تعالیٰ کے ساتھ میرا ایک وقت ہوتا ہے کہ نہیں پہنچتا اس میں کوئی مقرب فرشتہ اور نہ کوئی نبی مرسل۔

بزرگ فرماتے ہیں کہ جو حق تعالیٰ کے مشاہدہ میں ہے وہ کونین کی طرف نہیں جھکتا۔ اس کے علاوہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے مشاہدہ میں جس نے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور چیز کو دیکھا تو گویا اس نے بت کی پرستش کی۔

مشاہدۂ حق میں پھر ایک لطیف بحث ہے کہ جس چیز کو ہم جس چیز سے پاتے ہیں یہ چیز اس موجود کی علت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ معلول نہیں ہے، وہ قادر ہے اور سب کے سب ضعیف ہیں، قادر کو ضعیف سے نہیں پا سکتے۔ وہ غنی ہے اور سب محتاج ہیں، غنی کو محتاج سے نہیں پا سکتے، وہ باقی ہے اور سب فانی ہیں باقی کو فانی سے نہیں پا سکتے۔ وہ مالک ہے اور سب مملوک ہیں۔ مالک کو مملوک سے نہیں پا سکتے بلکہ مملوک کو مالک سے پا سکتے ہیں۔ ثابت ہوا کہ اس کو اسی سے پا سکتے ہیں۔ پھر فرمایا: وَجَدْنَا هٰذَا حَقًّا یعنی یہ بات جو ہم نے ذکر کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف راہ دکھانے والا بھی خود خدا تعالیٰ ہی ہے اس کو ہم نے حق پایا اور حق صدق ہوتا ہے اور حق واجب ہوتا ہے اور حق معبود ہوتا ہے یعنی جو کچھ ہم نے پایا ہے یا سمجھا ہے از خود نہیں پایا بلکہ اس علم سے پایا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمایا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا (یوسف:۸۱) — اور ہم نے آپ سے وہی کچھ بیان کیا جس کا ہمیں علم تھا۔

اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (الزخرف:۸۶) — مگر جس نے گواہی سچی دی اور ان کو خبر تھی۔

اور اس پر دلیل یہ ہے کہ دل کے دیدار کے بغیر زبان سے جو شہادت ہوتی ہے وہ جھوٹی ہوتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ (المنافقون:۱) — اور اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں۔

منافقوں کا کلمہ تشہد صدق کا تھا لیکن جب دل کے مشاہدہ کے بغیر تھا تو اللہ نے ان کو کاذب قرار دیا۔

اولیاء اللہ کو عالمِ ارواح میں ہی علم عطا کر دیا جاتا ہے

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ اولیاء کرام کو اس دنیا میں آنے سے پہلے عالم ارواح میں علمِ معرفتِ حق سے ممتاز کر دیا جاتا ہے۔ تکوینِ کائنات سے پہلے جب تمام روحوں نے اللہ تعالیٰ کے "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ" (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟) کے جواب میں ("بلیٰ") کیوں کہا تھا۔ اس وقت اہل عرفان معرفتِ حق کے سمندر میں مستغرق تھے۔ اللہ تعالیٰ کے بے پایاں کرم نے انہیں اس دنیا میں جو دار العمل ہے، آنے سے پہلے مورد الطاف و عنایات کر دیا تھا۔ ذیل کے اشعار میں مولاناؒ نے اسی حقیقت کو آشکار کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

پیر ایشاں اند کایں عالم نبود — جانِ ایشاں بُود در دریائے جود

(یہ اس وقت سے پیر روشن ضمیر چلے آتے ہیں جبکہ یہ عالم نہ تھا اور ان کی روح دریائے معرفت میں غرق تھی۔)

پیش ازیں تن عمرہا بگذاشتند پیشتر از کشت بر برداشتند

(وہ اس جسد عنصری میں آنے سے پہلے ہی بہت سی عمریں گزار چکے ہیں اور وہ اعمال کی کھیتی سے پہلے ہی اجر کا پھل اٹھا چکے ہیں۔)

پیشتر از نقش جان پذرفتہ اند پیشتر از بحر دُرہا سفتہ اند (۳۰۔۲)

(اور وہ اپنے جسم عنصری کے وجود میں آنے سے پہلے جان قبول کر چکے ہیں اور دریا کے وجود میں آنے سے پہلے موتی پرو چکے ہیں۔)

اولیاء اللہ کی شان و منزلت

مولانا رومیؒ کے مطابق اولیاء اللہ خدا کے محبوب اور خاص بندے ہیں جو تمام مخلوق میں اللہ کو سب سے عزیز ہوتے ہیں۔ اُن کی مثال اس طرح ہے جیسے ماں کو اپنے بچے سے بہت پیار ہوتا ہے اور بچہ ہر حال میں ماں کا دست نگر ہوتا ہے۔ اپنی ہر ضرورت کے لئے بے اختیار ماں کی طرف لپکتا ہے۔ بعینہٖ اولیاء ہر معاملے میں اللہ ہی کے سایہ عاطفت میں پناہ حاصل کرتے ہیں اور وہی ہر حال میں ان کا ملجا و ماویٰ ہے۔ اولیاء کرام کی بچوں سے مشابہت کی ایک خاص وجہ ایک حدیث ہے۔ ذیل کے شعر کا مضمون اس حدیث سے ہی لیا گیا ہے کہ "اَلْخَلْقُ عِیَالُ اللّٰہِ اَحَبُّھُمْ اِلَی اللّٰہِ اَنْفَعُھُمْ لِعِیَالِہٖ وَاَبْغَضُھُمْ اِلَی اللّٰہِ اَذَاھُمْ لِعِیَالِہٖ" (لطائف معنوی ص:۱۱۱) (مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، وہ شخص اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہے جو اس کے کنبے کو زیادہ نفع پہنچائے اور سب سے برا وہ شخص ہے جو اس کے کنبے کو زیادہ تکلیف دے۔)۔

اولیاء اطفالِ حق اند اے پسر در حضور و غیبت آگاہ باخبر

(عزیز من اسی طرح اولیاء بھی اللہ کے بچے ہیں، وہ غیب و حضور دونوں حالتوں میں اس سے خوب آگاہ ہیں۔)

پھر فرماتے ہیں۔

غائبی مندیش از نقصانِ شاں کو کشد کیں از برائے جانِ شاں (۲۲۔۳)

(غائب ہونا ان کے لئے مضر نہ سمجھو کیونکہ وہ بہر صورت ان کی جان کے لئے دشمنوں سے انتقام لیتا ہے۔)

یعنی یہ گمان نہیں کرنا چاہیے کہ اللہ کی نصرت بحالت حضوری ہی اولیاء کے شامل حال ہوتی ہے اور ان کو ایذا پہنچانے والا ظاہراً جب وہ کاروبار دنیوی میں مشغول ہوتا ہے، ان کو ایذا دے کر نقصان سے بچا تا رہتا ہے، ایسا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر حال میں اُن کا ناصر و مددگار ہے۔ وہ اپنے ان خاص بندوں یعنی اولیاء کو کسی حالت میں تنہا اور بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا بلکہ غیب و حضور میں ہمہ وقت ان کا حامی و ناصر رہتا ہے۔

اولیاء کی تصنع، بناوٹ اور ریا سے پاک طرزِ زندگی

اہل اللہ دنیاوی معاملات میں سیدھے سادے ہوتے ہیں۔ان کی زندگی تصنع، بناوٹ، ریا اور نمود و نمائش سے یکسر پاک ہوتی ہے۔وہ مجاہدہ، ریاضت اور مشقت کے خوگر ہوتے ہیں۔کوئی دنیاوی مشغلہ انہیں اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتا۔مولانا رومیؒ ان کی ہیئت کذائی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

از گزافہ کے شدند ایں قوم لنگ فخر را دادند و بخریدند ننگ

(یہ لوگ (اہل اللہ) دنیا کے میدان میں کوئی ہنسی کھیل کی وجہ سے لنگڑے تھوڑے ہوئے ہیں بلکہ انہوں نے دنیوی جاہ و منزلت کے فخر کو چھوڑ دیا اور گمنامی و مسکینی کی عار والی زندگی پسند کر لی ہے۔)

پا شکستہ می روند ایناں بحج از حرج راہیست پنہاں تا فرج

(یہ لوگ پا شکستہ ہونے کی حالت میں بھی حج پر روانہ ہو جاتے ہیں کیونکہ تکلیف سے راحت کی طرف ایک مخفی راستہ ان کے لئے موجود ہے۔)

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بندگانِ خدا دنیاوی آرام و آسائش ترک کر کے حج پر جو مجاہدہ و ریاضت سے عبارت ہے، روانہ ہوتے ہیں۔کوئے محبوب کا طواف کرتے ہوئے انہیں تکلیف سے ابدی راحت کی طرف لے جانے والا دروازہ نظر آتا ہے۔

دل زدانشہا بشستند ایں فریق زانکہ ایں دانش نداند آں طریق (۱۱۵۔۳)

(اس جماعت نے دل سے عقلوں کو دھوڈالا ہے کیونکہ یہ عقل اس راستے کو نہیں جانتی)

مولانا رومیؒ یہاں وہ عقل و دانش مراد لیتے ہیں جو مادی مصلحتوں اور محدود مفادات کے تابع ہے۔اہل اللہ ان تعینات سے ماوراء ہیں کہ ان کی زندگی محبت اور عشق الٰہی سے عبارت ہوتی ہیں۔

اولیاء کا اخفائے حال

مولانا رومیؒ نے ایک حدیث شریف کا مفہوم نظم کیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعض ایسے بھی دوست ہوتے ہیں جن کے سر کے بال پراگندہ، چہرے غبار آلود اور حال اس قدر رختہ کہ انہیں لوگوں سے بات کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی، جب وہ غائب ہو جاتے ہیں تو ان کی تلاش نہیں کی جاتی اور جب وہ حاضر ہوتے ہیں تو ان کو بلایا نہیں جاتا۔بیمار ہوں تو عیادت نہیں کی جاتی اور جب مر جائیں تو لوگ ان کے جنازے میں شریک نہیں ہوتے۔لیکن ان کا مقام اتنا بلند ہوتا ہے کہ باوجود زمین میں گمنامی کے ان کا چرچا آسمانوں میں ہوتا ہے۔

قوم دیگر سخت پنہاں میروند شہرہء خلقانِ ظاہر کے شوند

(بازار آخرت والوں کا ایک دوسرا گروہ وہ ہے جو نہایت چھپ چھپ کر لوگوں کے درمیان چلتا ہے۔ ظاہری مخلوق میں یہ گروہ کب مشہور ہوتا ہے اس لئے کہ ان کو اہل باطن ہی جانتے ہیں۔)

این ہمہ دارند و چشم ہیچ کس برنیفتد بر کیا شاں یک نفس

(وہ بھی سارے کمالات دیکھتے ہیں (جو انبیاء کو حاصل ہیں) حالانکہ کسی کی آنکھ لمحہ بھر کے لیے ان کی شان وشوکت پرنہیں پڑتی)

ہم کرامت شاں ہم ایشاں درحرم نام شاں را نشنوند ابدال ہم (۳۔۳۰۰)

(وہ خود اور ان کی کرامت اللہ تعالیٰ کے حریم حفظ میں ہے، وہ یہاں تک مخفی ہیں کہ ابدال بھی ان کا نام نہیں سنتے، باوجود اس کے کہ ان کو دنیا کی اکثر ڈھکی چھپی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔)

اولیاء اللہ کے اَخلاق وعادات

اس مضمون کا مفہوم اس حدیث سے ماخوذ ہے جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں تمہیں ان لوگوں کا پتہ نہ بتاؤں جو تم میں بہت اچھے ہیں؟ لوگ عرض کرنے لگے "یا رسول اللہ! بتایئے۔" اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "سب سے اچھے لوگ وہ ہیں جن کی زیارت کرنے سے اللہ بے اختیار یاد آنے لگے۔" اس تمثیل سے وہ اخلاق حسنہ مراد ہیں جو خندہ پیشانی، تصفیہء قلب و باطن اور محبت و خلوص کی بناء پر لوگوں کے دلوں کو تسخیر کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ بقول جگر مرادآبادی ع "جو دلوں کو فتح کرے، وہی فاتح" زمانہ کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ مثنوی کے یہ اشعار اس مضمون کا پیرایہ اظہار ہیں۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں ۔

اے مبارک خندہ اش کو از دہاں می نماید دل چو دُر از دُرجِ جاں

(اے مخاطب اس شخص کی خندہ روئی مبارک ہے جو ہنس مکھ صورت سے اپنا موتی کا سا دل جان کے صندوقچے سے نمایاں کر رہا ہے۔)

یہاں بطور استعارہ خندہ سے وہ ظاہری احوال و کیفیات مراد ہیں جن سے مقبولانِ حق کی باطنی کیفیات کا حال کھلتا ہے۔ اس مقابلے میں وہ مدعیانِ کاذب جو بزرگی و پارسائی کا جھوٹا لبادہ پہن کر لوگوں کو فریب دیتے ہیں ان کی حالت اس طرح بیان کی گئی ہے ۔

نا مبارک خندۂ آں لالہ بود کز دہانِ او سوادِ دل نمود

(نامبارک ہستی اس گل لالہ کی سی حالت والے شخص کی تھی جس کے منہ سے دل کی سیاہی صاف دکھائی دینے لگی)

اس شعر میں ان عیار و مکار روبہ صفت لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو سادہ لوح لوگوں کو اپنے جال میں پھنسانے کے لئے اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن ان کا باطنی خبث چھپانے سے نہیں چھپتا۔

انار خنداں باغ را خنداں کند　صحبتِ مردانت از مرداں کند

(تروتازہ انار سارے باغ کو تروتازہ بنا دیتا ہے، مردانِ حق کی صحبت اسی طرح تم کو مرد بنا دے گی۔)

اسی لئے مولانا رومیؒ کا کہنا ہے کہ اولیاء کی صحبت میں کچھ دیر کے لئے بیٹھنا سو سالہ بے ریا عبادت سے کہیں بڑھ کر ہے۔ مزید ارشاد فرمایا۔

گر تو سنگِ خارہ و مرمر شوی　چوں بصاحب دل رسی گوہر شوی

(اگر تو سخت پتھر یا سنگ مرمر بھی ہو جب تو کسی صاحب دل (ولی کامل) سے ملے گا تو اس کی برکت سے موتی بن جائے گا)

دل ترا در کوئے اہلِ دل کشد　تن ترا در حبسِ آب و گِل کشد (۱۰۱-۱)

(دل تجھے اہل دل کے کوچے میں لے جانے کا مقتضی ہے جبکہ جسم تجھ کو علائق جسمانیہ کی قید میں ڈالنے کا متقاضی ہے۔)

جو لوگ ولی بننا چاہیں ان کے لئے

اگرچہ ولایت ایک ایسی نعمت ہے جس کے حصول کے لئے کسب کا اتنا عمل دخل نہیں جتنا کہ عطاء الٰہی کا اس میں اظہار ہوتا ہے۔ عطاء الٰہی کا ورود اسی وقت ہوتا ہے جب بندے کے دل میں سچی طلب پیدا ہو جائے۔ ایسے لوگ جن کے دلوں میں ولایت کی خواہش یا لگن نہ ہو وہ بالعموم محروم رہتے ہیں چنانچہ درج ذیل امور کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

(۱) خدا کا ولی بننا ہو تو: پہلے اس کا ذوق وشوق اور دل میں طلب پیدا کرے اور اس کے ساتھ توفیق ایزدی اور عطاء الٰہی کے لئے التجا کرے۔

(۲) بندے کا ولی بننا اختیاری عمل ہے: کسی حد تک بندے کے اختیاری عمل میں ہے کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں "اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا یَتَّقُوْنَ (یونس: ۶۳) کہ ہمارے اولیاء وہ ہیں جو ایمان لائے اور جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔ ایمان اور تقویٰ دونوں اختیاری عمل ہیں۔

(۳) تقویٰ اختیار کرنا: اگرچہ اللہ تعالیٰ نے بندے کے اختیار میں رکھا ہے لیکن اس کے حصول کے لئے ارشاد ربانی ہے "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (التوبہ: ۱۱۹)، (یعنی اے ایمان والو! تقویٰ اختیار کرو اور سچے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ) پر عمل پیرا ہونا ضروری ولازمی ہے۔

ارادت اگرچہ اللہ کے ساتھ ہے لیکن کسی بزرگ کے ساتھ نسبت قائم کرنا ضروری ہے۔

طریقت میں اگرچہ تمام تر محبت واتباع اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ وابستہ ہے۔ لیکن اس کا اظہار کسی شیخ

طریقت کے ساتھ کرنا لازمی ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ اگر چہ ہم تواضع مخلوق الٰہی کے ساتھ کرتے ہیں لیکن حقیقتاً یہ تواضع اللہ کے لئے ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر اللہ کے لئے تواضع نہ ہو تو یہ ریا میں شامل ہوگی۔ اسی طرح طریقت میں سب کچھ اللہ کے لئے کیا جاتا ہے لیکن شیخِ مقتداء سے محبت، عقیدت اور حسن ادب کا ہونا لازمی ہے۔ شیخ کے ساتھ عزت وتکریم پر مبنی سلوک بھی اللہ کی طرف اٹھائے جانے والے قدموں میں شامل ہوتا ہے۔

(۴) ولی اللہ کی پہچان: ولایت کے حصول کے لئے کسی ولی اللہ کا انتخاب کرنا بہت اہم امور میں سے ہے۔ مولانا رومؒ نے فرمایا ہے کہ ہر کسی کے ہاتھ میں ہاتھ نہیں دے دینا چاہیے کیونکہ بہت سے لٹیرے اور مدعیانِ طریقت مشائخ کے بہروپ میں ملتے ہیں۔ جس شخص کا عقیدہ قرآن وسنت کے مطابق نہ ہو تو ایسا شخص نہ تو خود ولی ہوسکتا ہے اور نہ ہی کسی کو ولی بنا سکتا ہے۔ اس کی موٹی پہچان اور کسوٹی یہ ہے کہ جس کا دل رسول اللہ ﷺ کی بے پناہ تعریف وتوصیف پر تنگ ہو۔ وہ شیخ بننے کے قابل نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی نعت گوئی یا مدحت سرائی ہمیشہ اولیائے کرامؒ کا شعار رہا ہے۔

(۵) مصلح کامل ولی بننے کی شرائط: مصلح کامل ولی وہ ہے جو خود بھی صالح ہو اور مرید کو بھی ولایت کی منزل تک لے جانے کی اہلیت رکھتا ہو۔ اس مقصد کے لئے بیعت کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ اگر چہ بیعت کرنا سنتِ نبوی ہے تاہم سب سے پہلے اپنی اصلاح کرنا فرض کا درجہ رکھتا ہے۔ اس لئے بیعت کا وہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے جس سے اصلاح ہوسکے، فرض ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ کسی فرض کا موقوف علیہ بھی فرض ہوتا ہے۔

(۶) اتباعِ قرآن وسنت: جب تک پیر کا ہر عمل کامل طور پر قرآن وسنت کی مطابقت میں نہ ہو وہ قابلِ اتباع نہیں۔ خواہ ایسے شخص سے ہزاروں کرامتیں بھی صادر ہوں۔ اس کی یہ کرامتیں استدراج کے سوا کچھ نہیں ہوں گی۔ سالک کو خود بھی حتی الوسع سنت رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرنی چاہیے۔

(۷) تعلیمات کا حصول: سالک کے لئے طریقت سے متعلق تمام علوم کا حاصل کرنا ضروری ہے جس سے تقرب الی اللہ میں مدد ملتی ہے۔ ایسی تعلیم کے لئے چند ایک اصطلاحات کا علم ہونا کافی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ طریقت ایک بحرِ زخار ہے جس کا علم کسی شیخ کامل کی صحبت میں رہنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اگر چہ طریقت کی کتابوں کا مطالعہ کرنا نہایت ضروری ہے لیکن اس تعلیم کی تکمیل شیخ کامل کی صحبت کے بغیر ادھوری رہتی ہے۔

(۸) ریاضت اور مجاہدہ: راہِ طریقت کو طے کرنے کے لئے مجاہدات کا اختیار کرنا ازبس ضروری ہے۔ ایسا معاملہ بہت کم وبیش پیش آتا ہے کہ کسی بزرگ کی ایک نگاہ سے چشم زدن میں وہ مقام حاصل ہو جائے جو کئی سالوں کی ریاضت کے بعد میسر ہوتا ہے۔ اگر سالک میں اتنا ظرف نہ ہو تو وہ کسی مردِ کامل کی نگاہ جذب ومستی کا

متحمل نہیں ہوسکتا اور ایسی نظر پڑنے پر وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ لہٰذا بالعموم ریاضت کا طریقہ اختیار کرنا ہی بہتر خیال کیا جاتا ہے۔ ریاضت اور مجاہدہ شیخ کی طرف سے عطا کردہ انجذابِ قلبی کا اختلاط عموماً حوصلہ افزاء نتائج برآمد کرتا ہے۔ وہ لوگ جو ذکر، اذکار اور اوراد کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ وہ مقام ولایت پر فائز نہیں ہوسکتے۔

یاد رہے کہ ذکر کی کثرت کے بغیر بلند مقام کا حصول ممکن نہیں۔ ذکر اور دیگر ریاضات کے ساتھ اعلیٰ معیار کا باہم ہونا نہایت ضروری ہے، ورنہ خاردار جھاڑی پر ہاتھ پھیرنے والی بات ہوگی۔

(۹) احتساب: اس کتاب میں احتساب کے متعلق کافی بیان کیا جا چکا ہے۔ سالک کے لیے یہ جان لینا بہت بڑے نفع کا حامل بن جاتا ہے اگر وہ یہ معلوم کرلے کہ اس کے مشاغل نے اس پر کیا اثرات مرتب کیے ہیں اور اگر کچھ کمی رہ گئی ہے تو اس کی کیا وجہ ہے۔ اگر کچھ کمی (shortcoming) معلوم ہو جائے تو اس کا ازالہ کیا جائے۔ علامہ اقبالؒ نے احتساب کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) انسان اپنا امتحان اپنی نظر سے کرے۔ (۲) اپنا امتحان دوسروں کی نظر سے کرے۔

(۳) آخر میں اپنا امتحان خدا کی نظر سے کرے۔

(۱۰) طریقت میں سالک کو تعلیم فنا و بقاء: کی تمام منازل طے کرتے وقت دیگر روحانی واردات کے ساتھ ساتھ محبت الٰہی و عشق الٰہی اور عشق مصطفیٰ ﷺ (جو باہم ایک دوسرے کے ساتھ دائمی اور متصل ہیں) کے جذبے کو ابتدائی مراحل ہی میں دل میں راسخ کر لینا چاہیے۔ اگر ایسا ہو جائے تو مبتدی کی منزل بہت جلد طے ہو جاتی ہے لیکن منتہی کے لئے زیادہ مناسب یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو انوار و تجلیات عشق میں محو کردے۔

ولی کی پہچان

ولی کی پہچان کرنا ایک بہت مشکل امر ہے اور عام لوگوں سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ یہ شناخت کرسکیں کہ جس ولی کے ساتھ وہ اپنا وقت گزار رہا ہے آیا وہ صحیح معنوں میں ولی ہے یا ولی ہونے کا اظہار کرتا ہے۔ مولانا رومؒ کا کلام اولیائے کرام کی شان کے متعلق پیش کیا جا چکا ہے۔ اس میں آپ نے فرمایا کہ ہر کسی کے ہاتھ میں ہاتھ نہیں دینا چاہیے کیونکہ بہت سے شیطان بھی ولیوں کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس قسم کے جعلی ولیوں کو بھی ماننے والے لوگوں کی تعداد کچھ کم نہیں۔ کسی ارادت مند شخص کو جس سے بھی عقیدت ہو جائے وہ اسے صحیح ولی ہی تسلیم کرتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے بھی پیامِ مشرق میں پنجابی مریدوں کے متعلق ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ "ہو کھیل مریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد" ان کی عقیدت میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ بنا بریں یہ ایک لازمی امر ہے کہ نوخیز طالبوں کو اولیاء اللہ کی پہچان کے متعلق علامات

بیان کردی جائیں۔ ولی کی پہچان کے متعلق اگر قرآن سے مدد لی جائے تو تسلی بخش جواب حسب ذیل آیت میں مل جاتا ہے۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿٦٣﴾ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ (یونس: ٦٢ تا ٦٤)

سنو! بے شک اولیاء اللہ کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور (عمر بھر) پرہیز گاری کرتے رہے۔ انہی کے لئے بشارت ہے دنیاوی زندگی میں اور آخرت میں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس کو اللہ کا قرب حاصل ہو، (جس کا بیان الگ ہو چکا ہے) جس کا دل ذکر الٰہی میں مستغرق، شب وروز تسبیح وتہلیل میں مصروف ہو، جس کی محبت اور نفرت اللہ کے لئے ہو، جس کے آئینہ پر بالواسطہ یا بلا واسطہ آفتابِ رسالت کے انوار کا انعکاس ہونے لگے اور پرتو جمال محمدی ﷺ سے روح کو منور کردے، اور جو بکثرت اولیائے امت کی صحبت میں حاضر رہتا ہو ہی ولی کامل ہے۔

علامہ پانی پتیؒ فرماتے ہیں ولی دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو طالب اور مرید ہوں اور دوسرے وہ جو مطلوب اور مراد ہوں یا ایک مُحِبّ (محبت کرنے والا) اور دوسرا المحبوب یعنی وہ جو محبوبیت کی خلعت پہنے ہوئے ہو۔ ان کی پہچان کے لئے حضور اکرم ﷺ نے کچھ علامات اور خصوصیات کا ذکر فرمایا جو نیچے دی جارہی ہیں۔

(۱) جب ان کو دیکھا جائے تو خدا یاد آجائے "اِذَا رُؤُوْا ذُكِرَ اللّٰهُ" کہ کیا تمہیں ان لوگوں پر آگاہ نہ کروں جو تم سب سے بہتر ہیں عرض کیا گیا کہ یارسول اللہ ﷺ ضرور بتایئے۔ فرمایا جب ان کی زیارت کی جائے تو خدا یاد آجائے۔

(۲) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ انکا دل وہ آئینہ ہے جس میں تجلیات الٰہی کا عکس پڑ رہا ہے اور جب کوئی چیز ایسے آئینے کے سامنے رکھی جائے جس میں سورج کی کرنیں پڑ رہی ہوں تو وہ چیز بھی روشن ہو جاتی ہے اور اگر آئینے کا عکس روئی پر ڈالا جائے تو وہ جلنے لگتی ہے حالانکہ سورج کی کرنیں اگر بلا واسطہ پڑیں تو وہ نہیں جلتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سورج سے دور ہے اور آئینے سے قریب ہے۔

(۳) ہم دیکھتے ہیں کہ اولیاء کرام میں دو قوتیں ہیں ایک اثر قبول کرنے کی اور ایک اثر انداز ہونے کی۔ پہلی قوت کے ذریعے وہ اللہ سے فیض قبول کرتے ہیں اور دوسری کے ذریعے وہ ارواح اور قلوب کو فیض پہنچاتے ہیں اور اگر کوئی ان کا منکر نہ ہو تو ضرور فیضیاب ہوتا ہے یعنی وہ لوگ جن کا ایمان توحید اور رسالت پر مستحکم ہو اور کوئی ابلیسی وسوسہ اُسے متزلزل نہ کرے اور ان اولیاء سے عقیدت بھی رکھتا ہو تو اسے ان کے فیضِ ولایت کی خلعت سے نوازتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ اس ولایت خاصہ کا مژدہ خود اس دنیا میں دیا کرتے تھے "لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" اور فرمایا کرتے تھے: "اَبُوْبَكْرٍ فِي الْجَنَّةِ وَ عُمَرُ فِي الْجَنَّةِ ... الخ"

(دس حضرات کا نام لے کر فرمایا کہ یہ جنتی ہیں) اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو فرمایا: "اَمَا اِنَّکَ یَا اَبَابَکْرٍ اَوَّلُ مَنْ یَدْخُلُ الْجَنَّةَ مِنْ اُمَّتِی" (ابوداؤد) یعنی اے ابوبکر تم میری امت میں سب سے پہلے جنت میں داخل ہو گے۔ حضرت امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما کو فرمایا: "سَیِّدَا شَبَابِ اَھْلِ الْجَنَّةِ" (یہ دونوں جنتی جوانوں کے سردار ہیں)۔

حضور اکرم ﷺ کے بعد یہ خوشخبری درج ذیل طریقوں میں سے کسی طریقے سے دی جاتی ہے۔

(i) عالم بیداری میں بذریعہ کشف یا حالت خواب میں بذریعہ رؤیا صادقہ، چنانچہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ یہ خوشخبری ایک سچا خواب ہے، جو کوئی شخص خود دیکھتا ہے یا اس کے متعلق کسی اور کو دکھایا جاتا ہے یا فرشتے آتے ہیں اور بالمشافہ ان کو بشارت سے شاد کرتے ہیں "وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ" (حم السجدہ: ۳۰)

(ii) کسی شیخ یا بزرگ کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اس کا فلاں مرید اس درجے پر فائز ہو گیا ہے۔

(iii) کوئی شخص اپنی کرامات، احوال اور مقامات کو دیکھ کر اندازہ لگاتا ہے اور کبھی لوگوں پر از خود یہ احوال ظاہر ہو جاتے ہیں۔

(iv) افعال بادرہ سے بزرگوں کیساتھ خاص روحانی جلسوں میں خود کو حاضر پائے اور ضروری امور پر مامور کیا جائے۔

(v) دنیا کے لوگ اس کی صحبت سے تائب ہو کر نیک اعمال کی طرف راغب ہوں اور اس کی صحبت سے لوگ ولایت کے درجے پر فائز ہو جاتے ہوں اور ان پر اپنے جیسی کیفیات وارد کر سکتا ہو۔

(vi) خدا اور رسول اللہ ﷺ اور آپ کی امت کے اولیائے کرامؒ سے عشق کی حد تک محبت کرتا ہو اور ان کے عشق کا خمار اس کی آنکھوں میں مستی اور اشکوں کی صورت سے واضح طور پر نظر آتا ہو۔

(vii) وصال شدہ اولیائے کرامؒ سے اس کا رابطہ قائم ہو اور جس سے چاہے فیض لے سکتا ہو۔

(viii) رسول اللہ ﷺ کی شان میں بولے جانے والے کلمات سے تنگ دل نہ ہوتا ہو مثلاً آپ ﷺ کی توصیف میں اگر کچھ کلام کیا جائے تو یہ نہ کہے کہ تم نے رسول اللہ ﷺ کا درجہ خدا سے بڑھا دیا۔ (یاد رہے کہ جب خدا کے درجے کا تعین یا اس کی بلندی کی کوئی حد مقرر کی جائے تو اس حد سے اگر رسول اکرم ﷺ کو بلند تر کر دیا جائے تو اس حالت میں ان کا اعتراض درست ہو گا۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ تو حدود و قیود اور مقامات سے بلند اور بے نیاز ہے تو رسول اکرم ﷺ کی کوئی صفت بیان کرنا خدا کی شان کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ جب اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کو اپنی بہت سی صفات سے نوازا ہے تو ان صفات میں آپ کی شرکت خلاف توحید نہیں۔

(ix) رسولِ خدا ﷺ کے متعلق اس قسم کے الفاظ نہ بولتا ہو جس میں آپ ﷺ کی عزت و احترام اور وقار پر زد پڑتی ہو۔ مثلاً درج ذیل باتوں کو منہ سے نکالنا کفر ہوگا اور ان باتوں کو کہنے والا کبھی ولی اللہ نہیں ہو سکتا۔

(الف) رسولِ خدا ﷺ کسی کو ہدایت نہیں دے سکتے۔ (اَلْعِیَاذُ بِاللّٰہِ)

(ب) آپ ﷺ کے متعلق کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ کو اپنے انجام کی خبر نہ تھی (جبکہ حضور اکرم ﷺ نے خود بہت سے صحابہؓ کے متعلق جنتی ہونے کی خبر دی ہے کیونکہ کچھ لوگ برسرِ منبر ایسی ہرزہ سرائی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور خود کو ولی کامل بھی سمجھتے ہیں۔ "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ"۔

(ج) یہ نہ کہتا ہو کہ رسول خدا ﷺ نے اردو ہمارے مدرسے سے سیکھی جبکہ احادیث میں وارد ہے کہ آپ ﷺ کئی زبانوں کو جانتے تھے۔

(د) یہ نہ کہتا ہو کہ ہم نے خواب میں دیکھا کہ حضور اکرم ﷺ ہمارے فلاں عالم کے پیچھے تیسری صف میں نماز ادا کرنے لگے تو میں نے آپ کو بازو سے پکڑ کر صف اول میں کھڑا کر دیا حالانکہ آپ ﷺ بالاتفاق امام الانبیاء ہیں۔

(ہ) یہ نہ کہتا ہو کہ نماز میں حضور اکرم ﷺ کا تصور آ جائے تو نماز فاسد ہو جاتی ہے جبکہ کسی جانور کا خیال آ جائے تو نماز فاسد نہیں ہوتی۔ (تقویۃ الایمان) کچھ لوگ کہتے ہیں کہ تصورِ رسول اللہ ﷺ اور تصورِ شیخ کے بت سینے میں رکھنا شرک ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ۔

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام — میرا قیام بھی حجاب! میرا سجود بھی حجاب (ب۔ج:۴۰۵)

تصورِ شیخ کی تفصیل کے لئے جو مضمون اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے اس کا مطالعہ فرمائیں۔

(و) یہ نہ کہتا ہو کہ حضرت عزرائیلؑ تو ساری دنیا کو بیک وقت ایسے دیکھتے تھے جیسے کسی کے سامنے ایک تھال ہو مگر رسول خدا ﷺ کو دیوار کے پیچھے نعوذ باللہ کسی چیز کا علم نہ تھا۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ علم اولین و آخرین تو کجا آپ ﷺ کو اپنے شہر میں منافقین کا بھی علم نہ تھا حالانکہ آپ ﷺ نے فرداً فرداً تمام منافقین کی فہرست حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو لکھوا دی تھی۔

(ز) اگر اس کے سامنے کوئی نعت رسول خدا ﷺ کی مدحت میں بیان کی جائے تو وہ بل کھاتا ہوا نظر نہ آئے اور اپنی مجلسوں میں نعتوں کے پڑھنے کو گناہ نہ سمجھتا ہو۔

(ک) ایسی ہزاروں باتیں ہیں جس میں رسول خدا ﷺ کی یا اولیائے کرام کی بڑائی نظر آتی ہو تو کچھ لوگ اس سے منع کرتے ہیں اور دل میں خلش محسوس کرتے ہیں۔ ایسا شخص کبھی ولی اللہ نہیں ہو سکتا۔

سیدھے سادے مسلمان کے لئے ایک ولی اور غیر ولی میں پہچان کرنا بہت مشکل ہے۔ بہت سے لوگ کسی خود ساختہ ولی کے علم اور باتوں سے اس قدر متاثر ہو جاتے ہیں کہ ان کو ان کی ہر بات درست نظر آنے لگتی ہے۔

خواہ وہ صریحاً غلط ہی کیوں نہ ہو۔ ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ درج بالا باتوں کو بغیر تعصب کے دیکھے اور ان کی چرب زبانی میں نہ آئے ورنہ ساری عمر ہدایت نہ پائے گا۔ اس کے علاوہ درج ذیل باتوں کا خاص خیال رکھے۔

(۱) اولیائے سابقین مثلاً بایزید بسطامیؒ، حضرت داتا گنج بخشؒ، جنید بغدادیؒ، نظام الدین اولیاء، بابا فرید الدین گنج شکرؒ، بہاء الدین نقشبندؒ وغیرہ حتیٰ کہ ماضی قریب میں ہونے والے بزرگ پیر مہر علی شاہ صاحب، مولانا قاسم موہڑویؒ اور مولانا میاں شیر محمد شرقپوریؒ کے افکار، اعتقادات، اعمال اور احوال کو نگاہ میں رکھے کہ وہ کس نہج پر تھے۔ کچھ لوگ ان اولیائے کرام کو بھی نا قابل تقلید اور نعوذ باللہ بدعتی کہتے ہیں حالانکہ یہ حضرات مسلک اہل سنت والجماعت کے لئے بہت گراں قدر سرمایہ اور مشعلِ راہ ہیں۔

(۲) ان سابقین اولیاء کی تصانیف کا بلا تعصب مطالعہ کرے، ان اولیائے کرام کے احوال سے سالک پر واضح ہو جائے گا کہ ولی کی علامات کیا ہیں اور صحیح اعتقادات کون سے ہیں۔ حضرت معین الدین چشتیؒ نے فرمایا کہ جس شخص کو کوئی پیر نہ ملتا ہو کشف المحجوب کا مطالعہ کرنے کے بعد اسے پیر کامل مل جائے گا۔ آپ کا یہ بیان بالکل درست ہے کیونکہ کشف المحجوب کو پڑھنے سے تمام پردے کھل جاتے ہیں اور اس کا قاری ولی کی پہچان تک پہنچ جاتا ہے۔ راقم الحروف کی ابتدا اسی کتاب سے ہوئی اور غلط پیر کبھی بھی اس کتاب کے مطالعہ کا حکم نہ دیں گے کیونکہ اس سے ان کی قلعی کھل جاتی ہے اور وہ یہ کہہ دیتے ہیں اس کتاب میں لوگوں نے تحریف کر دی ہے ایسے لوگ کتنی کتابوں کو تحریف شدہ کہیں گے۔ مکتوبات شریف کا کوئی خط بھی آپ پڑھ لیں تو اس میں وہی رنگ جھلکتا ہے جو کشف المحجوب میں پایا جاتا ہے

(۳) اولیائے سلف کی زندگیوں سے اگر کچھ حقائق رونما ہو جائیں تو ان کو تسلیم کرنے سے اس لئے انکار نہ کر دیں کہ وہ آپ کے اپنے مسلک کے عالم کے خیالات سے ٹکراتے ہیں۔ اکثر لوگوں پر کچھ حقائق واضح ہو جاتے ہیں مگر وہ تعصب کی وجہ سے اس لئے انکار کر دیتے ہیں کیونکہ ان کے کوئی خاص عالم اس کی مخالفت کا حکم دیتے ہیں۔

اولیاء کی پہچان مشکل ہے

اللہ تعالیٰ کی پہچان آسان ہے کیونکہ اس جہان کا ہر ذرہ جمال الٰہی کا آئینہ دار ہے اور اس کی شان ربوبیت کی گواہی دیتا ہے مگر ولی اللہ کی پہچان ایک بہت مشکل امر ہے کیونکہ ہم جیسا ہونے، ہمارے اندر گھل مل جانے اور ہر ظاہری پہلو سے عام لوگوں سے جداگانہ نہ ہونے کے باعث اس کی شناخت ہونا مشکل ہے۔ کفار مکہ نے بھی اسی ظاہری مشابہت کے پیش نظر رسول خدا ﷺ کو کہا کہ آپ تو ہماری طرح کھاتے پیتے، سوتے جاگتے اور بازاروں میں پھرتے ہیں تو پھر آپ رسول کیسے ہو سکتے ہیں؟

وَ قَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ یَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ یَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ (الفرقان:۷)

(اور کفار بولے کیا ہوا ہے اس رسول کو کہ کھانا کھاتا ہے اور چلتا پھرتا ہے بازاروں میں۔)

ولیوں کے دلوں میں نورانی قندیلیں جلتی ہیں مگر وہ بظاہر شریعت سے متصف ہونے کی وجہ سے امتیازی پہچان نہیں رکھتے تو ان کو پہچاننا سوائے اہل نظر کے اور کسی کے بس کی بات نہیں۔ حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ اولیائے کرام ایسی دلہنوں کی طرح ہوتے ہیں جن کو ان کے پیا (محبوب) کے سوا کوئی نہیں پہچانتا۔ حضرت سہل تستریؒ فرماتے ہیں کہ حق یہ ہے کہ ولی کو ولی ہی پہچانتا ہے (روح البیان) جیسے کہ کہا جاتا ہے، ''ولی را ولی می شناسد'' حضرت شیخ الاسلام ہرویؒ فرماتے ہیں کہ جب تک خدا کی پہچان نہ ہو اس وقت تک ولی کو کوئی پہچان نہیں سکتا اور جب تک کوئی ولی کی پہچان نہ کرے اس وقت تک خدا کی پہچان بھی ممکن نہیں۔ (مکتوبات ربانی)

اگر کسی کو دیکھنے والی آنکھ میسر ہو تو ولی کے لئے مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے دل میں ایمان، ظاہر میں تقویٰ ہو اور عام مخلوق اسے ولی کہے۔ اس کی طرف دل کھنچیں اور اسے دیکھ کر خدا یاد آئے۔ یاد رہے کہ محروم سعادت لوگ کسی ولی میں یہ علامات ہوتے ہوئے بھی اسے نہ دیکھ سکیں گے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَتَرٰىهُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ وَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ (الاعراف:۱۹۸)

اے محمد ﷺ! آپ ان کو دیکھیں گے کہ وہ آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں حالانکہ انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔

اولیاء اللہ کی شناخت

حضرت سلطان باہوؒ فرماتے ہیں کہ اولیاء اللہ کی شناخت معرفت الٰہی، اللہ سے محبت اور دوستی کے حوالے سے ہے ان کی پہچان مرشد کامل کی درج ذیل باتوں سے حاصل ہوتی ہے۔

(۱) ذکر نور

(۲) تصورِ حضور، تفکرِ حضور اور ذکر نور۔ اہلِ ارواح کی قبور پر عمل دعوت پڑھے تصورِ حضور کے بغیر نہیں۔ جو شخص اخلاص واعتقاد کے ساتھ اولیاء اللہ کی قبور پر جا کر آیہ کریمہ، اسم اعظم، اسم اللہ اور کلمہ طیبہ ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' پڑھے تو روحانی طور پر متوجہ ہو اور فکر کے ساتھ مراقبہ کرے تو اس وقت وہ بزرگ روحانی بغیر شک وشبہ کے قبر سے اس طرح نکلے گا جس طرح سانپ کنجلی سے باہر نکلتا ہے۔ بزرگ روحانی کے لئے قبر سے نکلنا اور اس میں داخل ہونا ایسے ہی آسان ہے جیسے غوطہ زن کے لئے آنا جانا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ پڑھنے والا صاحب توفیق ہو تو وہ دیکھ پائے گا اور اگر وہ مردہ دل ہو تو دیکھنے سے محروم رہے گا خواہ وہ ساری عمر

ہی کیوں نہ بیٹھ کر پڑھتا رہے۔ اگر طالب باطنی طور پر صاحب بصیرت ہو تو بزرگ روحانی اس سے دینی یا دنیوی امور کے لئے کلام کرتا ہے اگر اہل نفس ہے تو نفس سے، صاحب دل ہے تو دل سے، صاحب روح ہے تو روح سے اور صاحب راز سے روحانی کلام بغیر شبہ کے درست ہوگا اور کبھی خلاف امر واقع نہ ہوگا۔ ابیات باہوؒ میں درج ذیل اشعار قابلِ غور ہیں ۔

ذکر حق نور است فکرش با حضور بے حضوری ذکر و فکر و بُعد و دور

(اللہ کے ذکر سے نورانیت اور اس کی فکر سے حضوری حاصل ہوتی ہے، بے حضوری کے ذکر وفکر اللہ سے بُعد اور دوری کا سبب بنتے ہیں۔)

ذکر را بگزار مذکورش مگو احتیاج نیست ذکرش روبرو

(ذکر کو چھوڑ اس کو یاد کیا ہوا مت کہہ، کیونکہ ذکر کی حاجت حضوری میں نہیں ہوتی۔)

گر ترا علم است دانش با حضور نظر کن بامردگاں اہل القبور

(اگر تجھ کو علم ہے تو دانشمندی حضوری سے حاصل ہو جائے گی، اہل قبور کے کامل مردوں پر نظر کر یعنی ان کے قدم بہ قدم چل)

عاقبت تو جائے خانہ شد قبر کس نبردہ در قبر ایں سیم و زر

(آخر کار انجام اور آخری گھر تیری قبر ہی ہے، کوئی آدمی سونا، چاندی لے کر قبر میں نہیں گیا)

علم می باید علم بر از عمل جز محبتِ حق دگر باطل خجل

(علم حاصل کرنا ضروری ہے کیونکہ علم کے بغیر عمل نہیں ہو سکتا، اللہ کی محبت کے سوا کسی اور کی محبت باطل، غلط اور شرمندگی ہوگی)

اولیائے ظاہرین و مستورین

سرِّ دلبراں (ص ۱۷۳) میں ہے کہ اولیاء ظاہرین کے سپرد خدمتِ ہدایتِ خلق ہوتی ہے اور وہ اس ظاہری خدمت سے پہچانے جاتے ہیں۔ اولیائے مستورین (چھپے ہوئے) کے سپرد انصرام امور تکوینی ہوتا ہے اور یہ لوگ اغیار کی نگاہ سے مستور رہتے ہیں۔ یہ لوگ خدمت پر مامور ہوتے ہیں۔ انہیں رجال الغیب اور مردانِ غیب کہتے ہیں۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے قدم بہ قدم چل کر عالم شہادت سے اس غیب کی جانب منتقل ہو گئے جسے مستوی الرحمٰن کہتے ہیں۔ یہ لوگ نہ پہچانے جاتے ہیں اور نہ ان کا وصف بیان کیا جاتا ہے۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو صرف اپنے ٹھکانوں میں پائے جاتے ہیں۔ عالم احساس میں جس انسان کی صورت چاہیں اختیار کر لیتے ہیں۔ لوگوں کو مغیبات کی خبریں دیتے ہیں اور

پوشیدہ امور ظاہر کرتے ہیں۔ کچھ لوگ تمام عالم میں پھرتے ہیں کبھی ظاہر ہوتے ہیں اور پھر غائب ہو جاتے ہیں۔ جنگل پہاڑ اور نہروں کے کنارے بستے ہیں۔ صفات بشری کو اپنے اوپر اوڑھے رکھتے ہیں۔ اچھے مکانوں میں رہتے اور بیاہ شادی بھی کرتے ہیں۔ کھاتے پیتے، بیمار پڑتے اور علاج بھی کرواتے ہیں۔ اولاد و اسباب اور اموال واملاک بھی رکھتے ہیں۔ لوگ ان سے حسد اور دشمنی بھی کرتے ہیں۔ انہیں ایذا بھی پہنچاتے ہیں، مگر حق تعالیٰ انکے حسن احوال اور کمالات باطنی کو اغیار کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھتا ہے۔ انہیں کے حق میں فرمایا گیا ہے "اَولِیَائِی تَحتَ قُبَائِی لَا یَعرِفُونَھُم غَیرِی"۔ (میرے اولیاء میری چادر کے نیچے ہیں انہیں میرے سوا کوئی نہیں پہچانتا)

ولی کی علامات

ولی میں درج ذیل چیدہ نشانیوں کا پایا جانا ضروری ہے۔

(۱) وہ اللہ کے ذکر میں عبادات اور اوراد کے ساتھ مشغول رہے۔

(۲) اپنی خواہشات اور کاموں کو پس پشت ڈال کر اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے۔

(۳) اسے اللہ کا ہی خیال دامن گیر رہے۔ خرازؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو دوست بنانا چاہتا ہے تو اس کے لئے اپنے ذکر کا دروازہ کھول دیتا ہے اور اس میں وہ لذت پانے لگتا ہے اس کے بعد قرب کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے، پھر مجلس انس تک اسے پہنچا دیا جاتا ہے اور توحید کی کرسی پر بٹھا دیا جاتا ہے اس کے بعد تمام حجابات اٹھا کر فردانیت کے گھر میں داخل کر دیا جاتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ کا جلال اور اس کی عظمت اس کے سامنے آشکار ہو جاتی ہے اور وہ اپنے آپ کو بھول جاتا ہے پھر اللہ تعالیٰ اسے اپنی حفاظت میں لے لیتا ہے۔

ابو تراب النخشبیؒ فرماتے ہیں کہ جب کسی کا دل اللہ سے اعراض کرنے کا عادی ہو جائے تو وہ اولیاء اللہ پر نکتہ چینی کرنا شروع کر دیتا ہے۔ مثنوی میں بھی ایسے اشعار موجود ہیں ۔

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد　میلش اندر طعنۂ پاکاں زند

(جب خدا چاہتا ہے کہ کسی کی پردہ دری کرے، تو اس کا میلان پاک لوگوں پر طعنہ زنی میں کر دیتا ہے۔)

ور خدا خواہد کہ پوشد عیب کس　کم زند در عیب معیوباں نفس (۱۱۰-۱)

(اور اگر خدا چاہتا ہے کہ کسی کی عیب پوشی کرے، تو عیب داروں کے عیب بھی نہیں بیان کرتا)

سورۃ النساء کی آیت نمبر ۸۰ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کو اللہ کی محبت کی علامت قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ جو رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ حقیقتاً میری اطاعت کرتا ہے اور مجھ سے محبت کرتا ہے، اس کی جزا یہ رکھی کہ خدا اس بندے سے محبت کرنے لگتا ہے۔ جس کو جتنا (حصہ) حضور اکرم ﷺ

کی متابعت سے نصیب ہوگا اتنا ہی زیادہ حصہ اسے اللہ کی محبت سے نصیب ہوگا۔ یہ اولیائے کرام کا طبقہ ہی ایسا ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی محبت نصیب ہوئی۔

شیخ ابوالفتح محمد بن عبد الباقیؒ نے مختلف راویوں سے، حضرت جنید بغدادیؒ کی یہ بات سنی کہ آپ نے فرمایا کہ ہم نے یہ علم تصوف قیل وقال کے ذریعے حاصل نہیں کیا بلکہ بھوک، ترک دنیا اور ترک مالوفات و مستحبات (وہ چیزیں جن سے انسان کو الفت ہوتی ہے) اور مرغوبات کو ترک کرنے سے پایا ہے۔ بعض مشائخ کا ارشاد ہے جس نے اپنے نفس پر سنت کو قول اور فعل میں حکمران بنادیا تو اس نے حکمت کے ساتھ کام کیا اور جس نے ہوا و ہوس کو اپنے نفس کا فرماں روا بنالیا وہ اپنے قول و فعل میں بدعت کا مرتکب ہوا۔

سورۃ النحل کی آیت نمبر ۷۵ کی تشریح میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ سب بندوں کی حیثیت ایک جیسی نہیں۔ بعض بندے ایسے ہیں جو زر خرید غلام کی طرح بے بس، بے اختیار، مفلس نادار اور بے فیض ہیں۔ اور نہ ان کے پاس کچھ ہے کہ کسی کو دے سکیں لیکن بعض بندے مقبولِ بارگاہ الٰہی ہوتے ہیں جو لوگ ارشاد ربانی "مَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا" کی عنایت سے بہرہ ور ہیں اور ان کو "فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّ جَهْرًا" کی بلند شان عطا کی گئی ہے۔ یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے خزانوں سے مالا مال فرمایا ہے اور ظاہری و باطنی نعمتوں سے ان کے دامن کو بھر دیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بخشے ہوئے خزانوں اور نعمتوں کو بڑی دریادلی سے محتاجوں میں بانٹ رہے ہیں مگر نہ تو اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں کوئی کمی واقع ہوتی ہے اور نہ ان اہل کرم کے ہاتھ سخاوت کرتے ہوئے تھکتے ہیں، ہر کوئی اپنے ظرف کے مطابق ان بزرگوں سے اپنی جھولیاں بھر لیتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ یہاں پر بتوں کی اور اللہ تعالیٰ کی نہیں بلکہ کافر اور مومن کی مثال دی جا رہی ہے۔ کافروں کی مثال ایسی ہے کہ اس کے مالک نے تمام تر اختیارات سلب کر لئے ہوں اور مومن وہ ہے جسے پورے انعامات تقسیم کرنے کے اختیارات حاصل ہوں۔ یہ دونوں انسان ایک جیسے نہیں ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو خزانے عطا کرنے کا یوں ذکر فرمایا ہے۔

اِنَّاۤ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ (الکوثر:۱) — بے شک ہم نے آپ (ﷺ) کو کوثر عطا کیا۔

وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (النساء:۱۱۳) — آپ کو وہ کچھ سکھایا جو آپ نہ جانتے تھے اور آپ پر اللہ کا فضل عظیم ہے۔

اس کے علاوہ آپ کو سارے خزانوں کی کنجیاں عطا کی گئی ہیں جیسا کہ حدیث شریف میں حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے "اُعْطِيْتُ مَفَاتِيْحَ خَزَائِنِ الْاَرْضِ" وغیرہ، رسول اللہ ﷺ کے طفیل اولیائے امت کو بھی اسی قسم کے انعامات عطا کیے گئے۔

مولوی اسمٰعیل دہلوی نے اگرچہ "تقویۃ الایمان" میں یہ لکھا ہے کہ جس کا نام محمد ﷺ یا علیؓ ہے وہ کسی چیز کا مالک ومختار نہیں لیکن اپنی دوسری تصنیف "صراط مستقیم" میں اپنے اسی ہاتھ سے حضرت علیؓ کے متعلق لکھنا پڑا کہ حضرت علی مرتضیٰؓ کے مبارک زمانے سے لے کر دنیا کے ختم ہونے تک قطبیت، غوثیت، ابدالیت اور دیگر مدارج ولایت سب آپؓ کے واسطے سے عطا ہوتے ہیں۔ نیز بادشاہوں کی سلطنت اور امرأ کی امارت میں بھی آپؓ کی ہمت کو بڑا دخل ہے اور یہ حقیقت عالم ملکوت کے سیاحوں پر مخفی نہیں۔ دوسری جگہ مولانا اسمٰعیل دہلوی لکھتے ہیں "اسی طرح ان عالی مرتبت اولیائے کرام کو عالم مثال، شہادت میں تصرف کرنے کا مطلق اذن مرحمت ہو چکا ہے۔

مذکورہ دونوں قسم کے اختیارات رکھنے والے بندوں کے متعلق ایک نہایت لطیف گفتگو اس جگہ بیان کرنا اس کلام کے موضوع کے عین مطابق ہوگا۔ وہ یہ کہ راقم الحروف کے دفتر میں ایک افسر نے دوسرے افسر سے یہ بات کہی کہ اگر کسی قبر پر کوئی کتا پیشاب کر جائے تو قبر میں موجود مردہ اس کتے کو اپنی قبر سے ہٹانے کی طاقت نہیں رکھتا اور اگر ایسا ہے تو پھر اہل قبر کو کسی قسم کے تصرف کی گنجائش نہیں۔ دوسرا شخص یہ استدلال سن کر بہت خوش ہوا؟ لیکن راقم الحروف نے اس سے کہا کہ اس میں خوش ہونے کی کوئی بات نہیں کیونکہ یہ بات قبر میں موجود مردے کے روحانی مراتب کے مطابق رونما ہوتی ہے۔ قبروں میں پڑے بہت سے مردے واقعی اسی طرح ہیں کہ وہ کتوں کو اپنی قبر سے دور نہیں کر سکتے لیکن کچھ صاحب قبر اس قدر بلند شان کے مالک ہوتے ہیں کہ ان کے مزاروں پر کتوں کا جانا تو ایک طرف رہا وہاں تو نجس خیالات والے انسانوں کا داخلہ بھی ممکن نہیں۔ اولیاء اللہ کے مزاروں پر صرف خوش عقیدت مسلمان ہی حاضری دیتے ہیں۔ کچھ ایسے مسلمان بھی ہیں جو یہ بات فخر سے کہتے ہیں کہ گزشتہ ۵۵ سال سے ہم کبھی داتا گنج بخشؒ کے مزار پر نہیں گئے کیونکہ وہ بدعقیدہ ہیں۔

شیخ فریدالدین عطارؒ نے کیا خوب کہا۔

اگر گیتی سراسر باد گیرد چراغ مقبلاں ہرگز نہ میرد

(یعنی اگر تمام دنیا میں جھکڑ اور آندھیاں بھی چل پڑیں تو مقبول ولیوں کے چراغ برابر جلتے رہیں گے، ان پر کوئی بھی آنچ نہ آئے گی۔)

غور سے دیکھا جائے تو ان اولیائے کرامؒ کی قبریں ابھی بھی زندہ ہیں۔ ہزاروں لاکھوں عقیدتمند رات دن حاضری دیتے ہیں۔

اولیاء را ہست قدرت از الٰہ

اولیاء کرام کو دو قسم کی قوتیں حاصل ہوتی ہیں۔ ایک اثر قبول کرنے کی اور دوسری اثر انداز ہونے کی۔

پہلی قوت کے سبب وہ بارگاہ الٰہی سے فیوض اور تجلیات کو قبول کرتے ہیں اور دوسری قوت سے وہ ان مومنوں کی نیک روحوں اور قلوب کو فیض پہنچاتے ہیں، جن کو ان اولیاء کرام سے روحانی لگاؤ اور قلبی مناسبت ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص ان اولیاء کے متعلق دل میں انکار نہ کرے اور تعصب سے دل کو پاک کر کے انکی خدمت میں حاضر ہو تو وہ اس کے فیوض اور برکات سے ضرور بہرہ مند ہوتا ہے۔

اولیاء کرام کی توحید حضور اکرم ﷺ کی رسالت اور قرآن کی حقانیت پر اس قدر مستحکم ہوتی ہے کہ کوئی ابلیسی وسوسہ اور معصیت اُن کو متزلزل نہیں کر سکتی۔ ان کا ظاہر و باطن، تقویٰ کے نور سے جگمگا رہا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی شرک خفی، جلی، حسد، کینہ وغیرہ تمام اخلاق ذمیمہ سے وہ پاک ہوتے ہیں۔ یہی تقویٰ وہ بلند مقام ہے جہاں جب انسان پہنچتا ہے تو اسے خلعت ولایت سے مشرف کیا جاتا ہے۔ اولیاء کرام ذکر الٰہی، نماز اور تلاوتِ کلام پاک میں ذوقِ حضوری اور خشوع حاصل کرتے ہیں اور عباداتِ الٰہی سے فتح الباب کی امید رکھتے ہیں۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے اور علماء و فقہاء کی صحبت سے دور رہتے ہیں وہ بے ادب ہوتے ہیں اور بالآخر تباہ ہو جاتے ہیں۔

حضرت مخدوم علی ہجویریؒ فرماتے ہیں کہ اولیائے کرام دنیاوی مال و دولت سے بے نیاز ہو کر صرف ذات خداوندی سے محبت کرتے ہیں۔ جب لوگ ڈرتے ہیں تو انہیں کوئی ڈر نہیں ہوتا، لوگوں کو حق تعالیٰ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ حضرت شاہ عبد العزیزؒ فرماتے ہیں کہ اولیاء کرام کے کلام و انفاس اور افعال و مکاشفات ان کے ہم نشینوں، اولاد اور نسل حتیٰ کہ ان کی زیارت کرنے والوں پر لگاتار برکتوں کی شکل میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں، ان کی دعاؤں کو قبول کیا جاتا ہے۔ جو کوئی کسی حاجت میں ان کا وسیلہ پکڑتا ہے، اس کی حاجت پوری ہوتی ہے۔

ولی کی شرائط

ولی کی شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے گناہوں سے محفوظ رکھے اگرچہ وہ انبیاء کی طرح گناہوں سے معصوم نہ ہو، لہٰذا جس میں شریعت سے روگردانی کا طرز عمل پایا جاتا ہو، سمجھ لینا چاہیے کہ شیطان نے اسے دھوکہ میں ڈال رکھا ہے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ نے ایک بزرگ سے ملاقات کے لئے بہت طویل سفر اختیار کیا لیکن جب اسے مسجد میں تھوکتے دیکھا تو آپ اس سے ملے بغیر واپس چلے آئے اور کہا کہ یہ شخص شریعت کے آداب میں سے ایک ادب کا بھی امین نہیں تو پھر اسرار خداوندی کا امین کیسے ہو سکتا ہے؟ اس سلسلہ میں ہماری تصنیف ''جنید بایزید'' میں مقامِ سنت پر ایک نہایت مبسوط باب لکھ دیا گیا ہے۔ وہاں پر ملاحظہ فرمائیں۔

ولی کو اپنی ولایت کا علم ہوتا ہے

صوفیائے کرام نے اس نکتے پر طویل بحث کی ہے۔ جس کے پیش نظر مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ بعض اولیاء کو اپنی ولایت کی اطلاع ہوتی ہے کیونکہ خصوصیات ولایت (کرامات، لوگوں کو رشد و ہدایت سے پاکیزہ زندگی کی طرف راغب کرنا، قبولیت دعا وغیرہ) ایسی چیزیں ہیں جن کا ولی کو علم ہوتا ہے لیکن ایک ولی اللہ سے اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ اسے اپنی ولایت پر تکبر بھی کرے کیونکہ تکبر کے ہوتے ہوئے کوئی ولایت کے منصب پر فائز نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اولیاء کرام کرامات کے اظہار کو پسند نہیں فرماتے۔

اولیاء باخبر ہوتے ہیں

سورۂ یونس آیت ۳۱ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ" (یعنی دنیا کے کاموں کا کون انتظام کرتا ہے)۔ سب لوگ یہی کہتے ہیں کہ مدبر الامر اللہ کی ذات ہے۔ تدبیر سے مراد ملکی نظام اور امر سے مراد تکوینی احکام ہیں جس سے دنیا قائم ہے یعنی رزق کی تقسیم، موسموں کی تبدیلی، موت وزندگی، قوموں کی ترقی اور تنزل، چاند وسورج کا طلوع وغروب ہونا۔ خیال رہے کہ قرآن اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم کے سارے انتظامات فرشتوں کے سپرد کیے گئے ہیں، وہ ماں کے پیٹ میں بچہ بنانے، جان نکالنے، اللہ کی رحمتیں مثلاً بارش وغیرہ لانے، عذاب لانے کے فرائض ادا کرتے ہیں اور قرآن میں ان فرشتوں کو مدبرات امر کہا گیا ہے۔ شب برات میں ہر قسم کے احکامات فرشتوں کے سپرد کیے جاتے ہیں۔

فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ (الدخان: ۴) اسی رات میں فیصلہ کیا جاتا ہے ہر اہم کام کا۔

فرشتوں کا مذکورہ احکام خداوندی کو بجالانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حقیقی مدبر تو اللہ تعالیٰ ہے اور اس کے اذن اور ارادے سے فرشتے بلکہ تکوینی اولیاء، بادشاہ اور حکام وغیرہ دنیا کا انتظام کرتے ہیں۔ ان میں قطب، غوث، ابدال، اوتاد ہیں جن کے ناموں سے ان کے کاموں کا علم ہوتا ہے۔ کفار میں سے کچھ تو اللہ کے خالق ہونے کا انکار کرتے ہیں (مثلاً دہریئے، کہتے ہیں "وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ" (الجاثیہ: ۲۴) (ہمیں ہلاک نہیں کرتا مگر زمانہ) اور کچھ بہت سے خالق مانتے ہیں۔ (خیر کا خالق اور شر کا خالق وغیرہ) اور بعض کافر تو موحد ہیں جو اللہ تعالیٰ کو معبود مانتے ہیں، مگر انکار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے ہیں۔

جب فرشتوں کو مدبر الامر (انتظام کرنے والا) مانا جاسکتا ہے تو اولیاء کرام کا اس انتظام میں اختیار نہ ہونا کس طرح روا ہوسکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کائنات میں اپنا نائب مقرر فرمایا۔ احادیث کثیرہ سے ثابت ہے کہ حضرات اولیاء اللہ کے ذریعے عالم کا نظام قائم ہے۔ تفسیر روح المعانی میں ہے کہ قطب عالم کے ذریعے زمین اور آسمان قائم ہیں۔ اسی لئے قطب کو عماد السماء کہا جاتا ہے۔ یہ حضرات اللہ کی طرف سے

عالم مقرر کیے گئے ہیں۔ اگر ولی اللہ ہے تو مالی ولی ہے، ولی مالک ہے اور مالی مالک کا خادم ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مشرک اپنے بتوں کو مشکل کشا، سننے والا، عالم غیب اور حاضر و ناظر کہتے ہیں، چنانچہ جو لوگ اولیاء اللہ یا انبیاء کو ان صفات سے متصف کرتے ہیں، وہ بھی مشرک ہیں۔ اس کا الزامی جواب تو یہ ہے کہ ہمارا خانہ کعبہ کو سجدہ کرنا اگرچہ بتوں کو سجدہ کرنے کی طرح ہی ظاہر ہوتا ہے اور آب زم زم گنگا جل کی طرح ہے، مگر ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مسلمانوں کا عیدین کا منانا کفار کی ہولی اور کرسمس کے برابر کوئی کیسے کہہ سکتا ہے؟ حقیقی بات یہ ہے کہ عیسائی اور یہودی اپنے نبیوں کو اللہ کا بیٹا اور فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے ہیں۔ کفار یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ کائنات کو بنا کر تھک گیا لہٰذا اب اس نے دنیا کے کام بتوں اور دیوتاؤں کے سپرد کر دیئے ہیں۔ کفار اپنے بتوں کو رب کے برابر کہتے ہیں۔

ثُمَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ ۝ اس کے بعد کافر لوگ اپنے رب کے شریک بناتے ہیں۔ (الانعام:1)

لیکن اگر اولیاء اللہ کو خدا کے برابر کہا جائے تو یہ واقعی شرک ہوگا۔ مگر دور کی بات کو سننا، دیکھنا جس کو صرف خدا کی صفات سے متعین کیا جاتا تھا، وہ قوت اب سائنس دانوں نے سیٹلائٹ کی مدد سے حاصل کر لی ہے۔ سائنس دان امریکہ میں بیٹھے ہوئے پاکستان میں ہر چلنے والی کار کی نمبر پلیٹ بھی سیٹلائٹ کے ذریعے دیکھ سکتے ہیں اور چاند والوں کی بات سن سکتے ہیں، چنانچہ ایسی باتوں میں ان کو خدا کے برابر کوئی نہیں سمجھتا لہٰذا اس نوعیت کا علم حاصل کر لینا، شرک نہیں ہو سکتا اور اگر ایسی باتوں کو سن کر دعویٰ کرنا شرک ہوتا تو پھر حضرت ساریہؓ کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے، جنہوں نے حضرت عمرؓ کی بات کو سینکڑوں میلوں کی مسافت پر سنا۔ اگر شرک اتنا سستا ہو جائے تو آج سب ہی مشرک ہوں گے۔ شرک کے مسئلے کی مذکورہ بالا تفصیل کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ بندوں کو خدا نہ مان کر اگر ان کی طرف ایسی صفات منسوب کر دی جاتیں تو خشک ملّا کا شرک کہلا سکتا ہے لیکن حقیقتاً اس میں شرک کی کوئی بات نہیں۔

نبی اور ولی وفات پانے کے بعد بھی باخبر ہوتے ہیں:۔

نماز میں نبی اکرم ﷺ کو سلام کیا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ بے خبر نہیں ہیں کیونکہ بے خبر کو سلام نہیں کیا جا سکتا۔ نیز قیامت کے دن حضور اکرم ﷺ دوسری امتوں اور اپنی امت کو دیکھ کر گواہی دیں گے۔ اس کے علاوہ معراج پر جانے سے پہلے بیت المقدس میں تمام انبیاء کا نماز کے لئے آنا اور آپ کی اقتداء میں نماز پڑھنا اس بات کی دلیل ہے کہ انبیاء کو خبر رہتی ہے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ حضرت موسیٰ اور ابراہیم علیہا السلام کا حضور اکرم ﷺ سے مختلف آسمانوں پر ملاقات کرنا بھی اس بات کو ثابت کرتا ہے۔ حضور اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا کہ نیند میں ہمارا دل نہیں سوتا۔ اور موت بھی ایک نیند ہے "اَلنَّوْمُ اَخُو الْمَوْتِ" موت نیند کی بہن ہے۔ لہٰذا موت کی حالت میں بھی انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کی اتباع کی بدولت اولیاء کرام بھی غافل اور بے خبر نہیں ہوتے۔ متعدد دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ بعد از وفات انسان دنیوی امور پر آگاہ ہوتا ہے۔ علامہ ابن قیم لکھتے ہیں کہ حضرت صعب بن جثامہ اور حضرت عوف بن مالک کی باہمی اخوت تھی۔ صعب نے عوف بن مالک سے کہا اے بھائی! ہم میں سے جو پہلے وفات پا جائے تو وہ دوسرے کو اپنے احوال سے آگاہ کرے۔ اس نے کہا کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ میں نے کہا ہاں پس صعب وفات پا گئے تو عوف نے انہیں خواب میں دیکھا کہ وہ ان کے پاس تشریف لائے۔ وہ کہتے ہیں میں نے کہا: بھائی صعب ہیں؟ انہوں نے کہا ہاں میں نے کہا تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا گیا؟ بتایا کہ مصائب کے بعد مغفرت کردی گئی۔ عوف کہتے ہیں میں نے ان کی گردن میں کچھ داغ دیکھا۔ میں نے پوچھا بھائی یہ نشان کیسا ہے؟ انہوں نے کہا یہ دس دینار ہیں جو غلامی میں یہودی سے میں نے قرض اٹھائے تھے اور وہ میرے گھر میں ایک ترکش میں رکھے ہوئے ہیں۔ پس تم وہ دینار اس یہودی کو دے دو۔ اس کے بعد جو حضرت صعب بن جثامہ نے کہا اس کی عبارت بھی ملاحظہ فرمائیے۔

وَاعْلَمْ يَا اَخِىْ اَنَّهٗ لَمْ يَحْدِثْ فِىْ اَهْلِىْ حَدَثٌ بَعْدَ مَوْتِىْ اِلَّا قَدْ لَحِقَ بِىْ خَبْرُهٗ حَتّٰى هِرَّةٌ لَّنَا مَا تَتْ مُنْذُ اَيَّامٍ وَاعْلَمْ اَنَّ بِنْتِىْ تَمُوْتُ اِلٰى سِتَّةِ اَيَّامٍ فَاسْتَوْصُوْا بِهَا

اور اے بھائی یقین رکھو کہ میری وفات کے بعد میرے اہل میں بھی واقعہ ہوا مجھے اس کی خبر ہے حتیٰ کہ ہماری بلی چند روز پہلے مر چکی ہے اور آپ یہ بات بھی جان لو کہ میری بیٹی چھ روز بعد انتقال کر جائے گی لہٰذا تم گھر والوں کو نصیحت کرو کہ وہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔

حضرت عوف فرماتے ہیں کہ جب صبح ہوئی تو میں نے کہا اس خواب میں ضرور کوئی خبر ہے۔ پس میں ان کے گھر والوں کے پاس آیا انہوں نے کہا "مرحبا بعوف" (عوف کو خوش آمدید) عوف نے کہا کہ کیا تم اپنے بھائی کے ورثاء (سوگوار) کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہو؟ جب سے صعب کی وفات ہوئی آپ نے ادھر کا رخ بھی نہیں کیا؟ حضرت عوف فرماتے ہیں میں نے معذرت کی جیسا کہ لوگ ایسے مواقع میں معذرت کر لیتے ہیں۔ پھر میں نے ترکش کی طرف نگاہ اٹھائی پھر اسے نیچے اتارا اور اس کے اندر جو کچھ موجود تھا اسے باہر نکالا تو میں نے دیکھا کہ ایک تھیلی تھی جس میں دینار تھے۔ میں اسے اٹھا کر یہودی کی طرف گیا اور اس سے پوچھا کیا صعب پر تمہارا کوئی حق بنتا ہے؟ وہ کہنے لگا صعب پر اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے وہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بہترین آدمی تھے۔ جو کچھ تھا میں نے انہیں معاف کیا۔ میں نے کہا کچھ بتلاؤ تو سہی اس نے کہا میں نے انہیں دس دینار قرض دیئے تھے۔ میں نے اس کے سامنے کیے تو اس نے کہا خدا کی قسم یہ تو ہو بہو وہی ہیں۔ میں نے (دل میں کہا)

ایک بات تو پوری ہوگئی پھر میں نے ان کے گھر والوں سے پوچھا کہ صعبؓ کے بعد کوئی واقعہ ہوا؟ انہوں نے کہا یہ ہوا اور وہ ہوا میں نے کہا مزید یاد کرو! تب انہوں نے بتایا کہ ہاں چند روز پہلے ہماری بلی مرگئی تھی۔ میں نے دل میں کہا یہ دو باتیں ہوگئیں۔ پھر میں نے پوچھا: میری بھتیجی کہاں ہے؟ انہوں نے بتایا وہ کھیل رہی ہیں۔ میں اس کے پاس گیا اور اسے چھوا تو وہ بخار سے تھیں۔ میں نے ان سے کہا اس کی دیکھ بھال کرو۔ پھر وہ چھ روز بعد وفات پا گئی (کتاب الروح لابن قیم ص ۱۴ مطبوعہ دار احیاء العلوم بیروت) علامہ ابن قیم نے ایسے بہت سے واقعات قلمبند کئے ہیں اور کہا ہے کہ میت سے زندہ شخص کو جو خبر موصول ہوتی ہے ایسی خبر کسی اور سے موصول نہیں ہوتی اور ایسی خبر پا کر ایک زندہ شخص یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ اس کے پاس جو خبر ہے کسی اور کے پاس نہیں (کتاب الروح ص ۵۹)

ولی کی ولایت وفات کے بعد بھی رہتی ہے

موت ولی اللہ کی ولایت کو منقطع نہیں کرتی۔ جس طرح نبی کی نبوت بعد از وصال باقی رہتی ہے، اسی طرح ولی کی ولایت بھی اس کی وفات کے بعد جاری رہتی ہے۔ شہداء کی طرح اولیاء کرام بھی زندہ ہیں اور ان کا فیض برابر پہنچتا رہتا ہے۔ حضرت عبدالغنی نابلسیؒ "شرح الطریقۃ المحمدیہ ﷺ" میں "کرامات اولیاء حق" کے باب میں لکھتے ہیں کہ کرامات کا صدور کسی نبی کے پیروکار امتی سے ممکن ہے، جس کا عقیدہ و عمل درست ہو اور یہ کرامت ایسی خارق عادت بات کا نام ہے جو بطور تعلّی و مقابلہ نہ ہو۔ نیز آپ سے یہ بات بھی منقول ہے کہ موت ولی کی کرامات کو منقطع نہیں کرتی اور ولی اللہ کی وفات کے بعد بھی اس کی ولایت جاری رہتی ہے۔ جس طرح نبی کی نبوت بعد از وصال باقی رہتی ہے اسی طرح ولی کی ولایت بھی باقی رہتی ہے۔ اس سے یہ بھی پتا چلا کہ شہداء کی طرح اولیاء کرام بھی زندہ ہیں اور ان کا فیض موت کے بعد بھی برابر پہنچتا رہتا ہے۔ کچھ لوگ صرف شہداء کو موت کے بعد زندہ سمجھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں اور نبیؐ کو موت کے بعد مردہ کہنے والا مسلمان نہیں ہے۔

صوفیائے کرام کو خراج تحسین

مسلمانوں میں جو جماعت سب سے زیادہ ذوق، شوق کے ساتھ تبلیغ میں سرگرم عمل رہی ہے، وہ صوفیائے کرام کی جماعت ہے جو برصغیر پاک و ہند میں دعوت اسلام کا علم بلند کرتی رہی ہے۔ خود ہندوستان میں اولیاء و صوفیاء نے جس بے نظیر استقلال اور دینی شغف کے ساتھ اسلام کی روشنیوں کو پھیلایا ہے وہ ہمارے آج کل کے حضرات متصوفین کے لئے اپنے اندر ایک عمیق درس بصیرت رکھتا ہے۔ یہاں کے سب سے بڑے اسلامی مبلغ حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ تھے جن کی برکت سے راجپوتانہ میں اسلام کی اشاعت ہوئی اور جن کے بالواسطہ یا بلاواسطہ مریدین تمام اطراف ملک میں اسلام کی شمع ہدایت لے کر پھیل گئے۔

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے دہلی کے اطراف میں، حضرت خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکرؒ نے علاقہ پنجاب میں، حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہیؒ نے دہلی اور اس کے نواح میں حضرت سید محمد گیسو درازؒ، حضرت شیخ برہان الدینؒ اور شیخ زین الدینؒ اور آخر زمانہ میں (اورنگ آباد کے) حضرت نظام الدینؒ نے دکن میں اور دور آخر میں حضرت شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی مرحوم نے دہلی میں یہی دعوت الی الخیر اور تبلیغ اسلام کی خدمت انجام دی۔ ان کے علاوہ دوسرے سلاسل کے اولیاء عظام رحمۃ اللہ علیہم نے بھی اس کام میں انتھک محنت کی ہے۔

پنجاب میں سب سے پہلے اسلامی مبلغ حضرت سید اسمٰعیل بخاریؒ تھے جو پانچویں صدی ہجری میں لاہور تشریف لائے تھے۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں ان کے ارشادات سننے کے لئے آتے اور جو کوئی ایک مرتبہ ان کا وعظ سن لیتا وہ اسلام لائے بغیر نہ رہتا۔ مغربی پنجاب میں اسلام کی اشاعت کا فخر سب سے زیادہ حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ کو حاصل ہے۔ ان کے علاوہ مغربی پنجاب کا علاقہ حضرت خواجہ شاہ محمد سلیمان تونسویؒ کے فیض سے فیض یاب ہوا۔ علاقہ بہاولپور اور مشرقی سندھ میں حضرت سید جلال الدین اوچی بخاریؒ کے فیضانِ تعلیم سے معرفت حق کی روشنی پھیلی اور ان کی اولاد میں سے حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے پنجاب کے بیسیوں قبائل کو مسلمان کیا۔ ایک اور بزرگ سید صدر الدینؒ اور ان کے صاحبزادہ سید حسن کبیر الدینؒ کے متعلق تواریخ میں لکھا ہے کہ ان کی شخصیت میں عجب کشش تھی۔ محض ان کے دیکھ لینے سے دل پر اسلام کی عظمت و صداقت کا نقش مرتسم ہو جاتا تھا اور لوگ خود بخود ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ گجرات میں حضرت امام شاہ پیرانویؒ اور ملک عبداللطیفؒ کی مساعی سے اسلام کی اشاعت ہوئی۔

بنگال میں سب سے پہلے شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے اس مقدس فریضہ کو انجام دیا جو حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مریدانِ خاص میں سے تھے۔ آسام میں اس نعمتِ عظمیٰ کو حضرت شیخ جلال الدین فارسیؒ اپنے ساتھ لے گئے جو سلہٹ میں مدفون ہیں۔ کشمیر میں اسلام کا علم سب سے پہلے بلبل شاہؒ نامی ایک درویش نے بلند کیا اور ان کے فیضانِ صحبت سے وہ راجہ مسلمان ہو گیا جو تاریخ میں صدر الدین کے نام سے مشہور ہے۔ پھر ساتویں صدی ہجری میں امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ سات سو سیدوں کے ساتھ یہاں تشریف لائے اور تمام خطۂ کشمیر میں اس مقدس جماعت نے نور عرفان کو پھیلایا۔ حضرت عالمگیرؒ کے عہد میں شاہ فرید الدینؒ نے کشتوار کے راجہ کو مسلمان کیا اور اس کے ذریعے علاقہ مذکور میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔

دکن میں اسلام کی ابتداء پیر مہابیر کھمدائیت سے ہوئی جو آج سے سات سو سال پہلے بیجاپور تشریف لائے تھے اور ایک بزرگ جو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے تھے علاقہ دکن کے ہادی اور رہبر تھے۔ مدارس کا علاقہ بھی اپنی ہدایت کے لئے چند صاحب حال بزرگوں کا رہین منت ہے، جن میں

سب سے زیادہ مشہور بزرگ نثار شاہ مدفون ترچناپلی ہیں۔ دوسرے بزرگ سید ابراہیم شہیدؒ ہیں جن کا مزار راوی میں ہے اور تیسرے بزرگ شاہ الحامدؒ ہیں جن کا مدفن ناگور میں واقع ہے۔

یوگنڈا کی طرف اسلامی آبادی عام طور پر اپنے اسلام کو حضرت بابا فخر الدینؒ کی طرف منسوب کرتی ہے جنہوں نے وہاں کے راجہ کو مسلمان کیا تھا۔ (اسلام کا سرچشمہ قوت ص ۹۳، از عاصم نعمانی بحوالہ ''تصوف اور تعمیر سیرت'' از سید ابوالاعلیٰ مودودی)

مرشد خدا کا سایہ ہوتا ہے

مولانا رومؒ فرماتے ہیں: اس آفت زدہ زمانے میں کسی مرشد کو بلا تاخیر تلاش کرنے کی کوشش کرو۔ مرشد خدا کا سایہ ہے، اس کے ذریعے خدا سے جاملو۔ یادرکھو اس راہ پر چلنے کے لیے جو فاسد خیالات دل میں آئیں گے وہ ابلیس لعین کی طرف سے ہوں گے۔ فرماتے ہیں: ہم نے حسد کے سر پر خاک ڈال دی ہے اور تم بھی ایسے ہی کرو اور اس سعادتِ ازلی کو حاصل کرو۔

سایۂ یزداں بود بندہ خدا مردۂ ایں عالم و زندہ خدا

(خدا کا خاص بندہ (مرشد) خدا کا سایہ ہوتا ہے، وہ جہاں کی نسبت مردہ اور خدا کے ساتھ زندہ ہوتا ہے۔)

دامن اُو گیر زو تر بے گماں تا رہی از آفتِ آخر زماں (۱۔۷۳)

(جلد اور بلا تامل اس مرشد کا دامن پکڑ لے تاکہ اس آخری زمانے کی آفت سے نجات پالے)

اندر ایں وادی مرو بے ایں دلیل ''لا احب الافلین'' گو چوں خلیل

(وادی (سلوک) میں بے دلیل (بغیر مرشد) نہ چل، خلیل اللہ کی طرح کہو کہ میں فنا ہونے والوں کو پسند نہیں کرتا۔)

رَو زِسایہ آفتابے را بیاب دامنِ شہ شمس تبریزیؒ بتاب

(جاؤ سایۂ خدا (مرشد کے ذریعے) آفتاب (حق) سے جاملو، کسی شمس تبریز کے دامن کو پکڑلو۔)

رہ نہ دانی جانب ایں سُور و عُرس از ضیاء الحق حسام الدیں پرس

(اگر جشن اور شادی کا مجھے راستہ معلوم نہیں ہے تو جاؤ ضیاء الحق، حسام الدین سے پوچھو)

ور حسد گیرد ترا در رہ گلو در حسد ابلیس را باشد غلو

(اور اگر اس راہ میں حسد تیرا گلہ دبا دے، تو یاد رکھو حسد میں ابلیس تجھ سے زیادہ ہے۔)

کو زآدم ننگ دارد از حسد با سعادت جنگ دارد از حسد

(حسد کی وجہ سے ہی تو ابلیس ذلت محسوس کرتا ہے اور حسد کے سبب ہی نیکی سے جنگ کرتا ہے۔)

خانماں ہا از حسد گردد خراب باز شاہی از حسد گردد غراب (۷۴۔۱)

(حسد کے سبب کئی گھر اُجڑ گئے اور شاہی باز حسد کے باعث کوے کی طرح بن گیا)

خاک شو مردانِ حق را زیرِ پا خاک برسر کن حسد را ہمچو ما (۷۵۔۱)

(مردانِ حق کے پیروں کی خاک بن جاؤ اور ہماری طرح حسد کے سر پر خاک ڈال دو)

تزکیۂ نفس

عربی زبان میں تزکیہ کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے، ایک تطہیر یعنی پاک صاف کرنا، دوسرے تنمیہ یعنی نشوونما کرنا، بڑھانا اور ترقی دینا۔ پس تزکیۂ نفس کا مفہوم یہ ہوا کہ نفس کو بُری صفات سے پاک کیا جائے اور اچھی صفات کی آبیاری سے اس کی نشوونما کی جائے۔ یہ بعینہٖ وہی چیز ہے جس کو آج کل کی زبان میں تربیت اور تعمیر سیرت کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس سے مقصود اس طرز کے انسان تیار کرنا ہوتا ہے جو کسی کو مطلوب ہوں۔

اس تزکیہ و تربیت یا بالفاظ دیگر انسان سازی کا کام کرنے والی چیز وہ نصب العین ہے جو انسان تیار کرنے والے کے پیشِ نظر ہو۔ جیسا نصب العین اس کے پیشِ نظر ہوتا ہے، ویسے ہی آدمی کو تیار کرنا چاہتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ یہ طے کرتا ہے کہ کون سی صفات اصل نصب العین کی ضد اور اس کے حصول میں مانع ہیں اور کون سی صفات اس سے مطابقت رکھتی ہیں اور اس کے حصول میں مددگار ہیں، پھر اسی کے لحاظ سے وہ ایسی تدابیر اختیار کرتا ہے جن سے غیر مطلوب صفات کو دبایا اور مٹایا جائے اور مطلوب صفات کو اُبھارا اور نشوونما دیا جائے۔

اسلام جو تزکیۂ نفس پیش کرتا ہے وہ اسی مقصد کے لئے کرتا ہے۔ اس کے نزدیک اللہ کے امتحان میں انسان کی کامیابی اور اللہ کے قرب سے اس کی سرفرازی کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ اس کی عبادت کامل ہو اور وہ انفرادی و اجتماعی طاقت سے زمین پر اللہ کی منشاء یعنی قیام خیرات و ازالہ سیئات کو پورا کرے۔ اس مقصد کی مناسبت سے اسلام نے انسانی صفات کو محمود اور غیر محمود اور مطلوب اور غیر مطلوب میں تقسیم کیا ہے۔

اسلام نے افراد کے تزکیۂ نفس اور تعمیر سیرت کے لئے جو نقشہ بنایا ہے، وہ تمام دوسرے نقشوں سے اپنے مقاصد اور نقطہ نظر میں وسیع تر اور اپنی جزرسی میں باریک تر ہے۔ اگر مختصر اور جامع الفاظ میں کوئی اس نقشے کی تعریف کرنا چاہے تو غالباً سب سے زیادہ موزوں تعریف یہ ہوگی کہ اسلام کے پیشِ نظر ایسے انسان تیار کرنا جو "مُتَخَلِّقٌ بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ" اور "مُتَّصِفٌ بِصِفَاتِ اللّٰہِ" ہوں۔ صحیح معنوں میں خلیفۃ اللہ بن کر زمین میں کام کریں اور اس کام کے صلے میں اللہ کے تقرب سے سرفراز ہوں۔

روحانی ارتقاء اس کا نام ہے کہ آپ اپنے نفس کی خواہشات پر قابو پائیں، اپنے ذہن اور اپنے جسم کی تمام

طاقتوں سے صحیح کام لیں۔ اپنے اخلاق میں خدا کے اخلاق سے قریب تر ہونے کی کوشش کریں، دنیوی زندگی میں جہاں قدم قدم پر آزمائش کے مواقع پیش آتے ہیں، اگر آپ حیوانی اور شیطانی طریقہ کار سے بچتے ہوئے چلیں اور پورے شعور اور صحیح تمیز کے ساتھ اس طریقے پر ثابت قدم رہیں جو انسان کے شایان شان ہے، تو آپ کی انسانیت یوماً فیوماً ترقی کرتی چلی جائے گی اور آپ روز بروز خدا سے قریب تر ہوتے چلے جائیں گے۔ یہی روحانی ترقی ہے۔ روحانیت انسانیت ہی کا دوسرا نام ہے۔ انسان اپنی حیوانی خواہشات کی بندگی سے نکل کر کمال انسانیت کی طرف جتنی زیادہ پیش قدمی کرے گا اور اخلاق و اوصاف انسانی سے آراستہ ہو کر رضائے الٰہی کے بلند ترین نصب العین تک پہنچنے کی جتنی کامیاب کوشش کرے گا، اس قدر روحانی ترقی اس کو حاصل ہوگی۔

تزکیۂ نفس کا مفہوم

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ خدائے بزرگ و برتر ارشاد فرماتا ہے۔

اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کیا ہے اور اسے تمہارے اوپر بھی حرام کر دیا ہے، پس ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔ اے میرے بندو! تم سب بے راہ ہو مگر جس کو میں سیدھی راہ پر چلاؤں، پس مجھ ہی سے ہدایت مانگو، میں تمہیں ہدایت دوں گا۔ اے میرے بندو! تم سب بھوکے ہو مگر جس کو میں کھانا کھلاؤں، پس تم مجھ سے کھانا مانگو، میں تمہیں کھلاؤں گا۔ اے میرے بندو! تم سب عریاں ہو مگر جس کو میں پہناؤں، تم مجھ سے لباس مانگو، میں تمہیں پہناؤں گا۔ اے میرے بندو! تم سب رات دن خطائیں کرتے ہو اور میں سب کے گناہ بخشنے والا ہوں، تم سب مجھ سے بخشش مانگو، میں تمہیں بخش دوں گا۔ اے میرے بندو! تم مجھے کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے کہ مجھے ضرر پہنچاؤ، نہ تم مجھے نفع پہنچا سکتے ہو کہ مجھے نفع پہنچاؤ۔ اے میرے بندو! اگر اوّل سے آخر تک سب انسان اور جن تم میں سے سب سے زیادہ متقی دِل والے آدمی کی طرح ہو جائیں تو اس سے میری بادشاہت میں کچھ بڑھ نہیں جائے گا۔ اے میرے بندو! اگر اوّل سے آخر تک سب انسان اور جن تم میں سے سب سے زیادہ بدکار، دِل والے آدمی کی طرح بن جائیں تو اس سے میرے ملک میں کوئی نقصان واقع نہیں ہوگا۔ اے میرے بندو! اگر اوّل سے آخر تک سب انسان اور جن ایک میدان میں جمع ہو جائیں اور مجھ سے (اپنی مرادیں) مانگیں اور میں ہر ایک کی مراد پوری کر دوں تو اس سے میرے خزانوں میں اس سے زیادہ کم نہیں ہو سکتا جتنا کہ سوئی کو دریا میں داخل کر کے نکال لینے سے (دریا کا پانی کم ہوتا ہے)۔ اے میرے بندو! یہ تمہارے اعمال ہیں جنہیں میں تمہارے لئے ہی گن گن کر رکھتا ہوں اور پھر تمہیں وہ پورے پورے دوں گا۔ پس جو بھلائی پائے وہ خدا کی حمد کرے اور جو اس کے سوا پائے وہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرے۔ (مسلم)

اس حدیث قدسی کے آخر میں جس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ لوگوں کے نیک بن جانے سے اللہ تعالیٰ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور لوگوں کے بد بن جانے سے اس کی سلطنت میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود وہ انسان کو بار بار حکم دیتا ہے کہ گناہوں سے بچو اور نیکیاں اختیار کرو، تو یہ خود انسان ہی کے فائدے کی خاطر ہے تا کہ انسان ہلاکت اور خسارے سے بچ جائے اور اپنے لئے زیادہ سے زیادہ اچھے اجر کو حاصل کر لینے کا بندوبست کر لے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ تمہارے اعمال ہیں، جنہیں میں تمہارے لیے ہی گن گن کر رکھتا ہوں اور پھر وہ تمہیں پورے پورے دوں گا۔

عربی زبان میں تزکیہ کا لغوی مفہوم یہ ہے کہ کسی شئے کو صاف ستھرا بنایا جائے اور اس کو نشوونما دے کر پروان چڑھایا جائے، اور اصطلاح میں تزکیہ کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو غلط رجحانات، میلانات اور اعمال سے ہٹا کر نیکی اور خدا ترسی کی راہ پر ڈالا جائے، اس تعریف کی رو سے تزکیہ نفس کی مہم قدرتی طور پر دو حصوں میں بٹ جاتی ہے۔

(۱) اپنا محاسبہ کر کے دیکھنا کہ ہم میں کیا کیا برائیاں ہیں اور پھر انہیں دور کرنے کی کوشش کرنا۔

(۲) اپنا محاسبہ کر کے دیکھنا کہ ہم میں کیا کیا اچھائیاں نہیں ہیں اور پھر انہیں اپنے اندر پیدا کرنے کی جدوجہد کرنا۔

جو عقل مند شخص اس مہم کا بیڑا اُٹھالے کہ اپنے نفس سے برائیاں دور کروں اور اُس میں اچھائیاں پیدا کروں، اس کے لئے سب سے زیادہ غور طلب امر یہی ہو جاتا ہے کہ وہ کون کون سے اعمال ہیں جو مجھے اس مہم میں کامیاب ہونے میں مدد دے سکتے ہیں اور وہ کون کون سے افعال ہیں جن کو اگر چھوڑا نہ گیا تو یہ مہم کبھی بھی سر نہ ہو سکے گی۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ جو شخص اپنے نفس کا تزکیہ کرنے کا خواہش مند ہوگا، اس کی سب سے بڑی سوچ یہی ہوگی کہ کیا کروں کہ گناہ گار نفس گناہوں کے بے پناہ نقصانات کا صحیح احساس کر کے اس سے متنفر ہو جائے اور کیا کیا قدم اُٹھاؤں کہ غافل دل نیکیوں کے لامحدود فوائد اور برکات کو دیکھ کر اس کی طرف بے با کانہ لپکے۔

واضح رہے کہ انسانی نفس ان اعمال کو ہمیشہ بے فائدہ اور لاحاصل سمجھتا ہے جن کے فوائد اس کے ذہن نشین نہ ہوں۔ اس لئے تزکیہ نفس کا خیال بھی صرف اسی شخص کے دل میں آ سکتا ہے جسے اچھی طرح پتا چل چکا ہو کہ برائیاں میرے لئے ہلاکت خیز اور اچھائیاں میرے لئے فائدہ مند ہیں۔ اس لئے انسان کے لئے پہلی ضروری بات تو یہی ہے کہ اسے قلبی یقین حاصل ہو جائے کہ خدا نے مجھے جن باتوں سے روکا ہے ان سے اسی لئے روکا ہے کہ وہ مجھے ہلاک کرنے والی ہیں اور جن کے کرنے کا حکم دیا ہے وہ مجھے دنیوی اور اخروی

دونوں سعادتوں سے ہمکنار کرنے والی ہیں، یعنی اسے اپنے خالق و مالک کی شفقت و محبت پر پورا سچا قلبی یقین ہو چکا ہو اور اس کا ایمان ہو کہ وہ رؤف و رحیم ہادی صرف میرے ہی فائدے کی خاطر مجھے زہر کھانے سے باز رہنے اور آبِ حیات پینے کا حکم دے رہا ہے۔

علامہ اقبالؒ اپنے ایک خط میں جو انہوں نے خان محمد نیاز الدین خان کو لکھا تزکیۂ نفس کے بارے میں فرماتے ہیں: اسلامی نقطۂ نظر سے تزکیۂ نفس کا مقصد محض ازدیادِ یقین و استقامت ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ جو شخص برائی کا نقصان نہیں جانتا وہ اس کے واقع ہونے سے بچ نہیں سکتا اور جو بھلائی کا فائدہ نہیں جانتا وہ اس کے کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔

واضح رہے کہ کلامِ الٰہی، احادیث نبویؐ اور سلف صالحین کے اعمال و اقوال ہماری ہمہ وقت یہ راہنمائی کرتے ہیں کہ ہم برائی کے نقصانات کو جان لیں اور بھلائی کے فوائد معلوم کر لیں، بشرطیکہ ہم تزکیۂ نفس کے ان ماخذوں کی طرف طلبِ صادق کے ساتھ راجع ہوں اور عزمِ صادق کے ساتھ ان پر عمل پیرا ہونے کی جدوجہد کریں۔ (روح اور نفس کی کشمکش ۲۲۷، نزول الروح والنفس از ڈاکٹر محمد عبدہ مصری)

محاسبۂ نفس

اگر آپ کہتے ہیں کہ آپ نے اسلام قبول کیا اور ایمان لے آئے تو دیکھئے کہ آیا فی الواقع آپ کا جینا اور مرنا خدا کے لئے ہے؟ کیا آپ اس کے لئے جی رہے ہیں اور آپ کے دل و دماغ کی ساری قابلیتیں، آپ کے جسم کی ساری قوتیں، آپ کے اوقات اور آپ کی محنتیں اس کوشش میں صرف ہو رہی ہیں کہ خدا کی مرضی آپ کے ہاتھوں پوری ہو اور آپ کے ذریعہ وہ کام انجام پائے جو خدا اپنی مسلم اُمت سے لینا چاہتا ہے؟ پھر کیا آپ نے اپنی اطاعت اور بندگی کو خدا ہی کے لئے مخصوص کر دیا ہے؟ کیا نفس کی بندگی، خاندان کی، برادری کی، دوستوں کی، سوسائٹی کی اور حکومت کی بندگی آپ کی زندگی سے بالکل خارج ہو چکی ہے؟ پھر دیکھئے کہ آپ جس سے محبت کرتے ہیں، کیا واقعی اس سے خدا کے لئے کرتے ہیں؟ جس سے نفرت کرتے ہیں خدا کے لئے کرتے ہیں اور اس نفرت اور محبت میں آپ کی نفسانیت کا کوئی حصہ شامل نہیں۔ پھر آپ کا دینا اور روکنا بھی خدا کی خاطر ہو چکا ہے؟ اپنے پیٹ اور اپنے نفس سمیت دنیا میں آپ جس کو جو کچھ دے رہے ہیں، اس لیے دے رہے ہیں کہ خدا نے اس کا حق مقرّر کیا ہے اور اس کو دینے سے صرف خدا کی رضا آپ کو مطلوب ہے؟ اور اس طرح جس سے آپ جو کچھ روک رہے ہیں، وہ بھی اس لیے روک رہے ہیں کہ خدا نے اسے روکنے کا حکم دیا ہے اور اس کے روکنے میں خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی تمنا ہے؟ اگر آپ یہ کیفیت اپنے اندر پاتے ہیں تو اللہ کا شکر ادا کیجئے کہ اس نے آپ پر نعمتِ ایمان کا اتمام کیا اور اگر اس سلسلہ

میں آپ اپنے اندر کمی محسوس کرتے ہیں تو ساری فکریں چھوڑ کر بس اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کیجئے اور اپنی تمام کوششوں اور محنتوں کو اسی پر مرکوز کر دیجئے کیونکہ اسی کسر کی بدولت آپ کو نقصان پہنچے گا لیکن اگر یہ کسر آپ نے پوری کر لی تو خواہ آپ کو دنیا میں کچھ حاصل نہ ہو، پھر بھی آپ خسارے میں نہ رہیں گے۔

یہ کسوٹی اس غرض کے لئے نہیں ہے کہ اس پر آپ دوسروں کو پرکھیں اور ان کے مومن یا منافق اور مسلم یا کافر ہونے کا فیصلہ کریں بلکہ یہ کسوٹی اس غرض کے لئے ہے کہ آپ اس پر اپنے آپ کو پرکھیں اور آخرت کی عدالت میں جانے سے پہلے اپنا کھوٹ معلوم کر کے یہیں اسے دور کرنے کی فکر فرمائیں۔ آپ کو فکر اس بات کی نہیں ہونی چاہیے کہ دنیا میں مفتی اور قاضی آپ کو کیا قرار دیتے ہیں بلکہ اس کی ہونی چاہیے کہ احکم الحاکمین اور عالم الغیب والشہادۃ آپ کو کیا قرار دے گا۔ آپ اس پر مطمئن نہ ہوں کہ یہاں آپ کا نام مسلمانوں کے رجسٹر میں لکھا ہے فکر اس بات کی کیجئے کہ خدا کے دفتر میں آپ کیا لکھے جاتے ہیں۔ ساری دنیا بھی آپ کو سند اسلام و ایمان دے دے تو کچھ حاصل نہیں۔ فیصلہ جس خدا کے ہاتھ میں ہے اس کے ہاں منافق کی بجائے مومن، نافرمان کی بجائے فرمانبردار اور بے وفا کی جگہ وفادار قرار پانا اصل کامیابی ہے۔

(روح اور نفس کی کشمکش ترجمہ الروح والنفس از ڈاکٹر محمد عبدہ مصری مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی)

ولایت سے متعلق حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کے فرمودات

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات شریفہ کے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔

مقام ولایت میں دنیا کیا آخرت سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ آخرت کی مصیبت کو دنیا کے مصائب کی طرح سمجھنا پڑتا ہے اور آخرت کے درد کو دنیا کے درد کی طرح نامناسب جاننا پڑتا ہے۔ حضرت داؤد طائی کا قول ہے کہ اگر تو بچاؤ چاہتا ہے تو دنیا کو سلام کہہ دے اور اگر تو کرامت چاہتا ہے تو آخرت پر تکبیر کہہ دے۔

فنا اور بقا دونوں ولایت کے جزو ہیں۔ پس ولایت میں آخرت کا نسیان ضرور ہے اور مرتبہ کمالات نبوت میں آخرت کی خواہش ہی بہتر اور محمود ہے۔ آخرت کا درد پسندیدہ اور مقبول ہے بلکہ اس مقام میں درد بھی آخرت کا درد ہے اور بہتری آخرت کی بہتری ہے۔

اقوالِ اولیاء و مشائخِ عظام

تین مشہور صوفیاء کے اقوال

(۱) خدا کے اولیاء کی تین نشانیاں ہوتی ہیں۔ (۱) ان کا خیال خدا کے حضور میں رہتا ہے۔ (۲) ان کا [illegible] خدا کے ساتھ ہوتا ہے۔ (۳) ان کا سارا کاروبار بھی خدا ہی کے ساتھ ہوتا ہے۔ (معروف کرخیؒ [illegible])

(۲) جب عارف کی روحانی آنکھ کھل جاتی ہے تو اس کی جسمانی آنکھ بند ہو جاتی ہے۔ وہ ذات حق کے [illegible]

چیز کو نہیں دیکھ سکتا۔ خدا کی معرفت وجد سے حاصل ہوتی ہے۔ (ابو سلیمان دارانی ؒ ۲۱۶ھ)

(۳) خدا کی سب سے زیادہ معرفت وہی رکھتا ہے جو اس میں سب سے زیادہ گم ہے۔ (ذوالنون مصریؒ ۲۴۶ھ)

کسی فرقے کی پہچان اولیاء کا وجود ہے

جس دین یا مذہب میں اولیاء اللہ ہوں، وہی سچا ہے جو دین ولایت سے خالی ہے، وہ جھوٹا ہے، جس شاخ پر پھل، پھول اور سبزہ ہو، نیز وہ جڑ سے وابستہ ہے تو ایسے درخت کی خدمت کی جاتی ہے۔ جو شاخ سوکھ جاتی ہے اس کا تعلق جڑ سے ٹوٹ جاتا ہے، وہ محض جلانے کے لائق ہوتی ہے۔ بنی اسرائیل اور عیسیٰ علیہ السلام کا دین جب تک منسوخ نہ ہوا تھا تب تک اس میں اولیاء اللہ ہوتے رہے۔ اصحابِ کہف، آصف بن برخیا، حضرت مریم، بنی اسرائیل کے دین کے اولیاء ہیں۔ جب سے وہ دین ختم ہوا ولایت ان سے جاتی رہی، غرضیکہ اولیاء اللہ حقانیت دین کی جیتی جاگتی دلیلیں ہیں۔ اولیاء اللہ اوّل سے آخر تک صرف اہل سنت والجماعت سے ہوئے ہیں کسی غیر مذہب یا فرقہ میں اولیاء نہیں ملتے۔

اگرچہ بنی اسرائیل میں حضرت مریم، اصحاب کہف اور آصف بن برخیا جیسے اولیاء پیدا ہوئے مگر ان سے وہ فیضان جاری نہ ہوئے جو کہ خواجہ اجمیریؒ اور حضرت غوث پاکؒ سے جاری ہوئے۔ ان کی ولایتیں وقتی تھیں کیونکہ ولایت دیوار نبوت کا سایہ ہوتی ہیں، دیوار گئی تو سایہ بھی گیا۔ اولیاء کرام آفتاب نبوت کے ذرے ہوتے ہیں جب سورج غروب ہو گیا تو ذروں کی چمک بھی جاتی رہی چونکہ ہمارا مدینے والا سورج کبھی غروب نہیں ہونے والا، اس لیے دین محمدی کے اولیاء کی چمک ختم ہونے والی نہیں۔

اَفَلَتْ شُمُوْسُ الْاَوَّلِیْنَ وَشَمْسُنَا اَبَدًا عَلٰی اُفُقِ الْعُلٰی لَا تَغْرُبُ

(پہلے لوگوں کے سورج غروب ہو گئے اور ہمارا سورج ہمیشہ بلندی کے کناروں پر رہے گا غروب نہ ہو گا۔)

مکتوبات ربانی ص ۹ ۷ جلد اوّل حصہ اوّل میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ مقامِ ولایت سے اوپر مقامِ شہادت ہے اور شہادت کے مقام کے بعد صدیقیت کا مقام ہے اور صدیقیت سے اوپر کوئی مقام نہیں، بلکہ کسی اور مقام کا ہونا محال ہے۔ بعض اہل اللہ نے ان دو مقاموں کے درمیان جو مقام بیان کیا ہے اس کا نام قربت رکھا ہے۔

عوارف المعارف میں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی متابعت کو بندے سے اپنی محبت کی نشانی قرار دیا ہے۔ تو اس صورت میں جس شخص کو جتنا وافر حصہ متابعت رسول اللہ ﷺ سے ملے گا اتنا ہی زیادہ حصہ اس کو اللہ کی محبت سے نصیب ہوگا۔ مسلمانوں کے طبقات میں سے صوفیاء کرام کا طبقہ اور گروہ ہی ایسا

ہے جو حسنِ متابعت میں کامیاب ہوا ہے۔ اس لیے کہ اس طبقے نے رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کی تعمیل کی اور آپؐ نے جس کام کا حکم دیا اس پر ثابت قدمی سے عمل کیا اور جن باتوں سے روکا اس سے رُک گئے، چنانچہ ان کے اعمال میں حضور ﷺ کی کامل درجہ پیروی اور متابعت پائی جاتی ہے اور عبادت، تہجد، نوافل، روزہ، نماز اور جو کچھ اس کے سوا ہے، اس کی بجا آوری میں آپؐ کی متابعت کی اور اقوال و افعال میں متابعت کی برکت سے یہ لوگ آپؐ کے اخلاق سے متخلق ہوئے یعنی حیاء، علم، درگزر، عفو، مہربانی، شفقت، ہدایت، نصیحت اور تواضع سے بہرہ مند ہوئے اور اس کی بدولت ان کو خوف، تسکین، ہیبت، تعظیم، صبر و رضا، زہد اور توکل سے حصہ ملا گویا انہوں نے متابعت کی تمام اقسام کو پورا پورا حاصل کیا (کامل متابعت کی) اور اس طرح انہوں نے تا حد کمال سنت کا احیاء کیا۔

کراماتِ اولیاء

عادت جاریہ نظامِ عالم کے خلاف کسی امر کا ظہور ہونا خرق عادت کہلاتا ہے۔ اگر کسی نبی سے صادر ہو تو اسے معجزہ کہتے ہیں، اگر کسی ولی سے ظاہر ہو تو اُسے کرامت کہتے ہیں۔ غیر مسلم سے بھی خرق عادت کا ظہور ہوتا ہے، اسے استدارج کہتے ہیں۔

کرامت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کرامت باللہ جو بندے اور اللہ کے درمیان تعلقات سے متعلق ہے، اس کا علم کسی غیر کو نہیں ہو سکتا۔ دوسری کرامت فی الخلق ہے جو بندوں سے بھی کسی قدر متعلق ہے۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک تصرف بالحق جو طالبانِ حق کے لیے مفید اور کارآمد ہے۔ اس سے مریدین کے قلوب و افعال کی اصلاح ہوتی رہتی ہے۔ اس کا فوری اظہار عوام پر نہیں ہوتا۔ دوسری قسم اظہار خرق عادت ہے جس کی فوری طور پر نمائش ہو جاتی ہے مگر یہ ارشاد اور طلب حق کے اُمور میں مفید نہیں ہے یہ اس لئے ظہور میں لائی جاتی ہیں کہ اس سے لوگ شیخ کے معتقد ہو جائیں اور طلبِ حق میں شیخ کی جانب رجوع کریں۔ کرامات برحق ہیں اور اس کی تفصیل بہت طویل ہے۔ اولیاء اللہ دنیا اور آخرت کی کسی چیز کی طرف رغبت نہیں کرتے۔ یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مقامِ ولایت پر پہنچنے کی وجہ سے مجاہدہ کے بعد انہیں راحت حاصل ہوتی ہے۔ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اولیائے کرام اللہ کی دلہنیں ہیں اور محرموں کے سوا کوئی ان کو نہیں دیکھ سکتا۔ یہ لوگ حجاب اُنس میں پوشیدہ رہتے ہیں۔ منقول ہے کہ ابوبکر طمستانی رحمۃ اللہ علیہ کی قبر کی لوح (تختی) کچھ دنوں بعد چرالی جاتی ہے استاد ابو علی دقاق رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ تختی اس لئے چرالی جاتی ہے کہ ابوبکر طمستانی رحمۃ اللہ علیہ نے دنیا میں رہتے ہوئے اپنے آپ کو پوشیدہ رکھا اور اللہ تعالیٰ بھی یہی چاہتا ہے کہ اس طرح ان کی قبر کو پوشیدہ رکھے۔ ابو عثمان مغربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ولی مشہور ہوتا ہے اور اس کی شرافت فتنے کا باعث نہیں بنتی

عبدالرحمٰن سلمیٰ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جہاں اولیاء اللہ کی انتہا ہوتی ہے وہاں نبوت کی ابتداء ہوتی ہے۔ سہیل بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ ولی وہ ہے جس کے اوقات لگاتار سنت اور شریعت کی موافقت میں ہوں۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ کرامت ولایت کی شرط نہیں ہے تو ولی کو کیسے پہچانا جائے گا۔ فرمایا کہ ولی اگر پہچانے نہ جاسکیں تو کیا حرج ہے۔ ولی کو ولایت کا علم ہونے کی ضرورت نہیں۔ بہت سے ولیوں کو اپنی ولایت کا بھی علم نہیں ہوتا تو پھر دوسروں کو اس کی ولایت کا علم ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ البتہ نبی کو دکھانا ضروری ہے کہ وہ نبی ہے چنانچہ نبی کو نبوت کا علم ہونا واجب ہے۔ ولی نبی کی شریعت پر ہوتا ہے، اس کے لئے نبی کا معجزہ ہی کافی ہے۔ اگر ولی نبی کی شریعت کے علاوہ دعوت دیتا تو پھر کرامت کی ضرورت ہوتی۔

کرامات برحق ہیں

کراماتِ اولیاء کے متعلق بزرگانِ دین کے اقوال اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ کرامات کے برحق ہونے کے اثبات پر اولیاء کرام کا اجماع ہے اور اجماع اُمت غلط نہیں ہوتا۔ معتزلہ کرامات کے منکر ہیں اور دونوں طرف سے طویل بحث کتابوں میں منقول ہے جس کا اس کتاب میں ذکر کرنا ضروری نہیں۔ اہلِ سنت و الجماعت کرامات کو روا سمجھتے ہیں اور حضرت مریم علیہا السلام کا بے جا موسمی پھلوں اور آصف بن برخیا رضی اللہ عنہ کا تختِ بلقیس کو ایک پلک جھپکنے کی دیر میں حاضر کر دینا، کراماتِ اولیاء کی دلیلیں ہیں جو قرآن میں بطور سند ملتی ہیں۔ روایات میں ہے کہ آصف بن برخیا رضی اللہ عنہ نے "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" پڑھی تو تخت آ گیا۔ ایک گروہ نے "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" اور ایک نے "يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ" پڑھنے کا ذکر کیا اور کچھ لوگ خدا کے بزرگ ترین نام (اسمِ اعظم) پڑھنے کا ذکر کرتے ہیں۔

صحابہ کرامؓ اور بعد کے اولیائے کرامؒ کی کرامات کا بھی ذکر مستند کتب میں ملتا ہے۔ (جن کا ذکر بہت طویل ہے۔)

کراماتِ اولیاء کی اقسام

حضرت ابنِ عربی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے اسم "برّ" کی کرم فرمائیاں کرامت میں ہیں اور ابرار کے حصہ میں پورے جمال کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔ آپ نے کرامات کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔

(۱) حِسّی کرامات عام لوگ حِسّی کرامات کو ہی سمجھ سکتے ہیں مثلاً دل کی بات پر مطلع ہونا، ماضی، حال اور مستقبل کے غیوب کی اطلاع دینا، چیزوں کی اصلیت سے ان کے احوال کو اخذ کرنا، پانی پر چلنا، ہوا میں اڑنا، لمبے سفروں کا طے کرنا، نظر سے اُوجھل ہو جانا، دُعا کا فوراً قبول ہو جانا، یہ سب حِسّی کرامات کی مثالیں ہیں۔

(۲) معنوی کرامات عوام کی وہاں تک رسائی نہیں ہوگی اور نہ ہی وہ اس کو اہمیت دیتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ کوئی آداب شریعت کو ملحوظ کرے، مکارم اخلاق کو اپنائے، رزائل سے دور رہے، واجبات کی محافظت کرے، نیکیوں کی طرف دوڑے، برائیوں سے محفوظ رہے، عبادت، مراقبہ، کشف اور دیگر عبادات میں مصروف رہے۔

منقول ہے کہ ایک شخص حضرت عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے پاس آیا اور چند روز آپ کی صحبت میں رہا اور جب واپس گھر جانے لگا تو حضرت عبدالعزیزؒ سے کہنے لگا، میں نے یہاں اتنے دن قیام کیا لیکن اس دوران مَیں نے کسی کرامت کا مشاہدہ نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا کہ جتنے دن تم میرے پاس رہے ہو تم نے میرا کوئی فعل قرآن اور حدیث کے خلاف ملاحظہ کیا؟ اس شخص نے نفی میں جواب دیا جس پر آپ نے فرمایا: اس سے بڑی اور کیا کرامت ہو سکتی ہے کہ میرا کوئی فعل قرآن اور حدیث کے خلاف نہیں۔

حضرت عبدالوہاب بن احمد بن علی شاراتی (م ۹۷۳ھ) فرماتے ہیں کہ ولی کے لئے کرامت کا ظاہر ہونا شرط نہیں۔ اگر شرط ہے تو وہ احکام خداوندی کی تابعداری کرے اوامر و نواہی سے پرہیز کرے تاکہ اس کی حالت کتاب و سنت کی مطابقت کی وجہ سے پختہ ہو، لہٰذا جس شخص کا یہ حال ہوگا تو اس کی ولایت پر قرآن پاک گواہ ہے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں تیس سال تک سخت مجاہدہ کرتا رہا۔ مگر مجھے کوئی چیز سخت ترین محسوس نہ ہوئی، ماسوا علم اور اس کی اتباع کے۔ داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جہنم میں خیمہ لگا کر بیٹھنا آسان ہے، بہ نسبت اس کے کہ ایک مسئلہ شرعی معلوم کر کے اس پر عمل کرنا اسی لیے کہا جاتا ہے کہ

اَلْاِسْتِقَامَۃُ فَوْقَ الْکَرَامَۃِ استقامت کا مرتبہ کرامت سے زیادہ ہوتا ہے۔

کرامات کے متعلق اولیائے عظام کے نظریات

ابو علی جوزجانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ولی وہ ہے جو اپنے حال میں فنا ہو چکا اور مشاہدہ حق میں باقی ہو، وہ نہ اپنی طرف سے کوئی بات کہتا ہے، نہ اسے غیر اللہ کے ساتھ قرار ہوتا ہے۔ ولی بجز خدا کسی چیز سے سکون قلب نہیں پاتا۔ حضرت واسطی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ولی کی ابتداء عبادت کے ساتھ ہوتی ہے اور آخر میں اللہ تعالیٰ اسے اپنی صفات ازلیہ کی طرف منتقل کر دیتا ہے اور وہ مناجات کی لذت کا مزا چکھتا ہے۔

کراماتِ اولیاء اس قدر وسیع مضمون ہے جتنا کہ کرامات کا دائرہ وسیع ہے چونکہ تمام کائنات مرد مومن کے لئے مسخر کر دی گئی ہے اس لئے کرامات کا دور بھی وہاں تک ہے جہاں تک کائنات کی وسعتیں پھیلی ہوئی ہیں [illegible] اعمال جو خرق عادات سے تعلق رکھتے ہیں اگر انبیائے کرامؑ سے سرزد ہوں تو اس کو معجزہ کہا جاتا ہے اور اگر کسی ولی سے سرزد ہوں تو اسے کرامت کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے معجزات اس قدر زیادہ ہیں کہ کسی [illegible] اس قدر معجزات نہیں دیئے گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کا دائرہ اختیار تمام [illegible]

اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ کو رحمۃ اللعالمین کے شرف سے نوازا گیا اور یہ شرف کسی رسول یا نبی کو عطا نہیں ہوا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جن مقامات کے لئے اللہ تعالیٰ کی ذات رب العالمین ہے، ان مقامات کے لئے آپ ﷺ کی ذات رحمۃ للعالمین ہے۔ لہٰذا نیابت الٰہی کا سب سے زیادہ حق آپ ﷺ کو عطا کیا گیا۔ اسی لئے آپ ﷺ کے معجزات بھی ایسے تھے جو کسی کو عطا نہیں کئے گئے۔ ان میں معراجِ مصطفیٰ، شق القمر اور انگلیوں سے چشمے کا بہنا، بے شمار معجزات میں سب سے زیادہ مخصوص ہیں۔ ولی کی کرامت ہی نبی کا معجزہ کہلاتی ہے کیونکہ ولی کی ذات کا مکمل انحصار نبی کی ذات پر موقوف ہے اور ولی نبی کے سینہ سے فیوض اخذ کرنے کے بعد ہی مقامِ ولایت پر فائز ہوتا ہے۔ جامع کراماتِ اولیاء مصنفہ علامہ یوسف بنہانی جو کہ ۹۲۵ صفحات پر مشتمل ہے، کراماتِ اولیاء پر لکھی گئی ہے اور اس قسم کی سینکڑوں کتب اس مضمون پر اور بھی لکھی گئی ہیں، اختصار کے باعث اس جگہ کرامات کے متعلق چند معلومات بیان کی جائیں گی۔ کچھ غیر معروف علماء نے اولیاء کرام کی کرامات سے انکار کیا ہے، ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو متقدمین کی کرامات کے تو قائل ہیں، مثلاً معروف کرخیؒ، بایزید بسطامیؒ، سہیلؒ اور جنیدؒ وغیرہ لیکن اپنے ہم عصر اولیاء کی کرامات کے منکر ہیں۔ حضرت شیخ ابوالحسن شاذلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسے لوگ اسرائیلیوں کے ہم نوا ہوتے ہیں کہ جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تو تصدیق کی لیکن اپنے زمانے میں آنے والے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کر دی۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام اولیائے کبار اس بات پر متفق ہیں کہ خوارق عادت امور کا تعلق معجزہ یا کرامت سے اس سے نبی کی صداقت کی دلیل حاصل ہوتی ہے اور کرامتِ ولی معجزہ؟ نبی کی ہم شکل ہوتی ہیں۔ یہ دونوں ایک ہی اعجاز کا مظہر ہیں۔ معجزات اور کرامات کا قرآن میں بھی ذکر ہے۔ آصف بن برخیا کا تخت بلقیس کو حاضر کرنا، حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ اور آصف بن برخیا کی کرامت تھی۔ رسول اللہ ﷺ کا معراج پر جانا، مسجد اقصیٰ میں جماعتِ انبیاء کو نماز پڑھانا اور اس سے متعلقہ تمام اُمور آپؐ کے معجزات میں شامل ہیں۔

کشف المحجوب میں حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے ولایت اور کرامات پر مکمل گفتگو کی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ جو لوگ اولیاء اللہ کے خلاف باتیں کرتے ہیں، انہیں توفیق خداوندی اور تائید ایزدی سے محروم کردیا جاتا ہے۔ یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسے منکرین تصوف کی مجلس میں بیٹھنا روح کو اندھا بنادیتا ہے اور ذوق کو نقصان پہنچاتا ہے۔ ان منکرین کے برعکس حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صوفیاء کو ایک نظر دیکھ لینا میرے لئے ہفتہ بھر کا زادِ راہ ہے۔

مشائخ کا قول ہے کہ معجزات لوگوں کے سامنے ظاہر کیے جاتے ہیں تاکہ لوگ قائل ہوجائیں اور اللہ کی طرف آنے لگیں جب کہ کرامات کو پوشیدہ رکھا جاتا ہے۔ ابن سالم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں (کتاب اللمع) کہ کرامات اس لئے عطا کی جاتی ہیں کہ ان کے ذریعے اولیاء کرام اپنے نفس کے خلاف دلیل قائم کرسکیں کہ جو

ذات ان کے لئے پتھر کو سونا بنا سکتی ہے کیا وہ انہیں غیب سے رزق نہیں عطا کر سکتی۔ ایسی کرامات سے ولیوں کے دِل میں رزق کے ختم ہونے یا کم ہو جانے کا اندیشہ باقی نہیں رہتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اللہ تعالیٰ کے حضور میں عرض کیا۔

رَبِّ اَرِنِیۡ کَیۡفَ تُحۡیِ الۡمَوۡتٰی (البقرۃ:۲۶۰) یا اللہ! مجھے دکھا کہ تو کیسے مردے کو زندہ کرتا ہے۔

اس میں بھی اس بات کا اظہار تھا کہ آپ ایمان تو رکھتے تھے، مگر اپنے نفس کو مطمئن کرنا چاہتے تھے۔ انبیاء علیہم السلام میں معجزات کا اضافہ ہونا، ان کی فضیلت کا باعث بھی ہے، لیکن اولیائے کرام کے لئے جب کرامات میں اضافہ ہوتا ہے تو ان کا خوف بڑھ جاتا ہے کہ کہیں اللہ تعالیٰ ان سے ناراض نہ ہو جائے۔

روایات میں منقول ہے کہ سہل بن عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید نے یہ عرض کیا کہ اسے اس بات کا خطرہ لاحق رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا رزق کم ہو جائے۔ شیخ نے اسے پتھر کا ٹکڑا دیا اور اسے کہا کہ اپنے رب کو پکارو وہ اس کو تمہارے لئے طعام میں بدل دے گا۔ اس شخص نے کہا کہ اس میں میرے لیے نمونہ کون ہے؟ آپ نے فرمایا: ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ اس کی مثال میں موجود ہے۔

چند مزید کراماتِ اولیاء کا مختصر ذکر

اولیاء کرام کی کرامات پر تو کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ یہاں چند مزید کرامات کا ذکر کیا جا رہا ہے اگرچہ کچھ کرامات کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔

اولیاء کی نظر میں سونا اور پتھر یکساں ہیں

کشف المحجوب میں ہے کہ مقام صحو میں اولیاء کرام کو درجہ عوام ملتا ہے اور سکر میں ان کو درجہ انبیاء سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ اہل سکر جب اس مقام سے اتر کر ماخوذ ہوتے ہیں (یعنی صحو میں) تو خود کو عوام کی حیثیت میں جانتے ہیں اور جب بے خود ہو کر اپنے سے مخفی ہو جاتے ہیں تو راجع بحق ہوتے ہیں۔ حضرت شبلیؒ نے فرمایا:

اَیۡنَمَا ذَهَبۡنَا وَذُو دَحَیۡثُ دُوۡنَا وَ فِضَّةٌ فِی الۡفَضَاءِ

(ہم جہاں گئے سونا ہی تھا اور جہاں ہم نے دورہ کیا موتی ہی ملے اور میدانوں میں چاندی ہی چاندی تھی)

حضرت داتا گنج بخش "لکھتے ہیں کہ انہوں نے ابو القاسم قشیری سے سنا کہ وہ فرماتے تھے کہ میں نے ایک بار طائرانی سے پوچھا کہ آپ اپنا ابتدائی حال سنائیں فرمایا کہ ایک وقت مجھ پر وہ تھا کہ مجھے ایک پتھر کی ضرورت پڑی اور کانہ سرخ میں جو پتھر میں نے اٹھایا وہی جوہر بن گیا اور میں نے اسے پھینک دیا اس لیے کہ انہیں پتھر کی ضرورت تھی؟ جواہرات درکار نہ تھے (کشف المحجوب)

ایک درویش نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ اے اللہ تعالیٰ تیرے حضور زبان ہلانا بھی جرم ہے۔

کشف المحجوب میں ہے کہ حضرت داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں کہ میں نے امام خزریؒ سے سنا کہ وہ سرخس میں لڑکوں کی عمر کا تھا اور قرمز (کیڑہ ریشمی کیڑوں) کے لئے شہتوت کے درخت کے پتے جھاڑنے کو ایک محلہ میں گیا اور پتے جھاڑ رہا تھا کہ شیخ ابوالفضل بن حسینؒ اس کوچے سے گزرے جب کہ میں درخت پر تھا۔ آپ نے مجھے نہ دیکھا۔ میں نے ان کی طرف سے کوئی شک نہ کیا بلکہ میں نے اس امر پر یقین کیا کہ وہ از خود غائب اور بارگاہ حق میں حاضر ہیں اور اپنے اس حال پر خوش ہیں۔ یکا یک آپؒ نے سر مبارک اٹھایا اور فرمایا "الٰہی ایک سال سے زائد ہوگا کہ تو نے مجھے ایک دانگ بھی نہ دیا کہ سر کے بال تو درست کر لیتا۔ کیا آپ اپنے دوستوں کے ساتھ ایسا ہی کرتے ہیں۔ امام خزریؒ فرماتے ہیں کہ اسی وقت شہتوت کے تمام پتے اور ڈالیاں تنا اور جڑ سب زریں ہوگئے۔ آپؒ نے دیکھ کر فرمایا "تعجب ہے کہ آپ کی بارگاہ میں کنایہ کرنا بھی موجب اعراض ہے۔ مقصد تو یہ تھا کہ کشائش قلب کے لئے کوئی نعمت ملے اور ظاہر یہ فرمایا بے شک آپؒ کے حضور زبان ہلانا ہی جرم ہے۔

حضرت شبلیؒ نے چار ہزار دینار دریا میں پھینک دیئے

کشف المحجوب میں ہے حضرت شبلیؒ نے چار ہزار دینار دجلہ میں پھینک دیئے۔ لوگوں نے کہا شبلیؒ کیا کر رہے ہو؟ فرمایا پتھروں کا پانی میں رہنا ہی بہتر ہے۔ لوگوں نے کہا کہ بجائے اس کے کہ دریا میں پھینکے لوگوں کو کیوں نہ دے دیئے۔ فرمایا تم لوگ بھی خوب ہو میں اپنے رب سے یہ چاہوں کہ میرے دل سے حجاب اٹھ جائے اور اس حجاب کو اپنے بھائی مسلمانوں پر ڈال دوں۔ یہ شرط اول دیانت نہیں کہ اپنے بھائیوں کے لئے وہ چیز پسند کروں جو اپنے لئے بدتر جان رہا ہوں اور یہ تمام کیفیت بحالت سکر ہوئی ہے۔

حضرت داتا گنج بخشؒ نے لکھا ہے کہ بڑائی یہ ہے کہ عارف کی نظر میں سونا سونا ہو اور پتھر پتھر مگر ان کی آفات پر ان کی نظر ہو۔ وہ سونے چاندی سے صاف کہتے ہیں کہ میرے سوا کسی اور کو مغرور بنا میں تیرے ساتھ مغرور نہیں ہو سکتا۔ جس پر سیم و زر کی آفات کھل جائے اس کے لئے یہ آفت نہیں ہیں اور اس سے ان پر حجاب نہیں آتا بلکہ وہ اسے ترک کرتے ہیں اور اس کا ثواب پاتے ہیں۔

چرواہے کی کرامت اور حضرت ابراہیم بن ادھمؒ

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ ایک چرواہے کے پاس سے گزرے تو اس سے فرمایا۔ تمہارے پاس پانی یا دودھ کا گھونٹ ہوگا؟ اس نے کہا آپؒ ان میں سے کیا چاہتے ہیں؟ آپؒ نے فرمایا: پانی پس چرواہے نے اپنے

ڈنڈے کو پتھر پر مارا تو اس سے چشمہ آب پھوٹ پڑا۔ آپؒ نے پانی پیا اور حیرت زدہ رہ گئے۔ چرواہے نے کہا "تعجب مت کیجئے" اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا اَطَاعَ مَوْلَاهُ اَطَاعَهُ كُلُّ شَیْءٍ" (بیشک بندہ جب اپنے مولیٰ کی اطاعت کرتا ہے تو ہر چیز اس کی اطاعت کرتی ہے۔ (الکواکب الدریہ ج ۱ ص ۱۹۷)

دریائے نیل کی طرف خط

قیس حجاج بیان کرتے ہیں کہ جب مصر فتح ہوا تو اہل مصر حضرت عمروؓ بن العاص کے پاس آئے اور کہنے لگے: اے امیرؓ! ہمارے اس دریا کا ایک معمول ہے جس کے بغیر یہ جاری نہیں ہوتا آپؓ نے فرمایا وہ کیا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ جب یہ مہینہ داخل ہوتا ہے تو اس کی بارہ تاریخ کو ہم ایک کنواری لڑکی کو تیار کرتے ہیں اسے زیورات سے سجاتے ہیں اور اس کے والدین کو راضی کر کے اسے دریا کی نذر کر دیتے ہیں۔ آپؓ نے فرمایا اس بات کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے، اسلام اپنے ماقبل کی ہر رسم بد کو مٹا دیتا ہے۔ اس کے بعد آپؓ نے وہ مہینہ اور کچھ مزید ایام انتظار فرمایا لیکن دریائے نیل تھوڑا یا زیادہ جاری نہ ہوا۔ پھر آپؓ نے صورت حال امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجی۔ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مکتوب روانہ فرمایا اور اس کے اندر ایک خط علیحدہ دریائے نیل کے نام لکھا اور حضرت عمروؓ بن العاص کو حکم فرمایا کہ یہ اندر والا خط دریائے نیل میں ڈال دو۔ آپؓ نے اسے کھول کر دیکھا تو اس میں لکھا ہوا تھا "اے دریا! اگر تو از خود چلتا تھا تو مت چل اور اگر تجھے اللہ تعالیٰ چلاتا ہے تو ہم اسی سے عرض کرتے ہیں کہ وہ تمہیں جاری کر دے۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے وہ خط ڈالا تو دریا جاری ہو گیا اور بارہ ہاتھ اونچا بہنے لگا اور تب سے اب تک ایک ہی حالت پر جاری ہے اور لوگوں کی اس رسم بد سے جان چھوٹ گئی۔ (کرامات اولیاء اللہ للا لکائی ج ۲ ص ۲۶۰)

حضرت ابراہیم الخواصؒ کی کرامت اور راہب کا قبول اسلام

حضرت ابراہیم الخواصؒ حضرت جنیدؒ بغدادی کے ساتھیوں میں سے ہیں انہیں ایک مرتبہ کسی صحرا میں ایک نصرانی ملا جس نے زنار پہن رکھا تھا۔ اس نے آپ کی صحبت میں رہنے کی درخواست کی۔ پس آپ اور وہ مسلسل سات روز سفر میں رہے ایک دن وہ آپؒ سے کہنے لگا۔ اے دین حنیف (اسلام) کے زاہد! تیرے پاس جو کرامت ہو پیش کر، بے شک ہم سخت بھوکے ہیں آپؒ فرماتے ہیں میں نے کہا الٰہی لَا تَفْضَحْنِیْ مَعَ هٰذَا الْكَافِرِ (اے میرے معبود! مجھے اس کافر کے سامنے رسوا نہ کر) پس اچانک ایک تھال اترا جس میں روٹیاں، بھنا ہوا گوشت تازہ کھجوریں اور پانی کا کوزہ تھا۔ پھر ہم سات دن چلتے رہے اور میں نے کہا: اے نصرانیوں کے راہب! اب تیری باری آ پہنچی پس تیرے پاس جو قوت ہے اس کا اظہار کر۔ پس اس نے اپنی

لاٹھی کا سہارا لیا اور دعا مانگنے لگا تو اچانک دو تھال نمودار ہوئے جن پر میرے تھال سے دوگنا چیزیں تھیں تو میں حیران رہ گیا اور میں نے کھانے سے انکار کر دیا تو اس نے میری منت سماجت کی، لیکن میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کہنے لگا آپ کھایئے میں آپ کو دو بشارتیں دیتا ہوں ایک یہ کہ بیشک میں مسلمان ہو چکا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے زنار توڑ ڈالا۔ دوسری یہ کہ میں نے اپنی دعا میں کہا اے اللہ! اگر اس بندے کا کوئی مقام ہے اور یہ حق ہے تو مجھ پر اس کا حق ہونا ظاہر فرما (کھانا اتار) تو مجھ پر یہ فتح ہوئی۔ (الکواکب الدریۃ ج ا قسم ثانی ص ۵۰۱)

باب ۳۹

حصہ ہشتم

(کائنات میں مقامِ آدم)

کائناتِ کُن فکاں میں انسان کی ہستی کا تعین

تخلیقِ کائنات میں خالق کا حُسن

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو نہایت حسین انداز میں تخلیق فرمایا۔ اس میں طرح طرح کی مخلوق کو وجود بخشا۔ اللہ تعالیٰ خود بھی جمیل ہے اور اس نے کائنات میں جن چیزوں کو پیدا کیا ان میں اس کے اپنے کمال اور جمال کا عکس نظر آتا ہے کیونکہ خالق کے کمالات اس کی تخلیق میں بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

ترا شیدم صنم بر صورتِ خویش بشکلِ خود خدا را نقش بستم

(میں اپنی شکل پر ہی بتوں کو بناتا ہوں اور اپنی شکل کے مطابق ہی خدا کا نقش باندھتا ہوں۔)

مرا از خود بروں رفتن محال است بہر رنگے کہ ہستم خود پرستم (پ۔م: ۲۳۸)

(میرا اپنے آپ سے باہر نکلنا محال ہے، میں جس رنگ میں بھی ہوتا ہوں خود پرست ہوں۔)

اس کائنات کے نظامِ تخلیق کو دیکھ کر ہر ذی عقل (انسان) یہ سمجھ سکتا ہے کہ کائنات کے تخلیق کی کیا غرض و غایت تھی اور اس کائنات کو کس کام کے لئے پیدا فرمایا۔ اگر ہم یہی سوال قرآن کریم سے کریں تو ہمیں یہ جواب ملتا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (الذاریٰت: ۵۶) اور نہیں پیدا فرمایا میں نے جن و انس کو مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں۔

اس آیت کی مزید تحقیق کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "لیعبدون" کا مطلب ہے لیعرفون یعنی جنوں اور انسانوں کی تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کی معرفت حاصل کریں یا یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پہچان کر سکیں۔ انسان اس بات سے قاصر ہیں کہ ہم اللہ کی معرفت (پہچان) حاصل کر سکیں کیونکہ ایک حدیث کے مطابق رسول

اللہ ﷺ نے فرمایا وَمَا عَرَفْنٰکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ (اسلامی تربیتی نصاب جلد اوّل از ڈاکٹر طاہر القادری) (یعنی اے اللہ ہم تجھے پہچاننے کا حق ادا نہیں کر سکتے۔) معرفتِ الٰہی پر ایک مضمون اس کتاب میں بھی شامل کر دیا گیا ہے اور یہاں معرفت حاصل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جتنی زیادہ معرفتِ الٰہی حاصل ہو سکے حاصل کی جائے۔ ہم جو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں، دین میں تفکر کرتے ہیں یا تصوف کی طرف توجہ دیتے ہیں تصوف اور تفکر کا مقصد بھی معرفتِ الٰہی حاصل کرنا ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پہچان کا یہ حصہ معلوم کرنے کے بعد ہی منشاء تخلیق کو پہچانا جا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سینۂ کائنات میں ایک راز تھا

بہت سے علوم جو اسلام کی تفہیم کے لئے رائج کئے گئے ہیں۔ اُن سے بھی اللہ تعالیٰ کی پہچان کی جا سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ ہم اس بات پر غور کریں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات قدیم ہے اور ازل سے ہی وہ اس کائنات کے خالق کی حیثیت سے موجود ہے مگر یہاں اگر قرآن کریم سے ہی سوال کیا جائے تو وہ یہ کہتا ہے وَّ کَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ (ھود: ۷) اور (اس سے پہلے) اس کا عرش پانی پر تھا گویا کہ اس وقت کوئی مخلوق موجود نہیں تھی۔ ایسی حالت میں اس بات پر بھی غور کرنا ضروری ہے کہ ازل سے ہی اللہ تعالیٰ کی صفات بالذات موجود تھیں مگر چونکہ کوئی مخلوق موجود نہ تھی اس لئے اللہ تعالیٰ کی ذات کو کوئی رزّاق، رحیم، رحمٰن وغیرہ کے ناموں سے نہیں پکارتا تھا کیونکہ یہ پکار اس وقت ہی ممکن ہوتی جب کوئی مخلوق وجود میں ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا تا کہ وہ اسے اس کے صفاتی اور ذاتی ناموں سے پکارے۔ یہ حقیقت اس حدیث قدسی سے واضح ہوتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

کُنْتُ کَنْزًا مَخْفِیًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ (موضوعات کبیر۔ص: ۹۳)

میں ایک مخفی خزانہ تھا پھر میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں تو میں نے مخلوق کو پیدا فرمایا۔

مستند احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے حضور کریم ﷺ کے نور کو پیدا فرمایا پھر ان کے نور سے ۱۸۰۰۰ قسم کی مخلوقات کو پیدا فرمایا۔ علامہ اقبالؒ نے انسان کی تخلیق پر متعدد مقامات پر کلام کیا ہے جس کا اس تحریر میں لانا ایک مشکل امر ہے۔ یہاں علامہ اقبالؒ کے کچھ اشعار شامل کیے جا رہے ہیں جن میں انسان کی فطرت، قدرت، کمالات اور بزرگی کا ذکر کیا گیا ہے اور علامہؒ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق فرما کر اپنے تمام مخفی رازوں کو انسان کے ذریعے ہی افشا کر دیا ہے۔

بزمِ کائنات کا مقصود

راقم الحروف کی ایک کتاب ''حضورِ قلب'' میں اس مذکورہ بالا حقیقت کو افشا کرنے کی کچھ توضیح کی گئی

ہے۔(دیکھیں حضور قلب کے صفحات نمبر ۲۱۵ تا ۲۴۸) ان صفحات میں بیان کردہ حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے لئے پیدا فرمایا تا کہ (وہ خدا کی پہچان کرے) اور اللہ تعالیٰ کی پہچان کے بعد اس سے راز و نیاز اور دوستانہ تعلقات یعنی ولایت والی دوستی پیدا کرے۔ مخلوقات میں سے کوئی بھی جنس ایسی نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دوستی کے تعلقات پیدا کر سکے کیونکہ اس کی جنس سے کائنات میں کسی کا ہونا۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کے اعتبار سے ناممکنات میں سے ہے۔ انسان کے علاوہ باقی ماندہ مخلوقات قطعی طور پر اللہ تعالیٰ سے دوستی کا میل جول نہیں رکھ سکتی۔ منشاءِ الٰہی کیونکہ انسان کے ساتھ یاری دوستی لگانا تھا اسی لئے ناممکن کو ممکن کرنے کیلئے اس نے درج ذیل انتظامات کیے۔ جب کسی کو کسی سے محبت ہو جائے تو وہ خود ہی اس کی راہیں متعین کر دیتا ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ باقی مخلوقات میں سے بکری، گھوڑا، بیل اور شیر کے علاوہ دوسری مخلوقات اس نوعیت کی تھیں کہ ان کا اللہ تعالیٰ سے دور تک کا واسطہ نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ دوستی ہو سکے۔ یہی بات انسان کے لئے کہی جا سکتی ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی اتنی بڑی ذات کا انسان کے ساتھ کس طرح تعلق ہو سکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا میرا دل اللہ تعالیٰ کی تنہائی کو دیکھ کر جلتا ہے چنانچہ میں اس کے ساتھ محفل سجانے کا سامان مہیا کر رہا ہوں۔

مرا دل سوخت بر تنہائیِ او ۔ کنم سامانِ بزم آرائیِ او (ز۔ع:۵۶۶)

(میرا دل اس کی تنہائی کو دیکھ کر جلتا ہے، میں اس کیلئے بزمِ آرائی کا سامان کر رہا ہوں۔)

اللہ تعالیٰ کے لئے انسان کی دل لگی (دوستی) کا سامان پیدا کرنا اس لئے بھی مشکل تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس قدر پُر جلال ہے کہ اس نے اپنے بندوں کے درمیان ستر ہزار پردے حائل کر رکھے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ دُوْنَ سَبْعِيْنَ اَلْفَ حِجَابٍ مِنْ نُوْرٍ وَّ ظُلْمَةٍ (المعجم الکبیر للطبرانی ج:۶ ص:۱۴۸)	بیشک اللہ تعالیٰ نے نور اور تاریکی کے ستر ہزار پردے (اپنے بندوں کے درمیان) رکھے ہیں۔

مذکورہ پردوں میں سے ایک پردہ بھی اُٹھا دیا جائے تو پوری کائنات جل کر راکھ ہو جائے، چنانچہ اس دوستی کا نبھانا فطرتی طور پر ناممکن تھا۔ اس اعتراض کو اللہ تعالیٰ نے بندۂ مومن کے لئے استثنیٰ کر دیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ

لَايَسَعُنِىْ اَرْضِىْ وَلَاسَمَائِىْ وَوَسِعَنِىْ قَلْبُ عَبْدِى الْمُؤْمِنِ اللَّيِّنِ الْوَدَاعِ (احیاء العلوم: ج۔۳ ص ۱۲)	میری ذات نہ تو زمین میں سما سکتی ہے اور نہ آسمانوں میں مگر میرے نرم خو بندے کے دل میں میری ذات سما سکتی ہے۔

اس کی توضیح یہ ہے چونکہ اللہ تعالیٰ لامکان ہے اس لئے اس کا مکان (اس کائنات) میں سمانا ممکن نہیں ہے، البتہ مومن کے دل کو لامکانیت کا درجہ دے دیا۔ اس حدیث کی رو سے انسان کے دل (لامکان) میں اللہ تعالیٰ (لامکان) کا سمانا ممکن ہو گیا۔ کافر کا دل اس لامکانیت کے درجے سے خارج ہے۔ جب اللہ تعالیٰ

چاہے تو کیا نہیں ہوسکتا بلکہ اس قرب کی مشکل کا حل اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ میں تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں جیسے فرمایا۔

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (ق:۱۶)　ہم تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

ایک اور بڑی بات یہ ہے کہ دنیا کے جاندار اور بے جان چیزوں کی شکل میں اللہ تعالیٰ سے مماثلت نہیں مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی دوستی کو قائم کرنے کے لئے انسان کو اپنی شکل عطا کردی۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ

خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ　اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا۔

(صحیح بخاری: ج ۴ ص ۵۶)

تیسری بڑی بات یہ ہے کہ خدا کی اتنی بلند و بالا ہستی کا معمولی ہستی سے رابطہ ہونا روا نہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا نائب مقرر کردیا اور اس کو تمام تصرفات اور قوتوں کا مالک بنادیا۔ انسان کو ان تصرفات پر فائز کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو دنیا کی تمام چیزوں کا مکمل علم دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (البقرۃ:۳۱)　اور اللہ تعالیٰ نے سکھا دیئے آدمؑ کو تمام اشیاء کے نام

انسان کو جو تصرف عطا کیا گیا ہے اس کا ذکر علم الاسماء کے زمرے میں اس کتاب کے مقدمہ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ انسان کو ہر فن اور علم کا مکمل ماہر بنادیا اور اس کائنات میں ہر بات پر اسے قادر بنادیا اور تسخیر کائنات کا ملکہ بھی عطا فرمادیا ہے۔ انسان کی روح کو اس قدر تصرف عطا کیا کہ اگر وہ چاہے تو پوری کائنات کو ایک لقمہ میں ہڑپ کرسکتی ہے اور جو بات اس کے ذہن میں آجائے تو وہ اسے عملاً کرنے پر بھی قادر ہے۔

کائنات میں انسان کے تصرفات

مذکورہ بالا تصرفات کے علاوہ انسان کو اور بہت سی قوتوں اور راز و نیاز کا اختیار دیا جس کا ذکر اس محدود بیان میں کرنا ممکن نہیں البتہ علامہ اقبالؒ کے چند اشعار موقع کی نزاکت کے مطابق نیچے بیان کیے جارہے ہیں۔ ان کا مختصر بیاں ملاحظہ فرمائیں جس میں انسان کی کچھ خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے۔

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات!　غلغلہ ہائے الاماں! بتکدۂ صفات میں!
حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں　میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں!
گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقشبند　میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں
گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود　گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں!
تو نے یہ کیا غضب کیا! مجھ کو بھی فاش کر دیا　میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

(ب۔ج:۲۹۷)

پہلے شعر میں علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا بالمشافہ دیدار ممکن نہیں لیکن میری نوائے شوق اس قدر تیز تھی کہ اس کے جذبے نے اُسے تمام بالائی مقامات کو جوعرش میں ہی موجود تھے چیر کے اللہ تعالیٰ تک پہنچادیا۔ اس فریاد کے راستے میں صفات کے بت حائل ہو جاتے ہیں جو میری فریاد کوعرش پر جانے سے روکتے ہیں۔ لیکن جب علامہؒ کا تخیل عرش تک جاپہنچا تو یہ صفات کے بت پریشان ہوکر شور کرنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا کی پناہ یہ شخص ہمیں راستے سے ہٹا کر براہ راست عرش تک جا پہنچا ہے۔ عرش والے تو علامہؒ سے اتنا خطرہ محسوس کرتے ہیں کہ حضرت اسرافیلؑ نے اللہ تعالیٰ سے شکایت کی کہ انہیں یہ خطرہ ہے کہ یہ شخص اپنے جذباتِ نوا سے کہیں وقت سے پہلے ہی قیامت برپا نہ کردے۔

حضورِ حق میں اسرافیلؑ نے میری شکایت کی   یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا

(ب۔ج:۳۱۵)

علامہ اقبالؒ دوسرے شعر میں فرماتے ہیں کہ میرے تخیلات اس قدر بلند ہیں کہ حور و فرشتہ کو اسیر کر سکتے ہیں اور میں ان کو اپنے سامنے حاضر کر لیتا ہوں۔ آپؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ میرے تخیلات اتنے بلند ہیں کہ میں اس سے اللہ تعالیٰ کی تجلیات کو بھی بدل دیتا ہوں اور خدا کے جلوؤں کو بھی دیکھ لیتا ہوں۔ خدا کی تجلیات میں خلل ڈالنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تو قسمت کے تیر چلاتا ہے مگر میں اُن کو بھی اپنی روحانیت سے بدل دیتا ہوں۔

تیسرے شعر میں علامہؒ نے فرمایا ہے کہ انسان ہمیشہ سے خدا کی تلاش میں رہا ہے اور جب یہ ممکن نہ ہوسکا تو اُس نے دیر و حرم کی عبادت گاہیں بنائیں لیکن خدا کی تجلی نظر نہ آئی۔ اس پر انسان خدا کے حضور اپنی خواہش کا اظہار کرتا رہا مگر دیر و حرم کے متولیوں نے لوگوں کو عبادت گاہوں تک محدود رکھا اور خدا تک رسائی چاہنے والوں کے خلاف ہوگئے۔ ان کے خیالات منتشر کر کے خدا تک پہنچنے میں رکاوٹ بنے۔

مذکورہ بالا نظم کے چوتھے شعر میں علامہؒ فرماتے ہیں کہ انسان بعض روحانی کیفیات کی وجہ سے کائنات کا وجود چیر کر اپنے مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ جذبات میں شدّت کی وجہ سے بہت بلند مقامات کو بھی طے کر لیتا ہے مگر بعض اوقات نفسانی خواہشات اور دیگر نفسانی کمزوریوں کے باعث مقامات بلند طے کرنے سے قاصر رہتا ہے اور توہمات کی دنیا میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ اس حالت میں اس کی روحانی پرواز ختم ہو جاتی ہے اور وہ عام انسانوں کی طرح ناکارہ رہ جاتا ہے۔ تاوقتیکہ ان بیماریوں کا ازسرِ نو ازالہ نہ کرے۔

پانچویں شعر میں علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ کائنات کی تخلیق سے پہلے اللہ تعالیٰ کی پہچان نہیں ہوسکتی اور پھر جب مخلوقات کو پیدا کیا تو یہ مہم درپیش تھی کہ اس کائنات کا سردار (خدا کا نائب) کس کو بنایا جائے اور نیابت کا تاج کس کے سر پر رکھا جائے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کی اچھائی یا برائی کو جانتا تھا چنانچہ اس کی رضا یہ تھی کہ خلیفۃ اللہ فی الارض کا منصب سنبھالنے کے قابل صرف انسان کو ہی بنایا جائے

مگر فرشتوں اور جنوں کو اس پر اختلاف تھا اور ہر کوئی خود کو اس منصب کے لائق سمجھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں اور آدمؑ کا امتحان لیا تو آدمؑ کی برتری کو فرشتے سمجھ گئے اور آدمؑ کو خلافت کا منصب سنبھالنے کے قابل سمجھا اور اُن کو سجدہ کر دیا۔ مگر ابلیس اپنی برتری کے احساس پر قائم رہا چنانچہ اس کو راندۂ درگاہِ الٰہی قرار دے کر جنت سے نکال دیا۔ امتحان سے پہلے اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم الاسماء کی افادیت سے نواز دیا۔ جس کی وجہ وہ نیابتِ الٰہی کا اہل تصور کیا گیا۔ علم الاسماء کے باعث آدمؑ کو تمام ممکنہ علوم سے نواز دیا گیا (جس کا مختصر ذکر اس کتاب کے مقدمہ میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔) اس علم کے باعث انسان کی ذات اس قدر بلند سمجھی جانے لگی کہ اس کا کوئی ہمسر ہونے کی جرأت نہ کر سکا۔

انسان نے خدا کے اسرار و رموز ظاہر کر دیئے

پانچویں شعر میں علامہ اقبالؒ اللہ تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں کہ الٰہی تو نے زمین و آسماں (اور پوری کائنات) کا علم مجھے دے کر اپنی شان و شوکت اور ذاتِ اعلیٰ صفات کے خصوصی راز تمام اہل کائنات میں سے صرف مجھے عطا کر کے خود اپنی ذات کو ہی فاش کروا دیا۔ علامہ اقبالؒ کے خیال میں اس راز کا علم انسان کو عطا کر کے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے مخفی رازوں کو افشا کر دیا۔ علامہؒ اس راز کی باتوں کو فاش کرنے کی ذمہ داری خدا پر عائد کرتے ہیں کیونکہ اُسی نے یہ تمام راز انسان کو دیئے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا کی طاقت اور بے نیازیوں کا بھرم کسی پر نہ کھلتا۔ اس بات کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس راز کا حامل ہونے کی وجہ سے انسان کا مقام تمام کائنات میں بڑھا دیا گیا اور ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ نے خود ہی اپنے رازوں کو افشا کر دیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی محبت کے لئے پیدا فرمایا اور اس نے انسان کے لئے اپنی محبت کا میدان بہت کھلا اور وسیع رکھا۔ جتنا کوئی اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی اس سے اتنی ہی زیادہ محبت رکھتا ہے۔ اس نے فرمایا تم مجھے یاد کرو تو میں فرشتوں کی محفل میں تمہیں یاد کروں گا۔ اگر تم مجھ سے محبت کرو گے تو تم جدھر بھی منہ کرو گے اُدھر ہی میرا جلوہ پاؤ گے۔ جیسا کہ فرمایا۔

فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (البقرۃ:115) سو جدھر بھی تم رُخ کرو وہیں ذاتِ خداوندی ہے۔

فرمایا کہ تم میری تلاش میں رہو گے تو میں تمہاری تلاش میں رہوں گا۔ حدیث نبویؐ ہے کہ

مَنْ كَانَ لِلّٰهِ كَانَ اللّٰهُ لَهٗ (کشف الاسرار) جو اللہ کا ہو جائے تو اللہ بھی اس کا ہو جاتا ہے۔

علامہ اقبال نے فرمایا ؎

ما از خدائے گم شدہ ایم او بہ جستجوست چوں ما نیاز مند و گرفتار آرزوست (ز-ع:485)

(ہم اللہ تعالیٰ کی گم شدہ متاع ہیں اور وہ مردِ کامل کی جستجو میں ہے، وہ ہماری طرح خواہشمند ہے اور وہ ہماری آرزو میں رہتا ہے۔)

خدا کے فراق میں تڑپنا مقصودِ کائنات ہے۔ اسی طرح خدا کو بھی ہمارے وصل کے بغیر قرار نہیں یہی محبت کا اصول ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس طرح کا ہمہ وقت رابطہ رکھنا اور خدا اور بندے کے درمیان تعلقات کو استوار رکھنا ہی طریقت کی روح ہے اور یہ وہ سمندر ہے جس کا کوئی کنارا نہیں۔ اهل اللہ عمر بھر اللہ تعالیٰ سے ایسے روابط قائم رکھتے ہیں اور اسی تعلق کو ہی اهل اللہ طریقت سمجھتے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے طریقت اور اس کے جہاں کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ طریقت کا مضمون اس سے وسیع تر ہے جسے اس کتاب میں لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مضمون کا احاطہ کرنا ان کتابوں اور بیانات سے باہر کی بات ہے۔

انسان کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی تخلیق کی غرض و غایت کیا ہے؟ اس مضمون کا مطالعہ تو کسی حد تک سائنس کی کتابوں کے مطالعہ سے بھی سمجھ میں آتا ہے مگر اس کا روحانی پس منظر بیان کرنا روحانی کتب کا ہی خاصہ ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں مقامِ آدم، بشریت اور ملکیت کے مختلف انداز کے علاوہ وجدان اور اس کے افکار پر کچھ تحریریں پیش کی گئی ہیں جس سے انسان کے مقامات کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔

باب ۴۰

مقامِ بشریت اور ملکیت

(انسان اور فرشتے میں فرق)

بزمِ قدرت میں انسان کا مقام

بزمِ قدرت میں انسان کو صاحبِ صدر کی حیثیت حاصل ہے۔ اگر وہ احکاماتِ الٰہی کا پابند ہو جائے تو اسے اس خلافت یا نیابت الٰہی کا شرف عطا کیا جاتا ہے۔

بانگ درا میں علامہ اقبالؒ نے بزم قدرت کو مخاطب کرتے ہوئے اس کی خوبیاں بیان کیں اور انسان کی ظلمت اور سیہ بختی کا پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ انسان اپنی خوبیوں سے خبردار نہیں اور اگر وہ اپنی پہچان کر لے تو اس کی سیہ بختی دور ہو جائے گی۔ علامہ اقبالؒ بزمِ قدرت کا جواب یوں لکھتے ہیں۔

انجمن حسن کی ہے تو تری تصویر ہوں میں عشق کا تو ہے صحیفہ' تیری تفسیر ہوں میں (ب۔د:۵۵)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ مسلمانو! اس بات کو غور سے سنو کہ قرآن میں آیہ تسخیر کس کی شان میں آئی ہے جس میں فرمایا۔

وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (الجاثیہ:۱۳)

اور اس نے مسخر کر دیا تمھارے لئے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب اپنے حکم سے۔

علامہ اقبالؒ اسرارِ خودی میں فرماتے ہیں۔

نائب حق در جہاں آدم شود بر عناصر حکمِ او محکم شود (ا۔خ:۱۴۲)

(دونوں جہانوں میں خدا کا نائب انسان ہوتا ہے اور اس کا حکم ہر عنصر (آگ' ہوا' پانی' خاک) پر چلتا ہے۔)

آیہ تسخیر اندر شانِ کیست؟ ایں سپہر نیلگوں حیران کیست؟

(یہ آیہ تسخیر کس کی شان میں آئی ہے۔ یہ نیلا آسمان کس (کی قدرتوں) پر حیرت زدہ ہے۔)

راز داں عَلَّمَ الْاَسْمَاءَ کہ بود؟ مست آں ساقی و آں صہبا کے بود؟

(عَلَّمَ الاسماء کا راز داں کون ہوا؟ اس ساقی کی شراب الست سے کون سرمست ہوا؟)

بر گزیدی از ہمہ عالم کرا؟ کردی از راز دروں محرم کرا؟

(تونے کس کو چن لیا اور اشرف بنایا؟ اور راز کائنات کا کس کو محرم بنایا؟)

اے ترا تیرے کہ مارا سینہ سفت حرف "اُدْعُوْنِي" کہ گفت و باکہ گفت؟

(ج۔ن:۵۹۶)

(آپ کے تیر (ہجر) نے ہمارا سینہ چھید ڈالا۔ مجھے پکارو (میں جواب دوں گا) کس نے کہا اور کس سے کہا؟)

انسان کو مٹی سے بنانے کی حکمتیں

تفسیر نعیمی میں انسان کو مٹی سے بنانے کی مندرجہ ذیل حکمتیں بیان کی گئی ہیں۔

(۱) مٹی میں تواضع وانکساری ہے۔

(۲) مٹی میں عیب پوشی ہے۔

(۳) انسان کو زمین کی خلافت کے لیے پیدا فرمایا لہٰذا اسے مٹی سے بنایا تاکہ زمین سے قوی تعلق رہے۔

(۴) مٹی آگ کو بجھا دیتی ہے تاکہ انسان حرص وہوس، شہوت اور حسد کی آگ کو مٹی سے بجھادے۔

(۵) مٹی پانی میں مل کر مختصر صورتیں اختیار کر لیتی ہے، انسان میں تمام عناصر موجود ہیں اور پھر "کن" فرما کر روح پھونکی، چنانچہ انسان عالم خلق اور امر کا مجموعہ ہے۔ یعنی صورتاً بشر ہو یا سیرتاً فرشتہ "خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ" (آل عمران:۵۹) (بنایا اسے مٹی سے پھر فرمایا اُسے ہو جا تو وہ ہو گیا) جو چیزیں عالمِ خلق سے ہیں (مثلاً عالمِ سفلی، عالمِ علوی، عالمِ اجسام، عالمِ انوار، عالمِ امر وغیرہ) یہ تمام لفظ "کن" سے بنے ہیں اور جو بلا واسطہ محض رب کے حکم سے بنیں، وہ عالم امر کہلاتی ہیں۔ انبیائے کرام خلق اور امر کا مجموعہ ہیں، ان کی جسمانیت عالم خلق سے ہے اور نورانیت عالم امر سے۔ خلق کے لئے تراب کا ذکر فرمایا (خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ) (اللہ تعالیٰ نے اسے مٹی سے بنایا) اور اس کے بعد "كُنْ فَيَكُوْنُ" کا لفظ فرمایا۔ روح کو ہم نہیں جان سکتے کیونکہ ہم سفلی لوگ ہیں اور روح علوی ہے۔ ہم سورج کی روشنی کو دیکھ سکتے ہیں لیکن اگر سورج کو دیکھیں تو آنکھیں پھوٹ جاتی ہیں، لہٰذا نبیؑ کی حقیقت پر غور کریں تو ایمان کی آنکھیں پھوٹ جاتی ہیں۔ انبیائے کرامؑ ہم جیسے نہیں ہیں۔

اللہ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا

کافر اپنا فطری دین جو عدم سے لایا تھا، کھو بیٹھا ہے۔ اس لیے اسے خاسر کہا جاتا ہے (خاسر وہ تاجر جو بجائے نفع کے اپنے اصل مال کو بھی کھو بیٹھے) جیسا کہ فرمایا۔

وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہے۔ (آل عمران: ۸۵)

جو اصل ایمان کھو بیٹھتا ہے۔ اسے نیکیوں کا بدلہ کیا ملے گا۔ ایمان کھونا اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرمایا۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ (آل عمران: ۸۶) کیسے ہوسکتا ہے کہ ہدایت دے اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو جنہوں نے کفر اختیار کر لیا ایمان لے آنے کے بعد۔

"یھدی" کا مطلب ہے کہ دین کا راستہ دکھانا یا منزل کی طرف پہنچانا یا توفیق خیر دینا یا ان کے دل میں معرفت پیدا کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے کافر کو ظالم کہا ہے کیونکہ وہ کفر کے ذریعے اپنے نفس کا حق مارتا ہے اور کفر کے ذریعے خود کو جہنم تک پہنچاتا ہے یا یہ کہ وہ رب کی چیز کو غیر جگہ استعمال کرتا ہے (یعنی نافرمانی میں) اسی لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (التوبہ: ۱۹) اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

انسان کی بشریت فرشتوں کی نورانیت سے بلند مقام رکھتی ہے

عامۃ المسلمین اکثر اوقات اس نزاع میں الجھے ہوئے نظر آتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بشر تھے یا نور۔ اس نزاع میں بعض لوگ تو ایک دوسرے پر کفر کا فتویٰ لگانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ قرآن کی آیات میں اور احادیث پر معمولی غور کرنے کے بعد یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو تمام مخلوقات میں سے افضل ترین شرف عطا فرمایا جو کہ شرف بشریت کے جامے میں نمودار ہوا۔ اس مشاہدے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بشریت کا مقام فرشتوں کی نورانیت سے اعلیٰ اور ارفع ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی فرشتوں کی نورانیت کو انسانوں کی بشریت سے زیادہ افضل قرار دے۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

(ب۔ج: ۳۱۹)

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلے پر اپنی مثنوی میں بہت کلام کیا ہے اور ایک شعر میں ہی اس تمام بحث کو سمیٹ لیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کا درجہ اس قدر بلند ہے کہ ہزاروں جبرئیلؑ آپ کی ذات مبارکہ میں محو ہو جائیں تو بھی تعجب کی بات نہیں۔ دوسرے مصرعے میں آپ حضور اکرم ﷺ سے ایک نظرِ عنایت کے طلب گار ہیں۔

اے ہزاروں جبرئیلؑ اندر بشر
بہرِ حق سوئے غریباں یک نظر (تشبیہات رومی)

(یارسول اللہ ﷺ آپ وہ بشر ہیں کہ جس میں ہزاروں جبرائیل سما جائیں' خدا کے لیے ہماری طرف ایک نظر فرمائیں)

قرآن مجید اور سیرت کی کتب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پوری کائنات کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۞ اور نہیں بھیجا ہم نے آپ (ﷺ) کو مگر تمام عالموں کے لئے رحمت بنا کر۔ (الانبیاء:۱۰۷)

مذکورہ بحث سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جبرائیل علیہ السلام جو نورانی مخلوق کے سردار ہیں' اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ آپ محمد مصطفیٰ ﷺ کے دربان' پیغام رساں اور ہمیشہ آپ کے زیر احسان رہے۔

حکیم الامت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے کلام میں (جس کی کچھ تفصیل نیچے دی جارہی ہے) فرمایا ہے کہ کامل ولی اللہ اور ذی شان مسلمان کے لئے یہ بات کچھ زیادہ حیرت انگیز نہیں کہ وہ ایک جلے ہوئے بال سے جبرائیل علیہ السلام کو اپنے ہاتھ پر سدھائی ہوئی چڑیا کی طرح بٹھا سکتا ہے۔ اگر فرشتوں کی مخلوقات اور فرشتوں کی نورانیت اعلیٰ ترین درجہ کی حامل ہوتی تو انسان کو تخلیق کرنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ بشریت کا درجہ ملکیت سے بڑھ جانے کی یہ دلیل کافی ہے کہ تخلیق کائنات کی تکمیل انسان کے پیدا ہونے کے بعد ظہور میں آئی۔ جو لوگ نورانیت کو بشریت سے بلند درجے پر فائز ہونا خیال کرتے ہیں وہ ایسا ہی کہتے ہیں جیسے ایک قوم کی بڑھیا نے ایک ڈپٹی کمشنر کو ان الفاظ میں دعا دی "بیٹا خدا تمہیں پٹواری کے عہدہ پر ترقی دے"۔ انسان کے مقام کے متعلق کچھ اندازہ حاصل کرنے کے لئے اگلے باب میں مقام آدم سے متعلق کچھ معلومات فراہم کی جارہی ہیں۔

انسان کو بشری اور ملکوتی جہتوں سے سرفراز کیا گیا ہے

اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور فرشتوں میں سے ہر دو کو بشری اور ملکوتی جہتیں عطا فرمائی ہیں۔ فرشتوں پر ملکوتی جہت کو غالب فرمایا لیکن ان کو اس بات کا بھی اختیار دیا گیا ہے کہ جب چاہیں بشری جہت اختیار کر لیں، چنانچہ جبرائیل علیہ السلام انسانی شکل میں حضور اکرم ﷺ کے پاس تشریف لاتے رہے (دیکھیے حدیث جبرائیل) انسانوں کو بھی اسی طرح بشری اور ملکوتی صفات سے نوازا گیا، لیکن ان پر بشری جہت کو غالب فرمایا کہ عام طور پر وہ بشری تقاضوں کے پابند رہتے ہیں، لیکن جب روحانی قوت ان پر غلبہ حاصل کر لے تو بشری تقاضے وقتی طور پر اٹھ جاتے ہیں اور وہ ملکوتی جہت کو بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ جب انسانوں پر ملکوتی جہت غالب ہو جائے تو اسباب ان سے اٹھ جاتے ہیں اور وہ مسبب الاسباب (یعنی اللہ تعالیٰ) پر تکیہ کرتے ہیں۔ اس صورت میں ان کا یقین علم الیقین سے بڑھ کر حق الیقین کا درجہ اختیار کر لیتا ہے۔ اس حالت میں اگر وہ دریا کو

عبور کرنا چاہیں تو کشتی کی حاجت نہیں رہتی۔

انسانوں کو ملکوتی جہت پر قدرت ریاضتوں اور مجاہدوں کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی عبادت بھی انسانوں کی روحانیت میں اضافہ کرتی ہے۔ اگر آپ وضو کریں تو آپ اپنے دل میں تزکیہ اور تجزیہ کی نورانیت محسوس کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بندے پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا فضل اور احسان یہ ہے کہ اسے دو رکعت نماز پڑھنے کی توفیق دی جائے۔ جو شخص رات کو نوافل ادا کرتا ہے تو دن کو اس کا چہرہ چمکتا ہے۔ دو رکعت نماز ادا کرنے سے بندے کو فرشتوں کے دو پروں جتنی طاقت عطا کی جاتی ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ مداومت کے ساتھ دو رکعت نماز تحیۃ الوضو ادا فرمایا کرتے تھے، ان کے اس فعل کی بدولت نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی کھڑاؤں کی آواز معراج کی رات عرش پر پہنچنے سے پہلے سنی۔ اس کے برعکس جو لوگ اپنے دلوں میں برے خیالات جمائے رہتے ہیں اور رات دن دھوکہ دہی اور فریب کاری میں لگے رہتے ہیں۔ ان کے چہروں پر خدا کی لعنت اور راندۂ درگاہ ہونے کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ چلّوں کی مشقت کے بعد اس قدر قوت حاصل کر لیتے ہیں اور وہ عوام کے دل و دماغ پر ایسا قبضہ جما لیتے ہیں کہ وہ جو بھی کہیں، عوام کو ویسا ہی نظر آنے لگتا ہے۔ ایسے مداری لوگ عوام کی تمام قوتوں کو سلب کر کے اپنے ارادے ان پر غالب کر دیتے ہیں۔ اس کلام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان جیسا بھی عمل کرے، اس کے اوقات اور اثرات ویسے ہی ڈھل جاتے ہیں اور ان کی ذات سے ان کے اعمال کی تجلیات کا ظہور ہونے لگتا ہے۔ ہماری تصنیف ''نشان منزل'' میں ایک روایت بیان کی جا چکی ہے کہ ایک دن حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: گزشتہ رات میں اپنی عبادت گاہ میں بیٹھا تو میں عرش پر پہنچا، حتیٰ کہ مجھے فرشتوں کی تسبیحات سنائی دینے لگیں۔ فرشتوں کی تسبیحات کا نور دور دور تک پھیلا ہوا نظر آتا تھا۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک تسبیح پڑھی تو اس کا نور فرشتوں کی تسبیحات پر غالب آ گیا۔ مجالس سعیہ میں اس بات کی تصدیق کی گئی ہے کہ انسانوں کو دو نفل پڑھنے کے بعد فرشتوں کے دو پروں جیسی طاقت دی جاتی ہے کہ وہ ہر آن واحد میں آسمان پر جا سکتے ہیں۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ اگر شیاطین نمازیوں کے دلوں پر اثر انداز نہ ہوتے اور ان کی توجہ نماز سے نہ ہٹاتے تو ابن آدم ملکوت کا مشاہدہ کرتے۔ راقم الحروف نے لیبیا میں تصوف کے موضوع پر تین گھنٹے کا ایک لیکچر دیا جس کو سن کر ایک شخص نے از خود ذکر و اذکار کا سلسلہ رات کے بارہ بجے سے صبح چھ بجے تک جاری کر لیا اور دس دن کے بعد عالم ملکوت وغیرہ کا مشاہدہ اس پر کھل گیا۔ اگر کسی شخص کی رہنمائی میں ذکر و اذکار کا شغل اختیار کیا جائے تو روحانی مقامات نہایت آسانی سے کھل جاتے ہیں۔

اہلِ سنت والجماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جامۂ بشریت میں اللہ کے نور تھے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نوری ہونے کے کیا معنی ہیں؟ تو وہ شاید یہ بھی بیان نہ کر سکے گا کہ انسان کے خاکی

ہونے کے کیا معنی ہیں؟ صوفیائے کرام کی تحریروں اور احادیث صحیحہ میں یہ بات ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے نور کو پیدا فرمایا اور باقی تمام مخلوق آپ ﷺ کے نور سے پیدا ہوئی۔ قرآن مجید میں آدم علیہ السلام میں نور الٰہی کے نفخہ ہونے کا ذکر آیا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (صٓ:۷۲) پس جب میں (آدم علیہ السلام کو) سنوار لوں اور اس میں اپنی طرف سے خاص روح پھونک دوں۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ انسانوں میں اگر نوری جہت غالب ہو جائے تو وہ خاکی ہوتے ہوئے بھی نوری صفات سے ہمکنار ہو جائے گا اور ہم اسے نوری بھی کہہ سکتے ہیں جیسا کہ لوہا آگ میں تپایا جائے تو آگ کی صفات اس میں پیدا ہو جاتی ہیں اور لوہا زبان حال سے یہ کہنے لگتا ہے کہ میں آگ ہوں' مجھ سے بچو۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے مثنوی میں لوہے کی یہ کیفیت بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ اگر انسان اللہ کے رنگ میں رنگ جائے "صِبْغَةَ اللّٰهِ" (البقرۃ:۱۳۸) تو اس میں اللہ تعالیٰ کا رنگ یعنی نور نمودار ہو جائے گا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ جب لوہا سرخ ہو جاتا ہے تو وہ آگ کی صفات رکھتے ہوئے بھی لوہا ہی کہلاتا ہے۔ حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بندہ خواہ کتنا ہی عروج کر جائے' پھر بھی وہ بندہ ہی کہلائے گا۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر بانسری کو انسان تصور کر لیا جائے تو یہ بانسری کسی شخص کے منہ میں آنے کے بعد رنگا رنگ نغمات الاپنے لگتی ہے۔ انسان بھی ایک ایسی بانسری ہے جس کا ایک سرا خدا کے قبضے میں ہے۔

مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا (ھود:۵۶) یعنی کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی چوٹی اللہ تعالیٰ پکڑے ہوئے نہ ہو۔

اور بانسری نواز یعنی اللہ تعالیٰ سے انسان کو فیض ملتا ہے اور بانسری نواز کے نغموں کی آواز اس بانسری (انسان) سے آنے لگتی ہے، چنانچہ انسان سے طرح طرح کے اسرار پھوٹنے لگتے ہیں۔ اس کلام سے مراد یہ ہے کہ انسان اکتساب فیض کے بعد اپنے روحانی مقامات کو بدل سکتا ہے اور بشری جہت میں رہتے ہوئے ملکوتی جہت میں بھی رسائی حاصل کر لیتا ہے۔

تفسیر روح البیان میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ کسی شخص نے فرشتے کو اس کی اصلی شکل میں نہیں دیکھا اور نہ ہی کسی انسان میں اس کی طاقت ہے کہ وہ فرشتے کو دیکھ سکے اور اگر دیکھے تو مر جائے۔ فرشتے تمام انبیاءؑ کے پاس انسانی شکلوں میں آئے، سوائے ہمارے حضور اکرم ﷺ کے کہ آپ نے جبرئیل علیہ السلام کو دو مرتبہ اپنی اصلی شکل میں دیکھا۔ مفتی احمد یار نعیمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ فقیر کا یہ خیال ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی نورانی اور حقیقی شکل کو بھی کوئی انسان نہیں دیکھ سکتا۔ ان کا قول زیر بحث گفتگو کی روشنی میں بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ جب فرشتوں کی اصل شکل ہر خاص و عام نہیں دیکھ سکتا تو حضور اکرم ﷺ کی تخلیقی اور حقیقی رفعتوں کو کون

پہچان سکے گا؟ ایک صحیح حدیث میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فرمایا "اے صدیق! تمہارے نبی کے مقام کو تمہارے خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا"۔ (مطالع المسرات ص ۱۲۹ مصر) چنانچہ اس سلسلے میں بحث کی کوئی گنجائش نہیں۔ صوفیائے کرام کا خیال ہے کہ معراج کی رات حضور اکرم ﷺ اپنی اصلی نورانی شکل میں تھے اور معراج کو اسی لیے خفیہ رکھا گیا کہ اس شکل کو کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن کی مختلف تجلیات تھیں، یعنی کنعانی کنوئیں میں پھینکنے کے وقت، قافلے والوں کا آپ کو نو درہم میں غلام بنانے کے وقت، مصر میں لاکھوں درہم کے عوض بیچنے کے وقت، مصری عورتوں کو دیکھنے کے وقت (جب زنان مصر نے اپنی انگلیاں کاٹ لیں) قحط مصر کے وقت (بھوکے مصری جب آپ کو دیکھ لیتے تو ان کو دو ماہ تک بھوک اور پیاس نہیں ہوتی تھی) غرضیکہ ہر آن آپ کی تجلیات میں فرق ہوتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جب زنان مصر کے سامنے اپنا نقاب اٹھایا تو وہ آپ کے اس خاص جمال کی تاب نہ لاسکیں اور بے خود ہو کر اپنی انگلیاں کاٹ لیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک یہ بھی صفت ہے کہ وہ ہر وقت ایک نئی شان میں ہوتا ہے اور اس کی اس حقیقت کا پرتو مخلوقات پر بھی اپنا اثر رکھتا ہے لہٰذا کائنات کی ہر شے مختلف وقتوں میں مختلف شان رکھتی ہے۔ دیکھئے سورج، صبح ضحیٰ، دوپہر، شام، بوقت غروب) اور مختلف موسموں میں مختلف نوعیت کے جلوے پیش کرتا ہے۔

کچھ تجلیات ایسی ہیں جو نظر آجاتی ہیں اور کچھ تجلیات ایسی ہیں جو خاص نظروں سے ہی دیکھی جاسکتی ہیں۔ سائنس والے اس کو یوں بیان کرتے ہیں کہ انسانی آنکھ صرف خاص Wave Lenght کو ہی دیکھ سکتی ہے۔ جب کہ بلی اور دوسرے جانور ایسی روشنیاں بھی دیکھ سکتے ہیں جو انسانوں کو نظر نہیں آتیں۔ کچھ مخصوص آلات ایسے ہیں جو کچھ مخصوص روشنیوں کو دیکھ لیتے ہیں اور کچھ ایسی روشنیاں بھی ہیں جو نہایت طاقتور آلہ جات سے بھی نہیں دیکھی جاسکتیں۔ اللہ تعالیٰ کے کچھ انوار ایسے ہیں جن کو ہر انسان اور جانور بھی دیکھ لیتا ہے، مگر کچھ انوار ایسے ہیں جن کو کچھ انبیائے کرام علیہم السلام بھی نہیں دیکھ سکتے۔

تفسیر نعیمی میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ جب فرش پر جلوہ فگن ہوتے تو ان کی تجلی اور طرح کی ہوتی تھی جس کو مومن و کافر چھوٹے و بڑے اور خاص و عام لوگ دیکھ سکتے تھے۔ مگر جب آپ معراج پر تشریف لے چلے تو آپ ﷺ کی تجلی کو صرف فرشتے اور انبیاء ہی دیکھ سکتے تھے۔ اس طرح جب آپ ﷺ سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچے تو تجلی اور قسم کی تھی جس کو صرف جبرائیل امین ہی دیکھ سکتے تھے اور جب سدرہ سے آگے بڑھے تو تجلی اور قسم کی تھی جسے صرف رب جلیل ہی دیکھ سکتے تھے اور اگر ان تجلیوں کو جبرائیل علیہ السلام دیکھتے تو فروغ تجلی سے ان کے پر جل جاتے۔ علامہ اقبالؒ نے درج ذیل شعر فرمایا ہے جس کا اردو ترجمہ یہی ہے۔

اگر یک سرِ موئے برتر پرم فروغِ تجلی بسوزد پرم

اسی طرح جب ہم خوش ہوتے ہیں تو ہمارے چہرے کا رنگ اور ہوتا ہے اور جب غصے میں ہوں تو تور بدل جاتے ہیں۔ بچپن، جوانی اور بڑھاپے کی شکلوں میں زبردست تغیرات آتے ہیں۔ معراج سے واپسی پر جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملاقات حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوئی تو موسیٰ علیہ السلام کو آپ کی آنکھوں سے جمال خداوندی کے جلوے جھلکتے ہوئے نظر آئے تھے اور موسیٰ علیہ السلام آپ کے چہرہ مبارک کو دیکھ کر اپنا شوق دیدار پورا کرتے رہے، یہی وجہ تھی کہ آپؑ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بار بار نمازوں کی تعداد میں تخفیف کے لئے روانہ کرتے رہے تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بار بار بارگاہ الٰہی میں جاتے رہیں اور ہر بار وہ خدا کے جلووں کی ایک نئی شان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھوں میں دیکھتے رہیں۔ صوفیاء کا خیال ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے جلووں کا دیدار جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک آنکھوں سے کیا وہ شاید طور کی تجلی سے بھی نہ کر سکے تھے۔ "واللہ اعلم بالصواب"۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "انفاس العارفین" کے صفحہ ۱۰۳ پر لکھتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں ملیح ہوں اور میرے بھائی یوسف علیہ السلام صبیح ہیں۔ ملیح کا لفظ عاشقوں کے لئے اور صبیح بے قرار اور مضطرب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ بھی روایات میں آتا ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام لباس فاخرہ پہن کر جلوہ گر ہوتے تو آپ کے جمال کی تاب نہ لا کر بہت سے لوگ جاں بحق ہو جاتے، لیکن سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ایسی کوئی روایت نہیں ملتی، حالانکہ معاملہ برعکس ہونا چاہیے تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد فرماتے ہیں کہ ایک بار انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چشم حقیقت سے دیکھا اور اس نکتہ کے بارے میں سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "خدا نے میرے جمال کو لوگوں کی نگاہوں سے مستور کر رکھا ہے، اگر میرا حسن ظاہر ہوتا تو ہر شخص وہی کرتا جو یوسف علیہ السلام کو دیکھنے والے کرتے تھے۔"۔

حُسنِ یوسف دمِ عیسیٰ یدِ بیضا داری آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

(آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یوسفؑ کا حسن، عیسیٰؑ کا دم اور موسیٰؑ کا چمکتا ہاتھ رکھتے تھے۔ جو صفات یہ تمام انبیاءؑ رکھتے تھے وہ تمام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اندر موجود تھیں)

حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ "انیس الارواح" میں فرماتے ہیں کہ حضرت خواجہ عثمان ہارونی رحمۃ اللہ علیہ " نے فرمایا کہ مردوہ ہے جو خدا کے علاوہ کسی کو نگاہ میں نہ رکھے اور دنیا و آخرت میں مبتلا نہ ہو بلکہ جو پاس ہو اس میں بھی مبتلا نہ ہو۔ جب ایسا ہو جائے تو اس کے بعد وہ اس مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے (کہ جو کچھ اس کے دوست یعنی اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہوتا ہے وہ سب اس کی ملکیت ہو جاتی ہے) اور ایسا شخص نائب حق بن جاتا ہے اور یہ رموز جز و کل سے کلی طور پر آگاہ ہو جاتا ہے اور

کائنات میں تصرف کرنے پر اسے تائید حاصل ہو جاتی ہے۔

از رموزِ جزو و کل آگہ بود   در جہاں قائم بامر اللہ بود (ا۔خ:۴۴)

(وہ شخص جزو کل کے رموز سے آگاہ ہو جاتا ہے اور کائنات میں نیابت الٰہی سے قائم ہو جاتا ہے)

روحانیت کے طالب یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مسجود ملائکہ بنایا ہے اور مسجود ساجد سے لامحالہ بہتر ہوتا ہے۔ انسان کی یہ افضلیت اس بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ روح اللہؑ، کلیم اللہؑ، ذبیح اللہؑ اور خلیل اللہؑ کہہ کر ہی نہیں پکارا گیا بلکہ یہ بات بھی معروف ہے کہ فرشتوں کو انسان کی خدمت پر مامور کیا اور اس کے برعکس انسانوں کو فرشتوں کا خادم نہیں بنایا۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ مقام عطا فرمایا تو پھر انسان کے لئے بھی لازم ہے کہ اپنے رب سے محبت اور عقیدت کا اس طریقے سے اظہار کرے جو اہل طریقت کا خاصا ہے۔ اگر اس لگن اور محبت سے اندازہ مطلوب ہو تو اولیائے کبارؒ کے احوال واقوال کا مطالعہ کیا جائے۔ عاشقانِ الٰہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیئے جانے والے کسی عذاب کیلئے فکرمند نہیں، البتہ اللہ تعالیٰ سے حجاب میں رہنے کو ہر عذاب سے زیادہ ناقابل برداشت سمجھتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جہنم کا عذاب اس لئے عذاب ہے کہ وہاں اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں اور اگر جہنم میں خدا کا دیدار ہو تو اہل جہنم کبھی جنت کی خواہش نہ کریں۔

حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ کا قول عین الفقر میں ہے کہ صاحب مراقبہ چشمِ زدن میں ارض وسما اور عرش و کرسی اور لوح وقلم کی سیر کر لیتا ہے۔ جس طرح فرشتے پل بھر دنیا میں موجود ہوتے ہیں اور پھر اپنے مقام پر چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح صاحب مراقبہ سیر کر کے اپنے وجود میں آپہنچتا ہے۔ یہ اہل مراقبہ جمالِ الٰہی کے سوا کچھ اور نہیں جانتے۔ فرماتے ہیں کہ جب صاحب مراقبہ دو آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھتا ہے تو تمام حجاب سوختہ (جل کر ختم) ہو جاتے ہیں اور صاحب مراقبہ جہاں چاہے' وہاں چشم زدن میں پہنچ سکتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ کعبہ مقصود ہزاروں برس کے فاصلے پر ہی کیوں نہ ہو' شوق رہبر ہو تو وہ نصف قدم کے برابر نہیں (تختِ بلقیس چشمِ زدن میں سینکڑوں میلوں سے حاضر کر دیا گیا تھا) لہٰذا شش جہات مراقبے والے کے پیش نظر (روبرو) ہوتی ہیں۔ اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو (حصول کمال کے بعد) ان تمام قوتوں اور صفات سے نوازا گیا ہے جس کے لئے نوری مخلوق معروف ہے۔

باب ۴۱

مقامِ آدم...... تصوف کی طرف اشارہ ہے

(جلتے ہیں جبریلؑ کے پر جس مقام پر)

تصوف کا مختصر پسِ منظر

تصوف نے دنیائے اسلام میں ایسے درخشندہ ستارے پیدا کیے ہیں، جن کا نام لیتے ہوئے مسلمانوں کی جبینیں احترام سے جھک جاتی ہیں اور ان کے احوال اور مقامات کا مطالعہ کرنے کے بعد دلوں کی دُنیا میں ان کے کمالاتِ روحانیت کے طوفان امڈ آتے ہیں۔ حضرت علی الہجویریؒ کی کشف المحجوب کو پڑھ کر دل و دماغ اس طرح متاثر ہو جاتے ہیں کہ پڑھنے والے کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ ہستی کس قدر عظیم ہے۔ اس کتاب میں ایک قاری کو ان کی ذات کی عظمت ان کے کلام میں صاف جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایسی کتابوں کے مطالعہ کے بعد انسان کا دل ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے اور یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ الٰہی یہ تیرے بندے کیسی شان رکھتے تھے کہ آج تک سینکڑوں سال کے بعد بھی، ان کے کلام کا دبدبہ پڑھنے والوں کے دلوں میں اس شدت سے اثر کرتا ہے کہ ان کے اوپر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے اولیائے عظام کی تصنیفات کے مطالعے کے ساتھ ان کی عظیم زندگیوں کے شب و روز، حرکات و سکنات اور ولایت کے کمالات آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے ہیں اور یہ سچ ہے کہ یہ لوگ حقیقی تصوف کے حامل تھے اور ان کی کتابوں کے روحانی موتی ان کی روحانی عظمت کی غمازی کرتے ہیں۔

اس تصوف کی دُنیا نے جو لوگ پیدا کیے ہیں۔ ان کے ناموں سے کون آگاہ نہیں؟ یہ اتنی بڑی ہستیاں ہیں کہ ان کے ناموں پر خود خُداوند تعالیٰ فخر فرماتا ہے اور فرشتے ان کے کمالات کا مداح ہے۔ ان بزرگوں کی سوانح حیات کثرت سے لکھی جا چکی ہیں جن کا مطالعہ کرنا ہر طالبِ طریقت کا معمول ہے۔ ایسے بزرگوں کی تحریریں آج بھی راہروانِ طریقت کی تشنگی کو بجھا رہی ہیں اور اکنافِ عالم میں لاتعداد لوگوں کے دلوں کو گرما رہی ہیں اور رہتی دنیا تک گرماتی رہیں گی۔ بزرگانِ اسلاف کی اب تک پہنچنے والی روحانی برکتوں، تحریروں سے تا قیامت لاتعداد اولیائے کبار رونما ہوتے رہیں گے۔

طریقت کے ان جلیل القدر اکابرین اور عمائدین نے اس علمِ تصوف کو سینہ بہ سینہ روشن کیا اور نہ مٹنے والے نقوش ہمارے دلوں پر چھوڑے۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اولیائے کرام کا سلسلہ من وعن جاری وساری ہے۔ اگرچہ منکرینِ طریقت کی چق چق اور بک بک سنائی دیتی ہے لیکن اس سے ان کی عظمت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ اس قدر عظیم ہستیوں کی تحریروں کے متعلق نہ جانے کیا کچھ کہہ کر روحانی باتوں کو ٹال دیتے ہیں، حالانکہ وہ تمام بزرگ جو طریقت سے منسلک تھے ان کی بزرگی کا پورا عالم اعتراف کرتا ہے۔ مخالفین طریقت کا یہ مخالفانہ کردار ایک ایسی حیثیت رکھتا ہے جیسے کوئی چوہا شیر کی دم سے کھیل رہا ہو۔ بھلا چوہے کی ذات شیر کو کیا نقصان پہنچا سکتی ہے؟ طالبانِ طریقت کے لئے لازم ہے کہ وہ ان کی باتوں پر کان نہ دھریں اور ان عظیم ہستیوں کے اقوال اور اعمال کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنی زندگی کو زیورِ طریقت سے آراستہ کریں۔ یہ وہ طریقت ہے جس میں خدائے پاک کی محبت اور رسول اکرم ﷺ کی اطاعت اور اولیائے کرام کے راہنما اصولوں کی پیروی شامل ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں جو قرآن اور حدیث کے عین مطابق ہیں۔ اب آپ کے سامنے طریقت کے چند حقائق کو بیان کیا جائے گا جس سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ انسان کو پوری مخلوق پر جو برتری اور فضیلت دی گئی ہے وہ اس کے روحانی مدارج کی بلندی کے باعث ہے۔

تخلیق انسان کے مرحلہ میں ہی انسان کو روحانیت سے نوازدیا گیا

یہ روحانیت تو انسان کو اس کی تخلیق کے وقت ہی عطا کر دی گئی تھی۔ پہلے پہل تو فرشتوں اور جنوں نے آدم علیہ السلام کو خلیفۃ اللہ ماننے سے انکار کیا مگر جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے علم کا ایک چھوٹا سا نمونہ ان کے سامنے پیش کیا تو آدم علیہ السلام کے کمالاتِ علم اور عرفان کو دیکھتے ہی فرشتوں پر کیفیتِ وجد طاری ہوگئی اور وہ سجدۂ آدم کے لئے تیار ہوگئے، مگر ابلیس نہ ماننے والوں میں شامل ہوگیا۔ (جیسا کہ آج بھی بہت سے لوگ روحانیت کے منکر نظر آتے ہیں) آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کیا کیا علوم عطا فرمائے، یہ تفصیل اس تحریر کی سطح سے بہت بلند اور ارفع ہے اس لئے ان کو یہاں پر بیان کرنا مناسب نہیں۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کر دینا کافی ہے کہ جس قدر علم، معرفت، اور روحانی استعداد اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو (اور ان کے ورثے میں اولادِ آدم علیہ السلام کو) عطا فرمائی وہ دوسری مخلوق میں سے کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ علوم روحانی کے علاوہ علوم دنیا یعنی سائنس کے رازوں کو جس طرح انسانوں پر کھول دیا گیا ہے وہ بھی دوسری کسی مخلوق پر نہیں کھولے۔ آدم علیہ السلام پر علم الاشیاء کی جو عطا تھی وہ روحانیت کی ابتدا تھی اور اس نے انسان کو باقی تمام مخلوقات سے ممتاز اور ممیز کر دیا۔ علامہ اقبالؒ کے نیچے دیئے گئے اشعار میں اس حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح نورانی مخلوق سے انسان کو بلند اور اعلیٰ مقام پر لاکر کھڑا کیا ہے؟

تخلیقِ کائنات سے اللہ تعالیٰ کا مقصود کیا ہے؟

(خُدا مخلوق سے سجدہ مگر انسان سے کچھ اور چاہتا ہے)

انسان کی تخلیق کا مقصد

انسان کو جن خوبیوں کا حامل بنایا گیا ہے ان کو درج ذیل دس نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذّٰرِيٰت:۵۶) اللہ تعالیٰ نے جنّوں اور انسانوں کو اپنی عبادت کے لئے پیدا فرمایا۔

مذکورہ عبادت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کی جائے۔(دیکھئے ہماری تصنیف ''حضورِ قلب'' کا مضمون ''اسرارورموزکلامِ اقبال کی روشنی میں'') یہاں اس بات کی وضاحت نہیں کی جائے گی کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کیونکر حاصل کی جاتی ہے۔ البتہ اس امر کو واضح کردینا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان سے عبادت کے علاوہ کیا چاہتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے بھی اس بات کو حسب ذیل شعر میں یوں بیان فرمایا ہے۔

مقامِ بندگی دیگر مقامِ عاشقی دیگر ز نوری سجدہ می خواہی ز خاکی بیش ازاں خواہی

(مقامِ بندگی کچھ اور ہے اور مقامِ عاشقی کچھ اور ہے، خُداوند تعالیٰ نوری مخلوق سے سجدہ چاہتا ہے، مگر خاکی مخلوق سے اس سے بھی کچھ زیادہ چاہتا ہے۔)(ز۔ع:۴۳۵)

علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں پر اس بات کو واضح کیا ہے کہ آدم کی تخلیق کا مقصد دیگر مخلوق کی طرح نہیں ہے بلکہ ان سب سے اعلیٰ اور فائق تر ہے۔ علامہ اقبالؒ نے انسان کو بالخصوص فرشتوں سے اعلیٰ تر مقام پر فائز کئے جانے کا بار بار ذکر کیا ہے اور آپ نے مسلمانوں کو کئی مرتبہ ان کے مقام سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا کہ بندۂ مومن کا یہ مقام ہے کہ اس کا سینہ رتبے میں عرشِ معلّٰی سے کم نہیں، اگرچہ اس کا جہانِ کارگاہ آسمان سے نیچے ہے لیکن انسان کو سوز و گدازِ سجود عطا کیا گیا ہے جب کہ نوری مخلوق کو سجدہ ریزی سے زیادہ کچھ نہیں ملا۔

عرشِ معلّٰی سے کم سینۂ آدم نہیں گرچہ کفِ خاک کی حد ہے سپہرِ کبود

پیکرِ نوری کو ہے سجدہ میسر تو کیا اس کو میسر نہیں سوز و گدازِ سجود (ب۔ج:۳۸۷)

جب اس انگارہ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا (ب۔د:۲۷۱)

<u>بندۂ مومن جس انداز سے عبادت کرتا ہے فرشتوں کو اُس کا تصور بھی نہیں ہوسکتا اُس کی نمازِ شوق و ذوق کی کیفیت ناقابلِ بیان ہے۔</u>

رازہائے آں قیام و آں سجود جز بہ بزمِ محرماں نتواں کشود! (پ۔چ:۸۵۹)

(اُس کے قیام اور جود کے راز، محرم راز لوگوں کے سوا کسی پر نہیں کھل سکتے۔)

انسان کی تخلیق کے مقصد کے پیشِ نظر ضروری ہے کہ مقامِ آدمی کی اہمیت کا مطالعہ کیا جائے اور اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے کیا درجہ عطا فرمایا ہے (اس سلسلے میں ہماری تصنیف ''نشانِ منزل'' میں تخلیقِ آدم کا بیان بھی ملاحظہ کیا جائے)۔ مضمون کی اہمیت کے پیشِ نظر'' مقامِ آدم'' پر راقم الحروف نے ایک مقالہ لکھا ہے جو اس تحریر میں قارئین کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ مقامِ آدم کا عنوان اس قدر وسیع المعانی ہے کہ اس پر ایک مکمل کتاب تحریر کی جاسکتی ہے لیکن زیرِ نظر کتاب کے لئے یہ مختصر سا بیان ہی کفایت کرے گا۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ بات اخذ کی جاتی ہے کہ عام انسان تو خورد و نوش کے لئے ہی جیتے ہیں لیکن انسانوں کی ایک جماعت ایسی بھی ہے، جس کی تخلیق سے یہ مقصود ہے کہ وہ فرشتوں اور عام مخلوق سے بہتر زندگی بسر کریں اور وہ زندگی جس سے تخلیق کا یہ منشاء حاصل ہو سکتا ہے، وہ اہل اللہ یا اہلِ طریقت کی زندگی ہے۔ درجِ ذیل مضمون میں مقامِ آدم سے متعلق تشریح پیش کی جا رہی ہے۔ اس کا مطالعہ فرمائیں۔

مقامِ آدم: (جلتے ہیں جبریلؑ کے پر جس مقام پر)

اگرچہ انسان کے مقامات بلند کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے لیکن نیچے دیئے گئے مضامین میں اس کے متعلق کچھ معلومات بہم پہنچائی جا رہی ہیں ملاحظہ فرمائیں!

مقامِ بندگی دیگر، مقامِ عاشقی دیگر

مقامات کی بلندی جو اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو عطا فرمائی ہے دیگر مخلوقات کو اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ خود بھی اپنے خاص بندوں کی عبادت، محبت اور ایثار پر فخر فرماتا ہے۔

کشف المحجوب میں حضرت مخدوم علی الہجویریؒ فرماتے ہیں کہ جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہجرت رسول اللہ ﷺ کے وقت حضور نبی اکرم ﷺ کے بستر پر سوئے تو اس رات حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ کی معیت میں تھے۔ اس شب کفار کا قصد حضور اکرم ﷺ کو شہید کرنے کا تھا تو جناب باری تعالیٰ نے جبرائیل و میکائیل علیہما السلام کو فرمایا کہ میں نے تم دونوں میں بھائی چارہ رکھا ہے اور تمہاری زندگی بھی دراز کی ہے، بتاؤ تم میں سے کون ہے جو اپنے بھائی پر اپنی زندگی نثار کرنے اور مرنے کو تیار ہے؟ دونوں اپنی اپنی زندگی بارگاہ الٰہی سے طلب کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دیکھو حضرت علیؑ کی بزرگی اور شرافت کہ وہ تم سے بلند ہے۔ جاؤ جا کر دیکھو کہ علیؓ ابن ابی طالب اپنے قتل اور مرگ کو قبول کر کے ہمارے حبیب ﷺ کی خوابگاہ میں سو گیا ہے۔ اب تم ان کی دشمنوں سے حفاظت کرو۔ حضرت صہیبؓ کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی اور ایسے ہی حضرت علیؓ نے بھی اپنی جان کی پرواہ نہیں کی۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ (البقرة:۲۰۷)

اور لوگوں میں وہ بھی ہے جو بیچ ڈالتا ہے اپنی جان (عزیز) کو اللہ کی خوشنودیاں حاصل کرنے کیلئے۔

صحابہ کرامؓ میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ لوگوں نے اپنی حیات عزیز کو مٹی کے کھلونوں سے زیادہ عزیز نہ جانا اور جب کہیں قطرہ خون بہانے کی ضرورت ہوئی تو انہوں نے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے۔ علامہ اقبالؒ نے کیا خوب کہا۔

مقامِ بندگی دیگر، مقامِ عاشقی دیگر
زنوری سجدہ می خواہی زخاکی بیش ازاں خواہی
(ز۔ع:۴۳۵)

(مقام بندگی کچھ اور ہے اور مقام عاشقی کچھ اور ہے' اور خداوند تو نوری مخلوق سے تو سجدہ چاہتا ہے' مگر خاکی مخلوق سے اس سے کچھ زیادہ چاہتا ہے۔)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں پر اس بات کو واضح کیا ہے کہ آدم کی تخلیق کا مقصد دیگر مخلوق کی طرح نہیں ہے بلکہ ان سب سے اعلیٰ اور فائق تر ہے۔ علامہ نے انسان کو بالخصوص فرشتوں سے اعلیٰ تر مقام پر فائز کیے جانے کا بار بار ذکر کیا ہے اور آپ نے مسلمانوں کو کئی مرتبہ ان کے مقام سے آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جو اپنی تشریح آپ ہیں۔

حضرت آدمؑ کے شجرِ خلد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگرچہ آدم شجر خلد کو کھانے کی لغزش کر چکا ہے' مگر اس یعنی خراب خانہ دنیا کو کوئی دوسری مخلوق آباد نہ کر سکی۔

قصور وار غریب الدیار ہوں لیکن
تیرا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد
مقام شوق تیرے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیادہ
(ب۔ج:۳۰۰)

بندہ مومن جس انداز سے عبادت کرتا ہے' فرشتوں کو اس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کی نماز شوق کی یہ کیفیت ناقابل بیان ہے۔

راز ہائے آں قیام و آں سجود
جز بہ بزم محرماں نتواں کشود (پ۔چ:۸۵۹)

(اس کے قیام اور سجود کے راز' محرم راز لوگوں کے سوا کسی پر نہیں کھل سکتے۔)

ما غلاماں از جلالش بے خبر
از جمال لازوالش بے خبر (پ۔چ:۸۳۴)

(ہم غلام اس کے جلال سے بے خبر ہیں' اس کے جمال لازوال سے بھی بے خبر ہیں۔)

زمین تو انسان کے لوازمات کو پورا کرنے کے لئے بنائی گئی ہے اور اس میں انسان کے لیے ہر چیز مہیا کی گئی ہے۔ اس کی فکر آسمان تک پہنچتی ہے۔ اس کے سوز و ساز کی کیا پوچھتے ہو' یہ کائنات پوری اس کے افسانے

کی تمہید ہے۔یہی معانی ان اشعار میں موجود ہیں۔

زمیں خاکِ درِ میخانۂ ما　فلک یک گردشِ پیمانۂ ما
حدیث سوز و سازِ ما دراز است　جہاں دیباچۂ افسانۂ ما(پ۔م:۲۳۹)

فرماتے ہیں کہ انسان کے دل میں موجود جذبہ شوق نے حریم ذات میں شور برپا کر دیا اور تمام عالم کو تہہ وبالا کر دیا۔تمام مخلوق انسان کے جذبہ تخلیات کی وجہ سے اس کے سامنے دست بستہ حاضر ہو جاتی ہے۔حتیٰ کہ اس دنیا میں ظاہر ہونے والی تجلیات الٰہی میں بھی تغیر و تبدل رونما ہوتے ہیں۔انسان کی تخلیق سے کُنتُ کَنزاً مَخفِیاً کا راز بھی افشا کیا گیا۔

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں　غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں
حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخلیات میں　میری نگاہ سے خلل تیری تجلّیات میں
تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا　میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں
(ب۔ج:۲۹۷)

فرماتے ہیں کہ انسان کو عشق کا ملکہ دیا گیا ہے اس سے برتر و بہتر پوری کائنات میں کوئی اور شے نہیں' کیوں کہ یہ عشق ہی تو انسان کا تحفۂ امتیاز ہے۔

انسان اور دولتِ عشق کی عطا

کائنات میں کوئی شے نہیں کیونکہ یہ عشق ہی تو ہے جو تمام معاملات کا حل تلاش کر لیتا ہے۔ایک جگہ فرماتے ہیں کہ عشق اگر جنون کی حد تک پہنچ جائے تو تمام مشکلات اور مصائب کو از خود دور کر دیتا ہے' حضور اکرم ﷺ نے ایک جست میں وہ تمام مقامات طے کر لئے جس کے نچلے کناروں تک جبرئیل علیہ السلام بھی نہ پہنچ سکتے تھے۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام　اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں
(ب۔ج:۳۱۰)

عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے　برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے(ب۔د:۶۲)

ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے　جس نے سیئے ہیں تقدیر کے چاک
(ض۔ک:۵۷۵)

عروجِ آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں　کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے
(ب۔ج:۳۰۲)

کبھی آوارہ و بے خانماں عشق کبھی شاہِ شہاں نو شیرواں عشق
کبھی میداں میں آتا ہے زرہ پوش کبھی عریاں ہے بے تیغ و سناں عشق
کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق کبھی سوز و سرورِ انجمن عشق
کبھی سرمایۂ محراب و منبر کبھی مولا علیؓ خیبر شکن عشق (ب۔ج:۳۷۹)

انسان کو اس کی محبت کے جوہر کے باعث اس کی خودی کو اس قدر رفعت عطا کی گئی ہے کہ اس کے سبب وہ پورے عالم میں اپنا فرمان چلاتا ہے۔

از محبت چوں خودی محکم شود قوتش فرماں دہِ عالم شود
(جب محبت سے خودی محکم ہو جاتی ہے' تو انسان کی قوت پورے عالم کی فرمانروا بن جاتی ہے۔)

پنجۂ او پنجۂ حق می شود ماہ از انگشتِ اُو شق می شود
(اس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے' چاند اس کی انگلی کے اشارے سے شق ہو جاتا ہے۔)

در خصوماتِ جہاں گردد حکم تابعِ فرمانِ اُو دارا وجم (ا۔ر:۲۵)
(اس کا حکم جہاں بھر کے تنازعات پر چلتا ہے' اور دارا و جمشید جیسے حکمران اس کے تابع فرمان ہو جاتے ہیں۔)

انسان کو عشق دیا گیا ہے' اس میں عام لوگ اپنے دامن کو چاک کر لیتے ہیں' لیکن سچے عاشق باہوش وحواس رہتے ہیں۔ علامہ اقبال کے جوشِ جنوں پر ایک تحریر لکھی گئی ہے جو شاید ہماری تصنیف تربیت نفس میں آئے گی یا ایک الگ نوٹ میں آئے۔

با چنیں زورِ جنوں پاسِ گریباں داشتم ، در جنوں از خود نہ رفتن کارِ ہر دیوانہ نیست
(ز۔ع:۲۱۸)

(اس جنوں کے زور میں بھی گریباں کا خیال رکھتا ہوں' ایسے جنوں میں از خود رفتہ نہ ہونا ہر دیوانہ کا کام نہیں۔)

کشادم چشم و بر بستم لب خویش سخن اندر طریقِ ما گناہ ہست (ا۔ح:۹۲۶)
(میں نے آنکھ کھولی اور ہونٹ بند رکھے' ہمارے مذہب میں بات (شکایت) کرنا گناہ ہے۔)

مقامِ آدمی

مسلمان کو اپنے مقام سے مکمل بے علمی ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں پر اس بات کو ظاہر کیا کہ انسان محض مٹی کا ایک تودا نہیں بلکہ اسے بے انتہا قوتیں اور صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں' جسے اگر وہ عمل میں لائے تو پوری دنیا اس کی دسترس سے باہر نہیں جاسکتی۔ کاش مسلمان آج اس بات کو سمجھ کر اپنے اندازِ عمل کو بدلیں۔

نوائے عشق را ساز است آدم کشاید راز و خود راز است آدم

(انسان کو نوائے عشق کے لئے ساز گار کیا گیا ہے' رازوں کو کھولتا ہے اور خود بھی ایک راز ہے۔)

جہاں او آفرید' ایں خوبتر ساخت مگر با ایزد انباز است آدم (پ۔م:۱۹۸)

(خدا نے جہاں کو بنایا اور یہ اس کو سنوارتا ہے' گویا خدا کے ساتھ انسان ساجھی بن گیا ہے۔)

گرچہ کم تسبیح و خونریز است او روزگاراں را چوں مہمیز است او

(اگرچہ وہ کم تسبیح اور خونریزی کرتا ہے مگر زمان و مکاں کے (کاروبار) کے لیے مہمیز کا کام کرتا ہے۔)

داغہا شوید ز دامانِ وجود بے نگاہِ او جہاں کور و کبود (ج۔ن:۶۰۳)

(اپنے وجود کے دامن سے آویزاں داغوں کو دھوتا ہے' اس کی نگاہ نہ ہو تو پورا جہاں مکمل طور پر اندھا ہو جاتا ہے۔)

بیا ربہائے او از خود خبر گیر تو جبریلِ امینی بال و پر گیر (ز۔ع:۵۴۵)

(اپنی ولایت الٰہیہ اور عظمتِ تحقیق کو پہچان' تو جبریلؑ امین (سے کم نہیں) ہے بال و پر پیدا کر۔)

کمالاتِ آدم علیہ السلام

کلیاتِ اقبال فارسی صفحہ ۲۵۲ پر علامہ نے خلافتِ آدم کی شان کو نظم کیا ہے اور انسان کے نائب خدا ہونے کی عظمت کو واضح کیا ہے۔ انسانِ خاکی کی ترقی اس کی نئی نئی چیزوں کی ایجاد اور تخلیق میں پنہاں ہے جبکہ باقی مخلوقات کے حصے میں روزمرہ کی عام روش کے علاوہ اور کچھ نہیں آیا۔ وہ تمام مخلوقات کے لیے خلیفۃ اللہ ہے اور ہر چیز اس کی خوبی تخلیق کی تفسیر ہے۔

فروغِ آدمِ خاکی ز تازہ کاری ہاست مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازیں کردند (ز۔ع:۵۱۸)

(آدمؑ کی آب و تاب اس کی تازگی تخلیق سے ہے' چاند و ستارے تو پہلے کی طرح ہی چمک رہے ہیں۔)

حرف اِنِّیْ جَاعِلٌ تقدیرِ او از زمیں تا آسماں تفسیر او

(اس کی قسمت میں خلافت الٰہی کی تحریر ہے' زمین سے آسمان تک ہر چیز اس کی ذات کی تفسیر ہے۔)

من چہ گویم از یمِ بے ساحلش غرق اعصار و دھور اندر دلش

(میں اس کے ناپیدا کنار ساحل کے متعلق کیا کہوں؟ کئی زمانے اور کئی جہان اس کے دل میں مدفون ہیں۔)

آنچہ در آدم بگنجد عالم است آنچہ در عالم نگنجد آدم است (ج۔ن:۶۵۶)

(جو انسان میں نہیں سما سکتا' وہ عالم ہے اور جو پورے عالم میں نہیں سما سکتا' وہ انسان ہے۔)

ما ہمہ یک دودمانِ نار و نور آدمؑ و مہر و مہ و جبریلؑ و حور (ج۔ن:۷۷۷)

(ہم سب نار و نور کے ایک خاندان سے ہیں (یعنی) آدمی' سورج' چاند' جبریل اور حور)

آشکارا مہر و مہ از جلوتش نیست رہ جبرئیل را در خلوتش (ج۔ن:٦٥٦)

(چانداور سورج اس کے جلووں سے آشکار ہیں' اس کی خلوت میں جبرئیل امین بھی راہ نہیں پا سکتے۔)

جز ایں چیزے نمی دانم ز جبرئیل کہ او یک جوہر از آئینۂ تست (ا۔ح:٩٣٦)

(میں جبریل سے متعلق اس سے زیادہ نہیں جانتا' کہ وہ آپ کے نور کے ہی ایک جوہر ہیں۔)

خاکی ہے مگر نوری کی کرتا ہے قبا چاک

درج ذیل اشعار اس مفہوم کو اچھی طرح واضح کرتے ہیں کہ انسان جسد خاکی رکھتے ہوئے بھی نوری مخلوق سے بدرجہا برتر اور افضل ہے اور جبریل علیہ السلام جیسے عالی مرتبت فرشتہ انسان کی شان کو دیکھ کر اپنی قبا چاک کر لیتا ہے۔ انسان کے مقاصد بہت بلند ہیں اور دنیا جیسی معمولی اور قلیل چیزوں کی طرف دھیان بھی نہیں کرتا (کاش آج ہم سب مسلمان ایسے ہی ہو جائیں)۔

تیرے مقام کو انجم شناس کیا جانے کہ خاک زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں
یہیں بہشت بھی ہے حور و جبریل بھی ہے تری نگاہ میں ابھی شوخیٔ نظارہ نہیں
(ب۔ج:٣٣٦)

فطرت نے نہ بخشا مجھے اندیشہ چالاک رکھتی ہے مگر طاقت پرواز مری خاک
وہ خاک کہ ہے جس کا جنوں صیقل ادراک وہ خاک کہ جبریلؑ کی ہے جس سے قبا چاک
وہ خاک کہ پروائے نشیمن نہیں رکھتی چنتی نہیں پنہائے چمن سے خس و خاشاک
(ب۔ج:٣٦١)

چمک اس کی بجلی میں، تارے میں ہے یہ چاندی میں، سونے میں، پارے میں ہے
کہیں اس کی طاقت سے کہسار چور کہیں اس کے پھندے میں جبریلؑ و حور
(ب۔ج:٣١٨)

افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن
جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں جبریلؑ و سرافیلؑ کا صیاد ہے مومن
(ض۔ک:٥٠٧)

ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشاں
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں
(ض۔ک:٥٢٢)

توڑ ڈالے گی یہی خاک طلسمِ شب و روز گرچہ الجھی ہوئی تقدیر کے پیچاک میں ہے

(ب۔ج:۳۵۷)

نہ خاکِ من غبارے راہگذارے نہ در خاکم دلِ بے اختیارے

(میری خاک ایسی نہیں کہ جیسے کسی راہگذر کی خاک ہو اور نہ ہی میرے خاکی بدن میں بے اختیار دل ہے۔)

بہ جبریلِ امیں ہم داستانم رقیب و قاصد و درباں ندانم (ز۔ع:۵۳۸)

(میں جبریلؑ امین کا ہم داستان ہوں' نہ تو میں اسے رقیب و قاصد سمجھا ہوں اور نہ دربان۔)

خاکی اور نوری مخلوق میں فرق

علامہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تمام فرشتوں میں سے حضرت جبریلؑ کا مقام اعلیٰ وارفع ہے۔ آپ نے اپنے کلام میں جبریلؑ امین کی خوبیوں کی بہت تعریف کی ہے' مگر علامہ ساتھ ہی یہ بھی ظاہر فرماتے ہیں کہ جہاں ان کی انتہا ہے وہاں ہمارے نبی کریم ﷺ کی ابتدا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ جبریلؑ امین تمام انبیاء کے بالخصوص رسول مقبول ﷺ کے دربان اور خادم تھے۔ مولانا رومؒ نے تو حضور اکرم ﷺ کی بشریت کو واضح کرنے کے لئے کس قدر دلخوش کلام فرمایا ہے۔

اے ہزاراں جبریلؑ اندر بشر بہرِ حق سوئے غریباں یک نظر (تشبیہاتِ رومی)

احادیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل علیہ السلام اور فرشتوں کو تخلیق آدمؑ کے سلسلے میں یہ راز ظاہر فرمایا تھا کہ حضرت انسان سے ان کو بے پایاں فیوض سے اکتساب کرنے کا موقع ملے گا۔ یہی وجہ تھی کہ جبریل علیہ السلام نے تخلیق آدم میں مٹی اور پانی کے جمع کرنے کے لئے سب سے زیادہ کوشش کی تھی۔ علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے درج ذیل اشعار سے مفہوم ازخود واضح ہو جاتا ہے۔

کجا نورے کہ غیر از قاصدی چیزے نمی داند کجا خاکے کہ در آغوش دارد آسمانے را

(کہاں وہ نوری (فرشتے) جو پیغام رسانی کے سوا کچھ نہیں جانتے' کہاں وہ خاکی جو اپنی آغوش میں پورے آسمان کو سمالیتا ہے۔) (ز۔ع:۴۴۶)

بلکہ فرماتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام تو خود عاشقوں کے سینوں سے عشق کی چنگاری حاصل کرنے کے جویا ہیں۔

سینہ کشادہ جبریلؑ ازبرِ عاشقاں گذشت تاشررے باو فتد آتشِ آرزوے تو

(جبریل جب عاشقوں کے قریب سے گزرتے ہیں تو سینہ کھول کر جاتے ہیں تاکہ تیری آرزو کی ایک چنگاری ان کے سینے میں گر جائے۔) (ز۔ع:۴۱۹)

اگر عنانِ تو جبریلؑ و حور می گیرند کرشمہ بر دلِ شاں ریز و دلبرانہ گذر

(اگر تیری سواری کی لگام جبریلؑ اور حور بھی تھام لیں تو ان کے دل پر نظر کی ایک تجلی گرا (اور بے نیازی سے گزر جا۔) (ز۔ع:۴۹۰)

احادیث صحیحہ میں ہے کہ قدسیوں کو ان کی نیکی پر اجر نہیں ملتا' اور اگر ملتا تو ان کے درجات بلند ہوتے رہتے' مگر حقیقت یہ ہے کہ جو فرشتہ جس درجے پر پیدا ہوا' اسی پر تا قیامت رہے گا' درجات کی بلندی تو مخالفتِ نفس اور کشمکش زندگی میں ہے۔ اپنی آرزوؤں' جستجوؤں اور امنگوں کے قوانین خداوندی کے تابع رکھتے ہوئے طاغوتی طاقتوں کا مقابلہ کرنا ایک بہت بڑی اور کڑی آزمائش ہے جس میں سے صرف انسان ہی گزر سکتا ہے۔ انسان کا اس مقابلے میں پورا اترنا ہی اس کے کمال اور بلندی عظمت کا نشان ہے۔ انسان کے لیے محض ''اللہ ہو'' نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اسے جذب' عشق' مستی' لذت، آرزو' مصائب زندگی سے مقابلہ' مقاماتِ ابتلاء اور سوز آہ و فغاں کا جہاں بھی دیا گیا ہے جبکہ قدسی ان تمام باتوں سے لاتعلق ہو کر تسبیح و ذکر اور طواف میں مشغول رہتے ہیں، علامہ نے فرمایا ہے۔

نہ کر تقلید اے جبریلؑ میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولی
(ب۔ج:۳۱۵)

نہ جبریلے' نہ فردوسے' نہ حورے نے خداوندے
کفِ خاکے کہ می سوزد زِ جان آرزو مندے
(یہ کام نہ جبریلؑ' نہ جنت نہ حور اور نہ خداوند کریم ہی کا ہے کہ کوئی خاکی انسان کی طرح جانِ آرزو کی آگ میں جلتا رہے۔) (ج۔ن:۷۴۰)

نہ داند جبریلؑ ایں ہائے و ھُو را
کہ نہ شناسد مقامِ جستجو را
(جبریلؑ (انسان کی) ہائے اور ھُو کو نہیں جانتے' کیونکہ ان کو جستجو کے مقام کا علم ہی نہیں۔)

بہ پرس از بندہ بیچارۂ خویش
کہ داند نیش و نوشِ آرزو را (ا۔ح:۸۹۶)
(اے خدا) اپنے اس بیچارے بندہ آدم سے پوچھ' کہ یہ زندگی کی آرزوؤں کی اونچ نیچ کو خوب جانتا ہے۔)

بگو جبریل را از من پیامے
مرا آں پیکرِ نوری ندادند
(جبریلؑ کو میری طرف سے یہ پیغام دو' کہ خدا نے مجھے نوری جسم تو عطا نہیں کیا۔)

و لے تاب و تب ما خاکیاں بیں
بنوری ذوقِ مجبوری نہ دادند (پ۔م:۲۱۰)
(لیکن ہم خاکیوں کی تب و تاب ملاحظہ کرو' کہ نوریوں کو یہ ذوق ہجر و عشق نہیں دیا گیا۔)

باوج مشتِ غبارے کجا رسد جبریلؑ
بلند نامی او از بلندیٔ بام است (ز۔ع:۴۵۸)
(اس مٹھی بھر خاک کی بلندی کو جبریل کہاں پہنچ سکتے ہیں' آواز کی بلند نامی اس کی جگہ کی بلندی سے ہوتی ہے۔)

جہاں پیدا و محتاج دلیلے
نمی آید بفکرِ جبریلے (ز۔ع:۵۶۲)

(یہ جہاں دلیل سے پیدا کیا گیا اور دلیل کا محتاج ہے، یہ جہاں جبریل کی فکر میں نہیں آ سکتا)

خانہ کعبہ کے معارف کا ذکر "نشانِ منزل" کے باب کعبہ میں ہو چکا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ خانہ کعبہ پتھر کی دیواروں، چھت اور دروازے کا مجموعہ ہے، مگر اس کا طواف محض پتھروں کا طواف نہیں۔ اس بیت اللہ سے انسان کے قلب و نظر کو جو معارف حاصل ہوتے ہیں۔ اس کا جبریل اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔

حرم جز قبلۂ قلب و نظر نیست طواف او طوافِ بام و در نیست

(حرم تو قلب و نظر کا قبلہ کے سوا کچھ نہیں، اس کا طواف محض مکان کا طواف نہیں۔)

میانِ ما و بیت اللہ رمزیست کہ جبریلِ امیں را ہم خبر نیست (ا۔ح:۹۸۶)

(ہمارے اور بیت اللہ شریف کے درمیان ایک راز ہے جس سے جبریل آمین بھی باخبر نہیں۔)

انہی صفات اور بزرگ تر مقامات کے حصول سے انسان کا مقام اس قدر بلند ہو گیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنی ان قدرتوں کے ساتھ جبریل کو کچے دھاگے سے باندھ سکتا ہے اور اپنے ہاتھ پر چڑیا کی طرح بٹھا سکتا ہے۔

می تواں جبریل را گنجشکِ دست آموز کرد شہپرش با موئے آتش دیدہ بستن می تواں

(جبریل کو ہاتھ پر بیٹھنے والی چڑیا کی طرح سدھایا جا سکتا ہے، ان کے بال و پر کو جلے ہوئے بال سے باندھا جا سکتا ہے۔) (پ۔م:۳۳۰)

مومن کی خدا پر کمند

انسان جب ہر چیز سے بڑھ کر اللہ کو چاہتا ہے اور اس کی طرف اس کی کیفیت مجنونوں کی سی ہو جائے تو درحقیقت وہ خدا پر کمند ڈالتا ہے اور پل بھر میں اس کو کھینچ لیتا ہے۔ اس کھینچ لینے سے مراد اللہ تعالیٰ کی توجہ اپنی طرف کرنا اور اس کی رضا حاصل کر لینا ہے۔

علامہ فرماتے ہیں کہ ہمارے جنونِ عشق میں جبریل امین ایک بے بس شکار سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے بلکہ فرماتے ہیں کہ اے مردِ مومن تجھے چاہیے کہ تو ذات باری تعالیٰ پر کمند طلب ڈال اسے کھینچ لے اور یہ استعداد انسان میں موجود ہے کیونکہ اس کو جبریل امین سے بھی زیادہ صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں۔

فقر بر کروبیاں شبخون زند برنوامیسِ جہاں شبخون زند (پ۔چ:۸۱۶)

(فقر مقرب فرشتوں پر بھی شب خون ڈالتا ہے، قدرت کی پوشیدہ قوتوں پر شب خون ڈالتا ہے۔)

عقلِ آدم بر جہاں شبخون زند عشق او بر لا مکاں شبخون زند

(انسان کی عقل جہاں پر شب خون کرتی ہے، اور اس کا عشق لامکاں پر شبخون کرتا ہے۔)

راہ داں اندیشۂ او بے دلیل چشم او بیدار تر از جبرئیل! (ج۔ن:۶۰۳)

(انسان کی فکر بلاشبہ بغیر راہبر کے بھی راہ دکھانے والا ہے' اس کی آنکھ جبریلؑ امین سے بھی بیدار تر ہو گی۔)

در دشتِ جنون من جبریلؑ زبوں صیدے یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

(صحرائے عشق میں جبریلؑ ایک بے بس شکار کی طرح ہیں۔ اے باہمت مسلمان! تو بھی اللہ پر کمند ڈال دے۔) (پ۔م:۳۳۶)

شیشۂ خود را بگردوں بستہ طاق فکرش از جبریلؑ می خواہد صداق

(انسان کا) شیشہ (دل) یعنی صراحی نے آسمان میں طاق بنایا ہے' اور اپنے فکر کی تصدیق جبریلؑ سے چاہتا ہے۔) (ج۔ن: ۶۲۳)

علامہؒ فرماتے ہیں کہ سیاروں کی گردش سے پیدا شدہ قوانین اور حالات کی پابندی انسان کے لئے ضروری ہے یعنی انسان پابندی فطرت پر مجبور ہے اور فرشتے اس مجبوری سے آزاد ہیں' اس لئے اس کی نگاہ ہمہ وقت انسان پر رہتی ہے کہ وہ ایسے نامساعد حالات میں سے کس طرح خود کو نکالتا ہے۔

فرشتہ گرچہ بروں از طلسمِ افلاک است نگاہِ او بتماشائے ایں کفِ خاک است

(فرشتہ اگرچہ پابندی فطرت سے آزاد ہے' مگر اس کی نگاہ اس بندہ خاکی کے نظارہ پر رہتی ہے۔) (ز۔ع:۴۶۹)

فروغ مشتِ خاک از نوریاں افزوں شود روزے زمیں از کوکبِ تقدیر او گردوں شود روزے

(فرشتے کہتے ہیں کہ یہ مٹھی بھر خاک کی چمک ایک روز فرشتوں سے بڑھ جائے گی' آدم کی بلندئ تقدیر سے یہ زمین بھی ایک روز آسمان بن جائے گی۔) (ج۔ن:۶۰۴)

جبریلؑ آدمؑ پر رشک کرتے ہیں

جبریلؑ امین انسانوں کے دردسوز' آرزو' غمِ پنہاں اور لذتِ آہ وفغاں کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے انسان کا سانیاز اور گداز حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں تمہید گلشنِ راز جدید صفحہ ۵۳۸ پر کلیاتِ اقبال فارسی کا ملاحظہ فرمائیں۔

بنالد از مقام و منزلِ خویش بہ یزداں گوید از حالِ دلِ خویش

(جبریلؑ اپنے مقام ومنزل پر روتے ہیں اور اپنے دل کا حال اللہ تعالیٰ سے کہتے ہیں۔)

تجلی راچناں عریاں نہ خواہم نخواہم جز غمِ پنہاں نخواہم

(الٰہی میں تجلیات کو اس طرح عریاں دیکھنا نہیں چاہتا' میں تو سوائے غمِ پنہاں کے اور کچھ نہیں چاہتا۔)

گزشتم از وصالِ جاودانے کہ بینم لذتِ آہ و فغانے

(میں دائمی وصال سے بھی آگے گزر گیا ہوں' کیونکہ میں انسان کی آہ وفغاں کی لذت کو دیکھتا ہوں۔)

مرا راز و نیازِ آدمے دہ بجانِ من گدازِ آدمے دہ (ز۔ع:۵۳۹)

(مجھے آدم کا سارا راز و نیاز عطا کر' میری روح کو آدم کا سا گداز عطا فرما۔)

درون سینہ آدم چہ نور است چہ نور است ایں کہ غیب او حضور است

(انسان کے سینے میں یہ کیا نور ہے' یہ نور کیسا ہے کہ اس کے مغیبات بھی حضور کی طرح ہیں۔)

گہے نارش ز برہان و دلیل است گہے نورش ز جانِ جبریلؑ است (ز۔ع:۵۴۰)

(کبھی اس کے دل میں برہان و دلیل کی آگ ہوتی ہے' کبھی اس کے نور میں جبریل علیہ السلام جیسی روح ہوتی ہے۔)

چہ نورے جاں فروزے سینہ تابے نیرزد با شعاعش آفتابے (ز۔ع:۵۴۰)

(یہ نور کیا ہے' جو روح افزا ہے اور سینہ گرما دیتا ہے۔ اس کی ایک شعاع کے سامنے سورج بھی ہیچ ہے۔)

مردِ حق از آسمان افتد چو برق ہیزمِ او شہر و دشتِ غرب و شرق (ج۔ن:۷۹۵)

(مردِ خدا تو آسمان سے بجلی کی طرح جھپٹتا ہے شرق و غرب کے شہر اور صحرا کو ایندھن کی طرح جلا دیتا ہے)

انسانوں میں سے ہی کبھی کوئی کلیم اللہ' کوئی مسیحؑ اور خلیل اللہ علیہم السلام اور کوئی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رتبہ حاصل کرتا ہے۔ بندہ مومن ہی چلتا پھرتا قرآن بن جاتا ہے حتیٰ کہ جبریلؑ معنوی بھی بن جاتا ہے ۔

ما ہنوز اندر ظلامِ کائنات او شریکِ اہتمامِ کائنات

(ہم تو ابھی کائنات کے اندھیروں میں ہیں' لیکن بندہ مومن کائنات کا اہتمام کرتا ہے۔)

او کلیمؑ و او مسیحؑ و او خلیلؑ او محمدؐ' او کتابؑ' او جبریلؑ

(انسان کلیمؑ' مسیحؑ اور خلیلؑ بھی بنتا ہے' وہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم' قرآن اور جبریلؑ بھی بنتا ہے۔)

آفتابِ کائنات اہلِ دل از شعاعِ او حیاتِ اہل دل (ج۔ن:۷۹۵)

(وہ اہلِ دل کی کائنات کا آفتاب ہے' اس کی شعاع سے دل کی زندگی وابستہ ہے۔)

معنیٔ جبریلؑ و قرآن است او فطرۃ اللہ را نگہبان است او (پ۔چ:۸۰۸)

(مومن ہی معنوی جبریلؑ اور قرآن ہے' فطرت الٰہی کا وہ نگہبان ہے۔)

اس انسان کو ایسی طاقت ملی ہے کہ اگر وہ اپنے نبی کی ذرا سی اتباع کر لیتا ہے تو وہ مقام جبریل علیہ السلام کا اہل بن جاتا ہے۔

ہر کہ از سرِ نبی گیرد نصیب ہم بہ جبریلِؑ امیں گردد قریب (پ۔چ:۸۲۸)

(جس کو سرِ نبی کا کچھ حصہ ملتا ہے' تو وہ جبریل امین کی طرح مقرب بن جاتا ہے۔)

مسجود ملائک آج رسوا کیوں ہے؟

اللہ تعالیٰ نے انسان کو "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ اٰدَمَ" سے خطاب کیا اور ہم نے بنی آدم کی عزت افزائی کی اور اکرام سے نوازا) اور اسے کہا: (بقول علامہ اقبالؒ)۔

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو　　فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور　　کہ شاہینِ شہِ لولاکؐ ہے تو (ب۔ج:۳۷۶)

(تیرے شکار تو فرشتہ وحور ہیں اور تو شہنشاہ لولاک کا شاہین بن گیا ہے)

مگر آج ہم دیکھتے ہیں کہ وہ عزت افزائیاں جو انسان کو دی گئی تھیں' ان سے اسے محروم کر دیا گیا ہے اور غالب کہتے ہیں کہ

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند　　گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

ان سوالوں کا جواب یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کے قوانین اٹل ہیں' اس لئے اس کی سنت کی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ابلیس نے اپنی سرکشی کی وجہ سے آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کیا تو وہ راندہ درگاہ ہوا۔ آج اگر انسان ابلیس کی دکھائی ہوئی راہوں پر چلنے لگا اور احکام خداوندی سے اعراض کرنے لگا تو اس کے سر سے سَخَّرَ لَكُمْ مَّافِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا تاج چھین لیا گیا۔ علامہؒ نے فرمایا۔

آتی ہے دمِ صبح صدا عرش بریں سے　　کھویا گیا کس طرح ترا جوہرِ ادراک
کس طرح ہوا کند ترا نشترِ تحقیق　　ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک
مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں　　کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک؟
(ا۔ح:۶۶۹)

روشن تو وہ ہوتی ہے جہاں بیں نہیں ہوتی　　جس آنکھ کے پردوں میں نہیں ہے نگہ پاک
باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری　　اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری (ا۔ح:۶۷۰)

جب مسلمان نے اللہ اور اس کے رسولﷺ کا دامن چھوڑ دیا اور اس کی یاد سے غافل ہو گیا تو اس نے وہ حاصل کردہ مقام کھو دیا، جس کا بیان گزشتہ مضمون میں ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو پھر وہی ذوق وشوق اور جذبہ عطا کرے کہ وہ از سر نو عنایات الٰہی کا حامل بن سکے۔ آمین

اس باب کے بعد "مَنْ اَنَا" کی تحریر اس لیے دی جا رہی ہے کہ مسلمان اپنی خودی کو پہچان لینے کے بعد اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکیں۔

باب ۴۲

"مَنْ اَنَا" (میں کون ہوں؟)

اپنی پہچان

(اپنی پہچان کر لینا ایک بڑے راز کو پالینا ہے)

اپنی شناخت کر لینا اولیائے خواص کا کام ہے اور یہ ایک عقدۂ لاینحل کا سراغ حاصل کر لینے سے کم نہیں۔ دینی اور دنیاوی اعتبار سے اپنی پہچان کرنے کے عمل کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ انسان کی پیدائش سے اب تک اپنی اپنی دانش کے مطابق ہر زمانے میں دانشوروں اور نکتہ دانوں نے اس مسئلہ کو حل کرنے کی سعیٔ پیہم کی ہے لیکن جوں جوں اس مسئلہ کی عقدہ کشائی ہوتی چلی گئی، یہ مسئلہ مزید وضاحت طلب ہوتا چلا گیا۔ مفکروں اور دانشوروں کی رسائی درونِ خانہ ہونا تو ایک طرف، یہ بیچارے کوچۂ عرفان کے ہی آس پاس بھٹکتے پھرتے ہیں۔ اپنے آپ کی پہچان کرنا تو اہل اللہ کی ہمت کا محتاج ہے اور تمام فلسفیوں اور نکتہ وروں کے بس کی بات نہیں ان کی کوتاہی کو علامہ اقبالؒ نے یوں بیان فرمایا ہے۔

من بہ تلاش تو روم یا بہ تلاش خود روم   عقل و دِل و نظر ہمہ گم شدگانِ کوئے تو

(میں تیری تلاش میں جا رہا ہوں یا اپنی تلاش میں ہوں، میری عقل و دِل اور نگاہ تیرے کوچے میں گم ہو چکی ہیں۔) (ز۔ع: ۴۱۹)

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور   چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے (ب۔ج: ۳۷۶)

اپنی پہچان کر لینا حقیقتاً اپنی زندگی کے اسرار و رموز کو پالینا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اسی موضوع پر اُسرارِ خودی اور رموزِ بےخودی کے عقدوں کو حل کرتے ہوئے فارسی میں ایک کتاب "اسرار و رموز" کے نام سے تحریر فرمائی ہے۔ فلسفۂ خودی کو بھی علامہ اقبال نے اسی عقدۂ مشکل کی وضاحت میں لکھا ہے اور آپ کا یہ بیان اسی نکتہ کے اردگرد گھومتا ہے کہ انسان خود اپنی پہچان کر لے۔ اپنی ذات اور شخصیت کو سمجھنے کی صورتِ حال، معرفتِ نفس اور یقینِ ذات کے علم کو حاصل کرنے کو علامہ اقبالؒ نے خودی (یعنی Self Realization) سے تعبیر کیا ہے۔ فلسفۂ خودی کو بالتفصیل ہماری ایک تصنیف "عقل و عشق[1] اور فلسفۂ خودی" میں اور اس کے علاوہ

1. اس کتاب کا مسودہ کوئی شخص لے گیا ہے۔ اب اسے دوبارہ لکھنے کی کوشش ہے اگر زندگی نے وفا کی۔

''رابطۂ شیخ'' اور ''حضورِقلب'' کی کتابوں میں کافی وضاحت سے بیان کردیا ہے۔اب ہم اس بات کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ انسان اپنی پہچان کن علوم اور کن اعمال کے ذریعے کرسکتا ہے۔علامہ اقبالؒ کے کلام کے مطالعہ سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ اہلِ فلاسفہ کا علم اس قدر سطحی نوعیت سے متعلق ہے کہ وہ انسان کو اپنا سراغ لگانے میں مدد نہیں دیتا۔آپ فرماتے ہیں کہ اہلِ فلسفہ کسی اہم نکتہ کی عقدۂ کشائی کرنے سے قاصر ہیں اور ان کی نظر بجائے عقدۂ کشائی کے اور بھی مقید ہوجاتی ہے۔

کھلتا نہیں میرے سفرِ زندگی کا راز لاؤں کہاں سے بندۂ صاحب نظر کو میں!
حیراں ہے بوعلی کہ میں آیا کہاں سے ہوں رومیؒ یہ سوچتا ہے کہ جاؤں کدھر کو میں
(ب۔ج:۴۴۰)

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے زندگی سوزِجگر ہے علم ہے سوزِدماغ
علم میں دولت بھی ہے،قدرت بھی ہے،لذت بھی ہے ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ
اہلِ دانش عام ہیں،کمیاب ہیں اہلِ نظر کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ!
شیخِ مکتب کے طریقوں سے کشادِ دل کہاں کس طرح کبریت سے روشن ہوبجلی کا چراغ
(ض،ک،۵۴۱)

گر بہ استدلال کارے دیں بُدے فخر رازی رازِ دارِ دیں بُدے
(اگردین کا کام دلائلؒ سے چل سکتا،توفخرالدین رازی دین کے بڑے رازدان ہوتے۔)

نورِ حق از سینۂ سیناؔ مجو روشنی از چشمِ نابینا مجو(پ۔چ:۸۲۶)
(نورِحق بوعلی سینا(جیسے فلسفی)کے دِل سے تلاش نہ کرو،نابینا کی آنکھ سے روشنی مت چاہو۔)

بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم دستِ رومیؔ پردۂ محمل گرفت(پ۔م:۲۷۶)
(فلسفی بوعلی تو اونٹنی کی غبار میں گم ہوگیا اور رومیؒ کے ہاتھ نے بڑھ کر محمل کا پردہ تھام لیا۔)

علامہ اقبالؒ اس فلسفے کے خلاف ہیں جس کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالا نہ گیا ہو۔آپ نے ایسے بہت سے اشعار تحریر فرمائے ہیں جن میں فلسفہ کی بے مائیگی کا اظہار ہوتا ہے۔

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالیؓ نہ رہی فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالیؔ نہ رہی(ب۔د:۲۰۳)
یا مُردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے
(ض۔ک:۵۰۴)

تڑپ رہا ہے فلاطوں میانِ غیب و حضور ازل سے اہلِ خرد کا مقام ہے اَعراف
(ب۔ج:۳۷۰)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ اہل فرنگ کو اپنی عقل پر ناز ہے لیکن انہیں میری طرف سے کہہ دو کہ عقل جس قدر تیزی اور کمال حاصل کرے گی وہ اتنی زیادہ ناقص اور مجبور محض ہوتی چلی جائے گی۔ عقل اگر پختہ نہ ہو تو اس سے وہ توقع نہیں کی جاسکتی جو عقل کا مقصود ہے۔

از من اے بادِ صبا گوئے بہ دانائے فرنگ　　عقل تا بال کشود است گرفتار تراست

(اے بادِ صبا! میری طرف سے دانائے فرنگ کو کہو، جب سے تمہاری عقل نے بال و پر کھولے ہیں وہ اور بھی مقید ہوگئی ہے۔)

برق را ایں بہ جگر می زند، آں رام کند　　عشق از عقل فسوں پیشہ جگر دار تراست

(عقل بجلی کو جگر پر گرا دیتی ہے اور عشق رام کر لیتا ہے، جادو کرنے والی عقل کے مقابلہ میں عشق زیادہ جگر دار ہے۔)(پ۔م:۳۵۷)

چشمِ جز رنگِ گل و لالہ نہ بیند ورنہ　　آں چہ در پردۂ رنگ است پدیدار تراست

(ظاہر آنکھ تو بجز گلِ ولالہ کے رنگوں کے سوا اور کچھ نہیں دیکھتی، لیکن جو کچھ اس پردۂ رنگ کے باطن میں ہے زیادہ قابلِ دید ہے)(پ۔م:۳۵۸)

نری عقل حیلہ ساز ہے، عقدۂ کشا نہیں

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ اگرچہ عقل سے بھی بہت سے کام چلتے ہیں اور یہ کئی عقدوں کو حل کر سکتی ہے، مگر نری عقل جس کو عشق اور محبت کی مدد حاصل نہ ہو معاملات کی گرہ کشائی نہیں کر سکتی۔ آپ فرماتے ہیں کہ وہ دلائل جو عقل دیتی ہے اور جن کو عشق تسلیم نہیں کرتا، رد کر دینے کے قابل ہیں۔ علامہ نے ''زبورِ عجم'' میں فرمایا ہے۔

ہزار بار نکوتر متاعِ بے بصری　　زدانشے کہ دِل او را نمی کند تصدیق

(ز۔ع:۱۳۳)

(وہ متاعِ بے بصری (جہالت) ہزار گنا بہتر ہے، اس علم و دانش سے جس کی دِل تصدیق نہ کرے۔)

مقامِ آدمِ خاکی نہاد دریا بند　　مسافرانِ حرم را خدا دہد توفیق (ز۔ع:۵۰۵)

(خدا مسافرانِ حرم کو وہ توفیق دے کہ وہ آدم خاکی کا مقام پالیں۔)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ عقل مظاہر میں صفاتِ الٰہی کا مشاہدہ کرتی ہے اور عشق چاہتا ہے کہ وہ خلوت ذات کی طرف متوجہ ہو۔ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ عقل اپنی ہستی کے علاوہ دوسری چیزوں میں غور و فکر کرتی ہے تاکہ کوئی نتیجہ اخذ کرے۔ عقل کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ دوسروں کے نظریات کو آگے بڑھا کر ایک نتیجہ اخذ کرتی ہے۔ اس کے برخلاف عشق ایک توفیق منجانب اللہ ہے جو اس کے کرم و فضل سے ملتا ہے۔ عشق

اکتسابی نہیں، وہ اپنا محاسبہ کرتا ہے اور خودی پر بھی نظر رکھتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ عقل اکتسابی چیز ہے اور محنت کرنے سے گھٹتی یا بڑھتی ہے جب کہ عشق اللہ کی نعمت اور غیبی دین ہے۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ عقل خودی سے محروم کرتی ہے اور عشق خودی کو ترقی دیتا ہے۔

عقل با غیر آشنا از اکتساب عشق از فضل است و باخود در حساب
(ا۔ر:۱۰۹)

(عقل غیروں سے آشنا ہے اور ان سے اکتساب کرتی ہے، عشق اللہ کا فضل ہے اور اپنا محاسبہ کرتا ہے۔)

عقل او را سوئے جلوت می کشد عشق او را سوئے خلوت می کشد
(ج۔ن:۶۰۹)

(عقل انسان کو محفل کی طرف کھینچتی ہے، عشق انسان کو خلوت (یعنی ذاتِ حق) کی طرف کھینچتا ہے۔)

خرد سے راہرو روشن بصر ہے خرد کیا ہے؟ چراغ راہگور ہے
دُرونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا؟ چراغ راہگور کو کیا خبر ہے (ب۔ج:۳۷۷)

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے
(ب۔ج:۳۷۶)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ عقل تو حیلہ باز ہے سو بہانے تراش لیتی ہے اور اصل مدعا تک پہنچنے میں مدد نہیں دیتی۔ عقل کے مقابلے میں عشق بیچارہ سیدھا سادہ ہے اور منزل کی طرف بلا تامل لے جاتا ہے۔

عقل عیار ہے، سو بھیس بنا لیتی ہے عشق بے چارہ نہ مُلا ہے، نہ زاھد، نہ حکیم
(ب۔ج:۳۵۲)

نشانِ راہ زعقل ہزار حیلہ مپرس بیا کہ عشق کمال زیک فنی دارد (پ۔م:۳۳۳)

(راہ کا نشان حیلہ باز عقل سے نہ پوچھ آؤ کہ عشق (عقل دونوں کے مقابلے میں) یک فنی میں کمال رکھتا ہے۔)

بُلھیا کیہہ جاناں میں کون؟

حقائق کی مکمل شناخت کرنا ایک ایسا مسئلہ ہے جو بڑے بڑے فلسفیوں اور سائنسدانوں اور فلاسفروں سے حل نہ ہو سکا۔ جب انسان کی اپنی شناخت ممکن نہیں تو خدا کی شناخت کیسے ممکن ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے بعد بزرگ ترین ہستی محمد مصطفیٰ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے کے بارے میں فرمایا: "ما عرفتک حق معرفتک" (اسلامی تربیتی نصاب: ج ۱ از ڈاکٹر طاہر القادری) (یعنی اے خدا! ہم تیری ایسی معرفت حاصل نہ کر سکے کہ جس سے تیری معرفت کا حق ادا ہو سکے) انسان کی معرفت حاصل کرنا بھی ناممکن

ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اے صدیق! قسم ہے مجھے اس ذات کی جس نے حق کے ساتھ مجھے مبعوث فرمایا میری حقیقت کو میرے ربّ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ (مطالع المسرات: ۱۲۹)

جس کسی نے کسی ہستی کی معرفت حاصل کرنے کی کوشش کی تو اس نے اپنی استعداد کے مطابق اس کو پہچانا، کسی نے کم اور کسی نے زیادہ۔ حضور اکرم ﷺ کے علم کے متعلق جب ہم بات کرتے ہیں تو کوئی شخص یہ بیان نہیں کر سکتا کہ حضور اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے کون کون سے علوم کس حد تک عطا فرما دیئے تھے جب کہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ "وَ فَوْقَ كُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ (یوسف: ۷۶)" یعنی ہر علم والے سے زیادہ علیم موجود ہوتا ہے۔" اس کا مطلب یہ ہوا کہ مطلق عالم اس دنیا میں (سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے اور) کوئی نہیں ہے اور اس کے سوا اگر کسی کو علم ہے تو وہ حضور اکرم ﷺ کی ذات ہیں۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ رسول خدا ﷺ نے مجھے علم کے ایسے ستر باب تعلیم فرمائے ہیں کہ جو کسی اور کو آپؐ نے تعلیم نہیں فرمائے، تو ایسی حالت میں علم و معرفت کی حدود کو کون چھو سکتا ہے اور یہ دعویٰ کرے کہ میں نے فلاں چیز کی معرفت حاصل کر لی، چہ جائے کہ انسان کی معرفت حاصل ہو سکے، جسے اللہ تعالیٰ نے سب سے احسن تقویم میں پیدا فرمایا ہے۔

اسلامی [illegible] ...روں اور سائنسدانوں نے اشیائے دنیا پر تفکر کیا تو اپنی بے بضاعتی کا اعتراف کیا بلکہ سائنسد... [illegible] نے تو بے بہا تحقیقاتی مشقت کے بعد خود کو پہلے سے بھی زیادہ مبہم اور بے علم تسلیم کیا ہے اور ان کے سامنے آنے والے حقائق نے پہلے سے بھی زیادہ پریشان کن پیچیدگیوں سے لبریز سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ تخلیقِ کائنات کے متعلق کمپیوٹر ریسرچ نے بہت سے رازوں کا انکشاف کیا لیکن ایسی ریسرچ نے بے شمار سوالوں کا جواب دینے سے انکار کر دیا جن سے پردہ اُٹھانا شاید ہزاروں سالوں کی تحقیق کے بعد بھی ممکن نہ ہو سکے۔ اگر اس کائنات کے رازوں کو افشا کرنے کا یہ حال ہو (جس کی تفصیل اس عامیانہ مضمون میں ممکن نہیں) تو انسان کی معرفت سے پردہ کون اُٹھائے گا۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ مذکور بالا سائنسدانوں اور فلاسفروں کی تحقیقات سے اس قدر زیادہ معلومات حاصل نہیں ہو سکتیں جتنا کہ اولیائے محققین سے ان چیزوں کے متعلق معرفت حاصل کی جا سکتی ہے کیونکہ ان کا علم اللہ تعالیٰ کی وساطت سے حاصل کیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کسی کو حقائق اشیاء کی معرفت عطا نہیں فرمائی۔ ابھی تک انسانوں اور جہانوں کے علوم سے جو علم ہم تک پہنچا ہے وہ رسولِ خدا ﷺ کی وساطت سے ہی پہنچا ہے اور کچھ علوم ایسے بھی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے عام کرنے کی اجازت نہیں دی۔ "عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ حَفِظْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وِعَائَیْنِ فَاَمَّا اَحَدُهُمَا فَبَثَثْتُهٗ فِیْكُمْ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَلَوْ بَثَثْتُهٗ قُطِعَ هٰذَا الْبُلْعُوْمُ یَعْنِیْ مَجْرَی الطَّعَامِ (مشکوۃ ج ۱ ص ۱۱۰) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم ﷺ سے دو قسم کے علوم حاصل کیے ان

میں سے ایک تو وہ جو مَیں تمھارے سامنے بیان کرتا ہوں اور دوسری قسم کے وہ کہ اگر میں ان کو لوگوں پر بیان کر وں تو (میرا) یہ گلہ کاٹ دیا جائے گا۔"وَاللّٰہُ اَعۡلَمُ بِالصَّوَابِ"۔

معرفتِ انسان کے اس عقدۂ مشکل کا حل، بحرِ معرفت کی شناوری کرنے والے چند عارفوں نے اپنے رب کی طرف سے عطا کردہ بصیرت قلبی سے ان معارف کے مخفی خزانوں کو معلوم کرنے کی کوششیں کیں اور وہ بھی ان معارف کی عمیق گہرائیوں میں کھو گئے۔ ایسے چند عارفین باللہ سکر و مستی کی حالت میں کھو کر جو کچھ کہہ گئے اس کی ایک مختصر سی روئیداد اس تحریر میں اپنی بساط کے مطابق پیش کی جارہی ہے۔ اُمید ہے کہ ہماری یہ کوشش قارئین کو زیرِ غور مضمون کی حقیقتوں کے قریب پہنچادے گی۔

عارفِ کامل حضرت بلھے شاہ رحمۃ اللہ علیہ کو جب اس حقیقت کا خیال آیا تو اس مہم کے آغاز پر ہی اُنہوں نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا اور اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے گرہ کشائی نہ کر سکے۔ درج ذیل کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیفیتِ حیرت میں سراپا استفسار بن کر رہ گئے۔ فرماتے ہیں۔

نہ میں مومن وچ مسیتاں نہ میں وچ کفر دیاں ریتاں
نہ میں پاکاں وچ پلیتاں نہ میں موسیٰ نہ فرعون
بلھیا کیہہ جاناں میں کون
نہ وچ شادی ناں غمناکی نہ میں وچ پلیتی پاکی
نہ میں آبی نہ میں خاکی نہ میں آتش نہ میں پون
بلھیا کیہہ جاناں میں کون
اوّل آخر آپ نوں جاناں نہ کوئی دوجا ہور پچھاناں
میتھوں ہور نہ کوئی سیاناں بلھیا اُوہ کھڑا ہے کون
بلھیا کیہہ جاناں میں کون

جہاں لوگوں کو علمِ معرفت اور مشاہداتی پہلو پر مکمل دسترس نہیں ہوتی، وہاں کچھ لوگ نیم روحانی محفلوں میں اس مسئلے پر بھی بہت بحث کرتے پائے گئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہم مومن ہیں یا کافر۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ہم اس وقت مومن کہلا سکتے ہیں جب تک صورتِ گرِ ازل (یعنی اللہ تعالیٰ) خود نہ کہہ دے کہ یہ میرا بندہ ہے اور مومن ہے۔ کچھ لوگ اسی عدم قبولیت کے ڈر سے کہتے ہیں" ہم انشاء اللہ مومن ہیں" وہ اپنے آپ کو مومن کہہ دینا ایک دعویٰ کے سوا کچھ نہیں پاتے کیونکہ یہ وہ فیصلہ ہے جو روزِ قیامت انسان کے اعمال کی قبولیت یا نامقبولیت کے بعد ہی اللہ تعالیٰ خود کرے گا۔ اس سے قبل کچھ کہنا محض لاف زنی ہے۔

حضرت بلھے شاہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

ع میری بُکّل دے وچ چور نی

اس کلام سے آپ کی مراد یہ ہے کہ وہ احکام اثار کے پردے میں چور یعنی محبوب حقیقی کا وجود اضافی محسوس کرتے ہیں۔ یہ محبوب حقیقی چوری سے آتا ہے اور چوری سے ہی نکل جاتا ہے۔ نہ کسی کو اس کے آنے کی خبر ہوتی ہے اور نہ جانے کی۔ کہیں اس کا نام رام داس اور کہیں فتح محمد ہے اور جب یہ امر اعتقادی اور فرضی مٹ گئے اور محو ہو گئے تو وہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے جس کی طرف نہ نسبت رام داس کی کر سکتے ہیں اور نہ فتح محمد کی۔

حضرت بلھے شاہ رحمۃ اللہ علیہ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ جب عشق کا زور ہو اور وحشت کا شور ہو تو پھر زبان بے قابو ہو جاتی ہے اور جو بات منہ پر آ جائے (خواہ وہ بظاہر شریعت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو) تو رُکتی نہیں۔ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ خود انسان کے منہ سے بولتا ہے تو وہ سچ کہنے سے کس طرح رُک سکتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ خدا بندے کے منہ سے بات کرتا ہے اس کی مثال اس حدیث سے ملتی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے "اِنَّ اللّٰهَ يَنْطِقُ عَلٰى لِسَانِ عُمَرَ" (یعنی اللہ تعالیٰ عمر رضی اللہ عنہ کی زبان پر گفتگو کرتا ہے)۔ فرماتے ہیں کہ اگر میں سچ کہہ دوں کہ میں اپنی ذات سے عدم محض اور لاشے مطلق ہوں تو لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ خود کو خدا سمجھ بیٹھا ہے حالانکہ عدم محض اور لاشے خدا کیسے ہو سکتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں جھوٹ بولوں تو یہ کہوں کہ میری ہستی مستقل ورائے ہستی حق ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انسان میں ہستی مطلق کا ظہور ہے اور اس کا غیر عدم محض ہے۔ آپ (بلھے شاہ) وحدت الوجود کی بات کو مانتے ہیں لیکن اس کو فاش طور پر کہنا نہیں چاہتے۔ آپ فرماتے ہیں کہ نفس کی آلودگیوں سے بچ کر زندگی گزارو تو پھر اللہ کو تلاش کر سکو گے اور پہچان سکو گے کہ تمہارے اندر کون ہے۔ فرماتے ہیں کہ یہ معاملات بڑے نازک ہیں اور قلب انسانی میں سب کچھ ہے، خدا بھی ہے۔

ایہہ تلکن بازی ویہڑا اے تھم تھم کے ٹرو اندھیرا اے
وڑ اندر دیکھو کیہڑا اے کیوں خلقت باہر ڈھونڈیندی اے
منہ آئی بات نہ رہندی اے

بلھیا رب اساں توں وکھ نہیں بن رب توں دوجا ککھ نہیں
پر ویکھن والی اکھ نہیں تاہیوں جان جدائی سہندی اے
منہ آئی بات نہ رہندی اے

سائیں عنایت رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کے ساتھ ساتھ حضرت بلھے شاہ رحمۃ اللہ علیہ کو یہ معلوم ہونے لگا کہ وحدت الوجود کے مطابق ہر شے کی حقیقت اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور ہمارے اندر بھی وہی ذات جلوہ فگن اور ہمارا بدن خاکی ہمارے اور خدا کے درمیان ایک برزخ ہے۔ ایک جگہ آپ نے فرمایا۔

تسیں آپے آپ ہی سارے ہو کیوں کہندے اسیں نیارے ہو

آئے آپے آپ نظارے ھو وچ برزخ رکھیا خاکی دا
کیوں اوہلے بہہ بہہ جھاکی دا
ایہہ پردا کس توں راکھی دا

تدھ باجھوں دوسرا کیہڑا اے کیوں پایا اُلٹا جھیڑا اے
ایہہ ڈڈھا بڑا اندھیرا اے ہن آپ نوں آپے آکھی دا
کیوں اُوہلے بہہ بہہ جھاکی دا
ایہہ پردا کس توں راکھی دا

حضرت بلھے شاہ رحمۃ اللہ علیہ کا کلام بہت طویل ہے۔ ان کے فلسفے اور تصورات کو ان کے ہی چند اشعار میں پیش کر دیا گیا ہے۔ ان کے پورے کلام کو اس جگہ تحریر کرنا ممکن نہیں۔ آپ کی ایک نظم سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بلھے شاہ کبھی تلاشِ حق میں نکلتے ہیں تو کہتے ہیں ''اک رانجھا مینوں لوڑی دا'' اور پھر جب فنافی اللہ کی منزل پر پہنچے تو محسوس کرنے لگے کہ یہ رانجھا تو میرے اندر ہی موجود ہے اور پھر خود ہی یہ فرمانے لگے۔

رانجھا رانجھا! کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی
سدّو مینوں ''دھیدو رانجھا'' ہیر نہ آکھو کوئی
رانجھا میں وچ، میں رانجھے وچ، ہور خیال نہ کوئی

جو کچھ ساڈے اندر وسّے، ذات اساڈی سوئی
جس دے نال میں نیونھ لگایا اوہو جیسی ہوئی
رانجھا میں وچ، میں رانجھے وچ، ہور خیال نہ کوئی

خبر سے نظر تک پہنچنا

علم دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جو خود دیکھا اور محسوس کیا جائے۔ یہ علم بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے، اس علم کو نظر کہتے ہیں۔ دوسرا علم وہ ہے جو دوسروں سے سُنا یا کتابوں میں پڑھا جائے، ایسے علم کو خبر کہتے ہیں۔ علماء بے عمل کا علم بھی خبر کی حد سے آگے نہیں جا سکتا اور یہی وجہ ہے ایسے علماء کا وعظ بہت دلربا تو معلوم ہوتا ہے، مگر لوگوں پر اثر پیدا نہیں کر سکتا۔ علمِ نظر جہاں کسی کو نصیب نہ ہو تو وہ کائنات کی پیمائش، علت و معلول اور قوانینِ فلسفہ سے تو آگاہ ہو سکتا ہے لیکن اُس کی پرواز زمانی، مکانی، طبیعی، مادی عالم اور خلاؤں سے آگے نہیں جا سکتی اور اس سے آگے اسے تاریکی نظر آتی ہے۔ ایسے علماء اور فلسفی جسور (جسارت والے) نہیں ہوتے اور فنا اور بقا سے ناآشنا ہوتے ہیں جب کہ غیور انسان اپنی خودی کی حفاظت کرتا ہے اور دنیا و مافیہا سے بے نیازی

اور وقار نفس پیدا کر لیتا ہے۔ وہ مادی قوتوں کے سامنے خم نہیں ہوتا۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں ۔

بلند بال تھا لیکن نہ تھا جسور و غیور حکیم سرّ محبت سے بے نصیب رہا!
پھرا فضاؤں میں کرگس اگرچہ شاہیں وار شکارِ زندہ کی لذت سے بے نصیب رہا!
(ب۔ج:۴۵۶)

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ علم بھی نام نہاد علماء یا نااہل علماء سے سیکھنا مناسب نہیں کیونکہ وہ روحانی قوتوں سے محروم رہتے ہیں۔ علم اور خبر ایسے شخص سے سیکھو اور سنو جو علم سے معلوم (یعنی حق تعالیٰ) تک رسائی حاصل کر چکا ہو اور خبر (یعنی حدیث) سے مخبرِ صادق کو پہچانتا ہو۔ نظر کے اثر انداز ہونے کی وضاحت علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں متعدد جگہوں پر کی ہے اور وہ فیض نگاہ کے بہت زیادہ قائل ہیں۔ ایک اور شاعر نے انسانی نظر میں کمال پیدا ہونے کی کیفیت کو یوں بیان کیا ہے ۔

نظر کی جولانیاں نہ پوچھو نظر حقیقت میں وہ نظر ہے
اُٹھے تو بجلی پناہ مانگے گرے تو خانہ خراب کر دے

مولانا رومؒ بھی فرماتے ہیں کہ تمام کتابیں اور علمی تحریروں کے اوراق کو نذر آتش کر دو اور اپنے دِل کے رُخ کو دلدار (یعنی پیرومرشد) کی جانب کر لو یہی کافی ہے۔ حضرت باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انسان کا دِل ایک بہترین کتاب ہے۔ اس کے ذریعے فیض حاصل ہوتا ہے اور حجاب کھل جاتے ہیں ۔

صد کتاب و صد ورق در نار کن روئے دِل را جانب دلدار کن
(سو کتابیں، سو ورق آگ میں جھونک دو، دِل کے چہرے کو اپنے دلدار مرشد کی طرف کر لو۔) (رومیؒ)

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر علم و حکمت در کتب، دیں از نظر
(پ۔ج:۸۶۵)
(دین کو کتابوں میں نہ تلاش کر اے بے خبر علم و حکمت کو کتابوں میں ڈھونڈ و لیکن دین نظر میں تلاش کرو۔)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی سکھائے کس نے اسمٰعیلؑ کو آدابِ فرزندی
(ب۔ج:۳۰۶)

در کنز و ھدایہ نتواں یافت خدا را در صفحۂ دِل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست
(کنز اور ھدایہ میں خدا نہیں ملتا، صفحہ دِل میں دیکھو کہ اس سے بڑی کوئی کتاب نہیں)

علم بذریعۂ وجدان

وجدان دماغ کی ایک قوت ہے جو شعوری استدلال (دلائل) یا مطالعہ کے بغیر علم حاصل کرتی ہے۔ اس کا مطالعہ کرنا اس لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے شعور اور اس کے ارتقاء کی نوعیت و حقیقت کے متعلق کسی قطعی رائے کا اظہار کر سکے اور کسی چیز کے ادراک کو وثوق کے درجے تک حاصل کر سکے۔ وجدان کشف یا جذبۂ عشق کے توسط سے انسانی شعور نے حاصل کیا ہے اور یہ مفروضہ قانونِ ارتقاء کے عین موافق ہے۔ وجدان کا مسئلہ مابعد الطبیعی حقائق سے منسلک ہے (یعنی یہ ایک غیر مادی غیر استدلال دنیا سے تعلق رکھتا ہے)۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں فرمایا ہے کہ روحانی وجدان محض ایک تاثر یا جذبہ نہیں بلکہ حقائقِ حیات کی بابت اس میں وسیع تر علم اور عمیق تر بصیرت پائی جاتی ہے۔ علامہ نے فرمایا کہ طبعی عقل، عقل نہیں۔ ایسی عقل حیوانی جذبات کی غلامی کرتی ہے، جب کہ عقلِ کلی میں وجدانِ عشق، سوز و گداز اور علم و عقل کی وسعتیں موجود ہیں۔ عقلِ جزوی وہ ہے جو خود پر تنقید نہ کرے (یعنی اپنی غلط بات کو درست تصور کرے) اور اپنی حدود سے ناواقف ہو۔ اسی عقل کو علامہ اقبالؒ نے مولانا رومؒ کی طرح الحاد آفرین، عقلِ بہانہ جُو یا عقلِ فسوں گر کہا ہے۔

مغرب کے فلسفیوں کے برخلاف، علامہ اقبالؒ یہ سمجھتے ہیں کہ اگرچہ وجدان میں قلبی کیفیات اور جذبۂ عشق کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے اور عشق و عقل کے انتخاب میں وہ عشق کو ترجیح دیتے ہیں تاہم عقل سے انہیں بیر نہیں۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ عقل اپنے کمال پر پہنچ جانے کے بعد وجدان میں بدل جاتی ہے یعنی اگر عقل جذبات کی غلامی سے کور یا تاریک نہ ہو جائے اور جادۂ حیات کی مسلسل راہنمائی کرتی رہے تو عقل کی منزل اور عشق کا حاصل ایک ہو جاتا ہے۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ ایسی عقل سے عقلِ سلیم مراد ہے اور قرآن میں بھی اس عقل کا متعدد بار ذکر کیا گیا ہے اور فرمایا ہے "اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ" (مگر وہ شخص جو لے آیا اللہ تعالیٰ کے حضور قلبِ سلیم۔ (الشعراء: ۸۹) عقل اگر عشق کے تابع ہو جائے تو عشق اس کا مددگار اور معاون بن جاتا ہے۔ ایسی عقل ذوقِ نگاہ سے بیگانہ رو نہیں رکھتی۔ آپ نے فرمایا ہے۔

ع عقل ہم عشق است و از ذوقِ نگاہ بیگانہ نیست

(عشق کی تابع عقل بھی عشق بن جاتی ہے اور وہ ذوقِ نگاہ سے بیگانہ نہیں رہتی۔)

ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں کچھ واقعات کی روایت کی گئی ہے اور پھر فرمایا گیا ہے کہ اے عقل والو! فلاں بات کو سمجھو۔ قرآن نے بار بار فرمایا کہ یہ لوگ عقل سے کام کیوں نہیں لیتے؟ اسی لئے علامہؒ نے ایسے علم اور عقلِ سلیم کو تسلیم کیا ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں۔

علم را مقصود اگر باشد نظر　　می شود ہم جادہ و ہم راہبر (ج۔ن: ۶۷۷)

(علم کا مقصود اگر نظر ہو جائے، تو یہ راستے کی رفیق اور راہنما بن جاتی ہے۔)

علم تفسیرِ جہانِ رنگ و بو دیدہ و دِل پرورش گیرد ازو (ج۔ن: ۷۷)

(علم اس دنیائے رنگ و بو کی تفسیر ہے، اور اس سے قلب ونظر پرورش پاتے ہیں۔)

ایک اور مقام پر علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ اپنے دل کے ساتھ عقل کو رکھو کیونکہ ایسی عقل جس نے دل (روح) سے ادب سیکھا ہو وہ باطل کے ساتھ کبھی الحاق نہیں کرے گی۔ ادب تو دل کی خوراک ہے۔

نقشے کہ بستۂ ہمہ اوہامِ باطل است عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دِل است

(وہ نقوش جن کے ساتھ تم نے دِل بستگی کی ہے تمام باطل ہیں، ایسی عقل پیدا کرو جو دل کی تربیت یافتہ ہو۔) (پ۔م: ۳۷۷)

بچشمِ عشق نگر تا سراغِ او گیری جہاں بچشمِ خرد سیمیاؑ و نیرنگ است

(عشق کی نظر سے دیکھو تاکہ تمہیں اس (خدا) کا سراغ مل سکے، یہ جہاں عقل کی نگاہ میں سفید جادو اور مکر و فریب ہے۔) (پ۔م: ۳۲۱)

مغربی فلاسفر، برگساں نے بھی وجدان کو عشق ہی کہا ہے اور مانتا ہے کہ یہ وہ عشق ہے جو انبیاء اور اولیاء کے ہاں پایا جاتا ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ وجدان نہ زمانی ہے اور نہ مکانی ہے۔ اس کے اندر جو زمان ہے اس میں نہ تو ماضی ہے اور نہ ہی اسے حال و مستقبل سے کوئی واسطہ ہے۔ وہ ایک تخلیقی میلان اور سیلان ہے۔ فرماتے ہیں کہ مادہ آلود عقل یا جزوی عقل کا کام چوہے کی طرح ہے کیونکہ اس کا تعلق خاک یعنی زمین سے ہے نہ کہ آفاق سے۔ اہلِ مغرب نے جزوی عقل کے ذریعے مادی دنیا میں ہی محنت کی ہے جسے ہم خرید و فروخت یا تجارت کہہ سکتے ہیں۔ عقل کا وجدان تو ایسی نادر چیز ہے کہ حضرت خضرؑ کے مقابلے میں موسیٰ علیہ السلام بھی حیرت کناں ہیں، وہ پہلے حضرت خضرؑ کے کاموں کی تاویل کو نہ سمجھ سکے۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ عقل بہانہ جُو راہ نہیں دکھا سکتی، چنانچہ اعمال اور علم کی بنیاد عشق پر رکھو

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ (ب۔د: ۲۸۲)

بہ خرد راہِ عشق می پوئی؟ بہ چراغ آفتاب می جوئی؟ (پ۔م: ۳۷۲)

(عقل سے تم عشق کا راستہ تلاش کرتے ہو، معمولی چراغ لے کر سورج کو ڈھونڈتے ہو۔)

علم بر بیم و رجا دارد اساس عاشقاں را نے اُمید و نے ہراس!

(علم کی بنیاد خوف اور اُمید کے درمیان ہوتی ہے اور عاشقوں کے لیے نہ اُمید ہوتی اور نہ خوف)

علم ترساں از جلالِ کائنات عشق غرق اندر جمالِ کائنات

(علم کائنات کی ہیبت سے ڈرتا ہے، جب کہ عشق کائنات کے جمال میں غرق ہے۔)

عشق آزاد و غیور و ناصبور در تماشائے وجود آمد جسور (ج۔ن:۲۰۸)

(عشق آزاد، غیرت منداور ناصبور ہے، وہ وجود کے مشاہدہ کرنے کی ہمت رکھتا ہے۔)

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ وجدان کو عقل بہانہ جُو تلاش نہیں کرسکتی اور نہ ہی حقائق کا ادراک کرسکتی ہے۔

اہلِ وجدان دوسروں کو سمجھانے کے لئے قال (باتوں) سے پرہیز کرتے ہیں اور نہ ہی ان کی بات زبان پر آ سکتی ہے، لہٰذا انہیں تشبیہ اور تمثیل (مثالوں) سے کام لینا پڑتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جب زبان کام نہ کرے اور تمثیلات سے بھی ادراک پیدا نہ کیا جاسکے تو بات کہنے والے کی بھی تسلی نہیں ہوتی اور نہ ہی سُننے والے کی تسلی ہو سکتی ہے۔ اگر کیفیت یوں ہو تو وجدان کی حقیقت کس طرح بیان ہوسکتی جب کہ اس کا تعلق نہ حواس سے ہو اور نہ ہی اس دنیا کے زمان ومکاں سے۔ آخر تنگ آ کر مولاناؒ فرماتے ہیں کہ کاش کہ ہستی کی کوئی زبان ہوتی تا کہ جلوے کے دیدار میں مست لوگ اپنے خیالات سے پردہ اُٹھا سکتے۔

کاش کہ ہستی زبانے داشتے تا زمستاں پردہا برداشتے (۴۴۸۔۳)

(کاش کہ ہستی کی کوئی زبان ہوتی تا کہ وہ عاشقوں سے پردہ اُٹھادیتی۔)

اے خدا بنمای تو جاں را آں مقام کاندر آں بے حرف می روید کلام

(اے خدا تو روح کو وہ مقام عطا کر کہ جہاں بغیر حروف کے کلام جاری ہو جائے۔)

دراصل وجدان کی حالت سکوت وسخن دونوں سے ماورے ہے کہ نہ تو وہ خاموش رہ سکتے ہیں اور نہ گویا، یا یوں کہیے کہ وہ خاموش بھی ہے اور گویا بھی البتہ اگر کسی شے کو سمجھنے کی بات ہو تو وجدان سے بہتر اس کی کوئی چیز اس کی ہمسری نہیں کرسکتی۔

اشیاء کے ظاہر اور باطن کا علم

انسان کو اللہ تعالیٰ نے کیا کیا جوہر ملکوتی عطا فرمائے ہیں، اس راز سے خود انسان بھی آشنا نہیں۔ انسانوں کی اکثریت تو ظاہری دنیا کی ظاہری شکل سے ہی قدرے آشنا ہے اور دنیا کی ہر چیز کو محض ظاہری نظر سے ہی پہچانتی ہے۔ اس کورنگاہی کی وجہ انسان کی قوانین الٰہی اور چشمِ بصیرت سے لاعلمی اور لاتعلقی ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہماری ایک بہت بڑی اکثریت باطنی علوم تو کیا ظاہری علوم سے بھی سراسر محروم ہے۔ یورپ کے علماء نے ظاہری علوم کو حاصل کرنے میں کافی تحقیق کی ہے، چنانچہ ان کا شعبہ سائنس نت نئی ایجادات کو معرض وجود میں لا رہا ہے اور پوری دنیا سے دادِ تحسین حاصل کر رہا ہے۔ اگر ہم اشیاء کی باطنی صورتوں پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ تحقیق کا یہ پہلو تو یکسر ویرانی کا شکار ہے، کیونکہ باطنی علوم کا یہ حصّہ نہ صرف تحقیقاتی کاوشوں اور محنتوں کا محتاج ہے بلکہ اس قلزم خاموش کو کھولنے کے لئے ضرب کلیمی اور وجدان کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو

لوگ باطنی علوم کی کشائش سے آگاہ ہیں ان کی تعداد تو مذکورہ بالا ظاہری علوم کے جاننے والوں سے بھی بہت قلیل بلکہ اقل ہے۔

ہم ہر روز اپنی زندگی میں استعمال ہونے والی بہت سی اشیاء کو ملاحظہ کرتے ہیں اور آگے گزر جاتے ہیں مگر ان اشیاء کے عظیم صانع نے جو کمالات اور اسرار ان میں مخفی کر دیئے ہیں ان کی طرف کبھی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ قرآن عظیم مسلمان کو اسی عرفان کے حاصل کرنے کی تاکید کرتا ہے اور جا بجا فرماتا ہے کہ اے انسان! کائنات میں جو کچھ پیدا کیا گیا ہے اس پر غور کر اور اپنی قوتِ فکر کو ان پوشیدہ اسرار کے کھولنے میں استعمال کر۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ عموماً یہ دُعا فرمایا کرتے تھے کہ الٰہی ہمیں تمام اشیاء کے حقائق کا علم عطا فرما "رَبَّنَا اَرِنَا حَقَائِقَ كُلِّ الْاَشْيَاءِ كَمَا هِيَ"۔ اسلام مسلمانوں کو کائنات کے اس قسم کے حقائق پر غور کرنے کی اہمیت بتاتا ہے چنانچہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے قدرت کے ان اسرار کو فاش کیا حتیٰ کہ انہوں نے خود خدا کی معرفت حاصل کرنے میں بھی اپنی قوتوں کے مطابق کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ علامہ اقبالؒ درج ذیل اشعار میں انسان کی ان ہی عرفانی کوششوں کو بروئے کار لانے کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔

گاہ میری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود ۔۔۔ گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں
تو نے یہ کیا غضب کیا! مجھ کو بھی فاش کر دیا ۔۔۔ میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

(ب۔ج:۲۹۷)

علامہ اقبالؒ کے نزدیک انسان کا وجود اس کی خودی کے ذریعے ہی پہچانا جاتا ہے۔ اگر انسان میں جوہرِ خودی ہے تو اس جوہر کو آپ اس کی شکل وصورت سے ظاہر ہوتا ہوا پاؤ گے، یعنی جہاں خودی کے جوہر بدل گئے انسان کی شکل بھی بدل گئی۔ انسان کی یہ زندگی ایک شرر کے مثل دیر پا نہیں لیکن اس عرصے میں زندگی کو اعلیٰ معیار پر لانے کے لیے خودی کی تعمیر کرنا ضروریات زندگی سے ہے۔

اے کہ ہے زیرِ فلک مثلِ شرر تیری نمود ۔۔۔ کون سمجھائے تجھے کیا ہیں مقاماتِ وجود (ض۔ک:۵۷۶)
وجود کیا ہے؟ فقط جوہرِ خودی کی نمود ۔۔۔ کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا (ض۔ک:۴۹۶)

اپنے دیدار کے بغیر زندگی موت ہے

جب تک انسان اپنی قوتوں، خوبیوں اور صلاحیتوں سے بیگانہ اور نا آشنا ہے اس وقت تک انسان اپنی فعالیت (کام کرنے کی قوت) سے آگاہ نہیں ہوتا۔ ایسا غیر فعال شخص مردہ حالت میں ہی زندہ رہتا ہے اور گویا اپنے کندھوں پر اپنی لاش اُٹھا کر چلتا پھرتا ہے۔ جو شخص اپنی صلاحیتوں کا اندازہ کر لیتا ہے تو وہ اپنی مخالف

قوتوں کے ساتھ مدافعت کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور ایک کامیاب انسان کہلاتا ہے۔ اسلام بھی اپنے ماننے والوں کو یہی سبق دیتا ہے اور صاف طور پر کہتا ہے کہ "ہے جُرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات"۔ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں ایسے لوگوں کا آخرت میں بھی کوئی مقام نہیں جو دنیا میں ضعیفوں کی سی زندگی گزارتے رہے۔ رمزِ دین کا جاننا بھی خودی کے اسرار سے واقف ہونا ہے۔ خودی کا عرفان ہنر کے تمام مرحلوں کی انتہا ہے۔ زندگی کا کمال بھی اپنی حقیقت کی پہچان کرنے پر منحصر ہے۔

چیست دیں؟ دریافتن اَسرارِ خویش زندگی مرگ است بے دیدارِ خویش

(دیں کیا ہے؟ اپنی مخفی طاقتوں کے دریافت کرنے کا نام ہے، جب اپنا دیدار نہ ہو سکا تو زندگی موت ہے۔) (پ۔چ: ۸۵۴)

بیا بر خویش پیچیدن بیاموز بناخن سینہ کاویدن بیاموز

(اُٹھ اور اپنے آپ پر توجہ مرکوز کرنا سیکھ، اپنے ناخن سے اپنا سینہ زخمی کرنا سیکھ)

اگر خواہی خدا را فاش بینی خودی را فاش تر دیدن بیاموز (ا۔ح: ۹۹۱)

(اگر اللہ تعالیٰ کو بے پردہ دیکھنا چاہتا ہے تو اپنی خودی کو فاش تر دیکھنا سیکھ)

مذکورہ بالا اشعار میں علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ جو لوگ اپنی خودی کی پہچان کرنے کے لئے کاوشیں بروئے کار لاتے ہیں اور اپنے سینے کو اس محنت سے داغدار کر لیتے ہیں، وہی لوگ حتی الامکان حق تعالیٰ کی بھی پہچان کر لیتے ہیں۔

کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں؟

ہر انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے بیش بہا اور مایۂ ناز جوہر مخفی کر رکھے ہیں۔ ان خزانوں کو کرید کر باہر لانا اور ان سے استفادہ کرنا کسی اہلِ ہمت انسان کا ہی مقدر ہوتا ہے۔ وہ شخص جس کو اپنے مخفی خزانوں اور کمالات کا علم ہی نہ ہو تو وہ ان خزانوں کو کام میں کب لا سکتا ہے؟ اپنے مخفی خزانوں کا علم ہونا انسان میں ہمت، بلندی اور کمال پیدا کرتا ہے۔ اگر کسی کو یہ معلوم ہو جائے کہ اعلیٰ معیار کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ کیا کچھ کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکتا ہے تو ایسا شخص کبھی تضیع اوقات کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔ اگر کوئی شخص کسی راہبر سے اپنی صلاحیتوں کے ذریعے کارہائے نمایاں انجام دینے کے رموز اور اسرار حاصل کر لیتا ہے اور ایسا کر لینے سے وہ اپنی زندگی کو کامیاب کر لینے کی کیفیت اور جذبہ حاصل کر لیتا ہے تو سمجھ لو کہ اس نے اپنی منزل کو حاصل کرنے کے پچاس فیصد اسباب مہیا کر لیے۔ اس کے بعد کمر ہمت باندھ کر اس منزل کی راہ پر چل نکلنے کا کام باقی رہ جاتا ہے، سو اگر وہ ہمت آزمائی کرے تو اپنی منزل حاصل کرنے کے لیے کوئی اور مشکل باقی نہیں رہ جاتی۔

کام تو اپنی صلاحیتوں کی پہچان کر لینا ہے اور اس پر گامزن ہونے کا عزم کر لینا ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی دو چار قدم منزل کی طرف چلے تو منزل سامنے آ جاتی ہے۔

علامہ اقبالؒ نے فلسفہ خودی کی بنیاد اسی اصول پر رکھی ہے (جس کا بیان اس کتاب کے ایک باب میں اور دیگر کتب میں کر دیا گیا ہے)۔ علامہ اقبالؒ مسلمانوں کو سمجھاتے ہیں کہ آج بھی اگر وہ توبہ کر لینے کے بعد سیدھے راستے پر آ جائیں تو کامیابی اُن کے قدم چومے گی۔ ان خزانوں کو ڈھونڈ نکالنے کی طرف علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ انسان کے اندر سب کچھ موجود ہے حتیٰ کہ خدا کا مکان بھی دِل میں ہی مل جاتا ہے۔

حقیقت اپنی آنکھوں پر نمایاں جب ہوئی اپنی　مکاں نکلا ہمارے خانۂ دِل کے مکینوں میں
اگر کچھ آشنا ہوتا مذاقِ جبہ سائی سے　تو سنگِ آستانِ کعبہ جا ملتا جبینوں میں
کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں؟　کہ لیلیٰ کی طرح تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں
جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس ان کی　الٰہی! کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دِل کے سینوں میں
کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمنِ دِل کو　کہ خورشیدِ قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں

(ب۔د: ۱۰۴۔۱۰۳)

مذکورہ بالا بیان کا حاصل یہ ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ احساس کمتری کا شکار نہ ہو کیونکہ ایک معمولی شخص بھی جب اچھوں کی راہنمائی میں چل نکلتا ہے تو وہ اپنی مخفی خوبیوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نہایت اعلیٰ وارفع منزل حاصل کر سکتا ہے۔ اس راہ پر نکلنے سے پہلے خلوص اور محبت کو ساتھ رکھتے ہوئے خواہشاتِ نفس کو ترک کر دینے کا مشورہ دیا جاتا ہے تا کہ دنیا اور آخرت سے آگے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی حقیقی محبت اس کے دِل میں جنم لے سکے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ ایسی محبت کے لئے انسان کے دل میں خلوص کا ہونا ضروری امر ہے۔

ع　نظارے کی ہوس ہو تو لیلیٰ بھی چھوڑ دے (ب۔د: ۱۰۷)

جب انسان اپنے اللہ کی طرف سفر کرنا چاہتا ہے تو وہ پہلے اپنے دِل کی طرف غور کرتا ہے اور اس کو اپنی منزل دِل میں ہی مل جاتی ہے۔ اس سفر کو سفر در حضر یا سفر در وطن کہتے ہیں یعنی اپنے اندر ہی سفر کرنا۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے۔

اگر چشمے کشائی بر دِل خویش　درون سینہ بینی منزلِ خویش!
(اگر تو اپنے دِل کی طرف نظر کرے تو تجھے اپنی منزل سینے میں نظر آئے گی۔)

سفر اندر حضر کردن چنیں است　سفر از خود بخود کردن ہمیں است
(حضر میں سفر کرنا یہی ہوتا ہے، اپنے آپ سے اپنے تک سفر کرنا یہی ہوتا ہے۔) (ز۔ع: ۵۵۸)

ایک پنجابی شاعر بھی اس سفر کی طرف یوں اشارہ فرماتے ہیں۔

عمر مکدیاں مکدیاں مک گئی اے پینڈا یار دے در دا نئیں مکدا
یار دِل دے اندر وسدا اے سفر اپنے ہی گھر دا نئیں مکدا

اے انسان! کبھی اپنے آئینے میں اپنی شکل دیکھ

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ اگر اپنے دِل کو پرواز کی رفعت سے آشنا کرلیا جائے اور اپنی خوبیوں کو پہچان کر اُن سے کام لیا جائے تو یہ عمل تعمیر خودی کا کام دے گا۔ اس طرح کرنے سے زندگی کی پستیاں اور کمزوریاں دور ہو جاتی ہیں۔ ایک معمولی صلاحیتوں والا انسان بھی اگر سرسری طور پر ہی اپنے آپ پر غور کرے اور ہر عضو میں مخفی حسن اور قوتوں کا اندازہ لگائے تو پھر اسے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا شاہکار ہے۔ انسانی دماغ کو دیکھیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے کس طرح کمپیوٹر کا نظام رائج کر رکھا ہے۔ دِل، شریانیں، پٹھے، پھیپھڑے، ہاتھ، پاؤں، سینہ اور جسم کا تمام نظام دیکھا جائے تو نہ صرف ایک بہت بڑے خالق کے نظام کا پتہ چلتا ہے بلکہ انسان کے دِل میں اپنی قدر و قیمت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کے کمالات کے اس اعلیٰ معیار کا اپنے اندر مشاہدہ کر لیتے ہیں وہ اس دنیا میں اپنا نرخ معلوم کرنے کا اندازہ کر لیتے ہیں اور ان کے اعمال اور اندازِ فکر میں رفعتیں نظر آنے لگتی ہیں۔ اس احساس کے پیدا ہونے کے بعد انسان اللہ کا شکر گزار بندہ بن جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ جب انسان اپنی نظر اپنے اندر کی محفل اور بیرون محفل کرتا ہے تو اس کا دِل حیرت آشنا ہو جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ انسان دنیا کے حسن، مال اور سیم وزر پر ہی نظر جمائے رکھتا ہے۔ اس کو چاہیے کہ اپنے دِل کے آئینے میں اپنی اداؤں پر بھی نظر کرے اور اپنی کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ بہت کم لوگوں کو اس حقیقت کا علم ہوتا ہے کہ ہماری زندگی میں کچھ مصائب اور مشکلات اس لیے بھی آتی ہیں کہ جو ہمارے کرتوتوں کی سزا کے طور پر رونما ہوتی ہیں۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے کہ تمہیں جو مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ہے اور حدیث پاک میں ہے کہ کوئی شخص رزق سے محروم نہیں کیا جاتا مگر اس گناہ کی پاداش میں جو اس سے سرزد ہو۔ جب ان برائیوں کو دور کر دیا جائے تو ہم کو ان مصائب سے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ اپنی روزمرہ زندگی میں ہم جو اعمال کرتے ہیں تو اس کے نتائج ہمارے آئینۂ زندگی میں تصویریں بن کر ہمیں نظر آتے ہیں۔ اس حقیقت کو سورۂ روم میں بیان کیا گیا ہے "ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ" (یعنی خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا ہے بوجہ ان کرتوتوں کے جو لوگوں نے کیے ہیں۔ (الروم: ۴۱)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ انسان اپنے دِل میں فضول اور ناکارہ چیزوں کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے۔

بھلا اس سامانِ آرائشِ دنیا کا ایک صافی اور کافی دِل سے کیا تعلق ہے۔ مطلوب اگر صفائے دِل ہو تو آرائش اور آسائشِ دنیا کو اہمیت دینا ایسے ہی ہے جیسے کسی نے آئینہ پر حنابندی کردی ہو۔ مسلمان کی اس ذلت آمیز زندگی کو دیکھ کر زمین و آسمان روتے ہیں اور چرند و پرند اللہ تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ! ہمارا بس چلتا تو ہم ان نافرمان انسانوں کو پاؤں تلے روند دیتے۔ فرماتے ہیں کہ حیرت کی بات ہے کہ مسلمان توحید کا دعویٰ تو کرتا ہے مگر اس نے اپنے پہلو میں حرص وہوس کے ہزاروں بت چھپا رکھے ہیں اور وہ ان بتوں کو پہلو میں رکھتے ہوئے بھی ان کا احساس نہیں کرتا بلکہ ان کو چنداں معیوب نہیں خیال کرتا۔ فرماتے ہیں کہ اس یوسفِ زندگی کا حسن جو انسان کو اللہ نے عطا کر رکھا ہے، اس کو کنوؤں میں مقید کر دینا پرلے درجے کی حماقت ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس یوسف کو سرِ بازار اور رونقِ مصر ہونا چاہیے۔ تصویرِ درد میں علامہ نے جو نقشہ کھینچا ہے وہ مسلمانوں کے لئے سبقِ عبرت کا درجہ رکھتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

کیا رفعت کی لذت سے نہ دِل کو آشنا تو نے
گزاری عمر پستی مین مثالِ نقشِ پا تو نے

رہا دِل بستۂ محفل، مگر اپنی نگاہوں کو
کیا بیرونِ محفل سے نہ حیرت آشنا تو نے

فدا کرتا رہا دِل کو حسینوں کی اداؤں پر
مگر دیکھی نہ اس آئینے میں اپنی ادا تو نے

زباں سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل
بنایا ہے بتِ پندار کو اپنا خدا تو نے!

(ب۔د: ۷۳۔۷۲)

جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا

ایک حدیث شریف میں ہے کہ "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ" (یعنی جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے رب کو پہچان لیا۔ (الاسرار المرفوعہ حدیث ۹۳۷)۔ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے کشف المحجوب میں فرمایا ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا یقیناً اس نے اپنے ربّ کو بھی جان لیا یعنی جس نے اپنے نفس کی فنا کو سمجھ لیا اس نے یقیناً ذات باری تعالیٰ کی بقاء کو جان لیا۔ بعض نے کہا ہے کہ جس نے اپنے نفس کو ذلت کے ساتھ (بندہ) جان لیا تو اس نے اپنے ربّ کو ربّ کی عزت کے ساتھ مان لیا۔

مشائخ کرام کا قول بھی کشف المحجوب میں نقل کیا گیا ہے "مَنْ جَهِلَ نَفْسَهٗ فَهُوَ بِالْغَيْرِ اَجْهَلُ" (یعنی جو اپنے نفس سے جاہل ہے وہ غیر سے جاہل تر ہے)۔ اس سب کلام کا خلاصہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی پہچان درکار ہو تو پہلے اپنے آپ کو پہچان لے۔ جو شخص اپنے آپ کو نہ جانے وہ کل کی معرفت سے محجوب ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ جس کا باطن نورِ مشاہدہ سے منور نہیں وہ اندھا ہے اور جو اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی

اندھا ہے۔ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی رویت بھی نصیب نہ ہوگی یہ اس لیے کہ جو شخص اطاعت نفس میں لگا رہتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ اپنے مشاہدے سے دور کر دیتا ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی چھوٹی سی بات کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی شناخت ہو جاتی ہے۔ ہم لوگوں سے ملاقات تو کرتے ہیں لیکن اپنے آپ سے ملاقات بھی ہونا ضروری ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لئے بہت سی نشانیاں بھیجنے کا ذکر کیا ہے۔ ان سے بھی یہی اخذ کیا جاتا ہے کہ شاید ان نشانیوں کو دیکھ کر لوگ خدا کی طرف رجوع کریں۔ اگر ہم قرآن کریم میں نظر دوڑائیں تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں بار بار جھنجھوڑنے کی کوششیں کی ہیں مگر انسان اس قدر ڈھیٹ واقع ہوا ہے کہ ان نشانیوں کی طرف کبھی دھیان ہی نہیں دیتا۔ ایسی نشانیوں کا ذکر اس کتاب میں اِنشاء اللہ اپنے مقام پر کریں گے۔

خوبصورت اشیاء دائمی مسرت کا سبب بنتی ہیں

اللہ تبارک وتعالیٰ سے زیادہ حسین وجمیل کوئی ذات متصور نہیں اور وہ خود جمال کو پسند فرماتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے پیامِ مشرق میں فرمایا ہے کہ انسان جو بھی کام کرتا ہے اس کی شخصیت اس کے ہر کام میں جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے، عین اسی طرح خدا کی خدائی شان بھی اس کے ہر فعل سے جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔

ترا شیدم صنم بر صورتِ خویش   بہ شکلِ خود خدا را نقش بستم

(میں کسی بت کو بھی اپنی صورت پر ہی تراشتا ہوں، میں اپنے خدا کا نقش (ذہن میں) اپنی صورت پر بناتا ہوں۔)

مرا از خود بروں رفتن محال است   بہر رنگے کہ ہستم خود پرستم (پ۔م: ۲۳۸)

(میرا اپنے آپ سے باہر نکلنا محال ہے، میں جس حال میں بھی ہوتا ہوں خود پرست ہوں۔)

علامہ اقبالؒ کے مذکورہ بالا فلسفیانہ اشعار سے بآسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ تخلیق کیا گیا ہے ہر شئے اللہ تعالیٰ کے حسن کی آئینہ دار ہے اور اللہ تعالیٰ کا حسن و جمال اس میں نظر آنا ایک لازم امر ہے۔ کوئی ذی عقل مخلوق ایسی نہیں جو اس کے حسنِ تخلیق سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکے۔ جن لوگوں کے ذہنوں میں اللہ تعالیٰ کی خوبصورت تخلیق کا حسن وجدانی کیفیت پیدا نہیں کرتا ہے تو اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایسے شخص کے ذہن چوپاؤں کی طرح محدود ہیں اور اس کے تخیلات میں اس قدر بلندی اور رفعت موجود نہیں جو خدا کی صناعی کا احساس پیدا کر سکے۔

اگر ہم کائنات پر غور کریں تو قدرت کے عظیم شاہکار نظر آتے ہیں اور جب سائنسدان ان کی ہیئت پر غور کرتے ہیں تو ان کی عقلیں خدا کی تخلیقی انواع پر دنگ اور ششدر رہ جاتی ہیں۔ کائنات کی اشیاء میں مخفی حسن

اور خدائی کمالات ان اشیاء کے حسین ہونے پر دلالت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کو دیکھ کر ایک روحانی مسرت دلوں میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ غور وفکر کا سلسلہ چونکہ لامتناہی ہے اس لئے اس غور وفکر سے حاصل ہونے والی مسرت بھی دائمی نوعیت رکھتی ہے۔ دائمی کا لفظ اس لئے بھی موزوں ہے کہ قرآن کی آیات کے مطابق کائنات پر اس قسم کا غور وفکر کرنا انتہائی بلند درجہ کی عبادت کا رتبہ رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے بارہا اس بات پر زور دیا ہے کہ وہ تخلیقِ کائنات کے کارناموں پر مسلسل غور وفکر کرتے ہی رہیں۔ تفکر فی الکائنات پر انشاء اللہ اس کتاب میں ایک الگ مضمون شامل کیا جائے گا۔

قرآن نے کائنات میں غور وفکر کرنے پر اس لیے تاکید فرمائی ہے کہ ایسا کرنے سے ان کے ایمان میں پختگی اور اعلیٰ درجے کا یقین حاصل ہو جاتا ہے۔ اس غور وفکر کے بعد اللہ تعالیٰ کے ان کمالات کے حقائق کھل جاتے ہیں جو ابھی صیغۂ راز میں تھے اور اس طرح کے غور وفکر سے بندے کے دِل میں خدا کی الوہیت سے متعلق خشیت اور خوف پیدا ہوتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر:۲۸)، (یعنی اللہ کے بندوں میں سے صرف علماء ہی (پوری طرح) اُس سے ڈرتے ہیں۔) جو قوم اللہ تعالیٰ کے کارخانۂ کائنات کے اسرار پر غور کرنے کے بعد ان کو فاش کرتی ہے تو وہ قوم یقیناً تحقیقی اور تخلیقی میدان میں کارہائے نمایاں دکھانے کی اہل ہوتی ہے اور اپنے کارناموں پر پوری دنیا سے دادِ تحسین حاصل کرتی ہے۔

یہاں قرآن کی اُن تمام آیتوں کا ذکر کرنا تو ممکن نہیں جن میں انسان کو اس کائنات اور خود اپنے آپ پر تفکر کرنے کا حکم ہے، البتہ یہ بات محسوس کر لینا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات میں اور خود انسانی جسم میں اس قدر نشانیاں مخفی کر دی ہیں کہ جن پر اگر بحث کی جائے تو علم کے سمندر بہہ نکلتے ہیں۔ شعبۂ کان، ناک، آنکھ کو ہی لیں تو معلوم ہوگا کہ اس پر لاکھوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور ابھی تک یہ تمام مضامین محتاجِ تحقیق ہیں۔ اسی طرح انسان کے دِل، سینہ، ٹانگوں، گردوں، پیٹ اور دیگر انسانی حصّوں پر تحقیق کا مضمون واحد ہے۔ ان باتوں کی طرف کچھ اشارات درج ذیل آیات میں ملتے ہیں اور ان کی تفصیل کی عمیق گہرائیوں کو بیان کرنا اس مضمون کی بساط سے باہر ہے۔ چند آیات تبرکاً ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۣ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ (الروم:۸)	کیا انہوں نے کبھی غور نہیں کیا اپنے جی میں نہیں پیدا فرمایا اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے مگر حق کے ساتھ۔
(۲) اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (الرعد:۳)	بیشک ان تمام چیزوں میں (اس کی قدرت کی) نشانیاں ہیں اس قوم کے لئے جو غور وفکر کرتے رہتے ہیں۔

(۳) وَفِيٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (الذٰریٰت:۲۱) — اور تمہارے وجود میں بھی (نشانیاں ہیں) کیا تمہیں نظر نہیں آتیں۔

(۴) وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (آل عمران:۱۹۱) — اور غور کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں۔

احادیث میں وارد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حسن دلوں کو اس قدر موہ لینے والا ہے کہ انسان کے تصور میں اس سے زیادہ حسین اور کوئی چیز متصور نہیں ہو سکتی۔ جو لوگ اس کے حسن کو دیکھنے کی سعادت حاصل کر لیتے ہیں وہ کبھی کسی اور طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے حتیٰ کہ رسول خدا ﷺ جب معراج کے دوران مشاہدۂ باری تعالیٰ میں مشغول ہوئے تو قرآن نے اس بات کی گواہی دی ہے کہ آپؐ نے کسی اور طرف آنکھ بھر کر بھی نہیں دیکھا "مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰى (النجم:۱۷) اسی لئے علامہ اقبالؒ بھی عشقِ مجازی کو عشقِ حقیقی کی طرف رجوع کرنے اور اپنی روح کو عشقِ الٰہی میں آباد کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

عشق اب پیرویٔ عقلِ خدا داد کرے — آبرو کوچۂ جاناں میں نہ برباد کرے
کہنہ پیکر میں نئی روح کو آباد کرے — یا کہن روح کو تقلید سے آزاد کرے

(ض۔ک:۵۶۵)

کم ہمت لوگوں کو اِن کی مجبوریاں کچھ کرنے نہیں دیتیں

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے نظام کو کچھ اس طرح بنایا ہے کہ ہر ذی عقل اپنی عقل سے کام لے اور اس دنیا میں اپنا مقام آپ پیدا کر لے۔ علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کو اسی لئے ایسے اسباق دیئے ہیں جن میں آپ نے مسلمان کو فرمایا ہے کہ اپنی خودی پہچان، خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے، ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک، کھو یا گیا کس طرح تیرا جوہر ادراک، کس طرح ہوا کند ترا نشترِ تحقیق، مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں، کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں آفاق، کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی وغیرہ۔

مسلمانوں کی کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے آپ نے پوری قوم کو عمل پر اکسایا اور فرمایا: ع

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!..................(ب۔د:۷۱)

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات..................(بِ۔ج:۴۴۹)

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو؟..................(ب۔د:۱۹۳)

کیوں ترے بس کا نہیں کارزار میں؟ ....(ب۔ج:۴۳۳)

کیوں مسلمانوں میں ہے دولتِ دنیا نایاب؟..................(ب۔د:۱۶۷)

کیوں نہیں ہوتی سحر حضرت انسان کی رات؟ .... (ا۔ح: ۲۶۴)

مذکور بالا سوالات کا جواب خود علامہ اقبالؒ نے اپنے اشعار میں دیا ہے اور فرمایا ہے کہ مسلمان اگر اپنے آپ کی اور اپنی صلاحیتوں کی پہچان کر لے اور اللہ اور اس کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام سے روگردانی نہ کرے تو اس کی اس ذلت آمیز زندگی کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ ایک جگہ آپ سوالیہ انداز میں فرماتے ہیں۔

کون ہے تارکِ آئینِ رسولِ مختار؟ مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار

کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار ہو گئی کس کی نگہ طرزِ سلف سے بیزار

قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں

کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں (ب۔د: ۲۰۲)

مسلمانوں کے دلوں میں ایسی بیماری رچ بس چکی ہے کہ جس نے انہیں بے عمل اور نکما کر دیا ہے اور وہ ہے مال وزر کی بے جا ہوس، جس نے ان کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی پر آمادہ کر رکھا ہے۔ عموماً مسلمان دین کی راہ سے دور رہنے کے لئے ایک عجیب نوعیت کی عذرداری کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں دین کی طرف آنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ اکثر لوگوں کو دنیاوی مصائب میں اُلجھے رہنا ہی دین سے دوری کا عذر پیش کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ یقیناً یہ لوگ اس لیے پریشان حالی میں وقت گزارتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف بالکل رجوع نہیں کرتے۔ ان لوگوں کی دین سے دوری کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے والدین نے دین پر چلنے کے راستے کی آشنائی نہ تو خود ہی حاصل کی اور نہ ہی اپنی اولاد کو اس سے خبردار کیا اور اس پر طرہ یہ کہ اس نئی پود کو اسلامی علوم اور نیاگانِ کہن (بزرگانِ اسلام) کی کتابوں کے ساتھ کبھی دور کا بھی واسطہ نہیں رہا۔ وہ نہیں جانتے کہ جنیدؒ و بایزیدؒ اور رومیؒ و اقبالؒ نے ان کے لئے کس قدر گرانمایہ علوم کے خزانے چھوڑے ہیں۔ راقم الحروف نے مسلمانوں کی علمی توجہ حاصل کرنے کے لئے ''جنیدؒ و بایزیدؒ اور'' سوز وساز رومیؒ'' کے نام سے دو کتابیں شائع کی ہیں لیکن آج مسلمان اگر کچھ مطالعہ کرنا بھی چاہتا ہے تو اسے ناول، فلمی لٹریچر اور فرسودہ حکایات کو روایت کرنے والے رسالوں کے مطالعہ کے علاوہ اور کوئی کتاب نظروں میں نہیں بھاتی۔ مسلمانوں کی یہ حالت دشمنانِ اسلام کے پھیلائے ہوئے نظریات کے باعث ہے۔ علامہ اقبالؒ نے درج ذیل اشعار میں مسلمانوں کو حقیقت حال سمجھنے کے لئے جھنجھوڑا۔

اگرچہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات جو فقر سے ہے میسر تونگری سے نہیں

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے زوال بندہ مومن کا بے زری سے نہیں

اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا قلندری سے ہوا ہے، تونگری سے نہیں

(ض۔ک: ۴۸۲)

علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کی حس میں بے ضمیری کو غیر اسلامی سلاطین، تفرقہ آمیز مُلاؤں، بھنگ اور شراب پینے والے پیروں کے اثرات سے منسوب کیا ہے۔

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری اے کشتۂ سلطانی ومُلائی و پیری (ا۔ح: ۶۷۰)

عصرِ حاضر، جہاں مغربی تہذیب کا دور دورہ ہے، مسلمانوں کی ضرورت سامانِ تعیش کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہی ضروریات ان کے دین کی راہ پر چلنے کے لئے روکاوٹیں بنتی ہیں۔ کاش مسلمان اس راز کو سمجھ لیتے کہ ان کی دین و دنیا میں کامیابی کا راز، محنت، سراپا عمل اور اتباعِ اسلام میں ہی پوشیدہ ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے کہ جب یہ چیزیں مسلمانوں پر کبھی آشکار ہوئیں تو پوری دنیا پر چھائے رہے۔

اپنی تلاش یا خدا کی تلاش (ایک ہی بات ہے)

"مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ" (الاسرار المرفوعة حديث: ۹۳۷) (جس نے اپنی پہچان کر لی اس نے ربّ کی پہچان کر لی) کی حدیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اپنی تلاش کرنے کا عمل بندے کو خدا تک پہنچا دیتا ہے، مگر علامہ اقبالؒ نے ایک دوسرے فلسفیانہ طریقے سے اس حقیقت کو ثابت کیا ہے کہ جب ہم خدا کو تلاش کرنا شروع کر دیں تو چند طویل اور سخت مشقتوں اور ریاضتوں کا راستہ طے کر لینے کے بعد ہماری ملاقات خود اپنے آپ سے ہو جاتی ہے۔ انہیں معنوں میں آپ نے فرمایا ہے کہ چونکہ قلبِ انسان میں اللہ تعالیٰ کا موجود ہونا احادیث سے ثابت ہوتا ہے، چنانچہ اس کو دل میں ہی تلاش کرنا چاہیے۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ جن کو ہم نے آسمانوں اور زمینوں میں تلاش کیا تو وہ جب ملے تو ہمارے دِل کی گہرائیوں میں ہی ملے۔

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دِل کے مکینوں میں
(ب۔د: ۱۰۳)

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ تیس سالوں کی ریاضتوں اور مجاہدوں کے بعد صرف ایک چیز میرے ہاتھ آئی کہ مجھے قرآن کی اس آیت "نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ" (سورۂ ق: ۱۶) (یعنی ہم اس (انسان) سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہیں۔) پر یقین قائم ہو گیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ اگر اس آیت پر پہلے ہی سے اتنا یقین ہوتا تو مجھے اس قدر طویل مجاہدات کی ضرورت نہ ہوتی۔ آپ کے فرمان سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مجاہدات شاقہ سے قربِ الٰہی میسر ہوتا ہے اور خدا ہمیں اپنے اندر محسوس ہونے لگتا ہے۔ گویا خدا کی تلاش کرنے سے اپنی ہی شناخت حاصل ہوتی ہے، یعنی انسان اپنے آپ کو پالیتا ہے اور خود کو بھی پہچان لیتا ہے۔ اس کے برعکس اگر ہم اپنی تلاش کریں تو ہم اللہ تعالیٰ کو پالیتے ہیں یعنی جب اپنا عرفان حاصل ہو گیا تو خدا بھی مل گیا۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا۔

کرا جوئی، چرا در پیچ و تابی؟　　کہ او پیداست تو زیرِ نقابی

(کسے ڈھونڈتے ہو، کیوں پیچ وتاب میں ہو، وہ (خدا) تو ظاہر ہے، تم خود پردے میں ہو۔)

تلاشِ اُو کنی جز خود نہ بینی　　تلاشِ خود کنی جز اُو نیابی (پ۔م: ۲۲۲)

(اس کی تلاش کرو گے تو اپنے سوا کچھ نہ پاؤ گے، اپنی تلاش کرو گے تو اس خدا کے سوا کچھ نہ پاؤ گے۔)

در خاکدانِ ما گہرِ زندگی گم است　　ایں گوہرے کہ گمشدۂ مائیم یا کہ اوست؟

(ز۔ع: ۴۸۵)

(ہمارے جسم میں زندگی کا موتی گم ہے، یہ گمشدہ موتی ہم ہیں یا وہ خدا۔)

آخری شعر قابلِ غور ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے جسم میں زندگی یعنی انائے مطلق (اللہ تعالیٰ) کے جلوے یا تجلیات گم ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ گم شدہ موتی ہم میں گم ہے یا ہم انائے مطلق (خدا) میں گم ہیں۔ بعض بزرگوں نے اسے اپنے اندر کا سفر کہا ہے۔ بہرحال بات اسی حدیث پر ختم ہوتی ہے کہ جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا۔ یہ دونوں اُمور لازم وملزوم ہیں۔

دینِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا راز یہی ہے کہ انسان خود کو برملا دیکھے

اسلام کی تعلیم عرفانِ خودی ہے۔ علامہ اقبالؒ کا فلسفۂ خودی ہمیں اپنی معرفت یا پہچان حاصل کرنے کا طریقہ سکھاتا ہے۔ علامہ کے نزدیک یہ ایک حقیقت ہے کہ عارف خودی کے سامنے دنیا جھک جاتی ہے اور وہ بے پناہ قوتوں کا مالک ہو جاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ اپنا عرفان حاصل کرنے کے بعد انسان کو درجۂ نیابت الٰہی حاصل ہو جاتا ہے اور اگر ایسا ہو جائے تو ہر چیز اس کے اشاروں پر عمل پیرا ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ ایک چشم زدن میں زمانے میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔ مکان ولامکان اس کے دائرۂ اثر میں آ جاتے ہیں اور پوری کائنات اس کی فرمانبردار بن جاتی ہے۔ وقت سے پہلے قیامت پیدا ہونے کے خدشے کا اظہار درج ذیل شعر میں ملتا ہے ۔

حضورِ حق میں اسرافیلؑ نے میری شکایت کی　　یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا

(ب۔ج: ۳۱۵)

علامہ اقبالؒ کا فلسفۂ خودی راقم الحروف کی کتاب ''عقل وعشق اور فلسفۂ خودی'' میں کافی تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے (اور یہ گم شدہ کتاب دوبارہ لکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے انشاء اللہ عنقریب زیورِ طباعت سے آراستہ ہو جائے گی)۔ پس چہ باید کرد میں علامہؒ نے '' خطاب بہ اقوام سرحد'' میں فرمایا ہے کہ اے مسلمان! اسلام میں اس بات کو حرام قرار دیا گیا ہے کہ مسلمان اپنے آپ سے اور خدا سے حجاب میں رہے۔ دین مصطفیٰ

کا راز یہی ہے کہ انسان خود کو برملا دیکھے اور یہی اس کی شہنشاہی ہے۔ دینِ اسلام اس بات کا نام ہے کہ مسلمان اپنے اندر مخفی اسرار کو دریافت کرے کیونکہ وہ ان اسرار سے نامحروم ہے تو وہ حقیقتاً مردہ ہے۔ ایسا مسلمان ہی ضمیرِ کائنات سے آگاہی حاصل کر لیتا ہے اور وہ "لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰهُ" کی تلوار بن جاتا ہے۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ مکان ولامکان میں مسلمان کی حکومت ہے۔ مسلمان کا دل اللہ تعالیٰ کے اسرار میں سے ایک سرّ ہے اور وہ انسان جو اپنے آپ سے بیگانہ اور بے خبر ہو تو اس کے مردہ ہونے میں کیا شک ہے۔ مسلمان وارثِ پیغمبر ہے اور اپنا جہاں خود پیدا کرتا ہے۔ جو مسلمان زندہ لوگوں میں شامل ہے وہ غیر اللہ سے فراغت حاصل کر لیتا ہے اور اس کے وجود میں خودی کا چراغ روشن ہو چکا ہوتا ہے۔ ایسا مسلمان ذکر کی شمشیر اور فکر کے سپر (ڈھال) سے خیر وشر کی جنگ جیت لیتا ہے۔ اس کے گرد راہ کا ہر ذرہ آفتاب کا درجہ رکھتا ہے اور کتاب اللہ اس کی عظمت پر گواہی دیتی ہے۔ مگر مسلمان غیر اللہ کی طلب میں گرفتار ہو کر آوارہ اور بے چارہ ہو جاتا ہے۔ اس قدر بیان کرنے کے بعد علامہ مسلمانوں کو ترقی کے رازوں سے مطلع فرماتے ہیں اور اپنے آپ کی تلاش کا حکم دیتے ہیں تاکہ وہ ہمیشہ جواں رہے اور اس کا چہرہ تجلیاتِ حق سے سرخ ہو جائے۔

علامہؒ فرماتے ہیں ۔

اے زخود پوشیدہ خود را باز یاب در مسلمانی حرام است ایں حجاب!

(اے مسلمان تو اپنے آپ سے پوشیدہ ہے، خود کو دوبارہ پالے مسلمانی میں ایسا حجاب حرام ہے۔)

رمز دینِ مصطفیٰؐ دانی کہ چیست فاش دیدن خویش را شاہنشہی است

(کیا تو جانتا ہے کہ دینِ مصطفیٰؐ کا راز کیا ہے؟ اپنے آپ کو برملا دیکھنا بادشاہی ہے۔)

چیست دیں؟ دریافتن اسرارِ خویش زندگی مرگ است بے دیدارِ خویش

(دین کیا ہے؟ اپنی شخصیت کے اسرار دریافت کرنا، اپنے دیدار کے بغیر زندگی موت ہے۔)

آں مسلمانے کہ بیند خویش را از جہانے برگزیند خویش را (پ۔چ: ۸۵۴)

(وہ مسلمان جو اپنے آپ کو دیکھ لیتا ہے، وہ یہ دیکھ لیتا ہے کہ وہ سارے جہاں سے برتر ہے۔)

علامہ اقبالؒ کا یہ موقف ہے کہ جو شخص اپنی روح کی شناخت نہیں کر سکتا اس کا تن اس کی روح سے وابستگی حاصل نہیں کر سکتا، چنانچہ وہ تن اور روح میں ناآشنائی کے باعث ان تمام کمالات سے محروم رہ جاتا ہے جو ابن آدم کا خاصہ ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہی وجہ ہے کہ عام انسان کے تمام افعال حق تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے سے قاصر ہیں اور نہ ہی اس کی کسی دعا میں اثر پایا جاتا ہے اور نہ ہی اس کی آہ عرشِ عظیم تک پہنچ سکتی ہے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حی وقیوم ہے اور ایسا جسم جو روح سے وابستگی حاصل نہیں کر سکتا مردہ ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے شخص سے بیزار ہیں کیونکہ خدائے زندہ صرف زندوں کا خدا ہے۔

ترا تن رُوح سے نا آشنا ہے عجب کیا آہ تری نا رسا ہے
تنِ بے رُوح سے بیزار ہے حق خدائے زندہ زندوں کا خدا ہے
(ب۔ج:۳۸۲)

زندگی کو آراستہ کرنا ہو تو اپنے وجود پر شہادت طلب کرو

معرفتِ خودی چند لمحوں میں حاصل ہو جانے والی چیز نہیں۔کبھی ایسا بھی ہوتا ہے یہ عرفان کسی مردِ خدا کے ذریعے ایک لمحہ میں بھی حاصل ہو جاتا ہے، مگر ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔عموماً عرفان کافی طویل مجاہدات کے بعد حاصل ہوتا ہے۔عرفان کے حصول کے لئے اسباب کا مہیا کرنا ضروری ہے۔

ضربتے باید کہ جانِ خفتہ برخیزد زخاک نالہ کے بے زخمہ از تارِ رباب آید بروں
(ز۔ع:۴۸۹)

(ایسی ضرب کی ضرورت ہے کہ خوابیدہ روح خاکی اثرات سے اُٹھ سکے،کوئی نغمہ مضراب کے بغیر رباب سے کیسے نکل سکتا ہے۔)

علامہ اقبالؒ جاوید نامہ کی ایک غزل میں مولانا رومؒ سے ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے دریافت کیا کہ موجود و ناموجود اور محمود و نامحمود کیا چیزیں ہیں اور ان کے معنی کیا ہیں؟ مولانا رومؒ نے فرمایا کہ موجود وہ ہے جو غور چاہتا ہے اور اپنے آپ کو ظاہر کرنا ہر وجود کا تقاضا ہے۔

ع آشکارائی تقاضائے وجود

مولانا رومیؒ نے فرمایا کہ انسان کی زندگی اپنے آپ کو اپنی نظروں میں آراستہ کرنا ہے اور اپنے وجود پر شہادت طلب کرنا ہے۔حق تعالیٰ نے بھی روز الست روحوں کی انجمن کو آراستہ کیا اور پھر شہادت طلب کی۔اللہ تعالیٰ نے روحوں سے یہ شہادت طلب کی اور فرمایا: "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ" (الاعراف:۱۷۲) (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں)

اگرچہ اس پر ایک الگ تحریر اس کتاب میں دی جا چکی ہے مگر مناسب ہوگا کہ وعدۂ الست کے متعلق یہاں بھی قارئین کو متعارف کروا دیا جائے تا کہ وہ اس معاملے کا فہم حاصل کر سکیں۔وعدۂ الست سے پہلے روحیں اپنے مقامات میں رہتی تھیں اور اس وقت تک انہیں معلوم نہ تھا کہ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کا کیا ارادہ ہے۔جب اللہ تعالیٰ نے اپنی قبائے ازلی کو ظاہر کرنا چاہا تو اسرافیل علیہ السلام کو صور پھونکنے کا حکم دیا اور تمام روحیں جمع ہو گئیں۔ان میں وہ کیفیت پیدا ہو گئی جو قیامت کے دن مردوں کو زندہ کرنے سے پیدا ہوگی۔روحوں کے جمع ہونے پر اللہ نے اپنا بلا کیف خطاب فرمایا اور کہا "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ" (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟) اہلِ سعادت نے

خوشی خوشی اپنے رب کے حکم کا جواب دیا اور "بلیٰ" کہا۔ جس طریقے سے انہوں نے جواب دیا اُن کی کیفیت اُسی کے مطابق ہوگئی۔ نیک اور بد میں امتیاز ہوگیا۔ یہ بھی معلوم ہوگیا کہ فلاں کا تعلق فلاں سے ہوگا اور فلاں سے کٹ جائے گا۔ بدبخت روحوں نے جب اللہ کا خطاب سُنا تو وہ کبیدہ خاطر ہوگئیں اور بادل ناخواستہ جواب دیا۔ وہ اس طرح بھاگیں جس طرح شہد کی مکھیوں کو دُھونی دی جائے تو دوڑتی ہیں۔ اس لئے انہیں ذلت اور خواری حاصل ہوئی۔ ان کے نور تاریک ہوگئے۔ اُس وقت سے مومن میں اور کافر میں امتیاز ہوگیا اور برزخ میں روحوں کے مقام کا تعین کر دیا گیا۔ اس سے پہلے روحیں جہاں چاہتی تھیں قیام کر لیتی تھیں۔ اہلِ مشاہدہ ان روحوں کو اب بھی الگ الگ دیکھ سکتے ہیں۔ جن روحوں نے خطاب الٰہی کا جواب نہ دیا، اُن کو محروم کر دیا گیا۔ یہ شہادت اس لئے طلب کی گئی کہ کل قیامت کے روز کافروں کی روحیں یہ نہ کہیں کہ ہم نے اپنے والدین کی پیروی کی وجہ سے شرک کیا اور یہ نہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو باطل پرستوں کے سبب ہلاک کیا ہے۔ (ابریز)

مولانا رومؒ علامہ اقبالؒ کو نصیحت فرماتے ہیں کہ خواہ تم زندہ ہو یا مردہ یا ابھی جان تمہارے لبوں پر ہی کیوں نہ ہو (یعنی ہر حال میں اور عمر کے ہر حصے میں) اپنے موجود ہونے کی شہادت تین مدارج میں طلب کرو۔ پہلی شہادت یہ ہے کہ اپنے نورِ خودی سے اپنے آپ کو دیکھو کہ تم کیا ہو اور تم میں کیا کمی ہے۔ دوسری شہادت دوسروں کا شعور ہے یعنی یہ دیکھو کہ دوسروں کی آنکھوں میں تمہارا کیا مقام اور حیثیت ہے۔ تیسری شہادت حق تعالیٰ کا شعور ہے یعنی تم یہ دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کے نورِ نظر میں تمہارا کیا مقام ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر تم نورِ حق کے سامنے استواری سے رہ سکو یعنی تمہاری عاشقی میں پختگی اور استواری ہو تو تم خود بھی اس کی طرح حی و قیوم ہو جاؤ گے۔ مراد یہ ہے کہ تم میں اللہ کا رنگ پیدا ہو جائے گا۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

زندگی خود را بخویش آراستن بر وجودِ خود شہادت خواستن

(زندگی اپنے آپ کو اپنی نظروں میں آراستہ کرنا ہے اور اپنے وجود پر شہادت طلب کرنا ہے۔)

انجمن روزِ الست آراستند بر وجودِ خود شہادت خواستند

(حق تعالیٰ نے روزِ الست انجمن آراستہ کی تھی اور اپنے وجود پر شہادت چاہی۔)

زندہ یا مردہ یا جاں بلب از سہ شاہد کن شہادت را طلب

(تم زندہ ہو یا مردہ یا جان بلب، تین شاہدوں سے شہادت طلب کرو۔)

شاہد اوّل شعورِ خویشتن خویش را دیدن بنورِ خویشتن

(پہلا شاہد اپنا شعور ہے، یعنی اپنے آپ کو اپنے نور سے دیکھنا۔)

شاہد ثانی شعورِ دیگرے خویش را دیدن بہ نورِ دیگرے

(دوسرا شاہد دوسروں کا شعور ہے، یعنی اپنے آپ کو دوسروں کے نور سے دیکھنا۔)

شاھد ثالث شعورِ ذاتِ حق خویش را دیدن بہ نورِ ذاتِ حق

(تیسرا شاہد حق تعالیٰ کا شعور ہے، یعنی اپنے آپ کو حق تعالیٰ کے نور سے دیکھنا۔)

پیش ایں نور ار بمانی استوار حی و قائم چوں خدا خود را شمار

(اگر تو اللہ کے نور کے سامنے قائم رہا، تو اپنے آپ کو اللہ کی طرح حی وقیوم سمجھ۔)

بر مقامِ خود رسیدن زندگی است ذات را بے پردہ دیدن زندگی است

(اپنے مقام پر پہنچنا اور ذات باری تعالیٰ کو بے پردہ دیکھنا ہی زندگی ہے۔)

مردِ مومن در نسازد با صفات مصطفیٰ راضی نہ شد اِلّا بہ ذات (ج۔ن: ۶۰۷)

(مردِ مومن صفات پر قناعت نہیں کرتا، رسول اکرم ﷺ اللہ تعالیٰ کی ذات کے دیدار کے بغیر راضی نہ ہوئے۔)

درج بالا اشعار کا مفہوم یہی ہے کہ جب تک انسان خود کو پرکھ نہ لے اور یہ دیکھ نہ لے کہ میں اپنی نظر میں درست ہوں تو اس وقت تک اسے اپنی قوتوں، استعدادوں اور تقابلی پہلوؤں سے راضی نہیں ہونا چاہیے۔ اسی طرح انسان کو چاہیے کہ وہ خود کو لوگوں کی نظروں سے تولے اور اگر کوئی کمی ہو تو اس کو دور کرے۔ یہ تمام مشاہدات اپنی شناخت کے لئے باریک بینی یا احتساب کرنے سے متصور ہیں۔ تیسری شہادت اللہ تعالیٰ سے طلب کی جاتی ہے کہ انسان اللہ کی نظروں میں کس قدر محمود ہے۔ اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ کی نظروں میں اس کا محمود ہونا نظر آتا ہے تو پھر یہ سمجھ لو کہ اسے اپنی زندگی گزارنے کے معیار میں استواری اور کامیابی حاصل ہو گئی۔ ایسی پختگی کی حالت میں انسان کو دوام یعنی حیات جاوداں مل جاتی ہے اور حی وقیوم سے مراد یہ ہے کہ اس کی قیومیت اللہ تعالیٰ کی صفت قیومیت سے قائم ہو گئی ہے اور یہی حیات جاوداں سے مراد ہے۔ ایسی حالت میں بندہ اگر مر بھی جائے تو بھی وہ زندہ و جاوید رہتا ہے۔ حضرت منصور حسین رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ تعالیٰ کو دِل کی آنکھ سے دیکھا تو پوچھا "مَنْ اَنَا" (میں کون ہوں؟) تو جواب ملا "اَنَا اَنْتَ" میں ہی تو ہے یعنی مجھ میں اور تجھ میں وہی حی وقیوم کی نسبت سے یک رنگی موجود ہے اور تیری قیومیت میری قیومیت سے وابستہ ہے۔

اپنی شناخت پر عامۃ المسلمین سے چند سوالات

جب کسی قوم میں قوانینِ فطرت کو نظرانداز کرنے کے باعث عوام میں اخلاقی یا انسانی قدروں میں تیزی واقع ہونے لگے تو عموماً اس ملک کی حکومت کے لئے یہ لمحہ فکریہ سے کم نہیں ہوتا۔ ایسے معاملات میں سوجھ بوجھ رکھنے والی حکومتیں، قوم کے متعزلاتی اُمور میں عموماً متفرق انجمنوں کا انعقاد کر دیتی ہیں جو زیرِ غور اُمور میں تحقیق کرتی ہیں۔ اس نوعیت کی تحقیقات کی ایک مثال یہ ہے کہ جو دوسری صدی عیسوی کے آغاز میں روسی فوجوں

میں کی گئی تھی جب کہ اعلیٰ روسی افسروں کے مشاہدہ میں یہ بات لائی گئی کہ روس کے سپاہیوں کے مزاجوں میں قدرے الجھاؤ پیدا ہونے لگا ہے اور وہ معمولی باتوں پر ایک دوسرے سے اُلجھنے میں دریغ نہیں کرتے۔ تحقیقاتی کمشن نے جو رپورٹ پیش کی تو معلوم ہوا کہ جب سے فوج میں سپاہیوں کی چینی کا راشن آدھا کر دیا گیا ہے اس وقت سے ان کے مزاجوں میں تلخی پیدا ہو گئی ہے۔ اس رپورٹ پر عمل درآمد کرواتے ہوئے چینی کا راشن بحال کر دیا گیا تو معلوم ہوا کہ فوج کی مذکورہ شکایت بھی رفع ہو گئی۔ اسی طرح مسلمانوں کو ایک محاذ پر جب فتح حاصل نہیں ہو رہی تھی تو معلوم ہوا کہ فوج نے مسواک کرنے کی سنت کو ترک کر دیا تھا، اس لئے فتح حاصل کرنے میں رکاوٹ ہوئی۔ افسوس ہے کہ آج کے مسلمان نے سنتوں کا ترک تو کیا فرائض کو بھی ترک کر دیا ہے۔ ایسی قوم کا جو حشر ہونا چاہیے تھا اور جو ہو رہا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔

علامہ اقبالؒ نے بھی اپنی قوم کے تنزل کی وجوہات پر غور کیا اور اُن کو دور کرنے کے لئے اپنے نظریات کو قوم پر پیش کیا۔ اس سلسلے میں علامہ اقبالؒ کے چند ایک نکات اور اشارات پیش کیے جا رہے ہیں۔ اگر ان اشعار کی تفصیل پیش کی جائے تو بات بہت دور نکل جاتی ہے لہٰذا ان اشعار میں موجود اشارات کو قارئین کے اپنے ذہنوں کے مطابق سوچنے اور سمجھنے کے لئے چھوڑا جا رہا ہے۔

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک — اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا وجم
دِل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت — فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دِل یا شکم
اے مسلماں! اپنے دِل سے پوچھ، مُلّا سے نہ پوچھ — ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم؟
(ب۔ج:۳۲۵)

دین ہو فلسفہ ہو، فقر ہو، سلطانی ہو — ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر
حرف اس قوم کا بے سوز، عمل زار و زبوں — ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر
(ض۔ک:۶۰۶)

ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہ لالہ رنگ — جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبورِ نیاز
ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو — مضطرب ہے تو کہ ترا دِل نہیں دانائے راز
(ب۔د:۲۶۴)

خوب ہے تجھ کو شعارِ صاحبِ یثرب کا پاس — کہہ رہی ہے زندگی تیری کہ تو مسلم نہیں
وہ نشانِ سجدہ جو روشن تھا کوکب کی طرح — ہو گئی ہے اس سے اب نا آشنا تیری جبیں
(ب۔د:۲۲۱)

وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو　ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیِ کردار
(ض۔ک:۵۰۲)

مجھ کو معلوم ہیں پیرانِ حرم کے انداز　ہو نہ اخلاص تو دعویٰ نظر لاف و گزاف
اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے　قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف (ض۔ک:۵۴۸)

حلقۂ شوق میں وہ جراٴتِ اندیشہ کہاں　آہ، محکومی و تقلید و زوال تحقیق
خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں　ہوئے کس درجۂ فقیہان حرم بے توفیق
(ض۔ک:۴۸۴)

اس بات میں کچھ مبالغہ نہیں کہ علامہ اقبالؒ نے اپنی تمام عمر مسلمانوں کو دینِ مصطفوی ﷺ کی شاہراہ پر لانے کے لئے وقف کر دی اور آپ کا پورا کلام ہی آپؒ کے اس انقلابی جدوجہد کا پیکرِ مثالی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے کچھ اشعار یہاں شامل کر دیئے گئے ہیں مگر یہ محض نمونے کے طور پر دیئے جا رہے ہیں ورنہ آپ کی تمام کتابوں میں ایک یہی اصلاحی مقصد نظر آتا ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ میری شاعری کو شاعری تصور نہ کیا جائے، یہ تو قوم کی دُکھ درد بھری کہانی کو بیان کر رہی ہے اور ان کو ایک متحدہ محاذ پر لا کھڑا کرنے کی کوشش ہے۔

نغمہ کجا و من کجا، سازِ سخن بہانہ ایست　سوئے قطار می کشم، ناقۂ بے زمام را
(ز۔ع:۴۴۷)

(میرا نغمہ کہاں اور میں کہاں، شاعری کا ساز ایک بہانہ ہے مَیں تو اپنی بے مہار اونٹنی کو ایک قطار میں کھینچ رہا ہوں۔)

علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کو پوری دنیا میں پسپائی کے اسباب بیان کیے اور انہیں خبردار کیا کہ اگر ایک زندہ قوم کی طرح زندگی بسر کرنا چاہتے ہو تو اقوامِ عالم کے شانہ بہ شانہ ترقی کی شاہراؤں کی تعمیر کرو اور اگر تم دینِ اسلام سے غفلت کا رویہ ترک کر دو گے تو اس منزل پر پہنچنا ممکن نہیں۔ آپ نے ملت کے سامنے بہت سے سوال اُٹھائے۔

کس طرح ہوا کند ترا نشترِ تحقیق؟ (ا۔ح:۲۶۹)　(تحقیق کو اپنا شعار بناؤ)

کس طرح محکم ہو ملت کی حیات؟　(ملتِ ابراہیمی کی اتباع کرو)
(ب۔ج:۴۳۲)

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے؟　(نماز و روزہ سے غفلت نہ کرو)
(ب۔د:۲۰۱)

کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعار اغیار؟ (مغربی تہذیب ہلاکت کی طرف لے جائے گی)
(ب۔د:۲۰۲)

کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے؟ (قرون اولیٰ کے مسلمان کی طرف اشارہ ہے)
(ب۔د:۱۶۵)

علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی نجات صرف دینِ مصطفوی ﷺ کی اتباع میں پوشیدہ ہے۔ کامیاب زندگی کا راز خودی کے سمندر میں ڈوب جانے میں پوشیدہ ہے۔ مسلمان جب تک اتباع ہوس و مال کو ترک کر کے عالمی طور پر مسلمانوں میں اسلامی اخوت کا علمبردار نہ بنے گا، اس وقت تک کٹتا، پٹتا اور روتا ہی رہے گا۔

کسی یکجائی سے اب عہد غلامی کر لو ملتِ احمدِ مرسل کو مقامی کر لو! (ب۔د:۲۰۱)
کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی
(ب۔ج:۳۲۲)

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِّ زندگانی ہے نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا
(ب۔د:۲۷۳)

علامہ اقبالؒ ہمیشہ مسلمانوں کو اُن کی موجودہ حالت کی گراوٹ اور تنزل کو بیان کر کے ان کے سروں کو بلند کرنے کی تجویزیں پیش کرتے رہے۔

کیوں چمن میں بے صدا مثلِ رمِ شبنم ہے تو لب کشا ہو جا سرود بربط عالم ہے تو
(ب۔د:۱۹۱)

نور سے دور ہوں ظلمت میں گرفتار ہوں میں کیوں سیہ روز، سیہ بخت، سیہ کار ہوں میں
(ب۔د:۵۵)

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو قطرہ ہے، لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے
(ب۔د:۱۹۳)

علامہ اقبالؒ کبھی تو قوم کو مخاطب کرتے ہوئے انہیں راز کی باتیں بیان کرتے ہیں اور کبھی رسول

اکرم ﷺ سے دادرسی کی فریاد کرتے ہیں اور کبھی اللہ رب العزت کی بارگاہ میں گڑگڑا کر قوم کی اصلاح کے لئے دُعائیں کرتے ہیں، لیکن افسوس کہ اس قوم کے افراد میں اگرچہ کچھ تبدیلی دیکھنے کو تو آئی مگر یہ تبدیلی اس قدر قلیل عرصے کے لئے تھی کہ علامہ کی روح آج بھی اپنی قبر میں بے قرار ہے۔

کار دنیا میں رہا جاتا ہوں مَیں ٹھوکریں اس راہ میں کھاتا ہوں مَیں
کیوں میرے بس کا نہیں کارِ زمیں؟ ابلہِ دنیا ہے کیوں دانائے دیں؟
(ب۔ج:۴۳۳)

ہے مرے سینۂ بے نور میں اب کیا باقی لاإلٰہ مردہ و افسردہ و بے ذوقِ نمود
کیوں مسلمان نہ خجل ہو تری سنگینی سے کہ غلامی سے ہوا مثلِ زجاج اس کا وجود
(ض۔ک:۵۶۷)

ہے مری بانگِ اذاں میں نہ بلندی نہ شکوہ کیا گوارا ہے تجھے ایسے مسلماں کا سجود
(ض۔ک:۵۶۷)

کیوں مسلمانوں میں ہے دولتِ دنیا نایاب تری قدرت تو ہے وہ جسکی نہ حد ہے نہ حساب
(ب۔د:۱۶۷)

اس دنیا سے رحلت فرمانے کے وقت آپؒ نے اپنی قوم کو یہ فرمایا کہ اب میرے بعد شاید ہی مستقبل قریب میں کوئی دانائے راز آئے۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید؟ نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟
(اقبال کے پیغام کا نغمہ اب سُننے میں آئے یا نہ آئے، حجاز کی طرف سے ٹھنڈی ہوا چلے یا نہ چلے۔)
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے دگر دانائے راز آید کہ ناید؟ (ا۔ح:۸۹۴)
(اس فقیر کی زندگی تو ختم ہوئی، اب کوئی اور آشنائے راز آئے یا نہ آئے۔)

باب ۴۳

حصہ نہم

(صوفی کی طریقت کے احوال وکرامات)

کراماتِ اولیائے کرام رحمۃ اللہ علیہم اجمعین

کرامات کا تذکرہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ لفظ کرامۃ کا لغوی معنی اور پھر اس کے اصطلاحی معنی پر روشنی ڈالی جائے۔ روحانیت کے ضمن میں کرامت معجزہ اور استدراج کا بھی ذکر آتا ہے۔ چنانچہ اس بحث سے متعلقہ دیگر امور پر بھی معلومات پہنچانا کرامت کا فہم حاصل کرنے کی ضروریات میں سے ہے۔

کرامت کا لغوی معنی

کرامت کی جمع کرامات ہے۔ یہ لفظ ''کَرُمَ یَکْرُمُ'' کا اسم ہے۔ کرامت کا معنی عزت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو دیگر مخلوقات پر جو عظمت بخشی ہے اس کا ذکر بھی اس مادے پر مشتمل ہے۔ ارشاد فرمایا۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (بنی اسرائیل: ۷۰) ہم نے آدم کی اولاد کو بڑی عزت بخشی۔

قیامت کے دن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی جو تمام اگلوں اور پچھلوں پر عظمت ہوگی اسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

اَنَا اَكْرَمُ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ عَلَى اللّٰهِ (مشکوٰۃ: رقم الحدیث ۵۷۶۵) اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تمام اگلوں اور پچھلوں سے زیادہ معزز میں ہوں گا۔

ایک دوسری حدیث میں ہے۔

اَلْكَرَامَةُ وَالْمَفَاتِيْحُ يَوْمَئِذٍ بِيَدِيْ (مشکوۃ رقم الحدیث ۵۷۶۵) عزت اور (خیر کی) تمام چابیاں اس دن میرے ہاتھ میں ہوں گی۔

فرشتوں کی بزرگی کا بیان بھی اسی لفظ سے کیا گیا: جیسا کہ سورۃ انبیاء کی آیت نمبر ۲۶ میں ہے ''بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ'' (بلکہ وہ تو (اس کے) معزز بندے ہیں) اور سورہ عبس آیت نمبر ۱۶ میں ہے ''كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ'' (جو بڑے بزرگ اور نیکوکار ہیں) مدعا یہ ہے کہ عزت وعظمت کے اظہار کے لئے یہ لفظ بہت اہم ہے۔ انسان

کو جو کرامت دی گئی اس کی پھر دو قسمیں ہیں۔ عام اور خاص

کرامت عامہ انسان کو حیوانِ ناطق بنایا گیا، اس کو معتدل قد و قامت عطا فرمائی گئی، عقل کی مخصوص قوت عطا فرمائی گئی۔ احسنِ تقویم یعنی دیگر تمام مخلوق سے حسین ترین ہیئت و صورت سے سرفراز فرمایا گیا۔ مستزاد یہ کہ بحر و بر وغیرہ پر اس کو حاکم بنایا گیا۔ کرامت کی اس قسم میں مسلم وغیر مسلم تمام انسان برابر ہیں۔

کرامت خاصہ انسانوں میں سے جو طبقہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے کسی رسول اور نبی کی پیروی کرے اللہ تعالیٰ کی جناب سے اس طبقے کے لئے مخصوص عزت ہے۔ اس عزت کا اصل اظہار تو قیامت میں ہوگا مگر دنیا میں بھی اس کا کچھ نہ کچھ اظہار ہوتا رہتا ہے۔ ایسی باتیں جن کا ظہور فطرتاً اور عادۃً ناممکن ہو، اللہ تعالیٰ کی بندگی بجالانے والے لوگوں کے لئے وہ بھی ممکن بنا دی جاتی ہیں تا کہ اللہ والوں کی عزت کا اظہار ہو۔ ایسے تمام امور کو خرق عادت یا خلافِ عادت کہا جاتا ہے۔ ایسے امور کی کئی اقسام ہیں یہاں ہم صرف دو اقسام کا ذکر کریں گے جن میں سے ایک معجزہ اور دوسری کرامت ہے۔

معجزہ کی تعریف

لفظ معجزہ اسم فاعل ہے اور عجز سے ماخوذ ہے۔ معنیٰ لفظِ قدرت کی ضد ہے۔ اس کے آخر میں جو حرف ''ۃ'' ہے اسے مبالغہ کے لئے لایا گیا ہے۔ واضح رہے کہ قرآن و حدیث میں لفظ معجزۃ نہیں ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کو جو کمالات عطا ہوتے ہیں انہیں قرآن و سنت میں ''اَلْاٰیَۃُ الْبَیِّنَۃُ'' (کھلی نشانیاں) اور ''اَلْبُرْھَانُ'' (کھلی دلیل) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ گویا لفظ معجزہ کا لسانِ عرب اور زبانِ سلف میں تنزل ہوا ہے۔ معجزہ کو معجزہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ نبی جس قوم کے پاس تشریف لاتا ہے اور باذنِ الٰہی جو کمالات دکھاتا ہے قوم کے تمام لوگ ایسے کمالات پیش کرنے سے عاجز ہوتے ہیں اور اس لئے بھی کہ عقل اس کے سامنے عاجز ہوتی ہے۔ چونکہ کرامت میں بھی یہ باتیں موجود ہوتی ہیں اسی لئے متقدمین حضرات کرامت سمیت تمام خرق (خلافِ) عادت امور پر لفظِ معجزہ کا اطلاق کرتے ہیں، تاہم متاخرین نے کرامت اور معجزہ میں لفظی فرق قائم کر دیا ہے۔ ان کے نزدیک لفظِ معجزہ نبی کے کمال کے لئے مختص ہے۔ (مجموعۃ الرسائل والمسائل لابن تیمیہ ج ۵ ص ۲)

معجزہ کی تعریف میں علمائے کرام نے یہ بھی کہا ہے کہ ''بعثت کے بعد نبی کے ہاتھ پر جو خلاف عادت فعل ظاہر ہو خواہ اس میں تحدی (چیلنج) ہو یا نہ ہو اس کو معجزہ کہتے ہیں''۔

کرامت کی تعریف

معجزہ کی تعریف میں تقریباً کرامت کی تعریف آ چکی ہے۔ مزید وضاحت کے لئے امام زین الدین

مناوی رحمۃ اللہ علیہ کا حسب ذیل کلام پڑھیئے۔ آپ فرماتے ہیں کہ کرامت ایک خرق عادت فعل کو کہتے ہیں جو ولی اللہ کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ دعویٰ نبوت شامل نہیں ہوتا۔ اس کے لئے بندہ کا مومن اور صالح ہونا شرط ہے ورنہ یہ فعل کرامت نہیں ہوگا۔ (الکواکب الدریہ ج ۱ ص ۵)

بعض علمائے کرام نے کہا ہے کہ" جس طرح معجزہ کو قرآن کی زبان میں " آیة" کہتے ہیں اسی طرح کرامت کو بھی آیة کہا جاتا ہے۔ کیونکہ معجزہ نبی کی نبوت پر دلیل ہوتا ہے تو کرامت بھی اس ولی کے نبی کی نبوت پر دلیل ہوتی ہے۔ اس لئے کہ جس ولی کے ہاتھ پر کرامت ظاہر ہوتی ہے وہ اپنے نبی کا سچا تابعدار ہوتا ہے۔ (مقدمہ دلائل النبوۃ الاصفہانی ج ۱ ص ۷۶)

کرامات درحقیقت نبی کے معجزات ہیں

کرامات کے لئے چونکہ یہ شرط ہے کہ جس بندے کے ہاتھ پر ظاہر ہو وہ اپنے نبی کی شریعت پر مکمل کار بند ہو، لہٰذا اس کامل پیروی کے نتیجہ میں جو خرقِ عادت فعل ظاہر ہوگا وہ درحقیقت اس کے نبی کا معجزہ ہوگا، چونکہ اس کرامت کا اظہار ولی کے ہاتھ پر ہوا اس لئے وہ اس کے حق میں باعثِ کرامت (یعنی باعث عزت) ثابت ہوگا۔ اسی لئے اولیائے کرامؒ سے صادر شدہ خرقِ عادت افعال اور کمالات کو کرامات کہا جاتا ہے۔

متذکرہ بالا ضابطہ کے پیش نظر اکثر علمائے کرامؒ نے حضور اکرم ﷺ کی اُمت کے اولیائے کرامؒ کی کرامات کو حضور اکرم ﷺ کے معجزات میں شمار کیا ہے چنانچہ مشہور محدث حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی مشہور تصنیف " البدایہ و النھایة " میں نبی کریم ﷺ کے معجزات اور گذشتہ انبیائے کرام علیہم السلام کے معجزات کا تقابل کیا ہے۔ انہوں نے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مردے زندہ کرنے کا ذکر کیا تو ان کے مقابلے میں دیگر دلائل کے ساتھ ساتھ حضور کی امت کے اولیائے کرام کے مردوں کو زندہ کرنے کے واقعات کا بھی ذکر کیا۔ ایک شخص (نباتہ بن یزیدؒ) کا سفر حج میں گدھا مر گیا۔ انہوں نے دعا کی تو گدھا زندہ ہوگیا۔ علامہ ابن کثیرؒ اس پر لکھتے ہیں۔

وَهِيَ مَعْدُوْدَةٌ مِنَ الْمُعْجِزَاتِ لِاَنَّ كُلَّ مَايَثْبُتُ لِوَلِيِّ فَهُوَ مُعْجِزَةٌ لِنَبِيِّهِ

(البدایہ ج ۴ ص ۵۴۹)

اس کا شمار معجزات میں ہوگا اس لئے کہ جو کمال بھی ولی کے لئے ثابت ہوگا وہ اس کے نبی کا معجزہ ہوگا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ گلزار ہوگئی۔ اس کے مقابلہ میں حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ ایسا واقعہ حضور اکرم ﷺ کے اُمتی حضرت ابو مسلم الخولانیؒ کو پیش آیا۔ اسود عنسی نے جب دعویٰ نبوت کیا تو حضرت خولانیؒ نے اُس کا انکار کیا۔ اس پر عنسی ملعون نے آگ تیار کرائی اور حضرت ابو مسلم خولانی کو اس آگ میں ڈال

دیا۔آگ آپ پر گلزار ہوگئی۔حضرت ابومسلم خولانی کی ملاقات جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: الحمدللہ! اللہ تعالیٰ نے وفات سے پہلے ہمیں اس شخص کی زیارت کرادی۔جس پر اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح آگ گلزار فرمادی۔صحابہ ابومسلم خولانی کو اس واقعہ کے حوالے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مشابہ قرار دیتے تھے۔حافظ ابن کثیرؒ کہتے ہیں: حضرت ابومسلم خولانیؒ اس مرتبہ کو اس لئے پہنچے کہ انہوں نے شریعت محمدیہ مطہرہ مقدسہ کی اتباع کی۔(البدایہ ج ۴ ص ۶۸۴ مُلَخَّصًا جِدًا)

حافظ ابن کثیرؒ نے مردوں کا زندہ ہونا، مردوں کا کلام کرنا، مردوں کا زندہ ہو کر طویل عرصہ تک دُنیا میں رہنا، اندھوں کا بینا ہونا، قبروں میں نور ہونا، گھر کی اشیاء کا نور کی طرح روشن ہونا، پانی پر چلنا وغیرہ بہت سی کرامات کا ذکر کیا ہے اور انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں شمار کیا ہے۔البدایہ والنہایہ کا مطالعہ کرنے والے شخص پر یہ حقیقت مخفی نہیں رہے گی۔

امام یوسف نبہانی علیہ الرحمۃ نے ''جامع کرامات اولیاء'' کی غرضِ تصنیف ہی یہ بتائی ہے کہ اس سے پہلے انہوں نے معجزات پر مشتمل ایک کتاب الموسوم ''بِحُجَّةِ اللّٰهِ عَلَى الْعَالَمِيْنَ فِيْ مُعْجِزَاتِ سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ'' تحریر کی تھی۔اُنہوں نے کہا اور اب میں جامع کرامات اولیاء کو تحریر کر رہا ہوں کیونکہ اولیاء کرام کی کرامات دراصل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات ہیں۔سو یہ کتاب درحقیقت ''حُجَّةُ اللّٰهِ عَلَى الْعَالَمِيْنَ'' کا تکملہ یا تتمہ ہے۔(جامع کراماتِ اولیاء ج ۱ ص ۷۵،۷۶)

اور یہ بات اکثر علمائے اسلام نے کہی ہے اور یہ ہے بھی حقیقت، کیونکہ ہر خیر اور ہر عزت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی بدولت حاصل ہوتی ہے اور کوئی مسلمان شخص اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتا حتیٰ کہ علامہ ابن تیمیہؒ نے کہا ہے: جس شخص نے دعویٰ کیا کہ اولیائے کرامؒ میں سے ایک ایسا شخص ہے جس تک رسالتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم تو پہنچی ہے مگر وہ ایسے طریقے سے بارگاہ الٰہی تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا جس میں اُسے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حاجت نہیں ہوئی تو وہ کافر اور ملحد ہے۔آپ نے یہ بھی فرمایا ہے: جس شخص نے کہا کہ وہ علم ظاہر میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا محتاج ہے، علم باطن میں نہیں۔یا علم شریعت میں محتاج ہے اور علم حقیقت میں نہیں۔تو ایسا شخص یہود و نصاریٰ سے بھی زیادہ بُرا ہے۔

(الفرقان بین اولیآء الرحمٰن و اولیاء الشیطان ص ۷۲)

سلسلۂ کرامات منقطع نہیں ہوا

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ کرامات درحقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات ہیں تو یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تا ابد باقی ہے اور آپ کی شریعت پر کاربند رہنے والے حضرات

قیامت تک باقی رہیں گے لہٰذا ان کے ہاتھوں پر وقوع کرامات کا سلسلہ بھی باقی ہے اور باقی رہے گا۔ علامہ ابن تیمیہ ؒ اس حقیقت کو اپنے دور ۷۲۸ھ سے قبل ثابت کر گئے۔ علامہ نبہانی علیہ الرحمۃ ۱۳۵۰ھ سے قبل اس حقیقت کے اثبات پر لکھ گئے، اور اب تک ہمارے زمانے میں سلسلۂ کرامات قائم ہے۔ جس کی دلیل مشاہدہ ہے۔ البتہ اس پرفتن دور میں اللہ کے بندے عامۃ الناس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔

کرامات کی اقسام

علمائے کرام نے کہا ہے کہ جو چیز کسی نبی کا معجزہ ہو سکتی ہے، جائز ہے کہ وہ کسی ولی کے ہاتھ پر بطور کرامت ظاہر ہو لیکن مطلقاً یہ بات درست نہیں ہے۔ اولیائے کرام کو یہ کرامات نہیں دی گئیں کہ وہ ڈوبے ہوئے سورج کو واپس لوٹائیں یا چاند کے دو ٹکڑے کریں یا ساتوں آسمانوں کے اوپر چلے جائیں۔ علمائے محققین نے کرامات کی اقسام بیان کی ہیں مگر انہوں نے ان اقسام میں متذکرہ بالا تین قسموں کا ذکر نہیں کیا۔ امام مناوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیس (۲۰) اقسام ذکر کیں اور ان سے پہلے امام تاج الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ نے پچیس (۲۵) اقسام گنوائیں ہیں۔ یہاں ہم ان دونوں حضرات کی تصانیف سے ان اقسام کا ذکر کر رہے ہیں۔

(۱) مردے زندہ کرنا

اس سے پہلے ہم حافظ ابن کثیر کے حوالے سے لکھ چکے ہیں کہ نباتہ بن یزید نے اپنے گدھے کو دوبارہ زندہ کیا۔ امام مناوی ؒ فرماتے ہیں کہ مردے زندہ کرنا کرامات کی اعلیٰ اقسام میں سے ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں چند واقعات بیان کئے ہیں، ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں

۱) مفرج دمامینیؒ کے پاس بھنا ہوا پرندہ لایا گیا تو انہوں نے کہا "اڑ جا اللہ کے حکم سے! تو وہ اڑ گیا۔

۲) حضرت شیخ اہدلؒ کی ایک بلی تھی۔ خادم نے اسے کوئی چیز ماری تو وہ مر گئی۔ خادم اسے اٹھا کر کہیں پھینک آیا۔ شیخ نے دو تین روز بعد اس سے معلوم کیا کہ بلی کہاں ہے؟ خادم نے کہا: کیا خبر؟ شیخ نے آواز لگائی تو بلی بھاگتی ہوئی حاضر ہو گئی۔

۳) حضرت ابو یوسف دھمائیؒ کا ایک ساتھی انتقال کر گیا۔ اس کے گھر والوں پر یہ صدمہ بہت گراں گزرا۔ انہوں نے بے تحاشا گریہ کیا۔ شیخ نے جب یہ صورت حال دیکھی تو میت کے قریب آئے اور کہا: اللہ کے حکم سے کھڑے ہو جاؤ! تو وہ کھڑا ہو گیا اور طویل عرصہ تک زندہ رہا۔

امام سبکیؒ، امام مناویؒ، حافظ ابن کثیرؒ، امام نبہانیؒ اور مولانا اشرف علی تھانوی وغیرہ نے احیاء موتی کی کرامات کا بکثرت ذکر کیا ہے۔ (طبقات الشافعیہ للسبکی ج ۱ ص ۵۲۵، الکواکب الدریہ ج ۱ ص ۱۴ جمال الاولیاء از تھانوی ص ۶۱)

قرآن کریم میں ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام جس مقام پر قیام پذیر تھے وہاں پہنچنے پر وہ مچھلی زندہ ہو کر دریا میں چلی گئی جسے پکا کر حضرت موسیٰ اور یوشع بن نون علیہما السلام نے دوپہر کے کھانے کے لئے ساتھ لیا ہوا تھا۔ دیکھئے سورہ الکہف کے ان الفاظ کی تفسیر وَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ عَجَبًا (الکہف: ۶۳)

(۲) مُردوں سے کلام کرنا

امام سبکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ قسم پہلی قسم سے بھی زیادہ ہے۔ حضرت ابوسعید خرازؒ، حضرت غوث الاعظمؒ اور ایک جماعت سے منقول ہے کہ ان کے ساتھ مردوں نے کلام کیا۔ امام زین الدین مناویؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے جدِ کریم شیخ شرف الدین مناویؒ نے امام شافعیؒ کو مخاطب کیا تو انہوں نے قبر اطہر سے جواب دیا۔ (الکواکب الدریہ ج ۱ ص ۱۵)

حضرت امیر حمزہؓ نے شیخ محمود کردیؒ کو قبر کے اندر سے سلام کا جواب دیا اور لڑکے کی ولادت کی بشارت دی اور فرمایا لڑکے کا نام ہمارے نام پر رکھنا۔ چنانچہ ان کے ہاں لڑکا ہوا اور انہوں نے اس کا نام حمزہ رکھا۔
(جمال الاولیاء از تھانوی ص ۳۶)

حضرت زید بن [illegible] رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وفات کے بعد بہت طویل کلام کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بارگاہ میں درود و سلام عرض کیا۔ اور خلفاء اربعہ کی خلافت کی تصدیق پر مبنی کلام کیا۔ (جمال الاولیاء، ص ۳۹)

یہ روایت امام بیہقی، امام طبرانیؒ حافظ ابن کثیرؒ اور امام نبہانیؒ وغیرہ نے بھی تفصیل کے ساتھ ذکر کی ہے۔ اہلِ ذوق کے لئے مکمل واقعہ کا مطالعہ کرنا بہت مفید ہے۔ محمد بن ابی بکر الحکمیؒ کے بارے میں منقول ہے کہ بعض مشائخ ان کی قبر پر تشریف لے گئے تو وہ کمر باندھے ہوئے قبر سے باہر نکلے۔ کمر باندھنے کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ ہم اب تک طلب میں ہیں۔ جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ اسے وصول ہو گیا، وہ جھوٹا ہے کیونکہ وصول تو محدود کی طرف ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ حدوں سے پاک ہے۔ (جمال الاولیاء، ص ۱۰۶)

(۳) دریا کا پھٹ جانا اور خشک ہونا

کرامت کی یہ قسم بھی بہت زیادہ وقوع پذیر ہوئی ہے۔ امام سبکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مشہور فقیہ امام تقی الدین ابن دقیق العید رحمۃ اللہ علیہ کے لئے سمندر پھٹ گیا تھا۔ (طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۵۲۶)

امام مناویؒ فرماتے ہیں: مشائخ کرام میں سے ایک بزرگ کشتی میں بیمار ہو گئے اور انتقال کر گئے۔ کشتی میں سوار لوگوں نے تجہیز و تکفین کی۔ جب دریا میں نعش پھینکنے کا ارادہ کیا تو دریا پھٹ گیا اور کشتی زمین پر بیٹھ گئی۔ قبر تیار کی گئی اور شیخ کو دفن کیا گیا اور پانی دوبارہ آپس میں مل گیا اور کشتی روانہ ہو گئی۔ (الکواکب الدریہ ج ۱ ص ۱۵)

امام مناوی نے کہا ہے کہ پانی پر چلنے کی کرامات تو اس قدر کثیر ہیں کہ وہ احاطۂ تحریر میں نہیں آ سکتیں۔

حضرت علاء حضرمی کے بارے میں منقول ہے کہ وہ پورے لشکر کو گھوڑوں سمیت پانی کے اوپر چلا کر پار لے گئے۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۱۱ ص ۲۸۲)

(۴) اشیاء کی حقیقت بدل دینا

حضرت شیخ عیسیٰ ہتار یمنی کے بارے میں منقول ہے کہ ان کے پاس کسی شخص نے بدتمیزی کرتے ہوئے دو بڑے بڑے برتنوں میں شراب بھیج دی۔ آپؒ نے ان دونوں کو الٹ پلٹ دیا اور فرمایا: بسم اللہ پڑھ کر کھاؤ۔ حاضرین نے کھایا تو وہ بہترین مکھن تھا اس جیسی رنگت اور ذائقہ کبھی نہیں پایا گیا۔ (طبقات سبکی ج ۱ ص ۵۲۶)

حضرت ابراہیم التیمیؒ نے دو ماہ تک کچھ نہ کھایا۔ پھر نکلے تا کہ اہل وعیال کے لئے کچھ لے آئیں لیکن کچھ نہ حاصل ہوا۔ جب پیلی ریت کے ایک ٹیلے سے گذرنے لگے تو وہاں سے کچھ ریت اٹھالی۔ جب گھر پہنچ کر اسے کھولا تو وہ سرخ گندم تھی۔ جب اس گندم کو کاشت کیا گیا تو تنے سے لے کر اوپر تک مکمل پودہ خوشوں سے بھرا ہوا پیدا ہوا۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۱۱ ص ۲۸۲، التصدیق بکرامات الاولیاء ص ۱۱۱)

(۵) زمین کا سکڑ جانا

زمین لپٹ جائے، فاصلے مٹ جائیں، امام مناویؒ فرماتے ہیں: ایسی کرامات حدِ تواتر تک پہنچ چکی ہیں۔ ایک بزرگ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ جامع مسجد طرسوس میں بیٹھے ہوئے تھے، انہیں حرم شریف کی زیارت کا شوق ہوا تو انہوں نے گریبان میں سر ڈالا۔ پھر سر اٹھایا تو حرم میں تھے۔ (طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۵۲۶)

مشہور ترین محدث، مفسر، مورخ اور صوفی امام جلال لدین سیوطیؒ کے خادم خاص محمد بن علی حباک بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ امام سیوطیؒ نے انہیں فرمایا: ہم چاہتے ہیں کہ نماز عصر مکہ معظمہ میں ادا کریں۔ آپ اس وقت مصر میں تھے اور دوپہر کا وقت تھا۔ آپ نے خادم سے فرمایا لیکن ایک شرط ہے کہ تم ہماری وفات تک یہ راز کسی پر ظاہر نہیں کرو گے۔ میں نے کہا: ہاں۔ آپ نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: آنکھیں بند کرو۔ میں نے آنکھیں بند کیں۔ آپ تقریباً ستائیس قدم چلے پھر فرمایا آنکھیں کھولو! میں نے آنکھیں کھولیں تو ہم جنت المعلٰی میں تھے۔ وہاں ہم نے ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ، فضیل بن عیاضؒ اور سفیان بن عیینہؒ کے مزارات کی زیارت کی۔ پھر حرم میں آئے اور طواف کیا، آب زم زم پیا اور مقام ابراہیم کے پاس بیٹھے رہے۔ پھر فرض ادا کئے، دوبارہ طواف کیا آب زم زم پیا۔ پھر آپ نے مجھ سے فرمایا: اے فلاں! طی ارض (زمین کا سکڑ جانا) ہمارے لئے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ پھر فرمایا: اگر تم چاہو تو یہاں رہو حتیٰ کہ حج کے ایام آئیں اور چاہو تو ہمارے ساتھ چلو۔ میں نے کہا: یا سیدی میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔ پھر ہم جنت المعلٰی تک چلے پھر آپ نے فرمایا: آنکھیں بند کرو۔ میں نے آنکھیں بند کیں تو ہم مصر میں تھے۔ (جامع کرامات اولیاء ج ۲ ص ۱۴)

(۶) جانوروں، درختوں اور پتھروں سے کلام

امام سبکیؒ اور امام مناویؒ فرماتے ہیں: اس کے وقوع میں اور اس کی کثرت میں کوئی شک نہیں ہے۔ منقول ہے کہ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ بیت المقدس کے سفر میں ایک انار کے درخت کے سایہ میں تشریف فرما ہوئے۔ درخت نے کہا: اے ابو اسحاق! مجھے عزت بخشیے اور مجھ سے کچھ تناول فرمائیے۔ یہ گذارش اس نے تین مرتبہ کی۔ وہ ایک چھوٹا درخت تھا اور اس کے سب انار کھٹے تھے۔ حضرت نے ایک انار لیا اور کھایا تو وہ درخت لمبا ہو گیا اور اس کے انار میٹھے ہو گئے۔ سال میں دو مرتبہ اس پر پھل آنے لگا اور اس درخت کا نام پڑ گیا "رُمَانَةُ الْعَابِدِیْنَ" (عبادت گزاروں کا انار)

حضرت قولی کے پاس دو شخص ایک گائے لے کر آئے ان میں سے ہر ایک دعویدار تھا کہ یہ گائے اس کی ہے۔ آپ اس وقت علاقہ معید کے قاضی تھے۔ گائے نے ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ کو عرض کیا: میں اس شخص کی ملکیت ہوں۔ (الکواکب الدریہ ج ا ص ۱۵)

(۷) مفلوج اور اپاہجوں کو درست کرنا

حضرت سری سقطی سے مروی ہے کہ انہیں پہاڑوں میں ایک شخص ملا جو مادرزاد اندھوں، اپاہجوں اور مریضوں کو درست کر دیتا تھا۔ حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے پاس ایک اپاہج لایا گیا جو مفلوج اور اندھا بھی تھا۔ آپ نے اس کو فرمایا: قُمْ بِاِذْنِ اللّٰہِ (اللہ کے حکم سے کھڑے ہو جاؤ) وہ کھڑا ہو گیا یوں لگتا تھا جیسے اسے کوئی بیماری نہ تھی۔

(طبقات السبکی ج ا ص ۵۲۶ ، جامع کرامات اولیاء اردو ج ا ص ۸۵۹ میں تفصیلی واقعات دیکھئے۔)

(۸) وقت کو مختصر اور دراز کرنا

امام سبکی، امام مناوی اور امام نبہانی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین نے کرامات کی اقسام میں ایک قسم یہ بھی بیان کی ہے، لیکن ان تینوں حضرات نے عنوان قائم کرنے کے بعد بطور نمونہ کوئی کرامت بیان نہیں کی، بلکہ امام سبکیؒ نے فرمایا ہے کہ عامۃ الناس کو ان دونوں قسموں کا سمجھنا دشوار ہوگا۔ امام نبہانیؒ نے بھی بعینہ یہی لکھ دیا ہے۔ ہم اپنے قارئین کے سامنے ان دونوں کی قسموں (۱) وقت کا مختصر کرنا، (۲) وقت کا دراز کرنا) پر بطور نمونہ ایک آدھ واقعہ عرض کر رہے ہیں۔ اگر سمجھ نہ آئے تو جان لو کہ کرامت ایسے خرقِ عادت فعل کو کہتے ہیں جو سمجھ نہ آئے۔ حضرت ابراہیم بن علی بن عمر المجتول کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کے دربار کے کسی فقیر کو ماں کی زیارت کا شوق ہوا تو اس نے اثنائے سفر آپ سے گھر جانے کی اجازت مانگی۔ آپ نے اجازت نہ دی۔ آپ اس وقت سفر حج میں تھے اور اس شخص کی ماں عجم کے کسی ملک میں تھی۔ آپ نے اس شخص کو خلوت میں

جانے کا حکم دیا۔ اس وقت لوگ جامع مسجد میں تلاوت قرآن میں مشغول تھے۔ جب وہ خلوت میں گیا تو اس نے اپنے آپ کو عجم میں پایا۔ پس اس نے وہاں چار ماہ قیام کیا۔ پھر اسے شیخ کی زیارت کا شوق پیدا ہوا تو اس نے اپنے آپ کو اسی خلوت میں پایا۔ باہر نکلا تو لوگ اسی طرح تلاوت میں مشغول تھے۔ امام مناوی فرماتے ہیں: یہ کرامت طی الارض پر مشتمل ہے اور اس میں وقت کا پھیل جانا بھی موجود ہے۔ پس جب وقت کا پھیل جانا جائز ہے تو سکڑ جانا بھی جائز ہوا۔ (جامع کرامات اولیاء عربی ج ۱ ص ۳۲۹)

مفسرین کرام نے حضرت عزیر علیہ السلام کے واقعہ کے تحت لکھا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں سو سال تک کے لئے سُلا دیا تھا تو آپ پر واقعی سو سال کا زمانہ نہیں گذرا تھا، البتہ آپ کے گدھے پر سو برس گذر گئے تھے اور اہل دنیا پر بھی سو برس گذرے تھے۔ آپ پر صرف دن کا کچھ حصہ گذرا تھا۔ جب آپ گھر سے نکلے تھے تو اس وقت آپ کے لڑکے کی عمر صرف اٹھارہ برس تھی جب کہ آپ کی اپنی عمر پچاس برس تھی لیکن جب آپ اس واقعہ کے بعد گھر پہنچے تو آپ کے لڑکے کی عمر ایک سو اٹھارہ برس ہو چکی تھی اور آپ کی عمر وہی پچاس برس تھی۔ (النکت والعیون ماوردی زیر آیت البقرۃ: ۲۵۹)

گذشتہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ وقت کے سکڑنے اور پھیلنے کا یہ ایک خرقِ عادت فعل ہے، جو قرآن میں مذکور ہے۔ ایسا خرقِ عادت عمل اُمتِ مسلمہ کے بہت سے اولیاء کرام سے بطور کرامت ثابت ہے۔

قبولیت دعا اللہ کے بندوں کی دعا کا فوراً قبول ہو جانا محتاج بیان نہیں ہے۔ اب تک ہم مشاہدہ کر رہے ہیں کہ اللہ کے بندوں کی دعاؤں سے دنیا و آخرت کی خیر حاصل ہو رہی ہے۔

(۹) زبان کو کلام سے روکنا اور جاری کر دینا

امام سبکیؒ، امام مناویؒ اور امام نبھانیؒ نے صرف عنوان قائم کیا ہے، اس کے تحت کوئی کرامت ذکر نہیں کی۔ ہم نے کافی محنت کے بعد حسب ذیل کرامات کو تلاش کیا۔

(۱) حسین ابن محمد المعروف ابن فرفرۃ مجذوب تھے۔ یہ ایک مرتبہ مشہور شافعی مفتی نجم الغزی کے درس میں آ پہنچے۔ حضرت نجم الغزیؒ صحیح بخاری شریف کا (جامع مسجد بنو اُمیہ میں) درس دے رہے تھے۔ ابن فرفرہ بے ربط کچھ بولنے لگے اور کچھ بلا مقصد سوالات کرنے لگے۔ حضرت نجم الغزیؒ نے کہا چپ رہو! انہوں نے کہا کہ تم چپ ہو جاؤ! یہ کہا اور حلقۂ درس سے باہر چلے گئے۔ اس کے چند روز بعد حضرت نجم الغزیؒ بیمار پڑ گئے ان کی ایک جانب پر فالج کا حملہ ہو گیا۔ اور زبان بند ہو گئی۔ چھ برس تک درس میں آتے رہے اور خاموش بیٹھ کر واپس چلے جاتے بعد میں ابن فرفرہ کی طرف رجوع کیا تو زبان جاری ہو گئی۔ پھر وہ ابن فرفرہ کے ہاتھ چومتے تھے اور محبت کرتے تھے۔ (جامع کرامتِ اولیاء ج ۲ ص ۱۴)

(۹) حضرت شیخ کمال الدین بن یونس کے حلقۂ درس میں کچھ لوگوں نے حضرت قضیب البان الموصلی کی غیبت شروع کردی۔ شیخ کمال الدین ابن یونس نے بھی ان لوگوں کی موافقت کی یعنی غیبت میں حصہ لیا۔ پس ایک دن ابن یونس درس کی طرف جا رہے تھے اور حضرت قضیب البان ایک مقام پر بیٹھے کوئی کپڑا سی رہے تھے۔ آپ نے شیخ کمال الدین کو آواز دے کر فرمایا: اے ابن یونس! ہم نے سی دیا۔ ابن یونس اس اشارے کو نہ سمجھ پائے اگرچہ وہ علمِ ظاہر میں بہت ماہر تھے۔ جب درس دینے کے لئے بیٹھے تو تمام علوم وفنون ذہن کی تختی سے اڑ چکے تھے، حتیٰ کہ بسم اللہ بھی بھول گئی تھی۔ کافی دیر غور وفکر میں غرق رہے پھر انہیں سمجھ آئی کہ قضیب البان نے کہا تھا "خَيَّطْنَاهُ" (ہم نے اسے سی دیا ہے۔) پس اہل درس کو کہا تم اسی حال میں بیٹھو میں آتا ہوں۔ سوار ہوئے اور قضیب البان کے پاس پہنچے، معذرت کی۔ آپ نے فرمایا: ہمیں زبان بند کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، جاؤ اور درس دو۔ آپ واپس آئے تو سابقہ تمام علوم بھی زبان پر جاری ہو گئے اور ان پر معرفت کا اضافہ بھی نصیب ہوا۔ (جامع کرامات اولیاء ج ۲ ص ۲۰ عربی)

(۱۰) متنفر دلوں کو مجلس میں اپنی طرف کھینچ لینا

یہ کرامت بہت سے لوگوں سے ظاہر ہوئی ہے۔ علامہ اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں کہ: محمد شمس الدین حنفیؒ لوگوں کے خیالات پر گفتگو کرتے تھے اور ہر شخص سے اس کے حال کے مطابق خطاب فرمایا کرتے تھے۔ آپ سے ایک شخص نے عرض کیا کہ ہم کو شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے بارے میں یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ انہوں نے اپنے متوسلین کے لئے ایک دن سکوت کا مقرر فرمایا تھا۔ اس عرض سے یہ غرض ہے کہ آپ ہمارے واسطے ایسا کر دیں۔ فرمایا: ان شاء اللّٰہ کل کریں گے۔ پھر آپ کرسی پر تشریف فرما ہوئے اور بغیر آواز اور حرف کے سِرّی طریقہ سے تکلم فرمایا۔ حاضرین میں سے ہر شخص نے اپنا حصہ لیا اور ہر ایک کہنے لگا کہ میرے دل میں شیخ نے یہ القاء فرمایا۔ شیخ فرماتے تھے ٹھیک کہتے ہو۔ جب منکرین میں سے کوئی شخص اس مقررہ دن میں حاضر ہوتا بے قرار ہو جاتا، کپڑے پھاڑنے لگتا، زمین پر لوٹنے لگتا اور کہتا خدا کی قسم یہ معمولی نہیں ہیں اور آپ کے سلسلے میں داخل ہو جاتا۔ (جامع کرامات اولیاء ص ۱۵۸)

ایسی ایک کرامت ہمارے دور کے ایک بزرگ جو حضرت مولانا محمد یار خان گڑھی شریف والے کے نام سے مشہور ہیں کی بھی معروف ہے گڑھی شریف خانپور کے مضافات میں ایک قصبہ ہے۔ یہ کرامت مولانا محمد یار خان گڑھی کے معاصر لوگوں کی زبانوں پر بھی عام ہے اور اسے مشہور عالم مفتی احمد یار خان نعیمی گجراتی نے بھی لکھا ہے۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ میں مفتی احمد یار خان نعیمیؒ کی مفید و معروف تصنیف مرآۃ شرح مشکوۃ کا مطالعہ کر رہا تھا۔ دوران مطالعہ یہ کرامت میرے سامنے آئی کہ علماء کبار کی ایک مجلس میں حضرت مولانا محمد یار

صاحب نے خاموشی کا وعظ فرمایا تو تمام حاضرین مجلس پر وجد کی حالت طاری ہوگئی۔ یہ دلوں پر حکومت کرنے کی واضح مثال ہے۔(مرأۃ شرح مشکوٰۃ)

(۱۱) کشف ہونا اور غیب کی خبریں بتلانا

امام سبکیؒ، امام مناویؒ اور امام نبہانیؒ نے فرمایا: اس کے کئی درجے ہیں اور ایسی کرامت کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ یاد رہے کہ جو چیز حواسِ خمسہ اور عقل کی رسائی سے ماوراء ہو وہ غیب ہے۔ آج کا انسان ہر طرح کی ترقی کے باوجود اتنی قدرت حاصل نہیں کرسکا کہ مستقبل میں جھانک سکے۔ اگر آج کا انسان مستقبل میں جھانک سکتا تو پینٹا گون میں ۱۱ ستمبر کا واقعہ رونما نہ ہوتا۔ لیکن اللہ کے بندوں کو اللہ تعالیٰ نے یہ طاقت عطا فرمائی ہے کہ وہ ماضی اور مستقبل کو اپنے سامنے دیکھتے ہیں۔ مولانا تھانوی کی کتاب سے ایک آدھ کرامت نقل کیئے دیتا ہوں۔ تفصیل درکار ہو تو "جامع کرامات اولیاء" اور تھانوی صاحب کی کتاب "جمال الاولیاء" کا مطالعہ کریں۔

مولانا تھانوی محمد بن ابی بکر الحکمی (جوامی تھے) کے حالات میں لکھتے ہیں کہ "شرجی کہتے ہیں کہ آپ کی کرامتوں میں یہ بھی ہے کہ دو بھائی بلادِ حرض سے موضع عواجہ میں پہنچے۔ جب عواجہ کے قریب آئے تو ان کے متعلق بہت سے غیر معمولی حالات اور کرامتیں سنیں مگر سچ نہ سمجھا اور یہ دونوں عواجہ میں مقیم رہے حتیٰ کہ یہ خبر ملی کہ ان کے باپ بیمار ہیں۔ انہوں نے اپنے شہر جانے کا ارادہ کیا تو اس وقت شیخ کے پاس آئے کہ آپ کا حقیقی حال معلوم کریں۔ جب ان کی خدمت میں پہنچے تو اپنے والد کے مرض کی اطلاع دی اور یہ بتایا کہ دونوں اسی وجہ سے اپنے شہر کا ارادہ کررہے ہیں۔ شیخ نے فرمایا: تم دونوں وہاں پہنچو گے تو وہ صحت یاب ہوچکے ہوں گے اور تمہارا شہر میں داخل ہونا رات کے اخیر میں ہوگا۔ تم اپنے والد کو صبح کے وقت وضو کرتے ہوئے پاؤ گے کہ ایک پاؤں دھوچکے ہوں گے اور دوسرا ابھی نہیں دھویا ہوگا۔ وہ دونوں شیخ سے رخصت ہوئے اور چلے گئے جب وہ وہاں پہنچے تو ان کا اپنے باپ کے پاس داخل ہونا اسی وقت ہوا جو وقت شیخ نے بتایا تھا اور اسی حالت پر ہوا جس پر شیخ نے کہا تھا۔ (جمال الاولیاء ص ۱۰۶۔۱۰۷)

مولانا تھانوی حضرت محمد بہاؤالدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ "شیخ علاؤالدین عطار کہتے ہیں کہ حضرت قدس اللہ سرہ بخارا میں تھے۔ ایک دن اپنے متوسلین سے صفتِ بصر پر گفتگو کررہے تھے۔ اثنائے کلام فرمایا کہ مولانا عارف اس وقت خوارزم سے سرائے کی طرف چلے ہیں اور سرائے کے راستہ میں فلاں جگہ تک پہنچ گئے ہیں۔ پھر کچھ دیر بعد فرمایا کہ مولانا عارف کے دل میں یہ خیال آرہا ہے کہ وہ سرائے نہ جائیں، اور وہ خوارزم کی طرف لوٹ گئے ہیں۔ حاضرین نے اس واقعہ کو بقید تاریخ لکھ لیا۔ پھر ایک مدت

کے بعد مولانا عارف خوارزم سے بخارا آئے تو جو کچھ شیخ قدس سرہ نے فرمایا تھا ان کو سنا دیا۔ انہوں نے کہا بعینہ یہی بات مجھے پیش آئی تھی۔ سب کو اس بات سے بہت زیادہ تعجب ہوا۔ (جمال الاولیاء ص ۱۴۰)

(۱۲) لمبی مدت تک کھائے پیئے بغیر زندہ رہنا

اس عنوان پر بھی امام سبکیؒ، امام مناویؒ اور امام نبہانیؒ نے کوئی واقعہ ذکر نہیں کیا۔ البتہ امام نبہانیؒ بہت آگے چل کر بعض اولیاء کی کرامات میں یہ بات ذکر کی کہ انہوں نے چالیس دن میں صرف انگور کا ایک دانہ کھایا۔ اس کے بعد امام نبہانیؒ نے اس امر پر دلائل پیش کئے ہیں کہ کھانے اور پینے کے بغیر زندگی گذاری جاسکتی ہے۔ یہ علمی بحث جامع کرامات اولیاء میں حضرت ابراہیم الیتمی کے حالات میں ملاحظہ فرمایئے۔ نیز اس کرامت کے حق ہونے پر ہم تبلیغی نصاب از مولانا محمد زکریا سہارنپوری کا ایک اقتباس پیش کر رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں'' ایک حدیث میں آیا ہے کہ دجال کے زمانے میں مومنوں کی غذا فرشتوں کی غذا ہوگی۔ یعنی تسبیح و تقدیس (سُبْحَانَ اللّٰہ وغیرہ الفاظ کا پڑھنا) کہ جس شخص کا کلام ان چیزوں کا پڑھنا ہوگا حق تعالیٰ جلّ شانہٗ اس سے بھوک کی مشقت زائل کر دیں گے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دنیا میں بغیر کھائے پیئے صرف اللہ کے ذکر پر گذارہ ممکن ہے۔ دجّال کے زمانہ میں عام مومنین کو یہ دولت حاصل ہوگی تو اس زمانے میں خواص کو اس حالت کا میسر ہو جانا کچھ مشکل نہیں۔ اس لئے جن بزرگوں سے اس قسم کے واقعات بکثرت منقول ہیں کہ معمولی غذا پر یا بلا غذا کے وہ کئی کئی دن گذار دیتے تھے ان میں کوئی وجہ انکار یا تکذیب نہیں۔
(تبلیغی نصاب ص ۴۰۴ رسالہ فضائل ذکر ص ۱۶۸)

تصرُّف　قدرت اور اختیار کا استعمال کرنا۔ مولانا تھانوی لکھتے ہیں: یہ تو جماعتِ اولیاء سے بہت منقول ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بارش ایک بزرگ کے پیچھے پیچھے چلا کرتی تھی اور متاخرین میں ایک بزرگ شیخ ابو العباس شاطر ہوئے ہیں، وہ بارش کو کچھ درہموں کے بدلہ فروخت کیا کرتے تھے اور ان سے اس باب میں اس قدر واقعات روایت ہیں کہ عقل کو انکار کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ (جمال الاولیاء ص ۲۴)

کیا اظہارِ کرامت ولی کے اختیار میں ہے؟

کرامات کی اقسام کا ذکر کرتے ہوئے مندرجہ بالا قسم (یعنی تصرف) کا ذکر اکثر علمائے کرام نے کیا ہے۔ اقسامِ کرامات کے بیان میں جن کتابوں سے راقم الحروف مدد حاصل کر رہا ہے اُن سب میں اس قسم کا ذکر موجود ہے، یعنی طبقات الشافعیۃ، از امام سبکی، الکواکب الدریۃ از امام مناوی اور'' جامع کراماتِ اولیاء از امام نبہانیؒ ''۔ تھانوی صاحب نے بھی یہ اقسام ذکر کی ہیں: چنانچہ متذکرہ عنوان'' تصرف'' اور اس کی مختصر وضاحت انہی کی کتاب کا اقتباس ہے۔

اس قسم (تصرّف) کے ضمن میں ہم اپنے قارئین کرام کی توجہ ایک اہم نکتے کی طرف مبذول کراتے ہیں۔ وہ یہ کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ولی کو کرامات کے اظہار میں اختیار نہیں ہوتا۔ وہ کہتے ہیں کہ ولی کے قصد اور ارادہ کے بغیر اس سے کوئی کرامت ظاہر ہو جاتی ہے۔ مثلاً اس کی کوئی دعا قبول ہو جاتی ہے یا کوئی شخص کسی ولی کی اہانت کرے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی فوری پکڑ ہو جائے۔ الغرض ان کے نزدیک ولی کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہوتا کہ وہ اپنے قصد اور تصرف (اختیار) سے کوئی خرقِ عادت فعل ظاہر کر سکے۔

محققین حضرات اس نظریے کو یکسر مسترد نہیں کرتے۔ وہ فرماتے ہیں: اس حوالے سے کرامت کی دو قسمیں ہیں (۱) اختیاری (۲) عدم اختیاری۔ یہ دونوں کرامتیں اولیاء کرام کے روحانی درجات، شریعتِ مطہرہ کی کامل مزاج شناسی اور موقع اور وقت کے لحاظ سے اُن کی دور اندیشی اور احتیاط پر موقوف ہیں۔ عام عبادت گذار بندوں کو کرامات کی عام اور معمولی اقسام سے نوازا جاتا ہے اور خواص کو تصرف اور اختیار سے بھی بہرہ ور کیا جاتا ہے۔ خود غور کیجیے کہ ایک بچے کے ہاتھ میں تو مصنوعی اور نقلی ریوالور یا بندوق دیتے ہیں اور محتاط و ماہر شخص کو کلاشنکوف سے لیکر ایٹم بم تک دے دیتے ہیں۔

تصرّف خاص اولیاء کو عطا ہوتا ہے مذکورۃ الصدر سطور سے معلوم ہوا کہ محققین کا نظریہ ہی حق ہے۔ بیشک خاص اولیائے کرام کو تصرّف عطا کیا جاتا ہے۔ غور کیجیے کہ بارش کا برسانا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے لیکن بشمول تھانوی صاحب متعدد علمائے کرام نے لکھا ہے کہ شیخ ابو العباس شاطر بارش کو فروخت کرتے تھے۔ یقیناً اُن کے اِس تصرف میں دینی، دنیوی، اُخروی اور عامۃ الناس کے ایمان ویقین کے حوالے سے کئی حکمتیں پنہاں ہوں گی۔ خدا جانے وہ بارش کی قیمت وصول کر کے کیسی کیسی دکھی انسانیت پر خرچ کرتے ہونگے۔

لفظ کُن سے تصرف

علمائے کرام فرماتے ہیں: بعض محتاط اہل اللہ حضرات کو حرف ''کُن'' (ہو جا) تک سے نواز دیا جاتا ہے۔ یعنی جب وہ کسی چیز کے بارے میں کہے ''کن'' (ہو جا) تو وہ ہو جاتی ہے۔ حضرت سیدنا غوث اعظم شیخ عبد القادر جیلانیؒ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی بعض کتابوں میں فرمایا ہے کہ اے بنی آدم میں ہی صرف معبود ہوں۔ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ میں جس چیز کو کہہ دیتا ہوں کہ ''ہو جا'' تو بس وہ ہو جاتی ہے، اور عدم سے وجود میں آ جاتی ہے۔ لہٰذا تم بھی میری خدمت واطاعت کرو! تا کہ میں تمہیں بھی ایسا ہی بنا دوں کہ جس شے کو کہہ دو کہ ''ہو جا'' تو وہ ہو جائے۔ (فتوح الغیب اُردو، ص ۳۰)

جن اہل اللہ کو اس مرتبہ علیا پر فائز کیا جاتا ہے وہ کس قدر احتیاط سے کام لیتے ہیں؟ اسے سطور ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔ امام عبد الوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں

کو اس دنیا میں حرف ''کن'' عطا فرماتا ہے تو کیا وہ اس حرف کن سے تصرف کرتے ہیں یا نہیں؟ اس کا جواب شیخ محی الدین ابن عربیؒ نے یہ دیا ہے کہ ادب کا تقاضہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ انہیں لفظ ''کن'' عطا فرماتا ہے تو وہ اس دنیا میں اس کے ساتھ تصرف نہیں کرتے۔ کیونکہ اس کا مقام دار آخرت ہے۔ لیکن یہ خاص بندے کن کی جگہ ''بسم اللہ'' کہتے ہیں، تا کہ جس طرح تکوین باطنا اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے ظاہراً بھی خاص ہو جائے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضور اکرم ﷺ تمام مخلوق میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا ادب کرنے والے ہیں، اس کے باوجود آپ ﷺ نے بعض غزوات میں لفظِ کن استعمال کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے غزوۂ تبوک میں صحابہؓ کے سامنے لفظِ کن کے ساتھ بیانِ جواز کے لئے تصرف کیا تھا، کیونکہ حضور اکرم ﷺ اظہارِ معجزات میں ماذون (مجاز) تھے اور یہ مسئلہ اسی قبیل سے ہے۔ پس حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''کن اباذر'' (ابوذر ہو جا) تو ابوذر ہو گئے، اور کھجور کی شاخ کو فرمایا کہ تلوار ہو تو وہ تلوار ہو گئی۔ (الیواقیت والجواہر عربی قدیم ج ۱ ص ۱۴۷)

وفات کے بعد تصرف

کرامات اور تصرف کا اظہار بدنی طاقت سے نہیں ہوتا بلکہ روحانی قوت سے ہوتا ہے۔ اس لئے بعض اولیاء کرام سے بعد از وفات بھی تصرف اور کرامات کا صدور ثابت ہے کیونکہ روح نہیں مرتی۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے فرمایا: جن سے زندگی میں امداد حاصل کی جاتی ہے ان سے وفات کے بعد بھی مدد حاصل کی جا سکتی ہے۔ مشائخ عظام میں سے ایک بزرگ نے کہا کہ میں نے چار حضرات کو دیکھا کہ وہ جس طرح اپنی زندگی میں تصرف کرتے تھے اسی طرح وہ اپنی قبروں میں بھی تصرف کرتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ ایک شیخ معروف کرخیؒ، دوسرے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور ان کے علاوہ دو حضرات کا نام لیا۔ انکا مقصد ان چار میں حصر کرنا نہیں تھا بلکہ اپنا مشاہدہ بیان کیا۔ سیدی احمد بن مرزوق نے کہا کہ ایک دن شیخ ابوالعباس حضرمی نے مجھ سے پوچھا کہ زندہ کی امداد زیادہ قوی ہے یا میت کی؟ میں نے کہا کہ ایک قوم کہتی ہے کہ زندہ کی امداد قوی ہے اور میں کہتا ہوں کہ میت کی امداد زیادہ قوی ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ ہاں۔ (اشعۃ اللمعات ج ۱ ص ۷۱۵ فارسی)

مولانا اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں: مقابر خاصہ میں برکات خاصہ ثابت ہیں۔ (نشر الطیب ص ۲۴۷)
اس جملہ کی توضیح تھانوی صاحب کی ایک اور تصنیف میں یوں مذکور ہے: وہ لکھتے ہیں'' جاننا چاہیے کہ بعض اولیاء اللہ سے بعد انتقال کے تصرفات وخوارق سرزد ہوتے ہیں اور یہ امر معنیً حدِ تواتر تک پہنچ گیا ہے۔'' (التکشف عن مہمات التصوف ص ۱۱)

قبر کی مٹی کھانے سے علم آ گیا

بعد از وفات اولیاء کرامؒ کے تصرّفات پر ایک آدھ واقعہ ملاحظہ فرمایئے! شیخ ابوعبداللہ محمد بن یوسف یمنی ضجاعیؒ ضریر (نابینا) کی کرامات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: آپ کی کرامتوں میں سے ایک یہ بھی ہے جو فقیہ کبیر احمد بن موسیٰ عجیلی سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے حضور اکرم ﷺ کی خواب میں زیارت کی کہ حضور اکرم ﷺ ان کو فرمارہے ہیں اگر تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ تم پر علم کھول دے تو ضریر کی قبر کی مٹی میں سے کچھ لو اور اس کو نہار منہ نگل جاؤ۔ تو اس فقیہ نے ایسا ہی کیا اور اس کی برکتیں ظاہر ہوگئیں۔

آپ کی کرامتوں میں یہ بھی ہے کہ جب مجاہد بادشاہ کے زمانے میں عرب میں پھوٹ پڑی اور روادی رل وغیرہ کی آبادیاں تباہ ہوگئیں تو فقہاء بنی زیاد کے پاس بہت سی کتابیں تھیں، ان کا منتقل کرانا ممکن نہ تھا اور نہ یہ ہوسکتا تھا کہ خود شہر سے نکل جائیں اور کتابیں چھوڑ جائیں۔ وہ ان کی وجہ سے بہت فکر مند تھے اتفاق سے شیخ طلحہ بن عیسیٰ ہتار وہاں پہنچے۔ ان حضرات کا یہ حال دیکھا تو ان کو بھی فکر ہوا۔ خواب میں حضور اکرم ﷺ کی زیارت ہوئی۔ فرمایا: فقہاء بنی زیاد سے کہہ دو کہ اپنی کتابوں کو ضریر کی قبر پر منتقل کر دیں، وہاں ان کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔ جب بیدار ہوئے تو سب کو اطلاع کر دی۔ ان حضرات نے جلدی جلدی سب کتابیں شیخ کی قبر پر منتقل کر دیں اور یہ کتابیں تقریباً ایک سال وہیں دھوپ اور بارش میں رہیں مگر کوئی نقصان نہیں ہوا اور نہ عرب وغیرہ میں سے کوئی ان میں سے کچھ لے سکا۔ (جمال الاولیاء از تھانوی ص ۱۰۵)

علامہ یوسف بن اسماعیل نبہانیؒ حضرت شیخ بن قیس حرانی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ شیخ سراج نے ان کے بارے میں کہا۔

وَهُوَ اَحَدُ الْمَشَائِخِ الَّذِيْنَ يَتَصَرَّفُوْنَ بَعْدَ مَوْتِهِمْ تَصَرُّفَ الْاَحْيَآءِ

یہ ان مشائخ میں سے ایک ہیں جو وفات کے بعد یوں تصرف کرتے ہیں جیسا کہ زندہ لوگ تصرف کرتے ہیں۔

(جامع کرامات اولیاء ج ۲ ص ۴۷)

حرام کھانے سے حفاظت

کرامت کی اقسام میں ایک قسم یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ بعض اولیائے کرام کو اللہ تعالیٰ ناجائز طریقوں سے حاصل کردہ مال کو اور غذا کو استعمال کرنے سے محفوظ رکھتا ہے۔ حضرت حارث محاسبی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں منقول ہے کہ حرام کھانے سے ایک خاص قسم کی بو اُن کی ناک کی طرف بلند ہوتی تھی تو وہ اس سے ہاتھ کھینچ لیتے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ اُن کی ایک رگ پھڑکتی تھی تو انہیں معلوم ہو جاتا تھا کہ ان کے سامنے رکھا ہوا کھانا حلال نہیں ہے۔ شیخ ابوالعباس مرسی سے بھی اسی طرح منقول ہے۔ (جامع کرامات

اولیاء عربی ص ۴۲، جمال الاولیاء ص ۲۴)

حضرت شیخ احمد بن عمر الانصاری ابوالعباس المرسیؒ کے حالات میں لکھا ہے کہ سلطان یعقوب نے ایک مرغی ذبح کرنے کا حکم کیا اور دوسری مرغی کا گلا دبا کر مار دیا پھر دونوں کو الگ الگ پکوا کر آپ کے سامنے رکھا اور خود دسترخوان پر آ بیٹھا تا کہ آپ کے ساتھ کھائے۔ حضرت نے خادم سے گلا دبائی ہوئی مرغی کے متعلق فرمایا اسے اٹھالو "هٰذِهٖ جِيفَةٌ" یہ مردار ہے، اور دوسری کے بارے میں فرمایا: اگر اس میں حرام شوربے کی آمیزش نہ ہوتی تو ہم اس میں سے کھاتے۔ (طبقات الکبریٰ للشعرانی)

امام مناویؒ فرماتے ہیں: ایک شخص نے آپ کے سامنے بغرض امتحان مشکوک طعام رکھا تو آپ نے رد کر دیا اور فرمایا: اگر محاسبیؒ مشتبہ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتے تو ان کی انگلیوں کی ایک رگ جنبش کرنے لگتی تو ہماری ساٹھ (۶۰) رگیں پھڑکنے لگ جاتی ہیں۔ (الکواکب الدریہ)

حضرت زید بن علی شاوری یمنی کے بارے میں مرقوم ہے کہ ان کے پاس کوئی نذرانے کے دینار اور درہم لے آتا تو آپ ان میں سے حلال اور حرام کو الگ الگ کر دیتے حتیٰ کہ لانے والا شخص اعتراف کر لیتا۔ (جامع کراماتِ اولیاء عربی ج ۲ ص ۷۰)

حجابات کے باوجود مقاماتِ بعید کو دیکھ لینا

کرامت کی یہ قسم بے شمار اولیائے کرامؒ سے منقول ہے۔ امام ابواسحاق شیرازیؒ کے بارے میں نقل ہے کہ وہ کعبہ معظمہ کو بغداد میں دیکھ لیا کرتے تھے۔ (جمال الاولیاء ص ۲۴)

حضرت حیات بن قیس الحرانیؒ کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ حران میں ایک مسجد کی بنیاد رکھی گئی۔ حضرت کو اس کے قبلہ نصب کرنے کے لئے بلایا گیا۔ آپ نے محراب کی سمت مقرر کی تو انجینئر نے کہا قبلہ یہاں نہیں ہے اور زوردار مخالفت کی۔ آپ نے فرمایا: یہ دیکھ کعبہ یہ رہا۔ جب اس نے سر کی آنکھوں سے کعبہ کا مشاہدہ کیا تو گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ (جامع کرامات اولیاء ج ۲ ص ۴۷)

مولانا اشرف علی تھانوی نے حضرت شیخ محمد بہاؤالدین نقشبندیؒ کے حالات میں ایسی متعدد حیرت انگیز کرامات بیان کی ہیں۔ بعض کرامات کا تذکرہ ہم "کشف ہونا اور غیب کی خبریں بتلانا" کے عنوان میں ذکر کر چکے ہیں۔

غیر معمولی ہیبت کا طاری ہونا

اولیائے کرام کی ذواتِ مقدسہ میں جلال خداوندی کی ہیبت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے کرّ وفر والے سلاطین ان کے سامنے خائف نظر آتے ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں کہ "ہیبت" جو محض

بزرگوں میں ہوتی ہے کہ صرف دیکھنے سے ہی انسان مرجاتا ہے۔ جیسا کہ بایزید بسطامیؒ کو ایک شخص دیکھ کر مر گیا تھا یا یہ کہ ان کے سامنے دنگ رہ جائے، یا ایسی بات کا اقرار کرے جس کے متعلق غالب گمان یہ ہو کہ وہ ان سے چھپا رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی اور بھی صورتیں ہیں غرضیکہ یہ قسم بہت ہوتی ہے۔ (جمال الاولیاء ص ۲۵،۲۴)

مخالفین کی شرارتوں سے محفوظ رہنا

اولیائے کرام کی شان یہ ہے کہ ان پر نہ کوئی خوف ہوتا ہے اور نہ غم، تاہم اس عنوان کے تحت ایسی غیر معمولی حمایتِ الٰہی بیان کرنا مقصود ہے کہ کوئی شخص ان کے ساتھ ظلم وزیادتی کرنا چاہے یا چال چلنا چاہے تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کے تمام حربے فیل کر دیتا ہے۔ تھانوی صاحب لکھتے ہیں: ان کے ساتھ جو شخص برائی کے ساتھ پیش آئے تو اللہ تعالیٰ اس کی بدی پر ان کی طرف سے کفایت فرماتا اور اس بدی کو بھلائی سے بدل دیتا ہے جیسے کہ امام شافعیؒ کو ہارون رشید کے ساتھ پیش آیا تھا۔ (جمال الاولیاء ص ۲۵)

امام نبھانیؒ نے بھی اتنا ہی لکھا ہے۔

مختلف شکلیں بدلنا

جس طرح ملائکہ یا جنوں کو مختلف شکلیں بدلنے پر قدرت حاصل ہے اسی طرح اولیاء کرام کی روح جب قوی ہو جائے تو انہیں بھی یہ قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔ امام نبھانیؒ لکھتے ہیں: یہی وہ قوت ہے جس کا نام صوفیہ حضرات عالم مثال رکھتے ہیں اور یہ حضرات عالم اجسام اور عالم ارواح کے درمیان ایک درمیانی عالم ثابت کرتے ہیں جس کا نام انہوں نے عالم مثال رکھا ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ وہ عالم، عالم اجسام سے زیادہ لطیف اور عالم ارواح سے زیادہ کثیف ہے اور اسی پر روح کے جسمانی شکل اختیار کرنے اور اس کے مختلف صورتوں میں ظاہر ہونے کی بنا قائم کی ہے اور اس کو حق تعالیٰ کے اس ارشاد سے استنباط کیا ہے "فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا" (تو ان کے واسطے جبریل ایک معتدل انسان بن گئے۔) وہ واقعہ بھی اسی قبیل سے ہے جو قصیب البان موصلی سے منقول ہے۔ یہ حضرت ابدال تھے۔ کسی شخص نے جب ان کو نماز پڑھتے ہوئے نہ دیکھا تو نماز نہ پڑھنے کی تہمت لگائی اور سختی سے اعتراض کیا۔ آپ فوراً اس کے سامنے مختلف صورتوں میں منتقل ہو گئے اور پوچھا تم نے کونسی صورت میں مجھے نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔ کرامتوں کی اس قسم میں بزرگوں کے بہت واقعات ہیں۔ متاخرین میں سے بعض کے لئے جو واقعات ہوئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ کسی شخص نے ایک بوڑھے درویش کو قاہرہ کے مدرسہ سیوفیہ میں ترتیب کے خلاف وضو کرتے دیکھا تو پوچھا کہ حضرت آپ ترتیب کے خلاف وضو کرتے ہیں۔ فرمایا میں نے تو ترتیب کے موافق ہی وضو کیا ہے مگر تم دیکھتے ہی نہیں اگر دیکھ سکتے تو ایسے دیکھتے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کعبہ مکرمہ دکھا دیا، پھر اسے مکہ معظمہ لے گئے اور اس شخص نے خود

کو مکہ معظمہ میں پایا اور کئی سال وہیں رہا۔ حکایت لمبی ہے جس کا بیان طویل ہو جائے گا۔

(جامع کرامات اولیاء ج ۱ ص ۴۳، جمال الاولیاء ص ۲۵)

ابن بطوطہ نے اپنی ''رحلۃ'' میں لکھا ہے کہ ایک بزرگ جمال الدین ساویؒ جو طائفہ قلندریہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی کرامات میں سے ہے کہ وہ شہر دمیاط کے ایک قبرستان میں مقیم تھے شہر میں ایک قاضی تھے جو ابن العمید کے نام سے مشہور تھے۔ ایک مرتبہ یہ قاضی صاحب کسی امیر شہر کے جنازے میں شامل ہوئے۔ انہوں نے قبرستان میں شیخ جمال الدین ساویؒ کو دیکھا تو کہا کہ اچھا تم وہ بدعتی شیخ ہو؟ شیخ نے کہا اور تم وہ جاہل قاضی ہو جو سواری (جانور) پر سوار ہو کر قبروں کو روندتا پھرتا ہے اور تم جانتے ہو کہ انسان کی حرمت مرنے کے بعد بھی ایسی ہی ہے جیسے زندگی میں۔ قاضی نے کہا میرے اس فعل سے بڑھ کر آپ کا ڈاڑھی منڈانا برا فعل ہے۔ شیخ نے کہا تو یہ تم مجھے کہہ رہے ہو! پھر شیخ نے ایک چیخ ماری اور سر اوپر اٹھایا تو ان کے چہرے پر بہت لمبی اور کالی سیاہ داڑھی تھی۔ اس پر قاضی اور دیگر تمام لوگ دنگ رہ گئے۔ پھر دوسری تیسری مرتبہ چیخ ماری تو بغیر داڑھی کے پہلی حالت میں آ گئے۔ قاضی صاحب نے آپ کے ہاتھ چومے اور ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، شیخ کے لئے مخصوص حجرہ تعمیر کروایا اور تا حیات اُن کی صحبت میں رہے۔ (جامع کرامات اولیاء ج ۲ ص ۹ عربی)

اُوپر حضرت قضیب البان کے مختلف شکلوں میں ہونے کا کچھ تذکرہ آ چکا ہے تاہم یہاں ان کی بعض دیگر کرامات پیش کر کے ان کے بارے میں اکابر اولیائے کرام کا نظریہ پیش کیا جاتا ہے۔ حضرت قضیب البان ''موصل کے رہنے والے تھے۔ موصل کے قاضی بیان کرتے ہیں کہ میں اُن کے بارے میں سوء ظن رکھتا تھا حالانکہ ان کی کرامات بہت مشہور تھیں، اور میں اپنے دل میں یہ ارادہ رکھتا تھا کہ اُنہیں بزور طاقت شہر موصل سے نکال دوں گا۔ پس ایک دن میں ایک تنگ گلی میں جا رہا تھا کہ سامنے سے شیخ قضیب البان آ رہے تھے۔ وہاں میرے اور ان کے سوا اور کوئی شخص نہ تھا۔ میں نے دل میں خیال کیا کہ اگر یہاں کوئی اور شخص ہوتا تو میں اس کو حکم کرتا کہ اسے قابو کر لے۔ شیخ چند قدم چلے تو ایک کُردی شخص کی ہیئت میں ہو گئے پھر بدوی شکل میں نمودار ہو گئے، پھر چند قدم چلے تو ایک فقیر کی وضع قطع میں ظاہر ہو گئے۔ پھر فرمایا: اے قاضی! یہ چار شکلیں ہوئیں۔ ان میں سے اصلی قضیب البان کو تم پہچانتے ہو کہ بزور طاقت اسے موصل سے نکالو۔ قاضی کہتے ہیں: مجھے اپنے آپ پر قابو نہ رہا۔ میں فوراً اُترا اور ان کے ہاتھ اور پیر چومے اور معافی چاہی۔

شیخ ابوالحسن علی قرشیؒ بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت قضیب البان کے گھر میں گیا تو اچانک دیکھا کہ پورا کمرہ ان کے جسم سے پُر تھا۔ میں یہ خلاف عادت فعل دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا اور واپس چلا گیا۔ پھر واپس آیا تو کمرے کے ایک کونے میں چڑیا کی مانند نظر آئے، میں دوبارہ واپس ہو گیا۔ پھر تیسری مرتبہ داخل ہوا تو اصل حالت پر تھے۔ میں نے عرض کیا: یا سیدیؒ! یہ پہلی اور دوسری حالت کیا تھی؟ فرمایا کیا تم نے وہ دونوں حالتیں

دیکھ لیں؟ میں نے کہا ہاں: فرمایا: تم ضرور نابینا ہو جاؤ گے۔ سو واقعی شیخ ابو الحسن قرشیؒ وفات سے پہلے نابینا ہو گئے تھے۔

حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت قضیب البان کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: وہ ولی اللہ تھے، مقرب تھے، صاحب حال تھے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک قدم صدق (بلند مرتبہ پر) تھے۔ کہا گیا: ہم نے انہیں نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔ فرمایا وہ اس ہیئت اور صورت میں نماز پڑھتے ہیں جسے تم نہیں دیکھ سکتے۔ میں نے انہیں دیکھا کہ وہ موصل میں نماز پڑھتے ہوں یا روئے زمین کے کسی مقام پر ان کا سجدہ باب کعبہ پر ہوتا ہے۔

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اولیاء کرام کے مختلف صورتوں میں متشکل، ہونے پر مستقل ایک رسالہ تصنیف فرمایا ہے جس کا نام "المنجلی فی تطور الولی" ہے۔ یہ رسالہ امام سیوطیؒ کی مشہور ترین تصنیف "الحاوی للفتاوی" میں شامل ہے۔ امام یوسف بن اسماعیل نبھانیؒ نے بھی یہ رسالہ مکمل "جامع کرامات اولیاء" جلد ثانی میں حضرت قضیب البانؒ کے ترجمہ کے بعد درج فرمایا ہے۔ اہل علم حضرات کے لئے یہ رسالہ لائق مطالعہ ہے۔
(جامع کرامات اولیاء ج ۲ ص ۱۹، ۲۰ عربی)

خزائن ارض پر مطلع ہونا

علمائے کرام نے کرامات کی ایک قسم یہ بھی بیان کی ہے کہ اولیاء اللہ کو یہ قوت عطا ہوتی ہے کہ وہ زمین کی اتھاہ گہرائیوں میں پوشیدہ خزانوں کو دیکھ لیتے ہیں۔ راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ جب اولیائے کرام کی آنکھوں میں خدائی طاقت آجاتی ہے تو پھر اُن کی نگاہوں سے کیا چیز چھپی رہ سکتی ہے؟ بہر حال "جمال الاولیاء" میں مذکور ہے کہ حق تعالیٰ ان حضرات کو زمین کے ذخیروں پر مطلع کر دیتا ہے جیسے کہ حضرت ابو تراب رحمۃ اللہ علیہ کے واقعہ میں ہے کہ جب انہوں نے زمین پر پتھر مارا تو زمین میں سے میٹھے پانی کا ایک چشمہ برآمد ہو گیا۔ امام سبکی فرماتے ہیں کہ اس واقعہ میں آئندہ واقعہ کی طرح دو کرامتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا پانی کو غیر جگہ میں پیدا فرما دینا اور زمین کا اُن پتھر مارنے والے بزرگ کی فرمانبرداری کرنا۔ ایک اور بزرگ سے منقول ہے کہ حج کے راستہ میں (انہیں) پیاس لگی تو کسی کے پاس سے پانی نہ ملا۔ ایک درویش کو دیکھا کہ اس نے بھالے وار لاٹھی زمین میں گاڑ رکھی ہے اور اس کے نیچے سے پانی اُبل رہا ہے۔ انہوں نے اس سے اپنا مشکیزہ بھی بھر لیا اور دوسرے حاجیوں کو بھی بتا دیا وہ بھی آئے اور اپنے اپنے برتن بھر کر لے گئے۔ (جمال الاولیاء ص ۲۵، ۲۶)

قلیل مدت میں کثیر کام کر لینا

بندہ جب اطاعت الٰہی پر کمربستہ ہو جائے تو قدرت کی طرف سے اس کی ہر ہر حرکت میں برکت رکھ دی

جاتی ہے۔ حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سید الانبیاء حضرت محمد ﷺ سے خادم مانگا تو حضور اکرم ﷺ نے ان کو حمد، تسبیح اور تکبیر پڑھنے کا حکم فرمایا۔ اس میں یہ راز تھا کہ جب تم ذکرِ الٰہی کرو گی تو تمہارے وقت میں اور تمہاری حرکات وسکنات میں برکت رکھ دی جائے گی۔ اسلاف کرام کے دیگر امور کس سُرعت یا برکت کے حامل ہوں گے، یہ پہلو ہم تک نہ پہنچا، البتہ اُن کی کثیر تعداد میں تصانیف ہم تک پہنچی ہیں۔ اب جب ہم ان تصانیف پر غور کرتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ خرق عادت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ امام سبکیؒ، امام شعرانیؒ، امام مناویؒ اور امام نبہانیؒ لکھتے ہیں کہ جب ان کی تصانیف کو ان کے علم میں مشغول ہونے کے وقت سے وفات تک کے زمانے پر تقسیم کیا گیا تو ایسی ثابت ہوئیں کہ وہ اتنے وقت میں پوری نقل بھی نہیں ہو سکتیں چہ جائیکہ تصنیف یہ کرامت بھی وسعتِ زمانہ کی ایک قسم ہے۔ جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ امام شافعیؒ کی عمر ان کی تصنیفات کے دسویں حصہ کے لئے بھی کافی نہیں ہو سکتی، باوجود اس کے کہ ان سے تلاوت قرآن مجید بھی بہت زیادہ ثابت ہے کہ ہر روز غور وفکر کے ساتھ ایک قرآن مجید ختم فرماتے اور رمضان شریف میں تو ہر روز ایسے ہی غور وفکر کے ساتھ دو دو قرآن مجید ختم فرماتے تھے اور باوجود درس وتلاوت فتویٰ نویسی، ذکر وفکر اور ان بیماریوں کے جو آپ کو پیش آتی رہتی تھیں۔ یہاں تک کہ آپ کبھی بھی ایک دو یا زیادہ بیماریوں سے خالی نہیں رہے بلکہ بعض دفعہ تو تیس تیس بیماریاں جمع ہو جاتی تھیں۔ ایسے ہی امام الحرمین جوینی ہیں کہ آپ کی عمر اور تصانیف کا حساب لگایا گیا تو آپ کی عمر ان کے لئے کافی نہیں پائی گئی، باوجود اس فیض کے جو طلبہ کو پہنچاتے تھے اور باوجود ان مجالسِ وعظ کے جن میں آپؒ وعظ فرماتے تھے۔ بعض بزرگوں نے تو ایک ایک دن میں قرآن شریف آٹھ آٹھ مرتبہ ختم کیا ہے۔ ایسے واقعات اور بھی بہت ہیں۔ (جمال الاولیاء ص ۲۶)

زہریلی اور مضر اشیاء کا اثر انداز نہ ہونا

ایسے واقعات بے شمار ہیں کہ بزرگوں نے بسم اللہ پڑھ کر زہر پی لیا تو ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ایک بزرگ کے بارے میں لکھا ہے کہ ان سے کسی بادشاہ نے کہا کہ تم مجھے کوئی کرامت دکھاؤ! ورنہ میں تمام درویشوں کو ہلاک کر دوں گا۔ بادشاہ کے قریب کچھ اونٹ کی مینگنیاں پڑی تھیں۔ آپ نے فرمایا دیکھو! دیکھا تو وہ سونے کی تھیں۔ نیز بادشاہ کے پاس ایک خالی پیالہ رکھا تھا آپ نے لیا اور اوپر کو اُچھال دیا پھر واپس کیا اور پانی سے بھرا ہوا اُلٹا کر کے دیدیا مگر اس میں سے ایک قطرہ تک نہیں گرا۔ بادشاہ نے کہا یہ تو جادو ہے۔ پھر آپ نے بہت سی آگ روشن کرائی اور اشعار پڑھنے کا حکم دیا۔ جب لوگوں پر وجد طاری ہو گیا تو یہ بزرگ اور سب درویش آگ میں چلے گئے، پھر نکلے اور بادشاہ کے ایک چھوٹے سے بچے کو لے کر آگ میں گھس گئے اور گھنٹہ بھر تک غائب

رہے۔قریب تھا کہ بادشاہ بھی بچہ کی وجہ سے جل جاتا مگر کچھ دیر بعد بچہ کو نکال لائے تو اس کے ایک ہاتھ میں سیب اور دوسرے ہاتھ میں انار تھا۔اس کے باپ نے پوچھا کہ تو کہاں رہا؟ بچہ نے جواب دیا کہ باغ میں تھا۔ بادشاہ کے ہم نشینوں نے کہا کہ یہ تو کوئی شعبدہ ہے، حقیقت نہیں ہے۔اس پر بادشاہ نے ان سے کہا کہ اگر تم زہر کے اس پیالے کو پی جاؤ تو میں تم کو سچا مان لوں گا۔آپ نے اس کو اٹھا کر پی لیا۔آپ کے تمام کپڑے جسم کے اوپر ریزہ ریزہ ہو گئے۔لوگوں نے آپ کے جسم پر اور کپڑے ڈال دیے تو وہ بھی ریزہ ریزہ ہو گئے۔اسی طرح کئی بار کیا گیا، حتیٰ کہ کپڑے جسم پر ٹھہر گئے اور جو پسینہ آیا ہوا تھا خشک ہو گیا مگر اس زہر نے جسم پر کوئی اثر نہ کیا۔ (جمال الاولیاء،۲۶،۲۷)

ملائکہ اور ارواح انبیاء علیہم السلام کا مشاہدہ کرنا

کرامت کی متذکرہ بالا اقسام جن کتب سے نقل کی گئی ہیں، ان میں پچیس (۲۵) اقسام گنوائی گئی ہیں۔ ہم نے اُن میں سے دو قسموں کو حذف کر دیا ہے۔ایک ''حیوانات کا تابعداری کرنا'' اور دوسری ''زیادہ کھانے پر قادر ہونا'' اِن میں سے پہلی کا ذکر تو ''جمادات، نباتات اور حیوانات کا کلام کرنا'' کے عنوان میں ہو گیا اور دوسری کے ذکر کی چنداں ضرورت نہیں ہے، اس لئے کہ بہت زیادہ تو وہ شخص بھی کھا جاتا ہے جس کے پاس جن ہو۔

یہاں ہم کرامت کی ایک عظیم الشان قسم کا ذکر کر رہے ہیں اور وہ ہے کسی کامل انسان کا انبیائے کرام علیہم السلام، اولیائے عظام رحمہم اللہ تعالیٰ کی ارواح کو دیکھنا اور ملائکہ کے وجود کا مشاہدہ کرنا۔ صوفیاء عظام کی اکثریت اس کرامت سے بہرہ ور ہوتی ہے۔امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ''صوفیاء جو راہِ الٰہی کے سالکین ہیں ان کے حالات اور ان کی سیرت تمام مخلوق کے حالات اور ان کی سیرتوں سے بہتر ہے۔ان کا طریقہ تمام طریقوں سے بہتر ہے اور ان کا اخلاق جملہ مخلوق کے اخلاق سے پاکیزہ تر ہے۔ بلکہ اگر تمام عقل مندوں کی عقلوں کو اور حکماء (داناؤں) کی حکمت کو جمع کیا جائے اور اسرار شریعت سے واقف علماء کرام جمع ہو جائیں اور اس امر میں کوشش کریں کہ صوفیہ کرام کی سیرت اور اخلاق میں ترمیم کر کے اس کی جگہ کوئی بہتر چیز لے آئیں تو وہ اس میں کامیاب نہیں ہوں گے۔پس بلاشبہ صوفیہ عظام کی تمام حرکات و سکنات ظاہری ہوں یا باطنی سب کی سب مشکوٰۃِ نبوت کے نور سے ماخوذ ہیں اور روئے زمین پر نور نبوت کے علاوہ اور کوئی نور نہیں ہے جس سے روشنی حاصل کی جائے حتیٰ کہ یہ حضرات عالم بیداری میں ملائکہ (فرشتوں) اور انبیاء کرام علیہم السلام کی روحوں کا مشاہدہ کرتے ہیں، ان کی آواز سنتے ہیں اور ان سے فوائد حاصل کرتے ہیں۔پھر صورتوں کے مشاہدہ کے بعد وہ مزید ترقی کرتے ہیں اور ایسے درجات عالیہ پر پہنچتے ہیں جہاں بیان کی زبان گنگ اور تنگ ہے۔ (الحاوی، ج ۲، ص ۲۵۷)

انسان اگر مکمل طور پر متبع سنت ہو تو فرشتے اس کے ساتھ مصافحہ اور سلام کرتے ہیں۔ حضرت مطرف بیان کرتے ہیں کہ انہیں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ انہیں سلام پیش کیا جاتا تھا پھر انہوں نے (بواسیر کی بیماری میں) داغ لگوایا تو وہ سلام بند ہو گیا۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: حضرت عمران بن حصین کو بواسیر تھی، وہ اس کی اذیت پر صبر کرتے رہے تو فرشتے انہیں سلام کرتے تھے۔ پھر انہوں نے داغ لگوایا تو فرشتوں کا سلام منقطع ہو گیا۔ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں: بیماری میں داغ لگوانا حرام نہیں ہے، صرف توکل کے منافی ہے۔ حضرت عمران بن حصین نے شدتِ تکلیف کے باعث صرف منافی توکل فعل کا ارتکاب کیا تو فرشتے ان سے دور ہو گئے۔ (پھر اس شخص کا کیا پوچھنا جو بہت سے حرام امور کا مرتکب ہونے کے باوجود کرامات کا خواہاں رہتا ہے؟) امام ابن سعدؒ نے حضرت قتادہؒ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمران بن حصین کے ساتھ فرشتے مصافحہ بھی کرتے تھے۔ داغ لگوانے پر فرشتوں کا آنا موقوف ہو گیا۔ پھر انہوں نے یہ علاج ترک کر دیا تو دوبارہ فرشتے آنے لگے۔

ایک انصاریؓ شخص نے حضرت جبریل علیہ السلام کو دیکھا، حضرت تمیمؓ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو دیکھا، حارثہ بن نعمانؓ نے دیکھا، حضرت ابن عباسؓ نے دیکھا، سیدہ عائشہؓ نے دیکھا۔ حدیث جبریل میں ہے کہ بہت سے صحابہ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو دیکھا۔ امام قرطبیؒ فرماتے ہیں: ان احادیث میں اولیاء کرام کی کرامات کا اثبات ہے۔ (الحاوی اللفتاوی ج ۲ موضحاً وملتقطاً ص ۲۵۶ ومابعدھا)

اب تک اہل اللہ کو ملائکہ کے ساتھ ملاقات اور مصافحہ کرنے کا اعزاز حاصل ہوتا ہے۔ بعض اولیاء کرام شبِ قدر حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ مصافحہ اور سلام کرتے ہیں۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ۔

بیداری میں زیارت مصطفےٰ ﷺ کرنا

اولیاء کاملین کی کثیر تعداد کو عالم خواب میں نبی کریم ﷺ کی زیارت ہوتی ہے، پھر بیداری میں وہ اس شرف سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں" رسول اللہ ﷺ کے وصال فرمانے کے بعد اس امت کے ایک سے زیادہ کاملین نے آپ کی زیارت کی ہے اور آپ سے بیداری میں فیض حاصل کیا ہے۔ شیخ سراج الدین بن الملقنؒ نے طبقات الاولیاء میں لکھا ہے کہ شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ العزیزؒ نے بیان کیا ہے کہ میں نے ظہر سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی۔ آپ نے فرمایا: اے میرے بیٹے! تم خطاب کیوں نہیں کرتے؟ میں نے کہا یا رسول اللہ (ﷺ) میں عجمی ہوں، فصحا بغداد کے سامنے کیسے کلام کروں؟ آپ نے فرمایا اپنا منہ کھولو! میں نے اپنا منہ کھولا تو آپ ﷺ نے اس میں سات مرتبہ لعاب دہن ڈالا، اور فرمایا لوگوں سے کلام کرو اور انہیں حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اپنے رب کے دین کی دعوت دو۔ پھر میں ظہر کی نماز

پڑھ کر لوگوں کے سامنے بیٹھ گیا میرے پاس بہت مخلوق آئی اور مجھ پر کلام ملتبس (خلط ملط) ہوگیا، پھر میں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی زیارت کی جو میرے سامنے مجلس میں کھڑے ہوئے تھے۔ آپ نے مجھ سے فرمایا: اے میرے بیٹے! کلام کیوں نہیں کرتے؟ میں نے کہا اے میرے والد گرامی! مجھ پر کلام ملتبس ہوگیا۔ آپ نے فرمایا اپنا منہ کھولو میں نے منہ کھولا! تو آپ نے میرے منہ میں چھ مرتبہ لعاب دہن ڈالا۔ میں نے کہا: آپ نے سات مرتبہ کیوں نہیں ڈالا؟ حضرت علی نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کی وجہ سے۔ پھر وہ مجھ سے غائب ہوگئے امام عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: (روح المعانی ج ۲۲ ص ۳۵)

کہ ائمہ اور مجتہدین بیداری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کرتے ہیں اور کتاب وسنت سے جو کچھ انہوں نے سمجھا ہوتا ہے اس کو لکھنے سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرتے ہیں، اور بہت اولیاء جو مجتہدین سے کم درجہ کے ہیں ان کو آپ سے بیداری میں ملاقات کا شرف حاصل ہے۔ جیسے شیخ عبدالرحیم قناوی، شیخ ابو مدین مغربی، شیخ ابوالحسن شاذلی، شیخ ابوالعباس المرسی اور بھی بہت سے ہیں۔ میں نے شیخ جلال الدین سیوطی کے ہاتھ سے لکھا ہوا ایک خط پڑھا ہے، انہوں نے اس شخص کو جواب لکھا ہے جو سلطان کے پاس ان سے سفارش کروانا چاہتا تھا۔ انہوں نے لکھا اے میرے بھائی! میں اس وقت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیداری میں پچھتر مرتبہ (۷۵) بالمشافہ ملاقات کر چکا ہوں۔ اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ حکام کے پاس جانے سے میں اس نعمت سے محروم ہو جاؤں گا تو میں سلطان سے تمہاری سفارش ضرور کر دیتا۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا خادم ہوں اور جن احادیث کو محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے، ان کی صحت (اور عدم صحت) معلوم کرنے کے لئے مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرنے کی حاجت ہوتی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے میرے بھائی کہ یہ نفع تمہارے نفع پر مقدم ہے۔ (میزان الکبری ج ۱ ص ۵۴)

علامہ انور شاہ کشمیری لکھتے ہیں۔

علامہ شعرانی نے یہ بھی لکھا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہے اور آٹھ ساتھیوں کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے صحیح بخاری شریف پڑھی ہے، ان میں سے ایک حنفی تھا۔ جب صحیح بخاری شریف ختم ہوگئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے دعا فرمائی۔ لہٰذا بیداری میں زیارت متحقق ہے اور اس کا انکار کرنا جہالت ہے۔ (فیض الباری ج ۱ ص ۲۰۴)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بیداری میں دیکھنے کا ثبوت

محدثین کرام نے بیداری میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت پر متعدد احادیث بیان فرمائی ہیں۔ ان میں سے صرف ایک حدیث یہاں درج کی جارہی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَنْ رَّانِیْ فِی الْمَنَامِ فَسَیَرَانِیْ فِی الْیَقْظَۃِ　جس شخص نے مجھے خواب میں دیکھا تو عنقریب وہ مجھ کو بیداری میں دیکھے گا۔

(بخاری شریف رقم الحدیث ۶۹۹۳)

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس حدیث شریف کے کئی مطالب ہیں۔

۱) اس سے مراد نبی کریم ﷺ کے زمانے کے لوگ ہیں، اور اس کا معنی یہ ہے کہ جس نے آپ ﷺ کو نیند میں دیکھا اور اس نے ہجرت نہیں کی، اللہ تعالیٰ اس کو توفیق دے گا اور وہ آپ کو بیداری میں دیکھے گا۔

۲) جس نے آپ ﷺ کو نیند میں دیکھا وہ عنقریب بیداری میں آپ کی روئیت کی تصدیق اور صحت کو دیکھے گا۔

۳) جس نے آپ ﷺ کو نیند میں دیکھا وہ آپ کو آخرت میں خصوصیت کے ساتھ دیکھے گا اور اس کو آپ کا قرب حاصل ہوگا۔

۴) امام ابن ابی جمرہؒ اور ایک جماعت نے اس حدیث کو اس معنی پر محمول کیا ہے کہ جس نے آپ کو نیند میں دیکھا وہ دنیا میں آپ کو حقیقتاً دیکھ لے گا اور آپ سے کلام کرے گا اور اس کو اولیاء اللہ کی کرامات سے ایک کرامت شمار کیا گیا ہے۔ صالحین کی ایک جماعت سے منقول ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو نیند میں دیکھا، پھر اس کے بعد انہوں نے آپ کو بیداری میں دیکھا۔ جن چیزوں کے متعلق وہ خوف زدہ تھے ان کے متعلق آپ سے سوال کیے اور آپ نے ان کا خوف دور کرنے کی طرف رہنمائی فرمائی۔

علامہ ابن حجرؒ نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ پھر لازم آئے گا کہ بعد کے یہ اولیاء اللہ صحابہ ہو جائیں اور صحابی ہونے کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے (علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں) میں کہتا ہوں کہ صحابی ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کو اس عالم دنیا میں وصال سے پہلے دیکھے اور جس نے آپ ﷺ کے وصال فرمانے کے بعد آپ ﷺ کو عالم برزخ میں دیکھا اس دیکھنے سے اس کا صحابی ہونا ثابت نہیں ہوگا۔ علامہ ابن حجر کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ کئی لوگوں نے نیند میں آپ ﷺ کو دیکھا اور پھر بیداری میں انہوں نے آپ ﷺ کو نہیں دیکھا، اور اگر اس حدیث کا یہ معنی ہو تو خواب میں آپ ﷺ کی زیارت کرنے والے ہر آدمی کو بیداری میں آپ ﷺ کی زیارت ہونی چاہیے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خواص کو تو زندگی میں کئی بار آپ ﷺ کی زیارت ہوتی ہے اور عوام کو اس وقت آپ ﷺ کی زیارت ہوگی جب ان کی روح ان کے جسم سے نکل رہی ہوگی۔

بیداری میں آپ ﷺ کی زیارت کے امکان اور اس کے وقوع کی علماء کی ایک جماعت نے تصریح کی ہے۔ ان میں چند حضرات یہ ہیں: حجۃ الاسلام امام غزالیؒ، قاضی ابوبکر ابن العربیؒ، امام عزالدینؒ بن عبدالسلام، ابن ابی حمزہؒ، امام ابن الحاجؒ اور شیخ یافعیؒ۔ میں نے اس موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے۔

(الدیباج، ج ۲ ص ۸۷۳)

امام ابوالعباس قرطبی مالکیؒ نے اس حدیث کی بہترین تشریح فرمائی ہے اور اپنا ایک واقعہ لکھا ہے۔ آپ لکھتے ہیں۔

"یہ نعمت مجھ کو کئی مرتبہ حاصل ہو چکی ہے۔ ایک مرتبہ جب میں حج کے ارادہ سے تیونس میں پہنچا تو میں نے وہاں سنا کہ دشمن مصر پر حملہ کر رہا ہے حتیٰ کہ دمیاط پر قابض ہو گیا ہے تو میں نے ارادہ کیا کہ جب تک امن نہیں ہو جاتا میں تیونس میں رہوں گا۔ وہاں میں نے خواب میں دیکھا کہ میں نبی کریم ﷺ کی مسجد میں ہوں، اور میں آپ ﷺ کے منبر شریف کے قریب بیٹھا ہوا ہوں، اور لوگ آ کر نبی کریم ﷺ کو سلام عرض کر رہے ہیں۔ جو لوگ سلام عرض کر رہے تھے ان میں سے کسی نے مجھ کو ڈانٹا اور کہا کھڑے ہو کر سلام عرض کرو۔ میں نے کھڑے ہو کر سلام عرض کیا۔ ابھی میں سلام عرض کر رہا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ اللہ تعالیٰ نے میرے حج کے ارادے کو پھر تازہ کر دیا اور حج کی روانگی کے جو اسباب میرے لئے مشکل تھے وہ آسان کر دیئے اور میرے دل میں دشمن کے حملے کا جو خوف تھا وہ زائل کر دیا۔ میں نے سفر شروع کیا اور تقریباً ایک ماہ بعد اسکندریہ پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ مصر کے لوگ بہت خوف زدہ تھے اور دشمن کا بہت غلبہ تھا۔ ابھی مجھے اسکندریہ میں پہنچے دس دن بھی نہیں ہوئے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے دشمن کی شوکت توڑ دی اور محض ارحم الراحمین اور اکرم الاکرمین کے رحم و کرم سے وہاں امن اور سلامتی ہو گئی۔ پھر اللہ نے مجھ پر اپنا احسان اور انعام مکمل کیا اور بیت اللہ کے حج کے بعد مجھے اپنے نبی ﷺ کی قبر مبارک اور مسجد شریف میں پہنچا دیا۔ اللہ کی قسم! پھر میں نے نبی کریم ﷺ کو بعینہٖ بغیر کسی کمی اور زیادتی کے بیداری میں اسی حال میں دیکھا جس طرح میں نے آپ ﷺ کو تیونس میں خواب میں دیکھا تھا۔" (المفہم ج ۶ ص ۲۴)

روحوں کے مابین ملاقات کے پانچ اصول

نیند یا بیداری میں روحوں کی باہمی ملاقات کے پانچ اصول بتلائے گئے ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ اکمل الدین البابرتی "مشارق الانوار" کی شرح میں فرماتے ہیں کہ دو شخصوں کے درمیان جو روحانی ملاقات ہوتی ہے وہ ان کے درمیان اتحاد کے باعث ہوتی ہے۔ اس باہمی اتحاد کے پانچ اصول ہیں (۱) ذات میں شرکت (۲) ایک یا ایک سے زائد صفات میں شرکت (۳) حال میں شرکت (۴) افعال میں شرکت (۵) مراتب میں شرکت۔ روحوں کے مابین مناسبت کی دو یا دو سے زیادہ جتنی صورتیں بھی تصور کی جا سکتی ہیں وہ ان پانچ سے باہر نہیں ہوں گی۔ روحوں کے مابین وجہ اتحاد جس قدر قوی ہو گی اسی قدر ان کے مابین اجتماع زیادہ ہو گا اور وجہ اتحاد جس قدر کمزور ہو گی اسی قدر ان کے درمیان اجتماع کم ہو گا۔ پس جس شخص کو متذکرہ بالا اصول خمسہ حاصل ہو جائیں اور اُس کی روح کی گذرے ہوئے کاملین کی ارواح کے ساتھ مناسبت قائم ہو جائے تو

وہ جب چاہے ان کیساتھ بیداری میں ملاقات کرسکتا ہے۔ (الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۵۸)

درود شریف ملاقات کا ذریعۂ عظمٰی ہے

ضروری ہے کہ یہاں سید عالم ﷺ کے ساتھ ملاقات کا جو سب سے بڑا ذریعہ ہے اس پر تھوڑی سی گفتگو ہو جائے۔ ہر مسلمان پر یہ بات عیاں ہے کہ جو شخص نبی کریم ﷺ پر درود و سلام بھیجے تو فرشتے اس درود و سلام کو آپ کی بارگاہ اقدس میں پہنچا دیتے ہیں۔ بعض احادیث میں یہ بھی ہے کہ آپ کے سامنے اس شخص کا اور اس کے باپ کا نام بھی پیش ہوتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس سے تعارفِ غائبانہ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پھر ایک طویل عرصہ تک یہ سلسلہ قائم رہے تو حضور اکرم ﷺ کی مقدس روح اس شخص کی طرف متوجہ ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ پھر اس شخص کی استعداد کے مطابق اسے خواب میں ملاقات کا شرف بخشا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے معمولات کو قائم و دائم رکھے اور اپنی استعداد میں اضافہ کرے تو مزید شان و شوکت کے ساتھ اسے خواب میں زیارت کرائی جاتی ہے۔ پھر اگر اس کی ہمت قوی ہو جائے اور حضور اقدس ﷺ کی مقدس روح کے ساتھ اس کی روح کو ایک گونہ مناسبت حاصل ہو جائے تو بیداری میں بھی اسے دیدار پر انوار سے نواز دیا جاتا ہے اور اگر اس کی ہمت اس قدر قوی نہ ہو تو چونکہ وہ خواب میں زیارت کا شرف حاصل کر چکا ہوتا ہے اس لئے اس کی وفات سے چند لحات قبل اُسے بیداری میں بھی زیارت کرا دی جاتی ہے تاکہ " فَسَیَرَانِیْ فِی الْیَقْظَةِ" (عنقریب وہ مجھے بیداری میں دیکھے گا) کا وعدہ پورا ہو جائے۔ الغرض بیداری یا خواب میں نبی کریم ﷺ کی زیارت کا حاصل ہونا بہت بڑی کرامت ہے اور اس کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ درود شریف ہے۔ امام نبہانی رحمۃ اللہ علیہ آیت شریف " وَابْتَغُوْا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ " (اللہ تعالیٰ کی طرف وسیلہ تلاش کرو) کے تحت امام ابو العباس تیجانی رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کرتے ہیں۔

وَلَاوَسِیْلَةَ اَعْظَمُ مِنَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَلَاوَسِیْلَةَ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَعْظَمُ مِنَ الصَّلٰوةِ عَلَیْهِ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر (اللہ تعالیٰ کی طرف) کوئی وسیلہ نہیں ہے اور درود شریف سے بڑھ کر حضور کی طرف اور کوئی وسیلہ نہیں ہے۔

(سعادۃ الدارین، ص ۱۱۳)

باب ۴۴

کراماتِ اولیائے کرامؒ بسلسلہ نقشبندیہ

حضرت محمد خان نقشبندیؒ کی کرامات

آپ مکہ مکرمہ میں مقیم تھے، حضرت شیخ عبداللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے عظیم خلفاء میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ جب ان کی ولایت کی شہرت غازی سلطان عبدالمجید خان ترکی مرحوم کی والدہ ماجدہ نے سنی تو اس خاتون نے حرمِ مکہ میں آپ کے لئے رہائش گاہ تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ تعمیر مکمل ہونے پر آپ اسی رہائش گاہ میں تشریف لے گئے اور طریقت و ارشاد کی خدمت کرنے لگے۔ آپ کا ایک خادم آپ کی کرامت یوں بیان کرتا ہے کہ میرا ایک نوعمر لڑکا تھا، وہ سخت بیمار ہو کر موت کے کنارے جا پہنچا۔ میں رات کو اسے اُٹھا کر حضرت کے پاس لے گیا۔ آپ اس وقت مراقبہ میں تھے۔ میں نے لڑکے کو آپ کے سامنے رکھ کر دُعا کی درخواست کی تا کہ اسے شفاء مل جائے۔ جب آپ نے اپنی نظر اس پر ڈالی تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اسے شفاء ہو گئی۔

ناجائز محبت کا خاتمہ

ایک اور آدمی ذکر کرتا ہے کہ اس کو ایک عورت سے محبت ہو گئی۔ قریب تھا کہ وہ برائی میں مبتلا ہو جائے۔ پھر حضرت سے اس نے اس بات کا یوں ذکر کیا کہ میرے اور گناہ کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں رہ گیا تھا، اگر میں گناہ میں مبتلا ہو جاتا تو اللہ کے ہاں یہ بات آپ کے لئے باعث عار ہوتی (کیونکہ میں آپ کا مرید تھا، اس لئے میری حفاظت آپ کے ذمہ تھی) یہ سن کر آپ نے ارشاد فرمایا کہ "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" کہو میں نے عرض کیا "سبحان اللہ" یہ تو میں ہمیشہ پڑھتا رہتا ہوں، فرمانے لگے کہ میرے کہنے پر ایک مرتبہ پڑھ کر تو دیکھو۔ جب میں نے پڑھ لیا تو یوں محسوس ہوا کہ میرے اور اس عورت کے درمیان سد سکندری حائل ہو گئی اور تین سال تک میری قوتِ شہوانیہ ہی ختم ہو گئی۔

حضرت محمد بن عبداللہ بن مصطفیٰ خانی دمشقی نقشبندیؒ

آپ کا علمائے باعمل اور اولیائے معرفت کے اکابرین میں شمار ہوتا ہے۔ آپ علامہ بے مثل، مرشد باکمال حضرت شیخ المحترم محمد خانی رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد ہیں۔ آپ نے طریقت کا سبق الشیخ مولانا خالد نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھا۔ آپ ان کے مقرب ترین مریدوں میں سے ہیں۔

6883

دو جگہ شیخ کا موجود ہونا اور گناہ غائب ہونا

آپ کا ایک پڑوسی رات کو اپنے گھر ایک فاحشہ عورت کو لے آیا۔ گھر میں کوئی بھی نہ تھا۔ دیا جلا کر اس کے پاس رکھا اور خود کوئی کام کرنے بازار چلا گیا۔ جب واپس آ کر گھر میں داخل ہوا تو جس کمرے میں وہ عورت بیٹھی تھی، اس کی کھڑکی کے شیشے سے جب اندر دیکھا تو وہاں حضرت شیخ کو تکیہ پر بیٹھے پایا۔ سخت گھبراہٹ کے عالم میں بھاگ کر مسجد میں جا پہنچا، مگر جب دیکھا کہ حسب معمول حضرت تو مسجد میں ہی تشریف فرما ہیں تو پھر گھر واپس لوٹا، اب پھر دیکھا تو حضرت بعینہٖ تکیہ پر تشریف رکھتے تھے۔ تین دفعہ ایسے ہی ہوا، اب پھر وہ مسجد میں آیا۔ حضرت کے ہاتھ چوم لئے اور سچی توبہ کی۔ اتنے میں اس فاحشہ عورت نے سمجھا کہ بہت دیر ہو گئی تو وہ واپس چلی گئی۔ کافی دیر کے بعد جب وہ واپس آیا تو گھر کو خالی پایا۔ رات بھر شکر خداوندی میں استغفار پڑھتے ہوئے صبح کر دی اور پھر کبھی ایسی حرکت نہ کی۔

ولی نے اسلام کی محبت عطا کر کے جہنم سے بچا لیا

محمد رشید پاشا مرحوم والیٔ بغداد، چھاؤنی نمبر پانچ کے قائد بن کر شام آئے، چونکہ ان کی تربیت یورپ کے علاقہ میں ہوئی تھی اور مغربی معاشرہ کی محبت ان کے دِل میں رچ بس چکی تھی۔ اس لئے اسلام کے بارے میں دِل میں ناپسندیدگی تھی۔ ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ وہ حج والے دن فوج کے لئے قربانیاں خریدنے بکر منڈی آئے، یہ منڈی حضرت کی مسجد کے قریب تھی۔ جب خرید و فروخت سے فارغ ہوئے تو بھیڑ اور بکریوں کو چھونے کے اثرات دور کرنے کے لئے مسجد میں ہاتھ دھونے گئے۔ جب پانی کے حوض کے قریب پہنچے تو وہاں حضرت وضو فرما رہے تھے۔ ان کے جی میں آیا کہ حضرت کے ہاتھ چومے جائیں۔ معاً خیال آیا کہ ایک مسلمان کے ہاتھ کیوں چومے جائیں، میں تو ان کو ساری کائنات سے بُرا سمجھتا ہوں، مگر دِل نے مجبور کر دیا تو پاشا صاحب نے آگے بڑھ کر حضرت کی دست بوسی کر لی اور حضرت نے اپنا ہاتھ بطور شفقت ان کے سینے پر رکھ دیا، پھر وضو شروع کر دیا۔ یہ صاحب واپس تو چلے گئے، مگر دِل حضرت کی خدمت میں ہی رہ گیا۔ واپسی پر مذکورہ چھاؤنی کے مشیر محمد تقی پاشا کو بطور تعجب اپنی ساری کہانی سُنا دی۔ مشیر صاحب نے کہا کہ جناب یہ تو حضرت شیخ محمد خانی ہیں جو ولی اللہ ہیں۔ انہی کی میں زیارت کرتا تھا تو آپ مجھے ملامت کرتے تھے۔ پاشا صاحب بولے: ایسے معزز و مکرم لوگوں پر اسلام کو فخر ہے۔ اب میں ان کی برکت سے اسلام کی حقانیت کا قائل ہو گیا ہوں۔ اب مجھے مسلمانوں سے بھی محبت پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے دست مبارک سے اللہ تعالیٰ نے مجھے جہنم سے بچا لیا ہے۔ پھر تاحیات پاشا صاحب حضرت کی رشد و ہدایت اور کرم نوازی کے احسان مند اور شکر گزار رہے۔

تعویذ نے اطباء کو مات دے دی

آپ کی ایک اور کرامت آپ کے پوتے شیخ عبدالمجید خانی نے بیان فرمائی ہے کہ میرے سب سے بڑے چچا شیخ احمد کو مثانے میں پتھری کی وجہ سے بڑی تکلیف تھی۔ قضائے حاجت کے وقت تو وہ سخت درد سے بے قرار ہو جاتے تھے۔ کئی کئی دن بیمار رہتے۔ وقت کے اطباء علاج کرتے تھک گئے، مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ایک دن حضرت نے انہیں تعویذ لکھ کر دیا اور فرمایا کہ اسے برتن میں پانی ڈال کر رکھ دیں، وہ پانی پیا کریں۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ سنگ ریزہ ٹوٹ کر پیشاب کے ساتھ باہر نکل آیا، الحمد للہ اس کے بعد وہ آج تک بخیریت ہیں۔

مرید کے حالات کی نگرانی

شیخ عبدالمجید حضرت کے کشف کے متعلق ذکر کرتے ہیں کہ مجھے والد محترم نے بتایا کہ کسی معاملہ کے واقع ہونے سے پہلے ہی حضرت اس کی خبر دے دیتے، پھر وہ واقعہ اسی طرح ہی ظہور پذیر ہوتا جیسے حضرت نے خبر دی ہوتی تھی۔ مریدین کے دلوں پر مطلع ہونے کے ساتھ تمام ادنیٰ و اعلیٰ خیالات کی عکاسی فرما دیتے تھے یعنی آپ کسی مرید سے اس کے حالات پوچھا نہیں کرتے تھے، بلکہ مرید کو تمام حالات کی از خود خبر دیتے تھے اور اس کے سلوک کے مراتب کی نگرانی فرماتے تھے۔ جس کے لئے کچھ کام کرنے کی اور کچھ سے باز رہنے کی تلقین فرماتے۔

حضرت خواجہ محمد معصومؒ کی کرامات

آپ سلسلہ نقشبندیہ کے امام ہیں۔ آپ نے اپنے والد ماجد امام ربانی شیخ احمد فاروقی سرہندی المعروف بہ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ سے فیض حاصل کیا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خلعت و تاج سے نوازا

آپ فرماتے ہیں کہ جب مدینہ منورہ سے واپسی کے لئے الوداع ہوا تو غم و زاری نے آلیا۔ پھر کیا دیکھتا ہوں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام حجرہ مبارکہ سے باہر تشریف لائے ہیں، مجھے لباس فاخرہ پہنا کر ساتھ ہی بادشاہوں جیسا تاج بھی پہنا دیا ہے، جو نہایت قیمتی و خوبصورت ہیرے جواہرات سے مرصع تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مخصوص ذاتی خلعتوں سے یہ خلعت عطا ہوئی ہے۔ حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ مادرزاد ولی تھے۔ رمضان المبارک میں دودھ نہیں پیتے تھے۔ تین سال کی عمر میں کلمہ توحید بیان کیا کرتے تھے۔ صرف تین ماہ میں قرآن پاک حفظ کر لیا تھا۔ سترہ سال کی عمر میں تمام علوم ظاہری و باطنی حاصل کر لئے تھے۔

آپ گرتوں کو تھام لیتے اور ڈوبتوں کو بچا لیتے

آپؒ کے ایک خلیفہ خواجہ محمد صدیق گھوڑے پر سوار ہو کر سفر کر رہے تھے کہ اچانک گھوڑا بدکا اور آپ گر گئے، مگر پاؤں رکاب میں پھنس گیا، گھوڑا سرپٹ دوڑ رہا تھا، انہیں اپنی ہلاکت کا یقین ہو گیا۔ ایسی حالت میں مرشد سے دُعا مانگی، کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا حضرت خواجہ معصوم رحمۃ اللہ علیہ فوراً تشریف لائے۔ گھوڑے کو رُوک لیا اور اس پر مجھے سوار کر دیا۔ ایک دفعہ یہی شیخ محمد صدیق سمندر میں گر گئے، تیرنا نہیں جانتے تھے، ڈوبنے لگے تو آپ کو مدد کے لئے پکارا۔ آپؒ تشریف لائے اور ہاتھ پکڑ کر ڈوبنے سے بچا لیا۔

آگ گلزار ہوگئی

آپؒ کے زمانے میں ایک مجوسی جادوگر کا بڑا چرچا ہو گیا کہ وہ آگ جلا کر خود اور اپنے چیلوں کو آگ میں لے جاتا ہے۔ آگ مطلقاً انہیں نہیں جلاتی۔ لوگ اس کی وجہ سے فتنہ میں مبتلا ہونے لگے۔ حضرتؒ نے بہت زیادہ آگ جلانے کا حکم دیا۔ پھر اپنے ایک مرید کو اس میں داخل ہونے کا حکم دیا۔ وہ مرید ذکر کرتا ہوا آگ میں داخل ہو گیا۔ آگ گلزار ہو گئی اور کافر جادوگر حیران رہ گیا (کیونکہ اس کی چال ناکام ہو گئی۔)

آنکھیں عطا فرما دیں

آپؒ کی خدمت میں ایک نابینا آدمی حاضر ہو کر دُعا کا طلب گار ہوا کہ اس کی نظر واپس مل جائے۔ آپ نے اس کو اپنے پاس بلا کر اپنا لعاب دہن اس کی آنکھوں پر لگا دیا اور فرمایا کہ گھر جا کر آنکھیں کھولنا۔ غرض اس نے اسی طرح کیا تو آنکھیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے درست ہو گئیں اور وہ نابینا آدمی بالکل بینا ہو گیا۔

اولیاء اللہ کی کرامات نگاہِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک طویل روایت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ صرف تین بچوں نے پنگھوڑے میں گفتگو فرمائی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے، زاہد جریج کے زمانہ میں ایک بچے نے، اس کے علاوہ ایک اور بچے نے بھی گفتگو کی۔ عیسیٰ علیہ السلام کا قصہ تو تم جانتے ہو، لیکن جریج بنی اسرائیل میں ایک عابد تھا، جو ایک دن نماز پڑھ رہا تھا کہ اس کی والدہ کو اس سے پیار آ گیا اور پکار اُٹھی اے جریج۔ جریج کہنے لگا، خدایا! نماز بہتر ہے یا ماں کی زیارت؟ پھر نماز پڑھنے لگا، پھر دوبارہ ماں نے پکارا۔ جریج نے پھر یہی کہا، تین بار ایسا ہی ہوا کہ جریج نماز میں مشغول رہا اور ماں کی طرف دھیان نہ کیا، ماں کو یہ بات ناگوار گزری۔ اس نے بددُعا کے لئے بارگاہ ایزدی میں ہاتھ کھڑے کر دیئے اور کہا، یا اللہ! جریج کو بدکار عورتوں کے فتنے میں مبتلا کرنے سے پہلے موت نہ دینا۔ وہاں ایک بدکار عورت رہتی تھی۔ اس نے بنی اسرائیل سے کہا،

میں جریج کو زنا کے فتنے میں مبتلا کروں گی۔ وہ اس کے پاس آئی، مگر جریج اس کے ہاتھ نہ آیا، اس فاحشہ عورت نے دیکھا کہ ایک چرواہا جریج کے گرجے کے پاس رات کو ٹھہرا ہوا ہے، اس نے اس چرواہے کو بدکاری کی دعوت دی، جب بچہ پیدا ہوا تو کہنے لگی کہ یہ بچہ جریج کا ہے، بنی اسرائیل نے جب یہ الزام سُنا تو جریج کو گالیاں دیں اور اس کا گرجا منہدم کر دیا۔ یہ دیکھ کر جریج نے نماز کی نیت باندھی، اللہ تعالیٰ کے دربار میں دُعا کی اور بچے کی طرف ہاتھ کا اشارہ کر کے کہا، اے لڑکے تیرا باپ کون ہے؟ بچہ بولا کہ چرواہا۔ لوگ شرمندہ ہو کر جریج سے معافی مانگنے لگے اور کہنے لگے کہ ہم سونے یا چاندی کا گرجا بنا دیتے ہیں۔ مگر جریج نہ مانا اور پھر پہلے کی طرح مٹی وغیرہ کا گرجا بنا لیا۔ ایک دوسرے بچے کی گفتگو اس طرح ہے کہ ایک عورت اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی کہ ایک نہایت ہی خوبصورت نوجوان گزرا۔ عورت نے کہا: اے اللہ! میرے بچے کو بھی ایسا ہی بنا دے۔ بچے نے کہا، اے اللہ! مجھے اس جیسا نہ بنانا۔ پھر ایک عورت گزری، جس پر زنا اور چوری کا الزام تھا، مگر سزا پا چکی تھی۔ دودھ پلانے والی کہنے لگی کہ اے اللہ! میرے بچے کو اس جیسا نہ بنانا، مگر بچے نے کہا، اے اللہ! مجھے اس جیسا بنا دے۔ جب ماں نے پوچھا تو بچے نے جواب دیا کہ وہ نوجوان تو ظالم و جابر تھا، میں اس جیسا نہیں بننا چاہتا تھا اور اس عورت پر زنا اور چوری کا الزام جس میں وہ بری ہو چکی تھی، مگر حسبی اللہ کہتی جا رہی تھی۔

(ماخوذ از جامع کراماتِ اولیاء ص ۸۹۔۹۰)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ بھی ارشاد گرامی ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ کئی بکھرے ہوئے بالوں والے، غبار آلود چہروں والے، پھٹے ہوئے کپڑوں والے ہوتے ہیں کہ ان کی کوئی انسان پرواہ تک نہیں کرتا، لیکن اگر وہ کسی بات پر خدا کی قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم ضرور پوری کر دیتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے ان کی قسم کو کسی خاص چیز کے ساتھ نہیں جوڑا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ایسے برگزیدہ لوگ جو بھی قسم کھائیں اللہ تعالیٰ اسے پورا فرما دیتے ہیں۔

ایک اور حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ایک آدمی نے بادل سے یہ گرجدار آواز سنی کہ فلاں آدمی کے باغ کو پانی پلا دے تو وہ آدمی یہ آواز سنتے ہی اس باغ کی طرف چل پڑا۔ باغ میں جا کر ایک آدمی سے ملاقات ہوئی اور اس سے اس کا نام دریافت کیا، اس نے جواب دیا کہ میں فلاں ہوں اور فلاں کا بیٹا اور پوتا ہوں۔

سائل کہتا ہے کہ میں نے اس باغ والے سے پوچھا کہ جب تو اس باغ کا پھل اُتارتا ہے اور کھیتی کاٹتا ہے تو پھر کیا کرتا ہے؟ اس نے کہا تمہیں پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ آدمی کہتا ہے کہ میں نے بادل کے اندر سے یہ آواز سنی تھی کہ فلاں کے باغ کو پانی پلا دے۔ اس لئے پوچھ رہا ہوں تاکہ تسلی ہو جائے (یعنی کوئی خاص کرامت ہے جس کی وجہ سے آپ کا نام بادلوں میں گونج رہا ہے) وہ باغ والا آدمی کہنے لگا کہ میاں جب تم

نے پوچھ ہی لیا تو سُن لو میں اس باغ کا پھل تین حصے کرتا ہوں، ایک تہائی اپنے اور اپنے اہلِ خانہ کے لئے، ایک تہائی مسکینوں اور مسافروں کے لئے اور ایک تہائی پھر اسی باغ پر خرچ کر دیتا ہوں۔ یہ ہے میرا عمل جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ غیبی طور پر میرے باغ کو سیراب فرماتے ہیں اور یہ کام کافی عرصہ سے جاری وساری ہے۔

سبحان اللہ! یہ ہیں اللہ کے نیک بندوں کی کمائیاں کہ ہر وقت اللہ کی ذات کو راضی کرنے والے ہوتے ہیں۔ اپنی جان، مال اور دولت سب کچھ اللہ کے راستہ میں قربان کر دیتے ہیں تو پھر اللہ بھی ان کو مراتب و درجات رفیعہ عطا فرماتا ہے یعنی صاحبِ کشف وکرامات بنا دیتا ہے۔

اولیاء اللہ کی کرامتوں کے جواز پر دلائل

پہلی دلیل بندہ اللہ تعالیٰ کا ولی ہے۔ اس بات کا ثبوت اس آیت میں ہے۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (یونس:۶۲) یقیناً اللہ کے ولیوں کیلئے کوئی خوف اور غم نہیں۔

دوسری آیت۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (البقرہ:۲۵۷) اللہ ایمانداروں کا ولی ہے۔

پھر فرمایا۔

وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ (الاعراف:۱۹۶) وہ نیک لوگوں کا ولی ہے۔

پھر فرمایا۔

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ (المائدہ:۵۵) صرف اللہ اور اس کے رسول تمہارے ولی ہیں۔

ان آیات مبارکہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کا ولی ہے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید میں یہ بھی آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کا محبوب ہے اور بندہ اللہ کا محبوب ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

يُحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗ۔۔ (المآئدہ:۵۴) اللہ ان (مومنوں) سے محبت کرتا ہے اور وہ (مومن) اس سے محبت کرتے ہیں۔

پھر ارشاد فرمایا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (البقرہ:۱۶۵) اور جو ایمان لائے ہیں وہ سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں اللہ سے۔

نیز ارشاد فرمایا۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ یقیناً اللہ توبہ کرنے والوں اور طہارت پسند لوگوں

(البقرہ :۲۲۲) کو محبوب رکھتا ہے۔

ان آیات کریمہ کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اللہ کی محبت اور ولایت بندوں کے لئے اور بندوں کی ولایت ومحبت اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔تو ہم کہیں گے کہ بندہ اطاعت الٰہی کی انتہائی حد کو پالیتا ہے۔ جو بھی خدا کا حکم ہوتا ہے، وہ کرتا ہے اور جو اللہ کی رضا ہوتی ہے،اس پر عمل پیرا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی منہیات سے منہ موڑتا ہے اور دوسرے لوگوں کو بھی رُوکتا ہے تو پھر اس طرح کیوں نہ ہو کہ مولیٰ کریم بھی ایک دفعہ اپنے بندے کی بات مان کر وہی کچھ کردے جو بندہ چاہتا ہے۔قرآن پاک میں ارشاد گرامی ہے۔

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْۤ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ — تم میرا وعدہ پورا کرو میں تمہارا وعدہ پورا کروں گا۔ (البقرہ:۴۰)

معلوم ہوا کہ بندہ اطاعت وعبادت پر ثابت قدم رہ کر اللہ تعالیٰ کے حکموں کو پورا کرتا ہے تو اللہ کریم اپنے بندے کی خواہش پوری فرما دیتے ہیں اور یہی اس بندے کے لئے کرامت ہے۔

دوسری دلیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ تعالیٰ سے حکایت بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

مَا تَقَرَّبَ عَبْدٌ اِلَیَّ بِمِثْلِ اَدَآءِ مَا افْتَرَضْتُ عَلَیْهِ اِلٰی اٰخر الحدیث — کوئی بندہ میرے فرائض کی ادائیگی سے بڑھ کر کسی اور چیز سے میرا قرب حاصل نہیں کر سکتا (فرائض کے بعد پھر وہ) نوافل سے مزید میرا قرب حاصل کرتا جاتا ہے۔ تا آنکہ میں اسے محبوب بنا لیتا ہوں۔جب وہ میرے مقام محبت تک پہنچ جاتا ہے تو میں اس کے کان، آنکھ، زبان، دل، ہاتھ اور پاؤں بن جاتا ہوں، وہ میرے ذریعہ سے سنتا، دیکھتا، بولتا اور چلتا ہے۔

حضور شافع یوم النشور علیہ الصلوٰۃ والسلام حدیث قدسی نقل فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

مَنْ اٰذٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ بَارَزَنِیْ بِالْمُحَارَبَةِ (اتحاف) — جس نے میرے کسی ولی کو تکلیف پہنچائی، اس نے میدان جنگ میں مجھے مقابلے کی دعوت دی۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے ولی کی تکلیف کو اپنی تکلیف قرار دیا ہے۔اس بات کی تائید قرآنی آیات سے بھی ہوتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ (الفتح:۱۰) — بیشک جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں، وہ صرف اللہ تعالیٰ سے ہی بیعت کر رہے ہیں۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ (الاحزاب:۵۷)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو تکلیف پہنچاتے ہیں، دنیا و آخرت میں ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوتی ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ اللہ کے ولی کی رضا اللہ کی رضا ہے اور اللہ کے ولی کی تکلیف اللہ کی تکلیف ہے اور محبوب ﷺ کی بیعت بھی اسی قاعدہ کے مطابق اللہ کی بیعت ہے۔ اس کی تائید ایک اور مشہور حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ جس کا ترجمہ نقل کیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہے کہ اللہ رب العزت قیامت کو فرمائیں گے، اے میرے بندے! میں بیمار ہوا تھا تو نے میری بیمار پرسی نہیں کی، میں نے تجھ سے پانی مانگا تھا تو نے مجھے پانی نہیں پلایا۔ میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا تو نے مجھے کھانا نہیں دیا۔ بندہ جواب میں عرض کرے گا۔ اے میرے رب! میں یہ کیسے کر سکتا تھا تو تو سب جہانوں کو پالنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا تھا تو نے اس کی بیمار پرسی نہیں کی تھی۔ کیا تجھے پتا نہیں تھا کہ اگر تو اس کی بیمار پرسی کرتا تو اس کا بدلہ میرے پاس پاتا۔ اسی طرح کھلانے اور پلانے کے بارے میں بھی اللہ کا ارشاد ہوگا۔

تیسری دلیل ہمارے مشاہدے میں عام طور پر یہ بات آئی ہے کہ بادشاہ جس آدمی کو اپنی خاص خدمت کے لئے مقرر کرتے ہیں اور جسے اپنی محبت والی محفل میں آنے کی اجازت دیتے ہیں، اسے کچھ ایسے اختیارات دیتے ہیں، جو دوسروں کو نہیں دیتے تو جب قرب و وصال والی دولت ملتی ہے تو مناصبِ شاہی خود بخود آ جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ قرب اصل ہوتا ہے اور عہدہ اس کے تابع، اللہ تعالیٰ شہنشاہ عالم جب کسی انسان کو اسرارِ معرفت عطا کر کے دوری اور فراق کے پردے ہٹا دیتا ہے اور اپنے قرب کی قالین پر بٹھا دیتا ہے تو پھر اس کو سارے جہان کی روحانی سعادتیں اور خداوندی معرفتیں حاصل ہو جانا کوئی باعث تعجب بات نہیں رہتی۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی اس کا مؤید ہے۔

مَنْ كَانَ لِلّٰهِ كَانَ اللّٰهُ لَهٗ (کشف الاسرار)

جو خدا کا بن جاتا ہے، خدا اس کا بن جاتا ہے۔

نبوت اور ولایت کی عمر ۴۰ سال ہے

مقاماتِ صوفیاء میں ہے کہ ابو سعید ابو الخیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شیخ ابو العباس قصاب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ بالعموم کوئی شخص (الاماشاء اللہ) چالیس برس سے قبل ولایت نہیں پا سکتا اور انبیائے کرام کو بھی نبوت چالیسویں سال ہی میں عطا ہوئی ماسوا یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے، شیخ ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قرآن میں ہے۔

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَكُنْ شَیْــٴًـا مَّذْكُوْرًا (الدھر:۱)

بیشک آدمی پر ایک وقت وہ گزرا کہ کہیں اس کا نام بھی نہ تھا۔

اس سے یہ مراد ہے کہ چالیس برس مکہ اور طائف کے درمیان رکھا گیا۔ یعنی چالیس برس کی تکمیل پر انسان اصل بلوغت کو پالیتا ہے اور پھر اس کا سینہ ہر آلائش سے پاک کر دیا جاتا ہے۔ فرمایا: جس نے چالیس برس سے کم مجاہدہ کیا اس کے معاملات کمال کو نہیں پہنچے۔ جس قدر کوئی ریاضت کرے گا اسی قدر حجاب اُٹھتے جائیں گے اور حقیقت اس پر آشکار ہوتی جائے گی، مگر درمیان میں پھر حجاب میں چلی جاتی ہے۔ حضرت ابو علی دقاق رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ نے دریافت فرمایا کہ کیا یہ انکشاف حقائق کی بات ہمیشہ رہتی ہے؟ فرمایا: نہیں شاذ و نادر ہی ہمیشہ رہتی ہے۔

ولایت اور نبوت میں فرق

نبی اور ولی کی دعوت میں کوئی چیز متضاد نہیں ہوتی جو کہ ایک دوسرے کی نفی کرے۔ فی الحقیقت ولایت نبوت کی عین تائید ہوتی ہے۔ نبی صاحبِ شریعت ہوتا ہے اور ولی صاحبِ دِل۔ اس لیے ولی سے کرامت اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتی جب تک اس پر عالم بے خودی طاری نہ ہو۔ جب تک اولیاء کی بشریت قائم ہو وہ محجوب ہوتے ہیں۔ جب عالم کشف میں ہوں تو مدہوش اور متحیر ہوتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ الطاف خداوندی کے پیش نظر اظہار کرامت حالت کشف کے بغیر درست نہیں کیونکہ یہ مقامِ قرب ہے اور یہ اس وقت حاصل ہوتا ہے جب ولی کے نزدیک پتھر اور سونا برابر ہو جائیں۔ یہ مقام صرف انبیاءؑ کا ہے اوروں کو عارضی طور پر میسر ہوتا ہے اور وہ بھی عالم سکر میں۔

اولیاء اللہ اس زمین پر اللہ تعالیٰ کی حجت ہیں جو نبوت کی تصدیق کرتے ہیں اور انبیاء کی نشان دہی کرتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر نبوت پر یقین آتا ہے۔ ان کے وجود مسعود سے نبوت زندہ رہتی ہے اور انوار و اثراتِ نبوت قائم رہتے ہیں اور بلندی انتشار پاتے ہیں۔ ان خاصانِ خدا کے وجود کا انکار اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی قدرت کا انکار ہے اور ان سے گریز و سرتابی اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت سے منہ موڑنا اور آنکھوں کو بند کرنا ہے، اور یہ کفرانِ نعمت ہے۔ (سرّ دلبراں)

تمثیلاً کہا جاتا ہے کہ ولایت نبوت کا سایہ ہے۔ اولیاء کی خطائیں، انبیاء علیہم السلام کی لغزشوں کا حکم رکھتی ہیں۔ ورنہ اولیاء کو انبیاء علیہم السلام کے احوال اور مقامات سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ تابع اپنے متبوع (جس کی اتباع کی جائے) کے برابر کیسے ہو سکتا ہے۔ اولیاء کے سارے کمالات انبیاء علیہم السلام کی اتباع کا نتیجہ ہیں۔ مشائخ کا قول ہے کہ مومنین کی ارواح اولیاء اللہ سے اقتباسِ نور کرتی ہیں اور اولیاء اللہ کی ارواح انبیائے کرام علیہم السلام سے فیض یاب ہوتی ہیں اور انبیائے کرام علیہم السلام کی ارواح نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مستفیض ہوتی ہیں اور روح ختم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ذات باری تعالیٰ سے مستفیض ہوتی ہے۔

جناب غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اولیاء اللہ مشاہدہ حق کرتے ہیں تو انبیائے کرام علیہم السلام اللہ سے کلام کرتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کو وحی آتی ہے، اولیاء اللہ کو الہام ہوتا ہے۔ وحی چونکہ کلام الٰہی ہے اس لئے اس کے ساتھ روح الامین جبرئیل علیہ السلام آتے ہیں۔ وحی کا انکار کفر ہوتا ہے اور اس کی تصدیق واجب ہوتی ہے، مگر الہام حدیث الٰہی ہے اور وہ قلب ولی پر نازل ہوتی ہے۔

ولایت کی قسمیں

مختلف مشائخ اور مصنفین نے ولایت کی مختلف اقسام کا تذکرہ اپنی تصانیف میں شامل کیا ہے۔ اگر ان کتب کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اولیاء کی بہت سی اقسام کے متعلق علم حاصل ہوتا ہے۔ قرآن نے سورۃ النساء میں انعام یافتہ لوگوں کو چار گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ یعنی نبیین، صدیقین، شہداء اور صالحین۔ سورۃ الواقعہ میں مقربین کی دو قسمیں ہیں اصحابِ یمین (دائیں طرف والے نیک لوگ) اور اصحاب شمال (یعنی جہنم میں جانے والے لوگ) یہاں صرف چند مشائخ سے متعلق اولیاء کی اقسام کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

(۱) ولایت کسبی جو تقویٰ، عبادت، مجاہدات اور مراقبات وغیرہ سے حاصل ہوتی ہے۔

(۲) ولایت فطری یعنی مادرزاد ولی جیسے حضرت مریمؑ اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ۔ حضرت مریم کے پاس بچپن میں ہی اللہ کی طرف سے کھانا اور پھل نازل ہوتے تھے اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی جب پیدا ہوئے تو رمضان المبارک تھا اور آپ دن کے وقت میں ماں کا دودھ نہ پیتے تھے۔ حضرت آدم علیہ السلام پیدا ہوتے ہی مسجود ملائک تھے۔ ولایت کسبی تو تقوے کا باعث ہوتی ہے، مگر ولایتِ فطری سے تو خود تقویٰ نصیب ہوتا ہے یعنی جب ولی ہو جائے تو متقی ہو جاتا ہے۔

(۳) ولایت عطائی جو کسی ولی یا نبی کی نظر کرم سے آنا فانا مل جائے، جیسے نگاہِ موسیٰ سے فرعون کے جادوگر اور حبیب نجار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نظر سے یکدم ولی ہو گئے۔

اولیاء اللہ کی اقسام

اولیاء اللہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ولی تشریعی اور ولی تکوینی۔

(۱) ولی تشریعی

یہ وہ مسلمان متقی لوگ ہیں جنہیں تقویٰ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا قرب نصیب ہو جائے ''وَكَانُوا يَتَّقُونَ'' سے ظاہر ہوتا ہے کہ بے عمل، بھنگی، چرسی، فاسق اور فاجر ولی نہیں ہو سکتا۔ باعمل، عالم دین، متقی ولی ہے۔

عُلَمَآءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ میری اُمت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہیں۔

اور فرمایا۔

اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا بیشک اللہ تعالیٰ سے علماء ہی ڈرتے ہیں۔

(فاطر:۲۸)

ایک حدیث کے مطابق جہاں چالیس مومن جمع ہوں وہاں ایک نہ ایک ولی ضرور ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنے بچے کی نماز جنازہ پڑھنے کے لئے چالیس مسلمانوں کے جمع ہونے کا انتظار فرمایا۔

(۲) ولی تکوینی یہ وہ اولیاء ہیں جنہیں عالم میں تصرف کرنے کا اختیار دیا گیا۔ حدیث شریف میں ہے۔

بِهِمْ یُمْطَرُوْنَ وَبِهِمْ یُرْزَقُوْنَ یعنی ان کی برکت سے بارش ہوتی ہے اور لوگوں کو رزق ملتا ہے۔

اس قسم کے ولیوں کی کئی جماعتیں ہیں۔ ابو عثمان مغربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دنیا میں ہمیشہ چالیس ابدال رہتے ہیں۔ خلفاء تین اور قطب ایک ہوتا ہے۔ عالم سے دنیا اس طرح قائم ہے جیسے میخ کی چوب سے خیمہ قائم ہوتا ہے یا جیسے عالم ارواح میں فرشتے دنیا کا انتظام سنبھالتے ہیں، جنہیں قرآن میں مدبرات امر کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ دنیا کی سلطنت اور حکومت ان اولیاء کے ہاتھوں میں تقسیم ہوتی ہے۔ حضرت بو علی قلندر رحمۃ اللہ علیہ نے علاؤ الدین خلجی کو خط لکھا تھا کہ اگر تم فلاں بدکردار حاکم سے باز پرس نہ کرو گے تو تمہاری حکومت کسی دوسرے کو دے دی جائے گی (یہ قصہ الگ بیان ہو چکا ہے)۔ علامہ اقبالؒ نے حضرت بو علی رحمۃ اللہ علیہ کے خط کے مضمون کو نظم کیا ہے۔ اس کا ایک شعر پیش کیا جا رہا ہے۔

باز گیر ایں عاملے بد گوہرے ورنہ بخشم مُلک تو با دیگرے (ا۔ر:۲۶)

(اس بدخصلت عامل کی باز پرس کرو، ورنہ تمہارا ملک ہم کسی دوسرے کو بخش دینگے۔)

ولایت کی قسمیں

سرّ دلبراں میں ولایت کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں۔

(۱) ولایت صغریٰ: اس کا مقام لطیفۂ قلب ہے۔

(۲) ولایت کبریٰ: اس کا مقام لطیفۂ قالبیہ میں ہے۔

(۳) ولایت علیا: دوام تجلی ذات بلا پردہ اسماء و صفات میں حاصل ہوتی ہے۔ اسے ولایت ملاء الاعلیٰ بھی کہتے ہیں۔

مرآۃ الاسرار میں ولایت کی چار قسمیں لکھی گئی ہیں۔

(۱) ولایتِ باطن نبوت مطلقہ: اس ولایت کے خاتم امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں۔

(۲) ولایتِ مقیدہ ہر نبی: اس کے خاتم شیخ ابن عربیؒ ہیں

(۳) ولایتِ مطلقہ عامہ ہر نبی: اس کے خاتم حضرت امام مہدی ہیں جو حضور اکرم ﷺ کی نسل سے ہوں گے۔

(۴) ولایتِ مطلقہ عامہ: اس کے خاتم حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔

حسبِ ذیل ولایت کی اقسام بھی لکھی جاتی ہیں ۔ تفصیل کیلئے سرِّ دلبراں دیکھیں

۱۔ولایتِ شمسی

۲۔ولایتِ قمری

۳۔ولایتِ خاصہ

۴۔ولایتِ ملاءاعلیٰ

۵۔ولایتِ محمدی ﷺ

ولایت جو مخصوص بہ نبوت نہ ہو

سرِّ دلبراں میں ہے کہ ہر ولی کسی نہ کسی نبی کے زیرِ قدم ہوتا ہے، مثلاً کسی کو ولایت ابراہیمی کسی کو ولایت یوسفی، ولایت موسوی، ولایت سلیمانی اور ولایت عیسوی حاصل ہوتی ہے اور منتخب اولیاء اللہ بوجہ اپنی جامعیت کے ولایت محمدی سے نوازے جاتے ہیں۔

تفسیر نعیمی میں ہے کہ ولایت یعنی دوستی تین قسم کی ہے: (۱) جسمانی (۲) طغیانی (۳) ایمانی۔ پہلی دو قسموں کے ولی من دون اللہ کہلاتے ہیں اور تیسری ولایت والے کو ولی من اللہ کہا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں: جسمانی محبت کرتے ہی مٹ جاتی ہے۔ دوسری محبت طغیانی بعد موت دشمنی میں بدل جائے گی اور تیسری محبت ایمانی ابدالآباد تک قائم رہے گی۔ ولی من دون اللہ جسمانی اور طغیانی ہرگز کام نہ آئیں گے بلکہ نقصان پہنچائیں گے۔ جیسا کہ فرمایا۔

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝　　اور اللہ کے بغیر تمہارا کوئی ولی اور مددگار نہیں ہو گا۔

(البقرہ:۱۰۷)

ولی من اللہ (ایمانی) مومنوں کے ہر جگہ کام آئیں گے۔ یعنی قبر، حشر اور دنیا میں ان کی مدد برحق ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا　　بیشک تمہارا ولی اور مددگار اللہ تعالیٰ اور اس کے

(المائدہ:۵۵) رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومن لوگ ہیں۔

اور فرمایا ہے۔

وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا (النساء:۷۵)

(اے اللہ) ہمارے لئے اپنی طرف سے کوئی ولی اور کوئی مدد کرنے والا بنا۔

ایک اور جگہ فرمایا ہے۔

فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَ جِبْرِيْلُ وَ صَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ۝ (التحریم:۴)

تو بیشک اللہ تعالیٰ آپ کا مددگار ہے، جبریل علیہ السلام اور نیک بخت مومنین بھی آپ کے مدد گار ہیں اور ان کے علاوہ سارے فرشتے بھی مدد کرنے والے ہیں۔

اس آیت کا منشا ہے کہ اگر تم نے یہود و نصاریٰ کی پیروی کی تو تمہارا ولی من اللہ کوئی نہ ہوگا اور "ولی من دون اللہ" کی دوستی تمہیں مضر ہوگی کیونکہ شیطان اور کفار دنیا میں تمہارے دوست بن جائیں گے، مگر موت کے بعد دشمن ہوں گے اور "ولی من اللہ" یعنی اللہ تعالیٰ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صالح مسلمان اور فرشتے یہ سب دنیا اور آخرت میں تمہارے ولی ہوں گے۔

باب ۴۵

علم ظاہر اور علمِ باطن

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ظاہری اور باطنی گناہوں سے بچو، کیونکہ یہ دونوں قسم کے گناہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے حرام قرار دیئے ہیں۔

وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ (الانعام:۱۲۰)
اور ترک کردو ظاہری گناہ کو اور چھپے ہوئے کو

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (الاعراف:۳۳)
آپ فرمایئے! بے شک حرام کر دیا ہے میرے رب نے سب بے حیائیوں کو جو ظاہر ہیں اُن سے اور جو پوشیدہ ہیں۔

مذکورہ آیات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان تمام گناہوں سے باز رہنے کا حکم دیا جا رہا ہے، جن کا تعلق براہِ راست یا تو جسم سے ہے یا دل سے ہے، خواہ یہ گناہ اعلانیہ ہوں یا چھپ کر کئے جائیں۔ مطلب یہ ہے کہ ظاہری اعضا سے بھی کسی پر زیادتی نہ کی جائے اور مسلمان کا دل بھی برائی سے پاک ہو اور جلوت اور خلوت دونوں پاکیزہ ہوں۔

صوفیائے عظام اور علمائے کرام نے لکھا ہے کہ ہر چیز کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن۔ ظاہر تو ہر کوئی دیکھ سکتا ہے مگر باطن کو فراست اور بصیرت والی آنکھ ہی دیکھ سکتی ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ جب ہم وضو کرتے ہیں تو ظاہری وضو کے ساتھ ساتھ ایک باطنی وضو بھی ہوتا ہے (حضرت داتا گنج بخشؒ کا ظاہری اور باطنی وضو کا بیان راقم الحروف کی کتاب ''حسنِ نماز'' کے وضو کے باب میں بیان کر دیا گیا ہے نیز دیکھیں حسن نماز صفحہ نمبر ۵۵۷ اور ۵۵۸) امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ جب ہم ظاہری وضو کرتے ہیں تو اس کی روحانی مسرت ہم اپنے باطن میں بھی پاتے ہیں۔ آپ کی مراد یہ ہے کہ ظاہر کا باطن پر اثر پایا جاتا ہے۔

مفسرین قرآن نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ قرآن کی بیشتر آیات کے ظاہری معنی بھی ہوتے ہیں اور باطنی معنی بھی مگر اختصار کے پیش نظر یہاں ایسی آیات کے معانی اور مطالب پیش کرنا ممکن نہیں۔ اس سلسلے میں سورہ فتح کی آخری آیت (نمبر ۲۹) کا باطنی ترجمہ کسی ولی اللہ سے پوچھیں تو معلوم ہوگا کہ اس میں بہت سے روحانی

رموز پائے جاتے ہیں۔ جس میں مختلف انبیاء اور اولیاء اُمت کے "روحانی مزاجوں" کی خبر دی گئی ہے اور ان مزاجوں کے منتقل ہوتے رہنے کا اظہار بھی کیا گیا ہے۔ خلفائے راشدین کی خلافتوں کی صحیح ترتیب بھی اس آیت میں ہی ظاہر کی گئی ہے۔ (تفصیل اس کتاب کے صفحہ نمبر ۵۶۸ پر ملاحظہ فرمائیں) قرآن میں خود بھی دو قسم کی آیات کا ذکر ہے، جن میں سے ایک محکمات ہیں اور دوسری متشابہات۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ متشابہات کا علم فقط " وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ "کو ہی دیا گیا ہے اور حضرت ابن عباسؓ نے خود فرمایا ہے کہ ہم راسخینِ علم میں سے ہیں۔

درجِ ذیل بیان سے یہ معلوم ہوگا کہ کچھ لوگ ظاہری اور باطنی علم کو ایک ہی نوعیت کا علم تصور کرتے ہیں کیونکہ اگر کوئی عمل ظاہر میں شریعت کا حکم رکھتا ہے تو باطن میں بھی اس کی جگہ ہونا ضروری ہے، اس اعتبار سے وہ اس کو ایک ہی بات تصور کرتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگرچہ ظاہر کو باطن کے ساتھ تعلق ہے اور دونوں کا پایا جانا ضروری ہے لیکن یہ بھی جاننا ہوگا کہ ظاہر سے باطن ضرور ایک الگ حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں دونوں اقسام کے بیانات کو پیش کیا جائے گا۔

ظاہر اور باطن کی چند مثالیں

جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے کہ ہر چیز کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ دنیا کا بھی ایک ظاہر ہے جس کو مختلف ملمع سازیوں اور زینتوں سے آراستہ کیا گیا ہے اور اس کی صورت کو موہوم خد و خال اور زلف و رخسار سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اس کو دیکھنے سے شیرینی، طراوت اور تازگی کا خیال آتا ہے لیکن حقیقت میں عطر لگا ہوا مردار، مکھیوں اور کیڑوں سے بھرا ہوا نجس خانہ اور زہر سے لبریز شکر ہے، لہٰذا اس کا باطن سراسر خراب اور ابتر ہے۔ اس کے باطن کی خرابی جتنا بھی کوئی تصور کر سکے، اس سے بھی بدتر ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس پر فریفتہ ہونے والا دیوانہ اور مسحور ہے، اس کا گرفتار مجنوں اور فریب خوردہ ہے۔ جو اس کے ظاہر پر فریفتہ ہو گیا، نقصان ابدی کے ساتھ داغدار ہو گیا۔ جس نے اس کی حلاوت (ظاہری) پر نظر کی، دائمی ندامت اور شرمندگی اس کے حصے میں آئی۔ دنیا اور اس کی خرابیوں سے نقاب کشائی مطلوب ہو تو ہماری تصنیف "حضورِ قلب" میں فسادِ قلب کا باب ملاحظہ فرمائیں۔ ہماری اس تصنیف "اسلام وروحانیت اور فکرِ اقبال" میں بھی اس دنیائے دنی پر کافی لکھ دیا گیا ہے۔

دوسری مثال جس سے ظاہر اور باطن کا فرق محسوس ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم ریاضتوں کے ذریعے اپنی روح کو طاقتور اور با تصرف بنا سکتے ہیں، کیونکہ ظاہر کی عبادات انسان کے باطن پر ضرور اثر انداز ہوتی ہیں۔ صورتِ نماز اور حقیقتِ نماز میں ایک نمایاں فرق ہے جس سے ظاہری نماز اور باطنی نماز میں فرق ظاہر ہوتا ہے۔ حضرت

مجدد الف ثانی نے حقیقتِ نماز پر جو کچھ لکھا ہے، اسے ہماری تصنیف "حسنِ نماز" میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

ایسا شخص جو کثرت سے عبادت کرتا ہے، اس کی روح کو پورے عالم میں تصرف عطا کر دیا جاتا ہے۔ باتصرف اور بے تصرف روح میں ظاہر اور باطن کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک شخص کی ظاہری صورت کا احکامات شرعی سے مزین ہونا تو ممکن ہے، لیکن اس کا باطن اس کے برخلاف بھی ہو سکتا ہے۔ منافق میں اور مسلمان کے گروہوں کے درمیان جو فرق دکھائی دیتا ہے، ظاہر اور باطن میں فرق ہونے کا سبب ہے۔ جن لوگوں کا باطن درست ہو اور ظاہر غیر شرعی اور پراگندہ ہو تو ایسا باطن بے معنی ٹھہرے گا کیونکہ شریعت ظاہر اور باطن دونوں کو مستلزم ہے۔

بہت سی احادیث میں اس بات کا ذکر آیا ہے کہ نظافت ایمان کی نشانی ہے یعنی اس سے مراد یہ ہے کہ باطن میں صفائی کا ہونا ضروری ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جسے تم مسجد میں جاتا ہوا پاؤ تو اس کے ایماندار ہونے کی گواہی دو۔ اس حالت میں بھی یہی بات متصور ہے کہ وہ سچے دل سے مسجد میں جاتا ہو نہ کہ مسلمانوں کی مخبری کرنے یا ریاکاری کی نیت سے جاتا ہو۔ اسی طرح دین کی عبادات میں مصروف ہونے سے یہ مراد نہیں کہ وہ دنیا کی ترقی اور ضروریاتِ اسلام (سائنس، ٹیکنالوجی، فنونِ ضروریہ میں کمال کے حاصل کرنے) کو نظر انداز کر دے کیونکہ محض عبادات کا خیال رکھنے سے ہی دینِ اسلام کی تکمیل نہیں۔ یہ تمام مثالیں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ ظاہر اور باطن میں تضاد عام نظر آتا ہے اور ظاہر و باطن کی درستی سے اپنی اصلاح کر لینا ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ ظاہر کی درستی سے باطن بھی درست ہونے کا امکان ہوتا ہے اور کبھی توبہ کے ذریعے باطن کی اصلاح ہو جائے تو ظاہر بھی درست ہو جاتا ہے۔ وَ بِاللّٰهِ التَّوْفِيْقُ۔

اُمتِ محمدیہ ﷺ ساری امتوں میں چُنی ہوئی امت ہے۔ اس کے پاس علوم و فنون کے خزانے ہیں۔ قرآن ہے، تفسیر ہے، حدیث ہے، شرع ہے، فقہ ہے، اُصول ہے، قانون ہے، منطق ہے، ادب ہے، میزان ہے، تحریر ہے، تقریر ہے، گویا کہ ہر شے ہے، لیکن بدقسمتی سے علم پر عمل اور عمل پر استقامت کی دولت الا ماشاء اللہ کسی کو بھی حاصل نہیں، نہ معلّم کو ہے نہ متعلّم کو۔ نہ اُن کو ہے نہ اِن کو۔ اگرچہ ہر کوئی اس کا دعویدار ہے۔ ایسے حالات میں جو علاج ممکن ہے، وہ یہ ہے کہ کسی صاحبِ حال کی صحبت میں رہ کر اپنے ظاہر اور باطن کو اس کے حوالے کر دے اور خود کو اس کے احکام کا پابند کرے۔

تصوف کو اس لئے شرف ہے کہ اس میں علمِ ظاہر اور باطن ہے

ظاہر کا باطن سے اس قدر گہرا رشتہ ہے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ظاہر اور باطن کا فرق رفتہ رفتہ بڑھتا جائے اور اعتقادات کی نوبت دین کی منزلوں سے دور ہوتی جائے تو اس کی نوبت

نفاق تک پہنچ جاتی ہے۔ نفاق اگر معمولی بات میں ہو تو یہ بھی منافقت کی ایک قسم ہوگی، مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کسی کا دل خوش کرنے کی خاطر کسی کو کھانے پر دعوت دے لیکن ساتھ ہی وہ دل میں یہ خیال کرے کہ اگر وہ کھانا نہ ہی کھائے تو بہتر ہے، اس حرکت پر منافقت کا ایک گناہ اُس کے نام پر لکھ دیا جاتا ہے۔ علمِ باطن کا شرف حضرت موسیٰ علیٰ نبیّنا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے قصہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ جہاں آپ حضرت خضر علیہ السلام سے فرماتے ہیں۔

هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰۤى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿۶۶﴾ (الکہف:٦٦)

کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں بشرطیکہ آپ سکھائیں مجھے رشد و ہدایت کا خصوصی علم جو آپ کو سکھایا گیا ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ علمِ شریعت کی طرح علمِ حقیقت کی طلب بھی واجب ہے۔ تخلیقِ انسان سے مقصود معرفتِ الٰہی ہے۔ ایمانِ حقیقی اس معرفت سے وابستہ ہے۔ یہ معرفت اہلِ باطن کی خدمت سے حاصل ہو سکتی ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ کو دیکھئے کہ باوجود علم و اجتہاد کے اس معرفت کے حاصل کرنے کے، حضرت بشر حافیؒ کے ہم رکاب چلا کرتے تھے اور جب لوگوں نے آپ سے اس کا سبب پوچھا تو جواب دیا کہ ان کو خدا کی معرفت مجھ سے زیادہ حاصل ہے۔

حدیث شریف میں مذکور ہے کہ انسان کے بدن میں ایک پارۂ گوشت کا ہے، اگر وہ درست ہو تو تمام بدن درست ہو جاتا ہے اور اگر وہ فاسد ہو تو تمام بدن فاسد ہے۔ یہ پارۂ گوشت قلب ہے۔ اصلاحِ قلب جسے صوفیائے کرام فناء قلب سے تعبیر کرتے ہیں، صرف علمائے باطن ہی کو حاصل ہے۔

امام ابوالقاسم قشیریؒ نے اپنے رسالہ میں یوں تحریر فرمایا ہے کہ عہدِ اسلام میں ہر زمانے میں اس گروہ کے شیوخ میں سے ایک شیخ صاحبِ علومِ توحید اور اپنی قوم کا امام گذرا ہے، جس کے آگے اس وقت کے ائمہ وعلماء نے سرِ تسلیم خم کیا ہے اور اُس سے برکت حاصل کی ہے۔ اگر اُن ائمہ میں کوئی فضیلت، خصوصیت نہ ہوتی تو معاملہ برعکس ہوتا۔ ایک روز امام احمد بن حنبلؒ (متوفی ۱۲ ربیع الاوّل ۲۴۱ھ) امام شافعیؒ (متوفی آخر رجب سن ۲۰۴ھ) کے پاس تھے، حضرت شیبان راعیؒ تشریف لائے۔ امام احمدؒ نے کہا ''اے ابوعبیداللہ! میں چاہتا ہوں کہ راعی کو اس کے علم کے نقصان پر آگاہ کروں تا کہ یہ بعض علوم کی تحصیل میں مشغول ہو جائے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا: ایسا نہ کیجئے، مگر وہ باز نہ رہے اور شیبانؒ سے کہنے لگے کہ آپ اس شخص کی نسبت کیا فرماتے ہیں جو دن رات کی پانچ نمازوں میں سے ایک بھول جائے اور اسے معلوم نہ ہو کہ وہ کون سی نماز بھولا ہے۔ اے شیبان! اس پر کیا واجب ہے؟ شیبانؒ نے کہا: اے احمدؒ! ایسے شخص کا دل اللہ تعالیٰ سے غافل ہے، واجب ہے کہ اس کو تادیب کی جائے تا کہ وہ پھر اپنے مولا سے غافل نہ ہو۔ یہ سن کر امام احمد بن حنبلؒ بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش

میں آئے تو امام شافعیؒ نے ان سے کہا، کیا میں نے آپ سے نہ کہا تھا کہ ان کو نہ چھیڑیئے۔ حضرت شیبانؒ عالم نہیں تھے۔ جب ان میں سے ایک ناخواندہ ایسا ہے تو ائمہ صوفیہ کا کیا حال ہوگا۔

منقول ہے کہ اکابرِ فقہاء میں سے ایک فقیہہ ابو عمرانؒ نامی کا حلقہ جامع منصور میں حضرت شبلی قدس سرہ (متوفی ۳۳۴ھ) کے حلقہ کے پہلو میں تھا، حضرت شبلیؒ کے کلام کی فصاحت اور لذت کے سبب ان کا حلقہ بیکار رہتا۔ ایک روز ابو عمرانؒ کے اصحاب نے حضرت شبلی کو شرمندہ کرنے کے ارادے سے ان سے حیض کا ایک مسئلہ دریافت کیا۔ حضرت شبلیؒ نے اس مسئلہ میں لوگوں کے اقوال اور اختلاف کو بیان کیا۔ جب ابو عمرانؒ نے آپؒ کی تقریر سنی تو اٹھ کر آپؒ کے سر کو بوسہ دیا اور کہا: اے ابو بکرؒ! آپ نے اس مسئلہ میں دس اقوال ایسے بتائے ہیں، جو میں نے کبھی نہ سنے تھے۔ تمام اقوال جو آپؒ نے بیان کئے ہیں، ان میں سے تین قول مجھے معلوم تھے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ فقیہہ ابو العباس بن عمر بن سُریجؒ (متوفی ۳۰۶ھ) حضرت جُنید بغدادیؒ (متوفی شوال ۲۹۸ھ) کی مجلس سے گزرے اور ان کا کلام سنا۔ فقیہہ موصوف سے پوچھا گیا کہ آپ اس کلام کی نسبت کیا رائے رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ ان کا کلام میں نہیں سمجھتا لیکن میں دیکھتا ہوں کہ ان کے کلام میں وہ رعب و ہیبت ہے جو کاذب و متکبر کے کلام میں نہیں ہوتی۔ امام عبد الوہاب شعرانیؒ طبقاتِ کبریٰ میں لکھتے ہیں کہ امام احمد بن حنبلؒ کی مجلس میں جب کبھی کلامِ صوفیہ کا ذکر آتا تو آپ حضرت ابو حمزہ بغدادیؒ (متوفی ۲۸۹ھ) سے فرماتے۔

مَا تَقُوْلُ فِیْ هٰذَا یَا صُوْفِیُ ؟ اے صوفی! آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں ؟

امام موصوف اپنے بیٹے سے فرمایا کرتے تھے "بیٹا! صوفیائے وقت کی صحبت میں رہا کرو کیونکہ وہ اخلاص میں ایسے مقام پر پہنچے ہوتے ہیں، جہاں تمہاری رسائی نہیں"۔ شیخ الاسلام ابو یحییٰ زکریا انصاریؒ (متوفی ذوالحجہ ۹۴۲ھ) فرمایا کرتے تھے کہ جس فقیہہ کو صوفیائے کرام کے احوال و اصطلاحات کا علم نہ ہو، وہ خشک روٹی کی طرح ہے جس کے ساتھ سالن نہ ہو۔ شیخ عز الدینؒ بن عبد السلامؒ (متوفی ۱۰ جمادی الاول ۶۲۰ھ) طریقِ صوفیہ کے منکر تھے اور کہا کرتے تھے کہ کتاب و سنت کے سوا کوئی اور طریق موصل الی اللہ نہیں ہے؟ جب آپ حضرت شیخ ابو الحسن شاذلیؒ کی صحبت سے مشرف ہوئے تو طریقۂ صوفیہ کو تسلیم کیا اور فرمایا کہ صوفیاء کی جماعت دین کی بڑی بنیاد پر قائم ہے۔ اور اس کی ایک بڑی دلیل وہ کرامات و خوارق ہیں جو اُن کے ہاتھ پر ظاہر ہوتے ہیں۔ اس قسم کی کوئی شے کبھی کسی فقیہہ کے ہاتھ پر ظاہر نہیں ہوئی بجز اس صورت کے کہ ان کے طریق کا اِتباع کیا جائے۔

شیخ الاسلام تاج الدین سُبکیؒ (متوفی ۷۷۱ھ) طبقات الشافعیۃ الکبریٰ میں لکھتے ہیں کہ جب ابو العباس موسیٰؒ (متوفی ۶۳۲ھ) اسکندریہ سے قاہرہ میں آئے تو ایک روز شیخ عز الدینؒ کی مجلس میں حاضر ہوئے

جہاں رسالہ قشیریہ پڑھا جاتا تھا۔ شیخ عزالدینؒ نے ابوالعباسؒ سے کہا کہ اس فصل پر کلام کیجئے۔ پس ابوالعباسؒ کلام کرنے لگے تو شیخ عزالدینؒ حلقہ میں پھر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اس کلام کو سنو جو ابھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے القاء ہوا ہے۔

علمِ باطن پر مشائخِ کبار کی آراء

مندرجہ ذیل کے مضمون میں چند مشائخِ عظام کے وہ نظریات جوانہوں نے ظاہر اور باطن کے متعلق بیان فرمائے، اختصار کے ساتھ قارئین کی نظر کئے جاتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کچھ مشائخ نے تو ظاہر اور باطن کو علمِ شریعت سے کوئی الگ علم قرار نہیں دیا ہے اور بعض علماء اور مشائخ نے دونوں علوم میں فرق بیان کیا ہے۔ ان دونوں گروہوں کے مشائخ کی آراء ملاحظہ فرمائیں۔

(الف) وہ مشائخ جو علم ظاہر و باطن میں فرق نہیں کرتے

(۱) شیخ ابونصر سراج طوسیؒ

آپ فرماتے ہیں کہ علمِ باطن علمِ شریعت سے الگ نہیں بلکہ اسی کا حصہ ہے۔ اس قول سے آپ کی مراد یہ ہے کہ جب تک علم ظاہر علمِ باطن میں موجود نہ ہو تو یہ علم نہیں بلکہ منافقت ہے، لہٰذا علمِ ظاہر اور باطن ایک ہی چیز ہے۔ فرماتے ہیں۔

اِنَّ عِلْمَ الشَّرِيْعَةِ عِلْمٌ وَّاحِدٌ وَهُوَ اِسْمٌ وَّاحِدٌ يَجْمَعُ بِمَعْنَيَيْنِ الرِّوَايَةَ وَالدِّرَايَةَ اِجْتَمَعَتْهُمَا فَهِيَ عِلْمُ الشَّرِيْعَةِ اَلدَّاعِيَةُ اِلَى الْاَعْمَالِ الظَّاهِرَةِ وَالبَاطِنَةِ

علمِ شریعت ایک ایسا علم ہے جو دو معانی کا جامع ہے یعنی روایت و درایت۔ اگر ان دونوں کو جمع کر دو تو یہی علمِ شریعت ہے جو اعمال ظاہری و باطنی کا داعی ہے۔

علمِ شریعت کی اس جامعیت کے پیشِ نظر وہ علم میں ظاہر و باطن کی تفریق کو جائز نہیں سمجھتے، چنانچہ لکھتے ہیں کہ

لَا يَجُوْزُ اَنْ يُّجَرِّدَ الْقَوْلُ فِي الْعِلْمِ اِنَّهٗ ظَاهِرٌ اَوْ بَاطِنٌ لِاَنَّ الْعِلْمَ مَتٰى كَانَ فِي الْقَلْبِ فَهُوَ بَاطِنٌ اِلٰى اَنْ يَّجْرِيَ وَ يَظْهَرَ عَلَى اللِّسَانِ فَاِذَا جَرٰى عَلَى اللِّسَانِ فَهُوَ ظَاهِرٌ (کتاب اللمع ص ۲۳)

علم میں ظاہر و باطن کی تفریق جائز نہیں کیونکہ علم جب تک قلب میں رہتا ہے، تو وہ پوشیدہ ہوتا ہے تا آنکہ زبان پر جاری و ظاہر ہو اور جب وہ زبان پر آجائے تو وہی ظاہر ہے۔

آپ کے فرمان کے مطابق علمِ ظاہر اور باطن ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں یا ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔

(۲) شیخ ابو طالب مکیؒ

آپ کا ارشاد ہے کہ حقیقت اور شریعت دونوں ایک راہ سے ہی عبارت ہیں۔

اَلْحَقِیْقَۃُ عِلْمٌ وَ ھِیَ اَحَدُ طُرُقَاتِ الشَّرِیْعَۃِ — حقیقت ایک علم ہے اور یہ شریعت ہی کے راستوں میں سے ایک راستہ ہے۔

(۳) حضرت امام قشیریؒ

امام قشیریؒ نے بھی ایک جگہ شریعت کو حقیقت اور حقیقت کو شریعت کہا ہے (الرسالہ القشیر یہ ص ۵۴) لیکن بعض اہلِ تصوف کے ہاں شریعت اور حقیقت متبادل الفاظ نہیں ہیں بلکہ ان کے درمیان کافی فرق ہے۔ جیسا کہ شیخ ہجویریؒ فرماتے ہیں۔

شریعت اندر حکم از حقیقت جدا است — یعنی شریعت حکم میں حقیقت سے مختلف ہے

ایک جگہ لکھتے ہیں۔

فرقِ بسیار میانِ ھر دو باشد — یعنی دونوں کے درمیان بہت فرق ہیں۔

اس فرق کی طرف امام قشیریؒ نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

اَلشَّرِیْعَۃُ اَمْرٌ بِالْتِزَامِ الْعُبُوْدِیَّۃِ وَالْحَقِیْقَۃُ مُشَاھَدَۃُ الرَّبُوْبِیَّۃِ فَالشَّرِیْعَۃُ اَنْ تَعْبُدَہٗ وَالْحَقِیْقَۃُ اَنْ تَشْھَدَہٗ — شریعت نام ہے التزامِ عبودیت کا اور حقیقت مشاہدۂ ربوبیت کو کہتے ہیں، چنانچہ شریعت یہ ہے کہ تُو اس کی عبادت کرے اور حقیقت یہ ہے کہ تُو اس کا مشاہدہ کرے۔

(الرسالۃ القشیریہ ص: ۵۴)

شریعت جس کا مفہوم انہوں نے "اَنْ تَعْبُدَہٗ" بتایا ہے (یعنی کہ تو اس کی عبادت کرے)، اس کا انسان کو مکلف بنایا گیا ہے لیکن حقیقت جس کی تعریف انہوں نے "اَنْ تَشْھَدَہٗ" سے کی ہے۔ (یعنی کہ تو اس کا مشاہدہ کرے۔) اسے اللہ تعالیٰ کی عنایات میں سے کہا گیا ہے یعنی شریعت بندہ کا فعل ہے اور حقیقت اللہ تعالیٰ کا یا شریعت احکامِ دین کی پابندی کو کہتے ہیں اور حقیقت خدا کی طرف سے احوال باطن کی حفاظت کو۔ قرآن کی آیت "وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا" (العنکبوت: ۶۹) (اور جو (بلند ہمت) مصروف جہاد رہتے ہیں ہمیں راضی کرنے کے لئے ہم ضرور دکھا دینگے انہیں اپنے راستے) میں پہلے حصہ کو شریعت سے متعلق بتایا گیا ہے اور دوسرے حصہ کو حقیقت کے حکم میں داخل کیا گیا ہے یعنی مجاہدہ شریعت ہے اور ہدایت حقیقت۔ (کشف المحجوب ۳۴۳)

(ب) وہ مشائخ جو ظاہر اور باطن میں فرق روا رکھتے ہیں

اہلِ تصوف کے نزدیک: شریعت اور حقیقت میں فرق ظاہر و باطن کا ہے۔ شریعت کے امور یعنی عبادات و معاملات وغیرہ کو وہ صرف ظاہر جسم سے متعلق سمجھتے ہیں اور انہیں اعمالِ ظاہری کہتے ہیں اور ایمان، یقین، صدق، اخلاص اور توکل وغیرہ کو جو کہ قلب سے متعلق ہیں، انہیں اعمالِ باطنی کہتے ہیں۔ (کتاب اللمع ص ۲۴)

پھران پر دو طرح کے اعمال کی الگ الگ فقہ اور ان کی جداگانہ حقیقت اور علم کے بھی وہ قائل ہیں۔ اسی طرح ظاہر و باطن کی یہ تفریق اس حد کو جا پہنچتی ہے جہاں سے دو مختلف راہیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک خدا کی متعین کردہ شریعت کی راہ جس پر چل کر آنحضرت ﷺ نے شہادت قائم کی اور دوسری طریقت یا سلوک کی راہ جسے اعمالِ باطنی کی درستی کے لئے مشائخ صوفیہ نے اپنی طرف سے خود ہی مقرر کیا ہے، اس دعویٰ کے ساتھ کہ اس طریق پر جب اعمال باطنی درست ہو جاتے ہیں تو قلب جو ان اعمال کا محل ہے، رمز آشنائے حقیقت ہو جاتا ہے اور اس پر غیب کے معانی و حقائق منکشف ہو جاتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں اس علم تک رسائی ممکن ہو جاتی ہے جو خدا کی طرف سے براہ راست ہے۔ یاد رہے کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے خدا تک پہنچانے والے دو راستوں کا ذکر مکتوبات شریف میں کیا ہے۔ ایک وہ راستہ جو براہ راست خدا سے ملا دے اس راہ سے انبیائے کرامؑ منسلک ہیں اور ان کے علاوہ وہ چند لوگ ہیں جو انبیائے کرامؑ کے طفیلی بن کر خدا سے منسلک ہوتے ہیں تفصیل کے لئے مکتوب نمبر ۱۲۳ دفتر سوئم، حصہ دوئم ملاحظہ کیجئے۔

(۱) حضرات عبداللہ بن عباسؓ اور ابوہریرہؓ

آپ دونوں کا خیال ہے کہ اس علم کو ظاہر و عام نہ کرنے کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ یہ بہت ہی دقیق علم ہے بلکہ اس کی ایک قسم وہ ہے جس کے اظہار سے گردن کٹتی ہے اور کفر لازم آتا ہے جیسا کہ ذیل کی دو روایتوں سے پتہ چلتا ہے۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے متعلق روایت ہے کہ آپؓ نے آیت تلاوت فرمائی۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ	اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا فرمائے
مِثْلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ	اور زمین کو بھی انہی کی مانند۔ نازل ہوتا رہتا ہے
(الطلاق: ۱۲)	حکم ان کے درمیان۔

آپ نے اس آیت کی تفسیر نہیں بتائی اور کہا کہ اگر میں اس کی تفسیر بیان کردوں تو تم لوگ مجھے پتھر مارو گے۔ دوسری روایت میں ہے کہ "تم کہو گے عبداللہ بن عباسؓ کافر ہے"۔ (احیاء علوم الدین اول ص ۸۸)

(۲) حضرت ابو ہریرہؓ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ نے فرمایا: "میں نے رسول اللہ ﷺ سے دو قسم کی باتیں یاد کیں۔ ایک کو شائع کیا اور دوسری کو اگر شائع کروں تو میری گردن کاٹ ڈالی جائے گی۔"

(۲) شاہ ولی اللہؒ: شاہ ولی اللہ مزید فرماتے ہیں۔ دین محمدیؐ کی دو حیثیتیں ہیں ایک ظاہری اور دوسری باطنی۔ جہاں تک دین کی ظاہری حیثیت کا تعلق ہے اس کا مقصود مصلحت عامہ کی نگہداشت ہے جس کی صورت یہ ہے کہ وہ احکام و معاملات جو اس مصلحت عامہ کے لئے بطور ذرائع اور اسباب کے ہیں انہیں قیام عمل میں لایا جائے اور ان کی اشاعت میں کوشش کی جائے، اور جن چیزوں سے مصلحت عامہ پر زد پڑتی ہے اس کو سختی سے روکا جائے تو یہ ہوئی دین کی ظاہری شریعت اب رہا اس کی باطنی حیثیت کا معاملہ، تو نیکی اور اطاعت کے کاموں سے دل پر جو اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں ان کے احوال و کوائف کی تحصیل دین کی باطنی حیثیت کا مقصود اور نصب العین ہے۔ (ہمعات ص ۲)

اس تفریق کے بعد وہ دین کے ہر پہلو کے لئے الگ الگ محافظین اور ان کے جداگانہ فرائض منصبی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: وہ بزرگ جن کو خدا کی طرف سے حفاظت شریعت کی استعداد ملی تھی وہ تو دین کی ظاہری حیثیت کے محافظ بنے۔ یہ فقہاء محدثین نمازیوں اور قاریوں کی جماعت ہے دین کی تحریف میں اگر کہیں سے کوشش ہوتی ہے تو یہ لوگ اس کی تردید میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور تعلیم و ترغیب کے ذریعہ مسلمانوں کو علوم دین کی تحصیل کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ دین کے محافظین کا دوسرا گروہ وہ ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے باطن دین کی حفاظت کی اطاعت اور نیکوکاری کے اعمال سے باطن نفس میں جو اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور دلوں کو ان سے جو لذت ملتی ہے یہ بزرگ لوگوں کو ان امور کی دعوت دیتے (ہمعات، ص، ۲)

شاہ ولی اللہؒ کی مزید وضاحت

"اللہ تک پہنچانے والے راستے دو قسم کے ہیں: ایک قسم تو وہ ہے جس کی وحی الٰہی اور تعلیمات انبیائے کرام نے تلقین فرمائی اور دوسری وہ ہے جسے الہام اور معارف اولیاء نے متعین کیا ہے۔" (التفہیمات الالٰہیہ ج ۲ ص ۲۸)

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

"خدا رسیدگی کے دو راستے ہیں۔ ایک راستہ تو وہ ہے جو نبی کے واسطہ سے خلق تک پہنچا۔ دوسرا وہ ہے جو اللہ اور اس کے بندہ کے درمیان ہے۔ اصلاً اس طریقہ میں کوئی بھی درمیانی واسطہ نہیں ہے۔ (فیوض الحرمین ص ۵۰) حضرت مجدد الف ثانیؒ کا مذکورہ بیان بھی یہی معنی رکھتا ہے

(۳) امام غزالیؒ: حضرت امام غزالیؒ نے علم باطن کو علم ظاہر سے الگ تسلیم کیا ہے اور اس کو خواص کے علم سے

تعبیر کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

اِنَّ مِنَ الْعِلْمِ كَهَيْئَةِ الْمَكْنُوْنِ لَا يَعْلَمُه' اِلَّا اَهْلُ الْمَعْرِفَةِ بِاللّٰهِ تَعَالٰی

بعض علوم پوشیدہ راز کی صورت میں ہوتے ہیں، جنہیں صرف وہ لوگ جانتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتے ہیں۔

امام غزالیؒ کا خیال ہے کہ اس سے مراد علم باطن ہے۔ (احیاء علوم الدین اول ص ۱۹)

اس علم کے متعلق دیگر صوفیہ کی طرح وہ بھی فرماتے ہیں کہ "یہ وہ علم ہے جو کتابوں میں نہیں لکھا جاتا بلکہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ اس کا کچھ حصہ عطا فرما دیتا ہے، وہ دوسروں سے اس کا ذکر نہیں کرتا۔ البتہ ان سے ضرور کہہ دیتا ہے جو اس کے اہل ہوں اور وہ اس کے شریکِ راز ہوتے ہیں۔ (احیاء علوم الدین اول ص ۱۹)

امام غزالیؒ کی مزید وضاحت

امام موصوف نے اسے علم معاملہ اور علم مکاشفہ میں تقسیم کیا ہے اور مؤخر الذکر کو علم باطن کہا ہے۔ پہلی قسم کا علم یا علمِ معاملہ احوالِ باطن کی نگہداشت اور صفائی باطن کے طریقے دریافت کرنے کا نام ہے۔ چنانچہ اسے علم اعمالِ قلوب بھی کہتے ہیں۔ اہلِ تصوف کا خیال ہے کہ یہ علم کتابوں سے حاصل نہیں ہوتا اور نہ کسی کے بتانے سے آتا ہے۔ لَمْ يَكُوْنُوْا يَتَلَقَّوْنَ هٰذَا الْعِلْمَ دِرَاسَةً عَنِ الْكُتُبِ وَلَا يَتَلَقَّاهُ بَعْضُهُمْ عَنْ بَعْضٍ بِالْسِنَةِ (قوت القلوب اول ص ۱۹۸) بلکہ اس کا حصول ماسویٰ اللہ سے انقطاع اور صدقِ ارادت پر موقوف ہے۔ جس کے لئے کسی عالمِ باطن کی صحبت میں رہنا ضروری خیال کیا جاتا ہے کیونکہ اسی وساطت سے اعمالِ باطنی درست ہو سکتے ہیں اور اس علم تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے جو خدا کی طرف سے براہ راست ہے اور جسے علمِ مکاشفہ یا علمِ حقیقت کہتے ہیں۔

اہلِ تصوف کا سارا زور اسی علم کے حصول پر ہے لیکن باطنی حقائق جن کی دریافت پر اس علم کا انحصار ہے، وہ حواس ظاہری کے ادراک سے باہر ہیں کیونکہ ان کا تعلق عالم مادیات کی بجائے عالم روحانی یا عالم ملکوت سے ہے۔ اُس عالم کو ہمارے اس عالم اجساد یا عالم مادیات کا باطن اور اس کی اصل کہا گیا ہے۔ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ فرماتے ہیں کہ "ملک ہستی کا ظاہر اور ملکوت اس کا باطن ہے۔ لیکن عالمِ ملکوت اور عالمِ اجساد کے درمیان پردہ حائل ہے اور وہ ہم سے غیب میں ہے۔ اگر اس طرف جانے کے لئے کسی طرح کوئی پگڈنڈی مل جائے تو آمد و رفت کا سلسلہ کھل سکتا ہے اور وہاں سے رسم و راہ پیدا ہو سکتی ہے۔ اہلِ تصوف کو اس پگڈنڈی کے تلاش کرنے کا دعویٰ ہے۔ چنانچہ صوفیاء محققین کا خیال ہے کہ حواسِ باطنی کو ترقی دے کر عالم ملکوت کا مشاہدہ اور غیر مادی حقائق کا علم حاصل ہو سکتا ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں۔

"جس طرح عالمِ محسوسات یعنی عالمِ جسمانی کے لئے قلب کی طرف حواس خمسہ کے پانچ دروازے ہیں، اسی طرح عالمِ ملکوت یعنی عالمِ روحانی کی طرف بھی دل میں ایک دروازہ ہے۔" (کیمیائے سعادت ص ۱۲) یہ دروازہ بالعموم خواب میں کھلتا ہے۔ جب حواس ظاہری معطل ہو جاتے ہیں اور عالمِ جسمانی سے ان کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں۔

"جس طرح خواب میں بہت سی اشیاء بزبانِ حال پیغمبروں کے علاوہ عام آدمیوں کو بھی تمثیلی رنگ میں نظر آتی ہیں اور وہ آوازیں سنتے ہیں مثلاً کوئی خواب میں دیکھتا ہے کہ اونٹ اس سے باتیں کر رہا ہے یا گھوڑا اس کو خطاب کر رہا ہے یا کوئی مردہ اس کو کچھ دے رہا ہے یا اس کا ہاتھ پکڑ رہا ہے یا اس سے چھینتا ہے یا یہ دیکھے کہ اس کی انگلی آفتاب، سورج، یا چاند گرہن بن گئی ہے یا اس کا ناخن شیر بن گیا ہے۔ اس قسم کی صورتیں جنہیں لوگ خواب میں دیکھا کرتے ہیں، انبیاء کو یہ چیزیں بیداری میں نظر آتی ہیں اور اسی بیداری کی حالت میں یہ چیزیں ان سے خطاب کرتی ہیں۔"

امام غزالیؒ نے معارج القدس میں قوتِ متخیلہ کی بلند پروازی اور عالمِ بالا سے اس کے اتصال پر تفصیل سے بحث کی ہے اور حکماء یونان کے اس خیال کو تسلیم کیا ہے کہ افلاک ذی روح اور تمام کلیات و جزئیات کی صور علمیہ ان کے نفس میں مرتسم ہیں اور یہ تمام صورتیں جو نفسِ فلکی میں مرتسم ہیں تخیل کے اعلیٰ درجہ میں انسان کے نفسِ ناطقہ میں مرتسم ہو جاتی ہیں۔ عالمِ بالا کے حقائق و معانی جو کسی صورت میں متمثل ہو کر نظر آتے ہیں یا محسوس ہوتے ہیں، امام غزالی اس چیز کو تمثیلِ خیال کہتے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عالمِ ملکوت اور عالمِ اجساد کے درمیان ایک اور عالم کا وجود ہے جس کا نام عالمِ مثال ہے۔ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ نے اس عالم کو خواب کی سیرگاہ بتایا ہے، جیسا کہ فرماتے ہیں۔

"سیرگاہ اُو عالمِ مثال است کہ متضمن عجائب ملک وملکوت است"

(خواب کی سیر اس عالم میں ہے اس میں عجائبات ملک اور ملکوت ہیں) اس عالم کی حقیقت ان کے بیان کے مطابق یہ ہے کہ عالمِ مثال، عالمِ ارواح اور عالمِ اجسام کے معانی وحقائق کے لئے آئینہ کی مانند ہے کہ اس عالمِ مثال میں اجسام وارواح کے معانی وحقائق لطیف صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں کیونکہ اس میں ہر معنی و حقیقت کی ایک خاص مناسب شکل ہے۔ عالمِ مثال میں بذات خود کوئی صورت اور شکل و ہیئت نہیں ہے۔ صور و اشکال دوسرے عالموں سے آ کر اس میں عکس ڈالتی ہیں جس طرح آئینہ میں کوئی صورت نہیں ہوتی بلکہ جو صورتیں اور شکلیں اس میں آتی ہیں، وہ باہر سے آتی ہیں۔

شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک عالمِ مثال کی صورت یہ ہے جو آپ حسب ذیل الفاظ میں فرماتے ہیں۔ "عالم

موجودات میں ایک ایسا عالم بھی ہے جو غیر مادی ہے اور جس میں معانی ان اجسام کی صورت میں متشکل ہوتے ہیں جو اوصاف کے لحاظ سے ان کے مناسب ہیں۔ پہلے اس عالم میں اشیاء کا ایک گونہ وجود ہو سکتا ہے، تب دنیا میں ان کا وجود میسر ہوتا ہے اور یہ دنیاوی وجود ایک اعتبار سے بالکل اس عالم مثال کے وجود کے مطابق ہوتا ہے۔ اکثر وہ اشیاء عوام کے نزدیک جسم نہیں رکھتیں۔ اس عالم میں منتقل ہوتی اور اترتی ہیں اور عام لوگ ان کو نہیں دیکھتے۔ (حجۃ اللہ البالغہ مصر، ج ا،ص ۱۰)

اس عالمِ مثال کے علاوہ شاہ ولی اللہؒ ایک اور عالم، یعنی عالم برزخ کی بات کرتے ہیں جو ان کے خیال میں عالمِ اجسام اور عالمِ مثال کے بیچ میں ہے اور دونوں عالموں کے احکام کا جامع ہے۔ انہوں نے معراج کو اسی عالم کی سیر بتایا ہے جہاں نبی کریم ﷺ کے جسم پر روح کے احکام ظاہر ہوئے اور روح پر معاملاتِ روحانی جسم کی صورت میں نمایاں ہوئے (مشائخ کو ان کے قول سے اختلاف ہے)۔ شاہ صاحب کا دعویٰ ہے کہ اس طرح کے وقائع صرف پیغمبرانِ عالی مرتبت ہی کے سامنے پیش نہیں آتے بلکہ اولیاء اُمت کے بھی مشاہدہ میں آتے ہیں جیسا کہ آپؒ فرماتے ہیں۔

وَ قَدْ ظَهَرَ لِحِزْ قِيلَ وَ مُوسٰى وَ غَيْرِهِمَا عَلَيْهِمُ السَّلَامُ نَحْوٌ مِنْ تِلْكَ الْوَقَائِعِ وَ كَذٰلِكَ لِأَوْلِيَاءِ الْأُمَّةِ (حجۃ اللہ البالغہ مصر دوم ص ۱۵۴)	اور اس قسم کے واقعات حضرت حزقیلؑ اور حضرت موسیٰؑ وغیرہ کو پیش آئے، اسی طرح اولیاء امت کو بھی پیش آتے ہیں۔

امام غزالیؒ کیمیائے سعادت میں فرماتے ہیں کہ ”دل ایک آئینہ کی طرح ہے اور لوحِ محفوظ بھی ایک آئینہ ہے جس میں تمام موجودات کی تصاویر ہیں جیسے صاف آئینہ کو تصوروں والے آئینہ کے سامنے رکھیں تو تمام تصویریں اس میں صاف نظر آتی ہیں۔ اسی طرح جب دل کا آئینہ صاف اور تمام محسوسات سے مُبرّا ہوتا ہے تو وہ لوحِ محفوظ سے تعلق پیدا کر لیتا ہے۔ پھر لوحِ محفوظ کی تمام تصویریں دل کے آئینہ میں جھلکنے لگتی ہیں۔

(کیمیائے سعادت ص ۱۳)

عالم غیب کی باتوں کا ایک صوفی کے قلبِ صافی پر عیاں ہونا خواب اور بیداری دونوں ہی حالتوں میں یکساں ہے۔ خواب میں اس وجہ سے کہ قلب عالم محسوسات سے کلیتاً فارغ رہتا ہے، چنانچہ اہل تصوف کے خیال میں وہ عالم ملکوت سے ربط پیدا کر لیتا ہے اور اس طرح غیب کے عجائب وغرائب کو دیکھ لیتا ہے اور جو کچھ آئندہ ہونے والا ہوتا ہے، اسے صاف طور پر نظر آجاتا ہے مگر خیالی کے لباس میں۔ یہی وجہ ہے کہ صوفی عارف کی نیند کو بھی عین بیداری کہا گیا ہے اور اس کا سونا جاہل کی نماز پر فضیلت رکھتا ہے کیونکہ اہل تصوف کا خیال ہے کہ عارفؒ کا قلب نیند کی حالت میں بھی بیدار رہتا ہے اور خواب میں وہی کچھ دیکھتا ہے، جو انبیائے کرامؑ حالت بیداری میں دیکھتے ہیں لیکن یہ چیز کچھ خواب کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ بیداری میں بھی ایسا ہونا

ممکن ہے۔امام غزالیؒ فرماتے ہیں۔

فَیَتَلَقَّوْنَ مِنْ اَمرِ الْغَیبِ فِی الْیَقْظَةِ — وہ بیداری میں غیب کی باتیں اخذ کر لیتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ کا خیال ہے کہ ''اسے خواب اور بیداری دونوں حالتوں میں فرشتے نظر آتے ہیں اور فرشتوں کی جماعت جن کاموں پر مامور ہے سالک انہیں ان کاموں کو کرتے اور اس ضمن میں آتے جاتے دیکھتا ہے اور انہیں جانتا پہچانتا بھی ہے۔(ہمعات ص ۲۴)

نیز غیبی امور سے اس کی واقفیت کی صورت یا اس کا ذریعہ علم بعینہ وہی ہوتا ہے جو انبیاء علیہم السلام کا رہا ہے جیسا کہ امام غزالیؒ فرماتے ہیں، کبھی انبیاء اور کبھی اولیاء کو بیداری اور صحت میں خوبصورت صورتیں نظر آتی ہیں جو جواہرِ ملائکہ کے مشابہ ہوتی ہیں۔ انہی صورتوں کے ذریعے انبیاء اور اولیاء کو وحی و الہام ہوتا ہے۔''
(فیصل التفرقہ ص ۳۵)

گویا اولیاء کو جو علم بذریعہ الہام حاصل ہوتا ہے اس میں اور پیغمبروں کے علم میں جو انہیں بذریعہ وحی حاصل ہوتا ہے مصدر کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ دونوں کے حصول کی جگہ اور صورت ایک ہی ہے۔

صوفیاء کا یہ وثوق ان کے اس خیال کی بنیاد پر ہے کہ

اِذَا بَلَغَ الْعَبْدُ مَقَامَ الْمَعْرِفَةِ اَوْحَی اللّٰهُ تَعَالٰی اِلَیْهِ بِخَوَاطِرِهٖ وَحَرَسَ سِرَّہٗ اَنْ لَّا یَسْنَحَ فِیْهِ غَیْرُ خَاطِرِ الْحَقِّ
(الرسالۃ القشیریہ،ص،۱۸۵)

بندہ جب معرفت کے مقام پر پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے اس کے دل میں بات ڈالتا ہے اور اس کے سرِّ کی نگہبانی کرتا رہتا ہے۔ تاکہ اس میں غیر خدا کی جانب سے کوئی بات القاء نہ ہو۔

(۴) شیخ ابونصر سراج طوسیؒ

فَالْعِلْمُ ظَاهِرٌ وَّ بَاطِنٌ وَّالْقُرْاٰنُ ظَاهِرٌ وَّ بَاطِنٌ وَ حَدِیْثُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ظَاهِرٌ وَّ بَاطِنٌ

علم عیاں بھی ہے اور نہاں بھی، قرآن کھلا بھی ہے اور پوشیدہ بھی اور حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔

اس خصوصی علم کی دو قسمیں بتائی گئی ہیں۔ ایک وہ جسے صرف ان لوگوں پر ظاہر کیا جاتا ہے جو اس کے اہل ہوتے ہیں۔ دوسرا وہ علم جس کا تعلق صرف خدا سے ہوتا ہے اور کسی کے سامنے ظاہر نہیں کیا جاتا۔
(احیاء علوم الدین اول ص ۸۹)

(۵) شیخ یحییٰ منیریؒ

ظاہری طہارت اور ظاہری تہذیب سے جس امر کو تعلق ہے شریعت ہے اور تزکیہ باطن اور تصفیہ قلب سے

جس کو لگاؤ ہے وہ طریقت ہے جیسا کہ کپڑے کو دھو کر ایسا پاک بنا لینا کہ اسے پہن کر نماز پڑھ سکیں یہ فعل شریعت ہے اور ہمیشہ باوضو رہنا طریقت ہے (مکتوبات ص ۸۶، ۸۳)

شیخ یحیٰی منیریؒ مزید فرماتے ہیں "اپنے اولیاء کے ساتھ حق تعالیٰ کی سنت رہی ہے کہ وہ پسند کرتا ہے کہ ان پر آشکار کرے جو مخفی ہو، ان کا سر جو کچھ بھی اخذ کرتا ہے، سب حق وصواب ہوتا ہے۔"

اہل تصوف کا عام خیال یہ ہے کہ اس مقام خاص میں پہنچ کر عارف کے قلب پر علم کے انوار روشن ہو جاتے ہیں جس سے وہ غیب کے عجائب وغرائب کو دیکھ لیتا ہے یہاں تک کہ کوئی بات نہ اس پر مخفی رہتی ہے اور نہ کوئی چیز اس سے غیب میں ہوتی ہے۔ اس دعویٰ ہمہ دانی کی ایک مثال کے متعلق حضرت شبلیؒ کا یہ قول ہے کہ

لَوْدَبَّتْ نَمْلَةٌ سَوْدَآءُ عَلٰی صَخْرَةٍ صَمَّآءٍ فِیْ لَیْلَةٍ ظَلْمَآءٍ وَلَمْ اَشْعُرْبِھَا وَلَمْ اَعْلَمْ بِھَا لَقُلْتُ اَنَّہٗ خَدَعٌ

کسی تاریک رات میں سخت چٹان پر اگر کوئی سیاہ چیونٹی رینگے اور میں اس سے واقف یا خبر نہ رکھوں تو یہ کہوں گا کہ میرے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے۔

حضرت ابراہیم الدسوقیؒ لکھتے ہیں کہ

شَھَدَنِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی مَا فِی الْعُلٰی وَاَنَا ابْنُ سِتِّ سِنِیْنَ وَنَظَرْتُ فِی اللَّوْحِ الْمَحْفُوْظِ وَاَنَا ابْنُ ثَمَانِیْ سِنِیْنَ وَفَکَکْتُ طِلَسْمَ السَّمَآءِ وَاَنَا ابْنُ تِسْعِ سِنِیْنَ وَرَاَیْتُ فِی السَّبْعِ الْمَثَانِیْ حَرْفًا مُعْجَمًا حَارَفِیْہِ الْجِنُّ وَالْاِنْسُ فَفَھِمْتُہٗ وَحَمِدْتُ اللّٰہَ تَعَالٰی عَلٰی مَعْرِفَۃٍ بِاِذْنِ اللّٰہِ تَعَالٰی وَاَنَا ابْنُ اَرْبَعَ عَشْرَۃَ سَنَۃً وَّالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

(الطبقات الکبریٰ اول ص ۱۸۳)

جب میں چھ برس کا تھا تو اللہ تعالیٰ نے جو کچھ آسمان کی پہنائیوں میں ہے، اس کا مجھے مشاہدہ کرایا۔ جب میں آٹھ سال کا ہوا تو میں نے لوحِ محفوظ کو دیکھ کر اس کا اندازہ کر لیا اور جب نو سال کی عمر کو پہنچا تو آسمان کے طلسم کو میں نے توڑ دیا اور جب چودہ برس کی میری عمر ہوئی تو میں نے سبع مثانی میں ایک معجم غیر معرب کلمہ دیکھا جس میں جملہ جن وانس حیران وسرگرداں تھے۔ میں نے اسے سمجھ لیا اور اس کی معرفت پہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ جو ساکن تھا میں نے اسے خدا کے حکم سے حرکت دی اور جو متحرک تھا، میں نے خدا کے حکم سے ساکن بنایا اور اللہ رب العالمین کا شکر ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ اپنے بڑے چچا حضرت شیخ ابوالرضا محمدؒ کی وسعتِ علم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انہوں نے ایک خادم کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"بخدا اگر زمین کے نچلے طبق میں ایک چیونٹی ہو اور اس کے دل میں سو خیالات آئیں تو اس کے ننانوے خیالات میں جانتا ہوں اور حق تعالیٰ سو کے سو کو جانتا ہے"۔

(۶) حضرت عبدالواحد بن زیدؒ

آپؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت حسنؓ سے علم باطن کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے حضرت حذیفہؓ سے علم باطن کے بارے میں پوچھا کہ وہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ میں نے جبریلؑ سے اس بارے میں سوال کیا تو انہوں نے کہا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے علم باطن کے متعلق پوچھا کہ وہ کیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ میرے اور میرے احباء واولیاء واصفیاء کے درمیان ایک راز ہے جسے میں ان کے دلوں میں ڈالتا ہوں۔ اس پر نہ کوئی مقرب فرشتہ مطلع ہو سکتا ہے اور نہ کوئی فرستادہ پیغمبر۔

(۷) اس راز کے متعلق امام غزالیؒ کی آراء

هُوَ سِرٌّ مِنْ اَسْرَارِ اللهِ تَعَالٰى يَقْذِفُهُ اللّٰهُ تَعَالٰى فِىْ قُلُوْبِ اَحِبَّآءِ لَمْ يُطْلِعْ عَلَيْهِ ملکاً وَّلا بَشَراً (احیاء علوم الدین سوم، ص ۲۱)

یہ اللہ تعالیٰ کے رازوں میں سے ایک راز ہے جسے وہ اپنے احبا کے دلوں میں ڈالتا ہے اور اس پر کسی فرشتہ اور انسان کو مطلع نہیں کرتا۔

اس راز کو مشائخ صوفیہ ربوبیت کا راز کہتے ہیں جسے ظاہر کرنا ان کے نزدیک کفر ہے کیونکہ اگر اسے ظاہر کر دیا جائے تو ان کے خیال میں نبوت بیکار ہو جائے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان رازوں میں سے کئی راز حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سینہ میں ڈالے گئے جس کی وجہ سے وہ دیگر صحابہ پر فضیلت رکھتے تھے۔ اس ضمن میں ایک حدیث پیش کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

مَا فَضَّلَكُمْ اَبُوْ بَكْرٍ بِكَثْرَةِ صِيَامٍ وَّلَا صَلٰوةٍ وَّ لٰكِنْ بِسِرٍّ وُّقِرَ فِىْ صَدْرِهٖ
(احیاء علوم الدین اول ۲۱،۸۸)

تم لوگوں پر ابو بکر کی فضیلت زیادہ روزہ رکھنے اور زیادہ نماز پڑھنے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس راز کی وجہ سے ہے جو ان کے سینے میں رکھ دیا گیا ہے۔

باطنی واردات اور کلامِ اقبالؒ

علامہؒ نے فرمایا کہ کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جن کا تعلق قلبی واردات سے ہے وہ بھی باطن کا حصہ کہلایا جاتا ہے۔ (اس کتاب میں خواطر قلبی پر ایک باب لکھا جا چکا ہے۔ اس کا وہ حصہ ملاحظہ فرمائیں۔) علامہ اقبالؒ نے بہت عمیق کلام واردات قلبی پر لکھا ہے، انہوں نے ان واردات کو پیش آنے والی حالتیں یا جان و دل پر گزرنے والی کیفیتوں کے طور پر لکھا ہے۔ اگر اس اعتبار سے دیکھا جائے تو واردات کا مقام چونکہ اکثر اوقات قلب پر ہوتا ہے لہٰذا آپ نے دل پر ان کیفیتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

عبد را تحصیل حاصل فطرت است واردات جانِ او بے ندرت است (ا۔ ر: ۷۳)

(غلام کی فطرت یہ ہے کہ وہ حاصل کردہ چیز کو ہی حاصل کرتا ہے۔ اس کے اندرونی مشاہدات ندرت سے خالی ہیں۔)

خنک آں ملتے کز وارداتش قیامت ہا بہ بیند کائناتش

(مبارک ہے وہ ملت جس کے کارناموں کے طفیل، اُس کے دور نے کئی قیامتیں دیکھیں۔)

چہ پیش آید، چہ پیش افتاد او را تواں دید از جبینِ اُمہاتش (ا۔ح:٩٧٦)

(کسی قوم کو کیا پیش آنے والا ہے اور کیا پیش آچکا ہے (یہ سب) اس کی ماؤں کی جبینوں سے دیکھا جاسکتا ہے)

فقر و شاہی وارداتِ مصطفیٰ است ایں تجلیہاے ذاتِ مصطفیٰ است (پ۔چ:٨٥١)

(فقر اور شاہی رسول اللہ ﷺ کی شخصیت عظمیٰ کے دو پہلو ہیں، یہ حضورِ اکرم ﷺ کی تجلیات سے ہی قائم ہیں۔)

باطن کا لفظ اَلْبَطَنُ سے بنا ہے جس کے معنی اہل عرب پیٹ کے لیتے ہیں۔ مفردات میں ہے کہ ہر اس چیز کو جس کا حاسہ بصر سے ہو سکے اسے ظاہر اور جس کا حاسہ بصر سے ادراک نہ ہو سکے اسے باطن کہا جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے باطن سے مراد اندرون یا تہہ دل جس کا حال دوسرا نہ جانتا ہو لیا ہے۔ قلب و نفس اور روح کی گہرائی کو بھی باطن میں شامل کیا ہے اور آپؒ کا اس موضوع پر بہت سا کلام موجود ہے لیکن ایسے کلام کو یہاں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ چند اشعار پیش کیے جا رہے ہیں۔

ساختی ایں رشتہ را زنارِ دوش کشتۂ مثلِ بتاں باطل فروش (ا۔ر:٧٢)

(تو نے رات اور دن کے دھاگے کو اپنے کندھوں کا بوجھ بنالیا ہے اور بتوں کی مانند باطل فروش بن گیا ہے۔)

درصفائے اوز قلبِ مومن است ظاہرش روشن ز نورِ باطن است (ا۔ر:٩٧)

(قلبِ مومن کی صفائی ہوتی ہے اور اس کا ظاہر نورِ باطن سے روشن ہوتا ہے۔)

ہستیِ مسلم ز آئین است و بس باطن دینِ نبیؐ این است و بس (ا۔ر:١٢١)

(مسلم کی ہستی آئین قرآن سے ہی ہے اور بس، رسول اللہ ﷺ کے دین کا باطن اس سے ہی قوی ہوتا ہے۔)

باطنِ ہر شے ز آئینے قوی تو چرا غافل زایں ساماں روی (ا۔ر:٤١)

(ہر شے کی پختگی یعنی اندرونی مقام آئین سے ہے، تو کیوں اس سامان سے بے خبر جا رہا ہے۔)

ظاہر اور باطن پر علامہ اقبالؒ کے اور بھی بہت سے اشعار ہیں جو تنگی قرطاس کی باعث شامل نہیں کیے جا رہے ہیں۔

باب ۴۶

خلوت اور جلوت کی کرامات

سوز و ساز خلوت و جلوت سے حاصل ہونے والی کیفیات ہیں اور یہ کیفیات عوام الناس کی دسترس سے بہت دور ہوتی ہیں۔ جولوگ روحانی دنیا میں قدم رکھتے ہیں ان کے خلوت و جلوت سے حاصل ہونے والے کمالات سے آشنائی نہایت ضروری ہے کیونکہ روحانی ابواب میں ان کے بغیر لب کشائی نہیں کی جاسکتی۔ مناسب ہوگا کہ روحانی نصاب کے یہ دو احوال اس کتاب میں شامل گفتگو کیے جائیں تاکہ رہروانِ طریقت کے لئے یہ اہم راستہ آسانی سے کھل سکے۔

اولیائے کرامؒ نے (بالخصوص سلسلۂ نقشبندیہ میں) دوام خلوت کو بہت اہمیت دی ہے۔ خلوت کے بارے میں سیدھی سادھی بات یہ ہے کہ جب سالک کے ظاہری حواس کے دروازے بند ہو جائیں تو وہ خواب میں بہت سی جگہوں اور مقامات کی سیر کرتا ہے۔ چنانچہ اولیائے کرام نے جب بھی اپنے ظاہری حواس کو بند کر دینے کی مشق کی تو ان کے باطنی حواس کھل گئے کیونکہ قلب کے حواس اس وقت تک نہیں کھلتے جب تک ظاہری حواس بند نہ کر دیئے جائیں۔ اسی حقیقت کو خلوت کے معنوں میں ظاہر کیا گیا ہے۔ خلوت کی مذکورہ بالا خوبی کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نبوت کی ابتداء سے پندرہ سال پہلے ہی خلوت کو پسند فرمایا اور غار حرا میں ایک ایک دو دو ہفتہ کی مدت کے لئے تنہائی میں عبادت کرتے رہے۔ اس خلوت میں ان کو انوار کا مشاہدہ ہوتا، اولیائے کرام نے غارِ حرا کی پیمائش کو ذہن میں رکھ کر اس بات کو ضروری سمجھا ہے کہ خلوت خانہ بہت تنگ ہو کہ جس میں سالک آرام سے چار زانو بیٹھ سکے اور کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکے۔ خلوت کرنے والا بجز دینی ضروریات مثلاً نفسانی خیالات کو دور کرنے، اخلاص کو نور سے منور کرنے، عقل کو ایمان سے اور اعضاء کو طاعت سے معمور کرنے کے متعلق مختلف ہدایات کا خاص خیال رکھے تاکہ خلوت کو صحیح معنوں میں اختیار کر سکے۔ ایسی کتب کا مطالعہ ضروری ہے کہ وہ کھانے پینے اور دیگر ضروریات زندگی کے متعلق مکمل ہدایات حاصل کر سکے۔

احادیث (اور روایات) صحیحہ میں حضور اکرم ﷺ کی غار حرا میں خلوت نشینی کے متعلق بہت تفصیلات موجود ہیں جن کا مطالعہ کرنا ہر شخص کے لئے خلوت اختیار کرنے سے پہلے ضروری ہے۔ وحی کی ابتدا بھی غارِ حرا سے ہوئی۔ اتنے طویل مجاہدات گذارنے کے بعد آپ ﷺ کو تبلیغ کو حکم ہوا جس کے بعد آپ ﷺ نے

جلوت اختیار کی جیسا کہ مولانا حالیؒ نے فرمایا

ع۔ اُتر کر حرا سے سُوئے قوم آیا

حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا کہ جو شخص دین کی سلامتی اور بدن وروح کے آرام کا خواہاں ہوا سے چاہیے کہ لوگوں سے یکسوئی اختیار کرے کیونکہ یہ زمانہ وحشت کا ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کو حضور اکرم ﷺ کی صحبتِ اختیار کرنے میں خلوت سے بھی زیادہ فوائد حاصل ہوتے تھے کیونکہ وہ آپ ﷺ کی انتہائی درجے کی اتباع میں زندگی بسر کرتے تھے اور حضور پاک ﷺ کے قلب کا عکس ان پر پڑتا اس لئے حضور پاک کی جلوت ان کی خلوت پر فائق تھی۔ خلوت کی مقدار مرید کے احوال کے مطابق اس کا مرشد تجویز کرسکتا ہے۔ یہ بات دیکھنے میں آئی ہے جس قدر مشائخ عظام گذرے ہیں سب نے ایک خاص وقت تک خلوت اختیار کی اور پھر جلوت میں آ کر لوگوں کے لئے فیض رسانی کا ذریعہ بنے۔ تمام پیغمبرانِ اسلام اور چیدہ چیدہ بزرگوارانِ اسلام کا یہی طریقہ رہا ہے اور یہ تمام باتیں روایاتِ صحیحہ سے واضح ہو چکی ہیں۔

خلوت کے فوائد

خلوت کی بدولت ہمیشہ پاک وصاف رہنا، نماز اور باجماعت نماز کے لئے تیار رہنا، تمام حواس کا فضول حرکات سے بچا رہنا اور حدودِ شرعیہ کا اہتمام کرنا نصیب ہوتا ہے۔ بعض مشائخ نے خلوت کی مقدار چالیس روز ذیل کی حدیث کی وجہ سے رکھی ہے۔

''حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے روایت کی ہے کہ جو شخص چالیس صبح حق تعالیٰ کے لئے اخلاص کا (برتاؤ) کرے تو حکمت کے چشمے اس کے دل اور زبان سے جاری ہونے لگیں گے اور بعض مشائخ نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت بتاتے ہوئے خلوت کی مقدار ایک مہینہ رکھی ہے''

علامہ اقبالؒ نے خلوت اور جلوت کو کمالِ سوز وساز کہا ہے اور فرمایا کہ دونوں مقامات اور حالات نیاز مندی کے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ دونوں (خلوت اور جلوت) میں اگرچہ خدا ہی ملتا ہے مگر روحانی دنیا کی ابتدا خلوت سے ہوتی ہے اور انتہاء جلوت سے ہے (جب تک خلوت سے رضائے حق کو حاصل نہ کرے گا اس وقت جلوت کے اثرات رونما نہیں ہوں گے) حضور اکرم ﷺ نے نبوت سے پہلے خلوت کا راستہ اختیار کیا اور سوائے اللہ کے اور دوسری چیز کی طرف التفات نہ کیا۔ علامہؒ فرماتے ہیں کہ اگر چہ تیری روح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح روشن کیوں نہ ہو پھر بھی تمہاری سوچ کے افکار بانجھ ہی رہیں گے یہ بات تو خلوت کرنے والے کی روح اور اس کی ہستی کی عظمت پر مدار کرتی ہے۔ علامہؒ فرماتے ہیں کہ جب ذوق نغمہ (ارتعاش نغمانی

کے باعث) مجھے خلوت میں لے آتی ہے تو میں اپنی تنہائی میں قیامت برپا کر دیتا ہوں علامہؒ فرماتے ہیں کہ اسرافیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے پاس جا کر کہا کہ مجھے اس شخص (اقبالؒ) سے ڈر لگتا ہے کہ یہ اپنے تخیلات کو جوش میں لا کر وقت سے پہلے ہی قیامت برپا نہ کر دے۔

حضورِ حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی　　یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا

(ب۔ج:۳۱۵)

علامہؒ نے فرمایا کہ جب میں خلوت اختیار کرتا ہوں تو اپنے دل سے پوری کائنات کی نفی کر دیتا ہوں۔ مولانا رومیؒ نے فرمایا کہ غیب وحضور جلوت اور خلوت کی ہی دو اطراف ہیں۔ خلوت غیب کے مترادف ہے اور اس میں اثبات ہے۔ حضور جلوت کا نام ہے اور اس میں حرکت ہے۔ انسان کی جلوت اللہ کے نور سے روشنی حاصل کرتی ہے اور جلوت میں نورِ ذاتِ الٰہی جلوہ گر ہوتا ہے عقل انسان کو جلوت کی طرف لے جاتی ہے اور عشق اس کو خلوت کی طرف کھینچتا ہے۔ خلوت میں بندہ اللہ کا تصور جما کر بیٹھ جاتا ہے۔ چند صفحات کے بعد علامہ اقبالؒ اور مولانا رومیؒ کے کلام کو اس باب میں شامل کر دیا گیا ہے۔

خلوت

خلوت انقطاع از ماسوی اللہ کی اصل ہے۔ اس میں بندے کو حق تعالیٰ کے ساتھ جو نسبت راز و نیاز حاصل ہوتی ہے اس میں کسی دوسری چیز کو شریک نہ کیا جائے یہ مقصد جن جن صورتوں سے حاصل ہو وہ سب خلوت میں شامل ہیں۔ درج ذیل اشعار بھی سرِّ دلبراں میں دیئے گئے ہیں۔

غیر را از خانہ بیروں کن درا با حق نشیں　　راز خود از حق بگوئے و در وئے غیرحق مبیں

(غیر اللہ کو اس گھر سے دور کر دو اور دل میں حق نشیں کراؤ۔ اپنا راز خدا سے کہہ دو اور اللہ کے غیر کا چہرہ نہ دیکھو)

از دروں شعر آشنا و از بروں بیگانہ وش　　ایں چنیں زیبا روش کم می بود اندر جہاں

(سرِّ دلبراں)

(اندر سے خدا آشنا ہو اور باہر سے بیگانہ ہو جا اس قسم کی خوبصورت روش دنیا میں کم ہوتی ہے۔)

خلوت در انجمن

ایسے لوگ جو بظاہر مخلوق کے ساتھ ہوں اور باطنی طور پر حق تعالیٰ کے ساتھ ہوں خلوت در انجمن کہلاتا ہے حق تعالیٰ نے ایسے حضرات کے لئے فرمایا ہے۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (النور:۳۷)　　(وہ (جواں) مرد جنہیں غافل نہیں کرتی تجارت اور نہ خرید و فروخت یادِ الٰہی سے)

خلوت میں خلع بدن کی حالت بھی کبھی رونما ہوتی ہے کہ جس میں روح صورت مثالی کے ساتھ نکل کر عالمِ بالا کی سیر کرتی ہے اور لباس بدن سے ایسے الگ ہو جاتا ہے جیسے جسم سے کپڑے اتر جاتے ہیں۔ یہ جبروت کی ابتدائی حالتوں میں سے ایک حالت ہے۔

جلوت

جلوت سے مراد صوفیوں کی وہ حالت ہے جو خلوت کے بعد ہوتی ہے۔ خلوت میں جو حق تعالیٰ سے نسبت راز و نیاز حاصل ہوتی ہے اس کے اثرات جلوت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ خلوت میں حاصل کردہ لطف و رحمت جملہ افضال و آثار خیر و طاعت، عبادت و حسنات کا صدور اسی حالت میں ہوتا ہے۔ یہ لفظ جلوت اَلْجَلْو سے بنا ہے جس کے معنی نمایاں طور پر ظاہر ہو جانے کے ہیں اور "جلوہ" بھی اسی سے بنا ہے جیسا کہ فرمایا: **فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ** (الاعراف ۱۴۳) (پھر جب تجلی ڈالی ان کے رب نے پہاڑ پر۔) جو لوگ خلوت میں نہ ہوں اور عامیانہ زندگی گذار رہے ہوں ان کو بھی جلوت کے حال میں تصور کیا جاتا ہے ان لوگوں میں عموماً وہ پاکیزگی اور خلوت کے کمالات ناپید ہوتے ہیں اور ان میں اعمال پر پابندی کا تصور نہیں پایا جاتا۔

خدا کو دیکھنا ہو تو خود بینی پیدا کرو

خدا کو دیکھنے سے مراد یہ ہے کہ اس کو اپنی بصیرت کی آنکھوں سے دیکھا جائے اور اس کی صفات کے جلوؤں کی پہچان کی جائے۔ اگرچہ اس کا نور کائنات کی ہر چیز میں موجود ہے لیکن کائنات کی چیزوں کا بغور مطالعہ کرنے سے انسان کی سوچ خدا کا سراغ لگا لیتی ہے۔ خدا کی طرف رجوع کرنا اور اس کی پہچان کے حاصل کرنے کا ذریعہ خلوت نشینی ہے۔ جہاں انسان کی روح مائلِ پرواز ہوتی ہے اور انسان اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والے حضور کے مزے لوٹتا ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں کئی انجمنیں انسان کا طواف کرنے لگتی ہیں۔

جواں مردے کہ خود را فاش بیند جہانِ کہنہ را باز آفریند

(وہ جواں مرد جو اپنے آپ کو آشکار دیکھ لیتا ہے وہ اپنے جہانِ کہنہ کو دوبارہ پیدا کر لیتا ہے۔)

ہزاراں انجمن اندر طوافش کہ او باخویشتن خلوت گزیند (ا۔ح:۹۶۱)

(ہزاروں انجمنیں اس کا طواف کرتی ہیں کیونکہ وہ اپنے آپ میں خلوت گزیں ہوتا ہے۔)

اپنے مقصد کے حصول کے لئے ہر صاحب فراست اور ہر اللہ والے کی صحبت سے استفادہ کرنا بہتر نتائج پیدا کرتا ہے۔ اس راہ میں اصل بات نیاز مندی کا حصول ہے۔ نیاز عاشقوں کی صفت ہے اور ناز صفتِ الٰہی ہے۔ دعا ہے وہ اپنے ہر عاشق کو قوت و ارادہ عطا فرمائے اور اس کی ناقص چیز کے بدلے میں کامل چیز عطا

فرمائے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔ کہ اصلاح کرنے والے کو اس نیاز کی طلب کے لئے کوشاں رہنا چاہیے۔

علامہ اقبالؒ کی محفلِ خلوت

اس جگہ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی خلوت کی محفلوں کا ذکر کرنا آسان بات نہیں۔ البتہ علامہؒ کی ایک رباعی یاد آ رہی ہے کہ آپؒ نے فرمایا: قیامت کے دن بھی میں اپنی قوم کی سوچ وفکر میں اس طرح غرق تھا کہ میں ان نازک لحات میں بھی خودی کی خلوت میں گم ہو کر رہ گیا۔ اگرچہ میں خدا کی بارگاہ میں حاضر تھا، مگر مجھے اس بات کا احساس نہ رہا کہ میں اللہ کی بارگاہِ کبریائی میں حاضر کیا گیا ہوں، لہٰذا میرا یہ حال تھا کہ میں اپنی خلوتوں میں اس طرح محو تھا کہ گویا میں خدا کے سامنے موجود ہی نہ تھا۔ یہ اشعار بال جبریل کے صفحہ ۳۷ پر دیئے گئے ہیں اور اس کتاب میں بھی دو صفحوں کے بال دے دیئے گئے ہیں۔

خلوت اور جلوت کی وضاحت

علامہ اقبالؒ نے بہت دلچسپ انداز میں خلوت اور جلوت کی وضاحت اپنے کلام میں فلسفیانہ انداز سے کی ہے۔ اس سے پہلے کہ علامہ اقبالؒ کا کلام پیش کیا جائے موزوں ہوگا کہ مولانا رومیؒ نے اس موضوع پر جو کلام کیا ہے اس کی وضاحت کی جائے کیونکہ علامہ نے مولانا رومیؒ کو اپنا استاد اور مرشد مانا ہے۔

مولانا رومیؒ کی وضاحت

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ خلوت اور جلوت یہ غیب وحضور کے دو انداز ہیں۔ غیب میں کبھی بندہ جلوت میں نبرد آزما ہوتا ہے اور کبھی خلوت میں اپنی ہستی کو ثابت کرتا ہے۔ اس کی جلوت اللہ تعالیٰ کی صفات کے نور سے روشن ہے اور اس کی خلوت نورِ ذات سے منور ہوتی ہے۔ عقل اسے جلوت کی طرف اور عشق اسے خلوت کی طرف لاتا ہے۔ عقل بھی اس کائنات میں نبرد آزما ہوتی ہے تاکہ مادیت کے طلسم کو توڑ دے۔

شیوہ ہائے زندگی غیب و حضور آں یکے اندر ثبات آں در مرور
(غیب وحضور تو زندگی کے مختلف انداز ہیں، غیب (خلوت) میں اثبات ہے، اور جلوت میں حرکت ہے۔)

گہ بجلوت میگدازد خویش را گہ بخلوت جمع سازد خویش را
(کبھی انسان جلوت میں خود کو پگھلا دیتا ہے اور کبھی خلوت میں اپنی شخصیت کا اجماع (ثابت) کرتا ہے۔)

جلوتِ او روشن از نورِ صفات خلوت او مستنیر از نورِ ذات (ج۔ن:۲۰۹)
(اس کی جلوت اللہ کے نور سے روشن ہے اور اس کی خلوت نور ذات الٰہی سے منور ہے۔)

عقل اُو را سُوئے جلوت می کشد عشق اُو را سُوئے خلوت می کشد
(عقل اسے جلوت کی طرف لے جاتی ہے اور عشق اس کو خلوت کی طرف کھینچتا ہے۔)

عقل ہم خود را بدیں عالم زند تا طلسمِ آب و گِل را بشکند (ج۔ن:۶۰۹)
(عقل بھی اس کائنات سے نبرد آزما ہوتی ہے تاکہ مادیت کے طلسم کو توڑ دے۔)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا تاثرِ خلوت وجلوت

جاوید نامہ میں علامہ اقبالؒ ''زرتشت'' کی غزل میں خلوت اور جلوت کی مزید وضاحت فرماتے ہیں کہ میں جلوہ حق کو اس کی انجمن کے بغیر نہیں دیکھنا چاہتا کیونکہ ایسا دیکھنا غلطی ہے۔ فرماتے ہیں کہ خلوت حُسنِ مطلق کی جستجو ہے اور جلوت اس کا دیدار ہے۔ عشق خلوت میں ہو تو کلیم اللہ ہے۔ جب وہ جلوت میں آئے تو بادشاہت ہے۔ پھر خلوت وجلوت کے متعلق فرماتے ہیں۔

خلوت و جلوت کمالِ سوز و ساز ہر دو حالات و مقاماتِ نیاز
(خلوت اور جلوت دونوں سوز وساز کا کمال ہیں' دونوں نیاز کے احوال (کیفیات ومقامات میں سے ہیں۔)

چیست آں؟ بگذشتن از دیر و کنشت چیست ایں تنہا نہ رفتن در بہشت!
(خلوت کیا ہے' دیر وکنشت سے گزر جانا۔ جلوت کیا ہے؟ بہشت میں اکیلے نہ جانا۔)

گرچہ اندر خلوت و جلوت خداست خلوت آغاز ست و جلوت انتہاست
(اگرچہ خلوت اور جلوت دونوں خدا میں ہی ہے' مگر خلوت آغاز ہے اور جلوت انتہا) (ج۔ن:۶۳۹)

مصطفیؐ اندر حرا خلوت گزید مدتے جز خویشتن کس را ندید (ج۔ن:۶۵۷)
(جناب مصطفیٰ ﷺ نے غار حرا میں خلوت اختیار فرمائی اور مدت تک اپنے سوا کسی کو نہ دیکھا۔)

گرچہ داری جانِ روشن چوں کلیمؑ ہست افکارِ تو بے خلوت عقیم (ج۔ن:۶۵۸)
(خواہ تیری روح موسیٰؑ کی طرح ہی روشن کیوں نہ ہو' خلوت کے بغیر تیرے افکار بانجھ رہیں گے۔)

سرِّ دیں صدقِ مقال، اکلِ حلال خلوت و جلوت تماشائے جمال
(دین کا راز سچ بات کہنے اور حلال کھانا ہے، خلوت اور جلوت اللہ کے جمال کے دو رُخ ہیں۔) (ج۔ن:۷۹۲)

پیام مشرق میں علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب میں اللہ تعالیٰ کے جلوؤں کے ذوق میں کلام کرتا ہوں تو اس جلوہ گاہِ یار کو دیکھ کر میرے دل میں ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے اور میں اپنے سوزناک اشعار سے محفل میں قیامت برپا کر دیتا ہوں اور جب میں خلوت میں جا کر حسن مطلق کی جستجو کرتا ہوں تو اپنے دل میں پوری کائنات کی نفی کر دیتا ہوں تاکہ حضورِ قلب قائم ہو سکے۔

چو ذوقِ نغمہ ام در جلوت آرد قیامت افگنم در محفلِ خویش
(جب مجھے ذوق نغمہ جلوت میں لاتا ہے تو میں اپنی محفل میں قیامت برپا کر دیتا ہوں۔)

چو می خواہم دمے خلوت بگیرم جہاں را گم کنم اندر دلِ خویش (پ-م:۲۰۷)
(لیکن جب میں ذرا خلوت اختیار کروں تو اپنے دل میں کائنات گم کر لیتا ہوں۔)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ ایسے مسلمان کا ذکر کرتے ہیں کہ جس کا دل دنیا کے مسائل حل کرنے میں ہی مصروف رہتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اسے حضورِ قلب اور رجوع الی اللہ کی عظیم سعادت عطا فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں کہ انسان کا دل لازمی طور پر خلوت پسند ہوتا ہے۔ ایسے دل کو خلوت حاصل کرنے کے لئے دوزخ کی تنہائی بھی قبول ہوتی ہے۔

دلِ من در کشادِ چون و چند است نگاہش از مہ و پرویں بلند است
(میرا دل دنیاوی مسائل حل کرنے میں مصروف ہے (حالانکہ) اس کی نگاہ چاند اور ثریا سے بھی بلند ہے۔)

بدہ ویرانۂ در دوزخ او را کہ ایں کافر بسے خلوت پسند است
(اے خدایا! اسے دوزخ میں کوئی ویرانہ عطا کر کیونکہ یہ کافر (دل) بہت تنہائی پسند ہے۔) (ا-ح:۸۸۸)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس انہماک میں مَیں نے اس منظر کی طرف توجہ نہ دی یہاں تک کہ جب پوری کائنات کے لوگ اللہ کے سامنے باادب اور خوف زدہ ہو کر حاضر تھے، لیکن میں نے خدا کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ تمام لوگ حیرت زدہ تھے کہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کو کیا ہو گیا ہے؟ فرماتے ہیں: اپنی اس حالت کی وجہ سے میں قیامت کے دن لوگوں کے سامنے تماشہ بن گیا۔

خودی کی خلوتوں میں گم رہا میں خدا کے سامنے گویا نہ تھا میں
نہ دیکھا آنکھ اٹھا کر جلوۂ دوست قیامت میں تماشہ بن گیا میں (ب-ج:۳۷۳)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں قیامت کے دن بھی آرام سے نہ بیٹھوں گا۔ مسلمانوں کی مغفرت کے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنا گریبان چاک کروں گا۔ اللہ تعالیٰ اس کا سبب پوچھے گا تو میں امت کی بخشش کا سوال کروں گا۔ اگر ایسا نہ ہو سکا تو میں اللہ تعالیٰ کا دامن مضبوطی سے پکڑ لوں گا تاوقتیکہ اللہ تعالیٰ امت کی بخشش کے لئے رضامند ہو جائے۔ فرماتے ہیں کہ اللہ کے دامن کو میں ہرگز نہ چھوڑوں گا۔ خواہ اس کا دامن چاک ہو جائے۔

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک
(ب-ج:۳۳۴)

خلوت اور جلوت کے کمالات پر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا کلام

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ خودی کی جلوتوں میں مصطفائی ﷺ ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے

غارِ حرا کی خلوتوں میں کافی وقت گذارا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہے وہ قصیدہ جو آپ ﷺ کی شان میں لکھا گیا اس کا ایک مصرع یہ ہے کَشَفَ الدُّجٰی بِجَمَالِہٖ... آپ ﷺ کی عبادت کے نور سے اندھیرے چھٹ گئے اور آپ ﷺ کے فضائل نورِ الٰہی سے چمکے۔ اور یہ اشارہ ہے جب آپ ﷺ نے خدا کی خلوتوں میں وقت گذارا اور پھر جب آپ ﷺ لوگوں پر ظاہر ہوئے یعنی یہ فیض آپ ﷺ کی جلوہ آرائی کے بعد ہوا۔ علامہؒ نے فرمایا ہے کہ خودی کی خلوتوں میں خدائے کبریا کے جلوے ملتے ہیں۔ جب انسان میں خلوت اور جلوت کے کمالات ظاہر ہوں تو انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کی ساری خدائی کے جلوے بندوں پر منکشف یعنی رونما ہو جاتے ہیں ۔

خودی کی خلوتوں میں مصطفائیؐ خودی کی جلوتوں میں کبریائیؐ
زمین و آسمان و کرسی و عرش خودی کی زد میں ہے ساری خدائی
(ب۔ج:۳۷۵)

وہ میرا رونقِ محفل کہاں ہے مری بجلی مرا حاصل کہاں ہے
مقام اس کا ہے دل کی خلوتوں میں خدا جانے مقامِ دل کہاں ہے
(ب۔ج:۳۷۶)

ہے زمانے کا تقاضا انجمن اور بے خلوت نہیں سوزِ سخن!
خلوت از اغیار باید نے زیار ۔ پوستین بہرِ دے آمد نے بہار (ب۔ج:۴۳۴)
(خلوت تو غیروں میں ہوتی ہے نہ کہ اپنے پیاروں میں پوستین تو برف کے موسم کیلئے ہے بہار کیلئے نہیں۔)

خلوت

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس دور میں نمود و نمائش زوروں پر ہے اور لوگ روح کی اصلاح کرنا نہیں چاہتے۔ ان کا ظاہر طرح طرح کی ملمع بازیوں سے مزین ہے اور آئینۂ دل بالکل مکدر ہو چکا ہے۔ جب حالات حد سے تجاوز کر جاتے ہیں تو روحانی افکار ناپید ہو جاتے ہیں اور قوم تباہ ہو جاتی ہے ۔

رُسوا کیا ہے اس دور کو جلوت کی ہوس نے روشن ہے نگہ آئینۂ دل ہے مکدر
(ض۔ک:۵۵۵)

بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ نظر اپنی حدوں سے ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر!
آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر

خلوت میں خودی ہوتی ہے خودگیر و لیکن
خلوت نہیں اب دیر وحرم میں بھی میسر!
(ض۔ک:۵۵٦)

انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اس کو
شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق!
(ض۔ک:۵۹۱)

خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند!
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
(ب۔ج:۴۱۹)

دردِ عشق

جس کی بہار تو ہو یہ ایسا چمن نہیں
قابل تری نمود کے یہ انجمن نہیں
یہ انجمن ہے کشتۂ نظارۂ مجاز
مقصد تیری نگاہ کا خلوت سرائے راز
(ب۔د:۵۱)

مدرسے نے تیری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوتِ کوہ وبیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش
(ض۔ک:۵۴۵)۔

ترستی ہے نگاہِ نارسا جس کے نظارے کو
وہ رونق انجمن کی ہے انہیں خلوت گزینوں میں
(ب۔د:۱۰۴)

مرے نالۂ نیم شب کا نیاز!
میری خلوت وانجمن کا گداز!(ب۔ج:۴۱۷)
جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مردۂ ذوق
خلوتیانِ میکدہ کم طلب وتہی کدو!
(ب۔ج:۴۰۴)

جلوت اور خلوت کا مضمون بہت طوالت طلب ہے۔قرآن مجید کی بہت سی آیات ان کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور دونوں کی مزید وضاحت کرتی ہیں مگر یہ تفصیل اس کتاب کے احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔

باب ۴۷

صوفی کی طریقت میں فقط مستی احوال

صوفی کے متعلق غلط العام تأثر

صوفیاء کے گروہ کے متعلق بہت سی پراگندہ روایات مشہور ہو چکی ہیں جن میں کافی حد تک حقیقت اور صداقت کا رنگ بھی پایا جاتا ہے، لہٰذا ان روایات کو جھٹلایا بھی نہیں جاسکتا مگر یہ بات بھی قابلِ تسلیم ہے کہ ایک مچھلی پورے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے۔ چنانچہ چند نام نہاد صوفیوں نے حقیقی صوفیاء کے گروہ کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اس بات کا ذکر فقر کے باب میں کیا جاچکا ہے کہ طریقت کو بدنام کرنے کے لیے اور مسلمانوں کو اس بلند پایہ طبقہ سے متنفر کرنے کی نیت سے، دشمنانِ اسلام نے جعلی صوفیاء کو جنم دیا۔ اس کے متعلق بہت سے مفکرین اسلام نے لمبی لمبی تحریریں پیش کی ہیں اور علامہ اقبالؒ نے جن کے زمانے میں یہ جعلی فرقہ عروج پر تھا، اس فرقے کے خلاف کافی کلام کیا ہے۔ آپ کے کلام میں جو تاثر پایا جاتا ہے وہ ضربِ کلیم کے حسب ذیل اشعار میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔

صوفی کی طریقت میں فقط مستی احوال　ملا کی شریعت میں فقط مستی گفتار　(ض۔ک:۵۰۱)
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو　ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستی کردار　(ض۔ک:۵۰۲)

جب ایسے صوفیاء کے متعلق بات ہوتی ہے تو اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ صوفیہ کے گروہ میں بہت مایہ ناز ہستیاں بھی جنم لے چکی ہیں جن کی برکت سے دنیا بھر میں اسلام لحہ بہ لحہ زندہ ہوتا رہا اور ایسے صوفیاء نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ”پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا“۔ تصویر کے دونوں رُخ دیکھنے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ جہاں اہلِ کفر نے غلط قسم کے صوفی پیدا کئے وہاں نیک طینت اور برگزیدہ ہستیوں نے فقر اور طریقت کے علم کو سربلند کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔

زیرِ نظر باب میں جعلی صوفیاء کے کردار سے قطع نظر، ایسے حقائق پر روشنی ڈالی جارہی ہے کہ مشائخ عظام ایک صوفی کی تربیت کے لئے کون کون سے علوم و عرفان اپنے سادہ لوح سالکوں کے سینوں میں اُنڈیل دیتے ہیں اور ان کو کتنی کڑی محنت کے بعد طریقت کے اعلیٰ مدارج پر لانے کی سعی فرماتے ہیں۔ اس جگہ ان علوم کا محض تعارفی ذکر کیا جارہا ہے کیونکہ ایسے مدارج کا طے کرانا تربیت کے باب میں اور عملی تربیت میں ہی بیان کیا

جا سکتا ہے۔

صوفی حال مست

صوفیوں میں حال کا وارد ہونا اکثر دیکھنے میں آتا ہے۔ اسی لئے علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ "صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال" جہاں باریک بین صوفی نظر آتے ہیں وہاں اگر حال وارد نہ ہو تو مصنوعی حال چڑھا لیا جاتا ہے اس لئے حال کے معاملے میں صوفی زیادہ ہی مشہور ہو گئے ہیں۔ کچھ لوگ غلبۂ حال سے مجذوب بھی ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہماری کتاب "جنیدؒ و بایزیدؒ" کا مطالعہ کریں جس کے آخری ابواب میں صحو اور سکر کے متعلق کافی تفصیل بیان کر دی گئی ہے۔ کچھ بنے ہوئے صوفیوں پر حال کا رنگ غالب رہتا ہے۔ ایک جگہ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے ؎

بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں لرز جاتا ہے آوازِ آذان سے" (ب۔د:۹۹)

کچھ لوگ جن پر حقیقی سُکر کی حالت زیادہ طاری رہتی ہے ان کو بھی اکثر اوقات حال مست دیکھا جاتا ہے یہ لوگ مصنوعی حال کے زمرے میں نہیں آتے۔ حضرت جنید بغدادیؒ سے بھی لوگوں نے سوال کیا کہ آپ کے صوفیاء پر قرآن سن کر وجد طاری نہیں ہوتا حالانکہ اشعار سن کر وہ وجد میں آجاتے ہیں آپ نے فرمایا قرآن میں وجد والی بات ہی کیا ہے۔ قرآن برحق ہے اور ذات برحق کی طرف سے نازل ہوا ہے جس میں مخلوق والی کوئی صفت نہیں کہ جس سے وجد آجائے۔ فرمایا اشعار تو مخلوق کی بنائی ہوئی چیز ہے اور عشق و محبت کرنے والے کا کلام ہے۔ اس لئے حال کی کیفیت وارد ہو جاتی ہے۔ یہ احوال تو حضرت جنید بغدادیؒ کے ساتھیوں کے متعلق ہیں لیکن علامہ اقبالؒ نے جو درج ذیل اشعار میں حال مست صوفیوں کی بات کی ہے وہ بنے ہوئے صوفیوں سے متعلق ہے۔ آپؒ نے فرمایا ایسے صوفی قوّال کے نشہ آور نغموں میں مست رہتے ہیں اور اپنی مجلسوں میں عراقی جیسے شاعروں کے شعر پڑھ اور سن کر اپنے اوپر نشہ طاری کر لیتے ہیں اور اپنی محفلوں کو قرآن سے نہیں سجاتے۔ علامہ اقبال صوفیوں کے حال مست ہونے کے خلاف نہیں بشرطیکہ وہ اس حال کے علاوہ اہل فقر والوں کی طرح صاحب کردار ہونے کا مظاہرہ بھی کریں۔ صرف مست ہونا اور اس کے علاوہ اور کچھ نہ کرنا آپ کے نزدیک ایک معیوب فعل ہے۔ اور ہاتھ مار مار کر وعظ کرنے والے صوفی اگرچہ بات قرآن و حدیث کی بھی کریں تو اس میں افسانوی رنگ زیادہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے کام میں مخلص نہیں بلکہ بناوٹ کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

صوفی پشمینہ پوش حال مست از شرابِ نغمۂ قوّال مست

(صوفی اون کا لباس پہنتا ہے اور عجب حال میں مست ہے قوّال کا نغمہ سُن کر وجد میں آجاتا ہے۔)

آتش از شعرِ عراقی در دِلش در نمی سازد بقرآں محفلش

(اس کے دل میں عراقی کے شعر کی آگ ہوتی ہے وہ اپنی محفل قرآن سے نہیں سجاتے۔)

واعظِ دستاں زنِ افسانہ بند معنیٔ اُو پست و حرفِ اُو بلند

(واعظ ہاتھ مار مار کر افسانوی رنگ میں بات کرتے ہیں، ان کی تقریروں میں لفاظی بہت ہوتی ہے مگر معانی کم۔)

از خطیب و دیلمی گفتارِ اُو با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ اُو (ا۔ر۔۱۲۳)

(وہ اپنے وعظ میں خطیب اور دیلمی کے حوالے دیتے ہیں اور حدیث کی مختلف قسموں کو بیان کرتے ہیں۔)

ایسے صوفیوں کی یہ حرکتیں علامہ اقبالؒ نے بہت محسوس کیں آپؒ نے فرمایا کہ ایسے صوفی اور ملا محض افسانوی رنگ میں باتیں کرتے ہیں اور حکمتِ قرآن کی زندگی سے لوگوں کو بیگانہ رکھتے ہیں۔ ان لوگوں نے اس بات کو رائج کیا ہے کہ اگر کوئی شخص مرنے کے قریب ہو تو اسے سورۃ یٰسٓ پڑھ کر سنائیں تو ایسا کرنے سے اس کی جان آسانی سے نکل جاتی ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے جو صفات رکھی ہیں اسے لوگوں کے سامنے ظاہر نہیں کرتے یہی وجہ ہے کہ لوگ قرآن مجید کی حکمتوں اور عظمتوں سے بے بہرہ ہیں۔ آپؒ فرماتے ہیں۔

بہ بندِ صوفی و ملاّ اسیری حیات از حکمتِ قرآں نگیری

(تم صوفی اور ملا کی قید میں گرفتار رہے قرآن پاک سے زندگی حاصل نہیں کرتے۔)

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست کہ از یٰسٓ او آسان بمیری (ا۔ح:۹۵۵)

(اس کی آیات سے تجھے بس اتنا سروکار ہے کہ مرتے وقت سورۃ یٰسٓ پڑھنے سے جان بآسانی نکل جاتی ہے۔)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں بہت سے لوگ بالوں کے سفید ہونے سے پیر بن گئے ہیں اور گلیوں کے بچے ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ایسے صوفیاء کی بدولت ملت کا وقار خاک میں مل گیا ہے۔

پیر ہا پیر از بیاضِ مُو شدند سخرہ بہر کودکاں کو شدند

(آج کل کے پیر صرف اپنے سفید بالوں کی وجہ سے پیر ہیں ان کے کاموں پر گلی کے بچے بھی ہنستے ہیں۔)

واعظاں ہم صوفیاں منصب پرست اعتبارِ ملتِ بیضاء شکست

(کیا واعظ کیا صوفی سب جاہ پرست ہیں ملتِ بیضاء کا وقار ختم ہو چکا ہے۔)

واعظ ما چشم بر بتخانہ دوخت مفتیٔ دینِ مبیں فتویٰ فروخت (ا۔ر۔۷۰)

(ہمارے واعظ کی آنکھ بت خانے پر لگی ہوئی ہے ہمارے دینِ مبین کے مفتی فتوے فروخت کرتے ہیں۔)

صوفی کا اثاثہ اُس کے فقر کی دولت ہے

ایک صوفی اپنا سب کچھ لُٹا کر شانِ فقر کو اختیار کرتا ہے، فقر تصوف کی جان ہے اور ایک صوفی کی پہچان ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا فرمان "اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ" (سفینۃ البحار: ج ۲ ص ۳۷۸) اس قول پر شہادت

ہے۔ فقر صرف ایک دعویٰ نہیں، یہ ایک خاص نوعیت کا طرز حیات ہے۔ فقیر وہ ہوتا ہے کہ اگر چہ اس کے ہاتھ خالی ہوں، مگر وہ دل کا غنی ہوتا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے فرمایا کہ رسمی شجرہ، کلاہ اور جبہ فقر کی علامت نہیں اور نہ ہی فقر میں دعویٰ پارسائی ہوتا ہے بلکہ اس کے برعکس وہ رسوم اور عادات کا پابند نہیں ہوتا۔ فقیر کی زندگی ایک مخصوص طرزِ عمل کا نام ہے جس میں صوفی کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک لازوال رابطے کے ذریعے ہمہ وقت تعلق قائم رہتا ہے۔ ایک صوفی اگر چہ خود سے دور رہتا ہے لیکن اس دوری کی حالت میں لامحالہ اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے قرب میں جا پڑتا ہے۔ اس کی نماز اور روزہ میں یہ کیفیت دکھائی دیتی ہے کہ وہ نماز میں اللہ اکبر کہتے ہی اس دُنیا سے اس طرح رخصت ہو جاتا ہے جس طرح کسی بسمل کی جان کچھ دیر میں ہی دنیا سے پرواز کر جاتی ہے۔

اُو چو با تکبیر ہا مقروں شدند ہمچو بسمل از جہاں بیروں شدند

(یہ لوگ تکبیر کہتے ہی جہاں سے بے تعلق ہو جاتے ہیں، جس طرح کوئی نیم مردہ دنیا سے نکل جاتا ہے۔)

مشہور ہے کہ فقراء کی ملکیت میں کچھ نہیں ہوتا حالانکہ محض بے سروسامان ہونا فقیر کی شان نہیں بلکہ اُس کے فقر میں شانِ سکندری کا سا جلال ہوتا ہے۔ وہ ہوس اور شان وشوکت اور دوسروں کے سہاروں پر انحصار کرنے سے اپنے دل کو محفوظ رکھتا ہے۔ (اس کتاب کے اوائل میں ایک بیان ''فقر اور درویشی'' شامل کیا جا چکا ہے۔) فقر ایک ایسی چیز ہے جو عبارت اور بیان میں ادا نہیں کی جا سکتی۔ اس کو فقط وہی سمجھ سکتا ہے جس نے فقر کا ذائقہ چکھا ہو یا جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فقر عطا کیا گیا ہو۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مرشد حضرت باقی باللہؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص پر اللہ تعالیٰ ارادت کی تجلّی فرما دیتا ہے تو فقط ایسا شخص ہی فقر اور درویشی کی طرف رغبت حاصل کرتا ہے، ورنہ جو اس تجلّی سے محروم رہتے ہیں، وہ فقر کی دولت سے بھی محروم رہتے ہیں۔ فقیروں اور صوفیوں کے ساتھ ان کی کدورت ان کی محرومی کا باعث بنتی ہے۔

فقر اور درویشی کے ابواب میں لکھے گئے علامہ اقبالؒ کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ فقراء کی نظر میں دونوں جہانوں کی بادشاہی کوئی معنی نہیں رکھتی اور دوسری طرف اُن کی کیفیت اس شان اور تمکنت کی حامل نظر آتی ہے کہ قیصر و کسریٰ کے ایوان اُن کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ جو لوگ فقر و فاقہ اور محنت شاقہ سے نہیں گھبراتے، ان پر مال کی کمی یا فراوانی قطعاً اثر انداز نہیں ہوتی۔ ان کا اُٹھنا، بیٹھنا، کھانا اور پینا سب کچھ اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتا ہے، ان کی طاقت اور تصرف کی بنیاد ان کی بے نیازی اور استغناء پر مدار کرتی ہے۔ وہ جس کو چاہیں تاج وتخت عطا کر دیں اور جس کو چاہیں اس کی شانِ ملوکیت کو ایک لمحہ میں منہدم کر دیں۔ یہ سب اُنہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہے۔ فقیر کی شان میں جو کلام علامہ اقبالؒ نے لکھا ہے، اسے راقم الحروف نے

جی کھول کر اس کتاب میں شامل کردہ مضامین فقر اور درویشی میں بیان کر دیا ہے۔ اس جگہ ایسے اشعار کی تمثیل بیان کرنے کی حاجت نہیں۔

بغیر اتباعِ شریعت، فقر محض ایک زندقہ ہے

یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ کچھ لوگوں نے صوفی کا روپ دھار کر خود کو شریعت سے مبرا اور بالا تصور کر رکھا ہے۔ (ایسے لوگوں کی کچھ تفصیل اس کتاب میں دے دی گئی ہے) صوفیاء کے نزدیک صوفیانہ لباس و خرقہ پوشی اور سر تراشیدہ ہونا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ جو لوگ خود کو تسبیح بدست، احوالِ وجد و استغراق کے حال میں رہنے اور عقیدت مندوں کے حلقۂ بگوش ہونے کو اہمیت دیتے ہیں، ان کا فقر سے کوئی علاقہ نہیں۔ فقیر کی علامت نہ تو خلوت پسندی ہے اور نہ ہی مردم بے زاری ہے۔ فقیر نہ تو ہُو حق کی بلند بانگ آوازوں سے اپنی بزرگی ظاہر کرتا ہے اور نہ ہی اپنے اوصاف و احوال اور قلندرانہ اداؤں کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس کا مطلوب فقط خُدا شناسی، قربِ الٰہی اور حق تعالیٰ کی رضا جوئی میں زندگی بسر کرنا ہے، اس کا وجود پورے جہاں کے لئے باعثِ رحمت ہے جسے نیچے بیان کیا جا رہا ہے۔

اہلِ طریقت کا وجود نہ صرف مسلمانوں کیلئے بلکہ پورے جہان کیلئے باعثِ رحمت ہوتا ہے

علامہ اقبالؒ نے فقر پر عجیب الانواع شعری کلام پیش کیا ہے جس کے مطالعے کے بعد فقیر کے مذکورہ بالا مقام سے آگہی حاصل ہوتی ہے۔ فقر ایک ایسی دولت ہے جو سینکڑوں مملکتوں کو بغیر تلوار کے فتح کر لیتی ہے اور فقر ہی اصل شہنشاہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قوموں کی امامت اہلِ طریقت کے سپرد کی ہے اور ہمارے پیغمبر ﷺ کی بعثت کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ اس امانت کا حق ادا کریں۔ ایک صوفی بھی آپ ﷺ کی اقتداء میں اس امانت کے حامل ہونے کا حق رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان حکومتوں نے تمام قوموں کی امانت کا حق ادا کیا۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے فرائض کو ادا کرنا بھی صوفیاء کے نزدیک امانت کا درجہ رکھتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا وجود مبارک ساری کائنات کے لئے باعثِ رحمت ہے اور آپ ﷺ نے مسلمان اور غیر مسلم قوموں میں کسی قسم کا امتیاز روا نہیں رکھا۔

صوفیاء کے نزدیک قومی امانت یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی ذات، اسماء اور صفات کے پرتَو کی قبولیت کی استعداد حاصل کر لے اور یہ شرف صرف انسانِ کامل کو ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید میں اس بات کا ذکر آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو تمام کائنات کے لیے ڈر سنانے والا اور ہادی بنا کر بھیجا ہے جبکہ باقی انبیاء اپنے وقت اور علاقے کے لئے مخصوص تھے۔ جس ذات کو پوری کائنات کا امام مقرر کیا ہو، وہ کائنات میں موجود تمام اقوام کے لئے ضامن کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر ایک اسلامی حکومت کے حقائق پر نظر کی جائے تو نبی ﷺ کی طرح

ان پر بھی حسب ذیل فرائض عائد ہوتے ہیں۔(۱) تمام ملکوں کی حفاظت کرنا (۲) اُن ممالک میں ہر انسان کے حقوق کی کماحقہ ادائیگی پر نظر رکھنا (۳) آدمیت کا احترام ہر قوم اور نسل کے لیے برقرار رکھنا (۴) مذکورہ خدمات کے عوض اُن سے خراج حاصل کرنا وغیرہ، علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ مذکورہ اسلامی ذمہ داریوں کو نبھانے کے بعد پوری دُنیا مسلمانوں کی ممنون ہو سکتی ہے۔

تا امینے حق بحقداراں سپرد بندگاں را مسندِ خاقاں سپرد(ا۔ر:۱۰۳)

(اللہ تعالیٰ نے بندوں کو مسندِ حکومت اس لئے سپرد کی کہ وہ امین ہونے کا حق ادا کریں اور حقداروں کو حق مہیا کریں۔)

ناموسِ ازل را تُو امینی تُو امینی دارائے جہاں را تُو یساری تُو یمینی

(بندوں کے ازلی نام و ناموس کا تُو امین ہے اور دُنیا کے مالکوں کا تو دایاں اور بایاں بازو ہے۔)(ز۔ع:۴۷۵)

اے امینے از امانت بے خبر غم مخور، اندر ضمیرِ خود نگر(ج۔ن:۶۰۲)

(اے مسلمان تو امین ہونے کی امانت سے بے خبر ہے، اس بوجھ کا غم نہ کھا، اپنے ضمیر پر نظر رکھ)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ دینِ مصطفیٰ ﷺ ہی دینِ حیات ہے اور زندگی بسر کرنے کی مکمل تفصیل بیان کرتا ہے۔ مسلمان کی زندگی شرع اسلام سے عین مطابقت رکھتی ہے۔ مسلمان کا ہر فعل اور ہر حرکت اللہ تعالیٰ کے احکام سے قوت اختیار کرتی ہے اور غیر اللہ سے قطعاً بے نیاز ہے۔ اس کردار کے تحت امتِ مسلمہ نے تمام کائنات کو اسلامی قوانین سے سیراب کیا اور حق پرست لوگ (تعصب سے مبرا) غیر مسلم ممالک پر بھی مسلمانوں کے ایسے برتاؤ پر ممنون ہیں۔

ہست دینِ مصطفیٰ دینِ حیات شرعِ او تفسیر آئینِ حیات(ا۔ر:۱۲۸)

(دینِ مصطفیٰ ﷺ تو زندگی گزارنے کا دین ہے، اس کی شرع زندگی کے قوانین کو بیان کرتی ہے۔)

ذاتِ ما آئینۂ ذاتِ حق است ہستیِ مسلم زآیاتِ حق است(ا۔ر:۷۵)

(ہماری ذات اللہ تعالیٰ کی ذات کی آئینہ دار ہے، مسلمانوں کا وجود اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔)

مسلم استی بے نیاز از غیر شو اہلِ عالم را سراپا خیر شو(ا۔ر:۱۵۸)

(اگر تُو مسلمان ہے تو غیر اللہ سے بے نیاز ہو جا اور پورے جہاں کے لئے سراپا خیر بن جا)

کشتِ حق سیراب گشت از خونِ ما حق پرستانِ جہاں ممنونِ ما(ا۔ر:۷۴)

(اللہ تعالیٰ کی یہ کھیتی (پورا جہاں) ہمارے خون سے سیراب ہے اور دنیا کے حق پرست لوگ ہمارے اس احسان کے ممنون ہیں۔)

مغربی ممالک کی حکومتیں، جیسا کہ دیکھنے میں آتا ہے، دنیا پر حکمران تو ہیں لیکن اس کے رہنے والوں کے

لئے امانت دار ہونے کا حق ادا نہیں کرتیں۔ یہ ممالک اپنے اور غیر لوگوں میں بے انتہا ناانصافی کا سلوک روا رکھتے ہیں۔ جہاں پر یورپ کی روشنی گئی تو وہاں علم و ہنر تو بلا شبہ نظر آتا ہے مگر غیر قوموں کے لئے ان کے قوانین مظالم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اقوامِ مغرب نے اگرچہ ایسے ادارے قائم کیے ہیں جن کا وجود بظاہر تو عدل و انصاف کا مدعی ہے اور مساوات کی یقین دہانی کراتا ہے لیکن حقیقت میں چنگیز اور ہلاکو سے بھی زیادہ ظالم اور نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے جو ظالمانہ سلوک روا رکھا ہے، اس کا نقشہ علامہ اقبال نے حسب ذیل اشعار میں کھینچا ہے۔

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے — حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات!
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت — پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات!

(ب۔ج:۳۹۹)

بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس — کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

(ب۔ج:۴۰۰)

بے شک اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا (النساء:۵۸) ”بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم فرماتا ہے کہ امانتوں کو ان کے سپرد کرو جو اُن کے اہل ہیں“ اس امانت سے مراد وہ حقوق ہیں جو باقی قوموں کے مسلمانوں کے ذمے واجب الادا ہیں۔ مسلمان کا دین اس بات کی ضمانت فراہم کرتا ہے کہ مسلمانوں کو جو بھی نعمت دی جائے وہ اس کے نزدیک ایک امانت کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کا حق ادا کرنا شریعت کا تقاضا ہے، خواہ متقاضی کافر ہی کیوں نہ ہو۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ تم میں سے ہر ایک شخص پاسبان ہے اور اس سے اس کی رعیت کا سوال ہوگا ”كُلُّكُمْ رَاعٍ وَ كُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ“، امین صرف امانت سے ہی نہیں بلکہ یہ ایک وسیع تر مفہوم ہے۔ مسلمان کی عبادت اور اس کی صحیح ادائیگی، اقتدار، حکومت، ملک، قوم کے راز، لوگوں کی حفاظت، عدل، تمام چیزیں امانت میں شامل ہیں، یہی وجہ ہے کہ ایک صوفی جب زمامِ اقتدار اُس کے ہاتھ میں آتی ہے تو وہ مذکورہ بالا تمام احکامات کی ضمانت دیتا ہے۔

حضرت داتا گنج بخشؒ کشف المحجوب میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اولیائے کرام کا ناصر اور مددگار ہے اور اس نے اپنی ان پاک ہستیوں کو اپنی دوستی اور ولایت کے لئے مخصوص کر لیا ہے۔ یہ اولیائے کرام اللہ کے ملک کے والی بنائے گئے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے افعال اور قوت کا مظہر بنایا ہے۔ حق تعالیٰ نے بہت سی انواع و اقسام کو ان کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔ آفات طبع اور ھویٰ سے ان کو پاک کر دیا ہے اور نفس کی پیروی سے ان کو آزاد کر دیا ہے۔ ان کی ہمت اور ارادے سوائے معیت و قوتِ الٰہی اور کچھ نہیں۔ یہ لوگ ہم سے قبل تھے (یعنی) یہ زمانہ ماضی میں بھی تھے اب بھی ہیں اور آئندہ بھی آتے رہیں گے۔ اولیائے کرام فرامینِ مصطفیٰ

ﷺ کے ساتھ ایسے مجرد ہیں کہ متابعتِ نفس کی راہ ان پر مسدود ہے حتیٰ کہ بارانِ رحمت جو آسمان سے نازل ہوتی ہے، وہ ان کے دم قدم کے صدقے ہوتی ہے اور زمین سے جو سبزہ اُگ رہا ہے، وہ ان کے صفائے حال کی برکت سے اُگ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کافروں پر مومنوں کو غلبہ انہی کی ہمت سے دیتا ہے۔

انسان کو روحانیت کے لئے کیوں چنا گیا؟

سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر ۷۲ میں فرمایا گیا ہے۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ

ہم نے پیش کی یہ امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے (کہ وہ اس کی ذمہ داری اٹھائیں)

لیکن انسان کے سوا کسی نے اس امانت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا (اس واقعہ کی تفصیل ہماری تصنیف ''حسنِ نماز'' اور ''حضورِ قلب'' میں کافی وضاحت سے پیش کی جا چکی ہے)۔ علامہ ثناء اللہ پانی پتیؒ نے اس آیت کی تشریح میں فرمایا ہے کہ اس امانت سے مراد احکامات شرعیہ کی بجا آوری کرنا نہیں ہے بلکہ یہ امانت نورِ عقل اور نارِ عشق کی حامل امانت ہے۔ نورِ عقل سے اللہ تعالیٰ کی ذات پر استدلال کیا جاتا ہے اور نارِ عشق وہ مخصوص آگ ہے جو اللہ کے سوا ہر چیز کو جلا دیتی ہے اور عبد اور معبود کے درمیان بلا پردہ تعلق قائم کرنے کی راہ فراہم کرتی ہے۔ اس آگ سے خُدا اور بندے کے درمیان تمام حجابات جل جاتے ہیں اور بندے کو خُدا سے ملنے اور ربط قائم کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کو روحانی، وجدانی اور ایمانی تعلق باللہ کے لئے چنا گیا۔ چنانچہ انسان کو علمِ تصوف کے زمرہ میں داخل کرنے کا اصل سبب یہی امانت تھی۔

انسان میں روحانیت کا مادہ رکھا گیا ہے

خُدا اور بندے کے درمیان تعلقات قائم ہونے کا نام تصوّف کہلاتا ہے جو کسی مردِ کامل کی وساطت سے حاصل کیا جاتا ہے۔ طریقت کے طرزِ عمل سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں، جس کے ذریعے بندے کی اللہ تعالیٰ سے نسبت قائم ہو سکے۔ اس سلسلے میں بہت سارے قوانین اور ضوابط کا وضع ہونا مشائخِ کرام کی تصنیفات اور اقوال سے ثابت ہوتا ہے۔ یہ روایت کہ خُدا نے انسان کو اپنی شکل پر پیدا فرمایا اور اس کے دل میں اپنے جلووں کو سمیٹنے کے لئے مخصوص نظام جاری فرمایا قطعاً درست ہے۔ (یہ تمام تفصیل ہماری تصنیف ''حضورِ قلب'' کے آخری حصے میں بیان کر دی گئی ہے۔) اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو کسی مقصد کے لئے تخلیق فرمایا اور انسان کی تخلیق کا مقصد قرب و وصلِ خُداوندی تھا۔ انسان میں اس بات کی مکمل اہلیت رکھی گئی ہے کہ فطرتی تقاضوں کے مطابق وہ اللہ تعالیٰ کا متلاشی رہتا ہے اور اس کے ساتھ اپنے تعلقات استوار رکھنے کا کلّی طور پر اہل قرار دیا گیا ہے۔ غور کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ تمام کائنات کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے تخلیق فرمایا اور انسان کو انسان

کے لئے تخلیق فرمایا اور انسان کو اپنی عبادت کے لئے پیدا فرمایا ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ انسان دُنیا کی تمام رکاوٹوں کے باوجود ہر وقت اللہ کو ہی اپنی توجہ کا مرکز بنائے رکھے اور دوسروں کی طرف نگاہ بھی اُٹھا کر نہ دیکھے۔ یہی تصوف کا منشأ ہے۔

طریقت میں مخصوص روحانی احوال اور آدابِ خُداوندی بجالائے جاتے ہیں

ایک صوفی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی شناخت، رموزِ خُداوندی و بے خودی، اناشکنی، خُدا شناسی، اپنے معاملات کی خُدا سپردگی اور تادیبِ نفس کے آداب جیسے امور سے مکمل طور پر آگاہ ہو۔ صوفیائے کبار کے صحبت یافتہ لوگ، اعلیٰ اخلاق کے حامل، صوفیانہ ادب سے آشنا، احوال و استغراق، کیفیاتِ جذب و جنوں اور رسمِ عاشقی کے اسباق کے حامل ہوتے ہیں، ایسے راہروانِ طریقت جن کو اللہ تعالیٰ اپنی دوستی کا شرف بخشتے ہیں اور انہیں اپنے نفس کے عیوب پر آگاہ کرتے ہیں وہ نفس کی آفات پر قادر ہونے کی استطاعت حاصل کر لیتے ہیں۔ اہلِ طریقت اخلاقِ نبوی ﷺ کا نمونہ پیش کرتے ہوئے سختی سے اس کے پابند رہتے ہیں اور یہی طریقت کا سب سے بڑا اصول ہے۔ یہ لوگ ان لوگوں سے اپنے تعلقات کو جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں جو ان سے تعلقات توڑتے ہیں، اسے عطا فرماتے ہیں، جو اُن کو محروم کرے، وہ اسے معاف فرمادیتے ہیں جو ان پر ظلم کرے۔ انسانی کردار میں ایسے اخلاق کا پایا جانا طریقت کی ضروریات میں شامل ہے۔

طریقت میں مختلف منازل اور مقامات طے کروائے جاتے ہیں

مشائخ کرام اپنے مریدوں کو چند مخصوص طریقوں سے خالق کون و مکان کو پہچاننے والی نظر عطا کرتے ہیں، کردار سازی اور آشنائے حقیقت کے رموز سے آگاہ کرتے ہیں۔ اپنے مریدوں پر اس بات کا زور دیتے ہیں کہ اپنی روز مرّہ زندگی میں حق تعالیٰ کے ساتھ براہ راست ربط قائم کرنے کے لئے اپنے اوقات میں سے کچھ اوقات کو مخصوص کریں۔ ان کی اس بات سے طالبانِ حق کے دلوں کے دروازے معرفتِ حق کے لئے کھول دیئے جاتے ہیں۔ ذکر و فکر میں مشغول اور الفت و چاہتِ حق میں غرق صوفی اپنے معاملات کی عمدگی کے باعث لوگوں کے دلوں میں گھر کر جاتے ہیں اور عوام کی ایک بہت بڑی تعداد کو اپنے اخلاق اور کردار سے متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ دینِ اسلام سے برگشتہ اور گمراہ لوگوں کو پھر سے سیدھی راہ پر گامزن کر سکیں۔ اپنے انہی اصولوں اور طریقوں کے باعث ایک صوفی کی نظر چوروں، بدمعاشوں اور قزاقوں کو واصل باللہ بننے کی سعادت عطا کر دیتی ہے۔ کشف المحجوب میں حضرت ابو علی فضیلؒ جو بہت بڑے راہزن تھے، کی توبہ کا واقعہ قابلِ مطالعہ ہے۔ یہی راہزن اور قزاق بالآخر اس قدر بڑے صوفی کا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے کہ جس کو ملنے کے بعد خلیفۃ المسلمین ہارون الرشید نے اس بات کا اعتراف کیا کہ ابو علی فضیلؒ

ہی حقیقت میں بادشاہ ہیں اور ان کے سامنے خلیفۂ وقت کی کوئی حیثیت نہیں۔

اہل طریقت اپنے اندر ایسی طاقت رکھتے ہیں کہ اُن کی نگاہوں سے لوگوں کو شفا ملتی ہے اور عوام کی بگڑی ہوئی تقدیر آسانی سے بدل جاتی ہے۔ ایک منتخب طرز پر دی جانے والی تربیت صوفی کو آ ہنی بازو عطا کرتی ہے، جس سے وہ مسکنت، غربت اور لاچاری کی زندگی ترک کرنے کے بعد زمانے کے حوادث ومصائب اور مشکلات سے مقابلہ کرنے کا اہل ہو جاتا ہے۔ ایک حقیقی صوفی پُر خطر زندگی اور سخت طوفانوں سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور آرام وآسائش کی زندگی قطعاً اس کے من کو نہیں بھاتی۔

تصوف ہمہ تن محبت کا سبق دیتا ہے

اہلِ تصوف خُداوند تعالیٰ، رسول کریم ﷺ اور جملہ لوگوں کے لئے محبت بھرا پیغام پیش کرتے ہیں۔ عاشقانِ رسول ﷺ نے پیغمبرِ اسلام ﷺ کے لئے اپنی جان ومال، عزت وآبرو اور ہر اس شے کو جو ان کی ملکیت میں تھی، قربان کردیا۔ جو لوگ راہ طریقت پر چلتے رہے، ان کے لیے عوام کے دلوں میں محبت اور احترام کا اس قدر جذبہ موجود تھا جو ان کے زمانے میں سلاطین کو بھی حاصل نہ تھا۔ عشقِ رسول ﷺ کی بات ہوتی تو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اپنے عشق کا اس طرح مظاہرہ کیا کہ ان کے سینوں میں ان کا عشق جھلکتا ہوا نظر آتا تھا، ان کی صحبت کی کرنیں آفتاب کی روشنی سے زیادہ تابندہ نظر آتیں۔ وہ حضور اکرم ﷺ کے ایک اشارے پر مر مٹنے کو اس طرح تیار ہوتے تھے کہ زمانہ ان کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ رسالت مآب ﷺ کے یہ پروانے راتوں کو شب خیزی میں بسر کرنے کے ساتھ ساتھ دن کو جذبۂ جہاد سے سرشار نظر آتے۔ ایک اشارے پر بے خطر آتشِ نمرود میں کودنے کو تیار رہتے۔

ایک صوفی کو یہی تعلیم دی جاتی ہے کہ آج بھی وہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم (جو حقیقی معنوں میں صوفی تھے) کی زندگیوں کو نمونہ بناتے ہوئے آگے بڑھے۔ ان صوفیاء کی راتوں کی آہ وزاری آج بھی عرشِ اعظم کے کناروں پر پہنچ کر فرشتوں اور قدسیوں میں وجدانی کیفیت طاری کر دیتی ہے۔ ان صوفیوں کے اصولِ زندگی اس قدر نپے تلے ہوتے ہیں کہ یہ اپنی مرضی کو خیر باد کہہ دیتے ہیں اور حبیب کبریا ﷺ کی ہر ایک ادا پر سرِ تسلیم خم کردیتے ہیں (ہماری کتاب "سنتِ مبارکہ" میں "اسوۂ حسنہ" کا مضمون مطالعہ فرمائیں)۔

طریقت میں اتباعِ شریعت کے سوا کچھ نہیں

یہود اور نصاریٰ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر اپنی مرضی سے عبادات کے ایسے طریقے وضع کئے جو کسی حال میں بھی عبادت کے معیار پر پورا نہ اُترتے تھے۔ اس میں انسانیت سوز رسوم پر مبنی عبادات بھی تھیں مثلاً پوری پوری رات جاگتے رہنا، پوری عمر اپنے اعضائے جسم کو معطل یا شل کر دینا، عورتوں سے اس قدر اجتناب

کرنا کہ عمر بھر شادی سے پرہیز کرنا وغیرہ۔ ایسی بے معنی ریاضتیں ان کی عبادت میں شامل تھیں، جن کو بربریت کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس ایک صوفی کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ رہبانیت سے دور رہتے ہوئے خود کو شریعتِ محمدی ﷺ کی اتباع میں وقف کر دے۔ شریعت کی ہی اتباع میں بندہ اپنے مولائے کریم سے رشتہ جوڑ لیتا ہے۔

اسلام میں شریعت کی اتباع میں ایک ایسا نظام نظر آتا ہے کہ جس میں رہبانیت، جلاوطنی، شوقِ تنہائی، ترکِ علائق و موالات، عالمِ سکر میں مدہوشی، خود اختیار کردہ چلہ کشی، صحرانوردی، عورتوں سے تجرد، اپنی ذات کی نفی، دنیا کے کاروبار سے گریز جیسے غیر اسلامی امور سے بچتے رہنے کے معنوی احکام میں پائے جاتے ہیں۔ ایک حدیث شریف کے مطابق اسلام میں اس بات پر یقین کیا جاتا ہے کہ مذکورہ تمام غیر اسلامی امور کا بدل اسلام کے نماز و روزہ، جہاد، تقویٰ، شب بیداری، خلوت، اعتکاف، حج اور زکوٰۃ وغیرہ کے اعمال میں بدرجۂ کمال موجود ہے۔ جو کچھ غیر اسلامی چلوں میں حاصل ہوتا ہے، اس سے کہیں زیادہ اثر اسلام کے ایک مختصر سے عمل میں موجود ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے فرمایا ہے کہ اسلام میں ایک فرض کی ادائیگی غیر شرعی اور خود اختیار کردہ ہزاروں چلّوں سے بہتر ہے۔ فرماتے ہیں کہ نفلی حج کی راہ میں اگر ایک فرض چھوٹ جائے تو ایسا نفلی حج قبول نہیں کیا جاتا۔ طریقت میں صحبتِ شیخ سے وہ فیض ملتا ہے جو غیر اسلامی چلّوں میں نہیں مل سکتا ہے تصوف ایسے اسلامی اصولوں کو اپنانے سے عبارت ہے۔ تصوف سے مقصود بس یہی ہے کہ صوفی عام مسلمانوں سے بڑھ چڑھ کر شریعت کی پابندی کرے۔

منشاء طریقت محیر العقول کام کرنا نہیں بلکہ مامورات پر عمل کرنا ہے

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ عام طور پر لوگوں میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ محیر العقول کاموں کا رونما ہونا کمالِ طریقت ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایسے امور تو کافروں اور مشرکوں سے بھی سرزد ہو جاتے ہیں اور مغیبات کا علم حاصل کرنا کرامات کی طرف توجہ دینا اصل طریقت نہیں۔ ہوا میں اُڑنا، پانی پر مصلیٰ بچھانا، کشتی کے بغیر دریا کو عبور کرنا، دور دراز کے سفر بغیر سواری کے طے کر لینا، آزارِ نفس کو ترجیح دینا، اپنے بدنوں کو طرح طرح کی اذیتیں دینا، دوسروں کے سینوں کی جاسوسی کرنا اور ان کے سینوں کو ٹٹولنا، اپنی کرامات کا اظہار کرنا، یہ سب امور حقیقت تصوف کے خلاف اور خارج ہیں۔ اس کے برعکس طریقت خود کو نفس کی آلائشوں سے پاک کرنے، کمینی دنیا کی آرزوؤں کو دل سے نکال پھینکنے اور ماسویٰ اللہ سے خود کو الگ رکھنے سے عبارت ہے۔ ایک صوفی کے لئے لازم ہے کہ وہ خود کو حبِّ جاہ و منصب سے دور رکھے اور دنیا کو دل میں جگہ نہ دے اور مفاداتِ عامہ کی خواہش نہ کرے۔ صوفی خود کو کسی ملک یا شہر سے وابستہ نہیں رکھتا کیونکہ وطن کسی ایک مقام میں

محدود نہیں اور مال و جان کے مقابلے میں وہ اسلام کے اوامر و نواہی کو ہی زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ یہ تمام امور اصلِ شریعت اور عینِ اسلام اور صوفی کی توجہ کے لئے مرکز بنے رہتے ہیں۔ ان امور کے خلاف چلنے والا ہرگز صوفی نہیں کہلا سکتا۔

طریقت کا مقصد، اخلاق سازی اور کردار سازی ہے

ایک صوفی کے کردار میں صبر و تحمل، بردباری، عجز و انکساری اور تواضع کا پیدا ہونا اشد ضروری امر ہے۔ وہ نظامِ حکومت کے غلط فیصلوں کے سامنے سینہ سپر نظر آتا ہو اور اپنے وقت کی شدید مزاحمتوں، عداوتوں اور مخالفتوں سے ٹکرا جانے کی اہلیت رکھتا ہو تو پھر جا کر کہیں وہ صوفی کہلانے کا حقدار ہوتا ہے۔ صوفی وہ ہوتا ہے جو جابر بادشاہوں کے سامنے ہمت و مردانگی کے ساتھ کلمہ حق کہنے سے گریز نہ کرے۔ اہل اللہ نے اپنے کردار سے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ وہ باطل کے سامنے اپنی گردن نہیں جھکاتے اور اللہ کے باندھے ہوئے عہد و پیمان پر استقامت کے ساتھ ڈٹے رہتے ہیں۔ ایک صوفی اپنے نبی ﷺ کی طرح مخالفتوں اور طوفانوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے۔ ایسے صوفی مردوں کے لئے شریف کنجاہی نے درج ذیل اشعار موقع کی مناسبت سے کہے ہیں۔

حالات کے قدموں پہ قلندر نہیں گرتا　　گرتا ہے ستارہ تو زمین پر نہیں گرتا
گرتے ہیں سمندر میں بڑے شوق سے دریا　　لیکن کسی دریا میں سمندر نہیں گرتا

علامہ اقبالؒ نے مردِ قلندر اور مردِ مومن کے نام جو اشعار لکھے ہیں وہ ایک سچے صوفی کے کردار کی ترجمانی کرتے ہیں۔ آپؒ نے لکھا ہے کہ جب ایک مردِ مومن اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو اس کے رکوع و سجود کی ہیبت سے روحِ زمین کانپ اُٹھتی تھی اور اس کی اذان سے پہاڑوں میں بھی لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ (مردِ مومن کے رکوع اور سجود کی کیفیت ہماری تصنیف ''حسنِ نماز'' میں کافی تفصیل سے بیان کر دی گئی ہے) اُن کی نماز عام لوگوں کی نمازوں کی طرح نہیں ہوتی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عرشِ اعظم پر مصلیٰ گزارتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کی رضا کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے۔ ان کی عبادت محض ارکانِ مخصوصہ کی صورت میں ہی نہیں بلکہ اپنی روحانی غایت و مقصود کی متحمل ہوتی ہے، جب نماز اور روزہ کا مقصود حاصل ہو جائے تو اللہ ان سے راضی ہو جاتا ہے اور ایسی عبادت صوفی میں مثالی اخلاق اور سیرت سازی پیدا کرتی ہے۔ عربی میں مثل مشہور ہے۔

اِنَّمَا الْاُمَمُ بِالْاَخْلَاقِ مَا بَقِيَتْ فَاِنْ ذَهَبَتْ اَخْلَاقُهُمْ ذَهَبُوْا!

اُمتیں اخلاق سے ہی ہوتی ہیں جب تک اخلاق باقی رہیں وہ بھی باقی رہتی ہیں لیکن اگر اخلاق

جاتے رہیں تو اُمتیں بھی جاتی رہتی ہیں۔
(الرسالہ القشیریہ ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن)

نظریہ تصوف کی وضاحت

تصوف ایک ایسا وسیع علم ہے کہ دنیا بھر میں اس پر لاکھوں کتابیں تحریر ہو چکی ہیں۔ صوفیائے کرام نے مولانا رومؒ کی مثنوی کی بہت سی شرحیں تحریر کی ہیں۔ مولانا رومؒ کے ایک شعر کی وضاحت میں ایک ہزار صفحات کی ایک کتاب جس کا نام ''بحر العلوم'' ہے لکھی گئی ہے۔ کافی اختصار سے کام لینے کے باوجود راقم الحروف کی ایک کتاب ''سوز و سازِ رومی'' کی ضخامت کافی ثقیل ہو چکی ہے۔ اس باب میں نظریہ تصوف اور تصوف کے چند مخصوص پہلوؤں پر روشنی ڈالی جارہی ہے۔ علامہؒ نے بھی مثنوی پر بہت کچھ لکھا ہے۔

نگاہِ شوق تسلی بہ جلوہ نشود کجا برم خلشے را کہ در دل است ہنوز
(ایک جلوے سے نگاہ کی تسلی نہیں ہوتی جو خلش اب بھی دل میں ہے، اسے کہاں لے جاؤں۔)

حضورِ یار حکایت دراز تر گردید چنانکہ ایں ہمہ ناگفتہ در دل است ہنوز
(محبوب کے حضور بات بہت لمبی ہوگئی اس کے باوجود بہت سی اَن کہی باتیں ابھی دل میں ہیں۔)(ز۔ع:۴۲۹)

تصوف کی تعریف مشائخ کی زبان سے

مشائخ عظام نے اپنے اپنے الفاظ میں تصوف کی تعریف بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور مختصر الفاظ میں بہت عمدہ عبارات عوام کی جاذبیت کے لئے پیش کی ہیں تاکہ لوگ اس کو سمجھ کر اس کی طرف رغبت کریں۔ اس سلسلے میں چونکہ کلام کافی طویل ہے لہٰذا ایک الگ باب اس موضوع کے لئے مختص کر دیا گیا ہے۔ آئندہ صفحات پر اس باب کی طرف رجوع فرمائیں۔ یہاں پر ابتدائی وضاحت کے لئے چند صوفیائے عظام کی تحریریں بطور نمونہ پیش خدمت ہیں، ملاحظہ فرمائیں۔

تصوف کی نظریاتی تشریح (چند مشائخ کی آراء)

تصوف شدت سے کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ کی اتباع کا نام ہے۔

(۱) حضرت ثناء اللہ پانی پتیؒ: فرماتے ہیں کہ تصوف میں وہ علم حاصل کرنا ہوتا ہے جو کتاب اور حکمت کے علاوہ ''علم لدنی'' جو قرآن کے باطن اور نبی کریم ﷺ کے روشن سینہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کا حصول بذریعہ تعلیم نہیں بلکہ بطریق انعکاس ہے۔ اس میں قرآن اور نبوت کی کرنیں دل کے آئینہ پر منعکس ہوتی ہیں۔ اولیائے کاملین انوار نبوت کے صحیح وارث ہوتے ہیں، وہ اپنے مریدین کو اس قسم کے علوم اور معارف کا اِلقا اور فیضان فرماتے ہیں۔ جبریلؑ نے پہلی وحی کے وقت رسول اللہ ﷺ سے تین مرتبہ معانقہ کیا اور اس کے بعد

"اقرأ" والی وحی نازل ہوئی۔ یہی طریقہ انعکاس کا ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو کچھ میرے سینہ میں ڈالا گیا، وہ میں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سینہ میں ڈال دیا۔

(۲) ابو سعید ابو الخیرؒ: فرماتے ہیں کہ تصوف ترکِ تکلف کا نام ہے۔ تکلف میں چونکہ خودی اور تکبر ہوتا ہے اس لئے اس کا ترک ضروری ہے۔

(۳) شیخ سعدیؒ: آپؒ نے فرمایا۔

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست　نہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

(طریقت خدمتِ خلق کے علاوہ کچھ بھی نہیں، تسبیح، مصلّی اور گودڑی طریقت نہیں ہے۔)

تصوف میں عاجزی اور نیاز مندی ہے اور اللہ تعالیٰ کو ان دونوں چیزوں سے بڑھ کر کوئی چیز پسند نہیں ہے۔ انکساری سخت پتھر پر گرے تو وہاں سے چشمہ آب جاری ہو جاتا ہے۔ تصوف میں عبادت بھی ہے اور خدمتِ خلق بھی عبادت اللہ کی ہوا کرتی ہے اور خدمت مخلوق کی ہوتی ہے۔ عبادت رائیگاں جاسکتی ہے مگر خدمت رائیگاں نہیں جاتی۔ عبادت کے معیار پر کوئی شخص ہی پورا اُترتا ہے، مگر خدمت خواہ کتنی حقیر ہی کیوں نہ ہو، مقبول ہوتی ہے۔ گویا تصوف ایسی راہ دکھاتا ہے جو قبولیتِ اعمال کا سبب بنے۔

(۴) علامہ اقبالؒ کا نکتۂ نظر: آپؒ نے اسلام کے تمام امور پر بہت عمیق اور فلسفیانہ گفتگو کی ہے۔ شاید ہی کوئی مضمون ایسا ہے جس پر آپؒ نے قلم نہیں اٹھایا۔ تصوف سے آپ کو گہری دلچسپی تھی۔ لہٰذا جس قدر آپ کا کلام تصوف پر ملتا ہے، شاید ہی کسی اور موضوع پر ملتا ہو۔ خودی آپؒ کا ایک ایسا پسندیدہ موضوع ہے جس میں آپ نے بہت طویل کلام کیا ہے اور اگر دیکھا جائے تو خودی پر آپ کا کلام دراصل تصوف کا ہی ایک حصہ ہے۔ اس کتاب میں تصوف پر علامہؒ کی آراء کو بہت زیادہ وزن دیا گیا ہے۔ یہاں چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

پس طریقت چیست اے والا صفات　شرع را دیدن بہ اعماقِ حیات

(اے اہل صفات' طریقت کیا ہے؟ شرع کو حیات کی گہرائیوں سے دیکھنا)

فاش می خواہی اگر اسرارِ دیں　جز بہ اعماقِ ضمیرِ خود مبیں

(اگر تو دین کے اسرار فاش دیکھنا چاہتا ہے تو اسے اپنے ضمیر کی گہرائیوں کے علاوہ کہیں اور نہ دیکھ)

بندہ تا حق را نہ بیند آشکار　بر نمی آید ز جبر و اختیار (پ۔چ:۸۲۷)

(جب تک بندہ حق (صداقت) کو آشکار نہ دیکھے، وہ جبر وقدر کے چکر سے باہر نہیں نکل سکتا)

عصرِ من پیغمبرے ہم آفرید　آنکہ در قرآں بغیر از خود ندید

(میرے دور نے ایک نبی (یعنی مرزا قادیان کی شکل میں) ظاہر کر دیا، وہ جسے قرآن پاک میں اپنے سوا اور کچھ نظر نہ آیا)

ہر یکے دانائے قرآن و خبر　　در شریعت کم سواد و کم نظر

(یہ سب قرآن وحدیث کے عالم ہونے کے دعویدار ہیں، مگر شریعت سے بے بہرہ اور اس کے راز دیکھنے سے بے بصر ہیں)

عقل و نقل افتادہ در بندِ ہوس　　منبرِ شاں منبر کاک است و بس

(ان کی عقل ونقل ہوس کے بند میں بندھی ہوئی ہے، ان کا منبر صرف منبر کاک ہے (وہ صرف پیٹ کے بندے ہیں۔)

زیں کلیماں نیست امیدِ کشود　　آستیں ہا بے یدِ بیضا چہ سود؟ (پ۔چ:۸۲۸)

(ان کلیموں سے کشادگی معاملہ کی اُمید نہیں، ایسی آستینیں جن میں یدِ بیضا نہ ہوان کا کیا فائدہ؟)

خسروی شمشیر و درویشی نگہ　　ہر دو گوہر از محیطِ لآ اِلٰہ!

(پ۔چ:۸۵۱)

(خسروی (بادشاہی) تلوار ہے اور درویشی نگاہ کا نام ہے، یہ دونوں گوہر لآ اِلٰہَ کے دائرۂ احاطہ میں ہیں۔)

فقر و شاہی وارداتِ مصطفیٰ است　　ایں تجلیہائے ذاتِ مصطفیٰ است

(فقیری اور بادشاہی دونوں حضور اکرم ﷺ کی کیفیتیں ہیں، یہ دونوں مصطفیٰ ﷺ کی ذات کی تجلیات ہیں۔) (پ۔چ:۸۵۱)

فُقر سوز و درد و داغ و آرزو ست　　فُقر را در خوں تپیدن آبرو ست (پ۔چ:۸۵۱)

(فقر سراپا (دین کے لئے) سوز ودرد وداغ وآرزو کا ہی نام ہے، فقر تو اپنے خون کو گرم رکھنے کا نام ہے۔)

علامہ اقبالؒ کا نظریہ اس کتاب کے اوائل میں ''فقر اور درویشی'' کے عنوان کے تحت کافی وضاحت سے بیان ہو چکا ہے۔

تصوف کے بارے میں اہلِ علم کا نقطۂ نظر

تصوف کسی ایک چیز کا نام نہیں، بلکہ مختلف چیزیں اس نام سے موسوم ہوگئی ہیں۔ جس تصوّف کی اہل علم تصدیق کرتے ہیں، وہ اور چیز ہے، جس تصوف کی دانشور تردید کرتے ہیں، وہ ایک دوسری چیز ہے۔ جس تصوف کی صاحبانِ تصوف اصلاح چاہتے ہیں وہ ایک تیسری چیز ہے۔

ایک تصوف وہ ہے جو اسلام کے ابتدائی دور کے صوفیا میں موجود تھا، مثلاً حضرت فضیل بن عیاضؒ، جناب ابراہیم بن ادہمؒ اور خواجہ معروف کرخیؒ۔ اس کا کوئی الگ فلسفہ نہ تھا، اس کا کوئی الگ طریقہ نہ تھا، وہی افکار، وہی اشغال واعمال تھے، جو کتاب وسنت سے ماخوذ تھے اور ان سب کا وہی مقصود تھا، جو اسلام کا مقصود ہے۔

یعنی اخلاص للہ اور توجہ الی اللہ "وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ" (البیّنۃ۔ ۵) " حالانکہ نہیں حکم دیا گیا تھا انہیں مگر یہ کہ عبادت کریں اللہ تعالیٰ کی دین کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے۔" اس تصوف کی ہم تصدیق کرتے ہیں اور صرف تصدیق ہی نہیں کرتے بلکہ اُس کو زندہ اور شائع کرنا ہم اپنا وظیفۂ حیات سمجھتے ہیں۔

دوسرا تصوف وہ ہے جس میں اشراقی اور رواقی، زرتشتی اور ویدانتی فلسفوں کی آمیزش ہوگئی ہے، جس میں عیسائی راہبوں اور ہندو جوگیوں کے طریقے شامل ہو گئے ہیں جس میں مشرکانہ تخیلات و اعمال تک خلط ملط ہو گئے ہیں، جس میں شریعت اور طریقت اور معرفت الگ الگ چیزیں بتلائی جاتی ہیں۔ ایک دوسرے سے کم و بیش لاتعلق بلکہ بسا اوقات باہم متضاد دکھائی جاتی ہیں اور جس میں انسان کو خلیفۃ اللہ فی الارض کے فرائض کی انجام دہی کے لئے تیار کرنے کے بجائے اسے اور مختلف مقاصد کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ اس تصوف کی ہم سراسر تردید کرتے ہیں اور ہمارے نزدیک اس کو مٹانا خدا کے دین کو قائم کرنے کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ جاہلیت کو مٹانا۔ یہ وہ تصوف ہے جس کی مخالفت حضرت علی الہجویریؒ، خواجہ سرہندیؒ اور علامہ اقبالؒ نے پوری شدومد سے کی ہے۔

ان دونوں کے علاوہ ایک اور تصوف بھی ہے جس میں کچھ خصوصیات پہلی قسم کے تصوف کی اور کچھ خصوصیات دوسری قسم کے تصوف کی پائی جاتی ہیں۔ اس تصوف کے طریقوں کو ایسے متعدد بزرگوں نے مرتب کیا ہے جو یقیناً صاحبِ علم اور نیک نیت تھے، مگر اپنے دور کی خصوصیات اور پچھلے ادوار کے اثرات سے بالکل بھی محفوظ نہ تھے۔ انہوں نے اسلام کے اصلی تصوف کو سمجھنے اور اس کے طریقوں کو جاہلی تصوف کی آلودگیوں سے پاک کرنے کی پوری کوشش کی ہے لیکن اس کے باوجود ان نظریات اور اعمال و اشغال میں جاہلانہ فلسفۂ تصوف کے کچھ نہ کچھ اثرات باقی رہ گئے، جن کے بارے میں ان کو یہ اشتباہ پیش آیا کہ یہ چیزیں کتاب و سنت کی تعلیم سے متصادم نہیں ہیں یا کم از کم تاویل کے ذرائع سے اُنہیں غیر متصادم سمجھا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں اس تصوف کے مقاصد اور نتائج بھی اسلام کے مقصد اور اس کے مطلوبہ نتائج سے کم و بیش مختلف ہیں اور نہ تو اس تصوف کا مقصد واضح طور پر انسان کو فرائضِ اخلاق کی ادائیگی کے لئے تیار کرتا ہے جیسے قرآنِ کریم میں فرمایا گیا ہے۔

لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (البقرۃ: ۱۴۳) (تاکہ تم گواہ بنو لوگوں پر)

کے الفاظ میں بیان کیا ہے اور نہ اس کا نتیجہ یہ ہو سکا ہے کہ اس کے ذریعے ایسے آدمی تیار ہوتے جو دین کے پورے تصور کو سمجھتے اور اس کی اقامت کی فکر انہیں لاحق ہوا اور وہ اس کام کو انجام دینے کے اہل بھی ہوں۔ اس تیسری قسم کے تصوف کی نہ تو مشائخ عظام کی ایک بڑی تعداد کلی تصدیق کرتی ہے اور نہ کلی تردید۔ اس کے پیروؤں اور حامیوں سے گذارش یہ ہے کہ براہ کرم بڑی بڑی شخصیتوں کی عقیدت کو اپنی جگہ رکھتے ہوئے آپ

کتاب وسنت اور بزرگانِ سلف کی سیرت کی روشنی میں اس تصوف پر تنقیدی نگاہ ڈالیں اور اسے درست کرنے کی کوشش کریں۔ نیز جو شخص اس تصوف سے اس بناء پر اختلاف کرے کہ وہ اُسے کتاب وسنت اور بزرگانِ سلف کی سیرت کے خلاف پاتا ہے، تو قطع نظر اس سے کہ آپ اس کی رائے سے موافقت کریں یا مخالفت، بہر حال اس کے حقِ تنقید کا انکار نہ فرمائیں اور اسے خواہ مخواہ نشانہ ملامت نہ بنانے لگیں۔

تدوینِ تصوف (تصوف کا مرتب ہونا)

حضرت رسول خدا ﷺ کے زمانہ مبارک میں جو اشخاص مسلمان ہو جاتے تھے، وہ اول صحبت میں بقدر استعداد باطنی نور ہدایت و کمالاتِ ولایت سے منّور و مملو ہو جاتے تھے جیسا کہ آئینہ آفتاب کے مقابلہ میں ہو جاتا ہے۔ بعد ازاں وہ بقدرِ حوصلہ و استعداد حضور اقدس ﷺ کے کلام شریف سے استفادہ علوم ظاہری کرتے تھے۔ پھر آنحضرت ﷺ کی صحبت میں ریاضات و مجاہدات، ہجرت، جہاد مع الکفار، بذلِ جان و مال، قیامِ شب و روز کے سبب بے حد ترقی کر جاتے تھے۔

كَانُوْا رُهْبَانًا بِالَّيْلِ وَ قِيَامًا بِالنَّهَارِ یعنی رات کے نمازی اور دن کے غازی، ان کی شان میں آیا ہے۔

غرضیکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب کمالاتِ ظاہر و باطن کے جامع تھے اور ایسے مرتبہ میں تھے کہ اُمت میں کوئی اس مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد قرنِ ثانی نے ان نفوس قدسیہ کی مصاحبت و مکالمت سے کسب ظاہر و باطن کیا۔ اسی طرح قرنِ ثالث وقوع میں آیا، مگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صحبت کی تاثیر ایسی نہ تھی جیسا کہ حضور اکرم ﷺ کی صحبت کی تھی۔ اسی طرح تابعین کی تاثیر اور بھی کمزور ہو گئی۔ دوسری صدی ہجری میں اکابرین کی ایک جماعت یعنی مجتہدین، علوم ظاہری کی ضامن ہوئی اور انہوں نے احکامِ شرعیہ کے استنباط کے لئے قرآن وحدیث سے قواعد واصول مرتب کر کے علوم عقائد و فقہ کی تدوین کی۔ اس کے بعد تیسری صدی ہجری میں اکابرین کی دوسری جماعت نے علوم ظاہری پر بقدر ضرورت (جو فرض عین تھا) اکتفا کیا اور فرض کفایہ کو دوسروں پر چھوڑ دیا اور اس میں ان کی تقلید قبول کر کے حقائقِ شریعت و کمالاتِ باطن کے افادہ و استفادہ کے لئے کمر ہمت باندھی اور اس کے قواعد واصول مُنضبط کر کے علم تصوف وطریقت کی تدوین کی۔ وہ قواعد بھی (مثلاً کم کھانا، کم سونا، عوام سے میل جول کم رکھنا، اربابِ عقول، قلوب مزکی اور نفوس مرضیہ کی صحبت میں رہنا، کثرت سے ذکر کرنا، خلق سے دور رہنا، سنت کا اتباع کرنا، بدعت کا ترک کرنا، مشتبہات سے پرہیز کرنا، نیز بے مقصد اور فضول گفتگو سے کنارہ کشی وغیرہ شرع سے مستنبط اور احادیث سے ثابت تھے۔ (التکشف از مکتوبات قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ)

صوفیہ کرام میں سے حضرت ذوالنون مصریؒ (متوفی ۲۴۵ھ) پہلے صوفی تھے جنہوں نے سب سے پہلے مصر میں ترتیبِ احوال و مقاماتِ ولایت میں کلام کیا اور حضرت ذوالنون مصریؒ کے تلامذہ میں سے حضرت ابوسعید خراز بغدادیؒ (متوفی ۲۷۹ھ) پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے فنا و بقاء میں تکلم کیا اور حضرت ابوحمزہ محمد بن ابراہیم بغدادیؒ (متوفی ۲۸۹ھ) پہلے صوفی ہیں جنہوں نے بغداد میں مذاہب صوفیہ میں کلام کیا۔

روح کی پیاس یادِ خُدا سے بجھتی ہے، یہی تصوف کی غایت ہے۔

یہ حقیقت اب پوری دُنیا کے مشاہدے میں آ رہی ہے کہ مغربی ممالک بالخصوص روس اور امریکہ میں لوگ جو پہلے مادیت کے فریب خوردہ تھے، اب اسلامی اصولوں اور روحانیت کے قائل ہوتے جا رہے ہیں۔ ان ممالک میں سپر چولزم (spirtualism) پر بہت کام ہو رہا ہے اور ان ممالک کی حکومتوں کو اس بات کا خطرہ لاحق ہو رہا ہے کہ عنقریب ان ممالک میں مذہب اسلام رائج ہو جائے گا۔ وہاں کے لوگ امام غزالیؒ، ابن عربیؒ، جنید بغدادیؒ اور مولانا رومیؒ وغیرہ کی روح پرور تصانیف سے متاثر ہو کر کثرت سے اسلام قبول کر رہے ہیں۔ ''روحانیتِ اسلام'' مؤلف واحد بخش سیال نے مغربی ممالک کے احوال کافی تفصیل سے بیان کئے ہیں، اس کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔

مذکورہ ممالک میں اسلام کے مقبول ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مادیت میں نہ تو روح کی غذا موجود ہے اور نہ ہی لادینیت میں ایسی بات موجود ہے۔ انسان مجموعہ ہے روح اور جسم کا۔ جسم کا تعلق مادی دنیا سے ہے اور اس کی غذا بھی مادی ہے۔ روح، عالمِ قدس کی چیز ہے اور اس کی غذا بھی روحانی ہے۔ خالقِ کائنات کی محبت، اس کی معرفت اور قرب وغیرہ رُوح کی غذا ہے۔ جس طرح انسان کا جسم مادی غذا نہ ملنے کی وجہ سے بے چین ہو جاتا ہے اسی طرح روح کو بھی روحانی غذا نہ ملنے سے سخت بے چینی اور بے قراری لاحق ہوتی ہے۔ لہٰذا مغربی دنیا اور اس کی بے چینی، پریشانی اور آپس میں رسہ کشی اور جنگ و جدال کی حقیقی وجہ روح کی بے قراری ہے اور جب تک اہلِ مغرب اور اہلِ روس روحانی غذا حاصل نہیں کریں گے' اسی طرح بے چینی، بدامنی اور جنگ و جدال میں مبتلا رہیں گے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان ممالک میں دولت کی فراوانی اور عیش وعشرت کے باوجود خودکشی اور دماغی امراض کی اس قدر کثرت ہے کہ اقوامِ متحدہ کے اعداد و شمار کے مطابق وہاں کے ہر شہر کے ہر ہسپتال میں نصف سے زیادہ بیڈ دماغی امراض کے مریضوں کے لئے مخصوص رہتے ہیں اور خودکشی کی وارداتیں بھی ان دولت مند ممالک میں غریب ملکوں سے کئی گنا زیادہ ہیں۔ ان تمام خرابیوں اور بے چینیوں کی وجہ وہی روحانی غذا کا فقدان ہے جس سے کئی صدیوں سے یہ لوگ محروم ہیں۔

ایک دفعہ ایک انگریز ادیب کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ میرے پاس اس قدر دولت ہے کہ ہر چیز خرید سکتا

ہوں، ہر قسم کا آرام و آسائش میسر ہے لیکن میرے دل میں ایک ایسی تڑپ ہے کہ جس کا علاج مجھ سے نہیں ہو سکا نہ اچھے اچھے کھانوں سے وہ تڑپ ختم ہوتی ہے، نہ اچھے کپڑے پہننے سے اور نہ حسین چہروں سے۔ اس انگریز ادیب نے ایک مسلمان سکالر سے پوچھا کہ آپ بتائیں کہ وہ کیا چیز ہے جو میرے اندر اس قدر آگ بھڑکا رہی ہے؟ مسلمان سکالر نے اسے جواب دیا کہ ہر انسان کے اندر روح موجود ہے اور روح کی غذا محبتِ الٰہی، یادِ الٰہی اور قربِ الٰہی ہے، جب تک اسے یہ غذا نہیں دی جاتی روح بے چین رہتی ہے۔ تمہارے دل میں حق تعالیٰ کی محبت موجزن ہے اور جب تک آپ یادِ خدا اور قربِ خداوندی سے محروم رہیں گے، بے چین رہیں گے۔ ایک امریکی نومسلم سے جب پوچھا گیا کہ آپ کس طرح مسلمان ہوئے؟ تو اس نے کہا کہ شراب سے۔ اس سے پوچھا گیا کہ شراب سے آپ کیسے مسلمان ہوئے؟ تو اس نے کہا کہ میں اس قدر شراب پیتا تھا کہ بالآخر اس کا اثر مجھ پر ختم ہو گیا اور مجھے نشہ چڑھنا بند ہو گیا۔ اس سے میری طبیعت میں سخت قسم کی بے چینی پیدا ہو گئی اور میں تیز قسم کی سپرٹس سے اپنی پیاس بجھانے لگا جس سے میرا دماغ اور بھی پریشان ہوا۔ ایک دن میں نے اپنے بھائی کے ہاتھ میں ایک کتاب دیکھی، وہ قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ تھا۔ جب میں نے اسے کھول کر بڑھا تو مجھے اس قدر سکون حاصل ہوا کہ میری جان میں جان آ گئی اور میں اسی وقت مسلمان ہو گیا۔ تو یہ خداوند عالم کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ مادیت اور لادینیت میں سرشار ممالک میں خود بخود اسلامی روحانیت کی تڑپ پیدا ہو رہی ہے اور نشوں سے خراب حال لوگ خود بخود اسلام کی طرف آ رہے ہیں۔ اس لئے آج کل ان ممالک میں اسلامی روحانیت کی جستجو اس قدر بڑھ گئی ہے کہ پہلے کبھی نہ تھی۔ روس میں تو باقاعدہ سرکاری طور پر قومی تجربہ گاہوں میں سرکاری ڈاکٹروں اور ماہرینِ روحانیت ونفسیات کے ہاتھوں اسلامی کشف و کرامات یعنی مافوق العادت اُمور پر آلات اور مشینوں اور کیمروں کے ذریعے تجربے ہو رہے ہیں اور ٹیلی پیتھی کے ذریعے دور دراز مقامات کے مابین سلسلہ مواصلات ہونا شروع ہو گیا۔ نیز روحانی قوت کے ذریعے وزنی چیزوں کو بغیر ہاتھ لگائے حرکت دینا زمین سے ایک دو انچ اوپر ہوا میں معلق ہونا اور دور کی چیزوں کو دیکھنا اور دور کی آوازوں کو سننا، ان تمام مافوق العادات اُمور پر تجربے ہو رہے ہیں اور وہ دن دور نہیں کہ جب روس اسلام کی بے پناہ روحانی قوت سے بہرہ ور ہو کر اسلام قبول کر لے گا۔

عالمِ اسلام کا سب سے بڑا المیہ

اسلامی دنیا کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ تہذیبِ مغرب کے زہریلے اثرات کا طوفان اُمڈا چلا آ رہا ہے اور نہ صرف گھر گھر کے اندر گھس رہا ہے بلکہ مسلمانوں کے دل و دماغ میں سرایت کر رہا ہے جس سے ہماری قدیم مذہبی، روحانی معاشرتی اور اخلاقی اقدار کو سخت دھچکا لگا ہے۔ دوسری مصیبت یہ ہے کہ اس زہریلے تمدن کو اقوام مغرب کی بے پناہ فوجی قوت کی پشت پناہی حاصل ہے جس کے ذریعے یہ زہر زبردستی ہمارے حلق

کے اندر اُتارا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ اقوامِ مغرب کی یلغار بھی اسلامی ممالک میں بڑھ رہی ہے کیونکہ جغرافیائی اور فوجی اعتبار سے یہ ملک بے حد اہمیت کے حامل ہیں اور قدرتی معدنیات اور تیل وغیرہ سے مالا مال ہیں۔ لہٰذا اِن فوجی اور تمدنی یا نظریاتی حملوں کے جواب میں ایک تو اسلامی ممالک کو متفقہ محاذ پیدا کر کے اپنی فوجی قوت کو بڑھانا اور یکجا کرنا ہے، دوسرے محاذ پر ہم نے ان لوگوں کے تمدنی یا نظریاتی حملوں کے جواب میں اپنی اسلامی روحانیت کے بے پناہ ذخائر کو بڑھانا اور بروئے کار لانا ہے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، قدرت ہماری امداد کر رہی ہے اور وہاں کے لوگ مادیت اور لادینیت کی خشک اور مہلک فضا سے تنگ آ کر خود بخود اسلامی روحانیت کی تلاش میں امام غزالیؒ اور ابن عربیؒ کی کتابوں کی ورق گردانی میں مصروف ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ فوجی محاذ پر اگرچہ ہم مسلمان فی الحال کمزور ہیں اور یہ کمزوری عارضی ہے، لیکن الحمد اللہ روحانی محاذ پر ہمیں فوقیت حاصل ہے بشرطیکہ یہ اطمینان بخش حد تک ترقی کر جائے۔ ان کی دفاعی لائن کے اِس حصے میں یعنی نظریاتی حصے میں اب اسلامی روحانیت نے جا بجا شگاف ڈال دیئے ہیں۔ یہ ایک اہم فوجی اصول ہے کہ "کمک ہمیشہ اس محاذ پر پہنچانی چاہیے، جہاں کامیابی ہو رہی ہو نہ کہ اس محاذ پر جہاں ناکامی کا سامنا ہو۔" اب چونکہ روحانیت کے میدان میں ہمیں کامیابی ہو رہی ہے، ہمارا فرض ہے کہ اسی محاذ کو ہم مضبوط سے مضبوط تر بنائیں اور زیادہ سے زیادہ اولیائے کرام کی تصانیف کے تراجم، ان کی روحانیت کے پیاسوں کے سامنے پیش کیے جائیں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ اسلام قبول کریں، جس سے ان کی توپیں خود بخود ٹھنڈی پڑ جائیں۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک انگریز نو مسلم کے سامنے جو تصوف کی کتابیں پڑھ کر مسلمان ہوا تھا، ایک مسلمان سکالر اقوامِ مغرب اور روس کی یلغار کا ذکر کر رہا تھا تو اس نے بڑے پُر سوز، درد افروز اور جان افزا الفاظ میں کہا کہ "آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں، جہاں اِن لوگوں کی توپیں اسلامی ممالک کی سرحدوں پر کھڑی کر دی گئی ہیں تو اللہ کی قدرت سے اِن کے اپنے گھروں کے اندر ہم جیسے جانثار مجاہدینِ اسلام پیدا ہو رہے ہیں۔" یہ حقیقت ہے اور خداوند بزرگ و برتر کی قدرت کا عظیم الشان کرشمہ ہے کہ بقول علامہ اقبالؒ

ع پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے (ب۔د:۲۰۶)

حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کی تہذیب و تمدّن میں خداوند عالم سے بغاوت اور تباہی کے تخم پوشیدہ ہیں اور ان کی معیشت ہو یا معاشرت، سائنس ہو یا سیاست ہر چیز کے اندر تخریب اور توڑ پھوڑ کے اثرات موجود ہیں۔ ہم مسلمانوں کے لیے واحد لائحہ عمل یہ ہے کہ ہم انکے گمراہ کن، کافرانہ اور مشرکانہ تمدّن کو اپنانے کی بجائے اس سے پرہیز کریں اور اسلام کے ابدی اصولوں پر سختی سے جم جائیں۔ مسلمان کبھی بھی کافروں کی غلامی میں ترقی نہیں کر سکتے۔ ہم مسلمان دینِ حق پر ہیں، لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم اقوامِ مغرب کی تقلید کی بجائے خود ان کو اپنی یعنی اسلام کی تقلید پر آمادہ کریں۔ مسلمان کا وجود دنیا میں خلیفۃ اللہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ خلیفۃ اللہ کے لئے یہ

مناسب نہیں کہ خداوند تعالیٰ سے باغی اقوام کا مقلد بنا پھرے۔ ہمارے مذہب اسلام اور ان کے مذہب عیسائیت کو بارہا دنیا میں آزمایا جا چکا ہے۔ جہاں عیسائیت کی حکمرانی سے یورپ چھ سات صدیوں تک دنیا کے تاریک ترین دور "جس کو مورخینِ یورپ (Dark Ages) کے نام سے یاد کرتے ہیں" میں مبتلا رہا ہے، وہاں اسلامی اقتدار کے زمانوں میں مسلم سپین، بغداد، دمشق اور بخارا کی یونیورسٹیوں سے یورپ کو بالخصوص اور باقی دنیا کو بالعموم علوم وفنون، تہذیب وتمدّن اور سائنس کے وہ انمول خزانے حاصل ہوئے کہ دنیا دنگ ہے۔

آج ہمارے نام نہاد ترقی پسند کہتے ہیں کہ مذہب رجعت پسندی ہے، جب تک اقوامِ مغرب مذہب پر پابند رہے زوال پذیر رہے، جب سے انہوں نے مذہب کا چغہ اُتار کر پھینکا، ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہیں۔ ہمارے ان نام نہاد ترقی پسندوں اور احساسِ کمتری میں ڈوبے ہوئے انسانوں نے تاریخ کا اتنا مطالعہ بھی نہیں کیا کہ جس سے ان کو معلوم ہو کہ اقوامِ مغرب نے صرف مادیّت کے میدان میں ترقی حاصل کی ہے، انہوں نے اپنے رجعت پسندانہ مذہب عیسائیت کو چھوڑ کر اور اسلام کی مادی ترقی اور سائنس کے فروغ کے اصولوں کو اپنا کر ترقی کی ہے۔ مذہب کی وجہ سے تنزل کے گڑھے میں جا گرنا اہل مغرب کا تاریخی تجربہ نہیں ہے۔ اسلام کا تاریخی تجربہ یہ ہے کہ اس سے مسلمانوں کو نہ صرف روحانیت کے میدان میں عظیم الشان کامیابیاں حاصل ہوئیں اور وہ قرب ومعرفتِ الٰہی کے بلند ترین مقامات پر پہنچ گئے، بلکہ مادیت کے میدان میں انہوں نے علوم وفنون اور سائنس میں وہ ترقی کی ہے کہ یورپ کے استاد بن کر دُنیا میں ابھرے تھے، یورپ کے مورخین اس بات کو متفقہ طور پر تسلیم کرتے ہیں کہ علوم وفنون اور سائنس وتمدّن کے میدان میں یورپ کو جو ترقی حاصل ہوئی ہے، وہ اسلام اور مسلمانوں کی مرہونِ منت ہے۔

موجودہ دنیا کی المناک حالت کا علاج اسلامی تصوّف ہے

جب دنیا کا اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا، تو انہوں نے دنیا کو روحانیت، تہذیب وتمدّن، علوم وفنون، فلسفہ اور سائنس کی دولت سے مالا مال کیا اور برِّ اعظم یورپ بلکہ ساری عیسائی دنیا کو قرونِ وُسطیٰ کے اس دور کی جہالت، بربریت اور تاریکی سے باہر نکالا جو تاریخ یورپ میں دورِ تاریک (Dark Ages) کے نام سے بدنام ہے، لیکن جب سے دنیا کا اقتدار نام نہاد مہذب اقوامِ مغرب کے ہاتھ آیا ہے، انہوں نے اپنے لادینی اور مادیت پرستانہ نظریات کے ذریعے استبداد اور قومی برتری کو فروغ دینے کی خاطر دنیا میں روحانی اور اخلاقی اقدار کا خاتمہ کر دیا ہے اور کمزور اقوام کے خون میں ہولی کھیل رہے ہیں، جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ انہوں نے دنیا کو ایسا جہنم بنایا ہے کہ جس سے نہ صرف کمزور اقوام بلکہ وہ لوگ بذاتِ خود نالاں اور پریشان ہیں۔ طاغوتی طاقتوں کے فروغ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ آپس میں لڑیں، خود بھی تباہ ہوں اور ساری دنیا کو بھی تباہ

کریں۔ چنانچہ آج دنیا میں بڑی اقوام کے درمیان جو شدید رسہ کشی، رقابت اور عناد پایا جا رہا ہے، وہ سب ان کے لادینی، مادی اور قومی برتری کے نظریات کا پیدا کردہ ہے اور جب تک ان منحوس نظریات کا دنیا سے خاتمہ نہیں ہوتا، دنیا میں بدامنی اور جنگ و جدال کا بازار گرم رہے گا اور بنی نوع انسان پر عالم گیر جنگوں کی بھرمار ہوتی رہے گی۔ اس میں شک نہیں کہ آنے والی تباہی سے اقوامِ مغرب بھی نا آگاہ ہیں اور اس کو روکنے اور آپس میں صلح جوئی کے لئے وہ لوگ زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے ہیں لیکن امن وسکون دور سے دور تر ہوتا جا رہا ہے اور موت بنی نوع انسان کے سروں پر منڈلا رہی ہے۔ جن کانفرنسوں کو یہ لوگ ہتھیاروں کی دوڑ کو بند کرنے اور امن و امان کی فضا پیدا کرنے کے لئے منعقد کرتے ہیں، انہی کانفرنسوں سے ان کا باہمی عناد زیادہ فروغ پاتا ہے اور مہلک سے مہلک آلات کے پہلے سے زیادہ انبار لگنے شروع ہو گئے ہیں ۔

ع مرض بڑھتا گیا جُوں جُوں دوا کی

دراصل ان کی عقل اس قدر مسخ ہو چکی ہے کہ بین الاقوامی آگ کو بجھانے کے لئے وہ پانی کی بجائے اس پر تیل چھڑک رہے ہیں۔ بالفاظِ دیگر جہاں امن وسکون کے حصول کے لئے باہمی ایمانداری کی ضرورت تھی وہاں یہ لوگ اپنا مطلب نکالنے کی خاطر بے ایمانی اور دھوکہ دہی میں یکتا بن گئے ہیں۔ جہاں دوسروں کے قلب کو مسخر کرنے کی خاطر باہمی محبت اور مروّت کی ضرورت تھی وہاں یہ لوگ نفاق اور بددیانتی میں کمال حاصل کر چکے ہیں، جہاں کمزور اقوام کے حقوق بحال کر کے ان کی تالیفِ قلب کی ضرورت تھی وہاں یہ لوگ اپنی طاقت کا مظاہرہ کر کے کمزور اقوام کے جذبات کا خون کر رہے ہیں۔ جہاں انسانی حقوق کی بحالی کے لئے انہوں نے بلند بانگ نعرے بلند کر رکھے ہیں، اور بے شمار انجمنیں کھڑی کر رکھی ہیں، وہاں کمزور اقوام جہاں کہیں اپنے حقوق کے حصول کے لئے کوشش کرتی ہیں، تو بموں اور میزائلوں سے ان کی تواضع کی جاتی ہے۔ جس عُریانی اور فحاشی کی ان کو احکم الحاکمین کی طرف سے سزا مل رہی ہے، وہی عُریانی اور فحاشی ان کی تہذیب و تمدّن کا مایہ ناز عنصر بن چکی ہے۔ جس عیش پرستی، تن پروری اور نفسانیت نے ان کے یہاں تمام روحانی اقدار اور سکونِ قلب کا جنازہ نکال دیا ہے، اسی عیاشی کے ذریعے یہ لوگ سکونِ قلب حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور خداوند عالم کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے جس روحانی اور قلبی بے چینی اور بدحواسی میں مبتلا ہوئے ہیں اسی بغاوت کو فروغ دینے کے لئے ان کی یونیورسٹیاں اور ادبی اداروں سے ہر سال لاکھوں، کروڑوں مالیت کی ایسی کتابیں، رسالے اور اخبار نکالے جا رہے ہیں جن میں الحاد، بربریت، لادینیت اور مادیت پر نہایت زہریلے مضامین شامل ہو رہے ہیں اور مذہب اور اربابِ مذہب کو بری طرح نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ حق و انصاف کو مسلسل جھٹلانے کی وجہ سے ان کے اذہان اس قدر مسخ اور معطل ہو چکے ہیں کہ اب انہوں نے تخریب کا نام تعمیر، بدکاری کا نام تمدّن، بے ایمانی کا نام اصول، بددیانتی کا نام پالیسی، فریب کاری کا نام ڈپلومیسی، بدی

کا نام نیکی اور عیاشی اور فحاشی کا نام ترقی ءنسواں رکھ دیا ہے اور انکے مسخ شدہ اذہان اب یہ محسوس کرنے سے بھی قاصر ہیں کہ ان اقدامات سے وہ اپنی جڑیں آپ کاٹ رہے ہیں اور اپنی بنیادیں آپ کھوکھلی کر رہے ہیں اور خداوند کریم کے غیظ و غضب کو دعوت دے رہے ہیں اور وہ دن دور نہیں کہ تیسری جنگ عظیم کی لپیٹ میں آ کر وہ خود بھی تباہ و برباد ہو جائیں اور باقی دُنیا کو بھی تباہ کر دیں۔ روس جیسے طاقتور ملک کا آسانی سے تباہ ہو جانا اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے اور باقی ممالک اسی قطار میں اپنی بربادی کا انتظار کر رہے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے اس کی پیشین گوئی ان الفاظ میں پہلے سے کر دی تھی۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے　کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہو گا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی　جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہو گا
(ب۔د:۱۴۱)

فقہی عبادات اور تصوف میں فرق

ہر عبادت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے فرمایا ہے کہ عبادت مثلاً نماز کے ظاہر کو صورتِ نماز کہا جاتا ہے اور باطنِ نماز کو حقیقتِ نماز کہا جاتا ہے۔ صورتِ نماز اور حقیقتِ نماز پر حضرت مجدد الف ثانیؒ کے افکار کو ہماری تصنیف ''حسنِ نماز'' میں کافی تفصیل سے پیش کر دیا گیا ہے۔ یہاں خلاصے کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جب عبادتِ نماز میں نفس کا دخل ہو تو صورتِ نماز ہو گی۔ اس میں نمازی صرف نماز کی صورت ہی اختیار کرتا ہے اور اس کے اجر میں جو جنت ملتی ہے، وہ حقیقتِ نماز کی جنت سے بہت مختلف ہے (اس کی مثال حضرت علیؓ کی وہ نماز سمجھ لیں جس میں ان کے بدن سے تیر نکال لیا گیا اور انہیں خبر بھی نہ ہوئی) دونوں کو جنت کے میوے میسر ہوں گے، ان میں بھی بہت فرق ہو گا۔ دونوں کی ولایت میں بھی فرق ہو گا۔ کچھ لوگ نماز پڑھتے ہیں تو ان کے دل دنیا کی باتوں اور کاموں میں ہوتے ہیں اور کچھ لوگ عرشِ اعظم پر مصلیٰ گذارتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا۔

احوال و مقامات پہ موقوف ہے سب کچھ　ہر لحظہ ہے سالک کا زماں اور مکاں اور
الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن　مُلّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں　کرگس کا جہاں اور ہے، شاہیں کا جہاں اور
(ب۔ج:۴۴۸)

فقہ کا تعلق انسان کے ظاہری علم سے ہے، وہ صرف یہ دیکھتی ہے کہ تم کو جیسا اور جس طرح حکم دیا گیا ہے اس کو تم بجالائے ہو یا نہیں؟ اگر بجالائے ہو تو فقہ کو اس سے کچھ بحث نہیں کہ تمہارے دل کا کیا حال تھا۔ دل

کے حال سے جو چیز بحث کرتی ہے، اس کا نام تصوف ہے۔ مثلاً تم نماز پڑھتے ہو، اس عبادت میں فقہ یہ دیکھتی ہے کہ تم نے وضو ٹھیک کیا، قبلہ رُو کھڑے ہوئے ہو یا نہیں؟ نماز کے تمام ارکان ادا کئے ہیں، جو چیزیں نماز میں پڑھی جاتی ہیں، وہ سب پڑھ لی ہیں اور جس وقت جتنی رکعتیں مقرر کی گئی ہیں، ٹھیک اسی وقت اُتنی ہی رکعتیں پڑھی ہیں یا نہیں؟ جب یہ سب کچھ تم نے کر دیا، تو فقہ کی رو سے تمہاری نماز پوری ہو گئی، لیکن تصوف یہ دیکھتا ہے کہ اس عبادت میں تمہارے دل کا کیا حال رہا؟ تم خدا کی طرف متوجہ ہوئے یا نہیں؟ تمہارا دل دنیا کے خیالات سے پاک ہوا یا نہیں؟ تمہارے اندر نماز سے خدا کا خوف اور اس کے حاضر ہونے کا یقین اور صرف اس کی خوشنودی چاہنے کا جذبہ پیدا ہوا یا نہیں؟ اس نماز نے تمہاری روح کو کس قدر پاک کیا؟ تمہارے اخلاق کو کہاں تک درست کیا؟ تم کو کس حد تک سچا اور عملی مسلمان بنا دیا؟ یہ تمام باتیں جو نماز کے اصل مقصد سے تعلق رکھتی ہیں، جس قدر کمال کے ساتھ حاصل ہوں گی تصوف کی نظر میں تمہاری نماز اُتنی ہی زیادہ کامل ہو گی اور ان میں جتنا نقص رہے گا، اُسی لحاظ سے وہ تمہاری نماز کو ناقص قرار دے گا۔

اسی طرح شریعت کے جتنے احکام ہیں، ان سب میں فقہ صرف یہ دیکھتی ہے کہ تم کو جو حکم جس صورت میں دیا گیا تھا، اس صورت میں تم اسے بجالائے یا نہیں اور تصوف یہ دیکھتا ہے کہ اس حکم پر عمل کرنے میں تمہارے اندر خلوص اور نیک نیتی اور سچی اطاعت کس قدر تھی؟ اس فرق کو آپ ایک مثال سے اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ جب کوئی شخص آپ سے ملتا ہے تو آپ اس پر کئی حیثیتوں سے نظر ڈالتے ہیں۔ ایک حیثیت تو یہ ہوتی ہے کہ وہ صحیح وتندرست ہے یا نہیں۔ اندھا، لنگڑا، لولا تو نہیں ہے۔ خوبصورت ہے، یا بدصورت، اچھے کپڑے پہنے ہوئے ہے یا میلے کچیلے لباس میں ہے۔ دوسری حیثیت یہ ہوتی ہے کہ اس کے اخلاق کیسے ہیں؟ اس کی عادات وخصائل کا کیا حال ہے؟ اس کی عقل اور سمجھ بوجھ کیسی ہے؟ وہ عالم ہے یا جاہل؟ نیک ہے یا بد ہے؟ ان میں پہلی نظر گویا فقہ کی ہے اور دوسری نظر تصوف کی ہے۔ دوستی کے لئے جب آپ کسی شخص کو پسند کرنا چاہیں گے تو اس کی شخصیت کے دونوں پہلوؤں کو دیکھیں گے۔ آپ کی خواہش یہ ہو گی کہ اس کا ظاہر بھی اچھا ہو اور باطن بھی اچھا، اسی طرح اسلام میں پسندیدہ زندگی وہی ہے جس میں شریعت کے احکام کی پابندی ظاہر کے اعتبار سے بھی صحیح ہو اور باطن کے اعتبار سے بھی۔ جس شخص کی ظاہری اطاعت درست ہے، لیکن باطن میں اطاعت کی روح نہیں ہے۔ تو اس کے عمل کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی آدمی خوبصورت ہو، مگر مردہ ہو اور جس شخص کے عمل میں تمام باطنی خوبیاں موجود ہوں، مگر ظاہری حالت درست نہ ہو، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص بہت شریف اور نیک ہو، مگر بدصورت ہو اور اپاہج ہو۔

تصوف بندہ کے اوقات کی حفاظت کرتا ہے

حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا کہ تصوف اوقات کی حفاظت کرتا ہے فرماتے ہیں کہ اوقات کی تفسیر تین

وجوہ پر ہوتی ہے۔

(۱) پہلی یہ کہ بندہ اپنی حد کے سوا کچھ نہ دیکھے۔

(۲) دوسری یہ ہے کہ بندہ اللہ کے ماسوا کسی سے موافقت نہ رکھے۔

(۳) تیسری یہ ہے کہ بندہ اپنے وقت کے ساتھ ہمنشین رہے۔

اپنی حد کے سوا کچھ نہ دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ عبودیت کی ایک حد ہوتی ہے اور وہ یہ کہ بندہ کو اختیار نہیں کہ وہ اپنے آقا کے دیئے گئے اختیار سے باہر قدم رکھے اور جب بندہ اس حد کو معلوم کر لیتا ہے تو اسے خصومت واعتراض نہیں رہتا۔ دوسری حد یہ ہے کہ کوئی چیز بندہ کی ملک نہیں اور جب وہ یہ جان لیتا ہے تو اس میں بخل نہیں رہتا اور نہ ہی مخلوق کے ساتھ اسکی منازعت (جھگڑا، تکرار) رہتی ہے کیونکہ اوروں کی ملک میں دخل انداز ہونا مشکل ہے اور بندگی کی حد یہ بھی ہے کہ بندہ آقا کی ملک میں تصرف رکھتا ہے، نہ اپنی ملک میں اور غیر کی ملک میں صرف مالک کی اجازت کے مطابق تصرف ہو سکتا ہے۔ جب اس حد کو معلوم کر لیتا ہے تو اوامر ونواہی کی شرط کو محفوظ رکھتا ہے، یعنی اپنے رب کے حضور کھڑا رہے۔ دیکھے وہاں جہاں خدا تعالیٰ کی رضا نظر آئے اور جہاں خدا تعالیٰ کی رضا نہ دیکھے وہاں نہ ٹھہرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا کو بندہ کی رضا کے ساتھ جوڑا ہے۔ جیسے ارشاد فرمایا ہے۔

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (البینۃ:۸)　اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے۔

بندہ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اس وقت حاصل ہوتی ہے جب بندہ اس چیز پر راضی ہو جو اس کو خدا تعالیٰ کی طرف سے پہنچے، یعنی اپنی مراد کو اللہ تعالیٰ کی مراد کے ماتحت اور اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی سے وابستہ رکھے۔

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (التکویر:۲۹)　اور تم نہیں چاہ سکتے بجز اس کے جسے اللہ چاہے۔

جب بندہ کا یہ وصف ہو جاتا ہے تو سب کچھ وہی ہو جاتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔

کسی بزرگ سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ کیسے رہتے ہیں؟ فرمایا کہ جس طرح وہ رکھتا ہے۔ لوگوں نے پوچھا کس طرح رکھتا ہے؟ فرمایا: جس طرح چاہتا ہے۔ لوگوں نے کہا: کس طرح چاہتا ہے؟ فرمایا: مجھ کو اس کی چاہت کے ساتھ کوئی کام نہیں۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ہر چیز کی انتہا ہے اور اللہ تعالیٰ سے آگے کوئی انتہا نہیں۔ اس تمام گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ عارفوں کا مقصود صرف اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے اور جب ایک چیز مقصود ہوتی ہے، تو اگر اسکے سوا دوسری چیز سے محبت کرے تو مقصود کو نہیں پہنچے گا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ (ق:۳۳)　اور ایسا دل لئے ہوئے آیا جو یاد الٰہی کی طرف متوجہ تھا۔

باب ۴۸

صوفی شریعت کی پیروی سے مختص ہے

جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے، صوفی ایسے شخص کو کہتے ہیں جو تصوف کی پیروی اور اس کے اصولوں پر پابندی کرنا اپنا منصبِ اوّلین تصور کرتا ہو۔ عام طور پر پاکباز اور اہلِ صفا کی راہ پر چلنے والا ہی صوفی سمجھا جاتا ہے لیکن جب کوئی لقب غلط العام معنوں میں استعمال ہونے لگے تو شکل وصورت سے صوفی نظر آنے والے کو بھی صوفی کہہ دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہر داڑھی رکھنے والے کو مولوی اور حجام کو خلیفہ کہنا یہود اور نصرانیوں کا طریقہ کار رہا ہے۔ اسی طرح سیدھے سادھے اور اہلِ طریقت کی وضع قطع رکھنے والے کو صوفی کہہ دیتے ہیں خواہ اس کے اعمال صوفیوں کے معیار کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔

درجِ ذیل بیان میں لفظ صوفی کی شان میں کچھ حقائق اور اس لفظ کے مناسب مختصر سی بحث کی جارہی ہے۔ یہ لفظ کب سے استعمال ہونا شروع ہوا اور اس پر منکرینِ طریقت کے اعتراضات کیا ہیں ان میں سے کچھ کے جوابات نیچے دیئے گئے ہیں، ملاحظہ فرمائیں۔

صوفی کون ہے؟

صوفی کون ہے؟ رموزِ تصوف میں ہے کہ صوفی وہ مومن ہوتا ہے جو آدابِ شریعت کی حفاظت کرتا ہو، حرام کا خیال بھی اپنے پاس نہ پھٹکنے دیتا ہو، یہاں تک کہ شبہ والی شے سے بھی اپنا ہاتھ کھینچ لیتا ہو۔ اپنے حواس کو نواہی سے بچاتا ہو اور غفلت سے بچتا ہو۔ اس کا ہر سانس اللہ کے نور کی خوشبو میں بسا ہوا ہو۔ اس کے اصول ضرورت اور عدم ضرورت کے وقت یکساں ہوں، وہ شہوات کے خلاف ہر لحہ نبرد آزما ہو۔ وہ محبوبِ حقیقی کی عبادت، دوزخ کے خوف یا جنت کے صلے کی خاطر نہ کرتا ہو۔ جس طاعت وعبادت میں عام طبیعتیں، سستی اور بے رغبتی محسوس کرتی ہیں، صوفی اسے اپنے لئے چیلنج سمجھتا ہے اور مردانہ وار اس کا مقابلہ کرتا ہے۔ یاد رہے کہ کرامت کی خواہش، عبادت کی مزدوری ہے جس کا رشتہ نفس سے جا ملتا ہے۔ ہاں اگر مالکِ حقیقی خوش ہو کر طالبِ حق کو سیفِ زبان کردے اور اس کی دُعائیں بارگاہِ ایزدی میں مقبول ہونے لگیں تو اس میں صوفی کے لئے کوئی ضرر نہیں بلکہ یہ انعامِ الٰہی ہے۔

صوفی دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک ابن الوقت اور دوسرا ابوالوقت۔ ابن الوقت صوفی، وقت میں مشغول رہتا

ہے اور وقت اس پر غالب رہتا ہے اور ابوالوقت صوفی وہ ہے جو وقت پر غالب ہو، وہ وقت کا تابع نہیں ہوتا بلکہ وقت اس کا تابع ہوتا ہے، اس کا اپنا ایک رنگ ہوتا ہے اور وہ کسی اور رنگ میں رنگا نہیں جاتا۔ وہ صاحب حال، صاحب مقام، صاحبِ تلوین اور صاحبِ تمکین ہوتا ہے، یہ وارداتِ غیبی سے متاثر ہوتا ہے اور جہاں تک ضبط کی بات ہے تو وہ صرف صاحبِ تمکین ہی کر سکتا ہے اور صاحبِ تلوین نہیں کر سکتا۔ صاحبِ تلوین جزا و سزا سے نا آشنا ہوتا ہے اور صاحبِ تمکین سے کچھ بھی باہر نہیں۔ وہ تو جاذب ہے دریائے معرفت ہی کیوں نہ ہو، وہ اسے پی جائے گا اور اس کے ہونٹ پھر بھی خشک رہیں گے، مگر صاحب تلوین معرفت کا ایک گھونٹ بھی برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

ابوالہاشم پہلے صوفی ہیں

عوارف المعارف میں روایت ہے کہ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ ایک بار میں نے ایک صوفی کو خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے دیکھا۔ میں نے اس کو کچھ دینا چاہا لیکن اس نے قبول نہ کیا اور کہا کہ میرے پاس چار دمڑیاں ہیں جو میرے لئے کافی ہیں۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حسن بصریؒ کے زمانے میں صوفی کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔

درجِ بالا روایت کی مؤید حضرت سفیان ثوریؒ کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر ابوالہاشم صوفی نہ ہوتے تو میں ریاکاری کی باریک باتوں سے واقف نہ ہوتا۔ بعض لوگوں نے صوفی کے لفظ کو دوسری صدی کے بعد استعمال کئے جانے کے متعلق لکھا ہے کہ صوفی صاحبِ وصول ہے، جو مقتضیاتِ طبائع سے آزاد ہو کر حقیقت سے پیوستہ ہو گیا ہو اور اپنی ذات سے فانی ہو کر حق سے باقی ہو۔ صوفی عاشق ہوتا ہے۔

فَلِوَجْهِهَا مِنْ وَّجْهِهَا قَمَرٌ وَبَقْيِهَا مِنْ عَيْنِهَا كُحُلُ

(وہ اپنے چہرے کے لئے آپ ہی چاند ہے اور اپنی آنکھوں کے لئے آپ ہی سُرمہ ہے۔)

اللہ تعالیٰ کی اتنی صفات ہیں جتنی اس عالم میں اشیاء ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام مذکور ہیں اور سات نام ایسے ہیں جو اُن سب کا نچوڑ ہیں اور اسمائے اُمہات کہلاتے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ علم، ارادہ، قدرت، کلام، بصر، سمع اور حیات وغیرہ۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن میں پندرہ سو نام ہیں۔ کسی نے کہا ہے۔

بنامِ آنکہ اُو نامے ندارد بہر نامے کہ خوانی سر برآرد

(اس کے نام سے شروع کرتا ہوں جس کا کوئی نام نہیں، لیکن جس نام سے بھی پکارو، وہ جواب دیتا ہے۔)

صوفی اور اس کا تصوف

صوفی اور تصوف کے معنی میں بہت سے اقوال ہیں۔ استاد منصور عبدالقاہر بغدادیؒ (متوفی ۴۲۹ھ) نے

ان دولفظوں کے معنی میں ایک مکمل کتاب تصنیف کی ہے۔ جس میں صوفیہ کرام کے ایک ہزار اقوال بہ ترتیب حروف معجم جمع کیے ہیں۔

امام ابوالقاسم قشیریؒ (متوفی ۴۶۵ھ) نے بھی اپنے رسالہ قشیریہ میں بعض اقوال نقل کیے ہیں جن کے دہرانے کی ضرورت نہیں کیونکہ انکے کچھ بیانات ہماری اس کتاب میں الگ باب میں لکھ دیئے گئے ہیں۔ اس مقام پر گنجائش وضرورت نہیں۔ امام ابوالقاسمؒ نے اپنے رسالہ میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد فاضل مسلمین کے لیے ان کے زمانہ میں سوائے صحبتِ رسول اللہ ﷺ کے کوئی علامت ونشان نہ تھا کیونکہ اس صحبت سے بڑھ کر کوئی فضیلت نہ تھی، پس ان کو صحابہ کہا گیا۔ دوسرا زمانہ جو آیا تو صحابہ کرامؓ کی صحبت سے فیض یاب ہونے والوں کو تابعین کہا گیا اور اسے وہ اشرف علامت سمجھتے تھے، پھر تابعین کے بعد جو ہوئے، انہیں تبع تابعین کہا گیا۔ بعدازاں لوگ مختلف ہو گئے اور مراتب ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ پس خواص کو جنکی امورِ دین کی طرف زیادہ توجہ تھی، زہاد اور عباد کہا گیا پھر بدعتوں کا ظہور ہوا اور فرقوں میں تداعی پیدا ہوگئی۔ ہر ایک فریق مدعی تھا کہ زہاد ہم میں ہیں۔ پس خواص اہلِ سنت جو اللہ تعالیٰ کی معیت کو ملحوظ رکھتے اور اپنے دلوں کو غفلت کے حوادث سے محفوظ رکھتے تھے، تصوف کے نام کے ساتھ منفرد ہوئے اور ان کے اکابر کے لئے یہ نام ۲۰۰ھ سے پہلے مشہور ہو گیا۔ ابو ہاشمؒ پہلے صوفی بزرگ ہیں جن کو صوفی کہا گیا، ان سے پہلے کسی بزرگ کو اس نام سے نہیں پکارا گیا جیسا کہ "نفحات جامی" میں مذکور ہے۔

بعض مشائخ کی نظر میں صوفی کی تعریف

حضرت داتا گنج بخش" فرماتے ہیں کہ اہلِ تصوف کے نزدیک صوفی کسی تعریف کا محتاج نہیں اور اس کی تشریح کی حاجت نہیں۔

حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ صوفی وہ ہے کہ اس کا کلام اس کے حال کی حقیقت کا مظہر ہو اور کوئی ایسی بات نہ کہے جو اس میں نہ ہو اور جب وہ خاموش رہے تو خاموشی اس کے حال کی ترجمان ہو اور دنیوی علائق سے بےتعلقی کا ثبوت اس کے اعضاء سے واضح ہو۔

حضرت ابوالحسن نوریؒ فرماتے ہیں کہ تصوف تمام ترحظِ نفس چھوڑنے کا نام ہے اور یہ امر واضح ہے کہ خوشی اور لذاتِ نفسانی کا ترک کر دینا یہ بندہ کا فعل ہے اور جسمانی حظ اور نفسانی لذتوں کا فنا ہونا من جانب اللہ ہے۔ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ صوفی وہ ہیں جن کی روحیں بشری کدورت سے صاف ہوتی ہیں اور تمام نفسانی آفتوں سے پاک ہو کر، حرص وہوائے شہوانی سے خلاصی پا کر دربار الٰہی میں صف اول میں جا کر درجہ قرب پاتی ہیں اور ماسوا اللہ سے دور ہو چکی ہوتی ہیں۔

حضرت محمد باقرؒ فرماتے ہیں کہ تصوف ایک نیک خصلت ہے جو شخص زیادہ نیک خصلت ہے، وہی اعلیٰ درجے کا صوفی ہے اور نیک خصلت دو قسم پر ہوتی ہے ایک اللہ تعالیٰ کے ساتھ، دوسری مخلوق کے ساتھ، جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضا و قضا میں راضی رہے وہ نیک خصلت بحق تعالیٰ ہے جو اللہ کے لئے مخلوق کا بارِ خدمت اپنے سر لے وہ نیک خُو مخلوق ہے۔ ان خصلتوں کا محتاج طالبِ حق ہو سکتا ہے۔

حضرت شبلیؒ کا قول ہے کہ "اَلصُّوْفِیُّ لَا یَرٰی الدَّارَیْنِ مَعَ اللّٰہِ غَیْرَ اللّٰہِ" یعنی صوفی وہ ہے جو دونوں جہان میں سوائے ذاتِ خدا تعالیٰ کے کچھ نہیں دیکھتا۔ چونکہ بندہ غیر ہے اور غیر کو نہ دیکھنا اپنے آپ کو نہ دیکھنا ہوا گویا حالتِ نفی و اثبات میں صوفی اپنے آپ سے بالکل فارغ ہوتا ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ درج ذیل اولوالعزم پیغمبروں کی اقتداء سے صوفی بنتا ہے۔

(۱) سخاوت حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے حاصل کرے یعنی انہوں نے رضائے محبوب میں اپنے لختِ جگر کو قربان کر دیا۔

(۲) رضا اسماعیلؑ سے حاصل کرے یعنی رضا مولیٰ پر اس درجہ راضی ہو کہ جان کی پرواہ نہ کرے۔

(۳) صبر ایوبؑ سے حاصل کرے یعنی کیڑوں کے ساتھ بھی اگر امتحان ہو تو بخوشی برداشت کرے۔

(۴) اشارہ زکریاؑ سے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا (تم لوگوں سے تین دن تک بول نہ سکو گے، مگر اشارہ سے) تو صوفی کو بھی اس اشارہ کی اقتداء کرنی چاہیے۔ (یعنی کلام غیر اللہ سے اجتناب کرے)

(۵) غربت یحییٰؑ سے یعنی کہ وہ اپنے وطن میں اپنے آپ کو مسافر سمجھتے تھے، اور رشتہ دار عزیز و اقارب میں رہ کر سب سے بیگانہ تھے (یہی صوفی کی پہچان ہے)۔

(۶) سیاحت عیسیٰؑ سے کہ آپ اپنے سفر میں اس قدر مجرد تھے کہ سوائے ایک پیالہ اور ایک کنگھی کے ہمراہ کچھ نہ رکھا حتیٰ کہ جب ایک شخص کو دیکھا کہ وہ دونوں ہاتھوں سے پانی پی رہا ہے تو آپ نے پیالہ پھینک دیا۔ جب ایک دوسرے شخص کو دیکھا کہ وہ بالوں میں انگلیوں سے خلال کر کے کنگھی کا کام لے رہا ہے تو کنگھی بھی ضائع کر دی۔

(۷) فقر میں سید الانبیاء حبیبِ کبریا محمد رسول اللہ ﷺ کی اقتدا کرے۔ جیسا کہ ایک حدیث پاک کا مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرمادیا تھا کہ اے محبوب اپنی جان پاک پر محنت و مشقت نہ ڈالیے، میرے خزانوں سے جس قدر چاہیں خرچ فرما کر اپنی شان کو دوبالا کیجیے۔ حضور اکرم ﷺ نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کی: الٰہی! میں یہ نہیں چاہتا بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک دن کھاؤں اور ایک دن بھوکا رہوں (ایسا کرنے والا ہی صوفی ہوتا ہے۔)

حضرت ابوالحسن نوریؒ فرماتے ہیں کہ تصوف رسوم و علوم کا نام نہیں بلکہ یہ ایک خاص خصلت ہے۔ یعنی اگر تصوف رسمی چیز ہوتی تو مجاہدہ و ریاضت سے حاصل ہو جاتا اور اگر یہ علم ہوتا تو محض تعلیم و تعلم سے حاصل ہو

جاتا، چنانچہ ثابت ہوا کہ جب تک اس خاص خصلت کو خود اپنے اندر پیدا نہ کرے، اس وقت تک وہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ رسم وخصلت میں فرق یہ ہے رسم وہ فعل ہے جو بتکلّف انسان کر سکتا ہے اور خصلت اس خاص فعل کو کہتے ہیں جو بغیر بناوٹ اور تکلف کے صادر ہو، اس کے تمام ظاہری اسباب باطنی اسباب کے موافق ہوں۔ یہ تمام اوصاف جس میں موجود ہوں، وہی صوفی ہے۔

حضرت مرتعشؒ فرماتے ہیں "اَلتَّصَوُّفُ حُسْنُ الْخُلُقِ" یعنی تصوف اخلاق حسنہ کا نام ہے اور یہ خصائل حمیدہ تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ کہ اوامر الٰہی ادا کرنے میں کسی قسم کی ریاکاری اور دکھاوا نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ عوام کے ساتھ نیک خصلت ہو، بڑوں کی عزت، چھوٹوں پر رحم اور ہر معاملہ میں انصاف پسند ہو۔ اس میں کسی قسم کا معاوضہ حاصل کرنا مقصود نہ ہو، تیسرے یہ کہ اپنے آپ کو ہوائے شیطانی کی پیروی سے بچائے رکھے اور ہر قسم کی حرص وخواہش نفسانی سے بچے۔ جو شخص ان تینوں تعریفوں کے ساتھ اپنے آپ کو متصف کر لے وہ نیک خصلت انسانوں میں شمار ہوگا۔ اس کی تائید ایک واقعہ سے ہوتی ہے۔ ایک صحابیؓ نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا کہ ہمیں اخلاق محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں کچھ سنائیں تو آپؓ نے فرمایا "کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنَ" یعنی آپؐ کے اخلاق ملاحظہ کرنے ہوں تو قرآن میں دیکھ لے۔

قرآن پاک میں آپ کے اخلاق حسنہ کی شہادت اس طرح دی گئی ہے۔

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم: ۴) بے شک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اخلاقِ حسنہ کے اونچے درجے پر فائز ہیں۔

حضرت مرتعشؒ کا بھی فرمان ہے کہ مذہب تصوف تمام تر مجاہدہ ہے، اس میں لہوولعب کو نہ ملانا چاہیے۔ رسم پرست لوگوں کی پیروی نہ کرنا چاہیے۔ تصوف کی کورانہ تقلید میں جو صوفی بن رہے ہیں، ان سے اپنے آپ کو بچانا چاہیے۔ عوام الناس نے اس زمانہ کے صوفیوں کو جب دیکھا کہ وہ ٹھمکہ کے ساتھ ناچتے، رقص وسرود کرتے ہیں، بادشاہوں کی بارگاہ میں پہنچ کر ایک ایک لقمہ کے لئے جھگڑتے ہیں اور بادشاہوں کے ہاں شرف باریابی حاصل کرنا ہی کمالِ فقر سمجھتے ہیں تو عوام کے خیالات خراب ہوگئے۔ وہ صوفیائے کرام سے بدظن ہوگئے اور کہنے لگے کہ شاید پہلے لوگ بھی اسی حال میں گزر گئے۔ یہ نہ سمجھا کہ زمانہ فتنہ کا ہے اور روزانہ بلائیں بڑھ رہی ہیں غرض کہ بادشاہوں کی حرص بڑھی تو ان کو ظلم وجور کی طرف مائل کر دیا اور عوام کے اندر بدکاری، زنا، فسق وفجور عام ہونے لگا۔

حضرت ابوعلی قزوینیؒ آپؒ فرماتے ہیں "اَلتَّصَوُّفُ هُوَ الْاَخْلَاقُ الرَّضِيَّةُ"، تصوف پسندیدہ خصائل کا نام ہے (جو بندہ تمام حالات میں اپنے رب کی رضا میں راضی رہے تو وہ صوفی ہے)۔ اچھی طرح یاد رکھو اگرچہ اہلِ طریقت روز بروز کم ہو رہے ہیں مگر طریقت کے اصول تباہ نہیں ہوسکتے کیونکہ اگر ایک جماعت

افعالِ قبیحہ میں سے کچھ اختیار کرے اور ان کو مجاہدہ وریاضت کے پردے میں پوشیدہ کرنا چاہے تو اہلِ طریقت کے مجاہدات ان کی وجہ سے لغو نہیں ہو سکتے (ان کے جذباتِ صدق، صادق ہی رہیں گے۔) اور ان اہلِ ہوا کے اعمالِ شنیعہ لغو ہی ہوں گے۔

حضرت ابوالحسن ابوالحجرؒ آپؒ فرماتے ہیں کہ آج کل تصوف کا صرف نام ہی رہ گیا ہے، حقیقت کچھ نہیں رہی۔ ایک دن وہ تھا کہ تصوف حقیقتاً خالص تصوف تھا، نام ونمود نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ تجھے وہ سعادت عطا فرمائے جو اس نے اپنے ولیوں کو عطا کی۔

صوفی کے لئے اخلاقِ ذمیمہ سے بچنا ضروری ہے

دربارِ خداوندی میں حضوری کے لئے باطن کی صفائی ضروری ہے یعنی برے اخلاق سے دل کا پاک ہونا اولین شرط ہے، جس سے ماسوا اللہ سے تخلیہ کی سعادت نصیب ہوتی ہے اور جب تخلیہ (خلوت وتنہائی) نصیب ہو جائے تو دل پر اچھے اوصاف جلوہ ریز ہوتے ہیں۔ پھر بفضلِ الٰہی بارگاہ خداوندی میں حضور حاصل ہو جاتا ہے۔ بُرے اخلاق گناہوں کی جڑ ہیں اور اچھے اخلاق نیکیوں کی بنیاد اور اصل ہیں۔ ولی کے لئے ضروری ہے کہ برائیوں کے خس وخاشاک سے اپنے دامن کو دور رکھے تا کہ نیکیوں کا خزانہ اسے حاصل ہو کر صفائے قلب مل جائے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ارشادِ خداوندی ہوتا ہے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ...... الخ (النساء:۱۵۹)

پس (صرف) اللہ کی رحمت سے آپ ﷺ نرم ہو گئے ہیں ان کیلئے اور اگر ہوتے آپ ﷺ تندمزاج سخت دل تو یہ لوگ منتشر ہو جاتے آپ ﷺ کے پاس۔

جب حضور علیہ السلام ان اوصاف رحیمانہ سے آراستہ کئے گئے تو اس مخصوص وصف کے مستحق ٹھہرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم:۴)

اور بے شک آپ ﷺ خلقِ عظیم پر ہیں۔

اسی لئے حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ ..

یعنی اپنے آپ کو اللہ کے اخلاق کا عادی بناؤ

(التعرف لمذھب التصوف: ج ا ص۵)

اللہ رب العزت کا ارشاد ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ

یقیناً فلاح پا گیا جس نے (اپنے نفس کو) پاک کر

دَسّٰهَا ؕ (الشمس:۱۰) لیا اور یقیناً نامراد ہوا جس نے اس کو خاک میں دبا دیا۔

تزکیہ کے سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے فرامین ہمیں ملتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَلتَّزْكِيَةُ هُوَ التَّطْهِيْرُ وَ الطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِيْمَانِ (المصنف ج۱، ص ۱۴) یعنی تزکیہ پاکیزگی کا نام ہے اور پاکیزگی ایمان کا حصہ ہے۔

ایمان تزکیہ قلب کے سوا کامل نہیں ہوتا اور اعمال ایمان کے بغیر مقبول نہیں ہوتے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ دل مقبول ہے جو غیر اللہ سے محفوظ ہے۔ اگر غیر اللہ میں مشغول ہے تو خدا تعالیٰ سے شرمسار ہے۔ پس یہ دل کبھی خطاب میں، کبھی عذاب میں، کبھی ثواب میں، اور کبھی عتاب میں ہوتا ہے۔ حاصلِ کلام یہ کہ بہت سارے لوگ نفس سے بے خبر اور اس کی مکر و فریب سے غافل ہیں۔ جو شخص اپنے نفس سے بے خبر ہوتا ہے، اس کے اور نفس کے درمیان پردہ حائل ہوتا ہے۔ (حائل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو مشاہدہ اور مراقبہ سے روک دیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس حالت سے اپنی پناہ عطا فرمائے۔) ایک مرتبہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس گھر میں کتا یا تصویر ہو اس میں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔

اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہوائے نفس اور وسوسے دونوں باطنی نجاستیں ہیں اور بُرے اخلاق کی جڑ ہیں۔ جن کے دل ان نجاستوں میں آلودہ ہیں، پاکیزہ فرشتے اس میں گزر نہیں کرتے۔ ایسا دل عالم ملکوت میں جا نہیں سکتا بلکہ اللہ کی نظرِ عنایت سے محروم ہوتا ہے۔ جیسے اللہ کریم کا ارشاد ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝ (البقرہ:۲۲۲) بے شک اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے بہت توبہ کرنے والوں کو اور دوست رکھتا ہے صاف ستھرا رہنے والوں کو۔

اخلاق ذمیمہ (برے) بے شمار ہیں مثلاً خواہش نفسانی، غصہ، دنیوی کاموں کی طرف میلان، جہالت، کینہ، حسد، نفاق، ریاکاری، خیانت، آرزوؤں کی لمبی فہرست، اہل ایمان کے ساتھ بغض، کسی کی تباہی پر خوش ہونا، عیب، تفاخر، تکبر، خود پسندی، ظلم، حرص، مکر، فریب کاری، حق و باطل کو گڈمڈ کر دینا، دھوکہ دینا، خوشامد، بے حیائی، باطنی پلیدی، فضول خرچی، کنجوسی، دوسرے کی بے عزتی کرنا، بخل، کھوٹ، دنیا کی محبت، جھوٹ، فتنہ پردازی، گالیاں دینا، زبردستی کرنا اور ہر وہ بات جس کو شریعت نے ناجائز قرار دیا ہو۔

اخلاقِ ذمیمہ کی دس قسمیں

(۱) حرصِ طعام

یہ تمام برائیوں کی جڑ ہے کیونکہ معدہ خواہشات کا سرچشمہ اور آفات کی کمین گاہ ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔

اَبْغَضُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ كُلُّ اُكُولٍ نُؤُوْمٍ وَ شُرُوْبٍ　　اللہ کے ہاں تم میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ وہ شخص ہے جو بہت کھانے والا، بہت سونے والا اور بہت پینے والا ہے۔　(الحدیث)

آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ انسان نے پیٹ بھر کر کھانے سے شر ہی حاصل کیا ہے۔ پھر فرمایا کہ میرے نزدیک پسندیدہ ترین عمل بھوک اور پیاس ہے۔ ایک موقع پر فرمایا: اے عائشہؓ جنت کے دروازے کھٹکھٹاتی رہو، ایک دن کھول دیئے جائیں گے۔ عرض کیا: حضور اکرم ﷺ کس طرح؟ فرمایا: بھوک اور پیاس کے ساتھ۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ معدہ جب کھانے سے پُر ہوگا تو گندے بخارات دماغ کی طرف اُٹھیں گے جو حواسِ انسانی کو ڈھانپ لیں گے اور عقل بیکار ہو جائے گی، خواہشِ نفس بھڑ کے گی، نفس حیوانی غلبہ پائے گا، یہاں سے مال و جاہ کی محبت پیدا ہوگی اس سبب سے تکبر، حسد، ریاکاری وغیرہ کی آگ برانگیختہ ہوگی اور یہ ساری برائیاں پیٹ بھرنے کے سبب ہوں گی لہٰذا سالک کے لئے بھوک اور پیاس عظیم دولت ہے۔ اس سعادت کو لازم کر لیں۔ مگر اس کی عادت بتدریج ڈالیں۔ ابتداء میں کھانا پینا، تھوڑا تھوڑا کم کریں۔ اس طرح کہ معدہ متاثر نہ ہو اور کام کرنے سے نہ رہ جائے۔ اس طرح کچھ وقت گزرنے پر آپ کو قوتِ ملکیہ حاصل ہو جائے گی۔

(۲) کثرتِ کلام

<u>حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ کثرتِ کلام سے دل میں تاریکی پیدا ہوتی ہے اور اس سے دل کی موت واقع ہو جاتی ہے۔</u>

لِاَنَّ كَثْرَةَ الْكَلَامِ تُوْجِبُ ظُلْمَةَ الْقَلْبِ وَ يَنْتَهِيْ تِلْكَ الظُّلْمَةِ اِلٰى اِمَاتَةِ الْقَلْبِ (الحدیث)　　کثرتِ کلام دل کی تاریکی کا سبب بنتی ہے اور یہ تاریکی دل کی موت پر منتج ہوتی ہے۔

حضور اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سا عمل بہترین ہے۔ آپ نے زبان مبارک نکالی اور اس پر دستِ مبارک رکھ دیا اور فرمایا: ''ابنِ آدم کی اکثر غلطیاں زبان سے ہیں'' یعنی زبان کی آفات بہت زیادہ ہیں اور ان کی بنیاد جھوٹ ہے۔ آج کے دور میں خاموشی اختیار کرنے اور مخلوق سے ربط و اختلاط ترک کرنے سے

بہتر کوئی چیز نہیں۔ جیسے بزرگ فرماتے ہیں۔

هَذَا زَمَانُ السُّكُوْتِ لِزُوْمِ الْبُيُوْتِ وَ الْقَنَاعَةِ بِالْقُوْتِ وَ التَّوَكُّلِ عَلَى الْحَيِّ الَّذِىْ لَا يَمُوْتُ

یعنی یہ وقت خاموشی اختیار کرنے کا ہے اور گھروں کو لازم پکڑنے کا اور قوت لا یموت پر قناعت کرنے کا اور حیّ لا یموت ذات پر توکل کرنے کا ہے۔

(۳) غیظ وغصہ: یہ نفسانی عوارضات میں سے ہے۔ اس کے بارے میں حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے۔

اَلْغَضُوْبُ اَقْرَبُ مِنَ النَّارِ وَاَ بْعَدُ مِنَ الْجَنَّةِ (الحدیث)

یعنی غصہ کرنے والا آدمی دوزخ سے زیادہ قریب ہے اور جنت سے زیادہ دور ہے۔

ارشاد ربانی ہے۔

وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ (آل عمران: ۱۳۴)

یعنی (نیک بندے) غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں کو معاف کردینے والے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کا یہ بھی ارشاد گرامی ہے۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّىْ (کنوز الحقائق: ص ۲۰)

اے اللہ بے شک تو معاف کرنے والا ہے معافی کو پسند کرتا ہے مجھے بھی معاف فرما۔

ایک جگہ فرمایا کہ مومن متواضع اور نرم خو ہوتا ہے۔ ان نصوص قطعیہ کی بنا پر تمام ایمان داروں کے لئے لازم ہے کہ خلق خدا پر رحم کریں، معافی کی کوشش کریں، مظالم کے مقابلہ میں احسان کریں اور غصے کو عقل کی قوت سے پی جائیں، دشمنی اور ہتک کو دل سے دور کریں۔ معاف کرنے کرانے والے بنیں، لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی شرائط اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق پوری کریں۔ خصوصاً اپنی ذات پر تاکہ نفس حدود شریعت پر استقامت اختیار کر کے عقل وبصیرت کا فرمانبردار اور اطاعت گزار ہو جائے۔

(۴) حسد: یہ اخلاق رذیلہ کی چوتھی قسم ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (النساء: ۵۴)

کیا حسد کرتے ہیں لوگوں سے اس نعمت پر جو عطا فرمائی ہے انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا بھی ارشاد ہے۔

اِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَاْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ (سنن ابی داؤد، کتاب الادب)

بے شک حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑیوں کو۔

فرمایا: حسد کینہ کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے اور کینہ غصہ سے، حسد یہ ہے کہ ایک شخص کے مال و دولت پر افسوس کیا

جائے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کو ملا ہے، اس کے زوال کی خواہش کی جائے اور اس کے وجود سے نفرت کرے۔ یہ بات تمام عالم کے مذاہب میں حرام ہے اور ایسا شخص خدا تعالیٰ کا دشمن ہے۔ اگر اس نعمت کے بارے میں نفرت نہ کرے اور اس کے ہونے پر ناخوش نہ ہو اور اپنے لئے بھی اس طرح کی طلب کرے تو اسے (رشک) غبطہ کہتے ہیں۔ اہل بہشت میں غبطہ ہوگا۔

(۵) دنیا سے محبت: ارشادِ خداوندی ہے۔

وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ﴿۲۰﴾ (شوریٰ:۲۰)

یعنی جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہوتا ہے، ہم اسے کچھ دے دیتے ہیں اور آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اگر یہ دنیا اللہ کے نزدیک مچھر کے پر برابر بھی ہوتی تو کافر کو یہاں سے پانی پینے کو نہ ملتا۔ فرمایا دنیا مومن کا قید خانہ اور کافر کی جنت ہے فرمایا: دنیا و مافیہا سب مردود ہیں، ماسوا اس کے جو کچھ اس میں اللہ کے لئے ہے۔ ایک جگہ فرمایا: دنیا کی محبت تمام گناہوں کی انتہا ہے اور گناہوں کی انتہا کفر ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے یہ بھی فرمایا: خبردار! جس نے دنیا کی رغبت کی اور اس میں اپنی خواہشات کو بڑھاتا رہا، اللہ تعالیٰ اس کے دل کی بصیرت کو اس کے مطابق ہی سلب کرلیں گے۔ جس نے زہد اختیار کیا اور خواہشات کو لگام دی، اللہ اس کو بغیر سیکھے علم دیں گے اور بغیر طلب کے ہدایت سے نوازیں گے۔

خبردار! تمہارے بعد ایک ایسی قوم آئے گی، جس کے لئے اقتدار مضبوط نہ ہوگا، مگر قتل و غارت کے ساتھ، تونگری بخل کے ساتھ، محبت حرص و ہوا کی پیروی کے ساتھ۔ خبردار! تم میں سے جو شخص اس زمانہ کو پائے، وہ تونگری کی قدرت رکھتے ہوئے فقر پر اکتفا کرے، محبت پر قدرت رکھتے ہوئے کنارہ کشی اختیار کرے، عزت و غلبہ کی قدرت رکھتے ہوئے عجز و انکساری پر صبر کرے اور ان سب سے اس کا مقصد خدا کی رضا ہو۔ ایک جگہ فرمایا۔ ''قیامت کے دن ایسے گروہ بھی ہوں گے جن کے اعمال ''تہامہ'' کی پہاڑی کی برابری کریں گے مگر ان کا ٹھکانہ آگ میں ہوگا۔ عرض کیا گیا: یارسول اللہ! کیا وہ نمازی نہیں ہوں گے۔ فرمایا! ہاں نمازی، روزہ دار، شب زندہ دار ہوں گے، اگر دنیا کی کوئی چیز ان کو پیش کی گئی تو وہ اس کی طرف لپکتے ہوں گے۔ دنیا اللہ تعالیٰ اور انبیاء کرام کی ناپسندیدہ چیز ہے۔ اس کی طرف توجہ ایک لحظہ کے لئے بھی نہیں ہونی چاہیے۔ اللہ پر توکل رکھیں اور اپنے کام اس کے سپرد کردیں۔

(۶) رعونت اور حبِ جاہ: فرمان باری تعالیٰ ہے کہ آخرت کا گھر ان کے لئے ہے جو دنیا میں بڑی بڑی خواہشات نہیں رکھتے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِیْنَ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَ لَا فَسَادًا (القصص:۸۳)

یہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کے لئے بناتے ہیں جو زمین میں نہ تو غلبہ کی خواہش رکھیں اور نہ فساد کا ارادہ۔

حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے۔

حُبُّ الْمَالِ وَالْجَاهِ یُنْبِتَانِ النِّفَاقَ فِی الْقَلْبِ كَمَا یُنْبِتُ الْمَآءُ الْبَقْلَ (الحدیث)

مال و جاہ کی محبت دل میں نفاق اُگاتی ہے جس طرح پانی سبزیاں اُگاتا ہے۔

مذکورہ دونوں چیزیں، رعونت اور حبِ جاہ، خدا سے دوری کا سبب بنتی ہیں۔ لہٰذا گوشہ خلوت اور اہلِ دنیا سے ترک ان دونوں کے لئے بہت اعلیٰ علاج ہے۔

(۷) حُبِ مال وجاہ: سورۃ المنافقون میں اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ انسان کا مال و دولت اور اولاد کی ناجائز چاہت اس کو ہلاک کرنے کے لئے کافی ہیں، لہٰذا ایسا نہ ہو تم اپنی اولاد کی خاطر خود تباہی میں گرفتار ہو جاؤ۔ انسان اپنی اولاد کے لئے رشوت، بے ایمانی، اور چور بازاری جیسے مہلک امراض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور وہ جانتا ہے۔ انسان کے مرنے کے بعد شاید ہی کسی کی اولاد والدین کے لئے نیک اعمال کا صدقہ بھیجے۔ اس لئے فرمایا گیا ہے۔

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (التغابن:۱۵)

تمہارا مال اور تمہاری اولاد فتنہ ہیں۔

حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے۔

دَعِ الدُّنْیَا لِاَهْلِهَا مَنْ اَخَذَ مِنَ الدُّنْیَا فَوْقَ مَا یَكْفِیْهِ اَخَذَتْهُ فَحَشَفَتْهُ وَهُوَ لَا یَشْعُرُ (الحدیث)

دنیا کو دنیا داروں کے لئے چھوڑ دو۔ جس شخص نے دنیا اپنی ضرورت سے زیادہ لی، دنیا اسے پکڑ لیتی اور اسے بیکار بنا دیتی ہے اور اسے اس کا شعور بھی نہیں ہوتا۔

دنیا کی حقیقت کو حضرت مجدد الف ثانیؒ نے مکتوبات شریف میں بیان کیا ہے (جسے ہم نے "تہذیب النفس" کے ایک باب "دنیائے دنی" میں بیان کر دیا ہے۔) حضور اکرم ﷺ کی احادیث میں ہے کہ ہم گروہِ انبیاء کل کے لئے ذخیرہ نہیں کرتے۔ ایک جگہ فرمایا کہ دو باتیں مومن میں اکٹھی نہیں ہوتیں ایک کنجوسی اور دوسری بداخلاقی۔ ایک جگہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ انسان ہمیشہ زیادہ مال کا طلب گار رہتا ہے اور اس کے منہ کو سوائے قبر کی مٹی کے اور کوئی چیز بند نہیں کر سکتی۔

(۸) کبر (بڑائی کا غرور) شرکِ خفی ہے: حدیث قدسی میں ہے کہ

اَلْعَظْمَةُ اِزَارِیْ وَ الْكِبْرِيَآءُ رِدَائِیْ فَمَنْ نَازَعَنِیْ فِيْهِمَا اَلْقَيْتُهٗ فِیْ جَهَنَّمَ (سنن ابی داؤد ج ۲، ص ۲۱۱)

عظمت میری پوشاک ہے اور کبریائی میری چادر ہے۔ جو ان میں میرے ساتھ نزاع (جھگڑا) کرے گا، میں اسے جہنم میں ڈالوں گا۔

ایک جگہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے۔

مَن تَوَاضَعَ لِلّٰهِ فَقَدْ رَفَعَهُ اللّٰهُ

جس نے اللہ کے لئے عجز اختیار کیا، اللہ نے اسے بلند کیا۔

کسی مشکل میں کسی اللہ کے بندے سے مدد حاصل کرنے کو اللہ ہی کی مدد تصور کرنا ضروری ہے، ورنہ شرکِ خفی ہوگا۔ یہ کہنا بجا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں دوا کو میرے لئے شفاء کا ذریعہ بنایا۔

(۹) عُجب (خود پسندی): فرمانِ باری تعالیٰ ہے کہ

يَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ (التوبہ: ۲۵)

(جنگ) حنین کے دن تمہاری (تعداد کی) کثرت نے تمہیں خود پسندی میں ڈال دیا۔

حدیث شریف میں ہے کہ تین چیزیں انسان کی ہلاکت کا باعث ہیں۔ ایک یہ کہ بخیل کو اپنا پیشوا بنانا، دوسرا حرص کی پیروی کرنا اور انسان کا اپنے نفس کے بارے میں خود پسندی میں مبتلا ہونا۔

(۱۰) ریا اور غرور: علماء اہلِ تصوف، اہلِ دنیا اور عام بندوں میں الا ماشاء اللہ ریا اور غرور پایا جاتا ہے۔

سورۃ الماعون میں ریا کا ذکر ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝ وَ يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝ (الماعون)

ہلاکت ہے ان نمازیوں کے لئے جو اپنی نمازوں سے بے خبر ہیں، جو ریا کاری کرتے ہیں اور معمولی برتنے کی چیزوں کو روکتے ہیں۔

لفظِ صوفی کے نام کا آغاز اور اس پر منکرینِ تصوف کے چند اعتراضات

اولیائے امت نے جو صوفی کی شان میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ اس کے برعکس آج کے چند بے لگام علماء نے جی بھر کر ان کے خلاف ہرزہ سرائی کی ہے۔ تصوف کے خلاف ایک نفرت آمیز کتاب میں کچھ اس طرح لکھا ہے کہ اگر ایک صوفی کے متعلق مذکورہ خوبیوں کو مان لیا جائے تو ایک صحابی اور ایک صوفی کی زندگی میں باعتبارِ مجموعی مماثلت ہونا ضروری ہے، اور ایک صوفی کو دیکھ کر ایک صحابی کی یاد تازہ ہو جانی چاہیے۔ لیکن کیا یہ معاملہ فی الواقع ایسا ہے؟

بلاشبہ آنحضور ﷺ کی صحبت، صحابہ کرامؓ کا امتیازی شرف ہے لیکن یہ شرف صحبتِ محض نام کی نہیں بلکہ سمع وطاعت میں ان کی سبقت، ایمان کی سخت ترین آزمائشوں میں انکی استقامت اور کارِ نبوت میں پیغمبر کی معاونت کی وجہ سے ہے۔ جیسا کہ قرآن کی متعدد آیتیں اس پر شاہد ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنے ہر عمل سے اپنے ایمان کی صداقت کا ثبوت دینے میں پیش پیش رہے پھر بھی اپنے اعمال کو ذرہ برابر اہمیت دینے کی بجائے آخرت میں انکی جواب دہی کے خوف سے لرزاں رہتے تھے۔ نجات کے لئے اللہ سے اُمید باندھے ہوئے پھر بھی اپنے آخری انجام کے سلسلہ میں متفکر رہے ہیں۔

اگر صوف سے ہی لفظ صوفی کا آغاز مان لیا جائے تو یہ بات تسلیم کرنا ہوگی کہ صوف تو بہت قدیم وقتوں سے انبیائے کرامؑ و اولیاء اللہؒ کے استعمال میں رہا ہے۔ شہاب الدین سہروردیؒ نے بھی اس بات کا ذکر کیا ہے کہ ہمیشہ سے زاہدین و عابدین اور صالحین کو صوف کا لباس مرغوب رہا ہے۔ کلاباذی نے بھی لکھا ہے کہ صوف کا لباس پہننا بہت سے انبیاء اور اولیاء کرام کی عادت تھی۔ کشف المحجوب میں یہ قول نقل کیا گیا ہے۔

عَلَيْكُمْ بِلِبَاسِ الصُّوْفِ تَجِدُوْنَ حَلَاوَةَ الْإِيْمَانِ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (کشف المحجوب ص ۲۲)	صوف کا لباس پہنو۔ اپنے دلوں میں ایمان کی حلاوت پاؤ گے۔

شیخ سہروردیؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے حوالے سے لکھا ہے جس دن حضرت موسیٰ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے، اس دن آپ صوف کا جُبہ ازار اور چادر بھی صوف کی پہنے ہوئے تھے۔ بعض علماء نے لباسِ صوف کی مخالفت کی ہے اور لکھا ہے کہ صوف پہننا حضور اکرم ﷺ سے منقول نہیں بلکہ حضرت سفیان ثوریؒ نے اس کو بدعت قرار دیا ہے۔ حضرت علی الہجویریؒ نے اسے ایک جگہ چوپاؤں کا لباس بتایا ہے کیونکہ بہت سے لوگوں نے اظہارِ زیب کے لئے اس لباس کو بطور فیشن اختیار کیا تھا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اگرچہ صوف کا لباس بہت قدیم زمانے سے مروّج ہے لیکن صوفی کا لفظ استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔

مذکورہ بالا مخالفین طریقت نے اس معاملے میں بہت تحقیق کے بعد جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ نیچے پیش کیا جا رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''اوائلِ اسلام میں ''تصوف'' یا ''صوفی'' کا کوئی سراغ نہیں ملتا''۔ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کو اعتراف ہے کہ یہ الفاظ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں نہ تھے۔ امام قشیریؒ کے بیان کے مطابق لفظ ''صوفی'' دوسری صدی ہجری کے اختتام سے قبل رائج ہوا۔ اس سے ملتی جلتی رائے ابن خلدونؒ کی بھی ہے اور اسی پر علماء تحقیق کا اتفاق ہے لیکن شیخ ابونصر سراج طوسیؒ نے اس سے مختلف رائے ظاہر کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حضرت حسن بصریؒ کے زمانہ میں صوفی کا لفظ مستعمل تھا۔ میسیوں کی تحقیق یہ ہے کہ لفظ صوفی تاریخ میں سب سے پہلے دوسری صدی ہجری کے نصف آخر میں جابر بن حیان کوفی اور ابوالہاشم کوفی کے لئے استعمال ہوا اور اس کی جمع ''صوفیہ'' ۱۹۹ھ بمطابق ۸۱۴ء کے قریب رائج ہوئی۔ ابوالہاشم کوفیؒ کی روایت کا

ذکر مولانا جامیؒ نے بھی کیا ہے۔فرماتے ہیں۔

اول کسے کہ وے را صوفی خواند	سب سے پہلے جسے لوگوں نے صوفی کہا، وہی
ندوے بود وپیش از کسے را بایں نام	تھے ان سے پہلے کسی کو اس نام سے نہیں پکارا
نخوانده بودند (نفحات الانس)	گیا۔

حاجی خلیفہؒ نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے۔امام سیوطیؒ کے نزدیک ابوالہاشم کوفی وہ پہلے شخص ہیں جنہیں صوفی کہا گیا اور انہوں نے سب سے پہلے قلوب پر لب کشائی کی۔ابوالہاشم کوفی کے معاصر جابر بن حیان کے نام کے ساتھ بھی صوفی کا لفظ ملا ہوا تھا، یہاں تک کہ اسے جابر بن حیان الصوفی ہی کہا جاتا تھا لیکن اس کا ذکر ایک صوفی کی حیثیت سے عام طور پر اس لئے نہیں کیا جاتا کہ وہ اصلاً کیمیا گر تھا اور شیعہ عقائد رکھتا تھا۔ان دونوں کا تعلق کوفہ سے تھا۔

بصرہ میں حضرت حسن بصریؒ کے شاگرد عبدالواحد بن زید جنہیں شیخ صوفیہ کہا جاتا ہے، کے بعض اصحاب نے پہلے صوفی حلقہ کی بنیاد ڈالی۔عبدالواحد بن زیدؒ کا نام امام غزالیؒ اور کلابازیؒ وغیرہ نے حضرت حسن بصریؒ سے علم باطن کی روایت کرنے کے ضمن میں لیا ہے۔بہر حال تصوف کا آغاز عالم اسلام کے دو مشہور شہروں یعنی کوفہ اور بصرہ سے ہوا۔کوفہ پر مانی کے فکر کا اثر تھا اور بصرہ پر ہندوستانی علم وفکر کا۔مانی کے مذہب میں عشق خداوندی کے عنصر پائے جاتے ہیں جب کہ ہندوستانی فلسفہ میں سارا زور ترکِ تعلق پر ہے۔

لفظ ''صوفی'' جو دوسری صدی ہجری کے اختتام تک غیر مروج رہا۔اسے مستقلاً اپنے لئے مخصوص کر لینے اور اس نام سے ایک علیحدہ جماعت قائم کرنے کی وجہ اہلِ تصوف کی طرف سے عام طور پر یہ بتائی جاتی ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں آپ کے ساتھیوں کو صحابہ کہتے تھے کیونکہ انہیں آپ کی صحبت کا شرف حاصل تھا چنانچہ اس تعلق اور نسبت کی طرف اشارہ سب اشاروں سے اولیٰ و افضل تھا۔عہدِ رسالت کے بعد جن لوگوں نے صحابہ سے کسبِ فیض کیا انہیں تابعی کہا گیا۔ان کے بعد پرہیز گارانہ زندگی گذارنے والوں کو زاہد کہا جاتا تھا لیکن جب زمانہ رسالت کو گذرے ایک عرصہ ہو گیا وحی آسمانی بند ہو گئی اور راہیں مختلف ہو گئیں اور لوگ ہوائے نفسانی میں گرفتار ہو گئے اور زاہدین ومتقین کے عزائم ٹوٹ گئے تو صالحین کا ایک گروہ سب سے الگ ہو گیا انہوں نے گوشہ نشینی اور تنہائی کو غنیمت جانا اپنے اخلاق ومعاملات کو پاکیزہ اور اپنی طبیعت کو منزہ کیا۔ اس لئے انہیں صوفی کہا جانے لگا اس نام سے وہ خود بھی موسوم ہوئے اور دوسروں کو بھی انہوں نے اسی نام سے پکارا۔غرض یہ کہ اسم صوفی ان کی نشانی ہے، علمِ الٰہی ان کی صفت ہے اور عبادت ان کا حلیہ ہے۔اس توجیہی بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحابی اور تابعی کی طرح صوفی بھی ایک علامتی لفظ ہے جسے ان لوگوں نے اپنی شناخت اور امتیاز کے طور پر اختیار کیا جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد زمانی بُعد کے باوجود ایمان وعمل کے اس بلند تر

معیار پر قائم رہنے کے لئے کوشاں تھے، جسے صحابہ نے پیش کیا تھا۔ شیخ سہروردیؒ فرماتے ہیں: حق تعالیٰ نے اہل خیر وصلح کا ذکر قرآن مجید میں فرمایا تو ایک کو ابرار اور دوسرے کو مقربین کہا۔ ان میں سے بعض کا صابرین و صادقین اور ذاکرین ومحبین نام رکھا۔ یہ جس قدر متفرق نام مذکور ہیں، ان سب کو لفظ صوفی شامل ہے۔

مخالفین طریقت کہتے ہیں کہ صحابہ کرام نہ تو خود کو ابرار واخیار سمجھنے والے تھے اور نہ خدا کی طرف سے مقربین وصادقین اور صالحین کا لقب پا کر اپنی برتری کا دعویٰ کرنے والے تھے۔ اپنے تمام اعمال وافعال سے خود کو ان کا مصداق ثابت کرنے کی انتہائی کوششوں کے باوجود خود کو انکا مصداق نہ سمجھنے والے ایک طرف اللہ کے برگزیدہ بندوں کا یہ حال اور دوسری طرف اہلِ تصوف کے اپنوں کے حق میں یہ دعویٰ کہ ''صوفیہ نے انواع عبادات، حقائقِ طاعات اور اخلاقِ جمیلہ سے جن درجات عالیہ اور منازل رفیعہ کو طے کر لیا ان میں انہیں ایک طرح کی خصوصیات حاصل ہو گئیں، وہ علماء فقہاء اور محدثین کی رسائی سے باہر ہیں۔''

مخالفینِ طریقت کا یہ کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ بندگی کے مطالبات کے بجائے اپنے لیے ایک نیا لفظ ''صوفی'' اختراع کر کے اور خود کو ایسی خصوصیات کا حامل قرار دے کر جو علماء فقہا اور محدثین کی رسائی سے باہر ہے، انہوں نے سب پر اپنی فوقیت جتانے کی کوشش کی، حالانکہ کسی فرد یا جماعت کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں کہ جو بات خدا کے کہنے اور اس کے متعین کرنے کی ہو، اسے وہ خود اپنی طرف سے متعین کرنے کی کوشش کرے۔ انبیاء مرسلین اور صحابہ وتابعین میں سے کسی نے بھی اپنی برتری کا دعویٰ نہیں کیا۔ یہ کہنے کا حق تو صرف خدا کو ہے اور وہی دلوں کے بھید کو جانتا ہے۔ رہا ''انواعِ عبادت، حقائقِ طاعات اور اخلاقِ جمیلہ میں صوفیہ کا اختصاص تو اس کی حقیقت سمجھنا درحقیقت تصوف کے بنیادی مسائل کو سمجھنا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے اکابر صوفیہ کے اقوال پر نظر ڈالنا چاہیے، جو تصوف کے حقیقی معنی ومفہوم پر دلالت کرتے ہیں ایسے لوگ حسب ذیل صوفیوں کی زبان میں تصوف کی تشریح کرتے ہوئے تصوف کی تعریف بیان کرتے ہیں یہ لوگ گویا صوفیوں کے بیان کو ہی صوفیوں کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ جن بزرگوں کا نام نیچے دیا گیا ہے، وہ بھی صوفی ہی تھے اور یہ عجیب بات ہے کہ وہ انہی صوفیوں کا سہارا لے کر صوفیوں کے سفینے کو ڈبونے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ صوفیوں کے اقوال کو یوں لکھتے ہیں۔

<u>معروف کرخیؒ فرماتے ہیں</u> تصوف، حقائق کے حصول اور جو کچھ خلائق کے ہاتھ میں ہے، اس سے دست کش ہو جانے کا نام ہے۔ (الرسالہ القشیریہ ص ۱۲۶، عوارف المعارف اوّل ص ۳۰)

<u>بشر بن الحارث الحافی کا کہنا ہے</u> صوفی وہ ہے جو خدا کے ساتھ دل پاک صاف رکھے۔

<u>ذوالنون مصریؒ کا بیان ہے</u> کہ صوفی جب بات کرتا ہے تو حقائق کی زبان سے اور جب خاموش رہتا ہے تو اس کے اعضاء بولتے ہیں یعنی علائق دنیوی سے علیحدہ ہو جانے کی بابت اس کے اعضا خبر دیتے ہیں۔

سہل بن عبداللہ تستریؒ فرماتے ہیں صوفی وہ ہے جو بشری نقائص سے پاک اور فکر سے مملو (لبریز) ہو، انسانوں سے علیحدہ ہو کر خدا میں مشغول ہو اور اس کے نزدیک سونا اور مٹی برابر ہو۔

ابوالحسن نوریؒ کہتے ہیں کہ تصوف ان تمام چیزوں کو چھوڑ دینے کا نام ہے جو نفس کو مرغوب ہوں۔

حضرت جنید بغدادیؒ کے خیال میں تصوف تین خصائل پر مبنی ہے۔ فقر پر ثابت وقائم رہنا، بذل وایثار کو شیوہ بنانا اور مشیتِ الٰہی کو اپنے حق میں بہتر سمجھتے ہوئے اپنے ارادہ واختیار کو چھوڑ دینا۔

مندرجہ بالا اقوال میں جس بات کا تکرار بارہا ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ اسبابِ دنیوی، خواہشاتِ نفس اور اپنے ارادہ واختیار سے کلیتہً عاری ہو جانے کا نام تصوف ہے اور یہی ترکِ تام، تصوف میں حصولِ حقائق کی کلید ہے، یعنی جن چیزوں سے علیحدہ ہو جانے کا مطالبہ ہے۔ وہ حقائق کی ضد اور حصولِ حقائق کی راہ میں سنگ گراں ہیں۔ اس لئے انہیں ہٹائے بغیر مقصودِ حقیقی حاصل نہیں ہوسکتا۔ ان مواقع کو دور کرنے اور حقائق تک پہنچنے کے لئے صوفیاء نے جو چیز اختیار کی اُسے فقر کہتے ہیں۔

دنیا میں تنہا یہی ایک چیز ہے جسے انہوں نے اختیار کیا۔ جس طرح صوف پوشی کو اس کی ظاہری علامت کے طور انہوں نے اپنا شعار بنایا چنانچہ تصوف کی تعبیر کے لئے اگر کوئی لفظ سب سے زیادہ موزوں ہوسکتا ہے تو وہ فقر ہی ہے کیونکہ یہ تصوف کی حقیقت سے قریب تر ہے۔

منکرینِ طریقت کے مذکورہ اعتراضات کے جوابات

منکرینِ تصوف کے اعتراضات کا پہلا جواب تو یہی ہے کہ انہوں نے جن اولیائے کرام کو بطور دلیل اپنی صفائی کے لئے پیش کیا ہے (یعنی معروف کرخیؒ، ذوالنون مصریؒ اور جنید بغدادی وغیرہ) وہ بذات خود صوفیاء کے زمرہ میں داخل ہیں۔ یہ تمام مشائخ عظام، طریقت میں بہت بڑا مقام رکھتے ہیں اور انہوں نے خود بھی طریقت پر بہت طویل کلام کیا ہے۔

طریقت کے منکرین کے لئے دوسرا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد اب تک ہزاروں ایسے صوفیائے عظام گزر چکے ہیں جن کی حتیٰ الوسع کوششیں اتباع شریعت اور صحابہ کرامؓ کی اتباع کرنے پر صرف ہوئی ہیں۔ ان صوفیوں کو قطب، غوث، ابدال، ابرار، اخیار وغیرہ کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے اور وہ حقیقی معنوں میں صحابہ کرام کی راہوں پر گامزن رہے۔ ایسے جید مشائخ کے متعلق غلط الفاظ استعمال کرنا کمال بے ادبی سے خالی نہیں۔ مخالفین طریقت کو یہ معلوم ہی نہیں کہ وہ ایک دو یا چار ہستیوں کی مخالفت نہیں کر رہے بلکہ لفظ صوفی کو خود ساختہ اصطلاح کہہ کر تمام مشائخ اسلام کو اپنے کلام کی زد میں لے آئے اور اپنے آپ پر لئے سخت ترین ظلم کر رہے ہیں۔ کیا وہ سمجھتے ہیں کہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور دیگر قادری، چشتی، سہروردی اور نقشبندی

سلسلے کے صوفیائے کرام نے خود کو خواہ مخواہ صوفی سمجھ لیا تھا اور وہ صحابہ کرام کے طریقے کے مخالف عمل کرتے تھے۔ (العیاذ باللہ) حضرات مخدوم علی ہجویریؒ، بایزید بسطامیؒ، جنید بغدادیؒ، معین الدین چشتیؒ، نظام الدین اولیاءؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ تمام کے تمام صوفیائے کرام کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ایسی ہستیوں کے خلاف لب کشائی کرنا انتہائی بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے؟

منکرینِ طریقت کا یہ کہنا کہ صوفیائے کرام نے خود ہی اس نئی جماعت کا نام دے دیا ہے اور یہ لوگ خود کو سب سے افضل سمجھتے ہیں۔ ان کا الزام بالکل غلط بیانی پر مبنی ہے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ احادیث میں اولیاء کرام کے گروہ کی نشاندہی کی گئی ہے اور ان کے اوصاف بھی بیان کئے گئے ہیں۔ (جن کو اس کتاب میں اولیائے کرام کی ولایت کے باب میں ذکر کیا گیا ہے) ایسے اولیائے کرام کے اسی گروہ کو صوفیائے کرام اہلِ طریقت کہا جاتا ہے۔ یہ ایسا گروہ نہیں ہے کہ جسے صوفیائے کرام نے اپنے پاس سے گھڑ لیا ہو۔ ایسا غیر ذمہ دارانہ بیان العجب ثم العجب! ایک دو شخصوں کے ذمے تو تھوپ دینا کوئی بات نہیں لیکن اولیائے کرام کا انکار تو اولیائے کرام کی جماعت کے انکار کرنے کے برابر ہے اور اس جماعت کا انکار ایک بہت بڑی جسارت ہے جس کی سزا منکرین کو بھگتنا ہوگی۔ ایسے لوگوں کی پہلی سزا تو یہی ہے کہ وہ نہ صرف دنیا میں ہی بلکہ آخرت میں بھی اولیائے کرام کے فیضان سے محروم رہتے ہیں اور آخرت میں اولیائے کرام سے مخاصمت رکھنے والے اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے زمرے میں شامل کئے جائیں گے۔ جیسا کہ ایک حدیث شریف میں وارد ہوا ہے۔

مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُہٗ لِلْحَرْبِ (بخاری)

یعنی جس نے میرے ولی سے دشمنی رکھی، میری طرف سے اس کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔

اگر یہ صوفیائے کرام ولی اللہ نہیں ہیں تو پھر کون سے لوگ ہیں جن کو منکرین اولیاء اللہ گردانتے ہیں۔ اگر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت بایزید بسطامیؒ، معین الدین چشتیؒ، نظام الدین اولیاءؒ وغیرہ اولیائے کرام (اور صوفیاء) نہیں تو پھر یہ لوگ کس کو اولیاء تسلیم کرتے ہیں۔ منکرین کے لئے تو کسی نے یہ بات کہی نہیں۔

ہر کہ شد محرم دل در حرم یار بماند وانکہ ایں کار نہ داند بہ انکار بماند

(جو شخص دل کا محرم ہو گیا، وہ اپنے یار کے حرم میں پہنچ گیا اور جو یہ کام نہیں جانتا وہ اپنے انکار میں ہی مارا گیا۔)

منکرینِ طریقت کو یہ جان لینا چاہیے کہ کاملین صوفیائے کرام کو قرآن کی زبان میں مقربینِ بارگاہ الٰہی کہا جاتا ہے اور اس کا ذکر سورۃ الواقعہ کی آیت ۱۰ سے ۱۴ تک بیان کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ ایسے مقربین آتے رہیں گے جو شروع زمانہ یعنی اگلوں میں زیادہ اور پچھلوں میں تھوڑے ہوں گے۔ حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ یہ دونوں گروہ (اگلے اور پچھلے) میری امت کے لوگ ہیں۔ ان کاملین، مقربین وغیرہ کو اگر عُرفِ عام میں صوفیائے کرام کہہ دیا جاتا ہے تو اس میں کیا قباحت ہے۔ ایسی باتوں پر جھگڑا کرنا فی سبیل اللہ

فساد والی بات ہے۔ افسوس ہے ہمارے لوگوں نے ہر بات پر اختلاف اور فساد کھڑا کرنے کی عادت اختیار کر لی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے ایسے ملاؤں کے خلاف خوب کلام کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس انتشار سے مسلمانوں کو محفوظ فرمائے۔ (آمین)

لفظ صوفی اور تصوف کی مزید وضاحت کے لئے اس کتاب میں منکرینِ طریقت کے اعتراضات کے جواب میں ایک الگ باب ترتیب دیا گیا ہے تاکہ طریقت کے سچے طالبین کے لئے ہر ممکن شک وشبہ کا ازالہ ہو سکے۔ یہ بات بھی یقینی ہے کہ ہٹ دھرم لوگوں کو سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی قائل نہیں کر سکتا۔

علامہ اقبالؒ کا اولیاء اللہ پر کلام

علامہ اقبالؒ نے قرآنِ کریم اور شریعت مطہرہ پر جو کلام بیان کیا ہے وہ زیرِ نظر کتاب کی ابتداء میں فقر اور درویشی کے عنوانات سے گزر چکا ہے۔ صوفی، مُلّا اور واعظ کے نام پر علامہؒ کا بہت سا کلام ہماری تصنیف ''شاہیں کا جہاں اور'' میں دے دیا گیا ہے۔ اولیائے کرام کے بلندیٔ مقام کے متعلق اشعار علامہؒ کے کلام میں جا بجا ملیں گے جن میں سے اکثر تو زیرِ نظر کتاب میں شامل کر دیئے گئے ہیں اور کچھ مزید اشعار نیچے دیئے جا رہے ہیں۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اِن کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
(ب۔د:۲۷۱)

تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضاء لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں
ترستی ہے نگاہِ نارسا جس کے نظارے کو
وہ رونق انجمن کی ہے انہیں خلوت گزینوں میں
(ب۔د:۱۰۴)

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اَولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بُوئے اسدُ اللّٰہی!
(ب۔ج:۳۴۹)

فقر مقامِ نظر، علم مقامِ خبر
فقر میں مستی ثواب، علم میں مستی گناہ!
علم فقیہہ و حکیم، فقر مسیحؑ و کلیمؑ
علم ہے جویائے راہ، فقر ہے دانائے راہ
(ب۔ج:۳۶۹)

طوالت کے خوف سے علامہ اقبالؒ کا اولیاء اللہ کے متعلق مزید کلام شامل کرنا مناسب نہیں ایسا کلام زیرِ نظر کتاب میں کافی بہتات سے کیا جا چکا ہے۔

باب ۴۹

حصہ دہم

(اصطلاحاتِ تصوف اور اشاعتِ اسلام)

اصطلاحاتِ تصوف

(عملِ تصوف کی طرف اشارات)

انسان بننے کے لئے محنت زیادہ کرنا پڑتی ہے

دین علم و فلسفہ کا نام نہیں، عمل کا نام ہے۔ ہر فلاسفر دین دار نہیں ہوتا لیکن ہر دین دار فلاسفر بھی ہوتا ہے۔ لوگ دین کا فلسفہ غیر اسلامی ممالک میں جا کر غیر مسلم فلاسفروں سے سیکھتے اور فلسفہ کی سند حاصل کرتے ہیں۔ اگر دین کا کمال فلسفہ ہوتا تو غیر مسلم فلاسفر ضرور دیندار ہوتے۔ دین کا حاصل فلسفہ نہیں، عمل ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں ہمارے علم پر سو فیصد عمل کی توفیق بخشے آمین، یعنی ہمارا کوئی بھی علم باطل نہ ہو۔ جس عمل کو ایک بار اختیار کر لیں، عمر بھر نبھائیں، کبھی ترک نہ کریں اور نہ ہی ناغہ کریں۔ ہر عمل کو زندگی کا آخری عمل جان کر کرنا چاہیے۔ ہر بات عمل ہے۔ نیک بات نیک عمل اور بری بات برا عمل ہے۔ عمل جب قائم ہو جاتا ہے تو قوی ہو جاتا ہے، پھر کبھی قضا نہیں ہوتا۔ عمل کے نور کا جلال عجز و کسل اور جبن کو جلا دیتا ہے۔ عمل ایک ایسا حصار ہے جسے کوئی پھاند نہیں سکتا۔ علم ایک پہاڑ ہے جسے کوئی ہلا نہیں سکتا جو اس سے ٹکراتا ہے، پاش پاش ہو جاتا ہے۔ علم ایک قلعہ ہے، جس میں کسی بھی طرح سے اور کوئی بھی کبھی داخل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اسے توڑ سکتا ہے۔ عمل ہر حال میں اپنے حریف کا مقابلہ کرتا ہے، اپنی انا بت قائم رکھتا ہے، حتی الامکان اپنا تسلسل کبھی ٹوٹنے نہیں دیتا اور یہ علم کی بہترین کرامت ہے۔ ہر عمل کے عالم پر علم کا حال وارد ہوتا ہے۔ عمل کے نور کی ضیاء سالک کی راہ کو روشن رکھتی ہے، کبھی تاریک نہیں ہونے دیتی ورنہ اس راہ کی تاریکی کو کوئی اور اجالا کبھی روشن نہیں کر سکتا۔ علمی قوت تقریروں اور تحریروں کی مرہونِ منت نہیں ہوتی۔ زندگی اعمال سے سنورتی ہے، مال سے نہیں۔ جسم خاک، علم نور ہے، خاک میں جب نور جلوہ گر ہوتا ہے تو خاک کی ماہیت بدل جاتی ہے۔ کسی اور طرح خاک کی خصلت نہیں بدل سکتی۔

دین کے تقاضوں کے مطابق عمل پیرا ہونے کی جدوجہد کا اسلامی نام طریقت ہے۔ جذب و مستی اور محویت و استغراق عمل ہی کے احوال و مقامات ہیں۔ عمل کے باہر کوئی شے نہیں' عمل نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ عمل ختم ہو جائے تو ہر شے ختم ہو جاتی ہے اور عمل ہی کائنات عالم کا روح رواں ہے۔ عمل سے خودی اور خودی سے بے خودی پیدا ہوتی ہے۔ گویا عمل تخم' خودی پودا اور بے خودی پھل ہے۔ یہی بے خودی ملتِ مصطفویہ کی جان ہے۔ عمل دل میں سوز' نگاہ میں عفت اور کردار میں بے باکی پیدا کرتا ہے۔ دم بدم عمل سے روحانی قوت بڑھتی اور جسمانی قوت گھٹتی رہتی ہے۔ عمل کے نور کی قوت جسمانی قوت کی کمی کو پورا کر دیتی ہے اور کسی بھی عمر میں کمزوری محسوس نہیں ہونے دیتی۔

عمل کے دو مقام

ہر عمل کے دو مقام ہوتے ہیں' ایک کمزور اور دوسرا قوی مثلاً تہجد کی نماز بیٹھ کر پڑھنا کمزور عمل ہے اور طویل قیام قوی عمل ہے۔ یہ دستور ہے کہ علم عامل کو چھوڑا کرتا ہے' عامل عمل کو نہیں۔ عامل جب علم کے آداب ترک کر دیتا ہے تو عمل باطل ہو جاتا ہے اور باطل عمل کبھی جاری نہیں رہتا۔ سالک کو چاہیے کہ اپنے کسی علم کو باطل نہ کرے' ابطالِ عمل حرام ہے۔ علم کی عمل پر فضیلت الگ دے دی گئی ہے۔

علم کی مہک

عمل اپنے عامل میں اسی طرح مہکتا ہے جیسے کہ پھول میں خوشبو! صوفیہ کا قول ہے جسم اور عمل روح ہے روح کے بغیر جسم محض مٹی کا تودہ ہے لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ (الصف: ۲) یعنی جس قول پر قائل کا اپنا عمل نہیں ہوتا' وہ کسی دل میں نہیں اترتا اور بسا اوقات بحث کا موضوع بن جاتا ہے۔

طریقت کا علم

طریقت کا وہ علم جو کبھی نہیں بدلا اور کبھی نہیں بدلتا' اپنے علم پر عمل کرنا ہے۔ جس علم پر عمل نہیں کیا جاتا وہ دنیا و آخرت میں شامت کا موجب ہوتا ہے اور جس علم پر عمل کیا جاتا ہے وہ کایا پلٹ دیتا ہے اور کن فیکون کا مقام رکھتا ہے۔ جذب و سلوک کے تمام مقامات' عمل ہی کی بدولت ہیں۔

یہ امت محمدیہ ساری امتوں میں چنی ہوئی امت ہے اس کے پاس علوم و فنون کے خزانے ہیں' قرآن ہے' تفسیر ہے' حدیث ہے' شرع ہے' فقہ ہے' اصول فقہ ہے' قانون ہے' منطق ہے' ادب ہے' میزان ہے' تحریر ہے' تقریر ہے' ہر شے ہے لیکن علم پر عمل اور عمل پر استقامت نہیں اور کسی کو بھی نہیں' نہ معلم کو ہے' نہ متعلم کو' نہ ان کو ہے' نہ اُن کو' اگرچہ ہر کوئی اس کا دعویدار ہے۔

اللہ کی رحمت

اللہ کی رحمت کے نزول کی بے شمار اقسام ہیں۔ اعلیٰ درجے کی رحمت اعلیٰ درجے کی منزل پر نازل ہوا کرتی ہے اور حکمت الٰہی کے تحت نازل ہوا کرتی ہے۔ رحمت جہاں ملامت کے روپ میں نازل ہوتی ہے منزل کی کایا پلٹ دیتی ہے۔ سلوک کی ساری منزل رحمت ہی کی منزل ہوتی ہے اور جس بھی روپ میں رحمت کا نزول ہو سالک ہی کی ہدایت کے لئے ہوتا ہے۔

توجہ

روح، قلب اور نفس تینوں کا آپس میں مربوط و متصل اور متحد ہو کر کسی خفتہ نصیب کے نصیب کو بیدار و بلند کرنا اور اس کی طرف کمال محبت کے عالم میں دیکھنے کا نام توجہ ہے۔ توجہ حجابات اٹھا دیتی ہے، ہلچل مچا دیتی ہے، سینے کے کینے و کدورت کو ختم کر کے اپنے لیے وقف کر لیتی ہے۔ جس کام کو تلقین کبھی نہیں کر سکتی، توجہ دم بھر میں کر دیتی ہے اور یہ توجہ کا ابتدائی مقام ہے۔ توجہ سینے کو گرما دیتی ہے، بیقرار کر دیتی ہے، بے تاب کر دیتی ہے اور جب تک غیر کو سینے سے نکال نہیں دیتی، جدوجہد جاری رکھتی ہے۔ بے شک غیریت سے پاک سینہ معرفت کا خزینہ ہے۔ یاد رہے کہ کونج کی توجہ انڈوں پر ہوتی ہے اور اسی توجہ سے انڈوں میں بچے بنتے ہیں، جس انڈے سے کونج کی توجہ اٹھ جاتی ہے، وہ سڑ جاتا ہے۔ یہ ایک پرندے کی توجہ کا حال ہے۔ بندوں کی بندوں پر اور پھر اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر توجہ کا کیا حال اور کیا مقام ہوگا؟

قدرت کے تمام معجزات رسول اللہ ﷺ کے نوری وجود کے حکم کے تابع ہوتے ہیں اور وہ نور اس دنیا میں سورج کی اتھاہ گہرائیوں میں دیکھا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ نظر اللہ تعالیٰ کی مقبولیت حاصل کیے ہوئے ہو۔

خدمت

مخلوق کی خدمت میں خالق کی خوشنودی اور رضا تلاش کرنا مقصود ہو اور کسی بھولے بھٹکے راہی کو راہ بتلانا انسانیت کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

ذکر

جس بندے کا اللہ آسمان پر ذکر کرتا ہے، وہی بندہ دنیا میں اللہ کا ذکر کیا کرتا ہے۔ بندے کا ذکر کرنا اللہ کے ذکر کی بدولت ہوتا ہے۔ جب آپ کسی کو ذکر میں مصروف دیکھیں تو سمجھیں کہ اللہ اس کا ذکر فرما رہا ہے۔ اس طرح جب تک اللہ بندے پر راضی نہیں ہوتا، بندہ اللہ پر راضی نہیں ہوتا۔ ہر شے سے افضل ذکر ہے۔ جو چیز ذکر کے لئے وقف ہے، وہ بھی افضل ہے۔ زمین کا جو خطہ ذکر کے لئے وقف ہے، مسجد ہے اور مسجد سے مقدس

اور کوئی مقام نہیں' نہ محل' نہ دربار' ذکر کے بدلے ذکر کا وعدہ ہے' کشف و کرامات کا نہیں۔ ذکر اختیاری اور کشف غیر اختیاری ہے۔ ذکر کسبی اور کشف وہبی ہے۔ ذکر و طاعت مطلوبہ اور کشف غیر مطلوبہ ہے۔ ذکر معتبر اور کشف غیر معتبر ہے۔ ذکر فی نفسہ مصداق اور امر الٰہی کی تعمیل ہے۔ جہاں ذکر ہوتا ہے وہاں مذکور ضرور ہوتا ہے۔ ذکر اور ذاکر و مذکور ایک ہوئے جیسے دودھ میں پانی مل کر دودھ ہوا اور آگ کی آغوش میں لوہا آگ ہوا اور یہ ذکر کا اصلی اور انتہائی مقام ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ''ذکر الٰہی کی ایک مجلس' بیس لاکھ بری مجلسوں کا کفارہ ہوتی ہے''۔ مجلس ذکر کا انعقاد رحمت الٰہی کے نزول کا موجب' ذکر الٰہی کی مجلس میں شریک ہونا مسعود و مستحسن اور خیر و برکت کا ضامن ہے۔

زندگی کے تین کام' ذکر الٰہی' اللہ کے دین کی دعوت و تبلیغ اور اللہ کی مخلوق کی بے لوث خدمت۔ یہ تینوں کام ہر جگہ جہاں بھی کوئی ہو' پوری آب و تاب سے شب و روز جاری رکھ سکتے ہیں۔ اگر چہ کسی درخت تلے ہوں۔ یہ تینوں کام اللہ کے کام ہیں اور اللہ کے سوا کسی بھی معاملہ میں توجہ کے محتاج نہیں ہوتے۔ جو مزہ درخت کے نیچے آتا ہے' کسی اور جگہ نہیں۔

معرفت کا منبع ذِکر ہے

ہمیشہ دریا منبع سے جاری ہوتے ہیں' شریعت و طریقت اور حقیقت و معرفت کا منبع ذکر ہے۔ علم و حکمت اور عشق و رقت کے چشمے ذکر ہی کے منبع سے پھوٹا کرتے ہیں اور ازل و ابد کے تمام مقامات اسی چشمہ ذکر کی آبشاریں ہیں۔ منبع قیامت تک کے لئے دریا کا کفیل ہوتا ہے اور منبع کی وسعت ادراک میں نہیں آسکتی کیونکہ اس کی وسعت و گہرائی تحت الثریٰ تک ہوتی ہے۔

ذکر بالجہر

ذکر بالجہر سے انجانوں کو ذکر کی تعلیم ہوتی ہے اور ذکر نہ کرنے والوں کو ذکر کا شوق اور اس کی طرف رغبت پیدا ہوتی ہے۔ ذکر بالجہر سے زبان' دل اور دماغ تینوں مشغول عبادت ہوتے ہیں' ذکر بالجہر ذاکر کو اونگھ' نیند اور سستی سے محفوظ رکھتا ہے' ذکر بالجہر کی تمام برکتیں ان تمام جگہوں تک پہنچتی ہیں' جہاں تک ذاکر کی آواز جاتی ہے۔ ذکر بالجہر کی وجہ سے ذاکر کو بکثرت گواہ ملتے ہیں جو قیامت کو گواہی دیں گے۔ ذکر بالجہر کرنے والوں کو فرشتے ڈھونڈتے ہیں۔ ذکر بالجہر کرنے والوں کی معرفت کی اللہ تعالیٰ نے بشارت دی ہے اور ذکر بالجہر کو لے جانے کے عمل پر فرشتے مامور ہیں۔ ذکر بالجہر کی وجہ سے مسلمان ایک مجلس میں جمع ہوتے ہیں۔ ذکر بالجہر ایک دوسرے سے تعارف' دوستی اور ملاقات کا باعث ہے۔ ذکر بالجہر کا نفع متعدی ہے' کیونکہ سننے والوں کو بھی ثواب ملتا ہے۔ ذکر بالجہر اہمیت کے اعتبار سے آفتاب کی طرح روشن ہے۔

صبر

صبر اللہ کی بہترین نعمت ہے جو اس سے محروم رہا' بے شک بھلائیوں سے محروم رہا۔ کوئی اگر کسی تکلیف پر واویلا کرے تو کیا پائے گا؟ واویلا کبھی نقصان پورا نہیں کر سکتا۔ اور واویلا صبر کے اجر کو تو کھا جاتا ہے مگر نقصان کو پورا نہیں کرتا۔ صبر کے سوا کوئی اور چیز کسی نقصان کو کسی بھی طرح پورا نہیں کر سکتی اور فقط صبر ہی ہر نقصان کا بہترین اجر اور نعم البدل ہے۔ صبر ہمیشہ اللہ کی رحمت کو کھینچ لاتا ہے۔ صبر ایک ایسا ہتھیار ہے' جس کا وار کبھی خطا نہیں جاتا اور صبر وہ حصار ہے جسے کبھی کوئی پھاند نہیں سکتا۔ صبر ایک ایسی لذت ہے جس کا قرار سدا رہتا ہے۔ بے شک صبر کا بدلہ نجات ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ ہمیشہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

فقر و درویشی

اسلام کے بے مثال فیض دو ہیں درویشی اور حکمت۔ آج یہ دونوں ہی نااہلوں کے ہاتھوں خجل ہیں۔ ہر ملاّ درویش اور ہر درویش حکیم ہے۔ یہ پتہ نہیں کہ ایک حکیم نے صرف نبض شناسی کے لئے چالیس برس ایک شہر کے دروازے پر گزارے جو آتا نبض دکھلا کر اندر جاتا۔ اس کے بعد اس حکیم نے اس مضمون پر کلام کیا' جو آج تک زندہ ہے اور درویشی کا قصہ اس سے کہیں دشوار ہے۔

اللہ کے فقیروں کی نظروں میں اللہ کے سوا کوئی اور شے جچا نہیں کرتی اور نہ ہی اللہ کے سوا کسی شے کے طالب ہوتے ہیں۔ صاحب توکل فقیر کے لئے نہ وطن ہے' نہ جائیداد' نہ کسب ہے نہ روزگار' نہ مال نہ سوال' صبح کرے تو شام کا اور شام کرے تو صبح کا نہ ذخیرہ ہو نہ فکر اور نہ ہی زندگی کی امید۔ متوکلین صبح پرندوں کی طرح بھوکے اٹھتے اور شام کو سیر ہو کر لوٹا کرتے ہیں۔ قرونِ اولیٰ کا فقیر اپنی جگہ سے اٹھ کر کہیں نہ گیا اور اللہ کے لئے کسی کا مہمان نہ بنا بلکہ ہر کسی کا میزبان بنا۔ جو روزی اللہ نے دی' اللہ ہی کے لئے اللہ کی مخلوق میں فراخ دلی اور خندہ پیشانی سے تقسیم کر دی۔ کسی بھی شے کی نہ طمع کی اور نہ ہی کوئی شے جمع کی۔ فاقہ جس سے لوگ آج بیزار ہیں' فقر کا فخر' فقر کی آرزو اور فقر کی جان ہے بلکہ فاقہ میں فقر کی تلوار ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اللہ کا خلیفہ اور اویس" اللہ کا فقیر تھا۔ فقیر کی نگاہ میں شفا اور زبان میں فیض ہوتا ہے۔

نفس

جس کارواں کا امام عشق نہیں ہوتا' اس کا امام نفس ہوتا ہے' وہ کسی منزل پر نہیں پہنچتا۔ یہ نفس کاہل ہے' سست ہے' بزدل ہے' بخیل ہے' سرکش ہے' عیار ہے' مکار ہے' تو اسے قابو میں رکھ' ہر وقت اس کو کسی نہ کسی کام میں مشغول رکھ۔ دم بھر کے لئے بھی فارغ مت ہونے دے' اسے سر کھجلانے کی فرصت بھی نہ ہو۔ اللہ کے بندو! اللہ سے ہر حال میں ڈرو اور اپنے نفس کی مخالفت کرو' یہ تمہارا نفس! زینت و لذت اور راحت و شہرت کا

طالب ہے۔ اس کی کسی بھی طلب کو پورا نہ ہونے دو۔ اللہ تعالیٰ نے بندے کو حاکم اور نفس کو محکوم بنایا ہے لیکن حقیقتاً نفس حاکم اور بندہ محکوم ہے۔ افسوس! صد افسوس۔

طریقت کا دارومدار طلب پر موقوف ہے' دنیائے طریقت میں گنتی کے چند بندے ہوتے ہیں' جن کی طلب خالص پختہ اور دوام ہوتی ہے' جو اپنی طلب کبھی نہیں بدلتے۔ طلب کی ساری تاریخ چند اوراق پر مشتمل ہے' ضخیم نہیں۔ ایک نے ان کے لئے اپنے دل کو دنیا و دین کی ہر طلب سے کلیتاً پاک کیا' حتیٰ کہ ان کے سوا اس میں کسی بھی شے کی کوئی طلب باقی نہ رہی' پھر وہ خرامِ ناز سے اٹھکیلیاں کرتا ہوا ان کی راہ میں نکلا۔ اس نے کہا کہ اس وقت اس کے ہمراہ اس کی ہر شے تھی۔ دل ساتھ تھا' جان ساتھ تھی' روح ساتھ تھی' نفس ساتھ تھا' حوریں ساتھ تھیں اور غلمان ساتھ تھے۔ گویا اس وقت یہ ننھا سا کارواں کل کائنات پر مشتمل تھا۔ جب یہ کارواں اللہ کے لئے صرف اللہ ہی کے لئے اللہ کی راہ میں نکلا' اللہ کے سوا کوئی اور غرض و غایت نہ تھی' بالکل نہ تھی' نہ کوئی دینی غرض تھی' نہ دنیوی۔ اس وقت اللہ کی رحمت نے اس کا استقبال کیا۔ حضور اقدس و اجمل' اکرم و اجمل' اطیب واطہر' روحی فداہ ﷺ نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ کالی کملی میں چھپا لیا۔ روحی فیض سے مشرف فرما کر خزانوں کی کنجیاں بخش دیں اور یہ عنایات کی حد ہے۔ ایک نے پوچھا کہ تم زندگی کا یہ سارا ساز و سامان لئے کہاں جا رہے ہو اور یہ کیا لینے جا رہے ہو؟ اس نے کہا کہ اگر وہ ملیں' گھر کا گھر بیچتا ہوں' میں ہستی کی ساری دکان بیچتا ہوں' زر و مال دنیا تو ہے ہی کیا چیز؟ میں قلب و نفس' روح و جاں بیچتا ہوں۔ نفس کی مخالفت میں جو مقام ملامت کو حاصل ہے' کسی اور کو نہیں۔

محبت

محبت دلکش الفاظ' خوشنما تراکیب اور حسن بیان کی محتاج نہیں' جذبے کی طلب گار ہے۔ جذبہ صادق ہو تو کلام کی سادگی یا ادبی فروگزاشتیں بھی ایک حسن بن جاتی ہیں۔ محبت فطرت ہے جو طرز ادا اور حسن زبان و بیان کی محتاج نہیں۔ محبت قلب و نظر کے پیغامات کی امین اور قلبی واردات کی ترجمان ہوتی ہے۔ اس کا اظہار جس بھی انداز میں ہو لائق التفات ہوتا ہے۔

جذبہ عشق

جذبہ ایک وہبی خصلت ہے' خالق کی عنایت سے مخلوق کو ودیعت ہوتا ہے اور ذوق و شوق جذبہ ہی کے مختلف مدارج ہیں۔ جذبہ جب جنون کے مقام پر پہنچتا ہے تو عشق بن جاتا ہے اور عشق ہر منزل کا میر کارواں ہوتا ہے۔ تلقین سینے کو غیر سے کبھی پاک نہیں کر سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ مقام عشق ہی کو بخشا ہے۔ اسی لئے یہ رقص و سرود اور ذکر الٰہی کی محفل غیر اختیاری حال ہے اور غیر اختیاری امور فتویٰ کے تابع نہیں' مرفوع القلم ہوتے ہیں۔

عشق و مستی

فرشتوں کی بندگی صرف سجدہ اور بندوں کی بندگی (سجدہ کے علاوہ) بندوں کی خدمت اور عشق و مستی ہے' یہی وجہ ہے کہ بندوں کے مقامات دم بدم بڑھتے اور بلند ہوتے رہتے ہیں اور یہ شرف فرشتوں کو حاصل نہیں۔ جبریل علیہ السلام جس روز سے پیدا ہوئے' جبریل ہی ہیں اور جبریلؑ ہی رہیں گے۔ عشق ایک جہان ہے جہاں کوئی دوسرا سمانہیں سکتا۔ عشق ایک حال ہے جو کبھی بدل نہیں سکتا۔ عشق ایک نشہ ہے جو کبھی اتر نہیں سکتا۔ عشق جب فراق کی آگ میں جل جاتا ہے تو جمال و وصال سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور جمال و وصال سے بے نیازی عشق کا وہ مقام ہے جس پر جبریل علیہ السلام کا بھی گزر نہیں۔

سلوک کی منزل

فصل کچی ہو یا پکی' نگران کی محتاج ہوتی ہے' سلوک کی پوری منزل نگران کی محتاج ہوتی ہے یا یہ کہ بچے' فصل اور فقر تینوں راکھی یعنی نگرانی سے پلتے ہیں۔ حیات کا ذوق اور موت کا خوف انسانی زندگی کے دو محور ہیں اور ہر کوئی انہی کے گرد گھوما کرتا ہے۔

شیخ کی پیروی

شیخ کی محبت و اتباع میں بیعت طریقت و فیض کا سلسلہ جاری ہوا کرتا ہے' جو شخص اپنے شیخ سے منحرف ہو گیا کیا اس کی بیعت اور کیا اس کا فیض۔ یاد رہے کہ ادب کی کڑی ٹوٹنے سے پہلے فیض کی کڑی ٹوٹ جاتی ہے!

ملامت

ملامت فقر کی قبا ہے۔ قبا کے نیچے جامہ ہوتا ہے' نظر نہیں آتا لیکن اصلی ہوتا ہے۔ شہرت نفس کے لیے مہلک اور ملامت تریاق ہے۔ بے شک ہر ملامت میں بخشش اور درجات کی بلندی ہے اور یہ شکوے کا نہیں' شکر کا مقام ہے۔ ایک ہی ملامت ساری عنایاتِ الٰہیہ کو پوری طرح ڈھانپ لیتی ہے۔ گویا پاک پردوں میں چھپا لیتی ہے اور عنایت کے ساتھ ملامت ضروری ہے تاکہ عنایات کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ جب بھی کسی پر کوئی عنایت ہوتی ہے تو ملامت ساتھ ہوتی ہے۔ تاکہ نظر نہ لگے اور ملامت عنایت کا حصار ہے۔ زنگار کو جتنا بھی رگڑو کم ہے!

فقیر کا کوئی ترکہ نہیں

اللہ کے بندوں یعنی فقیروں کا کوئی ترکہ نہیں ہوتا' جو کچھ وہ چھوڑیں صدقہ ہوتا ہے اور صدقے کی کوئی وصیت نہیں ہوتی۔ وہ بازارِ دنیا سے یہ کہتے ہوئے ایک دھوم سے گزرتے ہیں کہ نہ کسی سے کوئی ترکہ پایا اور نہ ہی چھوڑا۔ دنیاداروں کا ترکہ کچھ اور بات ہوتی ہے اور اس کے قوانین الگ ہوتے ہیں۔

دل

دل کے دروازے ہر کسی کے لئے ہر وقت کھلے نہیں رہتے۔ کبھی کبھی اور کسی کسی کے لئے کھلتے ہیں۔ دل اپنے دلبر کے سوا کسی دوسرے کو اپنے اندر رہنے نہیں دیتا۔ دل جب دلبر کو پالیتا ہے تو دروازے بند کر لیتا ہے اور پھر کبھی نہیں کھولتا۔

دیانت دار و بددیانت فقیر

بددیانت دنیا میں ابھرا' چمکا' عروج کو پہنچا' پھر زوال پذیر ہوا' غروب ہوا اور مٹ گیا۔ ہر بددیانت کا یہی حشر ہوتا ہے اور دیانتدار اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہوتا ہے' کبھی نہیں مٹتا' ہمیشہ زندہ رہتا ہے' اور اللہ ہر دیانتدار کی دیانت کا تذکرہ قیامت تک اپنے نیک بندوں کی زبانوں پر زندہ رکھتا ہے۔

مزید اصطلاحاتِ تصوف بلحاظ حروف تہجی

تصوف کے ضروری امور کو اختصار کے ساتھ پیش کرنے کے لئے چند اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں جن میں بعض مضامین کو رموز و کنایات سے واضح کر دیا جاتا ہے اور اہل تصوف ان الفاظ کے معنوں کو سمجھ لیتے ہیں۔ ان اصطلاحات کا مختصر تعارف نیچے دیا جا رہا ہے۔

اعتبار

تصوف میں اس لفظ کا استعمال عموماً حقیقت کے مقابلے میں ہوتا ہے۔ ہر وہ چیز جو حقیقی نہیں اعتباری ہے۔ ہر وہ چیز جو ظنی وہمی اور فرضی ہے اعتباری ہے صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات حقیقی ہے اس کے سوائے جو کچھ ہے سب اعتباری ہے۔

اشارہ

اشارہ یہ ہے کہ جسے متکلم تکلم کے ساتھ نہ بیان کر سکے کیونکہ یہ معنی کے اعتبار سے نہایت لطیف ہوتا ہے۔ ابو علی رودباریؒ نے کہا کہ ہمارا علمِ تصوف محض اشارہ ہے۔ جب عبارت بن جائے تو غائب ہو جاتا ہے۔

ایماء

ایماء کسی عضو کی حرکت کے ساتھ اشارہ کرنے کو کہتے ہیں شبلیؒ کہتے ہیں کہ جس نے اس کی طرف ایماء یعنی کسی عضو کی طرف اشارہ کیا اس کی مثال بت کے پجاری کی سی ہے۔ کیونکہ ایماء فقط اصنام کی طرف ہی ہوتا ہے۔

البادی

البادی اس حالت کو کہتے ہیں جو قلب پر بندے کے حال کے مطابق ظاہر ہوتی ہے جب بادی الحق کا ظہور ہوتا ہے تو وہ غیر حق ہر شے کو ختم کر دیتی ہے۔ حضرت ابراہیم خواصؒ نے فرمایا جب بادی الحق ظاہر ہوتا ہے تو ہر ظاہر ہونے والی حالت کو فنا کر دیتا ہے۔

الصول

مریدین و متوسط سالکین کا اپنے ساتھیوں کے احوال کے بارے میں زبان کھولنا الصول کہلاتا ہے۔ اور یہ ایک مذموم فعل ہے۔

استغراق

جب جذبہ حد سے بڑھ جائے تو استغراق کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے یہ اس وقت ہوتی ہے جب حب الٰہی دل میں موجزن ہو جائے اور محویت کا عالم وجود میں آئے۔ اس حالت میں سالک کو ذات الٰہی کے انوار میں استقدر انہماک ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی ذات سے فنا اور اللہ کے قرب سے بقا پالیتا ہے۔ پھر اس کا بولنا، چلنا اور کام کرنا اس حدیث کے مطابق ہو جاتا ہے جس میں بندے کا فعل اللہ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کی مثال حضرت عائشہ صدیقہؓ کی اس روایت سے ملتی ہے کہ جب آپ رضی اللہ عنہا سرور کائنات ﷺ کو ڈھونڈتے ہوئے حاضر خدمت ہوئیں۔ تو حضور اکرم ﷺ نے حضرت عائشہ کو دیکھ کر فرمایا کہ تم کون ہو؟ حضرت عائشہؓ نے جواب دیا کہ عائشہ۔ آپ ﷺ نے فرمایا'' عائشہ کون؟'' حضرت عائشہ صدیقہؓ نے جواب دیا کہ ابو بکر کی بیٹی۔ ارشاد ہوا '' کون ابو بکرؓ ؟ حضرت عائشہؓ نے جواب دیا کہ محمد ﷺ کے دوست۔

فرمایا'' محمد ﷺ کون؟'' یہ سن کر عائشہؓ خاموش ہو گئیں اور آگے کلام نہ کیا اور سمجھ گئیں کہ آپ ﷺ پر کوئی خاص کیفیت طاری ہے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ کی زیارت کو جب ذوالنون مصریؒ کے مریدان کے گھر پہنچے تو پوچھا'' هَلْ بَايَزِيد فِي الْبَيْتِ ''حضرت بایزیدؒ نے فرمایا'' مَا فِي الْبَيْتِ إِلَّا اللّٰهُ '' یعنی اس گھر میں اللہ کے سوا کوئی نہیں ایک بار آپؒ نے فرمایا'' کون؟ بایزید'' اس کو کئی سالوں سے ڈھونڈ رہا ہوں مگر وہ ابھی تک مجھے نہیں مل سکا۔

'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور دیگر اکابرین سلسلہ چشتیہ کئی کئی دن استغراق کی حالت میں رہتے مگر نماز کے اوقات کو ضائع نہ ہونے دیتے اور اس بے خودی کی حالت میں نماز ادا کرتے۔

البلاء

بندے کی حقیقتِ حال جاننے کے لئے آزمائش کے طور پر عذاب میں مبتلا کرنے کے ذریعے اس کا امتحان لینا البلاء کہلاتا ہے۔ ابو محمد جریریؒ کا قول ہے کہ انسان وہیں ہے جہاں آزمائش ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہم پیغمبروں کی جماعت دیگر لوگوں سے زیادہ آزمائشوں سے دوچار ہوتی ہے۔

اَلْھَمُّ

ھمّ کو واحد استعمال کرنے میں یہ اشارہ پوشیدہ ہے کہ سالک اپنے تمام ہموم یعنی ارادہ کو یکجا کر کے ایک ہی ارادے میں ضم کر دے۔ ابو سعید خرازؒ نے فرمایا اپنے ھمّ (ارادے) کو اللہ تعالیٰ کے سامنے اکٹھا کر دے۔

الرمس اور الدمس

دمس کا معنی دفن کرنا ہے اس لئے قبرستان کو دیماس کہتے ہیں سہلؒ فرماتے ہیں جب تو اپنے نفس کو تحت الثریٰ میں دفن کر دیتا ہے تو تیرا قلب عرش سے اوپر پہنچ جاتا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ تو اپنے نفس کو چھوڑ دے اور اس کی مخالفت کرے۔

ابن الوقت

ابن الوقت وہ صوفی کہلاتا ہے جو اسرار و واردات سے مغلوب الحال ہو جائے۔ اسرار کا اظہار کر دے۔ خوارق اس سے ظاہر ہو جائیں اور احکام ظاہری کی مخالفت کر بیٹھے۔ ابن الوقت ہی کو قلندر اور رند بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ (مقدمہ مثنوی مولوی معنوی اول ص ۲۴)

ابو الوقت

وہ صاحب مقام صوفی کہلاتا ہے جو آداب شریعت کا پورا پاس کرے۔ حالانکہ وہ واردات میں نفس اور روح پر قابو رکھے۔ خداوندی حکمت کے مقتضیٰ کو سمجھتے ہوئے کرامات اور خوارق پر قابو رکھے۔ ابو الوقت کا مقام ابن الوقت سے بہت اعلیٰ سمجھا جاتا ہے (مقدمہ مثنوی مولوی معنی اول ص ۲۵)

استدراج

ایسا خرق عادت جو کسی غیر صالح اور بے دین و مردود شخص سے ظہور میں آئے جیسے ساحر و جادوگر سے کسی خرق عادت کا ظہور (ضمیمہ مصطلحات صوفیہ فی نفحات الانس ۸۴۱)

اہل تکوین

اہل تکوین وہ اولیاء اللہ ہوتے ہیں جن کے سپرد مخلوق کے معاش کی اصلاح، دنیا کا انتظام، مصائب کا دفع کرنا ہوتا ہے۔ان میں سے جو اپنے زمانہ میں سب سے افضل ہوتا ہے وہ قطب التکوین کہلاتا ہے۔
(مقدمہ مثنوی مولوی معنوی اول ص ۲۶)

اخلاص

اخلاص بندہ اور رب کے درمیان ایک راز ہے جسے نہ تو فرشتہ جان سکتا ہے کہ لکھ لے اور نہ شیطان کہ اسے خراب کر سکے اور نہ خواہش نفس کہ اسے اپنی طرف مائل کر سکے۔

(حضرت جنیدؒ بغدادی، شعور حکمت و دانش ص ۶۹)

اخلاص یہ ہے کہ تو اپنے عمل کو دیکھنا چھوڑ دے (ابو محمد رویمؒ البغدادی شعور حکمت و دانش ص ۱۱۶)

اَلتَّحلِّی

اَلتَّحلِّی سے مراد صادقین کے ساتھ اقوال اور اظہارِ اعمال کے لحاظ سے مشابہت پیدا کرنا۔

اصطلام

اصطلام خصوصیت ہے ایسے غلبہ کی جو عقلوں پر وارد ہو کر انہیں اپنے غلبہ و قوت کے ساتھ سلب کر لیتی ہے۔کسی نے کہا کہ قلوب دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جن کو آزمایا گیا ہوتا ہے دوسرے وہ جن کو اصطلام لاحق ہو چکا ہوتا ہے۔اگر اصطلام واقع ہو تو قلوب جاتے رہتے ہیں۔

بقاء

بقاء اس حقیقت کا انکشاف کہ خلق حق سے قائم ہے۔اس مقام پر حق کا جمیع موجودات میں مشاہدہ ہوتا ہے اور بالکلیہ حق میں استہلاک ہو جاتا ہے اور کثرت میں وحدت اور وحدت میں کثرت کا مشاہدہ ہوتا ہے۔اس مقام کو اصطلاح تصوف میں جمع الجمع، فرق بعد الجمع، فرق ثانی اور صحو بعد المحو سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔یہ سب سے اعلیٰ مقام ہے، سلوک میں اس سے برتر کوئی مقام نہیں (حضرت ابوالخیر محمد زبیر، بزم جاناں ص ۶۶)
مزید وضاحت فنا اور بقاء کے عنوان میں پڑھیئے۔

تلوین

تلوین عارف کا ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہونا شیخ ابن العربی فرماتے ہیں کہ اکثر عارفین کے نزدیک تلوین ایک مقام ناقص ہے لیکن میرے خیال میں یہ کامل ترین مقامات میں سے ایک مقام

ہے اس لئے کہ حال تلوین میں بندہ کا حال اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مصداق ہوتا ہے۔ کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ (شمس بریلوی، ضمیمہ مصطلحات نفحات الانس ص ۸۴۵)

تمکین

محقق کا اپنے محل کمال اور درجات اعلیٰ پر اقامت کا نام تمکین ہے۔ اہل مقام مبتدی ہیں اور اہل تمکین منتہی ہیں۔ اس سے دونوں کا فرق ظاہر ہے۔ مقام تو منزل راہ ہے اور تمکین حضور باری تعالیٰ میں قرار ہے۔ پانی جب تک دریا میں ہے روانی ہے اور جب سمندر میں پہنچ جاتا ہے تو روانی کے بجائے قرار حاصل کر لیتا ہے حضرات صوفیہ کا ارشاد ہے۔ "اَلتَّمْکِیْنُ رَفْعُ التَّلْوِیْنِ" تمکین میں تلوین باقی نہیں رہتی تمکین سے تلوین کا رفع ہو جانا ہے یعنی تمکین میں تردد نہیں ہوتا اور ایک حال سے دوسرے حال کی طرف نقل نہیں کرتا اور اس میں تغیر پیدا نہیں ہوتا، اندیشہ غیر سے اس کا دل خالی ہو جاتا ہے اور نہ اس پر کسی معاملت کا اثر ہوتا ہے۔ جو اس کے ظاہر کو بدل دے اور نہ کوئی ایسا حال پیدا ہوتا ہے جس سے اس کا حکم باطن متغیر ہو جائے۔

(حضرت ہجویری، ضمیمہ مصطلحات صوفیہ نفحات الانس ص ۸۴۵)

تجلیہ

تجلیہ روح کو منزہ کرنا کدورت جسدیہ سے جو قالب عنصری کی مجاورت سے عارضی ہو گئی ہوں اور اسے چمکانا اور جلا دینا۔

تخلیہ

تخلیہ اللہ کے سوئی اور کسی چیز کا باقی نہ رہنا۔ سالک کی پہلی منزل تزکیہ ہے، پھر تصفیہ، پھر تجلیہ، پھر تخلیہ

تواجد

تواجد تکلف و تصنع سے وجد لانا۔ استدعائے وجد و اظہار حالت وجد بدون وجد

تجلی

حق تعالیٰ کے انوار کا اس کی طرف آنے والے سالکین کے دلوں پر چمکنا تجلی کہلاتا ہے

تخلی

ظاہر و باطن میں موجود حق سے دوسری طرف متوجہ کرنے والے عوارض سے علیحدگی اختیار کرنے کو تخلی کہتے ہیں۔ گویا تخلی میں خلوت، عزلت، اور وحدت کو لازماً اختیار کرنا ہوتا ہے۔ یوسف بن الحسینؒ فرماتے ہیں کہ تخلی سے مراد عزلت علیحدہ ہو جانا کیونکہ بندہ اپنے نفس پر قدرت نہیں رکھتا اور کمزور ہو جاتا ہے تو اپنے نفس

سے علیحدگی اختیار کر کے اپنے رب کی طرف رجوع کرتا ہے۔

تفرید

تفرید اللہ تعالیٰ کی حدوث بالکل علیحدہ ماننے اور حقائق فردانیت

توجہ

جمیع ماسوی اللہ سے روگرداں ہو کر حق تعالیٰ کی جانب متوجہ ہو جانے کے ساتھ سے قدیم جاننے کو کہتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ موحدین کی تعداد مومنین میں زیادہ ہوتی ہے۔ مگر مفریدین کی تعداد موحدین سے کم ہوتی ہے حسین بن منصورؒ نے اپنی شہادت کے وقت یہ لفظ کہے تھے۔ اور موَحِدْ کو یہی کافی ہے کہ وہ خدائے واحد عزوجل کو ایک مانے۔

تجرید

تجرید سے مراد قلوب کا شواہد الوہیت کے مشاہدے کے لئے کدورت بشریت سے خالی ہو جانا ہے۔ کسی شیخ نے تجرید کے بارے میں کہا ہے اللہ تعالیٰ کو ماسوی اللہ سے یکتا و منفرد ماننا اور بندے کا ہر اس مشاہدے میں محو ہو جانا جو اسے کرایا جائے تجرید کہلاتا ہے تجرید، تفرید اور توحید اگرچہ معنی کے اعتبار سے یکساں ہیں تاہم صوفیاء ان کو اپنے انداز میں مختلف طور پر بیان کرتے ہیں اور ان کی تفصیل واجدین کے حقائق اور اشارات کی مقدار کے مطابق ہوتی ہے۔

تلبیس

کسی شے کو اس کی ضد کے اوصاف کے ساتھ آراستہ کرنا تلبیس کہلاتا ہے۔ واسطیؒ فرماتے ہیں۔ تلبیس عین ربوبیت ہے۔ یعنی وہ مومن کو کافر اور کافر کو مومن کے لباس میں ظاہر فرماتا ہے۔

جمع

جمع ایک مجمل لفظ ہے اس سے وہ اشارہ عبارت ہے جو بندہ حق کی طرف کون وخلق کے بغیر کرے کیونکہ کون وخلق دونوں تخلیق کئے گئے ہیں اور خود اپنی ذات میں قائم نہیں بلکہ عدم کے دو کناروں کے درمیان موجود ہیں۔

جاہل

تصوف میں جاہل اسے کہتے ہیں جو حق کو اشیاء کے وسیلہ سے جانے۔

جذب ومحبت

جذب ومحبت کا طریق بے شک موصل ہے اس کا رخ سوائے حق سبحانہ کے اور کسی طرف کو نہیں ہوتا ہے بخلاف دوسرے طریقوں کے اکثر ان میں اپنا رخ انوار کی طرف رکھتے ہیں۔ بالآخر بعض تو انہی انوار میں رہ جاتے ہیں اور انجذاب اور محبت تمام افراد انسانی میں موجود ہے مگر چھپا ہوا رہتا ہے۔ چنانچہ اکابر مشائخ نقشبندیہ قدس اسرارھم اسی انجذاب سے تربیت کرتے ہیں (خواجہ باقی باللہ حضرات القدس ص ۲۹۳)

جذبہ

مرید اسم ذات کا ذکر کرتا ہے۔ شیخ اپنی توجہ سے مرید کے عالم امر کے لطائف کے تزکیہ میں مشغول ہوتا ہے یہاں تک کہ مرید فنا اور بقا کی صفت سے متصف ہو جاتا ہے۔

جمع وتفرقہ

متفرقات کو یکجا کرنا جمع ہے اور مجموعہ کو منتشر کرنا تفرقہ ہے پس جب جمعیت حاصل ہوگئی اللہ تعالیٰ فرمائے گا اور جب حال تفرقہ پر ہوگا تو مخلوق پر نظر کرے گا۔ (شیخ ابوبکر بن طاہر ابہری نفحات الانس ص ۳۶۵) تفرقہ یہ ہے کہ تمہاری ذات سے کسی چیز کو نسبت دی جائے اور جمع یہ ہے کہ وہ تم سے سلب کر لی جائے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ امور کسبی یعنی وظائف بندگی پر قیام اور بشریت کے متقاضی جو احوال ہیں ان کی نسبت ذات سے یہ تفرقہ ہے اور جو کچھ حق کی طرف ہے جیسے معانی کی تخلیق لطف واحسان کا ظہور یہ جمع ہے۔ بندہ کے لئے دونوں کا رکھنا ضروری ہے یعنی بندہ جمع وتفرقہ سے الگ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ جس میں تفرقہ نہیں اس میں بندگی نہیں اور جس میں جمع نہیں وہ معرفت سے محروم ہے۔ "اِیَّاکَ نَعۡبُدُ" کہنا تفرقہ کا اثبات ہے اور جب کہتا ہے "اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ" یہ طلب جمع ہے گویا تفرقہ آغاز ارادت ہے اور جمع اس کا انجام ہے۔
(تعریفات ضمیمہ مصطلحات صوفیہ فی نفحات الانس، ص ۸۴۷)

حال اور مقام

کتاب اللمع میں ہے کہ حال ایسی قلبی واردات میں سے ہے جو بندے پر ہر ایک خاص وقت میں وارد ہوتی ہے۔ پھر دل سے قرار پکڑتی ہے جب کہ دل سے رضا اور سب کچھ اس کے سپرد کر دینے کی صفات موجود ہوں۔ سالک کے لئے صفائے باطن پیدا کرتا ہے۔ اور کبھی یہ حال زائل بھی ہو جاتا ہے۔ حضرت جنید علیہ الرحمۃ کے مطابق حال صفائے اذکار کے ساتھ باطن میں وارد ہوتا ہے اور زائل نہیں ہوتا اور اگر زائل ہو جائے تو حال نہیں کہلاتا۔

مقام یہ ہے کہ بندہ اپنے مخصوص احوال میں سے ان پر فائز ہوتا ہے جیسے مقام توبہ ہے کہ زہد وفقر، صبر ورضا اور توکل وغیرہ ظاہری و باطنی ہیں مجاہدات و معاملات اور ارادت کے مطابق جب بندہ کسی حال میں مکمل ہو تو وہی اس کا مقام ہے۔ جس سے وہ اگلے مقام کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔ قرآن میں ہے وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ (اور فرشتے کہتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی ایسا نہیں مگر اس کے لئے ایک مقام متعین ہے۔ (الصّٰفّٰت: ۱۶۴)

حال اور مقام دیکھنے میں یہ دونوں الفاظ ملے جلے معلوم ہوتے ہیں حال کو حال اس وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ بدلتا رہتا ہے اور مقام ایک جگہ قائم ہوتا ہے۔ اور اس کو استقرار حاصل ہوتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک چیز جو حال ہوتی ہے رفتہ رفتہ مقام میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مثلاً کسی کے دل میں اگر محاسبہ کا جذبہ پیدا ہوا لیکن وہ صفات النفس کے غلبہ سے ختم ہو جاتا ہے اور پھر پیدا ہو جاتا ہے اور پھر زائل ہو جاتا ہے (یعنی کبھی پیدا ہوا اور کبھی زائل ہو گیا اور جب توفیق الٰہی شامل ہوئی تو محاسبے کا حال نفسانی صفات پر غالب آ جاتا ہے۔ اور نفس اس کے تابع ہو جائے تو اس وقت یہ جذبۂ محاسبہ اس کا وطن، مستقر اء اور مقام بن جاتا ہے تو اس وقت یہ جذبۂ محاسبہ اس کا وطن، مستقرار اور مقام بن جاتا ہے اور وہ محاسبے کے مقام میں داخل ہو جاتا ہے جب کہ وہ محاسبے کے حال میں تھا۔

مقام محاسبہ پر پہنچنے کے بعد اس پر مراقبہ طاری ہو جاتا ہے اب یہ کہہ سکتے ہیں کہ محاسبہ اس کا مقام ہے اور مراقبہ اس کا حال ہے جب بندے کا کھیل کود، سہو اور غفلت اللہ کی توفیق سے غائب ہوئی تو پھر یہ حال مراقبہ مقام بن جاتا ہے، مراقبہ کے مقام پر اس وقت قرار میسر آتا ہے جب مشاہدے کا حال طاری ہو جائے تو اس مشاہدے کے حال میں آنے کے بعد مراقبہ اس کا مقام بن جاتا ہے۔ اسی طرح مشاہدہ بھی مقام بن جاتا ہے۔ مشاہدے سے ترقی کر کے عالم فنا میں آتے ہیں اور وہاں سے رہائی پا کر بقا کی طرف لوٹ آتے ہیں یعنی عین الیقین سے حق الیقین تک پہنچ جاتے ہیں۔ عوارف المعارف میں مقامات اور احوال کی وضاحت ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقلی اور مقامات کے حصول کے طریقے، مقامات روحانی کے سلسلے میں بہت طویل کلام موجود ہے۔ جس کو اس جگہ شامل کرنا ممکن نہیں۔

حیرت

حیرت اچانک طاری ہونے والی کیفیت ہے جو قلب عارفین پر تامل، حضور اور غور وفکر کرنے کے وقت وارد ہوتی ہے۔ اور انہیں تامل حضور اور غور وفکر سے دور لے جاتی ہے۔ حضرت واسطیؒ کہتے ہیں اچانک طاری ہونیوالی حیرت، حیرت سے منہ پھیر کر حاصل ہونے والے سکون سے کہیں بلند رتبہ ہے۔

حجاب

ہر وہ چیز جو بندہ کو حق تعالیٰ سے محجب کر دے۔ ماسوی اور خیالاتِ ماسوی۔ سب سے بڑا حجاب، حجاب خودی ہے۔

حدث

حدث یہ اسم ہے اس شے کے لئے جو موجود نہ تھی اور ہوگئی صوفیاء کا بیان ہے کہ جب اللہ تعالیٰ عوام الناس کو تنبیہ کرنا چاہتا ہے۔ تو اپنی نشانیوں میں سے کوئی نشانی پیدا کرتا ہے۔ اور جب خواص کو متنبہ کرنا چاہتا ہے تو ان کے قلوب سے نئی پیدا شدہ اشیاء کا ذکر زائل فرما دیتا ہے۔

حضور

خالص یقین کے ساتھ قلب کا اس غائب کے لئے حاضر رہنا جو اس کے عیاں سے غائب ہو حضور کہلاتا ہے اگر اس طرح کی کیفیت سالک کو حاصل ہو تو غائب بھی اس کے لئے حاضر کے مانند ہے۔

خلافت

شیخ جب مرید میں دوسروں کو تعلیم دینے کی استعداد دیکھ لیتا ہے تو اسے خلافت عطا فرماتا ہے۔

خرقہ

خرقہ وہ لباس ہے جو شیخ اپنے مرید کو داخل سلسلہ کرتے وقت یا قبل تکمیل یا بعد تکمیل عطا فرماتا ہے۔

خطرہ

ایک قسم کا خطاب ہے جو ضمیر پر وارد ہوتا ہے اگر یہ خطاب نفس کی جانب سے ہے تو خطرۂ نفسانی ہے جسے حواجس بھی کہتے ہیں۔ شیطان کی جانب سے ہے تو خطرۂ شیطانی ہے۔ جسے وسواس بھی کہتے ہیں۔ فرشتہ کی جانب سے ہو تو خطرۂ ملکی ہے۔ جس کو الہام کہتے ہیں۔ حق تعالیٰ کی جانب سے ہے تو خطرہ رحمانی کہتے ہیں جو اس شان سے وارد ہوتا ہے کہ بندہ کو مغلوب کر لیتا ہے اور اس خطرہ کا دفیعہ محال ہو جاتا ہے۔ حالانکہ دوسرے خواطر میں یہ امر لازمی نہیں خطرہ کو خاطر بھی کہتے ہیں۔

دیوانہ

صوفیوں میں دیوانہ وہ کہلاتا ہے جو خود سے بیگانہ ہو گیا اور طلب حق میں سرگشتہ اور حیران رہتا ہو۔

دہشت

دہشت ایک حملہ ہے جو محبّ کی عقل پر محبوب سے حالت یاس میں ملنے پر ہوتا ہے اور جس کے گزر جانے پر مُحِبّ کو کوئی آفت لاحق نہیں ہوتی۔

دوام آگہی

اس میں عزیمت کی پراگندگی اور فتور خلل انداز نہ ہونا چاہیے خواہ لباس ذکر میں ہو خواہ صورت توجہ میں خواہ رابطہ کے توسط میں۔ الغرض جس طرح سے ہو مقصود حضور مع اللہ ہو۔ جب مذکورہ حضور کی کیفیت ہو جائے کہ وہ وجود غیر کا شعور اس حضور کا مزاحم نہ ہو اس حضور کو وجود عدم کہتے ہیں۔ جب یہ کیفیت سالک کا ملکہ بن جائے تو اس کو مشاہدہ کہتے ہیں جب اس حضور کی صفت کو بھی سالک اپنے سے نہ دیکھے تو وہ اپنے فنا حقیقی سے مشرف ہو گیا۔ اس وقت لَا یَعْرِفُ اللّٰہُ اِلَّا اللّٰہُ (اللہ تعالیٰ کو اللہ تعالیٰ ہی پہچانتا ہے) کے معنی ثابت ہوتے ہیں۔ اس مقام میں نہ ارواح ہیں اور نہ اشباح (اجسام) شہود بجانب مشاہدہ ہو جاتا ہے جب وجود حقانی کا لباس بقا سے مشرف ہو کر پوشیدہ ظاہر ہو جاتا ہے اور اپنی تمام صفات کو حضور کی طرح اپنے آپ میں معلوم نہیں کرتا تو اس وقت فضل الٰہی کی مدد سے اجسام کے فصول اور اجناس کو سراسر اعراض کے وجود کو معقولات ثانیہ سے جانتا ہے اور اَلْاَعْیَانُ مَا شَمَّتْ رَائِحَۃَ الْوُجُوْدِ (اعیان نے وجود کی بو بھی نہیں پائی) کا راز اس میں ظاہر ہو جاتا ہے اور سالک زبان حال سے یوں نغمہ سرا ہو جاتا ہے۔

تا حق بدو چشم نہ بینم ہر دم از پائے طلب می نہ نشینم ہر دم

(جب تک کہ حق کو سر کی دونوں آنکھوں سے ہر وقت نہ دیکھوں خدا کی طلب جاری رکھوں گا۔)

گویند کہ حق بچشم سرنتواں دید آں ایشاں اند و من چنینم

(لوگ کہتے ہیں کہ سر کی آنکھ سے خدا کو نہیں دیکھ سکتے ان کا وہی کہنا ہے اور میرا یہی کہنا ہے۔)

(خواجہ باقی باللہ حضرت القدس ص ۲۷۷)

دنیا

صوفیاء کرام کے نزدیک اللہ تعالیٰ سے غفلت کا نام دنیا ہے۔

دعویٰ

نفس کا خود سے وہ کچھ منسوب کرنا جو اس میں نہیں دعویٰ کہلاتا ہے۔ حضرت سہل بن عبداللہ فرماتے ہیں۔ بندہ اور خدا کے درمیان دبیز ترین پردہ دعویٰ ہے۔

ذکر

اللہ کی یاد، یاد الٰہی میں جمیع غیر اللہ کو دل سے فراموش کر کے حضور قلب کے ساتھ قرب معیت حق تعالیٰ کا انکشاف حاصل کرنے کی کوشش کو ذکر کہتے ہیں۔

ذوق

وہ مستی جو عاشق میں شراب عشق پینے کے بعد پیدا ہوتی ہے اور وہ شوق جو کلام محبوب سن کر اس میں بھڑکتا ہے اور وہ از خود وارفتگی جو جمالِ یار کے مشاہدہ سے اس میں پیدا ہوتی ہے۔ اس مستی وشوق اور از خود وارفتگی سے عاشق وجد میں آ جاتا ہے۔ بے خودی اس پر طاری ہو جاتی ہے۔

ذہاب

ذہاب بمعنی غیبت کے ہیں لیکن ذہاب کی کیفیت غیبت سے کہیں بڑھ کر ہے ذہاب سے مراد قلب کا مشاہدہ ہے حقیقت حاصل کر لینے کے بعد محسوسات کی حس سے جاتے رہنا پھر وہ اپنے ذہاب کی کیفیت کے احساس سے بھی مبرا ہو جاتا ہے۔ پھر اس مبرا ہونے سے بھی مبرا ہو جاتا ہے۔ الغرض ذہاب کا یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔

ذات

ذات یہ قائم بالذات ہوتی ہے جب کہ اسم نعت اور صفت ذات کی علامتیں ہیں اسم نعت اور صفت کا تعلق فقط صاحبِ ذات سے ہوتا ہے جسے مسمّیٰ کہا جاتا ہے یہی مسمی موصوف ومنعوت ہوتا ہے۔ جیسا کہ ''قادر'' اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے اسی طرح قدرت اسی کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔

روح

روح ایک ایسی چیز ہے جس کے جسم میں آنے سے جسم زندہ ہو جاتا ہے اور جس کے جسم سے نکل جانے سے جسم کو موت آ جاتی ہے حرکت حیات کا سبب یہی روح ہے۔

ریاضت

تزکیہ نفس اور تہذیبِ اخلاق اور اوصاف ملکوتی کے حصول میں مشقت اٹھانے کو ریاضت کہتے ہیں۔

رمز

ظاہر کلام میں پوشیدہ مفہوم کو رمز کہتے ہیں اس پر صرف اس کے اہل صوفیہ ہی کو دسترس حاصل ہوتی ہے۔

روح اعظم

انواع کی صورتِ نوعیہ کے علاوہ جن کو ارواح کہا جاتا ہے صوفیہ ایک اور روح مانتے ہیں جو ذات باری سے سب سے پہلے صدور میں آئی ہے اور تمام ارواح کی مربی ہے اس کو روحِ اعظم کہا جاتا ہے۔ اور یہی روحِ اعظم، روحِ محمدی ﷺ ہے جیسا کہ حدیث "اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ" (سب سے پہلے اللہ نے میرا نور پیدا فرمایا) میں مذکور ہے۔ (مقدمہ مثنوی معنوی دوم ص ۱۰)

روحانیت

جو شخص روحانیت میں جتنا بلند ہوتا ہے اتنا ہی وہ حُبِّ مال اور حُبِّ جاہ و اقتدار سے دور ہو جاتا ہے۔
(مولانا روم شعور حکمت و دانش ص ۹۹)

رین

رین (رنگ) سے مراد وہ زنگ ہے جو دلوں کو لگ جاتی ہے۔ کسی عالم کا قول ہے۔ کہ حجابات قلب تین قسم کے ہوتے ہیں۔

۱۔ مہر کی صورت میں اور یہ کفار کے دلوں پر لگی ہوتی ہے۔ (۲) رنگ اور قساوت کی صورت میں اس کا تعلق قلوبِ منافقین سے ہے۔ (۳) زنگ اور حجاب کی صورت میں اس کا تعلق قلوب مومنین سے ہے۔ ابن الجلاء سے پوچھا گیا کہ ان کے والد کا نام جلاء کیونکر پڑا؟ انہوں نے جواب دیا کہ ان کا نام جلا اس وجہ سے نہیں تھا کہ وہ لوہے کو صیقل کرتے تھے بلکہ اس وجہ سے کہ جب وہ قلوب پر گفتگو کرتے تھے تو ان سے گناہوں کا زنگ اتار دیتے تھے۔

سر

سرّ وجود اور عدم کے درمیان پوشیدہ ہوتا ہے۔ مگر معنوی طور پر موجود ہوتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے۔ کہ سرّ وہ ہے جسے حق تعالیٰ نے غائب رکھا ہو اور خلق اس کو نہ جان سکے۔ سرِّ خلق یہ ہے کہ اس پر حق تعالیٰ بلاواسطہ مطلع ہو۔ اور سرِّ حق پر صرف حق تعالیٰ ہی مطلع ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ سرّ السر ہوتا ہے۔ جس کا احساس سرّ بھی نہیں کر سکتا ہے۔ اگر ایسا ہو تو وہ سرّ نہیں کہلاتا ہے۔

سلوک

سلوک سے مقصود یہ ہے کہ بندہ اپنے اختیار اور کسب سے ان تعلقات کو جو حصول راہ کے لئے رکاوٹ کا باعث ہوں انہیں چھوڑ دے اور ان تعلقات میں ہر ایک کو اپنے اوپر پیش کرتا جائے اور چھوڑتا جائے اگر کسی

تعلق میں ٹھہر جائے اور اس میں اپنی دل بستگی پائے تو معلوم کرے کہ وہی تعلق اس کے لئے راہ حق میں رکاوٹ ہے پس اس کے قطع کرنے کی تدبیر کرے۔ ہمارے حضرت خواجہ قدس سرہ جب کوئی نیا کپڑا پہنتے تو فرماتے کہ یہ فلاں شخص کا حصہ ہے۔ اس کو آپ بطور رعایت پہنتے ہیں۔ (علاؤالدین عطار حضرات القدس ص ۲۲۰)

۲۔ ایک مدت میں اس کو تلاش کرتا رہا تو خود کو پاتا رہا اور اب میں خود کو تلاش کرتا ہوں تو اس کو پاتا ہوں۔ جب تو اس کو پائے گا تو خودی سے چھوٹ جائے گا اور جب چھوٹ جائے گا تو اس کو پالے گا۔ اب یہ کہنا دشوار ہے کہ ان دو باتوں میں سے کون سی بات اعلیٰ اور برتر ہے۔ یہ تو بس وہی جانتا ہے اور جب وہ نمودار ہوتا ہے تو تو نہیں ہوتا اور جب تو نہیں رہتا تو وہ ظاہر ہوتا ہے اب ان میں سے کون سی بات بڑھ کر ہے۔ یہ وہی جانتا ہے۔ (ابوسعید فراز نفحات الانس ص ۲۱۸)

آپ کو پاتا نہیں جب آپ کو پاتا ہوں میں　　خود ہی کھو جاتا ہوں یا پھر کھو دیا جاتا ہوں میں

سکر

سکر نام ہے اس حیرت و بے خود مدہوشی اور تعطل عقل کا جو مشاہدہ جمال معشوق کا نتیجہ ہو۔ اس میں غلبات وجود حق کے باعث عارف کی نظر میں ما یولم اور ما یلد کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔ (حضرت ابوالخیر محمد زبیر بزم جاناں ص ۶۵) وہ کیفیت ہے جس میں سالک کے لئے ظاہری اور باطنی احکام میں امتیاز اٹھ جاتا ہے۔ (مقدمہ مثنوی اول، ص، ۶۹)

شاہد

شاہد وہ ہے جو تمہیں وہ کچھ دکھاتا ہے جو تجھ سے غائب ہوتا ہے یعنی تیرے قلب کو اس غیب کے پانے کے لئے حاضر کرتا ہے۔ حضرت جنیدؒ شاہد کے متعلق فرماتے ہیں۔ شاہد حق تیرے ضمیر و باطن میں موجود ہے۔ اس سے باخبر ہے۔

شطح

ایسا کلام ہے جسے زبان وجد کی حالت میں بیان کرتی ہے۔ یہ کلام اپنے سرچشمے سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور دعویٰ سے قریب ہوتا ہے۔ مگر یہ کہ اس کا کہنے والا مستلب اور محفوظ ہو۔

شرب

ارواح و اسرار پاکیزہ کا وارد ہونے والے کرامات کا استقبال اور ان کرامات سے لطف نعمت حاصل کرنے کو شرب سے مشابہ قرار دیا گیا ہے کیونکہ ایسی کیفیت میں بندہ پر قرب مولیٰ کے انوار مشاہدہ ہوتے

ہیں۔تو وہ ان سے خوشی حاصل کرتا ہے۔اور نعمت کا لطف اُٹھاتا ہے۔

صاحبِ قلب ہونا

قلب میں جو علم اکٹھا ہوتا ہے۔اس کا زبان و بیاں اور فصاحت سے ظاہر نہ کرنا صاحب قلب ہونا کہلاتا ہے حضرت جنید ؒ فرمایا کرتے تھے اہل خراسان اصحاب قلب ہیں۔

صحو

صحو کے معنی ہیں ایک عارف کا غیب اور زوال احساس کے بعد احساس کی طرف لوٹنا اس مقام میں انسان تکلیف دہ اور آرام دہ اشیاء میں تمیز کر کے تکلیف دہ امور کا انتخاب کرتا ہے اور پھر اس میں موافقت حق کے باعث لذت حاصل کرتا ہے۔(حضرت ابوالخیر محمد زبیر بزم جاناں ص ۶۵) وہ حالت جس میں ظاہری اور باطنی احکام میں فرق باقی رہتا ہے(مقدمہ مثنوی مولوی معنوی اول ص ۶۵)

صفاء

صفات خلقیہ اور احساس فعل کے امتزاج سے پاک کیفیت کو صفا کہتے ہیں۔محمد بن علی ابو بکر کتانی ؒ صفاء کے بارے میں فرماتے ہیں۔صفا مذموم افعال کو زائل کر دیتا ہے۔اور صفاء الصفاء کے بارے میں بتایا کہ یہ احوال و مقامات سے گزار کر نیابت تک پہنچا دیتا ہے۔

صفاء الصفاء

حق کا حق کے ساتھ بلا علت مشاہدہ کرنے کیلئے موجودات کے اسرار کو ظاہر کرنے کا نام صفاء الصفاء ہے۔

طمس

کسی واضح شئے کے بیان کا محو ہو جانا طمس کہلاتا ہے عمر بن عثمان مکی ؒ نے فرمایا تو اس وقت تک حقیقت حق تعالیٰ تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا جب تک ان محو ہو جانے والے راستوں پر نہ چلے۔یعنی ان احوال تک نہ پہنچ جائے جن تک تمہارے علاوہ کوئی اور نہ پہنچ سکا ہو اور ان کا نشان باقی نہ ہو۔

طریقت

یہ ایک ایسی سیر ہے جو سالکین کے ساتھ مخصوص ہے یعنی قطع منازل و مقامات میں ترقی۔(تعریفات) روحانی زندگی کی ترقی کو سفر و سیر ہے۔شیخ ابونصر سراج رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب اللمع میں یہ مقامات سات قرار دیئے ہیں۔توبہ، ورع، زہد و فقر، صبر، توکل و رضا ان ہی مقامات کو یکے بعد دیگرے طے کرنا یا قطع کرنا طریقت ہے۔(شمس بریلوی، ضمیمہ، مصطلحات صوفیہ فی نفحات الانس ص ۸۵۶) شریعت طریقت اور حقیقت کا عنوان بھی

پڑھیے۔اس کی مزید تفصیل اس کتاب میں طریقت کے باب میں دیکھیے۔

عین

عین اشارہ ہے اس شئے کی ذات کی طرف جس سے اشیاء ظاہر ہوں۔حضرت جنید ؒ کا بیان ہے کہ حضرت ابو یزید بسطامیؒ کے حالات و واقعات اس باب کا پتہ دیتے ہیں کہ وہ عین الجمع تک رسائی حاصل کر چکے تھے اور عین الجمع اسماء توحید میں سے ایک اسم ہے جس کی اپنی خصوصیات ہیں جن سے اس پر فائز صوفیہ ہی باخبر ہوتے ہیں۔

عالمِ امر

عالم امر عرش سے اوپر ہے یہ عالمِ شکل وصورت جسم وجسمانیت سے منزہ ہے۔یہ عالمِ مجرد امر کُن سے یکدم ظاہر ہو گیا وہاں نہ بتدریج ہے نہ تقدیم وتاخیر (مولانا رکن الدین الورٰیؒ آداب سالک ص ۱۹)

عالمِ ملکوت

عالمِ غیب وعالمِ الارواح کو کہتے ہیں جو بغیر مادہ اور مدت کے واسطہ سے ظہور وجود میں آیا۔
(شمس بریلویؒ، ضمیمہ، مصطلحات صوفیہ فی نفحات الانس ص ۸۵۵)

عالمِ جبروت

جہاں شوق، ذوق، محبت، اشتیاق، طلب، وجد، سکر، صحو، مجد (بزرگی، عظمت) اور محو (کھو جانا یا عادات بشری کے اٹھنے) کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔

عالمِ خلق

عالم خلق فرش سے عرش تک ہے۔یہ عالم شکل وصورت میں جسم وجسمانیت رکھتا ہے۔اسکی خلقت میں بتدریج و باہمی تقدیم وتاخیر ہے (مولانا رکن الدین الورٰیؒ آداب سالک ص ۱۹) یہ دنیا کہلاتی ہے جہاں اشیاء اپنے مادہ اور مقدار کے ساتھ موجود ہیں۔(مقدمہ مثنوی مولوی معنوی اول ص ۲۵)

عالمِ لاہوت

جو لامکاں میں شامل ہے جہاں نہ گفتگو ہے اور نہ جستجو۔

عالمِ مثال

وہ عالم ہے جو خلق سے بالا ہے وہاں اشیاء میں مقدار تو ہے مادہ نہیں ہے۔(مقدمہ مثنوی مولوی معنوی

اول ص ۲۵)

عالمِ ملکوت

جہاں اس کے افعال تسبیح، تہلیل، قیام، رکوع، اور سجود ہیں۔

عالمِ ناسوت

حیوانات اور نفس کی دنیا ہے۔ حواس خمسہ سے افعال صادر ہوتے ہیں۔

عقد

عقد کا تعلق باطن سے ہے اور یہ اس عہد کو کہتے ہیں۔ جو بندہ اپنے قلب میں اپنے رب اور اپنے درمیان ٹھہراتا ہے کہ وہ فلاں کام کرے گا اور فلاں کام نہیں کرے گا۔

علمِ حقائق

وہ علم ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو اس علم کو دوسرے علوم سے عام، خاص کی نسبت ہے اس کا موضوع کسی حد معین پر محدود نہیں ہو سکتا۔ بلکہ تمام علوم کا موضوع اس کا موضوع ہے اسی کا نام علم حکمت ہے۔

غیبت

حضورِ حق و مشاہدہ حق میں مشغول رہتے ہوئے قلب کا خلق کے مشاہدے سے اس طرح دور رہنا کہ بندے کے ظاہر میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو غیبت کہلاتا ہے۔

غین

غین (بادل تیرگی) کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا۔ رسول اللہ ﷺ سے ایک روایت اس ضمن میں مروی ہے جو کہ ضعیف ہے۔ روایت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا البتہ میرے دل پر بادل چھا جاتے ہیں تو میں اللہ سے استغفار کرتا ہوں اور دن میں ستر بار اس کے حضور توبہ کرتا ہوں۔ شارحین حدیث فرماتے ہیں کہ بادل جو رسول اللہ ﷺ کے قلب اطہر پر چھا جاتا تھا اس کی مثال اس آئینہ کی سی ہے جس پر دیکھنے والے کی سانس سے بادل سا چھا جاتا ہے۔ اور تھوڑی دیر بعد وہ بادل چھٹ کر آئینہ پھر سے صاف اور روشن ہو جاتا ہے۔ بعض صوفیہ کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ نبی کریم ﷺ کا قلب اطہر اس طرح کے کسی غلبہ حق سے متاثر ہو کیونکہ نبی کریم ﷺ کا قلب مقدس رویت سے مخصوص ہے۔

فکر

تصور عقلی سے مقصود اصلی کی طرف بڑھنا۔

فقر

اِسمٌ وَّاقِعٌ فَاِذَا تَمَّ فَهُوَ اللّٰهُ وہ ایک نام ہے جب وہ کمال پر پہنچ کر تمام ہو گیا تو وہی اللہ ہے (شیخ عبد اللہ دونی نفحات الانس ص ۴۲۱) فقر صرف غنا کے فقدان ہی کو نہیں کہتے بلکہ غنا سے رغبت اور اس کی طرف میلان کے فقدان کا نام ہے۔ یعنی صوفی کے قلب کو آرزو سے تہی ہونا چاہیے۔ اس کا ہاتھ بھی متاعِ دنیا سے اس طرح خالی ہونا چاہیے۔ جس طرح دل خالی ہے۔ اسی بناء پر کہا گیا ہے۔ اَلْفَقْرُ هُوَ الْفَاقِدُ لِلْاَشْيَاءِ (فقیر وہ ہے جو اشیاء کو ہاتھ سے دے چکا ہو) شیخ ابو عبد اللہ خفیف قدس سرہ فرماتے ہیں۔ اَلْفَقْرُ عَدَمُ الْاَمْلَاکِ وَالْخُرُوْجُ عَنْ اَحْكَامِ الصِّفَاتِ (املاک کا نہ ہونا اور احکام صفات سے نکل جانا فقر ہے) شیخ ابو العباس نہاوندیؒ فرماتے ہیں (الفقر بدایۃ التصوف) فقر تصوف کا آغاز اور پہل ہے۔) شیخ ابراہیم بن احمد اطفواص قدس سرہ فرماتے ہیں فقر شرفا کی چادر، مرسلین کا لباس، صالحین کی زینت، متقین کا زیور عارفین کا مال غنیمت اور مریدین کی آرزو ہے۔ (شمس بریلوی، ضمیمہ مصطلحات صوفیہ فی نفحات الانس ص ۸۵۷)

فقیر

کوئی شخص اس وقت تک فقیر نہیں بن سکتا جب تک اس کی نظر میں سونے کی ڈلی اور مٹی کا ڈھیلا برابر نہ ہو جائیں (متفرق شعور حکمت ودانش ص ۳۲۹) فقیر وہ نہیں جس کا ہاتھ دنیوی ساز وسامان سے خالی ہو بلکہ فقیر وہ ہے جس کی طبیعت مراد سے خالی ہو (متفرق شعور حکمت ودانش ص ۳۳۱) فقیر وہ ہے کہ خدا سے اس کو کوئی حاجت نہ ہو (خدا سے اس لئے حاجت نہیں ہوتی کہ اس کی تمام تر حاجت وہی ہے اور بس اس کے سوا کچھ اور نہیں) شیخ مظفر کرمانشاہی نفحات الانس ص ۲۰۶) لَوْ لَعِبَ الْفَقِيْرُ عِشْرِيْنَ سَنَةً ثُمَّ صَدَقَ سَاعَةً لَنَجَا (یعنی فقیر اگر بیس سال تک لعب میں رہے پھر وہ ایک گھڑی سچ بولے تو اس نے نجات پائی۔ لعب سے مراد ہرگز نہیں بلکہ یقین کی کمی ہے اور سچ سے مراد یقین کامل ہے۔ (شیخ ابو الحسینؒ سیروانی صغیر نفحات الانس ص ۲۶۸) فقیر معزز ہوتا ہے (شیخ ابو منصور معمر بن احمد اصفہانی نفحات الانس ص ۴۷۹) فقیر میں یہ چار آداب ہونے ضروری ہیں۔ چھوٹوں پر رحم کرنا، بڑوں کی عزت کرنا، اپنے نفس سے انصاف چاہنا اور اپنے لئے انصاف کو چھوڑ دینا۔ (شیخ ابو الحسن شاذلی نفحات الانس ص ۷۶۸)

فنا

فنایت عدم شعور کو کہتے ہیں کہ ذات احد میں اس درجہ استغراق ہو کہ اپنا بھی ہوش نہ رہے۔ایک عالم بے خودی ہو جس میں اپنی خودی کا بھی ہوش نہ رہے۔

ہستی من رفت و خیالش بماند   ایں کہ تو بینی نہ منم بلکہ اوست (امیر خسرو)

جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تجلی رب کے وقت بے خودی و بیہوشی میں مقام فنا حاصل ہوا اور اگر اس ہوش نہ رہنے کا بھی ہوش نہ رہے تو اس کو فنا الفناء کہتے ہیں۔فنا کی تین قسمیں ہیں۔فنائے افعالی فنائے صفائی اور فنائے ذاتی۔(حضرت ابوالخیر محمد زبیر بزم جاناں ص ۶۵)

فَلَمْ تَهو نِیْ مَالَمْ تَکُنْ فِیْ فَانِیا   وَلَمْ تُغْنِ مَالَمْ یَخْلِیْ جَنّکَ صُوْرَتِیْ

(تم ۔ نب مجھ میں فنا نہ ہو گے میرے عاشق نہیں ہو اور جب تک میری صورت تم میں جلوہ گر نہ ہو گی فنا نہ ہو گ شیخ برہان الدین ابراہیم جعیری، نفحات الانس ص ۷۴۰)

ساف مذمومہ کا اپنی ذات سے نکال دینا اوصاف پسندیدہ کا وجود بقاء ہے۔فنا دو قسم کی ہے ایک تو یہی جس کا بیان کیا گیا۔کثرت ریاضت سے حاصل ہو جاتی ہے۔اور دوسری قسم کی فنا یہ ہے کہ عالم ملکوت کا احساس باقی نہ رہے۔یہ وہ مقام ہے جہاں فرد عظمت الٰہی اور مشاہدہ حق میں مستغرق ہو جاتا ہے۔مشائخ کے یہاں اسی قسم کی فنا معرض بحث میں آتی ہے(شمس بریلوی، ضمیمہ مصطلحات صوفیہ فی نفحات الانس ص ۸۵۸)

فناء اتم

وجود فنا: لا یعرف اللہ الا اللہ (اللہ تعالیٰ کو اللہ تعالیٰ پہچانتا ہے) کے مقام میں ہے اس فنا کو فنا اتم و اکمل کہتے ہیں۔جناب ارشاد ماب مخدومی و قبلہ گاہی مولانا خواجگی قدس سرہ فناء اتم کے بارے میں بیت پڑھا کرتے تھے۔

مدح و مذمت گر تفاوت می کند   بت گری باشی کہ او بُت می کند

(تعریف اور برائی میں جس کو فرق معلوم ہوتا ہو وہ بت بنانے والا خود بت پرست ہے۔)

نیز فرمایا کرتے تھے کہ جب تعریف اور مذمت کی تاثیر اس توجہ اور شگفتگی میں مزاحم نہ ہو تو جو حق تعالیٰ کی بارگاہ میں سالک ہوتی ہے تو اس وقت فنا اتم حاصل ہوتی ہے اس بیان سے خواجہ بزرگ قدس سرہ کے اس کلام کے معنی معلوم ہو جاتے ہیں۔جو آپ نے فرمایا کہ وجود عدم وجود بشریت کی طرف لوٹ آتا ہے۔لیکن وجود فنا ہرگز نہیں لوٹتا۔(خواجہ باقی باللہ حضرت القدس ص ۲۸۰)

فنا اور بقا

فنا سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تک اس کی سیر انتہائی ہوتی ہے اور بقا سے مراد کہ خدا کی ذات میں سیر کی ابتداء ہے۔ خداوند تعالیٰ تک سیر اس وقت پوری ہوتی ہے کہ انسان اپنے وجود کی وسعتوں کو صدق کے قدم سے ایک دم قطع کر لے اور سیر فی اللہ اس وقت ثابت ہوتی ہے کہ فنائے مطلق کے بعد بندے کو ایک ایسا وجود عطا ہو جائے جو حدوث کی آلودگی سے پاک اور منزہ ہو اور پھر وہ اس وجود سے عالم صفات میں صفات الٰہیہ اور اخلاق ربانی کے ساتھ ترقی کرتا رہے۔ (عبدالرحمٰن جامی نفحات الانس ص ۱۳۲)

فنا اور فناء فنا

اگر ملکوت و ملک طالب سے چھپ جائے اور وہ سب کو بھول جائے تو یہ مرتبہ فنا کا ہے اور اگر سالک کی ہستی بھی سالک سے پوشیدہ ہو جائے تو یہ مرتبہ فناءِ فنا کا ہے۔ (علاؤالدین عطار حضرات القدس ص ۲۱۹)

قبض و بسط

قبض و بسط دو بلند احوال ہیں جو اہل معرفت ہی کا حصہ ہیں جب اللہ تعالیٰ انہیں حالت قبض میں مبتلا فرماتا ہے تو مباح اشیاء گفتگو اور کھانے پینے کے اختیار کرنے سے متنفر کر دیتا ہے۔ اور جب انہیں حالت بسط کی طرف لوٹاتا ہے تو پھر اسے انہیں سب مباحات کے اختیار کرنے کی طرف لے آتا ہے۔ اور ان میں ان کی حفاظت بھی فرماتا ہے۔ الغرض قبض حال ہے فقط عارف کا۔

مکاشفہ

اس میں علم سے بذریعہ بیان وتشریح کام لیا جاتا ہے اس سے اصحاب العلوم کی رسائی عین الیقین تک ہوتی ہے۔

مکاشفہ ایسی حضوری ہے جو احاطہ بیان میں نہیں آسکتی۔ مراد مکاشفہ سے شواہد مشاہدات میں حضور قلب ہے۔ مکاشفہ کی علامت عظمت الٰہی کی کنہ میں تحیر ودوام ہے۔ مکاشفہ میں عارف جلال الٰہی میں متحیر ہوتا ہے۔ (حضرت ہجویری، ضمیمہ مصطلحات صوفیہ فی نفحات الانس ص ۸۶۱)

مکاشفہ خفی

اس کشف کے ذریعہ عالم صفات خداوندی میں سالک کو راستہ ملتا ہے۔

مکاشفہ ذاتی

یہ مکاشفہ بہت مشکل ہے اور اس میں اشیاء کی حقیقت ظاہر کر دی جاتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ذاتی جلووں

کو برداشت کی حد تک ظاہر کیا جاتا ہے۔ کیونکہ امت محمدیہ ﷺ کو آپ ﷺ کے طفیل ان جلووں سے مخصوص کیا گیا ہے۔

مکاشفہ روحانی

اس میں بہشت دوزخ، پل صراط، اور دیگر عوالم کی حقیقت کھل جاتی ہے۔

نفس

صوفیہ کی اصطلاح میں نفس وہ ہے جو سوزش قلب وفرحت وسکون بخش دے کسی شیخ" کا قول ہے نفس اللہ کی جانب سے چلنے والی بادِنسیم ہے جو باعث راحت اور اللہ کی آگ پر غالب آجاتی ہے اور یہی مفہوم تنفس کا بھی ہے۔

وجد

وجد قلوب پر بلاارادہ صفاء ذکر کے ذریعے طاری ہونے والی کیفیت کو کہتے جو پہلے مفقود ہوتی ہے۔

وصل

وصل کا مفہوم ہے غائب سے لاحق ہو جانا ابو بکر شبلیؒ کا قول ہے۔ جس نے یہ خیال کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ تک پہنچا ہوا ہے اس کو کچھ حاصل نہیں ہوا۔

وارد

خواطہ محمودہ جو چیز از قسم معانی دل بلاکوشش صادر ہو۔

ہجوم وغلبات

ہجوم وغلبات باہم قریب المعنی ہیں ہجوم صاحب غلبات کا فعل ہے یہ اس وقت واقع ہوتا ہے جب قوت رغبت ہو اور خواہشات واسباب نفس کا اس میں کوئی دخل نہ ہو۔ اگر ایسے میں طالب کو مطلوب تک پہنچنے کے کچھ مزید آثار معلوم ہو جائیں تو چاہے درمیان میں سمندر ہو یا کوئی چٹیل میدان ہو وہ اسے غلبات ارادہ قوت طلب رکھتے ہوئے عبور کرے گا اگر اسے آگ بھی راستے میں حائل دکھائی دے گی تو وہ جان وروح کی پرواہ کئے بغیر اس میں کود پڑے گا۔ چاہے اس میں وہ مطلوب تک پہنچے یا نہ پہنچے جس میں سوائے معرفت حق تعالیٰ کے کسی اور شئی کو کوئی دخل نہیں اور بسط بھی عارف کا حال ہوتا ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ کشادگی عطا فرمائی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی اس کی حفاظت فرماتا ہے۔ اس لئے خلق ان سے سیکھتی ہے۔

کشف

جو چیز فہم سے پوشیدہ ہو اور اسے بندے پر اس طرح ظاہر کر دیا جائے کہ جیسے عینی مشاہدہ ہو کشف کہلاتا ہے۔ ابو محمد حریریؒ نے فرمایا جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کو تقوی و توجہ سے نہ نبھایا وہ کشف مشاہدہ سے دور رہا۔

لوائح

لوائح وہ انوار ذاتیہ ہیں جو باطن پر چمکتے ہیں تا کہ سالک کی بلندی میں اضافہ ہو اور ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔ حضرت جنیدؒ نے فرمایا وہ لوگ کامیاب رہے جنہیں مختصر راستے کی طرف رہنمائی کی گئی اور وہ سرگوشی کرنے سے قریب تر ہو گئے جس کے ذریعے انہوں نے فہم خطاب کو سمجھنے میں تیزی حاصل کر لی۔

لوامع

اس اصطلاح کا معنی لواح سے قریب ہے لوامع دراصل لوا قع (برق) یعنی بجلی کے بار بار چمکنے سے ماخوذ ہے کہ جب بادلوں میں بجلی چمکتی ہے تو پیاسا سمجھتا ہے کہ بارش ہوگی۔ عمرو بن عثمان مکیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے خالص و پاکیزہ خیال میں اس طرح ورود فرماتا ہے۔ کہ جیسے بجلی یکے بعد دیگرے چمکتی ہے اور اس طرح وہ اپنے اولیاء کے قلوب کے لئے معرفت کی یہ روشنیاں دکھاتا ہے تا کہ قلوب ایمان بالغیب رکھتے ہوئے اصل کے متعلق کوئی خیال نہ باندھیں اور یہ معرفت کی بجلیوں کی چمک اس قدر زیادہ ہو جاتی ہے کہ نفس اس نور کا توہم کر ہی نہیں سکتا۔ اگر وہ اس کا توہم کرے تو یہ سلسلہ فوراً منقطع ہو جاتا ہے۔

لطائفِ ستہ: (چھ لطیفے)

یہ جسم انسانی میں چھ ایسے مواضع ہیں جن پر فیوض اور انوار و برکات الٰہیہ کا نزول ہوتا رہتا ہے وہ چھ لطائف یہ ہیں۔ قلب، روح، سر، خفی اخفی، امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے نزدیک انسان کا وجود مرکب ہے دو عالم کے اجزاء سے (یعنی عالم خلق اور عالم امر) جسمِ انسانی جو ظاہر ہے وہ تو مرکب ہے عالم خلق کے اجزا یعنی اربعہ عناصر اور نفس سے اور باطن اس کا مرکب ہے عالم امر کے ان پانچ لطائف سے قلب روح سر، خفی یہ جسم انسانی کے سینہ کے اندرون لطائف عالمِ امر کے مختلف مقامات ہیں اور یہ لطائف انوار سے منور اور مختلف انبیاء کے زیر قدم ہیں (حضرت ابوالخیر محمد زبیر بزم جاناں ص ۶۳)

لطائفِ عشرہ: (دس لطیفے)

صوفیاء کے نزدیک انسان کی ترکیب دس جزوں سے ہے جن کو وہ لطائف عشرہ کہتے ہیں۔ پانچ کا تعلق عالم ملکوت سے ہے اور یہ ہیں قلب، روح، سر، خفی، اخفی اور پانچ کا تعلق عالم ناسوت سے ہے اور وہ یہ ہیں نفس، آگ، پانی، مٹی، ہوا، مکمل مومن وہ ہے جس کے یہ دسوں اجزا ذکر الٰہی میں منہمک رہیں۔

(مقدمہ مثنوی ملوی معنوی چہارم ص ۷)

مراد

ایسا عارف جس کا اپنا کوئی ارادہ باقی نہ رہے اور وہ اشیاء تک پہنچ گیا ہو اس نے تمام احوال و مقامات اور مقاصد واردات طے کر لئے ہوں وہ مراد کہلاتا ہے۔ اس سے وہی کچھ چاہا جاتا ہے۔ جو کچھ اللہ چاہتا ہے اور وہ خود جو کچھ ارادہ کرتا ہے وہ ارادہ خداوندی ہوتا ہے۔

مرید

جس بندے کی ابتداء صحیح ثابت ہو چکی ہو اور وہ سیر الی اللہ کرنے والوں کے زمرے میں اسم کے ساتھ شامل ہو گیا۔ قلوب صادقین اس کے ارادے کے صحت کی گواہی دیں اور اس کے بعد وہ حال و مقام پر دھیان نہیں دیتا بلکہ وہ اپنے سفر وصل میں اپنے ارادے کی پاکیزگی کے ساتھ رواں دواں رہتا ہے۔

مقام

مقام کی یہ خصوصیت ہے کہ بندہ اپنے مخصوص احوال میں اس پر فائز ہوتا رہے۔ جیسے مقام صابرین و متوکلین جو بندے کا ظاہری مقام و باطنی مقام ہے اس کے مجاہدات و معاملات اور ارادات کے مطابق جب بندہ کسی حال میں مکمل ہو تو وہی اس کا مقام ہوتا ہے جس سے وہ اگلے مقام کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔

مبتدی

سیر الی اللہ کرنے والوں کے راستوں کو پوری قوت عزم کے ساتھ طے کرنے کے عمل کو شروع کرنے والے کو مبتدی کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ ان راستوں کے آداب کو بھی ملحوظ رکھتا ہے اور خدمت و تسلیم کے جذبے کے ساتھ ان راستوں کے آغاز و انجام سے خبر رکھنے والے سے سیکھنے کے لئے خود کو وقف کر دیتا ہے۔

موجود اور مفقود

موجود اور مفقود دو متضاد اسم ہیں موجود وہ ہے جو عالم عدم سے عالم وجود میں آیا اور مفقود وہ ہے جو عالم وجود سے عالمِ عدم میں آیا۔ ذوالنون مصریؒ نے فرمایا مفقود کا غم نہ کر کیونکہ کوئی موجود بندہ اس کا ذکر کرتا ہی رہتا ہے۔

معدوم

جس کا نہ کوئی وجود ہو اور نہ ہی ممکن ہو اگر تو کوئی چیز کھو بیٹھے جس کا وجود ممکن ہو تو وہ چیز مفقود کہلائے گی معدوم نہیں کسی عارف کا قول ہے عالم عدم کے کناروں کے درمیان موجود ہے پہلے بھی معدوم تھا اور آخر کار وہ پھر معدوم ہو جائے گا۔ عارف اس کے عدم کا مشاہدہ کرتا ہے اور ایسے میں وہ معرفت خالق کو پالیتا ہے۔

محادثہ

بندے اور خدا کا باہم ہمکلام ہونا صدیقین کا وصف ہے۔ ابو بکر واسطیؒ سے صدیقین کے آخری مقام کے بلند ترین حال کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمانے لگے وہ طلوع ہونے والے اور اللہ سے ہمکلامی کے شرف سے مشرف ہوتے ہیں۔ سید الکونین ﷺ کا ارشاد مبارک ہے بے شک میری امت وہ بھی ہے جن سے اللہ تعالیٰ ہمکلام ہوتا ہے۔

مناجاۃ

وہ رازدارانہ گفتگو جو بندے اور خالق کے درمیان خلوص ذکر کے ساتھ ہوتا ہے۔

مسامرہ

بندے کو پوشیدہ طور پر اسرار غیبی کے بارے میں جو خطاب ہوتا ہے اسے مسامرہ کہتے ہیں۔

مکان

یہ اہل کمال واستقامت اور تصوف میں منتہی صوفیہ کا حصہ ہے۔ جب بندہ اپنے احوال میں کامل ہو جاتا ہے تو اسے ایک مستقل مکان عطا کر دیا جاتا ہے کیونکہ اس نے احوال و مقامات طے کر لیئے ہوتے ہیں لہٰذا وہ بالآخر صاحب مکان ہو جاتا ہے۔

مشہود

جو کچھ شاہد دیکھتا ہے وہ مشہود ہے۔ ابو بکر واسطیؒ فرماتے ہیں کہ شاہد حق ہے اور مشہود کائنات ہے۔

مراقبہ

دل کے ماسوا سے نگہبانی، دل میں مفقود کے تصور کی محافظت کرنا بندہ کا اپنے علم کو بغرض فیضان علم قدسی حق تعالیٰ کی جانب رجوع کرنا۔

محو

کسی شئے کا اس طرح فنا ہو جانا کہ اس کا کوئی نشان باقی نہ رہے محو کہلاتا ہے۔

مشاہدہ

قدرت حق کی نشانیاں دیکھ کر قلب میں حضورِ حق کا پیدا ہونا اور باہم قریب آنے کا نام مشاہدہ ہے مکاشفہ اور مشاہدہ دونوں معنی میں ایک دوسرے سے قریب ہیں مگر کشف معنی کے اعتبار سے زیادہ مکمل ہے۔

مستی

حیرت وولولہ جو سالک صاحبِ شہود کو جمالِ دوست میں پیدا ہو۔

وقوف زمانی

اپنے آپ کو ہمیشہ زمانہ گزشتہ کی غفلت نسیان کے سبب شرمندہ کرتا ہے۔

(ملاحسین اخبار نقشبندی معمولات حضرات نقشبندیہ ص ۱۹)

وقوف عددی

اپنی حالت کی طرف نگاہ کرے اور دیکھے کہ حالات میں ترقی ہوئی ہے یا نہیں۔ اگر ہوئی ہے تو خداوند تعالیٰ کا مشکور ہو اور اگر نہیں ہوئی تو اپنا ماتم کرے (ملاحسین نقشبندی، معمولات حضرات نقشبندیہ ص ۱۹)

وقوف قلبی

نفس کو پاک کرنے، دل کو صاف کرنے اور روح کو جلا دینے میں ہر روز زیادہ کوشش کرے۔

(ملاحسین نقشبندی، معمولات حضرات نقشبندیہ ص ۲۰)

علامہ اقبالؒ کے نظریات

اُوپر لکھے گئے تمام اصطلاحات پر علامہؒ کا کافی کلام موجود ہے مگر اس کا اس جگہ بیان کرنا ممکن نہیں، علم ہی کو اگر لیجئے تو آپ نے قرآن اور حدیث کے ذریعے فلسفی انداز میں علم کو بیان کیا ہے، آپ کا مشہور کلام وہ ہے کہ جس میں حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہونے والی وحی کو آپ نے شعری زبان میں بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو وحی کی کہ علم، عزت اور حکومت میں سے جو چیزیں چاہتے ہو مانگ لو۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے علم کو سب چیزوں پر ترجیح دی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم عطا فرمایا اور اس کے ذریعے آپ کو دولت بھی ملی اور حکومت مل گئی۔ علامہ اقبالؒ نے لکھا ہے کہ

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوزِ جگر ہے علم ہے سوزِ دماغ
علم میں دولت بھی ہے، قدرت بھی ہے لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ
اہل دانش عام ہیں، کمیاب ہیں اہلِ نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ!
شیخِ مکتب کے طریقوں سے کشادِ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

(ض۔ک:۱۴۵)

توجہ، طریقت، ذکر، نفس، عشق اور مستی، استغراق، ابتلاء، اخلاص، تجلی، بقاء، وجد، واجد اور جذبہ، حال ومقام، حیرت، حضور، خلافت، دوام آگہی، ذوق، روح، ریاضت، روحانیت، سلوک، سکر، شاہد، صفاء، قلب پر آپ کا کافی کلام ہے مگر ان سب کی تفصیل بیان کرنے کے لئے پوری ایک کتاب کی ضخامت درکار ہے۔ فقر اور تصوف پر تو علامہ کا بہت سا کلام زیرِ نظر کتاب میں لکھا جا چکا ہے وصل پر علامہ کا کافی کلام ہماری تصنیف ''رابطۂ شیخ'' میں لکھا جا چکا ہے۔ طوالت کی وجہ سے ہر اصطلاح پر کلام لکھنا ضروری نہیں سمجھا جاتا ہے۔

باب ۵۰

خلافت اور خرقہ پوشی

خرقہ پوشی

صوفیاء کا شعار کمبل پوشی ہے اور یہ کمبل پوشی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

عَلَيْكُمْ بِلُبْسِ الصُّوْفِ تَجِدُوْنَ حَلَاوَةَ الْإِيْمَانِ فِيْ قُلُوْبِكُمْ

اون کا کپڑا پہنا کرو' ایمان کی لذت اپنے دلوں میں پاؤ گے۔

(کنز العمال حدیث۔ ۴۱۱۱۳)

ایک حدیث شریف میں ہے۔

كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ يَلْبِسُ الصُّوْفَ وَيَرْكَبُ الْحِمَارَ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صوف کا کپڑا پہنتے تھے اور گدھے کی سواری فرماتے تھے۔

(الوفا ص۔ ۵۷۰)

پیوند لگانے کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پسند فرمایا۔ حضرت عائشہ سے فرمایا۔

لَا تُضِيْعِي الثَّوْبَ حَتّٰى تَرْقَعِيْهِ

عائشہ! کپڑا ضائع نہ کیا کرو' پیوند لگالیا کرو۔

امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بعض اوقات ایسا کپڑا پہنتے کہ اس پر تیس تیس پیوند لگے ہوتے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے ایسے ستر بدری صحابہ کرام کی زیارت کی جو سب صوف کا لباس پہنتے تھے اور فرمایا کہ میں نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی زیارت کی' وہ ایک کمبل اوڑھے ہوئے تھے جو پیوند زدہ تھا۔ حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت ہرم بن حیان رضی اللہ عنہم نے اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ وہ صوف کا لباس پہنے ہوئے تھے۔

تاریخ مشائخ تصنیف محمد بن علی حکیم ترمذی میں ہے کہ ابتدا میں حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پشمینہ کی پوشاک استعمال فرماتے تھے۔ روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ نے ہمیشہ اپنا لباس صوف کا رکھا، غرضیکہ صوف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صحابہ کرامؓ اور اولیاء اللہ کا لباس رہا ہے۔ لہٰذا صوفیوں کو چاہیے کہ یہ لباس اختیار کریں کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ (ابوداؤد، ج۔۲)　جو کسی قوم سے مشابہت اختیار کرتا ہے، اسی قوم سے شمار ہوتا ہے۔

جو لوگ صوفیہ کی وضع اختیار کرتے ہیں، ان کی چار قسمیں ہیں۔

(۱) ایک وہ جن کا مقصود صوفیہ کی طرح باطن کی صفائی' اخلاق کی درستگی اور محققین صوفیہ کی صحبت میں رہ کر راہ طریقت میں حصول تقرب ہوتا ہے۔

(۲) دوسرے وہ لوگ جو صوفیاء کی نقل اس لیے کرتے ہیں کہ انہی کی طرح بن جائیں اور ان کی ظاہری اتباع باطنی اتباع کا پیش خیمہ بنے' یہ مجاہدہ کی راہ ہے۔

(۳) تیسرے وہ لوگ جن کا مقصود صوفیہ کا لباس اختیار کر کے ان میں گھل مل جانا ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ لوگ بھی صوفیہ جیسا اخلاق پیدا کر لیتے ہیں، بڑوں کی عزت کرتے ہیں، چھوٹوں پر شفقت کرتے ہیں۔ طلب مال اور طلب جاہ سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔

(۴) چوتھے وہ لوگ جو نفس پرستی، طلب عزت، اور طلب ریاست کی خاطر صوفیہ کی وضع اختیار کرتے ہیں۔ یہ لوگوں کو دکھانے کے لئے کم گوئی اور تنہائی اختیار کرتے ہیں' حالانکہ ان کا باطن حرص و ہوس میں گرفتار ہوتا ہے۔ اس قسم کے لوگوں کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ ان کی بھی اسی طرح عزت ہو' جس طرح محققین صوفیہ کی ہوتی ہے۔ یہ خرقہ ''جامہ مکر'' ہے، اور لباس ''غرور و تکبر'' ہے۔ قیامت کے دن یہ خرقہ ان کے لئے موجب حسرت و ندامت ہوگا۔

اس زمانے میں ایسے گروہ بہت ہیں۔ لہٰذا تم پر لازم ہے کہ جو کام تم سے نہ ہو سکے' اس کا ارادہ نہ کرو۔ اگر تم ہزار بار اعلان کرو کہ تم صوفی ہو' صوفی نہیں بن سکتے جب تک صوفیہ جیسا اخلاق اور شریعت کی کامل تابعداری تمہارے اندر موجود نہ ہو۔ طریقت خرقہ پوشی سے حاصل نہیں ہوتی۔ حرقت یعنی آتش عشق میں جلنے کا نام طریقت ہے۔ جسے طریقت سے آشنائی حاصل ہوگئی' وہ جو لباس بھی پہنے اس کے لئے روا ہے۔ اگر بغیر آشنائی طریقت مرقع صوف پہنا تو یہ لباس اس کے لئے مرقع ادبار و شقاوت ثابت ہوگا۔

کسی بزرگ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ خرقہ کیوں نہیں پہنتے؟ انہوں نے جواب دیا: اگر جواں مرد نہ ہو اور جوانمردوں کا لباس پہنے تو یہ منافقت ہے، کہ ان کی طرح بوجھ اٹھا نہ سکے اور جواں بنا پھرے۔ طالب دنیا اس خرقہ کو طلب دنیا کا ذریعہ بناتے ہیں اور اس کے ذریعے عزت و مال کماتے ہیں' مگر ایسی عزت بلا ہے۔ ارباب صفا جب خرقہ پہنتے ہیں تو علائق دنیوی سے ان کا دل علیحدہ ہو جاتا ہے۔ ان کے لیے یہ خرقہ ازدیاد نور کا باعث بنتا ہے اور نااہل کے لیے ازدیاد ظلمت کا۔ مختصر یہ کہ اسی خرقہ کے ذریعے کوئی دنیا سے آزادی حاصل کرتا ہے اور کوئی محنت و مشقت سے آزاد ہو کر دنیا کماتا ہے۔

حضرت ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

لازم ہے کہ اپنا باطن درست کرے اور تحقیق کی طلب میں سرگرداں ہو۔ رسوم ظاہری سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اس لئے کہ جو شخص ظاہری رسوم کا پیروکار ہوگا، وہ ہرگز ہرگز تحقیق کے درجے تک نہیں پہنچ سکتا۔ یاد رکھو کہ آدمی کا اپنا وجود خود اللہ تعالیٰ کی راہ میں حجاب ہے اور یہ حجاب اس وقت تک دور نہیں ہو سکتا جب تک حال وکیفیت نہ بدلے اور فنائیت کی منزلیں طے نہ ہوں۔ جو آدمی اپنے ظاہر کے سنوارنے میں لگا رہا، وہ بھلا فنافی الصفت کیسے ہو سکتا ہے؟

خرقہ کے آداب

خرقہ پوشی کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ خرقہ اس لیے بنائے کہ لباس کے بوجھ سے فارغ ہو جائے اور قسم قسم کے لباسوں کے جھنجھٹ سے نجات پا جائے اور گملی جب تک رہے، اس کا پیوند لگاتا رہے۔ پیوند سے مراد صوفی کا وہ حال ہے جو بحالت کیف و وجد اس پر طاری ہو اور صوفی اپنی روح کی آواز سنے نہ کہ عقل کی۔

خرقہ پوشی کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کی زیب و زینت سے مستغنی ہو جائے۔ اپنے فقر میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچا رابطہ رکھے۔ حضرت ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ خود میرے شیخ طریقت (حضرت ابوالفضل الختلیؒ) نے ایک خرقہ ۵۶ چھپن سال تک زیب تن کیے رکھا، جہاں سے پھٹتا، بے ترتیبی کے ساتھ اس پر پیوند چپکاتے رہتے۔

حضرت ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

اب اکثر مشائخ نے خرقہ پوشی ترک کر دی ہے اس کی دو وجہیں ہیں۔

(۱) ایک تو یہ کہ اب پشم مشکوک ہو گئی ہے کیونکہ پشم فروش اکثر لوگوں کی بھیڑوں کے بدن سے چوری اون اتار لیتے ہیں۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ نوخیز بدعتیوں نے اس لباس کو اپنا شعار بنا لیا ہے اور بدعتیوں کے کسی شعار کے خلاف کرنا اچھا ہے خواہ وہ سنت کے خلاف ہو۔

حضرت ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ''ایک جماعت لباس کو اتنی اہمیت نہیں دیتی۔ جس وقت جیسا لباس میسر آیا، پہن لیا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے عبا قبا پہنائی تو پہن لی، اگر پھٹا پرانا پیراہن دیا تو اسے بھی قبول کر لیا۔'' مجھے یہی طرز پسند ہے اور میں نے اپنے لئے اسی طریقے کو اختیار کیا ہے۔ ہمارے زمانے میں غزنی میں ایک بزرگ موید لقب ہیں، ان کا بھی یہ طریقہ ہے کہ ملبوسات میں کوئی تمیز و تخصیص نہیں ہے۔ مشائخ میں سے جو لوگ اپنا لباس نیلا رکھتے ہیں، اس کی تین وجوہ ہیں۔

(۱) یہ لوگ اکثر سیاحت میں رہتے ہیں اور نیلا لباس جلد میلا نہیں ہوتا۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ اکثر عوام سفید لباس کو پسند کرتے ہیں اور وہ عوام کی محبوب ترین چیز سے پرہیز کرتے ہیں۔

(۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ نیلگوں رنگ اصحاب غم واندوہ کا رنگ ہے چونکہ اصحاب ارادت اپنی دنیوی زندگی میں سوائے غم واندوہ کے کچھ نہیں پاتے اس لئے اہل غم کا لباس پہنتے ہیں۔ایک جاہل مدعی فقیر نے ایک بزرگ کو سیاہ لباس میں دیکھ کر دریافت کیا کہ حضرت آپ سیاہ لباس کیوں پہنتے ہیں؟ فرمایا۔

''حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین چیزیں چھوڑی تھیں۔فقر، علم اور شمشیر۔شمشیر تو سلاطین نے سنبھال لی، مگر اسے برمحل استعمال نہ کیا۔علم کو علماء نے اختیار کیا مگر صرف پڑھنے پڑھانے کی حد تک (عمل سے انہیں سروکار نہیں) اور فقر فقراء نے اختیار کرلیا لیکن اسے آلہ غناء اور ذریعہ حصول مال بنالیا۔میں نے تینوں کے غم میں سیاہ پوشی اختیار کی ہے۔''

مشائخ عظام رحمہم اللہ کی طرف جب کوئی شخص اصلاح کے لئے رجوع کرتا تھا تو وہ اسے تین چیزوں کی دو تین سالوں میں تعلیم دیتے تھے، اگر وہ دوران تعلیم ادب پر ثابت قدم رہتا تو اپنے ساتھ رکھتے، ورنہ جواب دے دیتے۔

(۱) پہلے سال اس سے خدمت کراتے تاکہ وہ خود کو سب کا خادم جانے اور سب کو اپنے سے بہتر تصور کرے۔

(۲) دوسرے سال اس سے خدمت حق کراتے یعنی زہد وورع اور عبادت وریاضت میں لگاتے تاکہ وہ تمام حظوظ نفسانیہ سے ترک تعلقات کرلے کیونکہ کسی بھی چیز کے لالچ میں عبادت کرنا دراصل اپنی ہی پرستش ہے۔

(۳) اور تیسرے سال اس سے اس کے دل کی نگہداشت (یعنی دل کی طرف دھیان) کراتے تاکہ وہ ہر طرف سے یکسو ہوکر صرف بارگاہ احدیت جل جلالہٗ میں حاضر رہے اور اس کا دل غفلت میں مبتلا نہ ہو۔جب مریدان تینوں شرائط پر پورا اترتا تو اسے خرقہ پہناتے۔یہ خرقہ پوشی کورانہ تقلید پر مبنی نہ ہوتی اور نہ رسمی ہوتی بلکہ مرید صاحب تحقیق ہوتا تھا۔

پیر کامل کون ہے؟

الاسرار المرفوعہ کی حدیث نمبر ۲۲۹ کے حوالے سے حضرت ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ

اَلشَّیْخُ فِیْ قَوْمِہٖ کَالنَّبِیِّ فِیْ اُمَّتِہٖ — شیخ اپنے مریدوں کے درمیان ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کہ نبی اپنی امت میں۔

کیونکہ شیخ دراصل دعوت الی الحق میں نبیؐ کا نائب ہوتا ہے۔اس لئے ضروری ہے کہ شیخ اس درجہ کامل میں ہو کہ اپنے مرید کے احوال سے پورا پورا واقف ہو کہ مرید درجہ کمال تک کتنا پہنچے گا۔کہیں ایسا تو نہیں کہ آگے

چل کر مردود طریقت ہو جائے گا؟ اگر شیخ یہ محسوس کرلے کہ مرید طریقت کے انتہائی منازل طے کرلے گا تو پھر اس کی پرورش کرے اور اس پر نگاہ رکھے۔ مشائخ اصل میں قلوب کے طبیب ہوتے ہیں جو طبیب مریض کی بیماری سے جاہل ہو وہ اپنی تجویز کردہ دوا سے مریض کو ہلاک کردے گا۔ شیخ جب اپنے مرید کا مکمل طور پر تصفیہ باطن کرلے تب اسے خرقہ پہنائے۔ اس کے بعد خرقہ کے حقوق کا خاص لحاظ رکھے اور ان حقوق کی ادائیگی میں ہمہ تن مشغول رہے۔

خرقہ کی حقیقت

خرقہ کی حقیقت یہ ہے کہ اس کا اوپر والا حصہ صبر کے ساتھ ہو۔ دونوں آستینیں امید و بیم کی ہوں۔ اس کے آگے پیچھے کے دامن قبض و بسط سے بنیں اور اس کا گریبان جہاں سے کمر باندھتے ہیں' مخالفتِ نفس کا ہو۔ اس کی کلیاں صحت و یقین کی ہوں۔

خرقہ کا وقار

حضرت ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جو شخص خرقے کی عظمت اور اس کے وقار کا تحفظ نہ کرسکے، اسے خرقہ ہرگز نہیں پہنانا چاہیے۔ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں اپنے شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی ہم رکابی میں آذربائیجان کے ایک علاقے سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ دو تین خرقہ پوش گندم کے ڈھیروں پر کھڑے ہیں اور انہوں نے خرقے کے دامنوں کو کسان کے سامنے پھیلا رکھا ہے تاکہ وہ ان میں گندم ڈال دے۔ میرے شیخ نے انہیں دیکھا اور آیت کریمہ "أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ (البقرۃ:۱٦) الخ" (یعنی یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کو خرید لیا) کی تلاوت فرمائی۔ میں نے عرض کیا: حضرت! یہ لوگ کس قدر ذلت میں گرفتار ہیں۔ حضرت شیخ نے فرمایا۔

"ان کے پیر کو مرید جمع کرنے کی حرص ہوئی تھی تو انہیں دنیا جمع کرنے کی حرص ہوگئی ہے اور کوئی حرص کسی حرص سے بہتر نہیں ہوتی۔" (کشف المحجوب: ۲۷ طبع لاہور) مختصر یہ کہ خرقہ صالحین کا لباس ہے اس لیے جو شخص اس لباس کو دنیا کمانے کا ذریعہ بنالے وہ گویا اپنے لئے بہت بڑی آفت اور تباہی جمع کر رہا ہے۔

خرقہ پوشی کی غرض وغایت

خرق، خلاف عادت کام کو کہتے ہیں اور عرف عام میں یہ لفظ کرامت پر بھی بولا جاتا ہے۔ خارق اس کو کہتے ہیں جو کوئی کرامت خلاف دستور یا عادت دکھادے۔ اس لئے خرق عادت یا خارق عادت بھی بولا جاتا ہے۔

اَلْخَرْقُ هُوَ الْكَرَامَةُ الَّتِي تَصْدُرُ خِلَافَ الْعَادَةِ الْعَامِ مِنَ الْخَارِقِ

یعنی خرق اس کو کہتے ہیں کہ جو بطور کرامت کسی کرامت والے کریم سے صادر ہو (اور خرقہ اس کرامت والے

لباس کو کہتے ہیں جو شیخ عطا کرے۔)

خرقہ ایک مقدس لباس کو کہتے ہیں جو اللہ کے برگزیدہ بندوں کی جانب سے بطور عطیہ ملتا ہے۔ اس کا ثبوت تورات، انجیل اور قرآن وحدیث سے ملتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنا کرتہ اور چادر اپنے فرزند شیث علیہ السلام کو عطا فرمائے اور اپنا عصا اور عمامہ حضرت ہابیل علیہ السلام کو دیا۔ یہ چیزیں بڑی حفاظت سے حضرت ہابیل اور حضرت شیث علیہما السلام نے اپنے پاس زندگی کے آخری ایام تک محفوظ رکھیں اور عندالوفات اپنی اولاد کو بڑی تاکید کے ساتھ سپرد کیں۔ (توراۃ متی، باب الوفات ص ۱۱۳)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کپڑے، کمبل اور عصائے موسوی آپ کے شاگرد یوشع بن نون کے حصے میں آئے جن کو انہوں نے بڑی حفاظت سے رکھا اور بعد میں اپنے جانشینوں کے سپرد کر دیئے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا لباس حضرت اسماعیل علیہ السلام کو عنایت ہوا اور آپ کے جوتے مبارک حضرت اسحاق علیہ السلام پھر یہ سب تبرکات حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس محفوظ رہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قمیص اور عمامہ مبارک محفوظ تھا اور چادر حضرت یعقوب علیہ السلام کی جو آپ ہر وقت اپنے جسم پر اوڑھے رکھتے تھے۔ مصر میں (عزیز مصر) کا منصب ملنے پر اپنے والد بزرگوار یعقوب علیہ السلام کی بینائی ختم ہونے کی خبر اپنے بھائیوں سے سن کر جو قمیص یوسف علیہ السلام نے اپنے والد کو بھیجی تھی۔ اس کے متعلق تفسیر فتح القدیر میں امام شوکانی نے لکھا ہے کہ یہ وہی قمیص تھی جو ابراہیم علیہ السلام کی بطور تبرک آپ کے خاندان میں چلی آ رہی تھی۔ قرآن پاک میں سورہ یوسف میں اس کا تذکرہ اس آیت میں موجود ہے۔

اِذۡهَبُوۡا بِقَمِيۡصِىۡ هٰذَا فَاَلۡقُوۡهُ عَلٰى وَجۡهِ اَبِىۡ يَاۡتِ بَصِيۡرًا (یوسف: ۹۳)

لے جاؤ میرا یہ پیراہن پس ڈالو اسے میرے باپ کے چہرہ پر وہ بینا ہو جائیں گے۔

تبرکات کا قرآن پاک میں بکثرت تذکرہ ملتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔

فِيۡهِ سَكِيۡنَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوۡسٰى وَاٰلُ هٰرُوۡنَ تَحۡمِلُهُ الۡمَلٰٓـئِكَةُ (البقرہ: ۲۴۸)

اس (صندوق) میں تمہارے رب کی طرف سے سکون وطمانیت (کا سامان) ہے اور وہ تبرکات پیغمبروں کے (یعنی خرقہ ملبوسات وغیرہ) ہیں جنہیں چھوڑ گئی ہے اولاد موسیٰ اور اولاد ہارون، جن کو فرشتے (ادب واحترام) سے اٹھا کر لائیں گے۔

یہ چیزیں طالوت اور جالوت کی جنگ کے موقع پر مجاہدین اسلام کے حوصلے بلند کرنے کے لئے فوج کے آگے ایڈوانس پارٹی کے ساتھ فرشتے اٹھا کر لائے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے جب جالوت کو قتل کیا تو اس (جہاد میں حکومت وسلطنت کے ساتھ یہ تبرکات بھی بطور انعام داؤد علیہ السلام کو ملے پھر آپ سے حضرت سلیمان

علیہ السلام تک پہنچے۔)

قرآن پاک میں سورۃ مزمل اور مدثر میں حضور اکرم ﷺ کے لباس کا تذکرہ موجود ہے: یٰاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ (اے چادر لپیٹنے والے) اور سورۃ المدثر میں "وَثِیَابَکَ" اور آپ کا لباس اور چادر مبارک جو اہل بیت پر آپ نے ڈالی تھی۔ حضور اکرم ﷺ نے اپنا جبہ مبارک حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے ہاتھ میں حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف بھیجا اس سے بھی ثبوت ملتا ہے کہ ملبوسات کا تبرک اپنے پاس برکت کے لئے رکھنا سنتِ انبیاءؑ و مرسلینؑ اور امتِ مسلمہ کے صالحین کی روایت ہے (یہ چوغہ بہت سے اولیائے کرام سے ہوتا ہوا حضرت مجدد الف ثانیؒ کے پاس پہنچا اور چلتے چلتے یہ چوغہ آج راقم الحروف کے پیر خانہ میں آج بھی موہڑہ شریف میں حضرت پیر خانصاحب کی اولاد کے پاس موجود ہے۔ جس کی زیارت سال میں دو بار کروائی جاتی ہے)۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک کلاہ پیش کی جس میں چار ٹکڑے تھے اور سفید رنگ کی تھی۔ آپ نے وہ ٹوپی حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کو عطا کی۔ انہوں نے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کو انہوں نے حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ کو عطا کی۔ اس ٹوپی کو کلاہِ چار گوشہ کہتے ہیں۔ (درثمین' واقعات الصالحین از شاہ عبدالرحیم دہلوی رحمۃ اللہ علیہ) اور الحدیث بروایت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

آداب الطالبین میں ایک روایت حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم نے اپنا عمامہ اور کلاہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا اور چادر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مرحمت فرمائی۔ ایک یمنی چادر سرخ رنگ کی جس میں سبز دھاریاں تھیں' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو عطا فرمائی۔ اس طرح جو سلسلہ مشائخ نقشبندیہ' قادریہ' چشتیہ اور سہروردیہ میں خرقہ پوشی یا خرقہ بخشی کا طریقہ جاری ہے اس کی اصل یہی ہے کہ یہ تبرکات اور خرقات انبیاء و اولیاء کی میراث اور سنت ہیں' جو اب بھی مشائخ میں بدستور رائج ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے بھی اس پر اظہار خیال فرمایا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو یدِ بیضا لئے بیٹھے ہیں' اپنی آستینوں میں

(ب د: ۱۰۴)

حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے جو جبہ مبارک حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہاتھ روانہ فرمایا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دور خلافت میں حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کے حوالے کیا اور فرمایا کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے اپنی امت کے لئے دعا کرنے کو کہا تھا اور یہ فرمایا تھا کہ ان کی دعا سے میری امت کے اتنے لوگ بخشے جائیں گے جتنے بنی ربیعہ اور بنی مضر کی بھیڑوں کے بال ہیں۔ چنانچہ حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے اتنے لوگوں کی بخشش کا سامان اپنی دعا میں پورا کر لیا۔ شاید یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ جبہ مبارک جو حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا گیا تھا' بہت

سے بزرگوں سے ہوتا ہوا (اس کی تفصیل طویل ہے) راقم الحروف کے بزرگ، پیر خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ (خواجہ محمد زاہدؒ) کے پاس موجود رہا۔ یہ جبہ مبارک حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے ہوتا ہوا شاہ سکندر کیتھلی رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت مجدد علیہ الرحمہ کے پاس پہنچا اور آخر میں مولانا محمد قاسم موہڑ دیؒ کے ہاتھوں پیر خان صاحبؒ کو عطا کیا گیا۔

کون نہیں جانتا کہ حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا خرقہ اس وقت عطا فرمایا تھا جب محمود غزنوی ہندوستان کے سومنات مندر پر سولہ حملے کر چکا تھا اور یہ مندر پر سترہویں حملے میں فتح ہوا۔ حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ اگر کوئی مشکل وقت آجائے تو میرے خرقے کو سامنے رکھ کر دعا کرنا، چنانچہ جب محمود کو شکست کا سامنا ہوا تو اس نے اس خرقے کو سامنے رکھ کر دعا کی (یاد رہے کہ حضرت اویس قرنیؓ نے بھی حضور اکرم ﷺ کا جبہ مبارک سامنے رکھ کر سجدے میں دعا کی تھی تو اللہ تعالیٰ نے دو قبیلوں کی بھیڑوں کے بالوں کے برابر امت محمد یہ ﷺ کی بخشش کا اشارہ فرمایا تھا) محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی اس دعا کے بعد دوسرے دن ہی جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور مسلمان فتح سے ہمکنار ہوئے۔ منقول ہے کہ سومنات کے مندر فتح کر لینے کے بعد محمود غزنویؒ کو خواب میں حضرت ابوالحسن خرقانیؒ کی زیارت ہوئی اور آپ نے فرمایا کہ اے محمود! تم نے ہمارے چوغے کی آبرو کو خاک میں ملا دیا اگر تم یہ دُعا کرتے کہ سب راجے مہاراجے مسلمان ہو جائیں تو بیشک ایسا ہی ہو جاتا۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ مکتوبات ربانی (مکتوب نمبر ۱۹۰ دفتر اول، حصہ سوم) میں لکھتے ہیں کہ تم جانتے ہو کہ پیر کیسی ہستی ہے۔ پیر وہ ذات ہے کہ جناب قدس خداوندی تک پہنچنے کے راستے میں اس سے استفادہ کرتے ہو اور اس راہ میں اس سے طرح طرح کی مدد اور اعانت حاصل کرتے ہو۔ خالی کلاہ، چادر اور شجرہ جو مروج ہو چکا ہے، پیری مریدی کی حقیقت سے خارج ہے اور رسوم و عادات میں داخل ہے۔ ہاں یہ بات درست ہے کہ شیخ کامل کا کرتہ بطور تبرک اپنے پاس رکھے اور اس کے ساتھ اعتقاد اور اخلاق سے زندگی گزارے۔ شیخ کے کرتے کو پاس رکھنے میں ثمرات و نتائج کا قوی اہتمام ہے۔ (آپ کے اس بیان سے معلوم ہوا کہ ان تبرکات سے انس رکھنا بدعت میں شامل نہیں۔)

انبیائے کرام اور اولیائے کرام کے تبرکات کا احترام کرنا حقیقتاً دل کے ساتھ منسلک ہے جیسا کہ قرآن مجید نے انبیائے کرام کی نشانیوں کے متعلق فرمایا ہے۔

ذٰلِكَ ۗ وَ مَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (الحج: ۳۲)

جو ادب واحترام کرتا ہے، اللہ کی نشانیوں کا تو یہ (احترام) اس وجہ سے ہے کہ دلوں میں تقویٰ ہے۔

شعائر (نشانیاں) کا معنی وہ علامات ہیں جن سے کسی چیز کی پہچان ہو سکے اور جن سے حق و باطل کی پہچان

ہو۔ ان کو شعائر اللہ کہتے ہیں جب صفا و مروہ کی پہاڑیاں شعائر اللہ ہیں تو مدینہ طیبہ اور اس کی گلیاں آثار اولیاء اور ان کے مزارات بھی شعائر اللہ میں شامل ہیں۔ ان معنوں میں سیرت کی کتابوں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تبرکات کو بھی شعائر اللہ میں شمار کیا گیا ہے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چادر مبارک اور دیگر تبرکات کو بھاری قیمتوں سے خرید کر اپنے ساتھ دفن کرنے کی وصیت فرمائی تھی۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موئے مبارک کو اپنی ٹوپی میں مزین فرمایا اور یک بار یہ ٹوپی کفار کے علاقے میں گر گئی تو اس کو حاصل کرنے کے لئے انہوں نے دوبارہ حملہ کیا اور اس طرح کچھ جوانان اسلام کو شہید ہونا پڑا۔ اسی طرح ایک روایت میں موجود ہے (سیرت رسول عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم از نور محمد بخش توکلی رحمۃ اللہ علیہ) کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ بچپن میں ایک بار حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کھیلنے میں جھگڑ پڑے اور فرمایا کہ جاؤ تم تو ہمارے نانا کے غلام زادے ہو۔ حضرت عبداللہؓ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جاؤ یہ بات ان سے لکھوا لاؤ۔ جب یہ بات لکھ دی گئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ تحریر میری قبر میں بطور سند رکھ دینا کہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا غلام ہوں۔ جب عاشقان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم [illegible] ہو تو منکرین اولیاء کا یہ کہنا کہ اولیائے کرام کے تبرکات کا احترام کرنا بدعت میں شامل ہے' تو قارئین ان کی بدبختی کا خود اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد مزید تفصیلات کا دینا اس مقام پر ضروری خیال نہیں کیا جاتا۔

حضرت داتا گنج بخشؒ کشف المحجوب میں فرماتے ہیں کہ صوفیائے کرام کا شعار کمبل پوشی ہے اور کمبل پوشی باتباع سنت ہے۔ جیسا کہ خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

عَلَيْكُمْ الصُّوفَ تَجِدُونَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ فِي قُلُوبِكُمْ (کنز العمال حدیث۔ ۴۱۱۱۳)	اپنے پر کمبل پوشی لازم کرو' اپنے دلوں میں حلاوت ایمان پاؤ گے۔

اور صحابہ کرامؓ میں سے کسی صحابیؓ کا بھی ارشاد ہے

كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمْ يَلْبِسُ الصُّوفَ وَيَرْكَبُ الْحِمَارَ (الوفا ص۔ ۵۷۰)	حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پشمینہ زیب تن فرماتے اور عربی گدھے کی سواری فرماتے تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا لَا تُضِيعِي الثَّوْبَ حَتّٰى تَرْقَعِيهِ '' اے عائشہ کپڑا ضائع نہ کرنا جب تک اس پر پیوند نہ لگ جائیں۔ ایسے ہی خلیفۃ المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا حال تھا کہ آپ ایسا خرقہ زیب تن فرمایا کرتے تھے جس پر تیس پیوند لگے ہوتے تھے اور حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ بہترین لباس وہ ہے جو کم قیمت میں حاصل ہو سکے۔ حضرت امیر

المومنین مولائے کائنات سیدنا علیؓ سے مروی ہے کہ آپ کا پیراہن مبارک ایسا ہوتا تھا جس کی آستین انگلیوں تک ہوتیں اور اگر کبھی اس سے بھی چھوٹی آستینوں کا پیراہن زیب تن فرمایا تو جتنی لمبی اور زائد آستین ہوتی' اسے آپ کاٹ ڈالتے تھے اور جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بفرمان الٰہی کپڑا متوسط زیب تن فرماتے تھے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے۔

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (اَیْ فَقَصِّرْ) (المدثر:۴) یعنی اے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے لباس مبارک کو درست رکھیئے۔

یعنی دراز اور لمبا ہو تو کاٹ دیجئے۔

حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ستر بدری صحابہؓ پشمینہ پوش کی زیارت کی ہے۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے سلمان فارسیؓ کو دیکھا کہ کمبل اوڑھے ہوئے تھے اور اس کمبل پر بہت سے پیوند لگے ہوئے تھے۔

سیدنا امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا امیر المومنین علیؓ اور ہرم ابن حبانؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت اویس قرنیؓ کو ایسے لباس پشم میں ملبوس دیکھا جس پر بہت پیوند لگے ہوئے تھے اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور مالک بن دینار اور حضرت سفیان ثوری رحمہم اللہ تمام کے تمام مرقعہ صوف زیب تن فرماتے تھے۔

حضرت امام ہمام سیدنا ابوحنیفہ نعمان کوفیؒ سے روایت ہے۔ یہ روایت ''تاریخ مشائخ'' مصنفہ محمد بن علی حکیم ترمذیؒ میں موجود ہے' لکھا ہے کہ امام اعظم رضی اللہ عنہ اول پوشاک پشمینہ زیب تن فرمایا کرتے تھے۔ بعد ازاں آپ نے گوشہ نشینی کا عزم فرمایا تو سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ابو حنیفہ گوشہ نشین مت بنو بلکہ لوگوں میں تمہارا رہنا ضروری ہے۔ تمہارے سبب اللہ تعالیٰ میری سنت اور میرے طریقہ کو زندہ فرمائے گا۔ تو پھر آپ نے عزلت نشینی کے ارادہ کو فسخ فرمادیا اور آپ نے کبھی قیمتی لباس زیب تن نہ فرمایا۔ حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ نے ہمیشہ اپنا لباس صوف کا رکھا اور آپ محققینِ طبقہ صوفیائے کرام سے ہیں۔

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ ایک روز حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو آپ کے جسم مبارک پر پوشاک پشمینی تھی۔ حاضرین مجلس نے ابراہیم بن ادھمؒ کو کچھ نظرِ حقارت سے دیکھا۔ سیدنا امام اعظمؓ نے فرمایا' یہ ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ ہمارے سردار ہیں۔ اصحابِ مجلس نے یہ سن کر آپس میں کہا کہ امام ہمام کی زبانِ حق ترجمان سے کبھی سچ اور حق کے سوا کوئی بات نہیں نکلی۔ ابراہیم بن ادھمؒ نے سید کا درجہ کیونکر پایا اور کہاں سے پایا۔ حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ رتبہ ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رب کی یاد دوامی کی برکت سے حاصل کیا اور وہ ذات ایسی بلند و بالا ہے اور ہم اپنی تنہائی کی خدمت میں محو ہیں' اس لئے وہ ہمارا سردار ہوگیا۔

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خرقہ صوفی ایک حیلہ ہے۔ بعض لوگ تو یہ حیلہ بغرض تبرک

کرتے ہیں اور جو کچھ اس خرقہ پوش پر لازم ہوتا ہے اسے پورا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو خرقہ سے آراستہ کرتے ہیں اس امید پر کہ شاید اس لباس کی برکت سے اللہ تعالیٰ کے حضور ہم بھی صوفیوں میں شمار ہو جائیں اور مشائخ تصوف نے خرقہ پوشی اس سے زینت حاصل کرنے کے مقصد سے کی اور اسی لیے دوسروں کے لئے پہننے کا حکم فرمایا اور خود بھی پہنا تاکہ وہ عوام میں ممتاز ہو جائیں اور عوام ان کے ہر قدم کی نگرانی میں لگے رہیں اور اگر وہ کبھی اپنے طریقہ کے خلاف قدم رکھے تو عوام اسے ملامت کریں اور اگر کبھی یہ شامت اعمال کسی گناہ کا ارتکاب بھی کرنا چاہیں تو اس خرقہ کی وجہ سے لوگوں سے شرما کر رک جائیں۔

مختصر یہ کہ کمبل محبوبوں کی ایسی زینت ہے کہ عام لوگ اس سے لوگوں میں ممتاز اور باعزت ہو جاتے ہیں اور خواص اس میں ذلیل۔ عوام کی عزت تو اس خرقہ پوشی میں یہ ہے کہ دنیا والے انہیں عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور خواص کی ذلت یہ ہے کہ انہیں عوام اسی قسم کے لباس میں دیکھ کر اس نظر سے دیکھتے ہیں جس نظر سے اس عوام نے خرقہ پوشوں کو دیکھا تھا۔ اور یہ ان کے لئے ذلت محض ہے۔ اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ

اَلْخِرْقَةُ لِبَاسُ النِّعَمِ لِلْعَوَامِ وَجَوْشَنُ الْبَلَاءِ لِلْخَوَاصِ	خرقہ پوشی عوام کے لئے نعمت ہے اور خواص کے لئے مصیبت۔

خرقہ پوشی کی تین شرطیں ہیں: اول یہ کہ خرقہ اس لیے بنائے کہ بار ملبوسات سے ہلکا ہو جائے اور انواع واقسام کے لباسوں سے فراغت حاصل کرے اور کمبلی جب تک رہے اس پر پیوند مسلسل چسپاں کرتا رہے جہاں سے پھٹے فوراً پیوند لگا دے۔ مشائخ طریقت رحمہم اللہ کے اس میں دو قول ہیں۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ پیوند لگانے میں ترتیب شرط نہیں جہاں سوئی ڈالے وہاں سے ہی نکال لے۔ موزونیت اور ترتیب کا تکلف نہ کرے اور ایک جماعت فرماتی ہے کہ پیوند لگانے میں موزونیت کا لحاظ ضرور رکھا جائے بلکہ وہ پیوند بتکلف اس طرح چسپاں کیا جائے کہ دیکھنے والا اس کی موزونیت میں تکلف محسوس کرے اس لیے کہ معاملاتِ فقر وصحتِ معاملات کا تقاضا یہی ہے کہ اس کا کوئی فعل ناموزوں نہ ہو۔

حضرت علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کشف المحجوب میں آداب اور شرائطِ خرقہ پوشی میں فرماتے ہیں۔ میں نے حضرت شیخ ابوالقاسم گرگانی رحمۃ اللہ علیہ سے مقام طوس میں سوال کیا کہ درویش کو کم از کم کیا لازمی ہے جس سے اس کے ساتھ نام فقر موزوں ہو سکے؟ فرمایا تین چیزیں کم از کم ضروری ہیں اور اس سے کم ہرگز نہ ہوں۔ اول یہ کہ وہ اپنی کمبلی پر جس وقت پیوند لگائے تو یہ سمجھے کہ پیوند کس طرح موزوں رہے گا اور اسے کس طرح کمبل پر چسپاں کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ دل کی آواز اور عوام کی بات اچھی طرح سن سکے اور اس کی حقیقت کو سمجھنے کی اہلیت رکھے۔ تیسرے یہ کہ فقر کا کوئی قدم زمین پر بیکار و غیر موزوں نہ پڑے۔ یعنی ہر قدم ذکر الٰہی کے ساتھ اٹھے اور آگے بڑھے حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس وقت میری گفتگو حضرت

شیخ المشائخ گرگانی رحمۃ اللہ علیہ سے ہو رہی تھی تو اس وقت ایک جماعت درویشوں کی ہمارے ساتھ وہاں موجود تھی۔ جب ہم بارگاہ شیخ سے باہر آئے تو ہر ایک شخص کلامِ شیخ میں تصرف کرنے لگ گیا ایک گروہ تو بوجہ نادانی اس کے اندر اس قدر اختلاف کر بیٹھا کہ اس نے کہہ دیا کہ بس فقر یہی ہے۔ ایک کہنے لگا کہ فقر کے معنی ہی یہ ہیں کہ بہت سے ٹکڑے جمع کر کے خوبصورت طریقے سے سیئے اور زمین پر اچھی طرح پاؤں رکھ کر چلے۔ اور ہر ایک اپنے اپنے گمان میں دعویدار تھا کہ ہم طریقت کے معانی خوب سمجھتے ہیں۔ میرے دل کا رجحان اس ہستی پاک شیخ گرگانی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف تھا۔ میں نے یہ بات ناپسند کی کہ اتنی بڑی ہستی کا فرمان اور اس طرح اختلافات میں مخلوط ہو کر رائیگاں ہو جائے۔ میں نے کہا کہ آؤ' ہم سب کلام شیخ پر بحث کریں۔ چنانچہ سب نے میرے سامنے اپنی اپنی تقریر کی اور اپنا مافی الضمیر بیان کیا۔ جب میری باری آئی تو میں نے کہا پیوند وہی ٹھیک ہے جو فقر پر چسپاں کیا جائے نہ کہ وہ پیوند جو تن پر چسپاں ہو۔ جب تم پیوند فقر پر لگاؤ گے تو وہ اگر ٹھیک نہ بھی چسپاں کیا گیا تب بھی ٹھیک رہے گا۔ صحیح بات یہ ہے کہ پیوند سے مراد صوفی کا وہ حال ہے جو بحالت کیف وتواجد اس پر طاری ہو اور سننا وہ ہے جو کیفِ حالیہ میں اسے مسموع ہو نہ کہ ناز ونعم کی دنیا میں رہ کر۔ اس معنی میں اگر وجد کے حق سے تصرف کریں، صحیح ہے اور اگر ہزل ولغو سے کریں تو غلط ہے۔ سمجھنا یہ ہے کہ صوفی آوازِ روح ہے نہ کہ آوازِ عقل۔ پاؤں ٹھیک رکھنا یہ ہے کہ حالت تواجد میں جو قدم اٹھے' وہ صحیح ہو نہ کہ کھیل اور رسم کے ساتھ۔ بعض لوگوں نے میرا یہ بیان حضرت شیخ المشائخ گرگانی رحمۃ اللہ علیہ کے حضور پیش کر دیا۔ آپ نے سن کر فرمایا۔

اَصَابَ عَلِیٌّ حَفِظَهُ اللّٰهُ — علی بن عثمان میرے کلام کے مفہوم کو پہنچ گیا' اللہ اسے اپنی حفاظت میں رکھے۔

تو خرقہ پوشی سے مراد گروہ صوفیا کی صرف یہ ہے کہ زیب وزینت دنیاوی کے غم سے نجات پائیں اور اپنے فقر میں حق تعالیٰ شانہ کے ساتھ سچا رابطہ رکھیں۔ آثارِ سلف میں مروی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خرقہ پوشی فرماتے تھے اور اسی خرقہ کے ساتھ آپ آسمان پر گئے اور کسی بزرگ کا قول ہے کہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کا خرقہ خواب میں دیکھا تو وہ پشمینہ کا تھا اور اس پر جو پیوند لگے ہوئے تھے' ان سے ایک نور چمکتا تھا۔ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے مسیح! علیک السلام! آپ کے اس خرقہ پر یہ نور کیسا ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ نور میرے اس صبر کا ہے جو میں نے بحالت اضطراب واضطرار صبر کے ساتھ اپنی ضرورت کے وقت اس خرقہ پر پیوند لگا کر شکر کیا۔ اللہ تعالیٰ نے میرے ہر رنج کے بدلہ میں ایک ایک نور عطا فرمایا۔

حضرت شیخ محمد بن خفیف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے بیس سال سخت ٹاٹ پہنا اور ہر سال میں چار چلے کیے اور ہر چلہ میں علومِ حقیقت کے حقائق وغوامض پر ایک کتاب تالیف کی۔ ان کے ہی زمانہ میں ایک بزرگ تھے جو علماء محققین اور طریقت میں شمار ہوتے تھے اور علاقہ فارس میں رہتے تھے انہیں محمد بن زکریا رحمۃ اللہ

علیہ کے نام سے پکارتے تھے۔ انہوں نے کبھی خرقہ زیب تن نہ فرمایا۔ حضرت شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کہ حضرت خرقہ کی کیا شرط ہے اور کس کے لئے خرقہ پوشی، رواہ ہے۔ فرمایا: خرقہ پوشی کی شرط وہی ہے جو محمد بن زکریا رحمۃ اللہ علیہ اپنے سفید پیراہن میں پوری کر رہے ہیں اور خرقہ پہننا بھی انہیں کو زیبا ہے۔

جولوگ مشائخ کرام میں سے اپنا لباس اکثر نیلا رکھتے ہیں اس کی چند وجوہات ہیں۔

ایک تو یہ کہ وہ سیاح ہوتے ہیں اور بحالتِ سفر سفید کپڑے میلے ہو جاتے ہیں اور انہیں سفر میں صاف کرنے اور دھونے کا موقع بدشوار (مشکل) ملتا ہے۔ دوسرے یہ کہ سفید لباس کی خواہش ہر ایک کو ہوتی ہے۔ اس وجہ سے وہ عوام کی محبوب ترین چیز سے مجتنب رہتے ہیں۔ تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ نیلگوں رنگ ملبوس کرنا اصحابِ غم اور اربابِ محنت کا کام سمجھا جاتا ہے اور چونکہ دنیا صوفی کے لیے دارِ محنت و مصائب ہے اور اس کا تمام کام مہجوری واندوہ کے ساتھ وابستہ ہے تو اربابِ ارادت نے اس دنیا میں لباسِ غم اختیار کر لیا اور ایک جماعت نے اس دنیا میں سوائے غم واندوہ کے کچھ نہ پایا اور اس کا ہر معاملہ نقصان وخذلان کا پیش خیمہ دیکھا تو انہوں نے یہ دیکھ کر کہ یہاں سوائے اضاعت وفنا کچھ حاصل نہیں تو اس غم میں لباس کبود پہن کر غمگین بیٹھ گئے اور سمجھ گئے کہ فوت ہونا موت سے اشد ترین ہے گویا ایک جماعت کسی عزیز کی موت پر سیاہ پوش ہوتی ہے۔ دوسری جماعت مقصود کے فوت ہونے پر سیاہ پوش ہوگئی۔ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کشف المحجوب میں خرقہ پوشی کے باب میں فرماتے ہیں کہ خرقہ پوشی صرف دو قسم کے لوگوں کے لیے موزوں و مناسب ہے ایک تارک الدنیا جماعت کے لئے دوسرے مشتاقانِ جمالِ الٰہی کے لئے۔

باب ۵۱

تبلیغ کے ذریعے سے اسلام کو زندہ کرو

(تبلیغ یہ ہے کہ علم سیکھو اور اس کو دوسروں تک پھیلاؤ)

علمِ تبلیغ کی کرامات

ہماری بھاری اکثریت افراطِ مال میں اپنی فلاح تصور کرتی ہے' مگر اپنی انتہائی سادگی کے باعث وہ اپنے پیغمبر علیہ السلام کی اس حدیث پر نظر نہیں رکھتی کہ علم حاصل کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ علم بھی عطا فرماتا ہے اور اس کی بدولت ان کو مال وزر اور حکومت بھی عطا فرما دیتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت سلیمانؑ کو اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا کہ علم' حکومت اور مال میں سے ایک چیز کو پسند کریں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے علم کو پسند کیا تو اس کی برکت سے آپ کو حکومت اور مال بھی عطا فرمایا۔ مشہور ہے کہ آپ کی سلطنت کی وسعت مشرق سے مغرب تک تھی۔ آج بھی آپ خدا کی اس سنت میں کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے' یعنی جو لوگ آج بھی دین کا علم سیکھتے ہیں' ان کو مال اور حکومت بھی عطا کی جاتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے دین کی طرف لوگوں کو بلانے والے قیامت کے دن سب سے زیادہ سر بلند ہوں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن تین گروہ شفاعت کریں گے' پہلے انبیاء' پھر علماء اور پھر شہداء۔ آپ نے فرمایا کہ جو شخص علم حاصل کر رہا ہو اس لیے کہ وہ اس علم سے اسلام کو زندہ کرے گا اور اسی اثنا میں اسے موت آجائے تو اس کے درمیان اور انبیاء کے درمیان صرف ایک درجے کا فرق ہوگا یعنی دین کے علم کو پھیلانے والوں کا درجہ انبیاء کے درجہ سے ایک درجہ کم ہوگا۔ ایک حدیث میں ہے کہ علم سیکھنے والوں کی اصل شان قیامت کے روز ہی نظر آئے گی۔

حضرت گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جن لوگوں کو خدمتِ ارشاد (یعنی رشد وہدایت پھیلانے کی خدمت) سپرد ہوتی ہے' ان کی نجات ضرور ہوگی۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے علم پھیلانے کی زبردست مثال قائم کی چنانچہ ایک صحابیؓ ایمان لانے کے بعد جب اپنی بستی میں واپس جاتا تو پورے علاقے کی تقدیر بدل دیتا۔ آج بھی اگر ہم اسی طرح علم کو پھیلانے کی کوشش میں مصروف ہو جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ دین کی روشنی سے ہر گھر منور نہ ہو جائے۔ صحابہ کرامؓ کے زمانے میں اسلام کو عروج ان کی اجتماعی کوششوں کی وجہ سے ملا تھا

اوران کی بلندی درجات کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ بعض لوگ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو ہدف ملامت بناتے ہیں لیکن ان کے دور میں جہاد پر جانے والے ایک صحابیؓ کے گھوڑے کے پیر سے اُڑنے والی مٹی کا مرتبہ اس قدر بلند ہے کہ ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے اٹھنے والی گردوغبار اگر میرے دامن پر پڑ جائے تو مجھے اپنے جنتی ہونے کا یقین ہو جائے گا۔

قرآن وحدیث میں تبلیغ کی حیثیت

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس معاشرے میں باہمی خیر کے قیام اور شر کے مٹانے کی سعی نہیں ہوتی' وہ بالآخر ہلاک ہو جاتا ہے۔ ترمذی شریف کی ایک حدیث میں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا ارشاد ہے کہ قسم ہے اس کی جس کے قبضے میں میری جان ہے' تمہیں نیکی کی ہدایت کرنا ہوگی اور برائی سے روکنا ہوگا' ورنہ عین ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر عذاب بھیج دے۔ پھر تم اس کو پکارو گے تو تمہیں جواب نہ آئے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب میری امت دنیا کو بڑی شے سمجھنے لگے گی تو اسلام کی وقعت اس کے دل سے نکل جائے گی' جب نہی عن المنکر چھوڑ دے گی تو وحی کی برکات سے محروم ہو جائے گی اور جب گالی گلوچ پر اتر آئے گی تو خدا کی نظر سے گر جائے گی' چنانچہ آج بھی جو اصلاحی کام میں حصہ لیتا ہے' اس کی خدمت کو بھی اللہ تعالیٰ اپنی ذاتی خدمت تصور کرتا ہے' جیسا کہ قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (محمد: ۷)

اے ایمان والو! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد فرمائے گا اور (جہاد میں) تمہیں ثابت قدم رکھے گا۔

اس آیت میں جو بات قطعی دلیل کے ساتھ ثابت ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کی اصلاح کے ساتھ منسلک ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرماتا رہتا ہے اگر آپ بھی اللہ کے دین کی مدد کرتے رہیں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کی مدد بھی کرتا رہے گا اور یاد رہے کہ خدمت دین وہ شخص بھی کرتا ہے جو کسی خدمت گزار عالم یا صوفی کی معیت میں تھوڑا سا وقت ہی صرف کر دیتا ہو لہذا جو شخص خدمتِ ارشاد کے اختیار کرنے پر یعنی لوگوں کی اصلاح کرنے میں تردد سے کام لیتا ہے تو وہ قرآن کی اس نص کا عملی طور پر انکار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں متعدد مقامات پر اس خدمتِ ارشاد کی ضرورت کو لوگوں پر پیش کیا اور فرمایا۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (آل عمران: ۱۰۴)

تم میں ایک ایسی جماعت ضرور ہونی چاہیے جو بلایا کرے نیکی کی طرف اور حکم دیا کرے بھلائی کا اور روک دے بدی سے اور یہی لوگ کامیاب

اور کامران ہیں۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران:۱۱۰)

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی ہدایت اور بھلائی کے لئے ظاہر کی گئی ہو۔ تم حکم دیتے ہو نیکی کا اور روکتے ہو برائی سے۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (النحل:۱۲۵)

اپنے رب کی طرف بلاؤ' پکی تدبیر اور اچھی نصیحت سے' اور ان سے اس طریقے سے بحث کرو جو سب سے بہترین ہو۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (حم السجدہ:۳۳)

اس سے زیادہ کس کی بات اچھی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیکی کرے اور کہے کہ میں تو (اپنے رب کے) فرمانبردار بندوں سے ہوں

علماء انبیاء کے جانشین ہیں

درج بالا آیات سے معلوم ہوا کہ عوام کی اصلاح خدا کی نظروں میں اس قدر بلند مقام رکھتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی اصلاح کی تکمیل کے لئے اپنی بہترین مخلوق یعنی انبیائے کرام علیہم السلام کو اس اہم کام کے لئے تعینات فرمایا۔ پھر ایک وقت آیا کہ انبیاء کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور لوگوں کی اصلاح کا یہ کام علماء کے سپرد کر دیا گیا اور فرمایا کہ علماء انبیائے کرام علیہم السلام کے اصلاحی کام کے وارث ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث اَلْعُلَمَآءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَآءِ (ترمذی: ص ۳۸۴) یعنی علماء انبیائے کرام علیہم السلام کے وارث ہیں، بھی اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔ احادیث میں ہے کہ شیطان پر ایک فقیہ سو عابدوں سے زیادہ بھاری ہے۔ کچھ روایات میں ایک مبلغ فقیہ کا ایک ہزار یا ایک لاکھ عابدوں سے زیادہ افضل ہونا بھی وارد ہے۔

علامہ اقبالؒ نے فرمایا۔

صحبت پیر رومؒ سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف (ب۔ج:۳۳۱)

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میرے جانشینوں پر اللہ کی رحمت ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین کون ہیں؟ تو فرمایا: جو میری سنت سے محبت رکھتے ہیں اور بندگان خدا کو تعلیم دیتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ میں علیم ہوں اور ہر صاحب علم سے محبت کرتا ہوں۔ ایک روایت میں ہے کہ علم دل سے جہالت کی بے بصری کو اس طرح دور کر دیتا ہے جس طرح چاند اندھیرے کو۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے واضح ہوتا ہے جس جگہ قرآن کی تعلیم اور مذاکرہ ہو وہاں انوار خداوندی نازل ہوتے ہیں اور فرشتے ان کو گھیرے میں لے لیتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ جس نے علم حاصل کیا اور دنیاوی طور پر کچھ حاصل نہ کیا' ایسے عالم کے لئے فرشتے' زمین کے مویشی' فضا کے پرندے' پانی کی مچھلیاں اور کراماً کاتبین تک خدا کے حضور دعا کرتے ہیں۔ جو علم حاصل کرنے کی کوشش کے باوجود حاصل نہ کر سکا' اس کے لئے ایک حصہ ثواب ہے اور جو حاصل کرے' اس کے لیے دو حصے اجر ہیں۔

علم والوں کی علامت یہ بیان کی جاتی ہے کہ اگر اس پر علم کا اثر ظاہر نہ ہوا اور نہ ہی پتہ چلے کہ یہ عالم ہے تو بھی اس کے خشوع وخضوع' تواضع اور مسکنت سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ عالم ہے۔ کیونکہ خشوع وخضوع انبیاء کا لباس ہے اور صدیقین وعلماء کی نشانی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اپنے معاملات میں ان سے مشورہ کرو' جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔

احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بلندیٔ مراتب اور رفع درجات کا ذریعہ ایمان اور علم ہے۔ ایک ایماندار شخص نادار مفلس ہی کیوں نہ ہو' کا فر رئیس سے اس کا درجہ اللہ تعالیٰ کی جناب میں بہت بلند ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

قطرۂ آب وضوئے قنبرے در بہا برتر زخونِ قیصرے (ا۔خ: ۱۶۲)

(حضرت علی رضی اللہ عنہ کے غلام قنبرؓ کے وضو کا ایک قطرہ ایران کے شہنشاہ کے خون سے زیادہ عزت والا ہے۔)

علم کے بارے میں صوفیاء کے نظریات

صوفیائے کرام نے علم کے متعلق جی کھول کر لکھا ہے جس کو طوالت کے خوف سے بیان نہیں کیا جا سکتا، البتہ چند ایک بزرگوں کے اقوال نقل کیے جا رہے ہیں۔

حضرت علیؓ نے فرمایا کہ علم حاکم ہے اور مال محکوم ہے، مالدار چل بستے ہیں، مگر علم والے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

رَضِینَا قِسْمَۃَ الْجَبَّارِ فِیْنَا لَنَا عِلْمٌ وَّلِلْجُھَّالِ مَالٌ

(ہم میں خدائے جبار نے جو بانٹ کی' اس پر ہم راضی ہیں' ہمارے لئے علم ہے اور جاہلوں کیلئے مال ہے۔)

فَاِنَّ الْمَالَ یَفْنٰی عَنْ قَرِیْبٍ فَاِنَّ الْعِلْمَ بَاقٍ لَّا یَزَالُ

(بے شک مال تو عنقریب فنا ہونے والا ہے اور علم باقی رہنے والا ہے' کبھی زوال پذیر نہ ہوگا۔)

حضرت ابن عباسؓ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

یَرۡفَعِ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ ۙ وَالَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ دَرَجٰتٍ ؕ (المجادلۃ:١١) اللہ تعالیٰ اونچے کرے گا درجات ان لوگوں کے جو تم میں سے ایمان لائے اور علم رکھتے ہیں۔

اس آیت کی تشریح میں فرمایا کہ (عام) اہل ایمان پر علماء کو سات سو درجات حاصل ہیں اور ہر دو درجوں کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے۔ حضرت جعفر بن صادقؓ فرماتے ہیں کہ اہل علم کا اصل کمال تفقہ فی الدین میں ہے کہ مصیبت میں ثابت قدم رہو اور معیشت درست رہے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ جو اللہ سے نہ ڈرے، وہ عالم ہی نہیں (کیونکہ قرآن میں ہے کہ علماء ہی اللہ سے ڈرتے ہیں۔)

سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ علم حاصل کرو، ورنہ علم تم سے نکل کر غیروں میں چلا جائے گا اور تم ذلیل ہو کر رہ جاؤ گے (آج یہی معاملہ مسلمانوں کے ساتھ پیش آ رہا ہے) علم کی دنیا میں بھی عزت ہے اور آخرت میں بھی۔ خلیفہ عبدالملک رحمۃ اللہ علیہ اپنے بیٹوں کو فرماتے ہیں کہ اگر تم مالدار ہو تو علم تمہارا جمال ہے اور اگر غریب ہو تو علم تمہارے لئے دولت ثابت ہوگا۔

حاتم اصم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا میں نے چار علوم حاصل کئے ہیں اور اب میں تمام علوم سے آزاد ہوں۔ ایک یہ کہ میرا رزق مقرر ہے۔ دوسرے یہ کہ میرے اوپر اللہ کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں، وہ میرے سوا کوئی دوسرا ادا نہیں کر سکتا۔ تیسرے یہ کہ موت میری طالب ہے جس سے فرار ممکن نہیں اور میں اس کے لئے تیار ہوں اور چوتھا یہ کہ خدا مجھے ہر وقت دیکھتا ہے اور میں ایسے فعل سے شرم کرتا ہوں جس سے کل قیامت کے دن شرمندہ ہونا پڑے۔

حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ علم ایک حرف ہے جو دونوں جہانوں میں تیرے لئے کافی ہے اور وہ حرف اللہ کا نام ہے۔

بَلِّغُوۡا عَنِّی وَلَوۡ اٰیَةً (جامع الصغیر: ج ا ص ۱۲۵) یعنی میری طرف سے لوگوں تک پہنچا دو، اگرچہ ایک آیت ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آج اسلام بہت غریب ہو رہا ہے۔ آج جو شخص اس کی خاطر ایک پیسہ خرچ کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو کروڑوں روپے کے بدلے قبول فرمائے گا۔ اس وقت دین کو تقویت دینے کا اجر زیادہ ہے۔ آج کوئی کمال دعوت اور تبلیغ کے درجے کو نہیں پہنچ سکتا۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ایک ایسا الحاد کا وقت آئے گا کہ جو میری ایک سنت کو ادا کرے گا، اس کو سو شہیدوں کا ثواب ہوگا۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اب یہ وہی وقت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ وقت میں بلاؤں پر صبر اور نعمتوں پر شکر کرنا ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیتا ہے اور جو لوگ اس کے علاوہ

عوام کی اصلاح میں لگے رہتے ہیں تو ایسے لوگوں کے لئے کائنات کی تسخیر آسان ہو جاتی ہے۔ جب بندہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ آزمائش کی غرض سے مصیبتوں میں مبتلا کرتا ہے لیکن اس پر انعام بھی ملتا ہے کہ اگر صبر کرے تو اسے پسندیدہ بنا دیتا ہے اور اگر راضی رہے تو برگزیدہ بنا دیتا ہے بشرطیکہ لوگوں کی اصلاح میں حصہ لیتا رہے۔

آخر میں قارئین سے استدعا ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ دینی تعلیم ضرور حاصل کریں اور ہفتے میں دو تین گھنٹے ہی اہل اللہ کے ساتھ گزاریں تاکہ ان کی تبلیغی محافل میں شمولیت کے باعث وہ بھی اسلام کے زندہ کرنے والوں میں شامل ہو جائیں۔

یہ وقت آپ کی مدد کا تقاضا کرتا ہے۔ آپ کی ذرا سی توجہ بہت معنوی نتائج برآمد کر سکتی ہے۔

اِختتامیہ

زیرِ نظر کتاب پچھلے بیس سال (۱۹۸۶ء) سے زیرِ ترتیب ہے اس کتاب میں چونکہ تصوف کے ضروری اور اہم مضامین کو شامل کرنے پر اہمیت دی گئی ہے اس لئے اس مشکل کام پر کافی محنت درکار تھی۔ تصوف کے متعلق تمام ضروری علوم پر سیر حاصل تفصیل جہاں تک ہو سکا اس کتاب میں جمع کر دی گئی ہے۔ اُمید ہے کہ یہ کتاب طالبانِ راہِ طریقت اور علوم کی تشنگی کو کافی حد تک پورا کرے گی۔ اسلام ایک سیدھے سادھے مسلمان سے دو باتوں کا تقاضا کرتا ہے۔ یعنی اوامر کی پابندی اور نواہی سے پرہیز کرنا۔ اوامر ونواہی کا علم حاصل کرنا اور حتیٰ الامکان اس پر عمل پیرا ہونا ہر مسلمان کے فرائضِ منصبی میں شامل ہے۔ جو شخص اپنی عملی زندگی میں اوامر ونواہی کی پابندی کرتا ہے وہ پورا اور مکمل مسلمان ہے اور جنت میں داخل ہونے کا حق دار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں درجات کا امتیاز رکھا ہے اور بعض کو بعض پر فضیلت دینے کا قرآن میں ذکر بھی فرمایا ہے۔ سیدھے سادھے مسلمان کا درجہ حاصل کرنے کے بعد مسلمان کیلئے بلند مقامات کے راستے بھی کھلے رکھے گئے ہیں۔ ایسے راستوں میں سے سب سے زیادہ معروف راستہ طریقت کی راہ پر چلنا ہے یہ وہ راستہ ہے جسے اسلام کے لاتعداد مشائخِ کرام نے اپنایا ہے۔ جن لوگوں نے اس راستے کو کامیابی سے طے کیا ہے اُن کے نام نہایت عزت واحترام سے لئے جاتے ہیں جن کی خاکِ پا کو بڑے بڑے شہنشاہ اور حُکّام وقت بھی نہیں پہنچ سکتے۔

مسلمانوں کا ایک گروہ تصوف کی سختی سے مخالفت کرتا ہے اور ان کی دیکھا دیکھی ایسی ہی ایک جماعت تقریباً ہر زمانے میں اپنا وجود رکھتی رہی ہے جب کہ ان میں سے بعض خوش قسمت لوگ تائب ہوئے اور ولایت کے بہت بڑے مقام پر فائز ہوئے۔ عزّ الدین عبدالسلام اور ابن جوزی کے علاوہ بہت سے نام اس فہرست میں آتے ہیں۔ منکرین طریقت کے خلاف بہت سے دلائل ملتے ہیں لیکن اگر ہوش وحواس کو قائم رکھتے ہوئے صرف اتنی بات ہی سوچی جائے کہ کیا وہ لاتعداد بڑی بڑی بزرگ ہستیاں جو تصوف کے ساتھ منسلک رہی ہیں ان تمام منکرین طریقت سے زیادہ علم وفہم، تقویٰ اور روحانیت میں ہزار گنا بڑھ چڑھ کر نہ تھیں؟ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، معین الدین چشتیؒ، مخدوم علی الہجویریؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ وغیرہ جیسے بزرگوں کے مقابلے میں منکرین طریقت کا مقام " چہ نسبت خاک را با عالم پاک " کے مصداق کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ زیرِ نظر کتاب میں اور ہماری تصنیف " سنت مبارکہ " میں منکرین طریقت اور منکرین احادیث کے متعلق کافی مواد لکھ

دیا گیا ہے۔ اس موضوع پر اور بھی بہت سی تحریریں لکھی جا چکی ہیں۔ ان منکرین کی مثال تو ایسے ہے جیسے کوئی چوہا شیر کی دُم سے کھیل رہا ہو۔ زیرِ نظر کتاب کے مطالعہ کے بعد کوئی ذی ہوش انسان طریقت کے خلاف ایک کلمہ بھی نہیں کہہ سکتا۔

آج اسلام کے نام لیواؤں کی دنیا میں اس قدر رسوائی ہو چکی ہے کہ جس کے متعلق یہاں بات کرنے میں شرم محسوس ہوتی ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ حالت صرف اس لئے ہے کہ لوگ طریقت سے دور ہونا تو کجا وہ تو مسلمان کہلانے کے بھی حقدار نہیں ہیں۔ پہلے زمانے کے مسلمانوں کے متعلق علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر (ب۔د: ۲۰۴)

شریعتِ حق کی اتباع نہ کرنا اس زمانے میں مسلمانوں کا شیوہ بن چکا ہے اور جب تک اسلام کے اس ضروری حصے پر عمل نہیں کرتے اس وقت تک مسلمان، مسلمان کہلانے کے حقدار نہیں ہو سکتے۔ اگر مسلمانوں کو شریعتِ حق کا دلدادہ بنا دیا جائے تو یہ اُن کی تمام بیماریوں کا علاج ثابت ہو سکتا ہے۔ راقم الحروف کے خیال میں مسلمانوں میں ایک بہت بڑا گروہ اس مقام پر تعینات ہونا چاہیے جو عوام کو نماز، روزہ کی طرف رغبت دلائے۔ مسلمانوں کے دل میں اگر ایسا شوق پیدا ہو جائے تو وہ طریقت کے دلچسپ اور پُرحشمت کاموں کی طرف توجہ دینا شروع کر سکتے ہیں۔ مسلمانوں کے اپنے معیار کو شریعت کے معیار سے کم پر راضی نہیں ہونا چاہیے کیونکہ کامیابی کے لئے اپنے معیار کا بلند تر ہونا ہی ضروری ہے۔ طریقت میں مشغول لوگوں کو اللہ کی طرف سے مدد ملتی رہے گی۔ اس سلسلے میں حکومت کی مدد بھی بہت ضروری ہے تاکہ تلاشِ معاش کا جنون جو مسلمانوں کے سروں پر سوار ہے اعتدال کی حالت میں آ جائے امریکہ میں مقیم اشخاص حکومتی پالیسیوں کے نتیجہ میں مطمئن نظر آتے ہیں۔ مسلمانوں کے لئے روزی رساں قوتوں کو عوام کے لئے روزی بہم پہنچانے کی سہولت کا ہونا ضروری ہے۔ اگر حکومت چاہے تو راقم الحروف اپنے دروس کی ٹی وی کی مناسب اشاعت اور بلامعاوضہ سپیشل لیکچرز سے مسلمانوں میں اسلام پر عمل کرنے کا ایک جذبہ پیدا کر سکتا ہے۔ اس بات کا تجربہ کیا جا چکا ہے کہ ایسے دروس لیکچرز کے ذریعے سامعین کا ۸۰ فیصد حصہ اسلام پر عمل پیرا ہو جاتا ہے یہ کام اپوزیشن کے علماء کا بھی ہے مگر وہ اس کی طرف توجہ نہیں دے رہے۔ اِن کی کوششوں کا کوئی ثبوت نظر نہیں آتا۔ حکومت کی مدد سے وہ یہ کام باآسانی کر سکتے ہیں۔

آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تصوف ایک ایسا مضمون ہے جس پر چلنے والے پورے ذوق و شوق سے اسلام کے اسباق پر عمل کر سکتے ہیں کیونکہ تصوف پر عمل کرنے والوں کو ایسی لذت ملتی ہے جو اُنہیں اسلاف والوں کے پہلو میں لا کھڑا کر سکتی ہے بشرطیکہ اس کے لوازمات کو حکومتی مدد سے پورا کیا جا سکے۔ راقم الحروف کو اگر موقع دیا جائے تو ایک یا دو سال میں تقریباً ۶۰ فیصد مسلمان اسلام پر لا کر کھڑے کئے جا سکتے ہیں۔ حکومت

کے علاوہ مشائخ اور متمول حضرات میں سے کوئی ایک بھی تن تنہا یہ کام چلا سکتا ہے مگر افسوس ہے کہ من حیث القوم کوئی بھی کم ترین سے کمترین کوشش نہیں کر رہا۔

خادم الفقراء

پیر عبداللطیف خان نقشبندی

خلیفہ مجاز نیریاں شریف' آزاد کشمیر

ای ۷/۱-'اے-ایکسٹنشن ذوالفقار سٹریٹ

کیولری گراؤنڈ' لاہور چھاؤنی۔

فون: (۰۴۲-۶۶۶۶۶۳۱)

شجرہ شریف

سلسلہ نقشبندیہ بہ مناسبت عبداللطیف خان نقشبندی، خاکپائے آستانہ عالیہ نیریاں شریف

"یا الٰہی خستہ حالم رحم کن بر حالِ ما — اتقا دارم زِ فضلت نیست جز تو والِ ما"

التجا دارم بہ درگاہت بنامِ مصطفیٰؐ — کاں بود احمدؐ محمدؐ درصفات و در عطا

دستِ او گیرم کہ دستِ خویش اورا گفتہ ای

زیں سبب گفتہ نہ باشد دستِ او از تو جدا

حضرتِ صدیقؓ و سلماںؓ، قاسمؒ و جعفرؒ دگر — بایزیدؒ و خواجہ ما بوالحسنؒ خورشید فر

بوعلیؒ بحرِ عطا بو یوسفؒ ابرِ مکرمت — عبدِ خالقؒ عارفؒ و محمودؒ شاہِ داد گر

بحرِ کرم را میتنیؒ بابا سماسیؒ و کلالؒ — نقشبندؒ، عطارؒ و چرخیؒ عشق را تیغ و سپر

پس عبیدُاللہؒ و زاہدؒ خواجہ درویشِ اجلؒ — خواجہ امکنگیؒ و باقیؒ باللہؒ آمد خوب تر

"پس مجددؒ عروۃ الوثقیٰ و شاہِ شاہ حسینؒ — خواجہ عبدُالباسطؒ و شاہ عبدِ قادرؒ دیدہ ور"

فقشوی محمودؒ خواجہ اولیاء عبداللہ شاہؒ — شاہ عنایتؒ، حافظ احمدؒ والیانِ بحر و بر

فخرِ ہند عبدُ الصبورؒ و گُل محمدؒ شاہ غفورؒ — خلق را عبدُالمجیدؒ عبدُالعزیزؒ آمزدگر

خواجہ سلطانؒ الملوکؒ و آں نظام الدینؒ شہؒ — خواجہ قاسمؒ ہادیٔ ہند و جہاں را راہبر

زاہدِ کاملِ محیؒ الدینؒ شاہِ نیروی — داد علاؤالدینؒ جہانِ عشق را کاملِ نظر

یا الٰہی رحم کن بر ما طفیلِ آں شہاں

لطف فرما بر لطیفؒ و دوستاں شام و سحر

ختم خواجگان

بروز جمعۃ المبارک بعد نماز عصر و قبل از مغرب پڑھیں

نمبر	ورد	تعداد	نمبر	ورد	تعداد
۱	بسم اللہ شریف	۱۰۰ بار	۱۳	یَا حَلَّ الْمُشْکِلَاتِ	۱۰۰ بار
۲	درود شریف	//	۱۴	یَامُسَبِّبَ الْاَسْبَابِ	۱۰۰ بار
۳	الحمد شریف	//	۱۵	یَا مُفَتِّحَ الْاَبْوَابِ	۱۰۰ بار
۴	سورہ الم نشرح لک	۷۹ بار	۱۶	یَاغِیَاثَ الْمُسْتَغِیْثِیْنَ اَغِثْنَا	۱۰۰ بار
۵	سورہ الاخلاص	۱۰۰۰ بار	۱۷	یَا وَاسِعَ الْمَغْفِرَاتِ	۱۰۰ بار
۶	الحمد شریف	۷ بار	۱۸	یَامُنَزِّلَ الْبَرَکَاتِ	۱۰۰ بار
۷	درود شریف	۱۰۰ بار	۱۹	یَا مُجِیْبَ الدَّعْوَاتِ	۱۰۰ بار
۸	یَا قَاضِیَ الْحَاجَاتِ	۱۰۰ بار	۲۰	یَااَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ	۱۰۰ بار
۹	یَا شَافِیَ الْاَمْرَاضِ	۱۰۰ بار	۲۱	درود شریف	۱۰۰ بار
۱۰	یَاکَافِیَ الْمُهِمَّاتِ	۱۰۰ بار			
۱۱	یَادَافِعَ الْبَلِیَّاتِ	۱۰۰ بار			
۱۲	یَارَافِعَ الدَّرَجَاتِ	۱۰۰ بار			

الداعی

عبداللطیف خان نقشبندی

ڈائریکٹر (ر) محکمہ

موسمیات، لاہور

ایصالِ ثواب برائے خواجگان نقشبندؒ

۱ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

۲ خواجہ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ

۳ خواجہ ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ

۴ خواجہ عبدالخالق غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ

۵ خواجہ ابویوسف ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ

۶ خواجہ عارف ریوکری رحمۃ اللہ علیہ

۷ خواجہ بابا سماسی رحمۃ اللہ علیہ

۸ خواجہ سیّد امیر کلال رحمۃ اللہ علیہ

۹ پیران پیر خواجہ بہاؤالدین رحمۃ اللہ علیہ

۱۰ خواجہ ابومنصور ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ

(من خدام دربار نیریاں شریف)

مصنف کی تصنیفات

	نام کتاب اور پبلشر	موضوع
۱۔	☆بیعت کی تشکیل (جنگ پبلشرز دو بار شائع کر چکے ہیں)	بیعت کا جواز اس کی اہمیت اور تصوف کے احوال واشغال پر مدلل گفتگو
۲۔	☆حضور قلب (جنگ پبلشرز سے چھپ چکی ہے)	معارف قلب، خشوع وخضوع، اقبالؒ کا فلسفہ حضور
۳۔	☆تہذیب نفس (پریس میں جانے والی ہے)	خطرات وآفاتِ نفس اور تزکیہ وتصفیہ باطن دنیائے دنی اور نفس کی حقیقت
۴۔	رابطۂ شیخ (جنگ پبلشرز سے شائع ہو چکی ہے)	رابطۂ شیخ اور تصور شیخ کا جواز، شیخ طریقت سے حاصل ہونے والی روحانی توجہات، کمالات، معاملات اور تصرفات
۵۔	☆ سنتِ مبارکہ (جنگ پبلشرز سے شائع ہو چکی ہے)	سنت کا تعارف، مقام، افہام، اقسام، تاریخ، آئینی اور شرعی حیثیت، احیاء اور اتباعِ سنت کی ترغیب
۶۔	☆نشان منزل (پرانا نام نشان منزل جلد اول حصہ اول) سنگ میل سے چوتھی بار طبع ہو رہی ہے)	پابندی صوم وصلوٰۃ کی اہلیت پیدا کرنے والی کتاب، دین کے بنیادی علوم مہیا کرتی ہے
۷۔	☆"Sign post of Salvation" (سنگِ میل سے چھپ چکی ہے)	نشانِ منزل کا انگریزی ترجمہ

۸۔	☆حسنِ نماز (پرانا نام نشان منزل جلد دوم) (فیروز سنز سے شائع ہو چکی ہے)	نماز کے مفصل معارف اور روحانی اسرار (ضخامت ۹۳۰ صفحات)
۹۔	☆سرمایہ ملت (پرانا نام نشان منزل جلد اول حصہ دوم) (کام جاری ہے)	ملت اسلامیہ کا چراغ، مسلمانوں کا علمی نصاب، سرمایہ قرآن، اقبالؒ اور رومیؒ کی خدمات، مکتوبات لطیف
۱۰۔	☆متاعِ اخلاق (پرانا نام نشان منزل جلد سوم) (عنقریب پریس میں جانے والی ہے)	اخلاقیات پر ایک خوبصورت اور دلچسپ کتاب
۱۱۔	☆سوز و سازِ رومیؒ (فیروز سنز پبلشرز سے شائع ہونے والی ہے)	مولانا روم کے کچھ افکار اور اشعار کی تشریح
۱۲۔	☆اسلام وروحانیتِ اور فکرِ اقبالؒ (ضیاء القرآن پبلی کیشنز سے چھپ چکی ہے)	تصوف کے علوم اور راہ حق کی تلاش
۱۳۔	☆اقتباسات از اسلام وروحانیت اور فکرِ اقبالؒ (نیشنل بک فاؤنڈیشن سے شائع ہو رہی ہے)	اصل کتاب کا ایک حصہ
۱۴۔	☆مسلک اولیائے اُمت (ہنوز زیرِ ترتیب ہے)	ان عقائد کی وضاحت جن پر اولیائے کرام قائم رہے۔
۱۵۔	☆مجلسِ اقبال (شیخ غلام علی پبلشرز سے چھپ چکی ہے)	اقبالؒ کے فارسی کلام کی فہرست جس کی مدد سے علامہ کا کوئی شعر بھی تلاش جا سکتا ہے۔
۱۶۔	☆جنیدؒ و بایزیدؒ (جنگ پبلشرز سے چھپ چکی ہے)	روحانیت جنیدؒ و بایزیدؒ اور ان کے مقالات و احوال

۱۷۔	☆عقل وعشق اور فلسفہ خودی (نستعلیق کمپیوٹر کمپوزنگ ہو چکی ہے)	عقل وعشق کا موازنہ اور اقبالؒ کا فلسفہ خودی
۱۸۔	☆اکتساب رزق وانفاق (کام جاری ہے)	قرآن کا روحانی انداز اکتساب وانفاق
۱۹۔	☆مسئلہ تقدیر (تکمیل کے آخری مراحل میں ہے)	نوجوانوں کی بے عملی کا خوبصورت حل
۲۰۔	☆غالب اور سخنورانِ کامل: (تقابلی جائزہ) (تکمیل کے آخری مراحل میں ہے)	مصنف کے بڑے بھائی جناب کے۔ایم۔نیازی غیر مطبوعہ تحریروں کا مرتب مجموعہ۔غالب کا چیدہ چیدہ شاعروں کے ساتھ تقابلی جائزہ، ۲۳ شعرا پر مفصل اور پر مغز تحریر۔
۲۱۔	☆متعلقاتِ زوجین (زیرِ ترتیب)	میاں بیوی کے درمیان تلخ زندگی کو خوش گوار بنانے کے لئے دلچسپ اور پر اثر طریقے
۲۲۔	ثنائے خواجہ (کلام پر نظرِ ثانی ہو رہی ہے)	مصنف کے نعتیہ کلام کا مجموعہ
۲۳۔	تعلیماتِ اقبالؒ (زیرِ ترتیب)	علامہ اقبال کے مختلف موضوعات پر کلام کی تشریح
۲۴۔	اَقَامَةُ الصَّلٰوةِ (نیشنل بک فاونڈیشن سے چھپ چکی ہے)	نماز کو جاری کرنے اور اِقَامَةُ الصَّلٰوة کے طریقے
۲۵۔	"شاہین کا جہاں اور" (زیرِ ترتیب ہے)	عام اور خاص مسلمان ہونے میں فرق

کتابِ رشد وہدایت کی ہمہ گیر آفاقی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے

نور وسرور اور جذبہ حب رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر مبنی آیات احکام کی مفصل وضاحت

اردو زبان میں پہلی مرتبہ

تفسیر احکام القرآن

مفسر قرآن، علامہ مفتی محمد جلال الدین قادری

آیات احکام کا مفصل لغوی وتفسیری حل امہات کتب تفسیر کی روشنی میں

مفسرین کی تصریحات کے مطابق پیش کیا گیا۔

اس لئے یہ کتاب طلباء، علماء، وکلاء، ججز

اورعوام وخواص کے لئے قیمتی سرمایہ

آج ہی طلب فرمائیں

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور۔ کراچی۔ پاکستان

تعارف مصنف

نام: عبداللطیف خان نقشبندی سال پیدائش: 1927ء

مقام پیدائش: جالندھر تعلیم: ایم ایس سی و دیگر محکمانہ تعلیمات

پیشہ: ڈائریکٹر (ر) محکمہ موسمیات لاہور، تاحال سرپرست ادارہ تبلیغ و ترویج اسلام اور سلسلہ درس و تدریس

ایڈریس: ای۔7/1 یولین کیولیری گراؤنڈ لاہور چھاؤنی: 042-6666631-6665475

اسلام کی ترویج اور اشاعت میں جن مقتدر ہستیوں نے کردار ادا کیا ہے اور جن کے طفیل وطن عزیز میں آبادی کا بہت بڑا حصہ اسلامی تعلیمات سے روشناس ہوا ہے ان میں سے ایک اہم شخصیت، مصنف کتاب ھذا پیر عبداللطیف خان نقشبندی بھی ہیں۔ موصوف اپنی دینی خدمات کے باعث ملک اور بیرون ملک دینی حلقوں میں خاصے معروف ہیں۔ اگرچہ آپ نے چالیس برس کا عرصہ ایک ایسے محکمہ میں ممتاز عہدوں پر گزارا ہے جہاں آپ کا تعلق مادی سائنس کے متعلقات سے وابستہ رہا، مگر آپ نے اس محکمہ کی اہم ذمہ داریوں کے علاوہ اوائل شباب سے ہی دینی اور تصوف کے عمیق علوم کا گہرا مطالعہ کیا اور اب تک آپ متعدد رسائل اور مکتوبات کے علاوہ بیس سے زائد دینی کتب کے مصنف ہونے کا اعزاز بھی حاصل کر چکے ہیں۔ آپ کے لاتعداد مضامین تصوف، روحانیت اور دیگر اسلامی عنوانات پر نوائے وقت، جنگ، اور خبریں جیسے اخبارات کے علاوہ مختلف دینی رسالوں کی زینت بن چکے ہیں۔ آپ کی جو کتب اب تک زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں ان میں سے آپ کی دس کتب "نشانِ منزل"، (اردو اور انگریزی) "حسنِ نماز"، حضور قلب"، بیعت کی تشکیل"، "سنتِ مبارکہ" جنیدؒ و بایزیدؒ"، "مجلس اقبال"، "رابطۂ شیخ"، "اقامۃ الصلوٰۃ"، "اسلام و روحانیت اور فکر اقبال" شائع ہو چکی ہیں اور "تہذیب نفس" کے علاوہ آٹھ عدد کتب عنقریب شائع ہونے والی ہیں۔

مذکورہ بالا تصانیف و اشاعت کے ساتھ ساتھ پیر عبداللطیف خان نقشبندی نے تبلیغ کا ایک انوکھا سلسلہ وضع کیا ہے اور وہ یہ کہ آپ مختلف مقامات پر کچھ لوگوں کے اجتماع میں دو تین دنوں کے لئے (صرف ایک گھنٹہ یومیہ) درس کا اہتمام کرتے ہیں، جس میں وہ جدید سائنٹیفک انداز میں اسلامی زندگی کے ایمان افروز حقائق اور قرآن و حدیث کے خوبصورت نکات سے آراستہ گفتگو کے ذریعے لوگوں کے دلوں کو اس طرح گرما دیتے ہیں کہ ان کی زندگیوں میں حیرت انگیز کیفیت، زبردست انقلاب اور اسلامی ولولہ پیدا ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات تو آپ منٹوں میں لوگوں کی زندگیوں کو بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ آپ کے اس حسن تعلیم و تدریس اور فیض صحبت سے اب تک ہزاروں مسلمان نشۂ اسلام سے سرشار ہو چکے ہیں۔ مصنف کی خواہش ہے کہ اگر درسوں کے اس طریقے کو وسیع تر پیمانے پر رائج کیا جائے تو مسلمانوں کی کثیر تعداد بہت جلد اصلاح نفس اور تعمیر سیرت و کردار کی دولت سے مالا مال ہو سکتی ہے مگر اس کے لئے حکومت یا متمول حضرات کی توجہ اشد ضروری ہے۔